

نے ہاتھ میں اٹھایا ہوا لقمہ وہیں رکھ دیا اور مٹھی میں لت پت انگلیاں قمیص کی جیب میں ڈال دیں۔ کہنے لگا۔ "فکر نہ کر یار۔ دس دس کے پورے پانچ نوٹ ہیں۔ بول کتنے دوں؟" پراٹھا ختم کر کے پیکٹ کی طرف متوجہ ہوئے۔ تو اس میں چھوٹی چھوٹی چیزیں بندھی ہوئی تھیں۔ ایک تیل کی شیشی، ایک کنگھی، صابن، پان، سات ماچسیں اور پندرہ بیس تار سگریٹ کی ڈبیاں۔ ان ساری چیزوں کو دستر خوان میں باندھ کے کالے خان نے بڑی احتیاط سے تکیے کے نیچے رکھ لیا۔ پھر وہیں سے اٹھ کے بستر بچھایا اور پھر سگریٹ کا دھواں اڑاتا لیٹ کے جانے کیا سوچنے لگا۔ اور میں اس کے پاس ہی بیٹھا دیکھ رہا تھا کہ یہ وہی کالے خان ہے جو فیکٹری سے میرے ساتھ آیا تھا۔ وہ آپ ہی آپ ہنس رہا تھا، وہ آپ ہی آپ مسکرا رہا تھا۔

ہمیں اپنے ہی کاموں میں پتہ بھی نہ چلا کہ کس وقت داروغہ صاحب آئے اور چلے گئے۔ بتیاں کب مدھم اور گل ہوئیں اور قیدی کس وقت بسیرا کرتے ہوئے بکھر گئے۔ بس ہم اپنی سرد دیواروں میں گھر کے اپنی حسرتوں کا ماتم کیا کرتے تھے لیکن آج تو جیسے ہم رہا ہو کے اپنے گھروں میں پہنچ گئے تھے۔ پھر جب قیدی سو گئے اور روزن میں سے سرد ہوا آکر کمبل میں لپٹی اندر آنے لگی اور چاروں طرف موت کی سی بھیانک خاموشی چھا گئی تو کالے خان نے نیا سگریٹ جلایا ٹھوڑی کے نیچے کمبل اچھی طرح لپیٹ لیا اور دوسرا کش لے کے بولا "کیا اتنی جلدی سو گئے یار؟" میں نے دیکھا اس کی چمک سگریٹ سے زیادہ تھی۔ اس کا لہجہ کہہ رہا تھا کہ وہ رات بھر نہیں سوئے گا اور جیسے بہت کچھ کہہ جائے گا۔

کالے خان کمبل اوڑھ کے بیٹھا رہا۔ اس کی انگلیاں کانپتی رہیں اور سگریٹ کا کش لمبا ہو کے کٹتا رہا۔ ٹوٹتا رہا۔

کالے خان کو اس کے ماموں نے ہی پالا تھا۔ ماں باپ تو بچپن ہی میں اسے اکیلا چھوڑ گئے تھے۔ لیکن تھوڑی سی جائیداد اس کیلئے ضرور رکھ گئے تھے ماموں نے نہ صرف اس کی پرورش کی بلکہ اس کی جائیداد کی دیکھ بھال بھی کرتا رہا۔ گاؤں کے ننھے سے اسکول میں اس نے چار جماعتیں بھی پاس کی تھیں یعنی اردو کی دو ریڈریں پڑھی تھیں۔ اور جمع تفریق کے سوال حل کئے تھے۔ لیکن یہ سب کچھ اس کے کسی کام نہ آسکا کہ مستقبل میں اسے ہل ہی تو چلانا تھا۔ جب وہ جوان ہوا اور اس نے اپنی زمینوں سے گندم کی بوریاں بھر کے ماموں کے صحن میں لا پھینکیں تو ماموں کے ذہن میں جانے کیا سمائی کہ وہ اپنے بھانجے کیلئے گاؤں کے امیر ترین گھر کی اکلوتی بیٹی بیاہ لایا۔ بنی اپنے ساتھ لمبی چاندی کے روپے ہی نہیں کھنکتی نہ لائی تھی بلکہ بے شمار زمینیں بھی لائی تھی۔ اتنی کہ انسان صبح گھوڑے پر بیٹھ کے اسے دوڑانا شروع کر دے اور شام تک دوڑاتا چلا جائے تو زمینیں ختم نہ ہوں۔ لیکن بنی کو پانے کے بعد کالے خان اور سب کچھ بھول گیا تھا۔ اس نے خود کہا۔ "یار دین محمد! میں تمہیں کیا بتاؤں کہ وہ کیسا نشہ ہے۔ شراب یا بھنگ کا نشہ تو اتر جاتا ہے۔ پر یار! یہ نشہ تو ہے ہی ایسا کہ ساری عمر نہ اترے۔ جب

ہنستی تھی تو یوں لگتا تھا جیسے گھنگھروں پر ترنم اٹھے ہوں۔ اور جب وہ چلتی تھی تو بڑی صحت مند ہوتی تھی اس کی چال۔ کتنا شہد بھرا تھا اس کے لبوں سے یار! اس کے لب چوم کے مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے میں نے کسی شہد کے چھتے کے نیچے منہ رکھ دیا ہو میرے ہونٹ مٹھاس سے تر ہو جاتے تھے۔ پھر یار! میرے بغیر تو اسے کوئی نیند ہی نہ لگتی تھی۔ میں باہر جاتا تو ظالم رات بھر جاگ کے انتظار کرتی اور میں گھر جاتا تو یوں کھل اٹھتی جیسے اسے زندگی مل گئی ہو۔"

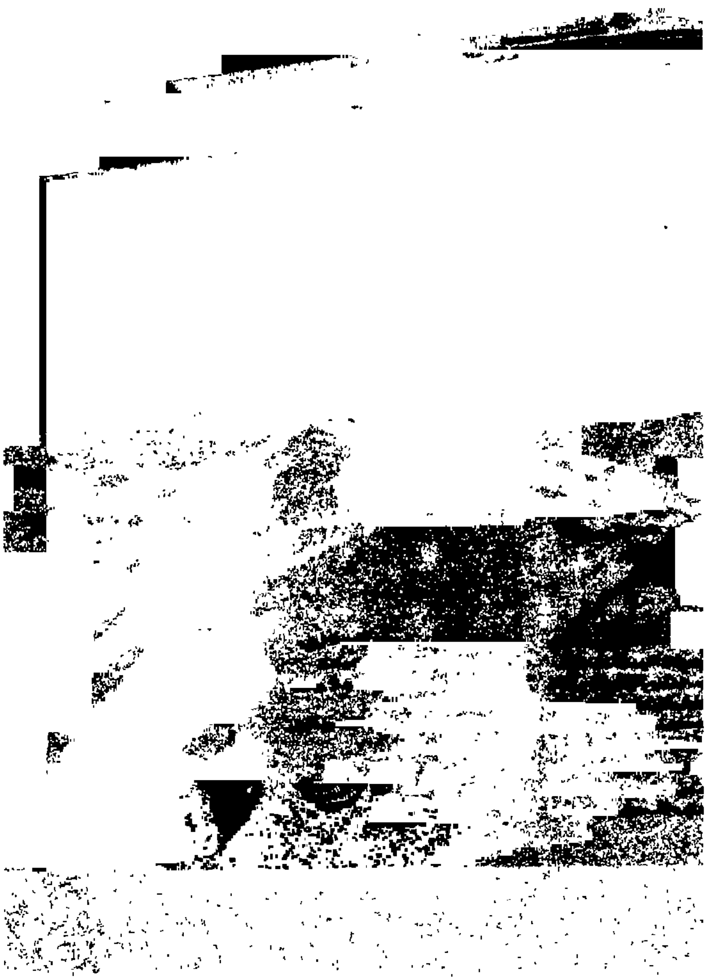
اس کی ساری باتیں سچی تھیں۔ میں اب اس کی ساری سنجیدگی کا سبب سمجھ گیا تھا۔ میں جان گیا کہ وہ پہلے کیوں بجھا بجھا سا رہتا تھا اور آج وہ اچانک ہی کھل اٹھا ہے۔ پر گاؤں میں اور لوگ بھی تو تھے جنہیں اس کی مسکراہٹوں سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ انہیں کچھ دلچسپی تھی تو بنی کی زمینوں سے۔ ایک روز جب وہ کھیتوں کو جا رہا تھا تو دشمن نے مل کے اس پر حملہ کر دیا۔ کالے خان بھی بے خبر نہ تھا۔ اس نے فوراً ڈب میں سے چاقو نکالا دیکھتے ہی دیکھتے ایک کے پیٹ میں بھونک دیا۔ جس کی آنکھوں میں لالچ رقصاں تھا، اس کی انتڑیاں ڈھیر ہو گئی تھیں۔ موقع کے گواہ تو تھے ہی۔ اسے پھانسی کی سزا نہیں ہوئی۔ اکیس برس قید کی سزا مل گئی۔ پھر اپنے لب سکیڑ کے اور سگریٹ جلا کے وہ کہنے لگا۔

"دین محمد۔ سوچو تو یار۔ میں نے بنی کے ساتھ کتنا بڑا ظلم کیا ہے اس وقت تو وہ ایک مسکراتی کلی ہے۔ لیکن میں نے اسے کیا دیا ہے۔ یہی کہ وہ اکیس برس کے طویل انتظار کے جہنم میں جل کے ختم ہو جائے۔ پکے جانو! میں جب سوچتا ہوں تو میرے سر میں سانپ رینگ جاتے ہیں اور کوئی میرے کلیجے کو کچوکے گھسیٹنا شروع کر دیتا ہے لیکن۔۔ وہ تو بڑی ہمت والی ہے یار! دیکھو کتنی دور سے مجھ سے ملنے آئی ہے۔ میرے لئے کتنی ساری چیزیں لائی ہے اور پھر وہ تو سینہ تان کے کہہ رہی تھی کہ اکیس برس آخر ہوتے ہی کتنا ہیں۔؟"

"اس طرح غم کرو گے تو تمہاری صحت گر جائے گی کالے خان۔ تمہیں بنی پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔ پھر یہ بھی تو سوچو۔ ممکن ہے تمہاری اپیل منظور ہو جائے اور پھر تمہیں بہت ساری معافیاں، بہت ساری رعایتیں بھی تو ملیں گی۔ ان سب کا خیال کرو تو دن رہ ہی کون سے جاتے ہیں۔"

اس رات ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ کالے خان نے باتیں شروع کی تھیں تو جیسے وہ سارے دنوں کی کسر پوری کر لینا چاہتا تھا۔ اس رات تو جیسے ہم سوئے ہی نہ تھے کہ ادھر آنکھ لگی اور ادھر بھونپو زور زور سے چیخنے لگا۔

اگلے دس پندرہ دنوں میں اس میں بڑی تبدیلی آگئی تھی وہ اب چپ بیٹھ ہی نہیں سکتا۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی بات چھیڑے رکھتا۔ فرق تھا تو صرف اتنا کہ اس کی ساری دلچسپیاں مجھ تک ہی محدود تھیں۔ بیرک کے دوسرے ساتھیوں سے شاید وہ بھی واقف ہو چکا تھا اس لئے ان کے نزدیک تک نہ جاتا۔ ہم دونوں کام ایک ہی جگہ بیٹھ کے کرتے تھے لیکن اب اتنے زیادہ کام چور ہو گئے تھے کہ سارا دن بیٹھے رہتے اور ایک کرسی بھی تیار نہ ہو پاتی۔ فیکٹری سے قفل کے ساری جیل کو چھان



مارنا جیسے ہماری عادت ہو گئی تھی۔ اور جب گنتی کا وقت قریب آتا تو ہم اپنے ایک ہی کلاس کے دوست سے ملنے چلے جاتے۔ ہم نے اپنا گھی، چینی، پتی اور دوسری چیزیں اسی کے کمرے میں چھپا کے رکھی ہوئی تھیں۔ بیرک میں رکھتے تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ دوست سے مل کے ہم اپنی ضرورت کی چیزیں سمیٹتے اور جلدی جلدی، دروازہ بند ہونے سے پہلے لوٹ آتے۔ کھانے کے اس میں گھی ڈالتے اور کبھی دال ٹھنڈی ہو جاتی تو ہم نوالہ منہ میں رکھ کے ذرا سا گھی بھی توڑ کے ڈال دیتے تھے کہ پیٹ میں جا کے خود ہی حل ہو جائے۔ جب گنتی ختم ہوتی اور روشنیاں بجھ جاتیں اور قیدی ادھر جانے کیلئے اکٹھے ہوتے تو میں اور کالے خان کمبل اچھی طرح لپیٹ کے اپنے اپنے تختوں پر بیٹھ جاتے۔ دن میں اگر پان مل گیا ہوتا تو پان منہ میں رکھتے۔ کالے خان تار کا سگریٹ سلگاتا۔ وہ جب تک سگریٹ سلگا نہ لیتا، ہنسی اس کے لبوں پر ناچتی رہتی تھی۔ پھر وہ باتیں شروع کرتا تو اکثر اس کی باتوں کا مرکز اس کی بیوی ہی ہوتی تھی۔ اس وقت جب کہ کالے خان کا عرف ماموں کے سوا کوئی بھی نہ تھا اور پھر اس کی عمر بھی تو بڑے عجیب دور میں تھی، اسے بیوی یاد نہ آتی تو وہ کسے یاد کرتا۔

ان دنوں اس ہنستے کھیلتے اور بات بات پر قہقہہ لگانے والے کالے خان کو میں دیکھتا تو مجھے اس کی بات پر یقین آ جاتا تھا کہ بیوی تو واقعی ایک ایسا نشہ ہے جو ایک بار چڑھ جائے تو اترنے کا نام ہی نہ لے۔ ایک رات ہم حسب معمول دیر سے لیٹے تھے لیکن روزن میں سے آتی ہوئی سرد ہوا نے میری نیند توڑ دی۔ سردی سے کانپتے اور کمبل سے منہ نکال کے میں نے دیکھا تو کالے خان ابھی تک جاگ رہا تھا۔ اس نے وہ ساری چیزیں اپنے سینے پر پھیلا رکھی تھیں جو بیوی اسے دے گئی تھی۔ وہ سگریٹ جلائے بڑی محویت سے چھت کے اندھیروں میں دیکھ رہا تھا۔

اسے بڑا چسکہ یہ لگا کہ اچھے صابن سے منہ ہاتھ دھونے لگا۔ روز نہیں تو دوسرے تیسرے داڑھی اور مونچھیں صاف کرانے لگا۔ کیا مجال جو اس کا قیدیوں والا لباس ذرا سا بھی میلا ہو جائے۔ وہ فوراً صابن لے کے سامنے نل پر جا بیٹھتا۔ اور اگر میں نے پوچھ بھی لیا کہ تمہارے کپڑے اتنے گندے تو نہ تھے، جو تم انہیں دھونے بیٹھ گئے ہو تو کھلکھلا کے ہنستا پھر ہلکے سے لہجے میں کہتا۔ "نہیں یار! یہ بات نہیں خیال تھا کہیں شام میں ملاقات نہ آ جائے۔" میں اس کی کمر پر دو ہتڑ جما دیتا تو وہ ہنستے ہوئے کپڑوں کو ملنے لگ جاتا۔ اس کی اگلی ملاقات جس کا اسے کئی روز سے انتظار تھا کوئی تین ہفتے بعد آئی۔ اس دن ہم فیکٹری سے نکل ہی رہے تھے کہ چکر کے جمعدار نے اطلاع دی۔ اتفاق سے کالے خان نے اس دن نہ کپڑے دھوئے اور نہ ہی شیو بنوائی تھی۔ پھر بھی ملاقات کی سن کے اس کی آنکھوں میں چراغ جل اٹھے تھے اور وہ مجھے چھوڑ کے بھاگ گیا تھا۔

میں اس شام کہیں نہیں گیا۔ کالے خان کہیں چلا جاتا تھا تو مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں تنہا رہ گیا ہوں۔ اگر یہ تنہائی چند لمحے بھی اور پھیلی رہتی تو میں جانے کیا کر بیٹھوں گا۔ بیرک میں آ کے پہلے میں نے اس کا بستر جھاڑا، پھر اپنا صاف کیا۔ کھانا دونوں کا لے آیا۔ اس شام گھاس پکی تھی۔ ساگ کو ہم گھاس ہی کہتے تھے۔ اور پلیٹیں فرش پر رکھ کے اس کا انتظار کرنے لگ گیا۔ یوں ہی بیٹھے بیٹھے مجھے خیال آیا کہ کالے خان اگر اتنا خوش ہے اور پرامید، تو صرف اس لئے کہ اسے اپنی اپیل منظور ہو جانے کا پورا یقین ہے۔ لیکن اگر اس کی اپیل منظور نہ ہوئی تو... پل بھر کیلئے تو میری نگاہوں کے سامنے اندھیرا پھیل گیا۔ اگر ایسا ہوا تو... تو کالے خان تو چیڑھ کے انگارے کی طرح بجھ جائے گا۔ اس کی امید اگر ایک بار بھی ٹوٹ گئی تو پھر مشکل ہی ہے جو وہ... لیکن پھر میں نے فوراً اپنے ذہن کو جھنجھوڑ ڈالا۔ نہیں، اس کی اپیل منظور ہو گی۔ بیرک کے آخری کونے کی طرف دیکھا تو وہ پہلے کی طرح بغلیں بجاتا ہنستا، جھومتا چلا آ رہا تھا۔ یہ خوشی بھی کیا چیز ہے۔ آئے تو انسان کو جیسے پر لگ جاتے ہیں، چھن جائے تو جیسے وہ زندہ درگور ہو جاتا ہے۔

قریب آ کے کھیس کی بکل کھولتے ہوئے اپنی خوشی کو بمشکل دباتے ہوئے اس نے پوچھا "کہیں گھاس تو نہیں کھا گئے؟" مجھے آپ ہی آپ ہنسی آ گئی "نہیں یار تمہارے بغیر تو اب کھانا حلق سے اترتا ہی نہیں۔" وہ سنبھل کے اپنے بستر پر جا بیٹھا۔ بکل کھول کے پوٹلیاں سامنے رکھتے ہوئے ہنس کے کہنے لگا۔ "بڑی بھاگوان ہے وہ بھی یار۔ جانے کیا الا بلا اٹھا لاتی ہے۔" اس نے پہلی پوٹلی کھولی تو اس میں دہی پراٹھے اور رانٹے تھے۔ دوسری پوٹلی میں باجرے کی پنجی روٹیاں اور گڑ کی بھیلیاں تھیں، جن میں بادام اور ساخروٹ توڑ کے ملائے گئے تھے اور تیسری میں صابن اور سگریٹ بھی آئی تھی۔ کالے خان نے اور چیزیں تو دوسری طرف سرکا دیں اور دسترخوان سامنے رکھ کے نوالا اٹھاتے ہوئے بولا۔ "یار دین محمد! یہ ملاقات کی جگہ تو بڑی واہیات ہے یار! یہ جیل والے اتنے سرد اور الو کیوں ہیں۔ جب وہ جانتے ہیں کہ ایک بیوی اپنے خاوند سے ملنے آتی ہے اور وہ بھی اتنی مدت بعد تو انہیں کم از کم چند لمحے تو تنہا رہنے دیا جائے۔" کالے خان ٹھیک کہتا تھا کہ ملاقات کا کمرہ ڈیوڑھی کے بائیں پہلو میں وارڈنوں کے دفتروں کے بالکل عقب میں تھا اس بڑے کمرے میں بہت ساری موٹی سلاخیں ایک قطار میں زمین اور چھت میں گاڑی گئی تھیں۔ اس طرف قیدی بیٹھتے تھے اور دوسری طرف ملاقاتی اور ان سلاخوں میں سے بڑی مشکل سے بازو ادھر ادھر جا سکتا تھا۔ میں نے بات ذرا ہیر پھیر سے اس سے کہی۔ "تمہارا گلہ ٹھیک ہے، لیکن کالے خان۔ ان کے نزدیک تو ایک عورت ایک قیدی سے ملنے آتی ہے اور بس۔ لیکن یار! تم نے پہلے کہا ہوتا تو اس کا بھی بندوبست ہو سکتا تھا۔ وہ اپنا ہی کلاسیا یار کس وقت کام آئے گا۔ تم ذرا فوراً بتانا، دارو غے سے سفارش کروا کے کسی خالی دفتر کا کمرہ کھلوائیں گے۔"

اس بار بیوی نے اس کا کہا مان لیا تھا۔ ایک ایک روپے کے بہت سارے نوٹ لائی تھی۔ جیل میں بخشش کا دھندا تو زیادہ ہوتا ہے نا۔ ایک روپے سے زیادہ کون دے، پیسے گن کے جیب میں ڈال کے اور باقی سامان سرہانے رکھ کے کالے خان بولا۔

اکثر شائقینِ معمہ

ہم سے دریافت کرتے ہیں کہ

بینک پے آرڈر، ڈرافٹ اور چیک

میں کیا فرق ہے؟

چیک کیش ہونے کی کوئی ضمانت نہیں لی جاسکتی

اس کے برخلاف

بینک پے آرڈر یا بینک ڈرافٹ

کی ادائیگی کا ذمہ دار

بینک اور صرف

بینک ہوتا ہے!

برصغیر پاک و ہند میں

دوشیزہ ادبی معمہ

واحد معمہ ہیں جو بڑے انعامات بینک پے آرڈر یا بینک ڈرافٹ کی صورت میں ادا کرتے ہیں

"اس کی صحت بہت ہی گر گئی ہے دین محمد! پہلے تو وہ آنگن میں چلتی تھی تو سارا آنگن کانپ جاتا تھا۔ بس اب تو بڑی کمزور ہو گئی ہے۔ پھر رو تو وہ بات بات پر پڑتی ہے۔ میرے میلے کپڑے اور بڑھی شیو دیکھ کے تو وہ اس طرح روتی ہے کہ میں کیا بتاؤں۔ پھر بڑے غصے گلے سے کہنے لگی۔ "لاؤ کالے خاں! تمہارے کپڑے دھو دوں۔" دین محمد! میں بھی کیا انسان ہوں یار! کہ اچھا بھلا ہونے کے باوجود اسے دکھی کیے ہوئے ہوں۔ اس کے آنسو بہتے ہیں تو چپ دیکھتا رہتا ہوں۔ کچھ کر بھی تو نہیں سکتا نا۔" کالے خاں کا لہجہ اداس سا ہو گیا۔ میں نے اس کی گردن دبائی۔

"تم نے پھر وہی بکواس شروع کر دی ہے خدا تمہارا ستیاناس کرے۔ کہا تو ہے تمہاری اپیل منظور ہو جائے گی۔ تم پھر۔ تم نے اسے تسلی دی ہوتی نا!" کالے خاں نے ذرا دیر بعد سر اٹھایا اور مجھے دیکھ کے کہا۔ "وہ تسلی تو بہت دی ہے لیکن ان تسلیوں سے کبھی دل بھی مانا ہے؟" پھر آپ ہی آپ کہنے لگا۔ "اگلی بار جی آئے گی تو تمہیں اس سے ضرور ملاؤں گا۔ میں نے آج بھی ذکر کیا تھا تمہارا اور۔" لیکن فوراً رک کے وہ کہنے لگا۔

"نہیں بھئی! اگلی مرتبہ تو تم علیحدہ کمرہ کھلوا کے دے رہے ہو نا۔ تو تمہیں پھر کیوں لے جاؤں۔ اپنے پاؤں پر خود ہی کلہاڑا مارنے والی بات ہو گی۔ یہ تو۔" زور سے ہنس کے کالے خاں نے کروٹ بدل لی اور میں بھی ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔

میرا خیال تھا کہ ملاقات کا اثر زیادہ دیر تک نہیں رہے گا اور کالے خاں جو اس وقت اداس ہے، صبح تک ٹھیک ہو جائے گا۔ میرا خیال درست نکلا کیونکہ صبح تو وہ پہلے سے بھی زیادہ ہشاش بشاش تھا۔ ابھی سارے قیدی سوئے ہوئے تھے کہ اس نے مجھے جھنجھوڑ ڈالا۔ میں نے آنکھیں کھول کر اوپر روزن کی طرف دیکھا تو آثار بتا رہے تھے کہ مشرق کی سمت چاندی اور دودھ بہنے لگے ہیں۔ میں بھی اٹھ بیٹھا اور ہم دونوں ان چیزوں کا شمار کرنے لگے جو دو روز پیشتر ختم ہو گئی تھیں اور پیسے نہ ہونے کی وجہ سے ہم منگوا نہ سکے تھے۔

کالے خاں اب پہلے سے بھی زیادہ خوش رہتا تھا۔ اب اس کی چہل قدمی بڑھ گئی تھی اور اس نے دفتر میں کام کرنے والے بابو قیدیوں، بیرک کے جمعداروں اور لنگر کے جمعداروں سے واقفیت پیدا کر لی تھی۔ ہسپتال کے سارے لوگ اسے جانتے تھے اور باورچی تو اس کا جیسے لنگوٹیا یار بن گیا تھا۔ بہر ایک تبدیلی اس میں یہ آئی تھی کہ اب وہ ہر روز ہی دفتر کے بڑے بابو قیدی کے پاس جانے لگا تھا۔ اس کو یہ عادت سی بن گئی تھی کہ کھانا نہ ملے تو بھوکا سو رہتا تھا لیکن بابو سے ملاقات نہ ہو تو اسے رات بھر نیند نہ آتی تھی۔ وہ کئی بار مجھ سے پوچھتا کہ کیوں میں تو بابو سے نہیں ملا اور بابو نے مجھے کوئی بات تو نہیں بتائی۔ اس کا خیال تھا، جونہی اس کی اپیل کا فیصلہ آئے گا۔ بابو جھٹ سے اسے بتا دے گا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہر روز ملنے کا عادی سا ہوتا جا رہا تھا مجھ سے بھی اکثر وہ پوچھتا رہتا تھا اور جب میں اسے بتاتا کہ اپیل کے فیصلے میں تو کچھ ماہ بھی لگ سکتے ہیں تو وہ بڑی حسرت سے کہتا۔

"تین ماہ تو ہو چلے ہیں اور کتنا انتظار کرنا پڑے گا یار!"

لیکن ایک ماہ اور گزر گیا تھا مگر اپیل کا کوئی جواب نہیں آیا تھا اور نہ ہی جی اس سے ملنے آئی تھی۔

ایک رات بات یوں ہوئی کہ جانے کیوں کالے خاں نے تکیے میں رکھے ہوئے آٹھ دس روپے نکال کے اپنے سرہانے رکھ دیئے تھے۔ اور صبح جب وہ فیکٹری جانے لگا تو اس نے گو بستر تہہ کر کے رکھا تھا لیکن روپے اٹھانا بھول گیا تھا۔ وہ تو اسے اسی وقت یاد آیا جب میں نے اس سے کہا کہ آج گھی ختم ہے، تھوڑا سا منگوا ہی لیں۔ تو وہ مجھے گھسیٹتا بھاگتا ہوا بیرک میں آیا، کمبل اٹھا کے دیکھے ایک ایک کمبل کو جھاڑا لیکن روپے ہوتے تو ملتے۔ غیر حاضری میں کوئی دوسرا قیدی ہاتھ پھیر گیا تھا۔ کمبل اسی طرح چھوڑ کے وہ باہر نکلا اور کہنے لگا۔ "پیسے تو ختم ہو گئے یار۔ رات آٹھ دس روپے تھے، وہ تو کوئی لے اڑا۔ لیکن یہ جی کہاں مر گئی جو اتنے دنوں سے نہیں آئی؟"

جی سے پچھلی ملاقات کو لگ بھگ چھ ہفتے ہو رہے تھے۔ اور دو دنوں سے تو وہ بے حد بے چین دکھائی دے رہا تھا۔ گو اس نے مجھ سے چھپانے کی کوشش ضرور کی تھی لیکن میں اس کی حرکات ہی سے تاڑ گیا تھا کہ وہ بے چین ہے اور اس کی بے چینی کی وجہ سمجھنا بڑی بات نہ تھی۔ جس دن اس کے پیسے چوری ہوئے، اس سے اگلی رات وہ بڑی دیر تک نہیں سو سکا تھا جیسے اسے بھول گئے تھے۔ شام اس نے لنگر کی دال کھائی تھی تو جی کو بے اختیار یاد کیا تھا اور اب جی ہی سے متعلق طرح طرح کے خیالات اس کی نیند کو دور بھگا کے لے جا رہے تھے۔ شام مجھ سے بھی اس نے کہا تھا کہ وہ خیریت سے ہو کہیں بیمار نہ پڑ گئی ہو۔ اور میں نے اسے تسلی بھی دی تھی لیکن اس کے دل میں جو وسوسے جنم لے چکے تھے، وہ کسی طور ختم نہیں ہو رہے تھے۔

اگلے روز کالے خاں کی کچھ عجیب سی حالت تھی۔ وہ کھویا سا گیا تھا۔ دوپہر میں جب پھر اسے لنگر کا سالن ملا تو اس کے لب، پلکیں اور ہاتھ ایک ساتھ کانپ گئے تھے اور اس نے بڑی مشکل سے ایک ایک نوالے کو حلق سے اتارا تھا۔ لیکن ہم ابھی بیرک میں چھٹی کے بعد آ کے بیٹھے ہی تھے کہ جمعدار نے اپنی مخصوص آواز میں اسے پکارا۔ "کالے خاں ولد شہباز خاں قیدی اکیس سالہ چلو تمہاری ملاقات آئی ہے۔" تو ہم دونوں ایک ساتھ بھاگ کھڑے ہوئے۔ بابو کو کہہ کہا، سفارش کرائی اور ڈیوڑھی میں جب دفتر کا کمرہ مل گیا اور ادھر جیل کی بڑی پھاٹک سے جی اندر آئی اور ادھر بڑے دروازے سے کالے خاں گیا تو میں نے جھری میں سے دیکھ کے، پھر نگاہیں ہٹا کے سوچا۔ "وہ دن کب آئے گا میرے دوست! جب تم اس گیٹ سے باہر جاؤ گے اور پھر کبھی بھی اس دنیا میں لوٹ کے نہیں آؤ گے، کبھی نہیں۔ جانے وہ دن کب آئے گا؟" یہی سوچتے ہوئے بیرک میں چلا آیا وہاں ٹھہر کے لینا بھی کیا تھا۔

لیکن جانے کیا بات تھی، پہلے کالے خاں ملاقات کے بعد اس وقت لوٹتا تھا جب بیرک کا آخری دروازہ بھی بند ہونے والا ہوتا تھا۔ اس شام ابھی



انتہائی پسندیدہ
کنول لین اور
صنم پاپلین
کی شخصیت کو اجاگر کرنے والے ملبوسات
کے لئے بے مثال
ٹیکسٹائل ملز
کراچی



کشف و کرامات اولیائے کرام کا خاصہ ہے۔ جو کبھی کبھی بندگانِ دین کے مبارک ذریعے سے اثر سے بیت بندوں کو اس کے لطف و کرم کے صدقے میں عطا ہو جاتا ہے۔



بابا مستیشان احمد صاحب

کا شمار بھی انہی برگزیدہ ہستیوں میں ہے جنہیں روحانی انعام و اکرام سے نوازا گیا اور اس کا منہ بولتا ثبوت حقیقتِ حال سے متعلق وہ اہم پیشن گوئیاں ہیں جو بذریعہ کشف کمل کی صورت میں ان پر ظاہر ہوتی رہیں۔ بابا جی سے شادی بیاہ، منگنیات، محبت میں کامیابی یا ناکامی، مالی مشکلات اور اولاد وغیرہ سے متعلق آپ کے سوالات کے جوابات بذریعہ کشف دینے پر رضامند ہو گئے ہیں اور وہ بک چکے ہیں آپ کے حالات کے تمام پہلوؤں کی جانچ کر فراخدلی کریں گے۔ صرف ضرورت ہے اس نام کی جس سے آپ پکارے جاتے ہیں اور اس کے ساتھ آپ کی والدہ کا نام، عمر اور مقامِ پیدائش۔ آپ ایک وقت میں صرف سوال کر سکتے ہیں۔ جوابات کے لیے جوابی لفافہ بھیجنا ضروری ہے۔ بابا جی کے جوابات کا کوئی نذرانہ نہیں ہے۔

خط لکھنے کا پتہ

روحانی ڈاک

۲۸ ناظم آباد شیرز ۵ پوسٹ بکس ۲۴۰۵

کراچی ۱۸

[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]



بے نظیر

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible] ؟؟؟

شاہ بلیغ الدین

پہلے قیدی

کسی کو کچھ معلوم نہ تھا کہ کہاں جانا ہے یا کیا کرنا ہے! ... پھر بھی دو دن تک ایک کاروان بے سرو سامان چلتا رہا۔ مدینے سے یہ کاروان نکلا تھا اور مکے کی جانب رواں دواں تھا۔ بے مقصد نہ کوئی کام کرتا ہے نہ بغیر منزل کے کوئی چل پڑتا ہے لیکن یہ اطاعت گزاروں اور وفا کیشوں کی ایک ایسی جماعت تھی جو مقصد اور منزل کے پتے کے بغیر نکل کھڑی ہوئی تھی۔ ان میں کا ایک ایک فرد لذت یقین سے سرشار تھا۔ یہ ایسے مست الست تھے کہ انہیں مقصد اور منزل کی پرواہ ہی نہ تھی۔ ان کا عمل خالصتاً للہ تھا۔ انہیں کیا ضرورت تھی کہ پوچھتے کہاں جانا ہے یا کیا کرنا ہے!؟

دیوانہ راہوئے بس است

چشم مست ساقی کوثر کا اشارہ ہوا تھا اور یہ رندانِ بادہ کش دامن جھاڑ اٹھ کھڑے ہوئے۔

ہوا یوں کہ ہجرت کے سترھویں مہینے رجب المرجب کے دنوں میں حضرت عبداللہ بن جحش بارگاہ نبوی میں طلب ہوئے، کون جانے ان سے کیا کہا گیا۔ جو بات ہم تک پہنچی ہے، اس کا مطلب ہے کہ "کچھ جیالوں کو ساتھ لو اور اللہ کی راہ میں نکل پڑو۔ یہ لو ایک تحریر بھی ساتھ لیتے جاؤ۔ خبردار! اسے پڑھنا مت جب تک دو دن کا سفر کر چکو تو اسے کھول کر پڑھنا اور جو کچھ اس میں لکھا ہوا ہے اس پر عمل کرنا عمل کرنے سے پہلے اپنے ساتھیوں سے پوچھ لینا۔ کوئی انکار کرے یا لوٹنا چاہے تو اسے ہرگز نہ روکنا۔"

ارشاد نبوی سن کر عبداللہ بن جحش خوش خوش کاشانہ نبوی سے نکلے اور تیاریوں میں لگ گئے۔ عبداللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ ام المومنین حضرت زینب کے سگے بھائی! ان کی والدہ حضرت امیمہ حضرت عبدالمطلب کی بیٹی تھیں۔ وہ اس وقت ایمان لے آئے جب مسلمان گنتی کے چند تھے۔ جاہلیت میں ان کا برّہ نام تھا، ہادیٔ برحق نے عبداللہ نام رکھا۔ یہ جماعت جہاد کے لیے ادھر مدینہ جانے سے بھی پہلے کی بات ہے جو اللہ کے لیے نکلنے والے کی رضا کی خاطر تین مرتبہ ہجرت کر چکے تھے۔ ۱۰ بار ...

[illegible]

جب [illegible]

کے [illegible] تھے۔

[illegible]

کے [illegible]

[illegible]

[illegible]

تھے ہر دو کی سواری کے لئے ایک اونٹ تھا۔

[illegible] عبداللہ بن جحش نے اسے کھولا۔ لکھا تھا: "اللہ کے نام پر [illegible] بڑھتے رہنا اور ساتھیوں [illegible] کو [illegible] نخلہ پہنچ جاؤ۔ یہاں [illegible] قریش کے ایک کاروان کا انتظار کرو اور اس کے بارے میں خبروں سے آگاہ کرتے رہو۔ [illegible] پھر ایک [illegible] [illegible]

یہ مقام جہاں مسلمان جا پہنچے تھے ایک نخلستان تھا مکہ اور طائف کے درمیان۔ اس وقت [illegible] [illegible] ٹھہرے تھے۔ [illegible]

ابن جحش نے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] مسلمان [illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] کو [illegible] [illegible]

[illegible] ہوئی [illegible]

[illegible] سے [illegible] سکا [illegible]

قریش نے ایک [illegible] نخلستان میں دیکھ کر [illegible]۔ [illegible] پہلی [illegible]

[illegible] مسلمانوں نے [illegible] قریش [illegible] حضرت [illegible] [illegible] [illegible] حضرت [illegible] [illegible]

مسلمانوں کے [illegible] حضرت [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] مسلمان [illegible] [illegible] [illegible] مسلمان [illegible] آخری [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

مسلمان [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

حضرت [illegible] قریش [illegible]

اس میں سے پانچواں حصہ نکال کر الگ کر دیا۔ صحابہ کو بتایا کہ یہ ہم اللہ کے رسول کی خدمت میں پیش کریں گے۔ ایسا کرنے کا کوئی حکم نہ تھا۔ بس حضرت عبداللہ نے ایک اجتہاد کیا تھا۔

مسلمان مدینہ پہنچے تو حضور اکرمؐ کی خدمت میں غنیمت کا خمس پیش کیا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو جو عمل کا انتظار فرما رہے تھے غنیمت دیکھ کر آپ ناراض ہو گئے اور امیر جماعت حضرت عبداللہ سے فرمایا کہ میں نے تمہیں لڑائی کا کوئی حکم نہیں دیا تھا۔ تم نے حرمت کے مہینے میں خون بہایا۔ آپ نے غنیمت کا پانچواں حصہ قبول فرمانے سے بھی انکار کر دیا اور غنیمت کی تقسیم روک دی۔ قیدیوں کا معاملہ بھی ملتوی کر دیا۔

ابن حضرمی کے قتل پر یہودی اور کفار بڑے بولائے، جہاں جاتے کہتے کہ لو بھئی اب مسلمانوں نے رجب کے مہینے کا احترام بھی چھوڑ دیا۔"

حضرت عبداللہ بن جحش نے جو کچھ کیا تھا اپنی ذمہ داری پر کیا تھا۔ اب جو حضور اکرمؐ نے سرزنش فرمائی تو بڑے پریشان ہوئے۔ ان کے سبھی ساتھی ڈر رہے تھے کہ ان کی جرأت بے جا پر کہیں خدا کا غضب نہ نازل ہو جائے۔

بات سے بات نکلتی رہی اور یہ چرچا بڑھنے لگا تو آخر کار رحمت خداوندی جوش میں آئی۔ اور حضرت عبداللہ بن جحش نے جو کچھ کام خلوص نیت سے کیا تھا اس کے بارے میں جبرئیل امین وحی لے کر آئے جس میں صاحب وحیؐ سے مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا گیا کہ "لوگ آپ سے حرمت کے مہینے میں لڑائی چھیڑنے کے بارے میں دریافت کرتے ہیں تو کہہ دیجیئے کہ اس میں لڑائی کرنا بڑا (گناہ) ہے مگر اللہ کی راہ سے روکنا اور اس کا انکار کرنا اور مسجد حرام سے روکنا اور اس کے رہنے والوں کو اس سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس سے بھی بڑا گناہ ہے اور فساد (یعنی دین سے پھیرنے کے لئے ایذا) قتل سے بڑا (گناہ) ہے۔" آگے چل کر دین سے پھیرنے کی کوششوں کا ذکر فرمایا گیا کہ "یہ لوگ ہمیشہ آپ سے جنگ کرتے رہیں گے یہاں تک کہ اگر موقع پائیں تو سب کو دین سے پھیرنے کی کوشش کریں گے۔"

یہ وحی کیا آئی کہ مسلمانوں کی دنیا بدل گئی۔ حضرت عبداللہ بن جحش اور ان کے ساتھی تو بہت خوش ہوئے بلکہ انہیں تو امید بندھی کہ ان کے حسن نیت کا صلہ بھی ضرور ملے گا۔ چنانچہ انہوں نے دربار نبویؐ میں پہنچ کر پوچھا بھی کہ "یا رسول اللہ! ہم نے تو جہاد کیا ہے کیا اللہ پاک اس کا اجر نہیں دے گا؟"

نیتوں کا حال جاننے والے پروردگار نے یہ بات بھی صاف کر دی اور وہ آیت نازل ہوئی جس کے الفاظ یہ ہیں کہ

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَالَّذِیۡنَ هَاجَرُوۡا وَجٰهَدُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِکَ یَرۡجُوۡنَ رَحۡمَتَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ

"بے شک جو لوگ ایمان لائے اور خدا کے لئے وطن چھوڑ گئے اور (کفار سے) جنگ کرتے رہے وہی خدا کی رحمت کے امیدوار ہیں اور خدا بخشنے والا رحمت کرنے والا ہے۔"

اب کیا تھا مجاہدوں کی سن لی گئی۔ حضور اکرمؐ نے غنیمت اور قیدیوں کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ کچھ ہی دن گزرے تھے کہ جنگی قوانین جاری اور تقسیم غنیمت کے احکام نازل ہو گئے۔

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کی غنیمت کے ساتھ حضرت عبداللہ بن جحش کی لائی ہوئی غنیمت بھی تقسیم فرمائی۔

حضرت عبداللہ نے جو اجتہاد کیا تھا۔ اسے بارگاہ رب العزت میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا اور حکم آیا کہ غنیمت کا پانچواں حصہ پیغمبر خدا کا ہے باقی مجاہدوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

اس سریے کی تاریخی اہمیت ہے۔ مسلمانوں کے ہاتھوں پہلا قتل اسی مہم میں ہوا۔ پہلی بار قیدی اسی مہم میں گرفتار ہوئے اور پہلی غنیمت اسی مہم میں آئی۔

ایک اور خصوصیت بھی اسی مہم سے وابستہ ہے کہ امیر المومنین کا لفظ بھی پہلی مرتبہ اس مہم میں استعمال کیا گیا۔ بعض کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن جحش مہم پر جانے لگے تو یہ لقب بارگاہ رسالت مآب سے ملا تھا لیکن یہ صحیح نہیں ہے بعض کہتے ہیں کہ مہم کے دوران میں ساتھیوں نے خود ہی اپنے سالار کو اس لقب سے پکارنا شروع کیا۔ خلفائے راشدین میں یہ لقب سب سے پہلے حضرت عمرؓ کے لیے استعمال ہوا اور صحابہ کرام میں یہ فضیلت حضرت عبداللہ بن جحشؓ کو حاصل ہوئی۔

ذٰلِکَ فَضۡلُ اللّٰهِ یُؤۡتِیۡهِ مَنۡ یَّشَآءُ

یہ اللہ کی مہربانی ہے جسے چاہے سرفراز کرے

نسیم ضیغمی

آپ کو یکم ... [illegible]

... [illegible] ... شہناز ... [illegible]

... زندگی میں ... [illegible]

... [illegible] ... آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں ... [illegible]

... [illegible]

جانور

وقت کا اپنا ایک بہاؤ ہے۔ وقت ایک دریا ہے جو ازل سے ابد کی جانب رواں دواں ہے۔ ساری تہذیبیں بلبلوں کی مانند ہیں جو وقت کے دھارے پر ایک پل کے لئے ابھرتے ہیں اور ہمیشہ کے لئے معدوم ہو جاتے ہیں۔ ہماری زندگیاں ناپائیدار ہیں۔ ہماری اپنی کوئی حیثیت اور اہمیت نہیں ہے۔ ہم ہوا اور وقت پر زندہ رہنے کے لئے سر اٹھاتے ہیں ... [illegible] ... وقت ہمیں فنا کر دیتا ہے ... [illegible] ... تاہم کچھ شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جو وقت کا ... [illegible] ... پر ہمیشہ کے لئے ... [illegible] ... کسی نہ کسی گوشے میں ان کی یاد تازہ رہتی ہے ... [illegible] ... وہ اتنا دہ ستاروں کی طرح ... دیتے ہیں۔ اور ہم نہیں ... [illegible] ... رکھنے کے ... نہیں ... چلتے۔ ڈاکٹر ... ایک ... شخصیت تھا۔

ڈاکٹر ... علم فلکیات کا پروفیسر تھا۔ ... خوش پوش، خوش وضع ... سفید ... اور ... آنکھیں ... تھا۔ وہ بہت با اخلاق تھا ... [illegible] ... دیکھا تھا۔ ... کا آئیڈیل تھا۔ سب اس پر ... [illegible] ... اس کی وجہ سے فلکیات کے شعبے میں داخلے ... تھا۔ لیکن ... [illegible] ... دیکھتا بھی نہیں تھا۔ کلاس ... زیادہ لڑکوں کی طرف اپنا رخ کئے رکھتا تھا۔ لڑکیوں کو یوں نظر انداز کر دیتا جیسے وہ وہاں ...

سے مزین ہوتی تھیں۔ لڑکیاں جل جاتیں مگر جل جانے کے سوا اور کیا کر سکتی تھیں۔

لڑکیاں جلتی رہتیں، کڑھتی رہتیں اور اس کی [illegible] التفات کو ترستی رہتیں۔

ڈاکٹر کامران کے بارے میں مزید کچھ کہنے سے پیشتر میں بہتر سمجھتی ہوں کہ اپنا اور اپنی دوستوں کا تعارف کرا دوں۔ میں، زبیدہ، ہما، ثمینہ، پروین اور مہر آپس میں گہری دوست تھیں۔ ہمارا تعلق کھاتے پیتے اور روشن خیال گھرانوں سے تھا۔ والدین کی طرف سے ہمارے اوپر ناروا طور پر کہیں آنے جانے کی پابندی نہیں تھی۔ بس یہ تھا کہ انہیں مطلع کرنا پڑتا تھا۔ انہیں ہم پر اعتماد تھا، اعتبار تھا اور ہم نے کبھی ان کے اعتماد کو مجروح نہیں کیا۔ ہم چھ لڑکیوں میں زبیدہ سب سے سینیئر تھی۔ سینیئر ان معنوں میں کہ وہ عمر میں ہم سب سے بڑی تھی۔ شادی شدہ تھی۔ تجربے کار تھی اور سوجھ بوجھ کی اچھی تھی۔ سارے وقتوں پر وہ ہمیں بڑے اچھے مشورے دیا کرتی تھی۔ وہ بڑی بہن کی مانند ہمارے کام آتی تھی۔ اس کا شوہر کاروباری سلسلے میں ہمیشہ باہر رہا کرتا تھا۔ ایک بچہ تھا جو نانی کے پاس رہتا تھا۔ اور وہ خود ایک بوڑھی ملازمہ کے ساتھ بڑے سے مکان میں رہتی تھی۔

ہمارے والدین زبیدہ سے اچھی طرح واقف تھے۔ وہ ہمارے گھر آتی رہتی تھی اور اس کا عمومی اثر ہمارے والدین پر بڑا اچھا تھا۔ چنانچہ ہم لکھنے پڑھنے کی غرض سے اکثر زبیدہ کے گھر ٹھہر جاتے تھے۔ زبیدہ تنہا رہتی تھی اور بقول کسی کے اچھی عورت تھی۔ اس لئے ہمارے گھر کے لوگ ہمیں زبیدہ کے یہاں ٹھہرنے کی اجازت دے دیتے تھے۔ کبھی کبھی ہم دو دو تین تین دن زبیدہ کے یہاں ٹھہر جاتے تھے اور زبیدہ فون پر ہمارے گھروں میں اطلاع دے دیتی تھی کہ ہم اس کے یہاں ہیں۔

زبیدہ کا گھر ہمارا اپنا گھر تھا۔ ہمیں اس کی ہر چیز استعمال کرنے کی اجازت تھی۔ زبیدہ کو کالج وغیرہ جانے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ وہ ایک سیٹھ لائف گزار رہی تھی، مگر اس نے محض ہماری وجہ سے داخلہ لے رکھا تھا اور ہم سب محض ڈاکٹر کامران کی وجہ سے شعبۂ فلسفہ میں گھسے ہوئے تھے۔

زبیدہ کے علاوہ میری دوسری دوستوں میں ہما سب سے زیادہ خوبصورت، شوخ، چنچل، بے باک اور سب سے آزاد رو لڑکی تھی۔ اس کے برعکس مہر کچھ مذہبی خیالات کی تھی۔ اُسے اخلاقی قدروں کا بڑا پاس تھا۔ وہ ہماری جماعت کی مولوی تھی۔ بایں ہمہ ڈاکٹر کامران سے متاثر تھی اور اسے پسند کرتی تھی۔ ثمینہ اور پروین نارمل لڑکیاں تھیں۔ انہیں اپنے مستقبل کی بڑی فکر رہتی تھی۔

ہم پانچوں لڑکیاں پانچ عنصروں کی مانند تھیں مگر ڈاکٹر کامران ہماری مشترکہ دلچسپی کا مرکز تھا۔ ہم نے کسی بیماری یا [illegible] کے علاوہ کبھی ڈاکٹر کامران کی کلاس کو مس نہیں کیا تھا۔

وہ ایک خوشگوار دن تھا۔ ڈاکٹر کامران کلاس میں لیکچر دے رہا تھا اور لڑکیاں حسب معمول اسے سننے کی بجائے [illegible] اور توجہ سے اس کے چہرے اور حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہی تھیں۔ یہ اتفاق تھا کہ آج مہر کلاس میں نہیں آئی تھی۔ وہ کبھی ڈاکٹر کامران کی کلاس سے غیر حاضر نہ ہوتی تھی۔ [illegible] ایک بار شدید نزلہ اور سر درد کی کیفیت میں بھی وہ کلاس میں آگئی تھی تا کہ ڈاکٹر کامران کی کلاس مس نہ ہو سکے۔ میں یہ سوچ ہی رہی تھی کہ اچانک ہما نے زور سے میری پسلیوں میں کہنی ماری اور سرگوشی میں بولی "کہاں ہو؟ پروفیسر صاحب تمہاری طرف دیکھ رہا ہے۔"

میں نے چونک کر دیکھا۔ ڈاکٹر کامران واقعی میری طرف دیکھ رہا تھا مگر وہ لمحہ بہت مختصر تھا۔ دیکھنے کا انداز بالکل سرسری تھا لیکن اس کی ان نگاہوں میں بہت کچھ تھا۔ کوئی ایسی بات جو صرف نظروں سے کہی جا سکتی تھی۔ میں نے دیکھا تھا کہ اس کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ بھی نمودار ہوئی تھی۔ [illegible] مگر معنی خیز [illegible] سے میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا کہ یہ مسکراہٹ اور نگاہ بطورِ خاص میرے لئے نہیں ہو سکتے تھے۔ [illegible] کی بات تھی کہ ڈاکٹر کامران کسی لڑکی کو معنی خیز نظروں سے دیکھے [illegible] مسکرائے بھی۔ ڈاکٹر کامران [illegible] سرد مزاجی کے لئے مشہور تھا۔

میں نے ایک بار پھر ڈاکٹر کامران کی طرف دیکھا۔ اس نے میری طرف دیکھا مگر اس طرح جیسے کوئی [illegible] ایک شاگرد کو [illegible] نہیں۔ میں اتنی خوش نصیب نہیں تھی۔ ڈاکٹر کامران اور [illegible] ناممکن! مجھے خود پر ہنسی آنے لگی۔ شہناز! تمہارا [illegible] دماغ چل گیا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ [illegible] کسی پر اپنی نظریں اور مسکراہٹ [illegible] ہو۔ میں نے خود کو سمجھایا، تسلی دی اور [illegible]



ہونٹوں کی وہ مسکراہٹ اور نظریں میرے دل و دماغ پر ثبت ہو کر رہ گئی تھیں۔

پھر اچانک ہی پیریڈ ختم ہونے کی گھنٹی بج اٹھی۔ ہوتا یہ تھا کہ گھنٹی بجتے ہی ڈاکٹر کامران اپنا بریف کیس اٹھا کر باہر نکل جاتا تھا مگر اس بار ایسا نہیں ہوا۔ وہ میز کے قریب کھڑا ہوا طلبا کو باہر نکلتے دیکھتا رہا جب نصف سے زیادہ طلبا باہر نکل گئے تو اس نے بریف کیس اٹھایا اور ایک بار پھر میری طرف دیکھا۔ اس دفعہ دیکھنے کا [illegible] بدلا ہوا تھا۔ وہ مجھے تقریباً گھور کر دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہوں سے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہ رہا ہے۔ یک پیغام تھا جو وہ نظروں کے ذریعے مجھ تک پہنچا رہا تھا۔

اپنی دوستوں کی پرواہ کئے بغیر میں تیزی سے اٹھی اور باہر نکلنے کے لئے باقی ماندہ طلبا کے ہجوم میں شامل ہو گئی اس وقت ڈاکٹر کامران بھی دروازے کی طرف بڑھا۔ پھر وہ میرے اور طلبا کے درمیان سے گزرا۔ اس طرح کہ اس کا شانہ میرے شانے سے ٹکرا گیا اور اسی لمحے میں اس کا دایاں ہاتھ میرے بائیں ہاتھ سے مس ہوا اور ایک مڑا تڑا کاغذ سرکتا ہوا میری ہتھیلی میں آ گیا۔ ڈاکٹر کامران تیزی سے آگے نکلتا چلا گیا۔

میں نے مضبوطی سے مٹھی کو بند کرنا چاہا تھا مگر پاؤں من من بھر کے ہو رہے تھے۔ میں چل رہی تھی مگر قدم لڑکھڑاتے جا رہے تھے پھر میں نے خود کو سنبھالا اور کاغذ کے پرزے کو ایک کتاب میں چھپا لیا۔ کچھ آگے گئی تھی کہ زبیدہ اینڈ کمپنی نے مجھے آ لیا اور سوالات کی بوچھاڑ کر دی مگر میں بڑی خوبصورتی سے انہیں ٹال گئی۔ رقعے کی نوعیت سے واقف ہوئے بغیر انہیں اس کے بارے میں بتانا مناسب نہیں تھا۔

ہم کالج کے ریستوران کے قریب پہنچے تھے کہ اچانک آسمان ابر آلود ہو گیا اور ہوا ایک لخت تھم گئی۔ میں نے چائے پینے کی تجویز پیش کی جسے اتفاق رائے سے منظور کر لیا گیا۔ ہم یہاں اکثر آتے رہتے تھے اور چائے پینے کے دوران گفتگو بھی جاری رہتی تھی۔ موضوع عموماً ڈاکٹر کامران ہوتا تھا۔ اس گفتگو میں مہر بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھی۔ مہر کا خیال آیا تو مجھے ترکیب سوجھ گئی کہ کس طرح کچھ دیر کے لئے اپنے دوستوں سے علیحدہ ہو کر وہ رقعہ دیکھ سکتی تھی۔

ہم میز کے گرد بیٹھے تھے مگر چائے ابھی نہیں آئی تھی۔ میں زبیدہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "مجھے حیرت ہے کہ آج مہر نہیں آئی۔"

"ممکن ہے کوئی ضروری کام پڑ گیا ہو۔" زبیدہ کی بجائے پروین نے کہا۔

"میرا [illegible] اس کا راستہ [illegible]"

"مگر اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا [illegible] ڈاکٹر کامران کی کلاس نہیں چھوڑی۔ ضرور کوئی خاص بات ہے" [illegible] نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے میں جا کر فون کروں اور مہر کی والدہ سے پوچھ لوں کہ وہ کالج کیوں نہیں آئی۔ آخر معلوم تو کرنا چاہئے۔" میں نے چاروں کی طرف تائید طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ انہوں نے بیک وقت سر کو اثبات میں جنبش دی اور میں فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

ریستوران سے نکل کر کالج کی عمارت کی طرف روانہ ہوئی تو اس وقت تک مطلع اچھا خاصا ابر آلود ہو گیا تھا اور موسم میں طوفانی کیفیت پیدا ہو رہی تھی۔ میں نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں میرے قریب کوئی نہیں تھا۔ جلدی سے کتاب سے وہ رقعہ نکالا اور غور سے دیکھنے لگی۔ کاغذ نیلے رنگ کا ٹکڑا تھا اور [illegible] تھی۔ اوپر کوئی القاب یا خطاب نہ تھا۔ میں نے کانپتی انگلیوں اور لرزتے دل کے ساتھ پڑھنا شروع کیا۔ "مجھے تم سے ایک ذاتی کام ہے مگر راز داری شرط ہے۔ تم اس رقعے کا کسی سے ذکر نہیں کرو گی اور کل رات آٹھ بجے [illegible] پہنچ جاؤ گی۔ تمہارا انتظار کروں گا۔" اس کے بعد ایک پتہ لکھا ہوا تھا۔

میں نے وہ رقعہ دوبارہ پڑھا اور مفہوم اخذ کرنے کی کوشش کی مگر اس کے سوا کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ ڈاکٹر کامران کو مجھ سے کوئی ضروری کام ہے اور وہ مجھ سے کل رات آٹھ بجے [illegible] چاہتا ہے۔ سادہ [illegible] سا رقعہ تھا۔ بین السطور میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ میں نے رقعے کو دوبارہ کتاب میں چھپا لیا اور کالج کی عمارت کی طرف چل پڑی جہاں ٹیلیفون بوتھ تھا۔

اس وقت بوتھ میں کوئی نہیں تھا۔ میں نے [illegible] مہر کے گھر کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے اس کی ماں مخاطب ہوئی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ آج مہر کالج کیوں نہیں آئی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ کالج گئی ہوئی ہے اور وہاں نہ ہوئی تو زبیدہ کے گھر پر ملے گی۔

یہ اطلاع پریشان کن تھی۔ مہر نہ تو کالج آئی تھی اور نہ زبیدہ کے گھر پہنچی تھی پھر وہ آخر کہاں گئی تھی۔ میں نے مہر کی والدہ کو خدا حافظ کہا اور بوتھ سے باہر نکل آئی۔ اس وقت میں ڈاکٹر کامران اور اس کے رقعے کو بھول چکی تھی اور صرف مہر کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

پھر بوندا باندی شروع ہو گئی [illegible] بارش کا پہلا قطرہ گرا [illegible] دیکھتے ہی دیکھتے تیز بارش شروع ہو گئی۔ ریستوران بہت دور تھا۔ میں نے [illegible] پناہ کے لئے ادھر

[illegible]

[illegible]

تب تک مہر کا رنگ پہلے سے بہتر ہو چکا تھا۔ زبیدہ نے مہر کو کہنا
چاہا مگر جب اسے پیچھے آتی ہوئی مہر پر [illegible] کی نظر پڑی تو ان کا
منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ سب جتنی مذاق میں مصروف تھیں مگر مہر کی
حالت دیکھتے ہی انہیں سانپ سونگھ گیا۔ بھیگا بھیگا ہوا لباس، دہشت
زدہ چہرہ اور ویران آنکھیں دیکھ کر ان سب کو سکتہ سا ہو گیا۔ ان کے
حلق سے کوئی آواز نہ نکلی۔ پھر سب کی سب مشینی انداز میں بول
اٹھیں "کیا ہوا۔ کیا ہوا مہر کو؟"

"میں قاتل ہوں۔ میں نے ماجد کو قتل کر دیا ہے۔" مہر چیخ کر
بولی اور سسکیوں کے ساتھ رونے لگی۔ اس کا سارا جسم بری طرح کانپ
رہا تھا۔ میں نے اشارے سے لڑکیوں کو سمجھایا کہ فی الحال وہ خاموش
رہیں اور مہر کو دل کھول کر رو لینے دیں۔

تھوڑی دیر بعد مہر کی سسکیاں تھمیں اور وہ نارمل ہو گئی۔
زبیدہ نے بڑی خاموشی سے اس کا بھیگا ہوا لباس تبدیل کر کے
اوڑھنے کو گرم چادر دی۔ پھر گرم دودھ کا گلاس اور اسپرین لا کر
دی اس کے بعد قریب بیٹھ کر اس کے بال خشک کرنے لگی۔

نارمل ہو جانے کے باوجود مہر کی کیفیت ایسی نہیں تھی کہ وہ
اپنے گھر جا سکتی۔ چنانچہ طے پایا کہ لڑکیاں رات کو زبیدہ ہی کے گھر
پر رکیں گی۔ زبیدہ نے باری باری ہر لڑکی کے گھر پر فون کر کے اہلِ خانہ
کو مطلع کر دیا کہ وہ آج رات اس کے گھر ٹھہریں گی۔

مہر گرم چادر اوڑھے مسہری پر دراز تھی۔ اس کی ویران
نگاہیں چھت پر جمی ہوئی تھیں اور لڑکیوں کی متجسس نگاہیں مہر کے
زرد چہرے پر جمی ہوئی تھیں وہ بڑی بے تابی سے منتظر تھیں کہ مہر
کب ہونٹ ہلاتی ہے اور انہیں ماجد کے قتل کے بارے میں بتاتی ہے۔

کچھ دیر بعد مہر نے چہرہ ہماری طرف گھمایا۔ اس کے لبوں پر
کمزور سی مسکراہٹ نمودار ہوئی جیسے وہ ہمارے دل کی بات سمجھ
رہی ہو۔

"آج دوپہر کے قریب میں اس غرض سے گھر سے نکلی تھی کہ پہلے
پروین کے گھر جاؤں گی اور اسے ساتھ لے کر کالج کے لئے روانہ ہوں
گی۔" مہر نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ "ہم دونوں کو مل کر جنگ
[illegible] نام پر ایک مقالہ لکھنا تھا۔ پروین کے گھر سے کچھ فاصلے پر تھی
کہ ماجد اپنی گاڑی لے کر نمودار ہو گیا۔ اس نے مجھے گاڑی میں
بیٹھنے کے لئے کہا میں نے انکار کر دیا مگر وہ میرے پیچھے پڑ گیا منت
سماجت کرنے لگا۔ مجھے لگا کر آخر گاڑی میں بیٹھنے میں حرج

کیا ہے۔ لگا جیسے وہ اتنا برا انسان نہیں ہے جتنا کہ میں تصور کرتی
تھی۔ اس کے بعد ماجد کے اصرار پر میں اس کی گاڑی میں بیٹھ گئی۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے اپنی خواہشات شروع کر دیں اور
کہا کہ اپنے تعلق کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں نے اس کی باتوں پر
توجہ نہ کی تو وہ طرح طرح کا ذکر چھیڑنے لگا۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی
کہ وہ میرا خیال دل سے نکال دے۔ میرا اور اس کا کوئی میل ممکن ہی
نہیں ہے۔ میرا ذہن اور انداز فکر اس سے بہت مختلف ہے۔ شہر
میں میرے علاوہ اور بھی لڑکیاں ہیں وہ ان کی طرف توجہ کیوں نہیں
کرتا۔ مگر وہ نہیں مانا۔ میں سارا وقت سنتی رہی۔ اس نے مجھے ایک کہانی سنائی
ایک انگریز لڑکی کو حرم کی زندگی قریب سے دیکھنے کا شوق تھا۔ کسی
کسی طرح وہ ایک شیخ کے حرم میں داخل ہو گئی۔ کچھ دنوں بعد جب
اس نے واپس جانا چاہا تو اس کی واپسی ناممکن ہو گئی۔ شیخ کا اسے
چھوڑنے کا ارادہ نہ تھا۔ لڑکی نے ہر حربہ آزمایا مگر ناکام رہی۔ پھر اس
نے سوچا اگر وہ شیخ کے دل میں اپنے لئے نفرت اور کراہیت پیدا کر دے
تو شاید جان چھوٹ جائے۔ اس نے شیخ سے جھگڑا کیا۔ بدتمیزی سے پیش آئی
خلوت میں طلب کی گئی تو جسم بیہودہ کا حق ادا کیا۔ جلوت میں اس نے
ایک بار شیخ کی پشت میں سوئی چبھو دی۔ مگر سب بے کار گیا۔ شیخ
اس کی ان اداؤں پر ریجھ گیا اور دن بدن اس کی طرف مائل ہوتا گیا۔ یہ
حالانکہ کبھی حرم سے واپس نہ جا سکی۔ وہیں کی ہو کر رہ گئی۔

کہانی سنانے کے بعد ماجد نے مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ اس
کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ کہانی سنانے کا مقصد بالکل واضح تھا۔ یعنی
میں جتنا جتنا ضد کرتی جاؤں گی اتنا ہی ماجد کے دل میں گھر کرتی جاؤں گی

"اس قدر تفصیل میں نہ جاؤ۔ بس اتنا بتاؤ کہ تم نے ماجد کو کیوں قتل کیا۔ ہمیں
معلوم ہے کہ ماجد بہت جنونی آدمی ہے۔ تم اصل بات بتاؤ۔"

مہر نے گہری سانس لی اور دوبارہ بولنے لگی "تو خلاصہ یہ ہے کہ
ماجد نے مجھے کسی نہ کسی طرح راضی کر لیا کہ میں اس کے ساتھ اس کے بنگلے
کے فلیٹ میں جاؤں اور اس سے اطمینان سے گفتگو کروں۔ میں نے سوچا
شاید اس طرح میں ماجد کو سمجھانے میں کامیاب ہو جاؤں اور وہ میرا
پیچھا چھوڑ دے۔

فلیٹ کی ایک اضافی چابی ماجد کے پاس بھی تھی۔ اس نے
فلیٹ کا دروازہ کھولا اور ہم اندر داخل ہو گئے۔ کمرہ بہت صاف
ستھرا تھا۔ ہم نے گفتگو شروع کی۔ ابتدا میں ماجد بہت قرینے اور
سلیقے سے بات کرتا رہا۔ پھر وہ اچانک تبدیل ہو گیا۔ اس نے چاہا کہ

ایک سوچ کر ... [illegible]
... [illegible]
آ گروں گی۔

ہر کے پہلے کی کیفیت تبدیل ہوگئی تھی اس کی آنکھوں سے وحشت
ابلنے لگی۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ [illegible] خالی خولی
[illegible] مسلسل
[illegible] تھا۔ وہ [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] کر فرش پر گرا [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] فوراً [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] ہوئی۔

"بھاگ کر دروازے کے قریب پہنچی تو وہ مقفل تھا۔" [illegible] سلسلہ
کلام جاری رکھا۔" واجد نے اندر داخل ہونے کے بعد دروازہ مقفل کر دیا تھا۔
ایک لمحے کے لیے میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ پھر فوراً ہی خیال آیا کہ چابی
واجد کی جیب میں ہوگی۔ میں نے جھک کر دیکھا۔ واجد بے حس و حرکت فرش پر
پڑا ہوا تھا اور اس کے سر کے گرد خون کا چھوٹا سا تالاب بن گیا تھا۔ وہ
یقیناً مر چکا تھا۔ میں لرزتے ہوئے قدموں سے اس کے قریب آئی اور بڑی
[illegible] احتیاط سے اس کے کوٹ کی جیب سے چابی نکال لی۔ پھر [illegible]
سے دروازہ کھولا اور [illegible] باہر کی طرف بھاگ نکلی۔ بھاگتی ہوئی
[illegible] کہاں جا رہی تھی۔ [illegible] اسی وقت [illegible] کے
قریب [illegible] حیرت ہے کہ میں نے اتنا طویل
فاصلہ پیدل کیسے طے کر لیا تھا۔"

مسلسل بولنے سے [illegible]
پیا اور [illegible]

ہم سب دیر تک خاموش بیٹھے [illegible]
[illegible] زبان
کھولی [illegible] پوچھا۔
"تو [illegible] دیا۔

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

"میرا خیال ہے کہ واجد [illegible] ایک [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] نہیں آئے گا۔"
"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" [illegible] بولی۔
"[illegible]" تم [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]"

[illegible]
نہیں سکتا تھا۔ [illegible] راضی کیا۔

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] جب تک کہ ہم
[illegible] پہنچ جائے۔

[illegible] زبیدہ بہت [illegible]
اس وقت [illegible]
[illegible]

تھی اور رہا شیریں اور پریت مہر کو سنبھالے پچھلی نشست پر بیٹھی تھیں زبیدہ مڑ مڑ کر مہر سے فلیٹ کا راستہ پوچھتی جاتی تھی مہر کی حالت تو غیر تھی ہی ہم سب بھی کچھ کم خوف زدہ نہیں تھے۔ البتہ زبیدہ کی حالت بہتر تھی وہ بڑے سکون سے ڈرائیو کر رہی تھی اور کبھی کبھی مہر کی تسلی کی خاطر دو چار الفاظ کہہ دیتی تھی۔

ایک مقام پر مہر نے زبیدہ کو گاڑی روکنے کے لئے کہا۔ زبیدہ نے گاڑی ایک طرف کھڑی کی تو مہر نے دائیں ہاتھ کی گلی میں داخل ہونے کے لئے کہا۔ گلی چوڑی تھی چنانچہ زبیدہ گاڑی کو لئے ہوئے گلی میں داخل ہوگئی گلی کا اختتام آ رہا تھا کہ مہر نے دوبارہ گاڑی روکنے کے لئے کہا۔ کچھ دیر عمارتوں پر نظر دوڑاتی رہی پھر گاڑی کو بیک کرنے کے لئے کہا۔ زبیدہ مہر کے اشاروں پر چلتی رہی حتیٰ کہ مطلوبہ عمارت مل گئی۔ مہر نے ایک عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ "یہی ہے وہ فلیٹ۔ جو تیسری منزل پر ہے۔"

مہر کے لہجے سے بے پناہ خوف کا اظہار ہو رہا تھا۔ زبیدہ بڑے دل گردے کی عورت تھی مگر اس وقت اس کے چہرے پر بھی تردد کے آثار پڑھے جا سکتے تھے۔ ہم تو لڑکیاں تھیں اس موقع پر کوئی مرد ہوتا تو اس کی حالت بھی ہم سے مختلف نہ ہوتی۔ میں نے مڑ کر دیکھا لڑکیاں سہمی اور سمٹی سمٹائی بیٹھی تھیں۔ ان کے چہرے خوف سے سفید پڑے ہوئے تھے۔

"میں مہر کے پاس ٹھہروں گی تم لوگ اوپر جاؤ۔" اچانک پروین نے کہا۔

ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر سب سے پہلے زبیدہ گاڑی سے اُتری۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے میں شیریں اور رہا گاڑی سے اُترے۔ گلی دور تک سنسان پڑی ہوئی تھی اور عمارت پر نصب برقی لیمپ ارد گرد کمزور سی روشنی پھیلا رہا تھا۔ ہم چاروں ایک دوسرے سے چپکے ہوئے آہستہ آہستہ عمارت کی طرف بڑھے اور اندر داخل ہو کر اوپر جانے کے لئے زینہ چڑھنے لگے رات کے سکوت میں ہمارے قدموں کی چاپ بڑا ناگوار سا اور وحشت اثر تاثر چھوڑ رہی تھی۔ ہماری ذہنی اور جذباتی کیفیت اس وقت ایسی تھی جیسے کہ ہم کسی جنازے میں شریک ہونے آئے ہوں۔

یہ چار منزلہ عمارت تھی صرف دوسری منزل کی بند کھڑکیوں کی درزوں سے روشنی پھوٹ کر باہر آ رہی تھی۔ ورنہ بقیہ تمام منزلیں میں مکمل اندھیرا تھا۔ شاید وہاں رہائش برائے نام تھی ہم سہمے ہوئے اور ٹٹولتے ہوئے تیسری منزل پر پہنچ گئے۔ مہر کے بتائے ہوئے کمرے کے سامنے پہنچ کر ہم ایک لمحے کے لئے رکے اور ایک دوسرے سے آنکھوں ہی آنکھوں ہی نظروں میں مشورہ کرنے لگے کہ دروازہ کون کھولے۔

یہاں بھی زبیدہ پہلے چل پڑی۔ اس نے آہستہ سے بڑھ کر دروازے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا۔ مگر دروازے کے پٹ اپنی جگہ قائم رہے ان میں ذرا بھی جنبش نہ ہوئی۔ ہم نے اگلے لمحے احساس کیا کہ دروازہ مقفل تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی میرے جسم میں خوف کی ایک لہر دوڑ گئی۔ زبیدہ کی آنکھوں میں بھی الجھن اور پریشانی کے آثار نظر آئے۔

"دروازہ مقفل ہے مگر یہ کیسے ممکن ہے؟" زبیدہ بڑبڑائی "مہر نے بتایا تھا کہ جب وہ کمرے سے نکلی تھی تو دروازہ پاٹوں پاٹ کھلا ہوا تھا۔"

"اس سے کئی امکانات اخذ کئے جا سکتے ہیں۔" میں نے سرگوشی میں کہا "ممکن ہے راحیل مراد ہو صرف زخمی اور بے ہوش ہوا ہو جب ہوش میں آنے کے بعد اٹھا ہو دروازے کو مقفل کیا اور مرہم پٹی کرانے چلا گیا۔ یا پھر وہ خود ہوش میں نہیں آیا۔ اس کے کسی دوست یا ہمسایہ یا محلے کے کسی دوسرے مکین نے اسے کمرے میں بے ہوش اور زخمی دیکھا اور طبی امداد پہنچائی۔ حالت ٹھیک ہو جانے کے بعد راحیل کہیں چلا گیا۔ یا پھر آخر میں یہ کہ وہ واقعی مر چکا ہے اور اس کی لاش یہاں سے ہٹائی جا چکی ہے۔"

"ممکن ہے وہ اندر ہی ہو۔" شیریں نے لقمہ دیا۔

"یہ کیسے ممکن ہے بے ہوش یا ہلاکت جیسی صورت میں وہ دروازہ کیسے مقفل کر سکتا ہے؟" رہا بولی۔

"ہو سکتا ہے وہ زندہ ہو یا اسے ہوش آگیا ہو اور وہ کسی وجہ سے ابھی تک اندر موجود ہو۔" شیریں نے کہا۔

"اس کی ابھی تصدیق کئے لیتے ہیں۔" رہا نے بڑی جرأت سے کام لیا۔ اس نے دروازے کو آہستہ سے تھپتھپایا اور پھر ایک ہاتھ سے تھپتھپاتے ہوئے قدرے بلند آواز میں بولی۔ "راحیل! کیا تم اندر ہو؟ کیا تم میری آواز سن رہے ہو؟ اگر سن رہے ہو تو جواب دو۔ اگر بول نہیں سکتے تو کوئی آواز پیدا کرو۔"

لیکن اندر سے کوئی آواز نہیں آئی۔ زبیدہ رہا کو شانے سے پکڑ کر کھینچتی ہوئی بولی۔ "پاگل ہوئی ہو۔ مرے ہوئے بھی کہیں بولتے ہیں۔ آؤ چلیں۔"

ہم جس خاموشی سے اوپر گئے تھے اسی طرح واپس پلٹ گئے جہاں سے

ناکامی سے ہنستے ہنستے بچی ہے۔ میں نے سوچا لیکن یہ سب بھی کا
ہو جانی اختراع ہو۔ وہ سرے سے یہاں تھی ہی نہ ہو۔ اور تق
ماجدہ کی ہلاکت کا قصہ من گھڑت ہوا ہو۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک
نر عمارت کی تیسری منزل میں کوئی قتل ہوا ہو اور کسی کو کوئی
ہو۔

زبیدہ خاموشی سے گاڑی میں بیٹھی اور انجن اسٹارٹ کر دیا۔
پہیوں کے شور سے بھی تھر تھر کانپ رہی تھی کسی کمزور کی مانند
"کیا ہوا؟ کیا دیکھا؟"

"کچھ بھی نہیں۔ دروازہ مقفل تھا۔" شیریں ہونٹ سیکڑ کر بولی۔
ہم سب زبیدہ کے گھر واپس آگئے۔ جب ہم زبیدہ کے
ٹھہرتے تھے تو وقت سونے میں ضائع نہیں کرتے تھے۔ رات کو دیر
تک شب زندہ رہتی تھی اور ہم رہ کر گفتگو کرتے تھے یا عام حالات
پر سوچتے تھے۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ہم سب ہال میں جمع ہو گئے
پھر اور ماجدہ کے بارے میں گفتگو شروع کر دی۔

"اگر ماجدہ کو کیا ہو گا تو ہم کو جیل ہو جائے گی۔ اور اگر زندہ ہو گا
پولیس کو رپورٹ کرے گا اور اس صورت میں بھی۔۔۔" شیریں کہتے
کہتے رک گئی۔

"اچھا بکواس بند کرو۔" زبیدہ بگڑ کر بولی۔ "ایسی باتیں
کر کے خواہ مخواہ ماجدہ ملا ہے۔ اگر ایسا ہوا بھی تو ہمیں صبر کرنا چاہیے
ہم اس راز کو اپنے سینے میں محفوظ رکھیں گے۔"

"مگر کسی کا خون رائیگاں نہیں جاتا۔" شیریں نے فلسفہ جھاڑا۔

"تم کبھی مجلسی تم چپ رہو۔ تمہیں بولنے کی بالکل تمیز نہیں ہے۔
بہت بے ڈھب بولتی ہو۔" زبیدہ نے اسے باقاعدہ جھاڑ دیا۔ پھر
شیریں خاموش ہی رہی۔ زبیدہ ہم سب کو مخاطب کر کے انتہائی
سنجیدگی سے بولی۔ "ہمیں صبر و تحمل کے ساتھ صبح کا انتظار کرنا چاہیے۔
دیکھیں صبح کیا ہوتا ہے۔ پھر اس کے بعد ہی کوئی قدم اٹھا سکیں گے۔"

ماجدہ کی گفتگو ختم ہو گئی اور اس کی بک بک بھی چپکی اور نرم و لطیف
باتوں سے دل بہلاتی تھی۔ پھر منگنی اور معاشقے کا ذکر چھڑ گیا۔ ماجدہ اب تک
منگنیاں توڑ چکی تھی۔ معاشقے کے بغیر اس کا بھی شادی کرنے کو
جی نہ چاہتا تھا۔ اسے اب تک کوئی ڈھنگ کا عاشق نہ مل سکا تھا۔ ایک
نا کارہ اور فضول۔ وہ اسے سخت ناپسند کرتی تھی مگر تفریح
وقت گزاری کے لئے برداشت کر لیتی تھی۔ کچھ دیر تک گفتگو ہوتی

اس عاشق کے بارے میں بات ہوئی۔ پھر موضوع بدل گیا
کہ پھر گفتگو کے لئے کوئی موضوع نہ رہا۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ
لڑکیوں کو ڈاکٹر کامران کا رقعہ دکھا دوں۔ یہ بہتر موقع ہے۔

میں نے بڑے ڈرامائی انداز میں اپنی جیب سے کاغذ نکالا
اور کسی عظیم ساحر کے انداز میں سب کو مخاطب کر کے بولی۔ "لڑکیو!
تمہیں گرم کرنے کے لئے میرے پاس بڑی دلچسپ اور مزیدار چیز ہے۔
مزا آئے گا۔ آپ بھی دیکھیں۔"

وہ سب حیرت سے میرا منہ تکنے لگیں۔ جیسے میں پاگل ہو
گئی ہوں۔ ماجدہ کو میں ان کے درمیان سب سے سنجیدہ اور ماجدہ
لڑکی تھی۔ مگر ایسا ہوتا تو ڈاکٹر کامران میری طرف کیوں متوجہ ہوتا۔
وہی ڈاکٹر کامران جیا ہے ایسی لڑکیوں کو گھاس نہ ڈالتا تھا۔

میں بہت شاندار انداز میں اپنی کتابوں تک گئی اور کتاب
سے وہ رقعہ نکال لیا۔ لڑکیوں کے درمیان واپس آ کر وہ رقعہ بلند کرتی
ہوئی فخر سے بیچ میں بولی۔ "یہ وہ خط ہے جو ڈاکٹر کامران نے کلاس
سے نکلتے وقت چپکے سے پکڑا دیا تھا۔"

شدید استعجاب سے تمام لڑکیوں کے منہ کھل گئے۔ شیریں کے
لب کچھ کہنا چاہ رہے تھے مگر زبان بولنے سے قاصر تھی۔ پھر زبیدہ اٹھی اور
رقعہ مجھ سے جھپٹ لیا۔

رقعہ کے لئے لڑکیوں میں چھینا جھپٹی ہو گئی تھی۔ رقعہ تتری کی
مانند مختلف ہاتھوں میں گردش کرتا ہوا دوبارہ زبیدہ کے پاس پہنچ گیا۔

"پڑھو اسے چلو۔" کوئی بے صبری سے چیخی۔ لڑکیاں کاغذ کے
اس ٹکڑے سے پرزے کو پڑھنے کے لئے بے تاب ہوتی جا رہی تھیں
ان میں سے ہر ایک کی کوشش تھی کہ پہلے وہ پڑھے۔ رقعہ پڑھنے کا
آغاز زبیدہ سے ہوا۔ پھر باری باری تمام لڑکیوں نے ڈاکٹر کامران
کی وہ مختصر مگر پراسرار تحریر پڑھ ڈالی۔

"عجیب بات ہے۔" زبیدہ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔!

"ناقابل یقین۔" شیریں بولی۔

"مجھے تو دیکھ کر شبہ ہوا تھا کہ ڈاکٹر کامران نے کوئی چیز تمہیں
دی ہے۔ مگر گمان نہیں تھا کہ وہ کوئی رقعہ ہو گا۔" جمیلہ مجھے مخاطب
کر کے بولی۔

"ہم تو سمجھتے تھے کہ ڈاکٹر کامران ہماری شکلیں بھی نہ پہچانتا
ہو گا۔" شیریں نے کہا۔

"سچی مجھے تو شبانہ سے حسد ہو رہا ہے۔ میرا کلیجہ پھٹا جا رہا

بات" پروین نے ہنستے ہوئے کہا۔
تمام لڑکیاں عابدہ اور اس کے قتل کو بھول چکی تھیں جیسے کہ زبیدہ پہلے اس کے متعلق کوئی بات ہی نہیں ہوتی تھی۔ وہ سب کی سب ڈاکٹر کامران کے متعلق گفتگو کر رہی تھیں۔ زبیدہ کے یہاں قیام کے دوران ہم ویسے بھی کم سوتے تھے مگر آج رات تو جیسے نیند ہی اڑ گئی تھی۔ ڈاکٹر کامران کے اس ایک چھوٹے سے رقعے نے ہم سب کو شدید ہیجان میں مبتلا کر دیا تھا۔ ڈاکٹر کامران ہمارا مشترکہ آئیڈیل تھا۔ مگر بازی میں لے گئی تھی جیت میرے حصے میں آئی تھی۔ وہ سب مجھے رشک بھری نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

ہمارے نزدیک ڈاکٹر کامران خود پسندی اور نرگسیت کا شکار تھا۔ وہ اپنی ذات کے سوا ارد گرد دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا تھا مگر اس کے ساتھ ہی وہ بے انتہا وجیہہ اور خوش پوش تھا۔ علم و دانش اور فہم و فراست میں بے مثال تھا اس کی شیریں زبانی اپنی جگہ مسلم تھی اور اسے بولنے کا فن آتا تھا چنانچہ ہم نے اس کی بے اعتنائی کو حق بجانب سمجھ کر ذہنی مفاہمت کر لی تھی مگر اب اس رقعے نے کایا پلٹ دی تھی۔ ڈاکٹر کامران نے مجھے خط لکھ کر بلایا تھا اسے مجھ سے کوئی ضروری کام تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ وہ میرا منتظر رہے گا یعنی وہ اپنی ذات کے خول سے باہر نکلا تھا۔ تھوڑا سا لوٹا تھا۔ برف پگھلی تھی اور موسم معتدل ہو رہا تھا۔

لڑکیاں مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ کئے جا رہی تھیں۔ رقعہ دو دفعہ پڑھنے کے باوجود انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ ڈاکٹر کامران کی تحریر ہے۔ اور اسے مجھ سے کوئی کام پڑ سکتا ہے۔ ان کے نزدیک یہ تمام باتیں ناقابلِ یقین تھیں۔

ہما میری طرف دیکھتے ہوئے مصنوعی غصے سے بولی۔ "تم بہت مکار اور جھوٹی ہو شہناز! تم ریستوران میں ہم سے یہ کہہ کر باہر گئی تھیں کہ مہر کے گھر فون کرنے جا رہی ہو مگر درحقیقت تم تنہائی میں ڈاکٹر کامران کا رقعہ پڑھنا چاہتی تھیں؟"

"تمہارا الزام درست بھی ہے اور غلط بھی۔ میں واقعی ڈاکٹر کامران کا رقعہ پڑھنے گئی تھی مگر مہر کے گھر فون بھی کیا تھا جب [illegible] مہر کی والدہ سے تصدیق کر سکتی ہو" میں نے کہا۔

"مگر مہر تمہیں کہاں سے مل گئی وہ تو مسعود کے [illegible] تھی۔" پروین نے پوچھا۔

"یہ بھی ایک اتفاق ہے اگر بارش نہ ہوتی اور میں پناہ لینے کے لئے مسجد کی طرف نہ بھاگتی تو وہ مجھے نہ ملتی اور [illegible] چلانا کیا ہوتا" میں نے جواب دیا۔

"اچھا اب یہ بتاؤ تم نے ہم سے ڈاکٹر کامران کے رقعے کے بارے میں کیوں چھپایا جبکہ ہمارے درمیان معاہدہ ہے ہم ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں چھپائیں گے اور ہمارا کوئی راز راز نہ رہے گا" شیریں نے حملہ کیا۔

اس بار میں واقعی گھبرا گئی۔ شیریں کی بات اپنی جگہ درست تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی زبیدہ میری حمایت میں بول پڑی۔ شیریں کو ڈانٹتے ہوئے کہنے لگی "شیریں! تمہارا یہ [illegible] بالکل درست تھا تم نے پڑھا نہیں کہ ڈاکٹر کامران نے رقعے میں رازداری کی شرط رکھی تھی اس نے تاکید کی تھی کہ شہناز اس رقعے اور متوقع ملاقات کے بارے میں کسی کو نہ بتائے۔ پھر اس کے علاوہ شہناز خود بھی اس کی نوعیت جانے بغیر ہمیں کیسے بتا سکتی تھی اور تم خود [illegible] اس نے خود ہی ہمیں رقعے کے بارے میں بتایا کہ نہیں۔" زبیدہ میری طرف مڑی "کیوں شہناز کیا تم یہ رقعہ ہم سے چھپا سکتی تھیں؟"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا" میں نے جواب دیا اور زبیدہ اس طرح لڑکیوں کو گھورنے لگی جیسے وہ سب کی سب غلط سوچ رہی ہوں۔ شیریں خجل سی نظر آنے لگی۔ خدا کا شکر جبکہ زبیدہ نے میرا اعتماد بحال کر دیا تھا۔ اس کے فوراً بعد ایک بار پھر خوشگوار گفتگو کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پروین مسکراتے ہوئے بولی "میرے خیال میں ڈاکٹر کامران کا شہناز کو رقعہ لکھنا اور خصوصی ملاقات کی دعوت دینا عابدہ کے قتل سے زیادہ اہم اور سنسنی خیز ہے" پھر میری طرف رخ کر کے بولی "ڈاکٹر کامران نے جو پتہ دیا ہے وہ اس کے اپنے گھر کا ہے یا کہیں اور کا؟"

"کوئی شادی شدہ شخص بیوی کی موجودگی میں کسی لڑکی کو رات کے وقت اپنے گھر کیسے بلا سکتا ہے اور وہ بھی ایک خاص کام کے لئے" شیریں بھنویں اچکاتے ہوئے معنی خیز لہجے میں بولی۔

"ڈاکٹر کامران شادی شدہ نہیں ہے ایسے لوگ شادی کہاں کرتے ہیں" ہما بولی۔

"کیا تم نے اس کی انگلی میں شادی کی انگوٹھی نہیں دیکھی" شیریں غصے سے بولی۔

"شیریں سچ کہتی ہے" ڈاکٹر کامران کی انگلی میں شادی کی انگوٹھی میں نے بھی دیکھی ہے" زبیدہ نے شیریں کی تائید کی۔ ڈاکٹر کامران نے



کہ ایک ... ہیں ان کا سب کا
دوسرے پہلا اپنی بیوی کو ہی ساتھ لے جا سکے گا لیکن
کرنے میں سہولت دی جائے گی۔ اس پیشکش سے
بہت سے لوگوں نے فائدہ اٹھایا۔ بعد میں مزید پیشکش
کی خاطر ہوائی کمپنی نے ان سب شوہروں کی بیویوں
کو ایک ایک خط لکھا، جنھوں نے اس پیشکش کے
تحت سفر کیا تھا۔ خط میں کمپنی نے لکھا "ہمیں امید
ہے اپنے شوہر کے ساتھ آپ کا حالیہ سفر نہایت
خوشگوار رہا ہوگا۔ اپنی رائے ہمیں لکھ بھیجئے"
جواب میں سب بیویوں نے لکھا: "کون سا
سفر؟ کیسا سفر؟"

پانچ منٹ پہلے فون کیا تو اس کی سیکریٹری نے بتایا کہ سر کا کچھ پتہ نہیں ہے۔ وہ کل بھی دفتر نہیں آئے تھے۔"

میں سوچ میں ڈوب گئی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ ہال میں سب کو واجد کے ... ہونے ... کہ کہیں سب ... مجھ سے ... واجد ... ہوا تو میں اس سے شادی کر لوں گی۔"

"اوہ تمہیں اطلاعات ... ہیں؟" شیریں نے چھیڑتے ہوئے بولی۔ "ڈاکٹر کامران شہناز کی خصوصی ملاقات کے لیے ... ہے اور مہرین بی بی واجد سے شادی کرنے جا رہی ہیں۔ خدا کی شان۔" شیریں نے ... کی مانند آسمان کی جانب ایک انگلی اٹھائی۔

"بہت بکواس کرنے لگی ہو۔" میں نے شیریں کی کمر پر ایک دھپ جمائی۔ اور وہ ... کر ہنسنے لگی۔ ہنستے ہوئے بولی: "تمھیں خوشی ہے کہ شادی کے بارے میں ... کے خیالات تبدیل ہو چکے اور اُدھر ڈاکٹر کامران کو آدمی ...۔"

میں شیریں کو دوسرا دھپ رسید کرنے جا رہی تھی کہ زبیدہ آگئی۔ اس نے شیریں سے ... کے بارے میں پوچھا جب

میں ایک خاص کام سے گیا ہوا تھا۔ جو شکیلہ صاحبہ نے میرے سپرد کیا تھا ... وہاں کوئی نگران موجود نہ تھا جنھیں پتہ لگ سکتا۔

"تم مطمئن رہو۔ ایسی کوئی بات نہیں آئندہ کے لیے میں بھی ... یہاں ہو جاتی ہیں۔" تو کسی ... یہ سب لڑکیاں چلی گئیں۔

اس رات پھر تک اور ... خوشگوار ماحول میں ... ہو گیا۔ سب تھی مگر شہناز کی غیر موجودگی کا احساس ... دل سے یہ مبارک باد دی۔ اور ہم سب اپنے اپنے بستروں پر چلے گئے۔ اس وقت تین بج رہے تھے۔ میں نے بتی بجھا دی مگر نیند نہ آئی۔ بستر پر کروٹیں بدلتی رہی۔ پھر پچھلے پہر کی خنکی کے ساتھ میری پلکیں آہستہ آہستہ بند ہونا شروع ہو گئیں۔

معلوم نہیں وہ بھرپور نیند تھی یا محض غنودگی۔ بہرحال میں نے ایک خواب دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ سفید لباس پہنے ہوئے میں اور ڈاکٹر کامران کے ہمراہ شعبۂ فلسفہ کی عمارت میں داخل ہو رہی ہوں۔ میرے گرد طلبا و طالبات کا ہجوم ... ہے۔ وہ سب ہمارے ساتھ چل رہے تھے۔ میں نے چند قدموں سے ڈاکٹر کامران کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی میرے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ واجد کا چہرہ تھا۔ میں نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ سب ... رہے تھے۔ ان ہی میں ہمارا عاشق صادق رضا بھی تھا جو شکار کرنے والے انداز میں میری طرف دیکھ رہا تھا۔

مارے دہشت کے میری آنکھ کھل گئی۔ گھڑی پر نظر ڈالی تو صبح کے دس بج رہے تھے۔ ادھر ادھر دیکھا، کمرے میں میرے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ لڑکیاں جا چکی تھیں اور ان کے بستر تہہ کیے ہوئے تھے۔ میں کمرے سے باہر نکل آئی۔ ہال میں شیریں اور مہر جبیں ... ان کی زبانی معلوم ہوا کہ پروین اور رضا اپنے گھر جا چکی ہیں اور زبیدہ ... کے پاس گئی ہوئی ہے۔ شیریں انگڑائی لیتے ہوئے مسکرا کر بولی: "دیر سے اٹھی ہو۔ کیا رات بھر ... کے خواب دیکھتی رہی ہو؟"

میں نے ٹالتے ہوئے پوچھا: "کیا واجد کا پتہ چلا؟"

"کچھ نہیں۔ عجیب الجھن ہے۔ اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ صبح سے کئی بار اس کے گھر فون کر چکی ہوں۔ ہر بار اس کی ماں ریسیو کرتی ہے اور جواب میں نہیں کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیتی ہے۔ ہمیں کچھ آگے ... کا موقع ہی نہیں دیتی۔ اس کے علاوہ بھی کئی بار فون کر چکی ہوں مگر مناسب جواب نہیں ملا۔ ابھی

سی کر وہ تشویش میں مبتلا ہو گئی۔ اس نے کہا "ہمیں کل تک اور انتظار کرنا چاہیئے۔ پھر کوئی راست اقدام کیا جائے گا۔"

پھر پریشان ذہن لئے ہوئے خواب گاہ میں چلی گئی۔ میں نے غسل خانے کا رخ کیا اور دیر تک نہاتی رہی۔

اس وقت ہم میں سے کوئی کالج نہ گیا۔ دوپہر کے کھانے پر میں، زبیدہ، شیریں اور مہر یکجا ہوئے مگر مہر کی پریشان خاطری کے سبب ماجد کے بارے میں کوئی گفتگو نہ کی۔ کھانے سے فارغ ہو کر زبیدہ نے ذرا دیر آرام کیا پھر شیریں کو مہر کا خیال رکھنے کی ہدایت کرتے ہوئے کسی گھریلو کام میں مصروف ہو گئی۔

مجھے رات کو ڈاکٹر کامران سے ملاقات کے لئے جانا تھا۔ اس کے لئے کچھ تیاری ضروری تھی۔ میں زبیدہ کو تلاش کرتے ہوئے اس کے کمرے میں پہنچی اور کہا کہ آج رات میں کوئی عمدہ لباس پہنوں گی۔ زبیدہ مجھے مسکراتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی "میں نے آج ہی ایک بہترین لباس خریدا ہے گہرے سرخ رنگ کا ہے۔ تم پر خوب جچے گا۔" اس نے اپنا کام روک دیا اور ساتھ لے کر کپڑوں کی الماری تک گئی۔ اس نے مجھے وہ لباس دکھایا اور مارے خوشی کے میری چیخ نکل گئی۔ لباس بے حد خوبصورت اور جاذب نظر تھا۔ مردوں کے لئے اس میں بہت کشش تھی۔ میں زبیدہ سے لپٹ گئی اور اسے چومتے ہوئے مزاح کے طور پر بولی "خدا ہم پر تمہارا سایہ ہمیشہ قائم رکھے۔"

جواب میں زبیدہ مسکرا دی۔

میں زبیدہ کے سنگھار دان کے سامنے سے اٹھی تو پورے ساڑھے سات ہو رہے تھے۔ میں نے لباس کا جائزہ لیا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ میرے لئے ہی تیار کیا گیا تھا۔ میرا اور زبیدہ کا قد و قامت اور جسم کی گولائی تقریباً یکساں تھی۔ وہ لباس پہن کر میں شعلہ جوالہ نظر آنے لگی پھر میں نے زبیدہ کی بہترین سینڈل پہنی۔ اور زبیدہ نے مگرمچھ کی کھال کا بنا ہوا اپنا گراں قیمت ہینڈ بیگ میری کلائی سے لٹکا دیا۔ اس نے اپنا طلائی ہار انگوٹھیاں اور دوسرے زیورات بھی پہنائے۔ منٹوں میں، میں کچھ کی کچھ نظر آنے لگی تھی۔ میں نے غور سے آئینے میں اپنی شکل دیکھی سر سے پیر تک کا جائزہ لیا اور آنکھ مار کر مسکراتے ہوئے بولی "شہناز بی بی! کیا یہ تم ہی ہو؟"

آخر میں زبیدہ نے اپنا سب سے قیمتی کوٹ میرے شانے پر ڈال دیا اور بوسہ اڑاتے ہوئے بولی "جاؤ شہناز! دیکھیں وہ کمبخت پروفیسر کیسے بچ کر جاتا ہے۔ بہت تنگ کیا تھا اس نے۔

اب میں اسے چورا بنا دوں گی۔"

موسم بہت صاف، خوشگوار اور خنکی لئے ہوئے تھا۔ میں نے ٹیکسی پکڑی تو آٹھ بجنے میں تیرہ چودہ منٹ باقی تھے۔ ڈرائیور کو ڈاکٹر کامران کا پتہ بتایا اور نشست گاہ سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر کے ڈاکٹر کامران کے بارے میں سوچنے لگی۔ ڈاکٹر کامران جو فلسفے کا پروفیسر تھا۔ جو بہت پراسرار تھا۔ اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں لوگ بہت کم جانتے تھے یا شاید جانتے ہی نہ تھے۔ اس کی رنگ میں شادی کی انگوٹھی دیکھ کر خیال پیدا ہوتا تھا کہ وہ شادی شدہ ہے مگر اس کا طور اطوار شادی شدہ جیسے لوگوں کے نہ تھے اور اسی ڈاکٹر کامران نے مجھے بلایا تھا۔ اسے مجھ سے کوئی کام تھا۔ آخر اسے مجھ سے کون سا کام درپیش ہو سکتا تھا۔ میں نے بہت غور کیا مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

جوں جوں فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا میری وحشت اور اضطراب میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ میں ڈاکٹر کامران کی تمنا کرتی تھی۔ اسے چاہتی تھی مگر جبکہ اس نے مجھے خود بلایا تھا۔ تو جانے کیوں پریشان اور بدحواس سی ہو رہی تھی۔ آخر میں ڈاکٹر کامران کے مقابل اور قریب کیسے جا سکوں گی۔ اور جب وہ مجھ سے مخاطب ہو گا تو میری کیا کیفیت ہو گی۔ کیا میں یہ سب برداشت کر سکوں گی۔ کہیں خود کو کھو نہ بیٹھوں۔ نارسا اور ناقابل تسخیر ڈاکٹر کامران! فاصلہ سمٹ رہا تھا اور لمحہ بہ لمحہ اس کے قریب ہوتی جا رہی تھی۔

ٹیکسی ایک بڑی اور جدید عمارت کے سامنے رک گئی۔ کرایہ دے کر ٹیکسی کو رخصت کیا اور گھڑی پر نظر ڈالی۔ آٹھ بج کر دو منٹ ہوئے تھے۔ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ اطلاعی گھنٹی کے بٹن پر ہاتھ رکھا تو ہیجان سے بری حالت تھی۔ دل اس شدت سے دھڑک رہا تھا جیسے ابھی سینہ توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ چند لمحے گزرے پھر دروازے کی دوسری طرف کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی میرا حلق ایک دم خشک ہو گیا۔

(بقیہ آئندہ ۔۔۔۔ ملاحظہ فرمائیے)



شمسیہ انصاری

اس کہانی کو پڑھ کر بہت سے بوڑھے ماں باپ اپنے خالی پلنگوں کو ٹٹولیں گے
سہارے بچوں کی نفرت کا ایک فیصلہ کن تجزیہ

دیوار میں لگی برقی گھڑی کے گھنٹے نے ٹن ٹن کر کے رات کے بارہ بجائے تو ممتاز دھیمے دھیمے محتاط انداز میں قدم اٹھاتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور اندر جا کر بہت ہی آہستگی سے چٹخنی اوپر چڑھا دی۔
دوسرے کمرے میں ممتاز کی ماں نے تھوڑی دیر بعد چونک کر ادھر اُدھر دیکھا۔ اب ممتاز بھی غائب تھا۔ اس نے تھکے ہوئے انداز میں کمرے میں ایک نظر ڈالی۔ وہ پلنگ پر لیٹ کر لحاف اوپر تک کھینچ لیا۔ جسم کا ایک ایک عضو اس طرح ٹوٹا سا تھا جیسے کسی نے بے دردی سے کچل کر رکھ دیا ہو۔ اعصاب پر تھکن بری طرح سوار تھی۔ کہتے ہیں کہ نیند تو سولی پر بھی آجاتی ہے۔ اور پھر اتنی تھکاوٹ میں لیکن پتہ نہیں کیا بات تھی کہ آج بھی پچھلی چار راتوں کی طرح نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ یونہی وہ کئی راتوں سے آنکھیں کھولے خالی خالی نگاہوں سے تکتی ہوئی پوری پوری رات گزار دیتی۔ اور اگر کبھی بھولے بھٹکے سے آنکھ جھپک بھی جاتی تو برابر کے کمرے سے گھسر پھسر کی دبی دبی آوازیں اور چوڑیوں کی کھنکھناہٹ جیسے اس کی نیند اچک لے جاتی۔ اور وہ لاتعداد بار درود کلمہ پڑھ کر کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرتی۔ لیکن خیالات کی دوڑ پر کسی کا کیا اختیار۔ خیال پھر پھر کر ان کے بند کمروں کے دروازے پر جا لگتے۔ اور وہ جھنجھلا کر سوچتی آج کل کے لڑکے لڑکیاں بھلا ان کو شرم و حیا کیسی۔ غضب خدا کا دن بھی کے کمرے میں ساس سسر رہتے ہیں اور وہ اتنا بھی نہیں سوچ کر بیٹھے ہیں۔ اور صبح کو جب منہ اندھیرے بہو کے کمرے کا دروازہ کھلتا تو ممتاز کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دیتی "کھول رہے ہیں ماں۔ اُٹھتے ہیں" لیکن ممتاز کا کمرہ بند ہی رہتا اور بہو جلدی جلدی سے چٹخنی گرا دیتی اور کپڑوں کا بکس کھول کر کپڑے اُلٹ پلٹ کیا کرتی۔
گیلے بال جھٹک کر جب بہو غسل خانے سے نکل کر ساس کو صبح کا سلام کرتی تو ان کا پارہ ایک دم سے اوپر چڑھ جاتا۔ "ہونہہ یہ ڈھنگ ہیں۔ گھر سنبھالنے کے۔ بھلا کس بے حیائی سے صبح صبح غسل اور جانے کہاں سے فرصت مل جاتی ہے گیارہ بجے جلتے ہیں۔" اور وہ اپنی جھنجھلاہٹ کا گلا گھونٹتے ہوئے بہت ہی لاتعلقی سے بہو کے سلام کا جواب دیتی۔
پہلے تو عید ہو گئی۔ ہفتے دو ہفتے گزر جانے پر بھی بہو کے انداز اور چاؤ چونچلے ختم ہونے میں نہیں آتے تھے اور پھر یہ روز روز صبح کا غسل کیسے لگتا ہے ان لوگوں کے آخر اس کا بھی خیال کیا کرے بہو کا گلا گھونٹ دیے۔ اس نے اپنا ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ نیم تاریکی میں پتلے پتلے دبلے سوکھے کالے کالے ہاتھ، ان کی انگلیوں کے پوروں پر لکھی اور بھولے برتنوں کا میل کچیل جن کے ناخن بھی برسوں سے برتن مانجھتے مانجھتے آدھے گھس گئے تھے۔ اس نے اپنی انگلیوں کو الگ الگ کر کے دیکھا

اور جیلانی ... ہاتھ پچیس برس پہلے کسی کا سہارا"
بنے تھے ... سے پہلے ان ہتھیلیوں کے پوروں کو دونوں
ہاتھوں میں لے کر عقیدت سے چوم لیا۔ "خدا کی قسم سائرہ بہن کا حسن
... ہاتھوں ہی میں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر کسی نے بہت خوبصورت
تصویر بنائی بھی ہوگی تو اس نے تمہاری انگلیوں کو دیکھا ہوگا۔" آج وہ
آواز گونج رہی ہے اس طرح کانوں میں گونج رہی تھی جیسے کوئی بھولی بسری
کہانی یاد آ رہی ہو۔ یہ ممتاز جب ڈیڑھ برس کا تھا، تب باپ کا سایہ
سر سے اٹھ گیا کیسی تکلیفیں اٹھا کر اس کو پالا اور کیا کیا مشکلات اس
کے پیچھے اٹھائیں۔ اور آج بیوی والا ہو کر اس طرح اس کے سینے پر مونگ
دل رہا ہے۔ ممتاز اور اس کی دلہن نے اس کے ساتھ جو زیادتیاں کی تھیں
وہ اس وقت بڑی شدت سے اُسے رہ رہ کر یاد آ رہی تھیں۔

ابھی پچھلے مہینوں کی بات ہے کہ وہ لوگ روزہ افطار کرنے اپنی خالہ کے گھر گئے تھے جاتے وقت بہو نے سب چیزیں باورچی خانے میں رکھ کر کہا۔ "ہاں تم افطار کر لینا۔ آج خالہ کے یہاں ہماری دعوت ہے۔" اور اس سے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی کھٹ کھٹ کرتی میاں کا ہاتھ پکڑ کر روانہ ہو گئی۔ پھیکی اور ٹھنڈی پھلکیاں کھاتے ہی اس کا جی کیسا کیسا ہونے لگا اور چائے دم کرتے کرتے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اور آنسوؤں کی سوزش اس کو اپنے حلق تک محسوس ہو رہی تھی۔ سینہ لگتا تھا، جیسے پھٹ جائے گا۔

دن تو جیسے تیسے گزر ہی جاتا ہے لیکن رات پہاڑ بن کر آ جاتی ہے وہ رات بھر درد سے کراہتی رہتی، کھانسی ایک منٹ بھی چین نہیں لینے دیتی اور یہ الگ کمرے کے دروازے بند کر کے رنگ رلیاں مناتے رہتے ہیں [illegible] جیسے کافی نہیں ہوتا کہ ممتاز رات کو بھی بیوی کی جوتیاں سیدھی کرتا رہتا ہے۔ اس نے بے چینی سے کروٹ بدلی۔ اندر کمرے میں بتی بھی کسی نے جلا دی تھی اور تھوڑی دیر تک چوڑیاں کھنکنے اور باتیں کرنے کی دھیمی دھیمی آواز آتی رہی پھر روشنی گل ہو گئی۔

یہ جلتی بجھتی روشنی ہی تو اس کی نیند لے اڑی ہے۔ [illegible] حلق میں کوئی چیز اچھل کر آ گئی۔ اب یہ چڑیل ساری رات بھر سونے نہیں دے گی۔ صبح دفتر بھی جانا ہے میرا بچہ کتنا دُبلا ہوتا جا رہا ہے۔ یہ عورت ہے یا چڑیل... اس نے لحاف منہ پر سے سرکا کر کمرے کی طرف دیکھا۔ کمرے میں قبرستان کی سی خاموشی تھی۔ لحاف سرکا کر پلنگ کی پٹی پر گڑمڈ ہو کر پڑا تھا، وہ بے تاب ہو کر اٹھ کر بیٹھ گئی اور زمین پر پیر لٹکا دیے۔ ٹھنڈے ٹھنڈے فرش کے لمس سے اسے عجیب سی آسودگی کا احساس ہو رہا تھا۔ [illegible] پلنگ کے سرہانے سے [illegible] کمرے کی طرف دیکھتے [illegible] جیسے تاریکی کا [illegible]

صبح ہوتی تو بہو بیٹے اسے زمین پر [illegible] ٹیک لگا کر [illegible] رہ گئے۔ اس کا جسم تو کسی طرح جل رہا تھا [illegible] آنکھیں بھیگی ہوئی رہی تھیں۔ بڑی مشکل سے کھانسی کے جھٹکوں کو [illegible] کہ وہ رات سوتے میں پلنگ سے گر پڑی۔" تم لوگ [illegible] مگر تم لوگ تو جیسے کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر سوتے ہو۔" اس کا لہجہ جلا بھنا تلخ تھا اور تلملاہٹ کا رخ بہو کی طرف تھا۔ بہو کی آنکھیں ندامت سے جھکی ہوئی تھیں اور آنسو [illegible] جیسے آنکھوں میں [illegible] سے تھے اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اس کو دل پر سے بوجھ سرکتا ہوا محسوس ہوا۔ پھر اس کی آواز دھیمے دھیمے تیز اور لہجہ تیکھا ہو گیا۔ ——— یہاں تک کہ اس کے بیٹے کو بھی دخل اندازی کرنی پڑی۔" اماں بس جانے دو بس کرو اماں۔ آج سے ہم دروازے کھلے رکھیں گے تب تو تم کو اطمینان ہو گا..." اور اس طرح بات ختم ہو گئی لیکن یہ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ کھلے دروازے اور بھی غضب ڈھائیں گے۔

دروازوں کے دونوں پٹ اپنے اندر چھپا کے یہ بھاری پردے جیسے ٹس سے مس نہیں ہوتے تھے۔ سرسراتی ہوئی ہوا کے جھونکے بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے۔ اور پردے [illegible] اندر جھانکتے بھی تو وہی گھپ اندھیرا رہتا۔ ایسے وقت میں تو ہاتھ کو ہاتھ بھی نہیں سجھائی دیتا تھا کہ...

اس کو بے اختیار وہ دن یاد آ گئے۔ جب وہ نئی نویلی دلہن بنی کمرے میں داخل ہوتی تھی۔ دروازے کے باہر سرسراہٹیں اور دبی دبی سرگوشیاں سے وہ بہت زیادہ گھبرا گئی تھی [illegible] حنائی بھرے ہاتھوں سے پسینے چھوٹ رہے تھے اور جب ممتاز کا باپ [illegible] آنکھوں میں [illegible] ریشم کے کرتے پہ لال پٹکا باندھے اندر داخل ہوا۔ تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے خون کی ایک ایک بوند اس کی رگ رگ سے نچوڑ لی۔ لیکن وہ فوراً ہی باہر کے قہقہوں سے چونک اٹھی۔ اور [illegible] پلنگ کی پٹی پر سر جھکائے بیٹھا رہا۔ جب بھی وہ آگے کی طرف کھسکتا پیچھے سے کھکھلانے کی آواز آتی اور وہ فوراً ہی اپنی جگہ پر [illegible] اس کی جھنجھلاہٹ اور شرم [illegible] صبح کو جب آنکھیں میں نیند بھرے [illegible] قہقہوں کے شور میں دروازہ [illegible] جیسے یہ لوگ [illegible] پر کھسیانی مسکراہٹ [illegible] باہر نکل گیا [illegible]

پڑی۔
[illegible]
[illegible]
[illegible]
باتیں تھیں۔ جب [illegible]
[illegible]
[illegible]
رہے تھے۔ [illegible] بات تھی [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] سکون بخش دے گا۔

کمرے میں بکھرے [illegible] تمام [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] اپنے شوہر کی [illegible]
[illegible] اس کا شوہر بھی [illegible]
[illegible]
[illegible] ذرا سی آہٹ پر بھی
سانس روک کر [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
آ گیا کرے کدھر جا رہا [illegible] یہاں [illegible] میری [illegible] پتہ نہیں کیسا ہو

[illegible] اور وہ [illegible]
پھر اس کی [illegible]
جب [illegible]
شوہر [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
پھر اس [illegible]
رات بھر وہ [illegible] اس کا شوہر [illegible]
[illegible]
بنا کر [illegible]
بھول کر شوہر کی باہوں میں [illegible]۔
اس کے بعد جب وہ [illegible] اس طرح گھر میں [illegible]
گھوم رہی ہے جیسے [illegible]
[illegible]
یہاں تک کہ [illegible]
رہی جب [illegible]
[illegible]
تھا۔ اس نے [illegible]
غائب تھی [illegible]
[illegible] آنکھوں میں
سمایا اور وہ [illegible] پڑی۔
[illegible]
بالکل اس نے [illegible]
[illegible] کی کوشش کر رہی تھی [illegible]
[illegible] پتہ نہیں [illegible]

کو بھر بھی ملازمت کریں تھا، اس کی آنکھوں سے بہت کم نظر آتا ہے اور پھر بیت وہ بالکل نئے کنکشے، کبھی گھڑی دیکھنے اور کبھی ریڈیو کا سوئچ آن کرنے کمرے میں چلی جاتی۔ اور ساتھ میں آپ ہی آپ باتیں کیا کرتی۔ پتہ نہیں کیا وقت ہے ابھی تک گوشت نہیں آیا خدا معلوم کب چڑھے گا اور اس طرح گھڑی کے گرد چکر، یا آنکھیں گاڑ کر دیکھنے کے بعد ایک نظر پیچھے بھی ڈال لیتی، لگتا اس کے دخل ہوتے ہی ہر کائی ختم ہو جاتی پھر جب وہ پیچھے مڑ کر دیکھتی تو گھبرا کر اٹھ کر بیٹھ جاتی۔

پہلے بھونڈے نذرات لاوے کی شکل میں جمع ہو کر اس وقت پھوٹ پڑے جب منی کی ہنسی میں اس کی بہو نے اپنے ایک رشتے کی نند سے کہا تھا اب تم اپنے بھائی صاحب کی بات نہ کرو۔ اب تو وہ بڈھے ہو گئے ہیں۔ لمحات میں ڈورا بھرتے بھرتے وہ رک گئی۔ موٹا سا سوا کھچ سے اس کی بائیں انگلی میں گھس گیا اور خون کی بوندیں رس رس کر زمین پر گرنے لگیں لیکن اس درد کے احساس سے زیادہ سینے کی تپش کی شدت معلوم ہو رہی تھی ایسا لگ رہا تھا جیسے گلے کی رگیں سوکھ گئی ہیں۔ بڑی مشکل سے اس نے تھوک نگل کر کہا۔ "بہو نہیں تو روز روز تو اسے غسل کرواتی ہے زکام ہے حرارت ہے گلے میں تکلیف ہے لیکن اس کا روزہ کا غسل ناغہ نہیں ہوگا، پھر بھی اسے بڑھا کہتی ہے۔ ڈائن۔ کھا کر ہی تو دم لے گی حرافہ۔ آنسو جو وقت بے وقت اس کا ساتھ دینے کو تیار رہتے تھے۔ وہ بھی اس وقت دھواں بن کر اڑ گئے۔ بہو نے حیرت سے ساس کی طرف دیکھا مگر وہاں تو جیسے جلادنی کی سختی تھی جیسے جوانی کا پھندا لگ رہا ہو۔ اور وہ منہ پیٹ کر اپنے کمرے میں جا گھسی۔

دوسرے دن گھر میں ایک ہنگامہ برپا تھا بہو کی آنکھیں رو رو کر جل تھل کر رہی تھیں صبح سے ان کی ایک کھیل بھی اڑ کر منہ میں نہیں گئی تھی اور اماں دھاڑ دھاڑ کر کہہ رہی تھی۔ بات کچھ بھی ہو۔ مگر خدا لگتی کہو گی بیدر منذ روز اچھے کا آنا ٹھیک نہیں ہے معلوم ہے وہ تیرا ماموں ہے پھر سگا ماموں تو نہیں" اور ممتاز ماں کے منہ پر ہاتھ رکھا التجا آمیز لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "اماں خدا کے لئے چپ رہو۔ زرینہ سن لے گی۔ وہ اسے سگے ماموں کی طرح چاہتی ہے اسی نے تو اس کی پرورش کی ہے" ممتا کے پیچھے کی سختی محسوس کر کے بڑھیا کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا اور وہ بے اختیار بلک بلک کر رو پڑی۔

پھر آنسو بھری آنکھوں سے بہو کے کمرے کی طرف دیکھ کر اپنی گٹھری سنبھالتے ہوئے بولی۔ "مجھے نہیں معلوم تھا کہ اپنی اولاد بھی اس طرح بدل جاتی ہے بیٹا تنگ نظر یا یہ کیا تمہیں […] کہ جیسے زبان ہلا جی کوئی […] اولاد ہو گی تو دل پر ہاتھ رکھ کر پوچھنا تک […] اس گھر کا پانی مجھ پر حرام ہے۔" یہ کہہ کر وہ گٹھری اٹھا کر نکل اسی وقت اپنی بیٹی کے گھر چلی گئی۔

لیکن یہ بھی ٹھیک ہے کہ ہوتے ہوئے کسی دوسرے کے گھر جا پڑنا بھی تو ٹھیک نہیں ہے اس طرح تو دل کی آگ بجھنے کی نہیں۔ اسی پر بس اتفاق پڑی کی خبر سنا دی کہ ادھر نواسی ہوا کچھ اچھا نہیں ہے۔ وہ کیسے یہ سب سن کر بیٹی کے گھر بیٹھی رہتی۔ اللہ جی تو شکر خورے کو شکر دیتا ہے۔ کل سے ممتاز بھی بار بار بلا رہا ہے۔ اس کی بیوی ایک بچی رہتی ہے […] گھر والی بڑی […] تو ہوتی ہی رہتی ہے۔ کوئی گھر چھوڑ کر اس طرح تھوڑی آ جاتا ہے۔ زرینہ بیمار ہے اس کی خبر گیری کرنے والا بھی کوئی نہیں ہے۔ اسے پوچھنا تھا کہ ماں تو خوش خوشی گھر اس طرح لوٹی جیسے کوئی معرکہ جیت کر آئی ہو۔

گھر آ کر اس نے زرینہ کو اس کی نانی یعنی تیسرے بیٹے کا پانی کرتے دیکھا تو اسے بے اختیار پیار آ گیا۔ اس کا دل چاہا کہ اس پیلی رنگت اور دھنسی آنکھوں والی زرینہ کو اٹھا کر سینے سے لپٹا لے۔ ممتا کا لاوا پھوٹ نکلا اس کی گود میں ممتاز کا بیٹا ہوگا اسی کے اپنے بیٹے کا بچہ۔ گول مٹول بھرے بھرے گالوں والے بہت سارے بچے اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم گئے۔ اس نے فاتحانہ انداز میں زرینہ کی طرف دیکھا اور فوراً اس کی نگرانی کا چارج لے لیا۔ پھر اسے ایک دم سے کیا یاد آئی اور مڑ کر بولی۔ "آج سے تو میرے پاس رہے گی۔ رات کو بھی تیرا پلنگ میرے پاس بچھے گا۔" زرینہ نے گھبرا کر میاں کی طرف دیکھا۔ ممتاز نے لیٹے لیٹے نگاہیں جھکا لیں۔ رات کو جب زرینہ اس کی پٹی سے پٹی ملا کر پلنگ بچھا کر لیٹی تو ماں اور سمونگی کے احساس سے اس کی آنکھیں چھلک آئیں۔ اور بہت ہی جلد پہلی بار گہری نیند سو گئی۔ رات کی تنہائی میں اس کے خراٹے گونج رہے تھے اور یہ خراٹے زرینہ کی آنکھوں میں جیسے مرچیں گھول رہے تھے۔ اس پہ سے زرینہ تو اپنے بچے کے خراٹے سے پریشان تھی، جاتی پر سو دیکھ کر اور بھی دہشت ہو رہی تھی گھبرا کر اس نے ڈبیا کی ٹھوڑی پر ہاتھ رکھا۔ "اماں۔ اٹھو میرا جی گھبرا رہا ہے۔" کہتے کہتے زرینہ کی آواز رندھ گئی لیکن بڑھیا ہلی نہیں۔ وہ اس کا ہاتھ سختی سے دباتے ہوئے سرگوشیوں میں بولی۔ "آتی کہو کیوں پڑے ہو ممتا کے ابا۔!!"

میرے درد کی دوا کرے کوئی

بلغم سے نجات

ذرا سی ٹھنڈ لگے یا گرد اٹھے تو بس فوراً زکام ہو جاتا ہے۔ ایک دو ماہ کے وقفے سے سینے میں اتنا بلغم جم جاتا ہے کہ سانس بری طرح پھولنے لگتی ہے۔ تو جب تک تھوک تھوک کر بلغم نہیں نکل جاتا، میں سخت اذیت کا شکار رہتی ہوں۔ ڈاکٹر جو ادویات دیتے ہیں ان سے بلغم جم جاتا ہے لیکن اگر دو تین دن تو چلو دن بعد وہی کیفیت عود کر آتی ہے۔ اگر کوئی صاحب اس تکلیف سے نجات دلا دیں تو احسان مند رہوں گی۔

ملک شیریں

کان کا درد

میرے کان میں معمولی سا درد تھا جو بڑھتے بڑھتے زخم کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ کان سے بہت بدبودار پیپ ہر وقت نکلتی رہتی ہے جس کے سبب میں کسی کے قریب جانے سے کتراتا ہوں۔ علاج اپنی بساط کے مطابق بہت کیا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اگر کسی کے پاس کوئی دوا ہو تو تجویز کریں، دعاؤں میں یاد کروں گا۔

محمد ہاشم، کراچی

پائیریا کے لیے

(۱) میرے پاس پائیریا سے نجات کے لیے بہترین منجن موجود ہے جو سینکڑوں کا آزمودہ ہے۔ خط لکھ کر طلب فرمائیں۔

مولانا محمد صدیق مدرس، مدرسہ اشرف العلوم مکان نمبر ۷ بلاک نمبر ۱۴ سیکٹر نمبر ۱۶ ڈی ۳ لانڈھی ملا کراچی

(۲) کسی بھی میڈیکل اسٹور سے ہومیو پیتھک دوا "فلوریک ایسڈ" لے لیں۔ صبح اٹھ کر اور رات کو سوتے وقت اچھی طرح منجن کی طرح استعمال کریں۔ ہر قسم کے گوشت اور بادی اشیاء سے پرہیز ضروری ہے۔

ظفر احمد ——— کراچی

بلند داغوں کے لیے

(۱) ہومیو پیتھک کی دوا آرسنک سلف ۳۰ کی ایک خوراک صبح نہار منہ کھا لیں (صرف دو مرتبہ)

(۲) ایلو ویرا کو نیل مد مجھنز دس قطرے ایک چمچ نیم گرم پانی میں ملا کر صبح خالی پیٹ اور شام کو سوتے وقت استعمال کریں۔ تین ماہ یہ دوا استعمال کرنے سے انشاء اللہ فائدہ ہوگا۔

ایم اکرم مرزا ——— لاہور

● یہ مسائل اپنے حل کے لیے قارئین کے تعاون کے منتظر ہیں۔ اگر آپ ان میں سے کچھ مدد کر سکتے ہیں تو ہمیں "دوشیزہ" کی معرفت لکھیے، انسانیت کی خدمت کا یہ بھی طریقہ ہے۔

بدست بجی منتظم کراچی ——— دوشیزہ

ایک سنسناتی ہوئی بھیانک پُر اسرار رات کا احوال جس کی کہانی کا سیاہ دامن اس روایت سے اسرار پوشیدہ تھے ——— بگولوں کا چیخ و پکار سے دل دہلا دینے والا پیغام ——— اجنبی انسانوں کا لاشوں کا کھنڈر کھنکھناٹ ——— اور دیو ہیکل کی بے بسی قید میں دہل کا جائیے — اس رات کی صبح لوگوں نے کیا کچھ دیکھا ——— ۹۹

منوّرہ نوری

حیدر فہری نے گھوڑا روکا اور آگے بڑھنے کا ارادہ ملتوی کردیا۔ شام گہری ہورہی تھی اور فاصلہ بھی ابھی بہت تھا۔ سامنے دریا کا پانی ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ شوریدہ سر موجیں شور مچاتی بل کھاتی ہوئی کناروں سے ٹکرا رہی تھیں اور پل سنسان نظر آرہا تھا۔ یوں تو اس طویل بل کھاتے ہوئے دریا کے اس پار کا علاقہ سرِشام ہی ویران ہوجاتا۔ وادیٔ الکفر کے تمام گھروں کے دروازے بند ہوجاتے اور بچے تمام دن گلی کوچوں میں اودھم مچانے اور اونچی نیچی پہاڑیوں میں دوڑ لگانے کے بعد اس وقت ذرا سی آہٹ پر سہم کر ماؤں کی گود میں گھس جاتے لیکن آج تو دور ہی سے دہشت برستی نظر آرہی تھی جیسے ہر طرف آہ و بکا ہورہی ہو اور وادی کے گوشے گوشے سے جنازے اٹھ رہے ہوں — یہ نہیں کہ دو بستیوں کے الحاق سے وجود میں آنے والی یہ وادی ازل سے ہی پُراسرار اور یہاں کے باشندے ہمیشہ سے ہی سہمے ہوئے تھے بلکہ یہ قطعۂ ارض جو اس دریا کی معاونت سے تختۂ گلزار بن گیا تھا۔ کبھی بڑا ہی حسین اور بارونق تصور کیا جاتا تھا کسی زمانہ میں شیر دل نے پانی سے نہیں اپنے لہو سے اس کے گوشے گوشے کو سینچا تھا، یہاں کے باشندوں کو اتفاق و محبت کی لذت سے آشنا کیا تھا۔ جب سے اب تک شیر دل کی داستان بچے بچے کی زبان پر تھی۔ کبھی سردیوں کی دوپہروں میں دھوپ کی ندی میں بیٹھ کر اور کبھی گرمیوں کی چاندنی راتوں میں ٹھنڈی ریت پر لیٹ کر جوان بزرگوں سے یہ کہانی سنانے کی ضد



درے سب یہ احساس یوں چھڑ تا کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہ رہتا شام سے صبح اور صبح سے شام ہو جاتی۔ پھر وقت گزرتا رہا بزرگوں کی موت جوانوں کو بڑا بنا تی گئی۔ یہ جوان بزرگوں کا روپ دھار کر بچوں کو یہ داستان سناتے رہے مگر جب کبھی کوئی تجسس فطرت کا مالک چونک کر پوچھتا۔

"شیر دل کہاں گیا؟"

تو کوئی جواب نہ دے سکتا۔ کہاں گیا کیوں گیا؟ یہ کسی کو علم نہ تھا مگر ہر لڑکا شیر دل بننے کی تمنا کرتا، جو امن کا نشان اور عظمت کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ یوں تو وادی الکغد کی بلند پہاڑیاں پل کھاتے دریا سے اس کی جانب رہنمائی کرنے والی سڑک کے دونوں جانب لاتعداد درخت اور یہ طویل پل اس جگہ کے لوگوں کی نفرت محبت اور لڑائیوں کے چشم دید گواہ تھے مگر ناکامی اور کامیابیوں کی ساری کہانیاں آہستہ آہستہ داستان پارینہ بن گئی تھیں اور اب کسی کو بھی کچھ یاد نہ تھا لیکن شیر دل زندہ جاوید ہو کر رہ گیا تھا نصف صدی گزر گئی تھی مگر اسے ایک لمحہ بھی فراموش نہ کر سکا تھا نہ اس موضوع کو چھیڑنے والے ہی کم ہوئے تھے، جب بھی یہ ذکر چھڑتا جوش کا عالم یہ ہوتا جیسے ابھی ابھی وہ اس وادی سے رخصت ہوا ہے، ابھی شب وادی سے لاپتہ ہوا ہے اور ابھی اس کی تلاش جاری ہے۔ شہروں سے الگ تھلگ دریا کے اس پار وادی الکغد کے ضعیف العمر سردار کے سوا وہ ہر فرد کے لئے دلچسپ موضوع تھا یہ شفیق و مہربان، عظمت و ہمت کا پیکر بوڑھا وادی کا محبوب سردار کبھی شیر دل کے بارے میں کچھ نہ کہتا اس کا چٹانوں جیسا سخت چہرہ اور سمندر جیسی گہری آنکھیں بڑی عجیب تھیں وہاں جن دنوں وادی الکغد کی بوڑھی دیوانی پر دیوانگی کا شدید دورہ پڑتا تو ان دنوں تھوڑی دیر کے لئے جہاں بستی والے شیر دل کو بھول جاتے وہاں وادی کا یہ حلیم سرداران سب کی سوچوں کا مرکز بن جاتا۔ ایسے میں شام ہی سے اداسی طاری ہوتی، بڑے بڑے بہادر جوان تاریکی ہونے سے قبل گھروں کو لوٹ جانا چاہتے اور ہر طرف یہ آہٹ پر محسوس ہوتا کہ وہ آئی، وہ آئی، اس بوڑھی پگلی کے وجود اور بے معنی حرکتوں نے وادی کا حسن اور رونق سب کچھ چھین کر یہاں کے باشندوں کو خائف کر دیا تھا۔ وہ کون تھی کہاں سے آئی کسی کو علم نہ تھا اس نسل نے آنکھ کھول کر اسے یوں ہی دیکھا تھا۔ وہ اپنے بزرگوں سے دریافت کرتے مگر انہوں نے بھی اسے عالم جنون ہی میں پایا تھا۔ مدتوں سے یہ ضعیف دیوانی بوڑھے سردار کی حویلی کے عقبی کمروں میں مقیم تھی۔ سردار کا اپنے ملازموں کو حکم تھا کہ اسے کھانا بڑے اہتمام سے پہنچایا جائے، دیوانی کبھی تو کھا لیتی اور کبھی برتن توڑ دیتی۔ دن بھر تنہائیوں میں بیٹھنے والی یہ پاگل شام ہوتے ہی اپنے کمرے میں تھرتھر سے نکل سے اٹے ہوئے بالوں میں گلاب کا ایک پھول لگاتی اور وادی کے وسط میں اس بلند چٹان پر چڑھ جاتی جو یہاں سب سے اونچی اور حسین جگہ تصور کی جاتی تھی، ایسے میں وادی الکغد کے بوڑھے سردار کی حالت دیدنی ہوتی، وہ اس چٹان کے گرد چکر لگاتا جیسے بس وہی اس پگلی کا محافظ ہے مگر وہ اس سب سے بے خبر ادھر ادھر گھومتی اور ہواؤں سے باتیں کرتی رہتی یہاں تک کہ رات گہری ہو جاتی۔ سردار حسب معمول بے قراری سے چکر لگا رہتا۔ اس کی سفید بھنویں فکر و تردد سے تن جاتیں اور آنکھوں میں اداسیاں گھلنے لگتیں۔ سیدھا لانبا قد خمیدہ نظر آتا اور سفید چہرہ دکھوں سے مثالا ہو جاتا۔ مگر وہ وہاں سے نہ ٹلتا جب ہر طرف اندھیرا پھیل جاتا تب دیوانی چیختی چلاتی چٹان سے اس طرح اترتی کہ اس پر وحشت طاری ہوتی وہ سنگریزے چن چن کر ہر سامنے آنے والے کا نشانہ لیتی بوڑھا مہربان سردار نرمی اور محبت سے اس کے لاغر بازو پکڑ کر حویلی کی طرف لے جاتا، مگر وہ پلٹ پلٹ کر چٹان کو تکتی، بین کرتی اور روتی ہوئی اپنے کمروں کی طرف لوٹ جاتی۔ اس کے بعد سردار اپنے دکھ کو چھپائے، تھکے تھکے قدموں سے حویلی میں ٹہل ٹہل کر شب گزار دیتا۔ وادی الکغد کے لوگوں نے یہ تماشے ہزاروں مرتبہ دیکھے تھے۔ کچھ لوگوں نے سردار سے کئی بار کہا بھی تھا۔

"مہربان آقا، اب شہروں میں پاگل خانے قائم ہو گئے ہیں، بوڑھی پگلی کو وہاں بھجوا دیجئے کم از کم آپ کو ہر روز اس محنت سے تو نجات مل جائے گی۔"

یہ سن کر سردار کا چہرہ سرخ ہو جاتا جیسے اسے یہ بات گراں نہ ہو۔ بارہا یوں بھی ہوا کہ وادی کے جوانوں نے سردار کو گھیر لیا اور پوچھا۔

"مہربان سردار! کیا آپ بھی اس دیوانی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے؟"

یہ سن کر سردار گہرا سانس لیتا اور محفل برخاست کر دیتا۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ بچپن سے ہی دیوانی کو اس حال میں دیکھ رہے ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کا جنون بڑھ رہا ہے

مگر اس کے دستور میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ سورج کے غروب ہونے کے بعد اپنے سرہانے پھول رکھ کر چٹان پر رکھ دیتی ہے اور وہاں سے چیختی شور مچاتی ہوئی اترتی ہے۔ یہ وہ منظر تھا جسے دیکھتے دیکھتے بچے جوان اور جوان بوڑھے ہو گئے تھے۔ اس لئے شام ہونے کے بعد شہر کی طرف سے آنے والے مسافروں کو اگر دیر ہو جاتی تو وہ وادی الکفہ میں داخل ہونے کی ہمت نہ کرتے بلکہ پل کے پرے اس چھوٹے سے مکان میں رات گزار دیتے جو کسی زمانہ میں شیر دل نے مسافروں کے لئے تعمیر کرایا تھا۔ یہاں ایک احاطہ گھوڑے باندھنے کے لئے مخصوص تھا اور چند کمرے مسافروں کے لئے۔

حیدر فہری نے گھوڑا روکا اور دور تاریکی میں ڈوبے ہوئے درختوں اور وادی الکفہ کی بلند چٹان پر نظر ڈالی تو ایک بار اس کا دل کانپ گیا۔ اس نے ایک جھرجھری سی لی۔ اسے محسوس ہوا کہ آج اس وادی پر نحوست پھیل رہی ہے، ہر طرف موت منڈلا رہی ہے اور دیوانی چٹان پر چڑھی چلا رہی ہے۔ وادی کا عظیم سردار چٹان کے نیچے مضطرب کھڑا دیوانی کے اترنے کا انتظار کر رہا ہے کہ کب وہ نیچے آئے اور وہ اسے حویلی کے پچھلے کمروں میں چھوڑ کر خود ٹہل ٹہل کر رات گزارے۔ حیدر فہری اس احاطہ میں داخل ہو گیا جو دیر سے لوٹنے والے تاجروں کے لئے مخصوص تھا۔ سردیوں کی طویل راتوں میں یہ مسافر آتش دان میں آگ جلا کر اس کے گرد بیٹھ جاتے، کبھی شہروں میں ہونے والے واقعات کا اور کبھی شیر دل کا ذکر چھڑ جاتا تب وہ سکون سے رات گزار دیتے لیکن آج حیدر فہری تنہا تھا اندر داخل ہوتے ہوتے اسے پھر شیر دل کا خیال آ گیا وہ جیسے خود سے بولا۔

"شیر دل! چپے چپے سے تمہاری یادیں وابستہ ہیں تمہارے ہر کام سے عظمت ٹپکتی ہے کاش تم اس دور میں پیدا ہوتے تو اس وادی کا حال دیکھتے جسے تم نے رشکِ ارم بنایا تھا۔"

اس نے اپنا گھوڑا احاطہ میں باندھا اور سردی سے بچنے کے لئے کمرے کی طرف چل پڑا۔ گھوڑا زور سے ہنہنایا اس نے پلٹ کر دیکھا وہ جیسے کان اٹھائے کچھ سننے کی کوشش کر رہا تھا۔

حیدر فہری نے پلٹ کر اسے تھپکی دی۔

"میرے دوست، میرے ساتھی، آج تو بھی میری طرح وہمی ہو گیا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ کمرے میں آ گیا چراغ روشن کرتے ہوئے آتش دان میں ایندھن جھونکتے ہوئے اس کے دل میں یہ عجیب سی خواہش پیدا ہوئی کہ کاش بہت زیادہ ہوتا کوئی کہانی سنتے کوئی کہانی سناتے ہوئے یہ شب گزر جاتی۔

***

رات کا ابتدائی حصہ گزر چکا تھا مگر نیند اس کی آنکھوں سے غائب تھی۔ نہ جانے کیوں محسوس ہو رہا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے اور در و دیوار زبانِ سکوت سے سرگوشیاں کر رہے ہیں۔

"حیدر! یہ رات بڑی اہم ہے۔ بڑی پراسرار ہے تم دنیا کی خبریں کیا کہتی ہیں؟ ہوائیں کیا خبر سنا رہی ہیں؟"

حیدر فہری بے چینی سے کروٹیں بدل رہا تھا۔ پھر یہ تصور کا وہم توڑنے کے لئے وہ خواہ مخواہ ہی سوچنے لگا ... حاکم شہر دیوانی کا اس قدر خیال کیوں رکھتا ہے؟ اور یہ عورت پاگل ہو کر بھی آرائش و زیبائش کو کیوں نہیں بھولتی؟ سفید بیلے بالوں میں ہر شام پھول لگانے کی بھلا اسے ضرورت کیا ہے جبکہ وہ بوڑھی ہو گئی ہے؟ خیالات امڈتے چلے آ رہے تھے اور حیدر فہری خود بخود ہی مسکرا رہا تھا مگر دوسرے ہی لمحے یہ مسکراہٹ کافور ہو گئی اور وہ ایک دم سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ایک عجیب سی آواز سنائی دے رہی تھی جیسے کوئی عورت خوش ہو ہو کر شیر دل کو پکار رہی ہو۔ یہ نسوانی آواز کس کی تھی وہ سننے کی کوشش کرنے لگا مگر گھوڑے کی آواز نے اس تسلسل کو توڑ دیا پھر اس نے خود ہی کہا۔

"حیدر! تو پاگل ہے، بھلا شیر دل کو اس انداز میں کون پکار سکتی ہے جبکہ یہ وادی چھوڑے ہوئے نصف صدی ہو گئی۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہے، اسے یہاں کون عورت یاد کر سکتی ہے؟" مگر قہقہوں کی مسلسل آواز نے اسے ایک مرتبہ پھر جھنجھوڑ دیا اسے بالکل یوں محسوس ہوا جیسے دیوانی خوشی سے قہقہے لگا رہی ہے "دیکھو وہ آ گیا، وہ آ گیا، وہ آ گیا" حیدر فہری گھبرا کر کھڑا ہو گیا معلوم ہوتا تھا کہ وہ پل پار کر کے ادھر آ رہی ہے مگر چند لمحے گزرنے کے بعد وہ پھر آتش دان کے قریب ہی لیٹ گیا۔ اس مرتبہ اسے اپنی حالت پر ہنسی آ گئی۔ یہ آج اسے کیا ہو رہا ہے وہ کیسی باتیں سوچ رہا ہے دیوانی تو کبھی یہ پل پار کر کے ادھر نہ آئی تھی ہاں شاید اس کی آواز سناٹے کو چیر کر ادھر آ رہی ہو۔ وہ روتی چیختی ہی کرتی چٹان سے نیچے آ رہی ہو اور وادی کا خدا ترس سردار نرمی اور شفقت سے اسے حویلی کی طرف لے جا رہا ہو۔ یہ

خیال یا لیستان کا نیل تھا وہ آتش دان کے قریب سکون سے لیٹ گیا مگر خوشی کی چیخیں ایک بار پھر بلند ہوئیں اور شب کی خاموشی کو چیرتی ہوئی فضا میں بکھر گئیں، یہ آوازیں بڑی واضح تھیں حیدر فہری پھر چونک گیا مگر اس مرتبہ گھوڑے کی ہنہنانے کی آواز کے ساتھ ہی ایک اجنبی آہٹ نے لے اور متوجہ کر لیا۔ کھٹ، کھٹ، کھٹ، جیسے کوئی مسافر پیدل سفر کرتا ہوا لاٹھی ہاتھ میں لئے بڑی دور سے آرہا ہو، وہ بغور سننے لگا شاید کسی بستی کا مسافر ادھر سے گزر رہا ہو مگر آواز دھیمے دھیمے بڑھتی ہوئی قریب آ رہی تھی، یہاں تک کہ وہ احاطے کے باہر رک گئی، فضا پر ایک دم سناٹا طاری ہو گیا ہوا کے دوش پر آنے والی آوازیں جیسے بند ہو گئیں، اسے محسوس ہوا کوئی ٹٹول ٹٹول کر احاطے کے اندر داخل ہو رہا ہے۔ اب حیدر فہری اٹھا اور بہ آواز بلند بولا۔

"کون ہے بھائی؟"

جواب میں کھٹ کھٹ کی آواز کمرے کی طرف آنے لگی، اور کسی ضعیف العمر آدمی نے پوچھا۔

"کوئی ہے؟"

"ہاں میں یہاں ہوں۔ حیدر فہری، وادی الکفہ کا مسافر۔"

"اچھا" آنے والا جیسے ٹھٹک گیا قدرے سکوت کے بعد بولا "میں بھی مسافر ہوں، شب تاریک ہونے کے سبب پل پار کرنے کی ہمت نہ کر سکا۔"

یہ لہجہ یہ آواز بڑی انوکھی تھی، اسے محسوس ہوا کہ نو وارد بوڑھا کوئی غیر معمولی انسان ہے، کوئی دوسری مخلوق ہے یا پھر کوئی بھٹکی ہوئی روح ہے جو سکون کی تلاش میں پھر رہی ہے، اب تک بوڑھا کمرے کے دروازے تک آچکا تھا وہ باہر سے بولا۔

"کیا میں اندر آسکتا ہوں؟"

"ہاں تشریف لائیے" حیدر فہری کھڑا ہو گیا آنے والے کو خوش آمدید کہنا ضروری تھا وہ خوش دلی سے بولا۔

"تشریف لائیے۔ اس وقت آرام کیجئے ہم دونوں صبح کو اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔"

بوڑھا یہ سن کر کمرے میں آگیا جس کی چھت بلند تھی، دیوار پر چراغ کی روشنی اپنا عکس ڈال ڈال کر بڑی پراسرار لگ رہی تھی۔ چھت کے قریب مکڑی کے بے شمار جالے لٹکے ہوئے تھے، بوڑھے نے اندر داخل ہو کر ادھر ادھر اس طرح دیکھا جیسے وہ اس گھر کے کونے کونے سے واقف ہو، حیدر فہری نے دیکھا اس شخص کی آنکھیں عجیب تھیں جن پر سفید ابرو سایہ کئے ہوئے تھے اور سفید گھنی داڑھی اسے کچھ زیادہ ہی بارعب بنا رہی تھی۔ حیدر فہری کو محسوس ہوا کہ یہ شخص ایک داستان ہے، ایک تاریخ ہے، اس نے خوش اخلاقی سے کہا۔

"معزز مسافر۔ آپ آتش دان کے قریب آجائیے اور آرام کیجئے۔"

"بیٹے" بوڑھے نے اسے بغور دیکھا "میں آرام کرنے یا سونے کے لئے قطعی تیار نہیں ہوں، میں تو بے چینی سے سیاہی چھٹنے کا انتظار کر رہا ہوں کہ کب صبح ہو اور میں آگے بڑھوں۔"

یہ کہہ کر بوڑھا پلٹا اور دروازے کے وسط میں کھڑے ہو کر اندھیرے میں دریا کے پرے نجانے کیا دیکھنے کی کوشش کرنے لگا اس کا قد دراز اور سیدھا تھا۔ اس کے انداز میں بے تابی تھی چند لمحے تاریکی میں آنکھیں پھاڑے دیکھتے رہنے کے بعد وہ پھر پلٹا اور کمرے میں آتے ہوئے بولا۔

"تم کدھر جاؤ گے برخوردار؟"

"وادی الکفہ" حیدر فہری نے جواب دیا اور اس پراسرار بوڑھے کو دیکھنے لگا جو آتش دان کے قریب بیٹھا تھا، دھیمی دھیمی آنچ اس کے وجود کو نمایاں کر رہی تھی حیدر نے محسوس کیا کہ سردی کے باوجود اس پر کپکپی تھی نہ گھبراہٹ مگر اس نے آتش دان میں اور ایندھن ڈالا چرچر کی آواز کے ساتھ کمرہ چند لمحوں کے لئے روشن ہو گیا اس نے دیکھا کہ بوڑھا اسے بغور دیکھ رہا تھا وہ بولا۔

"اچھا آپ کدھر جائیں گے؟"

"اتفاق سے تمہارا ہم سفر ہوں" بوڑھے نے دھیرے سے جواب دیا تو حیدر فہری چونک پڑا اس نے حیرانی سے کہا۔

"جناب! میں نے آج سے پہلے آپ کو کبھی اس وادی میں نہیں دیکھا کیا آپ وہاں پہلی مرتبہ جا رہے ہیں؟"

"نہیں پہلی بار تو نہیں" بوڑھے نے کہا۔ "البتہ بڑی مدت کے بعد ادھر آیا ہوں، شاید وہ تمہارے باپ کی نوجوانی کا زمانہ ہوگا۔"

"اوہ" حیدر فہری حیران ہو کر بولا "برسوں پہلے کی بات ہے۔"

"ہاں۔" بوڑھے نے سرگوشی کے انداز میں کہا "کیا نام تھا تمہارے باپ کا؟"

"سلطان فہری" حیدر نے جواب دیا۔

[illegible]

"اچھا، تو تم سلطان فریدی کے فرزند ہو۔ ہاں اس وقت وہ بالکل جوان تھا جب میں یہاں آیا تھا۔"

یہ کہہ کر غیر ارادی طور پر بوڑھا پھر باہر کی جانب تکنے لگا باہر سرد ہوائیں چل رہی تھیں مرغوں کا شور بدستور تھا مگر آوازیں وہ پکار، وہ قہقہے سب بند ہو گئے تھے جیسے کسی کی بے قراری کو قرار آ گیا ہو۔ حیدر فریدی سوچوں میں گم تھا پھر اس نے ایک دم کہا۔

"جناب! اس کے یہ معنی ہوئے کہ آپ کی آمد کا زمانہ شیر دل کا زمانہ تھا، کیا آپ اسے جانتے ہیں؟"

اس سوال پر بوڑھا بے چین ہو گیا اور ٹالنے کے انداز میں بولا۔

"سو جاؤ۔ ہم دونوں کو صبح سفر کرنا ہے۔"

"مگر ابھی آپ نے فرمایا تھا کہ آپ سونے کے لئے تیار نہیں اور نیند مجھے بھی نہیں آ رہی، اس سرائے میں کوئی تنہا آدمی سو بھی نہیں سکتا اور جب دو جمع ہوتے ہیں تو بہتر ہے کوئی اچھی بات کریں تو کیوں نہ کوئی پرانی داستان چھڑ جائے اور میرے خیال میں شیر دل سے زیادہ دلچسپ موضوع کوئی اور نہ ہوگا۔ مجھے بتائیے آپ کیا اسی کے زمانہ میں یہاں آئے تھے؟"

"ایک زمانہ گزر گیا اب اس وقت کی باتیں سن کر کیا کرو گے؟" بوڑھے نے اسے پھر ٹالا مگر وہ بھی ٹلنے والا نہ تھا بولا۔

"اچھا بس اتنا بتا دیجئے کہ کیا آپ نے اس عظیم شخص کو دیکھا جس کی عظمت کی کہانی سب کی زبان پر ہے۔ اور جو لاپتہ ہو گیا تھا۔"

"ہاں!" بوڑھے نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ "وہ میرا قریبی دوست تھا۔"

یہ سن کر حیدر فریدی اچھل پڑا اس نے بوڑھے کے ہاتھ پکڑ کر اپنی آنکھوں سے لگائے اور عقیدت سے بولا

"پھر تو آپ مجھے ضرور اس کی کہانی سنائیے۔ میں کل وادی میں جا کر یہ کہانی سب کو سناؤں گا۔ بتائیے وہ کہاں گیا؟"

اس وقت بوڑھے کے ہاتھ آہستہ آہستہ کانپ رہے تھے اس کی آنکھوں میں اداسیاں گھل رہی تھیں، چہرہ تاریک ہو رہا تھا اس نے کہا۔

"بیٹے، اگر تم نئی نئی کہانیاں سننا چاہتے ہو تو پرانی کے لئے بضد ہو؟"

"ہاں" حیدر فریدی نے جلدی سے کہا۔ "ان میں بزرگوں کی عظمت کی داستانیں ہوتی ہیں جو ہم نوجوانوں کے لئے سبق ہوتا ہے لہٰذا میں آپ سے درخواست کروں گا کہ شیر دل کے بارے میں آپ جو کچھ جانتے ہیں وہ مجھے بتا دیجئے۔"

یہ سن کر بوڑھا پہلی بار مسکرایا اور بولا "سنو!"

"پل کے پار یہ علاقہ کسی زمانہ میں دو ایسی بستیوں پر مشتمل تھا جن کے سردار صدیوں سے ایک دوسرے کے مخالف تھے۔ بے مقصد لڑائیاں اور جھگڑے ان کا شیوہ تھا۔ خود بھی نہ جانتے تھے کہ کیوں ایک دوسرے کے دشمن ہیں، بس صدیوں کی روایت قائم رکھنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ ان دونوں کے درمیان یہ بلند چٹان جو دریا کے ادھر سے بھی نظر آتی ہے۔ سرحد کا کام دیتی تھی۔ یہ قطعہ ارض آب و ہوا کے لحاظ سے بہترین، زراعت کے لئے مناسب، زرخیز اور شادابی میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا مگر سرداروں کی مسلسل لڑائیوں اور نا اتفاقی کے سبب کسی کو اس کی خوبیوں کے بارے میں سوچنے کا وقت ہی نہ تھا۔ دونوں علاقوں کے باشندے بڑی تنگی سے گزر بسر کرتے۔ ان کی آمدنی کا زیادہ حصہ ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے میں صرف ہوتا، وہ جہاں کہیں بھی ایک دوسرے کو پاتے دبوچ لیتے آزار پہنچاتے اور ان پہاڑی راستوں پر سفر کرتے ہوئے انہیں بھوت پریت ڈاکوؤں سے زیادہ دوسری بستی کے مسافروں کا خوف ہوتا یہ دشمنی

نجانے کب سے چلا آتا تھا، بڑی بڑی معرکہ آرائیاں ہوئیں بڑے بڑے انقلاب آئے مگر ان کی فطرتوں میں کوئی فرق نہ آیا سیکڑوں برس گزر گئے مگر ان کی مخاصمتوں میں کمی نہ آئی جب کوئی سردار مرنے لگتا تو آئندہ نسلوں کے دلوں میں نفرت کا بیج اس طرح بو جاتا کہ وہ متنفر ہر جذبہ پر غالب آجاتا۔ اس زمانہ میں ان علاقوں پر شہباز فہری اور حرث ضمیلی کی سرداری تھی اور وہ بھی ہمیشہ کی طرح ایک دوسرے کو تکلیف پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کرتے شیر دل شہباز فہری کا اکلوتا بیٹا تھا جو کم عمری ہی میں شہر کے مکتب میں بھیج دیا گیا تھا۔ ان دنوں علم و ادب کی اشاعت شہروں میں عام تھی۔ یہ تعلیم مذہبی بھی ہوتی اور سپاہیانہ بھی، یہاں دوسری کتب پڑھائی جاتیں۔ قوموں کے عروج و زوال کے قصے سنائے جاتے۔ بڑے بڑے معلم اخلاقی، روحانی، نفسیاتی اور جسمانی طور پر لڑکوں کو تربیت دیتے، پھر مناظروں، مشاعروں میں انہیں بھیجا جاتا، جہاں کامیابی کی صورت میں انہیں گھوڑے، شمشیر، خنجر، تیر و ترکش یا بہترین کتب انعام میں دی جاتیں۔ شیر دل مختلف اوقات میں مختلف انعامات جیت چکا اور چند برس عظیم مصلحین معلمین کی صحبت میں گزارنے کے بعد وہ ایک نیا انسان بن گیا تھا جب وہ اپنی بستی کے چھوٹے چھوٹے جھگڑوں کے بارے میں سنتا تو یہ سب باتیں اسے بہت چھوٹی بڑی معمولی محسوس ہوتیں۔ چراگاہ میں مویشی چرنے پر قتل و غارت، دریا کے کنارے نہاتے نہاتے جھڑپ، ایک دوسرے کے آبا و اجداد پر تنقید کرنے پر خون، کبھی وہ سنتا کہ شہباز فہری کے بہادروں نے حرث ضمیلی کے مویشیوں کے ریوڑ سے چند بکریاں اڑالیں، کبھی سنتا حرث ضمیلی نے صحرائی ڈاکوؤں کے ساتھ مل کر اس کے تاجروں کو زخمی کر دیا، وہ لوگ شہر آتے تو شیر دل کو یہ قصے بڑے اشتعال کے انداز میں سناتے مگر وہ کوئی توجہ نہ دیتا، اسے نہ فتح و شکست کی پرواہ تھی نہ جھگڑوں سے غرض، وہ تو ایک اچھے سردار کی خصوصیات پیدا کر کے ایک بہترین سردار بننا چاہتا تھا۔ علم اور عالموں کی صحبت نے اسے انسان کے اصل مقام سے آگاہ کر دیا تھا۔

کئی برس بعد اسے مکتب سے چھٹی مل گئی لیکن عملی زندگی میں قدم رکھنے سے قبل وہ چند دنوں کے لئے گھر کی طرف روانہ ہو گیا دو دن گھوڑے پر سفر کرنے کے بعد اس بل کھاتے دریا پر پہنچ کر اسے عجیب سی طمانیت کا احساس ہوا گھر پہنچنے کی خوشی بھی تھی اور طویل سفر کی تھکن بھی مگر ابھی دریا عبور کرنے کے لئے اسے لمبا چکر لگانا تھا جہاں کئی میل آگے جا کر دریا کا پاٹ تنگ تھا وہاں یہاں کے لوگوں نے دریا سے پار اترنے کا انتظام کر رکھا تھا۔ پیدل لوگوں کے لئے یہ راستہ بڑا دشوار تھا البتہ شہسوار جہاں دریا کی گہرائی کم ہوتی گھوڑا ڈال دیتے، کئی انسانی جانوں اور بہت سے مال کا نقصان ہو چکا تھا مگر پل تعمیر کرنے کے بارے میں کوئی بھی قدم نہ اٹھاتا تھا کیونکہ فریقین کے کام سے دوسرا فائدہ اٹھائے یہ کسی کو بھی گوارہ نہ تھا شیر دل نے یہاں آکر سوچا کہ اگر دونوں بستیوں کے اشتراک سے وادی کے بالکل سامنے پل تعمیر کر دیا جائے تو یہاں سے فاصلہ بھی نصف رہ جائے اور جانی و مالی نقصان بھی بند ہو جائے گا، ان خیالات میں گم وہ اپنی منزل کی طرف رواں تھا۔ آفتاب غروب ہونے کے قریب تھا شیر دل نے اپنی بستی کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا سے مست ہو کر گھوڑے کی لگامیں چھوڑ دی تھیں، دریا سے وادی کی جانب رہنمائی کرنے والی سڑک کشادہ اور بنجر زمین کی طرح تھی یہاں دونوں فریق ایک دوسرے سے جھگڑتے اور لاشیں گھسیٹ کر دریا میں اچھال دیتے، یہ سب علاقہ خشک اور ویران تھا۔

"مگر بابا! قطع کلامی معاف فرمایئے، یہ تمام علاقہ تو بڑا سرسبز شاداب ہے سڑک پر دونوں جانب درخت اور...."

"ہاں بیٹے۔" بوڑھے نے گہرا سانس لیا۔ "یہ سب شیر دل نے لگائے تھے۔"

"اچھا!" حیدر فہری نے متاثر ہو کر کہا۔ "پھر کیا ہوا؟"

"شیر دل اسی راستہ پر رواں تھا، اسے ہوش نہ تھا کہ گھوڑا آہستہ خرامی سے کن راہوں پر جا رہا ہے مگر ایک دم سے قہقہوں کی ملی جلی آوازوں نے اسے چونکا دیا۔ اس نے دیکھا وہ بالکل کسی اجنبی جگہ پہنچ گیا تھا پھر اس نے گھبرا کر ارد گرد دیکھا اور یہ محسوس کر کے اسے پسینہ آگیا کہ اپنی بستی میں مڑنے کے بجائے وہ حرث ضمیلی کی بستی میں داخل ہو گیا ہے سامنے ہی وہ بلند پہاڑی تھی جس کا پچھلا حصہ شہباز کی بستی سے نظر آتا تھا۔ قہقہوں کا مترنم شور شیر دل کو ہوش میں لے آیا اس نے دیکھا اسی چٹان کے دامن میں لڑکیوں کا جھرمٹ ہے جن میں ایک لڑکی کھڑی اسے بغور دیکھ رہی ہے، شوخی سے بھری ہوئی آنکھیں، یاقوتی قندیے موٹے ہونٹ، نکھرا نکھرا چہرہ اور تاریک گھنے جنگلوں کی طرح بکھرے گیسو جن میں دائیں طرف ایک گلاب کا پھول اٹکا ہوا تھا وہ اس پاگل بنا دینے والے وحشی حسن کو دیکھ کر

سندھ کے بعض علاقوں میں ایک عجیب رواج
ہے کہ اگر کسی لڑکی کے لیے مناسب
رشتہ نہ ملے تو اس کی شادی قرآن سے کر دی
جاتی ہے، یہ رسم اس طرح انجام دی جاتی
ہے کہ لڑکی کا باپ یا بھائی یا کوئی اور
بزرگ قرآن لے کر آتا ہے اور لڑکی کو نہلا
دھلا کر اور صاف ستھرے کپڑے پہنا کر
قرآن اس کے ہاتھ میں دے کر
کہتا ہے "تمہاری شادی قرآن سے ہو گئی
ہے۔ اب تم خود اپنی عزت و عصمت کی حفاظت
کرو۔"

سو اس کی وضع قطع سے وہ لڑکی سردار کی دختر معلوم ہوتی تھی، وہ بے تحاشا ہنسا اور اسے تنگ کرنے کا اشارہ کر کے شوخی سے بولی۔

"کوئی پاگل ہے شاید۔"

شیر دل کو محسوس ہوا اس کی آواز بھی اسی کی طرح خوبصورت ہے وہ جلدی سے اسے دیکھ کر مسکرایا اور بولا۔

"پاگل پہلے تو نہ تھا اب ہو گیا ہے بیچارہ۔"

"آہا عاشق مزاج بھی ہیں ذات شریف" کسی لڑکی نے ہانک لگائی باقی کھل کھلا کر ہنسیں اور وہ لڑکی جیسے جھینپ سی گئی چڑ کر بولی۔

"کوئی لٹیرا لگتا ہے جو دن دہاڑے بستی میں آگھسا ہے۔"

اب شیر دل کو احساس ہوا کہ وہ دوسرے کے علاقے میں کھڑا ہے اسے پلٹنا چاہیئے، یہ سوچ کر اس نے اخلاق برتا اور شائستہ انداز میں بولا۔

"معاف کیجئے میں ہی......"

"میں کے گلے پہ چھری" اس لڑکی نے زور سے کہا پھر لڑکیوں نے ٹھٹھا مارا۔ شیر دل بڑا زچ ہوا کہاں آ پھنسا تھا مگر ابھی تک اس کے دل میں کوئی برائی نہ تھی، وہ بھول کر یہاں آیا تھا اس نے سوچا خاموشی سے لوٹ جائے، یہ خیال آتے ہی اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی مگر وہ سب گھوڑے کے سامنے آگئیں اور "پکڑو پکڑو چور" کی آوازوں سے فضا گونج اٹھی سب سے بلند آواز اسی لڑکی کی تھی شیر دل بری طرح گھبرا گیا۔ اگر دشمن کے علاقے میں پکڑا گیا تو باپ کو کیا منہ دکھائے گا لڑکیوں کی بے موقع شوخی اسے پریشان کر رہی تھی۔ مگر ایک دم سے اس نے فیصلہ کیا کہ لڑکیوں کے اس گروہ کو خاص طور سے شوخ لڑکی کو سزا دیئے بغیر نہ جائے گا جو اسے مجبور سمجھ کر تنگ کر رہی تھی پاگل، لیٹرا، چور اور عاشق کے القاب سے نواز رہی تھی۔ ابھی لڑکیاں کچھ اور کرنے پائی تھیں کہ شیر دل کی فطری ذہانت عود کر آئی، اس نے ایک لمحہ میں گھوڑے کو ایڑ لگائی اور لڑکیوں کے گرد دوڑانا شروع کر دیا اب درمیان میں وہ سب چیخ رہی تھیں اور ان کے چاروں طرف گھوڑا چکر لگا رہا تھا۔ ایک دم سے شور بلند ہوا، کوئی لڑکی گر پڑی کوئی کسی دوسری سے چمٹ گئی مگر سردار کی لڑکی کا رنگ غصے سے سرخ ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں کچھ اور نہ آیا تو اس نے جلدی سے اپنے سر کا پھول نوچا اور شیر دل کے منہ پہ دے مارا۔ شیر دل نے زمین پر گرنے سے قبل ہی پھول اچک لیا گھوڑا روکا اس پھول کو لبوں سے لگایا اور شوخ لڑکی کی آنکھوں میں جھانک کر بولا۔

"اب کس کے گلے پہ چھری؟"

"چور کے" لڑکی نے بے ساختہ کہا۔

"کیا واقعی کچھ چوری ہو گیا؟" شیر دل نے دھیرے سے سرگوشی کی لڑکی بری طرح لاجواب ہو کر جھینپ گئی مگر ان نگاہوں کی تاثیر سے شیر دل کا قلب ڈانواں ڈول ہو گیا۔ اس نے جلدی سے گھوڑا موڑا اور پہاڑی کی طرف اشارہ کر کے حکم دینے کے انداز میں لڑکی سے بولا۔

"کل شام اس مقدس چٹان پر۔"

پھر اس نے اپنے علاقے کی طرف مڑتے مڑتے پلٹ کر دیکھا تو وہ تمام شوخی بھول کر کھوئے کھوئے سے انداز میں کھڑی اسے تک رہی تھی۔

دوسرے دن وہ دونوں غروب آفتاب کے بعد اس چٹان پر آگئے، شیر دل کے انداز میں فخر اور لڑکی کے رخ پر حجاب چھایا ہوا تھا۔ روبانہ سردار حرث خلیل کی دختر تھی، اس نے شکوے کے انداز میں شیر دل کو دیکھ کر پوچھا۔

"آپ نے یہاں کیوں بلایا ہے؟"

"تاکہ یہ پاگل، یہ لیٹرا، یہ چور، یہ عاشق آپ کی امانت لوٹا سکے" شیر دل نے برجستہ کہا اور روبانہ بری طرح شرمندہ ہو گئی بولی "کونسی امانت؟"

"یہ دیکھئے" شیر دل نے اس کا مارا ہوا پھول اسے دکھایا

اس نے بات بڑی ہی احتیاط سے کہی تھا پھر ردبانہ جھجکتی، اور شرماتی رہ گئی مگر شیردل نے اپنے ہاتھ سے وہ پھول اس کے بالوں میں لگا دیا اور بولا۔

"ردبانہ پھولوں کے لئے تمہاری زلفوں سے زیادہ خوبصورت جگہ شاید ہی کوئی ہو اور جواب خیال رکھنا میں تمہیں ہر روز اسی حال میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تمہارے سر میں ایک پھول مہکتا رہا ہو۔"

یہ کہہ کر اس نے بڑے ہی پیار سے ردبانہ کے سر کو چوم لیا۔

"کیا پھول بہت پسند ہیں؟" وہ شرم سے گلابی ہو کر بولی۔

"ہاں، بلکہ پھول سے مشابہ ہر چیز۔" شیردل نے اس کے تمتمائے ہوئے عارض کو بغور دیکھتے ہوئے کہا تو وہ سمٹ کر رہ گئی۔

یہ ملاقات محبت کی بنیاد تھی، ہر شام سورج ڈوبنے کے بعد وہ دونوں اپنی اپنی بستی سے اس چٹان پر آجاتے جہاں دونوں کے بزرگوں کی لڑائی میں مورچہ کا کام دیتی تھی۔ شیردل جب بھی وہاں پہنچا، ردبانہ کو پہلے سے اپنا منتظر پاتا اور ہر روز اس کی پسند کے مطابق اس کے دراز گیسوؤں میں گلاب کا تازہ پھول لگا ہوتا۔

ایک ملاقات بڑی عجیب تھی چاندنی کی زد سے بچ کر وہ دونوں ایک محفوظ جگہ بیٹھے تھے اور دونوں کی بستیوں پر ہو کا عالم طاری تھا، ردبانہ خاموش تھی اور شیردل اس کے روشن روشن چہرے کو تکتے ہوئے اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا ہر روز اس کے حکم پر چلا آنا بے پناہ محبت کی غمازی کر رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔

"ردبانہ: تم روز کیوں آتی ہو؟"

"تم بلاتے ہو نا؟" اس نے معصومیت سے جواب دیا تو شیردل کا دل مسرت و خوشی سے بے قابو ہو گیا، اس نے سرگوشی کی۔

"میرا کہا ٹال نہیں سکتیں؟"

"مر کر بھی نہیں۔" ردبانہ نے دھیرے سے کہا اور اپنا سر اس کے شانے پر ٹکا دیا فضا ساکن ہو گئی، چاند نے اپنا چہرہ بادلوں کے دامن میں چھپا لیا، کہیں چاندنی اور کہیں تاریکی کا منظر بڑا حسین تھا۔ بہتے ہوئے دریا کا شور اور موجوں میں تلاطم کی آوازیں سناٹے میں بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ جب دو محبت بھرے دل ایک ساتھ دھڑکتے ہیں تو کوئی چیز پراسرار نہیں لگتی، یہی حال اس وقت شب کا تھا۔ وہ خواہ مخواہ حسین لگ رہی تھی۔ شیردل نے بے قابو ہو کر ردبانہ کو بانہوں میں بھر لیا مگر وہ بجلی کی طرح سسک رہی تھی، وہ چونک گیا۔

"ردبانہ کیوں رو رہی ہو؟" وہ چند منٹ بدستور سسکتی رہی۔ شیردل سر جھکائے اسے محبت سے تکتا رہا، پھر وہ دھیمے سے بولی۔

"شیردل، میں اس محبت کے انجام سے ڈرتی ہوں۔"

شیردل ہنس دیا اور پیار سے بولا۔ "تمہارے خیال میں ہماری محبت کا انجام کیا ہوگا؟"

"دو دشمنوں کی اولادوں کی محبت کا ہوتا ہے۔" ردبانہ نے مایوسی اور دکھ کے انداز میں جواب دیا۔ "ہمارے آباؤ اجداد جو ہمیشہ سے ایک دوسرے کے بدترین دشمن ہیں کیا ہمیں موت کے گھاٹ نہ اتار دیں گے؟"

شیردل چاندنی میں اس کا چہرہ دیکھ کر دھیرے دھیرے مسکرا رہا تھا اس کی بات سن کر بولا۔

"محبت کی راہ میں مر جانا عین سعادت ہے، کیا تم موت سے ڈرتی ہو؟"

"میں موت کی پرواہ نہیں کرتی مگر سوچتی ہوں ہم جدا نہ ہو جائیں۔" یہ کہتے کہتے ردبانہ ایک بار پھر رو دی، شیردل کو محسوس ہوا اس کو دیوانگی کی حد تک چاہنے لگی ہے یہ حالت اس کی اپنی بھی یہی تھی، وہ جانتا تھا کہ اب ردبانہ کی جدائی سخت اذیت ناک ہوگی مگر اس کے احساسات کچھ اور تھے، لہٰذا اس نے کہا۔

"ردبانہ سنو تم نے شیردل سے عہد وفا باندھا ہے جو سمندر کے رخ پھیر دینے اور چٹانوں کو ریزہ ریزہ کر دینے کی قوت رکھتا ہے کیا وہ تمہارے حصول کے لئے نفرت کی ان فضاؤں کو نہیں بدل سکتا؟"

ردبانہ نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھول کر حیرت سے دیکھا اور بولی۔

"تم کیا کرو گے؟"

"بہ مت پوچھو۔" شیردل نے محبت سے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ "بس میری ایک شرط ہے تم اداس نہیں رہو گی اور ہر شام اس چٹان پر ضرور آؤ گی، اگر میں کچھ دن کے لئے وادی سے چلا بھی جاؤں تو تم یہاں آ کر میرا انتظار کرنا میں تمہیں اسی روپ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔"

ردبانہ مسرور ہو گئی اس کی آنکھوں میں فخر تھا، چاہت تھی، پھر وہ ہر شام شیردل کی خواہش پر سنگھار کر کے سر میں پھول لگا کر چٹان

پر آنے لگی ہے۔"

حیدر فہری حیرت سے سن رہا تھا اور بوڑھا اب بے تکان بول رہا تھا اور تیز چلتی ہواؤں کے دوش پہاڑی کی طرف سے کیسی کیسی آوازیں آرہی تھیں، جو کبھی لہروں کے تلاطم میں اور کبھی سرد ہواؤں کے جھکڑوں میں شامل ہو کر اپنی اہمیت کھو دیتی تھیں، شاید بوڑھا اس کہانی میں اس قدر محو تھا کہ اس نے محسوس بھی نہ کیا۔ حیدر فہری نے ادھر سے توجہ ہٹائی اور پھر سننے لگا بوڑھے نے کہا۔

"ایک بار رد باز کا باپ حرث خمیل اپنا مال بیچنے بغرض تجارت شہر کی طرف جا رہا تھا، چند وفادار اس کے ہمراہ تھے، اسی وقت شیر دل شہر کی طرف سے آرہا تھا کہ چند صحرائی لٹیروں نے حرث خمیل کو گھیر لیا، چیخ و پکار کی آوازوں نے شیر دل کو متوجہ کیا اس نے تلوار کھینچی اور ڈاکوؤں کے مقابلے پر آگیا مگر یہ مقابلہ کوئی نہ تھا، ایک طرف تجربہ کار لٹیرے تھے دوسری طرف شہر کے مکتب سے فنون حرب سیکھنے والا شیر دل جو میدان عمل میں نہ آنے کے باوجود بھی باعمل سپاہی تھا، نتیجہ یہ کہ تین زخمی ڈاکو اپنے چار ساتھیوں کی لاشیں چھوڑ کر فرار ہو گئے، حرث خمیل اور اس کے ساتھی اس فرشتہ رحمت کو حیرت سے تک رہے تھے اس قوی ہیکل جوان کی دلیری نے ان سب کو متوجہ کر لیا تھا۔ حرث خمیل نے بڑے اشتیاق سے دیکھا اور پوچھا۔

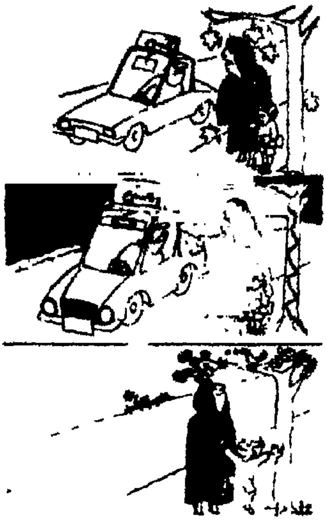
"اے بہادر جوان تو کون ہے؟"

"معزز سردار حرث خمیل! میں شہباز فہری کا بیٹا شیر دل ہوں جو آپ لوگوں کو خطرے میں دیکھ کر ادھر آگیا۔"

شہباز فہری کا نام سن کر حرث خمیل کا چہرہ غیض و غضب سے سرخ ہو گیا، دشمن کا احسان اس کی سب سے بڑی توہین تھی، اس کے ساتھی بھی اس بے عزتی پر پیچ و تاب کھا رہے تھے، چند لمحے یوں ہی گزر گئے، پھر حرث خمیل نے حقارت سے شیر دل کو دیکھا اور بولا۔

"کیا تو نہیں جانتا کہ حرث اور شہباز کے بزرگ صدیوں سے ایک دوسرے کے دشمن ہیں اور ہمارے ہاں نسلیں گزر گئیں ہم نے ایک دوسرے سے دوستی کا سوچا تو نہیں کیا کیونکہ یہ سب سے بڑی تحقیر ہے پھر تو نے مجھ پر یہ احسان کیوں کیا؟"

شیر دل نے بڑے اطمینان سے یہ سب کچھ سنا، بڑے تحمل سے نفرت کے اس انداز کو دیکھا اور بڑی شائستگی سے بولا۔



"محترم سردار! میں یہ تو جانتا ہوں کہ ہمارے آباؤ اجداد صدیوں سے معروف پیکار ہیں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں مگر مجھے یہ علم نہ تھا کہ نیکی اور بھلائی کا تصور بھی آپ لوگوں کے دل سے مٹ چکا ہے کہ آپ اسے اپنی توہین تصور کر رہے ہیں۔ جہاں تک احسان کا خیال ہے تو معاف کیجئے میں نے کوئی احسان نہیں کیا، میں نے صحرائی ڈاکوؤں سے ایک معزز تاجر کے مال کو بچایا ہے، حرث خمیل یا شہباز فہری کے دشمن کا تصور میرے ذہن میں نہ تھا، اس وقت آپ کی جگہ کوئی بھی ہوتا وہ یہی کرتا۔"

حرث خمیل اس لڑکے کی بات پر چونک پڑا جیسے یہ کوئی نئی بات ہے، ابھرتا خیال ہے جو اس نے اس سے قبل کبھی نہیں سنا تھا بولا۔

"شیر دل! تیری تربیت اس وادی سے بہت دور ہوئی ہے تیرے خیالات بھی بستی والوں سے الگ ہیں۔"

پھر خلاف دستور حرث خمیل چند لمحے شیر دل سے باتیں کرتا رہا اس کے بعد مصافحہ کر کے اپنی بستی کی طرف روانہ ہو گیا چند دن

بعد اس نے سنا کہ حرث ضمیل اس تجارت میں بڑا منافع کما کر لوٹا ہے اور اب وہ ڈاکوؤں سے محفوظ رہنے کی خوشی میں اپنی بستی میں جشن منا رہا ہے، اس نے بالکل خلاف توقع اور خلاف دستور شیر دل اور شہباز کو بھی مدعو کیا ہے، اس شب شہباز فہری حیرانی کے انداز میں دیر تک سوچتا رہا پھر شیر دل سے بولا۔

"بیٹے! یہ دشمن نے کوئی نئی چال چلی ہے ہمیں زیر کرنے کے لئے ورنہ صدیوں سے یہ علاقہ جشن مناتا ہے مگر انہوں نے کبھی بھی ہمیں مدعو نہیں کیا، یہ آج کیا بات ہے؟"

"بابا جان!" شیر دل نے کھلے دل سے کہا۔ "ہم اس جشن میں ضرور شرکت کریں گے کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم اپنے اختلافات مٹا دیں۔"

"شیر دل!" شہباز فہری نے جھنجھلاتے ہوئے انداز میں کہا۔ "میں نے تیری تربیت میں سخت غلطی کی۔ کاش میں تجھے شہر نہ بھیجتا بلکہ عام لڑکوں کی طرح بستی میں رکھ کر بس لڑائی کے داؤ پیچ سکھا دیتا تو تو آج اپنی خاندانی روایات سے باغی نہ ہوتا، وہاں کی تعلیم نے تیری سوچیں بدل دی ہیں۔"

یہ سن کر شیر دل کو سخت غصہ آیا، وہ دیر تک اپنے باپ کو سمجھاتا رہا، آخر بڑے رد و کد کے بعد طے ہوا کہ اس جشن میں شیر دل شریک ہو گا اور شہباز فہری بستی کے بہادر سپاہیوں کے ساتھ چٹان کے ادھر چوکس کھڑا رہے گا کہ جونہی حرث ضمیل کی طرف سے کوئی شرارت ہو تو وہ فوری اپنے دلیروں کے ساتھ اس پر ٹوٹ پڑے۔

دوسرے دن شیر دل دھڑکتے دل کے ساتھ اس علاقہ میں داخل ہوا جہاں کچھ عرصہ قبل ربابہ کو پہلی بار دیکھا تھا، ہوا اسے بڑی ہی فرحت بخش معلوم ہو رہی تھی۔ یہ ان دونوں بستیوں کی تاریخ میں پہلا اور حیرت انگیز واقعہ تھا کہ شہباز فہری کا آدمی اس بستی میں مہمان آیا تھا۔ کھانا شروع ہونے سے قبل حرث ضمیل کھڑا ہوا اور اس نے اپنے جوانوں سے شیر دل کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"میرے دلیرو! یہ معزز مہمان جس نے گزشتہ ہفتہ کئی ڈاکوؤں کا تنہا مقابلہ کر کے ہماری جان اور مال کی حفاظت کی تھی یعقوب فہری کا پوتا، شہباز فہری کا بیٹا شیر دل ہے۔"

یہ سن کر مجمع پر چند ساعت کے لئے سناٹا چھا گیا مگر پھر دھیمی دھیمی سرگوشیاں اونچی آوازوں میں تبدیل ہو گئیں۔ لوگوں کے چہرے کے رنگ متغیر تھے وہ کہہ رہے تھے۔

"ہمیں دشمن کا احسان گوارا نہیں۔"

"یہ ہماری توہین ہے۔"

"اسے جشن میں بلایا ہی کیوں ہے؟"

"ہاں اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے احسان سے مرعوب ہو کر دست صلح ہم بڑھا رہے ہیں۔"

اس وقت حرث ضمیل بے بسی کے انداز میں یوں تک رہا تھا، جیسے وہ سردار ہو کر بھی مجبور ہے وہ شاید کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کسی نے اس کی آواز نہ سنی، ہر فرد مخالفت پر آمادہ نظر آ رہا تھا۔ قریب تھا کہ بات بڑھ جاتی مگر ایک دم شیر دل کھڑا ہوا اور اس نے اپنے مخصوص دوستانہ انداز میں کہا۔

"میرے عزیزو! میں آپ کا دیرینہ دشمن پہلی مرتبہ اس بستی میں آیا ہوں اگر آپ کو میری آمد گوارا نہیں تو میں ابھی واپس چلا جاتا ہوں لیکن آپ لوگوں میں بزرگ بھی ہیں اور جوان بھی، میں آپ سب سے صرف ایک سوال کرنا چاہتا ہوں کوئی بھی مجھے اس کا جواب دیدے۔"

اس بات پر ایک دم سکوت چھا گیا نہ جانے شیر دل کا لہجہ ہی اثر رکھتا تھا یا سوال ہی عجیب کہ اس کی مخالفت میں بلند ہونے والی ہر آواز دھیمی ہو گئی لوگ گوش بر آواز تھے اس نے کہا۔

"میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ہمارے بزرگوں میں وجہ مخالفت کیا تھی؟"

یہ سن کر حرث ضمیل کا چہرہ حیرت سے متغیر ہو گیا اور وہاں پر موجود ایک نفس بھی اس کا جواب نہ دے سکا، حرث ضمیل کے علم کے مطابق بہت عرصہ قبل دریا کے ادھر کا یہ وسیع علاقہ ایک شخص برازیل کف کی جاگیر تھا، اس لئے یہ کف کی وادی کہلاتا تھا۔ برازیل کف کے دو بیٹے فہری اور ضمیل اس جاگیر کے وارث تھے مگر ان کی شدید نا اتفاقی کے باعث برازیل کف کو یہ جاگیر تقسیم کر دینی پڑی چنانچہ فہری کے حصے میں قلعہ وسیع سبزہ زار اور رعیت کے کچھ گھر آئے اور ضمیل کے حصے میں چشمہ آب ایک بڑی چراگاہ غلاموں کے کچھ گھرانے اور بنجر زمین کا ایک بڑا ٹکڑا جہاں فوراً ہی اس نے نیا قلعہ تعمیر کر لیا۔ اس کے بعد دونوں بھائی تجارت کر کے گزر کرنے لگے مگر چراگاہ، پانی کا چشمہ اور سبزہ زار وجہ مخاصمت بنے رہے، پھر ان کی اولادیں تلواریں کھینچ کر مد مقابل آ نے لگیں۔ یہ وسیع چٹان ان دونوں کے درمیان ایک آہنی وقت گزرتا رہا۔ یہ لوگ صرف بزرگوں کی مخالفت کے سبب لڑتے ہوئے آخر یہ بھول گئے کہ ان کے جد امجد دو سگے بھائی تھے بس یہ یاد رہ گیا کہ

دوسرے فریق نے ان کے مال پر قبضہ جمایا۔ جہالت کے لئے دو ایک دوسرے سے الجھ کر رہتے رہے اور اپنے ہاتھوں اپنا ہی نقصان کرتے رہے۔ شیردل نے یہ تمام واقعات دوہرائے، ہر فرد حیرت سے سنتا رہا آخر میں اس نے کہا۔

"اس رشتہ سے ہم سب ایک دوسرے کے عم زاد ہیں۔ میں نہیں کہتا کہ آپ مجھے نقصان پہنچائیں بس یہ کہتا ہوں کہ اس وقت سے پہلے کہ ہم دونوں کا کوئی بڑا دشمن ہمیں پست کر دے ہمیں ایک ہو جانا چاہیے اگر ہم اپنے اختلافات مٹا کر ایک دوسرے کا سہارا بن گئے تو وادی الکفہ قائم رہے گی ورنہ کوئی بھی ہاتھ ہم سے یہ ہماری آبائی جاگیر چھین لے گا۔ ہمارے سرداروں کو چاہیے کہ مل کر کام کریں اور آگے بڑھائیں تاکہ ہم ایک قوت بن سکیں۔"

اس وقت حرث ضمیل اور اس کے دلیر سر جھکائے حیرت سے یہ سب سن رہے تھے اور اس شب دونوں بستیوں میں شیردل کی یہ تقریر مشہور ہو گئی تھی۔ فہری اور ضمیل کے واقعات دوہرائے جا رہے تھے اور کچھ لوگ آپس میں کہہ رہے تھے۔

"اگر ہمارے جھگڑوں کا سبب واقعی یہ ہے تو بڑی بے بنیاد بات ہے۔" اور اسی شب شہباز فہری شیردل کو خونخوار نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"کم بخت! صدیاں انتظار کرنے کے بعد اس علاقہ میں حرث ضمیل وہ سردار تھا جو اولاد نرینہ سے محروم تھا ہم آسانی سے اسے موت کے گھاٹ اتار کر اس کی بستی پر قبضہ کر سکتے تھے مگر تو نے بزرگوں کے واقعات عام کر کے میرے مقصد میں رکاوٹ ڈال دی۔"

"نہیں بابا جان۔" شیردل اسے سمجھا رہا تھا۔ "آپ ماضی کو بھول جائیں اور دیکھیں دنیا کہاں جا رہی ہے۔"

مگر شہباز فہری کے ذہن میں یہ نئی منطق نہ آئی، اس وقت اس بستی کے لوگ بھی شیردل سے متفق نہ تھے لیکن پے در پے چند واقعات رونما ہوئے جنہوں نے ان کے خیالات میں تبدیلی پیدا کر دی۔ شہباز فہری کا ایک دیرینہ ساتھی سلطان فہری مصروف سفر تھا کہ ایک دم خیلوں کی لڑائی نے اسے چونکا دیا اس نے پلٹ کر دیکھا تو زنانہ سواری اور مال پر حملہ ہو چکا تھا۔ حملہ آور آٹھ نو تھے، سلطان فہری تنہا مقابلہ نہ کر سکا، بہت سا مال اور اس کی بہن آنکھوں کے سامنے اڑا لی گئی اور جب وہ روتا ہوا سردار کی خدمت میں پہنچا تو سردار نے دلیروں کو تیار ہو کر لٹیروں کے تعاقب کا حکم دیا گھر ان کے واپس ہونے سے پہلے شہباز فہری کے غلام نے آ کر کہا "سردار بستی سے باہر حرث ضمیل تجھے بلا رہا ہے۔"

شہباز فہری اپنے بہادروں کے ساتھ باہر نکلا تو حرث ضمیل سلطان فہری کے مال اور بہن کے ساتھ چند لٹیروں کو گرفتار کئے اس کا منتظر تھا۔ لاشعوری طور پر احسان مندی اور ممنونیت کے جذبات ان کے دلوں میں پیدا ہوئے مگر یہ ان کی آن کے خلاف تھا لہٰذا شہباز فہری نے کہا "حرث ضمیل! میں دیکھ رہا ہوں کہ اب تو نے دشمنی کے انداز بدل دیئے ہیں تو ہمیں احسان کر کے زیر کرنا چاہتا ہے تو نے سلطان فہری کی بہن اور اس کے مال کی حفاظت کیوں کی؟"

"شہباز فہری!" حرث ضمیل نے تحمل سے جواب دیا "تیرے بیٹے نے اس وادی میں نیکی کا جو بیج بویا ہے وہ کبھی نہ کبھی تناور درخت بنے گا، میں نے تیری بستی کے مقابلہ میں آنے والے لٹیروں سے جھگڑ کر شیردل کا احسان چکایا ہے، تیرا اب بھی دشمن ہوں۔"

"لیکن مت بھول اس بستی کا سردار میں ہوں شیردل نہیں اور سلطان فہری میرا آدمی ہے۔" شہباز فہری نے کڑک کر کہا۔

"ٹھیک ہے۔" حرث ضمیل نے گھورتے ہوئے انداز میں کہا، "تو بھی مت بھول کہ سلطان فہری کی بہن اس وادی کی عورت ہے جو کبھی میرے اور تیرے جد امجد کی جاگیر تھی، اس عورت کی حفاظت سے تو مجھے نہیں روک سکتا۔"

کیسی عجیب دشمنی تھی، کیسی عجیب لڑائی تھی، اس رات شہباز فہری لمبے لمبے سانس لیتا ہوا دیر تک جاگتا اور نجانے کیا کیا سوچتا رہا۔ مگر اب یہاں کے باشندے نیکی کی راہ پر گامزن ہو چکے تھے۔ اب شہباز فہری ہزار نفرت پیدا کرتا یا حرث ضمیل انہیں مخالفت پر آمادہ کرتا مگر شیردل نے انہیں جو راہ دکھائی تھی وہ اسے ترک نہ کر سکتے تھے کہ چند دن کے بعد سلطان فہری نے اس احسان کے بدلے میں حرث ضمیل کے ایک مہمان کو دریا میں ڈوبنے سے بچایا۔ حرث کے ایک پرانے ملازم نے شہباز فہری کے گمشدہ گھوڑے کی نشاندہی کی یوں وقت گزرتا رہا اور وہ لوگ اپنی پرانی روایات ترک کر ایک دوسرے کے قریب آتے گئے۔ اب وہ سفر کے دوران ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کے بجائے اچھے ہم سفر ثابت ہوتے، بوقت ضرورت ایک دوسرے کی مدد کرتے اور ان کی زبانوں پر شیردل کا ذکر

رہتا جس کی بدولت صدیوں کی نفرت کی دیواریں ٹوٹ گئی تھیں اور ایسے میں شیر دل ہر شام کو اس چٹان پر رعبانہ کا دیدار کرتا گھنٹوں اسے باتوں میں سنتے اس کے کانوں میں محبت کے گیت الاپتا رہتا۔ وہ کہتا "رعبانہ! دیکھا شیر دل نے کس طرح ان نفرتوں کو ان فاصلوں کو ختم کر دیا۔"

وہ اسے فخر سے دیکھتی تب وہ پھر کہتا۔

"سنو، میں ان بستیوں کو تخت گلزار بناؤں گا۔ یہاں کی بنجر زمین میں درخت اگاؤں گا اور اس دریا پر ایک پل تعمیر کروں گا جو یہاں کے باشندوں کے لئے اس سفر کو آسان اور فاصلے کم کر دیگا پھر میں حرث جمیل کے آگے دست سوال پھیلا کر کہوں گا۔

"حرث جمیل میں نے صرف رعبانہ کے لئے یہ سب کچھ کیا ہے، میں نے مخالفتوں کے طوفانوں کا رخ موڑ دیا ہے میں نے دشمنی کو دوستی میں بدل دیا ہے اور جہنم زار کو گلزار بنا دیا ہے اب میری جھولی بھر دے تو یہ سن کر رعبانہ شرما کر اپنا منہ اس کے سینہ میں چھپا لیتی۔"

یہ کہہ کر بوڑھا سانس لینے کے لئے رک گیا۔ حیدر فہری جو بڑے تحیر سے اس داستان کو سن رہا تھا آتش دان میں ایندھن ڈالنے لگا کیونکہ کمرہ ایک بہت جلدی سرد ہو جاتا تھا، باہر یخ بستہ ہوائیں چل رہی تھیں، ہر طرف سکوت چھایا ہوا تھا اب نہ کوئی آواز تھی نہ شور مگر بوڑھے نے جانے کیا محسوس کیا کہ وہ ایک دم کھڑا ہو گیا اور دروازے میں کھڑے ہو کر باہر کچھ دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ حیدر فہری نے محسوس کیا کہ اس کے انداز میں بیقراری ہے۔ بوڑھا کئی منٹ تک کھڑا ہوا دریا کے پرے دیکھتا رہا مگر اسے کچھ نظر آیا تو واپس پلٹا اور بولا۔

"یہ رات غیر معمولی نہیں ہے کیا، سنو ہوائیں کیا کہہ رہی ہیں دریا کی بے تاب موجیں خبر دیتی ہیں کہ کچھ ہونے والا ہے۔"

یہ سن کر حیدر فہری چونک گیا وہ خود بھی تو یہی محسوس کر رہا تھا مگر اس نے بات بدلی اور پوچھا۔

"معزز بزرگ، کیا آپ سردی محسوس کر رہے ہیں؟"

"نہیں بیٹے، بوڑھا پلٹ آیا اور اپنی جگہ بیٹھتے ہوئے بولا اب کسی چیز کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، اس عمر کو پہنچتے پہنچتے انسان کی ہر خواہش دم توڑ دیتی ہے۔" یہ کہہ کر وہ پھر باہر کی طرف دیکھنے لگا پھر جیسے خود سے کہہ رہا ہو۔

"شب نصف کے قریب گزر چکی ہے شاید۔"

"ہاں حیدر فہری سے کہا اب صرف چند گھنٹے باقی ہیں اور کہانی بھی تو تمام ہونے والی ہے؟"

"ہاں..... ہاں..... ہاں شاید۔" بوڑھے نے قدرے گھبرا کر کہا۔ "واقعی ختم ہونے والی ہے۔" چند لمحے توقف کر کے اس نے شروع کیا۔

"وقت گزرتا رہا شیر دل دونوں بستیوں کے لوگوں کو اپنے طرز عمل سے ایک دوسرے کے قریب کرتا رہا اور ہر شام چٹان پر رعبانہ سے ملتا رہا مگر ایک دن وہ اس ملاقات کا چکر لگا کر لوٹا تو حرث جمیل کی بستی میں گھما گہمی دیکھ کر چونک گیا سلطان فہری بولا۔

"جناب حرث جمیل کا بھتیجہ مہمان آیا ہوا ہے اور اسی شام دریا کے کنارے جب دونوں بستیوں کے جوان جمع تھے تو حرث جمیل اس کے قریب آیا اس کے ساتھ ایک نوجوان بھی تھا۔ خوبصورت کشیدہ قامت، بھرے بھرے بدن کا چست و چالاک انسان جس کا رنگ صاف اور بال بھورے تھے، حرث جمیل نے کہا۔

"شیر دل، یہ میرا بھتیجہ جمالی ہے جو تمہارے قصے سن سن کر تم سے ملنے کا متمنی ہے۔"

شیر دل نے جمالی کی طرف دیکھا نجانے کیوں اس کا دل بڑے زور سے دھڑکا یہ شائستہ نوجوان ہر فرد کو متوجہ کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس نے نہ چاہنے کے باوجود بھی معانقہ کے لئے ہاتھ بڑھایا تو جمالی بڑے جوش سے بولا۔

"شیر دل، میں آپ ہیں اس عظیم اقدام پر مبارکباد دیتا ہوں کہ تم نے صدیوں کی دشمنی کو اتنی جلد دوستی میں بدل دیا۔"

"مجھے خوشی ہے معزز جمالی" شیر دل نے بھی اخلاق برتا "تم نے میرے اس اقدام کو سراہا، میں تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں۔"

"میں خود بھی منافرت کا قائل نہیں ہوں ہمیں مل جل کر محبت و ہمدردی کے ساتھ کام کرنا چاہیئے۔" جمالی نے کہا۔

حرث جمیل نے ان دونوں کو دیکھا اور بولا۔

"تم دونوں کے خیالات بہت ملتے ہیں۔ تمہاری پرورش نفرت کی اس فضا سے بہت دور ہوئی ہے۔"

لیکن اس وقت بظاہر اس سلجھے ہوئے خوبصورت جوان میں شیر دل کو اپنا رقیب چھپا ہوا نظر آ رہا تھا اور اپنے ان ہی جذبات سے خائف ہو کر عمر میں پہلی بار اس نے شہباز فہری سے اپنی اس خواہش کا ذکر کر دیا جسے سن کر وہ بہت خوش ہوا اور بولا۔

"شیرول اس طرح سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے گی۔ دولت حاصل کرنے کا یہ بہترین طریقہ ہے مگر کیا حرمت خلیل اس رشتہ کو قبول کرے گا۔ میں نے سنا ہے اس نے اپنے بھتیجے کو اسی لئے بلایا ہے۔"

شیرول کے کان سائیں سائیں کرنے لگے اسے محسوس ہوا تھا کہ روبانہ اس کی زندگی ہے۔ اس کی رگوں میں گردش کرنے والے اس خون کی مانند ہے جو اگر نہ ہو تو موت واقع ہو جائے۔ اس شب وہ سو نہ سکا۔ جمالی میں کوئی کمی نہ تھی وہ حرمت خلیل کا خون تھا۔ اس بستی کا جائز وارث تھا۔ یہ خیالات اسے مضطرب کرتے رہے، وہ بار بار خود کو روبانہ کی محبت کا یقین دلاتا رہا مگر ایک عجیب سی بے چینی، ایک تصور اسے بدگمان کر رہا تھا۔

جمالی روبانہ کی حویلی میں قیام پذیر ہے، کیا یہ مسلسل ساتھ اور روبانہ کا بے پناہ حسن اسے متاثر نہ کرے گا؟

پھر چشم تصور اسے وہ مناظر دکھاتی کہ تڑپ تڑپ جاتا۔ اس طرح رات گزری۔ دن شروع ہوا۔ وہ بے دلی سے ہر کام میں مصروف رہا مگر محسوس ہوتا جیسے وہ یہ سب کچھ کر رہا ہے وہ اس سے بچھڑ گئی ہے۔ اس حالت میں جب شام ڈھلنے لگی ... انتظار ... وقت ... پر چڑھ گیا ... آنکھیں ... ایک چہرے ... سے ہی اس کی ... سب کچھ بھول گیا۔ روبانہ اس کی تھی یہ تصور بڑا حسین تھا ... باتیں کرتے رہے مگر ... شیرول کے قلب ... سب روبانہ سے کہہ دیا ... ایک رات اس کے لئے ... اذیت تھا۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں روبانہ، اگر جمالی نے اپنا حسن چھپا دیا تو حرمت خلیل اس کی جھولی بھرنے میں تکلف نہ کرے گا۔"

یہ سن کر روبانہ کھلکھلا کر ہنس دی اس کی آنکھوں میں جگنو سے چمک رہے تھے چہرے پر ... تھا ... چاندنی میں ... حسین لگ رہی تھی مگر آج شیرول کو اس کا حسن ... نہ تھا۔ اس نے دیوانگی کے عالم میں اس کے شانے پکڑ لئے اور بولا۔

"روبانہ مجھے بتاؤ میں کیا کروں اس خیال نے میرا سکون چھین لیا ہے۔"

اس حد... ردا شیردل سے ردابانہ محبت سے بولی، "تم جو کچھ کہہ چکے ہو اس سے اب بہت کم باقی ہے کہنے کے لئے، جہاں تک میرا سوال ہے، بتاؤں، ردابانہ زندگی کے آخری سانس تک تمہاری ہے شاید تم اسے بھول جاؤ مگر وہ تمہیں کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔"

یہ سن کر شیردل کو سکون سا ملا، ایک بار پھر عہد وفا باندھا گیا، پھر محبت کے گیت گائے گئے اور پھر پیار بھری سرگوشیاں ہوئیں۔

دوسرے دن شہباز فہری سے اجازت لے کر شیردل نے بستی سے باہر کھڑے ہو کر دونوں طرف کے جوانوں کو بلا کر کہا۔

"میرے دوستو! اگر ہم اس دریا پر مل جل کر ایک پل تعمیر کر دیں تو نہ صرف یہ کہ ہمارا سفر نصف رہ جائے گا مسافروں اور تاجروں کو مال و اسباب کے ساتھ مسافت کم طے کرنی پڑے گی بلکہ ہم صحرائی ڈاکوؤں سے بھی محفوظ ہو جائیں گے نیز جانی اور مالی نقصان جو دریا عبور کرتے ہوئے ہم آئے دن اٹھاتے ہیں، کسی دن ہماری کمر توڑ دے گا، تم میں سے جو جو میرا ساتھ دینا چاہے آ جائے۔"

یہ سن کر سب سے پہلے جمالی کھڑا ہوا اور بولا۔

"شیردل میں تمہاری تائید کرتا ہوں بلکہ اس عظیم خیال کی تعریف کرتا ہوں، قدرت نے صدیوں کے بعد اس وادی کو ایک اچھا سردار عطا کیا ہے اور ہم سب کی طرف سے میں اعلان کرتا ہوں کہ اس بستی کا بچہ بچہ اس کام میں تمہاری مدد کرے گا۔"

تھوڑی دیر کے لئے شیردل کے قلب سے بدگمانی شک اور رقابت کے بادل چھٹ گئے اس نے بے اختیارانہ محسوس کیا کہ جمالی ایک اچھا انسان ہے اور اس میں خود ایک بہترین سردار کی ہر صفت موجود ہے اس نے تہہ دل سے اس کا شکریہ ادا کیا اور اسی دن اس مبارک کام کا آغاز کر دیا۔ دن گزرتے گئے، کام تکمیل پاتا رہا اور دونوں علاقوں میں شیردل کی عظمت بڑھتی گئی دونوں بستیوں کی دوستی مستحکم ہوتی رہی اور شیردل سب سے نظریں بچا کر بلا ناغہ چٹان پہ آتا رہا، ردابانہ اور وہ ایک دوسرے کو اپنی بے پناہ چاہت کا یقین دلاتے رہے۔

وقت گزرتا ہے تو گزرتا ہی چلا جاتا ہے، مہینوں بیت گئے یہاں تک کہ وہ عظیم پل بن کر تیار ہو گیا۔ اس شام شہباز فہری حرث جیلی اور دونوں بستیوں کے جوان اور لڑکیاں شیردل کے اس عظیم کارنامے کو دیکھنے دریا پر آئے، یہ ان دونوں کے اتحاد کی پہلی نشانی تھی۔ سورج غروب ہو رہا تھا، اس کی سرخی کائنات کو حسن بخش رہی تھی۔ ردابانہ آتشیں لباس میں وہ ایک شعلہ نظر آ رہی تھی۔ سنہرے بالوں کی دو چوٹیاں بے خیالی میں سینہ پہ آ گئی تھیں اور چہرہ آفتاب کی طلائی کرنوں سے کچھ زیادہ ہی روشن ہو رہا تھا وہ محبت کے عالم میں اس پل کا سہارا لے کر کھڑی تھی بڑی معصوم لگ رہی تھی، جیسے یہ پل ایک فراز تھا خود ردا تھا چاہت تھی، شیردل کو محسوس ہوا کہ مہینوں کی شدید محنت کی قیمت اس ایک لمحے میں وصول ہو گئی۔ اس نے بڑی محبت سے ردابانہ کو دیکھا! مگر اس کے ساتھ ہی اس کی نظر جمالی پر پڑی جو قدرے فاصلے پہ کھڑا ہوا ردابانہ کو یک ٹک دیکھ رہا تھا اور ان آنکھوں میں برسوں سے کھلی ہوئی ایک چاہت تھی، والہانہ پن تھا، دیوانگی تھی، وہ کیسے جذبات تھے، جمالی آنکھوں کی زبان سے کیا کہہ رہا تھا، شیردل کی بصارت جیسے سماعت بن گئی اسے محسوس ہوا جمالی کہہ رہا ہے۔

"ردابانہ جمالی تجھ سے محبت کرتا ہے!"

شیردل کو محسوس ہوا اس کا دل سینہ توڑ کر باہر آنے کے لئے تڑپ گیا ہے، اس نے اپنے سینہ پہ ہاتھ رکھا اور نجانے کیوں پھر جمالی کی طرف دیکھنے کی جرأت نہ کر سکا۔ شاید یہ سب کچھ دیکھنے کی اس میں تاب نہ تھی مگر کوئی اندر ہی اندر اس سے کہہ رہا تھا

"شیردل، تیری بدگمانی غلط نہیں، تیرا شک جھوٹ نہیں، جمالی ردابانہ کا اتنا ہی طالب ہے جتنا کہ تو۔"

پھر نجانے کتنا وقت گزر گیا شہباز فہری اور حرث جیلی نے پل کی تعریف میں کیا کیا تقریریں کیں مگر اسے ہوش نہ تھا لوگ واپس جانے شروع ہو گئے، تاریکی پھیلنے لگی تب ایک دم ہی جمالی کی آواز نے اسے چونکا دیا وہ ردابانہ سے کہہ رہا تھا۔

"آؤ ردابانہ، اندھیرا چھا گیا اب واپس چلیں۔"

ردابانہ نے چوری چوری شیردل کو دیکھا آنکھوں ہی آنکھوں میں خدا حافظ کہا اور لوٹ گئی مگر شیردل نے یہ شب اسی پل پر گزار دی کبھی اس کا دل چاہتا کہ خود کو لہروں کے حوالے کر دے، کبھی سوچتا اس وادی کو خیر باد کہہ دے اور دور بہت دور چلا جائے، مگر وہ کچھ بھی نہ کر سکا، صبح ہوئی اور اسی اضطراب میں یہ دن بھی گزر گیا۔ شام آئی ردابانہ اسی انداز میں اسی مسرت کے ساتھ چٹان پہ آئی، شیردل کے بے چین دل کو جیسے قرار آ گیا، ردابانہ اسی کے لئے تو ہر روز جان پہ کھیل کر یہاں آتی تھی مگر جمالی کا تصور اسے بے چین کر رہا تھا دن بھر کی ذہنی تھکن اور اذیت ناک خیال سے اس کا جنون عروج پہ تھا اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"روبانہ، میں جمالی کے ساتھ تمہاری بے تکلفی برداشت
نہیں کر سکتا۔"

روبانہ نے لمحہ بھر کے لئے اسے حیرت سے دیکھا پھر یہ حیرت
مسرت میں بدل گئی وہ مسکرا کر بولی۔

"شیر دل بدگمانی دلوں کو اجاڑ دیتی ہے، سنو محبت وہ
جذبہ ہے جو فاصلوں کو مٹا دیتا ہے اور شک ان کے درمیان
وہ ناقابل عبور دیواریں حائل کرتا ہے جسے انسان کبھی نہیں
پلٹ سکتا اور تم اس کا شکار ہو گئے ہو۔"

"یہ شک نہیں حقیقت ہے۔" شیر دل ضد پر آ گیا۔ "بتاؤ کیا
وہ تم سے محبت نہیں کرتا؟"

"میں نہیں جانتی۔" روبانہ نے ناراض ہونے کے انداز
میں رخ موڑ لیا۔ ہمیشہ جب کبھی وہ یوں اظہار خفگی کرتی شیر دل
اسے منا لیتا تھا مگر اس وقت اس کی اپنی حالت بھی عجیب تھی
اس نے خود جمالی کی آنکھوں میں عشق کا ابھرتا ہوا دیکھا تھا لیکن
روبانہ اسے پھر بھی بدگمان اور شکی کا خطاب دے رہی تھی یہ اس
کی صادق محبت پہ الزام تھا اس نے کہا۔

"میری آنکھیں دھوکہ نہیں کھا سکتیں سن لو جمالی تمہیں
اپنی محبت کے جال میں پھنسا کر حاصل کرنا چاہتا ہے۔"

"مگر میں تو اسے نہیں چاہتی۔" روبانہ مشتعل ہو کر بولی "میں
تو بارہا کہہ چکی ہوں کہ آخری سانس تک تمہاری ہوں اور عورت
صرف ایک بار عہد وفا باندھتی ہے۔"

شیر دل لاجواب سا ہو گیا کیسی بے معنی سی بے ڈھنگی باتیں
ہوئی تھیں ان کے درمیان۔ روبانہ کا چہرہ غم و غصے سے تمتما رہا تھا
آنکھوں میں ستارے لرز رہے تھے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے وہ
اشکوں سے بھری آواز میں بولی۔

"شیر دل تم سمندروں کے رخ موڑ سکتے ہو، چٹانوں کو
ریزہ ریزہ کر سکتے ہو اس وادی کی فضا کو بدل سکتے ہو مگر میں جانتی
ہوں اپنے شک پر قابو نہیں پا سکتے کیونکہ تم ایک مرد ہو، مرد جو شکی
ہوتے ہیں، ان کی محبت پانی کے بلبلے کی مانند ہوتی ہے، بدگمانی
آئی اور محبت ختم ہو گئی لیکن یہ نہیں جانتے کہ یہ چیز عورت کی زندگی
میں زہر بھر دیتی ہے۔"

"میں نے تمہیں تو کچھ نہیں کہا روبانہ۔" شیر دل نے خفیف سا
ہو کر کہا۔ "لیکن میں اپنی محبت پہ ڈاکہ برداشت نہیں کروں گا۔"

"تمہاری محبت کو تم سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ ہاں اگر تمہارے
یہ بے بنیاد خیالات تمہیں بدل دیں گے اور تم بدل گئے تو جانتے
ہو کیا ہو گا؟"

"کیا ہو گا؟" شیر دل نے پوچھا۔

"شیر دل۔" روبانہ نے کہا۔ "بدگمانی کبھی کبھی طویل
رشتے کو لمحہ بھر میں کاٹ دیتی ہے اور انسان ایک لمحے میں اس مقام
پر پہنچ جاتا ہے جہاں سے واپسی کبھی ممکن نہیں ہوتی۔ تم بدل رہے ہو
میں دیکھ رہی ہوں کہ جب سے جمالی بستی میں آیا ہے تم بدل گئے ہو۔"

شیر دل کو یہ الفاظ سخت گراں گزرے۔ اس نے کہا۔

"روبانہ، میں بدگمان ہو جانے والے مردوں میں سے نہیں
ہوں لیکن مجھے لگتا ہے کہ جمالی کے آنے سے فضا بدل گئی ہے۔"

روبانہ چونک پڑی، بات کی گہرائی تک پہنچی کہ اس کا چہرہ
رنج والم سے سرخ ہو گیا۔ اس نے روٹھنے کے انداز میں کہا۔

"شیر دل، خواہ مخواہ برے خیالات کو دل میں مت لاؤ اگر
تمہارا دل میری طرف سے صاف نہیں تو مجھے موت کے گھاٹ اتار دو
یا ابھی میرا گلا گھونٹ دو، تمہارے بدل جانے کے بعد میں اس زندگی
پر موت کو ترجیح دوں گی۔" یہ کہتے کہتے اس نے شیر دل کے ہاتھ اپنی
گردن پہ رکھ لئے اور شیر دل بھی ایک لمحہ کے لئے سب کچھ بھول گیا۔
اس نے اپنے ہاتھ اس کی گردن سے ہٹا کر پیار سے شانوں پہ تھپک
دیئے اور بولا۔

"یقین کرو روبانہ مجھے تم پر اعتماد ہے بلکہ میں تمہاری محبت
کے سہارے زندہ ہوں اور جس دن میں نے تمہارے انداز میں تبدیلی
یا جمالی کے لئے التفات دیکھ لیا تمہارا نہیں اپنی محبت کا گلا گھونٹ
دوں گا، تمہیں جمالی کے لئے چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے وادی سے
چلا جاؤں گا، اتنی دور جہاں سے نہ واپس آ سکوں نہ میری شکل تمہیں
نظر آئے۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ جدائی میرے لئے ناقابل برداشت ہو گی
مگر تمہاری آنکھوں میں اس کے لئے پسندیدہ جذبات دیکھ کر میں
خود تمہاری راہ سے ہٹ جاؤں گا خواہ مجھے خود کو فنا کرنا پڑے۔"

"شیر دل۔" روبانہ رو پڑی۔ "ایسا خیال بھی مت کرنا تم نہیں
سمجھ سکتے تمہیں ناراض کر کے یا تم سے جدا ہو کر یہ زندگی کیسی ہو گی۔"
یہ پہلی جھڑپ تھی جو ان دونوں کے درمیان ہوئی گزرتے
روٹھتے وہ دونوں پھر من گئے۔ اظہار محبت پھر ہوا اور دیر تک ہنستے
کھلکھلاتے رہے۔

دوسرے دن شیر دل نے بڑے مسرورانہ انداز میں وادی سے ملحقہ پہاڑ کی کھوہ میں پر درخت لگانے کا کام شروع کیا۔ وہ دن بھر محنت کرتا رہا اور جمالی ہنستا رہا۔

"شیر دل، تم نے تو اس وادی کو تخت گلزار بنانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔"

"ہاں، شیر دل نے بھی ہنس کر کہا" میں چاہتا ہوں لوگ میرے بعد بھی مجھے یاد رکھیں۔"

کئی دن اس مقدس کام میں صرف ہوگئے۔ دن بھر وہ مصروف رہتا اور رات کو ردبانہ کی صحبت اس کی سب تھکن دور کردیتی۔ اس دوران شیر دل نے بار بار محسوس کیا کہ جب بھی ردبانہ آتی ہے تو جمالی کی حالت دگرگوں ہوجاتی ہے اس کی آنکھیں محبت کی داستان سناتی ہیں مگر ردبانہ کا رویہ ایک دم محتاط ہوگیا تھا۔ اب اس کی بے تکلفی کے انداز ختم کردیئے گئے جب وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ چھوٹے چھوٹے پودے دیکھتی یا کبھی شیر دل سے بات کرتی تو جمالی زیادہ سے زیادہ مصروف ہوجاتا یا وہاں سے ہٹ کر دریا کے کنارے کنارے ٹہلنے لگتا اور جب وہ واپس لوٹ جاتی تو لاشعوری طور پر اسے تکنے لگتا۔ شیر دل پر اگرچہ اس شب کی باتوں کا اثر موجود تھا مگر شب کی تنہائی میں وہ اس تصور کو ذہن سے نہ جھٹک سکا کبھی وہ سوچتا کہ جمالی اور ردبانہ ایک ہی حویلی میں رہتے ہیں۔ آخر ردبانہ پر کب تک اس کی آنکھوں میں مچلتے جذبات کا اثر نہ ہوگا۔ آخر اس نے شہباز فہری سے درخواست کی کہ وہ باقاعدہ حرث ضنیلی سے اس کا رشتہ طلب کرے۔ بستی کا دستور تھا کہ لڑکے کا باپ لڑکی کے باپ کو قیمتی تحائف بھجواتا تھا اگر وہ انہیں قبول کرلیتا تو رشتہ منظور تصور کیا جاتا جس دن شہباز فہری نے سلطان فہری کے ہاتھ قیمتی پارچہ جات اور جواہرات حرث ضنیلی کو بھجوائے وہ دن شیر دل کے لئے بڑا صبر آزما تھا وہ یقین کئے بیٹھا تھا کہ حرث وہ تحائف قبول کرے گا اور دوسرے دن اس کا آدمی ایسے ہی تحائف لے کر اس بستی میں آئے گا مگر چند گھنٹوں بعد ہی سلطان فہری وہ پارچہ جات اور جواہرات لے کر لوٹ آیا حرث ضنیلی نے کہہ دیا تھا کہ اسے یہ رشتہ منظور نہیں۔ چشم زدن میں یہ خبر بستی میں مشہور ہوگئی شہباز فہری کی نفرت عود کر آئی۔ حرث ضنیلی نے اس کے قابل فخر بیٹے کو ٹھکرا دیا تھا مگر اس بیٹے کی حالت اس وقت کیا تھی یہ کوئی نہ جان سکا ایک طرف یہ کھلا انکار دوسری طرف ردبانہ کی محبت کا یقین اسے بیاد کر رہا تھا وہ اس رات وہ چٹان پر بیٹھا اس کا انتظار کرتا رہا مگر آج وہ نہ آئی، شام ڈھلی رات آئی پھر رات بھی ڈھلنے لگی۔ شیر دل کے سینہ میں ایک درد ابھر رہا تھا۔ یہ پہلا اتفاق تھا کہ وہ انتظار کرتا رہا مگر ردبانہ نہ آئی۔ دوسرا دن بڑی بے چینی سے گزرا مختلف خیالات اسے تنگ کرتے رہے کبھی وہ سوچتا کہ جب دونوں بستیوں میں رنجش ہوتی تھی تو دونوں کے محافظ شب بھر جاگتے تھے شاید ردبانہ اس لئے نہ آئی ہو کبھی سوچتا شاید اس پر پابندی نہ لگا دی گئی ہو۔

دوسری رات بھی مایوسی لائی، وہ چٹان پر کئی گھنٹے مضطرب سے انداز میں بیٹھا رہا مگر ردبانہ آج بھی نہ آئی، نجانے کیوں آج کوئی دل میں چٹکیاں لے رہا تھا۔ "شیر دل جمالی جیت جائے گا۔" یہ خیال اسے دیوانہ کردیتا مگر وہ پھر خود پر قابو پاکر ردبانہ سے ملنے کے بارے میں سوچنے لگتا۔ شب آتی گزر جاتی مگر ردبانہ نہ آتی کئی دن اسی ناکامی کی نذر ہوگئے۔ وہ سورج ڈوبنے کے بعد چٹان پر چڑھتا اور صبح کے جھٹپٹے میں نیچے اترآتا پھر آخر اس نے ردبانہ سے ملنے کی ہر تدبیر آزمالی، آخر کئی دن کوشش کے بعد اسے خبر ملی کہ حرث ضنیلی کو ان کی ملاقاتوں کا علم ہوگیا ہے اور اب ردبانہ حویلی میں مقید اپنی ناکامی پر اشکبار ہے۔ اس دن شیر دل کو وہ تمام ملاقاتیں، ردبانہ کا گریہ اور اظہار محبت سب کچھ یاد آیا جس کے جواب میں اس نے کہا تھا۔

"ردبانہ، شیر دل سمندروں کے رخ موڑ دینے کی قوت رکھتا ہے کیا وہ تمہارے حصول کے لئے نفرت کی اس فضا کو نہیں بدل سکتا؟"

اس خیال کے ساتھ ہی اس کی مٹھیاں بھینچ گئیں آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے پھر اس نے جیسے ہواؤں کے دوش پر اسے پیغام بھیجا۔

"ردبانہ، گھبراؤ نہیں۔ آج شب شیر دل جان پر کھیل کر تمہارے پاس پہنچ جائے گا۔" اور اس رات کو سرشام ہی چٹان پر جاکر وقت کا انتظار کرنے لگا۔ آہستہ آہستہ وادی پر سکوت چھاتا رہا، تاریکی پھیلتی رہی یہاں تک کہ سیاہی کے دبیز پردے نے کائنات کو چھپا لیا۔ اس وقت شیر دل ہر خطرے کو بھول کر دشمنی کو فراموش کرکے اس چٹان سے پرے حرث ضنیلی کی بستی میں اترنے لگا۔ بڑی جدوجہد کے بعد وہ اس طرف اترا جہاں پہلی مرتبہ اس نے ردبانہ کو دیکھا تھا۔ جہاں اس کی محبت نے جنم لیا تھا۔ یہ وقت بڑا عجیب تھا شیر دل

ت کہ یاد آرہا تھا مگر وہ نظر بچا کر آہستہ سے ہو کر حویلی کی طرف
ی سے رسائی تھا اس راہ میں وہ چشمہ تب بھی آیا جس پہ
دلوں بستیاں لڑتی تھیں، وہ سبزہ زار بھی آیا جس پر یہاں کے
شہ ایک دوسرے کا خون بہاتے تھے وہ سب سے گزرتا ہوا
اس حویلی کے عقب میں آگیا جو حرث خلیل کی ریاست کی سب سے
بڑی بلند عمارت تھی یہاں بکھڑ درخت کے سائے میں رک کر وہ
آواز سننے کی کوشش کرنے لگا مگر کوئی صدا نہ تھی۔ چند لمحے یہاں
گزار کر وہ پھر دبے قدموں سے آگے بڑھا نجانے کیوں حویلی کا بیرونی
دروازہ آج ابھی بند نہ ہوا تھا۔ اس نے سوچا شاید روبانہ چٹان پہ
آنا چاہتی ہو مگر یہ خیال اس کے قدم نہ روک سکا وہ آہستہ سے اندر
داخل ہوگیا طویل و عریض صحن سے گزر کر وہ برآمدے تھا جس میں
اس بڑے ہال کی بے شمار کھڑکیاں کھلتی تھیں جہاں شیر دل پہلی بار
جشن کے سلسلے میں آیا تھا اور دائیں جانب وہ وسیع سیڑھیوں والا
زینہ تھا جس سے گزر کر بالائی منزل میں روبانہ کی خوابگاہ تھی۔ یہ سب
اسے روبانہ نے بتایا تھا۔ اس وقت اس کے قدم ادھر ہی اٹھ رہے
تھے رات اندھیری تھی بستی کا بچہ بچہ خواب غفلت کے مزے لوٹ رہا
تھا اور شیر دل روبانہ کے عشق میں دیوانہ وار آگے بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ جلد سے
جلد اس سے مل کر نئی صورت حال سے آگاہ کر کے آئندہ کے لئے
گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ حرث خلیل رشتہ دینے سے صاف انکار کر چکا
تھا، کامیابی کی آسان صورت کوئی نہ تھی مگر وہ بھی ہر مشکل سے ٹکرانے
کا فیصلہ کر چکا تھا۔ وہ اسی دھن میں بڑے ہال کی کھڑکی زینے کی طرف مڑتے
مڑتے اس کے قدم ٹھٹک گئے، اس کی نظر ہال کی کھڑکی سے اندر کی
طرف پڑی تو ہال کے آخری کونے میں روشنی کی زد میں کھڑے ہوئے
جمالی کے ہاتھوں میں روبانہ کا ہاتھ تھا وہ اس کے کان میں کچھ کہہ رہا
تھا، سرگوشی کر رہا تھا وہ کیا کہہ رہا تھا شیر دل کو یہ تو علم نہ ہو سکا مگر
روبانہ کے چہرے پر ناچتی ہوئی مسکراہٹ اس کی اندرونی خوشی کی
غمازی کر رہی تھی۔

شیر دل کی ہمت ٹوٹ گئی۔ کیا وہ دعویٰ محبت وہ عہد و پیماں
وہ گریہ سب جھوٹ تھا، شیر دل کا دل چاہا جمالی کا نہیں مگر روبانہ کا
گلا گھونٹ دے اور اس سے پوچھے۔

"او حسین عورت! جب تو جمالی کو چاہتی تھی تو مجھے میرے
جذبات سے کھیلنے کا حق کس نے دیا تھا، مگر اسے تو کچھ کہنے سننے کی
کیا وہ دوبارہ اسے دیکھنے کی بھی ہمت نہ تھی، پھر جمالی سے کیا کہا روبانہ

[illegible]

نے کیسے سنا کچھ خبر نہ تھی۔ بلکہ اسے چند روز قبل کے اپنے ہی الفاظ یاد
آ رہے تھے۔

"روبانہ جس دن میں نے تمہارے انداز میں تبدیلی یا جمالی
کے لئے التفات دیکھ لیا، تمہارا نہیں اپنی محبت کا گلا گھونٹ دوں گا
تمہیں اس کے لئے چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے اس وادی سے اتنی دور
چلا جاؤں گا کہ پھر تمہیں میری شکل نظر نہ آئے۔ خواہ اس راہ میں مجھے
خود کو فنا کرنا پڑے۔"

یہ الفاظ اس کی رہنمائی کر رہے تھے اور اس کا دماغ جیسے
سوچنے سمجھنے کی ہر صلاحیت کھو چکا تھا، سے نئے پہلو انداز میں وہ
ایک دم پلٹا اور اب چہرہ وادی سے نہیں بلکہ اصل ذہن پر چلتا ہوا
اپنی بستی میں لوٹ آیا اس نے اپنا گھوڑا کسا اس چٹان پر ان راتوں
پر آخری نظر ڈالی اور پھر بھٹکتا ہوا کسی نامعلوم منزل کی طرف چل پڑا
اگر صرف جمالی کی محبت کا سوال ہوتا تو وہ کبھی یہ قدم نہ اٹھاتا مگر روبانہ
کا انداز اسے یقین دلا چکا تھا کہ وہ بھی اسے چاہتی ہے ایسے میں ان
دونوں کے درمیان سے ہٹ جانا ہی بہتر تھا۔

بڑھا کچھ سانس لینے کے لئے رکا۔ حیدر خیری نے دکھ کے
انداز میں سوال کیا۔

"بابا! کیا آپ کو معلوم ہے وہ چھوکرا شیر دل کہاں گیا؟"

"وہ بستی سے نکل کر بڑے بڑے شہروں میں چلا گیا۔ یہاں کی زندگی وہاں سے بالکل مختلف تھی۔ یہاں کے لوگ دشمنی کے باوجود دشمن کی قدر کرتے تھے، مگر شہروں میں دوستی کا دم بھرنے کے باوجود کوئی کسی کا خیر خواہ نہ تھا۔ ہر فرد غیروں کے ساتھ مل کر اپنوں کا مخالف نظر آتا۔ یہ چیز شیر دل کے مزاج کے بالکل خلاف تھی مگر وہ ہمیشہ کے لئے وادی سے چلا آیا تھا۔ یوں وقت گزرتا رہا۔ ہر دن نئے نئے واقعات جنم لیتے رہے مگر شیر دل کے لئے صبح سے شام اور شام سے صبح کرنا بڑا دشوار ہوتا۔ جوں ہی سورج مغرب میں روپوش ہوتا چشم تصور اسے اسی چٹان پہ لے جاتی جہاں کبھی کوئی اپنی زلفوں میں مہکتا ہوا پھول لگا کر اس کا انتظار کرتی تھی۔ کبھی کبھی اسے محسوس ہوتا روبانہ کہہ رہی ہے۔

"شیر دل سنگ دلوں کے رشتوں کو لمحوں میں کاٹ دیتا ہے۔"

یا وہ اس کے سینے سے لگی سسک رہی ہے۔

"یہ زندگی تمہارے بغیر کیسی ہوگی تم سوچ بھی نہیں سکتے۔"

شیر دل ایسے میں بے قابو ہو جاتا۔ دل چاہتا اس قرنوں سالوں کے فاصلوں کو ایک لمحے میں طے کر کے پھر اسی وادی میں پہنچ جائے مگر ہوش آنے کے بعد اسے وہ منظر یاد آتا جب جمالی کے ہاتھوں میں روبانہ کا ہاتھ تھا اور وہ چپکے چپکے کچھ کہہ رہا تھا۔ تب وہ بے بسی کے انداز میں آنکھیں بند کر لیتا پھر تصور ہی تصور میں اس سے کہتا۔

"روبانہ! دیکھ یہ میرے عشق کی انتہا ہے کہ میں نے تجھے عیش کرنے کے لئے چھوڑ کر خود کو دکھوں کے حوالے کر دیا۔" وقت تیزی سے گزرتا رہا۔ ایک دن وہ ایک تنگ بازار سے گزر رہا تھا کہ ایک دم ایک جانی پہچانی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ جلدی سے ایک بڑے ٹھیلے کی اوٹ میں چھپ گیا اور پھر نہ معلوم انداز میں دیکھنے لگا۔ اس نے دیکھا چند قدم کے فاصلے پر سلطان فخری اپنے ایک دوست کے ساتھ محو گفتگو چلا جا رہا تھا۔ شیر دل نے سنا وہ کہہ رہا تھا۔

"شہباز فخری کو شک تھا کہ شیر دل کی گمشدگی میں حرث منیل کا ہاتھ ہے لہٰذا اس بنا پر ان دونوں میں سخت جھڑپ ہو گئی جو ایک شدید لڑائی میں بدل گئی۔ اس میں شہباز فخری مارا گیا اور حرث منیل زخمی ہو گیا۔ اس وقت حرث نے قسم کھا کر کہا تھا کہ اسے شیر دل کا کچھ علم نہیں، ہاں وہ اس کی تلاش میں کسر نہ چھوڑے گا مگر کچھ دن بعد وہ بھی زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسا۔"

سلطان فخری ٹھیلے کے قریب سے گزر گیا۔ شیر دل کا دل، پیچھے دوڑ کر اس کا دامن پکڑے اور پوچھے "روبانہ کا کیا حال ہے؟ کیا اب بھی چٹان پہ جاتی ہے؟" مگر فوراً ہی وہ دل شکستہ سا ہو گیا۔ اس دل نے کہا "شیر دل جس کی خوشی کے لئے تو سب کچھ چھوڑ آیا اسے احساس پرستی کیسی اور جمالی کی موجودگی میں اسے چٹان کی طرف آنے ضرورت ہی کیا ہے۔" وہ تھکے تھکے قدموں سے خود کو چھپاتے چھپاتے چل پڑا۔

وقت کچھ اور سرک گیا۔ وہ یادوں کو فراموش کر دینے کی کوشش میں شہر شہر گھومتا رہا۔ اس نے انسانوں کے بڑے روپ دیکھے، ہمدرد کے دامن میں چھپی ہوئی خود غرضی دیکھی، دوستی کے پردے میں پوشیدہ دشمنی دیکھی، زر کے لئے انسان کو انسان کا قاتل بنتے، اپنی غرض کے لئے دوسروں کی آبرو کو خاک میں ملاتا رہا۔ وہ سب دیکھتا اور کڑھتا لیکن تنہائی میں ایک شبیہ اسے یاد آتی تو وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوتا۔ محبوب نہ ملا تھا اس کا تصور تو تھا اور تصورات بھی کتنی قیمتی چیزیں ہیں ہر شے سے بیگانہ کر دیتے ہیں۔

کئی برس گزر گئے۔ شب آتی وہی روبانہ کا خیال وہی اس کی یاد۔ وہ سوچتا روبانہ کہتی تھی محبت صرف ایک بار ہوتی ہے مگر یہاں تو شیر دل ایک کے لئے دنیا سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ سورج ڈوبتا اور ابھرتا رہا۔ موسم بدلتے رہے۔ سردیوں کے بعد گرمیاں اور گرمیوں کے بعد سردیاں آتی رہیں مگر اس کے دل سے عشق کی حدت کم نہ ہوئی۔ وہ مسلسل اس دھیمی دھیمی آنچ میں جلتا رہا جو اندر ہی اندر اسے ختم کر رہی تھی۔ کئی برس بعد وہ ایک دن سوچوں میں گم چلا جا رہا تھا کہ اس نے دیکھا اس کی بستی کے چند تاجر ادھر سے گزر رہے تھے۔ شیر دل کے لئے چھپنے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ اس کا دل چاہا بھاگ جائے مگر وہ تماشہ بننے کے لئے تیار نہ تھا۔ اتنے میں وہ تاجر اس کے قریب آ گئے۔ شیر دل اپنی جگہ کھڑا رہ گیا مگر اس کی حیرت کی انتہا نہ تھی جب اس نے محسوس کیا کہ اس کے اپنے ہی آدمی اسے نہیں پہچانتے تھے۔ ایک نے کہا "بابا جی راستہ چھوڑ دیجئے۔" شیر دل انہیں تعجب سے دیکھتا ہوا ایک طرف کو ہٹ گیا پھر اس نے سوچا وہ لوگ اسے پہچان نہ سکے تھے کیوں نہ اپنی وادی کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرے۔ یہ سوچ کر وہ ان کے ساتھ چلتا رہا اور وہ لوگ باتیں کرتے رہے۔ اس نے سنا اب دونوں بستیاں ایک ہو گئیں اور ان کا سردار جمالی ہے جو بالکل شیر دل کے انداز میں سوچتا ہے اور وادی امکنہ کے سب باشندے اس سے بہت

پایا۔ شیردل ایک سچا عاشق تھا مگر اس وقت غریب اور بے بس تھا
لہٰذا ریت سے ساحل سے کہ بی بی ہی ہو سرد ہوا تھا
وں کی سرداری اور دولت کے آگے بے بس تھا۔ جمالی کا معتوب ہو کر وہاں
باشندوں میں محبت کا پیغام لے کر نہیں زندگی کی راہ پر چلنا سخت
ت کرنا اور وقت سے پہلے بوڑھا ہو جانا اس کی قسمت پھر
حیرانی سے سوچنے لگا، اس کے آدمی اسے کیسے پہچانے کیا وہ اتنا
ل گیا اس دن نہانے کیوں اس نے شہر میں شفاف پانی کے
حوض میں جھانک کر اپنا عکس دیکھا جہاں لوگ نہانے آتے
تھے مگر اس پانی میں شیردل وہ تھا وہ جوان جسے دیکھ کر لڑکیوں کے
دھڑک جاتے تھے بلکہ یہاں تو گھنے بال گھنی داڑھی والا ایک
تھکا بوڑھا نظر آ رہا تھا۔ شیردل کی آنکھوں سے پانی کے چند
نکل کر اس حوض کے پانی میں شامل ہو گئے اور وہ ملتے ملتے
ل کرتے وہاں سے چل پڑا۔ اس رات وہ خیالوں ہی خیالوں میں
شکوہ کرتا رہا۔

"رباب: دیکھو کوئی عشق میں یوں بھی تباہ ہوتا ہے۔"

اس کے بعد اسے اپنی وادی کی کوئی خبر نہ ملی اور اسے
جاننے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ شاید وہ جمالی اور روبانہ کی خوشگوار زندگی
میں دکھ پیدا کرنا نہ چاہتا تھا۔ وقت گزرتا رہا وہ اسے بھلا تو سکا نہیں
اس نے خود کو مٹا دیا تباہ کر دیا۔ یہ وقت کبھی دنوں میں گزرتا ہے کبھی
ہفتوں مہینوں اور سالوں میں لیکن کبھی کبھی ہمارے لئے یہ ظالم
تیز رفتار وقت رینگنے لگتا ہے۔ محسوس ہوتا ہے لمحے نہیں صدیاں
بیت گئیں ساعت نہیں قیامت گزر گئی۔ شیردل کی زندگی کے
پچاس برس تڑپ تڑپ کر سسک سسک کر بڑی اذیت سے گزر
گئے۔ اس کی بوڑھی آنکھوں نے بڑے بڑے انقلاب دیکھے ایک
نسل ختم ہو گئی دوسری نے جنم لیا اور جوان ہو گئی اور شیردل بھی جوان
سے ادھیڑ اور ادھیڑ سے بوڑھا ہو گیا۔

صدی کا نصف حصہ بیت گیا تھا مگر روبانہ کی محبت اپنی جگہ
قائم تھی۔ اس طویل مدت میں کوئی شام ایسی نہ بیتی جب اس
نے پھول لگا کر پہاڑی پر آنے والی اس خوبصورت و شوخ لڑکی کو یاد نہ
کیا ہو۔ بوڑھے نے کانپتی ہوئی آواز سے کہانی ختم کر دی۔ غالباً لیکن اس
کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔ حمید فخری نے دھیمی آواز میں پوچھا

"بابا، کیا شیردل زندہ ہے؟"

"معلوم نہیں" بوڑھے نے کچھ عجیب سے انداز میں جواب دیا۔

"تو آپ اس سے آخری بار کب ملے تھے اور کیا باتیں کی تھیں؟"
حمید فخری نے سوال کیا۔

"پچاس برس قبل وادی میں ملاقات ہوئی تھی۔" بوڑھے نے دھیمے سے
کہا، "مگر حیرت کی بات ہے جو عمر بھر اپنے عہد پر قائم رہا اس عشق میں
عجیب سی ضد تھی کہتا ہے کہ روبانہ وادی بلکہ کل کا حصہ ہو گا سردار
جمالی کی محبوب بیوی لیکن مرنے سے قبل اسے صرف ایک بار
دیکھنا چاہتا ہے، اس کی تمنا ہے کہ مرنے سے پہلے ایک بار صرف
ایک بار اس کے سامنے جائے اور کہے" رباب: بوڑھے مرد خود کو
محبت میں یوں بھی تباہ کر لیتے ہیں۔" حمید فخری حیرت سے دیکھتا
رہ گیا۔ کیسی عجیب خواہش تھی اس نے پوچھا۔

"پھر آپ نے شیردل کو کیا جواب دیا؟"

"بیٹے" بوڑھا پہلی مرتبہ ہنسا۔ "تم نہیں جانتے جذبوں کی
مخالفت کوئی نہیں کر سکتا۔ ہم انسان طوفانوں پر قابو پا سکتے ہیں،
دریاؤں کے رخ موڑ سکتے ہیں، زمین کے اندر اتر سکتے ہیں خلاؤں
میں پرواز کر سکتے ہیں مگر جذبوں سے نہیں ٹکرا سکتے۔ محبت وہ جذبہ
ہے جو لمحوں میں ہر فاصلے کو مٹا دیتا ہے اور بیگانگی و نفرت انسان
کو انسان سے بہت دور لے جاتی ہے اور ہم ان دونوں کے سامنے
مجبور ہیں۔"

داستان تمام ہو چکی تھی، حمید فخری ہمدردی و محبت سے
شیردل کے بارے میں سوچ رہا تھا کس قدر عظیم انسان تھا وہ جس نے
محبوب کی خوشی کے لئے خود کو مٹا دیا۔ پھر اچانک ہی اسے محسوس
کیا کہ رات گزر گئی صبح ہونے والی ہے، ہوائیں اعتدال پر آ رہی تھیں
دریا میں لہروں کا شور کم ہو رہا تھا اور سیاہی دھیرے دھیرے چھٹ رہی تھی بوڑھے
نے بے تابی سے کہا۔

"بیٹے چلو مجھے جلد از جلد وادی پہنچنا ہے۔ رات تمام
ہو گئی ہے بڑی ویران تھی۔"

صبح ہو چکی تھی حمید فخری اور بوڑھا پل پار کر کے تیزی سے
وادی کی طرف رواں تھے، حمید فخری جلد از جلد پہنچ کر یہ کہانی یہ
عجیب و غریب داستان سب جوانوں کو سنانا چاہتا تھا مگر نہ جانے
کیوں اس سے زیادہ عجیب اسی بوڑھے کی چال میں تھی جس لاٹھی کے
سہارے رات بھر وہ چلا تھا وہ اس کے ہاتھ میں تھی مگر جب چٹان کے پاس
میں لوگوں کا ہجوم دیکھ کر وہ دونوں ہی ٹھٹک سے گئے کچھ جوان زور زور
بوڑھے کو دیکھ کر ادھر آنے لگے بوڑھے نے خود ہی ایک سمت دیکھا۔

"مگر وہ اس چٹان کے دامن میں یہ قبر کیسی ہے؟"

"معزز مہمان" جوان نے جواب دیا۔ "اس وادی میں برسوں سے ایک دیوانی رہا کرتی تھی، گزشتہ شب وہ مرگئی۔"

"تو اسے یہاں دفن کر رہے ہو۔" بوڑھے نے تعجب سے کہا "یہ کوئی قبرستان تو نہیں ہے۔"

"ہمیں یہ قبرستان نہیں ہے مگر وہ یہیں دفن کی جائے گی ہماری وادی کے مہربان سردار کا یہی حکم ہے۔" جوان نے وضاحت کی "وہ دیوانی عجیب عجیب حرکتیں کرتی تھی بیچاری ہر روز سنگھار کر کے اپنے گندے بالوں میں پھول لگا کر اس چٹان پر چڑھ جاتی تھی لیکن رات اس کی دنیا تاریک ہو رہی تھی وہ پل کی طرف دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی رہی، چلاتی رہی چٹان پر چیخ چیخ کر چکر لگاتی اور قہقہے لگاتی رہی لیکن ایک مرتبہ وہاں سے پل کی طرف دوڑنا چاہتی تھی کہ چٹان سے گر گئی اور مرگئی۔ اب ہمارے سردار کا حکم ہے کہ اسی کے دامن میں اسے دفن کر دو۔"

جوان نہ جانے کیا کہتا رہا کہ سب نے دیکھا بوڑھے کے ہاتھ سے لاٹھی چھوٹ گئی اور وہ زمین پر گر پڑا اس کی آنکھیں غم و حسرت سے پھٹ گئی تھیں اور سانس اکھڑ گئی تھی ایک لمحے میں مہمان کی آمد اور بے ہوشی کی خبر عام ہو گئی اور چٹان کے دامن کا مجمع تیزی سے ادھر منتشر ہونے لگا۔ وادی کا مہربان شفیق سردار تیزی سے وہاں پہنچا اور پوچھا۔

"یہ کون ہے؟"

"جناب یہ بوڑھا آج ہی مہمان آیا ہے" کسی نے جواب دیا مگر بوڑھے کے قریب آنے والے سردار کے قدم جیسے زمین پر جم گئے اس نے جھک کر اس کا چہرہ دیکھا اور چلایا۔

"شیر دل تو آ گیا" بوڑھے نے کمزور آنکھیں کھولیں جن میں غم ہی غم تھا اور پھر موندلیں سردار نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔

"شیر دل تو نے بہت دیر کر دی، وہ عمر بھر تیرا انتظار کرتی رہی" بوڑھے نے پھر آنکھیں کھولیں چہرے پر دکھ کے سائے لہرائے لب کپکپائے مگر اس کی آواز نہ نکل سکی۔ وادی کے مہربان سردار نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور بولا۔

"شیر دل، روبانہ کی بے تابی اور گریہ دیکھ کر ایک رات جمالی نے اس سے عہد کیا تھا کہ صبح وہ اس کا ہاتھ شیر دل کے ہاتھ میں تھما کر وادی الکفر کی سرداری سے دست بردار ہو کر ہمیشہ کے لئے کہیں چلا جائے گا تاکہ عرت منیل اس شادی کے لئے مجبور ہو جائے لیکن اسی شب تو جانے کہاں چلا گیا۔ پھر جمالی تجھے مسلسل تلاش کرتا رہا روبانہ اس پہاڑی پر چڑھ کر برسوں تیری راہ دیکھتی رہی یہاں تک کہ وہ پاگل ہو گئی لیکن تیرا انتظار کرتی رہی۔"

بوڑھے نے ایک سسکی لی اور کراہا۔ وادی کے کئی جوان سہم گئے حیدر علی نے پوچھا۔

"معزز سردار جمالی کہاں ہے؟"

"بیٹے" بوڑھے سردار نے نرمی سے کہا "جمالی تو اسی رات ہی مر گیا تھا جب اس نے روبانہ سے یہ عہد کیا تھا کہ وہ اسے شیر دل کے حوالے کر دے گا۔"

پھر چٹان کے دامن میں دوسری قبر کھودی گئی اور شیر دل روبانہ کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔ اس شام وادی الکفر کے سب جوان ان قبروں پر فاتحہ پڑھ رہے تھے اور ان کے ساتھ کرشمہ بھی۔ عمر سردار کے ہاتھ آہستہ آہستہ کانپ رہے تھے وہ دیر تک یہاں کھڑا رہا۔ مجمع چھٹ گیا تب اس نے اپنی نم آنکھوں کو خشک کیا، لرزتے ہاتھوں سے ان قبروں پر چراغ جلایا پھر دیوانی کی قبر پر آہستہ سے اور سرگوشی کی۔

"سنو! روبانہ، جو راز نصف صدی سے میرے سینے میں دفن رہا اسے آج فاش کر دوں، سنو شیر دل کی بدگمانی تمہاری ذات پر غلط تھی، لیکن اسے مجھ پر شک صحیح تھا، آج تمہیں بتاؤں۔ میں بھی تم سے محبت کرتا تھا۔ میں نے تم سے عہد کیا تھا کہ تمہیں شیر دل کے حوالے کر کے وادی الکفر کی سرداری سے دست بردار ہو کر ہمیشہ کے لئے چلا جاؤں گا دیکھو آج میں نے اپنا عہد پورا کر دیا، اب مجھے لیا؟ وہ رات ہونے والی ہے اور مجھے بہت دور جانا ہے۔"

پھر وہ جھکا اس نے گلاب کا ایک پھول دیوانی کی قبر پر رکھا اور پلٹ گیا۔ ہوائیں ساکن تھیں شام کے دھندلکے پھیل رہے تھے وادی الکفر پر سناٹا طاری تھا اور لہروں کا مدھم مدھم شور سنائی دے رہا تھا جیسے کوئی الوداعی گیت گا رہا ہو لیکے میں وادی کا مہربان سردار لوگوں یہاں کے باشندوں کی خدمت کرنے کے بعد پہلی بار دور بہت دور جا رہا تھا۔ کہاں؟ یہ کسی کو خبر نہ تھی۔

تین عورتیں تین کہانیاں

عنبر رعنا فاروقی



لوگ کہتے ہیں پولیس والوں کی دوستی اچھی نہ دشمنی لیکن بلاوجہ پولیس کے لوگوں سے دوستی اور دشمنی کرنے والوں کی تعداد دن بدن بڑھتی ہی چلی جاتی ہے میرے ابا صاحب پولیس انسپکٹر تھے صبح سے شام تک ان سے ملنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا انہیں گھر والوں کی بھی فرصت نہیں ملتی تھی میں اکثر سوچا کرتی تھی کہ انہیں دو منٹ گھر میں ٹک کر بیٹھنا نصیب نہیں ہوتا۔

کہ ان کا کیا ہے میری تربیت جلد از جلد کی کیوں؟ ابا غصہ میں تب بھی کے مطلب کہ وہ دونوں ہی پولیس میں تھے۔ ان تمام باتوں کا اثر ہماری تربیت پر بھی پڑا۔ شکر ہے کہ ہم صرف تین بہن بھائی تھے۔ ایک بھائی دو بہنیں۔ میں بڑی تھی مجھ سے چھوٹا بھائی ارشاد اور سب سے چھوٹی بہن شگفتہ۔ ہم تینوں بہن بھائیوں میں ایک ایک سال کا فرق تھا۔ شگفتہ اور ارشاد میں چار سال کی چپقلش جاری رہتی شگفتہ کو بہت چاہتی تھیں اماں لیکن ابا سر پر چڑھا سکتا تھا۔ ارشاد پاپا اور امی دونوں کا منظور نظر تھا۔ مگر ابا کے پاس اتنا ٹائم نہیں تھا کہ ہماری تربیت پر بھی توجہ دے سکتے۔ امی ہماری بہت ہی سادہ محبت کرنے والی خاتون تھیں شوہر کی غیر معمولی مصروفیت کا زیادہ گلہ نہیں کرتی تھیں کیونکہ حقوق شوہر صرف اتنے ہی تھے کہ کھانے پینے کا پوچھ لیں بیماری میں اسپتال لے جانے کو اور دوسرے ہم بہن بھائیوں کی جائز ناجائز فرمائشوں کی تکمیل کرتی رہتی تھیں۔ جس کا سب سے زیادہ اثر ارشاد نے لیا کہ اسکول سے ناغہ کر لیتا تھا اسی وجہ سے بجائے گھر کے ارشاد کو دوسرے دوستوں نے گھیر لیا۔ وہ آوارہ گردی کرنے نکل جاتا۔ تو ابا کی وجہ سے وہ گھر پایا۔ مطمئن کر دیتیں۔ اماں کے لاڈ پیار نے ارشاد کو بالکل بگاڑ دیا۔

پندرہ سولہ برس کا تھا مگر اس کی دوستی اپنے سے دگنی عمر کے لوگوں
سے تھی۔ لمبی لمبی قلموں اور مونچھوں والے یہ لڑکے جب دروازے
پر شور مچانے لگتے تو سب کو پتہ چل جاتا کہ ارشد کے دوست آئے ہیں۔
ساری کالونی ان سے نالاں تھی مگر انسپکٹر صاحب کے ڈر کی وجہ سے
کچھ کہنے کی جرأت نہیں رکھتی تھی۔ ارشد اس کا فائدہ اٹھا رہا تھا مجھے
اس کے دوستوں سے چڑ تھی۔ اسکول جاتے ہوئے ان میں سے کسی سے
مڈبھیڑ ہو جاتی تو ذرا سی بھی شرافت کا مظاہرہ یہ لوگ نہیں کرتے تھے۔
آنکھوں آنکھوں میں کچھ ایسی حرکت کر جاتے کہ مجھے غصہ آجاتا۔ کئی بار امی
سے شکایت کی ارشد غلط قسم کے لوگوں میں پھنسا ہوا ہے۔ اگر آپ لوگوں
نے اس کی بڑھتی ہوئی دوستیوں پر نظر نہیں رکھی تو دیکھنا آگے چل کر
کیا گل کھلائے گا۔ امی الٹا مجھے ڈانٹنے لگتیں۔ میں یہ نہیں کہتی کہ میں ارشد
کے مقابلے میں باشعور لڑکی تھی۔ پاپا کے پیار نے مجھے بھی خاصا بگاڑ
دیا تھا۔ اسکول کی متمول گھرانوں کی لڑکیوں میں اکثر مقابلہ رہتا ہے
کہ کس نے کیا شے قیمتی خریدی۔ اس نمائش میں میں پیش پیش رہتی تھی۔
سترہ برس کی عمر تھی۔ اچھے برے کی کچھ تمیز نہیں تھی۔ میری سہیلیاں بھی
ہلا گلا کرنے والیاں تھیں پکچر کے ہم سب شوقین تھے۔ والدین سے بہانہ
بنا کر ہم ہر نئی پکچر دیکھ آتے تھے۔ کبھی ارشد دیکھ لیتا تو امی کی تھوڑی
سی ڈانٹ کھا لیتی۔ مگر روش نہ بدلتی۔ ویسے طبیعت میں بدمعاشی وغیرہ
قطعی نہیں تھی۔ ہم تفریح پسند تھے۔ نمائشی چیزوں پر جان چھڑکتے تھے۔
خود پسندی اور غرور کوٹ کوٹ کے بھرا ہوا تھا۔ لیکن غنڈوں یا موالیوں
سے دوستی کے مرض سے دور تھے۔ میٹرک کیا تو جیسے پر سے لگ
گئے۔ کالج میں قدم دھرتے ہی خود کو آسمان شے سمجھنے لگی۔ اپنے سے
کم حیثیت کی لڑکیوں سے تو بات کرنا گوارا نہیں تھی۔ صورت میری بہت
اچھی ہے۔ اس بات کا بھی بہت غرور تھا۔ کالج کی سرگرمیوں میں بڑھ
چڑھ کر حصہ لیا بچپن سے مجھے رقص کا شوق تھا۔ اسکول میں ڈرامے
وغیرہ میں حصہ لیا کرتی تھی کالج میں آکر اس شوق کو اور تیز کر دیا۔ کالج
کا پہلا ڈرامہ ہوا تو میں ہیروئن بنی۔ میرا رقص اتنا مقبول ہوا کہ کمشنر کی
بیوی نے دوبارہ فرمائش کی۔ میری شہرت گھر گھر پہنچی اور میرا
مزاج آسمان پر جا پہنچا مگر امتحانات نزدیک آئے تو پڑھائی میں
لگ گئی۔ اس طرف سے میں غافل نہیں تھی جب کہ ارشد میٹرک میں فیل
ہو گیا۔ میں نے فسٹ ایئر کلیئر کر لیا اور سیکنڈ ایئر میں آگئی۔ پاپا کو ارشد کے
فیل ہو جانے کا بہت دکھ ہوا۔ انہیں اب احساس ہوا کہ انہوں نے
بیٹے پر زیادہ توجہ نہیں دی جس سے وہ بگڑ گیا۔ اس کی بہت سی شکایتیں
بھی آنے لگی تھیں۔ لوگ اس کی بدخلقی اور آوارگی پر کھلے عام تبصرہ
کرتے۔ امی کو بیٹے کی وجہ سے ہر جگہ شرمندگی اٹھانی پڑتی تب وہ پاپا کی
ناجائز محبت سے سخت بیزار ہو گئیں۔ آئے دن بات بات پر لڑنے لگیں۔
دیر سے آتا تو پاپا سے شکایت کر دیتیں۔ ارشد پر قطعی اثر نہیں تھا۔
اپنے فیل ہونے کا اسے بھی صدمہ تھا لیکن بگڑتا گیا۔ اس کے دوست
یار اسے گھیرے رکھتے تھے اور وہ انہیں چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھا۔
کچھ دنوں بعد پتہ چلا کہ ارشد شراب بھی پینے لگا ہے۔ امی پاپا نے سر پیٹ
لیا۔ اسے سدھارنے کے لئے سختی سے کام لینا چاہا تو اس نے گھر چھوڑنے
کی دھمکی دے کر دونوں کو بوکھلا دیا۔ امتحان کی ناکامی اور امی پاپا کی
بے بسی کا اس پر رد عمل بغاوت کی صورت میں ہوا تھا۔

ایک دن وہ گھر آیا تو اس کے ساتھ ایک نیا دوست تھا
عجیب مزدور ٹائپ کا ہونق سا لڑکا تھا۔ وہ ریلوے کی وردی کا کوٹ
کاٹ چھانٹ کر پہنا ہوا تھا۔ میلا اٹنگا سا پاجامہ۔ بھدے پاؤں میں
پھٹی پرانی چپل پہن رکھی تھی۔ اتفاق سے میں اس وقت کالج سے
آئی تھی۔ میری سہیلی فریدہ نے مجھ سے اکنامکس کے نوٹس مانگے تھے۔
نوٹس کی کاپی لے کر میں باہر جا رہی تھی کہ ملازم ملے تو اس کے
ہاتھ بھیج دوں۔ سامنے سے ارشد اس ملازم صورت لڑکے کے ساتھ
آتا ہوا نظر آیا۔ میں سمجھی کہ شاید اسے نوکری وغیرہ دلانے لایا ہے۔ اس
لئے کچھ غور ہی سے اس کا معائنہ کر ڈالا۔ بعد میں یہ دونوں ڈرائنگ روم
میں جا بیٹھے۔ چائے اندر بھیجی گئی تب پتہ چلا کہ یہ گھامڑ ارشد کا دوست
ہے۔ مجھے بہت غصہ آیا کہ اب ارشد ان چرسی مزدوروں کو بھی منہ لگانے
لگا ہے۔

کچھ دنوں بعد یہ چرسی حضرت پھر آ دھمکے۔ ارشد نہا رہا تھا۔
شگفتہ باہر تھی۔ امی سو رہی تھیں۔ دروازہ میں نے کھولا اسے دیکھتے ہی
میرا منہ کڑوا ہو گیا۔ چہرہ پر نفرت کے تاثرات ابھر آئے جسے اس نے
محسوس کر لیا۔ معاف کیجئے۔ کہہ کر وہ قدم پیچھے ہٹ گیا۔ میں ناک سکوڑ کر
بولی۔ ارشد گھر پر نہیں ہے آپ تشریف لے جایئے۔ اس نے بڑی
حیرانگی سے مجھے دیکھا جیسے وہ میرا جھوٹ جانتا ہو۔ مگر کچھ بولے بغیر
مڑ گیا۔ اور تیز تیز قدم اٹھاتا غائب ہو گیا۔ بعد میں ارشد نے پوچھا کہ یہاں
لطیف تو نہیں آیا تھا۔ تب پتہ چلا کہ اس بھک منگے کا نام لطیف ہے۔
میں نے چڑ کر کہا ہاں وہ چرسی بھکاری آیا تو تھا مجھے کیا معلوم وہ آپ
کے منظور نظر ہیں۔ ارشد پیچ و تاب کھاتا باہر چلا گیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ
وہ اس لڑکے کو بہت زیادہ پسند کرنے لگا ہے۔ میں نے امی سے کہا کہ



اب ارشد پرسیوں سے دوستی بڑھا رہا ہے اس پر نظر رکھئے۔ امی نے پاپا کو بتایا اور اتفاق سے دوسرے دن وہ آیا تو پاپا گھر پر تھے۔ وہ ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ غالباً وہ لطیف سے ملنا چاہتے تھے۔ کوئی ایک گھنٹے تک پاپا اس سے باتیں کرتے رہے اس دوران چائے بھی منگوائی۔ اس کے چلے جانے کے بعد پاپا کہنے لگے: "اچھا شریف لڑکا ہے۔ دیہات سے آیا ہے کسی مل میں کام کرتا ہے اس لئے حلیہ بگڑا ہوا رہتا ہے۔ ورنہ میرا خیال ہے ارشد کے سب دوستوں سے معقول سا ہی ہے۔" یہ کہہ کر وہ باہر چلے گئے اور میں کھول گئی۔ شکایت چونکہ میری طرف سے ہوئی تھی اس لئے جھنجھلاہٹ مجھے ہی ہونا تھی۔

اس واقعہ کے کچھ دنوں بعد ہمارے گھر ایک چھوٹی سی تقریب ہوئی۔ شگفتہ نے اپنی سہیلیوں کو پارٹی دی تھی ارشد نے ضد کی کہ وہ بھی اپنے دوستوں کو چائے پر بلائے گا۔ امی پاپا نے اجازت دیدی اس روز ارشد کے سب دوست جمع ہوئے۔ سب کے سب اوباش صورت۔ ان میں لطیف بھی شامل تھا مگر وہ کمتری کے احساس میں مبتلا سب سے الگ تھلگ بیٹھا رہا۔ امی اور پاپا اندر ان لوگوں کے پاس جا بیٹھے میں گیلری سے جھانک جھانک کر ان سب کی حرکتیں نوٹ کرتی رہی۔ امی لطیف کے قریب کرسی پر بیٹھی تھیں۔ شاید وہ بھی پاپا کی طرح اس سے متاثر ہوگئی تھیں کیونکہ پارٹی کے بعد انہوں نے بھی یہی بات دہرائی کہ اگر ارشد کو کوئی سدھار سکتا ہے تو وہ لطیف ہے۔ پتہ نہیں یہ سب لوگ اس کا کیوں اتنا نوٹس لے رہے تھے جبکہ مجھے سو فیصد یقین تھا کہ یہ گھٹیا لڑکا ارشد کے تمام دوستوں سے زیادہ خطرناک ہے کم از کم اس کے دوسرے دوستوں کا کچھ معیار تو تھا یہ ٹٹ پونجیا تو ارشد کو لوٹ لوٹ کر کھانے والوں میں سے لگتا تھا۔ مگر نقار خانے میں طوطی کی کون سنتا ہے۔ امی پاپا اس کے گن گا رہے تھے۔ دراصل ارشد کو راہ راست پر لانے کا انہوں نے ایک نیا راستہ ڈھونڈا تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ اس کے دوستوں میں کسی ایک کو اپنے قریب لے آئیں اور اسے سمجھائیں کہ وہ ارشد کو غلط باتوں سے روکے۔ اس اسکیم کے تحت پاپا اور امی نے روکنا ٹوکنا چھوڑ کر اس کے دوستوں سے گھلنا ملنا شروع کر دیا تھا۔ امی اور پاپا کی مشترکہ رائے سے قرعہ لطیف کے نام نکلا۔ انہوں نے ارشد سے کہا کہ کل شام لطیف کو چائے پر ساتھ لانا مجھے اس سے کچھ ضروری بات کرنا ہے۔ ارشد حیران سا ہوگیا۔ اور میں پریشان کہ اللہ میرے ماں باپ کو کیا ہوگیا ہے وہ کس آدمی کے ہاتھ ارشد کی عادتیں سنوارنا چاہتے ہیں جو شکل سے ہی چرسی لگتا ہے اور میری اس سے چڑ اور بھی بڑھ گئی۔

دوسرے روز لطیف آیا تو امی نے اسے اندر اپنے پاس بلا لیا اپنے ساتھ بٹھا کر چائے پلائی۔ ارشد کو گیم پر جانے کی جلدی تھی تاکہ لے جا سکے پاپا نے لطیف کو روک لیا۔ دوسری مرتبہ مجھ سے چائے بنوائی۔ میں کرسی ڈال کر امی کے پاس ہی بیٹھ گئی کہ دیکھیں میری ماں کیا باتیں کرتی ہیں۔ لطیف سر جھکائے چائے پیتا رہا۔ امی اس سے اس کے گھریلو حالات پوچھتی رہیں۔ جس سے پتہ چلا کہ اس کے والدین چک میں رہتے ہیں۔ باپ بوڑھا ہے۔ تین چھوٹی بہنیں ہیں۔ کلرک کا کام سیکھ کر وہ مل میں ملازمت کر رہا ہے۔ ہر ماہ والدین کو دو سو روپے بھیج دیتا ہے پڑھائی بھی کرتا ہے۔ تیاری ہونے پر کسی امتحان میں بیٹھ جائے گا۔ امی بڑی توجہ سے اس کی باتیں سنتی رہیں۔ وہ بولا: "خالہ جی! آپ نے بتایا نہیں کہ مجھے آپ نے کیوں بلایا ہے؟" امی سنبھل کر بیٹھ گئیں۔ بولیں: "بیٹے تمہیں یہ اندازہ ہوگیا ہوگا کہ میرے اور ارشد کے پاپا کے دل میں تمہاری کتنی عزت ہے۔" لطیف عاجزی سے بولا: "یہ آپ لوگوں کی نوازش ہے خالہ جان ورنہ میرے جیسے مزدوروں جیسے کپڑے دیکھ کر تو لوگ ناک بھوں چڑھا کر راستہ بدل لیتے ہیں۔" میں نے چونک کر اسے دیکھا شاید وہ مجھ پر طنز کر رہا ہے۔ مگر اس کے چہرے پر ایسا کوئی تاثر نہیں نظر آیا۔ میں شرمندہ سی ہوگئی۔ امی کہنے لگیں: "لطیف بیٹے ارشد ہماری امیدوں کا واحد سہارا ہے۔ بیٹیوں کو بیاہ کر اپنے اپنے گھر چلے جانا ہے بیٹا ایک ہی ہے ہم چاہتے ہیں کہ دوسرے ہونہار بیٹوں کی طرح یہ بھی خوب پڑھے لکھے۔ مگر تم نے پارٹی میں دیکھ لیا ہوگا۔ کہ اس کی کیسے لڑکوں کے ساتھ دوستی ہے۔ اگر اس کی باز پرس کرتے ہیں تو جوان اولاد ہے گھر چھوڑ کر بھاگ گیا تو کیا کریں گے۔ نرمی برتتے ہیں تو یہ اپنی روش بدلتا نظر نہیں آرہا۔ میٹرک میں فیل ہو چکا ہے یہی لچھن رہے تو آئندہ دو چار سال پاس ہونے کی کوئی امید نہیں۔ پینے پلانے بھی لگا ہے۔ میں نے اس کے سب دوستوں کو دیکھ لینے کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس کی ذمہ داری تمہیں سونپ دوں۔ میں تمہیں اپنا بیٹا سمجھ کر درخواست کر رہی ہوں تم اس کی بُری عادتیں اور بُرے دوست چھڑا دو۔ ہم دونوں میاں بیوی ساری عمر تمہیں دعائیں دیتے رہیں گے۔"

امی کی اس طرح گڑگڑا کر بات کرنے پر مجھے بہت غصہ آیا۔ جھلا کر امی اور حقارت سے لطیف کو دیکھتی کمرے سے باہر نکل آئی کہ کہیں وہ یہ نہ سمجھے کہ یہ میری خواہش بھی یہی ہے۔ میں امی سے بتانا چاہتی تھی کہ میری تمہارے سامنے بیٹھا ہے وہ وہی ہے جو اول روز تم نے میرے انداز سے دیکھی تھی۔

اس کے بچے جانے کے بعد امی اور میری الجھن بڑھ گئی
ن کا موقف تھا کہ ارشد کو اب صرف لطیف بچا سکتا ہے۔ اور میں
س بات پہ اڑی ہوئی تھی کہ ارشد آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک جائے
ا۔ لطیف کم ظرف نہیں ہے۔ دیکھ لینا آپ۔ لوگ پچھتائیں گے۔ جب
ن لطیف کا ذکر میں نے امی سے کیا تو کہا: "یہ کیا کم بدمعاش ہے؟"
بلکہ کر اس کی طرف دیکھا اس کی صورت ہی بگڑ گئی تھی امی نے بھی
یہ محسوس کیا۔ انہوں نے اس کے سامنے مجھے جھڑک دیا۔ بولیں "اندر جا کر
بیٹھو ہر وقت بکواس کرتی رہتی ہو۔" امی نے میری اس کے سامنے بے عزتی
کی تھی گویا وہ انہیں مجھ سے زیادہ پیارا ہو گیا۔ میں خوب روئی سوچا کر
جب موقع ملے گا اس کی بے حرمتی مزید کروں گی۔ ٹکے کے مزدور کو سر چڑھا
لیا ہے۔ رات کو میں نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ مجھے یقین تھا کہ پاپا مجھے منانے
آئیں گے مگر امی نے ان کے کان بھی بھر دیئے۔ صبح ناشتے کے وقت
انہوں نے مجھ سے کہا: "نا بیٹی، ان باتوں کو تم نہیں سمجھتی ہو ان میں ٹانگ
کیوں اڑاتی ہو۔ آئندہ میں تمہاری امی سے ایسی شکایت نہ سنوں۔" میں
میں پیر پٹختی ناشتے سے اٹھ گئی اور پھر میں نے امی کے سامنے لطیف کو
کچھ کہنا ہی چھوڑ دیا۔ مگر اسے ایسی نظروں سے دیکھتی جیسے مجھے اس کا قتل
کرنا ہو۔ کبھی موقع ملتا تو ایک آدھ اسے حقیر کرنے والا فقرہ اچھال
دیتی۔

ایک دن کالج سے میری جلدی چھٹی ہو گئی۔ سوکس کی بس نہیں
آئی تھی میں بہت دنوں سے فوزیہ کے گھر جانے کا سوچ رہی تھی۔ کالج
سے جلدی آ گئی۔ ساڑھے گیارہ بجے کا وقت تھا۔ لیبر کالونی سے اندر
جا رہی تھی کہ مجھے اشرف نظر آیا۔ ارشد کا قریبی دوست تھا۔ اس کے قریب
خلیل بھی دکھائی دیا۔ وہ بھی اشرف کا دوست تھا مجھے آتا دیکھ کر وہ تقریباً
بھاگتے ہوئے میرے پاس آ گئے۔ دونوں کے رنگ اڑے ہوئے تھے۔
چہرے دہشت زدہ تھے۔ اشرف بولا: "شکیلہ باجی ارشد نے کچی شراب
پی تھی اس میں کچھ ملا ہوا تھا۔ وہ بے ہوش ہو گیا ہے۔" میں چیختے چیختے رک
گئی۔ میرا پریشان ہونا فطری امر تھا۔ گھبرا کر پوچھا: "امی پاپا کو خبر کر دی ہے؟"
خلیل بولا: "نہیں باجی ہمیں ڈر لگتا ہے۔ آپ کے پاپا ہمیں جیل بھجوا دیں گے۔
میرا ایک دوست ڈاکٹر ہے آپ ہماری مدد کریں ارشد کے پاس جا کر
بیٹھ جائیں ہم اسے بلا لاتے ہیں۔" میں نے پوچھا "ارشد کہاں ہے؟"
کہنے لگا "کالونی میں سلیم کے گھر پڑا ہے۔ اس کا تو سانس اکھڑنے لگا ہے"
بھائی جیسا بھی ہو بہن کی تو جان ہوتی ہے۔ میں گھبرا کر دوڑ پڑی "چلو
مجھے وہاں لے چلو تم لوگ جا کر میرے پاپا کو خبر کر دو میں قسم کھاتی ہوں

تم پر کوئی بات نہیں آنے دوں گی۔" خلیل کہنے لگا "آپ میرے ساتھ
آئیے اشرف آپ کے پاپا کو خبر کرنے جا رہا ہے۔" میں خلیل کے پیچھے پیچھے
چلتی گئی۔ ذہن میں وسوسے تھے دعا کر رہی تھی کہ ارشد کو اپنے امان میں رکھے
ہمارا ایک ہی تو بھائی ہے۔ بڑا ہے یا بھلا اس کی زندگی کے بدلے میں
اپنی جان فدا کر دوں گی۔

اگر امی کو اشرف نے اچانک یہ خبر سنا دی تو کہیں ان کا
ہارٹ فیل نہ ہو جائے۔ لیبر کالونی آج سے دس سال پہلے ایک نو آباد
کالونی تھا۔ اس وقت زیادہ تر مزدور اپنے کاموں پر گئے ہوئے
تھے۔ کالونی میں خاصی خاموشی تھی۔ خلیل مجھے لے کر جس کوارٹر میں داخل
ہوا اس کا دروازہ بغیر رنگ و روغن کا تھا۔ اندر کی نیم تاریکی تھی میں اندر
جاتے ہوئے ہچکچائی مگر بھائی کی محبت غالب آ گئی اور میں خلیل کے پیچھے پیچھے
اندر آ گئی۔ کمرے کے وسط میں ہی مجھے احساس ہو گیا کہ میرے ساتھ
دھوکہ ہوا ہے۔ خلیل نے اچانک پلٹ کر زور سے دھکا دیا۔ میں گھبرا کر پیچھے ہٹی تو
پھر میں خلیل کے ساتھی نے میرا منہ بند کر دیا۔ ایک دو نہیں وہاں
پانچ لڑکے موجود تھے۔ میرے منہ میں رومال ٹھونس کر میرے دوپٹے سے
کس دیا۔ ہاتھ کھلے تھے۔ ایک لڑکی اپنے ہاتھوں سے کہاں تک لڑ
سکتی ہے۔ مگر اتنی جلدی ہار ماننے والی میں بھی نہیں تھی۔ میں جب تک ہاتھ
پیر چلاتی وہ پانچوں قہقہے لگاتے۔ اشرف بولا: "تمہارے ہی غلام نے
ارشد کو دوست بنایا تھا شہر بھر میں تمہارے نام کا چرچا ہے۔ آج
ہم بھی تمہارا مال چکھیں گے۔" دوسرا کہنے لگا "یہ تو بڑی ہی ہے بڑی
معصوم بنتی پھرتی ہے جیسے ہم شہزادیوں سے کھیلیں گے۔ یار یہ اشرف نہیں
آیا سالا راستے میں ساری نہ پی ڈالی ہو۔" اس کا مطلب تھا ان ذلیل
چھوکروں نے یہاں ڈرنک کر کے عیاشی کرنے کا پروگرام بنایا تھا اور
یہ اندازہ بھی مکمل کیا کہ یہ کوارٹر لطیف کا ہے کیونکہ ایک لڑکے نے
غصے سے کہا کہ یار اشرف کی جگہ سلیم کو بھیجنا تھا۔ اگر لطیف کی جلدی
چھٹی ہو گئی تو سارا معاملہ چوپٹ ہو جائے گا۔

اشرف بھی آ گیا۔ اپنی مدافعت میں ناکام ہو کر میں رونے لگی
کہ شاید اس طرح ان ذلیلوں کو رحم آ جائے مگر اب ان پر نشہ طاری
ہو چکا تھا۔ اب کوئی معجزہ ہی میری عزت بچا سکتا تھا۔ اپنی برہنگی
کو چھپانے کی کوشش کرتی تو ایک ٹھوکر مار کر مجھے وہ دور پھینک دیتا
ابھی شاید واقعی معجزہ ہو گیا۔ دروازہ زور زور سے بجا ان سب کا نشہ
اتر گیا۔ ایک نے مجھے گھسیٹ کر پلنگ کے نیچے دھکیلا۔ دوسرے
نے چادر چارپائی پر ڈالی۔ اور دروازے پر چلے گئے۔ میں نے لطیف

کی آواز سنی۔ وہ غالباً کسی بات پر اُن سے اُلجھ رہا تھا۔ اندر کی آواز کو نچی ہو گئی تو وہ اندر داخل ہو گیا تھا۔ کمرے میں افراتفری اس کی نظر سے کب چھپی رہی ہو گی۔ وہ چیخ کر بولا۔

"تم لوگ یہاں شراب پی رہے تھے؟"

اشرف بولا: "تم بھی پی لو میرے یار بڑی مزے کی شے ہے۔"

لطیف نے غالباً اس کے تھپڑ مارا۔ میں نے پوری طاقت لگا کر پلنگ کو اچھالنا شروع کر دیا۔ لطیف نے دیکھا اور جلدی سے پلنگ اٹھا دیا اور یہاں میں جس حالت میں اسے نظر آئی وہ کسی بھی غیرت مند اور شریف آدمی کے لئے مرنے مارنے والا جذبہ بیدار کر دینے والی بات تھی۔ اور اب میں کہتی کہ لطیف غیرت مند اور شریف آدمی ہے۔ اس نے ان چھ لڑکوں کی ایسی مرمت کی کہ جیسے وہ بے جان گتے ہوں۔ انہیں اٹھا اٹھا کر زمین پر پٹخا۔ نازوں پلے امیر زادے اندر سے اتنے بزدل تھے کہ جیسے موقع ملا بھاگ گیا۔

جب سب فرار ہو گئے تو لطیف نے پلنگ کی چادر میری طرف پھینکی۔ میں سہمی رہی۔ چادر لپیٹ کر باہر نکلی انہوں نے میرے کپڑے الماری میں ٹھونس دیئے تھے وہ لطیف نے تلاش کر کے مجھے دیئے اور خود باہر چلا گیا۔ جلدی جلدی میں نے کپڑے پہنے اور جیسے ہی لطیف آواز دے کر اندر داخل ہوا میں بھاگ کر اس سے لپٹ گئی اور اس بری طرح سے پھوٹ پھوٹ کر رو دی جیسے یہ میرا اپنا آدمی ہے میرے پاپا اور ارشد جیسا۔ لطیف گھبرا گیا۔ اس نے میری کمر تھپکی کہنے لگا۔

" باجی یہ ساری غلطی ارشد کی ہے۔ اس نے کل مجھ سے ضد کی کہ اپنے کوارٹر کی چابی اس کے دوستوں کو دے دوں وہ لوگ امتحانات کی تیاری کر رہے ہیں۔ علیحدہ علیحدہ پڑھائی کیا کریں گے۔ مجھے ان لوگوں کی بات پر بھروسہ نہیں تھا مگر ارشد نے قسم کھائی کہ یہ لوگ کسی غلط کام کے لئے چابی نہیں مانگ رہے۔ اس کی ضمانت میں دیتا ہوں، تب مجبور ہو کر میں نے چابی دے دی۔

ایک چابی میرے اپنے پاس تھی۔ صبح میں کام پر چلا گیا۔ اتفاق سے میرا ایک کولیگ رفیق بھی یہیں رہتا ہے۔ وہ آج دیر سے کام پر آیا۔ اس نے بتایا کہ آج صبح سے پانچ چھ لڑکے تمہارے کوارٹر میں آ رہے ہیں ان کی حرکتیں کچھ مشکوک سی لگ رہی ہیں۔ یہ تم نے کن لوگوں کو اپنی چابی دی ہے۔ تمہارے رشتے دار تو لگتے نہیں۔ مجھے تو کچھ گڑبڑ لگتی ہے۔ رفیق کی زبانی یہ اطلاع ملتے ہی میں نے اپنا کام اپنے ساتھی کے حوالے کیا اور خود بھاگ کر یہاں آیا۔ میرے تو خواب میں

بھی یہ بات نہیں تھی کہ یہاں آپ ہوں گی۔۔۔" وہ کچھ نہ کہہ سکا اور میری گردن شرم سے جھک گئی۔۔۔ میں نے ایک ایک لفظ اسے بتایا۔ وہ بولا: "آپ کے ساتھ خدا نخواستہ کوئی زیادتی ۔۔۔ میرا مطلب ہے آپ کو کچھ ۔۔۔ آپ ٹھیک ہیں نا۔۔۔" وہ بات پوری نہیں کر پا رہا تھا اور میں اس کا مطلب سمجھ کر بولی: "میں آپ کی زندگی بھر مشکور رہوں گی آپ نے میری عزت بچا لی۔" وہ بولا: "خدا کی قسم آپ کو کچھ نقصان پہنچاتے تو میں ان میں سے ایک کو گھر جا کر شوٹ کر دیتا۔ اب آپ گھر چلئے۔"

امی نے مجھے لطیف کے ساتھ آتے دیکھا وہ حیرت زدہ ہوئیں۔ ارشد اسکول سے واپس نہیں آیا تھا۔ میں روتی ہوئی اندر بھاگ گئی۔ لطیف نے ساری بات امی کو بتائی۔ تھوڑی دیر بعد ارشد بھی آیا۔ امی نے اسے پہلی بار اس بری طرح سے مارا کہ میں رونا بھول کر باہر آ گئی۔ لطیف نے بھی بچانے کی کوشش نہیں کی۔ میں بھاگ کر ارشد سے لپٹ گئی چیخ کر بولی: "اس کا کیا قصور ہے امی۔" لطیف نے نرمی سے اسے مجھ سے چھڑایا اور ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ اس نے پوری تفصیل ارشد کو بتائی۔۔۔ تب میرے بیوقوف بھائی کی آنکھیں کھلیں۔ وہ روتا ہوا امی کے پاس آیا اور ان کے پاؤں پکڑ لئے امی کے بھی آنسو نہیں تھم رہے تھے۔ انہوں نے ارشد کو سینے سے لپٹا لیا۔ میں نے دیکھا لطیف بھی آنکھیں پونچھ رہا تھا۔ امی نے مجھے سینے سے لگا کر دیوانوں کی طرح چوما۔ بولیں: "میری چاند تجھے پتہ چلا کہ شرافت کسی کی میراث نہیں ہوتی تجھے لطیف سے نفرت ہو گئی تھی۔ اللہ نے اُسے ہی تیری عزت کا رکھوالا بنا دیا۔"

امی نے لطیف کا شکریہ ادا کیا وہ کہنے لگا: "امی یہ میری بہن ہے صرف ارشد کا ہی نہیں میرا بھی بہن کی حفاظت کرنا فرض ہے۔ اس واقعہ کا آپ کسی سے ذکر نہ کریں۔ ورنہ جتنے منہ اتنی باتیں سننے کو ملیں گی۔"

یہ واقعہ صرف ارشد کے لئے ہی نہیں میرے لئے بھی سبق بن گیا۔ اپنے بڑوں کی تمیز کے پیمانے میں نے بدل دیئے۔ کالج میں نمایاں نظر آنے کی کوشش ترک کر دی۔ میرا غرور حقیقتاً کچلا گیا۔ ارشد نے اپنے مطلبی اور بے ہودہ دوست ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیئے۔ پاپا کو امی نے یہ واقعہ بتا دیا تھا۔ انہوں نے ان سب لڑکوں کو بار بار تھانے میں بلوا کر انہیں چھٹی کا دودھ تو یاد دلا دیا لیکن امیر باپ کے بگڑے ہوئے بیٹے بھلا کہاں سدھر سکتے ہیں ارشد نے بعد میں

کر دہ لطیف سے میری دوستی سے خائف ہو گئے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح لطیف ان کی نظروں سے گر جائے اس کے لئے انہوں نے اسکیم بنائی کہ ناہید کو اغوا کر کے لطیف کے گھر لے جائیں۔ اور بعد میں اُسے وہیں چھوڑ کر فرار ہو جائیں اور پاپا کو فون پر اطلاع کر دیں کہ ناہید لطیف سے ملنے اس کے کوارٹر گئی ہے۔ اس طرح لطیف پاپا کی نظروں میں گر جائے گا۔ انہوں نے ارشد سے لطیف کے گھر کی چابی مانگی کہ امتحان کی تیاری کرنی ہے۔ ارشد نے لطیف سے چابی حاصل کر کے ان کے حوالے کر دی۔ ان لوگوں نے چابی کی نقل بنوا کر چابی کچھ گھنٹے بعد رات کے وقت ارشد کو واپس دے دی۔ یہ کہہ دیا کہ کسی دوسرے مکان کا بندوبست ہو گیا ہے۔ اب اگر خدانخواستہ وہ لوگ اپنی اسکیم میں کامیاب ہو جاتے تو ارشد کو ان لوگوں پر شبہ نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ چابی تو ارشد کے پاس تھی ہاتھ کیا معلوم کہ وہ نقل بنوا چکے ہیں۔ ان لڑکوں نے اپنی دانست میں بڑی جامع اسکیم بنائی تھی۔ مگر ارشد نے بروقت بچا لیا۔ اور میرا بھائی بھی سدھر گیا۔ لطیف کی صحبت میں اس نے محنت کرنا اور بُرے اچھے میں تمیز کرنا سیکھ لیا۔

کچھ عرصے بعد پاپا نے ٹرانسفر کرا لیا ہم لوگ میانوالی چلے آئے اس واقعہ کو دس گیارہ برس گزر چکے ہیں ارشد لندن میں ہے میری شادی ہو چکی ہے۔ ایک بچہ بھی گود میں ہے۔ اتفاق سے میرے میاں کا تبادلہ لائل پور ہو گیا اور ہمیں اسی لیبر کالونی میں جو اب سمن آباد کہلاتا ہے۔ بنگلہ ملا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ لطیف کا کچھ پتہ چل جائے اور میں اس عظیم محسن کا شکریہ ادا کر سکوں۔ آپ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوگا کہ اس عرصے میں کیا کرتی رہی۔ مجھے تو اس شخص کا اسی وقت میں شکریہ ادا کرنا چاہیئے تھا۔ اس کی وجہ کچھ اور ہے اور وہ یہ ہے کہ مجھے لطیف اچھا لگنے لگا تھا۔ اس کی مردانگی نے میرے دل میں ایک عجیب سا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ جیسے آپ کچھ بھی نام دے دیں۔ وہ آتا تو میرے دل میں چراغ جلنے لگتے نظریں طواف کرتیں اور میں بجھ بجھ جاتی وہ میری آنکھوں کا پیغام سمجھ گیا تھا۔ اگر وہ نظروں کے سامنے رہتا تو مجھے یقین ہے میں اپنے دل کی بات اگل دیتی مگر اس کی نوبت نہیں آئی۔ اس نے خاموشی سے ملازمت چھوڑ دی اور چپکے سے بالکل اچانک یہاں سے چلا گیا۔ ارشد کے نام اس کا ایک پہلا اور آخری خط ملا۔ لکھا تھا۔

”دوست معاف کرنا یہ فیصلہ بھی میں نے تمہاری عزت اور دوستی کی حفاظت کے لئے کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم سب بھی بھائی اپنے خاندان کے بنائے ہوئے راستوں پر چل کر اپنا اپنا تابناک مستقبل پاؤ گے۔ یہی میری دعا ہے“

یہ خط ارشد کو نہیں اس نے دوسرے پردہ سے مجھے لکھا تھا اور میں اب سوچتی ہوں کہ میرا لگاؤ اس وقت اس کے علاوہ کچھ نہیں سوچ رہا تھا۔ اگر وہ یہاں سے چلا نہ جاتا تو میں یقیناً بہر راستے سے بھٹک جاتی۔ یہ اس شخص کا مجھ پر دوسرا احسان ہے۔ جس کا شکریہ میں اس وقت ادا نہیں کر سکی تھی مگر اب کرنا چاہتی ہوں۔

(ناہید جیلانی۔ لاہور)

[illegible] توبہ

میٹرک کرنے کے بعد مجھ میں آگے پڑھنے کی ہمت نہ ہوئی اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ گھر کے معاشی حالات ابتر تھے۔ گھر میں امارت تو نہیں مگر اتنا کچھ ضرور خدا نے دیا تھا کہ اگر میں آگے پڑھنے پر آمادگی ظاہر کرتا تو میرے والد اور والدہ بخوشی میرے تعلیمی اخراجات پورے کرتے۔ میں در اصل بہت سیدھا سادا بدھو قسم کا لڑکا تھا میرے ساتھی لڑکے تیز طرار تھے۔ وہ مجھے نئے نئے انداز سے تنگ کرتے تھے۔ کبھی کسی فرضی لڑکی کے نام سے مجھے وابستہ کر کے چھیڑ خانی کرتے کبھی جعلی خطوط سے پریشان کرتے۔ میں ہی ایک کاٹھ کا الو انہیں ملا تھا۔ ان سے مستقل نجات تو ممکن نہیں تھی۔ فرار کا ایک راستہ تھا کہ پڑھائی چھوڑ کر کسی جگہ ملازمت کر لوں۔ پیسہ ہاتھ میں آئے گا تو اعتماد ہوگا دوستوں کے مذاق کا انداز بھی خود بخود بدل جائے گا۔ خوش قسمتی سے مجھے ایک تولیہ فیکٹری میں جاب مل گئی۔ چند سو کی نوکری تھی لیکن میرے لئے ہزاروں کے برابر تھی۔ جس بچے کی جیب میں بچپن سے دو چار آنوں کے سوا کچھ نہ رہا ہو اس کے لئے سو کی تعداد خزانے سے بڑھ کر ہے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ چاہے میرے دوست مجھے کتنا ہی بے وقعت کیوں نہ بنائیں۔ میں ان پر ایک پائی بھی خرچ نہیں کروں گا۔ لیکن جب پہلی ہی تنخواہ پر وہ مٹھائی

کھانے آ دھمکتے اور لگے شور مچانے کہ ہم تو کچھ بھی دیکھیں گے تب انکار کا یارا نہ رہا۔ غصہ آیا دل ہی دل میں انہیں کوستے دیئے لیکن خلاصی اسی صورت میں ہوئی جب میں نے ان چھ سات دوستوں کو کچھ اور کھانے سے تواضع کی۔ والدہ صاحبہ نے بعد میں ڈانٹ ڈپٹ بھی کی۔ کہنے لگیں "تو نہیں سدھرے گا۔ ساری عمر تجھے تیرے دوست لوٹتے رہیں گے اور تو ان کے ہاتھوں کھلونا بنا رہے گا دیکھ لیجو ایک دن سر پکڑ کر روئے گا۔" ان کا کہنا درست تھا بعد میں بھی مجھے ان لوگوں نے خاصا ستایا۔ ہر پل کو شیطان چوکڑی آ گھڑی ہوتی مجھے سو سو طرح سے پٹاتے۔ کبھی لالا لیپا دیتے کہ ایک لڑکی تجھے دیکھ کر آہیں بھرتی ہے اگر چاہو تو اس سے دوستی کرادیں۔ کبھی جھوٹا خط مجھے دکھاتے کہ کسی لڑکی نے میرے نام بھیجا ہے۔ اگر پڑھنا ہے تو پہلے فلاں ہوٹل میں کھانا کھلاؤ۔ میری سادگی دیکھئے کہ ہر دفعہ توبہ کرنے کے باوجود میں ان کے جھانسے میں پھنس جاتا۔ دراصل بات یہ تھی کہ لڑکیوں سے ملنے اور بات کرنے کا مجھے بہت شوق تھا۔ گھر میں ماحول کچھ ایسا تھا کہ لڑکیوں کو دور دور رکھا جاتا تھا۔ چچا زاد جنہیں جوان ہوتے ہی پردہ کرنے لگیں محلے کی لڑکیوں سے شروع سے دور دور رہنا پڑا۔ دل ہی دل میں خیالی صنم تراشتا ان سے باتیں کرتا۔ لیکن جونہی کوئی لڑکی قریب سے گزرتی میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگتے۔ اگر بھولے سے کسی نے دو باتیں کر بھی لیں تو پاؤں کے تلوے پسینے سے بھیگنے لگتے۔ زبان میں ہکلاہٹ سی آجاتی اور ذہن کی سلیٹ ایک دم صاف ہو جاتی۔ اس بوکھلاہٹ کا تماشہ دیکھنے والے بعد میں مجھے خوب خوب ستاتے۔ اسے مرض سمجھ لیں یا شوق کہ جی چاہتا تھا عورت کا قرب ضرور حاصل کروں۔ چاہے اس کا ذکر ہو یا اس کی تصویر یار دوست میری یہ کمزوری جان گئے تھے، اسی لئے وہ میری جیب کاٹنے کے لئے یہ راستہ اختیار کرتے تھے۔ اگر والدہ صاحبہ ذرا سی عقل مندی سے کام لے کر میری شادی کا بندوبست کر دیتیں تو شاید میں اس راستے پر اتنی دور نہ نکلتا۔ گھر میں کسی کو میرے بیاہ کی فکر نہیں تھی۔ اماں کو مجھ سے زیادہ میری دو بہنوں کی فکر تھی۔ وہ مجھ سے چھوٹی تھیں۔ لیکن اماں ابا دونوں ان کے جہیز کی جمع جوڑ میں لگے ہوئے تھے۔ کبھی بھولے سے کسی نے میرا ذکر چھیڑ بھی دیا تو اماں ہنس کر کہتیں "ارے اس کی عمر ہی کیا ہے، ابھی میں کام بھی پورا نہیں ہوا۔ چار پانچ برس بعد سوچیں گی پہلے تو شکیلہ اور سلمیٰ بلکانے لگ جاتیں ان کی فکر ضروری ہے" اماں کی نظر میں ہم ابھی دودھ پیتے بچے ہی تھے اور ابھی تو بچپن کو رخصت ہونے میں چار پانچ سال کا عرصہ درکار تھا جبکہ یہاں چارپائی کے بان بدن کاٹنے لگتے تو تکیے پر سر رکھتا تو جی چاہتا کوئی نرم نرم ہاتھ بالوں سے چھیڑ چھاڑ کرے۔ رومانی ناولوں میں پڑھے ہوئے نسوانی کردار گھیراؤ کر لیتے۔ پکچروں میں دیکھی ہوئی حسین صورتیں آنکھوں کے آگے رقص شروع کر دیتیں دل چاہتا کہ ان میں سے کوئی ایک میری گرفت میں آجائے۔ بیڑا غرق ہو ان فلموں کا، مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ آہستہ آہستہ میری صحت گرنے لگی۔ غلط قسم کی سوچیں عملی صورت میں آکر میری صحت پر اثر انداز ہونے لگیں۔ اور میں غیر محسوس انداز سے ان حرکتوں کا عادی ہونے لگا۔ والدہ والد پر غصہ آتا کہ آخر یہ مجھے بچہ کیوں سمجھتے ہیں۔ یہ غصہ بغاوت میں بدل گیا۔ میں گھر سے دور ہوتا گیا۔ زیادہ تر دوستوں میں وقت گزارتا۔

ایک دن مجھے بخار تھا۔ اتفاق سے میرے سب سے چھوٹے بھائی کو بھی بخار نے آدبوچا۔ اماں کہنے لگیں "جمیل جا بھائی کو ساتھ لے کر دوا لے آ۔" اماں کی ہر بات سے مجھے چڑ سی ہونے لگی تھی۔ چپکے سے اٹھا مفلر لپیٹا اور یہ جا وہ جا۔ سیدھا اپنے ایک دوست کے یہاں جا پہنچا۔ سوچا کہ شام تک اس کے گھر رہونگا۔ واپسی پر یہاں کسی ڈسپنسری سے دوا لیتا جاؤں گا تاکہ اماں کے عتاب سے بچ سکوں۔ ریاض نے مجھے دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا۔ کہنے لگا "یار تو بڑے اچھے وقت پر آیا ہے، ابھی گھر میں تیرا ہی ذکر ہو رہا تھا۔" میں نے پوچھا "ایسی کیا بات ہوگئی جو گھر میں میرا ذکر ہونے لگا۔" تب ریاض بولا "پہلے آرام سے بیٹھ چائے پانی پی۔ پھر کھل کر بات ہوگی۔" میں نے کہا، میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے میرے لئے اسپرو اور چائے منگوا دے۔ ریاض نے میرا ماتھا چھو کر دیکھا اور متفکر ہونے کی بجائے ہنسنے لگا بولا "یار حیرت کی بات ہے گھر میں مسیحا بھی ہیں اور بیمار بھی۔ اللہ کی مصلحت اسی میں ہے کہ تجھے اسی مسیحا سے شفا ہو۔" یہ کہہ کر وہ ہنستا ہوا اندر چلا گیا — اور میں احمقوں کی طرح منہ کھولے اس کی اس بات کا مطلب سوچتا رہا۔

تھوڑی دیر بعد باہر دھپ دھپ کی آوازیں آئیں، چوڑیاں کھنکیں دبی دبی سرگوشیاں سی ہوئیں۔ میرے کان کھڑے ہو گئے — دروازے کے قریب کچھ لڑکیوں کی موجودگی آثار لگ رہے تھے۔ بجا

ہو گئے ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔ اتنے میں دروازہ آہستگی سے کھلا۔ ریاض اندر داخل ہوا مگر اکیلا نہیں تھا ایک محترمہ ان کے ہمراہ تھیں۔ عورتوں کی عمر کا اندازہ مجھے کبھی نہیں ہوا۔ خدا گواہ ہے جلن کی ...ت چہرے والی خاتون تھیں۔ سفید لباس تھا اور ہاتھ میں ... تھاما ہوا تھا۔ گویا یہ محترمہ کوئی نرس ورس تھیں۔ میں بوکھلا ہو گیا۔ ریاض ہنستے ہوئے بولا "حسنہ بیگم یہ ہیں آپ کے مریض۔ ذرا ان کا بخار وخار اچھی طرح چیک کیجئے۔ ویسے آپ ... ان کا ٹمپریچر کچھ زیادہ ہائی ہو گیا ہوگا۔ جسے گھٹانے سے ہی اصلی بخار کا پتہ چل سکے گا۔" ریاض کے ریمارکس پر میرا ... جو ادھ موا تھا۔ وہ محترمہ بھی شرما کر اپنی جگہ کھڑی کی کھڑی رہ گئیں۔ ریاض بولا "بیٹھو جمیل یہ حسنہ ہیں۔ یہاں نزدیک ہی ڈاکٹر ... کلینک ہے۔ یہ ان کے یہاں کام کرتی ہیں۔ آج اتفاق سے ... اتی کو بخار ہو گیا۔ یہ انہیں دیکھنے آئی ہوئی تھیں۔ آپ دوسرے اچانک آ ٹپکے۔ چلئے لگے ہاتھوں آپ کا معائنہ بھی ہو جائے۔"

... ت پوچھئے میرا دل کس بری طرح سے دھڑکا۔ ہاتھ پیروں ... لرزا چلے سے تھا جونہی یہ خاتون قریب آئیں۔ میں گھبرا کر ایک ... ہٹنے لگا۔ ریاض نے ایک بھرپور قہقہہ مارا۔ وہ خاتون بھی ... ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ اور لوگ جو یہاں سے یہ تماشہ دیکھ رہے وہ بھی اپنی ہنسی نہ روک سکے۔ میں اور زیادہ نروس ہو گیا۔ ... مجھے نہ پکڑتا تو شاید چھلانگ مار کر باہر بھاگ چکا ہوتا۔ اس ... نے بمشکل تھاما۔ بولا "ابے احمق یہ کوئی چڑیل بھوت تو نہیں ... تھر تھر کانپ رہا ہے۔ سالا ہر جگہ ذلیل کراتا ہے اب سیدھی ... بیٹھو" یہ کہہ کر اس نے مجھے پھر کرسی پر دھکیل دیا۔ میں نے ... خود کو حالات کے حوالے کر دینے کی ہمت پیدا کی اور اس طرح وہ سانحہ رونما ہوا کہ ایک عورت کے نرم و گداز ہاتھوں نے میرا ... چھوا۔ میری کلائی تھامی۔ میرے سینے پر ہاتھ رکھے۔ اور ... سے منہ کھولو" کہہ کر میرے ہونٹوں کو دھیرے سے چھو لیا۔ یہ ... دیا کہ سو وولٹ کے کرنٹ جنہوں نے بخار سے زیادہ میرے ... دہکا دیا۔ کانوں سے گرم گرم لپٹیں نکلنے لگیں۔ تھوڑی دیر کے ... تے گھومنے لگی۔ مگر اس بجائے تو ریاض کو منہ پر ہاتھ رکھے ... کے دیکھا۔ حسنہ نے اسے ذرا گھور کر دیکھا۔ وہ ہنستے ہنستے ... ش ہو گیا۔ معاملی "آپ کو بہت تیز بخار ہے۔ انجکشن لگانا ہوگا۔ پلیز نروس مت ہوئیے۔ میں آپ ہی کی طرح انسان ہوں

ایک نوجوان نے ایک لڑکی کے باپ سے کہا۔ "جناب میں آپ کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور آپ سے اجازت مانگنے آیا ہوں۔"

باپ بولا: "تم لڑکی کی ماں سے ملے ہو؟"

نوجوان نے جواب دیا: "جی ہاں جناب! مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم دونوں شادی کے بعد اس شہر سے بہت دور چلے جائیں گے۔"

کوئی بھوت جن نہیں۔" میں نے پہلی دفعہ زبان کھولی ہوئے سے جواب دیا "میں سمجھا تھا کوئی پری اتر آئی ہے۔" ریاض نے آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھا اسے یقین نہیں آیا تھا کہ یہ جملہ میں نے کہا ہے۔ حسنہ بری طرح سے جھینپ گئی تھی اور شرماتی لڑکی کتنی اچھی نہیں لگتی۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھ رہا تھا اور ریاض مجھے۔

کچھ دیر بعد جب وہ انجکشن لگا کر واپس چلی گئی تو ریاض نے میری پیٹھ پر زور سے ایک دھپ ماری کہنے لگا "یار تو تو چھپا ہوا رستم نکلا۔ لڑکی کو پہلے ہی وار میں چت کر دیا۔ دیکھا نہیں کیسی میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔" میں ذرا اکڑ گیا۔ ریاض چائے لینے اندر چلا گیا۔ اس کی واپسی دس پندرہ منٹ میں ہوئی۔ اس وقفے میں میں نے اس گزرے ہوئے سین کو بار بار دھرایا۔ کتنا لطف آیا۔ کچھ مت پوچھئے۔ ریاض چائے لے کر آیا تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ کہنے لگا "یار تو بہت خوش قسمت، حسنہ کی زبان پر تیرا ہی نام ہے۔ کہہ رہی ہے ایسا لڑکا چراغ لے کے ڈھونڈو تب بھی نہ ملے گا۔" میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ کوئی عورت میرے متعلق یہ رائے رکھتی ہے۔ مجھے یقین نہیں آیا۔ بخار تو ٹھنڈے پسینوں نے اتار دیا تھا یہ سن کر رہا سہا اور بھی جاتا رہا کہ حسنہ میری تعریفیں کر رہی ہے۔ اس کے متعلق یہ پتہ چلا کہ بیاری لڑکی ہے۔ ڈھاکہ فال ہونے سے کچھ عرصہ پہلے یہ گھرانہ لٹ پٹ کر کراچی آباد ہوا ہے۔ مالی حالات دگرگوں تھے۔ اس واسطے لڑکی نے نرسنگ کا پیشہ اپنا لیا۔ بڑی اچھی عادت کی لڑکی ہے۔ اس کی ماں بیٹی کے لئے کسی اچھے لڑکے کی تلاش میں ہے۔ میں

چاہتی ہے کہ اس کے فرض سے جلد سبکدوش ہو جائے تاکہ اپنے لڑکے کی شادی کر سکے۔ میں نے حسنہ کے متعلق ساری تفصیلات معلوم کر لیں۔ صرف اس لئے کہ وہ پہلی عورت تھی جس نے میرے جسم کو چھوا تھا۔ میں بتا نہیں سکتا کہ میری اس وقت سے کیا کیفیت تھی۔ حسنہ کے ذکر سے ہی جسم میں سنسناہٹ سی ہونے لگی تھی۔ ریاض نے لگے سے میرے کان میں یہ فقرہ انڈیل دیا "جانتا ہے تیرا بر دکھاوا ہو چکا ہے لڑکی تجھے پسند کر چکی ہے۔ اب صرف تیری مرضی چاہیئے" میرے کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگیں۔ ریاض کہنے لگا "یار اچھی لڑکی ہے۔ ہم لوگ اسے چھ سات مہینوں سے جانتے ہیں۔ ہمارے گھر ٹیکہ وغیرہ لگانے آتی جاتی رہتی ہے۔ تجھے بھی اس نے پسند کیا ہے اگر تو ہاں کر دے تو ابھی منگنی کرا دوں گا بول بول نا؟" میں نے تھوک نگلتے ہوئے کہا "یار مذاق تو نہیں کر رہا؟" ریاض بولا "یہ مذاق کا کون سا وقت ہے۔ ہم نے زندگی بھر تجھے بیوقوف بنایا ہے۔ یہ ہماری زیادتی تھی لیکن اب معاملہ صرف تیرا ہی نہیں اس لڑکی کا بھی ہے۔ اگر ہماری کوشش سے دو زندگیاں سنور جائیں تو کون کافر ہوگا جو اس معاملے میں مذاق کرے۔"

معاملہ واقعی سنگین ہو چکا تھا۔ حسنہ نے اپنی ماں سے کہہ دیا کہ شادی ہوگی تو اسی لڑکے سے ورنہ ساری عمر کنواری رہوں گی۔ یہ بات ریاض نے مجھے میرے گھر آکر بتائی۔ کہنے لگا "اگر اجازت دے تو تیری والدہ سے بات کروں ـــ" میں نے کہا "وہ ماننے والی نہیں ہیں، پوچھ کر دیکھ لے"۔ والدہ سے ریاض نے سرسری بات کی۔ وہ بولیں "بیٹے جمیل کے لئے لڑکیوں کی کمی نہیں ہے پہلے میری بیٹیوں کے ہاتھ پیلے ہو جائیں پھر جمیل کا سوچوں گی۔ کوئی اچھا سا لڑکا نظر میں ہو تو بتاؤ" ریاض منہ لٹکائے واپس آگیا۔ میں بھی خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ البتہ میرے اندر کہیں لگن جاگ گئی تھی کہ سب سے بغاوت کرنے کو جی چاہنے لگا۔ ریاض مجھے اپنے گھر لے گیا وہاں بہانہ کر کے حسنہ کو بلایا وہ شرماتی لجاتی میرے سامنے آئی۔ کہنے لگی "آپ تو ادھر آتے ہی نہیں کبھی کبھار آتے رہا کریں نا ـــ؟"

اس کے منہ میں زبان نہیں ہے بیچارا اپنی ماں سے ڈرتا ہے۔ اس نے منع کیا ہوا ہے کہ خبردار جو کسی کنواری لڑکی کے سامنے بولا ـــ میں نے ریاض کو کھا جانے والی نظر سے دیکھا اور ذرا اٹک کر بولا "آپ مجھ سے کیوں ملنا چاہتی ہیں ـــ؟" وہ پٹ سے بولی "آپ اچھے جو لگتے ہیں ـــ"

میرے لئے یہ جملہ بہت تھا۔ ویسا اللہ جانے کیسا پڑھا کر والدین سے بغاوت کرنے کی ہمت خود بخود آ گئی ـــ ریاض کے یہاں معاملے طے ہوا۔ میں نے اپنی مجبوریاں بتا دیں۔ حسنہ نے کہا کہ شادی کے بعد وہ خود بخود ٹھیک ہو جائیں گی۔ آپ ہمت کریں۔ سارا انتظام میں خود سنبھال لوں گی۔ کرائے کا مکان لے لیں گے۔ کرایہ میں ادا کروں گی۔ اگر آپ کو اخراجات کی فکر ہے تو میرے پاس اتنا جمع ہو چکا ہے کہ آپ کے اور اپنے کپڑے بنوا سکوں۔ ریاض نے لقمہ دیا "شرم کر یار عورت ہو کر اتنا حوصلہ دکھا رہی ہے اور تو لڑکیوں کی طرح ہائے اللہ اماں ماریں گی کہہ کر پیچھے ہٹ رہا ہے۔ یار کیسا مرد ہے تو۔" میں نے سینہ ٹھونک کر کہا "میں تیار ہوں۔ آج ہی تیار ہوں"۔ ریاض نے تالی بجا دی۔ حسنہ نے شرما کر منہ پر ہاتھ رکھ لئے ـــ اور اس روز سے ٹھیک چوتھے دن میری شادی حسنہ بیگم سے انتہائی خفیہ انداز سے ہو گئی۔ ریاض کے والدین نے ہماری خاصی مدد کی، کرائے کا مکان ڈھونڈ کر دیا۔ شادی کا خرچہ حسنہ نے خود اٹھایا۔ اس کی والدہ اور بھائی نے کچھ سرگرمی نہیں دکھائی جس کی وجہ بعد میں مجھے حسنہ نے بتائی کہ اس کی والدہ بڑی لالچی ہیں وہ نہیں چاہتی تھیں کہ لڑکی کی کمائی سے اتنی جلد ہاتھ دھو بیٹھیں۔ میں نے کہا کہ ریاض تو کہتا تھا وہ تمہاری شادی کے لئے بڑی متفکر رہتی تھیں۔ حسنہ بولی "میں ہر کسی کو یہ بات کیسے بتاتی۔ سچ یہ ہے کہ والدہ مجھے زندگی بھر یونہی رکھنا چاہتی تھیں تاکہ گھر کا خرچہ چلتا رہے۔ اگر ان کی طبیعت میں لالچ نہ ہوتا تو میں شادی کے بعد ان کے ساتھ رہتی۔ علیحدہ مکان اسی لئے لیا ہے کہ وہ میرے معاملات سے دست بردار ہو جائیں۔ بیٹے پر وہ جان چھڑکتی ہیں مگر لڑکیوں کو جانے کیوں کھا جانے والی نظروں سے دیکھتی رہتی ہیں ـــ شکر ہے اب میری زندگی سنور گئی ـــ"

پتہ نہیں حسنہ سچ کہتی تھی یا جھوٹ مگر اس کے اس جملے پر میں قربان ہو گیا۔ گھر میں کسی کو خبر نہیں تھی کہ میں نے شادی کر لی ہے گھر سے چھپ کر جاتا تھا۔ بہانہ یہ تھا کہ دوست کے گھر جا رہا ہوں۔ ہفتے میں ایک دو راتیں گھر سے غائب ہو جاتا۔ امی سے کہہ دیا تھا کہ میری فکر مت کیا کریں میں کبھی کبھار دوستوں کے ہاں ٹھہر جایا کروں گا۔ بہرحال ایک نہ ایک دن تو کھلنا تھا جتنا بچ سکتا تھا بہتر تھا۔ دو مہینے تک ان کے کانوں میں بھنک تک نہیں پڑی۔ تیسرے مہینے میرے ملنے والوں میں سے کسی نے صور پھونک دیا۔ والدہ کو یقین نہیں

۔ والد صاحب یہ کہہ کے روہانسے ہو گئے۔ مجھ سے پوچھا گیا
اپنی شادی شدہ زندگی میں اب اتنا مگن ہو چکا تھا کہ انکار نہ
فضول جانا۔ اقرار کر لیا کہ گناہ ہے تو کر چکا جو سزا چاہے دے
دیجئے۔ حسنہ کو میں نہیں چھوڑ سکتا۔ والد صاحب بولے "ٹھیک
ہے برخوردار اب ہم تمہارے کچھ نہیں لگتے جو کچھ ہے وہ حسنہ ہی ہے
بندہ اس گھر سے تمہارا کوئی تعلق نہیں جاؤ اسی وقت چلے جاؤ۔"
میں نہیں جانتا تھا کہ اتنی جلدی خلاصی ہو جائے گی۔ ابھی دو
پہروں میں گھر کو خدا حافظ کہہ کر نکل آیا — نشیمن میرا آباد تھا مجھے
کس کی پرواہ تھی۔ حسنہ نے کھلے بانہوں سے میرا استقبال کیا
اور میں اس میں کھو کر دنیا کا سارا دکھ فراموش کر بیٹھا۔

دو سال گزرے حالات نے کروٹ لی۔ میں دو بچیوں کا
باپ بن گیا۔ ذمہ داریوں میں اضافہ ہو گیا۔ یہ دو سال بڑے
اچھے گزرے تھے۔ میری آمدنی میں ترقی ہو گئی تھی۔ اب میں بیوی
بچیوں کا خرچ اچھی طرح چلا سکتا تھا۔ حسنہ پر دوہری ذمہ داری
تھی جو مجھے بہت کھلتی تھی کہ وہ گھر بار بھی سنبھالے اور میری آمدنی
بڑھانے کی خاطر نوکری بھی کرے۔ اللہ نے میری بہتر جگہ پوسٹنگ
کروا دی تو میں پھر کیوں نہ اس کے آرام کا سوچتا۔ حسنہ سے کہا
کہ اب تم ملازمت چھوڑ دو — کہنے لگی "نہیں بچیوں کو بڑا ہونا
ہے ان کے لئے کچھ ابھی سے پس انداز کریں گے تبھی کچھ بنے گا۔"
میں نے کہا "حسنہ اب میں اپنی ذمہ داریاں محسوس کرنے والا
مرد ہوں بچیاں میری ہیں ان کی برائی بھلائی کی فکر مجھے بھی ہے۔ تم
مالی طور پر بے فکر ہو جاؤ، میں انشاء اللہ اس معاملے میں تمہیں کبھی
تکلیف نہیں ہونے دوں گا — وہ ٹال مٹول کرنے لگی کہ ابھی ایک
سال اور کرنے دو۔ اب آپ لوگ تو جانتے ہوں گے کہ مرد کتنا شکی
ہوتا ہے۔ ڈاکٹر سے اس کا گھل مل کر بیٹھنا نجانے پانی ساتھ پیتا
مجھے یوں بھی اچھا نہیں لگتا تھا مجھے بے حد غصہ آیا کہ جسمانی تکلیف
کے باوجود یہ ملازمت کیوں نہیں چھوڑتی، ضرور کوئی چکر ہے بس
دماغ میں یہ خیال بیٹھ گیا۔ خوب محنت کر کے ایک ہزار اس کی
ہتھیلی پر رکھے۔ بولا "لو اتنی آمدنی کم ہے کیا اب بھی ملازمت
نہیں چھوڑو گی تم" وہ نہ مانی، ہمارا یہ معاملہ اب زیادہ بگڑنے لگا
تھا۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ اگر ملازمت نہیں چھوڑتی تو مجھے چھوڑ
دو۔ وہ بہت دن اکھڑی اکھڑی رہی۔ میں نے اپنا موقف نہیں
بدلا۔ نتیجتاً اسے نوکری چھوڑنی پڑی لیکن اس کے بدلے میں کچھ
عجیب سی تبدیلی آ گئی۔ اسی دوران میرے والدین نے میری خطا
معاف کر کے مجھے گلے سے لگا لیا تھا اور میں چاہتا تھا کہ وہ میرے
ساتھ رہیں۔ والد صاحب بہت کمزور ہو گئے تھے۔ بہنوں کی شادی
کے معاملات طے ہو چکے تھے اور میری تنخواہ اللہ کے کرم سے اتنی
ہو گئی تھی کہ میں ان کی مدد کر سکوں لیکن حسنہ جو پہلے اس معاملے میں
میری ہم نوا تھی اب یکسر بدل گئی۔ بات بات پر ساس نندوں کی
برائیاں کرتی۔ ان سے ایسا رویہ اختیار کر لیا کہ روز جھگڑے ہونے
لگے۔ میں نے باز پرس کی تو کہنے لگی "گھر میں بیٹھی ہوں تو گھر کے
معاملات میں بھی دخل اندازی کرنے کا حق رکھتی ہوں۔ یہ گھر میرا
اور میری بچیوں کا ہے۔ میں نے تمہاری ساس یا نندوں سے شادی
نہیں کی ہے کہ انہیں بھی بھگتوں" — میں دنگ رہ گیا۔ وہ عورت
جو ساس نندوں کو اپنانے کے لئے ہر ممکن کوشش کیا کرتی تھی اب
ان کے خون کی پیاسی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس نے مصنوعی
چولا پہن رکھا تھا جو اتر چکا تھا۔ اس کی خوش اخلاقی محبت اور
خلوص سب آہستہ آہستہ رخصت ہو گئے اور وہ گھر جو کبھی پہلے
میرے لئے جنت تھا اب جہنم بن گیا — میں نے بھی فیصلہ کر لیا
تھا کہ چاہے یہ کچھ بھی کرے ملازمت کی اجازت اسے کبھی نہیں
دوں گا۔ کلینک میں کچھ مرد ڈاکٹر اور ہر قسم کے مریضوں کے
ساتھ خوش گپیاں کرنے میں وہ خوش رہتی تھی۔ گھر کی ذمہ داریوں
سے اس کا دم گھٹتا تھا۔ یہ اچھی بیوی کی نشانیاں نہیں ہیں۔ میرا
خیال تھا کچھ دنوں بعد یہ خود بخود سدھر جائے گی۔ آزاد پنچھی قفس
میں کچھ دن تو پھڑپھڑاتا ہی ہے۔ لیکن یہ عورت تو دن بدن چڑچڑی
ہوتی گئی — اور میں خون کے گھونٹ پی کر رہا گھر کے سکون کے لئے
ملازمت چھڑائی تھی، مگر یہ بالکل ہی حماقت ہو گیا۔

شادی کو تین سال سے زیادہ عرصہ ہو چکا تھا اسے ملازمت
چھوڑے چھ ماہ ہو چکے تھے، ہنوز حالات ویسے ہی تھے کہ ایک
روز میرا ایک دوست سلطان مجھ سے ملنے آیا۔ یہ میرے اسکول
کے ساتھیوں میں سے تھا۔ میٹرک کے بعد اس کو یو کے میں ملازمت
مل گئی تھی۔ اس کے گھر والے وہیں شفٹ ہو گئے۔ میری شادی کا
بھی اسے علم نہیں تھا کراچی میں اس کے رشتے داروں کی شادی
تھی اس میں شرکت کے لئے آیا۔ میرا پتہ پوچھ کر مجھ سے ملنے بھی آ گیا
میں اس سے انتہائی گرم جوشی سے ملا مجھے اس نے شادی کا بلاوا
دیا کہنے لگا "یار تمہیں بھی دکھا دوں میں سمجھو تم شادی میں شرکت

گیلی تھی۔ میں نے البم اسے دکھایا۔ حسنہ بچپن کے ساتھ اپنے میکے گئی ہوئی تھی ورنہ اسے ملوا دیتا۔ سلطان نے غیر معمولی دلچسپی اور انہماک سے تصویریں دیکھیں۔ مجھے اس کا یوں جھک جھک کر ایک ہی تصویر کو بار بار دیکھنا گراں بھی گزرا۔ جسے سلطان نے نوٹ کر لیا۔ کہنے لگا "جمیل یار مجھے تو حیرت ہو رہی ہے" میں نے پوچھا "کیسی حیرت؟" کہنے لگا "یار خفا مت کرنا۔ میں ایک اتفاق پر حیرت زدہ ہو رہا ہوں تمہاری بیوی کی شکل میرے ایک دوست فاضل کی وائف سے بہت ملتی ہے۔ فاضل میرا بہاری دوست ہے۔ لائل پور میں فرم کی طرف سے تین مہینے کے لئے میں ڈھاکہ گیا تھا وہاں فاضل سے میری دوستی ہوئی تھی۔ اس زمانے میں اس کا اپنی بیوی سے جھگڑا چل رہا تھا۔ وہ بہت پریشان رہتا تھا۔ اس کی بیوی میکے میں زیادہ رہتی تھی جس سے فاضل بدظن ہو گیا۔ ساس بیٹی کی حمایت کرتی تھی۔ معاملہ بہت خراب ہو گیا۔ میں نے ایک دو دفعہ اس کی بیوی کو دیکھا۔ چار لڑکیاں بھی تھیں مگر خاصی خوبصورت اور کم عمر لگتی تھی۔ معاف کرنا یار تمہاری وائف ہو بہو اس کی تصویر ہے کہیں ایسا تو نہیں کہ بھابی کی اس سے رشتے داری ہو؟" میں نے دماغ پر زور دیا۔ میری کوئی سالی نہیں تھی۔ اور حسنہ نے اپنے کسی رشتے داروں کا ذکر مجھ سے کیا تھا۔ میں نے کبھی پوچھا بھی تو کہہ دیتی۔ "کچھ انڈیا میں ہیں جو دو چار یہاں ہیں ان سے ہمارا ملنا جلنا نہیں ہے۔ قریبی رشتے دار ڈھاکہ میں مارے گئے۔ یہی اس کی والدہ کہتی تھیں۔ میں نے سلطان سے کہا "کہ یہاں تک تو بات درست ہے کہ حسنہ کا تعلق ڈھاکہ سے ہے اور جنگ میں اس کے رشتے دار مارے گئے ہیں ہو سکتا ہے وہ عورت حسنہ کی کزن وغیرہ ہو۔ میں حسنہ سے پوچھوں گا۔"

میں نے شام کو حسنہ سے پوچھا "تم کسی فاضل کو جانتی ہو۔؟" وہ ہڑبڑا کر بولی "کون فاضل؟ میں نہیں جانتی فاضل واضل کو۔" یہ کہہ کر اٹھ کر باہر چلی گئی۔ اس کے گڑبڑانے سے مجھے بڑی حیرت ہوئی اس کا مطلب ہوا کہ یہ اس فیملی کو جانتی ہے۔ مگر بتانا نہیں چاہتی۔ طبیعت میں کھوج پیدا ہوا۔ بار بار کریدتا تو وہ محتاط ہو جاتی۔ اگلے روز میں خود سلطان سے ملنے گیا۔ وہ اپنے عزیزوں کے گھر ٹھہرا ہوا تھا اس لئے کھل کر بات نہیں کر سکتا تھا۔ اسے لیکر ریستوران میں آ گیا۔ اسے بتایا کہ کل تمہاری بھابی سے فاضل کی بات پوچھی تو وہ گڑبڑا سی گئی۔ اب میں معاملے کی تہہ میں جانا چاہتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے وہ اب تک مجھ سے اپنے گھر کے حالات چھپاتی رہی ہے" سلطان کہنے لگا "مجھے بھابی سے علاوہ ایں چالاکی سے اصل بات اگلوانا" میں نے سلطان کو ساتھ لیا گھر آ گیا۔ حسنہ سے چائے کا کہا وہ چائے لے کر جونہی کمرے میں آئی سلطان گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ حسنہ چائے رکھ کر واپس چلی گئی۔ اس نے سلطان کی گھبراہٹ کا کوئی نوٹس نہیں لیا تھا۔ میں نے سلطان کے چہرے پر پریشانی کی لکیریں دیکھیں۔ کہنے لگا "جمیل اتنی مشابہت دنیا میں نہیں ہوتی یہ بھابی تو ہو بہو وہی ہیں۔ معمولی سا عمر میں فرق ہے۔ مگر یار۔" وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ پھر بولا "جمیل مجھے تو دال میں کچھ کالا نظر آتا ہے۔ تیری شادی بھی ہنگامی انداز سے ہوئی ہے۔" میرا سر گھومنے لگا۔ پتہ نہیں سلطان کیا کہنا چاہ رہا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ "سلطان تجھے دیکھ کر حسنہ نے تو کسی پہچان کا تاثر نہیں دیا۔" سلطان بولا "تجھے فاضل کی وائف نے نہیں دیکھا تھا۔ میں نے اسے کھڑکی سے آتے جاتے دو تین مرتبہ دیکھا تھا۔" یہ کہہ کر سلطان خاموش ہو گیا اندرونی طور پر میں بھی اضطراب کا شکار ہو گیا تھا۔ سلطان کہنے لگا۔ "اگر تجھے اپنی بیوی سے بہت محبت ہے تو اس معاملے پر مٹی ڈال لیکن اگر حقیقی حالات جاننا چاہتا ہے تو بتا۔ میں تجھے یہ بتا دوں کہ فاضل کراچی آ چکا ہے اور یہاں بینک میں ملازم ہے تجھے ساتھ لے چلتا ہوں وہ گتھی سلجھا دے گا۔ مجھے ابھی اس کی آمد کا پرسوں ہی پتہ چلا ہے کل ملنے جاؤں گا چاہو تو میرے ساتھ چلنا۔" میں فوراً تیار ہو گیا۔

دوسرے روز ہم دونوں بینک پہنچے۔ میرے دل کی حالت کا اندازہ آپ خود کر لیجئے۔ ایک نفرت آنے والا زلزلہ لوٹنے والا پہاڑی تھا کہ زمین میں جانے کیا نکل آئے۔ فاضل سیٹ پر نہ تھا۔ اس کے کولیگ نے بتایا کہ کینٹین میں کھانا کھانے گیا ہے۔ مجھ سے انتظار نہیں کر سکا۔ سلطان مجھے کینٹین لے گیا۔ کونے کی میز ہی وہ مل گیا۔ سلطان کو دیکھ کر کھانا کھاتے کھاتے اٹھ گیا اور طرح سے لپٹ گیا۔ قصہ مختصر کہ ہم سلطان کو لے کر بینک سے باہر آ گئے۔ میکلوڈ روڈ پہ کیفے یاسمین میں جا بیٹھے تب سلطان نے گھریلو حالات پوچھے۔ فاضل نے بتایا کہ اس کی بیوی خانم ڈھاکہ سے چلی گئی تھی۔ ڈھاکہ میں ہنگامے شروع ہو چکے اس لئے اسے تلاش کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ کسی نے بتایا پوری فیملی کراچی چلی گئی ہے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد جنگ چھڑ گئی۔


BURQ
NEW
BURQ
نیا برق
لاجواب
ڈٹیرجنٹ
صاف
ترین
دھلائی
dsf
برق کا استعمال گویا پیسے کی بچت - وقت کی بچت
دادا سوپ فیکٹری لمیٹڈ - کراچی

ہم رنگ تیاری ہو گئے۔ پاکستان بننے کے بعد مجھے بینک میں ملازمت مل گئی۔ بیوی کو تلاش کرنے کی خواہش تھی ہی نہیں اس لئے دوسری شادی کر لی۔ صاحب زندگی آرام سے گزر رہی ہے۔ پہلی بیوی سے چار لڑکیاں تھیں وہ میرے پاس ہیں۔ دوسری سے ابھی کوئی اولاد نہیں ہے — میں نے یہ کہانی سن کر فوراً جیب سے بٹوا نکال کر حسنہ کی تصویر اس کے سامنے رکھ دی پوچھا "اسے جانتے ہو؟" فاضل کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا — بولا "یہی تو ہے وہ سالی۔ اسے تمہیں یہ فوٹو کہاں سے ملی ہے —" تو میں نے کہا "تم کبھی ہمارے گھر جائے پر آنا پھر پوری تفصیل بتاؤں گا" سلطان نے آنکھ مار کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا — اور خود کہنے لگا "فاضل ہاں تم نے کسی شخص سے شادی رچالی ہے خود کو کنواری ظاہر کیا ہے جبکہ میرا خیال ہے کہ تم نے اسے طلاق نہیں دی تھی" فاضل کہنے لگا "طلاق تو دینے کی نوبت نہیں آئی — مزاج کی اتنی کڑوی عورت تھی کہ ہر وقت جھگڑا رہا۔ وہ زیادہ وقت میکے میں رہتی تھی اور بچیوں کی بھی پرواہ نہیں تھی اور وہاں اس کے ایک رشتے دار کا آنا جانا تھا جو مجھے پسند نہیں تھا مگر شاید میری بیوی اسے پسند کرتی تھی۔ اس بات پر جھگڑا ہوتا رہا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ طلاق میں بھی نہیں دوں گا۔ مگر اس کی نوبت آنے سے پہلے یہ پوری فیملی چپکے سے بھاگ گئی۔ اور اب اگر یہاں اس نے شادی کر لی ہے تو مجھے اس کا ٹھکانا تو سے ملنے کو جی چاہ رہا ہے جس نے چار بچوں کی ماں کو کنواری لڑکی سمجھ کر بیاہ رچالیا اور نباہ رہا ہے" میرا چہرا زرد پڑ گیا اور سلطان کی ہنسی چھوٹ گئی۔

گھر آنے کے بعد میں دیر تک دیوانوں کی طرح ٹہلتا رہا۔ میں واقعی کاٹھ کا الو ہی ہوں۔ ذہن کو ایک خیال تقویت دیتا تھا کہ شاید یہ مشابہت اتفاقی ہو۔ لیکن فاضل کا یہ کہنا "ہاں یار یہ سلیمہ ہی ہے کیا اب میں اسے بھی نہ پہچانوں گا۔" دماغ میں دھماکہ سا کر رہا تھا۔ ضبط نہ ہوا تو حسنہ کو بلا کر صاف پوچھ لیا کہ تمہارا پہلا نام سلیمہ تھا۔ وہ کہنے لگی "نہیں تو؟" میں نے کہا "تمہارے سرٹیفکیٹ کہاں ہیں" تو کہنے لگی "وہ ڈھاکے کے ہنگاموں کی نذر ہو گئے" میں نے پوچھا "تم نے نرسنگ کی ٹریننگ کہاں سے لی۔" تو کہنے لگی "باقاعدہ ٹریننگ نہیں لی۔ ڈاکٹر صاحب نے کام سکھا دیا تھا" میں جھلا گیا پہلے یہ بات اس نے مجھ سے کبھی نہیں کہی تھی غصے سے کانپتے ہوئے بولا "دیکھو حسنہ مجھ سے فراڈ مت کرو۔ یہ صحیح ہے کہ جس ملک میں ہم رہتے ہیں میں عورتوں کے معاملے میں اناڑی

اور خاصا احمق قسم کا آدمی تھا۔ تمہارے جانے سے پہلے بھی ... اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں ہمیشہ تمہاری ... ہیں۔ اگر کہو تو بلا لاؤں۔؟"

میرا ان سے پہلے کی بجائے ... "تمہیں کوئی حق ہے ... خلاف بھڑکا رہا ہے میں بہت عرصے سے تمہارے تیور بدلے ہوئے دیکھ رہی ہوں۔ اگر تمہیں میری بات کا یقین نہیں تو لاؤ قرآن میں اس پہ ہاتھ رکھ دوں" اس کے رونے دھونے اور قرآن کی قسم کھانے سے پہلی چوٹ ... لگا۔ لیکن صاحب جب تک کانٹا دل سے نہ نکل جاتا مجھے چین کہاں ملنا تھا۔ سلطان ... گیا تھا اس نے مجھے مشورہ دیا کہ ایسا کرو تم بھابی کو لے کر میرے ساتھ فاضل کے گھر چلو ... رہتا ہے بھابی سے کچھ ذکر مت کرنا۔ جب آمنے سامنے ہوں گے تو بھانڈا خود کھل جائے گا"

ترکیب معقول تھی۔ میں نے خود کو دو چار دن نارمل رکھا۔ جیسے میرا شک دور ہو گیا ہو۔ پھر موقع دیکھ کر حسنہ کو راضی کر لیا کہ وہ ایک دوست کی دعوت میں میرے ساتھ چلے۔ سلطان پہلے فاضل کے گھر پہنچ چکا تھا۔ میں حسنہ کو لے کر مقررہ جگہ پر پہنچا حسنہ میرے کہنے سننے سے برقعہ اوڑھنے لگی تھی اب اتارنے کا کہتا تو اسے شک ہو جاتا۔ اتفاق سے دروازہ کھولنے فاضل آیا حسنہ نے اسے دیکھتے ہی فوراً نقاب گرا دیا۔ فاضل چونکا ضرور مگر شاید واضح طور پر اسے نہ دیکھ سکا تھا اس لئے کوئی تاثر نہ دے سکا۔ حسنہ کو شدید پردہ کرتے دیکھ کر پھر میں ہمت نہ ہوئی کہ اسے سامنے آنے پر مجبور کرتا۔ اور وہ فاضل کی بیوی کے پاس چلی گئی۔ اور میں سلطان کے پاس بیٹھا رہا۔ فاضل نے اپنی بیوی کا ہم سے پردہ کرایا تھا اس لئے بھلا میں کیسے حسنہ کو اسے سامنے بلاتا۔ کھانا بھی الگ الگ کھانا پڑا سلطان کی اسکیم فیل ہو گئی۔ واپسی پہ میں حسنہ کو غور سے دیکھتا رہا۔ وہ غیر معمولی طور پر چپ تھی۔ میں نے بھی زیادہ بات نہیں کی۔ صبح اس کی آنکھیں سرخ اور سوجی ہوئی تھیں۔ جیسے روتی رہی ہو۔ میں نے پوچھا تو بھڑک کر بولی "کیوں کیا رونے یا سونے جاگنے پر پابندی لگا دو گے" اس کا تلخ جواب سن کر میں مسکرا دیا۔ اس کا مطلب صاف تھا کہ اس کے دل میں چور تھا۔ اسی دن سلطان نے بتایا کہ کل رات کھانے کے دوران فاضل کی چھوٹی لڑکی کے ہاتھ سے پلیٹ گر کر ٹوٹ گئی۔ فاضل کی بیوی نے اسے پیٹ دیا۔ اور تمہاری بیوی نے بھاگ کر اسے پکڑ لیا اور رونے لگی۔ فاضل کی بیوی بہت شرمندہ ہو گئی۔ اس وقت

مل کر بتایا میں رات فاضل کے یہاں رہا تھا اس نے مجھ سے
ذکر کیا۔ معاملہ پھر رہا تھا کہ کیا یہ عورت سلیمہ نہیں ... مطلب
سا ہے۔

اب میرا راستہ صاف تھا کہ اب ... ہو گیا ہے کہ طلاق کے بغیر
اس عورت کو اپنی بیوی بنائے ہوئے تھا اگر یہ بدبخت شادی سے
پہلے مجھے اپنے سارے حالات سچ بتا دیتی تو میں شائستہ صاحب بھی
دیتا قانونی اور شرعی طور پر اس کی علیحدگی کرا کر بندوبست
بھی کرا دیتا۔

مگر اب میں کسی صورت میں اسے معاف کرنے کو تیار نہیں
تھا۔ مسئلہ صرف یہ رہ گیا تھا کہ وہ اپنے منہ سے اقرار کرے اور لفظ
... یہ پیدائشی کلاکار عورت اپنے چہرے سے بھی کوئی تاثر نہیں
دے رہی تھی۔ چاہتا تو اس کی چٹیا پکڑتا مگر بات بڑھانے
سے میری جگ ہنسائی ... میں چاہتا تھا کہ یہ عورت خود اقرار کرے اور
میں خاموشی سے اس کی زندگی سے علیحدہ ہو جاؤں۔

تیسرے دن سلطان نے بتایا کہ تمہاری بیوی صبح فاضل
کے گھر گئی تھی۔ بچوں کو کچھ پیسے دے کر ... سلطان
کہا کہ یار کچھ ایسا بندوبست کرو۔ وہ فاضل کے گھر جائے اور مجھے اطلاع
وقت پر مل جائے۔ سلطان ہر طرح سے میری مدد کر رہا تھا۔ دو تین
روز بعد اس نے مجھے آفس فون کیا کہ فوراً فاضل کے گھر پہنچ جاؤ۔
میں اسکوٹر پر بیٹھ کر سیدھا وہاں پہنچا۔ گیٹ پر سلطان کھڑا
ملا۔ مجھے لے کر کوارٹروں میں آ گیا اور ہم دونوں فاضل کے سامنے
والے کوارٹر میں آ بیٹھے۔ اس نے بتایا کہ شہناز اندر ہی ہے۔ چند
منٹ بعد شہناز کمرے سے نکلی ادھر ادھر دیکھتی گیٹ کی طرف
لپکی اور میں نے اسے جا لیا۔ مجھے دیکھ کر اس نے قدم تیز کر دیئے مگر اب
اس کے بھاگنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ میں نے ٹیکسی روکی اسکوٹر پہلے
سلطان کے حوالے کر دیا تھا۔ ظاہر ہے میں اس حالت میں اسے اسکوٹر
پر بٹھا کر ... تو نہیں لے جا سکتا تھا ٹیکسی میں بٹھا کر اسے گھر لے آیا۔
راستے بھر وہ بھی چپ رہی میں بھی ہونٹ کاٹتا رہا۔ اس کی ...
دیکھئے کہ گھر آ کر بھی اس کا یہی موقف رہا کہ میں فاضل کی ... سے
ملنے گئی تھی۔ میں اسی ... سے ... گیا تھا اس وقت سلطان
اسکوٹر لے آیا میں نے اس سے کہا کہ یار بس اب یہ گیم ختم ہو جانا چاہیے
تم فاضل کو اسکوٹر پر بٹھا کر لے آؤ۔ یہ عورت ایسی ہی کچھ بتانے سے
کچھ نہیں مانے گی۔



سلطان فاضل کو آدھ گھنٹے میں گھر لے آیا۔ اس نے راستے میں
ساری بات بتا دی تھی۔ اس دن کا نقشہ آپ اپنی نظروں میں خود کھینچ
لیں جب وہ اور سلطان دبے پاؤں اندر داخل ہوئے ہوں گے۔
دروازہ میں نے پہلے سے کھلا رکھا تھا جس سے صحن میں چارپائی
پر بیٹھی شہناز ... فاضل اور سلطان کی آہٹ پر چونکی۔
فاضل اسے دیکھ کر بے ساختہ بول اٹھا۔ سلیمہ تم یہاں! شہناز
پہلے تو ... پھر ... اور منہ چھپا کر رونے لگی۔

اس طرح اس سارے ڈرامے کا ڈراپ سین ہو گیا۔

اب یار کہاں تھا۔ فاضل نے بعد میں مجھے کہا کہ میں اپنی طرف سے
اب طلاق دیتا ہوں۔ ... صاحب نے ... باتیں ... کہ خدا کے
لئے معاف کر دو۔ میں اگر سچ بات بتا دیتی تو تم مجھ سے شادی نہ
کرتے مگر اس نکاح کی میں کوئی بات سننے پر تیار نہیں تھا میں
سیدھا سادا آدمی تھا جسے اس نے بے وقوف بنا رکھا۔ میں مذہبی
خیال کا آدمی ہوں اس تعلق سے خود پر لعنتیں بھیجتا ہوں کہ ایک
شادی شدہ عورت سے نکاح کیا جو جائز ہرگز نہیں مگر اب تک
یہ گناہ سرزد ہوتا رہا۔ اور یہ بچیاں اللہ میری توبہ؟

اس سے علیحدگی کر چکا ہوں۔ طلاق کیا دیتا میرا تو نکاح
ہی نہیں ہوا تھا۔ اپنی دونوں بچیوں کو اپنے پاس رکھ لیا۔ تیسری
بچی علیحدگی کے دو ماہ بعد ہوئی وہ اپنی ماں ہی کے پاس ہے۔
میں نے دوسری شادی کر لی ہے تاکہ پھر اس عورت کی طرف راغب
نہ ہو جاؤں۔ ... دن ... اور ... کی بات یہ کہ
... بھی بھول گئی ہے ... عورت ہے کہ کوئی ... تب بھی
... ہو گا۔

جمیل انور کراچی

اس بھری برسات میں

میرے تھانے کے ڈی ایس پی دوست سلیمان جنجوعہ کا ٹرانسفر ہوا تو وہ جاتے ہوئے اپنی نوعمر ملازمہ شہزادی ہمیں سونپ گئے۔ امی نے بہت دنوں سے واویلا مچایا ہوا تھا کہ خدا کے واسطے کسی نوکر کا بندوبست کردو میرے تو ہاتھوں کے پور پھٹنے لگے برتن دھوتے دھوتے۔ یہاں کسی اچھی ملازمہ یا بااعتبار ملازم کا ملنا معجزے سے کم نہیں ہوتا۔ جو ملا بھی تو تین چار دنوں میں ہاتھ کی صفائی دکھا کر بھاگ گیا۔ تنہا ان کی گرتی ہوئی واسی ہوتی تھی۔ کام کی زیادتی نے امی کی صحت پر بُرا اثر ڈالا تھا ایسے ہی کمزوری میں کام کے بوجھ نے اور سارا مرا کردیا۔ امی نے اپنے ملنے جلنے والوں سے ذکر کیا ہوا تھا۔ سلیمان صاحب کا ٹرانسفر ہوگیا۔

وہاں ملازم کا ملنا پرابلم نہیں تھا۔ شاید اسی واسطے وہ اپنی ملازمہ ہمیں دے گئے تھے۔ بعد میں انہوں نے اس کی کہانی سنائی کہ یہ لڑکی لاوارث ہے۔ اس کی ماں بیوہ تھی۔ شوہر کا جیل میں انتقال ہوگیا تھا۔ وہ اپنے میاں سے ملنے جیل آتی تھی۔ اس کے انتقال کے بعد اس کی لاش لینے آئی۔ اس کے بلبلا کر رونے اور بین کرنے سے سلیمان صاحب کو رحم آگیا۔ لاش کو دفنانے کا انتظام سلیمان صاحب نے خود کیا۔ شہزادی اس وقت چھ سات برس کی تھی۔ دونوں ماں بیٹی کو سلیمان صاحب نے اپنے گھر میں پناہ دے دی۔ وہ گھر کا کام کاج کرکے مالک کو خوش رکھنے لگیں۔ اس طرح عزت سے روٹی کپڑے کا بندوبست ہو گیا۔ بڑی باکردار عورت تھی کبھی ہاتھ نہیں پھیلایا چوری نہیں کی اور نہ ہی کسی سے آنکھ مٹکا کیا۔ اپنے کام سے کام رکھا۔ رات کو اپنی بیٹی کو کلیجے سے لگا کر اپنی کوٹھڑی میں جا گھستی۔ چار سال زندہ رہی صحت کو گھن لگ گیا تھا معمولی سا بخار رہا اور چٹ پٹ ہوگئی۔ شہزادی دنیا بھر میں بے آسرا ہوگئی۔ گیارہ بارہ برس کی بچی کو سلیمان صاحب کہاں پھینکتے۔ گھر میں جو ماں کرتی تھی اسی کام پہ لگا دیا۔ روٹی کپڑا حسب معمول

دوشب

[illegible] سال کی [illegible] خوبصورت [illegible] خوبصورتی کی کوئی چھاپ تھی نہ حسن آتش و گلفام تھے لیکن جب جوان ہوئی تو قد اور جسم کی خوبصورتی پر حشر اٹھنے لگے۔ [illegible] غضب کے نکھار ہو گئے۔ کُرتے سے سینہ اور کمر جیسی دو موٹی چادر میں چھپائے رکھتی تھی مگر سلیمان صاحب کی تیز نظروں نے اس کی چڑھتی جوانی کا شور سن لیا تھا۔ جلد ہی بھانپ لیا تھا [illegible] کیونکہ گھر میں لڑکے جوان ہو رہے تھے اور پھر جوان بے سہارا چھوکری کی حفاظت آسان کام نہیں۔ جب ٹرانسفر ہوا تو انہیں موقع ہاتھ آگیا [illegible] کسی قرینے میں چھوڑ جاؤ۔ ہم کہاں تک ساتھ لیے لیے پھریں گے۔ سلیمان بیگم کے حوالے کر گئے جس وقت وہ ہمارے گھر میں داخل ہوئی موٹے سوتی کپڑے پہنے ہوئے تھی میلے کچیلے کپڑوں اور الجھے ہوئے بالوں میں اس کا سراپا انتہائی بے رونق لگ رہا تھا۔ امی نے سر سے پاؤں تک دیکھا [illegible] کام کا تھا۔ اس لیے انہوں نے زیادہ پوچھ گچھ [illegible] نہیں سمجھا۔ میرے کالج کے ٹیسٹ ہو رہے تھے اس لیے میں نے بھی اس کا زیادہ نوٹس نہیں لیا۔

دوسرے روز میں سہ پہر کو کالج سے لوٹی تو ایک نکھری نکھری سی عورت نے گھر میں ہلکی سی روشنی بھر دی تھی۔ امی نے اسے پہننے کے لیے کپڑے دے دیئے تھے جو اس کے جسم پر تنگ تھے اور اس کے جسمانی خطوط ابھر آئے تھے۔ دھلے دھلائے بالوں کا ہلکا سنہری پن چمک اٹھا تھا اور چہرے کی معصومیت چغلی کھا رہی تھی کہ لڑکی شریف اور پاک دامن ہے۔ امی نے بتایا اس کے اجلے روپ سے ڈر کر اسے موٹی چادر دے دی ہے کہ پہنے رکھے [illegible] اس نے بڑی حیرت سے امی کو دیکھا پھر شاید کر گئی اور [illegible] یہ لڑکی اچھی لگی مگر اتنی فرصت نہیں تھی کہ اس سے کچھ پوچھ گچھ کرتی بھی امی کہتی ہیں لڑکیوں سے زیادہ فری ہو جاؤ تو وہ سر پہ چڑھ جاتے ہیں۔ کالج سے واپسی پر امی کی گرجدار آواز پہلے [illegible] دیکھی۔ پھر کئی کی طرح وہ پورے گھر میں گھومتی رہتی تھی [illegible] صاف کرتی رہتی تھی اور امی [illegible] کام چھوڑ کر سوئیاں نکالنے بیٹھ گئی [illegible] ہوتے ہیں امی دعا دیتیں [illegible] دوشیزہ [illegible] سارے کام [illegible]

[illegible]

بلا سوال نہیں ہوا [illegible] سے پہلے [illegible]

پیار ہے۔ سب جانتی ہیں [illegible] انتظار ہی میں [illegible]

نکالا اور لڑکیوں [illegible] سے پہلے اس [illegible]

[illegible]

[illegible] میری اس [illegible]

[illegible]

[illegible]

جاؤ جا کر سو جاؤ۔ [illegible]

بات کرنے کی میں نے کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔

میری خالہ آمنہ کی لڑکی [illegible] میری دوست بن گئی اور کلاس فیلو بھی [illegible] ہمارے ساتھ گھر آیا کرتی تھی جب زیادہ دیر ہو جاتی تو نظام بھائی [illegible] ان کا سوتیلا بھائی تھا۔ خالہ کی جب شادی ہو کر [illegible] تب [illegible] بیٹا بھی ہے شادی سے پہلے [illegible] پہلی رات یہ راز اپنی بیوی کو بتایا کہ اس کی ماں کا انتقال ہو چکا ہے اور یہ شادی انہوں نے گھر والوں [illegible] بیوی کو سب سے چھپا کر رکھا [illegible] پیدائش [illegible] تب بچہ گھر لے آئے [illegible] کہ یہ بچہ [illegible] دوسری شادی تک یہ خبر چھپاتے رکھی اور پہلی رات بچہ بیوی کی گود میں ڈال دیا۔ خالہ کو سوتیلے بیٹے کا انکشاف [illegible] کو قبول نہیں کیا [illegible] گیا۔ خالہ [illegible] حرکت [illegible] تھے وہ بھی بچپن میں [illegible] جہاں [illegible] اس کی [illegible] ترقی کر گئی۔ [illegible] لڑکیوں کو سب کے سامنے [illegible] میں [illegible] لڑکیوں کے سرپرستوں [illegible] نظام [illegible]

[illegible]

[illegible] شہزادی [illegible]

[illegible]

نظام نے چونک کر مجھے دیکھا اس کے چہرے پر پہلی دفعہ میں نے خفت کے کچھ اثرات دیکھے [illegible] شہزادی [illegible] اس کی [illegible] نظام [illegible] [illegible]

[illegible]

پچھلا ماہ فریدہ کے ہاں گزرا تھا بہت کم اسے یہاں آنے سے روک رہی ہیں۔ نہیں معلوم کہ خالہ نے اسے کیا کہا۔ وقتی طور پر اس کا آنا بند ہو گیا۔ شہزادی بانہوں پر جو چھٹنے لگی۔ کام کاج سے اس کی غیر معمولی دلچسپی کم ہونے لگی۔ وہ کھوئی کھوئی سی پھرتی جیسے اس کی کوئی چیز کھو گئی ہو۔ میرا خیال ہے امی نے زیادتی کی تھی کیونکہ بندشیں تو جذبوں کو عریاں کر ڈالتی ہیں۔ شہزادی کی بے تابی اس کے دل کا افسانہ سب کو سنانے لگی۔ ادھر خالہ نے بتایا کہ نظام میں خاصی تبدیلی آ گئی ہے۔ اس نے بیہودہ آوارگی ترک کر دی ہے زیادہ تر اپنے کمرے میں گھسا رہتا ہے۔ کھانا بے دلی سے کھاتا ہے۔ اس کے ابا اس کی تبدیلی سے بہت خوش ہیں بار بار سر پر ہاتھ رکھ کر دعائیں دیتے ہیں کہ تو سدا ایسا ہی رہے۔ امی کہنے لگیں پتہ نہیں ہے کوئی ڈرامہ کھیلنا چاہتا ہے اس لئے کینچلی بدل لی ہے۔ مو فرتاپ لڑکے اتنی آسانی سے اپنی روش نہیں بدلتے۔

ایک رات بہت زور سے آندھی آئی۔ اس روز عظمٰی نشست کی تیاری میں ہمارے یہاں ٹھہر گئی تھی۔ شاید خالہ گھبرا گئی ہونگی انہوں نے مجبور ہو کر نظام کو ہمارے گھر بھیج دیا۔ ہدایت دی کہ عظمٰی کو دیکھ کر واپس لوٹ آنا۔ آٹھ بجے کا وقت تھا۔ آندھی رک گئی تھی بارش نے زور پکڑ لیا تھا۔ نظام بھیگتا ہوا آیا۔ دروازہ اتفاق سے شہزادی نے ہی کھولا۔ کسی کو خیال تک نہیں تھا کہ آنے والا نظام ہوگا۔ ڈیوڑھی میں اندھیرا تھا۔ محبت کے ابتدائی مراحل تو ان دو بے تاب دلوں نے وہیں اندھیرے میں طے کر لئے ہوں گے۔ کیونکہ امی نے پانچ چھ منٹ تک شہزادی کی آواز نہ سنی تو زور سے آواز دی کہ ارے کون آیا ہے جب شہزادی جسم چراتی تقریباً جھکائے اندر آئی اور چپ چاپ باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ اس کے پیچھے پیچھے نظام تھا وہ بھاگتا بھاگتا کمرے میں آیا۔ اس کی آنکھیں نامعلوم خوشی کے احساس سے جگمگا رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد شہزادی چائے کا پیالہ لئے آگئی۔ اس کے چہرے سے بھی شفق پھوٹ رہی تھی ہونٹ گہرے عنابی ہو رہے تھے۔ جیسے بار بار دوپٹے سے رگڑتی رہی ہو۔ شاید اپنی پہلی چوری پکڑے جانے کے خوف سے اس نے پیار کا رنگ اپنے لبوں سے چھڑانے کی کوشش کی تھی۔ وہ بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی عظمٰی شوخ لڑکی ہے چپکے سے میرے کان میں بولی ذرا اس کا رنگ تو دیکھو ضرور نظام نے چھیڑا ہے۔ میں زیر لب مسکرا دی۔ امی چاہ رہی تھیں کہ نظام کسی طرح جلدی سے چلا جائے مگر آئے تو مدت بعد یار کا دیدار ہوا تھا۔ امی جھنجھلا کر شہزادی پر برس پڑیں بولیں: جا اپنی کوٹھری میں بیٹھ کھانا عظمٰی اور فریدہ نکال لیں گی۔ کھانے کے بعد جلدی جلدی نظام کو اجازت لینا پڑی۔ وہ اٹھا اور باہر نکل گیا۔

رات کے کسی پہر میری آنکھ کھل گئی عظمٰی میرے پاس ہی سو رہی تھی پتہ نہیں کیوں مجھے یہ محسوس ہوا کہ باہر کوئی چل رہا ہے۔ امی ابو کا کمرہ ہم سے دور تھا۔ ہمارا کمرہ ڈیوڑھی سے نزدیک تھا۔ بارش بدستور ہو رہی تھی مجھے ڈر لگا کہیں چور نہ آگیا ہو۔ تھوڑی سی دیر بعد بارش کی آواز تیز ہو گئی۔ میں بستر سے اٹھی۔ برسات کی خوشگوار رت کا حسن اپنے جوبن پر تھا کھڑکی سے پردہ ہٹانے سے سرکایا۔ ڈیوڑھی کے آخری سرے پر دو سائے لرزاں تھے۔ میں نے سانس روک لیا۔ پھر ہلکی سی کھانسی کی آواز آئی جو منہ پر ہاتھ رکھ کر روک دی گئی۔ یہ یقیناً نظام کی کھانسی کی مانوس آواز تھی۔ دوسرا سایہ شہزادی کا تھا دات کے کسی پہر اس نے دوبارہ آنے کا وعدہ کیا ہوگا۔ اور اب بھری برسات میں وہ ایک دوسرے میں یوں گم تھے کہ انہیں نہ گھر والوں کا ڈر تھا نہ دین و دنیا کا۔ میں جلدی سے واپس آکر اپنے بستر میں دبک گئی۔ اور صبح اس بات کا تذکرہ کسی سے نہیں کیا۔

اس رات کے بعد نظام کتنی دفعہ اندر آیا اس کی رپورٹ مجھے نہیں معلوم ہاں یہ تبدیلی شہزادی میں نظر آتی گئی کہ پھول کی طرح تر و تازہ اور شگفتہ ہو رہی تھی۔ بات بات پر اس کے قہقہوں کی جھنکار سنائی دیتی۔ کام کے سفر میں شستی آگئی۔ امی اس کے چونکا دینے والے انداز سے خائف تھیں۔ اکثر دبے دبے الفاظ سے شکوہ کرتیں کہ کس جوان لونڈیا کو گھر لے آئے اس کی تو اپنی لڑکی سے زیادہ فکر کرنی پڑ رہی ہے۔ ابو کہتے کہ بہت ہے تو نکال دو لیکن اس کے بعد مجھ سے پھر لوکر دو کی فرمائش مت کرنا۔ یہاں امی چپ کی چپ رہ جاتیں۔

میرے کالج میں کچھ سرگرمیاں شروع ہو گئیں پہلے کھیل ہوتے رہے۔ گولڈن نائٹ کے بعد امتحانات کا بھوت سر پر سوار ہو گیا۔ ان تمام ہنگاموں میں میں گھر کے حالات سے بے خبر ہو گئی۔ اور جب یہ سارے ہنگامے ختم ہوئے تو گھر کی فضا کچھ بدلی بدلی سی۔ امی پریشان اور متفکر نظر آتیں اور شہزادی اداس۔ ایک رات وہ میرے لئے دودھ لے کر آئی تو خلاف معمول میری پائنتی میں بیٹھ گئی۔ وہ بہت غمگین تھی میں نے اسے حیرت سے دیکھا نرمی سے پوچھا کیا بات ہے شہزادی؟ اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں کچھ کہنے کے لئے ہونٹ ایک دو بار کھلے پھر تھرتھرا کر چپ ہو گئے۔

[illegible] کی ضرورت نہیں تھی
سو وہ ایک بیمار لڑکی بن گئی تھی۔ اب اسے کسی سہارے کی ضرورت نہیں تھی
ہم آنسے بھی شاید ہو گیا۔ اس نے مجھے سختی پر بنا شروع کر دی تھی
صبح امی بلند ہی جانے میں ناشتہ کر رہی تھیں۔ عقل نے جیت
شور مچا رکھا تھا مگر خلاف عادت وہ کسی کو ڈانٹ ڈپٹ نہیں کر رہی
تھیں بلکہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ میں نے پوچھا چپ چاپ بیٹھی
کیا امی سے عقل کے گھر جانے کی اجازت مانگی۔ کہنے لگیں۔ بیٹی جاؤ
مگر نظام سے بات چیت کرنا۔ مجھے کیا ضرورت تھی کہ میں بیچارے کو
منہ لگاتی۔ عقل ملی تو لپٹ گئی۔ کہنے لگی۔ وہ بڑی بیتوں سے ڈر رہا گیا۔
رات بھر پیٹ میں درد ہوتا رہا اچھی ہو گئی ہے میں نے کہا کیا کہہ رہی ہو
کیسے بچی کا کمال ہے تمہیں تو پتہ ہے کہ خبر ہی نہیں۔ امی بھی حالت ہے جو رہی تھی تم
گھبرا کر بولی۔ کیا عقل کیا بات ہے۔ مجھے کچھ پتہ نہیں۔ وہ میرے کانوں کے
پاس اپنے ہونٹ لے آئی اور بولی نظام نے تمہاری شہزادی کے ساتھ
منہ کالا کر دیا ہے۔ کیا بکواس ہے۔ کیا بک رہی ہو۔ میں جھلا گئی۔ عقل
بلکہ چڑ کر بولی۔ ارے تمہاری شہزادی بغیر شادی کے میری بھابی بننے
بن گئی ہیں اور اب کوئی نقصان سمجھو یا نہ سمجھو۔ کرنے والا ہے ستیاناس
امی اور میری باجی کی حالت دیکھنے والی ہے۔ تم نے نوٹ نہیں کی
اور اب شہزادی کے کپکپاتے لبوں کا راز مجھ پر فاش ہو گیا
اس بیچاری پر مجھے شدید ترس آیا۔ زندگی میں اسے پہلا پیار ملا تھا مجھے اس
کی اس بات پر خوشی ہوئی مگر اب گناہ کا بوجھ اسے اکیلے اٹھانا
پڑے گا۔ نظام جیسا بگڑا ہوا لڑکا اب کہاں ہے کہ یہ الزام اپنے سر لے گا یہ
بیچاری لڑکیاں جہاں بھی ہوں اور جس حیثیت میں بھی ہوں ان کی کہیں
امان نہیں۔ یہ گناہ کے پیچھے کا چلن ہے۔ بدخصلت آدمی اس سے اور
توقع ہی کیا تھی۔ جانے کتنی لڑکیوں کو تباہ کر چکا ہے یہ

سارا وقت گھر میں رہی۔
شہزادی کی طبیعت بہت بگڑ گئی۔ اس نے چند دن ہیں
رکھا لی تھیں۔ اس کی زندگی کا سوال تھا۔ ہسپتال لے جایا گیا مگر کی
فضا ایسی تھی کہ شہزادی کی بات کرنا بھی گناہ لگتا تھا۔ میرا جی چاہتا
تھا میں جا کر اسے دیکھوں۔ مگر یہ ناممکن تھا۔ امی نے کہا [illegible]
روز مجھے عقل نے بتایا۔ نظام ہسپتال گیا ہے۔ مجھے کچھ خوشی بھی ہوئی اور
حیرت بھی اور اسی شام وہ گھر لے آئے گھر پہنچ کے ابا جی سے
اکیلے میں کچھ باتیں کیں۔ ان کے چلے جانے کے بعد پتہ چلا کہ نظام
نے اپنے باپ سے درخواست کی ہے کہ اس کی شادی شہزادی سے
کر دی جائے۔ وہ اس بدنصیب لڑکی کو موت کے منہ میں جانے

[illegible]
اس شخص سے [illegible] کی [illegible] کر ہی [illegible] کی
حیثیت کا [illegible] کے لئے [illegible] اس کی نسبت شہزادی کی
زندگی خراب کرنے کی ہرگز نہیں تھی۔ [illegible] نے [illegible] میں سے
اشارہ یا تھا کہ شادی کا اگر [illegible] دیا ہے
عقل [illegible] بہت گھبرا گئے۔ انہوں نے کہا نظام [illegible]
جیسا لڑکا نہیں [illegible] کی [illegible]
انہوں نے اس بات کا تجزیہ کیا کہ اس نے [illegible] حرکت کیا ہی [illegible]
جب کہ ایک لڑکی کی محبت نے اس کی سرکشی توڑ دی تھی۔ خالہ نے
اس لڑکی کو بیوی کی حیثیت سے تسلیم کر لیا۔ خالہ نے اپنی شادی کا جو
بڑا الکال کر اپنی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیا۔ شہزادی ہسپتال سے واپس
گھر آگئی۔ چند دنوں بعد نظام کا اس سے نکاح پڑھا دیا گیا۔ خالہ
اور خالو دونوں نے اپنے ہاتھ سے نظام کو دولہا بنایا۔ بھلے شہزادی
کو [illegible] آپ [illegible] کر یہ لڑکی اپنے [illegible]
اور پیاری تھی۔ پیار کی پیاسی لڑکی نے اعتماد میں اپنا تن من اس کو
پر لٹا دیا تھا۔ صرف یہی اس کا گناہ تھا۔ عظیم تھا نظام جس نے اس کا ہاتھ
تھام لیا۔ اور خالہ دلہن کو اپنے گھر لے گئیں۔ اس لڑکی نے نظام کو
سچ مچ دوسرا ہی آدمی بنا دیا۔ اس نے ایف اے کر لیا۔ اسے [illegible]
نے اسے اپنی سفارش سے [illegible] نوکری دلوا دی۔ جہاں [illegible]
ساتھ مکان مل گیا وہ بیوی کو لے کر علیحدہ ہو گیا۔ مگر [illegible] اپنے
ابا اور اماں کو سلام کرنے ضرور آتا۔
یہ اس کہانی کا ایک اہم واقعہ میں بتانا بھول گئی جس
روز نظام اپنی دلہن بیاہ کر لے گیا۔ اس روز میں نے امی اور خالہ
کی گفتگو سنی۔ خالہ امی سے کہہ رہی تھیں۔ نظام کی ماں [illegible]
کی ملازمہ تھی۔ نظام کے ابا اس پر ریجھ گئے تھے۔ جس کے نتیجے میں
نے جنم لیا۔ اور اب یہی کہانی نظام نے دہرا دی ہے۔ پتہ نہیں
ماں باپ [illegible] اولادیں [illegible] کیوں [illegible] ہے۔ میں نے
کی بات سن کر اس وقت دعا مانگی تھی کہ یہ تاریخ پھر نہ دہرائی جائے
خدا شہزادی کو لمبی عمر دے تاکہ نظام دوسری شادی نہ کرے [illegible]
کے بچے محبت کی تلاش میں ادھر ادھر نہ بھٹکتے پھریں۔ خدا نے
دعا سن لی نظام کے تین بیٹے ہیں۔ اور شہزادی اپنے میاں
کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہی ہے۔

گلاب اور گندم کی خوشبو سے مہکتی ایک بستی کی کہانی
جنت اور آسائش کے میدان فتح کر کے نصیب ہوئی!
گلاب کی مہک افضل ہے یا
گندم کی بالیوں کی خوشبو؟؟

گیہوں اور گلاب

—— خواجہ احمد عباس ——

گرمی، بدن کو جھلسانے والی لُو، دوپہر کا سناٹا جو میلوں تک پھیلے ہوئے کھیتوں پر چھایا ہوا تھا۔ صرف ایک کھیت میں ٹریکٹر چل رہا تھا جس کی دھیمی گھڑگھڑاہٹ فضا میں مسلط خاموشی کو اور بھی نمایاں کر رہی تھی۔

اوشا نے کھڑکی سے باہر کے رنگین مناظر کو دیکھتے ہوئے سوچا، میری بھی کیا زندگی ہے۔ شہر سے یہاں کئی سو میل دور ویرانے میں [illegible] کا مکان، پھیلے ہوئے کھیتوں کے سمندر میں جیسے ایک ننھا سا جزیرہ ہو اور پھر کوئی آرام بھی تو میسر نہیں۔ نہ بجلی نہ پنکھے، ریفریجریٹر کا تو ذکر ہی کیا [illegible] تک میسر نہیں، نہ کلب نہ سینما، ایک بیٹری والا ریڈیو جس پر صبح، دوپہر، شام [illegible] ریڈیو سیلون سے فلمی گانے سن کر تھوڑا سا دل بہلا لیتی تھی مگر اس کمبخت بیٹری کو بھی خراب ہونا تھا۔ اگر رمیش آج شہر سے اسے بنوا کر نہ لایا تو دیکھنا کتنا لڑوں گی۔

رمیش! اس کا شوہر۔ تین برس ہوئے ان کی شادی کو ہوئے تھے۔ مگر اس عرصے میں کتنی تبدیلی ہو گئی تھی اس میں۔ کبھی کبھی تو اوشا کو لگتا کہ جس رمیش سے اس کی ملاقات نینی تال میں ہوئی تھی اور جس سے اس نے پہلے محبت اور پھر شادی کی تھی وہ کوئی اور رمیش تھا اور یہ فارم کا ڈائریکٹر رمیش کوئی اور ہی شخص ہے۔

تین برس پہلے وہ امریکہ سے ایگریکلچر کی ڈگری لے کر آیا تھا [illegible] بالکل [illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

تھا۔

شادی کے بعد [illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]



خود بوئے تھے اور جن کو اس نے بیٹوں کی طرح اپنے ہاتھ سے پانی دیا تھا۔ کتنی محنت اور محبت سے اس نے ان پودوں کو پروان چڑھایا تھا اور جس دن گلاب کا پہلا پھول کھلا تھا اس دن اوشا کو کتنی مسرت حاصل ہوئی تھی۔ بڑی احتیاط سے پھول توڑ کر دن بھر پانی میں رکھا۔ شام کو رمیش کے آنے سے پہلے بڑے اہتمام سے سنگھار کیا۔ گلابی رنگ کی ریشمی ساڑھی باندھی، بال بنا کر جوڑے میں وہی گلاب کا پھول سجایا، مگر اوشا کی من بھر کی خوشی خاک میں مل گئی جب رمیش دفتر سے لوٹا اور اس نے جوڑے میں سجے ہوئے پھول کی طرف کوئی دھیان نہ دیا۔ مایوسی کا وہ لمحہ آج دو برس بعد بھی ایک خلش کی طرح اوشا کی یادوں میں چبھ رہا تھا۔

"کیوں جی ......" اور اوشا کو امید تھی کہ اتنا کہنا ہی کافی ہے رمیش کی نظر ضرور بالوں میں لگے ہوئے پھول کی طرف جائے گی۔

"کہو کیا ہے؟" "کچھ نہیں۔"

"کیوں کچھ کہنا تو چاہتی تھیں؟"

"تو بتاؤ میں آج کیسی لگ رہی ہوں؟"

"جیسی ہمیشہ لگتی ہو...... بہت خوبصورت۔"

"بس رہنے دو تمہاری تو نظر ہی بدل گئی ہے۔"

"مطلب؟"

اس کے جواب میں اوشا نے رونا شروع کر دیا۔ اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی "مطلب یہ کہ تمہیں اب مجھ سے محبت نہیں رہی۔"

رمیش ایک لمحے کے لئے تو یہ الزام سن کر پریشان ہوا مگر پھر مسکرا کر بولا "پاگل ہو گئی ہو کیا؟ ...... یا کسی لیکچرار گرل فرینڈ نے تمہارے کان بھرے ہیں؟ آخر یہ خیال تمہیں پیدا کیسے ہوا کہ مجھے تم سے محبت نہیں رہی؟"

"تو پھر اب تم میرا نوٹس کیوں نہیں لیتے؟ یاد ہے جتنی [illegible] جب ہماری ملاقات ہوئی تھی تو شادی سے پہلے تم میری ہر بات کا نوٹس لیتے تھے۔ اب تو تم کبھی دیکھتے ہی نہیں کہ میں کون سی ساڑھی پہنے ہوئے ہوں یا میں نے کون سی خوشبو لگائی ہے یا میرے بالوں میں کون سا پھول لگا ہوا ہے!"

اب پہلی بار رمیش کی نظر اوشا کے جوڑے پر پڑی اور اس نے پھول کو سونگھنے کے بہانے چومتے ہوئے کہا "تاہم اس گلاب کی وجہ سے ہم پر ثابت ہو چکا ہے، اچھا بھئی ہم اس پھول کی شان میں ایک پورا قصیدہ پڑھ دیتے ہیں۔ تمہارے بالوں میں یہ گلاب ایسا لگتا ہے جیسے کالے بادلوں میں سے سورج جھانک رہا ہو یا اندھیری رات میں جگنوؤں کے بجائے الاؤ جل رہا ہو......"

"بس رہنے دو مذاق۔" اوشا نے آنسوؤں کے بیچ ہلکی سی ہنسی کو روکتے ہوئے کہا۔ سوال کی انتہا ہی تھی کہ [illegible] مگر اوشا کے دل میں ایک گلہ سا [illegible] اور عجیب سی [illegible] ہو گئی۔ یہ الجھن اور بھی گہری ہوتی گئی جب رمیش نے دفتر کے اوقات کے بعد بھی یونیورسٹی کی لیبارٹری میں ریسرچ کے لیے جانا شروع کر دیا۔

"صبح سے شام تک تو دفتر میں سر کھپاتے ہو، پھر بھی تمہیں ابھی ریسرچ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" اوشا نے پوچھتے ہی کہا۔ جب رمیش نے اپنا ارادہ ظاہر کیا۔

"یہ دفتری کام تو میں مجبوری سے کرتا ہوں اوشا، صرف اپنا اور تمہارا پیٹ پالنے کے لیے۔ ورنہ ہمیشہ سے میرا ارادہ زراعت کے مختلف مسئلوں پر ریسرچ کرنے کا ہی تھا۔ شام کو بیکار بیٹھنے سے بہتر ہے کہ میں کچھ دیر لیبارٹری میں گزارا کروں۔"

"تو یہ ریسرچ کرنے سے کیا تمہاری تنخواہ بڑھ جائے گی؟"

"نہیں میری تنخواہ تو نہیں بڑھے گی مگر ہو سکتا ہے ہمارے سارے دیش کی گیہوں کی پیداوار بڑھ جائے۔ کیونکہ گیہوں کے پودوں کو جو کیڑے کھا جاتے ہیں، ان کی روک تھام کے سلسلے میں ریسرچ کرنا چاہتا ہوں۔"

"بڑے دیش سیوک آئے کہیں کے! میں پوچھتی ہوں دیش نے تمہارے ساتھ کیا کیا ہے؟ امریکہ سے اتنی بڑی ڈگری لے کر آئے ہو اور اس پر صرف پانچ سو روپلی کی نوکری ملی ہے۔" اوشا کی بے اطمینانی میں یہ حسرت بھی شامل تھی کہ اس کے شوہر کی تنخواہ ہزار یا پندرہ سو کیوں نہیں ہے؟

"تم سے کس نے کہا کہ میں امریکہ سے اتنی بڑی ڈگری لے کر آیا ہوں؟ [illegible] تو میں نے دو برس پردیس میں رہ کر جھک مارا، وہاں کے حالات یہاں سے بالکل مختلف ہیں کیونکہ زراعتی تعلیم عملی طور پر جانے کسی کام کی نہیں [illegible] کم نہیں ہوتے مجھے تو شکایت صرف یہ ہے کہ مجھے ایک دفتر میں کرسی پر بٹھا دیا گیا ہے۔ بجائے اس کے کہ کسی فارم پر مجھے عملی کام کرنے کا موقع دیا جاتا۔"

اوشا نے روٹھی ہو کر کہا "تو اس کا یہ مطلب ہے کہ تم شام کو دفتر سے لیبارٹری چلے جایا کرو اور میں گھر میں بیٹھی تمہارا انتظار کیا کروں۔ نہ کلب جاؤں نہ کسی سے ملنے ......"

"یہ کس نے کہا ہے کہ تم گھر میں بیٹھی رہا کرو۔ تم کلب بھی جا سکتی ہو، اپنی سہیلیوں کے ہاں بھی جا سکتی ہو اور جب جی چاہے ان کے ساتھ

کیا تمہاری یہ حرکت کس نے دیکھی ہے؟“

اس دن سے یہ معمول ہو گیا کہ رمیش روز قریب ہی ہوٹل میں چائے پینے جاتا اور اوشا وقت کاٹنے کے لئے کوئی فلمی رسالہ پڑھتی۔ کبھی کوئی بات کو کہنے پر وقت ہوتی تو رمیش کہتا: ”لکھی بہت ہے تمہاری منہ بولی پکچر پر مضامین ایک نظم دیکھتی ہو میری سمجھ میں نہیں آتا اتنا اسٹرین برداشت کر سکتی ہو؟“ واقعی رسالوں اور میگزینوں کی ورق گردانی کے بعد رمیش کو سینما کے پردے پر تصویریں دھندلی ہی نظر آتی تھیں اور اس سے جہاں تک ہوتا وہ سینما جانے سے کتراتا تھا۔ مگر اوشا کہتی: ”واہ میں پہلے تو دن میں دو دو فلمیں دیکھا کرتی۔ سچ کہتی ہوں تم دیپ کمار کی نئی فلم ”آوارہ شہزادہ“ دیکھو تو [illegible] ہو جاؤ گے“

”کیا مطلب؟“

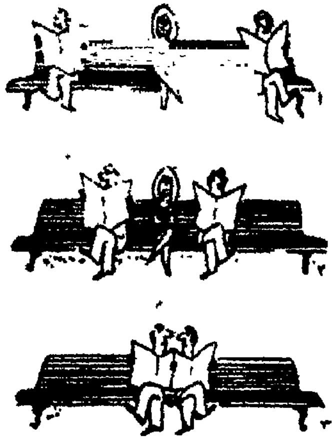
”مطلب یہ کہ وہ اتنا ہینڈسم ہے کہ دیکھنے والے کا دم [illegible] سے نکل جاتا ہے۔ یہ ہمارے کالج کا محاورہ ہے“

”تمہارے کالج میں انگریزی، ہندی، تاریخ، جغرافیہ کے علاوہ فلم اسٹاروں پہ دم ہونا بھی سکھایا جاتا ہے؟“

مگر اوشا پر اس طنز کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ اسی جوش و خروش کے ساتھ دیپ کمار اور اس کی فلموں کی تعریف کرتی رہی۔ ”اس وقت اس کے مقابلے کا ایک بھی ایکٹر نہیں ہے۔ رومینٹک سین تو ایسے کرتا ہے کہ کیا کوئی ہالی وڈ کا اسٹار بھی کرے گا [illegible] جیسا اچھا ایکٹر ہے ویسا ہی [illegible] کیریکٹر بھی۔ ”آوارہ شہزادہ“ میں اس نے کیا کام کیا ہے [illegible] ایک ہی فلم میں چار چار روپ بدلے ہیں۔ شہزادہ، بھکاری، [illegible] ایسی [illegible] ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں۔ اور تو اور ایک سین میں گوالن کا بھیس بدلا ہے [illegible] ابھی [illegible] جب [illegible] بھیس بدلنے کے لئے [illegible] بالوں کی وگ اتارتا ہے۔ تب پتہ لگتا ہے کہ ارے یہ تو وہی شہزادہ ہے۔ سچ کہتی ہوں گوالن کے بھیس میں اتنا خوبصورت لگتا ہے کہ تم بھی دیکھو تو عاشق ہو جاؤ۔“

رمیش نے ہنس کر کہا: ”ہم تو پہلے ہی [illegible] عاشق ہونے کو تیار ہیں۔ اس لئے کہ جو اس پہ عاشق ہے ہم اس پہ عاشق ہیں“

ان دونوں میں اس قسم کے مذاق اکثر ہوا کرتے تھے اور اب تک نہ کسی نے برا مانا تھا نہ غلط فہمی پیدا ہوئی تھی۔ سو اوشا نے کہا: ”تم اپنی لیبارٹری کی [illegible] وہاں [illegible] بھی [illegible] آتی ہیں۔ اس لئے تمہیں [illegible] کام کا بہانہ کر کے جانا ہو گا؟“



رمیش ہنس کر بولا: ”تم کو ایسی ہی بات۔ مگر مشکل یہ ہے کہ وہ مجھے منہ نہیں لگاتیں۔ میں سوچتا ہوں وہاں تو اپنی دال گلنی نہیں۔ اب گھر ہی میں ریسرچ کیا کروں۔“

”گھر میں؟ کیا یہاں لیبارٹری بناؤ گے؟“

”لیبارٹری بھی ایک چھوٹی موٹی بنالیں گے۔ مگر وہ اصل میں جس نئی قسم کے گیہوں کے بیج پر ریسرچ کرتی ہے اس کے تجربے تو [illegible] دور یونیورسٹی کی فارم پر جانا پڑتا ہے۔ ہے تو مشکل [illegible] اپنی ہی [illegible] پر میں ایک چھوٹا سا فارم بنالوں“

”مگر ہمارے یہاں اتنی جگہ ہی کہاں ہے؟ مشکل سے تین چار کیاریاں تو ہیں اپنے باغ میں“

”اتنی جگہ بھی کافی ہے۔ اگر ہم ان سب کیاریوں کو توڑ کر [illegible] میں گیہوں بو سکتے ہیں۔ تجربے کے لئے تھوڑی سی فصل بھی ہو جائے تو اپنا کام چل جائے گا“

اوشا نے تنک کر کہا: ”واہ! میری ان کیاریوں میں [illegible] کھلتے [illegible] اتنے خوبصورت گلاب کے پھول [illegible] کو کر تم وہاں گیہوں کی کاشت کرو۔ کھیتی باڑی کرنی ہے تو کوئی اور جگہ تلاش کرو“

اور رمیش نے دھیما پڑ کر کہا: ”تو پھر کچھ ایسا ہی کرنا پڑے گا“

اگلے ہفتے دفتر سے شام کو لوٹ کر رمیش نے اوشا کو خوشخبری دی کہ اس کا تبادلہ ہو گیا ہے۔ مگر اب اسے لکھنؤ سکریٹریٹ کو چھوڑ کر دہلی کے قریب گورنمنٹ کے ایک تجرباتی فارم کو سنبھالنا ہے۔

اصلاب ڈیڑھ برس سے وہ تجرباتی فارم تھا میلوں تک پھیلے ہوئے کھیت ٹریکٹروں کی غیر شاعرانہ گڑگڑاہٹ گرمی میں تو ہواؤں میں پہاڑوں کی طرف سے آتی ہوئی ریت بھری ہوائیں۔ برسات میں ہر طرف پانی ہی پانی سڑکیں بالکل ہی بند ہو جاتیں اور ان کا چھوٹا سا گھر ایک جزیرہ بن جاتا۔ ویسے بھی اوشا کو اکثر یہی محسوس ہوتا تھا کہ رمیش نے اسے تنگ کرنے کے لئے ایک غیر آباد جزیرے پر لا کر قید کر دیا ہے۔ یوں تو فارم پر کئی سو کسان، مزدور، ٹریکٹر ڈرائیور اور ٹرک چلانے والے کام کرتے تھے جو آدھے میل کے فاصلے پر گاؤں میں رہتے تھے لیکن اوشا کی نفاست پسند طبیعت ان کو لکھنؤ کی سوسائٹی کا نعم البدل تسلیم کرنے سے انکار کرتی تھی۔ ایک بار ہولی کے موقع پر رمیش اسے گاؤں لے گیا رات کو فارم کے سارے کسانوں نے مل کر جلسہ کیا، دیہاتی گانے گائے، دیہاتی ناچ ناچے۔ انعامات تقسیم کیے۔ رمیش نے سوچا تھا کہ اکیلے رہتے رہتے اوشا اکتا گئی ہے۔ اس جلسے میں شرکت کر کے اس کی طبیعت بہل جائے گی مگر جو فلمی گانوں اور فلمی ناچوں کی دلدادہ تھی، اسے ان جھنجھناتے گانوں میں کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ تین گھنٹے تک کرسی پر بیٹھی وہ غیر متعلق انداز میں اکتاہٹ کے ساتھ پروگرام دیکھتی رہی۔ اختتام پر رمیش کو اور اسے ہار پہنائے گئے۔ مگر یہ ہار گلاب کے پھولوں سے نہیں بنائے گئے تھے بلکہ ان میں گیہوں کی بالیں پروئی تھیں اور ایک ٹریکٹر ڈرائیور نے گھبراہٹ کے مارے ہکلاتے ہوئے کہا: "ہم اپنے ڈائریکٹر صاحب اور ان کی شریمتی جی کو گلاب کے پھولوں کی جگہ گیہوں کی بالیوں کے ہار پہنا رہے ہیں کیونکہ ہم کسانوں کے لئے تو گیہوں ہی ماتا ہے جہاں کی خوبصورتی ہے۔ خوشبو ہے خوشحالی ہے گیہوں ہی میں ہماری زندگی ہے۔"

اپنے گنوار لہجے میں اس نے ہر لفظ کا تلفظ بگاڑ کر ادا کیا تھا۔ "کھوب صورتی" "کھشبو" "کھس حالی" "جندگی"..... اوشا نے گھر پہنچتے ہی اس گندی ہار کو جس کی کانٹے دار بالیوں سے اس کی نازک گوری گردن پر خراشیں پڑ گئیں تھیں اتار پھینکا جیسے وہ اس کے ساتھ فارم کی ساری خشک اور غیر شاعرانہ زندگی ہی کو گلے سے اتار کر پھینک رہی ہو۔

گیہوں! گیہوں! گیہوں! رمیش کے ساتھ رہ کر اوشا کو اس لفظ سے ہی چڑ ہو گئی تھی۔ صبح اٹھو تو گیہوں کا ذکر، کھانے پر گیہوں کا ذکر، ٹہلنے جاؤ تو گیہوں کے کھیتوں تک۔ ہر قدم پہ ...

"آج یا تم نے دیکھا اوشا یہ گیہوں کی ایک نئی قسم ہے جو ہم نے یہاں اگائی ہے۔ اس کا دانہ سرخ اور سخت ہوتا ہے جسے کسی بیماری کی قسم نہیں لگ سکتی۔ یا دیکھو اوشا یہ ہندوستانی نسل کا گیہوں ہے اور اس کے برابر کھیت میں امریکی نسل کا گیہوں۔ دونوں کو سائنس کے اصولوں پر عمل کر کے ایک ہی فارم پر برابر اگا رہے ہیں۔ اب ہم یہ کوشش کر رہے ہیں کہ ان دونوں کے میل سے گیہوں کی ایک نئی قسم اگائی جائے جس میں امریکی گیہوں کی طرح دانہ موٹا نکلے گا اور دیسی گیہوں کی طرح گرمی سردی ہر قسم کا موسم برداشت کرنے کی طاقت ہوگی۔ میں سوچتا ہوں اس نئی قسم کا نام رکھوں گا "اوشا نئی گیہوں"، کیوں کیسی رہی؟"

اور اوشا جل کر کہتی "گیہوں، گیہوں، گیہوں، گیہوں..... تمہارے لئے دنیا میں اور کوئی بات ہی نہیں رہی۔ تم تو مجھے بھی گیہوں کا ایک دانہ سمجھتے ہو!"

"بے شک،" رمیش ہنس کر کہتا "تم میں اور گیہوں کے دانے میں بڑی مشابہت ہے..... گیہوں کے دانے میں انسان کی زندگی ہے..... اور تم..... میری جان ہو۔"

"بس رہنے دو، جھوٹی خوشامد کوئی تم سے سیکھے۔ کب سے کہہ رہی ہوں کہ دہلی جاؤ تو وہاں کسی کے باغ میں سے گلاب کی قلمیں لیتے آؤ میں بنگلے کے سامنے پھولوں کا باغ بناؤں گی۔ مگر تمہیں کبھی یاد ہی نہیں رہتا!"

اور ایک بار پھر رمیش وعدہ کرتا کہ اس بار وہ دہلی جائے گا تو گلاب کے پودے ضرور لائے گا مگر اگلی بار پھر بھول جاتا اور ایک بار پھر وہ ایک نیا وعدہ کر لیتا اور اوشا کی طبیعت گلاب کے پھولوں کے لئے اسی طرح ترستی رہتی جیسے کسی بانجھ عورت کی ممتا بچے کو گود میں کھلانے کے لئے ترستی ہے......

گلاب کے پھول! سرخ، گلابی، ننھی ننھی گلابی کلیاں، ادھ کھلے غنچے، جیسے شرما کر جھکتے پھولوں کو دیکھ کر مسکرا رہے ہوں۔ ایسا لگتا تھا اوشا کی ساری آرزوئیں سمٹ کر رسالے کے سرورق کی یہ رنگین تصویر بن گئی ہیں۔ نیچے لکھا تھا: "فلم اسٹار دیپک کمار کے باغ کا ایک منظر دیپک کمار پھولوں کا بہت دلدادہ ہے اور اس کے گھر کے گرد باغ میں بارہ قسم کے گلاب کھلے ہوتے ہیں۔ دیپک کمار کے گھر کی باقی تصویریں اندر دیکھئے!"

اندر دو صفحوں پر دیپک کمار کے مکان اور دیپک کی کئی تصویریں چھپی ہوئی تھیں۔ ...

پچھلی بہار [illegible]
[illegible]
سے بھرا ہوا گلدان [illegible]
اٹھانے بھاگتی ہوئی [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
ہمیشہ ہی [illegible] ہے۔ [illegible] مگر آج بھی [illegible]
ہے تو......

دروازے پر جیپ کے کرخت ہارن کی آواز آئی اور اوشا کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ رمیش کے استقبال کے لیے پلنگ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور ساڑھی کا پلو سنبھالتی ہوئی برآمدے کی طرف دوڑی۔ رمیش کے ساتھ [illegible] کا انتظار تھا۔

کھیتوں کے بیچ ہی سے کچی سڑک پر دھول کے بادل اڑاتی جیپ آئی اور [illegible] کے ساتھ ٹھہر گئی۔ رمیش [illegible] اوشا برآمدے کی سیڑھیاں اترتے ہوئے دوڑی۔

"[illegible] دھوپ میں [illegible] ہو۔ [illegible]" رمیش جیپ سے اترتے ہوئے مسکرایا۔

"چلو اندر، ورنہ کوئی بھی رسالہ نہیں ملے گا!"

رمیش جب [illegible] خاکی قمیض [illegible] چکا تھا۔ اس کے [illegible] کی گرد [illegible] تھی۔ پسینے سے قمیض بھیگی ہوئی تھی۔

وہ [illegible] ہو گیا تھا اس نے [illegible] اور [illegible] ہوئی تھیں۔

"پہلے یہ بتا دو میری سب چیزیں لائے ہو یا نہیں؟" اوشا نے برآمدے میں [illegible] کر کہا۔

"سب کچھ لایا ہوں۔" رمیش نے [illegible] کہا "اور جیپ میں [illegible] سامان [illegible]۔"

"[illegible] ہے؟"

"بالکل [illegible] سکتی ہو۔"

"اور کوئی کام ہے؟"

[illegible]

[illegible] تیزی سے
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
خاصی ہے۔"

[illegible]

"مگر ڈاکٹر صاحب [illegible] راستے میں [illegible] ہو گیا ہو تو میں دفتر جا رہی ہوں!"

"اور [illegible] لائے ہو؟"

"اور کچھ نہیں [illegible] رسالوں [illegible] کے لیے ہیں، [illegible] قلمیں ہیں!"

"یہ تو [illegible] گلاب کی قلمیں بھی لے آئے!" اوشا [illegible] کر بولی۔

"اس کی تم فکر نہ کرو، ایک [illegible] گلاب کے پھول تمہارے باغ میں [illegible] ایک ضروری بات بتانی ہے!"

رمیش نے قمیض [illegible] غسل خانے میں جا کر منہ ہاتھ دھویا۔ پھر [illegible] باہر آیا اور [illegible] سے ایک خط نکال کر اوشا کی طرف بڑھایا۔

[illegible]

[illegible]

جوتے کہا: کوئی تیز دل والے ہوں گے موٹے کالے کیمرے جو
ٹریکٹروں اور بیلوں کے ہرے دیسے سے تصویریں لے کر چل دیں گے؟
"کمپنی کا نام تو پڑھو؟" رشمی نے شرارت سے کہا۔ "دل میں
تو لڈو پھوٹ رہے ہوں گے؟
"مسٹر دیپ کمار پروڈکشنز اپنی فلم "نیا ہندوستان" کی شوٹنگ
کرنے؟ اس کا مطلب ہے کہ ...؟"
"تمہارے محبوب اداکار بطور ایکٹر، پروڈیوسر اور نہ جانے کیا
کیا، یعنی مسٹر دیپ کمار بذات خود جلوہ افروز ہو رہے ہیں؟"
اور اوشا نے رشمی کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا۔ "تم کو
رشمی اب تو بڑا مزا آئے گا۔ مگر میرے پاس تو کوئی ڈھنگ کی ساڑھی
بھی نہیں ہے۔ یہ لوگ آئیں گے تو میں پہنوں گی کیا؟"

* * *

"ہاں تو مسٹر دیپ کمار اس وقت آپ اپنے کون سے فلم کی آؤٹ
ڈور شوٹنگ کرنے جا رہے ہیں؟"
"نیا ہندوستان"
"اس فلم کے بارے میں آپ ہمیں کچھ بتا سکتے ہیں؟"
"ضرور، اس فلم میں ہم ان تبدیلیوں کو دکھانا چاہتے ہیں۔ جو
ہندوستانی سماج میں آزادی کے بعد ہوئی ہیں۔ ہندوستان کی تہائی
آبادی گاؤں میں رہتی ہے اور کھیتی باڑی کرتی ہے۔ اس لئے فلم کا
پس منظر ہے ایک ماڈل فارم جہاں ہیرو کسانوں کو زراعت کے نئے
طریقے سکھاتا ہے۔ در اصل میں کئی برس سے یہ محسوس کر رہا ہوں کہ
ہماری بیشتر فلموں کے ماحول اور کردار پرانے ہو چکے ہیں۔ ان کا تعلق آج
کے ہندوستان سے۔ آج کے سماجی اور نفسیاتی ماحول اور مسائل
سے بالکل نہیں ہے۔ ان فلموں کو دیکھنے سے تو ایسا لگتا ہے جیسے ہم ابھی
تک انیسویں بلکہ اٹھارہویں صدی میں رہ رہے ہوں۔ بلکہ کبھی کبھی تو
یہ خیال ہوتا ہے کہ ایسے کردار کسی صدی میں بھی وجود نہیں رکھتے تھے؟"
"جیسے آپ کا فلم "آوارہ شہزادہ" جس میں ہیرو ایک ٹین کی تلوار
سے ایک سو بیس سپاہیوں کو گرا دیتا ہے اور ہیروئن جو ایک بیچارے
کی بیٹی ہے۔ ہر سین میں ایک نیا ریشمی لباس پہنے نظر آتی ہے۔"
"آوارہ شہزادہ" کو REALISM کی کسوٹی پر پرکھنا ایک
غلطی ہوگی۔ یہ ایک تفریحی فلم تھی جو عوام کو ہنسانے اور ان کا دل خوش کرنے
کے لئے بنائی گئی تھی۔ پبلک کا دل بہلانا بھی تو آرٹسٹ کا اولین فرض
ہے ... یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ "آوارہ شہزادہ" جیسے

نئے ہندوستان کی آئینہ داری اور آرٹسٹک فلموں کی اہمیت سے کسے انکار ... معروف
"آوارہ شہزادہ" کے ٹکٹوں پر جو ٹیکس لگا ہے۔ اس کا حساب کیا جائے
تو معلوم ہوگا کہ اس طرح سے گورنمنٹ کو ایک کروڑ روپیہ دیا ہے جو اسکول
کہاں جائے گا؟ نہریں، سڑکیں، ڈیم اور اسکول گھر بنانے میں خرچ
ہوگا۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ "آوارہ شہزادہ" جیسی فلم کتنی
اہم اور ضروری ہے؟"
"سنا ہے "آوارہ شہزادہ" سے آپ کو بھی چالیس پچاس لاکھ
روپے کا منافع ہوا ہے؟"
"ہوا ہوگا شاید۔ مجھے آنے پائی کا حساب میرے اکاؤنٹنٹ
جانتے ہیں۔ میں نہیں جانتا۔ آپ کو یہ تو معلوم ہوگا کہ میں کوئی فلم پیسہ
کمانے کے لئے نہیں بناتا۔ میرا مقصد تو صرف آرٹ کی خدمت کرنا ہے
اور آرٹ کے ذریعے ملک و قوم کی خدمت کرنا۔"
"جی ہاں اس میں کیا شک ہے؟"
یہ انٹرویو بمبئی سنٹرل اسٹیشن پر فرنٹیئر میل کے ائیر کنڈیشنڈ ڈبے
کے سامنے ہو رہا تھا۔ دیپ کمار پروڈکشنز کے عملے کے باقی لوگ اپنے
اپنے ڈبوں میں بیٹھ چکے تھے۔ ہیروئن انکا رانی اور اس کی ایکٹوا
ہیئر ڈریسر جولیا ایک ائیر کنڈیشنڈ کوپے میں، کیمرہ مین مہاسکر اور ساؤنڈ
انجینئر ڈیسائی سیکنڈ کلاس میں، اسسٹنٹ ڈائریکٹر وغیرہ انٹر میں اور
باقی ملازمین تھرڈ کلاس میں۔ صرف دیپ کمار جرنلسٹوں اور مداحوں کی
بھیڑ میں گھرا ہوا پلیٹ فارم پر کھڑا تھا۔ مگر جب اس کے سیکرٹری دیو
راؤ نے آکر اسے یاد دلایا کہ گاڑی چھوٹنے میں صرف پانچ منٹ رہ گئے
ہیں تو دیپ کمار نے بڑے اہتمام سے ہاتھ جوڑ کر نمسکار کرتے ہوئے
سب سے اجازت چاہی۔
"اچھا تو بھائی لوگو اب اجازت۔ پھر اور لوگوں کو بھی رخصت
کرنا ہے!" اور یہ کہہ کر وہ اپنے ڈبے میں داخل ہوا اور دروازہ
بند ہو گیا۔
[illegible]
[illegible]
[illegible]
"نہیں جی تم جاؤ میں تمہارے ساتھ چلوں گی تو لوگ نہ جانے
کیا کہیں گے۔ دیکھتے نہیں کتنے جرنلسٹ باہر کھڑے ہیں؟"
"کہیں گے کیا؟ کیا میاں بیوی کا ساتھ سفر کرنا جرم ہے؟"
"عام لوگوں کے لئے نہیں ہے مگر تمہارے جیسے فلم اسٹار کے"

بلوچستان کے علاقے قلات میں طلاق دینے کا طریقہ یہ ہے کہ شوہر اپنی بیوی کی طرف سے تین ڈھیلے پھینکتا ہے اور ہر ڈھیلا پھینکنے سے قبل بیوی کا نام لے کر کہتا ہے کہ میں نے تجھ کو طلاق دی۔ جب وہ تینوں ڈھیلے پھینک چکتا ہے تو طلاق ہو جاتی ہے۔

معروف لوگ شریک ہوئے [illegible] ان میں فلمی صنعت سے وابستہ شخصیتیں بھی تھیں
جا پہنچے۔ دولہا کی عمر کچھ کم ہی تھی اور دولہا دلہن کی جوڑی کمال کی تھی
چھوڑ کر تھوڑے سے عرصہ میں ہی شہرت کی انتہا کو پہنچ گئی تب بھی وہ [illegible]
چہیتا دیپ اپنی ماں کا بیٹا ہی تھا بیوی کے ساتھ تو رہتا ہی تھا [illegible]
ہوتی۔ وہ ایسی باتوں سے تقریباً بے نیاز رہتی [illegible]
تہذیب کی محفل ہو جائے۔ ایک بات یاد رکھو کہ [illegible]
کا راز یہ ہے کہ لاکھوں لڑکیاں ان کے کان میں اپنا نام اچھالنا چاہتی ہیں اور
کرتی ہیں۔ بیوی جیسی غیر معمولی ہستی ان کے معاملات اور تصورات کو بھی
چور کر دے گی۔ اس لئے میرا یہیں رہنا بہتر ہے؟"

دیپ کو معلوم تھا کہ پاروتی جو کچھ کہہ رہی ہے ٹھیک ہی کہہ رہی ہے
لیکن جس بات سے وہ کبیدہ خاطر تھی وہ اس کے لئے فلمی دنیا کی چکاچوند
ہوتی۔ وہ پاروتی سے شادی کے پانچ سال بعد بھی ویسی ہی محبت کرتا
تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ اس سے ویسی ہی شدید محبت کرتی ہے
لیکن اسے شوہر تھا اور یہ [illegible] (تھا۔)
کردار عظیم فنکار دیپ کمار جب بالکل نئی باتیں کرتا یا اس کی طرف
بھی دھیان کرتی۔ اکثر دیپ کو محسوس ہوتا کہ پاروتی دل ہی دل میں اس
پر ہنس رہی ہے۔ اس کے عظیم فنکارانہ پن کا مذاق اڑا رہی ہے۔ کبھی کبھی
وہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتی جیسے بزرگ بچوں کے ساتھ کرتے ہیں
بالکل نادان بچوں کے ساتھ۔ اس وقت دیپ کو اپنی ذات کے کھوکھلے
پن کا احساس ہوتا جیسے اپنی بے انتہا دولت کے باوجود وہ کنگال
ہو۔ جیسے اپنی بے پناہ مقبولیت کے باوجود وہ گمنام اور غیر معروف ہو اور
باوجود اس کے کہ فلمی حلقوں میں اسے [illegible] سمجھا جاتا تھا وہ
جاہل اور بے وقوف ہو۔ بات یہ تھی کہ پاروتی کے سامنے دیپ کو [illegible]
کمتری محسوس ہوتا تھا۔ وہ اس کی عمر کی ہیروئنوں سے زیادہ خوبصورت تھی
اس کا باپ دلی کا ایک مشہور [illegible] بیرسٹر تھا جبکہ دیپ کا باپ چاندنی
چوک [illegible] کی ایک چھوٹی سی دکان کا مالک
تھا۔ اس نے انگلش لٹریچر میں ایم اے کیا تھا جبکہ دیپ کی تعلیم صرف
انٹرمیڈیٹ تک تھی۔ وہ باپ کے ساتھ [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] جبکہ دیپ [illegible] کو چھوڑ کر ہندوستان کے
کسی [illegible] شہر [illegible]
([illegible])

کر دیپ کمار کی صلاحیتوں کا [illegible] اور راج کپور کی
شوخی کا ایک مرکب ہے۔ اس کی ایکٹنگ کا معیار [illegible]
گیسوں [illegible] سے کیا جاتا لیکن جب وہ گھر آتا تو پاروتی
[illegible] کے [illegible] اس انداز سے کرتی کہ اس کے
مقابلے میں دیپ [illegible] اس کی [illegible]
[illegible] کی تعریف میں اخبار والے کالم کے کالم [illegible]
دیپ کمار کو حقیقت [illegible] لیکن پاروتی نے
کہا کہ کیوں [illegible] ہو؟"
اس کی [illegible] کے [illegible]
لیکن اپنی بیوی کی زبان سے اس نے تعریف کا ایک لفظ [illegible]
اس کے [illegible] تو اتر جاتے گے!
مگر اب "نیا ہندوستان" فلم بنا کر دیپ کو یقین تھا کہ پاروتی
کو [illegible] اعتراف کرنے پر مجبور کر سکے گا۔
اس فلم سے وہ [illegible]
[illegible] کے [illegible] کو دکھانا چاہتا تھا کہ
کس طرح [illegible] ساری قوم کو بیدار کیا جا سکتا ہے اور عوام [illegible]
[illegible] سے متاثر کیا جا سکتا ہے۔ یہ فلم وہ ایک نئے ڈھنگ
سے بنانا چاہتا تھا اس لئے اس نے فیصلہ کیا تھا کہ اس [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
اس [illegible]
[illegible]

سوال تو فرق ہی کیا ہے۔ جوتے اور ہیرو جب پرانے ہو جاتے ہیں
پھینک دیئے جاتے تھے یہاں کے بجائے نئے جوتے اور نئے ہیرو
لائے۔۔۔۔ ہاں یہ سینڈل مجھے فٹ ہیں۔" یہ الفاظ اس نے دیپ
سے کہے جو مادھوبالا کے پیروں کے پاس بیٹھا ایک جوتے کے بعد
دوسرا پہنا رہا تھا۔ اور پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں مادھوبالا اور دیپ
کے درمیان معاہدہ کیا اشارے ہوئے کہ اپنے سینڈل کا بل وصول کرنے
جب وہ ڈائریکٹر کے کمرے میں پہنچا تو ڈیسائی نے چھوٹتے ہی پوچھا۔
"کیوں مسٹر! فلم میں کام کرو گے؟" اور سورج کے منہ سے کچھ نہ نکلا
سوائے "جی! جی۔ ایک گلاس پانی دے کے۔"

۱۹۵۰ء۔ جب وہ سورج نرائن ماتھر سے دیپ کمار بن چکا
تھا اور اس کے پاس سات فلموں کے کنٹریکٹ تھے اور اس کے
بینک کے لاکر میں سوا لاکھ روپیہ، بلیک، تھا۔ اور جب وہ ایک
شام اپنی بیوک میں بیٹھ کر معاہدوں کے بارے میں قانونی مشورہ کرنے
ملا بار ہل پر اپنے ماسٹر سٹریکا چند پریم چند کے گھر گیا تھا۔ گو وہ خود
بھی اس وقت ورلی پر تین سو روپے مہینے کے فلیٹ میں رہتا تھا۔
لیکن اتنا عالی شان اور خوبصورت مکان اس نے کبھی اندر سے
نہیں دیکھا تھا۔ ہر طرف کتابوں کی اونچی اونچی الماریاں، دنیا کے
مشہور مصوروں کی شاہکار تصویریں، قیمتی قالین، خوبصورت دبیز
پردے، بڑھیا اور آرام دہ فرنیچر، صوفے، دیوان، کشن، کاٹھیاواڑی کام
کی پیڑھیاں، کانسی کے پرانے بت، ہر چیز مالک مکان کی خوش مذاقی
کا اعلان کرتی تھی۔ پھر ڈرائنگ روم کی دیوار پر لمبی کھڑکی میں سمندر
کا خوش نما منظر اور کام کی باتیں ختم کرنے کے بعد جب ماسٹر پریم
چند نے دیپ کا تعارف اپنی بیٹی پاروتی سے کرایا جو اسی سال ایم اے
کا امتحان دے رہی تھی، تو دیپ کو ایسا لگا کہ اس گھر کا سارا حسن اور
خوش مذاقی اس نازک اور حسین لڑکی میں سمٹ آئی ہے جو کچن میں
جا کر اپنے ہاتھوں سے پکوڑے بھی تل سکتی ہے۔ ڈرائنگ ٹیبل پر بیٹھ
کر سلیقے سے چائے انڈیل سکتی ہے اور ساتھ ساتھ بائرن کی
شاعری اور گوئٹے کے فلسفوں کے بارے میں علمی بحث بھی کر سکتی
ہے اور دیپ جس نے نہ کبھی ایسا گھر دیکھا تھا نہ کبھی ایسی لڑکی سے
ملا تھا، یہ سوچتا ہوا رخصت ہوا کہ میری ساری دولت اور شہرت کس
کام کی اگر پاروتی جیسی بیوی نہ ملے۔

۱۹۵۱ء۔ جب بڑی دھوم سے اس کی شادی پاروتی سے ہوئی
[illegible] دیپ کمار پروڈکشنز کا افتتاح ہوا۔

۱۹۵۲ء۔ جب اس کا پہلا بچہ پیدا ہوا جس کا نام جگدیپ
رکھا گیا (اگرچہ پاروتی جونیر کے نام سے پکارتی تھی) اور جب دیپ
پروڈکشنز کی فلم "آسمانی چوڑیاں" کی سلور جوبلی ہوئی۔ کمپنی کو سات
لاکھ کا منافع ہوا جس سے دیپ نے اپنا اسٹوڈیو بنوانا شروع کیا
اور ان کی دوسری اولاد ایک ننھی پیاری بچی جس کا نام جیوتی رکھا گیا۔
گرچہ ماں باپ پیار سے جیو کہنے لگے۔ اسی سال کے اخیر میں دیپ
اور پاروتی کا پہلا جھگڑا ہوا جب پاروتی نے دیپ کی نئی فلم "پیاسے
میرے بالم" دیکھی اور دیپ نے اس کی رائے پوچھی تو اس نے کہا۔
"میری پسند ناپسند کا کیا سوال۔ پبلک تو پسند کرتی ہے۔ سلور جوبلی
تو ضرور ہوگی نا؟ بس تو پھر کافی ہے۔" اور دیپ کو ایسا محسوس ہوا جیسے کہ
اس کی کامیابی کے شربت میں کسی نے کونین گھول دی ہو۔

۱۹۵۳ء۔ جب دیپ کی فلم "پیاسے میرے بالم" کی گولڈن جوبلی
ہوئی اور اس نے جوہو پر ایک بنگلہ خریدا اور پچاس ہزار اس کے فرنیچر
اور بیس ہزار باغ اور لان لگانے پر خرچ کر دیئے۔

۱۹۵۴ء۔ جب دیپ کمار پروڈکشنز کی فلم "چہل منیر بانو"،
جو ایک بڑے شہر میں غریبوں کی زندگی سے متعلق تھی فیل ہو گئی۔
دیپ کمار کے باغ کے پھولوں کو فلاور شو میں اول انعام ملا۔ جونیر
پہلی بار اسکول گیا اور جیو نے پاپا، ممی کہنا شروع کیا۔ دیپ نے
ڈاکٹری سرٹیفکیٹ حاصل کر کے شراب کا پرمٹ بنوایا۔

۱۹۵۵ء۔ دیپ کی نئی فلم "آوارہ شہزادہ" کی بے انتہا مقبولیت
نے کئی برس کے ریکارڈ توڑ دیئے۔ دیپ کمار کو اتنا فائدہ پہنچنے کا خوف
ہوا کہ اس کے اڈیٹر نے مشورہ دیا کہ وہ ٹیکس سے بچنے کے لئے فوراً
ایک ایسی فلم شروع کر دے۔ جس میں نقصان دکھایا جا سکے اور
چنانچہ اس کی فلم "نیا ہندوستان" کا مہورت ہوا۔

ٹرین ایک جھٹکے کے ساتھ کسی چھوٹے سے اندھیرے اسٹیشن
پر ٹھہر گئی اور مسافر ٹرنک کا ڈبہ اپنے ڈبوں کی طرف چلے۔ دیپ کمار
نے دیر سے کہا دو سوڈے کی بوتلیں دے دے۔ پھر اپنے کوپے کا دروازہ
بند کیا۔ سوٹ کیس میں سے وہسکی کی بوتل نکالی اور گلاس میں ایک
پیگ انڈیلا۔ پھر اس نے تکیے پر ملا ایک تہ ہونے والا چاندی
کا فریم نکالا جو سفر میں ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا تھا۔ ایک طرف جونیر
دوسری طرف جیو۔ بیچ میں پاروتی کی ایک مسکراتی ہوئی تصویر۔
"ہیلو پاروتی! ہیلو جیو! ہیلو جونی" اس نے گلاس اٹھایا اور ایک ہی
گھونٹ میں خالی کر دیا۔ پانچویں پیگ کے بعد اس نے پاروتی کی تصویر

کی طرف غور سے دیکھا اور دیکھتا رہا۔ شاید تم مجھ پر ہنستی ہو۔ پارو! میرا مذاق اڑاتی ہو۔ اس لئے کہ میرا باپ غریب تھا اور تمہارا امیر۔ یا اس لئے کہ میں انٹر میڈیٹ تک پڑھا ہوں اور تم ایم اے ہو۔ یا اس لئے کہ تم کلاسیکی موسیقی اور … جانتی ہو اور میں … پسند کرتی ہو اور میں آوارہ شہزادہ … بناکر بیچا کرتا ہوں۔ کیسی عجیب بات ہے نا؟

ساتویں پیگ کے بعد اس نے دھندلی آنکھوں سے پاروتی کی تصویر کو گھورا۔ ساری دنیا میری عزت کرتی ہے۔ لاکھوں میرے کام کو سراہتے ہیں۔ میری تعریف کرتے ہیں۔ میں جہاں جاتا ہوں میرے چاہنے والوں کی بھیڑ جمع ہو جاتی ہے۔ کتنے ہزار خط ہر مہینے میرے پاس آتے ہیں۔ … کسی … کی بھی نہیں ہے۔ تم میری عزت نہیں کرتیں پارو۔ تم مجھ سے محبت کرتی ہو مگر جیسے ماں اپنے بیوقوف بچے سے کرتی ہو۔ مجھے ایسی محبت نہیں چاہیئے، پارو میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے اپنے برابر کا سمجھو۔ میری عزت کرو۔

اور نویں پیگ کے بعد اس نے پھر پاروتی کی تصویر کو مخاطب کیا۔ تم اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہو؟ پارو! مانا کہ تم حسین ہو۔ پڑھی لکھی امیر ماں باپ کی بیٹی ہو۔ مگر دنیا میں ہزاروں لڑکیاں اور بھی ہیں۔ سمجھیں پارو۔ … تمہیں کبھی نہیں بھلا سکوں گا۔ پھر ہنس رہی ہو؟ پارو مت ہنسو۔ مت ہنسو۔

مگر اس کی مدہوش آواز کی گونج کو پہلے ہی میں کھو کر رہ گئی تھی اور جب وہ نشے سے چور ہو کر سو گیا پاروتی کی تصویر اسی طرح طنز اور تمسخر اور رحم کے انداز میں مسکراتی رہی۔

* * *

ٹریکٹر کے اسٹیرنگ وہیل کو سنبھالے رشی اپنے پیروں تلے موٹر کی دھڑ دھڑاہٹ کو محسوس کر رہا تھا۔ جب کبھی وہ ٹریکٹر چلاتا تھا اس کے تن بدن میں ایک عجیب سنسنی سی دوڑ جاتی۔ اس کا دل ایک عجیب احساس فتح سے بھر جاتا اور اسے ایسا لگتا کہ وہ ایک ماڈرن قسم کا ڈائرکٹر نہیں بلکہ ایک فوج کا سپہ سالار ہے جو … کرتی۔ دشمن کو پسپا کرتی چلی جا رہی ہے … ٹریکٹر نہیں ہے جس پر وہ سوار ہے، بلکہ … ہے ۔۔۔۔ نہیں … کروڑوں کسانوں کی … کے سامنے … جیسے … گئے تھے۔ مگر اس ٹریکٹر اور اس کے پیچھے لگے … کی … سے

سامنے نہ نظر آنے والے … کی ٹھیس سے شکست کھا رہا ہے۔

پھر … کی … فصل کو اس طرح کاٹ رہا تھا جیسے … میں … کی … اس تصویر کو سوچ کر رشی … سے ایسا ہی معلوم ہوتا تھا جیسے کھیت کی … ہو رہی ہو … تصویر بھی کس قدر … خوبصورت تصویر … کرشن چندر … کسان کی … ہے کہ … برش سے تصویر دی تھی … ہے کسان زمین کے سینوں پہ کیسی کیسی تخلیقی … کرتا ہے … کو ترتیب دیتا ہے … کسان کا … تھی، رشی نے سوچا … آج کے کسان کا … ہے جس پر … انسان کی کہانی لکھی جا رہی ہے۔ نہیں یہ تصویر کا اصلی … نہیں ہے۔ رشی نے سوچا کاش میں ادیب ہوتا … تاکہ اس عجیب اور خوبصورت اور سرور انگیز جذبے کا اظہار کر سکتا جو اس وقت وہ محسوس کر رہا تھا جو وہ ہر بار محسوس کرتا تھا جب بھی وہ فارم پر کسی مشین سے کام کرتا ہر بار وہ سوچتا دس سال پہلے اتنے بڑے کھیت کی فصل کاٹنے کے لئے سینکڑوں کسانوں اور ان کی عورتوں اور بچوں کو کم سے کم دس دن لگتے اور اب چند ہی گھنٹے میں وہ سارا کام ایک ٹریکٹر اور ایک مشین سے ہو سکتا ہے اور … لگتا ہے … یہ وہ … تھا جو … سے … انقلاب ہے جو اس کے فارم کی مشینیں کسانوں کی زندگی میں برپا کر رہی ہیں۔ وہ مشینیں جو آج کے کسانوں کو جانوروں کی طرح مشقت کرنے کی مجبوری سے آزاد کر رہی ہیں جو ملک کی پیداوار بڑھا رہی ہیں جو ہندوستان کے دیہات کا نقشہ بدل رہی ہیں۔ سامنے دوسرا ٹریکٹر … چلا رہا تھا۔ … کسان … جس کے باپ دادا سینکڑوں برسوں سے زمینداروں کی زمین پر … زمینداروں کی فصلیں کاٹتے اور خود …

پیٹ بھرنے کے بہتے آ رہے تھے۔ جنہوں نے کبھی ہل اور درانتی کے علاوہ کوئی دوسرا اوزار نہیں دیکھا تھا۔ کبھی ہل میں [illegible] بیلوں کے ساتھ بھی نہیں لگتے تھے۔ ان ہی کی [illegible] آج اس نظام کا [illegible] ٹریکٹر ڈرائیور ہے۔ [illegible] کی طرح خاکی نیکر اور قمیض اور ہیٹ پہنتا ہے اس کا [illegible] اب بھی [illegible] کی عادت سے مجبور ہوکر زمیندار کی اولاد سے اور ہر سرکاری افسر سے جی کہہ کر بات کرتا ہے مگر لگتا ہے کہ مزاج بدل چکا ہے۔ وہ ٹریکٹر چلانا سیکھنے کے لئے بھوپال کا سفر کر آیا ہے۔ وہ صبح کو ہندی کا اخبار پڑھتا ہے۔ رات کو ریڈیو سنتا ہے۔ ہفتے میں [illegible] ایک بار [illegible] دیکھتا ہے اور [illegible] کے سامنے [illegible] مجبور [illegible] کرتا ہے اور رمیش نے [illegible] خوبصورت تصویر بنا تا اور اس کے نیچے لکھ دیتا: "ہندوستان کا نیا کسان،" پسینے میں نہایا ہوا [illegible] ٹریکٹر کے پہیے کو سنبھالے ہوئے آہنی ہاتھ، مضبوط ٹھوڑی اوپر کو اٹھی ہوئی اور بے خوف نظر آسمان پر ....

سامنے آسمان پر افق کی طرف سے بھورے بھورے بادل اٹھ رہے تھے۔ کیا خوبصورت منظر تھا [illegible] لہلہاتے ہوئے [illegible] کی سنہری بالیں دھوپ میں چمکتی ہوئی۔ شمال کی طرف آم کے پیڑوں کے جھنڈ [illegible] دور پہاڑیوں کی دھندلی قطاریں دھیرے دھیرے [illegible] سیاہ بادلوں کے پیچھے چھپتی جا رہی تھیں۔ رمیش نے سوچا اس سے بڑھ کر حسین منظر دنیا میں [illegible] نہیں ہو سکتا، اور نہ ٹریکٹر کی گڑگڑاہٹ سے زیادہ پیارا کوئی سنگیت ہو سکتا ہے اس لئے کہ اس مشینی سنگیت میں طاقت ہے، آہنی آہنگ ہے۔ نئی زندگی کا پیغام ہے۔

"کٹ!"

فضا میں ایک مبہم سی آواز گونجی مگر رمیش کے سلسلۂ خیالات پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ ایک سیٹی بجی مگر رمیش کو اپنی زندگی سے اس سیٹی کا کوئی تعلق نہ معلوم ہوا۔ وہ ٹریکٹر چلاتا رہا۔ [illegible] کی چرخی گھومتی رہی، اس کی [illegible] فصل کو کاٹتی رہیں، سامنے آسمان پر بادلوں کے رنگین نقش بنتے رہے۔ گیہوں کی بالوں پر سورج کی آخری کرنیں ناچتی رہیں ......

"کٹ، کٹ!" کسی دوسری دنیا سے آواز آئی۔ سیٹیاں زور زور سے بجنے لگیں۔ مگر رمیش کا ہاتھ ٹریکٹر کے بریک پر نہیں گیا۔ فاتحانہ شان سے [illegible] کا گھوڑا [illegible] دشمن کی صفوں کو چیرتا ہوا ......

"ٹریکٹر [illegible]!"

اس کے بالکل قریب آکر کوئی چلّایا تو رمیش نے گھوم کر دیکھا کہ دیپ [illegible] کا اسسٹنٹ ہے اور اس کے پیچھے [illegible] پر پھیلا [illegible] دیپک [illegible] آ رہا ہے۔ [illegible] رمیش نے بریک لگا کر ٹریکٹر روکا اور انجن بند ہوتے ہی اس کے خیالات کا سلسلہ بھی ٹوٹ گیا [illegible] شاٹ بالکل خراب کر دیا [illegible] کے کھیت پر تو [illegible] ہی نہیں ہے۔ پھر کٹ کو کہتے ہیں [illegible] شاٹ میں جاتا تھا ......"

اب رمیش کو یاد آیا [illegible] کاٹ رہا ہے [illegible] کی فلم "نیا ہندوستان" کے ایک شاٹ میں حصہ لے رہا تھا کیونکہ دیپ خود ٹریکٹر نہیں چلا سکتا تھا اس لئے اس نے رمیش سے درخواست کی تھی کہ لانگ شوٹ میں وہ ٹریکٹر چلائے۔ ان دونوں کا قد اور بدن تقریباً ایک سا ہی تھا۔ دیپ بھی رمیش کی طرح خاکی نیکر، قمیض اور ہیٹ پہنے ہوئے تھا۔ دور سے پتہ بھی نہ چلے گا کہ کون ہے۔ جب کیمرہ قریب آئے گا تو دیپ کو ٹریکٹر کو بریک لگا کر اترتے ہوئے دکھایا جائے گا۔

"ٹھیک ہے رمیش،" دیپ نے ٹریکٹر پر سوار ہوتے ہوئے کہا "ذرا یہ تو بتاؤ بریک کیسے لگاتے ہیں؟"

رمیش نے اسے سب کل پرزے سمجھا دئے اور نیچے اتر آیا۔ کیمرہ [illegible] لگا رہا تھا۔ اس کے پیچھے دیپ کے [illegible] اور [illegible] کی بھیڑ لگی ہوئی تھی [illegible] بھی کھڑی تماشا دیکھ رہی تھی۔

"کیوں [illegible] اب تو [illegible] ہو گیا نا؟" رمیش نے پسینہ پونچھتے ہوئے بیوی سے پوچھا۔

"ہیں، کیا کہا؟" آشا کا دھیان کہیں اور تھا۔ اس کی نگاہیں دیپ پر لگی ہوئی تھیں۔

"کچھ نہیں۔ [illegible] دیکھو میں گھر جا رہا ہوں۔ [illegible] " اور وہ لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا چلا گیا۔

اگلا شاٹ شروع ہو گیا تھا۔ [illegible] ٹریکٹر کا ایک [illegible] پھر [illegible] دیپ نے [illegible] ایک [illegible] مشین [illegible] کی [illegible] ہوئی تان [illegible] ..... و ..... و ..... ایں .....

[illegible] ..... دیپ نے [illegible] مسکرا کر بریک لگائی اور [illegible] کی جانب [illegible] کیمرے نے گھوم کر اس [illegible] کو [illegible] میں [illegible] کی [illegible]

کمالا کو اور جوانی جھنجھوڑ رہے تھے۔ اتنا شکیل [illegible]
"ہاؤ...... ہاؤ...... ڈو...... یو...... آئی...... یو......؟" دیپ نے اس کا
پیچھا کیا۔ وہ کیسی ہی عجیب تھی۔ دیپ نے اسے [illegible]
بھاگی۔ پیچھے اور آخر کار دیپ نے اسے کلائی سے پکڑ ہی لیا۔
پہلے پہل کیسی بے نیاز شیخی جتائی تھی... اور اب چھوڑ دو مجھے کہا ... مگر
الکا اس ساتھ ساتھ جو [illegible] ... سٹارٹ [illegible]
چلایا "کٹ۔ کٹ"۔ دیپ نے گردن گھمائی، کیمرہ مین نے آسمان کی
جانب دیکھا اور دیپ نے اعلان کر دیا "شوٹنگ پیک اپ"۔
الکا اپنی تھکی ہوئی چڑیا کی طرح پھدکتے ہوئے چلتی "کم آن
ڈارلنگ، چل کر ٹھنڈا پانی پینا ہے"۔ دور سے اسسٹنٹ [illegible]
نے اس کو سینڈل پہنائی اور وہ دیپ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے چہرے پر
ہنسی ہوئی پاگل کو چھنکاتی چل دی۔

"کیسی ہو اوشا جی۔ آپ چلتی ہیں نا؟"

"چلئے"

کافی دور تک ان کو کھیتوں کے بیچ میں سے پگڈنڈی
پکڑ کر جانا تھا۔ راستے میں اوشا نے کہا "سر دیپ جی، آپ نے
بہت کام کیسے کر جاتے ہیں؟ ایکٹنگ، ڈائریکشن، پھر پروڈکشن کی
ساری ذمہ داریاں، میں تو سوچ سوچ کر حیران ہو جاتی ہوں"۔

دیپ نے اپنی مشہور مسکراہٹ کا اظہار کرتے ہوئے کہا "اس میں
کمال کی کونسی بات ہے، اگر کوئی کام بھی اچھا کیا جائے تو آدمی جتنا کام
چاہے کر سکتا ہے۔ مگر کیوں، آپ بھی [illegible] چاہتی ہیں؟ سچ کہتی
ہوں، میں نے آج تک آپ کی ایک بھی تصویر نہیں دیکھی، اتنا اچھا کام کر کے
آپ تو..."

نہ جانے کیوں اس وقت دیپ کو پاروتی کا خیال آیا اور اس
نے سوچا کاش یہ الفاظ کبھی پاروتی کی زبان سے نکلے ہوتے۔ مگر اوشا نے کہا
سکوپ تو بہت ہے، آپ جیسے کام کے آدمی کو [illegible] کی بہت سی ضرورت ہے۔
ڈائریکٹر کی حیثیت سے بھی اور ایکٹر کی حیثیت سے بھی..."
چند لمحے سوچ کر اوشا بولی "میں بتاتی ہوں کہ ڈائریکٹر کی حیثیت
سے [illegible]
—— آپ زندگی کے [illegible]
میں اس کے ساتھ آپ کی بیوی [illegible]
میں آپ نے [illegible]
جب [illegible]



میں تسلیم کرتا ہوں ... یہ ماننا ہی پڑتا ہے کہ وہ سین پکچرائز کرنے میں تو غضب
کے ہوتے ہیں، آپ کی فلموں میں..."

"ایکٹر کی حیثیت سے تو آپ کمال کرتے ہیں، جو پارٹ بھی
کرتے ہیں اس میں گھل مل جاتے ہیں۔ مگر سب سے بڑی بات یہ
ہے کہ آپ کے رومینٹک سین غضب کے ہوتے ہیں۔ آپ برا نہ مانیں
تو ایک بات کہوں؟"

"کہئے، کہئے۔" میں تو آپ کی باتیں بڑی دلچسپی سے سن رہا ہوں
"ہمارے کالج کی سب ہی لڑکیاں یہ کہتی ہیں جب کوئی ایکٹریس
آپ کو اسکرین پر scene love کرتے دیکھتی ہیں تو ایسا محسوس ہوتا
ہے جیسے آپ خود اس سے ......" اور شرم کے مارے اس کی زبان رک گئی۔

"محبت کا اظہار کر رہا ہوں، یہی کہوں نا؟"

اوشا نے سر جھکا کر ہاں کہا۔ پھر چند منٹ دونوں خاموشی سے
چلتے رہے۔ اور شام کے دھندلکے میں [illegible] کی قربت میں [illegible]
اس عورت جسم کی خوشبو کی لپٹیں [illegible] کے کپڑوں سے [illegible] اور
ان الفاظ کے جو ابھی اوشا نے اس کے بارے میں کہے تھے، دیپ
کو ایک عجیب راحت اور ایک عجیب تسکین محسوس ہوئی۔ اسے پہلے
کبھی نہ ہوئی تھی، احساس ہوا کہ جیسے اس کی زندگی کی سب سے بڑی کامیابی
آج حاصل ہوئی ہے۔

سگریٹ جلانے کے بہانے وہ رکا، اوشا بھی رک گئی۔
سگریٹ جلاتے وقت دیپ نے اوشا کو بھرپور نگاہوں سے دیکھا، اوشا
نے نگاہیں جھکا لیں۔

ایک بار دیپ کا ہاتھ بے اختیار اوشا کی کمر کی طرف بڑھا۔
مگر کچھ سوچ کر رک گیا۔

"کیا آپ کی زندگی یہاں [illegible] ہے؟" پھر قدم بڑھاتے
ہوئے دیپ نے سوال کیا۔

"ہماری بھی کیا زندگی ہے دیپ جی!"

"اب یہ دیپ جی کا تکلف رہنے بھی دو اوشا میرا نام صرف دیپ ہے۔"

"آپ تو نفسیات کے ماہر ہیں۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ایسے ماحول میں کیسی زندگی گزر سکتی ہے۔ بڑی بے مقصد بے رنگ، بے مزہ زندگی ہے ہماری تو......"

"کوئی کام کیوں نہیں کرتیں آپ تو پڑھی لکھی ہیں۔"

"پڑھی لکھی کیا ہوں۔ انٹر تک پڑھا تھا کہ شادی ہو گئی۔ میرے گھر والوں کے لئے یہی تو گریجویٹ...... مگر آپ ہنس کیوں رہے ہیں؟ میرا مذاق اڑا رہے ہیں کیا؟"

"نہیں نہیں میں تو اس لئے ہنس رہا ہوں کہ میں بھی صرف انٹرمیڈیٹ تک پڑھا ہوا ہوں۔ پھر بھی دیکھئے کام کرتا ہی ہوں۔"

"مگر آپ تو فلم میں کام کرتے ہیں۔"

"تو آپ بھی فلم میں کام کر سکتی ہیں۔"

"جی ـــ میں؟" اوشا کو ایسا لگا جیسے دفعتاً فضا میں ننھی گھنٹیاں بجنے لگی ہوں۔ جیسے گیہوں کے کھیت دفعتاً گلاب کے تختوں میں تبدیل ہو گئے ہوں۔

"مگر مجھے کام کون دے گا، دیپ جی؟"

"صرف دیپ کہو تو میں ہی کام دے سکتا ہوں اوشا۔"

"سچ دیپ!"

"ہاں اوشا میں جھوٹ نہیں کہہ رہا۔ فلم اسٹار بننے کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے، خوبصورتی اور ذہانت، ہماری بہت سی فلم اسٹارز صرف خوبصورت ہیں بلکہ بعض تو اب خوبصورت بھی نہیں۔ بس جیسے ہماری الکالائی ہیں جو اب تک دس برس پہلے کی شہرت کے بھروسے پر چل رہی ہیں مگر تم تو خوبصورت ہونے کے ساتھ ذہین بھی ہو۔"

"آپ مذاق تو نہیں کر رہے؟ دیکھئے یہ میری ساری زندگی کا سوال ہے۔"

"نہیں اوشا میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ مگر شاید مجھے ایسا کہنا نہیں چاہئے تھا۔ رمیش صاحب سنیں گے تو کیا کہیں گے؟"

"میں ان کی بیوی ہوں، لونڈی نہیں ہوں۔ اپنی بہتری کے لئے سوچ سکتی ہوں۔" اور اس عرصے میں بنگلہ آگیا۔ اندر روشنی ہو رہی تھی اور ریڈیو پر خبریں سنائی جا رہی تھیں، بنگلے کے باہر ہی [illegible] کا کچھ [illegible] ایک میں دیپ [illegible] دوسرے میں [illegible] اور جو لیا۔ کمرے میں تیز روشنی اور ساتھ ہی [illegible] تھی اور دوسرے کو کہہ

اوشا نے دیپ کو بڑے تپاک سے رخصت کیا۔

"اچھا مسٹر دیپ، آپ چائے، ہاتھ منہ دھو لیجئے، میں ابھی چائے بھجواتی ہوں۔"

"شکریہ مسز رمیش! آپ کو ہماری وجہ سے بہت تکلیف اٹھانا پڑتی ہے۔"

اوشا اندر کمرے میں چلی گئی جہاں رمیش ریڈیو کے قریب بیٹھا غور سے خبریں سن رہا تھا۔ دور سے بادلوں کی کڑک کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ ایک بجلی کی لہر آسمان کو چیر گئی۔ مگر اوشا کو کوئی گمان نہ تھا۔ ریڈیو اناؤنسر کہہ رہا تھا "[illegible] نے یہ اعلان کیا ہے کہ اس برس ہندوستان میں اور سب سالوں سے زیادہ غلہ پیدا ہوا ہے۔ گیہوں کی فصل اب پک کر کٹائی کے لئے تیار ہے۔ اگر یہ بارش سے پہلے کٹ گئی تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس برس کال کا کوئی ڈر نہیں رہے گا۔"

"سنا تم نے اوشا!" رمیش نے بیوی کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا "کٹائی کرنے میں ہمارا فارم تو سب سے آگے ہے۔ ان فلم والوں نے بار بار ٹریکٹر کو رکوایا نہ ہوتا تو آج ہی ساری فصل کٹ جاتی۔ مجھے امید ہے گیہوں کی پیداوار میں ہمارا فارم سب پر بازی لے جائے گا۔"

"فصل، ٹریکٹر، گیہوں، کٹائی کیا ان کے علاوہ دنیا میں کوئی بات ہی نہیں رہ گئی۔ کبھی میرا بھی خیال کیا کرو۔"

"کیوں کیا ہوا؟ طبیعت تو ٹھیک ہے۔ دن بھر دھوپ میں کھڑے کھڑے کہیں لو تو نہیں لگ گئی؟ نہ جانے کب ان فلم والوں کی بک بک سے نجات ملے گی۔"

اوشا کا جواب سن کر رمیش ہکا بکا رہ گیا تھا۔ ایک دم بپھر کر وہ بولی "وہ لوگ بالکل بک بک نہیں کر رہے۔ ایک اچھی فلم بنا رہے ہیں۔ بک بک تو کرتے ہو تم۔ ہر وقت بیج، کھاد، ہل، کٹائی، کوئی اور بات ہی نہیں رہی تمہارے لئے۔"

"ارے آج تمہیں کیا ہوا اوشا؟" رمیش نے حیران ہو کر پوچھا اور اسی وقت باہر اندھیرے آسمان میں بجلی اتنی زور سے کوندی کہ ان کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اور ایک ایسی بھیانک کڑک سنائی دی کہ سارا گھر ہل گیا۔

"رمیش میں بھی جا رہی ہوں۔"



چند لمحوں کے لئے ریشم اس کا مطلب نہیں سمجھا۔ پھر کہا: "ٹھیک
مگر کیوں؟" جب وہ اورشا نے کھڑکی کی طرف منہ پھیر لیا۔ "میں نوکری کا کام
کرنے جا رہی ہوں۔"

"دیپ۔ مسٹر دیپ نے مجھے آفر دیا ہے۔"

"اچھا یہ بات ہے" ریشم ہنس کر بولا۔ "تو دیپ صاحب تمہیں بھی فلم سٹار بنانا چاہتے ہیں۔ جیسی مبارک ہو۔ اب تم بھی ایکٹرسوں کی طرح لپٹی گھاگرا، چولی پہن کر، چھوڑو چھوڑو بھی صورت کتنا، گایا کرنا .... مگر جیسی اپنے فلموں کے پہنتے ہیں نہیں ضرور بتانا۔ جیسی فلم کوئی سی ہوگی بھتی کی بلی ہے یا بغداد کا چور؟"

"ریشم، ایک بیل کی کھڑک کی طرح اورشا کی آواز گونجی۔ "میں مذاق نہیں کر رہی ہوں۔ سچ کہہ رہی ہوں۔ اب تک یہاں رہتے رہتے تنگ آگئی ہوں۔"

"تنگ آگئی ہو، مگر کیوں؟"

"اس لئے کہ زندگی میں گیہوں ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ گلاب کے پھولوں کی بھی کوئی اہمیت ہے۔"

"تو تمہیں گلاب کے پھول چاہئیں روٹی نہیں ....؟"

بات کاٹ کر وہ چلائی "میں گلاب کی دو جھاڑیوں کا ذکر نہیں کر رہی، اپنی ساری زندگی کی بات کر رہی ہوں۔ تم نے اس فارم پر لاکر مجھے قید کر دیا ہے۔ نہ رہنے کو ڈھنگ کا مکان، نہ پہننے کو ڈھنگ کے کپڑے نہ کوئی ملنے جلنے والا، نہ سیر و تفریح، ہر طرف پھوہڑ گنوار، جنہیں بات کرنے کی بھی تمیز نہیں، ہر طرف گھاس کی بو، ٹریکٹر کی گھڑگھڑ۔ تم نے میری ساری زندگی کو بے کار، بے صرف، بے مقصد بنا کے رکھ دیا ہے۔"

ریشم کو غصہ بہت کم آتا تھا مگر جب آتا تھا تو بہت زور سے۔ اورشا سے بھی اونچی آواز میں وہ چلا کر بولا: "تم اس زندگی کو بے مقصد کہتی ہو ....؟ تم اناج پیدا کرنے کو بے کار سمجھتی ہو؟ اگر یہ کسان جن کو تم اجڈ گنوار کہتی ہو، کل کام کرنا بند کر دیں تو روٹی کہاں سے کھاؤ گی؟ یا کیا گلاب کے پھول سونگھ کر زندہ رہو گی؟"

ٹھیک ایک بار پھر باہر سے کوئی [illegible] ایک لمحے کے لئے سارا کمرہ چکاچوند کر دینے والی روشنی سے چمک گیا۔ ایک خوفناک روشنی جیسی تیز سرچ لائٹ پر ہوتی ہے یا فلم کی شوٹنگ کے وقت ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ریشم اور اورشا جھگڑتے ہوئے میاں بیوی نہیں بلکہ کسی پرانے ڈھنگ کے [illegible] کے ہیرو ہیروئن [illegible] سٹیج [illegible] غائب ہو گیا اور [illegible]

ہوا کر اورشا کے منہ سے بے اختیار "اوئی" نکل گیا۔

"کاشتکاروں کے لئے ضروری اطلاع۔ کاشتکاروں کے لئے ضروری اطلاع" ریڈیو پکار رہا تھا۔ "اتر پردیش کے ترائی کے علاقے میں زبردست طوفان آیا ہے۔ بڑی تیز بارش آنے والی ہے۔ سب کاشتکاروں کو چاہئے کہ فصل کی کٹائی جلدی کر کے اناج کو گوداموں میں رکھ دیں ورنہ بارش کی وجہ سے زبردست نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے۔ پہاڑی ندی نالوں میں پچھلے چوبیس گھنٹوں میں بارہ انچ بارش ہوئی ہے۔ اس لئے دریاؤں میں باڑھ آنے کا بھی خطرہ ہے۔ ندی کے کنارے والے علاقوں کو ہوشیار رہنا چاہئے۔"

"اورشا، ہماری فصل!" ریشم کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی اور اس لمحے وہ اپنا اور اورشا کا سارا جھگڑا بھول گیا۔ اس کے دماغ میں صرف ایک فکر، صرف ایک دھن رہ گئی کسی طرح فصل کو بچانا چاہئے۔

برآمدے میں پیتل کا ایک گھنٹہ لٹکا ہوا تھا۔ ایسے ہی موقع کے لئے فارم پر کام کرنے والوں کو ہدایات تھیں کہ اس کے بجتے ہی سب ڈرائیور ٹریکٹر لے کر جمع ہو جائیں۔ ریشم نے موگری اٹھا کر گھنٹہ کو بجانا شروع کر دیا اور چند ہی منٹ میں اس کے درجنوں آدمی دوڑتے ہوئے آگئے۔

[illegible] سب آدمیوں کو جمع کر کے ریشم اس طرح ہدایات دے رہا تھا جیسے جنگ سے پہلے کوئی جنرل اپنے افسروں کو احکامات دیتا ہے "جتنی کٹائی ہو کر کھیتوں میں پڑی ہے، بارش ہونے سے پہلے فوراً گوداموں میں پہنچا دینا ہے اور پچھلے [illegible] کھیت رہ گیا ہے اس میں ابھی کٹائی کرنی ہے [illegible] ایک ٹریکٹر اور [illegible] فارم پر جتنے [illegible] سب [illegible] بارش ہونے سے پہلے پہلے سارا کھیت کٹ جانا چاہئے۔"

"بہت اچھا [illegible]"

"مگر دیکھو میں لنگوا کا کام ہونا ہی چاہیے!"
"مگر اندھیرے میں کٹائی کیسے ہوگی جبکہ" لنگوا کا بڈھا باپ ہاتھ جوڑ کر بولا۔

رمیش کو ایسا لگا جیسے جنگ سے پہلے کسی جرنیل کو معلوم ہو کہ اس کے سپاہیوں کے پاس گولی بارود نہیں ہے اب دشمن کا مقابلہ کیسے کریں گے؟

چند لمحوں کے لئے سب خاموش ہو گئے۔ مگر پھر پیچھے سے آواز آئی: "اندھیرے کا انتظام میں کئے دیتا ہوں رمیش جی!"

سب نے مڑ کر دیکھا۔ دیپک کا ایک شوخ رنگ کا شرٹ پہنے کھڑا کہہ رہا تھا: "ہمارے جنریٹر اور آرک لیمپ کب کام آئیں گے؟"

"آرک لیمپ؟" رمیش کو ایسا محسوس ہوا جیسے لڑتے لڑتے اس کے ہاتھ میں ایک چمکتی ہوئی تلوار آ گئی ہو۔ "کتنے آرک لیمپ ہیں آپ کے پاس؟"

"آٹھ ہیں۔ جس کھیت میں کٹائی کرنی ہے اس کے لئے کافی ہیں!"

اور پھر اس نے جلدی کر کے اپنے اسسٹنٹ سے کہا: "اپنے آدمیوں سے کہو جنریٹر اور آرک لیمپ سب اس کھیت کے کنارے لگا دیں۔ بلکہ جلدی کرو، ذرا بھی دیر نہیں ہونی چاہیے!" یہ کہہ کر اس نے ٹریکٹر گاؤں کے اندر پہنچا اور رمیش کے ساتھ کھیت کی طرف بھاگا۔ اوشا نے محسوس کیا کہ اس لمحے رمیش اور دیپ دونوں نے اس کی ہستی کو بھلا دیا ہے۔

اس غیر متوقع کمک کے پہنچتے ہی کام شروع ہو گیا۔ کھیت کے چاروں طرف آرک لیمپ روشن کر دیئے گئے اور اس روشنی میں رمیش اور لنگوا کے ٹریکٹروں نے کٹائی کا کام شروع کر دیا۔ سو سے زیادہ مرد عورتیں بچے درانتیاں لے کر فصل پر ٹوٹ پڑے۔ باقی لوگ کٹی ہوئی فصل اٹھا کر گوداموں کی طرف دوڑنے لگے۔ آسمان پر کالے کالے بادل اٹھے ہی چلے آ رہے تھے۔ ہوا میں خنکی اور تیزی بڑھتی جا رہی تھی۔ بجلی بار بار چمک اور کڑک رہی تھی کسی بھی لمحے بارش شروع ہو جائے گی اور آندھی کٹی ہوئی فصل کو اڑا کر تتر بتر کر دے گی۔ ہر آدمی ہر عورت ہر بچے کے دماغ میں بس یہی ایک دھن تھی کہ کسی طرح بارش اور طوفان سے پہلے فصل کو بچا لیا جائے۔

رمیش ٹریکٹر کو اس طرح چلا رہا تھا جیسے وہ ٹریکٹر نہ ہو جنگی ٹینک ہو اور وہ گیہوں کی فصل نہ کاٹ رہا ہو بلکہ دشمن کی صفوں کو چیرتا ہوا آگے بڑھ رہا ہو۔

مگر لنگوا بھی … سے پہلے ٹریکٹر چلا رہا تھا اپنی فصل … لیے لنگوا چلا رہا تھا۔ آرک کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ اس کے ٹریکٹر کی سیدھ میں مکھیا کی بیٹی گوری درانتی چلا رہی ہے۔ گوری جو دو سال پہلے تک … کتنی منہ سے لگائی رہتی تھی، وہ گوری جو بچپن میں لنگوا کے ساتھ کھیل ہوئی تھی مگر اب ایک مدت سے اس سے شرمانے اور گھونگھٹ کرنے لگی تھی۔ "لنگوا کو … جانے ہے لنگوا اب ایک سواری آتی ہے!" وہ ہنس کر چھوڑ دیا اور گوری بھی اس وقت نہ جانے کہاں سے بہت آ گئی۔ درانتی ہاتھ میں لے کر کھڑی ہو گئی۔ … آہستہ آہستہ تو گوری کی درانتی تیز ہاتھ ٹریکٹر کے پیچھے پیچھے فصل کاٹ رہی ہے!

کچھ ہی دور پر لنگوا کا باپ اپنے بڑھاپے کی کمزوری بھول کر تیزی سے ہاتھ سے درانتی چلا رہا تھا اس کے قریب گوری کے چھوٹے بھائی بہن منو اور … چھوٹی چھوٹی درانتیاں لئے کام کر رہے تھے۔

اور کھیت کی مینڈھ پر کھڑی اوشا یہ سب دیکھ رہی تھی۔ اسے زندگی میں پہلی بار یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اور سب کام کر رہے ہیں اور وہ بیکار ہے۔

اس نے دیکھا ایک بوڑھی عورت کانپتے ہوئے ہاتھوں سے درانتی چلا رہی ہے مگر شاید اس کی چندھی آنکھوں سے کچھ سجھائی نہیں دیتا۔

اوشا نے سوچا، کہیں یہ بے چاری اپنا ہاتھ نہ کاٹ لے!

"لاؤ ماں جی مجھے دو، تم آرام کرو" اوشا نے بڑھیا سے درانتی چھینتے ہوئے کہا۔ مگر اسے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ کٹائی کا کام دیکھنے میں بہت آسان معلوم ہوتا تھا اتنا آسان نہیں ہے۔ … بیٹھنے سے اس کی ٹانگیں اکڑ گئیں۔ اس کی ریشمی ساڑھی کا پلو … کر پھٹ گیا۔ گیہوں کی سخت بالوں سے اس کے ہاتھوں اور بانہوں پر خراشیں پڑ گئیں۔ کئی بار ایسا ہوا کہ اس نے جڑیں پکڑ کر درانتی چلائی مگر درانتی پھسل گئی۔ ایک ڈنٹھل بھی نہ کٹا۔ ایک بار تو اس نے اپنا ہاتھ ہی کاٹ لیا تھا۔ … کٹائی ایک کاریگری ہے۔ … کام بھی نہیں کر سکتی! اس نے سوچا۔ اتنے میں گوری … آئی اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا: "کاکی ایسے نہیں، ایسے کاٹتے ہیں!" اور اس نے درانتی چلا کر دکھایا کہ اسے سیدھا تھام کر کس قدر تیزی سے کاٹ سکتی ہیں۔

… جا رہا تھا … رمیش … جب اس نے دیکھا کہ … اس کے ٹریکٹر کی سیدھ میں کوئی عورت فصل کاٹ

رہی ہے۔"

"مجھوں چاروں طرف ۔۔۔۔ تم ہو؟"

"ہاں اور کیا ۔۔۔۔ تم سمجھتے ہو میں اتنا کام اکیلی نہیں کر سکتی!"

[illegible]

رکھیں اور [illegible] ہو گئی ہیں!"

[illegible]

کی مدد کو دوڑی۔

جیسے ہی بارش [illegible] شروع [illegible]

آ گئی [illegible]

تیری ہو گئی [illegible]

[illegible]

اب اس کے [illegible] شروع ہو گئی تھی

ہوا ابھی تیز [illegible]

ہوشیار [illegible] کھیت

تر جانے والا تھا۔

"نکلو ابھی!" [illegible]

زمین کر خراب ہو جائیں گے!"

اسی دم بارش شروع ہو گئی اور [illegible] کے ساتھ دریا کی آواز فضا میں گونج اٹھی۔

[illegible]

سنبھالے کھڑا تھا۔

"کیا تم نے اس سب کا [illegible] کسی [illegible] کر اس سے پوچھا۔

"ہاں اللہ کا [illegible] ہے ۔۔۔ کیا [illegible] ہو گیا!"

اور [illegible] نے سوچا [illegible]

[illegible]

فصل [illegible]

ایک عورت نے دوسری عورت سے کہا۔ "میرے شوہر [illegible] کی قیمت [illegible] ہوتی ہے۔"

دوسری عورت بولی۔ "میرے شوہر [illegible] قیمت [illegible] ہوتی ہے۔"

پہلی عورت نے پوچھا۔ "آپ کے شوہر کیا کرتے ہیں؟"

دوسری عورت نے جواب دیا۔ "بھیک!"

[illegible]

[illegible]

[illegible]

"وہ سب [illegible] ہو گا!"

اب [illegible] بارش [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اس [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

چلا ہوں!"

اور جب سکوٹا طلب کر کے رتیش سے کہا اور اس کے لہجے میں سختی اور جلن تھی: "یہ جان جوکھوں کا کام ہے، مسٹر دیپ کوئی فلم کا سین نہیں لیا جا رہا ہے۔"

جب وہ ندی کے کنارے پہنچا جہاں بند کو توڑ کر پانی کا ایک تیز دھارا نشیب کی طرف بہہ رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ فارم کے سب لوگ جو تھوڑی دیر پہلے دوا کی تھیلیاں چلا رہے تھے، اب ریت کی بوریاں اٹھا اٹھا کر لا رہے ہیں۔ رتیش ان کو بند کے ٹوٹے ہوئے حصے میں ڈلوا رہا تھا: "ادھر جلدی، ادھر سے یہ بوری ادھر رکھو۔" بجلی کوندی تو اس نے دیکھا کہ بوریاں رکھوانے والوں میں دیپ بھی ہے۔ حیرت اور غصے سے وہ چلایا: "مسٹر دیپ آپ یہاں کیا کر رہے ہیں۔ جائیے آپ کو کچھ ہو گیا تو خواہ مخواہ الزام مجھ پر آئے گا۔"

مگر اسی دم اس کے آدمی نے آ کر کہا: "رتیش بابو، جلدی کیجئے بند ایک جگہ سے اور بھی ٹوٹ گیا ہے۔۔۔"

ساری رات بھرے اندھیرے میں یہ مہم جاری رہی یہاں تک کہ سویرے کا دھندلکا ہو گیا۔ بارش کا زور بھی کسی قدر تھما، تھک کر رتیش اور دیپ دونوں ریت کی بوریوں کے ایک ڈھیر پر بیٹھ گئے اور لوگ کام ختم کر کے اپنے اپنے گھر جانے لگے۔

"میرے خیال میں مسٹر دیپ کمار آپ جیسے فن کار کو تو اس رات میں اپنے فلموں کے لئے بڑا مواد ملا ہو گا؟" رقابت کی خلش اب تک اس کے دل میں چبھ رہی تھی۔

"اس میں کیا شک ہے۔ مگر معلوم یہ ہوا کہ زندگی فلم سے بھی زیادہ دلچسپ اور ڈرامیٹک ہے۔"

"جی ہاں! آپ کو تو یہ سب بھی فلم کا سین ہی معلوم ہوتا ہو گا۔ ہیرو اور ولین دونوں موجود ہیں۔" اس نے دیپ کمار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا: "صرف ہیروئن کی کمی ہے۔"

"تو لیجئے ہیروئن بھی آ پہنچی۔" دیپ کمار نے جو کھیتوں کی طرف منہ کئے بیٹھا تھا ادھر اشارہ کیا۔ رتیش نے دیکھا اس کی برساتی پہنے، پا پیادہ کھیتوں میں سے ہوتی ہوئی اوشا چلی آ رہی ہے۔ جب وہ قریب آئی تو انہوں نے دیکھا کہ اس کے کندھے پر تھرموس لٹکی ہوئی ہے اور اس کے ہاتھوں میں بسکٹوں کا ڈبہ ہے۔

"آپ لوگوں کے لئے چائے لائی ہوں۔" اس نے کہا۔ "رات بھر بھیگے ہیں کہیں سردی نہ لگ جائے۔"

وہ گلاس میں چائے انڈیل رہی تھی کہ ندی کی جانب سے ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا آیا اور دیپ کمار نے چھینکا۔

"میں پہلے ہی کہتی تھی، بمبئی کے نازک لوگ ہیں کہیں نمونیہ نہ ہو جائے۔" ابھی یہ کہہ ہی رہی تھی کہ رتیش کو ایک عجیب خیال آیا تھا۔

دونوں کو چائے دے کر اوشا کنارے کی طرف گئی، جہاں سے بند ٹوٹا تھا۔ اس جگہ کو جھک کر دیکھنے لگی: "یہ سارا حصہ ٹوٹ گیا تھا؟ بڑی خیریت ہوئی کہ تم لوگ آ گئے نہیں تو۔۔۔"

اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ اس کے بھیگے ہوئے سینڈل کنارے کی مٹی پر پھسلے اور وہ ندی کے تیز رفتار دھارے میں جا پڑی۔

"اوشا!" دیپ اور رتیش بے اختیار چلا پڑے اور اس سے پہلے کہ رتیش کچھ کرے دیپ کمار پانی میں کود گیا۔

رتیش جو تیراکی کا ماہر تھا، کچھ دور کنارے کنارے بہاؤ کے رخ دوڑا پھر پانی میں کودا اور کودتے ہی اسے معلوم ہوا کہ اسے اوشا کو ہی نہیں دیپ کو بھی بچانا پڑے گا۔ اوشا کو رتیش نے تھوڑا بہت تیرنا سکھایا تھا اور وہ کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھی۔ صرف تیز بہاؤ کا ڈر تھا کہ کہیں سے کہیں نہ پہنچا دے۔ لیکن دیپ؟ اس کو تو ہاتھ پاؤں مارنا بھی نہیں آتا تھا۔ ڈبکیوں پر ڈبکیاں کھا رہا تھا۔ رتیش نے پہلے اسے سنبھالنا چاہا مگر دیپ نے گھبرا کر رتیش کو اس بری طرح پکڑ لیا کہ وہ بھی نیچے بیٹھ گیا۔ ایک ڈبکی کھا کر جب دونوں ایک دوسرے میں گتھے پانی کے اوپر آئے تو تیرتے تیرتے اوشا یہ دیکھ کر چیخ پڑی کہ رتیش نے ایک زور کا گھونسا دیپ کی کنپٹی پر رسید کیا، اور وہ بے چارا بے ہوش ہو کر لٹک گیا، مگر اسی دم رتیش نے اس کے گھونگریالے بال مضبوطی سے بائیں ہاتھ میں پکڑ لئے اور اسی طرح اسے گھسیٹتا داہنے ہاتھ سے تیرتا اوشا کے قریب پہنچا۔ تھک کر اور بوجھل برساتی میں الجھ کر وہ بھی ڈبکی کھانے ہی والی تھی کہ رتیش اس کے قریب پہنچ گیا۔

اور اس نے پہلا کام یہ کیا کہ ایک زور کا جھٹکا مار کر برساتی کو اتار پھینکا۔ پھر اوشا کی طرف داہنا ہاتھ بڑھا کر چلایا: "میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لو اوشا، اور کنارے کی طرف تیرنے کی کوشش کرو۔ مجھے اس بجر بٹو کو بھی سنبھالنا ہے۔"

جان کے خطرے کے باوجود بجر بٹو کا لفظ سن کر اور دیپ کمار کے بے ہوش چہرے کو دیکھ کر اوشا کو ہنسی آ گئی اور جب اس نے رتیش کے بڑھے ہوئے مضبوط ہاتھ کی گرفت اپنے ہاتھ پر محسوس کی تو اس کو ایسا لگا کہ طوفان ختم ہو گیا ہے اور اب اس کو کوئی



خطرہ نہیں ہے۔

***

دیپ کمار پروڈکشنز والوں کو اسٹیشن پر چھوڑ کر رمیش اور اوشا جیپ میں واپس آرہے تھے۔

"رمیش!"

"ہوں!"

"مجھے معاف کر دیا تم نے؟"

"قصور تو میرا تھا اوشا!"

"تمہارا؟"

"ہاں میرا ــــ گلاب کے پھول بھی زندگی میں اتنے ہی اہم ہیں جتنے گیہوں!"

"پھر میں نے گورنمنٹ کو لکھا ہے کہ فارم کے لوگوں کے لئے ایک سینما ہونا چاہیئے تاکہ یہ لوگ بھی دیپ کمار کی فلم دیکھ سکیں۔ خصوصاً اس کی اگلی فلم نیا ہندوستان، جس کی شوٹنگ ہمارے فارم پر ہوئی ہے!"

"اور؟"

"اور اس سال چھٹی ملے گی تو میں پچھلے سال کی طرح یہیں بیٹھ کر ریسرچ نہیں کروں گا!"

"پھر کیا کرو گے؟"

"ہم دونوں بمبئی جائیں گے۔ دیپ کمار نے ہمیں ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ آنے کی دعوت دی ہے۔ اس کی شوٹنگ دیکھیں گے!"

"مجھے شوٹنگ دیکھنے کا کوئی خاص شوق نہیں ہے!"

"مگر مجھے تو شوق ہے۔ میں دیپ کمار کو اس کے اپنے کام کے ماحول میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ بُرا آدمی نہیں ہے۔ مگر ہر آدمی کا اپنا کام ہوتا ہے، اپنا ماحول ہوتا ہے۔ اس کے باہر وہ بھٹک جاتا ہے جیسے ندی میں کود کر وہ بے چارہ ہو گیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اسے ٹریکٹر پر بٹھا کے کیمرے کے سامنے کر کے کھڑا کر دیا جائے تو ڈر کے مارے مجھے پسینہ آ جائے۔ ہاں تو جاتے جاتے دیپ مجھے کیا کہہ گیا ہے؟ کہہ رہا تھا رمیش تمہارے فارم پر ان پندرہ دنوں میں میں نے زندگی کے بارے میں بہت کچھ سیکھا ہے۔ اس نئی سمجھ بوجھ کی جھلک تمہیں میری فلموں میں ملے گی۔ تب ہی تو میں یہاں سینما بنوانا چاہتا ہوں تاکہ دیپ کمار کی فلمیں دیکھتا جاتا ہوں ــــ

"پھر رپ سکنڈ کا ذکر ہے؟"

"کیوں تم اس سے خفا معلوم ہوتی ہو۔ تم سے الگ بیٹھ کر وہ سوچتا لگتا ہے کوئی ایسی ویسی بات کہہ دی جس سے تم ناراض ہو گئیں سو وہ اپنے آپ کو بہت کیا ہے۔ کہنے لگا مسز رمیش آپ فضول میں کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ آپ کی آنکھیں کس قدر بڑی اور آپ کی ناک کس قدر چھوٹی ہے۔ آیا بڑی لمبی ناک والا ہے؟"

اتنے میں گھر آ گیا، جیپ سے اتر کر رمیش نے اوشا کو سہارا دے کر اتارا۔ پھر بولا۔

"آؤ اب میں تمہیں ایک چیز دکھاؤں۔"

"دکھاؤ، تو پھر میں بھی تمہیں ایک بات بتاؤں گی۔"

"وہ دیکھو۔ تمہارے گلاب، کتنے خوبصورت پھول کھلے۔"

گلاب کی جھاڑیاں مکان کے پیچھے باغ میں لگی ہوئی تھیں مگر ان میں پھول ایک بھی نہیں تھا۔

"یہ پھول کس نے چرائے ہیں؟"

"میں نے رمیش بابو!"

لنگڑا کھڑا مسکرا رہا تھا اور اس کی جھولی میں سرخ گلابی اور سفید گلاب کے تازہ پھول بھرے ہوئے تھے۔"

"اوشا کیسی ہے؟" رمیش بولا [illegible]

لئے مگر بات یہ ہے کہ آج میری شادی ہے ۔۔۔ میں نے کہا آپ کو چاہئیں تھے یہ بیچنے ۔۔۔

"نہیں لنگڑا" اوشا ابھی سے بولی۔ "تم سب پھول لے جاؤ اور میری طرف سے دلہن کو پریزنٹ دینا اور جب شادی ہو جائے تو گلاب کی کیاری کم یہاں سے جاتا اور اپنے گھر کے باہر لگا لینا سمجھے؟"

"سچ حضور — تو کیا یہ سب لے جاؤں؟"

"لے جاؤ" رمیش نے اجازت دے دی۔ "مگر ایک پھول مجھے دے جاؤ" اور اس نے ایک خون کے رنگ کا سرخ گلاب چن لیا۔

لنگڑا چلا گیا۔

"دیکھا تم نے لنگڑا بھی گلاب کے پھولوں کو کتنا پسند کرتا ہے؟"

"مگر یہ بھی دیکھا کہ لنگڑا اٹھ کر چلا گیا کہ ہوں کتنا پیسہ کرتا ہے"

"لنگڑا بڑا خوش نظر آتا ہے نا!"

"شادی بھی تو گوری سے ہو رہی ہے۔ جانے کتنی خوبصورت ہے وہ؟"

"تم سے زیادہ خوبصورت تھوڑا ہی ہے؟"

"لنگڑا کے دل سے پوچھو۔"

"اچھا تو میرے دل سے بھی پوچھو۔" یہ کہہ کر اس نے اوشا کے جوڑے میں گلاب کا پھول لگا دیا اور اس کے بالوں کو چومتے ہوئے کہا۔ "اب بتاؤ وہ بات"

"تو لاؤ کان یہاں"

"سچ!"

"بھول!"

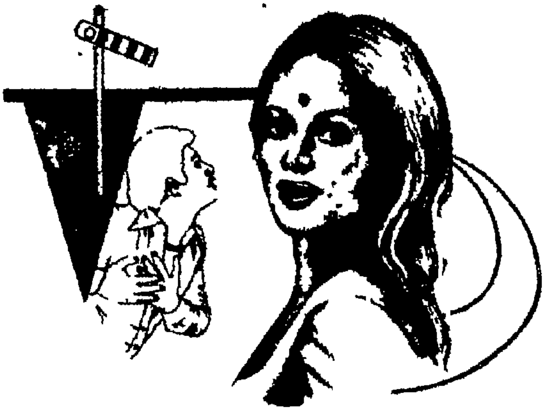
"ایک چھوٹی سی ننھی سی اوشا!"

"اور نہیں ایک چھوٹا سا ننھا سا رمیش"

"اوشا وہ دیکھو"

اوشا نے مڑ کر دیکھا

گلاب کی جھاڑیوں پر ایک چھوٹی سی ننھی سی گلابی کلی کی ایک معصوم ننھا شیرخوار بچے کی طرح مسکرا رہی تھی۔



موت کا سایہ منڈلاتے دیکھ کر انسان کتنا بدل جاتا ہے

کافی دیر تک سڑک دھوپ کر کے جمیلہ نے ٹیک لگا لی تھی
کمپارٹمنٹ میں رقیہ کو دھکیل دیا۔ رقیہ کے
پیٹ پر شہپاری کی ململ بندھی ہے۔ اس نے نگاہ نیچی کی تو اپنے
گول مٹول اونچے پیٹ کو دیکھ کر جھینپ گئی۔ موہ جان اس کی پہلی
اولاد ہے۔ جب وہ پیدا ہونے کو تھی تو ایک روز...... نجانے
کیا کیا یاد کر کے رقیہ شرما رہی۔

گاڑی کی رفتار تیز ہو رہی ہے۔ رقیہ اپنے خشد حتے سے
میں رفتہ رفتہ آگے بڑھ رہی ہے۔ سکھ بجا ہے اور شرم ہے کہ
اور شرم ہے لیکن شمس کا عمر ادا تا کا واسطہ بھی اس قدر مشکل ہے کہ رقیہ
چاہ کر بھی اس رشتے سے نہیں بھاگ سکتی [illegible]
وعدہ اکثر [illegible]

تھی۔ شکر ہے کوئی آدمی یہاں نہیں ہے؟ جبھی صاحبان رشوت کا پیسہ
لوٹ لیتے ہیں یہاں کوئی مسئلہ نہیں ہوتا؟ جمیلہ اپنے گرد شال کھینچ کر
اس نے سمجھایا تو رقیہ کو ڈھارس بندھی۔ بیٹا پہلا اسٹیشن پر گاڑی
دیر تک رکتی ہے۔ رقیہ اپنی جگہ پر سکڑ کے بیٹھی تھی۔ جمیلہ نے کہا
منہ نیچے اتار کر گھوم سنا!

• وہ تا! مجھے ڈر لگتا ہے!

• اپنے ڈر کا ہے کا؟ ہم کیا تھا اگر کوئی پوچھے گا تو کہہ دینا
بھی لگتا اور رستہ معلوم ہے۔ سے بھی کچھ پوچھ لیں گے --- ہی
--- جمیلہ نے جس بچکانہ انداز سے رقیہ بھی مسکرا دی
جمیلہ شکایت سے رقیہ سب سے بڑی نند تھی
اپنا بھی ایک ہی آسرا ہے یہاں، بہادری سے سہارا کا

سے بھاؤ تیل نمک سب کا ہوتا۔"

رقیہ نے گھوم کر دیکھا۔ بات صحیح ہے۔ بہت سی عورتیں، بچے، بوڑھے، جوان سب ٹرین کے ڈبوں میں تھیلے بھر کر بیٹھے ہیں۔ پھر بھی رقیہ ڈری ہوئی ہے۔ سنا ہے پکڑے جانے پر بھی کچھ نہ کچھ دینا پڑتا ہے۔

جمیلہ نے تنبیہ کی۔ "یہاں سے ٹھیک تیسرا اسٹیشن پر اترنا ہے، سمجھی!"

رقیہ سمجھ گئی۔

منزلِ مقصود پر گاڑی رکتے ہی رقیہ چھلانگ مار کر اتر گئی۔ سامنے جنگلی گھاس پھونس سے بھرا ہوا میدان ہے۔ اس میں سے نجانے کتنے لوگ پوٹلی کندھے پر رکھ کر بھاگ رہے ہیں۔ کوئی پیچھے مڑ کے نہیں دیکھتا۔ بھاگنے میں اناڑی رقیہ رہ رہ کر رک جاتی ہے۔ جمیلہ اسے آگے کو دھکیل دیتی۔ پیدل ہی سے رکتی کاہے کو ہے۔

پانچ بجے کی واپسی گاڑی سے رقیہ لوٹ آئی۔ اسی بھاگتے ہوئے جھنڈ کے ساتھ۔ اس وقت سب کے پاس سیر، دو سیر سرسوں کا تیل ہے، نمک ہے۔ کسی کسی کے میلے کپڑے کی گھونٹ میں نقد پیسے بھی ہیں۔ چند ہی روز میں رقیہ کو لگا کہ اب وہ اس کاروبار میں ماہر ہو گئی ہے۔ اب وہ پہلے سے زیادہ بے فکر اور بے جھجک ہو کر ٹرین میں گھس جاتی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اب رقیہ کے گھر دونوں وقت کھانا بنتا ہے۔ کبھی کبھی مچھلی اور گوشت بھی۔

گزرتے ہوئے دنوں کی بڑھتی ہوئی خوشحالی کے درمیان ایک روز رقیہ نے اچانک ہی محسوس کیا کہ اس کی لڑکی مہرو جان اب سیانی ہو گئی ہے۔ دس ہاتھ کی چھوٹی پرانی ساڑھی میں اب اس کے بدن کے نشیب و فراز چھپتے نہیں۔ مہرو کب سے اپنی ماں کے دھندے میں شریک ہو گئی ہے۔ یہ کوئی نہیں جانتا۔ رقیہ نے سوچا "آہ میری لڑکی کی عزت آبرو سب سے بڑی چیز ہوتی ہے۔ اسے سنبھالنا ہوگا، بچانا ہوگا۔" رقیہ نے دل ہی دل میں قسم کھائی۔ اس کا اکلوتا لڑکا بجلی بھی کس قدر بدل گیا ہے۔ وہ بھی آج کل گروہ کے ساتھ دھان سپاری چھپا کر بیچنے لگا ہے۔ دو پیسے اس کی جیب میں بھی آ جاتے ہیں۔ تو دس سال کی کچی عمر میں ہی اس نے کافی دنیا داری سیکھ لی ہے۔ مگر ایک وہ بھی لنگوٹی میں رکھ لیتا تھا اب [illegible] اور چند بیڑیاں بھی۔ ماں رقیہ اسے روزانہ آتے جاتے تنبیہ کرتی ہے

"اسے بیوقوف کیوں ترا سپاری لے کر چیک پوسٹ پر پکڑا جاتا۔ کئی لوگوں کی جان گئی ہے سمجھے؟"

"موت [illegible]"

رقیہ کبھی کبھی ٹرین میں بیٹھی بیٹھی اونگھنے لگتی ہے۔ مہرو جان کی چڑھتی عمر اسے بیکل کر دیتی ہے۔ ہر اسٹیشن پر اتر کر مہرو جان ٹرین والوں کو ایک خاص انداز سے گھورتی ہے۔ ایک روز رقیہ نے ٹوکا۔ "کیا تو کوئی ناچنی ہے جو بار بار کبھی مردوں پر نظر ڈالتی ہے۔ بدتمیز لڑکی۔ تجھے شرم نہیں آتی؟"

سرسوں پیدا ہونے کا جانا کافی دور ہے۔ پھر بھی ٹرین پکڑنے کے لئے روز پیدل اتنا چلنا ہی پڑتا ہے۔ شام کو رقیہ گھر پہنچتی ہے۔ جب سے کنبے کے افراد کماؤ ہو گئے ہیں تب سے شام کو دیا بتی بھی جلنے لگی ہے۔ شام ہوتے ہی نجانے کتنے جانے انجانے نوجوان لڑکے اس کی پوچھ تاچھ کرتے رہتے ہیں۔ کوئی "چچی" کہتا۔ کوئی "پھوپھی"۔ انہیں پہلے کبھی دیکھا بھی نہیں۔ رقیہ نے ان کی نگاہوں میں مکاری دیکھی ہے۔ ہوس کی بو ہوتی ہے اور رقیہ ایک دم سہم جاتی ہے۔ یہ سب مہرو کی وجہ سے ہونے لگا ہے۔ کم بخت اکھڑ ہی!

یوں تو روز پولیس والے ٹرین میں ایک آدھ چکر لگا لیتے ہیں۔ مگر تلاشی یا گرفتاری روز نہیں ہوتی۔ ایک روز سپاہیوں نے یکایک دھاوا بول دیا۔ شور و غل، بھاگ دوڑ۔ اور چیخ پکار کے بیچ ہوئے جھگڑے میں بیچاری رقیہ بری طرح پھنس گئی۔ وہ بھاگنا ہی چاہتی تھی کہ اتنے میں سپاہیوں نے اس پر دو چار بار لاٹھی چلا دی۔ رقیہ کے ہوش و حواس گم۔ گروہ کے دوسرے لوگوں کی بھی اچھی خاصی مرمت ہوئی۔ تیل، سپاری، نقد سب پولیس والوں نے چھین لیا۔ رقیہ جب گھر لوٹی تو سب سے پہلے اسے بجلی کا خیال آیا۔ مقدر سے بجلی کی آہٹ ملتے ہی رقیہ دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔ "کہاں تھا رے؟ تجھے پولیس والوں نے پکڑا تو نہیں؟"

"وہ کیا پکڑیں گے۔ میں ایسا سرپٹ بھاگا کہ بس۔ باپ بھی نہ چھو پائے۔"

رقیہ نے اس کے ماتھے پر ہاتھ پھیرا۔ نادان بچہ!

تھوڑی دیر میں مہرو جان بھی آ پہنچی۔ اسے معلوم ہے ماں کو لاٹھی لگی ہے۔ وہ رقیہ کے پاس آ بیٹھی اور رقیہ کو سہارا دے کر لٹایا۔ تھوڑی دیر میں آنکھ لگ گئی۔

مہرو نے بڑی ہمدردی سے پوچھا۔ "چوٹ زیادہ لگی؟"

رقیہ کمرہ بند کرکے لیٹ گئی۔

مہرو کمر پر ہاتھ رکھ کر بولی "دیکھا! اسی لئے میں ہجیلا بھی کی خاطر کرتی ہوں سب کچھ تاکہ ان لوگوں نے دیکھ کر بھی سمجھا؟"

"چپ رہ بے شرم! عورت ہے تجھے شرم نہیں آتی؟"

"کاہے کی شرم؟ وہ تو دھندہ ہی بے عزتی کا ہے جانا! روز روز لاٹھی گھونسہ سنبھال جا کر" مہرو اپنی ناگن کی سی چٹیا لہرا کر اندر چلی گئی۔

رقیہ کو نیند نہ آئی۔ وہ بیٹھے بیٹھے کوئی طریقہ سوچنے لگی۔ اس طرح سے کام نہیں چلے گا۔ مہرو جوان ہوئی جا رہی ہے۔ اب اسے جلدی ہی کسی کے حوالے کر دینا چاہیئے۔ مگر کس کے؟ کوئی اچھا لڑکا نظر آیا ہے نہ وہ پیسہ جمع کر پائی ہے۔

ایک روز شام کو گدھے کے تمام لوگ واپس آ گئے۔ صرف مہرو نہیں آئی۔ رقیہ دیر تک منتظر رہی۔ طرح طرح کے اندیشوں سے اُس کا دل بھاری ہو جاتا۔ آدھی رات تک رقیہ دروازے پر بیٹھی رہی۔ بعد ازاں اندر جا کر دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ اندھیرا چھٹتے ہی رقیہ اسٹیشن کو بھاگی۔ فاسٹ لوکل پلیٹ فارم پر رکتے ہی وہ پاگل سی اِدھر اُدھر دوڑنے لگی۔ وہ ...... وہ آ رہی ہے مہرو۔ مہرو جان! بے ترتیب کپڑے، سُرخ سُرخ آنکھیں۔ غیر متوازن چال۔ جھٹکے میں گجرا۔ لپک کر رقیہ نے اُس کا جھونٹا پکڑ کر کھینچ لیا۔

"حرام زادی۔ یہ حال بنا رکھا ہے تو نے؟"

"چھوڑ۔ چھوڑ دے مجھے!"

"چھوڑوں گی ہے۔ مار مار کر۔۔۔۔"

"کیا؟" مہرو شیرنی سی گرج اُٹھی۔

"کہاں تھی رات کو؟"

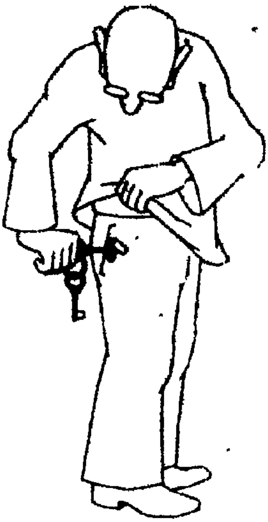
"کہیں بھی رہوں۔ تجھے کیا؟"

"تجھے اپنی عزت کی ذرا بھی پرواہ نہیں؟"

"ہونہہ! بڑی آئی ہے عزت والی، چھوری کا مال ۔۔۔"

"کیا؟ کیا کہا تو نے؟ نکل جا، نکل جا۔ پھر اس طرف کبھی قدم مت رکھنا۔"

مہرو نے پھر پیچھے مڑ کر دیکھا تک نہیں۔ اُلٹے پاؤں اسٹیشن کی طرف چلی گئی۔ اُس دن کے بعد اندھیرے کے سیاہ غار میں غائب ہو گئی۔ رقیہ نے اپنی بدقسمتی کے کیسے کیسے رنگ دیکھے تھے اور دیکھنے تھے۔ وہ رات بھر بلک بلک کر چھاتی سے چپکائے روتی رہی۔



صبح ہوتے ہی رقیہ کا کام شروع۔ آج صرف کمال اُس کے ساتھ ہے۔ بڑی حسن جمیلہ جیسے ان لوگوں کے سکھ دکھ میں شریک رہی ہے۔ اُس نے ابھی تک یہی اور اس رقیہ کو جھنجھوڑ کر پوچھا "کیوں ری کیا واقعی مہرو چلی گئی ہے؟" کافی دیر تک رقیہ خاموش سی بیٹھی رہی۔ پھر ایکا ایک جمیلہ کے پاس کھسک آئی۔ اُس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور جمیلہ کے کان میں آہستہ سے کہا "ایک بات کہوں۔ کسی سے کہیو مت۔ مہرو میرے پیٹ کی اولاد نہیں۔"

"ایں!"

"ہاں! اُسے میں نے ایک جھاڑی میں پڑا پایا تھا ... شاید کسی کا پھینکا ہوا ...." اور آگے کے جملے لڑکھڑا گئے۔ رقیہ کی آنکھوں میں کچھ گر جانے سے وہ پھیلانے لگی۔ جمیلہ کچھ نہیں پائی۔

اُس رات رقیہ کو بُرے بُرے خواب آئے۔ یہ اُس نے کیا کیا؟ جمیلہ سے یہ کہہ کر دھوکہ دینا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ مہرو چلی گئی ہے بھاڑ میں جائے۔ وہ چلی کہیں کی؟ اُس کے پاس تو کیا ہے سیرت، ہیرے کا ٹکڑا۔ رقیہ کے چہرے سے آنسو بہہ نکلے۔ آج نہ جانے کیوں صبح کا نکلا سورج رقیہ کو بڑا خوفناک سا

معلوم ہوا کسی تند شریر نے کس قدر زور تو اُگلا یا خون اُگل رہا ہو۔ یکایک
ٹیمی گاڑی رک گئی۔ چاروں طرف سے چیخ پکار سنائی دی۔ "ارے دیکھنا
دھونا اس کو تھینچا۔" یکدم چونک پڑی۔ لوگوں کو دھکیلتی سب سے
پہلے جب وہ ڈسٹینٹ سگنل کے پاس پہنچی تو کسی کی واضح آواز
سنی کہ اُس کا کلیجہ کانپ گیا۔ "کٹ گیا ہے۔ ایک دم ٹکڑے ٹکڑے
ہو گیا ہے۔ یا اللہ خون کے دریا میں لاشہ کس طرح جا گئے! ارے بھائی
کون بیٹھا تھا؟" کسی نے پوچھا۔

"شفیق میت صاحب جیل!"

ہائے! رقیہ بہری تو نہیں ہو گئی۔ کسی نامعلوم جادو کی قوت
سے کھنچتی وہ جائے واردات پر پہنچی۔ اس نے کیا دیکھا؟ عجیب
گوشت کا لوتھڑا! خون سے لت پت!

"کون ہے یہ؟ ... کون ہے یہ؟" رقیہ سب سے پوچھ
رہی ہے۔

اچانک رقیہ کو ایک کٹا ہوا ہاتھ اور ایک پیتل کی انگوٹھی
نظر آگئی۔ اُس کے بعد کچھ معلوم نہیں۔ جب ہوش آیا تو اس کے
چاروں طرف جانے پہچانے لوگ گم سم بیٹھے تھے۔ رقیہ اس بھیڑ میں
جیسے ڈھونڈ رہی تھی۔ وہ مہرو جان اُسے کہیں دکھائی نہ دی۔

جمیلہ سب کچھ سمجھ رہی تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "مہرو کو
بلاؤں؟ خبر کروں اُسے؟"

"نہیں۔ ہرگز نہیں۔ مجھے اس کی صورت سے بھی نفرت ہے۔"
رقیہ کے آنسو خشک ہو چکے تھے۔ لوگوں نے کہا۔ "بوڑھی کی بیچاری
پاگل ہو گئی ہے۔"

مگر پاگل ہونا بھی تو اس قدر آسان نہیں۔ صبح جمیلہ بلانے
آئی تو وہ سپاری کی تھیلی لے کر بیچنے چل پڑی۔ آج ڈرا اُس کے
آگے موہ ہے۔ وہ پیچھے کیا۔ پھر بھی وہ جا رہی ہے۔ رقیہ کی ٹانگیں
اس قدر کمزور ہو گئی ہیں کہ اسٹیشن تک جاتے جاتے لڑکھڑا کر گر جاتی
ہے۔ اکثر جھک کر کہا جاتا ہے۔ جمیلہ کئی بار سمجھا چکی ہے۔ "گھر پر
آرام کر لے۔ اکیلا پیٹ ہے تیرا۔ کسی طرح بھر ہی جائے گا" مگر
رقیہ یہ بات ان سنی کر دیتی ہے۔ وہ کسی کو بتا بھی نہیں سکتی کہ ہر ٹرین
پر اس کی آنکھیں کسی کو چوری چوری ڈھونڈتی رہتی ہیں۔ آخر ایک
روز یکایک پلیٹ فارم پر مہرو نظر آ ہی گئی۔ صاف ستھری چھینٹ کی ساڑھی پہنے
جھمکا لٹکائے مٹک رہی ہے۔

"توبہ! توبہ!" اس کی طرف دیکھتے ہی رقیہ نے پلیٹ فارم
پر تھوک دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے رخصت ہو گئی۔ مہرو اس کی کوئی تمیز نہ تو
پالی اعصاب۔ رقیہ نے مجبوری سے اُسے چلتا کیا۔

بھاگل اسٹیشن پر ایک روز رقیہ بیچ پر ٹک کر گھری سامنے
میں بیچ سے گر یا ہینڈل کسی نے کچھ اسا ہاتھ سے۔

"ارے ماں! ماں ہے تو؟" دبی ہاتھوں پکارا۔ وہی بچپن کا مانوس
روشن چہرہ میں ہاتھ ہلائے جا رہا۔ رقیہ نے حیرت سے پلٹ کر
دیکھا۔ مہرو جان کا لال اسے ہار رہا ہے۔ کیا ہو رہی ہے؟ جیسے سے گئی ہو۔
"ہٹ جا۔ ہٹ جا" کہتی سب بھیا۔ مت چھو مجھے۔ رقیہ نے
جھٹکا دے کر اُسے جھٹلایا۔

اُدھر چلی چل پولیس والوں کا جو وقت ہو گیا۔ اسمگلنگ
کرنے والوں کا گروہ بھی تتر بتر ہونے لگا۔ اب انہیں ہر وقت چوکنا
رہنا پڑتا ہے۔ سگنل کی طرح خطرے کی بو سونگھتا پڑتی ہے۔ رقیہ
کا حوصلہ ٹوٹ گیا۔ وہ جیسے بھی کچھ دن کی بھی کرو۔ بیاری کی
نس ہے جو اسے زبردستی اسٹیشن کی طرف لے جاتا ہے۔

اُس دن کے ہنگامے میں پولیس والوں نے گروہ کو اچانک
ہی چاروں طرف سے گھیر لیا۔ رقیہ بُری طرح جال میں اُلجھ گئی۔ پہلے
لاٹھی چلی۔ پھر آنسو گیس۔ جو نہی مسلح سپاہیوں کا ایک دستہ پلیٹ فارم
تک پہنچا، سب بھیڑوں کی طرح کھلے میدان کی طرف بھاگے۔ خطرے
کی آہٹ سب کو مل گئی۔ رقیہ ڈر کر گروہ والوں سے پیچھے رہ گئی
مگر کچھ دور جا کر گر پڑی۔ جمیلہ نے وقت پر اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا
اور جھاڑیوں میں گھسیٹ لے گئی۔ ادھر بعد میں بھی پولیس والے ایک ایک
کو پکڑ رہے ہیں۔ جمیلہ بھاگ گئی۔ رقیہ بیک رنگ کر قریب کی جھاڑی
میں چھپ گئی۔ اتنے میں ایک بندوق والے سپاہی نے اُسے
دیکھ لیا۔

"کون ہے؟ نکلو!"

گویا شیر گرجا۔ موت کا سایہ سر پر منڈلانے لگا تو رقیہ بلبلا کر
چیخ اٹھی۔

"رحم کرو! پہچانتا نہیں مجھے؟ میں مہرو جان کی ماں ہوں۔ جی
ہاں! مہرو جان کی ماں!" سپاہی کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی
مسکراہٹ اُبھری اور وہ اُسے وہیں چھوڑ کر دوسری طرف چل دیا۔

(ایک بنگالی کہانی سے ماخوذ)

طوفان

مہ جبین ناصر

انسان کسی خوب صورت چیز کو دیکھتا ہے تو اس میں سے کیا ابھرتا ہے ؟
ایک خوش و خرم بیاہتا جوڑے کی دلچسپ کہانی

ہنسا ارڈیگر اور شیام کے متعلق سب کا متفقہ فیصلہ تھا کہ ایسا حسین اور خوبرو جوڑا شاید کسی نے نہ دیکھا ہو۔ ہنسا پہاڑوں کے حسن و جمال کی جیتی جاگتی تصویر تھی۔ شیام شمالی ہند کی فضا میں پلا ہوا ایک خوبصورت نوجوان تھا۔ جب پہلی بار دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو ایک لمحے کے لئے مبہوت ہو کر رہ گئے۔ ہنسا شفاف گورے رنگ کی ایک صحت مند لڑکی تھی، جو گاؤں کی عورتوں کی طرح ساری پہنتی تھی اور جس کے دودھ کی طرح سفید سفید دانت اور گوری گوری سڈول پنڈلیاں اسے گھور رہی تھیں۔ ہنسا کے دل کش خطوط کو دیکھ کر اجنتا کی سنگ تراشی کے نادر نمونے یاد آ جاتے۔ کبھی کبھی تو یقین ہو جاتا کہ اس لڑکی نے آج سے کئی صدیاں پہلے اس دنیا میں ضرور جنم لیا تھا اور کسی سنگ تراش کی بے قرار روح کی نظر اس حسین مجسمے پر پڑی ہو



پڑی ہوگی۔ اور یہ لڑکی اطلاقی بل کھاتی۔ بڑی بڑی شوخ آنکھوں سے دیکھتی ہوئی اس کے قریب سے گزری ہوگی۔ بے چارے سنگ تراش کے دل پر چھریاں چل رہی ہوں گی۔ اس سنگ تراش نے ان خوبصورت لمحات اور لڑکی کے خدوخال، اس کے جسم کے دل آویز خطوط کو پتھر کے جامے میں ڈھالا ہوگا اور پھر اس لڑکی سے کچھ کہے بغیر ابدی نیند سو گیا ہوگا۔

شیام ایسا سنگ تراش نہ تھا، اور نہ آرٹسٹ شاعر یا افسانہ نگار ہی نہ تھا کہ اپنی محبوبہ کے حسن کو کسی افسانے میں اجاگر کرتا۔ وہ ایک فرم میں اچھی تنخواہ پر ملازم تھا۔ اس نے منسا کی معصوم اور کنواری ہنسی کو نہ رنگوں میں ابھارا اور نہ کسی ناول ہی کی ہیروئن بنا کر اسے امر کیا۔ بلکہ ایک عام انسان کی طرح اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ وہ چھوٹا سا نرم ہاتھ اس کی مضبوط ہتھیلیوں میں پھڑپھڑانے لگا۔ منسا پہلی نظر میں شیام کو دل دے بیٹھی۔ اسے سوچنے کا موقع ہی کب ملا تھا۔ بس محبت بڑھتے بڑھتے بڑھی اور پروان چڑھی، پیار میں جیسا کہ سب کا حال ہوتا ہے۔ وہی ان کا ہوا۔ یعنی ایک مہینہ کورٹ شپ کے بعد دونوں ازدواجی بندھن میں بندھ گئے۔

اب دونوں باندرہ میں رہتے تھے۔ سمندر کے کنارے ایک چھوٹا سا فلیٹ تھا۔ گردونواح میں رہنے والے اکثر لوگ اس حسین جوڑے کو رشک بھری نگاہوں سے دیکھتے جو اکثر غروب آفتاب کے وقت سمندر کے کنارے سیر کرنے جاتا۔ آس پاس کے رہنے والوں کی رائیں ان دونوں سے مختلف تھیں۔ مگر جوڑے کے متعلق ایک ہی رائے تھی، عورتوں کی زیادہ تعداد شیام کے حسن کی تعریف کرتی اور مرد منسا کو دیکھ کر عش عش کر اٹھتے۔ شادی کے کئی سال گزرنے کے بعد اس چھوٹے سے فلیٹ میں کئی چیزوں کا اضافہ ہوا۔ شروع میں تو صرف اس جوڑے کی ہنسی کی آواز سنائی دیتی تھی۔ آج کل وہاں بچے کھیلتے تھے۔ بڑی لڑکی کی عمر تیرہ برس کی ہوگی جو بالکل اپنی ماں کی تصویر تھی اور کئی منچلے نوجوان ابھی سے آس لگائے بیٹھے تھے کہ جونہی یہ نوخیز کلی شباب کی دہلیز پر قدم رکھے گی، وہ اپنا دل اس کی نذر کر دیں گے۔ ایک لڑکا دس سال کا تھا جو شیام کی طرح سینہ پھیلائے چلتا۔ وہی لمبوترا چہرہ، پروقار ٹھوڑی، لانبا قد اور گھنے گھنے سیاہ بال، ناک فدا مرو ڈسی، جسم گٹھا ۔ و ۔ توانا ۔ تندرست ۔

تین سال ہوئے ایک اور بچے کا اضافہ ہوا۔ یہ لڑکی تھی، جس کا رنگ ماں کی طرح گورا گورا سا تھا، پتلے پتلے ہونٹوں کی بجائے شیام کی طرح بھرے بھرے ہونٹ اور سر کے بال بھورے بھورے بالکل منسا کی طرح اور شیام کی طرح روشن روشن آنکھیں، جن کی پلکیں عورتوں کی طرح لمبی اور سیاہ تھیں۔ لڑکی کی صحت اچھی خاصی تھی۔ قد کے متعلق کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ کیونکہ جب لڑکی بڑی ہوگی تو قد کے بارے میں کوئی رائے قائم کی جا سکتی ہے۔

پانچ افراد کا یہ کنبہ اس دور ابتلا میں بہت خوش باش کنبہ تھا۔ دونوں جیون ساتھیوں میں بہت پیار تھا کسی چیز کی کمی نہ تھی کہ شکایت کا موقع ملتا۔ اکثر حسن اور دولت کا آپس میں بیر رہتا ہے اور یہیں سے لڑائی جھگڑے کی بنیاد پڑتی ہے۔ لیکن شیام کو نو سو روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ اس نے ایک چھوٹی سی کار بھی خرید لی جس پر سارا کنبہ اب سیر کرنے جاتا۔

دونوں کی ازدواجی زندگی بہت پیار اور آرام سے گزر رہی تھی۔ منسا تین بچوں کی ماں بن کر بھی اتنی حسین اور خوبصورت تھی کہ آج کل کی الہڑ اور نئی نویلی لڑکیوں کا حسن اس کے سامنے ماند پڑ جاتا۔ کام کاج سے اُسے خاصی دلچسپی تھی۔ ہر روز صبح وہ اپنے شوہر کے ساتھ سیر کے لئے جاتی۔ اسے تیرنے کا بھی شوق تھا۔ جوہو کے کنارے وہ کئی بار اپنی بچیوں کو ساتھ لے کر گئی۔ جب نہانے والی کاسٹیوم پہن کر دونوں سمندر میں نہانے کے لئے نکلتے تو گزرنے والوں کی نگاہیں منسا کے متناسب جسم پر آ کر جم جاتیں۔ ایسا معلوم ہوتا، اجنتا کے غار سے کوئی حسین مجسمہ ٹہلتا ٹہلتا سمندر کے کنارے آنکلا ہو۔ تھوڑی دیر نہا کر دونوں کنارے پر آ جاتے اور سورج کی ہنستی ہوئی شعاعوں کو اپنے جسم میں جذب کرتے ان کے تینوں بچے کبھی ان کے گرد ناچتے تالیاں بجاتے اور پھر پورا خاندان سمندر میں کود جاتا۔

شیام دفتر سے سیدھا گھر آتا۔ کبھی کبھی باورچی خانے میں جا کر منسا کا ہاتھ بٹاتا۔ سبزی کاٹتے کاٹتے اپنا ہاتھ کاٹ لیتا۔ اس وقت منسا بے حد پریشان ہوتی — "بابا جاؤ نا اپنے کمرے میں جو کام نہیں آتا وہ کیوں کرتے ہو؟" وہ کٹی ہوئی انگلی کو اپنے منہ میں ڈالتا اور کہتا — "اکیلا کمرے میں کیا کروں؟ تمہارے بغیر تو جی نہیں لگتا۔" "تو نا ڈرائینگ روم میں۔"



"شادی ہوئے اتنے سال بیت گئے۔ ابھی تک تم مجھے نئی نویلی دلہن سمجھتے ہو؟"

"اپنی صورت تو آئینے میں دیکھو۔ وہی بھولا بھالا چہرہ، مسکراتے ہوئے ہونٹ اور وہی گوری گوری باہیں۔ دلہن نہیں تو اور کیا ہو؟"

"اور تین بچے؟" وہ آنکھیں نیچی کرکے بولتی۔

شیام اس کے اور قریب آجاتا اور کمر کے گرد ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرتا۔

"ہٹیے نا، کام کرنے دیجئے۔ بچے دیکھیں گے تو کیا کہیں گے؟" دونوں میں اس طرح کی چھیڑ چھاڑ اکثر ہوتی رہتی۔ شادی کے بعد آج تک شیام اکیلا فلم دیکھنے کبھی نہ گیا ہمیشہ ہنسا اس کے ساتھ ہوتی۔ خرید و فروخت کے وقت بھی ہنسا اس کے ساتھ ہوتی کسی دوست کے گھر جاتے جب بھی دونوں ساتھ جاتے۔ دوست کے گھر پہنچتے ہی سارا فلیٹ شیام کے قہقہوں سے گونج اٹھتا۔ ہنسا کا بے تکلف انداز میں باتیں کرنا۔ اس کا سلیقے سے اٹھنا بیٹھنا۔ ہر ایک کی غمی یا خوشی میں شریک ہونا، کینہ اور بغض سے دور رہنا، ہر ایک کی مدد کرنا، یہ اس کے کردار کی ایک اہم خصوصیت تھی جن کی وجہ سے وہ اپنے حلقے میں کافی ہر دل عزیز اور مقبول تھی۔

اب شادی ہوئے سترہ برس ہو گئے تھے لیکن ابھی تک ان کی ازدواجی زندگی بے حد خوشگوار اور پرسکون تھی۔ شیام کی عمر چالیس سے اوپر تھی اور ہنسا کی عمر پینتیس برس سے کم نہ تھی۔ سر کے بال اسی طرح بھورے بھورے اور ریشمی تھے، صحت میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ گوشت کی ہلکی سی تہہ چڑھ گئی تھی جس سے اس کے جسم کی خوب صورتی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ چہرے پر وہی دلنواز مسکراہٹ، شیام کے قہقہوں میں وہی گونج تھی۔ چالیس برس کی عمر میں جوانی کے سائے ڈھلنے لگتے ہیں لیکن شیام کی چال ڈھال میں کوئی فرق نہ آیا۔ اس کے گندمی رنگ میں ایک کشش تھی۔ سینہ اسی طرح تنا ہوا، بازو کی مچھلیاں تنی ہوئی، ہونٹ اسی طرح موٹے اور ابھرے ہوئے۔ آنکھیں پرکشش اور پتلیاں بے حد سیاہ۔ بڑھاپا دونوں کے قریب نہ پھٹکا تھا۔ ان کے ملاقاتی ابھی تک یہی کہتے تھے کہ "تم دونوں ایور گرین ہو، تمہاری صورتیں ویسی کی ویسی ہیں، ماں باپ بننے کے باوجود تم نوجوانوں کی طرح اچھلتے کودتے ہو اور ایک دوسرے کی محبت میں ڈوبے نظر آتے ہو"۔ اب بھی دونوں ساتھ فلم دیکھنے جاتے باہر سے سامان خرید کر لاتے، اب تک دونوں سمندر کے کنارے ساتھ جاتے ہاں آج کل کبھی کبھی ان کی بڑی لڑکی ان کے ساتھ نہ ہوتی ورنہ یہ ایور گرین جوڑا سترہ برسوں سے ایک ہی ڈگر پر رواں تھا۔ اچانک ایک چھوٹا سا واقعہ ہوا۔ شیام صبح کے وقت دفتر جانے سے پہلے آئینے کے سامنے نکٹائی باندھ رہا تھا۔ ڈرائینگ روم کا شرقی دروازہ جو بالکونی سے ملحق تھا اس وقت کھلا ہوا تھا۔ دروازے سے قریب ہی ایک ڈرائنگ ٹیبل تھی۔ شیام نکٹائی باندھ کر دروازے میں کھڑا ہو گیا۔ اچانک اس کی نظر سامنے والی بالکونی پر پڑی وہاں ایک لڑکی نظر آئی جس کی عمر پندرہ برس سے زیادہ نہ ہوگی۔ اس نے شیام کی طرف پرمعنی نگاہوں سے دیکھا۔

جس طرح لڑکی نے اس کی طرف دیکھا، اس نگاہ میں ایک عجیب قسم کا بلاوا تھا۔ پہلے تو شیام کو یقین نہ آیا۔ اس نے سوچا شاید لڑکی نے اس کی طرف دیکھا نہیں تھا۔ اگر دیکھا بھی تھا تو شاید میں نے ان نگاہوں سے غلط مطلب نکالا شاید وہ دروازے کی طرف یونہی دیکھ رہی تھی۔ شیام نے نظر بچا کر

اس لڑکی کی طرف دیکھا ایک معصوم خوبصورت سا چہرہ، شرمیلی نگاہیں جو بار بار شیام کی طرف اٹھ جاتیں، اور جب شیام اس کی طرف دیکھتا تو لڑکی نگاہیں جھکا لیتی اور پھر سامنے کی عمارت کی طرف دیکھنے لگتی۔

اس نے جلدی سے کوٹ پہن لیا۔ اور پھر لڑکی کی طرف دیکھا۔ لڑکی اس کی طرف کنکھیوں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ سوچنے لگا یہ کیا بات تھی؟ یہ لڑکی اس کی طرف کیوں دیکھ رہی تھی؟ ہو سکتا ہے لڑکی صوفہ سیٹ کو دیکھ رہی ہو جو اس کے کمرے میں تھا۔ سامنے والی بالکونی اس بالکونی سے دور نہ تھی۔ لڑکی کی بالکونی کے ساتھ ہی ایک درخت تھا۔ بس اکیلا آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے ہوئے۔ اس کی لمبی لمبی ٹہنیاں ہوا میں لہرا رہی تھیں۔ کچھ ٹہنیاں لڑکی کی بالکونی سے ہمکنار تھیں۔ لڑکی اپنی بانہہ آگے کر کے ناریل کے چپٹے چپٹے نوکیلے پتوں کو پکڑنے کی کوشش کرتی تھی۔ کبھی ناریل کی طرف دیکھتی، پھر جنگلے پر جھک کر اپنے بالوں کو پیشانی سے ہٹا کر کنکھیوں سے تاکتی۔ اب تو اسے یقین سا ہو گیا کہ لڑکی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ شیام ایک لمحے کے لئے ہو نچکا سا رہ گیا۔ اس لڑکی نے اس کے سینے میں ہلچل سی مچا دی۔ لڑکی کا چہرہ کتنا پیارا پیارا تھا۔ گول چاند سا چہرہ، کچھ گندمی گندمی رنگ، پلکیں حیا سے بوجھل، ایک عجیب سی معصومیت اور کشش اس کے رخساروں سے عیاں تھی۔ بے حد شرمیلی نگاہیں جو دل کے پار ہوا رہی تھیں۔ یہ کیا ہو رہا تھا اور کیوں ہو رہا تھا۔ شیام نے اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ایسا نہیں ہونا چاہیئے۔ اس کی عمر چالیس برس سے اوپر ہی تھی اور لڑکی کی عمر پندرہ سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ یہ کیسی کشش تھی؟ جو اسے اس بالکونی کی طرف دیکھنے کے لئے مجبور کر رہی تھی۔ وہ دل میں خوش بھی تھا اور اپنے آپ سے نادم بھی۔ خوشی، غصے اور جھنجھلاہٹ کا ایک عجیب و غریب ملا جلا جذبہ اس کے دل و دماغ میں ابھر رہا تھا۔ وہ جلدی سے ڈرائنگ روم سے باہر نکل گیا۔

اگلی صبح پھر وہی لڑکی اسی طرح بالکونی میں کھڑی تھی۔ وہی شرمیلی آنکھیں اس کی طرف بار بار اٹھ اٹھ جاتیں۔ کبھی کبھی وہ اپنا ایک ہاتھ بڑھا کر ناریل کی لمبی لمبی ٹہنیوں کو چھوتی، کبھی جنگلے پر جھک کر اس کی طرف دیکھتی۔ کبھی رشتہ داروں سے نگاہیں بچا کر چہرے پر سے بالوں کو ہٹا کر شیام کی طرف بغور دیکھتی۔ اب تقریباً ہر روز یہی کچھ ہونے لگا۔ شیام نے پہلے سوچا وہ ہنسا کو سب کچھ بتا دے گا۔ لیکن دل میں کسی نے چپکے سے کہا جو کچھ ہو رہا ہے وہ بہت ہی پیاری، پرلطف اور بے ضرر سی بات ہے۔ ایک ہلکا ہلکا خوشی کا احساس اس کے رگ و پے میں سما رہا تھا۔ ایک عجیب سرور اور کیف سے وہ دوچار ہو رہا تھا۔ ایک نامعلوم سی خوشی اور مسرت اس کے دل میں اجاگر ہو رہی تھی۔ وہ اس خوشی سے کیوں منہ موڑے۔ اگر کوئی انسان کسی خوبصورت چیز کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے تو اس میں کیا برائی ہے۔ اپنے آپ کو سمجھانے کرنے اور روکنے کے باوجود وہ ان شرمیلی نگاہوں کو بار بار دیکھنے سے باز نہ رہ سکا۔ دل میں گناہ کا احساس پیدا ہوا۔ اگر بات پھیل گئی اگر اس کی بیوی کو اس بات کا علم ہو گیا تو گھر کا سارا سکون برباد ہو جائے گا۔ بات کیسے بڑھے گی۔ کیا گھر کا سکھ چین برباد ہو جائیگا اگر کسی دن ہنسا نے دیکھ لیا تو اسے کتنا دکھ ہوگا۔ اس عمر میں ایسی حرکتیں کرنا کہاں کی دانشمندی تھی۔ یہ سوچ کر وہ ایک لمحے کے لئے پریشان ہو گیا۔ کافی ذہنی کشمکش کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ لڑکی کی طرف دیکھنا کوئی گناہ نہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ لڑکی کی عمر پندرہ برس سے اوپر نہ ہوگی لیکن قد و قامت کے لحاظ سے وہ اٹھارہ انیس برس سے کم نہ معلوم ہوتی تھی۔ وہ دبلی پتلی سی لڑکی نہ تھی، کافی صحت مند اور توانا تھی۔ آج شیام دفتر جانے کے لئے اپنی کار میں بیٹھا تو لڑکی نیچے اتر آئی۔ وہ ایک سرخ اور نیلی دھاریوں والا اسکرٹ پہنے ہوئے تھی اور ایک براؤن رنگ کا بلاؤز، بالوں کو بہت سلیقے سے آراستہ کئے ہوئے تھی۔ اس نے شیام کی طرف کنکھیوں سے دیکھا اور پھر آگے بڑھ گئی۔ کچھ دنوں کے بعد شیام پہلی بار اکیلا شاپنگ کرنے گیا۔ شاید اس کی زندگی کا یہ پہلا موقع تھا جب وہ اپنی بیوی کو ساتھ نہ لے گیا اس نے شوخ رنگوں کی قمیض خریدی جو اکثر اس کی عمر والے مرد نہیں پہنتے۔ ایک اسکارف شوخ سرخ اور نیلی دھاریوں والا اور ایک بے حد بھڑکیلی نکٹائی اور ایک خوبصورت سی نائلون کی رنگین جراب جس پر نیلے اور پیلے رنگ کی دھاریاں کافی نمایاں تھیں۔ جب اس نے یہ چیزیں خرید لیں تو اسے اپنے آپ پر ہنسی سی آئی۔ ایک بار اس نے خود سوچا کہ ہنسا کیا کہے گی۔ اس نے اکیلے شاپنگ کیوں کی۔ بہر حال وہ ہنسا کو سمجھا دے گا۔

ہنسا نے قمیض، اسکارف، جرابیں اور نکٹائی دیکھی۔ قمیض کی بے حد تعریف کی۔ "یہ نیلی نیلی قمیض تمہارے جسم پر عجیب

بیچ گی اور یہ اسکارف جب تم پہنو گے تو اس مہک سے معطر
میں تم ہی تم نظر آؤ گے۔ ساری چیزیں بے حد اچھی ہیں۔ لیکن
تم مجھے ساتھ کیوں نہیں لے گئے؟" اس نے بہت پیار بھرے
لہجے میں کہا۔

"بات یہی ہوئی ہنسا کہ میں نے اپنے دفتر میں اپنے
ساتھیوں کو ایسی چیز پہنتے ہوئے دیکھا۔ جی اتنا للچایا کہ راہ میں
جو پہلی دکان نظر آئی وہیں سے یہ چیزیں خرید لیں معاف کرنا ہنسا۔"
ہنسا نے ہنس کر بات ٹال دی۔ اس چھوٹی سی بات کے لئے
لڑنا بے وقوفی تھی۔ مگر ہنسا کو معلوم نہ تھا کہ یہ سب چیزیں شیام اپنی
بیوی کو خوش کرنے کے لئے نہ لایا تھا۔ وہ اس لڑکی کو دکھانے
کے لئے لایا تھا جس کے نام سے وہ ابھی تک واقف نہ تھا۔

کچھ دنوں تک یہ آنکھ مچولی کا سلسلہ چلتا رہا۔ اس نے اپنے
اندر ایک نئی خوشی کا احساس پایا۔ اس نے محسوس کیا شاید وہ
پہلے سے زیادہ جوان ہو گیا ہے۔ شیام اپنے کپڑوں کی طرف زیادہ
دھیان دینے لگا۔ وہ بہت دیر تک آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر
اپنے بالوں کو سنوارتا رہتا۔ چہرے پر کریم لگاتا اور اپنے رخساروں
کو زور زور سے رگڑتا پھر پاؤڈر لگا کر نکلتا۔ اس کے اندر ایک
نئی تازگی اور توانائی عود کر آئی۔ ایک شام وہ اپنی کار میں بیٹھ کر
اپنے گھر سے ایک موڑ دور تک ہی گیا تھا کہ بائیں طرف سے کسی
نے ہاتھ ہلایا۔ اس نے کار روک لی۔ دیکھا تو وہی لڑکی کھڑی
تھی اس نے لڑکی کو پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا اور کار کی رفتار تیز
کر دی وہ ایک لمحے کے لئے خود خوش ہوا کہ لڑکی جسے دیکھنے کے
لئے اس کی آنکھیں بے تاب رہتی تھیں۔ آج اس کی کار کی پچھلی
سیٹ پر بیٹھی ہے۔ یوں اس نے سوچا کہ اگر کسی جان پہچان
والے نے اسے لڑکی کے ساتھ دیکھ لیا تو اس کا انجام بہت برا
ہوگا۔ جی، میں کہوں گا لڑکی لفٹ چاہتی تھی، بس بٹھا لیا۔ یہ جواب
سوچ کر وہ بے حد خوش ہوا۔ اس نے مڑ کر لڑکی کی طرف دیکھا
لڑکی مسکرا رہی تھی۔ لڑکی کے چھوٹے چھوٹے بال جو اس کے کندھوں
پر گر رہے تھے اس وقت تند اور تیز ہوا میں اڑ رہے تھے اور
بار بار اس کے رخساروں کو چھوتے ہوئے ہوا میں لہرانے لگتے۔
لڑکی بار بار اپنے ہاتھوں سے ان بالوں کو ہٹاتی، آسمان پہ
کالے کالے بادل چھائے ہوئے تھے اور وہ دونوں بے حد
خوش تھے۔ یہ کیسی خوشبو تھی، یہ کیسی چاہت تھی، وہ دونوں شاید



اس وقت تجزیہ نہ کر سکے لڑکی واقعی خوبصورت تھی۔ خوبصورت
ہی نہ تھی بے حد شریف اور معصوم بھی۔ سنجیدگی اور متانت اس
کے چہرے سے ٹپکتی تھی۔ لڑکی کا نام کیا تھا؟ وہ نام پوچھ کر کیا
کرے گا؟ کیا خوبصورتی کا نام ہوتا ہے۔ یہی لطیف احساسات
سے وہ لطف اندوز ہو رہا تھا ان کی قیمت اور قسمت کچھ کم نہ
تھی۔ اس نے لڑکی کی طرف بھرپور نگاہوں سے دیکھا اس نے
محسوس کیا کہ لڑکی کی نگاہوں میں شرم و حیا کے ساتھ ایک
عجیب اضطراب ہے۔ جیسے وہ کہہ رہی تھی دیکھو میں کتنی حسین
ہوں اور تم بھی۔ وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھی بے حد خوش تھی وہ ایسی
نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی جیسے چاہتی ہو کوئی اس کی
طرف تعریفی نگاہوں سے دیکھے دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے
رہے۔ اور ایک جملہ بھی نہ کہہ سکے۔ کبھی کبھی خاموشی ہر جذبے کو
عیاں کرتی ہے۔ اس وقت جملوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہی
کچھ سوچتے سوچتے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے شیام نے
کار موڑی اور کار اس جگہ لا کھڑی کی جہاں سے لڑکی کو بٹھایا تھا
لڑکی نے اترتے ہوئے احسان مند نگاہوں سے شیام کی طرف
دیکھا اور خاموشی سے آگے بڑھ گئی۔

شیام نے جلدی ہی اس بات کو محسوس کر لیا جو ہو رہا تھا
اس کا انجام اچھا نہ ہوگا۔ گھر کا سارا انتظام درہم برہم ہو جائے گا
لیکن جو کچھ ہو رہا تھا اگر یہ ہوتا رہے تو اس میں کیا حرج ہے؟
یہ عجیب چاہت تھی جو اس کے دل و دماغ پر چھا رہی تھی کیا
یہ واقعی محبت ہے۔ لیکن کیوں ہو اس کی کیا وجہ تھی، معاملہ واقعی
بہت نازک تھا اور روز بروز الجھتا جا رہا تھا۔ وہ جتنا سوچتا معاملہ

اور گھبرا ہونے لگی کیا وہ لڑکی کو چاہتا ہے؟ بالکل نہیں۔ کیا وہ اس لڑکی کو پسند کرتا ہے، شاید وہ لڑکی سے باتیں کرنا چاہتا ہے لیکن کیوں؟ وہ لڑکی کے قریب رہنا چاہتا ہے، اس کے حسن سے محظوظ ہونا چاہتا ہے۔ اگر یہ سلسلۂ حیات اسی طرح چلتا رہے۔ ایک خوبصورت بیوی، تین بچے اور یہ لڑکی جس کے نام سے وہ ناواقف ہے۔ جسے وہ پسند کرتا ہے اور لڑکی بھی اسے پسند کرتی ہے۔ پسند اور محبت میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ کیا پسند محبت میں نہیں بدل سکتی۔ وہ طرح طرح کی باتیں سوچتا اور لڑکی کو ذہن سے نکالنے کی کوشش کرتا۔ لیکن لڑکی کی شرمیلی نگاہیں بار بار اس کی طرف دیکھتیں اور روز بروز اس کی الجھن میں اضافہ ہوتا رہتا۔ اب شیام سیر کرنے نہ جاتا۔ ہنسا نے ایک دو بار اسے سیر کرنے کے لئے کہا لیکن اس نے انکار کر دیا۔ عجیب انتشار اس کے ذہن میں سما گیا تھا۔ وہ اپنی بیوی سے کیا کہے۔ آخر اس کی بیوی کا اس میں کیا قصور ہے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اپنی بیوی سے کچھ نہیں کہہ سکتا، اپنی جوان لڑکی کو کچھ نہیں بتا سکتا۔ جو راحت اسے مل رہی تھی اس سے وہ جدا ہونا نہیں چاہتا تھا۔

ایک دن ہنسا نے اس سے پوچھ لیا: "آج کل تم کچھ کھوئے کھوئے سے رہتے ہو، مجھ سے بات تک نہیں کرتے آخر بات کیا ہے؟"

"کام اتنا زیادہ ہے ہنسا کہ کچھ اور سوجھتا ہی نہیں امید ہے تم مجھے معاف کر دو گی؟"

"کئی دنوں سے ہم دونوں نے کوئی فلم نہیں دیکھی، آج شام کے لئے میں نے چار ٹکٹ منگوا لئے ہیں، تمہیں چلنا ہو گا شیام" ہنسا شکایت کے لہجہ میں بولی۔ ہنسا کی آواز بھی بھرا گئی تھی گلا رندھ سا گیا تھا وہ کئی دنوں سے ہنسا کے ساتھ باہر نہ گیا تھا۔ وہ کیا سمجھتی ہوگی، وہ ہنسا سے بے رخی برت رہا تھا، اس کا دل ملامت کر رہا تھا۔ اسے ایسی حرکتیں نہیں کرنی چاہئیں، یہ باتیں اسے زیب نہیں دیتیں جو خوشی اسے مل رہی تھی اس کا کیا ہوگا۔ دراصل آج کی شام شیام ہنسا کے ساتھ فلم دیکھنے جانا چاہتا تھا، لیکن اچانک اس نے ایک بہانہ بنا کر انکار کر دیا۔

ہنسا، شیام کا انکار سن کر ایک لمحے کے لئے اداس سی ہو گئی۔ پھر دل میں سوچ کر در گزر کر گئی، شاید کوئی خاص کام ہو، بار بار کہنا اچھا نہیں۔ شیام نے کھانا کھانے کے بعد تینوں کو کار میں بٹھایا اور سینما ہاؤس تک پہنچا دیا۔ "شو ختم ہونے کے بعد لینے آؤں گا" اس نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

جب شیام گھر پہنچا تو ڈرائنگ روم کی بالکونی کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ رات کے نو بج چکے تھے اس نے سوٹ اتار کر شب خوابی کے کپڑے پہن لئے۔ ایک سلک کا پاجامہ اور سلک کی قمیض۔ اس نے سامنے والی بالکونی میں دیکھا بالکونی خالی تھی۔ باقی کمروں میں قمقمے روشن تھے ہو سکتا ہے وہ سو گئی ہو۔ شیام بھی سونے پر لیٹ گیا۔ وہ سونا چاہتا تھا لیکن آنکھوں سے نیند غائب تھی، بہتر یہی تھا کہ وہ اپنے بچوں کے ساتھ فلم دیکھنے چلا جاتا۔ وہ جو کچھ کر رہا تھا اس سے وہ خوش نہ تھا۔ جس طرح وہ اپنی بیوی سے الگ تھلگ رہ کر سوچ رہا تھا وہ کوئی اچھی بات نہ تھی۔ ہنسا کی اداس آنکھیں اسے گھورتی ہوئی دکھائی دیتیں، ایک عجیب اداسی اور غم جسے وہ مشکل سے برداشت کر رہی تھی، اس کے چہرے سے عیاں تھی، کیا ہنسا کو معلوم ہو گیا تھا کہ ہنسا نے اُسے لڑکی کو تاکتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اگر دیکھا ہوتا تو وہ ضرور شیام سے شکایت کرتی۔ شیام اپنی بیوی کی عادتوں کو جانتا تھا۔ شکایت اور گلہ کرنے والی بیوی نہ تھی۔ وہ سب کچھ برداشت کرے گی لیکن حرفِ شکایت زبان پر نہ لائے گی۔ اس سارے معاملے میں ہنسا کا کوئی قصور نہ تھا۔ ہنسا میں کیا کمی تھی آخر وہ کیوں ایسی حرکت کرے۔ اچانک اس کی نگاہ بالکونی کی طرف اٹھ گئی بالکونی میں ایک چھوٹا سا بلب روشن تھا۔ اس روشنی میں وہ لڑکی کو بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ ناریل کے درخت کے پیچھے بہت دور آسمان پر چاند ابھر آیا اور چاند کی ٹھنڈی ٹھنڈی سفید کرنیں ناریل کے پتوں سے چھن کر آ رہی تھیں۔ لڑکی نے بالکونی کا بلب بجھا دیا اور بالکونی میں ایک ہلکا سا اندھیرا چھا گیا۔ اب چاند کی سفید کرنیں ناریل کے پتوں سے چھن کر لڑکی کے بھرے بھرے بالوں پر رقصاں تھیں۔ چاروں طرف ایک مہیب سی خاموشی تھی اور پراسرار فضا میں لڑکی کا حسن دوبالا ہو گیا تھا۔ اس وقت وہ کتنی پیاری اور دلربا دکھائی دیتی تھی۔ کبھی کبھی وہ جنگلے پر جھک جاتی اور کبھی کبھی اپنے بھرے بالوں سے اپنے رخساروں کو ڈھانپ لیتی۔ پھر بالوں کو پیچھے ہٹا کر اسے دیکھتی بالکونی سے ذرا دور سمندر کی لہریں ساحل کو چوم رہی تھیں۔ ہوا آہستہ آہستہ چل رہی تھی جیسے کوئی میٹھا میٹھا سا گیت گا رہی ہو۔ وہ بہت دیر تک دلدادہ سے کھڑا لڑکی کی طرف دیکھتا رہا اور اس

حسین منظر سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ اس کی پرسکون دنیا میں ہلچل سی مچ گئی تھی۔ اس کشمکش میں کافی وقت گزر گیا۔ لڑکی بالکونی سے جا چکی تھی۔ اس کے گھر کی بتیاں بجھ گئیں۔ وہ سو گئی ہوگی۔

جب شو ختم ہونے کے بعد شیام اپنی بیوی بچوں کو کار میں بٹھا کر گھر لایا تو راستے میں ہنسا نے کوئی بات نہ کی۔ آج ہنسا پہلی بار اکیلی فلم دیکھنے گئی تھی، شیام نے فلم کے بارے میں رائے پوچھی تو ہنسا نے بہت بے دلی سے جواب دیا ”اچھی تھی“ گھر پہنچتے ہی تینوں بچے ایک کمرے میں سو گئے۔ کھڑکی کھلی تھی۔ چاندنی کی نقرئی کرنیں ہنسا کے جسم پر پڑ رہی تھیں۔ وہ منہ پھیرے لیٹی ہوئی تھی۔ وہ اس طرح کبھی نہ لیٹی تھی۔ اس نے ہمیشہ شیام کا انتظار کیا اور جب تک وہ خواب گاہ میں نہ آتا ہنسا کو نیند نہ آتی۔ آج وہ کیسے سو گئی تھی، کیا وہ واقعی سو گئی تھی یا جاگ رہی تھی۔ اس کے دل پہ کیا بیت رہی تھی۔ آہستہ آہستہ دونوں کے درمیان ایک دیوار سی ابھر رہی تھی۔ دوستی رفاقت اور پیار کے بجائے غصے نفرت اور غم کی پرچھائیاں پڑ رہی تھیں اور زندگی میں ایک نئی الجھن کا اضافہ ہو گیا تھا۔ یہ الجھن اس کے گھر کے سکون کو برباد کر دے گی۔ یہ سب کچھ کیا ہے، یہ کیسا پیار ہے جہاں سانس لینا دوبھر ہو گیا ہے، جہاں اپنے پرائے دکھائی دے رہے ہیں، آخر اس سے کیا ملے گا۔ ایک سکون چھن جانے کے بعد دوسرے سکون کی تلاش میں مارے مارے پھرنا کہاں کی عقل مندی ہے؟ وہ اس ذہنی کشمکش کو ختم کر دے گا۔ وہ اپنی بیوی کے قریب بیٹھ گیا۔ ہنسا نے اس کی طرف مڑ کر نہ دیکھا۔ ہاں وہ خفا تھی اس نے آہستہ سے ہنسا کا چہرہ اپنی طرف کیا دیکھا تو وہ رو رہی تھی۔ پلکوں میں آنسو لرز رہے تھے۔

”مجھے معاف کر دو ہنسا۔“ وہ ان آنسوؤں کو دیکھ کر ویسے ہی سا گیا ”میں پھر ایسی غلطی نہ کروں گا۔“

”کیسی غلطی۔“ ہنسا چونک کر بولی۔

”یہی جو آج میں تمہارے ساتھ فلم دیکھنے نہ گیا اور اس دن اکیلا بازار سے سامان خرید لایا۔ کیا واقعی تم مجھ سے خفا ہو ہنسا؟“

”ہاں شیام، اس دن بھی مجھے تمہاری حرکت اچھی نہ لگی تھی اور آج بھی اچھی نہ لگی۔ بچے تم سے بے حد خفا ہیں۔ میری بات تو جانے دو“ اس نے تکیے میں اپنا چہرہ چھپا لیا۔

شیام نے اپنے دونوں لب اس کی اداس پیشانی پہ رکھ دیئے اور پلکوں پر لرزتے ہوئے آنسوؤں پہ اپنی کانپتی ہوئی زبان رکھ دی۔

”اٹھو“ تھوڑی دیر بعد اس نے اپنی بیوی کو اٹھاتے ہوئے کہا ”چلو ذرا بچوں سے مل لیں۔“ دونوں چپکے سے بچوں کی خواب گاہ میں گئے بچے اپنی اپنی چارپائیوں پہ لیٹے ہوئے تھے۔ شیام نے بڑی لڑکی کے سنہری بالوں پر بہت پیار سے ہاتھ پھیرا اور پھر دونوں بچوں کے پیروں کو چادر سے ڈھانپ دیا اور اپنی خواب گاہ میں چلے گئے۔

دوسرے دن جب شیام آئینے کے سامنے نکٹائی باندھ رہا تھا تو ایک ناقابل بیان طاقت اسے بالکونی کی طرف جھانکنے پہ مجبور کر رہی تھی۔ ناریل کے درخت کے قریب جنگلے پر جھکی ہوئی ایک معصوم صورت، وہ شرمیلی نگاہیں، رخساروں پہ بھورے بھورے بال جھکے جھکے سے اور دو خوبصورت بانہیں اسے بلا رہی تھیں۔ اس نے ایک بار تو ضرور سوچا کہ کیا ہی اچھا ہوتا کہ یہ سب کچھ یونہی ہوتا رہتا۔ ایک پیاری بیوی، بچے، یہ پرسکون گھر اور یہ معصوم لڑکی اور اس کی شرمیلی نگاہیں، لیکن یہ نہ ہو سکے گا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ خوشی کے لمحات اپنے آپ سے چھین رہا ہے، لیکن اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ اپنی بیوی اور بچوں سے خوشی چھین کر مسرت پر صرف اپنا حق جتا رہا تھا۔ وہ کسی صورت میں اس گھر کی خوشی برباد نہ کرے گا جب نکٹائی باندھ چکا تو اس نے محسوس کیا جو طوفان اسے گھیرے ہوئے تھا اب دھیرے دھیرے پیچھے سرک رہا ہے۔ وہ آج بالکونی کی طرف دیکھے بغیر دفتر چلا گیا۔



امی ابو کا پسندیدہ کھیل

جلتے پھول

عظمت عزمی

تارا اپنے والدین کی چوتھی بیٹی تھی۔ اس کی ماں لڑکے کی امید میں بیٹیوں کو جنم دے دے کر تھک چکی تھی۔ تارا کی پیدائش سے پہلے وہ یاس کی کیفیت میں تھی کہ اس بار ضرور لڑکا ہوگا۔ تارا پیدا ہوئی تو ان پر دورے پڑنے لگے اور انھوں نے اسے منحوس قرار دے کر اپنے پیار سے محروم کر دیا۔ تارا ماں کی محبت کی ایک نظر کے لیے ترستی ہوئی بڑی ہو گئی۔ باپ بیوی کے اس سلوک سے جو وہ تارا سے کرتی تھی متفکر رہا کرتا تھا۔ اس نے بیٹی کی محرومی مٹانے کے لیے اس کی ہر خواہش پوری کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ تارا احساس کمتری میں مبتلا تھی حسن اور ذہانت دونوں سے قدرت نے نوازا تھا۔ اس کے پاپا نے اسے پڑھانے کا بیڑا اٹھایا۔ ماں یہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی دوسری بیٹیوں کے مقابلے میں تارا زیادہ تعلیم حاصل کرے لیکن اس کی ہو چکی شوہر کی ضد کے آگے دم توڑ گئی۔ تارا نے اپنے اسکول کی ایک شفیق ٹیچر مس مراج میں ماں کا پیار تلاش کیا۔ لڑکیوں نے ان کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کر دیں۔ مس مراج نے سرد مہری کا رویہ اختیار کر لیا۔ تارا کا ننھا سا دل ٹوٹ گیا۔ اسے کسی کے پیار پر بھروسہ نہیں رہا۔ اس نے خود کشی کی ناکام کوشش کی۔ غلط فہمی دور ہو جانے کے بعد مس مراج اس کی عیادت اور معافی مانگنے آئیں مگر اب تارا بدل چکی تھی۔ اس نے صرف تعلیم کو اپنی منزل بنا لیا تھا۔ اس نے محنت سے پڑھائی جاری رکھی۔ اپنے پاپا کی حوصلہ افزائی سے وہ کامیابی کی منزلیں طے کرتی گئی۔ اس کی دو بہنوں کی منگنی طے ہو گئی۔ تارا کے لیے بھی ایک ڈاکٹر کا رشتہ آیا جو اس کی ماں کے نزدیک نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھا۔ وہ اس کی شادی کے لیے راضی تھیں لیکن تارا ڈاکٹر بننا چاہتی تھی اور پاپا اس کے حامی تھے۔ اسی بات پر گھر میں میاں بیوی کا جھگڑا رہنے لگا۔ ماں میٹرک کے بعد اس کی شادی کرنا چاہتی تھی مگر پاپا اسے ڈاکٹر بنانے پر مصر تھے۔ میٹرک فرسٹ ڈویژن کرنے کے بعد تارا کو اس کے پاپا اپنی بیوی سے چھپ کر اپنے ایک دوست ارباب صاحب کی مدد سے کالج میں داخلہ دلانے ان کے گھر گئے۔ جہاں ارباب صاحب کے صاحبزادے ایاز نے انھیں قائل کر لیا کہ تارا کو ڈاکٹری کی تعلیم دلانے کے لیے ضروری ہے کہ اسے لڑکوں کے کالج میں داخلہ دلوایا جائے تاکہ اس کے اندر خود اعتمادی پیدا ہو جائے۔ اس کے پاپا پہلے راضی نہ ہوئے لیکن ارباب صاحب اور ایاز نے انھیں دنیا کے نشیب و فراز سمجھا کر اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ تارا کو ایاز کے کالج میں داخل کرا دیں۔

تارا کالج میں داخل ہو گئی۔ وہ یہاں سہمی سہمی سی رہتی جسے کالج کے طالب علموں فواز احمد اور رفیق نے خاص طور پر محسوس کیا۔ یہ دونوں لڑکے اپنے اپنے طور پر تارا میں دلچسپی لینے لگے۔ ایاز بھی تارا کا خوف ختم کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔ لیکن تارا نے خود سے ایاز کو مایوس کر دیا۔ کالج میں پہلے دن کے دوران فواز احمد نے تارا کی مدد کی جس سے تارا کے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ ہو گیا۔ ادھر گھر میں تارا کی امی اس کے پہلے ڈاکٹر کے رشتے کے بارے میں سنجیدہ ہو گئی تھی۔ تارا کے ابو نے انھیں ڈانٹ کر خاموش کر دیا۔ اسی دوران اس کے ابو بیمار پڑ گئے۔ تارا نے ٹیسٹ کی تیاری کے سلسلے میں فواز احمد سے ایک کتاب لی تھی۔ باپ کی بیماری کے دوران وہ کالج نہ جا سکی۔ اور رفیق بہانہ کر کے وہ کتاب لینے اس کے گھر آ پہنچا۔



دوسرے دن تارا کالج گئی تو اس کا منہ پھولا ہوا تھا۔ نواز معاملہ سمجھ گیا۔ وہ تارا کی معصومیت سے پوری طرح گھائل ہو چکا تھا۔ وہ چاہتا تھا اس لڑکی میں جو احساس کمتری پیدا ہو جاتے۔ کتاب والے واقعے سے تارا بہت غصے میں تھی۔ وہ نوفی اپنی اس حرکت پر پشیمان تھا۔ تارا سے نظر انداز کرتی ہوئی چھٹی کے بعد کالج سے نکلی تو راستے میں نواز مل گیا۔ تارا نے راستہ بدلنا چاہا مگر نواز کی متناطیسی شخصیت اس پر اثر انداز ہو چکی تھی۔ اس کی ایک آواز پر تارا کے قدم رک گئے۔ اور وہ اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ نواز کا رویہ بہت مہذب تھا جس سے تارہ کم کرنے لگی۔ در حقیقت نواز اس کے دل سے بے جا خوف ختم کر کے اعتماد پیدا کرنا چاہتا تھا۔ جو کچھ دیر بعد اس کی محبت اور نرمی کے برتاؤ سے تارہ میں جاگ گیا۔ اور جب تارہ اس سے مل کر آئی تو وہ خاصی بدلی ہوئی لڑکی تھی۔ جس نے ماں کے غصے کی بھی پرواہ نہیں کی۔ اس کے پاپا کو ڈاکٹر نے کینسر بتایا جس سے وہ بہت پریشان ہو گئی۔

دو ماہ چار دن صدمہ بہ اپنی پریشانی بھول گئی۔ تارہ کی امی نے غصے میں اس کے گال پر گرم چمٹا رکھ دیا تھا۔ جس کی جلن کالج آنے کے بعد بڑھ گئی۔ نواز نے موقع پا کر اسے ہزار کی ٹیوب لا کر دی۔ اور دو چار میٹھی باتیں کیں اور اس کی ساری جلن جاتی رہی۔ نواز نے اس کے اندر جینے کا حوصلہ پیدا کر دیا تھا۔ کچھ عرصے بعد اس کی دو بڑی بہنوں عائشہ اور چاندنی کی شادیاں ہو گئیں۔ تارا نے زندگی میں پہلی بار سنگھار کیا۔ دیکھنے والوں کی نظریں چکا چوند ہو گئیں۔ خوشیوں کے یہ دن بھی گزر گئے۔ تارا کے پاپا کی بیماری بڑھ گئی۔ نواز نے تسلیوں کے سہارے پریشان نہ ہونے دیا۔ لیکن وہ منحوس دقت بھی جلد آ گیا۔ تارا کے پاپا نے دنیا سے منہ موڑ لیا۔ تارا ذہنی طور پر اس صدمے کے لیے تیار نہیں تھی۔ وہ بے ہوش ہو گئی۔ نواز جس نے اسے زندگی بھر کا رفیق بنانے کی قسم کھائی تھی اس کی حالت دیکھ کر اندر ہی اندر رو پڑا۔ جانے اور سوگ میں اس کے گھر آتا رہا۔ تارا ایک نیم دیوانی سی ہو گئی تھی۔ وہ سب بچیاں نے سب کو سمجھا دیا تھا کہ اس کی دلجوئی کرتے رہیں ورنہ یہ پاگل ہو جائے گی۔ چاندنی اور عائشہ کچھ دن رہ کر اپنے گھر چلی گئیں۔ اب اس گھر میں تارا، ساجدہ اور امی ہی تھیں۔

تارا نے کالج جانا شروع کر دیا۔ رضیہ بی نے ہزار کوشش کی کہ تارا گھر سے نہ نکلے۔ لیکن باپ کے مرنے کے بعد وہ ماں سے اور دور ہو گئی تھی۔ وہ نہ صرف کالج گئی بلکہ نواز سے بھی ملی۔ پیاسی تارا نے نواز کے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائیں۔ اور ادھر چوری چوری رضیہ بی نے ڈاکٹر احسن سے اس کا رشتہ پکا کرنے کی تیاریاں مکمل کر لیں۔ تارا سے عائشہ نے اس کی رائے پوچھی تو اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ نواز کے علاوہ کسی اور کو شریک حیات بنانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ اگر کسی نے زبردستی کی تو وہ گھر کی روایتوں کو توڑنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ تب رضیہ بی نے چال چلی۔ خواہ مخواہ کہ اس کی آرزو پوری کرنے کا وعدہ کیا۔ اور یوں تارا کی شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ رضیہ بی نے بتایا تھا کہ نواز کے گھر سے پیغام آیا تھا جسے منظور کر لیا گیا ہے۔ تارا خوشی سے دیوانی ہو گئی۔ تارا نے اس دوران ایک بھیانک سپنا دیکھا۔ وہ چیخ کر اٹھ بیٹھی۔

اس نے خواب میں دیکھا تھا کہ اس کے مرحوم پاپا کے سفید بال گلیوں میں اڑتے پھر رہے ہیں۔ رضیہ بی نے خواب سن کر تعبیر دی کہ تمہاری وجہ سے تمہارے باپ کی رسوائی کا خطرہ ہے۔ تمہیں ہر قربانی دے سکنا چاہیے۔ مرحوم باپ کی لاج رکھنی ہے۔ اور رضیہ بی کے ان لفظوں کا مطلب اس وقت کھلا جب نکاح کے وقت نواز کی جگہ ڈاکٹر احسن کا نام لیا گیا۔ تارا کو سکتہ سا ہو گیا۔ وہ دلہن بنی نواز کے سپنوں میں گم تھی کہ نکاح خواں نے ڈاکٹر احسن کے نام سے اس کی رضا مانگی۔ رضیہ بی نے مرحوم باپ کی عزت کا واسطہ دے کر اسے ہاں کرنے پر مجبور کر دیا۔ وہ صدمے سے بے ہوش ہو گئی اور اسی نیم بے ہوشی میں اس کی رخصتی ہو گئی۔ ڈاکٹر احسن اپنی بے ہوش دلہن کو حجلۂ عروسی میں لے آیا۔ تارا کو ہوش آیا تو سامنے ڈاکٹر احسن اس پر جھکا ہوا تھا۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ ڈاکٹر اب تک اس کی بے ہوشی کی وجہ اس کے پاپا کے انتقال کا صدمہ سمجھ رہا تھا۔ مگر تارا نے اس کا ہاتھ جھٹک کر صاف کہہ دیا کہ اس کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے۔ اس کی ماں نے دھوکے سے یہ شادی کی ہے۔ ڈاکٹر احسن ہکا بکا رہ گیا۔

(اب آگے پڑھئے)

تارا نے سرد اٹھا کر سامنے بیٹھے ہوئے پتھر کے آدمی سے پوچھا۔ "ڈاکٹر صاحب کیا محبت کرنا جرم ہے؟"

پتھر کا آدمی بولنے سے معذور تھا شاید!

"ڈاکٹر صاحب بتلائیے نا ۔۔۔ کہ محبت کرنا جرم ہے؟ اگر محبت جرم ہے تو پھر میں بھی مجرم ہوں۔ میں نے بھی محبت کی ہے۔ بتائیے کیا محبت کرنے والے کو مجرم کہتے ہیں؟ ۔۔۔ بتلائیے نا؟"

"یہ موقع تو ایسا ہی ہے تارا احسن کہ میں کہہ دوں کہ محبت کرنا جرم ہے۔ اور اگر تم نے کسی اور سے محبت کی ہے تو پھر تم بہت بڑی مجرم ہو ۔۔۔ اور پھر محبت صرف جرم ہی نہیں ایک سنگین جرم

ہے ——— لیکن اب میں یہاں سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں پاک ہوں
دل پر محبت کا داغ لگا بیٹھا ہوں ——— اور اب میری یہ محبت
نفرت کی ہوا پاکر شاید اسے برداشت نہ کر سکے تو پھر میں کیسے کہہ دوں کہ محبت
جرم ہے۔"

"لیکن میری محبت کو تو جرم سمجھا گیا ——— پہلے تو مجھے
محبت کے لیے ترسایا تڑپایا گیا ——— میں محبت کی کشمکش میں
جھلستی پھری ——— اگر میرے پاپا نہ ہوتے تو میں شاید نفرتوں کی
بوچھار سے مر جاتی ——— اور جب میرے پاپا مر گئے تو کون تھا
میرا جو مجھے پیار کرتا۔ میں سہمی ہوئی بزدل لڑکی بن گئی تھی ——— گھبرائی
ہوئی بولائی ہوئی ——— تشنہ لب لڑکی ——— تب
اس بزدل لڑکی کو ایک لڑکے نے سمجھا۔ اس نے اس لڑکی کو حوصلہ دیا ———
اسے جینے کا سلیقہ سکھایا ——— اس کا بکھرا ہوا یقین اور اعتماد
اسے ڈھونڈ کر دیا ——— اس کے خوف کو قتل کر کے وہ اسے زندگی
کے گلستان میں لے آیا ——— وہ بہت شریف اور بلند کردار
تھا ——— اس نے افسانوں ناولوں اور فلموں والی محبت ہرگز
نہ کی تھی ——— کبھی اس نے ڈائیلاگ نہیں بولے ——— کبھی
اس نے اپنی محبت کا یقین نہیں دلایا ——— بس اس کا سارا
وجود محبت کا روپ تھا ——— پیار کا احساس تھا ——— پناہ
کا مینار تھا ——— اس نے مجھے زندگی سے لڑنا سکھا دیا۔ ہم دونوں
نے کوئی غلط حرکت نہیں کی ——— بس میں نے اپنے آپ کو
اس کا جانا اور اس نے صرف ایک دفعہ کہا تھا کہ ——— تم ——— تم ———
میری ملکیت ہو ——— میری امانت ہو ——— تم اس امانت
میں خیانت نہ ہونے دینا ———" تارا کا ہاتھ اپنے آپ ہی اپنی
پیشانی پر چلا گیا ——— جیسے والی جگہ پر تو اس نے اپنے ہونٹ رکھے
تھے ——— وہ لرز گئی ——— خود کو سنبھالتے ہوئے اس نے
کہا ——— "میرے ساتھ زیادتی کی گئی ہے ڈاکٹر ——— امی
نے مجھ سے کہا کہ میں تمہاری شادی اسی سے کر رہی ہوں' وہی بات
سے کہہ سکے گا ——— مجھے پتہ نہیں تھا کہ امی آپ سے مطلب کر
آئی ہیں۔ مجھے پتہ ہوتا کہ برات لے کر آپ آ رہے ہیں تو میں آپ کو
کسی نہ کسی طرح پہلے ہی منع کروا دیتی ——— لیکن امی تو جھوٹ
بولتی رہیں ——— دھوکہ دیتی رہیں ——— مجھے نکاح کے
وقت پتہ چلا کہ یہ وہ نہیں آپ کی دلہن بنائی جا رہی ہوں میں اسی
وقت انکار کر دیتی لیکن امی نے مجھے میرے باپ کی قسم

دے دی ——— اپنی عزت اور اپنا بڑھاپا کا واسطہ
دیا ——— اور ——— اور میں ——— پاپا کے نام
پر مجبور ہو گئی ——— اور یہ ——— میں نے کیا کیا ———
یہ میں نے کیا کیا ——— پاپا اگر زندہ ہوتے تو کبھی یہ ظلم نہ
کرتے ——— لیکن میں نے یہ ظلم خود اپنے اوپر کر لیا ———
اف خدا ——— میں کیا کروں ——— پاپا جانی آپ مجھے
اپنے پاس کیوں نہیں بلا لیتے ——— میں مر جاتی تو اچھا تھا۔
یہ عذاب تو نہ سہنا پڑتا ———" تارا دونوں ہاتھوں میں منہ
چھپا کر سسک پڑی۔

ڈاکٹر احسن چند لمحے خاموشی سے اسے دیکھتے رہے پھر کروٹ
سے اٹھ کر وارڈ روب کی طرف آئے اور شب خوابی کا لباس نکال
کر ملحقہ غسل خانے میں چلے گئے۔ ان کے چہرے پر زردی کھنڈ گئی
تھی۔ انھیں ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی جادوگر نے انھیں طلسمی باغ
کے نظارے دکھاتے دکھاتے ان کے دل میں برچھیاں مارنا
شروع کر دی ہیں۔ دل ایک بد لتا تھا کہ وہ ان کی جانے ان بن گئی ہے
ان کے تصرف میں ہے ——— شرعی طور پر ان کے نکاح میں
آئی ہوئی ہے تو پھر یہ جبر کیسا ——— آسی کو دیسی آسی کر لیں
تو ہے وہ ——— ایک ڈانٹ میں چپ ہو جائے گی ———
اور پھر کر بھی کیا سکتی ہے وہ ——— بہت سی لڑکیوں کی شادی
ان کی مرضی کے خلاف ہو جاتی ہے۔ اسکول کالج کی ایسی حماقتیں
تو ہر ایک سے کسی نہ کسی طور ہو ہی جاتی ہیں ——— ان حماقتوں
کی خاطر اپنے "سب پر ضرر کرنا" اپنا دل جلانا بھی ایک حماقت ہو گی۔
آج کی رات ——— بابیار ——— نہیں آئے گی ———

یہ حسین خیزرات گزر گئی تو تم عمر بھر پچھتاؤ گے ڈیئر ——— تم
جو کچھ کرنا ہے کر لو۔ زیادہ سے زیادہ دس پندرہ دن روتی رہے گی
پھر آخر کار سمجھوتہ کر لے گی۔ لیکن وہی دل دوسری بار سرگوشی کرتا۔
تم ڈاکٹر ہو تمہارا کام ہمدردی کرنا ہے۔ اگر جیتنا ہے تو محبت سے
ہمدردی سے بہتر ——— آخر اس کی بات بھی تو سنو ———
کیا پتہ وہ بیچاری بھی مظلوم ہو ——— آئی ریشمی نازک سی
ہے ——— زبردستی کرو گے تو مر جائے گی ——— اتنی
سنجیدگی سے خوش نہیں ہوا جاتا ——— پیار دو گے تو پھول جیسی
گی ——— ہر ایک کھل جائے گی ——— غصہ سے
فائدہ ——— وقت مرتا ہوتے ہیں۔ ہو رہا اس کا

بھی حاصل نہ کر سکو گے —— تم اس کی حفاظت بھی تو نہیں
کر سکتیں —— سب پیار بھی تو تمہیں ہی دینا ہے ——
جس بے وقوف لڑکی کو جانے کیسے کیسے خواب دکھا کر تم اس کے لیے ہو ——
وہ تقاضے سے رہے نہیں —— اور جب احسن کپڑے تبدیل کر کے
باہر آئے تو اس کی سسکیوں اور ہچکیوں نے ایک لمحے کے لیے انہیں
وہیں روک دیا پھر وہ جلتی آنکھوں میں اپنا اضطراب چھپا کر اس کے
قریب آئے —— وہ گھٹنوں میں سر دیئے رو رہی تھی ——
وہ کتنی ساعتیں اور گزر گئیں مگر وہ خاموش کھڑے رہے —— ٹن
ٹن ٹن —— گھڑیال نے بارہ بجا کر انہیں تڑپا دیا۔
تارا کے سر پر ہاتھ رکھ کر انہوں نے بڑے پیار سے کہا: "پاگل
مت بنو —— رونے سے کیا حاصل —— ؟ زیادہ سے
زیادہ بے ہوش ہو جاؤ گی نا —— اور پھر تمہیں یہ پتہ بھی نہیں
ہو گا کہ تم کہاں ہو —— آج تم ہم دونوں کے درمیان کوئی اور
رشتہ قائم نہیں ہونے دینا چاہتی تو دوست ہی سمجھو مجھے اپنا ——
تاکہ میں تمہیں اعتبار دلا سکوں کہ میں تمہیں کوئی فریب کوئی دھوکا نہیں
دوں گا —— جو تم چاہو گی وہی کروں گا —— دیکھو تارا
دوستی کا رشتہ بڑا مضبوط رشتہ ہوتا ہے تم مجھے اپنا دوست سمجھ کر
سب کچھ بتا دو۔ شاید میں تمہاری کچھ ......"
"مجھے —— مجھے کسی رشتے کا اعتبار نہیں رہا —— کسی
رشتے پر یقین نہیں آتا اب۔ سب رشتے دھوکا ہیں' فریب ہیں' بناوٹ
ہیں۔" اس نے سر اوپر اٹھا کر احسن کی طرف دیکھا اس کی آنکھیں جل تھل ہو
رہی تھیں' گال آنسوؤں سے تر تھے۔ چہرہ سرخ تھا' ہونٹ بھیگے
ہوئے تھے۔
ڈاکٹر احسن نے لمبی گہری سانس لے کر کہا: "تمہارے اگر سب
رشتے فریب ہیں تو پھر وہ بھی تمام رشتہ بھی فریب ہوا جس کی خاطر تم
آج یہاں حجلۂ عروسی میں بیٹھی سہاگ رات پر آنسو بہا رہی ہو۔"
"نہیں نہیں —— وہ فریب نہیں ہے —— اس
پر مجھے یقین ہے۔ اتنا یقین جتنا کہ مجھے خدا پر ہے —— وہ
دھوکا نہیں ہو سکتا۔ وہ سچا رشتہ ہے' بالکل سچا۔"
"تو پھر تمہیں میرے جذبات کو بھی سچا ماننا پڑے گا ——
صرف سسکیوں کا کم جھوٹ بولتی ہو۔"
تارا نے سسکیاں روکنا چاہیں —— تو ڈاکٹر احسن پردے
برابر کرنے چلے گئے —— کمرے کی چٹخنی چڑھا کر پردے ٹھیک کر کے
وہ میز لیمپ کی طرف بڑھے' بٹن پر انگلی رکھا ہی تھا ——
کمرے میں اندھیری رات بال کھول کر لیٹ رہی۔
تارا کی چیخ نکل گئی —— "اللہ نہیں —— یہ
جلائیے نا —— لیمپ جلائیے مجھے ڈر لگ رہا ہے ——"
ڈاکٹر احسن نے لیمپ اور بٹن دبا دیا —— دھیمی دھیمی سی
روشنی کی کرنیں پلنگ کی طرف آنے لگیں۔
"نہیں —— نہیں آپ لیمپ جلا دیجئے —— مجھے ڈر
لگ رہا ہے۔"
"بیوقوف مت بنو —— کوئی جاگتا ہوا تو سمجھے
کہ میں تم پر نہ جانے کون سے ظلم توڑ رہا ہوں —— حقیقت
ظلم کوئی نہیں دیکھ پائے گا —— جو تم میری جان پر کر رہی
ہو —— چلو ہٹو —— ادھر کھسکو۔ کافی رات گزر گئی
ہے ——" ڈاکٹر احسن کا لہجہ بڑا سخت تھا۔
"نہیں —— نہیں —— آپ یہاں نہیں لیٹیں ——
میں آپ کو اپنے قریب نہیں آنے دوں گی —— میں کسی اور کی
امانت ہوں —— میری شادی آپ سے دھوکے سے کی گئی
ہے۔" تارا کھسک کر پلنگ کے دوسرے کونے پر چلی گئی۔
"دھوکے سے کیسے ہوئی ہے —— تم کو پورا اختیار تھا
نکاح کے وقت تم انکار کر دیتیں' اگر اپنی محبت اتنی ہی پیاری تھی
اب تو تم میری بیوی ہو —— میری شرعی اور قانونی بیوی'
تمہیں میرا حکم ہر حال میں ماننا پڑے گا —— میں ایک جیتا جاگتا
انسان ہوں' میرے جذبات بھی ہیں اور خواہشات بھی ——
اور یہ ہماری شادی کی پہلی رات ہے —— میں ڈاکٹر ہوں صاف
لفظوں میں کہہ رہا ہوں تمہیں میرا حق دینا پڑے گا —— یہ کوئی فلم
کا ڈرامائی سین نہیں ہے کہ میں تمہاری محبت کا فسانہ سن کر رام ہو
جاؤں اور باقی تمام رات صوفے پر لیٹ کر یا بیٹھ کر سگریٹ پھونکتے ہوئے
گزار دوں —— ایسی باتیں صرف افسانوں میں ہوا کرتی ہیں۔
یا کسی ناول میں ملا کرتی ہوں گی —— حقیقت میں تو ایسا ممکن
نہیں —— دیکھتی ہو کیسا کمرہ ہے' دروازے سے چھت تک پردے
گرے ہوئے ہیں' خوشبوئیں پھیلی ہوئی ہیں اور تم دلہن بنی ہوئی سجی
بنی بیٹھی ہو —— اور قانون اور مذہب نے تمہیں میری
بیوی بنا دیا ہے۔ میں تمہیں بھگا کر بھی نہیں لایا ہوں —— اور
جبکہ میں نے اپنی پچھلی تمام زندگی نہایت شریفانہ طریقے سے بیتی

کے تقاضوں کو تم سمجھ سکتی ہو ——— تم چاہو تو اس وقت تک کیا کر سکتی ہو ——— مجھ سے دور رہو گی ——— ؟ شوہر چاہو گی ——— ؟ ہر بات تمہیں بدنام کر سکتی ہے۔ میرا کچھ نہیں جائے گا۔"

"اب میں بدنامی سے نہیں ڈرتی ——— بے شک میں بدنام ہو جاؤں ——— رسوا ہو جاؤں ——— خواہ میں مر ہی جاؤں ——— لیکن میں مطمئن ہوں گی ڈاکٹر احسن ——— کہ میں نے اس دنیا کو دیکھ لیا ——— اس دنیا کو پہچان لیا ——— کہ یہاں سب ہی اپنی خواہشات کے غلام نکلے ——— کوئی اپنے نفس کے آگے گھٹنے ٹیک بیٹھا ہے، کوئی اپنی انا کے آگے سپر ڈالے ہوئے ہے، کوئی گلے گلے تک خود غرضی کی دلدل میں دھنسا ہوا ہے اور کوئی اپنے حقوق کے حصول میں ——— کسی کو اپنی برتری اور بلندی کا احساس زمین پر قدم نہیں دھرنے دیتا ——— یہاں سب غرض کے بندے، بزدل اور کم ظرف، مصلحتوں سے ناواقف ہیں ——— ڈاکٹر احسن آپ تو ڈاکٹر ہیں ——— بڑے بڑے دعوے سن رکھے تھے آپ کی انسانیت کے اور ہمدردی کے ——— غمخواری میں بھی آپ کا جواب نہیں، غریبوں پر بھی آپ رحم کھاتے ہیں ——— اور اس قدر کھاتے ہیں کہ ان کی بیٹی سے شادی تک کر لیتے ہیں ——— ٹھیک ہے قانونی طور پر آپ میرے شوہر بن چکے ہیں ——— تو شوہر صاحب آپ صرف میرے جسم پر اپنا حق جتا سکتے ہیں ——— سو جتلا لیجیے لیکن یہ سن لیجیے کہ میرے دل اور دل کی دھڑکنوں پر آپ کا کوئی حق نہیں ہو گا ——— جسم تو آپ کا ہو جائے گا لیکن روح آپ کی نہیں ہو گی ——— نہ میری آنکھوں میں آپ کے نام کا کوئی جذبہ ہو گا، نہ میرے خوابوں میں آپ کا عکس ہو گا ——— ان چیزوں پر کوئی قانون، کوئی مذہب آپ کا دعویٰ تسلیم نہیں کرتا ——— یہ سودے دوسرے ہی ہوتے ہیں ڈاکٹر صاحب ——— آپ کو خوب پتہ ہو گا کہ دل، روح اور جذبات کے بغیر جسم کچھ بھی نہیں ——— ایسے خوبصورت جسم تو بازار میں چند سکوں کے عوض مل ......"

"تارا ——— تارا خاموش ——— ہو جاؤ۔"

وہ بے خیالی میں کافی زور سے چیخ پڑے۔

"دھیرے بولئے ——— باہر کوئی جاگتا ہو گا تو سمجھے گا کہ میں آپ پر نہ جانے کون سے ظلم توڑ رہی ہوں ——— حالانکہ آپ نے ظلم کو کوئی نہیں دیکھ پائے گا جو آپ مجھ پر کر رہے ہیں ——— تارا نے بہت شدت کے ساتھ بدلہ لیا تھا ——— اس کا دل چاہ رہا تھا گیا تھا ——— جو ہر جذبے سے بے نیاز تھی ——— اس نے سمجھا تھا کہ زندہ رہنا ہے تو لوازمات کے لیے ... مرنے سے پہلے سب کے سامنے کچھ خوب بیان کرتے ہیں۔

ڈاکٹر احسن نے جو کافی دیر سے اپنی پلنگ کے کنارے پر دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھے تھے سر اٹھا کر اسے دیکھا ——— ان کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا ——— سرخ آنکھیں ——— دہکتے انگارے لگ رہی تھیں ——— بال پیشانی پر آ گرے تھے ——— وہ ایک ٹک تارا کو دیکھتے رہے اور پھر آواز دبا کر بولے

"ظالم ——— تیرے پاس انصاف نہیں ہے۔"

تارا کو یوں لگا جیسے اسے کسی نے گالی دے دی ہو ——— بپھرے ہوئے لہجے میں سمٹ کر تیزی سے بولی۔

"الزام مت دیجئے ڈاکٹر صاحب ——— میرے پاس تھوڑا بہت انصاف شاید مل بھی جائے ——— لیکن اپنا دامن بھی دیکھ لیجیے۔"

ڈاکٹر احسن کی امی شاید جاگ رہی تھیں۔ وہ احسن کی تیز تیز گفتگو سن کر کمرے کا دروازہ تھپتھپاتے ہوئے بولیں،

"احسن بیٹے ——— دلہن کی طبیعت کیسی ہے ——— کوئی چیز تو نہیں چاہیے؟"

ڈاکٹر احسن چونک گئے ——— آواز سنبھال کر انہوں نے کہا۔ "امی ان کی طبیعت ٹھیک ہے۔ آپ فکر مت کیجیے۔"

تارا بھی ان کی آواز سن کر سہم گئی تھی۔

ڈاکٹر احسن نے اس کی طرف دیکھا ——— اور اپنا ہونٹ دانتوں میں چباتے ہوئے بولے۔ "تارا میں بتا نہیں سکتا کہ میرے دامن میں کیا کچھ ہے لیکن تمہارے پاس انصاف نہیں ——— اگر تمہارے پاس انصاف ہوتا تو تم اتنی خود غرض نہ بنتیں ——— مزید طعنے مت دینا۔ بس میری بات سن لو کہ تم جو اپنی محبت کی خاطر ساری دنیا سے لڑنے کے لیے تیار ہو بیٹھی ہو، لیکن تم نے یہ سوچا کہ میں اپنی محبت کے لیے کس سے لڑوں گا ——— آخر میں نے بھی تو محبت کی ہے تارا ——— میری محبت کا تمہیں کیا پتہ نہیں ——— مجھے بھی تو ایسے ہی زخم آئے ہیں۔ ویسے ہی کرب تم نے بھی تو میرے دل پر لگائے ہیں۔ اگر میں تمہاری محبت کے درمیان حائل ہوا ہوں تو تم نے بھی تو میری محبت کے خواب ؛

ہیں ـــــ تم بھی تو ظالم ہو ـــــ تم بھی وہی کچھ کر رہی ہو جو سب لوگ کیا کرتے ہیں ـــــ تم اپنی تسکین کی خاطر مجھے ٹھکرا رہی ہو ـــــ تمہیں تمہاری امی نے بقول تمہارے دھوکہ دیا تو کیا برا کیا ـــــ میں نے تمہیں راہ میں آتے جاتے پسند کیا ـــــ تو تم نے بھی تو اس کو دیکھ کر ہی پسند کیا ہوگا ـــــ کالج میں، محلے میں، کہیں کسی تقریب میں ـــــ خدا کے سوا کسی کو بھی بغیر دیکھے نہیں چاہا جاتا تارا جی ـــــ تم نے ابھی ابھی مجھے کتنی بڑی بڑی باتیں کہہ دیں، تم نے لفظوں کی بوچھار کرتے وقت یہ تو سوچا ہوتا کہ یہ تیکھے لفظ کہاں جا کر لگیں گے اور کیا غضب ڈھائیں گے ـــــ یہ بھی میری محبت ہی تھی جس نے یہ سب کچھ برداشت کر لیا تارا ـــــ میں مرد ضرور ہوں ـــــ مگر کتا نہیں ہوں ـــــ تم نے سچ ہی کہا ـــــ جسم تو ہر جگہ مل جاتے ہیں ـــــ اونچے کوٹھوں پر بھی اور نیچے اندھیرے مکانوں میں بھی ـــــ لیکن مجھے جسم کی ضرورت نہیں ـــــ مجھے روح کا پیار چاہیے ـــــ دل کی چاہ چاہیے، محبت چاہیے، بیوی چاہیے، ساتھی چاہیے، ہمدرد، غم خوار چاہیے ـــــ دوست چاہیے ـــــ اور مجھے اگر کبھی جسم کی ضرورت پڑی تو میں تمہارا احسان کیوں لوں گا ـــــ یہاں چھپر کھٹ کے نیچے بٹن گلاب، موتیے، بیلے کی خوشبو میں، نرم روشنی تلے میں ـــــ بیوی کے ناز اٹھائے جا سکتے ہیں ـــــ اجنبی روح، اجنبی جسم کا احسان نہیں اٹھایا جا سکتا ـــــ تارا تم جو چاہے کہہ لیتیں لیکن اتنا بڑا طعنہ نہ دیتیں ـــــ سچ، تم ظالم ہو ـــــ بہت ظالم ـــــ میرے خدا میں آج بھی اکیلا ہوں ـــــ بالکل اکیلا ـــــ" اور پھر پُر وقار اور سنجیدہ سے ڈاکٹر احسن کو نہ جانے کیا ہوا، وہ دونوں گھٹنے گود میں لے کر ان پر سر رکھتے ہوئے سسک پڑے۔

"ماں ـــــ! میں کتنا اکیلا، کتنا مجبور ہوں تو نہیں جانے گی ـــــ میں تیری گود میں سر رکھ کر رونا چاہتا ہوں لیکن تیرے پاس نہیں آ سکتا ـــــ میں ٹھکرایا گیا ہوں ـــــ آج میں ٹھکرایا گیا ہوں ـــــ مجھے کبھی کسی نے نہیں ٹھکرایا ـــــ میری کوئی خواہش رد نہیں ہوئی ـــــ اب میں یہ عذاب کیسے سہہ لوں ـــــ میں نے تو نہ جانے کیا کیا سوچ رکھا تھا ـــــ اپنی ـــــ اپنی بہن کو رخصت کر کے، اپنے بھائی کو پڑھا کر، اپنا گھر، اپنا اسٹیٹس بنا کر پھر شادی کروں گا ـــــ تاکہ زندگی میں پیار ہی پیار اور سکون ہو ـــــ لیکن اب کیا ہوگا ـــــ مجھ سے میرا گھر چھینے دیکھا جائے گا ـــــ اور ـــــ اور ـــــ میں تو اپنے دوستوں کو سرپرائز دینا چاہتا تھا ـــــ میں کہتا تھا کہ اس قدر شان سے دلہن گھر لاؤں گا کہ لوگ حیران ہو جائیں گے ـــــ لیکن اب میں ماں تیرے سامنے کس منہ سے جاؤں گا ـــــ تو ـــــ تو ـــــ اپنے بیٹے کی پریشانیاں ایک نظر میں بھانپ لیتی ہے، مجھے یقین نہیں آتا ماں کہ میری قسمت اتنی خراب ہوگی ـــــ کیا میرے مقدر میں کوئی بھی تارا نہیں۔" وہ بلک بلک کر دو سال کے بچے کی طرح رونے جا رہے تھے اور تارا کا دل کسی پتھر کے نیچے سلا گیا تھا ـــــ یہ میں نے کیا کیا ـــــ؟ اس سوال کو وہ جتنا دبانا چاہتی تھی وہ ربڑ کی گیند کی طرح پھر ابھر کر اوپر آ جاتا تھا۔

"یہ مرد بھی کتنے عجیب ہوتے ہیں ـــــ کبھی اتنے ظالم بنتے ہیں ـــــ کبھی بالکل بچوں کی طرح بکھرنے لگتے ہیں ـــــ" تارا سے احسن کی حالت نہیں دیکھی جا رہی تھی۔

"ڈاکٹر احسن ـــــ!" اس نے دھیرے سے پکارا۔

لیکن اس نے سنا ہی نہیں،

"احسن ـــــ" اس نے پھر پکارا۔

ڈاکٹر احسن نے ذرا کے ذرا سر اوپر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور بپھر کر بولا،

"نہیں ـــــ تم مجھ سے بات مت کرو تارا ـــــ ہمارے تمہارے درمیان اب کونسا رشتہ، ـــــ کونسا ناطہ رہ گیا ہے ـــــ تمہارے دل میں میرے لیے کوئی گنجائش نہیں تو اپنے اوپر جبر مت کرو ـــــ اور ہاں نہ تم میرے اوپر ترس کھانا ـــــ یہ سب کچھ وقتی ٹینشن ہے ـــــ میں کوئی لے لوں گا ـــــ ٹھیک ہو جاؤں گا ـــــ تم فکر مت کرو ـــــ" احسن نے پیٹھ موڑ لی۔

"لیکن ڈاکٹر ـــــ ایک ـــــ ایک رشتہ تو قائم ہو سکتا ہے۔" تارا نے ڈرتے ڈرتے رک رک کر کہا تھا۔

"وہ کون سا رشتہ ہو سکتا ہے ـــــ نہیں تم مجھے اُونچی اُڑنے کے لیے ایسی باتیں کر رہی ہو ـــــ ہمارا کوئی ایسا رشتہ نہیں جس میں تم محبت کا رنگ بھر سکو ظالم لڑکی ـــــ" ڈاکٹر کا اعتبار کھو گیا تھا۔

"نہیں میں محبت کا رنگ کسی رشتے میں نہیں بھر سکتی ڈاکٹر ـــــ میں مجبور ہوں، میری محبت کسی کی امانت ہے ـــــ میں خیانت

کر سب ہی ڈاکٹر بھی ہوں ـــــ لیکن ہم تم دوست بن سکتے ہیں
ایسے اچھے اور سچے دوست جو ایک دوسرے کے لیے قربانی دے
سکتے ہوں ـــــ تم ڈاکٹر ہو تمہارا دل بڑا ہے ـــــ میں
کم ظرف ہوں، چھوٹے دل کی لڑکی ہوں ـــــ مجھے یقین ہے
تمہاری دوستی میرے لیے قربانی دے سکے گی۔"

"یہی خود غرضی ہوتی ہے تارا ـــــ" ڈاکٹر نے پھر پہلو بدلا۔

"ڈاکٹر تم نے سائنس پڑھی ہے، تم تعلیم یافتہ ہو اور تم تو
خوب جانتے ہو کہ تمہاری محبت یک طرفہ ہے اور میری محبت یک طرفہ
نہیں ہے ـــــ ہم دونوں ایک دوسرے کو بے انداز چاہتے
ہیں ـــــ سوچو اگر میں اپنی محبت کا گلا گھونٹ کر تمہارے آستاں
پر سر جھکا بھی دوں تو بتاؤ اس کا کیا ہوگا ـــــ وہ تو مر جائے گا ڈاکٹر
بلکہ وہ تو مجھے بھی مار دے گا ـــــ میں موت سے نہیں ڈرتی ،
اس کے بغیر بھی زندگی موت سے بدتر ہے میرے لیے ـــــ میں
تم سے پیار نہیں کر سکوں گی ـــــ میرے جسم کے مالک تم بن
بیٹھو گے لیکن میرا دل، میری آنکھیں اس کی ہی رہیں گی اور مجھے یقین
ہے کہ وہ مجھے ضرور ڈھونڈ لے گا ـــــ اور اگر میں اس سے ملی
اور میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکی، میرے وجود، میری شخصیت میں
شامل اس کی امانتوں نے بغاوت کر دی تو کیا ہوگا۔ میں تم کو مار کر
رہی ہوں ڈاکٹر صاحب اب مجھے کسی کی رسوائی کا کوئی خوف نہیں
رہا ـــــ بے شک میری ماں ذلیل ہو ـــــ بے شک
لوگ کہتے رہیں کہ ڈاکٹر احسن کی بیوی بھاگ گئی اپنے . . . ."

"بکواس بند کرو ـــــ" ڈاکٹر احسن کا ہاتھ اس کے
گال پر جا کر پڑا تو وہ بستر پر اوندھی ہو گئی ـــــ لیکن دوسرے ہی
لمحے وہ گال پر ہاتھ رکھ کر اٹھ گئی ـــــ اس کی آنکھوں میں جنون
برہنہ سر رقص کر رہا تھا ـــــ وہ ڈاکٹر کو دیکھ کر ہنس پڑی۔

"دیکھا ڈاکٹر کتنا برا لگا تمہیں ـــــ ابھی تو میں بھاگی بھی
نہیں موجود ہوں تمہاری گرفت میں۔" وہ پھر ہنسنے لگی بالکل عجیب
طرح ـــــ

ڈاکٹر احسن کا دل ڈوبنے لگا ـــــ کیا ہو رہا تھا اسے
اور ـــــ اور ـــــ یہ اس کے ہونٹ سے خون نکل
رہا ہے شاید ـــــ دانت گر گیا ہے ۔

"ڈاکٹر میری ماں نے نکاح کے وقت مجھے [illegible]
کی قسم دی تھی ـــــ اور اب ـــــ اب میں ہی اپنے فرض

باپ کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں اسے ذلیل کر دوں گی اسے بدنام کر دوں
گی ـــــ گلی گلی اس کے سفید بال اڑتے پھریں گے ـــــ
لوگ کردار اچھال اچھال کے گالیاں دیں گے ـــــ انہیں گھسیٹتے
اٹھائیں گے ـــــ میرے باپ کا کیا جائے گا ـــــ میرا باپ
تو مر گیا ـــــ وہ تو جنتی ہے ـــــ جنت میں بیٹھا ہوگا ـــــ
اس کی بے عزتی کون کر سکتا ہے ـــــ وہ تو عزت والا تھا، محبت
والا تھا ـــــ وہ دنیا سے اٹھ گیا تو محبت بھی دنیا سے اٹھ
گئی۔ میرے مقدر میں جو تھوڑی بہت تو ابھی کی محبت تھی وہ تم
جیسے ظالموں نے لوٹی ہے۔"

"یہ ـــــ یہ لڑکا بھی ـــــ کون ہے ـــــ؟"

"کوئی بھی ہو ـــــ تمہیں مطلب ـــــ ہاں تم چاہت
یعنی اس کا ـــــ تم یہی چاہتے ہو تاکہ ہم دونوں اجڑ جائیں مر جائیں۔
تم کتنے خود غرض ہو، اپنی ایک محبت کی خاطر دو محبتوں کو قتل کرنے پر
تلے بیٹھے ہو ـــــ ٹھیک ہے تم مجھے مار دو ـــــ مار دو ڈاکٹر
مار دو ـــــ مجھے جان سے مار دو ـــــ" تارا نے اپنا تکیہ
بھوڑ نوچ کر ایک طرف رکھ دیا ـــــ اور کھسک کر ڈاکٹر کے
قریب چلی آئی۔

"مار دو ڈاکٹر ـــــ مجھے مار دو ـــــ جان سے مار دو ـــــ"
اور ڈاکٹر کے ذہن میں ہیجان کے بعد بگڑے ہوئے ہوش سے تھے وہ اس
کے ملنے کے ڈاکٹر نے پھر کے نقش شروع کر دیئے ـــــ اسے
سنبھالو احسن ورنہ وہ پاگل ہونے کو ہے ـــــ کسی بھی لمحے
اس کے دماغ کی رگ پھٹ سکتی ہے۔ اس پر ہارٹ اٹیک ہو سکتا
ہے ـــــ اس دھان پان سی گڑیا میں کتنی قوت ہوتی
ہے ؟ اور اگر وہ جان سے چلی گئی تو تم کو قاتل کہا جا سکتا
ہے ـــــ"

"مار دو ڈاکٹر ـــــ مجھے مار دو ـــــ نا ـــــ کیونکہ میں
مار سکتی ہوں ـــــ" تارا اس کے سامنے گھٹنوں کے بل جھکی ہوئی
تھی ـــــ "مجھے جان سے مار دو ـــــ مجھے ختم کر دو۔"

ڈاکٹر احسن نے گھبرا کے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور پھر چلا کے
سامنے آ کے ہاتھوں سے اپنا سر تھام کر بولے۔

"نہیں تارا ـــــ دوست ـــــ دوستوں کو نہیں
مارتے ـــــ ان کی خاطر مر جاتے ہیں، انہیں مارتے نہیں ـــــ میں تارا
بہت شرمندہ ہوں، میں نے تمہیں توڑ دیا، مجھے معاف کر دو ـــــ

"خدا کے واسطے مجھے معاف کر دو تارا۔ مجھے معاف کر دو میں تمہارا دوست ہوں سچا اور قربانی دینے والا دوست ——— میں تمہاری خاطر قربان ہو جاؤں گا، برباد ہو جاؤں گا، فنا ہو جاؤں گا، بس تم مجھے معاف کر دو۔"

تارا زور سے ہنس پڑی۔

"زیادہ مکر نہ کرو ڈاکٹر ——— تارا کا کوئی دوست نہیں ——— لیکن نہیں ایک دوست ہے مگر وہ بہت دور ہے اور اب جب وہ آئے گا تو میرے لیے پستول لے کر آئے گا تاکہ مجھے ختم کر سکے یا خود ختم ہو جائے ——— تم مجھے دوست بن کر دھوکہ نہ دو۔"

"تارا میں تمہیں دھوکہ نہیں دوں گا ——— تمہیں تمہارے خدا کی قسم مجھ پر اعتبار کرو۔"

"نہیں ——— تم اس کا نام مت لو ——— وہ میرا ہے، تمہارا نہیں ہے۔"

"ہاں تارا وہ تمہارا ہے ——— تم اس کی امانت ہو ——— میں تمہیں خود اس کے سپرد کر دوں گا، لیکن تم مجھ پر اعتبار تو کرو، میں تمہارا دوست ہوں ——— سچا دوست ——— قربانی دینے والا دوست ——— تم نے ٹھیک کہا تھا ایک آدمی پہ زیادتی ہونا دو آدمیوں پر ظلم ہونے سے بہتر ہے ——— لیکن تم مجھ پہ اعتبار تو کرو ——— ابھی تمہیں یہ سوچنا ہے کہ تمہیں آئندہ کیا کرنا ہے ——— کس طرح حالات کا مقابلہ کرنا ہے۔ تم مجھ پر بھروسہ کرو۔"

"لیکن ——— تم ——— تم ——— مجھے دھوکہ تو نہیں دو گے ڈاکٹر؟" تارا ہکلانے لگی۔ ڈوبنے والے کے لیے تنکے کا تصور بڑا روح افزا ہوتا ہے۔

"نہیں ——— نہیں مجھے رب کریم کی قسم میں تمہیں دھوکہ نہیں دوں گا ——— میں تمہارا دوست ہوں ——— صرف دوست اور سچی دوستی کچھ طلب نہیں کرتی بلکہ ہمیشہ قربانی دیتی ہے ——— میں بھی قربانی دوں گا تمہارے لیے ——— تم خوش رہو گی تو شاید میرا ضمیر مطمئن رہے۔"

"تو کیا تم مجھے آزاد کر دو گے؟"

تارا نے آنکھوں میں حیرانی بھر کر انتہائی معصومیت سے پوچھا اور نہ چاہتے ہوئے بھی ڈاکٹر احسن کے ہونٹوں پر ہنسی پھیل گئی۔

"ہاں میں تمہیں آزاد کر دوں گا دوست۔ لیکن ابھی تمہیں تھوڑے سے انتظار کے بعد ——— میرے آگے بہت سے معاملے بہت مشکل ہیں ——— پہلے ان سے نپٹنا ہوگا ——— ہو سکتا ہے کہ میرے سوچنے سے بہت سے کام آسان ہو گئے ہوں ——— آج اس لڑکی کی بات کے جواب میں ایک دوسرے کی بات سمجھنے سے پہلے کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ تم منہ دھو لو ——— اور ہاں لباس تبدیل کر کے آرام کر لو ——— تاکہ تم بھی اپنے آپ کو آرام محسوس کرو اور میرے ضمیر پر بھی بوجھ نہ پڑے ——— اٹھو ——— وہ وارڈروب کھولو ——— اس میں شاید تمہاری ناپ کا لباس یا اور سارے کپڑے ہوں ——— وہ نکالو اور باتھ روم میں چلی جاؤ میں یہاں پر تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

تارا نے بے اعتباری اور حیرت سے آنکھوں میں سمیٹ کر اس کو دیکھا تو اس نے پیٹھ موڑ لی۔

"تارا جاؤ ——— دوستی میں ایک دوسرے کا کہنا بھی مانتے ہیں۔"

اور تارا نے پلنگ سے اترنا چاہا تو اسے چکر آ گیا ——— وہ اپنے آپ پہ قابو نہ پا سکی اور گرنے کو تھی کہ احسن نے جھپٹ کر اس کا بازو تھام لیا ——— وہ کھٹکے ہوئے لہجے میں بولی،

"چھوڑ دیجیے ——— میں ٹھیک ہوں۔"

"نہیں تمہیں چکر آ رہے ہیں ——— تم بیٹھ جاؤ ——— ادھر بیٹھو صوفے پر۔" ڈاکٹر نے تارا کو صوفے پر بٹھا دیا اور خود وارڈروب میں سے کپڑے نکالنے لگا ——— وہ کپڑے ساتھ میں لے کر دیوار کا سہارا لے کر باتھ روم تک گئی لیکن ڈاکٹر احسن لاشعوری طور پر اس کے پیچھے پیچھے ہاتھ بڑھائے چلتے رہے کہ کہیں اسے پھر چکر آ نہ جائے اور وہ گر نہ پڑے۔ اگر وہ ذرا بھی لڑکھڑاتی تو ان کا بڑھا ہوا ہاتھ اسے تھام لیتا۔

وہ صاف ستھرے پیرہن کے سوٹ میں کھلی کھلی زرد سی تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی ——— قریب ہی تپائی پر سلور ٹرے پڑا تھا۔ اور اس سے ذرا دور سونے کی چین کے ساتھ دل والا طلائی لاکٹ چمک رہا تھا ——— اور ڈاکٹر احسن تارا کی مسہری سے کچھ ہی دور قالین پر نیم دراز تھے۔ ان کا سر صوفے سے ٹکا ہوا تھا۔ انھوں نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ رکھے تھے۔ اور دایاں پاؤں بائیں پاؤں پہ رکھا ہوا تیزی سے ہل رہا تھا۔ وہ بڑے غور سے تارا کی باتیں سن رہے تھے۔

تارا اپنے حافظے میں بار بار ابھرتی ہوئی ٹوٹی پھوٹی تصویروں کو لفظوں کا روپ دے رہی تھی۔

اور کل رات اس کو ہر حرکت گویا دیکھ رہی تھی ——— میں
ست تھوڑے سے پہلے ولایت کے جنگل میں سکھ رہے تھے جب
مرزا احسن نے تارا سے کہا تھا۔

"تارا تم جرأت مت نا مجھے تمہاری باتوں سے نفرت سی لگتی ہے ——— کاش تمہیں پہلے ہی پتہ چل گیا ہوتا کہ تمہاری وفا مجھ سے بعد ہی ہے اور تم مجھے سب کچھ بتا دیتیں تو تم پر آنا نہ کیوں ہوتا ——— خیر میں اب بھی ان زخموں پر مرہم رکھنے کی کوشش کروں گا جو تمہارے سچ بولنے سے دل پر آگئے ہیں۔"

ٹن ——— ٹن ——— ٹن ——— ٹن ——— کلک

نے ڈاکٹر احسن کے خیالوں کی کڑی ہی منتشر کر ڈالی۔

"ہاں تو تارا تمہیں یاد ہے کہ تم کسی پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دوگی ——— اور ہاں کیا تم اب بھی اس کا نام بتانا نہیں چاہو گی ——— آخر مجھے اس سے اعتبار قائم کرنا پڑے گا؟"

"نہیں اس کی ضرورت نہیں ——— میں آپ کو اس کا نام نہیں بتاؤں گی۔ ابھی وہ یہاں ہے ہی نہیں پھر اس کا نام بتانے سے کچھ فائدہ؟ وہ مجھ سے ملنے آیا تو میں آپ سے ملوا دوں گی۔"

"اور اگر وہ بگڑ کر چلا گیا' اس نے تمہیں ذلیل کیا اور میرے خلوص پر اعتبار نہیں کیا تو؟"

"نہیں وہ اعتبار کرے گا ——— کرے گا ——— کرے گا' میں اسے جانتی ہوں ——— وہ مجھے جانتا ہے ——— میری صداقت پر دنیا کی کوئی طاقت اسے یقین کرنے سے نہیں روک سکتی؟"

"ٹھیک ہے ——— یہ حالات بتا دیں گے ——— لیکن دوست ذرا اپنے پیچھے والے تکیے کے پاس سے ہاتھ بڑھا کر لاکٹ تو اٹھا دو۔"

تارا نے پلٹ کر لاکٹ اٹھا دیا ——— "لیجئے ——— کیا کریں گے آپ اس کا۔"

"کچھ نہیں میں سوچتا ہوں ——— پہلے میں نے اسے اپنی آرزو بنا رکھا تھا ——— اور اب یہ میری مجبوری میری رسوائی بن گیا ہے' بتاؤ پانڈی میں کیا کروں اس کا ——— صبح ابھی مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ تم نے دلہن کو کچھ دیا کیوں نہیں ——— اور میں سوچتا ہوں میں بہت بولتے بولتے کہیں تھک نہ جاؤں اور بھرا ہوا تماشا نہ بن جائے اور پھر مجھے یہ بھی سوچنا ہے کہ صبح جب تمہاری سہیلیاں تمہیں چھیڑیں گی تمہیں ستائیں گی اور تمہاری انگلیوں میں کوئی نیا چھلا انگوٹھی دیکھنا چاہیں گی تو تم کیا کہو گی۔"

تارا چپ رہی ——— ایک بے نام اداسی سی چھائی تھی دل پر،

"تارا ——— ہم تم دوست ہیں کیا ——— ؟"

"جی ہاں!" وہ بمشکل بول سکی

"اور دوست کو دوست کا کہنا ماننا چاہیے؟"

"ہاں شاید ——— لیکن ایسا کہنا جس میں کوئی الجھن نہ ہو ——— اور جو بے ضرر ہو۔"

"میں کہہ چکا ہوں تارا ——— میری دوستی تمہیں کبھی تنگ نہیں کرے گی ——— اگر میں یہ لاکٹ تمہیں دینا چاہوں تو کیا تم لے لو گی تارا؟"

تارا چپ رہی۔

"میں نے کچھ پوچھا ہے؟"

"ہاں لائیے دے دیجئے ——— " تارا نے ہاتھ بڑھا دیا لیکن وہ لاکٹ ہاتھ میں پکڑے ہوئے ہلاتے رہے۔ تارا کا ہاتھ پھیلا رہا۔

"تارا ——— " بڑی دیر بعد انہوں نے سرگوشی کی۔

"جی ——— !"

"ایک بات مانو گی ——— ایک چھوٹی سی گزارش ایک معصوم سا ارمان ——— ایک عجیب سی تمنا ہے۔ بالکل بے ضرر ——— تمہارا کچھ نہیں بگڑے گا ——— تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا ——— بس میرے دل کو سکون مل جائے گا ——— تھوڑا سا چین آ جائے گا۔"

"کیا اس خواہش کی تکمیل بہت ضروری ہے؟"

"نہیں تمہارے نزدیک ضروری نہیں ہو گی۔ یک طرفہ جذبہ اسے ہی تو شاید کہتے ہیں ——— لیکن اس خواہش کی تکمیل شاید میری زندگی کا حاصل بن جائے۔"

"وہ خواہش ہے کیا؟"

"میں ——— میں یہ لاکٹ اپنے ہاتھ سے تمہارے گلے میں پہنانا چاہتا ہوں۔"

"لیکن لاکٹ اپنے ہاتھ سے پہنا کر آپ کو کیا مل جائے گا؟ میں خود پہن لیتی ہوں ——— لائیے مجھے دیجئے۔"

"اُف تم یہ پوچھ رہی ہو ——— کہ کیا مل جائے گا مجھے؟ میں نے تو سنا تھا کہ محبت کرنے والوں کے دل جیسے دھڑک اٹھتے محسوس ہوتے ہیں ——— مگر تمہیں سمجھ کیا آیا؟"

"ٹھیک ہے اگر میں آپ کی خواہش کا احترام کروں تو کیا آپ بھی اپنے دل کو شوٹ کروا لیا کریں گے کہ اس کے اندر کی تہہ بے ایمان ہو؟ مگر تو نہیں اُٹھا رہا ہے، یا پھر دوستی کے کیپسول میں دھوکہ بند کر کے تو نہیں دے رہے آپ مجھے ڈاکٹر صاحب!"

"اف میں کہتا ہوں ——— اعتماد ——— اعتماد ——— اعتماد ——— اعتماد بھروسے اور یقین کی بڑی ضرورت ہے اور اتنا مشکل ہے ——— مرض بڑھتا جائے گا ——— جوں جوں دوا ہو گی۔"

"پھر وعدہ رہا دوست کہ اعتماد ٹوٹنے کا نہیں۔" تارا نے بڑی محبت کر کے کہا تھا۔

"ہاں وعدہ رہا جانِ احسن وعدہ رہا۔"

تارا ایکبوں پر سے اٹھتے اٹھتے لرز گئی ——— اس نے مجھے جانِ احسن کیوں کہا ——— بہرحال ——— دیکھا جائے گا ——— اے خدا میری مدد کر ——— وہ اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "مجھے اجازت ہے پہنا دیجئے لاکٹ۔"

"کیا سچ؟" وہ خوش ہو کر اٹھ بیٹھے۔

"ہوں ——— سچ ——— !" اس نے ہولے سے جواب دیا۔

وہ اس کے سامنے وہیں نیچے قالین پر دو زانو ہو بیٹھے ان کے ہاتھوں میں لاکٹ تھا اور ان کی نظریں تارا کے چہرے پر تھیں۔ تارا کا چہرہ جھلنے لگا۔ آنکھوں میں ننھے ننھے چبھنے لگیں ——— اس نے آنکھیں موند لیں ——— دو ہاتھوں کا لمس اس نے شکستہ دل کے قریب محسوس کیا اور پھر اس کے اُلجھے ہوئے ریشمی بالوں کے نیچے گردن کی پشت پر وہ دو ہاتھ کانپتے رہے۔

"آنکھیں کیوں بند کر لیں ——— آنکھیں کھولو نا؟"

"نہیں میں آنکھیں نہیں کھول سکتی ——— اور میرے اپنے خواب بند ہیں وہ نکل جائیں گے۔"

"اوہ! میں بھول گیا تھا۔" کانپتے ہاتھ اس کی گردن کو چھوتے ہوئے واپس ہو گئے ——— پتھر کا سرخ دل اس کے سینے کے باہر لرزنے لگا اور سینے کے اندر کا گوشت پوست کا دل تو شاید دھڑکنا ہی بھول بیٹھا تھا ——— مگر وہ آنکھیں بند کئے رہی۔

"اب آنکھیں کھول لو۔ میں دور آ گیا ہوں۔" رُکتے ہوئے لفظوں میں سے درد پھوٹا پڑ رہا تھا۔

تارا نے آنکھیں کھول کر ایک نظر لاکٹ پر ڈالی اور ایک نظر احسن کو دیکھا ——— اور احسن نے ایک نظر تارا کو دیکھ کر ایک نظر لاکٹ پر ڈالی۔ اور پھر وہ دونوں ہنس دیئے ——— اور جب آدمی رونے کی بجائے ہنس دے تو وہ سمجھتا ہے کہ اس نے دوسرے کو دھوکہ دے دیا ——— لیکن یہ دھوکہ اس کے اپنے حساب میں ہی جا گرتا ہے۔

اور تارا کے مقدر کی کتاب میں بھی دھوکے ہی لکھے گئے تھے

بڑے عذاب وہ لمحے تھے جب احسن کو زبردستی اس کے قریب لا کر بٹھا دیا تھا ان لوگوں نے ——— اور اب وہ دونوں سب کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے تھے۔

"احسن چچا! صبح سے چچی جان ناشتہ نہیں کر رہی تھیں کہہ رہی تھیں کہ پہلے احسن چچا کو بلا کر لاؤ ہم تو ان کے ہاتھ سے کھائیں گے۔"

"نصیب نصیب!" احسن نے تارا کی طرف ذرا جھک کر کہا تو وہ لوٹ سمٹ گئی۔ اور شاید نزہت نے دیکھ لیا تھا۔

"احسن بھائی یہ بے ایمانی نہیں چلے گی۔ بھری بزم میں راز کی باتیں نہیں کی جاتیں۔"

احسن خجل ہو گئے ——— تارا کا سر جھک گیا۔

"بھائی جان اس پینٹنگ کو کیوں گھور رہے ہیں آپ ...؟ اس طرف بھی تو دیکھئے ایک جیتی جاگتی چلتی پھرتی پینٹنگ موجود ہے۔"

"تو کیا مطلب ——— گردن موڑ کر دیکھیں ——— نہیں بھئی چوری چوری کنکھیوں سے دیکھنے میں مزہ آتا ہے۔ ہے نا۔ احسن بھائی۔"

"بہت بول رہی ہو تم ——— بیماری بچی تمہیں بلایا کس نے تھا ——— کل تو بہت اکڑ رہی تھیں کہ نہیں آئیں گے ہرگز نہیں آئیں گے۔ کریں یہ اکیلے اکیلے شادی ——— اور اب صبح صبح کہاں سے ٹپک پڑیں ——— رات کو نیند بھی آئی تھی یا نہیں؟"

"مجھے تو نیند آ گئی تھی لیکن بھابی کا حال پوچھئے؟"

بڑی بدتمیز لگ ——— احسن شرمندہ ہو گئے ——— تارا کی ہتھیلیوں پر پسینہ آ گیا۔

نزہت نے ہنس کر کہا "احسن بھائی کی خدمت کیا کریں۔"

ی مرچ ہے تو ——— کا ذائقہ ہوتی ہے ——— اور
ناشتہ کریں آپ یہیں ——— یہ لڑکیاں تو ہمیں باتیں ہی کرتی
رہیں گی۔ ناشتے کا احسن بھائی کو کچھ کھلایا بھی یا نہیں؟"
"دلہن کو ناشتہ کھلائیں گے ——— ایک نے بات
[illegible] بش کی۔
"ہاں ہاں دلہن کو دودھ جلیبیاں کھلائیں گے۔" سب نے
[illegible] یہ کر ڈالی۔
احسن انجان بنے بیٹھے رہے۔
"احسن بھائی! اٹھائیے تو۔ ہم بھابی کو دودھ جلیبی کھلاتے ہیں۔"
"نہیں میں نہیں کھلاتا ——— تم خود کھلاؤ ——— میں
رہا ہوں۔"
"ایسے نہیں جانے دیتے ہم ——— بیٹھ جائیے نا ———
رہ جائیے ———"
"ارے جانے دو خوار ——— معلوم ہوتا ہے سفارتی
تعلقات خراب ہیں۔ لڑائی ہو گئی دونوں کی ———"
تارا کا دل دھک سے ہو گیا ——— احسن بھی کسمسا کے
اٹھتے بیٹھ گئے۔
"لڑکیو! دیکھو تم زیادہ تنگ نہیں کرو مجھے ——— ورنہ میں
اپنی دلہن کو لے کر فرار ہو جاؤں گا ———" نہ جانے کس نے
بلہ بولا کیا ——— سب ہنس پڑے۔
"لو احسن میاں گرم چائے آ گئی ——— ناشتہ کر ہی ڈالو،
پھر مہمان ایک ایک آ رہے ہیں، پھر کام بڑھ جائے گا اور پھر دلہن
لینے بھی تو کوئی آئے گا ان کے میکے سے۔"
"اللہ بھائی چلی جائیں گی ابھی ——— ابھی تو جلا دل بھی
نہیں بھرا ——— ابھی تو ہم نے دیکھا بھی نہیں ٹھیک سے ———"
تارا بالکل بچوں کی طرح ٹھنکی، لیکن پیار نے اس کے کندھے پر ہاتھ
رکھ کر کہا۔
"نیلما! تم احسن بھائی کی زبان میں کب سے بولنے لگیں۔ ہائیں
نہیں تو رکنے دو۔"
تارا کے حلق میں کانٹے چبھنے لگے ——— اسے کچھ سمجھ نہ
تھا۔ احسن نے ایک نظر ننھی دلہن پر ڈالی جو بیٹھی تھی، مسکرا کر دیکھا اور پھر
کھڑے ہوتے۔ "مجھے بھی گھر جانا ہے ——— اس
[illegible] کوئی شرارت تو نہیں سوجھ رہی۔"

ہوں کہ ٹائٹ نہیں پہنا احسن بھائی ——— ابھی تو مہمان
دوسرے ساتھی پہنچنے والے ہیں ——— راحت سلامت صبح سے
[illegible] بھائی اور فرقان بھائی کو تیار کر رہی ہیں جلدی سے پھر
آ جائیں گے ——— پیارے بھائی بیٹھ جائیے۔ اچھا تب تک
نہیں تو کر لیں گے آپ کو۔" نیلما شوخی سے بولی۔
"ارے بیٹھ جائیے احسن بھائی یہاں بیٹھیں بھتیجیاں ہیں مگر کچھ
کوشش رہی ہیں تو کیا ہوا آپ بھی جواب دے دیں۔"
"یہ بھتیجیاں ہیں یا شیطان کی خالائیں ہیں، خیر ابھی
ان سے تو شیطان بھی پناہ مانگتا ہے۔"
"ہوشیار خبردار ——— جہاں پناہ مس راحت عالم تشریف
لا رہی ہیں ——— اور ساتھ ہیں مس سلامت عالم بھی ہیں۔"
"خوش آمدید ——— خوش آمدید ——— ویلکم ———
ویلکم ———" سب نے تالیاں بجائیں ——— اور احسن
نے سر تھام لیا ——— شیطانوں کی پلٹون کے دو جرنیل آ چکے تھے
اب فرار کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔
تارا حیران تھی ——— اتنے رشتہ دار ——— کتنا بڑا
خاندان ہے ان کا ——— اتنی ساری لڑکیاں ——— اتنی
خواتین ——— کوئی اسے چچی کہہ رہا تھا، کوئی ممانی، کوئی بھابی
صبح سے بلکہ رات سے مہمان آ رہے تھے ——— یہ لوگ بارات
میں نہ جانے جانے پر شاکی بھی تھے اور دیکھ کر بے حد خوش بھی
تھے ——— ان لوگوں کے پاس کتنی محبتیں ہیں ایک دوسرے
کے لیے ——— کتنا پیار ہے آپس میں ——— یہ سب کتنے
خوش ہیں ——— کتنے نازاں ہیں مجھ پر ——— کیا میں اتنی
ہی مقبول اتنی ہی خوبصورت ہوں ——— لیکن میں ان لوگوں
کے بارے میں کیوں سوچ رہی ہوں۔
"آخر آپ نے ایمرجنسی میں شادی کیوں کی ———؟" تارا
چونک گئی ———
"حضور میں ڈاکٹر ہوں ہمیشہ کام ایمرجنسی میں کرتا ہوں اس لیے
عادت پختہ ہو گئی ہے۔ شکر کیجئے آئندہ ایسی غلطی نہیں ہو گی۔"
"ہم ایسی کوشش نہ کیجئے ——— ٹھیک ہے ہم بھابی سے
پوچھ لیتے ہیں۔" راحت جھٹ بھابی بنی ہوئی تارا کے قریب آ گئی۔
"بھابی! (LOVE) کا چکر تھا؟" راحت نے تارا کا
[illegible] پکڑ کر اس نے کان میں سرگوشی کی۔

تارا کے گالوں کی رنگت بدلنے لگی ــــ اس نے ہاتھوں میں اپنا سر چھپا لیا۔

"دیکھا شرما گئیں نا ــــ احسن بھائی ہنسے "چھپے رستم نکلے آپ ــــ ویسے تو زاہد خشک بنے رہتے تھے ــــ لیکن اندر ہی اندر اتنی بات بڑھا لی اور ہمیں پتہ بھی نہ چلا ــــ ہمیں بتاتے تو ہمیں پیر جیسی میں برات لے جانے کی ضرورت نہ پڑتی۔"

"ویسے بھابی آپ کو ہمارے احسن بھائی کی کون سی ادا اچھی لگی ــــ بتائیے ــــ پلیز بتائیے نا ــــ ارے اب تو آپ ہی کے ہیں شرمانا کیسا؟" ــــ لیکن تارا سے سر اوپر اٹھایا نہ گیا ــــ اس کا دل دھکا دھک ہونے لگا تھا ــــ وہاں دیوانیوں کو کیا پتا تھا کہ جس کے نام سے تم مجھے چھیڑ رہی ہو وہ میرے لیے اجنبی ہے انجان ہے ــــ میں اس کی دلہن نہیں ہوں ــــ وہ میرے کس منہ کا ویا ہے ہماری راہیں جدا جدا ہیں ــــ کچھ دنوں بعد ہم میں ایسی گہری جدائی پڑ جائے گی کہ پھر کوئی شخص ہم دونوں کا نام ساتھ نہیں لے سکے گا ــــ وہ تو چاہتی تھی کہ چیخ چیخ کر سب کو بتا دے ــــ تاکہ سب کے ہونٹوں پر تالے پڑ جائیں لیکن وہ چپ تھی کیونکہ اس کے ہونٹوں کو سی دیا گیا تھا ــــ اور پھر اس نے رات کو وعدہ بھی تو کیا تھا احسن کے گھر والوں کی خوشیوں کا احترام کرے گی ــــ تاکہ احسن سکون سے کوئی رستہ ڈھونڈ سکے ــــ تارا نے سر سے پھسلتا دوپٹہ سنبھالا۔

"اوہ دیکھو راحت ــــ بھابی انگوٹھیاں دکھا رہی ہیں ــــ رات کو ان کی تعداد میں اضافہ ہو گیا ہو گا۔"

"ارے ہاں بھابی ــــ کیا دیا بھائی جان نے منہ دکھائی میں ــــ؟"

"اسٹیتھسکوپ!" سیما چہکی۔

"دکھ من کی گولیاں۔" غزالہ نے گرہ لگائی۔

"تمہارا سر ــــ" احسن نے جھلا کر کہا۔

"فالتو نہیں بھیا ــــ بھلا سر ــــ آپ ہی اپنا سر جھکائیے بھابی کے قدموں میں اب تو ــــ"

"نیلم پھوپھو کی نئی انگوٹھی ہے بھابی کے ہاتھ میں ــــ؟" راحت نے تارا کے مہندی لگے ہاتھ نیلا کے آگے کر دیئے۔

"نہیں راحت باجی مجھے دکھا دیجئے ــــ" نیلا احسن کی طرف دیکھ کر شرارت سے مسکرائی۔

"مجھے تو بڑی باتیں آتی ہیں ــــ" راحت نے تارا کی طرف اشارہ بھی کر دیا ــــ شرم سے تارا کا سرخ چہرہ جھک گیا۔

"ہائے یہ غضب ــــ دل کے ٹکڑے ہی یہ تو" راحت نے مصرعہ اٹھایا لیکن احسن چپ چاپ اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھ گئے تھے۔

"میری جان ــــ بھائی جان!" فرقان کمرے میں داخل ہوتے ہی احسن سے لپٹ گیا ــــ فرقان کے پیچھے آنے والا عورتوں اور لڑکیوں کا ریلا بھی کمرے میں گھس آیا۔

"ارے فرقان بھائی آ گئے ــــ فرقان بھائی زندہ باد آپ ہنسنے لگا ــــ ہمارے کزن آ گئے۔" راحت مسہری سے اٹھ کر دروازے کی طرف بھاگیں۔

تارا نے دوپٹے کی اوٹ سے جھانک کر دیکھا ــــ کون ہے جس کی آواز اتنی اپنی سی لگ رہی ہے ــــ آنکھیں بند کر کے تو یوں لگتا ہے جیسے نواز بول رہا ہو ــــ لیکن نواز یہاں تم سے مل سکتی ــــ تم تو نہ جانے کہاں ہو؟

"بھابی کہاں ہیں ہماری ــــ ہمیں اپنی بھابی کو دیکھنے دو۔" وہ سب کو ہٹاتا ہوا مسہری کی طرف بڑھا تو تارا نے سر جھکا لیا ــــ

"تم کل کیوں نہیں آئے فرقان ــــ کیا تمہیں خط مل گیا تھا بھائی جان لیکن جہاز میں سیٹ نہیں مل رہی تھی کل کی بکنگ ہو گئی ــــ مجھے بھابی کے پاس بیٹھنے دو کل سے دل نہیں بھر آیا ــــ" فرقان نے ایک دھپ نیلا کو جما دی ــــ

"بڑے اچھے لگتے ہیں ــــ ان نہیں تو آتے ہی لڑنے لگے ــــ بیٹھ جائیے بھابی کے پاس لیکن مار پیٹ نہیں ــــ"

اور وہ جوتوں سمیت مسہری پر چڑھ کر تارا کے قریب بیٹھ گیا۔

"بھابی ــــ!" اس نے تارا کے کان میں سرگوشی کی "ہائے کسمائی ــــ تو وہ بڑے زور سے ہنس پڑا ــــ تارا کے قریب جھکتے ہوئے اس نے اپنا بازو تارا کے گلے میں ڈال دیا تو سلامت نیلا اور سیما تالیاں بجا بجا کر ہنسنے لگیں۔

دوسرے ہاتھ سے گھونگھٹ اٹھاتے ہوئے اس نے بڑے پیار سے کہا "بھابی میں ہوں آپ کا غلام ــــ آپ کا اکلوتا

ب فرقان احمد ——" اس کا آخری جملہ ہوا ہو گئی۔
"آتی جیتیں ——
تتنے پیار ——
آتی نوازشیں —— آخر کس لیے —— ؟"
"مائی ڈیئر بھائی —— میں سمجھ رہا تھا کہ آپ
لیے بے انتہا خوبصورت تحفہ لایا ہوں۔ لیکن سب پھیکے پڑ گئے
وہ ہماری حدود میں واقعی خوبصورت تھا۔ لیکن شکر ہے اب آپ
حسن کے رنگ اندر پڑ گیا ہے —— سب آپ خود بتا دیجیے
کہ کیا تحفہ دوں؟"
وہ جوڑ ایک مضبوط بازو تھا لیکن اس کا کاندھے شل
ہونے لگے۔ یہ مجھ سے اٹھائی نہیں جاتی بہرحال سب
نے تھک کر اپنے گھٹنے پر سر ٹکا دیا۔ اٹھیاں تو نے مجھے یکدم
سے اٹھا کر کہاں پہنچا دیا۔ تم سب سارے لوگوں میں —— سب
اتنے سارے رشتوں کو کیسے نبھاؤں گی۔ اتنے سارے چہروں کو
مد ہوکا دوں گی۔ تم سے واقعی نہیں ہو سکے گی نا۔
"اے —— رے رے —— بھائی جان ——
رلیے نہیں سر اوپر کیجیے —— دیکھیے میں آپ کا ٹک گئی
پھر اوپر اٹھا لیجیے وہ چہرہ جان لیجیے مجھے گدگدی کر رہا ہے
ب —— اللہ دو —— اللہ —— ارے
آگ سر اوپر کر کے بیٹا —— فرقان نے خوش ہو کر تالی بجا دی۔
ہوئی نا بات —— اب بتائیے کیا تحفہ دوں آپ کو —— ؟"
چھوٹا بول پائی —— سامنے احسن بھی تو بیٹھے تھے۔ "بھائی
نے کیا لیں گی؟"
"دل —— ؟"
"لیکن وہ تو بھائی جان نے پہلے ہی افسوس میں ترتیب ہو گیا
یہ ہے کون ملے گا —— " فرقان نے شرارت سے پیچھے کی طرف
اور آواز پیچھے سے آئی تھی —— وہ سعادت تھی ——
"لیکن فرقان بھائی جو دل احسن بھائی نے دیا ہے وہ تو پتھر
ہے۔" سعادت چہکی۔
اسے لگا جیسے اس سارے منصب پر دل دیا تھا تو وہ پتھر
ہی تھا —— گوشت پوست کا دھڑکتا دل تھا —— لیکن
کے پاس جا کر وہی پتھر کا بن گیا —— " احسن مذاق میں کر
ہے تھے لیکن تارا کے کان سن سے ہو گئے —— وہی پتھر کا دل

گیا —— دلہن —— دولہا —— لڑکیاں پھر
بھی —— ! قیمتی ہیں پتھر نہیں، لیکن اللہ احسن بھائی کا خیال رکھنا
مجھ پر ہے تم جلدی سے اپنے اچھے خیالات کو ٹھیک —— سے
تو اسے بچا لے وہ سب کچھ —— مجھے پتہ ہے تم پتھر
کہہ رہی تھیں یاد رکھنا۔
"بھائی اب خدا تمہیں کبھی دکھ نہ دے یہ آنسو میں برداشت کر کے آپ کی
اور بھائی جان کی —— میں اس کار دینی یاد رکھوں گی اب اور
نئی خوشی لی ہے۔ بھائی اب تم خود کو ہر دم ٹھیک —"
تارا کو یاد آئی —— لیکن احسن نے پہلے ہی رومال دے دیا
تھا اس قدر بلا وجہ دل میں اتر نہیں آتی تھی —— اور پھر احسن
کی انگلی کو سرے میں ڈالی جو گر پڑی تو چلا جاتا ہے شرم سے گیا۔ اس نے
ایک ایک کو دیکھ کر ڈالی —— سب لڑکیوں کے ذہنوں میں ایک
ایک کام ڈال دیا —— مختلف کر کے سب کو سمجھا دیا ——
احسن نے اللہ کر کے چلے گئے وہ دلہن ہاتھ پکڑ کر لیا آ —— فقط
ایک نیلا جامنی کے پاس دوپٹہ ہی تھی ہو اس نے سے ہی پکڑا۔
"کام بہت ہے —— بھائی کی شادی یونہی نہیں
ہو جاتی۔ اتنی پلاننگ جس جاتے ہی کام ہوتے کرتے —— کل
ولیمہ ہے —— اللہ دے سے زیادہ مہمانوں کو کارڈ نہیں
پہنچے ہیں —— لیکن میرا احتیاط جلدی سے سارے کام
تو پڑا ہوا تھا۔ چلو اللہ کا شکر ہے فرقان تو آ گئے —— اور
نیلا بھائی کو آرام کرنے دو ویسے ہی بیچاری دو ماہ تیاری کی ہے
اور پھر کل اتنی جیت کی خواب گی۔ خدا کرے میری بچی کو کچھ ہو
گیا تو میں تمہاری پٹائی کر دوں گی —— آپ نے ہی تو سارا وقت
اپنی زرخیز لگا رکھی تھی صبح سے —— مجھے پتہ ہی نہیں کہ تم لوگ میری بیٹی کو
تنگ کر رہے ہو —— صرف مجھے ہی کہتا ہم دونوں کو یہاں وقت
دیتی ——"
"امی ہم نے ان کو تھوڑا سا تنگ کیا تھا —— ہم نے تو
بھائی جان کو تنگ کیا۔"
"بھائی جان کو تنگ کیا تو کیا، پریشان نہیں ہوئی ہو گی ——
اس کے تکیوں پر تو قبضہ کر لیا تھا —— ارے بھئی اب کہاں بیٹی ملا
احسن الگ الگ تو نہیں۔ ماشاء اللہ میری چاند سورج کی جوڑی ہے
اللہ سلامت رکھے۔ سدا سکھی رہیں، دل کو خوش رہیں یا رب بس ملا
کوئی تمنا نہیں —— میرا بیٹا سعادت مند رہا اس کی بیٹی ہے

میرا ——"

"ہاں تارا بیٹے تم تھوڑی دیر کے لیے لیٹ جاؤ —— پھر تمہاری امی تمہیں دیکھنے آتی ہوں گی —— شاباش شاباش شرماتے نہیں آرام سے لیٹ جاؤ، مگر اکڑ کر نہیں ہو گی۔"

اور تارا کی کمر اکڑی ہی تھی، لیکن اب تو دل بھی سرکش ہو چلا تھا۔ احسن کی امی کی پیار بھری دعائیں کانٹا بن کر اس کے حلق میں چبھنے لگی تھیں۔

"دل جڑے رہیں —— اللہ جوڑی سلامت رکھے ——"

اونہہ! جوڑی تو بنی ہی نہیں جو سلامت رہے گی —— اور دل! دل کا جڑنا بھی آسان نہیں ہوتا —— بندہ حسن اگر کہیں اور بندھے ہوں تو پھر دل کسی در پر نہیں جھکتا —— میں تو دھوکے سے اس دہلیز پہ لائی گئی ہوں ورنہ میری جبیں تو نواز کے قدموں میں جھکنا تھی۔ لیکن اب بھی کچھ نہیں بگڑا —— میں اب بھی نواز کی ہوں، یہ کچھ دن کا دکھاوا ہے، ورنہ احسن تو میرے کچھ بھی نہیں۔

"کیا سوچنے لگیں دلہن بٹیا —— ؟ دیکھو چندا یہ تمہارا گھر ہے تم اس گھر کی مالکہ ہو۔ تمہیں اس گھر کو سنبھالنا ہے۔ ہم اب بوڑھے ہو گئے ہیں اب ہمارے بس کا کچھ نہیں۔ قبر میں پیر لٹکے ہیں، نہ جانے اللہ کس گھڑی اٹھا لے۔ تم بٹیا اپنی صحت کا خیال کرو۔ پھول بھری تو ہو —— اتنے دن کی تھکان —— اور پھر راتوں کی بیداری بٹیا مجھے ساس مت سمجھنا میں تو تمہاری امی ہوں —— اور ماں سے شرماتے نہیں ہیں، چلو لیٹ جاؤ، چلو لیٹ جاؤ ——" تب تارا نے جھکی پلکیں اٹھا کر ان کی طرف دیکھا ...... بوڑھے چہرے پر پیار کی ٹھنڈی چھاؤں پھیلی ہوئی تھی —— ممتا بھری مسکراہٹ ہونٹوں پر لیے وہ بڑے غور سے اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں سکون تھا، اطمینان تھا ...... اور بہت ساری محبتیں تھیں —— تارا پر یک دم تھکن ٹوٹ گری —— اس نے اپنے ٹھنڈے ہاتھ سے تکیہ سیدھا کرنا چاہا تو انہوں نے تیزی سے اٹھ کر تکیہ سیدھا کیا، کمر کی سمٹی چادر ٹھیک کی، اس کے ماتھے تک آتا دوپٹہ ٹھیک کیا اور پھر اسے بازو سے پکڑ کر یوں آہستگی سے بستر پر لٹا دیا جیسے وہ بیس سال کی تارا نہیں بلکہ دس کی گڑیا سی بچی ہو۔

تارا کو ڈھیر سی شرم آنے لگی دل کی چوری ڈس جو رہی تھی اور جب انہوں نے جھک کر اس کی پیشانی چوم کر دعا دی "جگ جگ جیو میری بچی۔ دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو" تو تارا کے دل میں پیچ سی اتر گئی۔ اس نے آنکھیں موند لیں، ہتھیلیاں اس کے اوپر تھیں۔ چاند ڈال رہی تھیں اور پھر باہر سے کھینچنے کی آواز آئی۔ اور وہ باہر سے غور سے ملاحظہ کر رہی تھیں —— تب تو دیکھو تو شیطانوں نے پھولوں کو اٹھا پھینک دیا —— پاگل ہی دیوانیاں —— چھ میں سینڈ میں سب پیچھے چھوڑ۔ اور اب شاید وہ اس کے پاس آ کھڑی ہوتی تھیں۔ ماتھے پر اتنا لمس پا کر تارا نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔

"بھوک تو نہیں لگی —— ؟ کچھ کھانا ہے بٹیا۔ چائے —— پانی —— دودھ، کچھ لاؤں —— ؟"

تارا نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"اچھا تو پھر آرام سے سو جاؤ —— اور سونا کہ رہی ہے بٹیا تکلیف ہو رہی ہو گی ناک میں —— تم تارا ہاں میں دروازہ باہر سے بند کر دیتی ہوں اور کسی کو اس طرف آنے نہیں دوں گی۔" وہ اس کے سر پہ ہاتھ پھیر کر چلی گئیں اور دروازہ آہستگی سے بند ہو گیا۔ لیکن تارا کے دل کی دیواروں میں وہ اندر اترتی چلی گئی —— "کیسا مذاق ہو رہا ہے میرے میرے مالک —— جب میں محبتوں کے لیے ترستی تھی محبتیں نہیں مل سکیں، جن لوگوں کی محبت کے لیے دل دیوانہ تھا وہ تو دشمنوں کا روپ بن بیٹھے، اور جن لوگوں کی محبت کی نہیں وہ پیار کی بوچھار کیے دے رہے ہیں —— اب پتہ کر ان کی محبت مجھے چبھتی ہے کاٹتی ہے —— اب کروں —— ؟ کیا کروں میرے مالک —— وہ ترم بدلتی رہی —— لیکن وہ کسی نے سچ ہی کہا تھا کہ نیند کی سیج پر بھی آ جاتی ہے تو پھر وہ تو ترم کے گدے پر بچھی ہو شنیل کی چادر تھی۔

تارا نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

ہونٹوں کے لمس اور گرم گرم آنسوؤں نے اسے ڈرا وہ تو یہی سمجھی تھی کہ ایک لمحے میں شاید احسن آ گئے ہیں۔ لیکن جب پلکیں جھپکائیں تو اپنے اوپر جھکے ہوئے چہرے کو نزم جانے پہچانے لگے —— اس نے اپنی پہچان سے کروٹ تو وہ نہیں لی سنجیدگی اس کی پیشانی چوم لی۔

"میری بچی —— میری جان —— میری

[illegible]

[illegible]

تمارا اس سے عائشہ آپی بڑی پیاری تھیں۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ عائشہ آپی سے ڈھیر ساری باتیں کرے، ڈھیر باتیں کرتے کرتے جب تھک جائے تو ان کی گود میں سر رکھ کر خوب روئے اور عائشہ آپی پیار سے اس کے بال سہلاتی رہیں اور وہ روتے روتے سو جائے

لیکن نیلا نے اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔

"پیاری بھابی چلئے صوفے پر بیٹھئے، مٹھائی کھائیے، پھر میں چائے بنا لاؤں گی آپ کو ــــــ اور پتہ ہے آپ کو بھائی فرقان بھائی آپ کے لیے ایک انوکھا تحفہ لائے ہیں۔ وہ آپ کو سرپرائز دینا چاہتے ہیں۔ ارے بھابی چائے لے آئی ہیں بھابی ــ لیجئے نا ــ"

نیلا نے اس کا ہاتھ پکڑا تو وہ چونک گئی۔

"بھابی آپ کو تو بخار ہے ــــــ! امی امی بھابی کو بخار ہو گیا ــ امی بھائی جان کہاں ہیں ــ؟ میں ابھی بھائی جان کو بلاتی ہوں۔" نیلا اٹھ کر جانے لگی تو تمارا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"کیوں بھابی؟"

"تم زیادہ فکر مت کرو، معمولی بخار ہے، میں ابھی ٹھیک ہو جاؤں گی، ہاں عائشہ آپی کو ادھر بلا دو۔"

"عائشہ باجی آپ کو بھابی بلا رہی ہیں تو آپ ادھر آ جائیے مسہری پر۔"

"ارے دلہن بیٹا کیا ہوا ــ تم نے بتایا بھی نہیں کہ بخار ہو گیا۔" احسن کی امی اس کے قریب چلی آئیں۔ رضیہ بی نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔

"بہت تیز تپ رہی ہے بچی، یہ احسن میاں کدھر گئے آپا بی سلام کرنے بھی نہیں آئے۔"

"رضیہ بہن وہ ابھی ابھی کہیں باہر نکل گئے۔ ویسے میں خود جاتی ہوں۔ اصل میں ان لڑکوں لڑکیوں نے اسے صبح صبح بہت تنگ کیا، ماشاءاللہ بڑا خاندان ہے سب ہی جمع ہو گئے ہیں۔ اور وہ سکون کا عادی ہے۔ کسی دوست کے یہاں چلا گیا ہے۔ میں ابھی بلوا کر لاتی ہوں۔ وہ آتے ہوں گے، ماشاءاللہ بہت بڑے ڈاکٹر ہیں۔ ابھی کوئی دوا دیں گے تو بخار اتر جائے گا۔" وہ تیزی سے باہر چلی گئیں۔ اور تمارا نے اپنے قریب بیٹھی ہوئی عائشہ آپی کے زانو پر سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ اور عائشہ آپی بڑے پیار سے آہستہ آہستہ اس کا سر دبانے لگیں۔ باہر ہونے والا شور یکدم کم ہو گیا۔ تو فرقان کی آوازیں آنی بند ہو گئیں شاید سب ایک کمرے میں جمع ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر بھائی جو تمارا کے جیٹھ ہوتے تھے اسے دیکھنے آئے اور وہ دوا دے کر پچاس سو پانچ روپے بھی لے گئے تھے۔

تمارا کو بخار اترا تو احسن کی امی نے تولیے سے اس کا پسینہ خشک کرتے ہوئے اس سے پوچھا تھا۔ "بیٹا امی کے ساتھ جا سکتی ہو ــــــ میرا مطلب ہے تمہارا دل چاہ رہا ہے، ا بہت سے بیٹا ــ بس ہوا لگنے کا ڈر ہے اور کوئی بات نہیں ــ"

"میں مگر نہیں جا رہی امی ــــ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" تمارا نے آہستہ سے کہا۔ وہ گھر ویسے بھی نہیں جانا چاہتی تھی۔ وہاں اس کے لیے تھا ہی کیا ــــــ کون سے پاپا بیٹھے تھے جو اسے گلے لگا لیتے ــــــ بس امی اسے دلار سے جاتیں اور اسے قائل کرنے کی کوشش کرتیں کہ انہوں نے اتنا بڑا دھوکہ دیا ہے کہ اس کی محبت سے مجبور ہو کر دیا ہے۔ اور محبت اور نفرت کا فرق خوب جانتی تھی۔ رضیہ بی نے جاتے وقت اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعا دی لیکن وہ انجان بنی رہی۔ عائشہ آپی کا ہاتھ پکڑ کر اس نے یہ ضرور پوچھا تھا۔ "آپی کل آؤ گی ؟"

انھوں نے آہستہ سے سر ہلا دیا تھا۔

امی چلی گئیں تو وہ سب اس کی عیادت کو آ گئے۔ نیلا ان نے باقاعدہ سب کا تعارف کروایا۔ کچھ رشتے اس کی سمجھ میں آئے کچھ نہیں۔ اس نے سنجیدگی سے رشتوں کو سمجھنے کی کوشش بھی کہاں کی۔ یہ رشتے صرف دکھاوے کے تھے نبھانے کو نہیں، سمجھتی تھی۔ لیکن جب نیلا اس کے لیے سوپ لے کر آئی اور فرقان نے نیلا کے ہاتھ سے پیالہ لے کر ایک ہاتھ سے سہارا دے کر اسے اٹھایا اور ہاتھ سے سوپ کا پیالہ اس کے ہونٹوں سے لگایا تو اسے ان سے وحشت ہونے لگی ــــــ دل میں کوئی چور چھپا تھا بار بار سر اٹھا کر اس سے پوچھتا تھا کہ ان محبتوں ان ملاوٹ کو تم بتاؤ، نفرت اور جلن کی صورت میں دو گی نا ــــــ؟ تمہیں تو نواز کا بن جانا ہے یہ لوگ تو دو کے ہیں۔ تمہیں لپیٹ کر نہیں دیکھتا ہے ــــــ سکون صرف کی باتوں میں ہے ــــــ لیکن یہ فرقان کو مار سکتی۔ تو تمہارا ہے میں نے بڑی مشکل سے تو احسن کو روکا ہے سے کیا کر سکتی ہوں۔

بھابی کی دلہن سے آپ جلد سے جلد ملنا چاہتی تھیں
یں دوسرے آیا ہوں ——— بھابی کیسی لگیں آپ کو
آرام سے لیٹ جایئے ——— بھابی جلدی تو نہیں تھکیں گی ———
ن چائے پئیں گی ——— بھابی آپ کو بہت اچھی لگے
بہت خوش ہوں گی آنے والی ہیں ——— بھابی جی
یک تصویر اتروا لیجئے گا ——— بھابی کی سالگرہ آ رہی ہے
——— بھابی سیب کاٹ دیجئے ——— بھابی سر دبا دوں ———
پائے بنا لاؤں ——— وہ استفسار سے لوگوں کی
رہ گئی ——— وہ ان لوگوں سے ملتے جلتے تھک جاتی تھی
لیکن ان کے دل کیسے توڑ دیتی سو جیسے تیسے باتیں کرتی رہی ———
ب اس کی آنکھیں بوجھل ہونے لگیں تو وہ سب خود ہی چلے گئے۔

آخر وہ آ ہی گیا جس کا انتظار تھا ——— فواز احمد کا بیٹا
ئش سے دیوانے ہو گئے ——— نیلا کے دل کی کلی کھل گئی
کی آنکھیں بھی چمکنے لگیں ——— راحت سعادت اپنے
کے حضور آداب بجا لائیں۔ لیکن وہ تو بچہ ہوا تھا۔
یہ شادی بھلا تو ہو گئی کیسے۔ احسن چچا کو ایسی جلدی کیا تھی
بیگم کو کوئی کڈنیپ تو نہیں کر رہا تھا۔ ویسے تو وہ بہت پیار کا
کرتے ہیں۔ لیکن شادی کے موقع پر ہمیں بھول گئے۔ ہم نے
چچا کی شادی کے ایسے اعلیٰ قسم کے پروگرام بنا رکھے تھے سب
گئے یار ——— پتا ہے فرقان بھی پتہ ہو تاکہ احسن چچا جیسے
ہی اتنا بڑا نادر فیصلہ کر ڈالیں گے تو ہم جا ہی نہیں
بلا کر بھلا کیا آخر یہ کوئی آئیڈیا وغیرہ کا چکر تو نہیں ہو گیا ——— کوئی
سرسری منٹ آئی ہو علاج کرانے پہنچ گئے ڈاکٹر صاحب
بن گئے اور مریضہ صاحبہ دلہن بن گئیں۔
پتہ نہیں پھر کیا ہوا ——— بیٹے جو کچھ ہوا اچھا ہی ہوا۔
ڈیسنٹ ہیں ہمارے بھابی ——— کہا احمد نے
میں تو بچہ اپنے پیارے سارے لاڈلے بھائی کی شادی میں
نہ کر سکا۔ بہرحال کل ولیمہ ہمارا منتظر ہے تب خوب مزے
بریں گے جب ساتھ ساتھ سنئے پروگرام بنایئے۔
پروگرام وروگرام کچھ نہیں ——— یہ احسن چچا ہیں کہاں؟
[illegible] کی جیب میں سے پستول نکال کر [illegible]
[illegible] خاص بھی [illegible] نہیں کیا۔ میں ان سے پوچھوں گا کہ آپ نے

تم نے بغیر شادی کیسے کر لی ——— یہ میری ٹیم کی شکست
تمہیں [illegible] پستول [illegible]
نیلا کا ابھی نہیں [illegible] راحت نے [illegible]
ہے کہ [illegible] باس شاندار [illegible]
احسن بھائی سے [illegible] ——— ویسے [illegible]
بہانہ [illegible] ہے۔
جی ہاں یہ [illegible] ہے۔ میں نے آپ کی طرح [illegible] سے نہیں
کھیلا۔
اور کیا اور بھائی نے پستول اٹھا لی ہے [illegible] نے پوچھا
جی آپ کی دعا سے یہ [illegible] موجود ہیں اسے یہ
اینڈ ناپ۔ اس نے [illegible] پستول اٹھائی تو اس نے [illegible]
اتار دیئے [illegible] نہیں پڑا [illegible] زندگی بڑی پیاری
ہوتی ہے۔ [illegible] کیوں [illegible] کر لیا۔ [illegible]
کھل ہو گئی۔ [illegible] سب [illegible] ہنس پڑے۔
لو باس ان آ گیا ——— زبردست [illegible]
شاندار [illegible] ——— راحت کی [illegible] کوئی نئی شرارت
کھلائی ———
فواد سیکرٹری ——— کرنسی [illegible]
پاس۔ [illegible] فرقان کی کرسی کے پیچھے پر بیٹھ گیا۔ [illegible] پوری پارٹی
[illegible] تھی ——— اور اندر کسی [illegible]
سوات سے واپس کراچی پہنچ کر ان لوگوں میں یوں بیٹھا ہے جیسے
مدتوں سے [illegible] ان لوگوں کے پاس۔ اب راحت بیگم [illegible]
بتائیں چلئے [illegible] کونسی شرارت آپ کے [illegible]
بتاتی ہوں مگر ایک شرط پر کہ فرقان بھائی مخالفت نہیں
کریں گے۔
میری اجازت کے بغیر سانس نہیں [illegible] مخالفت کیسے کرے
گا۔ تم بتاؤ تو سہی۔ فواز نے راحت کے [illegible] کی
[illegible] تو وہ [illegible] بہت [illegible] ہیں۔
بتاتی ہوں میں [illegible] آج ہم کیوں نہ [illegible] کی
بہادری کا امتحان کریں۔ [illegible] احسن بھائی پستول [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] احسن

بھابی اور انھیں پریشان کرنے کے بعد بیج منہ کھائی میں دے سے بیٹھے
جائیں۔ اور اگر بھابی بیچ بیچ میں ہی گھبرا جائیں یا مارے خوف کے انھیں کچھ
ہونے لگے تو احمد بھابی سیٹی بجا دیں تو ہم سب پہنچ کر ان کا تعارف
سنگے ہاتھوں بھابی سے کروا دیں۔ اور پھر بھابی سے جا کر میں ڈانٹ
کھانے کا وعدہ دے کر صلح صفائی کرا دیں گے۔"

"ونڈر — ونڈر فل آئیڈیا —" نواز احمد نے فاتحہ
اٹھا کر داد دی۔ ایما اور سعادت نے بھی تائید کر ڈالی۔ وہاں سے گزرتے
ہوئے سلیم نے بغیر سنے بغیر سمجھے ہی انگوٹھا لگا دیا:

"بہت اچھا خیال ہے۔ مجھے منظور ہے۔"

"اور نیل تم —؟" راحت نے پوچھ ہی لیا۔

"اللہ بھابی ڈر جائیں گی۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"چھوٹی سی بے بی ہیں نہ جو ڈر جائیں گی — میں
ہنستے ہنستے پستول سے تھوڑی چلاؤں گا نیل رانی — بس تھوڑی سی
انجوائے منٹ کی خاطر انھیں ڈرائیں گے۔ اور دیکھو تائی اماں یا کسی
اور کو پتہ نہیں چلنا چاہیے ورنہ — دھائیں — دھائیں —
دھائیں —"

"او یار میرے یہ پستول تیرے کہاں سے آیا —؟ جو اتنا
خوش ہو رہا ہے — کسی نے پکڑوا کرا نہیں۔"

"نہیں ڈیئر کسی کو گمان بھی نہیں ہوا کہ میرے پاس پستول
ہے — دراصل میں یہ — یہ — اپنے ایک
دوست کی فرمائش پر لایا ہوں — مگر سنئے جناب آپ ہمارے
پروگرام میں ٹانگ نہیں اڑائیں گے — آخر نواز احمد ہیں
ہم — اپنا تعارف نئے انداز سے ہی کروائیں گے۔"

"کروا دو پیارے — لیکن سوچ سمجھ لو معاملہ مسز
احسن کا ہے۔ ہم لوگ ویسے ہی صبح بھابی جان کو خاصا تنگ کر چکے ہیں
اب وہ زیادہ برداشت نہیں کریں گے۔"

"کیسے نہیں کریں گے۔ انھیں برداشت کرنا پڑے گا کہ یہ دن
روز نہیں آتے — ہاں تو لڑکیو ابھی جاؤں اندر۔"

"اس حلیے کا ذکر تو ہم نے کہیں نہیں دیکھا۔ جناب ذرا
حلیہ بگاڑ لیجیے۔"

"یہ لیجیے — یہ — یہ لیجیے — بگڑ گیا حلیہ —"
نواز نے دو تین ہاتھ مار کر جمے جمائے بال بگاڑ دیئے۔ پینٹ کے اندر
سے قمیص باہر نکال لی۔ آستینوں کے بٹن کھول دیئے۔ "ٹھیک ہے

اب ٹھیک لگا؟" [illegible]

"ہاں کچھ کچھ —" سعادت نے فرمایا۔

"لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا۔ ہاں کہو تو ڈھاٹا باندھ
لوں پنجابی فلموں والا۔"

"نہیں احمد بھائی نہیں پھر تو بھابی بیچ بیچ ڈر جائیں گی۔" نیلا
بیچ کے بیچ بول پڑی۔

"نہیں باندھ رہا ہوں ڈھاٹا — کیوں جان دے رہی ہو
ویسے لگتا کیا زمانہ آ لگا ہے۔ وہ کل کی آئی ہوئی بھابی احمد سے پیاری
ہو گئیں — ٹھیک ہے جی ٹھیک ہے —"
نیلا شرمندہ ہو گئی۔

"چلو نیل اسی بات پر جاؤ اور بھابی کے کمرے کی کھڑکی کھول
کر آؤ — اگر اندر سے بند ہو تو چپ چاپ سے کھول آنا
اور تم لوگ سب سٹور کوئی دخل در معقولات نہیں کرے گا جب تک
میں سیٹی نہ بجاؤں۔ مسز فرقان آپ سن لیجیے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ اپنی
بھابی کی ذرا سی آواز سن کر دوڑ سے پہلے آئیں اور سارا ایکٹوٹی کا سارا
مزہ جاتا رہے۔ ہاں راحت سعادت تم لوگ کسی بہانے سے بڑوں
بڑوں کو روکے رکھنا اندر نہیں جانے دینا — اچھا —
بائی — میں جا رہا ہوں مشن پہ —" نواز باہر نکل گیا۔

نیند نواز احمد کی طرح ظالم بن گئی تھی کہ ایک مرتبہ جو آنکھوں سے
دور ہوئی تو پھر پلٹ کر آنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ تارا تکیے میں منہ
چھپائے بچھڑے لمحات کو آنکھوں میں پکار رہی تھی۔ لیکن ماضی کے ہر
منظر کے ساتھ حال کا ایک سین چپک گیا تھا۔ وہ کالج کے بڑے سے
سائنس لیبارٹریز اور لمبی لمبی مسافتوں کے ساتھی نواز احمد کو یاد کرنا
چاہتی تھی لیکن اس کے اور نواز احمد کے درمیان ڈاکٹر احسن آ جاتا۔
وہ نواز احمد کی ٹھنڈی میٹھی باتوں کی بوچھار میں بھیگ کر اپنے سلگتے
ذہن کو سکون بخشنا چاہتی تو فرقان کے ہاتھ کا دباؤ کندھے شل کر دیتا۔
وہ چاہتوں میں ڈوبے ہوئے اس لمحے کا حظ اٹھانا چاہتی جب لمحے
نواز احمد نے اسے اپنی ملکیت قرار دیا تھا تو نیلا کی باہیں اسے جکڑ
لیتیں اس کا والہانہ پیار بیچ کے بیچ آ کر اس کا حلق خشک کر دیتا۔
تارا نے کروٹ بدل کر اپنی پیشانی پہ اپنی انگلیاں رکھیں۔
نواز احمد کیا تم یقین کرو گے کہ میں اب بھی تمہاری ملکیت ہوں۔
بس تم ایک دفعہ کہیں مل جاؤ تا کہ میں تمہیں سب کچھ بتا دوں

نواز احمد تم میری اس بات پر یقیناً خوش ہو گے ——— دیکھو میں اب بھی دل ہی دل میں آنکھوں ہی آنکھوں میں تمہیں ہی چاہنے لگی ہوں، پھر اب میں بڑی بہادر بن گئی ہوں۔

نیلا آہستہ سے مسکرا کر رہ گئی تو تارا نے کروٹ بدل کر آنکھیں موند لیں ——— وہ ان لوگوں سے بچنا چاہتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ یہ لوگ پھر بھی اس سے محبت کرنے لگیں۔ اسے چاہنے لگیں۔ زیادہ رفاقتیں اور قربتیں ہی تو محبت کا بیج گہرا بوتی ہیں۔ یہ سب لوگ اسے محبت دے کر اس سے نہ جانے کیا کیا توقع باندھ بیٹھیں۔ اور اس کے پاس ان لوگوں کو دینے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ جو کچھ تھا وہ پہلے ہی نواز احمد کو دے چکی تھی۔ سارے سودے تو وہ پہلے ہی سے کر آئی تھی۔ اب تو اس کا دامن خالی تھا اور یہ لوگ اسے بڑا ساہوکار سمجھ رہے تھے۔ نادانی تھی نا سراسر ان کی۔ نیلا نہ جانے کیا کر رہی تھی۔ پرنٹ ٹھیک کر رہی تھی یا کروٹ صاف کر رہی تھی۔ تارا چاہتی تھی کہ وہ جلد از جلد چلی جائے تاکہ وہ اپنا تکیہ نکال کر رکھ سکے۔ وہ اس کے بالوں میں الجھ رہا تھا اور اس کا آویزہ بھی اس کے گال میں چبھے جا رہا تھا۔ دروازہ بند ہونے کی آواز پر اس نے پلکوں کی درز سے جھانکا۔ نیلا جا چکی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ تکیے کے سنہری پھندنے گھنگھریالے بالوں میں الجھ گئے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ کھینچ کر بالوں سے نکال رہی تھی۔

"ہینڈز اپ ——!"

وہ چونک گئی۔ نہ جانے کون اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا تھا۔

"خاتون! اپنے تمام زیورات اتار کر مجھے خاموشی سے ……"

یہ آواز ——— یہ آواز ——— اس آواز کو تو میں خواب میں بھی پہچان سکتی ہوں ——— کاش ——— کاش یہ میرا وہم نہ ہو ——— تارا نے یک دم پلٹ کر پیچھے کی طرف دیکھا۔

"ہائے نواز ——— تم؟"

نواز کے ہاتھ سے پستول چھوٹ کر نیچے گر پڑا۔ وہ تارا کو دیکھ کر مبہوت ہو گیا۔

"نواز ——— نواز ——— خدارا تم کہاں چلے گئے تھے مجھے چھوڑ کر۔ تمہارے پیچھے میں لٹ گئی۔ پھر میرے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ سب لوگوں نے مل کر دھوکا دیا ہے۔" تارا کی آنکھوں کے پیمانے چھلک گئے۔

"تم ——— تم تارا ہو ——— نہیں تم تارا نہیں ہو سکتیں ——— تم میری تارا نہیں ہو ——— تم میرے قریب مت آؤ ——— میری تارا تو میرے بغیر دلہن نہ بنتی، وہ میری ملکیت تھی ——— وہ میرا انتظار کر سکتی تھی تمہاری طرح۔ تم ——— تم کون ہو ——— ؟ میں تمہیں نہیں جانتا ——— تمہاری صورت تارا سے ملتی ہے لیکن تمہارا دل میری تارا کی طرح نہیں۔ اس کا دل تو میرے لیے دھڑکتا تھا۔" نواز کی آواز کانپ رہی تھی۔

"تم میرے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھو یہ اب بھی تمہارے لیے ہی دھڑک رہا ہے نواز ——— تم اپنی تارا کو بھی نہیں پہچانتے۔ تمہیں کیا ہو گیا نواز ——— ؟ میں تو تمہاری تارا ہوں ——— تمہاری اپنی تارا ——— تمہاری ملکیت ——— اپنی ملکیت کو نہیں پہچان سکے ہو نواز ——— ؟" تارا نے نواز کا ہاتھ دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ اس کی آنکھوں سے بے تحاشا آنسو بہہ رہے تھے۔ "نواز تم یقین کرو میری شادی دھوکے سے ہوئی ہے۔ مجھے میری امی نے دھوکا دیا ہے۔ میری اپنی امی نے۔ میری سگی امی نے نواز میری سگی امی نے" اس نے اپنا سر نواز کے بازو پر ٹکا دیا۔ لیکن وہ بازو ——— وہ بازو تو پتھر کا بن گیا تھا ——— "نواز جی میں تمہاری ہوں ——— صرف تمہاری ——— پھر میں کسی سے نہیں ڈرتی بالکل نہیں ڈرتی ——— آخر تم پہلے کہاں گئے تھے؟ میں نے محلے کے بچوں کو بار بار تمہاری گلی میں بھیجا لیکن تمہارا سراغ ہی نہیں ملا ——— بتاؤ میں کیا کرتی ——— ؟ کیا کرتی نواز ؟ ——— مجھے میری امی نے مجبور کر دیا تھا۔"

"اور تم مجبور ہو گئیں ——— ہاں نا ——— ! ہر لڑکی یہی کہتی ہے ——— تم لڑکیاں بڑی ظالم، بڑی خود غرض ہوتی ہو۔ دل کسی کا توڑتی ہو اور گھر کسی کا آباد کرتی ہو ——— میں تمہیں سب سے مختلف سمجھتا تھا ——— میں سمجھتا تھا کہ تم میرے جذبوں کا احترام کرتی ہو مجھے ہی قبول کرو گی، تم جانتی ہو تم میرا انتظار کر سکتی ہو لیکن تم بھی وہی نکلیں۔ افسانوں، ناولوں اور فلموں کی ہیروئنوں کی طرح بے وفا، ظالم ——— خود غرض ——— تارا جب تمہیں یہ سب کچھ کرنا تھا تو تم نے مجھ سے اتنا قریب کیوں کیا ——— مجھے پاگل کیوں بنایا ——— پہلے ہی دن تم مجھے جھڑک دیتیں ——— میری راہ سے ہٹ جاتیں ——— مجھ سے کٹ جاتیں ——— تاکہ میں تم سے نفرت کرنے لگتا ——— لیکن تم نے مجھے محبت دے کر ——— یہ ——— یہ ——— یہ سب کچھ کیا کر دیا تارا ——— کیا کر لیا

شاید ابھی تم تارا کی طرح محبت کی متلاشی تھا ـــــ شاید ابھی تم پیار کو
پہچانا تھا ـــــ تم نے میرے ہونٹوں سے ادا کی محبت کا سامنا
نہیں کیا ہے ـــــ تم مجھے تو پانا چاہتی تھیں نا ـــــ تم چاہتی
تھیں کہ میں ـــــ میں بھی تمہیں ملوں ـــــ میں بھی تمہیں۔"

"نہیں ـــــ نہیں ـــــ نہیں نواز ـــــ
نہیں تم مجھے کچھ نہیں ابھی تک ہے ۔ یہ کہ میرے ساتھ دھوکہ ہوا ـــــ
نواز ـــــ مجھے اپنے بابا کی قسم میرے ساتھ دھوکہ ہوا ہے نواز ـــــ
میں تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں ـــــ چلو تم مجھے اپنے ساتھ
لے چلو ـــــ یہ کتاب میں کسی سے نہیں ڈرتی ـــــ سچ میں
احسن سے شادی کرنا نہیں چاہتی تھی۔"

"نہیں چاہتی تھیں تو انکار کر دیتیں ۔" نواز کا لہجہ تیکھا
سا تھا ۔

"میں نے تو انکار کر دیا تھا ـــــ لیکن امی نے مجھے بتایا تھا
کہ میں احسن کی نہیں تمہاری دلہن بن رہی ہوں ـــــ تم بات
سمجھ رہے ہو ـــــ لیکن تمہاری جگہ ڈاکٹر احسن آ گیا ـــــ
نواز ـــــ"

"اور نواز مر نہیں گیا تھا جو تم ڈاکٹر احسن کا ہاتھ پکڑ کر اس
کے گھر میں چلی آئیں ـــــ تارا ـــــ میرے پاس ابھی
اتنے قیمتی زیورات نہ تھے ۔ میں تمہیں ایسے چمکیلے ریشم کے کپڑے
پہنا سکتا تھا ـــــ یہ ـــــ یہ ـــــ تمہاری مجبوری
ہے ۔" نواز نے گھوم کر چاروں طرف دیکھا ـــــ "یہاں تم نے
اپنی خوشیوں کی گٹھری باندھی ـــــ اور تمہیں میرا خیال بھی نہ
آیا ہو گا کبھی ـــــ اب خواہ مخواہ مت رو ـــــ تم غلط تو کبھی
نہیں تھیں ـــــ" وہ ایک دم پلٹ کر تارا کی طرف بڑھ آیا ۔
"یہ ـــــ تم نے مہندی بھی رچائی ہے ـــــ مگر میرے لیے نہیں
ہے دیکھو ـــــ دیکھو تارا ـــــ" نواز نے تارا کی دونوں
ہتھیلیاں تھام کر اس کے سامنے پھیلا دیں ۔

"یہ مہندی نہیں میرے خوابوں کا خون ہے ـــــ یہ
میرے ان جذبوں کا خون ہے جو میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھے
تھے ـــــ اور تم نے انہیں قتل کر دیا ـــــ تارا میں
تمہارے لیے آفتاب بھی تھا آفتاب تو تھا ـــــ لیکن اب
اب ـــــ تمہیں بتانے سے کیا فائدہ ـــــ اب تو سب کچھ
لٹ گیا ـــــ سب ختم ہو گیا ـــــ اف! کتنا پاگل تھا میں

مگر میں سلطان بن کر سپاہی تمہاری گلی میں گیا کہ اور تمہاری
نظر آ جائے شاید میں تمہیں دیکھ سکوں ـــــ لیکن ظالم تم نے مجھے
تمہیں دیکھا ہی کب ـــــ؟ جب تم میری نہیں تھیں ۔"

"نواز ـــــ نواز ـــــ" تارا سسکیاں لے کر نواز
کے کاندھے پر گر گئی اور وہ ایک پتھر کی چٹان کی طرح اس کے سامنے
کھڑا تھا ۔ وہ بلک رہی تھی سسک رہی تھی ـــــ اسے سوچنا
ہوش بھی نہیں تھا ۔ اس کا گھونگھٹ بکھر اور پڑا اس کے قدموں میں پڑا
تھا ـــــ اس کے بال کھل گئے تھے ـــــ لیکن بالوں میں
الجھا ہوا ایک طوق لٹک رہا تھا ـــــ اس کی مانگ کی افشاں
بکھر گئی تھی ـــــ چہرے کا میک اپ آنسوؤں نے دھو ڈالا تھا
وہ سب پہلے سے بے نیاز اس کے سامنے کھڑی تھی ـــــ "نواز
میں اب بھی تمہاری ہوں ـــــ" اس نے تڑپ کر اپنا سر
نواز کے سینے سے لگا دیا ۔ اس کا سر یونہی لگا رہا اور وہ نواز نے
وہ مضبوط بازوؤں نے اسے اپنے اندر سمیٹا نہیں ـــــ "نواز ـــــ
تم یقین کرو ـــــ میں اب بھی ویسی ہی ہوں جیسی شادی سے
پہلے تھی ۔ میں نے تمہاری خاطر اپنے آپ کو بچایا ہے ۔ میں صرف
تمہارے لیے ہوں نواز ـــــ صرف تمہارے لیے ـــــ تم
یقین کیوں نہیں کرتے ـــــ میں بہت ـــــ بہت پریشان ہوں
میں بہت تھک گئی ہوں ۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے ۔" تارا اس
وقت سب کچھ بھول گئی تھی ۔ اسے یہ بھی خیال نہ رہا کہ دروازہ کھلا ہے
اور کھلے دروازے میں سے کوئی اندر آ گیا یا کسی نے اسے اس حالت
میں دیکھ لیا تو ـــــ؟ اس وقت تو اس کے سامنے اس کا نواز
تھا اور اسے نواز کے علاوہ کچھ نظر نہیں آ رہا تھا ـــــ "نواز تمہیں میری
باتوں کا یقین کیوں نہیں آ رہا ۔ تم میرا اعتبار کرو نا ـــــ میرا اعتبار
کرو ـــــ" تارا کے آنسوؤں سے نواز کی قمیص بھیگ گئی تھی لیکن
وہ یونہی کھڑا رہا انجان بنا ہوا ۔

"نواز ـــــ بولو ـــــ تمہیں کیا ہو گیا ـــــ کہ
نہیں ـــــ بولو نواز بتاؤ تم کس لیے آئے تھے ـــــ کیا مجھ
سے ملنے آئے تھے ـــــ تو پھر کچھ بولو نا ـــــ دیکھو میں تمہاری
تارا ہوں ـــــ صرف تمہاری ـــــ" تارا کا دل چاہ رہا تھا
کہ نواز اسے اپنی بانہوں میں لے کر تسلی دے ـــــ سمجھائے ـــــ
اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھے ـــــ پیار کرے ـــــ
لیکن وہ تو پتھر کا ہو گیا تھا ـــــ اتنا بے درد اتنا ظالم ہو گیا تھا ۔

ایک ——— دو ——— تین ——— شعلہ سا لپک کر بجھ گیا
پھر بار بار اسی وہ موم کی طرح پگھلتی رہی ——— اور پھر کمرے سے
کوئی چیز اس کے اندر ٹوٹ گئی تھی ——— وہ یکسر تازہ دم
ہو گئی ——— اس کی آواز میں کرب کے ساتھ تازگی بھی تھا
وہ متحرک عمل کر رہی تھی۔

"ٹھیک ہے نواز ——— مت سمجھنا کہ وہ ہاری ہوں
——— اور پھر جیسے اسے کچھ یاد آگیا ——— اس نے اپنی
ہتھیلیوں کی پشت سے آنسو پونچھے اور لپک کر کمرے میں
پڑا دوپٹہ اٹھایا تو اس کے نیچے سے پستول پڑا تھا۔ تمارا نے جھک کر
تھرتھراتے ہاتھوں سے پستول بھی اٹھا لیا۔ اور پھر دوپٹہ اچھی طرح سر سے اوڑھ کر
اس نے پستول نواز کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"شکریہ نواز احمد صاحب آپ نے میری خواہش پوری
کر دی اور میرے لیے پستول لے آئے۔ لیکن نواز اب اور کرم کیجیے
اس پستول سے میری زندگی کا خاتمہ بھی کر دیجئے۔ اب میرے لیے
زندگی میں کوئی کشش نہیں رہی۔ لیجئے نواز احمد صاحب۔" تمارا
کا لہجہ بالکل ہی بدل گیا تھا لیکن نواز ٹک ٹک اسے دیکھ رہا تھا جو
جو لینے آیا تھا خود ہی لٹ گیا تھا۔

"نواز صاحب! آپ میرا یہ کام بھی نہیں کر سکتے۔ ہاں ٹھیک
ہی تو ہے آپ کیوں یہ مصیبت مول لیں گے۔ لوگ آپ
کو قاتل کہیں گے آپ بڑے باپ کے بیٹے ہیں خواہ مخواہ سوسائٹی
میں بدنام ہوں گے۔ یاد آیا میں نے آپ سے کہا تھا کہ میں خود ہی
اپنے باپ کے پاس چلی جاؤں گی تاکہ آپ آرام سے بقیہ زندگی گزار
سکیں ———"

تمارا صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس نے ایک بار غور سے پستول کو
دیکھا اور پھر پستول اپنی کنپٹی پر رکھ دیا۔

"خدا حافظ ——— نواز احمد ———"

نواز نے بے دم نظروں سے اسے دیکھا اور کچھ [illegible] سے بولا۔
"یہ پستول خالی ہے بیگم صاحبہ ——— میں اس میں گولیاں ڈال
ڈال کر آپ تب زحمت کیجئے گا۔" اس نے پستول جھپٹ لیا اور
پل کے پل دروازے سے باہر ہو گیا۔ تمارا ہارے ہوئے جواری کی طرح
صوفے پر لڑھک گئی۔ نواز کا سفاک لہجہ اس کے کانوں میں سیٹی کی
طرح گونج رہا تھا ——— ظالم ——— بے حس ——— تمہیں
میرے مرنے کا اندازہ نہیں ہوا ——— کیسا جوا کھیل گئے ہو تم ———

تمہارا اس طرح انتظار کر رہی تھی ——— اس نے سوچا تھا کہ تم
معافی مانگ لو گے ——— تم بھی پتھر نکلے ——— میں بھی
رہی کہ تم بہت سخت ہو ——— تم کوئی فیصلہ نہیں کر پائے
لیکن تم تو بزدل نکلے۔" تمارا کمرے میں مسلسل ٹہل رہی تھی۔ اور
نواز کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا تمارا کے کمرے کے باہر کھڑا
تھا لیکن اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ دروازہ کھول کر اندر جا سکے
اسے پتہ تھا اگر اس نے اندر جانے کی کوشش کی تو وہ اس کی چٹیا پکڑ کر
[illegible]

اندر تمارا ——— بہت رو رہی تھیں۔ احمد بھائی
اب باہر آ ہی نہیں رہے ——— وہ اندر اکیلی ہیں
دروازے سے تک آیا لیکن دروازہ کھٹکھٹانے کی ہمت نہیں ہوئی۔

اسے دروازے کے آگے کھڑا دیکھ کر نجمہ باجی نے کہا
"کیوں جی کیا بات ہے کیوں یہاں پہرہ دے رہے ہو ———؟" اور وہ وہاں
سے ہٹ کر فرقان کے پاس چلی آئی۔

"فرقان بھائی ذرا آپ کمرے میں جا کر دیکھئے احمد بھائی ابھی
تک باہر نہیں نکلے پتہ نہیں کیا کر رہے ہیں۔"

"ہاں کافی دیر ہو گئی ہے انہیں باہر آ جانا چاہئے تھا۔"

"اچھا بھائی جان آپ ذرا دیکھ لیجئے ——— میں اندر گئی تو
مجھے تو وہ ڈانٹیں گے آپ چلے جائیں نا۔ سچ اگر بھابی ناراض ہو گئیں تو کیا
ہوگا۔" اور پھر فرقان اس کی بے چینی پر ہنس دیا۔

"بہت پیاری ہو گئی ہیں تمہیں بھابی ——— ابھی آئے نہیں
آنے ہوئے تو ابھی گھنٹے بھی نہیں ہوئے۔"

"فرقان بھائی پلیز ——— بس مجھے ڈر لگتا ہے اگر
امی کو اس شرارت کا پتہ چل گیا تو سب کا کورٹ مارشل کر دیں
گی ———"

"اچھا اچھا اب جان مت کھاؤ ——— میں جاتا ہوں۔"
فرقان نے ابھی ایک قدم دروازے کی طرف بڑھایا ہی تھا کہ
تمارا کے کمرے سے چیخ کی آواز آئی۔ کھڑکی کا پردہ باہر لٹکا اور کھڑکی
کھلی ہوئی تھی۔ وہ اندر چلا گیا۔ تمارا کی چیخ سن کر سب لوگ پریشان
ہو گئیں۔

اس نے تمارا کے کمرے پر ہاتھ رکھ کر زور سے پکارا۔
"بھابی ——— بھابی —3"
تمارا نے چیخ ماری اور دروازے کی طرف دیکھا

اور فرقان نے جھک کر اس کے بکھرے بکھرے بال سمیٹتے ہوئے نواز کے متعلق پوچھنا چاہا۔

"بھابی جانی اس نے ڈرایا آپ کو ——— وہ گیا کہاں ؟"

"ک ——— کو ——— ن ——— کون ——— ؟" تارا ہکلا گئی ———

"وہ احمد بھائی ——— وہ نواز احمد تھا۔ پستول تھا نا اس کے پاس ؟ وہ آپ کو ڈرانے آیا تھا لیکن خود بھاگ گیا — یہاں کھڑکی سے گیا ہے نا ؟"

سب راستے بند ہو چکے تھے سوائے ایک راہ کے جو اقرار کی راہ تھی، اعتراف کا راستہ تھا ——— تارا اُٹھ کر بیٹھ گئی — کتنی اُجڑی اُجڑی اور ویران سی لگ رہی تھی وہ۔ آنکھوں میں چھل چھل کرتے آنسو۔ گنجلے ہوئے کپڑے، بکھرے ہوئے بال، گالوں پر بنی ہوئیں آنسوؤں کی لمبی لمبی دھاریں ——— اب اسے اقرار کرنا تھا اپنے گناہ کا اقرار ——— وہ جس طرف چل نکلی تھی وہ راستہ آگ کے جنگل کی طرف جاتا تھا۔ اور اب پلٹنا تو ناممکن تھا اور اسے اسی جنگل میں جل مرنا تھا ——— اس نے اقرار میں سر تو ہلا دیا لیکن آنسو آنکھوں کی منڈیر پھلانگ کر گالوں پر بہہ نکلے۔

"اُف ! اُف بھابی ——— آپ نے تو رلا دی جناب بھا دیتے ——— بس اتنا سا دل ہے آپ کا۔ کوئی یوں روتا ہے بھلا ؟"

اتنا سا دل ! اوہ فرقان علی تم کیا جانو میرے دل کو اتنا سا ہوتا تو اتنے درد کیسے سمو لیتا اپنے اندر ——— ہاں تم نے رونے کی بھی خوب کہی ستم بتاؤ کوئی یوں بھی لٹتا ہے بھلا ——— ؟ تارا نے صرف بھیگی بھیگی پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا اور منہ سے تو وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی،

"سویٹ بھابی جان کیا وہ کچھ لے گیا آپ کا ؟" فرقان وہیں اس کے پاس بیٹھ گیا۔

تارا کا دل چاہا وہ کہہ دے کہ سچ پوچھو تو وہ تو سب کچھ ہی لے گیا۔ اب تو کچھ بھی نہیں بچا ——— فرقان جی ! ——— تارا نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

"بھابی ——— بھابی آپ اتنی پریشان کیوں ہیں ؟ میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا ——— لیکن پلیز یہ آنسو مجھ سے نہیں دیکھے جاتے ——— انہیں پونچھ لیجئے ورنہ ——— ورنہ میں خود ہی پونچھ دیتا ہوں۔" اس نے اپنی پینٹ کی پچھلی جیب میں سے رومال نکالا اور بڑی نرمی سے بڑے پیار سے تارا کے آنسو پونچھے تو تارا نے اس کا رومال ہٹا کر اپنی ہتھیلیوں سے آنسو پونچھنا چاہے مگر اس نے شرارت سے تارا کے دونوں ہاتھ پکڑ کر ایک ہاتھ میں تھام لیے۔

"اوہ بھابی ——— آپ کے ہاتھ تو ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔ اتنی بری طرح ڈر گئیں آپ ——— ؟ بڑی عشکی ہیں یہ شرارت تو ———" وہ تارا کے ٹھنڈے سے ہاتھ اپنے گرم ہاتھوں سے مسلنے لگا تو وہ گھبرا گئی۔ اس نے ہاتھ کھینچے تو وہ ہنس پڑا۔

"آپ کے ہاتھ گرم کر رہا ہوں ——— آپ کا چھوٹا اور اکلوتا دیور ہوں نا ——— اور یہ مجھے اس طرح لگا جا رہا ہے جس طرح تم نے لگایا ہے سالے بال خراب کر دیے ——— اور اب اسے لگ گئی شاید ——— ویسے بھائی جان تو نہیں آئے نا صبح سے ادھر۔" وہ بڑی شرارت سے مسکرایا ——— تارا کٹ کر رہ گئی۔ بڑی ہمت کر کے اس نے ہاتھ چھڑائے اور سر جھکا لیا۔

"یہ دیکھا اپنا دوپٹہ سنبھالیے ڈرپن بھابی۔" اس نے جھک کر سرہانے سے نیچے لٹکتا ہوا دوپٹہ اٹھایا۔ "ویسے بھابی آپ تو بس اسی طرح بیچ بالکل اسکول گرل لگتی ہیں۔ گھبرائی گھبرائی اناڑی سی۔"

لیکن تم بڑے چرب زبان ہو ——— آخر تم چاہتے کیا ہو — میں تو ہوں ہی اناڑی ——— لیکن خدا را تم مجھ پہ رحم کرو ——— تارا نے چاہا کہ وہ کہہ دے لیکن اس نے موقع ہی کہاں دیا۔

"بھابی ——— وہ نواز بڑا شریر ہے ——— وہ شادی میں شریک نہیں ہو سکا دراصل وہ سوات چلا گیا تھا اپنے دوستوں کے ساتھ وہاں سے اس کے دوست نے اس سے پستول منگوائی تھی وہی پستول لیے یہاں چلا آیا ——— اور یہاں پہ آ کر راحت سعادت اور نیل ...... اے نیل تم ابھی تک باہر ہی ہو — آ جاؤ آ جاؤ ——— نواز تو بھاگ گیا ——— اور راحت سعادت کو بھی بلا لو۔"

کیا سب کو بلا کر سب کے سامنے ذلیل کرو گے ——— ا... بتا کیوں نہیں دیتے کہ نواز کو تم کیونکر جانتے ہو ——— تارا کی نظریں فرقان کے ہونٹوں پر تھیں۔ وہ دریا کی بپھری ہوئی لہر کا اضطراب اپنے اندر سمیٹے بیٹھی تھی۔

(باقی آئندہ)

ہر گھر میں ماں اور حقیقت تعلق کا آنکھوں میں
تصادم کا سلسلہ جاری آپا کا تھا



عفری بخاری

کشور آپا اب چپ ہو گئی تھیں۔ اور اُن کے کمزور سے کرخت چہرے پر مسکراہٹ کی شبنم بکھر گئی تھی یہ گویا ان کے فیصلے پر آخری مہر تھی اور یہ تو سب جانتے تھے کہ ان کے فیصلے اٹل ہوتے تھے ان میں کسی رد و بدل کی گنجائش نہ ہوتی تھی۔ ایسے میں خالہ اماں اور ماسی بیگم پیچ و تاب کھانے کے سوا کر بھی کیا سکتی تھیں۔ خالہ اماں نے تو تجربہ کر کے ایک پہلو بھی بدلا مگر ماسی بیگم کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اس گھڑی کو کوس رہی تھی جس لمحے وہ کشور آپا کے پاس آن گئی تھی۔ وہ تو محض دعا نہانے کی خاطر گئی تھی اور پھر انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ کشور آپا وہاں سے ناک بھوں چڑھاتی آئیں گی۔ اور شاید اس قصور پر اس کی تھوڑی بہت درگت بھی بنا دیں۔ مگر یہ تو اس کے وہم میں بھی نہیں تھا کہ پانسہ یوں پلٹ جائے گا۔ اور تین چار سو کی رقم کی بجائے صرف پچاس روپوں کی آس باقی رہ جائے گی۔ ماسی بیگم کی تو تین سال کی محنت پر گویا پانی پھر گیا تھا۔

مگر اس دن کشور آپا کی بدمزاجی جانے کدھر گئی تھی۔ وہ خوش اور مسرور نظر آ رہی تھیں۔ اور جب رات کو وہ سونے کے لئے کمرے میں گئیں تو ان کا دل بچوں کی طرح ہنسنے کو چاہ رہا تھا مگر جانے کیا ہوا کہ ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امنڈ پڑا۔ اور ان آنسوؤں کی آنچ سے ان کا پتھر دل موم کی طرح پگھل کر رہ گیا۔

لفظ لڑکی سے کشور آپا کو چڑ سی ہو چلی تھی جسے دیکھو کسی نہ کسی لڑکی کے گن گنوانے پر اصرار کرتے بیٹھا نظر آتا۔ پھوپھیوں اور خالاؤں کے پاس ہر قسم کی لڑکیوں کے ڈھیروں نمونے جمع ہو گئے تھے جنہیں کشور آپا کی خدمت میں پیش کرتی رہتی تھیں۔ پھر یہ ماسی بیگم تھی جو کسی بلا کی طرح چمٹ کر رہ گئی تھی ہر دوسرے تیسرے دن وہ آ دھمکتی "بی بی جی بڑا اچھا گھرانہ ہے۔ لڑکی بھی لاکھوں میں ایک ہے چل کر دیکھ لیجئے" اور وہ چڑ جاتی۔

پہلے پہل تو اس ذمہ داری کو قبول کر کے وہ بہت پچھتائی تھی اور اسے ان رشتے والوں پر حیرت بھی ہوتی تھی جو کیسی بے حسی اور ڈھٹائی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ مگر پھر وہ اس سلسلے کی عادی ہو گئی تھی۔ مگر اس کے ساتھ وہ بدمزاج اور تند خو بھی ہو گئی تھی۔ اس کا چہرہ بھی پتھر کی طرح سخت اور کھردرا ہوتا جا رہا تھا۔ اور دل کے دروازے تو اس نے سب سے پہلے بند کر لئے تھے۔

"وہ بھائی کو کیا کر رہے گی ——— پتنگ کی طرح پیچھے ہیں دلہا کماتا ہے ——— تم کو کیا دیتا ہے وہ بھی نہیں پوچھتا ———"

"اس کا بیاہ ہو گیا تو اپنا اپنا بستر بوریا گول کرنا پڑے گا ——— بھائی"

کی تنخواہ پہ سے بھی آنہ فرشتانا چہرہ لگا۔۔۔۔۔ جس کا جو دل چاہتا ہو دیتا
اور دولت کو جب تنہا ہوتی تو گھر سوچا کرتی یہ سب لوگ
اس وقت کہاں تھے جب کلثوم بن بیاہی لڑکیوں سے سر پھوڑتے پھوڑتے
اس کے بال قبل از وقت سفید ہو گئے تھے اور اس کے رخساروں
کے گلاب مرجھا گئے تھے۔ اس وقت تو کسی کو کچھ خیال نہ آیا خود اماں
بھلی بنی اس کی تنخواہ ٹھونستی رہی تھیں۔ اور وہ بھی تو یہی سمجھ رہی تھی کہ
اُسے جو کچھ حاصل ہونا تھا ہو چکا ہے۔

مگر پھر ایک دن اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ کچن میں جاتے جاتے
اس کے قدم ٹھٹک گئے۔

کچن کے اندر اشرف دبے دبے لہجے میں اماں سے جھگڑ
رہا تھا۔

"نہیں اماں یہ نہیں ہو سکتا۔ پہلے آپا کا بیاہ ہو گا پھر میرا"

"اس کا تو اب ہو لئے سے رہا۔ تو مجھے اپنی خوشی دیکھ لینے
دے" اماں کی آواز برچھی کی طرح اس کے سینے میں اتر گئی تھی۔

"کیوں نہیں ہو سکتا۔ میں کہتا ہوں ہو گا ضرور ہو گا۔ میں سب
کچھ کروں گا سب کچھ"

وہ تیزی سے اپنے کمرے میں پلٹ گئی تھی۔ اس کے اندر جیسے
توڑ پھوڑ ہونے لگی تھی۔ اور اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اور جب
عورت کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے ہیں۔
وہ بھی رو پڑی تھی۔ ایک گہرا زخم اس نے کھایا تھا مگر ایک ہاتھ نے اس
پر پھاہا بھی رکھ دیا تھا۔ اشرف جوان ہو گیا تھا اور اس سے پندرہ سال
چھوٹا ہوتے ہوئے بھی اس کا بڑا بھائی تھا۔ اس کے بعد سے اشرف کے
سامنے ہوتے بھی اس کی نظریں خواہ مخواہ جھکنے لگی تھیں۔

پھر ایک دن چند عورتیں آئیں اور اماں بی نے اُسے اندر چلنے
کو کہا۔ وہ ٹھٹک گئی۔ یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ وہ اس تجربے سے کیسے گزرے
گی۔ یہ مرحلہ موزوں وقت پر پیش آتا تو اس کے چہرے پر اس کا فطری ردعمل
ہوتا مگر اب تو وہ عمر کے اس دور میں تھی جہاں دماغ ہر بات کا تجزیہ کرنے
بیٹھ جاتا ہے۔ پھر وہ کیا کرے۔ اتنے میں اماں ٹنک کر پہنچ گئیں۔۔۔۔

"ارے بال ڈال سے کم بخت آگے سے زیادہ سفید ہو گئے ہیں۔۔۔۔"

اور اس کی کنپٹیاں بارودی سرنگ کی طرح پھٹ پڑی تھیں۔ اور اس
کا جی چاہا تھا۔ ایک لمبی حیوانی چیخ مار کر اپنے گرد و پیش کی ہر چیز کو تباہ
و برباد کر دے۔ مگر تبھی اس کی نگاہ اشرف پر پڑی تھی۔ جو اماں کے پیچھے
دہلیز میں کھڑا تھا۔ کچھ کچھ مضطرب چہرے پر کیسی التجا تھی وہ اندر چلی گئی۔

مگر یوں کہ اس کا بچپنا تھا کہ کیا لینے والی نظروں سے عمر بھری آنکھیں
آہستہ آہستہ انہیں بھی برداشت کی عادت ہو گئی تھی۔ اشرف نے کیسی کیسی کوششیں
کی تھیں اس کے بیگانہ جذبے پر اس کا دل ٹھنڈ کر رکھ دیا تھا آخر عورتیں آتی تھیں
اُسے دیکھا پھر لوٹیں۔

"بیگم کو بچایا نہیں آپ نے۔"

اماں کی نظریں جھک کر زمین میں گڑ گئیں۔ وہ بھی پتھر ہو گئی۔۔۔
اور عورتوں کی آنکھوں میں سرد مہری کی برف جم گئی۔۔۔۔ پھر یہ برف
اس نے کئی بار کئی آنکھوں میں دیکھی اور اس نے محسوس کیا کہ اشرف کے
قالب میں جیسے کچھ کچھ چہرے پر ملال کی زردی ہولے ہولے گھلتی
جا رہی ہے۔ اور اس کی آنکھیں بھیگی سی رہتی ہیں۔ وہ کئی بار اپنا بڑا سا
ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیتا۔

"آپا تم بالکل فکر نہ کرو میں سب کچھ ٹھیک کر دوں گا میں سچ
کہتا ہوں آپا قرآن پاک کی قسم"

اس کی فکر کا بوجھ اشرف کے ناتواں کندھوں پر آ گیا تھا۔
اور اس بوجھ سے اس کے کندھے جھکتے جا رہے تھے کیا وہ بھی قبل
از وقت بوڑھا ہو جائے گا نہیں نہیں۔ ایسا نہیں ہو گا ورنہ اس کا
سینہ پھٹ پڑا تھا۔ ایک دن بڑے ضبط سے اپنے آنسو روک کر وہ کہہ
دی تھی۔

"اشرف تم میری فکر چھوڑ دو مجھے شادی سے کوئی دلچسپی نہیں
میں بیاہ نہیں کروں گی"

"نہیں آپا"

"بس میں جو کہتی ہوں"

اور اشرف نے منہ دوسری طرف پھیر لیا تھا۔ شاید وہ اس کی
آنسوؤں سے تر مسکراہٹ کو دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

یہ سب پندرہ سال پہلے کی باتیں تھیں۔ اب تو اشرف کا سن
بھی تیس سے اوپر جا رہا تھا۔ مگر ہر بار وہ یہی سوچتی ابھی ایسی جلدی کیا
ہے جب وہ تیس برس کی تھی تو۔۔۔

مگر دوسرے کب چین لینے دیتے ہیں۔ اور اب تو وہ پچھلے
تیس برس سے اشرف کی دلہن ڈھونڈ رہی تھی۔

ہر گھر میں داخل ہوتے وقت اس کی آنکھوں میں قصابوں
کی سی بے رحمی سماتی اور اسے ہر لڑکی ایسی بکری لگتی جسے وہ ہر طرف سے
ٹٹول کر دیکھتی اور تھکتی۔ ایک دن وہ بھی ایک ایسی سوکھی مریل سی بکری لائی تھی
یہ تو بڑی شوخ چنچل اور تر و تازہ بکریاں تھیں مگر اس سے کیا فرق پڑتا

ہے۔ اسی بکریوں کو بھی کھلا کر پال سکتا تھا۔
ہر گھر سے نکلتے وقت یہ ضرور کہتی۔
"لڑکی کی عمر کچھ زیادہ دکھائی دیتی ہے۔"
"ارے نہیں بی بی جی ستو کی نہ ہوگی بیس کی ہوگی۔"
"ناک کس قدر چپٹا سا پکا ہوا تھا۔"
"اے بی بی خدا کو منہ دکھانا ہے۔"
"بیچ دو۔" وہ اُٹھ جاتی۔
یوں تک پہنچا کر اسے خود بھی سی خوشی محسوس ہوتی مگر
ماؤں کا مسئلہ عجیب ہے ڈھنگا سا تھا جانے کیوں غریب بنی ٹھنی ہی سی
کلبلا اور مغرور کہ سسرال میں وہ عظیمیں کیسی بے نیازی کا مظاہرہ کرتی
تھیں جیسے کچھ پڑا ہو۔ ٹھنڈے مشروب کے ایک گلاس یا چائے
کی ایک گرم پیالی پر لڑکی دکھا دیتیں۔ اور لڑکیاں بھی ایسی بے حیا کہ بے دھڑک
اس سے ہنستے بولتے تھیں۔ ذرا کی ذرا مسکتیں ہنسنے میں کسی کے گالوں میں
ننھے ننھے گڑھے پڑ جاتے کسی کے رخساروں پر گلال بکھر جاتا اور کسی کے
ماتھے پر پیار اُبھر آتا۔ مگر وہ انھیں پسند کرنے پر تیار نہ ہوتی۔ کوئی نہ
کوئی نقص ضرور نکل آتا۔ مگر انھیں کیا فکر کیا پرواہ تھی۔
ایک بار اسی برکتے نے سمجھایا تھا۔
"بی بی جی اُونچے امیر گھرانوں کی لڑکیاں ہیں۔ انہیں کس بات
کی کمی نہیں ایک ایک لڑکی کے کتنے پیام موجود ہوتے ہیں کہیں نہ کہیں
تو لگ ہی جاتی ہیں۔ پھر اس نے حوالے دے دے کر ان لڑکیوں کے بارے
میں بتایا تھا کہ وہ کیسے اچھے اچھے گھروں میں بیاہی یا منگی تھیں جنہیں
وہ نا پسند کرا آئی تھی۔
"ہوگا۔" اس نے جل کر کہا۔
"ہمیں تو بہت خوبصورت لڑکی چاہیئے جو میرے لاجینئیر کی
لائے۔ اور جہیز پانچ ہزار سے زیادہ ہرگز نہ مانگیں گے ... سنتی ہے
اشرف اس وقت ڈیڑھ ہزار تنخواہ لے رہا ہے۔ گلبرگ میں کوٹھی بن
رہی ہے۔ اور پچیس ہزار کی گاڑی خرید رہا ہے۔ اس نے سُن لیا تم
سب کچھ جانتی ہو بی بی جی۔"
ماسی برکتے اسے کتنی اُونچے اونچے گھروں میں لے گئی تھی مگر
بی بی جی کی پسند جانے کیسی تھی۔ وہ حیران تھی۔ اور اگر وہ ایسی مستقل
مزاج اور ٹھنڈے دل کی نہ ہوتی تو کب کی حوصلہ ہار بیٹھی ہوتی۔ مگر اسے
بھی ضد ہو گئی تھی کہیں تو پانی مرے گا آخر۔ حالانکہ خالہ اماں کئی بار
چپکے سے سمجھا چکی تھی۔

"مگر بیاہ اسی کے ساتھ تو اور ہوتی ہے۔ اس مزاج کے دل میں
کڑھ رہی ہے یہ بھائی کا بیاہ کہیں نہ ہو سکے گی۔ اپنا جہیز ہے کالی ماں
کی جلن ہے۔"
ماسی برکتے پھر بھی ڈٹی رہی مگر اس بار تو بیچ بیچ ہمت ہار گئی تو
اور ماسی برکتے کو خالہ اماں کی باتوں پر سولہ آنے یقین آ گیا تھا۔
کیسی اچھی لڑکی دکھائی تھی اس نے مہر یا شاہد سے کشش وزیر جہ
پھر مہر اور حمید کا معاملہ بھی بغیر دقت طے ہو گیا تھا خود کشور آپا بھی
خوش تھیں۔ مگر پھر جانے کیا ہوا کہ سب کچھ نا پسند ہو گیا۔
ماسی برکتے نے لڑکی کی ماں سے تین سو روپے طے کئے تھے
چھوٹی سی کوٹھڑی میں بڑا حبس اور گرمی ہوتی تھی اسلیے تو اس کی ماں
نے ایک جھول سے بچے کو بھی جھنڈ سے ہٹا لیا تھا۔ اس نے سوچا تھا اب کے
ایک برقی پنکھا ضرور خرید سکے گی اور وہ معاملہ پٹ جانے پر کتنا خوش
تھی۔ مگر صاحبزادی کے مزاج ہی بگڑے بیٹھے تھے سیکڑوں لڑکیاں ٹھکرا دیے
تھے مگر کوئی لڑکی پسند نہیں آ سکی تھی اب کی تو سب کچھ ٹھیک تھا پھر
یہ نیا شوشہ چھوڑ دیا۔ بھلا اتنی سی بات پر کوئی اتنا اچھا رشتہ چھوڑتا
ہے۔ یوں نہیں کہتیں کہ بھائی کو کنوارے بٹھائے رکھنے کا ارادہ کر لیا ہے۔
اس دن تو اشرف میاں کا چہرہ بھی اُتر گیا تھا اور خالہ اماں
کی ممتا نے جو جوش مارا تو اپنا منہ اشرف میاں کے قریب لا کر کہا۔
"غضب خدا کا بیس سے کہیں اوپر ہو گیا ہے سن تیرا اور
یہ مذاق ہمارا جاری ہے سیکڑوں گھر دیکھے سیکڑوں لڑکیاں گڑیوں
کی طرح ہاتھ کے سامنے لائی گئیں مگر کوئی پسند نہ آئی میں تو قرآن
پاک پہ ہاتھ رکھ کر کہہ دوں گی یہ تمہارا بیاہ نہ ہونے دے گی۔ مگر میں
پوچھتی ہوں تم کیوں چپ ہو تم کیوں اپنی زندگی برباد کئے جا رہے ہو۔
آخر بولتے کیوں نہیں ہو؟"
اور اشرف میاں گھبرا کر پرے ہٹ گئے تھے۔ کشور آپا کے
خلاف وہ ایک لفظ سننے کو تیار نہ تھے۔
حالانکہ دل میں وہ بھی قائل تھے۔ آخر اس لڑکی میں عیب
بھی کیا تھا۔
اشرف میاں تو سنبھل گئے مگر کشور آپا کو خالہ اماں کی یہ کڑ
چھبن کھٹک گئی۔
"اگر خالہ اماں کی مرضی ہو تو ٹھیک ہے بسم اللہ کیجئے۔" زہر میں
بجھے ہوئے بولیں۔
"اے میں کون ہوتی ہوں پسند کرنے والی مرضی تو [illegible]

مگر آج کل فیشن عجیب نہیں رہا۔ اس زمانے میں کون لڑکی فیشن نہیں کرتی۔" خالہ اماں نے اپنی جھنجلاہٹ کا اظہار کر ہی دیا۔

"اور یہ بھی تو کہئے کہ آج کل ہر ماں ایسا داماد چاہتی ہے جو اس کی نخروں پلی بیٹی کے ہاتھ پیلے نہ ہونے دے۔" کشور آپا کے لہجے میں نفرت بھری تھی۔

"ٹھیک ہے آپا اگر یہی اعتراض ہے تو میں بھی کہوں گا کہ مجھے بیوی چاہئے نوکرانی نہیں۔" اشرف میاں موقع ملتے ہی بول پڑے تھے۔

میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔ وہ تو پہلے چٹ منگنی پٹ بیاہ پر آمادہ ہیں۔ خالہ اماں سے کہو تاریخ مقرر کر لیں۔" کشور آپا نے تلخی سے کہا اور جوتیاں سمیٹ اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں ظاہر ہے ان کی موجودگی کے بغیر تاریخ مقرر نہیں ہو سکتی تھی۔ مہینہ بھر تک ایک عجیب سی خاموشی سارے گھر پر طاری رہی۔

اشرف میاں بھی کسی خیال میں گم رہے اور کشور آپا کو صدمہ تھا کہ اشرف نے ان کی بات کو توڑا تھا۔ آخر وہ اس کا بھلا چاہتی تھیں بُرا تو نہیں چاہتیں۔

مگر آخرکار دونوں میں صفائی ہوگئی۔

"میں تمہاری دشمن نہیں ہوں۔" کشور آپا آنکھوں میں آنسو بھر کر بولیں۔

"جانے دیجئے اس قصے کو میں فی الحال شادی نہیں کرنا چاہتا ابھی ایسی جلدی بھی کیا ہے۔"

"یہی تو میں کہتی ہوں آج کچھ سوچ بیٹھا ہو۔ دیکھنا تمہارے لئے کیسی دلہن ڈھونڈتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے آپا آپ جیسا مناسب سمجھیں کریں۔"

اشرف میاں نے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔

ماسی برکتے کافی دنوں غائب رہی۔ پھر ایک دن آ پہنچی۔

"ایک بہت اچھی لڑکی ڈھونڈی ہے بی بی جی۔ اگر یہ بھی پسند آئی تو پھر مجھے معاف ہی کیجئے گا بس یہ آخری بار ہے۔"

وہ چڑ گئی۔

"ایسا مت کہیں سنا کہ اگر تو لڑکی نہ ڈھونڈے گی تو کیا اشرف کا بیاہ نہ ہوگا۔"

"یہ بات نہیں بی بی جی۔" ماسی برکتے روہانسی ہو گئی۔

"اچھا بتا خوبصورت ہے؟"

"بہت۔"

"جہیز بھی وہ مرضی کا دیں گے؟"

"ہاں دیں گے۔"

وہ سادہ تھی مگر بڑی ڈھٹائی سے سب کچھ کہہ جاتی تھی۔

"بس تو پھر ٹھیک ہے کل شام کو چلیں گے۔"

اور اگلی شام دونوں گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی جا رہی تھیں۔ ایک موڑ مڑتے ہی ماسی برکتے نے اچانک آگے کو جھک کر اپنا ہاتھ ڈرائیور کے کندھے پر رکھ دیا۔

"بیٹا میاں گاڑی روک لینا۔"

"یہیں رہتے ہیں وہ؟" اس نے ازحد سنجیدگی سے کہا تھا۔

"نہیں بی بی جی وہ لوگ تو آگے رہتے ہیں مگر یہاں بھی ایک لڑکی ہے چلتے چلتے ایک نظر اسے بھی دیکھ لیں۔ مجھے معلوم ہے آپ کو گوارا نہیں آئے گی۔ مگر لڑکی کی ماں نے بڑی منت کی تھی۔ میں نے سمجھایا بھی مگر وہ یہی کہتی رہی ماسی برکتے تمہیں مقدر کا کیا پتہ جانے میری بیٹی کے نصیب کھل جائیں۔"

"بیکار ہے۔" اس نے نخوت سے کہا۔

"نہیں بی بی جی میں وعدہ کر چکی ہوں کہ آپ کو ضرور لاؤں گی۔"

"تم بھی حد کرتی ہو، خواہ مخواہ پریشان کرنے سے کیا فائدہ۔ جب تم جانتی تھیں کہ لوگ ہمارے مطلب کے نہیں ہیں تو تم نے وعدہ کیوں کیا۔"

"غلطی ہوگئی بی بی جی مگر اب آپ ضرور چلیں ورنہ وہ لوگ انتظار کرتے رہیں گے۔"

گاڑی سے اتر کر دونوں ایک تنگ سی گلی میں داخل ہوگئے۔

"اُف کیسی بدبو ہے۔" وہ دوپٹے سے ناک دبائے چل رہی تھی۔ آخر ایک دروازے پر ماسی برکتے نے دستک دی۔ فوراً دروازہ کھل گیا جانے کس جناتی عمل سے کھلا تھا کیونکہ سامنے تو کوئی دکھائی نہیں پڑا۔ دونوں اندر داخل ہو گئیں۔ ماسی برکتے آگے آگے تھی اور وہ پیچھے سنبھل کر قدم اٹھاتی ہر شے کو بنظرِ حقارت دیکھتی گھر کی صفائی بڑے اہتمام سے کی گئی تھی۔ مگر پھر بھی سب کچھ میلا میلا اور پرانا تھا۔ دو نو عمر لڑکیاں شرماتی شرماتی سلام کرتی ایک کمرے میں چلی گئیں۔ دونوں کا لباس صاف ستھرا اور اہتمام سے پہنا گیا تھا۔ یہ سب کچھ کشور آپا کو بیزار کرنے کے لئے کافی تھا۔ جس کمرے میں بیٹھی تھی وہ چھوٹا اور گھٹا گھٹا سا تھا۔ شاید اس لئے کہ گھر کی ہر قیمتی اور خوبصورت چیز لا کر وہاں رکھ دی گئی تھی۔ فرنیچر بھی قدیم وضع کا تھا۔ وہ بہت کوفت محسوس کر رہی تھی اور ماسی برکتے کو بار بار

کر رہی تھی۔

"بیگم بخت کا دماغ چل گیا ہے۔ اس گھر میں رہنے سے بہتر تھا کہ یتیم خانے میں رہ جاتی۔"

ایک عورت مظلومیت کی تصویر بنی انکساری سے مسکراتی اندر داخل ہوتی۔ چند رسمی باتوں کے بعد مٹھائی اور مشروب سے اس کی تواضع کی گئی۔

پھر چند بے رس جملوں کا تبادلہ ہوا۔

پھر چائے لائی گئی۔ وہ پریشان ہو گئی۔

"نہیں نہیں اس کی ضرورت نہیں۔" اس نے رکھائی سے کہا اور دل میں ماسی بکتے کو کہا۔

"بڑا فرق ہوا اس کم بخت کا۔"

"کوئی حرج نہیں۔" عورت نے مسکرا کر کہا۔ "رشتے ناطے تو قسمت کے بغیر نہیں ہوتے۔ گھر آئے مہمان کی مدارت کرنا تو سب کا فرض ہے۔"

"آپ یہ تکلفات رہنے دیں۔" اس نے قدرے ناخوشگوار لہجے میں کہا تھا۔ "میرا مطلب ہے لڑکی دکھا دیجیے۔ مہربانی ہوگی۔"

عورت کا چہرہ مرجھا گیا مگر وہ مسکراتی رہی۔

"راحیلہ بیٹی اندر آ کر مہمانوں کو چائے بنا کر دو۔" عورت نے آواز دی۔ لڑکی اندر آ گئی۔

میز کھانے والی چیزوں سے بھری ہوتی تھی۔ اس نے اچٹتی سی نظر لڑکی پر ڈالی۔

مرجھایا سوکھا چہرہ جیسے اس عمر میں اس نے بہت سے دکھ جھیل لیے ہوں۔

مگر اسے کسی کے دکھوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اسے تو ایک لڑکی چاہیے تھی۔ خوش رو، خوش گفتار، پڑھی لکھی ہزاروں کا جہیز ساتھ لانے والی لڑکی۔ وہ اٹھ کھڑی ہوتی۔

ماسی بکتے کو بھی اٹھنا پڑا۔ عورت کا چہرہ فق ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں رحم کی اپیل تھی۔ وہ اب بھی چائے پینے پر اصرار کر رہی تھی جیسے اور کوئی بات اسے سوجھ نہ رہی ہو۔

لڑکی کا دبلا پتلا کانپتا ہوا ہاتھ شکریہ کی طرف بڑھتے بڑھتے خلا میں معلق ہو گیا تھا۔

مگر اسے کسی کی پروا نہ تھی۔ وہ گلی میں نکل آئی۔ وہ ابھی باہر آئی تھی۔ سامنے گھر کے دروازے میں ایک نوجوان کھڑا گھور رہا تھا۔

جانے کے لیے سامان کم تر نہیں تھا۔ زندگی میں رشتوں تھی۔ اسے اچانک سامنے دیکھ کر وہ تذبذب میں پڑ گیا پھر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

کچھ کچھ چہرے والا یہ نوجوان جس کے چہرے پر افسردگی اور شرمندگی گھل رہی تھی۔ کون تھا؟ وہ ٹھٹھک کر رک گئی۔

بہکتا آگے بڑھی اور منت بھرے لہجے میں بولی۔

"یہ لڑکی کا بھائی ہے۔ اسی سال گورنمنٹ سے پاس ہوا ہے اور یہ لڑکی اس سے چھوٹی ہے۔"

وہ سنبھل گئی اور اپنے یوں اچانک رک جانے پر کچھ شرمندہ سی ہو کر بولی۔

"بالکل اشرف جیسا ہے۔"

وہ تیز تیز قدموں سے گھر سے باہر نکل گئی۔

اس نے محسوس کیا جیسے اس کے دل کے بند دروازوں کو کوئی آہستہ آہستہ کھول رہا ہے۔

ایک کچے کچے چہرے والا نوجوان لڑکا جس کے شانے یوں ڈھلوں کی مانند جھکے ہوتے ہیں۔

یہ مرحلہ بڑا کٹھن تھا۔ وہ ایک بار پھر سر کو جھٹک کر گاڑی کی طرف بڑھی۔ یہ اپنے مقدر کے سامنے کھڑی تھی۔ مگر اس بار اسے اپنے مقدر کا فیصلہ خود کرنا تھا۔ وہ بڑی تیز رفتاری سے گلی پار کرتی گاڑی میں جا بیٹھی تھی۔ اس کی سانس پھول رہی تھی۔ ماسی بکتے اس کے پیچھے تقریباً بھاگتی آئی تھی آج تو اس کی خوب شامت آنے لگی۔ وہ خوف زدہ تھی اس سے واقعی بڑی غلطی ہو گئی تھی مگر جب وہ گاڑی میں بیٹھی تو کشور آپا نے اسے کچھ بھی نہ کہا۔ وہ کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

ڈرائیور نے کھٹاک سے دروازہ بند کیا اور جونہی گاڑی اسٹارٹ کی کشور آپا نے آگے کو جھک کر کہا۔

"ڈرائیور گاڑی گھر لے چلو اب ہم اور کہیں نہیں جائیں گے۔"

رنگوں کا بادشاہ

عظمت عزمی



آذر زوبی

[illegible]

[illegible]

"سچ مانو، اس کے ہزار رنگ ہیں۔" بلکہ گھر سے پیچھے پیچھے لیکن سب کے سب سچے اور کھرے رنگ ہیں۔ یہ رنگ بولتے ہیں، ہنستے ہیں، مسکراتے ہیں، اٹکھیلیاں کرتے ہیں یا چھیڑتے ہیں۔ آنکھوں کی چمک سے پاس بلاتے ہیں۔ دل میں اتر جاتے ہیں، ہونٹوں پہ مسکراہٹ جما دیتے ہیں لیکن کبھی کبھی اس کے یہ رنگ رلا بھی دیتے ہیں۔ سچ رنگوں کا بادشاہ ہے وہ۔"

"ہاں وہی جسے لوگ آذر زوبی کے نام سے جانتے ہیں۔"

وہ آذر ہے۔ پتھر کے صنم تراشتا ہے لیکن انہیں پوجتا نہیں۔ کیا سبب ہے وہ جو گھر اکران سے ٹکرا کر جانے کی سوچے۔ وہ تو نرم دل، شاعر صفت حساس مصور ہے جس کے ہاتھ اور دل آذر کے سے ہیں۔ سچا اور نڈر دل۔ میں نے اس دل کے کئی زاویوں کو جانچا ہے۔ آذر زوبی کے اسٹوڈیو میں جب شام اپنے نقش پر سرمئی آنچل پھیلا رہی تھی۔ تب آذر زوبی ہم سے بڑی شگفتہ اور چہکتی ہوئی باتیں کر رہے تھے۔



میں نے ان سے پوچھا: "مصوری کا شوق آپ کو کب سے ہوا؟"
انہوں نے مسکرا کر جواب دیا "کہ جب دنیا میں آیا تو اپنے ساتھ ہی اس شوق کو بھی لایا تھا۔" میرا اگلا سوال تھا کہ "آپ نے بچپن میں اپنے کسی استاد کا کارٹون تو نہیں بنایا؟" "بنایا کیوں نہیں۔ کئی دفعہ بنایا اور مار بھی کھائی۔ استاد ملا پڑھایا کرتے تھے اور ہم رستم و سہراب کی تصویریں بناتے تھے۔ اور پھر بعد میں تختیوں سے مار بھی کھاتے تھے۔" "بچپن میں کوئی انعام وغیرہ بھی ملا آپ کو؟" میں نے فوراً ہی دوسرا سوال کر دیا۔

"بہت شاباشیں ملا کرتی تھیں بعد میں کوئی بھی فنکشن ہوا کرے اسکول کی سجاوٹ تزئین اور آرائش ہمارے ذمے ہوتی تھی۔ ہم بھی خوب پھولے پھرتے تھے اور نئے نئے انداز سے اسکول سجاتے دیواروں پر تصویریں بنا کر لگاتے تھے۔" "لیکن زیدی صاحب اب تو آپ کو معاشرے اور عوام سے کوئی شکایت نہیں کہ وہ آپ کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا یا آپ کو وہ قدر و منزلت نہیں دیتا جس کے آپ مستحق ہیں جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے کہ۔

تصویریں سجائیں گھر گھر اور معتبر در و در ہے
تصویریں سجانے والو کچھ قدر کرو فنکاروں کی

"نہیں جی نہیں۔ مجھے ایسا کوئی شکوہ گلا نہیں۔ میں بہت مسرور اور شاداں ہوں کہ مجھے اپنے فن کا پورا پورا خراج مل رہا ہے۔ معصوم اور سچے لوگ جس خلوص اور پیار سے میری حوصلہ افزائی کرتے ہیں مجھے عزت و احترام دیتے ہیں وہ میرے لئے قابل صد افتخار ہے ویسے میرے ایک عزیز دوست شاعر نے بھی کچھ یونہی کہا ہے کہ

عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہل وطن
یہ الگ بات ہے کہ دفنائیں اعزاز کے ساتھ

سچ پوچھئے تو یوں ہوتا بھی ہے لیکن میرے معاملے میں ایسی کوئی بات نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں نے جتنی محنت کی اتنا صلہ مجھے ملا بھی۔ دراصل میں ہمیشہ ہی سے ان نام نہاد فنکاروں کی صفوں سے دور رہا جو اپنے فن کے ساتھ وفا اور محنت و محبت کم کرتے ہیں لیکن پرچار زیادہ کرتے ہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ کام اور بے تکی ... اور پھر عوام الناس نے انہیں پسند نہیں کیا تو وہ رنجیدہ ہو گئے۔ شکوہ بلب ہیں۔ آہیں بھرتے ہیں۔ زندگی سے عاجز ہو بیٹھے۔ دیکھیں صاحب شاعر ہو، مصور ہو، مجسمہ ساز ہو، مقصد یہ کہ ہر فنکار بڑا حساس ہوتا ہے وہ معاشرے کا نمائندہ ہوتا۔ بیرومیٹر ہوتا ہے اور معاشرہ کبھی ساکت نہیں ہوا۔ پھر یہ تو طے ہے کہ جب معاشرہ ساکت نہیں ہو سکتا تو فنکار کے فن میں بھی جمود پیدا نہیں ہونا چاہیے۔ وہ میرے بلند پایہ کسی نے کہا ہے کہ۔





اس رہ میں مقام بے محل ہے
پوشیدہ قرار میں اجل ہے

"بلا سیالکوٹی ہے"۔ میں چہک گئی تھی۔ میں نے حیران ہو کر آذر صاحب کو دیکھا۔ ان کے چہرے پر محبت کا اور بکھرا ہوا تھا آنکھوں میں چاہت کے پاکیزہ اور گہرے رنگ تیر رہے تھے۔ ہونٹوں پر پیام بھری مسکراہٹ آن رہی تھی۔ رنگوں کے بادشاہ کا یہ نیا رنگ تھا اور بھلا میں اس رنگ کو کیوں نہ پہچانتی۔ یہ عشق کا رنگ تو بڑا اچھا بڑا پاکیزہ بڑا میٹھا ہوتا ہے احساس کی شدت خلوص کا رچاؤ محبت کی ٹھنڈک ہی



تو اس رنگ کو سجا دیتی ہے اور میں اس عشق کے مالک کو آذر صاحب کے چہرے پر جھلملاتے دیکھ کر بے چین ہو گئی تھی۔ مجھے اس کا پس منظر معلوم کرنا تھا۔ میں نے ان سے پوچھا "آذر صاحب سنا ہے کہ آپ نے ہمارے شاعر مشرق اور ہمارے سیالکوٹی کے شکوہ جواب شکوہ کو اپنے برش کے ذریعے صفحہ قرطاس پر تصاویر کی صورت دے دی ہے مجھے لگتا ہے آپ حکیم الامت سے بڑے متاثر ہیں"۔ "متاثر نہ ہوتا تو میں یہ سب کچھ نہ کر سکتا۔ یہ دیکھئے یہ پورا "شکوہ" جواب شکوہ ہے۔ تصاویر کے پیکر میں مجھے اقبال نے نہ صرف متاثر کیا ہے بلکہ میں انہیں چاہتا ہوں پوجتا ہوں عشق کرتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ صرف شاعر ہی نہیں مصلح قوم بھی ہے وہ ریفارمر ہے۔ اور ریفارمر اور مصلح قوم کبھی نہیں مرا کرتے۔ وہ دلوں میں زندہ رہتے ہیں۔ ریفارمر یا مصلح قوم دنیا کے کسی بھی خطے کا ہو میرے دل میں ان کے لئے عزت و احترام ہے"۔ میں نے اس بڑی سی خاکی کی ورق گردانی شروع کر دی۔ اقبال کا شکوہ جواب شکوہ کا ہر مصرعہ تصویر کا پیکر لئے ہمارے سامنے تھا۔ ہم اپنی کھلی آنکھوں میں حیرانی لیے ان تصاویر کو دیکھ رہے تھے ہمارے ہونٹ خاموش تھے لیکن شاعری کا اور مصور کا اعجاز بول رہا تھا۔ اور میں سوچ رہی تھی کہ شعر اقبال کا ہے اور قلم آذر کا۔ شراب ناب ہے اور بھی مقاتشہ کیونکہ پھیلا ہے اس سے ۔ یہ مقصد ہے آذر

سے وہ شاید اس کا تھا اور مجھے آذر صاحب سے اور بھی سوالات کرنے تھے اس لئے میں نے اپنے دل پر جبر کر کے کرنا بند کر دی اور آذر صاحب سے پوچھ ہی لیا "یہ بتائیں کہ جب کوئی ناواقف آدمی آپ کو پہچان کر آپ کے فن کی تعریف کرتا ہے تو آپ کو کیسا لگتا ہے۔؟"

"سچ پوچھیں تو جب میرے فن کی تعریف کرتا ہے تو مجھے بڑی مسرت ہوتی ہے مگر کوئی دنیا اور بعض حضرات میری تصاویر دیکھ کر تعریف نہیں کرتا تو پھر بھی مجھے تکلیف ہوتی ہے۔"

میں ہنس پڑی "خوب کہا آپ نے۔ آذر صاحب آپ یہ بتایئے کہ آپ یہاں اپنے اسٹوڈیو میں لڑکیوں اور لڑکوں کو کس قسم کی تربیت دیتے ہیں۔؟"

"یہ انٹیریر ڈیکوریشن کی تربیت ہے جیسے آپ گھریلو تزئین و آرائش یا اندرونی سجاوٹ بھی کہہ سکتی ہیں۔ یہاں پر میں لڑکوں لڑکیوں کو تربیت دیتا ہوں۔ زندگی میں رنگوں کی اہمیت بتاتا ہوں۔ رنگوں کے استعمال کا طریقہ اور سلیقے کے فن سے متعارف کرواتا ہوں۔ یہ تین ماہ کا کورس ہے۔ ہفتے میں دو دن کلاسیں ہوتی ہیں۔ ہر ایک کلاس میں تقریباً پچیس چھبیس طالب علم ہیں۔"

"تو یہ اسکول آپ نجی طور پر چلا رہے ہیں۔؟"

"جی ہاں بالکل۔ در اصل ہمارے یہاں رنگوں کو اتنی اہمیت نہیں دی جاتی حالانکہ پوری کائنات رنگ و نور کا سیلاب ہی ہے۔ اگر دنیا میں سے رنگ نکال لئے جائیں تو دنیا بے رنگ، بے مصرف سی ہو جائے گی۔ انسان پر بہت اثر ہوتا ہے اس کی شخصیت پر ہر چیز کا اثر ہوتا ہے خاص طور پر رنگ تو بہت اثر انداز ہوتے ہیں۔ جدید سائنسی تحقیق نے ثابت کر دیا ہے کہ بیشتر بیماریاں غلط ماحول، رنگوں کی غلط ترتیب کی وجہ سے پھیلتی ہیں۔ زندگی کا حسن تناسب میں ہے ہر شخصیت اور ماحول کے لئے تناسب اور ترتیب بڑی ضروری ہے۔ لیکن ہمارے یہاں اس سلسلے میں بڑی لاپرواہی برتی جا رہی ہے حالانکہ سجاوٹ کو لازمی مضمون کی حیثیت سے ہمارے اسکول اور کالجوں کے نصاب میں شامل کرنا چاہیئے۔"

"اچھا آذر صاحب یہ بتائیں کہ آپ کوئی پرچہ نکالتے تھے۔؟"

"جی ہاں میں "شعور" نکالتا تھا۔ یہ بہت پرانی بات ہے اس کو سال پہلے میں گھر گھر شعور بانٹنے پر تل گیا تھا۔ میں نے دل کھول کر شعور بانٹا کہ گودام خالی ہو گئے۔ لیکن جب مجھے یہ خدشہ ہوا کہ کہیں میں خود ہی بے شعور نہ رہ جاؤں تو میں نے شعور نکالنا بند کر دیا۔ اور پھر لوگ بھی خاصے باشعور ہو گئے تھے۔ اور شاید آپ نے "شعور" تو نہ دیکھا ہوگا۔؟"

"جی نہیں کبھی واسطہ نہیں پڑا۔" میں اُن کی دلچسپ باتوں سے محظوظ ہوتے ہوئے بولی۔

"ٹھیک ہے تو پھر ہم آپ سب کو شعور عطا کریں گے ابھی ہم اتنے بے شعور نہیں ہوتے کہ آپ ہمارے پاس آئیں اور شعور حاصل کئے بغیر چلی جائیں۔" اور ذرا سی دیر بعد ہم سب کے پاس "شعور" کے



آنند ندبے اپنی صاحبزادی اور بیگم کے ساتھ۔



پہ چہ شمارے موجود تھے۔

"شعور بخشنے کا شکریہ جناب مگر ہمیں اس سے مستفید ہونے کے لئے تو سکون اور تنہائی کی ضرورت ہے آپ یہ بتائیں کہ آپ کو ادیب کون کون سے پسند ہیں۔؟"

"مجھے اشفاق احمد، ممتاز مفتی، قدسیہ بانو، سعادت حسن منٹو وغیرہ بہت پسند ہیں۔"

"آذر صاحب سنا گیا ہے کہ آپ کی بیگم بھی مصورہ ہیں۔؟"

"جی ٹھیک ہی سنا آپ نے۔ وہ مصورہ ہیں بینیٹنگز اور مجسمے وغیرہ بھی بناتی اور بہت اچھے بناتی ہیں۔ ویسے بھی بیوی کے معاملے میں تنقید نہیں کرنا چاہیئے۔"

"اور بچوں کے معاملے میں کیا ارشاد ہے آپ کا۔ کتنے بچے ہیں آپ کے کیا انہیں بھی مصوری سے لگاؤ ہے۔؟" میں نے جھٹ سے نیا سوال اگل دیا۔؟

"میرے تین بچے ہیں۔ دو بیٹے۔ وہ دونوں آرٹ کی دنیا سے وابستہ ہیں بڑا اچھا ذوق ہے ان کا۔ ایک بیٹی ہے میری دنیا لے جہاں مصوری سے دلچسپی نہیں وہ پہلی میڈیکل کی طالبہ ہے۔"

"اچھا آذر صاحب یہ بتائیں کہ آپ کی تصاویر ماشاءاللہ پاکستان میں مصوری کے شائقین کے من پسند ہیں۔ لیکن بین الاقوامی طور پر آپ کی تصاویر کہاں کہاں پہنچیں۔؟"

"اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اچھی عزت دی۔ میری تصویروں کی نمائش بین الاقوامی سطح پر ہو چکی ہے اور میرا فن لوگوں میں پسند کیا گیا خاص طور پر ہندوستان، امریکہ، کینیڈا، برازیل وغیرہ میں۔ علاوہ عرض کر دوں کہ میری تصویریں کینیڈی خاندان کے گھر کی رونق بڑھا رہی ہیں چار سال میں اٹلی میں بھی رہا وہاں بھی میرے فن کا چرچا چلا رہا۔"

"اچھا آذر صاحب اگر آپ مصور نہ ہوتے تو کیا ہوتے؟"

"میں مصور نہ ہوتا تو یقیناً پرستار شمع جلاتا ہی ہوتا۔"

"چلئے اب اگر آپ مصور ہیں اور بڑے پائے کے مصور ہیں تو ہمیں اپنا اسٹوڈیو دکھائیے گا۔"

"جی ہاں کیوں نہیں چلئے۔"

ہم سب اٹھ کر ان کے پیچھے ہو لئے۔ اسٹوڈیو میں رنگ مقفل تھے کبھی دیواروں پر لگی ہوئی پینٹنگز ہیں بالتقصد کبھی مجسمے ہمیں بلاتے تھے۔ آذر زوبی کے یہاں سارے قوسیں رنگ اور ذوق کر خضب



ڈھالتے ہیں۔ مصور حساس ہو اور حسنِ امتزاج سے واقف ہو تو اسے تصویروں کے عنوان نہیں رکھنا پڑتے۔ تصویریں خود اپنے عنوان بتا دیتی ہیں۔

سامنے کی دیوار پر لگی ہوئی ایک بڑی سی پینٹنگ تھی "خوف و ہراس، خونی ہلچل اور رنگ برنگے اور جذبے کے رنگوں کے ساتھ یہ ۱۹۶۵ کی جنگ کا نقشہ ہے۔" آذر زوبی ہمیں اپنے مخصوص شگفتہ انداز سے بتا رہے تھے۔

"اور یہ دیکھئے یہ ممتاز مفتی کا مجسمہ ہے۔ یقیناً جانتی ہیں۔ یہ اپنا منٹو ہے۔ یہ احسان دانش ہے یہ بھائی احمد ندیم ہیں۔" میں نے حیران ہو کر ان مجسموں کو دیکھا۔ ٹھیک۔ فاصلے ختم کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے آذر زوبی ہر وقت اپنے پیاروں اپنے دوستوں کے درمیان رہتا ہے۔ اور یہ پینٹنگ یہ دھمال کا منظر سندھی ٹوپی پہنے ہوئے یہ ڈھول بجاتا ہوا آدمی اور دھمال ڈالتی ہوئی یہ لڑکی کیسی متحرک سی ہے یہ تصویر کیسے جوشیلے رنگ ہیں۔ کیا غضب کا انداز ہے ان کا۔ میں آذر زوبی سے مل چکی تھی اب ان کے فن سے مل رہی تھی۔ دونوں ہی اپنی جگہ یکتا تھے۔

اور پھر دیر بعد ہم آذر زوبی کو ساتھ لے کر ان کے گھر کی طرف آنکلے تھے۔ دوستوں کی گاڑی میں بیٹھے بیٹھے میں نے آذر صاحب سے پوچھ لیا کہ رنگوں میں کوئی خاص رنگ آپ کو زیادہ پسند ہے۔

"جی ہاں، وفا کا رنگ" وہ بے ساختہ بولے تھے۔

اور میں نے اس وفا کے رنگ کو آذر زوبی کے گھر میں پھیلتے دیکھا یا یہ صغرا ربابی کے نام سے پہچانی جاتی ہیں آذر زوبی کی حیات کی شریک ہیں۔ ہم نے ان کی پینٹنگز دیکھیں بہت خوبصورت اور حسین تھیں۔ آذر زوبی اور صغرا ربابی کے حسن ذوق نے پورے گھر کو نکھارا ہوا تھا۔ رنگوں کا امتزاج۔ خوش ذوقی کا احساس نازک خیالی کے جلوے، بہت طرازیوں کا حسن۔ فنکارانہ صلاحیتوں کے پیکر ان کے گھر کو جنت نظیر بناتے ہوئے تھے۔ آذر صاحب ہمیں اپنے جملے سے سیالکوٹی کی پینٹنگ دکھائی بس غضب کی تھی وہ پینٹنگ۔ ہمارا شاعر اقبال ایک درخت کے نیچے سنسان راستے میں زمین پر بیٹھا ہے۔ ہاتھ میں کتاب ہے بدن پر کرتا اور تہبند ہے۔ پیر ننگے ہیں۔ چہرے پر تفکر اور حزن و ملال کے سائے بچھے ہوتے ہیں۔ اُف کیا غضب کا تاثر تھا اس تصویر کا۔ کاش میں بھی مصور ہوتی اور قلم کے ذریعے اس تصویر کی تصویر کھینچ کر رکھ دیتی۔

صغرا ربابی کسی مہمان کا انتظار کر رہی تھیں ہم نے ان کا زیادہ وقت نہیں لیا۔ ہاں ان سے ان کی پسند پوچھی تو انہوں نے بتایا کہ ہر خوبصورت چیز مجھے پسند ہے خاص طور پر معصوم بچے میری کمزوری ہیں خواہ وہ جانور کے ہی کیوں نہ ہوں۔ موسیقی سے بھی مجھے لگاؤ ہے کلاسیکی ڈانس بھی من بھاتا ہے۔

"ہم نے سنا ہے کہ آپ کوئی اسکول آف آرٹ چلاتی ہیں؟"

"نہیں جی پہلے چلاتی تھی۔ لیکن اب تو صرف گھر چلاتی ہوں۔"

وہ مسکرا کر بولیں۔

تھوڑی دیر میں اطلاع ملی کہ مہمان آ چکے ہیں اس لئے ہم نے کچھ تصویریں بنائیں۔ اور اجازت چاہی۔ صغرا ربابی اور آذر زوبی نے ہم لوگوں کو چائے کے لئے روکنا چاہا۔ لیکن ہم نے آذر صاحب کو یاد دلایا کہ ہم چائے اسٹوڈیو میں ہی پی چکے ہیں آذر صاحب گیٹ تک ہمیں چھوڑنے آئے اپنے مخصوص انداز میں باتیں کرتے کرتے آخر انہوں نے ہمیں خدا حافظ کہا اور میں سوچنے لگی کہ آذر زوبی صرف ایک فنکار ہی نہیں

ایک کھلاڑی بھی ہے

رنگوں کا کھلاڑی

لفظوں کا کھلاڑی





دِل توڑنے والے سبھی
پتھر دِل ہوتے ہیں؟

سُمیرا رَباب

یوں تو ہر فرد کی شخصیت الگ الگ ہوتی ہے مگر بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اُن کی شخصیت و انفرادیت، دیکھنے والوں کو پہلی ہی نظر میں نہ صرف متاثر کرتی بلکہ ذہن میں پنجے گاڑ دیتی ہے۔ اور ان کی گرفت ہر آن بڑھتی ہی جاتی ہے۔

دلآویز کی شخصیت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ آپ سوچیں گے کہ شاید وہ بہت خوبصورت ہوگی۔ نہیں، شکل و صورت کے اعتبار سے وہ ایک عام سی لڑکی نظر آتی تھی اور اس میں وہ جسمانی کشش بھی نہیں تھی جو مردوں کو بار بار اپنی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیتی ہے وہ تو کچھ اور ہی باتیں تھیں جنہوں نے اس کی شخصیت کو منفرد بنا دیا تھا۔ ان کی تفصیل میں بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے پوری بات سن لیجئے۔

میں اسے ٹیوشن دینے کے لئے اس کے گھر جایا کرتا تھا اور چونکہ میرے لئے کسی لڑکی کو ٹیوشن دینے کا یہ پہلا چانس تھا اس لئے شروع شروع میں، میں کافی نروس سا تھا مگر دلآویز کچھ زیادہ ہی کھلے دل کی نکلی۔ جہاں اس کی شاگردانہ فرماں برداری نے بہت جلد مجھے خود اعتمادی کے منبر پہ لا کھڑا کیا، وہاں اس کی ذہانت نے مجھے کسی بات کو بار بار دہرانے کی کوفت میں بھی مبتلا نہ ہونے دیا۔ اس سلسلے میں اکتاہٹ محسوس کرنے کی بجائے نہایت سنجیدگی سے اُسے پڑھانے لگا۔

چند ہی روز کی آمد و رفت کے بعد مجھے پتہ چل گیا کہ اس کا کوئی بھائی نہیں اور باپ مر چکا ہے۔ اس لئے وہ سروس کے ساتھ پرائیویٹ طور پر تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ وہ اگر سروس نہ کرتی تو بھی گھر کا خرچہ با آسانی چلتا کہ اس کا باپ خاصے وسائل چھوڑ گیا تھا لیکن وہ چاہتی تھی کہ جتنی زیادہ بچت ہو سکے کی جائے تاکہ چھوٹی بہنوں کے لئے جہیز تیار کیا جا سکے۔ اس کی اس سوچ نے بھی مجھے خاصا متاثر کیا تھا۔

اُس کے کمرے کی میز کتابوں کے علاوہ دوائیوں کی شیشیوں سے بھری نظر آتی تھی کیونکہ وہ ہمیشہ کچھ بیمار سی رہتی تھی۔ اس کی ماں نے مجھے بتایا کہ بچپن ہی سے اُس کی صحت ٹھیک نہیں رہی۔ میں آپ کو یہ بھی بتانا چاہوں کہ اس کے متعلق یہ ساری باتیں مجھے اُس کی بہنوں اور ماں نے بتائی تھیں کیونکہ وہ بڑی خاموش طبع واقع ہوئی تھی اور پڑھائی کے دوران ہمیشہ سر جھکائے خاموش بیٹھی رہا کرتی تھی۔ اس کے ہر وقت نگاہیں جھکائے رکھنے کا یہ انداز اتنا عجیب تھا کہ جب کبھی وہ اچانک نگاہ اٹھاتی تو میرا دل کانپ جاتا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے اس کی ذات کا سارا حسن سمٹ کر اُس کی بڑی بڑی آنکھوں میں آ گیا ہے اور اگر ان پر پلکوں کی چلمن فوراً نہ گرائی گئی تو میں ان میں اس طرح ڈوب جاؤں گا کہ پھر کبھی نہ ابھر سکوں گا۔ مگر ایک ثانیے ہی میں ان پر پلکوں کی چلمن گر چکی ہوتی اور نگاہیں بھی یوں جھک جاتیں جیسے غلطی سے اٹھ گئی تھیں۔

اس کی شخصیت کے اسی انداز نے مجھے نہ صرف سب سے زیادہ متاثر کیا تھا بلکہ یوں لگتا تھا جیسے یہ آنکھیں چپکے چپکے میرے دل میں اُتر گئی ہیں اور ہر وقت ہر جگہ میرا پیچھا کرتی رہتی ہیں۔ میں نے لاکھ جتن کئے مگر ان آنکھوں کے سحر سے نہ بچ سکا اور دل ہی دل میں اُسے چاہنے لگا لیکن جوں جوں میری چاہت بڑھتی گئی ویسے ویسے دلآویز کی خاموشیوں میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ اب وہ پڑھائی کے دوران مجھ سے سوال کرنے میں بھی بخل سے کام لینے لگی۔ گفتگو تو پہلے بھی کبھی درس و تدریس کی حد بندیوں سے آگے نہیں بڑھی تھی پھر میں اظہارِ محبت کیسے کرتا؟ نتیجہ یہ ہوا کہ میں اپنی ہی آگ میں سلگنے لگا۔ جہاں مجھے دلآویز کی آنکھوں پر بے طرح پیار آتا تھا وہاں اپنی آنکھوں پر بُری طرح غصہ بھی آنے لگا کہ یہ میرے دل کا پیغام اُسے پہنچانے میں کیوں ناکام رہی ہیں؟

میرا علم اور تجربہ تو یہ بتاتا تھا کہ جن عورتوں کو مردوں کی قربت نصیب نہ ہو جنسی نا آسودگی انھیں بے باک بنا دیتی ہے لیکن کچھ عورتیں فطری شرم و حیا کی وجہ سے اپنے خول میں سکڑی، سمٹی رہتی ہیں اور جب کوئی مرد پیش قدمی کرتا ہے تو وہ چھوئی موئی کی طرح اُس کی جھولی میں آ گرتی ہیں مگر ایک حادثے نے میرا ان معلومات اور تجربات کا رُخ بھی موڑ دیا۔ ورنہ شاید میں دل سے مجبور ہو کر کوئی غلط حرکت کر بیٹھتا۔ ہوا یوں کہ ایک بار دلآویز کو کتاب دیتے ہوئے میری انگلیاں اُس کے ہاتھ سے چھو گئیں تو اس نے فوراً اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا اور لمحہ بھر کو شدید خفگی کی ایک لہر اُس کے چہرے پر اُبھری مگر نگاہوں کو پلکوں کی چلمن میں چھپائے وہ پڑھنے میں منہمک ہو گئی۔ اس نے بغیر نگاہ اُٹھائے اور بغیر کچھ بولے مجھے سب کچھ سمجھا دیا تھا۔ میں جان گیا تھا کہ ارادی طور پر اُسے چھونے کا انجام کیا ہو سکتا ہے چنانچہ لاکھ چاہنے کے باوجود میں آداب کی حدود سے نکلنے کی جرأت نہ کر سکا۔ اب میں اچھی طرح پرکھ چکا تھا کہ اگر اس کے یہ انداز طبع کی حیثیت رکھتے تو میری انگلی چھو جانے سے ان کے بھرم کھل جاتے مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔

ایک روز میں اسے پڑھانے گیا تو پتہ چلا کہ وہ بیمار ہے۔ اُسے دیکھے بغیر چلے جانا اب میرے بس میں نہیں رہا تھا۔ میں نے اُس کی ماں سے عیادت کرنے کے لئے کہا تو وہ خود ہی بستر سے اُٹھ کر آ گئی۔ نماز کی پابند ہونے کے باعث اُس کا چہرہ ہر وقت دوپٹے کے ہالے میں چھپا رہتا تھا لیکن اس وقت جب وہ بستر سے اٹھ کر آئی تھی تو بھی اُس کا چہرہ اُسی طرح دوپٹے کے ہالے میں تھا۔ نگاہیں جھکی ہوئی تھیں اور ہونٹوں پر پیاری پیاری سی مسکراہٹ۔ میں سادگی کے اس حسین پیکر کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ میرا جی چاہا کہ اس کی ساری بیماریاں، سارے دُکھ میں سمیٹ لوں اور اپنے حصے کی ساری خوشیاں اُسے دے دوں۔ بے حد ضبط و احتیاط کے باوجود میں اُس سے پوچھ ہی بیٹھا:

"تم اتنی اُداس اُداس، پریشان اور بیمار بیمار سی کیوں رہتی ہو دلآویز—؟"

دل ہی دل میں اُتر جانے والی نگاہیں ایک ثانیے کو اٹھیں اور جھک گئیں مگر ہونٹ پھر بھی خاموش ہی رہے تو میں نے پھر پوچھا۔

"بتاؤ نا دلآویز؟"

اب کے اُس نے میری بات کا جواب دینے کی بجائے عجیب غیر متوقع انداز میں الٹا مجھ سے سوال کر ڈالا۔

"آپ میری اُداسی اور بیزاری سے اس قدر پریشان کیوں ہیں؟"

اُس نے یہ سوال کر کے میری دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ میں بوکھلا گیا اور کوئی جواب نہ دے سکا حالانکہ اس سوال کے میرے پاس ہزاروں جواب تھے مگر اس وقت سب نامعلوم ہو گئے تھے۔ مجھے خاموش پا کر اس نے پھر اپنا سوال دہرایا تو میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"یہ سوال نہ پوچھو تو بہتر ہے۔"

"کیوں؟" وہ بولی۔ "آپ نے تو میرا تجسس کچھ اور بڑھا دیا۔ آخر میری ذات سے ایسی کونسی بات وابستہ ہے جو زبان پر نہیں لائی جا سکتی؟"

دلآویز کی اس بات پر میں نے نہایت سادگی سے اپنا دل کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ مگر وہ جذبات سے عاری چہرے کے ساتھ بولی۔

"بس اتنی سی بات تھی؟ انسان ہونے کے ناطے خیالات کا بھٹک جانا کوئی بُری بات نہیں لیکن جس راہ کی منزل سے ہم ناواقف ہوں، اُسے چھوڑ دینا ہی بہتر ہوتا ہے۔"

"ایسا نہ کہو دلآویز۔" میں نے ڈوبتے دل کے ساتھ کہا۔ "دل کو چھوڑنا اور دھڑکن کا رخ موڑنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ تم نہیں جانتیں کہ میرے دل میں تمہارے لئے کتنا خلوص اور پیار ہے۔"

"میں جانتی ہوں۔ خلوص کی جھلک میں نے پہلے دن ہی آپ کی آنکھوں میں دیکھ لی تھی لیکن خلوص اور محبت میرے نزدیک کسی قسم کے اظہار و اقرار سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ آئندہ براہ کرم اس موضوع پر کبھی بات نہ کیجئے گا۔"

تب پہلی بار مجھے محسوس ہوا کہ مظلوم و معصوم دکھائی دینے والی یہ لڑکی کتنی سنگدل ہے۔

اُس نے کتنی نرمی سے میرا دل توڑ دیا تھا۔

اس کے بعد وہ مجھ سے کچھ انجان سی بن گئی۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں نا کہ دل کسی کا دوست نہیں ہوتا، میرا دل بھی میرا دشمن بن گیا تھا۔ میں اُسے لاکھ سمجھاتا کہ وہ اُس سنگدل لڑکی سے پیار کرنا چھوڑ دے مگر اس نے میری ایک نہ سنی۔ میں نہ چاہنے کے باوجود بڑی شدت سے دلآویز کو چاہنے لگا۔ اور میری سوچوں پر اُس کا قبضہ بڑھتا ہی چلا گیا۔

کی منزل سے ایک عورت نے مجھے ڈرائنگ روم کی طرف دیکھا جہاں اس کا بیٹا اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ کمرے میں روشنی کئے بغیر بیٹھا تھا اور اندر سے کہا۔

"سنو، تم وہاں کیا کر رہے ہو؟"

بیٹے نے جواب دیا۔ "جی کچھ نہیں۔"

عورت بولی۔ "ہوں — میں دیکھ رہی ہوں کہ تم روز بروز اپنے باپ کی طرح ہوتے جا رہے ہو۔"

معمول کے مطابق میں اُس کے گھر اُسے پڑھانے جاتا رہا۔ میں نے اُس سنگدل لڑکی کی خواہش کے مطابق اس موضوع پر پھر کبھی بات نہ کی لیکن میری حالت سے اُس کے بخوبی اندازہ لگا لیا تھا، حالانکہ اُس نے یہ نہیں جتایا کہ میں کس کرب سے گزر رہا ہوں۔ اس کے باوجود وہ مجھ سے یکسر انجان بنی رہی۔

کچھ عرصے بعد اُس کی صحت بڑی تیزی سے گرنے لگی۔ وہ شدید بیمار ہو گئی۔ گھر کے لوگ سخت پریشان ہو گئے اور سب کچھ دھرا رہ گیا۔ وہ پلنگ سے ایسی لگی کہ پھر ماہ تک نہ اٹھ سکی۔

ٹیوشن کا سلسلہ تو کب کا ختم ہو چکا تھا مگر میں دل سے مجبور ہو کر عیادت کے بہانے باقاعدگی سے اس کے گھر جاتا رہتا۔ کمزوری کے باعث وہ بات نہ کر سکتی، بس آنکھیں بند کئے لیٹی رہتی۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر میرا دل خون روتا، اور یہ خواہش پوری شدت کے ساتھ قصوں کی طرح بھڑک اٹھتی کہ وہ ایک بار آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھ لے مگر میری یہ خواہش کبھی پوری نہ ہو سکی۔ بلکہ بعض دفعہ ایسا بھی ہوا کہ وہ میری آمد پر کروٹ بدل کر منہ چھپا لیتی۔ میں غم و غصے سے پاگل سا ہو جاتا اور سوچتا کہ اب کبھی اس سنگدل لڑکی کو دیکھنے نہیں آؤں گا لیکن چند روز بعد میرے قدم پھر اپنے آپ اس کے گھر کی طرف اٹھ جاتے۔

کچھ عرصہ پہلے جب میں اُس کے گھر گیا تو پتہ چلا کہ آج اُس کی طبیعت قدرے سنبھل گئی ہے، اس نے اپنی ماں اور بہنوں سے کافی باتیں کی ہیں۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ اس کے کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ آج وہ آنکھیں کھولے لیٹی ہے۔ مجھ کو پہچان کر مجھے



ہی اُس نے آنکھیں موند لیں۔ اور کروٹ بھی بدل لی۔

اُس کی اِس حرکت سے میرا دل چُور چُور ہو گیا۔ میں نے بے ساختہ کہا۔

"تم کتنی سنگدل اور بے حس ہو ڈلاّ وریز۔ میں نہیں جانتا تھا کہ تمہیں مجھ سے اتنی نفرت ہے۔ بہرکیف اب میں کبھی تمہاری دہلیز پر قدم نہیں رکھوں گا۔" یہ کہہ کر میں تیزی سے لوٹ آیا اور پھر کبھی اُس مظلوم دکھائی دینے والی ظالم لڑکی کے گھر نہیں گیا۔

تھوڑی دیر پہلے اُس کی موت کی خبر سنانے کے ساتھ ساتھ اُس کی ماں نے مجھے ایک خط بھی دیا ہے۔ ڈلاّ وریز نے یہ مختصر سا خط مرنے سے کچھ دن پہلے لکھا تھا مگر اس نے اپنی ماں اور بہنوں سے التجا کی تھی کہ اسے اُس کی موت کے بعد مجھے پہنچایا جائے۔

ڈلاّ وریز کی یہ آخری تحریر آپ بھی پڑھ لیجئے:۔

میرے محبوب۔

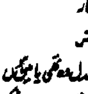
ماہی عدم بننے سے پہلے آپ سے معافی مانگنا چاہتی ہوں کہ آپ کا دل دکھانے کی گنہگار ہوں اور یہ گناہ اُس وقت تک میری روح کا بوجھ بنا رہے گا جب تک آپ مجھے معاف نہیں کر دیں گے۔ اتنا اعتراف آج میں اپنی زندگی میں کر چکی ہوں کہ پہلے روز ہی میں نے آپ کی آنکھوں میں خلوص دیکھ لیا تھا۔ پھر اُن میں میں نے محبت کی تحریر بھی پڑھ لی تھی اور آپ کو اُس سے کہیں زیادہ چاہنے لگی تھی جتنا آپ مجھے چاہتے تھے۔ مگر میں آپ کو پیار کا جواب پیار سے کیسے دیتی کیونکہ میں تو کینسر کی مریضہ تھی، اسی لئے میں آپ سے انجان سی بن گئی۔ آخری اسٹیج میں پہنچنے تک آپ کو پُر خلوص دیکھ کر جہاں میرا دل عقیدت و محبت سے جھک جاتا تھا وہاں وہ مجھ سے بغاوت بھی کرنے لگتا تھا۔ میں ڈر کے مارے آنکھیں نہیں کھولتی تھی کہ کہیں آپ کی صورت دیکھ کر دل کے غلبے میں نہ آ جاؤں۔ میں اس ڈر کے مارے آپ سے بات نہیں کرتی تھی کہ کہیں میرے دلی جذبات الفاظ بن کر ہونٹوں سے نہ پھسل پڑیں۔ چنانچہ بے رُخی برتنے کے سوا میرے لئے اور کوئی راستہ نہیں رہ گیا تھا۔ اس طرح میرا دل تو لہولہان ہو رہا تھا مگر مجھے خوشی ہے کہ میں نے آپ کو سراب کے پیچھے بھاگنے سے بچا لیا۔ میں جانتی تھی کہ میں راکھ ہوں آپ ہاتھ ڈالنا چاہتے ہیں اس میں دبی ہوئی چنگاریوں سے گھر کی شمع روشن ہونے کی بجائے آپ کی انگلیاں جل جائیں گی۔

آخری بار آپ نے مجھے سنگدلی کا طعنہ دیا اور اس کے بعد لوٹ کر نہیں آئے۔ مگر میری آنکھیں ہر شام آپ کا رستہ تکتی رہیں۔ یہ بھی آپ کا مجھ پر احسان تھا کہ آپ نے مجھے دل کے فریب سے بچا لیا۔ اب صرف ایک اور احسان کی طالب ہوں۔ وہ یہ کہ اس پگلی لڑکی کو معاف کر دیجئے جو جیتے جی آپ کے پیار کا جواب پیار سے نہیں دے سکی تھی۔

آپ کی گنہگار

ڈلاّ وریز

یہ خط پڑھ کر میں سوچ رہا ہوں کہ سنگدل وہ تھی یا میں۔ کاش مجھے پہلے سے یہ علم ہو جاتا کہ وہ اپنی ذات پر ظلم میری بھلائی کے لئے کر رہی ہے۔ اس کی شخصیت کا یہ پہلو اس کی موت کے بعد میرے سامنے آیا ہے۔ کبھی کبھی اُوپر سے پتھر نظر آنے والی شخصیتیں اندر سے کتنی نرم و نازک ہوتی ہیں اور وہ جو بظاہر ظالم دکھائی دیتے ہیں ان سے زیادہ مظلوم کوئی نہیں ہوتا۔



ســـل

قمر الاسلام عثمانی

فرار

لیلیٰ ایران کے چھوٹے سے شہر یزد کی ایک ستم رسیدہ لڑکی ہے۔ جب وہ تیرہ سال کی تھی تو ایک اجنبی نے جبراً اس کا دامن عصمت داغدار کر دیا پھر مزید ستم یہ کہ جب وہ انیس سال کی ہوئی تو اس کے والدین نے اس کی مرضی اور پسند کے خلاف تقیر نامی ایک گنوار اور کریہہ شخص سے اس کی شادی کر دینا چاہی۔ لیلیٰ اس جبر کے خلاف بہت دل برداشتہ ہو گئی۔ اس کی مایوسی اس قدر بڑھی کہ وہ گھر سے بھاگ نکلی۔ اس کی منزل تہران تھی۔ وہ ابھی سکول ہی میں تھی، اس کا خیال تھا بہت جلد کسی [illegible] ہو کر والدین کے پاس واپس آ کر سرخرو ہو جائے گی۔ [illegible] کی مدد سے وہ قم پہنچی پھر وہاں سے پرویز اور ثریا [illegible] کر تہران پہنچ گئی۔ پرویز اور ثریا لیلیٰ کو اس شرط پر ساتھ رکھنے پر آمادہ ہو گئے کہ لیلیٰ گھریلو کاموں میں ثریا کا ہاتھ بٹائے گی۔ لیلیٰ ثریا کے ساتھ رہنے لگی پرویز کہیں اور رہتا تھا۔ پھر کچھ ہی دنوں بعد لیلیٰ پر یہ انکشاف ہوا کہ ثریا پرویز سے منسوب ہونے کے باوجود بیژن نامی ایک نوجوان سے ناجائز تعلق قائم کئے ہوئے تھی۔ پھر انہی دنوں پرویز [illegible] شامل ہو گیا۔ [illegible] کے باوجود ثریا کو اس کی خبر ہو گئی اور وہ لیلیٰ کی دشمن بن گئی۔ لیلیٰ کو پرویز کی نظروں سے گرانے کے لئے ایک دن ثریا نے بیژن کو [illegible] کی غرض سے لیلیٰ کے پاس بھیجا مگر عین وقت پر پرویز وہاں پہنچ گیا اور اس نے خاصی ہاتھا پائی کے بعد بیژن کو وہاں سے بھگا دیا۔ جاتے جاتے بیژن کی جیب سے [illegible] گر گیا تھا جس سے ایک [illegible] برآمد ہوا جس سے معلوم ہوا کہ بیژن اور ثریا کبھی شوہر اور بیوی رہ چکے تھے اور وہ ایک بچے کے والدین بھی تھے۔ اس انکشاف نے پرویز پر بہت برا اثر ڈالا اور اس کے ساتھ ہی اس نے محسوس کیا کہ اب لیلیٰ کا یہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ اس نے اسی وقت لیلیٰ کو اپنے دوست [illegible] کے ہاں منتقل کر دیا۔ [illegible] ہوئے [illegible] ہی دن ہوئے تھے کہ ثریا لیلیٰ کا تعاقب کرتے ہوئے وہاں پہنچ گئی۔ ثریا نے لیلیٰ پر [illegible] کا الزام لگایا تھا اور [illegible] اسی وقت پولیس اسٹیشن [illegible]۔ اس وقت گھر پر کوئی نہیں تھا مجبوراً لیلیٰ کو تنہا ان کے ساتھ جانا پڑا۔ [illegible]

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] کمال سے رابطہ قائم کیا اور کمال بڑی ہوشمندی سے لیلیٰ کو وہاں سے نکال لے گیا۔ [illegible] [illegible] زندگی گزارنے کے لیے لیلیٰ کو بڑھے جوہری کا سہارا لینا پڑا [illegible] ہسپتال [illegible] اس کے چہرے میں تھوڑی سی تبدیلی آ جائے [illegible] پہچان نہ سکیں۔ [illegible] اس نے اپنا نام بھی تبدیل کر لیا تھا [illegible] ہسپتال ہی میں کمال اس کے ساتھ [illegible] [illegible] کہ اسے ہسپتال سے رخصت کر دیا گیا۔ جوہری نے تہران کے مضافات میں [illegible] ایک حویلی میں اس کی رہائش کا بندوبست کر دیا تھا [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ایک دھماکہ کر دیا۔ اس نے کمال کے سامنے [illegible] کہ ایک نوجوان باہر کھڑا کسی لیلیٰ نام کو پوچھ رہا ہے۔ اس کا کمال پر شدید ردعمل ہوا [illegible] اور وہ مٹھیاں بھینچ کر [illegible] باہر نکلا چلا گیا "ہر دفعہ [illegible] ذبح کر دوں گا۔"

کمال کی اس غیر متوقع حرکت پر لیلیٰ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ مگر شکر ہے کہ کچھ ہوا نہیں۔ پرویز کمال کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی جا چکا تھا۔ پھر اس رات جوہری کوٹھی آیا اور صبح کمال کے ہمراہ واپس چلا گیا۔ جوہری اور کمال گئے ہی تھے کہ لیلیٰ کو دالان میں ایک انگوٹھی پڑی ہوئی ملی۔ انگوٹھی بے انتہا خوبصورت اور گراں قیمت تھی۔ لیلیٰ نے انگوٹھی کو اٹھا لیا اور سوچ میں پڑ گئی کہ کیا کرے۔ پھر اس نے انگوٹھی کو اپنے پرس کے استر میں محفوظ کر دیا۔ کچھ دیر بعد جوہری اور کمال انگوٹھی کی تلاش میں دوبارہ آ پہنچے۔ وہ بے حد پریشان اور سراسیمہ تھے۔ لیلیٰ نے اس انگوٹھی کے بارے میں نہیں بتایا۔ وہ دونوں مایوس اور ناکام واپس چلے گئے۔ ان دونوں کے جانے کے بعد لیلیٰ باہر نکلی تو اس کی ملاقات پرویز سے ہو گئی۔ اس نے پرویز کو بتایا کہ وہ شادی کر چکی ہے اور بڈھا جوہری اس کا شوہر ہے۔ اس بات کا پرویز پر بڑا شدید ردعمل ہوا۔ مگر اس کے باوجود لیلیٰ کے لیے اس کے احساسات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ لیلیٰ نے پرویز کو ٹالنے کے لیے کہا کہ وہ ثریا سے پیچھا چھڑا لے پھر وہ اس کے بارے میں سوچے گی۔ وقت گزرتا رہا۔ پھر ایک دن اچانک ہی لیلیٰ کی ملاقات نوشی سے ہوئی۔ مگر لیلیٰ نے [illegible] سے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ نوشی ہکا بکا رہ گئی۔ اس کی اپنی ایک کہانی تھی۔ خانم کے حرم کدے سے نکلنے کے بعد کچھ اچھی نہیں گزری تھی۔ وہ ایک خطرناک گروہ کے ہتھے چڑھنے کے بعد منشیات کی عادی ہو گئی تھی۔ اب موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ لیلیٰ نے ایک ہمدرد خاتون کی حیثیت سے اس کی مدد کا وعدہ کر لیا۔ پھر لیلیٰ نے نوشی کے علاج کے سلسلے میں ڈاکٹر جمشید کو فون کیا تو حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ اس انگوٹھی کا تعلق اس سے اور اس کی بہن سے ہے اور اس انگوٹھی کی خاطر ان دونوں کے درمیان شدید اختلاف موجود ہے۔ پھر وہیں سے اچانک لیلیٰ کا دماغ گھوم گیا۔ ڈاکٹر سے گفتگو ختم کر لینے کے بعد اس نے کمال کو فون کر کے خانم کا فون نمبر مانگا اور رات کو ٹھیک بارہ بجے اس نے آواز بدل کر خانم کو فون کیا اور بتایا کہ اس کی بھاگی ہوئی لڑکی ثریا کی تحویل میں ہے۔ اس نے غلام کو اغوا کیا ہے اور عنقریب کسی دوسری جگہ فروخت کرنے والی ہے۔

لیلیٰ نے ثریا سے انتقام لینے کی تیاری کی اور ایک ملاقات کے دوران پرویز کو بتا بھی دیا کہ ثریا عنقریب کسی مصیبت میں پھنسنے والی ہے۔ وہ پرویز سے مل کر واپس آئی تو خود اس کے لیے ایک مصیبت تیار کھڑی تھی۔ اس کی الماری پاؤں پاٹ کھلی ہوئی تھی اور کسی نے اس کا وہ پرس پار کر دیا تھا جس کے استر میں اس نے انگوٹھی چھپائی تھی۔ پھر کچھ ہی دیر بعد معلوم ہو گیا کہ اس کا پرس کہاں تھا۔ معلوم نہ ہو سکا کہ [illegible] کس نے پرس اٹھایا تھا۔ لیلیٰ نے سوچا کہ وہ پرس زہرہ نے لیا۔ مگر کمال جو کہ اس وقت وہیں موجود تھا شبہے میں پڑ گیا۔ اس نے جاننا چاہا کہ پرس میں کیا تھا اور



ورقـوزة

لیلیٰ اس سے بے حد خوفزدہ ہو گئی تھی۔ مگر لیلیٰ نے اپنی ذہانت سے کمال کی توجہ دوسری طرف مبذول کرا دی۔ کمال چلا گیا تو لیلیٰ نے افروزی پر سے نگاہ ہٹا کر
سے نکال کر ترنگ کے سہارے گھر پہنچا دی۔ کچھ دیر بعد فرخی کا فون آیا اور لیلیٰ نے دیکھا کہ وہ بہت جلد ڈاکٹر شیخ کے توسط سے علاج کی
غرض سے ڈاکٹر صادق کے کلینک میں داخل کرانے والی ہے۔ وہ لگا تھا جیسے کہ پرویز سے ملنے آیا۔ وہ بہت پریشان تھا۔ اس نے بتایا کہ
خانم اور تقی ثریا کو تلاش کرتے ہوئے اس کے مکان پر گئے تھے۔ انہوں نے ثریا کو بری طرح زدوکوب کیا اور دھمکی دی کہ اس نے فی الفور فلاں
نامی لڑکی کو ان کے حوالے نہ کیا تو اسے بے دردی سے قتل کر دیں گے۔ لیلیٰ یہ سن کر دل ہی دل میں بہت خوش ہوئی مگر اس کی خوشی پر اس وقت اوس
پڑ گئی جب پرویز نے غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں پوچھا کہ اسے کیسے معلوم ہوا تھا کہ ثریا پر عنقریب مصیبت آنے والی ہے
اور خود لیلیٰ کا اس ڈرامے میں کیا کردار تھا۔ لیلیٰ پرویز کے سوال پر ہکا بکا رہ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دے۔

اگلے لمحے لیلیٰ نے خود کو سنبھال لیا اور بڑی خوبصورتی سے پرویز کا ذہن دوسری طرف ڈال دیا۔ پھر اس نے ثریا کے سلسلے میں چند ضروری
ہدایات کیں اور رخصت ہو کر گھر آ گئی۔ مگر یہاں کمال نے صورت حال کی اطلاع دی۔ جوہری کو اب تک یہ پتہ چل گیا تھا۔ لیلیٰ کو اس اطلاع پر یقین نہ آیا۔ اس
نے کمال کو تو واپس بھیج دیا مگر خود معلومات حاصل نہ کر سکی۔ دوسرے دن اسے فرخی کو ہسپتال میں داخل کرانے کے لیے تہران جانا پڑا۔ واپسی پر اسے پتہ
چلا کہ کمال اس کے گھر سے غائب تھا اور ترنگ بھی اور دونوں کا کچھ پتا نہ تھا۔ اس صورت حال سے لیلیٰ کو سخت
پریشانی ہوئی۔ بعد میں پتہ چلا کہ کمال سارا فرنیچر ٹرک پر لاد کر کہیں لے گیا تھا۔ فون پر اس نے کمال سے استفسار کیا مگر کمال اس
سلسلے میں ٹال گیا۔ لیلیٰ کو اندازہ تھا کہ وہ سب بتا سکتا تھا اب یہ فکر بھی لگ گئی کہ جوہری اس طرح کہیں اور کمال روپوش ہو گیا تھا۔ وہ یہ بھی معلوم کرنا
چاہتی تھی کہ کمال فرنیچر کہاں لے گیا تھا مگر یہ معلوم کرنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ اس کی الجھنیں یہیں تک نہیں تھیں کہ ایک دن اسے مزید ایک
دھچکا ہوا۔ خانم نے ایک خط تحریر کیا تھا۔ خط کی تحریر سے معلوم ہوا کہ محسن نامی کوئی شخص فرخی کا عاشق تھا اور لیلیٰ کے توسط سے اس سے ملنا
چاہتا تھا۔ اس نے اپنی ان سطروں میں لیلیٰ کو دھمکی دی تھی کہ اگر اسے فرخی سے ملوایا تو اس کے حق میں اچھا نہ ہو گا۔ خط پڑھ کر لیلیٰ نے فیصلہ کیا کہ وہ محسن سے
ضرور ملاقات کرے گی۔ اسی دوران اس نے فون کر کے فرخی سے محسن کے بارے میں تصدیق کر لی۔ گفتگو سے اندازہ ہوا کہ فرخی محسن کو پسند کرتی تھی لیکن
کہ خود لیلیٰ نے ظاہر کیا کہ وہ محسن سے ملنا چاہتی ہے مگر ابھی دو دن گزرے تھے کہ محسن کا کچھ پتہ نہ چلا۔ ایک دن پرویز نے لیلیٰ کو ثریا کا پیغام موصول ہوا۔ اس نے بتایا کہ ثریا
کو بلا خانم سے ملنا ہو گا۔ وہ بہت پریشان ہے اور کہیں جانا چاہتی ہے۔ لیلیٰ نے پرویز کو ہدایت کی کہ وہ ثریا کی نگرانی کرے۔ اگر وہ پرویز
کو ساتھ لے جانا چاہے تو پیچھا کرے۔ پھر اسی رات لیلیٰ بستر پر لیٹی تو اچانک دروازے کی گھنٹی بجی۔ اس نے دروازہ کھول کر دیکھا اس
کے سامنے ایک خوبصورت اور خوش پوش نوجوان مسکرا رہا تھا۔

وہ خوبصورت نوجوان محسن تھا۔ وہ فرخی پر مرتا تھا اور لیلیٰ کے ذریعے فرخی سے ملنے کا خواہاں تھا۔ لیلیٰ نے پہلے تو انکار کیا مگر پھر
محسن کی خواہش و دھمکی پر فرخی سے ملانے پر آمادہ ہو گئی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی ایک شرط بھی رکھ دی۔ اس شرط کے تحت محسن
کو جوہری کی خفیہ پناہ گاہ کا پتہ لگانا تھا اور اس کام کے بعد فرخی کو تلاش کر کے واپس لانا تھا۔ محسن فوراً آمادہ ہو گیا۔ صبح لیلیٰ نے ہسپتال فرخی کو
فون کیا اور باتوں باتوں میں محسن کے بارے میں پوچھا۔ فرخی نے واضح طور پر اقرار نہیں کیا مگر اس کے لہجے سے معلوم ہوا کہ وہ محسن میں دلچسپی رکھتی تھی۔
اور محسن پیچھے کے اقتباسات بھی ہوئے کہ بالکل اچھا آدمی تھا۔ کچھ دن بعد محسن نے لیلیٰ کو فون کر کے تہران میں ایک مخصوص جگہ ملنے کو کہا۔ لیلیٰ
وہاں پہنچی تو محسن نے اسے کچھ ہدایات دے کر جوہری کے خاص کمرے میں بھیجا۔ جوہری اسے دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ مگر لیلیٰ نے کمال ہوشیاری سے
اسے مصروف کر دیا۔ اس دوران محسن دوسرے کمرے سے فرخی سے ملا۔ کچھ دیر بعد لیلیٰ واپس ہوئی تو اس کا تعاقب کیا گیا۔ وہ محسن کے بتائے
ہوئے خفیہ مقام تک تعاقب کرنے والوں کو لے گئی۔ مگر محسن کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ وہ جیسے غائب ہو گیا تھا۔ وہ فرخی کو لیلیٰ کے گھر لاتے ہی یہیں آ گیا۔ دوسرے دن
پرویز نے لیلیٰ کو فون پر بتایا کہ ثریا کا کوئی سراغ نہیں مل رہا ہے۔ لیلیٰ نے اس سے کہا کہ وہ ثریا کا تعاقب کرے اور دیکھے کہ کہاں جاتی
ہے۔ مگر پرویز نے بے چینی کا اظہار کیا۔ لیلیٰ کو غصہ آ گیا۔ چنانچہ لیلیٰ نے فیصلہ کیا کہ وہ خود یہ کام انجام دے گی۔ دوسرے دن علی الصبح وہ تہران پہنچ گئی
اس نے ثریا کے دروازے پر دستک دی۔ پھر کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور ثریا اس کے سامنے کھڑی تھی۔

لیلیٰ نے ثریا کو باور کرا دیا کہ وہ گمشدہ لیلیٰ کی بہن ہے اور اس کی تلاش میں نکلی ہے۔ ثریا نے گفتگو کے دوران لیلیٰ کو محسوس ہوا کہ اندر کوئی کمرے
میں کوئی چھپا ہوا ہے۔ چنانچہ رخصت ہونے کے بعد لیلیٰ کچھ دور ایک محفوظ مقام پر پوشیدہ ہو گئی۔ کچھ دیر بعد ثریا کے مکان سے ایک عورت اور ایک لڑکا
نکلے۔ لیلیٰ نے اندازہ کر لیا کہ وہ ثریا کا بیٹا تھا۔ پھر جانے سے اس نے عورت اور لڑکے کو اپنی گاڑی میں بٹھا لیا۔ وہ گاڑی سے اتر جانے کے بعد بھی ان کا تعاقب
کرتی رہی اور ان کا پتہ معلوم کر کے دم لیا۔ جب پرویز کا فون آیا تو لیلیٰ نے تعاقب کی پوری روداد سنا دی۔ اور اس پر زور دیا کہ اب وہ ثریا کے سلسلے میں اپنے
وکیل سے بات کرے۔ پرویز کے جانے کے بعد محسن نے فون کیا۔ وہ فرخی سے ملنے کے لیے بیتاب تھا۔ لیلیٰ نے تھوڑے تامل کے بعد اسے فرخی سے ملانے ہسپتال

ہے گئی۔ زرشی اور محسن کی ملاقات سے لیلی نے اندازہ کیا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ وہ ڈاکٹر جمشید کا شکریہ ادا کر کے اس کے کلینک
روانہ ہو گئی۔ کلینک کے دروازے پر اس کا ٹکراؤ ایک شخص یعنی ایک خوبصورت نوجوان سے ہو گیا۔ دونوں کے درمیان دلچسپ نوک جھونک ہوئی۔ لیلی
ڈاکٹر جمشید کے کمرے میں پہنچی تو یہ دیکھ کر چونک گئی کہ وہی نوجوان ڈاکٹر کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے اس کا تعارف کرایا تو وہ حیران رہ گئی۔

وہ نوجوان ڈاکٹر جمشید کا بھائی فرہاد تھا۔ [illegible]
ہو گئے۔ فرہاد نے اشاروں میں ظاہر کیا کہ وہ لیلی کی محبت میں گرفتار ہو گیا ہے اور شادی کا خواہاں ہے۔ لیلی نے فرہاد کو [illegible] کا اظہار
نہیں کیا۔ پھر ایک دن فرہاد نے لیلی کو فون پر بتایا کہ اس نے ڈاکٹر صاحب کو بتا دیا ہے اور وہ بہت جلد شادی کرنے والے ہیں۔ اس [illegible] لیلی پر
بہت بڑا اثر ہوا۔ وہ گم صم سی ہو گئی۔ زندگی اسے خالی خالی اور ویران نظر آنے لگی۔

اسی شب لیلی کو فرہاد نے فون کیا اور وہ پھر سے اس کی منزل وہی تھا۔ اس سے ملاقات کے بعد پتہ چلا کہ وہ بہت سنجیدہ
ہے اور اس سے شادی کا خواہاں ہے۔ لیکن لیلی کو اس کے ڈاکٹر بھائی کی مخالفت کا یقین تھا۔ جو درست نکلا۔ ڈاکٹر نے اس معاملے میں لیلی سے بات
کرنا چاہی۔ لیلی اس سے ملنے کلینک جا رہی تھی کہ اسے تعاقب کا خطرہ محسوس ہوا۔ تعاقب کو جھکائی دیتا تھا۔ لیلی تیزی سے گاڑی چلاتی کلینک پہنچی
جہاں ڈاکٹر نے اسے فرہاد سے شادی کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ لیلی نے ڈاکٹر کو ترکی بہ ترکی جواب دے کر لاجواب کر دیا۔ کلینک سے نکلتے وقت اسے
فرہاد مل گیا۔ اس کے ساتھ وہ باہر نکلی تو تعاقب اور خانم اس کا مسلسل تعاقب کر رہے تھے۔ لیلی نے فرہاد سے گاڑی کی رفتار بڑھانے پر اصرار کیا اور اچانک
تعاقب اور خانم کی گاڑی ٹرک سے ٹکرا گئی اور وہ دونوں شعلوں کی لپیٹ میں آ گئے۔ لیلی نے فرہاد کو اپنی پوری کہانی سنا دی جس سے فرہاد کی محبت
دو چند ہو گئی۔ مگر اب وہ اپنی شادی پر بھائی کی مخالفت سے پریشان تھا۔ لیلی نے تسلی دی اور بتایا کہ اس کا بھائی اس کے کام میں ہے وہ راضی
ہو جائے گا۔ فرہاد متحیر ہو گیا۔ (اب اس کہانی کی آخری قسط پڑھئے)



فرہاد کی آنکھوں میں سوالات مچل رہے تھے۔ وہ نظروں ہی نظروں میں مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ میں کس طرح ڈاکٹر جمشید کو قائل کر سکوں گی۔ مگر میں فی الوقت کچھ بتانے کے موڈ میں نہیں تھی۔ کچھ کر کے ہی دکھانا چاہتی تھی۔ بڑی خوبصورتی سے فرہاد کو ٹال گئی اور آئندہ ملاقات کا پیمان کر کے ہم ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔

گھر پہنچی تو بہت ہشاش بشاش تھی۔ دبا دبا سا جوش بھی تھا ڈاکٹر جمشید کو شکست دینے اور فرہاد کو جیتنے کا۔ اب اگر فرہاد خود ہی شادی سے انکار کرے تو اور بات ہے ورنہ روئے زمین پر کوئی طاقت مجھے فرہاد کو حاصل کرنے سے روک نہ سکتی تھی۔ زہرہ کو چیونگم کا ایک پیکٹ دیا اور گنگناتی ہوئی اپنے کمرے میں داخل ہو گئی۔ میں کافی دنوں بعد گنگنائی تھی۔ زہرہ اور زینت مجھے حیرت سے دیکھنے لگیں۔ مجھے اچانک جوہری کا خیال آیا۔ فرہاد اور ڈاکٹر جمشید کے چکر میں تو بیچارے کو بھلا ہی بیٹھی تھی۔ جانے کہاں چھپا بیٹھا تھا اور کیا کر رہا تھا۔ ممکن ہے اس نے پہلے والی جگہ تبدیل کر دی ہو اور کسی دوسری جگہ روپوش ہو گیا ہو مگر وہ اس طرح کب تک چھپا رہ سکے گا۔ اس کی جان کب تک بچی رہے گی۔ وہ زینب کی طرف بڑی ادا سے مخاطب ہو کے بولی "میرا خیال ہے جوہری کسی بڑی مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہے۔"

"ہاں خانم! مجھے معلوم ہے۔ سنا ہے کہ وہ شرفاکو کی ملکیت کے جواہرات لے کر بھاگ رہا تھا جو کہیں راستے میں گم ہو گئے۔ اب جواہرات کے مالکان اس کی تلاش میں ہیں۔ مل جائے تو جانے کیا حشر کریں۔ دوسری بات جو اور بھی خطرناک ہے وہ یہ ہے کہ جوہری جواہرات کا اسمگلر ہے۔ حکومت بھی اس کی تاک میں ہے۔ جب بھی قانون کے ہتھے چڑھا وہ اس کا آخری دن ہو گا۔" زینب ہمدردی میں کہہ گئی۔ اسے اپنی غلطی کا احساس بھی نہ ہو سکا۔ مگر جوہری کے اسمگلر ہونے کا انکشاف میرے لئے ایک دھماکہ تھا۔ میں اپنی جگہ ساکت و جامد رہ گئی۔ یہ بات تو میرے ذہن میں دور دور تک نہ تھی کہ جوہری وہ نہیں ہے جو نظر آتا ہے۔ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ کوئی ایسی بات جو مجھے نہیں معلوم اور وہ بات کیا تھی۔ آج زینب نے بڑی سادگی سے مجھے بتا دی تھی۔ میں سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ جوہری اسمگلر ہو گا۔ جوہری اسمگلر ہے تو کل یقیناً اس کا دست راست ہو گا۔

دونوں ہی کریہہ کالا دھندا چلا رہے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے
رازدار تھے اور شاید دونوں اسی وجہ سے ایک دوسرے کے ساتھ
رہنے پر مجبور تھے۔ پھر میرا سارا وقت ان دونوں کے بارے میں سوچتے
ہوئے گزر گیا۔

صبح حسبِ معمول دیر سے سو کر اٹھی۔ غسل خانے میں نہا
رہی تھی کہ باہر کسی مرد کی آواز سنائی دی۔ شاور سے گرتے ہوئے پانی
کے شور میں وہ آواز واضح طور پر نہیں سنائی دی تھی مگر اتنا اندازہ ضرور
ہو گیا تھا کہ وہ کوئی مرد تھا اور میری خوابگاہ میں تھا۔ میں نے شاور بند
کر دیا۔ ہاں کوئی میری خوابگاہ ہی میں تھا۔ آخر وہ کون تھا۔ کمال
تو نہیں ہو سکتا تھا، کیونکہ میں نے اسے اپنی خوابگاہ میں داخل ہونے
سے منع کر دیا تھا۔ میں نے لاپروائی سے سر کو جھٹکا دیا اور شاور کھول
کر دوبارہ نہانے لگی۔

کچھ دیر بعد غسل خانے کے دروازے پر دستک سنائی دی
میں نے پھر شاور بند کر دیا۔ خدایا یہ کون تھا۔ کمال ہو نہیں سکتا تھا۔
جوہری جان کے خوف سے کہیں چھپا بیٹھا تھا۔ پرویز کا سوال ہی نہیں
پیدا ہوتا تھا۔ فرہاد میں اس قدر ہمت نہیں تھی اور زینب یا زہرہ نے
کبھی ایسی حرکت نہیں کی تھی۔ وہ بڑی دلچسپی سے میرا غسل خانے سے
نکلنے کا انتظار کرتی رہتی تھیں۔

میں دروازے کے قریب گئی اور قدرے برہمی سے پوچھا،
"کون ہے؟"

"دروازہ کھولو خانم! میں تمہیں نہاتے ہوئے دیکھنا چاہتا
ہوں۔" دوسری طرف سے جواب آیا اور میں ششدر رہ گئی۔ یہ جوہری تھا
جس کی آمد تو قطعی غیر متوقع تھی۔ میں دیر تک خاموش کھڑی رہی۔
میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دوں، کس ردعمل کا اظہار کروں۔ دروازہ
کھول کر اسے اندر آنے دوں یا لباس پہن کر باہر چلی جاؤں۔ سوچ بچار
میں کئی لمحے گزر گئے۔ جوہری کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ "دروازہ کھولو
ہیرا! یہ میں ہوں۔ جوہری! اتنی دور سے صرف تمہیں دیکھنے آیا ہوں
جلدی سے دروازہ کھولو تاکہ میں اندر آ سکوں۔"

اب مجھے کچھ حوصلہ ملا۔ اپنے سراپے پر نظر ڈالتی ہوئی بولی
"میں، اس وقت میرے جسم پر کوئی کپڑا نہیں ہے۔ بالکل برہنہ ہوں
خوابگاہ میں انتظار کرو میں کپڑے پہن کر آتی ہوں۔"

"جانتا ہوں کہ عریاں ہو، اسی لئے تو اندر آنا چاہتا ہوں
میرے سامنے برہنہ ہوتے ہوئے شرم آ رہی ہے۔ یہ تو مجھ سے
خدا جانے کب سے لگی ہو۔ خدا کے لئے جلدی دروازہ کھولو
مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا۔"

میں دروازے سے لگی کھڑی رہی اور جوہری گڑگڑاتا
گیا۔ حتیٰ کہ اس کے لہجے سے غصہ جھلکنے لگا۔ میں نے سوچا
نہ بگڑ جائے۔ ابھی اس کی ناراضگی مناسب نہیں تھی، ابھی
ضرورت تھی۔ مجھے اس سے کئی کام لینے تھے۔ جہاں اتنا برداشت
کیا وہاں تھوڑا اور سہی۔ میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی اور ایک
تولیہ اٹھا کر جسم کے گرد لپیٹ لیا۔ پھر لہجے میں نرمی پیدا کرتی
"دروازہ کھولتی ہوں مگر ایک شرط ہے۔"

"کون سی شرط؟" جوہری بے صبری سے بولا۔

"یہی کہ تم خود کو اچھا آدمی ثابت کرو گے اور مجھے پریشان
کرو گے۔"

جواب میں جوہری کے ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ میں
دروازے کا لاک آہستہ سے گھمایا اور دروازے کا ایک پٹ ذرا سا
دیا۔ جوہری نے ایک نظر مجھے دیکھا اور دروازہ ایک دھکے سے
پاٹوں پاٹ کھول کر اندر آ گیا۔ اس کی سانس بری طرح پھول رہی
اور بوڑھی آنکھوں میں حیوانی چمک تھی۔ وہ دیر تک مجھے گھورتا
رہا۔ نظروں ہی نظروں میں سیراب ہوتا رہا۔ پھر میرے قریب آیا
اور میرے شانے اور گردن کے خم پر شہادت کی انگلی پھیرنے لگا۔

"آج میں تمہیں نہلاؤں گا۔" یکایک جوہری بولا۔

"میں قلوپطرہ نہیں اور نہ تم سیزر۔ لہٰذا مجھے نہانے ہی دو۔" میں
مسکراتے ہوئے بولی۔

"میری نگاہ میں تم قلوپطرہ سے بہت بڑی ہو۔" جوہری نے
کہا اور میرے سنبھلنے سے پہلے تولیہ میرے جسم سے کھینچ کر دور پھینکا۔
جوہری مجھے دیر تک نہلاتا رہا۔ اپنے کمزور اور ناتواں ہاتھوں
سے مساج کرتا رہا۔ وہ بے چارہ مردِ کب تھا۔ بے ضرر آدمی تھا۔
بس ایک بڑھاپے کی ہوس تھی، نظروں کی بھوک تھی جسے وہ تسکین
دے رہا تھا۔ دیکھا جائے تو بے چارے بوڑھے لوگ بہت اچھے
اور بہترین انسان ہوتے ہیں، دیتے بہت ہیں اور لیتے کچھ نہیں۔

کوئی آدھ پون گھنٹے بعد ہم غسل خانے سے باہر نکل آئے
اور ناشتے کی میز پر جا بیٹھے۔ جوہری نے بے تکان بولنا شروع کر دیا
موضوع وہی تھا جو عمر نابرابری کا نوجوان اور خوبصورت لڑکیوں
کی موجودگی میں ہوتا ہے۔ میں نے بھی سمجھ لیا وہ آج رات یہیں

ہو جائے (اس میں حرج بھی کیا تھا وہ کوئی کمال لڑکا تو نہیں) مگر اس نے انکار کر دیا اور کہا کہ اسے فی الفور واپس جانا ہے۔ میں نے مصنوعی خفگی سے کہا "یہ جلدی جانا تھا تو آئے ہی کیوں تھے۔ تمہیں کیا معلوم میں تنہائی کی آگ میں بری طرح جل رہی ہوں۔"

جوہری خوش ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں مسرت اور خوشی کی ایسی چمک نمودار ہوئی جو عموماً کسی نوجوان کی آنکھوں میں اس وقت ابھرتی ہے جب اس کی محبوبہ اس سے دلچسپی کا اظہار کرتی ہے۔ جوہری نے ہاتھ بڑھا کر میری داہنی کلائی پکڑ لی اور کانپتی ہوئی آواز میں بولا "میں اسی لئے آیا تھا کہ تمہیں تنہائی سے نجات دلا دوں۔"

"اچھا، وہ کس طرح۔" میں نے لہجے کو پر شوق بناتے ہوئے پوچھا۔

جوہری نے چائے کی پیالی میز پر رکھ دی اور ذرا آگے کی طرف جھکتے ہوئے معنی خیز لہجے میں بولا "میں آج کل ایک چکر میں گرفتار ہوں۔ اس وقت موقع نہیں ہے کبھی تفصیل سے بتاؤں گا۔ مختصراً یہ سن لو کہ کچھ عرصے کے لئے سفر پر جا رہا ہوں، اب یہ دل پوچھنا کہ ہم کہاں جائیں گے۔"

"ہم یعنی کہ۔۔۔" مارے حیرت کے میں جملہ پورا نہ کر سکی۔

"ہاں ہم دونوں ساتھ جائیں گے۔ میرا جی چاہتا ہے تم ہمیشہ میرے ساتھ رہو۔" جوہری بڑے اطمینان سے بولا۔

میرا تو جیسے دم گھٹ کر رہ گیا۔ مجبوری کی اور بات ہے۔ برضا و رغبت تو اس شخص کو چند گھنٹے بھی برداشت نہ کیا جا سکتا تھا۔ اس کی قربت کے تصور سے ہی وحشت ہونے لگتی تھی۔ کسی بڈھے اور ناکارہ شخص کے ساتھ زندگی گزارنا ایک مستقل عذاب ہوتا ہے۔ خواہ کوئی دولت و جواہرات کے انبار ہی لگا دے۔ جوہری جیسے شخص کے ساتھ طویل عہد و پیمان نہیں کیا جا سکتا تھا۔

"ہم کس حیثیت سے سفر کریں گے؟" میں نے سرسری طور پر پوچھا۔

"دو دوست کی حیثیت سے۔" جوہری نے جواب دیا۔

میرے ذہن میں فوراً ایک خیال آیا۔ زینب نے اشارہ کیا تھا کہ جوہری جواہرات کا اسمگلر ہے۔ کیا عجب جو وہ مجھے اسمگلنگ کے سلسلے میں بطور چارہ استعمال کرنا چاہتا ہو۔ شاید وہ میرے توسط سے سونا اور جواہرات باہر لے جانا چاہتا ہے۔ ایک اسمگلر کی حیثیت سے وہ انٹرپول کی نظروں میں ہوگا، چنانچہ وہ خود خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ البتہ میرا چہرہ پولیس کے لئے نیا چہرہ ہوگا۔ پولیس مجھ پر شبہ بھی نہ کر سکے گی اور جوہری کا کام بن جائے گا۔ اس مفروضے کی کڑیاں ملیں بھی تو جوہری کا بال بھی بیکا نہ ہوگا خواہ مجھ سے اس کا تعلق ظاہر ہو گیا۔ جوہری کو مجھ سے کیا ہمدردی ہو سکتی تھی۔ اسمگلر کسی کے نہیں ہوتے۔ گویا جوہری مجھے داؤں پر لگا رہا تھا۔ اس نے مجھے اسی مقصد کے لئے پالا تھا۔ میں قربانی کا بکرا تھی۔ اس نے مجھ پر جو کچھ خرچ کیا تھا ایک ٹرپ میں اس سے دگنا تگنا کمائے گا۔ نہیں جوہری صاحب میں اس قدر بے وقوف اور احمق نہیں ہوں۔ زمانے نے بہت کچھ سکھا دیا ہے۔ تمہاری یہ چال کارگر نہ ہو سکے گی۔ مگر یہ باتیں جوہری پر ظاہر نہیں کی جا سکتی تھیں اور جوہری سے کلی طور پر انحراف کرنا بھی مناسب نہیں تھا۔

"مگر لوگ ہمیں ایک ساتھ دیکھ کر کیا کہیں گے، سوچیں گے کہ میں تمہاری داشتہ ہوں۔ یہ بات میرے حق میں بری ثابت ہوگی۔ پھر شاید میں کبھی شادی نہ کر سکوں۔" میں سنبھلتے ہوئے بولی۔

"میرے پاس اس کا حل موجود ہے۔ میں نے ہر پہلو پر غور کر لیا ہے۔" جوہری نے بڑے اطمینان سے کہا۔ "تمہیں ہر قسم کی بدگمانی اور شبہ سے بچانے کے لئے ہم الگ الگ سفر کریں گے۔ میں تمہیں کسی بہانے سے تیونس بھیجوں گا۔"

"تیونس کہاں ہے؟" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

"شمالی افریقہ میں۔"

"سنا ہے افریقی وحشی اور آدم خور ہوتے ہیں۔"

"پرانی بات ہے۔" جوہری ہنستے ہوئے بولا۔ "اب افریقہ وہ پہلے والا افریقہ نہیں رہا۔ آدم خور مہذب اور متمدن ہو گئے ہیں۔ اس کے علاوہ تم کسی قبیلے کے درمیان نہیں رہنے جا رہی ہو۔ تیونس اچھا خاصا ترقی یافتہ ملک ہے وہاں عرب آباد ہیں اور مذہباً مسلمان ہیں جیسے کہ ہم ہیں۔ میں تمہیں ہوائی جہاز کے ذریعے تیونس یا الجزائر یا مراکش بھیجوں گا۔ پھر تم ایئرپورٹ سے سیدھے کسی ایسے ہوٹل میں جاؤ گی، جہاں کہ تمہارے لئے پہلے ہی ایک کمرہ ریزرو کرایا جا چکا ہوگا۔ تم وہاں اس وقت تک ٹھہرو گی جب تک کہ میں خود نہ پہنچ جاؤں۔ پھر اس کے بعد ہم ہیں اور زندگی کے شاندار لمحات، دولت ہو اور فرصت ہو تو آدمی کیا نہیں کر سکتا۔ میں تمہیں سارا شمالی افریقہ دکھاؤں گا۔ تمہیں نہیں معلوم کہ وہ خطہ کس قدر خوبصورت ہے۔"

اب مجھے جوہری کے اسمگلر ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہا۔ وہ جو کچھ مجھ سے چھپا رہا تھا اس کی گفتگو نے ظاہر کر دیا تھا۔ وہ اپنے تیئں

مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش ہو رہا تھا۔ اس کی دانست میں میں اس کے جال میں آ گئی تھی مگر میں اتنی سادہ لوح بھی نہیں تھی۔ کھل کر مخالفت کرنا مصلحت کے خلاف تھا۔ چنانچہ بات کو گھماتے ہوئے بولی "افسوس کہ میں اس دلچسپ سفر سے لطف اندوز نہ ہو سکوں گی۔"

"کیوں؟" جوہری نے مجھے بڑی عجیب نظروں سے دیکھا۔

"اس لئے کہ میں ایک ایسے مرض میں گرفتار ہوں جس کی وجہ سے طول طویل سفر کو برداشت نہ کر سکوں گی۔ ممکن ہے راستے ہی میں مر جاؤں۔ میں ابھی مرنا نہیں چاہتی۔ مرنے سے پہلے چاہتی ہوں کہ اپنے خاندان کی نظروں میں سرخرو ہو جاؤں۔"

"تو اب کونسی روسیاہ ہو؟" جوہری قدرے سخت لہجے میں بولا۔

"کچھ دنوں میں کوئی قاعدے کا شوہر نہ مل سکا تو ہمیشہ کیلئے روسیاہ ہو جاؤں گی۔ میرے خاندان کے لوگ مجھ پر ہمیشہ نفریں بھیجتے رہیں گے۔"

"میں شادی کرنے کے لئے تیار ہوں۔ مجھ سے شادی کر لو۔"

جوہری نے بے دھڑک کہا۔ میرے اوسان خطا ہو گئے۔ مجھے جوہری سے اس پیش کش کی امید نہیں تھی۔ سوچنے کی بات ہے میں آقا میر سے بچ کر بھاگی تھی اور یہاں یہ سڑا سانپ جوہری میرے گلے پڑ رہا تھا۔ لیلیٰ کے لئے اس سے مضحکہ خیز بات اور کیا ہو سکتی تھی۔ میں نے دولت و ثروت کی تمنا ضرور کی تھی۔ بہترین اور پر آسائش زندگی کا خواب دیکھا تھا مگر یہ چیزیں ایک اچھے شوہر کا بدل نہیں ہو سکتی تھیں۔ زندگی میں سب کچھ ہو مگر اپنی مرضی اور پسند کا مرد میسر نہ ہو تو سب بیکار ہے۔ سونے چاندی کی چار دیواری میں مقید ہو کر تنہائی اور بے بسی کی موت مر جانا کہاں کی دانائی ہے۔ سونا چاندی زر و جواہرات اضافی اور ثانوی چیزیں ہیں۔ اصل چیز تو دل کا رشتہ ہے۔ آدمی کو آدمی کی ضرورت ہوتی ہے اور میں اسی آدمی کی تلاش میں پنڈ سے نکل بھاگی تھی، جو جوہری میرا آدمی نہیں ہو سکتا تھا۔ نہیں نہیں جوہری میرا گوہر مقصود نہیں تھا۔ میں نے اتنی اونچی پرواز اس لئے نہیں کی تھی کہ مال دار جوہری جیسے انسان کی گود میں آ گروں۔ اگر ایسا ہی تھا تو وہ اجڈ گنوار آقا میر ہی کیا بُرا تھا۔

اگر میں آزاد اور خود مختار ہوتی تو ایک چانٹا اس بوالہوس بڈھے کے چہرے پر جڑ دیتی مگر افسوس کہ بہر وہی مجبوری آڑے آ گئی۔ بار بار مصلحت کو پیش نظر رکھنا پڑتا تھا۔ خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتی تھی۔ صاف طور پر انکار کرتی تو جوہری مشتعل ہو کر میرے خلاف جانے کیا کر بیٹھتا۔ میں چاہتی تھی کہ سانپ مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ مگر یہ کس طرح ممکن ہو سکتا تھا۔

جوہری غور سے میرے چہرے اور اس کی کیفیات کا جائزہ لے رہا تھا۔ میری طویل خاموشی پر اس کی آنکھوں سے ناگواری مترشح تھی۔ اب مزید تاخیر مناسب نہیں تھی۔ میں نے پہلو بدلا اور چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ طاری کرتے ہوئے بولی "شادی بیاہ کے معاملات اتنی آسانی سے طے نہیں پا جاتے۔ زندگی بھر کا معاملہ ہوتا ہے۔ تم میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے، بھرپور اور بہترین شوہر ثابت ہو گے تاہم مجھے سوچنے کے لئے کچھ وقت درکار ہے۔ امید ہے کہ تم بُرا نہیں مانو گے۔"

"نہیں بُرا ماننے کی کیا بات ہے۔ سوچو اور اچھی طرح سوچو بس یہ بتا دو کہ کتنے دنوں میں فیصلہ کر لو گی؟" جوہری مصنوعی ہنسی کی نمائش کرتے ہوئے بولا۔

"کم از کم بیس دن کی مہلت چاہیئے۔" بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا اور اس کے ساتھ ہی مجھے افسوس ہوا کہ یہ میں نے کیا حماقت کی۔ زیادہ وقت لینا چاہیئے تھا۔ اس عرصہ میں اپنی نجات کی کوئی بہتر راہ نکال لیتی۔ مگر اب جو ہو گیا تھا اس میں الٹ پھیر جوہری کو شبہے اور بدگمانی میں ڈال دیتی۔

"ٹھیک ہے، بیس دن ہی سہی، بلکہ میری طرف سے ایک دن اور لے لو۔ پورے تین ہفتے ہو گئے، میں تمہارے فیصلے کا بے چینی سے انتظار کروں گا۔ مجھے یقین ہے کہ تم دوراندیشی سے کام لو گی اور زندگی کا ایک بہترین اور سنہرا موقعہ ہاتھ سے جانے نہ دو گی۔" جوہری آسودگی سے مسکراتے ہوئے بولا۔

جوہری چلا گیا۔ میں بیم و رجا اور سود و زیاں کے اندیشوں میں گھر گئی۔ بڑی مشکل آ پڑی تھی۔ یہ میری زندگی کا نازک ترین موڑ تھا۔ میری ذرا سی عجلت اور غفلت مجھے ہمیشہ کے لئے ڈبو سکتی تھی۔ بیس دن کے اندر اندر مجھے جوہری سے چھٹکارا حاصل کر لینا تھا مگر کس طرح، یہی بات سوچنا ہے۔

مجھے فرہاد یاد آ گیا۔ اگر حالات نے موافقت کی اور فرہاد آنے والے بیس دنوں میں میرا ہو گیا تو جوہری میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ ؟ بیس دن کے اندر اندر میری شادی ہر حال میں ہو جانی تھی یا فرہاد

ہوئی ہے۔

میرا سارا وقت سوچتے ہوئے گزر گیا۔ بستر پر خاموش پڑی رہی پر کھانا بھی نہ کھایا گیا۔ زینب میری اس کیفیت سے پریشان ہو گئی تھی۔ وہ دبے پاؤں میرے کمرے میں داخل ہوئی اور قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ خاصی دیر تک مجھے محبت بھری نظروں سے دیکھتی رہی، پھر ہمت کر کے میرے سرہانے بیٹھ گئی اور میرے سر کو سہلاتے ہوئے مشفقانہ لہجے میں بولی "خانم تم واقعی جوہری سے شادی کرنے جا رہی ہو؟"

میں نے سر اٹھا کر زینب کی طرف دیکھا اور اس کے ساتھ ہی میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ زینب نے شہادت کی انگلی سے میرے آنسو پونچھے اور محبت سے بھرپور لہجے میں بولی "میں آغائے جوہری کی ملازمہ ہوں مگر جانے کیوں تم سے انسیت ہو گئی ہے، شاید اس لئے کہ تم اس مکان میں آنے اور رہنے والی عورتوں سے بہت مختلف ہو۔ ظاہر میں تم کچھ بھی ہو مگر اندر سے بہت معصوم ہو۔ میں حیران ہوں کہ تم جوہری کے چنگل میں کیسے آ پھنسیں۔ مگر اس میں حیرانی کی بھی کیا بات ہے۔ جوہری تو معصوم اور سادہ دل لڑکیوں کو پھانسنے میں ماہر ہے۔"

زینب نے اس انداز میں مجھ سے کبھی بات نہیں کی تھی۔ اس کی محبت پا کر میرا دل بھر آیا۔ اس نے میرے زخم پر انگلی رکھ دی تھی میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ زینب مجھ پر اور جھک آئی اور محبت سے میری پیٹھ سہلانے لگی، میں اس محبت کو سہار نہ سکی۔ میری ہچکیاں بندھ گئیں اور جسم بری طرح کانپنے لگا۔ زینب فوراً اٹھی اور جا کر پانی کا گلاس لے آئی۔ پانی پیا تو کچھ قرار آیا۔ پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ زینب کی طرف دیکھنے لگی۔

زینب نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور ہتھیلی کی پشت کو سہلاتے ہوئے نرمی سے بولی "خانم! تم جوہری سے ہرگز شادی نہ کرنا اور اس کے ساتھ کہیں باہر جانے کا خیال تو دل سے ہی نکال دو۔ اب تک کئی عورتیں جوہری کے چکر میں ملیامیٹ ہو چکی ہیں۔ جو عورت اس کے ساتھ باہر گئی کبھی لوٹ کر نہ آئی۔ خدا جانے ان عورتوں کا کیا حشر ہوا۔ سب میں تمہیں کیا بتاؤں کہ ان دو آنکھوں نے اس گھر میں کیا کیا دیکھا ہے بس اتنا سمجھ لو کہ جوہری اچھا آدمی نہیں ہے، اسے بوڑھا، کمزور اور ناتواں مت سمجھو۔ وہ درندہ ہے درندہ، عورتوں کو چیر پھاڑ کر نگل جاتا ہے، ان کا نشان تک نہیں ملتا۔ دولت سارے جرم ڈھانپ دیتی ہے۔ میں اور اصغر خود اس ملازمت سے تنگ آ گئے ہیں، مگر کیا کریں، کہاں جائیں۔ اتنے اچھے پیسے اور آسائش و آرام کی زندگی کون دے گا۔ بس اس لالچ میں پڑے ہیں۔ ویسے اب میرے شوہر نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ جلد ہی نوکری چھوڑ کر کسی دور دراز کے علاقے میں چلا جائے گا۔ روکھی سوکھی ہی سہی مگر سکون کی زندگی بہتر ہوتی ہے۔ ہم دونوں کو زہرہ کی بھی فکر ہے وہ بڑی ہو رہی ہے۔ لڑکیاں جلد جوان ہو جاتی ہیں۔ میں زہرہ کو یہاں کیسے رکھ سکتی ہوں۔ وہ کمال بھی کوئی اچھا آدمی نہیں ہے، دوسرا جوہری ہے۔" زینب کچھ دیر کے لئے رکی پھر جلدی سے بولنے لگی "خانم جس قدر جلد ممکن ہو سکے تم یہاں سے نکل جاؤ۔ اب تک جتنی عورتیں یہاں آئی ہیں ان کا رویہ ہم سے بہت توہین آمیز رہا ہے مگر تمہاری بات مختلف ہے۔ تم ان سے بالکل الگ ہو، تم ہمیں ملازم نہیں سمجھتی ہو اور زہرہ کے ساتھ تو تمہارا سلوک بہت ہی اچھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں یہ سب باتیں تمہیں بتا رہی ہوں مگر خدا کے لئے کہیں ان کا ذکر جوہری یا کمال سے نہ کر دینا ورنہ ہم زندہ درگور کر دیئے جائیں گے۔"

میں نے بے اختیار ہو کر زینب کو لپٹا لیا۔ اپنا چہرہ اس کے چہرے کے قریب لا کر بھرائی ہوئی آواز میں بولی "کوئی انسان نہ آقا ہوتا ہے نہ ملازم۔ یہ ہماری اپنی تقسیم اور درجہ بندی ہے۔ ورنہ قانونِ قدرت میں سب برابر ہیں۔ میں آدمی کا احترام کرتی ہوں بشرطیکہ وہ آدمی ہو۔ مجھے اس مختصر سی زندگی میں ہر قسم کے آدمی ملے ہیں اچھے بھی برے بھی اور تم یقین کرو کہ میں نے اچھے آدمیوں کو ہمیشہ پلکوں پر بٹھایا ہے اور دل میں جگہ دی ہے۔ تم اچھے آدمیوں میں سے ایک ہو۔ زینب! میں تمہاری عزت کرتی ہوں، تم یقین کرو کہ میں تمہاری اور اصغر کی زندگی پر رشک کرتی ہوں۔ کس قدر پرسکون اور آسودہ زندگی ہے۔ میں بھی ایسی ہی زندگی کی تلاش میں ہوں۔ اس زندگی کی جستجو میں دربدر ہوں۔ میں بھی اپنے اصغر کی تلاش میں ہوں۔ جس دن مجھے میرا اصغر مل گیا میں بھی کہیں گم ہو جاؤں گی۔ [illegible] کبھی فرصت ملی اور وقت نے اجازت دی تو میں تمہیں اپنی سرگزشت سناؤں گی پھر تمہیں معلوم ہوگا کہ میں کتنی ستم دیدہ اور ظلم رسیدہ لڑکی ہوں۔"

زینب نے جھک کر میری پیشانی کو چوما اور پھر بڑے اصرار اور پیار کے ساتھ مجھے کھانا لا کر کھلایا۔ کھانے سے فارغ ہوئی تو اس نے مشورہ دیا کہ میں ذرا باہر گھوم پھر آؤں تاکہ طبیعت بحال ہو جائے۔ مشورہ معقول تھا۔ میں نے ایک بار پھر غسل کیا، کپڑے تبدیل کئے۔ آرائش کی اور باہر نکلنے کا ارادہ کر رہی تھی کہ باہر اطلاعی گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی۔

میرا دل بری طرح دھڑک اٹھا۔ خدایا یہ کون ہے، کیا کوئی نئی آفت سر پہ کھڑی ہے۔ زینب نے مجھے رکنے کا اشارہ کیا اور خود بیرونی دروازے کی طرف چلی گئی۔ کچھ دیر بعد اس کی واپسی ہوئی۔ اس نے بتایا کہ کوئی فرہاد صاحب مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔

فرہاد کا نام سنتے ہی میری عجیب کیفیت ہو گئی۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں اس کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔ پھر مجھے خود پر غصہ آنے لگا کہ میں بلا وجہ ڈری ڈری سی کیوں رہتی ہوں۔ اگر میں نے حوصلے اور ضبط سے کام نہ لیا تو نقصان اٹھا جاؤں گی۔

میں نے زینب کو خدا حافظ کہا اور باہر نکل آئی۔ فرہاد اپنی گاڑی میں میرا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی باہر نکل آیا اور تیزی سے میری طرف بڑھا۔

"کوئی حماقت نہ کر بیٹھنا۔ چپ چاپ گاڑی میں چل کر بیٹھ جاؤ اور کسی پرسکون مقام کی طرف نکل چلو۔" میں نے اس کی بے تابی کے پیش نظر کہا۔ اس کے بڑھتے ہوئے ہاتھ رک گئے۔ ہم دونوں گاڑی میں بیٹھے اور گاڑی چل پڑی۔ کافی دور نکل آنے کے بعد فرہاد نے گاڑی درختوں سے گھرے ہوئے ایک پرفضا گوشے میں کھڑی کر دی۔ اور میری طرف مڑتے ہوئے بولا "لیلیٰ تم نے مجھے پاگل کر دیا ہے۔ یہ بتاؤ اتنے دنوں سے ملیں کیوں نہیں۔ اگر میں خود نہ آتا تو شاید تم کبھی ملنے کی کوشش بھی نہ کرتیں۔"

"یہ بات نہیں ہے۔ دراصل میں مصروف بہت تھی۔ اس کے علاوہ یوں ملتے رہنے سے کیا فائدہ۔ میں تو مستقل ملاپ کے بارے میں سوچتی رہتی ہوں۔" میں فرہاد کے شانے سے سر لگاتی ہوئی بولی۔

"میں اسی سلسلے میں تمہارے پاس آیا تھا۔ بھائی جان تم سے ملنا چاہتے ہیں۔" فرہاد نے کہا۔

"تمہارے بھائی جان!" میرا لہجہ خود بخود طنزیہ ہو گیا۔ "وہ اوّل درجے کے خود غرض اور حریص آدمی ہیں۔ انہوں نے تمہیں پالا پوسا بڑا کیا۔ اعلیٰ تعلیم دلائی تاکہ بعد میں تم سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اور تم دیکھ ہی رہے ہو کہ وہ ہماری شادی کے مخالف ہیں۔ حالانکہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس میں تمہاری مرضی اور پسند بھی شامل ہے وہ نہیں چاہتے کہ تم مجھ سے شادی کرو۔ وہ چاہتے ہیں کہ تمہاری شادی کسی ایسی لڑکی سے ہو جو بڑے دولت مند اور بااثر خاندان کی ہو تاکہ وہ اس لڑکی کے خاندان کے اثر و رسوخ سے اپنے لئے فائدے اٹھا سکیں۔"

"نہیں، نہیں، یہ نہ کہو۔ بھائی جان ایسے نہیں ہیں۔ میں قسم کھانے کے لئے تیار ہوں۔" فرہاد جلدی سے بولا۔

میرے لبوں پر تلخ ہنسی بکھر گئی۔ "موقت آنے پر ثابت کر دوں گی کہ تمہارا بھائی بے انتہا لالچی اور تمہاری توقع سے کہیں زیادہ چالاک ہے۔ بس کچھ دن انتظار کرو۔"

"میں تم سے بحث نہیں کروں گا۔ سر دست اس لئے آیا ہوں کہ تمہیں بھائی جان کے پاس لے چلوں۔ میری ان سے تفصیل بات چیت ہوئی ہے اور اب وہ تم سے دوبارہ ملنا چاہتے ہیں۔"

"کمال ہے مرد ہو کر ایک عورت کو بار بار بلواتے ہیں۔ انہیں مجھ سے کام ہے تو خود کیوں نہیں آجاتے۔ اس میں بھی ایک چال ہے۔ میں نے کہا تھا نا کہ تمہارا بھائی بہت خود غرض اور لالچی ہے۔ یہاں تک چل کر آنے میں اسے نقصان ہی نقصان ہے۔ اسے کلینک سے اٹھنا پڑے گا اور اتنی دیر کی آمدنی ماری جائے گی۔ اس کے علاوہ پٹرول بھی خرچ ہوگا۔ وہ تو اپنے بھائی کے لئے چھوٹی موٹی قربانی کرنے کے لئے بھی تیار نہیں ہے اور تم ہو کہ اس کے نام کی مالا جپے جا رہے ہو۔"

فرہاد کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ ذلت اور اہانت کے احساس سے گلا ایک دم خشک ہو گیا۔ ہونٹ کاٹتے ہوئے بولا "ٹھیک ہے وہی آجائیں گے کب بھیجوں؟"

"کل کسی وقت بھیج دو، میں گھر پر رہوں گی۔"

فرہاد نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور ہونٹوں سے لگاتے ہوئے بولا "تم مجھ سے ناراض تو نہیں ہو؟"

"نہیں میں تم سے ناراض نہیں ہوں، ہو بھی کیسے سکتی ہوں؟ تم تو میری آرزو ہو، چاہت ہو، البتہ مجھے اپنی قسمت سے گلہ ہے۔"

فرہاد نے مجھے آگے نہیں بولنے دیا، شدت سے لپٹا لیا۔ اور میرے لبوں پر اپنے لب رکھ دیئے۔ میں دیر تک آنکھیں بند کئے سکڑی سمٹی اس کے پہلو میں بیٹھی رہی۔

دوسرے دن فرہاد پھر ملنے آیا، مگر وہ تنہا تھا۔ ڈاکٹر جمشید اس کے ساتھ نہیں آیا تھا۔ اسے تنہا دیکھ کر میرے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ دوڑ گئی اور وہ میری مسکراہٹ کا مفہوم سمجھ کر کٹ کر رہ گیا۔

"کیا کہا تھا میں نے، میری بات کو تم کچھ نہ سمجھ کر رہے، یہ بات میں نے اپنے تجربے اور مشاہدے سے کہی تھی۔ خالی خولی شاعری نہیں کی تھی۔" میں نے کہا۔

فرہاد مسکرا کر بولی۔ "میں نے تم دونوں کی آسانی کے لئے ایک درمیانی راستہ ڈھونڈا ہے، وہ تم سے ملنے کیلئے تیار ہو جائے گی۔ اور نہ وہ تم سے ملنے یہاں آئیں گے بلکہ تم دونوں کی ملاقات کسی تیسری جگہ پر ہوگی۔ انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے تمہیں بھی نہ ہونا چاہیئے۔ وقت اور جگہ کا تعین تم کرو گی۔"

"ٹھیک ہے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے مگر میں سوچتی ہوں کہ ڈاکٹر جمشید کس قدر خود غرض اور خود پسند ہے کہ اپنے چھوٹے بھائی کے لئے جسے کہ وہ اولاد کی طرح عزیز رکھتا ہے ایک بے ضرر لڑکی سے ملاقات نہیں کر سکتا —— ٹھیک ہے میں اس سے ملوں گی اور مجبور کر دوں گی کہ وہ مجھ سے گڑگڑا کر درخواست کرے کہ میں تم سے شادی کر لوں۔ تم دیکھنا کہ میں اس مغرور شخص کا غرور پاش پاش کر دوں گی۔"

"وہ کس طرح؟" فرہاد نے بے یقینی کی کیفیت میں پوچھا۔

"انتظار کرو فرہاد، وقت سب سے بڑا منصف ہے، وقت آنے دو پھر تم سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا۔"

پھر طے پایا کہ ڈاکٹر جمشید اور میں کل صبح دس بجے کیفے طاؤس میں ایک دوسرے سے ملیں گے۔ ڈاکٹر وہاں پہلے سے موجود ہوگا اور میں بعد میں پہنچوں گی۔ میں نے فرہاد کے کان میں یہ بات اچھی طرح ڈال دی کہ اگر میں وہاں پہنچی اور ڈاکٹر موجود نہ ہوا تو الٹے پاؤں واپس آجاؤں گی اور پھر کبھی نہ ملوں گی۔

وہ رات میری زندگی کی عجیب ترین رات تھی۔ طرح طرح کے خیالات میرے دل میں آتے رہے۔ میری سوچ کا محور میرا گھر تھا۔ انسان اپنی جائے پناہ سے دور ہو کر کتنی شدت سے اس کے بارے میں سوچتا ہے۔ میں اپنے والدین اور بھائیوں کے بارے سوچ رہی تھی۔ وہ یقیناً مجھے معاف کر دیں گے اور شفقت بھری آغوش میں سمیٹ لیں گے۔ وہ آغوش جس کی گرمی اور حرارت میں ابھی تک اپنی رگ و پے میں محسوس کر رہی تھی اور جو شاید ساری زندگی جاری و ساری رہتی ہے۔ صدیوں سے ایک لڑکی کا یہ خون کا رشتہ ہے۔ یہ رشتہ کبھی نہیں ٹوٹتا۔ پھر مجھے اپنی گلی کی وہ من موہنی اور خوبصورت سی کیتا یاد آگئی جس کے پانچ پیارے پیارے بچے تھے۔ وہ بچے اب بڑے ہو گئے ہوں گے تو نہ جانے کہاں ہوں گے اور کیا پتہ خود بھی بچے دینے لگے ہوں۔

سوچتے سوچتے میری پلکیں بھاری ہو گئیں اور نیند نے ڈیرہ جما چھا گیا۔

صبح کمرے سے پہلے اٹھ گئی اور ضروریات سے فارغ ہونے کے بعد تیاری کی جانب متوجہ ہو گئی۔ دس بجنے میں دس منٹ باقی تھے کہ میں کیفے طاؤس کے سامنے جا پہنچی۔ راستے بھر یہی سوچتی رہی کہ ڈاکٹر جمشید اس بار کس انداز میں گفتگو چھیڑے گا۔ آخر اس نے دوبارہ ملنے کا مقصد کیا تھا۔ بہرحال مجھے پہلے جیسی گھبراہٹ اور وحشت نہیں تھی۔ میں نے خود کو ذہنی طور پر ڈاکٹر جمشید سے معرکہ آرائی کے لئے تیار کر لیا تھا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ اسے ترکی بہ ترکی جواب دوں گی خواہ کچھ بھی ہو جائے۔

گاڑی کھڑی کرنے کے بعد میں کیفے میں داخل ہوئی۔ اندر روشنی بہت مدھم تھی۔ ایک عجیب قسم کی رومان پرور نیم تاریکی ماحول پر چھائی ہوئی تھی۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر اردگرد کا جائزہ لیا۔ آنکھیں تاریکی سے مانوس ہو گئیں تو ایک گوشے میں ڈاکٹر جمشید دکھائی دیا۔ وہ میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے اپنی طرف دیکھتے پا کر وہ اپنی نشست سے اٹھا اور استقبال کے لئے آگے بڑھا۔ میری توقع کے خلاف اس کے لبوں پر بڑی زہریلی مسکراہٹ تھی۔ کیونکہ میں اس سے ناخوشگوار ملاقات اور شدید تجربے کے بعد اس کی یہ دوستانہ مسکراہٹ میرے لئے ایک معمے سے کم نہ تھی۔ میری عورتوں والی حس نے مجھے بتا دیا کہ ڈاکٹر کی یہ مسکراہٹ مکاری اور عیاری سے زیادہ کچھ اور نہیں ہے۔ اب وہ انتہائی ڈپلومیٹک انداز میں مجھے چت کرنا چاہتا تھا مگر کیا میں اس کی کوئی چال کامیاب ہونے دوں گی۔

ڈاکٹر جمشید نے میرا ہاتھ پکڑا اور ایک کرسی پر بٹھاتے ہوئے خوش دلی سے بولا۔ "وقت پر آئی ہو۔ میں تمہارا انتظار ہی کر رہا تھا۔ یہ جگہ ہر قسم کی گفتگو کے لئے بہت مناسب اور موزوں ہے۔"

"یہ جگہ فرہاد کی تجویز کردہ ہے۔" میں نے جواب میں کہا۔ پھر لاپرواہی سے شانے اچکاتے ہوئے بولی۔ "ہاں ڈاکٹر تم مجھ سے ملنا چاہتے تھے، آگئی ہوں۔ کہو کیا بات ہے؟"

ڈاکٹر نے مجھے غور سے دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ "پہلے ہم حلق تر کر لیں پھر گفتگو ہوتی رہے گی، کیا خیال ہے بیئر منگوا لی جائے؟"

"نہیں مجھے بیئر سے بھی نشہ ہو جاتا ہے۔ میرے لئے کوکا کولا منگوا دو۔" میں نے کہا۔

ڈاکٹر نے کولا کا آرڈر دیا اور ادھر ادھر کی گفتگو شروع کر دی۔ وہ ٹھیک سادہ شہر میں بڑھتی ہوئی کثافت اور اس کے مضر اثرات کے

بارے میں بتا رہا تھا۔ میں حیرت سے اسے دیکھنے [illegible] کافی کی پیالی
میز پر رکھتی ہوئی بیزاری سے بولی "ڈاکٹر شاید تم [illegible] گئے ہو کہ ہم
یہاں کس لئے آئے ہیں؟"

ڈاکٹر نے بھی پیالی میز پر رکھ دی اور دونوں کہنیاں میز پر ٹیکتے ہوئے ترش لہجے میں بولا "تمہاری گفتار میرے ساتھ کچھ اچھی نہیں ہے، حالانکہ دیکھا جائے تو میں تمہارا محسن ہوں۔ میں نے تمہارے چہرے کو اپنی بہترین فنی صلاحیتوں کی وجہ سے کیا سے کیا بنا دیا ہے، مگر تم۔" ڈاکٹر کھل کھلا کر ہنس دیا۔ اس کی آواز اتنی بلند تھی کہ وہاں بیٹھے ہوئے لوگ بے ساختہ چونک پڑے اور مڑ کر ہماری طرف دیکھنے لگے۔ اس پڑھے لکھے اور ماہر فن ڈاکٹر کی اس عجیب حرکت پر مجھے خجالت سی محسوس ہوئی۔

"گفتار سے تمہاری کیا مراد ہے؟" میں نے ڈاکٹر سے پوچھا پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا میں مشتعل لہجے میں کہنے لگی۔ "ڈاکٹر میں تمہاری توجہ چند امور کی طرف مرکوز کرنا چاہتی ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ قسمت نے مجھے اس حد تک مجبور کر دیا ہے کہ میں جوہری جیسے انسان کے ساتھ رہ رہی ہوں۔ مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ میں بدکار اور خود فروش عورت ہوں۔ دوسری بات یہ کہ یہ جانتے ہوئے کہ فرہاد مجھے چاہتا ہے اور ہم ایک دوسرے سے زندگی بھر کا عہد و پیمان کئے ہوئے ہیں، میں تم سے التفات کروں اور اس سے بے وفائی کی مرتکب ہوں۔ انتہائی احمقانہ بات ہے۔ اگر تمہارے ذہن کے کسی گوشے میں کوئی چور چھپا ہوا ہے تو اسے نکال دو۔ اس میں تمہاری بھلائی ہے۔ آخر ہم دونوں کی زندگی خراب کر کے تمہیں کیا ملے گا؟"

ڈاکٹر کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ ہکلاتے ہوئے بولا "نہیں نہیں تم غلط سوچ رہی ہو۔ میرا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا تم میرے بارے میں ذرا انصاف سے کام لو۔"

"انصاف کی بات کرتے ہو تو میں بھی کہوں گی کہ تم بھی میرے بارے میں انصاف سے کام لو۔ میں انسان ہوں اور مجھے حق پہنچتا ہے کہ میں اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی مثبت فیصلہ کروں۔ تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ تم میرے محبوب کو مجھ سے محض اس لئے چھین لو کہ وہ تمہارا بھائی ہے اور تم نے اس پر سرمایہ کاری کی ہے۔"

میرا یہ وار اتنا کاری تھا کہ ڈاکٹر تلملا کر رہ گیا۔ اس کی ساری شخصیت، غرور، خود پسندی اور عزتِ نفس چکنا چور ہو کر رہ گئی۔ وہ اس طرح تلملایا تھا جیسے سانپ زخم کھا کر بلبلاتا ہے۔ وہ دیر تک مجھے شعلہ بار نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر خلاف توقع انتہائی سرد لہجے میں بولا۔ "خوب سے خوب خاتون! بے شک تمہیں حق پہنچتا ہے کہ تم اپنے لئے ایک بہترین مستقبل کی سوچو۔ بے شک تمہیں حق حاصل ہے کہ اپنی آئندہ زندگی کے لئے کسی بہترین شوہر کا انتخاب کرو، مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہر کس و ناکس پر ڈورے ڈالنا شروع کر دو۔ انسان کو ہمیشہ اپنے معیار اور رتبے کے مطابق کوشش کرنی چاہئے، ورنہ [illegible] گھاٹا ہے۔"

میں نے نفرت سے ہونٹ سکوڑتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر میں دل کے معاملات میں سود و زیاں کی قائل نہیں ہوں۔ میں احساسات و جذبات کی تجارت نہیں کرتی جو نفع و نقصان کی سوچوں، بہت وقت تلف ہو چکا ہے۔ اب تمہیں جو کچھ کہنا ہے صاف اور واضح لفظوں میں کہو، اشارات میں بات نہ کرو۔ مرد ہو بہادر بنو۔"

ڈاکٹر اپنے ہونٹ چبانے لگا۔ برداشت کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ بالآخر ضبط کے ساتھ بولا۔ اچھا ہوا کہ تم خود ہی کھل گئیں۔ سنو! مجھے یہ اچھی طرح یقین ہے کہ تمہاری اور فرہاد کی ازدواجی زندگی دائمی اور پائدار نہیں ہو سکتی۔ تم بہت دنوں تک ساتھ نہیں چل سکتے۔ تم ہم فکر اور ہم خیال نہیں ہو۔ تم دونوں میں کوئی قدرِ مشترک یا مشترکہ خصوصیات نہیں ہیں۔ بالآخر ایک دوسرے سے جدا ہو جاؤ گے۔ پھر اس کے بعد تمہارے لئے بہت برا ہوگا۔ مرد کا کیا ہے، کچھ نہیں بگڑتا مگر عورت کہیں کی نہیں رہتی۔ میرا دوستانہ مشورہ مانو تو ابھی سے فرہاد سے الگ ہو جاؤ تاکہ بعد کے عذاب سے بچی رہو۔ میں مانتا ہوں کہ تمہیں اس سے محبت ہے اور فرہاد بھی تمہیں چاہتا ہے۔ مگر اس میں شادی کا پہلو کہاں سے نکل آیا۔ ٹھیک ہے کچھ دنوں دوستوں کی مانند ساتھ رہو، گھومو پھرو، عیش کرو۔ باہر گھوم آؤ، میں خرچ دینے کے لئے تیار ہوں مگر شادی کا خیال دل سے نکال دو۔ اس میں تم دونوں کی بہتری ہے۔ کہو تو میں ابھی پچاس ہزار کا چیک دینے کے لئے تیار ہوں۔"

ڈاکٹر نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر چیک بک نکال لی اور میری طرف اس طرح دیکھنے لگا جیسے پوچھ رہا ہو کہ "کہو کیا کہتی ہو؟"

مارے غصے کے میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ جی چاہا کہ جھپٹ کر ڈاکٹر کے دیدے باہر نکال دوں، مگر انسان ہر وہ کام نہیں کر سکتا جو وہ کرنا چاہتا ہے۔ مصلحتیں اسے مار ڈالتی ہیں۔ میں نے خون کا گھونٹ پیا اور میز پر کہنی ٹیکی اور براہ راست ڈاکٹر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے انتہائی دل جمعی سے بولی۔ "ڈاکٹر مجھے تمہاری حالت پر بہت ترس آ رہا

ہے۔ افسوس کہ اس قدر لکھنے پڑھنے کے باوجود تم آدمی نہ بن سکے۔ افسوس کہ تم میں عقل و شعور کا فقدان ہے۔ افسوس کہ تم عورت کو سمجھ نہ سکے۔ تم ذرا بھی عورت سے واقف ہوتے تو ایسی باتیں نہ کرتے۔"

ڈاکٹر کے ہونٹ شدت غیظ سے کانپنے لگے۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر زبان گنگ ہو کر رہ گئی۔ اس نے دو تین بار منہ کھولا مگر حلق سے کوئی آواز باہر نہ نکلی۔ اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں اور ان میں خون کی سرخی جھلکنے لگی تھی۔

"تم مجھے پچاس ہزار کی رشوت دے رہے تھے۔" میں دوبارہ کہنے لگی۔ "مجھے اجازت دو کہ میں تمہیں پچاس ہزار دوں اور اس کے عوض پھر کبھی تمہاری شکل نہ دیکھوں۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میرے اور تمہارے درمیان اس قسم کے حالات پیدا ہوں مگر تم نے خود مجبور کر دیا ہے۔ اب صرف ایک جملہ سن لو، وہ یہ کہ میں فرہاد سے ہر حال میں شادی کر لوں گی۔"

"فرہاد میری اجازت کے بغیر شادی نہیں کر سکتا۔" ڈاکٹر گھٹی گھٹی آواز میں بولا۔

"وہ تمہاری ہی اجازت سے مجھ سے شادی کرے گا۔ میں ایسا کروں گی کہ تم کسی کتے کی مانند میرے پیچھے پیچھے پھرو گے اور گڑگڑا کر درخواست کرو گے میں فرہاد سے شادی کر لوں۔ وہ دن زیادہ دور نہیں ہیں۔"

میں پرس سنبھال کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ پرس سے کچھ نوٹ نکال کر میز پر ڈالے اور یہ کہتی ہوئی کیفے سے باہر نکل آئی۔ "بل میں ادا کر دوں گی۔ اس وقت کے مہمان تم تھے، میں نہیں۔"

بڑے بے کیف سے دن گزر رہے تھے۔ طبیعت پر اضمحلال طاری تھا اور روح پژمردہ ہو کر رہ گئی تھی۔ میں ان دنوں فرہاد سے بھی نہیں ملی تھی۔ اب ملنے ملانے کا وقت نہیں تھا۔ کوئی ٹھوس قدم اٹھانے کا وقت آ گیا تھا۔

ایک صبح سو کر اٹھی تو عجیب کسلمندی سی تھی، طبیعت بھاری بھاری تھی اور سر میں شدید درد تھا۔ مجھے چائے کی خواہش ہوئی، ہاتھ بڑھا کر گھنٹی بجائی کہ زینب کو بلاؤں۔ کئی لمحے گزر گئے مگر زینب نہ آئی۔ میں نے دوبارہ گھنٹی بجائی۔ اس کے بعد تیسری اور چوتھی بار بجائی مگر زینب جانے کہاں رہ گئی تھی۔ اس سے پہلے وہ گھنٹی کی پہلی آواز پر آ جاتی تھی۔ بستر سے نکلنے کا جی نہ چاہتا تھا مگر الجھن کے باعث اٹھ بیٹھی۔ کمرے سے نکل کر زینب کو متعدد آوازیں دیں مگر جواب ندارد۔ خدایا زینب کہاں مر گئی تھی۔ وہ دیر تک سونے کی عادی بھی نہ تھی اور گھر سے باہر بھی نہ جاتی تھی۔ باہر کے سارے کام اس کا شوہر اصغر انجام دیتا تھا۔

ہال میں آئی تو دیکھا کہ دروازے پاٹوں پاٹ کھلے ہوئے تھے اور وہاں کوئی نہ تھا۔ معاملہ کچھ گڑبڑ تھا۔ یعنی کچھ دیر پہلے زینب یہاں موجود تھی، تو اتنی دیر میں وہ کہاں چلی گئی اور گھر اس طرح کھلا چھوڑ گئی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ زینب کے علاوہ بھی وہاں کوئی اور نہ تھا۔ یہ سب کے سب کہاں چلے گئے تھے۔ زینب، اصغر اور زہرہ، مکان میں کوئی نہ تھا۔ میں نے ہال کے دروازے بند کئے اور اس سے ملحق کمرے میں داخل ہوئی۔ یہاں کسی کے خرخر کی آواز سنائی دی جیسے کوئی ہانپتے میں سانس لے رہی ہو۔ میں نے ذرا آگے بڑھ کر دیکھا تو بے اختیار چونکنا پڑا۔ زہرہ ایک چادر اوڑھے فرش پر سو رہی تھی۔ اس کے بغل میں ایک گڑیا دبی ہوئی تھی، میں زہرہ پر جھک گئی اور اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

زہرہ نے اچانک سے پلکیں کھولیں اور خوف و ہراس کے عالم میں اچھل کر بیٹھ گئی پھر زار و قطار رونے لگی۔ میں نے اسے لپٹا لیا اور پیار سے بولی "کیا بات ہے زہرہ؟ کیوں رو رہی ہو، تمہاری ماں کہاں ہے؟"

زہرہ بڑی مشکل سے چپ ہوئی۔ میرے سینے سے لگی گہری گہری سانس لیتی رہی۔ میں نے اس سے کئی سوالات کر ڈالے۔ بالآخر اس نے لب کھولے اور روتی ہوئی بولی۔ "اماں گھنٹہ بھر ہوا باہر گئی ہے۔"

"کہاں گئی ہے؟"

"بابا کو لینے، انہیں پولیس پکڑ کے لے گئی ہے۔" زہرہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"پولیس لے گئی ہے، آخر کیوں؟" میں نے شدید حیرت کے عالم میں پوچھا۔

"پتہ نہیں کیوں۔" زہرہ معصومیت سے بولی۔ "رات پولیس کے دو آدمی آئے تھے۔ انہوں نے پتہ نہیں بابا اور اماں سے کیا باتیں کیں، میں ٹھیک سے سن نہ سکی۔ مجھے وہاں سے ہٹا دیا گیا تھا۔ پھر بابا نے اپنا ایک سامان جوڑا لیا اور خاموشی سے ان کے ساتھ چلے گئے۔ شاید انہیں جیل لے جایا گیا ہے۔" زہرہ بری طرح نروس تھی اور بار بار رو پڑتی تھی۔

کمال ہے، آخر بے چارے اصغر نے ایسا کونسا جرم کیا تھا جو پولیس والے اسے ساتھ لے گئے تھے۔ میں نے زہرہ کو مخاطب کر کے انتہائی محبت سے کہا۔ "تم فکر نہ کرو، تمہارے بابا کو وہ جیل نہیں لے گئے ہیں، کوئی معمولی کام ہو گا۔ ہاں، زینب کب یہاں سے گئی ہے؟"

"ماما رات بالکل نہیں سو سکی۔ صبح تک جاگتی رہی۔ بار بار میری طرف دیکھتی رہی اور کمرے میں ٹہلنے لگتی۔ صبح ہوتے ہی اس نے چائے تیار کی۔ پھل کا جوس نکالا اور مجھے ہدایت کی کہ جیسے ہی تم اٹھو مجھے بھی ناشتہ کرا دینا۔ ماما نے کہا تھا کہ ممکن ہے اسے واپسی میں دیر ہو جائے اور خانم کو ناشتہ نہ ملے، تہران بہت دور ہے نا، آنے جانے میں وقت لگتا ہے۔۔ آپ کو ناشتے میں دیر ہو گئی، میری آنکھ ہی نہ کھل سکی۔ آپ ناراض تو نہیں ہو گئیں؟" زہرہ نے سہمے ہوئے انداز میں میری طرف دیکھا۔

میں نے زہرہ کو سینے سے لگا لیا اور سر سہلاتے ہوئے بولی "میں تم جیسی اچھی لڑکی سے بھلا ناراض ہو سکتی ہوں۔ خوفزدہ ہونے کی بالکل ضرورت نہیں۔ میں گھر پر موجود ہوں، تمہارا بابا اور ماما بہت جلد واپس آ جائیں گے۔"

میں نے زہرہ کو ساتھ لیا اور اپنی خوابگاہ میں واپس آ گئی۔ میری کسلمندی اور بیزاری ہوا ہو گئی تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ آخر پولیس بے چارے اصغر کو کیوں پکڑ کر لے گئی تھی، اس کا جرم کیا تھا کہیں اس واقعے کا تعلق میری ذات سے تو نہیں ہے۔

طرح طرح کے وسوسے مجھے ستانے لگے۔ اشتہا مر گئی تھی ناشتے کی خواہش ہی نہ ہوئی۔ اسی حیص بیص میں دن کے دس بج گئے۔ میں نے زہرہ کو زبردستی ناشتہ کرایا اور اس کی خاطر خود بھی تھوڑا سا زہر مار کر لیا پھر زہرہ کو کھلونوں میں الجھا کر باہر برآمدے میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ اصغر نہیں آیا تھا تو زینب کو تو آ جانا چاہیے تھا، کیا انہوں نے اسے بھی بند کر دیا ہے، نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا ہوتا تو پولیس زینب کو بھی ساتھ لے گئی ہوتی۔ خدا جانے کیا قصہ تھا۔ جو بھی تھا اچھا نہیں تھا۔

گیارہ بجے کے قریب میں تھک کر خوابگاہ میں پلٹنے والی تھی کہ مجھے اصغر اور زینب آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ ان کے چہرے ستے ہوئے تھے اور آنکھوں سے ویرانی عیاں تھی۔ قریب آنے پر میں نے دیکھا کہ زینب کی آنکھیں سرخ اور متورم تھیں۔ یقیناً وہ دیر تک روتی رہی تھی۔ میں سوچنے لگی کیا ہوا ہے اصغر تو اس کے ساتھ ہی ہے محض ایک رات جاگنے سے کسی کی آنکھیں سرخ ہوتی ہیں نہ متورم۔

مکان میں داخل ہونے کے بعد اصغر اپنی قیام گاہ کی طرف چلا گیا اور زینب سیدھی میری طرف آئی۔ میں اسے لئے ہوئے اپنی خوابگاہ میں آ گئی اور زینب کو ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولی "بہت پریشان ہو زینب، شاید رات بھی روتی رہی ہو۔ زہرہ نے کچھ اشارہ کیا ہے مگر پوری بات تو تم ہی بتاؤ گی۔"

زینب نے چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا اور تھر تھر کانپتی ہوئی بولی "وہ سب کچھ ختم ہو گیا خانم، کچھ نہیں رہا۔"

ایک لمحے کے لئے میں گھبرا گئی پھر خود پر قابو حاصل کر لیا "کیا ختم ہو گیا، ذرا صاف بات کرو، میرا ذہن یوں ہی بہت الجھا ہوا ہے۔"

"پولیس نے جوہری اور کمال کو گرفتار کر لیا ہے۔" زینب میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "وہ کل شام ہی اپنی خفیہ قیام گاہ سے گرفتار ہوئے تھے۔ جوہری نے کچھ کہنے کے لئے اصغر کو بلوایا تھا، مگر۔۔"

"مگر کیا؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"اصغر کے پہنچنے سے پہلے ہی جوہری نے خوف اور صدمے سے دم توڑ دیا۔ اپنی بدنامی، ذلت اور سزا کے خوف سے اس کی حرکت قلب بند ہو گئی۔ بوڑھا اور کمزور تھا نا۔ کمال جیل میں ہے، اسمگلنگ اور جوہری کا دست راست ہونے کے جرم میں اسے بہت طویل سزا ملے گی۔ کیا پتہ گولی ہی مار دی جائے۔ ایران میں اسمگلنگ کی سزا موت ہے۔"

میں سناٹے میں رہ گئی۔ جوہری اور کمال کا اس قدر اچانک اور اتنے غیر متوقع طور پر ڈراپ سین ہو جائے گا، مجھے امید نہ تھی۔ خود بخود میری ایک دردسری ختم ہو گئی تھی۔ قدرت بڑے اچھے وقت میں میرے کام آئی تھی۔ ایک کانٹا دل و دماغ سے نکل گیا تھا۔

"کیا تمہیں جوہری اور کمال کے انجام پر افسوس ہے؟" میں نے زینب سے پوچھا۔

"افسوس ہے نہ خوشی۔ مگر واقعہ اس قدر اچانک طور پر ہوا ہے کہ میں برداشت نہ کر سکی۔ کوئی بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور پھر موت کا صدمہ تو ویسے ہی دوسرا ہوتا ہے۔" زینب اداس لہجے میں بولی۔

زینب سچ کہہ رہی تھی۔ بعض اوقات انسان کو اپنے بدترین دشمن کی موت پر بھی افسوس ہوتا ہے۔ دشمن سے بھی ایک قسم کی الفت اور قربت ہو جاتی ہے۔ جب خانم اور تقی کاوہ کے جانتے ہی جل مرے تھے تو خود مجھے بھی ان کی بے بسی اور مجبوری کی موت پر افسوس ہوا تھا۔

دن بڑے اداس سے گزر رہے تھے۔ میرے لئے کوئی مسئلہ نہ رہ گیا تھا۔ میرے تمام دشمن یکے بعد دیگرے خود بخود انجام کو جا پہنچے تھے مگر اس کے باوجود جانے کیوں میں بے چین سی تھی۔ بڑی ویرانی سی محسوس ہو رہی تھی۔ ادھر زینب اور اصغر وغیرہ کا حال بھی کچھ اچھا نہیں تھا۔ اس مکان میں سب ایک سائے کی مانند زندگی گزار رہے تھے۔ زندگی اور ہما ہمی مفقود ہو کر رہ گئی تھی۔

کتنے دن اور گزر گئے، پھر زینب میرے پاس آئی اور بڑے

دکھ سے بتایا کہ اب ان کا اس مکان میں کوئی کام نہیں ہے اور وہ کسی دوسری جگہ منتقل ہو جانا چاہتے ہیں۔ میں نے زینب کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور آہستہ سے دباتے ہوئے کہا کہ انہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جوہری نے وہ مکان میرے نام کر دیا تھا اور میں اسے زینب اور زہرہ کی محبت میں ان کے نام منتقل کر دینا چاہتی ہوں۔ مجھے یقین تھا کہ ایسے کئی مکانات میری قسمت میں لکھے ہوئے ہیں۔ پھر میں یہ مکان اس خلوص اور محبت سے ان کے حوالے کیوں نہ کر دوں۔ زینب اور اصغر اس مکان کو کرائے پر اٹھا کر آسانی سے نسبتاً چھوٹے سے مکان میں رہ سکتے تھے۔ پھر اب اصغر بھی کوئی دوسری ملازمت کرنے کے لئے آزاد تھا۔

جب میں نے زینب کو اپنا مافی الضمیر بتایا تو اس کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ میرے ہاتھوں کو چومتے ہوئے بولی "جوہری کے تصرف میں رہنے والی بے شمار عورتوں میں سے تم واحد عورت ہو جو اس قدر نیک اور انسان دوست ہو۔ تم نے ہمیں کبھی ملازم نہیں سمجھا اور انسانیت اور حسن سلوک سے پیش آتی رہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ تم زندہ ہو ـــ ورنہ قاعدے سے تمہیں اب تک نابود ہو جانا چاہئے تھا۔ قدرت کبھی بے انصاف نہیں ہوتی۔ اب اگر میرے گھر میں کوئی بچی ہوئی تو میں اس کا نام تمہارے نام پر رکھوں گی۔"

"میرا نام لیلیٰ ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مجھے معلوم ہے، بہت پہلے سے معلوم تھا مگر میں نے کبھی ظاہر نہیں کیا۔" زینب بھی مسکرا دی۔

"میں کچھ دن اس گھر میں تمہاری مہمان رہوں گی، پھر شاید تہران ہی چھوڑ دوں۔" میں نے کہا۔

"شرمندہ نہ کریں خانم! یہ مکان آپ ہی کا ہے خواہ اس کی قانونی حیثیت کچھ بھی ہو۔ آپ ہمیں ہمیشہ اپنی خدمت میں پائیں گی۔"

اب مجھے سوچنے اور غور کرنے کے لئے کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ سوائے ڈاکٹر جمشید کے۔ وہ میرا دشمن تھا۔ مگر دوسرے دشمنوں سے مختلف اور منفرد۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ میرے دوسرے دشمنوں کی مانند صفحۂ ہستی سے مٹ جائے۔ میں تو اس کی طویل عمری کی دعائیں مانگ رہی تھی۔ چاہتی تھی کہ وہ میری اور فرخ کی شادی اور خوشگوار ازدواجی زندگی دیکھنے کے لئے طویل عرصے تک زندہ رہے۔ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ اس کے تمام دعوے جھوٹے اور باطل ثابت ہو گئے ہیں۔

میرے تمام دشمن ختم ہو چکے تھے۔ میں اکیلی تھی۔ بہت بڑی دولت مجھے مل چکی تھی۔ حقیقت جانب سے ملنے کا خطرہ نہیں رہا تھا۔ البتہ انہیں بے فکری سے ڈاکٹر جمشید سے بنرد آزمائی کر سکتی تھی۔ اب ڈاکٹر کو زیر کرنا کوئی مشکل بات نہیں تھی۔ نسخہ میری جیب میں تھا۔ صرف وقت کا انتظار تھا اور اب وہ وقت آ گیا تھا۔

اس موقع پر مجھے اپنے ننھے منے دوست فرخ کی یاد آئی۔ میرے دوستوں اور محسنوں میں اسے کلیدی حیثیت حاصل تھی اور اب میں جو قدم اٹھانے جا رہی تھی اس میں اس کی شمولیت اشد ضروری تھی۔ میں نے فرخ سے ملنے کا پروگرام بنایا اور پھر ایک دن فرخ سے ملنے تہران روانہ ہو گئی۔

دوپہر کے قریب تہران پہنچی۔ یہ وقت ایسا ہوتا ہے کہ اسکول میں چھٹی ہونے والی ہوتی ہے۔ اگر فرخ اسکول آیا ہو گا تو گھر لوٹتے ہوئے مجھے مل جائے گا۔ میں نے اس کے گھر سے کچھ فاصلے پر گاڑی کھڑی کر دی اور اس گلی پر نظریں جما دیں جو اس کے گھر کی سمت جاتی تھی۔ کچھ دیر بعد مجھے فرخ دوسرے لڑکوں کے ہمراہ آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ گلی میں داخل نہیں ہوا تھا کہ میں گاڑی اسٹارٹ کر کے اس کے قریب لے گئی اور کھڑکی سے سر نکال کر ریشمی آواز میں بولی "فرخ!"

اپنا نام سن کر فرخ ٹھٹکا پھر مڑ کر آواز کی سمت دیکھنے لگا۔ کسی کو موجود نہ پا کر سمجھا کہ اسے وہم ہوا ہے۔ میں نے پھر اس کا نام لے کر پکارا۔ اس بار فرخ کی نظر گاڑی پر پڑی۔ اور جب اس نے مجھے دیکھا تو تھوڑی دیر کے لئے دم بخود رہ گیا۔ اس نے سوچا بھی نہ ہو گا کہ میں اس طرح اسے آ کر ملوں گی۔ اس کے خیال میں میں اسے بھول چکی تھی۔

"فرخ کیا مجھے بھول گئے؟ یہاں میرے قریب آؤ۔" میں نے اسے پیار سے پکارا۔ وہ جھجکتا ہوا میرے قریب آیا تو میں نے دروازہ کھول کر اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔ اب میں نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ اچھا خاصا جوان ہو چکا تھا اور شاید شیو بھی کرنے لگا تھا۔ اس کے بیٹھتے ہی میں نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ اور کافی فاصلے پر ایک نسبتاً ویران جگہ پر لا کر کھڑی کر دی۔ پھر مسکراتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتی ہوئی بولی۔ "فرخ کیا تم اپنی لیلیٰ کو بھول گئے ہو؟"

"نہیں خانم بھولا نہیں ہوں، مگر اس اچانک ملاقات پر حیران ضرور ہوں۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ تم کبھی مجھ سے ملنے آؤ گی۔" فرخ نے معصومیت سے جواب دیا۔

"تمہیں ایسا نہیں سوچنا چاہیئے تھا۔ کیا میں تمہیں کبھی بھول سکتی ہوں، بس مصروفیت کچھ ایسی تھی کہ تم سے مل ہی نہیں سکی۔ تم ٹھیک تو ہو؟"

"ہاں ٹھیک ہوں۔"

"مجھے تم سے پھر کام آپڑا ہے فرخ، کیا تم میری مدد کرو گے؟" میں نے کہا۔

فرخ نے مجھے بڑی عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ اس کی شاکی نظریں کہہ رہی تھیں کہ کیا تم میرے خلوص کا امتحان لے رہی ہو۔

"تمہارے کام آنا میں اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا خانم۔" بالآخر فرخ نے کہا۔ میں مسکرا کر رہ گئی۔

"تمہیں مجھے کچھ وقت دینا پڑے گا۔ میں تمہیں کرچ لے کر جاؤں گی۔ کیا تم رات کو آٹھ نو بجے تک باہر رہ سکتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میں اکثر دوستوں کے ساتھ فلم دیکھنے چلا جاتا ہوں اور واپسی رات ہی کو ہوتی ہے۔ البتہ گھر میں بتانا پڑے گا۔ میں گھر میں کہہ دوں گا کہ دوستوں کے ساتھ فلم دیکھنے جا رہا ہوں۔ پھر اس کے بعد آزاد ہوں۔"

میں نے فرخ کی پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئے کہا: "اچھا تو چلو میں تمہیں تمہارے گھر کے نزدیک چھوڑ دوں۔ گھنٹے دو گھنٹے آرام کرو۔ اسی عرصے میں والدین سے اجازت بھی لے لو۔ چار بجے کے قریب آ کر میں تمہیں کرچ لے جاؤں گی۔ تم مجھے وہیں مل جانا جہاں اس وقت ملے تھے۔"

"مگر فرخ تم نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ کام کیا ہے۔ بس یونہی حامی بھر لی۔"

"کام کے بارے میں پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ بس یہ کافی ہے کہ کام آپ کا ہے اور مجھے کرنا ہے۔" فرخ نے سادہ لہجے میں کہا اور میں اس کے خلوص اور محبت سے بہت متاثر ہوئی۔

میں نے فرخ کو لے جا کر اس کی گلی کے نکڑ پر چھوڑ دیا اور وقتی طور پر خدا حافظ کہہ کر مرکزی شاہراہ پر نکل آئی۔ مجھے دو ڈھائی گھنٹے تنہا ہی میں گزارنے تھے۔ سوچا کسی ریستوران میں کھانا ہی کھا لوں۔ ایک جانے پہچانے ریستوران کا رخ کیا۔ کھانے کا آرڈر دیا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد چائے پی۔ تھوڑا سا وقت سرک گیا۔ پھر اسی وقت میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ بل ادا کیا اور باہر نکل آئی۔ اب میں کسی پبلک ٹیلی فون بوتھ کی تلاش میں تھی۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد مجھے ایک ٹیلیفون بوتھ دکھائی دے گیا۔ خوش قسمتی سے اس وقت اندر کوئی نہیں تھا۔

میں نے گلاس ڈور ایک طرف سرکایا اور بوتھ میں داخل ہو گئی۔

فرہاد کا نمبر ملایا اور انتظار کرنے لگی۔ ذرا دیر بعد ہیلو کی آواز سنائی دی۔ اتفاق سے وہ فرہاد ہی تھا۔ میری آواز پہچانتے ہی وہ چیختے ہوئے لہجے میں بولا "لیلیٰ! یہ تم ہو، کہاں روپوش ہو گئی تھیں۔ اب تک کئی بار تمہارے گھر پر فون کر چکا ہوں مگر ہر بار یہی جواب ملا کہ کہیں گئی ہوئی ہے۔ آخر یہ کیا چکر ہے لیلیٰ! تم نے مجھے بیمار کر دیا ہے۔ آخر تم مجھ سے گریز کیا کر رہی ہو۔ بتاؤ کب ملو گی؟؟؟"

"اب ہم کبھی نہ مل سکیں گے، مجھے بھول جاؤ۔"

"کیا کہہ رہی ہو۔" فرہاد دوہانسی آواز میں بولا۔

"ہاں فرہاد سچ کہہ رہی ہوں، مجھے بھول جاؤ، ہماری قسمت میں ملاپ نہیں تھا۔ میں کل صبح ایک طویل سفر پر روانہ ہو رہی ہوں ہمیشہ کے لئے۔"

"سفر، کہاں، کیوں؟" فرہاد بری طرح نروس ہو گیا۔

"یہ سب بتانے کی ضرورت نہیں ہے، بس مختصراً سن لو اب میں کبھی لوٹ کر نہ آؤں گی۔ میں خود نہیں جانتی کہ میرے سفر کا اختتام کہاں ہوگا۔ اچھا خدا حافظ۔" فرہاد چیختا رہا چلاتا رہا۔ مگر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ گھڑی پر نظر ڈالی سوئی آہستہ آہستہ چار کی طرف سرک رہی تھی۔ میں گاڑی میں بیٹھی اور فرخ کے گھر کی طرف روانہ ہوئی۔

فرخ حسب وعدہ مقررہ جگہ پر مل گیا۔ اس نے والدین سے اجازت لے لی تھی۔ ہم فوراً کرچ کی طرف روانہ ہو گئے۔

گھر پہنچ کر میں نے فرخ سے کہا کہ وہ ہاتھ منہ دھو کر چائے پئے اور آرام کرے۔ اس عرصے میں میں ایک ضروری کام سے فراغت پا لوں۔ فرخ کو غسل خانے میں چھوڑ کر میں لکھنے کی میز پر آ بیٹھی۔ بیس پچیس منٹ کی محنت کے بعد میں نے ایک تحریر تیار کی اور بار بار پڑھ کر اچھی طرح اطمینان کر لیا۔ پھر وہ تحریر لئے ہوئے فرخ کے پاس واپس آئی۔ فرخ بستر پر بیٹھا کوئی رسالہ دیکھ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے رسالہ ایک طرف ڈال دیا اور سوالیہ نظروں سے میرے ہاتھ میں دبے ہوئے کاغذ کو دیکھنے لگا۔

"یہی وہ کام ہے جو تمہیں انجام دینا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اس وقت تمہیں زبردست اداکاری کرنی ہوگی۔ اس پرچے میں مکالمے لکھے ہوئے ہیں اور تمہیں یہ مکالمے بڑی خوبصورتی اور مہارت سے ادا کرنے ہیں۔ ابھی وقت کافی ہے۔ تم اسے دیکھ لو اور مشق کر لو۔"

فرخ نے پرچہ لے لیا اور حیرت بھری نظروں سے تحریر کا جائزہ لینے لگا۔ وہ تحریر پڑھ چکا تو میں نے کہا "تمہیں ڈاکٹر جمشید کراس کی

لینک میں فون کرتا ہے اور جب وہ تم سے مخاطب ہو تو یہ کلمات ادا کرتے ہیں، وہ تم سے جیسی بھی گفتگو کرے جواب انہی مکالموں کی صورت میں دینا ہے۔ بس یہ خیال رہے کہ اسے بیگمان نہ گزرے کہ تم کسی کی تحریر پڑھ رہی ہو۔ ظاہر یہ ہونا چاہیے کہ تم خود بول رہی ہو۔"

فرخ نے اثبات میں سر ہلایا اور تحریر کو غور سے دیکھنے لگا۔

رات کو کھانے سے فارغ ہونے کے بعد میں نے فرخ سے کہا کہ وہ صداکاری کے لئے تیار ہو جائے، میں اسے فون کے قریب لے آئی۔ میں نے اسے ڈاکٹر جمشید کی کلینک کا نمبر بتایا۔ فرخ نے نمبر ملایا دوسری طرف اس کی سکریٹری تھی۔ فرخ نے ڈاکٹر جمشید سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر فون پر آ گیا — اور فرخ نے تحریری ہدایات کے مطابق بولنا شروع کیا۔

"ہیلو ڈاکٹر۔ نہیں یہ ضروری نہیں کہ تم بھی مجھے جانو، بس درخواست یہ ہے کہ جو کہہ رہا ہوں غور سے سنو۔"

میں فرخ کے کان سے کان ملائے کھڑی تھی۔ مجھے ڈاکٹر کی پریشان آواز سنائی دی "عجیب بات ہے۔ یہ تو معلوم ہونا ہی چاہیے کہ میں کس سے بات کر رہا ہوں؟"

"کوئی ضروری نہیں ہے۔ اب کام کی بات سنو۔ میں تم سے اس انگوٹھی کی بات کرنے جا رہا تھا جو تم نے جوہری کو درست کرنے کے لئے دی تھی اور وہ جوہری سے کہیں کھو گئی تھی۔ وہی انگوٹھی جس کی خاطر تم میں اور تمہاری بہن میں شدید جھگڑا ہو چکا ہے۔"

"کیا، پھر سے کہو، میں سمجھا نہیں، تمہیں اس انگوٹھی کے بارے میں کیا معلوم؟" مارے جوش اور ہیجان کے ڈاکٹر کی سانس پھولنے لگی تھی۔

"میں خود اس انگوٹھی کے چکر میں تھا۔ میں نے اس انگوٹھی کو چرانے کے لئے دو تین لڑکیاں جوہری کے پیچھے لگا دی تھیں مگر جانے کس طرح وہ انگوٹھی جوہری کی دوست لیلیٰ یا گوہر خانم کے ہاتھ لگ گئی اور اب گوہر خانم یہاں سے جا رہی ہے — اسے کوئی شدید صدمہ پہنچا ہے۔ وہ خودکشی کا ارادہ کر بیٹھی ہے۔ صبح وہ تہران چھوڑ دے گی، جانے کیا کرے گی۔ مجھے اس کا نہیں انگوٹھی کا افسوس ہے۔ انگوٹھی ہاتھ سے چلی جائے گی، میں نے تمہیں اطلاع دے دی ہے، شاید کچھ کر سکو۔"

اور اس کے ساتھ ہی فرخ نے ریسیور رکھ دیا۔ میں نے دیکھا کہ فرخ کی پیشانی پسینے سے بھیگی ہوئی تھی اور آنکھیں کسی نامحسوس کیفیت سے بوجھل سی ہو گئی تھیں۔ مجھے فرخ کی اداسی کے سبب کا احساس تھا۔ وہ میری تحریر کے متن سے الجھ گیا تھا۔ بالآخر اس سے رہا نہ گیا، پوچھ بیٹھا: "یہ کیا ہے لیلیٰ خانم! یہ انگوٹھی اور خودکشی کا کیا چکر ہے؟" اس کے لہجے سے دکھ جھلک رہا تھا۔

"تم پریشان نہ ہو فرخ، اس میں میری بہتری کی صورت ہے بہت جلد تم سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے۔" میں نے اسے لپٹا کر پیشانی چوم لی۔ "اُدھر میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں نہیں تو دیر ہو جائے گی۔"

میرے سمجھانے کے باوجود فرخ اداس اداس سا رہا، اسے چھوڑ کر آئی تو میں خود اداس سی تھی۔ کتنا معصوم لڑکا تھا وہ۔

ایک مرحلہ طے ہو گیا تھا۔ اب اس مرحلے کا نتیجہ میرے سامنے آنے والا تھا۔ میں خود کو اس کے لئے تیار کرنے لگی۔ میں نے جو پانسہ پھینکا تھا اس میں مجھے اپنی جیت کا مکمل یقین تھا۔

اس رات میں نیند بھر کر سو نہ سکی۔ صبح جلد آنکھ کھل گئی اور ابھی غسل سے فارغ ہوئی تھی کہ زینب نے آ کر اطلاع دی کہ کوئی ڈاکٹر جمشید اور فرہاد مجھ سے ملنے آئے ہیں۔ میرے لبوں پر زہریلی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ میں نے زینب سے کہا کہ انہیں نشست گاہ میں بٹھائے میں آتی ہوں۔

میں نے الماری کھول کر جوہری کی انگوٹھی نکالی اور بائیں ہاتھ کی انگلی میں پہن لی۔ ذہنی طور پر آنے والی جنگ کے لئے خود کو تیار کیا اور نشست گاہ میں داخل ہو گئی۔

مجھے دیکھتے ہی ڈاکٹر جمشید اور فرہاد بے ساختہ کھڑے ہو گئے۔

"بیٹھ جاؤ ڈاکٹر! کھڑے کیوں ہو گئے؟"

ڈاکٹر کرسی پر بیٹھ گیا اور اس کے ساتھ ہی فرہاد بھی۔

میں بھی کچھ فاصلے پر سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ پھر اس کے ساتھ ہی ایک طویل طویل اور ناگوار خاموشی سایہ فگن ہو گئی۔ ہم میں سے کوئی دیر تک کچھ نہ بولا۔ میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر بے حد مضطرب اور پریشان نظر آ رہا تھا۔ پھر اس وقت اس کی نظر میرے بائیں ہاتھ کی ایک انگلی پر پڑ گئی اور وہ بُری طرح چونکا اور اس کے ساتھ ہی اس کا چہرہ جوش اور ہیجان سے بُری طرح تمتمانے لگا۔ میں دل ہی دل میں مسکرا دی۔

"ڈاکٹر! کیا میں غریب خانے پر زحمت فرمانے کی وجہ پوچھ سکتی ہوں؟" میں نے بڑے سکون سے پوچھا۔

کچھ کہنے کے لئے ڈاکٹر کا منہ کھلا پھر بند ہو گیا۔ پھر کھلا اور پھر بند ہو گیا۔ وہ کسی پیاسی چڑیا کی مانند سانس لے رہا تھا۔

اب میں نے فرہاد کی طرف دیکھا وہ ایک دم اجڑا اجڑا سا نظر آ رہا تھا۔ سہمی اور گھبرائی ہوئی نظروں سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔

میں نے دوبارہ ڈاکٹر کی جانب دیکھا۔ اس نے گھبرا کر نظریں جھکا لیں اور پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔ "یعنی تم خودکشی کرنے جا رہی ہو؟"

"ہاں ارادہ تو کچھ ایسا ہی ہے۔" میں نے لاپرواہی سے کہا۔

"آخر کیوں، نہیں یہ اچھی بات نہیں ہے۔ میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔"

"بہت خوب! آخر تم کس تعلق اور رشتے سے یہ بات کہہ رہے ہو۔ مجھ پر تمہارا حق ہی کیا ہے، تم نے مجھ پر کون سی سرمایہ کاری کی ہے جو تمہیں میرے ضائع ہونے کا دکھ ہوگا۔"

"نہیں تم خودکشی نہیں کرو گی۔" ڈاکٹر مضبوط لہجے میں بولا۔ مگر اس کے لہجے کی لرزش کو میں نے محسوس کر لیا تھا۔

"ڈاکٹر تمہیں میری خودکشی کی فکر کیوں ہے۔ میرے مرنے سے تم پر کوئی حرف نہ آئے گا۔ میرے مرنے سے کسی پر کیا اثر پڑے گا۔ سب جانتے ہیں کہ میں گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی ہوں۔ میرا تہران میں کوئی نہیں ہے۔ ایسی لڑکی کی موت کا کون نوٹس لیتا ہے۔"

"آخر تم خودکشی کیوں کرنا چاہتی ہو۔" ڈاکٹر کی آواز بھرا گئی۔

"خودکشی کیوں کرنا چاہتی ہوں — مجھے زندگی میں ملا ہی کیا ہے۔ تہران نے مجھے بڑے چرکے دیئے ہیں۔ لوگوں نے دل کھول کر زخم لگائے ہیں۔ میں کانٹوں پر چلی ہوں۔ زندگی کو زہر کی مانند پیا ہے، مجھے زندگی سے کیا ملا ہے۔ کچھ نہیں — مجھے زندگی میں امید کی ایک کرن نظر آئی بھی تھی مگر تم نے اسے چھین لیا۔ اب میرے لئے زندگی میں کچھ نہیں رہا۔ میرا تابود ہو جانا ہی ٹھیک ہے۔" میں نے کہا اور چہرے کو دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔

میں نے انگلیوں کی درز سے دیکھا کہ ڈاکٹر کی حریص نظریں بائیں ہاتھ کی انگلی میں پھنسی ہوئی انگوٹھی پر جمی ہوئی تھیں۔

"میں تم سے تنہائی میں کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔" ڈاکٹر بڑی مشکل سے کہہ سکا۔

"نہیں تنہائی میں کوئی بات نہیں ہوگی۔ جو بات ہوگی ہم تینوں کی موجودگی میں ہوگی۔ ہم تینوں ایک مثلث کے تین زاویے ہیں۔ ایک زاویہ بھی کم ہو تو مثلث مکمل نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر! محبت اور رقابت کا یہ مثلث ازل سے چلا آ رہا ہے — دو کے درمیان کوئی تیسرا بھی ہوتا ہے اور تم میرے اور فرہاد کے درمیان ہو۔"

"ایسی باتیں مت کرو۔" ڈاکٹر چیخ کر بولا — اس کا چہرہ پسینے میں بھیگ گیا تھا۔ وہ بہت کرب کے عالم میں تھا اور اس کی کیفیت مجرموں جیسی ہو رہی تھی۔ وہ فرہاد سے نظریں چرا رہا تھا — اور اس کے ساتھ ہی اس کی نظریں میری انگلی میں پھنسی ہوئی انگوٹھی میں دھنسی جا رہی تھیں۔

"بچہ دہ ہو ڈاکٹر! دھیرج سے کام لو تم پڑھے لکھے آدمی ہو۔ دوراندیش ہو۔ سچائی اور جرأت سے کام لو۔ جو کہنا ہے کھل کر کہو۔ سنو میں تمہارے دل میں اتر گئی ہوں، تمہاری نظروں کو پہچان رہی ہوں، تمہارے مفہوم کو پا لیا ہے اور تمہارے مافی الضمیر کو خوب سمجھ رہی ہوں۔"

"شاید میں ہی غلطی پر تھا۔" ڈاکٹر شکست خوردہ لہجے میں بولا "مجھے تمہارے اور فرہاد کے درمیان نہیں آنا چاہیے تھا۔ مجھے تمہاری اور فرہاد کی شادی پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔" ڈاکٹر کا سر جھک گیا اور آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے۔

میرے لبوں پر تلخ اور زہریلی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ میں نے انگلی سے انگوٹھی اتاری اور اسے ڈاکٹر کی طرف پھینک دیا "لو سنبھالو ہمارا تمہارا سودا پکا ہو گیا۔ اسے اٹھاؤ اور یہاں سے دفع ہو جاؤ۔"

میری اور فرہاد کی شادی ہو گئی۔ مجھے حاصل کر کے فرہاد بے حد خوش تھا مگر اس کے ساتھ ہی اداس اور غمگین بھی تھا — میں نے اسے ڈاکٹر جمشید اور انگوٹھی کے بارے میں ایک لفظ بھی نہ بتایا، مگر وہ ذہین آدمی تھا، سب کچھ سمجھ گیا تھا۔ اپنے بھائی کی اصل حقیقت بے نقاب دیکھ کر اسے بہت دکھ پہنچا تھا۔ اب وہ تہران میں ٹھہرنے کے لئے بالکل تیار نہ تھا۔ چنانچہ شادی کے تیسرے دن اس نے کہا کہ ہمیں لندن چل کر رہنا چاہیے۔ ورنہ یہاں اس کا دم گھٹ جائے گا۔ میں نے اس کی رائے پسند کیا مگر اس کے ساتھ ہی دو شرطیں بھی رکھ دیں۔ فرہاد مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"پہلی شرط یہ کہ لندن جانے سے پہلے میں یزد جا کر والدین اور بھائیوں کو دیکھنا چاہتی ہوں — اور تم میرے ساتھ ہو گے۔"

"دوسری شرط؟" فرہاد مسکرایا۔

"دوسری شرط یہ کہ لندن جائیں گے تو ایک تیسرا آدمی بھی ہمارے ساتھ ہوگا۔"

"تیسرا آدمی؟" فرہاد نے حیرت سے دہرایا۔

"آدمی نہیں لڑکا کہو۔" پھر میں نے اسے تفصیل سے فرزند کے بارے میں بتایا — اور آخر میں کہا "میں اسے انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم

دلواؤں گی اور تمہاری ہی طرح تاحیات گزارنے کی نصیحت بتاؤں گی۔"

فرہاد نے مجھے ایک دھپ رسید کی اور قہقہہ لگا کر ہنستا ہوا بولا "مگر خانم! کہیں تم میرے لئے ایک رقیب نہ پال بیٹھنا۔"

"فرخ میرا چھوٹا بھائی ہے مگر محبت کے معاملے میں رقیب ہی ثابت ہوگا۔" میں نیم باز آنکھوں سے فرہاد کو دیکھتی ہوئی بولی "فرخ نہ ہوتا تو آج تم بھی نہ ہوتے۔"

ہم خوبصورت گاڑی میں یزد کی طرف رواں دواں تھے راستے میں شب بسری کے لئے قم کی اسی سرائے میں ٹھہرے جہاں میں تہران جاتے ہوئے بے سروسامانی کے عالم میں ٹھہری تھی۔ وہ رات میری زندگی کی حسین ترین رات تھی، کوئی خوف اور خدشہ نہ تھا یاس و ہراس کی سیاہ رات دم توڑ چکی تھی اور میں نے جو خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر مل گئی تھی۔

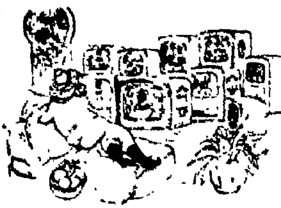
صبح ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد ہم مزید سفر کے لئے تیار ہو گئے۔ بیرونی دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے کہ اچانک ایک آدمی میرے سامنے آگیا۔ میں نے اسے دیکھا اور مارے حیرت اور مسرت کے بھونچکی رہ گئی۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا اور ایک لمحے تک دیکھتا رہا پھر اس کی آنکھوں میں حیرت اور مسرت کی چمک نمودار ہوئی۔ وہ تیزی سے ہاتھ پھیلا کر آگے بڑھا پھر جھجک کر رک گیا مگر مجھ سے برداشت نہ ہو سکا میں نے لپک کر اس کا بھدا اور تیل دگریس میں لتھڑا ہوا ہاتھ پکڑ لیا اور بے تحاشہ چومنے لگی۔ اس پر بھی تسکین نہ ہوئی تو اس کے چوڑے چکلے سینے میں سما گئی۔ کچھ دیر بعد میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔۔۔ اتنا بڑا قوی ہیکل مرد روتا ہوا بڑا عجیب لگ رہا تھا۔

"ہاشم تم؟" میں گھٹی گھٹی آواز میں بولی، پھر میری آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہو گئے۔

"ہاں۔ ہم سڑکوں کے بادشاہ ہیں، کہاں جائیں گے بی بی" ہاشم ہتھیلی کی پشت سے آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔ میں نے پلٹ کر فرہاد کی طرف دیکھا وہ الجھی ہوئی نظروں سے ہم دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا اس کے انداز سے ناگواری مترشح تھی۔ میں نے فرہاد کا ہاتھ پکڑ کر ہاشم کے قریب کیا اور تفصیل سے اس کے بارے میں بتانے لگی۔ میں نے گفتگو ختم کی تو فرہاد نے بڑی محبت اور خلوص سے ہاشم سے ہاتھ ملایا۔

"یہ لیلیٰ پہلی مرتبہ باد جانا ہی ہے" فرہاد ہنستے ہوئے بولا۔

"میں نے گھر سے نکل بھاگنے والی لڑکیوں کو کبھی واپس ہوتے ہوئے



نہیں دیکھا۔ ہاشم نے فرہاد سے کہا، پھر مجھے مخاطب کرکے بولا "مگر بی بی آپ نے تہران میں میرے دیئے ہوئے فون نمبر پر کبھی رابطہ قائم کرنے کی کوشش نہیں کی میں اکثر تمہارے بارے میں سوچتا رہتا تھا کہ جانے کیا انجام ہوا ہو" پھر میرے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ بلند آواز سے غلام کو پکارنے لگا۔ غلام ہانپتا کانپتا بھاگتا ہوا آیا اور باس کی طرف تابعداری کے انداز میں دیکھنے لگا۔

"ابے مجھے کیا آنکھیں پھاڑ کے دیکھ رہا ہے، ادھر دیکھ" ہاشم نے میری طرف اشارہ کیا۔

غلام نے میری طرف گردن گھمائی، پھر اس کی گدلی آنکھیں سکڑیں، پھیلیں اور ایک دم پھیل گئیں۔

"کیسے ہو غلام؟" میں مسکرائی، مگر وہ مارے حیرت کے گنگ رہ گیا۔

میں نے پرس کھول کر سو کے دو نوٹ نکالے اور غلام کی طرف بڑھا دیئے۔ "اپنے لئے کچھ خرید لینا۔"

"یہ کیا ہے، ہماری بے عزتی تو نہ کرو" ہاشم بگڑتے ہوئے۔

"باپ اور بھائی کو بھلا کوئی کیا دے سکتا ہے۔ مگر میں خود کو اپنی خوشی سے دے رہی ہوں، تم کون ہو دخل در معقولات کرنے والے؟" میں نے مصنوعی برہمی سے کہا اور ہاشم ہنس کر رہ گیا۔

فرہاد نے گھڑی پر نظر ڈالی اور میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "لیلیٰ! دن بہت چڑھ آیا ہے ذرا دیر میں گرمی بڑھ جائے گی۔ میرا خیال ہے چل دینا چاہئے ابھی سفر بہت باقی ہے۔"

دروازے سے نکلتے ہوئے میں نے مڑ کر دیکھا ہاشم میری ہی جانب دیکھ رہا تھا۔ میں نے نظروں ہی نظروں میں اسے بڑے احترام سے سلام کیا اور فرہاد کے پیچھے پیچھے سرائے سے باہر نکل آئی۔

باہر سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔

آخری خواہش

اللہ نہ کرے جو یہ سزا کسی کو ملے ——!

رام لعل

میں نے اپنی بیوی سے سلوجا کا تعارف کراتے ہوئے کہا —— "ٹکے یہ میرا بہت ہی پیارا دوست ہے۔ بچپن کا!"

میں اپنی بیوی کو پیار سے 'ٹکے' کہتا ہوں۔ ویسے اس کا اصلی نام کانتا ہے۔ ٹکے نے میرے دوست کا سواگت دونوں ہاتھ جوڑ کر اور بہت ہی خوشگوار مسکراہٹ کے ساتھ کیا۔ یہ مسکراہٹ ٹکے کی دل کش شخصیت کا خاص حصہ ہے۔ اس نے جلدی سے نوکر کو بلا کر ٹیکسی میں سے سلوجا کا سامان نکال لانے کے لیے کہا اور خود ڈرائنگ روم سے ملے ہوئے گیسٹ روم کی طرف جاتی ہوئی بولی۔

"میں ابھی آتی ہوں! ان کے لیے ذرا ایک نظر کمرے کو دیکھ لوں!"

سلوجا ٹکے کی شخصیت اور خصوصی توجہ سے متاثر ہو کر بولا

"بھابی، مجھے یہاں ٹھہرنا تھوڑی ہے! پلیز ڈونٹ بودر! میں شام کی گاڑی سے کلکتہ چلا جاؤں گا!"

کانتا جو دوسرے کمرے کی طرف جاتے جاتے رُک گئی پلٹ کر اس صوفے کی پشت کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی جس پر ابھی ابھی سلوجا نے خود کو گرایا تھا۔ بولی —— "جانے کی ایسی بھی کیا جلدی ہے! کچھ روز رہیے! اپنے بچپن کے دوست سے اتنے عرصے بعد مل کر خوشی نہیں ہوتی آپ کو؟ یہ تو آپ کو اکثر یاد کرتے ہیں!"

میری بیوی کی زبان سے کبھی کبھی اتنی پُرلطف اور سچی بات نکل جاتی ہے جو مجھے بہت متحیر کر دیتی ہے۔ سلوجا کی طرف پہلے تو سوالیہ نظروں سے دیکھا، پھر اس کے پاس صوفے میں دھنس کر اس سے لپٹتے ہوئے کہا "سنا تم نے؟ تمہاری بھابی نے کیا کہا ہے؟ اتنی جلدی جانے کی اجازت نہیں ملے گی!"

سلوجا بولا —— "لیکن کل تک مجھے کلکتہ ضرور پہنچنا ہے کل وہاں ٹینڈر کھلیں گے۔ نہیں پہنچوں گا تو میری فرم مجھے سروس سے فوراً الگ کر دے گی۔ جانتے تو ہو پرائیویٹ فرموں کا ایسی [illegible] تمہاری طرح گورنمنٹ کا گزیٹڈ افسر تھوڑے ہی ہوں! ایک ڈپٹی جیلر کو کسی ٹینڈر کی اہمیت کا احساس کیسے ہو سکتا ہے؟"

"دیکھو سلوجا! زیادہ بک بک کی یہاں تو ابھی جیل میں بند

کر دوں گا!"

ہم تینوں زور سے ہنس دیئے۔ کاتنا تو دیر تک ہنستی ہی چلی گئی، پھر اچانک اپنی ہنسی روک کر سلوجا سے بولی ——— "آپ جلدی سے منہ ہاتھ دھو لیجیے میں جب تک ناشتہ لگاتی ہوں۔"

"ہاں بھئی اس وقت تو فوراً ہی کچھ کھانے کو جی چل رہا ہے راستے میں کہیں چائے بھی نہیں مل سکی۔" یہ کہہ کر سلوجا اپنے سامان کی طرف جانے کے لیے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

میں نے بیوی کو بتایا جو کچھ دیکھا! ہم دونوں کی عادتیں کتنی ملتی ہیں، بھوک، پیاس، مذاق، غصہ! ہر معاملے میں ایک ہی جیسے ہیں۔ جب ہم کالج میں تھے تو ہماری ذہانت کا معیار بھی ایک ہی جیسا تھا۔ ہم ایک ہی طرح کی کتابیں پڑھنا پسند کرتے تھے۔ فلموں اور آرٹسٹوں کے بارے میں بھی ہمارا ٹیسٹ کامن تھا۔ اور ہمارا دوستوں کا سلیکشن بھی قریب قریب ایک ہی طرح کا ہوتا تھا۔ کسی کسی آدمی سے چڑ رکھنے تک میں بھی ہم پارٹنر ہی ہوتے تھے! کیوں سلوجا؟"

میں نے ہنس کر اس سے اپنی باتوں کی تائید چاہی اور کاتنا کو مزید بتایا۔ "یہی سب دیکھ کر ہمارے فرینڈز اور ٹیچرز کہا کرتے تھے، تم دونوں جڑواں کیوں نہ پیدا ہوتے! شکل بھی ایک سی پائی ہوتی!"

کاتنا نے بہت میٹھی نظر سے سلوجا کی طرف دیکھا، غالباً وہ اس کی دلکشی اور صحت کا میرے ساتھ موازنہ کرنا چاہتی تھی، کہ سلوجا کاندھے پر تولیہ ڈال کر ہاتھ روم کی طرف جاتے جاتے پلٹ آیا۔ میری بیوی سے کہنے لگا ——— "بھابی، کاتنا نے اپنی اور میری اور تو سب باتیں آپ کو بتا دیں، لیکن ایک بات شاید کبھی نہ بتلائے گا!"

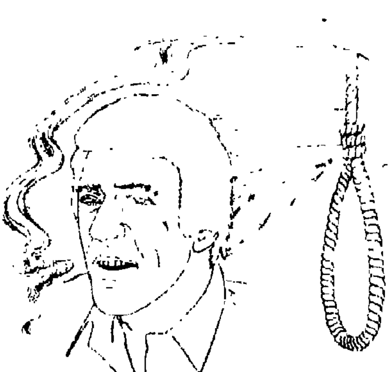
یہ کہہ کر اس نے آنکھوں میں بہت شرارت بھر کر میری طرف دیکھا، جیسے پوچھ رہا ہو "میں ہی بتا دوں وہ بات؟"

"اب کون سی بات رہ گئی ہے سالے!" میں نے اپنی بیوی کے سامنے اسے بہت پیار سے گالی دے دی۔ "بتا دے نہ وہ بات بھی! میں ڈر تا تھوڑی ہوں!"

کاتنا جیسے ہم دونوں کی دلچسپ گفتگو کی وجہ سے وہاں سے ہٹ نہیں پا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سلوجا پر ہی جمی تھیں کہ وہ آخر کہتا کیا ہے! سلوجا نے مجھے سگریٹ کی ڈبیا نکالتے دیکھ کر کہا۔ "لاؤ ایک سگریٹ پلا دیجئے!"

سگریٹ سلگا کر بولا ——— "بھابی، محبت میں بھی ہماری پسند ایک ہی نکل تھی! یعنی ہم دونوں ایک ہی لڑکی سے پیار کیا کرتے تھے! یاد ہے نا کار!"

میں اچانک سناٹے میں آ گیا۔ اپنی بیوی کی طرف بغیر پلک جھپکاتے دیکھتا سا رہ گیا۔ یک بیک گھبرایا ہوا سا! مجرموں کی طرح! کاتنا بھی میری طرف دیکھنے لگی تھی۔ اس کی آنکھیں جھک ہی گئی تھیں۔ لیکن اس کی نظر مجھے تولتی ہوئی سی محسوس ہوئی۔ دل کی



گہرائی تک اترتی ہوتی!

سلوجا نے ایک بھولی بسری یاد دلا کر مجھے ایک صدمے سے دوچار کر دیا۔ میں بہت کوشش سے مسکرایا ——— اور کانتا کے قریب جا کر اس کے کندھوں پر دونوں ہاتھ رکھ دیئے۔ بہت ہی آہستگی سے کہا ——— "اسے میں بچپن کی حماقت تو نہیں کہوں گا کیونکہ اس وقت میں اٹھارہ انیس برس کا ہو ہی چکا تھا اور جس لڑکی سے میں نے محبت کی تھی وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ وہ اسی زمانے میں مر گئی تھی لیکن میں تمہیں دشواس دلا سکتا ہوں، کہ میں نے اس کی نسبت تمہیں کہیں زیادہ چاہا ہے۔"

اس پر کانتا زور سے ایک مترنم قہقہہ مار کر بولی۔ "آپ اتنے اموشنل کیوں ہوتے جا رہے ہیں؟ اگر آپ نے مجھ سے ملنے سے پہلے کسی اور سے بھی محبت کی تھی تو میں آپ کو مجرم تھوڑی سمجھتی ہوں!"

سلوجا ہم دونوں کے پاس آ کر بولا ——— "بھابی! میں نے ایک بار جب اسے یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ روشی تم سے نہیں مجھ سے محبت کرتی ہے تو غصے میں بھر کر اس نے میرے منہ پر گھونسہ دے مارا تھا! اچانک حملے سے میرا سارا جبڑا ہی ہل گیا تھا اور دانتوں سے خون آنے لگا تھا۔ کیوں کمار؟"

گھونسہ مارنے کی بات یاد آتے ہی میں زور سے ہنس پڑا اور سلوجا سے کہا ——— "اب جلدی سے ہاتھ منہ دھو جاؤ ورنہ اسی قسم کا ایک اور گھونسہ دوں گا! تمہارے ساتھ ناشتہ کر کے مجھے آفس بھی جانا ہے۔"

ناشتے کی میز پر کانتا نے بہت سی لذیذ چیزیں لگا دیں لیکن میں اسے دکھانے کے لیے اپنے پرانے کاغذات میں سے ایک فوٹوگراف بھی نکال لایا۔ اسی لڑکی کا جسے سلوجا نے تو بس سرسری ہی نظر سے دیکھا لیکن کانتا اسے ہاتھ میں لیے بیٹھی سی رہ گئی۔ اسے عجیب تیکھی نظروں سے دیکھنے لگی۔

میں نے اس سے کہا ——— "مگر یہ بھی ایک حقیقت سمجھو کہ یہ لڑکی مر نہ گئی ہوتی تو آج تمہاری جگہ پر یقیناً وہی بیٹھی ہوتی۔"

سلوجا آملیٹ کا ایک بڑا سا ٹکڑا کانٹے میں لگا کر منہ میں ڈالتے ڈالتے رک گیا۔ بولا۔ "یہ منہ اور مسور کی دال! وہ زندہ ہوتی تو میں ابھی تک کنوارا تھوڑے ہی رہ گیا ہوتا! اس نے مجھی سے شادی کی ہوتی جناب!"

میں نے ہاتھ میں اٹھائی ہوئی چھری اس کے سامنے کر دی۔

اور کہا ——— "یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔ محض بھیجے چھوڑ کر وہ کسی اور کی ہو ہی نہیں سکتی تھی!"

کانتا نے ہم دونوں کو ہنستے ہنستے ڈانٹ پلائی ——— "اوہ! آپ لوگ بھی کتنے عجیب ہیں! ایک ایسی لڑکی کے لیے جھگڑ رہے ہیں جو اب زندہ ہے ہی نہیں!"

اس نے پھر میری طرف رُخ گھما کر جواب طلب کیا ———

"بتائیے آپ نے اب تک یہ تصویر چھپا کر کیوں رکھی تھی؟ کیا مجھ سے چھپ چھپ کر اس سے من بہلاتے ہیں؟"

میں نے کہا ——— "ارے نہیں رے! اسے تو میں بالکل بھول ہی چکا تھا۔ اس سلوجا کم بخت نے آج یاد دلائی تو میں تلاش کر کے اسے نکال لایا تمہیں دکھانے کے لیے ہی۔ چاہو تو اسے پھاڑ کر پھینک دو!"

سلوجا بولا ——— "اسے پھاڑنے کی ضرورت نہیں ہے بھابی! یہ تصویر مجھے دے دیجئے۔ اس پر تو میرا حق زیادہ ہے کیونکہ میں نے ابھی تک شادی نہیں کی۔ اسی کی یاد کے سہارے زندگی گزار رہا ہوں۔ کمار کو تو آپ جیسی چاند سی وائف مل ہی چکی ہے!"

یہ کہہ کر اس نے کانتا کے ہاتھ سے تصویر لے لی۔ اسے کچھ لمحوں تک گہری نظر سے دیکھا پھر احتیاط سے کوٹ کی جیب میں رکھ لی۔

میں نے مسکرا کر بیوی سے کہا ——— "جس طرح کی حرکتیں سلوجا کر رہا ہے انہیں دیکھ کر جی چاہتا ہے، اسے آج جیل کی ہوا کھلا ہی دوں! کیوں تمہارا کیا خیال ہے ——— کے؟"

میری بیوی نے ہنس کر سلوجا کو بتایا ——— "بھائی صاحب! یہ تو بات بات پر سب کو جیل ہی کی دھمکیاں دیا کرتے ہیں! ڈپٹی جیلر ہیں نا! ویسے بھی ان سے کوئی ملنے کے لیے آ جاتا ہے تو اسے اپنی جیل کی یاترا ضرور کراتے ہیں۔ آپ کو بھی معلوم ہوتا ہے معاف نہیں کریں گے!"

میں نے ڈائننگ ٹیبل سے اٹھ کر اپنے شریر پر یونیفارم چڑھاتے ہوئے کہا ——— "کیا کروں، نوکری ہی ایسی ملی ہے! لوگوں کو جیل یاترا کرانے کی! اپنا گھر بھی تو ایک جیل خانہ ہی سا ہے! یہ جنگلہ بظاہر جیل کی اونچی چہار دیواری سے باہر رکھا گیا ہے لیکن ہے تو جیل ہی کا ایک حصہ! ہم سے جو بھی ملنے آتا ہے وہ دراصل جیل ہی میں آ جاتا ہے! چلو سلوجا تمہیں آج اس جیل کی پوری یاترا

کرا دوں؟"

میں نے قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی یونیفارم کا جائزہ لیا۔ اسے پہن کر میں ایک دوسری ہی شخصیت بن جاتا ہوں جس کے سامنے میری بیوی بھی دب جاتی ہے جسے میں بے پناہ پیار کرتا ہوں۔ میں نے پلٹ کر سلوجا کی طرف دیکھا، وہ بھی اب مجھ سے پہلے سے کہیں زیادہ مرعوب نظر آ رہا تھا۔ وہ اپنے خوبصورت سوٹ میں تھا جس کی دلکشی شاید خود اس کی نظر میں بھی ختم ہو گئی تھی۔

میں نے اپنا سیاہ پالشڈ ہنٹر اس کے کاندھے سے چھو کر کہا —

"چلیے جناب!"

سلوجا جیسے بادلِ نخواستہ اٹھتے ہوئے بولا —

"خدا کسی دشمن کو بھی جیلر دوست نصیب نہ کرے!"

کانتا نے پیچھے سے پکار کر کہا — "اپنے دوست کو بہت دیر تک قید میں نہ رکھیے گا۔ لنچ پر انہیں ضرور ساتھ لے کر آ جائیے گا!"

میں نے بہت سنجیدگی سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اسے پلٹ کر دیکھا اور بیٹھک ہی سے وِدا کرتا ہوا باہر گیا۔ بنگلے سے باہر نکلتے ہی کئی لوگ ملے جان پہچان کے اور میری خوشنودی کے خواہشمند۔ ان سب نے مجھے سلام کیا۔ بعض لوگ راستہ چھوڑ چھوڑ کر ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ ایسے وقت میں خود کو واقعی بہت اہم سمجھنے لگتا ہوں۔ اپنی اہمیت کے احساس سے میں بے حد محظوظ ہوتا ہوں۔ دنیا میں لذیذ ترین چیز شاید اپنی اہمیت کا احساس ہی ہے!

لیکن میں نے سلوجا کو کسی لمحے بھی نظر انداز نہ کیا۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے میں چلتا رہا۔ جب ہم جیل کے مہیب پھاٹک میں داخل ہوئے۔ وہاں بہت سے لوگ جو پہلے سے جمع تھے ہمیں راستہ دینے کے لیے ادھر ادھر تیزی سے سرک گئے۔ بہت سے اپنے عزیزوں سے ملاقات کے لیے آئے ہوئے تھے، بعض ان کی رہائی کے منتظر تھے۔ پھاٹک کے بعد ایک کشادہ ڈیوڑھی تھی، وہاں جیل کے گارڈوں کی فورس موجود تھی، اس کے بعد ایک اور پھاٹک تھا، پہلے پھاٹک کی طرح مہیب، اونچا اور مضبوط۔ اس پھاٹک کے پار بہت سے قیدی کھڑے تھے جو آج چھوٹنے والے تھے۔ وہ اپنے قیدی ساتھیوں سے گلے مل مل کر رو رہے تھے، ایک دو تو ہنس ہنس کر جلدی ہی واپس آنے کے وعدے کر رہے تھے۔

سلوجا نے انہیں بہت حیرت سے دیکھا، پھر یکایک جیسے اس کے سامنے میلوں تک پھیلی ہوئی ایک اور ہی دنیا آ گئی۔ بارکیں، احاطے، کھیل کے میدان، چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیوں کے کئی سلسلے اور کتنی ہینڈلوم فیکٹریاں وغیرہ بھی! جتنے لوگ حدِ نظر تک گھومتے ہوئے دکھائی دیے، اپنے اپنے کام میں بے حد مصروف اور اپنے حال میں مست، جیل کی فضا سے بے حد مانوس!

میں نے سلوجا سے کہا — "یہاں سے تمہیں میری زندگی کا صحیح اندازہ ہو سکے گا۔ یہ سب کوئی نہ کوئی جرم ہی کر کے یہاں آتے ہیں، ہو سکتا ہے ایک آدھ کوئی کسی کی سازش سے یا عدالتوں کے غلط فیصلے کی وجہ سے آ گیا ہو، لیکن بیشتر تعداد مجرموں ہی کی ہے۔ مجھے ہر روز انہی سے نپٹنا پڑتا ہے، انہیں سنبھالنا بھی پڑتا ہے۔ اسکول ماسٹروں کو بچوں پر اتنی محنت نہیں کرنی پڑتی ہو گی، جتنی محنت مجھے ان بڑی عمر کے غیر مہذبوں کو پھر انسان بنانے میں کرنی پڑتی ہے۔ ان کے ساتھ ساتھ ہی ان کی غیر مہذب اور مجرم فضا میں ہمیشہ رہنا بھی پڑتا ہے!"

سلوجا میری وضاحت سے زیادہ قیدیوں کی طرف متوجہ تھا۔ جب میں اسے اپنے دفتر میں لے گیا تو وہ وہاں دیواروں پر ٹنگی ہوئی پینٹنگز دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ گاندھی، نہرو، مہاتما بدھ، کچھ اسکیچ خوبصورت عورتوں کے بھی تھے، مناظر کشی بھی تھی، تجریدی آرٹ کے نمونے بھی۔

"یہ سب قیدیوں نے بنائے ہیں۔ ان کے کچھ خالق تو اپنی اپنی میعاد گزار کے چلے گئے ہیں لیکن بعض ابھی تک قید کاٹ رہے ہیں! ابھی ملاتا ہوں ان سے تمہیں۔"

سلوجا کو جیسے یقین نہ آیا، ایسی مجرم فضا میں آرٹسٹ بھی پیدا ہو سکتے ہیں! یا کوئی اتنی اذیت ناک زندگی بسر کرتے ہوئے اپنے اندر کے آرٹسٹ کو زندہ رکھنے میں کامیاب بھی ہو سکتا ہے!

اسی وقت ایک نیا قیدی داخل کرنے کے لیے لایا گیا۔ میں نے اس کے کاغذات کا معائنہ کرنے سے پہلے اس کے منہ پر زور سے تھپڑ مارا جس سے وہ لڑکھڑا کر نیچے گر پڑا، اس کے بعد میں نے اس کا نام پوچھا اور رجسٹر میں درج کیا۔ اس کے رہنے کے لیے ایک بلاک الاٹ کیا اور جب وہ چلا گیا تو سلوجا کو اپنی طرف بہت نفرت سے دیکھتے ہوئے پایا۔ اس نے کہا — "تم بہت ظالم ہو، ایسا کبھی سوچا بھی نہیں تھا میں نے!"

"نہیں ایسا مت سوچو سلوجا! یہ میرے فرائض میں شامل ہے، اس

طرح کا پہلا سائیکلوجیکل ٹریٹ منٹ بہت ضروری ہوتا ہے، قیدی کو یہاں لاتے ہی جہنم کی سی زندگی کا احساس کرایا جاتا ہے تاکہ وہ جیل کو ایک تفریح گاہ نہ سمجھ بیٹھے!"

سلوجا میری طرف بغیر پلک جھپکائے دیکھتا رہا۔ خاموش، سنجیدہ کسی قدر سہا ہوا بھی؟ مجھ سے پہلے سے کسی قدر زیادہ ہی متفکر!

میں نے ہنستے ہوئے کہا — "ایسے بھی کچھ قیدی یہاں آتے ہیں جو سختی اور اذیت کے باوجود جیل کو تفریح گاہ ہی سمجھتے ہیں۔ جیب کترے، نقب زن، اٹھائی گیرے وغیرہ جن کی سزا سال چھ مہینے سے زیادہ نہیں ہوتی، یہاں سے جاتے ہی ہفتہ دس دن کے بعد پھر آجاتے ہیں۔ ان کا آنا جانا لگا ہی رہتا ہے۔ ان کے ساتھ میں سختی سے پیش آتا ہوں لیکن وہ میرا بہت لحاظ کرتے ہیں۔ جیل سے باہر شہر میں کہیں بھی مل جاتے ہیں تو میرے پاس آکر سلام کرتے ہیں، میری خیریت پوچھتے ہیں، ٹیک کر میرے برانڈ کا سگریٹ لے آتے ہیں جسے میں بخوشی قبول کر لیتا ہوں، اسے میں رشوت نہیں سمجھتا، کیونکہ میرا رویہ تو کبھی نہیں بدلتا! ان سے ازراہِ مذاق پوچھ لیتا ہوں، کب تک آ رہے ہو میرے پاس؟ وہ بھی ہنس کر بلکہ بہت فخر سے جواب دیتے ہیں۔

"بس حضور! کچھ ہی دنوں میں پہنچ جاؤں گا!"

یہ کہہ کر میں نے اپنا برانڈ سلگایا اور سلوجا سے کہا — "چلو تمہیں کچھ قیدیوں سے ملا لاؤں۔"

پہلے ہم زنانہ وارڈ میں گئے، کچھ جوان اور ادھیڑ عورتیں ایک دوسرے کے ساتھ تیز کلامی میں مصروف تھیں، دو عورتیں ان کے جھگڑے سے بے نیاز ایک دوسرے کے بال کاٹنے میں لگی ہوئی تھیں، دو پتھروں کو ایک دوسرے پر مار مار کر انہوں نے کٹے ہوئے بالوں کا زمین پر ڈھیر سا لگا رکھا تھا، وہ اپنے سامنے یکایک مجھے کھڑا دیکھ کر مسکرا دیں، بے حد ناپاک اور ہونٹوں کے ساتھ بالکل چپکی ہوئی سی مسکراہٹ! ایک عورت نے دونوں ہاتھوں میں سارے بال سمیٹ کر میرے سامنے کر دیئے — "یہ جیلر صاحب انہیں میرے عاشقوں میں تقسیم کرا دیجئے گا!"

مجھے دیکھ کر جھگڑتی ہوئی عورتیں خاموش ہو گئیں۔ زنانہ وارڈر انہیں اپنی اپنی بارک میں چلے جانے کے لیے ہنکانے لگی تو ایک عورت نے میری طرف ہوائی بوسہ اچھال کر کہا — "دیکھو جیلر! تم اپنی والدہ کو منع بھی نہیں کرتے! انہیں جی بھر کر دیکھنے ہی نہیں دے رہی ہے حرامزادی!"

میں سلوجا کو جلدی سے باہر لے آیا۔ کہا — "جیل میں رہ رہ کر ہر انسان شرم و حیا سے بے نیاز ہو جاتا ہے، مرد اور عورتیں سبھی! یہاں کچھ دیر اور رکے ہوتے تو ایسی بکواس سننے کو ملتی کہ تم اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے!"

مردوں کے ایک وارڈ میں جاتے ہی بہت سے قیدی ہمارے گرد جمع ہو گئے۔ بہت شوخی سے ایک دوسرے کی بے ہودگیوں کی شکایتیں کرنے لگے، جیسے جانتے ہوں کہ میں اپنے مہمان کی موجودگی میں ان سے کچھ نہ کہوں گا۔ میں نے ایک معمر قیدی کو بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑ دیا اور سمجھایا — "یہ سب تمہارے بچے ہیں، انہیں اخلاق سکھایا کرو، اخلاق!"

وہ سب سالہا سال جیل میں رہ کر عورت کو بھول چکے تھے عورت کی بہت دور ہی سے خوشبو سونگھ کر عشقیہ کورس گانے لگتے تھے۔ اس لئے عورتوں کا وارڈ ان کی پہونچ سے بہت دور بنایا گیا تھا۔

سلوجا نے ان کی باتیں بہت توجہ سے سنیں، ان کی بارکوں میں بنے ہوئے سیمنٹ اور پتھروں کے بیڈ بھی دیکھے جن پر وہ سوتے تھے، ان کے نیچے بنے ہوئے — چھوٹے چھوٹے لاکر بھی دیکھے۔ جن میں وہ اپنے کپڑے اور کھانے کے برتن رکھتے تھے۔

تھیٹر میں کچھ قیدی کسی ڈرامے کی ریہرسل کر رہے تھے میرے کہنے پر انہوں نے سلوجا کو کچھ ڈائیلاگ بول کر سنائے۔ مغلیہ عہد ہی کا کوئی ڈرامہ تھا۔ "جن قیدیوں کو گھومنے پھرنے کی آزادی ملی ہوئی ہے۔ وہ سب یہاں جمع ہو جاتے ہیں۔ ان کے ڈرامے دیکھنے کے لئے کبھی کبھی باہر کے تماشائی بھی آجاتے ہیں۔ جیسے کمشنر، کوئی منسٹر وغیرہ! قیدیوں کا من بہلانے کے لئے یہاں کبھی کبھی مشاعرے بھی کرائے جاتے ہیں۔ یہ لوگ بھی اپنے کہے ہوئے شعر سنایا کرتے ہیں!"

سلوجا نے ایک بار تھیٹر کے بیچ پر کھڑے ہو کر چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ شاید اسے دور دور بنی ہوئی کوٹھڑیاں اور بارکیں اور عمارتیں بکھر بکھر کر بیٹھے ہوئے تماشائیوں کی طرح معلوم ہوئیں جیسے وہ ان کے سامنے ابھی کوئی ناٹک پیش کرنے والا ہو لیکن وہ کچھ کہے بغیر جلدی ہی بیچ پر سے اتر آیا۔ اپنی سوچوں میں بالکل ڈوبا ہوا!

وہاں سے نکل کر ہم عمر قید کے خطرناک قیدیوں کے پاس

گئے۔ انہیں ہمیشہ بند ہی رکھا جاتا ہے۔ کبھی کوٹھڑی سے نکالا نہیں جاتا۔ چھوٹی چھوٹی سلاخوں والی کوٹھڑیوں میں کئی قسم کے مجرم بند تھے قتل کے، ڈکیتی کے، سازشوں وغیرہ کے۔

ایک سردار کی مونچھوں کے کونے غیر معمولی طور پر اوپر کو اٹھے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھوں میں انتہائی وحشت تھی۔ اس نے مجھے دیکھ کر بڑی تمکنت سے کہا۔

"کیپٹن کار صاحب! ہمیں دکھانے کے لئے آج کس یار کو لے کر آئے ہو؟ اسے کہہ دو چار روز ہمارے ساتھ ہی کوٹھڑی میں رہ کر دیکھے تو!"

میں نے سلوجا کو بتایا — "یہ انتہائی سفاک قسم کے قاتلوں میں سے ہے اسے اگر ایک گھنٹے کے لئے چھوڑ دیا جائے تو آٹھ دس قتل تو کر ہی ڈالے گا۔ قتل کرنے میں اسے بہت لذت ملتی ہے، خصوصاً عورتوں کو قتل کرنے میں!"

ایک اور قیدی جو بالکل بوڑھا ہو چکا تھا اور جس نے ہمیشہ بچوں کے قتل کئے تھے۔ اپنی بڑھی ہوئی داڑھی اور سر کے بالوں کی وجہ سے بالکل گورو دیو ٹیگور ہی معلوم ہوتا تھا مجھے دیکھ کر بہت ہی نرم اور شیریں آواز میں بولا — "شت شت پرنام جیلر صاحب!

آپ سے ایک بہت ہی ضروری بات پوچھنا ہے۔ میں کئی برسوں سے ایک الجھن میں پھنسا ہوا ہوں۔ میرا دشواس ہے۔ مجھے اس دودھا سے نکالنے میں آپ ہی میری سہائتا کر سکتے ہیں اچھا یہ بتائیے مرتیو اور جیون میں کوئی انتر کیا ہے؟ اس بات کا ثبوت کیا ہے کہ جو لوگ خود کو زندہ بتلاتے ہیں، وہ واستو میں زندہ بھی ہیں یا نہیں اور جن کو ہم مرا ہوا سویکار کر چکے ہیں، وہ ہو سکتا ہے مرے ہی نہ ہوں، ہمارے بیچ ہی میں رہ کر ہمارے اچھی چیزوں کا لطف لیتے رہتے ہوں! جیلر صاحب! میری بات کا جواب دیتے جائیے! آپ کو اپنے خدا کا واسطہ! اپنے گریٹ نبیو کا! بس ایک منٹ کے لئے اور رک جائیے! پلیز کم کر سیل! ٹھہرو! ٹھہرو!!"

"سالہ تنہائی کی آگ میں بھن بھن کر فلاسفر بنتا جا رہا ہے۔"

میں نے بڑی عجلت سے سلوجا کو آگے بڑھایا۔ آگے کوٹھڑیوں میں ایک انگریز بند تھا جسے میں نے ایک سگریٹ آفر کیا اور سلوجا کو بتایا "یہ ایک بہت بڑا انٹرنیشنل چیٹ ہے۔ مختلف قسم کی فرموں سے ساز باز کر کے فارن ایکسچینج میں کروڑوں کا ہیر پھیر کر لینا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔"

سیاسی اور کلاس ون قیدیوں کی رہائش کا ایک بنگلہ

نمائیں، برآمدے، چھتیں، آرام کرسیاں، ٹیبل لیمپ، بجلی کے پنکھے، اخبارات، کتابیں، ریڈیو، ٹینس یا بیڈمنٹن کورٹ وغیرہ سب کچھ انہیں مہیا ہوتا ہے۔ ان میں سے بیشتر یا تو بستروں پہ دراز تھے یا آرام کرسیوں پر بیٹھے سگار یا پائپ پیتے ہوئے مطالعے میں مصروف تھے۔ یہ لوگ موڈ ہونے پر ہی بات چیت کرتے ہیں، ورنہ عام طور پر ہوں ہاں میں ہی جواب دے کر ٹال جاتے ہیں۔ مجھے اور سلوجا کو دیکھ کر انہوں نے بس ایک لمحہ کے لئے سر اٹھایا اور پھر مطالعہ میں غرق ہو گئے۔ ایک صاحب ترکی ٹوپی پہنے کوئی بہت بڑی کتاب لکھنے میں لگے ہوئے تھے۔ ان کی میز پر کاغذات کا ایک بلند و بند ڈھیر پڑا تھا۔

سلوجا بولا: "معلوم ہوتا ہے اس جگہ تنہائی ہی سب سے سنگین سزا ہے۔ ان سب کے چہرے تنہائی سے ولتے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے۔ ان میں سے کچھ دراصل ہم لوگوں کو ہی قیدی سمجھتے ہوں! ہم جو ان کی دنیا سے باہر رہتے ہیں۔"

میں نے ہنس کر جواب دیا: "یہاں تھوڑی ہی دیر رہ کر تم پر بھی فلاسفی اترنے لگی! مجھے ڈر معلوم ہو رہا ہے کہیں تم یہیں رہنے کا فیصلہ ہی نہ کر ڈالو۔"

یہ سنکر اس نے گھڑی دیکھی اور کہا — "ان لوگوں کے وقت کے بارے میں بھی بہت عجیب طرح کے احساسات ہوں گے لیکن اب واپس نہ چلیں! ایک بجنے کو ہے!"

میں سمجھ گیا، سلوجا اب تھک گیا ہے۔ جس طرح وہ قدم اٹھا رہا تھا، ان سے بھی یہی معلوم ہوتا تھا۔ اب ہم پھانسی پانے کے منتظر قیدیوں کی کوٹھڑیوں کے بالکل سامنے پہنچ چکے تھے۔ میں نے کہا — "جیل کا یہ مختصر مگر اہم ترین گوشہ بھی دیکھتے چلو، پھر پتہ نہیں کب آ سکو!"

چھوٹے سے احاطے میں چھ کوٹھڑیاں تھیں۔ دو خالی تھیں۔ ان کے مکینوں کو دو روز پہلے پھانسی پر لٹکایا جا چکا تھا۔ چار ابھی موجود تھے اپنی اپیلوں کے فیصلے کے منتظر! چاروں کے چہرے موت کی طرح زرد تھا وقت کا ہر لمحہ ان کے خون سے خراج وصول کر رہا تھا۔

سلوجا سلاخوں کے پاس جا کر انہیں دیکھنے لگا — گہری خاموشی سے۔

ایک آدمی گیتا پڑھنے میں مصروف تھا۔ اس نے ہماری آمد کا کوئی نوٹس نہ لیا۔

دوسرا آدمی اپنے ہاتھ میں ایک جاسوسی ناول لئے کھڑا تھا۔ مجھ سے کہنے لگا: "سرکار صاحب، کوئی ناول بھجوا دیجئے نا! اسے تو کئی بار پڑھ چکا ہوں۔ اب کوئی دلچسپی ہی نہیں رہی۔"

میں نے اس کے ہاتھ سے کتاب لے لی، اسے الٹ پلٹ کر دیکھا اور اسے واپس کرتے ہوئے کہا: "ایک بار اور پڑھ ڈالو۔ شام کو کوئی دوسرا بھجوا دوں گا!"

تیسری کوٹھڑی کا قیدی سلاخوں کے ساتھ اپنا چہرہ چپکا کر ہماری طرف بغیر پلک جھپکائے دیکھتا رہا۔ اپنی ایک ہی آنکھ سے اس کی دوسری آنکھ دائمی طور پر بند تھی لیکن معلوم ہوتا تھا۔ اس نے جان بوجھ کر ایک آنکھ بند کر رکھی ہے! کھلی ہوئی آنکھ میں جو حسرت اور بے بسی کی کیفیت تھی اسے الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔

چوتھا قیدی ایک ٹوٹی کنگھی سے اپنے بال سنوارنے میں لگا ہوا تھا۔

ان قیدیوں سے بیس گز کے فاصلے پر ایک اونچی دیوار تھی۔ دیوار میں ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔ سلوجا کو میں اس طرف چھوٹے سے ایک احاطے میں لے گیا۔ وہاں پہنچ کر وہ ہکا بکا سا رہ گیا۔ چند فٹ اونچا ایک پلیٹ فارم تھا جس کے بیچوں بیچ ایک کنواں بنا تھا۔ اس پر لکڑی کے تختے رکھے ہوئے تھے۔ دو بلوں پر زمین کے متوازی ایک مضبوط لٹھے کے ساتھ ایک ریشمی رسہ لٹک رہا تھا۔ پھندے کی شکل میں بنائے ہوئے جس کا دوسرا سرا لٹھے کے ساتھ مضبوطی سے بندھا ہوا تھا۔

سلوجا نے حیران ہو کر پوچھا — "کیا پھانسی اسی جگہ پر دی جاتی ہے؟"

"ہاں یہی وہ جگہ ہے جہاں اب تک بلاشبہ ہزاروں آدمی جھول چکے ہوں گے!"

اسے جیسے یقین نہیں آیا۔ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا وہ پلیٹ فارم پر چڑھ گیا۔ لکڑی پر پڑے ہوئے تختوں کے اوپر جا کر کھڑا ہو گیا۔ پھانسی کے عین نیچے ایک ہاتھ سے پھندے کو چھو کر بولا — "کیا اسی کو گلے میں پہن لینے کے بعد نیچے کا تختہ گر جاتا ہے؟"

اس نے ایک معصوم بچے کی سی حیرانی کے ساتھ ایک ایک تفصیل جاننا چاہی تو مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے پلیٹ فارم کے پاس لگے ایک ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اسے بتایا: "اسے کھینچ کر دباتے ہی پاؤں کے نیچے سے دونوں تختے کھسک جاتے ہیں اور پھانسی پانے والا ایک

ہی جھٹکے میں جھول جاتا ہے؟"

اس نے پھندا اپنے گلے میں پہن لیا اور پوچھا ——— "کیا ایسے؟"

"ہاں اور رسی پھندے کی گانٹھ بالکل نرخرے کے اوپر ہونی چاہئے!"

سلوجا نے پھندے کی گرہ اپنے نرخرے کے عین اوپر رکھ لی اور رسے کی گرفت بھی قدرے سخت کر لی۔

میں نے ہنس کر کہا ——— "اب تم موت کی بالکل زد میں ہو۔ میرے ہاتھ کی ہلکی سی جنبش سے تم جھول جاؤ گے۔ کیا تم سے تمہاری آخری خواہش پوچھوں؟ جیسا کہ جیل کے قاعدے کے مطابق مرنے والوں سے پوچھا جاتا ہے۔"

سلوجا نے کوئی جواب نہ دیا۔ کسی سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ لمحوں تک خاموش ہی کھڑا رہا۔ اسی طرح گلے میں پھندا ڈالے میری طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھتا رہا۔ میں نے اسی طرح چلتے ہوئے کہا ——— "تمہیں ایک موقع اور دیتا ہوں۔ بولو تمہاری آخری خواہش کیا ہے؟"

سلوجا پہلے سے کہیں زیادہ افسردہ ہو گیا۔ اس کی میری طرف لگی ہوئی ٹکٹکی بھی طویل ہو گئی۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولا ———

"میری آخری خواہش یہ ہے کہ میں تمہارے سامنے اپنے ایک جرم کا اعتراف کر لوں۔ اس جرم کا تمہیں آج تک علم نہ ہو سکا۔ کیا تم میرا اعتراف سننے کے لئے تیار ہو؟"

میں نے قہقہہ لگا کر کہا ——— "ہاں بالکل تیار ہوں لیکن سب سچ سچ ہی کہنا۔ اس سے تمہیں مرنے کے بعد شانتی بھی ملے گی۔"

سلوجا کے چہرے پر انتہائی کرب اور بے چینی پیدا ہو گئی۔ جیسے کوئی بات اس کی زبان تک آتے آتے پلٹ جاتی ہو۔ میں نے ذرا تحکم سے کہا۔

"جلدی بتاؤ! تم کون سے جرم کا اعتراف کرنا چاہتے ہو؟"

سلوجا نے جذبات سے گلوگیر آواز میں کہا ——— "جس لڑکی سے ہم دونوں پیار کرتے تھے نا ——— اس کی موت کے لئے دراصل میں ہی ذمہ دار تھا!"

یہ سن کر میرا ہنسی کا موڈ آف ہو گیا۔ میرا ہاتھ یکایک کانپ اٹھا لیکن میں بہت سختی سے ہینڈل کو تھامے رہا۔ اس سے بہت ہی غضب ناک ہو کر پوچھا۔

"تم ذمہ دار تھے! تم! کس طرح؟ کیسے؟ جلدی بتاؤ نہیں تو ابھی تمہیں پھانسی دے دوں گا!"

اس نے میرے غصے کے سامنے کوئی گھبراہٹ دکھائی پہلے کی طرح اور اسی متوازن اور بھرائی ہوئی آواز میں بتانے لگا۔

"مجھے معلوم تھا روشنی تم ہی سے پیار کرتی ہے لیکن یہ مجھ سے برداشت نہیں ہو پاتا تھا۔ میں اندر ہی اندر رشک و حسد کی آگ میں جلا کرتا تھا۔ چاہتا تھا وہ کسی طرح تمہارا خیال چھوڑ دے۔ میرے قریب آ جائے۔ روشنی کو میں نے کئی بار سمجھایا تھا۔ تمہاری برائی بھی کی تھی اور اسے کئی طریقوں سے دھمکایا بھی تھا لیکن وہ اپنے ارادے کی پکی تھی۔ میری دھمکیوں کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ میں نے مجبور ہو کر ایک آخری حربہ استعمال کرنا چاہا۔ اس سے کہہ دیا۔ اب میں کانٹے کو اپنے راستے سے ہٹا دوں گا۔ میں سچ مچ تمہیں مار ڈالنے کے منصوبے سوچا کرتا تھا۔ تمہیں کبھی پتہ نہ لگ سکا۔ ایک بار ہم صبح کی گاڑی سے گھر واپس جانے والے تھے۔ اسی روز میں نے تمہیں گاڑی سے دھکا دے دینے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ یہ بات روشنی کو بھی بتا دی تھی۔

اس رات بہت بارش ہو رہی تھی۔ تمہیں یاد ہے اس روز سردی کتنی تھی۔ میں اپنے کمرے میں بستر کے اندر پڑا پڑا صبح ہونے کا انتظار کر رہا تھا اور باہر سخت بارش کی آواز سن رہا تھا۔ میرے دروازے پر مسلسل بوچھاڑ پڑ رہی تھی اور دروازوں سے پانی بھی اندر آ رہا تھا۔ جو فرش پر پھیلتا جا رہا تھا۔ میں روشنی کے ریٹائرڈ کیپٹن باپ کے مکان کی سب سے اوپر والی منزل پر رہتا تھا نا۔

ایک چھوٹے سے کمرے میں اکیلا۔ اچانک وہ بارش میں بھیگتی ہوئی میرے پاس آئی۔ مجھ سے تمہاری زندگی کی بھیک مانگنے لگی۔ میں نے غصے میں آ کر اسے باہر نکال دیا اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ وہ ساری رات میرا دروازہ کھٹکھٹاتی رہی اور روتی رہی اور بارش میں بھیگتی رہی۔ میں نے پختہ ارادہ کر لیا تھا اب تمہیں مار کر ہی چھوڑوں گا۔ یہ سوچتے سوچتے نہ جانے کس وقت میری آنکھ لگ گئی۔

صبح اچانک ہی تمہاری آواز سن کر میں نے دروازہ کھولا تھا۔ میرا خیال تھا۔ اسٹیشن پر جانے کے لئے تم ٹیکسی لے کر آئے ہو گے لیکن تم تو اپنا پروگرام ملتوی کر دینے کی خبر لے کر آئے تھے کیونکہ روشنی کو نمونیا ہو گیا تھا۔ تم صبح اس سے ملنے کے لئے گئے تھے۔ تب ہی یہ بات تمہیں معلوم ہوئی تھی لیکن روشنی نے یہ بات کسی کو نہیں بتائی کہ وہ رات کو سردی اور بارش میں کہاں بھیگتی رہی تھی۔ تم اس کی بیماری کی وجہ سے بہت پریشان تھے۔ اس لئے تم وہیں رہ گئے اور میں چلا گیا۔ دل میں ایک عجیب سی مسرت کہ روشنی کا اچھا ہوا اسے سزا مل

تھی تم نے کئی روز کے بعد مجھے ایک دکھ بھرا خط لکھا۔ روشنی مرگئی تھی تمہاری دنیا ویران ہوگئی تھی۔ تمہاری پہلی محبت کا انجام واقعی دردناک تھا لیکن اصل بات کسی کو بھی نہ بتا سکا۔ آج تک سینے میں چھپائے پھرتا رہا تم سے دور دور! کتنے برسوں سے تم سے نہیں ملا۔ اسی وجہ سے تمہارے خط آتے رہتے، تم اپنے یہاں آنے کے لئے انوائیٹ کرتے رہے لیکن میں تمہارے سامنے ہونے سے ڈرتا تھا۔ آج اتفاق سے تمہارے یہاں آنکلا۔ آج اتفاق ہی سے جیل میں بھی پہنچ گیا اور پھانسی کے اس پھندے تک بھی جس کا میں بھی بجا طور پر مستحق تھا۔ یہ اچھا ہوا کہ میرے ضمیر نے مجھ سے بہت کچھ کہلوا لیا۔ اب سزا تمہارے ہاتھ میں ہے تم اس ہینڈل کو دبا دو، ذرا سا جھکا دو۔ میں اپنے جرم کی سزا پانے کے لئے تیار ہوں سچے دل سے!"

وہ میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک آگئی تھی۔ سچائی کی چمک! اپنے بوجھ سے آزاد ہونے پر تسکین پا لینے کی چمک! لیکن میں خاموش کھڑا تھا، ایک عجیب سے سکتے میں میں اسے کوئی جواب نہ دے سکا۔ آخر اسی نے مجھ سے کہا "سوچ کیا رہے ہو کمار! میرے جرم کی سزا کیا پھانسی نہیں ہے؟"

میں نے بہت جدوجہد کے بعد جواب دیا— "نہیں ہر جرم کی سزا پھانسی نہیں ہوا کرتی۔ تم سے جو کچھ ہوا ایک خاص عمر میں ہوا ایک خاص کیفیت میں ہوا۔ تم کسی کی جان نہیں لے سکتے تھے میری بھی نہیں، میں جانتا ہوں تم اتنے بہادر کبھی نہیں تھے جو کچھ تم نے روشنی سے کیا وہ تمہارا ایک جذباتی ابال تھا محض! بس اور کچھ نہیں!"

یہ کہہ کر میں نے ہینڈل چھوڑ دیا، اس سے کہا— "نیچے آ جاؤ، اب گھر چلیں گے، کانتا کھانے پر ہمارا انتظار کر رہی ہوگی!"

لیکن وہ اپنی جگہ پر کھڑا رہا بولا— "تم بہت فراخ دل ہو بے حد محبت کرنے والے معصوم دوست! تم مجھے یہاں سے مت اتارو، اپنے ہاتھ سے پھانسی دے کر میری آخری خواہش کی تکمیل کردو پلیز! کمار جلدی کرو!"

میں نے اس کی طرف شک شبہے سے دیکھا، یہ وہ کہیں پاگل تو نہیں ہوگیا ہے! پلیٹ فارم پر جا کر اس کے گلے سے زبردستی پھندا نکالا اور اسے نیچے لاتے ہوئے کہا—

"تمہارے جرم کی یہی سزا کیا کم ہے کہ تم اتنی مدت سے اکیلے بھٹکتے پھرتے ہو!..."

ختم شد

سلوجا نے کوئی جواب نہ دیا۔ جیل کی چار دیواری سے باہر آکر بھی وہ اسی طرح افسردہ رہا۔ جیسے بوجھ سے وہ آزاد ہونا چاہتا تھا، وہ ابھی تک اس کے کندھوں پر پڑا تھا۔ صبح اس نے جو بشاشت دکھائی تھی اب اس سے وہ بالکل ناآشنا معلوم ہوتا تھا۔

اسے اتنا سنجیدہ دیکھ کر کانتا بھی حیران ہوئی۔ اس نے سلوجا کے لئے کئی طرح کے لذیذ کھانے تیار کر رکھے تھے لیکن وہ انہیں کھانے میں کوئی دلچسپی نہیں دکھا رہا تھا۔ کانتا نے اس سے خاموشی کا سبب پوچھنا چاہا تو اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے بھی کچھ اور پوچھنے سے بیوی کو منع کر دیا۔

کھانا کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ جہاں اس کا سامان رکھا گیا تھا۔ کانتا اور میں اپنے کمرے میں چلے گئے آرام کرنے کے لئے میں نہیں چاہتا تھا کہ آج کے واقعے کے متعلق کچھ کانتا کو بتاؤں لیکن اس نے سلوجا کی اداسی کے بارے میں کرید کرید کر پوچھا تو اسے سب کچھ بتا دیا۔ سب کچھ جان کر وہ خوفزدہ ہوگئی، بہت تشویش سے بولی۔

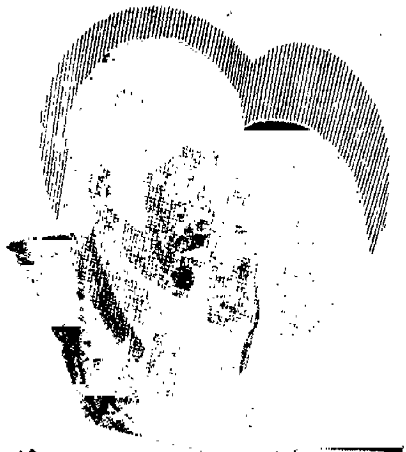
"اگر آپ نے غصے میں کہیں سچ مچ ہینڈل دبا دیا ہوتا تو!!"

میں نے اسے پیار کرتے ہوئے بتایا— "ہاں میں بے شک ایسا کر سکتا تھا لیکن میں نے ہینڈل دبانے کی بجائے اپنے غصے ہی کو دبا دیا! اس طرح وہ میرے ہاتھ سے مرنے سے بچ گیا، مر جاتا تو میری بھی خیر کہاں ہوتی، میرے گلے میں بھی تو پھانسی کا پھندا آپڑتا کسی روز!"

کانتا نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا، بولی: "ایسی بات منہ سے نہ نکالئے اب سو جائیے!"

ہم دونوں کافی دیر تک سوتے رہے، خوب گہری نیند، خوب پیٹ بھر کے کھانا کھایا تھا نا! کانتا مجھ سے پہلے ہی جاگی۔ ساڑھے چار بجے کانتا نے مجھے چائے پینے کے لئے جگایا۔ نوکر کو سلوجا کے کمرے میں بھیجا تاکہ اسے بھی چائے کے لئے بلا لائے لیکن نوکر وہاں جاتے ہی چیختا ہوا پلٹ آیا، خوف اور حیرانی سے کانپتا ہوا بولا۔

"صاحب تو سلیپنگ فین کے ساتھ بیڈ شیٹ باندھ کر لٹک رہے ہیں"



محبت کرنا تو میں نے کیا واقعی بہت بڑا جرم ہے!

شیشے جیسی لڑکی کی
نازک سی اچھوتی کہانی

— غزالہ فتح —

ہم پکچر دیکھ کر لوٹ رہے تھے کہ نیفی نے آئس کریم کھلانے کی پیش کش کی۔ میں فوراً تیار ہوگئی۔ نیفی نے ریسٹورینٹ کے قریب اسکوٹر کھڑا کیا ہی تھا کہ اسے شاید کوئی دوست نظر آگیا وہ لپکتا ہوا ادھر کو چلا گیا اور میں خاموشی سے کھڑی اس کا انتظار کرتی رہی۔ کافی دیر کے بعد میں نے دیکھا وہ دونوں باتیں کرتے ادھر ہی آرہے تھے۔ شام کے سلونے اندھیرے میں میں نے دیکھا وہ لمبے قد اور کافی کی رنگت کے سے بالوں والا خوش شکل سا نوجوان تھا۔ نیفی اس کے ساتھ چلتا خاصا چھوٹا لگ رہا تھا وہ دونوں باتوں میں اتنے مشغول تھے کہ نیفی ایک جانب کھڑے میرے وجود کو تقریباً فراموش کر بیٹھا تھا۔ بلکہ یکو بیزاری سے میں نے ان کی باتیں سننی شروع کیں۔ نیفی اس سے اپنے چلنے کو اصرار کر رہا تھا مگر وہ انتہائی سنجیدگی سے متواتر انکار کر رہا تھا۔ کافی وقت اسی اصرار و انکار میں گزرا تو نیفی کو غصہ آگیا۔

"بس ٹھیک ہے خدا حافظ۔"

وہ ناراضگی سے بولا کر جلدی سے واپسی کے لیے مڑا۔ مجھے ایک کونے میں کھڑا دیکھ کر ٹھٹک سا گیا اور اگلے لمحے تمام غصہ نظر انداز کرکے وہ میرا تعارف اس سے کرا رہا تھا۔

"ہیلو" اس کی آواز میں شوخی رچی تھی۔ ہم کتنی ہی دیر اس کے پاس بیٹھے رہے تب فیضی نے اس سے اچانک پوچھا "اچھا تو سرمد جلدی سے بتا دو کیا بات ہے؟"

"کیسی بات؟" وہ گھبرا گیا۔

"وہی بات جس نے میرے اتنے پیارے دوست کو اُداس کر رکھا ہے۔" فیضی واقعی اس سے بہت پیار کرتا تھا۔

"ارے نہیں ایسی کوئی بات نہیں" وہ ٹالتا رہا مگر فیضی کب کسی کی ماننے والا تھا، تب اسے بتانا ہی پڑا۔

"تم جانتے ہو فیضی میں اپنے گھر میں سب سے چھوٹا اور لاڈلا تھا میری سالگرہ بڑی دھوم دھام سے منائی جاتی ہے اب میرا جنم دن نزدیک آ رہا ہے اور مجھے اپنے گھر بار اپنے والدین سے محرومی کا احساس شدید تر ہوتا جا رہا ہے۔"

"اوہ!" فیضی اداس ہو گیا اور اس سمے میرا جی چاہا کہ اس لمبے تڑنگے دکھی لڑکے کو اتنا پیار دوں کہ یہ سب غمگین خیالات سراسر فراموش کر بیٹھے۔

فیضی اور میں نے نہایت رازدارانہ طریقے سے اس کی سالگرہ کی تیاریاں شروع کر دی تھیں میں بازار سے اون خرید لائی تھی اور چپکے چپکے اس کا سویٹر بنا کرتی تھی، جمعے کو اس کا جنم دن تھا وہ اس صبح خاصا پریشان تھا مگر بہرحال صبح صبح ہی وہ فیکٹری چل دیا فیضی نے اس روز چھٹی کی اور ہم سارا دن رات کے فنکشن کی تیاریاں کرتے رہے۔ سرمد کے آنے کے وقت تک ہم لباس بدل چکے تھے میں نے فیروزی رنگ کا سوٹ اور فیروزی ہی خوبصورت سیٹ پہنا تھا جبکہ فیضی اپنے سیاہ سوٹ میں خوب جچ رہا تھا۔ سرمد کے آنے تک تمام تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ دروازے پر ہی وہ مجھے مل گیا۔ اس کی نگاہوں میں حیرت اور ستائش نمایاں تھی، اسے اتنا غور سے تکتے پا کر میں شرما گئی اور اندر چلی آئی سرمد کو خوب بنا سجا دیکھ کر وہ مزید حیران ہوا۔

"تم لوگ کہیں جا رہے ہو کیا؟"

وہ اتنی زبردست تیاری سے یہی نتیجہ اخذ کر سکا تھا کمرے میں داخل ہوا تو چائے کے لوازمات اور کیک سے سجی میز دیکھ کر وہ سب کچھ جان گیا۔

"مگر بھئی یہ فیضی یہ تکلف......" وہ جانے کیا کہنا چاہتا تھا۔ مگر فیضی نے اس کی بات کاٹی اور اسے تھامے میز تک لے آیا کیک کاٹتے اور موم بتیاں بجھاتے ہوئے میں نے اس کی آنکھوں میں سچی خوشی کی چمک دیکھی۔ وہ بے انتہا خوش تھا۔ فیضی نے اسے فراز کی کتابوں کا سیٹ دیا تھا جسے اس نے بہت مسرت سے قبول کیا اور جب میں نے سویٹر کا پیکٹ اس کے ہاتھ میں تھمایا تو میرے ہاتھ کانپ رہے تھے اس کے چہرے کی مسکراہٹ اتنی شریر تھی کہ مجھے اپنا چہرہ تپتا محسوس ہو رہا تھا۔ "شکریہ بہت شکریہ" وہ بے ساختگی سے بولا، بے حد خوشگوار ماحول میں ہم نے چائے پی اور رات گئے تک ہم نے کتنی ہی باتیں کر ڈالیں اسے اتنا خوش دیکھ کر میری روح تک مسرور ہو گئی تھی۔ ان چند دنوں میں وہ میرے دل پر پوری طرح سے قابض ہو چکا تھا۔

دوپہر ہی میں کھانے کے بعد لیٹی ہی تھی کہ فیضی آ گیا۔

"گڑیا میری پیاری بہن"

"بس بس مسکہ نہ لگاؤ کام بتاؤ۔"

"جا میری بہن مجھے ٹرانسسٹر لا دے ابھی کومنٹری آنے والی ہے۔"

"مگر وہ تو اوپر ہے۔" میں نے فوراً جھجک کر کہا۔

"تو کیا ہوا جاگ رہا ہے" وہ بڑی لجاجت سے بولا۔

"تم خود لے آؤ نا" میں نے پھر کہا مگر وہ ناراض سا ہو گیا۔ تب میں اٹھی اور جان بوجھ کر بڑبڑاتی اوپر چل دی۔ میں نے دھیرے سے دروازہ کھولا کمرے میں نیم تاریکی تھی، شاید وہ سو رہا تھا۔ میں دبے قدموں چلتی اندر آ گئی وہ بستر پر آنکھیں بند کئے لیٹا تھا اور ٹرانسسٹر اس کے بستر کی دوسری جانب میز پر تھا۔ اسے سوتا دیکھ کر میں مطمئن سی ہو گئی تھی اس لئے ہاتھ بڑھا کر ٹرانسسٹر تھام لینا چاہا مگر اگلے ہی لمحے میرا ہاتھ اس کی مضبوط گرفت میں تھا۔ وہ آنکھیں کھولے انتہائی شرارت سے مسکرا رہا تھا۔

"گڑیا، ابھی میں تمہارے بارے میں ہی سوچ رہا تھا" اس کی گمبھیر آواز کمرے کی خاموش پرسکوت فضا کو توڑ گئی اور میں ایک دم لرز گئی۔

"میرا ہاتھ چھوڑیئے" میری آواز بہت مشکل سے نکلی۔

"میں نے یہ ہاتھ چھوڑنے کو نہیں تھاما گڑیا۔ وہ بہت جذباتی ہو رہا تھا "تم میری ویران دنیا میں بہار بن کر آئی ہو گڑیا" وہ دھیرے دھیرے میرے ہاتھ کو دبا رہا تھا۔

"پلیز سرمد صاحب مجھے جانے دیجئے" میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا اور چہرہ انتہائی گرم ہو رہا تھا تب وہ اٹھ کر بیٹھ گیا مگر میرا ہاتھ ابھی تک اس کی مضبوط گرفت میں تھا "گڑیا میرے پیارے

سے دوست کی ننھی سی بہن میرے دل و دماغ پر بری طرح چھا گئی ہو! کیا میں تمہارے دل میں کوئی لطیف جذبہ پیدا نہیں کر سکا؟"

اس کا لہجہ استفہامیہ تھا۔ میں خاموش رہی بس چپکے سے سر جھکائے سرخ پڑتی گئی۔

"جواب دو گڑیا کیا میری دیوانگی یکطرفہ ہی رہے گی؟" اس کے سوال میں ان تمام جذبوں کی شدت تھی۔

"مجھے جانے دیں نا۔" بمشکل میری آواز نکلی۔

"پہلے میری بات کا جواب دو۔" میں نے کہنا چاہا کہ سرمد تمہیں تو میں پہلے ہی دن اپنے دل کے سنگھاسن پر بٹھا چکی ہوں۔ مگر میں تو لڑکی تھی نا کیسے کہہ دیتی، میری متواتر خاموشی سے وہ الجھن میں پڑ گیا تھا۔

"گویا میں نے خود کو ہر قسم کا جواب سننے کے لئے تیار کیا ہے تم بلا جھجک کہو۔"

اس کی آنکھوں میں اندیشے سے لہرا گئے تھے میں پھر بھی خاموش رہی تو اس نے خود ہی میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"جاؤ گڑیا۔" وہ شکست خوردہ سے لہجے میں بولا اسے اتنا پریشان اس قدر اداس دیکھ کر میرا دل کانپ گیا۔ میں آہستہ سے اٹھی وہ صرف میری طرف دیکھ کر رہ گیا، میں جانے کو مڑی مگر جانے کیوں میں دروازے تک نہیں جا سکی اور پھر واپس آگئی "سرمد۔" مجھے اپنی آواز کہیں بہت دور سے آتی محسوس ہوئی "سرمد" میں نے دوبارہ کہا اس نے چونک کر میری طرف دیکھا مگر اٹھتی گرتی پلکوں کی چلمن اور میرا سرخ چہرہ دیکھ کر وہ سب کچھ سمجھ گیا۔ اگلے ہی لمحے میں اس کے مضبوط بازوؤں کے حصار میں تھی۔

"اتنی دیر مجھے خواہ مخواہ تنگ کیا۔" وہ میرے بالوں پر چہرہ رگڑتا ہوا جذباتی لہجے میں بولا۔ "گڑیا تم میری زندگی ہو میری زندگی کا حاصل ہو۔" وہ بے خود ہلکا رہا تھا تب اچانک میں چونک گئی اور اس کے بازوؤں میں سے نکل آئی۔ میرا رنگ حیرت انگیز حد تک سرخ ہو گیا تھا سرمد نے چھوٹی انگلی میرے رخسار پر آہستگی سے لگائی۔ "دیکھوں یہ رنگ اترتا ہے کہ نہیں۔" وہ بہت مخمور ہو رہا تھا اور میں مسرور سی وہاں سے نیچے آگئی۔ نیچے اترتے ہی میری نظر فیضی پر پڑی تو میری گویا جان نکل گئی۔ وہ بے تابی سے برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔ میں اتنی دیر کے بعد آئی تھی اور اب بھی ٹرانسسٹر میرے ہاتھ میں نہ تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میرے قریب آگیا۔

"وہ فیضی میں اوپر گئی تو وہ سوئے ہوئے تھے۔ میں نے بہت

ایک دن یوسف دو بجے دوپہر عصمت چغتائی کے نام کال آئی۔ ان کے بھتیجے قسیم بیگ چغتائی نے جو اسی روز حیدرآباد سے پہنچے تھے فون ریسیو کیا۔ دوسری طرف کسی پرستار کی تھرتھراتی ہوئی آواز تھی۔ "کیا عصمت چغتائی صاحبہ سے بات ہو سکتی ہے؟"

قسیم بیگ نے پوچھا "آپ کون صاحب ہیں؟ کہاں سے بول رہے ہیں؟" جواب ملا۔ "میں عصمت چغتائی صاحبہ کا برسوں سے پرستار ہوں۔ ان سے ملنے پنجاب سے آیا ہوں۔ ریلوے اسٹیشن سے سیدھا اخبار کے دفتر پہنچا۔ وہاں سے عصمت صاحبہ کا فون نمبر لیا اور یہیں سے فون کر رہا ہوں۔ اگر ان سے نہ مل سکا تو بے نیل و مرام جانا پڑے گا۔" قسیم بیگ نے جواب دیا۔ "عصمت چغتائی صاحبہ دو بجے تک آرام فرمایا کرتی ہیں۔ اس وقت دو بجنے میں پندرہ منٹ باقی ہیں۔ آپ کے پاس سواری ہے تو فوراً چلے آئیے۔" پرستار خوشی سے چہکتی آواز میں بولے۔ "میرے پاس کرائے کی سائیکل ہے آپ مجھے کوٹھی کا پتہ سمجھا دیجئے۔" قسیم بیگ نے پتہ سمجھایا اور فون بند کر دیا۔ دس منٹ بعد وہ صاحب ہانپتے کانپتے گھر پہنچ گئے۔ عصمت چغتائی کے اس پرستار کو دیکھنے کا اشتیاق گھر کے سبھی افراد کو ہو گیا تھا۔ اس لیے ان صاحب کو اندر فوراً بلوا لیا گیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ سامنے بیٹھی ہوئی عصمت چغتائی کو دیکھ کر بے تاب ہو گئے آگے بڑھے اور ان کے قدموں پر اپنا سر رکھ دیا۔ پھر سر اٹھا کر جذبات سے رندھی آواز میں بولے۔ "میری تیس برس سے آپ سے روحانی ملاقات ہے کتنی خوشی کی بات ہے کہ آج جسمانی ملاقات بھی ہو رہی ہے۔" اور عصمت چغتائی نے گھبرا کر اپنے پاؤں سمیٹ لیے!

تلاش کیا مگر ٹرانسسٹر مجھے نہیں ملا۔ شاید وہ کسی الماری۔۔۔۔"
میں پھولے ہوئے سانسوں کے درمیان تیزی سے بولی،
"گڑیا" فیضی نے سرزنش کے انداز میں کہا تو میں بول اٹھی "فیضی میں تم سے چاہوں بھی تو جھوٹ نہیں بول سکتی، اوپر گئی تو وہ جاگ رہے تھے اور۔۔۔ اور۔۔۔۔" میرا فقرہ ختم ہونے سے پہلے ہی وہ بول اٹھا "ٹھیک ہے گڑیا میں تم پر اعتماد کرتا ہوں اور سرمد میرا عزیز دوست ہے اگر وہ چاہے تو میں تمہارا ہاتھ۔۔۔۔۔" ہم میں لاکھ بے تکلفی سہی مگر یوں میرے سامنے بات کرتے ہوئے وہ جھجک گیا اور میں نے آخرکار باورچی خانے میں ہی پناہ لی۔

اوائل گرما کی وہ ایک خوبصورت سہ پہر تھی جب سرمد نے میرے ہاتھ میں منگنی کی انگشتری پہنائی، اس روز میں نے اپنا واحد کامدار سوٹ پہنا تھا اور میک اپ بھی کیا تھا ہماری منگنی کی اس تقریب میں صرف فیضی ہی شامل تھا۔ فیضی نے سرمد کی انگلی میں انگوٹھی پہنائی، تو جانے کیوں اس کی آنکھیں چھلک اٹھیں سرمد نے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لیا اور کتنی ہی تسلیاں دے ڈالیں۔ میرا دل خوشی کے بیکراں احساس سے اچھل رہا تھا مگر فیضی کو اداس دیکھ کر میں بے قرار سی ہو گئی۔ منگنی کی سادہ سی تقریب کے بعد جب ماحول سے اداسی کچھ چھٹ گئی تو سرمد نے کہا۔

"گڑیا ذرا جلدی سے چائے بنا لاؤ۔"
میں اپنا بھاری بھرکم دوپٹہ سنبھالتی جانے کو ہی تھی کہ فیضی نے پکارا۔
"سرمد میرا خیال ہے کہ آج اس ننھی سی دلہن سے کام نہ کروائیں۔ چائے اور کھانا بازار سے کھایا جائے یہ بھی کیا یاد کرے گی۔"
فیضی کی بات پر میں لجا سی گئی۔ عین وقت پر فیضی نے جانے سے انکار کر دیا۔ وہ ہمیں تنہائی کا موقع فراہم کرنا چاہتا تھا "میرا پیارا بھیا"۔ میرا دل اس کے بے پناہ پیار سے بھر گیا۔ سرمد کے پیچھے اسکوٹر پر بیٹھے میں نے خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی تصور کیا، آرزوئیں اس طرح بھی پوری ہوتی ہیں، میرے خوش ہوتے دل نے سوچا "میرا" کے نیم تاریک ماحول میں بیٹھے سرمد نے کتنی ہی باتیں کر ڈالیں۔ اپنے مستقبل کی اور اپنی چاہتوں کی کتنی ہی مضطرب سی کہانیاں سنا ڈالیں۔
"گڑیا اپنے والدین کے بعد میں خود کو انتہائی بدنصیب انسان سمجھنے لگا تھا مگر شاید قدرت کو میری خوشیاں منظور تھیں کہ تم لوگ فیضی مجھے مل گئے" میرا ہاتھ تھامتے ہوئے سرمد نے جذب کی سی کیفیت میں کہا تو میں نہال ہو گئی۔

"سرمد ہمارے قرب میں تمہیں کبھی محرومی کا احساس نہ ہو سکے گا" میں نے تھوڑا سا شرماتے ہوئے اقرار کر لیا۔

اس روز بادل خوب گھر گھر کر آئے ماحول اتنا خوبصورت ہو گیا تھا کہ میں سموسے تلنے بیٹھ گئی۔ فیضی اور سرمد ابھی واپس نہ آئے تھے کتنے ہی لمحے گزر گئے کہ سرمد کا چہرہ مجھے باورچی خانے کے دروازے سے نظر آیا۔ بظاہر نظرانداز کرتے ہوئے میں کام پر جھک گئی مگر دل کی دھڑکن بری طرح تیز ہو گئی۔
"کیا ہو رہا ہے؟" وہ خوش دلی سے بولا۔
"دیکھ لو" وہ میرے قریب چوکی گھسیٹتے ہوئے بیٹھ گیا۔
"یہ لو رانی"
"کیا ہے؟"
"دیکھ لو" وہ میرے ہی انداز میں بولا تو میں نے ہنس کر اس کی طرف دیکھا اس کے ہاتھ میں بڑے بڑے چند نوٹ تھے جنہیں وہ لہرا رہا تھا "لو پکڑو۔"
"کیوں؟ بھئی میری تنخواہ ہے۔" وہ مجھے سمجھانے کے سے انداز میں بولا مگر میں برا مان گئی۔
"تم نے ہمیں سمجھا کیا ہے؟ ہم اتنے گرے ہوئے ہیں کہ تم۔۔۔۔" میں غصے کو ضبط کرتے ہوئے بولی تو وہ یک لخت کھڑا ہو گیا "میرا مطلب یہ نہ تھا گڑیا دیکھو نا فیضی بھی ساری تنخواہ تمہارے ہاتھ میں دیتا ہے اور پھر میرے آنے سے خرچ بھی بڑھ گیا ہے اسی لئے تو۔"
اچھا اب پکڑو یہ پیسے" بات بدلتے ہوئے تیزی سے بولا۔
"میں تو کبھی نہ لوں گی تمہارے پیسے۔"
"اچھا تو مجھے غیر سمجھتی ہو"
"نہیں ایسا تو نہیں" "چلو جلدی سے پکڑو۔"
"نہیں نہیں۔"
"نہیں لو گی؟"
"نہیں کبھی نہیں" "تو پھر ٹھیک ہے۔" وہ ایک جھٹکے سے باہر چلا گیا۔ فیضی آفس سے آیا تو ہم دونوں نے ہی چائے پی سموسے کھائے مگر وہ نہیں آیا۔ کافی رات گئے تک فیضی نے اس کا انتظار کیا مگر پھر کھانا کھا کر سو گیا مگر جانے کیوں میں نہ تو کھانا کھا سکی اور نہ ہی نیند سے میری آنکھیں بند ہوئیں بارہ بجے کے قریب وہ آیا تو میں نے ہی دروازہ کھولا، میری طرف دیکھے بنا ہی وہ اوپر جانے لگا۔

"کھانا کھاؤ گے؟" میں بولی۔

"میں کھا آیا" وہ درشتی سے کہتا ہوا اوپر چل دیا۔ صبح تک شاید پھر بھی وہ ناراض سا تھا۔ میں جو کپڑے استری کر کے رکھ آئی تھی وہ نہیں پہنے۔ میں ساری رات صحیح طرح سو نہیں سکی تھی وہ نہ جانے کیوں یک طرح بیٹھا رہا۔ مجھے خواہ مخواہ ہی اس پر پیار آ گیا تبھی میں نے فیضی سے کہا۔

"فیضی تیرا فیض عام ہے ہماری صلح کرا دے۔"

میں نے کہا تو فیضی چونک اٹھا سرمد یونہی پھولا سا بیٹھا رہا۔

"کیوں کیا ہوا؟"

"دیکھو نا فیضی تم ساری تنخواہ میرے ہاتھ پکڑاتے ہو اور پھر پان سگریٹ تک کے لئے مجھ سے لیتے ہو۔ اب یہی بات میں نے سرمد سے کہی تو برا مان گیا اسے کہو فوراً تمام پیسے گن کر میرے ہاتھ پکڑا دے۔"

فیضی ارے ارے ہی کرتا رہا اور سرمد نے کھلتے چہرے کے ساتھ تمام پیسے مجھے دے ڈالے جو میں نے جانے کیا سوچ کر دراز میں منتقل کر دیئے۔

اور پھر وقت کا پنچھی پر پھیلائے اڑتا ہی چلا گیا میری زندگی کے وہ حسین ترین دن تھے میری پوری زندگی میں صرف دو مرد آئے تھے ایک فیضی جو میرا دوست بھی تھا اور بھائی بھی جس نے مجھے باپ کی سی شفقت بھی دی۔ اور پھر وقت کی گردش نے میری زندگی کی کتاب میں ایک اور حسین باب کا اضافہ کیا۔ یہ سرمد تھا جو میری روح پر چھا گیا۔ میں جو اس کے خیال سے جاگتی تھی اس کے خواب لئے سوتی تھی۔ میں نے اس سے ٹوٹ کر محبت کی تھی اور محبت بہت شکی بہت نازک مزاج ہوتی ہے۔ محبوب کی ذرا سی بے التفاتی معمولی سی بے پرواہی دل چیر کر رکھ دیتی ہے ان دنوں جانے کیوں مجھے یہی محسوس ہو رہا تھا جیسے سرمد میرا نہیں رہا۔ وہ میرے ساتھ ہوتا ہنسی مذاق کرتا میرے چہرے کو ہاتھوں میں لے کر کتنی ہی خوبصورت باتیں کرتا مگر پھر بھی یہ احساس دن بدن شدید ہوتا جا رہا تھا کہ وہ وہاں میرے پاس نہیں ہوتا۔ وہ مجھ سے بات کرتا ہے تو اس کی آنکھوں میں شدید جذبوں کی وہ والہانہ چمک نہیں ہوتی اور سب سے بڑی اذیت ناک تبدیلی یہ کہ وہ رات کو بہت دیر سے گھر آتا۔ فیضی اس کی اس روش سے خاصا پریشان تھا مگر بالکل خاموش تھا۔

"فیضی تم اس سے پوچھتے تک نہیں کہ وہ اتنی رات تک کہاں رہتا ہے؟" ایک روز میرے دل کے انجانے اندیشے زبان تک آ ہی گئے۔

"یہ بات میرا بھی قسمت سے گھس کر ساتھ گویا صرف دوست ہوتا تو میں اس سے پوچھ سکتا تھا مگر اب تو بات اور ہے نا۔" فیضی نے میری انگلی کی انگوٹھی کی جانب اشارہ کر کے کہا تو اتنی بے بسی سے کہا کہ میں اداس ہو گئی۔

دس بج گئے تھے مگر ابھی تک سرمد نہیں آیا تھا فیضی خالی خالی نظروں سے میری طرف تکتا رہا اور میں نظر چرائے خاموش بیٹھی رہی کافی دیر یونہی بیت گئی گیارہ بج گئے تھے فیضی ابھی تک اپنے بستر پر اکڑوں بیٹھا تھا تبھی دروازے پر شناسا سی دستک ہوئی فیضی نے میری جانب دیکھا اور پھر چادر تان کر لیٹ گیا۔ میں نے خاموشی سے دروازہ کھولا وہ اندر چلا آیا۔

"ناراض ہو تو مجھے اتنا خاموش دیکھ کر وہ بھی تیرا اندازہ کر سکا تھا میں چپ رہی اور جلدی سے باورچی خانے کی طرف چل دی مگر وہ میرے سامنے آ گیا۔

"پہلے میری بات کا جواب دو۔"

"مجھے نہیں معلوم" میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور باورچی خانے میں کھانا گرم کرنے لگی۔

"اتنی تکلیف نہ کرو میں کھانا کھا کر ہی آیا ہوں۔" وہ بولا تو میں نے جلدی سے اسٹو بند کر دیا۔

"رات گئے یہاں آنے کی کیا ضرورت ہوتی ہے وہیں اتنا وقت گزارتے ہو کھانا تک کھا لیتے ہو وہاں چند گھنٹے سو بھی جایا کرو۔" میں تیزی سے بولتی اپنے بستر پر جا لیٹی چادر سر تک اوڑھتے میں نے دیکھا وہ اسی جگہ پر چپکا کھڑا رہا۔ پھر آہستہ قدموں سے اوپر چلا گیا۔

اگلے روز وہ ساڑھے آٹھ بجے ہی گھر موجود تھا میں مسکرا دی جوابا وہ بھی مسکرا دیا مگر اس کی مسکراہٹ میں جان نہ تھی بس یونہی رکھی سی مسکراہٹ، کھانے پر وہ بہت پر مذاق باتیں کرتا رہا۔ فیضی کو میری نقلیں اتار کر بتاتا رہا کہ کیسے رات میں اس پر برس پڑی تھی اور وہ مجھ سے خوفزدہ ہو گیا تھا جوابا فیضی بھی ہنس دیا اور میں ایک کونے میں بیٹھی سوچتی رہی کہ ہم سب کتنے بڑے اداکار ہیں۔ سرمد نہ چاہنے کے باوجود مذاق کر رہا ہے اور فیضی کتنی سپاٹ سی ہنسی سے اس کے مذاق کی داد دیتا ہے۔ جانے ان دنوں میری تمام حسیں مجھے آنے والے وقت سے خوفزدہ کیوں کئے دیتی تھیں۔

کتنے ہی روز وہ وقت پر گھر آیا چلیں کہیں ہم بازار بھی گئے مگر پھر وہی آدھی رات کو لوٹنا کھانا کھائے بنا اپنے کمرے میں لیٹ

جاتا۔ میں بہت پریشان تھی اور فیضی تو بالکل گم سم ہو گیا تھا۔ میں جانتی تھی کہ فیضی کے لئے کل کائنات میری ہی ذات ہے اس لئے میں نے محض فیضی کے لئے خود کو سنبھالے رکھا ورنہ سرمد کی اتنی بے نیازی نے تو مجھے اندر سے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ شروع میں بہت ناراض بھی ہوئی تھی مگر اب بالکل خاموش تھی۔ محبت میرے نزدیک مانگنے کی نہیں بن مانگے مل جانے کی چیز تھی اور آج جب زندگی کا بوجھ اپنے نحیف کندھوں پر اٹھائے کتنے ہی برس بیت گئے ہیں اور بیتے چلے جاتے ہیں میں اپنے اس نظریئے پر قائم ہوں۔ اس رات بھی وہ حسب معمول بہت دیر سے آیا۔ فیضی اور میں بھی حسب معمول جاگ رہے تھے اس کی دستک کی آواز پر فیضی ہمیشہ کی طرح سوتا بن گیا اور میں سلیپر پاؤں میں ڈالتی دروازہ کھولنے چل دی، ہمیشہ کی طرح دروازہ کھول کر میں مڑنے ہی والی تھی کہ میں نے اپنے ہاتھ پر اسی دشمن جاں کی گرفت محسوس کی، نہ چاہنے کے باوجود میں کھڑی رہی۔

"سنو گڑیا میرے لئے کھانا گرم کر دو۔"

اس کا لہجہ بالکل عام سا تھا اتنے دنوں کے بعد اس نے کھانے کو کہا تھا، میں فوراً باورچی خانے میں چلی آئی کپڑے تبدیل کر کے وہ بھی وہیں آ گیا کھانا چھوٹی میز پر رکھ کر میں اپنی چارپائی پر آ گئی وہ کچھ دیر بیٹھا سوچتا رہا اور پھر کھانا کھانے لگا کتنی ہی دیر گزر گئی وہ میری چارپائی کے قریب کھڑا تھا "گڑیا صرف بات سن لو میری۔" اس کے لہجے میں التجا تھی مگر میں خاموش ہی رہی حالانکہ دل تو اچھل اچھل کر پسلیوں سے باہر نکل آنے کو بے قرار تھا۔

"گڑیا کیا کسی کو پیار کرنا بہت بڑا جرم ہے۔"

وہ اداس سا تھا میں نے ایک لمحہ سوچا پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"سرمد جو کہنا ہے کہو میں نے خود کو ہر قسم کی بات سننے کے لئے تیار کر لیا ہے۔"

جانے کب کا کہا ہوا جملہ خود بخود ہی ہونٹوں سے پھسل گیا۔

گڑیا مجھے یہ انگوٹھی واپس کر دو۔ اس نے میری منگنی کی انگوٹھی کی طرف اشارہ کیا تو میں سر تا پا لرز گئی تبھی اس نے اپنی جیب سے ایک انگوٹھی نکالی جس کے سرخ نگینے اس نیم تاریکی میں بھی جگمگا رہے تھے۔

"گڑیا ہماری منگنی بہت جلدی ہو گئی تھی تب مجھ میں اتنی حیثیت نہ تھی کہ تمہیں قیمتی طلائی انگوٹھی پہنا سکتا، تمہاری خوبصورت انگلی میں یہ چاندی کی ... سی انگشتری پہنا کر میں کبھی بھی خوش نہیں رہا اور آج دن رات کی محنت سے میں نے تمہارے لئے یہ انگوٹھی خریدی ہے۔"

اس کی بات سن کر میں سن سی ہو گئی، سرمد اتنے دنوں اس لئے مصروف رہا جانے کیوں میرا دل بھر آیا۔ فیضی کے علاوہ مجھے کوئی اتنا بھی چاہ سکتا تھا۔ میں نے سوچا بھی نہ تھا وہ خاموش میرے نزدیک کھڑا تھا۔ میں نے ایک نظر اپنے ہاتھ میں پڑی اپنی منگنی کے حسین تحفے کو دیکھا اور بولی "سرمد میرے نزدیک تحفے کی اہمیت قیمت سے نہیں جذبات سے ہے۔ یہ انگوٹھی میرے کنوارے جذبات میں مچل جانے کی پہلی یادگار ہے اسے میں خود سے کبھی جدا نہ کر پاؤں گی۔" میں نے لجاتے ہوئے کہہ ہی ڈالا۔

"مگر گڑیا یہ طلائی انگوٹھی کیا تمہارے لئے میرے دل میں محبت کے بیکراں جذبے کا اظہار نہیں کرتی جبکہ اس کے حصول کی جدوجہد میں میں نے فیضی جیسے پیارے انسان کو پریشان کیا اور سب سے بڑھ کر میری ننھی سی گڑیا مضطرب رہی۔ اس کی آواز جذبات کی شدت سے بھیگ سی گئی تھی۔

"ٹھیک ہے سرمد ہماری محبت کی یہ عظیم یادگار کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھو۔"

میں نے تو سادہ سی بات کی تھی مگر جانے اس نے کسی اور وقت سے کیا مراد لی تھی کہ وہ خوشی سے بے حال ہو گیا اور پہلی بار اس سے محبت کے حضور میں گستاخی سرزد ہو ہی گئی میں تو مدہوش سی تھی جانے اس نے کب میرے چہرے کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھام لیا اور اپنے تپتے ہوئے ہونٹ میری شبنمی پیشانی پر رکھ دیئے ہم لڑکیاں سدا اپنے خوابوں میں حسین شہزادوں کو چھپائے تخیلات کی حسین وادیوں میں گھوما کرتی ہیں کہ خوابوں خیالوں پر کون پہرے بٹھا سکتا ہے مگر اس شب جب میرے خوابوں کا حسین شہزادہ حقیقت میں میرے قریب تھا اور حسن کے حضور میں عقیدت سے نذرانہ عشق پیش کر رہا تھا تو میں کانپ رہی تھی میرا رنگ خطرناک حد تک سرخ تھا اور میرے چہرے سے شعلوں کی سی لپٹیں نکل رہی تھیں اتنے دنوں کی تاراضگی اور دل آزاری جانے کہاں خاموشی سے بہہ گئی تھی اس وقت لمحے جامد ہو گئے تھے اور جب سرمد کے ہونٹ میری پیشانی سے ہٹے تو میں نے آنکھیں کھولیں بڑی ہی حسین مسکراہٹ ہونٹوں پہ لئے وہ چند لمحے مجھے تکتا رہا اور پھر تیزی سے اوپر اپنے کمرے میں چل دیا۔

اگلی صبح بہت سہانی تھی یا پھر میرے خوشیوں بھرے دل

کر وہ صبح عام جسموں سے بہ رنگین اور خوبصورت لگی تھی۔ فیضی سرمد اور میں ناشتہ کرتے وقت خاموش مگر خوش تھے۔ فیضی اور سرمد بہت صبح سے اور پل کر بیٹھے رہے اور میری توقع کے عین مطابق سرمد اپنے دوست سے کچھ بھی نہ چھپا سکا تھا۔ سرمد ناشتہ کرنے کے بعد فیکٹری کے لئے چل دیا۔ ناشتے کے برتن اٹھانے کر رہی تھی کہ فیضی بولا "مگر یا خوش ہونا۔"

"ہاں فیضی بہت۔" میں نے صدق دل سے اعتراف کیا، فیضی میرا دوست بھی تو تھا نا۔

"مگر جانے گڑیا میں خوش کیوں نہیں۔" فیضی بڑی سنجیدگی سے بولا میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"گڑیا سرمد میرا بچپن کا دوست ہے میں نے اس کے عروج کا زمانہ بھی دیکھا ہے، جانے وہ اتنے مختلف حالات سے سمجھوتہ کیسے کر پایا ہے، میں اس کی جگہ ہوتا تو سنبھل نہ پاتا۔" فیضی جانے کیا کہنا چاہتا تھا، میں سمجھ نہیں سکی وہ بھی پھر نہیں بولا اور آج اتنے برس گزر جانے پر میں اس کے خدشوں کی زبان سمجھ سکی ہوں۔ واقعی فیضی ہمیشہ دولت میں کھیلنے والے شخص محبت سے دل تو کر سکتے ہیں مگر ہمیشہ کے لئے آسودہ نہیں ہو سکتے۔

کتنے ہی دن خوشیوں کے ہنڈولے میں جھولتے گزر گئے مگر جانے خوشی کو اگر گزر جانے کی اتنی جلدی کیوں ہوتی ہے؟ دبے پاؤں آتی ہے پل بھر کو ٹھہرتی ہے اور پھر غموں اور پریشانیوں کا لامتناہی سلسلہ پیچھے چھوڑے چپکے سے چل دیتی ہے۔ سرمد کتنے ہی دن خوش رہا مگر پھر وہی پرانی روش، رات گئے اس کا انتظار کرتے آنکھیں بوجھل ہو جاتیں وہ اپنی اس غیر حاضری اور خاموشی کے کتنے ہی جواز پیش کر چکا تھا مگر میں مطمئن نہیں تھی۔ ایک دوپہر کو جب میں باورچی خانے میں روٹیاں پکا رہی تھی کہ وہ اچانک ہی آ گیا اور پیڑھی گھسیٹ کر قریب ہی بیٹھ گیا۔

"آج اس وقت کیسے آ گئے۔" میں نے بظاہر نارمل انداز میں سوال کیا۔

"گڑیا میں جو اتنے دنوں سے دیر سے آ رہا ہوں نا تو اس کی وجہ معلوم ہے۔"

"کیا نا کھاؤ گے۔" میں نے سراسر الٹ سوال کیا۔

"نہیں۔" وہ بولا "پہلے میری بات سن لو۔" وہ ذرا سختی سے بولا۔ وہ چہرے میں بنا کوئی تاثر دیئے بولی۔

گویا تمہیں تمام عمر تو اس گھر میں رہنا تھا تمہیں فیضی کی تمام خوشیاں تم سے وابستہ ہیں اور تمہارا مستقبل میرے ساتھ ہے اب مجھے اپنا مستقبل بنانے کے لئے بھی تو کچھ جدوجہد کی ضرورت ہے نا۔ فیضی بہت پیارا دوست ہے مگر میں شادی کے بعد اس گھر میں رہنا نہیں چاہتا۔" وہ بلاتکلف کہے جا رہا تھا مگر میں اس وقت اپنی شادی کا ذکر سن کر بھی نہیں شرمائی، میں نے پلکیں جھکا دینے کی بجائے بڑے ہی غور سے اس کا چہرہ دیکھا اور پھر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ پیار کرنے والوں کے چہرے پہ بے یقینی اور جھوٹ کی زردی تو نہیں ہوتی، ان کے چہروں پر تو استحکام اور اعتماد کا تناؤ ہوا کرتا ہے۔ مجھے اتنا غور سے دیکھتے ہوئے وہ جھینپ سا گیا۔

"تمہیں یقین نہیں آیا میری بات پر۔" اس نے میری آنکھوں کی کہانی پڑھ لی تھی۔

"نہیں سرمد، اس لئے کہ تم جو کہہ رہے ہو تمہیں خود بھی اس پر یقین نہیں۔" میں نے بڑے ہی سرد لہجے میں کہا اور آنکھوں میں چھلکتے آنسو چھپانے کو جلدی سے باہر آ گئی۔

سرمد کو ہماری سادہ سی پرسکون زندگی میں آئے ایک برس گزر گیا تھا اور آج اس ایک برس کے طویل عرصے میں یہ پہلی رات تھی کہ وہ گھر نہیں آیا تھا اور غالباً یہ میری اٹھارہ سالہ زندگی کی پہلی ہی رات تھی کہ میری آنکھ ایک لمحے کو بھی نہیں لگی، میرا سر ایک لمحے کو بھی تکیے پر نہیں ٹکا اور اس ظالم شب کی صبح کو فیضی کی سوجی سوجی آنکھیں دیکھ کر مجھے حیرت نہیں ہوئی، اگلے روز سرمد سرشام ہی گھر آ گیا تھا چائے اس نے اپنے کمرے میں منگالی تھی۔ چائے کا ٹرے ہاتھ میں تھامے فیضی ہی اس کے کمرے میں آ گیا۔ کتنی ہی دیر گزر گئی۔ یوں تنہا بیٹھے بیٹھے میری طبیعت گھبرا سی گئی، میں دبے پاؤں اوپر چلی آئی مگر اندر جانے کی ہمت نہیں کر سکی کہ سرمد بڑے ہی بے بس لہجے میں فیضی سے کہہ رہا تھا۔

"فیضی میں کچھ دیر کے لئے اتنے پیار کرنے والے لوگ پا کر خوش تو ہو گیا تھا مگر مجھے احساس ہوا ہے کہ میں مطمئن نہیں ہوں، اس چھوٹے سے گھر میں میرا دم گھٹتا ہے، میرا جی چاہتا ہے کہ میں کھلی فضاؤں میں معلق ہو جاؤں۔ میں سخت پریشان ہوں میں کتنی ہی ضد کرتا ہوں مگر اپنی بے پناہ امنگوں کو پورا نہیں کر پاتا۔ اب تو محنت سے میرا ایمان اٹھتا جاتا ہے۔"

وہ سخت پریشان تھا اور فیضی کو اپنا رفیق سمجھ کر اپنے دل

کی بات کہہ رہا تھا میرا بھی اس کی باتوں سے بے تاب ہو گیا۔ وہ اپنے بدلتے ہوئے حالات سے ذہنی طور پر نباہ نہ کر پایا تھا اور شعوری یا لاشعوری یہ سرد جنگ اس کے ذہن کو پاش پاش کر رہی تھی، میں نے کنکھیوں سے ذرا سا جھانکا فیضی اس کے سر پہ ہاتھ پھیر کر تسلی دے رہا تھا مگر اس کی نگاہیں کسی غیر مرئی نقطے پر مرکوز تھیں۔ شاید وہ اپنے اس دولت کے منتشر اور غیر متوازن ذہن میں اپنی بہن کی خوشیوں کے لئے گنجائش تلاش کر رہا تھا۔

اور پھر شب بھر غائب رہنا سرمد کی عادت ہی ہو گئی مگر میں بے خبری سے سو جانے کی عادت نہ پا سکی اور صبح فیضی بھی سوجی آنکھوں سے نظر آتا رہا، کتنے ہی دن فیضی مجھ سے نظر چراتا رہا جیسے کچھ کہنا چاہ رہا ہو مگر کہہ نہ پاتا ہو سب کچھ کہہ دینے سے کچھ نہ کہنے کی کیفیت زیادہ کربناک ہوتی ہے اور جب میں اس خاموشی کا کرب اٹھاتے اٹھاتے تھک گئی تو میں نے کہہ ہی ڈالا۔

"فیضی اب کہہ بھی دو کب تک اکیلے ہی یہ بوجھ اٹھاتے پھروگے" میری بات سن کر وہ ایک جھٹکے کو چونکا اور پھر بولا۔

"ہاں گڑیا مجھے بہت پہلے ہی کہہ دینا چاہئے تھا مگر خیر اتنی دیر تو نہیں ہوئی" وہ ایک لمحے کو رکا اور پھر بولا "گڑیا پاک بھارت جنگ میں سرمد کے سب احباب ختم ہو گئے مگر اب سے کچھ ہی دیر پہلے اس کے ایک رشتے کے چچا کا انکشاف ہوا ہے جو جنگ سے پہلے ہی مغربی پاکستان میں آباد ہو گئے تھے اور سماجی حیثیت میں سرمد کے والد سے بھی بہت بڑھ کر ہیں۔ آج کل سرمد فیکٹری میں اور ٹائم نہیں لگاتا بلکہ اپنے چچا کے یہاں رہتا ہے" مجھے اس ساری بات میں کوئی بھی بات اتنی پریشان کن نہیں لگی۔ میں نے کہہ ہی دیا۔

"مگر فیضی اس میں اتنی پریشان ہونے والی کیا بات ہے"

"پریشانی کی اصل وجہ تو گڑیا سرمد کے چچا کی نوجوان اور حسین بیٹی ہے"

"اوہ" اچانک ہی میرے منہ سے نکلا "تو یہ بات ہے" میں نے دل میں سوچا مگر زبان پر نہیں لائی، میں نے کچھ بھی نہیں کہا اور برتن اٹھا کر چل دی فیضی لاکھ میرا بھائی سہی مگر محبت کے عظیم جذبے کی ہتک مجھے گوارا نہیں تھی۔ فیضی نے بھی دوبارہ کریدنا مناسب نہیں سمجھا ہاں البتہ رات کو جب ہم سونے کو لیٹے تو فیضی نے کہا۔

"گڑیا میں نے پتہ کیا ہے سرمد کے چچا میری توقع کے عین مطابق اسے داماد بنانے کی سوچ رہے ہیں"

مجھ سے کوئی چیز میرے سینے کے اندر ٹوٹ گئی۔

"مگر سرمد کیا سوچ رہا ہے" مجھے اپنی آواز بھی اجنبی سی لگی۔

"ابھی تک تو یہ سوچ اس کے ذہن میں نہیں مگر سرمد جیسے لوگوں کے لئے دولت کی چمک بڑی حیثیت رکھتی ہے وہ ہم سے جھوٹ بول کر چچا کے ہاں جاتا ہے تو اس کے دل میں کوئی چور ضرور ہوگا"

حالات نے فیضی کو بہت عقلمند بنا دیا تھا اور وہ اس وقت پکے پختہ ڈھنگ سے سوچ رہا تھا۔

"گڑیا تم خاموش ہو گئی ہو میں تمہیں یہ تکلیف دہ باتیں بتانا نہیں چاہتا تھا مگر اب میں چاہتا ہوں کہ سب کچھ تمہارے علم میں آجائے کوئی بھی حادثہ ایک دم ہمیں تباہ نہ کر دے، ہم اپنے ذہن کو ہر اذیت ناک خبر کے لئے تیار رکھیں"

"ٹھیک ہے فیضی سب کچھ ٹھیک ہے" میں بدقت تمام بولی اور میرا تکیہ بھیگتا چلا گیا۔

اگلے چند دنوں میں فیضی سب اطلاعات مہیا کر چکا تھا، ایک روز جب فیضی باہر جانے کو تیار ہو رہا تھا کہ سرمد آگیا۔

"ہیلو فیضی" سرمد بولا دونوں کچھ دیر باتیں کرتے رہے پھر فیضی باہر چل دیا۔ سرمد میرے قریب آگیا۔

"گڑیا مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ہم دور ہوتے جا رہے ہیں"

اس کی آواز مدھم تھی مجھے اس پر ترس آگیا بیچارہ محض ہماری وجہ سے اتنی ڈھیروں دولت سے کترا رہا تھا، دو پاٹوں بیچ پھنسا شخص بڑا ہی مصیبت زدہ ہوتا ہے مگر کب تک آخر ایک روز تو اسے فیصلہ کرنا ہی تھا فیضی کے خیال میں وہ اپنی نا آسودہ خواہشات کی تکمیل کے لئے اپنے چچا کو ترجیح دیتا مگر مجھے اپنی اتنی بہت ساری محبت پر بہت یقین تھا۔ محبت انتہا پسند جذبہ ہے اور مجھے محبت نے انتہا کا یقین بخشا تھا خود پر یا سرمد پر نہیں بلکہ اپنے بے لوث اور بے پناہ جذبوں پہ یوں سرمد کو شاکی دیکھ کر میرا دل بھر سا آیا، کوئی موضوع نہیں ملا تو میں بولی

"سرمد نغمہ کیسی ہے کبھی اسے ادھر لاؤ نا" میں نے بڑی ہی کوشش سے اپنا لہجہ عام سا کیا تھا اور سرمد تو میرے ہونٹوں سے نغمہ کا نام سن کر کانپ سا گیا تھا ایک لمحہ وہ سر جھکا کر زرد سا ہوا، پھر بڑی ہی آہستگی سے بولا۔

"اچھا ہوا تم لوگوں کو خود ہی پتہ چل گیا میں سوچ رہا تھا کیسے بتاؤں"

"اس میں اتنی پشیمانی کی ضرورت ہی کیا ہے۔ خدا کا شکر

ہے کہ تم کوئی تماشا نہ لاؤ" میں نے سوچا کہ وہ ایسے ہی لفظوں ہوں۔ مجھے شانوں سے تھام کر سرگوشیوں میں کہے گا میری گڑیا میرے اپنے ترتم ہو مگر کچھ بھی نہیں ہوا۔ وہ ذرا سی دیر کو پشیمان ہوا تھا مگر میرا ناول انداز دیکھ کر سنبھل گیا تھا اور بڑی ہی شادمانی سے اپنے چچا کے بارے میں تفصیل سے بتانے لگا۔ میرا جی لرزنا تھا تو گویا ہمارے درمیان اپنا پن تحلیل ہونے کو ہے میں نے دھڑکتے دل سے سوچا۔

وہ دن میں نے انگاروں پہ لوٹتے گزارے میری محبت کا یقین ڈگمگایا مگر دل نے بار بار حوصلہ دیا اور جن لمحوں سے ڈرتے ڈرتے میں نے اپنی جان پہ بنا لی تھی وہ قیامت کا لمحہ آ ہی گیا۔ اس روز اتوار تھا سرمد اور فیضی گھر میں ہی تھے۔ سرمد اچانک ہی بولا۔

"فیضی میرے چچا بہت دنوں سے ضد کر رہے ہیں کہ میں ان کے ہاں منتقل ہو جاؤں۔"

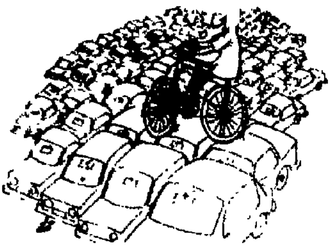
سرمد نے کہتے کہتے چپکے سے میری طرف بھی دیکھا تھا مگر میں انجان سی بن گئی۔ اتنا عرصہ امید و بیم کی کشمکش میں رہی تھی کہ اب تاثرات چھپانا آ ہی گیا تھا۔ فیضی نے جانے کیا جواب دیا میں نے سننا ہی نہیں چاہا اور پھر اگلے روز ہی ایک ہاتھ میں اٹیچی اور دوسرے میں مجھولڈال تھامے سرمد سیڑھیاں اتر رہا تھا میں پوری جان سے لرز گئی۔ میری اتنی بے تحاشہ محبت کا انجام یہ ہوگا۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ فیضی نے ایک پل سرمد کو جاتے دیکھا اگلے ہی لمحے اس کی نظریں میرے چہرے پر تھیں جو زرد ہوا جا رہا تھا تبھی فیضی ایکدم سرمد کے قریب چلا گیا۔

"سرمد تم نے اتنی جلدی فیصلہ کر لیا۔ میں نے کہا تھا کہ اچھی طرح سوچ لو۔"

فیضی کے لہجے میں وہی بے بسی تھی جو لڑکی کے باپ یا بھائی میں ہوتی ہے۔

"فیضی اب مجھے نہیں روکو میں نے یہ فیصلہ بہت سوچ کر کیا ہے اور اب میں نے جان لیا ہے کہ ہم لوگ جو سونے کا چمچ منہ میں لے کر پیدا ہوتے ہیں کبھی بھی نامساعد حالات میں خوش نہیں رہ سکتے۔ میں تم دونوں سے بہت پیار کرتا ہوں فیضی مگر میں مجبور ہوں مجھے جانا ہی ہوگا۔" اس کی آواز مدھم اور اعتماد سے پُر تھی۔ "میں نے لفظ کو جانچ لیا ہے۔ وہ اچھی شریک حیات بن سکتی ہے مگر مجھے گڑیا کے لئے افسوس ہی رہے گا۔"

میں نے سنا اور پھر ٹوٹ پھوٹ گئی بے دم سی ہو کر کرسی پر بیٹھ گئی۔



"مگر سرمد......" فیضی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ سرمد نے ہلکے سے "فیضی میرے ارادے کو مت ڈگمگاؤ وہ خوشیاں میری منتظر ہیں۔ اس بیمار زندگی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔"

فیضی تھک کر بیٹھ گیا میری طرف دیکھا اور پھر جانے اسے میرے چہرے پر کیا نظر آیا وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور سرمد کا تھام لیا۔

"کمینے کتے تم نے ہمارا سکون تباہ کر دیا۔ میں نے اپنی گڑیا کو ساری دنیا سے بچا کر پھولوں کی طرح پالا تھا تم نے اس کا دل پارہ پارہ کر دیا تم نے......"

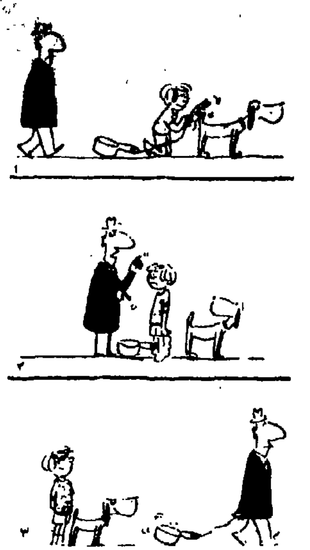
اگلے ہی لمحے سرمد تیزی سے اپنا کالر چھڑا چکا تھا۔

"فیضی اپنے حواس میں رہو میں اپنی مرضی کا مختار ہوں۔ اگر تم نے مجھے اس سے کرکہا تو میں اپنے چچا کی بات بھی مان لوں گا تم نے اپنی جوان بہن کی وجہ سے مجھے......"

اور اس کا فقرہ ختم ہونے سے پہلے ہی فیضی کی پانچوں انگلیاں سرمد کے رخسار پر سرخ نشان چھوڑ چکی تھیں۔ میرا جی سا ہو گیا تھا۔ جذبوں کی تضحیک نے مجھے نیم جان کر دیا تھا کا اتنا بڑا الزام میرے جسم کو مفلوج سا کر گیا فیضی وحشت ناک ناراض تھا اور سرمد بڑے ہی سکون سے کہہ رہا تھا۔

"فیضی یہ درست ہے کہ میں نے ڈیڑھ برس اکٹھا گزارا ہے مگر میں اپنے ذہن پر کوئی بوجھ نہیں لے جا رہا کیونکہ اپنی رہائش کا خرچ گڑیا کو دیتا رہا ہوں۔"

فیضی تو خاموش رہا مگر میرے ضبط کے سارے بندھن جسم میں جیسے یکدم پارہ سا بھر گیا۔ میں اٹھ بیٹھی۔



"سرمد ہم بہن بھائی غریب ضرور ہیں مگر اتنے بے غیرت نہیں۔"

میری آواز غیر معمولی حد تک اونچی تھی۔ میں تیزی سے اندر چلی گئی اور کچھ ہی دیر بعد واپس آئی تو میرے ہاتھ میں سرمد کے دیئے گئے تمام ہی نوٹ موجود تھے۔

"لیجئے" میں نے بڑی حقارت سے رقم اس کی طرف بڑھا دی وہ جھجکا سا گیا۔ "جلدی کیجئے سرمد صاحب آپ کو جانے میں دیر ہو جائے گی۔"

میں نے خون ہوتے دل کے ساتھ کہا اس کا ہاتھ کانپا مگر میں رقم اسے تھما کر مڑ گئی۔ "اور اب سرمد صاحب ایک بھی پل ضائع کئے بغیر اس گھر سے رخصت ہو جائیے۔ یہ ہم بہن بھائیوں کی محبت اور پیار کا گہوارہ ہے دولت کے پجاریوں سے میں اس کی فضا آلودہ ہونے نہ دوں گی۔"

سرمد کے قدم ڈگمگائے تھے مگر پھر وہ بے آواز قدموں سے دروازے کی طرف چل دیا۔ میں ڈوبتے قدموں سے اُسے چھوڑنے دروازے تک گئی۔

"خدا حافظ گڑیا" وہ کچھ نڈھال سا ہو رہا تھا۔

"خدا حافظ سرمد صاحب مگر یہ یاد رکھئے اس گھر کے دروازے آپ کے لئے ہمیشہ کے لئے بند ہو رہے ہیں۔" میں نے کہا اور جھٹکے سے دروازہ بند کر دیا۔ میں واپس مڑی "میرے خدا!" میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میرا پیارا فیضی رو رہا تھا۔ شفاف قطرے اس کے چہرے کو بھگوئے جا رہے تھے۔ ہاں وہ رو رہا تھا میرے لئے اپنی گڑیا کے لئے جسے اس نے ساری دنیا سے بچا کر پھولوں کی طرح پالا تھا اور جسے آج کانٹوں کے ڈھیر نے لہولہان کر دیا تھا۔

"فیضی" میری آواز قدرے بلند تھی "فیضی آج سے اس گھر میں کوئی نہیں روئے گا یوں سمجھو کہ تمام دکھ سارے آنسو آج سرمد کے ساتھ ہی رخصت ہو گئے آج سے سرمد کا نام کوئی نہ لے گا۔ اسے یاد کوئی نہ کرے گا۔"

"میں نے تیزی سے کہہ ڈالا کہ دل کی دنیا تو اتھل پتھل ہو رہی تھی۔ فیضی نے اپنے آنسو خشک کر ڈالے اور واقعی اس دن کے بعد کوئی بھی نہیں رویا کسی نے بھی سرمد کا نام نہیں لیا مگر یہ میرا دل ہی جانتا ہے کہ ایک لمحہ بھی وہ سنگدل میرے اعصاب سے دور نہیں ہوا میں جاگتی تو اس کے خیال سے سوتی تو اس کے خوابوں میں میں نے اسے جتنا بھلانا چاہا وہ اتنا ہی میرے قریب آتا چلا گیا۔ اس کے پیار کی خوشبو مجھ سے چمٹی ہی رہی، خود سے جنگ کرنا بڑا ہی مشکل کام ہے کئی دفعہ اس جنگ میں خود کو ہی ہار جانا پڑتا ہے۔ فیضی تو میرا بھائی تھا میری رگ جان سے زیادہ قریب وہ مجھے مجھ سے زیادہ سمجھتا تھا۔ میں کھلکھلا کر ہنسی تو کہتا۔

"گڑیا رو تو مت مجھے آنسوؤں سے نفرت ہے۔"

ہم دونوں دکھی تھے مگر اپنے طور پر ایک دوسرے کو دھوکہ ہی دیئے چلے گئے۔ سرمد کے بغیر کچھ بھی نہیں رکا۔ صبح اسی آب و تاب سے آتی اور پھر ہمیشہ کی طرح شام کی سیاہی سورج کا اجالا جاتی تھی زندگی کا کاروان رواں دواں تھا اور ہم دونوں زبردستی زندگی کی لاشیں گھسیٹے جا رہے تھے۔ والدین کے بعد اپنی زیست ہم نے اپنے ہاتھوں سے مرتب کی تھی۔ کوئی بھی شخص ہمارے درمیان نہیں آیا۔ ہماری زندگی کی پرسکون ندی میں پہلا کنکر سرمد تھا جو ہمارے لئے طوفان کے بیٹے چھوڑ کر چلا گیا۔ عورت بہت کچھ کر دل دیتی ہے اور جب پیار کرے تو محبوب پر تن من دھن قربان کر دیتی ہے۔ سرمد میرا محبوب تھا میرے تمام جذبوں اور محبتوں کا مرکز میں نے اسے اتنا ٹوٹ کر چاہا

بھوٹ بھوٹ کر روتے ہوئے ایک بچے نے اپنی ماں کو بتایا۔ "میں نے دیوار سے لگی ہوئی سیڑھی نیچے گرا دی تو پاپا نے مجھے بہت مارا۔" ماں نے اسے چمکارتے ہوئے کہا۔ "عجیب آدمی ہیں۔ اتنی سی بات کی اتنی بڑی سزا۔ ویسے جب تم نے سیڑھی گرائی تھی تو تمہارے پاپا تھے کہاں؟" بچے نے جواب دیا۔ "سیڑھی کے اوپر۔"

تھا کہ اپنا آپ کھو بیٹھی تھی، کسی کے لئے اپنا آپ کھو دینا بڑا ہی لذت آمیز ہوتا ہے مگر اس ظالم نے میرے جذبوں کی قدر نہیں جانی دل بڑا وسیع بڑا ہی مقدس ہوتا ہے مگر جب دل میں بال برابر دراڑ آجاتے تو پھر اسے جوڑنا بڑا ہی مشکل ہو جاتا ہے، دل ایک بار ٹوٹ جائے تو جڑا نہیں کرتا۔

سرمد کے بغیر ایک ایک پل صدی بن کر بیتا مجھے لتنے ظالم ہوتے ہیں، ساعتیں اتنی اذیت ناک ہوتی ہیں۔ مجھے اندازہ ہی نہ تھا اور پھر ایک روز اچانک ہی فیضی بولا۔

"گڑیا سرمد میرے آفس میں آیا تھا۔"

میری پیشانی عرق آلود ہو گئی۔

"مگر میں اس سے ملا ہی نہیں، میں نے کہہ دیا کہ میں آفس میں موجود نہیں ہوں میں نے ٹھیک کیا نا؟"

وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا مگر میں کچھ بھی نہیں بولی، وہ میرا چہرہ تکتا ہی رہا تو مجھے کہنا پڑا۔

"فیضی میرے سامنے اس کا نام نہ لو مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

میں نے ضبط کر کے کہا تو وہ خاموش ہو گیا مگر اگلی ہی صبح وہ آفس جانے کو بڑھا مگر جاتے جاتے لوٹ آیا۔

"گڑیا کیا مجھے ایسے ہی کرنا چاہئے تھا کہیں یہ بداخلاقی تو نہیں.....؟"

"خدا حافظ فیضی۔" میں نے بات ہی ختم کر دی اور وہ لاجواب سا ہو کر باہر چل دیا۔

اس روز وہ لوٹا تو اس کا رنگ نکھرا ہوا تھا۔

"گڑیا ایک بات سنو گی؟" وہ فرط شوق سے بولا:

"ہر بات سنوں گی سوائے اس کے ذکر کے....." میں اس کا نام بھی زبان پر نہ لانا چاہتی تھی۔

"تو پھر رہنے دو۔"

وہ مایوس سا ہو گیا مگر تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ خود ہی بتا رہا تھا۔ "گڑیا سرمد وہاں خوش نہیں ہے اور ابھی تک نغمہ والی بات بھی ٹالے جا رہا ہے۔ ارشد نے مجھے بتایا کہ وہ بہت خاموش رہنے لگا ہے اور نغمہ کے ساتھ باہر جانے کو بھی تیار نہیں ہوتا۔"

فیضی خوش تھا مگر میں خوشی کی رمق بھی محسوس نہیں کر سکی۔ بس ایک بار سب تعلق ٹوٹ گئے تو کیسی خوشی اور کیسے غم، اسے دل نے چاہا تھا اور وہ دیوانہ اب بھی پوجے جا رہا تھا مگر ذہن تو ہر ناطہ توڑ چکا تھا۔

"ارشد کون ہے فیضی؟" میں پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

"ارشد سرمد کے چچا کا پرسنل سیکرٹری ہے اور میرا دوست بھی وہ سب کچھ جانتا ہے اور روز ہی سرمد کے بارے میں مطلع کرتا رہتا ہے۔"

اور پھر اس روز میں نے ارشد کے بارے میں استفسار کیا کیا فیضی ہر دم اس کے حوالے سے سرمد کی خبریں ہی سناتا رہتا۔ کئی دفعہ تو مجھے یوں لگتا کہ سرمد کے چچا کا پرسنل سیکرٹری ارشد نہیں فیضی خود ہے۔ فیضی اور میں بچپن سے ایک تھے، میں اس کی رگ رگ سے واقف تھی۔ سرمد نے اس کی ذات پر بہت رکیک الزام لگائے تھے فیضی غریب مگر خودداری کی دولت سے مالا مال تھا اور اب جب وہ اتنی خوش اسلوبی سے اس کا ذکر کرتا تھا محض میرے لئے اپنی گڑیا سی بہن کی خوشی کی خاطر کئی دفعہ مجھے اس پہ رحم بھی آتا، میری وجہ سے وہ اتنے تنگ حالات میں بھی خوش تھا۔ میں اس کا ذکر سننے کو تیار تک نہ تھی مگر اتنی بے رخی کے باوجود مجھے احساس تھا کہ محض اس کے ذکر سے ہی گھر کا سکوت ختم ہو جاتا تھا۔ گھر کی گہما گہمی لوٹتی آ رہی تھی۔ ایک روز فیضی بولا کہ گڑیا وہ بہت ناخوش ہے۔ بلند و بالا حویلیاں اور بے تحاشہ دولت اسے سکون نہیں بخش سکیں۔ وہ جلد ہی لوٹ آئے گا اور واقعی وہ لوٹ آیا۔

اس روز فیضی دیر سے اٹھا تھا اس لئے آفس نہیں گیا۔ باورچی خانے میں ہی اس کی شاد آواز پہنچی تھی۔

"گڑیا وہ چائے گرما گرم۔"

میں چائے تیار کر کے اندر آئی مگر حق ایک دم سے ہی ہاتھ سے چھوٹ گئی فیضی کے ساتھ وہ بھی تھا۔ چہرے پر انتہائی خوشگوار تاثر لئے میرے ہاتھ کانپے اور میں نے واپسی کی سوچی مگر سرمد کی آواز نے پاؤں پکڑ لئے۔

"ارے فیضی یہ گڑیا اب ہم سے پردہ کرے گی۔"

اس کی آواز میں گذشتہ تلخیوں کا شائبہ تک نہ تھا میں نے بھاگ جانا چاہا مگر میں بزدلی کا مظاہرہ کرنا نہیں چاہتی تھی مضبوط قدموں سے اندر آ گئی۔ سرمد کی پرشوق نگاہوں نے میرے قدم نہیں لڑکھڑائے وہ دیدہ نگاہوں سے تکتا وہ کہہ رہا تھا۔

"فیضی پیار سے بڑی کوئی دولت نہیں میں نے تین ماہ میں ہی بھر پایا آج واپس اپنے گوشۂ عافیت میں پلٹ آیا ہوں۔"

اور جواباً فیضی خوش دلی سے ہنس دیا میں نے اپنے چہرے سے کوئی بھی تاثر نہیں دیا اور چپکے سے باہر چلی آئی۔

اس روز بالکل عام دنوں کی طرح فیضی چائے پی کر آفس چلا گیا اور سرمد اندر ہی تھا۔ میں اس کا سامنا کرنا نہیں چاہتی تھی مگر وہ خود ہی میرے قریب چلا آیا۔

"گڑیا مجھے معاف کر سکو گی۔" ملتجی سے لہجے میں بولا تو میں نے نظریں بھی نہیں اٹھائیں۔

"گڑیا پیار کرنے والوں کے دل تو بہت بڑے ہوتے ہیں سمندر سے بھی گہرے کیا میری ذرا سی لغزش کی تلافی نہ ہو پائے گی۔"

"سرمد صاحب میں نے بڑی ہی مشکل سے آپ کو اپنے دل سے نکالا ہے، بڑی ہی دقتوں سے اپنے ذہن کو آزاد کیا ہے اب مجھے مزید آزمائش میں مت ڈالیئے، اتنا انتشار میرا ذہن قبول نہ کر پائے گا۔"

میں دو ٹوک سے لہجے میں بولی مگر وہ ویسے ہی کھڑا رہا۔

"گڑیا میں ایک انسان ہوں عام سا انسان مجھ سے کوئی بھی غلطی سرزد ہو سکتی ہے، فیضی نے مجھے معاف کر دیا تم جو اتنے پیارے سے ذہن کی لڑکی ہو مجھے معاف نہ کرو گی۔"

اس کی آواز کے زیر و بم میری ہستی لرزا گئے مگر میں پتھر سی بن گئی۔

"سرمد صاحب عورت سب کچھ برداشت کر سکتی ہے مگر جب دوسری عورت کا وجود درمیان میں آ جائے تو پھر برداشت کی قوت اپنا دامن سختی سے چھڑا لیتی ہے اور ہمارے درمیان دوسری عورت آ چکی ہے اب کا معفو کا کوئی راستہ نہیں۔" اس روز جانے مجھے کیا ہو گیا تھا۔ سرمد جتنا جھکا میں اتنی ہی سخت ہوتی گئی۔

"گڑیا میں وہاں ایک پل بھی چین سے نہیں رہ سکا۔ دولت کے انبار، حسین ساتھی، اچھا عہدہ کوئی بھی مجھے سکون نہیں پہنچا سکا میں نے یہ دن قبر کے عذاب سے بدتر گزارے ہیں اور کئی دنوں کے بعد مجھے احساس ہوتا چلا گیا کہ میرے اس بے تحاشا اضطراب کی وجہ تمہاری ذات ہے تمہاری ذات جو محبت کی علامت ہے پیار کی نشانی ہے، میں تمہارے دامن میں پناہ لینے لوٹ آیا ہوں تم مجھے یوں کرب ناکیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں تنہا نہیں چھوڑ سکتیں۔"

سرمد گردن کو جھکائے بڑے ہی مؤثر انداز میں کہے جا رہا تھا اس کا ہر لفظ میرے ذہن کی آواز کو دبائے دیتا تھا۔

"سرمد کاش تم صرف میرے مجرم ہوتے تو میں تمہاری راہ میں آنکھیں بچھا دیتی مگر سرمد تم تو محبت کے مجرم ہو یہ جرم تو ناقابل تلافی ہے نا۔ تم نے اتنے پاک جذبے کی توہین کی ہے۔ تم نے پیار کے بے لوث جذبے کی تضحیک کی ہے یہ جرم کیسے معاف ہو گا میں مجبور ہوں سرمد۔"

میں نے بہت آہستہ مگر بڑے ہی مضبوط لہجے میں کہا۔ سرمد خاموش ہو گیا۔

"تو میں واپس چلا جاؤں۔" اس کے لہجے میں ناامیدی کا گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔

"نہیں سرمد تم یہاں رہنا چاہو تو رہ سکتے ہو مگر اتنا جان لو کہ دل ایک بار ٹوٹ جائے تو پھر جڑ نہیں پاتا۔"

"تو گڑیا مجھے جانا ہی ہو گا۔" وہ افسردہ سا بولا۔ "بڑے ہی تھکے ہوئے قدموں سے وہ دروازے تک گیا۔"

"گڑیا میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میں تمہارے بنا مر جاؤں گا۔ مگر اتنا بتا دوں کہ یہ زندگی اپنی لاش اپنے ہی کندھوں پر اٹھائے گزرے گی۔"

آنسوؤں میں بھیگی آواز سے وہ بولا اور فوراً باہر چل دیا اور مجھے یوں لگا کہ میرا جیون ہولناک اندھیروں کی نذر ہو گیا۔

جانے کیوں میں چاندی کی وہ انگشتری اپنی انگلی سے الگ نہیں کر سکی جو اب پرانی ہو کر بدرنگ ہو گئی ہے۔

دوشیزہ کی محفل

رعنا فاروقی

* — آذر تحریم (مردان) نے پہلی دفعہ "دوشیزہ" کا شکر اور مدیر کی ہاتھ تھاما ہے۔ لکھتے ہیں: "اس جرأت کو ایک پرستار کی گستاخی سمجھ لیجئے۔ ہمیں تو اس دوشیزہ کو پاکر ہر طرف پیار و محبت اور خلوص کے دیئے جلتے دکھائی دینے لگے ہیں۔ امید ہے یہ کافر ادا دوشیزہ ہمیں بھی اپنی محفل میں بیٹھنے کی اجازت دے گی۔ عصمت کی تازہ کہانی 'تھوڑی سی پاگل' نے بہت متاثر کیا۔ دعا کرتا ہوں ہمارے ملک کی دوشیزائیں بھی گھینا کی طرح تقلید کریں صرف بڑے بڑے لوگوں کو آئیڈیل بنانا چھوڑ دیں۔"

آذر صاحب آپ کی جرأت نے دوشیزہ کا دل موہ لیا ہے بلاشبہ یہ مردانگی ہے جس کا شیوہ یہ بھی ہے کہ اب ساتھ نہ چھوڑئے۔

* — حیدرآباد دکن سے "برگ آوارہ" کے ایڈیٹر محمود خاور رقمطراز ہیں: "میری جانب سے عصمت نمبر پر دلی مبارکباد قبول کریں یہاں رعنا فاروقی صاحبہ کے انٹرویو کو جدت پذیر حلقوں نے بے حد سراہا ہے۔ اور سب سے زیادہ اچھی بات جو لگی وہ مختلف النوع مشاہیر، شعراء اور دیگر قلمکاروں سے کہانیوں کا انتخاب کرنا ہے مجھے یقین ہے ایسی جہتوں اور کوششوں سے دونوں ممالک کے تہذیبی، ثقافتی، تاریخی، علمی و ادبی تعلقات میں لازوال اور خوشگوار استحکام آئے گا۔"

* — اعجاز ہاشمی (شاہدرہ) نے اپنی قیمتی رائے بھیجی ہے "خاص نمبر، عید نمبر، عصمت چغتائی نمبر اور پھر سالنامہ، یہ چاروں شمارے ایسے غضب کے تھے کہ تعریف کے بغیر چارا نہیں۔ سرورق کی دوشیزہ کا ہر ماہ تعارف ضرور کرایا کریں۔ ڈاکٹر نصرت حبیب کے مشورے ایک اچھا سلسلہ ہے اس پر خود غور کیجئے لعض بہنیں کا شکریہ ادا کرتی ہیں۔ بہت قدر رکھیں گا کہ گھر لو دوشیزائیں بھی تو بڑے شوق سے پڑھتی ہیں۔"

* — ریحانہ ناز (گل دخشنوہ) سے تشریف لائی ہیں۔ آئیل کی تعادیر مجھے بہت بھاتی ہیں۔ نزار اور نئے پھول کا بے چینی سے انتظار رہتا ہے۔ نزار ختم ہو جانے پر کوئی دلچسپ سلسلہ شروع کیجئے۔

ریحانہ 'نیا گھر' ناول ہوا اور اس بار شروع کر دیا ہے اس کے بارے میں اپنی رائے ضرور بھیجئے۔ اور آپ اپنے انتخابات وغیرہ ضرور بھیجئے گا۔ چپٹ پٹے ہوں۔ ہماری دوشیزہ کا نئی سٹی سالے دار چیزوں کی شوقین ہے۔

* — ظفر مہدی (لاہور) نے ہمیں اپنے تین منٹ عنایت کئے ظفر بھائی ہمیں بہت افسوس ہے کہ ہم آپ کے تین منٹ کی قدر نہیں کر سکے۔ آپ کوئی اچھی سی کہانی بھیجئے۔

* — ارشاد محمود نے میانوالی سے مشورہ بھیجا ہے کہ "آپ آئیڈیل کی تلاش کے لئے فیس رکھیں اس آمدنی کو کسی اچھے فلاحی کام میں صرف کیا جا سکتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو سکے تو لوگوں سے ضرور رکھیں۔"

* — سحر حقیق خان شکار پور سے ہمارے لئے دو کہانیاں لائے ہیں۔ حقیق صاحب دونوں کہانیاں اچھی ہیں، چھپ جائیں گی۔

* — غلام نبی بسمل گوجرانوالہ (نصیر آباد) سے مخاطب ہیں: "پیاری فاروقی آجکل دوشیزہ کی معیار گرتی جا رہی ہے۔ پتہ نہیں کس کا جادو اس پر اثر انداز ہوا ہے؟"

محترم بسمل آپ نے تو دوشیزہ کی نسبت سے اس کے معیار کو بھی مؤنث بنا ڈالا۔ اور ہاں یہ تو لکھ دیتے پیارے بھائی کہ آپ کو کیا کیا چیزیں غیر معیاری لگیں — تاکہ اس پر کئے گئے "جادو" کا اثر اتار سکیں۔

* — پشاور سے خواجہ محسن الدین نے تبصرہ کیا ہے "تیسی اور آشنا نا آشنا۔ اچھی کہانیاں تھیں۔ 'نیا جنگل' 'تابوت' حتیٰ کہ ایک کہانیاں لگیں۔ نزار ہمیشہ کی طرح بہت اچھی تھی۔ یہ آپ کے رسالے کا بہترین سلسلہ ہے۔ سرورق اچھا تھا۔ لیکن نومبر کا سرورق بھدا لگا۔ نئے سلسلے حالوز کا بے تابی سے انتظار ہے۔"

* — یوسف علی شاکر نے پشاور سے لکھا ہے کہ "سالنامہ کے ٹائیٹل کی تصویر پیاری بھی مگر یہ خوا الرا انہوں نے گھر کا سمان کو کیا شو کیا تو آنکھیں غیر معمولی بڑی ہو گئیں۔ چلتے پھول اسمیاری تخلیق ہے میں نے بھی 'بہتے زخم' بھیجا تھا وہ شائع ہو جائے گا۔" حیدلی مبارکباد قبول کیجئے۔

یوسف بھائی آپ کے "بہتے زخم" شائع کرنے سے مجبور ہیں

کوئی اچھی سی کہانی بھیجئے۔

✹ ۔ ناظر عباس پنڈی سے مخاطب ہیں "نوجوان نسل کے لئے یہ پرچہ رہبر کامل کی حیثیت رکھتا ہے۔ بالخصوص آئیڈیل کی تلاش، ہر نوجوان دل کی دھڑکن کا ترجمان ہے۔"

✹ ۔ اصغر صابری (دوبئی) کو گلہ ہے کہ "آپ میرے خطوط کے جواب محفل میں کیوں دیتی ہیں ڈاک سے دیا کریں۔"

اصغر بھائی آپ ہماری مصروفیت نہیں جانتے۔ یقین کیجئے ہمارے دل میں آپ کے خلوص کی بیحد قدر ہے۔ مگر ہر اک کو فرداً فرداً ڈاک کے ذریعے جواب دینا ممکن نہیں۔

✹ ۔ دوبئی سے نواز صاحب لکھتے ہیں "عصمت عزمی سے کہیں کہ وہ تارا کے کردار پر ظلم کرنا چھوڑ دیں ورنہ میں جلتے پھول کی ساری قسطیں نکال کر چار سو فٹ کی بلندی سے ہوا میں بکھیر دونگا۔"

نواز صاحب آپنے عظمت عزمی کو عصمت عزمی بنا ڈالا۔ پہلی شکایت تو انہیں آپ سے یہ ہے۔ دوسری شکایت ہمیں آپ سے ہے وہ یہ کہ اوراق بکھیرنے کے لئے چار سو فٹ بلندی کا ہی انتخاب کیوں کیا۔ جبکہ دیکھئے نہ اگر اوراق پھینکتے وقت خدانخواستہ پاؤں پھسل گیا تو ۔۔ ؟

✹ ۔ طارق رشید لوبی نے راولپنڈی سے خط لکھا ہے۔ (یاد رہے کہ ان کا چھٹ پٹا افسانہ 'جوتا' دسمبر کے شمارے میں شائع ہوا تھا) فرماتے ہیں "میرے دوست یقین ہی نہیں کرتے کہ یہ افسانہ میں نے لکھا ہے۔ میری پسندیدہ مصنفہ عصمت چغتائی کی ایک کہانی مزید دیا کریں۔ 'فیصلہ' کا انجام میری سمجھ میں نہیں آیا۔ پلیز بتا دیجئے 'قرار' اور 'جلتے پھول' بیحد پسند آرہے ہیں۔"

طارق رشید لوبی جی آپ ہیں تو ابھی انٹر کے طالب علم مگر سوچ میں بڑی دور کی کوڑی لاتے ہیں۔ لکھتے رہئیے اچھا مقام پیدا کریں گے لیکن شرط یہ ہے کہ اچھا ادب بھی پڑھتے رہیں 'فیصلہ' کا انجام آپ کی سمجھ میں نہیں آیا جبکہ آپ تحریر میں خاصے سمجھدار ہیں۔ اس کا انجام یہ ہے کہ بھیا جی جیسے بااصول اور باکردار آدمی ان جبلتوں کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں۔ جو ازل سے لے کر ابد تک اٹل رہی ہیں۔ کچھ سمجھے یا اور وضاحت کر دوں ۔۔ ؟

✹ ۔ صابر سلطان نے مسقط سے ہمیں دعائیں بھیجی ہیں۔ "خدا آپ کو تندرستی دے اور دوشیزہ کو ترقی۔ میں معموں میں حصہ لینا چاہتا ہوں لیکن ان کی وصولی کی آخری تاریخ دس گیارہ ہوتی ہے۔ جب کہ پرچہ ہمیں چار تاریخ تک ملتا ہے۔ بتائیے ہم کیا کریں۔ نیز چند افسانے اور لطیفے بھیجے تھے ان کے بارے میں اپنی رائے بھیجیں۔"

سلطان صاحب معمہ ایک مہینے ایڈوانس دیا جاتا ہے۔ مثلاً اس دفعہ معمہ ۱۹ اور ۲۰ شائع ہوئے ہیں۔ ان کی وصولی فروری میں ہوگی آپ اس میں شرکت کر لیا کریں۔ آپ کے افسانے قابلِ اشاعت نہیں تھے۔ لطیفے بھی مزیدار نہیں تھے۔ بار بار پڑھے گئے لطیفے بھیجنے سے احتراز کیا کریں۔

✹ ۔ شہزاد احمد فاروقی (کراچی) کا خیال ہے کہ "عظمت عزمی کی تحریر کبھی تو اس قدر رواں لئے ہوتی ہے کہ ان کا مدمقابل کوئی نہیں ہوتا اور بعض اوقات جھٹکے کھا کر چلتی ہے۔ جس سے قاری کے ذہن کو بھی دھچکے لگتے ہیں۔ رخسانہ صاحبہ نے بیچارے ملوا کر احسان کیا سالگرہ نمبر سب سے بازی لے گیا۔ مبارکباد قبول کیجئے۔"

✹ ۔ لیاقت آباد کراچی سے سرفراز احمد خاں لکھتے ہیں۔ "اس دفعہ 'رانی بائی' نے مجھے بیحد متاثر کیا۔ ایوارڈ دینے کو جی چاہتا ہے۔ میں آپ کے دفتر آنا چاہتا ہوں بتائیے آپ کب مل سکتی ہیں ؟"

سرفراز صاحب! آپ کسی بھی جمعہ یا ہفتہ کو ایک بجے کے بعد تشریف لے آئیے ہم سے ملاقات ہو جائے گی۔

✹ ۔ دہاڑی سے فرحت نسیم بٹ نے پیارا سا خط لکھا ہے فرماتی ہیں "پیاری بہن کافی عرصے سے 'دوشیزہ' پڑھ رہی ہوں، شاید اس کی دلچسپی کی وجہ یہ ہے کہ آپ کا خلوص اور جذبہ کاوش اس میں شامل ہوتا ہے۔ دسمبر کا شمارہ حسبِ معمول بہت پسند آیا۔ 'جانور' کا بیحد شدت سے انتظار ہے۔ عظمت عزمی کی قسط دلچسپ رہی۔ غزلیات کی اشاعت مت بند کیجئے۔ یہ تو رسالے کی جان ہوتی ہیں۔ ایک کہانی بھیج رہی ہوں قبول فرمائیے۔"

✹ ۔ نائلہ عزیز شہداد پور سے لکھ رہی ہیں "محترمہ میں اس وقت سے دوشیزہ پڑھ رہی ہوں جب سے 'مینا' کی پہلی قسط شائع ہوئی تھی۔ میں کچھ لکھنا چاہتی ہوں مگر ردی کی ٹوکری سے ڈر لگتا ہے۔"

نائلہ ہمیں تمہارے مکرمہ لکھنے سے کوفت ہوئی ہے ہمیں اپنی بہن سمجھو اور اعتماد سے اپنی لکھی ہوئی چیزیں بھیجو اچھی ہوئیں تو ضرور شائع ہو جائیں گی۔



آئیڈیل کی تلاش

ڈاکٹر سمیع خان

♥♥♥♥

رنگِ گل کا بیاں

میری سہیلی کی عمر ۲۲ سال ہے۔ یو پی کے ایک معزز خاندان سے اس کا تعلق ہے۔ بی اے پاس اور شکل و صورت کی اچھی ہے۔ اس کو ایک ایسے شریکِ حیات کی ضرورت ہے جو نیوی میں افسر ہو۔ اس کے علاوہ اور کوئی شرط نہیں۔

عارفہ۔ کراچی

پیار بھرا دل

میری خالہ جن کی عمر ۴۰ سال ہے۔ تعلیم میٹرک، اعلیٰ خاندانی پر عہدہ حاصل ہے۔ کشمیری فیملی سے تعلق ہے۔ ان کو چالیس سالہ کنوارے لڑکے کی ضرورت ہے۔ آمدنی اتنی ہو کہ آسانی سے گزارہ ہو جائے۔

نبیلہ۔ راولپنڈی

حسن بے باک

پاک بری، بحری یا ہوائی فوج کا آفیسر میرا آئیڈیل ہے۔ مردانہ وجاہت، پرکشش، خوش اخلاق، ہنس مکھ اور اعلیٰ کردار کا مالک ہو۔ میرے نزدیک دولت کی کوئی اہمیت نہیں۔ میں ایک مخلص پاکستانی ہوں۔ تعلیم بی اے، بی ٹی ہے۔ بطور ایجوکیشن افسر کے ملازمت کر رہی ہوں۔ عمر تقریباً تیس سال ہے۔ پرکشش، خوش اخلاق، خوب سیرت اور خوش لباس ہوں۔

ایس۔ آر۔ ملتان

اداسیوں کی جھیل

میرا آئیڈیل بلند قامت، خوب صورت ڈاکٹر یا انجینئر ہے جو پُر خلوص، باوقار اور معزز خاندان کا فرد ہو۔ میں ۱۸ سالہ بی اے پاس خوب صورت دوشیزہ ہوں۔ زندگی میں کبھی خوشیاں نہیں دیکھیں۔ چاہتی ہوں کہ زندگی کے اس طویل سفر میں کوئی ایسا شریکِ سفر ملے جس کے پیار کے سائے میں زندگی گزار دوں۔

شیبا آدم۔ کراچی

آئیڈیل کی تلاش —— اس کالم میں ہمیں بے شمار مرد حضرات "اپنا آئیڈیل" لکھ کر بھیجتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے گزارش ہے کہ یہ کالم "صنفِ خواتین کے آئیڈیل" کے لیے مخصوص ہے۔ مرد حضرات اس میں اپنی صرف آفرز بھیج سکتے ہیں۔ آئیڈیل لکھنے والی لڑکیوں اور آفرز بھیجنے والے مردوں سے ایک چھوٹی سی گزارش یہ بھی ہے کہ وہ اپنا مکمل پتہ لکھنا مت بھولیں۔ مطمئن رہیے آپ کے پتے ہماری فائلوں میں محفوظ رہیں گے۔ اور بلا اجازت کسی کو نہیں دیئے جائیں گے۔ یاد رہے جن خطوط کے ساتھ مکمل پتے نہیں ہوں گے وہ شائع نہیں کئے جائیں گے۔

پھول کی داستان

میری عمر ۱۷ سال ہے۔ ہر دیکھتی آنکھ کو پسند آجاتی ہوں۔ ہر محفل میں سما جانے کی صلاحیت رکھتی ہوں۔ شریف اور متوسط گھرانے سے تعلق ہے۔ سوچتی ہوں شاید کوئی محبت بھرا دل میری فریاد سے تڑپ اٹھے اور میری دنیا میں شہزادہ بن کر آجائے۔

شازی ۔ پشاور

تنہا چاہت

تعلیم میٹرک، معصوم سی بھولی بھالی صورت، ضدی اور خوددار طبیعت کی مالک ۱۷ سالہ دوشیزہ ہوں۔ مجھے سادہ دل، اچھی شکل اور نیک سیرت کے شریک سفر کی تلاش ہے۔ کاش مجھے میرا آئیڈیل مل جائے۔

مس مشرف ۔ لائلپور

پھوٹتی کرن

میری ایک سہیلی جس کی عمر ۱۹ سال ہے بی ایس سی پارٹ ٹو میں زیر تعلیم ہے۔ ایک غریب پٹھان خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ قبول صورت اور تعلیم کی شوقین ہے۔ اس کے لیے ایک پڑھا لکھا شریف اور نیک لڑکا درکار ہے۔ کیا کوئی پڑھا لکھا شخص ایک غریب لڑکی کو اپنا کر اس کی تعلیم کا شوق پورا کر سکتا ہے۔

مس رضیہ خان ۔ کراچی

آرزو کے دیپ

میرا آئیڈیل ایک خوبصورت اور خوب سیرت نوجوان ہے، دراز قد، بڑی بڑی آنکھیں جن میں حوصلہ اور عزم کی شمع روشن ہو۔ محنت کش انسان مجھے پسند ہیں۔ میں ایک غریب اور شریف خاندان کی بیس سالہ دوشیزہ ہوں۔ تعلیم میٹرک ہے۔ صاف رنگت، لمبا قد اور نیلی آنکھیں ہیں۔

ملوکا بیگم ۔ کراچی

خوشبو کا ساگر

میری بہن کی تعلیم بی اے اور عمر ۲۲ سال ہے۔ کھاتے پیتے اور شریف خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ باجی کی خواہش ہے کہ لڑکا مخلص اور اسمارٹ ہو۔ زندگی بھر اپنی چاہت میں کمی نہ کرے۔

ثمینہ ۔ لاہور

نشیلے سپنے

میرا جیون ساتھی بے حد آزاد خیال، اسمارٹ اور بااثر نوجوان ہے۔ جو بہت خوبصورت اور نشیلی آنکھوں کا مالک ہو۔ جدید طرز زندگی اور جگمگاتی محفلوں کا دلدادہ ہو۔ بزنس مین، انجینئر یا فوجی افسر ہو۔ جس کے پاس اپنا ذاتی مکان اور ایک عدد گاڑی ضرور ہو۔ میں ۱۸ سالہ پرکشش اور نشیلی آنکھوں اور سڈول جسم کی اسمارٹ لڑکی ہوں۔ تعلیم ایف اے ہے۔ اگرچہ خیالات مغربی ہیں لیکن سیرت کا رنگ خالص مشرقی ہے۔ تصنع اور بناوٹ سے نفرت کرتی ہوں۔ خدا کرے میرے من مندر کا دیوتا مجھے جلد کہیں مل جائے۔

شازی نیلم ۔ پشاور

پیار کی دہائی

میرا آئیڈیل ایک شریف النفس اور بھری بھری جسامت والا ۲۵ سال سے زیادہ عمر کا مرد ہے۔ جو میڈیکل لائن سے وابستہ ہو اگر ڈاکٹر ہو تو یہ میری خوش نصیبی ہوگی۔ میں ایک دبلی لڑکی ہوں، جاذب نظر اور اسمارٹ ہوں۔ عمر ۲۰ سال ہے۔ سروس کر رہی ہوں کاش مجھے جیون ساتھی مل جائے۔

مس اے آر ملک ۔ راولپنڈی

صدائے بلبل

میرے سپنوں کا شہزادہ ۲۶ سال کا دراز قد قبول صورت اور ہمدرد انسان ہے۔ کم سے کم تعلیم بی اے ہو۔ بزنس مین یا کسی اچھے عہدے پر فائز ہو۔ ماڈرن اور سیر و تفریح کا شوقین ہو۔ غیر ممالک میں ہو تو زیادہ بہتر ہے۔ میں ایک اچھے گھرانے کی ایف اے کی طالبہ ہوں۔ عمر ۲۰ سال، سانولا رنگ، دبلی پتلی، نازک اندام۔ نہ تو زیادہ حسین ہوں اور نہ بد صورت۔ مجھے زندگی میں دکھوں کے سوا کچھ نہ ملا کاش کوئی مجھے اپنا لے۔

ثاقب ثمینہ ۔ لاڑکانہ

پیار کے پیچ و خم

میری دوست بہت خوب صورت اور حسین ۱۹ سالہ دوشیزہ ہے۔ اس کے لیے ایک اچھے خاندان کے شریف، نیک سیرت اور خوب صورت شریک زندگی کی ضرورت ہے۔ دولت کی خواہش نہیں اگر آئیڈیل مسلح افواج سے ہو تو اس کی خوش قسمتی۔ جہیز کے لالچی رجوع نہ کریں۔

مس بخاری ۔ سرائے عالمگیر

ساتھی کی زلف

میری سہیلی کھلتے سانولے رنگ اور میانہ قد، معمولی سے نقوش نازک مگر خوب صورت سراپے کی اسمارٹ سی دوشیزہ ہے۔ جو بی اے پاس، بہت خوددار حساس، خوش گفتار، خوش اخلاق، سلیقہ مند اور روشن خیال ہے۔ اس کے لیے انہی صفات کا حامل کم از کم گریجویٹ دراز قد، روشن خیال اور معقول آمدنی والا تنہا شخص درکار ہے۔ عمر

۔۔۳۰ سال تک ہو۔ مسز انصاری۔ کراچی

بن خودی

میں خوش حال، ۲۳ سال، تعلیم یافتہ، دراز قد، معقول صورت عمدہ سیرت کی دوشیزہ ہوں۔ سادہ مزاج اور صوم و صلوٰۃ کی پابند ہوں۔ میرا آئیڈیل ۲۵ سال سے ۳۰ سال کی عمر کا نوجوان ہے۔ جو شریک سفر بن جائے وہ باہمی تعاون کی قدر و قیمت کو سمجھتا ہو، چاہت اور خلوص کو عزیز رکھے اور پرہیزگار ہو۔

فرزانہ جودت۔ کراچی

دامن کا پھول

میری بہن کا آئیڈیل کیرل صورت، اعلیٰ عہدے پر فائز سول یا آرمی آفیسر ہے۔ لڑکی کی عمر ۲۰ سال اور تعلیم میٹرک ہے۔ لڑکے کے والدین اور بہن بھائی ہوں تو اچھا ہے۔ تنہا نہ ہو۔

زاہدہ پروین۔ اوکاڑہ

چنچل گوری نار

میری سہیلی جس کی عمر ۲۴ سال۔ تعلیم ایف اے، گندمی رنگ، پرکشش جسم، بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں کی مالک۔ امور خانہ داری میں ماہر، آزاد خیال اور پکچر دیکھنے کی شوقین ہے۔ اگر اس کو اپنا آئیڈیل مل جائے تو وہ خدمت گزار شریک حیات بن کر گھریلو زندگی کو جنت بنا دے گی۔

اے بیگم۔ سوات

آئینۂ بہار

میرا آئیڈیل ڈاکٹر یا آرمی افسر ہے جس کی عمر ۲۸-۳۰ کے درمیان ہو۔ خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ خوب سیرت بھی ہو۔ آنکھیں بڑی اور پرکشش ہوں۔ غیرت مند، شریف، باوقار، آزاد خیال اور خوش مزاج ہو۔ پشاور یا مردان کے رہنے والوں کو ترجیح دی جائے گی۔

مس الطاف بیگم سوات

پیار کی ریت

میری تعلیم بی اے، عمر ۲۱ سال، اسمارٹ، پسند کی مالک، مستقل مزاج اور بہترین خاندان کی فرد ہوں۔ میرا آئیڈیل ایک باوقار، غیرت مند، بہادر اور بلندیوں کو چھونے والا نوجوان ہے۔ اگر پائلٹ ہو تو بہت ہی اچھا ورنہ ڈاکٹر ہو، عمر ۳۰ سال تک ہو۔

سیدہ عائشہ احمد۔ لاہور

گرد کا درد

میری چھوٹی بہن جس کی شادی آج سے چار سال پہلے ایک پہلو نشیں سے ہوئی تھی، پہلو نشیں کے ناروا سلوک کی وجہ سے میری بہن کی زندگی تباہ و برباد ہو گئی۔ لڑکی ایم اے بی ایڈ ہے۔ اور بے اولاد ہے۔ خوش رو، عفاف پیکر اور قبول صورت ہے۔ اس وقت پیدائشی نیک کے عرصے پر فائز ہے۔ کوئی بھی شخص جو دوسری شادی کرنا چاہے، بنجوگ ہے اولاد ہو، پڑھا لکھا، شریف اور آرمی کے علاوہ کسی مناسب عہدے پر فائز ہو۔ عمر ۴۰ سال سے زیادہ نہ ہو۔ میری بہن کا شریک سفر بن سکتا ہے۔

نسیم اختر۔ جہلم

صحرا میں پھول

میں بچپن ہی سے ماں کی محبت، باپ کی شفقت، بہن بھائیوں کے پیار اور شوہر کے خلوص سے محروم رہی ہوں۔ میری سگی والدہ نے میرے والد سے طلاق لے کر دوسری جگہ شادی کر لی۔ سوتیلی ماں کا سلوک مجھ سے مناسب نہ تھا۔ والد صاحب مجھ سے بے اعتنائی برتتے رہے۔ کم عمری میں میری شادی میری مرضی کے خلاف کر دی گئی۔ شوہر سے ذہنی سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ آخر کار ایک سال بعد طلاق ہو گئی۔ والد نے کوڑے کرکٹ کی مانند شادی کی صورت میں گھر سے نکال باہر کیا اور طلاق کی صورت میں مجھ پر گھر کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند کر دیئے گئے۔ یہ معاشرہ مجھ جیسی لڑکی کو کسی طرح بھی نہیں بخش سکتا۔ اس وقت میری عمر ۱۸ سال ہے۔ تعلیم مڈل ہے۔ سانولا، مختصر دکھی اور حساس لڑکی ہوں۔ مجھے ایسا شریک سفر چاہیے جو وفا اور خلوص کا پیکر ہو۔ مجھے سہارا دے، پیار دے۔ میں تا عمر اس کے خلوص کو دل سے قدر کروں گی۔

بلقیس اختر۔ مظفر گڑھ

پیار کا سایہ

میرا آئیڈیل تعلیم یافتہ، خوش اخلاق، نیک اور ہمدرد نوجوان ہے جو کسی اچھے عہدے پر فائز ہو یا زمیندار ہو تاکہ زندگی آرام سے گزر سکے۔ عمر ۳۰ تا ۳۵ سال تک ہو۔ ملتان میں رہتا ہو۔ میں ایک معزز گھرانے کی دوشیزہ ہوں۔ عمر ۲۴ سال، تعلیم ایف اے، گندمی رنگ اور اچھے نقوش کی مالک ہوں۔

مس الف۔ ملتان

صبح کی تلاش

میں ایک اچھی شکل اور سانولے رنگ کی دوشیزہ ہوں۔ متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ میرا آئیڈیل دراز قد، اسمارٹ اور خوش اخلاق انسان ہے۔ دولت کی تمنا نہیں، بس خلوص اور وفا کا پیکر ہو۔

راحیلہ۔ لاہور

حسن بے اماں

میرا آئیڈیل اعلیٰ تعلیم یافتہ، اچھے خاندان اور اچھی ملازمت و

دوڑ

شخص ہے گریجویٹ انجینیئر ملبا قد صاف رنگ، اسمارٹ نیک سیرت، اور پُرخلوص طبیعت کا مالک ہو۔ کراچی یا ایران میں ہو تو بہتر ہے۔ میں پانچ بھائیوں کی اکلوتی بہن ہوں۔ اسی سال بی اے کیا ہے عمر ۲۲ سال ہے۔

فرحت تقدیس۔ کراچی

نمودِ سحر

میری سہیلی کی پسند ایک ایسا شخص ہے جو دراز قد، خوش وضع خوش اخلاق، باکردار اور ذہین ہو۔ جو اس کے جذبات کا احترام کر سکے۔ اسے محبت دے سکے۔ میری کزن درمیانے قد اور گندمی رنگت کی قبول صورت، تعلیم یافتہ، حساس، اسمارٹ، خوش اخلاق، خوش لباس لڑکی ہے۔ امورِ خانہ داری میں ماہر ہے۔ اپنی روایات سے محبت کرنے والی اور دوسروں کے دکھ درد میں کام آنے والی پچیس سالہ دوشیزہ کو اپنے شریکِ سفر کا بے چینی سے انتظار ہے۔

عالیہ احمد۔ کراچی

دل کی لگن

میں مکمل طور پر گھریلو لڑکی ہوں۔ امورِ خانہ داری میں ماہر ہوں۔ سلیقہ مند صوم و صلوٰۃ کی پابند۔ شرم و حیا میرا گہنا ہے۔ مجھے ایسے شریکِ سفر کی تلاش ہے جو شریف النفس، خوبصورت، باوقار اور اسمارٹ ہو۔ تصنع اور بناوٹ سے مجھے نفرت ہے۔ کاش مجھے اچھا شریکِ زندگی جلد مل جائے۔ میں تا شاکے دیپ جلائے اپنے آئیڈیل کی منتظر ہوں۔

انجم بیگ، کراچی

گلاب کی پنکھڑیاں

ہم دو منہ بولی بہنیں ہیں اور محبت سگی بہنوں جیسی ہے۔ ہم دونوں کے خیالات بھی ایک جیسے ہیں پسند بھی ایک جیسی ہے۔ آئیڈیل بھی ایک جیسا ہے۔ ہم ایسے انسان کا سہارا بننا چاہتے ہیں جو زمانے کے ستم سے پریشان اور دکھی ہو۔ ہم اس کا دامن محبت اور خوشیوں سے بھر دیں گے۔ بس سیما کا رنگ سانولا اور میری رنگت گوری ہے۔ ہمارا آئیڈیل بڑا آدمی نہیں۔ خلوص اور محبت اور وفا کا پیکر ہو۔ کاش ہمیں دو بھائیوں یا دو دوستوں کا ساتھ مل جائے۔

شازیہ سیما۔ لاڑکانہ

حسن کا نور

میرا آئیڈیل ایک شریف انسان ہے جو اعلیٰ عہدہ پر فائز ہو، انجینیئر ہو تو زیادہ اچھا ہے۔ میں کھاتے پیتے گھرانے کی ۲۲ سالہ بی اے پاس، دراز قد، پُرکشش نقوش، مناسب جسم اور کھلتے ہوئے رنگ کی دوشیزہ ہوں۔

ب، خ۔ کراچی

غمِ دوری

مجھے ایک ایسے شریکِ سفر کی تلاش ہے جو شریف النفس، خوش اخلاق، خوش لباس، ہمدرد اور خوش شکل ہو۔ میڈیکل آفیسر ہو تو اچھا ہے۔ میں ۲۴ سالہ تندرست جسم کی قبول صورت لڑکی ہوں۔ بال لمبے اور رنگت گندمی ہے۔ کاش مجھے میرا آئیڈیل مل جائے۔

آر ——— ڈیرہ غازی خان

کھلتی کلی

میرا آئیڈیل دراز قد، پُرکشش آنکھوں والا، اسمارٹ، شوخ، پاکیزہ خیالات اور سلجھی ہوئی عادات کا ۲۸ سالہ نوجوان ہے۔ کار اور کوٹھی دونوں ہوں۔ بزنس میں یا کسی اچھے عہدے پر فائز ہو۔ میں کراچی کے ایک معزز اور اچھے گھرانے کی لڑکی ہوں۔ کھلتا ہوا گندمی رنگ روشن آنکھیں اور دراز قد کی اسمارٹ لڑکی ہوں۔ جس محفل میں جاتی ہوں ہاتھوں ہاتھ لی جاتی ہوں۔ اگر مجھے میرا آئیڈیل مل جائے تو اپنے پیار کے تمام خزانے اس پر لٹا دوں گی۔ بہار بن کے اس کے وجود پہ چھا جاؤں گی۔

ش، ب، ناز۔ کراچی

مس ذکی۔ لاہور کے نام!

میں بھی آپ ہی کی طرح دکھی ہوں۔ میری عمر ۲۳ سال تعلیم میٹرک اور تنخواہ ۲۵۰/- روپے ماہانہ ہے۔

چودھری مقبول احمد گجر۔ محلہ گجراں
مقام و ڈاکخانہ قلعہ رہتاس۔ براستہ دینہ۔ ضلع جہلم

آپ کے خیالات پڑھ کر بہت متاثر ہوا ہوں۔ مجھے آج تک سکون نہ مل سکا۔ اگر آپ سکون دے سکیں تو حاضر ہوں۔ میری عمر ۲۹ سال تعلیم میٹرک اور تنخواہ ۵۰۰/- روپے ماہانہ ہے۔

محمد افضل خان۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۱۴۔ جبل کیمپ مسقط

میں آپ کو بچی کے ساتھ اپنانے کو تیار ہوں۔

ملک جاوید اکبر۔ ٹیلیفون آپریٹر۔ مظفر گڑھ۔

عمر ۲۸ سال اور ماہانہ آمدنی چار ہزار روپے ہے۔ آپ کے دکھوں کا مداوا کر سکوں گا۔

محمد صدیق

روم ۔۔۔ سی ڈی ڈبلیو۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۰۴۲ - دوبئی

آپ کی تحریر نے بہت متاثر کیا ہے۔ میری تعلیم ایف اے
عمر ۲۴ سال اور ماہانہ آمدنی -/۲۳۰۰ روپیہ ہے۔
محمود ین فرشاہی۔ پوسٹ بکس نمبر ۴۲۱۲ بسطی۔ دوبئی

عمر ۲۱ سال، تعلیم انٹر اور تنخواہ -/۶۴۰۰ روپے ہے۔ خود بھی
مصیبت زدہ ہوں۔ سفر میں آپ کا شریک بننا چاہتا ہوں۔
جی ایم چوہدری۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۱۵۶ - دوبئی

آپ کو اپنانے کے لیے تیار ہوں۔
محمد اسمٰعیل - کریسٹ ڈرائی کلینرز
۱۹۹ - فیروز پور روڈ - لاہور

سکون کی تلاش میں ۴۲ سال گزار چکا ہوں۔ ابھی تک
شادی نہیں کی۔ گورنمنٹ ملازم، تعلیم بی اے۔ آمدنی -/۵۰۰ روپے
ماہانہ ہے۔ شمیم عباس
وارڈ نمبر ۴۔ بلاک نمبر ۲ ایم ایچ نمبر ۱۴۲ - راولپنڈی

میں آپ کے معیار پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔
لقمان شیخ۔ ٹی ٹو ڈبلیو، ٹی۔ پوسٹ بکس نمبر ۸۲۰۹ صلالہ، عمان

مسز ایم کے۔ گوجرہ کے نام:
میں بزنس مین ہوں۔ ماہانہ آمدنی -/۲۵۰۰ روپے ہے۔ آپ
کی تمام تر توقعات پر پورا اتروں گا۔
شہزاد قمر۔ مکان نمبر ۴۰۵۔ اے بلاک
شاہ جمال - ناظم آباد - لاہور

بیگم زماں۔ کراچی کے نام:
میں بھی زمانے کا ستایا ہوا، ظلم کا مارا اور محبت کا بھوکا
ہوں۔ مراد علی خاں
ویسٹ منسٹر ٹریڈنگ کمپنی لمیٹڈ۔ پوسٹ بکس نمبر ۴۹ الشارجہ

مجھے برسوں سے ایسے ہم سفر کی تلاش ہے جو مجھے صرف
محبت دے سکے۔ خدا کا دیا میرے پاس سب کچھ ہے۔ عمر ۳۵ سال،

تعلیم میٹرک اور تنخواہ سات ہزار روپیہ ہے۔
ایم خان۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۰۲ - راس الخیمہ

بیوی فوت ہوئے دو سال گزر چکے ہیں۔ آپ کو اپنا کر
مجھے خوشی ہو گی۔
سید نذیر حسین شاہ معرفت سید شبیر حسین شاہ
پی ای ای ہائی اسکول سرود۔ ڈاکخانہ سرہوٹہ
تحصیل و ضلع کوٹلی۔ (آزاد کشمیر)

تعلیم ایف اے، تنخواہ دو ہزار درہم ہے۔
محمد جان معرفت حل بیلر ہوٹل
آتمارام پریتم داس روڈ۔ کھڑی۔ کراچی

آپ کی سہیلی کے معیار پر پورا اتروں گا۔
آر بی اے بٹ
PAK CARPORAL MESS P.O.BOX 877
M.A.M MUSCAT OMAN

م ر ش۔ ڈیرہ غازی خان کے نام!
میں آپ کے معیار پر پورا اتروں گا۔ میری عمر ۱۹ سال۔ اور
تعلیم ایف اے ہے۔ اورنگ زیب اعوان
مکان نمبر ۲۹۵۔ محلہ زبکزئی جہر چ روڈ، پشاور شہر

عمر ۲۶ سال ہے۔ ماہانہ آمدنی ساڑھے گیارہ ہزار روپے ہے
اسمارٹ، خوش اخلاق اور شریف گھرانے کا چشم و چراغ ہوں۔
ایم اے چوہدری۔ پوسٹ بکس نمبر ۴۴۳۳ - روی، عمان

آپ کی خواہش کے عین مطابق ہوں۔
رشید نعمانی - پوسٹ بکس نمبر ۲۰
ایل ای بی اے ایف - چکلالہ۔ راولپنڈی

آپ کے آئیڈیل کے مطابق ہوں۔ زندگی بڑی خوشگوار
گزرے گی۔ خالد معرفت FISONS
پوسٹ بکس نمبر ۳۵۰۵۔ بہادر آباد۔ کراچی

میں ۲۲ سالہ شوخ و چنچل طبیعت کا مالک ہوں آپ کو
اپنانے کو تیار ہوں۔

نور الحسن، ۱۷۱ ذیل گھر، کچہری بازار۔ لائلپور

تعلیم ایف اے۔ ڈراموں میں بحیثیت کلاکار کے شرکت کرتا
ہوں۔ شادی کے لیے آپ جیسی دوشیزہ کا متلاشی ہوں۔

خادم حسین انجم شہزادہ جیسی مکان نمبر ۲۶/۲ بلاک ۱۲ ڈیرہ غازیخان

میں انجینئر ہوں۔ ماہانہ آمدنی دو ہزار روپے ہے۔ آپ کی ہر
فرمائش پوری کر سکوں گا۔

فرحت جہاں۔ بلاک ۱۳۔ ڈیرہ غازیخان

شاھدہ رفیق۔ کراچی کے نام!

میں ہی آپ کا آئیڈیل ہوں۔ تنخواہ چھ ہزار روپے ماہوار ہے۔

نور محمد۔ پوسٹ بکس نمبر ۴۰۲۔ مسقط

آپ کی تحریر نے بہت متاثر کیا ہے۔ میری عمر ۲۱ سال اور
تنخواہ ۲۵۰۰/- روپے ہے۔

غلام جان۔ پوسٹ بکس نمبر ۸۹
پی۔ او۔ ڈی۔ ایم اے ایم مسقط۔ سلطنت آف عمان

عمر ۲۵ سال، تنخواہ تین ہزار روپے ہے۔ آپ کو پیار کی
دولت سے مالا مال کر دوں گا۔

وزیر محمد۔ پوسٹ بکس نمبر ۸۹۔ مسقط۔ عمان

ذاتی بزنس و زمینداری۔ عمر ۲۷ سال۔ تعلیم بی اے۔ آمدنی
پندرہ ہزار روپے ماہانہ ہے۔

عبدالوحید قریشی

۲۲/۴ الیوسف چیمبرز۔ نیو چالی۔ شاہراہ لیاقت۔ کراچی

عمر ۲۰ سال تعلیم ایف ایس سی تنخواہ ۴۵۰۰/- روپے ہے
آپ کو پا کر خوشی ہوگی۔

ایم رفیق۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۰۰۔ مسقط عمان

نسیمہ خان۔ کیماڑی کے نام!

میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں اور دل و جان سے
آپ کو اپنانے کے لیے تیار ہوں۔

صالح محمد۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۴۲۱ ظفر علالہ سلطنت آف عمان

میں آپ کے معیار کے مطابق ہوں میری تنخواہ تین ہزار
روپے ہے۔ شہزاد احمد شاہ

سی سی سی جبل کیمپ۔ پوسٹ بکس نمبر ۷۱۲۔ مسقط

میں آپ کو اپنی زندگی کا ساتھی بنانے کے لیے تیار ہوں میری
تعلیم میٹرک اور ماہانہ آمدنی چار ہزار روپے ہے۔

ممتاز حسین خان۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۸۴۱۔ ابوظبی

میری عمر ۲۵ سال، تعلیم میٹرک اور تنخواہ آٹھ ہزار روپے ہے۔

میاں محمد شریف

KPELL VEIEN 6 OSLO-4 NORWAY

میں آپ کے آئیڈیل کی ہو بہو تصویر ہوں۔ عمر ۲۵ سال تعلیم
بی ایس سی۔ ماہانہ آمدنی ۲۰۰۰/- روپے ہے۔

لیفٹیننٹ محمد اقبال۔ پی این ایس راجباہی ڈاکیارڈ۔ کراچی

عمر ۲۰ سال، تنخواہ سات ہزار روپے پاکستانی۔ جہیز کی قطعی

سرورق کی شخصیت

ریحانہ سیمیں

سیاحت کی شوقین ریحانہ ابھی طالب علمی
کے دور میں ہے۔ انھیں لکھنے سے شغف ہے
لیکن ان کا کہنا ہے کہ جب تک مطالعہ پر عبور
نہیں کچھ لکھنا ناانصافی ہے۔

خوبصورت نہیں صرف پُرخلوص ساتھی کی تلاش ہے۔
چوہدری فقیر محمد پوسٹ بکس نمبر ۳۸۹۔ ڈہران ائیرپورٹ
سعودی عرب

مجھ میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو آپ کو پسند ہیں۔ عمر ۲۳
سال، تعلیم میٹرک اور تنخواہ تین ہزار روپے ماہانہ ہے۔
اے، ایس مومن، بی بیٹری۔ فرسٹ رجمنٹ
عمان آرٹلری۔ ریجکیو مانکی۔ سلطنت آف عمان

این، ایس، کراچی کے نام:
آپ کے معیار پہ پورا اتروں گا۔ عمر ۳۰ سال گریجویٹ ہوں،
معقول تنخواہ ہے۔
اے آر خان۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۹۶۔ بحرین

آپ کی تحریر سے متاثر ہوا ہوں۔ تعلیم سیکنڈ ایئر۔ عمر ۲۴
سال۔ ذاتی کاروبار ہے۔ اختر شاکر
شاکر منزل، مکان نمبر ۱۷۲، بی اچھیٰ گھٹی۔ سکھر

آپ کو شریکِ سفر بنا کر مجھے خوشی ہوگی۔
افتخار پوسٹ بکس نمبر ۱۰۷۔ جی پی او۔ سکھر

آپ کی خواہشات کے عین مطابق ہوں۔
شاکر براہِ ہیڈ کوارٹر
پوسٹ بکس نمبر ۹۰۲۔ مسقط۔ عمان

میں آپ کے معیار پہ پورا اتروں گا۔ عمر ۳۰ سال مالی حالت
اچھی ہے۔ ایس قمر
SKOTTEGARDEN - 47
2770 - KASTRUP DANMARK

شاید میں آپ کے دکھوں کا مداوا کر سکوں۔
بشیر جاوید معرفت البدر کمپنی
القطیف۔ براستہ ڈہران۔ سعودی عرب

اگر آپ کے دل میں خلوص ہے تو میں آپ کے زخموں کا
مرہم ثابت ہوں گا۔ حبیب چودھری
معرفت حبیب اینڈ کمپنی۔ جیکسن اسٹریٹ کیماڑی کراچی

میں آپ کے خیالات کے عین مطابق ہوں۔
محمد امین۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۱۵۔ الریاض سعودی عرب

مجھ میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو آپ کو پسند ہیں۔ عمر
۲۹ سال۔ تعلیم ایف ایس سی ہے۔
ایم گلزار احمد۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۰۷۶۔ شارجہ (یو اے ای)

مس ح، پ، مردان کے نام!
عمر ۲۴ سال، تعلیم میٹرک، تنخواہ چار ہزار روپیہ ماہانہ ہے
طورخان ڈرائیور۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۴۴۳۔ دوبئی

میں ہو بہو آپ کے آئیڈیل کی تصویر ہوں۔ تعلیم ایف اے سی
عمر ۲۸ سال اور ماہانہ آمدنی سات ہزار روپے ہے۔
ایم غلام حیدر۔ پوسٹ بکس نمبر ۴۷۳۔
شارع المطار، جدہ۔ سعودی عرب

میں آپ کے معیار پہ پورا اتروں گا۔ تعلیم بی اے اور عمر
۲۵ سال ہے۔
ثاقب سومیدار کے رحمن معرفت پوسٹ ماسٹر جیلہ، سمیلہ

سرکاری ملازم ہوں، ماہانہ آمدنی ۵۰۰/- روپے ہے۔
ظفر جاوید ۳/۶/جی - ۱۴۹ اسلام آباد

تعلیم بی اے، بی کام، تنخواہ سات ہزار روپے ماہوار ہے
آپ ہی کا آئیڈیل ہوں۔
فیض اللہ۔ سول کوارٹر نمبر ۴۷c، کوہاٹ روڈ۔ پشاور

اگر آپ جیسا جیون ساتھی مل جائے تو زندگی مزید حسین ہو
جائے گی۔ تعلیم بی اے آنرز، عمر ۲۵ سال، تنخواہ آپ کے معیار
سے زیادہ ہے۔ آفتاب معرفت قاضی فیاض ہاشمی

برائٹ لین ۔ نگاآبادی سر کلر روڈ ۔ گجرات

آپ کے حسین خوابوں کی تعبیر ہوں ۔ ماہانہ تنخواہ ۔/۹۰۰۰ ہے
محمد افضل ناز
پوسٹ بکس نمبر ۱۳۸۱ ۔ العین ۔ ابوظہبی
پی روحی ، لاہور کے نام !
عمر ۲۳ سال ، تعلیم بی اے ، خوب صورت و خوب سیرت ہوں
عاشق علی آرزو ۔ پوسٹ بکس نمبر ۵۵ ۔ میر پور خاص

عمر ۲۲ سال تعلیم ایف اے ماہانہ آمدنی ۔/۶۰۰ روپے ہے ۔
شاہد احمد صدیقی پوسٹ بکس نمبر ۵۲۳۱
سٹی پوسٹ آفس ۔ کراچی ۲

میں آپ کے معیار پر پورا اتروں گا ۔
عبدالخالق شاہین ۔ مکان نمبر ۸۵-۸۴
نیو لندن فیشن ہاؤس ۔ محبوب کلاتھ مارکیٹ صدر کراچی ۳

مجھ میں وہ سب خوبیاں ہیں جو آپ کو پسند ہیں یہاں پر اچھی ملازمت پر ہوں ۔ تنخواہ ۔/۳۲۰۰ روپے ہے ۔
محمد سرور ۔ پوسٹ بکس نمبر ۴۰۶۹ ۔ دوبئی

جو آپ چاہتی ہیں وہ میں ہوں اور جو میں چاہتا ہوں وہ آپ ہیں ۔
عیسیٰ خان ۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۱۶۸ ۔ شارجہ

آپ نے ہو بہو میرے وجود کی عکاسی کر دی ۔ شاید میں آپ کا شریک سفر بن سکوں ۔ تعلیم ایف ایس سی ۔ عمر ۲۱ سال ہے ۔
خالد شیراز ، نسیم برادرس ، زینت ہاؤس
لاثانی علی چوک ۔ واہ کینٹ

اگر آپ کے دل میں نیک خواہش ہے تو میں آپ کا ساتھی بننے میں فخر محسوس کروں گا ۔ عاشق علی مغل
پوسٹ بکس نمبر ۶۱۲ ۔ جدہ ۔ سعودی عرب

عمر ۲۵ سال تعلیم میٹرک اور معقول تنخواہ ۔ بالکل آپ کے آئیڈیل کے مطابق ۔ اقبال ایم
معرفت پوسٹ بکس نمبر ۳۸۸ ۔ مسقط ، عمان

مجھ میں وہ تمام خوبیاں ہیں جو آپ کو پسند ہیں ۔
محمد رفیق روشن معرفت سید بخش ٹیلر ماسٹر
ویسٹ رافع ۔ بحرین (عرب گلف)

میں آپ کا آئیڈیل ہوں ۔ تعلیم بی اے ۔ آمدنی ۔/۱۰۰۰ ماہانہ ہے
ایم صدیق طاہر معرفت رفیق ٹیلر ہاؤس ، کوٹلی ۔ (آزاد کشمیر)

عمر ۲۵ سال ۔ تعلیم مڈل اور ماہانہ آمدنی تین ہزار روپے ہے ۔
محمد اسلم عاصی ۔ ص ۔ ب ۱۳۴۱ ۔ کویت

آپ کی تحریر نے بہت متاثر کیا ۔ میں آپ کا ہم خیال ہوں ۔
ایم اے جنجوعہ ۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۷۷ ۔ ابوظہبی

آپ کے اور میرے خیالات میں ہم آہنگی ہے ۔ میں ہی آپ کا آئیڈیل ہو سکتا ہوں ۔ ایم اے بٹ
پوسٹ بکس نمبر ۱۱۰۵ ۔ ڈیرہ ۔ دوبئی ۔

میں بھی آپ کے آئیڈیل پر پورا اترتا ہوں۔ میری پسند بھی
آپ جیسی لڑکی ہے جو دولت اور ذات پات کو کوئی اہمیت نہ دے
اعجاز احمد ا سٹریٹ نمبر ۷
جہانگیر پارک، شاہدرہ ٹاؤن۔ لاہور

میں فیکٹری منیجر ہوں۔ تعلیم ایم ایس سی۔ تنخواہ ۲۰۰۰/۔ روپے
ماہانہ۔ عمر ۲۶ سال ہے۔ آپ کو پاکر مسرت ہوگی۔
بلال الدین سی/۵۹۸۔ بلاک نمبر ۲
سینٹرل کمرشیل ایریا۔ پی، ای سی، ایچ، ایس۔ کراچی ۲۹

اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ صرف اچھے ساتھی کی کمی ہے۔
ایم اصغر ملک۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۶۹
ٹویوٹا ڈویژن۔ مسقط۔ سلطنت آف عمان

عمر ۲۲ سال، تعلیم ایف، اے۔ آپ کے خوابوں کی تعبیر ہوں
ملک ظفر اقبال جاوید
ڈاک خانہ بجار۔ تحصیل خوشاب ضلع سرگودھا

مجھے بھی آپ جیسی رفیق سفر کی ضرورت تھی۔ عمر ۳۰ سال۔ تنخواہ
۲۰۰۰/۔ روپے ماہوار۔ جہیز کا لالچ نہیں۔
غلام حسین ساجد، فیلڈ اسسٹنٹ ہائیڈرو جیالوجی
ڈائریکٹوریٹ واپڈا (نارتھ) ۳ سریاب، کوئٹہ

مجھ میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں، جو آپ پسند کرتی ہیں۔
چودھری محمد اشرف فیضی
معرفت ظہیر اسٹیشنری مارٹ، مین بازار ادیا خاں (میانوالی)

آپ کے آئیڈیل کی تصویر ہوں۔
گوہر 105/6 - B.G.7/4 اسلام آباد

آپ کے معیار کے مطابق ہوں۔ عمر ۱۸ سال ہے۔
عبدالوحید بٹ، دکان نمبر ۱
مدینہ مارکیٹ۔ منڈی کامونکی۔ ضلع گوجرانوالہ

میں آپ کے آئیڈیل پر پورا اتروں گا۔ تنخواہ تقریباً
ہزار روپے ہے۔ محمود احمد عینی
پوسٹ بکس نمبر ۱۶۱۹۔ العین۔ ابوظہبی

آپ نے جس آئیڈیل کی عکاسی کی ہے شاید میں اس
اتر سکوں۔ ایم اے نسیم
البدر ایسٹ۔ وایا دہران۔ سعودی عرب

میں بھی آپ جیسے ساتھی کا متلاشی ہوں۔
عنایت اللہ خاں جتوئی
قصبہ گڑھ۔ تحصیل سمندری۔ ضلع لائلپور

میں آپ کے آئیڈیل کے عین مطابق ہوں۔
غلام رسول لاہوری
پوسٹ بکس نمبر ۱۳۴۵۔ العین۔ ابوظہبی

ڈی، اے کاظمی۔ کراچی کے نام!
عمر ۲۹ سال۔ آرمی میں میجر ہوں۔ آپ ہر طرح خوش ر
ایم جہانگیر۔ سی، ۲۷۴ بلاک بی
نارتھ ناظم آباد۔ کراچی ۳۳

ماہ تربین، لاہور کے نام:
عمر ۳۰ سال۔ ذاتی بزنس اور اللہ کا دیا سب کچھ ہے
ممتاز معرفت پبلشر بک اسٹال
اڈہ گورنمنٹ بس سروس۔ جھنگ صدر

تعلیم ایم اے۔ تنخواہ چار ہزار سعودی ریال ماہانہ۔ آپ
کے آئیڈیل کی تحریر کردہ صفات کا حامل ہوں۔
ایم اے ہاشم
ARAMCO P.O.BOX 1526 ALFARHA
ABQAIQ VIA DHARAN SAUDI ARABIA

کیا جو تم نہ سکے اُسے مہذب بنانے کے لیے



آدمی کا بچہ

فرح صمیم صابر

سیکھنے کے سوا اُسے دُنیا کی کسی چیز سے دلچسپی نہیں تھی تفریح کے نام پر کبھی کبھار ریڈیو سن لینا اس کے لیے بڑی بات تھی، اور اُس کی یہی عادات ہوسٹل میں بسنے والے فیلوں کے لیے چڑ بن گئی تھیں۔ اُنہوں نے اُسے ماڈرن بنانے اور تہذیب سکھانے کے سو جتن کر ڈالے تھے مگر بقول اُن کے وہ اب تک آدمی کا بچہ نہیں بن سکا تھا۔ ہر بار اس کی فطری جھجک اور بزدلی آڑے آ جاتی تھی اور اس کے ساتھیوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کی جھجک اور بزدلی کیسے ختم کریں۔؟ آخر بڑی سوچ بچار کے بعد ایک روز انہیں یہ ترکیب سوجھ ہی گئی۔

انہوں نے فیصلہ کیا کہ اپنے ساتھ میلے میں لے جانے سے پہلے اُسے شراب پلائی جائے اور پھر چرس بھرے سگریٹ کے سوٹے لگوا کر زندہ ناچ گانا دکھایا یا سنوایا جائے تو اس کی جھجک ختم ہو جائے گی اور اس کے اندر کا مرد جاگ اُٹھے گا۔ چنانچہ انہوں نے پہلے شراب اور پھر چرس کے سگریٹ پلائے اور پھر میلہ دیکھنے چل پڑے۔ جب وہ میلے میں پہنچے تو اس کا سر چکرا رہا تھا اور یقین ہو گیا تھا کہ وہ اچانک کسی گٹر یا نالی میں گر جائے گا اور کتے اس کا منہ چاٹنے لگیں گے۔ بچپن ہی سے وہ سنتا آیا تھا کہ شراب پی کر انسان انسان نہیں رہتا جانور بن جاتا ہے اور یہ انسان کو مفلس اور بے غیرت بھی بنا دیتی ہے۔ اُسے اپنا دماغ گُند اور پھیپھڑے چھلنی ہوتے معلوم ہو رہے تھے یوں لگتا تھا جیسے کسی نے بہت سے انگارے منہ میں ڈال لیے ہوں اور

اگر وہ سب اُسے پکڑ کر نہ چلتے تو وہ اب تک گر چکا ہوتا۔ شرابیوں کے بارے میں اس کی سوچ یا رویّے بڑے افسردہ تھے اس کی وجہ بھی یہ تھی کہ اس کے گھر میں ٹی وی تھا نہ اس نے انگریزی فلمیں دیکھی تھیں بلکہ انگریزی فلمیں تو کیا اس نے کوئی فلم ہی نہیں دیکھی تھی۔ ورنہ اُسے پتا تو معلوم ہوتا کہ شراب کیا ہے اور شرابی کیسے ہوتے ہیں؟

میلے میں وہ تھیٹر گئے۔ تھیٹر کی ٹوٹی پھوٹی کرسیاں اُن پر مٹی کی تہیں جمی ہوتی تھیں وہ اپنے رومالوں سے کرسیاں صاف کر کے بیٹھ گئے اُسے بیچ میں بٹھایا گیا تھا تاکہ وہ بھاگ نہ جائے۔ تھیٹر میں چاروں طرف دھواں ہی دھواں تھا۔ شاید ہی کوئی ایسا آدمی ہو جو سگریٹ نہ پی رہا ہو۔ سامنے ایک ٹوٹا پھوٹا بدشکل سا اسٹیج بنا تھا جس کی پچھلی طرف پھٹی پرانی چادریں لٹکی ہوتی تھیں جن پر اداکاراؤں کی تصویریں بنی تھیں۔ اسٹیج کے سامنے کچھ سازندے بیٹھے تھے اور نہ جانے کہاں سے گانوں کی آواز لاؤڈ اسپیکروں سے آ رہی تھی۔ مگر چونکہ اس کا سر چکرا رہا تھا مگر اس کے باوجود وہ شرما اور گھبرا رہا تھا یوں لگتا تھا جیسے ابھی اُس کا باپ آ جائے گا اور اُس کا سر پکڑ کر زور سے ہلاتے ہوئے کہے گا۔ "ٹھہر جا بیٹا... ابھی تجھے تماشا سناتا ہوں۔" اتنے میں تھیٹر کے اسٹیج پر آ کر ایک مریل اور مخنی جیسے شخص نے اعلان کیا "صاحبان قدر دان... شو شروع ہوتے ہیں" اللہ ہے سہارا پہلے ہی ڈبل شو" وہ مریل شخص مائیکروفون سے ہٹا اور موسیقی پھر شروع ہو گئی۔ اُس نے سوچا کہ ریکریئیشن ہال میں ریڈیو کے سامنے بیٹھ کر کئی بار سُنے تھے اور جن گیتوں کو سن کر اس کا دل دھڑکا اور بہت گھبرا

ڈالنے کر چلا تھا وہ گیت اب یہاں آ سمائے کی طرح گنگنا رہے تھے۔ لوگوں نے تالیاں سیٹیاں اور کوسیاں بجا کر اس اداکارہ کا استقبال کیا وہ ایک نازک اور لاغر سی لڑکی تھی اور بالکل زبیدہ معلوم ہوتی تھی وہ اسٹیج پر آکر ناچنے لگی اور وہ سوچنے لگا کہیں یہ سچ مچ زبیدہ تو نہیں ہے؟ اس کا دل دھڑکنے لگا اس نے غور سے دیکھا تو اسے پتہ چلا کہ وہ ناچنے کے ساتھ کچھ گا بھی رہی تھی ساتھی سیٹیوں میں نجانے کسی نے اسے کیا کہا کہ وہ گاتے گاتے ہنس پڑی، وہ حواس باختہ ہو گیا اس نے زبیدہ کو تین سال سے زیادہ نہیں دیکھا تھا اب وہ بالکل اسی طرح اسی عمر کی ہوگی۔ اسے زبیدہ کا مسکرانا یاد آ گیا وہ اپنے باپ کی پٹ اور تبدیلی ہونے سے پہلے اس کے گھر آتی جاتی رہتی تھی۔ وہ اس کی چھوٹی بہن کی کلاس فیلو تھی وہ چھوٹے چھوٹے پیارے قہقہے لگا کر ہنستی تھی اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ اس کی بہن کے بجائے اس سے بات کرے۔ ذرا ذرا سے پیارے اور خوبصورت قہقہے لگاتے۔ پھر وہ اس سے شرماتی تھی اور وہ بھی اس سے شرماتا تھا مگر پردوں؟ دروازوں، کھڑکیوں دیواروں کی اوٹ میں کھڑے ہو کر وہ اس کے چھوٹے مگر پیارے قہقہے ضرور سنتا تھا اسے ہمیشہ اس بات کی خواہش رہی کہ وہ کبھی ایک بڑا لمبا اور خوبصورت قہقہہ لگائے جسے وہ سنبھال کر ہمیشہ کے لئے اپنی یادداشت میں محفوظ کرلے اور پھر ساری زندگی تنہائی کے سیاہ راستوں میں بیٹھ کر اس کے خوبصورت پیارے قہقہوں کا تصور کرتا رہے کاش ایسا ہو جاتا تو اس کے دماغ میں ایک خوبصورت قہقہہ ضرور محفوظ ہوتا اور آج وہ اندر سے اتنا خالی اور ویران نہ ہوتا۔ اگر زبیدہ نے اپنا انمول قہقہہ اس کی یادداشت کے ذخیرے میں محفوظ کروایا ہوتا تو آج اس کا خوبصورت قہقہہ تالیوں اور سیٹیوں کے شور میں دب کر نہ رہ جاتا وہ دھمال ڈالتے ہوئے اس کے بال کھل گئے اس کے دل پہ چوٹ لگی اسے زبیدہ کے خوبصورت بال یاد آگئے وہ کبھی اس بات کا فیصلہ نہ کر سکا تھا کہ زبیدہ کا حسن اس کے چھوٹے چھوٹے پیارے قہقہے یا کالے چمکیلے سیاہ بال تھے پتہ نہیں وہ اتنے کروڑوں دلوں کا بوجھ کس طرح اٹھا سکتی ہے اسے یاد آیا کہ ایک بار رات کو وہ جغرافیے کے پرچے کی تیاری میں مصروف تھا کہ اسے زبیدہ کے بالوں کا دھیان آ گیا اور پھر وہ کچھ نہ پڑھ سکا ساری رات وہ ان بالوں کو ایک دوسرے کے ساتھ گانٹھ کر قطب شمالی سے قطب جنوبی اور قطب جنوبی سے شمالی تک زمین کے چاروں طرف لپیٹتا رہا اور چکر گنتا رہا ان دنوں میں اسے بالوں کے بارے میں سب شعر یاد ہو گئے تھے۔

زبیدہ ابھی ناچ رہی تھی اس کا سر چکرا رہا تھا اور اسے نزدیک کی چیزیں دور اور دور کی چیزیں نزدیک نظر آنے لگی تھیں اسے نیند آ رہی تھی وہ آنکھیں بند کر کے سونے کی سوچ رہا تھا کہ اس کے منہ سے آہ نکلی وہ اٹھ کر بھاگنا چاہتا تھا مگر اسے اس کے دوستوں نے پکڑ کر بٹھا لیا وہ حیران تھا آہستہ آہستہ آنکھیں کھول کر اسٹیج پر دیکھ رہا تھا۔ زبیدہ کے پیچھے اب اس کے ماموں کی لڑکی رخشندہ اسٹیج پر ناچ رہی تھی پچھلے سال چھٹیوں میں وہ ان کے گاؤں گیا تھا اسے پتہ نہیں تھا کہ ماموں نے رخشندہ کا رشتہ کہیں طے کیا ہوا ہے اسے تو صرف اتنا پتہ تھا کہ پتلی پتنگ اور دبلی پتلی رخشندہ کے جسم سے کوئی برقی یا مقناطیسی لہریں ضرور نکلتی ہیں جو اس کے نزدیک سے دور جانے والوں کو پیچھے اپنی طرف کھینچتی اور آگے دھکیلتی رہتی تھیں اس نے بادلوں کو برستے ہر گناؤں کو چڑھتے لہروں کو بہتے اور آندھیوں کو چلتے دیکھا تھا پہاڑوں ریت کی مٹی کا بن کر بھی ایسی مضبوط چٹانوں، طوفانوں اور لہروں کو رکتے نہیں دیکھا تھا اس پتلی اور لاغر سی لڑکی میں اتنی طاقت، قوت اور زور تھا کہ وہ آنکھ کے اشارے اور ہونٹوں کی چھوٹی سی جنبش سے سب کام کروا لیتی تھی سپہر بھونچال اٹھا سکتی تھی دھرتی کا سینہ چیر سکتی تھی طوفان بپا کر سکتی تھی اور اونچے اونچے پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہلا سکتی تھی۔ اسے پینے کے لئے پہاڑوں کا راستہ کاٹ کر دودھ کی نہریں بنا دینے، ہنس کر زہر پی جانے، رانجھا کی طرح کانوں میں بالیاں ڈالنے اور مہینوال کی طرح اپنے گوشت کے کباب کھلانے کی تمام سچ ثابت ہوتیں۔ اسے ہاتھ لگا کر دیکھنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگانے کا جذبہ دل میں پیدا ہوتا دل چاہتا کہ آدمی کتابیں اور ڈگریاں، ملازمتیں یا پنشن آب میں پھینک کر مرزا صاحب بن جائے تلواریں نیزوں اور تیروں کی بارش میں کسی تیز بھاگنے والی گھوڑی پر سوار ہو کر اسے اٹھا لے جائے۔

رخشندہ اسٹیج کے کونے پر کھڑی اٹھتے ہوئے نوٹ اکٹھے کر رہی تھی مریل سا آدمی لوگوں سے اور پیسے لٹانے کے لئے کہہ رہا تھا۔ روپے دیتے ہوئے ایک آدمی نے رخشندہ کا بازو پکڑ لیا تو اس

ں کھولنا تھا۔ اُس کا دل چاہا کہ وہ لوگوں کے سروں پر
پاؤں رکھتے ہوئے بھاگ کر آگے چلا جائے اور رخشندہ کا بازو پکڑ کے
اُس آدمی کو باہر نکال دے۔ وہ غصے سے اپنی سیٹ سے اُٹھا لیکن
پھر سیٹ میں جکڑا دیا گیا۔ اتنے سارے لوگوں کے سامنے
کیا کرنا چاہیے وہ کیونکر۔ اُسے بڑی غیرت آئی۔ اس کی بے عزتی
تھی وہ سر جھکائے بیٹھا تھا اس نے سر اُٹھا کر دیکھا تو وہ بڑی بے برگی
سے بات کر رہی تھی اُسے بڑا غصہ آیا اُس نے اُٹھ کر بڑے
زور سے کہا۔

"رخشندہ"

آس پاس کے لوگ اُسے بڑی حیرانی سے دیکھنے لگے۔
"رخشندہ نہیں بھئی، یہ رن اختر ہے" "کوئی عاشق لگتا ہے"
"شرابی ہے" "نشے میں ہے"
اُس پر آوازوں کے اتنے پتھر برسے کہ وہ لہولہان ہو گیا
رخشندہ اسٹیج سے اُتری تو اعلان ہوا۔
"اب ملک کی مشہور گلوکارہ چاند بائی... فرمائشی گانا
سنائیں گی"
چاند بائی اسٹیج پر آئی تو وہ ہکا بکا رہ گیا اُسے ایسا لگا
جیسے اُس کا سارا جسم سُن ہو گیا ہو وہ اُس کی چھوٹی پھوپھی فوزیہ
تھی۔ ان کا کچھ مہینے پہلے بیاہ ہوا تھا جب وہ دلہن بنی تھی تو اس نے
یہی کپڑے پہنے تھے۔ اسی طرح اُس کے بال بنے تھے۔ وہی قد
وہی عمر ایسی ہی شکل و صورت وہ اُٹھ کر بھاگ جانا چاہتا تھا پر وہ سیٹ
میں پھنسا ہوا تھا اُس نے اگلی سیٹ والے آدمی کے سامنے اپنے آپ کو
چھپا لیا اگر چھوٹی پھوپھی کی نظر اُس پر پڑ جائے اور وہ اتنے سارے
لوگوں کے سامنے پوچھ بیٹھے "جاوید... تو یہاں کیسے؟" پھر کیا ہوگا؟
چھوٹی پھوپھی کی آواز، گھنگروؤں کی جھنکار، سارنگی، ہارمونیم
اور طبلے کی آواز سے مل گئی۔ اُسے اپنے ساتھیوں سے ڈر لگنے
لگا تھا اگر انہیں پتہ چل گیا کہ وہ اُس کی چھوٹی پھوپھی ہے تو پھر؟
اُسے یاد آیا کہ اُس کی چھوٹی پھوپھی کی آواز ہمیشہ سے بہت اچھی
تھی۔ اپنے کمرے میں پہنچ کے وہ کبھی کبھی گاتی یا گنگناتی رہتی تھی۔
ایک بار آپا سا جا - "مجھے پیر جانے دو، دو ملنگی سا جنا" مجھے بہت
اچھی لگی تھی اگر اُسے ذرا بھی شک ہو جاتا کہ کوئی اُس کا گانا سُن رہا ہے
تو آواز اُس کے گلے میں پھنس جاتی گھر والے کبھی کبھی شادی بیاہ کے

موقع پا کر ہر محفل میں گانے کی فرمائش کر دیتے تو وہ شرم سے لال
ہو جاتی۔ اور گھٹنوں میں سر چھپا کر گٹھڑی سی بن جاتی پر چھپ... اُس
نے سوچا چھوٹی پھوپھی کو تھیٹر کے اسٹیج پر گانے کی کیا ضرورت ہے
وہ کیسے آ سکتی ہے یہ چاند بائی ہی ہو گی۔ پر نہ جانے یہ کس طرح کی
چاند بائی ہے کہ اس میں اور فوزیہ پھوپھی میں رتی بھر بھی فرق نہیں
لگتا کیا پتہ یہ تھیٹر والے جادو بھی جانتے ہوں
اور انہوں نے جادو کے زور سے یہ فراڈ کی ہو
کر دیکھنے والوں کو ناچنے گانے والیاں اپنی ہی مائیں بہنیں نظر آتی
ہوں۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا سب مست تھے اس کا شک مضبوط ہوا
اس نے اپنا شک مٹانے کے لئے اپنے ایک ساتھی سے پوچھا۔
"یار حمید... تجھے بھی چاند بائی اپنی پھوپھی نظر آتی ہے؟"
"کیا بکواس کرتا ہے؟" حمید نے غصہ میں جل کر کہا۔ اس کا
شبہ دور نہ ہوا۔ اُس نے اگلی سیٹ والے آدمی سے پوچھا۔
"بھائی جی... کیا آپ کو بھی چاند بائی اپنی پھوپھی نظر آتی ہے؟"
اگلی سیٹ والے آدمی نے "لاحول ولا قوۃ" کہہ کر اُس کے منہ
پر تھپڑ مار دیا اُس کے ساتھی تھپڑ مارنے والے پر پل پڑے۔ دنگا
ہو گیا بڑی مشکل سے لوگوں نے بات کو رفع دفع کیا اور معاملہ ٹھنڈے
سے بٹھایا۔ چاند بائی اسٹیج سے اُتری اور اُسے یقین ہو گیا کہ اب اُس
کا باپ اسٹیج پر آئے گا اور کہے گا "ڈبل شو شروع ہو گیا صاحبان
قدر دان... جلدی جلدی ٹکٹ لے کر آ جاؤ۔" اُس کے دوستوں
نے اُسے سمجھایا کہ بھئی وہ ساری عورتیں جو باری باری اسٹیج پر آ رہی
تھیں پیشہ ور گانے والیاں اور طوائفیں تھیں پر اُسے یقین نہ آیا وہ
اُسے اُٹھ کر بھاگنے بھی نہیں دیتے تھے بے بس ہو کر وہ کہنے لگا۔ "تم
سب جھوٹ کہتے ہو... یہ تمہیں بھی اپنی مائیں بہنیں نظر آتی ہیں۔ پر
تم مجھے بتاتے نہیں مجھ سے چھپاتے ہو تم سب بے غیرت ہو" وہ بچوں
کی طرح اونچا اونچا رونے لگا۔
تب اس کے سارے دوستوں نے بیٹھنے کے لئے یہ سمجھ لیا کہ وہ
نہ طبیب بن سکتا ہے اور نہ آدمی کا بچہ۔

آپ کا سونا چاہیئے

یا

بینک ڈرافٹ

آپ کا فیصلہ یقیناً "بینک ڈرافٹ" کے حق میں ہوگا

برصغیر پاک و ہند میں

"دوشیزہ ادبی معمہ"

واحد معمہ ہیں جو
بینک کے ڈرافٹ کے ذریعے انعامات
کی ادائیگی کرتے ہیں

بینک ڈرافٹ ہر شک و شبہ سے پاک ہوتے ہیں

"دوشیزہ ادبی معمہ" نمبر ۱۸ میں

۹۰ ہزار کے بجائے ۲ لاکھ ۷۰ ہزار روپے
تقسیم کئے جا رہے ہیں

پہلا انعام ------ ۶۰ ہزار کے بجائے ۲ لاکھ روپئے
دوسرا انعام ------ ۲۰ ہزار کے بجائے ۴۵ ہزار روپئے
تیسرا انعام ------ ۱۰ ہزار کے بجائے ۲۵ ہزار روپئے

ایک غلطی والے حلوں پر ۹۰/۹۱ روپے کی بجائے ۲۰۱/۵۵ روپے فی کس ادا کئے گئے
دو غلطی والے حلوں پر ۲۰/۲۱ روپے کی بجائے ۵۱/۴۳ روپے فی کس ادا کئے گئے

دیانتداری اور ایمانداری کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے

انعامی رقم کے بدلے میں **کیش واؤچرز** صرف تحریری درخواست
پر بھیجے جاتے ہیں

دوشیزہ ادبی معمے نمبر ۱۸ کا پہلا انعام

صحیح حل دوشیزہ ادبی معمے نمبر ۱۸				
نمبر	صحیح حل	کتاب یا رسالہ	مصنف یا مترجم	صفحہ
۱	بے نبی	اور ڈان بہتا رہا	مائیکل شولوخوف / [illegible] جالندھری	۲۸۹
۲	نظریات	تاریخ اور کائنات	سید محمد تقی	۲۲۵
۳	ذہن	یادوں کی برات	جوش ملیح آبادی	۳۷۹
۴	دنیا	پھول اور کلیاں	رابندر ناتھ ٹیگور / [illegible]	۷۸
۵	تباہ	آگ کا دریا	قرۃ العین حیدر	۳۸۱
۶	دامن	بنت الجزائر	ممتاز احمد شفیم	۱۵۲
۷	انجام	جرمئے تے لوگ	سیدہ افضل	۲۹۷
۸	قسم	تو پشکن	دیبا خانم	۱۳۵
۹	سر	خوشبو وفا کی	فریدہ حق [illegible]	۳۱۹
۱۰	مجاز	کالے کوسے	عظیم بیگ چغتائی	۹

2 لاکھ روپے

بالکل درست حل بھیج کر

صغریٰ بیگم

S/4/1 پاک ماڈرن کالونی کراچی نے حاصل کیا

رقم چیک کی بجائے بینک پے آرڈر (BANK'S PAY ORDER) کے ذریعے دیا جائے گا

غلطی کے [illegible] حل موصول ہوئے جنہیں دوسرا انعام

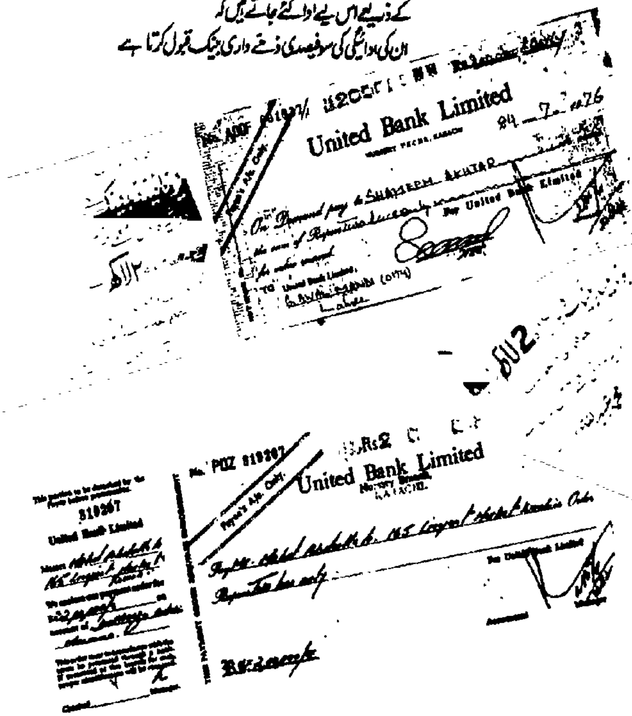
ہزار کی بجائے ۱۰ ہزار روپے حساب [illegible] روپے فی حل دیا گیا

[illegible]

دوشیزہ ادبی معموں کے بڑے انعامات

بینک ڈرافٹ

کے ذریعے اس لیے ادا کیے جاتے ہیں کہ
ان کی ادائیگی کی سو فیصدی ذمے داری بینک قبول کرتا ہے



دفتری اور انتظامی اخراجات منہا کرنے کے بعد انعامی رقم ادا کی جائے گی!

۹۰ ہزار روپے کے انعامات 90000

پہلا انعام ۱۰۰ فیصد درست حل پر ۶۰ ہزار روپے

دوسرا انعام ایک غلطی والے حل پر بیس ہزار روپے — تیسرا انعام دو غلطی والے حل پر دس ہزار روپے

فیس داخلہ فی حل ایک روپیہ ہے۔ [illegible] حل بھیجے جا سکتے ہیں۔ [illegible] دوشیزہ ادبی معمہ [illegible] ہدایات کی پابندی لازمی ہے [illegible] شائع ہوتی ہیں۔ [illegible] انعامی رقم میں مزید کمی بیشی ہو سکتی ہے۔

[illegible]

دوشیزہ ادبی معمہ نمبر ۱۹

نمبر	اشارات	ممکن الفاظ			حل نمبر.....	حل نمبر.....	حل نمبر.....
۱	ایک ـــــ گزر چکی تھی	قیامت	مدت	رات			
۲	کبھی کبھی ـــــ کے لیے سب کچھ قربان کرنا پڑتا ہے۔	دشمنوں	اپنوں	دوسروں			
۳	اس کے ـــــ اس کو دھوکا نہیں دے سکتے۔	بھائی	کان	دوست			
۴	ان کی ـــــ انسانی صنعت کا ایک شاہکار بن گئی۔	تعمیر	ساخت	تراش			
۵	ـــــ اٹھا کر سب کو خاموش کر دیا۔	چھڑی	ہاتھ	تلوار			
۶	میں ـــــ ہار چکا تھا۔	ہمت	بازی	دولت			
۷	ـــــ بیکار معلوم ہوتی ہے۔	تحریر	گویائی	ترتیب			
۸	سب ـــــ اس طرح غائب ہو گئیں جیسے سرے سے موجود ہی نہ تھیں۔	کتابیں	آوازیں	سکھیاں			
۹	ـــــ کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔	برداشت	مصیبت	تحریک			
۱۰	محلے والے اس کا ـــــ نہیں توڑنا چاہتے تھے۔	ہاتھ	منہ	دل			

(حل سادہ کاغذ پر بھی بھیجے جا سکتے ہیں [illegible] ڈاک ٹکٹ بھیجیے)

نام و مکمل پتہ ـــــــــــــــــــــــ

تعداد حل ـــــــــــ دستخط ـــــــــــ

ڈاک سے اپنے حل لفافے میں اس پتے پر بھیجیے
دوشیزہ ادبی معمہ ۱۹ معرفت ماہنامہ دوشیزہ پوسٹ بکس نمبر [illegible] کراچی

دوشیزہ ادبی معمہ نمبر ۱۹ [illegible] مکمل جوابوں کے ساتھ [illegible] کر دیا جائے گا [illegible] شائع ہوگا۔ انعام یافتگان کی مکمل فہرست [illegible] دوشیزہ میں ملاحظہ فرمائیں۔

[illegible]

[illegible]

دوشیزہ کے [illegible] حل موصول ہوئے جنہیں تیسرا انعام
[illegible] ہزار کی بجائے [illegible] ہزار روپے بحساب [illegible] روپے فی حل دیا گیا

[illegible]

[illegible]

معمّے کی آخری تاریخوں
کا
خیال رکھئے

آخری تاریخ گزرنے کے بعد موصول ہونے والے حل کسی قیمت پر مقابلے میں شامل نہیں کئے جا سکیں گے!

دوشیزہ ادبی معمّوں کے تمام اشارے اُردو کی مطبوعہ کتابوں اور رسالوں سے لیے جاتے ہیں اسلئے کہ ماہر کی رسوائی زمانہ قلابازیاں آپکو انعام سے محروم نہیں کر سکتیں!

آپ بے فکر ہو کر دوشیزہ ادبی معمّوں کے مقابلے میں حصہ لیجئے!

دفتری اور انتظامی اخراجات منہا کرنے کے بعد انعامی رقم واجب الادا ہے

90,000 ۹۰ ہزار روپے کے انعامات

پہلا انعام ۰ بالکل درست حل پر ۰ ۶۰ ہزار روپے

دوسرا انعام ایک غلطی والے حل پر بیس ہزار روپے — تیسرا انعام دو غلطی والے حل پر دس ہزار روپے

فیس داخلہ فی حل ایک روپیہ ایک نام اور ایک کوپن کے ساتھ دو روپے پچاس پیسے میں تین حل بھیجے جا سکتے ہیں۔ اس حساب سے جتنے چاہے حل بھیج سکتے ہیں۔ دوشیزہ ادبی معمہ نمبر ۲۰ کے اپنے تمام حلوں کے ساتھ ایک کوپن دوشیزہ ادبی معمہ ۲۰ ضرور بھیجئے جو ماہنامہ دوشیزہ سے کاٹا گیا ہو۔ مفصل شرائط اور ہدایات کی پابندی لازمی ہے جو ماہنامہ دوشیزہ کراچی میں شائع ہوتی ہیں۔ ایک شخص الگ الگ کوپنوں پر الگ الگ انعام حاصل کر سکتا ہے۔ انعامی رقم میں مزید کمی بیشی ہو سکتی ہے۔

دفتر ماہنامہ دوشیزہ ۱۸۸ سی سنٹرل کمرشل ایریا علامہ اقبال روڈ پی ای سی ایچ ایس کراچی میں دستی حل وصول کرنے کی آخری تاریخ ۱۸ فروری رات ۸ بجے اور ڈاک سے ۲۰ فروری تک

دوشیزہ ادبی معمہ نمبر ۲۰

نمبر	اشارات	ممکن الفاظ			حل نمبر	حل نمبر	حل نمبر .....
۱	—— کے لیے یہ بات برداشت سے باہر تھی کہ ان کے مرکزی مقدس مقام پر مسلمانوں کا قبضہ ہو	یہودیوں	ہندؤں	عیسائیوں			
۲	انسان جو کچھ —— کرے سوچ سمجھ کر کرے	پسند	فیصلہ	ارادہ			
۳	لاکھوں امریکی جرمن نسل سے ہیں اس لیے انہیں —— کی شکست سے کبھی رنج ہوا	اپنوں	دشمنوں	جرمنوں			
۴	سب سے بڑی —— یہ تھی کہ کوئی عینی شہادت موجود نہ تھی۔	ہار	الجھن	جیت			
۵	جنسی بے راہ روی پر —— پابندیاں لگا کر قابو نہیں پایا جا سکتا۔	معمولی	قانونی	مصنوعی			
۶	یہ رسم اب تک چلی آ رہی ہے اور —— تک جاری رہے گی۔	برسوں	قیامت	صدیوں			
۷	جس —— نے مالک سے غداری کی ہو وہ کیا وفا کرے گا۔	مال	ملازم	غلام			
۸	زندگی میں میں نے کتنی ایک عظیم —— مناظر دیکھے ہیں۔	اجتماعی	جذباتی	قدرتی			
۹	ایک ہی —— کے ایک ہی مسئلے میں کئی کئی قول ملتے ہیں۔	فرقے	نسل	امام			
۱۰	تمہارے مشورے کے بغیر کوئی —— طے نہیں کیا جائے گا۔	معاہدہ	مسئلہ	معاملہ			

(حل سادہ کاغذ پر بھی بھیجے جا سکتے ہیں، کوپن منسلک نہ ہونے کی صورت میں فی کوپن تین پیسے کے ڈاک ٹکٹ بھیجئے)

ڈاک سے اپنے حل اور فیس اس پتے پر بھیجئے

دوشیزہ ادبی معمہ ۲۰ ماہنامہ دوشیزہ پوسٹ بکس نمبر ۵۰۳۸ کراچی

نام و مکمل پتہ ------------------------

تعداد حل ------------ دستخط ------------

دوشیزہ ادبی معمہ نمبر ۲۰ کا صحیح حل ۲۸ فروری ۸۰ء کو ایک بجے دن دفتر دوشیزہ میں مطبوعہ کتابوں کے مکمل حوالوں کے ساتھ آویزاں کر دیا جائے گا اور روزنامہ جنگ کراچی ۲ فروری ۸۰ء کو مشرق لاہور میں شائع ہوگا۔ انعام یافتگان کی مکمل فہرست مارچ ۸۰ء کے دوشیزہ میں ملاحظہ فرمائیں۔

کلیم کی آخری تاریخ ۱۶ جنوری سنہ ۱۹۷۶ء

دوشیزہ ادبی معمے ۵۱ کے انعام یافتگان کی مکمل فہرست شائع کی جا رہی ہے۔ پہلے انعام کی خوشخبری تار کے ذریعے پہنچا دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ماہر نتائج کے ایک اور دو غلطی کے انعام پانے والے خوش نصیبوں کو فرداً فرداً بذریعہ ڈاک اطلاع دی جا چکی ہے۔ اطلاع سے دو دن بعد انعامی رقوم بھی ارسال کر دی گئی ہیں۔ جو اس رسالے کی اشاعت سے قبل آپ کو مل چکی ہوں گی۔ اگر آپ کو انعامی رقم نہ ملے اور آپ سمجھتے ہیں کہ آپ انعام کے حقدار ہیں تو ایک روپیہ کلیم فیس کے ساتھ اپنے بھیجے ہوئے حل کی تفصیلات سے مطلع فرمائیں یعنی کس تاریخ کو کتنے حل بھیجے تھے فیس کس طرح روانہ کی تھی۔ منی آرڈر رسید نمبر، پوسٹل آرڈر یا نقد کا نمبر کا حوالہ دیجئے۔ اگر حل رجسٹری ڈاک سے بھیجے گئے تھے تو رجسٹری نمبر، ڈاک خانے کا نام۔ آپ کا حل کس انعام کا مستحق ہونا چاہیے تھا۔

ایسے تمام کلیم زیادہ سے زیادہ ۱۶ جنوری تک مل جانے چاہئیں۔ اس تاریخ کے بعد کسی کلیم پر غور نہ ہوگا۔ اگر آپ کا کلیم درست ثابت ہوا تو انعامی رقم کے ساتھ آپ کی کلیم فیس بھی واپس کر دی جائے گی۔

[illegible]

دوشیزہ ادبی معمے

کے منتظمین ان لوگوں کی قطعاً حوصلہ افزائی نہیں کرنا چاہتے جو ہزاروں کی تعداد میں اپنے حل بھیجتے ہیں۔ اگر یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہا تو ہم اشاروں یا ممکن الفاظ بڑھانے پر مجبور ہو جائیں گے!

[illegible]

[illegible]

دوشیزہ ادبی معمّوں میں جب آپ الگ الگ ٹکٹوں کے ساتھ بھیجے ہوئے حلوں کا الگ الگ انعام حاصل کر سکتے ہیں، چاہے حل ایک ہی نام اور پتے کے کیوں نہ بھیجے گئے ہوں — لیکن اس سہولت سے آپ اسی صورت میں فائدہ اٹھا سکتے ہیں جب آپ دوشیزہ ادبی معمّوں کی فہرست نمبر ۲ کی پابندی کرتے ہوئے ایک منی آرڈر یا پوسٹل آرڈر کے ذریعے ایک ٹکٹ کے ساتھ ایک ہی شخص کی طرف سے بھیجے گئے حلوں کی فیس بھیجیں۔ اگر منی آرڈر یا پوسٹل آرڈر کے ذریعے کئی ٹکٹوں کے ساتھ آتے ہوئے حلوں کی فیس بھیجی جاتی ہے تو زائد ٹکٹ نظر انداز کر دیے جاتے ہیں اور انعام صرف ایک ٹکٹ پر ہی دیا جاتا ہے۔

ٹوکن دوشیزہ ادبی معمہ نمبر ۱۹

دوشیزہ ادبی معموں کی شرائط میں نے پڑھ لی ہیں اور مجھے ہر شرط کا ایک ایک لفظ منظور ہے۔ منسلکہ حل شامل مقابلہ کیجیے میں آپ کے ہر فیصلے کا پابند رہوں گا/گی۔

نام ____________________

مقام و پتہ ________________

____

ٹوکن دوشیزہ ادبی معمہ نمبر ۱۶

دوشیزہ ادبی معموں کی شرائط میں نے پڑھ لی ہیں اور مجھے ہر شرط کا ایک ایک لفظ منظور ہے۔ منسلکہ حل شامل مقابلہ کیجیے میں آپ کے ہر فیصلے کا پابند رہوں گا/گی۔

نام ____________________

مقام و پتہ ________________

____

ٹوکن دوشیزہ ادبی معمہ نمبر

دوشیزہ ادبی معموں کی شرائط میں نے پڑھ لی ہیں اور مجھے ہر شرط کا ایک ایک لفظ منظور ہے۔ منسلکہ حل شامل مقابلہ کیجیے میں آپ کے ہر فیصلے کا پابند رہوں گا/گی۔

نام ____________________

مقام و پتہ ________________

____

ٹوکن دوشیزہ ادبی معمہ نمبر

دوشیزہ ادبی معموں کی شرائط میں نے پڑھ لی ہیں اور مجھے ہر شرط کا ایک ایک لفظ منظور ہے۔ منسلکہ حل شامل مقابلہ کیجیے میں آپ کے ہر فیصلے کا پابند رہوں گا/گی۔

نام ____________________

مقام و پتہ ________________

____

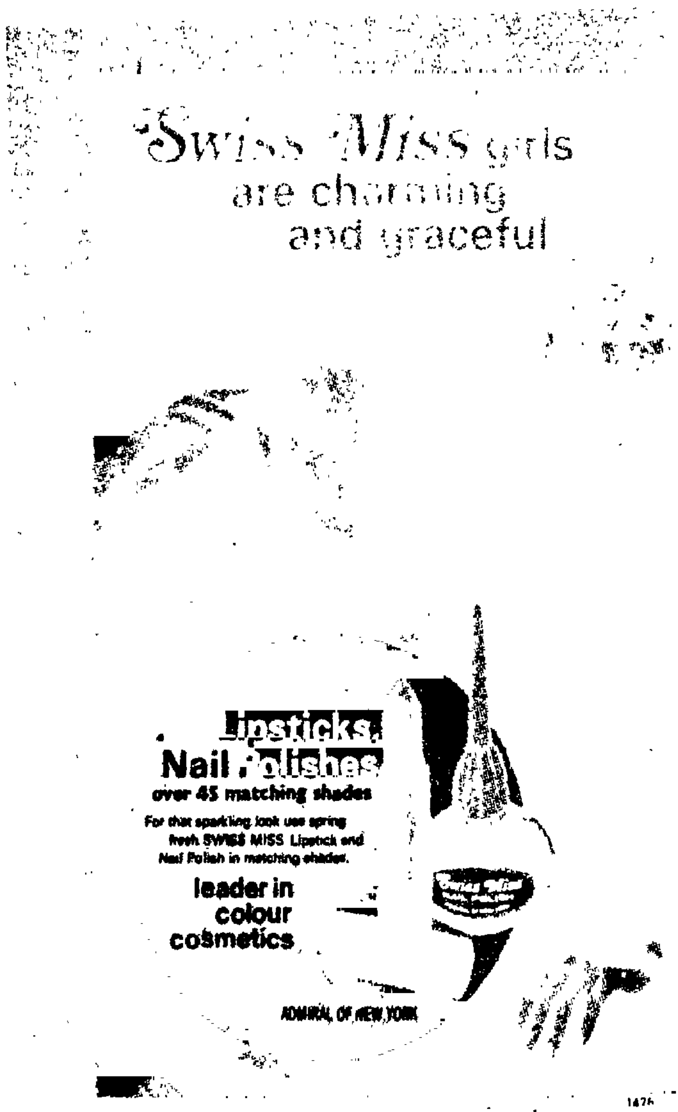

سپیشل نمبر

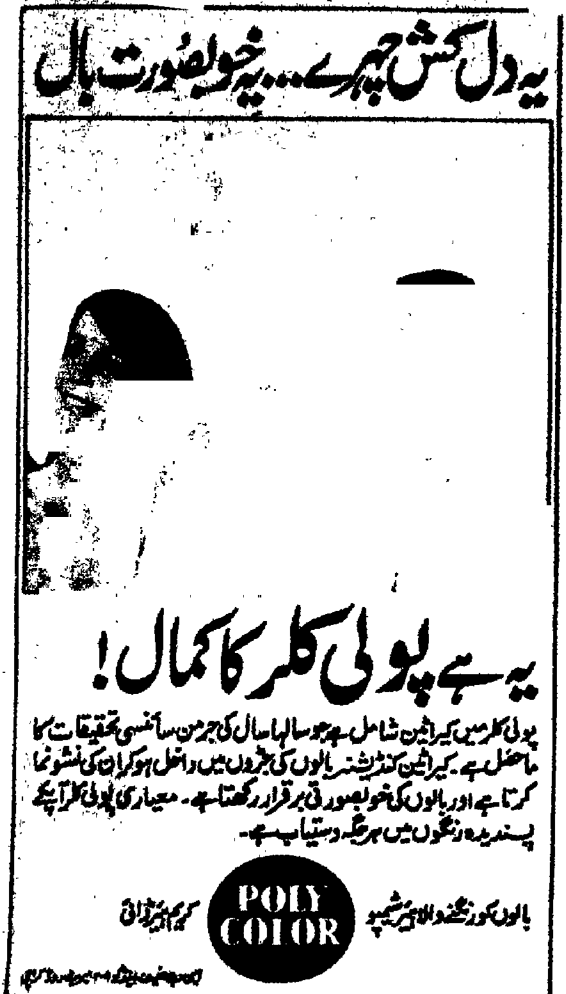


ملک کے نامور فنکار شاہد سجاد نے بابائے قوم حضرت قائد اعظمؒ کی شبیہ کو پہلی مرتبہ کانسی میں ڈھالنے کا کامیاب تجربہ کیا ہے۔ (تفصیلی انٹرویو اندر کے صفحات پر ملاحظہ کیجئے)



دلکش بالوں کے لئے
ویسلین
شیمپو
ویسلین
بیوٹی شیمپو
آپ کے بالوں کو اچھی طرح
صاف کر کے ملائم، ریشمی اور
حسب منشا سنگھار کے قابل
کر دیتا ہے
ویسلین
میڈیکیٹڈ شیمپو
زود اثر ادویاتی اجزاء کے
ذریعے آپ کے سر کی
خشکی کو نہایت عمدگی سے
دور کر دیتا ہے۔
پونڈز کی مصنوعات


Swiss Miss girls
are charming
and graceful
Lipsticks,
Nail Polishes
over 45 matching shades
For that sparkling look use spring fresh SWISS MISS Lipstick and Nail Polish in matching shades.
leader in colour cosmetics
ADMIRAL OF NEW YORK
1476



یہ دل کش چہرے... یہ خوبصورت بال
یہ ہے پولی کلر کا کمال!
پولی کلر میں کیراٹین شامل ہے جو سالہا سال کی جرمن سائنسی تحقیقات کا ماحصل ہے۔ کیراٹین کنڈیشنر بالوں کی جڑوں میں داخل ہو کر ان کی نشو نما کرتا ہے اور بالوں کی خوبصورتی برقرار رکھتا ہے۔ معیاری پولی کلر آپ کے پسندیدہ رنگوں میں ہر جگہ دستیاب ہے۔
بالوں کو رنگنے والا ہیئر شیمپو
POLY COLOR
کریم ہیئر ڈائی

دوشیزہ



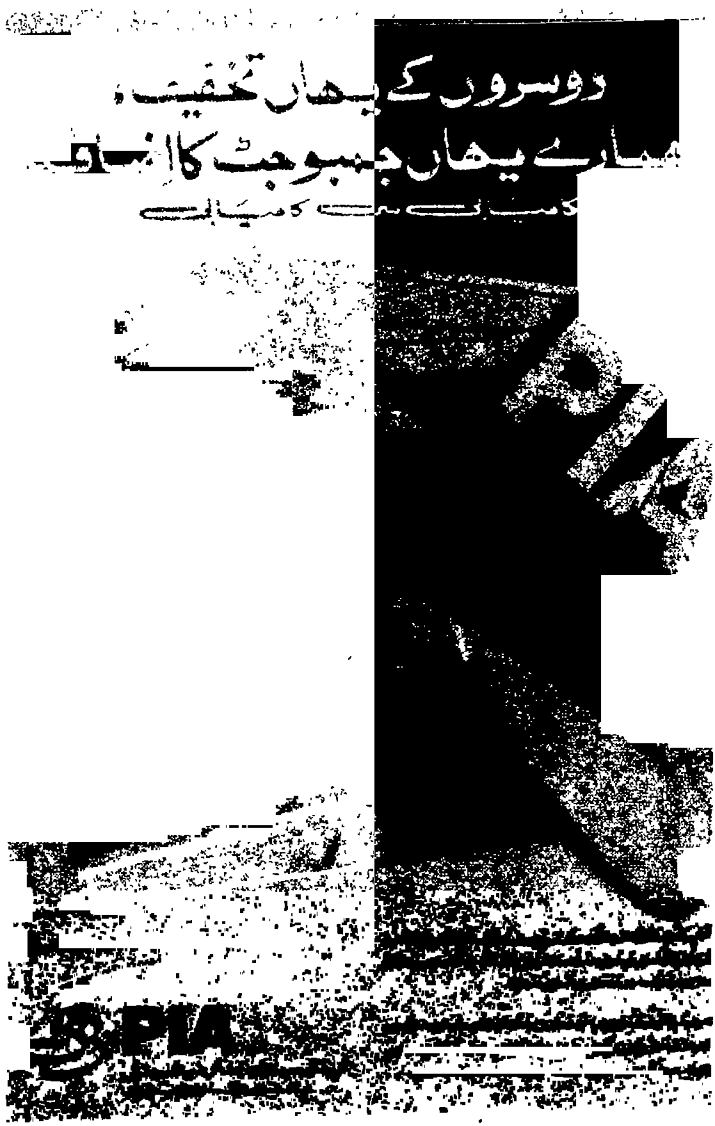
فروری ۱۹۷[illegible]ء

جلد (۷)

شمارہ (۲)

اسپیشل نمبر
قیمت ۵ روپے

[illegible]



دوسروں کے یہاں تکلیف،
ہمارے یہاں جمبوجیٹ کا
PIA
PIA

سیال دولت

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

خدا کی تلوار

موتہ کا میدان ہے۔ گھمسان کا رن پڑ رہا ہے، سوار پیادے، تیر انداز، شمشیر زن اور نیزہ باز ایک دوسرے سے گتھے ہوئے ہیں۔ تیر برس رہے ہیں، تیر کمانوں سے نکل رہے ہیں، زرہ بکتر کٹ رہے ہیں، نیزے سینک رہے ہیں۔ تلواروں کی جھنکار سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی، بہادروں کے نعرے بجلی کے کڑاکوں کی طرح گونج رہے ہیں، نصرانیوں کی ٹڈی دل فوج دھواں دھار حملے کر رہی ہے، صلیب کا نشان میدانِ جنگ میں ہر جگہ نمایاں ہے۔ ہرقل اور شرحبیل کے تجربہ کار جرنیل اپنے اپنے دستوں کو چابکدستی سے لڑا رہے ہیں۔ ان کے پاس کیا نہیں ہے؟ فولادی خودیں ہیں — مرصع زرہ بکتر — جواہر نگار ہتھیار — کڑکتی کمانیں — بھاری نیزے — آئینہ کی طرح صاف بال سے زیادہ باریک دھار کی تلواریں — [illegible] — نصرانی لشکر کی کیا شان و شوکت ہے! ساز و یراق دیکھو تو مال و منال جانچو تو! ایک بات سے ثابت ہے کہ یہ دنیا کی بہت بڑی سلطنت کی فوج ہے۔ ایسی مملکت کی جس کے وسائل بے شمار ہیں۔ اونٹ ہیں — قطار اندر قطار، [illegible] گھوڑے ہیں — فوج در فوج! فیل پیکر، شیر آسا — ! یہی جاہ و حشم ساز و یراق تھا کہ فارس جیسی عظیم الشان سلطنت کچھ ہی دن پہلے اس کے مقابلے میں آئی تو مسل کر رکھ دی گئی۔

آج عرب کے بادیہ گرد ان کے سامنے ہیں۔ اور عربوں میں بھی قریش کے زعماء نہیں، طائف کے سرمایہ دار نہیں — بلکہ مکّے کے مہاجر اور مدینے کے انصار! وہ جنہوں نے غزوۂ خیبر میں شکم کھول کر [illegible] اور غزوۂ خندق میں پیٹ پر پتھر باندھ کے فقیروں کی سی مملکت مدینے کی چار گلیوں سے شروع ہوئی تھی جس کے قیام کو آٹھ سال گزر چکے تھے۔ لیکن آج بھی اس کا ایوانِ حکومت مٹی کی دیواروں اور کھجور کے پتوں سے پاٹی ہوئی مسجد نبوی تھا۔ ان کا بادشاہ فرش زمین پر سوتا، پیوند زدہ کپڑے پہنتا، اپنے ہاتھوں سے اپنا جوتا گانٹھتا اور کئی کئی وقت کے فاقے جھیلتا تھا۔ عقل کہتی تھی حریفوں کا کوئی مقابلہ نہیں، اسباب بتاتے تھے کہ دشمنوں کا کوئی تناسب نہیں لیکن تاریخ کچھ اور ہی نتائج سامنے رکھتی ہے۔

موتہ کا میدانِ جنگ گرم ہے۔ نصرانیوں کے ہاتھوں میں موتہ کی بہترین صنعت کی تلواریں چمک رہی ہیں۔ مسلمانوں کے ایک ایک کر کے تین سپہ سالار شہید ہو چکے ہیں۔ فتح نصرانی لشکر کے قدم چومتی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن شرحبیل اب بھی سہما ہوا ہے۔ جب تک میدانِ جنگ میں ایک مسلمان بھی زندہ ہے کچھ کہا نہیں جا سکتا کہ جنگ کا نقشہ کیا ہو گا؟

نیزہ بدست حملہ آور نصرانیوں کے قلبِ لشکر میں گھس جاتا،

مزید تازہ دم کمک کی کوئی امید نہیں تھی لیکن ان کا حوصلہ کسی طرح
نہ ٹوٹنے پایا۔ اس کے مقابلے میں دشمن کی صفیں اب بھی عیسائی عرب سواروں کے
لشکر میں اب بھی بھر رہا ہے۔ ان کا لشکر بے پناہ ہے۔ مسلمانوں
کی جرأت ابھی کوئی چیز ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ شجاعت کی بھی حد ہوتی ہے
لیکن ان کی ہمت کی حد نہیں۔

دنیا کی بڑی سے بڑی سلطنت کی فوج بھی ہوتی تو اس وقت
جنگ موتہ کا نقشہ ایسا ہے کہ ہتھیار پھینک کر بھاگ کھڑی ہوتی۔
لیکن کفن بدوش، خدا کے سرفروش، توحید کی امانت کے رکھوالے،
یہ کسی بات کو خاطر ہی میں نہیں لاتے۔ زید، جعفر اور ابن رواحہ
کے بعد ثابتؓ بن اقرم نے بڑھ کر اسلامی علم سنبھال لیا اور پکار کر بولے

"مسلمانو! جلدی سے اپنا سردار چن لو، جب تک میں اس
پرچم کی حفاظت کرتا ہوں!"

مسلمان بولے "تمہارے سردار ہونے پر ہم سب راضی ہیں"

ثابتؓ نے کہا "جو سچ پوچھو تو میں اس کا اہل نہیں، بہتر ہے
کہ خالدؓ بن ولید کا انتخاب کر لو!"

خالدؓ بن ولید سردار بنے تو لڑائی ایک نئے مرحلے میں داخل ہو گئی
نئے سالار نے سوچا کہ نصرانیوں کے حوصلے بڑھے ہوئے ہیں۔ اتنی بڑی
تعداد کا دیر تک مقابلہ ممکن نہیں۔ پیچھے ہٹنا موت کو دعوت دینا ہے۔ جو
دستہ پیچھے تھا حضرت خالدؓ نے اسے آگے بڑھایا اور حکم دیا — "جو جو
سو ہو، بڑھ کر حملہ کرو!"

رومی یہ بات سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ تھکے ہوئے مسلمان ان پر ٹوٹ
پڑیں گے۔ خالدؓ شور و غل کرتے آگے بڑھے۔ مجاہدوں نے اب جو حملہ کیا تو معلوم
ہوتا تھا جیسے کسی پُرشور طوفانی دریا کا بند ٹوٹ گیا ہو۔ نصرت سے وہ
یلغار کی کہ رومی دب گئے۔ پیچھے ہٹ کر نئے سرے سے اپنی فوج کی
مورچہ بندی کرنے لگے۔ خالدؓ کی حکمت عملی کامیاب رہی، دشمن کا حوصلہ
ٹوٹ گیا۔ تھوڑی دیر کے لیے لڑائی رک گئی۔ اب جو موقع ملا تو مسلمانوں
نے بھی اپنی فوج کو پھر سے ترتیب دیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حالات جنگ کا علم ہوا تو آپؐ
نے جہاد عام کا اعلان فرمایا۔ جو مسلمان جہاں تھا، جس حال میں تھا، فوراً
سے شام کی طرف چل پڑا۔ عرب کے مشرکین جو رومیوں کے ساتھ ہو گئے
تھے یہ سن کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ لیکن اس سے کیا ہوتا تھا۔ ان کی اپنی
فوج ایک لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ شرحبیل نے اپنی اگلی صفوں کو آگے بڑھایا

——— اللہ اللہ — میدان جنگ کا نقشہ ہے۔ بس! ایک کہرام مچا ہے
جانبازو! آج اسلام کی لاج رکھنا"
نصرانی یہ نعرہ سن کر پیچھے ہٹے۔ ادھر سے مسلمان سر ہتھیلی پر لیے
آگے بڑھے۔

ابتدائی اسلامی معرکوں میں یہ شمشیر زنی کا سب سے بڑا معرکہ ہے
نصرانی لشکر کا دولہا خالدؓ بن ولید، مسلمانوں کا عظیم سپہ سالار، اپنی لوہے کی
زرہ میں تھا۔ آج کوئی حضرت خالدؓ کو دیکھتا — ! ایمان نے ان کو
کس بلا کا حوصلہ دیا تھا۔ بپھرے ہوئے شیر کی طرح وہ جدھر جھپٹتے دشمن بھاگ
کھڑے ہوتے۔ جوانی کی تلوار کی زد میں آتا پانی نہ مانگ سکتا۔ وہ ہاتھ —— وہ
صفائی —— وہ ضرب —— وہ کاٹ تھی کہ دشمن کا دل چھوٹ گیا۔ اس معرکے
ایک دو نہیں، نو تلواریں جوش شجاعت کی تاب نہ لا کر خالدؓ کے ہاتھ سے
ٹوٹ گئیں اور جب کہ دسویں تلوار صفحہ یمانیہ نے جنگ کا پانسہ پلٹ دیا
مسلمان دشمن کے نرغے سے نکل آئے۔ دشمن اپنی اتنی بڑی تعداد کے باوجود
ایسا خوف زدہ ہوا کہ موتہ کا معرکہ رک گیا۔

فوری طور پر فتح و شکست کا اعلان تو نہ ہو سکا۔ لیکن یہ جنگ نتیجہ
ہی میں مسلمانوں کی بے نظیر شجاعت اور جانبازی کا رعب و دبدبہ چھا کر
جنگ کی صورت میں رومیوں کو ہمت نہ ہوئی کہ میدان جنگ کا رخ کرتے۔
جنگ موتہ ابھی جاری تھی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی میں
صحابہ سے ارشاد فرمایا،

"جب میرے مقرر کردہ تینوں سردار شہید ہو گئے تو مسلمانوں کے
لشکر کی کمان خالدؓ نے سنبھالی۔ خداوندا! وہ تیری تلواروں میں سے
ایک ہے۔ اب تو ہی اس کی مدد فرما!"

ضمنی

کسی انگریز کا مقولہ ہے "مسلمانوں کو شکست ہمیشہ صرف ایک ہی قوم نے دی ہے اور وہ ہے خود مسلمان" اسی مقولہ کی روشنی میں یہ عبرت انگیز کہانی پڑھئے!

منصور نوری



ایک چنگاری کی داستان جس نے نصرانی اندلس میں آگ دی

مجاہدین اسلام نماز ظہر ادا کرنے کے بعد آج خلاف معمول اسی جگہ جمع تھے جہاں انہوں نے فریضہ صلوٰۃ ادا کیا تھا۔

کچھ عرصہ قبل ہی اندلس مکمل طور پر مسلمانوں کے قبضے میں آیا تھا اور سپہ سالار اسلام موسیٰ بن نصیر نے دار السلطنت طلیطلہ سے شمال کی جانب روانہ ہونے سے قبل مغیث رومی کو تحائف اور فتح و کامرانی کی خوشخبری کے ساتھ دار الخلافہ دمشق روانہ کیا تھا جہاں سے اس کی واپسی اس وقت ہوئی جب موسیٰ بن نصیر جلیقیہ تک پہنچ کر اسپین کے بقیہ حصوں کو فتح کرنے کی تدابیر سوچ رہا تھا۔ قاصد دمشق سے خلیفہ ولید بن عبد الملک کا ایک فرمان لے کر واپس آیا تھا۔ انہوں نے موسیٰ بن نصیر کو مزید فتوحات سے روک کر فوراً دار الخلافت میں حاضر ہونے کا حکم بھیجا تھا۔ یہ خبر اندلس کے مسلمانوں کے لئے باعث تعجب تھی وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ اس عظیم کامیابی کے بعد ان کے محبوب سپہ سالار کو مزید پیش قدمی کی بجائے خلیفہ نے اسے واپس کیوں بلا لیا ہے جبکہ خود موسیٰ بن نصیر کو بھی خلیفہ کے اس حکم سے دلی صدمہ پہنچا تھا لیکن وہ خلیفہ کے حکم کی تعمیل ہر حال میں ضروری سمجھتا تھا۔ مجاہدین آج اس عظیم فاتح کا آخری خطاب سننے کے منتظر تھے۔

موسیٰ بن نصیر اٹھا اس نے ایک نظر اپنے تمام ساتھیوں پر ڈالی اس لشکر میں اس کے خیر خواہ بھی تھے اور مخالف بھی، جانثار بھی تھے اور جڑیں کاٹنے والے دشمن بھی [illegible] تھا اس کے دائیں طرف جنرل حبیب بن عبیدہ الفہری، زیاد بن عبیدہ، عمرو بن حبیب [illegible] بن مالک [illegible] تھے جن کے چہروں پر خلوص اور آنکھوں میں عقیدت کے جذبات نمایاں تھے۔ اس نے بائیں طرف دیکھا جہاں دمشق سے واپس آنے



دلاور امیر مغیث الرومی اور دیگر مجاہدین براجمان تھے ان میں نوجوان
عمر بن عدی بھی تھا۔ جو [illegible] کے سامنے جاتا اور اس
کی تنبیہ طرح طرح کے اعتراض اٹھاتا تھا جسے میدان جنگ میں اسلامی
احکام کی خلاف ورزی کرنے پر موسیٰ بن نصیر کئی بار تنبیہ کر چکا تھا۔
اور جسے ایک مرتبہ سر عام موسیٰ بن نصیر نے بیس کوڑوں سے [illegible]
نہ رکھنے کی تعمیل بھی کی تھی۔ سو اسی دن سے وہ موسیٰ بن نصیر کو
اپنا مخالف تصور کرنے لگا تھا۔ اس کے قریب ہی اس کا رشتہ دار
عمرو بن نعیم تھا جو اپنے کارناموں کی داد اور ذہانت کی حوصلہ افزائی کے
لئے ہر بار میدان جنگ میں کسی نہ کسی دستے کی کمان طلب کرتا تھا جو
کسی امیر کے ماتحت لڑنا اپنی توہین سمجھتا تھا۔ پھر اس نے سامنے نظر ڈالی
جہاں عام سپاہیوں کے ساتھ اس کا اپنا بیٹا عبد العزیز بن موسیٰ بیٹھا ہوا
تھا جس کی تربیت میں اس نے کوئی کوتاہی نہ برتی تھی۔ جس کی شجاعت
کا سب اعتراف کرتے تھے ——— جو نظر تک پھیلے ہوئے اسلامی لشکر
پر نگاہ ڈالنے کے بعد وہ یوں مخاطب ہوا۔

"میرے عزیزو! تمام ستائش اس خدائے بزرگ و برتر کے لئے
ہے جس نے ایک نقطۂ کن سے تمام موجودات کو شرف وجود عطا فرمایا
ازاں بعد ہزاروں درود اس نبی محترم پر جو شمع ہدایت لائے اور آدم
کی گم کردہ راہ اولاد کو صراط مستقیم سے آشنا کر کے عبادت کا وہ طریقہ
سکھایا جس نے اس مشت خاک کو خدا سے ملا دیا۔ مسلمانو! ہم وہی تو
ہیں جو کبھی نااتفاقی کی آگ میں اپنے ہی بھائیوں کو بھسم کرتے تھے۔
لیکن اس مالک حقیقی نے ہم پہ کرم فرمایا اور ہمیں اتحاد و ایثار کے جذبہ
سے ہمکنار کیا۔ آج رب العزت نے ہمیں ان اقوام پر برتری عطا فرمائی
ہے جو کبھی ہم پہ حکومت کرتی تھیں۔ دیکھو اور غور کرو کہ آج اندلس
میں صلیب کی جگہ ہلالی پرچم لہرا رہا ہے۔ آج جبل الطارق سے لے کر
کوہ البرتات تک اور پرشلونہ سے لے کر اشبیلونہ تک ہر جگہ صدائے اللہ اکبر
گونج رہی ہے۔ یہ صرف تمہارے اتفاق و اتحاد کا نتیجہ ہے کہ خدا نے تم
پر فتوحات کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ آج شاہان قوط کے تخت و
تاج یہاں بادیہ نشینوں کا تسلط ہے جنہیں دنیا غیر مہذب اور بدو کہتی تھی
میرے فرزندو! یاد رکھو تمہارا یہ اتحاد اور یہ جذبہ عمل ہی تمہیں بارگاہ
ایزدی میں مقبول اور دنیا میں باعزت مقام پر فائز رکھے گا۔ تم جانتے
ہو کہ معرکۂ گواڈلیٹ نے ہمارے جو حوصلے بلند کئے اس سے غرناطہ، قرطبہ، مالقہ،
طلیطلہ، اشبیلیہ اور ماردہ میں ہمیں کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کے بعد
میں غرناطہ سے آگے بڑھ کر تمام یورپ کو فتح کرنا چاہتا تھا مگر امیر المومنین
کے حکم سے مرکز کی جانب حاضر ہونا ہے، شاید مجھے طلب کیا گیا ہے
شاید میں اب یہاں واپس نہ آسکوں لیکن تم اسے کبھی ملامت سے مت
سمجھنا۔ میری دعائیں ہر دم تمہارے ساتھ رہیں گی۔ میرے بعد میرا بیٹا
عبد العزیز بن موسیٰ میرا قائم مقام ہوگا۔ مجھے امید ہے کہ وہ تمہاری قیادت
میں کبھی کوئی کوتاہی نہ برتے گا!"

یہ سن کر عبد العزیز بن موسیٰ ادب کے ساتھ کھڑا ہو گیا جہاں
ہزاروں آنکھوں میں ستائش و پسندیدگی کے جذبات تھے وہاں کچھ
نگاہوں سے حسد و نفرت کی چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں مگر ان سب
سے بے خبر عبد العزیز بن موسیٰ دست بستہ باپ کے روبرو کھڑا تھا۔ موسیٰ
بن نصیر نے شفقت سے بیٹے کی جانب دیکھا اور کہا۔

"میرے جان پدر! میں تمہیں اندلس کا امیر مقرر کرتا ہوں۔ تم امن و امان
قائم رکھنا اور ہمیشہ عدل و انصاف سے کام لینے کی پوری کوشش کرنا
اسلام میں ایک امیر کے لئے یہی حکم خداوندی ہے اور اب میری ایک
نصیحت گوش ہوش سے سنو۔ دشمن سے کبھی غافل نہ ہونا۔ عورتوں سے
ہرگز اختلاط نہ کرنا۔ یہ حسین و جمیل مخلوق اور اس کی محبت مرد کے ذہن
اور قلب کو بیکار کر دیتی ہے۔ بیٹے اگر کبھی تیرے دل میں کسی کی محبت
پیدا ہو تو کانٹا سمجھ کر نکال دینا اس میں جتنی دیر لگتی ہے خلش اتنی ہی
بڑھتی ہے اور اب میں تمام مومنوں کو گواہ بنا کر تجھے ایک مخلص دوست
دیتا ہوں۔ میں نے ۷۷ برس کی طویل عمر تک سچی دوستی کی جو علامات
پہچانی ہیں وہ سب اس شخص کی تنہا ذات میں موجود ہیں ——— یہ تیرا
پھوپھی زاد بھائی اور میرا بھانجا و بھتیجا ایوب بن حبیب ہے جو تنہائی
میں تیرا بہترین رفیق اور محفل میں ایک بے باک مشیر ثابت ہوگا!"

یہ سن کر ایک کشادہ جبیں جوان کھڑا ہوا۔ یہ ایوب بن حبیب
تھا جس نے جھک کر بڑے ہی احترام سے موسیٰ بن نصیر کا شکریہ ادا کیا اور کہا

"یا امیر! یہ اس احقر کی عزت افزائی ہے کہ آپ نے بہترین
توقعات کے اظہار کے ساتھ اسے عبد العزیز بن موسیٰ کا مشیر مقرر فرمایا
ہے۔ میں ان ہزاروں مسلمانوں کی موجودگی میں وعدہ کرتا ہوں کہ
امیر اندلس کو اپنی عقل کے بموجب بہترین مشورے دے کر رفاقت و
مشاورت کا حق ادا کرتا رہوں گا!"

مجمع نے ستائش بھری نگاہوں سے ایوب بن حبیب کو دیکھا
جس کی جبین پر صداقت کی روشنی تھی۔ اس وقت عمر بن عدی اور
عمرو بن نعیم نے معنی خیز اشارات سے ایک دوسرے کو دیکھا جیسے یہ سب
کچھ ان کی منشا کے خلاف ہوا تھا۔ ان کے چہرے شکست کے آثار

سے سرخ [illegible]
ہوا اٹھ بیٹھا۔
"سپہ سالار اعظم! اگر اجازت مرحمت فرمائیں تو کچھ عرض کروں؟"
"عرطفہ بن عدی! تم کیا کہنا چاہتے ہو، کہو۔" موسیٰ بن نصیر نے شفقت سے کہا۔
"میں صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میدان جنگ میں میں نے عبدالعزیز سے زیادہ جانفشانی کا ثبوت دیا ہے۔ تجربہ کار اور شمشیر زنی میں بھی ایوب بن حبیب سے زیادہ تیز ہوں مگر مجھے نہ امیر ہونے کا اعزاز ملا نہ مشیر ہونے کا۔ کیا یہی آپ کا انصاف ہے؟"
مجمع نے چونک کر اسے دیکھا جس نے سپہ سالار اعظم اور سردار کے فیصلے کو للکارا تھا مگر سردار نے حسب عادت نرمی سے کہا۔
"نوجوان عرطفہ بن عدی! اندلس میں ہماری کامیابی تم جیسے دلیر جوانوں کی رہین منت ہے اور تم بھی انعام کے مستحق ہو مگر اس کا حق نہیں کہ تمہیں امارت عطا کر سکتا ہوں اور نہ مصاحبت دے سکوں۔ جہاں تک عبدالعزیز کا تعلق ہے تو میں نے صرف اسے قائم مقام مقرر کیا ہے۔ امارت کا فیصلہ امیرالمومنین خود فرمائیں گے۔"
عرطفہ لاجواب ہو کر پیچ و تاب کھاتا ہوا بیٹھ گیا۔ پھر عمرو بن نعیم کھڑا ہوا اور بولا۔
"امیر لشکر! اگر آپ امارت اور مشیر اپنے ہی رشتہ داروں کو بناتے ہیں تو کیا میں آپ کا رشتہ دار نہیں ہوں؟"
موسیٰ بن نصیر نے بڑے ہی دکھ سے اسے دیکھا۔ اس کا رشتے کا بھانجا تھا جو عرطفہ بن عدی کی صحبت میں بیٹھ کر اس کے خلاف سازشیں کرتا تھا مگر اس نے بڑے تحمل سے کام لیا اور بولا۔
"عزیزی! عمرو تم ہی نہیں بلکہ اس فوج کا ہر جوان مجھے اپنے فرزند کی طرح عزیز ہے۔ میں کہہ چکا ہوں کہ عبدالعزیز بن موسیٰ اندلس کا عارضی امیر ہے۔ امارت کا فیصلہ امیرالمومنین کو خود کرنا ہے۔ ہو سکتا ہے ان کی نظر انتخاب تم ہی دونوں میں سے کسی ایک پر پڑ جائے اور اس صورت میں عبدالعزیز، موسیٰ اور ایوب بن حبیب کو تمہاری ہی [illegible] میں [illegible] تب میں ان دونوں کو بھی یہی مشورہ دوں گا کہ تمہاری اطاعت کریں۔ ساتھ ہی قوم کا مفاد مدنظر رکھیں۔ تم لوگ اگر امارت اور مصاحبت کے جھگڑوں میں پڑ گئے تو اپنا مقصد حاصل نہ کر سکو گے۔ یاد رکھو تمہارا مقصد پیغام ربانی کو دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچانا ہے

تھا [illegible] کے [illegible]
اندلس کا امیر کوئی [illegible]
ایک ایک [illegible] کی قوم کا [illegible]
پہلے [illegible]؟
اس بات سے سب کے دل [illegible]
اسلام نے موسیٰ بن نصیر کے خیال اور عبدالعزیز بن موسیٰ کی امارت کی تائید کی۔ عرطفہ بن عدی اور عمرو بن نعیم [illegible] خاموش ہیں۔
اسی شب موسیٰ بن نصیر اندلس کے [illegible] بے شمار [illegible] غلام [illegible] مال غنیمت [illegible] اپنے چند دیرینہ ساتھیوں کے ساتھ سرزمین اندلس کو خیرباد کہہ کر دمشق کی جانب روانہ ہو گیا۔ اس وقت آبادی سے دور ایک محفوظ مکان میں عرطفہ بن عدی اور عمرو بن نعیم محو گفتگو تھے۔ عرطفہ بن عدی نے کہا۔
"میں تو غیر ہوں لیکن تو تو موسیٰ بن نصیر کا رشتہ دار ہے اس نے تجھے کیا دیا؟"
"اونہہ!" عمرو بن نعیم نے غصے سے کہا۔ "اس بوڑھے نے انصاف نہیں کیا۔ دوران جنگ بھی وہ ہمیں [illegible] آج کے اجتماع میں بھی وہ ہمیں بڑی [illegible] سے ٹال گیا۔ دوسرے لوگ تو [illegible] ہیں لیکن میں یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکتا۔"
عرطفہ بن عدی نے عمرو بن نعیم کو غور سے دیکھا وہ تذلیل کے احساس سے کانپ رہا تھا۔ عرطفہ بولا۔
"میں نے ہر موقع پر اسے ضعیف العمر کہہ کر اس کی ہر بات رد کی۔ مجھے تو توقع تھی کہ شاید وہ جنگ کے بعد ہماری حوصلہ افزائی کرے مگر تو نے دیکھا اس نے مجھے کیا [illegible] کرتا ہے۔ لیکن میرا نام بھی عرطفہ بن عدی ہے۔ میں اسے بتاؤں گا کہ اس کا بیٹا اندلس میں کس طرح حکومت کرتا ہے۔ میں اندلس کے مسلمانوں کو اس سے یوں برگشتہ کر دوں گا کہ وہ اسے ایک لمحے کے لئے بھی برداشت نہ کریں گے۔"
"عرطفہ! میں تیرے ساتھ ہوں مگر مجھے بتا کہ تو کیا کرے گا۔"
"عبدالعزیز کا مشیر ایوب بن حبیب ہے تو جانتا ہے کہ وہ کیا [illegible] ہے۔ جہاں [illegible] شروع کرتا ہے [illegible] کرتا ہے۔"
"سن!" عرطفہ بولا۔ "تو آج سے [illegible] سردار [illegible]

تمھیں اطلاع ملی ہے کہ [illegible] شہر سے [illegible] شام کی طرف روانہ ہو چکے
ہوں گے۔"

شاید ہاشم نے تو یہ کہا کہ "دیکھا گیا [illegible] تیرہ سے
[illegible] موسیٰ بن نصیر نے کہا تھا کہ اس
سے [illegible] تھا [illegible] وہ اندلس میں تیری مدد
کس طرح کریں گے؟"

"مجلس تو یہ جواب دے کر [illegible] احکامات کی تعمیل کر رہا ہے مگر
تمھارے [illegible] موسیٰ بن نصیر اور اس کے بیٹوں کی
حکومت [illegible] صرف [illegible] تمام خیال [illegible]
[illegible] اور قوت بڑھ جائے [illegible] وہ
[illegible] کہ ایوب بن حبیب کی [illegible]
اور عبدالعزیز بن موسیٰ کا [illegible] ان کی قوت [illegible]
دل [illegible] اندلس میں نفرت کی [illegible] کبھی سرد
نہ ہوگی۔ عمرو بن [illegible] عبدالعزیز بن موسیٰ [illegible] امیر کے خلاف
سازش کا جال بچھا رہا ہے۔"

خیال امیر اندلس عبدالعزیز بن موسیٰ اور اس کا مشیر ایوب
بن حبیب چند جانثاروں کے ساتھ گھوڑوں پر سوار دارالسلطنت اشبیلیہ
کی طرف رواں تھے۔ آج ان کا رخ القصر کی جانب تھا جہاں شاہ
لذریق کی بیوہ [illegible] خدام کے ساتھ ان کا انتظار
کر رہی تھی۔ اس وقت امیر اور مشیر محو گفتگو اپنے ساتھیوں سے کافی
آگے نکل آئے تھے۔ ایک دم ایوب بن حبیب نے گھوڑا روک
کر کہا۔

"اب ہمیں گھوڑوں کی رفتار کم کر دینی چاہیے ہم القصر
کے دروازے پر پہنچنے والے ہیں جبکہ ساتھی بھی کافی پیچھے رہ
گئے ہیں۔"

"ہاں!" عبدالعزیز نے کہا: "ہمیں وقت کا احساس ہی نہ رہا ہم
کتنی جلد پہنچ گئے۔ تم نے موضوع ہی ایسا چھیڑ دیا تھا وقت بھی کیا
عجیب چیز ہے جو گزر جاتا ہے مگر کتنی ہی یادوں کے نشان چھوڑ
جاتا ہے۔"

"اکثر یادیں بڑی ہی دلچسپ ہوتی ہیں۔" ایوب بن حبیب
مسکرایا: "حقیقت یہ ہے کہ [illegible] اندلس سے [illegible]
[illegible] شہروں کو اطاعت پر مجبور کر دیا تھا آپ کا بہت بڑا

کارنامہ ہے [illegible]
[illegible] جانب سے
کیوں خطاب کرتے ہو۔ بچپن کے دوستوں میں یہ تکلف کہاں
نہیں لگتا۔ سچ یہ ہے کہ یہ ساری تمام کامیابی تمہارے مشوروں اور
تقریروں کی مرہون منت ہے کہ تم نے [illegible]
راہ راست پر [illegible] حکومت [illegible] کی خواہش [illegible]
کے [illegible] تقریریں [illegible] اس کا مجھے پورا احساس ہے۔
یا [illegible] ہم بہت سی مشکلات کا شکار ہو گئے تھے جو
تمہاری فہم و فراست کے بغیر قابو نہیں پایا جا سکتا تھا۔"
یہ سن کر ایوب بن حبیب مسکرایا اور خاکساری کے انداز
میں بولا۔

"بچپن کی دوستی اپنی جگہ لیکن امیر کا احترام کرنا میرا فرض ہے
جہاں تک مشکلات کا تعلق ہے تو بات صرف اتنی ہے کہ ہم نے اندلس
کے مفتوحہ شہروں میں جو مسلمان حکمران مقرر کیے تھے ان کے پاس مکمل
اختیارات نہیں تھے جس کے سبب [illegible] کے ہاتھ سے انھیں کمزور سمجھ کر باغی
ہونے لگے تھے لیکن خدا کا شکر ہے کہ اب انہوں نے مکمل اطاعت
قبول کر لی ہے اور یہاں کا ہر شخص [illegible] حکومت سے اسلامی حکومت کو بہت زیادہ
بہتر سمجھنے لگے ہیں۔ اگر آپ کے خیال میں حالات کا رخ بدلنے میں میرے
مشوروں کا بھی دخل تھا تو یہ آپ کی بات اور عنایت ہے۔"
"کیا؟" عبدالعزیز نے بڑے اشتیاق سے دیکھا: "تمہاری
باتوں پر عمل کر کے میں نے بہت سی الجھنوں سے نجات پائی ہے مجھے
یقین ہے کہ اب بھی تم حق دوستی ادا کرو گے لیکن دیکھنا اپنی عادت کے
مطابق تقریر نہ شروع کر دینا۔"

"سنیے!" ایوب بن حبیب مسکرایا: "آپ جانتے ہی ہیں کہ سلطنت
روم پر عیسائی مذہب قبول کرنے کے بعد [illegible] تقسیم ہو گئی تھی۔
ایک گاتھ قوم کا [illegible] دوسرے رومی سلطنت کا [illegible] ٹکڑے ہو جاتا
ان دونوں نے ایک دوسرے پر اپنا اثر ڈالا اور رومیوں کے اثر سے گاتھ
قوم کی جفاکشی اور سپاہیانہ خصائل جاتے رہے اور گاتھ قوم کے
اثر سے رومیوں میں بہت سے عجیب دستور رائج ہو گئے مثلاً امیروں
کے محلوں میں رعایا کی اولاد [illegible] پرورش پاتا یا غلاموں کی نسل در
نسل بلا معاوضہ خدمت انجام دینا جو کوئی [illegible] چند سکوں کے عوض
ایک غلام خرید لیتا اس کی نسلیں مالک کی نسلوں کی خدمت انجام دیتے
رہتے تھے۔ آج یہ حال ہے کہ [illegible] اور غریب

دوشیزہ

[illegible] بندگیاں رنج و الم [illegible]

میرے دوست [illegible]

اگر تم مجھے کوئی مشورہ دینا چاہتے ہو [illegible]

میں تاریخ سنانا چاہتا ہوں کہ [illegible] تمام حالات کی خبر مجھے [illegible]

ظلم کی عنایت کے سبب آج تک ہم ساتھیوں میں [illegible]

کا دور دورہ ہے [illegible] ایوب بن حبیب مسکرایا اور بولا۔

"میں جانتا ہوں کہ آپ کو ان تمام حالات کا علم ہے لیکن میں جو مشورہ دینے والا ہوں اس سے قبل یہ سب کچھ کہنا ضروری تھا مجھے کہنا یہ ہے کہ آج القصر میں داخل ہونے کے بعد آپ ان کاشتکاروں، غلاموں اور نسل در نسل امیروں کی خدمت کرنے والے خادموں کے لئے کوئی ایسا فیصلہ سنائیں جو انہیں اسلام کی طرف لے آئے۔" عبدالعزیز بن موسیٰ نے ایک لمحے کے لئے کچھ سوچا اور پھر ستائش بھرے انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"ایوب، خدا کی قسم تم میرے کام کی بات کرتے ہو اپنا بیان جاری رکھو۔" ایوب بن حبیب نے کہا "مظلوم غلام اور غریب کاشتکار ہو کل آبادی کا تقریباً نصف حصہ ہیں اگر یہ اسلام سے متاثر ہو جائیں تو ہمارے مسائل بھی نصف کے قریب حل ہو جائیں گے کیونکہ فتح کے بعد مفتوحہ ملک کا ہر فرد ایک مسئلہ ہوتا ہے۔"

عبدالعزیز بن موسیٰ نے ایوب بن حبیب کے اس خیال کی تائید کی۔ اب ان کے ساتھی بھی ان سے آملے تھے اچانک نصاریٰ کی [illegible] کے نغموں کی صداؤں نے سب کو متوجہ کر لیا یہ وہی قوم تھی جو کل تک انہیں پسپا کر دینا چاہتی تھی لیکن آج وہی سردار القصر میں جمع ہو کر فاتحین کو ہدیہ تہنیت پیش کر رہے تھے۔ مسلمانوں کے عزت آمیز سلوک نے انہیں ایسا کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ امیر اندلس عبدالعزیز بن موسیٰ اور دیگر مسلمان القصر کے دروازے پر رک گئے جہاں مسلمانوں کا ہجوم تھا۔ کل تک حکومت کے ظلم و ستم کا شکار ہونے والے لوگ اسلامی حکومت میں اپنی عزت، مال و جان کو محفوظ تصور کرتے ہوئے فتح و نصرت کے شادیانے بجا رہے تھے۔ امیر اندلس کو دیکھتے ہی گھنٹوں اور بانسریوں کی آواز کے ساتھ حسین لڑکیوں کے گیتوں کی آواز بلند ہوئی حسین رقاصائیں [illegible] سے ہوتے [illegible] اپنے رقص کا کمال دکھا رہی تھیں۔ مظلوم و غریب کاشتکار نئے امیر کو جھک جھک کر سلام کر رہے تھے۔ دیر تک یہ سلسلہ جاری رہا پھر شاہ لرزیق کی ملکہ کے خاص دستے کے ایک سپاہی نے امیر کے روبرو آکر سلام

[illegible]

[illegible] القصر میں داخل ہونے [illegible]

"ہم القصر میں داخل ہونے سے قبل [illegible]"

[illegible] امیر اندلس نے جواب دیا۔

[illegible] لڑکیوں کی آواز [illegible]

[illegible]

فتح کے بعد [illegible] امیر اندلس عبدالعزیز بن موسیٰ [illegible]

[illegible] سے مخاطب ہوا۔

[illegible] آج [illegible]

تم اب تک بہت سی [illegible] آج [illegible] تمام [illegible] ختم ہو گئے تم سب خواہ کسی بھی [illegible] سے تعلق [illegible] آزاد ہو۔ [illegible] امیر نہیں دوست [illegible] تمہاری عزت مال اور جان کی حفاظت کرنا امیر اندلس [illegible] فرض ہے اسلام [illegible] اصولوں کو تمہارے سامنے [illegible] کی دعوت دیتا ہوں اور اس کے ساتھ ہی اندلس کے امیر کی حیثیت سے آج یہ دستور جاری کرتا ہوں کہ جو غریب کاشتکار یا زرخرید غلام اسلام کے دامن میں آئے گا وہ خود کو اپنے غیر مسلم آقا کی غلامی سے آزاد سمجھے۔ نہ اس پر کسی آقا کی خدمت واجب ہو گی نہ کسی آقا کا اس پر کوئی حق باقی رہے گا اور میرے لشکر میں اسے وہی حق دیا جائے گا جو دوسرے مسلمانوں کو حاصل ہے۔"

یہ اعلان سن کر مظلوم [illegible] میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور اس وقت سینکڑوں نہیں ہزاروں کی تعداد میں مظلوموں نے [illegible] اور رسول اللہ کی رسالت کا اعتراف کر کے غلامی کی زنجیریں توڑ دیں۔ فضا بہت دیر تک اللہ اکبر کے نعروں سے گونجتی رہی پھر امیر اندلس نے کہا۔

"اب ہم القصر میں داخل ہونا چاہتے ہیں [illegible]" خاص دستے [illegible] کی رہنمائی کی اور آگے [illegible] پیچھے دیگر مسلمان القصر میں داخل ہو گئے۔

محل کی بالائی منزل سے [illegible] پھول برسائے [illegible]

ہو سکے نقصان میں نہ ڈالو جو جاسکے۔ امیر اندلس عبدالعزیز بن موسیٰ بن نصیر
اندلس کے سلام کے جواب میں نظریں اٹھائے بغیر ملکہ ایلونارہ شاہ لذریق کی
قصر پر تھا کہ القصر کی عمارت کے باہر بلند سیڑھیوں پر ایک لمحہ کے
لیے وہ رکی کہ زمین نے جیسے اس کے قدم پکڑ لئے ہوں۔ کتنے کے
عالم میں کھڑا رہتے دیکھا وہ ایک سیاہ ماتمی لباس میں ملبوس ہو کر
گلے میں چاندی کی صلیب اور صبح کی روشنی سے زیادہ روشن چہرہ۔ امیر
اندلس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ امیر اندلس نے سامنے دیکھا اور تاب
نظارہ نہ لا کر نظریں جھکا لیں۔ ایک سرخ سردار آگے بڑھا اور عرض کیا۔

"ملکہ امیر اندلس! یہ شہنشاہ لذریق کی بیوہ ایلونا (ایگیلونا) ہیں۔"

"یہ سچ ہے شہنشاہ کی نوعمر بیوہ تا امیر اندلس اس سے تعارف سے قبل بھی واقف تھا پھر اس نے خود کو سنبھالا اور ملکہ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"معزز ملکہ! مزاج بخیر ہے؟"

ملکہ نے اسے سوگوار نگاہوں سے دیکھا اور قدرے توقف کے بعد بولی۔

"امیر اندلس کے سامنے شہنشاہ! ہمیں اپنی بربادی کا آپ سے کوئی گلہ نہیں نہ ہم ایسا کرنے کا حق رکھتے ہیں ہماری تقدیر میں یہی لکھا تھا کہ جس قصر میں ملکہ بن کر حکومت کریں اسی کے دروازے پر ایک لونڈی کی حیثیت سے شہنشاہ کو خوش آمدید کہیں۔ میں آپ کو اس عظیم فتح پر مبارکباد دیتی ہوں!"

نوجوان امیر کا دم سے بھرا ہوا دل حسن کی اس افسردگی پر کچھ اور مغموم ہو گیا اس نے منتظر بارہ امراء کی طرف دیکھا اور شائستگی سے گویا ہوا۔

"معزز ملکہ! آپ ہمیں شہنشاہ کہہ کر خطاب نہ کیجئے۔ مسلمانوں میں حاکم وقت رعایا کا خادم ہوتا ہے اور مفتوح قوم کے ہر فرد کو باعزت سمجھتا ہے۔ آپ بھی ہماری نظر میں لونڈی نہیں شاہ لذریق کی ملکہ ہیں۔ محترم و قابل عزت ہیں اور ہم حکم دیتے ہیں کہ آپ اس قصر میں اپنی سابقہ شان سے رہیں گی۔ خدام و محافظ دستہ بدستور آپ کی خدمت انجام دے گا!"

ملکہ ایگیلونا نے چونک کر دیکھا اس کی سوگوار آنکھیں امیر اندلس کی نگاہوں سے چار ہوئیں تو امیر کے قدم لڑکھڑا گئے نظروں کے تصادم نے اسے کچھ اس بات پر مجبور کر دیا تھا کہ دشتی میں ڈوبا ہوا وہ یوں کھڑا تھا جیسے یہاں صرف وہ ہے اور ملکہ ایگیلونا۔ ایک دم عبداللہ بن حبیب نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور شائستگی سے بولا۔

دوشیزہ

◆◆

روانگی کا وقت تھا عرفطہ بن عدی کے مشتعل ساتھیوں میں اس کی اور اس کے ساتھیوں کی خفیہ منزل لگی ہوئی تھی جانکنی اور بعد وہ دمشق سے واپس آیا تھا اس کی جماعت کے لوگ عمر بن ثمیم الکلبی، زید بن موسیٰ بن کعب اور سعید بن اسلم اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ حاضر خدمت ہوئے تھے یہ سب مسلمان تھے مگر یہ وہ لوگ تھے جو قوم کے مفاد پر اپنے مفاد کو ترجیح دیتے تھے۔ ان میں کچھ اعلیٰ عہدہ حاصل کرنا چاہتے تھے اور کچھ موسیٰ بن نصیر، عبدالعزیز بن موسیٰ اور ایوب بن حبیب سے ذاتی رنجش رکھتے تھے ان کے علاوہ وہ چند نومسلم بھی تھے۔ جو اپنے سابق آقاؤں کی غلامی سے نجات پانے کے لئے مسلمان ہو گئے تھے مگر ان کے دل ہنوز ایمان سے خالی تھے جو عرفطہ کی بڑھتی ہوئی قوت کے پیش نظر اسے مستقبل قریب کا امیر سمجھ کر اس کی خوشامد میں لگ گئے تھے۔

ان دنوں خلیفہ ولید بن عبدالملک کی وفات اور سلیمان بن عبدالملک کی تخت نشینی کی خبر تمام اسلامی دنیا میں پھیل چکی تھی اس کے ساتھ ہی پرچہ نویسوں کی آمد سے اندلس میں موسیٰ بن نصیر کے معتوب ہونے کی خبر بھی عام تھی۔ جہاں بہت سے مسلمان اپنے محبوب سپہ سالار کے انجام سے ہراساں اور اداس تھے وہاں مخالفین کی جماعت کے لئے یہ بڑی مسرور کن بات تھی کہ سلیمان بن عبدالملک نے تخت خلافت پر بیٹھتے ہی موسیٰ بن نصیر پر ایسا غضب ڈھایا تھا کہ اس کا اور اس کی اولاد کا سکون درہم برہم ہو گیا تھا۔

اس وقت عرفطہ بن عدی کی اندلس میں آمد کی خبر پا کر اس کی جماعت کے لوگ یہ دلچسپ حالات سننے کے لئے اس کے گھر پہنچے مگر عرفطہ بن عدی بے قراری کے انداز میں کسی کا منتظر تھا اور سب لوگ جانتے تھے کہ وہ اپنی کسی مہم پر بیٹا عبداللہ کا انتظار کر رہا ہے جسے دمشق روانہ ہونے سے قبل اس نے بڑی اہم ذمہ داری سونپی تھی مگر وہ ابھی تک نہ آئی تھی لہٰذا عرفطہ بن عدی نے کہا۔

"میرے دوستو! اس سے قبل کہ میں تمہیں یہ سناؤں کہ دمشق میں موسیٰ بن نصیر پر کیا گزری، تم پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے یہاں کیا کارنامہ انجام دیا؟"

"جناب!" عمر بن ثمیم نے کھڑے ہو کر کہا: "آپ کے جانے کے بعد ہم نے سب سے پہلا عقلمند عورتوں کے بھیدوں کو

بغاوت پر آمادہ کیا اور یہاں کے مسلمان [illegible]
نام تھا لہٰذا ان شہروں میں ایک ہجوم شورش برپا ہو گئی۔ مگر افسوس
کہ ایوب بن حبیب کی تقریروں نے اس آگ کو بھڑکنے نہ دیا۔ اس نے
گلی گلی کوچے کوچے جا کر [illegible] حکومت کی بدعنوانیوں کو حقیقتوں کے
سامنے اس انداز سے پیش کیا کہ لوگ حب اسلامی حکومت کے گیت
گانے لگے اور بغاوت خود بخود ختم ہو گئی۔ اس کے بعد میں نے عبدالعزیز بن
موسیٰ کے مخالفین میں دس افراد کا اضافہ کیا ہے۔ چار سو کی تعداد [illegible] مسلمان
اگرچہ یہ تعداد بہت کم ہے مگر آپ جانتے ہیں کہ ملکہ وقت کے خلاف
آواز اٹھانا اور لوگوں میں نفرت پھیلانا آسان بات نہیں ہے۔"

"ہم اپنا کام خفیہ طور پر کرتے ہیں۔" جمیل بن یوسف نے کہنا شروع
کیا: "ایوب بن حبیب پر اس کام کو ختم [illegible] مؤثر تقریر کر
دیتا ہے کہ وہ امیر اندلس کی [illegible] اور [illegible] حکومت کی
خامیوں کو اجاگر کرتا ہے۔ ہم جن سے بات کرتے ہیں تمہیں اس کا یقین
نہیں ہوتا۔ عالم یہ ہے کہ کسی کسی [illegible] ہم سے دریافت کرتے ہیں کہ تم اپنے
امیر کی برائی کیوں کرتے ہو جب کہ وہ ایک اچھا حکمران ہے۔"

"واو نہیں!" عمر طرف بن عدی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "یہ بات صرف
خوشامدی، [illegible] اور بے غیرت مسلمان ہی کہہ سکتے ہیں۔"

"اس فضول موضوع کو چھوڑ دیں۔" عمرو بن عاصم نے نفرت سے
کندھے اچکاتے ہوئے کہا: "ہم دمشق کے حالات سننے کے منتظر ہیں۔"

"خدا کی رحمت [illegible]" طرف نے کہنا شروع کیا۔ "موسیٰ بن نصیر
جو ہمارے حق سے [illegible] گیا تھا اب اپنے کئے کی سزا بھگت رہا ہے۔ یہ
سب اس طرح ہوا کہ جب موسیٰ بن نصیر مال غنیمت کے ساتھ [illegible]
اور وہاں سے طارق و مصر سے شام کی جانب روانہ ہوا تو اس کے پہنچنے سے پہلے ہی [illegible] تھا
ان دنوں امیر المومنین ولید بن عبدالملک شدید بیمار تھے۔ نتیجہ سلیمان بن عبدالملک نے
محسوس کیا کہ اس مرض سے ان کی جانبری ممکن نہیں۔ اس بنا پر اس نے طارق اور
موسیٰ بن نصیر کو حکم بھیجا کہ وہ ابھی دارالخلافہ میں داخل نہ ہوں ——— اس کا
منشاء یہ تھا کہ اگر اس کی تخت نشینی کے بعد موسیٰ بن نصیر
اس بے شمار مال غنیمت کے ساتھ دمشق آیا تو اس کی حکومت کی
ابتدا شاندار تصور کی جائے گی لیکن موسیٰ بن نصیر امیر المومنین سے ملاقات
کے جوش میں دارالخلافہ میں داخل ہو گیا اور جب خلیفہ ولید بن عبدالملک
کی خدمت میں پہنچا تو وہ حالت خراب ہونے کے سبب نہ اظہار مسرت
کر سکا نہ حوصلہ افزائی۔ لیکن ولی عہد سلیمان بن عبدالملک کے دل میں
اس کی طرف سے گرہ پڑ گئی۔ اسی ہفتے ولید بن عبدالملک نے

وفات پائی اور [illegible] تخت [illegible]
[illegible] ہوا؟"

"وہ کیسے [illegible]" [illegible] نے [illegible]
نکالی اور [illegible] عمر طرف بن عدی نے [illegible] کیا۔

"لیکن میں نے بھی اس کو [illegible] دیا۔ جب میں امیر المومنین
کو تخت نشینی کی مبارکباد دینے حاضر ہوا تو میں نے بڑی سادگی سے
انہیں بتایا کہ موسیٰ بن نصیر نے اندلس، مراکش اور افریقہ کی حکومت
اپنے بیٹوں عبدالعزیز، عبداللہ اور مروان میں تقسیم کر دی ہے۔"

"اصل بات تو یہی ہے [illegible] درست جس نے [illegible]
میں آگ لگا دی ہے [illegible] سب ساتھیوں کو [illegible]
سے [illegible] شکایت ہے کیا ہم نے ان علاقوں کی فتح میں اس کے
بیٹوں سے زیادہ جانفشانی کا ثبوت نہیں دیا تھا؟ مگر [illegible] تقسیم
نہ کیا۔"

"جانتے ہو اس کے بعد کیا ہوا؟" عمر طرف بن عدی نے کہا۔ "اس کے
بعد دمشق میں [illegible] ساتھیوں نے امیر المومنین کے غضب کو کسی
طرح بھڑکایا [illegible] سے اس پر [illegible]
سے [illegible] کیا [illegible]
امیر المومنین نے اس کا مال و متاع ضبط کر کے اسے زندان میں
ڈال دیا۔"

"بہت خوب [illegible]" عمرو بن عاصم خوش ہو کر ناچنے لگا [illegible]
[illegible] ان سب کو [illegible] انہوں نے [illegible]
[illegible] عمر طرف بن عدی کی [illegible] دیکھ کر [illegible]
ہو گیا [illegible]۔

"[illegible] میں نے تمہیں [illegible]
ہی سے تمہارا منتظر ہوں مگر تم جتنی [illegible]
ہو" [illegible] اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔

"یہ نہیں [illegible] تمہارے لئے کیا [illegible]
بس [illegible]"

"اچھا [illegible]
بیٹھے ہوئے [illegible] دیکھا: "خیر تو ہے [illegible] کیا ہے؟"

"تمہاری [illegible] کے علاقوں میں ایک [illegible] سے
[illegible] سلطنت کی [illegible] سے بہت [illegible]
[illegible]

تنہائی میں اشارے دے چکی تھی کہ اب وہ اس جوانی پہ صرف
باتوں سے اس کا دل بہلاتی ہوں!"

"وہ تمہیں بے تکلف کر دیا!" عرطفہ بن عدی نے اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا اور تھوڑی دیر کے لئے یہ بھی بھول گیا کہ گھر میں اور لوگ بھی موجود ہیں۔ دیر تک وہ اسے والہانہ انداز میں چومتا رہا اور وہ بھی اٹھلاتی اور ناز دکھلاتی رہی پھر وہ بولا۔

"مجھے القصر کی خبریں سناؤ؟"

"القصر میں امیر اندلس روز آتے ہیں" شانجہ اس کے سینے سے لگی لگی دھیرے دھیرے بولی۔ "اور ملکہ ایشلونہ ان پر سو جان سے فدا ہے میرا خیال ہے وہ امیر اندلس کو صرف اس لئے پسند کرتی ہے کہ وہ اندلس کے حاکم ہیں شروع شروع میں اس نے ان کی ہمدردیاں حاصل کیں اور اب ان کی محبت چاہتی ہے!"

"کیا امیر اندلس بھی اسے چاہتے ہیں؟" عرطفہ بن عدی نے بے تابی کے انداز میں سوال کیا۔

"میں وثوق سے نہیں کہہ سکتی۔" شانجہ اس کے سینے سے ہٹ کر الگ بیٹھ گئی۔ "لیکن انہوں نے کبھی کوئی غیر شائستہ بات نہیں کی ہاں ان کا بلاناغہ القصر میں آنا اس بات کی علامت ہے کہ وہ ملکہ سے محبت کرنے لگے ہیں!"

"تم بہت سمجھدار ہو شانجہ!" عرطفہ بن عدی نے پیار سے کہا۔ "یقین کرو جب امیر اندلس عبدالعزیز بن موسیٰ پہلے دن القصر میں داخل ہوئے تھے اور حسین ایشلونہ کو دیکھ کر دم بخود رہ گئے تھے میں اسی وقت جان گیا تھا کہ آگے کیا ہونے والا ہے!"

چونکہ رات کافی ہو چکی تھی لہٰذا لوگ رخصت ہونے لگے اور آہستہ آہستہ سب چلے گئے جب کمرہ خالی ہو گیا اور صرف وہ دونوں رہ گئے۔ تب شانجہ ایک دم عرطفہ بن عدی کے شانے سے لگ گئی اور بولی۔

"عرطفہ! میں نے یہ سب کچھ تمہاری محبت میں کیا ہے۔ میں نے اپنی ذات کو خطرے میں ڈال کر ملکہ تک رسائی حاصل کی ہے لیکن ہر لمحہ ڈرتی ہوں کہ اگر بات کھل گئی تو انجام کیا ہوگا؟"

"کچھ نہیں ہوگا شانجہ!" عرطفہ بن عدی نے اسے پھر سینے سے لگا لیا۔ "میرے ہوتے ہوئے تمہارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا خدا کی قسم میں اندلس کی سب سے بڑی طاقت ہوں!"

"اب مجھے کیا کرنا ہے؟" شانجہ نے اس کے خوبصورت چہرے

کو جنت سے نکلنا ہو سکتا ہے۔

"ابھی ایسا نہیں ہوگا کہ جب امیر اندلس ملکہ ایشلونہ کی اداؤں کو جانیں تو ان پہ نظر رکھو اور مجھے ان کی ہر ہر بات سے آگاہ کرتی رہو جانتی ہو ملکہ ایشلونہ کا حسن معمولی حسن نہیں ہے امیر اندلس ضرور متاثر ہوگا اور عشق میں کیا انجام ہوتا ہے بس یہی دیکھنا ہے جو مجھے خبر ہوتی رہے!"

••

امیر اندلس عبدالعزیز بن موسیٰ اپنے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ ان دنوں وہ عجیب طرح کی فکروں سے گھرا ہوا تھا۔ اپنے باپ موسیٰ بن نصیر پر خلیفہ کے عتاب کی خبر نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ نہ اب وہ چین سے بیٹھ سکتا تھا نہ کوئی قدم اٹھا سکتا تھا۔ ادھر ملکہ ایشلونہ کا حسن اس کا والہانہ پن اور اس کی بے تابی اسے بے کل کئے دیتی تھی۔ ایک طرف وہ خود بری طرح گھائل تھا تو دوسری طرف ایوب بن حبیب کی نظریں جیسے اس کا تعاقب کر رہی تھیں۔ وہ وقتاً فوقتاً جیسے کا احساس دلاتے لوگ بھی دیتا تھا لہٰذا وہ اب اپنے اس شہر سے گھبرانے لگا تھا۔ وہ ابھی اسی ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا کہ اس کے غلام ہشام نے آکر دست بستہ بتایا۔

"آپ کا گھوڑا باغ کی پچھلی جانب تیار کھڑا ہے۔ ایوب بن حبیب اس وقت موجود نہیں ہیں۔ ہاں کچھ لوگ ملاقاتی آپ کے منتظر ہیں!" یہ سن کر امیر اندلس نے گویا اطمینان کا سانس لیا۔ ایوب بن حبیب موجود نہ تھا۔ وہ اب اس سے نظر بچا کر ہی شہسواری کے لئے نکلتا تھا۔ دیکھنے والے سمجھتے کہ وہ سیر کے لئے نکلا ہے لیکن وہ تفریح کا بہانہ کر کے سبزہ زاروں اور پرسکون گوشوں کو چھوڑ کر القصر پہنچ جاتا جہاں ایشلونہ کی ملاقات اسے دنیا جہان کی فکروں سے بے نیاز کر دیتی۔

امیر اندلس باغ کی طرف روانہ ہو گیا جہاں عرطفہ بن عدی اور عمرو بن نعیم اس کے منتظر تھے اسے دیکھتے ہی وہ دونوں مؤدبانہ انداز میں کھڑے ہو گئے۔

"ہم امیر اندلس کی خدمت میں سلام پیش کرتے ہیں!"

امیر اندلس عبدالعزیز بن موسیٰ کو ان کی آمد اس وقت قدرے گراں گزری مگر انہوں نے یہ ناگواری ظاہر نہیں ہونے دی بلکہ پوچھا۔

"تم لوگ نظر نہیں آتے آج کل کہاں رہتے ہو؟"

"ہم بارہا امیر سے ملنے کی کوشش کر چکے ہیں مگر شرف حاصل نہیں ہوا!" عرطفہ بن عدی نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

"اچھا! جب [illegible] [illegible]
[illegible] ؟"
ناصر ہمارے ساتھ تھا اور [illegible] [illegible]
"میں خود بھی دمشق سے [illegible] [illegible]
طرفہ ابن عدی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "امیر المومنین سلیمان بن
عبدالملک نے جو کچھ مسلمانوں کے اس [illegible] کے ساتھ کیا ہے وہ
میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کاش میں وہ سب کچھ نہ دیکھتا"
طرفہ بن عدی نے یہ بات اس طرح کہی کہ عبدالعزیز بن موسیٰ
مغموم ہو گیا۔ وہ بوجھل قدموں کے ساتھ گھوڑے کی طرف چلنے لگا۔
اور جب امیر اندلس کے گھوڑے کی [illegible] ہو گئی
تب طرفہ بن عدی نے عمرو بن [illegible] سے کہا۔
"تم نے میرا کمال دیکھا۔ میں نے اس وقت اندلس کے امیر
کے دل میں خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کے خلاف نفرت کی آگ
کس طرح بھڑکائی ہے؟"
"اور عوام میں موسیٰ بن نصیر کے واقعات کو اسی انداز میں عام کر
دینا کیا میرا کمال نہیں ہے" عمرو بن [illegible] نے جواب دیا۔ دونوں کے لبوں
پر معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی۔

حسین اشبیلونہ کے تصور میں گم جب عبدالعزیز بن موسیٰ وہاں
پہنچا تو موسم بڑا حسین تھا۔ القصر کے طویل و عریض باغ میں گلہائے
رنگا رنگ کے تختے حدِ نظر تک پھیلے ہوئے دعوتِ نظارہ دے رہے تھے
ان کے درمیان سنگِ مرمر کے بڑے حوض میں فوارے چھوٹ رہے تھے
وہ اس حوض کے قریب کھڑا باغ کی اس فصیل نما دیوار کی طرف دیکھ رہا
تھا جس کے پار وہ چوڑی اور طویل سڑک تھی جس پر چند دن قبل ہی اسلامی
فوج پھیلی ہوئی تھی۔ ابھی وہ اس تصور میں گم ہی تھا کہ ایک مترنم آواز
نے اسے چونکا دیا۔
"کنیز امیر اندلس کی خدمت میں سلام پیش کرتی ہے" عبدالعزیز
بن موسیٰ نے گردن موڑ کر دیکھا ملکہ ایشلونہ جھک کر اپنی [illegible]
اپنی تہذیب کے مطابق اسے سلام کر رہی تھی۔
"ہم کہہ چکے ہیں کہ ہم آپ کو لونڈی نہیں سمجھتے" عبدالعزیز بن موسیٰ
اس کے نکھرے نکھرے حسن سے نظریں چراتے ہوئے بولا۔
"یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے امیر اندلس، ورنہ اپنی حقیقت ہم خود
سمجھتے ہیں" ملکہ کے لہجے کی یاسیت نے اسے بری طرح متاثر کیا اور وہ
بات بدلنے کے لئے بولا۔
"ملکہ! گزشتہ ملاقات میں آپ نے وعدہ کیا تھا کہ اپنے بارے

جہاں [illegible] ہے کہ [illegible] شکست [illegible]
اشارہ کر کے ساتھ چلنے کو کہا اس [illegible] کے [illegible]
کھڑی تھی امیر اندلس کو دیکھ کر اس نے جھک کر سلام کیا امیر نے اس
پر ایک سرسری نظر ڈالی اور [illegible] [illegible]
وہ دونوں قریب [illegible] بیٹھ گئے تھے اور ایشلونہ کہہ رہی تھی۔
"امیر اندلس! اگر آپ کے پاس وقت ہو تو [illegible]
کہیں [illegible] آپ کو [illegible] ؟"
"ملکہ! امیر اندلس نے جواب دیا۔ "ہم آپ کے پاس [illegible]
کے لئے قرار ہیں وقت کی [illegible] کرو"
"تو پھر سنئے" ملکہ ایشلونہ نے سلسلہ کلام [illegible] [illegible]
کی ایک شہزادی تھی [illegible] [illegible]
میں [illegible] شہزادی [illegible] کنیزوں کے ساتھ کشتی میں [illegible]
[illegible] [illegible]
شاہی کشتی [illegible] [illegible]
تھا شہزادی کا خیال تھا کہ چند گھنٹے [illegible] محل میں لوٹ آئے
گی مگر ابھی چند میل ہی [illegible] تیز ہواؤں کے ساتھ آسمان پر
بادل چھا گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں بارش ہونے لگی شہزادی گھبرا گئی اس
نے ملاحوں کو کشتی [illegible] کی طرف موڑنے کا حکم دیا۔ ملاحوں کی تمام
کوششیں بیکار ثابت ہوئیں۔ تیز بارش [illegible] ہواؤں نے سمندر میں
طوفان برپا کر دیا تھا۔ جب طوفان تھما تو کشتی ساحل افریقہ کے قریب
جا چکی تھی اور شہزادی [illegible] [illegible] لیکن [illegible]
[illegible] جب [illegible] [illegible]
بے ہوش تھی۔ جب وہ ہوش میں آئی تو وہ اندلس کے [illegible]
کے [illegible] کے [illegible] کنیز تھی۔ بادشاہ [illegible]
متاثر ہوا تھا اسی لئے اس نے اسے اپنے محل میں [illegible]
[illegible] اپنی ملکہ بنا لیا لیکن ملکہ کو ابھی [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] مسلمانوں سے شاہ لذریق کی جنگ [illegible]
[illegible] مسلمانوں سے [illegible] جنگ [illegible]
نے اسے محل میں تنہا چھوڑ دیا اور خود میدانِ جنگ کی طرف روانہ ہو گیا
جہاں سے واپسی اس کا مقدر نہ تھی اور آج وہ بدنصیب شہزادی
ایک بیوہ ملکہ اور ایک مفتوحہ کی حیثیت سے امیر اندلس کے سامنے
بیٹھی ہے۔"

ملکہ کی آواز بھرا گئی تھی۔ عبدالعزیز بن موسیٰ پر ملکہ کی اس
ہمدردی کی داستان کا گہرا اثر ہوا اس لئے اظہارِ ہمدردی کرتے ہوئے
کہا۔

"ایشلونہ! آپ کے ساتھ جو کچھ ہوا بہت برا ہوا۔ ہمیں اس کا افسوس ہے" ملکہ نگاہیں جھکا کر بولی۔

"امیر اندلس! حقیقت یہ ہے کہ شاہ کی موت نے مجھ سے سب کچھ چھین لیا ہے۔ یہ آپ کی مہربانی ہے کہ آپ نے القصر میں ہمیں ایسی سابقہ شان سے رہنے کی اجازت مرحمت فرما دی ہے۔"

"نہیں نہیں" عبدالعزیز بن موسیٰ نے بے تاب ہو کر کہا۔ "یہ آپ کا حق ہے۔ ہم آئندہ بھی آپ کی دلجوئی کی کوشش کرتے رہیں گے۔"

"آپ کتنے عظیم ہیں" ایشلونہ نے کہا اور عبدالعزیز بن موسیٰ کے شانے پر سر رکھ کر سسک سسک کر رونے لگی۔ یہ سب کچھ ایک لمحہ میں ہو گیا نوجوان امیر کا دل زور سے دھڑکا ملکہ کی یہ حرکت اسلامی تہذیب کے منافی تھی اس کا دل چاہا کہ ملکہ کو اپنے سے جدا کر دے کیونکہ وہ اس کے لئے نامحرم اور اجنبی تھی۔

مگر تنہائی نے کیوں ایسا کرنے کا حوصلہ نہ کر سکا۔ ایشلونہ نے جو کچھ کیا تھا وہ اس کا نہیں اس کی تہذیب کا قصور تھا مگر اصل چیز اس کے جذبات اور وہ حالات تھے جنہوں نے اسے قابلِ رحم بنا دیا تھا۔ عبدالعزیز بن موسیٰ کا مضبوط ہاتھ اٹھا اسے ہٹانے کے لئے نہیں بلکہ دلاسہ دینے کے لئے اور وہ اس ہاتھ کو اس کے ریشمی بالوں سے بھرے ہوئے سر پر پھیرنے لگا اور دھیرے سے بولا۔

"ایشلونہ! دل چھوٹا نہ کرو ہم تمہیں وہی عزت اور مقام دیں گے جس کی تم مستحق ہو۔"

تھوڑی دیر بعد عبدالعزیز بن موسیٰ کا گھوڑا القصر سے اپنی قیام گاہ کی طرف روانہ ہو رہا تھا اور ایشلونہ مسرت سے تمتماتے ہوئے چہرے کے ساتھ گوشہ سے اطلاع میں کھڑکی سے ہاتھ ہلا کر رخصت کر رہی تھی جب گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز مدھم اور عبدالعزیز بن موسیٰ درختوں کے پیچھے روپوش ہو گیا تب وہ پلٹی مگر شاہجہ کو دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔

"شاہجہ! تو یہاں کیا کر رہی تھی؟ کیا مطلب ہے تیرا؟"

"ملکہ عالم!" شاہجہ احترام سے جھک گئی "کنیز تو ملکہ کو ایک بار پھر ملکہ دیکھنا چاہتی ہے۔"

...سکی اس گہرائی کو محسوس کر کے گلا گھونٹ سکی۔ اندلس کی بات طلحہ بن عدی نے شاہجہ سے تمام حالات کے سلسلے میں بات ہو جانے کے بعد کہا۔ عبدالعزیز بن موسیٰ سے تنہائی تنہائی کو خوش رکھنے کا ہے۔"

دوسری جانب عبدالعزیز بن موسیٰ کے خاص مشیر ایوب بن حبیب خود اپنا اعتراض بھی کہہ رہا تھا۔

"اگر کچھ عرض کروں تو گستاخی اور خاموش رہوں تو وفاداری اور وفاداری کے خلاف ہے۔ آپ جس سے متاثر ہیں وہ نہ شاید اپنا مذہب ترک کرے گی نہ اسلام قبول کرے گی۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو ایوب؟" عبدالعزیز بن موسیٰ نے کہا "ہم اسلامی احکام کے خلاف کچھ نہیں کریں گے۔ تمہیں بدگمانی نہیں کرنی چاہیئے۔"

"مجھ کو بدگمانی نہیں ہے" ایوب بن حبیب نے جواب دیا "لیکن قدم آگے بڑھانے سے پہلے اتنا سوچ لیجئے کہ جسے آپ چاہنے لگے ہیں وہ اندلس کی ملکہ کی حیثیت سے بے پناہ آسائش دیکھ چکی ہے کیا وہ آپ کے ساتھ سادہ زندگی گزار سکے گی۔ اور پھر یہ بھی بات بھولئے کہ جو کچھ چچا جان کے ساتھ ہوا ہے وہ اس بات کی علامت ہے کہ یہاں ان کے بہت سے مخالف موجود ہیں آپ کسی سے بھی اچھی توقعات نہ رکھئے اور سمجھ لیجئے کہ اس دور میں ملکہ کی طرف محبت کا ہاتھ بڑھانا اپنے مسائل میں اضافہ کرنا ہے کیا چچا جان کی آخری نصیحت آپ کو یاد نہیں ہے؟"

"ہمیں سب کچھ یاد ہے ایوب!" عبدالعزیز نے زچ ہو کر کہا "لیکن یقین کرو ایشلونہ بری عورت نہیں ہے۔ وہ لڑکی معصوم ہے" جب ایوب بن حبیب نے کچھ کہنا چاہا تو عبدالعزیز نے اس کی بات کاٹ دی "ایوب! اب ہمیں تنہا چھوڑ دو ہم آگے کچھ سننا نہیں چاہتے۔"

وقت گزرتا رہا طلحہ بن عدی اور عمرو بن حلیم کی تحریکی سرگرمیاں بڑھتی رہیں۔ اندلس میں ظہور میں آنے والے واقعات اہم خبریں بن کر دمشق جاتے رہے۔ سلیمان بن عبدالملک موسیٰ بن نصیر کے خاندان سے برگشتہ ہوتا رہا اور ملکہ ایشلونہ روز بروز عبدالعزیز بن موسیٰ کے قریب ہوتی گئی وہی حرکتیں جو کبھی اسلام کے منافی سمجھی جاتی تھیں اب بے اختیاری طور پر سرزد ہونے لگیں عبدالعزیز بن موسیٰ ایشلونہ کے تیرِ عشق سے گھائل ہو چکا تھا۔

ایک روز ایوب بن حبیب نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"امیر اندلس! آپ [illegible] کے
سوا کچھ نہیں ہے۔ آپ کا یہ فعل اندلس کے تمام مسلمانوں کے لیے [illegible]
"ہم کچھ نہیں سمجھ سکتے اس میں کیا برائی ہے۔ محبت اور شادی
ہمارا ذاتی معاملہ ہے اس سے اندلس کے مسلمانوں پر کیا اثر پڑے گا؟"
عبدالعزیز نے جواب دیا۔
"اس سوال کا جواب دینے سے قبل میں آپ سے ایک
سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ اگر اندلس میں آپ کی فوج کا ہر سپاہی
عیسائی لڑکیوں سے عشق کرنے لگے تو آپ کیا کریں گے؟"
"ایوب!" عبدالعزیز نے قدرے درشتی سے کہا۔ "ایسا طنز
کرتے وقت مت بھولو کہ اسلام میں اہل کتاب سے شادی جائز ہے۔"
"امیر اندلس!" ایوب بن حبیب نے اسی لہجے میں جواب
دیا۔ "آپ شاید یہ بھول رہے ہیں کہ اس شادی کی اجازت دینے کے
باوجود اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے۔
"مشرک آزاد عورت سے مسلمان کنیز بہتر ہے اور مشرک آزاد
مرد سے مسلمان غلام بہتر ہے!"
چونکہ اب بھی عیسائیوں کے عقائد مشرکانہ ہیں لہٰذا ان سے شادی
کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ یہ بھی مت بھولئے کہ آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم نے کسی غیر مسلم عورت کو نکاح کا شرف نہیں بخشا اور ان کے بعد
کسی بھی جلیل القدر صحابی نے یہ مثال قائم نہیں کی جبکہ قرآن پاک
کے ہر حکم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عملی جامہ پہنایا اور صحابہ
کرام نے ان کی پیروی کی۔ پھر مجھے بتائیے کہ انہیں غیر مسلم عورتوں سے
نکاح کرنے میں کیا چیز مانع تھی۔ صرف یہی کہ وہ اپنے گھروں میں غیر
مسلم عورتوں کو لا کر خرابی نہیں پیدا کرنا چاہتے تھے!" جواب اس قدر
مدلل تھا کہ عبدالعزیز کچھ نہ کہہ سکا۔ قدرے توقف کے بعد بے بسی کے
انداز میں بولا۔
"ایوب! خدا کی قسم یہ ہماری پسند کا معاملہ ہے۔" ایوب
بن حبیب نے اسے پرشکوہ نگاہوں سے دیکھا اور بڑی افسردگی سے کہا۔
"آپ ایک فوجی اندلس کے مسلمانوں کے امیر ہیں۔ جو قدم
آپ اٹھائیں گے یہاں کے مسلمان کل اس کی تقلید کریں گے۔
سوچ لیجئے کہیں آپ کے اس اقدام کے بعد مسلمان اور عیسائی یوں
گڈمڈ نہ ہو جائیں کہ دوست اور دشمن کی تمیز باقی نہ رہے۔

"میرے امیر! میرے دوست! ذرا سوچیے جو نسلیں عیسائی [illegible]
کی گود میں پروان چڑھیں گی ان کے دل میں اسلام کے لئے جذبہ [illegible]
[illegible] ہو سکتا ہے [illegible]
میں ڈھل جاتی ہیں۔ [illegible]
"ایوب!" عبدالعزیز نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "میں
کہہ رہا ہوں کہ اگر تم اپنی [illegible] سے [illegible]
اعتراف ہے کہ تم ایک حد تک ٹھیک ہو لیکن میں اس معاملے میں
اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ [illegible] کی اجازت نہیں لے سکتے۔"
ایوب بن حبیب بے بس ہو کر خاموش ہو گیا۔
ایک دن اندلس کے مسلمانوں نے یہ خبر بڑی حیرت سے
سنی کہ امیر اندلس عبدالعزیز بن موسیٰ نے شاہ راڈرک کی بیوہ ایلشونہ
سے نکاح کر لیا ہے۔ اس بات سے مسلمانوں پر مختلف کیفیات طاری ہوئیں۔
ایوب بن حبیب [illegible]
[illegible] مسلمان فوج کے وہ سپاہی جو کسی حسیناؤں کے
دام الفت میں گرفتار تھے لیکن ان سے شادی کا حوصلہ نہ رکھتے تھے
اس بات سے ان کے [illegible]
[illegible]
کے ہاتھوں میں [illegible] آزادی سے چل سکتے تھے۔
اسی شب عبدالعزیز بن موسیٰ کے گھر میں ایک جشن ہوا جس میں
[illegible] کی تمام [illegible] نے شرکت کی اور عبدالعزیز بن موسیٰ نے کہا
"پیاری ایلشونہ! [illegible] تمہارا اصل کام اب شروع ہوا ہے۔
[illegible] کے فرائض انجام دینے ہیں [illegible] لیکن اب
وہاں تمہیں ایک ایسا [illegible] کہ ایلشونہ عبدالعزیز بن موسیٰ کو
سادگی اور اسلامی اخوت سے ہٹا کر عیش و عشرت کی طرف [illegible]
اور یہ کام زیادہ مشکل بھی نہیں کیونکہ ایلشونہ خود [illegible]
کی مالک ہے۔"
"اگر [illegible] یہ کام [illegible] کر دیا تو مجھے کیا انعام دو گے؟" ایلشونہ
نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔
"عبدالعزیز بن موسیٰ کے زوال کے بعد جب میں اندلس
کا امیر بنوں گا تو تمہیں وہی مقام ملے گا جو عبدالعزیز نے ایلشونہ
کو دیا ہے۔"
یہ سن کر [illegible] کے بعد یہ شب اس نے [illegible]
[illegible] کے ساتھ گزاری۔ اس سے آئندہ کے لئے ہدایات حاصل کیں۔
دوسری صبح [illegible] دمشق کی طرف روانہ ہو گیا۔
ایلشونہ سے شادی کے بعد عبدالعزیز بن موسیٰ کی [illegible]

دیا گیا تھا۔ یہ محل بھی تھی اس سے کچھ فاصلے پر ایک بڑا قصر تعمیر کرایا گیا اور اس
کے طول و عرض میں باغ میں ایلشلونہ کے لئے ایک خاص عبادت گاہ
تعمیر کرائی جہاں اپنے مذہب کے مطابق وہ عبادت کرتی اور وہیں
ایک عیسائی راہب تثلیث کی تلقین کرتا جسے اس تعلیم کو وہ کبھی کبھی سنتی رہیں۔
ایلشلونہ اکثر اسی عبادت گاہ کے باہر کھڑا اس کا انتظار کرتا
رہتا۔ دونوں اپنے اپنے مذہب پر سختی سے قائم تھے۔ عبدالعزیز بن موسیٰ
نے اسے مکمل مذہبی آزادی اور ایوان شاہی میں تمام مراعات عطا
کی تھیں۔

وقت گزرتا رہا۔ مسلمان سپاہیوں کی عیسائی بیویوں میں اضافہ
ہوتا گیا جن کی بدولت وہ بتدریج اسلامی اصولوں سے دور ہوتے گئے۔
مسلمانوں میں اختلاف بڑھتا گیا۔ ایوب بن حبیب اپنی تقریروں سے
جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر انہیں ان کے فرائض کا احساس دلاتا رہا۔ خوبصورت شاہجہ
عمر ظفر بن مہدی کی محبت میں ایوان شاہی میں ایک کنیز کی حیثیت سے
نہ صرف جاسوسی کرتی رہی بلکہ اپنے چھوٹے چھوٹے فقروں سے ملکہ کے
دل میں نت نئے خیال ڈالتی رہی۔ ان حالات سے بے خبر عبدالعزیز
بن موسیٰ ایلشلونہ کے حسن اور اس کی دلفریب اداؤں سے مسحور ہوتا گیا
اور ملکہ ایلشلونہ آہستہ آہستہ اس کے دماغ پر غالب آتی رہی۔

یوں ایک برس گزر گیا اور ملکہ ایلشلونہ عبدالعزیز کے بیٹے عاصم
کی ماں بن کر ام عاصم کہلائی جانے لگی۔ اس بیٹے کی پیدائش نے اس
کے اقتدار کو سوا کر دیا تھا۔ اب امیر اندلس کے ساتھ اس کا نام بھی لیا
جاتا تھا۔ امور سلطنت اور دیگر مہمات میں اس کا مشورہ لازم ہو گیا تھا۔
لیکن اس نے تو اندلس کے شاہانہ جشن دیکھے تھے وہ دلدادہ عیش و
نشاط اپنی سابقہ زندگی سے کچھ اس طرح مسحور تھی کہ عبدالعزیز بن موسیٰ
کی زندگی کو قریب سے دیکھنے کے بعد اسے یہ بڑی ہی سادہ اور بے رنگ
نظر آئی اور واقعی عبدالعزیز کی زندگی امیر اندلس بن جانے کے بعد
بھی بڑی سیدھی سادی اور ہر تکلف سے پاک تھی۔ اس مذہب کی یہ زندگی ایلشلونہ
کو دل سے پسند نہ تھی کبھی کبھی وہ بری طرح بے چین ہو جاتی اس کا
دل چاہتا کہ وہ عبدالعزیز کو بدل کر رکھ دے اسے ایک معمولی انسان کی
طرح نہیں ایک حاکم کی طرح جیتا دیکھنا چاہے مگر عبدالعزیز کی بے پناہ
محبت کے سامنے وہ سب کچھ بھول جاتی اور شاید یہ غیر معمولی چاہت
زندگی کے اس نمایاں فرق کو مٹا دینے میں کامیاب بھی ہو جاتی مگر شاہجہ
کی باتوں سے ایلشلونہ کی خواہشات پھر بیدار ہو جاتیں۔ ایک روز شاہجہ
نے اس سے کہا۔

"ملکہ! امیر اندلس سابقہ شاہان اندلس کی طرح تاج کو اندر
استعمال نہیں کرتے ان سے آپ کی شان میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔"
یہ کہہ کر وہ چپکے سے کچھ بات کر کے وقت سے کچھ دور کھڑی ہو گئی۔
ابھی کچھ دن ہی گزرے تھے ایلشلونہ بھی محسوس کرنے لگی تھی پہلے سرداری کی آن
و تخت اندلس جہاں کے شہنشاہ کا شاہانہ جلال اس کا رعب و دبدبہ
کی شان و شوکت دیکھنے والوں کو مرعوب کرتی تھی وہاں اب ایک
لباس جو سیدھا اور معمولی تھا اور کھانے والا امیر حکمران تھا وہ فارس
نزدیک حکمران کی اصول پرستی میں عار سمجھتا تھا۔ اور ایلشلونہ اب
معمولی امیر کی ملکہ تھی۔ ایک دن وہ اس کے اصرار پر ملکہ اکرام
عبدالعزیز بن موسیٰ کو اپنی روش پر لانے کا فیصلہ کر لیا۔

ایک روز جب عبدالعزیز سپاہیانہ لباس پہن کر باہر
جانے کے لئے تیار ہوا تو اس کی نگاہ اپنے بیٹے پر پڑی جو
آبنوسی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا جسے شاہجہ بہلا رہی تھی۔ عبدالعزیز
بچے کو دیکھنے لگا۔ یہ وہ وقت تھا جب ایلشلونہ اپنی عبادت گاہ سے
آتی تھی اور عبدالعزیز اسے بوسہ دے کر دیوان خانہ میں چلا جاتا تھا
بھی اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا اس نے دیکھا زمرد جڑا تاج
بال شانوں پر بکھرے ہوئے اور ایک چھوٹی سی صلیب گلے میں ڈالے ہوئے
چلی آ رہی تھی۔ عبدالعزیز کو اس کی نسائیت اور اس صلیب سے
نفرت تھی لیکن ایلشلونہ کا حسن اور اس کی شخصیت کے سامنے وہ بے بس
ہو کر رہ جاتا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ مسکرا کر رہ گیا۔ ایلشلونہ نے
اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ اس کے خوبصورت اور مضبوط جسم پر سیاہ
اور سادہ لباس تھا۔ اس نے سوچا اسی وضع قطع کے کپڑے امیر
ہشام بھی پہنتا ہے۔ اس کے چہرے پر سرخی کا رنگ اتر گیا۔
دیکھ کر شاہجہ وہاں سے چلی گئی اور عبدالعزیز جو ایلشلونہ کو غور سے
رنگ کے اس تغیر کو محسوس کر کے بولا۔

"ام عاصم! تم اچانک افسردہ کیوں ہو گئیں؟"

"شکریہ۔ جو تم بھی ایک برس سے کچھ نئے لباس پہنے
اسے آپ نے محسوس تو کیا۔" ایلشلونہ نے نگاہوں کے انداز میں
دیکھا۔

"ام عاصم!" عبدالعزیز نے تعجب سے کہا۔ "تم کہنا
چاہتی کیا ہو؟" "آپ نے تو بہت سے ایسا قصر تعمیر کرایا ہے جو شاید
کسی شہنشاہ نے اپنی ملکہ کے لئے تعمیر کرایا ہوگا اس میں ہر قسم کا
آرام کا سامان مہیا کیا گیا ہے۔" ایلشلونہ نے اس کے گلے میں بانہیں

[illegible] جب کہ ... [illegible] ... ہم تاج پہن لیں گے۔"

عبدالعزیز نے ایجیلونہ کو دوسرے معاملات میں بہلانے کی کوشش کی۔

"ام عاصم! ایک پردہ نشین عرب کی بیوی ہو کر بھی آپ [illegible] زبان سے جو بات نکلتی ہے اس پر قائم [illegible] محبت بھی ادا کیا۔"

"ہم پردہ نشین عرب کی بیوی ہیں اور امیر اندلس کی ملکہ ہیں، لیکن آج محض ایک لونڈی کی طرح آپ سے فریاد کرنا چاہتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ اس کے قدموں پر جھک گئی۔ عبدالعزیز کو محسوس ہوا اس کی بیوی نہیں بلکہ کمال قدموں پر جھک آیا ہے اور اس ایک لمحہ ایک ساعت نے اس کی سوچ کا رخ موڑ دیئے جسے وہ عمر بھر کے ساتھ محفوظ رکھ سکتا تھا۔ قدموں سے لپٹی ہوئی ملکہ کے قدموں میں گر گئے تاج کی عورت کی حیثیت ثابت ہوئی اور ایک مجاہد کے عزم و ہمت کی ساری بلندی تھیں وہ خود کو بے بس محسوس کر رہا تھا۔ اس نے بیوی کو بڑی نرمی سے اس کے شانوں سے پکڑ کر اٹھایا اور شرارت سے کہا۔

"تمہاری یہ خواہش ہماری طرف سے پوری کی جائے گی۔"

یہ سن کر ایجیلونہ کا دل خوشی سے دھڑکا اور مسرت سے ... مسرت چھپا کر بولی۔

"ملکہ اندلس کے منصب و وقار کے لیے شاہی عظمت و شان و شوکت کا پہلا قرینہ ہے کہ صرف آج ہماری خاطر اپنے سر سے عمامہ اتار کر تاج شاہی اس مجسم سر پر رکھ لیں اور ہم دیکھ کر خوش ہو سکتے ہیں۔

مان لیجیے ہماری قسم!" عبدالعزیز کا دل اس بات پر پسیج گیا۔

"اے حسین ساحرہ! تو نے اکبری اور القصر کے [illegible] کی ملکہ بن گئی ہے، خدا کی قسم ہم تیری فرمائش رد نہیں کر سکتے۔" اس نے تالی بجائی۔ غلام حاضر ہو گیا۔ ملکہ نے حکم دیا۔

"وہ طشت لے آؤ جس میں ہم نے تاج شاہی رکھوایا ہے۔"

یہ سن کر عبدالعزیز کا ماتھا ٹھنکا لیکن اس سے کچھ کہنے سے قبل ایجیلونہ چلی اور اس سے لپٹ گئی اور وہ سب کچھ بھول گیا۔ تھوڑی دیر بعد دو حبشی غلام بڑا طشت لے کر داخل ہوئے جس میں ایک تاج رکھا ہوا تھا جس میں ہر طرح کے قیمتی ہیرے اور نگینوں سے جڑے گئے تھے۔ آج یہ سب سے قیمتی مال تھا جو لے آئے۔ ایجیلونہ نے عبدالعزیز کو اٹھا

ال کر دی اور [illegible]

ے کافی نہیں کہ ہم [illegible]

زیادہ کیا مطلب؟ عبدالعزیز [illegible]

سینکڑوں کنیزیں اور غلام ہماری شان کے مطابق نہیں ہے۔"

"ہم یہاں ان کی بات ختم کیا چاہتے ہیں،" ملکہ نے شکوہ کیا۔

"ہمیں تو یہ دکھ ہے کہ جو لباس امیر زیب تن کرتے ہیں وہی ان کے غلام بھی پہنتے ہیں، کیا ایک عام آدمی اور حاکم وقت میں فرق نہیں ہونا چاہیے؟ آپ ایک فاتح اور فرمانروائے اندلس کی حیثیت سے نہ قبا زرنگار پہنتے ہیں اور نہ شاہی تاج سر پر رکھتے ہیں، ہمیں اس بات پر دکھ ہے، ملال ہے۔"

"ام عاصم!" عبدالعزیز بولا: "ہم کئی بار کہہ چکے ہیں کہ اسلام میں آقا اور غلام کے لباس میں کوئی فرق نہیں ہوتا ہے۔ جہاں تک تاج کا تعلق ہے تو سلف خلفاء و بنو امیہ تاج نہیں پہنتے صرف عمامہ سر پر رکھتے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ ہم اپنے سر پر تاج رکھیں۔"

"لیکن آپ امیر اندلس ہیں اور شاہان اندلس کے رعب و داب کو تازہ رکھنا ان کے ساتھ برابری کرنا تو آپ پر لازم ہے۔" ایجیلونہ نے کہا۔

"نہیں!" عبدالعزیز بن موسیٰ نے جھنجھلا کر کہا: "مسلمان جہاں جاتے ہیں وہاں اپنا دستور رائج کرتے ہیں، ہم بھی اپنے بزرگوں کے مسلک سے ہٹنا نہیں چاہتے۔"

یہ جواب سن کر ایجیلونہ کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ عبدالعزیز کا تمام غصہ فوراً ہی کافور ہو گیا۔ مطمئن ہو کر اس نے قدرے دھیمے لہجے میں کہا۔

"ہم نہیں سمجھ سکتے کہ تم اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر کیوں ملول ہو جاتی ہو۔ ہم نے شادی کے وقت تم سے وعدہ کیا تھا کہ ہم تمہارے مذہبی معاملات میں دخل نہیں دیں گے لیکن تم بھی اس بات کو ذہن میں رکھو کہ ہم اسلامی اخوت و مساوات کو ترک نہیں کر سکتے۔ ہم تو اپنے وعدوں پر قائم ہیں، تمہیں بھی ہمارے مذہبی جذبات کا احترام کرنا چاہیے۔"

ایجیلونہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔ عبدالعزیز پریشان ہو گیا۔ محبوب بیوی کی اشکباری اس سے دیکھی نہ جا سکی۔

"اچھا اپنے غلاموں سے کہو کہ ہمارے لیے ایک تاج بنوا لیں۔"

عبدالعزیز کو یہ معلوم ہوا تو ابھی اندازہ [illegible] جب سے امارت اس کا [illegible]
تھا کہ ابھی تک سلیمان نے ایوب بن حبیب کے آنے کی اطلاع بھی عبدالعزیز
ابن موسیٰ کو نہیں پہنچائی تھی ابھی بات چل رہی تھی جب اس نے دربان
کی اجازت چاہی۔ ایوب بن حبیب اندر داخل ہوا۔ امیر کو سلام
کیا اور بیٹھ گیا۔

"امیر! آج میں اپنے انداز فکر کے مطابق اپنا مشورہ پیش
نہ کروں تو بہتر نہیں ہو سکتا اگر فرمائیں تو عرض کروں کہ میں غلط سمجھ رہا
ہوں"؟

"ہم تمہاری بات سنیں گے ایوب! وضاحت کرو" عبدالعزیز
نے اجازت دی۔

"آپ نے جس طرح اور جس جوش سے نصاریٰ اندلس کو زیر کیا ہے
جس سے ہمارے ساتھی مایوس ہو رہے ہیں" ایوب نے شکوہ کیا۔
"ایوب! تم جانتے ہو ہم اپنی قوت بڑھانا چاہتے ہیں تاکہ
دمشق کی حکومت کے اثرات سے محفوظ ہو جائیں گے" عبدالعزیز نے
دلیل پیش کی۔

"بلاشبہ اس اقدام سے آپ کو عیسائیوں کی حمایت حاصل ہو
جائے گی لیکن مسلمان برگشتہ ہو جائیں گے" ایوب بن حبیب نے کہا۔
"آپ آخر یہ کیوں نہیں سوچتے کہ وہ مسلمان جنہوں نے آپ کے باپ
کا اور آپ کا میدان جنگ میں ساتھ دیا اور جو دل سے اب بھی آپ
کے خیرخواہ ہیں کیا ان کا حق ان مسیحی سرداروں سے زیادہ نہیں جو کل
تک آپ کا اقتدار ختم کرنے کے درپے تھے اور جو آج بھی وفادار
نہیں ہیں۔ مجھے بتائیے کہ اگر وہاں جنگ آپ ان عیسائیوں کے
قابو میں آ جاتے تو کیا آج آپ اندلس کے امیر ہوتے؟ جن مجاہدین
کی قوت کی بدولت آپ نے یہ ملک حاصل کیا وہی مجاہدین آج
کے ان مسیحی ناظموں کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہو رہے ہیں۔ میں یہ
بتا دینا چاہتا ہوں کہ عیسائیوں کو ہتھیار بنانے کے چکر میں اگر آپ
نے ان مسلمانوں کو متنفر کر دیا تو پھر کسی کی قوت ان کے آگے نہ ٹک سکے
گی۔ ادھر امیر المومنین سلیمان بن عبدالملک آپ کے خاندان سے ناخوش
ہیں ادھر یہ مسلمان مایوس ہوتے جا رہے ہیں ان حالات میں پھر عیسائیوں
کی طاقت کا آپ کیا کریں گے جو صرف اقتدار کا ساتھ دینے والے
ہیں اور صرف اس لئے آپ کی حمایت کر رہے ہیں کہ آپ امیر اندلس
ہیں معاف کیجئے امیر! [illegible] ان کی حمایت سے [illegible] آپ کو

[illegible] کے خلاف [illegible] کہیں کامیاب [illegible]
میں ایک بار پھر اس گستاخی کی معافی چاہتا ہوں"۔
ایوب بن حبیب نے یہ بات [illegible] بیان کر دی تو
عبدالعزیز بڑی توجہ سے باتیں سن رہا تھا [illegible]
یہ تقریر سن کر اس کی جبین پر تفکرات کی شکنیں ابھر آئیں اس کی
اس ہونے والی بیوی کی ہوشیاری کے جال میں پھنسنے کے بعد
کوئی راہ نہیں پا رہا تھا صرف [illegible] کوشش [illegible]
یہاں تک کہ اس کی ہمت ٹوٹ جاتی ہے اس [illegible]
"ایوب! ہم صرف اپنا مستقبل محفوظ کرنا چاہتے ہیں
تمام اندلس کے مسلمان [illegible] آج بھی مانتے ہیں [illegible]
ہم جانتے ہیں کہ اندلس میں ہماری کامیابیاں ان ہی کی بدولت
ہیں لیکن ہم مستقبل سے غافل ہو کر سب کچھ کھو دینا [illegible]
"آپ کس فکر میں ہیں امیر!" ایوب نے کہا [illegible]
کہنے کا یہ مطلب غلط ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ جو [illegible]
امیر المومنین سے نہیں اندلس کے مسلمانوں سے [illegible]
ایک طرف مسلمانوں کی قوت پارہ پارہ ہو جائے گی تو دوسری
طرف ان کے دلوں سے آپ کے لئے جذبۂ حمایت مٹ جائے گا"۔
عبدالعزیز جو اس بات سے ناخوش ہو گیا اس نے کہا۔
"ایوب! اپنا مشورہ مکمل کرو ہم کیا کریں؟" ایوب بن
حبیب نے چند لمحے سکوت کیا پھر بولا۔
"امیر کے لئے میرا مشورہ صرف اتنا ہے کہ وہ اپنی
امیر المومنین سلیمان بن عبدالملک کی اطاعت کا یقین دلا دیں
ذہن سے یہ بات نکال دیں کہ وہ آپ کے والد سے خفا ہیں [illegible]
خلیفہ آپ کو اندلس کی امارت سے معزول نہیں کر سکتے تھے لیکن
تک انہوں نے ایسا نہیں کیا اس کا مطلب ہے [illegible]
ہونے کے باوجود انہیں آپ سے کوئی پرخاش نہیں لہٰذا آپ ا
اپنی اطاعت کا [illegible] یقین دلا دیں [illegible]
[illegible] کے [illegible] تحائف بھیجنے کی تیاری کریں [illegible]
کے مسلمانوں کی [illegible] کا تعلق ہے تو [illegible]
آج [illegible] مسلمان اسلام [illegible]
[illegible]
[illegible]

مجھے ہر صورت [illegible]
عبدالعزیز نے [illegible]
عمر دالسی کی گفتگو تمہاری سمجھ میں نہیں آئی [illegible]

"امیر! تم [illegible] تمہاری محبت اور شوہر [illegible] دمشق کے لئے تحائف اور امیر المومنین کو ہماری طرف سے [illegible] کرو جس سے ہماری اطاعت کا یقین ہو جائے۔"

دوسرے دن امیر اندلس کی جانب سے امیر المومنین سلیمان بن عبدالملک کی خدمت میں [illegible] جواہرات بطور تحائف روانہ کئے گئے۔ اس کے ساتھ ہی [illegible] خط تھا جس میں امیر اندلس نے اپنی اطاعت کا یقین دلایا تھا۔ اس وفد کو دمشق کی طرف روانہ کرنے کے بعد امیر [illegible] نے [illegible] کی تمام [illegible] توجہ اندلس کے مسلمانوں کے لئے وقف کر دی۔ آہستہ آہستہ ان کے غیظ و غضب کو ٹھنڈا کر کے ان میں ایک بار پھر اسلامی اخوت اتحاد کی روح پھونک دی۔ لیکن بدقسمتی سے انہی دنوں [illegible] میں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے اندلس کے مسلمانوں کے دلوں کو امیر کی طرف سے دوبارہ متنفر کر دیا۔ [illegible] ایک [illegible] جب اپنی عبادت گاہ سے لوٹی تو عبدالعزیز وہاں موجود تھا۔ اس کی کرسی کے پاس کا خورد سال بیٹا عاصم [illegible] تھا اور شاہ [illegible] زمین پر سر رکھ کر اسے سجدہ کے انداز میں سلام کر رہی تھی۔ [illegible] گئی بولی۔

"شاہ [illegible] کیا کر رہی ہو؟" شاہ [illegible] کرسی پر [illegible] مجھے [illegible] میں بولی۔

"ملکہ عالم! [illegible] شاہ کو شاہی آداب کے تحت سلام کر رہی تھی۔ [illegible] اس طرح سلام قبول کیا کرتے تھے۔"

[illegible] شاہ [illegible] نے اس کے [illegible] ماضی کے [illegible] دن یاد آگئے جب وہ پہلی مرتبہ شاہ لرزیق کے [illegible] تھی اور [illegible] بادشاہ [illegible] اور شاہ [illegible] دل [illegible] تھے۔ [illegible] جہاں وہ شاہ لرزیق [illegible] اس کا [illegible] اور [illegible]

[illegible]

"[illegible]" ایک نگاہ [illegible] تو اس [illegible] کے قریب [illegible] قریب [illegible] کیا۔

"[illegible]" عبدالعزیز [illegible] جواب دیا۔

"ملکہ عالم! ہم اندلس کے [illegible] ہیں مگر [illegible] اسلام [illegible] نہیں۔"

"لیکن امیر! آپ اس ملک کے [illegible] جہاں [illegible] کی [illegible] مسلمانوں [illegible] کوشش [illegible] آنسو بہائے [illegible] جب [illegible] تمام [illegible]"

[illegible] اندلس [illegible] کے مطابق [illegible] آتش [illegible] کی [illegible] مسلمانوں [illegible] جذبات کو سرد کرنے کی ہر ممکن کوشش [illegible] کوئی [illegible] مسلمان [illegible] کے سامنے [illegible] تھے۔ [illegible] کے خلاف [illegible] امیر کے خلاف [illegible]

اور اس بات [illegible] شاہ [illegible] سے [illegible] تھا۔ آپ نے [illegible] سے [illegible] کام کیا ہے [illegible] ہوا ہے۔

[illegible] بادشاہ ہونے کا ثبوت [illegible] جو بات کہہ سکتی
میں اس طرح وحشی ہوں کہ وہ سب میری ہی ہے وہ قوی تر شکل آئی ہے
جو تجھ سے دور تنہ [illegible] خدا کی قسم وہ خود مجھ تک پہنچ [illegible] ورنہ
ہنسنا، عورت کر جو یا مجھ کو اس طرح تو ناچنا آسان ہے۔"

"اچھا!" شاہ عجم ایک دم چونک اٹھی۔ "شاید یہ اصل ہے جو کہ اس لڑکے کا ہاتھوں مرد احمق بنتا ہے جو کام میں نے انجام دیا ہے کیا وہ تم کسی مرد سے لے سکتے تھے یا جس طرح ملکہ ایلونہ نے امیر سے اپنی بات منوائی کیا کوئی مرد منوا سکتا تھا؟"

عرف [illegible] شاہ عجم کو منانے کے انداز میں بولا۔ "تم واقعی بے حد ذہین ہو مگر اب آئندہ کی بات کرو۔" شاہ عجم شرح کی کرتے ہوئے بولا۔

"آئندہ کے لئے [illegible] کہنے کی ضرورت نہیں دوسرا قدم ملکہ خود اٹھائے گی۔"

ملکہ نے دراصل اس مسئلہ کو اپنے وقار کا سوال بنا لیا۔ مسلمانوں نے اب تک امیر کو جھک کر سلام کرنا نہیں شروع کیا تھا۔ ایک رات اس نے امیر کی توجہ اس جانب مبذول کراتے ہوئے کہا۔

"امیر! عیسائی تعداد میں تو آپ کو جھکتے ہیں لیکن یہاں آنے والے مسلمان صرف السلام علیکم یا امیر کہتے ہیں۔ یہ فرق ٹھیک نہیں۔"

"اس کو ختم کرنے کی کوشش کرو۔" عبدالعزیز نے [illegible] کی کوشش کی۔ "مسلمانوں میں خدا کے سوا کسی کے سامنے جھکنا شرک ہے۔ میں انہیں مذہبی طور پر جھک کر سلام کرنے کا حکم نہیں دے سکتا۔ اگر میں نے ایسا کیا تو ہمارے خلاف بغاوت کھڑی ہو جائے گی۔"

"بغاوت اس صورت ہوگی کہ آپ حکم دیں۔" ملکہ نے چڑ کر کہا۔ "جب انسان میں قوت نہ ہو تو اسے تدبیر سے کام لینا چاہئے۔"

عبدالعزیز حیرت سے اس کا منہ تکنے لگا۔

"کیا مطلب؟"

ملکہ نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "مطلب یہ ہے امیر کہ مسلمانوں کو ناراض کئے بغیر بھی ان کا سر جھکایا جا سکتا ہے۔ دربان خانے میں ایک کھڑکی بنوائیے اور حکم دیجئے کہ مسلمان اس میں سے گذر کر آپ کے پاس آئیں۔ اس طرح انہیں مجبوراً سر جھکا کر آپ کی خدمت میں آنا پڑے گا۔"

قبل اس کے کہ عبدالعزیز کچھ کہتا۔ ملکہ نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"اچھا! اندلس [illegible] کر سکتے ہیں کہ عیسائی لوگ امیر کے سامنے [illegible] حاضر ہوں۔ مسلمانوں کو بھی آپ کا احترام کرنا چاہئے۔ عیسائیوں کے ہر قدم پر آپ کی تعظیم واجب ہے۔ یہ تقاضائی [illegible] حسن میں تمہارا فلسفہ بے جوڑ ہو گیا۔

دوسرے دن دربار خاص میں کھڑکی تعمیر ہو گئی۔ امیر کے پاس آنے کے لئے ہر مسلمان کو اس سے اس طرح گذرنا پڑتا کہ اس کا سر جھک جاتا۔ گو امیر نے سر جھکانے کا حکم نہیں دیا تھا لیکن مسلمان کھڑکی سے داخل ہونے کا مفہوم سمجھ گئے تھے۔ وہ مجبوراً امیر کے حکم کی تعمیل کر رہے تھے لیکن ان کے دلوں میں اس کے خلاف غم و حقارت کی آگ سلگتی رہی۔ بالآخر مسلمانوں کو اس بدعت سے چھٹکارا پانے کے لئے ایک اہم فیصلہ کرنا پڑا۔ ان کا ایک وفد خلیفہ سے ملاقات حاصل کرنے کے لئے دمشق روانہ ہو گیا۔ خلیفہ نے اس وفد سے اندلس کے حالات سنے تو اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ [illegible] پہلے ہی اسے عبدالعزیز کی طرف سے کافی بدظن کر چکا تھا۔ اس وفد کی آمد نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ اس نے وفد کو انصاف کا یقین دلا کر انہیں دمشق میں رکنے کا حکم دیا۔ وہ حالات خلیفہ سے [illegible] ترتیب کر گئی۔ جب جب اس نے عبدالعزیز کے خلاف خیال کیا تو اسے اطلاع ملی کہ امیر اندلس نے اپنا ایک وفد خلیفہ سے ملاقات کے لئے بھیجا ہے۔ اس نے امیر اندلس کے اس وفد کو دربار میں حاضر ہونے کی فوراً اجازت دے دی۔

وفد کے سربراہ محمد بن حبیب نے خلیفہ کے حضور امیر اندلس کا مکتوب اور تحائف پیش کئے۔ خلیفہ نے وہ خط پڑھا اور سنا جس میں اطاعت کا یقین دلانے کے بعد خلیفہ کی بقا اقبال کی دعا کی گئی تھی پھر اس نے وہ تحائف دیکھے لیکن قیمتی تحفے بھی اس وقت خلیفہ کو متاثر نہ کر سکے۔ اس نے اکھڑے ہوئے لہجے میں وفد سے پوچھا۔

"ہم نے سنا ہے عبدالعزیز بن موسیٰ نے قبا و ارغوانی اور تاج پہنا ہے کہ وہ بادشاہ کہلانے لگا ہے کیا یہ سچ ہے؟"

اس سوال سے اراکین وفد کے رنگ اڑ گئے۔ ان کے تصور میں یہ نہ تھا کہ اتنی چھوٹی چھوٹی باتیں بھی خلیفہ تک پہنچ گئی ہیں۔ [illegible] کچھ کہنے کا حوصلہ نہ کر سکے۔ آخر ان میں سے ایک نے ہمت کی اور اپنے امیر کی صفائی پیش کی۔

"امیر المومنین! آپ نے جو کچھ سماعت فرمایا اس کی حقیقت

محض اتنی ہے کہ [illegible]
موقعوں پر صرف خلفاء کی [illegible]
کرتے ہیں کہ یہ قوم حکمران کے [illegible] اس بغاوت کا [illegible] کی ہے۔
اس وقت دربار پر سکوت طاری تھا۔ سلیمان بن عبدالملک نے [illegible]
دوسرا سوال کیا۔

"عبدالعزیز بن موسیٰ اندلس [illegible] پہنچتی ہیں وہ
شاہان اندلس کے [illegible] مال غنیمت کے ساتھ ہمارے پاس
کیوں نہیں بھیجا گیا؟"

"امیر المومنین! [illegible] نے لکھا ہے کہ [illegible] کہ
امیر اندلس عبدالعزیز بن موسیٰ کو دمشق کی خلافت سے زیادہ کوئی چیز
عزیز نہیں۔ امیر المومنین [illegible] کہ اس خط میں ان کے ارادے
کو قبول نہیں تھا۔"

"ہمیں یہ اطلاع ملی ہے کہ عبدالعزیز بن موسیٰ کے ایوان میں
چھبیس تاج موجود ہیں۔" سلیمان بن عبدالملک نے انکشاف کیا تو لوگ
دم بخود سانس روک گئے۔

"اور ہم نے یہ بھی سنا ہے کہ عبدالعزیز بن موسیٰ نے ایک قصر تعمیر
کرایا ہے جس میں ایک ایسی خانقاہ ہے جہاں [illegible] کی تعلیم دی جاتی
ہے اور ہمیں یہ بھی خبر ملی ہے کہ [illegible]
رسم گستری نے خاص مقصد سے نصارٰی اندلس کے دل جیت لئے ہیں۔"
اہلِ دربار کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔

"ہمیں اندلس کے مسلمانوں کی طرف سے شکایات کی ایک طویل
فہرست موصول ہوئی ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ عبدالعزیز کے خیرخواہ
بھی اسے سن لیں۔"

اس کے بعد خلیفہ نے اندلس کے مسلمانوں کی جماعت کو اور
مرظفر بن عدی کو طلب کیا اور حکم دیا۔

"امیر اندلس کے وفاداروں کے روبرو امیر اندلس کے جرائم
کی تفصیل بیان کرو!"

"امیر المومنین! مرظفر بن عدی ان سب کی طرف سے [illegible]
اندلس کے امیر عبدالعزیز بن موسیٰ کی طرف سے وہاں کے [illegible]
کو پہلی شکایت یہ ہے کہ عبدالعزیز نے اپنے باپ موسیٰ بن نصیر کے
زوال سے متاثر ہو کر خود سری اختیار کی اور تکمیل مقاصد کے لئے
[illegible] سے شادی کی [illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

"امیر اندلس نے [illegible]
[illegible] سلیمان بن عبدالملک نے [illegible]
اشارہ کیا اور [illegible]

"امیر المومنین! دوسری شکایت یہ ہے کہ امیر اندلس نے اشبیلیہ
کے قریب [illegible] ایک
شاہانہ ایوان تعمیر کرایا ہے جہاں ایک خانقاہ [illegible]
ہے جہاں [illegible] کی تبلیغ کرتے ہیں [illegible]
وہاں [illegible] اسلامی [illegible] کے خلاف [illegible] کرتے ہیں۔"

[illegible]
[illegible]
تردید [illegible] کرنے کے [illegible] سلیمان بن عبدالملک نے [illegible]
کو [illegible] اشارہ کیا [illegible]

"امیر المومنین! اندلس کے مسلمانوں کو [illegible]
سب سے اہم شکایت یہ ہے کہ [illegible] عبدالعزیز نے [illegible]
اور [illegible] کہ اسلامی اصولوں کی خلاف ورزی کی [illegible]
[illegible]
نصرانی [illegible]
[illegible]
[illegible]
کو [illegible]
سے [illegible] مسلمانوں سے [illegible]

مرظفر بن عدی خاموش ہو گیا تب خلیفہ سلیمان بن عبدالملک
نے حاضرین سے مخاطب ہو کر کہا۔

"امیر اندلس کے وفاداروں میں کیا کوئی ایسا شخص ہے جو ان الزامات
کی تردید کرنا چاہتا ہے؟" لیکن ان میں سے کوئی [illegible] جرأت
نہ کر سکا۔ تب سلیمان بن عبدالملک نے [illegible]
[illegible]

"ہم [illegible]
[illegible] اندلس کے امیر عبدالعزیز بن موسیٰ کے [illegible]
[illegible] اندلس [illegible]
[illegible]

[illegible] امیر المومنین [illegible] کیا جا رہا ہے۔

مظلوم مسلمانوں کی جماعت اور امیر اندلس کا وفد دمشق سے
اندلس تک کا سفر طے کر کے گیا تھا۔ یہ سلطنت کی [illegible] اندلس پہنچ ہی تھی کہ
ان سب کے احساسات [illegible] تھے، عمر ظفر بن مدنی نے عبدالعزیز کی
عدالت کے آخری دن سے آج تک جاسوسی کے فرائض بڑے خوبصورت
انداز میں ادا کئے تھے۔ وہ اندلس کے مسلمانوں میں ایک ہردلعزیز اور
خلیفہ کی نظروں میں جانا پہچانا انسان تھا۔ اسے یقین تھا کہ عبدالعزیز
سے قتل کیا جا چکا ہے اور اندلس کے مسلمانوں کی اکثریت اب اس
کا امیر منتخب کرے گی۔ مظلوم مسلمان صرف یہ آرزو رکھتے تھے کہ اب
عبدالعزیز بن موسیٰ کی حکومت [illegible] خلیفہ کی خدمت میں خود
[illegible] کر جانا ناقابل معافی جرم سمجھا جائے گا جسے امیر کبھی معاف نہ کرے گا
اور اگر وہ [illegible] تو [illegible] اور نصاریٰ اندلس اسے ایسا
نہ کرنے دیں گے۔ —

عمر ظفر بن حبیب نے ایوب بن حبیب کی قیام گاہ پر سرداروں کو جمع
کر کے خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کا حکم سنایا اور وہ فاتح جرنیل حبیب
بن عبیدہ الفہری اور جرنیل زیاد بن بدر کے حوالے کر دیا۔ رات کا وقت تھا
شمع کی روشنی میں پکڑتے ہوئے جرنیل نے لرزتے ہاتھوں سے لفافہ
چاک کیا۔ [illegible] کی آنکھیں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں مگر جوں ہی
جرنیل حبیب بن عبیدہ الفہری نے یہ حکم پڑھا اس کا رنگ زرد ہو گیا۔
ایوب بن حبیب نے زیاد بن بدر کو اشارہ کیا۔
"زیاد بن بدر! امیر المومنین کا حکم پڑھ کر سناؤ"۔ یہ سن کر زیاد بن
بدر نے حکم نامہ پڑھنا شروع کیا۔
"جناب امیر المومنین کا حکم ہے کہ عبدالعزیز بن موسیٰ کو قتل
کر کے اس کا سر دربار خلافت میں روانہ کر دو۔" سامعین پر یکدم موت
کا سا سناٹا طاری ہو گیا۔ یہ رات قیامت کی رات تھی۔ عبدالعزیز
بن موسیٰ کے خیرخواہ [illegible] تھے کسی کی آنکھیں نم تھیں کسی کی گویائی سلب
تھی تھوڑی دیر بعد زیاد بن بدر نے کہا۔
"امیر المومنین کا دوسرا حکم یہ ہے کہ اپنی مرضی سے امیر کا انتخاب
کر لو۔" اس وقت ہر فرد حیرت کی تصویر بنا ہوا تھا مگر دربار خلافت
کا حکم اٹل تھا جس کی تعمیل مقدم تھی۔

❖

دوسری صبح عبدالعزیز بن موسیٰ فریضہ نماز ادا کرنے کے
بعد ایوان شاہی کے باغ میں خانقاہ سے باہر کھڑا [illegible]

[illegible]
گرد [illegible]
حبیب، حبیب بن عبیدہ الفہری، زیاد بن بدر [illegible] ایوب
بن حبیب [illegible] کے ہاتھوں [illegible]
عبدالعزیز بن موسیٰ نے ان سب کو حیرت سے دیکھا [illegible]
نے آگے بڑھ کر [illegible] کیا۔

"امیر اندلس! ہماری نیت [illegible] ہم آج بھی آپ
کے اور مسلمانان اندلس کے خیرخواہ ہیں لیکن دربار خلافت کا حکم ہے
اب عبدالعزیز بن موسیٰ [illegible] اس
پہنچ گیا اس نے [illegible] حبیب بن عبیدہ الفہری نے کہا۔
"یہ کوشش [illegible] امیر اندلس پر شاہی ایوان کا محل اور
پر حملہ کیا جا چکا ہے۔"

یہ سن کر عبدالعزیز بن موسیٰ [illegible] کچھ
مسلمان گرجا کی جانب سے [illegible] امیر اندلس
کی [illegible] اشبیلیہ کے چوراہے پر [illegible] گیا۔ چند لمحوں [illegible]
کے سامنے ان کے سر تن سے جدا ہو چکے تھے۔

تھوڑی ہی دیر میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح سارے شہر میں
پھیل گئی۔ لوگ دوڑے دوڑے اس چوراہے کی طرف آ رہے تھے کچھ عبرت
حاصل کرنے اور کچھ تماشہ دیکھنے کچھ ایسے تھے جو واقعی اس جوان امیر
سے ہمدردی رکھتے تھے انہوں نے اس کا [illegible] دیکھا تھا جب اسے
کوئی [illegible] نہ کر سکتا تھا اور آج اس کا [illegible] بھی دیکھ رہے تھے جب
وہ ایک عورت کے ہاتھوں تباہ ہو گیا تھا۔

شاہی [illegible] ایوان سے نکل کر عمر ظفر بن مدنی کی قیام گاہ کی
طرف جا رہی تھی اس نے عمر ظفر کی محبت میں واقعی بہت بڑا کام
انجام دیا تھا۔ شاہی قصر میں جاسوسی کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی آج
اسے اپنی خدمات کا صلہ ملنے والا تھا۔ عمر ظفر بن مدنی کی نشست گاہ
کے قریب پہنچ کر اس کے قدم لڑکھڑا گئے۔ چہرے سے حسرت کا
رنگ اڑ گیا عمر ظفر بن مدنی [illegible]
تھا شاہ [illegible] کہہ رہا تھا۔

"عمر [illegible] تمام حالات میری مرضی کے مطابق ہو گئے۔
مجھے یقین ہے ہماری [illegible] کی محنت [illegible] نہیں جائے گی۔
امیر المومنین کا دوسرا حکم ہے کہ مسلمان اپنا امیر کا انتخاب خود کر لیں [illegible]
سمجھتا ہوں کہ اس نے مسلمانوں کی سب سے بڑی خدمت کی ہے۔

پڑا امت [illegible]

سکا ہو [illegible]

شاہ [illegible]

کہا تھا کہ کسی [illegible]

[illegible]

[illegible]

اور [illegible]

رہنا خطرے سے خالی نہیں؟

وقت میں [illegible] شاہ [illegible]

محبت کی ناکامی کے [illegible]

دیوار کا سہارا لیا [illegible]

ہو گیا اس نے زیر لب کہا

"مرطفہ! آج تیری اصلیت کھل گئی [illegible]

محبوب سے [illegible]

اندلس کو تباہی کی [illegible]

[illegible]

وہاں سے [illegible]

[illegible]

تک [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

شاہ [illegible]

[illegible]

[illegible]

کر سکتی ہے؟"

[illegible]

اس [illegible]

کے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

❖

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اور [illegible]



ڈاکٹر کامران مقامی کالج میں نفسیات کا پروفیسر تھا۔ وہ بہت سنجیدہ اور متین شخص تھا۔ لڑکیوں کے لئے اس میں ایک خاص کشش تھی۔ مگر وہ خود لڑکیوں کی طرف مطلق توجہ نہیں کرتا تھا۔ لڑکیوں میں وہ مغرور اور خود پسند مشہور تھا۔ اسی کالج کی ایک لڑکی شہناز [illegible] [illegible]

(اب آگے پڑھئے)

"کون ہے؟" دروازے کی دوسری طرف سے آواز سنائی دی۔ وہ ڈاکٹر کامران ہی تھا۔

"مسٹر دروازہ کھولئے۔ یہ میں ہوں شہناز۔ آپ نے بلایا تھا" میں نے محسوس کیا کہ میری آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔

اس وقت میں ڈاکٹر کامران کے بارے میں سوچ رہی تھی اور جہاں میں کھڑی ہوں ڈاکٹر کامران کا مکان ہے یا دفتر۔ وہ تنہا رہتا ہے یا کوئی اور بھی اس کے ساتھ ہے۔ مجھے ڈاکٹر کے بارے میں کچھ بھی تو نہیں معلوم تھا۔ ایک ہلکا سا خوف دل میں جاگزیں ہوا مگر جب میں نے ڈاکٹر کامران کی متین اور سنجیدہ شخصیت پر غور کیا تو اپنا خوف بے جا اور بے بنیاد نظر آیا۔

میرے اندر ایک تجسس لہریں لے رہا تھا۔ ڈاکٹر کامران کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کا تجسس مجھے بے قرار کئے ہوئے تھا۔ آخر اس نے مجھے کس لئے بلایا تھا۔ کیا ڈاکٹر کامران اس وقت ویسا ہی سلوک اور رویہ روا رکھے گا جو وہ کلاس میں برتتا ہے یا ممکن ہے یہاں اس کی شخصیت کا کوئی دوسرا پہلو نظر آ جائے۔ ہر انسان کی تقریباً دو شخصیتیں ہوتی ہیں۔ ظاہر اور باطن۔ بہت سے لوگ اندر سے وہ نہیں ہوتے جو وہ باہر سے نظر آتے ہیں، معاشرت، رکھ رکھاؤ اور لین دین میں وہ کچھ اور ہوتے ہیں اور اپنی نجی اور ذاتی



[illegible] تھا یا

تو ــ وہ یہ ایک سوال تھا جو بری طرح میرے ذہن کو کچوکے لگا رہا تھا۔ ممکن ہے ڈاکٹر کامران کوئی مردم، الم رسیدہ اور انتقام جو شخصیت ہو۔ پھر فوراً ہی ایک اور خیال میرے ذہن میں آیا اور اس کے ساتھ ہی وحشت نے مجھے آلیا۔ اگر یہ ڈاکٹر کامران کوئی جنسی مجرم یا جنونی ہوا تو ــ تو پھر کیا ہوگا؟

بلند مقامات پر حسن اور بااثر اور باوقار شخصیت کے حامل بیشتر ایسے لوگ پائے گئے ہیں جو دیکھنے میں بہت نارمل، پرسکون، خلیق اور شفیق نظر آتے تھے۔ مگر اپنی ذاتی زندگی میں وہ بے حد گھناؤنے اور مکروہ تھے۔ وہ یا تو جنسی دیوانگی کے شکار ہوتے تھے یا اول درجے کے اذیت کوش اور اذیت رساں۔ ان کے حسین اور سنجیدہ چہرے کے پیچھے ایک خون آشام درندہ چھپا ہوتا تھا۔

تصور میں ڈاکٹر کامران کا پرکشش اور وجیہ چہرہ گھوم گیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کی جگہ سینگوں والے دیو نے لے لی۔ میں بڑی سنجیدگی سے سوچنے لگی کہ غلط آئی مجھے یہاں نہیں آنا چاہیئے تھا۔ مگر اب سوچنے کا موقع نہ تھا۔ دروازہ کھل چکا تھا اور ڈاکٹر کامران میرے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ اس کے لبوں پر اس کی وہی مخصوص مسکراہٹ تھی پلک جھپکتے ہی میرا سارا تصور دور ہو گیا۔ وہ مجھے لئے ہوئے اندر گیا اندر پہنچتے ہی میرا رہا سہا خوف بھی جاتا رہا۔ وہاں ڈاکٹر کامران تنہا نہیں تھا۔ ایک نوجوان سا شخص ہاتھ میں کوئی فائل لئے کھڑا تھا۔

ڈاکٹر کامران اس نوجوان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ مصروف گفتگو ہو گئے۔ ان کا انہماک ایسا تھا جیسے میں وہاں موجود ہی نہیں تھی۔ کہاں تو ڈاکٹر کامران نے خط لکھ کر مجھے خصوصی ملاقات کے لئے بلایا تھا اور اب یہ بے اعتنائی اور بے رخی، اس نے مجھے بالکل نظرانداز کر دیا تھا۔ جانے کیوں مجھے تذلیل کا احساس ہوا۔ بوریت سے بچنے کے لئے میں ان کی گفتگو سننے لگی۔ آخر وہ کونسی ایسی گفتگو تھی جس کی وجہ سے ڈاکٹر کامران مجھے فراموش کر بیٹھا تھا۔ بہت جلد مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ نوجوان اخبار کا آدمی تھا اور ڈاکٹر کامران سے کوئی مضمون لینے آیا تھا۔

ایک اندیشے نے میرے ذہن میں سر ابھارا اور میرا خون کھول گیا۔ تو یہ تھا اصل معاملہ۔ محترم ڈاکٹر کامران نے مجھے اس لئے یہاں بلایا تھا کہ میں ان کے مضمون کی کچھ نقلیں تیار کروں یا درست کئے ہوئے مضمون کو دوبارہ لکھوں۔ تو یہ تھا میرا مصرف۔ یہ تھی اس خصوصی اور یہ تھی ملاقات کی غرض و غایت اور اس کے [illegible] عمدہ لباس پہن کر جس بے رنگ [illegible] بیٹھ پھر بڑی شان سے یہاں آئی تھی۔ مجھے ذہن میں یہ کہ اس قیمتی لباس کی قسمت پر رونا آگیا۔

میں اس وقت سخت کبیدہ ہو گئی تھی اور مارے غصے کے کھول رہی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں خود پر طنز کرتے ہوئے کہا "شہناز! کیا تم اس خوش فہمی میں مبتلا تھیں کہ فلسفے کا پروفیسر تم پر فریفتہ ہے۔ اور وہ تم سے تنہائی میں ملنے کے لئے بے قرار ہے۔ افسوس کہ تم نے وقت برباد کیا۔"

میں نے زیبو سے خوبصورت اور گراں قیمت لباس پر حسرت بھری نظر ڈالی۔ میں یہ لباس پہن کر مضمون کی نقلیں تیار کرنے آئی تھی۔ ظاہر ہے یہ کام ایک استاد شاگرد سے اور کیا کام لے سکتا تھا۔ واپسی پر جب لڑکیاں مجھ سے اس ملاقات کی تفصیل پوچھیں گی تو میں کیا جواب دوں گی۔ مارے شرم اور خفت کے میرے منہ سے آواز بھی نہ نکلے گی۔ سارا رومانس دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔ اس ڈاکٹر کامران نے مجھے بری طرح ذلیل کیا تھا۔ اگر وہ کمرے میں داخل ہوتے ہی خلاف توقع مجھے لپٹا لیتا اور اپنی سنجیدگی اور متانت کے خول سے نکل کر مجھ پر بوسوں کی بوچھاڑ کر دیتا تو شاید میں اس قدر ہراساں اور خوش نہ ہوتی جتنی اس صورت میں ہوئی تھی۔

سخت الجھن ہوئی تھی۔ میری توجہ ان کی گفتگو سے ہٹ کر کمرے کی آرائش کی طرف چلی گئی۔ میں تنقیدی نظروں سے کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ بوریت میں آدمی اور کیا کر سکتا تھا۔ ڈاکٹر کامران کی بے رخی کا یہ عالم تھا کہ اس نے مجھے بیٹھنے تک کے لئے نہ کہا تھا صرف ایک مسکراہٹ پر اکتفا کر کے رہ گیا تھا۔ یہ تھی میری پذیرائی اور یہ تھا وہ رومانس جس کی توقع لے کر میں یہاں آئی تھی۔

کمرہ زیادہ کشادہ نہیں تھا اور وہاں فرنیچر بھی پرانا تھا ایک طرف کتابوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ اس کمرے سے ملحق دوسرے کمرے کا [illegible] اندازہ نہ کر سکی۔ بہرحال کمرے کی حالت ایسی نہیں تھی کہ میں متاثر ہوتی۔ وہاں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ میں دل ہی دل میں سوچنے لگی کہ ڈاکٹر کامران کے پاس [illegible] یقیناً [illegible] کے اور کچھ نہیں ہے اور میں اس [illegible] اور بے مروت شخص کی ذاتی زندگی کے بارے میں کیا کیا سوچ رہی تھی۔

میں نے [illegible] نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا۔

ن ہوا کہ پہلے [illegible]
اور شائستہ اس کی حالت اس کمرے سے بہتر ہو۔ ڈاکٹر کامران
پرکشش اور خوش شکل آدمی تھا۔ یقیناً اس میں جاذبیت بھی
دیکھی۔ ممکن ہے اپنی ملازمت کو سہارا بنا کر [illegible] تعلق سے
اور بہت ساری باتیں سوچنے لگی۔ ایسی باتیں جو کہ نوجوان اور
ن پسند لڑکیاں عموماً سوچتی ہیں۔ "نہیں بھئی یہ ڈاکٹر کامران اس
سادہ اور سپاٹ نہیں ہوگا۔ ضرور اس کی وجاہت کے علاوہ
کی زندگی کا کوئی رنگین پہلو بھی ہوگا" میں نے دل ہی دل میں کہا۔
کمرے کے کونے میں [illegible] تھی۔ میں ایک کرسی گھسیٹی اور
بے فکری سے بیٹھ گئی۔ میرا انداز کچھ ایسا تھا جیسے کہ ڈاکٹر کامران پر
ہر کر رہی ہوں کہ بری طرح تھک گئی ہوں اور سخت اکتاہٹ محسوس
رہی ہوں۔ مگر ڈاکٹر کامران نے کوئی توجہ نہیں دی۔ بدستور گفتگو میں
مگن رہا۔ میں ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔

ان کی گفتگو جاری رہی۔ [illegible] گفتگو تھی جو ختم ہونے
میں نہ آتی تھی۔ ڈاکٹر کامران اس وقت پہلے سے زیادہ [illegible]
رہا تھا۔

خدا خدا کرکے وہ گفتگو ختم ہوئی اور نوجوان چلا گیا۔ نوجوان
کے جاتے ہی ڈاکٹر کامران میری طرف مڑا۔ اس کے لبوں پر بڑی [illegible]
اور مہربان مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ میری ساری اکتاہٹ اور کوفت پلک
جھپکتے میں ہوا ہو گئی۔ وہ میرے قریب آیا اور اپنی مصروفیت اور
میرے انتظار کی زحمت کے لئے معذرت چاہنے لگا۔ پھر وہ مجھے
دوسرے کمرے میں لے گیا۔ کمرہ جس کے بارے میں میرا خیال تھا کہ
خوابگاہ ہوگی، مطالعے کا کمرہ ثابت ہوا۔ یہاں فرش پر ایک نفیس قالین
بچھا ہوا تھا اور ایک گوشے میں لکھنے کی میز رکھی ہوئی تھی۔ میز پر کتابوں
کا انبار لگا ہوا تھا۔ قریب ہی ایش ٹرے تھی جس میں سگریٹ کے
ٹوٹے پڑے ہوئے تھے۔ دیوار پر چند جدید ترین طرز کی تصویریں
آویزاں تھیں۔

میں نے ان تمام چیزوں پر نظریں دوڑاتے ہوئے مختصر سے
وقت میں طے کر لیا تھا کہ کسی نہ کسی طرح ڈاکٹر کامران سے اس کی اس
وقت کی بے اعتنائی کا شکوہ ضرور کروں گی۔ اس نے مجھے [illegible] کر
بلایا تھا۔ اسے اس طرح پیش آنا چاہئے تھا۔ میں ڈاکٹر کامران کی
طرف مڑی۔ "آپ نے خاصا انتظار کرا [illegible] کر جانا چاہئے تھا کہ پہلے
مجھے اس کمرے میں بٹھا دیتے پھر چاہے جتنی دیر گفتگو کرتے۔" میرا

[illegible] دی۔
اس کے لئے پہلے ہی معذرت طلب کر چکا ہوں۔" ڈاکٹر کامران نے کہا
مسکرایا۔ "چونکہ وقت کے [illegible] بری عادت ہے کہ جب
تک کسی سے بات کر رہا ہوتا ہوں تو دوسرے کی طرف توجہ نہیں دے پاتا۔"
"آپ مجھے سائیکالوجی کے بعد ملنا چاہئے تھا۔" میں نے احتجاج
کے طور پر کہا۔

میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر کامران مجھے حیرت بھری نظروں سے
دیکھ رہا تھا۔ طنزیہ لہجے میں بولا۔ "تم واقعی کس قدر نازک مزاج واقع
ہوئی ہو" پھر وہ قہقہہ لگا کر خوشی سے بولا۔ "اور خاص طور پر تم جس قدر
خوبصورت ہو اتنی ہی حساس بھی۔ بہت مغرور اور خود سر بھی ہو۔"

اس وقت ڈاکٹر کامران کلاس کے ڈاکٹر کامران سے بہت
مختلف نظر آ رہا تھا۔ سو میری ساری بے اعتنائی کی جگہ شوخی نے
لے لی تھی جو کہ اس کے مزاج کے خلاف تھا۔ مجھے ڈاکٹر کامران کی گفتگو
سے حوصلہ ملا۔ ہمت کر کے بولی۔ "سر آپ عورتوں کے معاملے میں بہت
تجربہ کار معلوم ہوتے ہیں۔"

"تم بہت شریر ہو۔ میں نے تمہارے انتخاب میں غلطی نہیں
کی" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی وہ میرے
بے حد قریب آ گیا اور مجھ پر جھکتے ہوئے عجیب سے لہجے میں بولا۔ "تم
بلاشبہ خوبصورت اور پرکشش ہو۔ مگر اس چہرے کے پیچھے فہم و فراست
بھی ہے۔ میں اپنے شاگردوں کو خوب اچھی طرح سمجھتا ہوں اور
ان میں سے میں نے ذہین ترین شاگرد کا انتخاب کیا ہے۔"

انتخاب؟ انتخاب؟ خدایا یہ کس قسم کا انتخاب ہے۔ میں الجھ کر
سوچنے لگی۔ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ پوچھ بیٹھی۔ "سر آپ نے مجھے
کس کام کے لئے منتخب کیا ہے؟"

جواب دینے کی بجائے وہ [illegible] کمرے میں ٹہلنے لگا۔ کچھ دیر
بعد وہ واپس آ کر بیٹھ گیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ "میں جانتا ہوں تم
کل سے بہت پریشان ہو۔ میرے اس طرح بلانے نے تمہیں اضطراب میں
مبتلا کر دیا ہے اور تم یہ جاننے کے لئے بے تاب ہو کہ آخر میں نے
تمہیں کس غرض سے بلایا ہے --- میرا خیال ہے کہ [illegible]
کام لینا چاہئے۔ کچھ باتیں کر لیں تاکہ وہ [illegible] واقفیت حاصل
کریں، پھر وہ [illegible] بھی آ جائے گا --- [illegible] پر اعتبار کرنا اور
اس سے [illegible] کی [illegible] بات ہے۔"

ڈاکٹر کامران کس حد تک صحیح کہہ رہا تھا۔ اس کے سامنے میں بھی بھولی صورت منع کرنے کے باوجود اپنی سہیلیوں کو اس کا خط دکھا چکی تھی اور متوقع ملاقات کے بارے میں بھی بتا آئی تھی۔ مگر کیا یہ ڈاکٹر کامران کا محض خیال تھا یا وہ واقعی میری اس حقیقت سے باخبر ہو گیا تھا۔ وہ بہرحال بے وقوف نہیں تھا اور بقول خود عورتوں اور ان کے مزاج و عادات کو سمجھتا تھا۔ میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی: "فلسفہ اور عورت شناسی دو بڑی مختلف چیزیں ہیں۔"

"فلسفی بھی انسان ہوتے ہیں اور عورتوں سے متعلق اپنی رائے رکھتے ہیں۔"

"صرف رائے رکھتے ہیں ورنہ عملی طور پر وہ عورت کی نفی کرتے ہیں۔" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں تمہارا اشارہ سمجھ رہا ہوں۔" ڈاکٹر کامران میرے طنز کو محسوس کرتے ہوئے بولا: "لڑکیاں مجھے خود پسند، خشک، بداخلاق اور جانے کیا کیا کہتی رہتی ہیں۔ ان کی توقعات بڑی عجیب ہیں۔ وہ کلاس اور رقص گاہ میں فرق محسوس نہیں کرتیں۔ وہ توقع رکھتی ہیں کہ میں کلاس میں تدریس کے دوران ہی انہیں عاشقانہ اور جانبازانہ نظروں سے دیکھنا شروع کر دوں۔ بلکہ اگر ممکن ہو تو دو چار ہوائی بوسے بھی اڑا دوں ـــــ ایک شاگرد اور محبوبہ میں کچھ تو فرق ہونا چاہیئے۔ میں حیران ہوں کہ تمہیں یہ شکایت کیوں کر پیدا ہوئی۔"

ڈاکٹر کامران کے آخری جملے میں میرے لئے توہین کا پہلو نکلتا تھا۔ اس سے مجھے کچھ دکھ پہنچا۔ اعتراض کے طور پر بولی: "یہ میری ذات کا مسئلہ نہیں ہے۔ میں تو دوسری لڑکیوں کے خیالات کی ترجمانی کر رہی ہوں۔ وہ آپ کو انتہائی مغرور، خشک اور بداخلاق جانتی ہیں۔"

"لڑکیاں!" ڈاکٹر کامران عجیب سی ہنسی ہنسا۔ "ان لڑکیوں کا کیا کہنا۔ وہ تو ہر مرد سے تجسس و ستائش کی تمنا رکھتی ہیں، خواہ وہ بنیا ہو، جنگی ہو یا فلسفے کا پروفیسر۔ انہیں تو بس اپنی تعریف چاہیئے کوئی ہر دم ان کی تعریف میں رطب اللسان رہے۔"

ڈاکٹر کامران کا لہجہ خاصا تلخ ہو گیا تھا اور میں سوچ رہی تھی کہ گفتگو کس نہج پر پہنچ رہی ہے۔ میں کس لئے آئی تھی اور کیا شروع ہو گیا تھا۔ میرے اور ڈاکٹر کامران کے درمیان باقاعدہ جھڑپ کی سی فضا قائم ہو گئی تھی۔ اس نے بھی غالباً اس بات کو محسوس کر لیا۔ ہنستا ہوا بولا: "ہم ایک دوسرے سے لڑنے لگے۔ حالانکہ ہماری ملاقات کا مقصد یہ نہیں تھا۔ پہلے کیا پھر بھی ... کے لئے اس کا ..." وہ اٹھا اور دوبارہ کمرے میں ٹہلنے لگا۔ پھر میری طرف ... ہوئے بولا: "تم خوبصورت اور ذہین ہونے کے ساتھ تم حوصلہ مند ہو۔ تمہارے اندر برداشت کم ہے، سمجھ میں نہیں آتا اگر تم برا محسوس کرو تو کیا کروں۔" اس کے بعد اس کا لہجہ جارحانہ نہیں تھا۔ وہ بہت نرمی سے بول رہا تھا۔ مگر ہچکچاہٹ اور شک و شبہ واضح طور پر عیاں تھا۔

میں اٹھ کر اس کے قریب گئی اور بڑی اپنائیت سے بولی: "آپ یہ بات آج کے سلسلے میں کہہ رہے ہیں۔ یعنی وہ خصوصی ملاقات"

"ہاں تم ایک مدت سے میری نظروں میں تھیں۔ بلکہ تمہارا پورا گروپ میری نظروں میں تھا۔ ان میں سے میں نے صرف تمہیں پسند کیا۔ اس لئے کہ تم ان میں سب سے ذہین، متحرک، خوش لباس اور زندہ دل ہو۔"

انکشاف کا وہ لمحہ میرے لئے بڑا حیران کن تھا تو ہم سب بہت دنوں سے ڈاکٹر کامران کی نظروں میں تھے، اور وہ خصوصی طور پر مجھے نظروں میں رکھے ہوئے تھا۔ بڑا تعجب! میں ہنستے ہوئے ڈاکٹر کامران سے بولی: "آپ سراغرسانی کا ادارہ کیوں نہیں کھول لیتے۔ میں کہتی ہوں بہت کامیاب رہیں گے۔ اس لکھائی پڑھائی سے جان بھی چھوٹ جائے گی اور آمدنی بھی بے حساب ہو گی۔ چونکہ آپ کا تعلق فلسفے اور نفسیات سے ہے اس لئے اس میدان میں آپ کا کوئی حریف ثابت نہ ہو سکے گا ـــــ کل تک ہمیں یہ بھی یقین نہیں تھا کہ آپ ہمیں پہچانتے بھی ہوں گے۔ یہ میری نہیں تمام سہیلیوں کی رائے ہے۔ مگر معلوم ہوا کہ آپ ہم سب میں دلچسپی رکھتے تھے۔"

"سب نہیں، صرف تم۔" ڈاکٹر کامران مسکراتے ہوئے بولا۔ پھر ذرا سنبھلتے ہوئے کہا: "اچھا اب شرارت چھوڑ دو۔ میں بس انسان ہوں۔ میرے بھی کچھ مسائل اور ضرورتیں ہیں اور اس سلسلے میں میں نے تمہیں زحمت دی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم میرے اعتماد کو مجروح نہیں کرو گی۔"

"اگر آپ میرے متعلق اس قدر شکوک میں مبتلا ہیں تو جانے دیجئے۔ میرے لئے یہ ملاقات اور بے تکلفی کی فضا ہی بہت کافی ہے۔ یہ ملاقات خصوصی نہ بن سکی تو کوئی حرج نہیں۔" ڈاکٹر کامران کا گومگو کا عالم اور حد سے زیادہ احتیاط مجھے کھلنے لگی تھی۔ شک و شبے اور بے اعتمادی کی فضا میں کوئی بات قرینے سے نہیں ہو سکتی یہ ایک طے شدہ امر ہے۔

میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر کامران بھی بڑی گہری نظروں سے
دیکھ رہا تھا۔ جیسے وہ مجھے میرے جملوں کی سچائی پرکھنے کی کوشش
کر رہا ہو۔ میں ڈری کہ کہیں وہ اپنے ارادے سے منحرف نہ ہو جائے
انتہائی خوشامدانہ لہجے میں بولی "سر جب آپ مجھے اعتماد کا شرف
بخش رہے ہیں تو کیسے ممکن ہے کہ میں بدعہدی کروں۔ پھر اس کے
علاوہ آپ کے اور میرے درمیان استاد اور شاگرد کا رشتہ بھی تو موجود
ہے، اور یہ رشتہ کچھ کم مضبوط نہیں ہوتا۔"
ڈاکٹر کامران کچھ متاثر نظر آ رہا تھا۔
"میں تم سے ایک عجیب درخواست کرنے والا ہوں۔" بالآخر
اس نے کہا۔ وہ براہ راست میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ "ممکن ہے
قبول کر لو، یا شاید رد کر دو۔ اور اسی کا احتمال زیادہ ہے بہرحال دونوں
ہی صورتوں میں، میں تم سے گزارش کروں گا کہ تم اسے اپنی ہی ذات
تک محدود رکھو گی۔" وہ رکا۔ اس کی آنکھیں کسی انجانے جذبے سے چمک
رہی تھیں۔ پلکیں جھپکائے بغیر وہ دوبارہ مجھ سے مخاطب ہوا "میں
جانتا ہوں کہ سہیلیوں سے تمہاری بڑی بے تکلفی ہے اور تمہارے
درمیان کوئی راز، راز نہیں رہتا۔ مگر اس کے باوجود میں تم سے درخواست
کروں گا کہ تم یہ بات انہیں نہیں بتاؤ گی۔ کیا تم وعدہ کرتی ہو؟"
"وعدہ رہا۔" میں نے دوستانہ لہجے میں کہا حالانکہ میں اچھی
طرح جانتی تھی کہ میں ایک گھناؤنا جھوٹ بول رہی ہوں۔
"میں نے جب بھی کسی عورت پر اعتبار کیا سوائے پشیمانی
کے کچھ نہ حاصل ہوا۔" ڈاکٹر کامران نے بہت کرب ناک لہجے میں کہا۔
میں محسوس کئے بغیر نہ رہ سکی کہ وہ بہت دکھی اور رنجیدہ انسان ہے
اس وقت اس کے چہرے کا دبدبہ اور طنطنہ جانے کہاں غائب ہو گیا
تھا۔ اس کی جگہ یاسیت اور محرومی نے لے لی تھی۔ ہاں وہ اندر سے
بہت ٹوٹا ہوا تھا۔ اس کی حالت اس وقت کچھ ایسی رحم طلب اور
افسوسناک تھی کہ میں دل ہی دل میں شرمندگی محسوس کرنے لگی۔ دکھ
ہوا کہ میں اس سے جھوٹ کیوں بولی۔ وہ بہت ذہین اور زود فہم دماغ
کا آدمی تھا۔ اس نے پہلے ہی عورت کی ایک منفی صفت کی طرف
اشارہ کر دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ عورت پر مشکل سے اعتماد کیا جا
سکتا ہے۔ میں آپ ہی آپ خود کو ذلیل و حقیر محسوس کرنے لگی ڈر کے
خوف کے مارے تھا کہ ڈاکٹر کامران کی طرف دیکھ بھی نہ سکی۔
"بہرحال اب جو ہو، سو ہو۔ میں نے تم پر اعتماد کر لیا ہے
اور تم نے راز داری کا وعدہ بھی کیا ہے حالانکہ اپنے تجربے کی
روشنی میں مجھے یہ بھی [illegible] کہ [illegible]
اس کے برعکس وہ مجھ سے [illegible] سر آپ کہاں
بیٹھے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں بچپنے سے تمام عمر تک [illegible]
میں نے کے برعکس بڑی ملاوٹ سے لیا۔
"بات ہرگز بھی نہیں ہے تم میری درخواست قبول کر لو یا رد کر دو۔
دونوں صورتوں میں ذلیل اور منفی سوالات نہیں کرو گی۔ وقت آنے
پر میں خود وضاحت کر دوں گا۔" ڈاکٹر کامران کا لہجہ قطعی آمرانہ
ہو گیا۔ اس کا ہر جملہ میرے تجسس اور آتش شوق کو بڑھاتا جا رہا تھا۔
میری برداشت جواب دے گئی۔ جھنجھلا کر بولی "سر تمہید بہت
طولانی ہو گئی ہے۔ اس حد تک کہ اب میرے اعصاب اس کے
متحمل نہیں ہو سکتے۔"
میرے لہجے اور انداز تخاطب پر ڈاکٹر کامران چونک پڑا۔ اس
نے مجھے غور سے دیکھا اور خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔
"شہناز! کیا تم میری بیوی بننا پسند کرو گی۔ فرضی بیوی، ایک مختصر
مدت کے لئے۔"
میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ڈاکٹر کامران کی طرف
دیکھا وہ بے حد سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ میں نے سوچا شاید
مجھ ہی سے سننے میں غلطی ہوئی ہے یا ڈاکٹر کامران سے شدید
جذباتی وابستگی کی وجہ سے وہم ہوا۔ میں نے ہکلاتے ہوئے پوچھا
"سر کیا کہا آپ نے؟" ڈاکٹر کامران نے پرسکون لہجے میں ایک بار پھر
اپنی بات دہرائی اب شبہے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ میرے کانوں میں
گھنٹیاں سی بج رہی تھیں۔ میں ڈاکٹر کامران سے ہر قسم کی خواہش کی
توقع رکھتی تھی مگر اس عجیب و غریب خواہش کی طرف ذہن نہ گیا تھا
پھر مجھے ڈاکٹر کامران کی یہ بات بڑی مضحکہ خیز نظر آئی، کہیں وہ کوئی
سنجیدہ مذاق تو نہیں کر رہا تھا۔ مجھ سے رہا نہ گیا یہ بات ہی ایسی تھی۔
ایک بار پھر پوچھ بیٹھی۔ "سر آپ نے کیا کہا تھا؟"
اس بار ڈاکٹر کامران کی پیشانی پر بل پڑ گئے اور وہ مجھے حیرت
بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔ پھر شاید اسے میری بے بسی پر رحم آ گیا
وہ آگے آیا اور میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے انتہائی پرسکون
اور نرم لہجے میں بولا "تم سخت تعجب اور حیرت زدہ ہو۔ اور اس
میں حق بجانب بھی ہو۔ بات ہی کچھ ایسی ہے کہ ذہن قبول نہیں کرتا۔
مگر میں نے جو کچھ کہا ہے وہ مذاق نہیں ہے۔ دراصل یہ کام اپنے
والد صاحب کے لئے انجام دے رہا ہوں۔"

ڈاکٹر کامران کا انداز دوستانہ تھا۔ اس کا ایک ہاتھ میرے شانے پر رکھا ہوا تھا اور میں ہاتھوں میں انگلی پھیر رہی تھی۔ اس کے ہاتھ کا لمس اور مگر حرارت مجھے بے خود کئے دے رہے تھے۔ میں نے مسکرا کر اس سے کہا: "آپ کی خواہش میرے لئے بہت ہی ناقابل یقین سی ہے۔ میں آپ کے والد صاحب کو کس طرح فریب دے سکوں گی؟ اور پھر سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں کروں۔ کیا آپ کے والد صاحب آپ کی بیوی سے واقف نہیں ہیں؟"

ڈاکٹر کامران نے میرے شانے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا: "دیکھو ہمارے درمیان طے ہوا تھا کہ کوئی سوال نہیں کرو گی۔"

"اگر کچھ پوچھوں گی نہیں تو یہ عجیب و غریب کردار کس طرح ادا کر سکوں گی؟" میں نے کہا۔

"کیا بیوی بننا کوئی عجیب بات ہے؟" خلاف توقع اس بار اس کا لہجہ کچھ شوخ تھا۔ شاید وہ موضوع تبدیل کرنا چاہتا تھا۔

"فرضی بیوی! کیا یہ عجیب بات نہیں ہے؟" ڈاکٹر کامران نے میرے شانے پر سے ہاتھ اٹھا لیا اور کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ پھر مسکراتے ہوئے بولا: "یہ عجیب بات سہی مگر میں اپنی خواہش تم پر مسلط تو نہیں کر رہا ہوں۔ تم چاہو تو انکار بھی کر سکتی ہو۔ رہا کچھ پوچھنے کا سوال تو میں تمہارے صرف انہی سوالوں کے جوابات دے سکوں گا جن سے کہ تمہیں یہ کردار بخوبی ادا کرنے میں مدد مل سکے۔ میں تمہیں چوبیس گھنٹے کا وقت دیتا ہوں۔ کل اسی وقت آکر بتا جاؤ کہ تمہارا فیصلہ کیا ہے۔ جواب 'ہاں' یا 'نہیں' میں ہونا چاہیے۔"

"یہ کوئی جنگ اور امن کا مسئلہ نہیں ہے کہ غور و خوض کے لئے وقت چاہیے۔ سیدھا اور صاف مسئلہ ہے۔ میں ہاں یا نہیں یہاں بھی کر سکتی ہوں۔ اگرچہ آپ کی خواہش بہت پر اسرار اور پیچیدہ ہے مگر اس کے باوجود میرا جواب ہاں میں ہے۔ آپ میرے استاد ہیں، میں آپ کی خواہش کو حکم کا درجہ دیتی ہوں۔ مگر الجھن بہر حال رہے گی۔ میں جو کچھ کروں گی اس کا مقصد تو معلوم ہونا چاہیے۔"

"میں نے کہا تھا کہ مجھے عورتوں کا گہرا تجربہ ہے اور اسی تجربے کی بنیاد پر کہتا ہوں کہ عورتوں میں دو دلی کی کیفیت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ یعنی وہ کوئی فیصلہ کر لینے کے بعد سوچتی رہتی ہیں کہ خدا جانے ان کا فیصلہ صحیح ہے یا غلط۔ اسی لئے کہتا ہوں کہ گھر جا کر اطمینان سے سوچو اور پھر کل آکر اپنے حتمی اور آخری فیصلے سے آگاہ کرو۔"

"سر آپ کو تو فلسفے کی بجائے زن شناسی پر لیکچر دینا چاہیے

کیوں کہ آپ بہترین زن شناس ہیں" ڈاکٹر کامران نے ... کہا۔ "درست ہے کہ مجھے محبت کرنے سے ... ہے مگر وقت ضائع نہیں کرتا۔" مجھے دکھ سا ہوا۔ "یعنی آپ محبت کے قائل نہیں ہوتے؟" میں نے پوچھا۔ ڈاکٹر کامران سوچ میں پڑ گئے۔ اس کی پیشانی پر سلوٹیں پڑ گئی تھیں۔ کچھ دیر بعد سر ہلاتے ہوئے بولے: "آج کے مادی دور میں کون کسی سے سچی محبت کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ خواہ وہ کوئی بھی ہو، عورت مرد کی تخصیص نہیں ہے۔ جسے بھی روحانی محبت کہتے ہیں وہ ناپید ہو گئی ہے۔ سب کے سب دولت اور اقتدار کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ آدمی مشین اور ایٹم زدہ ہو گیا۔ اس سے عشق و محبت کی صلاحیت چھن گئی ہے۔ اب محبت جگر تسکین نفس کا وسیلہ ہے۔ اب محبت نام ہے جسمانی تلذذ کا اور ادب کی تحریریں بھی اس بات کا پرچار کرتی ہیں۔ اگر کوئی سچی محبت کی بات کرتا ہے تو وہ جھوٹا اور ریاکار ہے یا بے چارہ بالکل بھولا اور معصوم ہے۔ ہم تم عشق کے بارے میں کتابوں میں پڑھتے آئے ہیں وہ صرف کتابوں تک محدود ہے۔ اس کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

ڈاکٹر کامران کا چہرہ قدرے سرخ ہو گیا تھا۔ اس کا لہجہ اور بولنے کا انداز ویسا ہی ہو گیا تھا جیسا کہ کلاس میں لیکچر کے دوران ہوتا تھا۔ میں نے سوچا اگر درمیان میں ٹوک دیا تو جانے کب تک بولتے رہیں۔ چنانچہ اس کے رکتے ہی میں فوراً بول پڑی: "عورت اور محبت کے متعلق آپ کے نظریات یہ ہیں تو آپ نے شادی کی یا نہیں۔ یہ آپ اپنی انگلی میں انگوٹھی کیسے پہنے ہوئے ہیں؟"

ڈاکٹر کامران بے ساختہ مسکرا دیا: "تم بہت ذہین ہو۔ تمہاری تیزی اور طراری مجھے پسند آئی ہے۔ تم کل رات آٹھ بجے آنا اور اپنے فیصلے سے آگاہ کرنا۔ پھر اس کی روشنی میں تمہارے سوالوں کے جوابات دے سکوں گا۔ اگر تم نے میری فرضی بیوی بننا منظور کر لیا تو میں اپنے طور پر تمہاری معلومات میں اضافہ کروں گا۔ اچھا اب جاؤ، وقت کافی ہو چکا ہے اور مجھے بھی کچھ کام کرنے ہیں۔ مگر یاد رہے کہ تم نے وعدہ کیا ہے کہ اس ملاقات کے بارے میں کسی کو نہیں بتاؤ گی۔ اخلاقی طور پر تم پابند ہو گی۔" اس نے اس طرح ہاتھ ہلایا جیسے کہ یہی ملاقات کا اختتام ہو۔

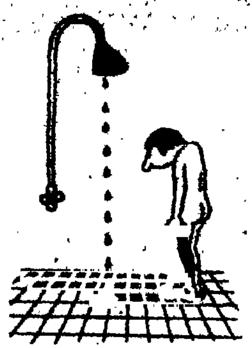
میں اٹھ کھڑی ہوئی اور دروازے کی طرف بڑھتی ہوئی بولی: "میں نے اپنے فیصلے سے آپ کو آگاہ کر دیا ہے۔ لیکن ...

خواہش پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ مجھے وہ جانتے ہوئے بھی [illegible]
فرضی بیوی بننے کے لئے تیار ہوں۔ تاہم میں کل آپ کو حتمی فیصلے
سے آگاہ کروں گی۔ شاید آج رات مجھے نیند بالکل نہ آئے۔"

"اچھا خدا حافظ۔ کل رات آٹھ بجے میں تمہارا انتظار کروں گا
میری دعا ہے کہ آج رات تمہیں اچھی نیند آئے۔" اس نے اپنی جگہ
سے اٹھنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ میں الجھے ہوئے دماغ کے ساتھ بوجھل سے
وہاں سے نکل آئی۔

باہر خاصی خنکی تھی۔ میں نے ٹیکسی پکڑی اور زبیدہ کے گھر کی
طرف روانہ ہوگئی۔ گھر میں داخل ہوئی تو معلوم ہوا کہ گھر پر کوئی نہیں
ہے۔ آیا سے زبیدہ اور لڑکیوں کے بارے میں پوچھا تو اس نے لاعلمی
کا اظہار کیا۔ میں نے غسل خانے کا رخ کیا۔ منہ ہاتھ دھو کر زبیدہ کا
لباس تبدیل کرنے میں مصروف ہوگئی۔ اس دوران میں مسلسل ڈاکٹر کامران
کے بارے میں سوچتی رہی۔ کتنی عجیب خواہش کی تھی اس نے۔ خدا
جانے پس پردہ کیا تھا۔ کہیں کسی مصیبت میں تو گرفتار ہونے نہیں
جا رہی تھی۔ اب جو کچھ ہو سو ہو، فیصلہ میں نے کر لیا تھا۔ یوں بھی میں
تجسس قسم کی لڑکی تھی۔ میں ڈاکٹر کامران کو کھوجنا چاہتی تھی کہ آخر وہ
ہے کیا شے! اسے دیکھنے جاننے اور سمجھنے کا اس سے بہتر موقع
اور کون سا ہو سکتا تھا، میں اس کی بیوی جو بننے جا رہی تھی ۔۔۔ ذہنی
اور وقتی طور پر ہی سہی۔ مگر اس کے ساتھ ہی ایک مصیبت میں گرفتار بھی
تھی۔ ڈاکٹر کامران نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں کسی کو کچھ بتاؤں گی نہیں
مگر یہ کیسے ممکن تھا۔ لڑکیوں سے کوئی بات چھپانا ناممکن تھا۔ قطعی ناممکن
تھا۔ مجھے کل رات بھی ڈاکٹر کامران سے ملنے جانا تھا، اور اسی گھر سے
جانا تھا۔ پھر میں یہ سب لڑکیوں سے کیسے چھپا سکوں گی۔ نہیں یہ عملی
طور پر ناممکن تھا۔ میں رازداری کی شرط پر قائم نہیں رہ سکتی تھی۔

کل سے آج تک میرے ذہن پر عذاب ٹوٹتے رہے تھے پہلے پہل
کا تصور اور اب یہ ڈاکٹر کامران کا نیا شوشا، دل و دماغ پر بڑی کاری
چوٹ پڑی تھی اور میں منتشر ہو کر رہ گئی تھی۔ ڈاکٹر کامران بہت
پراسرار اور پیچیدہ ثابت ہوا تھا۔ میں باہر سوچ رہی تھی کہ آخر ڈاکٹر
کامران کی اس عجیب و غریب خواہش کے پس پردہ کیا ہے کہیں وہ
فراڈ تو نہیں ہے، وہ کوئی گہرا کھیل تو نہیں کھیل رہا ہے، آخر اس کا
نتیجہ کیا نکلے گا۔ میں خود کو تباہ و برباد تو کر نہیں بیٹھوں گی۔ پھر میری
نظروں میں ڈاکٹر کامران کا وجیہہ پر وقار اور معصوم چہرہ گھوم گیا۔ نہیں
نہیں وہ فراڈ نہیں ہے، مجھے میرے دل نے گواہی دی۔ وہ حقیقتاً کسی



مصیبت میں پھنسا ہوا ہے جو میری مدد کا طالب ہے۔ آخر وہ میرا
استاد ہے اور میں اس کی شاگرد ہوں، اس کا مجھ پر حق بنتا ہے۔ یہ تو
میری خوش قسمتی ہے کہ اتنی لڑکیوں میں اس نے مجھے منتخب کیا ہے۔
اسے مجھ پر اعتماد ہے۔ اس پر اعتماد ہی کا معاملہ ہے اور شاید اسی
لئے اس نے رازداری کا وعدہ لیا ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی
اور سے بات نکلے اور معاملہ دوسروں تک پہنچے ۔۔۔ مگر کیا میں رازداری
کی شرط پر برقرار رہ سکوں گی۔ بس یہی بات تھی جو مجھے کھائے جا رہی
تھی۔ ایک طرف میرا استاد، میرا محبوب تھا جو کسی آفت میں گرفتار
تھا اور مجھ سے مدد کا طالب تھا۔ دوسری طرف عزیز از جان اور
راز دار دوست تھیں جن سے میں کوئی بات مخفی نہ رکھ سکتی تھی۔ میں
عجیب دوراہے پر تھی۔ میرا سر گھوم رہا تھا۔ ذہن سائیں سائیں کر رہا
تھا اور سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔ مارے بے بسی اور بے چارگی کے میری
آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

پھر جانے کیا ہوا کہ میں بستر پر گر پڑی اور پھوٹ پھوٹ کر
رونے لگی۔ میں نے غور کیا تو اپنی بے کلی اور بے چینی کی وجہ سمجھ میں
آ گئی۔ ڈاکٹر کامران نے مجھے فرضی بیوی بنانے کی خواہش کی تھی۔
سوال یہ تھا کہ اس نے مجھ سے سیدھے سادے انداز میں شادی کا ذکر
کیوں نہیں کیا۔ کیا میں سچے معنوں میں اور حقیقی طور پر اس کی
بیوی بننے کے قابل نہیں تھی۔ مجھے ڈاکٹر کامران کی اس خواہش میں
اپنی تذلیل کا احساس ہوا تھا اور اس احساس نے مجھے
بے حال کر دیا تھا۔ ایک تو محبت کی چوٹ اور پھر [illegible] کی اس
سے بڑھ کر اور کیا تذلیل ہو سکتی تھی۔

میں ڈاکٹر کامران کے افسوسناک رویے پر غور کر رہی تھی کہ میرے دروازے پر دستک ہونے کی آواز سنائی دی اور میں اچھل کر بستر پر بیٹھ گئی۔ پھر آئینے کے سامنے جا کر اشک آلود چہرہ صاف کرنے لگی اسی وقت زبیدہ کی آواز سنائی دی۔ وہ آپا سے میرے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ آپا نے بتایا کہ میں واپس آ گئی ہوں اور کمرے میں لباس تبدیل کر رہی ہوں۔

آپا کا جملہ ختم نہیں ہوا تھا کہ لڑکیاں بھرا مار کر میرے کمرے میں داخل ہو گئیں۔ زبیدہ سب سے آگے تھی۔ قریب آ کر وہ غور سے میرا چہرہ دیکھنے لگی۔ پھر اچانک اس نے میری ٹھوڑی پکڑ لی اور چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے حیرت زدہ لہجے میں بولی "خدا مجھے موت دے کیا تم رو رہی ہو، تمہاری آنکھیں سرخ ہیں اور چہرہ تمتمایا ہوا ہے۔"

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔" میں نظریں چراتے ہوئے بولی۔

"جھوٹ مت بولو شہناز! تم واقعی رو رہی ہو۔ تمہارا چہرہ چغلی کھا رہا ہے۔ کیا ہوا آخر؟" شیریں بول پڑی۔

"بخدا کوئی خاص بات نہیں ہے، تنہا تھی اور۔۔۔"

"اور تنہائی کی وجہ سے آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔" شیریں نے میرا جملہ اچک لیا۔

زبیدہ نے شیریں کو گھور کر دیکھا، شیریں نے جلدی سے منہ دوسری طرف کر لیا۔ زبیدہ نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا اور چمکارنے کے انداز میں بولی "کوئی خاص بات ضرور ہے ورنہ تم تو بہت زندہ دل اور ہنس مکھ ہو۔ میں نے تمہیں کبھی بھی اداس یا روتے ہوئے نہیں دیکھا۔"

"[illegible] اچانک ہی بولی۔ اس نے رخ میری طرف کیا اور شرارت آمیز لہجے میں بولی "کہیں پھر جیسا واقعہ تمہارے ساتھ تو نہیں پیش آ گیا۔ فلسفے کا پروفیسر کوئی پیش دستی تو نہیں کر بیٹھا؟"

تمام لڑکیاں ہنس پڑیں۔ میرے لبوں پر بھی پھیکی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اس فلسفے کے پروفیسر سے تو پیش دستی یا زبردستی کی توقع رکھنا عبث ہے۔ وہ کتابوں کے علاوہ ہر اور چیز کو ہاتھ لگانا گناہ سمجھتا ہے۔"

"تو پھر آخر بات کیا ہے۔ تم رو کیوں رہی تھیں؟" حمیدہ نے پوچھا۔

"یہ لازمی نہیں ہے کہ جب کوئی خاص بات ہو تبھی آدمی روئے۔ کبھی کبھی آنسو یوں ہی بے وجہ ٹپک پڑتے ہیں۔" میں نے کہا پھر لہجے کو قدرے خوشگوار بناتی ہوئی بولی۔ "اچھا اب ذرا خاموش رہو، تم لوگ تو بیچ بیچ ہی میں ٹانگ اڑاتی ہو۔ دوسرے کو بولنے کا موقع ہی نہیں دیتیں۔"

پروین نے مجھے غور سے دیکھا اور مسکراتی ہوئی بولی "میں نہیں مانتی شہناز! تمہارے یہ آنسو بے سبب نہیں ہیں۔ ایسا تو نہیں یہ محبت کے آنسو ہوں۔ کسی طوفانی محبت کا سرآغاز۔ بعض لڑکیاں محبت کر کے نہیں سہار پاتیں اور مارے مسرت کے رو پڑتی ہیں۔"

"کیوں بکواس کرتی ہو۔" شیریں درمیان میں بول پڑی۔ "شہناز کوئی چودہ سالہ لڑکی نہیں ہے۔ وہ ہم سب سے زیادہ چالاک اور ہوشیار ہے۔ اچھا اب تم اپنی چونچ بند رکھو اور اسے کچھ کہنے دو۔"

"آج رات مجھے گھر میں رکنا تھا کیونکہ میرا منگیتر آنے والا تھا، اور جب میرا منگیتر آنے والا ہوتا ہے تو امی جان کہیں باہر نہیں نکلنے دیتیں۔ میں نے انہیں بڑی مشکل سے راضی کیا ہے اور بھاگی آئی ہوں کہ تمہارا اور ڈاکٹر کامران کا قصہ سنوں۔ دیکھو ایک ایک لفظ بیان کرنا کچھ چھپانا نہیں ورنہ یقین کرو آخرت میں تمہاری بخشش نہیں ہوگی۔" ہما چہکتے ہوئے بولی۔

"تم لوگ چپ ہو تو میں اپنی زبان کھولوں۔" میں برا سا منہ بنا کر بولی۔

"اچھا اب شروع ہو جاؤ۔ آج کالج میں لیکچر کے دوران میرا دل بالکل نہیں لگا۔ سارا وقت تمہارے اور ڈاکٹر کامران کے بارے میں سوچتی رہی۔" شیریں بولی۔

"ہاں یہ درست ہے میں بھی سارا دن انہی دونوں کے بارے میں سوچتی رہی۔" پروین نے زبان ہلائی۔

میں نے ٹھنڈی سانس بھری اور تلخ لہجے میں کہا۔ "تم لوگ ڈاکٹر کامران کو مارلن برانڈو سمجھتی ہو۔ تم نے سوچا ہوگا کہ اس نے ہیرو کے انداز میں مجھے دونوں بازوؤں سے پکڑا ہوگا اور سینے سے لگا کر پرجوش بوسہ لیا ہوگا۔ اگر ایسا سوچا تھا تو غلط سوچا تھا۔ وہاں ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔"

"اوہ! کوئی بات نہیں ہوئی۔" ہما بولی۔ "تو تم اس لئے رو رہی تھیں۔ تم بہت سی رومانی توقعات لے کر وہاں گئی ہوگی مگر کوئی بات نہیں ہوئی اور تمہیں مایوس لوٹنا پڑا۔"

تمام لڑکیاں بے ساختہ ہنس پڑیں [illegible]

بڑی مہر بھی ہنس دی۔ زبیدہ وا نہیں لا ٹیلے تھی "تم آپس درمیان میں نہ کئے جا رہی ہو۔ شہناز کو کچھ نہیں بولنے دو گی۔"

"اب اگر شہناز کے علاوہ کوئی اور بولے تو ہماری زبان کھینچ لو۔" شکیل نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ مگر میری توجہ مہر کی طرف مرکوز ہو گئی تھی۔ وہ ابھی تک پریشان اور دہشت زدہ تھی ایک دن میں اس کا چہرہ اتر گیا تھا۔ میں نے زبیدہ سے پوچھا "واجد کا کچھ پتہ چلا؟" زبیدہ نے بڑی مایوسی سے نفی میں سر ہلا دیا۔ کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی۔

"اب تم اپنا ماجرا سناؤ۔" کچھ دیر بعد زبیدہ نے مجھے مخاطب کیا۔ میں نے بے کم و کاست سب کچھ دہرا دیا۔ ریاکاری سے کام لئے بغیر سب کچھ بتا دیا، کچھ نہیں چھپایا۔ لڑکیاں تصویر حیرت بن گئی تھیں۔ دیر تک سانس روکے بیٹھی رہیں پھر لڑکیاں سنبھلیں اور تبصرے کے طور پر یکے بعد دیگرے کہنے لگیں "یہ ایک فریب ہے۔ یہ ایک جال ہے۔ جو شہناز کے لئے بچھایا گیا ہے۔ ڈاکٹر کامران زبردست فراڈ معلوم ہوتا ہے۔"

میں کیا کہتی، خاموش رہی۔ بس یہی خیال ستا رہا تھا کہ میں نے ڈاکٹر کامران سے وعدہ کیا تھا کہ اس ملاقات کا حال کسی کو نہیں بتاؤں گی مگر وعدہ میں نے توڑ دیا تھا۔

آیا زبیدہ سے اجازت لے کر چلی گئی تھی۔ اب پورے گھر میں ہماری حکومت تھی۔ ہم ڈاکٹر کامران کے بارے میں تبصرے اور رائے زنی کرتے رہے۔ پھر بھوک نے ستایا تو کھانے کے کمرے میں جمع ہو گئے پہلا لقمہ لیا تھا کہ دوسرے کمرے میں ٹیلیفون کی گھنٹی زوردار آواز کے ساتھ بج اٹھی۔ میں دروازے کے قریب بیٹھی ہوئی تھی۔ زبیدہ نے مجھے اشارہ کیا کہ جا کر فون اٹینڈ کروں۔

میں نے ہاتھ میں اٹھایا ہوا لقمہ ویسے ہی پلیٹ میں رکھ دیا اور دوسرے کمرے کی طرف چل پڑی۔

"ہیلو۔" میں نے ریسور اٹھاتے ہوئے کہا۔

دوسری طرف سے مردانہ بھاری آواز سنائی دی "کون بول رہا ہے؟"

"تمہیں کس سے بات کرنی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"مہر بانو سے۔ مجھے ان سے ایک ضروری بات کرنی ہے تم شاید ان کی دوست ہو۔ بہرحال تم ہی ان تک میرا یہ پیغام پہنچا دو ان سے کہو کہ وہ کب تک چھپی رہیں گی۔ وہ واجد کی تلاش میں ہیں اور بہت

محترمہ شملہ پالیسی کی پتلون نے پریشان ہو کر کہا، "محترمہ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے کہ آپ کے ایک بچے کی عمر دو سال ہے اور دوسرے کی چار برس ہے اور پھر آپ یہ کہتی ہیں کہ آپ کے شوہر پانچ سال ہوئے انتقال کر گئے۔"

عورت نے جواب دیا، "ہاں مگر میں تو زندہ ہوں۔"

جلد اس کی سو کر بھگتنے کے لئے تیار ہو جائیں۔"

"آخر تم ہو کون؟" میں نے پوچھا۔ پھر میں ہیلو ہیلو ہی کرتی رہی مگر دوسری طرف سے لائن مردہ ہو چکی تھی۔

میں دیر تک ریسور پکڑے کھڑی رہی۔ میرا جسم جیسے ایک دم بے جان ہو گیا تھا۔ پھر مجھے اپنے کانوں میں کوئی آواز سنائی دی۔ کھانے کے کمرے سے کسی نے مجھے پکارا تھا مگر میں اپنی جگہ سے جنبش نہ کر سکی۔ کچھ ہی دیر بعد کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "کیا بات ہے شہناز! کس کا فون تھا؟ اور تم نے میری آواز پر جواب بھی نہیں دیا۔"

میں نے پلٹ کر دیکھا وہ زبیدہ تھی اور اس کے پیچھے دوسری تمام لڑکیاں کمرے میں آ موجود ہوئی تھیں۔ زبیدہ کی نظر جونہی میرے چہرے پر پڑی وہ چونک گئی۔

"خیریت تو ہے، کس کا فون تھا؟" زبیدہ نے دوبارہ کہا اور میرے جواب کا انتظار کئے بغیر ریسور میرے ہاتھ سے لے کر ہیلو ہیلو کرنے لگی۔ مگر دوسری طرف جواب ندارد تھا۔ لائن تو کبھی کی ڈیڈ ہو چکی تھی۔ زبیدہ نے غصے سے ریسور کریڈل پر پٹخ دیا اور مجھے گھورنے لگی۔

"واجد کی طرف سے تو کوئی پیغام نہیں تھا؟" اچانک مہر کی آواز ابھری۔ میں نے مہر کی طرف دیکھا اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ اور آنکھیں خوف سے پھیلی ہوئی تھیں۔

میں نے بدقت تمام خود کو سنبھالا اور رک رک کر بولی "زبیدہ کے شوہر کے کسی دوست کا فون تھا۔ وہ پوچھ رہا تھا کہ زبیدہ کا شوہر کب تک سفر سے واپس آئے گا؟"

میں نے کہنے کو کہہ دیا مگر میرے لرزتے لہجے نے جھوٹ کی قلعی کھول دی تھی۔ لڑکیاں بے یقینی کی کیفیت میں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگیں۔ زبیدہ نے ایک بار پھر مجھے غور سے دیکھا اور سر ہلاتے ہوئے بولی "تمہاری حالت ٹھیک نہیں معلوم ہوتی۔ چلو، چل کر ذرا آرام کر لو۔"

زبیدہ مجھے سہارا دے کر خوابگاہ میں لے آئی اور میں مسہری پر لیٹ گئی۔ لڑکیاں بھی حیران اور متعجب خوابگاہ تک آ گئی تھیں۔ میں ان سب کو مخاطب کر کے بولی "جاؤ تم لوگ جا کر کھانا کھاؤ۔ کیوں میری وجہ سے اپنا کھانا خراب کرتی ہو۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔"

لڑکیاں مجھے حیرت سے دیکھ کر رہ گئیں۔ زبیدہ نے ایک بار پھر دانشمندی کا ثبوت دیا اور ان سب کو کھانے کے کمرے میں واپس لے گئی۔

لڑکیوں کے جاتے ہی میرا ذہن دوبارہ فون کرنے والے کی طرف منتقل ہو گیا۔ آخر وہ کون تھا۔ کیا وہ واقعی واجد کا دوست تھا۔ شاید یہ فلیٹ والا دوست ہو۔ اسے معلوم تھا کہ واجد اور میں کچھ دیر کے لئے وہاں گئے تھے۔ مگر اسے زبیدہ کا فون نمبر کیسے معلوم ہو گیا۔ اور یہ بھی کوئی مشکل بات تھی۔ ممکن ہے خود واجد نے اسے بتایا ہو یا اس نے میرے گھر فون کر کے اس کی والدہ سے زبیدہ کا فون نمبر معلوم کر لیا ہو۔ پھر خیال آیا کہ ہو سکتا ہے واجد زندہ ہو اور انتقاماً مجھ کو پریشان کرنے کے لئے مر جانے کا ڈھونگ رچایا ہوا ہو۔ اس خیال سے مجھے کچھ تقویت ملی۔ خدا کرے واجد زندہ ہو۔ پھر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ میں نے سوچا کس قدر احمق ہوں میں اب تک اس پہلو پر غور نہیں کیا تھا۔ مجھے پہلے ادھر ادھر دوڑ دھوپ کر کے معلوم کرنا چاہئے تھا کہ واجد زندہ ہے یا واقعی مر گیا ہے۔ اس سے کم از کم امید و بیم والی کیفیت تو نہ ہوتی۔ میں نے طے کیا کہ کل گھر سے نکل کر اس بارے میں مزید معلومات حاصل کروں گی۔ آخر اس طرح معاملہ کب تک چلے گا۔ واجد مرا ہو یا نہ مرا ہو، بیچاری ہم مزید سوکھ کر مر جائے گی۔ اس کی حالت غیر ہی ہوتی جا رہی تھی۔ مگر کچھ کرنے سے پہلے زبیدہ سے مشورہ کرنا ضروری تھا۔ فون والا واقعہ اس کے علم میں لائے بغیر میں کوئی قدم نہ اٹھا سکتی تھی۔

لڑکیاں کھانے سے فارغ ہو کر واپس آ گئیں۔

"طبیعت سنبھل گئی ہو تو جا کر کھانا کھا لو۔" زبیدہ نے کہا۔

"نہیں بھوک بالکل نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"ڈاکٹر کو بلا لوں؟" زبیدہ نے میری پیشانی کو چھوتے ہوئے کہا۔

"نہیں، اب ایسی بھی طبیعت خراب نہیں ہے۔ ذرا دیر بعد خود بخود ٹھیک ہو جاؤں گی۔ کبھی کبھی دل یوں ہی بے حد گھبرانے لگتا ہے۔ خدا جانے یہ عارضہ بیٹھے بٹھائے کیسے ہو گیا۔"

لڑکیاں معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگیں۔ زبیدہ میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی "میرا مشورہ ہے کہ اٹھ کر کھانا کھا لو۔ خالی پیٹ رہنا مناسب نہیں۔"

"مگر وہاں صرف ہم دونوں ہوں گے۔ میرے اعصاب بھیڑ بھاڑ کے متحمل نہیں ہو سکتے۔" میں نے مسہری سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"اچھا اب ہم بھیڑ بھاڑ ہو گئے۔" جمانہ منہ بنا کر بولی۔

"مکار!" شمیم زیر لب غرائی۔

میں اور زبیدہ کمرے سے باہر نکل رہے تھے تو مجھے پروین کی آواز سنائی دی۔ وہ کمرے میں موجود لڑکیوں سے کہہ رہی تھی "میں نے کہا نہیں تھا کہ شہناز ڈاکٹر کامران پر بری طرح مرمٹی ہے ورنہ یہ اداکاری اور بیدلی کا دورہ کیا معنی رکھتے ہیں۔ پہلے تو میں نے کبھی نہیں سنا کہ اس کے دل میں درد اٹھا ہو۔ حتیٰ کہ اس وقت بھی نہیں جب مہر کا واقعہ پیش آیا تھا۔ اس وقت تو وہ بڑی دل والی بنی ہوئی تھی۔"

لڑکیاں دبی آواز میں ہنسنے لگیں۔ مگر ان کی ہنسی میں کھسیانا پن صاف طور پر نمایاں تھا۔

کھانے کی میز پر بیٹھے تو میں نے زبیدہ کی طرف سر جھکاتے ہوئے آہستہ سے کہا "زبیدہ! فون کرنے والا وہ اجنبی تمہارے شوہر کا دوست نہیں تھا۔" پھر میں نے اسے پوری بات بتا دی۔ ایک لمحے کے لئے زبیدہ کی آنکھوں میں حیرت نمودار ہوئی پھر اس نے شانوں کو اچکاتے ہوئے کہا "مجھے بھی کچھ شبہ ہوا تھا میں سمجھ گئی تھی کہ تم اصل بات چھپا رہی ہو اور دوسروں کے سامنے وضاحت کرنے سے گریز کر رہی ہو۔" زبیدہ نے گہری سانس لی "مگر سوال یہ ہے کہ فون کرنے سے اس اجنبی کا مقصد کیا تھا۔ اگر واجد واقعی مر گیا ہے اور وہ مخبر ہے تو اسے پولیس کو اطلاع دینی چاہئے تھی۔ پھر اس کے علاوہ واجد کی لاش کا کوئی نام و نشان تک نہیں ہے۔ وہ شہر کا جانا پہچانا آدمی ہے۔ اس کے تعلقات وسیع ہیں۔ اس کا ایک فلیٹ میں ایسی پراسرار حالت میں مر جانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ یہ بہت اہم واقعہ ہے اور کل تک اس کی خبر اخبار میں ضرور آ

جانا چاہیے۔ اس کے بعد ہی کوئی قدم اٹھایا جا سکتا ہے۔"

"مگر اس بستی کا صاحب ثروت یا ڈاکٹر کامران کے پاس سے
کسی طرح بھر کا سراغ لگایا گیا ہوگا؟" میں نے فکرمندی سے کہا۔

"اونہہ۔ یہ ہم کو دیکھنا ہے۔ لیکن ابھی تو کیا ہو رہا ہے
کیا نام ہے۔ کیا معلوم واجد نے کیا بات کی۔" زبیدہ نے اوپر والی سے
ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔ پھر دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔
"اچھا اب میں چلوں گی۔ ہماری وہاں سے غیر موجودگی کو لڑکیاں
جانے کیا معنی پہنا رہی ہوں گی۔ تم کھانا کھا کر جلدی سے آ جاؤ۔"

میں کھانا کھا کر بیسن پر ہاتھ دھوتے آئی تو مجھے ہال سے
لڑکیوں کی زور زور سے بات کرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔
آوازیں یہاں تک صاف پہنچ رہی تھیں اور ان کی گفتگو سن کر میں مسکرا دی
کیونکہ موضوع سخن میں اور ڈاکٹر کامران تھے۔

"مگر ڈاکٹر کامران مجھ سے بھی قریبی جیون ساتھی بننے کی درخواست
کرتا تو میں بھی اسی طرح فخر کر رہی ہوتی اور اداؤں میں دکھاوا کر رہی ہوتی۔"
جس طرح کہ شہناز کر رہی تھی۔" یہ ہما کی آواز تھی۔

جواب میں شیریں کی آواز سنائی دی۔ "وہ کہہ رہی تھی اگر
ڈاکٹر کامران کہیں سچ مچ اس سے شادی کی درخواست کر دیتا تو
ہم سلام دعا سے بھی گئے تھے۔"

اگلے دن اتوار کی رخصت پر تھی چنانچہ میں نے سوچا جب سے
برتن ہی دھو ڈالوں۔ لڑکیوں میں سے کسی کسی کو تو دھونا تھا ہی
کوئی نہ دھوتا تو زبیدہ کسی سے کچھ کہے بغیر خود دھو لیتی۔ میں نے
برتن دھوئے اور انہیں قرینے سے ان کی مخصوص جگہ پر رکھ دیا۔
جب واپس ہال میں آئی لڑکیاں سو چکی تھیں اور زبیدہ چادر کی
خوابناک نیلگوں روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

زبیدہ کی گفتگو سے مجھے بہت سکون ملا تھا چنانچہ میں مہر
اور واجد کی طرف سے ذہن ہٹا کر ڈاکٹر کامران کے بارے میں سوچنے
لگی اور اسی کیفیت میں جانے کب نیند آ گئی۔

صبح معمول کے مطابق سب جلد بیدار ہو گئے۔ ضروریات
سے فارغ ہو کر ناشتے کے بعد سب کے سب گیسٹ روم کی میز کے
گرد جمع ہو گئے۔ لڑکیوں کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ تھی اور وہ
مسکرا مسکرا کر ایک دوسرے کو اشارے کر رہی تھیں۔ میرا موڈ بھی بہت
اچھا تھا اور میں ان کے اشاروں کنایوں کو سمجھ رہی تھی۔

"بیگم کامران مزاج تو ٹھیک ہیں؟" آخر شیریں نے زبان
کھولی۔

"بالکل ٹھیک ہیں مگر تمہاری کچھ ہیں" میں نے شگفتگی سے
جواب دیا۔

جانے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا تھا کہ زبیدہ نے ٹوک دیا۔
"اور تم یہ یاسمین کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ "اچھا اب گپ شپ
کی ضرورت نہیں ہے۔ تم لوگ وہاں سے چپ کیوں نہیں گئی ہو۔ آج
اپنے اپنے گھر جاؤ یہ معلوم نہیں کیا حالات پیش آئیں اور پھر تم
لوگوں کو یہاں رکنا پڑے۔ گھر سے طرح طرح حاضری ابھی بات نہیں
ہے۔ البتہ مہر یہیں میرے پاس رہے گی۔ میں اس کی والدہ سے
ایک دن کی اور اجازت لے لوں گی۔ آج شام تک دیکھوں گی شاید
واجد کے بارے میں کچھ معلوم ہو جائے اس کے بعد ہی مہر کے بارے
میں کوئی فیصلہ کیا جا سکے گا۔"

بات معقول تھی چنانچہ کوئی چوں چرا نہ کر سکا۔ یہاں تک کہ مہر
کی رائے سے کسی نے اختلاف نہ کیا تھا۔

سب نے جلدی جلدی ناشتہ کیا اور زبیدہ کے گھر سے نکل
پڑیں۔ میں گھر پہنچی تو ساڑھے نو بج رہے تھے۔ میرے بہن بھائی
ابھی اسکول جا چکے تھے۔ ابا بھی جاب پر جا چکے ہوئے تھے مگر
وہاں دوسری دو بستیاں موجود تھیں جن سے کہ میں ملنا چاہتی تھی۔
میری خالہ اور ان کی بڑی صاحبزادی تھیں۔ میری خالہ امی جان سے
بڑی تھیں اور بہت قدامت پرست واقع ہوئی تھیں۔ اتفاق سے
غریب گھرانے میں بیاہی گئی تھیں۔ لڑکیوں کی تعلیم اور ملازمت کے
خلاف تھیں۔ وہ اکثر امی جان کو میرے سلسلے میں ٹوکتی رہتی
تھیں۔ ان کے خیال میں امی جان مجھے تعلیم دلوا کر اور حد سے زیادہ
آزادی دے کر خراب کر رہی تھیں۔ میں ان خالہ سے بہت ڈرتی
تھی اور ان کی صاحبزادی مجھے اس طرح گھورتی تھیں جیسے میں
ابھی ابھی کسی آوارہ گردی سے واپس آئی ہوں۔ میں نے جلدی سے ان
دونوں کو سلام کیا اور چپ چاپ سر جھکائے ہوئے اپنے کمرے
میں گھس کر دروازہ بند کر لیا۔

کچھ دیر بعد امی جان کمرے میں آ گئیں۔ میں نے انہیں بتایا
کہ ناشتہ ٹھیک ہو رہا ہے لیکن اس وجہ سے بہت تھکن محسوس ہو رہی
ہے۔ انہوں نے صحت کا خیال رکھنے کی تاکید کرتے ہوئے کمرے
کا دروازہ بھیڑ دیا اور خالہ جان کے پاس چلی گئیں۔

میں بستر پر لیٹ کر سوچنے لگی کہ اب کیا کرنا چاہیے؟ حالات

رہتا اگر مجرموں سے ملنے جاتا تھا۔ مگر اس سے پہلے واجد کا مسئلہ تھا، اور یہ مسئلہ اپنی جگہ بہت اہم تھا۔ میں نے میز پر رکھی ہوئی ٹیلیفون ڈائریکٹری اٹھائی اور صفحات پلٹ کر ایک نمبر تلاش کرنے لگی۔ نمبر جلد مل گیا۔ میں نے ریسیور اٹھایا اور نمبر ملانے لگی۔ سلسلہ ملنے پر میں نے پوچھا "شاہراہ خالد پولیس اسٹیشن؟"

"ہاں کہو۔" دوسری طرف سے ایک سخت اور کرخت آواز ابھری۔

"میں معلوم کرنا چاہتی تھی کہ پرسوں شاہراہ خالد پر کوئی غیر معمولی واقعہ تو نہیں ہوا؟"

"ایسے واقعات تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ کچھ معلوم کرنا ہے تو یہاں پولیس اسٹیشن پر آکر معلوم کیجئے۔" اور اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

اب پولیس اسٹیشن کون جاتا۔ اور خواہ مخواہ پولیس کے چکر میں پڑتا۔ میں دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ مگر پھر فوراً ہی ایک دوسری ترکیب سوجھ گئی۔ میں نے ایک ممتاز اخبار کے دفتر کا ٹیلیفون نمبر تلاش کیا اور لائن ملنے پر جو بھی آیا اس سے وہی سوال دہرایا یعنی کیا پرسوں رات شاہراہ خالد پر کوئی غیر معمولی واقعہ رونما ہوا ہے۔ دوسری طرف سے ہولڈ آن کرنے کے لئے کہا گیا۔ کچھ دیر کھسر پھسر ہوتی رہی پھر ایک دوسری آواز نے کہا "خاتون! جہاں تک مجھے معلوم ہے گزشتہ رات شاہراہ خالد سے قتل کی دو خبریں موصول ہوئی ہیں۔ تفصیل مجھے نہیں معلوم۔ اس وقت دفتر میں ایڈیٹر صاحب موجود ہیں نہ رپورٹر جو صحیح طور پر کچھ بتایا جا سکے۔"

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میری پیٹھ پر پسینہ بہہ رہا ہے۔ میری دونوں ہتھیلیاں بھی گیلی ہو گئی تھیں۔ شاہراہ خالد پر دو قتل، بار بار میرا ذہن یہی گردان کر رہا تھا۔ شاید گزشتہ رات فلیٹ کا دروازہ توڑا گیا ہو اور واجد کی لاش برآمد ہوئی ہو۔ میں نے سوچا کہ شاہراہ خالد جا کر کچھ سن گن لینا چاہئے۔ پوچھ گچھ کروں گی تو معلوم ہو جائے گا۔

میں جلدی سے بستر سے اٹھی۔ بعجلت تمام لباس تبدیل کیا، کچھ کتابیں سنبھالیں اور کمرے سے باہر آکر امی جان سے کچھ پیسے لئے اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ مجھے اپنی پشت پر خالہ کی نگاہیں چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ پھر ان کی آواز بھی بلند ہوئی۔ "یہ لڑکی تو ہاتھ ہی سے نکلتی جا رہی ہے۔ میں کہتی ہوں [illegible]

اب بھی وقت ہے اسے پڑھائی سے اٹھا لو ورنہ سر پر چڑھ گئی ہے۔"

امی جان نے خالہ کو جواب نہیں دیا البتہ مجھے پکار کر "اپنی صحت کا خیال رکھنا۔ اب اتنی زیادہ محنت ٹھیک نہیں۔"

باہر نکل کر میں نے ٹیکسی پکڑی اور شاہراہ خالد کی طرف ہو گئی۔ مختلف سڑکوں سے گزرنے کے بعد میں شاہراہ خالد پر آ گئی۔ ایک بڑی سی عمارت کے سامنے میں نے ٹیکسی چھوڑ دی۔ ٹیکسی نکل گئی تو میں پیدل اس گلی کی طرف چل پڑی جہاں کہ وہ فلیٹ تھا جس میں واجد اور میں نے کچھ وقت گزارا تھا اور ایک ناخوشگوار واقعے کے بعد پتہ نہیں چلا تھا کہ واجد زندہ ہے یا مر گیا۔

اس وقت فلیٹ کے آس پاس کوئی نہیں تھا۔ میں نے فلیٹ کے بیرونی دروازے پر نظر ڈالی، کوئی خاص بات نظر نہ آئی۔ کوئی بات ہوتی تو ضرور پتہ چل جاتا۔ میں نے سوچا کہ اندر جاؤں، مگر ہمت نہ پڑی۔ پھر خیال آیا کہ غلط جگہ پر تو نہیں آگئی۔ ہو سکتا ہے یہ وہ فلیٹ نہ ہو۔ اسی کشمکش و پیچ میں تھی کہ فلیٹ سے ایک جمعدارن جھاڑو لئے ہوئے برآمد ہوئی۔ میں نے سوچا کہ اس سے کچھ پوچھنا چاہئے۔ اس کی طرف بڑھنا چاہتی تھی مگر جمعدارن نے مجھے کچھ ایسی خشمگیں نظروں سے دیکھا کہ مجھے اپنا ارادہ ملتوی کر دینا پڑا۔

دل پر ایک بھاری بوجھ لئے ہوئے وہاں سے واپس ہو گئی۔ میرے ذہن میں بار بار ایک جنازہ گھوم رہا تھا۔ جنازہ جسے لوگ کاندھوں پر اٹھائے ہوئے تھے۔ اندر واجد کی لاش پڑی ہوئی تھی اور سر کے گرد پٹیاں لپٹی ہوئی تھیں۔ مگر لاش کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور ہونٹ پھڑپھڑا رہے تھے۔ "مہر سے کہہ دو کہ میری روح ضرور اس سے انتقام لے گی۔ میرا خون رائیگاں نہیں جائے گا۔"

یک لخت مجھ پر خوف و ہراس طاری ہو گیا۔ قتل، جنازہ، انتقام میں۔ آپ ہی آپ بڑبڑانے لگی۔ محسوس ہوا جیسے مجھے مالیخولیا ہو گیا ہو۔ ایسی ذہنی کیفیت کبھی نہیں ہوئی تھی۔

میرے قدم اور تیز ہو گئے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے براہ راست واجد کے دفتر جا کر معلوم کرنا چاہئے کہ وہ قبرستان کو سدھار گیا ہے یا موٹر سائیکل کو چوٹ لے گیا ہے۔

اسے بدقسمتی کہیے یا اتفاق کہ واجد کا دفتر بند تھا۔ دل برداشتہ ہو کر میں نے ٹیکسی لی اور سیدھے گھر لوٹ آئی۔ زبیدہ اور مہر باورچی خانے میں مشغول تھیں۔ مہر کے سامنے میں نے گفتگو کرنے سے گریز



کر دوں۔ لگی تھی۔ میں بالکل ہی تنہائی کی اس بیٹھک کر رہنے کے بعد جیسے ہی تنہائی ملی میں نے زبیدہ کے سامنے سارا ماجرا دہرا دیا۔ زبیدہ سوچ میں پڑ گئی۔ کچھ دیر بعد بولی۔ "تمہیں شام تک انتظار کرنا چاہیئے۔ شاید شام کے اخبارات میں کوئی خبر آجائے۔"

اسی وقت میرے کمرے میں آگئی میرا ساتھیں گفتگو کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا۔ پھر گفتگو کا رخ ڈاکٹر کامران کی جانب ہو گیا۔ مجھے کل رات اس سے ملنے کے لئے جانا تھا۔ زبیدہ مشورہ دینے لگی کہ مجھے کیا پہن کر جانا چاہیئے۔ کچھ دیر گفتگو چلتی رہی۔ پھر ہم آرام کرنے کے لئے لیٹ گئے۔ لیٹتے ہی میرا ذہن ڈاکٹر کامران کی طرف چلا گیا۔ اسی کے بارے میں سوچتے سوچتے پلکیں جھپک گئیں۔ آنکھ کھلی تو شام ہو گئی تھی اور رات کا اندھیرا آہستہ آہستہ پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ لباس درست کرکے میں باہر نکلی اور شام کا اخبار لے آئی۔ پھر شروع سے آخر تک پورا اخبار پڑھ ڈالا۔ ایک خبر پر میری نظر رکی اور غور سے پڑھنے لگی۔ یہ ایک قتل کی خبر تھی۔ ایک شخص نے بدچلنی کے شبے میں چاقو کے پے در پے وار کرکے اپنی بیوی کو ختم کر ڈالا تھا۔

بس قتل کی یہی ایک خبر تھی۔ مگر قتل کی اس دوسری خبر کا کیا ہوا جس کے بارے میں اخبار کے دفتر سے کسی نے اطلاع دی تھی۔ میں نے زبیدہ سے اس کا ذکر کیا۔ وہ بے چاری بھی الجھن میں مبتلا ہو کر رہ گئی۔

دیر ہو رہی تھی۔ زبیدہ نے مجھ سے کہا کہ میں اب اس الجھن میں نہ پڑوں اور ڈاکٹر کامران سے ملاقات کے لئے روانگی کی تیاری کروں۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی پونے سات ہو رہے تھے۔ وقت بہت کم رہ گیا تھا۔ مجھے بہت عجلت کے عالم میں تیار ہونا تھا۔ جلدی سے غسل خانے میں گھس گئی۔ نہا کر فارغ ہوئی تو زبیدہ میرے بالوں اور چہرے کی آرائش کرنے لگی۔ زبیدہ نے مجھے مشورہ دیا کہ میں آج بھی وہی لباس پہن کر جاؤں جو کل پہن کر گئی تھی کیونکہ میری سطح کی طالب علم سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ ہر روز ایک نیا لباس تبدیل کرے گی۔ اس سے ملاقاتی پر کچھ اچھا اثر نہیں پڑتا اور وہ خواہ مخواہ بدگمانی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

آرائش و زیبائش سے فارغ ہو کر میں باہر نکلنے کی سوچ رہی تھی کہ اچانک ایک خیال آیا۔ میں نے کسی تجربہ کار عورت کو کہتے سنا تھا کہ اگر تم کسی مرد کو اپنے بارے میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی لینے پر مجبور کرنا چاہتی ہو تو اسے اپنی فکر اور تشویش میں مبتلا کر دو۔ میں نے سوچا کہ آج اس مقولے پر عمل کرنا چاہیئے۔ بہتر ہے کہ میں اس عورت کے تجربے سے فائدہ اٹھاؤں اور ڈاکٹر کامران کو ذرا پریشان کر دوں۔

میں نے ریفریجریٹر سے ایک سیب نکالا اور آہستہ آہستہ کھانے لگی۔ میں دانستہ تاخیر کر رہی تھی اور مجھے اس میں لطف آ رہا تھا۔ میں چشم تصور سے دیکھ رہی تھی کہ میرے وقت پر نہ پہنچنے پر ڈاکٹر کامران کتنا پیچ و تاب کھا رہا ہوگا۔

ڈاکٹر کامران سے ملاقات کا وقت آٹھ بجے طے ہوا تھا اور میں ٹھیک آٹھ بجے گھر سے نکلی۔ ٹیکسی سے اتر کر اس کے مکان میں داخل ہوئی تو آٹھ بج کر بیس منٹ ہو رہے تھے۔ ڈاکٹر کامران میرا انتظار ہی کر رہا تھا اور میری توقع کے مطابق خاصا پریشان نظر آ رہا تھا بلکہ کچھ ناراض بھی تھا۔ اس نے بڑی بے اعتنائی اور سرد مہری سے میرا استقبال کیا۔ مگر یہ کیفیت وقتی تھی۔ اندر پہنچتے پہنچتے اس کی ناراضگی دور ہو گئی اور وہ بے حد پرجوش نظر آنے لگا۔ میں سوچنے لگی کہ کاش یہ ناراضگی یہ ملاقات خالص عاشقانہ ہوتی۔ مگر اسے تو مجھ سے کام تھا اور میں اس کے کام کے سلسلے میں یہاں آئی تھی۔ میں نے اس کے چہرے کا بغور جائزہ لیا۔ چہرے پر لکھی ہوئی تحریر واضح طور پر تنبیہ کر رہی تھی کہ اگر میں اس شخص سے متعلق کوئی نازک احساسات رکھتی ہوں تو فوراً دل سے نکال دوں۔ یہ خیال خام ہے۔ اس محال بات دھن ہوں۔ سراب کے پیچھے بھاگنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئی۔ اس وقت ڈاکٹر کامران بہت وجیہہ اور خوبصورت نظر آ رہا تھا۔ اس نے اسپورٹس شرٹ پہن رکھی تھی۔ اور اس لباس میں وہ بہت پرکشش اور قد سے نوجوان دکھائی دے رہا تھا۔ البتہ آنکھیں گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

ہو کر پر خود کو ان لوگوں سے دور رکھنے کی کوشش ہے۔ فرض کر سکتی ہو کہ اس سے میرا مقصد سوسائٹی میں خود کو شادی شدہ ظاہر کرنا ہے۔ فرض کر سکتی ہو کہ میں نے یہ کوٹھی محض شوق اور زیب و زینت کی خاطر یہاں رکھی ہے۔ تم اور بھی بہت سے امکانات فرض کر سکتی ہو مگر میری التجا ہے اور درخواست ہے کہ اس قسم کے سوالات نہ کرو۔"

وہ بولتا رہا اور میں سحر زدہ انداز میں اسے تکتی رہی۔ میری پلکیں بھی نہیں جھپک رہی تھیں۔ پھر وہ کھلا اور کرسی کی پشت گاہ سے ٹک گیا۔ شاید ایک منٹ کی خاموشی رہی پھر وہ دوبارہ بولنے لگا۔

"تمہارے یہاں آنے سے یہ ثابت ہوا ہے کہ تم نے میری خواہش کا احترام کیا ہے اور درخواست قبول کر لی ہے۔ اس کے لئے میں تمہارا شکر گزار ہوں ___ مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ تم نے گلاس سے ایک گھونٹ لینے کے بعد دوسرا گھونٹ نہیں لیا۔ خیر، تمہاری مرضی۔ میں اصرار نہیں کرتا۔ تم سوچ رہی ہو گی کہ ایک تنہا مرد کے گھر میں ہو، اس لئے احتیاط لازم ہے۔ ایسا ہے تو ایسا ہی سہی۔ ویسے میں صدقِ دل سے بتا دوں کہ اس میں کسی فریب اور حیلے کو دخل نہیں ہے۔ تم میری مہمان ہو، کچھ نہ کچھ تو پیش کرنا تھا ہی۔ میں اپنے بہترین دوستوں کو یہی پیش کیا کرتا ہوں۔ آدمی پرانا ہو تو شراب اچھی چیز ہے۔ ریاکار اور منافق لوگوں کو یہ راس نہیں آتی۔ میں تمہیں اچھی پرخلوص اور مہربان لڑکی سمجھتا ہوں اسی لئے یہ مشروب پیش کیا تھا ___ تم چاہو تو گلاس اٹھا کر پھینک سکتی ہو۔ مگر میں ہمیشہ سوچتا رہوں گا کہ تم شراب پینے سے ڈریں کیوں؟"

میری زبان تالو سے چپک کر رہ گئی اور جانے کہاں سے ایک بے ایمان، چنچل، خود سر آنسو کا قطرہ میرے رخسار پر ڈھلک آیا۔ یا اللہ میں مر جاؤں گی، یا اللہ یہ مجھے کیا ہو رہا ہے۔ شراب میرے جسم میں پانی ہو گئی تھی اور یہ شخص مجھ پر نشے کی مانند چھاتا جا رہا تھا۔

"تمہارے دل میں کوئی بدگمانی ہے تو دل سے نکال دو۔" ڈاکٹر کامران کی آواز سنائی دی۔ "یقین دلاتا ہوں کہ تمہارے لئے خطرناک نہیں ثابت ہوں گا۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ میرے والد صاحب لندن میں مقیم ہیں۔ ان کی بیوی انگریز ہے۔ والد صاحب آج سے ٹھیک تیسرے دن یہاں آنے والے ہیں۔ وہ ایک مدت سے اپنے خطوط میں اصرار کرتے آ رہے تھے کہ میں شادی کیوں نہیں کرتا۔ فوراً شادی کر لوں۔ میں نے انہیں جھوٹ لکھ کر بھیج دیا کہ میں نے ایک لڑکی سے شادی کر لی ہے۔ جواب میں انہوں نے لکھا کہ میں بیوی کے ہمراہ لندن آؤں اور کچھ وقت ان کے ساتھ گزاروں۔ میں نے لکھا کہ میں بہت مصروف ہوں، نہیں آ سکتا۔ اب انہوں نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ خود آئیں گے۔ دراصل انہیں ایسا مرض لاحق ہے کہ یہاں کی آب و ہوا راس نہیں آتی، جان پر بن جاتی ہے۔ مگر انہیں بہو کو دیکھنے کی اتنی تمنا اور اس قدر اشتیاق ہے کہ جان لیوا مرض کی پروا کئے بغیر یہاں آئیں گے اور چند دن ٹھہر کر واپس چلے جائیں گے۔"

"شہناز!" ڈاکٹر کامران نے مجھے پہلی بار نام لے کر مخاطب کیا اور اس کی زبان سے اپنا نام سنتا مجھے بہت عجیب لگا۔ "والد صاحب نے لکھا تھا کہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں اپنی بہو کو دیکھے بغیر نہ مر جاؤں۔ ان کی آرزو ہے کہ میں شادی کروں، میری اولاد ہو۔ میں ان کا اکلوتا بیٹا ہوں، ان کی یادگار ہوں، ان کی نسل کا امین ہوں۔ انگریز بیوی سے صرف دو لڑکیاں ہیں۔"

ایک مدھم اور تلخ ہنسی ڈاکٹر کامران کے لبوں پر نمودار ہوئی۔ "میرے والد صاحب بڑے عجیب طرزِ فکر کے مالک ہیں۔ ان کے عقائد کے بارے میں سوچتا ہوں تو تعجب ہوتا ہے۔ مجھے ایک عرب شاعر کی یاد آتی ہے۔ اس نے وصیت کی تھی کہ اس کے مرنے کے بعد اس کی قبر پر اس مضمون کا کتبہ نصب کروایا جائے۔ "یہ قبر میرے باپ کے جرم کی یادگار ہے۔ میں اس جرم کا مرتکب نہیں ہوا۔ مجرد جیسا مجرد مرا۔" میں اس شاعر کا ہم خیال اور ہم عقیدہ ہوں۔ اپنے والد کے خیالات اور عقائد سے سخت نالاں اور پریشان ہوں۔ محض اس خیال سے تمہیں زحمت دی ہے کہ والد صاحب دیارِ غیر میں ہیں، کمزور اور ناتواں ہیں، بیمار بھی ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ زندگی کے آخری ایام میں انہیں کوئی تکلیف، کوئی صدمہ پہنچے۔"

"والد صاحب لندن میں کیوں مقیم ہیں اور انہوں نے انگریز عورت سے شادی کیوں کر لی؟" میں نے بے صبری سے پوچھا۔

"یہ ایک تفصیلی قصہ ہے مگر مختصراً بتائے دیتا ہوں۔ میں بچہ تھا کہ والدہ کا انتقال ہو گیا۔ والد صاحب نے دوسری شادی نہیں کی اور میری پرورش کرتے رہے۔ حتیٰ کہ میں بڑا ہو گیا۔ آخر میں جب تھا کہ والد صاحب سینے کے ایک پیچیدہ اور خطرناک مرض میں گرفتار ہو گئے۔ پہلے تو انہیں سانس لینے میں دقت ہوتی، پھر دم سا گھٹنے لگا۔ وہ بڑی مشکل سے سانس لے پاتے تھے۔ ڈاکٹروں نے تشخیص کیا کہ یہاں کی آب و ہوا ان کے موافق نہیں ہے۔ پھر وہ ڈاکٹروں ہی کے مشورے پر لندن چلے

نے مستقل تبدیلی آب و ہوا کے علاوہ وہاں علاج معالجے کی آسانیاں بھی زیادہ تھیں۔ میں زیرِ تعلیم تھا، چنانچہ مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ وہاں ان کی حالت حیرت انگیز طور پر سنبھل گئی۔ گریجویشن میں نے انگلستان سے کیا، پھر ڈاکٹریٹ کے لئے فرانس چلا گیا۔ اس عرصے میں والد صاحب دو ایک بار وطن واپس آئے مگر انہیں پھر وہی عارضہ لاحق ہو گیا۔ مجبوراً انہوں نے لندن میں مستقل رہائش اختیار کر لی۔ پھر ایک نوجوان انگریز بیوہ سے شادی کر لی۔ کوئی نہ کوئی ان کی مستقل دیکھ بھال کے لئے ہونا ہی چاہیئے تھا۔

ڈاکٹریٹ کر کے میں وطن واپس آ گیا اور کالج میں ملک و قوم کی خدمت انجام دینے لگا۔" ڈاکٹر کامران مسکرایا۔ "میں نے یہ باتیں تمہیں اس لئے بتائیں کہ تم بہت متجسس تھیں اور میرے بارے میں جانے کیا کیا سوچ رہی تھیں۔ اب قصہ یہ ہے کہ والد صاحب کسی وقت بھی نازل ہو سکتے ہیں۔ پہلے میں ان کی آمد کو محض مذاق سمجھتا تھا مگر اب اندازہ ہو رہا ہے کہ وہ بے حد سنجیدہ ہیں اور آنے کے لئے بے چین ہیں۔ وہ جلد از جلد اپنی بہو کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ میرا مقصد ان کو محض خوش کرنا ہے۔ چاہے وہ میری فرضی بیوی سے ملیں یا حقیقی سے۔"

ڈاکٹر کامران بہت پُرخلوص ہو کر بات کر رہا تھا مگر جانے کیوں مجھے محسوس ہوا کہ اس صداقت اور سچائی میں کہیں کوئی جھوٹ بھی پوشیدہ ہے۔ کوشش کے باوجود میں اس جھوٹ کو تلاش نہ کر سکی لیکن یقین کرنے کو جی نہ چاہتا تھا کہ محض اپنے باپ کو خوش کرنے کے لئے وہ اتنے بڑے فریب کا سہارا لے گا۔ میرے ذہن میں ایک سوال مچلا اور میں پوچھ بیٹھی: "آپ کے والد صاحب کا ذریعہ معاش کیا ہے؟ میرا مطلب ہے کہ لندن جیسے شہر کے اخراجات ہر کوئی برداشت نہیں کر سکتا۔"

میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر کامران کے چہرے پر ناگواری پھیل گئی تھی۔ اسے میرا سوال پسند نہیں آیا تھا۔ اس نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

"والد صاحب میرے مقابلے میں کہیں زیادہ دولتمند ہیں، اتنے زیادہ کہ لندن میں مستقل آسودہ اور خوشحال زندگی گزار سکتے ہیں۔" پھر وہ میری طرف تیز و تند نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا: "اب تو کوئی سوال باقی نہیں ہے؟"

"صرف ایک سوال اور۔" میں نے اس کی برہمی کی پروا نہ کرتے ہوئے کہا۔ "کیا یہاں آپ کے خاندان کے دوسرے افراد نہیں رہتے۔ اگر آپ نے کوئی شادی کی ہوگی تو انہیں بہرحال خبر ہوگی۔"

"والد صاحب کا تعلق اس شہر سے نہیں [illegible] سے ہے، اور خاندان کے تقریباً تمام ہی افراد وہیں موجود ہیں۔ وہ سب کے سب [illegible] والد صاحب بخوبی جانتے ہیں کہ میں اپنے عزیز و اقارب سے رسم و راہ نہیں رکھتا بلکہ ان سے دور بھاگتا ہوں۔ والدہ کے خاندان کے لوگ بھی یہاں نہیں ہیں۔ والدہ نے زندگی میں کبھی ان سے ملا ہوں۔ بلکہ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ زندہ بھی ہیں یا نہیں۔"

"کیا مجھے والد صاحب کو لینے کے لئے آپ کے ساتھ ائیرپورٹ جانا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں یہ مناسب نہیں ہوگا۔ کسی جان پہچان کے کسی نے تمہیں ساتھ دیکھ لیا تو ہم دونوں کے لئے برا ہوگا۔ تم ہر شب سات بجے کے قریب یہیں آ جانا۔" ڈاکٹر کامران مسکرایا۔ "خوب اچھی طرح سن لو کہ والد صاحب موڈی ضرور ہیں مگر صاحبِ نظر بھی ہیں۔ پھر تم یہیں ملو گی اور میں انہیں لینے ائیرپورٹ جاؤں گا۔ جہاز نو بجے تک آ جائے گا۔ میں انہیں یہاں لاؤں گا۔ خود گھر ٹھہراؤں گا انہیں۔ گھر کے چھوٹے ہونے کا بہانہ بنا کر کسی ہوٹل میں ٹھہراؤں گا۔ جب انہیں ہوٹل میں چھوڑ آؤں گا تو بعد میں بیٹھ کے طے کریں گے کہ آئندہ ملاقاتوں کو کیا کیا جائے گا۔"

"کیا تمہارے لئے ممکن ہے کہ تم دیر تک گھر سے باہر رہ سکو؟"

معقول جواب

ایک آدمی طویل سفر پر روانہ ہوا۔ لیکن بیچ ہی راستے میں واپسی کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے بیوی کو تار دیا کہ گھر واپس آ رہا ہے۔ اور پھر جب وہ گھر پہنچا تو بیوی کو کسی اجنبی نوجوان کے پہلو میں پایا تو اسے بے حد غصہ آیا۔ اسے اپنے خسر کے پاس لے گیا اور کہا: "میں آپ کی بیٹی کو طلاق دے دوں گا۔"

خسر نے کہا: "بیٹا اتنی عجلت سے کام نہ لو، مجھے یقین ہے کہ میری بیٹی کے پاس یقیناً کوئی معقول جواب ہوگا۔ پہلے مجھے اس سے بات کر لینے دو۔"

اگلے دن خسر صاحب داماد کے پاس آئے اور کہنے لگے: "میں نے کہا تھا کہ میری بیٹی کے پاس کوئی معقول جواب ضرور ہوگا۔ دراصل بات یہ ہے کہ اسے تمہارا تار ملا ہی نہیں تھا۔"

مرسلہ: ارشاد احمد [illegible]

ہو کہ میں خود کو لڑکیوں اور عورتوں سے دور رکھنے کی کوشش ہے۔ فرض کر سکتی ہو کہ اس سے میرا مقصد سوسائٹی میں خود کو شادی شدہ ظاہر کرنا ہے۔ فرض کر سکتی ہو کہ میں نے یہ انگوٹھی محض شوق اور زیب و زینت کی خاطر پہن رکھی ہے۔ تم اور بھی بہت سے امکانات فرض کر سکتی ہو مگر میری التجا ہے اور درخواست ہے کہ اس قسم کے سوالات نہ کرو۔"

وہ بولتا رہا اور میں سحر زدہ انداز میں اسے تکتی رہی۔ میری پلکیں بھی نہیں جھپک رہی تھیں۔ پھر وہ رکا اور کرسی کی پشت گاہ سے ٹک گیا۔ شاید ایک منٹ کی خاموشی رہی پھر وہ دوبارہ بولنے لگا۔

"تمہارے یہاں آنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تم نے میری خواہش کا احترام کیا ہے اور درخواست قبول کر لی ہے۔ اس کے لئے میں تمہارا شکر گزار ہوں ۔۔۔ مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ تم نے گلاس سے ایک گھونٹ لینے کے بعد دوسرا گھونٹ نہیں لیا۔ خیر، تمہاری مرضی، میں اصرار نہیں کرتا۔ تم سوچ رہی ہوگی کہ ایک تنہا مرد کے گھر میں ہو، اس لئے احتیاط لازم ہے۔ ایسا ہے تو ایسا ہی سہی۔ ویسے میں صدق دل سے بتا دوں کہ اس میں کسی فریب اور حیلے کو دخل نہیں ہے۔ تم میری مہمان ہو، کچھ نہ کچھ تو پیش کرنا تھا ہی۔ میں اپنے بہترین دوستوں کو یہی پیش کیا کرتا ہوں۔ آدمی برا نہ ہو تو شراب اچھی چیز ہے۔ بیمار اور منافق لوگوں کو یہ راس نہیں آتی۔ میں تمہیں اچھی، پرخلوص اور مہربان لڑکی سمجھتا ہوں اسی لئے یہ مشروب پیش کیا تھا ۔۔۔ تم چاہو تو گلاس اٹھا کر پھینک سکتی ہو۔ مگر میں ہمیشہ سوچتا رہوں گا کہ تم شراب پینے سے ڈریں کیوں؟"

میری زبان تالو سے چپک کر رہ گئی اور جانے کہاں سے ایک بے ایمان، چنچل اور آنسو کا قطرہ میرے رخسار پر ڈھلک آیا۔ یا اللہ میں مر جاؤں گی، یا اللہ یہ مجھے کیا ہو رہا ہے۔ شراب میرے جسم میں پانی ہو گئی تھی اور یہ شخص مجھ پر نشے کی مانند چھاتا جا رہا تھا۔

"تمہارے دل میں کوئی بدگمانی ہے تو دل سے نکال دو" ڈاکٹر کامران کی آواز سنائی دی۔ "یقین دلاتا ہوں کہ تمہارے لئے خطرناک نہیں ثابت ہوں گا۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ میرے والد صاحب لندن میں مقیم ہیں۔ ان کی بیوی انگریز ہے۔ والد صاحب آج سے ٹھیک تیسرے دن یہاں آنے والے ہیں۔ وہ ایک مدت سے اپنے خطوط میں اصرار کرتے آ رہے تھے کہ میں شادی کیوں نہیں کرتا۔ فوراً شادی کر لوں۔ میں نے انہیں جھوٹ لکھ کر بھیج دیا کہ میں نے ایک لڑکی سے شادی کر لی ہے۔ جواب میں انہوں نے لکھا کہ میں بیوی کے ہمراہ لندن آؤں اور کچھ وقت ان کے ساتھ گزاروں۔ میں نے لکھا کہ میں بہت مصروف ہوں، نہیں آ سکتا۔ اب انہوں نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ خود آئیں گے۔ دراصل انہیں ایسا مرض لاحق ہے کہ یہاں کی آب و ہوا راس نہیں آتی، جان پر بن جاتی ہے۔ مگر انہیں بہو کو دیکھنے کی اتنی تمنا اور اس قدر اشتیاق ہے کہ جان لیوا مرض کی پروا کئے بغیر یہاں آئیں گے اور چند دن ٹھہر کر واپس چلے جائیں گے۔"

"شہناز" ڈاکٹر کامران نے مجھے پہلی بار نام لے کر مخاطب کیا اور اس کی زبان سے اپنا نام سننا مجھے بہت عجیب لگا۔ "والد صاحب نے لکھا تھا کہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں اپنی بہو کو دیکھے بغیر نہ مر جاؤں۔ ان کی آرزو ہے کہ میں شادی کروں، میری اولاد ہو۔ میں ان کا اکلوتا بیٹا ہوں، ان کی یادگار ہوں، ان کی نسل کا امین ہوں۔ انگریز بیوی سے صرف دو لڑکیاں ہیں۔"

ایک مدھم اور تلخ ہنسی ڈاکٹر کامران کے لبوں پر نمودار ہوئی۔

"میرے والد صاحب بڑے عجیب طرز فکر کے مالک ہیں۔ ان کے عقائد کے بارے میں سوچتا ہوں تو تعجب ہوتا ہے۔ مجھے ایک عرب شاعر کی یاد آتی ہے۔ اس نے وصیت کی تھی کہ اس کے مرنے کے بعد اس کی قبر پر اس مضمون کا کتبہ نصب کروایا جائے: "یہ قبر میرے باپ کے جرم کی یادگار ہے۔ میں اس جرم کا مرتکب نہیں ہوا۔ مجرد جیا مجرد مرا۔" میں اس شاعر کا ہم خیال اور ہم عقیدہ ہوں۔ اپنے والد کے خیالات اور عقائد سے سخت نالاں اور پریشان ہوں۔ محض اس خیال سے تمہیں زحمت دی ہے کہ والد صاحب دیار غیر میں اکیلے، کمزور اور ناتواں ہیں، بیمار بھی ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ زندگی کے آخری ایام میں انہیں کوئی تکلیف، کوئی صدمہ پہنچے۔"

"والد صاحب لندن میں کیوں مقیم ہیں اور انہوں نے انگریز عورت سے شادی کیوں کر لی؟" میں نے بے صبری سے پوچھا۔

"یہ ایک تفصیلی قصہ ہے مگر مختصراً بتائے دیتا ہوں۔ میں بچہ تھا کہ والدہ کا انتقال ہو گیا۔ والد صاحب نے دوسری شادی نہیں کی اور میری پرورش کرتے رہے۔ حتیٰ کہ میں بڑا ہو گیا۔ انٹر میں تھا کہ والد صاحب سینے کے ایک پیچیدہ اور مہلک مرض میں گرفتار ہو گئے۔ پہلے تو انہیں سانس لینے میں دقت ہوتی۔ پھر دم سا گھٹنے لگا۔ وہ بڑی مشکل سے سانس لے پاتے تھے۔ ڈاکٹروں نے تشخیص کی کہ یہاں کی آب و ہوا ان کے موافق نہیں ہے۔ پھر وہ ڈاکٹروں ہی کے مشورے پر لندن چلے

ے مستقل تبدیلی آب و ہوا کے علاوہ وہاں علاج معالجہ کی آسانیاں
ں زیادہ تھیں۔ میں زیر تعلیم تھا چنانچہ وہ مجھے بھی ساتھ لے گئے وہاں
ن کی حالت حیرت انگیز طور پر سنبھل گئی۔ گریجویشن میں نے انگلینڈ
ے کیا پھر ڈاکٹریٹ کے لئے فرانس چلا گیا۔ اس عرصے میں والد صاحب
ایک بار وطن واپس آئے مگر انہیں پھر وہی عارضہ لاحق ہو گیا۔
را انہوں نے لندن میں مستقل رہائش اختیار کر لی۔ پھر ایک نوجوان
ریز بیوہ سے شادی کر لی۔ گویا ان کی مستقل دیکھ بھال کے لئے
ا ہی چاہیئے تھا۔

"ڈاکٹریٹ کرکے میں وطن واپس آگیا اور کالج میں ملکی تعلیمی
خدمت انجام دینے لگا۔" ڈاکٹر کامران مسکرایا۔ "میں نے یہ باتیں تمہیں
اس لئے بتائیں کہ تم بہت متجسس تھیں اور میرے بارے میں جاننے کو بیتاب
ہو رہی تھیں۔ اب قصہ یہ ہے کہ والد صاحب کسی وقت بھی نازل ہو
سکتے ہیں۔ پہلے میں ان کی آمد کو محض مذاق سمجھتا تھا مگر اب اندازہ ہو رہا
ہے کہ وہ بے حد سنجیدہ ہیں اور آنے کے لئے بے چین ہیں۔ وہ جلد از جلد
بہو کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ میرا اطمینان کر محض خوش کرنا ہے۔ چاہے
میری فرضی بیوی سے ملیں یا حقیقی سے۔"

ڈاکٹر کامران بہت پُرخلوص ہو کر بات کر رہا تھا مگر جانے کیوں
مجھے محسوس ہوا کہ اس صداقت اور سچائی میں کہیں کوئی جھوٹ بھی
پوشیدہ ہے۔ کوشش کے باوجود میں اس جھوٹ کو تلاش نہ کر سکی۔ یقین
نہ کرنے کی وجہ نہ تھی کہ محض اپنے باپ کو خوش کرنے کے لئے وہ
اتنے بڑے فریب کا سہارا لے گا۔ میرے ذہن میں ایک سوال مچلا اور
میں پوچھ بیٹھی۔ "آپ کے والد صاحب کا ذریعہ معاش کیا ہے؟ میرا مطلب
ہے کہ لندن جیسے شہر کے اخراجات ہر کوئی برداشت نہیں کر سکتا۔"

میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر کامران کے چہرے پر ناگواری پھیل گئی تھی
شاید میرا سوال پسند نہیں آیا تھا۔ اس نے خشک لہجے میں جواب دیا۔
"والد صاحب میرے مقابلے میں کہیں زیادہ دولتمند ہیں۔ اتنے زیادہ
کہ لندن میں مطمئن آسودہ اور خوشحال زندگی گزار سکتے ہیں۔" پھر وہ میری
جانب تیز و تند نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "اب کوئی سوال باقی
رہ گیا ہے؟"

"صرف ایک سوال اور۔" میں نے اس کی برہمی کی پرواہ نہ کرتے
ہوئے کہا۔ "کیا یہاں آپ کے خاندان کے دوسرے افراد نہیں رہتے۔
آپ نے کوئی شادی کی ہو گی تو انہیں بہرحال خبر ہو گی۔"

"والد صاحب کا تعلق اس شہر سے نہیں فیروز آباد سے ہے،

معقول جواب

ایک نئی شادی شدہ لڑکی سسرال سے روانہ ہوئی۔ لیکن دو دن
بعد ہی واپس لوٹ آنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے بیوی
کو تار دیا کہ وہ کل پہنچ رہا ہے۔ اور پھر جب
وہ گھر پہنچا تو بیوی کسی اجنبی نوجوان کے پہلو میں تھی
اسے دیکھ کر سخت طیش آیا اور وہ اپنے خسر کے پاس
پہنچا اور کہا۔ "میں آپ کی بیٹی کو طلاق دے رہا ہوں۔"
خسر نے کہا۔ "بیٹا اتنی عجلت سے کام نہ لو مجھے
یقین ہے کہ میری بیٹی کے پاس یقیناً کوئی معقول جواب
ہو گا۔ پہلے مجھے اس سے بات کر لینے دو۔"
اگلے دن خسر صاحب داماد کے پاس آئے اور
کہنے لگے۔ "میں کہتا تھا کہ میری بیٹی کے پاس کوئی
معقول جواب ضرور ہو گا۔ ایسا ہی ہوا۔ بات یہ ہے کہ
اسے تمہارے آنے کا تار ہی نہیں ملا۔"

مرسلہ: ارشاد احمد، گوجرانوالہ

اور خاندان کے تقریباً تمام ہی افراد وہیں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ میرے
والد صاحب بخوبی جانتے ہیں کہ میں اپنے عزیز و اقارب سے رسم و راہ
نہیں رکھتا بلکہ ان سے دور بھاگتا ہوں۔ والدہ کے خاندان کے لوگ بھی
یہاں نہیں ہیں اور میں زندگی میں کبھی ان سے ملا ہوں۔ بلکہ مجھے یہ بھی
نہیں معلوم کہ وہ ہیں بھی یا نہیں۔"

"کیا مجھے والد صاحب کو لینے کے لئے آپ کے ساتھ ایئرپورٹ
جانا ہو گا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں یہ مناسب نہیں ہو گا۔ کسی جان پہچان کے آدمی نے ہمیں
ساتھ دیکھ لیا تو ہم دونوں کے لئے بُرا ہو گا۔ تم ٹھیک سات بجے کے
قریب یہیں آجانا۔" ڈاکٹر کامران مسکرایا۔ "خوب بن سنور کر آنا۔ والد صاحب
مغرب زدہ ہیں مگر صاحب نظر بھی ہیں۔ پھر تم یہیں گھر پر ٹھہرو گی اور میں انہیں
لینے ایئرپورٹ جاؤں گا۔ جہاز نو بجے تک آجائے گا۔ میں انہیں یہاں
لاؤں گا۔ خود مگر ٹھہراؤں گا نہیں گھر کے چھوٹے ہونے کا بہانہ بنا کر
کسی ہوٹل میں ٹھہرا دوں گا۔ جب انہیں ہوٹل میں چھوڑ آؤں گا تو بعد
میں بیٹھ کے طے کریں گے کہ آئندہ ملاقاتوں کا کیا کیا جائے گا۔"

"کیا تمہارے لئے ممکن ہے کہ تم دیر تک گھر سے باہر رہ سکو؟"

اس نے پوچھا۔

"زبیدہ! اگر ذہن میں رکھتی ہوئی اپنی شادی مشکل ہے مگر کیا آپ کے والد صاحب میرے والدین سے ملنا چاہیں گے؟"

"میں نے اس پہلو پر بھی غور کر لیا ہے۔ والد صاحب کو پہلے ہی لکھ دیا ہے کہ میری بیوی کے والدین اور اہل خاندان صولت نگر میں رہتے ہیں اور وہ محض تعلیم کی غرض سے یہاں آئی تھیں۔ یہیں کالج میں میری اس سے ملاقات ہوئی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کیا اور شادی کر لی۔ خوش قسمتی سے یہاں والد صاحب کا قیام بہت مختصر عرصے کے لئے ہوگا۔ وہ خود بھی کہیں آنا جانا پسند نہ کریں گے۔"

میں اس کی بیدار مغزی اور اعلیٰ منصوبہ بندی پر حیران رہ گئی۔ خاموش ہو کر میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ پورے دس بج رہے تھے۔ میں ہڑبڑا کر کھڑی ہو گئی۔

"بہت دیر ہو گئی ہے اب چلوں گی۔ کوشش کروں گی کہ اپنے وعدے پر پوری اتروں۔"

ڈاکٹر کامران بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ میری پشت پر ہاتھ رکھتے ہوئے سرگوشی سے بولا۔ "تم اچھی لڑکی ہو۔ مجھے یقین ہے کہ اپنا وعدہ ضرور نبھاؤ گی۔ میں اپنے انتخاب میں کبھی مار نہیں کھاتا۔"

وہ مجھے دروازے تک چھوڑنے آیا۔ آئندہ ملاقات کی امید لئے ہوئے ہم ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔

ٹیکسی لی اور زبیدہ کے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔ ذہن بار بار سوچ رہا تھا کہ ڈاکٹر کامران محض والد صاحب کو مطمئن اور خوش کرنے کے لئے کتنا بڑا ڈرامہ کھیلنے جا رہا تھا۔ مگر کیا فی الواقع حقیقت یہی تھی یا پس پردہ کوئی اور بات تھی۔ ذہن ڈاکٹر کامران کی بات کو قبول نہ کرتا تھا۔ یہ ہضم ہونے والی بات ہی نہیں تھی۔ مگر یقین کرنے کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔

ٹیکسی سے اتر کر گھر کی طرف بڑھی تو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ دروازہ مقفل تھا یعنی لڑکیاں کہیں گئی ہوئی تھیں۔ خدایا کیا کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آگیا ہے۔ پھر سوچا کہ آج رخصت ہے ممکن ہے لڑکیاں موقع غنیمت سمجھ کر کہیں گھومنے پھرنے نکل گئی ہوں۔ میرے پاس اضافی چابی تھی۔ زبیدہ نے ایسے موقع کے لئے دے رکھی تھی۔ میں نے پرس سے چابی نکالی اور قفل کھول کر مکان میں داخل ہو گئی۔

گھر میں اکیلی تھی، تنہائی سے ڈر لگنے لگا۔ ٹی وی کھول کر بیٹھ گئی کہ دل بہلے گا۔ مگر وہاں تو ایک خوفناک فلم چل رہی تھی۔ میرے خوف میں اضافہ ہی ہوا۔ میں نے گھبرا کر ٹی وی بند کر دیا اور خوابگاہ میں گئی۔ لباس تبدیل کر کے باورچی خانے میں آگئی۔ سوچا کہ آملیٹ تیار کر لوں۔ فرائنگ پین میں گھی ڈالا تھا کہ باہر اطلاعی گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی۔ گھی سے بھرا ہوا فرائنگ پین میں نے چولہے پر رکھ دیا۔ باورچی خانے سے نکل کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ لڑکیوں کو خوب ڈانٹ پلاؤں گی کہ میری غیر موجودگی میں گھومنے کیوں گئیں۔ انہیں میری واپسی کا انتظار کرنا چاہئے تھا۔

آگے بڑھ کر میں نے دروازہ کھول دیا۔ سامنے نظر پڑی تو دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ میری آنکھیں مارے خوف کے پھٹ گئیں اور سارا جسم پسینے میں نہا گیا۔ یوں محسوس ہوا جیسے دل ایک بار بڑی شدت سے دھڑکا اور پھر یک لخت ساکت ہو گیا۔ میرے حلق سے ایک چیخ نکلی اور میں چکرا کر گر پڑی۔

حواس پر چھائی ہوئی تاریکی میں میں نے دیکھا تھا کہ کفن میں لپٹی ہوئی ایک کریہہ اور خوفناک لاش میرے سامنے کھڑی تھی۔ پھر وہ لاش سائے کی مانند مجھ پر سے گزرتی ہوئی مکان میں داخل ہو گئی تھی۔

زبیدہ جب اپنی سہیلیوں کے ساتھ
گھر پہنچی تو اس نے کیا دیکھا۔؟
واقعات کی دلچسپ کڑیاں
مقبول عام سلسلہ "[illegible]"
کی اگلی قسط میں ضرور ملاحظہ کیجئے!

عصمت چغتائی

کنواری

مرد سے کنوارا پن چھین لو۔ سیپ کی کٹوری کی طرح
جو سیپ کو توڑ دو تو پانی پھر نہیں ہوتا ـــــــ
اور عورت ـــــ !

عصمت چغتائی کے کہنہ مشق قلم سے نکلی ہوئی ایک کہانی جس کا اثر دیر تک ذہن پر چھایا رہے گا

راست [illegible] کا سانس پھولا ہوا تھا۔ [illegible] کی وجہ سے [illegible] سی [illegible] ایک سی سانس [illegible] آتی تھی۔ [illegible] وہ [illegible] پلنگ پر گر پڑی اور [illegible] مجھے خاموش بیٹھے دیکھا۔

میں [illegible] خاموش بیٹھنے کے موڈ میں تھی مگر اس کی حالت دیکھ کر مجھے پریشان ہونا پڑا۔ اس کا رنگ [illegible] زرد ہو رہا تھا

گھٹی گھٹی بے نور آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے [illegible] منہ پر [illegible] تھا [illegible] بیمار [illegible] تھی۔ مجھے معلوم ہوا [illegible] بتاتے ہوئے ڈاکٹر [illegible] اس کا پیٹ [illegible] سیدھا [illegible] تھا۔ مجھے معلوم ہوا [illegible] ہوں۔ [illegible] بتا دیا [illegible]



ایک دن کالا آ ٹر ملتا ہی تھا۔

"ایک مشورہ لینے آئی ہوں۔" سائنس تاؤ میں آتے ہی اس نے کہا۔

مجھ جیسا آشفتہ دل بیتے نہیں کہ نمودار ہو کر مشوروں کی ضرورت آن پڑی۔ میں نے چونک کر سوچا۔ مگر نہایت خندہ پیشانی سے کہا۔

"ضرور ضرور۔ آج کل بہت مشورے میرے دماغ میں بھنبھنا رہے ہیں ــــ"

"کیا میں شادی کر لوں؟" اس نے بڑی لجاجت سے پوچھا گویا اگر میں نے اجازت نہ دی تو وہ کنواری ارمان بھری رہ جائے گی۔

"مگر تمہارا شوہر؟"

"موت آئے حرامی پیٹے کو۔ اُسے کیا خبر ہو گی۔"

"یہ بھی ٹھیک کہتی ہو۔ بھلا تمہارے شوہر کو تمہاری شادی کی کیا خبر ہو گی۔" میں نے سوچا۔ "مگر تمہاری شادی کے چرچے اخباروں میں ہوں گے۔ آخر آپ بڑی فلم سٹار ہو۔"

فلم سٹار کی دم میں ٹھینگا۔ "اللہ قسم ہے مجھے نہیں معلوم کہ یہ گالی ہوتی کہ نہیں۔ مدت ایک سانس میں تین گالیاں بکنے کی عادی ہے مجھے تو اس کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ گالی ہی سنائی دیتا ہے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ سوائے چند عام فہم گالیوں کے یہ گالیاں میرے پلے نہیں پڑتیں۔

"بھئی ایک بات میری سمجھ میں بالکل نہیں آتی۔" میں نے بات کی لگام ایک دم دوسری سڑک پر موڑ دی۔ "تم شادی شدہ ہو تو پھر تمہارا بچہ حرامی کیسے ہوا؟"

"اللہ آپا اللہ کا واسطہ کبھی تو سمجھا کرو۔ کم بخت شادی تو شوہر دو سال کا تھا تب ہوئی تھی۔"

"شوہر کے باپ سے ہی تھا؟" میں نے سہم کر پوچھا۔

"اُونہہ، تمہیں یاد تو کچھ رہتا نہیں، بتایا تو تھا ...... کمبخت ......"

"اچھا ...... یاد آ گیا ...... وہ تمہیں گرہستی کا شوق چرایا تھا۔" میں نے اپنی کند ذہنی پر شرمندہ ہو کر کہا۔

"پھر سر پھرا یا تھا۔ اس کے خصم نے دھندہ کرانا شروع کر دیا۔"

پتہ نہیں اس کا خصم پیشہ میں کیا تھا۔

"اونہہ، چھوڑو اس نامراد شادی کا، نئی شادی کا ذکر کرو، اللہ کے کب کر دی ہو۔ کون ہے وہ خوش نصیب؟"

"مستند؟" اور وہ قہقہہ مار کر قالین پر لوٹ گئی۔

ایک ہی سانس میں اس نے سب کچھ بتا ڈالا کب عشق ہوا کیسے ہوا اب کس مرحلے سے گزر رہا ہے۔ مستند اس کا کس بری طرح دیوانہ ہو چکا ہے۔ کسی فلم میں کسی دوسرے ہیرو کے ساتھ تو سین نہیں کرنے دیتا۔ اور وہ خود بھی اُسے کسی دوسری ہیروئن کے ساتھ لگنے یا نہیں جانے دیتی۔

"آپا فلم والیاں بڑی چھنال ہوتی ہیں۔ ہر ایک سے فکر لڑانے لگتی ہیں۔" اس نے ایسے بھولپن سے کہا جیسے وہ خود بڑی پارسا ہے۔ "کیا کری چھٹنی سی کہانی لکھو ہم دونوں اس میں مفت کام کریں گے۔ مزا آ جائے گا۔" اس نے چمکارہ دیا۔

"منسر سب کاٹ دے گا۔"

"منسر کی ......" اس نے موٹی سی گالی منسر کی تعیناتی پر داغی۔ "شادی کے بعد کام چھوڑ دوں گی۔ مستند کہتا ہے اپنی دلہن کو کام نہیں کرانے دوں گا۔ جمہوری چکھ کر سفر میں گے۔" اس نے خلاؤں میں پینگ لیتے ہوئے کہا۔ اور ایک دفعہ تو مجھے بھی یقین ہو گیا کہ اس کی دنیا بس جائے گی۔ چھوٹے سے بنگلے میں وہ بیگم بنی بیٹھی ہو گی۔ بچے اُسے گھیرے بیٹھے ہوں گے

"اماں کہا نا، اماں کہا نا،" وہ چلائیں گے۔

"ارے ہے ذرا تو صبر کرو...... آ رہی ہوں جانِ منو۔" وہ کلیجہ سے لپٹا لے گی۔

تب بچوں کا باپ مسکرائے گا۔ "بیگم کیوں لاڈ کی ہو۔ ابھی بچے ہیں۔"

"بس ایک ہو جائے پھر سالے کو شادی کی کھنڈی پڑے گی۔"

"تو کیا ابھی شادی طے نہیں ہوئی۔" خوابوں کی بستی سے لوٹ کر میں نے پوچھا۔ میرا دل بیٹھ گیا جیسے میری اپنی کنواری کی بات ٹوٹنے سے لوٹ گئی۔

"نہیں تو آپا حرامزادہ بڑا چالاک، نہ جانے کیا لگتا ہے۔" وہ ڈینگ مستند کو پھانسنے کی ترکیبیں پوچھتی رہی۔ نہ جانے کیوں یہ بات اس کے دل میں بیٹھ گئی تھی کہ اگر بچہ ہو گیا تو مستند کے پیروں میں بیڑیاں پڑ جائیں گی۔

"اور مستند کا کس نے شادی نہ کی تو؟"

"کمینے کا بچے نہیں اس کا تو باپ بھی کرے گا۔"

"خیر باپ کا ذکر فضول ہے وہ مر ہی چکا۔"

"حرامزادے کی چھاتی پر چڑھ کر شادی کر لوں گی۔"

"مستند کے باپ کی چھاتی پر چڑھ کے کیوں نہ مونگ دلیں؟"

"جب میری شادی ہوئی تو ماں کی بہن برس کے بیٹے کی ماں بھی
تم کوئی ایسی ترکیب بتاؤ کہ اسے کسی ایک دن پہلے اور ...... پھر
تو کہیں وہ مجھ سے پوچھتی تھی ان سے مجھے سخت وحشت ہوتی تھی
من کتنی بار سندر کے کہ جیسے اس آئی سندر پانچ برس کی
طرح جیسے اور زور تھا سنیا اپنا آکاش سے تھا یا آج سبز کے گال کی طرح چکنے
عشق لڑانے شروع کر دیتے۔ اسی بچپن بچپنے میں من اُسے نانی
اپنے آپ کرانے کا تعجب بڑا اور باتیں کرتی بہنیں اور شکریں اپنا بے تکلف
ہو گیا جیسے برسوں سے آشنا ہے۔

اُسے دیکھ کر یہ فدا نہ تھا تا مشکل نہ تھا کہ کیوں من نے دل
دے بیٹھی۔ اس کی صحبت میں ایک عجیب احساس نہیں گزرتا تھا وہ
جیسی بچی بنانی تم ضعیف لڑکی کے لیے تھوڑا سی زندگی بھی چھلکا دینے
لگانی تھی۔ وہ سندر کے ہر جملے پر بے تحاشا قہقہے لگاتی۔ وہ بات بچی
اُس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ پر لبوں کی جنبش پر سرور ہو کر کھلکھلا
اٹھتی۔ مسرت کی اچھلتی کودتی موجیں اُسے گول ڈالتیں۔ سندر کے لب
بلتے اور وہ قہقہہ مارتی۔ پانی دیتی ہوتی تو پھر گم ہو جاتا۔ کھاتی
دیتی تو منہ کا نوالہ سامنے بیٹھنے والے کے اوپر چھوڑ کر دیتی۔

وہ دونوں نہ جانے کتنا عرصہ چھپا کر ایسے ہی کھیل کھیلی کرنے
میں آتے تھے۔ بچوں جیسی شرارتیں کرتے قلابازیاں کرتے۔ کبھی
روٹھتے کبھی منتے۔ انہیں دیکھ کر بچے کبڑی کے وہ کھنڈرے بچے یاد
آجاتے جو پرانے کھیت میں بھٹکتے آجاتے ہیں۔ کیا نرالا ہوا
عشق تھا دونوں کا۔ بے پروں کے ہواؤں اُڑتے جاتے تھے۔

جنگلی ہرنیوں جیسے چوکڑیاں بھرتے ہوئے پیار نے من کی
کایا پلٹ دی۔ وہ ایک دم بہت حسین اور جاذب نظر بن گئی۔ جیسے
نیچے دیے روشن ہو گئے۔ سوئی ہوئی آنکھیں جاگ اٹھیں۔ ہزاروں
جادو سرگوشیاں کرنے لگے۔ سپاٹ سینہ کھل اٹھا اور کولھے لہرانے
لگے۔ بسنت سے کلیاں تڑوا کر وہ پھر تیلی ہو گئی۔

سندر اور من کی جوڑی ایسی ہی لگی۔ من ظروں میں وہ سندر کے
ساتھ تھی۔ انہیں ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ بیت سے بڑے سر کے
بین میک اپ روم میں پھرنے لگے۔ وہ فلمیں جو آدھی ہو گئی تھیں
پھر گئیں۔ من نے پہلی بار کسی لڑکے کو دل دیا تھا سب کچھ بھول
کر وہ اُسی میں ڈوب گئی۔

سندر اس کے بڑے لاڈ کرتا۔ اس کے بچپن پر پیار آتا
اُس کے الجھے ہوئے بالوں میں جا کر یوں ڈال دیتا تاکہ کسی یہاں

اسکول

سے تنگ آ کر ایک پیرنٹ ہیڈ مسٹریس
سے شکایت کرتی کہ ان کا بیٹا زیادہ بد تمیز ہو گیا ہے۔ گھر والوں
سے زیادہ ٹیچروں کی صحبت میں اثر قبول کرتا ہے لہٰذا
میں نے ایک تجویز سوچی ہے۔ امید ہے کہ وہ کارگر
ثابت ہو گی اور وہ عادت چھوڑ دے گا۔

دوسرے دن ہیڈ مسٹریس کو لڑکی کی ماں کا خط
موصول ہوا "اگر آپ کی تجویز کامیاب ہو گئی تو براہ
مہربانی اس کی تفصیل مجھے بھی بھیجیے۔ میں اس کو لڑکی کے
ڈیڈی پر آزماکر دیکھوں گی۔"

کر کے رسالہ لگاتا۔ خالہ سے چھپ کر گلیسیرین لگاتا۔ جانی کو وہ بکی بنا کر بچوں کے
ساتھ وہ ہمیشہ کی طرح آگئے من کے جسم سے مطلب تھا اس کی آمد
اسی طرح منہ بسورے رشتہ داروں کے تنور میں بھڑک جاتی تھی پھر کر وہ
بہت پیار کرتا تھا۔ من نے اس عجیب بچے کو مال کے سنانا شروع کیا تاکہ
بنا کر گود میں جا کر گھنٹوں بیٹھا رہا اور باتیں کیا کرتا۔

"آپا شمیم شرمندہ کر رہا ہے۔ یہ تم ہی کہو کیا بات ہے؟"
وہ محروم کرتی اور میرے کانوں میں من کی بات کے سوال کرتے گئے،
دیکھنے میں تو سندر کیا لا ابالی سا تھا۔ مگر بچوں کے معاملے میں اس کا مقیم
حیرت انگیز تھا۔ آتے ہی بچے اُسے گھیروں کی طرح گھیر لیتے۔ اس کی
جیبیں کیا تھیں جادوگر کی زنبیل تھیں۔ ٹافیاں، پنسلیں، پٹاخوں کی ڈبیاں،
کاغذ پر تراشنے کی تصویریں، سیاہ کیمٹ، میٹھی گولیاں، دھاگے کیا الا بلا
نکال کر بانٹنے لگتا۔ ایک دن بچے نے میری سینٹ کی شیشی توڑ دی۔ میں
نے اُسے مارنا چاہا تو وہ سندر کے ہاتھوں سے اُسے چھڑا لے گیا۔
"آپ مدیر کی تو اسے اپنے گھر لے جاؤں گا" وہ اُسے کندھے
پر بٹھا کر بولا۔

"اس نے میری شیشی توڑ دی ہے ضرور ماروں گی۔"
"ارے توڑ دیتے جائیں گے سالے نوابوں کے یہ بچے اپنی شیشی"
اس نے جیب سے نئی سر بند سینٹ کی شیشی نکال دی۔

"مگر یہیں میری شیشی نہیں ہے کیا تم ہی کا کیس لے گئی جو
کی؟" اس نے شیشی کھول کر سب بچوں کے بالوں کے کپڑوں پر چھڑک دی۔
پر چھڑکی اور جو بچ گئی تو میرے سامنے ڈال دی۔ جب وہ بچوں کو

ایک دن مُکالا تو جلتا ہی تھا۔

"ایک مشورہ لینے آئی ہوں۔" سانس قابو میں آتے ہی اس نے کہا۔

مجھے تھوڑا آشفتہ دیتے نہیں کہ مُردار کو پھر مشوروں کی ضرورت آن پڑی۔ میں نے چڑ کر سوچا۔ مگر نہایت خندہ پیشانی سے کہا۔

"او مزور دار آج کل بہت مشورے میرے دماغ میں بھنبھنا رہے ہیں ——"

"آپا میں شادی کر لوں؟" اس نے بڑی لجاجت سے پوچھا گویا اگر میں نے اجازت نہ دی تو وہ کنواری ارمان بھری مر جائے گی۔

"مگر تمہارا شوہر؟"

"موت آئے حرامی پِلّے کو۔ اُسے کیا خبر ہوگی۔"

"یہ بھی ٹھیک کہتی ہو۔ بھلا تمہارے شوہر کو تمہاری شادی کی کیا خبر ہوگی۔" میں نے سوچا۔ "مگر تمہاری شادی کے چرچے اخباروں میں ہوں گے۔ آخر اتنی بڑی فلمسٹار ہو۔"

"فلمسٹار کی دُم میں ٹھینگا ——" اللہ گواہ ہے مجھے نہیں معلوم کہ یہ گالی ہوتی کہ نہیں۔ مرد ایک سانس میں تین گالیاں بکنے کی عادی ہے مجھے تو اس کی زبان سے نکلا ہر لفظ گالی جیسا سنائی دیتا ہے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ سوائے چند عام قسم گالیوں کے یہ گالیاں میرے پلّے نہیں پڑتیں۔

"بھئی ایک بات میری سمجھ میں بالکل نہیں آتی۔" میں نے بات کی لگام ایک دم دوسری سڑک پر موڑ دی۔ "تم شادی شدہ ہو تو پھر تمہارا پِلّہ حرامی کیسے ہوا؟"

"اُئی مرے آپا اللہ کا واسطہ کبھی تو سمجھا کرو۔ کم بخت شادی تو شبّو دو سال کا تھا تب ہوئی تھی۔"

"شبّو کے باپ سے ہی نا؟" میں نے سہم کر پوچھا۔

"اُونہہ، تمہیں یاد تو کچھ رہتا نہیں بتایا تو تھا ...... کم بخت ......"

"اچھا ...... یاد آگیا ...... وہ تمہیں گرہستی کا شوق چرایا تھا۔" میں نے اپنی کُند ذہنی پر شرمندہ ہو کر کہا۔

"پھر سر پڑا یا تھا۔ ماں کے خصم نے دھندا کرانا شروع کر دیا۔"

پتہ نہیں ماں کا خصم رشتے میں کیا لگتا تھا۔

"اُونہہ، چھوڑو اس نامراد شادی کا، نئی شادی کا ذکر کرو، اللہ رکھے کب کر رہی ہو۔ کون ہے وہ خوش نصیب؟"

"مسٹر سندر!" وہ زور سے قہقہہ مار کر قالین پر لوٹ گئی۔

ایک ہی سانس میں اس نے سب کچھ بتا ڈالا۔ کب عشق ہوا کیسے ہوا اب کن مراحل سے گزر رہا ہے۔ سندر اس کا کس بُری طرح دیوانہ ہو چکا ہے۔ کسی فلم میں کسی دوسرے ہیرو کے ساتھ تو سین نہیں کرنے دیتا۔ اور وہ خود بھی اُسے کسی دوسری ہیروئن کے ساتھ ٹک یا نہیں ملانے دیتی۔

"آپا یہ فلم والیاں بڑی چھنال ہوتی ہیں۔ ہر ایک سے ٹکر لڑانے لگتی ہیں۔" اس نے ایسے بھولپن سے کہا جیسے وہ خود بڑی پارسا ہے۔ "آپا کوئی چٹپٹی سی کہانی لکھو ہم دونوں اس میں مفت کام کریں گے مزا آجائے گا۔" اس نے پچکارا دیا۔

"سنسر سب کاٹ دے گا۔"

"سنسر کی ......" اُس نے موٹی سی گالی سنسر کی قینچی پر داغی۔ "شادی کے بعد کام تھوڑی کرنے لگی۔ سندر کہتا ہے اپنی دلہن کو کام نہیں کرانے دوں گا۔ چھوٹے چھوٹے بچے ہوں گے۔" اس نے خوابوں کے جھولے میں پینگ لیتے ہوئے کہا۔ اور ایک دم تو مجھے بھی یقین ہو گیا کہ اس کی دنیا بس جائے گی جب کہ بنگلے میں وہ بیگم بنی بیٹھی ہوگی۔ بچے اُسے گھیرے بیٹھے ہوں گے۔

"اماں کھانا! اماں کھانا!" وہ چلائیں گے۔

"ارے ہے ذرا تو صبر کرو ...... آگ تو لگ جانے دو۔" وہ کفگیر سے انھیں مارے گی۔

تب بچوں کا باپ مسکرائے گا۔ "بیگم کیوں مارتی ہو، ابھی بچے ہیں۔"

"بس ایک روڑا ہو جائے پھر سالے کو شادی کرنی پڑے گی۔"

"تو کیا ابھی شادی طے نہیں ہوئی۔" خوابوں کی بستی سے لوٹ کر میں نے پوچھا۔ میرا دل بیٹھ گیا جیسے میری اپنی کنواری کی بارات دروازے سے لوٹ گئی۔

"نہیں آپا حرامزادہ بڑا چالاک ہے۔ نہ جانے کیا اٹکا ہے۔" وہ دیر تک سندر کو پھانسنے کی ترکیبیں پوچھتی رہی۔ نہ جانے کیوں یہ بات اس کے دل میں بیٹھ گئی تھی کہ اگر بچہ ہو گیا تو سندر کے پیروں میں بیڑیاں پڑ جائیں گی۔

"اور جو اُس نے پھر بھی شادی نہ کی تو؟"

"کمینے کا کلیجہ نہیں اُس کا تو باپ بھی کرے گا۔"

"خیر باپ کا ذکر فضول ہے وہ مر بھی چکا۔"

"حرامزادے کی چھاتی پر چڑھ کر خون پی جاؤں گی۔"

"شبو کے باپ کی چھاتی پر چڑھ کے کیوں نہ خون پی گئیں؟"

مسہری پر پڑی کیا تھی۔ اس کی پوری ماں کے بیچ میں تھی۔
تم کوئی ایسی ترکیب بتاؤ کہ سامنے کی ایک نہ چلے اور ..... " جو
ترکیبیں وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا ان سے مجھے سخت وحشت ہو رہی تھی۔
من کتنی بار سمندر کے کنارے پہ بیٹھی تھی۔ سمندر پیچھے کی
طرح یہیں اور زور تھا۔ نیا نیا ادھر سے پانی سے بھرے گالوں کی طرح پیچھے
شور زور سے شروع کر دیتے۔ اسی پانی کی پہچان میں من اسے اتنی
پیچھے کرنے کا قصہ بڑا اور پانی کی لہر پر ہی بیٹھ کر سمندر کی بلند لہروں
ہو گیا جیسے برسوں سے آشنا ہے۔

اسے دیکھ کر پتہ نہیں کیوں اس کا مشغلہ بن گیا کہ من اسے ڈل
رہتی تھی۔ اس کی صحبت میں ایک عجیب سا احساس ہوتا کہ یہ تھا
پانی بنانی تم نصیب ہوگی کہ پہلے تو وہ اسی زمین پر چھلکا دینے
لگی تھی۔ وہ سمندر کے ہر چھینٹے پہ بے تحاشا قہقہے لگاتی۔ وہ بات نہیں
اس کی چہرے کی تازگی جو لہروں کی جنبش پر سمجھ کر کھلکھلا
اٹھتی۔ شرارت کی اچھلتی کودتی لہروں نے جھکولے لگا لیے۔ سمندر کا لب
لہجہ اور وہ مقابلہ سا رہتی پانی میں بیٹھی ہوتی تو پھر تھک جاتا کھا تا کھاتی
ہوتی تو سمندر کی لہر اس کے سامنے بیٹھنے والے کے اوپر چھڑک دیتی۔

وہ دونوں نہ جانے اپنا گھر چھوڑ کر میرے ہی بال کھیلنے کرنے
کیوں آتے تھے۔ بچوں جیسی شرارتیں کرتے قلابازیاں کرتے۔ کبھی
روٹھتے کبھی منتے۔ انھیں دیکھ کر مجھے بچپن کے وہ لمحے بیتے یاد
آجاتے جو راستے کھیت میں بھٹکتے جاتے ہیں۔ کیونکہ نانا جڑا
عشق تھا دونوں کا۔ بے پروں کے ہو جیسے اڑتے جاتے تھے۔

جنگلی ہرنیوں جیسے چوکڑیاں بھرتے ہوئے پیار نے من کی
کایا پلٹ دی۔ وہ ایک دم سے سنجیدہ اور جاذب نظر ہو گئی۔ جیسے
نیچے دیے روشن ہو گئے۔ سرخی بھری آنکھیں جھلک رہی تھیں۔ ہزاروں
جادو سرگوشیاں کرنے لگے۔ بہت تیز ہوا تھا اور کرنے لگے لہرانے
لگے بسنت رنگے کشتیاں اڑ کر وہ پھر تتلی ہو گئی۔

شنا اور من کی جوڑی بکھر گئی۔ جن لمحوں میں وہ سمندر کے
ساتھ رہتی انھیں ڈوبنا شروع کر دیا۔ سیٹ سے پیشہ ور کے
سین میک اپ روم میں بیٹھنے لگے۔ وہ خیں بہادری ہو گئی تھی جو
کم کیوں۔ من نے پہلی بار کسی نوجوان کو دل دیا تھا۔ سب کچھ بھول
کر وہ اسی میں ڈوب گئی۔

شنا اس کے پیچھے لگا رہتا۔ اس کے پیچھے پیچھے پھرتا
اس کے الجھے ہوئے الجھنوں کو جان کر جان ڈال دیتا۔ علی کی ادائیں

اسکول

مریضہ طارق لاہور

سے نئے فرقہ کی بہت ہو چکی ہے مسٹر سپس
نے اپنی کمر لگی کو اتنا ہی نہیں سمجھا ہے۔ مجھے شروع
سے ہی لڑکیوں کا صحبت میں رہنا پسند ہے۔ جناب
میں نے ایک بار تجربہ کر لیا ہے۔ اب جو ہم کر دکھا کر
ثابت کیا کہ ہم عادت چھوڑ دیں گے۔

دوسرے دن ہیڈ مسٹریس کو لڑکی کی ماں کا خط
موصول ہوا۔ "اگر آپ کی تجربہ کامیاب رہا ہے تو براہ
مہربانی اس کی تفصیل مجھے بھی بھیجئے۔ میں اس کے لڑکی کے
ڈیڈی پر آزما کر دیکھوں گی۔"

کر کر مسکراتا تھا۔ خالص بچوں کی سی باتیں کرتا۔ جانی کو دیکھتا پاتا تو بچوں کے
ساتھ وہ جو کرتی ہوتا اُسے من کے جسم سے مطلب تھا۔ اس کی آمد تی
اسی طرح سمندر پہ ایک رشتہ داروں کے تنور میں جب گر جاتی تھی شوہر کو وہ
بہت پیار کرتا تھا۔ من نے اس بد نصیب بچے کا حال اُسے سنا دیا تھا۔ اُسے
بیٹا کہہ کر گود میں بٹھا کر گھنٹوں پیار کی باتیں کیا کرتا۔

"تمہارا شوہر تو مرنے کر بیٹھا رہتا ہے۔ تم ہی بتاؤ کیا بات ہے؟"
وہ مجھ سے کہتی اور میرے کانوں میں من کی باتوں کے ڈھول بجتے ہیں،
دیکھنے میں سمندر کیسا لا ابالی سا تھا۔ گو بچوں کے معاملے میں اس کا رویہ
حیرت انگیز تھا۔ آتے ہی بچے اُسے کھلونوں کی طرح گھیر لیتے۔ اس کی
جیبیں کیا تھیں جو ہر وقت بھری رہتیں۔ رنگین پنسلیں، چاکلیٹوں کی ٹکیاں،
کاغذ پر بنانے کی تصویریں، چاکلیٹ جیسی گولیاں، وہ جانے کیا الا بلا
نکال کر بانٹنے لگا۔ ایک دن بچے نے میری سینے کی شیشی توڑ دی۔ میں
نے اُسے مارنا چاہا تو وہ میرے ہاتھوں سے اُسے چھین لے گیا۔
"تمہاری کی تو سے اپنے گھر سے لاؤں گا۔" وہ مسکراتے
ہوئے بیٹھا کر رہا۔

"اس نے میری شیشی توڑی ہے ضرور ماروں گی۔"
"اچھا تو اور دیتے ہیں بس کے ساتھ ماروں گے۔ یہ بیچ کی شیشی کی۔"
اس نے جیب سے نئی نویلی ہی شیشی نکال دی۔
"مگر اُنھیں پوری شیشی نہیں دی ہے۔ اتنا ہی آتی ہیں کو ہی سے
کی۔" اس نے شیشی کھول کر ذرا بچوں کے بالوں سے کپڑوں پر چھڑکی
بچوں کی ٹولی لوگوں کی تو میرے سامنے ڈال دی۔ جب وہ بچوں کو

جب تک وہ میرے کمرے میں چلا گیا تو میں نے سر دکر میرے شانے پر
سر ڈال دیا۔
"آپا ایسے ... آدمی کے ساتھ کوئی بیاہ کیسے
اور بہو ... کی زندگی نے ایک نیا جنم لیا یا ... مگر
... محبت ... فوراً آجاؤ ... ساتھ جانے کے
لیے ... اس نے اپنے ... کے سامنے تیر استعمال کر ڈالے،
شام سے ہی اس کے ... کی بوتل ... کر پہنچی۔ ... رخصت
کر دیا ... نازک لمحوں میں ساتھ ... کی قسمیں دیں ... شدہ
... ہوا ... ساری رات جاگتی رہی۔ ... دیا
... ہوتے ہی ... تتلیاں ... کر ڈالا۔
یہ عالم ... کہ ... کر ... ہو گئیں۔ ... تم
کے ... عاشقوں سے بڑی کوفت ہوتی ہے مگر ... حال
دیکھ کر ... ایک ہی رات میں ... کے
... ہو گیا ہے ... کیا ... چیخ ...
میں کیوں اس کم بخت کے بارے میں سوچوں۔ دنیا میں کتنے
بڑے بڑے مسئلے ہیں جن میں ہی الجھا ہوا ہے۔ پھر آخر میں اس کا خیال
کیوں کرتی ہوں۔ یہ سب کچھ کیوں ... رہی ہوں ... اس وقت نہیں
مجھے ... کرنے کے لیے بھی ... سمجھ کر ... ہو گا۔
کتنے دن سے میں ... ہوں ... کا خیال مجھے
... کہتا ہے: "میں زندہ ہوں ... میرے سینے میں دل دھڑک رہا ہے
میری رگوں میں خون ... . مجھے بتاؤ میں
کیوں ہوں، کیا ہوں اور کب تک ... ہوں گی": اچھا ہے ... ایک
... پھر تتلیاں ... بند ہو جائیں گی۔
"آپا ایک ... " اس نے تھوڑی دیر ... آہیں
بھر کے کہا۔
"کیسا ... ؟"
"... ذرا ... جلدی ... رہی ہوں"
"مگر ابھی تو وہ ... نہ ہو گا۔" میں نے ... چاہا ... پھر وہ
... لکھ دیا۔ ... نہ تھا۔
"شام ... کا ... آنکھیں ... شرماتی ہوئی ... میں منہ
چھپا کر ہنسنے لگیں۔ میں نے کہا: "خیریت؟"
"... دو۔"
"... تھا۔"
...

... ... کر ... تھا۔ ...
آ ... ۔"
"اچھا ...... بات ہے ... ہو۔ ... میرے
... گیا۔ ... کا ... " ڈاکٹر کے پاس گئیں۔"
"وہ ... رہی ہوں۔ ڈاکٹر ... کتاب
... نہیں ہوتا ... نہیں ... "
"... تو ... بلکہ ... ہم سے ...
... تم پاس ہو گی؟ ... میں نے ... "
"تو پھر ... لکھو نا۔"
"کیا لکھوں؟"
"لکھو ... سال۔"
"... ہو تم، ابھی کہاں ہے ... "
"اچھا تو ... نے ... لکھ دو۔"
"... اس کے ... کر ... اور کیا معلوم
... ہو۔"
"... کی ... کہ ... ہو گی۔ میری طرح ... میرا
کہنا ہے ... ہی ہو گا۔" پھر تھوڑی دیر ... کر ایک دم بولیں: "خدا
اللہ کرے۔"
"کون؟" میں نے چونک کر پوچھا۔
"... کی ... لڑکی ... نہیں ...
... کرنے کے لیے ... ہے۔" اس نے نہایت
... کی ... نگاہیں ...۔
"احمق ہو تم، کیسے معلوم؟"
"ارے میں خوب جانتی ہوں ... کو۔ جب
... کی زندگی میں ... آیا تھا اس نے گالیاں بکنا بند کر دی
... کے ... ہاتھوں ... کر ... کا ...
دیا تھا۔ اس کے ... ہوتے ہی ... کے ...
... بہنے لگی۔ اس کے منہ سے پھر وہی گالیاں ... کر ...
گیا ... کی ... بن گئی۔"
"اس کا حق ہے۔"
"کس کا؟"
"اس کی ماں ... کا۔ ... آپا بہت سی ... میں
... سمجھیں ..."

[illegible]

"اور تم کیا .... وہ اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر بولی تھیں۔ اپنے کئے کی سزا پا رہی ہے ...."

میں نے تصدیق کی یا نہیں۔ تصویر میں سوتن میرا پیٹ کا بچہ ہوا ہے۔ کل کلاں کو مرے بعد نکال دیتا تو تنگ آ کر مجھے الزام نہ دیں گے:"

دوسرے دن تم کو ان بچوں کو لے پہنچیں۔ کل سے ڈاکٹر کا ان کی تھیک کی۔ مددی چہرے پہ سوا تھے۔ ساتھ ساتھ سندر کی کہانی بھی گئی۔ ساس بھی بھاگ کے سوئی جہاں وہ سو جاتا تھا۔ بیٹی کی نو جوانی کی پیدائش کا علاج کرے تو دیکھو اب پھر رہی تھیں۔ آج اس کی ماں دوبارہ جان دینے پر تیار ہیں۔ تھکی تھکے تو کیسے پوچھنے لگا۔ کیسے پاس کوئی چارہ کی بچی ہے جو چاہے کر لو، بتا دوں۔ ماہر نے کچھ مشورہ دے کیا تھا۔ اب آئندہ اس مصیبت سے پالا نہیں پڑے گا۔ میں نے بہ وجہ کوشش کے نہ بتایا کہ سندر کو جانے والا ہل کے پیر مفلوج ہو چکے ہیں۔

صبح شام ماں کی مددی نے ڈاک بٹھا دی۔ کام پر اس نے ابا مدد دی۔ ایک پرندہ پر مرنے کو دیتی ہیں سے جانے کی دھمکی دی۔ نو دو تک پرندہ ہم مار مرہم مقرب کر رہی تھی۔ بیماری کی مقدار کی دور ہی گئی۔ تھکی تک، میں نے سوچا۔ مگر جب پرندہ پر سر ہلا گیا تو دونوں نے ناک پونچھ کر ہنسنے لگیں۔

"مگر مجھے یہ وقت کیوں بتایا تم نے؟" میں نے چڑ کر کہا اور لی آئی۔

اخباروں میں استقلال کی خبریں چھپنے لگیں۔ مددی نے دل ڈالا تصدیق کر دی۔ میں نے پوچھا "یہ کیوں؟"

"مگر پتہ چلے گا تو بہت کچھ ہو گا۔ میں کہ دو دن گئی میں کبھی چھوڑ کر چلے گئے، دونوں کی کے ڈرے کر ایاں کا اس سمجھ بیٹھے کچھ نہیں لگے گی۔"

ایک دن حواس باختہ دوڑی ہوئی آئیں۔

"تم نے مجھے نہیں جانے دیا۔ یہ دیکھو"۔ وہ اخبار جس میں سندر کی شادی کی خبر چھپی تھی لا کر دینے لگیں۔

"یہ خوشی ہیں نے کب منع کیا؟" میں نے حیران ہو کر کہا۔ "نو بیٹی کے جنم میں"۔ اور وہ شام کے بولے کا وہ دعا دے کر چلی گئیں۔ گیارہ بجے رات کو جب وہ سندر کے گھر پہنچیں تو گھڑی ہو چلنے

[illegible] سب ملا کر ایک [illegible] لہ دے۔ کے سب سے [illegible] ہو گئے۔ ان کے لئے پاس [illegible] تھے۔ ابھی میں نے اسی شام ان کو ملی ہیں کہ [illegible] بہتے ہیں بچوں کے ساتھ [illegible] پر [illegible] لگی۔ [illegible] ہیں [illegible] پوچھے جی سندر ملی [illegible] لگ گئے یہ جانتی۔

ماں بچے کے بعد سندر جس لہجے سے بات کرتے وہ نفرت انگیز لگا گیا تو ماں دہی مددی۔ کیا مددی کبھی ان خاندانوں میں گھل مل کر اُن کی اپنی بن سکیں گی۔ اُن کے گھر والے ان سے کیسے گھل مل سکیں گے اور دیوانیاں بنیں گی۔

"یہ دور کا سر سلطان ہے۔" ساس کے کی نہیں سے گیا اور کہا مگر یا یہ بھی ساس سے کبھی نہیں وہ سے گی۔ سندر کی طرف نظر کرے گی۔ مدد کا فخر سے میری ماں ہے کی بچے پڑھانے کی کہ سندر کی کہاں کا پیٹ دوڑ گیا۔ اس کے کا پیٹ دوڑ کر سے چلے جانے سے پیٹ جانے والے سے خلیں سے کو پیٹ ڈالے۔ اس کے کچھ بیٹے گھٹے بالوں میں انگلیاں ڈال کر نوچ ڈالے۔ مگر ساس "سندر" کی قسم سے اس کے پیٹ تھام لیا۔

ان سے کیا سندر کے حق میں آتے ہیں ہے کہ کر دیا بیٹا ہو گیا ان بیٹیوں کے سامنے وہ اپنی داستان کے دو بول کر سب کے شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ معنوی خوشی ہر جی سے بولا:

"اسے آپ؟"

"آپ کے بچے،" ان دنوں نے بات پیچھے کر سندر کی گھر بہت بڑی تڑپی تھی۔

"جوہری سے کچھ زیادہ بڑے تھے۔ چاندی کی کرن کا کام دے دی بیاہ بیٹی میں نہیں ہو گا۔ مددی کی سیر بھی ہو جائے گی اسے دیکھ لے گی۔" مددی مددی کی بیٹی کا قائل تھا آج تو ان کا گیا جب سے سندر کی بیٹی کے گھر میں شکایت آئی تو وہ قسم کھا کر بیاہ کی زنجیر کر لی کہ وہ اس کے حق میں آئے گی۔ مگر جب سب ہو گئی تو سندر اس کے پاس آ نہ سکا۔ سب سو گئے اور وہ سندر کے بیٹوں کی جا پہنچے کے ساتھ ہی پڑ رہی۔ ساس کا جسم سندر میں چلا جانے کے لئے آتی، اور اب سندر لا کر کیسے کہتے کہ وہ ان کے پاؤں کا جل بجتی آئی تھی ہے سندر سوتا ہوگا۔ وہ چلتے کے ساتھ بیٹی کو بیٹی ہے گی۔ آنے سے کہیں کے سندر جو گا کا پیچھے وہ بیٹی بہلاتے گی۔

[illegible]

خوب روئے گی۔ پھر دونوں مل جائیں گے۔ ساری کلفت دل کی
مٹ جائے گی۔ سارے شکوے اسی طرح آنسو بن کر دل میں اتر کر
پگھلنے لگتی آئی تھی۔ اس سے پہلے تو وہ ایسی جھلک سی تابانی لیتی آئی تھی
جو ہاتھ کے مس سے روشنی کی طرح پگھل کر غائب ہو جاتی تھی۔
من مندر کے پیروں کی چاپ سننے کے لیے بے قرار ہو گئی
گوش بن گئی۔ جب بیروں وہ پلنگ سے اٹھا ہوگا۔ اس نے تصور میں
تعمیر کرنا شروع کر دیا۔ اس کی طرف کھنچا چلا آرہا ہوگا۔ ایک، دو، تین
چار، پانچ اس نے زنانے سے وہ سارے قدم گن ڈالے جو اس کے
اور مندر کے درمیان حائل تھے گنتے گنتے وہ تھک گئی۔ اگر وہ ہزار میل
پر بھی ہوتا تو اب تک پہنچ چکا ہوتا۔ وہ بہت اداس ہو گئی۔ احساس کے ناخنوں
سے کچیاں بھیجے جیسے کی طرح کٹنے لگیں۔ شاید مندر کے بھائی جاگ
پڑے ہوں گے۔ اور وہ ان کی موت کی دعائیں مانگنے لگی۔
مندر کا گھر تھا سی بھری جوانی بہنیں کیا بیٹھی نیند سو رہی
تھیں۔ ان کے خواب کتنے سہانے تھے۔ ان کے دلوں میں کسی بیوفا
کے پیار کے زخم نہیں پڑے تھے۔ اسے غصہ آنے لگا۔ اے کاش
کوئی ان کا جہاں بھی لوٹ لے۔ ان کے سینوں میں سانپ چھوڑ دے
کہ یہ بھی گھر اندھیارے میں کسی کے پیروں کے نشان ٹٹولتی پھریں۔ پھر
مندر کو ترسنے والی کا اعجاز معلوم ہو۔
آخر کس جرم کی سزا میں اس کا بچپن تاویران اور جوانی زخم زخم
ہو کر رہ گئی تھی۔ اس سے زیادہ ضبط نہ ہو سکا اور مندر کے کمرے کی
طرف چلنے لگی جہاں وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ سو رہا تھا۔
وہ جیسے ہی باہر نکلی ہوا کا اجنبی صورت دیکھ کر آنکھوں کے تو
کھانسنے لگا۔
"کون ؟" داوا نے ہانک لگائی۔ وہ چوروں کی طرح جھجکنے کے
پیچھے دبک گئی۔ داوا اٹھے اور جھونپڑے پر کھڑے آدھ گھنٹہ تک رفع
حاجت کرتے رہے۔ مرگیا بڈھا شاید کرتا ہی نہیں۔ وہ سانس سانس
پھولی۔ ایک بیری سے بیر الجھا اور دھڑام سے گری۔ گھر میں جاگ ہو
گئی۔ وہ پھر اپنے پلنگ پر جاکر دبک گئی۔
صبح ہوتے ہی اس نے مندر سے کہا: "سیدھی طرح چلی
چلو۔ ورنہ خون خرابے ہو جائیں گے۔"
"تم نے انکار کر دیا ہوتا۔ کسی ہوٹل میں انتظام کرا دیتا۔"
"کیسے؟ کیا بھائی گھر تک آیا جا رہا ہے۔ ورنہ کیوں جاتے ہو
کھانے کو پیسے لے لیتا۔"

"وہ ماموں کی بات نہیں میری جان، میرے گھر والے بڑے
تیز و ماڈرن ہیں۔ ہم ماموں کو پسند نہیں کرتے۔"
"تم بھی تو ظلم والے ہو؟"
"میری اماں جان سے تم شام کی گاڑی سے چلی جاؤ۔ پرسوں
میرے بھائی آ رہے ہیں، ان سے مل کر......"
"تو میں بھی نہیں جاؤں گی۔" بڑی جھک جھک کے بعد یہ
طے ہوا۔ من بظاہر بستی کے لیے روانہ ہو جائے، ایک اسٹیشن بعد نئی
دہلی پر اتر کر کسی ہوٹل میں ٹھہر جائے۔ مندر وہیں آ جائے گا۔ بڑی
دھوم دھام سے سالگرہ من کو اسٹیشن پہنچانے گیا۔ وہ ایک دم اشکبار
بن گئی۔ چھوٹے بھائیوں نے تو زار بھی بہا لیے۔
نئی دہلی پر اتر کر وہ ایک ہوٹل میں ٹھہر گئی۔
دو پیاسے انسان ایک دوسرے میں غرق ہو گئے۔ من کے
سارے دکھ دور ہو گئے۔ وہ انتظار کی گھڑیاں وہ ملاقاتیں کاسہ سب
مندر کے پیار نے پاٹ دیا۔ مگر باوجود کوشش کے مندر رات گزارنے
پر راضی نہ ہوا۔
"میری ماں میرے بغیر رات بھر بنا کھائے بیٹھی رہے گی۔"
"تمہاری ماں کی......" وہ موٹی سی گالی چبا گئی۔ مندر
کی جان کو آ گئی۔ اس کے کپڑے چھپا دیے۔ اس کے جوتے گودی میں دبا
کر بیٹھ گئی۔ دس مرتبہ دروازے سے بار بار خدا حافظ کہنے کو لوٹا گیا
جانے والے کو نہ روک سکی۔ وہ اسے شو نے اجنبی بستر پر سسکیاں
بھرتا چھوڑ گیا۔
دوسرے دن مندر حسب وعدہ آگیا۔ من نے پورا بکر
بیئر کی بوتلوں کا برف میں لگا کے رکھا تھا آتشدان میں دہکتی ہوئی
آنچ اٹھ رہی تھی۔ من کی تانی پگھل رہی تھی۔ مندر بیئر پیتا رہا۔
اس کی آغوش میں پگھلتی رہی۔ کاش کوئی وقت کی نبض پکڑ کر
یہ لمحے یونہی فضا میں معلق ہو جاتے۔ وہ اسی طرح مندر
تحلیل ہو جاتی۔ دونوں کا سوال مٹ جاتا۔ وہ پیتے رہے۔ سوتے
پھر جاگ اٹھتے اور پھر سو گئے۔
شام کو دونوں ننھے بچوں کی طرح کمبل میں چھپیں کرتے
باہر کی دنیا ان کے لیے ختم ہو گئی تھی۔ جیسے من آتشدان کے پاس
دو زانو ہو کر انھوں نے اپنی دنیا بسا لی تھی۔
دن بھر کی بیئر کا نشہ ٹپکا پڑ رہا تھا۔ من پلنگ سے لگ کر بیٹھنے
لگا۔ من کو کسی نہ کسی بہانے سے مندر کو الگ کرنے کا خیال آتا تھا



اس کا بس چلتا تو وہ اس کی گردن پکڑ کر دبا دیتی اور پھر اس کے بعد پھر سوچ کر اپنے ذہن سے وہ خیال جھٹک دیتی۔ بس ہمت تو اُسے ساری عمر ہی نہ ہوئی اپنے دل کے کسی کونے میں آسیب کی طرح بسا یہ احساس بہت کھٹکتا کہ رہ سکے نہ نکلے۔

مگر پھر نہ جانے کس لمحے اسے موت کے قدم آگے بڑھتے دکھے۔ ممی ہمیشہ کی طرح ساکت ہو گیا۔ ہمت ختم ہو گئی۔ سب لوگوں کی بکواس شروع کی ساتھی نے ند سے اس کی پسلی میں لات ماری کہ آنکھیں نکل پڑیں۔ مگر اُس نے پھر اُسے ہاتھوں میں بہت پیار سے پکڑا اور ممی کے من کو بھا گئی تھی۔ اُسے یوں لگا جیسے وہ سینے میں ہی اُلٹنے لگا تھا۔ اس چار چوٹ کی مار میں ملامت سے بڑی تھی۔ ممی تو سمجھتی ہی آتی کہ وہ اُسے اتنا مارے اتنا مارے کہ ہڈیاں چکنا چور ہو جائیں تب تو وہ اُسے چھوڑ کر نہ جاسکے گا۔

گر خاندان والوں کی دہشت ممی کے پیار سے زیادہ عجیب ثابت ہوئی۔ وہ چلا گیا اور ممی صبح تک آہیں بھرتی رہی۔ تڑپتی رہی۔

کاش وہ لنگڑا لولا اور اپاہج ہوتا۔ اُس کے سب جاننے والے اُسے بھول جاتے اور وہ صرف اُس کا ہو کر رہ جاتا۔ ممی نے سمندر کو ایک مرتبہ بتا دیا تھا۔ دنیا کو لات مار کے وہ اس کی ہی ہو کے لگ کر بیٹھ رہی۔ نہ اس کے گھر خبر کی نا ملنے جلنے والوں کو۔ آخر دنیا بھی مسلسل اُس کے جلتے ہوئے ہونٹ چومتی رہی۔ پھر بھی چین نہ پڑا تو بخار میں پھنکتے ہوئے جسم سے لگ کر سو رہی۔ خواب میں اُس نے دیکھا کہ گرم سنہری آنچ میں وہ پگھلتی جا رہی ہے اور وہ اُسے جسم پر ملتی ایک مشعل گئی ہے۔ اس کے رشتہ دار کسی جتن سے بھی ممی کا چہرہ نہ دیکھ سکیں گے۔ ڈاکٹر نے اُسے ڈرایا کہ گر وہ ٹکڑے میں ہزار بار اُسے شوہر کی تو وہ اچھا ہو سکے گا۔ خدا خدا کر کے رات بیتی اور دن ہوا۔ نہ کہ گیا تھا۔ شاید وہ دور سے آئے۔ مے ہیلا ہو گئے۔ دیوانی بلّی کی طرح وہ ہوٹل میں چکر کاٹتی رہی۔ پھر رات گئے کرشمہ کی شکل پہچان ڈالی۔ وہ جو اُسے لائی تھی جو بیکٹ ہو گئے تھے۔ اس کی ہتاوا صرف یہ اُسی کو علم اسے ثار ہونے کا گمان بھی نہ تھا۔ ایک سینما ہال پر شو لگے ہوئے تھے وہاں ممی کی بہت خم چل رہی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ پاگل ہو کر دوپٹہ ہوا میں لہرا کر چلا چلا کر یہی گیت گانے لگے جسے لوگ سنتے کے سینے میں دس مرتبہ جاتے تھے۔ مگر اس نے ٹال دیا۔ ممی کی آواز آتا کی تھی۔ اس کی بھی آواز قدرت تھی کہ جگار سے پھٹا پاس ہو رہی

تھی۔

کروڑوں کے دل کی ملکہ خیالوں کی ملکہ کے بجائے شرمیلی سی دل لیے تنہا رہتی ہیں کی طرح جب پتا لگا کہ آتے کا شوہر شل ہو گئے تو وہ کر سوچاں کی طرف چل دی۔ مگر وہاں جا کر معلوم ہوا سارا خاندان اُمڈ پڑا ہے۔ شکل کی خبر تک نہ لگی۔

مہر جاو بچا کر وہ بیوی کی کشش سے بچنے میل چاہتی تھیں وہ جانے کہ ممی سے خدا کی نہ ذات ملے نہ آتی پر صحت تھی۔ حد تک نے اس سے پہلے کبھی نہ لگی تھی۔ میں نے ممی سے بہت کہا:

"نہاؤ دھاؤ کچھ کھاؤ۔"

"اب تو اس شعور طوائف کی بھی ہی کھٹکی لگی۔ بتاؤ آپا کیا کروں، وہ اس کمینے نے مجھے خراب کیا اور اب بیاہ رچا لیا ہے۔"

"اب بزرگ مت تم پہلے ہی سے خراب تھیں۔" میں نے زچ ہو کر کہہ دیا۔

"آپا تم بھی اب کہہ رہی ہو تم تو بڑی روشن خیال ہو۔"

ممی چلا اُسی کے لہجے میں کہہ دیا:

"روشن خیال کی دُم! میں اس سے زیادہ روشن خیالی اور کیا کر سکتی ہوں کہ تمہاری اس آوارہ زندگی کا الزام تمہاری مجبوریوں اور احساسِ تنہائی کے سر تھوپ دوں کیا ہم تمہاری بیتی ہوئی زندگی کے قدم قدم پر نئی راہ پر ڈال سکتی ہوں۔ کیا یہ زبردستی حلق میں اتارا ہوا زہر جو تمہاری رگوں میں جذب ہو گیا ہے، نچوڑ کر نکال سکتی ہوں کہ تم ہنسو، زہر تو اب گرفت سے باہر ہو چکا ہے۔"

"تم نہیں جانتیں آپا۔" اُس نے ٹھنڈی سانس بھر کے کہا۔

اور میں نے سوچا بیچاری ممی جان سکتی۔ تم جانتی ہو کہ وہ زندگی انسان کو کیا بنا دیتی ہے جہاں نہ ماں کا پیار نہ باپ کی شفقت، نہ

سمندر کے بیوپاری سے کہہ دیئے، دلہنوں کی طرح سجی کشتیاں تیار رکھو
کا پروانہ ہو۔ [illegible]
سمندر سے ملنے کی ہر کوشش ناکام ثابت ہوئی تھی تو انہیں
ہی معلوم تھا کہ وہ ایک دوسرے کی تقدیر بن چکی ہیں۔
لیکن ایک دن وہ جانے کیسے سمندر کے کنارے پہنچ گئی۔ [illegible]
[illegible] سے نکل بھاگی اور سمندر کے سامنے [illegible] ہو گئی۔ اُس نے
[illegible] سے جا پکڑا۔
"خون کرو گی [illegible]" وہ [illegible] بھیگی بلی بنا وہ اس
کے ساتھ گھر سے ہی چلا آیا۔
"کیا چاہتی ہو؟" اس نے [illegible] کے لہجے
کہا۔ کاش وہ [illegible] تو حیرت کی دیوار ٹوٹ جاتی۔ وہ [illegible]
کو سیٹ کر لیتا مگر نہیں وہ [illegible] اپنی جگہ سمجھا تھا۔
"مجھے اگر سمجھ کر رہو۔ تمہاری ماں کے پیر دھو کر [illegible] سمندر،
تمہیں پلنگ پر بٹھا کر [illegible] چلاتے ہیں
تمہاری لونڈی بن کر رہوں گی۔"
"مگر ....." وہ بکھلایا۔ "بھلی بات تو یہ ہے کہ میں [illegible]
کے [illegible] میں نہیں پڑنا چاہتا۔" مگر [illegible] کا پوت ایک
جیسوں سے بدتر عورت کیسے بیاہ سکتا ہے۔ وہ تو دو ہزار عورتوں کے ساتھ
رہ کر بھی کنوارا ہے، اس کنواری سے بھی زیادہ پاک اور مقدس جس کا
کنوارپن کسی حادثہ کا شکار ہو گیا ہو۔
مرد سدا کنوارا ہی رہتا ہے۔ [illegible] کی طرح جس میں
کوئی بھی پانی [illegible] اور [illegible] جانے
سے بھی ناپاک ہو جاتا ہے۔
مرد کا غرور بکھر گیا۔ سارے [illegible] ہو کر بکھر گئے۔ پہلے
تو اس نے نہایت بیہودہ قسم کی مغلظات سمندر کے جنم جنم کو سنائیں،
پھر [illegible] تیل کی بوتل سے [illegible]
الماری سے گلاس اور [illegible] نکال کر [illegible]
نکال کر [illegible]
سے [illegible]
نئے [illegible] جوتوں کی قطار سے [illegible]
کر جوتوں سے [illegible]
سمندر کو [illegible] یہ سب [illegible] جب [illegible] نے منہ سے
[illegible] تھا۔
[illegible]

[illegible] مرد نے پھر سے [illegible]
کو قتل کرنے کی ترکیبیں [illegible]
[illegible]
"[illegible] کرو؟"
"مجھے اس کی کوئی ترکیب نہیں معلوم۔" میں نے [illegible] کہا۔
"اُس کی آنکھوں میں تیزاب ڈال دوں، ساری عمر کو اندھا
ہو جائے۔"
مگر سمندر [illegible] جیسے [illegible] بیاہ
لایا۔ [illegible] کنواری جیسے [illegible] رشتوں نے بھی ہاتھ نہ لگایا تھا جیسے
دلہن [illegible] ہوتی رہی۔
اگر وہ [illegible] خودکشی کر لیتی یا گھل گھل کر مر جاتی تو بھی کہانی
کا [illegible] کا خاتمہ ہوتا [illegible] وقت [illegible]
وہ [illegible] کی طرح [illegible]
ہو گئی۔ ایسی ہی ایک عورت ہیں وہ ایک [illegible] کے
ساتھ [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] تھا۔
مجھے دیکھتے ہی [illegible] پہچانیں۔
"آپا [illegible] شادی کر لوں؟"
"کس سے؟" میں نے [illegible] پوچھا۔
"[illegible]
ہے۔" وہ [illegible] کی طرح شرمائیں۔
"منظور کرو، نیک کام میں دیر کیسی؟"
اس بات کو کتنے سال گزر گئے مگر اس وقت تک [illegible]
[illegible] کنواری ہے۔ اس کے [illegible]
[illegible] شرمندہ تعبیر نہیں ہوا۔
وہ خوبصورت [illegible] بیگم [illegible] بیٹھی ہے۔ [illegible]
گھوم رہے ہیں۔
[illegible]
بچوں کا باپ [illegible]
"[illegible] بیگم [illegible] بچے ہیں۔"

پناہ

پروین سرور

کہ ایسے حالات میں کوئی کام لگ کر حوصلہ چاہئے۔
وہ یہ حوصلہ کہاں سے لاتا ۔ ؟

ہنستا سمے خوشبو والوں کیلئے پروین سرور کی ایک دلکش نئی کہانی

رات بھر اس نے اکتاروں پر تنگ کر کاٹی۔
نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ کمرے کی تاریکی میں اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور اس کے ساتھ اس کا احساس جاگ رہا تھا۔ سامنے کھڑکی میں ایک قطار میں رکھے ہوئے تین کانچ کے گلدستوں میں بے ترتیبی سے ٹھونسے ہوئے گیندے اور بیلے کے تین گلدستے مہک رہے تھے۔
ان پھولوں کی ملی جلی تیز خوشبو رات بھر ان گلدستوں میں سے اڑ اڑ کر اسے پریشان کرتی رہی۔ اس کے دیکھتے ہوئے احساس



کوٹھیاں ساری بالکل اسی طرح جس طرح ان کو بھولنے والیوں نے اس کو شدید اعصابی تناؤ کا شکار کر رکھا تھا۔

نگین — زرین — اور نوشین۔

کل شام کو جب وہ تھکا ہارا اپنے دفتر سے واپس آیا تو امداد علی نے بڑے معنی خیز نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا — "میاں صاحب! یہ لڑکیاں دے گئی تھیں۔"

وہ اس وقت دفتر کی فائلوں کے حساب کتاب میں الجھا ہوا ذہن لے کر آیا تھا۔ ابھی تک دفتر کا صاحب اور سال بھر کے درآمد و برآمد کئے ہوئے سامان کی خرید و فروخت اس کے ذہن پر چھائی ہوئی تھی۔ کونسا مال کس موقع پر خریدا گیا — کونسا کس دن کمپنی کی طرف سے بیرون ملک بھیجا گیا۔ کتنی ہنڈیاں آئیں اور کتنی گئیں — کس نے بھجوائیں — کس نے بھرائیں۔

امداد علی کی بات اسے مضحکہ خیز سی معلوم ہوئی — اس وقت تو اس نے کوئی دھیان نہ دیا مگر جب وہ کھانا کھانے سے پیشتر ہاتھ دھونے کے لئے نل پر پہنچا اور پانی کی ایک بوند بھی نصیب نہ ہو سکی۔ تو اس نے بے اختیار آواز دی۔

"امداد علی۔"

"جی صاحب — جی"

امداد علی اس کے لئے کھانا اور چائے ایک ساتھ ہی لیکر آنے کی تیاری میں برتن میز پر رکھ رہا تھا۔ آواز سنتے ہی سب کچھ چھوڑ چھاڑ لپکا چلا آیا۔

"یہ گلدستے کون لایا تھا؟"

"جی — نیچے والیاں دے گئی تھیں۔"

امداد علی اس کے پاس دو تین سال سے ملازم تھا۔ اس لحاظ سے گویا ہر طرح اس کے ذاتی معاملات میں بھی دخیل ہو چکا تھا۔

"تینوں ایک ساتھ آئی تھیں؟"

"نہیں — جی — باری باری۔" امداد علی نے نظریں جھکا لیں — لیکن وہ ان جھکی نظروں میں چھپی ہوئی مسکراہٹ کو نہ چھپا سکا۔

"ہوں۔" نیاز نے ایک لمبا سانس لیا تو امداد علی جھٹ بول اٹھا۔ "پہلے تو وہ آئی تھی جی — سب سے بڑی۔"

"اچھا۔"

"پھر دوسری آئی تھی —"

"اور پھر تیسری آئی ہو گی —" نیاز نے خود ہی جملہ پورا کر دیا۔

"جی صاحب — !"

"کچھ کہا تھا؟"

"بس جی — سلام کر گئی تھیں۔"

وہ چپکا ہو رہا۔ اس کا دل بے اختیار چاہا کہ ان گلدستوں کو نوچ کر کھڑکی سے باہر پھینک دے مگر پھر امداد علی کی موجودگی میں وہ ایسا نہ کر سکا۔ اس نے چپ چاپ کھانا کھایا۔ چائے کی پیالی ختم کی اور سوچ سوچ کر خرم کی طرف گھر سے باہر چلا گیا۔ پھر جب وہ واپس آیا تو آدھی رات گزر چکی تھی۔ گلدستے مہک لٹا رہے تھے اور کمرے کی بسیط خاموشی میں گھڑی کی ٹک ٹک زور زور سے بج رہی تھی۔

نگین — زرین — اور نوشین

لاحول ولا قوۃ — رات بھر وہ کروٹیں بدل بدل کر ان ناموں اور شکلوں کو اپنے تصور سے جھٹکتا رہا۔ رہ رہ کر اپنے جلتے ہوئے احساس پر سے طنز اور تمسخر کی چنگاریاں اٹھا تارہا اور اس الجھن میں الجھتے الجھتے صبح ہو گئی۔

اپنے پلنگ پر سے اٹھتے ہی اس نے سب سے پہلے وہ تینوں گلدستے کھڑکی سے باہر صحن میں پھینکے اور ایک دم یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ مزید بدمذاقی ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔ تمام ہی ان کرایہ داروں کو نوٹس دے کر اپنا مکان خالی کرا لے گا اور جتنی بھی جلدی ہو سکے گا ان سے چھٹکارا پائے گا۔

بس — وہ انہیں نکال کر ہی دم لے گا — خواہ پولیس ہی کیوں نہ بلانی پڑے — دنیا بھری پڑی ہے شریف لوگوں سے۔ اچھے مکان کبھی خالی نہیں رہتے۔ آپ ہی کوئی عزت دار آ جائے گا اور پھر روزی رزق تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔

سورج مشرق کی کھڑکیوں میں سے آہستہ آہستہ نمودار ہو رہا تھا۔ کمرے میں زرد دھوپ کی جالیاں دھیرے دھیرے پھیل رہی تھیں۔ کھڑکی سے نیچے کھلے والی کیاری میں کہیں کہیں شبنم کے شفاف قطرے چمک رہے تھے — اور چڑیاں چہک اٹھی تھیں۔

بالکونی میں امداد علی ہولے ہولے گنگنا رہا تھا۔ کبھی کبھی آیتوں کو گنگنانے لگتا۔ برتنوں کی کھڑکھڑاہٹ میں اس کی آواز دب کر رہ جاتی۔

نیاز دیر تک کھڑکی کے پٹ کھولے کچھ سوچتا رہا۔ مکان بہت اچھے موقع پر تھا۔ بس کا سٹاپ سے بالکل قریب

بس یہی کوئی فرلانگ بھر کا فاصلہ ہوگا [illegible]
پھر گیٹ کے عین سامنے سینٹ میری اسکول تھا۔ تھوڑی ہی دور
تین آکسفورڈ اور کیمبرج ٹائپ کالج ایسے بس دو ہی تھے۔ ایک
لڑکیوں کا کالج بھی تھا۔ ہر طرح کا آرام تھا۔ مین مارکیٹ بھی
دور نہیں تھا۔

وہ خود تو ایک سرکاری فرم میں چیف اکاؤنٹنٹ تھا مگر یہ
مکان اس کو آبائی ورثے میں ملا تھا۔ دو چار سال پہلے یہ ایک
کشادہ صحن پر مشتمل ایک دو منزلہ عمارت تھی۔ لیکن پھر جب ارد گرد
کے علاقے میں آبادی بڑھنے لگی اور جدید وضع کے خوبصورت بنگلے
ایک دوسرے پر سبقت لے جانے پر تل گئے تو اس نے آمدن کے
خیال سے اس میں ترمیم کر دی۔

کشادہ صحن کی چار دیواری کے ساتھ ساتھ اس نے لیموں
اور کھٹے کی باڑ لگوا دی۔ بنگالی سبز گھاس کچے صحن میں لگوا کر ہرا بھرا لان
بنا دیا۔ گلاب اور للی کی بہترین کیاریاں سجائیں۔ کمروں کے فرش
اکھڑوا کر چکنے اور چمکدار ٹائیل بچھا دیئے۔ جالی دار دروازے اور
اسپرنگ جنت میں اضافہ کرنے لگے۔ داخلی برآمدے میں پھولدار
ماربل اور چپس کی گلکاری عجب بہار دینے لگی۔ مرمر کے ستون اور
سیڑھیاں نظر کی ٹھنڈک اور تازگی کا سامان مہیا کرنے لگیں۔ پام
کے بڑے بڑے گملوں نے صحن میں چار چاند لگا دیئے۔ دیواروں
پر ہلکے فیروزی — زرد — اور گلابی رنگ کا ڈسٹمپر ہو گیا۔ غسل خانہ اور باتھ
ٹب، باتھ شاور، سبھی کچھ تو جیتا ہو گیا۔ پھر چار سو روپے ماہوار کا کرایہ
ایک معقول آمدن تھی۔ وہ اگر ملازمت چھوڑ بھی دیتا تو اس کی اکیلی
جان کے لئے کافی تھا۔

اوپر کی منزل میں اس نے اپنی رہائش کا بندوبست کر لیا۔
دو کمرے تھے، ایک غسل خانہ تھا۔ اور ایک گیلری نما لمبی سی بالکنی
جہاں اردلی آئیل اسٹوو رکھ کر اس کے لئے کھانا پکاتا تھا۔ ساتھ
ہی ایک چھوٹا سا اسٹور تھا —— اور بس۔

اچھی گزر ہو جاتی تھی۔ اوپر چڑھنے کے لئے سیڑھیاں بھی
باہر کی طرف بالکل علیحدہ تھیں، یوں اس کا تعلق اپنے مکان اور اس
کے مکینوں سے بالکل نہ رہا۔ صرف اتنا ضرور تھا کہ وہ بالکنی میں کھڑے
ہو کر صحن کے لان میں مزید دیکھ سکتا تھا۔ وہاں کے کھلے ہوئے
پھولوں سے اپنی نظروں کو تازہ کر سکتا تھا، وہاں سے آتی ہوئی خوشبو
ہوا کے جھونکوں سے اپنے تھکے ہوئے ذہن کو سیراب کر سکتا تھا۔

کیونکہ بچپن ہی سے اس کی سخت ماحول میں تربیت ہوئی تھی۔
وہ سلیقہ مندانہ اور شریفانہ زندگی کا پابند تھا۔ اپنے کام سے کام رکھتا تھا
اور کسی کی اس کو پرواہ ہی نہ تھی۔

اس کو تو صرف کرایہ سے غرض تھی۔ مکان میں بسنے والوں سے
کیا مطلب۔

لیکن کچھ دنوں سے وہ بڑی شدت سے یہ احساس کر رہا
تھا کہ ان کرایہ داروں کو اپنا مکان دے کر اس نے بہت بڑی غلطی کی
ہے۔ وہ خود اپنے ہی مکان میں جیسے کرایہ دار ہو کر رہ گیا ہے اور
کسی بات میں بھی اس کا حق — اس کا دخل نہیں رہا — اس پر طرہ
روز روز کی دھما چوکڑی کا طوفان۔

اس نے یہ محسوس کیا تھا کہ وہ جب سیڑھیوں پر سے نیچے
اترتا ہے تو چوڑیاں بجنے لگتی ہیں۔ اس پر طعنے کسے ہوئے جملے
پھینکے جاتے ہیں۔ اس کی غیر موجودگی میں اس کی خیریت پوچھی جاتی
ہے۔ سلام بھیجے جاتے ہیں۔ جب وہ گھر میں داخل ہوتا ہے تو جیسے بہار
لوٹ پڑتی ہے۔ جب وہ نہانے کے لئے نل کے نیچے بیٹھتا ہے
تو پانی کی ایک بوند بھی نہیں ملتی۔ پڑھنے کے لئے رات کو بیٹھتا ہے تو
مین سوئچ بند ہو جاتا ہے۔

اس نے تنگ آ کر یہ فیصلہ کر لیا۔

آخر وہ ایسے ذلیل لوگوں سے کب تک نباہ کر سکتا ہے۔ زخم
کو ناسور بننے سے پہلے ہی اگر مناسب دوا اور علاج سے بند کیا جائے
تو دانشمندی ہوتی ہے۔ ستم تو یہ ہے کہ کرایہ کے لئے جس شخص
نے بات کی تھی وہ کوئی نہایت شریف اور باریش بزرگ تھے، لیکن
بات کرنے کے بعد وہ ایسے غائب ہوئے جیسے کبھی تھے ہی نہیں۔
اور اب — مکان صرف عورتوں کے قبضے میں تھا۔

ایسی عورتیں جن کا کوئی مرد نہ تھا مگر دن بھر اندر باہر ہر قسم کے
مردوں کی چہل پہل نظر آتی۔ جن کی آمدن کا بظاہر کوئی ذریعہ نہیں تھا
مگر لباس اور طرز زندگی ایسا تھا جیسے بڑی بڑی فیکٹریوں اور ملوں
کی مالک ہوں۔ دیکھنے میں تنہا اور لاوارث مگر رنگ حیات چنچل
[illegible]

اصل — اس نے حماقت سے جھٹلا دیا۔

وہ بھلا ایسی بازاری قسم کی عورتوں کو اپنے گھر میں گوارا نہیں
کر سکتا۔ ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں —— وہ کو شریفوں کی
بہو بیٹیاں ہیں —— محلے میں تو اور بھی تھے۔ توبہ توبہ ایسی عورتیں

جن کے وجود کا کوئی نشان ہی نہیں۔ کب آئے کب گئے یہ بھی پتا نہیں!

تین لڑکیاں — ایک ماں — نکما بھائی — نہ جانے کیا۔

جب دیکھو کبھی ایک سائیکل پر لڑکی لٹکائے سبزی خریدنے مارکیٹ کی طرف اڑی جا رہی ہے تو دوسری کالج کی فیس لگائے بھاگی چلی جا رہی ہے۔ تیسری بیں روز پکڑی پکڑی آکر چنے کی پلیٹ چاٹ چاٹ کر ہنس رہی ہے۔ لڑکیوں سے الجھ رہی ہے اور ماں — وہ اپنے کڑے ہوئے بالوں میں پنیں لگا کر زرد چہرا لئے بیگم میں لکڑی قصائی سے جھگڑ رہی ہے۔ کبھی بینت — اور کبھی شش۔

توبہ ہے۔

اور لو علی نے بالکنی ہی میں ایک چوکی پر اخبار کا کاغذ بچھا کر سامان سجایا تو وہ جلدی جلدی شیو بنانے بیٹھ گیا۔ تولیہ ناک پر رکھ کر اس نے آئینے میں جھانک کر دیکھا۔ رات بھر جاگنے اور سوچنے کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں سرخی جھلک رہی تھی۔ بال بے ترتیبی سے ماتھے پر پڑے تھے اور مونچھیں ضرورت سے زیادہ نیچے لٹک آئی تھیں۔ اس کی سفید رنگت میں بے خوابی کی وجہ سے زردی نمایاں تھی۔

اس نے کریم منہ پر لگائی اور جلدی جلدی برش سے صابن کے جھاگ پھیلانے لگا۔

"اپنے بنگلے کی بھی سراسر بدنامی ہے۔" لڑکیاں ابھی تک اس کے ذہن پر مسلط تھیں — اور — بنگلے کی بدنامی کے معنی تھے۔ خود اپنی بدنامی۔

وہ بدنامی سے بہت ڈرتا تھا — دنیا میں صرف ایک بات بڑی ہیبت ناک تھی — اور وہ تھی بدنامی۔

اس نے گرم پانی کی پیالی میں رکھا ہوا استرا نکال کر زمین پر چھڑکا۔ پھر بائیں ہتھیلی پھیلا کر جانچتے ہوئے ٹیڑھے میڑھے منہ بنا کر کنپٹی پر گولائی کی طرف ... پھر ایک دم گھنٹی کا بٹن نمودوں میں دبا۔

"اور لو علی" — اس نے اچھل کر آواز دی۔

استرا ہاتھ سے رکھ کر اس نے دوبارہ گھنٹی کی آواز پر کان لگائے۔ پھر آواز سے قینچی اٹھا کر ایک طرف کی مونچھیں کترنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ گھنٹی کی آواز سنتے ہی اور لو علی نیچے چلا جائے گا مگر وہ باتھ روم میں تھا۔ جب گھنٹی کی آواز تیز اور مسلسل ہونے لگی تو بے اختیار ہو کر اس نے شور میں جھانک کر دیکھا۔ اور لو علی وہاں بھی نہ تھا۔

اوہ — اسے یاد آیا کہ اور لو علی کو تو اس نے مٹن خریدنے کے لئے مارکیٹ بھیجا تھا۔

ٹرن — ٹرن — گھنٹی کی آواز اس کے کانوں کے پردے پھاڑنے لگی تو جھنجھلا کر اس نے تولیے سے منہ پونچھا۔ آدھی کتری ہوئی مونچھوں کی پرواہ کئے بغیر وہ سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگا۔

اس نے سوچا تھا کہ وہ آخری سیڑھی پر کھڑے کھڑے ہی آنے والے سے بات کر کے واپس آ جائے گا۔ لیکن جب وہ نیچے اترا تو وہاں کوئی بھی نہ تھا۔

اس نے چونک کر دائیں بائیں دیکھا۔ صابن کہیں کہیں اس کے منہ پہ لگا تھا اور ایک طرف کی مونچھ اسے کچھ چھوٹی محسوس ہو رہی تھی اور دوسری کچھ ضرورت سے زیادہ کتر گئی۔

"کون ہے —" اس نے بے اختیار آواز دی۔

آخری سیڑھی پھلانگ کر وہ برآمدے میں آیا۔ وہاں سے دور کے ستونوں کی آڑ میں سے چھلانگ لگا کر پھاٹک کی طرف بڑھا تو زرشین کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں نیلے رنگ کا لفافہ تھا اور وہ کوئی خط پڑھ رہی تھی۔

وہ ٹھٹک گیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ ضرور وہ سید صاحب کے لڑکے کا محبت نامہ پڑھ رہی تھی۔ خود سید صاحب کئی مرتبہ اس کے سامنے بڑی بے بسی سے کہہ چکے تھے کہ برابر لڑکا ہاتھ سے گیا۔ یہ لڑکیاں اسے نکالے لئے جا رہی ہیں۔

نیاز کو یک تند دیکھ کر قاصد لڑکا بدحواس ہو کر دیوار پھلانگ گیا۔ اخبار والا گھنٹی بجاتے بجاتے تھک کر پاس ہی سے واپس جا رہا تھا۔ ایک دم سائیکل روک کر پھاٹک پکڑ کھڑا ہو گیا۔

زرشین نے چونک کر سر اٹھایا۔ بے اختیار خط کو ریشمی گریبان میں اڑس کر پیاری مسکراتی جیسے برسوں کی آشنا ہو۔ اس کی مسکراہٹ میں بجلی کی ایک چمک سی تھی۔ نیاز نے بڑی بے اعتنائی سے پھاٹک کی طرف قدم اٹھائے تو اس نے اپنے سینے پر ایک ادا سے ہاتھ مارا — "ہائے۔"

نیاز نے گھور کر اس کی طرف دیکھا ... وہ بل کھاتی ہوئی لہرائی — "میں مر گئی" اور پھر تنی تتلی اس کو چھو کر ناگن کی طرح رینگ گئی۔

وہ بھونچکا رہ گیا — بھوری بھوری آنکھوں میں ...

کہ اس نے [illegible] کی
حالت میں [illegible]
اور چٹان کی طرح [illegible] ہوتے ہیں — [illegible]
ہی ابھر آئی تھی۔

نیاز نے [illegible]
ہونے والے [illegible]
ہو کر اس کی شکل [illegible] پسینے کی ننھی سی
نمودار ہوئی وہ خود [illegible] فضا میں تیز خوشبو کے جھونکے اڑ
رہے تھے۔ وہ خود جیسے کسی صندل میں غرقاب کر دیا گیا تھا۔

اخبار والا بجلی کی سی [illegible] کر مسکرائے جا رہا تھا۔

جب نیاز نے تمام کا پرچہ اس کے ہاتھ سے لیا اور پیسے ادا کرنے کے
لئے جیب میں ہاتھ ڈال کر جیب کی تلاشی لینی شروع کی تو اسے ایسا
محسوس ہوا جیسے کہہ رہا ہو — اچھا — بابو جی — ہم تو آپ کو
بہت پارسا سمجھتے تھے — ڈوب چلے۔

اس نے گھبرا کر جیب سے رومال [illegible] پونچھا ہونٹ
خشک ہو چلا تھا۔ پھر قمیص کے دامن سے ہاتھ رگڑ لیا۔

"وہ — جی — اخبار والا روپے جیب میں ڈالتے ہوئے سائیکل
کے پیڈل پر پاؤں رکھ کر اس کی طرف [illegible] —
مجبوری ہے جی"

"کس بات کی؟"

"زمانہ ہی ایسا آ گیا ہے" — اخبار والا روانہ ہو گیا —

نیاز نے کوئی جواب نہ دیا — ایک دم پلٹ کر اس تیزی سے
اپنے کمرے کی طرف [illegible] میں وہ سیڑھیاں پھلانگتا
گیا —

اس نے دروازہ بند کر لیا — وہ ہرگز ایسی ذلت برداشت
نہیں کر سکتا۔ آج ہی تو [illegible] ہیں —

دفتر میں جانے کا وقت ہو چکا — مگر سارا وقت چائے کی
کیتلی کی طرح [illegible] اپنے محلے میں [illegible]
ہرگز ہرگز گوارا نہیں کرے گا۔ اور پھر اس حال میں کہ اس نے تمام عمر
کبھی عشق نہیں کیا۔ کسی عورت کو [illegible] چالیس [illegible]
یوں ہی گزر گئے۔ کبھی شادی کا ارادہ نہیں کیا۔ کسی کو اپنے [illegible]
اپنے تصور میں [illegible] —
[illegible]

[illegible]
اس نے جیسے [illegible]
[illegible] کی حفاظت کا
[illegible] ہو گیا۔

جانا [illegible] دسمبر [illegible]
[illegible]
[illegible] جب وہ اپنے خیالوں میں گم
[illegible] کی طرح جھپٹ کر
[illegible] — اور پھر [illegible]
آن کھڑی۔

وہ [illegible] کے لئے تیار ہو رہا تھا — مگر
[illegible] جلدی تھی۔

[illegible]
[illegible] کرتے سنبھل
[illegible] کے تمام [illegible] چکے تھے مگر
[illegible] دھوپ چمک رہی تھی۔ ایسا معلوم
ہوتا تھا جیسے وہ اپنے [illegible] نکل پڑے گی۔
فضا میں ایک تیز خوشبو کا جھونکا [illegible] کر گیا۔

[illegible] ایک عجیب [illegible]
نظروں سے نیاز کی طرف دیکھا [illegible]
[illegible] — اوہ — [illegible]
وہ [illegible] گیا۔ کوئی جواب [illegible]
[illegible] اس کی آنکھوں کے سامنے [illegible] غائب ہو گئی۔

لاحول — اس نے [illegible]
کیا اور اپنے کمرے کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس [illegible]
تھا۔ یوں جیسے ساری [illegible] کر رہ گئے ہوں۔

ایک عجیب سی بے چینی اس کے [illegible] رنگ
رہی تھی۔ اس نے پوری طاقت سے [illegible]
[illegible] آ رہی تھی۔

تھوڑی دیر [illegible] اور اخبار سے [illegible]
[illegible] کے 2 [illegible]
[illegible] پانی بند تھا۔
[illegible] — یہ سب کیا ہے — [illegible]
[illegible]

اٹھا۔ اس نے حسبِ معمول تولیہ اپنی کمر سے لپیٹا تھا اور باتھ روم کا دروازہ دیکھا تو ابھی پانی بند ہونے میں بہت دیر تھی۔

امداد علی نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔

وہ جھنجھلایا ہوا اسی طرح بالکنی پر آن کھڑا ہوا نیچے جھانک کر دیکھا تو صحن کے ہرے بھرے لان میں تینوں لڑکیاں ننگی پیٹھ ربڑ کی پائپ لگائے پانی کے فوارے اڑا اڑا کر ایک دوسرے کو بھگو رہی تھیں بھاگ بھاگ کر چیخ رہی تھیں۔

"توبہ توبہ — بے شرم —" اس کا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ مارے حیرت کے اس نے اپنی آنکھیں مسل ڈالیں۔

قہقہے بدستور ساری فضا میں بکھر رہے تھے۔ ہرے درختوں کی نمو اور سبز دھوپ ادھر ادھر پھیل رہی تھی اور دوپہر کا سناٹا ٹوٹ رہا تھا۔

وہ نفرت اور حقارت سے پلٹ آیا مگر دو قدم آگے جا کر پھر واپس آ گیا۔ بالکنی کی دیوار کی اوٹ سے بھرپور نظروں سے ایک بار پھر اس نے جھانک کر دیکھا — سڈول چکنے بدن، چمکتی پھسلتی پنڈلیاں، اڑتے ہوئے گھونگھریالے بال۔

اس کی رگوں میں خون دوڑنے لگا۔ دماغ کے پٹھے چٹخنے لگے۔ آنکھوں میں خون اتر آیا اور نظریں پھیل کر رہ گئیں۔

امداد علی کے قدموں کی آہٹ ہوئی تو وہ جلدی سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ جلدی جلدی کپڑے پہنے، بالکنی پر چھن کر آتی ہوئی ہوا کے جھونکوں میں اپنا پسینہ سکھایا، اور پھر کھانے سے فارغ ہو کر شام کے انتظار میں لیٹ گیا۔

شام ہوئی تو گرمی میں بوند بوند پانی چھڑکا تھا۔ لڑکیوں نے چاروں طرف کے نلکے کھول کر پانی کا سیلاب کھڑا کر رکھا تھا۔ وہ نہانے کے لئے اپنے ایک دوست کے گھر چلا گیا۔ دن ڈھلے جب واپس آیا تو مغرب کی اذان ہو چکی تھی۔

اپنی سیڑھیاں چڑھنے کی بجائے وہ ان کے برآمدے میں چلا گیا۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ وہ ان کے دروازے کو دھڑا دھڑ پیٹ ڈالے گا۔ پھر آئندہ کرایہ داروں کا انتخاب بہت چھان بین کے بعد کرے گا۔

آخر کرائے کے ٹھیکروں سے عزت کا سودا تو نہیں کیا جا سکتا۔ برآمدے میں دائیں ہاتھ کمرے کا پردہ اٹھا ہوا تھا۔ تیز بلب کی روشنی سے آنکھیں چکا چوند ہو رہی تھیں۔

[illegible] کمرے کی دہلیز پر تھی۔ جہاں [illegible] سے دیکھا [illegible] ہو رہا تھا۔

چمکیں — رنگین — زریں —

تینوں لڑکیاں کرسے کے ساتھ ساتھ جاپانی گڑیوں کی طرح تھرک رہی تھیں۔ دائیں بائیں ٹانگ پیچھے، بدن کا ایک ایک عضو تھرک رہا تھا۔ کبھی کھڑے ہو کر — کبھی بیٹھ کر — کبھی —

توبہ توبہ — اس نے پہلی طاقت سے بے اختیار دروازہ پیٹ ڈالا۔

دھماکے کی آواز سن کر ساز بجنا بند ہو گیا۔ اندر کچھ سرگوشیاں ہوئیں پھر ایک آوازیں ٹکرائیں، ایک لڑکی بھاگی آئی۔ دروازے میں اسے کھڑا دیکھ کر جاپانی گڑیا کی طرح منمنائی — "ہائے"

اور پھر دھڑ دھڑاتے قدموں واپس بھاگ گئی۔

پھر اسے محسوس ہوا جیسے دوسری آئی۔ [illegible]

"ہائے — اور پھر بھاگی —"

"کون ہے۔ ؟"

"ہمسائے کھڑے ہیں دوارے"

"پاپی کو بلاؤ — کمار بلاؤ — ممی کو بلاؤ"

"چپ — چپ — بدتمیز —"

"ہائے — !"

قہقہوں اور سرگوشیوں میں وہ جھنجھلا کر رہ گیا۔

"ممی — ممی جی — ممی جان" ایک لڑکی پکارتی ہوئی اندر کو بھاگی۔

"کون ہے — او آہا — نیاز صاحب — کیسے بھول پڑے؟"

اس کے ڈریسنگ گاؤن کی ڈوریاں جھول رہی تھیں۔

نیاز نے اس آواز کا سہارا لیا۔ لڑکیوں کی ماں نے کچھ اتنی گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا کہ وہ بھیگی طرح ایک دم پھٹ پڑنے کی بجائے مناسب موقع اور وقت کی تلاش میں رک گیا۔

عورت نے آگے بڑھ کر اسے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا پھر اس کی کمر کو اپنے پرخلوص ہاتھ کے گھیرے میں لے کر اسے ڈرائنگ روم کی طرف لے چلی۔

اس نے اپنا ہاتھ چھڑانا چاہا مگر چھڑا نہ سکا — گرفت اور بھی گرم ہو گئی — اس نے اپنی کمر آزاد کرانے کے لئے جھٹک کر قدم آگے بڑھایا — مگر گھیرا اور بھی تنگ ہو گیا۔

کیسا نرم — اور گرم لمس تھا — عجیب انوکھا — اور نیا —

وہ جیسے اچانک ہی بری طرح چونک اٹھی۔

دھنس گئی۔

اس نے گھبرا کر کمرے کی دھندلی روشنی میں چاروں طرف دیکھا جیسے ڈھونڈ رہی ہو۔ اپنا گھر۔ اپنا کمرہ۔ اچانک اسے یوں لگا جیسے اسے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ اس کے اردگرد پرکشش اور قیمتی چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔ سنگ مرمر کے سفید، ہموار اور تراشے ہوئے مجسمے۔

سامنے دیوار پر بڑی بڑی تصویروں اور جالیوں کے درمیان ایک ننھی عورت کی تصویر رکھی تھی جو کرسی سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ ایک ایک ذرہ۔ ایک ایک غم اتنا نمایاں تھا کہ اس نے گھبرا کر نظریں جھکا لیں۔

نگین۔ زرین۔ نوشین۔ ماں نے بڑی بے قراری سے پکارا۔ پھر اپنے گھنگھریالے بال سمیٹنے لگی۔

اس کا دل بے اختیار اچھلا۔ دھڑکا۔ پھر بیٹھ گیا۔

ایک لڑکی دبے پاؤں داخل ہوئی۔ زرین تھی شاید۔ اس نے ٹیبل لیمپ روشن کر دیا۔ ننھی عورت میں جیسے جان پڑ گئی۔ وہ اپنے بالوں میں سجے ہوئے پھولوں کے ساتھ مسکرانے لگی۔

"ابھی تم سب آئی کیوں نہیں۔ نیاز صاحب بلا رہے ہیں۔" ماں نے زرین سے کہا۔

نیاز کو سخت گرمی اور حبس محسوس ہوا۔ وہ پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ اس نے پسینہ پونچھنے کے لئے ایک بار پھر رومال نکالا۔ مگر وہ تو ابھی وہیں تھا۔

وہ بے حد خاموش تھا۔ شرمایا شرمایا سا بیٹھا تھا۔ عورت نے اس خاموشی کا طلسم توڑنے کے لئے اطمینان سے ایک سگریٹ سلگایا۔ ایک اس کی طرف بڑھایا۔ پھر بڑے کاروباری انداز میں بولی۔ "اتنے دنوں کے بعد آئے ہیں آپ۔"

نیاز نے چونک کر نظریں اٹھائیں۔ دیوار پر لٹکی ہوئی ننھی عورت شکایت کر رہی تھی۔ "اتنے دنوں میں آئے ہیں آپ۔"

اس نے گھبرا کر نظریں پھیر لیں۔ تینوں لڑکیاں اس کے سامنے کھڑی تھیں۔ اس نے باری باری تینوں پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالی۔ تینوں مسکرا رہی تھیں۔

نگین نے دیکھا۔

نوشین نے دیکھا۔

زرین نے دیکھا۔

"اتنے دنوں میں آئے ہیں آپ۔"

"اتنے دنوں میں آئے ہیں آپ۔" اتنے دنوں میں آئے ہیں آپ۔"

ہر طرف سے کوئی پکار رہی تھی اور وہ اطمینان سے بیٹھا سوچ رہا تھا۔ اور تمام پہچانیں اور ملاقاتیں وقت کی گرد میں دب گئیں۔ اس کے ساتھ اب کوئی بھی رشتہ، کوئی تعلق باقی نہ تھا۔

اس نے عورت کے بڑھائے ہوئے ہاتھوں میں سے سگریٹ لیکر اپنے لبوں میں دبا لیا۔ پھر اس کے لبوں میں جلتے ہوئے سگریٹ سے دھواں کر دھوئیں کا ایک مرغولہ سا کمرے میں پھیلتے ہوئے دیکھتا رہا۔ مسکرانے کی کوشش کر رہی بہت خفت سے کر رہا تھا۔ مگر عورت دیکھتی رہی۔ سوال:

"کبھی دکھائی نہیں دیئے آپ۔"

"دراصل کام بہت ہو گیا ہے۔ آج بھی یہی پوچھنے کے لئے حاضر ہوا تھا کہ اس دوران آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں۔ کوئی شکایت ہو تو فرمائیے۔"

عورت کچھ دیر تک دیکھتی رہی۔ پھر اس کا ہاتھ دبا کر مسکراتے ہوئے بولی۔ "شکریہ نیاز صاحب، آپ کتنے اچھے ہیں۔ دراصل لڑکیاں یہاں خوش نہیں ہیں۔"

اس نے حیرانی سے عورت کے چہرے کی طرف اپنی نظریں جما دیں۔ جہاں کراہیت کی وجہ سے گالوں میں ننھے ننھے بھنور چکر کاٹ رہے تھے۔

"جی ہاں۔ اس ماحول میں گھبرا گئی ہیں۔ نہ کوئی سوسائٹی ہے دلچسپی۔ نہ کوئی ڈھنگ سے بات کرنے والا۔" وہ خلوص کا مظاہرہ کرتی ہوئی اس پر جھک آئی۔ اس کے سانس کی حرارت خود اسے اپنے سانس میں گھلتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"ایک دم یہاں زندگیوں میں گھٹ کر بالکل ہی گھٹ گئی ہیں۔ ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ آپ کا مکان بہت جلد خالی کر کے کسی ماڈرن کالونی میں چلے جائیں۔ یہ جگہ تو بڑی پرانی ہے۔"

نیاز کے تن بدن میں چنگاریاں اڑنے لگیں۔ اس کے دماغ میں خون تیزی سے دوڑنے لگا۔ آنکھوں میں شعلے لپک کر بیتاب ہو گئے۔ اس نے ہونٹ بھینچ کر الفاظ تو لے۔ مگر کچھ کہہ نہ سکا۔ اور اس کے چہرے پر مردنی سی پھیل گئی۔



تحریر: رعنا فاروقی

تین عورتیں تین کہانیاں

گل بانو کا گھرانہ گلبرگ لاہور میں ہمارے پڑوس میں آباد تھا اس وقت ہمارا بچپن تھا۔ گل بانو جوان تھی انیس بیس سال کی [illegible] عمر سے اسے لڑکوں کی طرح پالا گیا تھا۔ وہ پانچ بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی، گھر کا ہر فرد اس پر جان چھڑکتا تھا۔ اس کے ابا گجرات کے پنجابی تھے اور اماں کشمیری پنجابن۔ گل بانو بہار کے موسم میں پیدا ہوئی تھی، اس موسم میں چاروں طرف پھول کھلے ہوئے تھے اور ان پھولوں میں سب سے خوش رنگ پھول گل بانو تھی۔ تبھی اس کی پھوپھی نے اس کا نام گل بانو رکھ دیا۔ اس کلی جیسی کومل اور پیاری لڑکی کا بچپن لڑکوں کی طرح کھیلتے کودتے گزرا۔ بھائیوں کی نقل میں وہ ان جیسے کپڑے پہنتی۔ ان جیسی زبان بولتی۔ اس کے بھولے بھولے چہرے پر لڑکوں کی زبان ایسی جچتی تھی کہ محلے والے اسے بلا کر اس کی توتلی باتیں سنا کرتے۔ گھر میں سب کی چہیتی تو وہ تھی ہی لیکن اس کا باپ سب سے زیادہ اسے چاہتا تھا۔ کہتا تھا جب سے یہ پیدا ہوئی ہے میرے کاروبار میں خیر سے بڑی ترقی ہوئی تھی۔ ایسی خوش نصیب بچی کے لیے کیسا پردہ [illegible] چودہ پندرہ سال تک وہ لڑکوں کے ساتھ "آنکھ مچولی" اور ہٹ پٹ پٹیلو کھیلتی پھرا کرتی۔ محلے کے بزرگوں نے اس کے باپ کو سمجھایا کہ لڑکی جوان ہو رہی ہے اسے لگام ڈال کر رکھو ورنہ بعد میں پچھتاؤ گے۔ تب باپ کی سمجھ میں آیا کہ لڑکیوں کی پرورش لڑکوں سے مختلف انداز سے



کی جاتی ہے۔ اس سے قبل کہ گھر بٹھانا چاہا وہ پابندیوں کی عادی نہیں تھی روتے چلانے لگی۔ اسکول جانا، گھمانا پھرنا چھٹ گیا۔ باپ پریشان ہوگیا۔ تب اس کی سہیلیوں کا سہارا لیا گیا۔ ہمیں تو یہ باتیں یاد نہیں مگر امی بتاتی ہیں کہ اسے گھر بٹھانے کے لئے ماں باپ کو بڑی دقتیں اٹھانی پڑیں۔ برقعہ تو اس نے قینچی سے کاٹ کر دھجی دھجی کر دیا کہنے لگی "مگر مجھے یہ کالا کفن پہنایا تو دیکھ لینا میں اس کے بدلے سفید کفن اوڑھ لوں گی۔" ماں ڈر گئی، برقعہ اوڑھانے کا خیال ترک کر دیا۔ اسکول چھوٹنے اور گھر والے کی ذمہ داری بھائی کے سپرد کر دی کہ جذباتی اور ضدی لڑکی ہے کہیں بیچ بیچ کچھ نہ کر بیٹھے۔ لیکن یہ چنچل تھی آہستہ آہستہ [illegible] ہوئی تب سب کو چین آیا۔"

اس کا رجحان پڑھائی سے زیادہ کھیل کود کی طرف مائل تھا۔ کھیلوں میں وہ اول آتی، اسی وجہ سے استانیاں اسے پسند کرتی تھیں۔ کم بخت خوبصورت بھی ایسی تھی کہ انسان چھوتے ہوئے ڈر محسوس کرے کہ کہیں اس کی اجلی رنگت میلی نہ ہو جائے۔ بڑی بڑی ہرنی جیسی مست آنکھیں۔ گالوں پر بہاروں کا گلابی پن گھلا ہوا ہونٹوں کی لالی گلاب کی پنکھڑیوں کو شرمائے ۔۔۔ وہ ابھی تک لڑکوں کی طرح بولتی تھی۔ جوانی میں اس کا لاابالی پن اور قیامت ڈھاتا تھا۔ مسکراہٹ ایسی کہ جو منہ میں آتا کہہ جاتی سننے والے "ہائے بے شرم" کہتے رہ جاتے، بال اس کے براؤن تھے جو اس کی سنہری رنگت پر بیحد خوبصورت لگتے تھے۔ میٹرک تک وہ اسکول کی بیسیوں لڑکیوں اور لڑکوں کے دلوں کی دھڑکن بنی رہی، عاشق مزاج بھی ایسی تھی کہ اپنی اداؤں سے ان کی حوصلہ افزائی خوب کرتی، ان کے خطوں کے جواب دیتی اور بعد میں سب کے سامنے ان کا مذاق اڑاتی۔

دن گزرتے گئے گل کی حرکتوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس نے میٹرک کے بعد آگے پڑھنے سے انکار کر دیا کہ یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔ ماں باپ خود یہی چاہتے تھے کہ اس کا باہر آنا جانا بند ہو تاکہ اسے کھانے پکانے اور سینے پرونے کی تربیت دے کر اس کی شادی کی تیاریاں کریں۔ اسے ان گھریلو امور سے قطعی دلچسپی نہیں تھی۔ ماں نے زور دیا تو کہنے لگی "میری قسمت ایسی اچھی ہے کہ جس گھر جاؤں گی وہاں دس دس نوکر کام کریں گے میں کیوں اپنا وقت ضائع کرتی پھروں۔" اور واقعی اس کا نصیب ایسے پیسے کے معاملے میں بہت ہی اچھا تھا۔ اس لئے ماں دعائیں دے کر چپ ہوگئی۔ اب والدین کو اس کے بیاہ کی فکر لگ گئی۔ بھائی بھی چاہتے تھے کہ اس کی کسی اچھی جگہ شادی ہو [illegible] حسن کے لئے کمی نہیں تھی، خوبصورتی پہ بیسیوں دل نچھاور ہیں ایک ساتھ یوں تو لڑکے شہد کی مکھیوں کی طرح بھنبھناتے ہیں۔ شہر کا ایک سے ایک اچھا گھرانا اسے بہو بنانے کا خواہشمند تھا لیکن اس کے بھائی کہتے تھے جب تک گل خود کسی رشتے کو پسند نہیں کرے گی اس کی بات پکی نہیں کریں گے اور گل صاحبہ ہر لڑکے کا فوٹو دیکھ کر ایسے ریمارکس پاس کرتیں کہ بھائی اور باپ بھی اپنی ہنسی نہ چھپا سکتے۔ اسے سر پہ ہی اتنا چڑھا رکھا تھا کہ کیا مجال اس کی پسند کے خلاف تنکا بھی توڑیں البتہ ماں باپ کڑھنے لگی تھی وہ کہہ گئی تھی کہ لڑکی بری طرح بگڑ گئی ہے اگر اس کی شادی وقت پر نہ ہوئی تو کوئی نہ کوئی گل ضرور کھلے گا اور یہی ہوا۔ ایک روز وہ بھاگی بھاگی میری امی کے پاس آئی۔ میری امی کو خالہ جان کہتی تھی، امی بھی اس کی شوخی شرارتوں کی وجہ سے اسے پسند کرتی تھیں۔ اس روز اس کی رنگت اڑی ہوئی تھی۔ امی کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور رونے لگی۔ وہ گھبرا گئیں اسے کبھی روتے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ ضرور کوئی غیر معمولی بات تھی۔ امی نے پیار کیا پچکار کر پوچھا تو ۔۔۔ کہنے لگی "[illegible] وہ جو تھانیدار ہے نا عبدالقدوس ۔۔۔ اس حرامزادے نے مجھے لوٹ لیا ۔۔۔ اور اب شادی نہیں کرتا۔ بتاؤ خالہ میں کیا کروں۔ اگر اس نے مجھ سے بیاہ نہیں کیا تو میں جا کے اس کے گولی مار دوں گی۔" امی حیران رہ گئیں۔ اس لڑکی نے نا تجربے کاری سے یہ بات کہی تھی کہ امی کی جگہ کوئی بھی ہوتا اس کی یہی حالت ہوتی۔ "بھئی گل خالہ میں تو اسے گھاس تک نہیں ڈالتی تھی، میرے پیچھے پیچھے پھرتا تھا، بے حد خوبصورت میرا بھی دل موم ہو گیا۔ مگر میں پھر بھی اس کے ہاتھ آنے والی نہیں تھی مجھ سے کہنے لگا گھومو چلیں میں تم سے دو تین ضروری باتیں کروں گا میں نہیں مانی کہنے لگا گھر نہیں جانا چاہتی تو میرے دوست کے گھر چلو، وہاں اس کے بیوی بچے موجود ہیں۔ خالہ میں بے وقوف بن گئی۔ اس کے کہنے میں آگئی۔ گھر میں اس کا دوست تھا نہ اس کی بیوی بچے پھسلا کر بٹھا لیا کہ ابھی آجاتے ہیں۔ بس بھولے دو چار میٹھی میٹھی باتیں کیں۔ میں اس کی محبت میں موم بنی گئی، جتی گئی ۔۔۔ اور اس نے اپنی خواہش کے جال میں پھنسا لیا خالہ مجھ میں اتنی ہمت نہیں رہی تھی کہ اس کے بڑھتے ہاتھ روک سکتی۔ خالہ تب میرا قصور تو نہیں تھا نا ۔۔۔ اب مجھے وہ اچھا لگنے لگا ہے۔ میں اس سے ملنے کے لئے بے چین ہوں اور وہ ملتا نہیں، کبھی دوسرے پر ٹال دیتا ہے کبھی [illegible]

پہ میرا اس سے رشتہ [illegible]
میری ماں نے سمجھایا کہ [illegible]

اس دولت کا کسی بات سے ذکر مت کرو۔ وہ شخص بالکل ہے اسی
کو دیکھنے کی اپنی صورت میں سمجھ نہیں ... ہو سکتی۔ سو مناسب تو
ہوا۔ میں کوئی اسے بیوہ پہنچا کر تو رہی تھی۔ وہ مجھے لے گیا تھا
اتی بولیں "بیٹے یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ کس نے کس کو بیوہ پہنچایا۔
سب یہ دیکھتے ہیں کہ نقصان کسے ہوا۔ ظاہر ہے قدوس کا بال
بیکا بھی نہیں ہوا۔ ہاں یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ اس کا جرم تمہارے جسم
میں پلے، پھر قدوس کا نقصان ہوگا۔ اس کا پاتھ رہا۔" وہ بولی۔
"ہاں خالہ تو بات تم نے ٹھیک کہی۔ مجھے اب کیا کرنا چاہئے۔" اتی
بولیں "میں تمہاری ماں سے بات کرتی ہوں وہ اس معاملے کو آسانی
سے سلجھا سکتی ہیں۔" وہ راضی ہو گئی۔ کہنے لگی "ٹھیک ہے مجھے
ان سے بات کرتے ہوئے شرم آتی ہے آپ تو میری سہیلی بھی ہیں
میری خالہ بھی ۔۔۔ ہیں نا۔"

اتی نے اس کی والدہ سے اسی روز جا کر بات کی وہ بیچاری
رونے لگیں۔ ساتی بولیں "رونے سے کچھ نہیں ہوگا تم نے بیٹی کی
تربیت ایسی کی ہے کہ اسے برے بھلے کی تمیز نہیں ہے وہ لڑکوں
کی طرح سوچتی ہے اسے تو یہ بھی پتہ نہیں کہ ایسی باتوں میں نقصان
عورت کا ہوتا ہے" بات کوئی بات درست تھی۔ اس کی ماں نے اپنے
شوہر کو بتائی کہ بیٹی نے عبدالقدوس تھانیدار سے دل لگا لیا ہے۔
اگر اس سے شادی نہ ہوئی تو نتیجہ زمانہ دیکھے گا۔۔۔ باپ بیچارا بوکھلا
گیا۔ اس نے بیٹی کو بلایا وہ بولی "ابا میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گی جو
اس نے مجھ سے بیاہ نہیں کیا۔" معاملے کی سنگینی باپ کی سمجھ میں
آگئی۔ اس نے جا کر تھانیدار سے بات کی۔ اپنے ساتھ تھوڑی بہت
کو بھی لے گیا۔ قدوس گھبرا گیا۔ وہ ان باپ بیٹوں کا اثر و رسوخ
سمجھتا تھا۔ فوراً شادی پر راضی ہو گیا۔ عزت کی خاطر باپ نے
زیادہ دھوم دھام نہیں کی۔ خاموشی سے بیٹی کا نکاح کر دیا۔ میاں
عبدالقدوس اسے اپنے گھر لے آئے، مگر میاں اسے یہ بتا دیا کہ وہ
شادی شدہ اور ایک بچے کا باپ بھی ہے۔ گل بانو نے یہ سن کر
گھر سر پر اٹھا لیا۔ کہنے لگی میں سوکن برداشت نہیں کر سکتی اسے چھوڑو
یا مجھے۔ قدوس گھبرا گیا اس نے بہتری اسی میں سمجھی کہ پہلی بیوی
کو اپنی زندگی سے رخصت کر دے۔ ان دنوں وہ غریب عورت میکے
گئی ہوئی تھی وہیں اسے طلاق نامہ بھجوا دیا۔ اب گل نے بے فکری

انتھونی ایڈن سے ایک خاتون نے
خود کو جتانے کے انداز میں کہا تھا۔ آخر پہلے [illegible]
استعمال کیا۔
"محترمہ کیا آپ پسند نہیں کریں گی کہ آپ کا بچہ
ذہن میں آپ جیسا ہو اور شکل و صورت میں میرا
ہو جائے تو وہ اچھی زندگی گزار سکے گا"
ایڈن نے اس کی بات سن کر مسکراتے ہوئے
کہا۔ "یقیناً میں یہ پسند کروں گا لیکن سوال یہ ہے
کہ بچہ میری شکل کا ہوا اور ذہن آپ کا؟"

مرسلہ۔ مینا کلیم بیگ، دھوبی پورہ [illegible]

کہ وہ پولیس والا ان میں نہیں ہے گی۔ قدوس اس کے حسن کا دیوانوں
کے جال میں بری طرح پھنس گیا تھا۔ اس نے اسے علیحدہ بنگلہ خرید
کر دیا۔ گل بانو ٹھاٹ سے بنگلے میں اتری۔ اپنی پسند کی چیزوں سے
کمرے کو آراستہ کیا۔ اپنے ان کے لئے دنیا بھر سے پرچے منگوائے
گئے۔ پاس ایک سے ایک طلائی زیور ... حسن میں پہلے سے کہیں
زیادہ نکھار آ گیا تھا۔ واقعی ایک چاند آسمان پر تو دوسرا قدوس کے
گھر اتر آیا تھا۔ قدوس اسے دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا۔ سب سے کہتا
کہ اس شہر میں میری بیوی جیسی حسین کوئی عورت نہیں۔ یہ زمانہ
گل نے اپنے آپ کو سجانے سنوارنے کی تربیت
میں گزارا۔ چار بیٹے ہو گئے تھے مگر وہ کنواری لگتی تھی۔ خوب گھومتی
پھرتی۔ شوہر کی بانہوں میں بانہیں ڈالے سیر کرنے جاتی۔ گھر میں
خادم کام کرتے تھے۔ بچے ماں سے زیادہ ان سے مانوس تھے۔

گل کا دوسرا امتحان اس وقت شروع ہوا جب قدوس کی
ڈھلتی عمر ... ۔ وہ بیوی سے رخصت ہو کر شہر کو چلا گیا
بڑھاپے اسے لگتا کہ تم حسین ہو وہ تم پر کبھی کبھی ان کی نظر نہیں ڈالے
کی گھر کی قدم اٹھانے سے پہلے سوچ لینا کہ میں نے تمہاری خاطر
اپنی بیوی بچوں کی قربانی دی ہے۔ تم میری عزت اور محبت کی لاج
رکھنا۔ گل خدا جانے کس کی ... ان دنوں وہ بیچے آگئی تھی۔ میری
امی کو آ کر خوب سناتی اور دیر تک اپنے میاں کی چاہت کے قصے
دہراتی رہتی۔ قدوس کی کوشش پر ... پہلے ... کیا تھا۔ قیدی
بننے کے بعد اسے گھر ... ۔ ان ... میں گل نے ...

جیسے بچے۔ وہ جنگی قیدی کی بیوی تھی اور ہنسی نہیں تھی۔ ہر وقت سنگھار آراستہ اور خوشبوؤں میں بسی رہتی۔ باپ سے ضد کر کے گاڑی لی تھی۔ خود چلاتی پھرتی۔ صبح سے شام تک ادھر ادھر گھومتی پھرتی۔ انہی سیر و تفریح کے دوران اس کی دوستی ایک نوجوان قمر الدین سے ہو گئی۔ قمر الدین بھی دولتمند والدین کا اکلوتا لڑکا تھا۔ وہ بھی جی بھر کر خرچ کرتا تھا۔ اپنی بیوی بچوں کی اسے قطعی پرواہ نہیں تھی۔ لڑکیوں پر پیسہ لٹاتا تھا۔ گل اسے مل گئی اور دونوں ایک دوسرے پر مٹے۔ خوبرو وہ بھی کم نہیں تھا۔ ان کا ملاپ زیادہ بڑھ گیا تب قمر نے شادی پر زور دیا۔ اس کے مشورے پر گل نے عدالت میں درخواست دی کہ اس کا شوہر جنگ میں لاپتہ ہو گیا ہے اسے دوسری شادی کی اجازت دی جائے، عدالت نے فیصلہ دیا کہ جب تک جنگی قیدی واپس نہیں آجاتے دوسری شادی کی اجازت نہیں دی جا سکتی گل نے یہ کارروائی چھپکے چھپکے کی تھی۔ لیکن بات چھپ نہ سکی۔ اس کی ماں کو پتہ چلا وہ بہت ناراض ہوئی گل یہی کہتی رہی کہ کیا پتہ قدوس لنگڑا لولا آئے پھر میں اس کے ساتھ کیسے گزارا کروں گی۔ اسے ذہنی جھٹکے دے کر نیم پاگل تو ضرور کر دیا ہوگا، میرا اس سے نباہ اب نہیں ہوگا۔

آخر ایک دن جنگی قیدیوں کی واپسی ہو ہی گئی قدوس واپس آیا۔ بچے اس سے لپٹ کر خوشی سے دیوانے ہو گئے مگر بیوی کے ماتھے پر بل دیکھا۔ وہ جھوٹ موٹ کی گرمجوشی دکھا رہی تھی جو قدوس سے چھپی نہ رہی، وہ کیسی کیسی توقعات لے کر آیا تھا مگر یہاں بیوی کا رخ دیکھا تو اس کا دل خون ہو گیا۔ یہ وہ گل نہ رہی تھی جس کے گھونگھٹ قدوس کی محبت کے چراغ جھلملاتے تھے۔ گل نے بھی شوہر کو زیادہ دھوکے میں رکھنا مناسب نہیں سمجھا اس نے اسے بتا دیا کہ تمہارے سال کی قیدی نے مجھے ذہنی طور پر تم سے دور کر دیا۔ اب میرا تمہارے ساتھ گزارا نہیں ہو سکتا۔ قدوس بھونچکا رہ گیا۔ اسے بیوی سے ایسی صاف گوئی کی امید نہیں تھی۔ وہ تو سمجھ گیا تھا کہ بیوی نے کہیں اور دل لگا لیا ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کچھ دنوں بعد میری محبت اس پر غالب آجائے گی لیکن گل نے قربانی دینا سیکھا ہی نہیں تھا اور وہ جو کہتی تھی ڈنکے کی چوٹ کرتی تھی۔ جو بات دل میں ٹھان لیتی اسے پورا کرنے سے دنیا کی کوئی طاقت اسے باز نہیں رکھ سکتی تھی۔ شوہر نے منت کی، ہاتھ جوڑے، عزت کے واسطے دیئے، سر سے جھگڑا کیا، ماں باپ بھی دم بخود تھے بیٹی کی من مانیاں اب رنگ لا رہی تھیں اسی کا رچایا ہوا۔ قدوس سے طلاق لے کر ہی چھوڑی۔ قدوس نے

طلاق دے دی اور بچے اپنے پاس رکھ لئے۔ وہ بچوں سے بہت محبت کرتا تھا آتی اور گل بھی چاہتی تھی کہ بچے باپ کے پاس ہی رہیں۔ والدین نے بچوں کو کی گود سے گھر سے نہیں نکال سکتے تھے۔ کیونکہ ان کا خون تھا اور اس کی خواہشات کے آگے ہمیشہ جھکتے آئے تھے۔

قمر اپنا پیغام لے کر آیا۔ اس کے والدین کی پہلی شرط یہی تھی کہ گل کے ماں باپ جیسی تھی۔ اپنے لڑکے کی ضد سے مجبور ہو کر انہوں نے اپنی پہلی بیوی کے ہوتے ہوئے اس کا دوسرا بیاہ کرنے پر راضی ہو گئے تھے۔ چنانچہ جب فریقین کی بات چیت طے ہو گئی تو تیاریاں بھی بڑے دھوم دھام سے ہونے لگیں۔ وہ لوگ بھی نام و نمود پر جان دینے والے تھے۔ ادھر گل کے ماں باپ کے پاس بھی پیسے کی فراوانی تھی گل کو کنواری لڑکیوں کی طرح دھوم دھام سے بیاہا گیا۔ وہ دلہن بنی بالکل نوخیز لڑکیوں کی طرح شرما رہی تھی۔ جب خدا حسن دے تو اس پر ہر بات بھلی لگتی ہے، اس کی ادائیں اب اور بھی من موہنی ہو گئیں۔ دلہن دیکھنے کے بہانے محلے کا ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ قدوس اس روز اپنے بچوں کو لے کر شہر سے چلا گیا، اور وہ خود دلہن بن کے نئے شوہر کی باہوں میں باہیں ڈال کر نئے گھر چلی گئی۔ سسرال میں اس کی خوب آؤ بھگت ہوئی۔ قمر کے والدین بڑے سخت اور پرہیزگار لوگ تھے۔ گھر میں پردے کا سختی سے رواج تھا۔ نماز روزے کے سختی سے پابند تھے اور ان کی خواہش تھی کہ گھر کی یہ ساری روایتیں اور عادتیں برقرار رہیں۔ لیکن ادھر گل کا پردے کے نام سے دم گھٹتا تھا۔ اس کے سسر نے پہلے روز اس کے لئے برقعہ سلوا دیا تھا جسے اس نے ایک دو دن تو جا کر پہنا۔ پھر شوہر کے آگے پھینک دیا کہ اسے تم پہنو پھر پتہ چلے گا کہ دو قدم چلنا کتنا دشوار ہو جاتا ہے۔ شوہر نے سمجھایا کہ خدا کے لئے گھر سے پہن کر نکلا کرو اس کے بعد گاڑی میں اتار دیا کرو۔ کہنے لگی "جب مجھے خود گاڑی ڈرائیو کرنی ہے تو برقعہ کیوں سر پر لادے پھروں میں ایسے جھنجھٹ نہیں پالتی۔ اگر مجھے دیکھ کر مردوں کی نیت خراب ہوتی ہے تو وہ اپنی اپنی نیت پر پردہ ڈالیں میں کیوں اپنے حسن کو برقعے میں ڈھانپتی پھروں۔"

عجیب سرپھری عورت تھی یہ گل بھی۔ شوہر نے محبت کے واسطے دیئے سمجھایا کہ والدین کی نافرمانی کرو گی تو ان کے دل سے اتر جاؤ گی۔ وہ دوسری بہو کو چاہنے لگیں گے۔ اسی بات پر گل نے غصے سے لگایا کہنے لگی "چاہتے ہیں تو چاہا کریں مجھے بڑھوں کی محبت کی ضرورت بھی نہیں تم تو بس مجھے ہی چاہو گے نا۔" آگے اس سے کچھ کہنا بہت مشکل تھا۔ شوہر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ وہ جان گیا تھا کہ یہ گاڑی چلنے والی نہیں ہے۔ گل


NEW
BURQ
نیا برق
لاجواب
ڈیٹرجنٹ
صاف
ترین
دھلائی
نئے برق کے جھاگ کے بلبلوں میں کپڑوں سے میل کچیل باہر نکالنے کی زبردست قوت موجود ہے۔
برق کی صاف و شفاف، اجلی اور چمک دار دھلائی آپ کو برق کی گرویدہ بنا دے گی۔
برق کا استعمال گویا، پیسے کی بچت - وقت کی بچت
dsf
دادا سوپ فیکٹری لمیٹڈ - کراچی

آنا نصیب ہے اسے بھی کبھی نہیں ہکا جا سکتا اور یہ خدشہ بے بنیاد
نہیں تھا۔ گل بغیر آستین کے بلاؤز پہنتی۔ آنا جانا گاڑی پر چلاتی ملنے
جلنے والوں کے یہاں جاتی۔ ساس سسر نے ایسی آزادی اپنے پورے
خاندان میں نہ دیکھی تھی، وہ بے تحاشہ پیسہ رکھتے ہوئے بھی انتہائی
قدامت پرست تھے۔ بہرحال گل کی وہ روش کر کے تیکھے آگئی تقریر
نے بہتر جانا کہ وہ عارضی طور پر سمجھوتہ کرے مگر وہ راضی نہ ہوئی۔ آخر
اس نے کچھ ماہ بعد ہی طلاق دے دی۔ اس دفعہ گل بالوذ ذہانت سے
کام لیتے ہوئے اپنا زیور کپڑا اپنے ساتھ لے آئی تھی اور اب اس نے
اعلان کر دیا کہ وہ مزید شادی نہیں کرے گی۔ بھائیوں نے اپنے اپنے
گھر آباد کر لئے تھے کسی کو اس کی اتنی پرواہ نہیں رہی تھی کہ اس کی
سرگرمیوں پر نظر رکھتا۔ آزادی سے کلب جاتی، گھومتی پھرتی۔ والدین
نے اس کی اس زندگی سے بھی سمجھوتہ کر لیا۔ وہ اکیلی دوبئی گئی ۔۔۔
مسقط اور بحرین گئی، وہاں سے پوری چھپے چیزیں لا کر اونچی دکانوں
پر فروخت کرنے کا دھندہ شروع کر دیا۔ کسٹم میں اس کے بہت سے
دوست بن گئے تھے۔ انہیں بھی اپنے ساتھ کام میں شریک کر لیا تھا
ان دنوں اس کی ایک پٹھان ٹھیکیدار شیر دل سے بڑی گاڑھی چھن
رہی تھی۔ وہ بھی کافی مال دار آدمی تھا مگر بڑا تندخو اور اکھڑ مزاج تھا
گل کی قسمت ایسی تھی کہ جس سے وابستہ ہو جاتی تھی وہ اپنی محبت
اور دولت اس کے حوالے کر دیتا تھا۔ تحائف اینٹھنے کے لئے وہ
کسی بڑے ہوٹل میں اپنی سالگرہ کی پارٹی دیتی اور اس کا قرب حاصل
کرنے کے لئے تحائف کا ڈھیر لگ جاتا۔ اسے اب مردوں سے کھلونوں
کی طرح کھیلنے میں لطف آنے لگا تھا ان کی دولت بٹورنے کے
اسے نت نئے گر آ گئے تھے۔ اس نے اپنی کوٹھی خرید لی تھی زیادہ
وقت وہیں رہتی تھی۔ ماں باپ محبت سے مجبور ہو کر اس سے ملنے
جاتے تھے۔ ورنہ اسے اب کسی کی پرواہ نہیں رہی تھی۔

ایک دفعہ کویت گئی۔ پندرہ روز بعد واپس آئی تو بے حد خوش
تھی۔ اپنے والدین کے گھر آئی۔ اسے دیکھنے کے لئے محلے کی عورتیں
لڑکیوں سے جھانکا کرتی تھیں۔ جب وہ اپنے کٹے بال جھلاتی،
سڈول وہ دھیا عریاں بازو لہراتی اپنی شاندار گاڑی سے اترتی تو
دیکھنے والی آنکھیں رشک و حسد سے اسے دیکھتی رہتیں عورتوں
کے سینے جلن کے مارے سلگنے لگتے کہ ہائے کیسی خوش نصیب عورت
ہے جیسی زندگی چاہی ویسی ہی گزار رہی ہے۔ اوپرے دل سے
توبہ توبہ کیا کرتیں مگر دل میں اس پر رشک چھپائے رکھتیں۔ اس دفعہ
کویت سے آئی تو اپنی کوٹھی میں رہنے کی بجائے والدین کے پاس
آکر ٹھہری مزید کوئی خاص بات تھی وہ ایک مدت سے زیادہ عرصہ بھی
ان کے ساتھ نہیں رہتی تھی۔ اس دفعہ پیدا ہلتے ہی گیا وہ نہیں گئی۔
بعد میں عقدہ کھلا کہ کویت میں کسی مسلم شیخ سے شادی کا معاہدہ
کر کے آئی ہے۔ حسب روایت اس نے اس دفعہ بھی پہلے کی طرح
اپنے نئے ارمان اور شادی کا ڈھنڈورا پیٹ دیا۔ شیر دل سے بھی کہہ
دیا کہ اگلے پندرہ روز کے اندر وہ کویت ہمیشہ کے لئے چلی جائے گی
شیر دل نے وجہ پوچھی تو بتا دیا کہ وہ اب شادی کرنا چاہتی ہے اس کو
پسند کا آدمی مل گیا ہے۔ شیر دل چپ ہو گیا۔ گل نے پوچھا کہ کیا تمہیں
اس خبر سے خوشی نہیں ہوئی ہے۔ شیر دل نے بجھے بجھے لہجے میں جواب دیا۔
"اگر تمہیں شادی کرنا تھی تو میں کوئی برا آدمی نہیں تھا اپنی بیوی کو
طلاق دے سکتا تھا تم نے کبھی اس موضوع پر مجھ سے بات نہیں کی۔"
گل اپنی عادت کے مطابق زور زور سے ہنسنے لگی اور اس پٹھان بچے
کو اس کی ہنسی نے تاؤ دلا دیا۔ طیش سے بولا "ہنستی کیوں ہے کیا
میں مرد نظر نہیں آتا ہے" گل ادا سے بولی "تمہی اب تو چاہے تم مرد ہو
یا نامرد ہو مجھے اس سے واسطہ نہیں مجھے شادی کرنا ہے نوازش
ہوگی کہ اب مجھے کسی اور نظر سے مت دیکھو۔ میں ہمیشہ کے لئے یہاں
سے جا رہی ہوں ہنسی خوشی مجھے رخصت کرو۔"

شیر دل بولا "میں تمہاری خوشی کی خاطر اپنی جان دے سکتا
ہوں۔ تم نے جو کیا میں نے معاف کر دیا۔ بولو شادی کے لئے کیا تحفہ
لوگی۔" گل ہنستے ہوئے بولی "اب مجھے کسی شے کی ضرورت نہیں" شیر دل
کہنے لگا "تمہیں تو ضرورت نہیں ہے مگر تمہیں تحفہ دینا اپنا فرض سمجھتا
ہوں۔ رات کو میں آؤں گا۔ میرا انتظار کرنا سو مت جانا۔" اس کے
جانے کے بعد گل خوب ہنسی اسے امید تھی کہ شیر دل حسب عادت
کوئی قیمتی تحفہ اس کے لئے خریدے گا۔

رات کو سب کے ساتھ اس نے ٹی وی دیکھا، کھانا کھایا اور
سر میں درد کا بہانہ کر کے اپنے کمرے میں آ گئی، چوکیدار سے کہا "شیر دل
آئے تو اسے اندر بھیج دینا۔" دس بجے کے قریب وہ انتظار کر کے سو گئی
شیر دل نہیں آیا۔ بارہ ایک بجے جب سارا گھر میٹھی نیند سو رہا تھا۔
کوئی سایہ دیوار پھاند کر کوٹھی میں داخل ہوا۔ گل نے اپنا کمرہ کھلا
چھوڑا ہوا تھا۔ وہ بے خبر میٹھی نیند سو رہی تھی۔ آنے والے نے اپنے
ہاتھ میں چھوٹی سی بوتل پکڑی ہوئی تھی جس کو اس نے پھرتی سے
سونے والی کے چہرے پر اچھال دیا اور خود اس کی پہلی چیخ پر ہی

اندھیرے میں گم ہو گیا۔

وہ گل جس کی مہک نے سارے شہر کو مسحور کر دیا تھا پلک جھپکتے میں ایسی بھیانک اور کریہہ منظر شے ہو گئی کہ کوئی پاس کھڑا ہونے کو تیار نہ ہوا۔ اس سے ناطہ اور محبت کرنے والے اب بھی بیٹی کی صورت نہ دیکھ سکے۔ آنکھوں کی جگہ دو بھیانک کھوے نظر آتے تھے۔ کبھی ان آنکھوں سے حسن و مستی کے ساغر چھلکتے تھے اب گوشت کے جلے لوتھڑے جھانک رہے تھے۔ وہ کان جن میں ہر وقت ہیروں کے آویزے جھلملاتے تھے گل کر بہہ گئے تھے، ہونٹوں کی پنکھڑیاں جھڑ گئی تھیں۔ اس کی جگہ سیاہ جلے گوشت کے ٹیڑھے میڑھے لوتھڑے جھول رہے تھے۔ کہاں وہ چاندی سونے جیسا اجلا روپ اور کہاں یہ چڑیل سی وحشتناک صورت۔ ہر آنکھ اس کے انجام پر اشکبار ہوئی جاتی تھی۔

اس کے بیان پر شیر دل گرفتار کر لیا گیا۔ اس وقت وہ نماز پڑھ رہا تھا۔ اس نے واقعات سے لاعلمی ظاہر کی مگر اس کے ہاتھ جلے ہوئے تھے۔ مقدمہ چلا۔ وہ بھی پیسے والا آدمی تھا اور ادھر گل کے والدین بھی کم نہیں تھے لیکن اس مقدمے کے انجام سے بہت پہلے گل کی زندگی کا چراغ گل ہو گیا اور گل کے والدین نے مقدمہ ختم کرا دیا۔ مرنے سے کچھ دیر پہلے اس نے اپنے والدین کو بلایا کہنے لگی "مجھے ٹیپ سے کچھ گانے سنا دو۔" اس عجیب و غریب عورت نے بستر مرگ پر بھی اپنی آن شغل سے منہ نہ موڑا۔ خوب گانے سنے۔ لوگ اظہار ہمدردی کرنے آتے تو بھیانک انداز سے ہنسنے لگتی۔ کبھی اس کی یہ ہنسی سننے والوں کے دل لوٹ لیا کرتی تھی مگر اب لوگ آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو خود نہیں دیکھ سکتی تھی اس لئے لوگوں کی اس حالت سے بے خبر تھی۔ خوب سے کہتی "میں جب تک جیوں گی زندگی کے ایک ایک لمحے سے زندگی نچوڑ لوں گی۔ وقت سے پہلے مرنا میری فطرت میں نہیں ہے۔"

اور مرنے سے چند منٹ پہلے ٹیپ ریکارڈ کر لیا کہنے لگی "اچھی بس ہم چلے اگر میرے کپڑے پھاڑ دیں تو یہ سانس آسانی سے نکل جائے۔" والدین آبدیدہ ہو گئے، انہوں نے بچوں کو بلوانے کی اپنی سی ہر کوشش کر ڈالی تھی لیکن قدوس راضی نہیں ہوا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ خود ہسپتال کے برآمدے میں بیٹھا [illegible] بھائیوں سے کہتی تھی "تم مجھے باری باری سب پیار کرو۔ مجھے سب نے ہمیشہ چاہا ہے اب بھی چاہو کہ چاہتوں میں رخصت ہونا چاہتی ہوں۔ میں نے تم لوگوں کو بہت تنگ کیا مگر کیا کرتی میری طبیعت ہی کچھ ایسی تھی کہ اپنی ضد نہیں چھوڑ سکی۔" بھائی اپنی بہن کا یہ حشر دیکھ کر مسلسل رو رہے تھے انہوں نے باری باری آگے بڑھ کر [illegible] والدین نے اسے مسلسل پیار کئے۔ تب اس کی روح بڑے سکون سے جسم سے نکل گئی۔

اس کے جنازے میں شیر دل بھی تھا اور قدوس بھی وہ دونوں اپنے اپنے آنسو چھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ عورت سماجی اور فنی نقطۂ نظر سے بہت بڑی تھی۔ اور اس کا انجام بھی بے حد عبرتناک ہوا مگر اس کی خوش نصیبی سے کسی کو انکار نہیں کہ جس نے پیار کیا۔ وہ آخری لمحے تک اس کی محبت میں تڑپتا رہا۔ حتیٰ کہ شیر دل بھی اس کی موت پر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

سیما ناز۔ کراچی

میاں صاحب بہت [illegible] اعتراف کرتے ہوئے شرم آ رہی ہے کہ [illegible] ناراض ہونے [illegible] کی خواہش تھی [illegible] صاحب [illegible] میری [illegible] کو دیکھنا [illegible] عجیب [illegible] دوستوں کے ساتھ [illegible] کے ہاتھوں [illegible]

والی [illegible] میں [illegible] اس کے لئے [illegible] داخل نہ تھا بلکہ سکول کے ماسٹر بھی اس میں [illegible] صاحب کا [illegible] کی بات پر خوش ہو کر [illegible] تھا [illegible] کے لئے [illegible] کا دل جیت لیا تھا [illegible] کے علاوہ [illegible] گزارا [illegible] بہت دیر بعد کی [illegible]

اسے معلوم ہوا کہ فلاں سلیم چوہدری کی لڑکی سے شادی بھائی صاحب کی ہو گئی
کے بعد میں پیدا ہوا میرے لاڈ پیار کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا سارا گھر ابا کی
وجہ سے مجھ سے دبتے تھے میری شرارتیں جو دوسروں کے لئے حد سے
زیادہ تکلیف دہ ہوتی تھیں نظر انداز کر دی جاتیں میری غیر حاضریوں کا
کوئی نوٹس نہ لیا جاتا کبھی غلطی کو ذہانت بنا کر بڑھا چڑھا کر بیان کرتے
ابا بہت سیدھے سادے سے آدمی تھے انھوں نے اپنی ترقی اپنی جسمانی
طاقت کے بل بوتے پر حاصل کی تھی پڑھے لکھے نہیں تھے لیکن مجھے وہ
عالم فاضل بنانے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ پرائمری جماعتیں استادوں
کی مہربانی سے بڑے شاندار نمبروں میں پاس کر لیں۔ والد صاحب خوشی
سے پھولے نہیں سماتے تھے گھر گھر مٹھائی تقسیم کی۔ ڈھول بجا کر اسکول کے
اسکول کے استادوں کے گلے میں نوٹوں کے ہار پہنائے گئے۔ گاؤں میں
ہائی اسکول نہیں تھا شہر آٹھ میل دور تھا مجھے وہاں داخل کرا دیا گیا۔ اسکول
آنے جانے کے لئے سواری کا انتظام کیا گیا مگر مجھے پہنچی کا دورہ پڑ جاتا گیا
تن آسانی میری گھٹی میں پڑی تھی۔ اتنی مشقت کیسے برداشت کر پاتا اور
پھر سب سے بڑی مصیبت انگریزی زبان تھی۔ ماسٹر صاحب انگریزی
کے جوتے سے کرتا یا اور اس پٹائی کی الٹے یہ سزا دی کہ میں
انگریزی زبان کا ایک لفظ بھی پوری طرح نہیں سمجھ سکا۔ اور آپ جانتے
ہیں کہ اس آزاد ملک میں ہمارے سابقہ آقاؤں کا ابھی تک تسلط ہے یہ
سبب ہے کہ ہم ان کی زبان کو اپنے دیس سے نہیں نکال سکے۔ ہماری
صلاحیتوں کا پیمانہ انگریزی زبان پر عبور رکھنے سے مقرر کیا جاتا ہے۔ انگریزی
بولنے والا اونچا اور دیسی زبان بولنے والا حقیر سمجھا جاتا ہے۔ قسم اپنے
رب کی ہم ذہنی طور پر ابھی تک انگریزوں کے غلام ہیں۔ ان کی زبان کے
غلام ہو کر خواہ مخواہ آزادی کا ڈھول پیٹتے رہتے ہیں۔ انگریزی نہ جاننا اس
ملک میں ایسا جرم ہے جو انسان سے اس کا سماجی مرتبہ چھین لیتا ہے۔ میں
انگریزی نہ سمجھنے کا مجرم تھا۔ جس کی سزا کے طور پر مجھے کمتری کے احساس
سے نوازا گیا۔ میں اپنے باپ کی ناک اور اولاد بھی کو گاڑ کر اپنا بھی گاڑ دیں
باوجود جتنی آسانی سے نہ پڑھی جاتیں۔ اس سالی انگریزی نے یہ مدد کیا میں
انگریزی کی کلاس میں خدا خدا کرتا۔ انگریزی کے استاد کے سامنے جاتے ہوئے
جھجکتا۔ ان لڑکوں سے مرعوب رہنے لگا جو انگلش میں رواں جملے بولتے تھے
ترقی کا جذبہ دیکھ کر میری صلاحیتوں کو چاٹ گیا میں بار بار کمتری
ذلیل ہونے لگا۔ اس زمانے میں والد صاحب کی صحت خراب ہو رہی تھی سالی
اسمبلی کا پیریڈ شروع ہو چکا تھا میرا رزلٹ نکلا اعلان تک خبر پہنچی تو
سکتے انسو ہو گئے سکتے کے ... بیٹا جیتا رہا ابا تک ایسی بیوقوف

بتا دیا ہم سمجھتے تھے باپ کا نام روشن کرے گا مگر یہ تو خاندانی
چراغ بجھانے والا نکلا ... دوسرے برس میں بیمار ہو گئے والد
کی سالہا سال ... صاف طور پر لکھا گیا تھا ... ابا جان
ایسے چل بسے ... کر میری ترقی کی آس جانے تھے آنکھ لگا
تھا نہیں بھی بیمار ہو گئے۔ بڑھاپے کا مرض ... سے جان ... پر تھے
بستر سے لگ گئے اور میں آزاد ہو ... پھر کیا ... ابا کی بیماری
نے مجھے اور کھیلنے کودنے کا موقع فراہم کر دیا۔ جب ان کی حالت زیادہ خراب
ہوئی تب اسپتال میں داخل کرا دیا۔ بیماری میں دیکھنے والوں کے طرح
لگتا۔ جائیداد بیچ بیچ کر علاج پر پیسہ پانی کی طرح بہایا۔ حساب کرنے والا
کوئی نہیں تھا۔ والد صاحب ایسی بہنیں شادی کے قابل ہو گئی تھیں مگر ابا کی
بیماری کی وجہ سے ان کی شادیاں التوا میں پڑ گئی تھیں۔ دو سال والد صاحب
بستر پر رہے۔ فالج کا مرض تھا۔ جیسے چند دن پہلے ان کا ہسپتال ہی
میں انتقال ہو گیا ——— ... بہت کچھ کرنے کا جذبہ پھر بھی
پیسہ ادھورا۔

اس وقت مجھے میٹرک میں ہونا چاہیئے تھا لیکن ابھی تا ابا کی بیماری کی وجہ
سے ابھی ساتویں جماعت میں ہی لٹکا ہوا تھا ——— اور سب دو طرف ہی
جاتا رہا پھر پڑھنے پر مجبور کرتا تھا جس کی کتاب انتقال تھی۔ پھر ادھر گیا میں
ناکام ہو کر اس کے بعد ماں سے کہہ دیا مجھ سے آگے نہیں پڑھا جاتا مجھے گل شیر
کے پاس بھیج دو۔ اس کے ساتھ پڑھائی بھی ہو گی۔ گل شیر جو میرے ماموں کا
لڑکا تھا ماں بھی چاہتی تھی کہ کچھ دنوں کے لئے میں باہر چلا جاؤں تاکہ
میرے غم کے جذبات کچھ کم ہو جائیں۔ چلتے وقت ہدایت کی کہ جلدی چلے
آنا۔ بہنوں کی شادی بیاہ کے فیصلے بھی کرنے ہیں۔ زمینوں کے جھگڑے
سمیٹنے ہیں۔ ان تمام باتوں میں تیری موجودگی ضروری ہے۔

وہ گل شیر کے پاس ہی تین چار مہینے رہا جہاں میری زندگی
نو دواتاری کی تھی ... جو کس کی طرح ... بے ... کے
انسان ... جاتا ہے۔ گل شیر ... دنیا ... کر کے ... تے
تھے گل کے پاس پیسے نہیں ہوتے تھے ... پر کام سکھ ...
تھا اس کے ساتھ ... اسکول میں ... کا طالب علم بھی تھا اس
کے مقابلے میں میں ... کی ... زیادہ ... نہیں ...
سے ... کر ... پاس ... تھا ... ختم ہونے ... کو
تار بھیجنا ... کے ساتھ ... کی تاکہ ... بیچ
... ایک مکان ... سے ... دیا ... ہے ... کر ... تے
گھر سے ... پر ... سے ... اور ... نکل ... کر ... کیا

[illegible]

... نہیں سکیں گی۔

[illegible]

قصہ مختصر میری بہنوں کی ذمہ داریوں سے ... [illegible]

[illegible]

بڑھی دیہاتی عورت اپنی جھولی میں کچھ اٹھائے ہوئے میرے پاس کھڑی تھی۔ میں نے غور سے اس کے شفیق چہرے کو دیکھا۔ اس کی ایک امر جھلک تھی۔ میں نے بتایا کہ اپنے کسی پرانے دوست سے ملنے آیا تھا وہ نہیں ملا۔ بڑھی عورت بولی "بیٹا ان آبنیتے سے بچھڑ گیا ہوا شاید وہ جو اردوں کی بچی ہو گی۔ تو کہاں سے آیا ہے؟" میں نے بتایا کہ شہر سے آیا ہوں۔ بڑھیا نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا "بیٹا اب کہاں جائے گا رات ادھر ہی بسیرا کر۔ آ جب تیرا دوست آ جائے تو اس سے مل کر چلا جائیو۔"

میں اس وقت بڑی ہی آسانی اور شستگی سے اس کے ساتھ چل پڑا۔ ایک سی اندھیری کوٹھری نما جھونپڑی میں ہم داخل ہوئے تو لگتا جیسا یہاں اجالا سا ابھر گیا۔ کالی اندھیری مسہری منڈے ایک پیاری سی لڑکی چاول چن رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ بڑی بی نے مجھے برابر والی کوٹھری میں بٹھا دیا۔ یہی لگا اس جھونپڑی سے منہ میں ہونٹ چھپائے سی صاف ستھری لگی تھی۔ ایک کٹورہ نما بھرا پانی چھپی ہوئی تھی میرا اس پر بیٹھ گیا۔ بڑی بی کھانا بنانے چلی گئیں۔ غالباً بڑی بی نے اس لڑکی کو میرے بارے میں بتا دیا ہوگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ لڑکی ہاتھ میں چائے کا پیالہ لے کر آئی۔ میں نے پہلی دفعہ لالٹین کی روشنی میں اس لڑکی کو غور سے دیکھا۔ میں نے بچپن میں ایک ہندوستانی فلم دیکھی تھی۔ زیبا۔ اس کی ہیروئن جس نے ناگا ہاتھ میں تو پہلے دیا، نام تو مجھے یاد نہیں لیکن لڑکی بالکل اس جیسی تھی۔ بڑی بڑی معصوم آنکھیں، بھولی صورت اور من موہنی ادائیں۔ کالی چنری میں اس کا چہرہ چاند کی طرح دمک رہا تھا۔ پیالہ اس کے ہاتھ سے لیتے وقت میرا ہاتھ ہوئے ہوئے کانپ رہا تھا۔ دل میں ایک نئی کسک جاگ اٹھی تھی جیسے گئے تو گئے یہاں تو دل بھی جاتا نظر آ رہا تھا۔ خالی جیب سے دل کا علاج بھی ممکن نہیں یہ سوچتے ہی ٹھیس اور بڑھ گئی۔ وہ کچھ تیز سی تھی۔ سہمی سہمی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ کچھ پوچھنا چاہتی تھی مگر میرے مزاج سے ناواقف تھی اس لئے ہونٹ کھولتی اور سختی سے بند کر لیتی جیسے خود کو باز رکھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ اتنے میں اس کی ماں نے اسے آواز دی وہ مڑ کر جھجکتی چلی گئی۔ ادھر چولہے میں دل سلگ رہا۔ اس غربت کی حالت میں سوچ رہا تھا کہ جھونپڑی کی حسب میں نہیں تھی۔ تھوڑی دیر بعد بڑی بی حلاوت اور سادگی کتنے لوگ بیٹھے جو زندگی ہو سکتی ہے مل کر ہمارے ساتھ کھا لو۔"

کھانے کے بعد زمین پر چٹائی بچھا کر دسترخوان لگایا گیا تھا۔

کہا تمہیں ہم نہیں خود شرکت کرتے ہیں میں نے بھی دیکھا تھا۔ اماں سے پوچھا "اماں بی بھی مہربان ہیں آپ نے تنا اعتبار کر لیا ہے مگر میں چند لوگوں کو تو...؟"

اماں بی ہنس کر بولیں "ہم غریبوں کے پاس عزت اور اخلاق کے سوا اور کوئی شے نہیں ہوتی سو کوئی اٹھا نہیں سکتا۔ میری بیٹی ہے فیروزاں میری اکلوتی ہے۔ میرا بیٹا اور بہو ایک حادثہ کا شکار ہو گئے تھے۔ بیٹے کو گولی لگی، ساری بہو دیکھتی رہ گئی اور ہم ——— وہ اماں بی کچھ کہتے کہتے اٹک گئیں ——— جیسے ضبط کرنے کی کوشش کر رہی ہوں ——— پھر بولیں "اس حرام کی نے خود کشی کر لی ——— بچی کا بھی خیال نہیں کیا ——— فیروزاں نے سر اٹھا کر بڑی حسرت سے اپنی دادی کو دیکھا ——— اور بولی "اماں تم ہر ایک کے سامنے اپنی کہانی سنانے بیٹھ جاتی ہو ——— چلو روٹی تو کھانے دو" اماں بی ہنسنے لگیں "کیسے لگیں تم بول بیٹا روٹی کھا تو رہے ہو" دکھ اگر یہ ہی ہو تو مجھے دیکھ کر دیا اکثر بیٹا اگر کوئی آ جائے تو غم ہلکا کر لیتی ہوں۔"

میں ہنس دیا ——— روٹی مجھے زندگی میں اتنی مزے دار کبھی نہیں لگی تھی۔ ان ہاتھوں کی لذت اس میں گھلی ہوئی تھی جنہیں بچپن سے مجھ کو جانے کر دل بہلا دیتا تھا مگر پھر خیال آیا کہ یہ عشق تم پر اب نہیں سجتے تمہاری جیب میں صرف چند لاکھ ہی ہیں اللہ جانے تمہاری نوکری یہاں بھی لگے نہ لگے۔ اس خیال کے آتے ہی میری آنکھوں میں پھر آنسو بھر آئے جنہیں میں نے جلدی سے چھپا لیا۔

کھانے سے فارغ ہو کر اپنی کوٹھری میں آ گیا۔ اماں بی میرے پاس آ بیٹھیں۔ مجھ سے میرے بارے میں پوچھنے لگیں۔ میں نے اپنے گھر کے متعلق تھوڑی بہت باتیں انہیں بتائیں ——— جب نیند آنے لگی تو وہ چلی گئیں۔ بولیں "بیٹا فیروزاں دودھ گرم کر رہی ہے جلدی پی کر سو جانا۔" اور میرا دل ہر حال میں یا انتظار کرتا۔ وہ آئی وہی بڑی سی جیسی سبک سی چال وہی معصوم بھولی صورت وہی شرما جانے کا دل میں اتر جانے والا احساس۔ میں ایک ٹک کچھ دیر جھکا کر دیکھتا رہا مگر اس نے سہمے سہمے دیکھا اور اپنی اوڑھنی سنبھالتے ہوئے بولی "آپ سے ایک بات پوچھوں سچ سچ بتائیں گے؟" میں نے کہا "ہاں بولو" ——— شرما جھجکتے ہوئے بولی "آج کھانا کھاتے ہوئے آپ کی آنکھوں میں آنسو کیوں آ گئے تھے؟" ——— تو آخر اس کی گہری نظروں سے میرے آنسو چھپ نہ سکے تھے۔ میں نے اسے جھوٹ بول کر ٹال دیا۔ کیا بات کیسے بتاتا وہ تو بہت ہی معصوم لڑکی تھی۔ کہنے لگی "تم نے یہ بات چھپائی ہے

[illegible] — مگر ان [illegible] ہے کہ
بند محسوس ہونے لگے تو پہچان لیں — " یہ کہہ کر وہ [illegible] اندر چلی
گئی — اور میں پھر ساری رات نہیں سو سکا۔

دوسرے روز میں نے تہیہ کر لیا کہ میں یہاں سے چلا جاؤں گا
اماں جی سے رخصت کے وقت [illegible] "تمہارے
پاس پیسے ہیں —؟" میں ایک دم [illegible] "تو پتا
دیتا ہوں" [illegible] پریشانی [illegible] کے
چہرے پر اس وقت [illegible] اماں جی کی
دور اندیش آنکھوں سے کچھ نہ چھپا تھا میں چپ ہو گیا۔ انہوں نے [illegible] پاس
روپے ہتھیلی پر رکھ دیئے [illegible] "ضرورت کے لیے رکھ لے۔"
میں نے جلدی سے گٹھڑی اٹھائی اور [illegible] کے قدموں پر اپنے
ہاتھ رکھ [illegible] — اماں کے
خلوص [illegible] تک کسی سے ایک حیلہ نہیں پایا تھا
میرا [illegible] تھا۔ اماں نے خاموشی سے گٹھڑی رکھ لی۔ فیروزاں سے
بولیں "بھائی کے لیے [illegible] راستے میں کھا لے گا —"

میں ایک رات میں ہی اس گھر سے ایسی نسبت محسوس کرتا
تھا جیسے اپنا گھر ہو، میری اماں کی محبت [illegible] دل کو لگی تھی اس
لڑکی کے لیے چاہت کا ایسا جذبہ جاگ اٹھا تھا جس میں بدمعاشی نام کو
نہیں تھی۔ چلتے وقت اس نے کھانے کی پوٹلی میرے ہاتھ میں تھما دی جو
میں نے ریل میں بیٹھنے کے بعد [illegible]
[illegible]
پیالے میں رکھا ہوا تھا میں نے روٹی نکالنے کے لیے [illegible]
— اور [illegible] کوئی چیز پھسل کر سیٹ سے گر گئی۔ میں
نے جھک کر دیکھا [illegible]
تہہ میں [illegible]

"یہ گٹھڑی میں رکھ رہی ہوں — اگر صرف امانت سمجھ کر
اٹھاؤ گے تو اتنی تکلیف نہیں کروں گی۔ مگر اس کے علاوہ کسی اور چیز کو
بھی اپنی امانت سمجھتے ہو — تو ضرور آنا — ایک بات اور
— [illegible] کہ اپنی کمائی کے روپے دینا
اپنی ماں سے مانگ کر نہیں — فیروزاں!"

لڑکی صرف ذہین نہیں [illegible] تھی
— میری زندگی کا [illegible]
کے پاس [illegible]

[illegible] کتاب [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] جیب میں [illegible] روپے ہو گئے۔ تب وہ کتاب سے
ایک [illegible] — ایک دن [illegible] کے پاس جا —
[illegible] ٹکٹ خرید [illegible] کر دیا
فیروزاں کے لیے میں نے [illegible]
[illegible] فیروزاں کی [illegible]
[illegible] اماں جی کے گھر کی طرف
چل دیا —!

ان خوشیوں میں کسی کو بھی اپنا شریک بنانا نہیں چاہتا ہوں
ہم دونوں کو ایک دوسرے کے مقابل پا کر [illegible] اس کی آنکھیں
اس کے ہونٹ اس کی باتیں خوشی اور سرشاری کے رنگ میں [illegible]
طرح ڈوبی ہوئی تھیں۔ میں نے اماں جی کو پیسے لوٹاتے وقت کہا۔
"اماں جی یہ پیسے [illegible] کی کمائی کے ہیں۔" فیروزاں کا چہرہ
کھل گیا۔ میں نے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا "فیروزاں میری امانت کب
[illegible]" اس کے مکھڑے پر سرخ گلاب کھلتے دیکھے۔
چوڑیاں اماں جی کو تھما دیں۔ [illegible] انہوں نے خوشی سے لے کر [illegible]
[illegible] کر دیا۔ [illegible] رسم ہے
چوڑیاں [illegible] کا دولہا ہی [illegible] انہیں [illegible]
اپنی دلہن کو پہنا دینا میری نظریں انہیں [illegible] پر جم گئیں۔ وہ مجھے
غور سے دیکھ رہی تھی — ایک دم جھینپ کر پیر کے انگوٹھے سے زمین
کریدنے لگی۔ میں نے چوڑیاں اماں جی کو دوبارہ تھما دیں اور بولا۔
"ماں جی میری کوئی دلہن نہیں جب آ جائے گی تو آپ سے یہ چوڑیاں
لے جاؤں گا۔ ابھی آپ رکھیے۔ کیا پتہ میری دلہن اسی گاؤں کی کوئی
لڑکی ہو۔"

رات کو فیروزاں مجھے ملی میں اپنی خوش نصیبی پر جتنا رشک
کرتا کم تھا کہ [illegible] دل کے آنگن میں اتر آیا تھا بہت
[illegible] دوسرے
[illegible] گئیں۔ بات کچھ آگے بڑھنے لگی تو وہ
[illegible] بھاگ گئی۔

دوسرے روز میں [illegible] اپنے دوست اختر کے پاس

گیا وہ تپاک سے ملا۔ میں چھ دن وہاں رہا۔ اختر کی بیوی اور فیروزاں
کی محبت کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ اس نے ہر طرح سے میرا
ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔ طے ہوا کہ میں اختر کے نام خطوط لکھوں اس
میں فیروزاں کے نام پرچہ رکھ دیا کروں۔ فیروزاں باقاعدگی سے جواب دیتی
رہی۔ زندگی بڑی نکھری نکھری نظر آتی تھی۔ میں موقع نکال کر ایک دو روز
کے لئے لائل پور کا چکر لگا آتا تھا۔ اس نسخے سے کام میں دل خوب
لگنے لگا۔ ریڈیو کا کام سیکھ کر اپنا کام کرنے لگا۔ آمدنی اچھی ہونے
لگی۔ ماں کے خط پر خط آ رہے تھے کہ شادی ہو سکے تو بہتر ہے۔ میں ان
سے ملنا چاہتا تھا کہ فیروزاں کے متعلق سب کچھ بتا سکوں۔ ان کا تار
آیا کہ مجھ تک پہنچ جاؤ اور میں راولپنڈی روانہ ہو گیا۔ دو بہنیں پنڈی میں
بیاہی ہوئی تھیں۔ ان سے ملا۔ وہ سامان باندھ کے تیار ہو گئیں۔ انہیں
ساتھ لئے چک میں آیا۔ ماں خوشی سے پھٹ گئی۔ بھائی لائے ہوئے
گھر میں اکیلی رہ رہی تھی۔ رات کو میری چھوٹی بہن بھی اپنے میاں کے ساتھ
ملنے آ گئی۔ وہ باہر کے چک میں بیٹھے تھے اور اسی رات ماں نے مجھے ایسی
خبر سنائی کہ جی چاہا اسی وقت گھر چھوڑ کر بھاگ جاؤں۔ میری چھوٹی بہن
کے شوہر نے کہلوا دیا تھا کہ افضل کی شادی اس کی مجھلی بہن سے ہو گی
ورنہ وہ میری بہن کو طلاق دے دے گا۔ میری زبان پر فیروزاں کا نام
بھی نہیں آیا تھا کہ ماں نے مجھے اپنی دی ہوئی زبان کا پابند کر دیا۔
ایک طرف بہن کی زندگی کا سوال تھا۔ اس کے دوسرا بچہ ہونے والا
تھا۔ طلاق کے بعد اس کا اور ان کا کیا بنتا۔ میرا دماغ چکرا گیا۔ فیروزاں
کو چھوڑنا میری موت تھی۔ اس نے مجھے انسان بنا سکا تھا۔ اسے
دھکے کیسے دیتا۔ ماں بھی مجھ پر کتنا بھروسہ کرنے لگی تھیں۔ انہیں کتنا
صدمہ ہو گا۔

میں سوچوں کے سمندر میں غوطے کھاتا رہ گیا اور صبح سویرے
بہن کے سسرال والے بھی آ گئے۔ بزرگوں کی پنچایت سی بیٹھی تھی۔
میں نے بہن کے آنسو دیکھے۔ اس کے بچے کا پھول سا چہرہ دھیان میں
آیا تو خود بخود سر جھکا لیا۔ دوسرے دن میرا نکاح کر دیا گیا۔ ماں نے
تیاری کر رکھی تھی۔ زیادہ لین دین نہیں ہوا۔ دلہن بیاہ کر گھر آ گئی۔ مجھے
اسے قبول کرنا پڑا — پندرہ دن گھر رہا پھر لاہور آ گیا۔ بیوی کو وہیں
چھوڑ آیا کہ ابھی الگ گھر کا کوئی بندوبست نہیں ہے۔ دل سنبھلنا شروع کر
دیا۔ ساتھ لائل پور جانا چھوڑ دیا۔ فیروزاں کو کوئی خبر [illegible]
تھی۔ اس کی [illegible] انگلستان [illegible] بہت نہیں کر سکا [illegible]
کی خبر سنائی۔ وہ ملی، پوچھا [illegible] ماں نے [illegible]

شاید [illegible] گئی [illegible]
میں [illegible] شکایت [illegible]
بیٹھے تو [illegible] اپنا کر [illegible] جذبات [illegible]
درمیان کا وہ فاصلہ [illegible] رکھا ہوا تھا خود سپردگی [illegible]
[illegible] لمحہ آ گیا کہ ہم ایک دوسرے میں گم ہو گئے

انسان سب سے پہلے دل سے پیار کرتا ہے۔ اس کی آنکھوں
میں آنسو نہیں دیکھ سکا۔ جذبات کی شدت نے مجھے ایک شخص کو [illegible]
[illegible] لیکن ہر شرط [illegible] آنے کے بعد میں اسے [illegible] دیکھ سکتا تھا
جب میں اختر کے پاس گیا اسے بتایا کہ ماں شادی پر راضی نہیں ہے
میں فیروزاں سے چھپ کر شادی کرنا چاہتا ہوں تو میری مدد کر۔ اس نے
اماں جی کو منا لیا اور بڑی ناراضی سے لائل پور [illegible] کر میرا نکاح کرا دیا۔
پہلی شادی کے متعلق میں نے اختر کو بھی کچھ نہیں بتایا تھا صرف اتنا
بتایا کہ ماں نے منگنی بہن کی نند سے کر دی ہے۔ وہ شادی نہیں ہونے
دیں گی۔ اس لئے چھپ کر شادی کر رہا ہوں۔ فیروزاں کو اپنا کر میرا ضمیر
مطمئن ہو گیا۔ میں نے سوچا اسے [illegible] لائل پور [illegible] رکھوں گا۔ ماں [illegible]
[illegible] کر بھاگ نہیں سکتے [illegible] فیروزاں کو [illegible] حکومت
کر یہاں [illegible] آیا کروں گا۔ ماں راضی ہو گئی تب اپنے گاؤں لے جاؤں گا۔

[illegible] میری ماں کا خط آ گیا کہ [illegible] آ جا
وہاں جا کر پتا چلا میری ماں کی طبیعت خراب تھی [illegible] میں وہ کچھ
ہو گئی [illegible] آنکھوں کی روشنی بجھ گئی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس
نے کسی قسم کی خوشی کا اظہار نہیں کیا۔ میں نے بھی کوئی بات نہیں کی۔
رات کو جب ہم ایک بستر پر لیٹے تو اس نے منہ پھیر لیا۔ میں نے پوچھا
کہ مجھ سے ناراض ہے [illegible] لگی۔ جب میں تجھے پسند نہیں تھی تو شادی
کیوں کی تھی۔ [illegible] تو صاف انکار کر دیتا۔ میں بکھر گیا۔ غصے میں
[illegible] بھائی [illegible] کو طلاق دے دیتا [illegible]
[illegible] بھائی اپنی بیوی [illegible]
[illegible] انکار کر دیتا [illegible] اب
بھی کچھ نہیں بگڑا [illegible] اس کی بات سے [illegible]
[illegible] کیسی باتیں کر رہی ہے [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

اور سب سے زیادہ [illegible]

ہو جائے گا [illegible]

کر چاہتی تھی [illegible]

اور کوئی یہ حق ہے [illegible]

ہے میرا باپ [illegible]

بیٹی کی شادی [illegible]

ایک مہاجرانی پر [illegible]

[illegible]

تو تیرا نہیں [illegible]

ہم سب کا [illegible]

[illegible]

میرے [illegible]

گیا اب [illegible]

رشتے [illegible]

[illegible]

داستان

[illegible]

جس بیٹی کو [illegible] اس کی حالت

بھی جان [illegible] ہیں۔

تم رہو گے سب [illegible] اس کے گاؤں والوں

کے [illegible]

[illegible]

لیکن اس سے پہلے میرا دل بہت [illegible]

[illegible]

ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔ وہ کسی بھوکے بھیڑیے کی طرح اب فیروزاں کا سراغ
لگانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس بار وہ دہل گیا۔ نہ صرف یہ کہ میں بری تھی
بلکہ بچہ کر وہ گھبرا گیا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی اداسی بھر گئی۔
جیسے میرے آنے کا اسے دکھ ہوا ہو۔ میں اپنی بے قراری پر قابو نہیں رکھ
سکی میں آنسو بھر آئے۔ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا کہنے لگا
"چلو گھر چلیں۔ تیری بھابی تجھے دیکھ کر خوش ہوگی۔" میں نے
پوچھا "فیروزاں؟" وہ بولا "صبر کرو، اس کا تو مسئلہ ختم ہو گیا تھا۔" میں ضبط نہ
کر سکی، چیخ کر بولی "تو فیروزاں نے کسی سے شادی؟" اختر نے میرے
منہ پر ایک زور سے طمانچہ مارا، پھر کھینچ کر مجھے گلے سے لگا کر رونے
لگا۔ میں جتنا بکا تھا کہ اختر بتا کیوں نہیں رہا اور اگر فیروزاں نے دوسری
شادی رچا لی ہے تو اختر رو کیوں رہا ہے۔ اختر نے میرا ہاتھ پکڑا۔
اپنے ساتھ باہر لے آیا کہنے لگا "دوست جو کچھ ہوا ہے اسے صبر سے
سننا۔ تیرے چلے جانے کے بعد گاؤں میں اس لڑکی کی بہت
رسوائی ہوئی۔ تیرا آنا جانا سب کو پتہ چل گیا تھا۔ میں نے انہیں بتا
دیا کہ تمہاری فیروزاں سے شادی ہو چکی ہے اور لاہور میں اس کا نکاح
ہوا ہے۔ لوگوں نے یقین نہیں کیا۔ ادھر تم نے اچانک آنا بند کر دیا۔ فیروزاں
کو حمل ہو گیا۔ اس کی دادی کی حالت بہت خراب ہو گئی۔ اس نے
مجھ سے کہا کہ ان دونوں کو لاہور لے جاؤں۔ میری شادی کی تاریخ طے
ہو رہی تھی۔ مجھے جہلم جانا تھا مگر ان کو ساتھ رکھنا بھی ضروری تھا۔ گاؤں
میں مزید رہنا ان کے لئے دشوار تھا۔ تمہارا صحیح ٹھکانہ معلوم نہیں تھا
مگر لاہور میں جہاں پہنچ کر سکتا گیا۔ ان دونوں کو اپنے رشتے دار کے
یہاں ٹھہرایا۔ جب تمہارا کوئی پتہ نہ ملا تو مجھے جہلم جانے پر مجبور ہونا پڑا۔
ان دونوں کو یہ بتایا کہ تم پنڈی اپنی ماں کے پاس گئے ہوئے ہو۔ میں

وہاں جا کر بھی کچھ کر نہیں سکا۔ اس طرح تم دونوں لاہور میں رہ گئیں۔
جہلم آ کر میری شادی طے ہو چکی تھی وہ شادی نبھانے مجھے یہاں تک
گئے۔ جب رشتے داروں کے یہاں وہ ٹھہری تھیں۔ شادی میں آ کر
انہوں نے بتایا فیروزاں بیاہے کی شادی کی صورتحال ایسی تھی کہ
میں جا نہیں سکتا تھا اور ایک ہفتے بعد ان کا خط آیا کہ فیروزاں کا
حمل گر گیا تھا اسے ہسپتال داخل کرایا مگر وہ بچ نہیں سکی۔ اس کی دادی
ابھی میرے رشتے داروں کے پاس ہے مگر اس کی حالت بھی خراب ہے۔
یہ تھی محبت کی کہانی جو آخر یونہی ختم ہو گئی۔ میں یوں
کی طرح دھاڑیں مار مار کر رو دیا۔ بال نوچ لئے۔ اختر نے
گلے سے لگا لیا۔ وہ میرا غم سمجھتا تھا۔ مجھے سنبھالنا اس سے مشکل ہو گیا تھا
جس کے لئے میں نے اختر نے میری ماں کا واسطہ دے کر مجھے خودکشی سے
باز رکھنے کی کوشش کی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میرے ماموں کا گھر ان
لوگوں کو معلوم نہیں تھا۔ میری خط و کتابت اختر کے ذریعے ہوتی تھی۔ وہاں سے میرا ٹھکانہ انہیں کیا معلوم ہوتا۔ غلطیاں تو ساری
میری اپنی تھیں۔ بے شک خط انہیں کہاں ملتے۔ وہ تو اس زمانے میں جہلم
تھا۔ ہم فیروزاں کی دادی کو لینے گئے۔ وہ اتنی دیوانی ہو گئی تھیں کہ مجھے
پہچان تک نہیں سکیں۔ انہیں ہسپتال میں داخل کرایا۔ ہفتے بعد وہ
اپنی فیروزاں سے جا ملیں۔ دونوں دادی پوتی کی قبریں ساتھ ساتھ
ہیں اور میرا کام فیروزاں کی قبر پر یاد کے دیئے جلانا رہ گیا ہے۔
زندگی میں پھر شادی نہ کرنے کا ارادہ ہے کہ مجھے ہر وقت اپنے پاس
فیروزاں کی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔ وہ میرے تصور میں ہمیشہ زندہ رہے گی۔

افضل خان ——— لاہور

[illegible]

میری قسمت اچانک ایسے کھل گئی تھی جیسے لاٹری نکل آتی ہے
اور وہ بھی سوچا نہیں جا سکتا تھا۔ میں ایک غریب گھر کی لڑکی
تھی۔ ماں کا میری پیدائش پر انتقال ہو گیا تھا۔ باپ نے پالا۔ میری
ماں اس کی تیسری بیوی تھی۔ پہلی دو بیویوں سے کوئی بچہ نہ ہوا۔
انہیں طلاق دے دی تھی۔ میری ماں کے اوپر تلے تین بچے ہوئے
وہ سوا دو مہینے سے زیادہ نہ جیے۔ میں تیسری اولاد تھی اور بقول
محلے والوں کے ایسی منحوس کہ ماں کو نگل گئی۔ میرے باپ کو
یہ طعنہ بہت برا لگتا تھا۔ وہ میری خاطر اپنے رشتے داروں سے لڑتا
محلے کی عورتوں سے جھگڑا کرتی۔ اسے شادی کا مشورہ دیتا تو بگڑ
جاتا۔ کہتا کہ میری تقدیر میں اولاد اور بیوی کا سکھ ایک ساتھ دیکھنا
نہیں لکھا ہے۔ کچھ فیصلے آسمان پر ہی ہو جاتے ہیں اور ان سے
ٹکرانے والا ہمیشہ رسوا رہتا ہے۔ میں مزید دکھ نہیں چاہتا۔ ابا
ٹھیک ہی کہتے تھے۔ تقدیر سے ٹکرا کر تو وہ اور بگڑ جاتی ہے۔ مگر
اس وقت میں بہت چھوٹی تھی۔ ان کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی

تھیں، وہ میرے ساتھ اٹھ آئے تھے اور میں ہوش سنبھال چکی تھی۔ گو وہ
سال کی ہوں گی جب ان پر فالج کا حملہ ہوا۔ بیل خواب و خیال
ہو گئے، فاقہ کشی کی نوبت آگئی۔ رشتے داروں میں کسی کو ہمدردی
کیا ہوتی انہوں نے ہمارے گھر کے راستے سے گزرنا بھی چھوڑ
دیا۔ ہمسایوں نے کچھ عرصے ساتھ دیا مگر یہ بھی کہاں تک ساتھ دیتے
منہ پھیر لیا اور اب ابا کے لیے جو کچھ کرنا تھا مجھے ہی کرنا تھا۔
میں برتن مانجھنے اور جھاڑو دینے کا کام کرنے لگی۔ ابا اپنی لاڈلی
بیٹی کو دوسروں کے گھر کام کرتے دیکھتا تو اس کی بیماری اور
شدت پکڑ لیتی، مجھ سے چھپ کر وہ بلکتا رہتا۔ ایک ہاتھ
پیر بیکار ہو چکا تھا، اسے اٹھانا بٹھانا کھلانا پلانا بھی میں ہی کرتی
تھی۔ رفتہ رفتہ میں اپنا ماضی بھولتی گئی۔ ابا کا میرے ناز اٹھانا یاد
نہ رہا جو زندگی مجھے ملی تھی میں اس کی عادی ہو گئی۔ کام کرنے والوں
کے لیے محنت بہت بڑا نشہ ہے جس میں ڈوب کر انسان سب کچھ
بھول جاتا ہے۔ میں صبح سات بجے سے دوپہر تین بجے تک مختلف
گھروں میں کام کر کے جب لوٹتی تو بری طرح تھکن سے چور ہوتی۔
ابا کو کھانا کھلانا اور ان کے کپڑے بدلنا دشوار ہو جاتا ۔۔۔ رات
آٹھ بجے سے جو پیر پھیلا کر سوتی تو صبح ابا کے بار بار اٹھانے پر ہی
آنکھ کھلتی۔

بچپن چند برسوں میں بیت گیا۔ جوانی آئی اور میری قسمت
اچانک کھل گئی۔ ابا کا ایک بچپن کا یار تھا فقیر محمد، وہ جوانی میں کسی
بات پر اپنے والدین سے ناراض ہو کر گھر سے بھاگ گیا تھا۔ اس
کی شادی ہونے والی تھی، والدین نے اسے تلاش کرنے کی ہر کوشش
کر ڈالی مگر وہ نہیں ملا۔ اس کی منگیتر نے کسی اور سے عشق کی پینگیں
بڑھا کر شادی رچالی۔ فقیر محمد کا کوئی اتہ پتہ نہ ملا۔ اس کے دوست
احباب سب اسے بھول بھال گئے ۔۔۔ والدین مر کھپ گئے۔ ایک
جگ بیت گیا اور اب وہ اچانک آگیا۔ ایئرپورٹ سے سیدھا میرے
ابا کے پاس آیا۔ وہ اسے پہچان نہ سکے تو زبردستی گلے سے لپٹ
کر رو پڑا۔ کہنے لگا جب سے گیا ہوں بیس سال سے خواب میں دیکھتا
رہا۔ سوچتا تھا کہ تو بھی مجھے اسی شدت سے یاد کرتا ہو گا مگر تو نے
ابا نے اس کی آواز پہچان لی۔ ان کا فالج زدہ ہاتھ اٹھ سکا تو
وہ اپنی دونوں باہوں میں اسے لپیٹ لیتے ۔۔۔ اور پھر تو وہ دونوں
باتوں میں ایسے کھوئے کہ ساری رات آنکھوں ہی آنکھوں میں گزر گئی۔ میں نے دو دفعہ
چائے بنا کر انہیں پلائی۔ ابا ایسے چہک رہے تھے جیسے انہیں نئی



بیماری اور میری خاطر مفلسی در بدری ہوئی
مجھے بعد میں احساس ہوا کہ وہ تھیں ان کے ساتھ وطن
واپس ہو گئے تھے۔ اسی رات ابا نے میری قسمت فقیر محمد سے وابستہ
کر دی۔ فقیر محمد ابا سے چند برس چھوٹا تھا مگر صحت قابل رشک
تھی۔ اس نے باہر جا کر کسی جہاز میں ملازمت کر لی تھی۔ خوب کمایا
اور خوب لٹایا۔ جب تھک گیا تو واپس وطن لوٹا۔ یہاں اس کا
کوئی قریبی رشتے دار نہیں رہا تھا اور اب میرے ابا ہی اس کے سب
کچھ تھے۔ اس طرح اچانک میری قسمت کی لاٹری کھل گئی۔

دوسرے دن ابا نے مجھے ہدایت کی کہ جہاں جہاں تو کام
پر جاتی ہے آج جا کر سب کو بتا آ کہ کل سے وہ لوگ کوئی بندوبست
کر لیں اور اپنی سہیلیوں کو خوشخبری بھی سنا دینا کہ اس جمعہ کو شام چار بجے
تیرا نکاح ہے۔ آج شام کو مسجد میں کہلوانا ہے بڑا ... پلاؤ کی دیگ کا
سامان بنائے ۔۔۔ ابا خوشی سے بہکا بہکا کر مجھے ہدایتیں دے
رہے تھے اور مجھے لگ رہا تھا ابا بچارے پاگل ہو گئے ہیں ۔۔۔
غم دیکھ دیکھ کے ان کا دماغ الٹ گیا ہے ۔۔۔ میں گھبرا کر رونے لگی تو
وہ ہنس پڑے۔ ہاتھ سے اشارہ کر کے مجھے اپنے قریب بلایا۔
اور خود بھی رو دیئے ۔۔۔ پتہ نہیں اپنی جسمانی بے بسی پر یا پھر جذبات
سے مغلوب ہو کر وہ خوشی کے آنسو نہ چھپا سکے ۔۔۔ دل کی بھڑاس
نکل چکی تو کہنے لگے "بیٹی تو مجھے پاگل سمجھ رہی ہے تیرے باپ
نے عمر بھر تجھے کچھ نہیں دیا، اور اب جب کچھ دینا چاہتا ہے تو تو
مجھے دیوانہ سمجھ رہی ہے۔ میں بالکل ہوش و حواس میں ہوں فقیر محمد
بڑا اچھا آدمی ہے تجھے پلکوں پر بٹھا کر رکھے گا ۔۔۔ اس کی عمر کچھ زیادہ
نہیں چالیس سے کچھ اوپر ہی ہو گا مجھ سے تو چار پانچ برس چھوٹا ہی ہے

اس کا دنیا میں کوئی نہیں ہے، صرف میرے بیٹے ۔۔۔ اور آپ نے دیکھا ہوگا کہ جس کے پاس پیسہ ہوتا ہے اس کے لئے رشتے ناطے جوڑنا کتنا آسان کام ہے۔ اگر فقیر محمد کچھ دن اور تنہا رہا تو اس کے بہت سارے رشتے دار نکل آئیں گے اور اسے اچک لیں گے۔ تقدیر نے اسے میرے گھر کا راستہ دکھا دیا ہے۔ بتاؤ اس سے اچھا رشتہ کبھی تو نے یا تیری سہیلیوں نے خواب میں بھی دیکھا تھا۔۔۔؟

ابا خوشی سے پاگل ہوئے جا رہے تھے اور میں بھی خوش تھی کہ محلے کے اوباش لڑکوں کی بھوکی نظروں سے بروقت نجات مل گئی، مجھے بھی خدا نے اچھے گھر میں بیٹھنے اور عزت اور خاموشی سے زندگی بسر کرنے کا موقع دیا تھا۔ فقیر محمد بہت اچھا آدمی تھا۔ اس نے میرے ابا کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا لیا تھا۔ شادی سے پہلے اس نے ملیر میں دو منزلہ شاندار مکان خریدا۔ وہیں پر دوکان کھولی اور مجھ سے بیاہ کے ہفتے بعد وہ باقاعدگی سے دوکان پر بیٹھنے لگا۔ ابا کو ہم اپنے ساتھ نئے مکان میں لے آئے۔ ہنسی خوشی دن گزرنے لگے۔ کتنا اچھا ہوتا کہ داستان یہیں ختم ہو جاتی۔ محبت اور مالی آسودگی کے جھولے میں جھولتے ہوئے میری زندگی کتنی دلفریب ہو گئی تھی۔ فقیر محمد دنیا بھر کی عورتیں برت چکا تھا۔ اسے عورت کی نفسیات پر پورا عبور تھا۔ میری آنکھ کے اشارے کو پہچانتا تھا۔ اس نے مدتوں آوارہ گردی کرنے کے بعد آشیانہ بنایا تھا اور اس کا تنکا تنکا اسے اپنی جان سے زیادہ پیارا ہو گیا تھا۔ میرے کانٹا چبھتا اور تکلیف اسے ہوتی۔ ابا دو سال اور جئے۔ وہ فقیر محمد کا مجھ سے والہانہ پیار دیکھ دیکھ کر خود بخود زیر لب مسکراتے رہتے۔ میری پہلی بیٹی ہوئی اس کے سال بعد پھر بچے کی آمد آمد ہوئی۔ ابا دوسری بچی کی پیدائش سے ایک ہفتے پہلے نمونیے کا شکار ہو کر اللہ کو پیارے ہوئے ان کا سوئم اور چہلم بڑی شان سے ہوا۔ فقیر محمد نے چالیس دن تک مسجد میں سیپارے پڑھوائے اور کھانا تقسیم کیا۔ آٹھ دن بعد میری دوسری بچی فیروزہ پیدا ہو گئی تھی، گھر کے کام کاج کے لئے ملازمہ رکھ چھوڑی تھی۔ آمدنی خوب تھی خوب عیش کئے۔ دس سال جیسے جنت میں کٹے۔ تین لڑکیاں اور ایک لڑکا ہوا۔ ہم دونوں میاں بیوی اپنی چھوٹی سی دنیا میں مگن تھے کہ دکھ کا پہلا پتھر میرے سر پر آ گرا۔ گرمی کے دن تھے بجلی کا پنکھا چلتے چلتے رک گیا۔ واجد میرا بیٹا تین سال کا تھا، وہ گرمی سے گھبرا کر رونے لگا۔ میرے شوہر عشاء کی نماز پڑھ کر سو گئے تھے ۔۔۔ بچے کے رونے سے ان کی نیند اچاٹ ہو گئی۔ اٹھے پنکھے کو دیکھا اور میز کو سرکا کر چارپائی کے درمیان لا کر رکھی اس پر کرسی رکھی ۔۔ اور اس پر کھڑے ہو کر پنکھا ٹھیک کرنے لگے۔ میں واجد کو تھپک کر سلانے کے لئے برآمدے میں لے آئی۔ کوئی تین چار منٹ ہوئے کہ اندر سے دھڑام کی آواز آئی ۔۔ میں اندر بھاگی تو شوہر سر کے بل زمین پر گرے ہوئے تھے۔ وہ اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکے ۔۔ پہلے میں سمجھی کہ بجلی نے شاک مارا ہے لیکن بعد میں پتہ چلا کہ پیر ڈگمگانے سے کرسی ہل گئی ۔۔ میز کی سطح چکنی تھی کرسی جم نہ سکی اور وہ کرسی سمیت دھم سے زمین پر آ گرے ۔۔ سر پر گہری چوٹ لگی کہ بیرونی خون بہا اور انہیں ہوش نہ آیا [illegible] پندرہ دن جانکنی میں رہے ۔۔ اور نیم بے ہوشی میں دم توڑ دیا۔ میری دنیا اجڑ گئی۔ بھری جوانی میں سفید دوپٹہ اوڑھ لیا ۔۔ میں پھر سے بے سہارا ہو گئی تھی۔ سسرال میں کوئی تھا نہ میکے میں جو بچوں کے سر پر ہاتھ رکھ دیتا۔ مجھے دنیا کا تجربہ نہیں تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں، کیسے گھر اور باہر دونوں سنبھالوں۔ دوکان پر ایک دو اعتبار کے آدمی بٹھائے۔ سال چھ مہینے بعد کام میں گھاٹا دکھا کر وہ رفوچکر ہو گئے۔ دوکان [illegible] جا رہی تھی اور بچے بگڑتے جا رہے تھے۔ ان دونوں کو مجھ ہی کو سنبھالنا تھا ۔۔۔ لڑکیوں کی مجھے اتنی فکر نہیں تھی جتنی لڑکے کی۔ میری امیدوں کا یہ واحد مرکز تھا۔ لڑکیوں کا کیا چند سالوں بعد اپنے اپنے گھر کی ہو جائیں گی۔ ان کی فکر صرف اتنی تھی کہ جہیز وغیرہ جمع ہو جائے ۔۔۔ زیورات کے کچھ سیٹ میں نے پہلے ہی بنوا رکھے تھے۔ صرف کپڑا لتا چاہیئے تھا، اگر دوکان ڈھنگ سے چلتی رہتی تو اس طرف سے بھی بے فکری رہتی۔

بہت سوچ بچار کے بعد میں نے واجد کے لئے ٹیوٹر رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ اسے ابھی اسکول بھیجنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ چار ساڑھے چار سال کا تو تھا ہی۔ میری ایک ملنے والی نے اپنے بھانجے کے دوست کا پتہ دیا کہ یتیم لڑکا ہے اور اپنے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لئے اسے چند ٹیوشنز کی ضرورت ہے۔ میں نے لڑکے کو بلوا لیا۔ وہ ملیر کے پرائمری اسکول میں چند ماہ کے لئے لگا ہوا تھا۔ میرے بلانے پر آیا۔ بیٹھک میں بٹھا دیا پہلے سوچا بھی کہ پردہ کروں یا نہیں۔ [illegible] زمانہ نہیں ہے۔ میرا ارادہ چھوٹی بچی کو بھی پڑھانے کا تھا اس لئے اس سے ملنا بھی ضروری تھا [illegible] میں سامنے آ گئی میں [illegible]

نکلا۔ پھر تو اس کا قد اور نکھار، جسم کی رعنائی اور رفتہ رفتہ سے بڑھتی
ذمہ داری اٹھانے کی شکل اس میں پیدا ہو گئی تھی۔ مجھے اس کا جھجک
کرنا اس کی شخصیت سے متضاد لگا۔ مگر کہا کچھ نہیں۔ کیونکہ اس
سے مرعوب سی ہو گئی۔ خود پڑھی لکھی نہیں، جب اس کی واسطے پڑھے
لکھے لوگوں سے ملنے جلنے کا [illegible] پاتی ہوں۔ الیاس نے
بڑی اپنائیت سے وعدہ کیا کہ آپ کے بچے کو سال بھر تک پڑھائی
میں تیز کر دوں گا۔ شرط صرف یہ ہے کہ آپ بچے کو گھر آ جانے کی اجازت دیں۔
وہیں میں پاس ہے اور میں ان کو پیار کروں۔ آپ مداخلت نہ کریں۔ میں الیاس
کی صاف گوئی پر بھی خوب ہنسی اور شوہر کے مرنے کے بعد پہلی مرتبہ
میرے چہرے پر ہنسی آئی تھی۔ ذہن ایک فکر سے آزاد ہوا۔ گھر
کا کفالتی انتظام ہو گیا تو تینوں بچیوں کو بھی اس کے پاس پڑھانے
بٹھا دوں گی۔ اب یکسوئی سے دوکان کے [illegible] سکتی تھی۔

ایک ماہ میں الیاس ایسا گھل مل گیا جیسے گھر کا ہی فرد ہو۔
وہ اپنے سوتیلے بہن بھائیوں کے ہاتھوں تنگ تھا۔ اپنا ٹھکانہ
الگ کرنے کی فکر میں تھا۔ چاہتا تھا پڑھ لکھ کر اچھی نوکری
پر لگ جائے تو ان لوگوں سے پیچھا چھوٹ جائے۔ میں نے اس کی
تنخواہ سو روپے کر دی اور اپنی بچیوں کو بھی پڑھنے بٹھا دیا۔ شام
کا کھانا بھی وہ میرے گھر کھانے لگا۔ پھر میرے بند دوکان کا حساب
وغیرہ بھی اس سے کرانے لگی۔ لوگوں نے باتیں بنانا شروع کر دیں۔
میں نے سب کو منہ توڑ جواب دیا کہ زبانی ہمدردی سے میرے بچوں
کی زندگی نہیں سنور سکتی۔ اگر تم میں کوئی سچا ہمدرد ہے تو مجھے بہن
بیٹی بنا کر سر پر ہاتھ رکھ دے۔ جب میرے دکھ کا کوئی ساتھی
نہیں تو مجھ پر انگلی اٹھانے کا بھی کسی کو حق نہیں۔ الیاس کو جب
یہ حالات پتہ چلے تو [illegible] میں آ گیا کہنے لگا۔ "آپ کی عزت کا معاملہ
ہے [illegible] میں ایک ایک سے [illegible]" اس کے لہجے میں [illegible]
میری آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے پہلی بار میرے کندھے پر ہاتھ رکھا [illegible]
چونک کر پیچھے ہٹ گئی گو اس کے چہرے پر کسی قسم کے جذبات نہیں
تھے۔ سادگی سے بولا۔ "اگر آپ [illegible] باتیں بنانے
والوں کا [illegible]" بڑی محبت سے اس نے میرے
سر پر ہاتھ رکھا اور کہنے لگا۔ "[illegible]" چپکے فوراً آنسو پونچھ [illegible]
بہانہ کر کے [illegible]

بات آئی گئی ہو گئی۔ وہ یہاں بیٹھا باتیں کرتا رہتا تھا اور
ان کی پڑھائی [illegible] الیاس سے [illegible]

کی پڑھائی [illegible] ایک [illegible] کہنے لگا "اگر آپ بھی پڑھ
لکھ لیں [illegible] تو آپ کی طرف [illegible] نظروں سے [illegible]
پڑھنی شروع کر دی [illegible] حالانکہ [illegible] حساب [illegible]
کر لیتی ہوں" یہ سن کر [illegible] مگر میں بھی
الف ب پڑھنے لگی۔ [illegible] الیاس جب پاؤں
[illegible] قریب آیا تھا [illegible] گھر کا [illegible] حصہ بن جا
رہا تھا [illegible] وقت کی جب میں ایک دن لے
جانے [illegible] ساڑھے دس بجے تھے۔ بچے پڑھتے
[illegible] سو گئے۔ الیاس [illegible] دیکھ
حساب کتاب [illegible] اس وقت جانے اسے کیا سوجھی
کہنے لگا "اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو آج رات یہاں سو جاؤں۔ میں
گھر والوں سے روز روز کی لڑائی ہوتی ہے، میں وہاں نہیں جانا
چاہتا۔" میں نے سوچ کر یہیں سے اجازت دے دی۔ مگر اس شرط پر کہ
بہت سویرے یہاں سے چلا جائے۔ اگر کسی کو خبر ہو گئی تو جینا دو بھر
کر دیں گے۔ کہنے لگا "آپ فکر نہ کریں، میں آذانوں سے پہلے اٹھ
جاتا ہوں۔ میں باہر سے کنڈی لگا کر چلا جاؤں گا۔ آپ بے فکر
ہو کر اندر سے کنڈی لگا لیں۔" میں نے جمائی لی۔ پھر دیکھا
کہا پھر کہنے لگا "آج موسم کچھ زیادہ ٹھنڈا ہے، آپ چائے بنا دیں گی؟"
میں نے جلدی جلدی چائے بنائی۔ اس دوران بچے اس سے کہانی
سنتے سنتے سو گئے تھے۔ میں نے اسے چائے دی اور بچوں کو [illegible]
باری اس کے پلنگ پر [illegible] خود جانے لگی تو کہنے لگا "ذرا رکئے،
حساب کتاب میں آپ کی مدد ضروری ہے۔ آپ کو جمع تفریق تو
خوب آتی ہے، ذرا یہاں بیٹھ کر میری مدد کریں۔" میں چادر لپیٹ
کر پاس آ بیٹھی۔ حساب تو اس نے مجھے کیا کرانا تھا۔ قلم
مجھ سے [illegible] ابھریں [illegible]
سے چھوٹ گیا۔ جھک کر اٹھانے لگی تو وہ بھی جھک گیا۔ اس کی
شریر آنکھیں میری آنکھوں کے مقابل آ گئیں۔ نہ جانے اس نے
میں کیا دیکھا تھا کہ میرا وجود [illegible] ہو گیا۔ میں پلک جھپکے بغیر
ایک ٹک دیکھتی رہ گئی اور وہ مسکرا کر آنکھوں سے ایک عجیب سی نشہ
[illegible] چلا گیا۔ پھر تو میری یہ حالت ہو
گئی کہ اس کے ہاتھ میری سمت بڑھے تو میں مقناطیسی انداز سے اس
کی طرف کھنچتی چلی گئی۔ مجھے یاد [illegible] اس سے عمر میں بڑی
ہوں اور ہم ایک دوسرے کو عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ مگر

تقاضوں نے اخلاق و اقدار کی سبھی دیواریں ڈھا دیں۔ کسی نے سچ کہا ہے جہاں مرد اور عورت کی تنہائی شیطانی فعل کو جنم دیتی ہے میں جو چادر لپیٹ کر اس کے سامنے آیا کرتی تھی، ایسی غافل ہوئی کہ اپنی سدھ بدھ رہی نہ تن پوشی کی۔

یہ لمحات مجھ سے میری عزت کا خراج لے کر رخصت ہو گئے۔

الیاس میرے تن من کا مالک بن بیٹھا۔ دنیا نے جو باتیں بنائی تھیں وہ سچی ہو گئیں — الیاس نے مجھے اپنے سحر میں قید کر لیا تھا۔ اور اب نجات کی ایک ہی صورت تھی کہ ہم شادی کر لیں۔ الیاس فوراً راضی ہو گیا۔ کہنے لگا "تمہیں پانے کے لئے تو اتنا انتظار کیا ہے۔ میں نے تمہیں رباحق کی خالہ کے یہاں دیکھا تھا تب سے دل ہار بیٹھا تھا۔ میری مراد میرے رب نے پوری کر دی۔"

اس کی مراد پوری ہوئی، محلے کے مولانا نے ہمارا نکاح پڑھایا۔ اس وقت اڑوس پڑوس والے دشمن بنے ہوئے تھے۔ ایک یہ مولانا صاحب تھے جنہوں نے گواہوں کا بندوبست خود کیا۔ شادی کے بعد بزرگ کی حیثیت سے گھر آنے جانے لگے میں اور الیاس ان کی دل سے عزت کرتے تھے۔ میری بے فکری کے دن آ گئے تھے۔ الیاس نے دکان کا حساب کتاب تو پہلے ہی سنبھال رکھا تھا اور وہ نگرانی بھی خود کرنے لگا — سال بعد میرا پاؤں بھاری ہوا — الیاس نے ضد کر کے حمل گروا دیا کہنے لگا "مجھے ابھی بچے نہیں چاہئیں۔ یہ تین بچے ہمارے لئے بہت ہیں۔" وہ پہلے اپنی پڑھائی مکمل کرنا چاہتا تھا۔ دو سال بعد ایم اے کر لیا۔ اس دوران دکان میں گھاٹا ہو گیا۔ اس نے مجھ سے کچھ زیورات لے کر نقصان پورا کیا — مگر بقول الیاس کاروبار بگڑتا چلا جا رہا تھا — میں اس پر پورا بھروسہ کرتی تھی اس لئے کبھی ایک پیسے کا حساب بھی نہیں لیا — نقصان ہی نقصان میں بچیوں کے زیورات گئے، جمع پونجی گئی اور مکان بھی رہن رکھوانا پڑا — مگر الیاس اس گھاٹے کو پورا نہ کر سکا۔ چڑچڑا ہو گیا۔ بات بات پر الجھنے لگا۔ بچوں کو مارنے پیٹنے لگا — میں اتھ پھوٹی گنوار جیسی جاہل عورت ہو چلی ہوں، بچوں کو رکھنا چاہتی ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اسے خوش کیسے رکھوں۔ بچے اس سے ڈرنے لگے۔ مولانا صاحب میرے کہنے پر سمجھاتے تو پیر پٹختا باہر نکل جاتا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ مجھ سے اکتا چکا تھا اور بندھن توڑنے کے لئے بہانہ ڈھونڈ رہا تھا — ازدواجی زندگی کے چار سال اس نے شہزادوں کی طرح بسر کئے تھے۔ میں نے اس کے ناز نخرے کی طرح اٹھائے تھے۔ میری ساری کمائی کھا پی کر اس نے برباد کر دی — اور ایک شام دوست کے یہاں جانے کا کہہ کر گیا تو واپس نہیں آیا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ اب وہ میری زندگی سے نکل گیا۔ اس کا رویہ آنے والے واقعات کی نشاندہی کر گیا تھا۔ میرا یہ خیال بے بنیاد نہیں تھا۔ اس رات کے بعد وہ واپس نہیں آیا۔ ڈاک سے طلاق نامہ بھیج دیا۔ طلاق کی وجہ ذہنی ہم آہنگی نہ ہونا اور میرا جاہل ہونا بتایا گیا تھا — اور کیا اب میں یہ بھی کہوں کہ اس شخص نے ایک طے شدہ پروگرام کے تحت مجھ سے شادی کی۔ اپنا مستقبل بنایا۔ تعلیم مکمل کی میرا سارا پیسہ ہضم کیا اور رفوچکر ہو گیا۔ بچے بیچارے ہو کر رہ گئے کہ پاؤں کی زنجیر بن جاتیں — میں لوگوں سے انصاف کیسے مانگتی کیونکہ اس شادی سے میرا اپنا ہی دشمن ہو گیا تھا۔ لے دے کے مولانا صاحب رہ گئے تھے وہ آگے بڑھے میرا سر اپنے سینے سے لگا کر تسلی دی۔ کہنے لگے "اس بدبخت کی حرکتیں بتا رہی تھیں کہ وہ تیرے ساتھ دھوکے بازی کر رہا ہے۔ تجھے جھوٹ بتاتا رہا کہ دکان میں گھاٹا ہوا۔ اصل میں اس نے تیرا پیسہ گھسیٹا ہے۔ اگر ذرا سی بھی عقل ہوتی تو کہیں یہ دن نہ دیکھتی۔" اس وقت سارا زمانہ مجھ پر ہنس رہا تھا۔ کہاں تک روتی، صبر آ گیا — مولانا صاحب نے اخلاقی طور پر میرا بڑا ساتھ دیا کہنے لگے "میں تجھے بیٹی کہہ چکا ہوں باپ بن کر دکھاؤں گا۔"

پہلے پیسہ پاس تھا مگر مرد کے سہارے کی ضرورت تھی، اب روپیہ بھی ختم ہو چکا تھا سہارا اور ناگزیر ہو گیا تھا۔ مولانا صاحب نے تگ و دو کر کے میرا بچا کھچا زیور اور دکان جو تقریباً خالی ہو چکی تھی، اونے پونے فروخت کر کے مکان رہن سے چھڑوایا۔ اوپر کا حصہ دو سو پچاس پہ کرائے پہ دیا۔ سلائی کی مشین خریدی، دونوں بچیوں کو سینے سلانے پر لگایا۔ مفلسی میرے لڑکپن کی سنگی تھی۔ پھر مجھ سے آن ملی۔ بچیاں جوان ہو رہی تھیں ان کے جہیز کے لئے جو رکھا تھا وہ الیاس کی نذر ہو چکا تھا۔ اب نئے سرے سے زندگی شروع کرنا پڑ رہی تھی۔ میری بیٹیاں بہت صابر تھیں — حالات کو انہوں نے خاموشی سے قبول کر لیا۔ مولانا صاحب دونوں وقت باقاعدگی سے آتے۔ ان کے آنے سے کچھ حوصلہ بڑھ جاتا — وہ لاوارث آدمی تھے محلے والے دونوں وقت کھانا بھجواتے تھے — میں نے سوچا کہ گھر میں کسی مرد کا ہونا لازمی ہے ان سے درخواست کی کہ آپ مستقل طور پر گھر آ جائیں بوڑھے آدمی پر دنیا انگلی بھی نہیں اٹھا سکتی تھی — وہ بہت خوش ہوئے — فوراً اپنا بستر لے کر آ گئے۔

پھر سال گزر گئے۔ ایسا ہی ہوا تھا۔ اب یہ چپکے سے
کے میرے بیٹک۔ مولانا صاحب نے بتایا کہ وہ مدرسہ چلا رہے
نہیں خبر درست تھی یا غلط۔ میں اب ان کا شکریہ نہیں کرتی
تھی۔ پچیس سے اوپر عمر ہو گئی تھی اب بیٹیاں جوان ہو چکی تھیں بچی
فیشن اٹھارہ کی اور فیروزہ سترہ کی تھی۔ مجھے اب ان کے بیاہ کی فکر
تھی۔ جب پیسہ تھا تب رشتے بہت آئے تھے مگر اب بڑا اتفاق
مشکل کام تھا۔ مولانا صاحب مجھے تسلی دیتے تھے کہ ان کی فکر مت
کرو۔ میں ایسے رشتے ڈھونڈ کر تمہارے بچوں کے ہاتھ پیلے کروں گا
اب تک مولانا نے میرے ساتھ جو برتاؤ کیا تھا اس نے مجھے یقین
دلا دیا تھا کہ باپ کے بعد یہ میرا اور میرا سہارا ہے۔ سال دو سال
تک وہ میں لگے لیکن مولانا رشتے ڈھونڈ لائے۔ حیدرآباد میں مقیم
زمیندار گھرانے کے دو بھائی تھے۔ اچھے کھاتے پیتے لوگ تھے
پہلے ان کے والد کو لڑکیاں دکھانے گھر لائے، انہیں لڑکیاں پسند
آگئیں۔ مجھے لڑکے دکھانے گئے، پڑھے لکھے نہیں تھے مگر مجھے لوگ
معقول لگے۔ ان لوگوں کو شادی کی جلدی تھی۔ لڑکوں کی والدہ کا ایک
سال پہلے انتقال ہو گیا تھا گھر میں کوئی اور عورت نہیں تھی۔ چاہتے تھے
فوراً شادی ہو جائے۔ زیادہ سوچ بچار کا وقت نہیں تھا۔ منظور
کر کے ایک مہینے کی تاریخ دے دی۔ یہ بات مولانا نے پہلے ہی
بتا دی تھی کہ جہیز میں دینے کے لئے کچھ نہیں ہے اس لئے کپڑا
زیور تمہیں ہی لانا ہو گا۔ وہ امیر لوگ تھے ہزاروں کا زیور کپڑا بری
میں لائے۔ صبح دس بجے بارات آئی شام کو نکاح تھا۔ دوپہر کو
کھانے کا انتظام کیا ہوا تھا۔ کھانا کھلانے کے لئے مولانا صاحب
نے محلے کے لڑکوں بالوں کو جمع کیا ہوا تھا بارات میں پانچ مرد تھے
عورت ایک بھی نہیں تھی۔ نکاح سے ایک گھنٹہ پہلے مولانا پھولے
پھولے سانسوں سے میرے پاس آ کے کہنے لگے "حمیدہ اری بہن
میں نے دولہا جواب بات سوچی ہے کہ لڑکیاں تو اپنے باپ کے
ہاتھ چوم لیں گی۔" میں کپڑے سنبھال رہی تھی۔ کام سے ہاتھ
روک کر حیرت سے پوچھا "کیا ابا؟" ویسے انہیں بتا بھی تھی اور اب
"ذرا ٹھنڈے دل سے میری بات سن کر جواب دینا۔ میں ستر برس
کا بوڑھا آدمی ہوں۔ آج مرا کل دوسرا دن۔ میرے بعد تیرے سر پر
کون ہاتھ رکھے گا۔ لڑکیاں دونوں اپنی جگہ ہی چلی گئیں بھی دو چار
برس بعد اپنے گھر بسا لے گی۔ بیٹا تیرا لائق ہے۔ وہ اپنا ہی
کچھ کرنے کی نوبت ہے۔ بتا پھر تو کہاں ٹھوکریں کھاتی پھرے گی۔ ؟

مر تیرا ہمدرد ہے تو خاصا کھاتا پیتا آدمی ہے۔ ابھی کافی عمر ہے
عمر میں ساٹھ سے کم ہی ہو گی اگر تو ہاں کر دے تو ابھی لگے ہاتھوں
تیرا نکاح بھی ان سے کر دوں۔ تو اپنی بیٹیوں کے ساتھ ہی چلی
جائے گی مجھے بھی تو اپنی بچیوں کی فکر ہے۔"
میں ہکا بکا رہ گئی۔ آخر انہیں سوچ کیا تھی کہ بچے میں
لے کر دو بیٹیاں کے ڈھونڈتا ہے۔ جہاں ان بیٹیاں تیری تو رہتی
رہیں گی سے تیری رضا پائی اور کیا نہیں اس کا تجزیہ میں ابھی تک
نہیں کر پائی مگر انہوں نے مجھے ڈانٹ اور پیار سے تیرے نکاح کے لئے
راضی کر لیا۔ اور خدا معلوم وہاں لڑکوں کے باپ کو کیا کہیں کہ جا کر
وہ بھی رضامند ہو گیا۔ مجھے بتایا کہ میں نے لڑکوں کے نکاح کی شرط
یہی رکھی تھی کہ پہلے وہ اپنی شادی لڑکیوں کی ماں سے کرے وہ دونوں
طرف سے رضامندی ہو گئی تو ہم یہ بتا کر شادیاں دو دن کے لئے
ملتوی کر دی جاتیں تاکہ میرے لئے بھی جوڑے بنائے جائیں خریدے جائیں
خریداری کا انتظام مولانا نے اپنے ہاتھ میں لیا۔ صاف لفظوں میں
کہہ دیا کہ جتنی بری لڑکیوں کے لئے آئی ہے اتنی ہی حمیدہ بیگم کے
لئے بنائی جائے تب نکاح دیں گے۔ وہ لوگ اتنا پیسہ ساتھ نہیں
لائے تھے کچھ مہلت مانگی۔ مگر مولانا اکڑ گئے۔ وہ جانتے تھے پیسے
والے آدمی ہیں کچھ دیکھ مزید کریں گے۔ بات کی پکڑ گئی۔ لیکن پھر
ان لوگوں کو بازار جانا پڑا۔ صرافہ بازار سے تیس تولے کا زیور خریدا۔
کپڑے سلے سلائے لئے۔ مولانا پیش پیش رہے۔ ہم تینوں ماں
بیٹیاں دلہن بننے بنانے میں لگی رہیں۔ کھانے والے کا ہوٹل سے
انتظام کیا۔ محلے میں ایک تماشا سا ہو گیا۔ عورتیں بچے بہانے کر کے
مجھے دیکھنے کے لئے گھر میں گھسے آتے تھے عجیب ہنگامہ سا ہو گیا۔
مولانا نے جیسے تیسے ان لوگوں کو نمٹایا۔ تیسرا روز تھا سارا انتظام ہو چکا
تھا۔ ہم تینوں کے نکاح پڑھا دیئے گئے۔ اسی شام رخصتی ہونے والی
چلنے سے کچھ دیر پہلے مولانا نے مجھے سینے سے لگایا کہنے لگے زیورات
وہ میرے پاس رہیں گے تم سسرال جاؤ پھر لے کر میں تھے کہ یہ
دونوں بیچ کھا نہ دیں گے۔ اور دوسری بات یہ کہ ان لوگوں پر بھی
نظر رکھی جو بوڑھا کرو۔ لڑکوں کا باپ کچھ نالائق سا ہے میں نے تمہارے
زیورات خریدنے کی ضد میں ان سے خاصی بدتمیزی کی ہے، ہو سکتا
ہے بگڑ جائے تمہارے بدلے۔ تم پہلے ہی اعتماد کر کے دھوکا کھا
چکی ہو اب آنکھیں کھول کر چلو۔ اپنے اور بیٹیوں کے زیورات یہیں
چھوڑ جاؤ۔ گھر دیکھ لو جب بھیجوں گی۔ کل دوپہر کو میں حیدرآباد آؤں گا۔ وہاں

کہ حالات ٹھیک ہوئے تو مجھے بتاؤ یہ میں زیورات تمہارے سپرد کر دوں گا
اگر حالات خدانخواستہ ٹھیک نہ نکلے تو زیورات ہم انہیں واپس نہیں
کریں گے ۔ یہ بات مجھے اچھی لگی۔ سارے زیورات اتار کر صندوقچی
میں رکھے اور مولانا کے سپرد کر دیئے۔

حیدرآباد آتے ہی میرے شوہر نے زیورات دیکھنے کی ضد کی
میں نے خدا ہمت کر کے کہہ دیا کہ گھر سنبھال کر میں کل جا کر لاؤں گی۔
وہ بگڑ گئے ۔ چیخنے چلانے لگے کہ تم دھوکے باز عورت ہو۔ میرے
زیورات ہضم کرنا چاہتی ہو۔ بات طول پکڑ گئی۔ بیٹے کے باپ کو
سمجھانا چاہتے تھے کہ ہو سکتا ہے یہ سچ بول رہی ہوں مگر وہ کسی
طور راضی نہیں ہوئے ۔ رنگ میں بھنگ پڑ گیا۔ ہمیشہ کی نوبت
آتے آتے رہ گئی۔ بڑا لڑکا باپ سے الجھ بیٹھا۔ وہ اپنی بیوی کو
لے کر کسی دوست کے گھر چلا گیا۔ مجھے اور میری بیٹی فیروزہ کو دھکے دے کر
میں باہر نکال دیا کہ جاؤ پہلے زیورات لے کر آؤ پھر گھر میں گھسنے دیں گے۔

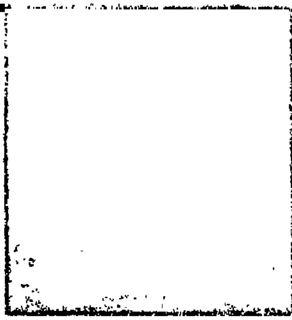
لئے لٹائے آنسو بہاتے کراچی واپس آ گئے۔ یہ فکر تھا کہیں
مولانا صاحب حیدرآباد نہ چلے جائیں۔ بارہ بجے کے قریب گھر
پہنچے ۔ ہمیں دیکھنے کے لئے محلہ اکٹھا ہو گیا۔ رکشہ سے اتر کر گھر پہنچے
تو سب سے پہلے واجد آکر لپٹ گیا۔ دروازے پر زبیدہ کھڑی
تھی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ مولانا کہیں دکھائی نہیں دیئے میں
نے واجد سے پوچھا "ابا کہاں ہیں؟" وہ روتے ہوئے بولا وہ تو کل
رات سے غائب ہیں۔ ہم دونوں رات کو اکیلے تھے پوری رات ان
کا انتظار کرتے رہے وہ نہیں آئے ۔ سارا محلہ چھان لیا ان کا پتہ
نہیں چلا۔

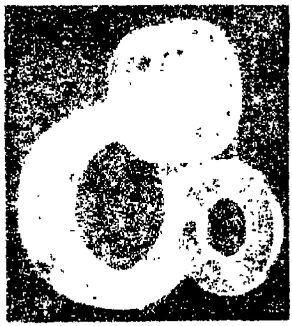
میں گھبرا کر اندر بھاگی۔ ایک ایک کرکے صندوق کھولا ہر چیز چھان
چھان مارا۔ زیورات کی صندوقچی غائب تھی وہ بھی۔ مولانا اپنا کام کر گئے
تھے۔ آپ خود سوچ لیجئے کہ اس کے بعد کیا کچھ دیکھنا ہوگا۔ اپنے
شوہر کو کیا منہ دکھاتی وہ اسے کیا کچھ نہ کہیں گے۔ وہ تو خدا کا شکر
گزاری تھی اور دھمکیوں تک ہی بات پہنچی ان لوگوں نے تھانے میں
رپورٹ داخل کرائی تھی۔ کچھ نیک دل محلے داروں نے بیچ میں پڑ کر فیصلہ کیا
مجھے اور فیروزہ کو طلاق ہو گئی۔ فیروزہ کی اس کے میاں نے نہیں چھوڑا۔
اور آج کل میں بے سہارا زندگی بسر کر رہی ہوں۔ مجھے آپا
کی بات رہ رہ کر یاد آتی ہے کہ تقدیر سے الجھو تو وہ ایسی چٹکیاں دیتی
ہے کہ ساری عمر زخم سہلاتے رہو۔ دونوں بچیاں بھائیوں میں ایک
تو طلاق کا داغ بھی اٹھائے ہوئے ہے۔ مجھ پر بڑھاپے میں منہ
پر کالک مل گئی ۔ بیٹا ایسا ناک کی نکلا کہ پلٹ کر نہیں دیکھا۔ سارا وقت
آوارہ گردی میں گزارتا ہے ۔ مولانا احمد الیاس طویلی منصوبہ بنا کر
اپنا اپنا مفاد سمیٹ ہمیں اندھیروں میں دھکیل کر رخصت ہوئے
اور آج کل ایک پولیس کانسٹیبل ہوتے ہوئے بھاگتے روز گھر کے چکر
لگائے لگا ہے اس نے رپورٹ کے نام پر ہی کچھ سہارا دیا تھا۔ سوچتی
ہوں پھر کسی نئے ڈرامے کا آغاز ہونے والا ہے، پھر اعتماد کے
نام پر ہم بے سہارا عورتوں کو الو بنایا جائے گا۔

حمیدہ بیگم ۔ کراچی

ان صفحات میں ہم آپ کو زندگی کی ان کہانیوں سے روشناس کرا رہے ہیں جو ہمارے اور آپ کے
ارد گرد بکھری ہوئی ہیں مگر انہیں سنانے کا ہم حوصلہ نہیں کرتے۔ آپ بھی معاشرے کو یہ آئینہ
دکھانے میں ہمارے ساتھ تعاون کریں۔ سچائی اور بےباکی سے لکھی گئی ان کہانیوں کے پیچھے کسی نہ کسی
بھٹکتی ہوئی روح کی زندگی کے ان پہلوؤں پر روشنی ڈالیے جو بتاتے ہوئے آپ سب گھبراتے
ہیں۔ کہانی کا سچا ہونا لازمی ہے۔ اپنی لکھی کہانیاں ہمیں ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک بھیج دیں
تحریر خوشخط ہو یہ ضبط ہو اس کی کوئی قید نہیں۔

رعنا فاروقی ــ دوشیزہ ــ پوسٹ بکس ۱۵۸۰ کراچی ۱۹



پچھلے ماہ خواجہ احمد عباس کی کہانی "گیہوں اور گلاب" شائع ہوئی تھی [illegible]
کی [illegible] اس کہانی میں [illegible] کی [illegible] ہے
کر [illegible] اس کہانی میں خواجہ احمد عباس نے
کی عظمت کو [illegible] آپ کو [illegible] عباس کی
پیار بھری [illegible] ہو۔



خواجہ احمد عباس

سونا بنا دانہ

جب سے بیج پھوٹا تھا اور جس کے ننھے سے بدن پر ہلکا ہلکا سبز رنگ جھلک رہا تھا اور جس کے بڑھنے کے ڈھنگ میں لڑکپن کی جوانی کا جوش بھی تھا اور لڑکپن کی ضد بھی۔ وہ بولا۔

"بھائیو! میری کہانی آپ تینوں کے لئے شاید نئی ہو مگر اس ملک کے رہنے والوں کے لئے نئی نہیں ہے جیسا میں نے پہلے بھی آپ سے کہا میرے لئے یہ سرزمین اجنبی نہیں ہے۔ میرا خاندان یہیں پیدا ہوا تھا کن حالات میں وہ یہاں سے نکلے اور کہاں کہاں پہنچے یہ بھی ایک کہانی ہے مگر وہ کہانی اب میں آپ کو سناتا ہوں۔ آج سے بہت دنوں پہلے کی بات ہے شاید صدیوں گزریں بلکہ ایسا لگتا ہے کئی صدیاں بیت گئیں۔ تین ہزار برس گزر چکے اب وہ زمانہ خواب جیسا لگتا ہے۔ مشرقی پنجاب میں جہاں بہت سے قصبے اور گاؤں ہیں ان میں ایک بستی تھی [illegible]

بستی بھی ایسی ہی [illegible] دریا کے کنارے آباد تھی، وہ گاؤں تھا ایک کا نام تھا گوٹھ۔ دریا کا پار یہاں سے ہمارا [illegible] ساتھ ہی [illegible] اور یہاں کے [illegible] ہزاروں برس کی تہذیبیں تو ایک طرف سے اکیلی ہی [illegible] تھیں۔ تین ہزار برس پہلے کے لوگ اب زمین سے زیادہ دور نہیں اور دل سے [illegible] انسان [illegible] صاحب [illegible] نہیں [illegible] کی کائنات میں صرف [illegible] کے لئے ہی محبت کے رشتے قائم کئے جاتے ہیں۔

اس طرح اسی سرزمین پر یہاں پانی بہت کم [illegible] کی جگہیں تھیں [illegible] کی [illegible] گوٹھ بہت [illegible] ہے [illegible] کی [illegible] کے [illegible] اس [illegible]

[illegible]

کی طرف [illegible]

سے [illegible] تھے

اور اب اس کی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے وہ پوچھتے

اور انہوں نے [illegible] کا نام انہوں نے اپنے

شہنشاہ کے نام پر رکھا ہوا ہے۔

گوجرانوالہ اور بابر پور دونوں کی [illegible] تاریخی اہمیت

تھی گورنمنٹ کے [illegible] پاس [illegible]

کے زمانے کی قدیم تہذیب کے آثار ملے ہیں اور بابر پور کے بارے میں

تو مشہور تھا کہ کہیں بھی زمین [illegible] جائے تو مٹی میں سے [illegible]

کے زمانے کے سکے [illegible] ہیں گورنمنٹ میں زیادہ تر ہندو [illegible]

آباد تھے اور بابر پور میں مسلمان [illegible] گورنمنٹ میں پیپل

کے [illegible]

[illegible]

کی سفیدی کی [illegible]

تھا [illegible] صاحب کے [illegible]

[illegible] اور بابر پور میں [illegible]

[illegible] گورنمنٹ کے [illegible]

بڑی [illegible] رکھتے تھے لیکن

دونوں کی زمینیں ایک دوسرے سے [illegible] دونوں کاشتکاری کرتے

تھے گیہوں اگاتے تھے ان کی زمینیں بہت زرخیز تھیں کیونکہ

یہاں اس علاقے میں [illegible] لیکن کوئی [illegible]

جانے کس بات پر یہاں [illegible] انہوں نے اپنے [illegible]

[illegible]

کے ضلع [illegible] بابر پور کے [illegible]

اور گورنمنٹ کے [illegible]

[illegible] قریب [illegible]

پھر [illegible] کاشت [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کاشت کا [illegible]

[illegible] شروع کرنے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] شروع کرنے [illegible]

بابر پور کے [illegible] گورنمنٹ کے [illegible]

[illegible] اصل پانی [illegible]

[illegible]

[illegible]

زمینداری [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

برخلاف اس کے [illegible] اپنی زمین سے [illegible]

[illegible]

کی [illegible]

ایک جیسا تھا ان دونوں [illegible] ان کی زمینوں کا رشتہ ایسا تھا جیسے

[illegible]

میں [illegible]

[illegible]

دیکھیں [illegible]

[illegible]

[illegible] ہر وقت پانی [illegible] اللہ جانے اب

[illegible]

کیا ہے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

جسے اب تو گندی گندی باتیں کرنے لگا۔ تمہاری گھر والی نے
کیا تو کیا ہے گی بچہ

اور پھر دونوں ہنس پڑتے اور ان کے دلوں میں بجتے ہوئے
بیل بھی خوشی سے گردنیں ہلا ہلا کر اپنی اپنی گھنٹیاں بجانے لگتے۔ اور ان
کے لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں گیہوں کی بالیں ہوا میں جھوم اٹھتیں۔ نیم
کے پیڑوں کے نیچے مور ناچنے لگتے۔ اور پیپل کی ڈالیوں میں بیٹھے ہوئے
طوطوں کے جوڑے محبت سے چور ہو کر ایک دوسرے کو ٹھونگیں مارنے
لگتے۔

تو صاحب! یہ وہ زمین تھی اور یہ وہ ماحول تھا جس میں میرے
باپ دادا نے جنم لیا تھا۔

ایک برس کا ذکر ہے کہ دونوں کھیتوں میں ہل چلا چکے تھے۔
اب بیج بویا جا رہا تھا۔ آسمان پر تھوڑے تھوڑے بادل چھائے ہوئے تھے
آم کے باغوں میں کوئلیں کوکو کر رہی تھیں۔ نفضو اور رام دین دونوں اپنے
کھیت میں بیج ڈال رہے تھے۔ رام دین جو کئی برس ہوئے فوج میں بھی
کاٹ آیا تھا پہلی جنگ عظیم کے زمانے کا ایک گیت گنگنا رہا تھا۔ "تیرے باہر
کھڑے رنگروٹ تیموں بھرتی ہو لے نا" اور ان دنوں کو یاد کر رہا تھا جب
وہ خاکی وردی پہنے جہاز میں چڑھ کر ترکوں اور عربوں سے لڑنے کے لئے
عراق بھیجا گیا تھا۔ حالانکہ اسے بالکل پتہ نہیں معلوم تھا کہ ان لوگوں نے
کسی کا کیا بگاڑا ہے کہ ان کے خلاف لشکر کشی ہو رہی ہے۔ اور پھر اُسے
ولایت کی سردی یاد آ کر ایک جھرجھری سی آ گئی۔ جرمنی کی وہ برف اور
بارش اور کیچڑ جس میں وہ جرمنوں سے لڑے تھے۔ اس لئے کہ جرمنی کا
بادشاہ اپنے بادشاہ جارج پنجم کا دشمن تھا۔ اور جرمنوں کو ہار ہوئی تھی
اور اتحادی فوجوں کو فتح ہوئی تھی۔ جنگی محاذ پر بہادری دکھانے کے
صلے میں رام دین کو ایک جرمن توپ انعام میں ملی تھی مگر رام دین کو تو صرف
یہ یاد تھا کہ اس کے دوست صوبیدار عمر خان اور جمعدار جسونت لڑائی میں
کام آئے تھے۔ اب نہ کبھی اُسے عمر خان وہ لطیفے سنائے گا جن کو سن کر
سب لوگ خندق میں بھی لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے اور نہ اب کبھی جسونت
سنگھ ماہیا گائے گا جس کو سننے کے لئے دشمن بھی اپنی خندقوں سے نکل
پڑتے تھے۔

جب وہ تمغوں سے لدا پھدا اپنے گاؤں واپس آیا تو نمبردار جگو
کی لڑکی لاجو کی شادی ذیلدار بہرام خاں سے ہو چکی تھی۔ اب تو اُسکی
گود میں ایک بچہ کھیل رہا تھا اور رام دین کے لئے یہ یاد کرنا مشکل ہو گیا
[illegible]
اٹھا کر اور [illegible] کی کشتی ان کو [illegible] اپنے پیار کی [illegible]
تھی کہتے ہیں وقت سب کچھ بھلا دیتا ہے۔ گاؤں میں پھر کسی نے لاجو
کی زبان سے رام دین کا نام نہ سنا۔ کسی نے اس کی آنکھ سے ایک آنسو گرتے
نہ دیکھا۔ لیکن یہ سچ ہے کہ اس دن سے رام دین نے اپنے کھیت
میں پھر سرسوں نہیں بوئی۔

یاں تو رام دین گنگنا رہا تھا "تیرے باہر کھڑے رنگروٹ [illegible]
[illegible] گیت [illegible] کی [illegible] کی نوک پر [illegible]
ہو رہی تھیں۔ اور اس کا ہاتھ کھیت میں مٹھی سے بیج پھینکتا جا رہا تھا اور اس کی
سبز سُری اور بھاری آواز میں ایک ایک لفظ گونج رہا تھا۔ میرے مولا
بلا لو مدینے مجھے۔ یہ نعت اس نے ایک بار پانی پت کے بازار میں
شربت والے کی دکان پر سنی تھی جہاں وہ [illegible] صاحب [illegible] کے
پاس آتے ہوئے رستے میں [illegible] بیٹھ گیا تھا۔ اس دکان پر
ہمیشہ بھیڑ رہتی تھی کیونکہ [illegible] شربت کے علاوہ [illegible] کے
علاوہ وہاں ایک بھونپو والا گراموفون باجا بھی لگا ہوا تھا جس پر کوئی
نہ کوئی ریکارڈ چلتا ہی رہتا تھا۔ [illegible] نعت بڑی اچھی لگی تھی اور اس
نے پتہ کیا تھا کہ یہاں ایک بار پھر [illegible] ریکارڈ [illegible]
کا ایک [illegible] چاہتا ہوں۔

اس دن سے جب کبھی نفضو خوش ہوتا یا کسی سوچ میں ہوتا تو
اس کی زبان سے بے اختیار اس نعت کے الفاظ نکل آتے۔ میرے
مولا بلا لو مدینے مجھے۔ وہ بہت خوش بھی تھا اور اداس بھی [illegible]
میں بھی تھا۔ خوش اس لئے تھا کہ اس کے بیٹے [illegible] نے پٹواری کا امتحان
پاس کر لیا تھا اور اب اس کی نوکری لگ جائے گی تو نہ صرف گھر میں کمانے
[illegible] بلکہ [illegible] گاؤں میں ان کے گھرانے کی عزت
اونچی ہو جائے گی۔ مگر [illegible] اس بات کی تھی کہ [illegible] جانے میں
[illegible] نفضو جیسا [illegible] آدمی جس
[illegible] تھی اور
اور پریشان [illegible] اس [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

نے سوچا [illegible] گاؤں [illegible]

مقابلہ [illegible] گاؤں میں [illegible]

[illegible]

اسی سے [illegible]

مولا بخش [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

رام دین کی [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ایسے ہی [illegible]

یہ ان دونوں کا آپس کا [illegible]

کی بات پر [illegible]

[illegible]

اور پھر اس نے [illegible]

بات رام دین کو سنا دی [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

رام دین نے کہا [illegible]

گاؤں کی [illegible] کا بھی تو سوال ہے [illegible]

[illegible]

دل ہی دل میں [illegible]

جوان ہوتے ہیں [illegible]

ایسے ہی کسی [illegible]

[illegible]

کیا ہے؟

نفسو نے کہا [illegible]

تمہیں بتانی ہی بھول گیا [illegible]

[illegible] پاکستان [illegible]

[illegible]

[illegible] چودھری [illegible]

[illegible]

نفسو نے کہا [illegible]

[illegible]

رام دین نے کہا [illegible]

اور شاید [illegible]

[illegible]

[illegible]

صاحب [illegible]

[illegible] پاکستان [illegible]

[illegible]

اور نفسو [illegible]

[illegible]

[illegible]

اور چودھری [illegible]

میں؟

تو پھر [illegible]

[illegible] پاکستان [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

سمجھتی ہو کہ وہ پیدا ہوا تو اس کے باپ نے کہا کہ یہ میری
پیدائش کا فخر تھا۔

رام دین جب دن بھر کھیت میں کام کر کے جب تھکا
ہارا گھر لوٹتا تھا تو اس میں اتنی ہمت نہ ہوتی تھی کہ اشنان کر کے پوجا
کے لیے مندر جائے۔ اس نے ایک دن گھر پہنچتے ہی جب اس نے
اپنی بیوی سے نہانے کے لیے پانی مانگا تو وہ چپکے سے دو گھڑی تکیں
بات کیا ہے؟ وہ بولی تم آج پوجا پاٹھ کا دھیان آیا ہے؟
دھرم کے کام میں تو اپنی جوان بیٹی کا [illegible] رام دین
نے ہنس کر کہا اور جلدی جلدی سر پر لوٹے انڈیلنے لگا۔

سیدھا مندر تو وہ گیا [illegible] لیکن ابھی
پوجا ختم نہیں ہوئی تھی کہ وہ وہاں سے کھسک آیا اور بجائے سیدھے
راستے سے لوٹنے کے وہ مندر کے پچھواڑے کی طرف ہو لیا۔ اس کے
ہاتھ میں لاٹھی تھی جو شام کو گھر سے نکلتے ہوئے وہ ضرور ساتھ رکھتا تھا سانپ
بچھو کے خیال سے [illegible] لاٹھی کو زمین پر ٹھک ٹھک کر کے
چلتا تھا۔ مندر کے آس پاس [illegible] اس
نے لاٹھی کو کندھے پر رکھ لیا کہ کوئی آہٹ نہ ہو۔ اور خود بھی دبے پاؤں
پیپل کے پیڑ کی طرف چل کر اس کے پیچھے [illegible] حرکت کرتے
ہوئے نظر آ رہے تھے۔ اس نے چوروں کی طرح آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے
ہوئے سوچا۔ [illegible] دیکھ کر لوٹ جائے
جانے کی حرکت نہ کی [illegible]
[illegible] کی بات یاد [illegible]
تو سب [illegible] لیکن اپنے باپ کی عزت کا خیال کرو۔ اب وہ
اتنے قریب آ گیا تھا کہ وہ [illegible] سن سکتا تھا۔ [illegible] کہہ رہا تھا۔
[illegible] کہتا ہوں کہ یہ سب پاگل پن ہے۔ میرا تمہارا ملاپ
نہیں ہو سکتا۔ پھر شام ہوتے ہی [illegible] ہو جاتا ہے کہ آپ سے
آپ پیر ادھر ہی اٹھتے ہیں۔
لڑکی نے کوئی جواب نہیں دیا صرف سسکیاں بھرنے کی
آواز آئی۔

پیڑ کی آڑ لے کر رام دین اب ان کے بہت قریب آ گیا تھا۔
اب وہ [illegible] پہچان سکتا تھا۔ لیکن وہ لڑکی
جو [illegible] سسکیاں لے رہی تھی وہ جانے کی [illegible] نہیں
ہو سکتی [illegible]
اور یہ لڑکی تو [illegible] ہے۔

اور پھر سسکیاں [illegible]
[illegible] پاگل پن ہے [illegible] نہیں ہو سکتا۔
رام دین [illegible]
[illegible] یہ خود اس کی اپنی پالی ہوئی تھی۔
وہ کیا [illegible] اس کی [illegible] ہو گئی تھی۔
لاٹھی کی [illegible]
اس کے [illegible] ایک [illegible]
کی [illegible] آہستہ آہستہ لاٹھی [illegible]
سوچا [illegible] دونوں پاپیوں کا کام تمام کر دوں گا۔
پھر اس کی لاٹھی اندھیرے میں [illegible]
لے میں مندر میں [illegible] گرج [illegible]
وقت رام دین کو یاد آیا کہ [illegible]
کوئی [illegible] کا [illegible]
بیٹی نے یہ [illegible] اور [illegible] دنیا دیکھے گی۔
نہیں ان پاپیوں کو سزا دینے کے [illegible]
لاٹھی پر اس کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی [illegible]
زمین پر گر پڑی۔
وہ ایک دم [illegible] آواز آئی [illegible]
کی طرح اندھیرے میں غائب ہو گئیں۔
رام دین گھر لوٹ کر آیا تو پہلا سوال اس نے بیوی سے کیا۔
ساوتا کہاں ہے؟
تمہارے پیچھے پیچھے ہی تو مندر گئی تھی تم نے وہاں دیکھا؟
وقت اسے خیال آیا کہ اس طرح [illegible] چھوٹ جائے
[illegible] کو سزا دینے کے بجائے [illegible]
[illegible]
اور پھر وہ چلا جائے کر [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
کیا [illegible] کا [illegible] تھا۔
[illegible]

سے ہو کر ایک پگڈنڈی کی جانب جا رہی تھی اور اس پگڈنڈی پر [illegible]
تھی کہ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے مدھم روشنی میں گاؤں کے
جھونپڑے نظر آنے لگے۔ مجھے کہیں [illegible] مگر سفید رنگ کی ہوئی
مسجد جلی ہوئی سی تھی پاس کی پگڈنڈی [illegible] سے پھیلی ہوئی
سی بہتی ہوئی ندی دیکھیں [illegible] ایک عورت [illegible]
اور لمبی قمیض پہنے ہوئے تھی [illegible] یہاں سے چلی
جاؤ۔ یہاں تمہاری جان کا خطرہ ہے اگر تم ابھی سے [illegible] گیا تو
تم اپنی جان سے جاؤ گی۔

اور شرلین کی آواز سن کر رام دین نے سوچا [illegible]
ایک ساتھ دو لڑکیوں کو خواب [illegible] ایسی [illegible] ہی
ہو سکتی ہے مگر [illegible]
بار رام دین پر [illegible]
تھا اور کہہ رہا تھا شرلین کا کیا بتاؤ میری [illegible]
کر باہر جا چکی ہے

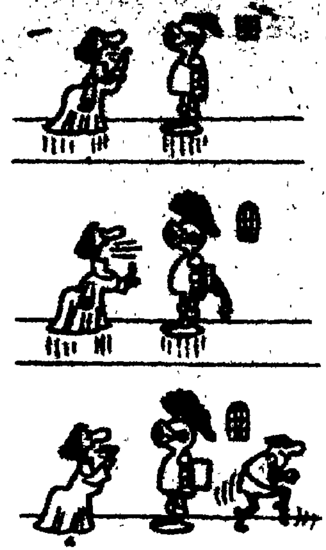
"نہیں جی میرے باپ تو زبردستی بھیجے یہاں سے [illegible]
یہ کہتے ہیں [illegible]
یہاں آنے میں بھی خطرہ ہے [illegible]
چاہیے تو بالکل [illegible]

"تم کیوں روتی ہے [illegible] بات ہو تو
مجھ سے کہو [illegible] اپنا سمجھا ہے"
"[illegible] میری [illegible]
ہو رہا ہے۔ باہر [illegible]"

مگر رام دین [illegible] نہیں
دے رہا تھا اس کی [illegible]
الٹ پلٹ ہو گئی ہے [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
اس کی [illegible]

اسی طرح [illegible]
پہنچا تھا کہ [illegible]
کھڑا ہوا ہے۔

"[illegible]



"نہیں یہاں تیری جان کا خطرہ ہے"
"جان کا خطرہ تو سب [illegible] تمہیں تو سب [illegible]
[illegible] وہاں بھی
[illegible] جان کی فکر نہیں
ایمان کی فکر ہے"
"ایمان کی فکر [illegible]"

"[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
لیا جاتا تھا"

"[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
"[illegible]"
"[illegible]"

یہ کہہ کر فضلو نے چپکے سے پیچھے سے محمد کو گھسیٹ کر آگے کیا۔ اب تو اپنی جڑوں والی تلوار نکال اور اپنے ہاتھ سے اس پاپی کا کام تمام کر دے۔

ایک پل کے لئے بجلی چمکی اور رام دین نے دیکھا کہ سامنے کھڑے ہوئے چھوکرے کا چہرہ بالکل سفید ہے۔ پر اس وقت اسے وہ نظر نہیں آیا گوندا دکھائی دیا۔ اور اس کے نتھنوں میں سرسوں کی خوشبو تیز ہو گئی۔

کچھ دیر مکمل خاموشی رہی۔ دور کہیں گاؤں کے باہر گیدڑ چلا رہے تھے اور رام دین کو محسوس ہوا کہ وہ محمد کے دل کی دھڑکن کو سن سکتا ہے۔ اس نے فضلو سے کہا۔ "فضلو بھیا بھگوان ہی جانتا ہے کون پاپی ہے اور پاپ کیا ہے۔ ہم تو ان پڑھ کسان ہیں گیہوں اگانا جانتے ہیں۔ اب تم جاؤ اور اسے بھی لے جاؤ۔ مگر سنبھل کر جانا گاؤں کے کچھ لوگ [illegible]۔"

اور پھر وہ اپنے جھونپڑے کے اندر چلا گیا۔ دیوار پر جہاں کدال کی جگہ خالی تھی۔ تھا کہ پرماتما کی روشنی میں دیکھا کہ رادھا اپنی کھاٹ پر پڑی سسکیاں لے رہی ہے اور دوسرے کونے میں گوندا بیٹھا ہے اور اس کا چہرہ بھی خوف اور دہشت سے سفید ہے۔ بالکل محمد کی طرح اور اتنے میں بارش شروع ہو گئی۔ اور رام دین کی آواز سن کر کسان باپ اور بیٹے دھرم کی باتیں بھول گیا اور سوچنے لگا کہ ٹھیک وقت پر بارش ہوئی ہے۔ اب جیسے بوئے ہوئے بیج خود اُگیں گے۔

رات بھر بارش ہوتی رہی۔ اس سے اگلے دن بھی ہوا اور مینہ برستا رہا۔ تیسرے دن جب بارش کا زور کم ہوا تو رام دین نے گوندا سے کہا۔ "چل بیٹے، اٹھ دیکھیں کہ اپنے کھیت کا کیا حال ہے۔"

اپنے اور فضلو کے کھیتوں کے بیچ کی مینڈھ پر کھڑے ہو کر رام دین نے نظر دوڑائی تو دونوں طرف ہریالی ہی ہریالی نظر آئی۔ پانی میں سے ننھی ننھی کونپلیں جھانک رہی تھیں۔ اس نے سوچا اس بار فصل اچھی ہو گی۔ فضلو بھی آ کر دیکھے گا تو کتنا خوش ہو گا۔

پر فضلو اس دن اپنے کھیت پر نہیں آیا۔

اگلے دن بھی نہیں۔ اس سے اگلے دن بھی نہیں۔

پھر کبھی فضلو اپنے کھیت پر نہیں آیا۔

معلوم ہوا کہ باہر کے بلوائیوں کے ڈر سے سب گاؤں خالی کر کے پانی پت چلے گئے ہیں۔ فضلو بھی گیا اور محمد بھی اور اس کے گھر والے بھی۔ پھر خبر آئی کہ مغربی پنجاب سے لٹے پٹے شرنارتھیوں کا ایک قافلہ بابر پور کے خالی گاؤں میں آ کر بسایا گیا ہے۔

سارے علاقے میں خون خرابے ہو رہے تھے۔ نفرت کا بازار گرم تھا۔

مگر سورج اب بھی چمک رہا تھا۔ اس کی گرمی مٹی اور پانی میں سے نکل کر ننھی کونپلوں کو جوان کر رہی تھی اور ان کے پیٹ کے اندر گیہوں کی فصل اگ رہی تھی۔ جو رام دین کے کھیت میں بھی اور فضلو کے کھیت میں بھی۔ فضلو اپنی کھیتی ادھوری چھوڑ گیا تھا۔ وہاں پانی پت کی ایک تنگ گلی میں چھوٹی سی کوٹھری میں اپنے گھر والوں سمیت [illegible] کی قید میں تھا اور بہت سارے [illegible] خیرات کی روٹیاں کھانے پر مجبور تھا۔

گوندا نے باپ سے کہا۔ "فضلو کاکا کے کھیت میں پانی کون دے گا بابا؟"

اور رام دین نے جواب دیا۔ "ہم پانی دیں گے۔ اور کون دے گا؟ یہ تو ان کا [illegible]۔"

رہٹ گھومتا رہا جیسے دنیا کا چکر چلتا ہے۔ گہرے کنوؤں سے ٹھنڈا میٹھا چمکتا ہوا پانی نکلتا رہا۔ نالیوں میں بہتا ہوا پانی کھیتوں میں جاتا رہا۔ رام دین کے کھیت میں اور فضلو کے کھیت میں۔ سوکھی دھرتی کی پیاس بجھاتا رہا۔ اور دھرتی اپنی کوکھ سے فصل کو جنم دیتی رہی۔ اپنی گود میں پروان چڑھاتی رہی۔

ہندوستان تقسیم ہو گیا۔ پاکستان بن گیا۔ جلسے ہوئے جلوس نکلے جشن منائے گئے گیت گائے گئے۔ نئی حکومتیں بنی تھیں۔ دفتر منظور ہوئے۔ تقسیم اور آبادی کے تبادلے کے نئے معاہدے ہوئے۔ شرنارتھیوں اور مہاجروں کے قافلے ادھر ادھر آ جا رہے ہیں۔

پر سورج اسی طرح چمکتا رہا۔ ہندوستان پر بھی اور پاکستان پر بھی۔ لائل پور کے کھیتوں پر بھی، بابر پور اور گڑ منڈی کے کھیتوں پر بھی۔ دھوپ تیز ہوتی گئی۔ سورج کو دیکھ کر گیہوں کی بالیاں خوشی سے جھوما کرتی تھیں۔ سورج کی کرنیں پیار سے ہری ہری بالیوں کو چومتی تھیں اور ان کے پیار کی گرمی سے بالیوں میں دانے پڑتے گئے پکتے گئے یہاں تک کہ فصل تیار ہو گئی۔ رام دین کے کھیت میں بھی فضلو کے کھیت میں بھی۔

گوندا نے پوچھا۔ "بابا فضلو کاکا کے کھیت میں کٹائی کون کرے گا؟"

اور رام دین نے کہا۔ "ہم کریں گے اور کون کرے گا؟"

پھر خبر آئی کہ مغربی پنجاب سے آئے ہوئے شرنارتھیوں کے لئے پانی پت کو خالی کرایا جا رہا ہے۔ اب پانی پت اور بابر پور کے سب گاؤں پاکستان جائیں گے۔ ان کے لئے اسپیشل ٹرینیں چل رہی ہیں۔

تمہارے باپ نے بھی آنکھوں سے [illegible] نذرو کے

کھیت میں کٹائی کی ہے۔

محمود شہزادے کے [illegible] میں بھی [illegible] سپاہی [illegible]

نے کہا ہوں کھیت پر جاکر باپ بھائی کا ہاتھ کیوں نہیں بٹاتی؟

نذرو اور محمود سلطان کے گھر والوں کو پانی پت کی کھڑی

میں قید ہوئے نہ جانے کتنے دن ہو گئے تھے۔ تب تو انہوں نے گنتی ہی

چھوڑ دی تھی۔ ایک دن نذرو نے بیٹے سے کہا: اب تو اپنے کھیت

میں کٹائی ہو رہی ہوگی۔

کٹائی ہو بھی چکی تھی۔ اب چھپائی ہو رہی تھی۔ لمحہ ایک تپائی پر

کھڑی ہاتھ میں [illegible] سے چھپائی کر رہی تھی۔ ہوا سے بھوسہ اڑ کر ایک

طرف جا رہا تھا، گیہوں کے دانے نیچے گرتے جا رہے تھے۔ اور ان میں

ٹپ ٹپ گرتے ہوئے نذرو کے آنسو جذب ہوتے جا رہے تھے۔

سنا کہ اسپیشل ٹرینیں آ گئی ہیں۔ ان میں لاہور لائل پور اور

منٹگمری سے لاکھوں شرنارتھی آئے ہیں۔ اور اب انہیں خالی کر کے انہی

ٹرینوں میں پانی پت اور باہر کے [illegible] کو پاکستان بھیجا جا رہا ہے۔

رام دین نے کہا: چل اب گھروندا چل دی۔ نذرو اور اس

کے گھر والوں کو مل آئیں۔ پھر کون جانے اس جیون میں کبھی ملاقات ہو

یا نہ ہو۔

اسٹیشن پر کئی ٹرینیں کھڑی ہوئی تھیں۔ ملٹری کے پہرے میں

مسافروں کو سوار کرایا جا رہا تھا۔ ہر طرف افراتفری مچی ہوئی تھی۔ پھر بھی

کسی نہ کسی طرح انہوں نے باہر [illegible] کو ڈھونڈ ہی نکالا۔

[illegible] کھڑکی کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ گھروندا کو دیکھتے ہی اس

کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ ماں نے پوچھا: اری کیا ہوا؟ اور باپ

نے کہا: ارے تو اپنے گھروندے والے ہیں۔ سلام بھائی رام دین۔ سلام گھروندا۔

اب تو جاتے ہیں بیٹا۔ [illegible] گھروندا نے بس

ایک نظر [illegible] کی طرف دیکھا اور پھر اپنے آنسوؤں کو چھپانے کے لئے

[illegible]

[illegible] رام دین نے [illegible] نذرو [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ہے۔

ریل نے سیٹی دی اور نذرو نے کہا: اچھا بھیا رام دین اب

رخصت ہو گئے۔



رام دین بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کچھ نہ کہہ سکا۔ صرف اتنا کہا

نذرو بھیا! اور دونوں بڑھ کے ایک دوسرے سے لپٹ گئے اور دونوں

کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر ایک کی مونچھوں اور دوسرے کی داڑھی کو بھگونے

لگے۔

نذرو [illegible] رام دین نے ایک تھیلا

پکڑاتے ہوئے کہا: بھیا یہ تھیلا بھی ساتھ لیتے جاؤ۔

تھیلا لیتے ہوئے نذرو نے کہا: کیا ہے اس میں [illegible]

کچھ بھی نہیں؟

[illegible] کے دانے ہیں۔ رام دین نے چلتی ریل کے ساتھ چلتے

ہوئے کہا: یاد ہے ہم نے ایک دوسرے کے کھیت میں بیج ڈالا تھا۔ یہ

اسی فصل میں سے [illegible]

اور باہر [illegible] کی زمین میں [illegible]

[illegible] منٹگمری کے پاس کے گاؤں [illegible] جہاں نذرو کو زمین کا

ایک چھوٹا سا ٹکڑا الاٹ ہوا تھا۔ اور جب دوسرے سب [illegible]

[illegible] کا انتظار کر رہے تھے۔ نذرو اور محمود نے رام دین کا دیا ہوا

تھیلا کھولا اور وہ دانے جن میں [illegible] کے آنسو اور گھروندا کی [illegible] جذب

تھا پاکستان کی زمین میں بو دیئے۔

کتنے ہی برس گزر چکے ہیں اور سارے منٹگمری کے ضلع میں مشہور

ہے کہ باہر والے نذرو کے کھیت میں گیہوں کی جتنی اچھی فصل ہوتی

ہے ویسی سارے پاکستان میں کہیں نہیں ہوتی۔

پچھلے سال تو بہت ہی اچھی فصل ہوئی تھی۔ اناج کے [illegible]

[illegible] نذرو نے بیٹے سے کہا [illegible]

[illegible] اپنے پاس [illegible] میں سوچتا ہوں تیرا بیاہ کر دوں۔

محمود نے کہا: ابا ابھی بیاہ نہیں کروں گا۔ [illegible] پھر نذرو نے

بیٹے سے اس بارے میں [illegible]

کہا۔ مجھ سے اس شریمتی کا کیا حال ہے؟

"وہ تو بیمار ہے۔ بابا کے گھر پر بیٹھی رہتی ہے اور روتی رہتی ہے۔ سال منیہ برستے رہنے سے بھی۔ لوگ کہتے ہیں پاگل ہو گئی ہے۔"

"وہ بیمار نہیں کیا؟"

"تو بابا پر بڑا جادو کیا ہوا ہے اس کو اپنی آنکھ کا تارا بیٹی مر رہی ہے سارا گھر اجڑ گیا ہے۔"

اور پھر اگلے برس جب فصل پکی اور کٹائی کا وقت آیا تو اپنا لہلہاتا ہوا کھیت دیکھ کر نفضو نے کہا بیگموں سے مجھے یہ دیکھ کر تجھے اپنی باپ دادا کی زمین نہیں یاد آتی۔ وہی سونا ہے وہیں ہوا ہے۔ مٹی بھی ویسی ہی ہے۔ وہی ہمارا خون پسینہ ہے پھر نہ جانے کیا بدل گیا ہے۔

پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر اس نے بیٹے سے پوچھا "کیا تجھے کچھ ہندوستان کی بھی خبر ہے؟"

"خبر اچھی نہیں ہے بابا۔ اس برس بارش وہاں اچھی نہیں ہوئی۔ کتنے ہی علاقوں میں سوکھا پڑا ہے کہیں کہیں تو کال جیسی حالت ہے۔ دنیا کے کتنے ہی ملکوں سے اناج بھیجا جا رہا ہے۔"

"اپنے باپ دادا کے گھر والوں کی طرف کیا حال ہے۔ وہاں تو سب ٹھیک ٹھاک ہے نا؟"

"نہیں بابا ادھر بھی کچھ اچھی حالت نہیں ہے۔"

اور کئی دن تک نفضو کسی گہری سوچ میں کھویا رہا۔ کٹائی چھٹائی کرتا رہا۔ پر کسی سے بات نہ کرتا۔ آپ ہی آپ کچھ بڑبڑاتا رہتا۔ تین وقت تک کھانا نہ کھایا۔ مجھے کی ماں نے کہا "کیا فاقہ کر کے جان دینے کا ارادہ ہے؟ جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب تو کچھ کھا لو۔"

"وہاں وہ لوگ بھوکوں مر رہے ہیں اور تو کہتی ہے میں کھانا کھاؤں۔"

"کون لوگ؟" بیوی نے حیرت سے پوچھا۔ "کن کی بات کر رہے ہو؟"

"رام دین اور اس کی بیوی اور ان کے بچے گووندا اور رادھا۔"

"اب ان کی فکر کیا کرو۔ ملک بٹ گیا۔ ہم کہاں سے کہاں آ گئے۔ کتنے برس خون پسینہ ایک کر کے اب دو وقت کی روٹی نصیب ہوئی ہے تو تم ان کی فکر میں مرے جا رہے ہو۔"

اور نفضو گرج کر بولا "چپ رہ مجھے کی ماں!" اور پھر کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لی اور دھیمے لہجے میں بولا۔ "جیسے اپنے آپ سے ہی بات کر رہا ہو۔ ملک بٹ گیا ہے پر دل نہیں بٹے۔ تم کیا جانو تم نے تو بنا بنایا کھیت پایا ہے۔ زمین میں جان ڈالنا تو وہ جنہیں بتا؟" اور پھر سامنے پڑی ہوئی چنگیر میں سے ایک روٹی اٹھا کر بیوی سے بولا "ہماری یہ روٹی جو ہم کھاتے ہیں یہ اناج انہیں کے ہاتھوں سے پیدا ہوا ہے۔ جو بیج رام دین کے کھیت میں بوئے تھے اور اس نے میرے کھیت میں۔ جب تک اناج سے بیج اور بیج سے اناج پیدا ہوتا ہے گا اس رشتے کو ہم کیسے بھول سکتے ہیں۔"

اور کئی دن بعد ایک رات کو لائل پور کی منڈی میں انبار کے گوداموں میں ہندوستان بھیجنے کے لئے گیہوں رکھا گیا۔ تو وہاں کے پہرے والے نے دور سے دیکھا کہ کوئی گودام کا دروازہ کھول کر پیچھے سے جا رہا ہے۔ اس نے سوچا ضرور اناج چور ہوگا مگر یہ کچھ عجیب چور تھا کہ چور کوئی بوجھ اٹھا کر اندر کیوں لے جا رہا ہے۔ دبے پاؤں پیچھے گیا اور ٹارچ کی روشنی ڈالی تو دیکھا کہ ایک بڈھا اناج سے بھری گٹھڑی بوری الٹ کر اسے ڈھیر میں ڈال رہا ہے۔ پاس ہی کئی اور بوریاں بھی اناج سے بھری پڑی ہیں۔ اور بڈھا ساری دنیا سے بے خبر منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہا ہے۔

جب نفضو اپنے اناج کی بوریاں اس ڈھیر میں ڈال رہا تھا تو وہ کہنا چاہتا تھا "تم نے جو اناج کے بیج مجھے دیے تھے، رام دین ان میں ہماری تمہاری عمر بھر کی دوستی ہی نہیں تھی، گووندا اور رادھا کا پیار بھی تھا۔ یہ دانے جو اب میں تمہیں بھیج رہا ہوں اور شریمتی جو اب دیوانی ہو گئی ہے اس کی پاک محبت بھی ہے۔ تم ٹھیک کہتے تھے بھیا کہ دشا ہی بہتر جانتا ہے کیا گناہ ہے کیا ثواب ہے۔ کیا نیکی ہے کیا بدی ہے۔ ہم ان پڑھ کسان تو بس گیہوں کا دانا جانتے ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ گیہوں کا ایک دانہ بھی پیار کے بنا پروان نہیں چڑھتا۔"

مگر اس کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلا۔ نہ پہرے دار کو کوئی آواز سنائی دی۔ یہ پیغام صرف میں نے سنا۔ اس لئے کہ جیسا آپ سب بھی جانتے ہیں اناج کا دانہ جو پیار سے پیدا ہوتا ہے۔ دل کی ان کہی بات سمجھ سکتا ہے۔

سو دوستو! اب میری کہانی بھی ختم ہوئی۔

پہاڑوں کی برف

احمد ندیم قاسمی

میں نے قلم کو کاغذ پر جھکایا ہی تھا کہ آواز آئی "تم ہے بی بی!
خدا کی راہ میں ایک آنہ دے دے۔ تیرا بچہ جیوے۔"

میں نے قلم کو واپس قلم دان میں رکھ دیا۔ اگر اس قلم کی قیمت چالیس پیسے کے آس پاس ہوتی تو میں اسے یقیناً پٹخ دیتا۔

صبح سے بار بار ایک بے تکی سی سوچ بچار کے بعد مجھے صرف ایک فقرہ سوجھا تھا، مگر بھکارن کی آواز نے اسے یوں اڑا لیا تھا جیسے پھونک مارنے سے چراغ کی لو غائب ہو جاتی ہے۔

کیا بھلا سا فقرہ تھا! میرے افسانے کا یہ پہلا ہی فقرہ قاری کے ذہن کو جکڑ لیتا۔

ملازم مکان کی تیسری منزل میں تھا۔ بھکارن کی آواز اس تک شاید نہ پہنچ سکی تھی ورنہ میری ہدایت کے مطابق بھکارن کو اس کی طرف سے دفع ہو جانے کا مشورہ فوراً ملتا۔ بھکارن ابھی ایک ہی آواز لگا کر شاید چل دی تھی۔

یکایک کھوئے ہوئے فقرے کے چند الفاظ گڈمڈ صورت میں میرے ذہن میں ابھرے۔ ایک جلتی ہوئی سلائی بجھے ہوئے چراغ کی طرف بڑھی ——— اس کا رنگ پہاڑوں کی برف کی طرح صاف تھا ——— مگر نہیں۔ میں نے برف کے رنگ میں کوئی اور رنگ بھی ملایا تھا۔ سانولا صحرائی رنگ، یا شاید شفق شام کا سا رنگ یا ممکن ہے ———

"تم ہے بی بی! خدا کی راہ میں ایک آنہ دے دے۔ تیرا بچہ جیوے!"

تو وہ کم بخت ابھی تک دروازے کے سامنے سڑک میں کھڑی تھی!

وہ سلائی دھنک کی ایک لکیر سی چھوڑ کر بجھ گئی اور میں پکارا۔

"بی بی یہاں گھر میں نہیں ہیں۔"

"بی بی نہیں تو بابو، تو ہی خدا کی راہ میں ایک آنہ دے دے بے شک، تیرا بچہ جیوے۔"

میں خاموش رہا۔ بھکاریوں سے زبان لڑانا میرا شیوہ نہیں۔ ان کے پاس سب سے بڑی دلیل بھوک کی ہوتی ہے اور مجھے اس دلیل کا کبھی کوئی جواب نہیں سوجھ سکا۔

کچھ دیر کے بعد ذہن کی دھند میں حرکت پیدا ہوئی اور افسانے کا ابتدائی فقرہ جیسے آنکھیں ملنے لگا ——— اس کا رنگ پہاڑوں کی برف کی طرح ———

"تیرے بچے جئیں۔ تو ہی تو شہنشاہ ہے نا بابا۔" بھکارن کی آواز جیسے ٹھنڈا پسینہ بن کر مجھ پر گری۔ میں نے دیکھا تو وہ میرے کمرے کے سامنے سڑک پر کھڑی تھی۔ مجھے اس کا صرف ایک ہاتھ نظر آیا جس میں سے اس نے ... اٹھا رکھا تھا۔ اس ہاتھ کا رنگ



پہاڑوں کی برف کا سا تھا، چکنا ہوا سفید مگر کہیں کہیں ہلکی سی نیلاہٹ
درتا ہوا۔ یہ شاید اس کی رگوں کا رنگ تھا مگر اس کے ناخنوں نے مجھے
زیادہ سوچنے کی مہلت نہ دی۔ یہ ناخن سرے سے اٹھے ہوئے تھے اور
کٹے پھٹے اور عنابی تھے۔ پھر جیسے دیکھتے دیکھتے اس کی انگلیوں
میں ایک نہایت متوازن حرکت پیدا ہوئی ——— تو وہ کسی ماہر کی
[illegible] تک کا وقت گزارنے کے لیے کوئی دھن
بجانے لگی ہے! ——— کیا رہنوں کو بھیک دی جاتی ہے؟
فرکیا اتنے سفید ہاتھوں کو بھیک مانگنے پہ مجبور کر دیا جاتا ہے؟
لیکن کیا مجبوری ہاتھ ہو سکتی ہے؟
میں نے [illegible] ایک آنہ نکالا اور [illegible] دے دیا۔
وہ بولی: [illegible]
نہ جانے [illegible] اس کے [illegible] آنے
تھا میں نے آنہ پھینکنے کی [illegible]
لے اندر [illegible] ایک گھنٹے کے فاصلے [illegible]
سے ہی [illegible]

سامنے آگیا مگر یہ سب [illegible] ایک ہائی کے تیسرے حصے میں چھا گیا۔
لگا جیسے [illegible] کو نہ کرنا آ گئی ہے [illegible]
تک پہنچتے میں [illegible] سگے مگر سیڑھیاں خالی تھیں۔ میں
[illegible] گلی میں [illegible] والی لڑکی کے پاس آیا۔ وہ گلی کے
[illegible] سے ننگی تھی [illegible] کی شلوار پہ اس
نے [illegible] قمیص پہن رکھی تھی اور اس کے سر اور سینے پہ
[illegible] کی چادر لپٹی ہوئی تھی۔ پھر دوسری گلی [illegible]
[illegible] نے مجھے اپنے افسانے
سے [illegible] کی [illegible] لاشعور اور
[illegible] کے ساتھ وہ چہرہ [illegible]
یہ چہرہ [illegible] سامنے آیا تھا۔ [illegible]
[illegible] تھا اس [illegible] ہوئے [illegible]
[illegible]
[illegible] سیاہ
[illegible]

بے معنی کھیل کھیلتی ہے بے حد سفید کاغذ۔ بالکل پہاڑوں کی برف کی طرح۔
پھر مجھے اپنے آپ پر ہنسی آنے لگی۔ دراصل یہ سب کچھ اس ذہنی
فضا کا نتیجہ تھا جو میں نے اپنے افسانے کا آغاز کرتے ہوئے قائم کر لی تھی
انسان بھی کتنا بے اختیار جانور ہے! اس پہ خود اپنے ذہن کا جبر کتنا شدید
ہوتا ہے! لا حول ولا قوۃ۔ میں قلم اٹھا کر افسانے کا پہلا کھویا ہوا
فقرہ ڈھونڈنے لگا۔

مگر جوانی کی بجلی ہوتی تو پہلے کس کو ملی ہے جو مجھے ملتی! ایسا
محسوس ہونے لگا جیسے میں افسانے کا پہلا فقرہ نہ لکھ سکا تو ایک بھی افسانہ
کیا میں کبھی کوئی افسانہ نہیں لکھ سکوں گا۔ جیسے وہ ایک کھونٹی تھی جس پہ
مجھے اپنے خیالوں کا سارا اثاثہ لٹکانا تھا اور اب یہ کھونٹی ٹوٹ گئی ہے تو
میرا ہر خیال پتھر بن گیا ہے اور میں چھت تلے ان کے اس بوجھ تلے دبا
ہوا جا رہا ہوں۔

پھر ردی خریدنے والے نے گلی میں ایک ماتمی سر میں کوئی بیس
الفاظ کا فقرہ نہایت تکلّری آواز میں ادا کیا اور مجھے اس پر غصہ آ گیا۔ یہ
ردی والا پچھلے کئی برس سے ہر روز ایک دو بار اس گلی میں سے گزرتا تھا
اور میرے مکان کے سامنے ضرور رکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں پڑھنے لکھنے
والا آدمی ہوں اور ایسے آدمیوں کے ہاں ردی بہت عام مل جاتی ہے
میں اس آواز کا عادی تھا اور افسانہ لکھتے ہوئے بھی میں نے یہ آواز کئی
بار سنی تھی اور میرے افسانے کی روانی میں اس نے کبھی کوئی مداخلت نہیں
کی تھی۔ مگر آج مجھے ردی والے پر اتنا غصہ آیا کہ میں قلم رکھ کر اٹھا اور کھڑکی
میں سے نہایت قہر آلود نظروں سے دیکھتا رہا۔ مگر میری نظر سب سے
پہلے گلی کے نکڑ پر پڑی اور مجھے پہلی بار محسوس ہوا کہ فقرہ محسوس بھی ہو
سکتا ہے ——— بھکارن دوسری گلی میں مڑ رہی تھی۔

میں جیسے اس کے تعاقب میں بھاگا۔ میں کتنی گلیوں اور سڑکوں
کو طے کرتا ہوا دیوانوں کی طرح بھاگ رہا تھا۔ نہ جانے میں ٹریفک سے کیسے
بچا اور چوراہوں کو کیسے پار کیا۔ نہ جانے میں نے کتنے سگریٹ جلائے
اور کہاں پھینکے۔ پھر جب میں سائیکل کے ایک چوک میں ٹریفک سگنل
کی سرخ بتی دیکھ کر رکا تو مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ میں کہیں جا رہا
ہوں۔ میں کہاں جا رہا ہوں؟ وہ کیوں بتی میں کہاں جا رہا ہوں؟ یہی
میں نے اپنے آپ سے پوچھا۔

میں عشق کے سب مرحلوں اور تمام منزلوں سے آگاہ ہوں۔ میں
زندگی اس بات پر حیرت بھی ہوا ہوں اور شرمندگی کو بھی لگا ہوں
مگر مجھے ایسی وحشت کا تجربہ کبھی نہیں ہوا تھا کہ ایک بھکارن کے پیچھے دوڑ پڑوں

بھکارن کی صورت ایک سیکنڈ کی جھلک نے میرے ذہن کو کچھ ایسے نقطے پر
پہنچا دیا ہے جہاں سے میں جا رہا ہوں اور جہاں سے مگر واپس نہ آ سکوں تو تم
کے بچے مجھ پر ہنسو گے اور کہو گے۔ تو کیا یہ سچ ہے کہ ہر انسان میں تھوڑا سا جنون
ضرور ہوتا ہے؟ مگر میرا یہی جنون کیا کم ہے کہ جب لوگ دونوں
ہاتھوں سے دولت سمیٹ رہے ہوتے ہیں تو میں افسانہ لکھ رہا ہوتا ہوں
اور جب میرے احباب شراب پی رہے ہوتے ہیں تو میں سوچ رہا ہوتا ہوں
کہ ان کے لاشعور میں کس قیامت کے سانپ رینگ رہے ہوں گے۔ مجھے جنون
کی اسی مقدار پر قانع رہنا چاہیئے۔

میں گھر لوٹ آیا۔ میں نے رات کا ایک بہت بڑا حصہ اپنے لکھے ہوئے
افسانے کا پہلا فقرہ سوچنے میں کاٹا مگر جہاں پہاڑوں کی برف میرے
ذہن میں آئی وہیں بھکارن نے میری پیٹھ پر ہاتھ رکھا کر آنا شروع کیا اور
کشت خیال میں یونانی اہرام کے پہلوں کی قطاریں اٹھ رہی ہیں۔

میں صبح کو دیر سے اٹھا جیسے رات پوری نیند سویا ہوں۔
پھر اپنے کمرے میں اس اہتمام سے آ بیٹھا جیسے سورج کے نکلتے ہی
دوپہر ہو گئی ہے اور بھکارن اب آئی ہی ہو گی۔ اس مسئلے پر دیر تک
میرے اور میرے ذہن کے درمیان خاصی تلخ بحث چلتی رہی۔ میں
کہتا تھا کہ دیکھو تو میرے ہاتھ میں قلم ہے۔ میں تو افسانہ لکھنے بیٹھا ہوں
مگر میرا ذہن کہتا تھا کہ نہیں، تم جھوٹے ہو۔ تم تو بھکارن کا انتظار کر رہے ہو
اس وقت تو میں نے اپنے ذہن کو جھوٹا ثابت کر دیا تھا، مگر جب
دوپہر کو بھکارن آئی تو مجھے معلوم ہوا کہ میں اسی کا منتظر ہوں۔

آواز آئی: بے سخی۔ خدا کی راہ میں ایک آنہ دے دے۔ تیرا
بچہ جیوے۔

اور میں نے سوچا کہ کیا کسی شاعر نے اس سے بہتر شعر بھی کہا ہے؟
عجیب بات ہے کہ نہ تو میں چونکا ہوں نہ کوئی اٹھا اور نہ میں نے
قلم کو تکلیف میں رکھا۔ میں نے بڑے سکون سے اٹھ کر صرف اتنا کہا۔
معاف کرو۔ آج پھر آئی ہو؟

اس پر مجھے لگا جیسے وہ ہنسی ہے۔ نہایت مختصر مگر نہایت پُر اثر
ہنسی جیسے کسی پیالے کا کنارہ کسی والی چھو جائے۔ پھر وہ میرے کمرے
کے دروازے پر بولی: بابو تمہارا بچہ جیوے۔

میں نے دیکھا تو وہ میرے کمرے کے دروازے میں یوں کھڑی
تھی کہ اس کا پورا دھڑ باہر تھا مجھے اس کا صرف ایک ہاتھ
نظر آیا جس سے اس نے کواڑ کو پکڑ رکھا تھا۔ اس ہاتھ کی انگلیوں پر مہندی کی
بہت کالا رنگ تھا اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کل سے یونہی کھڑی ہے

وہ اللہ سے کافی ڈرتی ہے۔
یکایک میں نے ڈرا کر کہیں وہ کوئی پرچھوا کہنہ جانے لگے۔ کہ میں نے اس کی انگلیوں کی متلاشی حرکت سے اس کی شدید جھجک محسوس کی تھی جیسے اتنی بے خودی سے نہیں مانگی جاتی۔ جھکا رہی جیسے سامنے آس لگی جا بیٹھی۔ طوالتوں تک نے اپنے شانے اٹھا دیے ایک [illegible] کر رکھا ہے جیسا کہ وہ کہے کہ جیسے ساتھ کسی کا لاؤ آ جا بیٹھے۔ سو شاید اس کی بے نیازی کو شکست دینے کے لئے آخر شانہ جھکا کر جو اس کی کمر کے لئے یا ہو جس پہ اس کا بیٹھ رہے تو نہ تھا۔
"لا" وہ بولی "اللہ مجھے بہت ڈر لگتا ہے کہیں اللہ تیرا بھی تیرے جیسے سخت "
ایک دم وہ مادی کی سائس ماری تھی۔ میں اپنے کرنے کی اس کا حکم تعمیل کرنے کے لئے بالکل تیار نہیں تھا۔ میں نے ایک اداسی تیزی سے اس کی بے مدد گاہی اپنی ہتھیلی پر گرا دیا جیسے وہ آنسو کے انقلاب نکالا اور اسی طرح میرے بازو کو پکڑی رہی تو تمہارا کون سے سکتے جاؤں گا۔
مگر وہ آنسو کے ارکان اسی طرح کو بیٹھی رہی۔ میں نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا تو وہ شرمانے پر رکھے ہوئے مٹی کے ایک کھلونے کو دیکھ رہی تھی۔
میں نے اس کے ایک کے میں اس کے کمرے کا اس طرف دیکھا یا اگر کوئی خاص نظر آئے تو اسے اپنے ذہن میں سے نکال کر پھینک دیکھ گئی ہو مگر یکایک اس نے میری طرف دیکھ کر پوچھا "تمہارے ہے وہ"
میں نے کہا "نہیں ہوتی ہے"
وہ بے اختیار کانپی کی پہلیوں سے کانپی کی پہلی پہلی مٹی ہاتھ سے نکل گئی۔
میں تیزی سے کھلونے کو بیٹھ کر اپنے کپڑوں کی طرح اچھالتی اور پھیلتی ہوئی جا رہی تھی پھر وہ دوسری طرف مڑ گئی۔
محبت فطرت کی نہایت خوبصورت تخلیق ہے مگر شیطانی کا بھی ایک قریب ترین ہے جو انسان کو دیکھ کر چلنے کے حالات کو ایک لا محدود سی آتی ہے اور جہاں جا کر جاتے ہیں تو یہی رنگ کے ہوتے بادل کو ہم پیار سے دیکھتے ہیں اور اپنے کاموں میں لگ جاتے ہیں بات کو محبت بھی کم ہوتی ہے اور اس کی رنگینی چند لمحوں کے لئے [illegible] انتہا اور اس کو یہ معلوم ہوتی ہے جس کا ہم ملتے ہیں میں نے [illegible] عورتوں کو کئی بار اس قرینے سے دیکھا ہے جس کی [illegible] تو آپ دیکھتے تو پھر آپ کسی اور طرف نظر ڈالیں ہی سے توجہ ہٹا سکیں گے۔

ایک عادی جواری نے اس کی بیوی نے دو پہر کو کہا کہ وہ اسے اسی وقت ریشمی ساڑی لا کر دے۔ جواری نے عاجزی سے کہا: "لیلا، تو سوچ کہ اس وقت جوا کھیلنے کی کون سی دکان کھلی ہوگی۔"

— مرسلہ: مرزا الیاس بیگ۔ [illegible]

مگر جب کوئی شخص نیا نیا ہی پہاڑ پر آتا ہے تو وہ وہ جنگل والی بیابانی سے بھاگتی ہیں یا وہ شخص سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ بیٹھے کی طرح عدم بر کتنے بھی شرما جاؤ یا پھر وہ دوسرے تمام کاموں سے ہاتھ کھینچ لو اور کئی سال کی اس زندگی گزار دو کہ وہ فقط ایک کام کرتا ہے۔ وہ کئی گھنٹے بہتے ہوئے چشمے کے کنارے پاؤں ڈال کر بیٹھ کر سکتا ہے۔ کبھی کبھی وہ لانے چند چڑیاں دیکھ کر چلی جاتی ہیں مگر پھر ایک اور سوچ آتی ہے اور ان کی پروں کو کسی ایک کے ساتھ ہے اس کے باوجود سال کا آخوش بدلنا ہے کہ اب جا کر آج ایک طرف نکلے جا رہے ہیں کوئی الگ تھلگ ہیں ہے۔
یہ سوچ کر کہ شخص کی یہ سوچ مجھے بھی ساحل کی اس زندگی کی طرف لئے جا رہی ہے۔ مجھے اپنے آپ پر ایک بار ہنسی آ گئی۔ مجھے تو سو کر تکیوں پر بھی ہنسی آ جاتی ہے کہ اس کی تنگ قمیص سی تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں اداسی تک کے ساتھ کیسی عجیب لگتی ہوں گی اور میں تو سپاٹ سا اٹھا رہا ہے کی خود ہی بہت کم سوچ کر سکتا ہوں کہ جب اس کی جوانی ڈھل گئی ہوگی تو اسے دیکھ کر لوگ اپنی اپنی حالت پر کیسے کیسے سوچتے ہوں گے۔ ہنستے ہنستے میں نے قلم اٹھایا اور یہ لکھنے بیٹھ گیا جیسے آج افسانے کا ایک ہی فقرہ لکھنا ہے اور کوئی دوسرا فقرہ بھی نہیں لکھا جائے گا۔
"اس کا رنگ پہاڑوں کی برف کی طرح صاف تھا"
"اس کا رنگ پہاڑوں کی طرح صاف تھا جیسے ——— اس کا رنگ پہاڑوں کی برف کی طرح صاف تھا جو ——— اس کا رنگ پہاڑوں کی برف کی طرح اس حد تک صاف تھا کہ ———"
اور پھر کھڑکی کی جالیوں سے کانپتی کی پہلیاں بجھ گئیں۔
ایک سوچ آئی اور ساحل کو اپنے بادلوں کی تپش کو لپیٹ گئی۔
آنکھ لگانے پاس بت رکھ دی اس حد تک کہ اپنی ہتھیلی پر صرف ایک ساتھ کو محسوس نہ کیا جہاں تک کرتا ——— کہیں جا

حسن کا رشتہ ہے خلوص سے اس مشاہدے کے پیچھے جو سب ہے اس کی حقیقت کیا
مرتے وقت ایک تحفہ ہے حق ہے مجھ پر جو تیری حسن کا ہی ہے! ———

دوسرے دن کی دوپہر کا وقت تھا میں نے اس بڑھیا کی طرح کا ہجوم کرنے کے بعد اپنے اندر جھانکا تو اس کا عکس سا اس پر تھوک ہے ——— وہ دونوں ایک ہی زمانے میں ایک ہی پانی بھی نہیں آئی!

مگر سارے سال اور اس طرف میں ہی تو نہیں ہوں جس سے میں نے ایک بار دیا ہوگا، نہ جانے کتنے دن میں اس نے کتنوں کے سامنے ہاتھ پھیلائے ہوں گے جو تو کیا جس طرح وہ میرے پاس آئی ہے، اسی طرح دوسروں کے ہاں بھی جاتی ہوگی؟ سارا شہر بھکاریوں کا شکار اسے لگا ——— اچھا تو یہ ہیں جنت میں پیدا ہوئی ہے!

کل رات میری گشت خیالات صرف پلاٹ اہتمام کے چہروں کی دنیاں الٹ رہی تھیں۔ مگر آج رات تو ادھر ایک چہرہ نمودار ہوتا، اُدھر ایک شعلہ سا بھڑک اٹھتا۔ پھر دھواں سا چھا جاتا۔ پھر تیرتے ہستے۔ پھر جس طرح آتیں ہیں جیسے کوئی شیشہ کی کرچیاں ہیں ہے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ کل سارا دن گھر سے باہر رہوں گا۔ کل کسی کھوکھلے بھی شعر کہوں گا۔ کل نماز بھی پڑھوں گا۔

مگر صبح بہت دیر سے آنکھ کھلی۔ نماز کا وقت نکل چکا تھا۔ نہانے اور ناشتہ کرنے میں بھی خاصی دیر لگی۔ دوپہر ہی کی طرح میں بیٹھا اخبار پڑھنا شروع کیا تو دوپہر تک پڑھتا رہا۔ جب ملازم نے آکر کہا کہ چند منٹ کے لئے اخبار مانگ رہے ہیں، تو میں نے وقت دیکھا۔ یکایک کسی بچے نے جیسے مجھے اندر اچھال کر سے باہر دے مارا اور سیڑھیوں پر سے اتنی تیزی سے اترا کہ بچے بھی یوں نہیں اترتے ہوں گے۔ دروازہ کھول کر میں سیدھا گلی کے پاس گیا اور گلی میں جھانکا۔ وہ بچے سگریٹ کی ڈبیوں سے مکان بنا رہے تھے اور گلی میں سے ایک بڑھیا گزر رہی تھی جو ہوا سے بھرے ہوئے تھے میں بہت چھوٹی سی لگ رہی تھی۔

میں پھر اوپر کے کمرے کی طرف لپکا اور ملازم سے پوچھا "کوئی مجھ سے ملنے تو نہیں آیا تھا؟"

وہ بولا "آپ سو تو نہیں رہے تھے صاحب، اگر کوئی آتا تو میں دبتا؟"

مزید کریدنے کے لئے مجھے کوئی دوسرا قرینہ کا سوال نہ سوجھا اور ملازم جیسے اپنے آپ سے کہنے لگا "بس صبح صبح ایک سبزی والا آیا تھا۔ یا اخبار والا، یا پھر ابھی ابھی وہ منگتی آئی تھی جو مجھ سے پوچھتی تھی کہ کیا واقعی کوئی صاحب سے ملنے آیا تھا۔ کیا آپ نے کسی کو وقت دے رکھا تھا؟"

میں جواب دیئے بغیر پلٹ کیا۔ تو وہ آئی تھی اور چلی گئی تھی! تو وہ اتنی خود دار تھی کہ اس کے آنے کے بعد کوئی آیا ہی نہیں تھا کیا فرشتوں کو یہ زیب دیتا ہے کہ وہ آئیں کے دو کا کیا زندگی میں شامل کریں۔

سیڑھیوں پر سے آہستہ آہستہ اترتا ہوا میں گلی میں آگیا پھر دوسری گلی سے ہوتا ہوا سڑک پر آیا اور دور دور تک نظریں دوڑائیں کہ شاید وہ کسی راہگیر کا دامن تھامے کھڑی ہو۔ شاید کسی دکان کے سامنے پڑی ہوئی سڑی ہوئی چیزوں میں سے کوئی گری ہوئی چیز چن رہی ہو۔ شاید وہ کسی درخت کے تنے کے ساتھ لگ کر اداس کھڑی ہو کر آج اس کی گلی بند ہو گئی تھی میں سے ایک آدھ کٹ گیا۔

سارے پر شہر کی زندگی رواں تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

اور واقعی کچھ بھی تو نہیں ہوا تھا۔ کتنی عجیب بات ہے کہ انسانوں کے اندر کے طوفان ان کے اندر ہی چلتے رہتے ہیں۔ ہر شخص کے اندر سے اس کا طوفان باہر آجائے تو کسی قیامت برپا ہو جائے۔

میں واپس اپنی گلی میں آیا تو بچوں نے سگریٹ کی ڈبیوں سے پنج منزلہ مکان تعمیر کر لیا تھا اور ساتھ والے مکان کے دروازے پر ایک بی بی، ترکاری والے کے ہاتھ اپنی اولاد کی کمائی کا پیسہ لٹا رہی تھی۔

اور وہ سامنے مکان کی دہلیز پر بیٹھی تھی۔ تو میری خیریت اس کے لئے اتنی اہم ہے؟ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی اور بیٹھے بیٹھے ایک طرف ہٹ کر مجھے راستہ دے دیا۔ اس کے پاؤں ننگے میلے تھے جیسے وہ گلی سے کسی دوسرے کے پاؤں لگا کر چلی آئی ہے۔ مگر آج اس کے ہاتھ خشک اور صاف تھے اور ناخن کٹے ہوئے تھے!

"آج تو تمہارے ناخن کٹے ہوئے ہیں!" میں نے بڑے انداز انداز میں کہا جیسے محض میرے پاس آنے کی تقریب میں اس نے اپنے پیکر میں یہ خاص اصلاح کی ہے۔

اور اس نے اپنے ہاتھ یوں گود میں چھپا لئے جیسے کوئی چوری کی ہے اور اب پکڑی گئی ہے۔ پھر چھینٹی کی پیالی سے چھینٹ کی پیالی چھوٹی اور میں اوپر لپکا۔ اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر میں نے اسے بلانا چاہا، مگر جھجک گیا جیسے میرے منہ سے ایک بھی لفظ نکلا اور سارے شہر میں کسی نے سن لیا تو پھر میں نے اشارہ سے اوپر آنے کو کہا اور وہ

دھڑکنے لگی مگر مجھے معاف کرنے میں کوشاں تھی اور پھر وہ بولی کہ
کیس اس نے مجھ پر نگاہ ڈال کر اوپر ہی اوپر دیکھا میں ایک طرف
ہٹ گیا جیسے ڈر تھا کہ کہیں نیچے نہ جا گروں گا۔

میں نے اپنے تھیلے کے نیچے سے ایک انگشتی اٹھائی اور اس کی طرف بڑھا دی۔ اس نے ہاتھ پھیلایا مگر انگشتی دیکھ کر کھینچ لیا "نہیں یہ میرے پاس بھان نہیں ہے"

"تم انگشتی لے لو۔" میں نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹا کر کہا۔

"پوری ہے؟" اس نے پوچھا۔

میں نے مسکرا کر کہا: "ہاں تمہارے پاس بھان جو نہیں ہے۔"

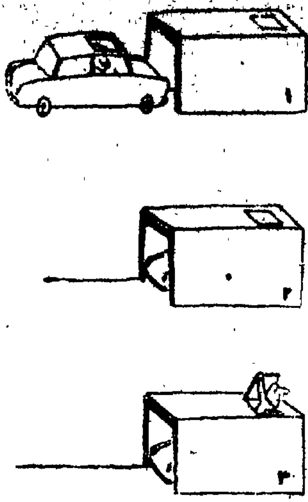
ایک آدھ پیسے والی بھکارن کے لئے انگشتی ایسی ہی ہے جیسے ایک افسانہ نگار کی ایک افسانے کی ... میں نے طے کر لیا کہ اس نے انگشتی کے لئے ہاتھ پھیلایا تو میں اسے کلائی سے پکڑ لوں گا اور ظاہر ہے جاذب طور سے پکڑ لوں گا۔ کیونکہ میرے پورے آٹھ آنے اس کے پاس ہوں گے پھر جب میں اس کی کلائی اپنی گرفت میں لے لوں گا تو اس سے کہوں گا۔ میں اس سے کہوں گا میرے افسانے کا پہلا فقرہ ایک کوندے کی طرح میرے ذہن میں چمکا اور پھر الفاظ کی برف پر شفق برس پڑی مگر قبل اس کے کہ میں ذہن پر بیٹے فقرے کو سنبھالتا، میں نے دیکھا کہ وہ جا رہی ہے۔

"انگشتی لیتی جاؤ" میں پکارا ایسے لہجے میں جیسے کوئی ننگا شکستہ شعر پڑھ رہا ہوں۔

وہ پلٹی اور دروازے میں سے جھانک کر بولی "تم نے تو لی سکتی"

دیر میں نے بہت بعد میں سوچا کہ جسے انگشتی دکھانے اور اس کے جانے کی ایک صدی میں وہ ایک لڑکی دار ہوا تھا۔ جب میں نے اسے انگشتی دی تھی اور جب میں نے دیکھا اس کے ہاتھ پر رکھا تھا تو اس کی کلائی پکڑ لینے کا فیصلہ مجھے کہاں یاد نہیں آیا تھا۔

پھر ایک دم مجھے احساس ہوا کہ میرا کیا کھو گیا ہے۔ انگشتی کے علاوہ وہ میرے افسانے کا پہلا فقرہ بھی اپنے ساتھ لے گئی تھی اور مجھے صرف اپنا چھوڑ گئی تھی جو اس کے جانے کے بعد دیر تک دروازے میں سے جھانکتا رہا ... سے دکھائی دیتا رہا پھر یکایک گرد وہ بالکل غائب ہو گیا۔



میں نے چھٹے اور ساتویں دن شہر کی سب لائبریریاں چھان ڈالیں مگر حسن پر لکھی ہوئی ضخیم کتابیں بھی چھان ماریں مگر مجھے وینس یا شاید افروڈائیٹ کے چہروں میں وہ چہرہ نظر نہ آیا جو ان سب سے کسی نہ کسی تفصیل میں مختلف تھا۔ شاید بھکارن کے نتھنوں کے خفیف ابھار نے اس کی ناک کے دونوں طرف وینس کی ناک کے مقابلے میں زیادہ متناسب توسیع پیدا کر دی تھی یا شاید سائیکی کی گردن بھکارن کی گردن کے مقابلے میں کچھ بھی تھی اور میلی تھی یا ممکن ہے افروڈائیٹ کے مقابلے میں بھکارن کے ہونٹوں کے گوشے زیادہ گہرے اور زیادہ جذباتی تھے۔ میں اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بھکارن کا چہرہ اپنی مجموعی حالت کی صورت میں مجھے تو یاد تھا مگر جب میں اس کی صرف آنکھوں یا صرف گالوں یا صرف ہونٹوں کے بارے میں سوچتا تو سارا چہرہ ذہن کی اوٹ میں چھپ جاتا۔

ساتویں دن شام کے قریب مجھ پر ایک انکشاف ہوا کہ میں نہایت بے معنی زندگی گزار رہا ہوں۔ ہم سب غالب کے شعر نہیں ہیں کہ جب چاہا اٹھا کر پڑھ لیے، تو سامنے آتے ہیں اور گم ہو جاتے ہیں ہم ٹوکتے ہیں اور لے کب واپس آتے ہیں۔ تم نے ایک چہرہ دیکھا تھا جو بے حد حسین بے حد عجیب چہرہ تھا لیکن جیسے یہ چہرہ جس کے بارے میں تم سوچ تک نہ سکتے تھے کہ کسی صورت کا ایسا چہرہ بھی ہو گا کیا ایک

بھاگ کے سامنے آیا اور گزر گیا۔ اسی طرح کئی اور چہرے آئے اور چلے گئے اور گزرتے رہیں گے اور اگر تم ہر چہرے پہ نظریں جماتا [illegible] تو ایک روز تمہیں معلوم ہوگا کہ تمہارے چہروں نے تمہیں پاگل خانے پہنچا دیا ہے۔

جانتے ہیں یہ پہلی رات تھی جب میں اٹھا تو سورج کا لال چہرہ آیا تھا۔ ناشتے کے بعد میں نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے افسانے کا پہلا فقرہ لکھنے بیٹھ گیا۔ جلتی ہوئی ایک دیا سلائی بجھے ہوئے چراغ کی طرف بڑھی اور پہاڑوں پر برف چمکنے لگی۔ ہر طرف ہزاروں آئینے لگ گئے جن میں ہزاروں سورج چمک رہے تھے پھر تیرگی کے اس طوفان میں ایک چہرہ ابھرا اور آواز آئی [illegible] سکی ہے۔

میں پلنگ پہ سے کود کر اترا اور دروازے میں سے بھاگ کر پھر بجلی کی سی تیزی سے سیڑھیاں اتر کر گلی میں پہنچ گیا۔ پھر دوسری گلی میں چلا گیا پھر سڑک پر آ گیا۔ سڑک پر معمول کی زندگی رواں تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

اور واقعی کچھ بھی تو نہیں ہوا تھا۔ صرف اتنی سی بات ہوئی کہ محلے کے ایک تانگے والے نے میرے پاس آ کر حیرت سے پوچھا "کیوں بابو جی، خیریت تو ہے جو آپ ننگے پاؤں کیوں کھڑے ہیں؟"

تانگے والے نے میرے ننگے پاؤں دیکھ لئے تھے مگر میرے ذہن کو جو زخم زخم ہو رہا تھا، ایک تانگے والا کیا، کسی نے بھی نہ دیکھا۔ کوئی کسی کے زخم نہیں دیکھتا۔ شاید اس لیے کہ زخم دیکھنے دکھانے کی چیز نہیں ہیں یا شاید اس لئے کہ سب کے اپنے اپنے زخم ہوتے ہیں۔

تو کیا یہ زخم جو میرے ذہن میں ہے کسی اور کے ذہن میں بھی ہے؟ اگر ہے تو وہ کہاں ہے کہ میں اسے اپنے سینے سے لگا کر ذرا سا رو لوں۔ انسان آخر زخموں کے ان تالوں کو کیوں چھپائے پھرتے ہیں جو ظاہر ہوں تو سب انسان پیار سے ایک دوسرے کو لپٹا لیں۔

تانگے والے کو کوئی جواب دیئے بغیر میں واپس اپنے کمرے میں آیا اور بستر پر سر سے پاؤں تک چادر اوڑھ کر یوں پھیل کر لیٹ گیا جیسے کروڑ ہا سالوں کا سفر طے کر کے آ رہا ہوں۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے ذہن سے رجوع کیا۔ مگر اس نے بھی آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ سب سو رہے تھے۔ چاروں طرف نہایت گہرا سناٹا مسلط تھا۔ آج ردی والا بھی کہیں مر گیا تھا۔

میں نے غنودگی کے عالم میں دیکھا کہ بھکارن میرے کمرے کے دروازے پر کھڑی ہے اور کہہ رہی ہے "خدا کی راہ میں ایک آنہ دے دے سخی، تیرا بچہ جیوے۔"

میں نے چادر اتار کر پھینک دی۔ دروازے پہ بھکارن کھڑی تھی اور کہہ رہی تھی "خدا کی راہ میں ایک آنہ دے دے سخی تیرا بچہ جیوے۔"

میں کچھ ایسے لہجے میں بولا جیسے وہ بالکل میرے قابو میں ہے اور میں اس سے ہر قسم کی جواب طلبی کر سکتا ہوں "اتنے دنوں کہاں تھیں؟" میں نے ڈانٹ کر پوچھا "کیا تمہیں معلوم ہے کہ آج کم از کم ایک ہفتے کے بعد میرے پاس آئی ہو؟"

میرے لہجے کا اثر صرف اس کی آنکھوں پر ہوا جو آج کسی گلابی دھاگے کے حلقے میں گھری ہوئی تھیں۔ ان آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہوئی، وہ چمک جو انتہائی پیار یا انتہائی نفرت یا انتہائی خوف کی حالت میں پیدا ہوتی ہے۔

"بولو، کہاں تھیں تم؟" میں گرجا۔

"میں یہیں تھی بابو، اور کہاں تھی" وہ بچے کی طرح بولی۔

"تو پھر تم ایک ہفتے تک آئیں کیوں نہیں؟" میں نے اسی لہجے میں پوچھا۔

اور وہ بولی "میں [illegible] گئی تھی، ایک آنہ اس دن کا باقی سات آنے سات دنوں کے، آج آٹھواں دن تھا تو آ گئی۔"

بھکارن کا چہرہ پھر کی طرح گھوما اور ایک آن میں پہاڑوں کی برف تڑاخ تڑاخ کرتے چٹخی اور اس کے بڑے بڑے چٹانوں کے سے تودے بہتے چنگھاڑتے ہوئے آ گئے اور میرے سر پر پڑنے لگے۔ وحشیوں کی طرح میں نے بستر پر سے تکیہ اٹھا کر دور پھینک دیا اور اس کے نیچے پانچ پانچ دس دس روپے کے جتنے بھی نوٹ رکھے تھے، انہیں مٹھی میں لے کر میں بھکارن کی طرف بڑھا۔ اس کی کلائی کو کڑی کی طرح پکڑ کر میں نے یہ نوٹ اس کی مٹھی میں ٹھونس دیئے اور چیخا "ان روپوں سے جتنے بھی آنے ہیں لے لو آنے والے دنوں کے۔ مگر تم ایک بھی دن پہلے یہاں آ گئیں تو گلا گھونٹ دوں گا۔ یہاں سے دفع ہو جاؤ۔"

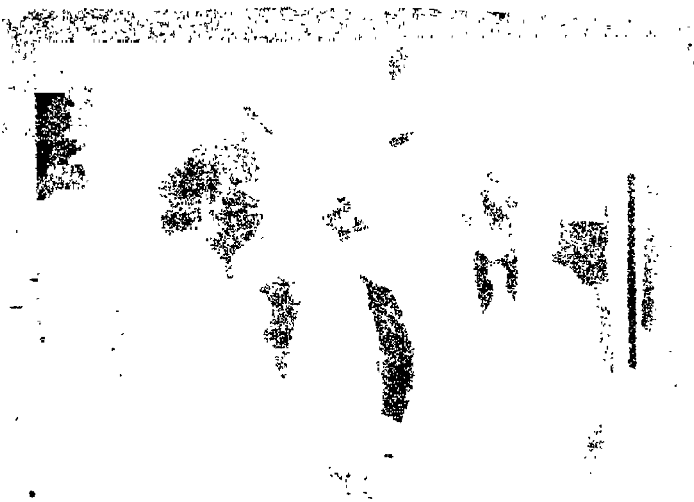
فن کی دنیا کا گراں قدر سرمایہ

شاہد سجاد

وہی جس نے دنیا دیکھی ہے۔
جو دیس دیس پھرا ہے۔
ہاں جسے شاہد سجاد کہتے ہیں۔
جس نے تینوں ملکوں کی سرد و گرم ہواؤں کے تھپیڑے کھائے
ہیں اسے میں نے اس کے اپنے اسٹوڈیو میں دیکھا تو مجھے یوں لگا
جیسے اس شخص کو گلی کوچوں میں آوارہ پھرنے والی مستانی ہوا تک
نے نہیں چھوا۔ بس یہیں اسی اسٹوڈیو میں پیدا ہوا تھا اور یہیں پل بڑھ

کھویا کھویا بکھرا بکھرا شاہد سجاد
الف لیلیٰ کی داستان کا طلسمی کردار لگتا ہے!





صہبائی منیر تسلیم چیرمین ادارہ انڈس آرٹ گیلری میں شاہد سجاد کے ساتھ

کر جوان ہوا تھا، انہی بادھوتے جنگلوں کے درمیان، اسی جگہ کی مٹی اور لکڑی کے تختوں کے درمیان رہتے بستے اس نے اپنے کئی جنم گزار دیئے ہیں۔ اب یہ جانے اس کا کون سا جنم ہوگا۔ میں حیرت سے شاہد سجاد کو دیکھ رہی تھی اس کے ہاتھ گیلی مٹی سے کھیل رہے تھے اس کے بکھرے بکھرے بال گرد آلود تھے کپڑوں پر بھی مٹی لگ گئی تھی لیکن اسے کسی چیز کی پرواہ نہیں تھی وہ اپنے کام میں گم تھا جیسے وہ تپسیا کر رہا ہو جیسے وہ پیار کر رہا ہو جیسے وہ عبادت کر رہا ہو۔ کتنا مگن تھا وہ، کیسی لگن تھی اس کی، اس لگن ہی نے تو اسے مجسمہ ساز بنا دیا تھا ورنہ وہ تو صرف ایک حساس نوجوان تھا۔

بکھرا بکھرا، خوابیدہ خوابیدہ، نرم نرم باتوں میں کھویا ابھرتا شاہد سجاد مجھے الف لیلیٰ کی داستان کا کوئی طلسمی کردار نظر آ رہا تھا۔ بکھرا بکھرا، سویا سویا سا انسان جو اپنی شخصیت کی ظاہری آرائش سے بے نیاز تھا، جس کی تجسس آمادگی اسے ایک عرصے تک بالاکانی کے گھنے جنگلوں میں لئے پھرتی رہی اور گری پڑی مٹی سے نقش ابھارتے ابھارتے وہ دھات کی پلیٹوں پر دلآویز پیکر ابھارنے لگا ہے۔ جیسے جنگلوں سے وہ اپنے دامن میں ایسی نقوش کا اتنا وسیع، اتنا خوبصورت اتنا شگفتہ ذخیرہ سمیٹ کر لایا تھا کہ دھات کے ٹکڑے بھی گھنے جنگلوں کی خوشبو سے مہکنے لگے۔

کانسی پر نقش و نگار بنانا اور نرم جذبے کو پگھلانا ایک قدیم فن ہے جسے مجسمہ سازی کی دنیا میں بڑی پُراسرار روایات سے نسبت دی جاتی ہے۔ شاہد سجاد اپنے تصورات کو غزل کے اشعار کی طرح کانسی میں ڈھالتا ہے اور اس میں تخلیق کی نئی نئی راہیں نکالتا ہے اس کے تخیل اور احساس کی انگلیوں نے دھات کو اظہار کی ایسی زبان دی ہے جسے صدیوں تک فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔

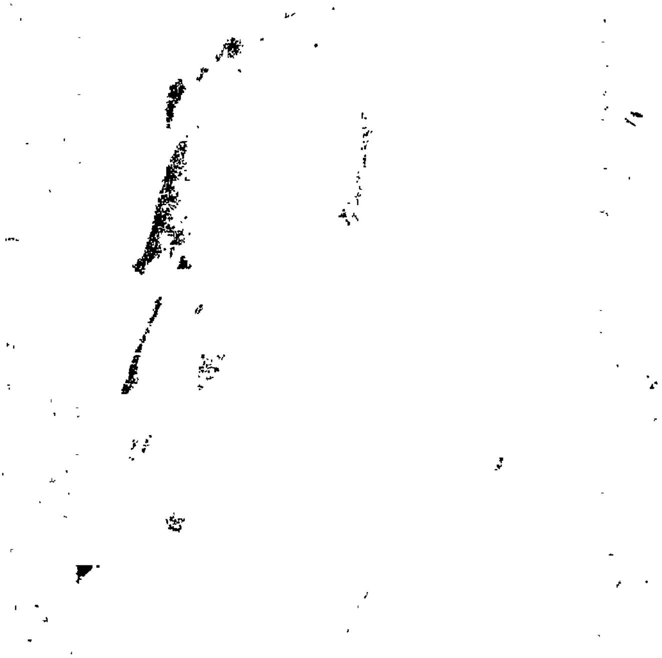
کچھ دیر بعد جب اسے میری موجودگی کا احساس ہوا تو اس نے میری طرف اس طرح دیکھا جیسے نیند سے بیدار ہوا ہو۔

"بس میرا تھوڑا سا کام رہ گیا ہے پھر ہم اوپر چلیں گے" وہی حساس نوجوان دھیمے دھیمے لہجے میں بول رہا تھا اور نرم نرم بولنے والے اس آدمی کے انہماک کو دیکھتے دیکھتے میری نظریں بھٹک گئیں۔ سامنے جو اسم ذرا فاصلے پر مٹی کی تصویر نے مجھے پکار لیا تھا۔ میں اس کی طرف چلی گئی۔

وحات پر [illegible] ہیں۔ مرحوم [illegible] تصویریں لگی ہیں
ڈھاکا میں بھی [illegible] پاکستان [illegible] ہیں جو
کردیا تھا قائد اعظم کا خوبصورت پورٹریٹ [illegible] تصویروں کے
ساتھ میرے سامنے جلوہ گر تھا اس کے ساتھ ہی ایک پینٹنگ لگی تھی
جس میں شاعر مشرق کی تجویز [illegible] تھی

ان تمام تصویروں میں ایک [illegible] تھی۔ میری نگاہیں ان
تصویروں پر جمی رہ گئیں۔ مفکر اسلام شاعر مشرق علامہ اقبال جنہوں نے
برصغیر کے مسلمانوں کے لئے ایک آزاد مملکت کا خواب دیکھا۔ قائد اعظم
محمد علی جناح جن کے حسن تدبر سیاسی بصیرت اور آہنی عزم نے اس
خواب کو [illegible] حقیقت بنا دیا [illegible] مرحوم جناب
[illegible] علی [illegible] جنہوں نے [illegible] سے [illegible] میں
[illegible] ملک کی تعمیر [illegible] اپنے [illegible]
[illegible] چار سال کی [illegible] مدت [illegible] پاکستان کو عالمی سطح پر ایک
باعزت مقام حاصل ہو گیا

کانفرنس میں [illegible] تین [illegible] جہاں [illegible] قائد اعظم
کے [illegible] سالگرہ کے موقع پر [illegible] کی جانب سے ایڈریس [illegible] کیا
[illegible] کے [illegible] پیش کیا گیا تھا جس کا افتتاح صوبائی وزیر تعلیم
جناب [illegible] علی [illegible] نے کیا تھا پاکستان [illegible] بانی [illegible] رہنماؤں



شاہد [illegible] کی [illegible] شبیہ

ے الفروش کا نسی پر ابھارے گئے تھے۔ شاہد سجاد نے قوم کے محسنوں کو جس خلوص و محبت سے نذرانۂ عقیدت پیش کیا تھا قوم نے بھی اس کی اسی طرح پذیرائی کی تھی۔

آج اس عظیم فنکار کے بنائے ہوئے وہ تینوں عظیم پیکر میں بہت قریب سے دیکھ رہی تھی۔ کیسا طلسم تھا ان تصویروں میں۔ شاہد کا فن شاید اپنے نقطۂ عروج پر تھا۔

بائیں طرف کی دیوار کے ساتھ کچی گولائی کے مجسمے سر اٹھائے کھڑے تھے۔ دائیں طرف جگہ خالی تھی اس میں شاہد سجاد صاحب اپنے مجسمے وغیرہ رکھتے ہیں۔ کافی جدید قسم کے آلات شاہد سجاد کے آس پاس بکھرے پڑے تھے اور اب وہ ہاتھ دھو رہے تھے ان کا کام ختم ہو چکا تھا۔۔۔ ہم لوگ ان کے ساتھ اوپر چلے گئے یہ ان کا ڈرائنگ روم تھا۔

سادگی اور فن کاری کا حسین امتزاج، منقش میز، شاہد سجاد صاحب کے ہاتھ کی بنی ہوئی آرام دہ کرسیاں، مجسمے اور دیواروں پر لگی ہوئی پینٹنگز کمرے میں فرشی نشست کا بھی انتظام تھا سو ہم وہیں بیٹھ گئے۔

ٹک ٹک کی غذا شاہد سجاد صاحب چائے بنا لائے اور ہمیں پتہ بھی نہ چلا دراصل ان کی بیگم اپنی پھوپھی کے یہاں گئی ہوئی تھیں۔ خوشبو اور کشش کا مزہ لیتے ہوئے میں نے شاہد سجاد صاحب سے سوالات پوچھنا شروع کر دیئے۔ وہ اپنے مخصوص دھیمے دھیمے انداز میں بتاتے رہے کہ یہ شوق بچپن سے ساتھ نہیں لگا۔ بس یہ تو ابھی دس بارہ سال پہلے نہ جانے کہاں سے میرے ساتھ ہو لیا۔ بچپن میں جب میں چھوٹا سا ہوتا تھا تو مجھے سجا سجا کر لکھنے میں مزا آتا تھا۔ یوں سجا سنوار کر لکھتے لکھتے میں کتابت کی راہ پر آ گیا، اور پھر کتابت کی راہ نہ جانے کیسے پینٹنگ سے آ ملی۔ ۱۹۶۴ء تک میں پینٹنگ سے دل بہلاتا رہا۔ شاہد سجاد صاحب بولتے بولتے چپ ہو گئے۔

خود کلامی کے سے انداز میں بولنے والے شاہد سجاد انفرادیت کے رسیا ہیں جدت انہیں مرغوب ہے۔ وہ تیرہ سال کی عمر میں گھر سے الگ ہو گئے تھے۔ شاید زندگی کے دامن میں تجربات کے موتی بھرنا تھے سو وہ اٹھارہ سال تک قریہ قریہ گھومتے رہے جاپان، یورپ، ایشیا، انڈیا، ملایا سب ہی جگہ ہو آئے۔ کھلے دل اور کھلی آنکھوں سے نظارے سمیٹتے رہے کہ نظاروں سے انہیں پیار تو بچپن ہی سے تھا۔ گھر سے باہر سودا وغیرہ لینے بازار جاتے تو کسی دکان پر لگی ہوئی خوبصورت تصویر ان کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیتی۔ وقت گزرتا چلا جاتا اور وہ وہیں کھڑے رہتے۔ وہ اب بھی پہروں گوشے گوشے سے لگے رہتے تھے۔ "شاہد صاحب آپ نے تعلیم کہاں تک حاصل کی؟" میں پوچھ بیٹھی۔۔۔

"ساتویں تک۔" وہ دھیمے سے جواب دے کر مجھے حیران کر گئے۔ مجھے یقین نہ آیا میں نے پوچھ لیا کہ کہیں آپ مجھ سے مذاق تو نہیں کر رہے ہیں۔

"نہیں جی۔۔۔ میں نے سچ مچ صرف ساتویں تک ہی پڑھا ہے۔ گھر والوں نے پرائمری میں داخل کروا دیا اور پھر پلٹ کر خبر نہ لی۔ پرائمری پاس کر لی تو سیکنڈری میں داخل کروا دیا۔ سیکنڈری میں میں نے صرف ساتویں تک پڑھا اور پھر میں ایک دن اسکول سے واپس آیا تو پلٹ کر اسکول نہیں گیا۔ کتنا اچھا ہوا کہ میں پھر اسکول نہیں گیا۔ اگر میں نے بی اے کر لیا ہوتا تو میں شاید اس وقت اتنا آزاد نہ ہوتا۔ بی اے کر لینے کا تصور مجھے بڑا احمقانہ سا لگتا ہے۔"

یہ شاہد سجاد کا ایک نیا رخ تھا۔

اور اس رخ میں سچائی کی چمک تھی، سادگی کا نور تھا۔

وہ بچوں کے سے بھولپن سے بتا رہے تھے کہ میں زندگی کو پابند کرنے کا قائل نہیں، میں سوچ سمجھ کر کچھ کرنا نہیں چاہتا۔ بس میرا جو جی چاہتا ہے وہ کر لیتا ہوں۔۔۔ میں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ میں زندگی کو مجسموں کے قالب میں ڈھالتا ہوں۔

میرے نزدیک زندگی کی بنیاد ایکشن ہے عمل ہے۔

میں نے دیکھا کہ صرف سات جماعتوں تک نصابی تعلیم حاصل کرنے والے شاہد سجاد بڑی شستہ اور بڑی خوبصورت انگریزی بول رہے تھے، ان کی اردو بھی ٹکسالی سنوری ہوئی تھی۔ شاہد سجاد کا ایک بڑا پیارا سا بیٹا ہے جو انہیں بے حد عزیز ہے وہ اسے بہت پیار کرتے ہیں۔ پیاری تو انہیں اپنی شریک حیات سلمانہ بھی ہیں جو ان کی بڑی اچھی دوست اور خیال رکھنے والی بیوی ہیں۔ وہ ان کے شوق کے آگے بند نہیں باندھتیں بلکہ شوق کی تکمیل میں ان کا ساتھ دیتی ہیں۔ شاہد صاحب ابھی تک بہت سارے مجسمے بنا چکے ہیں اور ان کے ان مجسموں کی کئی کامیاب نمائشیں بھی ہو چکی ہیں۔ ایک نمائش ۱۹۷۴ء میں آرٹس کونسل میں ہوئی ایک ۱۹۷۶ء میں ہوئی۔ لندن کی گولڈ ہال گیلری میں بھی ایک گروپ نمائش ہو چکی ہے، یہ بہت کامیاب رہی۔ لوگوں نے ان کے فن کو بڑی گرمجوشی سے سراہا۔



بہار علی الاشنن پاروں کی نمائش کا افتتاح کر رہے ہیں

شاہد سجاد مجسموں کے خطوط سے کھیلتے ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی بھی ایک کھیل ہے۔ وہ اس کھیل سے پوری پوری طرح محظوظ ہونا چاہتے ہیں وہ دنیا کو ایک سوراخ میں سے دیکھنے کے قائل نہیں ہیں۔ دنیا کے اندر اتر کر دنیا کے اندر ڈوب کر انہوں نے دنیا کو جانچا ہے وہ احساس کی جس آگ میں خود جل رہے ہیں اسی آگ سے دھات کو پگھلا کر فنی پیکروں کا روپ بخشتے ہیں۔ ان کے ذہنی عکس مجرد فضا کو بھی دھات کے جسم میں سمیٹ لیتے ہیں۔

اکثر پوری دنیا کی سیر کرنے والے شاہد سجاد اپنی زمین، اپنے پاکستان سے بڑی محبت کرتے ہیں۔ وہ ان ولایت پلٹ نوجوانوں میں سے نہیں جو یورپ کے ایک دو ممالک کی سیر کرنے کے بعد فضاؤں میں اُڑنے لگتے ہیں اور زمین کے قدم زمین پر ٹکتے ہی نہیں۔ ان کا تو زمین سے بڑا گہرا رشتہ ہے۔ وہ زمین کی چکنی مٹی کو اپنے حسین تصورات کا روپ دے دیتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں کی مشاقی ان کے فن پاروں کو لافانی حسن بخش دیتی ہے۔ میں نے بائیں طرف رکھے ہوئے ایک مجسمے کو دیکھتے ہوئے شاہد صاحب سے پوچھ لیا "کیا آپ نے مجسمہ سازی کی کوئی باقاعدہ ٹریننگ لی ہے یا یہ خداداد صلاحیت ہے آپ کی؟"

"خداداد صلاحیت ہی ہے یہ لیکن اس صلاحیت میں نکھار پیدا کرنے کے لئے امریکہ سے تین مہینے کا ایک کورس کر آیا ہوں۔" میں نے دیکھا کہ جب شاہد سجاد اپنے بنائے ہوئے مجسمے کی طرف دیکھتے ہیں تو ان کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہو جاتی ہے، جب وہ کوئی نیا مجسمہ بناتے ہیں تو اس مجسمے سے انہیں پیار ہو جاتا ہے اس سے عشق کرنے لگتے ہیں، اس کے بدن کے خطوط اعضا درست کرتے وقت انہیں گزرتے وقت کا بھی احساس نہیں ہوتا۔ اپنے اسٹوڈیو میں اگر وہ کام میں منہمک ہو جائیں تو کبھی چھ گھنٹے کبھی بارہ اور کبھی کبھی اٹھارہ گھنٹے دم سادھے گزر جاتے ہیں۔ جنون کی اس منزل پر کھڑا ہوا یہ فنکار، جس کا روپ ملوٹیلیا کا سا ہے۔

جس کا دل شاعر کا دل ہے۔

بیچ پوچھیے تو فن کی دنیا کا گراں قدر سرمایہ ہے۔ ●

دوشیزہ کا انعام یافتہ ناول
قسط نمبر (۱۰)

عظمت عزیز

جلتے پھول

تارا اپنے والدین کی چوتھی بیٹی تھی۔ اس کی ماں ملک کی نامور ... تین بیٹیوں کو جنم دے دے کر تھک چکی تھی۔ تارا کی پیدائش سے پہلے وہ یہ آس لگائے بیٹھی تھی کہ اس بار ضرور لڑکا ہوگا۔ تارا پیدا ہوئی تو ان پر دورے پڑنے لگے اور انھوں نے اسے منحوس قرار دے کر اپنے پیار سے محروم کردیا۔ تارا ماں کی محبت کی ایک نظر کے لیے ترستی ہوئی بڑی ہوگئی۔ باپ بیوی کے اس سلوک سے جو وہ تارا سے کرتی تھی فکر محسوس کرتا تھا۔ اس نے بیٹی کی محرومی مٹانے کے لیے اس کی ہر خواہش پوری کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ تارا کو حسن اور ذہانت دونوں سے قدرت نے نوازا تھا۔ اس کے پاپا نے اسے پڑھانے کا بیڑا اٹھایا۔ ماں یہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی دوسری بیٹیوں کے مقابلے میں تارا زیادہ تعلیم حاصل کرے لیکن اس کی ہر مخالفت شوہر کی ضد کے آگے دم توڑ گئی۔ تارا نے اپنے اسکول کی ایک شفیق ٹیچر مس معراج میں ماں کا پیار تلاش کیا۔ لڑکیوں نے ان کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کردیں۔ مس معراج نے سرد مہری کا رویہ اختیار کرلیا۔ تارا کا ننھا سا دل ٹوٹ گیا۔ اسے کسی کے پیار پر بھروسہ نہیں رہا۔ اس نے خودکشی کی ناکام کوشش کی۔ غلط فہمی دور ہوجانے کے بعد مس معراج اس کی عیادت اور معافی مانگنے آئیں مگر اب تارا بدل چکی تھی۔ اس نے صرف تعلیم کو اپنی منزل بنا لیا تھا۔ اس نے محنت سے پڑھائی جاری رکھی۔ اپنے پاپا کی حوصلہ افزائی سے وہ کامیابی کی منزلیں طے کرتی گئی۔ اس کی دو بہنوں کی شادی ہوگئی۔ تارا کے لیے بھی ایک ڈاکٹر کا رشتہ آیا جو اس کی ماں کے نزدیک نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھا۔ وہ اس کی شادی کے لیے اڑ گئیں لیکن تارا ڈاکٹر بننا چاہتی تھی اور پاپا اس کے حامی تھے۔ اسی بات پر گھر میں میاں بیوی کا جھگڑا رہنے لگا۔ ماں میٹرک کے بعد اس کی شادی کرنا چاہتی تھی مگر پاپا اسے داخلہ دلانے پر مصر تھے۔ میٹرک فرسٹ ڈویژن میں کرنے کے بعد تارا کو اس کے پاپا اپنی بیوی سے چھپ کر اپنے ایک دوست ارباب صاحب کی مدد سے کالج میں داخلہ دلانے ان کے گھر گئے۔ جہاں ارباب صاحب کے صاحبزادے ایاز نے انھیں قائل کرنا چاہا کہ تارا کو ڈاکٹری کی تعلیم دلانے کے لیے ضروری ہے کہ اسے لڑکوں کے کالج میں داخلہ دلوایا جائے تاکہ اس کے اندر خود اعتمادی پیدا ہوجائے۔ اس کے پاپا پہلے راضی نہ ہوتے لیکن ارباب صاحب اور ایاز نے انھیں دنیا کے نشیب و فراز سمجھا کر اس بات پر راضی کرلیا کہ وہ تارا کو ایاز کے کالج میں داخل کرادیں۔

تارا کالج میں داخل ہوگئی۔ وہ پہلے سہمی سہمی سی رہتی تھی جسے کالج کے دو طالب علموں ایاز احمد اور رفیق نے خاص طور پر محسوس کیا۔ یہ دونوں لڑکے اپنے اپنے طور پر تارا میں دلچسپی لینے لگے۔ ایاز بھی تارا کا خوف ختم کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔ لیکن تارا نے [illegible] کالج میں ہنگاموں کے دوران رفیق احمد نے تارا کی مدد کی جس سے تارا کے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ پیدا ہوگیا۔ ادھر گھر میں تارا کی امی اس کے لیے ڈاکٹر کے رشتے کے سلسلے میں سنجیدہ ہوگئی تھیں۔ تارا کے ابو نے انھیں ڈانٹ کر خاموش کردیا۔ اسی دوران اس کے ابو بیمار پڑ گئے۔ تارا نے پیپرز کی تیاری کے سلسلے میں ایاز احمد سے ایک کتاب لی تھی۔ پاپا کی بیماری کے دوران وہ کالج نہ جاسکی۔ اور رفیق بہانہ کرکے وہ کتاب لینے اس کے گھر آپہنچا۔



دوسرے سے تارا کا رہ گئی تو اس کا سر پچھا اچھا تھا۔ نواز معاملہ سمجھ گیا۔ وہ تارہ کی معصومیت سے پوری طرح گھائل ہو چکا تھا۔ وہ چاہتا تھا اس لڑکی میں اعتماد پیدا ہو جائے۔ کتاب والے واقعے سے تارا بے حد خفت محسوس کر رہی تھی اپنی اس حرکت پر پشیمان تھا۔ تارہ اسے نظر انداز کرتی ہوئی چھٹی کے بعد کالج سے نکلی تو راستے میں نواز مل گیا۔ تارا نے راستہ بدلنا چاہا مگر نواز کی مقناطیسی شخصیت اس پر اثر انداز ہو چکی تھی۔ اس کی ایک آواز پر تارا کے قدم رک گئے۔ اور وہ اس کے ہمراہ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ نواز کا رویہ بہت دیر سے گیا تھا جس سے تارہ سہم کر رہ گئی۔ درحقیقت نواز اس کے دل سے بے جا خوف ختم کر کے اعتماد پیدا کرنا چاہتا تھا۔ کچھ دیر بعد اس کی محبت اور نرمی کے سبب تارا کے دل سے تارہ میں جاگ گیا۔ اور جب تارا اس سے مل کر آئی تو وہ خاصی بدلی ہوئی لڑکی تھی جس نے ماں کے غصے کی بھی پروا نہیں کی۔ اس کے پاپا کو ڈاکٹر نے کینسر بتایا تھا جس سے وہ بے حد پریشان ہو گئی۔

وہ کالج جا کر وقتی طور پر اپنی پریشانی بھول گئی۔ تارہ کی امی نے غصے میں اس کے گال پر گرم چمٹا رکھ دیا تھا۔ جس کی جلن کالج آنے کے بعد بڑھ گئی۔ نواز نے موقع پا کر اسے رومال کو برف سے ٹھنڈا کر دیا۔ اور وہ چند میٹھی باتیں کیں اور اس کی ساری جلن جاتی رہی۔ نواز نے اس کے اندر جینے کا حوصلہ پیدا کر دیا تھا۔ کچھ عرصے بعد اس کی دو بڑی بہنوں عائشہ اور چاندنی کی شادیاں ہو گئیں۔ تارا نے زندگی میں پہلی بار سنگھار کیا۔ دیکھنے والوں کی نظریں چکا چوند ہو گئیں۔ خوشیوں کے یہ دن بھی گزر گئے۔ تارا کے پاپا کی بیماری بڑھ گئی۔ نواز نے تسلیوں سے اسے پریشان نہ ہونے دیا۔ لیکن وہ منحوس وقت بھی آ گیا۔ تارا کے پاپا نے دنیا سے منہ موڑ لیا۔ تارا ذہنی طور پر اس صدمے کے لیے تیار نہیں تھی۔ وہ بے ہوش ہو گئی۔ نواز جس نے اسے زندگی بھر کا رفیق بنانے کی قسم کھائی تھی اس کی حالت دیکھ کر اندر ہی اندر رو دیا۔ جنازے اور سوئم میں اس کے گھر آتا رہا۔ تارا کچھ نیم دیوانی سی ہو گئی تھی۔ [illegible] چچا نے سب کو سمجھا دیا تھا کہ اس کی دلجوئی کرتے رہیں ورنہ یہ پاگل ہو جائے گی۔ چاندنی اور عائشہ کچھ دن رہ کر اپنے اپنے گھر چلی گئیں۔ اب اس گھر میں تارا، ساجدہ اور امی رہ گئی تھیں۔

تارا نے کالج جانا شروع کر دیا۔ رضیہ بی نے ہر ممکن کوشش کی کہ تارا گھر سے نہ نکلے۔ لیکن باپ کے مرنے کے بعد وہ ماں سے اور دور ہو گئی تھی۔ وہ نہ صرف کالج گئی بلکہ نواز سے بھی ملی۔ یہاں تک کہ تارا نے نواز کے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائیں۔ اور ادھر چوری چوری رضیہ بی نے ڈاکٹر احسن سے اس کا رشتہ پکا کرنے کی تیاریاں مکمل کر لیں۔ تارا سے عائشہ نے اس کی رائے پوچھی تو اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ نواز کے علاوہ کسی اور کو شریک حیات بنانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ اگر کسی نے زبردستی کی تو وہ گھر کی روایتوں کو توڑنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ تب رضیہ بی نے پہلی دفعہ اسے گلے لگا کر اس کی آرزو پوری کرنے کا وعدہ کیا۔ اور یوں تارا کی شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ رضیہ بی نے بتایا تھا کہ نواز کے گھر سے پیغام آیا تھا جسے منظور کر لیا گیا ہے۔ تارا خوشی سے دیوانی ہو گئی۔ تارا نے اس دوران ایک عجیب سا سپنا دیکھا۔ وہ چیخ کر اٹھ بیٹھی۔

اس نے خواب میں دیکھا تھا کہ اس کے مرحوم پاپا کے سفید بال گلیوں میں اڑتے پھر رہے ہیں۔ رضیہ بی نے خواب سن کر تعبیر کی کہ تمہاری وجہ سے تمہارے باپ کی رسوائی کا خطرہ ہے۔ تمہیں ہر قربانی دے کر اپنے مرحوم باپ کی لاج رکھنی ہے۔ اور رضیہ بی کے ان لفظوں کا مفہوم اس وقت کھلا جب نکاح کے وقت نواز کی جگہ ڈاکٹر احسن کا نام لیا گیا۔ تارا کو سکتہ سا ہو گیا۔ وہ دلہن بنی نواز کے سپنوں میں گم تھی کہ نکاح خواں نے ڈاکٹر احسن کے نام سے اس کی رضا مانگی۔ رضیہ بی نے مرحوم باپ کی عزت کا واسطہ دے کر اسے ہاں کہنے پر مجبور کر دیا۔ وہ صدمے سے بے ہوش ہو گئی۔ اور اسی نیم بے ہوشی میں اس کی رخصتی ہو گئی۔ ڈاکٹر احسن اپنی بے ہوش دلہن کو حجلۂ عروسی میں لے آیا۔ تارا کو ہوش آیا تو [illegible] ڈاکٹر احسن اس پر جھکا ہوا تھا۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ ڈاکٹر اب تک اس کی بے ہوشی کی وجہ اس کے پاپا کے انتقال کا صدمہ سمجھ رہا تھا۔ مگر تارا نے اس کا ہاتھ جھٹک کر صاف کہہ دیا کہ اس کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے۔ اس کی ماں نے دھوکے سے یہ شادی کی ہے۔ ڈاکٹر احسن ہکا بکا رہ گیا۔

تارا کی صاف گوئی نے اس کے ارمان خاک میں ملا دیے تھے۔ اس نے ٹھنڈے دل سے اس کے جذبات کا تجزیہ کیا اور اس سے وعدہ کر لیا کہ وہ اس کے راستے سے ہٹ جائے گا۔ مگر ابھی کچھ دن اسے اس رشتے سے سمجھوتہ کرنا پڑے گا۔ اس کے [illegible] تعلقات کے [illegible] دونوں دوست رہیں گے۔ اور اس طرح سہاگ رات کسی خوشی کے بغیر بیت گئی۔ تارا کی امی نے [illegible] زیادتی کی معافی مانگی [illegible] بتایا کہ سب کچھ [illegible] گیا۔ اور اس کے [illegible] نواز بھی [illegible]

دہشت زدہ کر گئی۔

(اب آگے پڑھئے)

جلتے پھول

نیلا، راحت، سعادت، سیما، سلیم احمد، جانے کون کون
...ہی ایک ساتھ اندر چلے آئے ——— "احمد بھائی کہاں گئے؟"
...را بھابی ڈر گئیں ——— "ہو سکتا ہے کرنل چوکتی گیا ——— ؟ زیور سے
...ہم بھی تو غائب نہیں ہو سکتے ——— "
"تارا کو یوں لگا جیسے وہ ابھی ابھی پاگل ہونے والی ہے اس
دماغ کی رگیں پھٹنے لگی تھیں۔
"نیتا بھابی میں نے تو منع کیا تھا احمد بھائی کو ——— لیکن
ملنے ——— "اور سیما راحت سعادت یہی تھا انھوں نے اور
دیا انھیں، بالکل ہی ڈاکو سمجھ رہے تھے اپنے آپ کو ———
...پ کے زیور اتروانے آئے تھے ——— تاکہ آپ کو پریشان کریں
پھر جانے نہیں دعوت کا وعدہ لے کر واپس کریں۔ یا آپ کی منہ دکھائی
... سے دیں ——— بیک بھابی آپ بھی کیا سوچتی ہوں گی کہ کیسے
... ہیں یہ ——— لیکن بھابی نواز بھائی بہت شریر ہیں۔ سو سال
... جان انھیں چاہتے بھی بہت ہیں۔ وہ شادی میں شریک نہیں
...کے اس لیے ناراض ہو رہے تھے۔ اب اگر ہمدانی بھائی یا
... جان کو پتہ چل گیا تو ہماری مصیبت آجائے گی۔ اچھی بھابی
... بھائی جان کو مت بتائیے گا ——— ورنہ وہ ہمیں بہت
...یں گے ——— بڑے بیچارے خود تو بھاگ گئے اور
... پھنسا گئے ——— کوئی ایسے تعارف کرواتا ہے۔ کیسے
...ڈرا کر رہے تھے کہ میں اپنی بھابی جان سے اپنا تعارف نرالے
... ڈھنگ سے کرواؤں گا۔" نیلا مسلسل بولے گئی۔ فرقان جھنجلا گیا،
...بس اپنی قینچی جیسی زبان چلانا بند کرو ——— بہت بول چکی ہیں
... بھابی کی۔"

اور تارا کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ الفاظ گونج
اس کے کانوں میں اترتے گئے۔

"میں اپنی بھابی جان سے اپنا تعارف ——— بھابی جان ———
بھابی جان ——— ہمدانی بھائی ——— ڈاکٹر احمد ہمدانی ———
نواز احمد ——— احمد بھائی ——— "بھائی جان انھیں
چاہتے بھی بہت ہیں ——— اور وہ بیسٹر بھی ہیں۔ ایسے موقع
پر وہ بھی کام آئیں گے ——— ہم دونوں کی پسند ایک سی ہے۔"
"تو ڈاکٹر احسن ——— ڈاکٹر احمد ہمدانی ——— ہمارا خاندان
ڈاکٹروں کا خاندان کہلاتا ہے ——— دل کی دھڑکن کے پس منظر
میں جیبوں کی گھڑی بڑی ہیبت ناک لگ رہی تھی ——— تارا
کا دماغ سُن ہو گیا۔ سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں نہ جانے کہاں
کھو گئی تھیں ——— اس نے آنکھیں موند کر سکون کی تلاش میں
کہیں دور جانا چاہا لیکن فرقان نے اسے واپس بلا لیا۔

"بھابی ——— میں آپ کے اس نالائق بھتیجے کو بھی
ڈھونڈ کر آپ کے سامنے حاضر کرتا ہوں۔ آپ جو چاہیں اسے سزا
دیجئے گا ——— لیکن پلیز آنکھیں تو کھولئے۔"

وہ آنکھیں کھول کر کر آئی بھی کیا۔ حقیقتیں بڑی ظالم تھیں اور
خوابوں کے محل ٹوٹ چکے تھے۔ زندگی کے صحرا میں ریت اڑ رہی تھی
اور ایک بگولا اپنا مقصد تھا وہ تنکا سے برسانے پر تُلا ہوا تھا ———
بھابی ——— بھابی ——— بھابی ——— دور سے آتی
ہوئی آوازیں بڑی بھیانک تھیں ——— ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے
پیچھے ہزاروں بدروحیں چیختی چلاتی چلی آ رہی ہوں اور وہ خاموش جنگل
میں ایک مضبوط پناہ گاہ کی تلاش میں دوڑتی چلی جا رہی ہے۔

☆☆

فون کی گھنٹی بجتی ہی چلی گئی۔

تارا نے ایک نظر فون کو دیکھا اور پھر آنکھیں موند لیں۔ وہ کہیں
فون سننے اور فرقان سے بیزار ہو چکی تھی۔ اس وقت بھی وہ چاہ رہی تھی
کہ نیلا بھابی آکر فون اٹھا لیں۔ اسے نیلا کے وجود سے نفرت ہو گئی تھی
"بھائی جان کا فون ہے ——— اور آپ ہی سے بات ——؟"

تارا ——— بھیا صاحب؟"

"جی ——— میں بھائی جان میں بول رہی ہوں ——— وہ

وہ ساکن رہ گیا تھا۔ یہ آواز کسی بھابی کی شاید تھی۔ لیکن بھابی اسے پہچان گئی

کیا ——— جگا دوں انہیں۔ لیکن بھائی جان وہ تو آپ سے ناراض

ہوں گی آپ رات کو آئے کیوں نہیں۔ پہلے تو بنا اُف کے اٹھ کر کھانے پر

نہیں نہیں ——— بھائی جان میں تو مذاق کر رہی تھی۔ مجھے پتہ ہے کہ آپ

بڑے مصروف ڈاکٹر ہیں۔ رات کو ایمرجنسی ڈیوٹیاں بھی کرتے رہتے ہیں ———

لیکن بھابی بے چاری کو کیا پتہ ——— وہ تو یہ سمجھی کہ آپ نے

فون پر امی کو بتا دیا تھا حضور سے آپ نے اسے کہ بھابی کو کہہ بھی دیا

تھا ——— لیکن آپ کو خود خیال کرنا چاہیئے تھا۔ آپ کتنے دن

کے بعد ——— اوہ سوری بھائی جان ——— میں بھول گئی

تھی کہ میں آپ سے بات کر رہی ہوں۔ اچھا میں بھابی کو جگاتی ہوں

آپ ہولڈ کریں ذرا ———"

تارا کو اس کی گھبراہٹ پر ہنسی آ گئی۔ لیکن وہ ضبط کر گئی۔ نیلما اسے جگانے آ گئی تھی۔

"بھابی ——— بھائی جان ——— فون ہے آپ کا بھائی جان بلا رہے ہیں ———" تارا نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ "اللہ جلدی اُٹھئے نا ——— بے چارے کب سے آپ کا ... میں نے کہیں فون اٹھا دوں؟ ہوں ———" وہ جھک کر فون اٹھا لی ——— "لیجئے آپ بات کیجئے اپنے ڈاکٹر صاحب سے، مجھے تو کام کرنا ہے کالج کا ——— میں جا رہی ہوں۔" نیلما اس کی شرارت سمجھ گئی تھی۔ اس نے ریسیور کان سے لگا تو لیا لیکن منہ سے کچھ نہ کہا گیا اس سے۔

"ہیلو ——— ہیلو تارا آپ ہیں اس وقت؟"

"جی ہوں"

"آپ سو رہی تھیں غالباً ——— میں نے آپ کو ناحق پریشان کیا ———"

"جی ——؟"

"میں معذرت خواہ ہوں۔"

"جی ——— ہی کوئی بات نہیں۔"

"نیند پوری ہو گئی؟"

"جی ——!"

"اب تھکن تو نہیں ہے نا؟"

"جی نہیں۔"

"وہ مجھے تھوڑا سا بیزار لگ رہا تھا آپ کو؟"

"جی نہیں۔"

"تو پھر جواب اب لگا دیجئے۔ لیکن ابھی ذرا ٹھہر کر تھوڑا دیر لگانے سے تو چل جائے گا ——— ابھی تو مجھے آپ سے بات کرنا ہے۔"

تارا چپ رہی۔

"جی ہاں ——— نہیں کیا آپ نے۔"

تارا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی اور بے خیالی میں پھر "جی نہیں ———" کہہ بیٹھی اور اب ڈاکٹر حسن کی ہنسی پر اسے شرمندہ کر گئی تھی ———

"تارا ———"

"جی ———"

"میں کل رات گھر نہیں آیا تھا۔"

"جی ——— بھائی نے بتایا تھا۔"

"ہوں، تو امی نے بتایا تھا کہ میں گھر نہیں آیا۔"

"جی نہیں ——— وہ آپ کے دوست ....."

"ان میں سے امی کو میں بتایا تھا کہ میرے دوست کو ڈیوٹی ٹھیک ہو گیا ہے۔ وہ ہر چیز میں ایڈمٹ ہے۔ اور میرا اس کے پاس رہنا بہت ضروری ہے۔ لیکن ایسی کوئی بات نہیں۔ میں خود گھر نہیں آنا چاہتا تھا۔ امی اور نیلی کو مطمئن کرنے کے لیے صرف اسی قسم کا بہانہ کارآمد ہو سکتا ہے ——— ہاں آپ تو یہ پوچھنے سے رہیں کہ میں کیوں گھر نہیں آنا چاہتا تھا۔ لیکن میں بتا دوں کہ میں اس لیے نہیں آیا تھا کہ آپ رات کو آرام سے سو سکیں۔ مجھے پتہ ہے کہ آپ پچھلی تین چار راتوں سے سو نہیں سکی ہیں۔ سونے سے پہلے ڈر ڈر کر مجھے دیکھتی تھیں اور اگر کبھی آنکھ لگ بھی گئی تو چونک کر اٹھ جاتی تھیں۔ ظاہر ہے یہ خوف میری جانب ہی سے تھا آپ کو ——— ویسے بھی میں ڈاکٹر ہوں۔ مجھے مریضوں کا خیال رکھنا چاہیئے۔ آپ کی نیند اگر پوری نہ ہوتی تو آپ سخت بیمار ہو سکتی تھیں۔ ابھی تو آپ بخار کی وجہ ہی سے کمزوری محسوس کر رہی ہوں گی۔ لیکن کل ساری رات میں بھی نہیں سو پایا۔ بڑے کٹھن تھے سارا وقت ہی لگتے ——— اور پھر تو تنہائی کا پہروں کی گھن گرج کے ساتھ میرے اوپر شلاتے رہے ——— ویسے نیا تجربہ تھا ——— مجھ پر بیتی تو مجھے مریضوں کا احساس ہوا ——— وہ ——— آپ تو بور ہو گئی ہوں گی ——— کیوں تارا؟"

"کچھ بھی نہیں۔"

"تو اگر آپ اجازت دیں تو آج آپ کے گھر رہ کر دیکھ لوں [illegible] کو سمجھ سکی تھی واقعی۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔"

"میری مرضی! تارا میری مرضی سے کیا ہوتا ہے۔ میری مرضی تو بہت کچھ تھی لیکن آپ نے اجازت ہی نہیں دی ——— لیکن گھر آنے کی اجازت تو دے سکتی ہیں نا آپ۔"

"آ جائیے۔"

"یوں نہیں تارا ——— آپ اتنی بے دلی سے کیوں کہہ رہی ہیں۔ آپ چاہیں تو منع کر دیں ——— بخدا میں نہیں آؤں گا، دیکھیں تارا ہم لوگ اچھے دوست ہیں۔ آپ کمرے میں میری موجودگی سے پریشان ہوتی ہیں تو بتا دیں۔ ویسے آپ کو مجھ پر اعتماد کرنا چاہیئے دیکھیں گھر آیا تو وہیں سونا پڑے گا اپنے کمرے میں ——— امی اور نیل کو میں کسی شک و شبہ میں نہیں ڈالنا چاہتا ——— اور پھر بہت دنوں بعد یہ خوشی ملی ہے انھیں ——— کہیے تارا آپ ہیں نا فون پر ———"

"جی ——— ہوں۔"

"تارا ——— !"

"جی ——— !"

"آپ گھر نہیں گئیں؟"

"نہیں ———"

"کیوں ——— ؟"

"بس ویسے ہی دل نہیں چاہ رہا۔"

"نواز آیا تھا؟"

"جی ——— جی نہیں ———" تارا پریشان سی ہو گئی۔

"اچھا تو پھر میں اسے لیتا آؤں گا۔ بہت شرمندہ ہے وہ بیچارہ۔ اچھا تو پھر ——— خدا حافظ۔"

"خدا حافظ ———" تارا نے ریسیور کریڈل پر رکھ کر گہری سانس لی۔ اسفند کس کس طرح امتحان لے گا میرا ——— اب نواز کا سامنا کیسے کروں گی ——— اس کی [illegible] نظریں میرے جسم کو [illegible] طرح چھید ڈالتی ہیں ——— اسفند ایسے پریشان [illegible] تم بیٹھے [illegible] اور نواز نے جب [illegible] کہا تھا کہ [illegible] ہو تم بالکل ٹھیک [illegible] ہو گیا ہے ——— کہیں ہماری [illegible] کا کورس تو نہیں...."

"جی ——— نہیں نہیں ——— [illegible] اور تم کس قدر [illegible] بہت [illegible] ———

"یار کل کتنی گرمی ہے ——— [illegible] دل پر [illegible] ہے یا [illegible]...."

"ملی ——— کیں ——— یہ بات تو ہے۔ میں [illegible] گیا ہوں۔ میں تھک گیا ہوں یار ———" "تم نے [illegible] میں کہا تھا نواز، لیکن تمہاری آواز بھاری ہو گئی تھی۔ تمہارا سر جھک گیا تھا۔ اور جب [illegible] نے [illegible] لگائی تھی۔ ڈیئر کرنل! بات غلط ہو گئی کیا۔ [illegible] آ گئے؟" اور تم نواز اس [illegible] ٹھیک سے [illegible] ——— کیا حال ہو گیا تھا تمہارا ——— تم ——— تم سے تو [illegible] کیوں نہ کیا ——— نواز ——— بہادری کا کورس [illegible] تم اپنے [illegible] سے [illegible] ——— تم ڈر گئے ہو ——— لیکن میں تو نہیں ڈرتی میں بہادر ہوں ——— بہت بہادر ——— تم [illegible] نہ بنی نواز تو میں اس کی [illegible] نہیں بنوں گی ——— میں نے بڑے وثوق سے بڑے اعتماد سے اس کے [illegible] اپنی محبت کا ذکر کر دیا ہے۔ میں اپنی محبت کا تمسخر نہیں اڑواؤں گی ——— ٹھیک ہے نواز تم بہادر بنو میں بزدل نہیں بنتی ——— [illegible] محبت کرتی رہوں گی [illegible] میرا ساتھی تھا ——— جو اتنا [illegible] اتنا [illegible] کہ ——— کہ اس دنیا میں کوئی دوسرا نہیں ——— ٹھیک ہے جناب نواز احمد صاحب ٹھیک ہے ——— اب وہی ہو گا جو اس دن سر نے کلاس میں بتایا تھا ——— غالب کا شعر تھا نا کہ؛

یا رب چھیڑ چلی جائے اسد

[illegible] وصل تو حسرت ہی سہی

یہ شعر سن کر [illegible] ——— تم شعر [illegible] سوال کر رہے تھے ——— پھر [illegible] لڑکوں کو [illegible] ——— سب ہی جھوم جھوم کر کہہ رہے تھے کہ یا رب چھیڑ چلی جائے اسد ——— یا رب چھیڑ چلی جائے اسد ہم سب لڑکیاں [illegible] جا رہی تھیں ——— اور تم [illegible] سے [illegible] رہے تھے کہ [illegible] ٹھیک ہے کہ غالب [illegible] کی سی حسرت اور ناامیدی نہیں لیکن یہاں پر غالب وصل سے [illegible]

گئی ہیں —— جہاں تک پیسے پھینکنے کی بات ہے وہ تو غالب کی شرحی کی آئینہ دار ہے لیکن وصل —— وہ سرتے بلکہ مناسکر تمہیں بیٹھ جانے کا اشارہ کیا تھا۔ تمہارے ساتھی سی ساتھی شوخ چلانے لگے تھے —— اور آپ نے بیٹھتے وقت لڑکیوں کی سیٹوں کی طرف بہت شریر انداز سے دیکھا تھا اور میں نہ جانے کیوں کٹ سی گئی تھی ناز —— لیکن تم دوبارہ نہیں جھکوں گی —— تم آؤ ناز شوق سے آؤ —— تم سے اب بچھڑ کے چلا گیا —— میں تمہیں چاہتی رہوں گی —— ستاتی رہوں گی —— دیکھو رہی کہ تمہارا سودا کتنا ہے —— تم کب تک اجنبی بنو گے ——

اب تمہیں تمہارا سودا دیکھنا ہے، تمہارا ضبط تنا چاہیے فراز احمد بھائی۔

تارا مسہری پر سے اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آ کھڑی ہوئی

گھنگھریالے بال —— زندگی سی بھری بھری سادہ چہرہ —— دھلی دھلی آنکھیں —— پھیکے ہونٹ۔

کیسی اجڑی اجڑی ہوئی لگتی ہو تم تارا —— بس یوں لگتا ہے جیسے ابھی ابھی تمہارا ماتم ہوا ہو —— ! —— کیسی زندگی کا بھی ماتم ہوتا ہے —— لیکن اپنا وجود بھی کسی جنازے سے کیا کم ہے —— ! لیکن اب اس پر پھول بھی چڑھانے ہوں گے تاکہ وہ میت خوبصورت لگے تو تو پر لوٹے —— تمہیں پتہ ہے فراز احمد تم تمہارا ہی منتظر ہیں۔

تارا مسکرا کر کھینچ کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ گئی۔ اس نے دراز کھول کر میک اپ کا سارا سامان نکال لیا —— چہرے پر پاؤڈر جما کر اس نے ہونٹوں کا شیڈ بھی دے ڈالا۔ پلکوں کے اوپر آئی لائنر جھکا کر اس نے ایک دو بار پلکیں جھپکائیں —— ہائے کیسی لگنے لگیں میری آنکھیں —— ! تمہیں ان آنکھوں پر بھی اعتبار نہیں رہا تھا —— بے حس کہیں کے —— اور لپ اسٹک کا شیڈ —— نہیں یہ نہیں —— اور یہ والا یہ بھی عجیب ہے —— اف اتنی ساری لپ اسٹک میں سے کس کا انتخاب کروں —— پتہ نہیں فراز کو کون سا شیڈ اچھا لگتا ہو —— کتنا اچھا ہوتا کہ میں تمہاری پسند کا میک اپ کرتی —— اف کتنی خوش قسمت ہوتی ہیں وہ لڑکیاں —— جو اپنے چاہنے والوں کی پسند سے اپنے آپ کو سجاتی ہیں —— ان کی پسند کے مطابق پہنتی ہیں سجتی ہیں —— کتنا مزہ آتا ہوگا انہیں جب وہ اپنے آپ پر کتنی مغرور آتی ہیں وہ —— انہیں فقط چاہ ہی تو چاہیے نا ——

شدید احساس کا پیدا —— لگتا ہی پیدا نہیں ہوتی حفاظت ہوتی ہے —— بیٹھتے ہی لگ —— مجھے نہیں کے —— اسلام ہم اپنے پیار کو آزمائیں تو دیکھیں —— اس نے آئینے میں جھانک کر اپنے عکس سے پوچھا —— ٹھیک ہے تمہارا دعویٰ غلط ہے تو پھر بھی —— اب ہم بھی اپنے پیار کو آزمائیں گے —— اس نے اپنے بال سنوارتے ہوئے عجیب سی بے بسی سے کہا —— کتنی مضطرب ہو رہی ہے انجانی کاوش کوئی جان سکتا —— اس کی سوچ ذہن کی دیواروں سے سر پھوڑ رہی تھیں —— اس کے جذبات اتھل پتھل ہو رہے تھے —— وہ اپنے آپ کو بہت مطمئن اور پرسکون ظاہر کرنا چاہتی تھی پاگل لڑکی۔

لپ اسٹک کا شیڈ لگا کر ہٹتے ہٹتے وہ ایک دم چونک پڑی نیل دروازے کے پاس کھڑی شرارت سے مسکرا رہی تھی۔ "بھابی جان —— بھائی جان آنے والے ہیں، تبھی سنور رہی ہیں ——" اس نے ہنس کر نیل کو دیکھا۔

"تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا نیل۔"

"اوف —— اف —— اوف —— میں گری مجھے سنبھالو ——" وہ مصنوعی غش کھاتے کھاتے سنبھلی اور سرگوشی میں بولی تھی۔ "بھابی جان —— ! میرے ننھے بھائی جان کہیں کے نہیں رہیں گے۔ ٹھیک ہے بھابی آج تو اپنے ترکش کے سارے تیر ہی آزما ڈالیے تاکہ بھائی جان آئندہ کبھی رات باہر گزارنے کی جرأت نہ کر سکیں —— لائیے بھابی میں آپ کی کنگھی کر دوں —— آج آپ بال کھلے چھوڑ دیں —— اور کپڑے نہیں بدلے آپ نے —— یہ تو گیلے ہو گئے —— اسے بھابی گلابی کیش کے کام کا دوپٹہ پہن لیجئے اس کے ساتھ آتا یا چاہے ہو —— نہیں اسے چھوڑیئے۔ اچھا ایک منٹ میں بھرت کی قمیض ہے بھی شیفون سے —— بھری ہوئی جیسی زرد ہے اور اس کے ساتھ پھولے پھولے پھولوں والا دوپٹہ ہے —— بھابی جان آپ کو میری قسم وہ پہن لیجئے —— میں ابھی نکال دیتی ہوں پھر تو بھائی جان آپ کو دیکھ کر اپنی ساری تھکان بھول جائیں گے اور بھابی الماری سے وہ لے آؤ —— نکال بیچ ساری سوٹ لگ رہی ہے —— میں الماری میں سے وہ والا جوڑا نکال لاؤں۔" نیل کمرے سے گئی اسے پتہ ہی نہ چلا تھا۔ وہ تو ایک ٹک آئینے میں اپنے عکس کو دیکھے جا رہی تھی۔

"اسے فراز میرے سے کب تک گیا ——؟"


عورت نسوانیت حسن اور لطافت کا پیکر
مگر یہ مردوں کی طرح شیو کیوں؟
کیسی انوکھی بات! آپ ہیں تو عورت! لیکن اپنے
غیر ضروری بالوں کو مردوں کے انداز میں شیو کر کے دور کریں!!
اور اب تو اینفرینچ کریم یا لوشن آپ کے بازوؤں کے نیچے اور ٹانگوں
کے بالوں کو یوں صاف کر دیتی ہے جیسے وہاں بال تھے ہی نہیں
اینفرینچ بہت ہی محفوظ ہے۔ اس کے استعمال کا فائدہ یہ ہے
کہ نہ کٹنے کا اندیشہ۔ نہ جلن کی مصیبت۔ نہ ہی داغ دھبے
دیکھئے آپ اینفرینچ استعمال کیجئے اور نسوانیت کو نکھاریئے
یہی نسوانیت کا انداز ہے۔ اسی میں دلکشی ہے۔
گلاب اور لیمن کی خوشبوؤں کا انتخاب
اینفرینچ

ممی تو تب تک تیار ہو چکی تھی ——— ٹھیک تم ———
آج کل کب جیسے ہو ——— پھر وہ سب کچھ ختم ہوا ——— اب
ہم لوگ آفس کے لیے نکلیں ——— ابھی وہ سنگھار میز پر بیٹھی تھی
پھر کمرہ وہ ممی کی طرف لوٹ آئی ——— "میں نے کیوں بلایا
اپنا آپ کو ——— ؟ میں نے کیوں میک اپ کیا ——— جب
وہ آئیں تو آئیں گے ڈاکٹر احسن ——— وہ مجھے دیکھ کر کیا سوچیں
گے ——— یہی سوچیں گے کہ میں بڑی خوش ہوں، بڑی مسرور
ہوں اور ان کے لیے میں نے اپنے آپ کو سنوارا ہے ——— اُف
اگر وہ بہک گئے تو ——— آج کی ساری رات ——— ان کے
ساتھ اس کمرے میں ——— ہلکی ہلکی سرگوشیاں ———
خاموشی، سناٹا اور پھر میرا میک اپ ——— اللہ نہیں نہیں ——— "
تارا نے دونوں ہتھیلیوں سے گال مسل دیے۔ روج اور پوڈر ہتھیلیوں
پر لگا کچھ گال میں جذب ہو گیا ——— بے کار نہیں بیٹھے رہنا
تھا ——— پریشان اور اُجڑی اُجڑی سی ——— اور پھر بیٹھ
گیا ——— وہ آگئے تو آجائے ——— میں کوئی اس کی ہوں
جو اس کے لیے سجوں ——— وہ میرا کون ہے ——— ؟
کچھ بھی نہیں نا آخر پھر ——— یہ سب کیوں ——— ؟ اللہ میاں مجھے عقل
دے ' اللہ میاں مجھے سکون دے، میرے اللہ مجھے طاقت اور حوصلہ
دے ———

وہ تکیے پر سر ٹکا کر لیٹ گئی ——— تھوڑی دیر میں نیلی آگئی
اس نے انکار کیا، منانے کے بہانے بہت بولی لیکن اس کی منتوں کے
آگے تارا کو ہار جانا پڑا۔

وہ مسہری پر بیٹھی تو نیلی نے کہا ——— کتنی پیاری لگ رہی ہیں
کانپنے لگیں۔ یعنی تو بستر پر کانچ کے ٹکڑے پھیل گئے ——— تم باہر
آگئے ہو نواز ——— احسن تم سے باتیں کر رہے ہیں لیکن تم
بہت دھیرے دھیرے بول رہے ہو ——— نیلی کہہ رہی ہے
امی پتہ نہیں کیا کہہ رہی ہیں ——— اور تم ——— تمہارے
بول بھی بھیگے ہوئے ہیں نواز ——— ؟

"ہم نواز بیٹے ——— آج تارا بیٹی کمرے میں چائے
نہیں پئیں گے" امی کی آواز سنائی دینے لگی۔ "اور احسن بیٹا تم گئے
نہیں اس کے پاس۔ تم نے اس کا حال نہیں پوچھا ——— اس کی
طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"
"کیا ہو گیا ——— ؟"

اسے لفظ نہیں آواز ترستی ہے ——— تم اتنے چپ کیوں
کیوں ہو ——— ؟ پھر کچھ بھی بہت ٹھیک کیا۔
"بخار ہو گیا تھا ——— " امی جواب دے رہی تھیں۔ "اب تو
اللہ کا شکر ہے ——— بخار کم ہو گیا ہے ——— اور پھر یہ
کالج جانے کی بھی ہے ——— مجھے تو تمہارا پیار آتا ہے اس پر اللہ
اس کی تکلیفیں مجھے دے دے۔ رات وقت کی بات ہے امی مجھی اور ان
کو بھی پیار آتا تھا ہم پر۔ احسن بیٹا تم بہت کچھ کھا رہے ہو ———
وہ چیز تو اٹھاؤ بیٹا ابھی سے گرتے ہو۔"
"نیلی سے آنے گی امی۔"
"پھر تو چلی تو نیلی سے آئے گی لیکن وہ دوائیاں ہو رہے ہو
اس کے لیے۔ کیا ان کے متعلق بھی نیلی ہی جانتی ہے ——— اسے اس
نیلی نے چائے کا کہا کہ نہیں ——— آجاؤ بیٹا نواز آجاؤ نا۔ وہاں کیوں
کھڑے ہو گئے تم ؟"
"میرا خیال ہے امی ہم لوگ چائے باہر لان میں پی لیں۔"
"نہیں بیٹا ——— ادھر آجاؤ ——— بچی اکیلی ہے ———
اسے بخار بھی تھا وہ باہر کیسے آئے گی ——— اور نیلی چائے کے علاوہ
مٹھائی بھی لیتی آنا احسن بھائی کے لیے ——— آؤ ——— آؤ ———
اور بیٹھو ——— اسے بخار کی کچھ بھی تو ——— شرما گیا ———
تم لوگوں کی طرح کی ہے ——— دیکھو میرا فرقان چلا گیا تو کیسا گھر
سنا ہو گیا ——— اور تم بھی آ جایا کرو نا، آج کل کا کی تو بند ہو گئے"
"جی ——— جی ہاں !!"
"اور اب ——— " کل سے سب لوگ کمرے میں آسکتے ہیں
اب مجھے پلٹ کر اسی کو سلام کرنا ہو گا ——— اور تم سامنے ہو گے،
"احسن تارا بیٹے !"
"السلام علیکم ——— امی ——— "
"اور ماشاء اللہ ——— ماشاء اللہ ——— بیٹیا جیتی رہو
اللہ تمہیں خوش رکھے۔ دیکھا کیسی پیاری لگ رہی ہے سندھی کام کی
قمیض میری بیٹی پر ——— یہ چوڑیاں اسی طرح پہنے گی ندی کی ہیں
گی ——— نظر لگ جائے گی میری بچی کو ——— ذرا سا کالی رہتا
سے کاجل کا ——— اللہ بہتر نہیں ہوتا ——— ٹیکا اور نظر تو بہت
یقین بیٹا ——— اس کے ساتھ چاندی کا سیٹ اچھا لگے گا ———
وہ پہن رہی تھی ——— نیل ——— نیلا ——— بچا ہی بجان کر
چاندی کا سیٹ نکال کے رو ——— سرخ اور پھر گر کر رو چھن رونا لیکنہ

زور میں ——— خوشگوار ہی ہے ——— [illegible]
صوفے پر۔ دیکھو آج ہم سب ناشتہ کر رہے ہیں جانے کب سے آئے ہیں
پھر کھانا پڑا ہے۔"

"بھئی کیسی طبیعت ہے آپ کی؟"

وہ مسکراتے ہوئے بیٹھ گئی ——— سامنے احسن بیٹھے
تھے۔ بس رونا تھا تو ایک بے حد احساس کہ نواز سامنے بیٹھا ہے۔

"تمہارا بھئی ——— کیا پوچھ رہے ہیں احسن؟"

"جی ——— بس ——— ٹھیک ہیں۔"

"آپ کی طبیعت کیسی ہے جناب؟"

آنکھیں شرارت سے چمک رہی تھیں ڈاکٹر احسن ———
اس نے جھکی جھکی نگاہوں سے ڈاکٹر کو دیکھا اور دھیرے سے بولی۔

"جی ——— ٹھیک ہوں ——— بالکل ٹھیک ہوں۔"

"تو اس قدر گھبرانے کی کیا بات ہے تارا؟"

"اوہ۔ گھبرانے کی کیا بات ہے، آپ ہوتے ہیں ہماری بگڑی تو کچھ
احساس ہوتا نزاکت کا ——— کہ عذاب گزر رہے ہیں آپ پر
تو ہم ہی جانتے ہیں۔"

"جی میں گھبرا تو نہیں رہی۔"

"اور نواز آپ کو کیا ہو گیا ہے؟" ڈاکٹر نے نواز کی طرف دیکھتے
ہوئے کہا۔ "بس نا بھول گئے کیا ——— ؟ امی جان ایک تو بات
سنی آپ نے ——— آج یہ صاحب یہاں آنے سے انکار فرما
رہے تھے۔ ایک تو پیسے والے دن سے خود غائب رہا اور پھر جب ہم
گاڑی لے کر دعوت کرنے پہنچے تو انکار ہو رہا تھا۔"

"نہیں احسن بھائی ایسی ——— کیا بات ہے جی؟"

"کچھ نہیں امی ——— بس ایسے ہی سر میں درد ہو رہا تھا۔"

"کیا ہو گیا ہے بیٹے ——— میں دیکھ رہی ہوں جس دن سے تم
لوٹے ہو ٹھیک نہیں ہو۔ مزاج گر گیا ہے ——— وہاں لکھا یا کچھ ہوا
میں لکھا ——— میں کہوں کیا ہو گیا ہے اسے کہ آخر چپ چپ
کیوں ہے ——— ویسے میں ابھی بس کام میں بیٹھے ہے کوئی بھی
نہیں کی ——— کیا ملا اس جو ابھی تک شادی میں مزید لے نہ بیٹھا
تم تھے ہی تو ڈراما میرا کوئی ٹھیک ہے کہاں نہیں تھا آج یہاں ہو
کل وہاں ——— تمہی دیکھ لو کس پہ ہے۔"

"نہیں نہیں امی یہ بات نہیں۔ تمہارا حلق کیسی؟"

"تو پھر بتاؤ کیا بات ہے؟"

ہماری آنکھ بند ہونے کی دیر ہے ٹوٹی ہوئی ہی تارا کا حل چاہا۔
تو اتنا کچھ ہو سکتا ہے کہ لکھا گیا ہے۔ یہ کیسے یہ بیان کی تھی اور سوچنے
سامنے۔ بس سوچ سوچ کر رہ گئی۔

"ہاں نواز یہ بتاؤ کہ آج تم ہی کچھ کیا کہ غصے میں ہو۔" احسن
نے تارا کے چہرے کا لکھی دیکھتے ہوئے یہ پہلے بھی ہوتے ہوئے نواز سے پوچھا
"——— یہ آپ مستقل رہیں گے ——— ؟" نواز نے جانے کیسے
دیا نواز نے یہ تو اس کو خود بھی پتہ نہ چلا۔

"بہت خوب ——— بہت خوب بھئی! کیوں نواز تم
یہاں اس دن کی طرح باہر پھر بھاگ جاؤ گے؟"

"خالی تو رہنا کر رہے گئے تھے اب پھر وہاں کیا کریں گے ———"
وار کرنے کے لیے پر اچھا ہو گئے ہیں تھا اس کو۔ اس نے نظر پھیر کر نواز
کو دیکھا اس کا چہرہ دکھوں کی نشانی ہو گیا تھا ——— آنکھوں میں
بے پناہ اضطراب تھا ——— کیا لکھا ضبط کے سبب تھا وہ ———

"یہ کیا ہستی اور رونق کی بات ہونے لگی۔ ڈاکٹر وہ ابھی تک
نہیں گیا ابو تھوڑا کے۔" "امی تو یہی کہ ہیں اچھی ہیں۔"
تم خوش نہیں ہو کے تو تمہیں سے بات نہیں تھی ——— بھول
پھر دیکھو تم ہونا چاہیے ——— اگر نواز کیا اچھے ہوا بیٹھا بھی ہے

"میں سمجھ اکتا رہے مجھے باتیں کی احسن بھیا۔"

"شکریہ کہ ہے ہو؟" احسن نے مسکرا کر نواز کی طرف دیکھا تھا
"معمولی ہونے کے لیے ہی نہیں کبھی کبھی بیٹھنے کے لیے بھی
کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر بیٹھا اور بیٹھنے کو اچھا ہو اور بیٹھنے والے
سے ڈر نہ ہو تو ——— ؟" تارا نے سر جھکا کے نیچے کر دیا۔

"اور وہ شرطیں ——— کیا جواب دیا ہے۔ یہ ڈاکٹر صاحب
تم لوگ کو کیا کہتے ہو اس رشتے کے بارے میں۔"

"مانتا ہوں ساتھ سب ہے جو حیران ہوں عقل چاہیے لگے کسی نے
اتنا چھپایا ہوا ہے جان۔"

"ہاں یہ بات تو ہے تم بھی ٹھیک کہتے ہو نواز میاں۔"

"یہ بھی خوب رہی۔ سو تو آپ پہ نیت کر سکتے ہیں ———
لیکن سلوک تو اس سے بہتر ——— انہیں سے اعتراض ہوا کیوں کہ
انہوں نے تو ماننا ہی ہے۔" کہ ایک جھلک سی نظر نواز پر
ڈال سامنے دیوار پہ لگی پینٹنگ کو گھورنے لگا تھا۔

"ہاں بھئی آپ لوگ احمد صاحب!" احسن نے نواز سے پوچھا تو
وہ چونک گیا۔ "بیٹے صاحب وہ یہاں پر موجود ہی نہیں تھے۔ کہاں

پہلے سے بھی بڑھ کر ——— ادھر سے نیل آگئی تھی ———
چائے پی گئی کہ نہیں۔ بھئی تم نے خاصی دیر کر دی۔ وہ ایک دلچسپ مناظرہ سن رہی تھیں تم۔"

"کیوں احمد بھائی! آپ مناظرے بھی کرنے لگے ہیں!"

"مناظرے!" وہ ہنس دیا "بہت عجیب طرح ——— نیل یہاں نظارے کی تاب نہیں ہے تم مناظرے کی بات کر رہی ہو ——— دیکھو ——— وہ سامنے کی پینٹنگ کتنی خوبصورت تخلیق ہے، پہاڑوں سے آتی ہوئی ندی بظاہر کتنی پرسکون نظر آ رہی ہے لیکن اس کی لہروں کا اضطراب کوئی نہیں جانتا ——— اور ندی سے پانی بھر کر جاتی ہوئی سندھی لڑکی اتنی پریشان کیوں لگتی ہے ——— خود مصور سے غلطی ہوئی ہے۔ اسے لڑکی کو یہاں ندی کنارے منتظر کھڑے دکھانا تھا ——— اور نیل ———" نواز ایک آنکھ دبا کر شرارتاً سا ہنسا "واقعی تم بھی تو ایسے اس خاتون کو دیکھ رہی ہو۔"

نیل نے ہنس کر تارا کی طرف دیکھا۔

"ارے پاگل ہو، نہیں ادھر دیکھو پینٹنگ میں ——— وہ خاتون جو پانی کے دو گھڑے تو سر پر اٹھائے ہوئے ہیں اور ایک کمر پر۔ یعنی اسی تعداد میں لادا ہوا ہے اور بلندیوں کی طرف جا رہی ہیں۔ پہاڑوں پر چڑھنا آسان نہیں ہوتا۔ انھوں نے ایک قدم آگے بڑھایا تو لگتا ہے لڑکھڑا پڑیں گی وہ۔" "جانے کیوں وہ منظر پیارا لگا تھا ——— ایسی اُلٹی سیدھی باتیں تو اس نے کبھی نہ کی تھیں۔

نیل خوب ہنس رہی تھی۔ "بھئی نواز بھائی آپ بہت شریر ہیں!"

"نیل ویسے یہ بیچارے بھائی ہی نا ——— میرا مطلب ہے بڑی ظلم پرور لگی ہیں!"

"کون احمد بھائی؟" نیل نے ہنستے ہوئے تارا کی طرف دیکھا۔

"بھئی میں پینٹنگ کی بات کر رہا ہوں ——— اس میں بہنے کیا بات ہے ——— ویسے کافی تبدیلیاں ہو گئی ہیں۔ ڈرائن سی کمرے میں آگیا ——— بڑی الماری یہاں سے اُٹھ گئی ——— اور یہی بنا گھر کی رونق بڑھ گئی ہے ——— بڑی خوبصورت ہے پینٹنگ ——— میرا دل چاہ رہا ہے اسے تو یہاں سے چرا کر لے جاؤں اور اپنے کمرے میں سجا لوں ——— !" وہ پھر سنجیدہ ہونے لگا۔

"بدمعاش! آنکھ نہ تا اپنی حرکتوں پر ——— پینٹنگ ابھی سے رہی ہے تو سیدھی طرح مانگ لو، مگر مجھ سے نہیں! اپنے پاس سے۔"

"نہیں جان سے کیوں ——— میں تو آپ سے مانگوں گا۔"

زور زار احمد تم مجھے کچھ جان کے غصے کرتے ہو ——— لیکن طنز کرنے سے باز نہیں آتے۔ تارا نے پیر کے انگوٹھے سے قالین کریدتے ہوئے دُکھ سے سوچا۔

"کیوں بھئی مجھ سے کیوں مانگو گے ——— یہ تو تمہاری بھابی جان کا ہے ——— ان سے مانگو!"

"ڈبل بیڈ والا کمرہ سنگل آدمی کا نہیں ہوتا۔" جلنے دو جیسے کہ گیا تھا جو لگ گئی۔ نیل نے اپنی ہنسی دانت سے ہونٹ دبا کر روک لی۔

"اچھا ——— یہ بھی تم نے چھپایا۔" احسن نے نواز کی پیٹھ پر ہاتھ مار کر بات مذاق میں ٹال دی۔ آخر وہ ان کا بھتیجا ہی نہیں دوست بھی تو تھا۔ لیکن کوئی بات کوئی خلا کوئی چیز دل میں اٹک سی گئی تھی۔

احسن سوچنے لگا۔ ڈبل بیڈ والا کمرہ سنگل آدمی کا نہیں ہوتا ——— یہ بات سب جانتے ہیں، لیکن یہ کوئی نہیں جانتا کہ یہ ڈبل بیڈ ابھی تک سنگل آدمی کے لیے ہے۔ میرا اعتقاد تو یہ صوفہ ہے ——— میں صوفہ پر نہ سوؤں تو وہ سو سکے گی۔ میں اتنے بڑے بستر پر اکیلا جاگتا رہوں گا۔ سلگتا رہوں گا، نہ جانے کب تک ——— میں جانتا ہوں کہ ایک دن وہ مجبور ہو کر مجھ پر ضرور بہک سکی ——— آخر وہ لڑکی ہے ——— اور وہ سب کچھ جانتی ہے۔ آجکل کی لڑکیاں نادان نہیں ہوتیں اور میں اس کا شوہر ہوں ——— مجازی خدا ——— ہرکارہ ——— ایک دن اسے میرا خیال ضرور آئے گا ——— تب میں اسے اس کی انتقام پسندی کی کوئی سزا دیئے بغیر اسے سینے سے لگا لوں گا ——— لیکن کب ——— ! میں آخر کتنا انتظار کروں گا ——— ضبط، جبر ——— میں کس کس طرح اپنے آپ کو مارتا ہوں ——— وہ پاگل لڑکی مجھ پر ستم توڑنے کے لیے آج اور یہاں کر بیٹھی ہے۔ اس کی طرف دیکھتا ہوں تو ضبط چھٹنے لگتا ہے، واہ آنکھیں چرا آتا ہوں تو دل بند ہونے لگتا ہے۔

"بھائی جان آپ کی چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے اور مٹھائی لیجئے نا۔" یہ کہہ کر نیل نے دیکھا امی جان نماز کو چلی گئیں۔

"بھابی آپ چائے نہیں پئیں گی ———" نیل اس سناٹے میں اکیلی گھبرا رہی تھی۔ بھائی جان خود اپنے ہاتھ کو گھورتے کچھ سوچنے کیا سوچنے لگے تھے ——— احمد بھائی کبھی کبھی بھابی کو دیکھتے اور پھر پینٹنگ میں کھو جاتے ——— اور بھابی مستقل سر جھکائے پیر کے انگوٹھے سے قالین کرید رہی تھیں۔

"ہاں ابھی نواز جا رہے تھا ——— کیا سوچنے لگے تم؟" احسن نے نواز سے پوچھ لیا۔

"میں نے تو آپ کو سوچتا ہوا چھوڑ دیا تھا ——— ہاں احسن چچا! ایک بات پوچھوں آپ سے ——— بُرا تو نہیں مانیں گے۔"

تارا کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کپ کی چائے تھرتھرا کر چھلکنے لگی۔ اس نے کپ نیچے رکھ دیا۔

"نہیں بیٹی نہیں ——— میں تو بڑی چھوٹی باتوں کا بُرا نہیں مانتا ——— پوچھو اپنی بچی سے۔" احسن تارا کو دیکھ کر عجیب طرح سے مسکرانے لگے۔

تارا نے نچلا ہونٹ دانتوں میں داب کر سوچا ——— ٹھیک ہے ——— تم دونوں مل کر اپنی اپنی جگہ سے مجھ پر پتھر پھینکو میں اکیلی تم دونوں کے وار سہوں گی، کیونکہ تم دونوں ہی اپنی اپنی جگہ اپنی دانست میں میرے ہمدرد میرے غمگسار ہو نا۔

"احسن چچا آپ نے ابھی کہا تھا کہ پیکر وہ آپ کا نہیں اس لیے میں آپ کی بجائے ان سے یہ پینٹنگ مانگوں ——— لیکن احسن چچا پیکر اگر ان کا ہے تو یہ تو آپ کی ہیں ——— ان کے مالک و مختار تو آپ ہیں نا۔ اس لیے میں آپ سے کیوں نہ مانگوں اس پینٹنگ کو۔"

"لیکن یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ یہ میری ہیں۔"

تارا کی پیشانی پر شبنم اُتر آئی ——— دل نے اُچھلنا شروع کر دیا ——— ڈاکٹر احسن ——— یوں مجھے ذلیل مت کرو اس کے سامنے۔ ادھر تو دیکھو ——— یہاں نیلا بھی بیٹھی ہے۔

"یہ میری نہیں بلکہ ———" وہ تھوڑا سا مسکرائے۔ "بلکہ میں ان کا ہوں۔"

اور نیل کھلکھلا کر ہنس پڑی ——— تارا نے ایک لمبی سانس لے کر جھکا ہوا سر اوپر کر لیا۔

"اوہ یہ تو بہت بُرا ہوا ——— یعنی آپ بھی گئے ہمارے ہاتھ سے۔"

"ہاں جی ——— بالکل گئے۔ اب ہاتھ دھو لو تم لوگ ہم سے۔" احسن پھر شگفتہ نظر آنے لگے۔

"وہ تو ہم پہلے ہی دھو چکے ہیں۔" نواز نے ایک نظر تارا پر ڈالی اور تارا کہیں خلاؤں میں گم ہو گئی۔

"احمد بھائی!" نیل نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔ "آپ کسی سے دریافت کیجئے، پینٹنگ آپ کو پسند آگئی ہے اس لیے تحفتاً سامنے دیوار پر سے اتار لیجئے اور گھر لے جا کر اپنے کمرے میں ٹھیک اپنے بستر کے سامنے لگا لیجئے۔"

"لیکن نیل اس کام کے لیے بہادر آدمی کی ضرورت ہے۔" ملا ہی ہر چیز ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتی تھی۔

"تو کیا آپ انہیں بزدل سمجھتی ہیں؟" نیلا اور احسن ایک ساتھ پوچھ بیٹھے تھے ——— اور اب وہ جواب سوچ رہی تھی، لیکن نواز خود بول اٹھا۔

"وہ جو کچھ کہہ رہی ہیں انہیں کہنے دیجئے۔ آپ لوگ تو جانتے ہیں کہ میں بزدل نہیں ہوں تو آہستہ آہستہ سمجھ جائیں گی یہ بھی۔ لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ میرے پاس ایک دل ہے۔"

"جو اس پینٹنگ پر آ گیا ہے۔" نیل نے جملہ پورا کر دیا۔

"ہاں ——— آ گیا ——— لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اگر میں اسے یہاں سے اتار کر لے بھی جاؤں تب بھی میرا دل خوش نہ رہ سکے گا۔ وہ یہ سوچتا رہے گا کہ احسن چچا اسے ہر روز ناشتے سے لاتے ہوں گے اور اب ان کا دل کو سونا ہو گیا ہوگا ——— وہ اسے دیکھنے کے عادی ہو گئے ہوں گے۔ اب انہیں وہ جگہ خالی خالی سی لگتی ہوگی ——— اور میرا دل یہی سوچے گا ——— کہ میں نے کس بہادری سے قبضہ کر رکھا ہے یا میں نے کسی کا حق چھین لیا ہے یا میں نے ڈاکہ ڈالا ہے ——— بھلا بتائیے کسی کی چیز پر اس طرح ڈاکہ ہی تو ہوگا ——— جتنا نیل؟"

"اللہ توبہ ——— احمد بھائی آپ تو بال کی کھال نکالتے ہیں۔ سے جانا ہے تو رہنے دیجئے پینٹنگ وہیں رہنے دیں۔"

"نیل! دیکھو یہ دل ہے بہت بُری شے۔" نواز نے تارا کی طرف جھک کر ذرا دھیمے لہجے میں کہا لیکن احسن نے پھر بھی سن لیا۔

"ہاں دوست! یہ ہے تو بہت بُری شے۔ اور جب یہ کسی پر آجائے تب تو یہ بُرا ہی نہیں خطرناک بھی ہو جاتا ہے۔" احسن نے خوش ہو کر کہنا چاہا تھا لیکن لہجے کا خول ٹوٹنے لگا۔ حسرت کی ہلکی سی لہر ان کے چہرے پر رینگ آئی۔

تینوں ایک دم خاموش ہو گئے۔

"میں چلوں گا اب۔" نواز ایک دم اٹھ کھڑا ہوا، تارا نے شرارت سے کہا۔

"یہ بیٹھے رہئے آپ چلی دیجئے، کیا ہوا اگر آپ کو؟ احمد بھائی یہ کوئی اعتراض نہ کریں گے۔"

"سوال سے نہیں جانا چاہتا یہاں سے جا رہا ہوں۔۔"

"تو پھر الٹا ان سے یہ مانگو گی کہ آپ کی جائداد تو نہیں دبائے
ڈال رکھی ہے؟"

"جائداد ——! ہمارے پاس جائداد کہاں۔ ہم تو فقیر آدمی ہیں، بس
صاحب جائداد تو آپ جیسے لوگ ہوتے ہیں۔"

تارا نے پلٹ کر اسے بغور دیکھا، لیکن نواز نے بنا ہنسے
ہوئے کہا، "ایک جھونپڑا دو دو بنگلے ہیں۔"

"وہ بھی تو کیا ہوا لیکن اصل جائداد تو آپ ہی تو ہیں۔ بڑے
بھائی جان کی ساری جائداد آپ کی ہی تو ہے۔"

"اچھا بھابی! اب میں چلتا ہوں۔" نواز جانے لگا تو احسن نے
اسے روک کر کہا۔

"بھائی جان سے کہہ دینا کہ بہتر ہے وہ ان کے پاس ہی آ جائیں، بیرسٹر
کیس بھیجوں گا، ذرا اچھی طرح دیکھ لیں۔"

"جی کہہ دوں گا —— اچھا خدا حافظ!"

نواز چلا گیا۔ تارا نے ایک گہری سانس لے کر سر صوفے کی پشت
سے ٹکا دیا۔ آنکھیں موندتے ہوئے اس نے سوچا نواز تم اتنے بزدل نکلو گے
مجھے معلوم نہ تھا۔ اب جو تم مجھ پر طنز کے تیر برسا کر مجھ سے انتقام لینا چاہتے
ہو تو یہ بھی سوچا تم نے کہ مجھے ٹھکرا دیتے تو اپنے لیے ذلیل و رسوا کو
خرید لیتے۔ اچانک اس کی کلائی پر کسی کی انگلیوں کا لمس جاگا۔ اس نے
فوراً آنکھیں کھول دیں۔ احسن اس کے قریب صوفے پر آ بیٹھے تھے۔

"تارا! یہ تو بھلا آپ کے حسن کی تمکنت کے آگے ہماری آنکھیں
نہیں ٹکتیں، لیکن آپ نے آنکھیں کیوں بند کر لیں۔ کیا بالکل ناقابل برداشت
ہو چکی ہے ہماری صورت؟"

تارا اس کے چہرے کو تکتی رہی۔

ڈاکٹر احسن کے چہرے پر شگفتگی کی ساری جھلکیاں ہوتی تھیں لیکن آنکھوں
میں اب بھی امید کی لرزاں تھی۔ ان کی انگلیاں تارا کی نبض پر رکی ہوئی تھیں
اور تارا اپنے دونوں ہاتھ اپنی گود میں رکھے ہوئے خاموشی سے ڈاکٹر احسن
کو دیکھتی رہی۔

"کیا دیکھ رہی ہو تارا؟" احسن کی آواز پیار سے بوجھل ہو رہی تھی۔

"جی کچھ نہیں۔" تارا سنبھل گئی۔ ڈاکٹر احسن کا التفات اسے
اتھل پتھل کیے دے رہا تھا —— کیا کہے وہ؟ —— کہاں
جائے وہ —— کس سے کہے —— کس کی سنے ——؟
یہ شخص جو میرا شوہر ہے اور مجھ سے اتنے قریب بیٹھا ہے میں اس سے
کیسے کہوں نواز —— تم تو کچھ کہتے ہی نہیں —— اور میں اب

کس سے اپنے پیار کا تاوان طلب کروں۔ کس کے خلاف احتجاج
کروں —— کاش تم ایک بار پھر اسی انداز میں اپنے
پیار کا یقین دلا دو —— بس ایک بار کہہ دو نواز کہ تارا تو میری
ہے تو میں تمام زنجیریں توڑ کر اس شخص کے التفات کو ٹھکرا کر یہاں سے
اڑ جاؤں۔ لیکن اب تو میں اس سے اجتناب برتتے برتتے بھی ڈر
رہی ہوں کہ کہیں یہ مشکل نہ ہو جائے۔ اور کہیں یہ ڈاکٹر احسن تمہارا نام
معلوم کرنے پر مصر ہو گئے تو میں تمہارا نام کیسے بتاؤں گی نواز۔ اب تو
تم بھی بدل گئے ہو اور حالات بھی۔ اور دیکھو نواز اب ڈاکٹر احسن کی انگلیاں
میری نبض پر سے میری ہتھیلی تک آ پہنچی ہیں۔ انھوں نے میرے ہاتھ
اٹھا کر اپنے ہاتھوں میں لے لیا ہے۔ نواز میں ان کی طرف دیکھ نہیں رہی
ہوں لیکن میرا بایاں رخسار جلنے لگا ہے۔ ان کی نظریں میرے ماتھے پر
اتری جا رہی ہیں۔ اب بتاؤ میں کیا کروں، ان سے بچ کر کہاں جاؤں؟

احسن نے منہ قریب لا کر کہا، "معلوم ہوتا ہے میری قسمت
کا ستارا مجھ سے روٹھ گیا ہے۔"

"جی!" تارا نے گردن موڑ کر ان کی طرف دیکھا تو بالوں کی
ایک شریر لٹ گال پر آ گری۔ اس نے اپنا ہاتھ ڈاکٹر احسن کے ہاتھ سے
چھڑا کر وہ لٹ کان کے پیچھے کرنی چاہی تو انھوں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا،

"او ننھی ہرن! بیٹھی رہو بھئی —— کیا تیزی ہے تمہاری
بلکہ یہ تو تمہیں اور خوبصورت بنا رہی ہے۔"

تارا چونک سی گئی۔ ٹھیک تو ہے تم بھی تو نواز کے بھیا ہو
ڈاکٹر احسن، اسی نظر سے دیکھتے ہو اسی انداز سے سوچتے ہو۔

"کیا سوچنے لگیں —— اتنی گم صم مت رہا کرو۔ میں چاہتا
ہوں کہ تم ہنستی رہو، خوش رہو۔ یہاں اس گھر سے میں اس گھر میں
تم چہکتی کودتی پھرو —— یہاں تمہارے قہقہے گونجیں، تمہارا
رنگین آنچل اڑتا پھرے، ہر جگہ بس تم ہی تم نظر آؤ تارا ——" ڈاکٹر
احسن نے اس کے دوپٹے کا کونہ پکڑ کر جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔

تارا منہ سے کچھ نہ بولی۔ بس اداس تھکی آنکھوں سے ڈاکٹر احسن
کو دیکھا جو سگریٹ سے سگریٹ سلگا رہے تھے۔ اور وہ آہستہ سے تھوڑی
دور کھسک گئی۔ اس وقت وہ سمجھ گئی تھی کہ ڈاکٹر احسن کسی بھی لمحے دوستی
کے رشتے ناطے توڑ کر ایک دم سے شوہر بن سکتے ہیں۔

"میں کاٹ تو نہیں کھاؤں گا تم کو —— قریب بیٹھنا گوارا نہیں
تمہیں بات کرو تو جواب نہیں دیتی ہو۔ آخر کیا بات ہے؟" ڈاکٹر
احسن نے کسی حد تک اپنے لہجے کی تلخی کو مسکراہٹ میں چھپانے کی

سنی کی۔

"تمہیں تو ڈاکٹر کی ملاقات [illegible] ہوتی ہے۔" تمارا نے آہستہ سے کہا

"کیا تم نے [illegible]"

"ہاں ہوں" تمارا نے سر [illegible] دیا [illegible] آنکھیں

[illegible] ڈاکٹر احسن۔

"تو پھر شاید میری صحت ٹھیک نہیں ہوتی ہو گی۔ اس کے باوجود

[illegible]"

تمارا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر آئی۔ اس نے نچلا ہونٹ

دانتوں میں دبا کر سر جھکا لیا۔

ڈاکٹر احسن نے وہ مسکراہٹ پکڑ لی اور شوخ ہو کر بولے۔

"پھر تارا، تم میری تو بہت پرانی شناسا ہو کیونکہ جانتی ہو گی ہے نا

[illegible] جب بھی [illegible] مجھ سے [illegible] تو [illegible] بھی بھول جاتی ہو

[illegible] باتیں کرتی ہو [illegible] ظاہر ہے تم جواب ہی نہیں دے سکتیں

[illegible] اچھے بچے بڑوں کو جواب نہیں دیتے۔"

تمارا کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ اس نے [illegible] ہنسی

[illegible] تو وہ صوفے پر سے اٹھ کر ان کے سامنے قالین پر آ بیٹھی،

"اچھا تمارا ڈیئر آج تم ایک بار [illegible] کے ہی [illegible]

[illegible] سوچ رہا ہوں [illegible] تو سب کچھ بھول [illegible]

رشتیں، عاشق ہو جاتیں، پھر سر اٹھا کر اوپر ——— نہیں [illegible]

ٹھیک ہے میں [illegible] اٹھا دیتا ہوں۔" ڈاکٹر احسن نے ہاتھ بڑھا کر

[illegible] ٹھوڑی [illegible] کر دی۔ [illegible] چہرہ اس کے سامنے تھا۔ سگریٹ کے

[illegible] دھواں [illegible] چہرہ...... تمارا نے ان کی طرف دیکھا۔

[illegible] ہوئے آئینے میں [illegible] سے آئینہ ٹوٹ

[illegible] ہو جاتا ہے لیکن [illegible] بہت [illegible]

[illegible] رہ جاتے ہیں ایسا ہی تو [illegible] ڈاکٹر احسن کا چہرہ۔ ان

کے ہونٹوں میں [illegible] سگریٹ [illegible] کانپ رہی تھی۔

[illegible] ہونٹوں [illegible] تھا اور وہ آنکھیں جو ہمیشہ تارا

[illegible] اپنی [illegible] لگی [illegible] آنکھیں۔

"تمارا ——— میں ——— بہت برا ہوں ———

بہت برا ——— [illegible] میں بڑا ہو گیا ہوں ——— [illegible]

[illegible] ——— [illegible] ——— مجھے [illegible] تم میری

[illegible] ——— تم کسی [illegible] ——— [illegible]

[illegible] تم مجھے دیکھو ——— مجھ سے باتیں کرو [illegible]

[illegible]

[illegible] احسن آپ اپنی [illegible] پوری کر سکتے ہیں۔ آپ

دوسری شادی کر لیجئے [illegible] آپ کو پوری اجازت ہے۔

[illegible] کی اجازت ہے۔"

[illegible] احسن [illegible] کے احساس [illegible]

[illegible] طلاق [illegible]

[illegible]

[illegible] طلاق [illegible]

[illegible]

پہلے کبھی کسی کو طلاق نہیں ہوئی تھی۔ لوگ [illegible] طلاق کی وجہ پوچھ

[illegible] کہ وہ انہیں پسند [illegible]

انہوں نے [illegible] کیا ہوں کے [illegible]

[illegible] گھر سے باہر نکل گئے [illegible]

[illegible]

[illegible] بستر پر آ گئی۔ اس کے [illegible]

[illegible] پاؤں پھیلا کر لیٹ [illegible] بھی طاقت نہیں رہی

[illegible]

[illegible] اس کے [illegible]

[illegible] کسی کی باتوں [illegible] چھپ [illegible]

[illegible] ———

"احسن ——— احسن بچا ——— [illegible]

ہے ——— [illegible] یہاں [illegible] کمرے میں

[illegible]۔" [illegible] تھیں۔ تمارا نے آنکھیں

[illegible] ابھی امی [illegible] کہاں [illegible] کیا بتاؤں گی نہیں۔

امی [illegible] دروازہ [illegible] رہیں پھر انہوں نے [illegible] دروازہ

دی احسن کر ——— تارا [illegible] ہے کی

اندر کوئی نہیں۔" دروازہ [illegible] اندر آ گئیں پھر کمرے کی لائٹ

جل گئی۔

"اسے کہاں لگتا احسن ——— [illegible]

بغیر بتائے چلے گئے کچھ ٹھیک ہی نہیں ہے ——— جا ہو ——— تارا کتنی گھبرائی
ہوئی ہے۔ بھوک لگ رہی ہوگی۔" وہ اُسے چادر اوڑھا رہی تھیں۔ "اور
احسن بیٹے کہیں غسل خانے میں تو نہیں ہو ——— جانے کہاں ہو۔"
وہ پریشان ہو رہی تھیں۔ تارا شرمندہ ہونے لگی۔ میری کیسی باتیں ہی
ہوں، فضول ادھر اُدھر کی باتوں سے احسن کا دل بھاری تو کیا ہو جاتا ———
خواہ مخواہ نہ جانے کیا کیا کہہ دیا۔ مگر انھوں نے امی کو بتا دیا تو کیا ہوگا۔ امی
تو مجھے بہت اچھا، بہت پیارا، بہت معصوم سمجھتی ہیں۔ اللہ کرے وہ
امی کو نہ بتائیں کچھ۔

امی مسہری پر بیٹھی ہوا اُس کا دوپٹہ اٹھا کر اس کے سر پر ڈالتے
ہوئے اسے دعائیں دے رہی تھیں۔ احسن کو بھلا بُرا کہہ رہی تھیں۔ اور
اس کی لاپرواہی پر خفا ہو رہی تھیں ——— اور تارا کو دعا دینے کیلیے
مزہ آ رہا تھا ——— امی کی نرم سی انگلیاں اس کے بال سنوارنے لگیں
تو تارا کی آنکھوں میں سچ مچ نیند اتر آئی۔

احسن نے تارا کے گال پر ہلکی سی چپت لگا کر اسے جگایا تو وہ
ایک دم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ سامنے ہی نیلا کھڑی تھی اور امی صوفے پر
بیٹھی تھیں۔ وہ خجل سی ہو گئی۔ احسن نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے
"معاف کر دیجئے سرکار معاف کر دیجئے۔ غلطی ہو گئی جو آپ
کو اکیلا چھوڑ کر چلے گئے۔ سنا ہے آپ ہمارے پیچھے رو رہی تھیں،
اور آپ نے چادر بھی نہیں اوڑھی تھی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ تب ہی ڈر کر جاگ
رہی تھی اور آپ کے کمرے میں اندھیرا بھی تھا۔"

"بس ——— بس کریں بھائی جان۔ آپ تو ڈرامہ کنٹری
نشر کرنے لگے۔ بھابی بے چاری پریشان ہو گئی ہیں۔" نیلا نے احسن
کو ٹوک دیا۔

"بھابی کی پریشانی کا کتنا خیال ہے۔ اور جب مجھے ڈانٹ
پڑ رہی تھی تب میری بے چارگی کا خیال نہیں آیا۔ اچھا اب تم چائے کھانا
منگواؤ، بھوک لگ رہی ہے، ڈر بھی گئے ہیں۔"

تارا سب کچھ سمجھ گئی تھی۔ وہ بستر پر سے اٹھ کر امی کے پاس
صوفے پر جا بیٹھی۔ امی نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے قریب کر لیا۔ تارا
نے اپنا سر امی کے کندھے سے لگا لیا۔ امی اس کے بکھرے بکھرے
بال سمیٹتی رہیں اور بڑے پیار سے سمجھاتی رہیں۔ "بیٹا میں نے
احسن کو بہت ڈانٹا ہے۔ اب یہ تم سے لڑیں تو مجھے بتانا میں دیکھ لوں
گی۔ اور اگر کبھی یہ رات کو باہر جانا چاہیں تو ہرگز مت جانے دینا
کتنا کہا ہی کر تنگ کر جاؤ۔ اور بیٹا اکیلی مت پڑی رہا کرو۔ میرے پاس
آجایا کرو۔ یا نیلی کو پاس بلا لیا کرو۔ تم تو ابھی باتیں کرتی ہو، ویسے
نیلی کا رزلٹ پڑا ہے نیلا کمرے میں ہی رہتی ہے۔ آج کل نیلا تو
پڑھائی میں مصروف ہے۔ اور نیلا تمھیں گھومنے کا شوق نہیں، اور
مری ہیں لڑکیاں اتنی سنجیدہ نہیں ہوتیں۔ یہ احسن تو بس پرندے ہیں۔
کہاں گئے ہیں اپنی شہرت میں ہی بھلا بیٹھے ہیں تم ضد کر کے ان کے
ساتھ گھومنے جایا کرو۔ کبھی خریداری تک کرنے نہیں گئیں تم احسن
کے ساتھ۔"

"امی سب کچھ تو ہے میرے پاس۔" تارا دھیرے سے بولی۔

"سن لیا امی آپ نے۔" احسن شرارت سے بولے۔

"اچھا اچھا تم چپ رہو جی۔ سیدھی سی بیوی مل گئی ہے نا
اس لیے ابھی تک یہی حال ہے ہمارا۔ مل ہوتی کوئی تیز سی تو سب
بھول گئے ہوتے۔"

"وہ تو اب بھی بھول چکا ہوں۔" انھوں نے بہت دھیمی
آواز میں کہا تھا۔ لیکن تارا نے سن لیا تھا۔ امی تو اسے دعائیں دینے
میں مگن تھیں۔ پھر انھیں نہ جانے کیا خیال آیا ایک دم بولیں،

"تارا بیٹے تم نے ساڑھی نہیں باندھی ابھی تک۔ احسن کو تو
ساڑھیوں کا بڑا شوق تھا۔ اتنی ساری ساڑھیاں شادی سے پہلے
لا کر رکھی تھیں۔ لیکن اب اب پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے انھیں
ساڑھی باندھنے کو نہیں کہا تم سے۔"

"اونہہ ہوں۔" تارا نے منہ سے کنکھیوں سے احسن کو
دیکھا۔ وہ دانت بھینچ کر اسے آنکھیں دکھا رہے تھے۔ "اب آپ
آنکھیں کیوں دکھا رہے ہیں؟" تارا نے نہ جانے کیوں کہہ دیا۔ وہ
امی کے پاس بیٹھ کر نڈر شگفتہ ہو رہی تھی۔

"احسن ——— احسن سچ میں ناراض ہو جاؤں گی تم
ابھی میرے سامنے ہی تنگ کرنے لگے میری بچی کو۔ مت کہا کرو
پھول سی تو ہے۔" امی نے بڑے پیار سے گردن جھکا کر اس کی
پیشانی چومی تو احسن ٹھنڈی سانس بھر کر بولے۔

"امی! بڑی خوش قسمت ہیں آپ!"

تارا کو ان کی بے چارگی پر ہنسی آ گئی۔ اس نے بڑی مشکل سے
اپنی ہنسی روکی۔ امی بے چاری احسن کا مطلب کہاں سمجھتیں وہ تو
خوش ہو کر کہہ رہی تھیں: "ہاں بچے ہیں بڑی خوش قسمت ہوں کہ
بیٹا نے میری بہو ایسی لی، اور مجھے یہ دن دکھائے ہیں۔ اللہ
کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔ میں بھی سوچتی تھی کہ کہیں اتفاق سے

رہیں اور تنہا رہ جانے کے خیال سے ہی تو کیا ہوگا۔ وہ بے چارا آدمی [illegible]
پاس بھی رہ سکتی ہوں۔ [illegible] کی جان سے وہ کہے گی۔ تارا کو
لگتی تو وہ بھی مجھے بلا لیتی۔ لیکن جو سکون تمہارے پاس رہ کر ملتا ہے
وہ کہیں نہیں مل پاتا۔ اب تو اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ میری دلہن
بھی ہوا ایسی نیک ایسی [illegible] ہے کہ وہ تو کچھ جانتی بھی نہیں۔"

"ہاں۔ ہوں۔ ہوں۔" دعا سنتے ہوئے احسن نے امی کی
بات سن کر جھکا سے بیٹھے تھے۔ اور تارا کا چہرہ ایک دم زرد ہو
گیا تھا۔

"بیچ جاؤ بیٹا اب تو کوئی دوسرے نہیں علی ہیں۔ اب تو اسی
[illegible] جائزہ اٹھے گا۔ دل کا اطمینان ہو ہی گیا ہے۔ جب پاکستان
[illegible] آفتاب [illegible] ابا نے یہ مکان خریدا تھا تم بہت چھوٹے تھے۔
اس وقت اس مکان میں صرف دو کمرے تھے۔ وہ اکثر [illegible]
[illegible] کہ بس اب میں یہاں کمرے بنواؤں گا۔ اس کمرے میں احسن کی دلہن
سجے گی۔ اور یہاں دوسرا کمرہ بیٹھک یہاں نماز پڑھا کریں گی،
اس کے بعد یہ کمرہ [illegible] کا ہوگا۔"

"ہاں امی جب تک [illegible] تھا تب ابا نے یہ کمرہ بنوایا تھا
مجھے یاد ہے اچھی طرح۔"

"اور دیکھو اسی کمرے میں تمہاری دلہن بھی آگئی۔ تمہارے ابا
زندہ ہوتے تو اپنی چاند سی بہو کو دیکھ کر کس قدر خوش ہوتے۔" امی
اداس ہو گئی تھیں۔

تارا نے احسن کی طرف دیکھا وہ [illegible] لیٹ گئے تھے جہاں
تارا بیٹھی تھی۔ وہ ایک تکیے پر اپنا گال رکھ کر گہری گہری سانسیں لے
رہے تھے۔ امی نے دوپٹہ اٹھا کر اپنے منہ پر ڈال لیا تھا جو تارا اور [illegible]
کی [illegible] نے [illegible] وہ مسلسل [illegible]
جا رہے تھے۔

"مگر یہ [illegible] دیکھ رہی ہو تم۔ اس [illegible]
ڈاکٹر کی حالت [illegible] تو نہیں [illegible]
تمہیں اپنا [illegible]
[illegible]"

"ہاں ———" امی نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

"تارا بیٹی مجھے یہ گھر بڑا پیارا ہے میرے شوہر کی نشانی ہے، تمہیں بھی
یہ گھر [illegible] ہو جائے گا ——— خدا تمہارا سہاگ ہمیشہ قائم رکھے۔

[illegible]
[illegible]
احسن نے اپنا منہ [illegible]
[illegible]
[illegible]
گھر بڑا پیارا ہے میرے شوہر کی نشانی ہے ——— تمہیں بھی یہ گھر [illegible]
ہو جائے گا ..... تمہیں بھی یہ گھر [illegible] پیارا ہو جائے گا ———"

لیکن مجھے یہ گھر کیوں پیارا ہوگا۔ مجھے تو اس گھر میں رہنا ہی نہیں
ہے۔ میرا سہاگ یہاں کہاں ——— میرا سہاگ تو وہ [illegible] ہے جو
مجھ سے [illegible] گیا ہے۔ یہ شادی؟ شادی تو نہیں، شادی تو دلوں کے
ملاپ کا نام ہے، شادی تو رضا سے ہوتی ہے، خوشی سے ہوتی ہے،
جبر سے تو نہیں ہوتی، دھوکے سے تو نہیں ہوتی۔ میں ——— میں
احسن کی بیوی نہیں ہوں۔ لیکن امی ایسی دعائیں کیوں مانگتی ہیں۔
اگر اللہ میاں نے ان کی دعائیں سن لیں تو؟ اگر اس گھر میں میرے بچے
کھیلنے لگے تو ——— ؟ نہیں ——— نہیں ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔
کبھی نہیں ہوگا۔ میں صرف نواز احمد کی ہوں، [illegible] لیکن اس
میں احسن کا کیا قصور ——— احسن نے مجھ سے شادی کیوں کی ——— ؟
مجھے وہ پہلے پسند کیوں کیا ——— ؟ لیکن امی ——— امی
کا کیا قصور ہے تارا بیگم۔ ان سے تو تم بھی پیار کرنے لگی ہو ———
انہیں کس جرم کی سزا دو گی۔ جب ان کے خواب بکھریں گے جب
وہ بدنام ہوں گی، جب ان کا بیٹا ان کی گود میں سر چھپا کر روئے گا،
جب وہ تمہیں [illegible] کے گھر میں دیکھیں گی ——— تو کیا بیتے گی ان پر،
کیا حال ہوگا ان کا؟ اور تارا [illegible] کیا یہی بہتر ہوتا ہے ——— ؟
کیا ایسے ہی [illegible] کے ——— ؟ وہ [illegible] نواز جس
کی خاطر تم [illegible] کے لیے تیار بیٹھی ہو، اس نے
تمہاری آنکھوں سے [illegible] نہیں [illegible] تو
[illegible] ابھی تو تیرا
[illegible] جب بھی آیا [illegible]
کے [illegible] کرتا یا ——— لیکن وہ ———
بھی کیا کرے [illegible] اس کے یقین کر لیں
[illegible] ——— [illegible]
بھی کہاں ہوتی ——— وہ بھی تو [illegible]

گیا ہے ——— عدالت نے کیوں کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔
میری جو اس کی جان جان تھی سب اس کی بچی ہیں۔ اسے عطر بنا دیا ہے
کیا ایسے ہی مذاق کئے جاتے ہیں اپنے بندوں سے۔ میں ———
میں کیا کروں ——— کہاں جاؤں۔ اس طرح کہنے کر کہاں جانا
تمارا کو پھر بھی لگا تھا۔ اس نے آنکھیں موند لیں۔ لیکن احسن نے اسے
دونوں کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ دیا۔

"تمارا ——— تمارا ——— تم کو کیا ہو رہا ہے تمہیں ——— ؟
سنو آنکھیں کھولو ——— کیا محسوس کر رہی ہو تم ؟" احسن گھبرا گئے تھے

"میرا ——— دل ——— یہاں کچھ ہوتا ہے
پا ——— پانی ——— پانی دیں۔" تمارا دونوں ہاتھ بائیں طرف
اپنے سینے پر رکھے نیم غشی کی حالت میں صوفے کی پشت سے ٹکی
ہوئی تھی۔ ڈاکٹر احسن نے اس کی نبض دیکھی سنبھالتے ہوئے اس کو اٹھا کر
گود کا ... تمارا پھیلے ہوئے دونوں ہاتھوں پر اٹھا کر بستر پر لٹا دیا۔ اس کی
گھبراہٹ بڑھ گئی ... تھیں۔

"کیا ہو گیا ——— ؟ کیا ہو گیا میری بچی کو ——— ؟" احسن
نے دیکھے ... کہا دیا۔ نیلما نے کہا احسن پانی میں ملا
کر تمارا کو پلا دیا۔ احسن پھر گریبان ہی نکال لائے اپنے بیگ میں سے تھوڑی
دیر بعد تمارا کی طبیعت سنبھلی تو سب کے چہروں کی رونق لوٹ آئی۔ احسن
خاموش سے تھے ... جیسے کوئی چیز کہیں رکھ کر بھول
گئے ہوں ... کا ... ہو گیا تھا۔ ... کا تذکرہ کیا گیا۔ اور
وہ سب ... کے اسی سلسلے احسن کو تمارا کا خیال ...
... رہی۔ نیلما جانی کہ آگے ... رکھتی رہیں اور انہیں
نسائی ... احسن سر جھکائے ... کی باتیں سنتے رہے۔

اس وقت ڈاکٹر احسن نے تمارا سے بہت ساری باتیں کیں۔
سپتال کا ... اپنے ... رشتہ داروں کی اپنی بہنوں
... بہت پیاری تھیں ... سب سے بڑی بہن ...
میں ... ڈاکٹر ... کے ساتھ ... رہتی تھیں ... سے چھوٹی
... ڈاکٹر ... کی شادی ...
سال ہوئی تھی ... سب سے ...
... چھوٹی ...
... اس نے بڑی ... کے ...
دیا تھا۔ ... اس ... شادی میں شریک نہیں ہو پائی تھی۔ ان
بچوں کے ٹیسٹ ہو رہے تھے اس لیے وہ فوراً آ سکیں۔ اب

انہوں نے تمارا کو بچپن سے ایک ... آج تک ... رہا تھا
پہلے احسن تمارا کو سمجھا ... کی طرح آج تک ...
... سکے ... ہاتھوں ...
... بات بنا کے ... لوگ ... کہتے ہیں۔ تمارا ... کسی تیسری
... وہ ... کے درمیان ... کر ... تھی
... کو ... بات ...
احسن کو ... ہو گئے اور ... ہو گیا
... رہی تھی۔

اور احسن ... کہیں ... کر ...
... تمارا ...
چاہتے تھے ... اور ... کے دل میں ہے
... چاہتے تھے۔ ... اس کے دل میں ... محبت
... ناکام ہو گئے تھے۔ ...
... کے ...
کی ... کے متعلق بتا رہے تھے۔

"شیپ بھی تو چلتا نہیں آتا اس پاگل کو۔"

دوسرے دن ... نے ... کے کمرے میں رکھوا دیا۔
نیلما ... مصروف تھی۔ ... کے علاوہ
کسی ... تو پھر ... کا ...
کیا کرتا؟ ... ایک دن ... احسن نے تمارا سے پوچھ لیا۔
"تمارا ... ڈپریشن ہوگی ——— ڈاکٹر ... بتانا چاہیے
تھا نا؟"
"میرے پاس ... ہوتا تو شاید بتا دیتی۔"
احسن ہنس دیئے۔ "تمارا ... کہتا تو ...
ویسے ... پرائیویٹ بھی پڑھ سکتی ہو۔"
لیکن تمارا نے انکار کر دیا۔

تمارا نے ... انکار کیا تو وہ ... ہو گئے۔ ...
کے ... ہلکا ...
... خواب ...
ہی۔ ... خواب ... تھی۔ لیکن احسن نے ... کو
... کر دیا۔ ... چپ ہو
گئی اور ... احسن نے ... سا ... کہا دیا۔ ...
... تو وہ ... [illegible]

نے بڑے سب جو سنتے تھے سنا ڈالا
تاش کے بادل چھٹے بھاگنے لگے
اور سب کے سب بھر گئی
میں لٹ گیا امام وطائی، میں لٹ گیا مہا بھائی
اور وہ بیٹھے بیٹھے بھر گئی۔

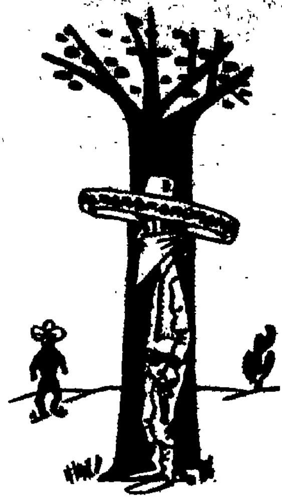
٭

بظاہر زندگی سکون کے ساتھ گزر رہی تھی۔ اپنے اپنے جوڑے پر دونوں نے بہت اشعار ہونے کے سبب نواز یاد آتا تھا اور ایسا یاد آتا تھا۔ اس کی صورت نظروں کے سامنے آ جاتی تھی، لیکن وہ ظالم خود نہیں آتا تھا۔ نہ جانے کہاں گم ہو گیا تھا۔ وہ اسے ڈھونڈنا چاہتی تھی۔ لیکن کیسے ڈھونڈتی اسے۔ احسن تو خود تارا کی نازبرداریوں میں ایسے گم ہوئے تھے کہ انہیں نواز یاد ہی نہیں رہا تھا۔ وہ خود انہیں نواز کی یاد کیسے دلاتی۔

ایک دن وہ ان کے کمرے میں سے چاروں البم اٹھا لائی۔ ہر البم میں نواز موجود تھا۔ اس دن وہ نواز کو یاد کر کے روئی تھی۔ اس کی تصویروں سے اس کا دل ہی نہیں بھرتا تھا۔ وہ تصویریں دیکھ رہی تھی کہ نیلا کا بالکے آ گئی۔ وہ وہیں اس کے پاس بیٹھ رہی۔ ایک صفحے پر نواز کی چار تصویریں چار کونوں پر لگی تھیں۔ بیچ میں سے ایک تصویر غائب تھی۔ کارنر لگے ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے جلدی میں تصویر نکالی ہے۔ نیلا نے اس خالی جگہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"بھائی جان یہاں پر احسن بھائی کی بہت خوبصورت تصویر لگی تھی نہ جانے کس نے پار کر لی۔ سچ آپ کی شادی سے کچھ دن پہلے تک میں نے لگی دیکھی تھی۔ وہ تصویر اتنی پیاری تھی، دھاری دار قمیض اور ٹائی میں اتنے پیارے لگ رہے تھے احسن بھائی۔"

دھاری دار قمیض اور ٹائی ——— ہوں تو اسی نے نواز تارا کی وہ تصویر یہاں سے اڑائی تھی۔ تب ہی تو میں کہوں وہ کہاں سے ... ایک خط تو مل رہا ہے ——— بس ایک دفعہ نواز میرے پاس آ جائے کر مجھ سے باتیں کرے۔ اس نے طرح طرح کی دعائیں مانگیں، لیکن کوئی دعا بھی اللہ میاں تک نہ پہنچی۔ ملازمت ... کے لیے ... اب نے احسن سے کہیں باہر جانے کی خواہش ظاہر کی ... خود ہی تارا نے باہر جانے سے انکار کر دیا تھا۔ احسن خوش ہو کر ... ایک دفعہ ماں ... کے گھر گئے ... نہیں گئے تو نواز کے یہاں تب اس نے ... کیا تھا ———



احسن آپ مجھے کار چلانا سکھا دیجئے۔ احسن خوشی خوشی اسے ڈرائیونگ سکھانے لگے۔ انہیں کیا پتہ تھا کہ یہ ضدی پاگل لڑکی کتنا بڑا فیصلہ کر چکی ہے۔ وہ خالی سڑکوں پر کار چلاتے ہوئے سارے ٹریفک کے اصول سمجھاتے اور وہ سوچا کرتی کہ وہ دن نہ جانے کب آئے گا۔ جب میں خود اکیلی یہ کار چلا کر نواز سے ملنے کالج جا پہنچوں گی۔ وہاں اس سے دل کی باتیں کروں گی اور اگر وہ مجھے سہارا دینے پر راضی نہ ہوا تو واپسی میں کسی ٹرک سے کار ٹکرا دوں گی۔ کوئی نہیں جان پائے گا کہ تارا نے خودکشی کی ہے۔ احسن بھی بدنام نہ ہوں گے۔ امی بھی دنیا والوں کے آگے سر جھکا دیں گی اور میری عاقبت بھی سدھر جائے گی۔ بس وہ جان سے گئی ... کی خاطر جان دیں گے۔

تب اسے یقین آ جائے گا کہ تارا بزدل نہیں تھی۔

تارا بے وفا نہیں تھی۔

تب اسے یاد آئے گا کہ تارا تو اس کی ملکیت تھی۔ پھر شاید وہ رونے بھی لگ جائے۔ ہاں مگر مرنے کے بعد تو سبھی روتے ہیں وہ ... بات تو جب تھی کہ ابھی وہ آ کر پیار کرتا اور ... کہ ہم زندہ ہی ہیں ...

اس دن تارا نے ... بڑے ... صبح ... بس ... پر ... احسن ... دیر ...

ہوا سے ہی سر چادر یا پلو چھوڑ دی دیکھنے جاتے ہیں۔ اطمینان رکھو۔ تیار ہو جاؤ
لیکن تارا نے نقاب اٹھا کر دیا۔ احسن امی کے پاس جا پہنچا۔
"امی سمجھا لیجئے امی ہو کر بہت سے کہنے کا کوئی خیال نہیں رکھتا ہوں۔ میں اتنے شوق سے سیٹیں بک کروا کے آیا ہوں اور یہ انکار کر رہی ہیں۔" اور امی کے آگے وہ ضد نہ کر سکی۔ ان کا نرم لہجہ حکم بن جاتا تھا اس کے لیے۔ وہ بے دلی سے تیار ہو گئی۔ سیٹیں تین تھیں۔ آدھی دور احسن نے نیلا سے بہت کہا مگر اس کی پڑھائی بہت ضروری تھی وہ راضی ہی نہ ہوئی۔ گاڑی میں بیٹھے تو احسن کو نواز کا خیال آگیا۔

"اسے تارا نواز کو لے چلتے ہیں۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔" تارا صرف یہی کہہ سکی۔ ورنہ اس کا جی تو چاہا کہہ دے کہ اس سے اچھی اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ نواز سوسائٹی میں رہتا ہے اتنا تو اسے معلوم تھا لیکن اس کے گھر کی طرف جانے والے راستوں سے وہ بالکل ناواقف تھی۔ اس وقت وہ بڑے غور سے ہر موڑ ہر کراسنگ کو دیکھ رہی تھی۔

گیٹ کھلا ہوا تھا۔ احسن گاڑی اندر لے گئے۔ گاڑی سے اتر کر وہ احسن کے پیچھے پیچھے چلی۔ لان کے قریب والے برآمدے میں سے ہوتے ہوئے وہ ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ نواز سیٹھ کا ہی بیٹا تھا۔ پھر گھر وہاں سی خاموشی سے سناٹا پڑا تھا۔ باورچی خانے میں ایک ادھیڑ عمر عورت چائے بنا رہی تھی۔ احسن نے اس سے پوچھا:

"زینب بی نواز کہاں ہیں؟"

"سلام بیٹا۔ چھوٹے میاں تو اپنے کمرے میں ہی پڑے رہتے ہیں جی۔"

احسن تیزی سے نواز کے کمرے کی طرف بڑھے۔ تارا پیچھے والے تھے۔ غم شروع ہو جاتی تو کیا خاک مزہ آتا ——— آئیں اس کے کمرے میں تو اندھیرا ہے۔

"نواز ——۔ نواز —— یار کہاں ہو تم ——— ؟ یہ اندھیرا کیسا کر رکھا ہے۔ سناٹا سب ہو گیا —— ؟" یہ کہہ کر احسن نے ہاتھ بڑھا کر لائٹ جلا دی۔ نواز اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

"ارے بھائی جان آپ! آپ کو یہاں آنے کی ہماری؟" وہ بڑی عجیب طرح بولا تھا۔

"اے میاں کے بچے —— یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔ کیا ہو گیا تجھے۔ ملاقات کب سے نہیں ہوئی تو نے؟" احسن نے جانے کیا کیا کہہ ڈالے۔ لیکن تارا کو سنائی نہیں دیا۔ وہ تو خود کی ہوئی دل کی طرح وہیں کی وہیں کھڑی رہ گئی۔ اس نے سوچا بھی نہ تھا نواز اس قدر بری طرح بکھر گیا ہوگا۔ صرف اپنی انا کی خاطر۔ اپنی ضد، اپنی کے پیچھے جانے کا غم ان کا دل اس بری طرح چھلنی کرے گا ——

میں مر جاؤں گی مر جاؤں گی لیکن تمہیں اتنا اداس، اتنا غم زدہ نہیں رہنے دوں گی۔ یہ تم ہو نواز؟ بال تو نواز تمہارے ہی ہیں۔ لیکن چہرہ تو تمہارا نہیں ——— بتاؤ اس چہرے پر رہنے والی شوخی کہاں گئی نواز؟ اس چہرے کا نکھار اس چہرے کی شادابی کیا ہوئی نواز یہ تمہاری آنکھیں تو نہیں۔ آنکھیں بجھی بجھی سی خاک کشش رہنے والی ان آنکھوں ان آنکھوں میں تو زندگی کا نور ہوتا تھا۔ ان آنکھوں میں تو تمہاری تارا رہتی تھی تم نے اسے باہر کیوں نکال دیا۔ تمہاری آنکھوں میں بسنے والی محبت کہاں رخصت ہو گئی نواز؟ تم نے میری محبت کو آنسو بنا کر تو نہیں بہا دیا ——— تم نے اپنا آپ کیوں سجا دیا نواز۔ میں مر تو نہیں گئی۔ ابھی تو میں زندہ ہوں اور تمہاری صرف تمہاری ہوں۔

میرا سوگ منانے سے پہلے مجھ سے مل تو لیتے، پوچھ تو لیتے۔ اپنے اوپر میرے اوپر ظلم کر کے تمہیں کیا مل گیا نواز جانی؟ تارا یہ کیسے پوچھتی اس سے، ان دونوں کے بیچ احسن جو بیٹھا ہوا تھا ظالم سماج بن کر۔

"بھئی تارا، یہ تو نہیں مانتا۔ تم کہہ کر دیکھو شاید مان جائے۔ میں ذرا بھابی جان سے مل آؤں۔" احسن کمرے سے نکل گئے۔

ٹھنڈی ٹھنڈی اداس خاموشی ان دونوں کے جسموں سے لپٹ کر رہ گئی تھی۔ وہ تکیے کا سہارا لئے بیٹھا تھا۔ اس کی نظریں تارا کی پیشانی سے چپک کر رہ گئی تھیں۔ اور تارا؟ وہ ایک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی، وقت ٹھہر گیا ہے۔ ترسے ہوئے دل نے سرگوشی کی تو وہ بے ساختہ تڑپ سے چلتی ہوئی اس کے بیڈ تک چلی آئی۔ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر اس نے بمشکل تمام کہا۔

"نواز ——— نواز یہ کیا ہو گیا تمہیں؟"

لیکن اتنا سا جملہ ادا کر کے وہ تھک گئی۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔ اس کی آواز کانپنے لگی۔ اسی کیفیت میں اس نے دوبارہ کہا،

"نواز تم ناراض ہو مجھ سے مگر ایک دفعہ مجھ سے مل تو لیتے، تمہاری حالت دیکھ کے میں اندھی ہو جاتی تو ——— !" اس کی آنکھوں میں جلن ہونے لگی تھی۔ اس نے اپنا چہرہ دیوار کی طرف کر لیا۔ نواز نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر تھکے ہوئے لہجے میں رک رک کر کہا،

اپنے تیور تو سنبھالو کہ کوئی یہ نہ کہے
دل بدلتے ہیں تو چہرے بھی بدل جاتے ہیں

اپنی آواز کی مدہوشی پہ آؤ تاو پیا جو
پیار کے بدن تو مجھ ٹوٹ سے نکل جاتی ہیں

تارا ایک دم چپ ہو گئی۔ "نواز تم سمجھتے کیوں نہیں۔ میں مصلحتاً کہتی ہوں۔ تمہاری تو نواز کے سامنے ہے۔ وہ نہیں بدلی۔ اس کا چہرہ بدلا ہے نہ اس کا دل۔ تم نے کبھی اس کا چہرہ غور سے دیکھا ہے؟ نہیں دیکھا تو دو آج دیکھ لو کہ اس کی پیشانی پر کس کا نام لکھا ہے۔ اس کی آنکھوں میں کس کی صورت ہے۔ اس کے ہونٹوں پر کس کی تمنا مچل رہی ہے۔ دیکھو نواز تم سے دیکھو اس کا چہرہ اس کی روح، اس کا جسم سب کچھ ہی نواز کا انتظار کر رہا ہے۔ لو دیکھ لو نواز۔" تارا اس کے قریب آ بیٹھی۔ جذبات کی شدت سے اس کا چہرہ نواز کی طرف جھک گیا تھا۔ نواز نے بے اختیاری کے عالم میں سر ہلا دیا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں بے قابو ہونے لگی تھیں۔

"نہیں ——— نہیں تارا ——— نہیں تم میری نہیں ہو۔ تم تو مجاجان کی ہو۔ میرے مجاجان کی۔" نواز کے ہاتھ خود بخود تارا کے چہرے کی طرف بڑھتے گئے اور تارا جذبات اور اپنی خواہشات کے طوفان پر بند باندھتے تھک چکی تھی۔ یلغار بڑی شدید تھی۔ مگر ضبط کا بند ٹوٹنے جا رہا تھا۔ وہ جسے دیکھنے کو آنکھیں ترستی تھیں وہ سامنے تھا۔ ٹوٹا ہوا بکھرا ہوا۔ بس اس کا دل بھی ٹوٹ جانے، بکھر جانے کو چاہنے لگا اس کے سینے پر سر رکھ کر ڈھیروں آنسو بہانے کی تمنا کتنی شدید تھی۔

"تارا ——— تو ——— تم ——— میری ——— ہے۔"

کانپتی انگلیوں کا لمس اس کے گالوں نے پایا تھا۔ اس نے پوری پوری آنکھیں کھول کر نواز کو دیکھا اور بس اتنا ہی کہا،

"ان آنکھوں سے پوچھو نواز۔"

اتنے میں برتنوں کی کھڑکھڑاہٹ اور قدموں کی چاپ سنائی دی نواز کے ہاتھ بے جان ہو کر نیچے گر گئے۔ تارا سنبھل گئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ زینب بی چائے کی ٹرالی لیے آ رہی تھیں۔

"میں چائے لے آئی جی ———" زینب نے ٹرالی تارا کے آگے کرتے ہوئے کہا

"لیکن میں نے تو نہیں کہا تھا۔" نواز چڑ رہا تھا۔ زینب ابھی جواب بھی نہ دینے پائی تھی کہ احسن آ گئے۔

"میں نے بھی کیا نہیں کہا تھا ——— آخر فیصلہ کیا ہوا۔ چلو اب ہم کو نہیں دیکھو یار نو بج گئے ہیں۔ پہلے تو اچھا منع ہو جائیں گے — اب چائے پینے کی گنجائش کہاں نہیں ہے۔" احسن بہت جلدی میں تھے، "کیا ہوا تارا؟ احسن نامعقول نے تمہاری بات مانی کہ نہیں۔"

"ہاں جی۔" تارا نے دھیرے سے کہا۔

"تو پھر مٹھائی کھلوائیں صاحب۔"

"مگر میں ایسے ہی چلوں گا۔"

"پچھلے برس وہ اچھی خاصی پڑھی لکھی ہوتی تھی اب بڑے ملال سے مجھے میں ڈال رہا۔ لوگ سمجھیں گے ہیر دیرینہ کو ڈھونڈ تا ڈھونڈتا پھر آگیا ہے۔"

نواز نے جا کر پھر سے کپڑے پہنے بالوں میں کنگھا پھیرا آئینے میں اپنی شکل بغور دیکھی ڈھیلی ڈھالی سی شلوار میں وہ خاصا ڈھیلا ڈھالا سا لگ رہا تھا۔

"اچھا میں ذرا پاپا سے کہہ دوں کہ میں آپ کے ساتھ جا رہا ہوں اور دیر سے آؤں گا۔" نواز نے اندر جانا چاہا۔ لیکن احسن نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"میں نے کہہ دیا ہے کہ تم میرے ساتھ فلم دیکھنے جا رہے ہو اور آج گھر واپس نہیں آؤ گے۔ بلکہ میرے ساتھ چلو گے۔ اب آ جاؤ جلدی سے۔"

تارا جلدی سے دروازہ کھول کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ نواز کو آگے بیٹھنا پڑا۔ احسن نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے پلٹ کر دیکھا اور اس کی اس حرکت پر مسکرا دیئے۔ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ان دونوں کی باتیں سن کر اسے معلوم ہوا کہ نواز بیمار ہو گیا تھا۔ اسے بخار آ رہا تھا پچھلے دنوں جب وہ سینما گھر پہنچے تو پکچر شروع ہو چکی تھی۔ ہال میں اندھیرا ہو گیا تھا۔ ٹارچ والا شخص آگے تھا۔ وہ ان لوگوں کو ان کی سیٹیں بتا رہا تھا۔

تارا کی آنکھیں بے نور ہو گئی تھیں۔ اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ آج وہ پہلی مرتبہ پکچر ہال میں آئی تھی۔ ظاہر ہے نروس تو ہونا ہی تھا۔ اس نے قدم آگے کو بڑھایا۔ قدموں تلے زمین نہ آ سکی۔ شاید سیڑھیاں تھیں۔ وہ بری طرح لڑکھڑا گئی مگر دو ہاتھوں نے بڑھ کر اسے سنبھال لیا۔ وہ ان ہاتھوں کو خوب پہچانتی تھی۔ ان ہاتھوں میں ہی تو وہ مقدر کی ڈوریاں تھامنا چاہتی تھی۔

احسن نے فوراً پلٹ کر دیکھا۔ "کیا ہوا؟ گھبرا گئی تھیں تم۔ چلو میرا ہاتھ پکڑ لو اندھیرا ہے۔"

تمہارا ہاتھ پکڑ کر اب کیا کرتی۔ ڈاکٹر احسن جب میں گرنے لگی تو وہ مجھے سنبھال لے گا۔ تم کیا جانو وہ میرے ساتھ ہے۔ تارا نے پل کے پل نہ جانے کیا کیا سوچ ڈالا۔ اس نے احسن کا ہاتھ نہیں پکڑا تو احسن نے جھک کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"بہت شکریہ۔" تب ہال کی ... "بیٹھ جاؤ اس بیچ والی کرسی پر۔ نواز تم اس طرف جاؤ۔"

خلا ہے ظہیر کی تو اکیلی ہی تھی، اس کا کمرہ بھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔
رنگین تصویر یا البموں کے سامنے بیٹھی بکھرا سا احساس ہے کہ کوئی کچھ سے کہا تھا اس کا نواز کتنی محبت کے بعد اس کے ساتھ تھوڑا سا بیٹھا ہے۔ اس کے دائیں ہاتھ کی طرف سے اگر وہ ہاتھ کی طرف احسن نے دیکھتے تو وہ نواز کے کمرے سے نکل کر بیٹے کی طرف سے مڑ جاتی۔ بیٹی خواہ بھی ہونی تھی اس طرف احسن بیٹھا تھے اور ان سے لپٹے ہوئے تھا احساس وہ لوگ نے کے بیے اپنا گرم ہاتھ تارا کے ہاتھ پر رکھ دیا تھا اور تارا کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔

نواز نے کرسی پر بیٹھے ہوئے تارا نے سینا کے چہرے سے دیکھا، ایک والہانہ سی محبت کا پیغام دے رہا تھا۔ اس کے اندر کہیں ہلکی بکھری ہونے لگی۔ وہ کانپ جاتی۔ لیکن نواز شاہ سے کچھ۔ دل کچھ ہونے لگا۔ پہلے پہ محبوب اس کی نگاہ سے ہٹتے تھے۔ تصویر کچھ بکھری ہوتے تھے۔ ہوا چلتی تھی اور نواز کہتا تھا کہ وہ شاعر ہے جو شاید ہی ملک اور اپنے خوشیوں کا پایہ عمر ثبت کر دیتے ہیں اور کوئی دوسرا ان کی بات میں نجانے کیا ڈھونڈ سکے۔ احسن نے تارا کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا تو اس کا ہاتھ لرزا تھا لیکن اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور دوسری طرف کو جھک گئی۔ احسن کا ہاتھ نواز کے ہاتھ پر جا پہنچا۔ نواز نے اس کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

کہانی آگے بڑھتی رہی۔ تصویریں بدلتی رہیں۔ ان دنوں میں جدائی ہو گئی تھی۔ وہ لڑکی اس لڑکے سے ملنے کے لیے بیتاب ہو جاتی تھی۔ تو راستے بند تھے۔ نواز کی انگلیاں تارا کی آنکھوں میں پڑی ہوئی انگوٹھیاں سے کھیل رہی تھیں —— پھر بے تاب ہو کے انگوٹھیاں الجھا دیں احسن نے پہنا دی ہیں —— احسن نے سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا ——
تارا نے انگوٹھیاں اتار کر پرس میں ڈال دیں۔

لڑکی کی شادی اس کی مرضی کے خلاف ہو رہی تھی۔ احسن نے تارا کی طرف جھک کر پوچھا۔ "بور تو نہیں ہو رہی ہو تارا؟"
"نہیں —— نہیں تو۔" تارا کی آواز بوجھل تھی۔

لڑکی جنونی ہو رہی تھی —— نواز نے تارا کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھ دیا —— اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا جیسے کہ نیچے اور قمیص کے اوپر نواز کی سخت انگلیوں میں دبا ہوا اس کا ہاتھ لرزنے لگا۔

وہ لڑکا اس لڑکی کی تلاش میں گھومتا رہا مگر وہ اتنا شدید وہ دیوانہ ہو گیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر درد کے نغمے تھے۔ تارا کی نظریں پردے پر جمی ہوئی تھیں۔ احسن کی کہانی اس کے سامنے تھی۔ وہ اس شکل کی صورت میں دیوانہ نظر آتا تھا دنیا ہی اداس ہو چکی تھی

آنکھیں بند کیے کرسی پر بیٹھی وہ خلا میں گھورتی رہی —— بھولی کا انجام سے کیا تھے کہ وہ اس کے نام پر پھر کچھ صرف بیت گئے تارا کو احساس ہوا کہ وہ نہیں تھا ہی کچھ تمام ہوئی۔

نواز نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں سے لگایا۔ گرم گرم آنسو اس کی ہتھیلی کو بھگوتے گئے۔ اس کا دل پھٹ گیا شیشے کے سامنے بند ٹوٹ گئے۔ نواز کے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے ہاتھ پر ہونٹ رکھ کر خاموش بیٹھی رہی۔ احسن اس کی طرف جھک گئے۔ نواز جانتی کو کچھ ہو گیا۔
"تارا —— تارا —— کیا ہو گیا تمہیں —— کوئی بات بری بات ہوئی تو نہیں ہیں۔ دیکھو کیا کیا کہیں گے —— تارا نظر اٹھا اپنا —— بچی ہو سب کچھ جھوٹ ہے —— بتاؤ کیا ہو گیا ہے تمہیں دوا کرو —— میں ابھی بتلائے دیتی نہیں تو کہتا ہوں —— بس یہ خرافات ہوئی ہے اس میں —— میں تو تمہیں تلاش کرنے کے لیے دیا تھا بہ صنم —— تم جلدی سے چپ ہو جاؤ —— اچھا بیٹھو تم ہو رہی"
احسن بیٹھا تھا کر تمہاری ہی طرف یہ کہتا رہا تھا۔
"نہیں —— نہیں —— میں بالکل ٹھیک ہوں۔" تارا نے تو پوچھ لیا تھی۔
"مگر روتا نہیں ——"
"نہیں ——" وہ پھر کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اس احسن اس کی طرف جھک کر بیٹھ گئے۔ وہ پھر دیکھنے کی بجائے یہ دیکھتے رہے کہ وہ رو تو نہیں رہی۔ انٹرول ہوا تو ہال روشنیوں سے بھر گیا۔ تارا نے جھک کر نواز کی طرف دیکھا۔ اس کی کرسی خالی تھی۔ وہ نہ جانے کب اٹھ کر چلا گیا تھا۔



"جانے والے"
کہ تیری یاد کی حرارت کی بولی ہیں
میں کس طرح گھر جاؤں گی؟
تو اب کرو سدا اپنے قبر کی یاد آ؟
[illegible]
[illegible]

تہہ خانے میں، بانس مروانے لگا تھا، تیسرے قدم کے بعد نہیں ——
آپ بھی سحر عتیق خان کے ساتھ چل کر دیکھئے اس تہہ خانے میں کیا طلسم ہے ——

سحر عتیق خان

میں بالکل بے بس تھی اور وہ گندی نالی کا غلیظ کیڑا میرے سامنے بڑی ڈھٹائی سے ریوالور تانے کھڑا تھا اور مجھ کو تہہ خانے کی اس کال کوٹھڑی کی طرف چلنے کا حکم دے رہا تھا جہاں پر اس نے اپنی تشدد پسند انا کی تسکین کے لئے جانے کتنی خوبصورت اور نوجوان عورتوں کو سڑا کر مار دیا تھا۔ مجھے اپنے ہوش و حواس قابو رکھنے محال ہو رہے تھے اور میں اپنے آپ کو کوس رہی تھی کہ کیوں میں اس ظالم اور سفاک شخص کے ساتھ آئی جو اپنی دہشت پسند طبیعت کی وجہ سے پہلے ہی بدنام تھا۔

چند سال پہلے وہ میرے کوٹھے پر چوری کی نیت سے آیا تھا۔ اس رات کافی رش تھا۔ میں اپنا آخری گاہک نمٹا کر ایک تھکے ہوئے مسافر کی طرح سونے کے لئے لیٹی ہی تھی کہ مجھ کو باہر کی طرف کھلنے والی کھڑکی کی چرچراہٹ نے چوکنا کر دیا۔ میں نے



اندھیرے میں اپنا تھیلا اٹھایا اور کھڑکی کے پاس چھپ کر کھڑی ہو گئی۔ خلاف توقع کرہ روشن ہو جانے سے وہ میرے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر سٹپٹا سا گیا اور جب میں نے اس کے چہرے کا نشانہ لیا تو اس کی گھگھی بندھ گئی۔ وہ گڑگڑا کر اپنی زندگی کی بھیک مانگنے لگا۔ کیونکہ اس وقت وہ میرے رحم و کرم پر تھا۔ مجھ کو شاید اس کی نوعمری پر ترس آ گیا۔ میں نے اپنے پرس سے کچھ نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیئے اور آئندہ ایسا برا کام نہ کرنے کی تاکید کرتے ہوئے اس کو دروازے سے باہر نکال دیا۔

کافی دنوں کے بعد ایک روز وہ پھر میرے پاس آیا اور کچھ پیسوں کا مطالبہ کیا۔ وہ بڑی بے تکلفی سے صوفے پر نیم دراز سا ہو گیا اور اس نے اپنی ٹانگیں سامنے رکھی ہوئی میز پر ایسے پھیلا دیں جیسے وہ مجھ سے کوئی تاوان وصول کرنے آیا ہو۔ میں کافی کا ایک کپ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے اس کے پاس بیٹھ گئی۔

وہ مشکل سے اٹھارہ انیس سال کا لگ رہا تھا۔ اس کا چہرہ جذبات سے عاری اور سپاٹ تھا۔ گہری بھنوؤں والی چھوٹی چھوٹی نیلی آنکھیں مستقبل کے خطرات کی غمازی کر رہی تھیں۔ اس نے بغیر کسی شکریہ کے کپ میرے ہاتھ سے تقریباً چھین لیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اسے کتنے پیسے چاہئیں؟

"پچاس پونڈ۔" اس نے جلدی سے جواب دیا۔ میں نے میز کی دراز سے پچاس پونڈ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیئے۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی چمک تھی اور وہ کسی بھوکے انسان کی طرح نوٹوں کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ میں نوٹوں کو ہاتھ میں دبا کر دوبارہ اس کے پاس آ بیٹھی۔

"تم نے اپنا نام تو بتلایا نہیں۔ کیا نام ہے تمہارا؟"

"تم مجھے ٹوئیس کہہ سکتی ہو۔" اس نے بڑی بے نیازی سے جواب دیا۔

"کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ تمہیں پیسوں کی ضرورت کیوں پیش آئی؟" میں نے دوسرا سوال کیا۔ یہ سنتے ہی اس کے چہرے پر پھر وہی درشتی آ گئی اور اس نے اپنی دادی کو ایک غلیظ سی گالی دے کر کہا کہ وہ کنجوس بڑھیا مجھ غریب کے لئے ایک پینی بھی نہیں دیتی۔ حالانکہ اس کے پاس بے شمار دولت ہے۔ میں جب بھی اس سے رقم کا مطالبہ کرتا ہوں تو وہ مجھ کو گھر سے نکال دینے کی دھمکی دیتی ہے۔ وہ آفت اگر جلدی دوزخ میں نہ گئی تو میں اسے جہنم رسید کر دوں گا۔" اس نے اپنی مٹھیاں جوش انتقام کے جذبے سے سختی سے بھینچ لیں۔

اور وہ ایک روز نشے میں دھت خود میرا اگلا شکار بن گیا۔ اس نے شاید اپنی دادی کو مار دیا تھا۔ اس روز وہ بہت خوش تھا۔ اس نے سینہ تان کر اپنی جیب سے نوٹوں کی گڈیاں نکال کر میری طرف اچھال دیں اور مجھے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ رقم خاصی معقول تھی اس لئے میں چلنے پر رضامند ہو گئی۔

اس کا گھر سمندر کے کنارے بڑی پر فضا جگہ پر واقع تھا۔ گھر کی چار دیواری میں رنگ برنگے پھولوں کی کیاریاں مخمل جیسی نرم ہری گھاس کا لان، برآمدے میں بڑے بڑے پتوں والے پام کے پودوں کے گملے بہت خوبصورت دکھائی دیتے تھے۔ کمرے بیش قیمت سامان اور فرنیچر سے بھرے پڑے تھے۔ کھڑکی سے ٹھاٹھیں مارتا سمندر اور مکان سے ملحقہ نہانے کا تالاب ایک خوبصورت سماں پیش کر رہا تھا۔

اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی دادی کا قد آدم فوٹو دیکھ کر اس کو ایک بڑی سی گالی دی۔ "خدا کا خوف کرو ٹوئیس، مرے ہوؤں کو گالی تو نہ دو۔" "کیوں نہ دوں؟" اس نے میری طرف گھورتے ہوئے کہا "یہ سب کچھ میرے باپ نے بڑی ملازمت سے کمایا تھا جس پر وہ قابض ہو گئی تھی۔ میرے باپ کی موت کے بعد جس کو بحری قزاقوں نے مار ڈالا تھا۔ میری دادی نے جائیداد ہتھیانے کے لئے میری ماں پر ظلم کرنے شروع کر دیئے۔ پھر ایک روز اسی نے میری ماں کو مار کر سمندر میں پھنکوا دیا۔ اس سے پہلے کہ اس کی لاش ملتی۔ وہ شارک مچھلیوں کی خوراک بن گئی۔ میں اس وقت بہت چھوٹا تھا۔ ورنہ میں اس کا خون پی جاتا۔ میری دادی نے لاکھوں پونڈ بینک سے نکلوا کر اس ڈر سے جانے کہاں دفن کر دیئے کہ کہیں میں اس کے جعلی دستخطوں سے رقم نہ نکلوا لوں۔" کچھ دیر کے لئے وہ کسی سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اس نے الماری سے عمدہ قسم کی شراب نکالی اور ایک ہی سانس میں غٹا غٹ چڑھا گیا۔ دھری آنکھ میری طرف بڑھاتے ہوئے وہ بولے، اگر وہ لیجے میں بولا "جانے وہ دولت کہاں دفن ہے۔ کاش میں اس خزانے کو پا سکتا۔" پھر وہ مجھے اپنے سونے کے کمرے میں لے گیا اور کچھ دیر بعد وہ مجھ سے اپنی قیمت وصول کر رہا تھا۔

یہ پہلی بار وہ مجھے گلے لگانے پہ مائل کرنے آیا لیکن جوں ہی قریب پہنچا مجھے
مستقل ملاقاتی بن گیا تھا اس لئے یہ جانتے ہوئے بھی کہ اب وہ کچھ زیادہ ہی عجیب
اور پُراسرار ہو گیا ہے۔ میں حسب معمول اس کے ساتھ چلی آئی تھی۔
میں نے توقع کے مطابق اس کا رویہ کچھ بدلا بدلا سا محسوس کیا۔ اس
نے گھر آتے ہی زور کی ٹھوکر سے دروازہ کھولا۔ مجھ کو ایک جھٹکے سے
صوفے پر گرا دیا۔ غٹاغٹ شراب کی دو بوتلیں چڑھا گیا اور مجھ کو
تقریباً گھسیٹتے ہوئے سونے کے کمرے میں لے گیا۔ میں سہم کر ایک
طرف صوفے پہ دوپٹہ اتارا اور باقی کپڑوں سمیت ہی بستر پہ دراز ہو گئی
رئیس نے اپنے کپڑے اتار کر بڑی بے ترتیبی سے پھینک دیئے اور
اس نے میرے کپڑے اتارنے کی بجائے پھاڑنے شروع کر دیئے جیسے
کوئی بھوکا انسان فروٹ کی تھیلی کو منہ کی طرف سے کھولنے کی بجائے
جلدی میں درمیان سے ہی پھاڑ ڈالے۔ اس وقت اس کی چھوٹی
چھوٹی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی وحشت اور درندگی تھی۔ میں نے
اس رویئے کا اس سے احتجاج بھی کیا۔ لیکن کسی تبدیلی کی بجائے
اس کے چہرے پر بڑی معنی خیز اور کریہہ سی مسکراہٹ دوڑ گئی جیسے
وہ سوچ رہا ہو کہ اب اسے کپڑے پہننے کی ضرورت ہی پیش نہ آئیگی۔
پھر میں خود اپنے کپڑے اتارنے میں اس کی مدد کرنے لگی تاکہ میرے کپڑے
پھٹنے سے بچ جائیں اور پھر اس نے مجھے بھوکے بھیڑیئے کی طرح نوچنا
اور بھنبھوڑنا شروع کر دیا۔

جی بھر کے مٹانے کے بعد وہ اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھتے
ہوئے اٹھا اور دوسرے ہی لمحے اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا اس کے
چہرے پہ بڑی وحشت ناک درندگی تھی پھر اس نے ہذیانی کیفیت
میں بکنا شروع کر دیا۔ "او کتیا! مجھ سے بھاگنے کی کوشش کرو۔ آج میں
تمہاری موت بن کر آیا ہوں۔ آج کے بعد تمہیں کبھی آسمان دیکھنا
نصیب نہ ہوگا۔ میں تمہیں سسک سسک کر ماروں گا تم ایڑیاں
رگڑو گی، اپنی زندگی کی بھیک مانگو گی اور میں تمہارے گڑگڑانے سے
لطف اندوز ہونگا قہقہے لگاؤں گا کیونکہ یہی میرا دل پسند مشغلہ ہے۔
موت گھر میں لے جانے سے پہلے میں تمہیں اس جگہ
سے متعارف کرادوں تاکہ تم میری عقل کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکو،
کیونکہ میرا ہر کام منظم مکمل اور سوچے سمجھے منصوبے کے تحت
ہوتا ہے۔ نہانے کے تالاب کے عین نیچے کال کوٹھڑی ہے۔
جس کا دکان کے نقشے میں کوئی وجود نہیں۔ نہانے کے تالاب
اور کال کوٹھڑی کے درمیان چار فٹ موٹی بجری اور سیمنٹ

کی چھت ہے۔ کال کوٹھڑی کی [illegible]
میں اندر سے دروازے کے کھلنے کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ باہر
سے دروازہ ایک بٹن کے دبانے سے کھلتا ہے اور اسی کے دبانے سے بند
ہوتا ہے۔ دروازہ بند ہونے کے بعد اس میں کوئی روزن نہیں رہتا
بلکہ عام دیوار کی طرح یکساں ہو جاتا ہے۔ اس میں ہوا کا کوئی
انتظام نہیں صرف ایک مضبوط شیشہ ہے جس میں سے میں
اپنی انا کی تسکین کے تحت تمہاری موت کا دلچسپ نظارہ کروں گا۔
جب تم بھوک اور پیاس کی شدت سے چلاؤ گی تو تمہاری آواز
کوٹھڑی کی دبیز دیواروں سے ٹکرا کر واپس ہو جائے گی جب تم
ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ایک اذیت ناک موت مر جاؤ گی تو میں اس کوٹھڑی
میں داخل ہوں گا تمہاری لاش کو بھاری پتھروں سے باندھ
کر اور کمرے کے اندر ایک کشادہ نالی کے ذریعے جو کہ دروازے
کے ساتھ ہی کھلتی اور بند ہوتی ہے تمہاری لاش کو سمندر کی تہہ
میں شارک مچھلیوں کے حوالے کر دوں گا پھر چند روز بعد یہ کوٹھڑی صاف
ہو کر کسی دوسری موت کی منتظر ہو گی۔"
پھر اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور ریوالور کے اشارے
سے کوٹھڑی کی طرف چلنے کے لئے کہا۔
میں اپنے ہوش و حواس برقرار رکھنے کی پوری کوشش کر رہی تھی مگر
بھی میری ٹانگیں بری طرح کانپ رہی تھیں کیونکہ اس سے زیادہ
دہشت ناک گھڑی میں نے آج تک نہیں دیکھی تھی۔ موت میری
آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑی تھی۔
میں نے بہت التجا آمیز لہجے میں کہا۔ "رئیس تم نے مجھے
مار تو دینا ہی ہے۔ مجھے کپڑے تو پہن لینے دو" اس نے پھر زوردار قہقہہ
لگایا اور کہا "ذرا رک کر، تم ایسے ہی خوبصورت لگ رہی ہو" میں نے اس
کو اس وقت کا واسطہ دیا جب وہ اسی طرح میرے پیار کی زندگی
تھا اور میں نے اس پہ رحم کیا تھا کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ میز پر سے
گھڑی اٹھاتے ہوئے بولا "اچھا صرف چار منٹ کی مہلت دیتا ہوں"
میں نے جلدی جلدی اپنا پرس اور کپڑے سمیٹے اور غسل خانے میں
چلی گئی ٹھیک چار منٹ بعد اس نے دروازے کو ایک زوردار
دھکے سے کھول دیا اس وقت میں کپڑے پہن چکی تھی۔
اس نے ریوالور کے اشارے سے تنگ آکر مجھے چلنے کا حکم
دیا اور میں ریوالور کی نوک پر کپڑوں سے ہوتی ہوئی ایک کمرے میں
گئی وہاں اس نے ایک بٹن دبایا ایک بڑی بھاری سی الماری کی

محسوس کر لیا تھا کہ اسی جگہ سے کھسک گئی تھی اس نے مجھے دیکھ لیا
تھا اسی دوران دروازے سے جیسے ہی وہ باہر گیا میں بھی تیزی سے گئی تھی
اس نے مجھے اندر دھکیل دیا اور مجھ پر خونخوار نگاہیں ڈالیں شاید کمال کر کے اس
کی کیفیت ہی ایسی تھی جیسے اس پر ایک اذیت ناک اور میرے سے مسکرا رہا
کھڑی تھی۔

میں نے لوسی کی طرف ایک بار پھر ... نظروں سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک خوفناک سی چمک تھی۔ اس پر ایک جنونی کیفیت طاری تھی اور وہ کسی مشین کی طرح کام کر رہا تھا۔ اس نے دیوار پر ایک جگہ انگلی رکھی۔ ہلکی سی گڑگڑاہٹ سے دیوار میں ایک بڑا سا دروازہ بن گیا اور آہستگی سے کھل گیا۔ اس نے میری طرف تحسین طلب نظروں سے دیکھا۔ میرا حلق جیسے منجمد ہو گیا جو میرے سامنے کھڑی تھی ہر طرف گہری دھند میں بڑی عجیب سی نظر آ رہی تھی میری گھٹی گھٹی چیخ نکل گئی اور میرے حواس خطا ہونے لگے۔

اف خدایا! مجھ پر رحم کرو۔ میں نے لرزتے ہوئے کہا

رشی نے ایک شیطانی قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ گھبراؤ نہیں ابھی یکشا وجبر ہے۔ تم عورتوں کی اس قسم کی نو آمخ کر کے مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے۔ اس کے بعد اس نے مجھے اس کے اندر سے اندر جانے کا حکم دیا۔ میرے قدم جیسے من من بھر کے ہو رہے تھے میں نے گڑگڑا کر اس سے ایک بار پھر رحم کی بھیک مانگی۔ اس کو خدا کے واسطے دیے لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ جب میں نے اندر جانے سے انکار کر دیا تو اس نے مجھے دروازے کی طرف دھکا دیا۔ میں مزاحمت کرتے ہوئے دروازے کے ایک طرف اس طرح ڈھلک گئی کہ میرے گلے کا لاکٹ میرے کپڑوں سے باہر آ گیا۔ وہ لاکٹ دیکھتے ہی کسی بھوکی بلی کی طرح میری طرف لپکا اور ایک جھٹکے سے میری گردن سے وہ لاکٹ نوچ لیا۔ اس نے فوراً لاکٹ کی ڈبیہ کو کھولا۔ اس کی آنکھوں میں ایک ہوسناک چمک پیدا ہو گئی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور ہاتھ کانپنے لگے۔

"کہاں سے لیا تم نے یہ لاکٹ؟" اس نے درشتی سے پوچھا۔ "ایک بڑے ... کی دکان سے" میں نے کانپتے ہوئے جواب دیا۔ اب اس کے ہاتھوں میں تہہ شدہ ایک پوشیدہ سا کاغذ تھا وہ فوراً تہہ خانے میں داخل ہو گیا میں کسی ماہر شکاری کی طرح ... پہنچی اور دوسرے ہی لمحے دروازہ بند ہو چکا تھا۔ سب کچھ پلک جھپکتے میں ہوا۔ میرے ہوش جب ٹھکانے آئے تو مجھے احساس

ہو گا۔ میں لپک کر باہر ... ہے ... کی ... اور ساتھ ہی ... مجھے لگا ... میں پھنسنے ... تھی کچھ دیر بعد میں اپنے ... بیٹھے ... سے ... مجھے اسی طرح ایک ... جس طرح ... میں ... گڑگڑا رہی تھی لیکن اس کی آواز ... نکلیں شاید یہ کمال کرشمہ ... ساؤنڈ پروف کمرہ تھی۔

میں کھڑی کے دروازے سے باہر نکلی بٹن دبایا دروازہ بند ہو گیا۔ بٹن پھر دبایا ... عمارت ... کی طرح دروازہ سامنے آ کر کھل گیا۔ میں نے رشی کے کمرے ... آ کر اطمینان سے اپنے بال درست کیے ... پہنچنے سے پہلے گھر پہنچ گئی۔

اور اس وقت جبکہ میں تمہارے سامنے بیٹھی اپنی ہی رسوائیوں کی داستان ... رشی کا خیال آ رہا ہے جس کے ہاتھوں نے ... ایک خوفناک کھیل کھیلی اور وہ مجھ سے مات کھا گیا۔

مجھ کو معلوم تھا کہ وہ ایک خطرناک آدمی ہے اور ایک نہ ایک دن مجھ کو اس قسم کی حالت سے دوچار ہونا پڑے گا۔ میں نے اس کی لالچی طبیعت کو پہچانتے ہوئے ہو بہو اس کی دادی کے لاکٹ جیسا ایک نقلی لاکٹ تیار کیا تھا کہ اس کی دادی کے قدیم خزانے نمایاں تھا۔ رشی کا خیال تھا کہ لاکھوں پونڈ کے مدفون خزانے کا راز اس کے لاکٹ میں تھا جو کہیں گم ہو گیا تھا۔

جس وقت میں نے رشی سے پیچھا چھڑانے کی ہمت باندھی تھی اس وقت وہ لاکٹ میرے پاس ہی تھا۔ میں نے اندر میں جاتے ہی پہلا کام یہی کیا تھا کہ میں نے لاکٹ کے تہہ شدہ کاغذ کے پرزے پر آئی برو پنسل سے باریک الفاظ میں لکھ دیا تھا

"تہہ خانے میں بائیں دیوار کے ساتھ تیسرے
قدم کے عین نیچے"

ناکام شوہروں کے جرم کا ایک انوکھا افسانہ



شکیلہ رفیق

"بیگم صاحب... وہ بیگم احمد آئی ہیں۔" رافعہ لان میں کھڑی ہوئی مالی سے کچھ باتیں کر رہی تھیں کہ ملازم نے آکر اطلاع دی۔

"ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔ میں ابھی آتی ہوں۔" انہوں نے ملازم سے کہا اور پھر مڑ کر مالی سے بولیں۔

"ہاں! تو میں کہہ رہی تھی کہ یہاں اگر گھاس نہیں اُگ سکتی تو کم از کم اتنی کوشش تو کرو کہ گلاب کے چند پودے ہی لگ جائیں۔"

"بیگم صاحب! میں نے آپ کو بتایا تا کہ زمین یہاں کی بنجر ہے۔ بنجر زمین میں پودے کا اُگنا آسان نہیں... پھر بھی میں کوشش کروں گا۔"

"ہاں میں یہی کہنا چاہتی تھی کہ کوشش کر کے تو دیکھو۔"

"اچھا جناب۔" مالی نے زمین کا جائزہ لیتے ہوئے کہا اور رافعہ ساڑھی کا پلو سنبھالتی اندر چلی گئیں۔

"ہیلو مسز احمد!"

"ہیلو مسز عثمان۔" عثمان رافعہ کے شوہر کا نام تھا۔

"کہیے آج کیسے بھول پڑیں؟" رافعہ ان کے نزدیک ہی صوفے پر بیٹھ کر بولیں۔

"معصوم تو کبھی کبھی بھول ہی جاتے ہیں۔ آپ تو بھولتی ہی نہیں ہیں۔" مسز احمد نے کہا تو دونوں قہقہہ لگا کر ہنس پڑیں۔

"اور سنائیے کیا ہو رہا تھا۔" مسز احمد نے مسکرا کر پوچھا۔

"بھئی دراصل مجھے گلابوں کا جنون کی حد تک شوق ہے اور ہمارے بیرونی حصے کی زمین جسے میں لان بنانے کا سوچ رہی تھی بالکل بنجر ہے۔ نہ تو اس پر گھاس ہی اُگ سکتی ہے نہ گلاب۔ میں مالی سے اس وقت یہی کہہ رہی تھی کہ کسی طرح کوشش کر کے اس پر گلاب لگائے۔ آپ سامنے کا بڑا سا پلاٹ دیکھ رہی ہیں نا کیسا حسین ہے۔ میں مسز رلینیٹ سے ملی تھی۔ میرا بھی یہی چاہتا ہے کہ میں اس میں بھی گلاب کا گلدستہ لگاتی... روز تازہ تازہ گلاب اس میں کتنے خوبصورت لگیں گے نا مسز احمد...؟" انہوں نے بڑے شوق سے کہا۔

"جب! پھر مالی نے کیا کہا ہے؟"

"ہوسکتا ہے اتنا زمین پر کبھی بڑے صاحب نے بھی دیکھا ہو۔"
"تو آپ بازار سے گلاب منگوا کر اس طرح کیوں نہیں بنوا لیتیں"
"کاغذ کے پھول۔؟"
"ہاں ہاں تو کیا ہوا اب تو اتنے خوبصورت پھول بننے لگے ہیں کہ پہچاننا بھی مشکل ہوتا ہے کہ اصلی ہیں یا نقلی۔" مسز احمد نے کہا۔
"نہیں مسز احمد! بازار سے جب نئے پھولوں میں اس کے علاوہ بات کہاں! میں لگاؤں گی تو اصلی ہی پھول لگاؤں گی ورنہ نہیں۔" رافعہ کے انداز میں بچپن تھا۔
"جیسی آپ کی مرضی۔" اس بے تکی ضد سے مسز احمد کا لگاؤ تو نہ تھا کہ رافعہ کے خیالی محلوں کا مسلسل ذکر کرتی جاتیں۔
"احمد صاحب آج کل نظر نہیں آتے؟" رافعہ نے ان سے پوچھا
"ہم بھی کتنے عجیب پڑوسی ہیں کہ مہینوں ملاقات نہیں ہوتی۔ کراچی کی زندگی ہے کچھ ایسی بھاگ دوڑ والی کہ کسی کی خبر نہیں ہوتی۔ احمد صاحب تو آج کل امریکہ میں ہیں۔" رافعہ مرعوب ہوتے بغیر رہ نہ سکی۔ کچھ دیر بعد ملازم چائے لے کر آ گیا۔ دونوں نے چائے پی اور مسز احمد انہیں پھر آنے کی دعوت دے کر چلی گئیں۔

•

انہیں رخصت کر کے وہ کمرے میں آئیں تو شان آفس سے آ چکے تھے۔ کچھ پریشان لگ رہے تھے طبیعت کچھ مضمحل سی ہے۔
"کیوں؟ آپ لیٹے کیوں ہیں۔؟" رافعہ نے پوچھا۔
"طبیعت ٹھیک نہیں ڈارلنگ! آج میں کلب نہ جا سکوں گا۔ آپ ہی چلی جائیے گا۔"
"اچھا! اگر تو زیادہ گڑبڑ تو نہیں ڈیئر؟" رافعہ نے نرمی سے انداز میں پوچھا تو وہ پیار سے بولے۔
"Don't worry darling ---- آپ جائیں۔" انہوں نے کروٹ بدل لی۔
"میں ذرا تیار ہو کے بس گئی کہ وہ لوگ شعیب صاحب کی فیملی آنے سے پہلے واپسی پر نوشین ڈراپ کر دے گی۔"
"نہیں نہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں بس ذرا ریسٹ کی ضرورت ہے۔" وہ پھر بھی پیشانی پہ سے بولے۔
"اوکے! بائی۔!" رافعہ نے دھانی سے کہا اور تیار ہونے ذرا ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔
کلب کی رونق حسبِ معمول عروج پر تھی بہار حلقہ ایک تو ان

کہ ان کے ساس سسر کی دنوں میں فرق ہی کیا آ سکتا تھا۔؟
رافعہ تیزی کی گاڑی [illegible] ساتھی بانسہ ملتی ہیں واضح ہوا ابھی تک بھی تھیں۔ انہیں پہلی بار دیکھنے کے بعد کوئی بھی دو ہی گھڑی کو سکتے ہو جایا کرتا تھا۔ وہ لیڈی تو ایسی تھی کہ مرکز کی ہلکی ہلکی سی اندازہ کر کی باتوں میں تھے جیسے تشبیہ کے پیک ادھر کر کے گئے۔ وہ تمام چبھتی نگاہوں کو نظر انداز کرتی اپنی مخصوص ٹیبل کی جانب بڑھتی گئی محض اتفاق تھا کہ وہ تنہا تھیں اور نوشین بھی اب تک نہ آئی تھی۔ وہ میز پر بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگیں۔ نوشین کے شوہر حیثیت کی بنا پر تھے معروف رہتے تھے کہ انہیں کلب آنے کی فرصت کبھی کبھار ہی ملتی تھی اس لئے وہ اپنا کلب کا زیادہ تر وقت رافعہ کی معیت میں ہی گزارتی تھی۔
رافعہ نے شیمپئن منگوائی تھی اور تنہائی سے بور ہو کر ہلکے ہلکے گھونٹ لے رہی تھیں۔ وہ کی نظریں ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں اور پھر ان کی بھٹکتی ہوئی نظر نوشین پر پڑی جو تقریباً دوڑتی ہوئی آ رہی تھی اس کے ساتھ ایک نیا جوڑا بھی تھا جس سے وہ ہنس ہنس کر کچھ بات کر رہی تھی۔
"ہیلو رافعہ۔!"
"ہیلو! آج تم نے بڑی دیر کر دی۔؟"
"ان سے ملو یہ مسٹر اینڈ مسز ملک ہیں ہمارے نئے پڑوسی" نوشین نے تعارف کرایا تو وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی دونوں سے باری باری ہاتھ ملایا۔
"آپ نہیں کھیلیں گے..... انہیں برج ہماری وجہ سے ہوتی ہے" مسز ملک نے مسکرا کر رافعہ سے کہا۔ "دراصل ٹونی اور پپی (یہ غالباً ان کے بچے تھے) شاور کے نیچے کھڑے ہو کر ٹھنڈے پانی میں بھیگ کے اب بخار میں پڑے ہیں۔ ادھر صبح سے ان کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی۔
I THINK HE IS FEELING SOME TROUBLE IN HIS STOMACH"
انہوں نے ملک صاحب کی طرف دیکھ کر کہا۔
"نہیں تو کوئی بات نہیں" انہوں نے سگریٹ کا کش لگایا۔
"نہیں نہیں کوئی بات نہیں بیمار تو ہو ہی جاتا ہے۔" رافعہ نے اخلاق سے کہا اور وہ دونوں مسکرا کے دوسری ٹیبل کی طرف بڑھ گئے۔
"بیٹھو۔" ان کے جانے کے بعد رافعہ نے نوشین سے کہا اور ہاتھ کے اشارے سے ڈرنک کا آرڈر دیا۔
"آج گاڑی دیر سے ملی ... شرارت سے پوچھا تھا۔ بڑی مشکل سے ٹیکسی لے کر آئی ہوں۔" نوشین نے کہا اور چیئر کھینچ کر قریب کر لی پھر بولی۔

"بابا تم سے مسز عثمان کہاں جاتی ہیں؟"
"وہ نہیں بتا کر گئیں کہاں جا رہی ہیں۔"
پھر دونوں عورتیں ... ایک ساتھ کھانے
بیٹھے تو زرشینہ کو کیا یاد آیا کہ وہ رالف سے بولی۔
"بابا ... تمہاری شادی کو کتنا عرصہ ہو جائے گا؟"
"بیس سال۔"
"بیس سال۔!! کمال ہے بیس سال میں ایک بیٹا بھی نہ ہوا۔؟"
زرشینہ نے بچوں کی طرح حیرت سے پوچھا۔
"ہم چاہتے تھے ... ہمیں ... تین بچوں کا ... ہو
یہ تو تم بچوں کا حال سن چکی ہو ... کس قدر مصروف ہو جاتا ہے
انسان بچوں کے بعد ... پھر وہ بیش کہاں ... تو اسے پتا بھی ہو سکتا
نہیں ہو جاتا۔" رالف نے سنجیدگی سے کہا۔
"بچی ایک ... حکم ... ہوتا چاہیے۔" زرشینہ نے شوخی سے کہا۔
"نہیں ... تم کر سکتی ہو۔"
"کمال ہے بچے کے بغیر گھر سونا سونا نہیں لگتا۔؟"
"ہمارے پاس اتنا وقت ہی نہیں ہوتا کہ اس سونے پن
کو محسوس کر سکیں۔"
"پھر بھی۔"
"LEAVE THIS TOPIC" رالف نے بور ہو کر کہا تو زرشینہ
بھی خاموش ہو گئی۔
زرشینہ نے آج پہلی بار رالف سے یہ بات کی تھی اس سے قبل بھی
کئی بار وہ بچوں کے سلسلے میں استفسار کرنا چاہتی تھی مگر وہ یہ پوچھتی تھی کہ بچے
بولتے نہیں ہیں۔ زرشینہ کے علاوہ بھی کلب کی کئی بیگمات اس سے اکثر
یہی سوال کرتی تھیں۔ مگر وہ بھی کہہ کر ٹال جایا کرتی تھی کہ لے اور
عثمان کو بچے سر درد لگتے ہیں۔

❖

اب وہ سب کے سامنے یہ وضاحت کس طرح پیش کرتی کہ دنیا
کی ہر عورت کی طرح اس کی کوکھ بھی ایک ننھے منے سے بچے کے لیے
بے چین ہے اس کی مریل بانہیں کس طرح اس انداز میں وا ہوتی ہیں
کہ وہ اپنے بچے کو گود میں سمیٹ رہی ہے کیا اس کا جی نہیں چاہتا کہ
اس کے گھر میں بھی ننھے منے بچوں کی کلکاریاں گونجیں جیسی تمنا ہوں مگر
جب عثمان ہی ...
لیکن اب وہ یہ بات کسی کو بتا بھی نہیں سکتی ... وہ اداسی سے

اس بچے اس بات ... ہر جگہ جیسے ... سے پوچھا اس ... کو
کچھ ... اس بات ... کی ... بتا نہ سکی تھی۔
کبھی کبھی تو وہ سخت بیزار ہو جاتی جب ... سے
دولت سے ملازمین اور ... سب عثمان سے ہی اس کا
سب کچھ ہے کہ اس کی گود ہی ... سے
... سے جو اپنے پیار ... ہو۔
شادی سے قبل اس کی خواہش تھی کہ ... اس نے بچپن ہی سے
... تھے وہ سب ایک ... بچے ... تھے وہ ایک ... سے
... تھی اور ... ملنے ... لڑکیاں
اور ... زندگی کے ... میں ... بیٹی ... ہوں ... کی
انداز میں سوچا کرتی تھی ... لڑکے ہوں گے پیار بھرے گے
اور دنیا کا ہر عیش ہو گا ... پھر خدا نے اسے واقعی ہر عیش ... دیا تھا۔
ہر دولت دی تھی ... اولاد جیسی عظیم دولت کے اس
دولت کے ... کو ... تھا کہ ... کی
چاہت ... لیکن وہ بھری ... کی ... جب ... تھی
رات ... جب وہ کلب سے ... گھر ... میں
ذرا ... سے ... کی جانب ... ہوئی
... ہوتی تو ... ایک ... عجیب
عجیب ... سا ... بڑھ سے ... بیڈ پر ... بیٹھ ... اور ...
... ایک ... سیٹھ عثمان کے ... پر
... عجیب ... اس نے ایک ... پر نظر
... پر ... سیٹھ عثمان پر ڈالی ... طرح
ڈریسنگ روم میں جا کر کپڑے تبدیل کرنے لگی ... نیلی
... آئی اور ... پیالہ ... کر
اس میں ... کر کر ... گی۔

❖

ان دنوں عثمان ... سے ... تھے ... ہر ... عثمان
کے ساتھ ہوتی تھی ... کی ... اس کی حیثیت ... بیزاری تھی کر
عثمان کے ... پر بھی وہ ... نہ ہوتی ... ہی
ہی جا ... کے سبب وہ شام ہوتے ہی کلب ... تھی
زرشینہ ... ہوتی تھی اور ... لگے ... پیالہ
... کرتی تھیں ... وقت ہی وہ ... کلب کے ... ہی
سیٹھ ... کی ... باتیں ... تھیں۔

[illegible]
کرلینے کے بعد ... کا مرکز بنا تھا۔
"سوتی تو ہوں" رافعہ نے اقرار کیا۔
"تم عثمان کو سمجھاؤ نا! ان کا اب یہ نخرہ بہت ہو چکا چاہیے"
"سمجھاؤں گی"
"پتہ ہے کہ لوگ کیا کہنے لگے ہیں" زرشین نے دبے لہجے
میں ... کیا۔
"کیا" رافعہ نے پوچھا
"اب تو سب کو شک ہونے لگا ہے کہ تم میں یا عثمان میں کوئی
خرابی ہے" زرشین نے جیسے سنبھل کر کہا۔
"کیا؟"
"ہاں رافی!"
"زرشین یہ تم کیا کہہ رہی ہو یہ جھوٹ ہے" رافعہ نے اپنے
آپ کو بھی دھوکا دیا۔
"مجھے معلوم ہے یہ جھوٹ ہے اس میں ذرا بھی صداقت نہیں" زرشین نے تسلی آمیز انداز میں کہا "مگر لوگوں کو تب ہی یقین آئے گا جب
تم ماں بن جاؤ گی تم عثمان کو سمجھاؤ ... کرو"
"عثمان کو؟"
"تو اور کیا! جب وہ خوشی سے ملے تو تم ہی سے اس سلسلے
میں بات کرنا! آخر کب تک یہ یوں تنہا زندگی گزارو گی"
"مگر زرشین..." اس کے ہونٹ کپکپا گئے۔
"ہوں"
"مگر میں...؟"
"میں... میں..."
"زرشین...!!"
"سب کچھ کہو گی بھی یا پریشان ہی کرتی رہو گی" زرشین جھنجلا گئی۔
"مگر زرشین یہ کس طرح ممکن ہے...؟"
"کیوں؟ ممکن کیوں نہیں..." زرشین حیرت سے بولی۔
"زرشین ہمارے آنگن میں کوئی پھول... کوئی پھول کبھی نہیں
کھلے گا... در اصل عثمان..." اس نے عثمان کا نام لیا اور آگے الفاظ اس کے
حلق میں پھنس کر رہ گئے۔
"رافی...!!!" زرشین بھونچکی رہ گئی۔
"ہاں زرشین وہ لوگ جھوٹ نہیں کہتے" اس نے جیسے اپنے دل کا



[illegible] حل کرنا ہوگا۔

حال ... آگیا تھا "میری زندگی ... اس کے پاس
... زرشین ... جس میں کوئی پھول نہیں کھل سکتا۔
کوئی نہیں"
رافعہ ... پھوٹ پھوٹ کر ...
... زرشین نے اس کے آنسو ... دیا۔
کافی دیر بعد رافعہ نے خود ہی اپنے آنسو پونچھ ڈالے ...
... زرشین کو دیکھا جو بڑے غور سے اس کے چہرے کا مطالعہ کر رہی
تھی۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی پُراسرار مسکراہٹ تھی۔
"رافعہ" اس نے پکارا اور رافعہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔
"تم نے جو کچھ بتایا وہ حقیقتاً افسوسناک ہے۔ مگر میرا خیال ہے تمہیں
اپنا بھرم تو قائم رکھنا چاہیے تاکہ کسی کو شک نہ ہو" زرشین نے ...
... کہا۔
"بھرم! وہ کس طرح..." رافعہ نے حیرت بھری نظروں سے
اسے دیکھا۔
"جس طرح... جس طرح حینہ نے قائم کر رکھا ہے..." وہ ...
مسکراہٹ سے بولی۔
"کیا مطلب...؟" رافعہ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔
"بھولا کون نہیں تو ..." مسکراہٹ مزید ... گئی۔
"کیا؟ تو کیا... یہ میرا مطلب ہے...؟" وہ ... کچھ کچھ
سمجھ کر بولی۔ اور زرشین نے ... انداز میں اثبات میں سر ہلا کر
جیسے فیصلہ دے ہی دیا۔
"تمہارے آنگن میں تازہ پھول نہیں تو کیا! تم بازار سے خرید
کر تو سجا سکتی ہو نا...!"
اور
رافعہ کی نظروں میں مسز احمد گھوم کر رہ گئیں۔

سُچا دامن

…ستم کو پہلو ہے سے جوڑنے والے حضرات کے لیے بطورِ خاص لکھی گئی ایک پُرلطف کہانی

کو بیتے ہیگنے سے ہرچرن چاولہ کا مہکتا ہوا تازہ گلدستہ

ہرچرن چاولہ

بھائی گوربچن سنگھ نے دکان کے آگے پڑے تخت کے نیچے سے جھاڑو نکالی، تخت صاف کیا اور جھاڑو پھر تخت کے نیچے چھپا کر رکھ دی۔ تخت پر چڑھنے سے پہلے اس نے تین بار تخت کو دائیں ہاتھ سے چھوا اور اسی ہاتھ کو ماتھے سے لگا کر منہ ہی منہ میں کچھ پڑھا۔ تخت پر دکان کے شٹر سے دروازے میں تین بڑے بڑے تالے اوپر نیچے لگے ہوئے تھے۔ پہلے اس نے درمیانی تالے کو جھنجھوڑا پھر اسے بوسہ دیا۔ تینوں تالے ایک ایک کر کے کھول دیئے اور اندر چلا گیا۔ اندر جا کر اس نے پہلے جھاڑن سے شوکیسوں اور اسٹینڈنگ شیلفوں کو صاف کیا اور ایک خوشبودار اگربتی اپنی گدی کے پیچھے شیو جی کی مورتی کے آگے جلا کر رکھ دی۔ تھوڑی دیر آنکھیں بند کئے، ہاتھ باندھے، سر جھکائے وہ دھیان میں بیٹھا رہا۔ اتنے میں دکان میں آہٹ سی ہوئی۔ آنکھیں بند کئے کئے ہی اس نے اندازہ لگا لیا کہ بندہ سنگھ آ گئے ہیں۔ جب اس نے آنکھیں کھولیں تو دونوں نے کہا:

"سردار جی... ست سری اکال۔"

ست سری اکال کہہ کر وہ پھر دکان کا مال اور دوسرا الم غلم سامان سنبھالنے لگا جو کل دکان بند کرتے وقت باہر رہ گیا تھا۔ اس سے اس کا مطلب تھا کہ دونوں بھی بیکار وقت ضائع نہ کریں اور اپنے کام سے مطلب رکھیں۔ اس کا خیال تھا کہ اگر وہ یہ سختی نہ برتے تو یہ بیکار کے لوگ اس کا کیا کرایا سب چوپٹ کر کے رکھ دیں۔

ویر سنگھ کچھ سال پہلے چاندنی چوک میں باداموں کی سوغات کی ریڑھی لگاتا تھا۔ ڈنڈے پہ کنستر دھرا ہوتا۔ ان کے تال پر سارا دن وہ "ایک ایک نے، ایک ایک تنے" کی رٹ لگائے رہتا۔ بجلی والے، مزدور، قلی، کباڑی اور غریب لوگ اس سے سوغاتی پیتے تھے۔ شام تک دو تین سو بن جاتے جو اس کے لیے بہت کافی تھے۔ اکیلا دم تو تھا، نہ گھر نہ بار، نہ دوست نہ رشتہ دار۔ تقسیم نے سب کچھ اس سے چھین لیا تھا مگر وقت کے مرہم نے سب گھاؤ ٹھیک ٹھاک کر کے اسے بھی دنیا میں بستے رہنا سکھا دیا تھا۔ خوش و خرم زندگی گزار رہا تھا کہ ایک دن کارپوریشن والوں نے اسے چاندنی چوک سے اٹھا کر میلوں دور ایک نئی بستی کے کنارے لا پٹخا۔ جہاں اس کی طرح اور بھی کئی بے سہارا لوگ تھے جن کے پاس گھر تو تھے مگر پیٹ پالنے کے وسائل نہ تھے۔ ہوا یوں تھا کہ وہ بازار میں کھڑا سوغاتی بیچ رہا تھا کہ اچانک آ گئے آ گئے کا شور بلند ہوا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھل پاتا کمیٹی والے اسے لیے جا رہے تھے، اس کی ریڑھی ایک ٹرک میں اور اسے دوسرے ٹرک میں لاد کے ایک ان دیکھی انجانی منزل کی طرف لیے جا رہے تھے۔

ویر سنگھ نے سوچا جو ہوا سو ہوا، گزرا کل ختم ہو گیا اب اسے سر چھپانے کو جگہ تلاش کرنی چاہیے۔ ٹرک کو چھوڑ کر وہ نئی بستی میں اتر گیا۔



نئے مکان تھے نئی نکور، سڑکیں اچھی تھیں۔ کہیں کہیں بے رونقی بھی تھی۔ و
گیا، کھلے میدان تھے۔ کتنی کتنی مکانوں کے بیچ کھلے چھوٹے ہوئے تھے۔ ویر سنگھ
نے ساری بستی چھان ماری۔ تمام مکانوں پر قبضہ ہو چکا تھا۔ صرف سڑک
کے کنارے جہاں بستی ختم ہوتی تھی کچھ مکان خالی پڑے تھے۔ ان مکانوں
پر وقتی لوگوں نے قبضہ نہیں کیا تھا کیونکہ وہ بالکل سڑک پر واقع تھے اور
وہاں بچوں کو رکھنا ٹھیک نہیں تھا۔ شہر کی تمام نئی بستیوں کے لیے
بنائی جانے والی اینٹوں کے ٹرک اسی سڑک پر سے گزرتے تھے۔ اس لیے دن بھر
اینٹوں سے بھرے ٹرک اس سڑک پر دوڑتے رہتے۔ پچھلے چند دنوں میں ٹرکوں
سے ایک دو بچوں کی موتیں بھی ہو چکی تھیں۔ ویر سنگھ اکیلا آدمی تھا۔ اس
نے سوچا اسے کچھ نہیں، تو سڑک پر رونق ہی دیکھے گا۔ اور اگر واہگرو
کو منظور ہوا تو اسی سڑک پر وہ پھر روزی بھی لگائے گا۔ یہی سوچ کر اس نے
چوراہے کے قریب سڑک کے کنارے ایک مکان پر قبضہ کر لیا۔ کچھ
دن بعد پھر ایک پھٹے کو دو اینٹوں پر رکھ کر اس نے سفید سفید سردائی کے
گلاس اس پر سجائے اور بیچنے لگا۔ "ایک ایک آنہ ایک آنہ"
ٹرک ڈرائیور اور مزدور تھکے ہوئے سردائی کے گلاس پیتے اور آگے
اپنے سفر پر روانہ ہو جاتے۔ ویر سنگھ کا کام چل نکلا اور پیٹ کا ایندھن
کا سامان بننے لگا۔ گرمیوں کے تپتے ہوئے دنوں میں اس کی ٹھنڈی سردائی کے

گلاس کم ہونے لگے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ سردائی کے گلاس پڑے
پڑے لوگوں کی اداسی ہوئی گرد سے اٹے ہونے لگے۔ تنگ آکر آخر اس
نے یہ دھندا بھی چھوڑ دیا۔ وہ کتنی دن اندر پڑا رہا۔ ایک دن کسی نے
اس کے دروازے پر دستک دی تو باہر نکلا۔ یہ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی تھا
اس نے پوچھا:

"سردار جی، کیا کام کرتے ہو؟"

ویر سنگھ کو لگا جیسے وہ اس کا مذاق اڑا رہا ہو۔ جل کر بولا:

"مہاراجہ لگا ہوں۔"

آنے والا شخص بے مزاج کا ملک تھا۔ بولا: "سردار جی، کب
تک یونہی پڑے رہو گے۔ میں جانتا ہوں تمہاری سردائی نہیں بکتی،
مگر اور بھی تو کئی کام ہیں جو تم کر سکتے ہو۔"

ویر سنگھ کو ان الفاظ میں ہمدردی کی جھلک نظر آئی۔ بولا: "اور کیا
کام کروں؟"

"مطابق [illegible] بھی تو کر سکتے ہیں۔ تم یہاں سے دس میل
دور شہر جاتے ہو [illegible] جو کسی کو نصیب ہوتی ہے۔ اسے اچھا
خوب یاد آیا۔ کل [illegible] یہاں سے دو میل دور [illegible] کا بڑا
دفتر ہے۔ کل وہاں [illegible] کی بھرتی ہوگی۔ تم بھی چلے جاؤ۔ سالا [illegible]

ماہوار مل ہی جایا کریں گے ۔"

دوسرے دن وہ وہاں گیا تو قصبوں کی بھرتی ہو رہی تھی۔ کوئی خاص بہتر طریقہ اس میں جانچ پرکھ کا نہیں تھا۔ بس ایک صاحب شکل دیکھتا تھا اور ایک تجربے کار کے سپرد کر دیتا تھا۔ ویر سنگھ بھی بھرتی ہو گیا۔ [illegible] دو سال کی گیری کرتا رہا۔ بیس کے [illegible] سے گھر پر بھی کھانا کھا کر وہ پچاس روپے مہینے کے ساتھ اوور ٹائم کے بھی تیس چالیس روپے بچا تا رہا۔ ساتھ کر جب وہ گھر پہنچتا تو شام کے بعد کے کر وات کی سیاہی مکمل اندھیرے پر چھا چکی ہوتی۔ دو سال وہ کارخانے اور بستی کے بیچ کو لہو کا بیل بنا رہا۔ اُسے پتہ بھی نہ چلا کب دن چڑھتا تھا اور کب رات ہوتی تھی۔ پھر جب کارخانے میں کام گھٹ جانے کی وجہ سے اوور ٹائم گھٹا بند ہو گیا تو اس کمی کو پورا کرنے کے لیے اس نے شام کو اپنے گھر کے سامنے [illegible] بیچنے کی ریڑھی لگانی شروع کر دی۔ تب اُسے محسوس ہوا کہ کارخانے کی دنیا سے باہر بھی ایک دنیا ہے جو کافی بدل چکی ہے۔ دو تین سال سے اس کی اپنی بستی بھی کافی ترقی کر چکی تھی۔ سڑکیں پکی کر دی گئی تھیں۔ میدانوں کو خوبصورت پارکوں میں بدل دیا گیا تھا۔ مکان اپنی اصلی شکلیں بدل کر نئے اور خوشنما بنگلے بن رہے تھے۔ سڑک پر کاروں، تانگوں، موٹرسائیکلوں اور اسکوٹروں کی چہل پہل نظر آنے لگی تھی۔ میونسپلٹی کی بسوں کا بھی خاطر خواہ انتظام ہو گیا تھا۔ آس پاس کے تمام خالی گھر اب بھر گئے تھے۔ بستی کے اندر کی دکانوں سے زیادہ ویر سنگھ کے آس پاس مکانوں میں بنا دی گئی دکانوں پر کافی رونق رہنے لگی تھی۔ اُسے یہ سب تبدیلیاں اب محسوس ہوئیں جب وہ دفتر سے جلدی گھر آنے لگا۔ اُس کے پاس اب ہزار ڈیڑھ ہزار کے قریب روپیہ بھی جمع ہو چکا تھا۔ اُس نے سوچا، کیوں نہ ایک چھوٹی سی دکان کھول لے۔ مکان تو اس کا برلب سڑک عین موقع پر ہے ہی۔

دوسرے دن وہ دفتر سے چھٹی لے کر وہ شہر سے ضروری سامان بیچنے کے لیے خرید لایا اور باہر والے کمرے میں چیزوں کو ترتیب سے سجا کر دکان بنا ڈالی۔ ہر روز شام کو وہ دکان پر بیٹھنے لگا۔ وہ ہاتھ اور زبان کا صاف آدمی تھا، اس لیے اس کا کام چل نکلا۔ شہر کی ہوا اب یہاں تک بھی پہنچ چکی تھی۔ اس کے گاہک جن میں زیادہ تر عورتیں ہی ہوتیں، آٹا، دال چاول کے علاوہ [illegible] کے ساتھ ساتھ بال صفا پاؤڈر، فیس پاؤڈر، لپ اسٹک اور دوسری قسم کی چیزیں بھی مانگنے لگیں۔ پھر ایسے ہی کئی ملتی جلتی چیزیں لا کر رکھنا پڑیں۔ جب کام بہت بڑھ گیا تو اُسے نوکری چھوڑ کر دکان کا ہی ہو جانا پڑا۔

[illegible] ویر سنگھ [illegible] پیارے لال جی نے کہا [illegible] دفتر میں بھرتی ہونے کی اطلاع [illegible] مکانات کی فروخت کا کام کرتا تھا۔ پہلے لوگ کہتے تھے وہ بستی ہے اس لیے اس کا کام اچھا چل رہا تھا مگر اب لوگوں نے جہاں [illegible] پسند کر لیا تھا اور بستی میں پانی اور بجلی کا بھی بندوبست ہو گیا تھا۔ دوسرے باہر کی پرانی بستیوں سے یہاں کے ریٹ بھی مناسب لگ رہے تھے۔ اس سے پیارے لال کے کام کو کافی [illegible] لگا اور ویر سنگھ کا [illegible] پڑنے لگا۔ ویر سنگھ نے کبھی اُس سے پھوٹی کوڑی [illegible] واپس نہ مانگی بلکہ جب کبھی روپے دیتے آیا تو کہتا۔ "رہنے دو لالہ جی پھر آ جائیں گے۔"

ایک دن ویر سنگھ [illegible] پیارے لال کے گھر جا پہنچا۔ کسی بھی شخص نے ایک نیا کام اور جوش [illegible] دیا تھا۔ تبھی ویر سنگھ بولا۔ "لالہ آخر کب تک یونہی پڑے رہو گے۔ میں جانتا ہوں تمہارا کام ٹھپ ہو چکا ہے مگر اور بھی تو کئی کام ہیں۔ ہمت کیوں ہارتے ہو۔"

لالہ بولا۔ "کچھ میں نہیں آتا اور کیا کروں ؟"

ویر سنگھ بولا۔ "کام تو کئی ہیں۔ [illegible]۔ اچھا دوست ہو کل سے میری دکان پہ آ جانا۔ تھوڑا سا حساب کتاب کرنا ہو گا۔ جو کہو گے دے دیا کروں گا۔"

پھر دن بعد پیارے لال ویر سنگھ کی دکان کے کھاتے سنبھالے بیٹھا تھا۔ دوپہر کو جب لالہ کے گھر سے کھانا آتا تو اس میں کافی ہڈیاں، گوشت اور سبزی وغیرہ ہوتی جیسے [illegible] ہو۔ لالہ اپنے پر خلوص اصرار سے ویر سنگھ کو بھی ساتھ شامل کر لیتا۔ کچھ دن تو ویر سنگھ لالہ کے ساتھ کھاتا رہا مگر پھر جب اس نے [illegible] تو لالہ کی ناراضی ہوا۔ مجبوراً وہ لالہ کے کھانے میں شریک ہونے لگا۔ مگر اس نے چپ چاپ لالہ کی تنخواہ میں [illegible] روپے کا اضافہ کر دیا اور کبھی کبھی [illegible] اس کے گھر پر بھی کسی نہ کسی صورت پہنچانے لگا۔ انہوں نے بھی ویر سنگھ کی خاطر مدارات میں اضافہ کر دیا اور وہ اس کے گھر کا ایک فرد بن گیا۔

پیارے لال نیت کا صاف، کام کا پکا اور زبان کا میٹھا تھا۔ تمام حساب کتاب بھی [illegible] کرتے تھے جیسے وہ [illegible] تھا [illegible] ویر سنگھ نے [illegible] دکان کے کام میں [illegible] شہر جانا اور [illegible] اور ٹھیک [illegible] پانچ دن رات [illegible] کبھی میل نہ آیا۔



ویر سنگھ نے اس کے بعد سے سب سے پہلا سبق اس عورت سے سیکھا تھا
پکارنا شروع کر دیا۔ حالات کے دس بیس برس گزر چکے تھے مگر بھی اس کا
کام تمام تھے میں رہتا۔ دکان میں بیٹھ کر وہ سب کچھ کرتا جو اس کو سنبھالنے
سنبھالنے یا سنوارنے کے لیے ضروری ہوتا۔ ایک گاہک دکان پر آتا تھا
کب جاتا تھا، یہ اندازہ لگانا خود اس کے لیے مشکل تھا۔ وہ کبھی کبھی دکان
پیارے لال کے گھر بھی جا پہنچتا مگر وہاں کی باتوں سے وہ بے تعلق تھا۔
پیارے لال کی لڑکی تو شانتا شیاما تھی جو اپنی ماں کے پاس
رہتی تھی۔ میٹرک کرنے کے بعد اب وہ چھ سال سے کالج میں آ گئی
تھی۔ جب وہ کالج گئی تو پیارے لال اور اس کی بیوی اپنی دنیا میں مگن
رہے مگر اب اسے قریب اور پھر جوان دیکھ کر وہ فکر مند رہنے لگے۔
اس کی ماں اکثر ذکر کرتی کہ لڑکی کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ مگر وہ جب بات دیتے
تو وہ تنہا ہوتا اور تھکا ہوا آتا کہ آدھی بات سنتے سنتے وہ نیند کی آغوش
میں لڑھک جاتا۔

"مگر میں جوان لڑکی بیٹھی ہے اور تمہیں دکان اور بازار کے جھگڑوں
سے ہی فرصت نہیں۔" ایک دن اس کی بیوی نے پھر اسے یاد دلایا۔
"جلی لوگ، یہ کوئی ہنسی کا کھیل تو نہیں۔" اس نے کہا۔ "کوئی
ڈھنگ کا لڑکا نظر آئے تو بات کروں۔"

لالہ دن بھر پریشان رہا۔ حساب کتاب کے دوران پر شیاما
سامنے آ کھڑی ہوتی۔ پھر وہ بڑی اور بڑی ہوتی جاتی اور سوچوں میں غروب
جاتا اور اس سے حساب میں غلطیاں ہو جاتیں۔ اس روز وہ پھر کر اس
سے کہتا، ابھی ڈھنگ سے دیکھا یا نہیں ہی سے کہ کتنی کتنی دیر منہ میں
دبائے ہوئے سوچتا رہتا اور سوچتا رہا۔ ویر سنگھ بولا۔

"چاچا جی، آج تم گم کیوں ہو؟ کھا تا نہ کھاؤ، دیکھو کتنا اندھیرا ہے۔"
لالہ کو یک دم یاد آیا۔ اس کی بیوی تو ہسپتال گئی ہے اور کھانا
شیاما نے ہی بنایا ہوگا۔ کسی خیال کے زیر اثر وہ ذرا سا مسکرایا۔ اسے
یک دم ہوک سی چبھن محسوس ہوئی اور اس کے ہاتھ جلدی جلدی نوالے منہ
تک پہنچانے لگے اور جب تیزی سے چلنے لگے۔ خلاف معمول شام کو جلدی
فارغ ہو کر شیاما کی بات سے وہ گھر پہنچ گیا۔

"جلی لوگ، ذرا ادھر آؤ۔"

اس کی بیوی اپنی جگہ سے شاید نہ اٹھی تو وہ جلدی سے اس کے
پاس پہنچ گیا۔ "آج کھانا شیاما نے پکایا تھا؟"

"ہاں، میں تو ہسپتال گئی تھی۔ کیوں، کیا بات ہے؟"

"آج ویر سنگھ کھانے کی بہت تعریف کر رہا تھا۔"

"پھر ...... ؟"

"اب تم کو کوئی بہتیاں بھیج رہا ہوں۔"

جوان بیٹی کی ماں لالہ کی بات سمجھ گئی۔ اس کا چہرہ چمک اٹھا،
بولی "اے میاں، یہ تو میں بھول ہی گئی تھی۔ کیا لڑکا گھر ہی میں بیٹھا ہے
تو پھر کرنا بات۔"

لالہ مسکرا کر چپ ہو گیا مگر تھوڑی دیر بعد بولا: "کھانا شیاما
کے ہاتھ سے بنوایا کرو۔ اسے اچھا لگتا ہے۔"

پھر دن ایسے ہی گزر گئے۔ ایک دن پھر جب ویر سنگھ نے کھانے
کی تعریف کی تو لالہ بولا "سردار جی! یہ بھی اتنا ہی گھر ہے۔ کیا اب بھی باہر
کھانے کا بندوبست تمہیں اپنے گھر ہی کرنا چاہیے۔"

ویر سنگھ نے لالہ کی طرف دیکھا اور اس کے چہرے کی مسکراہٹ
جانچ کر بولا "چاچا! یہ آپ ہی کا گھر ہے، آپ ہی کی اور کرم ہے۔"

"اچھا تو آج شام کھانا گھر آؤ۔ بھگوان نے چاہا تو سب کام ٹھیک
ہو جائیں گے۔"

شیاما کو جب پتہ چلا کہ اس کی زندگی کی ڈور ویر سنگھ سے باندھی
جا رہی ہے تو وہ بہت روئی اور تلملائی کیونکہ ویر سنگھ اس کے خوابوں کا
شہزادہ نہیں تھا۔ وہ اس کی نظروں میں ایک بے ڈھنگا دکان کا نوکر تھا جو
دکان کا کام کرتا تھا۔ گھر کی ٹھنڈک نہیں ملتی مگر جب ماں نے سمجھایا تو وہ
وہ لالہ جی کی خاطر اور گھر والوں کی بات ماننے کے لیے تیار ہو گئی اور شادی کر نے کے بعد اس کے
ساتھ چلی گئی۔

شادی کے پہلے چند دن تو ویر سنگھ کام سے جلدی گھر آ جاتا
مگر پھر سب حالات کے مطابق چلنے لگے۔ شیاما
ویر سنگھ کی ... اور ...

بھابی نے پہلے مگر آج وہ شاکر کے پاس آتے ہوئے کیوں اٹھتے ہیں کسی نے
بھابی یا صبر کی سی ہمکی کی گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ لیکن کمی جو
انہیں پہننا آتی وہ دکان سے منگوا لیتی۔ سب اچھے اچھے کپڑے وہ لا دیتا
تھی۔ آنکھوں پر چشمہ چڑھائی کھانے اور بچوں کو ان کو آتی جیسے کہ کوروں سے بھی
بڑھ کر مکان میں بھی ویریسنگھ نے کافی بڑا بنوایا تھا۔ جس میں صرف وہ تھی تو
بسنگھ۔

ایک دن ویریسنگھ نے کہا۔ "آتا بڑا گھر ہے۔ تم کو تو کوئی کمانے والا
لاؤں۔ بچا ہے پیسے آمدنی ہی ہو جائے گی۔"

"تمہارے ... شیا مابل ہی ہو گئی۔ اُن دنوں گھر لی سراغ والا
آر جیسا پیسہ نکلا تھا۔ اُسے لگا جیسے وہ پیسہ کسی نے ویریسنگھ کے سر پہ
پھینکا ہو جو اُس کے سر کے درمیان سے گزرتا ہوا اُس کی گود میں
آ گرا ہے جو اب سنبھل کر آہستہ آہستہ اوپر واپس جاتا ہے۔ اور
ہنسی کی گرفت میں پیسا الجھا ہے کہ جیسے سانپ کے منہ میں کچھ زہر
سے اس کا اس پر ترس سا آگیا۔ اُس نے سوچا اور کچھ نہیں تو گھر میں رونق
ہو جائے گی۔

دوسرے دن ویریسنگھ ایک جوان جوڑے کو لے آیا۔ مختصر سامان
سامان تھا جو ایک کمرے میں ہی سما گیا۔ سامان نیا نیا اور خوبصورت
تھا۔ پھر سجایا بھی اُن لوگوں نے اس ڈھنگ سے کہ اور بھی خوبصورت
نظر آنے لگا۔ لڑکا کسی دفتر میں کلرک تھا۔ صبح آرام سے اٹھتا۔ شیو کرتا، نہاتا
دھوتا۔ ناشتہ کرتا اور کپڑے بدل کر ابھی بوٹوں کے تسمے ہی باندھ رہا ہوتا
کہ اس کی بیوی رجنی ایک چھوٹے سے خوبصورت سے ٹفن کے ڈبے
میں اس کا کھانا رکھ کر ڈیوڑھی میں پڑے سائیکل کی ٹوکری میں رکھ
آتی۔ تسمے باندھ کر وہ ڈیوڑھی میں پہنچتا اور ادھر ادھر دیکھنے کے بعد
بیوی کے لبوں پر بوسہ دینے کے بعد زیر لب مسکراتا، سائیکل باہر نکال لیتا
یا لڑکی کے پیچھے کی طرف سے سب کچھ دیکھتی رہتی۔ جب رجنی
ہونٹوں پر ایک دبی دبی مسکان لیے ڈیوڑھی سے کمرے کی طرف آتی تو
شیلا کو اس کے چہرے پر کچھ ایسی رونق اور نور محسوس ہوتا جیسے کہ
اس کے رخ پر سارے ملک کی صبح کو دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ رونق اور حسن
تو ہی رجنی کے چہرے پر نظر آتا تو شیلا کو لگتا جیسے رجنی کل ہی بیاہ کر
اس گھر میں آئی ہے۔ رجنی کہتی ہے اس کی شادی کو دو سال ہو گئے ہیں
اور خود شیلا کی شادی کو تو صرف آٹھ مہینے ہوئے ہیں پھر کیا بات ہے
رجنی کے چہرے پر جو بشاشت اور نکھار ہے وہ اس کے چہرے پر نہیں
اور دیکھیں گی ہوتی جا رہی ہے۔ جھنجلا کر اُن سوچوں کی لکیروں کو

ذہن سے باہر نکال دیتی مگر وہ پھر چیونٹیوں کی طرح اس کے سر پر چڑھنے لگتی
تھیں۔ وہ سوچتی جب ویریسنگھ آتے گا تو وہ اس سے پوچھ لے گی کہ
.... کرو .... نہیں ایسے پوچھنا ٹھیک نہیں۔ کیسے برے بھی
ایسے پوچھا جاتا ہے۔

ایک دن اس نے بسنتی رنگ کی خوبصورت سی فرنچ شفان کی ساڑھی
باندھی۔ ایسی ساڑھی اس کلرک کی بیوی کے پاس تو ساری زندگی بھی
نہیں آ سکتی تھی۔ اس نے لپ اسٹک لگائی۔ بندیا لگائی اور پاؤں تک سے
خود کو سنوارا اور لڑکے کے ہاتھ ویریسنگھ کو کہلا بھیجا۔ وہ گھنٹے تک بھی جب وہ
نہیں آیا تو اس نے کہلا بھیجا۔ جلدی آؤ بہت ضروری کام ہے۔ ویریسنگھ
گھبرایا ہوا آیا اور بولا:

"کیا ہے جلدی بتاؤ۔ وہاں گاہک کھڑے ہیں۔"
وہ جل کر رہ گئی مگر سنبھل گئی۔ "جلدی آؤ۔ سینما چلیں گے۔ بڑی
اچھی فلم لگی ہے۔ کاغذ کی ... "

اُس نے خاص ادا سے ویریسنگھ کے گلے میں اپنی بانہیں ڈال
دیں۔ ویریسنگھ نے پروا ہی سے اپنے گلے سے بانہوں کا ہار اتارتے ہوئے
بولا۔ "پھر کسی دن چلیں گے۔ آج تو دکان پر بہت مصروفیت ہے۔"
"مصروفیت، مصروفیت۔ تمہیں کبھی فرصت ہوتی بھی ہے۔"
وہ ایک ادا سے دلبری سے منہ پھیر کر روٹھ کر بیٹھ گئی۔
"اچھا۔ آج رہنے دو۔ پرسوں چھٹی ہے ضرور چلیں گے۔"
ویریسنگھ مناتے ہوئے بولا۔

وہ منہ پھیرے پھیرے بولی: "چھٹی کے دن بھی تو تم سارا سارا دن
دکان کے اندر بیٹھے ہر کا سامان سمیٹتے رہتے ہو یا شہر سودا لینے یا حساب کتاب
کرنے چلے جاتے ہو۔ پھلے ہو تو آج چلو۔"
"اچھا بابا۔ تم تیار ہو جاؤ۔ میں ابھی آتا ہوں۔"
ویریسنگھ کے جانے کے بعد شیلا سوچنے لگی۔ سینما تو ایک بہانہ تھا
وہ تو دیکھنا چاہتی تھی کہ ویریسنگھ کے پاس اس کے حسن کی تعریف کے لیے
وہ الفاظ بھی ہیں کہ نہیں۔ وہ بنی ٹھنی کیسی سلونی لگتی تو کس لیے۔ محبت کے
دو میٹھے بولوں کی خاطر نا۔ ویریسنگھ آئے تو ابھی دروازے سے ہی اُس کی آنکھیں
نم ہو گئیں۔ اس نے کہا تھا تم تیار ہو جاؤ میں ابھی آتا ہوں۔ کیا وہ کچھ
اور تیار ہو گی۔ کیا ویریسنگھ کو اس کی تیاری نظر نہیں آئی۔ سوٹ سے سینما
تک ... جاتے مگر تعریف کے دو بول اور بہت ... تھی نہیں
اُس نے دل کو تسلی دینے کے لیے ویریسنگھ کی راہ تکنی شروع کر دی۔
وہ جب آئے گا تو اس کے ایک ایک اپ کی طرف ضرور متوجہ ہو گا۔ اور اُس

کے حسن کی تعریف میں چند الفاظ ہونٹوں سے نکلنے ہی والے تھے مگر راہ دیکھتے دیکھتے اُس کی آنکھیں تھک گئیں وہ نہیں آیا۔ رات گئے ویر سنگھ وہ اُس کے پہلو میں لیٹ گیا اُسے پتہ بھی نہ چلا۔ صبح جب وہ اٹھی تو وہ پھر غیر حاضر تھا۔ جانے کب اُٹھ کر نہا دھو کر دوکان پر چلا گیا تھا۔ سامنے کرنیل بابو رام سرن نالی کے پاس کھڑا داتن کر رہا تھا۔

پہلے پہل تو شیلا نے اپنے آپ کو ویر سنگھ کے معمول کے مطابق ڈھال لیا تھا مگر اب نجانے کیوں اُس کا دل چاہتا کہ ویر سنگھ وقت سے گھر آتے۔ اُس کی طرف دیکھے۔ اُس کے حسن کی تعریف کرے۔ اُس کے ساتھ سینما جائے اور...... مگر ویر سنگھ اس کی کوئی بھی خواہش پوری نہ کر سکا۔ وہ صبح سے رات گئے تک کام کرتا رہتا اور حسبِ معمول لیٹ آتا رہا۔ اُسے تو پتہ بھی نہ چلتا کہ وہ کب آیا، کب کھانا کھایا، گرم بھی کیا یا نہیں۔ وہ روز روز اُس کی راہ بھی تکتی، انتظار بھی کرتی مگر جانی کی وہ کوشش نیند جانے کب اُسے اپنی آغوش میں کھینچ لیتی۔ نہ جانے نیند آتی تھی تو کیا تھا۔ وہ اس کا مالک تھا سرتاج۔ کیا وہ اُسے جگا نہیں سکتا تھا مگر نہیں وہ تو شاید ایک مشین تھا جو ہر چیز، ہر کام معمول اور ترتیب سے کئے جا رہا ہے۔ زندگی ان پلوں کی کھونا گاڑی کی طرح ایک چکر میں چلی جا رہی تھی۔ شیلا اسی چکر کو جیسے کہیں دنیا سمجھ بیٹھی تھی مگر نئے کرایہ دار بوس نے اُس کی زندگی کا رُخ بدل دیا۔ ویر سنگھ کے رویئے سے مایوس ہو کر وہ اور زیادہ دھیان سے کرایہ دار کی ہر حرکت کا جائزہ لینے لگی۔ آہستہ آہستہ وہ اُس میں اور اس بات پر رُکنے بھی لگی۔ میاں بچھڑ کر یوں بیٹھے، کمرے میں دھواں کیوں، یوں ہی وائرلیس میں سائیکل رکھ کے راستہ کیوں بند کر دیا۔ مگر کرایہ دار انتہائی شریف اور حیثیت ثابت ہوتے۔ اُس کے ہر اعتراض کو نشانِ منسا کر دیتے۔

شام کو چھٹی ہوتے ہی لڑکا سیدھا گھر آتا۔ بیوی منٹوں میں سج دھج کر تیار ہو جاتی۔ دونوں پکچر دیکھنے چلے جاتے یا گھومنے نکل جاتے۔ چاندنی راتوں میں تو وہ گھنٹوں کمرے کی چھت پر بیٹھے گپیں ہانکتے رہتے۔ پھیر پھار میں تو کتنی بار وہ کھانا کھانا بھی بھول جاتے۔

انہی دنوں شاپ اسسٹنٹ بیمار ہو گیا تو شیلا نے سکھ کا سانس لیا۔ اب تو کم از کم ویر سنگھ رات جلدی گھر آیا کرے گا۔ کیونکہ تنہا کام تنگ ہاتھوں سے کب ہو سکے گا۔ لیکن تو واقعی ویر سنگھ رات جلدی ہی آنے لگا مگر وہ اتنا تھکا ہوتا کہ وہ شیلا کے پاس بیٹھ کر بات کرنے کی بجائے کھانا کھا کر سو جاتا۔ ایک دن شیلا نے اُسے بہت مجبور کیا تو وہ اُسے سینما لے گیا لیکن پکچر شروع ہوتے ہی وہ گہری نیند سو گیا۔ دوسرے دن ویر سنگھ رات بھر جاگ کر تھیٹر گیا تو شیلا نے اُس

سے پتہ کر دیا۔ ایک شام کو جب وہ گلی میں جھانک رہی تھی کہ شاید ویر سنگھ آ جائے، اُس کی نگاہ اچانک ہی رات کو لوٹ آنے والے کرایہ دار کی طرف ہو گئی تھی تو شیلا اُن دنوں سے گھومنے پھرنے کو ترس گئی۔ آج اس نے چاندنی رات میں سیر کا پروگرام بنایا تھا۔ ویر سنگھ نے پھر وہی پہلے والا سوال پوچھا، شیلا کی ساری امیدیں ٹوٹ گئیں۔ مٹی کی طرح سلگتی اور گھٹتی رہی۔ آخر وہ ہفتوں کے صبر کا غبار پھوٹ پڑا۔ جب ویر سنگھ رات کو ساڑھے بارہ بجے گھر آیا تو وہ جاگ رہی تھی۔ وہ حیران ہو کر بولا۔

"شیلا آج نیند نہیں آئی؟"

"اب کبھی نہیں آئے گی۔"

"کیوں، کیا بات ہے؟"

"کیونکہ میں ہر بات معلوم ہو۔ رات گئے ایک بجے سے پہلے تم نہیں لوٹتے اور منہ اندھیرے چلے جاتے ہو۔"

ویر سنگھ کچھ نہیں سمجھا۔ بولا "تمہیں پتہ ہے، دکانداری میں تو بہت کچھ ہوتا ہے۔"

"بس مجھے ایسی دکانداری کی بات نہ کرو" شیلا تڑپ کر بولی۔

شیلا کے تیور دیکھ کر ویر سنگھ نرمی سے بولا "آخر کوئی بات بھی بتاؤ گی؟"

"بات کیا بتاؤں، بس سیدھی بات ہے وقت پر گھر آ جایا کرو یا......"

"یا۔؟" ویر سنگھ نے حیران ہو کر دہرایا۔

"یا کرایہ دار کو نکال دو۔"

"کیوں؟" ویر سنگھ کا چہرہ مجسم سوال بن گیا۔

"ہر بات نہیں کہی جا سکتی کچھ سمجھا بھی کرو۔"

وہ ہاتھوں میں منہ چھپائے روتی ہوئی پلنگ پر جا گری۔ ویر سنگھ اُس کے پاس جا بیٹھا اور اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی سمجھ جانے کی اداکاری کرتے ہوئے بولا۔

"اچھا تم فکر نہ کرو۔ میں کل ہی اسے نکال باہر کرتا ہوں۔"

مگر جب شیلا کی سسکیاں اور تیز ہو گئیں تو وہ اور بھی پریشان ہو گیا کہ اب اُس کے رونے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔

ساکھ

مشرقی معاشرے کی
ایک جیتی جاگتی تصویر



طاہرہ عباس حسینی

ہاں بہن سعیدہ، میں پندرہ برس کے ساتھ کے بعد اس عمیش کو چھوڑ کر چلی آئی۔ مرتا ہے تو مرنے دو میری لاتوں سے مرے، کسی طرح اس کے نجس وجود سے یہ دنیا تو پاک ہو۔ میں تو خوش ہوں کہ وہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر رہا ہے۔ میں بھی تو پورے پندرہ برس اس کے کارن ایڑیاں رگڑ رگڑ کر زندہ رہی ہوں۔ دن رات اس کی جھڑکیاں، طعنے سہنا، اس کی غراتی آوازیں سننا، اور اس کے جبری وار سہنا، جسم کو ... سمجھنا اور عجب راتوں کو ہر طرح محروم ہو کر، عورت ذات پیدا ہونے کی ذلت برداشت کر کے سونا تو اب میں دیکھتا آیا، کہاں سے وقت کا انداز ناپ ہے، اور ان کی زہر بھری ہنسی اور اب تو اس ہنسی میں میری بچی کی بھی ہنسی شامل ہو گئی ہے۔ جانتی ہو کیا کہتی ہیں مجھ سے یہ بہنیاں؟ آپا کہتی ہیں تو نصیب دیکھ ایک تو شہر سے والی تھی کہ اس بڑے بہنوئی کی شکل مانگ کر آئی ایک تو ہے کہ باؤ کے منہ میں دہانہ ہر لی بجلی کی طرح ہر دم چیختی چلاتی ہے مگر تم بھی نہیں کرتی! اور میری منو کیا کہتی ہے جانتی ہو وہ کہتی ہے بیٹی کے لئے ماں کی گود ہی سب سے بڑا تحفظ ہے، میں آنند چین کی نیند سو رہی تھی کہ میری ماں میری نگہبان ہے، مجھے کاہے کا ڈر؟ مگر تم نے جانتے بوجھتے دشمن کے خونخوار پنجے میں میری نازک گردن دے دی اور تم میں اتنی بھی ہمت نہ تھی کہ اپنے ہاتھوں سے میرا گلا گھونٹ کر مجھے موت دے دیتیں۔ یا وہ بھیانک زندگی سے بچا لیتیں!

ہاں ہاں، دونوں طعنے دینے میں میری جان پر بنے ہیں۔ حق بجانب ہیں مگر تم ہی بتاؤ میں کیا کرتی۔ میں تو تمہارے نصیب بھائی کی باندی تھی۔ زر خرید کنیز سے بھی بدتر۔ لونڈیاں خریدنے میں دام تو لئے جاتے ہیں مگر یہاں تو نقد وصول پر سارا کام بن جاتا ہے۔ ہزاروں لاکھوں کے مہر بندھتے ہیں مگر کتنوں کو تم نے یہ قرض ادا کرتے دیکھا یا سنا ہے؟ آپا جان تمہیں سب معلوم ہے مگر وہ دام وصول نہیں کر سکتے وہ دام وصول کرنے والی ہوتی ہے۔ تب گھر کی چہار دیواری میں قید، شرم و حیا کی کالی کوٹھڑی میں قید، شوہروں کے دستور کے ... پنجرے میں قید، کیسے نکالتی ہیں گھر سے قدم؟ سب بند ہیں اور بھی دیتی مگر کیا ہوتا؟ پھر چلی جاتی سسرال اور میکے میں پھر ایک عورت کا ٹھکانہ کہاں ہے؟ ... آپ ہی آ بیٹھی، بھائی ہی بچا پہنچ گئے مگر ہیں پندرہ برس اگلے دن ہی ... بیٹھی رہی سوچ تو، پندرہ برس ایک جگ کے برابر ہیں۔ کتنے دن دم گھٹتا ہوتی رہی ہیں؟ اب جو تم کر رہی ہو جانے سے پہلے کیا کر نکل بھاگ ہو تم نے پہلے سب ہی ڈر کے تمام دھرنے کر دیا ہے اور تو اور تم بھی جو اپنے بھائی کے طور طریقوں سے اچھی طرح واقف ہو مجھے طعنے دیتی ہو اور نہیں سوچتیں کہ میں بھی تمہاری طرح عورت ذات ہوں۔ میں اکیلی ہی ایسی نہیں اجڑی ہوں بلکہ ہندوستان کی ساری بہنوں کی یہی کہانی ہے۔ ... جنہیں ... نے قربانی کا ...

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

رہی وہ لوگ ان جھگڑے فضولی سے اس پاس سے ہنگامے کر دیکھتی رہی جب برات سے گئے پھوپی اماں اپنے گھر گئیں تو مجھے دم مارنے کی مہلت ملی پھوپی اماں کا گھر گاؤں ہی میں تھا۔ ان بے چاری کو بابا جلدی سے رہنے نہ دیتے تھے۔ ان کی ایک بہو تھی ایک بیاہی بیٹی اور ایک صبیحہ آپا سے بڑی بن بیاہی بیٹی۔ وہ جلدی میں اکیلی ہی آئی تھیں صبح کو سب کو لے کر آنے کا وعدہ کر کے اچھی طرح اندھیرا ہونے پر چلی گئیں۔ بابا باہر بیٹھے یار دوستوں سے باتیں کرنے والی برات کے انتظامات کرنے میں مصروف تھے۔

جب میں نے جھانکا کمرہ پایا تو میں اس پلنگ پر جا کر لیٹ گئی جس پر آپا اب تک گھونٹ بنی بیٹھی تھیں۔ میں نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا "ہائے اللہ میں تو کام کرتے کرتے مر گئی" آپا کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر میں نے سر اٹھا کر آپا کی صورت بغور دیکھی۔ میں نے دیکھا کہ ان کا گورا گورا چہرہ دھلے کپڑے کی طرح بالکل سفید ہے لہو کی ایک بوند بھی کہیں جلد کے نیچے نہیں جھلکتی مگر آنکھیں اس طرح پھیلی تھیں کہ معلوم ہوتا جیسے وہ خوفناک بھوتوں کا ناچ دیکھ رہی تھیں۔ وہ لالٹین کی روشنی میں شیشے کی طرح جھلکتی تھیں اور پلک جھپکنے کا نام نہ لیتی تھیں۔ میں نے جلدی سے کروٹ ہو کر ان کا گھٹنا ہلایا "کیا سوچ رہی ہو آپا؟" میں نے پوچھا۔

امی کا سایہ جب تین برس پہلے ہمارے سر سے اٹھا تھا اسی وقت سے انہوں نے گھر کا سارا کام سنبھال لیا تھا۔ وہ اپنے سن سے کہیں زیادہ سمجھدار تھیں۔ پہلے سے کوئی مجھ سے اگر کوئی ان کی باتیں سنتا جانے گھروں کے رواج، شادی بیاہ، مرے جینے کی رسمیں پوچھتا تو وہ ایسی باتیں کرتیں جیسی بڑی بوڑھیاں کرتی ہیں۔ مگر صبیحہ آپا کا بھولپن تھا کہ دیکھ کر ہی منہ چوم لینے کو جی چاہتا تھا لیکن اس وقت ان کا چہرہ اتنا بھیانک تھا کہ میں نے گھبرا کر سوال دہرایا "کیا سوچ رہی ہو آپا؟"

وہ جیسے گہری نیند سے چونکیں۔ انہوں نے لمبی سانس لے کر مجھے بھینچ کر کلیجے سے لگا لیا اور وہ بولیں "کچھ نہیں بی بی۔ اب میرا سب دور اندھیر ہو گیا۔"

مجھے بھی آپا جیسی باتیں کرنا آگئی تھیں۔ میں نے کہا "آپ دوا نہ ہم سب لڑکیوں کا اپنے گھروں سے اٹھنا ہی ہے۔ ہاں تمہارے ماتھے میں یہ منحوسیت ہے کہ نواب تو بابا سے بھی بڑے ہیں۔" پھر میں نے خیال میں ان کے ایک اور تیر مارا "اب تو حامد بھائی اپنے دل میں لیں گے۔"

حامد بھائی ہمارے رشتے کے بھائی تھے۔ ان کی ماں اور میری والدہ سگی بہنیں

جنتی امی میں بڑا اسکا ہاتھ تھا اس لئے آپا کے بیاہ بھی انہوں کا ہاتھ میں حامد بھائی کے لئے مانگ لیا تھا۔ حامد بھائی اور آپا اس رشتے سے کچھ پہلے سے واقف تھے اور دونوں ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ آپا صورت شکل میں ہزاروں میں ایک تھیں۔ حامد بھائی بھی اچھے بھلے جوان چلے تھے ادھر کچھ دنوں سے جب سے کہ انہوں نے اپنی اسکول پاس کر لیا تھا۔ آپا سے شادی کی بات چیت میں زیادہ گرمی آگئی تھی۔ بابا کو فکر تھی کہ نواب صاحب سے سفارش کرا کے انہیں کہیں کچہری دفتر میں نوکر رکھا دیں تو پھر آپا کا بیاہ ہو جائے۔ اس لئے ادھر حامد بھائی کا ہمارے ہاں آنا جانا کم ہو گیا تھا۔ ہم بہنیں ان سے پردہ کرنے لگی تھیں۔ سب یقین تھا کہ سال بھر مہینے کے اندر ہی اندر آپا حامد بھائی کی ہو کر چلی جائیں گی۔ مگر آفت نا گہانی کی طرح تمہاری بھابی کی جنت سدھاریں اور بابا کی نگاہوں میں وہ جچا ہو سہرا پیاہوں کی کر انہیں سوائے تمہارے بھائی کے نواب کے جھرّی دار چہرے کے کچھ سوجھتا ہی نہ تھا۔ ہونٹوں سے تھوک اڑانے کو بھی مشرف ہوتا ہے اس کے نزدیک جبق کے علاوہ کچھ نہیں دکھائی دیتا۔

دوسرے دن صبح کو گاؤں کی ایک چھوکری نے آپا کو ایک پرزہ لا کر دیا۔ لکھا تھا "رات میں نے اس ظلم کی روداد سنی جو ہم دونوں پر آج توڑا جانے والا ہے۔ میں مارنے مرنے پر تیار ہوں محض تمہارے خیال سے خاموش ہوں۔ مجھے صاف صاف جواب دو کیا تم بھی مجھے بھول گئیں۔

حامد"

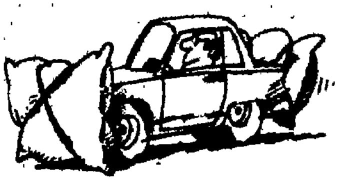
میں نے آپا کے پیچھے کھڑے ہو کر اس پرزے کو پڑھ لیا انہوں نے مجھ سے چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے نچلا ہونٹ دانتوں سے دبا کر یہ پرزہ دوبارہ پڑھا پھر مجھ سے پنسل منگا کر اس پر لکھا "آج رات کو اس کا جواب مل جائے گا۔" میں آپا سے اس جواب کا مطلب بھی نہ پوچھ سکی، جیسے ہی چھوکری نے پرزہ پھر آنچل میں باندھا۔ ڈیوڑھی میں پھوپی کی ڈولی آ گئی۔ بس مجھے فوراً کام میں جت جانا پڑا۔ دوپہر تک سارا گھر بیبیوں سے بھر گیا۔ باہر دیگیں کھنکنے لگیں، بھابی پھوپی کی بہو جو آئیں تو اپنے ساتھ ایک ڈھولکی بھی لیتی آئیں۔ بس اب تو گیتوں کا سلسلہ چھڑا کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی۔ اسی ہنگامے میں نہ جانے کب آپا نے چپکے سے گوٹے لگی ہوئی اینٹوں کا ایک گولا حلق سے اتار لیا۔ اور سب کی آنکھ بچا کر انگوٹھی بھی کر دیکھ کا ہیرے کا سفوف بھی پھانک لیا۔ اب وہ خاموش دھلائی جا رہی ہیں کپڑے پہنا کر سنواری بنائی جا رہی ہیں لیکن منہ سے بولتی نہیں۔ دوسرے کھیلتی ہیں بس برابر جھومتی جا رہی ہیں۔ محفل نے کہا شرم ہے، یہ حال ہے۔ اس لئے انہیں بٹھا کر

کر ایک پلنگ پہ لٹا دیا۔

اتنے میں شور ہوا "برات آگئی، برات آگئی" بینڈ باجے ڈھول

پر کوئی بیس آدمی آئے تھے۔ مونگ پھلی بیچنے والے کی ساری بی بیاں دروازے پہ جھانک کر برات کا تماشا دیکھنے نکل گئیں۔ میں بدنصیب بھی انہیں میں تھی۔ ادھر جو دھکا لگا تو آپا جیسے جاگیں اور انہوں نے پلنگ سے اترنے کی کوشش کی مگر انہوں نے صرف ایک پاؤں زمین سے لگایا تھا کہ ایکا ایکی ان کی سانس اکھڑی اور وہ پلنگ سے آدھ دھڑ سے نیچے لٹکی ہوئی بے ہوش ہو گئیں۔ آمنہ خالہ جو برات کے ساتھ آئی تھیں ویسے ہی آپا کے پاس پہنچیں۔ آپا کی حالت دیکھ کر الٹے پاؤں پلٹیں۔ انہوں نے دوسری بی بیوں کو جمع ہونے سے روکا۔ پھوپی سے کہا "دلہن کو اتنی ہوش کی ہے۔ اس کا ہاتھ منہ دھلا دو" اور اپنی خاص ملازمہ کو بھیج کر تمہارے بھائی کو ڈیوڑھی پر بلایا۔ ان سے کہا "دلہن نے کچھ کھا لیا ہے مرشد (?) بھیج کر فوراً ڈاکٹر کو بلاؤ۔" آدھے گھنٹے میں ڈاکٹر آیا۔ اس نے انجکشن دیا کہا "انہیں کسی طرح جگاؤ اور سونے نہ دو۔" وہ ادھر باہر گیا، ادھر میں نے آپا کو خوب جھنجھوڑ ڈالا۔ انہوں نے آنکھیں کھولیں تو وہ اپنا سر میری گود میں رکھ کر ایک طرح ہونٹ بھینچ کر مسکرائیں پھر میرے سہارے سے اٹھ کر بیٹھیں مجھ سے ہانپتے ہوئے کہا "کہہ دینا جواب ہو گیا" اور ہنسنے لگیں میں نے ایسی بھیانک ہنسی آج تک نہیں سنی۔ محض خیال سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس ہنسی میں کراہ تھی، فریاد تھی، انتقام کی خوشی۔ ایسا محسوس ہوتا کہ آپا نہیں ہنس رہی ہیں بلکہ مرگھٹ کے بھوت کسی تازہ لاش کو نوچ کر کھاتے جاتے اور ہنستے جاتے ہیں۔ میں نے چاہا انہیں منع کروں مگر ڈر سے میری گھگھی بندھ گئی۔ ہنستے ہنستے آپا کو کھانسی آئی۔ انہوں نے ذرا سا جھک کر میری گود میں خون کی کلی کی اور ان کا سنگار مسل گیا مگر پھر میں […] گیا۔ اتنے میں تمہارے بھائی اور ڈاکٹر کے ساتھ اندر آئے۔ ڈاکٹر نے نبض دیکھی بند آنکھیں کھول کر دیکھیں۔ دل کی حرکت سننے کی کوشش کی۔ سر ہلا کر تمہارے بھائی سے کہا "یہ مر گئی ہے" […] آپا کو گود میں لئے بت بنی بیٹھی تھی۔ مرنے کا نام سن کر […] آپا کے منہ پر منہ رکھ کر رونے لگی۔ […] پیچھے کھڑی بہن سے ڈانٹ کر کہا "تم […] ہو گیا تھا اسے ساری بی بیوں کو رخصت کرو اور […] ہٹاؤ" ڈاکٹر نے […] ان کا منہ دیکھا […] کہنا چاہتا تھا مگر تمہارے بھائی اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ساتھ لے کر چلے گئے۔ دوسری بی بیاں جلدی جلدی گھر […] دی گئیں۔

[…] آمنہ خالہ اور تمہارے یہاں سے آئی ہوئی ماماؤں نے […] ماتم شروع کر دیا۔ میں پچھاڑیں کھاتے کھاتے […]

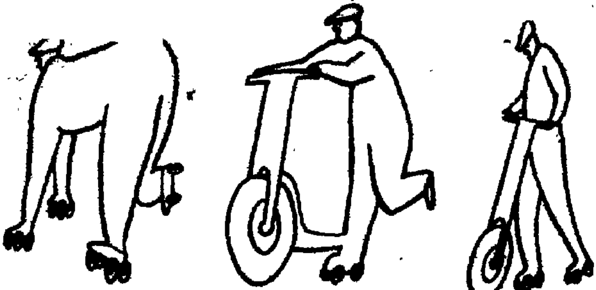


ہو گئی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کب آپا کی دوسری برات نکلی اور کب وہ ملک الموت کی دلہن بن کر ہمیشہ کے لئے چلی گئیں۔

صبح کے قریب مجھے اس وقت ہوش آیا جب پھوپی نے مجھے جھنجھوڑ کر کہا "اٹھو بیٹا! تمہارا ابھی نہانا ضروری ہے۔ تمہیں معلوم ہے آپا کی میت کو چھونے کا غسل واجب ہے" میں نے صدمے […] پر بھی اس سے نہانے میں زیادہ پس و پیش نہیں کیا مگر جب میں نہا کر نکلی تو پھوپی اماں نے مجھے زبردستی آپا کی آئی ہوئی ڈالی کے کپڑوں میں سے ایک شاندار جوڑا پہنا دیا اور ایک قیمتی دوشالہ اڑھا کر وہ مجھے گود میں لے کر بیٹھ گئیں۔ مجھے جو گرمی سے آرام ملا تو میں ان کے سینے سے سر لگا کر سو گئی۔ مجھے خبر بھی نہ ہوئی کہ کب مولوی صاحب اندر آئے اور کس نے ان کے سوال پر میری طرف سے ہامی بھر دی۔

میں اس وقت جاگی جب […] مجھے گود میں اٹھا کر […] لے چلے۔ میں نے گھبرا کر آنکھ کھولی تو وہ مجھے آنگن میں لا چکے تھے۔ میں نے ان کی گود سے اترنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا "مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟" انہوں نے اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے ہنس کر کہا "ہمارے گھر" میں اس کا مطلب نہ سمجھی اور میں نے ادھر ادھر نظر ڈالی۔ آمنہ خالہ آگے آگے تھیں۔ تمہارے بھائی میرے […] ہاتھ رکھے […] کے ساتھ تھے۔ پھوپی اماں ان کے پیچھے تھیں۔ اتنے میں ڈیوڑھی کی دہلیز آ گئی تھی۔ میں نے پھر ان کی گود میں […] ہوئے کہا "میں نہ جاؤں گی، کہیں نہ جاؤں گی" […] میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا "بیٹا […] اب تمہیں اپنے دولہا کے گھر جانا ہی ہے۔" ہمیشہ کی طرح میں ان کی گود سے […] آمنہ خالہ نے […] سوار ہو کر […] کے ہاتھوں سے […] اپنی گود میں کھینچ لیا۔

تمہارے یہاں پہنچتے ہی مجھے […] ہنسی ہنسی مراثنوں […] نے گھیر لیا اور سارے دن تمہارے خاندان کی بی بیوں نے ایک منٹ کے لئے بھی اکیلا نہ چھوڑا۔ پھر رات آئی تو […] کا […] کیا […] دلہن کے […] اور پھر […] مظالم توڑ دیئے گئے جن کے



برداشت کرنے کے لئے محبت پیدا کی گئی ہے اور تم جانتی ہو کہ یہ
میں آپا کی آخری ہنسی نہیں بھول سکتی۔ اسی طرح تمہارے بھائی کی پہلی
ہنسی کو بھی نہیں بھول سکتی۔ وہ اگر آتش کدے جیسی تھی تو یہ
اس کو بجھانے جیسی تھی جس نے بڑی جھک میں ایک بیچ دیا ایک چپک
لیا۔ جب تمہارے بھائی گھر سے جانے لگے تو ان کا تعویذ اتر گیا تھا میں ان
کی دوا تھی دوا پر کیا گزرتی ہے ان کو اس سے کیا مطلب؟ بیچارے
پندرہ برس وہ جو دو گولیوں دیں کے بہانے ہوتے ہوں جسم کو خوش
کھاتے رہے بہر حال ڈاکٹر انگلش نے کہا تھا یہ سلسلہ ایسا ہے جس میں صرف ایک
دوا کے سوا جس کی آگ نے مجھے پاس پندرہ برس کی عبادت ہوتی
رہی۔ اسی وظیفے کو ادا کیا گیا۔ دو سال بعد ہی برس اصغری پیدا ہوئی۔
ڈاکٹروں نے اتفاق کی منتقل دکھائی کہ بچہ پیدا کر سکتے تھے گیا اور بچے
خوشی بھی ساتھی کہ اب زندگی بھر ان بچیوں کی محبت سے ہی محفوظ ہو گئی
گو اس سے زیادہ تمہارے بھائی کو خوشی ہوئی۔ انہیں اطمینان ہو گیا کہ اب
ان کے معمولات میں کوئی فرق نہ آئے گا۔

میں نے پندرہ برس کیسے کاٹے، یہ میرا دل ہی جانتا ہے
بس زندگی کے دو ہی سہارے تھے۔ ایک تو تمہارے بھائی کا کتب خانہ
دوسرا اصغری کو اپنی بیٹی جیسی پالنے کا ارمان۔ تم جانتی ہو کہ
تمہارے بھائی کا گھر میں بیٹھک سب کی سب بڑی بڑی کتابوں سے
[illegible]
[illegible]
[illegible]

سفید بالوں کو اب تو انہیں بہت ہی ... شاید میں بڑا اب سے ان کے دل کی
حالت کیوں نہ کہوں مگر جب ان کو اس کا یقین ہو گیا کہ ان کے بچے کی
ماں تو انہوں نے اپنے جذبات کے اظہار کرنے میں کوئی کمی
نہیں محسوس کی۔ اب ایسے میں میری سب سے بڑی رفیقِ حیات تھیں
کتابیں۔ میں نے صرف قصے کہانیاں اور ناولیں ہی نہ پڑھیں۔ بلکہ
سنجیدہ موضوعات پر بھی کتابیں پڑھ ڈالیں اور میں زندگی کی اخلاقی
قدروں پر غور کرنے کی عادی سی ہو گئی اور اصغری کے متعلق بہت ہی
میں نے بہت وقت اس کی تعلیم میں صرف کیا۔ میری خواہش تھی اسے کسی
انگریزی اسکول میں تعلیم دلائی جاتی لیکن تمہارے بھائی نے ایک دن بھی
اس گھر کی کوئی لڑکی اب تک اسکول نہیں گئی وہ بھی نہیں جا سکتی تھی۔
اس لئے اس کی تعلیم گھر ہی کے اور میرے ہی سر رہی۔ میں نے ہی کیا
پڑھایا تھا کہ اسے پڑھا رہی ہو؟ بہر حال اس کے پیدا ہونے کے بعد کچھ
سال اسی کی بدولت کٹ گئے گو آپا کی یاد کسی طرح دل سے دور نہ ہوئی
پھیرے میں ... خواب میں ضرور دکھتی رہی ...
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

(مرسلہ: [illegible])

[illegible]

[illegible]

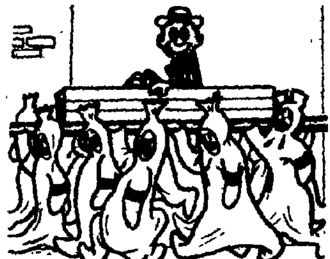
[illegible]

[illegible]

سہیلی نسیم میرے منہ پر پانی چھڑک رہی ہے۔

[illegible]

[illegible]



انھیں باہر سے لاکر اندر پہنچا گئے ہیں!" تب سے وہ اسی دن وہ اپنے
کمرے ہی میں بے سُدھ پڑے تھے۔ بایاں ہاتھ اور پاؤں عجیب بے ڈھنگے
طریقے سے پلنگ پر پڑے تھے۔ میں نے پوچھا ڈاکٹر کو کیا ہو گیا؟ ویسے ہی
شبہ ہوا۔ ڈاکٹر آگیا، پردہ کرا دیا اور ہم لوگوں کو ہٹ جانا پڑا اور پھر تو
ایک ہفتہ تک ڈاکٹروں اور مرض میں برابر جنگ جاری رہی۔ نرسیں
رات دن مریض کے کمرے میں بیٹھی رہتیں اور ہم میں سے کسی کو بھائی
کے پاس نہ جانے دیتیں۔ اسی زمانے میں مجھے اس کا علم ہوا کہ بھابی بیاہ
رہی تھیں بلکہ اصغری کی شادی کی مخالفت کرنے کی وجہ سے محل کی کوٹھڑیوں
میں سے ایک میں بند کردی گئی تھیں۔ وہیں سے وہ بیاہ کی صبح کو نسیمہ
کے ہاں چلی گئی تھیں۔ دوپہر کو جب بھائی کو معلوم ہوا تو وہ اپنے سسر کے
گھر پہنچے، جس طرح ہو سکے لے آؤ ورنہ تمہاری خیر نہیں! مگر وہاں
بھابی نے باپ سے ملاقات کرنے سے بھی انکار کردیا اور کہہ دیا کہ
تم یا تمہارے داماد مجھے پریشان کروگے تو میں ابھی مجسٹریٹ کے ہاں جاکر
تمہارے داماد پر حبس بیجا کا دعویٰ کردوں گی اور جیل کا منہ دکھا کر ہی چھوڑوں
گی۔ جب سسر نے داماد سے آکر یہ دھمکی بیان کی تو بھائی حد
سے زیادہ خفا ہوئے۔ سسر کو گالیاں دیں، مارنے کو دوڑے اور جوم
لرزش ہو کر گر پڑے۔ فالج نے فوراً ان کو گرا مارا۔ میں بھائی کو کوئی بہت
اچھا آدمی نہ سمجھتی تھی لیکن خون کی کشش کو کیا کرتی۔ میں نے اسی لئے
بھابی کو خط لکھا اور یہ تھا ان کا جواب۔

اگر میں عورت ہوتی تو بھی بھائی کی دکھ بھری کہانی کے بعد
میں بھائی کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں کرسکتی تھی مجھ کو بھی بھابی پر ایک
جھنجھلاہٹ ضرور تھی۔ عورت مرد کی بیوی ہی نہیں ہے اس کی محبوبہ بھی ہے
اس کی بہن بھی ہے، اس کی ماں بھی اور سب سے بڑھ کر اس کی غمگسار بھی ہوتی
ہے اسی وجہ سے ان دونوں کی جوڑی انسان کہلاتی ہے۔ اب اگر وہ بھی

اپنا پورا ہر کر بیٹھتے اور سنگدل ہو جاتے تو پھر انسانیت کہاں جا کر چھپ
یہ معلوم ہو گیا کہ بھائی خطرے سے نکل گئے اور گو ایک ہاتھ اور ایک
ٹانگ ہمیشہ کے لئے بے سُدھ ہو گئی مگر جان بچ گئی تو میں پھر یہاں چلی آئی
مگر ماں کا برا حال ہو رہا تھا، ہر وقت دل ہی دل میں گھلا کرتا تھا پھر چند دن کے
بعد مجھ سے نہ رہا گیا، سامنے بھر یہی سوچتی رہی کہ ان کی خدمت کے لئے لاکھ
نرسیں لگی ہوں پر انھیں وہ نگاہیں کہاں سے ہوگا جو اپنی بیوی، بیٹی یا
بہن میں ہوتا ہے۔ ان کے گر قسمت ہو کیا بھی ہوں تو ان کے پاس ان کی
تیمارداری کے لئے ہم میں سے کسی کو ضرور رہنا چاہئے اور پھر دل کی بھابی
کی حرکت سے خفا ہو کر آیا اپنے دولت کی یہ حالت اور وہ اکیلے پڑے ہیں
میں یہی سوچتی جب بھائی کے کمرے میں داخل ہوئی تو میں نے
دیکھا وہ آرام کرتے ہیں اور نرس کی جگہ آرام کرسی پر بھابی بیٹھی ہیں!
میں تعجب اور خوشی سے چیخنے ہی والی تھی کہ انھوں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ
کر چپ رہنے کا اشارہ کیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر کمرے کے باہر لے آئیں!
وہ اپنی صفائی میں جلدی جلدی بولیں "تم کہتی ہوگی کہ میں
عجیب طرح کی عورت ہوں، یا تو بیزاری کرتے تھے یا پھر اس شوہر کی
خدمت کرنے چلی آئی، مگر کیا کروں، میں ماں بھی تو ہوں۔ اصغری نے
مجھے مجبور کیا، کہنے لگی ساری سسرال میں بدنام ہو رہی ہوں، سب
کہتے ہیں جب ماں بوڑھے شوہر کی نہ ہوئی تو بیٹی اپنے خاوند کی کیا ہوگی
تمہارے داماد بھی کچھ بدگمان سے دکھائی دیتے ہیں۔ میں نے بھی دل
میں سوچا جیسے اصغری کے کارن اتنے دکھ جھیلے دو چار سال اور سہی!"
وہ ابھی اپنی بات تمام بھی نہ کرنے پائی تھیں کہ اندر سے بھائی
نے کمزور آواز میں پکارا "ارے کہاں چلی گئیں؟"
اور وہ جھپٹتی ہوئی کمرے میں چلی گئیں۔ میں نے جھانک کر دیکھا تو
وہ بھائی پر اس طرح جھکی ہوئی تھیں جیسے چیل کو دیکھتے ہی مرغی اپنے
پر پھیلا کر بچوں کو چھپانے کے لئے جھک جاتی ہے۔ بھائی مسکرا رہے
تھے اور ان کی آنکھیں ایک نا آسودہ بچے کی طرح چمک رہی تھیں
انھوں نے اپنا سیدھا ہاتھ اٹھا کر بھابی کا گال سہلایا اور کہا "مجھے سب
سے بڑا افسوس یہی ہے کہ میں تمہارے حسن کی ویسی پرستش نہ کرسکوں گا
جیسی میں نے پندرہ برس کے ساتھ میں چاہا، افسوس لوٹ لوں گی!"
اور بھابی ایک رات کی بیاہی دلہن کی طرح شرمائیں اور مسکرا کر
بولیں "یہ اسی چلی! تم کو ایسی حالت میں بھی یہی سوجھتی ہے!"

• ایک حلقے کا کہنا ہے کہ نئی نسل بے حیائی، جنسی بے راہ روی اور عریانیت پسندی کی جانب مائل ہے۔

• دوسرے حلقے کا دعویٰ ہے کہ پرانی نسل میں عریانیت پسندی اور فحش پرستی کا رجحان زیادہ غالب تھا۔

• تیسرے حلقے کا خیال ہے کہ عریانیت نہ پہلے تھی نہ آج ہے اور نہ آئندہ کبھی ہوگی۔ یہ وہ طبقہ ہے جس کا ہماری معاشرتی زندگی میں کوئی واضح اور واقعی عنصر موجود نہیں ہے۔

فحاشی! عریانی! بیحیائی!

عریانیت کو تجارتی مال نہ بنایا جائے

تحریر: آنسہ ناصرہ بیگم

[illegible]

آپ نے بہت اچھا [illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ہو گیا ہے۔ [illegible]

[illegible] اب کثرت سے [illegible]

[illegible] ہو جاتی ہے۔ ایسی حالت میں [illegible]

[illegible] جاتا ہے۔

میں نے جو کچھ کہا ہے وہ اس عہد کی تصویر ہے۔ اس دور کی نئی یا پرانی نسل کی تخصیص نہیں ہے۔ اس تصویر میں [illegible] دونوں شامل ہیں۔ دونوں ہی نسلوں کے لوگ [illegible] کے سلسلے جنسی ہیجان [illegible] سے دولت سمیٹنے میں مصروف ہیں۔ آج ہم اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں [illegible] اسکینڈلز کی جو فراوانی دیکھتے ہیں وہ انہی فلموں، ٹی وی پروگراموں، رسالوں اور ناولوں کا عکس ہے۔ عورت اور مرد کے درمیان محبت غیر فطری چیز نہیں، ایک جبلی تقاضہ ہے۔ یہ بہت خوبصورت، بہت لطیف اور [illegible] مقدس جذبہ ہے۔ اسی جذبے کی بنیاد پر [illegible] زندگی کی عمارت تعمیر ہوتی ہے [illegible] جنم دیتا ہے لیکن جب محبت کو بازار کی جنس بنا دیا جائے [illegible] بازاری مال کی طرح اس کی خرید و فروخت ہونے لگے اور جب محبت [illegible] میں بکنے لگے تو پھر [illegible] اور جنسی بے راہ روی کے سوا کیا پایا جا سکتا ہے۔ [illegible] ہو سکتے ہیں۔

[illegible] کہ عورت کو صرف گھر کی

[illegible]

نئی نسل پر جنسی اظہار کی پابندی کیوں؟

غزالہ یاسمین (اُردو کالج، کراچی)

یہ عجیب سوال ہے کہ نئی نسل بے حیائی اور عریانیت پسندی اور جنسی بے راہ روی کی طرف زیادہ مائل نظر آتی ہے۔ نئی نسل اگر جنسی احساسات و جذبات کا اظہار کرتی ہے تو اسے آپ بے حیائی، عریانیت اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں لیکن میں پوچھتی ہوں کہ کیا پرانی نسل پر عنفوانِ شباب میں یہ سب کچھ نہیں گزرا تھا۔

اگر انسان کی آنکھوں میں روشنی ہے تو وہ دیکھے گا ضرور — قوتِ سامعہ صحیح ہے تو وہ سنے گا ضرور۔ ذائقہ کی حس ناقص نہیں ہوئی ہے تو وہ چکھے گا ضرور۔ اسی طرح اگر اس کی جنسی جبلت مردہ نہیں ہو گئی ہے تو وہ اظہار اور تسکین کی متمنی ضرور ہوگی۔ اس پر چڑھنے یا چراغ پا ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ اسے بے حیائی آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں۔ اگر ایک لڑکی کسی لڑکے کو دوست بناتی ہے اور دونوں ساتھ گھوم پھر لیتے ہیں یا سینما دیکھ لیتے ہیں تو اس کے معنی یہ کیوں نکال لئے جاتے ہیں کہ ان دونوں میں لازمی طور پر ناجائز جنسی تعلقات قائم ہیں۔ اگر ایک کالج میں پڑھنے والے لڑکے لڑکیاں لان میں بیٹھ کر آپس میں ہنستے بولتے ہیں تو اس میں بے حیائی کی کونسی بات ہے اور اگر ان میں سے کسی لڑکے کو کسی لڑکی کے ساتھ یا کسی لڑکی کو کسی لڑکے کے ساتھ محبت ہو جاتی ہے تو اس میں برائی کیا ہے؟ کیا پرانی نسل کے لوگ محبت نہیں کرتے تھے؟ کیا محبت انسان کی جبلت میں داخل نہیں ہے؟ اگر یہ بے حیائی یا عیب ہے تو پھر پرانی شاعری اور پرانا ادب محبت کے موضوعات سے کیوں بھرا پڑا ہے۔ پھر نئی نسل پر ہی جنسی اظہار کی پابندی کیوں عائد کی جاتی ہے؟

بات یہ نہیں ہے جناب کہ نئی نسل بے حیائی یا عریانیت پسندی کی طرف زیادہ مائل ہے بلکہ اصل بات یہ ہے کہ پرانی نسل کے لوگ جو کام پردوں کے پیچھے چھپ کر کرتے تھے وہی کام نئی نسل کے لوگ پردے سے باہر ذرا کھل کر کرتے ہیں۔ مرد پہلے بھی عورت کو جھوٹی محبت کے فریب دے کر لوٹتا تھا اور آج بھی دھوکہ دینے کی کوشش کرتا ہے لیکن شاید آج کی لڑکی مرد کی چالوں کو پرانی لڑکیوں سے زیادہ بہتر سمجھتی ہے۔ آج کی پڑھی لکھی لڑکیوں کو

جو مسئلے کا قریب سے کر تو شاید آسان نہیں ہے۔

ہماری نئی نسل کی ایک بات کہوں۔ ملک کی تعلیم سے متعلق حکام کو چاہئے کہ جنس کی تعلیم کو بھی دوسرے مضامین کی طرح اسکولوں اور کالجوں کے نصاب میں شامل کر لیں۔ بہت سی گتھیاں خود بخود سلجھ جائیں گی۔ پھر یہ موضوع کسی کے لئے اجنبی نہیں رہے گا۔ اس پر سب کھل کر بات کر سکیں گے۔ جو باتیں اب بدی یا بے حیائی کی علامت سمجھی جاتی ہیں پھر وہی باتیں اصلی اور فطری سمجھی جائیں گی۔

ہماری تہذیب برہنگی کی متحمل نہیں

سید شاہد علی (اسلامیہ کالج، کراچی)

ہر دور میں کوئی معاشرہ بھی کلی طور پر عریانیت کی طرف مائل نہیں رہا۔ البتہ یہ ضرور دیکھا گیا ہے کہ ہر عہد میں ایک خاص طبقہ ہوتا ہے جو معاشرے کی اخلاقی قدروں کو توڑ کر بے راہ روی پھیلانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس بات کو دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ہر عہد میں ڈاکو، چور، جیب کترے اور اسمگلر بھی موجود ہوتے ہیں لیکن پورا معاشرہ کسی عہد میں بھی ڈاکو یا چور نہیں بن جاتا۔ اسی طرح آج بھی نئی نسل کے کچھ لڑکوں یا لڑکیوں میں اگر بے حیائی، جنسی بے راہ روی اور عریانیت پسندی کا رجحان نظر آتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ پوری نئی نسل ہی بے راہ رو ہو گئی ہے۔

عریانیت پسندی کا مسئلہ ایسا ہے کہ جسے کسی معاشرے کی تہذیب اور اس کے مذہب سے الگ کر کے نہیں سمجھا جا سکتا۔ ہمارا مذہب اسلام ہے۔ جہاں مسلمان مذہب میں سور کا گوشت کھانا اور شراب پینا حرام ہے۔ لیکن یورپ اور امریکہ کی ملکوں میں ان دونوں چیزوں کو حرام نہیں سمجھا جاتا۔ ان کے معاشروں میں یہ دونوں چیزیں بلا تکلف استعمال کی جاتی ہیں۔ اسی طرح ہمارا مذہب بیک وقت ایک سے زیادہ (یعنی چار تک) بیویاں رکھنے کی اجازت دیتا ہے لیکن یورپ والے ایک وقت میں ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا

معیوب سمجھتی ہیں۔ ان مثالوں سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ہر قوم کی اپنی الگ تہذیب، اپنی الگ روایات اور اپنا الگ تمدن ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ ضروری نہیں کہ اگر یورپ میں لڑکیاں شرٹ پہنتی ہیں یا سگریٹ پیتی ہیں یا نیم عریاں لباس میں رقص کرتی ہیں تو پاکستان میں بھی لڑکیوں کو اس عالم میں دیکھ کر تحسین و آفرین کے ڈونگرے برسائے جائیں۔ یورپ میں اگر لڑکوں اور لڑکیوں کے بلا لحاظ اختلاط کے نتیجے میں حرامی بچوں کی فراوانی پائی جاتی ہے تو پاکستانی معاشرے کو یہ چلن اختیار کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ پاکستان کی تہذیب اس طرز زندگی کی متحمل نہیں۔ یہاں اسے بجا طور پر بے حیائی جنسی بے راہ روی اور عریانیت پسندی سے تعبیر کیا جائے گا۔

تہذیب و ثقافت کی روایات سیکڑوں برسوں کے مسلسل عمل سے پیدا ہوتی ہیں۔ تہذیب کی جڑیں ہر قوم کے دل و دماغ میں بہت گہری ہوتی ہیں۔ ہر قوم اپنی تہذیب و ثقافت کو عزیز رکھتی ہے بشرطیکہ اس قوم کی غیرت و حمیت مردہ نہ ہو گئی ہو۔ ایسی صورت میں یہ کہ لڑکوں یا لڑکیوں کا پاکستان میں یہ کہہ کر مطالبہ کرنا کہ انہیں سڑکوں اور پارکوں میں بوس و کنار کی کھلی اجازت دی جائے یا انہیں اشتعال انگیز نیم عریاں ملبوسات میں گھومنے پھرنے سے نہ روکا جائے تو یہ ہماری تہذیب اور ہمارے مذہبی اصولوں کے خلاف ہوگا۔ ہمارا تہذیبی نظام اس بے راہ روی کو گوارا نہیں کر سکے گا۔

میرے خیالات کا خلاصہ یہ ہے کہ پوری نئی نسل بے حیائی یا عریانیت پسندی کی طرف مائل نہیں ہے۔ ایک خاص ذہن رکھنے والا طبقہ ہے جس میں مغربی طرز کی زندگی اپنانے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ پاکستان کی اکثریت تو شہری آبادی مغربی طرز کی بے راہ روی اور آزادی کو معیوب اور برا سمجھتی ہے۔ پاکستان کی اکثریت اپنی تہذیب، اپنے کلچر اور اپنے مذہب کا دل سے احترام کرتی ہے۔ وہ تہذیب کی کسی قسم کی بے حیائی قبول نہیں کرتی۔

خواجہ احمد عباس کی رائے ہے کہ کرشن چندر اپنے قلم کی نوک
تعصب کے غبارے میں چبھو دیتا ہے!
اسی تیز نوک کا کارنامہ آپ بھی دیکھیے!

ناآسودہ دلوں کی سلگتی کہانی
جس کے سبھی کردار سچے ہیں!

کرشن چندر

تھانیدار

تھانیدار نیاز احمد میرے پتا جی کا بہت دوست تھا۔ دیکھنے میں میرے پتا جی سے بھی بہت خوبصورت تھا۔ میرے پتا جی کی شکل و صورت بھی اچھی تھی ان کا قد پانچ فٹ گیارہ انچ اور رنگ گندمی اور سانولے کے درمیان تھا۔ وہ ہر ایک سے بڑی نرمی اور مٹھاس سے بات کرتے تھے اور جس سے بات کرتے تھے اس کا دل موہ لیتے تھے۔

مگر تھانیدار نیاز احمد کی بات اور ہی تھی۔ وہ کچھ اس طرح کا خوبصورت تھا جیسے لوگ تصویروں میں ہوتے ہیں۔ اونچا پورا قد، چھ فٹ تین انچ کا جوان، پتلی کمر، چوڑا چکلا سینہ، دانت سفید تھے جب جھلملی چھوٹی بل کھاتی ہوئی مونچھیں، چوڑی پیشانی پر کسی پرانے زخم کا داغ جو اس کی سفید پیشانی پر ایک مستقل تیوری کی طرح معلوم ہوتا تھا چنانچہ جب وہ مسکراتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سوچ میں ڈوبا ہوا آدمی مسکرا رہا تھا۔ اس کی یہ ادا عورتوں کو بہت پسند تھی۔

تھانیدار نیاز احمد اکثر دورے پر رہتا مگر جب دورے سے واپس آتا میرے پتا جی سے ہر روز شام کو ملتا۔ ان دنوں میرے پتا جی بہت رات گئے نیچے گھر میں آتے۔ اوپر ہی ہسپتال کے اسپیشل وارڈ میں جو اکثر خالی ہوتا تھا، اور اگر خالی نہ ہوتا تھا تو خالی کرا لیا جاتا تھا میرے پتا جی اور تھانیدار نیاز احمد کی بیٹھک جمتی تھی۔ کیونکہ گھر میں ماں جی کا حکم چلتا تھا۔ گھر میں شراب پینے اور گوشت کھانے کی ممانعت تھی۔ اور میرے والد صاحب دونوں ہی چیزوں سے کبھی کبھی شوق فرماتے تھے۔ تھانیدار نیاز احمد جب دورے سے واپس آ جاتا تو ان کے دونوں شوق پورے ہو جاتے۔ دونوں دوست اسپیشل وارڈ میں بیٹھ کر خود مرغ بھونتے، طرح طرح کے مسالے گوشت میں ڈال کر تجربے کرتے، باتیں کرتے، گاتے اور بہت رات گئے تک ان کے قہقہوں کی آوازیں باغ میں آتیں۔ میری ماں کا چہرہ اس روز اترا اترا سا رہتا اور وہ دیر تک برآمدے کی چوبی ستون سے لگی اور عشق پیچاں کی بیل کے قریب کھڑی میرے پتا جی کا انتظار کیا کرتیں۔ رات کے کوئی گیارہ بارہ بجے اور کبھی کبھی ایک بجے کے قریب میرے پتا جی باغ کے نیلے نیلے ٹائلوں والی روش پر جھومتے جھامتے گھر آتے ہوئے دکھائی دیتے اور ان کے لبوں پر یہ گیت ہوتا،

"چھٹی جب کالی اس بن میں"

میری ماں کو اس گیت سے بڑی چڑ تھی۔ گیت کیا تھا، بس یہی ایک مصرع تھا جو میرے والد اکثر شراب کے نشے کے بغیر بھی موج میں آ کر گایا کرتے تھے۔



"بھیٹی جب کان اس بن میں۔"

اور میری ماں جتا کر کہتیں:

"آخر اس گیت کا مطلب کیا ہے؟ جب دیکھو اسے گا[illegible] ہے ہو!"

"بھلی مانس!" میرے پتا اس کے ماسٹر کی طرح ایک انگلی [illegible] کر کہتے: "اس گیت کا مطلب ہے۔ بھیٹی کان اس بن میں یعنی [illegible] کان اس بن میں پھٹ گئی، پھٹ گئی۔ کان جیسے ہوتی ہو کان [illegible] لوہے کی کان، نمک کی کان، پتھر کے کوئلے کی کان۔ کوئی بھی کان [illegible] کو بعد میں بھر کر اٹھایا جاتا ہے۔ کان سے مراد ہے تمہارا کان جیسے [illegible] جس میں یہ سونے کی بالیاں جھلک رہی ہیں۔ مگر ان کی سرگرد[illegible] ی۔ آج تم بہت اچھی لگ رہی ہو۔ یہ رنگ روپ تم کہاں سے [illegible] تمہاری ماں تو بڑی بدصورت تھیں۔"

"وہ کیا بدصورت تھیں؟" میری ماں غصے سے چڑ کر [illegible]۔ "وہ تو خوبصورت تھیں بلکہ مجھ سے ہو تمہاری ماں سے اچھی تھیں! [illegible] تم یہاں کوڑے کا شوق ہے جو تم سے دس بار کہا ہے ۔۔۔ چلو

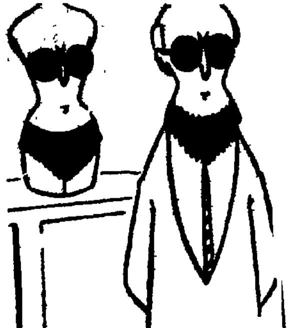
بھاگو ۔۔۔ سر پھٹ!"

"یہ ابھی تک بھاگ رہا ہے!" میرے پتا میری طرف دیکھ کر میرے سر کے بالوں سے کھیلتے ہوئے کہتے۔

"باپ بولنے لگ جھڑپ ہے کہ تو بیٹا کیسے رہے گا؟" میری ماں غصے سے بھڑک کر اصل مطلب پر آ جاتیں۔ وہ لڑنا چاہتی تھیں باپ [illegible] دینا چاہتے تھے۔ [illegible] سے ملاقات کے بعد ہمیشہ اسی طرح ہوتا تھا۔ مگر اس لڑائی سے پہلے مجھے سونے کے لیے بھیج دیا جاتا تھا [illegible] میاں بیوی [illegible] کر سیدھے [illegible] کر لڑا کرتے تھے۔ یہ بہت اچھی لڑائی ہوتی تھی کیونکہ میرے والد [illegible] کر بہت شگفتہ ہو جاتے [illegible] اور [illegible] سے میری ماں کی باتوں کا جواب دیتے تھے۔ [illegible] بہت [illegible] سے پہلے ندی کا پانی [illegible] کی طرح چمکتا اور عشق پیچاں کے پھول [illegible] کی مہک سے [illegible] معطر ہوتا۔ اس لیے اس نکھری نکھری [illegible] فضا میں لڑائی بھی بہت نکھری [illegible] سے ہوتی تھی۔ شطرنج کے کھیل کی طرح اس لڑائی کے بھی اصول تھے۔ [illegible]

[illegible] کے ساتھ صدر مقام پر آتا تھا ... میرے پتا کے لیے ... سال سے نیاز احمد کے دورے کم ہوتے جا رہے تھے۔ پچھلے مہینے میں صرف چار روز کے لیے آیا تھا۔ پھر وہ آٹھ دس روز کے لیے آنے لگا۔ پھر بارہ پندرہ روز کے لیے قیام کرنے لگا۔ اب گزشتہ چار ماہ سے وہ یہیں صدر مقام پر ٹھہرا ہوا تھا۔ ان چار ماہ میں وہ ایک بار بھی دورے پر نہیں گیا۔ یہ میری ماں کے لیے بڑا مصیبت کا وقت تھا۔

پھر ایک روز رات میں بڑی بھگدڑ مچی۔ فوج نے ہمارے بنگلے کا محاصرہ کر لیا نہ صرف ہمارے بنگلے کا بلکہ جہاں جہاں دوسرے افسر لوگ رہتے تھے ان سب کے بنگلے فوج کے گھیرے میں لے لیے گئے اور ان سب کے گھروں کی تلاشی لی جانے لگی۔ ہمارے صدر مقام میں جگہ جگہ مشعلیں سی جلتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں، اور لوگ گھبرا کر ادھر ادھر جا رہے تھے۔ پولیس کے دستے گشت کر رہے تھے اور مختلف مکانوں کی تلاشیاں لے رہے تھے۔ پوچھنے سے معلوم ہوا کہ راجہ جی نے تھانیدار نیاز احمد کی گرفتاری کے احکام جاری کیے ہیں اور انعام بھی رکھا ہے۔ جو کوئی راجہ کے سامنے نیاز احمد کو زندہ یا مردہ پیش کرے گا اسے ایک ہزار روپے کا انعام دیا جائے گا۔ اسی سلسلے میں دھڑ دھڑ ہر چھوٹے بڑے افسر کے مکان کی تلاشی لی جا رہی تھی کیونکہ تھانیدار نیاز احمد افسروں میں بہت مقبول تھا۔ پولیس نے رات بھر تمام بنگلے چپہ چپہ چھان مارا مگر نیاز کا کہیں پتہ نہ چلا۔ فوج کے چلے جانے کے بعد دیر تک میری ماں اور باپ بستروں میں بیٹھے کھسر پھسر کرتے رہے۔ ان کے خیال کے مطابق میں سو رہا تھا۔ معاملہ اس قدر اہم تھا کہ وہ لوگ بہت دھیمی آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ دراصل بات یہ تھی کہ نیاز احمد ہمارے ہی گھر میں چھپا بیٹھا تھا۔ میری ماں نے اسے پوجا گھر میں رام اور سیتا کی مورتی کے پیچھے چھپا دیا تھا۔ فوج کے لوگوں نے پوجا گھر کو بھی کھول کر دیکھا مگر وہ کمرے کے اندر نہ گئے، صرف دروازے سے اندر جھانک کر پلٹ گئے۔ کیونکہ وہ پوجا گھر تھا اور لوگ میری ماں کے سخت مزاج سے واقف تھے۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ میری ماں اپنے دھرم کے اصولوں کی پابندی سختی سے کرتی ہیں۔ چنانچہ انہیں اس بات کا شبہ تک نہ ہو سکا



تھیں، میرے والد بجتے تھے۔ پھر بیچ میں میرے والد اونچا بولنے لگتے تھے۔ آخر میں میری ماں روہانسی ہو جاتیں اور دھیرے دھیرے سسکنے لگتیں۔ یہ سگنل تھا کہ اب صلح ہو گی۔ اس کے بعد میرے پتا آرام کرسی سے اٹھ کر آتے اور بڑے پیار سے میری ماں کا ہاتھ پکڑ کر بڑی لجاجت سے معافی مانگنے لگتے۔ اس کے بعد میں کچھ نہ دیکھتا۔ خوشی سے لحاف میں دبک کر سو جاتا۔ جتنے دن نیاز احمد سے صحبت رہتی یہی کچھ ہوتا تھا۔

نیاز احمد کی بیوی مر چکی تھی لیکن اس نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔ پہلی شادی سے ایک لڑکا تھا جو بڑے شہر میں پڑھتا تھا۔ نیاز احمد کی عمر ۴۵ برس سے کم نہ ہو گی لیکن دیکھنے میں وہ مشکل سے ۳۵ برس کا دکھائی دیتا تھا۔ وہ بڑا کسرتی جوان تھا۔ اور جب وہ صبح سویرے اپنے قلعے نما تھانے کی سیڑھیاں اتر کر گھوڑا دوڑاتا ہوا ندی کنارے جاتا اور لنگوٹ باندھ کر کسرت کرتا تو صبح کی لطیف سنہری دھوپ میں اس کا گورا بدن کندن کی طرح چمکتا تھا۔ اور سر پر گھڑے رکھے وہ چلتی عورتیں اسے کنکھیوں سے دیکھتی جاتیں۔ گھبرا کر نظر جھکا لیتیں اور ایک گہری آہ بھر کر اپنی راہ چلی جاتیں۔ نیاز احمد کو یہ معلوم تھا کہ اس پر ہزارہا ایک شادی شدہ اور غیر شادی شدہ عورتیں مرتی ہیں۔ اچھے اچھے خاندان والے گھروں سے اس کے لیے شادی کے پیغام آتے تھے مگر وہ شادی سے انکار کرتا تھا۔ یہ بھی ایک راز تھا جس کا صرف میرے پتا کو علم تھا۔

کچھ عرصے سے نیاز احمد کے معمول میں تبدیلی آ چکی تھی۔

تھا۔ میری ماں نے ایک مسلمان کو اپنے باپ کے گھر میں پناہ دی تھی اور اسے اپنے مقدس اشنان گھر کی مورتی کے پیچھے چھپا دیا تھا۔ اور میری ماں دراصل ایسا کبھی نہ کرتیں اگر میرے پتا جی مجبور کر کے انہیں اس بات کے لیے مجبور نہ کر دیتے۔ میرے باپ نے غصے میں آکر نانی جی کو سب بتانے کی دھمکی دی تھی۔ اس پر میری ماں راضی ہو گئیں مگر نانی کے چلے جانے کے بعد پھر میرے دھیرے دھیرے باپ سے جھگڑنے لگیں۔

"میں تم سے کہتی ہوں کہ اس کا انجام اچھا نہ ہوگا۔ تم اپنی ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔"

"اور وہ جو بیچارا اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا اس کا کچھ خیال نہیں ہے۔"

"وہ اپنے کیے کی سزا پائے گا۔ کیوں اس نے ایسا کیا؟"

"اس نے کہاں کچھ کیا تھا۔ جب راجہ کی بہن ہی اس پر عاشق ہو گئی تو وہ کیا کرتا؟"

"کیا کرتا؟" میری ماں غصے سے بولیں۔ "اسے منع کر دیتا۔ وہ راجہ ہے۔ ملازم، ملازم ہے۔ پھر وہ ہندو، وہ مسلمان۔ اس کا پریم کچھ اچھا نہیں ہو سکتا۔ اس سے دونوں کا دھرم بھرشٹ ہوتا۔"

"محبت دھرم نہیں دیکھتی۔"

"تم تو ناستک ہو۔ میں سمجھتی تھی تم آریہ سماجی ہو۔ تم ایک مسلمان کو اپنے گھر میں پناہ دو گے مگر تم تو آریہ سماجی سے بھی گئے گزرے ہو۔ تم تو ٹھیک ناستک ہو۔"

"دوستی بھی تو کوئی چیز ہے۔"

"اور دھرم کوئی چیز نہیں ہے۔ اپنے مذہب کا تمہیں کوئی خیال نہیں ہے۔ اس کی یہ ہمت کہ تمہارے راجہ کی بہن سے پیار کرنے چلا ہے اور تمہاری یہ غیرت کہ اسے گھر میں پناہ دے رہے ہو۔"

"جانکی!" میرے باپ نے اپنے بستر سے جھک کر زور سے میری ماں کی بانہہ پکڑ لی اور انہیں سمجھاتے ہوئے بولے۔ "تم نہیں جانتی ہو دوستی بھی ایک دھرم ہے۔ وہ خود ایک مذہب ہے۔ اس کے اپنے اصول ہیں جس طرح تمہارے دھرم کے اصول ہیں۔"

میری ماں نے اپنی بانہہ چھڑاتے ہوئے کہا۔ "پھر تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم اپنے دھرم کے اصولوں کو دوستی کے اصولوں پر قربان کر دو۔ میں جس مندر میں تمہیں اشنان کیے بغیر

[illegible] کاشف

زبیدہ ملک کی شادی دسویں میں کر دی گئی۔ وہ دسویں جماعت کی طالبہ تھی۔ اس کے سسرال والوں نے اسے میٹرک کرنے کی اجازت دے دی۔ وہ اسکول جاتی رہی۔ جب نتیجہ نکلا تو سب لڑکیاں حیران رہ گئیں کہ ہر جماعت میں اول آنے والی لڑکی دسویں میں فیل کیسے ہو گئی۔ اس سے سب نے پوچھا "تم فیل کیسے ہو گئیں؟ کیا شادی کے بعد پڑھنا چھوڑ دیا تھا؟" وہ فیل ہونے پر افسردہ تھی۔ اس لیے جھنجھلا کر بولی۔ "میں تو پڑھتی تھی مگر وہ بھی پڑھا دیتے تھے۔"

نہیں جانے دیتی تھی۔ میں نے اسی مندر میں تمہارے مسلمان دوست کو چھپا لیا ہے۔ نہ جانے بھگوان مجھے اس کی کیا سزا دیں گے؟ کیونکہ میں نے اس مندر کو بھرشٹ کر دیا ہے۔ زندگی میں جو کام میں نے کبھی نہیں کیا تھا وہ بھی تم نے مجھ سے کرا لیا۔"

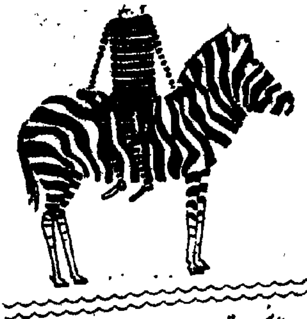
میری ماں رونے لگیں۔

پتا جی انہیں دلاسا دینے لگے۔

"چند دنوں کی بات ہے۔ اس کے بعد جب معاملہ ذرا ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ اور پولیس اور فوج کی دوڑ دھوپ کم ہو جائے گی تو وہ خود ہی ہمارا گھر چھوڑ دے گا اور اس علاقے سے بھاگ جائے گا۔ یہاں تو اسے جان کا خطرہ ہے۔"

"اس کی جان کو ہی نہیں، تمہاری جان کو بھی خطرہ ہے۔ یہ مت بھولو کہ تم بھی راجہ کے ملازم ہو۔ اور ملازم ہوتے ہوئے تم راجہ سے غداری کر رہے ہو۔ میں اب تم سے زیادہ نہیں کہتی۔ صرف اتنا کہتی ہوں کہ اپنے دوست سے کہو کہ وہ سنکرانت سے پہلے یہاں سے اپنا منہ کالا کر جائے۔ سنکرانت کے دن میں اس مندر کو اپنے ہاتھ سے گنگا جل سے دھو کر صاف کروں گی اور مشر جی کو بلوا کر گیتا کا پاٹھ کراؤں گی، یگ کروں گی، دان کروں گی۔ پراچت کا بھوگ لگا کر برہمنوں کو کھلاؤں گی۔ جب جا کے میرے دل کو چین آئے گا۔"

دوسرے کمرے میں کچھ آہٹ سی ہوئی۔ میرے پتا نے گھبرا کر کہا۔ "ذرا آہستہ بولو، آہستہ بولو کہیں وہ سن نہ لے۔"



"کس نے؟ تو اچھا ہے!"

ماں اور بھی جھلا کے بلند آواز میں بولیں۔

"شش" کہہ کر میرے پتا نے میری ماں کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور پھر پھونک مار کر لیمپ بجھا دیا۔

ساتھ والے کمرے میں نیاز احمد کو چھینک آگئی۔ اس میں پھر ذرا سی آہٹ ہوئی۔ پھر چاروں طرف خاموشی چھا گئی۔ ان دونوں کمروں کے درمیان کا دروازہ دوسری طرف سے بند تھا۔ روشندان ذرا سا کھلا تھا۔

پتا جی نے ماں سے کہا۔ "کل صبح اس روشندان کے شیشے پر سیاہی پھیر کر اسے بھی بند کرا دینا۔"

"بہت اچھا!" میری ماں نے سرگوشی میں کہا۔

پھر وہ سونے سے پہلے منہ ہی منہ میں کوئی جاپ کرنے لگیں۔ یہ ان کا روز کا دستور تھا۔

دوسرے دن صبح کے وقت میری ماں سب سے پہلے اٹھیں۔ ابھی لوگ سوئے پڑے تھے کہ انہوں نے نیاز احمد کے لیے چائے اور ناشتے کا سامان تیار کر لیا۔ اور سب چیزیں ایک طشت میں سجا کر اس کے کمرے میں لے گئیں مگر فوراً ہی لوٹ آئیں۔ انہوں نے جلدی جلدی بیڈروم میں آ کر میرے والد کو جگایا اور ان سے کچھ کہا۔ دونوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ میرے والد گھبرا کر بستر سے اٹھے اور پاجامے کا ازار بند اڑستے ہوئے بولے۔

"کدھر، کہاں، کیسے؟"

میری ماں آہستہ سے بولیں۔ "تم خود چل کر دیکھ لو!"

پتا جی بھاگے بھاگے پوجا گھر میں گئے مگر وہاں نیاز احمد

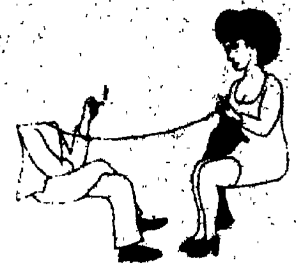
[illegible] ایک کھڑکی کھلی تھی۔ وہ رات کو یہ کھڑکی کھول کر کہیں فرار ہو گیا تھا۔

اسی دن صبح کے ساڑھے نو بجے کے قریب تھانے کی پولیس کو پیچھے کی سڑک کے کنارے اس کی لاش پائی گئی۔ کسی نے مار کر اس کی لاش کے چار ٹکڑے کر دیئے تھے۔ اور کوئی اسے زندہ یا مُردہ لانے کا انعام لینے بھی نہیں آیا تھا۔

جس وقت میرے پتا نہا دھو کر ناشتہ کر رہے تھے ہسپتال کے اردلی نے انہیں اطلاع دی کہ تھانیدار نیاز احمد کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے لاش گھر میں آچکی ہے۔ پتا جی نے گھور کر غضبناک نظروں سے میری ماں کی طرف دیکھا اور میری ماں نے خائف اور پشیمان ہو کر اپنی نگاہیں جھکا لیں۔ پتا جی ناشتہ کھائے بغیر کمرے سے باہر نکل گئے اور ماں کے ہاتھ سے چائے کا پیالہ فرش پر گر کر ٹوٹ گیا اور وہ کرسی پر جھک کر رونے لگیں۔

میرے پتا نے دو دن تک کھانا نہیں کھایا۔ اور کئی دن تک میری ماں سے بات نہ کی۔ پھر سنکرانت آگئی اور میں حسب معمول ست سنگے میں تلا۔ میری کوری دھوتی مشر جی کو دے دی گئی اور ماں مجھے گوردوارے لے گئیں۔ گوردوارے کے باہر والے مندر میں ہم نے گھنٹہ بجایا۔ اور پھر ہم وہاں سے شاہ مراد کے مزار کی جانب چل دیئے۔ لیکن آج میری ماں بہت اداس تھیں۔ اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد نہ جانے کیا خیال کر کے آب دیدہ ہو جاتی تھیں۔ جب ہم ڈھلتی دھوپ میں شاہ مراد کے مزار کے قریب پہنچے تو کیا دیکھا کہ مزار کے قریب سنسان پگڈنڈی پر شاہی محل کی ایک پالکی رکھی ہے۔ اور اس کے گرد چار کہار کھڑے ہیں۔ میری ماں شاہی ڈولی دیکھ کر ٹھٹک گئیں اور مجھے لے کر ایک درخت کی اوٹ میں ہو گئیں اور دیر تک چپ چاپ کھڑی رہیں۔ آخر انہوں نے چپکے سے کہا۔ "تو بچہ ہے تجھے شاہی محل کے کہار جانے دیں گے، جا کے دیکھ تو سہی مزار پر کیا ہو رہا ہے؟"

میں ان کی اجازت لیتے ہی جھٹ پٹ دوڑا اور پاؤں سے کنکر اچھالتا، پتھروں کو ٹھوکریں مارتا ہوا مزار کی طرف بڑھتا گیا۔ جدھر گھنی بیریوں کا جھنڈ تھا۔ کہاروں نے مجھے کچھ نہیں کہا لیکن جیتے نے مجھے دور سے دیکھ لیا۔ اور دیکھتے ہی اشارے سے وہیں رک جانے کو کہا۔ میں ایک جھاڑی کے قریب رک گیا، بلکہ دبک کر چھپ گیا۔ میں نے سمجھا یہ بھی جیتے کا کوئی نیا کھیل ہے۔ جب میرے پاس آ کر



آہستہ سے بولو۔ مزار پر کسی نہیں ہونا چاہئے اس وقت!"

"کیوں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

جتے نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ صرف اتنا

کہا "میں تم کو لے چلوں گا!"

"کیسے؟" میں نے پھر پوچھا۔

مگر جتے نے پھر میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر سنتے کی جھاڑیوں کے پیچھے پیچھے سے کھیتوں کے بل چل کر کہیں مڑ کر کہیں رک کر بیریوں کے جھنڈ کے اندر لے آیا۔ وہاں ہم دونوں دبک کر بیٹھ گئے۔ اور بیریوں کی شاخیں ہٹا کر دیکھنے لگے۔

چاچا رمضانی مزار کے قریب بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے سفید برقعے میں ایک عورت کھڑی تھی۔

"شاہی محل کی رانی ہوگی!" میں نے دھیرے سے کہا اور ہماری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ کیونکہ برقع عام طور پر مسلمان عورتیں پہنتی ہیں اور وہ بھی کالا ہوتا ہے۔ سفید برقع صرف وہ ہندو عورتیں پہنتی ہیں جو شاہی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔

چاچا رمضانی کی گھگھی بندھی ہوئی تھی اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سفید برقعہ والی عورت کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کا تسبیح والا ہاتھ کانپ رہا تھا۔

برقعے والی عورت نے تحکمانہ لہجہ میں اس سے کہا:

"اور تم میری آمد کا کسی سے ذکر نہیں کروگے؟"

رمضانی نے نفی میں سر ہلایا۔

"اور تم سب نذر نیاز دوگے!"

رمضانی نے اثبات میں سر ہلایا۔

سفید برقعہ والی عورت دیر تک برقعہ کے اندر سے رمضانی کو گھورتی رہی۔

اس کے بعد برقع کے ایک کونے سے دو تین پتلی پتلی نازک سی مخروطی انگلیاں باہر نکلیں ابھر کر کچھ نوٹ جھپٹ گئیں اور سو سو کے کئی نوٹ رمضانی کی جھولی میں گر پڑے۔

رمضانی جلدی جلدی تسبیح پھیرنے لگا۔

"قبر کہاں ہے؟" اس عورت نے اسی طرح تحکمانہ لہجے میں پوچھا۔

چاچا رمضانی نے ایک کونے سے صرف ایک ہی اشارہ کر سکا۔ مگر اس عورت نے سب کچھ لیا اور وہ بڑے منضبط قدموں سے چلتی ہوئی مزار کی سیڑھیاں اتر کر قبرستان میں چلی گئی۔

اب میں اور جتّو ابھی گردن موڑ کر قبرستان کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ عورت ایک قبر کے قریب جا کر رک گئی اور دیر تک وہیں خاموش کھڑی رہی۔ پھر وہ یکایک اس قبر پر گر پڑی اور اس کے دونوں ہاتھ قبر پر پھیل گئے۔ اور ان ہاتھوں کی انگلیاں قبر پر اس طرح تڑپنے لگیں جس طرح بہت ہی پتلے پانی میں مچھلیاں تڑپتی ہیں۔

پھر وہ انگلیاں بھی ساکت ہوگئیں۔

اور یکایک بیریوں میں گہرا سناٹا چھا گیا۔

مزار پر اندھیرا سا ہوگیا۔

اور چاچا رمضانی کے تسبیح کے دانے کانپنے لگے۔ اور میں اور جتّو حیرت اور خوف سے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

ایک لمبے سکوت کے بعد وہ عورت وہاں سے اٹھی لیکن اب اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ اور اس کا سفید براق برقعہ قبر کی مٹی سے اٹا ہوا تھا۔ وہ بڑی تیز قدموں سے چلتی ۔۔۔ اچھلتی کودتی ۔۔۔ جھاڑیوں اور بیلوں سے الجھتی ہوئی مزار کے اوپر کی پگڈنڈی پر آ گئی اور کسی سے کچھ کہے بغیر پالکی میں بیٹھ گئی۔

کہاروں نے پالکی کا پردہ گرا دیا۔

اور اسے اٹھا کر چل دیئے! ۔۔۔۔ اور چند لمحوں میں ہماری نظروں سے غائب ہوگئے۔

دوشیزہ کی محفل

رعنا فاروقی

☆ اس محفل میں سب سے پہلی آواز نبیلہ ملک کی ہے یہ لاہور سے تشریف لائی ہیں۔ فرماتی ہیں تہ اگر لبنیٰ کو اپنے ماں باپ سے ملواتے تو آخری قسط کا مزہ آجاتا۔ "جلتے پھول" کی میں دیوانی ہوں۔ اگر تقدس اور نواز دونوں مر جائیں تو بہت مزہ آئے گا۔ آئیڈیل کی تلاش میں بہت سی لڑکیاں پائلٹ کی خواہش رکھتی ہیں مگر پائلٹ کبھی اپنی آفر بھیجتے ہی نہیں۔ اور کیپٹن ڈاکٹرز سے بھی یہی شکایت ہے اکثر ڈاکٹر اپنی آمدنی بھی نہیں بتاتے۔ اس طرف بھی توجہ دی جائے اس شمارے میں شہزاد لرخ کی کہانی "محبت کے مجرم" بہت اچھی تھی جو دی ہیں۔ "پروانہ" نے متاثر کیا۔ آپ اجازت دیں میں بھی ایک کہانی لکھ بھیجوں ☆

نبیلہ ڈیئر "وراثت" کی قسط تم نے غور سے نہیں پڑھی ورنہ "مزہ" ضرور آجاتا۔ اور یہ "جلتے پھول" میں نواز اور ستارا کے مرنے سے بھی کچھ مزہ ملنا چاہیے۔ خوب! کسی کے مرنے پر مزہ لینا بُری بات ہے۔ اگر پائلٹ اور کیپٹن ڈاکٹرز اپنی آفر نہیں بھیجتے تو سمجھ لیں یہ بہت مغرور لوگ ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہے تو یہ حضرات آپ کی شکایت کا جواب ضرور دیں گے۔ کہانی آپ بھیج سکتی ہیں۔

☆ طلعت نسرین رخسانہ ابوظہبی سے فرماتی ہیں پرچے کا مطالعہ مدت سے کر رہی ہوں مگر ردی کی ٹوکری کے خوف نے خط نہیں لکھنے دیا۔ "جانور" اور "جلتے پھول" مجھے پسند ہیں عثمانی صاحب اور عزمی صاحب کو مبارکباد دے دیجئے۔

☆ نجمہ قریشی نے لاہور سے ہمیں مبارکباد کا خط بھیجا ہے لکھتی ہیں "آپ کو پتہ ہے ہماری دوشیزہ نے انڈیا میں کیسی دھوم مچائی ہے۔ عصمت چغتائی صاحبہ کے دورۂ پاکستان کے سلسلے میں آل انڈیا ریڈیو اور ٹیلی ویژن والوں نے جو انٹرویوز لئے ان میں عصمت صاحبہ نے دوشیزہ کی بے حد تعریف کی ہے۔ بارہ جنوری ۸۷ء کو امرتسر والوں نے عصمت آپا کا انٹرویو ٹی۔وی پر دکھایا جو ہم لوگوں نے یہاں لاہور میں یہ انٹرویو دیکھا۔ عصمت آپا نے اس وقت بھی دوشیزہ کو بہت پیار سے ہاتھوں میں تھاما ہوا تھا۔ تفصیلی طور پر انہوں رخسانہ سہام مرزا اور آپ لوگوں کے حسنِ سلوک کا تذکرہ کیا گیا ہے پاکستان کے کسی اور پرچے نے انہیں اتنا متاثر نہیں کیا جتنا دوشیزہ نے۔ آدھے گھنٹے کے انٹرویو میں وہ بیس منٹ تک صرف آپ لوگوں کی ہی باتیں کرتی رہیں۔ آخر آپ نے عصمت آپا پر ایسا کون سا جادو کر دیا تھا۔ ☆

نجمہ! محبت و خلوص کے جادو سے بڑھ کر دنیا میں اور کون سا جادو ہے۔ وہ ادیب خاتون ہیں ہمارے ان جذبوں کی سچائی کو انہوں نے دل سے محسوس کیا۔ اور ہمیں خوشی ہے کہ ہماری محبت کی انہوں نے بھی حوصلہ افزائی کی۔ یہ ان کی عظمت کا ثبوت ہے۔

[illegible] آپ کا افسانہ [illegible] آ جاتی
ہے کہ آپ کی [illegible] کی جانب سے شکریہ قبول کیجئے

☆ لودھراں سے محمد حسین سیمنٹ اینڈ جالی ہاؤس
رفاقت کا نام میں شامل نہیں ہے اسے آپ نے [illegible]
مخاطب کیا ہے لکھتے ہیں "دوشیزہ کی جان محترمہ بیگم رعنا فاروقی
صاحب! آج پہلی بار دوشیزہ پڑھا اور حیران ہوں کہ اب تک اس
بہترین رسالے سے بے خبر کیسے رہا۔ آپ اور شمارہ سہام مرزا صاحبہ کو
مبارکباد دیتا ہوں کہ خواتین کی صحیح رہنمائی کے لئے مثبت اور [illegible]
قدم اٹھایا۔ [illegible] آخر میں آپ سے ایک بات [illegible] کے
حضرت صاحب کے ساتھ [illegible] یہ [illegible] جہاں چار
عورتیں اکٹھی ہو جائیں وہاں زیادہ تر فضول باتیں ہوتی ہیں۔ [illegible]
[illegible] کے متعلق ایک جملہ کہہ دیا [illegible]
[illegible] میں جو ذہنی سکون ملتا ہے وہ دولت سے نہیں خریدا جا سکتا۔
اچھا ابھی بیگم رعنا فاروقی صاحب خدا حافظ"

محمد حسین سیمنٹ اینڈ جالی ہاؤس صاحب معاف کیجئے آپ
نے بھی تو یہی صاحب لکھا ہے [illegible] چار عورتیں صرف بیکار
باتیں ہی کیا کرتی ہیں لیکن جہاں چار مرد حضرات جمع ہو جائیں وہاں
کونسی شرعی باتیں ہوتی ہیں، قتل و غارت، سیاست، [illegible]
[illegible] اور عورتوں کے متعلق فضول قسم کی باتوں کے علاوہ بتائیے
اور کیا کرتے ہیں۔ آپ کا پیغام بہنوں کو پہنچا دیا ہے بھائی محمد حسین
سیمنٹ اینڈ جالی ہاؤس [illegible]

☆ مظفر گڑھ سے ع۔م۔ رانا نام چھپانے کی معذرت کے
[illegible] آپ نے پچھلے شمارے میں [illegible]
صاحبہ کے [illegible] اعتراض کیا تھا [illegible] آپ کو لکھتا
ہوں۔ [illegible]
کیا ہے تو اُن کی گفتگو پر [illegible] کے لئے پابندیاں مت لگائیے
[illegible] محترمہ یا محترم کے نام سے [illegible] مخاطب
کیا جاتا ہے کیونکہ رشتوں کے تعین کے لئے عورتوں کا فرق معلوم ہونا بھی
ضروری ہے [illegible] ہر شخص بہت
حساس ہوتا ہے آپ نے میری کہانی کے متعلق کچھ نہیں بتایا [illegible]
[illegible] برداشت [illegible] شکریہ [illegible] ہے۔

رانا بھائی آپ کی [illegible] بھی آپ کی طرح حساس ہے
آپ نے لکھا ہے کہ [illegible]

[illegible] آپ [illegible] شمارہ [illegible]
[illegible] آپ کی [illegible]
[illegible] رشتوں کے تعین کے لئے عورتوں کے فرق
کی [illegible] خواتین سے [illegible] مسلم
[illegible] شائع کر دیتے ہیں [illegible] نہیں ہے
آپ کی کہانی [illegible] کوشش کیجئے۔

☆ پشاور سے عبدالستار صاحب [illegible]
[illegible] وقت [illegible] نکال لیتا
ہوں۔ گو میں ابھی [illegible] دلچسپی نہیں رکھتا مگر دوشیزہ
کے [illegible] ناول مجھے بہت پسند آئے ہیں۔ [illegible]
اچھا نہیں تھا۔ ایک خاتون کے بارے میں [illegible] وہ خط
آپ نے شائع نہیں کیا شاید آپ مجھے SPOIL ہونے سے
بچانا چاہتی ہیں [illegible]

ستار بھائی میری سمجھ میں آپ کی ایک بات نہیں آئی کہ
آپ کسی [illegible] سے دلچسپی نہیں رکھتے اور ایک خاتون کے
بارے میں اپنی پسندیدگی کے متعلق ہمیں لکھ بھی چکے ہیں۔ [illegible]
متضاد بیانات سے ہم کیا نتیجہ اخذ کریں [illegible] درست ہے
کہ [illegible] پڑھائی پر زیادہ دھیان دیجئے یہ میری خواہش ہے
[illegible] دلچسپی لینے کے لئے ایک عمر ہوتی ہے آپ کا [illegible]
جلد شائع ہو جائے گا۔

☆ [illegible] سے غلام حیدر عباسی نے یاد کیا ہے
فرماتے ہیں [illegible] کہانیاں، اور [illegible] مرزا صاحبہ کے
اداریے سب سے پسند ہیں۔ [illegible]
ترجمانی [illegible] کی بھی مبارکباد۔

عباسی بھائی [illegible] میری جانب سے شکریہ قبول
فرمائیے۔ [illegible] ہے۔ آپ کو
بھی مبارک ہو۔

☆ کنری [illegible] سے [illegible] صاحب لکھتے ہیں:
"[illegible] دوشیزہ کے [illegible] سے
[illegible] میں بھی اس [illegible]
[illegible] سے [illegible] کے
[illegible] ہو جائیگا"
[illegible] بھائی آپ [illegible] دوشیزہ کی [illegible]

سا کالموں میں محفل میں آپ کی تجویز پر ہم پہلے ہی کافی غور کر رہے ہیں۔ وہاں سے قارئین کے تازہ افسانے اکثر پڑھنے کو ملیں گے۔

☆ پرویز ... پشاور سے ایک خط سے پڑھنے ... بھیجا ہے۔ بہت پسند آیا۔ خدا دوشیزہ کو دراز عمر عطا کرے آمین۔

ہماری آواز بھی آمین کہنے میں آپ کے ساتھ شامل ہے۔

☆ خان شوق چکنی (پشاور) سے بہت عرصے بعد ہماری محفل کو چلایا ہے لکھتے ہیں جنوری کا دوشیزہ بہت اچھا لگا اتنا پسند آیا کہ گزشتہ تمام نمبر اس کے مقابلے میں ماند پڑ گئے۔ جانور کی قسط نے دھماکہ سا کر دیا۔ بہت خوبصورت اور منفرد سلسلہ ہے آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ دوشیزہ کی محفل کو دن بدن محدود کیجیے کیا آپ کو ہم قارئین سے دلچسپی نہیں رہی ہے۔ یہ محفل ہماری محفل ہے آپ اتنی جلد ختم کریں گی تو ہم آنا چھوڑ دیں گے۔ اور طنز و مزاح کو پرچے میں ضرور شامل کریں اس قدر سنجیدگی بھی ٹھیک نہیں۔

شوق صاحب، توبہ توبہ کیسی باتیں کرتے ہیں آپ ہماری یہ مجال کہ قارئین سے بے رخی برتیں۔ آپ نہیں آئیں گے تو سونی محفل میں ہماری سسکیاں کون سنا کریں گی۔ ایسا بھول کر بھی مت سوچیے گا۔ اس دفعہ آپ کی دوسری شکایت بھی پوری کر دی گئی ہے۔

☆ جلیس النصاری طیر (کراچی) سے لکھتے ہیں۔ جانور کا جواب نہیں اس کہانی نے تجسس پوری طرح بیدار کر دیا۔ پیمانہ اور تین عورتیں تین کہانیاں، بہت پسند آئیں۔ باقی دوسری کہانیاں بھی معیاری تھیں۔

جلیس بھائی، جانور ایک حقیقی کہانی ہے اور سچی کہانیاں افسانوں سے کہیں زیادہ پُرلطف ہوتی ہیں۔ یہ کہانی قدم قدم پر آپ کا تجسس بیدار کرے گی۔

☆ خالدہ کوثر کرشن نگر لاہور سے پہلی دفعہ تشریف لائی ہیں۔ ابھی محفل میں مردوں کو کیوں گھسا رکھا ہے۔ یہ مرد حضرات ہر جگہ گھسنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جانور کی پہلی قسط بہت عمدہ اور تجسس سے پُر تھی۔ جلتے پھول، تین عورتیں تین کہانیاں، پیمانہ بہت پسند آئے۔ ایک صفحہ خانہ دار خواتین کے لئے بھی مختص کیجیے۔ کہانی بھیجنے کی کیا شرائط ہیں؟

☆ خالدہ امین ... ہم خواتین نے مردوں کو اپنے حقیقی ... دوشیزہ

[illegible] جانتے، بلکہ ہر وقت عورت کو محفل سے نکالنے ... عورت صرف رسومات کی باتیں، کھانے پکانے اور بچے پیدا کرنے تک ... عورت اور مرد دونوں معاشرے کا بنیادی کردار ہیں ہم دونوں کو ساتھ مل کر کام کرنا ہے۔ ... اپنے بھائیوں سے گزارش کرے ... ان کے محفل میں ... آپ کے کہنے پر ... بھیجنے کی شرائط پرچے میں درج ہیں۔ خانہ دار خواتین کا صفحہ ... مرتب کریں۔ اس معاملے میں قارئین کی رائے درکار ہے۔

☆ محمود خان راولپنڈی سے تحریر فرماتے ہیں۔ دوشیزہ کو سیاست سے علیحدہ رکھیں اور مہنگائی کے دور میں قیمت مزید نہ بڑھائیں ویسے یہ رسالہ ہے اتنا دلچسپ کہ یہ قیمت گراں نہیں گزرتی۔

—— آپ کی تجاویز نوٹ کر لی ہیں اور کوئی خدمت۔؟

محمد آصف اوکاڑوی لکھتے فرماتے ہیں۔ جلتے پھول بہت پسند آئی۔

آصف ندیم صاحب آپ کے خط کا بقیہ حصہ ہم اس لئے حذف کر رہے ہیں کہ ہو بہو یہی خط یوسف ندیم (رحمان) آپ کے بھائی اپنے خط میں تحریر کر چکے ہیں اور ان کا یہ خط شائع کر دیا تھا۔

☆ راولپنڈی سے ایک فوجی افسر جمشید خان نے اپنی خوبصورت انگریزی میں ہمیں خوبصورت سا خط لکھا ہے۔ انہیں جنوری کے سرورق کی تحریر نے بہت متاثر کیا ہے۔ اور ہماری یادداشت کہتی ہے کہ اس سے پہلے دسمبر کے شمارے کے سرورق کے لئے بھی ہمیں ان کا تعریفی خط موصول ہوا تھا۔

جمشید صاحب، ذرہ نوازی کا شکریہ۔ آپ کے خط سے ہماری حوصلہ افزائی ہوئی ہے۔

☆ سید عبدالعزیز شاہ بھرہ سے لکھتے ہیں۔ جانور کی پہلی قسط نے بہت خوشی دی۔ تین عورتیں تین کہانیاں بہت دلچسپ تحریر ہے۔ میرے دل میں بھی ایک کانٹا چبھا ہوا ہے سوچتا ہوں ... آپ تک پہنچا ہی دوں۔

سید صاحب، سوچنا کیسا، آج ہی لکھ ڈالیے۔

☆ بہاولپور سے ... تشریف لائے ہیں۔ مزید تعریف کروں گا ... آپ ہماری دوشیزہ ... گھبرا بھی جاتے ... عصمت چغتائی ... مثلاً عصمت چغتائی کی ایک کہانی ضرور شائع کریں۔ کیا آپ ...

کہانیوں کی بھی ہر پرچے کی زینت ہیں [illegible]
بھیج سکا مگر ایک کہانی بھیجی ہے اس کی اشاعت کا خواہش مند ہوں۔

ہماری دوشیزہ میں [illegible] صاحب [illegible] کی مدد [illegible] اس کی
نوک پلک درست کرتی ہے [illegible] کی کہانی شائع کرتے
ہیں آپ اپنی کہانی بھیجئے تو آئندہ اشاعت کا فیصلہ تو اس کے بعد کا
مرحلہ ہے۔

☆ شمشیر گوہر (ڈیرہ غازی خان) سے [illegible]
لکھتے ہیں آپ کی محفل میں پہلی اور آخری بار شرکت کی جسارت کر رہا
ہوں، عرصہ دراز سے پرچہ زیر مطالعہ ہے۔ مجھے اس کا [illegible]
دیا ہے۔ میں اس سلسلے میں ان صاحبان کا شکر گزار ہوں جن کی دلکش
تحریریں اس پرچے میں [illegible] ہوتی ہیں؟

رفیق صاحب آپ نے پہلی بار محفل میں شرکت کی خوشی، امید کرتے
آخری بار والی بات [illegible] بڑے [illegible] گستاخی ہو گئی ہے؟

☆ ناکرہ عزیز شہداد پور سے تحریر فرماتی ہیں۔ باجی محفل میں
پہلی بار حصہ لے رہی ہوں۔ مضمون حاضر خدمت ہے۔ تیز دوشیزہ
کی ممبر بننے کی کتنی فیس ہو گی۔

ناکرہ عزیز ہم اپنے قارئین کو ہمیشہ یاد رکھتے ہیں۔ محفل میں
آپ کی پہلی بار شرکت نہیں ہے۔ جنوری کے شمارے میں بھی آپ کو
جواب دیا جا چکا ہے۔ ٹھیک کہا نا ہم نے۔ آپ کی مراد خریدار بننا
ہے تو [illegible] بھیج کر آپ سال بھر کی خریدار بن جائیں گی۔ آپ کا مضمون
بہت مختصر ہے۔ ادھورا سا لگتا ہے۔ کچھ اور بہتر کر کے بھیجئے ذرا طویل۔

☆ ظفر سعید چیمہ نے دوبئی سے [illegible] نامہ بھیجا ہے کہتے ہیں
کئی برس [illegible] ایک [illegible] کے چکر کا [illegible] شروع کر دیتا ہوں۔ [illegible]
میں دوسرے رسائل کے مقابلے میں اس کی سب سے زیادہ مانگ
ہے اور اسی مقبولیت کی وجہ سے میں دوشیزہ کے خاص [illegible]
نمبر نہیں خرید سکا میں ان دنوں دوبئی سے باہر گیا ہوا تھا، واپس آیا تو
[illegible] سے نہیں ملے۔ میں قارئین سے گزارش کرتا ہوں کہ کوئی
مجھے یہ دونوں نمبر بھیج دے شکر گزار ہوں گا۔ ظفر سعید چیمہ پوسٹ بکس
نمبر [illegible] جبل علی دوبئی۔ یو۔ اے۔ ای

☆ سمیع اللہ [illegible] سے لکھا ہے [illegible]
دلچسپ سلسلہ ہے [illegible] کے بعد ان [illegible] کو بھی
نئے مستقل عنوان کے [illegible] مسلسل [illegible] ایک [illegible]
ہے۔ دیگر قارئین سے اس معاملے میں [illegible]

[illegible]
ہیں؟

☆ [illegible] لکھتی ہیں [illegible] پاکستانی
[illegible] سے پڑھا جاتا ہے [illegible] یہاں
[illegible] بہت [illegible] میں بھی دوست
[illegible] ہوں؟

☆ [illegible] سے [illegible] کو سلسلہ [illegible]
نے بہت متاثر کیا ہے؟

☆ [illegible] پڑھنے [illegible] لکھتی ہیں
[illegible]
[illegible]
[illegible] دیتا ہوں [illegible]
کو مبارک ہو۔

فنکار صاحب کیا آپ فلمی [illegible] کی طرح [illegible] اپنے آپ
سے کہتے [illegible] کیا چاہتے تھے [illegible] کسی بات [illegible]
جس [illegible] کا استعمال کیا جائے وہ زیادہ عزیز ہوتی ہے۔ یہ تھوڑی سی
زیادتی تو آپ کو برداشت کرنی پڑے گی۔

☆ سوات سے خالد جاوید [illegible] لکھتے ہیں سلام شوق
[illegible] اسلام شوق
قبول کریں۔ محفل میں شرکت پہلی بار ہے۔ آپ کی کاوشیں قابل [illegible]
ہیں ہر کہانی اپنی مثال آپ ہے۔

خالد جاوید صاحب آپ پہلی بار آئے اور کچھ [illegible]
[illegible] کہ سبھی قارئین [illegible] ہیں [illegible]
اگر ہم آپ کو پیارے خالد جاوید کہیں تو آپ کا ردعمل کیا ہو گا۔

☆ پشاور سے [illegible] آصف خان کا خط آیا ہے لکھتے ہیں
[illegible] کا شمارہ [illegible] ہاتھ [illegible] گیا [illegible] کر دیا۔
اس کے علاوہ [illegible] پاکستان [illegible] کے بارے میں [illegible]
[illegible] کا نام [illegible] کی توفیق
دے۔ آمین۔

قاتل کون؟

سید ظہیر حسین

فرض کیجیے —— قصور اور لاہور کے درمیان انتہائی سنسان جگہ پر کار میں ایک انتہائی لاغر اور نحیف و نزار عورت کی لاش آپ کو ملے اور کار سے چند گز کے فاصلے پر اس کا شوہر بے ہوشی کے عالم میں پڑا ہو تو آپ اس واردات کو کیا کہیں گے؟

قتل کی سوچی سمجھی سازش؟
ڈکیتی —— ؟
یا اتفاقی کمزوری کا نتیجہ —— ؟
بہت سوچ سمجھ کر آپ کو فیصلہ کرنا ہوگا۔
قتل کے اس المناک سانحے کی واقعاتی شہادتیں کچھ اس طرح سامنے آتی ہیں۔

مقتولہ کے دیور نے پولیس میں رپورٹ درج کرائی کہ جب ہم قصور اور لاہور کے درمیان پہنچے تو میرے بھائی کو احساس ہوا کہ کار میں بریک آئل نہیں ہے اس لیے اس نے مجھے بریک آئل لانے کے لیے لاہور کی طرف بھیجا۔ جب میں واپس آیا تو کیا دیکھتا ہوں میری بھابی کار میں مردہ حالت میں پڑی ہیں اور بھابی خون میں لت پت ہے۔ وہاں میرے بھائی کا کوئی اتا پتہ نہیں تھا۔ میرا خیال ہے کہ ڈاکوؤں نے میری بھابی کو قتل کر دیا ہے اور بھائی کو پکڑ کر لے گئے ہیں۔

پولیس جائے وقوعہ پر پہنچی تو مقتولہ کے شوہر کو کار سے چند گز کے فاصلے پر بے ہوشی کے عالم میں پایا۔ جب اسے اٹھایا گیا تو وہ ہوش میں آ گیا۔ پولیس کو مقتولہ کے شوہر نے بتایا کہ ڈاکوؤں نے [illegible] میری بیوی کو گھیر لیا اس کو اتنی مہلت ہی نہیں ملی کہ [illegible] کار کے باہر [illegible] اور [illegible] گولی چلا دی۔ شوہر نے مزید بتایا کہ اس کے بریف کیس میں [illegible] اور [illegible] بے ہوش ہو گیا۔

پولیس کے کھوجی نے [illegible] کار کے پاس کی جگہ کا معائنہ کرنے کے بعد بتایا کہ کار کے قریب ایک ہی شخص کے پاؤں کے نشانات نظر آتے ہیں۔ کار کی پچھلی نشست پر بریف کیس موجود تھا، جس میں سے ایک [illegible] اس میں [illegible] روپے تھے۔ اور مقتولہ کی طلائی چوڑیاں بھی کار ہی سے [illegible] مقتولہ کا ایک [illegible] ہوا تھا اور پولیس کو [illegible] خون کی ایک [illegible] مقدار میں کار کے باہر [illegible] ملی تھی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کار بغیر بریک آئل کے چلائی نہیں جا سکتی تھی —— ؟ کیا کوئی ذی فہم انسان سنسان علاقے میں [illegible] کر کے اپنے بھائی کو بریک آئل کی خاطر شہر کی طرف بھیج سکتا ہے —— ؟

اگر بھائی بریک آئل لے کر ٹھیک وقت پر پہنچا تھا تو اس کے پاؤں کے نشانات کیوں نہیں پائے گئے —— ؟

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ مقتولہ کے جسم سے تین گولیاں برآمد ہوئیں۔

ڈاکوؤں نے ایک بیمار اور لاغر عورت کو جس کا کل وزن ساٹھ پاؤنڈ تھا تین گولیاں مار کر ہلاک کرنا ضروری سمجھا اور اس کے شوہر کو جو کافی صحت مند اور تنومند شخص ہے صرف زد و کوب کیا۔

مقتولہ کو جب کار سے باہر نکلنے کا موقع ہی نہیں دیا گیا تو [illegible] کار سے باہر موجودگی کیا معنی رکھتی ہے۔ شوہر کے بیان کے مطابق کار میں گولی ماری گئی تو خون کار کے قریب زمین پر کیسے آگیا —— ؟

ڈاکوؤں نے [illegible] بریف کیس میں [illegible] طلائی چوڑیاں کیسے چھوڑ دیں؟

ریوالور کیوں برآمد نہیں ہوا —— ؟

واقعاتی شہادت کی کڑیاں آپ کے سامنے ہیں ان کو ملا کر [illegible] جائیے —— اور اپنی تحقیقات کے بعد ہمیں بتائیے کہ اس خون ناحق کے چھینٹے کس کی آستین پر ہیں —— ؟ اصل قاتل کون ہے ؟

کیا آپ اس سلسلے میں لاہور پولیس کی مدد کر سکتے ہیں —— ؟؟

ہوسکے کہ قریشی صاحب کے پاس سب کچھ تھا لیکن افسوس سے کبھی ایسے ہی منزل نہیں سکی تھی جس کا وہ متمنی تھا اچھا ہو رہا تھا لیکن ان کا خیال تھا کہ یہ سب چھن جائے گا [illegible] تو یہیں کہ کوئی ایسا تو پھر سے [illegible] کو تحفظ دلائے ہیں۔ [illegible] کا حال ہیں سامنے پھرتے ہیں، یہ تو نصیب کی باتیں ہیں، جو کچھ ہوتا اقتدار کی خاطر تقدیر بنتی اور دولت برس پڑی اور جو قسمت نے ان کو دے رکھا تھا پھر سے نصیب کی دھوپ چھاؤں میں چھٹیاں کرنے لگے دن دولت تو ہمیشہ کھیل ہے۔ کبھی ایک کی چھت پر اور کبھی دوسرے کی منڈیر پر۔ اصل چیز تو شرافت ہے جس پر قریشی صاحب کو ناز تھا لیکن

[illegible] کہ [illegible] تقدیر کا سلسلہ [illegible] لیکن [illegible] لگا [illegible] یہ لوگ [illegible] مستقل [illegible] ہے۔ جھوٹ [illegible] گی جیسے [illegible] ہمیشہ محروم رہا [illegible] [illegible] [illegible] نسلوں کے نصیب جاگے [illegible] کے [illegible] نے [illegible] [illegible] [illegible] شیشے [illegible] ہیں سے جھانکنے لگے لیکن شرافت نہ کسی کو ملی تھی نہ کسی سے چھن سکی۔ جو پہلے رذیل تھے [illegible] سونے کی گولیاں کھاتے ہوئے بھی رذیل ہی ہیں اور جو حقیقتاً شریف تھے وہ [illegible] میں بھی [illegible]

اقتدار کے ایک پاگل [illegible]

مسعود ملک



۔ی ہے سے صداقت ہی کی ہے۔

اسی قسم کے خیالات اور اس کی بنا پر قریشی صاحب اپنی خاندانی اور شخصی شرافت پر ناز کیا کرتے۔ جو برائیوں سے پرہیز کر کے شرافت کہا جاتا ہے قریشی صاحب عمر بھر ان سے دامن بچاتے رہے۔ اس کوٹھی میں انہوں نے کبھی کسی لڑکی کو راہ چلتے [illegible] سے وابستہ کر لیں کیا چار بچوں کے باپ بنے۔ منگو کیا مجال جو کوئی ان میں بچوں پر نقص نکال سکتا ہو۔ اس عمر میں [illegible] لیکن ان کا طرز عمل قائم رہا۔ جوانی کے جن جذبوں میں معمول ہوتا ہے لیکن قسم لے لیجئے جو کبھی نظر بھٹکی ہو۔ شاید کسی عورت نے نظر بھر کر دیکھا ہو چہرے پر شرافت اور طبیعت میں لا حول کے جملہ آداب آئے۔ شراب کو سگریٹ تک بھی نہیں۔ جو ازاں بھی کبھی نہیں کیا۔ ہاں سگریٹ تک پہ ہمیشہ چار حرف بھیجے۔ جانے کس نے بچا دی [illegible] لیکن خود کبھی طلب نہ کی جتنا عمر میں ایک دفعہ دیکھا جب حج کی نماز آئی تھی منگو نے [illegible] دفعہ ہی سے سلام۔ مذہب کا یہ حال کہ نمازیں پڑھ پڑھ کر گھٹنوں کو گولا اٹھے تسبیح کرنا تھا شمسی کا حصہ تھی کہ کبھی رکتی ہی نہ تھی۔ وظیفوں کا ورد تا اسے کیے کر کرتے۔ مولود ہوا تو سنا حرم۔ قرآن کے حافظ سنت کے عامل اور شرع کے پابند تھے۔ گفتگو کے فقروں میں حدیثیں اور قرآنی حوالے پڑے رہتے کسی بندۂ خدا سے بیر نہ تھا۔ سوائے ایک شخص کے۔ اور وہ تھا منگو :

دراصل منگو سے قریشی صاحب کی عداوت کوئی شخصی تنازعہ نہ تھی بلکہ ان کی شرافت ہی کی دلیل تھی۔ منگو کم بخت کی حرکتیں ہی ایسی تھیں کہ ہر شریف آدمی اس کے پاس [illegible] کرتا تھا۔ بچپن میں کی عمر ہی میں اس گھاٹ کا پانی پی چکا تھا جس کی چالیس سالہ قریشی صاحب نے بھی نہ تھا۔ جوئے کے [illegible] کی [illegible] جھگڑوں کی [illegible] بھی۔ رنگوں میں [illegible] خراب ہوتی تھی۔ [illegible] میں بھی [illegible] پھرتا اور ایک دفعہ [illegible] باپ [illegible] پر [illegible] کر گھر سے نکال دیا تھا تو ایک [illegible] کا [illegible] تھا۔ وہ تو خدا بھلا کرے قریشی صاحب کا جنہوں نے اسے [illegible] سے وہاں لگنے نہیں دیا اور وہ آج کل کوئی بڑا بھوکا ہوتا۔ جب دیکھو نیلے کپڑے پہنے ہونٹوں پر پان کا رنگ جمائے سینہ پھیلائے پھرتا ہے۔ اور قریشی صاحب نے کہا "منگو میاں کبھی یاد کر لیا کرو۔ وقت پڑے سے گیس تو نہیں ہو گے؟"

کہہ لیا :

"حضور! مقصد تو نماز کا بھی [illegible] ہے اور جیسے اس دنیا میں [illegible]

[illegible] پائی دہشت کے [illegible] کے [illegible] کا مطلب [illegible]

یہاں [illegible] کا ؟"

قریشی صاحب کو غصہ تو بہت آیا لیکن ٹال جانے کی کوشش کرنے لگے۔ "دیکھو منگو ... ایسے اخلاق شریف انسان تھے اگر تمہیں یا خیال نہیں تو تم ادب کر ان کی عزت کا ہی خیال کر لیا کرو۔ سو کوئی اچھی بات نہیں ہے۔"

منگو ہنستے ہوئے بولا "حضور! جو بنا تھا بن چکا۔ اب تو نام ابا کی بھی شریف ہو سکیں گے۔"

"ارے نہیں! یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔" قریشی صاحب بولے۔ "اگر اب بھی تم برے کاموں کو چھوڑ دو تو تم شریف بن سکتے ہو۔"

منگو بے اختیار ہنس پڑا۔ "واہ بابو جی! صرف چند چیزیں نہ کرنے سے ہی شریف بن جاؤں گا؟ تو شرافت کیا ہوئی ہر سو ملاں کے پرہیز کی طرح ہے؟"

اور قریشی صاحب اس پرہیز کے فلسفہ پر ابھی کچھ الجھ گئے تو منگو پان کے بچوں کو جھڑکتا ہوا اسکو دھکا کر ستا رہا اور پھر بولا "حضور مائی باپ! یہ جو مرضی ہے کہہ لیں۔ لیکن ہم لوگ جب یہاں جیتے ہیں سمجھا ہے تو جینے کا مزہ اسی میں ہے کہ ہر بات میں ٹانگ اٹکا کر اسے چکھیں جو گھڑی نئی گی۔ اس سے اسی سے نپٹ لیں گے۔ خواہ مخواہ پہلے ہی آدمی زندگی کا مزا کرکرا کیوں کرے۔ اس کا کیا مزہ رہا؟"

اور قریشی صاحب مستقل پہنچتے ہوئے معاملہ سوچ میں گم ہو گئے۔ ان کا بس چلتا تو آج سے عرصہ پہلے منگو کو اپنی کوٹھی سے نکال چکے ہوتے۔ لیکن منگو ان کے بوڑھے ملازم خیر دین کا لڑکا تھا۔ اور ملازم بھی وہ جس کے باپ دادا قریشی صاحب کے خاندان کی چاکری کرتے آئے تھے۔ اتنے سالوں میں گویا بدی کا پتھر بھی پانی بن گیا ہے۔ خیر دین خاندان کا گویا ایک حصہ بن چکا تھا۔ قریشی صاحب جب کبھی منگو کو نکالنے لگے بڈھا خیر دین ان کے پاؤں پکڑ لیتا اور قریشی صاحب شرافت اور وضعداری سے مجبور ہو کر چپ ہو جاتے پھر بھی منگو کو سخت حکم تھا کہ وہ لڑکیوں والے حصے سے گزر کر کبھی کوٹھی کی طرف آنے کی کوشش نہ کرے۔ بچے کالج کے گریجویٹ بھی بیکار ہو گئے ہیں۔ کوٹھی کے دروازے سرشام ہی بند ہو جاتے تھے۔ لیکن منگو راستے سے ہٹ کے بازار میں پھرتا رہتا۔ بچے لمبے ہی گھڑا ہو کر دھمکی پڑھتیں۔ ایک اشتہار میں [illegible] کا جاننا [illegible]۔ وہ منگوں کے ساتھ تھے [illegible] رات دونوں کے قریب [illegible] کر اندر

آتا اور شطرنج میں اپنا کھانا پینا تک بھول جاتا۔

اسی طرح کئی برس گزر گئے۔ قریشی صاحب جتنی محبت کرتے تھے
وہ ہر وقت شرم میں [illegible] نہایت [illegible]
کی اپنی کوٹھی میں رہ رہا ہے۔ وہ اس کے باپ کو دیکھتے تو کانوں میں
انگلی دے لیتے اور خدا کی قدرت پر [illegible] کے اندر
سے ملتی نکلتا ہے۔ باپ ایسا شریف کہ اس کے پیچھے سے فرشتے
وضو کریں اور بیٹا ایسا [illegible] کہ شیطان بھی شاگردی کرے۔ جب [illegible]
الٹی سیدھی حرکتیں کرتا پھرے۔ تو اس کے بوڑھے باپ نے [illegible]
پکڑ کر قریشی صاحب کا ہاتھ روک لیا ورنہ وہ تو ہنٹر سے اس کی کھال
ادھیڑ دیتے۔ جب وہ عورت والا واقعہ ہوا تھا کہ [illegible] قریشی
صاحب کی عزت کا خیال [illegible] باپ کی سفید داڑھی کا۔ آپ بھی پوچھئے
سردیوں کی رات کے دس بجے جب بارش ہو رہی تھی اور قریشی صاحب
اپنی بیٹھک میں چند معزز دوستوں کے ساتھ بیٹھے تھے تو ایک جوان
خوبصورت عورت ان کی کوٹھی میں رات بسر کرنے کی اجازت مانگے۔
تو وہ کیسے مان لیتے۔ اگر اس کے شرابی خاوند نے اس وقت مار کر اسے
گھر سے باہر نکال دیا تھا اور وہ بارش میں اپنے ایک سالہ بچے کو
لے کر کہیں اور نہیں جا سکتی تھی تو اس سے قریشی صاحب تو ذمہ دار
نہ تھے۔ کیا ضروری تھا کہ وہ عورت سچ کہہ رہی تھی۔ اور اگر بالفرض
محال وہ سچی ہو تو اس کا کیا ثبوت تھا کہ اندر گھر میں بیٹھے ہوئے مہمان کل کو قریشی صاحب
کی نیت پر شبہ نہیں کریں گے۔ زمانہ بھی آج کتنا خراب ہے۔ ساری
رات عورت ان کے ساتھ ہے تو دنیا والے کیسے کیسے قصے مشہور کر
جائیں گے۔ دنیا میں ایک نہیں ہزاروں بے کس عورتیں ہیں لیکن ان کی خاطر
اپنی شرافت اور عزت کو داغ لگوانا بھی تو عقلمندی نہیں۔ چنانچہ قریشی
نے نوکروں کو آواز دے کر کہا کہ اس عورت کو فوراً باہر نکال دیں۔ اتفاق سے
کوئی نوکر موجود نہ تھا۔ [illegible] گیا ہوا تھا۔ چنانچہ انہوں نے مجبوراً
منظور کو بلایا۔ اور جب وہ اس بے کس عورت کو باہر لے گیا تو قریشی
صاحب اور ان کے دوست دیر تک زمانے کی خرابی کا ذکر کرتے رہے
جس میں شرافت سے رہنا دن بدن مشکل ہوتا جا رہا تھا۔

پچھلی رات کو قریشی صاحب تھوڑی دیر پہلے ہی آرام سے
سو رہے تھے۔ [illegible] کر وہ باہر گئے اور انہوں نے دیکھا کہ بڑے کمرے کے
[illegible] پر کوئی لمبا لمبا سا [illegible] ہوا ہے۔
بجلی کا بٹن دبایا تو [illegible] کمرہ روشنی
روشنی سے جگمگا اٹھا۔

شعاع: ایک شخص نے اپنے
گھر سے ایک [illegible] سات فٹ لمبی
[illegible] ایک مشین حرکی سیر میں
[illegible] مشین کے ساتھ اس
کا ایک [illegible] ہے کہ یہ قتل کے
ایک مقدمے میں ملوث ہوں۔ [illegible]
[illegible] کی اشد ضرورت تھی اس لئے میں نے
مشین چرائی ہے۔ [illegible] ایک مشین [illegible]
اس لئے میں دوسری مشین خرید کر [illegible]
میں اپنے ساتھ یہ مشین لے جا رہا ہوں اسے میں گروی
رکھ کر اپنے اخراجات پورے کروں گا۔ تاہم میں کوشش
کروں گا کہ جلد ہی یہ مشین وہاں سے چھڑا کر ان کے گھر میں
چھوڑ جاؤں گا۔ پولیس [illegible] شاہ [illegible]
اپنی تحویل میں لے کر چور کی تلاش شروع کر دی ہے۔
(ایک خبر)

"اوہ منظور! تو یہاں کیا کر رہا ہے؟" قریشی صاحب حیران ہو کر
بولے اور منظور نہایت تیزی سے جیب چھپا کر کھڑا ہو گیا۔ "اپنے
کمرے میں کیوں نہیں سویا؟"

منظور خاموشی سے فرش کی طرف دیکھتا رہا۔ اور اپنے نحیف سے
لڑکھڑاتے ہوئے جسم کو سنبھالتا رہا۔

"ابے بولتا کیوں نہیں؟" قریشی صاحب نے اس کا کان کھینچا۔
منظور نے ان کے پاؤں پکڑ لیے۔

"سرکار میں نے آج تک کسی کی چوری نہیں کی۔ لیکن آج آپ
کی [illegible] ہوں۔ وہ بے چاری بڑی دکھیا معلوم ہوتی ہے۔ اس کا بچہ
سردی میں [illegible] اور اس کا بچہ یقیناً مر جاتے اگر میں انہیں اپنے کمرے میں
نہ سلاتا!"

قریشی صاحب کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ "نمک حرام کو
[illegible] جب کے [illegible] کی بات اس کی زبان سے
[illegible] کی بات پر انکار کر رہا تھا تو
انہیں [illegible] سے باہر جا پڑا۔ نمک حرام باہر نکل کر
[illegible] اس فاحشہ کو گھر سے باہر نکال [illegible]

(باقی صفحہ [illegible] پر)



چاہیے جاکر لمنہ کالا کر۔ خبردار جو یہاں قدم رکھا۔"

اور جب تیسرے روز منگو کے باپ خیرالدین نے قریشی صاحب سے ڈاکٹری فیس کے لیے کچھ روپے مانگے کیونکہ منگو کو ساری رات باہر لان میں گزارنے کی وجہ سے نمونیہ ہوگیا تھا تو قریشی صاحب نے یہ کہتے ہوئے صاف انکار کر دیا کہ ایسے ننگ انسانیت کا مر جانا ہی بہتر ہے۔ لیکن منگو اپنا علاج کرنا جانتا تھا۔ اس کے ستول جھڑوں اور کسرتی ٹانگوں میں جب کیسی خراب کا اسباب ہوا تو وہ چند دنوں میں بھلا چنگا ہوا، چولہے میں کھڑا ان کباب کھا رہا تھا۔

کباب والا منگو کا اکھاڑے کا یار تھا۔ اس سے لنگوٹیا سے ملنگ ریکا کرتا تھا۔ چنانچہ جب منگو مولوں کے ایک تانگے پر نظریں جمائے سیخ سے اتار کر کباب کھا رہا تھا تو وہ اپنے ایک گاہک کی آنکھ مار کر بولا،

"یار منگو! تمہارا قریشی صاحب کہتا ہے کہ حیلا اس لونڈیا پر دل آگیا تھا جو تو نے پناہ کا ڈھونگ رچایا" تو منگو نے کباب والی سیخ زمین پر پٹخ دی۔ منہ کا نوالہ تھوک دیا اور فضا میں تین چار چکر بکھیر کر بولا۔

"لے بھئی بھلا اس کی طرح شرافت کا قیدی ہوں جو کھل کر دل بھی نہ بہلا سکوں۔ قسم پیر کی جس لونڈیا پر منگو کا دل آئے گا سچ کہتا ہوں چولہے میں جھونک کر سالی کا بھرتہ بنا ڈالوں گا۔"

اس قسم کی باتوں کی وجہ سے منگو اور قریشی صاحب ایک دوسرے کو ناپسند کرتے تھے۔ اگر حالات ایسے ہی رہتے تو ایک نہ ایک دن ان دونوں کا ٹکراؤ یقینی تھا۔ لیکن وقت کی ہوائیں کڑیلیں دور اُگے ہوئے تنکوں کو بھی یک جا اڑنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ چنانچہ ۱۹۴۷ء میں جب ملک کے بٹوارے میں مختلف افراد کو قومیت کی کڑاہی میں تلا ہوا کیا ہونا پڑا تو منگو اور قریشی صاحب بھی دیوار کی اینٹوں کی طرح کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہوگئے۔ جس آبادی میں قریشی صاحب رہتے تھے وہاں تین چار کوٹھیاں مسلمانوں کی تھیں اور ایک دو

جہریں سکھوں کی بھی آبادی تھی۔ ان سب کے بیچ میں چند غریب مسلمانوں کے آٹھ دس مکانات تھے۔ برسوں سے ہمسائیگی کی بنیاد پر مل جل کر رہتے تھے۔ اور اگر مکان اب بھی وہی تھے جن میں رہتے تھے لیکن فضا تھی جس سے خلوص نچڑ گیا تھا۔ اشتعال دن بدن بڑھ رہا تھا اور آپس کے تعلقات دیمک زدہ درخت کی طرح کھوکھلے ہو گئے تھے۔ ایک ہی جھونکے پر زمین بوس ہونے کو تیار تھے۔

اور پھر ایک روز اس جھونکے کے اولین سانس ماحول کی پیٹھ کو چھونے لگے۔ کسی رنڈی کے کوٹھے پر ایک سکھ نے شراب کے نشے میں منگو سے الجھ کر کہا: "سالا منگو! اپنے اسلام کو پاکستان میں بچا۔ یہاں تو جو مسلمان بچے گا اس کی لاش سے ہم اسلام کی چتا جلائیں گے" تو لوگوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا ورنہ منگو اس سکھ کا پیٹ چیر دیتا۔

پھر چڑھتے شاہ کی درگاہ پر شام کے وقت منگو بابا جی آنے کے تیل اور موتیے کے لیے گیا۔ وہ نہا دھو کر صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے تھا اور ایک کونے میں بیٹھ کر قوالی سنتا رہا۔ کافی دیر بعد اٹھا۔ جوتی اٹھا کر باہر نکلنے لگا تو دہلیز سے تھوڑی سی مٹی اٹھا کر ماتھے پر لگائی اور زیرِ لب بولا:

"پیر جی اسلام کو بچانا۔"

شام کی نماز ادا کر کے قریشی صاحب تسبیح ہاتھ میں لیے باہر لان میں نکلے تو منگو نے سامنے آکر سلام کیا۔ انہوں نے تیوری چڑھا کر اسے دیکھا اور پھر ان کی نظر اس کی جیب پر پڑی۔ ایک ننگی امریکن ایکٹریس کی تصویر آدھی باہر جھانک رہی تھی۔ ان کے چہرے سے نفرت جھلکنے لگی۔ منگو نے ان کی نظر کا اندازہ کر کے فوراً تصویر کو جیب میں گھسیڑا اور بولا،

"حضور ایک ضروری بات کرنا ہے۔"

جواب دینے کی بجائے قریشی صاحب منگو کو ناگواری سے دیکھنے لگے۔

"جی ہندو اور سکھ عنقریب ہم لوگوں پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔" قریشی صاحب کی تسبیح چھوٹ گئی اور آنکھیں پھیل پھیلی رہ گئیں۔ "کیا کہا؟" وہ چلائے۔

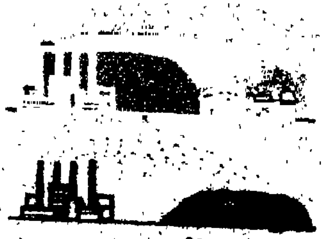
"جی میں نے آج ساری کنسول ہے۔ ایک ہفتے کے اندر اندر ان کا ارادہ ہے۔" پھر منگو اور قریشی صاحب کافی دیر تک سر جوڑ کر باتیں کرتے رہے اور جب باتیں ختم ہوئیں تو قریشی صاحب منگو کے دوست بن چکے تھے۔

رات ہوتی تو سر پر ہرے سے کپڑا باندھ لیتا ہاتھ میں لاٹھی لیے
مسلمانوں کے مکانوں پر پہرہ دیتا رہتا۔ اس کے دو تین
ساتھی بھی اس کے ساتھ تھے گلی کے ناکوں پر اور سڑک کے موڑ
پر وہ درختوں کے سایہ میں چھپ چھپ کر ہندوؤں اور سکھوں
کی حرکات دیکھتے۔ رات ہی رات میں انہوں نے کچے تالاب کے
کنارے پڑی ہوئی سینکڑوں اینٹیں مسلمانوں کے گھروں میں پہنچا
دیں جو حملے کا مقابلہ کرنے کے لیے منڈیروں کے ساتھ چن دی گئیں
اگلے روز مشکو ہر گھر میں گیا اور گندھک سے بھر گیا اور لوگوں کو سکھایا
کہ کس طرح باورچی خانے کی پھکنی سے بھر کر بطور بندوق استعمال کر سکتے
ہیں۔ رات کے اندھیرے میں اس نے چاقو اور لاٹھیاں تقسیم کیں۔
اپنے گھر میں پڑی ہوئی شراب کی خالی بوتلوں میں چونا اور ٹکر بھر کر
لوگوں کو دیے کہ وقت آنے پر ان میں تھوڑا سا پانی ڈال کر کارک
مضبوطی سے بند کر کے باہر پھینک دیں تو یہ بم کی طرح چلیں گی۔
مسلمانوں کا وقت انتہائی بے چینی سے کٹ رہا تھا۔ رات کے
اندھیرے میں کبھی کبھار قریشی صاحب باہر جھانکتے تو مشکو ہاتھ میں لاٹھی لیے
بہت مستعدی سے اندھیرے میں سے نکل کر قریب آتا اور تسلی دیتا "جب تک
مشکو زندہ ہے قریشی جی کوئی سالا مسلمانوں کو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔" اور
گھبراہٹ میں قریشی صاحب کو پتہ بھی نہ چلتا کہ مشکو کے منہ سے
شراب کے بھبکے نکل رہے ہیں۔ وہ اسے ہمدردانہ سمجھاتے "دیکھو
مشکو! تم پہرہ دیتے وقت ہندوؤں کے علاقہ میں نہ جایا کرو۔ ادھر ہی
رہا کرو۔"

مشکو دبی دبی ہنسی ہنستا "چھوڑیئے قریشی جی! کیوں فکر کرتے ہیں
ہم نے تو زندگی کا پورا مزہ لے لیا ہے۔ اب مر بھی گئے تو کیا ہے،
اور اگر ایک مشکو کے مرنے سے اسلام بچ جائے تو بسم اللہ! میں
ادھر ان لوگوں کی ٹوہ لینے جاتا ہوں اور اس میں مسلمانوں ہی کا فائدہ ہے۔"

جیسے جیسے وقت گزرتا گیا مسلمانوں کی بے چینی میں اضافہ
ہوتا گیا۔ گنے چنے چند مسلمانوں کی کوئی تنظیم بھی نہ تھی۔ زیادہ سے
زیادہ وہ یہ کر سکتے تھے کہ آپس میں مل کر کسی دن لڑ بھڑ کر وقت کا
بھلے انداز میں ذکر کرتے رہیں۔ مشکو رات کو پہرہ دیتا اور دن کو مسلمانوں
کے گھروں میں جا کر ان کی ہمت افزائی کرتا۔ اس نے چار تھوڑے تھوڑے
مضبوط ہاتھوں پر باندھ لیے تھے اور ہر وقت ہتھیار اپنے پاس رکھتا۔

کبھی کبھی قریشی صاحب نماز پڑھ کر وظیفہ کر رہے ہوتے۔ وہ
آیت کریمہ اور سورۃ الکہف پڑھ کر اٹھنا چاہتے تھے کہ آہٹ سے مشکو کی



مشتی ستمبر

ایک دم دروازہ دھڑاک سے کھل گیا اور مشکو گھبرائے ہوئے انداز میں اندر
داخل ہوا۔ بڑی جلدی سے اس نے دروازہ بند کیا۔ اندر سے زنجیر
چڑھائی۔ قدم قدم چلتا کمرے میں آیا اور پاؤں کھول کر کھڑا ہو کر قریشی صاحب
کو گھورنے لگا۔

"کیا ہے مشکو؟" بڑی مشکل سے قریشی صاحب کے خشک
حلق سے پھنسی ہوئی آواز نکلی، کیونکہ مشکو کے انداز سے وہ اندر ہی اندر
ڈر رہے تھے۔ مشکو کی آنکھیں ابل رہی تھیں۔ توازن ڈگمگا رہا تھا۔
منہ سے شراب کی بو آ رہی تھی لیکن وہ پہلے سے ہوش میں تھا۔

"قریشی جی! میں ایسے کبھی نہ ہونے دوں گا۔ مشکو کے جیتے جی
آپ ایسا ہرگز نہیں کر سکتے!"

"کیا بات ہے مشکو؟"

"میں وکیل نہیں قریشی جی کہ بہت باتیں کر سکوں۔ میں تو اپنی
بات ایک زبان سے کرتا ہوں اور وہ ہے چاقو کی زبان۔ اسی زبان
سے میں کہہ رہا ہوں کہ اگر آج رات آپ نے یہاں سے چھپ کر نکلنے
کی کوشش کی تو کسی سکھ کی کرپان سے پہلے مشکو کا چاقو آپ تک
پہنچ جائے گا۔"

"مشکو....!" قریشی صاحب چلائے۔

"مشکو ٹھیک کہتا ہے قریشی جی! میں صاف آدمی ہوں۔ آپ
کے اپنے گھر کے لیے تو ایک ٹرک اور کار آ سکتی ہے جو رات رات
میں آپ کا سب سامان یہاں سے نکال لے جائے۔ لیکن آپ نے یہ نہیں
سوچا کہ ان مسلمانوں کا کیا ہوگا جن کے پیچھے جتھے منڈلا رہے ہیں؟"

"لیکن میں اتنے آدمیوں کے نکالنے کا انتظام کیسے کر سکتا ہوں؟
میرا.... میرا...."

"ہاہا!" مشکو بے اختیار ہنس پڑا "آپ اپنے گھر کی سوئی اور
ایک ایک تنکا یہاں سے لے جانے کا انتظام کر سکتے ہیں اور ان کا کیوں

بقیہ صفحہ



کام نہیں کرسکتے۔ وہ آپ کے باورچی خانے کے چوہے سے زیادہ میٹھی ہیں جو آپ نے جائے ہیں اور ان کو چھوڑ رہے ہیں۔"

قریشی صاحب چائے خانے سے اٹھ کھڑے ہوئے اور اندر کی طرف مڑتے ہوئے سخت ناگواری میں بولے:

"میں نے کسی کا ٹھیکہ نہیں لیا ہوا۔"

"ہوں!!" منگو الفاظ چبا چبا کر بولا "ٹھیکہ... نہیں... لیا... اور قریشی جی، وہی ٹھیکہ تو میں آپ کو دینے آیا ہوں۔"

چرررر۔ فضا میں آواز ابھری۔ اور منگو بازو بھر لمبا چاقو تول کر ہاتھ میں پکڑے ٹھیکے کی طرف اٹھا "آپ کو اس قلم سے لکھنا ملے گی قریشی جی! آپ لوگ نمازیں پڑھ پڑھ کر خدا سے حوروں کے لیے دعا بازی کرتے رہتے ہیں تو اب آپ کو عادت ہو گئی ہے کہ ہر جگہ دعا بازی کریں۔"

منگو اچھل کر میز پر چڑھ بیٹھا اور چاقو ہاتھ میں اچھالتا ہوا بولا "شرط نمبر ایک یہ ہے قریشی جی کہ سب ٹرک میں جو سامان ہے وہی وہ سارے کا سارا نہیں ہے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ آگے چل کر آپ کو اس سے نشتر لگ جائے گا۔ اگر میرے وعدے پر اعتبار نہیں حدیث میں پڑھ لیجئے گا۔ دوسری شرط یہ ہے کہ یہاں سارے ملک کی نفری چالیس ہے۔ خالی ٹرک میں وہ لوگ جیسے بھی ہوں بجائیں اور آپ انہیں اسلام کا سامان سمجھ کر لے جائیں۔ اگر یہ

تو منگو نہیں تھا... حضرت کے اندر سے جو اچھوتا ہوا کی شدت سطح پر کسب کر کھڑا ہو گیا... تو گھبری خوشی سے قریشی صاحب چپ تھے۔

"منگو اطمینان سے بیٹھ اترا۔ کھینچ کر جیب سے چاقو نکالا تو سطح پر ایک لمبی سی چمکتا لکیر کھینچی اور قریشی صاحب کی آنکھوں نے آنکھیں بند کر لیں:

"ٹھیک دینے والا جواب نہیں ملا کرے، وہ صرف خود کو بتاتا ہے کہ ٹھیک منظور ہوتا ہے کہ لیا ہے ورنہ نہیں۔ سب میں آپ کو قریشی جی!"

"ٹھیرو" قریشی صاحب کانپتی ہوئی آواز میں بولے اور آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ لیا "دیکھو میں تمہیں اپنے ساتھ لے چلوں گا۔ باقی لوگوں کی بات تم رہنے دو۔"

"واہ قریشی جی خوب سمجھے آپ بھی۔ میں کیا اپنی جان بچانے کو یہ ڈرامہ کھیل رہا تھا؟ سوال اس وقت منگو کی جان کا نہیں بلکہ اسلام کی آن کا ہے۔ سکھ کہتے ہیں وہ مسلمانوں کی لاشوں سے اسلام کی چتا سجائیں گے۔ اگر ایک مسلمان بھی ان کو مل گیا تو وہ یہ سمجھیں گے کہ اس سے انہوں نے اسلام کے سینے میں سوراخ کر دیا ہے اور میں یہ کبھی برداشت نہیں کرسکتا کہ وہ لوگ اسلام کو اتنا کمزور سمجھیں کہ اس سے کھیل سکیں۔ منگو اس وقت جائے گا جب سب مسلمان یہاں سے چلے جائیں گے۔"

دروازہ کھول کر منگو باہر جھکے گا تو مڑ کر دبی آواز میں بولا "مجھے ابھی اور بھی کام کرنے ہیں۔ آپ سب گھروں میں کہلا دیں کہ وہ اندھیرا پڑنے پر ایک ایک کر کے آئیں اور آپ کی کوٹھی میں چھپ جائیں۔ ان کو یہاں سے نکالنا آپ کا کام ہے۔"

شام کے وقت قریشی صاحب کی کوٹھی میں ہو کا عالم تھا۔ تاریکی چھانے پر ایسا لگتا تھا جیسے قبرستان ہو۔ آہستہ آہستہ کیلوں کی طرح چلتے ہوئے لوگ ایک ایک کر کے دبے پاؤں آنے لگے اور خوفزدہ سے ایک دوسرے کے سامنے ہی ہٹ کر بیٹھنے لگے۔ مصیبت کے وقت انسان فطرتاً تنہائی پسند ہو جاتا ہے اس لیے کوئی کسی سے نہ بولا۔

عشاء کے وقت منگو تیزی سے کوٹھی میں داخل ہوا اور قریشی صاحب کو ایک طرف لے جا کر بولا:

"غضب ہو گیا قریشی جی! ابھی ابھی دیکھ کر آیا ہوں، شہر سے باہر جانے والی سڑک پر ٹرکوں اور سکھوں کا پہرہ ہے۔"

سب کے چہرے خزاں زدہ پتوں کی طرح مرجھا گئے۔ سرجوڑ کر مشورے ہونے لگے۔ سرگوشیوں میں بحث ہوئی۔ سب اپنی اپنی نشستوں سے

رہے تھے لیکن کوئی بس نظر نہ آتا تھا۔ پچھلے [illegible] حیثیت
چالیس گھنٹے اندر لوگوں کی بسادی کی گئی ہے جس کے [illegible] گروہ سے کی بغیر [illegible]
اعلیٰ کا اسسٹنٹ سر جھکائے تھا۔ کافی دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے جیب
سے شراب کی بوتل نکالی اور غٹاغٹ چڑھا گیا۔ چند لمحوں منہ پونچھ کر
اٹھا اور واٹلی توڑتا ہوا بولا۔

"قریشی جی! یہ آپ کے لیے کام لگتا نہیں سب اپنا پروگرام
جاری رکھیں سڑک صاف کرنے کا میں ذمہ لیتا ہوں۔ آپ یہاں ٹرک
میں بیٹھ کر انتظار کریں اور ٹھیک ایک بجے یہاں سے چل دیں خواہ یہاں
حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں۔ راستہ اللہ نے چاہا تو آپ کو صاف ملے
گا کہیں رکے بغیر شہر سے نکل جائیں میں ذمہ لیتا ہوں کہ کوئی آپ کا پیچھا
نہیں کرے گا۔ شہر سے نکل کر پٹرول پمپ سے ایک میل آگے چھپر کے
پاس میرا انتظار کریں۔ اگر میں دو بجے تک پہنچ گیا تو بہتر ورنہ آپ چل دیں
لیکن ایک بجے سے پہلے یہاں سے ہرگز نہ چلیں۔"

سب نے مشکوک نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا لیکن
منگو کی آواز میں اعتماد تھا۔ اور کوئی دوسرا حل نہ تھا اس لیے اس سکیم پر
فیصلہ ہو گیا۔ منگو نے اپنے ایک لڑکے ایک دوست کو بلایا اور کونے
میں لے جا کر سرگوشیوں میں مشورے کرنے لگا۔ پھر دونوں اندھیرے میں
غائب ہو گئے۔

رات کے بارہ بج چکے تھے۔ منگو کو گئے ڈیڑھ گھنٹہ گزر چکا
تھا۔ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں تارے اداسی بکھیر رہے تھے۔ سب سناٹے
میں دل دھک دھک کر رہے تھے۔ موت و حیات میں الجھی ہوئی بے کل
نظریں اور الجھتیں، ہونٹ کپکپاتے، ٹانگیں لرزتیں اور ہر لمحہ اعصاب
میں نیا تناؤ پیدا کرتا۔ ساڑھے بارہ بجے یاس کی لکیریں دھڑکتے دل
سے رینگ رینگ کر ٹرک میں چڑھیں اور پھر سکوت چھا گیا۔

قریشی صاحب بار بار گھڑی دیکھ رہے تھے۔ ہر سیکنڈ اذیت
سے بھرپور تھا۔ ایک بجنے میں پندرہ منٹ باقی تھے۔ سناٹا گہرا ہو گیا
تھا۔ دبے دبے سانس ہر لمحہ تیز ہو رہے تھے۔ لوگ اکثر انسانی پنڈلیوں
میں آرے سے چل رہے تھے۔

یکلخت سناٹا چیخ اٹھا۔ بندوقوں کے دھماکوں سے فضا گونج
گئی۔ عورتیں اور بچے ایک دم چونکے لیکن مردوں نے ان کا منہ بند کر
دیا۔ پہلے لوگوں نے سمجھا کہ جتھے نے حملہ کر دیا ہے اس لیے سب
دبک گئے لیکن بندوقوں کی آوازیں فاصلے سے آ رہی تھیں۔ عورتوں کے منہ
بھینچ کر [illegible] کسی نے کہا [illegible] کوئی [illegible]



مورچے کی حفاظت

کسی منچلے کا حکم دینا چاہیے کسی نے کہا ٹھہرو چاہیے۔ کچھ وقفے سے شور و
غوغا، چیخوں اور بندوقوں کے چلنے کی آوازیں مسلسل آ رہی تھیں۔
تھوڑی دیر بعد سفید سفید دھوئیں کی زبانیں تاریک فضا میں اٹھنے لگیں
اور پھر ہلکی ہلکی سی روشنی اس دھوئیں کی بنیادوں کو روشن کرنے لگی۔
پھر لمبے لمبے شعلے بن گئے۔

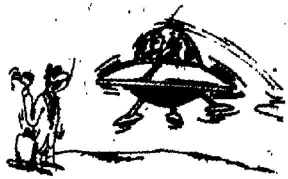
"ہندوؤں کے بازار میں آگ لگ گئی۔" خیر دین خوشی سے کھلتی
ہوئی آواز میں بولا۔

"منگو کا کام ہے۔" قریشی صاحب بولے۔

"بلوہ دینے والے ہندو یقیناً ادھر بھاگ گئے ہوں گے" کسی
نے کہا۔

ایک بج رہا تھا فضا میں شور اٹھ رہا تھا۔ گولیاں ابھی تک چل
رہی تھیں۔ آہستگی سے ٹرک تو یکدم روانہ ہو گئے۔ شہر کا راستہ صاف تھا
باہر نکل کر قریشی صاحب نے ٹرک کو روانہ کر دیا۔ پیچھے تعاقب کرنے والا
کوئی نہ تھا۔ اس لیے قریشی صاحب چھپر کے قریب ٹرک روک کر منگو کا
انتظار کرنے لگے۔

پونے دو کا وقت تھا گولیوں کی آوازیں اب کافی دور تھیں۔
لیکن ہر آواز کے ساتھ ان کے دل دہل جاتے۔ پراسرار تاریکی میں ہر
درخت پر ان کو سکھوں کے جتھے کا گمان ہوتا۔ قریشی صاحب
سٹیئرنگ پر ہاتھ رکھے تشویش سے کانپ رہے تھے۔ ان کی نظریں
بار بار گھڑی دیکھتیں اور پھر سڑک پر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر منگو کا
سراغ لگاتیں۔ کار کا انجن چل رہا تھا۔ دو بجنے میں دس منٹ
باقی تھے۔



تھوڑی دیر بعد منگو گولی کی سی تیزی سے درختوں کے جھنڈ سے نکل کر کار کی طرف لپکا۔ اس نے ایک لنگوٹ باندھا ہوا تھا اور کالے جسم پر تیل کی مالش کی تھی۔ دھونکنی کی طرح چلتا ہوا سانس اس کے منہ سے الفاظ چھین لیتا تھا۔

منگو کے بیٹھتے ہی کار تیزی سے روانہ ہو گئی۔

پسینے اور تیل میں شرابور منگو کے جسم پر چھوٹی بڑی بیسیوں خراشیں تھیں۔ دائیں بازو میں گولی لگنے سے خون ٹپاٹپ نکل رہا تھا۔ اس کے گرد اس نے کپڑا لپیٹا اور جب سانس قدرے درست ہوا تو اس نے بتایا کہ وہ اور اس کا ساتھی زمین دار کے بدلے کے راستے ہندوؤں کے بازار میں گھس گئے اور بھاگتے ہوئے منگو کانوں پر تیل چھڑکتا جاتا تھا اور اس کا ساتھی آگ لگاتا جاتا تھا۔ ہندوؤں نے گولیوں کی بارش کی اور اس کا ساتھی مارا گیا لیکن منگو بچ گیا۔

کہانی ختم کرنے کے بعد منگو نے زور سے انگڑائی لی اور گرگرایا۔

"سرکار! آج بڑے بڑے تو آگ میں بھون کر رکھ دیئے"

پھر کسی پر جما ہوا خون کھرچتے ہوئے بولا:

"کیوں جی، کوئی آدمی رہ تو نہیں گیا؟"

"نہیں بھئی سب آگئے" قریشی صاحب نے رفتار تیز کرتے ہوئے کہا۔ لیکن پیچھے سے ان کی چھ سالہ بچی بول پڑی:

"رحمت درزی!"

اور قریشی صاحب کو مجبوراً بتانا پڑا کہ انہوں نے آدمی تو بھیجا تھا لیکن رحمت درزی لٹنے میں چور تھا۔ گھر کے سب دروازے بند تھے اور وہ کسی کی بات نہ سنتا تھا۔ انہوں نے

سا ہے حالانکہ پہلے بہانہ طے کر لیا۔ دراصل قریشی صاحب نے کی طرف کوئی آدمی بھیجا ہی نہ تھا کیونکہ وہ اس سے سخت نفرت کرتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ وہ بہت عیاش اور آوارہ قسم کا تھا کہ وہ اپنی بیوی سے پیشہ کرواتا ہے۔ وہ نہیں چاہتے تھے ایسے لوگ پاکستان میں آئیں۔

"گاڑی روکو!" وہ ایک دم چلایا۔ گاڑی ذرا پیچھے چلو!

"کیا ہوا منگو؟"

"ہمیں ان کو بچانا ہوگا!"

"منگو پاگل نہ بنو! ہندو سکھ اب بیدار ہیں۔ اور ایک آوارہ آدمی اور اس کی فاحشہ بیوی کے لیے اپنی جان کو خطرے میں نہ ڈالو" قریشی صاحب نے سمجھایا۔

"اپنی جان کی ...." منگو نے گالی دی۔ "وہ فاحشہ ہے تو کیا ہوا قریشی جی، اللہ اور رسول کا نام تو لیتی ہے۔ ہندو سکھ تو اسے مسلمان سمجھ کر مار دیں گے اور کہیں گے کہ ہم نے اسلام کی ہتک کی ہے۔" قریشی صاحب چپ تھے۔

"دیکھیے قریشی جی، آپ گاڑی شہر سے باہر روکیے۔ میں بدلے کے راستے انہیں نکال لاؤں گا۔" گاڑی چلتی رہی۔

"گاڑی روکو!" منگو اتنے زور سے چلایا کہ قریشی صاحب کا ہاتھ سٹیئرنگ پر کانپ گیا۔ انہوں نے منگو کو ایک دفعہ پھر سمجھانے کی کوشش کی لیکن جب وہ سٹیئرنگ پر جھپٹا تو انہوں نے مجبوراً بریک لگا دی اور منگو دروازہ کھول کر باہر لپکا۔

"ٹھیرو منگو کہاں جاتے ہو؟" انہوں نے منگو کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا لیکن اس نے اس زور سے جھٹکا دیا کہ اس کا چکنا چپڑا جسم قریشی صاحب کے ہاتھ سے پھسل گیا اور منگو لڑکھڑا کر باہر جا گرا۔۔۔

"منگو! منگو!" وہ باہر نکل آئے۔

سیدھی سڑک کی گرد ہوتی لمبائی پر شہر جانے والی سمت میں ایک دھبہ تیزی سے اندھیرے میں تحلیل ہو رہا تھا۔ قریشی صاحب نے چند لمحے سوچا۔ پھر کار میں بیٹھے اور پاؤں دباتے ہوئے ان کے منہ سے نکلا "پاگل!" اور پھر شہر سے مخالف سمت میں انہوں نے کار پوری رفتار پر چھوڑ دی۔

ریاض مرزا



تکلف برطرف

قارئین دوشیزہ کی فرمائش پر زیرِ نظر شمارے سے "تکلف برطرف" کے عنوان سے ایک نئے سلسلے کا آغاز کیا جا رہا ہے۔ اس بار یہ صفحات ان خطوط سے ترتیب دیے جا رہے ہیں جو عرصے سے دوشیزہ کی عدالت میں موصول ہوتے رہے ہیں۔ آئندہ آپ اس عنوان کے تحت علمی، ادبی، سیاسی، معاشرتی اور ثقافتی نوعیت کے سوالات الگ بھیج سکتے ہیں۔ سوالات بھیجتے وقت تین باتوں کا خیال رکھیں۔
(۱) زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیجے جائیں جن میں سے منتخب سوالوں کا جواب شائع کیا جائے گا۔
(۲) سوالات دلچسپ، مختصر اور خوش خط لکھے ہوئے ہوں۔ (۳) تہذیب و اخلاق سے گرے ہوئے سوالات نہ بھیجے جائیں۔ (ادارہ)

محمد انور، حیدرآباد

س: محبت کا پہلا مدرسہ؟

ج: ماں کی گود۔

س: میک اپ کی تعریف؟

ج: بدصورتی کا اعتراف۔

ظفر مسعود، کراچی

س: کیا آپ لڑکی کو کشتی کا چیلنج دے سکتے ہیں؟

ج: کیوں نہیں۔ مگر پہلے اسے آمادہ تو کریں۔

س: کیا آپ بھی آرٹ کی دنیا میں کھوئے رہتے ہیں؟

ج: جی ہاں! مگر اتنے بھی نہیں جتنے وہ مصور صاحب کھوئے رہتے تھے جنہیں ہوسٹل میں کمرہ دیا گیا تو چند روز بعد انہوں نے کہا کہ مجھے قدِ آدم آئینے کی ضرورت ہے۔ چھوٹا آئینہ میرے لیے کافی نہیں کیونکہ میں تین بار پتلون کے بغیر کالج جا چکا ہوں۔

نزہت فردوس، لاہور

س: عورت کی آخری خواہش کیا ہوتی ہے؟

ج: عورت کی کوئی خواہش "آخری" نہیں ہوتی۔

س: میاں بیوی کے رشتے کی مضبوط بنیاد؟

ج: ہر ماہ کی "پہلی" تنخواہ۔

اظہر الحق، پشاور

س: آج کل عورتیں کیسے مرد پسند کرتی ہیں؟

ج: جو گھر کی دیکھ بھال اور اچھا کھانا پکانے کا سلیقہ رکھتے ہوں۔ ایک شوہر نے اپنی نئی بیاہتا بیوی سے کہا اب تو آپ ہمیں عمدہ عمدہ کھانے کھلائیں گی۔ بیوی نے جواب دیا، کیا آپ اچھے کھانے پکانا جانتے ہیں؟

س: اور مرد کیسی عورتیں پسند کرتے ہیں؟

ج: جو ان کی محبت پر فوراً یقین کر لیں۔

سراج الدین، سرگودھا

س: میری وہ مجھ سے محبت تو کرتی ہیں۔ مگر زبان سے اعتراف نہیں کرتیں۔ کیا کروں؟

ج: تعجب ہے آپ کو ایک حقیقت کا اعتراف کرانے کا طریقہ بھی یاد نہیں۔ سنئے ایک بار ایک انسپکٹر کی گھڑی گم ہو گئی اس نے تھانے میں رپورٹ درج کرا دی۔ پولیس نے بہت سے آدمی پکڑ کر تفتیش شروع کر دی۔ دوسرے دن انسپکٹر نے تھانیدار کو اطلاع دی کہ گھڑی گھر سے مل گئی ہے، لہٰذا رپورٹ خارج کر دو۔ تھانیدار نے جواب دیا کہ رپورٹ اب کس طرح خارج کی جا سکتی ہے۔ آٹھ آدمی گھڑی چوری کر کے

۔ موت آ جاتی ہے۔

ریاض الحسن خان ۔ راولپنڈی

س: حسن کیا ہے؟
ج: میک اپ کا کمال۔
س: زندگی محض ایک فریب ہے۔
ج: لیکن بڑا انمول بڑا دلکش۔

شہیستہ ناز ۔ کراچی

س: کیا محبت کرنا جرم ہے؟
ج: محبت کرنا جرم نہیں، اب تو محبت نبھانا جرم ہے۔
س: غموں کا علاج؟
ج: علاج: موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

بشیر احمد ۔ جھنگ

س: کیا لیڈر بننے کے لیے امیر ہونا ضروری ہے؟
ج: جی نہیں! امیر بننے کے لیے لیڈر ہونا ضروری ہے۔
س: کیا یہ صرف بیوفائی کا زمانہ ہے؟
ج: صرف بیوفائی کا نہیں مہنگائی کا بھی۔

محمد اختر ۔ کوہاٹ

س: ہم تو اس کے قائل ہیں کہ انسان ہمیشہ نیت اچھی رکھے۔
ج: جی ہاں! قانون بھی نیت کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ کسی عدالت میں ایک مقدمہ کی سماعت کے دوران جج نے ملزم سے کہا کہ تم نے اپنے شوہر کے سر پر کرسی دے ماری اور وہ ٹوٹ گئی۔ ملزمہ نے جواب دیا کہ میرا ارادہ یہ نہیں تھا۔ جج نے وضاحت طلب کرتے ہوئے کہا یعنی تمہاری نیت حملہ کرنے کی نہ تھی؟ ملزمہ نے جواب دیا، جی نہیں میری نیت کرسی توڑنے کی نہ تھی۔
س: بے چارہ پروانہ کیوں شمع پر جان نثار کرتا ہے؟
ج: شمع بھی تو پگھل پگھل کر جان دے دیتی ہے۔

اقبال شاہد ۔ میرپور خاص

س: لوگ موت سے کیوں ڈرتے ہیں؟
ج: اس لیے کہ موت رشوت نہیں لیتی۔
س: آجکل لڑکیاں خوبصورت کتابیں سینے سے لگا کر باہر کیوں نکلتی ہیں؟
ج: "اچھے" لڑکوں کو متوجہ کرنے کے لیے۔

محمد ناصر پہلوان ۔ نکر ایکن

س: میری عمر سات سال کی ہے اور میری منگیتر چھ سال کے ہیں۔ اب ہم شادی کرنا چاہتے ہیں۔
ج: جہاں اتنا صبر کیا ہے، کچھ دن اور ملک الموت کا انتظار کیجیے۔
س: ہم دونوں میں بہت پیار ہے۔
ج: پھر تو یہ بھی کی پردہ داری ہے۔

احمد علی شیرازی ۔ جہلم

س: کیا باہمی ہمدردی اور تعاون سے واقعی ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے؟
ج: جی ہاں! ایک فقیر دو ٹوپیاں پہنے سڑک کے کنارے بھیک مانگ رہا تھا۔ ایک شریف آدمی نے اسے کچھ پیسے دیئے اور پوچھا کہ بھائی تم ایک کے بجائے دو دو ٹوپیاں کیوں لیے بیٹھے ہو۔ فقیر نے بڑی متانت سے جواب دیا کہ سر! دوسری ٹوپی میری نہیں میرے دوست کی ہے۔ اس آدمی نے کہا کہ وہ خود کہاں ہے؟ فقیر نے بتایا کہ وہ نئی فلم کا ایوننگ شو دیکھنے گیا ہے۔ میں بھی جب دوسرا شو دیکھنے جاؤں گا تو وہ میری جگہ بیٹھے گا۔ تعاون ہو تو ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔
س: چپکے سے ایک بات بتائیں۔ کیا شادی شدہ عورت سے محبت کی جا سکتی ہے؟
ج: کان ادھر لائیں۔ کی جا سکتی ہے بشرطیکہ وہ آپ کی بیوی ہو۔

غزالہ پروین ۔ گجرات

س: لوگ کہتے ہیں کہ جب لڑکی جوان ہوتی ہے تو ماں باپ کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔ میں پوچھتی ہوں کہ جب لڑکا جوان ہوتا ہے تو؟
ج: تو پڑوسیوں کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔
س: دنیا میں برائیاں کرنے والے آخر یہ کیوں نہیں سوچتے کہ انھیں ایک دن مرنا ہے۔
ج: سوچتے ہیں۔ تبھی تو کوئی برائی موت کے بعد کے لیے اٹھا کر نہیں رکھتے۔

رفیق شامی ۔ گوجرانوالہ

س: اس بے چاری کا ایک دل ہے اور قبضہ جمانے کی تگ میں درجنوں ہیں۔
ج: الاٹمنٹ آرڈر کس کے نام ہے؟

آئیڈیل کی تلاش

ڈاکٹر مسیح خان

چشم التفات

مجھے اپنی بہن کے لیے کسی شریف خاندان کے نیک نوجوان کی تلاش ہے جو مضبوط کردار کا مالک ہو اور اپنے جیون ساتھی کی قدر کر سکے بر سر روزگار ہو۔ میری بہن سانولے رنگ کی قبول صورت دوشیزہ ہے۔ تعلیم انٹر اور عمر ۲۱ سال ہے۔ انتہائی پرخلوص اور نازک جذبات کی مالک ہے اگر لڑکے کے والدین رابطہ قائم کریں تو بہتر ہے۔

مسز خان۔ کراچی

زلفوں کا دھواں

میرا آئیڈیل ایک باوقار سانولا سلونا اسمارٹ نوجوان ہے جو خوش اخلاق اور اچھے کردار کا مالک ہو میں متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ سانولا رنگ، عام سے نقوش اور قبول صورت ہوں، ایسے ساتھی کی تلاش میں ہوں جسے دنیا نے ٹھکرا دیا ہو۔ میں اس کے دکھوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لوں گی۔ شاہدہ، لاہور

دیدۂ گلچیں

میری کزن کا آئیڈیل کوئی تصوراتی محبوب یا فلمی ہیرو نہیں، بلکہ ۳۰-۳۲ سال کا سنجیدہ، باوقار نوجوان ہے۔ مناسب شکل و صورت گندمی یا سانولا رنگ، درمیانی قد، صحت مند ہو، وہ پاکستان نیوی کا کوئی جوان ہو یا کوئی انجینئر۔ خوش مزاج، خوش لباس اور خوش گفتار ہو میری کزن [illegible] اس کے معیار کا نوجوان مل سکے۔ وہ خود ۲۲ سالہ سنجیدہ، باوقار، اسمارٹ اور ذہین لڑکی ہے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ، اعلیٰ ذوق کی مالک اور بے حد سمجھدار ہے۔ رنگ گندمی، مناسب ناک نقشہ اور حسن سیرت بے مثال ہے۔

شاہدہ حسن۔ کراچی

سپنوں کی کلی

میرا آئیڈیل خوبرو، مسلم، ڈاکٹر، کیپٹن یا انجینئر ہے۔ روشن خیال اور با اعتماد ہو۔ کراچی میں رہائش ہو تو بہتر ہے۔ میرا تعلق ایک معزز خاندان سے ہے۔ تعلیم میٹرک ہے۔ مگر ہر ماحول میں ڈھل جانے والی قبول صورت اور نہایت حساس لڑکی ہوں۔ میں اپنے آئیڈیل کی بے چینی سے منتظر ہوں۔

"یاسمین شیخ۔ کراچی"

رستے منتظر

میرا آئیڈیل شریف، ثابت قدم، خوش مزاج، خوش اخلاق، اسلام پسند صورت والا انسان ہے جو تعلیم یافتہ، اسمارٹ اور اچھے عہدے پر فائز ہو۔ عمر ۲۵ - ۲۸ کے درمیان ہو۔ میری تعلیم انٹر ہے۔ بڑی بڑی آنکھیں، کھلتا ہوا رنگ، لمبے بال اور پرکشش چہرہ ہے۔ متوسط اور اچھے خاندان سے تعلق ہے۔ میں ایک گھریلو لڑکی ہوں۔ میری عمر ۲۰ سال ہے۔

"ر، پ، سعدیہ۔ کراچی"

پلکوں کی آس

میرے خوابوں کا شہزادہ اسمارٹ، صحت مند، خوش شکل،

اور خوش مزاج، اچھے حسب نسب کا، تعلیم یافتہ نوجوان ہو جس کی عمر ۲۲ سال ہے۔ سابق مشرقی پاکستان سے بنگالیوں کے نہایت ظلم سہے ہیں۔ میں اپنے جیون ساتھی کی تلاش میں ہوں۔ کاش کوئی باہمت بلند حوصلہ نوجوان آگے بڑھ کر میرے دکھ بانٹ لے۔

"مضطرب، کراچی"

زلفوں کی اوس

میری چھوٹی بہن جس کی عمر ۱۶ سال ہے۔ خوبصورت گداز جسم، سانولا رنگ، امور خانہ داری میں ماہر ہے وہ صوم و صلوٰۃ کی پابند میٹرک میں پڑھتی ہے۔ اس کے لیے مناسب عمر کے تعلیم یافتہ اور خوش اخلاق نوجوان کا رشتہ مطلوب ہے۔ لڑکے کی آمدنی معقول ہو ذاتی مکان ہو، صوم و صلوٰۃ کا پابند اور پٹھان ہو تو لازمی ہے۔ بیرون ملک میں رہنے والے بھی لکھ سکتے ہیں۔ "م ج، ا۔ پشاور"

شبنم کی آنچ

مجھے ایسے آئیڈیل کی تلاش ہے جو دراز قد، مضبوط جسم، سلیقہ مند اور خوش مزاج، نیلی آنکھیں ہوں، اس کی عمر ۲۸-۳۰ سال سے زیادہ نہ ہو۔ اگر پائلٹ یا انجینئر ہو تو بہت خوش قسمتی ہے۔ لیکن ہر صورت میں کم از کم اعلیٰ تعلیم یافتہ یا بزنس مین ہو تب بھی ٹھیک ہے۔ میں بی اے فائنل کی طالبہ ہوں۔ خوبصورت آنکھیں، سبز سا رنگ اور شوخ و شریر ہوں۔ اگر مجھے میرا آئیڈیل مل جائے تو دن رات پوجا کروں گی۔ "مس ک، غ، لاہور"

آشا کے دیپ

میرا آئیڈیل تعلیم یافتہ، خوش شکل اور خوش اخلاق نوجوان ہے۔ جس کی عمر ۳۰ سال سے کم ہو۔ معقول آمدنی، اچھی شکل و صورت اور ملازمت ہو۔ کسی مغربی ملک میں رہتا ہو۔ میں میٹرک پاس، خوش شکل، صاف رنگ اور پرکشش آنکھوں والی اسمارٹ لڑکی ہوں۔ سولہ سال کی فیشن ایبل اسمارٹ لڑکی اپنے آئیڈیل کو زندگی بھر شکایت کا موقع نہ دے گی۔ "ناہید قریشی، کراچی"

پریم کی پیاسی

میری بہن جو بے حد حساس ہے اسے بچپن میں ماں باپ کا پیار ملا لیکن بعد میں باپ نے نظریں پھیر لیں تو اس کی جگہ بھائی نے لی۔ لیکن شادی کے بعد اس کی محبت بھی نفرت میں بدل گئی۔ اس سے بہن کے نازک دل پر چوٹ لگی۔ اور وہ تمام مردوں سے نفرت کرنے لگی۔ میں چاہتی ہوں کہ کوئی مخلص انسان میری بہن کا ہاتھ تھام سے اور اس کو اتنا پیار دے سکے کہ اس کی نفرت محبت میں بدل جائے۔ میری بہن کی تعلیم بی اے ہے۔ عمر تقریباً ۲۲ سال، دبلی پتلی، دراز قد اور خوبصورت حسین زلفوں کی مالک ہے۔ لڑکے کی عمر ۳۰ سال سے کم نہ ہو۔ ڈاکٹر ہو تو بہت ہی اچھا ہے۔

"الف بخاری، ڈیرہ غازی خان"

الفت کی دیوانگی

مجھے ایسے ساتھی کی تلاش ہے جو میرے دل کی پکار سن سکے اور میری پیاسی روح کو محبت اور خلوص سے سیراب کرے۔ میرا رنگ گورا، جسم سڈول، نظر، ایم اے سی اور امور خانہ داری میں ماہر۔ امید ہے مجھے میرا جیون ساتھی ضرور ملے گا۔ "سیدہ ن، ر، کراچی"

گلاب کا شکوہ

میں بہت غریب لڑکی ہوں۔ دنیا میں سوائے ماں کے کوئی نہیں۔ میٹرک کر چکی ہوں۔ مجھے دولت سے محبت ہے نہ کار کوٹھی سے بس اتنا کافی ہے کہ زندگی کی آسائشیں چاہتی ہوں۔ میرا رنگ گندمی، متناسب جسم اور پرکشش شخصیت ہے۔ میرا آئیڈیل دراز قد اسمارٹ گندمی رنگت کا لڑکا جوان ہے۔ کاش میرا ساتھی مجھے بھی میری خوشیاں لوٹا سکے۔ "طاہرہ حبیب، پشاور"

پھول سی بانہیں

مجھے ایسے جیون ساتھی کی تلاش ہے جو قبول صورت اسمارٹ اور مخلص ہو۔ میں عام لڑکیوں سے مختلف ہوں اور چاہتی ہوں کہ میرا جیون ساتھی بھی عام لڑکوں سے ہٹ کر ہو۔ اسے پیار اور خلوص کی دولت سے مالا مال کر دوں گی۔ "شہناز چوہدری، [illegible]"

شوق کی پرورش

میری عمر تقریباً ۲۰ سال، صاف رنگ، تعلیم بی اے، صوم و صلوٰۃ کی پابند ہوں۔ میرا آئیڈیل ایک ایسا انسان ہے جو کسی دارالعلوم سے فارغ التحصیل ہونے کے ساتھ ساتھ گریجویٹ بھی ہو۔ مسجد کا پیش امام ہو تو بہتر ہے۔ شگفتہ مزاج اور جہیز کا لالچی نہ ہو۔ سیر و تفریح اور اشعار کی بجائے مطالعے کا شوق رکھتا ہو۔ "فرزانہ صدیقی، کراچی"

چلتا پھرتا چاند

میری بہن کی عمر ۱۸ سال ہے۔ اسی سال میٹرک کیا ہے۔ سلائی کڑھائی اور امور خانہ داری میں ماہر ہے۔ سانولا رنگ، سیدھی سادی، اچھے اخلاق اور چھریرے بدن کی مالک ہے۔ ایسے لڑکے کی تلاش ہے جو میری بہن کو خوش رکھ سکے۔ ذات شریف ہو۔ "مس رحمت، لاہور"

گلشن کی بہار

میری بیٹی جس کی عمر ۲۲ سال ہے تعلیم یافتہ، گوری رنگت والی خوب صورت، خوش شکل کی مالک ہے۔ سلیقہ شعار اور امورِ خانہ داری سے بخوبی واقف ہے۔ دعا ہے کہ آئیڈیل کی [illegible] پر خلوص اور باوفا ہو، کسی اچھے عہدے پر فائز ہو یا [illegible] اچھا ہے۔ اگر مجھے اچھا داماد [illegible] تو ایک بہت بڑی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاؤں گی۔

"مسز رحمان، سیالکوٹ"

چشمۂ شیریں

میرا آئیڈیل ایک شریف، مخلص، اسمارٹ اور خوش مزاج نوجوان ہے [illegible] کا شائق ہو [illegible] عمر ۲۵ — ۳۰ کے درمیان ہو۔ میری عمر ۱۸ سال ہے۔ متوسط طبقے سے تعلق ہے۔ [illegible] دلکش نقوش ہیں [illegible] آنکھیں [illegible] سائنس کی طالبہ ہوں اور ڈاکٹر بننا چاہتی ہوں۔ اگر مجھے میرا آئیڈیل مل جائے تو ساری زندگی اس کی خدمت کر کے گزار دوں گی۔

"فائزہ رعنا، کراچی"

کرن کرن چاندنی

میری بہن کی عمر ۲۰ سال اور تعلیم میٹرک ہے۔ گورا رنگ، بڑی بڑی پرکشش آنکھیں، جاذبِ نظر چہرہ، متناسب جسم، امورِ خانہ داری میں ماہر، معزز کشمیری گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ لڑکا ڈاکٹر، انجینئر یا ذاتی وسیع کاروبار کا مالک ہو۔ بیرونِ ملک حضرات زحمت نہ کریں۔

مسز چوہدری، سیالکوٹ

حسن کی لغزش

میں میٹرک میں تھی کہ ایک ایسے حادثے کا شکار ہو گئی جس کے بعد [illegible] لڑکیاں دلکشی کو ترجیح دیتی ہیں۔ جیسے تیسے بی اے کیا اور اب اس انتظار میں ہوں کہ کوئی میری اس لغزش کو نظر انداز کرتے ہوئے مجھے اپنانے پر آمادہ ہو جائے۔ میں ساری زندگی اس شخص کے پیر دھو دھو کر پیوں گی۔

"ثنا، لاہور"

حکایتِ دل

میری بھتیجی کا آئیڈیل تعلیم یافتہ، مہذب، ہنس مکھ، سمجھدار شخص ہے۔ اس کی اپنی تعلیم [illegible] ہے اور ایک اسکول کی ہیڈ مسٹریس ہے۔ عمر ۳۲ سال، جاذبِ نظر چہرہ اور [illegible] آئیڈیل [illegible] تو بہتر ہے [illegible] کسی [illegible]

[illegible] سے قبول صورت [illegible] کی تلاش تھی۔

"[illegible]"

لطافتِ حسن

میں ایک متوسط گھرانے کی قبول صورت، خوش مزاج، ہنس مکھ لڑکی ہوں۔ [illegible] عمر ۲۰ سال، متناسب قد، گندمی رنگت [illegible] ہوں۔ میرا آئیڈیل [illegible] اخلاق اچھے ہوں، صورت کا اسمارٹ ہو [illegible] زندگی میں کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔

"[illegible]، لاہور"

دمکتا ہوا مہتاب

میرا نام [illegible] گھرانے کا تعلیم یافتہ، سیر و تفریح کا شوقین، قبول صورت، دراز قد، [illegible] آزاد خیال نوجوان ہے جس کی عمر ۲۵ سال سے زیادہ نہ ہو۔ ایسا پرکشش آنکھوں والا [illegible] کوٹ کوٹ کر بھری ہو۔ میں ایک متوسط گھرانے کی ۱۸ سالہ نازک اندام، دراز قد، سفید رنگت کی اسمارٹ اور [illegible] دوشیزہ ہوں۔ بچپن سے خوشیوں کو ترستی رہی ہوں۔ کاش مجھے میرا آئیڈیل مل جائے۔

"ع، گل۔ راولپنڈی"

حسنِ معصوم

میں ایک شریف گھرانے کی ۱۹ سالہ دوشیزہ ہوں۔ گوری رنگت، اچھے نقوش کی مالک، ایک درد مند دل رکھتی ہوں۔ [illegible] طالبہ ہوں۔ میرا آئیڈیل قبول صورت، بی اے پاس، شریف النفس ہو۔ آمدنی کم از کم ۲۰۰۰ روپے ماہانہ ہو [illegible]۔

"نسیمہ نفیسہ، کراچی"

چندن کی خوشبو

میری ایک ۱۸ سالہ [illegible] تعلیم یافتہ، اچھی عادتوں والی پرکشش شخصیت کی مالک [illegible] آئیڈیل [illegible] عمر ۲۵ — ۲۲ سال کے درمیان ہو [illegible] اسمارٹ [illegible] کاش اس کے انتظار کی گھڑیاں ختم ہو جائیں۔

"ن، س۔ کراچی"

حیا کی کرن

میرا آئیڈیل ایک دراز قد، گورے رنگ کا تعلیم یافتہ [illegible] نوجوان ہے [illegible] رنگ، متناسب جسم کا قبول صورت [illegible]

دوشیزہ ہوں ابھی سے بچپنے ہے پہلے ہیں ... ہر طرح سے میری [illegible]
ایک مخلص جیون ساتھی کی تلاش ہے جو کامیاب ثابت ہو ہر قسم کی ذمہ داری اور حقوق
لینا پڑی۔ اگر کوئی دولت مند ہے اور چاہتا ہے تو اس کا دامن پیار کی دولت سے
بھر دوں گی۔ "نائیلہ آفتاب، کراچی"

امبر بہار

میں کھاتے پیتے گھرانے کی شریف اور نیک سیرت لڑکی ہوں۔
میں نے انٹر تک تعلیم حاصل کی ہے۔ عمر ۱۹ سال ہے۔ صاف رنگ اور اچھی
صورت کی مالک ہوں۔ پُرخلوص محبت کرنے والی جس [illegible] ہے پر ناز
اسمارٹ ... شریف انسان کو شریک سفر بنانا چاہتی ہوں۔ کاش
میری یہ خواہش پوری ہو جائے۔ "عافیہ مشتاق، کراچی"

ذوقِ بے تاب

میں تعلیم یافتہ، خوش شکل، اچھی سیرت کی ۱۸ سالہ خوش حال
دوشیزہ ہوں۔ سچائی اور خلوص سے پیار کرنے والا نوجوان میرا آئیڈیل ہے
بے چینی سے اپنے ہمسفر کی منتظر ہوں۔ "سلطانہ رفعت، کراچی"

س، ں کراچی کے نام!
مجھے بھی ساتھی کی تلاش ہے اگر آپ توجہ فرمائیں تو کامیاب
زندگی کی ضمانت دے سکتا ہوں۔
معراج الدین، پوسٹ بکس نمبر ۸۹، ابوظہبی (یو اے ای)

ایس ایس۔ لاڑکانہ کے نام!
میں آپ کے آئیڈیل کے عین مطابق ہوں۔
عنبر شہزاد معرفت مستری محمد ابراہیم
نزد جامع مسجد اہل حدیث۔ بالمقابل کوٹھی حاجی چراغ دین
ڈاک خانہ خاص گوجاکھ۔ گوجرانوالہ

عمر ۲۸ سال، آمدنی ۴ ہزار روپے ماہانہ، اسمارٹ اور آزاد خیال
ہوں۔ خالد ربانی۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۵۰۵۔ کویت

میں ہی آپ کا آئیڈیل ہوں۔ آپ کو خوش رکھنے کی پوری
کوشش کروں گا۔ مقبول شاہ
پوسٹ بکس نمبر ۶۰۷۲۔ جدہ۔ سعودی عرب

ف، الف۔ کراچی کے نام!
عمر ۲۷ سال اور تعلیم بی اے ہے۔ ائر فورس میں ملازم ہوں
کوشش ہی آپ کے انتخاب پر پورا اتروں۔
شمیم عباس۔ پوسٹ بکس نمبر ۵۹
بی اے ایبٹ۔ چکلالہ۔ راولپنڈی

آپ کے آئیڈیل کے مطابق ہوں۔ عمر ۲۶ سال، تنخواہ
تین ہزار روپے ماہانہ ہے۔
ایس ایم احمد۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۹۷۔ شارجہ

میں آپ کے معیار پر پورا اتروں گا۔
ایس ایچ ضیاء ۳۰۸۰۔ آرڈیننس کمپنی۔ پشاور چھاؤنی

میری شخصیت آپ کے آئیڈیل سے مطابقت رکھتی ہے
تعلیم ایف اے، گورنمنٹ ملازم، عمر ۲۴ سال ہے۔
سید سلطان طاہر۔ مکان نمبر ۶۵
گلی نمبر ۳۔ بلاک نمبر ۱۔ بھلوال۔ ضلع سرگودھا

بیگم عابدہ حمید، کراچی کے نام!
میں آپ کے معیار پر ہر طرح پورا اتروں گا۔
ایم اسلم ... معرفت رحمن الیکٹرانک، بلاک نمبر ۲، بھلوال

عمر ۲۸ سال، کویت میں ملازم ہوں۔ تنخواہ چار ہزار روپے
ماہوار ہے۔ ایم اقبال۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۰۹۱۔ کویت

آپ کے معیار پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔ تنخواہ ۳۰۰۰
روپیہ ماہانہ ہے۔
"حنیف احمد باجوہ"
[illegible] کمپنی۔ المیقات مدینہ۔ سعودی عرب

شاھین کوثر۔ کلاں کوٹ کے نام!
میں آپ کو اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا [illegible]
سید حسین شہزاد ۱/۲ گیپ سینٹر۔ ملیر، کراچی

عمر ۲۲ سال، تنخواہ چار ہزار روپے ماہانہ ہے۔ آپ کو زندگی
کی خوشیوں سے ہمکنار کر دوں گا۔ مرزا اکمل کاظمی
پوسٹ بکس نمبر ۱۲۸۰۱۔ ابوظہبی (یو اے ای)

آپ کو خوش رکھنے کی کوشش کروں گا۔ عمر ۲۶ سال، تنخواہ
۲۵۰۰/- روپے ماہانہ ہے۔ محمد عبداللہ مراد
پوسٹ بکس نمبر ۹۰۰ مسقط۔ عمان

ن۔ ب۔ پشاور کے نام!
آپ نے جو آئیڈیل ذہن میں تخلیق کیا ہے۔ میں اس کا جیتا جاگتا
ثبوت ہوں۔ آئم معرفت جان جلالد
پوسٹ مین ڈریسٹ کالج۔ پشاور

میں آپ کے آئیڈیل کے عین مطابق ہوں۔ عمر ۲۴ سال اور
تنخواہ ۱۵۰۰/- روپے ہے۔ ایم امیر
بشیر اسٹریٹ نمبر ۱، مکان نمبر ۱۔ وحدت کالونی مکرم آباد لاہور

آپ جیسے ہم سفر کی تلاش ہے۔
ایم کے خان۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۹۶۔ ابوظہبی

مسز شاہ۔ لاہور کے نام!
میں آپ کے خیالات کی قدر کرتا ہوں۔
محمد جاوید اقبال۔ ایس ای ٹی
گورنمنٹ ہائی اسکول۔ چک ۲۲۹ ر۔ب۔ فیصل آباد

آپ کی توقعات کے عین مطابق ہوں
ایم صدیق۔ مکان نمبر ۵۔ بلاک نمبر ۴۹
سیکٹر ۲ ڈی۔ لانڈھی نمبر ۶ کراچی

نگہت ساہیوال کے نام!
آپ کے آئیڈیل کے عین مطابق ہوں۔
علی احمد معرفت محمد انور سگریٹ فروش

[illegible]
[illegible]
آپ کے خیالات سے مطابقت رکھتا ہوں
کمال چاند، مقام [illegible] تحصیل [illegible] ضلع ساہیوال

آپ کی ہر صفت سے متاثر ہوا ہوں۔ عمر ۲۴ سال اور تنخواہ
چار ہزار روپے ہے۔ محمد اسلم رانا
پوسٹ بکس نمبر ۲۳۶۔ شارجہ (یو اے ای)

دبئی میں چھ ہزار روپے ماہانہ پر ملازم ہوں۔ اللہ کا دیا سب
کچھ ہے۔ صرف نیک اور غریب شریک سفر کی تلاش ہے۔
محمد منصب شاہ [illegible]۔ پوسٹ بکس نمبر ۴۴۴۴۔ دبئی

آپ کے خیالات میرے دل کی ترجمانی کرتے ہیں۔
شوکت حسین بٹ، پوسٹ بکس نمبر ۱۰۹۱۔ شارجہ

آپ کے معیار پر پورا اتروں گا۔ مستقل تنخواہ ہے۔
منظور سلیم، پوسٹ بکس نمبر ۲۶۹۸۔ ریاض۔ سعودی عرب

زندگی میں پہلی بار کسی کو اپنانے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ مایوس نہ
کیجیے گا۔ محمد اشفاق ذیب عالمگیر
پوسٹ بکس نمبر ۲۲۶۔ ابوظہبی (یو اے ای)

کاروبار کرتی کا مالک ہوں۔ عمر ۲۴ سال ہے۔
شاہد آفتاب۔ شاہ نکڈر، ڈاکخانہ خاص، ضلع سرگودھا۔

میں لڑکا آپ کے خیالات کی تصویر سمجھتا ہوں۔ عمر ۲۲ سال
تعلیم بی اے بی ایس سی اور تنخواہ ۲۵۰۰/- روپے ہے۔
فقیر محمد جنجوعہ۔ البقالی
پوسٹ بکس نمبر ۲۹۷۔ جدہ۔ سعودی عرب

آپ کے معیار پر پورا اتروں گا۔ ذاتی کاروبار، آمدنی معقول
ہے۔ تعلیم میٹرک ہے۔

ایم مسعود ۔ ٹھیکیدار ٹریکٹر والا ۔ بستی پٹھولی بالا
مکان نمبر ۲۱ سرینا ارڈر ۔ تحصیل اوکاڑہ ضلع ساہیوال

تعلیم میٹرک اور تنخواہ ۔/۵۰۰۰ روپے ہے ۔
محمد حنیف ہاشمی ۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۰۰
ام القوین (یو ۔ اے ۔ ای)

آپ کے معیار پر پورا اتروں گا ۔ عمر ۲۵ سال ۔ تعلیم بی اے ۔
ماہانہ آمدنی ۔/۵۰۰۰ روپے ہے ۔
مرشد جیلانی ۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۷۶ ۔ دوبئی (یو ۔ اے ۔ ای)

آپ کے تصور کی ہو بہو تصویر ہوں ۔
حسرت معرفت شبیر احمد کمشنر تعمیرات عامہ
ترقیاتی ڈویژن ۔ میرپور (آزاد کشمیر)

عمر ۲۹ سال اور ماہانہ آمدنی ۔/۱۵۰۰ ریال ہے ۔
عبداللہ شمس ۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۴۴۲ جدہ ۔ سعودی عرب

نیلمان احسن بھاولپوری کے نام !
اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مشتعل ادارے میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہوں ،
آپ کو اپنا شریک زندگی بنانا چاہتا ہوں ۔
اے ۔ ایم اسلم ۔ صوفی منزل ۔ حکیم اسٹریٹ ۔ اچھرہ ، لاہور

مجھ جیسا ہی ایک ہم خیال اور معمولی شکل و صورت کا مالک
ہوں ۔ منور خان ۔ گلشن فلورمنڈی بازار ۔ ساہیوال

عمر ۲۵ سال ، آمدنی ۔/۱۵۰۰ روپے ماہانہ گریجویٹ ہوں آپ
کے معیار پر پورا اتروں گا ۔ ابن گیلانی
پوسٹ بکس نمبر ۳۰۹۹ ۔ ڈیرہ دوبئی (یو ۔ اے ۔ ای)

سعیدہ منائم خوری ۔ کراچی کے نام !
آپ کے معیار کے مطابق ہوں ۔ عمر ۲۶ سال ۔ تعلیم بی اے ، اور
تنخواہ ۔/۲۰۰۰ روپے ہے ۔ وحید شیخ
۹۴ مدنی فلیٹ ۔ پی ای سی ایچ ایس ۔ کراچی

آمدنی ۔/۲۰۰۰ روپے ماہانہ ہے ۔ آپ کی خواہش کے مطابق ۔
نہایت مہذب ، سادہ ، خوب صورت اور ...
نشانی ہیں ۔ ... اسلام آباد ...
میں ... گی ... ہوں گا ہی ۔
مشتاق احمد ۔ پوسٹ بکس نمبر ۸۳ ۔ کراچی

کے کیانی ۔ پشاور کے نام !
آپ کی خواہشات کے مطابق ہوں ۔
رشید بٹ ۳۲/۵ ۔ شاہ کمپاؤنڈ ۔ ایس آئی ٹی ای کراچی

شازیہ جلال کے نام !
دنیا کا ٹھکرایا ہوا انسان ہوں ۔ تعلیم میٹرک ، عمر ۲۱ سال ہے ۔
جاوید احمد ۔ الفتح فوٹو گرافر
بالمقابل گلی ، امر ٹیکسٹائل ملز ، ملیر ۔ کراچی ۳۲

میں آپ کے خیالات کے عین مطابق ہوں ۔ عمر ۲۴ سال ،
تعلیم بی اے ، تنخواہ ۔/۱۵۰۰ روپے ماہانہ ۔
ایس ۔ اے ۔ قیوم معرفت ندیم فوٹو اسٹوڈیو
بھٹ روڈ ۔ حیدرآباد

میں آپ کے معیار پر انشاء اللہ پورا اتروں گا ۔ عمر ۱۹ سال اور تعلیم
میٹرک ہے ۔ ملک عبدالستار نیشی
بمقام گھڈی ۔ پوسٹ آفس کندیاں ۔ ضلع میانوالی

اگر آپ نے ساتھ دیا تو زندگی بھر ایک جان دو قالب بن کر رہیں گے
ناظم عباس ۔ اسٹیٹ بینک آف پاکستان ۔ راولپنڈی

آپ کے معیار پر پورا اتروں گا ۔ آمدنی ۔/۱۶۰۰ روپے ماہانہ ۔
ڈسپنسر عبدالعزیز ملک معرفت ہسپتال امراض نسواں
۲۱ ۔ گلستان کالونی ۔ ملتان روڈ ۔ لاہور

پچھلے دو سال سے بہتر آئیڈیل کی تلاش میں ہوں ۔
صادق میاں معرفت ڈاکٹر اسلم ، ۹۹ ڈاکٹر گورنمنٹ ، اوکاڑہ

شاید آپ کے معیار پر پورا اتروں ۔ عمر ۲۴ سال ، گریجویٹ ،

سرکاری ملازم ہوں تنخواہ [illegible]
معرفت [illegible] نمبر [illegible]
اسٹیشن روڈ۔ سکھر

ایک بینک میں سینئر کیشیر ہوں۔ آپ کے آئیڈیل کے عین مطابق ہوں۔
محمد اشرف وحید
معرفت فاروق کریانہ اسٹور۔ پرانی آبادی
نزد جامع مسجد پنج بہاڑہ۔ راولپنڈی

الله کا دیا سب کچھ ہے بس آپ جیسے ساتھی کی کمی ہے۔
محمد یعقوب۔ لاک نمبر ۱۲۲۱۔ سی ایم سی سائٹ۔ دوبئی

آپ اگر موقع دیں تو آپ کی ہر خدمت پر آمادہ ہوں۔
محمد عزیز اللہ شاہ معرفت گل شیر
جریدۃ البلاد۔ جدہ۔ سعودی عرب

ہمراہی بن جانے سے پہلے اپنی تعریف کرنا نہیں چاہتا۔
شیخ ایم اسلم آزاد۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۶۲۳۔ ڈیرہ۔ دوبئی

آپ کے آئیڈیل کے عین مطابق ہوں۔
احمد دین اختر
پوسٹ بکس نمبر ۲۲۳۔ دہران ائیرپورٹ۔ سعودی عرب

باعزت و پُر وقار زندگی بسر کر رہا ہوں۔ آپ کے معیار پر پورا اتروں گا۔
محمد شاہد قریشی
پوسٹ بکس نمبر ۱۰۵۰۔ ڈیرہ۔ دوبئی

آپ کے خیالات کی قدر کرتا ہوں۔ تعلیم میٹرک، تنخواہ [illegible] روپے ماہانہ ہے۔
غلام علی کھوکھر
کمرشل پلاٹ ۱۵۲۔ نزد پریس چوک گلی نمبر [illegible]
شاہدرہ [illegible]
میں آپ کی تمام شرائط پر پورا اترتا ہوں۔

[illegible] پوسٹ بکس نمبر ۲۰۲
[illegible] (یو اے ای)

آپ نے جس آئیڈیل کا خاکہ پیش کیا ہے میں اس کے ہر زاویے پر پورا اترتا ہوں۔ خالد خان
موضع شیخاں کوہاٹ۔ تحصیل و ضلع ڈاکخانہ کوہاٹ

مجھے اپنے معیار کے مطابق پائیں گی۔
شاہد جمیل احمد [illegible] پوسٹ بکس نمبر ۸۵ [illegible]

آپ مجھے موقع دیں تو خدمت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھوں گا۔
آر ایم مجید۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۳۰۰۔ ابوظہبی (یو اے ای)

عمر ۲۲ سال، تعلیم بی اے ۷۰۰۰ روپے ماہانہ آمدنی صرف نیک ساتھی کی تلاش ہے۔
ایم حسین
P.O.BOX 1149 MATRAH OMAN

میں آپ کے آئیڈیل پر پورا اتروں گا
خالد سرفراز، پوسٹ بکس نمبر ۱۰۱۰۵ ام القیوین (یو اے ای)

آپ کا ہم سفر بننے کی صلاحیت رکھتا ہوں
کے آر ڈار۔ الیکٹریکل انجینئر۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۰۳۲۔ جدہ

مجھے بھی ایک نیک ہم سفر کی ضرورت ہے۔ تعلیم میٹرک، عمر ۳۲ سال اور تنخواہ ۲۵۰۰ روپے ماہانہ ہے۔
چوہدری محمد فاروق۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۰۸۸۔ دوبئی

ماہانہ آمدنی پانچ ہزار روپے ہے۔ خود غرض ساتھی نہیں چاہئے۔
عبدالحمید شاکر۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۳۹۰ راس الخیمہ (یو اے ای)

خود کو آپ کے معیار کے مطابق پاتا ہوں۔
محمد اعجاز۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۳۳۲۔ دوحہ، قطر

جیم اور بین اکونٹ لائن کے نام:
آپ مجھے اپنے آئیڈیل کے مطابق پائیں گی۔ تعلیم انٹر اور ماہوار آمدنی مبلغ ۳۵۰۰ روپے ہے۔
محمد دین پوسٹ بکس نمبر ۱۳۸۹۶ ... دوبئی

عمر ۱۹ سال، تعلیم میٹرک، آمدنی مبلغ ۲۵۰۰ روپے ماہانہ ہے۔
محمد ایوب خان۔ معرفت
CONDECO CO. P.O.BOX 4043 ABU-DHABI

میرا لڑکا سیڈیولی ڈی کا کام کرتا ہے۔ آمدنی آٹھ سو روپے ماہانہ ہے اگر مناسب سمجھیں تو رجوع کریں۔
رحیم بخش، محلہ اسلام نگر۔ گلی ۱۵۔ لائلپور شہر

عمر ۲۲ سال، تعلیم میٹرک، آمدنی پانچ ہزار روپے پاکستانی ہے
عبدالستار مینتی معرفت محمد عاشق
پوسٹ بکس نمبر ۶۰۸ - ریاض، سعودی عرب

عمر ۱۹ سال، تعلیم ایف اے۔ تنخواہ مبلغ ۴۵۰ روپے ماہوار ہے
آپ کو خوش و خرم رکھوں گا۔
آصف ندیم ۳۸ ... نرسری لائن۔ کوئٹہ چھاؤنی

عمر ۲۱ سال، ذاتی کاروبار، ماہانہ آمدنی مبلغ ۱۰۰۰ روپے، تعلیم میٹرک ہے۔ آپ کا دامن خوشیوں سے بھر دوں گا۔
محمد اشرف معرفت خوشی محمد دھوبی
دیپالپور چوک۔ اوکاڑہ۔ ضلع ساہیوال

انشاء اللہ آپ کے جذبات و احساسات پر پورا اتروں گا۔
عمر ۲۲ سال، تعلیم بی اے، تنخواہ مبلغ ۱۲۰۰ روپے ماہانہ۔
ایس آر آفریدی معرفت ڈاکٹر عبدالغفور درانا
بالمقابل یونائیٹڈ بینک۔ ڈرگ کالونی کراچی

مجھے صرف فرمانبردار بیوی کی ضرورت ہے۔ عمر ۲۵ سال، تنخواہ مبلغ ۴۵۰ روپے ماہانہ۔
مقبول احمد
...

تعلیم میٹرک، تنخواہ ... روپے ... عمر ... سال ہے
عبدالمجید، پوسٹ بکس ... ابوظہبی (یو اے ای)

ذاتی کاروبار، عمر ۲۵ سال، تعلیم میٹرک ہے۔ شاید قدرت نے آپ کو میرے ہی لیے پیدا کیا ہے۔
راحیل عالم شکیل، نزد چوپال شاہ عالم خان
بمقام مسد گوگرہ، تحصیل اوکاڑہ۔ ضلع ساہیوال

مجھے اپنا شریک سفر بنا لیں، تمام عمر آپ کا خادم رہوں گا۔
ایم اے رانا، پوسٹ بکس نمبر ۲۲۲۸ ۔ دوبئی

عمر ۲۳ سال، معقول تنخواہ اور تعلیم ایف اے ہے۔
سید مہدی حسن عابدی
SHAQRE HOSPITAL ALWASHAM
SAUDI - ARABIA

اس بھری دنیا میں اکیلا ہوں۔ آپ کے خیالات و جذبات کا خلوص دل سے احترام کرتا ہوں۔
محمد سلیم آرزو معرفت علی ... فروش
نیو ... کالونی ۔ لانڈھی۔ کراچی ۳۲

اگر نگاہِ کرم ہو جائے تو ساری عمر خدمت میں گزار دوں۔
محمد ارشد، مدینہ کاٹن فیکٹری، چشتیاں۔ ضلع بہاولنگر

گڑیا رانی۔ کراچی کے نام:
میری شخصیت آپ کے آئیڈیل سے مطابقت رکھتی ہے۔
عارف ... معرفت محمد رمضان ۱۲۰۸ محمد علی سوسائٹی کراچی

صبا ... کراچی کے نام:
مجھے بھی آپ جیسے آئیڈیل کی تلاش ہے۔ تعلیم بی اے اور عمر ۲۳ سال ہے۔ محمد عارف
بی اے ... سیکریٹری ... چیف منسٹر سندھ
چیف منسٹر ہاؤس۔ کراچی

گورنمنٹ ملازم، معقول تنخواہ، آپ کے جذبات کی حقیقی تصویر ہوں۔ غلام ... عباسی ...

روحانی ڈاک



کشف و کرامات اولیائے کرام کا خاصہ ہے۔ جو کبھی کبھی بزرگانِ دین کے مسلک و سلوک سے اثر نیت بندہ کر اس کے لطف و کرم کے صدقے میں عطا ہو جاتا ہے۔

بابا سید شان احمد صاحب

کا شمار بھی انہی بزرگ ہستیوں میں ہے جنہیں روحانی انعام و اکرام سے نوازا گیا اور اس کا منہ بولتا ثبوت حقیقت حال سے متعلق وہ اہم پیش گوئیاں ہیں جو بذریعہ کشف تحلی کی صورت میں ان پر ظاہر ہوتی رہیں۔ بابا جی شادی بیاہ، مقدمات، محبت میں کامیابی یا ناکامی، مالی مشکلات اور اولاد وغیرہ سے متعلق آپ کے سوالات کے جوابات بذریعہ کشف دینے پر رضامند ہو گئے ہیں اور وہ ٹھیک ٹھیک آپ کے حال اور مستقبل کے تانے بانے میں جھانک کر فوراً خدا لگتی کہہ دیں گے۔ صرف ضرورت ہے اس نام کی جس سے آپ زیادہ پکارے اور پہچانے جاتے ہیں اور اس کے ساتھ آپ کی والدہ محترمہ کا نام، عمر اور مقام پیدائش۔ آپ ایک وقت میں صرف دو سوال کر سکتے ہیں۔ جوابات کے لیے جوابی لفافہ بھیجنا ضروری ہے۔ بابا جی کے جوابات کا کوئی نذرانہ نہیں ہے۔

خط لکھنے کا پتہ

روحانی ڈاک

ماہنامہ دوشیزہ پوسٹ بکس ۵۹۵

کراچی ۲۴

میں بھی آپ کی طرح دکھی ہوں۔ تنخواہ ۹ سو روپے ماہانہ ہے۔
محمد رضا۔ کوارٹر نمبر ۱۲۱-G کورنگی کراچی

زندگی میں بہت دکھ اٹھائے ہیں۔ آپ کو اپنانے کے لیے تیار ہوں۔
افروزہ خان
پوسٹ بکس نمبر ۲۰۱۹ سیب ائیرپورٹ مسقط عمان

تعلیم بی اے۔ معقول تنخواہ، عمر ۲۵ سال۔ مجھے صرف سکون کی تلاش ہے۔ جہیز چاہیے نہ دولت۔
بشیر الاسلام قریشی۔ ہاربلینڈ کمپنی۔ میکلوڈ روڈ لاہور

دکھی انسان ہوں۔ آپ جیسے ساتھی کی تلاش ہے۔
جہاں زیب۔ پوسٹ بکس نمبر ۴۲۴۴
معرفت اکبر ٹھیکیدار۔ ابوظہبی

میں ایک ڈاکٹر ہوں۔ میرا اپنا ذاتی کلینک ہے اور ملازمت بھی کرتا ہوں۔ آمدنی تقریباً دو ہزار روپے ماہوار ہے۔
ڈاکٹر عبدالصمد "الصمد سرجیکل کلینک اینڈ میڈیکل اسٹور"
وارڈ ۸ ریلوے روڈ ضلع مظفر گڑھ

تعلیم بی اے اور تنخواہ ۳۰۰۰/- روپے ماہانہ ہے۔ آپ کے دکھوں کو اپنا دکھ سمجھوں گا۔
منصور احمد ۱۳۶۲۸۹ ویسٹرن فرنٹیئر رجمنٹ
سگنل پلاٹون۔ ثمریت صلالہ۔ ظفار سلطنت عمان

میں آپ کے جذبات اور احساسات پر پورا اتروں گا۔ سرکاری ملازم ہوں۔ تنخواہ ۵۰۰/- روپے ہے۔
محمد رفیق۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۴۰۲ لاہور

آپ کی تحریر نے بہت متاثر کیا ہے۔ آپ کو اپنا شریک سفر بنانا چاہتا ہوں۔
محمد خالد۔ سیکنڈ آفیسر
مسلم کمرشل بینک شورکوٹ شہر۔ ضلع جھنگ

میں آپ کی تمام خواہشات پوری کروں گا۔ [illegible]
تنخواہ ۵ ہزار روپے ماہوار ہے۔
ایم آصف سعید ۱۶۸۲۹
[illegible]۔ پوسٹ بکس نمبر ۹۲۴۰ دوحہ قطر

عمر ۲۹ سال، اچھی شکل و صورت، تعلیم انٹر، ماہانہ آمدنی ۳ ہزار روپے ہے۔
ایم ولی خان۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۰۳۱ ابوظہبی

آپ نے جس خواہش کا اظہار کیا ہے میں خود کو اس کا اہل سمجھتا ہوں۔ میری عمر ۲۵ سال، تعلیم بی اے اور تنخواہ ۸ ہزار ریال ہے۔
ایم ایم چوہدری معرفت عبدالرؤف قریشی
پوسٹ بکس نمبر ۴۳۳۶ جدہ۔ سعودی عرب

میں آپ کے معیار پر پورا اتروں گا۔
شکیل احمد، پوسٹ بکس نمبر ۲۹۴۶، جدہ، سعودی عرب

[illegible] انتخاب غلط ہے میرے سوچ سے
کیا میں ہی بدنصیب تیرا انتخاب ہوں
عامر۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۳۴۶ روی مسقط عمان

آپ کے خوابوں کی تعبیر ہوں۔ پیار کی دولت سے مالا مال کر دوں گا۔
اے ایم صابری۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۰۰۹۸ ابوظہبی

آپ مجھے ہر لحاظ سے اپنے معیار کے مطابق پائیں گی۔
ایس شاہ۔ پوسٹ بکس نمبر ۹۱۴۷ دوبئی

زندگی کی پرخار راہوں میں ۳۲ سال سے [illegible] دکھوں کا بوجھ اٹھائے تنہا بھٹک رہا ہوں۔ آج تک کسی نے [illegible] نہیں۔
ایم اے نعیم۔ مکان نمبر [illegible]

آپ کے معیار پر پورا اترتا ہوں۔ عمر ۲۸ سال، تعلیم بی اے

اور تنخواہ ۱۵۰۰/- روپیہ ہے۔
ایم سرور رانی۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۹۷۵ دبئی

مجھے بھی زمانے نے بہت ستایا ہے اس لیے دکھی انسان
کی بہت قدر کرتا ہوں۔ ۔۔۔ ے یاست
مکان نمبر 56 E X ۔ ایکٹائی کالونی جمشید روڈ کراچی

آپ کا جیون ساتھی بننے کے لیے تیار ہوں۔
انور شاہین۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۷۶۱۔ دوبئی۔

عمر ۲۴ سال۔ تعلیم بی ایس سی ماہانہ آمدنی ۵۰۰/- روپیہ ہے۔
محمد نصیر خان ۲/سی-۷۶ پی ای سی ایچ ایس کراچی ۲۹

آپ کے آئیڈیل کے عین مطابق ہوں عمر ۳۲ سال تعلیم بی اے
محمد عثمان یعقوب معرفت حبیب بینک
بی اے ایف برانچ - فننگ روڈ - کراچی۔

پانچ سال سے ہم خیال شریک سفر کی تلاش تھی آپ کی تحریر
کو اپنے خیالات سے ہم آہنگ پاکر مسرور کر رہا ہوں۔ عمر ۲۹ سال،
باعزت ملازمت اور معقول تنخواہ ہے۔
ایس اے رامے۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۱۸۱۔ دوبئی۔

مجھے بھی آپ جیسے آئیڈیل کی تلاش تھی۔ تعلیم میٹرک۔ عمر
۲۶ سال اور تنخواہ ۲۰۰۰/- روپیہ ہے۔
مشتاق احمد۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۳۵ شارجہ (یو اے ای)

آپ کی تحریر نے دل پر گہرا اثر کیا ہے مجھے بھی ایسے ہی ہمسفر
کی تلاش ہے جو میرے دکھ درد کا سہارا بن سکے۔
ماسٹر محمد اقبال معرفت محمد خان۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۲۷۔ ابوظبی

تعلیم ایم اے، ماہانہ آمدنی ۶۰۰۰/- روپیہ ہے۔
قاضی سلیم الدین
پوسٹ بکس نمبر ۲۱۰۴۴ صفات کویت

آپ کی خواہش کے مطابق تعلیم ۔۔۔ عمر ۔۔۔ سال ۔۔۔ آپ کا جیون ساتھی
ایم جمیل ۔ ایل
عبدالواسطہ بیگ معرفت محمد پی او ۔ دبئی

معقول تنخواہ، عمر ۳۲ سال ہے آپ کی ہاں کی خوشی ہوگی۔
اے کے چاند، پوسٹ بکس نمبر ۳۲ - ابوظبی

مجھے بھی ایسے ساتھی کی تلاش ہے جو پیار کو بانٹ سکے۔
افتخار احمد چوہدری
۲۳۹ ۔ ڈی، شاہ پور ۔ ۳۶ سکی شوکت ملت ملتان

عمر ۳۳ سال، انجینئر ہوں، تنخواہ ۱۵۰۰/- روپیہ ماہوار ہے
محمد راشد معرفت محمد انور ٹکٹ کلکٹر
ریلوے اسٹیشن - لائلپور

شازیہ خان، کراچی کے نام:
آپ کے خطوط کو آنت پر پورا اترتا ہوں آپ کا ہم خیال
ہوں۔ عبدالستار خان غوری
11/C-K.P.O محمد علی ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی ۸

میں بالکل آپ کے آئیڈیل کے مطابق ہوں تعلیم بی ایس سی
ماہانہ تنخواہ ۵۰۰/- روپیہ ہے جمیل الحق
پوسٹ بکس نمبر ۱۳۴۴ - صفات - کویت

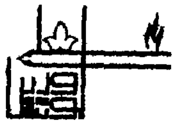
آپ کے خیالات قابل قدر ہیں۔
ایم کے بٹ معرفت شاہد محمود۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۹۵ - ابوظبی

آپ کے جذبات اور خیالات پر پورا اتروں گا۔
سلیم الدین۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۰۴۳ - ابوظبی

آپ کے آئیڈیل کے عین مطابق ہوں عمر ۲۹ سال سرکاری
ملازم، تنخواہ ۵۰۰/- روپیہ۔ تعلیم بی اے۔
ایم اے خان ۳۳۷/۹ ریلوے ہاؤسنگ کراچی کینٹ

◆◆◆◆

سنساتی لو کے تھپیڑوں بھری دوپہر کو صفیہ کا دوبارہ طلاق دے کر آنا
کہ تب ایک برسات کی سی گھٹا امنڈ آئی



میاں جی جانتے تھے کہ جو جھوٹ اور جو سچ تھا وہ عمر بھر کا ایک
پیار تھا ساتھ کا، جو ان کا پہلے مرگ نہیں ہو گیا ہے!!

جیلانی بانو

گرمی اپنے نقطۂ عروج پر تھی۔
در و دیوار سے شعلے بھڑکتے دکھائی دے رہے تھے سنساتی لو کے تھپیڑوں میں سے گرمی کے بھبکے سے اُٹھ رہے تھے۔ ایسی گرمی تو کبھی نہ پڑی تھی۔ یا پھر آج سب کے دل میں آگ بھڑک اٹھی تھی۔ پھلجھڑی کی طرح سب کسی شعلے کے انتظار میں تھے۔ بات بات میں بھڑک اٹھنے کو تیار۔

اماں بی چاہتی تھیں آج صفیہ کا قصہ کوئی نہ چھیڑے تاکہ دو چار گھنٹے بعد جو آتش فشاں پھٹنے والا ہے اس سے کچھ دیر تو محفوظ رہیں۔ اس کوشش میں وہ ہر ایک سے ڈری ڈری تھیں اور دامن تھام رکھنے کی کوشش میں بری طرح ہانپ گئی تھیں۔ ابا میاں چاہتے تھے کہ یہ بات اب باہر نہ پہنچنے پائے۔ اس کوشش میں وہ صبح صبح کراچی سے گئی کے گھر رہنے والی منہاج تک کو منا دیا تھا کہ آج کیا ہونے والا ہے! اماں کی کوشش تھی کہ صفیہ پر غم کا پہاڑ ٹوٹنے سے پہلے اس کی خوب دلجوئی کریں۔ چنانچہ صبح سے وہ سب لاڈ صفیہ کے ہو رہے تھے جن سے صفیہ کو نفرت سی تھی اور اس طرح ماں میٹی میں پانی سا وطن گئی تھی۔ ایسی شرر فشاں فضا میں سب باری باری سے چپ رہے تھے۔ "آج اگر کسی کی آواز نکلی تو حلق دبا دوں گا" ابا میاں نے حلق کی ساری قلعی بند کرکے اعلان کیا اور اس وارننگ کو سن کر زیر لب تبسم ہوتی ہوئی سسکیاں بھی چیخوں میں بدل گئیں۔

اندر والی صحنچی کے پکے فرش پر اماں نے کئی گھڑے پانی بہا دیا۔ دالان کی کھڑکیوں میں خس کی ٹٹیاں لگا دیں۔ صفیہ کے جہیز والا پنکھا بیچ میں رکھا اور تخت پر سفید چاندنی بچھائی تو لیا غنیمت تھا کہ سارا گھر سنولائی پھر رہی تھیں۔ لیکن جیسے آج صفیہ کا دولہا پہلی بار گھر آیا ہو۔ یقین تھا کہ اس حادثے کی خبر سن کر لوگوں سے گھر بھر جائے گا۔ سب کو ان کے ساتھ ہمدردی ہو گی۔ ایک بیٹی کی بیاہی بیٹی طلاق لے کر گھر بیٹھے تو ان کے لیے یہ ایک جانی گداز حادثہ ہوتا ہے۔ صفیہ سے زیادہ تو انہیں خود طلاق کی صدمہ بھگتنا ہوتا تھا۔

اتنے اہتمام کے باوجود گرمی کا یہ حال تھا جیسے بڑے ابا کے مرتبان میں بچتے گل سب کا موڈ گرمی ہو گئی گولی گھت

کھیلتے۔ مگر صفیہ والی بات نے ان کو بھی ہلا کر رکھ دیا تھا۔ بیچ
میں سب کے ساتھ وہ پہرہ کا شاد و جبر ہو گیا تھا۔ اسی لیے تو آج اماں
نے بچوں کو زبردستی پلنگوں پر لٹا کے بنا کھڑکی بالکل تہہ خانے کی
سیڑھیوں سے جلایا تھا۔

ہزار منتوں کے بعد جب صفیہ کے آنسو تھمے تو رات کافی
ہو چکی تھی اور گرمی بڑھتی جا رہی تھی۔ پانی پیتے میں اس نے اماں کی کوری
صراحی توڑ دی اور انہوں نے بھی بے صبری سے [illegible] مگر جب وہ
مزید لاڈ کروانے کے لیے ان کے پلنگ پر جا لیٹی تو اماں اس کے
گرم بدن کے پھڑکوں سے گھبرا گئیں۔ مجبوراً وہ نفاست پسند فرزانہ کے
پاس جا کر لیٹ گئی۔ فرزانہ ہر وقت فراک کے پائنچے اٹھائے الگ
تھلگ سی اپنا ابھرتی جیسے بتاشوں پر چل رہی ہو مگر اس وقت تو وہ
گوٹا کاری پھیلائے اپنے جہیز کے کپڑے سی رہی تھی۔ ایسے وقت
زبیدہ بھی پاس سے گزر جاتیں تو وہ جلنے لگتی تھی لیکن صفیہ کو پھر
بات کرنے کی آج چھوٹ مل گئی تھی اس لیے اس نے بڑے صبر کے
ساتھ کیا۔

"بہن مت بنتے، پیارے کپڑے مس جائیں گے۔"
"تو کہیں اور جا بیٹھو۔" صفیہ جان بوجھ کر سفید ساٹن پر
ایڑیاں رگڑنے لگی۔
"میں تو پہلے سے بیٹھی ہوں۔"
"تو اب چلی جاؤ۔"
"کیا مصیبت [illegible] لگا رکھی ہے۔" فرزانہ جوان ہو گئی
اماں [illegible] سے چونک کر سمجھو گئے پھر انہیں خیال آیا کہ آج
صفیہ کے [illegible] اس لیے فرزانہ کو ڈانٹنا فضول ہے۔
"مری جا رہی ہے کپڑوں کے لیے۔ جہیز تک [illegible]
اتفاقات پر لوگ تھوک دیتے ہیں۔"
افضل نے صبح صبح تھوک کر کروٹ بدل لی [illegible] صفیہ کے
[illegible] یاد آ رہا تھا کہ ایک [illegible] کے حصے کی [illegible]
[illegible] آج شام تک صفیہ پھر ان کی [illegible]
[illegible] بیٹھی رہی تھی۔
اصل میں سارا قصور فرزانہ کا تھا مگر وہ اس وقت اماں کو



شربت پلا رہی تو انہیں اتنا غصہ کیوں آتا! جب اتنی شدید گرمی میں
کوئی پیاسا بھی ہو تو اول فول بکنے ہی لگتا ہے۔ امجد کو عقل ہوتی تو
جنگلوں کی نصیحت سمجھ کر برداشت کر لیتا مگر اس نے تو اسے ترکی بہ ترکی
جواب دینا شروع کر دیئے سب کے سامنے صفیہ کا بھرپور … سنا ڈالا
اور کہہ دیا کہ پرسوں آکر وہ صفیہ کا فیصلہ کر جائے گا۔ بیچاری زندگی کا وہ
عالیشان پروگرام اس ذرا سے دھکے سے گر پڑا۔ صفیہ سے زیادہ اماں روئیں
اور اماں سے زیادہ اماں بی بلکہ اماں بی کے گرمی دانوں پر تو جیسے
نمک چھڑک گیا۔ وہ کمینہ کیا فیصلہ کرے گا! اماں بی خود اس کی اوقات
پر ہزار بار تھوک دیں گی۔ جہاں میں کی انگوٹھی پر جیسے کا نگینہ کیا سمجھا!
بھولا اماں بی کو روتے دیکھ کر ان کا غصہ اور بڑھا۔ اس تٹ پونجئے کے لئے
رونے کی کیا ضرورت ہے۔ انہوں نے اتنا ڈانٹا۔ امجد اور اس کے خاندان
میں اتنے کیڑے ڈالے کہ صفیہ کو اس سے نجات پانے میں ہزار
خوبیاں نظر آئیں۔ اس نے اماں کے سب زہر میں بجھے ہوئے فقرے
رٹ لئے تاکہ امجد کے منہ پر مار سکے۔

صبح وہ اٹھی تو یوں جیسے اکھاڑے میں جانے والا پہلوان۔

وہ امجد کی بے چینی سے منتظر تھی کہ سات بار اس کے منہ پر اپنی طرف
سے طلاق مار سکے۔ وہ خفا کیا! … خدا سی کلی کی
آمد تھی اور اس کیلئے بھی ماں بہنیں منہ کھولے بیٹھی رہتی تھیں۔ اور یہ
امجد کا … سالا … کے کہہ کے الگ۔ اب کسی کرنے میں …
سے زندگی تو گزر جائے گی کوئی نہ کوئی بھائی جا کر روٹی تو دے دے گا
پھر اسے طلاق کا خیال آیا جوانی میں بیوہ ہو کر انہوں نے کیا کیا راج
راج … خاندان کے پاؤں پر پالا اپنی بیٹی تھی۔ ذرا سی ٹھیس لگی
کہ پھوٹا سب انہیں کانچ کے برتن کی طرح سنبھالے رہتے۔ ماں باپ
ماموں چچا اور بھائی اپنی کمائیوں کا آدھا حصہ انکساری سے پیش کرتے
تھے جسے ہزار نخروں کے بعد قبول کر لیتی تھیں۔ عید بقر عید کو سب
سے پہلے انہیں کے کپڑے بنتے۔ فصل کے پھل سب سے پہلے وہ چکھتیں
قابلِ رشک زندگی تھی۔

صفیہ کو یوں لگ رہا تھا جیسے آج وہ اچانک کئی بانس اونچی
ہو گئی ہے۔ آج سے من مانی کرنے کا اسے اختیار مل گیا تھا جو بات
چاہے … اسی شہزادے کے ادھ سلے کپڑوں پر لپیٹ کر اسے
پھانسی مل رہا تھا۔

امجد کا انتظار کرتے کرتے اب سب اونگھنے لگے تھے مگر صفیہ
اور فرزانہ کی بحث کبھی ختم ہی نہ ہوتی تھی۔ اللہ توبہ ہے ایک منٹ کو ہو

کسی کی زبان نکلے۔" اماں بی نے کروٹ بدل کر پھر سے دستی پنکھیا جھلنا
شروع کر دی۔

"کسی اور پلنگ پر لیٹ جاؤ صفیہ۔"

"میں تو ہرگز نہ جاؤں گی۔"

"اپنی نندوں کا بھرپور سیکھ آئی ہیں۔" فرزانہ نے کھینچ کھانچ کر
اس کے نیچے سے کپڑے نکالے اور خود بھی ایک کونے پر لیٹ گئی گرمی
کے مارے اس کے لبوں پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں … کی
کی قمیض پسینے میں بھیگ کر بدن سے چپک گئی تھی مگر وہ تو صفیہ
کی طرح اس نے دوپٹہ اتار کر پھینکا اور نہ اماں بی کی طرح ہر وقت
پنکھا جھلتی تھی۔

"کمال ہے۔" صفیہ چاہتی تھی فرزانہ بھی اس کی طرح دوپٹہ
پھینک کر قمیض پیٹ تک اٹھائے ہوئے کروٹوں تک چڑھا کے
سویا کرے۔ اس کا بس چلتا تو باقی کے کپڑے بھی اتار پھینکتی

"تو کیا تمہاری طرح ننگا ہو کے ناچا کریں!" گرمی کے مارے
فرزانہ کا بھی چہرہ … خوب …

"ہائے فرزانہ کی بچی ہوتی ہے یا اصول؟" اماں بی جو بڑی جاگ
رہی تھیں مگر ظاہر یوں کیا جیسے گہری نیند سے چونک پڑی ہوں۔

"اللہ توبہ ہے بھلا کبھی اساڑھ میں ایسی گرمی پڑی تھی!"
اماں بی بے چینی سے کروٹ بدل رہی تھیں۔

"اساڑھ؟ اساڑھ کہاں سے آ گئے۔ ابھی تو بیساکھ بھی ختم
نہیں ہوا۔ اماں بی کی تو مت کٹ گئی ہے!"

"اور کیا اماں بی تو پاگل ہیں۔ ہماری قسمت میں یہی لکھا تھا
کہ بوڑھے گالیاں نہیں مگر دیکھنا اپنے ہی آگے آ رہا ہے۔ مجھے ستا کے
تم بھی چین نہیں پا رہی ہو!" اماں بی کو بڑی دیر کے بعد بولنے کے
لئے موضوع ملا۔

"تو کون تیرا سر دبا رہی ہے؟" اماں نے اچانک آنکھ بند
سے چیخ کر پوچھا کہ سوتے ہوئے ابا میاں اور اونگھتی ہوئی صفیہ چونک …

"تیری بھی ماں اس کا ارمان کیوں دل میں لئے بیٹھی ہو؟"
اماں بی اتنے زور زور سے پنکھیا جھلنے لگیں کہ ٹوٹے پنکھے میں سے
زوں زوں آواز آ رہی تھی۔

"گونگوں کی طرح کیوں کائیں کائیں کئے جا رہی ہو؟" صفیہ نے
جھنجھلا کے اماں اور دادی کو ڈانٹا اور قمیض کا دامن اٹھا کے جھلنے لگی

"اپنی نندوں کی زبان سیکھ آئی ہو؟" سب سے صفیہ کو …

ہوا تھا فرزانہ اپنے آپ میں اتنے سجاتی بات بات میں اپیا کی سسرال والوں میں کیڑے ڈالتی۔ دولہا بھائی کے سامنے اپنی سلیقہ مندی اور اپیا کے پھوہڑپن دکھاتی بات یہ تھی کہ اس کی شادی بڑی حویلی والوں کے ہاں ہوئی تھی۔ جو شہر کا پڑھا لکھا خاندان کہلاتا تھا۔ ادھر صفیہ کا میاں اپنے خاندان میں پہلا گریجویٹ تھا۔

اندھوں میں کانے راجہ کی طرح خاندان نے تو اس کی قابلیت پہ بیعت کرلی تھی مگر وہ ساری دنیا کو جاہل سمجھنے کی فکر میں پھرا کرتا تھا لیکن آج گرمی کے چرکے ہی کیا کم تھے جو صفیہ اپنی نندوں پر مسلسل الیکٹرک ہوئی جاتی۔ "گرمی کوس کوس کر کھاتی گئیں ابھی بچی ہیں ابھرائی سے" وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھیں۔ چاروں طرف تڑپنے پھڑکنے کو کچھ نہ ملا۔ دو پٹا لات مار کے پھینکا فرزانہ کے کپڑے اور ریشم کی ٹوکری دوسری جگہ پٹخی اور پنکھا ڈھونڈنے لگی۔

مگر کس کو کیا غرض پڑی تھی انہیں کوسنے کی۔ انھوں نے اس حال کو پہنچایا "اب کی اماں نے جواب دیا "ساڑھے پانچ ہزار نوے روپے لگا کے بیاہ کیا تھا ہم سر لے سے اپنی بیٹی کو بیاہتے ہیں یوں لگ رہا تھا جیسے ساڑھے پانچ ہزار نوے روپے پڑے آگ میں جل رہے ہوں اور اس کی گرمی میں اماں بھنی جا رہی تھیں۔ "دیکھ رہی ہو۔ دلوی خالہ سمجھا لو اماں کو نہیں تو میری زبان کھل جائے گی" صفیہ نے اماں کو فرزانہ کی پشتی کرتے دیکھ کر دلوی کا سہارا لینا چاہا۔ اس طرح اس کا محاذ طاقتور ہو سکتا تھا لیکن دلوی خالہ ذرا دیر پہلے والی بات پر عدم تعاون کئے بیٹھی تھیں۔ اس لئے پانی میں ڈبو ڈبو کر پنکھا جھلے گئیں۔ جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو مگر اماں کو تو جیسے کسی نے کھولتے تیل میں ڈال دیا ہو۔ "اے لو زبان کھول کر ماں کے کوسنے کرتوت بیان کریں گی سسرال والے" کر چھینک پھانک اماں نے صفیہ کی سات پشتوں کو ادھیڑ ڈالا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ دلوی خالہ اب بھی یوں ہی غیر جانب دار رہتیں مگر اماں اپنا میکہ صفا بچا گئی تھیں اور صفیہ کے باپ دادا پر الیکٹرک ہو لاد کیسے سن لیتیں بس ایکدم فضا میں بارود سی سلگ اٹھی۔ سب ایک دوسرے پر پھٹ پڑے۔ ابا میاں کو اللہ نے ایک اچھا چانس پھر پھاٹک کے دے دیا تاکہ اماں پر پل سکیں چپکی میں کائیں کائیں مچی دیکھ کر نیلو ریحان اور بڑے بھی ان کو سے گئے۔ دوپہر ہوتے ہی انہیں زبردستی یوں پلنگوں پر لٹایا جاتا تھا جیسے صلیب پر چڑھے ہوں۔ جب وقت کسی طرح کٹتا تو ریحانے

سُلانے پاؤں تک گئے تھے کہ ریحان کے کھٹ سے کھڑا پھیلا اور اس بات پر کتنی گھنٹے مار کٹائی میں لگ گئے۔ پھر ریحان اماں نانا کے تصویروں والے رسالے الماری میں سے نکال لایا اور سب بچھے پا چپٹی ہوتی رہی۔ بند کمرے میں رکھی ہوئی ہر چیز سے جی بھر گیا تو ایک بار پھر ریحان اور نیلو میں زور دار معرکہ ہوا اور نیلو نے بالکل اماں کے اسٹائل میں قسم کھائی کہ اب وہ ریحان کا منہ دیکھے گی۔ مجبوراً ریحان نے اس کے گھونسوں سے بچنے کی ایک ترکیب نکالی میز پر کرسی رکھ کر وہ روشندان میں جا بیٹھا اور سڑک کا جائزہ لینے لگا تاکہ موقع دیکھ کر صحن میں کود سکے مگر لُو کا ایک بھونکا اس کا منہ جھلس گیا۔

آنگن میں کوئی نہ تھا صرف پیچھے کی نگر میں رہنے والی کبوتری نے اسے گھور کر دیکھا گرمی کے مارے وہ منہ کھولے ہانپ رہی تھی آنگن میں چگنے والے اماں بی کے سفید مرغ نے پہلے تو اسے دیکھ کر سب مرغیوں کو خطرے سے آگاہ کیا پھر ان کے ساتھ فلرٹ کرنے میں مشغول ہو گیا۔

چلچلاتی دوپہر میں گلی پڑی سنسا رہی تھی بس یہ سب رکھے بلاقی کی ماں محلے والوں کے کپڑے سمیٹ کر پیٹنے کے تھیلے رہی تھی نیم کے نیچے محلے کے لونڈے اب کھیل سے تھک کر بیٹھے ایکدوسرے کو گالیاں دے رہے تھے اور سندیلی آموں کی گٹھلی اب خالی ہو چکی تھی۔ دونوں بیل ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے لونڈوں کی گالیوں سے محظوظ ہو رہے تھے۔ حلوائی کی دکان کا ایک پٹ بند تھا اور دھوئیں سے بھری سیاہ کوٹھری میں لوگ بیٹھے جوا کھیل رہے تھے۔ ریحان نے اپنی انگلیوں سے آنکھیں میں اور تیز روشنی میں چندھیا کے دیکھا کہ دولہا بھائی سائیکل پر چلے آ رہے ہیں۔ یہ خوفناک خبر سنانے کو وہ پلٹا تو نیلو اور سندیلی کی توقع میں سے فائدہ اٹھا کر غائب ہو چکے تھے۔ روشندان سے چھلانگ لگا کے وہ پلنگ پر کودا اور لپک کر باہر جانا چاہا مگر اماں نے جیسے پاؤں میں پھندا ڈال کر گھسیٹ لیا۔

"اٹھو بیٹا! چل کر سو رہیں"

ریحان نے رک کر دیکھا فضا میں گرمی کے بگولے اڑ رہے تھے صفیہ آپا بھوں بھوں رو رہی تھیں اور ناک سنک سنک کر ساری بھگی گندی کر رہی تھیں جلدی اماں ناک سکڑ کے یوں ہاں کوٹ رہی تھیں جیسے اماں کی زبان پگھل رہی ہو۔ سب پھیپھڑوں میں شرارے منہ ...

"دولہا بھائی آتے ہیں۔ میں ان کی سائیکل اندر لے آؤں"

پیا [illegible] ساری باتیں [illegible] سب [illegible] کے [illegible]
چھوٹی چھوٹی مشاورتی کی جانے لگی جیسے وہ ایک بہو نہیں آئی ہوں۔
[illegible] بیگم کی طرح باہر ہوا [illegible] زیبا نے منہ چڑا کے
کہتی [illegible] خود نے بیگم اماں کا دوپٹہ کسی طرح [illegible] انہوں نے
[illegible] کا دوپٹہ کھینچ کر سر پر ڈال لیا۔ امی میاں کو اس وقت گہری
نیند کا بہانہ سب سے زیادہ [illegible] الاماں [illegible] سے بھرا ہوا
الاماں الاماں کر کے جلدی جلدی [illegible] یا صفیہ نے کہا آپ مجھے اس
وقت [illegible] کر کے [illegible] جانے والی تھی گر جائے
[illegible] دوپٹہ پھینک کر [illegible]
چڑھانے [illegible] کروٹ بدل کر وہیں لیٹ گئی جیسے ازل سے سوتی چلی آ
رہی ہے۔

ابھی آیا ہے۔ یہ اطلاع کتنی [illegible] ہوا کرتی تھی۔ کتنی
خوشامدوں کے بعد وہ سسرال جانے پر راضی ہوئی تھی پھر بھی اب
بے صبری سے [illegible] پوچھا تھا [illegible]
کے لئے [illegible] تھی مگر آج ابا نے ہمیشہ کے لئے چھوڑ جائے گا
[illegible] لیکن اماں بی نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر
ہمت بندھائی [illegible] اس کمینے سے وہیں کیا کرے گا [illegible] پہلے تو
ریحان کے [illegible] کی آواز آئی پھر [illegible] سنائی دیں
پسینے میں [illegible] سیاہ رنگت تپ کر رہی ہے
کی طرح [illegible] انگلیوں سے ریحان کا کان پکڑ کے اس نے
اماں کے آگے [illegible] کے انداز میں سانس اور
سانس کی [illegible] کو سلام کیا [illegible] نگاہوں سے اسے
دیکھ رہی تھیں جیسے اب [illegible] ایٹم بم نکلنے والا ہو۔
[illegible] اماں بی نے حسب عادت [illegible] کی
دعا میں [illegible] صفیہ اماں بی کی اس دعا سے جل کر رہ گئی۔ اماں
بی اس کی [illegible] کیا؟
اور [illegible] اس دعا سے یوں مسکرائیں جیسے کسی نے بوٹ کے
چھینٹے اچھال دیئے ہوں۔ اس کے لئے کرسی سے [illegible] تک پہنچنے
کا تصور بھی محال تھا مگر [illegible] ساس کی اس دعا کے ساتھ ہی
ایک نیا [illegible] سامنے آ کھڑا ہوا [illegible] کا سوٹ پہنے منہ میں
[illegible] ایک سیاہ [illegible] ہے جس کے اندر [illegible]
[illegible] اس کے [illegible] اماں کے [illegible] اس

صفیہ کی [illegible]
پہننا پسند تھی [illegible]
میں اسے اپنی [illegible] کا خیال آ گیا۔
ریحان میاں [illegible]
ریحان پر غصہ آنے لگا۔
"وہ جانتی تھیں [illegible] کیسی تربیت دی ہے؟"
اماں کی اس [illegible] تربیت [illegible] صفیہ بیگم اس کے
[illegible] کی نقل کر رہی تھی۔
"اماں میاں [illegible] ہو گئے [illegible]
[illegible] کیوں نہ [illegible] گے؟"
اماں نے [illegible] صفیہ اماں کے
اس جواب سے بہت خوش ہوئیں مگر [illegible] سے گری
کے [illegible] حال تھا۔
"[illegible] ریحان کو
کمرے میں دھکیل دیا [illegible] کے لئے [illegible]
جو آنے [illegible] تھا [illegible] میں [illegible] خود بخود
انہیں یاد آ گئیں ایک [illegible] کا [illegible] شربت کے
پیالے [illegible]
[illegible] کیا بات ہوئی تھی؟ [illegible] پسینے میں
بھیگ گئے [illegible] اماں بی [illegible]
[illegible]
جس [illegible] آ رہی تھی۔
"[illegible] کی قسمت
میں [illegible]
سے [illegible] گیا ہے۔
[illegible] دیکھا تو
[illegible]
[illegible] اماں بی
[illegible] کے
[illegible]
"[illegible] تمام سے [illegible]
والوں کے [illegible]

خوب آتی ہو اور مجھ سے صفیہ کے ... کے
آسمان سے کوئی کی کے گود میں گرا دیا۔ وہ [illegible]
ذرا سی پنکھیا کی [illegible] سال تک [illegible]
گئے ہیں [illegible] سکتا تھا [illegible] آسانی [illegible] ہو جانے کی یوں
گئی کہ اس کے [illegible]
کرنے کے لئے کوئی سہارا مل رہا تھا۔

"مزا [illegible]" امّاں نے پھر [illegible] کر [illegible] پنکھا
اٹھا کر صفیہ کو جھلنے لگیں۔

"ارے [illegible] لڑکی کے [illegible] ہے" صفیہ نے
[illegible] بڑی تکلیف سے کہا [illegible]
[illegible] سے زیادہ اذیت [illegible] کے
لئے اللہ کی [illegible]۔

"آپ سب کو تکلیف ہو رہی ہے میری [illegible]" صفیہ کے
[illegible] ایک [illegible] انداز [illegible] اب میں پاؤں
[illegible] کے [illegible] بال میں سے [illegible]
والی پسینے کی دھاریں [illegible] بہہ [illegible] گرتی
کی شدت کے ساتھ [illegible] کا احساس [illegible] سب اس
گھر میں [illegible] رنگ [illegible]
اس نے [illegible] حلق [illegible] تک [illegible] ہوا خون
گرم [illegible] لگا تھا [illegible] صفیہ کا [illegible]
پسینے میں بھیگ [illegible] بال [illegible]
[illegible] کیسے وہ اس عورت کو برداشت
کرتا رہا۔؟

"ذرا سا پانی پی لو" امّاں جلدی سے [illegible] کے کٹورے میں
ٹھنڈا پانی لے کر صفیہ کے پاس [illegible] امّاں کا [illegible] دیا۔
"بھلا کوئی آسانی سے بات [illegible] صفیہ نے کہاں سیکھا ہے!"
ان سے بات [illegible] ٹھنڈا پانی [illegible] کہ وہ
سمجھ گیا۔

"اچھا تو [illegible] اماں تو صفیہ [illegible]
[illegible] کیا [illegible] لے
[illegible] سب سمجھ رہا [illegible]۔"

"اماں [illegible] باپ کا گھر ہے [illegible] کو اس [illegible]
آ رہا تھا [illegible]
[illegible] ذرا زبان سنبھال کر بات کرو [illegible] گھر کی [illegible] جائے۔

[illegible] سے امّاں کے [illegible] کی [illegible]
[illegible] کیا [illegible] ایک [illegible] کے اٹھ گئے۔

امّاں [illegible] جس [illegible] تھا اثر ہو چکی
[illegible] اس خاندان کی [illegible]
کے [illegible] میں [illegible] پر [illegible]
کہ اس [illegible] پیدا [illegible] ہو
[illegible] جو [illegible] نام سے [illegible]
رہا تھا [illegible] کوئی [illegible] کی [illegible] کر
[illegible] امّاں نے [illegible] بے صبری سے
اس کے [illegible] انتظار کر رہی تھیں۔

"اے میاں سنبھل کر بات کرو، بڑوں کے آگے خاندان کے
[illegible] مت کرو۔"

"[illegible] ہے آپ نے [illegible] کو [illegible]
[illegible] میں نے بہت برداشت کیا ہے [illegible]"

"آخر کیا کرو گے؟" صفیہ نے [illegible] سے پوچھا۔
اماں [illegible] سے خاموش کرنے لگیں [illegible]
پریشان [illegible] ایک [illegible] کا
[illegible] تھا۔

"کیا کروں؟ بتاؤں؟" اس نے پنکھا پھینک کر پوچھا [illegible]
جیسے جیب میں سے پستول نکالنے والا ہو [illegible] منہ پہ
[illegible] رہی تھیں۔

اب [illegible] صفیہ کی [illegible] پتنگ کی طرح
فضا میں معلق ہو جائے گی۔ اماں [illegible] سوچا۔ وہ کیا کر
سکتے [illegible] قسمت کے [illegible] پر [illegible] ہوئے
آنسو پونچھ کر [illegible] سے پنکھا اٹھا لیا [illegible] پڑی
تھی۔ یہ سلسلہ [illegible] کی بیوی کا [illegible] چاہتی تھیں [illegible]
کی طرح [illegible] کے سر پر [illegible] تھا [illegible] سے پہلے وہ
[illegible] رہی۔

[illegible] سے [illegible] دیکھا [illegible]
[illegible] کے [illegible] ہو گیا تھا اس لئے وہ
[illegible] کے [illegible] کر کے رہ جاتی۔

"[illegible] ہم [illegible]
سے [illegible] کی یہ [illegible] لیکن ہم نے بھی بہت برداشت
کیا ہے [illegible] اب [illegible] تھا [illegible]
[illegible] کرتے۔"

"میں شربت لے کے آیا ہوں؟" ہم نوا اماں ٹھیک کہتی ہیں کیونکہ وہ سارے اثر انگیز فقرے گرمی کے مارے تر بتر ہو گئے تھے۔ جو راستے میں اس نے یاد کئے تھے بات ادھوری چھوڑ کر وہ پنکھا اٹھا کے دوبارہ جھلنے لگا۔ جس میں اب دو چار تنکے ہی رہ گئے تھے۔

"تمہاری ماں کوئی خطابات بھی کرتی ہیں۔" آگے صفیہ سکول کے بارے میں کچھ نہ کہہ سکی۔

اتنی دیر میں فرزانہ لپاتیں جھپاتیں شربت بنا کے لے آئی تھی امجد کے لئے اس وقت شربت پینا زہر تھا مگر فرزانہ سے منع کرنے کی ہمت نہ پڑ سکی اسے اپنی یہ سالی اتنی پسند تھی کہ آج بھی اس میں کوئی عیب نہ نکال سکا۔

شربت کا پورا گلاس ایک سانس میں چڑھانے کے بعد بھی ابھی نہ بھیگ سکا فرزانہ نے بڑھ کر دونوں کھڑکیاں کھول دیں ورنہ ابھی تک اندھیاری جھک آئی تھی کھڑکی کھلتے ہی تازہ ہوا کا ایک جھونکا امجد کی پیشانی چوم گیا۔ اماں بھی اٹھ کے صفیہ کے پاس آبیٹھیں اور اس کی سسکیاں روکنے کی کوشش میں خود بھی کبھی کبھی رو پڑتیں۔

"اللہ بھلا نہ کرے مگر لڑکیوں کے نصیب تو اچھے بنائے۔" اماں نے قبل از وقت ہی واویلا شروع کر دیا تھا۔

فرزانہ بڑے غور سے امجد کو گھور رہی تھی جیسے امجد کا یہ روپ اس نے آج تک نہ دیکھا ہو جب شربت کی لکیریں پیٹ میں ٹھنڈ کا غبار اٹھانے لگیں تو وہ اپنے کیے پر پچھتانے لگا اسے یاد ہی نہ رہا کہ فرزانہ بھی اس کی باتیں سن رہی ہوگی۔ جی چاہا ابھی اٹھ کر چلا جائے مگر صفیہ کی سسکیوں نے اسے گوند لگا کے چپکا دیا۔

"بنو دولہا بھائی کو پنکھا جھلو" فرزانہ نے بنو کو حکم دیا اور بات کو ان سنی کرنے والی بنو سہم کر پنکھا ڈھونڈنے لگی حالانکہ اس کا جی باہر پڑا تھا جہاں نیم تلے سب ریل ریل کھیل رہے تھے مگر آج کسی حکم سے انکار کرنا بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔

"بادل آ رہے ہیں..." باہر گلی میں کوئی لڑکا چلاتا ہوا بھاگا۔

منہ کھولے ہانپتی ہوئی ایک چڑیا کمرے میں آئی اور چار سو پانی ڈھونڈ کر پھر باہر اڑ گئی مگر اس کے پروں کی ٹھنڈی ہوا بہت دیر تک سب کے چہروں پر تھپکتی رہی۔

"بنو آؤ بادل آ رہے ہیں" ریحانہ نے کواڑ کی اوٹ سے بنو کو پکارا۔ امجد کا غصہ اسے ابھی تک اندر آنے سے روکے ہوئے تھا۔

بنو نے پنکھا پھینکا اور باہر بھاگ گئی۔

کمرے میں خاموشی اور گہری ہو گئی۔ یوں بھی ذلت کے احساس

کر رہے تھے پہلے وہ سنا اب جیسے تو وہ پسینا اٹھا نظا کر پسینا دیکھ کر اماں بی پچھتانے لگیں۔ وہ بے چینی سے اس بات کی منتظر تھیں کہ امجد صفیہ کو طلاق دے تو وہ خوب اپنے جی کی بھڑاس نکالیں۔ امجد کی سات پشتوں کو ادھیڑ کے رکھ دیں۔ فرزانہ بھابی کہتی ہیں جانے امجد کے متعلق کیا کیا سوچ رہی تھی۔ صفیہ کی سسکیاں پھر بڑھ گئیں ساتھ ہی اس کی بھی بڑھ گیا سانس بھی گھٹتی جا رہی تھی اب تو سب اس کے وجود کو نظر انداز کر چکے تھے۔

"اماں بی آپ کے کپڑے اٹھا لاؤں؟" ریحانہ نے کواڑ کی آڑ سے پوچھا اسے دولہا بھائی کے سامنے بڑی شرم آتی تھی۔ اماں بی بھڑک پڑیں۔

"میرے کپڑے کو چھوتے تو ہاتھ توڑ دوں گی خبردار جو تو نے ہاتھ لگایا"

"اماں بی مینہ آ رہا ہے" فرزانہ نے جھک کر بادل دیکھنا چاہے اور پان تھالی میں رکھ کر اتنی دور سے امجد کو دیا جیسے وہ بھنگی ہو پھر دوپٹہ سنبھالتی ہوئی وہ باہر چلی گئی۔

"اے میری بڑیاں بھیگ جائیں گی" اماں بھی بھول بھال کے چپلیں اور کسی بچے کی جوتیاں انگوٹھوں میں اٹکا کے شڑپڑ کرتی ہوئی باہر چلی گئیں۔

"اسے بے پروا چل رہی ہے ضرور برسے گا۔ چلو باہر نکل کے بیٹھو" وہ خوشی خوشی اندر آ کے زبردستی صفیہ کو اٹھانے لگیں۔

"کوئی پلنگ اندر اٹھوا لیتا" فرزانہ باہر سے سوکھی مرچوں کی ٹوکری لئے ہوئے آئی تو ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا بھی اندر گھس آیا۔

"میں اٹھا لاؤں؟" امجد کو فرزانہ کے ساتھ کام کرنے کا نادر موقع مل گیا لیکن عورتوں سے پلنگ اٹھوانا تو مردانگی کی ہتک تھی لہذا اکیلے ہی سارے پلنگ اندر ڈھونا پڑے۔ اماں جھوٹ موٹ منع کرتی رہ گئیں فرزانہ کو تو بارش نے جیسے پر لگا دیئے تھے۔ بلا وجہ وہ مینہ میں بھیگتی پھر رہی تھی کبھی خربوزے کے بیج دیوار پر سے اٹھانا یاد آتے کبھی ریحان کی قمیض بھول جاتی یا پھر ہمسائے کے پاس کوئی ضروری کام یاد آ جاتا اور وہ خواہ مخواہ چکر کاٹتی پھرتی آنگن میں دوڑنے لگی۔

ٹھنڈی ٹھنڈی بوندیں اس کے گرم بدن پر ایک لمحہ [illegible] کی ڈلی بن کر گرتیں پھر گرم ہو کر پگھل جاتیں۔ ہلکی ہلکی پھوار میں بچے خوشی کے مارے چیخ چیخ کر آنگن میں گھوم رہے تھے۔ صفیہ ابھی تک صحنچی میں بیٹھی سسک سسک کے جا رہی تھی۔ امجد دالان میں چھپا کھڑا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا اماں بی مرغوب دولت کا جائزہ لینے کی خاطر زبردستی اپنی خمیدہ کمر کو پلنگ کے

سہانے سہانے لگتے تھے۔ پانی کی بوندیں ٹھنڈی ہوتیں تو ان کی جلن کی ترنگ ٹوٹ جاتی تھی۔ ادھر امجد کو لیلیٰ نے مدد کر دیا تھا۔ کبھی وہ فرزانہ کو اسے لائی کبھی بچوں کو بھگانے پر اڑ گئیں۔ کبھی ٹوٹے کے بھیگے پتنگوں پر ان کا بکرا ہو اٹھتا۔ امجد منی پر گرتی ہوئی بوندوں کا کھیل دیکھنے میں غرق ہو چکا تھا۔

آس پاس اڑتے ہوئے پتنگوں کا انبار لگا تھا۔ بیٹیوں کے سرپ، بچھڑے، برے کے گھڑے اور دھک لگے دوپٹوں کی رنگینیاں چاروں طرف بکھری ہوئی تھیں۔

اماں بی سے بھی بجرے کو رستے سفنے کے بعد فرزانہ دوپٹہ کھینچتی ہوئی اندر آگئی پیچھے بھی اندر بھاگ آئے۔ مینہ کا زور بڑھ گیا۔ بجلی کی تیز ہوا کے جھونکے پانی کے ٹھنڈے چھپاکے اندر پھینک جاتے اور سب کو بے اختیار ہنسی آ جاتی تھی۔ پسینے میں بھیگے ہوئے گرم کپڑے اب ٹھنڈے ٹھنڈے لگ رہے تھے۔

پہلے مینہ کی سوندھی خوشبو سونگھنے کے لئے ابامیاں کا جی مچل اٹھا مگر اس وقت تو وہ ظہر کی نماز کے لئے بھی نہ اٹھ سکتے تھے ممکن تھا ان کی صورت دیکھ کر امجد کو اپنا ارادہ یاد آجائے۔

عینک لگا کے انہوں نے گم سم بیٹھے ہوئے امجد کو دیکھا پھر سسکیاں لیتی ہوئی صفیہ کو اور فضا کو ناہموار دیکھ کر پھر لیٹنا پڑا۔

”رم جھم مینہ برسے۔ پردیس میں رہنے والا میرا نی ملہار گھنگنانے لگا۔

”ان بن مورا جیارا ترسے۔“

فضول سے خیالوں سے چونک کر امجد نے دیکھا تو یہ ہے اتنی سی بات پر صفیہ کس بری طرح رو رو کر ہلکان ہو رہی تھی اگر طلاق دینا ہی ہے تو اتنی بھی بے رحمی کیوں؟

”فرزانہ اپنی آپا کو بھی باہر لاؤ۔ امجد تو بڑی گرمی ہے۔“ وہ بڑی شرمندگی سے بولا۔

اماں بی نے مسرت سے کنکنا کے اسے دیکھا۔ بزدل کہیں کا ہمت ہی نہ تھی کچھ کرنے کی۔ ادھر ان کی نماز کا وقت نکلا جا رہا تھا۔

بڑی دیر کی کشاکشی کے بعد دو آدمیوں کی بیٹا کھی بنا کے صفیہ زبردستی باہر لائی گئی۔ یوں جیسے ہاتھ پاؤں مفلوج ہو چکے ہوں۔ لڑکوں نے نئی دلہن کی طرح اس کی آؤ بھگت کی۔ امجد نے جلدی سے اٹھ کر پلنگ صاف کیا جہاں وہ خود بیٹھا ہوا تھا۔

رو رو کر صفیہ کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔ چہرے کا رنگ گلابی ہو رہا تھا۔ سسکیوں کے مارے اس کا سارا بدن ہل رہا تھا۔ آئی تو یوں آہیں بھرتی ہوئی بیٹھی رہی جیسے اس کے سلگتے ہوئے بدن کی آگ یہ بوندیں بھی نہ بجھا سکیں گی۔

اس کی صورت دیکھ کر امجد مجرموں کی طرح سہم گیا۔ اس وقت طلاق کا نام لینا صفیہ کو مار ڈالنا ہے۔ جیسے کہ وہ اللہ کی بارش کے ساتھ گھٹاؤں کی گرج تھی۔ پھر جھک کر بادلوں کا اندازہ لگایا اماں بی ہاتھ جھاڑتی ہوئی اندر جا کے ابامیاں کو اٹھانے لگیں۔

”تمہیں میری قسم ذرا باہر نکلو۔ بڑی ٹھنڈی ہوا ہے۔“ آج پہلا موقع تھا جب لڑائی کے بعد بیٹے میں انہوں نے پہل کی تھی۔

”اماں بیٹھک کی چھت ٹپک رہی ہے۔“ فرزانہ تیزی سے گھبرائی آئی اور پھر جانے کیا دیکھ کر بھی اندر جا بیٹھی۔

”تو یہ آؤ پرنالے کے نیچے نہائیں۔“ ریحان فرید سے صلح کرنے پر اب راضی ہو گیا۔

”مجھے مت ریلیو۔ اماں نالاٹ۔“ زینت نے بی بی کی دوستی کا ہاتھ جھٹک دیا اور کھڑے ہوئے پلنگ میں منہ اڑا کے آنگن میں ناچتی ہوئی بوندوں کا تماشہ دیکھنے لگی۔

کھڑکی کی گڑھی میں ٹھنڈ سے کانپتی ہوئی کبوتری جلا جلا کر کسی کو پکار رہی تھی۔ نہانے کے بعد گیلے پروں سے وہ نہیں اڑ سکتی تھی امجد صفیہ کے اور قریب ہو بیٹھا۔

”شرارت ہوئی! ابھی سنبھل جائے گا“ مگر صفیہ جواب دینے کی بجائے اور دور سرک کے بیٹھ گئی۔

”ذرا دیر بیٹھ جاؤ تو سارا گھر چوپٹ ہو جاتے۔“ اماں تنکتی چلاتی باہر آئیں۔

”چھت پہ دھان پھیلایا تھا سب غارت ہو گیا!“

”چلو جانے دو کونسی دولت لٹ جائے گی۔“ یہ ابامیاں کہہ رہے تھے جو ایک دانہ برباد ہوتے دیکھ کر تین تین دن لڑتے تھے۔

”بارش تھمتے ہی گھر چلو گی نا؟“ امجد نے جھک کر اتنے دھیمے لہجہ میں پوچھا کہ دور سے کان لگانے کے باوجود اماں بی کچھ نہ سن سکیں۔

”ابھی میں نے کہا منی ہو کہاں چلی گئیں؟“ اندر ابامیاں پکار رہے تھے۔

اپنی چمکتی ہوئی آنکھوں سے اماں بی نے فضا کا بغور جائزہ لیا اور سخت مایوس ہو گئیں۔ مینہ جلوت کی آگ بجھا چکا تھا۔

بڑی بیزاری کے ساتھ وہ نماز کے لئے اٹھیں۔

مینہ میں بھیگتا ہوا ایک کبوتر جانے کہاں سے کبوتری کی آواز پر کھنچا ہوا چلا آیا اور اس کے آس پاس گھوم گھوم کر تسلی دینے لگا۔ ●●

دوشیزہ ادبی معمہ ۱۹ میں بالکل درست حل دو نکلے

پہلا انعام دو لاکھ روپے دو خوش نصیبوں کے حصے میں آیا

صحیح حل دوشیزہ ادبی معمے نمبر ۱۹				
نمبر	صحیح حل	کتاب یا رسالہ	مصنف یا مترجم	صفحہ
۱	قیامت	پس دیوار زنداں	آغا شورش کاشمیری	۲۹۲
۲	دھڑکن	رنگ چمک چمک اٹھے	عزیز سلطانہ	۲۵۰
۳	گھائی	رنگ چمک چمک اٹھے	عزیز سلطانہ	۱۹۲
۴	ساخت	غلامی کی تسخیر	حبیب اللہ خان	۸۴
۵	[illegible]	[illegible]	[illegible]	۱۴۵
۶	بازی	جینا سیکھئے	ڈیل کارنیگی	۱۴۸
۷	گویائی	آوارہ راستہ	کرشن چندر	۱۲۵
۸	آوازیں	پس دیوار زنداں	آغا شورش کاشمیری	۲۹۳
۹	بہشت	کالی سوپ سے روشن سائے	رحمان شاہ عزیز	۳۰
۱۰	دل	ذکر یار چلے	مرزا ظفر الحسن	۱۴۴

فی کس ایک لاکھ روپے ادا کئے جائیں گے

انعام کی رقم بینک ڈرافٹ کے ذریعے ادا کی جائے گی!

حافظ حبیب الرحمن صاحب
البیب ۱۵۵، بلاک ۴ یونٹ نمبر (۶)
لطیف آباد، حیدر آباد

محمد انور بھٹی صاحب
مکان نمبر ۴/۲۲، محمد پورہ، گلی نمبر ۷
لائلپور

[illegible]

[illegible]

[illegible]

آپ کو سونا چاہیئے

یا

بینک ڈرافٹ

آپ کا فیصلہ یقیناً بینک ڈرافٹ کے حق میں ہوگا

برصغیر پاک و ہند میں

دوشیزہ ادبی معمے

واحد معمے ہیں جو
بینک ڈرافٹ کے ذریعے بڑے انعامات
کی ادائیگی کرتے ہیں
بینک ڈرافٹ ہر شک و شبہ سے پاک ہوتے ہیں

دوشیزہ ادبی معمہ نمبر ۱۹ میں

۹۰ ہزار کے بجائے ۳ لاکھ ۷۰ ہزار روپے
تقسیم کیئے جارہے ہیں

پہلا انعام ——— ۶۰ ہزار کے بجائے ۳ لاکھ روپیئے
دوسرا انعام ——— ۲۰ ہزار کے بجائے ۴۵ ہزار روپیئے
تیسرا انعام ——— ۱۰ ہزار کے بجائے ۲۵ ہزار روپیئے

ایک غلطی والے حلوں پر ۲۲۲/۶۰ روپے کی بجائے ۹۴/۱۳۵ روپے فی کس ادا کیئے گئے
دو غلطی والے حلوں پر ۲۵/۱۳ روپے کی بجائے ۱۲/۴۵ روپے فی کس ادا کیئے گئے

دیانت داری اور ایمانداری کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے

معمے کی آخری تاریخوں کا خیال رکھئے

آخری تاریخ گزرنے کے بعد موصول ہونے والے حل کسی قیمت پر مقابلے میں شامل نہیں کئے جائیں گے!

[illegible]

[illegible]

ذو غلطی کے ۲۰۰ حل موصول ہوئے جنہیں ٹیبل ۱ الف ۲

۱۰ [illegible] کی بجائے ۲۰ [illegible] کے حساب ۲۰ روپے فی حل دیا گیا

[illegible]

[illegible]

[illegible]

90,000 روپے [illegible]

[illegible]

دوسرا انعام ایک غلطی والے حل پر بیس ہزار روپے — **تیسرا انعام دو غلطی والے حل پر دس ہزار روپے**

[illegible]

[illegible]

دوشیزہ ادبی معمہ نمبر ۲۰

نمبر	اشارات	ممکن الفاظ			حل نمبر……	حل نمبر……	حل نمبر……
۱	کرۂ ارض کے مرکزی حصے ... مقام ... کے لیے یہ بات برداشت سے باہر تھی	یہودیوں	ہندوؤں	عیسائیوں			
۲	انسان جو کچھ ـــــ کرے سوچ سمجھ کر کرے	پابند	فیصلہ	ارادہ			
۳	لاکھوں افراد کی جو نسل سے ... ـــــ کی شکست ...	اپنوں	دشمنوں	[illegible]			
۴	سب سے بڑی ـــــ یہ تھی کہ کوئی عینی شہادت موجود نہ تھی۔	ہار	الجھن	جیت			
۵	جنسی بے راہ روی پر ـــــ پابندیاں لگا کر قابو نہیں پایا جا سکتا۔	معمولی	قانونی	معاشی			
۶	یہ رسم اب تک چلی آ رہی ہے اور ـــــ تک جاری رہے گی۔	برسوں	قیامت	صدیوں			
۷	جس ـــــ نے مالک سے غداری کی ہو اس سے کیا وفا کرے گا۔	مال	خادم	غلام			
۸	زندگی میں میں نے کئی ایک عظیم ـــــ مناظر دیکھے ہیں۔	اجتماعی	جذباتی	قدرتی			
۹	ایک ہی ـــــ کے ایک ہی مسئلے میں کئی کئی قول ملتے ہیں۔	فرقے	نسل	امام			
۱۰	تمہارے مشورے کے بغیر کوئی ـــــ طے نہیں کیا جائے گا۔	معاہدہ	مشورہ	معاملہ			

[illegible]

ڈاک سے اپنے حل اور فیس اس پتے پر بھیجئے

دوشیزہ ادبی معمہ نمبر ۲۰ ماہنامہ دوشیزہ پوسٹ بکس نمبر ... کراچی

نام و مکمل پتہ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ

تعداد حل ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ دستخط ـ ـ ـ ـ ـ

[illegible]

[illegible]

دوشیزہ ادبی معموں کے تمام اشاریے
اُردو کی مطبوعہ کتابوں اور رسالوں سے
لیے جاتے ہیں اس لئے کمپائلر کی [illegible]
قلابازیاں آپ کو انعام سے محروم نہیں
کرسکتیں!
آپ بے فکر ہو کر دوشیزہ ادبی معموں کے
مقابلے میں حصہ لیجئے!

۹۰ ہزار کے انعامات 90,000

دوسرا انعام ایک غلطی والے حل پر بیس ہزار روپے

تیسرا انعام دو غلطی والے حل پر دس ہزار روپے

[illegible]

[illegible]

دوشیزہ ادبی معمہ نمبر (۲)

نمبر	اشارات	ممکن الفاظ			حل نمبر	حل نمبر	حل نمبر .....
۱	[illegible]	شہرہ	شخصی	شہری			
۲	[illegible]	کنہیوں	برائیاں	خامیوں			
۳	[illegible]	نیک	حرکت	عزت			
۴	[illegible]	دادا	تجمیرا	ریتا			
۵	انسان کا اندرونی حصہ بجائے خود ایک ــــ ہے۔	دنیا	کارخانہ	خزانہ			
۶	[illegible] ــــ ہوتے ہیں۔	مطلبی	[illegible]	ہرجائی			
۷	[illegible]	سنگ مرمر	مٹی	پتھر			
۸	[illegible]	ہوا	فضا	ننگ			
۹	ــــ [illegible]	بچپن	سفر	کمپیوٹر			
۱۰	[illegible] ــــ ہے۔	لیڈر	سپاہی	پادری			

([illegible])

ٹکٹ لگا کر اپنے حل درج ذیل پتے پر بھیجئے

دوشیزہ ادبی معمہ ۲ [illegible]

نام مع مکمل پتہ ــــــــــــــــــــــ

تعداد حل ــــــــــ دستخط ــــــــــ

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کلیم کی آخری تاریخ ۷ فروری ۱۹۷۷ء

دوشیزہ ادبی معمہ ۱۹ کے انعام یافتگان کی مکمل
فہرست شائع کی جا رہی ہے۔ پہلے انعام کی خوشخبری تار کے ذریعے
پہنچا دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ [illegible] کے انعام
پانے والے خوش نصیبوں کو فرداً فرداً بذریعہ ڈاک اطلاع دی جا چکی ہے
اور اطلاع سے دو دن بعد انعامی رقم بھی ارسال کر دی گئی ہیں۔ [illegible]

[illegible]

[illegible]

دوشیزہ ادبی معمے اب آپ الگ الگ کوپنوں کے ساتھ بھیجے
ہوئے حل کا الگ الگ انعام حاصل کر سکتے ہیں چاہے حل ایک ہی نام اور
پتے سے کیوں نہ بھیجے گئے ہوں ۔۔۔ لیکن اس سہولت سے آپ اسی صورت
میں فائدہ اٹھا سکتے ہیں جب آپ دوشیزہ ادبی معمہ کی شرط نمبر ۲ کی پابندی کرتے
ہوئے ایک منی آرڈر یا پوسٹل آرڈر کے ذریعے [illegible]
[illegible] منی آرڈر یا پوسٹل آرڈر
کے ذریعے کوپنوں کے ساتھ آنے ہوئے [illegible] فیس نہیں بھیجی جاتی ہے تو وہ
زائد کوپن نظر انداز کر دیے جاتے ہیں اور صرف ایک ہی کوپن [illegible]

ٹوکن دوشیزہ ادبی معمہ نمبر ۲۱

دوشیزہ ادبی معموں کی شرائط میں نے پڑھ لی ہیں اور مجھے ہر شرط کا ایک ایک لفظ منظور ہے۔ منسلکہ حل شامل مقابلہ کر لیجیے۔ میں آپ کے ہر فیصلے کا پابند رہوں گا / گی۔

نام ______________

مقام و پتہ ______________

____

ٹوکن دوشیزہ ادبی معمہ نمبر ۲۱

دوشیزہ ادبی معموں کی شرائط میں نے پڑھ لی ہیں اور مجھے ہر شرط کا ایک ایک لفظ منظور ہے۔ منسلکہ حل شامل مقابلہ کر لیجیے۔ میں آپ کے ہر فیصلے کا پابند رہوں گا / گی۔

نام ______________

مقام و پتہ ______________

____

ٹوکن دوشیزہ ادبی معمہ نمبر ۲۱

دوشیزہ ادبی معموں کی شرائط میں نے پڑھ لی ہیں اور مجھے ہر شرط کا ایک ایک لفظ منظور ہے۔ منسلکہ حل شامل مقابلہ کر لیجیے۔ میں آپ کے ہر فیصلے کا پابند رہوں گا / گی۔

نام ______________

مقام و پتہ ______________

____

ٹوکن دوشیزہ ادبی معمہ نمبر ۲۱

دوشیزہ ادبی معموں کی شرائط میں نے پڑھ لی ہیں اور مجھے ہر شرط کا ایک ایک لفظ منظور ہے۔ منسلکہ حل شامل مقابلہ کر لیجیے۔ میں آپ کے ہر فیصلے کا پابند رہوں گا / گی۔

نام ______________

مقام و پتہ ______________

____







دوشیزہ



مئی ۱۹۷۷ء
جلد ۱۰ شمارہ ۵
فون ـ ۲۳۲۳۳۳
قیمت ۵/ روپیہ

بچے کے لئے ماں کا دودھ بہترین غذا ہے
اگر ماں کا دودھ میسر نہ ہو تو بچے کو
وِیٹا مِلک دیجئے



وِیٹا مِلک ـــ بچوں کے لئے
جلد حل ہو جانے والا مکمل غذائیت بخش مِلک فوڈ

بچے کے لئے ماں کا دودھ قدرتی طور پر بہترین غذا ہے۔ اس کے باوجود جب بھی ماں کے لئے اپنا دودھ پلانا ممکن نہ ہو اور اگر بوتل سے دودھ پلانے کی ضرورت ہو تو اس صورت میں ویٹا ملک ایک موزوں بدل ہے۔

مکمل غذائیت بخش ویٹا ملک بچوں کی نشوونما اور صحت کے لئے ضروری غذائی اجزاء ـــ پروٹین، کاربوہائیڈریٹ، فولاد اور وٹامن وغیرہ مہیا کرتا ہے۔

جلد حل ہو جانے کی وجہ سے ویٹا ملک تیار کرنا آسان ہے۔ اگر چاہیں تو مائیں ایک وقت میں ایک سے زیادہ خوراک تیار کر کے محفوظ رکھ سکتی ہیں۔

ویٹا ملک ـــ ۴۵۰ گرام کے ٹن میں دستیاب ہے۔

کوپن یہاں سے کاٹ کر اس پتہ پر بھیجئے

V 88

گلیکسو لیبارٹریز (پاکستان) لمیٹڈ
پوسٹ بکس ۳۷۴۲، کراچی ۲

براہِ مہربانی مجھے
ویٹا ملک کی کتاب مفت ارسال کیجئے
میں محصول و رجسٹرڈ ڈاک کے لئے
ایک روپے کے ٹکٹ بھیج رہا / رہی ہوں۔

نام ____________________

پتہ ____________________

____



GL-V.2-77

Asiatic

تاریخ

میں زخموں سے چور چور ہو گئی ہوں،
آخر یہ کس گناہ کی سزا ہے ——؟

میں اب بھی کہتی ہوں، درختوں کے سائے تاریخ کی فرحت خیز ہیں، دریاؤں کے پانی کی مٹھاس تاریخ بھی وہی ہے، [illegible] آنگن کے پیڑوں کے پیچھے سے چڑھتا چاند تاریخ کی مسکراہٹ ہے، لہلہاتے کھیت تاریخ کے نغمے الاپ رہے ہیں، پھر ——— پھر یہ کس گناہ کی سزا مل رہی ہے؟ مجھے کیوں زخمی کیا جا رہا ہے؟ [illegible] کے ساتھ کیوں پیٹا جا رہا ہے؟ [illegible] لہلہاتے کھیت آگ میں جلتے ہیں، [illegible] کے بچے بھوکے ہیں [illegible] گلیوں میں [illegible] گرتی ہیں [illegible] درختوں کے سائے سمٹ جاتے ہیں، دریاؤں کے پانی کی شیرینی کم ہو جاتی ہے، فضائیں غیر معطر ہو جاتی ہیں، آنگن کے پیڑوں کے پیچھے سے جھانکتا چاند چھپ جاتا ہے اور لہلہاتے کھیتوں کے نغمے چپ ہو جاتے ہیں ——؟؟

وہ گھر جو اداس ہو گئے ——
وہ گھر جو اجڑ گئے ——
وہ گھر جن کے چراغ بجھ گئے —— ان گھروں کی خوشی کا انتظام کون کر سکے گا؟ بہتے ہوئے آنسوؤں کو کون روک سکے گا —— جگر کے ٹکڑوں کو کون جوڑ سکے گا ——؟؟

حقائق سے روگردانی شرمندگی کا باعث ہوتی ہے، جذبات کے عدسے کبھی صحیح تاریخ مرتب نہیں کر سکتے۔ میں صرف اتنا پوچھنا چاہتی ہوں۔ پانی کو کبھی پہاڑوں پر چڑھتے دیکھا ہے؟ درخت سے ٹپکنے والے پھلوں کو آسمان کی سمت جاتے دیکھا ہے؟ سورج کو مغرب سے نکلتے اور زمین کی گردش کو ایک لمحے کے لیے رکتے دیکھا ہے؟ اگر جواب نفی میں ہے تو پھر جذبات کے آتش فشاں کو کیوں دہکایا جا رہا ہے؟

اگر تم زندہ قوموں کی صف میں اپنا نام لکھوانا چاہتے ہو تو اپنے مقدس وطن کی مقدس مٹی کو اپنے ہاتھوں میں لے کر حلف اٹھاؤ کہ اپنے ضمیر کو کبھی مرنے نہیں دو گے۔ قومیں مردہ ہو جاتی ہیں جن کے ضمیر زندہ نہیں ہوتے۔

میرے بچو! بے آرام رہنے سے تمہاری [illegible] دکھ میں اپنے شہر میں چاندنی کے تاروں کو جوڑے بیٹھی ہوں، [illegible] اپنے جذبات اور [illegible] الفاظ تم سے کہہ سکتی ہوں، میں اپنے پاس کچھ نہیں رکھتی، جو کچھ تم سے لیتی ہوں اسی طرح لٹا دیتی ہوں —— [illegible] گفتگو دوسروں کے تجربات سے اور سیاست سے [illegible] —— میں ——؟ میں کیا کہہ رہی ہوں، میں نے کبھی کسی کو معاف نہیں کیا ہے، کیا اب [illegible] کر سکے گی ——؟

کچھار کا شیر

شاہ بلیغ الدین

رستم اور فیروزان فارس کے دو بڑے آدمی تھے جو سلطنت کے سیاہ و سفید کے مالک تھے لیکن ان میں باہم اس قدر ان بن تھی کہ سلطنت عجم کی قوت پارہ پارہ ہو کر رہ گئی تھی۔ اہل فارس نے دیکھا کہ مسلمان کالی آندھی کی طرح آگے بڑھ رہے ہیں اور ہر روز نئی فتح ان کے قدم چوم رہی ہے تو دوست دشمن سب مل بیٹھے کہ فیروزان اور رستم ایک ہو جائیں۔ پوران دخت کو تخت سے اتار کر شاہی خاندان کے کسی مرد کے سر پر تاج رکھا جائے تاکہ سلطنت کی پرانی شان اور کھویا وقار واپس آ جائے۔ اس تصفیے کے بعد یزدجرد کو تخت پر بٹھا دیا گیا —— یہ یزدجرد سوم تھا۔

یزدجرد کے تخت پر بیٹھتے ہی اہل فارس نے اس کی اطاعت کا اعلان کیا اور مسلمانوں سے لڑنے کے لیے ان میں سے ہر ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر کوشش کرنے لگا۔ حیرہ، انبار، ابلہ اور بہت سے ایسے مقامات پر جہاں مسلمانوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ یزدجرد نے خاص ہدایات کے ساتھ اب اپنے آدمی بھیجے اور سلطنت عجم کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مسلمانوں کی دشمنی میں اہل فارس کا خون کھولنے لگا۔

حضرت مثنیٰؓ بن حارثہ نے یہ خبریں سنیں تو کچھ مجاہد آدمی ادھر ادھر پھیلے تھے۔ جب معلوم ہوا کہ یہ بات سچ ہے تو حضرت عمرؓ کو سارے واقعات لکھ بھیجے۔ ساتھ ہی اپنی یہ اطلاع بھی لکھی کہ اس عہد و پیمان کے بعد ہمارے فتح کیے ہوئے تمام علاقے ہاتھ سے نکلنے کو ہیں۔ سواد کے لوگ ابھی سے شورش پیدا کر رہے ہیں۔

مدینے سے جواب ملنے تک حضرت مثنیٰؓ اپنے کچھ دستے لے کر ذی قار آ گئے اور باقی فوج الطف میں ٹھہر گئی۔ حضرت عمرؓ نے فوراً جواب بھیجا کہ ——

اپنے دستے وہاں لے جاؤ جہاں آبادی اور دشمن کی سرحدیں ملتی ہیں۔ بعض پانی کے چشموں پر پھیل جاؤ اور قبیلہ ربیعہ اور مضر اور دوسرے دوست قبیلوں کے جو بہادر اور شہسوار ہوں انہیں اپنی فوج میں بھرتی کر لو!

حضرت مثنیٰؓ اس انتظام کے تھوڑے ہی دنوں بعد بیمار ہو کر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ افسوس کہ مسلمانوں کے ایسے ہی صاحب نظر اور بہادر شخص سپہ سالار نے وفات پائی۔

حضرت عمرؓ نے ان حالات کو بھانپ لیا تھا اس لیے جہاد عام کا اعلان فرما دیا —— حج سے فارغ ہوتے ہی حضرت

گویا باقاعدہ خلافت میں باقاعدہ کچھ عرصہ گزر چکا تھا لیکن ایرانیوں
کے مقابلے کے لیے مدینے سے کوچ کر رہے ہوتے۔ حضرت عثمان غنیؓ
حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ حضرت علیؓ اور بہت سے بزرگ صحابہ
ساتھ تھے۔ امیر المومنین کا ارادہ یہ نکلتا تھا کہ ہر مسلمان سرے کٹا دے
کہ ان کے پرچم تلے پہنچ گیا۔

مدینے سے تین میل دور جہاں نام چشمے پر پہلی منزل تھی ابھی
تک لوگ ایک دوسرے سے برابر پوچھتے تھے کہ کیا امیر المومنین خود
ہمارے سپہ سالار ہوں گے لیکن صحیح جواب کسی کو معلوم نہ تھا۔

تبوک کی مہم کے بعد یہ پہلا موقع آیا تھا کہ مسلمان ایک زبردست دشمن
کے مقابلے پر مدینے سے بہت دور جا رہے تھے اور مقابلہ وقت بڑے لشکر
تھا اس لیے اس مہم کی بڑی اہمیت تھی۔ مجاہد جب موقع پاتے حضرت
عثمانؓ سے یا حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ سے ضرور سوال کرتے کہ
امیر المومنین آگے چلیں گے یا نہیں۔ حضرت عثمانؓ خاص
تھے اور ابن عوفؓ غالباً حضرت عمرؓ کے سب سے زیادہ بے تکلف
دوست تھے۔ انہی سے صحیح بات کا علم ہو سکتا تھا چنانچہ مسلمانوں کے
مستقل اصرار پر حضرت عثمانؓ نے حضرت عمرؓ سے پوچھ ہی لیا کہ ــــــ

آپ نے اپنے بارے میں کیا طے کیا ہے۔ فوج کی قیادت
آپ خود فرمائیں گے یا اپنے بجائے کسی اور کو اس مہم کا سپہ سالار بنائیں گے؟

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ـــــــ

مسلمانوں کو نماز کے لیے جمع کر لیجیے۔ اس سوال کا جواب انہی
سے پوچھ لیتے ہیں۔

امت سے مشورے کی جب بھی ضرورت ہوتی تو حضور اکرمؐ
یہی کیا کرتے تھے۔ اسی پر شیخینؓ بھی عمل کرتے رہے۔

اعلان کے ساتھ ہی مسلمان جمع ہو گئے۔ بلکہ وہ سب الصلوٰۃ جامعہ میں
دکھا دیا گیا ایسا لگتی کہ دکھ سبھی کی تو فوج کا ہر مجاہد سب مل بیٹھے
اور امیر المومنین کی زبان سے ان کا فیصلہ سننے کا انتظار کرنے لگے۔

حضرت عمرؓ نے کھڑے ہو کر پہلے تو اللہ کی حمد و ثنا کی پھر
آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام بھیجا اس کے بعد اپنے
بھائیوں سے مخاطب ہو کر کچھ اس طرح باتیں کیں کہ ـــــــ

تمہارا اشتیاق و رغبت تمہارا جوش بجا ہے۔ میرا دل تو یہی چاہتا
ہے کہ میں اس جہاد میں شریک ہوں لیکن اس کا فیصلہ مجھے نہیں
کرانے دیجیے آؤ! ہم سب مل کر بیٹھیں اور سوچیں کہ کیا صورت ہو سکے
بہتر ہو سکتی ہے اہل اسلام اپنی نیک رائے پیش کرو۔ تمہاری

ہر مجاہد کی یہ بات کا جواب تھا —
ایک ایک مختار اپنی اپنی رائے پیش کرنے لگا، مجمع میں سے
میں سے کسی نے یہ بات کی کہ حضرت عمرؓ چلیں، امیر المومنین خود
کی قیادت کریں اس لیے طے پایا کہ حضرت عمرؓ کو بزرگ صحابہ
فوج کے مشورے کے بعد صائب رائے سے آگے بڑھیں گے
مشورے کے لیے بلایا جائے جب یہ بزرگ آئے تو ان کی رائے میں
بیٹھے ایک ایک بات پر غور کیا گیا تفصیل بتائی گئی ـــــ

امیر المومنین کا یہاں جنگ میں جانا مناسب نہیں فوج کی
قیادت کسی بزرگ صحابی کو تفویض کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔

حضرت عمرؓ نے عوام کے مشورے کے بعد جو خواص وقت سے
واسطے پوچھی تھی بات معلوم ہوئی تو آپ نے اسی وقت پھر سارے مسلمانوں
کو جمع کیا اور فرمایا کہ ـــــــ

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو مذہبِ اسلام پر جمع کیا ہے ان کے
دلوں میں الفت پیدا کی ہے اور ایک دوسرے کو بھائی بھائی بنایا ہے۔
مسلمان گویا آپس میں ایک جسم ہیں۔ جس طرح جسم کے ایک حصے کو تکلیف
ہوتی ہے تو جسم کا دوسرا حصہ اس تکلیف کو محسوس کرتا ہے مسلمانوں
پر فرض ہے کہ وہ اپنے معاملات ایک دوسرے کے مشورے سے طے
کریں۔ ملت کے معاملات بہتر جو ہیں سمجھنے والوں نے مجھے وہاں جانے
سے روک دیا ہے اس لیے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ خود جانے کے بجائے
اس جنگ کے لیے مسلمانوں کا سپہ سالار کسی اور کو بنا دوں۔

سوال یہ تھا کہ اسلامی لشکر کا سپہ سالار کسے بنایا جائے سوال
بہت اہم تھا اور بڑے سوچ بچار کے بعد فیصلہ کرنے کی ضرورت تھی۔
یہ بحث ابھی ہو ہی رہی تھی کہ امیر المومنین کے نام ایک قاصد پہنچا جو
سعد بن ابی وقاصؓ کا پیغام لایا تھا۔

حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ ـــــ کیا پیغام لایا ہے؟

معلوم ہوا کہ اطلاع آئی ہے کہ ـــــ

ایک ہزار جنگجو اور بہادر سواروں کی جمعیت جہاد کے لیے
تیار ہے۔ بتائیے کہ ان بہادروں کو کہاں بھیجا جائے؟

یہ سنتا تھا کہ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے فرمایا ـــــ

ہم نے اپنا سپہ سالار پا لیا۔

حضرت عمرؓ نے پوچھا ـــــ وہ کون؟

ابن عوفؓ بولے ـــــ کچھار کا شیر ابن ابی وقاص!

وقت نے انتخاب کی تائید کی اور سعد بن ابی وقاص بانیٔ

دوشین

جاتے گئے۔ انہیں مسلمانوں کے لشکر کا سپہ سالار مقرر کیا گیا ــــــ
مگر اک ولولۂ تازہ دیا سب کے دلوں کو!

عجم کی سلطنت عظیم الشان سہی اس کے وسائل بے پناہ سہی لیکن حضرت سعدؓ کا لشکران سرفروشوں کا لشکر تھا جو اپنے لیے نہیں اپنی شان و شوکت کے لیے نہیں صرف اللہ کے نام کو اونچا رکھنے کے لیے بڑی سے بڑی قوت کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ اس میں ستر سے کچھ اوپر بدر کے مجاہد تھے۔ تین سو سے زیادہ بیعت رضوان کے سعادت مند اور تین سو کے لگ بھگ ہی فتح مکہ کے مجاہد جو جید صحابہ کرام شامل تھے اور سات سو لیسے جو صحابہ کی اولاد تھے۔ کل لشکر کی تعداد قادسیہ پہنچنے کے بعد تیس ہزار ہو گئی تھی۔ مقابلہ ایک لاکھ بیس ہزار سے تھا بلکہ تعداد اس سے بھی کچھ زیادہ ہی تھی۔ عجمی لشکر کی کمان اس مرتبہ خود رستم کر رہا تھا۔ شاہان کسریٰ کا وزیر جنگ! سلطنت عجم کی افواج قاہرہ کا سالار اعلیٰ! جس کے سر پر تاج امارت رکھا گیا تھا۔ مدینے اور قادسیہ کے درمیان کوئی سات سو میل کا فاصلہ تھا۔

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ قادسیہ کی جنگ کے لیے چلے تو مسلمانوں کے سروں پر خیر و برکت کا سایہ تھا۔ سترہ برس کی عمر میں انہوں نے اسلام قبول کیا۔ وہ ان ابتدائی مسلمانوں میں سے تھے جو سابقون الاولون اور عشرہ مبشرہ میں گنے جاتے تھے۔ خود فرماتے تھے کہ ــــــ
میں نے اس وقت اسلام قبول کیا تھا جب اللہ نے نماز بھی فرض نہیں کی تھی۔ ایک سفر میں ہم پر ایسا بھی گزرا ہے کہ ہمیں ترا اسلام تھا

حضرت سعد مجاہد ہونے کے ساتھ ساتھ رقیق القلب بھی تھے اور حضور اکرمؐ کے ایک طرح ماموں ہوتے تھے ــــــ بہادر سپاہی، بڑے شہسوار اور ماہر ہونے تیر انداز!

جنگ احد میں پانسا پلٹا۔ کافر حضور اکرمؐ کو نشانہ بنانے آگے بڑھے۔ ابن قمیئہ نے حضور پر قاتلانہ حملہ کیا تو جو صحابہ کرام آنحضرت صلعم کے دائیں بائیں لڑ رہے تھے ان میں حضرت سعدؓ بن ابی وقاص پیش پیش تھے۔ اور اپنی بے پناہ تیر اندازی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ کوئی اس وقت حضرت سعدؓ کی خوش قسمتی کو دیکھتا۔ سرورِ کونینؐ خود ترکش سے ایک ایک تیر نکال کر سعدؓ کو دیتے اور فرماتے کہ ــــــ

سعدؓ! میرے ماں باپ تم پر فدا ہوں اسی طرح تیر چلاتے رہو!
مگر یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

بدر، احد، خندق، حدیبیہ، خیبر، فتح مکہ اور دوسرے معرکوں میں سعدؓ ہمیشہ ذات رسالتؐ پر پروانہ وار فدا ہوتے رہے۔ وادی رابغ میں ابوسفیان کی جنگی ٹولی کا منہ صرف ایک تیر نے موڑ دیا تھا اور یہ تیر حضرت سعدؓ کی کمان سے نکلا تھا۔ اللہ کی راہ میں یہ پہلا تیر تھا جو مسلمانوں کی طرف سے چلایا گیا۔

آپ کے نفسیاتی اور گھریلو مسائل

نہ جانے کتنے گھر چھوٹے چھوٹے گھریلو مسائل کے سبب اُجڑ جاتے ہیں اور نہ جانے کتنی زندگیاں چھوٹی چھوٹی نفسیاتی الجھنوں کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔

ہم میں سے بیشتر لوگ نہیں جانتے کہ خود ہمارے اندر ایسی صلاحیتیں موجود ہیں جنھیں بروئے کار لا کر ہر قسم کی پریشانیوں پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

ہم یہ اعلان کرنے میں دلی مسرت محسوس کرتے ہیں کہ ملک کے ایک نامور ماہر نفسیات نے ہماری درخواست پر "دوشیزہ" کے صفحات پہ ان خواتین و حضرات کو مفید مشورے دینے کا وعدہ کر لیا ہے جو نفسیاتی یا گھریلو الجھنوں سے پریشان ہیں۔ یہ سلسلہ آئندہ شمارے سے دوبارہ شروع کر دیا جائے گا۔ آپ اپنے مسائل ہمیں لکھ بھیجیں۔ لیکن اس ضمن میں چند باتوں کا ضرور خیال رکھیں، (۱) اپنے خطوط میں صرف ضروری باتیں لکھیں غیر ضروری باتیں لکھ کر خط کو ہرگز طول نہ دیں، (۲) تحریر صاف اور خوشخط ہو۔ کاغذ کے صرف ایک طرف لکھیں۔

فیصلہ

شہزادی طرطینہ کو حاصل کرنے کے لیے وہ دو برس تک انگاروں پر تڑپتا رہا اور جب وہ اسے مل گئی تو اس نے ایک ایسا عجیب و غریب فیصلہ کر ڈالا جس پر تاریخ آج تک حیران ہے؟

منوہر نوری

ف اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ پھیلتی جا رہی تھی غروب ہوتا آفتاب ابھرتے ہوئے ماہتاب کے نظروں بچا کر ہوا تیزی سے مجلہ مغرب کی طرف رواں تھا۔ عروج و زوال کے اس کرب ناک منظر کی تاب نہ لا کر دریائے فرات کا پانی فرطِ غم سے کناروں سے ٹکرا رہا تھا۔ موجیں بل کھاتی ایک دوسری سے ٹکراتی ہوئی مبہم سا شور پیدا کر رہی تھیں۔ ایسے میں دریا کے کنارے کنارے ایک شہسوار گھوڑے پر تجسس نظریں ڈالتا ہوا سفر کر رہا تھا۔ آفتاب کی روشنی سے زیادہ روشن چہرہ، رنگ پر سنجیدگی، بہادری اور جرأت مندی کا عجیب سا رنگ اور آنکھوں میں ذہانت کے ساتھ ساتھ ایک عزم و فیصلہ کرکے عمل کر دینے کی قوت کا عکس۔ یہ شاپور ذوالاکتاف تھا۔ ایران کا نوجوان تاجدار جس کے حسن و جمال کا مقابلہ ایران کا کوئی مرد نہ کر سکتا تھا۔ جو ناممکن کام کو انجام دینے اور ناقابلِ تسخیر قوت کو بآسانی تسخیر کرنے کی غیر معمولی قوت رکھتا تھا۔ جس کے بارے میں مشہور ہو چکا تھا کہ ایران کے سابقہ تمام شہنشاہوں سے بڑھ کر فطرت کا مالک ہے اس زمانہ کا عام دستور تھا کہ سرحدی ساتھیوں یا تاجروں کے لباس میں مختلف علاقوں کا گشت لگا کر اپنے بارے میں معلوم کیا کرتے تھے اور ان کے حالات معلوم کرتا تھا کہ اگر کسی علاقہ میں اس کو مخالفت کا احساس ہو تو اسے بزورِ قوت کچل دے۔ یہ زمانہ نوشیرواں عادل سے پہلے کا وہ زمانہ تھا کہ جب عراق کے بہت سے سرحدی علاقے خود مختار تھے۔ انہیں سلطنتِ ایران میں شمار نہ کیا جاتا تھا۔ دریائے فرات کے کنارے قلعہ حضر بھی ایسا ہی ایک قلعہ تھا جس کا سردار ہمیشہ سے خود مختار سمجھا جاتا تھا۔ نہ اسے کسریٰ کو ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا اور نہ وہ کسی معاملہ میں جواب دہ ہوتا تھا اور دریا کے ادھر کا وسیع حصہ اس کی ملکیت تصور کیا جاتا تھا۔ ضیزن ساطرون اس قلعہ کا مالک تھا جس نے اس قلعہ کو اس طرز پر تعمیر کیا تھا کہ اب ساطرون کی حکومت قلعہ کی مضبوطی اور اس کی ناقابلِ تسخیر لیے اس سرحدی علاقہ میں ہی نہیں بلکہ ایران میں بھی ایک موضوع بن گئی۔ یہاں تک کہ اس علاقہ کے اردگرد کے حکمران ساطرون سے خوف محسوس کرنے لگے تھے اور کچھ سرپھرے دبے الفاظ میں کسریٰ کو مشورہ دیتے کہ ساطرون کو اطاعت پر مجبور کریں۔ شاید وہ اس کی طاقت نہ دیکھ سکے۔ مگر ساطرون کا نہ

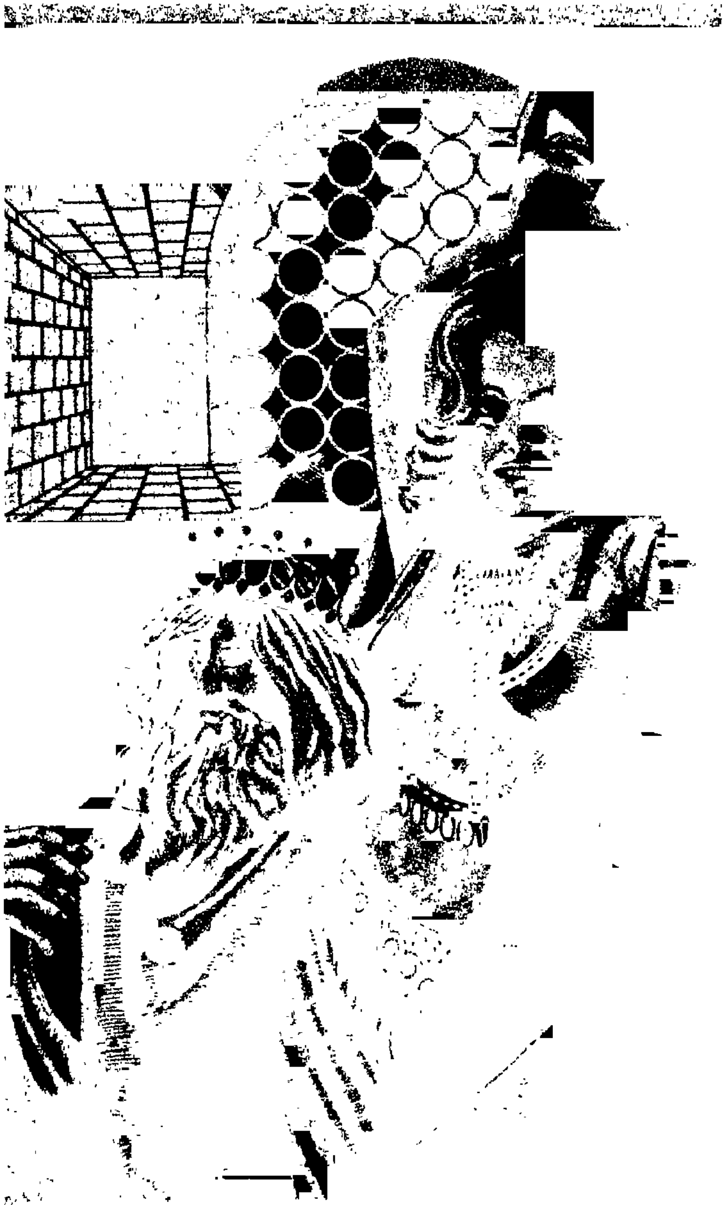
کسی کے معلوم کرنے سے غرض تھی بلکہ کسی سے بھی نہ تھی وہ تو محض اپنے
خود کی دنیا میں گم تھا۔

شاہ پور رسالہ دار اس شہر سے بلوچ سفری تھیلہ لٹکائے اپنے پہاڑی
گھوڑے پر سوار چلا جا رہا تھا اس وقت اس کے جسم پر جو لباس
تھا وہ لباس تھا ورنہ صاحب و غلام اس کے ہم رکاب تھے وہ ایک
علاقے میں کی ان سرحدی علاقوں کا جائزہ لینے نکلا تھا اس طرح اس علاقہ میں
آگیا تھا کوئی بھی اسے پہچان نہ سکتا تھا سامنے قلعہ حصار کی بلند و بالا
ناقابل تسخیر عمارت دعوت نظارہ دے رہی تھی۔ چند کوس کا سفر طے
کرنے کے بعد اس نے اچانک گھوڑا موڑا اور اس کچے راستے پر
ڈال دیا جہاں سے قلعہ کی طرف راستہ جاتا تھا مگر چند منٹ ہی گزرے
تھے کہ گھوڑے کے سرپٹ دوڑنے کی آواز نے اسے چونکا دیا تو اس
نے خیال کیا کہ شاید قلعہ کی طرف سے کوئی شہسوار [illegible] نکلا ہو مگر
دوسرے ہی لمحے نسوانی چیخ کی آواز نے اس خیال کی نفی کر دی۔ اسے
اندازہ کرنے میں مشکل نہ تھا کہ شہسوار کوئی عورت ہے مگر چیخ کی آواز
گھوڑے کی سرکشی اور سوار کی مجبوری کا اعلان کر رہی تھی۔

شاہ پور نے اپنا گھوڑا آواز کی سمت موڑا تاکہ اس چیخ و پکار
والے کو نیچے ٹیلوں پر آنے سے قبل ہی وہ اس گھوڑے کو
روک سکے اچانک اس نے دیکھا آبادی کی جانب سے ایک سیاہ
گھوڑے پر سوار ایک خوفزدہ سی لڑکی اس کی گردن کو مضبوطی سے تھامے
ایک وحشت زدہ انداز میں بے اختیاری طور پر چلا رہی ہے شاہ پور
نے یہ منظر دیکھا اور فوراً ہی وہ سمجھ گیا کہ گھوڑا لگام کی بندش سے
آزاد ہو کر پوری طرح سرکشی پر آمادہ ہے دوسرے ہی لمحے شاہ پور
نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور گھوڑے کے ساتھ ساتھ اپنا گھوڑا
دوڑانا شروع کر دیا اس کا مقصد یہ تھا کہ گھوڑے کو قابو کرنا نہیں
بلکہ گرتی ہوئی لڑکی کو سنبھال لینا تھا۔

لڑکی کی حالت ناگفتہ بہ تھی چیخیں کراہٹوں میں بدل گئی تھیں
چہرہ گھوڑے کی گردن کے بالوں میں چھپ گیا تھا اور اس کے اپنے
گیسو کھل گئے تھے اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اپنی جان
کو خطرے میں ڈال کر اسے گرنے سے بچائے لہٰذا چند منٹ کی دوڑ
کے بعد شاہ پور دوڑتے ہوئے گھوڑے سے اچھل کر اس سرکش گھوڑے
پر سوار ہو گیا شاہ پور نے ایک ہاتھ سے اس کی ٹوٹی ہوئی لگام تھام
لی پھر اپنی طاقتور رانوں کے دباؤ سے اسے قابو میں کرنے کی کوشش
کی اور دوسرے ہاتھ سے خوفزدہ لڑکی کو سہارا دیا جو بے ہوش ہو چلی تھی اس

کھو کر اس کے بازوؤں میں بے ہوش ہو گئی تھی۔
تھوڑی دیر بعد شدید جد و جہد کے بعد [illegible] شاہ پور اپنے
مقصد میں کامیاب ہو گیا گھوڑا آہستہ آہستہ سیدھے راستے پر آگیا [illegible]
ختم ہو چکا تھا شاہ پور نے [illegible] ایک محفوظ جگہ پر [illegible] جب
اس نے اپنے بازو کے حلقے میں جھولتی ہوئی بے ہوش لڑکی پر نظر ڈالی تو وہ
ششدر رہ گیا [illegible]
تھی سراپا حسن [illegible]
آنکھوں پر جھکی ہوئی سیاہ دراز پلکیں [illegible] ہوئی تھیں۔
چہرے کی رنگت خوف و دہشت کے باعث زرد ہو گئی تھی پیشانی
جبیں عرق آلود تھی اور چھوٹی چھوٹی منتشر لٹیں اس کے حسن میں اضافہ
کر رہی تھیں شاہ پور خود فراموشی کے عالم میں چند لمحے اسے دیکھتا
رہا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی اس وقت تک [illegible]
طور پر اس نے یہ کام محض ہمدردی کے تحت کیا تھا مگر اب اس کے
جذبات پہلو بدل رہے تھے تھوڑی دیر بعد [illegible]
حسین کو اپنے مضبوط بازوؤں پر سنبھالے گھوڑے سے اترا اور ایک
گوشے میں لے گیا یہ جگہ [illegible] فاصلہ پر تھی
[illegible] مسلسل سناٹا [illegible] فضا اس [illegible] آواز سے
گونج رہی تھی شاہ پور نے اپنے سفری تھیلے سے پانی کی چھاگل نکالی اور
اس کے منہ پر چھینٹے دیئے۔ تھوڑی دیر بعد لڑکی نے آہستہ سے اپنے
سر کو حرکت دی۔ اس کے لبوں سے آہ نکلی اور تنفس تیز ہو گیا۔ چند لمحے
بعد اس نے آنکھیں کھولیں خوبصورت سیاہ آنکھیں جن میں خوف و ہراس
کے سائے لہرا رہے تھے پھر فوراً ہی اس نے بند کر لیں شاہ پور کو یوں
محسوس ہوا جیسے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں بجلی کوندی ہو اور غائب ہو گئی ہو چند
ساعت بعد اس نے پھر آنکھیں کھولیں اور ہوش میں آتے ہی [illegible]
[illegible] شاہ پور نے پانی کے چند قطرے اس کے
منہ میں ٹپکائے [illegible]
شاہ پور پر مرکوز ہو گئیں [illegible]
[illegible]
شاہ پور نے کہا "آپ اپنی طبیعت سنبھالئے"
لڑکی [illegible]
[illegible] کوشش کرنے لگی۔
شاہ پور [illegible]
[illegible]



وہ آنکھیں جھپک جھپک کر دیکھ رہی تھی۔ ان آنکھوں میں شاہ پور کے لئے حیرت شامل بھی تھی اور مرعوب ہو جانے کا انداز بھی۔ وہ خود بھی بے خودی کے عالم میں اسے تک رہا تھا۔ اچانک لڑکی کی آنکھیں دو بے باک آنکھوں سے ٹکرائیں اور وہ گھبرا گئی۔ بولی

"میں آپ کی مشکور ہوں آپ نے میری جان بچائی ہے۔ کیا میں اپنے محسن کے بارے میں کچھ جان سکتی ہوں۔ ؟"

شاہ پور مسکرا کر بولا: "میرے بارے میں آپ کا اتنا ہی جان لینا کافی ہے کہ میں فرات کی دوسری جانب رہنے والا ایک تاجر ہوں اور اس علاقے میں اپنا مال فروخت کر کے واپس جا رہا تھا کہ ۔۔۔"

لڑکی نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا۔

شاہ پور نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ پھر قدرے توقف کے بعد بولا: "اب میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ میں کس سے ہم کلام ہوں۔ ؟"

اس سوال پر لڑکی نے شرما کر کہا: "میں قلعہ حضر کے حکمران ساطرون کی بیٹی ظرطونہ ہوں۔"

"او حضر کی شہزادی ؟" شاہ پور نے اسے دلچسپی کے انداز میں دیکھا۔ "میں نے اس قلعہ اور قلعہ دار کی عظمت کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے۔ نہ صرف سرحدی علاقوں میں بلکہ ایران تک یہ بات مشہور ہے کہ ساطرون اور اس کا قلعہ ناقابل تسخیر ہے۔"

یہ سن کر ظرطونہ فخر سے مسکرائی۔ "مجھے فخر ہے کہ میرے بابا جان وہ سردار ہیں جنہیں ابھی تک کوئی کسریٰ اطاعت پر مجبور نہ کر سکا۔ شہنشاہ قلعہ حضر کو ایرانی سلطنت میں شامل کرنا چاہتا ہے۔ مگر کوئی بابا جان کو جھکنے پر مجبور نہیں کر سکا۔"

شاہ پور قائل ہونے جیسے انداز میں مسکرا دیا۔ شہزادی کا فخر بجا تھا۔ ساطرون واقعی ایک آہنی انسان تھا جسے کوئی قوت زیر نہ کر سکی تھی۔ اس نے بات بدلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"شہزادی کیا آپ یہ بتانا پسند فرمائیں گی کہ اس گھوڑے پر سوار ہو کر آپ قلعہ سے باہر تشریف کیوں لائیں کیا آپ کو علم نہیں کہ اس نسل کا گھوڑا بڑا سرکش ہوتا ہے۔ ؟"

"معزز تاجر!" شہزادی نے جواب دیا: "میں ہر شام اپنی بگھی میں بیٹھ کر فرات کے کنارے سیر کے لئے آتی ہوں ہمیشہ سہیلیاں، کنیزیں اور خدام بھی ساتھ ہوتے ہیں مگر اب میں نے باقاعدہ شہسواری سیکھی ہے۔ گھوڑا ابا جان کا ہے۔ آج شام میں اس پر سوار ہو کر تنہا ہی آ گئی کہ ایک دم اس کی لگام ٹوٹ گئی۔"

"مگر آپ کے بابا جان نے آپ کو روکا نہیں؟" شاہ پور نے تعجب سے دیکھا۔

"میں ان کی لاعلمی میں آئی تھی۔" شہزادی نے کہا۔ "ویسے حقیقت یہ ہے کہ اس گھوڑے کو لگام کے سوا کوئی قابو نہیں کر سکتا۔ نجانے آپ نے کس طرح اسے روکا۔"

شاہ پور چند لمحے اشتیاق سے تکتا رہا پھر بولا۔

"شہزادی اگر ایک گزارش کروں تو قبول فرمائیں گی ؟" شہزادی نے سوالیہ انداز میں دیکھا اور اس نے کہا۔

"بس اتنی گزارش ہے کہ آئندہ اس زندگی کو خطرے میں نہ ڈالئے۔"

یہ سن کر شہزادی ظرطونہ کا دل مسرت سے معمور ہو گیا۔ خوشی اور حجاب کا ملا جلا رنگ رخسار کو گلگوں بنا رہا تھا اور شاہ پور اسے بغور دیکھ رہا تھا۔

شام گہری ہو رہی تھی آفتاب اپنی تمام رنگینیاں ابھرتی شام پر نثار کر کے دم توڑ رہا تھا اور اب شاہ پور شہزادی کو قلعہ حضر کے پھاٹک تک چھوڑ کر واپس لوٹ رہا تھا مگر اس کا تصور نہ جانے کہاں تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اپنا سب کچھ ان انجانی راہوں میں چھوڑ چلا ہے۔ پھر اس نے دریا کے کنارے اپنے گھوڑے کی رفتار کم کی اور جیسے فرات کی لہروں کو مخاطب کر کے بڑے عزم سے کہا۔

"تم گواہ رہنا۔ شاہ پور آج اس قلعہ اور اس کی شہزادی کو فتح کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے۔ ساطرون جیسا آہنی انسان کو جسے کوئی کسریٰ جھکنے پر مجبور نہ کر سکا شاہ پور جھکائے گا۔"

6

آج شہزادی ظرطونہ کو خبر نہ تھی کہ شب کب ڈھلی اور کب تمام ہو گئی۔ وہ آج خلاف معمول اپنی خوابگاہ کے عقبی چمن میں رات بھر ٹہلتی رہی۔ کبھی ٹہلنے لگتی کبھی حوض کے کنارے سنگ مرمر کی بنچ پر بیٹھ جاتی۔ اس کا بھرا بھرا انداز اس بات کا گواہ تھا کہ وہ بری طرح پریشان ہے۔

وہ ایک ہی تصور میں گم تھی۔ ایک مضبوط و توانا جسم، ذہین و دوربین آنکھیں۔ وہ بے ہوش ہوتے ہوتے کسی کے سینے سے چمٹ گئی تھی اور جب اسے ہوش آیا تھا تو وہ اس پر جھکا ہوا ہوش میں آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں تردد اور پریشانی تھی اور جس محویت سے اس نے اسے دیکھا تھا وہ دیکھتی رہ گئی تھی۔ اس کی شخصیت میں کتنا جادو تھا اس کے انداز میں ایک تمکنت و وقار تھا اور اس کی آواز میں ایک دلفریب شائستگی تھی۔

شہزادی جتنا تصور سے اس وقت بھی اس کی نگاہوں میں

والہانہ پن سے دیکھ رہی تھی جس سے خوشبو آتی جا رہی تھی۔
اس سال تھوڑی دیر سے گزرے تھے۔ وہ خوشبو دن بھر اپنے
چمن میں محمل کر گزارتی تھی۔ تمام وقت اسی طرح بے قراری میں رہتی۔ ہر
شام وہ دریائے فرات کے کنارے سیر کو جاتی مگر وہ تاجر جو اس کا اسپ
لے کر گیا تھا، وہ پھر اس کا دیدار نہ کر سکی۔ کبھی وہ تھوڑی دیر کے بعد تک
اسے باہر دور تک کا انتظار کرتی کہ شاید کوئی شہسوار نظر آئے شاید کوئی
غیر معمولی بہادر گھوڑا دوڑاتا ہوا ادھر آ نکلے مگر ایسا نہ ہوا۔
تھوڑی دیر میں صبح ہونے والی تھی۔ نسیم سحر کے خوشگوار جھونکے
بڑے فرحت بخش تھے۔ ستارے دزدیدہ نگاہوں سے دنیا کو دیکھتے ہوئے
رخصت ہو رہے تھے اور چاند شاید شہسوار مشرق کی آمد کے خیال سے
بڑی تیزی سے دوڑ رہا تھا لیکن شہزادی کو تو جیسے اس کا
احساس ہی نہ تھا۔ اسے خواب چند دن سے طلوع صبح کا نہیں صرف
دریائے فرات کے کنارے ایک قوی ہیکل شہسوار کا خیال پریشان
کرتا تھا تو ایک تاجر اور اس کے خیال میں شہزادی بے خود ہوتی جا
رہی تھی۔ اسے نہ وقت گزرنے کا احساس تھا نہ یہ خبر کہ سوسن اس کی
کنیز اور رازدار بھی کب سے کھڑی دیکھ رہی ہے۔ مگر یہ خیال
میں ڈوبتے ڈوبتے وہ ایک موڑ پر پہنچی تو بری طرح ٹھٹک گئی۔ "سوسن تم ہو؟"
"جی شہزادی!" سوسن نے احترام سے کہا: "آقا ناشتہ پر
آپ کے منتظر ہیں۔"
یہ سن کر شہزادی چونک گئی۔ اس نے دیکھا کہ صبح ہو چکی تھی وہ
چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی اپنی خوابگاہ میں داخل ہو گئی جہاں
مشاطہ منتظر تھی کہ اسے ناشتہ کے لئے تیار کرے۔
اس دن طعام خانہ میں تھوڑی دیر کے خود مختار سردار ساطرون نے
اپنی بیٹی سے پوچھا۔
"عزیز قرطوسہ! ہمیں یہ اطلاع ملی ہے کہ فرات کے کنارے تمہارا
گھوڑا بدک گیا تھا تب ایک تاجر نے تمہاری جان بچائی کیا یہ صحیح ہے؟"
شہزادی چونک پڑی کہ جس خبر کو اس نے چھپایا تھا وہ عام ہو
گئی تھی، اس نے خود کو سنبھالا اور کہا۔
"آپ نے صحیح سنا ہے بابا جان! ہم معافی چاہتے ہیں کہ آپ
کی لاعلمی میں آپ کا خاص گھوڑا لے گئے تھے کیا آپ ہمیں معاف
کر دیں گے۔"
ساطرون نے انتہائی شفیق لہجہ میں کہا: "بیٹی! ہم نے تمہیں معاف
کر دیا مگر ہم یہ جاننا چاہیں گے کہ آخر تم نے حادثہ کے بارے میں ہم

[illegible]

ارسطو سے شاگرد سکندر اعظم کی موت پر کہا
کہ جن کے انتظار میں بیٹھا تھا کہ شاہی محل سے
خبر آئے کہ عظیم فاتح سکندر اعظم نے موت کے بعد
وفات پائی۔ ارسطو نے سر جھکایا، شاہی
ہرکارے سے کہا: "سکندر اعظم کو میں نے بہت قریب
سے دیکھا ہے۔ اس کی زندگی اور کلام میں ہم انسانوں
کے لیے نہایت قیمتی سبق موجود ہیں۔"
ارسطو نے سر اوپر اٹھایا اور کہا: "تم نے غلط
بات کی۔ اس طرح کہو کہ سکندر کا سکوت اس کے
کلام اور اس کے کلام سے زیادہ سبق آموز ہے۔"

نے ہمیں کیوں نہ بتایا؟"
قرطوسہ نے کہا: "بابا جان! ہم آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتے
تھے۔ پھر ہمیں کوئی چوٹ بھی تو نہیں آئی!" اس جواب پر ساطرون کچھ
کو تجسس دور کرنے کے لئے اس نے پوچھا۔
"کم از کم ہمیں یہ علم تو ہونا چاہیے کہ وہ کون بہادر تھا جس نے
اس گھوڑے کو قابو کر کے تمہاری جان بچائی تاکہ ہم اس کا شکریہ ادا
کر دیتے۔ احسان فراموشی ہم مجوسیوں کی شان نہیں!"
شہزادی نے اطمینان سے جواب دیا۔
"بابا جان! میں قصبے سے نکل کر چند کوس ہی گئی تھی کہ گھوڑے
کی لگام ٹوٹ گئی۔ وہ سرکش ہو کر دوڑا تو میں نے مدد کے لئے پکارنا شروع
کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے زور سے اس کی گردن پکڑلی۔ میں اپنی
جان بچانے کے لئے کوشش کر رہی تھی کہ میں نے محسوس کیا کوئی سوار
میرے ساتھ ساتھ گھوڑا دوڑا رہا ہے۔ مجھے کچھ ڈھارس بندھی مگر
گھوڑا اور تیز دوڑنے لگا۔ پھر بے ہوش ہوتے ہوتے میں نے محسوس
کیا کہ کوئی اسی گھوڑے پر سوار ہوا اور بے ہوش ہونے سے قبل اس نے
سنبھال لیا۔"
ساطرون نے حیرت سے سنا اور بولا: "وہ کوئی غیر معمولی
انسان ہوگا مگر تم نے غلطی کی کہ اسے اپنے ساتھ قلعہ میں نہ لائیں، ہم

اس کی بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے کہا "تاجر ہو تو ہم سے ملنے آتے ہیں
لگے ہوئے تھے اس طرف سے مال لے کر آنے والوں کی تجارتی سرگرمیاں رکی ہوئی تھیں
بغیر نہیں جاتا" شہزادی کوئی جواب دینے بھی نہ پائی تھی کہ اس کا قصہ پھر شروع ہو گیا۔
ہوا تھا وہ خود کو دنیا کے کنارے اسی مقام پر دیکھ رہا تھا [illegible]
خادم لے ... مہرجان اور دیگر عزیزوں کی نذر کی [illegible]
حسب دستور فرانس سالاروں نے سب عزیزوں کو طعام خانے میں [illegible]
کر لیا۔ سالاروں کی عادت تھی کہ کھانے کے وقت ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے ہوئے
دستر خوان پر ہی بیٹھا اور بڑی محبت سے اپنے کھانے میں شریک کرتا۔
اس نے قطعہ جس کو کوئی فرد ایسا نہ تھا جسے اس نے پوری محبت کے ساتھ کھایا نہ
کیا ہو، کاش وہ حاصل نہ ہوا ہو۔ اونچے سے اونچا اور ادنیٰ سے ادنیٰ ہر شخص
اس کے دستر خوان میں شامل ہونے کی سعادت حاصل کر چکا تھا۔
ادھر دستر خوان بچھتے ہی سالار مہرجان، فوج کا ایک اعلیٰ افسر
سو رہا تھا اور تمام امیر تاجر اور سب بہترین پوشاکوں میں ملبوس طرح طرح کی
طعام خانے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے جھک کر پہلے سالاروں کو اور پھر
شہزادی کو سلام کیا، پھر سالاروں کے اشارے پر بیٹھ گئے۔ اب وہ سب
باتیں کرتے ہوئے چو گفتگو کر رہے تھے، مہرجان نے کہا۔
"شہزادی حضور! سنا ہے کہ آپ کو کسی حادثے کا سامنا کرنا پڑا؟"
"ہاں! شہزادی نے بے دلی سے جواب دیا۔ "لیکن یہ ایک اتفاق
تھا۔ ہم با حفاظت گھوڑے سے گرے تھے۔"
"حیرت ہے!" سوداگر نے کہا۔ "سنا ہے کسی تاجر نے اسے قابو
کر لیا تو وہ کون بہادر تھا؟"
"ہم اسے نہیں جانتے۔ شہزادی کا گھوڑا بے قابو ہو جاتا تھا۔"
مہرجان نے کہا: "ہمارے علاقے میں تو کوئی تاجر ایسا دلیر نہیں
کہ اتنے سرکش گھوڑے پر سواری کر سکے۔"
یہ سن کر سالاروں نے کہا اور بولا: "مہرجان! ہماری بیٹی ایسی
پر سواری کا شوق ہے لہٰذا یہ دیکھ کر یہاں اتنا بہادر کوئی نہیں ہے" شہزادی
سوداگر حیرت سے شہزادی کو دیکھنے لگا۔ چند منٹ خاموشی کے بعد سالاروں
نے دھیرے سے کہا۔
"ہم نے ایک نئی اور عجیب خبر سنی ہے!" سوداگروں نے اس کی
طرف دیکھا تو وہ بولا۔
"ہم نے سنا ہے کہ ایران کا نیا تاجدار شاہ جو بڑے فتوحات اپنے
آباؤ اجداد کی طرح ایک عام سپاہی کے علاقے میں اپنی سلطنت کا جھنڈا
لگا رہا ہے اور قریب ہی ہمارے علاقوں کو سلطنت ایران میں شامل کرنے

کہ تمہیں بہت پسند آئے گا۔"
"جی ہاں!" مہرجان نے کہا۔ "لیکن حضور! ہمارے علاقے سے
کوئی تعلق نہیں کا اصل آدمی وہاں کے لوگوں کے لیے موافقت ہے۔ وہ دستور میں
صدیوں سے مقبول رہا ہے جب اس کا تعلق تاجر طبقے سے تھا تو مجھے
کوئی مشکل نہیں کہ ان کا اصول آج بھی مفید ہے۔ اس طرح شاید ہم سے
کرایا ہے کہ صدیوں کو اپنا اس کی جانب ہم کو کسی قسم کی خرابی نہیں کرے گا۔
میرا خیال ہے کہ سرحدی کو کبھی اس کا خیال نہیں آنا چاہیے۔"
"آ کیا بات صرف اتنی ہے؟" سوداگر نے کہا۔ "اگر نئی نئی تاجپوشی
ہوئی ہے اور وہ جوان ہے تو پھر ہمارا ایران کے ساتھ رشتہ ہوں گا۔ لیکن
وہ کبھی بھی نصیب سے بچ جائے گا۔ پھر زمانے کا یہ خیال ہے کہ وہ ستارہ کی
طرح چمکے گا اور اس کے حال میں پیدا ہو گی۔"
"میں آپ سے اتفاق نہیں کرتا۔" زال نے کہا۔ "میرا خیال ہے
کہ وہ ساتھ تمام شہزادوں سے مختلف ہے۔ اس قدر سے بھی آگے نکل
گئے۔" مہرجان نے کہا۔
"زال! کیا تم نے دیکھا ہے جو بات کہہ رہے ہو؟"
زال نے بڑے فخر سے کہا: "کسریٰ کا مقابلہ خاص طور پر شہزادی
جب تاج پوشی اور جشن کے دنوں میں ایران کے دار السلطنت میں تھا۔ اس
کی بدولت مجھے بھی کسریٰ کے دیدار کا موقع مل گیا۔ میرا خیال ہے وہ مگر
تاجداروں سے جدا ہے۔ فطرت کا مالک ہے۔ وہ لگتا ہے بالکل جوان ہے مگر
چہرے پر ایسا جلال اور ایسی سنجیدگی ہے کہ میں نے کبھی نہیں دیکھی۔"
"سنا ہے کہ تاج سر پر رکھتے ہی چہرے پر جلال آ گیا جاتا ہے۔"
سوداگر نے کہا۔ "میری آنکھوں نے بھی ایسے بادشاہوں کو دیکھا ہے جن کی
پرجلال صورت دیکھی ہے جن میں اس سے کم بات بھی ہے لیکن شکل کی تمیز نہ
تھی۔" مہرجان نے تائید کی اور اس سوداگر کو جواب دیا کہ زال سے دوستی رکھا
"درست! میری آنکھوں نے بھی ایسے بادشاہ نظر دیکھے ہیں
مگر یہ کسریٰ کی بات الگ ہے۔"
"سنا تو میں نے بھی یہی ہے۔" سالاروں کی جانب کا خاتمہ کیا
"کہ یہ کسریٰ شاید باصول حاکم ہے۔ مگر یہ عدد دستور ایران کی
پہلی تو نظر کا اثر ہی تک ہے اور ہمارے حالات پر قریب ہے۔"
"جی ہاں!" مہرجان نے کہا۔ "لیکن کی وہ سلطنت کی مدد تھی
جو عدالت اور حکمت سے اشرف رہا ہے جو ہمارا چلن داخل کر گئے ہیں۔"
"لیکن کوئی نئی بات نہیں۔" سوداگر نے کہا۔ "آج کل سب
ملکوں کے حاکم یہی کرتے ہیں اپنے علاقوں میں بیرونی نظام پاؤں تک گئے سے

دائیں جانب … اس کا ذکر … ہے

ناں نے بہت غور کیا کہ … کی شکل …

محفوظ ہیں۔ بھلا قیصر و کسریٰ کی سلطنت سے … کیسے …

دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہم ایران کے مالک ہیں؟

یہاں سالار … شہزادی … کے ساتھ … گفتگو …

طرف شہزادی کا … سوسن سے … پہلے … تھی۔

"سوسن! ماں نے تمہیں ایک ایسی بات بتائی تھی کہ …

عام کر دیا؟" ایرج نے کہا۔ سوسن نے … کیا۔

"شہزادی صاحبہ! ایرج نے آج … سے کہا تھا …

افواج … حکم دیا۔ … سے …

آ کر …

دوسری کا اندازہ نہیں کر سکتے؟"

سوسن کی صورت پر شہزادی … اور اس …

انداز … تھا۔

"تو اپنے مقابلے کی بات نہیں کہہ سکتی؟"

اس پر سوسن شرم و حیا سے … جس سے شہزادی کے

دل میں سوئی ہوئی کسی … بیدار ہو گئی۔

6

دربار کسریٰ کی شان و شوکت کا عالم عجیب تھا۔ شہنشاہی

مسند … تخت …

اس کا … تاج ایک سونے کی زنجیر سے … لٹکا

ہوا … جواہرات سے …

کا … برداشت نہ کر سکتا تھا …

کسریٰ کو اس کے وزن کا احساس نہ ہو۔

اس کے دائیں جانب ایران کا سب سے بڑا عالم … تھا۔

مذہب کا پیشوا … اس کے ساتھ …

اور دیگر … کی نشستیں تھیں …

…

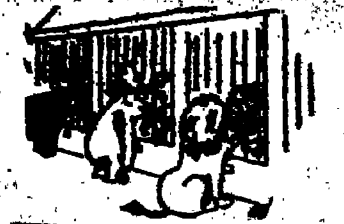
نشستیں تھیں … شاہی …

تھا اس کا … کسریٰ …

…

…

اس …



… تخت … شہزادی …

…

…

…

اپنے …

کی حیثیت …

…

…

ذی … کسریٰ کا …

…

…

…

…

…

… جب کسریٰ کے …

نے حکم دیا۔

…

…

…

…

… کسریٰ نے …

"… ذی …

… کیا۔

…

…

…

کے علاقوں کا خیال ہے کہ اب اس قلعہ کو کوئی تسخیر نہیں کر سکتا۔ وہاں کے عوام دل و جان سے ساطرون کو چاہتے ہیں۔"

یہ سن کر دربار پر سکوت طاری ہو گیا۔ کسریٰ نے متجسس نگاہوں سے عادیان کی طرف ایسے دیکھا جیسے رائے طلب کر رہا ہو۔

عادیان کھڑا ہوا اور بولا: "حضور! میں تو یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ سرحدی علاقے جس طرح بھی ممکن ہو سلطنت ایران میں شامل کر لینے چاہئیں خواہ انہیں فتح کر لیا جائے یا ان سے ٹیکس لیا جائے۔"

کسریٰ نے دوسری طرف دیکھا اور ہرمز کھڑا ہو گیا اور بولا۔

"عالیجاہ! میں بھی عادیان کا ہم خیال ہوں۔ سرحدی علاقوں کو چاہیے کہ آپ کی اطاعت قبول کریں۔" جب کسریٰ نے مشورہ طلب نظروں سے سپہ سالار اعلیٰ بازان کو دیکھا تو اس نے کھڑے ہو کر عرض کیا: "عالیجاہ! آپ تمام علاقوں پر نظر ڈالنے سے قبل قلعہ حضر کی طرف توجہ دیں۔ اگر یہ قلعہ اور اس کا سردار مطیع ہو گیا تو دوسرے علاقوں کا کوئی حاکم بھی سر نہ اٹھا سکے گا۔"

"ما بدولت اس مشورے سے بہت خوش ہیں!" کسریٰ نے کہا۔

"ما بدولت خود کافی عرصے سے یہی سوچ رہے ہیں کہ جس طرح بھی ممکن ہو سب سے پہلے قلعہ حضر کو فتح کر لیا جائے مگر اس کی صورت کیا ہو ما بدولت چاہتے ہیں کہ آپ لوگ اپنی اپنی رائے پیش کریں۔"

"عالی جاہ!" عادیان نے عرض کیا: "آپ حضر کے قلعہ دار کو پیغام بھیجیں کہ اطاعت قبول کر کے ٹیکس ادا کرے ورنہ اسے یہ بھی بتا دیا جائے کہ ایرانی فوج اس کے قلعہ کو فتح کرنے کی قوت رکھتی ہے۔"

"یہ صحیح ہے عالی جاہ!" سپہ سالار بازان نے کہا: "حضر کی فوج اور اس کا سپہ سالار کتنا ہی بہادر ہو ایرانی فوج کی برابری نہیں کر سکتا۔"

اس کی تائید تمام درباریوں نے کی لیکن کسریٰ کا مشیر خاص خاموش بیٹھا کسریٰ کو بغور دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا اور اس نے بصد احترام عرض کیا۔

"حضور! یہ غلام ایک مشورہ دینا چاہتا ہے اگر اجازت ہو تو عرض کرے۔"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو ذی زان؟" کسریٰ نے سوال کیا۔

"عالی جاہ! یہ ٹھیک ہے کہ آج تک کوئی فوج ایرانی بہادروں کا مقابلہ نہیں کر سکتی مگر یہ بھی مدنظر رکھنا چاہیے کہ قلعہ حضر کا قلعہ دار اپنے جلال کی وجہ سے آہنی انسان مشہور ہے لہٰذا ہمیں پہلے شریفانہ انداز میں گفتگو کا آغاز کرنا چاہیے۔" "مجھے سب اہل دربار سن رہے تھے" کسریٰ نے کہا: "اپنی بات کی وضاحت کرو۔"

ذی زان نے جواب دیا: "عالی جاہ! آپ حکم دیں تو ساطرون کے سامنے دو شرطیں پیش کریں، ایک یہ کہ وہ سلطنت کسریٰ کی اطاعت قبول کر کے باقاعدہ ٹیکس ادا کرے۔ دوسری شرط یہ ہو کہ حضور کے قرابت داروں میں شامل ہو کر خود مختاری کا اعزاز برقرار رکھے۔"

یہ سن کر شاہ پور زیر لب مسکرا دیا۔ ذی زان اس کے مزاج کو کس حد تک سمجھتا تھا اس کا صحیح اندازہ آج ہوا تھا۔ ابھی وہ کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ دوبارہ وزیر کھڑا ہوا اور عرض کیا۔

"عالی جاہ! ذی زان کا مشورہ بڑا صائب ہے۔ اس طرح دونوں ہی صورتوں میں قلعہ حضر ہماری سلطنت میں شامل ہو جائے گا۔" سپہ سالار بازان نے اس موقع پر خاموش رہنا مناسب نہ سمجھا اور بولا۔

"حضور! حقیقت یہ ہے کہ قلعہ حضر کی شہزادی صرف ایران کے تاجدار ہی کے قابل ہے۔ سرحدی علاقوں میں تو اس کے حسن کی شہرت گوشہ گوشہ میں پھیلی ہوئی ہے۔"

"عالی جاہ!" عادیان نے کہا: "اگر اس تعلق کے بعد ساطرون کے ادھر کا علاقہ اور سب سے مضبوط قلعہ سلطنت میں شامل ہو گیا تو پھر کسی حکمران سے جنگ کی نوبت نہ آئے گی بلکہ وہ خود ہی اطاعت کر لیں گے۔"

"لیکن اگر ساطرون نے یہ شرطیں ماننے سے انکار کر دیا؟" قارن نے خدشہ کا اظہار کیا۔

"تو ایران کے بہادر قلعہ حضر کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کی قوت رکھتے ہیں!" بازان نے فخر سے کہا۔

جواب چونکہ معقول تھا لہٰذا کوئی کچھ نہ بولا اور کسریٰ چند لمحے سنجیدگی سے سوچتا رہا پھر اس نے کہا۔

"ما بدولت تم سے متفق ہیں۔ ذی زان تمہارا مشورہ دانشمندانہ ہے۔ ہم ساطرون کو پہلے شرائط نامہ بھیجیں گے پھر دوسرا قدم اٹھائیں گے۔ ہم حکم دیتے ہیں کہ پانچ نہایت ذہین افراد پر مشتمل سفارتی وفد ذی زان کی قیادت میں ساطرون کے پاس جائے اور ہماری شرطیں پیش کرے۔

(۱) یا وہ شہزادی کو کسریٰ کے حوالے کر کے اپنی خود مختاری و حکمرانی برقرار رکھے۔

(۲) اور یا کسریٰ کی اطاعت قبول کر کے باقاعدہ ٹیکس ادا کرے۔

سرحدی علاقہ میں کسریٰ کی جانب سے ساطرون کی خدمت میں آنے والے سفیروں کی خبر عام ہو چکی تھی۔ سفراء ایران تیزی سے سفر کرتے ہوئے قلعہ حضر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اس زمانہ کا خاص دستور

تھا کہ سفیروں کے ساتھ سپاہیوں کا ایک دستہ بھی ایران سے آیا تھا جو دوسرے علاقوں تک جاکر اپنے سفیروں کی حفاظت کرتا ہوا گیا تھا۔ گلستہ زرق برق لباس پہنے قدم قدم پہ شاہی شان و شوکت سے دیکھنے والوں کو مرعوب کرتے تھے۔ دارالسلطنت کو پار کرکے یہ لوگ بڑی تیزروی سے قلعہ معز تک پہنچ گئے، یہاں ان کے پہنچنے سے قبل یہاں کی خبر پہنچ چکی تھی۔ ساطرون کا ایوان عہدیداروں اور معززین شہر سے بھرا ہوا تھا۔ شہر کو سفیروں کے شایانِ شان سجایا گیا تھا لیکن قلعہ کا ایوان اپنی شان و سجاوٹ کے لحاظ سے عجوبۂ روزگار تھا۔ ساطرون بہترین پوشاک اور قیمتی زیورات میں ملبوس تخت پر جلوہ افروز تھا۔ سوطاب، مہرجان، نزال اور دیگر عہدیدار اعلیٰ قدر و مراتب اپنی اپنی نشستوں پر براجمان تھے۔ مگر اتنے نفوس کی موجودگی کے باوجود ماحول پر سکوت طاری تھا۔

ایرانی سفیر اپنی شہنشاہیت کے زعم میں گھوڑے بڑھاتے آگے بڑھ رہے تھے، ان کے قیمتی ملبوسات ہیرے و یاقوت سے آراستہ تھے جو سورج کی روشنی میں چمک چمک کر آنکھوں میں خیرگی پیدا کر رہے تھے۔ قلعہ کے دروازے پر سپہ سالار اعلیٰ مہرجان نے آگے بڑھ کر ان کا شایانِ شان استقبال کیا۔ فوجی باجوں اور بینڈ کی دھن کے ساتھ انہیں خوش آمدید کہا گیا۔ پھر یہ دستہ اور پانچ سفیر دربارِ ساطرون میں لے جائے گئے۔ ساطرون نے حکم دیا۔

”معزز سفیروں اور ان کے ساتھیوں کی داڑھی اور ملبوسات پر مشک چھڑکا جائے۔“

حکم کی تعمیل کی گئی پھر ساطرون نے ان سے مخاطب ہو کر دریافت کیا۔

”ایران کے باعزت سفیرو! تمہارا قلعہ معز تک تشریف لانے کا مقصد کیا ہے؟“

یہ سن کر ذی زان ایک قدم آگے بڑھا اور کسریٰ کی مبالغہ آمیز تعریف کی اور ایران کی بے پناہ قوت و عظمت کا ذکر کیا اور پھر دو شرطوں پر مشتمل شرائط نامہ ساطرون کے سامنے پیش کر دیا۔ شرائط نامہ کا مسودہ کاغذ ایک خوبصورت سونے کی نلکی میں بند تھا۔ ساطرون نے نلکی کھولی، خوشبویات میں بسا ہوا کاغذ ہاتھ میں لیا اور مذہبی عالم علدیان کی طرف دیکھ کر مخاطب ہوا۔

”معزز علدیان! یہ شرائط نامہ پڑھ کر سنائیے۔“

علدیان اعلیٰ حاکم حضر کے روبرو جھکا، اس کے ہاتھ سے کاغذ لیا اور جب اس نے با آوازِ بلند ان شرطوں کو پڑھا تو ساطرون کے

حب الوطنی

قتل سے بے شک محبت ہے جب کہ غداری کی عزت مختصر ہوتی ہے۔ حب الوطنی اپنے وجود پر مصر ہوتی ہے اور اپنے غدار کی خواہشمند ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح جائز اولاد کو دیکھ کر ماں باپ مسرور ہوتے ہیں، لیکن ناجائز اولاد کو معدوم ہستی سے مٹانے یا چھپانے ہی میں عافیت سمجھی جاتی ہے۔

درباریوں کے چہروں کے رنگ بدل گئے۔ ان کا بس نہ چلتا تھا کہ آنے والے سفراء کے منہ نوچ لیں۔ مہرجان غصے سے مٹھیاں بھینچ رہا تھا۔ سوطاب اور نزال کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں اور معززین شہر توہین کے احساس سے اپنے ہونٹ کاٹ رہے تھے۔ پھر حواس باختہ سے اپنے سردار کو تک رہے تھے، جس کے چہرے پر سمندر جیسا سکوت تھا کوئی اندازہ نہ کرسکتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ ذی زان نے سب کے چہروں کو بغور دیکھا۔ مگر ساطرون نے دریافت کیا۔

”اگر یہ شرط ناقابل قبول ہو تو؟“

”معزز سردار!“ ذی زان نے برجستہ کہا ”اس صورت میں آپ کو کسریٰ کی اطاعت کرنی پڑے گی۔ حلفِ وفاداری اٹھانا ہوگا پھر باقاعدہ ٹیکس ادا کرنا پڑے گا۔“

”جو ٹیکس باجگزار ممالک ادا کرتے ہیں ان کی صورت کیا ہوتی ہے؟“ ساطرون نے دریافت کیا۔

”دولت اور عورت“ ذی زان نے بے تکلفانہ انداز میں جواب دیا۔

اس جواب پر سننے والوں کے چہرے توہین کے احساس سے سرخ ہو گئے۔ ساطرون کو بھی یہ بات بہت ناگوار گزری لیکن وہ نہ تو کم ظرف تھا نہ جذباتی۔ لہٰذا اس نے ایران کے معزز سفیروں کو حضر کے شاہی مہمان خانہ میں ٹھہرایا اور جواب دینے کے لئے ایک شب کی مہلت طلب کی۔

اس رات جبکہ دنیا خوابِ استراحت کے مزے لوٹ رہی تھی ساطرون کے محل کے ایک شاندار کمرے میں اعلیٰ عہدیدار اور معززین شہر کی محفل جمی ہوئی تھی۔ سپہ سالار اعلیٰ مہرجان، سوطاب، نزال،

بیجن اور داریان کے علاوہ قلعہ کے بہت سے اور لوگ بھی موجود تھے
یہ سب قلعہ خضر کے وہ معززین تھے جنہوں نے آنکھ کھولی تو اپنے علاقہ کو خود مختار پایا تھا اور جن کا سردار ایک شفیق باپ اور مہربان محافظ کی طرح ان کی دیکھ بھال کو اپنا فرض سمجھتا تھا اور جنہیں اپنی آزادی پر فخر اور اپنے سردار کی عظمت پہ ناز تھا۔ ساطرون کا اعلان شکست تھوڑ چالاک اور ہووم ہو جانے سے گرا جانے کی ہمت کا ثبوت دے رہا تھا اس لئے بجائے اس کے تمام معززین کو دیکھا جو اس کے خیر خواہ اور ہمدرد تھے اور اپنے علاقہ کے لئے جان دے دینے کے لئے تیار نظر آتے تھے احسن نے کہا۔

"معززین! میں نے ہمیشہ آپ سب کو اپنا خیر خواہ اور دوست پایا ہے اور اب بھی سمجھتا ہوں کہ آپ مجھے اپنے مشورہ سے نوازیں گے اگر صرف شہنشاہ کا معاملہ ہوتا تو میں ایرانی افواج کو گزشتہ دن ہی جواب دے دیتا مگر اب معاملہ ہمارے علاقہ کا ہے، زمین کا ہے اور اس کا مالک میں نہیں آپ سب ہیں۔ اگر آپ کسریٰ کی اطاعت کرنے میں خوش ہیں تو میں اس کی اطاعت کے لئے تیار ہوں اور اگر آپ اپنی زمین کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں تو یقین کریں کہ میں آپ سب سے پہلے تیار ہوں۔"

"معزز سردار!" مہربان کھڑا ہوا۔ "قلعہ خضر کا علاقہ صدیوں سے خود مختار رہا ہے اور اب بات صرف اتنی ہے کہ موجودہ کسریٰ اس علاقہ کی خود مختاری برداشت نہیں کر سکتا لہٰذا اس نے یہ چال چلی ہے۔" یہ کہہ کر وہ کھڑا ہوا۔

"معزز سردار! یہ بات ثابت ہو چکی کہ کسریٰ غیر معمولی قوت کا مالک ہے اور اس علاقہ کو فتح کرنے کے لئے کسی چال کی ضرورت نہ تھی۔ میں سمجھتا ہوں یہ کوئی اور بات ہے۔"

"میرا خیال ہے وہ آپ کو مرعوب کرنا چاہتا ہے۔" سوداب نے کہا۔

"میں کہتا ہوں" بیجن نے کہا "آخر دوسرے علاقے بھی تو کسریٰ کو ٹیکس ادا کرتے ہیں اور اپنے معاملات میں خود مختار ہیں۔ کیوں نہ ہم بھی اسی طرح اطاعت کر لیں تاکہ بات آگے نہ بڑھے کسریٰ سے جھگڑا ہماری دانشمندی نہیں ہے۔"

یہ سن کر مہربان کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا اس نے بیجن کی جانب دیکھا اور کہا۔

"بیجن! اطاعت کے بعد ٹیکس ادا کر کے بیٹھے گا
اطاعت کے بعد اس کی ہدایت پر ہمیں کبھی عزت کی صورت
عزت کا کوئی مطالبہ کیا جاتا تو بچا کر کیا تم برداشت کر سکتے ہو۔"

"ہرگز نہیں" بیجن نے کہا "بات سے انکار نہیں ہم ہرگز یہ نہیں کریں گے کہ قلعہ خضر کی عزت کسریٰ کے ہاتھوں لٹ جائے۔"
وہ ساطرون کی جانب جھکا اور معذرت آمیز لہجہ میں بولا۔

"آقا! اس مشورہ سے میرا مقصد ہرگز یہ نہ تھا مگر اب معزز نے مجھے احساس دلایا کہ اطاعت قبول کرنا ہماری ذلت ہے اب کسریٰ کے خلاف آواز اٹھانے میں پہل کرتا ہوں کہ ہم کسریٰ کی اطاعت نہ کریں گے اور مجھے امید ہے میری اس نادانی پر آپ مجھے معاف کر دیں گے۔"

"بیجن! مجھے تمہاری نیت پر جب بھی شک نہ تھا جب تم اطاعت کا مشورہ دے رہے تھے۔" ساطرون نے شفقت سے جواب دیا "تم تو قلعہ خضر کے کسی فرد کو بھی اتنا گرا ہوا نہیں سمجھتا کہ وہ ذلت برداشت کرے گا۔"

دیر تک گفتگو ہوتی رہی پھر معزز داریان کھڑا ہوا اور اس نے کہا۔

"آقا! آخر ہم آپ کی رائے جاننا چاہتے ہیں اور آپ کے ہر فیصلہ پر دل و جان سے عمل کرنے کے لئے تیار ہیں۔" ساطرون چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔

"صورت حال یہ ہے کہ اس پیغام کے بعد شہنشاہ کسریٰ کی زیر اطاعت میں رہنا صرف ہماری روایت کے خلاف ہے بلکہ ہماری توہین ہے دوسری شرط اس کی اطاعت قبول کرنا ہے لیکن اس کے بعد بھی کیا ضمانت ہے کہ ہماری عزت محفوظ رہے گی۔"

"آقا!" مہربان نے گفتگو میں حصہ لے کر کہا "ہم دونوں ہی صورتوں میں کسریٰ کی نیت پر بھروسہ نہیں کر سکتے اگر معاملہ صرف ہماری غلامی کا ہوتا تو ہم ہر طرح گزر کر لیتے لیکن جب معاملہ ہماری عزت کا ہے تو میں یقین دلاتا ہوں کہ اگر ہم نے اطاعت قبول کر لی تو ہماری بیٹیاں بھی شہزادوں کی صورت میں طلب کی جائیں گی لہٰذا میں کہتا ہوں کہ اہل قلعہ کی طرف سے آپ سفیروں کو جواب دے دیں کہ ہم ان کی دونوں میں سے کوئی شرط بھی منظور نہیں۔" ان چند فقروں نے قلعہ خضر کے معززین میں نئی روح پھونک دی اور وہ ہر قوت سے ٹکرانے کے لئے تیار نظر آنے لگے۔

اگلی صبح سے ساطرون نے ان علاقوں کی حفاظت

سے ملنے کے لیے [illegible] ہو رہا ہے۔

"مسعود: [illegible] ایران [illegible] مگر ساطرون بڑا عقلمند ہے لیکن یہ حقیقت نہیں ہے وہ اپنا علاقہ اور اپنی بیٹی دونوں میں سے کوئی چیز بھی آپ کے حوالے نہیں کرے گا اور اگر آپ جنگ پر آمادہ ہیں تو وہ بھی اپنے دفاع کے لئے تیار ہے۔"

6

رات کا وقت تھا خاموشی ہر چیز پر مسلط تھی مگر کسریٰ کے قصر میں تیز روشنی میں محفل رقص و سرود برپا تھی۔ ہال میں [illegible] مصاحبان خاص بیٹھے تھے اور ایران کی خاص رقاصہ رقص کر رہی تھی [illegible] حسن و رقص میں اپنا ثانی نہ رکھتی تھی کسریٰ کی طرف سے باقاعدہ ماہانہ ملتا تھا۔ ایران کے سردار اس کی صرف ایک جھلک دیکھنے کو بھی ترستے تھے۔ اس وقت وہ ناچ رہی تھی اور سردار اس پر [illegible] کے ڈونگرے برسا رہے تھے [illegible] اس کے جسم کی جنبش دیکھنے والوں کے دلوں میں ہلچل مچا رہی تھی۔ [illegible] چند سکے اس پر نچھاور کر دیتے۔ یہ دیکھ کر دیگر سردار بھی دولت لٹانے لگے اور سلسلہ دراز ہونے لگا۔

جس وقت سب سردار اس کی طرف متوجہ تھے اس وقت شہنشاہ ایران شاہ پرویز [illegible] جس کے لئے یہ محفل آراستہ تھی ایک بت سے [illegible] اس محفل میں موجود ہوتے ہوئے بھی اس سے بہت دور تھے۔ چشم تصور سے [illegible] دیکھ رہی تھی کبھی وہ ایک [illegible] قربت کے [illegible] اس [illegible] کے سامنے [illegible] لڑکی گھوڑے [illegible] حسن کو قریب سے دیکھ رہا تھا اس کے روشن تابناک چہرے کی [illegible] یاقوتی لبوں سے نکلتی ہوئی [illegible] حرکت [illegible] شہزادی [illegible] ساطرون کی بیٹی کا شاہ پرویز نے جب [illegible] سکون نہ پا سکا تھا [illegible] صرف ایک ہی [illegible] تھی کہ وہ جس طرح بھی ممکن ہو اس قلعہ کو فتح کر کے شہزادی کو حاصل کر لے وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ساطرون جیسے غیر معمولی انسان [illegible] میں یہ کام آسان نہ تھا مگر وہ [illegible] شہزادی [illegible] کسریٰ [illegible]

[illegible] شاہ پرویز [illegible] کو اتنی شدت سے [illegible] حقیقت تھی [illegible] شاہ پرویز [illegible] کر چکا تھا [illegible] اپنے تخیل کی دنیا [illegible] ساطرون [illegible] کسریٰ [illegible] کی حیثیت سے ساطرون کے محل میں [illegible] اس کے قلب میں [illegible] شہزادی کے چہرے کی [illegible] نفرت و حقارت [illegible] شاہ پرویز [illegible] اس کی طرف [illegible] حقارت سے دیکھا۔

"شہزادہ [illegible]"

گھوڑے [illegible] شہزادی کے چہرے پر نفرت کا رنگ [illegible] بولی۔

"شاہ ایران کے [illegible] مجھے [illegible] میرا دل نہ جیت سکا۔ [illegible] اس دن سے آج تک میں نے [illegible] کبھی نہیں [illegible]"

کسریٰ [illegible]

"شہزادی [illegible] تم [illegible] ہوتا ہے۔"

شہزادی کو غصہ آ گیا اس نے غصے سے کہا۔

"یہ آپ [illegible]"

کسریٰ [illegible] شہزادی [illegible] کر دیا۔

شہزادی کی چیخیں نکل گئیں۔ اس نے خود کو چھڑانے کے لئے پوری قوت سے ہاتھ پیر مارے: "مجھے چھوڑ دے۔ مجھے چھوڑ دے!"

شاہ پور نے جواب دیا۔

"شہزادی! ہم نے تمہیں اور تمہارے قلعہ کو جان کی بازی لگا کر فتح کیا ہے۔ اب ہم تمہیں ملکہ بنانے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔۔۔"

شاہ پور ابھی ان ہی تصورات میں مستغرق تھا کہ ایک آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس کا تصور ٹوٹ گیا۔ نہ قلعہ حضر تھا نہ سامنے مفتوح ساطرون تھا نہ بازوؤں میں کسمساتی ہوئی شہزادی۔ بلکہ خادم دست بستہ کھڑا تھا۔ سردار اس کی طرف متوجہ ہوا۔ رقاصاؤں کے قدم رک گئے۔ خادم کہہ رہا تھا۔

"عالی جاہ! سفیر لوٹ آئے ہیں۔ اور معزز ذی زان حضور سے ملاقات کی درخواست کر رہے ہیں۔"

کسریٰ نے اپنے اوپر قابو پاتے ہوئے اسی شاہانہ تمکنت سے کہا۔

"ذی زان کو حاضر کیا جائے۔"

6

چند روز بعد بازان کی قیادت میں کسریٰ کی پندرہ ہزار فوج نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا اور اہل حضر قلعہ بند ہو گئے۔

اس دن مہرجان نے کہا۔

"آقا جب تک مہرجان زندہ ہے دنیا کی کوئی قوت شہزادی کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہ کر سکے گی۔" تھوڑی دیر بعد ساطرون نے اہل حضر کو جمع کیا اور ان سے یوں مخاطب ہوا۔

"میرے عزیزو! ہمارا قلعہ صدیوں سے خود مختار ہے اور ہمیں کوئی کسریٰ اطاعت پر مجبور نہ کر سکا۔ موجودہ کسریٰ نے اپنی سلطنت کی توسیع کے لئے اپنے ناپاک قدم ہماری طرف بڑھائے ہیں۔ ہمارا اور اس کا مذہب جدا نہیں ہے۔ ہم اطاعت کر سکتے تھے مگر ہم جانتے ہیں کہ اس کے بعد بھی اہل حضر کی حرمت محفوظ نہ رہے گی۔ میرے دوستو! ایران میں انسان تین طبقوں میں تقسیم ہو چکے ہیں۔ حکمران، عوام اور غلام۔ ان کی زندگیوں کا فرق تم بخوبی سمجھتے ہو۔ حکمران عیاشیاں کرتے ہیں اور عوام اپنے خون پسینے کی کمائی ٹیکس کی صورت میں انہیں ادا کر دیتے ہیں۔ ہمارے ساتھ بھی یہی کچھ ہو گا۔ اس سے بچنے کی صرف ایک صورت ہے وہ یہ کہ ظلم کے خلاف اٹھ کر جان دے دیں۔ اس کے لئے سب سے پہلے میں خود کو پیش کرتا ہوں۔ تم میں سے جو پسند کرے میرا ساتھ دے۔ میں تم کو پوری اجازت دیتا ہوں کہ جس کا دل چاہے کسریٰ کی فوج میں شامل ہو جائے کیونکہ میں نہیں کہہ سکتا یہ مقابلہ کتنے عرصے جاری رہے گا۔"

یہ تقریر سن کر اہل حضر چلانے لگے۔ "سردار! ہم آخری دم تک آپ کے ساتھ ہیں۔" اور پھر حضر کا بچہ بچہ تیر و ترکش لے کر فوج کی صف میں شامل ہونے کے لئے آگیا۔ ساطرون نے اپنی موجودگی میں اس طرح فوجوں کو فصیل پر تعینات کیا کہ وہ شب و روز ایرانیوں کے سخت حملے کا جواب دے سکیں۔ مہرجان کے دستے بھی ٹولی ٹولی بدل بدل کر مقابلہ کرنے لگے۔ اسی کشمکش میں کئی دن گزر گئے۔

ایک شام شہزادی حسب معمول اپنے تصورات میں گم باغ کے ایک پرسکون گوشہ میں محو خرام تھی۔ آفتاب غروب ہونے والا تھا اس کی سنہری کرنیں قلعہ کی بلند عمارتوں اور اونچے اونچے درختوں پر آخری نظر ڈالتی ماحول کو طلسماتی کرتی ہوئی تیزی سے سرک رہی تھیں مگر شہزادی اپنے خیالوں میں اس درجہ منہمک تھی کہ اسے سوسن کے آنے کی بھی خبر نہ ہوئی اچانک وہ اس کی آواز سے چونک گئی۔ اس نے پوچھا۔

"سوسن! تو یہاں کب سے کھڑی ہے؟"

"جب سے حضور کسی کے حسین خیالوں میں غرق ہیں۔"

"سوسن!" شہزادی نے خود کو سنبھالتے ہوئے پوچھا "کیا کوئی نئی خبر لے کر آئی ہو؟"

"شہزادی صاحبہ!" سوسن نے کہا "ایرانی سپاہی اسی طرح حملہ کر رہے ہیں اور حضر کے بہادر بھی انہیں اسی طرح جواب دے رہے ہیں کم بخت کسریٰ نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا ورنہ نجانے کتنی خبریں پیدا ہو چکی ہوتیں۔" شہزادی ایک دم ہنس کر بولی۔

"سوسن! تو بھی عجیب باتیں کرتی ہے۔ بھلا اور خبریں کیسے پیدا ہو جاتیں؟"

"حضور!" سوسن نے سرگوشی کی۔ "جب قلعہ کا پھاٹک کھلا ہوتا تو آپ فرات کے کنارے سیر کو جاتیں اور وہ بہادر تاجر آتا تو کیا کوئی نئی بات نہ پیدا ہوتی؟"

شہزادی کے چہرے پر شفق کے رنگ بکھر گئے جس کے تصور سے وہ حسین ہو جاتی تھی جسے وہ پہروں یاد کرتی تھی جس کی شجاعت دلیری نے اسے مرعوب کر دیا تھا اس کا ذکر سوسن نے کس بے تکلفی سے کیا تھا۔ سوسن پھر بولی۔

"شہزادی! اگر آپ حکم دیں تو قباحت کیوں ہو؟"

"کیا کہہ گئی؟" شہزادی پھر چونک پڑی۔

"یہی کہ اگر کوئی تاجر قبا سے واسطہ رکھے تو اسے پکڑ لو، یہ تو شہزادی کا مجرم ہے۔"

شہزادی مسکرا دی اور بات بدلنے کے لئے بولی "تو قباد سے کہہ دوں گی اور قباد تو بچ سکا اور تو رُخ مہر جان سے اور مہر جان یا بابان سے" اس پھیر پر سوسن مسکرا دی بولی۔

"اب ایسا نہیں ہوگا قباد نے عہد کیا ہے کہ اب میری بات کسی کو نہیں بتائے گا بس آپ اجازت دے دیں کہ اس سے کہوں یا نہیں؟"

"نہیں سوسن تم کچھ نہ کہنا" شہزادی کے لبوں پر جیسے ایک آہ نے دم توڑ دیا "اپنے دیس جانے والے پرندے دیس واپس نہیں آیا کرتے" یہ سن کر سوسن کا دل بھر آیا اس نے کہا۔

"حضور ایسا خیال نہ فرمائیں۔ قباد کہہ رہا تھا کہ اگر ایرانی فوج محاصرہ نہ کر لیتی تو وہ تاجر ضرور آتا مگر اب تو باقاعدہ پہرہ ہے اس جانب وہ سفر نہیں کر سکتا کیونکہ ان کی فوجوں نے پڑاؤ ڈال دئیے ہیں۔"

"ہوں" شہزادی اپنے دکھ کو چھپا لینا چاہتی تھی، سوسن نے پھر کہا۔

"کسریٰ نے کثیر فوج بھیجی ہے پر وہ کم بخت بھی کیا کہے عشرتی علاقوں سے نکل کر شہزادی کے حسن کا چرچا ایران تک پہنچ چکا ہے اور بہت اس نے بھی سن لی مگر خود دیکھ لیتا ہماری شہزادی کو تو شاید خود ہی فوج لے کر آجاتا" شہزادی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خلا میں گھورتی رہی تب سوسن نے کہا۔

"شہزادی حضور! آپ نے ایرانی فوج کو دیکھا ہے؟"

"ہاں! میں اکثر اس جھروکے سے اس فوج کا نظارہ کرتی ہوں" شہزادی جھروکے سے باہر دیکھ کر بولی۔

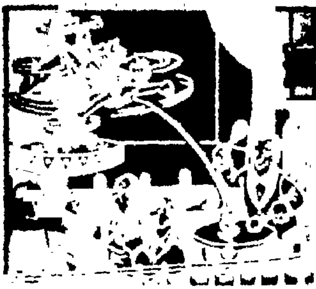
"حضور! قباد کہہ رہا تھا کہ قلعہ کو ایرانی فوج کبھی فتح نہیں کر سکتی کیونکہ ہمارے لشکر کے دلوں میں بڑا جوش ہے وہ اپنی شہزادی کو بچانے کے لئے جان دے دیں گے۔"

"کب کہہ رہا تھا؟" شہزادی نے سوال کیا۔

"کل رات جب وہ اپنے دستے کے ساتھ ایرانیوں پر پتھراؤ کر رہا تھا میں بھی اس کے ساتھ پتھر پھینک رہی تھی۔"

"کیا تو بھی فوج کے ساتھ مل کر لڑتی ہے؟" شہزادی نے پوچھا۔

"ہاں!" سوسن نے کہا "مہر جان نے قباد کی ڈیوٹی بات سے لگا دی ہے تو میں بھی اس کے ساتھ جاتی ہوں۔"



شہزادی معنی خیز انداز میں مسکرا کر کھڑی ہو گئی اور جنگ کا نقشہ دیکھنے کے لئے جھروکے کی طرف چلی گئی۔

ایرانی فوج کو حضر کا محاصرہ کئے چھ ماہ گزر گئے لگاتار کوشش کے باوجود وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ لمحہ لمحہ کی خبریں کسریٰ کو پہنچ رہی تھیں کہ قلعہ حضر ناقابل تسخیر ہے اس طرف جانے والے سرداروں میں سے نہیں ہے کسریٰ پر یہ دھن سوار تھی کہ وہ اسے زیر کر کے دم لے گا۔

بازان نے کسریٰ کو خبر بھیجی کہ قلعہ کی عمارت ناقابل تسخیر ہے جسے دیکھنے سے ہی دلوں پر ہیبت طاری ہو جاتی ہے اور دور سے دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ فرات کے ادھر خط استوا پر ایک آہنی دیوار آسمان سے باتیں کر رہی ہے۔ یہ سن کر کسریٰ نے پانچ ہزار فوج مزید روانہ کی اور بازان کو شدید حملوں کا حکم دیا۔ اس بار بازان نے نئے سرے سے فوج کو مرتب کیا۔ اور ہر سالار کو اس کے دستے کے ساتھ نئے انداز سے ہدایات دیں۔ ایرانی سپاہی بڑے جوش و ولولے کے ساتھ پھیل گئے اور سخت حملے کرنے لگے۔ اس شب سالاروں نے بڑے بڑے سرداروں کو طلب کیا اور ان مشوروں کا طالب ہوا۔

"اہل حضر! کسریٰ کی پندرہ ہزار فوج نے ہمارا محاصرہ کیا تھا اور مسلسل کوشش کے باوجود وہ ہمیں نہیں جھکا سکی تھی۔ اب اس میں پانچ ہزار کا اضافہ ہو گیا ہے۔ میرے عزیز دوستو! میں تمہیں یہ ضرور بتاؤں کہ تم اپنے معاملات میں آزاد ہو تم اگر چاہو تو" مگر اس کی بات پوری نہ ہو سکی اور آوازیں آنے لگیں۔

"سردار! ہم آپ کے ساتھ ہیں"

"جب تک ہمارے جسم میں لہو کی ایک بوند بھی باقی ہے ہمیں

کوئی طاقت بچا نہ سکے گی؟

"قلعہ حضر کا محاصرہ کب تک ختم ہو گا اور ہم کب تک اپنی فوج وہیں برباد کرتے رہیں گے، ہم کیوں نہ سکون کی زندگی گزاریں گے؟"

سالاروں نے جب یہ باتیں شہزادوں سے کہیں تو وہ اس کے بھی اور بیزار ہو گئے۔ دستگرد میں ساری بیگمات بھی اداس ہو گئیں۔

مگر ابھی تک سالاروں میں ایک ایسا قابل اور بہادر سردار اور بہرام جیسا سپہ سالار موجود ہے جو دنیا کی کوئی قوت کے آگے قلعہ کو فتح نہیں کر سکتی۔ ... جو دیکھنے والوں کو یہی ... ہے؟

لوگوں کے تاثرات کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ بہرام نے اپنی فوج کو تین حصوں میں تقسیم کر کے ... مختلف مقامات سے فصیلوں پر حملے کئے ... نئے نئے حربے استعمال کئے۔ کبھی سنگ باری کی گئی کبھی تیر اندازی۔ بہرام کی تدبیروں سے ... کو شدید نقصان پہنچا تھا۔ جنگ اس طرح جاری تھی کہ کبھی ختم نہیں ہو گی۔

آہستہ آہستہ شہزادی بھی اس ماحول کی عادی ہو گئی تھی۔ شروع شروع میں یہ محاصرہ ناقابل برداشت محسوس ہوتا تھا، فرات کے کنارے جانے کے لئے دل مچلتا تو وہ بے چین ہو جاتی۔ بہادر تاجر کا خیال آتا تو دل بے چین ہو جاتا مگر اب اس نے صبر کر لیا تھا اس کی خواہشیں ... تک محدود ہو کر رہ گئی تھیں۔ کبھی ... تو ... کسریٰ کی فوجوں کے حملے کا نظارہ کر لیتی ورنہ اپنی فوج کے ... محلوں کی ... دن ... میں اور ... میں ... اس طرح ... اور محاصرہ کو ایک برس پورا ہو گیا۔ کسریٰ نے بازان کو پیغام بھیجا۔

"اگر تم ابھی تک ناکام ہو تو فوج کی کمان ذی یزن کے سپرد کر دو"

ذی یزن ... ایک بہادر جوان تھا مگر وہ اس قلعہ کی ... کا اندازہ کر چکا تھا ... [illegible] ... فوج ... [illegible] ... طرح بیان کیا کہ ... اس نے حکم دیا۔

"فوج میں اعلان کر دو کہ جس بہادر کی بدولت قلعہ حضر کی تسخیر ممکن ہو سکے گی اس کو اس قلعہ کا حاکم بنا دیا جائے گا۔"

اس اعلان نے ایرانی فوج میں ایک نئی روح پیدا کر دی ...

محاصرہ ... پوری قوت سے ... لیکن ... وہ بہادر تھا ... [illegible] ... ایک طرف ... دوسری طرف ایک ... تھی ... [illegible] ... کبھی ... کبھی شدید بارش ... [illegible] ... سالاروں اور اس کی رعایا ... کسریٰ کی ... فوج ان کے ... یہاں تک کہ محاصرہ کا دوسرا برس شروع ہو گیا اور ... یہ بات مشہور ہو چکی تھی کہ کسریٰ کی فوج ہار جائے گی اور اس صورت حال کی خبر کسریٰ کو بھی ہو چکی تھی۔ وہ اب زیادہ ... پامال کر دینے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کی فطرت میں ... جس چیز کے حصول میں جتنی مشکلات بڑھتیں اس کی طلب اتنی ہی سوا ہوتی۔ اب قلعہ حضر کو فتح کر کے شہزادی ... کو حاصل کرنے کا جذبہ انتہا کو پہنچ گیا تھا ... نے مجبور ہو کر فیصلہ کیا کہ وہ اپنی فوج خاص کے ساتھ خود اس قلعہ کی تسخیر کے لئے جائے۔ چنانچہ ایران میں اس کا باقاعدہ اعلان کر دیا گیا۔

... کسریٰ ... ہزار فوج خاص کے ساتھ ... شان سے ... کی طرف روانہ ہو گیا۔

6

... بار محاصرہ بہت سخت تھا ... جنگ ... فوج کے ساتھ ... کسریٰ ... موجود تھا ... میں ایک خاص ... بن گئی تھی ... کسریٰ اسے تسخیر کرنے کا عزم کر کے ... [illegible] ... سخت ... ہو جاتے تو اس کی ... بھی باقی نہ رہتیں ... قلعہ تھا وہ ابھی تک قائم تھا۔ اس کے ... آثار ... سالاروں ... خطاب ... کیا۔

... حضر کسریٰ اپنی فوج خاص کے ساتھ قلعہ کا ... ایران کی تمام قوت ...

اعلان ہو اور کہ وہ تو ہم اس قوت کے بارے [illegible] رکھتے ہیں اور اگر ہم
جانے کا کام لوٹ جانے پر مجبور کر دیا تو پھر کوئی شہنشاہ بھی
ہمیں باجگزاری پر مجبور نہ کر سکے گا۔

یہ سن کر حرارت سے جو شعلے بلند ہوئے اور عوام خون کا
آخری قطرہ تک اپنے علاقہ کی حفاظت اور وطن کی حرمت کے لئے بہا
دینے کے لئے بے قرار ہو گئے۔ فصیلوں پر تازہ دم سپاہیوں کے دستوں
نے یہ تقریر سنی تو اس قدر پر جوش ہو گئے کہ ایرانی فوجوں کو
بار بار پیچھے ہٹنا پڑا۔ وہ جب آگے بڑھتے تو لشکر کسریٰ کے سپاہی پھر الٹے
پیچھے لوٹ جاتے۔ ادھر اہل مصر کا جوش و خروش کمال کو پہنچ چکا تھا۔

ان دن گھوڑوں سے عورتیں نکل آئیں اور انہوں نے اپنے عظیم
آقا کو اپنی وفاداری کا یقین دلانے کے لئے گیت گائے کہ کسریٰ اپنے
دارالسلطنت سے نکل آیا ہے لیکن ہم اسے لوٹ جانے پر مجبور کریں
گے۔ اہل مصر کی عظمت ہم سے قائم ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ہم نے
کبھی شکست نہیں کھائی۔ ہم آزاد ہیں اور آزاد رہیں گے۔ ہم عورتیں یہاں
جنگ میں مردوں سے پیچھے نہیں ہیں۔ اے ہمارے [illegible] اجازت دے
کہ ہم کسریٰ کا تاج نوچ کر تیرے قدموں میں رکھ دیں۔

گلی گلی لڑکیاں یہ گیت گا رہی تھیں اور مردوں کے حوصلے بلند
ہو رہے تھے۔ آثار بتا رہے تھے کہ یہ قلعہ اور اس قلعے کے باسی کبھی زیر
نہ کئے جا سکیں گے۔ ادھر کسریٰ کو محاصرہ کئے کئی ہفتے گزر گئے تھے کہ
اس نے معززین کو جمع کیا اور سب کا مشورہ طلب کیا۔ بابان نے کہا۔
"عالی جاہ! میں دو برس میں ہر کوشش آزما چکا ہوں مگر
یقین ہے کہ کوئی قوت مصر کو فتح نہ کر سکے گی۔ یہاں حضور کا لشکر جو
کوشش جاری رکھے گا مگر بے سود ہو گی۔"

کسریٰ نے کہا "شاید ملت خود بھی یہی محسوس کرتے ہیں۔ سردار! تمہارا
کیا خیال ہے؟"

ذی دان نے عرض کیا "عالی جاہ! اس قلعہ کے باشندوں کو
حست پر مجبور کرنے کا خیال ہی ترک کر دیں۔ اس کا حاکم اور یہ رعایا
بالا غیر معمولی انسان ہیں۔"

کسریٰ نے اثبات میں سر ہلایا اور جرمن کی رائے طلب کی۔ جرمن نے
عرض کیا۔

"عالی جاہ! اس علاقہ کے باشندے قدیم سے آزادی پسند ہیں
اور انہوں نے اس ملک کی تعمیر کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ کوئی بیرونی قوت انہیں
فتح نہ کر سکے گی۔"



ابھی کسریٰ نے تھوڑا سا [illegible] ہی تھا کہ شاہ مصر کی طرف سے ایلچی آیا
سفیر نے یہ کہا آپ یہاں کیوں آئے ہیں کیا محاصرہ اٹھا لیا جائے گا
اس پر بادشاہ نے خود حقارت سے کہا "ہمیں کوئی بیرونی قوت فتح
نہیں کر سکتی۔"

شہزادہ نے جواب دیا۔

"عالم پناہ! میرا زمانہ بھی کہتا ہے کہ سالہا سال [illegible] اور
غیر معمولی قوت کا مالک ہے۔ اسے دنیا کی کوئی قوت تسخیر نہیں کر سکتی
بہتر ہے کہ آپ محاصرہ اٹھا لیں اور پھر خیموں سے نکل کر اس کی طرف
دوستی کا ہاتھ بڑھائیں۔"

اس وقت کسریٰ شاہ ایران کو دو برس قبل کی شہزادی کی طرف سے کی
بات یاد آگئی جس نے کہا تھا۔

"مجھے خوف ہے کہ ہم سے یا مصر کو آج تک کوئی کسریٰ [illegible]
اطاعت پر مجبور نہیں کر سکا۔ لیکن یہ بات بھی غلط ہے کہ اس کے اندر کسی قسم
کا جوش یا حوصلہ نہ پیدا کر سکی۔ معززین قوم کی طاقت سن کر اور خود اس
قلعہ کا اندازہ کر کے وہ نہ صرف حقارت دیدہ ہو کر مرعوب
ہو جانے کے انداز میں سالہا سال کے محاصرے میں ہر روز [illegible] تھا۔ حقیقت یہ
ہے کہ [illegible] اس عظیم سلطنت کو ہی ایسا سامنا کرنا پڑا تھا جس کی مثال تاریخ میں کہیں نہیں ملتی
نے اس کی [illegible] اور قوت کو بھی محاصرہ اٹھانے پر مجبور کر دیا تھا۔

مورخ اس بات پر متفق ہیں کہ شاہ مصر کی قوت نے کامل دو
برس تک محاصرہ کئے رکھا۔ لیکن کامیابی نہ ہوئی اور جیسے ہی اس شب
سب شاہ مصر خاموشی سے محاصرہ اٹھا دینے کا حکم دے کر واپس چلا گیا۔

آگیا محبوب کا قصر چھٹی آیا جس نے اہل حیرہ کی ہمت توڑ دی اور قلعہ پر ساطرون ہمیشہ کے لئے تسخیر کر لیا گیا۔ وہ واقعہ یہ تھا کہ اس شام شہزادی نظیرہ اپنے تصورات میں گم حیرہ کے سے ایرانی فوج کا نظارہ کر رہی تھی کہ ایک دم اس کی آنکھوں کے سامنے بجلی سی کوند گئی۔ شاہی سواری میں ایک جوان، مکلف لباس زیب تن کئے اور بیش قیمت تاج سر پر رکھے نظر آ رہا تھا جو اس نے بغور دیکھا آفتاب کی طرح روشن چہرہ، آنکھوں میں سنجیدگی اور بہادری کا رنگ۔ شہزادی اسے دیکھتی رہ گئی اور دل میں محبت اس کے چہرے پر وہ بہادری کے رنگ نکھر گئے۔ اس وقت اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ ہواؤں میں اڑ رہی ہے۔ اس کا محبوب بہادر تاجور اصل ایران کا تاجدار شاہ پور ذوالاکتاف ہے۔ وہ خوشی و مسرت سے بے قابو ہو گئی اور اس وقت عشق کے ایک ہی وار نے عقل کو ٹھکانے لگا دیا اور شہزادی عالم تصور میں دیکھتے ہی دیکھتے اس کے پاس پہنچ گئی جہاں نہ عظیم ساطرون کی عظمت کا تصور تھا نہ بہادر مہرجان کا نہ ہی ناقابل شکست فوج کا احساس تھا نہ قلعہ والوں کی فکر بس خیال تھا تو صرف کسریٰ کا۔ بہت دیر بعد جب آفتاب غروب ہو گیا اور کسریٰ کی سواری وہاں سے ہٹ گئی تب دل نے سرگوشی کی کیوں نہ آج شب قلعہ کی فتح میں کسریٰ کی مدد کی جائے اور جس دروازے پر قابل اعتماد تعینات ہیں وہ دروازہ کھول دیا جائے؟

یہ تصور بڑا حسین تھا۔ حیرہ کے باہر بیٹھے ہوئے مستقبل کے حسین خواب دیکھتی رہی اور جو کہتے ہیں محبت اندھی ہوتی ہے اسے محبوب کے سوا کچھ نہیں سوجھتا، یہی کیفیت شہزادی نظیرہ کی تھی وہ محبوب کے دیدار نے اسے بے قابو کر دیا تھا۔ اس موقع کے لئے ابن ہشام نے لکھا ہے کہ اس رات شہزادی نے کسریٰ کو پیغام بھیجا کہ مجھے ملکہ بنانے کا وعدہ کرو تو میں دروازہ کھول دوں، مگر ایک خیال یہ ہے کہ شہزادی نے کوئی پیغام بھیجے بغیر ہی دروازہ کھول دیا۔ بہرحال یہ بات ہوا مگر حقیقت یہ ہے کہ جس رات ایرانیوں کو شکست کا یقین کرنے کے بعد ادھر ساطرون چند گھنٹے آرام کرنے کے لئے محل میں گیا، شہزادی کی کنیز سوسن کے محبوب نے قلعہ کا دروازہ کھول دیا اور اس طرح جب کسریٰ اور اس کی پچیس ہزار فوج شکست کھا کر لوٹ جانے والی تھی صرف ایک لڑکی کی بدولت اس عظیم قلعہ کے اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو گئی۔

وہ رات اہل حیرہ کے لئے قیامت کی رات تھی ایرانی فوج جب قلعہ میں گھس گئی۔ اس اچانک حملے سے بیدار ہو کے پاسبانوں کی آنکھیں بھی کھل گئیں، پھر جاگ پڑے اور دہشت و حیرت سے یہ دیکھتے رہ گئے کیونکہ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ حیرہ والوں کی قوت ایرانیوں کا مقابلہ کر سکے گی۔ تب وہ بھرپور حملہ کر کے قلعہ میں گھس کر قتل عام شروع کر دیں گے اس وقت کوئی چارہ نہ تھا۔

"ایرانی کس طرح اندر داخل ہو گئے؟" کوئی کچھ نہ جان پایا کہ یہ ہوا کیسے، نظر دکھانے کو وہاں کسی نے مہرجان کو پکارا کسی نے اپنے سردار ساطرون کو خبر کرنے کے لئے آواز دی مگر ان سب کے ہونٹوں پر ایرانیوں کی تلواریں تاریخ رقم کر رہی تھیں۔ پھر ایرانی سپاہی گلی کوچوں میں پھیل گئے اور قتل و غارت گری جاری تھی اور گھروں کے دروازے توڑ توڑ کر لوگوں کا صفایا کر کے عورتوں کے ساتھ بد سلوکی کر رہے تھے۔

کسریٰ شاہانہ تمکنت و وقار کے ساتھ فاتحانہ انداز سے ساطرون کے محل میں داخل ہوا اور حکم دیا: "قلعہ دار ساطرون اور سپہ سالار اعلیٰ مہرجان و دیگر سرداروں کو حاضر کیا جائے۔"

تھوڑی دیر بعد ساطرون اور قلعہ کے سپہ سالاروں کو حاضر کیا گیا ساطرون کا چہرہ غیر معمولی طور پر ہراساں تھا اور ہار جانے کے باوجود اس کی آنکھیں شکست نہ کھانے کا اعلان کر رہی تھیں۔ اس وقت قلعہ حیرہ کا ہر شہر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا کہ کسریٰ نے اس کی طرف دیکھا اور آہ و بکا کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں مگر ساطرون کے انداز میں ابھی بھی وہی تمکنت تھی۔ کسریٰ نے آج تک ایسا کوئی سردار نہیں دیکھا تھا۔ اس نے ستائش کی نظر سے اسے دیکھا مگر دوسرے ہی لمحہ طنزاً سوال کیا۔

"ساطرون! اے ناقابلِ تسخیر قلعے! تیری وہ عظمت کیا ہوئی جس پر تجھے اور تیری رعایا کو فخر رہتا تھی۔ تو تو کہتا تھا کہ آہنی حصار والا قلعہ تو ناقابل شکست ہے۔ پھر شکست کیسے ہو گئی؟"

ساطرون نے اس تذلیل آمیز سوال پر اسے بے باکانہ انداز میں دیکھا اور اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔

"تاجدار ایران! میں خود حیران ہوں کہ ایرانی فوج حیرہ کے قلعہ میں کس طرح داخل ہو گئی۔ جبکہ میں نے احتیاط کی وہ تدبیر اختیار کی تھی کہ کوئی بیرونی قوت اسے فتح نہ کر سکتی تھی اور اسی لئے میں نے اپنی فوج کے ساتھ کبھی ایسا کوئی سلوک کیا کہ ایک شخص بھی میرا مخالف ہو لیکن آپ سے یہ پوچھنا ہے کہ ساطرون نے آج پہلی بار آپ نے اسے فتح کر لیا ہے میں اس شکست کو تسلیم نہیں کرتا۔ یہ دروازہ سے آپ گھس آئے

اسیں ہوتے!"

شاہ پور اس جواب پر ساکت سا ہو گیا اس نے اس دلیر تیغ زن کو عقیدت سے دیکھا اس وقت سب منتظر تھے کہ سالاروں کے قتل کا حکم دیا جائے گا مگر کسریٰ نے کہا۔

"قلعوں سالاروں کو چونکہ وہ سالہا سال اس کا فیصلہ بعد میں کریں گے!" یہ سنتے ہی لوگ اس آہنی ہمت والے سوار کو کھینچتے ہوئے لے گئے دربار جانے کے باوجود شکست تسلیم نہ کرنے کا اعلان کر رہا تھا اب کسریٰ نے کہا "تم نے سپہ سالار فوج! تیرے قلعہ میں کل کتنی فوج ہے؟"

"کل آٹھ ہزار سپاہی اس قلعہ میں ہیں!" مہرجان نے جواب دیا تو کسریٰ اور اس کے سرداروں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے صرف آٹھ ہزار فوج نے ان کی چھتیس ہزار فوج اور کسریٰ کو چکر میں ڈال دیا تھا چند لمحے کسریٰ پھر تعجب میں غوطہ زن رہا پھر بولا۔

"تم نے اپنی فوج کی تربیت کن اصولوں پر کی ہے؟"

"میں نے انہیں متحد رہنا اور نا اتفاقی سے بچنے کی ہدایت کی ہے" مہرجان نے جواب دیا "لیکن محنت مشقت کا درس اپنے عمل سے دیا ہے جتنی محنت میری فوج کے سپاہی کرتے ہیں اس سے زیادہ میں خود کرتا ہوں!"

کسریٰ نے تعریفی انداز میں دیکھا اور حکم جاری کیا۔

"چونکہ مہرجان ایک غیر معمولی سپہ سالار ہے اس نے کامل دو برس جس طرح مقابلہ کیا ہے وہ قابل تعریف ہے اہلیان چاہتے ہیں کہ اس سپہ سالار کی موت بھی اتنی عظیم ہو جتنا وہ خود ہے لہٰذا اسے قلعہ کے بلند و بالا فصیل سے نیچے پھینکا جائے!" قلعے کے باشندے مہرجان کی زندگی کی بھیک مانگتے رہ گئے۔ وحشی ایرانیوں نے اسے قلعہ کی فصیل سے نیچے پھینک دیا۔ پھر دیگر سرداروں نائل، عاقبان اور سوداب کی موت کا حکم دیا گیا۔ وہ کھینچ کھینچ کر سولیوں پر لائے گئے اور موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ اس کے بعد شاہ پور محل کے زنانہ حصے کی طرف بڑھا۔ مگر دو برس تک جس لڑکی کو تصور ہی تصور میں جیرا قابو کرتا رہا تھا جس کو خیالوں ہی خیالوں میں زبردستی ملکہ بنا تا تھا اور جس کے چہرے کو پانے کے لئے بیداری اور تنہا دیکھتا تھا اسے آج حقیقت میں دیکھا تو وہ اس کی دیوانی تھی۔ شاہ پور کو توقع دھی کہ اس قتل عام کے بعد شہزادی طلباتہ اس کا سنا ہر گز نہ کر سکے گی۔ اس خوشی میں کسریٰ نے تین روز تک جشن منانے کا اعلان کیا ایرانی اس فتح کی خوشی میں شراب پی پی کر بدمستیاں کرتے ہوئے قلعہ حضر کے گھروں میں گھس گئے جنہوں نے یہ

ہیرو، عام آدمی اور پیشہ

یک اچھے معاشرتی نظام میں یہ امکان ہونا چاہیئے کہ ہر آدمی کو بیک وقت ہیرو، عام آدمی اور پیشہ ور بنا دے۔ ہیرو کی حیثیت میں اسے پیش قدمی کا موقع ملنا چاہیئے، عام آدمی کی حیثیت میں اسے محفوظ ہونا چاہیئے اور پیشے کی حیثیت میں اسے مفید ہونا چاہیئے۔

(برٹرینڈ رسل — معاشرے پر سائنس کے اثرات)

منظر دیکھ کے دیکھتے رہ گئے وہ اپنی عزت و ناموس بچانے کی کوشش کرتے لوگ قتل ہو رہے تھے اور لوٹے جا رہے تھے کسریٰ اور شاہ پور کے پہلو میں دنیا جہان سے بیگانہ تھی نہ انہیں اس قوم کا احساس تھا نہ بہادر قوم کا۔ اس طرح تین یوم گزر گئے۔

ایک رات شہزادی بستر پر آرام سے کروٹیں بدل رہی تھی اس کے بالوں میں پھول سجے ہوئے تھے، ہاتھوں میں کلائیوں کے گجرے اور کانوں میں جھکتے ہوئے پھول اس کے بے پناہ حسن میں اضافہ کر رہے تھے۔ مگر ان ہی پھولوں کی پتیاں ٹوٹ ٹوٹ کر بستر پر بکھر گئی تھیں اور شہزادی مضطرب تھی۔ کسریٰ نے پوچھا۔

"شہزادی! تم بے چین کیوں ہو؟"

"ان پھولوں کی پتیوں کے سبب میں بے آرامی محسوس کر رہی ہوں!" شہزادی نے جواب دیا۔

"پھولوں کی تو سکون کی علامت ہیں تم ان سے بے چینی کیوں محسوس کر رہی ہو؟" کسریٰ نے حیران ہو کر دیکھا۔

"ہاں!" شہزادی نے سادگی سے کہا "کیونکہ یہ پتیاں میرے جسم پر چبھتی ہیں!"

اب کسریٰ کی حیرت کی انتہا نہ رہی وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اس نے غور سے اس کو دیکھا اور دریافت کیا۔

"تمہاری پرورش کیا دیگر شہزادیوں سے مختلف ہوئی ہے، مجھے بتاؤ؟"

"میرے بابا جان نے غیر معمولی ناز و نعم سے مجھے پالا ہے پرورش

کہا ہے؟" شہزادی نے جواب دیا۔ "وہ ہر شب سونے سے قبل میرے کمرے میں آتی تھی میرے بالوں میں کنگھی کرتی اپنے ہاتھوں سے عطر لگاتی پھر اس پر خوشبویات چھڑکتی اور جب تک میں سو نہ جاتی میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہتی۔"

شاہ پور حیرانی سے سنتا رہا پھر اس نے پوچھا۔ "پھر تمہیں کیا شہزادی تم نے قلعہ کا دروازہ کھلوا کر اس کی فتح میں ہماری مدد کیوں کی؟ کیا تمہیں علم نہ تھا کہ تمہارا باپ اور تمہاری قوم کا تمام خاندان بہت بے دردی سے قتل کر دیا جائے گا؟"

"مجھے سب علم تھا۔" شہزادی نے تفاخر سے کہا۔ "مگر میں تم سے محبت کرتی تھی اس لیے سب تمہارے حق میں کیا۔"

کسریٰ نے کوئی جواب نہ دیا۔ شب گزرتی رہی اور وہ سوچتا رہا کہ اس محبت کو کیا سمجھے جس کی بدولت شہزادی نے اپنوں کی محبت کو بھی بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ کیا چاہنے والے کے عشق میں چاہنے والے کو فنا کر دینا کیسی محبت تھی وہ سمجھ نہ سکا تھا۔ دوسری صبح اس نے شہزادی سے کہا۔

"شہزادی نا اطمینانی! قلعہ حضر کے عظیم سردار کی بیٹی! مجھے اعتراف کرنے میں کوئی باک نہیں کہ میں تم سے شدید محبت کرتا ہوں۔ دو برس مسلسل میں نے تمہارا ہی تصور کیا تھا مگر وہ تصور اس حقیقت سے مختلف تھا۔ میں تمہیں بزور قوت فتح کر کے تمہاری آنکھوں میں جھانک دیکھنا چاہتا تھا کہ ایک شکاری کو سب سے زیادہ وہ ہرنی عزیز ہوتی ہے جو چوکڑیاں بھرتی ہوئی مشکل سے جال میں آتی ہے اور وہ اس کے شکار سے بے گناہ ہے۔ لیکن خود جال میں آ کر پھنس جانے والے پرندے کو شکار کر کے شکاری کو مسرت نہیں ہوتی ہاں حیرت ضرور ہوتی ہے۔ میں اگر قلعہ کی فتح میں ناکام لوٹ جاتا تو مجھے اتنی تکلیف نہ ہوتی جتنا آج میں نے یہ سن کر محسوس کیا کہ آہنی حصار والا قلعہ شکست پذیر تھا اس کی اپنی بیٹی جو میری محبوب ہے۔ مگر اب میں تمہاری محبت پر مجبور نہیں ہو سکتا۔ جس نے اپنے اعزہ اور قوم کے ہر فرد نے تمہاری عزت کی خاطر اپنی زندگیوں کو داؤ پر لگا دیا تم نے محض اپنی محبت کی خاطر ان سب کے جان و مال اور عزت کو داؤ پر لگا دیا۔ تمہیں بچاتے بچاتے تمہاری قوم کی ہر عورت لٹ گئی۔ مشکل ہی ہے کہ میں تم سے خوش رہ سکوں گا اگر تمہارا جرم ناقابل معافی ہے۔ شاہ پور تمہیں اس کی ضرور سزا دے گا۔"

شہزادی نے حیران ہو کر دیکھا مگر کسریٰ نے حکم دیا۔

"قلعے سے باہر جو لشکر کا سب سے سرکش گھوڑا ہے لایا جائے اور شہزادی کے جسم سے قیمتی لباس اور زیورات اتار لیے گئے اور اس کے لمبے بالوں کو تکمیل کی گئی لوگ خوف کے مارے سہم گئے کہ کسریٰ قلعہ سے باہر نکلا اور حکم دیا

"شہزادی کے حلقۂ گیسوؤں کو گھوڑے کی دم کے ساتھ گوندھ دیا جائے اور پھر اسی سرکش گھوڑے کا سوار اس گھوڑے کو میدان میں دوڑائے۔" چند لمحوں بعد گھوڑے کی ہنہناہٹ گونج اٹھی اور اس کے ساتھ شہزادی کی چیخیں بلند ہوئی تھیں۔ وہ بڑا سرکش گھوڑا تھا جس پر سواری کرتے ہوئے شاہ پور نے اس کی جان بچائی تھی مگر آج اہل حضر اس انجام پر رو رہے تھے اور اہل ایران تعجب اور دکھ سے دیکھ رہے تھے مگر شہزادی کی جان ہی تھی پھر اس کی چیخیں معدوم ہو گئیں وہاں شاہی میدان میں ہر طرف سنائی دے رہی تھیں۔ شہزادی کا نرم و نازک حسین جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور جسم کے ٹکڑے بھی سرکش گھوڑے کے سموں تلے روندے گئے اور میدان میں صرف خون کے دھبے باقی رہ گئے۔

تھوڑی دیر سنسان تھا آفتاب اداسی کی طرح دنیا پر چھا رہا تھا اور ایسے میں ایرانی لشکر واپس جا رہا تھا۔ اس وقت شاہ پور اپنے خاص گھوڑے پر سوار تھا۔ اس کے چہرے پر وہی جلال اور رعب تھا۔ کسی کو علم نہ تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے مگر پہلے دو برس قبل کی طرح آج بھی یہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنا سب کچھ ان اونچی نیچی راہوں میں چھوڑ کر جا رہا ہے مگر پھر بھی اس کے چہرے پر سختی تھی۔ سکوت تھا۔ پھر اس نے بڑی بے چینی سے اپنی سواری روک کر دریا کی طرف دیکھا اور دیر تک سرگوشی کی۔

"دو فرات کی عظیم لہرو! گواہ رہنا جو چیز ہم نے اپنی قوت سے کبھی بھی حاصل نہ کی تھی ہم اس سے دستبردار ہو گئے ہیں۔" پھر اس نے اپنی سواری تیز کر دی۔ شام کی چادر پھیلتی جا رہی تھی۔ آفتاب پر عالم نزع طاری تھا اور بستی کا وہ منظر بڑا متاثر کن تھا۔ فرات کا پانی فرط غم سے کناروں سے ٹکرا ٹکرا کر ہم ماشور پیدا کر رہا تھا اور ایسے میں شاہ پور کی سواری قلعہ حضر سے دور ہوتی جا رہی تھی۔



پھانسی

مسعود مفتی

[illegible]

ہو گئی!

جیل کی فضا بالکل خاموش تھی۔

یہ سکوت اور بھی گہرا ہو گیا۔ جب اس نے سنا کہ اس
ں نامنظور ہو گئی ہے اور پھانسی کی سزا کی توثیق ہو گئی ہے
بت اس کے دل کے اندر تھا، باہر زندگی حسب معمول
منے والے درخت کے پتے اب بھی ہوا سے ہلکورے
تھے۔ دور سے بگل کی آواز آج بھی سنائی دے رہی
لاخوں والے دروازے پر چڑیا آج بھی کسی وقت بیٹھ کر
ں کر دیتی تھی، مگر یہ سب آوازیں آج عجیب و غریب
ہو رہی تھیں، اس کا شل ہوتا ہوا ذہن ان آوازوں
ب سی اجنبیت محسوس کر رہا تھا، جیسے سے شعلے گرم
ہوا دھوپ کا انداز بھی بدلا ہوا اور سائے بھی اپنی جگہ
لے ہوئے۔

دس مربع فٹ کی اس کوٹھڑی میں وہ اس روز آیا تھا جب سیشن جج نے پھانسی کی سزا سنائی تھی، اب وہ پچھلے تین ماہ سے اپیل کے انتظار میں یہاں گھڑیاں گن رہا تھا۔

موت کی سزا پانے والوں کی کوٹھڑیاں جیل میں علیحدہ تھیں جہاں کڑی نگرانی اور زیادہ ویرانہ تھا۔ دوسرا فرق یہ تھا کہ یہاں قیدیوں کو ایک قرآن مجید دیا جاتا ہے، جو وہ سارا دن پڑھنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ کئی دفعہ پڑھتے پڑھتے اس نے سوچا تھا کہ اسی کمرے میں اس سے پہلے کئی لوگ یہی قرآن پاک پڑھ چکے ہیں، جو اب اس دنیا میں نہیں تھے، کئی صفحوں پر اسے آنسوؤں کے نشان نظر آئے، کون جانتا ہے کہ یہ آخری وقت کے آنسو تھے یا چند روز پہلے کے۔ کیا پتہ یہ جرم پر پچھتاوے کے آنسو تھے یا کسی بے قصور کی بے بسی کے۔

قرآن کریم اس کے سامنے ہوتا اور وہ ایسے خیالات میں کھو جاتا۔ کبھی یہ سوچتا کہ یہ مقدس کتاب تو دنیا میں زندگی گزارنے کے ڈھنگ بتاتی ہے تو اب ایسے وقت اسے کیوں دی جا رہی ہے، جب دنیا کے دروازے اس پر بند ہو رہے تھے، پڑھتے پڑھتے اس کے دل میں کوئی خیال سر اٹھاتا تو وہ سوچنے لگتا کہ کیا ان لوگوں کے احساسات بھی ایسے ہی تھے، جو اس سے پہلے اس کوٹھڑی میں رہے اور چند روز بعد پھانسی پا گئے۔

خود اسے اپنے جرم پر کبھی افسوس نہیں ہوا تھا۔

اس نے اپنے باپ کو قتل کیا تھا۔ حسن دھاڑے سادہ زمیندار گھرانے میں۔ اور وہ اپنے والدین کا اکلوتا لڑکا تھا، بہت سلجھا ہوا اور نیک جس کی زندگی میں کبھی کوئی جذباتی طوفان نہیں آیا تھا اس لئے کہ اس نے اخلاق اور اقدار کی قیود توڑنے کی کبھی کوشش نہ کی تھی، بلکہ بچپن میں بچہ بننے کے جو اصول اسے سکھائے گئے تھے وہ زندگی بھر ان پر قائم رہا اور بائیس سالہ جوانی میں آ کر اچھا بچہ بنا رہا۔ گاؤں سے دسویں پاس کر کے وہ شہر میں ملازمت کرتا تھا کئی دفعہ شہر کی رنگینیوں نے اسے اکسایا تھا لیکن اس کی تربیت آڑے آ گئی تھی، اور یہی خیال ستاتا کہ ماں کو پتہ چل گیا تو وہ کیا کہے گی ماں جو اسے دنیا میں ہر چیز سے زیادہ عزیز تھی اور جس کا دل دکھانے کی مجھ میں ہمت نہ تھی۔

وہ تین ماہ سے موت کے ویٹنگ روم میں پڑا ہوا زندگی کے متعلق سوچتا رہا۔ گزری ہوئی زندگی کے متعلق اس کوٹھڑی کے در و دیوار اداس تھے جو دماغ کو سکون دینے کی بجائے کھلتی دیتے تھے کہ اس کی فضا میں دھیرے دھیرے آنے والی موت کی سرسراہٹ تھی اور اس کے سلاخ دار دروازے سے نظر آنے والے جنگلی، جیل اسٹاف، گھڑی، چڑیا اور چھوٹے گزری ہوئی زندگی کی یادوں کے پٹ کھولتے جاتے، اس وقت اس کی سابقہ محرومیاں بلبلا کر ڈسنے لگتیں، تسکین پائی ہوئی خواہشیں تند کر رہ جاتیں، دفن شدہ ولولے لہرانے لگتے۔ مزید زندگی کی خواہش تڑپنے لگتی اور قسمت کے خلاف گلے شکوے قطار اندر قطار اٹھنے لگتے۔

اس کوٹھڑی میں قرآن کے صفحوں پر خالی خولی نظریں جمائے اس نے دن میں کئی کئی دفعہ وہ سارے واقعات ذہن میں دہرائے تھے جو قتل سے متعلق تھے۔

سب سے پہلے اسے ماں کے خط سے معلوم ہوا تھا۔ کہ اب اس کا باپ جھگڑتا رہتا ہے۔ خط میں نہ کوئی خاص وجہ لکھی تھی اور نہ جھگڑے کی نوعیت بتائی تھی۔ اس نے یہی سوچا کہ ماں کے پاس خط لکھنے کو اور کچھ نہ تھا اس لئے اس نے ایک غیر ضروری چیز کا ذکر کر دیا ہے ورنہ ماں باپ میں جھگڑے کہاں نہیں ہوتے۔

اگلے ایک دو خطوں میں خاموشی تھی، اس لئے جب باپ اسے ملنے آیا تو اس نے موضوع نہ چھیڑا۔

چند روز بعد وہ گھر گیا تو ماں نے باپ کے چڑچڑے پن کا سرسری سا ذکر کیا اور بس، اس کے اپنے مشاہدے میں کوئی پریشان کن چیز نہ آئی۔

پھر ایک دن اسے ماں کا مفصل خط ملا جس میں اس نے لکھا تھا کہ اس کا والد پچھلے کئی دنوں سے اسے زدوکوب کر رہا ہے وہ چاہتا ہے کہ نئے قانون کے تحت میں اسے دوسری شادی کی اجازت دے دوں اور دوسری شادی میں مدد بھی کروں پھر ماں نے یہ بھی لکھا تھا کہ وہ دوسری شادی سکینہ سے کرنا چاہتا ہے۔ جو ماں کی خالہ زاد بہن تھی اور اپنے باپ کے مرنے کے بعد بہت سی زمین کی اکلوتی وارث تھی۔ ماں نے لکھا تھا: "تمہارا باپ جائیداد کی حرص میں اتنا دیوانہ ہو گیا ہے کہ اپنے سے آدھی عمر کی لڑکی سے شادی رچانے پر تلا ہوا ہے، وہ مجھ سے تحریری اجازت بھی چاہتا ہے اور یہ بھی کہ میں ان لوگوں پر زور ڈالوں کہ وہ یہ

وہ یہ سوچ سوچ کر پیچ و تاب کھا رہا تھا کہ اس کا باپ شادی کر رہا ہے اس کا سر جھک گیا۔ باپ کی عمر پچاس کے قریب تھی اور ماں کی عمر چالیس کی تھی ایسے میں بیس اکیس سالہ لڑکی سے شادی جانے ایسے لگا جیسے وہ خواب یا نشے کی حالت میں ہو اور حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہ ہو، لیکن جب بار بار خط دیکھتا تھا تو اس کا دل ڈوبتا ہی جاتا۔

اسے اپنی ماں سے بے پناہ محبت تھی اور ماں کا دکھ پگھلی ہوئی آگ بن کر اس کے رگ و پے میں گھلنے لگا، اس نے حالات کا تجزیہ کرنے کی کوشش نہ کی اور ماں نے ساری بات کو جس انداز سے لکھا تھا اس نے من و عن قبول کر لیا۔ ماں کی ذات اس کی نظر میں اتنی بلند تھی کہ اس کا سارا غصہ باپ کی طرف منتقل ہو گیا۔

یہ کیا باپ ہے؟ جو گھر تباہ کرنے پر تلا ہوا ہے ہمارے اپنے گھر میں کس چیز کی کمی تھی جو وہ مال و دولت کی حرص میں اندھا ہو رہا تھا۔ اکلوتے بیٹے کے لئے کیا یہ ساری زمینیں کافی نہ تھیں جو وہ گھر کا ٹھہرا ہوا پرسکون ماحول یوں برباد کرنا چاہتا تھا اور وہ باپ ہی کیا جو یہ نہ دیکھ سکے کہ نئے پیسے آنچل تو اس کے بائیس سالہ جوان بیٹے کے خیالوں میں لہرا رہے ہیں اس کا فرض تو بیٹے کے خیالوں میں جھانکنا تھا، لیکن وہ خود ہی ان آنچلوں کے پیچھے بھاگنے لگ گیا۔ اٹھتے بیٹھتے وہ جتنا ہی سوچتا اس کے دل میں باپ کے خلاف نفرت بڑھتی جاتی۔ اس باپ کے خلاف جسے اس نے ساری عمر پیار کیا تھا اور غالباً اسی وجہ سے اسے باپ کے طرز عمل سے صدمہ پہنچا تھا۔ چنانچہ وہ ساری محبت اب مکمل طور پر مظلوم ماں کی طرف منتقل ہو گئی اور باپ کے لئے سوائے نفرت کے اور کوئی جذبہ باقی نہ رہا۔

جب وہ گھر کی طرف روانہ ہوا تو غم اور غصے سے نیم پاگل ہو رہا تھا۔ وہ خوب اندازہ کر سکتا تھا کہ معاملہ یونین کونسل تک جانے سے ان کی جگ ہنسائی ہو رہی ہوگی بالخصوص جب کہ یونین کونسل کا چیئرمین ان کی مخالف پارٹی کا تھا اس سے انصاف کی توقع تو بالکل نہ تھی البتہ یہ یقین تھا کہ اس معاملے کو بڑھا چڑھا کر اچھالا جائے گا، تمسخر کا ذریعہ بنائے گا اور ان کو دکھ پہنچا کر خوش ہوگا۔

جیسے جیسے گاؤں قریب آتا گیا وہ سوچنے لگا کہ میں گاؤں

غازی

جنگ ستمبر کے میدان میں لڑنے والے غازی،
[illegible]
[illegible]
[illegible]

میں کیسے داخل ہوں گا؟ میں لوگوں کا سامنا کیسے کر سکوں گا پہلے تو چوپال پر ہی دو چار خیر سلا پوچھنے والے ہوں گے۔ آگے اڈے پر سبھی دکاندار اور خوانچے والے جانتے ہیں اس کے آگے مسجد کے مولوی صاحب بچے پڑھانے کے ساتھ ساتھ باہر جھانکتے رہتے ہیں جن سے بات کئے بغیر آگے جا نکلنا ممکن نہیں اور پھر اس کے بعد تو بانا ہے، جہاں سو ملنے والے ہوں گے ان سب کی طنزیہ نظروں کا مقابلہ کیسے کر سکے گا اور نہ معلوم گھر کا کیا حال ہو گا۔ ماں کس حال میں ہوگی اور باپ کا موڈ کیسا ہو گا؟

باپ کا خیال آتے ہی اس کے خون میں نفرت کے ابال اٹھنے لگے۔ آخر بابا کو کیا پڑی تھی، بیٹھے بٹھائے بھس میں تیلی پھینکنے کی۔

اور پھر گاؤں آ گیا، مجرموں کی طرح نیچے دیکھتے ہوئے وہ چلتا رہا، کسی سے نظریں بچائے، کسی سے جسم چراتے، بازار سے گزرنے کی بجائے اس نے پچھلے قبرستان سے لمبا راستہ اختیار کیا۔

گھر کا دروازہ نظر آیا تو نہ خوشی سے اس کا دل اچھلا، نہ یہ خواہش ہوئی کہ گھر والے باہر ہی مل جائیں بلکہ اس کا دل بھاری بوجھ سے بیٹھنے لگا، نہ معلوم گھر میں کیا نظر آئے گا۔

دہلیز پہ وہ لمحہ بھر کو ٹھٹکا... اور پھر اندر داخل ہو گیا۔

صحن خالی تھا اور وہاں ہمیشہ کی طرح شہتوت کے نیچے بیٹھ کر سبزی نہیں کاٹ رہی تھی۔

وہ بڑے کمرے میں گیا۔ وہ بھی خالی تھا، صندوقوں کو تالے لگے تھے جو ان کے باہر جانے کی نشانی تھی۔

وہ باورچی خانے کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اندر سے بیراں نکلی۔ اسے دیکھا اور ٹھٹک گئی۔ پھر گھونگھٹ نکال کر سلام داغ دیا۔

گھر خالی دیکھ کر اس کا ذہنی تناؤ اتنا بڑھ گیا تھا کہ وہ سلام کا جواب دینا اور حال احوال پوچھنا بالکل بھول گیا۔ تقریباً چیخ کر بولا۔
"ماں کدھر ہے؟"
بیراگن نے اسے غور سے دیکھا اور بولی "یونین کونسل کے دفتر میں۔ وہاں طلاق کے مقدمے کی تاریخ ہے۔"
اس نے جست لگائی اور ٹرین سے باہر نکلا اور تقریباً بھاگتا ہوا دفتر کو چلا۔ راستے میں کسی نے آواز بھی دی مگر وہ رکا نہیں اور لپکتا چلا گیا۔
دفتر کے باہر میدان میں مقدمہ پیش تھا۔ بہت سے لوگ جمع تھے۔ جب وہ ان کے قریب آ رہا تھا تو اسے بالکل ایسا لگا جیسے مداری کا تماشہ ہے جہاں وہ گرد لوگ جمع ہوں۔ شرم اور غیرت نے ایک دفعہ پھر پاؤں پکڑ لئے اور وہ مجمع کو چیر کر آگے بڑھنے کی بجائے دم سادھ کر پیچھے بھاگنے لگا۔
چیئرمین اور مصالحتی کمیٹی کے دو ممبران کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ سامنے اس کی ماں چارپائی پر بیٹھی تھی اور چہرے پر ٹپکتے زار و قطار رو رہی تھی۔ ماں کو یوں سر عام مجرموں کی طرح روتا دیکھ کر وہ غصے سے نیم پاگل ہو گیا۔ اس کا باپ بلند آواز سے بول رہا تھا۔
"میں اسے اتنے عرصے سے سمجھا رہا ہوں مگر یہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتی۔ زبانی بھی سمجھایا، جھگڑا بھی کیا، مارا بھی مگر اس کی حرکتیں بڑھتی ہی گئیں۔ میں ہر چیز برداشت کر سکتا ہوں، مگر بدچلنی برداشت نہیں کر سکتا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اسے فضل ماشکی کے ساتھ بدفعلی کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اگر یہ بھاگ نہ جاتے تو میں وہیں قیمہ......"
"بابا!!" وہ لوگوں کو چیر کر آگے بڑھا اور اس کی چیخ صور اسرافیل کی طرح سب کے کانوں میں گھستی گئی۔
اسے دیکھ کر مجمع میں بھنبھناہٹ سی ہوئی۔ ایک آدھ طنزیہ آواز آئی "لو بیٹا بھی آ گیا" اور پھر ہر شخص ساکت ہو گیا۔ اس کی ماں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر چیخ مار کر اس کی طرف جھپٹی۔ اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا اور بلک بلک کر رونے لگی۔ ماں کو بانہوں میں تھاما تو اس کے دماغ سے سب خیالات محو ہو گئے، سوائے اس کے کہ ہر قیمت پر اپنی ماں کی حفاظت کرے۔
ماں ہچکیوں کے درمیان بولی "یہ سب بہتان ہے... جھوٹ ہے... اپنے مقصد کے لئے یہ مجھے ذلیل کر رہا ہے۔"

اس نے غصے سے باپ کی طرف دیکھا تو وہ جیسے کن انکھیوں سے دیکھ رہا تھا۔ نظریں ملتے ہی اس نے بیٹے کی طرف ہاتھ پھیلائے "میرے بچے میرے بیٹے۔"
باپ کے چہرے سے اپنی چبھتی نظریں ہٹا کر اس نے مجمع پر نگاہ دوڑائی... حیرانی...... دلچسپی..... تمسخر... طنز... احساس برتری... طعن... یہ سب اس کا محاصرہ کئے ہوئے تھے۔ مخالفت بھرے چیئرمین کے چہرے پر شیطانی وارفتگی تھی جیسے بلی اندھے چوہے کو اچھال اچھال کر مزہ لیتی ہے۔
اسے پتہ بھی نہ چلا کہ کب اس نے ماں کو چھوڑا اور کب لپک کر مجمع میں سے ایک آدمی کے کندھے سے کلہاڑی چھین لی۔ اسے تب ہوش آیا جب کلہاڑی کے پے در پے وار لگانے کے بعد اس کا باپ اپنے خون میں لت پت اس کے قدموں میں گر پڑا۔ ماں کی چیخیں سن کر اس نے کلہاڑی پھینک دی... اور کئی بازوؤں نے اسے جکڑ لیا۔
اس نے اپنے آپ کو چھڑانے کی بالکل کوشش نہ کی جب ذرا شور تھما تو اس نے چیئرمین کی طرف دیکھ کر غصے اور حقارت سے کہا "جج صاحب!! میرا فیصلہ تمہارے فیصلے سے زیادہ باعزت ہے۔"
اس لمحے سے لے کر آج تک اسے اپنے جرم پر ذرا بھر بھی ندامت نہ ہوئی تھی۔ مقدمہ چلا، پھانسی کی سزا ہوئی، اپیل کی گئی وہ نامنظور بھی ہو گئی۔ اس میں کافی وقت لگا لیکن اس دوران وہ لمحہ بھر بھی نہیں پچھتایا۔ آج اسے بتا دیا گیا تھا کہ دو دن بعد اسے پھانسی دی جائے گی اور پچھلے دو گھنٹوں سے وہ ان سارے واقعات کو یاد کر رہا تھا جن سے گزر کر وہ یہاں پہنچا تھا۔ مگر اس ساری یاد میں باپ کے لئے کوئی ہمدردی نہ تھی جس نے اس کی ماں پر محض اس لئے بہتان لگایا کہ وہ اپنے مقصد کو چھپا سکے۔ وہ اس کی نظر میں بدترین ریاکار تھا۔ اس کے منہ سے دو ایک گالیاں ابھریں، پھر وہ سنبھلا اور بول بول کر قرآن مجید پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔
وہ سویا نہیں تھا۔ ویسے ہی آنکھیں بند کرکے رات کے اندھیرے میں گم تھا اور سوچ رہا تھا کہ پھانسی میں کس قسم کی اذیت ہوگی۔ جب اسے کوٹھڑی سے نکال کر لے جائیں گے تو اس پر کیا عمل کیا جائے گا، کیا وہ ڈرے گا یا لرزے گا اور پھر اس کے بعد

پر اس ... [illegible] ... سب
چہرے چھپ جائیں گے ... تو کیا دل نہیں
گھبرائے گا۔ قبر ایک ہی شکار ہو جائے گا ... زور
سے گڑگڑ ... زندگی اور موت کے درمیان لٹکنے
والے وہ آخری لمحے کیسے گزریں گے، اور جب وہ مر جائے گا۔
تو کیا تب بھی وہ مر جائے گا؟؟؟ اس نے بڑبڑا کر آنکھیں
کھول دیں مگر فوراً ہی جیسے ... کوٹھری کا گھپ اندھیرا
بھی اسے موت کا ... محسوس ہونے لگا ... ایک دم جی
متلانے لگا۔ کہیں سے روشنی کی ایک ہی کرن مل جائے اس نے
تڑپ کر پہلو بدلا، سلاخوں والے دروازے کے پار چاندنی کی روشنی
میں دیواروں اور درختوں کے نقوش دیکھ کر اس کی ہمت بندھی،
اس کا سانس زور زور سے چل رہا تھا مگر وہ خود سمجھ رہا تھا اور جس
طرح پیاسا ... پانی پر ٹوٹ پڑتا ہے اسی طرح وہ آنکھیں پھاڑ
پھاڑ کر چاندنی کو تکنے لگا۔ جیسے یہی اس کی زندگی کا واحد ثبوت
تھا اور جوں ہی وہ آنکھ بند کرے گا تو پھانسی کے تختے زن سے
گردن پر آ پڑیں گے۔

ماتھے پسے سرسراہٹ چلتی ہوئی رخسار تک آئی، وہاں
سے ذرا نیچے گردن سے ہوتی ہوئی کندھے میں گھس گئی اس نے
ڈرتے ڈرتے ہاتھ اٹھایا انگلی سے کندھے کو چھوا تو وہ گیلی ہو گئی۔
"پسینہ" وہ زیرلب بڑبڑایا اور تقدیر کے اعتماد سے چہرے
پر ہاتھ ملا۔

"اوہ خدا! اس قدر ٹھنڈے پسینے میں تر ... تھا بغیر محسوس
کئے، اس کی قمیض گیلی ہو کر کمر کے ساتھ چپک گئی تھی۔ وہ اٹھ بیٹھا
اور جسم سے چپکے ہوئے کپڑے درست کرنے لگا تو ایک دم اس
کا ہاتھ گرم نمی میں لگا۔ خوف زدہ ہو کر اس نے ٹٹولا، تو ٹھنڈی سی
آہ بے اختیار اس کے لبوں سے نکل گئی۔
اس کا پاجامہ پیشاب سے تر تھا۔
وہ لڑکھڑاتا ہوا سلاخوں کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر
دروازے کے قریب ہوا تاکہ ہوا میں کپڑے سوکھ جائیں۔ تب
اس نے پہلی بار خود محسوس کیا کہ وہ سوکھے پتے کی طرح تھر تھر کانپ
رہا ہے۔
اس نے بہت چاہا اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی مگر
... سوا جسم کا ہر حصہ علیحدہ انداز میں دھڑک رہا تھا اور وہ

کہانی ... [illegible]

> قسمت نے کس کو چھوٹا یا بڑا نہیں بنایا
> کتنا ہی ادب ... کہ تو انہی ... انسان کی اپنی
> ... کے پیکر ... [illegible]

بے بس ہو کر دوبارہ لیٹ گیا۔ چاندنی کو دیکھنے کی خواہش کے
باوجود اس کی آنکھیں آپ ہی آپ بند ہونے لگیں، نیند سے
نہیں بلکہ نقاہت سے۔
ایک دم اسے کسی نے جھنجوڑ ڈالا۔ گویا کہ وہ اٹھ گیا
تو جیسے کسی نے چٹکی بھی اور وہ چکرا کر سلاخوں والے دروازے
سے جا لگا، ٹیکنے کا سہارا لینے کے انداز میں اس نے سلاخوں کو
مضبوطی سے پکڑ لیا اور چہرہ چپکا اوپر اٹھنے لگا۔ لیکن ابھی بالکل کھڑا
ہی ہوا تھا کہ ایک دم زور کا جھٹکا آیا اور دروازہ اپنی چوکھٹ
سے نکل کر باہر کی طرف گرا۔ وہ بھی سلاخوں سے چپکا ہوا منہ کے بل
گرا اور سنبھلنے سے پہلے ٹانگوں پر دو چار اینٹیں آن پڑیں۔ وہ
زور سے کراہا اور سر کو سلاخ پر ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اس کے نتھنوں
اور حلق میں گرد کے بادل گھسنے لگے۔
"بھونچال" وہ بڑبڑایا۔
اور بے ہوش ہو گیا۔
جب اسے دوبارہ ہوش آیا تو چاندنی میں سائے پہلے
جیسے ہی تھے، فضا میں گرد اور دھول بھی بدستور تھی اور جیل کے
دوسرے حصے میں شور کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ اس نے
اندازہ کیا کہ وہ زیادہ دیر بے ہوش نہیں رہا۔
اس نے گردن ہلائی۔
پھر باری باری بازوؤں کو حرکت دی۔
ڈرتے ڈرتے ٹانگیں ہلائیں۔
کہیں کوئی درد نہ اٹھا۔ سر موڑ کر دیکھا تو اینٹیں جسم سے
لگ کر پرے گر پڑی تھیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کمر میں ذرا سا درد
محسوس ہوا۔ جب جسم کو ادھر ادھر ہلایا تو وہ معمولی چوٹ تھی۔
اب اس نے ارد گرد کا جائزہ لیا۔
موت کی سزا پانے والوں کی قریباً سبھی کی کوٹھڑیاں گری

پڑی تھیں۔ ساتھ والے کمرے کا قیدی مرا پڑا تھا۔ جلے میں اس کا چہرہ بھی پک گیا تھا باقی چیزیں واضح اور صاف نہ تھیں کیونکہ گرد کا بادل پھیکی چاندنی کو چاٹ گیا تھا۔ جیل کے دوسرے حصوں سے چیخ پکار کی آوازیں آ رہی تھیں۔

اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال کوندا۔ اس کی زندگی کے دو دن باقی ہیں۔ اگر وہ اس موقع سے فائدہ اٹھالے تو شاید اسے نئی زندگی مل جائے۔ دوسری سوچ کے بغیر وہ وہاں سے چل دیا۔ اس نے اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش نہ کی۔ پکڑا جاؤں گا تو کیا فرق پڑتا ہے، دو ہی تو دن ہیں زندگی کے۔ اور وہ بھی قید تنہائی میں، پکڑ کے قید کریں گے یا گولی ماریں، پھانسی سے بڑی سزا تو کوئی نہیں.... وہ سوچتا چلا گیا۔

جیل میں افراتفری تھی۔ ایک دو بارکیں گر گئی تھیں اور سبھی لوگ زخمیوں کو نکال رہے تھے، کچھ لوگ ادھر ادھر بھاگ رہے تھے کسی کی مدد کے لئے، کسی کو بلانے کے لئے، کوئی چیز اٹھانے کے لئے۔ ان میں سے اکثر گارڈ کو پکار رہے تھے۔ وہ بھی ان میں خلط ملط ہو گیا، کہیں رکتا کہیں بھاگتا کہیں دوسروں کو پکارتا، آنکھ مچولی سی کھیلتا رہا اور ایک دفعہ موقع پا کر جیل کی بڑی دیوار تک جا پہنچا جہاں تھوڑی سی تلاش کے بعد گرا ہوا حصہ نظر آ گیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ تیز تیز چلتا ہوا وہ باہر نکلا اور سرپٹ بھاگنے لگا۔

شہر کا حلیہ بالکل بدل گیا تھا۔ گری ہوئی عمارتیں، ٹیڑھے میڑھے بجلی کے کھمبے، ٹوٹی ہوئی تاریں، کہیں درخت سڑکوں کے بیچ، سڑک میں دراڑیں، فضا میں گرد ہی گرد، گلیاں اور راستے پہچانے ہی نہ جاتے تھے۔ لوگ بدحواسی میں ادھر ادھر بھاگ رہے تھے، کہیں زخمیوں کے کراہنے کی آوازیں آتیں، کہیں امدادیوں کو بلانے کا شور تھا، بالکل حشر کا سماں تھا اور نفسا نفسی کا عالم تھا۔ چاند کی بھیگی گرد آلود روشنی میں اور بھی پر اسرار لگتا تھا۔

وہ ادھر ادھر گھوم رہا تھا۔ اس قتل کے علاوہ اس نے کبھی کوئی اور جرم نہ کیا تھا مگر اب مجرموں کی صحبت میں رہتے رہتے اس نے کافی سیکھ لیا تھا اور اب قسمت نے موقع بھی مہیا کیا تھا۔ کیونکہ اس نے جیل میں سنا تھا کہ ہر زلزلے کی تواریخ بتاتی ہے کہ اس کے فوراً بعد جرائم میں ایک دم اضافہ ہو جاتا ہے، اور زلزلہ زدہ لوگ اپنے نقصان کو بھول کر اپنے ہی جیسے مصیبت زدہ لوگوں کو لوٹنا شروع کر دیتے ہیں، چنانچہ وہ بھی اس موقع سے فائدہ اٹھانے پر تل گیا۔

ایک آدمی کی ٹانگ ملبہ میں دب گئی تھی، اس کا اوپر والا دھڑ گلی میں تھا اور وہ بے ہوش تھا۔ یہ بظاہر اس پر سے ملبہ ہٹاتا رہا۔ لیکن در اصل اس کی قمیض اتار رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ کامیاب ہو گیا۔ اپنی قیدیوں والی قمیض اتار کر تار تار کر دی اور دوسری پہن لی۔ اپنے لئے دوسری زندگی لینے کی عجلت میں وہ زخمی کی زندگی خطرے میں ہی چھوڑ کر چل دیا۔ ایک اور جگہ سے اس نے صندوق اٹھایا جس میں کچھ کپڑے اور نقدی تھی۔ اس کی اسکیم مکمل ہو چکی تھی اور شہر سے باہر جانے والی سڑک پر ہو لیا۔

نئی زندگی واقعی مختلف تھی۔ اس نے اپنا نام تبدیل کر لیا۔ داڑھی بڑھا لی۔ چہرے پر خود ہی استرے سے زخم لگا کر بڑا سا نشان بنا لیا۔ سر کے بال بڑھا کر پٹے بنا لئے۔ لوگوں سے الگ تھلگ رہتا، نہ کوئی دوست تھا نہ ہمراز۔ وہ کہیں ایک جگہ جم کر کام نہ کرتا۔ چند روز ایک جگہ مزدوری کر لی پھر کہیں اور خوانچہ لگانے لگا یا کسی ٹھیکیدار کے پاس اٹک جاتا۔

یہ بہت ہی بور اور اکتا دینے والی زندگی تھی۔ تنہائی اور خوف اس کے اعصاب کو ہر وقت بھاری بوجھ کی طرح دباتے رہتے، زندگی کے میلے اپنی پوری آن بان سے رونق کے غبار اٹھاتے مگر وہ شرکت سے قاصر تھا کیا معلوم کس جگہ قسمت کیا گل کھلائے اور وہ پہچانا جائے وہ کھل کر قہقہہ لگانے کو ترستا تھا اس کا دل کسی ہمراز سے بے تکلفانہ، بے حجابانہ باتیں کرنا چاہتا تھا۔ مگر مجبور تھا۔ دوسروں کو ہنستے دیکھ کر وہ آہیں بھرتا اور شعلوں فرماں لڑکوں کی آنکھوں میں تارے دیکھ کر اس کی اپنی آنکھیں بجھنے لگتیں۔

تین چار ماہ میں وہ تنگ آ گیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ خاموشی سے جا کر اپنی ماں کو نکال لائے اور دونوں کسی دور کے علاقے میں جا کر کھل کر زندگی گزاریں۔

سہ پہر کے سائے لمبے ہو رہے تھے۔ جب وہ گاؤں کے قبرستان پہنچا اس کا ارادہ تھا کہ اندھیرا ہونے تک وہیں چھپا رہے اور رات کو جا کر ماں سے ملے۔ ماں کے ملنے کے خیال سے ہی اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور اس فخر سے سوچا کہ میں نے مشکل وقت میں اپنی جان پر کھیل کر ماں کی حفاظت کی ہے۔

جہاں وہ چھپا ہوا تھا اس سے کچھ دور باپ کی قبر تھی۔ لیکن وہ ادھر نہیں گیا۔ اس نے فاتحہ بھی نہیں پڑھی۔ وہ ابھی تک اسے معاف نہیں کر سکا تھا کیونکہ اس کی وجہ سے اس کا گھر تباہ ہوا اور پھانسی کی سزا ملی اور اگر خدا یہ مدد غیب سے نہ بھیجتا تو وہ اب تک مر چکا ہوتا۔ اس نیک دل اور خوش سیرت ماں کو گاؤں میں شرمناک تہمت کی ذلت اٹھانی پڑی اور اس کے ازلی دشمن چوہدری کو ان پر ہنسنے کا موقع مل گیا۔ بہت سوچنے کے سال بھر پہلے بھی وہ گاؤں آیا تھا اور تھوڑی ہی دیر بعد کس ذلت سے گیا تھا۔ ہاتھوں میں ہتھکڑی، جسم پر خون کے چھینٹے، پیچھے لوگوں کا ہجوم، ساتھ ساتھ اس کی ماں روتی چلاتی بین کرتی۔ بچے اس کی ہتھکڑیوں کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے ایک دوسرے پر گرتے ہوئے اور وہ ناہموار قدموں سے چلتے ہوئے یہ سوچ رہا تھا کہ باپ کی ہوس نے اسے کہاں پہنچا دیا ہے۔ آج وہ اپنے گاؤں میں آیا ہے لیکن چوروں کی طرح چھپ کر۔ وہ بچپن کے ساتھیوں سے گلے نہ مل سکتا تھا۔ وہ ہر گھر کے سامنے رک کر گھر والی بوڑھی سے دعائیں نہ لے سکتا تھا۔ نہ کسی ہمسائے کے بچے کے سر پر پیار کے ساتھ ہاتھ پھیر سکتا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے ہی گھر کھلے بندوں نہ جا سکتا تھا۔

حسرتوں کا گولہ اس کے حلق میں پھنسنے لگا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور گیلی آنکھوں میں نفرت بھر کے اس نے اپنے باپ کی قبر پر بڑی ہی کڑی نگاہ ڈالی۔ اور پھر اس کے خیالوں میں ماں آگئی۔ نہ معلوم وہ کس حال میں ہوگی۔ روتے روتے اس کا حلیہ بگڑ گیا ہوگا۔ لوگوں کے طعنوں کے تیروں نے اس کا سینہ چھلنی کر دیا ہوگا۔ وہ پیسے کی وجہ سے بھی تنگ ہو سکتی ہے۔ معلوم نہیں خوشیا مراثی اسے حصہ دیتا ہے یا نہیں۔ نہ معلوم گاؤں والوں کا سلوک اس کے ساتھ کیسا ہے۔ اس کے ذہن میں ماں کی جو تصویر ابھری تھی وہ انتہائی سوگوار اور اداس تھی۔

شام ہونے لگی۔ ادھر ادھر سے فاختہ کی آواز آئی۔ بلبلوں کے گروں کی دبی دبی سنائی دی، جہاں کہ اکثر شام کو نہایا کرتا تھا۔ طوطوں کے غول کے غول شور کرتے اس کے اوپر سے گزرنے لگے۔ بیزاری دور کرنے کو وہ ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ ایک جگہ وہ دیوار ذرا سی ٹوٹی ہوئی تھی اس نے جھانک کر دیکھا گاؤں سے آنے والا راستہ صاف نظر آتا تھا۔ اپنے آپ کو احتیاط سے چھپا کر

انتظام کرنے کے بعد وہ وہیں بیٹھ کر رات ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ یہ راستہ ہمیشہ کی طرح آج بھی سنسان تھا کیونکہ یہ صرف گاؤں سے قبرستان آتا تھا اور بڑی سڑک دوسری طرف تھی۔ اور وہاں بیٹھے بیٹھے اس نے دیکھا کہ گاؤں کی فصلیں تیار ہونے کو تھیں۔ جہاں کسانوں کو گندم کی کاشت کرنا تھی وہ کھیت خالی تھے۔ کہیں کہیں کپاس کی کاشت تھی مگر باقی سب گنا ہی تھا۔ ابھی فصل میں کچھ دیر تھی اس لئے لوگوں نے ان کو کاٹنے والے میلے نہیں لگائے تھے ورنہ تو شام کو اس راستے پر خوب رونق ہو جاتی تھی۔

وہ کافی دیر خالی سڑک کو دیکھتا رہا۔ کئی دفعہ کسان کی کھیتوں پر نظر ڈالی اور بالآخر اکتا گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ پیچھے ہٹ کر آرام کرے کہ دور سے اسے ایک شخص آتا دکھائی دیا۔ پھر نہ جانے کہاں سے ایک اور شخص نمودار ہو گیا۔ خوفزدہ ہو کر وہ انہیں دیکھنے لگا کیونکہ ادھر آنے والا یقیناً قبرستان آئے گا اور اس کی موجودگی مخفی نہ رہ سکے گی۔ جلدی سے ادھر ادھر چکر لگا کر اس نے چھپنے کی جگہ تلاش کی اور پھر گردن نکال کر دیکھنے لگا۔

چند ہی ثانیوں میں اسے اندازہ ہو گیا کہ ان میں سے ایک مرد اور ایک عورت ہے۔ وہ ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ عورت نے دیہاتی لوگوں کی مخصوص دھوتی پہنی ہوئی تھی جو رنگ میں بار بار دھلنے سے کالی ہو جاتی ہے۔ مگر اس کا کرتا سرخ تھا اور ویسا ہی کرتا تھا اور سر پر کھلتے ہوئے سرخ رنگ کی چادر تھی۔

یہ کون ہو سکتے ہیں؟ اس نے کتنے ہی اندازے لگائے۔

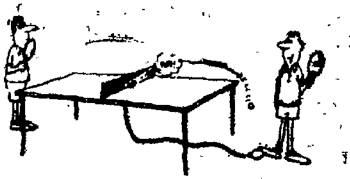
وہ سوچتا کہ یہ فلاں لوگ ہوں گے، لیکن ان کی کوئی حرکت یا چال دیکھ کر وہ خیال بدل لیتا۔

وہ دونوں ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر تھے، مگر تھوڑی دیر میں نزدیک آگئے اور آتے گئے۔

وہ ایک دم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ جیسے اسے بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔ حفاظتی حدود سے اندر ہی اندر وہ جتنا آگے جھک سکتا تھا جھک کر باہر آگیا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ چال پر غور کیا، جسم کے حجم کو دیکھا، کپڑوں کا اسٹائل پرکھا۔ اس نے پکی دیوار کو اتنے زور سے پکڑا کہ انگلیاں مٹی میں دھنسنے لگیں اور اس کے منہ سے دبی دبی چیخ نکل گئی۔

"ماں!"

اس کی آنکھیں گویا باہر آ رہی تھیں۔



چلتے چلتے دونوں بالکل قریب آگئے۔ ہوا کے جھونکے ان کی گفتگو کے اونچے الفاظ اڑا کر اس تک لاتے مگر دوری کی وجہ سے وہ سمجھ نہ سکتا تھا۔ ایک جھونکا ماں کی ہنسی اٹھالایا مانوس نانہ، اپنائیت کا انداز لئے۔ وہ تھوڑا متعجب ہوا کیوں کہ اس میں سوگواری کی جھلک تک نہ تھی بلکہ کھلتی ہوئی بھرپور ہنسی تھی۔

مگر اس کے ساتھ کون تھا؟

اس نے غور سے دیکھا اور اس کے جسم سے جان نکلنے لگی۔ وہ فضل ماشکی تھا۔

حیرت اور غصے سے اس کے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگا۔

"فضل ماشکی" وہ بڑبڑایا "فضل ماشکی"

اس نے بے یقینی سے پاؤں بدلا "فضل ماشکی؟؟"

اس کے دماغ میں بدترین وسوسوں نے سر اٹھایا مگر وہ ابھی تک قبول کرنے کو تیار نہ تھا اور بالکل پتھر کا بت بنا انہیں دیکھ رہا تھا جو قدم بہ قدم بڑھتے آرہے تھے۔

وہ بھول چکا تھا کہ اسے اپنے آپ کو چھپانا ہے، اسے کوئی ہوش نہ تھا کہ دیوار کا سہارا لیا ہے یا نہیں۔ اس کی ساری جسارت آنکھوں میں سمٹ آئی تھیں اور وہ منہ کھولے دیکھے جا رہا تھا۔

اب وہ دونوں اس سے چار کھیت دور تھے پہلا کماد کا تھا۔ دوسرا خالی تھا اور ساتھ ہی ایک راستہ اندر کو مڑتا تھا، دو کھیت کماد کے تھے۔

پہلا کھیت ختم ہو گیا، دوسرے کے ساتھ چلتے چلتے ان کے قدم رکنے لگے انھوں نے دبے انداز میں مشورہ کیا اور پھر اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ مگر وہ کیا کرتا۔

فضل ماشکی نے عورت کا ہاتھ پکڑا۔ دونوں نے ادھر ادھر دیکھا، اور کھیتوں کے اندر جانے والے کچے راستے پر مڑ گئے۔ اب وہ کماد کی اوٹ میں تھے اور وہ دیکھ نہیں سکتا تھا۔

سب کچھ بھول کر اس نے ایک جست لگائی۔ دیوار پھلانگ کر سڑک پر آگیا۔ سرپٹ دوڑتا ہوا وہ کھیت کی کھوکھ گیا اور رک کر جھانکا کہ دونوں کماد والے کھیت میں گھس رہے ہیں۔

بغیر سوچے سمجھے اس نے شبے پانی چکر کاٹا اور دوسری طرف سے اسی کھیت میں داخل ہو گیا۔ چھپکلی کی سی ہوشیاری سے آگے بڑھا۔ قدم قدم، چپہ چپہ، ایک ایک انچ۔

ایکدم ماں کی ہنسی کی آواز آئی اور وہ وہیں دبک گیا کماد جلنے سے اس نے اندازہ لگایا کہ وہ ان سے دو تین گز دور ہوں گے۔

دونوں سرگوشی میں باتیں کر رہے تھے۔ اور وہ کان کھڑے کر کے سننے کی کوشش کرنے لگا۔

فضل کی آواز میں تندی اور بے صبری تھی "فکر نہیں کر اور لے دو دن لگا"

پھر خاموشی چھا گئی اور وہ دم سادھے پڑا رہا۔

اچانک فضل بولا۔

"تو ابھی ادھر ہی رہ۔ میں چلا جاؤں تو تو دوسری طرف سے نکل جانا"

اور کماد ہلنے لگا۔

وہ دم سادھے پڑا رہا۔ تیز دھاروں والے پتوں سے اس کے چہرے اور بازوؤں پر کئی خراشیں آئیں مگر اندر سے دل جیسے کسی نے تیز چھری سے چھید دیا تھا۔ اس کے ذہن میں حشر برپا تھا۔ یہ سب کچھ کیا تھا؟ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ لیکن اس اندرونی طوفان کے باوجود اس کے بازو شل تھے۔ اور قوت بالکل غائب تھی۔ اس نے کئی دفعہ ارادہ کیا کہ ابھی اٹھ کر ان دونوں کو دبوچ لے مگر اس کا جسم دماغ کا ساتھ نہ دیتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے اعضا قابو میں نہیں ہیں۔

گنتی کی اس کمین گاہ میں تھوڑی دور اس کی ماں بیٹھی تھی اور اس تمام سانحے سے بے خبر تھی جو اس کے جوان لڑکے پر گزر چکا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ باہر نکلی، جھاڑے ہوئے بے پرکھی اور جھک کر نہر کی چھوٹی نالی میں منہ ہاتھ دھونے لگی۔

"ماں؟"

وہ تڑپ کر مڑی اور اس اجنبی کو حیرت سے دیکھنے لگی۔ جو ابھی وہاں اگا تھا اسے الگ کر دیکھا جا رہا تھا اب اپنی شعلہ بار آنکھیں

کسی جلاد کی طرح اس پر جھکتے ہوئے تھا۔
داڑھی، چہرے پہ زخم کا نشان، پگڑی۔
یہ کون تھا؟؟؟
مگر آنکھوں کی بناوٹ۔
اور ناک کا خم۔
ماں کی آواز۔
وہ پہچان گئی۔
پھر وہ دونوں ان بھاری لمحوں کی گرفت میں آ گئے جہاں وقت رک جاتا ہے۔
وہ سر سے پاؤں تک لرز رہا تھا جیسے آتش فشاں پہاڑ کے لاوے کو باہر نکلنے کا راستہ نہ ملے۔
وہ سکتے میں تھی، مرا ہوا بیٹا زندہ اور یہاں، فضل ماشکی، بیٹا؟؟
لاوا پھٹ پڑا "ماں!!! میں نے سب کچھ دیکھ لیا ہے"
دونوں مٹھیاں بھینچ کر اس نے ہوا میں لہرائیں اور زور سے رانوں پر دو ہتھڑ مارتے ہوئے جھک کر بیٹھ گیا پھر دونوں ہاتھ زمین پر ٹیک دیئے اور زار و قطار رونے لگا۔
عورت کے چہرے کے رنگ بدلتے رہے نہ معلوم کن کن خیالات کے زیر اثر جہاں جنسی خیالات کا معاملہ ہو وہاں عورت کے دل کا راز پانا قطعی ناممکن ہے، ایسے وقت اس کا چہرہ آئینہ نہیں، بلکہ پردہ بن جاتا ہے۔ مگر بیٹے کو ماں کی طرف دیکھنے کا کوئی ہوش نہ تھا، وہ اپنے جذبات سے مغلوب تھا۔
"بیٹا، دل نہ خراب کرو" چند لمحے بعد وہ بولی "میں تمہیں سب بات سمجھا دوں گی"
بیٹے نے زور سے انکار میں سر ہلایا۔ وہ آنسو روکنے کی مدید کوشش کر رہا تھا، جو اسے بولنے نہیں دیتے تھے۔ وہ کچھ کہنے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔
عورت اسے گومگو کی حالت میں دیکھتی رہی۔
"بابا۔۔۔ ٹھیک۔۔۔" وہ مزید کچھ نہ کہہ سکا اور شدت مایوسی کے عالم میں دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھک لیا۔
ماں اسے دیکھتی رہی، اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کہے۔
ایک دم اس نے چہرے سے ہاتھ ہٹا لئے اور ماں کی طرف پھیلا کر بولا "ماں تم نے بابا کو مجھ سے مروا ڈالا، تم نے جھوٹ بولا تھا!"
عورت اب سنبھل چکی تھی "میں نے جھوٹ نہیں بولا تھا" "تو وہ فضل ماشکی۔۔۔" وہ آگے کچھ نہ کہہ سکا۔
"یہ تمہارے باپ کا قصور ہے بیٹے" عورت سنبھل چکی تھی "جس عورت پر سر بازار تہمت لگائی جائے اور وہ بھی خاوند کی طرف سے اور پھر اس کا کوئی سہارا نہ رہے نہ لوگ، نہ خاوند، نہ بیٹا تو وہ پھر اس تہمت کا ہی سہارا لے سکتی ہے اور کون تہمت لگے گا۔ میں نے تو فضل کا کبھی سوچا ہی نہ تھا، مگر وہ مر گیا تم لاپتہ ہو گئے جیل والوں نے کہا کہ تم لڑنے میں مر گئے ہو۔ لوگوں نے ہر وقت فضل کا نام میرے منہ پر مارا تو میں اس کی پناہ نہ لیتی تو کہاں جاتی؟"
اس نے اپنے ہاتھ بیٹے کی طرف پھیلا دیئے۔
بیٹے نے چند لمحے ماں کو غور سے دیکھا۔ پھر وہ تیزی سے آگے بڑھا، اپنی ماں کو زور سے دھکا دیا اور خود بھاگتا ہوا کھیت کا موڑ مڑ گیا۔
اس نے پیچھے سے ماں کی پکار سنی مگر وہ سرپٹ بھاگتا گیا بھاگتے بھاگتے اس کے ذہن میں باپ کا وہ چہرہ ابھرا جو بیٹے کی کلہاڑی کا پہلا وار روکنے کے لئے دونوں بازوؤں میں چھپا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر حیرت تھی، استعجاب تھا، خوف تھا اور معصومیت تھی، وہاں ریاکاری نہ تھی۔
قبرستان کے پاس پہنچ کر دیوار پھلانگی۔ تیر کی طرح باپ کی قبر پہ گیا۔ اس پر اوندھے منہ گر پڑا اور اس کا اندرونی کرب ایک چیخ بن کر ابل پڑا۔
"بابا!!! مجھے بتاؤ کون سچا ہے؟"
پھر نرم مٹی میں ناخن کھبوتا ہوا وہ بلک بلک کر رویا کہ ارد گرد کے درختوں سے پنچھی اڑ گئے۔
تین دن اور تین راتیں وہ پاگلوں کی طرح گھومتا رہا، اور اس سوال کا جواب سنسان سڑکوں، اندھیری گندی گلیوں، نیلے آسمان چاند سورج اور پرندوں سے پوچھتا رہا۔ مگر کسی انسان سے نہ پوچھا، جو قابل اعتبار مخلوق نہ تھی۔
چوتھے روز صبح وہ پولیس اسٹیشن میں تھانیدار کے سامنے کھڑا تھا اور بڑے ہی غیر جذباتی سپاٹ انداز میں کہہ رہا تھا۔
"میں جیل سے بھاگا ہوا قیدی ہوں مجھے پھانسی کی سزا ہوئی تھی۔"



تین عورتیں تین کہانیاں

تحریر۔ رضا فاروق

میں سازش کا شکار ہو گئی

مجھے آج تک پتہ نہیں چلا کہ میرے دیور کو مجھ سے نفرت کیوں ہوئی۔ میں طبیعتاً نرم دل ہوں۔ چھوٹے بڑے سبھی سے میرا سلوک بہت اچھا ہے۔ خوبصورت اور سلیقہ شعار ہوں۔ بچپن سے میرے سگھڑ پن کی تعریف ہوتی رہی ہے۔ باجی کی شادی کے وقت میری عمر صرف دس سال کی تھی اور امی اکثر بیمار رہتی تھیں۔ چار چھوٹے بھائی تھے، میں نے گھر کا کام کاج خود سنبھال لیا چپاتیاں تک خود ڈالتی تھی۔ اسکول سے آتے ہی گھر کی صفائی ستھرائی اور کھانے پکانے میں لگ جاتی، چسمہ، اتنی تھی کہ کھیل اور پڑھائی کے لئے بھی ٹائم نکال لیا کرتی۔ درس لو ڈو تا میرا پسندیدہ گیم تھا۔ کلاس میں زیادہ ہوشیار نہیں تھی لیکن فیل بھی کبھی نہیں ہوئی۔ ویسے ٹیوشن بھی کبھی نہیں لی۔ اپنے آپ پڑھ لیا کرتی اور پاس ہوتی رہی۔ باجی کا سسرال گوجرانوالہ میں تھا ان کے شوہر لیکچرار تھے۔ خاندان کے باقی لوگ زمیندار تھے۔ یہاں بیوی شہر میں رہتے تھے اور بقیہ افراد گاؤں میں رہائش پذیر تھے۔ اسکول کی چھٹیاں ہوتیں اور باجی کا خط آجاتا کہ گڑیا کو ماں بھیج دو۔ میں اپنے چھوٹے بھائی محمود کے ساتھ تیار ہو جاتی، اکبر ریلوے میں ملازم تھے وہ کسی جاننے والے کے ہاتھ گوجرانوالہ بھیج دیتے۔ باجی کے ہر سال بلانے کی وجہ مجھ سے محبت ہی نہیں تھی اصل وجہ یہ تھی کہ ان کے چھوٹے بچے مشکل سے قابو میں آتے تھے۔ میں وہاں جاکر انہیں سنبھال لیا کرتی۔ بچوں کی محبت میری گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ وہ مجھ سے بہت جلد مانوس ہو جاتے اور باجی اگلے بچے کی تیاری میں لگ جاتیں۔ اس طرح دو ڈھائی مہینے وہ سکون سے بسر کر لیتیں۔

وقت کے ساتھ ساتھ میں بڑی ہوتی گئی۔ میرا چمپئی رنگ دودھیا ہوتا گیا۔ آنکھوں میں شوخی شرارت اور نوعمری کی چمک آ گئی۔ قد پانچ فٹ چار انچ ہو گیا۔ جسم بچپن کی جسمانی مشقت سے خوبصورت ہو گیا۔ پھرتی میں خاندان کی لڑکیوں میں میری مثال دی جاتی تھی کہ وہ بھی تو بچی ہے گھر کا کام کاج منٹوں میں نمٹا کر کالج کی پڑھائی بھی محنت سے کرتی ہے اور پھر میری شادی کا سبب بھی ایک عجیب سا حادثہ بنا۔ ایسا ہوا کہ ایک روز میں اپنی پھوپھی کے گھر گئی۔ میری امی کی طبیعت خراب تھی۔ کالج سے اس روز چھٹی کر لی تھی۔ امی نے کہا کہ

ابھی پھوپھی سے کشتی کے پیسے لئے تھا۔ میں نے جلدی جلدی برقعہ
اوڑھا۔ اور گلی میں داخل ہونے کے بعد ہی سختی سے پردہ کرنے لگی
تھی کیونکہ محلے کے وہی لڑکے جو کبھی بھائیوں کی طرح ساتھ کھیلا
کرتے تھے اب عاشق بنے گریبان کھولے بال بکھرائے
راستوں کے چکر کاٹنے لگے تھے۔ یہ تو ہماری فلموں کی مہربانی
ہے کہ زمری سے فلمیں دیکھتے دیکھتے جوان ہوتے ہی کسی سے
عشق کرنا اپنا اولین فرض سمجھنے لگے ہیں۔ میں نے اسی لئے برقعہ
اوڑھ لیا کہ نہ نظر آؤں گی نہ دل پھینک آہیں بھریں گے۔ اب
مصیبت یہ ہوئی کہ برقعے کا نیچے والا حصہ تو مل گیا اور اوپر والا نہ مل
سکا۔ امی نے کہا کہ ذرا سی دور تو گھر ہے یونہی چلی جا۔ میں نے
سوچا اس وقت سب لوگ اسکول، کالج یا دفتر گئے ہوتے ہیں۔
یونہی چلے جانے میں کیا مضائقہ ہے۔ میں جھلا کر دوپٹہ اوڑھے
باہر آ گئی۔ پھوپھی کا گھر اگلے محلے میں تھا۔ جلدی جلدی گلیاں پار
کرنے لگی۔ چوک عبور کر کے بائیں گلی میں پھوپھی کا گھر تھا۔ چوک پر
پہنچی تو ایک تانگہ اچانک سامنے آ گیا، میں گھبرا کر ایک طرف ہونے
لگی۔ تانگہ بھی اسی طرف ہو گیا۔ میں حواس باختہ ہو کر ایک دم پیچھے
ہٹی اور اینٹ سے ٹھوکر کھا کر گر پڑی۔ تانگہ اسی وقت روک لیا
گیا۔ کوئی تانگے میں سے کودا اور مجھے سہارا دینے کے لئے بڑھا۔
اس وقت تک میں کھڑی ہو چکی تھی۔ غصے سے آنے والے کو
گھورنے لگی۔ یہ کوئی نوجوان تھا۔ خوش شکل اور مہذب سا۔ محبت
اور ہمدردی سے کہنے لگا "آپ کو چوٹ تو نہیں آئی؟" میں نے
زبان پر آئی گالی بڑی مشکل سے روکی اور بولی "جائیے صاحب
اپنا راستہ لیجئے مجھے ہمدردی کی ضرورت نہیں ہے۔" یہ کہہ کر
میں تیزی سے واپس پلٹ آئی کہ یہ حضرت اپنا راستہ لیں تب
پھوپھی کے گھر جاؤں گی۔ پاس ہی میری سہیلی کبریٰ کا گھر تھا۔
اسے میں نے اپنی قمیض سلنے کو دی ہوئی تھی۔ میں کبریٰ کے
گھر گھس گئی۔ کبریٰ نے پڑھائی چھوڑ کر سلائی کے اسکول میں
داخلہ لے لیا تھا۔ میں کچھ دیر اس کے پاس بیٹھی۔ پھر اسی کے
گھر سے جلدی میں نکلی اور پھوپھی کے گھر چلی آئی۔ گیارہ بجے کا
وقت تھا مجھے حیرت ہوئی کہ پھوپھا جان کی آواز آ رہی تھی اس
کا مطلب ہے ہوا کہ وہ دفتر نہیں گئے تھے، خیر میں نے دروازہ
کھٹکھٹایا۔ اندر سے باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں مگر کسی نے
دروازہ نہیں کھولا۔ میں جھنجلا کر ڈرائنگ روم والے دروازے
کی طرف آ گئی۔ اسے ہاتھ لگایا وہ کھل گیا۔ گویا اندر کوئی مہمان وغیرہ
موجود ہے۔ میں نے سوچا دھوپ میں جلنے سے بہتر ہے کہ اندر
چلی جاؤں۔ اندر آئی تو ایک دم ٹھٹک گئی۔ سامنے صوفے پر
وہی نوجوان براجمان تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا۔ کہنے لگا
"آئیے آپ کو کس سے ملنا ہے۔" میں چڑ کر بولی "جی یہ میری
پھوپھی کا گھر ہے۔ آپ اپنی مہربانی رہنے دیجئے۔" وہ مسکرا اٹھا
اور میں یہ شکر کرتی ہوئی اندر آ گئی کہ پھوپھا ڈرائنگ روم میں موجود
نہیں تھے ورنہ ضرور ڈانٹ پڑ جاتی۔ اندر آئی تو دو اجنبی خواتین
نظر آئیں ——— اور سلمیٰ میری پھوپھی کی بڑی لڑکی سفید ریشمی غرارہ
سوٹ اڑائے دوپٹہ سر پر جمائے نظریں جھکائے کھانے کی میز
پر چائے کے برتن رکھ رہی تھی۔ اوہو تو یہاں خاص مہمان آئے



ہوئے تھیں۔ میں نے ادب سے ان لوگوں کو سلام کیا۔ وہ مجھے دیکھ کر تھوڑی سی حیران نظر آئیں۔ پھوپھی نے میرا تعارف کرایا "یہ میرے بھائی کی بچی ہے۔" ان میں سے ایک کہنے لگی "آپ سے تو چوک پر ملاقات ہو چکی ہے۔ ہمارے تانگے کے سامنے آگئی تھیں۔" پھوپھی نے تشویش سے مجھے دیکھا۔ اودھر تو تانگے میں یہ خواتین بھی موجود تھیں۔ میں نے یہ غور ہی نہیں کیا تھا۔

وہ دونوں بڑی محبت پیار سے مجھ سے باتیں کرنے لگیں پھوپھی خاصی پریشان نظر آرہی تھیں۔ چائے کی ٹیبل پر بھی وہ بجھی بجھی رہیں اور چار روز بعد مجھے ان کی پریشانی اور بجھو جانے کا مطلب سمجھ میں آگیا۔ وہ خواتین سلمیٰ کا رشتہ لینے آئی تھیں۔ مگر میں نے راستہ کاٹ دیا — اور وہ میری صورت کی گرویدہ ہوگئیں۔ ادھر صاحبزادے بھی میری صورت پر فریفتہ ہو گئے تھے۔ انہوں نے سلمیٰ کا ذکر تک نہیں چھیڑا۔ باتوں باتوں میں میرے گھر کا پتہ پوچھا اور ہمارے گھر آدھمکیں۔ امی کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ ایک اچھا رشتہ مل رہا تھا۔ ملٹری انجینئر لڑکا تھا، خاندان بھی اچھا تھا۔ چند ماہ میں میری شادی ہوگئی اور شادی کی پہلی رات انہوں نے مجھ سے پہلا فقرہ یہ کہا "زیادہ چوٹ تو نہیں آئی محترمہ؟" میں شرما کر دوہری ہو گئی۔ وہ بولے "تمہیں تو شاید اتنی چوٹ اس وقت نہیں لگی ہوگی مگر میرا دل آج تک زخمی ہے۔ کیسی تیکھی نظر سے دیکھا تھا تم نے۔"

میرے شوہر کی وارفتگی اور پیار کا اندازہ آپ لگا لیں میرے پروانے تھے اور میں ان کی دیوانی۔ مجھے نہیں معلوم کہ میرا چھوٹا دیور کیوں مجھ سے جلنے لگا، جبکہ میری ساس اور تینوں نندیں مجھے پسند کرتی تھیں۔ بہت سوچتی ہوں تو صرف ایک وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ شادی سے پہلے اظہر اسے بہت چاہتے تھے۔ اس کی ہر فرمائش پوری ہوتی تھی۔ ہر فنکشن میں اسے ساتھ لئے پھرتے تھے۔ گھر میں بھی اس کا پلنگ اظہر کے ساتھ بچھا ہوا تھا۔ کھانا ساتھ، سونا ساتھ، کھیلنا کودنا ساتھ۔ دونوں بھائیوں کی عمر میں دس سال کا فرق تھا۔ اظہر اٹھائیس کے تھے تو جاوید اٹھارہ کا ہوگا۔ لیکن ذہنی طور پر وہ بالکل بارہ چودہ سال کے لڑکوں جیسا تھا۔ ہر بات پہ اڑ جاتا، چیزیں توڑ پھوڑ دیتا۔ اور اپنی ضد منوانے کے لئے بھوک ہڑتال کر دیتا۔ جس کے والدین اب بھی ناز برداریاں اٹھاتے تھے۔ لیکن اظہر کی دلچسپی اور محبت کا محور اب میں بن گئی تھی اور اظہر اندر ہی اندر مجھ سے جلنے لگا تھا۔ بظاہر بھابی بھابی کرتا رہتا مگر جب اکیلا ہوتا تو انتہائی نفرت اور نخوت سے بات کرتا۔ میں سوچتی کہ پیار محبت سے اس کا رویہ بدل جائے گا۔ اس لئے کبھی اظہر سے اس کی شکایت نہیں کی، کبھی کبھی ساس بگڑ جاتیں "تو اپنی بھابی سے کس اکھڑپن سے بات کرتا ہے۔ عمر میں تجھ سے ایک دو برس بڑی ہیں اور رشتے میں بھی تیرا ان کا احترام واجب ہے۔"

وہ باز آنے والا نہیں تھا۔ میں نے اپنے طور پر اس کا ہر ممکن علاج کر ڈالا۔ کبھی پیسے دے کر کبھی اسے کالج کے لڑکوں کے ساتھ باہر جانے کی اجازت دلوا کر اسے رام کرنا چاہا مگر پتہ نہیں کیوں اس نے میرے خلوص کو ٹھکرا دیا۔ اظہر کے سامنے وہ مجھ سے بڑی محبت جتلاتا۔ مگر ان کی عدم موجودگی میں وہ گن گن کے اس محبت کے بدلے لیتا۔ کبھی طنز کر کے کبھی پریشان کر کے۔

شادی کو تین سال گزر گئے۔ میں ایک بیٹے کی ماں بن گئی۔ گھر میں میری اہمیت اور بڑھ گئی۔ نندوں کی شادیاں کر دی تھیں۔ ایک چھوٹی رہ گئی تھی۔ اس کے لئے بھی رشتے کی تلاش جاری تھی۔ اظہر نے ایف ایس سی کر لیا تھا۔ پہلے سال لاہور انجینئرنگ کالج میں داخلہ نہیں ملا۔ وہ سال بھر گھر بیٹھ کر میرا خون جلاتا رہا اور دوسرے برس اتفاق سے میرے میاں کا کراچی تبادلہ ہو گیا۔ وہاں انہوں نے کوشش کر کے جاوید کو انجینئرنگ میں ایڈمیشن دلا دیا۔ بنگلہ ملتے ہی مجھے بھی بلا لیا۔ اور اب جاوید کو مستقل طور پر میرے ساتھ رہنا تھا۔ کالج میں جانے کے بعد وہ اور "چھلا" ہو گیا تھا۔ ماں پاس نہیں تھی مجھ پر ایسے حکم چلاتا جیسے اس کی باندی ہوں۔ میں بچے میں اتنی الجھی رہتی تھی۔ اوپر سے نواب صاحب کا حاکمانہ انداز۔ میں ایک روز پھٹ پڑی، وہ جیسے منتظر تھا تو تڑاخ پہ اتر آیا اور شام کو اظہر آئے تو ان سے شکایت جڑ دی۔ انہوں نے الٹا اسے ڈانٹا کہ بھابی سے ادب سے پیش آیا کرو۔ آئندہ میں ایسی کوئی بات سننا نہیں چاہتا۔ تب وہ پیر پٹختا کمرے میں آیا، مجھ سے بولا "آج کی بات یاد رکھنا بدلہ نہ لوں تو میرا نام نہیں۔"

میں نے یہ بات اظہر کو نہیں بتائی کہ بلاوجہ وہ اور بگڑیں گے گھر کا ماحول اور خراب ہوگا۔ بظاہر جھگڑا ختم ہو چکا تھا۔

کوئی معقول لڑکا ہوتا تو آئندہ ایسی بات پیدا ہی نہیں ہونے دیتا لیکن وہ ٹھہرا "ایسی جلدی تائب ہونے والا نہیں تھا۔ دو ماہ بعد اس نے واقعی بدلہ لے لیا۔ اظہر کو کسی کام سے جانا تھا۔ وہ چلے گئے، میرا اردلی بادشاہ گھر کے کام کے لئے آتا تھا۔ کوہاٹ کا لمبا چوڑا آدمی تھا۔ میں اس سے لاشعوری طور پر ڈرتی تھی، کیونکہ اسے عورت کی عزت کرنا نہیں آتا تھا۔ اکھڑ سا انسان تھا۔ جب بولتا ایسا لگتا جیسے لٹھ مار رہا ہو۔ جاوید مجھ سے بار بار کہتا کہ آپ نے بادشاہ کو بہت ڈھیل دے رکھی ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ ایسے لوگ بڑے مغرور اور خودسر ہوتے ہیں۔ اگر ذرا بدتمیزی یا ڈانٹ ڈپٹ کرو تو مارنے مرنے پر تل جاتے ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ ان جیسے لوگوں سے نرمی سے بات کی جائے۔

مجھے کیا معلوم کہ جاوید کے دل میں کیا ہے۔ بادشاہ مجھ سے اپنے گھر کی باتیں کرتا، اپنے گاؤں کے قصے سنایا کرتا۔ میں ذرا دلچسپی سے سن لیتی۔ جاوید نے اپنی ماں کو خط لکھا کہ بھابی آوارہ ہو گئی ہیں، ایک اردلی کو اتنا سر چڑھا رکھا ہے کہ مجھے ان کی نگرانی کرنی پڑ رہی ہے، پتہ نہیں بھائی کے کیا ارادے ہیں۔" میری ساس نے اظہر کو خط لکھا، مرد ایسے معاملات میں صد درجہ شکی ہوتا ہے۔ وہ واپس آئے تو چپ چپ سے تھے میں نے پوچھا تو ٹال گئے۔ اگر مجھے ذرا سی بھی بھنک پڑ جاتی تو اسی وقت اردلی کو نکال باہر کرتی۔ مجھ سے کہنے لگے "بادشاہ کی جگہ دوسرا اردلی بلا لیں۔" میں نے مخالفت کی کہ کام ستھرا کرتا ہے۔ اکھڑ آدمی ہے مگر کام میں تیز ہے اس لئے اس کا ہٹانا مناسب نہیں، میں اسے کنٹرول کرنا جانتی ہوں۔ اظہر نے مجھے گہری نظروں سے تولا۔ میرے دل میں چور ہوتا تو فکر کرتی میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں کہ اتنی گھٹیا بات سوچ رہے ہیں۔ اتفاق سے چوتھے دن ان کے گوادر جانے کے آرڈر آ گئے۔ وہ کچھ کہے بغیر چلے گئے ۔۔۔ ان کے جانے کے تیسرے دن کی بات ہے کہ میں نے بادشاہ سے کہہ کر ایک پلنگ لان میں ڈلوایا۔ میرے بیٹے انجم کو بہت گرمی لگ رہی تھی۔ وہ رو رہا تھا اسے لے کر میں یہاں لیٹ گئی۔ جاوید گیارہ بجے کے قریب آیا کہنے لگا "بھابی اپنے کمرے میں چلیں اوس پڑ رہی ہے انجم بیمار ہو جائیں گے۔" میں بھی نیند میں تھی اندر چلی آئی۔ جاوید نے کہا "بھابی اندر سے چٹخنی لگا لیں چوکیدار گھر چلا گیا ہے" وہ چلے آئے تو میں نے چٹخنی لگائی اور انجم کو CCT پر لٹا کر سو گئی۔ ایک بجے کے قریب کسی نے دھڑ دھڑ دروازہ بجایا۔ میں اٹھنے ہی لگی تھی کہ اٹھنے سے پہلے کسی نے کھٹ سے دروازہ کھول دیا۔ میں نے جلدی سے لیمپ جلایا تو باہر اظہر کھڑے تھے اور اندر دروازہ کھولنے والا شخص بھاگ کر مسہری کے پیچھے چھپ گیا۔ میں نے چیخ مار کر اظہر سے لپٹنا چاہا۔ انہوں نے دھکا دے کر مجھے پرے دھکیل دیا۔ ان کے پیچھے جاوید کھڑا آنکھیں چمکا رہا تھا۔ مجھے اس ڈرامے کا پہلے تو کچھ پتہ ہی نہیں چلا، میں سمجھی کہ شاید میرے کمرے میں چور گھس آیا ہے۔ مگر جب اظہر نے مسہری کے پیچھے چھپے ہوئے آدمی کو گریبان پکڑ کر باہر نکالا تو وہ بادشاہ تھا۔ تب تک بھی میرا یہی خیال تھا کہ بادشاہ چوری یا بری نیت سے کمرے میں گھس آیا تھا۔ لیکن جب اظہر نے مجھے دھکا دیا تب میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا کہ یہ کیا ہوا۔ بادشاہ نے دو چار جھٹکے کھانے کے بعد سر جھکا کر کہا "مجھے بی بی نے مجبور کیا تھا کہ رات میرے پاس رہو۔" میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ جاوید چہک کر بولا "دیکھ لیا بھائی جان!" میں جاوید کی سازش کا شکار ہو چکی تھی۔ اس نے ہی اس کو مسہری کے نیچے چھپا دیا تھا۔ اظہر نے اپنے آنے کی اطلاع جاوید کو دے دی تھی جو جاوید نے مجھ سے چھپائی، اور بھائی کو بدگمان کرنے کے لئے یہ جال بچھایا۔ جس میں میں اپنی بے خبری کی وجہ سے پھنس گئی۔

چار سال تک میں میکے بیٹھی رہی۔ اظہر نے مجھے دوسرے روز میرے میکے بھیج دیا تھا۔ بعد میں بادشاہ نے جگہ جگہ اس اسکینڈل کو پھیلایا۔ یہی آدمی کہ جب گھر کے آدمی نے شور مچایا تو وہ کیوں نہ سر چڑھتا۔ یہ چار سال میرے روتے اور نمازیں پڑھ پڑھ کر خدا سے دعائیں مانگتے گزرے۔ پھر خدا کو رحم آ گیا خاندان کے لوگوں نے اظہر کو سمجھا بجھا کر صلح پر راضی کر لیا میں واپس آ گئی، جاوید کراچی ہوسٹل میں داخل ہو گیا تھا اور میرے میاں کھاریاں میں تھے۔ میں نے ان کا دل جیتنے کی بھرپور کوشش کی مگر وہ بالکل سرد ہو گئے۔ بظاہر زندگی ٹھیک ٹھاک گزر رہی ہے مگر میں ہی جانتی ہوں کہ میرے اور اظہر کے درمیان کتنا بڑا فاصلہ ہو گیا ہے۔ بچوں کی خاطر سمجھوتہ کرنا پڑا

ہے سودہ تو یہ زندگی اب جہنم سے بھی بدتر ہے۔ اور جاوید خدا اس کو ایسے دکھ سے دوچار کرے، تب اسے پتہ چلے گا کہ اس نے مجھ پر کتنا بڑا ظلم کیا ہے۔



ہم دو بھائی اور ایک بہن تھے۔ میری بہن ہو بہو آپ کی دوسری تصویر تھی۔ کچھ عرصے سے بڑے شوق سے ہر ماہ پرچہ خریدتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے آپ سوچ رہی ہوں گی کہ اپنی بہن کے ہوتے ہوئے آپ کی تصویر سے محبت کیسی تو میری بہن، میری دو پیاری اور عزیز از جان بہن پانچ سال پہلے مجھ سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ گئی۔ ماں کا بچپن میں ہی انتقال ہو چکا تھا۔ والد حیات تھے۔ انہوں نے ہم تینوں بچوں کو ماں کی طرح پالا تھا۔ دوسری شادی ہماری وجہ سے نہیں کی۔ ہم لوگ پنجگور (بلوچستان) کے رہنے والے ہیں۔ پانچ سال پہلے یہ قصبہ ایک وبا کا شکار ہو گیا۔ خاندان کے خاندان تباہ ہو گئے۔ صبح جاگتے اٹھتے اور شام تک دو چار افراد موت کے منہ میں چلے جاتے۔ میرے بابا چاہتے تھے کہ کسی طرح یہاں سے ہم لوگ بھاگ نکلیں مگر موت نے انہیں دبوچ لیا۔ پہلے وہ اللہ کو پیارے ہوئے۔ شام کو میرا بھائی ان کے پاس چلا گیا اور دوسری صبح میری لاڈلی بہن بھی ان دونوں سے جا ملی اور اس دنیا میں، میں تن تنہا رہ گیا۔ موت نے مجھے بخش دیا تھا۔ حالانکہ میں نے رو رو کر اس سے التجا کی تھی کہ مجھے بھی ساتھ لے لے مگر وہ سنگدل میرا منہ چڑاتی پاس سے گزر گئی۔

میرے پڑوس میں رحیم الدین کا گھرانہ تھا۔ ان کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ میں انہیں چاچا کہتا تھا۔ ان کی بیوی مریم بڑی پیاری اور خوبصورت تھی۔ وبا پھیلی تو یہ گھر بھی اس کی چیرہ دستیوں سے محفوظ نہ رہ سکا۔ سارا گھرانہ موت کے منہ میں چلا گیا سوائے مریم چاچی کے۔ مریم چاچی کے کچھ رشتہ دار کراچی میں رہتے تھے۔ وہ قصبہ چھوڑ کر جانے لگیں تو مجھے بلا لیا۔ کہنے لگیں: "اسلم اگر چاہو تو میرے ساتھ چلو۔ یہاں اب کون ہے جس کے ساتھ رہو گے۔" میرا دل بھر آیا۔ میں رونے لگا۔ چودہ پندرہ سال کا ابھرا ابھرا سا بچہ تھا۔ مریم چاچی کو رحم آگیا۔ کہنے لگیں۔ "مت رو تمہیں اپنا چھوٹا بھائی سمجھ کر ساتھ لے جا رہی ہوں۔ تمہیں تکلیف نہیں ہونے دوں گی۔"

چاچی مجھے لے کر کراچی آگئیں۔ حسب وعدہ مجھے اسکول میں داخلہ دلا دیا۔ چاچی مریم کھاتے پیتے گھر کی عورت تھیں۔ کرائے پر مکان لے کر علیحدہ رہتی تھیں تاکہ رشتہ داروں پر بار نہ گزرے۔ بڑی خوددار شریف خاتون تھیں۔ اپنے لئے کسی فیکٹری وغیرہ میں ملازمت ڈھونڈ لی۔ مجھ سے کہا کہ جب تمہارے لائق کوئی کام مل جائے گا تو پڑھائی کے ساتھ ساتھ جاب بھی کر لینا۔ میں چاچی کے احسان تلے دبا ہوا تھا۔ چاہتا تھا جلدی سے کام مل جائے تاکہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکوں۔ ساتویں جماعت میں داخلہ لے لیا تھا مگر آکر مریم چاچی کا ہاتھ بٹاتا اور رات کو دیر تک پڑھتا رہتا۔ اگر دو چار سال اسی طرح گزر جاتے تو میں اپنے انہماک اور شوق کی وجہ سے دس بارہ جماعتیں ضرور پڑھ لیتا لیکن حالات نے پلٹا کھایا۔ چاچی کو ایک شخص نے پسند کر لیا۔ وہ جوان عورت تھیں۔ کب تک تنہا زمانے کا مقابلہ کر سکتی تھیں۔ شادی کی پیشکش قبول کر لی۔ شادی کے بعد مجھ سے ان کی علیحدگی ناگزیر تھی کیونکہ بھلا ان کے شوہر کو مجھ سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی اور میری وجہ سے وہ اپنا مستقبل کیسے تاریک کر لیتیں۔ ان دنوں وہ خاصی پریشان نظر آتی تھیں۔ میں حالات کے نرم گرم تھپیڑے سہہ چکا تھا۔ ان کی پریشانی بھانپ گیا۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ آپ میری وجہ سے متفکر نظر آتی ہیں۔ آپ میری محسنہ ہیں۔ جو کچھ آپ نے کیا ہے وہ ساری عمر نہیں بھلا سکوں گا۔ میں اتنا خود غرض بھائی نہیں ہوں جو بہن کی خوشیوں میں روڑے اٹکاؤں۔ آپ شادی کر لیں۔ میں کام تلاش کر لوں گا۔ چاچی چپ ہو گئیں۔ چند مہینوں بعد ان کی شادی ہو گئی۔ وہ شوہر کے گھر چلی گئیں۔ جاتے وقت مجھے سو روپے دیئے۔ کہنے لگیں: "تم ہمت سے دنیا کا مقابلہ کرنا۔ میری دعا ہے جہاں جاؤ قسمت تم پر مہربان رہے۔"

وہ میری زندگی سے ہمیشہ کے لئے چلی گئیں۔ میں نے اسکول چھوڑ دیا اور تندہی سے کام تلاش کرنے لگا۔ سوسائٹی میں مجھے ایک گھر میں سبزی وغیرہ لانے اور بچوں کی دیکھ بھال کرنے کی ملازمت مل گئی۔ ان لوگوں نے رہنے کو بھی جگہ دے دی۔ چلو رہنے کو ٹھکانہ تو ملا۔ روٹی تو اللہ نے ہی دینا ہے۔ طبیعت کو تھوڑا سا قرار ملا۔ سبزی لانے کے بعد بچوں کو اسکول بھی میں ہی چھوڑنے جاتا تھا۔ کبھی کبھی ڈرائیور مجھے گاڑی چلانے کی ٹریننگ دینے لگا۔ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ دل کا بہت اچھا تھا۔ مجھ سے بھائیوں جیسا سلوک کرتا تھا۔ ایک دن پوچھنے لگا۔ "کبھی تمہارا کوئی ملنے والا نہیں آتا۔ نہ تم کسی سے ملنے جاتے ہو۔ کیا تمہارا دنیا



میں کوئی اپنا ہے بھی یا نہیں۔ اس نے تو یہ بات ازراہ تفنن کہی تھی۔ مگر میرے دل پر تیر کی طرح کھب گئی۔ میرا اس دنیا میں اپنا کوئی نہیں تھا۔ آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔ ڈرائیور نے حیرت سے مجھے دیکھا اور بڑھ کر گلے لگا لیا کہنے لگا: "بھائی میرے روتے کیوں ہو۔ سچ سچ بتاؤ ماجرا کیا ہے؟" میں نے اسے بتا دیا کہ میرے اپنے مر کھپ چکے ہیں۔ میں واقعی دنیا میں بالکل اکیلا ہوں۔ ڈرائیور نے مجھے بہت دلاسہ دیا اور اس روز سے وہ میرا کچھ زیادہ ہی خیال رکھنے لگا۔ مجھے اس نے مشورہ دیا کہ تم ڈرائیونگ اسکول میں داخلہ لے لو۔ لائسنس مل جائے تو ڈرائیوری کی جگہ آسانی سے مل جائے گی۔ ایک دن مجھے چھٹی دلا کر ڈرائیونگ ٹریننگ اسکول لے گیا اور داخلہ دلا دیا۔ تین ماہ بعد مجھے لائسنس بھی مل گیا۔ تب ڈرائیور نے کہیں دوسری جگہ ملازمت کر لی اور میری اسی سیٹھ کے یہاں ڈرائیوری کی سفارش کر دی۔ میری تنخواہ ایک سو پچاس روپے مقرر ہو گئی۔ کھانا اور رہائش مفت کی تھی۔ یہ دن میری خاصی بے فکری کے دنوں میں شمار ہوتے ہیں۔ کھانا پینا اور سیر کرنا بس یہی مشاغل تھے۔ بچوں سے اپنا دل لگا لیا تھا۔ وہ بھی مجھ سے بہت محبت کرتے تھے۔ چاچی جی سے ملنے کو جی تو بہت چاہتا تھا لیکن ان کا پتہ معلوم نہیں تھا اور پھر یہ سوچ کر دل کو مار لیتا تھا کہ مولا جانے اس کا شوہر مجھے دیکھ کر خوش بھی ہو یا ناراض ہو جائے۔ ان تین چار سالوں میں میرا قد اونچا ہو گیا تھا۔ چہرے پر مونچھوں کی سبزی آگ آئی تھی۔ پہلی نظر میں تو چاچی بھی نہیں پہچان سکتی تھیں پھر یاد دہانی انہیں پریشان کرنے سے فائدہ؟ مجھے تو اللہ نے تنہائی کی سزا دی تھی سو بھگتنا تھی جب تک وہ چاہے۔

صاحب کے بنگلے کے پاس کچھ عرب لوگوں کا آنا جانا تھا۔ میں خود عرب ہوں قدرتی طور پر ان سے میل بڑھانے کی خواہش پیدا ہو گئی۔ ان لوگوں نے میرا خوشی سے خیر مقدم کیا تب بھید کھلا کہ یہ لوگ سونے کی اسمگلنگ کرتے ہیں۔ مجھ سے کہنے لگے کہ کب تک ایک سو پچاس کے لئے رات دن خدمت کرتے رہو گے۔ دوبئی جا کر کام کرو پھر دیکھو کیسی عیش کی زندگی ملتی ہے۔ میں ان لوگوں کے بہکاوے میں آ گیا جو کچھ جمع کیا تھا ان کے ہاتھ پر رکھ دیا اور ایک رات کی تاریکی میں مجھے اطلاع ملی کہ آج فلاں رات کو اڈے سے جہاز روانگی ہے۔ ملازمت کو خیر باد کہہ کے میں اپنا مختصر سا سامان اٹھائے گھر سے رخصت ہو گیا۔ اڈے پر پہنچا وہاں پہلے سے بہت سارے لوگ جمع تھے۔ تعداد پوری ہو گئی تو سب کو ایک لانچ میں بھر دیا۔ تین دن تین رات ہم کھلے سمندر میں بھیڑوں کی طرح سفر کرتے رہے۔ کھانے پینے کی شدید تکلیف تھی۔ وہ تو شکر ہے کہ ہم تھوڑے سے بچنے ہوئے جو ساتھ لے کر چلا تھا وہ مصیبت ہر جاتی خیر صاحب جیسے تیسے دوبئی پہنچے۔ لانچ ہمیں اتار کر یہ جا وہ جا۔ پیدل قافلہ بنا کر ہم چلے تب کہیں دوبئی کی شکل دیکھنا نصیب ہوئی اور اس سے زیادہ دقت تو ملازمت تلاش کرنے میں ہوئی۔ ہفتوں بھوکا پیاسا مارا مارا پھرا۔ پھر کہیں جا کر تین سو پچاس ریال کی ڈرائیوری ملی مہینے میں تین ہزار درہم تک ہو جاتے تھے۔ میرے تو واقعی ٹھاٹ ہو گئے مزے سے کھاتا پیتا ڈرائیوری کے لئے گاڑی ملی ہوئی تھی۔ صاحب مقامی آدمی تھا تعلیم یافتہ اور مہذب۔ ڈانٹ نہ ڈپٹ۔ زندگی میں مادی آسائش مل گئی مگر روحانی خلا تھا کہ سلگتا تھا اپنے ہم وطن لوگوں کی شکل دیکھنے سے کچھ پیاس بجھ جاتی تھی مگر وہ سب لوگ دولت کمانے کی دوڑ میں اتنے مصروف تھے کہ انہیں باہمی میل جول کے لئے وقت ہی نہیں ملتا تھا۔ ایک سال بعد میرا جی گھبرانے لگا صاحب سے چھٹی مانگی تو فوراً مل گئی۔ سیدھا کراچی پہنچا۔ کینٹ اسٹیشن پر واقع ہوٹل میں ٹھہرا۔ تمام دن گھومتا پھرتا رہا کوئی دوست

تھا نہ پیچھے والا۔ اکیلا آدمی جائے تو جائے کہاں۔ اچانک خیال آیا کہ پھر چڑیا گھر چلتا ہوں۔ تھوڑی بہت جانوروں سے محبت کر لوں۔ شاید انہیں ہی کا رحم آ جائے۔ رکشہ لیا وہاں پہنچا ٹکٹ لے کر اندر آ گیا لیکن پھر لوٹ آیا۔ ایک ایک پنجرے کو دیر تک دلچسپی سے دیکھتا ہوا جب ہاتھی کے پاس پہنچا تو اچانک میری نظر بنچ پر بیٹھی ہوئی ایک لڑکی پر پڑی۔ وہ بیٹھی نہیں بلکہ گم تھی اس انداز سے جیسے اسے یہاں کی کسی چیز سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا کہ شاید اس کے کوئی بھائی بھتیجے ساتھ ہوں مگر مجھے کوئی بچہ، آدمی یا عورت ایسی نظر نہ آئی جو اس کی طرف توجہ دے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ شاید وہ بھی تنہا تھی یا اسے کسی کا انتظار ہوگا یہ سوچ کر میں آگے بڑھ گیا۔ کچھ دیر گھوم گھام کر پھر اسی جگہ پہنچا تو یہ دیکھ کر تشویش ہوئی کہ وہ پھر اسی پوز میں خلاؤں میں گھور رہی تھی۔ اب مجھ سے نہیں رہا گیا کیونکہ شام گہری ہو رہی تھی اور ایک اکیلی لڑکی کا اتنی دیر تک یوں ہی خلاؤں میں گھورتے رہنا پریشانی کی بات تھی۔ ڈرتے ڈرتے میں اس کے پاس گیا۔ پہلی دفعہ ایک اجنبی عورت سے بات کر رہا تھا اس لئے اندر ہی اندر کپکپی سی چڑھ رہی تھی۔ بولا: "محترمہ کیا آپ کو کسی کا انتظار ہے۔" اس نے بڑی اداسی سے مجھے دیکھا کہنے لگی "نہیں۔" میری ہمت بڑھی۔ پوچھا "کیا آپ تنہا ہیں؟" وہ بولی "جی" مجھے بڑی حیرت ہوئی عورت شکل سے وہ کسی اچھے گھر کی لڑکی لگتی تھی۔ میں نے کہا "کیا آپ کو معلوم ہے کہ چوکیدار باغ ختم کرنے کا اعلان کر چکا ہے۔" وہ بولی "جی جانتی ہوں۔" اب میں حکمانہ انداز سے بولا "محترمہ آپ اپنے گھر چلی جائیں۔ لوگ آپ کو اکیلی دیکھ کر چہ میگوئیاں کر رہے ہیں۔" وہ بولی "آپ بھی تو ان ہی میں سے ہیں۔" مجھے غصہ آ گیا کیونکہ حقیقتاً میری نیت بری نہیں تھی۔ چڑ کر بولا "میں آپ کو ورغلانے نہیں آیا۔ سیدھا راستہ بتانے آیا ہوں۔" اس پر اس کی آنکھیں چھم چھم برسنے لگیں۔ میں گھبرا گیا۔ عورت کو روتا دیکھنا میرے بس کی بات نہیں تھی یقیناً اس پر کوئی بڑی افتاد آ پڑی تھی۔ محبت سے بولا "خاتون آپ مجھے بتائیں کہ آپ کو کیا تکلیف ہے؟" وہ اٹھ کھڑی ہوئی کہنے لگی "مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ میں ایسے دور سے گزر رہی ہوں کہ اب تو دکھوں میں بھی مزہ آنے لگا ہے۔" میں نے ذرا دلی سے پھر کہا کہ وہ مجھے اپنے بارے میں سچ سچ بتائے۔ میں خود اکیلا آدمی ہوں۔ میری جان کسی کے کام آ جائے تو اسے میں اپنے رب کی مہربانی سمجھوں گا۔ وہ غور سے مجھے دیکھنے لگی پھر بولی "میں ابھی بالکل تنہا ہوں۔ ظلموں کے شکنجوں میں گھر سے بھاگ آئی تھی اور اب اس کی سزا بھگت رہی ہوں۔" شکل سے دیکھا کا دیکھتا رہ گیا۔ پوچھا "کہیں بھاگ گئی تھیں؟" وہ بولی "نہیں میرے

ساتھ ایک آدمی ہے وہ مجھے گھر والوں سے بھگا کر لایا کہ کام دلائے گا وہ کر کے لایا تھا وہ مجھ سے محبت کرتا تھا کہنے لگا ہم ... لگا یہ اچھی جگہ ہے وہاں پکڑے جانے کا احتمال نہیں ہے۔ اس کے ساتھ آ گئی۔ یہاں اس نے یہاں لا کر مجھے دھوکے سے ... اور اب یہ مجھے بیچنے کی فکر میں ہے۔ میری آنکھیں کھل گئی ہیں۔ آج وہ مجھے کاروباری پہ ایک آدمی کے پاس چھوڑ کر گیا تھا۔ اس آدمی کے کچھ ملنے والے آ گئے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ اپنے گھر چلی جا رات کو آ جانا تب سے میں یہاں بیٹھی ہوں۔ جانا چاہتی ہوں مگر گھر والے قبول نہیں کریں گے اور اب جہاں جاؤں گی مجھے یہی عمل ادا کرنا ہوگا طوائف کا۔ سوچ رہی ہوں پھر کیوں نہ واپس کسی فلیٹ میں چلی جاؤں۔" مجھ سے بات کرتے کرتے وہ پھر رونے لگی۔ میں نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا بولا "اگر تیری کہانی سچی ہے تو اسی وقت میرے ساتھ چل۔ میں وعدہ کرتا ہوں تجھے قبول کرتا ہوں کہ تیری حفاظت کروں گا۔"

میں اسے لے کر ہوٹل واپس آیا۔ وہاں آ کر میں نے اس سے گھر کی تفصیل معلوم کی۔ میری نیت یہ تھی کہ کسی طرح لڑکی کو واپس گھر جانے پر آمادہ کر لوں۔ مگر وہ رونے لگی بولی "ماں باپ مجھے ٹکڑے کر کے پھینک دیں گے واپس نہیں جاؤں گی۔" میں نے کہا کہ "مجھے دبئی جانا ہے کیا تم ساتھ چلو گی۔" وہ فوراً راضی ہو گئی۔ بولی "آپ جانے سے پہلے مجھ سے شادی کر لیں۔ تاکہ مزید دھوکہ نہ کھاؤں۔" وہ واقعی صنم گزیدہ تھی اس کی تسلی کے لیے یہ اقدام ضروری تھا۔ اس کی مرضی جان کر میں دوسرے روز صبح کورٹ پہنچا۔ آسیہ ساتھ تھی۔ وکیل نے اسٹامپ پیپر پر تمام ضروری کوائف درج کر کے جلد فارغ کر دیا۔ جب کہ دلال اس کام کے ہم سے دو سو روپے مانگ رہے تھے۔ شادی رجسٹرڈ کرا کے ہم دونوں باہر نکلے۔ اسی روز ہم نے شناختی کارڈ اور پاسپورٹ بھی بنوا لیا۔ اب مسئلہ صرف یہ رہ گیا تھا کہ اس کے لئے کپڑے وغیرہ کا انتظام کروں۔ وہ باہر نکلنے سے کترا رہی تھی بولی "وہ لوگ مجھے تلاش کر رہے ہوں گے۔ اگر راستے میں مل گئے تو پکڑ لیں گے۔" میں نے اسے تسلی دی کہ اتنا بڑا شہر ہے میں تمہیں برقع پہنا دوں گا۔ ڈرو مت اب تم میری بیوی ہو غیر عورت نہیں۔ وہ بڑی مشکل سے راضی ہوئی۔ ... کرتے ہوئے بازار پہنچا اور ابھی خریداری کی نوبت بھی نہیں آئی تھی کہ کسی نے زور سے آواز دی "آسیہ! آسیہ!" میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا ایک موٹا سا آدمی بھاگا چلا آ رہا تھا۔ آسیہ کا چہرہ دیکھتے ہی زرد پڑ گیا۔ بولی "یہ وہ آ گیا۔ اب بتاؤ کیا ہوگا۔" میں مقابلے کے لئے تیار تھا جونہی وہ قریب آیا

میں غصے میں پاگل تھا۔ آپ مہربانی فرما کر میری بچی کا کھوج لگوا دیں۔ مجھے یہ
ہیں۔ وہ بیچاری لڑکی جانتی ہے میرے گھر سے بھاگ گئی ہے۔ پولیس
نے اس کی رپورٹ درج کی ہے۔ آپ کی بیوی کب سے بچی کو لے گئی
دیکھا کہ آسیہ خوف سے کانپ رہی تھی مجھے اس پر ترس آگیا۔ بولا
آپ پولیس کو ساتھ لے کر آئیے۔ لڑکی آپ کو ابھی مل جائے گی۔
اس وقت آپ یہاں سے تشریف لے جائیں۔ میری بیوی کا پورا پتہ
بتا کر مت لگائیں۔ اس شخص نے میرے الفاظ کو محسوس کر کے لہجہ
بدل لیا اور بولا۔ آپ ناحق ناراض ہو گئے ہیں۔ ذرا لب سہلا کر آپ کو رپورٹ
جا کر اس کی تصدیق کرلیں۔ پرسوں کی تاریخ میں ہماری شادی ہونی ہے
اس پر دو آدمی پھر کر بولا۔ پولیس اس کی تلاش میں ہے۔ آپ کو اس
سے شادی کا مزہ بھی مل جائے گا۔ ہم نے اسے پیسوں سے خریدا ہے
مفت کا مال نہیں ہے جو تم آسانی سے ہضم کر جاؤ۔ میں نے کہا کہ
جائیے پولیس کو ساتھ لائیے پھر بات ہوگی۔ لوگ جھگڑے کی صورت میں جمع ہو
گئے تھے۔ میں آسیہ کا ہاتھ پکڑ کر بڑبڑاتا ہوا باہر نکل گیا۔ واقعی آسیہ
ہم بستر تھی اگر میں اس کی بات مان لیتا تو پریشانی اٹھانی پڑتی۔
جیسے جیسے میں نے خریداری کی اور جیسے ہی ٹیکسی کے لئے فٹ پاتھ
پر کھڑا ہوا وہ آدمی ایک پولیس افسر کے ساتھ آ دھمکا۔ کہنے لگا۔ آپ
ہمارے ساتھ چلئے کیس پیش کر کے تفصیل بات ہوگی۔ پولیس افسر ساتھ
تھا اس لئے انکار کرنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا انہیں ساتھ لے
کر ہوٹل میں آیا۔ پولیس افسر اس سے ملا ہوا تھا کہنے لگا۔ اگر آج آپ
سے تب بھی لڑکی آج دستیاب ہو جاتی ہے مگر پولیس نے آپ کا
کھوج نکال لیا تھا۔ میں نے کہا۔ آپ کو اصل پتہ لڑکی اس کے والدین
کے سپرد کرنی چاہیئے۔ اس کے اصلی وارث یہ لوگ نہیں ہیں۔ یہ لوگ
اسے بازار حسن کی زینت بنانا چاہتے ہیں۔ پولیس افسر بولا یہ ہمیں
کس سے غرض ہے کہ لڑکی کس کی بیٹی ہے اور کس کی نہیں۔ اس شخص نے
سے خریدا ہے اور اب اصولاً اسی کے ساتھ رہنا چاہیئے۔ میں سمجھ
گیا کہ پولیس افسر پیسہ کھا کے آیا ہے۔ اب یہ وہی کرے گا جو یہ دلال
چاہتا ہے۔ میں نے کچھ سوچ کر جواب دیا کہ میں اس لڑکی سے شادی
کر چکا ہوں اگر معاملہ بڑھانا ہے تو خوشی سے بڑھاؤ۔ لڑکی میرے
نکاح میں ہے لیکن میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے جو پیشیاں بھگتتا
پھروں۔ بہتر ہوگا کہ معاملہ بات چیت سے طے ہو جائے۔ میں
رقم ادا کرنے کو تیار ہوں جس کے عوض یہ لڑکی خریدا گیا ہے۔ پولیس افسر
دلال کو ایک کونے میں لے گیا۔ انہوں نے آپس میں کھسر پھسر

کی پرواہ کئے بغیر جائیں تو تمہیں پتا لگ جائے گا کہ گھر کتنی سخت ہے۔ ایک
عورت کو بیچنے اور خریدنے میں مجرموں کا ساتھ دینا ... ہر شہر میں
بازار حسن کیوں نہیں۔ میرے پاس وقت ہوتا تو شاید میں آپ کی مدد
کرتے۔ پاس ... اب اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا اس
نے سودا بازی کی۔ وہ دس ہزار پیسہ آسیہ کو چھوڑنے کے لئے راضی
ہو گئے۔ میں نے چیک بک نکالی۔ دس ہزار کا کر اس چیک کاٹ
کر دیا جس پر ان لوگوں نے انکار کر دیا کہ نقد چاہیے۔ نقد پیسہ اس وقت
میرے پاس نہیں تھا میں نے کہا کہ تم لوگ کل اسی وقت آنا۔ میں پیسے
بینک سے نکلوا لوں گا۔ وہ کہنے لگے کہ اس وقت تک ایک آدمی تمہارے
ساتھ رہے گا۔

مختصر یہ کہ وہ لوگ ایک شخص نگرانی کے لئے چھوڑ کر چلے گئے۔
صبح میں نے بینک سے پیسے نکلوا کر ان کے حوالے کر دیئے اور اس
طرح آسیہ ان کے چنگل سے آزاد ہو گئی اور میں اسے اپنے ساتھ لے کر
دوبئی آگیا۔ یہاں میں نے مکان کرائے پر لیا۔ زندگی میں ایک ٹھہراؤ آ
گیا تھا۔ محبت کا مرکز مل گیا تھا۔ ملکیت کا احساس جاگ چکا تھا۔ کتنی
پرلطف زندگی تھی میری۔ جلد ہی میں نے اپنی گاڑی خرید لی۔ آسیہ مجھے
جان کہہ کر بلاتی تھی اور اب تک وہ میری جان تھی۔ اس کے بغیر نوالہ
میرے حلق سے نہیں اترتا تھا اور میرے بغیر وہ نوالہ توڑ کر بھی حلق تک
نہیں پہنچتی تھی۔ کام سے فارغ ہو کر میں گھر دوڑا چلا جاتا۔ وہ میری منتظر
ہوتی ہم ایک ساتھ کھانا کھاتے۔ ہنستے کھیلتے پھر گاڑی میں بیٹھ
کر سیر کو نکل جاتے سینما چلے جاتے یا یونہی بازار شاپنگ کر کے لوٹتے
گھر میں رفتہ رفتہ سبھی چیزیں آگئی تھیں۔ فریج، رنگین ٹی وی، کپڑے دھونے
اور برتن دھونے کی مشین، ایئرکنڈیشن۔ بھلا کس چیز کی کمی تھی۔ وہ مجھے اور
میں اسے پا کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئے۔ محبت کا ذائقہ پہلی دفعہ چکھا
تھا۔ ایسا لگا کہ اس کے سوا ہر شے کڑوی لگنے لگی۔

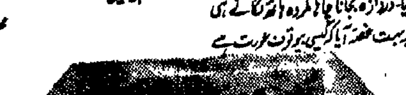
ایک دن اس نے ضد کی کہ آپ گاڑی نئی لیں یہ والی تو بہت زیادہ
ہونے لگا ہے کچھ دنوں بعد نئی لے لیں گے۔ فی الحال بغیر گاڑی کے گزارہ
کر کے دیکھیں۔ جان آرزو کا حکم تھا۔ میں نے نو ہزار درہم کی گاڑی
فروخت کر دی پیسے اس کی ہتھیلی پر رکھ کے کہ سنبھالو بعد میں ضرورت
پڑنے پر لے لوں گا۔ آسیہ نے ان پیسوں میں سے تین ہزار درہم کے
زیورات خریدے اور بہت سارے کپڑے بنوائے۔ یہ کپڑے کراچی
سے سلوائے۔ وہ اسی کی ذات کا پنجابی تھا۔ اپنی چرب زبانی سے اس
نے پیسے بھی خوب ٹھگے اور اس سے دوستی بھی گانٹھ لی جب گھر پہنچا

بیگم صاحبہ درزی کو کپڑے دینے کی ضد کرنے لگیں۔ پہلے اجازت طلب کرتی تھیں پھر خود جانے لگیں۔ مجھے غصہ آنے لگا کہ جب دیکھو درزی کی دکان پہ کھڑی ہوئی ہیں۔ میں نے باز پرس کی تو کہنے لگیں: "جانِ عزیز میرا ہم زبان اور ہم ذات ہے۔ میں اسے بھائی سمجھتی ہوں۔ آپ کو مجھ پر بھروسہ نہیں ہے، تبھی ایسی باتیں سوچنے لگے ہیں۔" خیر بات ٹل گئی۔ مجھے اس پر پورا بھروسہ تھا لیکن وہ ماضی میں ایک تلخ تجربہ اٹھا چکی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ پھر وہ کسی برے حادثے سے دوچار ہو۔ اب وہ میری عزت تھی۔ اس لئے ڈانٹ ڈپٹ ضروری سمجھتا تھا۔ پاکستان جانے سے پہلے میرے ایک ڈرائیور دوست نے پیسے قرض لئے تھے۔ وہ ان دنوں واپس گیا ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ جب تک اس سے نہ ملوں، وہ مجھے پیسے نہیں دے گا۔ آسیہ سے کہا کہ اس جمعہ کو میں ابوظہبی جاؤں گا، پیسے لے آؤں گا۔ تم ادھر ادھر مت جانا۔" وہ کہنے لگی "نہیں جاناں اس جمعہ کو مت جاؤ۔ اس دفعہ ہم پکچر دیکھنے جائیں گے اگلے جمعہ کو چلے جانا۔" جہاں اتنا صبر کیا تھا ایک ہفتہ اور سہی۔ اس جمعہ کو ہم دونوں نے پکچر دیکھی، ہوٹل میں کھانا کھایا۔ خوشی خوشی گھر لوٹے۔ دوسرے جمعہ کو میں جانے کے لئے تیار ہو گیا تو وہ آبدیدہ ہو گئی۔ بولی "جانے کیوں میرا دل گھبرا رہا ہے مت جاؤ۔" مجھے ہنسی آ گئی ایسا پیار کیا کہ چند گھنٹوں کی بات ہے شام تک واپس آ جاؤں گا۔ دل چھوٹا مت کرو۔ وہ ایک ٹک مجھے دیکھتی رہی پھر آنسو پونچھتی اندر چلی گئی۔ میں اس کی محبت کے دل ہی دل میں مزے لیتا ابوظہبی چلا گیا۔

وہاں پہنچ کر خاصی کوفت اٹھائی کیونکہ ڈرائیور جدہ گیا ہوا تھا۔ لوگوں نے کہا کہ وہ شام تک آ جائے گا۔ انتظار کرو۔ پیسے کا معاملہ تھا۔ بار بار کون آتا۔ ٹھہر گیا۔ شام تک بھی وہ نہ آیا تب میں نے واپس جانے کی ٹھانی۔ رات کو واپس گھر آ گیا۔ دروازہ بجانا چاہا مگر وہ ہاتھ لگاتے ہی کھل گیا۔ آسیہ کی لاپرواہی پر بہت غصہ آیا کہ کیسی بے وقوف عورت ہے میری غیر موجودگی میں دروازہ کھلا چھوڑ رکھا ہے۔ اندر پہنچا تو کمرے خالی تھے۔ گھر میں جیسے جھاڑو پھری ہوئی تھی۔ [illegible] بھی غائب۔ نقد، بیش قیمت زیورات ظالم نے کچھ بھی تو نہ چھوڑا۔ میرے سالوں کی کمائی چند گھنٹوں میں لٹ گئی۔ مجھے چکر آ گیا، سر پکڑ کر زمین پر بیٹھ گیا۔ گھر کے در و دیوار گھور رہے تھے۔ اگر صرف آسیہ کی غائب ہوتی تو میں یہ خیال کرتا کہ خدا نخواستہ کوئی حادثہ پیش آ گیا ہوگا مگر اب دل کو تسلی کیسے دیتا کہ وہ مجھے چھوڑ کر نہیں گئی۔ پیسے کا کیا ہے چند سال بعد پھر محنت کر کے مل جائے گا مگر یہ دل جو اعتماد، محبت اور محبت جیسی قیمتی نعمت سے محروم ہو گیا اس کا کیا بنے گا؟ کیا محبت اور قربانیوں کا دنیا یہی صلہ دیتی ہے۔ دیر تک سر جھکائے روتا رہا پھر لڑکھڑاتے قدموں سے باہر نکلا۔ درزی کی دکان تک پہنچا۔ دکان پر تالا لگا ہوا تھا۔ برابر والی دکان سے پوچھا۔ وہ بولا بھائی صبح نو بجے ایک عورت آئی تھی۔ وہ اسے اپنے ساتھ لے گئی تھی تب سے اب تک لوٹ کر نہیں آیا۔ میں لڑکھڑا گیا۔ پھر انکشاف ہوا۔ وہ دونوں ایئرپورٹ پر دیکھے گئے تھے۔ آہ میرے ساتھ کتنا بڑا دھوکہ ہوا۔ وہ تو مجھے بہت چاہتی تھی۔ میرے بغیر کھانا نہیں کھاتی تھی۔ آخر ایسی کیا مجبوری تھی جو اسے مجھ جیسے محبت کرنے والے آدمی سے دور لے گئی۔ مجھے کچھ تو بتا دیتی۔ مجھے رخصت کرتے وقت اس کے آنسو مکاری کے تھے سوچتا ہوں اور پھر بکھر جاتا ہوں۔

اور اب میں تھک گیا ہوں۔ کتنی عجیب بات ہے۔ ایک چوبیس پچیس سالہ نوجوان اتنی جلدی تھک جائے مگر میں اتنا ٹوٹ چکا ہوں کہ لگتا ہے صدیوں سے جاگ رہا ہوں اور اب مجھے سو جانا چاہئے۔ محبت پیار سب دھوکہ فریب اور اب یہ فریب کھانے کی سکت ہی نہیں۔

محمد اسلم - دبئی



میں ڈیڑھ سال کی تھی کہ ماں بکریاں چراتی ہوئی ایک کھڈ میں جا گری۔ باپ کا میری پیدائش سے دو ماہ پہلے چیچک نکل آنے سے انتقال ہو گیا تھا۔ ماں کا دوسروں کی بکریاں چرانے پر گزارہ تھا۔ مجھے وہ اپنے بھائی کے پاس چھوڑ کر پہاڑیوں پر نکل جاتی۔ اس روز اتفاق سے ایک بکری کا پیر پھسلا وہ کھڈ میں گر گئی۔ میری ماں اسے بچانے کے لئے کھڈ میں اتر رہی تھی کہ توازن بگڑ گیا اور وہ سر کے بل گہری کھائی میں جا گری۔ بکریاں ادھر ادھر بھاگ گئیں۔ جب وقت پہ بکریاں مالکوں کے گھر نہیں پہنچیں تو انہیں تشویش ہوئی۔ وہ بھاگے بھاگے آئے۔ میرے ماموں تلاش میں باہر

نکلے، وہاں انہیں بہن کی لاش ملی جسے ختم ہوئے بھی کئی
گھنٹے گزر گئے تھے۔ نزدیک ہی کھنڈر میں بکری اپنی ٹوٹی ٹانگ
لئے چلا رہی تھی۔ معاملہ سمجھ میں آ گیا کہ بکری کی خاطر اس نے
جان دی ہے۔ نہ جیسے لوگ بتاتے ہیں کہ شوہر کے مرنے کے بعد
وہ نیم دیوانی سی ہو گئی تھی اور اسی لاپرواہی نے اس کی
جان لے لی۔ اب اس دنیا میں ماموں کے سوا کوئی سہارا
نہیں تھا۔ یوں تو میرا چاچا بھی زندہ تھا۔ مگر وہ آدمی بڑا
سخت گیر طبیعت رکھتا تھا۔ بھائی کی شادی سے اختلاف
تھا اس لئے اس نے اپنی بیوہ بھاوج کو سہارا دینے سے
یکسر انکار کر دیا۔ بھائی نے اس وقت بہن کو سہارا دیا اور جب
وہ دنیا سے چلی گئی تو مجھے بھی اسی نے پناہ دی۔ وہ مجھے
کندھے پر اٹھائے اٹھائے پھرتے۔ بچے کا کیا ہے جس نے
پیار کیا اس کے ہو جاتے ہیں۔ میں ان سے مانوس ہو گئی۔
ایک دن کیا ہوا کہ ماموں شیر دل کا اونٹوں کے پیچھے کسی سے
جھگڑا ہو گیا، اس آدمی کا نام تھا تلوار خان۔ وہ شخص صرف
نام کا ہی تلوار نہیں تھا۔ اپنے ہاتھ میں بھی تلوار اٹھائے پھرتا
تھا۔ اس کمینے آدمی نے میرے ماموں کی گردن اڑا دی۔
پٹھان آدمیوں میں جوش بھی کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔ جب
اشتعال میں آ جائیں تو قتل و غارت ان کے لئے معمولی شغل
بن جاتا ہے۔ ماموں کی لاش جب گھر آئی ان کی گردن تن
سے جدا تھی۔ [...]وں کا حال تو مجھے یاد نہیں مگر لوگوں نے
بتایا کہ میں بھاگ کر [...] اور ماموں [...] اٹھانے کی کوشش
کرنے لگی۔ میری کیفیت [...] سے [...]بتر ہو گئی سات لہو میں

لٹ گئے، وہ روتے روتے میں نے مدد پر لی تھی۔ اس وقت
میری ایسی بھیانک شکل ہو گئی کہ ممانی نے چیخ مار کر مجھے پرے
دھکیل دیا۔ میں ایک بار پھر اکیلی ہو گئی۔ اب چاچا کو تھوڑی
سی غیرت آئی، وہ مجھے گود میں اٹھا کر گھر لے آیا۔ اس وقت
میری عمر پانچ سال کی ہو گی۔ مجھے اپنی چاچی کی وہ تیوریاں
اچھی طرح یاد ہیں جو انہوں نے مجھے دیکھ کر چڑھائی تھیں، پھر
بڑے جھٹکے سے میرے کپڑے اتارے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے
نہلایا، اور جھاڑو میرے ہاتھ میں پکڑا دی کہ چل گھر میں جھاڑو
دے، اور اب یہ بتانے کی غالباً ضرورت نہیں کہ انہوں نے میرے
ساتھ کیسا سلوک کیا ہو گا۔ گھر کے سارے کام کاج کے ساتھ ساتھ
مار پیٹ عذاب بن گئی تھی۔ روتے دھوتے دو سال گزرے میں
آٹھ سال کی ہو گئی۔ میرا شعور بھی بیدار ہو گیا۔ اب ظلم کے خلاف
احتجاج کرنا آ گیا جس سے مظالم اور سوا ہو گئے۔ اللہ میں کہاں
جاؤں کس طرح اس ظالم ڈائن چاچی کے چنگل سے نکلوں۔
ایک روز اس نے مجھے چشمے سے پانی لانے کو کہا۔ میں بڑی
سی ڈول نما بالٹی سر پہ اٹھائے پانی لینے نکل کھڑی ہوئی۔
چشمہ پہاڑ کے اس پار تھا۔ میں سخت چٹانوں سے الجھتی چلی
جا رہی تھی کہ اچانک آندھی آ گئی۔ پہاڑی آندھیاں ویسے بھی
دن کو رات بنا دیتی ہیں۔ ریت میری آنکھوں میں گھسنے لگی۔
ڈول ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میں لڑکھڑاتی لڑکھڑاتی کہاں کی کہاں
پہنچ گئی۔ جب تھک گئی تو ایک پتھر سے پشت کر کے رونے لگی۔
ہواؤں کی تندی رکی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے منہ اٹھایا۔ انجان
جگہ تھی پہلے کبھی یہاں سے گزر نہیں ہوا تھا۔ شام کا اندھیرا



ہوتے ہوئے بڑھ رہا تھا۔ گیدڑوں اور جھینگروں کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔ میں گھبرا کر اونچی آواز سے رونے لگی۔ اتفاق سے میرے قصبے کا ایک چرواہا ادھر سے گزر رہا تھا اس نے رونے کی آواز سنی تو ڈر گیا کہ جانے کوئی بدروح نہ ہو لیکن پھر مرد تھا حوصلہ کر کے آواز کا کھوج نکالا اور زور سے بولا "اگر انسان ہے تو سامنے آجائے۔" میں نے آواز پہچان لی، دوڑتی ہوئی گئی۔ وہ مجھے دیکھ کر حیران ہو گیا، پوچھنے لگا "زری تو یہاں کیسے؟" میں رونے لگی اس نے گود میں اٹھا کر پیار کیا، مجھ سے میرے حالات پوچھے جو میں نے اسے سارے بتا دیئے۔ اس نے پچکار کر کہنے لگا "اب تجھے گھر چھوڑ آتا ہوں۔ کل آکر تیرے چاچا سے بات کروں گا۔" میں اس سے چمٹ گئی کہ مجھے چاچا کے گھر مت بھیجو۔ میں تمہارے گھر جاؤں گی۔ اس کا دل پسیج گیا۔ مجھے لیکر اپنے گھر آگیا۔ اس کی بیوی نے میری بپتا سنی تو پیار کر کے گلے سے لگا لیا۔ نہلا دھلا کر اپنا بڑا سا گھگرا پہننے کو دے دیا۔ جس میں میں پوری چھپ گئی۔ دودھ کا بڑا سا گلاس دیا جسے پی کر میں زمین پر ہی سو گئی۔ رات کو وہ دونوں میاں بیوی سر جوڑ کر بیٹھے، انہیں ڈر تھا کہ کہیں میرا چاچا ناراض نہ ہو۔ وہ میرے چاچا کو بلا لائے۔ چاچا کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی میں دھاڑیں مارنے لگی کہ میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔ چاچا بولا کہ جب تک رہنا چاہتی ہے اسے اپنے پاس رکھو اس کی چاچی بہت مار پیٹ کرتی ہے تم پیار سے رکھو گے تو اس کی جان وہاں سے بچ جائے گی۔ چاچا نے اجازت دے دی تو چرواہے نے مجھے اپنے پلنگ پر سلا دیا کہنے لگا "بیٹی اب سو جا کل تیرا کوئی فیصلہ کروں گا۔"

صبح ہوئی تو وہ میری انگلی پکڑ کر دوسرے گاؤں میں لے گیا۔ وہاں کے ڈاکٹر کو اپنے بچے کے لئے ملازمہ کی ضرورت تھی، میرے محسن نے مجھے ان کے سپرد کر دیا۔ میری ساری کہانی سنائی، ڈاکٹر نے اپنا بچہ میرے حوالے کر کے ہدایت کی کہ بچے کو جتنا آرام سے رکھو گی، اتنا ہی تمہارا ہم خیال رکھیں گے۔ اور واقعی انہوں نے جو کہا وہی کر کے دکھایا۔ میں ان کے بچے سے بہنوں کی طرح پیار کرتی تھی اور وہ مجھے اپنی بیٹی جیسا سمجھتے کھانے پینے کو اچھا دیتے۔ بیماری دکھ میں پورا خیال رکھتے۔ مار پیٹ کبھی نہیں کی، بڑے سکھی دن تھے وہ میرے، اس گاؤں کا نام ڈھلک تھا۔ اس چھوٹی سی جگہ پہ ڈاکٹر کو بڑی اہمیت حاصل تھی ان کی وجہ سے میری بھی ہر جگہ عزت ہوتی تھی میرا بچپن وہیں بیتا۔ چاچا زندہ ہے یا مر گیا اس نے پلٹ کر کبھی نہیں پوچھا میرا محسن چرواہا جب کبھی آتا تھا مجھ سے ضرور ملتا تھا اور میں اس کی بڑی عزت کرتی جو دال دلیہ ملتا اس کے آگے رکھ دیتی وہ دعائیں دیتا چلا جاتا۔

تیرہ برس کی ہوئی تو قصبے میں کلیاں سی چٹکتی نظر آنے لگیں۔ ڈاکٹر صاحب کا ایک نیا ڈرائیور آیا۔ گل باز اس کا نام تھا اور تھا بھی پکا گل باز۔ شادی شدہ آدمی تھا مگر طبیعت کا ایسا کھلنڈرا جیسے کنوارا ہو۔ میں جانے کیوں اسے بھا گئی ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گیا کہ جان جائے مگر تجھے نہیں چھوڑوں گا مجھے وہ اچھا لگنے لگا۔ اس نے ڈاکٹر سے میرا رشتہ مانگا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ میں اس کے رشتے داروں سے پوچھ لوں کیونکہ شادی بیاہ کے معاملات میں ان کی رائے بہت ضروری ہوتی ہے۔ میرا محسن جب مجھ سے ملنے آیا تب ڈاکٹر صاحب نے شادی کی بات بتائی۔ اس نے جواب دیا کہ یہ بچی میری نہیں ہے اس کے چاچا سے اجازت لے لوں پھر کچھ کہوں گا۔ اس وقت مجھے پتہ چلا کہ چاچا ابھی زندہ ہے۔ اسے میرے زندہ مردہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا اس لئے کہہ دیا کہ جو جی چاہے کرو۔ اب وہ ہماری بچی نہیں رہی، قصہ کوتاہ میری شادی گل باز خان سے ہو گئی۔ اس کی پہلی بیوی نے خوب ہوا دیلا کیا مگر گل باز کو مجھ سے پیار تھا اس نے بیوی اور رشتے داروں کو ناراض کر کے مجھے اپنے پاس رکھا۔

زندگی بڑی مزیدار چیز لگنے لگی۔ دن عید تو رات شب برات۔ شوہر نے بچپن کے سارے لاڈ پورے کر دیئے۔ دو تین سال جیسے جنت میں بس گئے۔ ایک روز وہ کہنے لگا زری میرا جی چاہتا ہے کہ میٹھے چاول کھاؤں۔ میں نے فوراً گڑ منگوایا اور چاول نکالنے اندر چلی گئی۔ گل باز کہنے لگا "بیوی ہو تو تجھ جیسی میں نے زبان سے بات نکالی اور تو اسے پورا کرنے میں جت گئی۔ اچھا تو چاول پکا میں اپنے بھائیوں کو ان کے گھر چھوڑ آؤں۔" میں نے کہا کہ ذرا ٹھہرو چاول ان بچوں کو بھی دے آنا۔ وہ رک گیا۔ میں نے جلدی جلدی چاول پکائے بڑی تھالی میں چاول ڈال کر اس کے حوالے کئے کہ جاؤ پہلے

ندر کر چاول دے ساؤ پھر ہم پی کر کھا لیں گے۔ اس نے خوشامد سے
جانخوں کر اس پر بٹھایا اور چل پڑا۔ ابھی اسے گئے تھوڑی دیر
ہی ہوئی تھی کہ میری ننھی کا چھوٹا بیٹا بھاگتا ہوا آیا۔ میں اسے
دیکھ کر گھبرا سی گئی وہ بولا "ماموں کا گھوڑا کھڈ میں جا گرا ہے" کھڈ
میں گرنے کے تصور سے ہی مجھے جھرجھری آ گئی تھی۔ بچپن سے میں
کا خوف اعصاب پر سوار تھا۔ یہ خبر سنی اور بے ہوش ہو گئی
جب لوگوں نے پانی وانی ڈالا تب ہوش میں آئی۔ تب خبر
ملی کھڈ نے اس دفعہ میرے سہاگ کی بھینٹ لے لی ہے میرے
شوہر کو جب کھڈ سے نکالا وہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔

چہلم کے بعد میرے سسرال والوں نے ہاتھ پکڑا اور باہر
نکال دیا۔ بولے "اب تم بھی جاؤ۔ جس کے لئے تم رہتی تھیں وہ
جا چکا ہے۔ اب ہمارا پیچھا چھوڑ دو" میں روتی دھوتی گھر سے نکل
آئی۔ منزل (ایمرا آباد کا قرن) اور ٹانک کے علاوہ کسی اور
گاؤں کی شکل تک نہیں دیکھی تھی۔ ڈاکٹر کا ٹانک سے تبادلہ
ہو چکا تھا۔ راستے میں جانتی نہیں تھی اب کہاں جاؤں، میری
حالت سانپ والی لوڈو کے گیم جیسی ہو گئی تھی کہ پہلے ایکدم
سیڑھیاں چڑھی پھر سانپ کا منہ آیا اور دھڑام سے نیچے
آ اتری۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ میں کدھر کا رخ کروں۔ سونے کا تعویز
گلے میں تھا، کانوں میں جھمکے اور ہاتھ میں انگوٹھی پہنی ہوئی تھی،
لیکن ہاتھ میں ایک دھیلا نہیں تھا۔ آنسو پونچھتی لاری کے اڈے
پر پہنچی اور ایک خالی بس میں بیٹھ گئی۔ مجھے نہیں معلوم تھا بس
کہاں جائے گی۔ جب بس بھر گئی تو چل پڑی۔ راستے میں کنڈکٹر
نے ٹکٹ مانگا تو میں رونے لگی۔ اپنی انگوٹھی اتار کر کنڈکٹر کو
دے دی بولی "میرے پاس پیسے نہیں ہیں"۔ ایک شخص نے کنڈکٹر
کو بلا کر میرا ٹکٹ دلوا دیا۔ اس طرح میری خلاصی ہو گئی۔ لیکن
میری منزل کہاں ہوگی یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ بس جب ایک
جگہ رکی اور سارے مسافر اترنے لگے تب میں نے ڈرتے ڈرتے
کنڈکٹر سے پوچھا "یہ کونسی جگہ ہے؟" وہ بولا "ڈیرہ" میں
بس سے اتر کر کھڑی ہو گئی۔ کنڈکٹر چیختے میں کہنے لگا "یہ بس
آگے نہیں جائے گی" میں اس کی بات کا مطلب نہ سمجھ سکی پھر
اڈے سے باہر آ گئی اور یونہی چلتی ہوئی شہر میں نکل آئی۔ بھوک
سے انتڑیاں قل ہو اللہ پڑھ رہی تھیں۔ قدم من من بھر کے
ہو گئے۔ آخر ہاتھ پھیلانے پر مجبور ہو گئی۔ بھیک مانگنے کا طریقہ
نہیں آتا تھا۔ ہاتھ پھیلایا اور گھبرا کر کھینچ لیا۔ سامنے ایک ہسپتال
تھا اس کے ساتھ کوارٹر بنے ہوئے تھے۔ ایک کوارٹر کے سامنے
سپاہی کھڑا تھا میں اس کے پاس گئی۔ پشتو کے علاوہ کوئی
اور زبان مجھے نہیں آتی تھی۔ میں نے سپاہی سے پوچھا "مجھے
یہاں روٹی مل سکتی ہے؟" سپاہی نے مجھے سر سے پاؤں تک
گھور کر دیکھا پھر بولا "اندر جاؤ بیگم صاحب سے مانگو" میں
ڈرتی جھجکتی اندر آئی۔ یہ پولیس کے افسر کا کوارٹر تھا بیگم صاحبہ
نے مجھ سے اچھا سلوک کیا، مصیبت صرف یہ ہوئی کہ وہ جس
زبان میں بولتی تھی وہ میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اردلی کو اندر
بلا کر اس نے مجھ سے بات کی پوچھا "نوکری کرو گی؟" میں نے
تاخیر کئے بغیر حامی بھر دی۔ اس طرح اس دفعہ پھر رہنے کا ٹھکانہ
ہو گیا۔ میری نئی مالکن بھی بہت مہربان اور نیک دل عورت
تھی مجھے اس کی بولی بھی سمجھ میں آنے لگی ایک روز مجھ سے
کہنے لگی "تو کب تک بغیر مرد کے زندگی گزارے گی، اردلی بھی
ہمارا اکیلا ہے کتنی دفعہ مجھ سے کہہ چکا ہے کہ تجھ سے اس کی
شادی کرا دوں، بتا تیری کیا مرضی ہے؟" میں مالکن کی بات پر
چپ ہو گئی جسے رضامندی جان کر انھوں نے میرا اردلی سے
نکاح پڑھا دیا۔ یہ شخص گل باز کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں
تھا مگر میں خدمت کو شعار بنا کر وقت گزار دینا چاہتی تھی اس
نے مجھ سے میرے جھمکے اور انگوٹھی اتروالی اور کہیں بیچ آیا۔
مجھے کہتا رہا کہ تجھے دوسری بنوا دوں گا۔ میں نے کوئی شور نہیں
مچایا کہ اس کی ضرورت شدید ہو گی۔ ایک دن کہنے لگا "میں دریا
خان دوست کی شادی پر جا رہا ہوں تم بھی میرے ساتھ چلو
ذرا اچھی طرح تیار ہونا" میں نے مالکن کو بتایا۔ اس نیک بخت
نے مجھے اپنی ایک قمیض نکال کر دی۔ مجھے خود تیار کرایا۔ خوب
بن ٹھن کر میں میاں کے ساتھ گھر سے نکلی، گاڑی میں بیٹھی، مجھے
کچھ نہیں پتہ تھا کہ حضرت مجھے کہاں لے جا رہے ہیں۔ ہوش
اس وقت آیا جب وہ ایک گھر میں مجھے لے گیا۔ وہاں بہت
ساری عورتیں جمع تھیں۔ مجھ سے بولا "تم اندر بیٹھی رہنا، جب
جانے لگوں گا تو میں بلوا لوں گا" میں اندر آ کر بھوتنوں کی طرح
ان عورتوں کو دیکھنے لگی۔ وہ سب مجھے عجیب نظروں سے
دیکھ رہی تھیں۔ ایک موٹی سی عورت نے مجھے اندر جا کر بٹھا

چلا۔ بولی "ابھی آتی ہوں یہیں بیٹھی رہنا"۔ عجیب پراسرار سا ماحول تھا شادی کا گھر تو ہرگز نہیں تھا۔ گھنٹہ بھر چپ بیٹھی رہی پھر وہ موٹی عورت آئی کہنے لگی تمہارا سودا پکا ہو گیا ہے اب تم یہاں رہو گی۔ میں گھبرا کر کھڑی ہو گئی وہ عورت بولی "باہر شکاری کتوں کا پہرا رہتا ہے، باہر نکلو گی تو وہ ٹانگ چبا ڈالتے ہیں"۔ میں کونے میں بیٹھ کر رونے لگی۔ میرے نصیب کہ شادی کا کوڑیاں بیچ کر بھاگ گیا۔ مگر ہمت ہارنا میں نے بھی نہیں سیکھا تھا دو دن تک کچھ کھایا نہ پیا روتی رہی، اور تیسری رات خدا نے ایک موقع فراہم کر دیا۔ رات کو ایک عورت کو بچھو نے کاٹ لیا۔ سب عورتیں اس کے پاس جمع ہو گئیں۔ میں وہاں سے چوروں کی طرح نکلی۔ اتفاق کہہ لو یا قسمت کہ اس وقت کوئی کتا بھی میری راہ میں مزاحم نہیں ہوا اور میں گھر سے نکل کر سیدھی اسٹیشن پہنچی جو گاڑی کھڑی تھی اس میں بیٹھ گئی۔ دو دن کی چلی ہوئی تھی۔ مالکن نے دس روپے چلتے وقت دیئے تھے۔ پکوڑے لے کر پیٹ کی آگ بجھائی اور ڈبے میں جا کر سو گئی۔ آنکھ اس وقت کھلی جب خاکروب نے پیر کا انگوٹھا ہلایا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی، وہ بولا "بی بی کہاں جانا تھا؟" میں نے کہا "[illegible]"۔ وہ بولا بی بی یہ تو پشاور سٹی ہے۔ میں ایک دم رو پڑی کہ اب پھر کوئی آفت کھڑی ہو جائے گی۔ خاکروب کو رحم آ گیا، وہ مجھے ساتھ لے کر اسٹیشن ماسٹر کے پاس گیا میں نے اسے اپنی کہانی سنائی۔ اب اتفاق ایسا ہوا کہ اسٹیشن ماسٹر انسپکٹر کو جانتا تھا۔ اس نے مجھے تسلی دی۔ ایک سپاہی کو میرے ساتھ کر دیا اور کچھ پیسے دیئے، سپاہی مجھے ڈیرہ لایا اور مجھے انسپکٹر صاحب کے گھر خیریت سے چھوڑ گیا

مالکن نے مجھے دیکھا اور خوش ہو کر کہنے لگی "تم واپس آ گئیں تو دریا خان رہ گئی تھی ہمارا لعل نے بتایا تھا کہ وہاں سے آنا نہیں چاہتی تھی"۔ میں رونے لگی اور بی بی کو ساری بات بتا دی۔ بی بی نے اسی وقت صاحب کو بلایا۔ پورا قصہ بتایا۔ صاحب نے لعل کو بلا کر پوچھا "زر گل کہاں ہے؟" وہ بولا صاحب اسے میرے دوستوں کے گھر والوں نے کچھ دنوں کے لئے روک لیا اس کا بھی دل لگ گیا تھا۔ میں چھوڑ آیا۔ صاحب نے آواز دے کر مجھے اندر بلوایا، مجھے دیکھ کر میرے شوہر نامدار کے چہرے کا رنگ اڑ گیا وہ گھبرا کر انسپکٹر صاحب کے قدموں پر گر گیا۔ صاحب نے اسی وقت اسے ہتھکڑی لگوا کر جیل میں ڈلوا دیا۔ بعد میں دو سال کی قید کرا دی۔ مجھ سے اس کی طلاق دلوا کر میری تیسری شادی ایک دوسرے سپاہی سے کرا دی اور اللہ کا شکر ہے کہ یہ شادی میرے حق میں اچھی ثابت ہوئی۔ میرا یہ شوہر شریف اور اچھا آدمی تھا۔ سب سے بڑی بات تو یہ کہ انسپکٹر صاحب کا مجھے پورا تحفظ حاصل ہو گیا۔ انہوں نے کہہ دیا کہ ہم تجھے اس گھر کی بہن سمجھتے ہیں جو کوئی دکھ ہو فوراً آ کر بتانا ــــ اور یہ لفظ نمائشی یا وقتی نہیں تھے۔ آج میں اپنی بیوگی کا زمانہ اپنے گھر گزار رہی ہوں۔ انسپکٹر صاحب کی بڑی بیٹی مجھے اپنے گھر لے آتی ہے اور بڑی عزت و تکریم سے رکھتی ہے۔ میرا ایک بیٹا ہے جس کی میں نے شادی بھی کر دی ہے مگر میرا دل اس چھوٹی بی بی کے پاس ہی لگتا ہے۔ وہ جب مجھے محبت سے پھوپھو کہتی ہے تو مجھے لگتا ہے مجھے میری محنت اور جد و جہد کا پورا اجر مل گیا۔

زر گل - دریا خان

اِن صفحات میں ہم آپ کو زندگی کی ان کہانیوں سے روشناس کراتے ہیں جو ہمارے اور آپ کے ارد گرد بکھری ہوئی ہیں مگر انہیں سنانے کا کام حوصلہ نہیں کرتے۔ آپ بھی معاشرے کو میر آئینہ دکھانے میں ہمارے ساتھ تعاون کریں۔ سچائی اور صباکی سے لکھی گئی ان کہانیوں کو بھیجنے کی شرط صرف یہ ہے کہ یہ عورتوں کی زندگی کے ان پہلوؤں پر روشنی ڈالیں جو بتاتے ہوئے آپ سب گھبراتے ہیں۔ کہانی کا سچا ہونا لازمی ہے۔ اپنی لکھی کہانیاں ہمیں ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک بھیج دیں۔ تحریر ٹوٹی پھوٹی ہو بے ربط ہو اس کی کوئی قید نہیں۔

رعنا فاروقی — دوشیزہ — پوسٹ بکس ۵۹۰۰ کراچی ۲۹



چکور

واجدہ تبسم

عورت کی زندگی کا ہر موڑ ایک نیا حادثہ بن کر اس کے سامنے آکھڑا ہوتا ہے، دل کی گہرائیوں میں اتر جانے والی ایک گہری کہانی

آنگن میں تخت بچھا ہوا تھا۔ جس پر اماں بیٹھی تھیں اور سامنے ہی برآمدے میں الطاف گھوڑا بنا ہوا تھا۔ منّا اس کی پیٹھ پر سوار تھا۔ تبھی لہرا لہرا کر گا رہا تھا۔

چل میرے گھوڑے ٹھمک ٹھوں
چل میرے گھوڑے ٹھمک ٹھوں

الطاف گویا ڈر کے مارے جلدی جلدی بھاگنا شروع کر دیتا اور منّا ہنسی سے بے حال ہو جاتا۔

دلہن کو جب لاؤں گا
پیٹھ پہ تیری بٹھاؤں گا

الطاف چلتے چلتے رک گیا۔ اور منّے کو پیٹھ سے اتار کر بولا

"ہاں رے۔ ابھی سے دلہن کی فکر؟"

تبھی ہوا ری میں لہرا کر گئی تھی۔ منّا آنکھیں پھاڑ کر بولا۔

"آئیں، پچھلے کا یاد رکھے گا؟"

الطاف آستین سے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ "بس یار، ہم اب تو تھک گئے۔"

مگر تھک جانے پر بھی اس نے منّے کو گود میں اٹھا لیا اور

چکے چپکے پان چبانے لگا۔

اماں سے یہ سب کچھ مشکل دیکھا گیا۔ سدا سی ہو کر بولیں "لاکھوں فرض کیا بیٹا الطاف گھر بار سنبھلنے اور ان کے بچوں سے دل بہلاتے پھرتے ہو۔ اگر شادی کر لو تو اللہ خود ہی انتظام کرے۔ بھر تم سنتے کہاں ہو۔"

الطاف پھر بگڑ گیا اماں پر آج پھر نصیحت کا دورہ سوار ہے۔ انگے کو گود سے اتار کر بولا "جاؤ یار تمہاری امی انتظار کرتی ہوں گی۔"

منا بھی گھبراتا ہوا بھاگ گیا۔ اور الطاف وہیں مونڈھے پر ٹک گیا۔ برسات کی شام تھی گھنے گھنے اودے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہوائیں بھیگی بھیگی تھیں اور فضا سرمئی سرمئی سے اندھیرے میں لپٹی ہوئی۔ اس اندھیرے سے ایک چاند جیسی من موہنی صورت ابھری اور الطاف کے ذہن پر چھا گئی۔ گوری گلابی گال، کالی کالی آنکھیں لمبے لمبے بال اور دھوپ جیسی متوالی چال۔ "! چھا بی۔" وہ زیر لب مسکرایا۔

"نہیں اماں۔" وہ جیسے چونک کر بولا "میں ابھی سے شادی کے بندھن میں نہیں بندھوں گا۔ آپ نہیں جانتیں چھابی کتنی پیاری کتنی گڑیا سی لڑکی ہے۔ اتنی نازوں کی پالی۔ میں ابھی کم از کم دو سال شادی نہیں کروں گا۔ میری تنخواہ بڑھ جائے۔ بس یک دم، چٹکی بجاتے میں۔ دھنڑ دھنڑ دھنڑ۔ دھاں دھاں دھاں۔" اور وہ گول گول گھوم کر منہ سے باجا سا بجانے لگا۔

"اور اماں آپ جانتی ہیں میں صابر و کر کوئی تکلیف نہیں دینا چاہتا ہوں گا۔ بھلا اتنی کم تنخواہ میں کیا ہوگا؟ اور پھر آپ کہتی ہیں نا کہ ایک سر کے دو سر ہوئے تو پھر تیسرا سر آتے دیر نہیں لگتی۔" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ اس کے ذہن میں بوٹ سی جاگی۔ ننھا سا سر، دو ننھے ننھے ہاتھ۔ چھوٹے چھوٹے پیر کلیا جیسا منہ۔ جس نے اپنے ہاتھ سینے پر رکھ کر زور سے دبا لیے۔

"اور اماں یہ تو ہے کہ کھلانے والا اپنا رزق ساتھ ہی لے کر آتا ہے مگر پھر بھی۔"

اماں کے منہ پر آتی ہوئی ہنسی سنجیدگی سے بدل گئی "تو میں سال دو سال ہی ہوں بیٹا گھر بسا لے۔ بیٹا گھر بسا لے گر بیٹا ئے تب نا؟ مر جاتیں تب جائیو اپنی شادی ہماری قسمت میں ہی ہوتے نا تمہیں تو ہم بھی کیا کریں۔ دوسروں کی گودیں بھری پڑی ہیں دیکھو بیا بھی اُلٹ پلٹ ہو جاتا ہے۔ بیٹیاں ہیں وہ اپنے گھروں کی۔ تو سالوں سی چاند دن کی کانسے کی تو پھر بھی اپنے گھر ہی کے ہو گے ہم تو بیٹا یو نہی ترستے چلے جائے یونہی ترستے ترستے مر جائیں گے۔" اماں کا

جیا پھر سامنے گھوم گیا۔ ایک ہاتھ سے اپنی پھوپی بیوی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا اچھلتا آ رہا تھا۔ وہیں سے چلا کر بولا "الطاف بھائی۔ الطاف ماموں۔ دیکھئے نانی نے نیا فراک پہنا ہے تو آپ کو دکھانے آئی ہے۔"

اماں کا جی جل گیا تیزی سے بولیں "کیوں ناحق دوڑ دوڑ پھرتے ہو کمبخت۔ اپنے ماں باپ کو دکھاؤ جا کر۔"

منے نے سہم کر اماں کو دیکھا اور الٹے پیروں بھاگ گیا۔

•

اماں کو الطاف کی تنخواہ کے بڑھنے گھٹنے سے خطرہ تھا۔ یہاں کبھار جو بچے اور نیم صورت کی سوتی انھیں بس اتنی۔ اور یہاں بھی گھر میں کمانے والے ہی کتنے تھے۔ اور الطاف کی تنخواہ تو ابھی اماں واقعی سو سے اوپر ہی تھی مگر اسے تو بس ایک ہی دھن تھی کہ اتنی کمائی میں چھابی جیسی لڑکی کا گزر نہیں ہو سکے گا۔

"اماں آپ کو معلوم ہی ہے چھابی کے ڈیڈی کے ہاں بیرا، چپڑاسی بے گار سب ہیں۔ تنخواہ تو بعد چھابی کیا سوچے گی۔"

"کیا سوچے گی؟" اماں تنک کر بولیں۔ "ہم کوئی تمہیں زادے تو ہیں نہیں۔ پھر دی کیوں بیٹی۔"

پھر ایک دم الطاف کو خیال آجاتا کہ کتنے دنوں سے اس نے یہ محبت اپنے دل میں پال رکھی ہے۔ مگر چھابی ذرا کے دیکھ جاتی تو بھلا اس کے ڈیڈی اس جیسے لڑکے کو اپنی بیٹی دے دیتے۔ بھلا چھابی کو ایک سے ایک اچھے سے اچھے پیاموں کی کمی تھی؟

"اور اماں چھابی جس گھر سے ہے سب کل وہاں چھت پر بجلی کا پنکھا تو ہوگا ہی۔ اور بلی اماں اب میں نے تو فون بھی لگوا دوں گا بس دفتر سے خالی وقت میں دیکھو کر اپنی چھابی کو فون کیا کروں گا۔ رنگ گھنٹی بجے گی اور ایک دم وہ دوڑ کر رسیور منہ سے لگائے گی اور بڑی پیاری آواز سے کہے گی۔"

"ہیلو ڈارلنگ۔"

اماں کو حصہ تو بہت آتا لگتا جب یہ بات ہوتی۔ کیا لوگ بے ہیں اولاد سے پہلے یہی گھر کے نانی کا بنا دیتے ہیں۔ بیا ہو تو دنیا میں شادیاں ہی نہ ہوں۔ ایسے ہی تو نیچے ساتویں آسمان پر چڑھ جاتے ہیں۔ کوئی ہو بڑا ہوا تو یہ بھی ہم سے ڈالیں

یں۔ بال سفید ہو گئے مگر دیکھیں نہ تھکیں۔"

اماں خفا ہو جاتیں تو انھیں منانے کا ایک ہی طریقہ الطاف کو
آتا تھا۔ پیچھے سے آکر گلے میں باہیں ڈال کر پھر گود میں لیٹ جانا۔ اور
پھر اماں بھی اسے پیار ہی کرتیں۔

شام کو الطاف دفتر سے آتا تو موٹر سائیکل کھڑی کر کے چپکے
سے اماں کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ اماں دو دن سے بڑے شدید
قسم کے غصے میں تھیں۔ منے اور گڑیا نے ان کا دل جلا کر رکھ دیا تھا۔ ہوتا
کیا۔۔۔ وہی روز روز کے قصے۔ الطاف اتوار ہونے کی وجہ سے گھر
پر ہی تھا۔ دونوں آئے اور اس کی چھاتی پر چڑھ بیٹھے۔ اس کے کمرے
کی چیزوں کو یوں الٹ پلٹ کیا گویا پولیس والے خانہ تلاشی لے کر
گئے ہوں۔ چاکلیٹ چھین چھین کر کھاتے اور پھر آکر پھپھی کا دودھ ختم ہوا تو
الطاف نے منے کو گھٹنوں پر بٹھا لیا اور جھلا جھلا کر کہنے لگا۔

بی اے۔ ایم اے پاس کرے گا
جج بن کر اجلاس کرے گا

بس اماں کو بہت ہی اچھا کر غصہ آگیا۔ جھنجھلا کر بولیں۔ "منا
کون کتنا ہے جسے کر سے جج بنائے گا!"

الطاف ہنسنے لگا۔ "ارے اماں آخر کو بچہ ہے ماں کے ذہن
میں اگر بیٹھ جائے کہ جج بنانا کتنی بات ہے۔"

اماں منہ سے تو کچھ نہ بولیں بس غصے میں تھوتھا بن کر بیٹھ رہیں۔ الطاف
نے گود میں سر رکھ دیا تب بھی نہ بولیں۔ پھر اس نے منہ اٹھا کر پوچھا؛

"اماں ابھی تک بھی غصہ نہیں اترا؟"

"تجھے ہماری کیا فکر! تیرا کلیجہ تو منے پوپلے کے بچوں سے
ٹھنڈا ہے:"

الطاف کا منہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ اچھل کر اٹھ بیٹھا: "اچھا؛
بات ہو اسی شبرات پر شادی!"

اماں کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا: "سچ؟"

"ہاں۔" الطاف پوری باچھوں سے کہہ رہا تھا "میری
تنخواہ چار سو ہو گئی ہے اماں۔ اور سنئے۔ اب مجھے حکومت کی طرف
سے ایک بنگلہ بھی ملے گا۔"

اماں نے خوشی خوشی چٹ چٹ الطاف کی بلائیں لے ڈالیں
الطاف کی آنکھوں میں چاندنی چاندنی بکھر بکھر گئیں۔ چاند میں ننھا
سا چاند ابھر رہا تھا۔ گول مٹول سا پیارا پیارا جس کی اپنی گوری باہیں
اس کی طرف پھیلا رہی تھیں۔ الطاف کے منہ سے نکل پڑا۔

کتوں کے بھونکنے پر ہمیں بہت بڑا اعتراض ہے
کہ ان کی آواز سے چند لمحے تمام آبادی کو معطل کر دیتی ہے
خصوصاً جب کسی دکان کے تختے کے نیچے سے ان کا
پھٹا خفیہ جلسہ باہر سڑک پر آکر تبلیغ کا کام شروع کرتا
ہے تو آپ ہی کہیے ہوش ٹھکانے رہ سکتے ہیں!
ہر ایک کی طرف باری باری متوجہ ہونا پڑتا ہے۔ پھر
ان کا شور کہ ہماری عدالت احتجاج (زیر لب)
بے ڈھنگی حرکات و سکنات (حرکات ان کی حرکات
ہماری) اس ہنگامے میں دماغ بھلا خاک کام کر
سکتا ہے۔ اگرچہ مجھے نہیں معلوم کہ کتا ایسے موقع پر دماغ
کام کرے بھی تو کیا تیر مارے گا۔ "پطرس"

بی اے۔ ایم اے پاس کرے گا
جج بن کے اجلاس کرے گا

چھالی بڑی خوب صورت تھی۔ بہت ہی پیاری۔ کلی جیسی
نازک۔ چاند جیسی روشن۔ دلہن بنی تو چار چاند لگ گئے۔ شرماتی لجاتی
سرخ سرخ سی ریشمی گٹھڑی۔ الطاف نے گھونگھٹ ہٹا کر منہ دیکھا اور
ہنس کر اپنی آنکھیں میچ لیں۔

"اپنی حیا کی کرن خراب کرے؟"

چھالی مسکرائی۔ شرم سے دوہری ہو گئی۔

الطاف کی زندگی کا رنگ بدل گیا۔ گھر کی حالت ہی بدل گئی۔
منا اور گڑیا اب بھی آتے مگر چھالی کی موجودگی میں الطاف ان سے بات
کرنے کی بھی فرصت نہ پاتا۔ دیکھتا تو وہ بھی دیا۔ اماں کے بوڑھے چہرے
پر بھی کھل کھلی اٹھی۔ بہو بیٹے کو خوش دیکھ کر ان کا اپنا خون بڑھتا تھا
کمرہ جو چوبیس گھنٹوں میں سے اٹھارہ گھنٹے تو بند ہی رہتا سوئی ہنسی
کی آوازیں اور کھسر پھسر اور جب چھالی باہر نکلتی تو ایسی گلابی گلابی لگتی
لگتی جیسے شاخ پر کھلا تازہ پھول اسے ہولے ہولے خوب سرگوشی کی ہو۔
اماں دونوں کی تو اماں کی آنکھیں تماشی تھیں۔

امّاں نے بیٹیوں بھابھیوں کی مدد سے کر چھوٹے چھوٹے کے سلے
جوڑے خود ہی تیار کئے تھے۔ جب بڑے آتے، نیز ے ٹکڑے رنگین
کترنیں سیون میں سے بچتیں تو امّاں اپنے گھٹنے کے نیچے جمع کرتی جاتیں
ایک دن نجمی نے ایک لال رنگ کا چھوٹا سا ریشمی ٹکڑا مانگا تو امّاں
نے ڈپٹ دیا۔ "نہیں دوں گی۔"

"دے بھی دیجئے امّاں۔ اب بھلا اس ٹکڑے میں کیا رکھا ہے؟"
الطاف حیرانی سے بولا۔

"بس نہیں دیتی میں پھر تو کیا کسے گا پوچھ کر؟" اور سب
ہنس پڑے اور امّاں کے چہرے ہنسی سے کھل گئے مگر الطاف کچھ بھی نہ
سمجھ سکا۔

اب شادی کے دو تین مہینوں بعد الطاف نے دیکھا کہ امّاں
وہی سارے نیلے پیلے ٹکڑے سمیٹے بیٹھی ہیں اور ننھے ننھے کرتے،
ٹوپیاں اور جھبلے سی رہی ہیں۔ الطاف کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"ہوں تو یہ بات تھی!"

وہ جلدی سے کمرے میں گھس پڑا اور بھابی کو گدگدا کر بولا۔

"بھابی کچھ دیکھا؟"

"کیا" بھابی حیران ہو کر بولی۔ "نہیں تو، میں نے تو کچھ
بھی نہیں دیکھا۔"

الطاف کے چہرے سے ہنسی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ کھلکھلا کر
بولا۔ "امی چھوٹے چھوٹے کپڑے سی رہی ہیں۔"

"کیوں؟" بھابی نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

"بھئی!" وہ اس کے گال کو انگلی سے چھو کر بولا۔ "ننھے مہمان
کے لئے۔ اور کیوں؟"

بھابی کا منہ تپ گیا۔ ہونٹوں کے کنارے کانپ اٹھے۔ "کیسی
باتیں کرتے ہیں آپ۔" وہ جھینپ کر بولی۔

الطاف اس کے سامنے پلنگ پر اوندھا لیٹ گیا۔ "بھابی
مجھے بچے جیسے پیارے لگتے ہیں۔ بہت ہی اچھے لگتے ہیں جب
اپنی شادی نہیں ہوئی تھی نا۔ تو میں روزانہ محلے کے بچوں کے
ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ ان کا اودھم مچانا۔ ان کا ضد کرنا۔ ان کا توتلی باتیں
کرنا، ان کا ہنسنا، ان کا رونا، مجھے یہ سب کچھ، سب کچھ بڑا اچھا لگتا
ہے۔ اچھا لگتا ہے نا؟"

وہ بھابی کی آنکھوں میں جھانک کر بولا۔ "اور ایک بات بتاؤں
ایک دن میں شاپنگ کے لئے گیا تھا۔ تو میں ایک ننھا منا سا بش شرٹ
خرید لایا۔ سوچا یوں کہ میں گیا تو تھا خود کے لئے کچھ اور
وہ بش شرٹ مجھے کچھ اتنا پیارا لگا کہ بس دل چاہا لے ہی لوں۔ ننھے
منے کو پہناؤں گا۔ مگر جب گھر پہنچا تو نیت بدل گئی۔ یہ
ہی ننھے کے لئے کیوں نہ رکھ لوں؟ پھر مجھے اپنی بھابی کی
شکل یاد آگئی۔ اور پھر میں نے اپنی شکل آئینے میں دیکھی۔ یہ
گھونگھرالے بال، یہ پکوڑی ناک، سانولا رنگ اور اپنی بھابی
ہے ہی چاند کی چاندنی۔ بس اس حسین جوڑے کی پیداوار کے
بڑا پیارا ہوگا نا اپنا بیٹا؟"

بھابی ہنسی سے دوہری ہوئی جا رہی تھی۔

"ہائے اللہ آپ بھی کیا کیا سوچتے ہیں۔"

الطاف اٹھ کے بیٹھ گیا۔ "اچھا یہ بات! تو کیا تم نہیں
ہوگی سو؟"

بھابی جھینپ کر بولی۔ "تو یہ ہے۔"

الطاف لپک کر اٹھا اور اپنے سوٹ کیس میں سے ایک
سا گلابی نیلے پیلے پھولوں کا بش شرٹ نکال لایا۔

"دیکھا بھابی۔ میں نے اسے آنا چھپا کے رکھا ہے۔ میں تو
تمہاری یہ نہ کہہ دیں کہ کیسا بےشرم ہے دیکھو تو ابھی سے اپنی اولاد
کے لیے جمع جتھا کر رہا ہے۔"

بھابی نے بہت ہی شرما کر جھکی جھکی آنکھوں سے بش شرٹ کو
دیکھا۔ نیلے پیلے، گلابی گلابی، لال لال پھول ہی پھول۔

بھابی کے اپنے جیون میں بھی پھول ہی پھول کھل اٹھے۔

***

شادی کو چھ ماہ گزر چکے تھے اور یہ چھ ماہ ایسے پر لگا کر اڑے
کہ کسی بات کا ہوش نہ رہا۔ ہنستے کھیلتے گاتے مسکراتے۔ بھابی تھی اور
الطاف۔ اور بس ان کی رنگین نخرے دار اور کبھی ختم نہ ہونے والی
میٹھی میٹھی باتیں۔

ایک دن منا اور نجمی آئے ہوئے تھے۔ الطاف ان کے
پاس بیٹھا "چاؤں چاؤں بلی کھاؤں" کھیل رہا تھا مگر بار بار وہ
بیٹھی بھابی کی طرف دیکھتا جاتا۔ منا روٹھا سا ہو کر شکایتاً بولا۔

"جب سے ماموں کی شادی ہوئی ہے ہمارے ساتھ کھیلنا
بالکل ہی چھوڑ دیا ہے۔ اب بھی ان کا سارا دھیان ممانی کی طرف ہی
لگا ہوا ہے۔"

اس بیباک حقیقت گوئی پر الطاف کچھ جھینپ سا گیا۔ بھابی بھی

میں منہ چھپا کر ہنسنے لگی پھر شرمندہ سے بولی۔
"بالکل ٹھیک بات ہے سنئے سب نے کا شکایت کر دی۔"
"اچھا سنئے!" الطاف اس کی شوخی پر ہنس کر بولا۔ "ہم تو تمہارے ساتھ اب کھیل نہیں سکتے کیونکہ ہمیں ایک گڑیا مل گئی ہے۔ اس اس بات کا ہم وعدہ کرتے ہیں جلد ہی تمہارے دل بہلانے کو ایک گڑیا تمہیں بھی دیں گے۔"
سنا کچھ سمجھا، کچھ دیکھا۔ مگر بھابی سمجھ گئی۔ دونوں ہاتھ منہ پر رکھ کر بولی۔ "ہائے اللہ کیسے بے شرم ہیں۔ بچوں سے ایسی بات کرتے لاج نہیں آتی۔"
اماں کے پوپلے منہ میں ہنسی سماتی نہ تھی۔ بھابی نے دوسرے دن کی نکھایا تھا۔ بس اللہ کی مرضی بہانیوں پر ہنسا کیں سے جاتی تھی۔ الطاف دفتر جانے کے لئے جوتے پہننے لگا تو اس کی شرارتی پکڑ کر بولا۔
"آج تو دل چاہتا ہے آفس ہی نہ جاؤں۔"
"کیوں بھلا؟" بھابی ہنس کر بولی۔
"بس یونہی، اور کیا!"
"پھر بھی۔" بھابی ناز سے مسکرا کر بولی۔ "کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔"
الطاف ہنس پڑا۔
"ہے نا؟" بھابی بھی ہنسنے لگی۔ الطاف ٹائی کی گرہ تنگ کرتے ہوئے بولا۔
"بھابی۔ یہ ہے تو بڑی خوبصورت سی بات۔ مگر دیکھنا میری جان! میں یہ نہیں چاہتا ہوں کہ میری ننھی منی سی گڑیا کو کوئی تکلیف ہمارے ابھی تو عمر ہی کیا ہے رانی۔"
"کیا مطلب؟" بھابی کچھ نہ سمجھ سکی۔
"مطلب؟ ارے ننھی سی یہی مطلب کہ ابھی سے اتنی جلدی کیا بچے کی؟ یہ ملائم گال۔ یہ دبیز پاتھیں، یہ چھپیلا بدن۔ یہ حسن تباہ ہو جائے گا جب ڈالی میں پھل آنے شروع ہو جائیں گے تو۔"
بھابی تیزی سے بولی۔ "تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ان باتوں سے کوئی عورت یہ چاہے کہ وہ ماں ہی نہ بنے؟"
الطاف قہقہہ لگا کر بولا۔ "ارے تو جو اس دن کہتی تھی کہ آپ بڑے بھرے ہیں۔ اب بتانا ذرا؟"
بھابی کے کان شرم سے لال پڑ گئے۔ "ہائے اللہ آپ تو بس



زبان پکڑ لیتے ہیں!"
بھابی کو عرصے کی پرانی شکایت تھی۔ وہ تین دنوں میں طبیعت پھر پہلے جیسی ہو گئی۔ مگر اس مختصر سی بیماری میں اس پر یہ بات خوب کھل گئی کہ ان دونوں کی طرح، بلکہ ان سے بھی کچھ بڑھ کر ہی اماں کو بھی بچے کی آرزو ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے چہرے سے ظاہر نہ ہوتا ہو۔
شادی کو ایک سال ہو گیا تھا۔ بھابی دوبارہ میکے گئی تو زاہدہ بھی آئی ہوئی تھی۔ زاہدہ کی شادی بھابی کی شادی کے دو ماہ بعد ہوئی تھی اور اب وہ زچگی کے لئے میکے آئی ہوئی تھی۔ ایک رات ابھی سب سونے ہی تھے کہ زاہدہ نے پاس سوئی بھابی کو جگا دیا۔
"آپی۔ آپی سنئے تو۔"
بھابی نے ہاں ہوں کی اور کروٹ لے کر پھر سو گئی۔ جب کہ زاہدہ نے ہلکی سی کراہ کے ساتھ کہا۔
"ہائے آپی سنتیں ہی نہیں۔"
بھابی گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ "کیوں کیا ہوا زاہدہ؟"
"پیٹ میں بہت درد ہو رہا ہے آپی۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے کوئی پیٹ کو کاٹے ڈال رہا ہے۔"
بھابی نے گھبرا کر کہا۔ "تو اب کیا ہوگا؟"
زاہدہ مطمئن آواز میں بولی۔ "امی کو جگا دیجئے۔ وہی سب کچھ کر لیں گی۔"
رات ڈھل رہی تھی اور پہلے گھر میں ہلچل مچ گئی۔ سب نے جلدی جلدی ستریاں اٹھائیں۔ زاہدہ ٹال مٹول کرتی رہی مگر بھابی نے اس

ہے۔ منتیں بھی دو چار نوافل پڑھنے ہی رہتے۔ خالہ بیگم نے جگ مگ کرتی بیلوں والی ساڑی اڑھا دی۔ مانگ میں افشاں بھری، ہونٹوں پر مسّی کی دھڑی جما دی اور سجا دی۔

"جیسی بھری بھری جا رہی ہے ویسے ہی آئیو۔" رات کو زاہدہ کو موٹر میں ڈال، ہسپتال لے جایا گیا۔ بڑی مشکلوں سے کوئے کا کیس چل سکا۔ چھابی اور امی اس کے ساتھ ہی رہیں۔ امی بار بار وظیفہ کرتیں۔ منتیں مانگتیں۔

"مولیٰ تیری دہائی۔ پہلوٹی کا بچہ ہے۔ چین آرام سے گودی بھر دیجو۔"

"اللہ تیری خیر، بھری پُری گھر سے آئی ہے ویسی ہی جائے۔"

چھابی سن جیسی بیٹھی رہی۔ نہ خوشی نہ غمی۔ ایک نامعلوم سا احساس اس کا دل دکھائے دیتا تھا۔ کرسی پر بیٹھے ہی بیٹھے اس کی آنکھ لگ گئی۔ صبح ہی صبح اس کی آنکھ کھلی تو نرس زاہدہ کا سٹریچر لے کر جا رہی تھی۔ چھابی گھبرا کر اٹھی اور لپک کر زاہدہ کے پاس پہنچ گئی ننھی منی گڑیا سی بیٹی اس کے پہلو میں پڑی ہوئی تھی اور وہ درد کے ساتھ ہلکے ہلکے مسکرا رہی تھی۔ مگر بڑی ہی خوشیوں بھری مسکراہٹ اس کے گال تکلیف سے تمتماتے ہوئے ضرور تھے مگر اس تکلیف کے باوجود بھی اس کے چہرے پر چھائی خوشی کا اندازہ لگا لینا چھابی کے لئے مشکل نہ تھا۔

چلّہ نہا کر زاہدہ سسرال جانے لگی تو گود بھرائی کی رسم ہوئی۔ ماں خالاؤں بہنوں نے دعائیں دیں اور ننھی کو خوب پیار کیا۔ چھابی نے ننھی کو گود میں لیا تو زاہدہ ہنس کر بولی۔ "اب آپ بھی ایک کھلونے کا انتظام کر لیجئے آپی۔ دل بہلا رہے گا۔" اور اس نے ہنس کر اپنے دولہے کی طرف دیکھا۔

چھابی نے آنکھیں اٹھا کر دونوں کو دیکھا تو اسے اک دم الطاف یاد آگیا۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ ایک لمحے کو اسے خیال آیا۔ "اگر مجھے کبھی بھی ایسا کھلونا نہ ملا تو ؟ ؟ ؟" اس تو کے آگے وہ کچھ سوچ نہ سکی۔ اس "تو" کے آگے زندگی کا تصور ہی مشکل تھا

⁂

ایک دن اماں نے چھابی کو ایک تعویز لا کر دیا۔ چھابی نے اسے لے تو لیا مگر حیرت سے بولی:

"اس کا کیا کروں گی میں؟"

اماں کچھ گھبرا سی گئیں۔ پھر سنبھل کر بولیں۔ "اسے بیٹا اس کو باندھے رکھو۔ بڑے خواب تمہیں دکھائی دیں گے۔"

اماں تو چلی گئیں۔ مگر چھابی بڑی دیر تک ان خوابوں کے بارے میں سوچتی رہی ــــ رنگین ــــ سنہری ــــ رنگ دار چمکدار خواب جو اس نے اور الطاف نے دیکھے ضرور مگر پورے نہ ہوئے۔

"اماں کون سے بُرے خوابوں کا ذکر کرتی ہیں۔" اس نے مجبور دل اور گیلی آنکھوں سے سوچا۔ "میں نے تو سارے ہی رنگین خواب دیکھے ہیں۔ رنگین جیسے قوس قزح۔"

اسے خود سے زیادہ ترس اماں پر آتا اور اماں سے بڑھ کر الطاف پر۔ اسے بچے کا کتنا چاؤ ہے؟ اور پھر اُسے ان ننھے منے کرتوں اور اس رنگین بش شرٹ کا خیال آ جاتا جو الطاف نے آج سے نہیں چھ سال سے خرید کر رکھا تھا۔

"شادی کو پانچ سال گزر گئے تھے۔ اللہ کو میری گود بھرنی ہوتی تو بھر نہ دیتا؟"

چھابی کے سپنوں میں ننھے منے ہاتھ، چھوٹے چھوٹے پاؤں رس گھولتے رہتے۔ سب سے بڑھ کر اسے ننھی منی ہتھیلیوں اور گلاب کے پھولوں جیسے کومل تلوؤں کا خیال آتا۔ جو دن رات اس کے تخیل کو سجائے رکھتے۔

الطاف کو نیا بنگلہ مل گیا تھا اور اس نے ایک چھوٹی سی موٹر بھی خرید لی تھی۔ ایک دن الطاف آفس سے ذرا جلدی ہی لوٹ آیا اور چھابی سے بولا۔

"میں ذرا نہا کر آتا ہوں تم بھی تیار ہو جاؤ۔"

"کیوں؟" چھابی حیرت سے بولی۔ "کہاں جانا ہے؟"

"ارے شہر میں نمائش لگی ہے تمہیں معلوم نہیں۔ ذرا گھوم آئیں گے۔"

"پیدل چلیں گے؟" چھابی رُک رُک کر بولی۔

"اور موٹر کو سر پہ رکھ لیں گے۔" الطاف قہقہہ لگا کر بولا۔

"دیکھو دیر مت لگانا۔" اور وہ ہاتھ گاؤن کا ندھے پہ ڈال گنگناتا چلا گیا۔

جب سے الطاف نے موٹر خریدی تھی چھابی اس میں بیٹھنے کو ترستی تھی۔ موٹر کی چھت سے الطاف نے ایک ننھا منا کا ربڑ کا گڈا لٹکا رکھا تھا جو دھکا کھا کر زور سے "ہلتا" رہتا۔ پھر جھولنا شروع کر دیتا۔ چھابی کو "ہلتی" کا وہ لفظ تیر کی طرح دل میں چبھتا محسوس ہوتا کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ الطاف کو بچے کا کتنا شدید ارمان

ہے !!!

چھایا اداس اداس سی پھرتی رہی اور الطاف سے کہتا رہا "پھر تو خرید رو چھایا ۔"

ایک دُکان پر الطاف نے فیاضی سے کہہ کر ہی دیا کہ یہ تو خرید لے

چھایا بے دلی سے ہنس کر بولی "کیا اون بھی کچھ ترسے ہے !"

"پھر بھی کچھ نہ کچھ تو لینا ہی ہوگا۔ آخر یہ نمائش روز روز تو نہیں لگتی ہے ۔"

ایک دُکان پر ایک بچہ کھلونے کے لئے بُری طرح مچل رہا تھا اس کی ماں نے زوردار طمانچہ اس کے منہ پر مارا۔

چھایا تیزی سے آگے بڑھ گئی اور جھٹ پلٹ کر اس غریب عورت کو دیکھتی رہی۔ جو غریب ہو کر بھی ساری دنیا کی دولت اپنے بازوؤں پر اٹھائے ہوئے تھی۔

اچانک ایک دُکان پر چھایا ٹھٹک گئی۔ شوکیس میں سامنے ننھے ننھے موزے اور دستانے رکھے ہوئے تھے۔ اس نے بہت ہی کھے دل سے دیکھا۔ دل کے کسی کونے میں دبی تمنا پوری طرح جاگ گئی ان ننھی ننھی ہتھیلیوں اور مخمل ایسے نازک تلوؤں کے لئے گرم دستانے اور موزے تو ہونے ہی چاہئیں ۔"

اس نے دکاندار سے بھاؤ پوچھا ۔

"اصلی ولائتی مال ہے میم صاحب۔ ان دستانوں کی قیمت ہے ساڑھے ستائیس روپے اور یہ موزے تو صرف چودہ روپے کے ۔"

"اتنے مہنگے !" چھایا حیرت سے بولی۔

"ارے میم صاحب ! آپ انہیں مہنگا کہتی ہیں۔ یعنی چودہ روپے بھی کوئی چیز ہیں بچوں کے لئے۔ اپنے دل کے ٹکڑوں سے پندرہ روپے تو کیا زندگی بھی کوئی چیز نہیں !"

چھایا بوکھلا اٹھی۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں سن سکتی تھی۔ اس کی مامتا جاگ اٹھی۔ دل کے کونے میں سویا سویا پیار جاگ اٹھا جو اس نے اپنے بچے کے لئے تھا۔ اپنے ان دیکھے بچے کے لئے جو ابھی پیدا بھی نہ ہوا تھا جس کا ابھی تصور بھی نہ تھا۔ مگر جس کے ہونٹ تصور ہی تصور میں اسے ماں کہہ کہہ کر پکارتے تھے۔

اس کے ہونٹوں کے کنارے کانپنے لگے۔ اور اس نے جھٹ اٹھا کے وہ دستانے اور موزے اپنے سینے سے لگا لئے۔

* * *

چھایا نے لاکھ اپنے دل سے یہ خیال ہٹانا چاہا مگر وہ اس حقیقت

پلا بہت دنوں سے اس کی الطاف کی طرف نظریں جھکی جھکی سی رہنے لگی ہیں۔ کہاں وہ دن کہ محبت بھری باتیں اور لطافتیں ختم ہونے میں نہ آتیں اور کہاں یہ دن کہ بات کرنے کے لیے ڈھونڈنے سے موضوع ہی نہ ملتا۔

"کیا یہ میرا اپنا قصور ہے ؟ کیا میں ایسا نہیں سوچ سکتی کہ یہ الطاف کا قصور ہے ؟ مگر سچ تو یہ ہے کہ قسمت ہی میری کھوٹی تھی۔"

وہ آنکھوں میں آنسو لئے بہت دیر تک اداس بیٹھی رہی۔

پڑوس میں ایک وکیل صاحب رہتے تھے جن کے ڈھیر سارے بچے تھے۔ الطاف کی جلد ہی سارے بچوں سے دوستی ہو گئی۔ پانچ سوا پانچ کے لگ بھگ میں جب وہ آفس سے لوٹتا تو موٹر کی آواز سنتے ہی سب کے سب دوڑ پڑتے اور الطاف کی جیبیں ٹٹولنی شروع کر دیتے۔

چھایا کبھی اس منظر کی تاب نہ لا سکتی۔ کبھی کبھار کوشش کر کے وہ اپنے بے جان جسم کو کھڑکی تک لے بھی آتی تو آنسوؤں کی چلمن اس منظر کو اس کی آنکھوں سے اوجھل کر دیتی۔

اماں کی شفقت بھری نظریں اب قہر بنتی جا رہی تھیں۔ دبی دبی زبان سے انہوں نے دو ایک طعنے بھی دیئے۔ وہ زبان تک نہ لا سکی۔ تنہائی میں جب اس کے کمرے میں کوئی نہ ہوتا۔ وہ دھیرے سے سوٹ کیس کھولتی اور نرم نرم اونی شرٹ کو اپنی آنکھوں سے ملتی رہتی۔

"الطاف نے کتنے ارمانوں سے یہ خریدا ہوگا۔ یہ آستینیں اتنی چھوٹی ہو کر بھی کتنی بڑی ہیں۔ ننھے کی کہنیاں تو ضرور ہی ڈھک جائیں گی اور یہ ہے تو اتنا ذرا سا۔ مگر ننھے کے سارے وجود کو ڈھک لے گا بیگم۔ مگر ننھا ہے کہاں ؟"

اس کی مامتا بے کل ہو اٹھتی۔ اس کے ہاتھ ننھے ننھے ہاتھوں کو کھوجتے۔ اس کے ہونٹ کانپتے ہی رہ جاتے کہ ان ننھے منے ہونٹوں کو چوم سکے جن میں دودھ کی خوشبو رچی بسی ہو۔"

چھایا اور الطاف کی محبت خاندان بھر میں ضرب المثل بن چکی تھی۔ مگر اب ان دونوں کے بیچ نفرت کی ایک دیوار غیر محسوس طریقے پر کھڑی ہوتی جا رہی تھی۔

الطاف کی بہن شہناز اپنی سسرال سے آتی تو اس کی نند ذکیہ بھی اس کے ساتھ تھی۔ شہناز بہت ذہین نہ تھی مگر چھایا کی گرد کو بھی نہ پہنچ پاتی۔ رات گئے تک سب باتیں کرتے رہتے اور چھایا من ہی من میں اپنے دل میں کسک سی محسوس کرتی۔ الطاف ذکیہ میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لے رہا تھا۔ اس کی ہر بات پر قہقہے لگاتا۔ ذکیہ بیان لگا رہی ہوتی تو بہت مہذب بن کر کہتا،

اچھا ہو ... [illegible]
شہناز بچوں کے لئے کچھ بھی رہی ہوتی تو کہتا "آپ کی انگلیاں سلائیوں پر تو خوب چلتی ہیں۔ فرصت رہے تو ایک سویٹر ہمیں بھی بُن دیجئے گا۔"

چھایا کو یاد آتا کہ گہرے رنگ کا سویٹر اس نے ابھی پرسوں ہی تو سلائیوں سے اتارا ہے۔

شہناز کی ایک بڑی پیاری سی بچی تھی۔ گول مٹول، گوری گوری وہ تین سال کی۔ اور گود کا بچہ دو تین ماہ کا تھا۔ الطاف بچی کو گود میں لیتا، جھلاتا، بھینچ بھینچ کر پیار کرتا، چکپھیریاں دیتا۔ چھایا دل ہی دل میں بڑکتی مگر کچھ کر نہ پاتی۔ الطاف کبھی دبی زبان سے اور کبھی کھلم کھلا اپنی محرومی کا ذکر کرتا۔ "امّاں کو بچے کی کتنی آرزو ہے۔"

چھایا چاہے کسی کام میں مصروف ہوتی یہ خیال اس کے ذہن سے نہ ہٹتا کہ اس کی گود سونی ہے۔ دوسروں کے بچوں کو پیار کرنے کی اس کے دل کو کبھی چاہت نہ ہوتی۔

ایک دن سردی بہت پڑ رہی تھی۔ شہناز کا بیٹا کمبل میں لپٹا پڑا تھا مگر پھر بھی کانپ رہا تھا۔ الطاف جھٹ اٹھا اور سوٹ کیس کھول کر دستانے اور موزے نکال لایا۔ اور اسے پہنا دیئے۔ چھایا کا دل اندر ہی اندر کانپتا رہا مگر وہ منہ سے کچھ نہ کہہ سکی۔ وہ کیسے دو جوڑی موزے اور سویٹر تو بُنتی رہتی ہے کیا اسی کے ذریعے ہوتے موزے پہنانے ضروری تھے؟ مگر وہ منہ سے کچھ نہ کہہ سکی۔ اگر اس کے منع کرنے پر الطاف نے کہیں یہ کہہ دیا "بانجھ تو ہو، بچے جننے کیا عورت ہے" تو کیا وہ اس تیر کو برداشت کر سکے گی؟

"امّاں کہتی ہیں دوسری شادی کر دو بیٹا۔ گھر کتنا سونا سونا لگتا ہے، بنا بچوں کے۔" شہناز کی آواز سنائی دی۔

"سوچیں گے۔" الطاف کی بہت دھیمی سی آواز آئی۔

چھایا گھر گئی۔ زندگی کے بارے میں اس انداز سے چھایا نے کبھی نہ سوچا تھا۔ "الطاف کسی اور کا ہو جائے۔" یہ وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ کیا واقعی ایسا ہو جائے گا۔ کیا سچ مچ؟؟ "میرے خدا" وہ تکیے پر اوندھے منہ گر پڑی۔ "میرے خدا میرے مالک، کیا وہ ننھی ننھی بانہیں کبھی میرے گلے کا ہار نہ ہوں گی؟ کیا وہ چھوٹے چھوٹے ہاتھ کبھی میرے سینے سے نہ کھیلیں گے۔ کیا وہ ملائم ملائم ہونٹ کبھی مجھے ماں کہہ کر پکاریں گے۔ میرا کرتا خدایا۔ کبھی نہیں۔ کبھی بھی نہیں۔ اس سے تو اچھا ہے مجھے خود ہی موت آ جائے۔"

... چاہت سے محروم رہی۔ ... [illegible]
سے پہاڑ سنگ جھاڑ دیا تھا، اس کے لئے جیون کے پھول ایسا چھڑ رہے تھے۔

"میں خدا کی ذات سے ناامید نہیں ہوں۔" چھایا سادگی سے کہہ رہی۔

الطاف نے اسے اجنبی نگاہوں سے دیکھا۔ "بارہ بہت طویل مدت ہے چھایا!"

چھایا اس کے پیروں پر گر پڑی۔ "آپ نہیں جانتے کہ بارہ بلکہ بیس بیس برس بعد بھی بچے ہوتے ہیں۔ آپ میرے ہیں۔ آپ سے ہٹ کر میں زندہ نہ رہ سکوں گی۔ بچے کے بغیر میری ماتا آسودہ رہ سکتی ہے مگر محبوب کے بغیر میری زندگی، میری محبت، میرا جیون سب کچھ تباہ ہو جائے گا۔ امّاں کہہ رہی آپ....."

چھایا نے آنسو برساتی آنکھیں اٹھا کر الطاف کو دیکھا۔ بارہ برس۔ اتنی طویل مدت۔ مگر چھایا وہی تھی۔ بالکل وہی۔ وہی رنگ وہی روپ۔ آنکھوں میں وہی ستارے۔ بالوں میں وہی گھٹا۔ ہونٹوں میں وہی رس۔ گالوں میں وہی گلاب۔ مگر قدرت نے گلاب بھی تو اپنا ایک حسن رکھتے ہیں۔ الطاف ایک لمحے کو سا گیا اور پھر سنبھل گیا۔

"تم سے جس نے بھی کہا، جو بھی کہا غلط کہا ہے چھایا!"

اور تھوڑے دن بیتے۔

الطاف کے رویے میں تبدیلی ہوئی ضرور مگر آنکھ کی جگہ رحم نے لے لی۔ کبھی کبھی وہ چھایا کو ایسی نگاہوں سے دیکھتا کہ چھایا جھنجھلا جاتی۔ "مجھے رحم کی نہیں محبت کی ضرورت ہے۔"

امّاں نے سب کھلم کھلا طعنے بند کر دیئے تھے۔

... پھر رنگ لا رہا تھا۔ قسمت اس پر مہربان ہو گئی تھی۔

ایک دن خوشی خوشی الطاف گھر لوٹا۔ کئی زمانوں بعد چھایا سے اتنی خوشی خوشی بات کر رہا تھا۔

"چھایا میرا گریڈ بڑھنے والا ہے۔ دلّی سے آرڈر آیا ہے۔ میں کتنا تھا ناداری سے میں میرے لئے بہت ... [illegible]"
چھایا ایک لمحے کو مسکرائی مگر اسے ... نے گھیرا!

آتی دولت۔ مگر کمانے والا کوئی تو ہو۔" اس کا ہی الٹ پلٹ ہو کر رہ گیا۔

چھابی کی طبیعت اچھی نہ تھی۔ بیٹھی ہی رہتی کھانا وانا سب بند تھا۔ الطاف جب دلی جانے لگا تو رہ رہ کے پوچھتا۔ چھابی کو ہدایت کرتا۔ "صحت کے بارے میں لاپرواہی مت برتنا کھانا نہیں کھایا جاتا تو پھل ہی کھا لیا کرو۔"

چلتے چلتے الطاف کہہ گیا "دعا وغیرہ کھاتی رہنا۔" چھابی کو اس جملے پر محبت کی بجائے رحم کی گدگدی سی اس نے دل کے درد کو چھپا کے کہا:

"صفرے کی پرانی شکایت ہے آپ ہی طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔"

الطاف چلا گیا۔ پانچ چھ دنوں بعد اس کا خط اس کے نام آیا۔ بالکل رسمی سا خط۔ "میں اچھا ہوں۔ انٹرویو ابھی نہیں ہوا۔ گھر کی بہت یاد آتی ہے۔"

ہر تیسرے چوتھے دن الطاف کے خط آتے۔ مضمون وہی یکسانیت لیے ہوئے۔

ایک دن چھابی کی طبیعت صبح سے خراب تھی۔ اسے رہ رہ کے چکر آتے۔ اور دل ڈوبتا محسوس ہوتا۔ ایسا لگتا تھا دم گھٹ کے رہ جائے گا۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھا رہا تھا اور ادھر ابکائیوں نے الگ نڈھال کر دیا تھا۔ چھابی نے دل نہ چاہتے ہوئے بھی موٹر نکلوائی اور ہاسپٹل پہنچ گئی۔ لیڈی ڈاکٹر نے اسے خوب غور سے دیکھا اور چند سوالات کیے!

عمر کتنی ہے۔ شادی کب ہوئی تھی۔ طبیعت کب سے خراب ہے۔ پھر وہ ذرا ٹھہر کر بولی۔ "آپ ذرا یہاں بیٹھئے میں ابھی آپ کا معائنہ کروں گی۔"

چھابی ڈاکٹر کے کہنے پر بے دلی سے میز پر لیٹ گئی۔ ڈاکٹر نے اس کے پیٹ کو خوب دیکھا بھالا پھر ہنس کر کہنے لگی۔ "آپ کو تین ماہ کا حمل ہے۔"

چھابی میز پر ہی اچک کر بیٹھ گئی۔ پہلے تو اسے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ پھر ایک دم ہکلانے لگی۔

"سچ ... واقعی ... کیا ... یہ حقیقت ہے۔ آپ سچ کہہ رہی ہیں ... سچ مچ ... ڈاکٹر کیا میں سچ مچ ماں بننے والی ہوں۔ آپ نے مجھ سے مذاق تو نہیں کیا ہے ... کیا سچ مچ ..."

ڈاکٹر مسکرا کر بولی۔ "جی ہاں بالکل سچ ہے۔ آپ یقیناً ایک ننھے منے کی ماں بن رہی ہیں۔"

"اوہ ڈاکٹر!" چھابی لیڈی ڈاکٹر سے لپٹ گئی ٹپ ٹپ ٹپ آنسو ڈاکٹر کے کوٹ پر گرنے لگے۔

وہ جلد سے جلد یہ خبر اماں اور الطاف کو سنا دینا چاہتی تھی، مگر یوں لگتا تھا جیسے موٹر دھیرے دھیرے چل رہی ہے۔

بارہ برس کے بن باس کے بعد آخر کار آج اس کے جیون میں بہار لوٹ آئی تھی۔ اس کے تصور میں آج نئے ڈھنگ سے نئے رنگ سے چمکدار، رنگیلے سپنے جھلمل جھلمل ناچ رہے تھے۔ بار بار ایک ننھا منا، گیلا گیلا سا وجود اس کے سراپے میں رینگ جاتا۔ اپنی ننھی ننھی انگلیوں سے اس کی آنکھیں بند کر کے پوچھتا،

"میں کون ہوں۔ بوجھو تو؟"

"تو میرا لال ہے۔ میرا جیون۔ میری زندگی ہے تیرے بنا جیون کے یہ بارہ سال اندھیری رات سے مشابہ تھے۔ میری آنکھوں کے تارے راج دلارے۔"

اس کی آنکھوں کے آگے بہاریں جھوم جھوم اٹھیں۔

گھر پہنچ کر وہ اماں سے لپٹ گئی۔ شرم کے مارے اس کے منہ سے الفاظ نہ نکلتے تھے۔ جب وہ شرما کر پوری بات کہہ سکی تو اماں نے کانپتے ہاتھوں سے اس کے ہاتھوں میں خط پکڑا دیا۔

"صابرہ!

میں تم سے بہانہ کر کے آیا تھا۔ انٹرویو وغیرہ کچھ بھی نہ تھا۔ اصل میں ہم سب نے کچھ اور ہی طے کر رکھا تھا۔ اگر اماں کو ساتھ لے آتا تو بات تم پر ظاہر ہو جاتی اور بھانڈا پھوٹ جاتا۔ تمہاری صورت یاد آتی ہے تو اب بھی رحم آتا ہے مگر زندگی کے قیمتی بارہ سالوں کے بعد اب اور کتنا انتظار ہو سکتا تھا؟ میں نے زکیہ سے شادی کر لی ہے۔ طلاق نامہ ساتھ ہی ارسال ہے۔"



تحیّر خیز ماڈرن رومانی ناول
— قسط نمبر (۵) —

جانور

[illegible]

ڈاکٹر کامران مقامی کالج میں فلسفے کا پروفیسر تھا۔ وہ بے حد وجیہہ اور دلکش تھا۔ لڑکیوں کے لیے اس میں ایک خاص کشش تھی۔ مگر وہ خود لڑکیوں کی طرف مطلق توجہ نہیں کرتا تھا۔ لڑکیوں میں وہ مغرور اور خود پسند مشہور تھا۔ اسی کالج کی چھ لڑکیاں شہناز، زبیدہ، جما، عمر، شیریں اور پروین بھی ڈاکٹر کامران میں دلچسپی رکھتی تھیں۔ مگر شہناز ان سے آگے نکل گئی تھی۔ ڈاکٹر کامران کی روکھائی کے باوجود وہ اس سے شدید محبت کرتی تھی۔ پھر ایک دن ڈاکٹر کامران نے پُراسرار انداز میں ایک قصہ شہناز کو سنایا جس میں اُسے آئندہ ملاقات کو ڈاکٹر کامران سے ملنے کے لیے کہا گیا تھا۔ وہ ڈاکٹر کامران کو ملنے کی سوچ رہی تھی کہ ایک ناخوشگوار واقعہ رونما ہو گیا۔ مہر النساء نے ایک خفیہ اور سرکش عاشق واجد کو ہلاک کر دیا۔ اس واقعے سے لڑکیوں میں سراسیمگی پھیل گئی وہ سب مل کر اس جگہ میں واجد کی لاش دیکھنے پہنچیں جہاں کہ مہر النساء نے ہلاک کیا تھا۔ مگر لاش غائب تھی۔ اس صورت حال سے وہ سب خوف زدہ ہو گئیں۔ دوسرے دن شہناز ضروری تیاریوں کے بعد ڈاکٹر کامران سے ملنے پہنچی۔

دروازہ خود ڈاکٹر کامران نے کھولا۔ وہ اس وقت ایک اخبار نویس سے مصروف گفتگو تھا۔ اخبار نویس رخصت ہوا تو ڈاکٹر کامران نے شہناز کی طرف توجہ کی۔ باتوں کا سلسلہ چل نکلا اور شہناز ڈاکٹر کامران سے مسحور ہوتی رہی۔ پھر اچانک ڈاکٹر کامران نے یہ کہہ کر شہناز کو چونکا دیا کہ وہ کچھ عرصے کے لیے اسے فرضی بیوی بنانا چاہتا ہے۔ شہناز پریشان ہو گئی مگر ڈاکٹر کامران سے اس قدر متاثر تھی کہ آمادگی ظاہر کر دی۔ دوسرے دن ملاقات کا وعدہ کر کے زبیدہ کے گھر واپس آئی تو فون پر ایک اجنبی کا پیغام ملا۔ وہ عمر کو پہچانتا تھا اور دھمکی دی تھی کہ واجد کا خون رائگاں نہیں جائے گا اور مہر سے بدلہ ضرور لیا جائے گا۔ شہناز اس دھمکی پر بوکھلا گئی۔ اس نے اپنے طور پر واجد کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ اُسے یقین سا ہونے لگا کہ واجد واقعی میں مر چکا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی اس پر خوف بری طرح طاری ہو گیا۔ ساتویں دن دوبارہ ڈاکٹر کامران سے ملنے اس کے گھر پہنچی۔ باتوں باتوں میں ڈاکٹر کامران نے بتایا کہ اس کا باپ بوڑھا اور مریض ہے اور اپنی بیماری کے سبب لندن میں مستقل طور پر رہنے پر مجبور ہے۔ عنقریب کچھ عرصے کے لیے یہاں آ رہا ہے۔ اُسے ڈاکٹر کامران کی شادی کی شدید خواہش تھی اور ڈاکٹر کامران نے اُسے مطمئن کرنے کے لیے لکھ دیا تھا کہ اس نے حال ہی میں شادی کر لی ہے۔ اب اس کا باپ بہو سے ملنے آ رہا تھا۔ چونکہ ڈاکٹر کامران نہیں چاہتا تھا کہ اس کا جھوٹ کھلے اور اس کے باپ کو دکھ پہنچے اس لیے اس نے شہناز سے فرضی بیوی بننے کی درخواست کی تھی۔ شہناز ڈاکٹر کامران کی بات



بڑی عجیب تھی مگر اس نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ ڈاکٹر کامران سے مل کر نہ جانے کیوں آئی تو وہ منتقل ہوا۔ شہناز نے اضافی جوابی کی صورت معلوم گھر والوں اندر آکر اپنے لیے رات کا کھانا تیار کرنے لگی۔ اس وقت باہر اندھیرا پھیل چکا تھا۔ شہناز نے سوچا کہ لڑکیاں واپس آگئی ہیں۔ اس نے جھانک کر دروازہ کھولا اور سامنے دیکھا تو مارے خوف کے اس کی چیخ نکل پڑی اور وہ بےہوش ہو کر گر گئی۔ اس کے سامنے کفن میں لپٹی ہوئی ایک لاش کھڑی تھی۔ پھر وہ لاش اس کے وجود کو پھلانگتی ہوئی مکان میں داخل ہو گئی۔

لڑکیاں واپس آئیں تو شہناز کو ہوش آچکا تھا۔ طبیعت سنبھلی تو شہناز کو یاد آیا کہ وہ شے جسے وہ لاش سمجھ رہی تھی وہ اصل میں لاش نہیں تھی بلکہ کوئی مرد تھا۔ اس نے جسم کے گرد سفید چادر لپیٹ رکھی تھی۔ لڑکیوں کے پوچھنے پر شہناز نے بتایا کہ ڈاکٹر کچھ عرصے کے لئے اسے اپنی فرضی بیوی بنانا چاہتا ہے اور وہ یہ محض اپنے بوڑھے اور بیمار باپ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کر رہا ہے جو کہ عنقریب لندن سے آنے والا ہے۔
اگلی صبح شہناز کو فون پر ایک اجنبی کا پیغام موصول ہوا۔ اجنبی اس سے تنہائی میں میڈیکل کالج لائبریری میں ملاقات کرنا چاہتا تھا۔ شہناز بادل نخواستہ اس سے ملنے پہنچ گئی۔ اجنبی سے مل کر انکشاف ہوا کہ وہ ڈاکٹر کامران کا دوست ہے اور وہ مرا نہیں ہے البتہ اس کی حالت بہت خراب ہے اور وہ وہی تھا جو سفید چادر اوڑھے زبیدہ کے گھر میں گھسا تھا مگر ملاقات خود اس سے ہو گئی تھی۔ شہناز یہ خبر لے کر دوستوں کے درمیان پہنچی تو ان سب پر شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس خوشی میں ایک چھوٹے سے جشن کا اہتمام کیا گیا۔ مگر اس وقت [illegible] کے درمیان نہیں تھی۔ جب کہ گھر فون کیا گیا تو گھر والوں نے یہ دہشت ناک خبر دی کہ گھر پر نہیں ہے جب کہ وہ گئی ہے۔ اس اطلاع نے سب کو پریشان کر دیا اور وہ سب سوچنے لگیں کہ آخر وہ گئی کہاں۔ اگلے دن طے شدہ پروگرام کے مطابق شہناز ڈاکٹر کامران کے گھر گئی۔ اس رات ڈاکٹر کامران کا باپ لندن سے آنے والا تھا۔ ڈاکٹر کامران اپنے باپ کو ائیرپورٹ سے لے کر آیا تو شہناز نے اس بوڑھے شخص کو قریب سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی چمک تھی۔ شہناز کو اچانک خیال آیا کہ کہیں وہ کسی مصیبت میں تو نہیں پھنسنے جا رہی۔ ہو سکتا ہے یہ بوڑھا ڈاکٹر کامران کا باپ نہ ہو کوئی فراڈ ہو۔ یہ خیال آتے ہی شہناز پر خوف طاری ہو گیا اور اس کی حالت غیر ہو گئی۔

مگر بعد کے واقعات نے ثابت کیا کہ وہ بوڑھا شخص ڈاکٹر کامران کا باپ ہی تھا۔ شہناز کے لیے وہ بہت مہربان اور شفیق ثابت ہوا۔ اس نے شہناز کو واقعی خسر جیسی محبت دی۔ ڈاکٹر کامران نے باپ کو ہوٹل میں ٹھہرایا اور وعدہ کیا کہ اگلے دن رات کا کھانا وہ کسی ریستوران میں کھائیں گے۔ شہناز زبیدہ کے گھر پہنچی تو اس وقت تک وہ واپس آچکی تھی۔ اس کی حالت بہت خراب تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کا ایک عاشق تھا جو زبردستی اسے اپنے گھر لے گیا تھا اور بےہوش کر کے اغوا کر دیا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ بری طرح زدوکوب بھی کیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ وہ کسی دوسری جگہ شادی کرنے کے خیال سے باز آجائے اور اس سے شادی کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ وہ جنت دل برداشتہ تھی۔ اس نے اپنے منگیتر سے منگنی توڑنے کا ارادہ ظاہر کیا اور کہا کہ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے وہ اس کا انتقام ضرور لے گی اور سب سے پہلا نشانہ ڈاکٹر کامران ہوگا۔ دوسرے دن شہناز ڈاکٹر کامران کے گھر پہنچی اور وہاں سے وہ دونوں ہوٹل روانہ ہو گئے۔ رات کا کھانا ڈاکٹر کامران اس کے باپ اور شہناز نے ایک ریستوران میں کھایا۔ کھانا جاری تھا کہ کسی نے عقب سے ڈاکٹر کامران کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ڈاکٹر کامران نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ اچانک ہی اس کا چہرہ سفید پڑ گیا اور چمچ ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑا۔

——— (اب آگے پڑھئے) ———



میں نے ڈاکٹر کامران کے عقب میں کھڑے ہوئے شخص پر نظر ڈالی۔ وہ انگریزی ادبیات کا پروفیسر تھا۔ اس نے ڈاکٹر کامران کی خیریت پوچھی تھی اور یہ محض رسمی بات تھی مگر اس کا ڈاکٹر کامران پر اتنا شدید ردعمل ہوا کہ نہ صرف وہ پروفیسر بلکہ میں اور ڈاکٹر کامران کا بوڑھا باپ بھی حیران رہ گئے۔ کئی ثانیوں کے بعد ڈاکٹر کامران اپنے حواس میں واپس آیا اور کندھے اچکاتے ہوئے انتہائی ناگواری سے بولا "ٹھیک ہوں"۔

اس کا لہجہ اتنا خشک اور کھردرا تھا کہ پروفیسر بے ساختہ چونک پڑا اور ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ اس کے شانے سے ہٹا لیا۔ کچھ دیر تک وہ حیرت بھری نظروں سے ڈاکٹر کامران کو دیکھتا رہا پھر خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔ میں نے ڈاکٹر کامران کے باپ کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ابھی تک حیرت کے آثار

تھے اور آنکھوں سے تجسس جھانک رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ بُرا ہوا۔ اب ناگوار گفتگو کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو جائے گا اور خاصی بدمزگی رہے گی، چنانچہ اس سے پہلے کہ ڈاکٹر کامران کا باپ کچھ کہتا میں اس کو مخاطب کرتے ہوئے بولی: ”آپ کو کاشی کے رویّے پر حیرت تو ہو رہی ہوگی۔ دراصل وہ پروفیسر تھا ہی ایسا آدمی۔ جاننے والے اسے پسند نہیں کرتے۔ دوسروں کے معاملے میں ٹانگ اڑانا اس کا مشغلہ ہے۔ اس قدر غیر ذمہ دار اور عاقبت نااندیش ہے کہ لوگ اس سے بچ کر چلتے ہیں۔ گزشتہ سال اس نے اپنی حماقت اور غلط مشوروں سے اپنے ایک دوست کو اس کی بیوی سے جدا کروا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ کاشی اسے سخت ناپسند کرتا ہے اور کالج کے دوسرے لوگ بھی پسند نہیں کرتے۔“

میں نے بالواسطہ طور پر ڈاکٹر کامران کی مدد کی تھی۔ ڈاکٹر کامران کا باپ کچھ مطمئن نظر آنے لگا تھا۔ ڈاکٹر کامران کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں میرے لئے تشکر نمایاں تھا۔ اس کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ بھی نمودار ہوئی تھی۔ اسے یقیناً اس بات کی خوشی ہوئی تھی کہ میں آڑے وقت پر اس کے کام آئی تھی اور ایک ”سچی اور صحیح بیوی“ کی مانند نازک وقتوں پر اس کی مدد کر رہی تھی۔ ڈاکٹر کامران نے جو کچھ مجھے سمجھا تھا میں اس سے بڑھ کر ثابت ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر کامران کی آنکھوں میں اپنے لئے پسندیدگی اور ستائش کے جذبات دیکھ کر میں خوشی سے جھوم اٹھی۔ میرے لئے اس سے بڑی سرخروئی اور کیا ہو سکتی تھی۔ میں انہی چیزوں کی تو تمنا کرتی آ رہی تھی۔ ڈاکٹر کامران، جو کسی لڑکی پر نظر ڈالنا بھی پسند نہیں کرتا تھا مجھے جس ممنونیت سے دیکھ رہا تھا، یہ میرے لئے ایک اعزاز سے کم نہیں تھا۔ میرے دل میں عجیب سے احساسات انگڑائیاں لینے لگے۔ کاش میں اس شخص کی حقیقی بیوی ہوتی۔ کاش میں اس کے دل میں گھر کر سکوں۔ کاش یہ اس کا اظہارِ تشکر اور احساسِ ممنونیت خلوص اور سچائی پر مبنی ہو۔ کہیں وہ میرے تعاون کی قیمت تو ادا نہیں کر رہا ہے۔

میں اور ڈاکٹر کامران کا باپ گفتگو میں مصروف ہو گئے مگر ڈاکٹر کامران چپ چپ کسی خیال میں الجھا بیٹھا رہا۔ وہ اس قدر پریشان تھا کہ ٹھیک سے کھایا بھی نہیں جا رہا تھا۔ وہ تو یہ چاہتا تھا کہ کوئی نہیں ایک ساتھ بیٹھے کہ اس کے ایک ساتھی نے دیکھ لیا تھا۔ اب اسے فکر تھی کہ اس کا چرچا ہوگا، بات پھیلے گی، مگر سوال یہ تھا کہ اس میں پریشانی کی کیا بات تھی۔ آخر ڈاکٹر کامران کی صحت پر کیا اثر پڑتا تھا۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ کیا ایک استاد اپنی شاگرد کے ساتھ کہیں آتا جاتا نہیں۔ پھر اس میں پریشانی کی کیا بات تھی، ضرور کوئی بات تھی جو ڈاکٹر کامران مجھ سے اور اپنے باپ سے چھپا رہا تھا۔ افسوس کہ میں اس سے اس سلسلے میں کچھ پوچھ بھی نہ سکتی تھی۔ ڈاکٹر کامران نے اس سلسلے میں مجھے سختی سے زبان بند رکھنے کی تاکید کی تھی۔ اس نے شروع میں ہی کہہ دیا تھا کہ میں کوئی سوال نہیں کروں گی اور وعدے کے مطابق آنکھ بند کر کے اس کے احکامات کی تعمیل کرتی رہوں گی۔

کھانا تو ختم چل رہا تھا، کھا کیا رہے تھے، زہر مار کر رہے تھے۔ خاصی بدمزگی پیدا ہو گئی تھی۔ بالآخر ڈاکٹر کامران کے باپ سے نہ رہا گیا۔ ڈاکٹر کامران کو مخاطب کرتے ہوئے پُرتشویش لہجے میں بولا۔

”کاشی کیا بات ہے؟ ایسی تو کوئی بات نہیں ہوئی جو تم اس قدر سیریس اور نروس ہو گئے ہو؟“

”کوئی خاص بات نہیں ہے۔ دراصل آج کل کام بہت ہے تھک گیا ہوں اور چاہتا ہوں کہ آج جلد بستر پر چلا جاؤں۔“ ڈاکٹر کامران نے جواب دیا۔ یہ دراصل اس بات کا اعلان تھا کہ اب ہم کھانے سے ہاتھ اٹھا لیں، وہ کبھی کا ہاتھ اٹھا چکا تھا، پھر ہم بھی رہی۔ ہم چھوٹے بڑے لقمے لے کر بہت جلد کھانے سے فارغ ہو گئے۔

ریستوران سے نکلتے ہوئے ڈاکٹر کامران نے کل کا پروگرام بنایا اور طے کیا کہ کل دوپہر کا کھانا اپنے باپ کے ساتھ کسی ہوٹل میں کھائے گا۔ البتہ رات کا کھانا گھر پر ہوگا، تجویز ڈاکٹر کامران کی تھی اور اس نے اس پر اصرار بھی کیا تھا کہ میں اس پروگرام میں شامل نہیں تھی۔ دراصل وہ نہیں چاہتا تھا کہ آج کے ناخوشگوار واقعے کا اعادہ ہو۔

گاڑی اس ہوٹل کی طرف چل پڑی جہاں کہ ڈاکٹر کامران کا باپ مقیم تھا۔ گاڑی ہوٹل کے سامنے رکی تو وہ بیٹھے بیٹھے میری طرف مڑتے ہوئے کہا: ”شازی بیٹا! میری خواہش ہے کہ کل تم

..ب سے ..ں ..ا ..س ..یہ جو میں نہایت سے لایا ہوں۔ بے
بڑی خوشی ہوگی۔" پھر اس نے جھک کر فرطِ محبت سے میری
پیشانی کو چوما اور گاڑی سے اتر گیا۔

ڈاکٹر کامران نے دوبارہ گاڑی اسٹارٹ کی۔ مجھے جو
فخر کا احساس ہو رہا تھا کہ آج میں نے بڑے نازک موقع پر
ڈاکٹر کامران کی مدد کی تھی۔ اگر میں بیچ میں نہ بول پڑتی تو جانے کیا
نتیجہ نکلتا۔ احساسِ تفاخر کے تحت میں نے ڈاکٹر کامران سے
کہا۔ "پروفیسر کو دیکھ کر آپ بُری طرح نروس ہو گئے تھے۔
حالانکہ قاعدے سے پریشان مجھے ہونا چاہیئے تھا۔ بات تو
میں نے بنا دی مگر مجھے یقین ہے کہ آپ کے والد صاحب
آپ کے بارے میں کچھ مشکوک ضرور ہو گئے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ
وہ اپنے شبہے کو رفع کرنے کے لئے اس پروفیسر سے ملاقات
کریں اور چھان پھٹک شروع کر دیں۔ اگر ایسا ہوا تو بہت
بُرا ہوگا۔"

ڈاکٹر کامران کے ہونٹ سختی سے بھنچ گئے پھر اس
نے ایک گہری اور طویل سانس لی اور مجھ سے مخاطب ہو کر
انتہائی سرد لہجے میں بولا۔ "تم نے اس وقت جو میرے لئے کیا
اس کے لئے شکر گزار ہوں، اور آئندہ جو کچھ کرو گی اس کے
لئے پیشگی شکریہ ادا کرتا ہوں اور اس کے ساتھ ہی ایک
التماس بھی ہے، وہ یہ کہ تم مجھے بالکل ہی کودن اور احمق
مت سمجھو، میں اپنے باپ کو تم سے زیادہ جانتا ہوں اس
لئے تمہارا تردد بیکار ہے۔ اس کے پاس اتنا وقت نہیں ہے
کہ وہ اپنے شکوک رفع کرتا پھرے۔ وہ ہر قسم کے جھوٹ کو
آسانی قبول کر لیتا ہے۔ پھر اس کے علاوہ میں ایک مدت
سے خطوط کے ذریعے اسے ذہنی طور پر آمادہ کرتا رہا ہوں۔
وہ میری ہر بات کو بے چون و چرا تسلیم کر لے۔ اسے یہاں
رہنا ہی کتنا عرصہ ہے، چار چھ دن میں لندن چلا جائے گا اور
صرف وہ بلاوجہ ادھر ادھر گھوم کر نہیں گزارے گا۔ تاہم تمہاری
ہی خاطر بتا دوں کہ اگر میں نے دیکھا وہ کسی شبہے میں مبتلا
ہو کر دوں گا کہ ان دنوں مجھ پر کام کا بار ہے اور لیستوران
ہوسے جو غیر اخلاقی حرکت سرزد ہوئی تھی وہ محض اعصابی
اور شدید تھکن کا نتیجہ تھی۔ کیو اب مطمئن ہو گئیں؟"

ڈاکٹر کامران خاصا ناراض نظر آ رہا تھا۔ اس کے خفیلے
لہجے سے میں ایک لمحے کے لئے گھبرا گئی مگر دوسرے لمحے
بیٹھتے ہوئے بولی۔ "وہ صرف بداخلاقی کی بات نہیں تھی۔"

ڈاکٹر کامران نے سر گھما کر مجھے غور سے دیکھا اور بے
مسکرا دیا۔ پھر ایک ہاتھ بڑھا کر میرے بالوں کو سہلاتے ہوئے
نرم لہجے میں بولا۔ "دوست کہتی ہو، وہ صرف بداخلاقی کی بات
نہیں تھی۔ میرے لہجے میں تیزی اور تندی بھی تھی اور شدید
ناراضگی اور جھنجھلاہٹ کا اظہار بھی ہو رہا تھا۔ یہ بات واقعی
سوچنے کی ہے۔ میں واقعی خراب ہو گیا ہوں، آئندہ خیال
رکھوں گا اور خوش اخلاق بننے کی کوشش کروں گا۔"

غصہ مجھے بھی آ گیا تھا کہ ڈاکٹر کامران کے اس مصنوعی
"اقبالِ جرم" پر مسکرا دی۔ میٹھے لہجے میں بولی۔ "مگر اس سے
کیا حاصل۔ جب تک آپ خوش اخلاق نہیں بنیں گے ہماری
شادی کا مختصر ترین عرصہ اپنے اختتام کو پہنچ چکا ہوگا ویسے
میری سمجھ میں ایک بات نہیں آتی وہ یہ کہ آپ مجھ سے کیا توقع
رکھے ہوئے ہیں۔ مجھے آپ کے والد صاحب کے سامنے آپ
کی بیوی کا رول ادا کرتے رہنا ہے یا اس کے علاوہ کوئی دوسری
بات بھی ہے۔ بیوی کے علاوہ شاید آپ مجھے اتالیق کا درجہ
بھی دینا چاہتے ہیں تاکہ وقتاً فوقتاً آپ کا اخلاق چیک کرتی
رہوں، کیوں؟"

ڈاکٹر کامران نے ایک بار پھر پلٹ کر میری طرف دیکھا
نگاہوں ہی نگاہوں میں مجھے ٹٹولتا رہا مگر زبان سے کچھ نہیں کہا
میں ایک بار پھر اس کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو گئی۔ آخر
اس میں ایسی کیا بات تھی جو میری سوچ کی رو گھوم پھر کر اس کی
طرف منتقل ہو جاتی تھی۔ وہ کسی بھی کیفیت میں ہو، سنجیدہ ہو
غصے میں ہو یا شوخی کر رہا ہو، ہر کیفیت میں میرے ذہن میں
ایک خوشگوار تاثر کی مانند موجود رہتا تھا۔ میں اس سے مرعوب
بھی تھی، متاثر بھی، اور خوفزدہ بھی۔ اس سے بے انتہا قریب
ہونے کے باوجود ہر لمحہ یہ احساس رہتا تھا کہ ایک غیر مرئی
دیوار ہمارے درمیان حائل ہے۔ میں نے اس پر اعتماد کر لیا
تھا۔ اس کے ایک ایک لفظ پر یقین رکھتی تھی۔ مگر جانے کیوں
یہ سوچتے ہوئے عجیب سا لگ رہا تھا کہ اس نے محض اپنے
باپ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے یہ سارا ناٹک رچایا
ہے۔ اس کا یہ جھوٹ کبھی نہ کبھی تو کھلے گا۔ ممکن ہے کہ اس کا

باپ اپنی بیماری کے باوجود چند کئی سال زندہ رہے تھے اور اس عرصے میں اس کا دوبارہ یہاں آنا ہوا تو ڈاکٹر کامران کیا کرے گا۔ اپنے جھوٹ کو کس طرح نبھائے گا۔ ممکن ہے آنے والے دنوں میں میری کہیں شادی ہو جائے پھر اس صورت میں وہ اپنے باپ کو کیا جواب دے گا، کیا یہ کہے گا کہ اس نے مجھے طلاق دے دی ہے یا صاف صاف بتا دے گا کہ اس نے مجھ سے سرے سے شادی کی ہی نہیں تھی۔

مختلف سوالات تھے جو میرے دماغ میں چکرا رہے تھے اور میں ڈاکٹر کامران سے ان کے جوابات چاہتی تھی۔ مگر اس کی ناراضگی کے خوف سے کچھ پوچھ نہ سکتی تھی۔ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ سوالات سے کتراتا ہے اور اکثر معمولی بات پر مشتعل ہو جاتا ہے۔

گاڑی سڑک پر دوڑتی رہی اور میں منہ سیئے بیٹھی رہی۔ پھر میری طبیعت اوبنے لگی اور وقت گزاری کے لئے کوئی مناسب جملہ سوچنے لگی۔ کچھ دیر بعد ذرا تامل کے ساتھ بولی۔
"کل کا کیا پروگرام ہے؟ مجھے کس وقت اسٹیج پر نمودار ہونا ہے؟"

اس بار ڈاکٹر کامران نے مڑ کر میری طرف نہیں دیکھا۔ بدستور سامنے نظریں جمائے رہا۔ پھر قدرے توقف کے بعد بولا "کل تم کالج نہ جانا۔ میں دوپہر کو والد صاحب کو کسی ریسٹورنٹ میں کھانا کھلانے لے جاؤں گا۔ پھر انہیں ان کے ہوٹل میں چھوڑ کر سیدھے گھر آ جاؤں گا۔ تم دو سوا دو تک گھر پہنچ جانا۔ میں گھر تمہارے حوالے کر کے دوبارہ کالج چلا جاؤں گا۔ کام ختم کر کے دوبارہ والد صاحب کے پاس جاؤں گا اور انہیں لے کر گھر آؤں گا۔ اس عرصے میں تم تیاریاں مکمل کر لوگی۔ ویسے اس سلسلے میں تمہیں زیادہ تکلیف نہیں ہوگی۔ ایک ملازمہ صبح آتی ہے اور گھر ٹھیک ٹھاک کر کے دوپہر تک لوٹ جاتی ہے۔ کل اسے مزید ہدایات دے دوں گا تاکہ تم پر بار نہ پڑے۔ البتہ تمہیں دو چار قسم کے کھانے تیار کرنا پڑیں گے۔" وہ ہنسا اور میری پیٹھ پر دھپ مارتے ہوئے بولا "کھانا پکانا جانتی ہو نا؟"

اور میں بوکھلائی ہوئی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

اس نے مذاقاً کھانا پکانے کے بارے میں پوچھا تھا مگر حقیقت یہی تھی کہ میں کھانا پکانے کے فن سے بالکل نابلد تھی۔ اس سلسلے میں میری لیاقت چائے ابالنے سے آگے نہیں تھی۔ میں تو قرینے سے اٹھا بھی نہیں سکتی تھی اور توے پر روٹی ڈالنا تو اپنی جگہ ایک مرحلہ تھا اور رہا قورمہ یا بریانی اور کباب بنانے کا مسئلہ تو اس سلسلے میں میری اہلیت صرف کھانے تک محدود تھی۔ سلیقے سے کھانا جانتی تھی اور فراخدلی سے پکانے والے کی تعریف کر دیتی تھی۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ بیوی بننے کے بعد فرضی ہی سہی، ان مراحل سے بھی گزرنا ہوگا۔

میرے تو جیسے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے فوری طور پر فیصلہ نہ کر پائی کہ کیا کروں۔ اسی وقت ڈاکٹر کامران نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور ایک انگلی مروڑتا ہوا شوخی سے بولا "آنکھیں پھاڑ کر کیا دیکھ رہی ہو۔ شاید پکانا نہیں جانتیں؟"

بس یہی ایک بات ہے جو کوئی لڑکی سننا پسند نہیں کرتی خواہ وہ کھانا پکانا جانتی ہو یا نہ جانتی ہو۔ یہ اس کی اہلیت اور لیاقت کا امتحان ہوتا ہے، اس کی نسوانیت کے لئے ایک چیلنج ہوتا ہے۔ وہ یہ ہرگز پسند نہیں کرتی کہ کوئی مرد اس سے یہ کہے کہ وہ کھانا پکانا نہیں جانتی۔ وہ یہ برداشت ہی نہیں کر سکتی۔ چنانچہ میں پٹ سے بول پڑی "کیوں نہیں جانتی۔ اتفاق سے اچھا ہی پکا لیتی ہوں، میری امی کہا کرتی ہیں کہ میرا شوہر خوش نصیب ہوگا، ایسا پکاؤں گی کہ انگلیاں چاٹتا رہ جائیگا۔"

ڈاکٹر کامران بے ساختہ ہنس دیا "اچھی بات ہے کل تمہارا امتحان ہو جائے گا، دیکھوں گا کہ تمہاری امی کے بیان میں کہاں تک صداقت ہے۔"

میری پیٹھ پر پسینہ سرسرانے لگا۔ خدایا کل کیا ہوگا۔ اب تو پیچھے ہٹنے کا موقع بھی نہیں تھا۔ خوامخواہ جوش میں آگئی تھی۔ اب اگر پیچھے ہٹتی ہوں تو یہ ڈاکٹر کامران، موذی انسان میرا مذاق اڑائے گا۔ مذاق اڑوا لینا گوارا تھا مگر ڈر یہ تھا کہ کہیں اس کی نظروں میں ہلکی نہ ہو جاؤں۔

ڈاکٹر کامران میرا ہاتھ سہلاتے ہوئے نرمی سے بولا۔
"اچھا تو پھر یاد رہے کل تم سوا دو تک میرے گھر پہنچ جانا۔ اس وقت تک میں بھی گھر پہنچ چکا ہوں گا۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ کل میں کالج نہ جا سکوں گی۔ اپنی دوستوں کو کیا عذر پیش کروں گی۔ یوں بھی آج کل کالج سے بہت غیر حاضری ہونے لگی ہے۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"ڈاکٹر کامران کالج میں موجود ہے پھر تمہیں حاضری اور

غیر حاضری کا کیا غم ہے۔" اس نے کہا، پھر فلاسک کر بولا "ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی وہ یہ کہ تمہارے اپنی دوستوں سے کس قسم کے تعلقات ہیں جو ہر بات کے لئے ان کے سامنے جوابدہ ہونا ضروری سمجھتی ہو۔"

میں جھجکتے ہوئے بولی۔ "کم از کم یہ تو بتانا ہی پڑتا ہے کہ ہم میں سے کوئی کس دن، کالج کیوں نہیں جا رہا ہے اور اصل ہم میں آپس میں محبت بہت ہے۔"

زبیدہ کا مکان قریب آگیا تھا۔ میں نے گاڑی روکنے کے لئے کہا۔ اس نے گاڑی روک دی اور اس کے ساتھ ہی مٹھی میں میرے بال جکڑ لئے اور جھک کر رخسار چومتے ہوئے بولا۔ "اگر تم حقیقتاً میری بیوی ہوتیں تو میں تمہیں ان لڑکیوں سے اتنا زیادہ گھلنے ملنے کی اجازت نہ دیتا۔"

میں نے آہستہ سے اپنے بال چھڑائے اور مسکراتے ہوئے بولی۔ "جب بیوی ہوتی تبھی نا۔ فی الحال تو نہیں ہوں۔"

اس نے ہاتھ بڑھا کر میرے لئے دروازہ کھولا اور میں خود کو سمیٹتے ہوئے باہر نکل آئی۔ پھر اس نے ملبوسات کا پیکٹ میرے حوالے کیا اور یاد دہانی کے طور پر بولا۔ "کل دو سوا دو کے درمیان، ٹھیک۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا گویا اس کی بات سمجھ رہی ہوں۔ پھر مڑ کر زبیدہ کے مکان کی سمت چل پڑی۔ میری رفتار ابھی تیز تھی۔ مگر ابھی مکان میں داخل نہیں ہوئی تھی کہ ایک خیال آیا اور میرے قدم یک لخت سست پڑ گئے۔ میں نے کامران سے وعدہ کیا تھا کہ کل اس کے گھر آ کر رات کے کھانا تیار کروں گی مگر عالم یہ تھا کہ میں کچھ ابھی بھی صحیح طور پر نہ کر سکتی تھی۔ بڑا غلط وعدہ کیا تھا۔ سوچا کہ پلٹوں اور جا کر کامران سے معذرت کر لوں مگر اسی وقت گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔ پلٹ کر دیکھا تو ڈاکٹر کامران کی گاڑی تیزی سے دور ہوتی جا رہی تھی۔

میں نے سر کو جھٹکا دیا اور مکان میں داخل ہو گئی۔ لڑکیاں بھی تھیں اور بڑی بے تابی سے میری راہ دیکھ رہی تھیں ریحانہ دراز تھی۔ پہلی نظر میں اندازہ ہو گیا کہ ابھی تک اس نے سنبھلی نہیں ہے۔ میں نے ملبوسات کا پیکٹ ایک سمت دیا اور بڑی دلچسپی سے لڑکیوں کے سوالات میں گھر گئی۔ لڑکیاں سوالات کرتی جا رہی تھیں اور پیکٹ کھول کر ایک ایک لباس کا جائزہ لیتی جا رہی تھیں۔ پروین اور شیریں نے تو باقاعدہ ایک ایک جوڑا منتخب کر کے اپنے جسموں پر چڑھا لیا۔

پروین نے بڑا عمدہ، شوخ رنگ کا جوڑا پہنا تھا لباس پہن کر وہ آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھی اور مختلف زاویوں سے اپنا جائزہ لے رہی تھی۔

"شہناز! تم اجازت دو تو کل میں یہ جوڑا پہن کر ہما کے منگیتر سے ملنے چلی جاؤں۔" وہ آئینے کے سامنے اپنے سراپے کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔

"کیا اس سے کوئی ملاقات طے ہو گئی ہے؟" میں نے اسے بھرپور نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہی سمجھ لو۔" پروین ہنستے ہوئے بولی۔ پروین خوبصورت رہی ہو یا نہ رہی ہو مگر اس نے جسم بہت دلکش پایا تھا۔ جنس مخالف کو پکار کر دعوت دینے والا جسم تھا اس کا۔ چیختا اور چنگھاڑتا ہوا اور ہم سب اس کی اس برتری کو دل و جان سے تسلیم کرتے تھے مگر ہما جو اب تک خاموش بیٹھی ہوئی تھی اسے پروین کی یہ بے حیائی ایک آنکھ نہ بھائی۔ غراتے ہوئے بولی۔ "پروین شرم کرو تم ہما کے منگیتر پہ ڈورے ڈال رہی ہو۔"

"میں ہما کے منگیتر کو کوئی چھین تھوڑی رہی ہوں۔ وہ تو خود اپنے منگیتر کو چھوڑ رہی ہے اور جب وہ چھوڑ ہی رہی ہے تو میں اپنی قسمت کیوں نہ آزماؤں۔" پروین برا سا منہ بنا کر بولی پھر وہ میری طرف مڑی اور خوشامد کے انداز میں بولی۔ "شہناز تم نے بتایا نہیں، کیا میں تمہارا یہ لباس استعمال کر سکتی ہوں؟"

"ضرور، شوق سے۔" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "بس شرط یہ ہے کہ اسے پہن کر کالج نہ جانا۔ اگر ڈاکٹر کامران نے تمہیں اس لباس میں دیکھ لیا تو کچھ اچھا نہیں ہوگا۔"

پروین نے میری یہ بات مان لی اور وعدہ کیا کہ وہ اس لباس میں کالج نہیں جائے گی۔ اس لباس سے اس کا مقصد محض ہما کے منگیتر کو رجھانا تھا۔ پروین کچھ اور کہتی مگر ہما نے اسے ٹوک دیا اور مجھے مخاطب کر کے بولی کہ میں ڈاکٹر کامران اور اس کے باپ سے ملاقات کے بارے میں بتاؤں۔

اور میں زبیدہ کا لباس اتارتے ہوئے انہیں ڈاکٹر کامران

اور اس کے باپ سے ملاقات کے بارے میں بتانے لگی۔ لڑکیاں میرا ایک ایک جملہ بہت توجہ اور شوق سے سن رہی تھیں درمیان میں شوخ فقرے بھی جڑتی جاتی تھیں۔ جب میں نے انہیں ریستوران میں پروفیسر کی مداخلت اور ڈاکٹر کامران کی بوکھلاہٹ کے بارے میں بتایا تو بے انتہا محظوظ ہوئیں۔

میں نے اپنی بات ختم کی تو وہ سب کی سب ان لیباسوں پر تبصرہ کرنے لگیں جو ڈاکٹر کامران کے باپ نے مجھے دیئے تھے۔ شیریں چہکتے ہوئے بولی "چلو کم از کم بے شوہر ہونے سے فرضی شوہر رکھنا تو بہتر ہے۔ اس کے کچھ فائدے تو ہیں"

مہر نے اسے گھور کر دیکھا مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔ آخر وہ کس کس کی اصلاح کرتی وہاں تو سبھی ایک رنگ میں رنگے ہوتے تھے۔ ہمانے ان سب کے مقابلے میں زیادہ دلچسپی سے میری بات سنی تھی مگر سوالات سب سے کم کئے تھے۔ وہ ہر وقت کسی خیال میں کھوئی رہی تھی۔ جب میں نے لڑکیوں کو بتایا کہ میں ڈاکٹر کامران سے کل کے لئے ایک بے ہودہ احمقانہ وعدہ کر آئی تھی تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ وہ ہنس رہی تھیں مگر میں اپنی جگہ بہت پریشان تھی۔ بالآخر میں نے زبیدہ کو مخاطب کر کے کہا "اب میں کیا کروں زبیدہ، میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ مگر وعدہ نبھانا بھی ضروری ہے ورنہ مکر جاؤں گی کل دو بجے ڈاکٹر کامران کے گھر جا کر کھانا پکانا ضروری ہے اگر نہ گئی یا جا کر صاف لفظوں میں اپنے نااہلی کا اقرار کر لیا تو پھر کبھی اس کا سامنا کرنے کی ہمت نہ کر سکوں گی"

زبیدہ ہنستے ہوئے بولی "کہو تو آپا کو تمہارے ساتھ کر دوں وہ جا کر سب ٹھیک کر دے گی"

زبیدہ نے یہ بات مذاقاً کہی تھی مگر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری ساری پژمردگی دور ہو گئی ہے۔ مجھے امید کی کرن نظر آئی۔ میں نے بے انتہا سنجیدگی سے کہا "تم چاہو تو میری مدد کر سکتی ہو"

زبیدہ بدستور ہنستے ہوئے بولی "تمہارا مطلب ہے کہ میں تمہارے ساتھ چلوں اور کھانا پکاؤں"

"نہیں ساتھ چلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ تم ڈاکٹر کامران کے سامنے آؤ۔ وہ خود بھی اس بات کو پسند نہیں کرے گا۔ البتہ وہ ڈھائی اور تین کے درمیان واپس چلا جائے گا۔ تم آپا کو لے کر ساڑھے تین بجے تک ڈاکٹر کامران کے گھر آ جانا۔ پتہ میں لکھوائے دے رہی ہوں۔ پھر آرام سے کھانا تیار کیا جا سکے گا"

تھوڑے سے بحث و مباحثے کے بعد اتفاق رائے سے اس تجویز کو منظور کر لیا گیا۔ پیدین تو اس حد تک آمادہ ہو گئی تھی کہ وہ بھی کل زبیدہ اور آپا کے ہمراہ ڈاکٹر کامران کے گھر جائے گی ان کا ہاتھ بٹائے گی اور ہما کے منگیتر سے پھر کبھی مل لے گی۔ مگر اسے ڈانٹ ڈپٹ کر خاموش کر دیا گیا۔ ہما نے اس پر زور ڈالتے ہوئے کہا کہ وہ جلد از جلد اس کے منگیتر سے ملاقات کرے ایسا نہ ہو کہ وہ اس عرصے میں اس کے والدین سے رابطہ قائم کر کے منگنی توڑنے کے سلسلے میں کوئی سوال کر بیٹھے اور اس کا منصوبہ فلاپ ہو جائے۔

ہم سونے کے لئے لیٹے، شدید طور پر تھکی ہوئی ہونے کے باوجود اس رات مجھے دیر تک نیند نہ آئی۔ وہی ڈاکٹر کامران تھا اور میں۔ میری ساری سوچ اسی کے گرد تھی، میری فکر کا محور وہی تھا۔ وہ میرے لئے سوہانِ روح بنا ہوا تھا اور نشاطِ روح بھی۔ اس کے بارے میں سوچتی تھی تو تکلیف ہوتی تھی اور سوچے بنا رہا بھی نہ جاتا۔ وہ کبھی شعلہ تھا کبھی شبنم، کبھی شدید قسم کی جلن اور تپش کا احساس ہوتا تھا کبھی ٹھنڈک کا۔ وہ خود پاگل تھا اور مجھے بھی پاگل بنا دیا تھا۔ میں اس سے دور ہٹ جانے کی سوچتی تھی مگر اس کوشش میں ہر بار ایک قدم آگے بڑھ جاتی تھی۔ جب اس کا باپ لندن واپس چلا جائے گا تو پھر میرا کیا ہو گا ظاہر ہے کہ وہ مجھ سے نہیں ملے گا۔ ہمارے درمیان اجنبیت کی لکیر کھنچ جائے گی۔ وہ میرے قریب سے سائے کی مانند گزر جائے گا ان بادلوں کی مانند جو پانی برسائے بغیر گزر جاتے ہیں۔ کیا میں اس کی جدائی برداشت کر سکوں گی۔ شاید میں کبھی اس کی بیوی نہ بن سکوں۔ فرضی بیوی کا رشتہ ہی بڑا غنیمت تھا اور اب یہ رشتہ بھی چند دنوں بعد ٹوٹ جانے والا تھا۔ میں نے اس بارے میں سوچا تو میرے دل میں درد ہونے لگا۔

کاش میں اس مغرور، وحشی، خود غرض اور خود پسند فلسفی کو گرفتار کر سکتی۔

میں دیر تک کروٹیں بدلتی رہی اور سوچتی رہی کہ کس طرح اس شخص کو رام کر سکتی ہوں، کس طرح گرفت جمائی جائے کہ وہ

میرے سارے بھی نہ نکل سکے بلکہ ہمیشہ کے لئے میری باہوں میں مقید ہو جائے۔ میں ہر وہ طریقہ سوچتی رہی جس سے کہ میری آرزوؤں اور خوابوں کی تعبیر نکل سکتی تھی۔ پھر ایک تدبیر مجھے سوجھ گئی۔ میں نے سوچا کہ اس سلسلے میں اس کے بوڑھے اور دردمند باپ سے مدد لینی چاہیئے۔ وہ مجھے پسند کرتا ہے، ابھی جان سے چاہتا ہے ضرور میری مدد کرے گا۔ میں نے سوچا کہ موقع نکال کر تنہائی میں اس بوڑھے آدمی سے ملوں گی اور ہمت کر کے اسے سب کچھ بتا دوں گی۔ کہ میں اور ڈاکٹر کامران مل کر کس طرح اسے فریب دے رہے ہیں۔ فریب کا پردہ چاک کرتے ہوئے رو کر اسے بتاؤں گی کہ میں اس کے فریبی اور دھوکے باز بیٹے سے شدید محبت کرتی ہوں اور یہ سب جو کر رہی ہوں وہ اس کی محبت سے مجبور ہو کر کر رہی ہوں۔ بوڑھے آدمی کا دل یقیناً پسیجے گا اور وہ میرے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھے گا۔ پھر ہم دونوں مل کر کوئی ایسی ترکیب کریں گے کہ ڈاکٹر کامران کو مجھ سے شادی کرتے ہی بن پڑے گی۔

مجھے پورا یقین تھا کہ اعترافِ حقیقت اور اظہارِ ندامت پر یقیناً وہ بوڑھا آدمی مجھ سے متاثر ہوگا اور میری مدد پر کمربستہ ہو جائے گا۔ مگر اس کے ساتھ ہی ایک خدشہ بھی تھا جو کہ بار بار میرے ذہن میں ڈنک مار رہا تھا۔ ایسا نہ ہو کہ حقیقتِ حال کھلنے کے بعد وہ بوڑھا آدمی مشتعل ہو جائے، اسے سخت صدمہ پہنچے اور وہ کچھ کہے سنے بغیر فی الفور یہاں سے لندن روانہ ہو جائے۔ اس صورت میں میں ڈاکٹر کامران کے قہر و غضب کا نشانہ بنتی اور اس سے بالکل ہی ہاتھ دھو بیٹھتی۔

میں غور کرنے لگی کہ آخر ڈاکٹر کامران کے ذہن میں میرے لئے کیا ہے۔ اس کی نگاہ میں میری کیا حیثیت ہے۔ اس نے مجھے بیوی بنانا پسند نہیں کیا تھا بلکہ فرضی بیوی کی حیثیت سے وقتی طور پر قبول کیا تھا۔ پھر اس کا وہ وقتی لگاؤ، لمحاتی جذباتیت وہ کیا چیزیں تھیں، کیا میں ان تمام جذبوں کو اظہارِ تشکر کے کھاتے میں ڈال دوں۔ کیا وہ سب محض شکریے کی چیزیں تھیں کیا ان تمام باتوں میں مصلحتیں کارفرما تھیں۔ میں نے سوچا تو میرا دل کٹنے لگا۔ کیا اتنا ظالم تھا وہ شخص کہ اپنے کسی مقصد براری کے لئے ایک لڑکی کے خلوص اور جذبات سے کھیل رہا تھا۔ نہیں اب میں اسے کسی طور نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ آخر تک کوشش کئے جاؤں گی۔ تمام ذلتیں اور رسوائیاں گوارا کر کے کامران کو اپنے حصار سے باہر نہ نکلنے دوں گی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ صبح ہی ڈاکٹر کامران کے باپ سے جا کر ضرور ملوں گی، پھر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ ڈاکٹر کامران کا باپ ناراض ہو کر لندن لوٹ گیا تو خود ڈاکٹر کامران تو یہاں موجود رہے گا۔ ایک ہی جگہ رہ کر بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔ فاصلے سمیٹے جا سکتے ہیں، دشمنی کو دوستی کی شکل دی جا سکتی ہے، وصال نہ سہی جلوہ دیکھ کر جیا تو جا سکتا ہے۔

رات کم خوابی کے باوجود صبح جلد اٹھ کر بیٹھ گئی۔ لڑکیاں کچھ جا چکی تھیں کچھ ناشتے کی میز پر موجود تھیں۔ ضروریات سے فارغ ہوئی، جلدی جلدی ناشتہ کیا، پھر لباس تبدیل کر کے باہر نکل آئی، دس بجے تھے۔ ساڑھے دس بجے تک ڈاکٹر کے باپ کے پاس پہنچ جانا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق ساڑھے گیارہ بجے سے پہلے ڈاکٹر کامران کا وہاں پہنچنا ممکن نہیں تھا اور یہ ایک گھنٹہ اس کے باپ سے گفت و شنید کے لئے کافی تھا پھر اس کے بعد ڈاکٹر کامران وہاں پہنچ جاتا تو کوئی حرج نہیں تھا۔

میں نے ٹیکسی لی اور ڈرائیور کو مطلوبہ ہوٹل کا پتہ بتانے کے بعد سوچ میں ڈوب گئی۔ رہ رہ کر میری نظروں کے سامنے ڈاکٹر کامران کا چہرہ آ رہا تھا۔ ڈاکٹر کامران جو کہ عورتوں کے بارے میں کچھ اچھی رائے نہیں رکھتا تھا، جو عورتوں کو دغاباز اور فریبی سمجھتا تھا، جو عورتوں کو شیطان کی خالہ کہا کرتا تھا اور راز داری کی اہل نہیں سمجھتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ عورتیں اس قدر پیچیدہ اور پراسرار ہوتی ہیں کہ خدا ان کا خالق خود نہیں سمجھ سکا کہ وہ کیا ہیں اور کیا نہیں ——— جانے کیوں میں خود کو چور سی محسوس کرنے لگی۔ میں چوری ہی تو کرنے جا رہی تھی۔ ڈاکٹر کامران کی لاعلمی میں اس کے خلاف جا رہی تھی۔ اسے بے خبر رکھ کر اس کے منصوبے کو چوپٹ کرنے جا رہی تھی۔

ہوٹل کے سامنے ٹیکسی سے اتری تو دل بری طرح دھڑک رہا تھا، سخت پیاس لگ رہی تھی اور قدم لڑکھڑا سے جا رہے تھے۔ کسی نہ کسی طرح مطلوبہ کمرے کے سامنے پہنچی اور رک کر سانس درست کرنے لگی۔ عجیب طرح کا خوف سوار تھا اور جسم آہستہ آہستہ کانپ رہا تھا۔ میں نے خشک لبوں پر زبان

ری اور ہاتھ بڑھا کر دروازے پر دستک دی۔
اگلے لمحے اندر سے ایک بوڑھی آواز سنائی دی "آجاؤ"
میں نے دروازے کا لاک گھمایا اور پٹ کھول کر اندر داخل
ہی۔ اندر داخل ہونے کے بعد سامنے نظر ڈالی تو یک لخت میرا
ل اچھل کر حلق میں آگیا۔ آنکھوں میں اندھیرا سا چھا گئی اور یوں
سوس ہوا جیسے چکرا کر فرش پر گر جاؤں گی۔ میں نے سہارے کے
ئے دیوار کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ میں نے جو کچھ دیکھا تھا اس پر یقین
ہیں آرہا تھا۔ میں نے دوبارہ آنکھیں کھول کر سامنے دیکھا۔ نہیں
یہ میرا تصور نہیں تھا۔ میں جو کچھ دیکھ رہی تھی وہ اپنی جگہ ایک
حقیقت تھی ——— ڈاکٹر کامران اپنے باپ کے قریب بیٹھا ہوا
مسکراتی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر اس قدر
بھرپور سکون تھا کہ مجھے حیرت کا دوسرا جھٹکا لگا۔ اس کی نگاہوں
میں نہ غصہ تھا نہ ناراضگی نہ ملامت۔ اس کے برعکس اس کی نگاہوں
میں کچھ ایسی کیفیت تھی جیسے کہ وہ میری آمد کا منتظر ہی تھا اور اس
کے اس سکون اور اطمینان نے مجھے مار کر رکھ دیا۔

اس کا باپ مجھے دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اٹھا اور بڑی
تیزی سے میرے قریب آیا۔ اس نے کچھ کہا بھی جسے میں گھبراہٹ
اور خوف کے باعث سن نہ سکی۔ وہ چند لمحے مجھے غور سے دیکھتا رہا
پھر میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے قدرے تعجب سے بولا "کیا بات ہے
بیٹا تم بہت گھبرائی ہوئی نظر آرہی ہو؟"

ڈاکٹر کامران اپنی جگہ سے اٹھا اور ہمارے قریب آتے
ہوئے اپنے باپ سے معنی خیز لہجے میں بولا "میں بتاتا ہوں کہ یہ
اس قدر گھبرائی ہوئی کیوں ہیں، دراصل انہیں امید نہیں تھی کہ میں
یہاں موجود ہوں گا۔ جب میں گھر سے چلا تھا تو میں نے کہا تھا کہ
کالج جا رہا ہوں اب یہ اتفاق ہے کہ میں کالج کی بجائے ادھر چلا آیا
پروگرام کے مطابق مجھے دوپہر کو یہاں آنا چاہئے تھا۔" پھر وہ میری
طرف مڑا اور شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا "تم ابا سے اتنی محبت
کرنے لگی ہو کہ مجھے حسد ہونے لگا ہے۔" اس نے شگفتہ لہجے میں کہا
مگر میں اس شگفتہ لہجے میں بھی طنز کی کاٹ کو محسوس کئے بغیر نہ رہ سکی۔

ڈاکٹر کامران کی بات پر اس کا باپ مسکرا دیا تھا۔ اس نے
میرا ہاتھ پکڑا اور ساتھ لئے ہوئے صوفے پر آکر بیٹھ گیا۔ میں نے
دیکھا کہ ڈاکٹر کامران بدستور اپنی جگہ کھڑا ہوا تھا اور بڑی چبھتی ہوئی
نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ

تھی۔ میں نے شرمندگی سے نظریں جھکا لیں اور اس کے باپ کو مخاطب
کر کے مری ہوئی آواز میں بولی "اس وقت مجھے گھر پر ہونا چاہئے تھا
غلطی ہی کی جو چلی آئی۔"

"اس وقت تم نے جو کیا اس سے بہتر کوئی اور کام نہ ہو سکتا
تھا۔ جب تک میں یہاں ہوں زیادہ وقت میرے ساتھ گزارو جب
میں لندن چلا جاؤں تو بھلے ہی گھر میں قید ہو جانا۔" وہ اپنے بیٹے
کی طرف مڑا اور خفگی کے عالم میں بولا "میری سمجھ میں نہیں آرہا
کہ تم شازی کو کونسا امتحان دلوا رہے ہو کیا وہ امتحان اتنا ہی اہم
ہے کہ وہ میرے لئے تھوڑا سا وقت بھی نہ نکال سکے۔ کیا میں ہزاروں
میل دور سے صرف تم سے گپیں لڑانے کے لئے آیا ہوں؟" وہ
بولا پھر کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر افسردگی کے ساتھ دوبارہ کہنے لگا۔
"بتانا نہیں چاہتا تھا مگر بتا رہا ہوں کہ رات مجھے سانس کی سخت
تکلیف ہو گئی تھی، یوں محسوس ہو رہا تھا کہ کسی بھی لمحے دم گھٹ جائے گا
اب شاید مجھے اپنے پروگرام سے پہلے واپس جانا پڑے، اس
لئے سنگدل نہ بنو۔ اس قدر اصول پرستی بھی ٹھیک نہیں۔ میرے پاس
وقت کم ہے اور جو چند گھڑیاں رہ گئی ہیں ان میں مجھے اپنی بہو سے
جی بھر کر باتیں کر لینے دو۔" بولتے بولتے اس کی آنکھیں نم ہو گئیں اور آواز بھرا گئی۔
میرے سر پر ہاتھ پھیرتا ہوا بولا "اسے جی بھر کر اپنے بیمار اور کمزور
خسر کو دیکھ لینے دو، پھر کیا پتہ آئندہ اسے تابوت میں بند میری بوڑھی
لاش کا ہی دیدار کرنا پڑے۔"

"ایسی باتیں نہ کیجئے۔" میں بے اختیار اس بوڑھے آدمی
سے لپٹ گئی اور میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے
میں اس سے لپٹی تو یوں محسوس ہوا جیسے عہد طفولیت میں اپنے
باپ کی شفیق آغوش میں آگئی ہوں۔ بوڑھا اپنی لرزتی اور کانپتی
انگلیوں سے بڑی نرمی اور محبت کے ساتھ میرے سر کو سہلانے
لگا۔ میں نے کنکھیوں سے ڈاکٹر کامران کی طرف دیکھا وہ طنز آلود
نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ آگے بڑھا اور باپ
کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا "ابا آپ ملول نہ ہوں صرف
دو تین دن کی بات ہے پھر شازی کو فرصت ہی فرصت ہے۔
ویسے یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ رات کا کھانا ہم گھر پر ہی کھائیں
گے۔ جی بھر کر شازی سے باتیں کر لیجئے گا۔" پھر وہ میری طرف مڑا
اور پیشانی پر شکن ڈالتا ہوا بولا "ہاں اب تم کہو یہاں کس لئے
آئی تھیں؟"

میں اپنی جگہ لرز کر رہ گئی۔ ڈاکٹر کامران نے یقیناً بھانپ لیا تھا کہ میں کیا ارادہ لے کر یہاں آئی تھی۔ وہ غضب کا آدمی تھا۔ دوسروں کے خیالات پڑھنے اور مافی الضمیر سے آگاہی حاصل کرنے میں اسے مہارت تھی۔ میں اس سے نظریں ملاتے ہوئے گھبرا رہی تھی، سر ڈالتے ہوئے بولی۔ "بس یونہی چلی آئی تھی۔" اور اس کے ساتھ ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

بوڑھے آدمی نے ہاتھ پکڑ کر مجھے دوبارہ بٹھا دیا۔ "بیٹھو چائے پی کر جانا۔" پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ "بیٹی اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ تم شوہر کی ہر بات کو آیت سمجھ کر حرف بحرف عمل کرو۔ ہر شخص کا زندگی گزارنے کا، اپنا ایک ڈھب ہوتا ہے۔ شخصی آزادی کو کہیں بھی قربان نہیں کرنا چاہیے۔"

ڈاکٹر کامران کے تیور بگڑ گئے اور آنکھوں میں سختی عود کر آئی۔ مضبوط لہجے میں بولا۔ "اگر بیوی شوہر کی بات کان دھر کر نہ سنے تو میں ایسی ازدواجی زندگی پر فاتحہ پڑھ لینا ضروری سمجھتا ہوں۔ مجھے خوف ہے کہ آپ چند دنوں میں شازی کو میرے قابو سے باہر کر دیں گے۔"

اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر ایک جھٹکے سے کھڑا کیا اور دروازے کی طرف دھکا دیتے ہوئے بولا۔ "جاؤ گھر جاؤ۔ کتابوں سے دل لگانے کی کوشش کرو پھر سہ پہر کو رات کے کھانے کی تیاری شروع کر دو۔"

ڈاکٹر کامران کا باپ اسپرنگ کی مانند اپنی جگہ سے اچھلا اور بیٹے پر برستا ہوا بولا۔ "کامی میں سمجھ نہیں سکا کہ تم کس قسم کے آدمی ہو، تمہاری سرشت میں یہ کمینگی کب سے آ گئی ہے۔"

ڈاکٹر کامران نے کوئی جواب نہ دیا۔ شعلہ بار نظروں سے مجھے گھورتا رہا۔ میں دروازے کے قریب رکی اور مڑتے ہوئے اس کے باپ سے روہانسی آواز میں بولی۔ "رات کو کھانے پر آپ کا انتظار کروں گی۔"

میں کمرے سے باہر نکل آئی، ڈاکٹر کامران بھی میرے ساتھ ساتھ زینے تک آیا۔ میں نے سوچا شاید وہ کچھ کہے گا۔ اپنے نامناسب رویے کے لئے معذرت چاہے گا۔ میری انا مجروح ہوئی تھی، مجھے شدید دکھ پہنچا تھا، اس کے باپ کے سامنے تذلیل ہوئی تھی، لہٰذا وہ اس کی تلافی کرے گا۔ خوبصورت اور نرم جملوں سے میرا دل موہ لے گا۔ میری زخمی انا کو تسکین ملے گا اور اپنے تیز و تند الفاظ سے جو زخم مجھے لگایا تھا اُس پر محبت بھرے الفاظ کے پھاہے رکھے گا۔ مگر ایسی کوئی نہ ہوئی۔ وہ طنزیہ انداز میں مسکراتا رہا اور اس کی آنکھوں سے تمسخر جھلکتا رہا۔ میرا دل کٹ کر رہ گیا۔ کتنا ظالم تھا یہ انسان۔ اس کے لئے کیا کر رہی تھی اور یہ میرے لئے کیا کر رہا تھا۔ کوئی بیوی بھی یہ رویہ، یہ سلوک برداشت نہیں کر سکتی تھی، اور میں، اس کی بیوی بھی نہیں تھی، مگر اس کے باوجود میں نے بیوی سے بڑھ کر ظرف کا ثبوت دیا تھا۔ اگر وہ ذرا سی میری خوشامد کر لیتا یا یہی احساس دلا دیتا کہ اس نے جو کچھ کیا اس پر پشیمان اور شرمندہ ہے تو میرا مان رہ جاتا۔ دل بڑھ جاتا، میں اپنی ذلت اور اہانت کو بھول جاتی۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا تھا بلکہ الٹا طنزیہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے حقارت اور تمسخر جھلک رہا تھا۔

میرا جی رونے کو چاہ رہا تھا مگر اس کے سامنے رونے کی ہمت نہ کر سکی۔ اس ظالم پر میرے رونے کا کیا اثر ہوتا اور زیادہ مضحکہ اڑاتا۔ شدید رنج کے عالم میں بولی۔ "میرا صرف اتنا قصور ہے نا کہ تمہارے باپ کو دیکھنے چلی آئی اور تم اس پر اس قدر ناراض ہوئے کہ میں خود کو بیمار سی محسوس کرنے لگی ہوں۔"

میں نے سوچا کہ شاید اب وہ کچھ کہے گا۔ کوئی میٹھا سا لفظ یا کوئی مہربان اور محبت بھری مسکراہٹ، جس سے میرا زخم مندمل ہو جائے گا۔ میں پورے وقار کے ساتھ دوبارہ اپنے قدموں پر کھڑی ہو جاؤں گی۔ مگر وہ خاموش رہا۔ اس کی تیز و تند نظریں مجھ پر آگ برساتی رہیں۔ پھر اس کے لب ہلے اور اس نے سخت لہجے میں کہا۔ "دو بجے، ٹھیک دو بجے میں گھر پر تمہارا انتظار کروں گا۔" اور اس کے ساتھ ہی وہ پلٹ کر کمرے کی طرف چل دیا۔

میرا دل بجھ گیا۔ میں تھکے تھکے قدموں سے زینہ اترنے لگی۔ آخر یہ ڈاکٹر کامران کس قسم کا آدمی تھا۔ میں اسے کبھی سمجھ بھی سکوں گی یا سمجھنے کا ارمان لئے ہوئے موت کی آغوش میں جا سوؤں گی۔ یہ صبح صبح اپنے باپ کے پاس کیسے آ گیا تھا۔ کیا اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ میں اس کے باپ سے ملنے آؤں گی۔ کیا اس کی روح انسان کی روح ہے، یا اس کے قالب میں کوئی دوسری روح کارفرما ہے۔ اس نے مجھے چائے پینے کی

حلت بھی نہ دی اور مجھے وہاں سے روانہ کر دیا۔ پھر اس کے بچنے کا انداز کس قدر جارحانہ تھا۔ زہر ٹپک رہا تھا اس کی نگاہوں سے، اور وہ زہر بوند بوند کر کے میری روح پر جم گیا تھا۔

یہ شخص میری وفاداری پر کتنا یقین اور اطمینان رکھتا تھا اسے پختہ یقین تھا کہ میں کبھی بھی اس کے بتائے ہوئے راستے سے انحراف نہ کر سکوں گی۔ وہ جو کہے گا میں آنکھ بند کر کے اس پر عمل کروں گی۔ ایک معجزہ کی مانند اس کے اشاروں پر چلتی رہوں گی۔ اس کی نگاہ بہت گہری ہے۔ وہ میرے دل و دماغ کو پڑھ لیتا ہے اور امتحان لیتا ہے کہ میں کب کیا کرنے والی ہوں کیا اُسے ماورائی اور پراسرار قوتیں حاصل ہیں۔ کیا وہ کوئی ساحر ہے۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس کے آگے میری حیثیت ایک کٹھ پتلی سے زیادہ نہیں ہے۔ وہ جس طرح چاہتا ہے مجھے نچاتا ہے۔ میں ڈاکٹر کامران کی بیوی کا کردار ادا کر رہی تھی مگر معلوم ہوا کہ میں سرے سے کوئی کردار ادا نہیں کر رہی تھی، میرا کوئی وجود نہیں تھا۔ میرا کوئی کردار نہیں تھا، میں فعال نہیں تھی، ساکت اور جامد تھی، مٹی کا ڈھیر، چپ چاپ، خاموش، اصل کردار، تو ڈاکٹر کامران اور اس کا باپ تھے جو خوامخواہ مجھے نچا رہے تھے۔

تاہم مجھے ڈاکٹر کامران کے باپ سے ہمدردی تھی۔ میری طرح وہ بھی تاریکی میں تھا۔ ڈاکٹر کامران کے ارادوں کی ہم دونوں کو خبر نہیں تھی۔ بس فرق یہ تھا کہ اس کا باپ نادانستگی میں اس کے ہاتھوں میں کھیل رہا تھا اور میں جان بوجھ کر۔ اپنی چتا میں نے خود اپنے ہاتھوں تیار کی تھی، اور جب کوئی خود جل مرنا چاہے تو اس کا کیا علاج۔

زبیدہ کے گھر میں داخل ہوتے ہی لڑکیوں نے اطلاع دی کہ پروین کا ساطرین گیا ہے اور وہ آج دوپہر کو کھانا ہما کے منگیتر کے ساتھ کھائے گی۔

"پروین نے بہت جلد کامیابی حاصل کر لی۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ابھی کچھ دیر پہلے اس نے فون کیا تھا اور بتایا تھا کہ ہما کے منگیتر نے خود درخواست کی ہے کہ وہ دوپہر کا کھانا اس کے ساتھ کھائے۔" شیریں نے کہا۔

میں نے ہما کی طرف دیکھا۔ کل کے مقابلے میں آج وہ بہتر نظر آ رہی تھی۔ میری غیر موجودگی میں شاید وہ نہائی دھوئی تھی اور کچھ آرائش بھی کی تھی۔ اب اس کے چہرے پر وہ پہلے جیسی پژمردگی نہیں تھی اور وہ گفتگو میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھی میں نے غور سے اس کے چہرے کا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ نچلا ہونٹ ابھی تک کچھ متورم ہے۔ البتہ ہونٹ کا یہ ورم اس کی دلکشی میں اضافہ کر رہا ہے۔ زخمی ہو کر ہما اور خوبصورت نظر آنے لگی تھی۔ وہ پروین اور اپنے منگیتر کے بارے میں کم اور ڈاکٹر کامران کے بارے میں زیادہ گفتگو کر رہی تھی۔

ڈاکٹر کامران کا ذکر چھڑا تو مجھے اچانک احساس ہوا کہ وقت بڑی تیزی سے سرک رہا ہے، کچھ دیر بعد دو بج جائیں گے اور مجھے اس وقت ڈاکٹر کامران کے گھر پہ ہونا چاہیئے۔ میری ہی تحریک پر دوپہر کے کھانے کے لئے دسترخوان لگایا گیا اور میں ہی سب سے پہلے کھانے سے فارغ ہوئی۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد میں روانگی کی تیاریوں میں مصروف ہو گئی۔ ہر چند کہ میں ڈاکٹر کامران کے صبح کے رویئے سے دل برداشتہ تھی اور چاہتی تھی کہ یہیں بیٹھی رہوں بھاڑ میں جائے اس کے گھر پہنچ جاؤں اور جو کچھ برا بھلا پکا تا آتا ہے پکا کر اس کے سامنے رکھ دوں۔ مگر اس کے باپ کا خیال مانع تھا۔ وہ مہمان تھا اور اس کی خاطر یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ چنانچہ میں نے اس کی ہدایت کے بموجب اس کا لایا ہوا ایک خوبصورت لباس زیب تن کیا، ہلکا پھلکا میک اپ کیا اور گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔ چلتے وقت ایک بار پھر زبیدہ کو ڈاکٹر کامران کے گھر کا پتہ بتایا اور تاکید کی کہ ٹھیک تین بجے تایا کے ساتھ وہاں پہنچ جائے۔

میں اور ڈاکٹر کامران تقریباً ایک ہی وقت اس کے مکان پر پہنچے۔ کوئی فرق تھا تو صرف اتنا کہ وہ چابی سے قفل کھول رہا تھا اور میں ٹیکسی سے اتر رہی تھی، ٹیکسی کی آواز سن کر وہ مڑا اور مجھ پر نظر پڑتے ہی تیزی سے پلٹ آیا۔ ٹیکسی کا کرایہ ادا کیا اور بڑی شائستگی سے بازو پکڑ کے مجھے ٹیکسی سے اتارا۔ اس کا رویہ اتنا نرم اور دل موہ لینے والا تھا کہ مجھے شدید حیرت ہوئی میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا، وہاں ایسی کوئی بات نہ تھی جس سے اندازہ ہوتا کہ وہ صبح مجھ پر کس بے رحمی سے برس چکا ہے۔ اس نے بڑے تپاک اور گرمجوشی سے میرا استقبال کیا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں بڑی ریاضت کے بعد اس کے ہاتھ لگی ہوں اور وہ مجھے کبھی خود سے جدا نہ ہونے دیگا۔

وہ میرا ہاتھ پکڑے ہوئے اندر لے گیا۔ میرے اندر پھر ایک امید جاگی کہ شاید وہ صبح کے ناخوشگوار واقعے کا ذکر کرے گا اور اپنے نامناسب اور جارحانہ رویے کی معافی مانگے گا مگر ایسا نہ ہوا۔ اس نے شاید وہ بات اپنے ذہن سے ہی نکال دی تھی۔ وہ مجھے لئے ہوئے سیدھا باورچی خانے میں پہنچا۔ کھانا پکانے کے تمام لوازمات اور اشیاء دکھائیں اور کچھ ضروری ہدایات دیں۔ پھر اس کے بعد کمرۂ نشست میں لے آیا۔ صوفے پر بٹھانے کے بعد چند لمحوں تک مجھے غور سے دیکھتا رہا پھر سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”بہت تھکا ہوا ہوں۔ کیا خیال ہے کالج جانے سے پہلے کچھ دیر آرام نہ کر لوں۔“

میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ یہاں رہے۔ اس کے برعکس چاہتی تھی کہ فی الفور روانہ ہو جائے تاکہ میں انتظامات شروع کر دوں اور جب زبیدہ اور آیا آئیں تو فوراً کام میں جٹ جائیں۔ پھر ڈاکٹر کامران کے رک جانے میں ایک خطرہ اور بھی تھا۔ فرض کیا آرام کرتے ہوئے اس کی آنکھ لگ گئی اور اس اثناء میں زبیدہ اور آیا پہنچ جائیں تو پھر اس صورت میں سارا معاملہ چوپٹ ہو جائیگا چنانچہ میں چاہتی تھی کہ وہ فوراً چلا جائے۔ اسے مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ ”میرا خیال ہے کہ اگر آپ ٹھہر گئے تو دیر ہو جائیگی پھر آپ تھکے ہوئے بھی ہیں ممکن ہے آنکھ لگ جائے۔ آپ کے سو جانے پر مجھے اعتراض تو کوئی نہیں مگر کام کروں گی تو آواز ہوگی ممکن ہے اس سے آپ کی نیند اچاٹ ہو۔“

”تم بہت سمجھدار ہو۔“ وہ میری ٹھوڑی پکڑ کر مسکراتے ہوئے بولا۔ ”عورت سمجھدار نہ ہو تو دو کوڑی کی بھی نہیں ہوتی۔“

”عورت سمجھدار ہو یا ناسمجھ اسے ہر حال میں اپنے عورت ہونے کی سزا بھگتنی پڑتی ہے۔“ میں نے معنی خیز لہجے میں کہا اور اس کا ہاتھ ایک طرف ہٹا دیا۔

ڈاکٹر کامران نے میری اس حرکت کا برا نہیں مانا دلچسپی اور توجہ سے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر اٹھتا ہوا بولا۔ ”اچھا اب میں چلوں گا۔“ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر چابی کا گچھا نکالا اور میری طرف بڑھاتا ہوا بولا۔ ”ہم لوگوں کی واپسی میں خاصی دیر ہے، تم گھر پر ہو، شاید اس کی ضرورت پیش آ جائے۔“

میں نے ہاتھ بڑھا کر چابی کا گچھا لے لیا۔

ڈاکٹر کامران رخصت ہوا تو ڈھائی بج رہے تھے۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے زبیدہ کو تین کا وقت کیوں دیا۔ اگر وہ اور آیا آدھ گھنٹہ پہلے آ جاتیں تو اچھا تھا۔ ڈاکٹر کامران کے گھر میں ٹیلیفون بھی نہیں تھا جو زبیدہ کو فوراً چل پڑنے کے لئے کہہ دیتی۔ آدھ گھنٹہ بیکار جا رہا تھا اور مجھے اس کا افسوس تھا۔ آدھ گھنٹہ گزارنا اپنی جگہ ایک مسئلہ تھا۔ میں نے سوچا یہ آدھ گھنٹہ کس طرح گزارا جائے۔ کچھ نہ سمجھ میں آیا تو خوابگاہ میں جا لیٹ گئی۔ مگر اس میں بھی خاک لطف نہ آیا۔ اٹھی اور آئینے کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی اور مختلف زاویوں سے اپنا جائزہ لینے لگی۔ آئینے کے سامنے کچھ وقت گزارنے کے بعد خوابگاہ سے نکلی اور باورچی خانے میں جا کر کھانا پکانے کی اشیاء کا جائزہ لینے لگی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ڈاکٹر کامران کھانا گھر پر کھاتا تھا یا باہر۔ اور اگر گھر پر کھاتا تھا تو اس کا کھانا کون تیار کرتا تھا۔ جہاں تک میرا خیال تھا وہ کھانا باہر ہی کھاتا تھا کیونکہ اپنا کھانا تیار کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس نے خود ہی بتایا تھا کہ صبح کے وقت ایک ملازمہ آتی تھی اور گھر کی صفائی کر کے چلی جاتی تھی۔ باورچی خانے کے آثار سے بھی پتہ نہ چلتا تھا کہ یہاں کھانا پکتا ہوگا۔ ہر چیز صاف ستھری اور چمکتی دمکتی تھی۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ یہاں کبھی کھانا نہیں پکایا گیا۔ پتیلیاں اور دیگچیاں تھیں، مگر ان کی قسمت میں کسی نسوانی ہاتھ کا لمس نہیں لکھا گیا تھا، چولھے تھے، مگر گرم ہونے کو ترس رہے تھے۔

ایک لمحے کو مجھے خود پر فخر اور غرور کا احساس ہوا یہ میں تھی جو آج اس گھر میں چولھا جلانے جا رہی تھی۔ کیا ہوا جو میں خود کھانا پکانے نہیں جا رہی تھی مگر یہ میرا دم قدم ہی تو تھا جس کی وجہ سے جانے کب کے سرد چولھے روشن ہونے والے تھے۔ کم از کم اس گھر میں کچھ دیر کے لئے تو گھر کا سا سماں ہوگا۔ اس لمحے مجھے پھر ایک کمی، ایک محرومی کا احساس ہوا، کاش میں ڈاکٹر کامران کی بیوی ہوتی۔

میں باورچی خانے ہی میں تھی کہ بیرونی دروازے پر گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی۔ جا کر دروازہ کھولا۔ زبیدہ سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس کے پیچھے آیا تھی جو بڑی خوش نظر آ رہی تھی۔ میں ان دونوں کو اندر لے آئی۔ زبیدہ نے پہلے باورچی خانہ اور وہاں موجود اشیاء کا جائزہ لیا۔ پھر آیا کو ایک تفصیلی ہدایت دے کر میرے ساتھ کمرۂ نشست میں آ گئی۔ ذرا دیر بیٹھ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی

اور میرے ساتھ پوٹ کر جائزہ لے ڈالا۔ اس نے ڈاکٹر کامران کے سلیقے کی تعریف کی۔ وہ دوبارہ پلٹ کر کھانے کے کمرے میں آئی اور میز سجانے لگی۔ اس کے احکامات کے مطابق میں اس کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد باورچی خانے میں مختلف آوازیں اور خوشبوئیں بلند ہونا شروع ہوگئیں۔ زبیدہ نے مسکراتے ہوئے کہا "آپا چھ بجے سے پہلے تمام کھانے تیار کر دے گی اور ہم ڈاکٹر کامران اور اس کے باپ کے آنے سے قبل یہاں سے رخصت ہو جائیں گے۔"

"تم آپا کو کیا کہہ کر یہاں لائی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے اسے بتایا ہے کہ یہاں تمہارے منگیتر کی دعوت ہے اور یہ ہم سب کی عزت کا معاملہ ہے۔" زبیدہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اب وہ کھانا پکانے میں اپنی بہترین صلاحیت بروئے کار لائے گی۔"

زبیدہ نے درست کہا تھا ابھی پونے چھ ہی ہوتے تھے کہ آپا نے سارے کھانے پکا کر رکھ دیئے۔ کھانے میں بڑا تنوع اور رنگا رنگی تھی۔ کئی قسم کے پلاؤ تھے، سالن کی کئی اقسام تھیں۔ شاہی ٹکڑے بڑے سلیقے سے تیار کئے گئے تھے۔ کباب بھی کئی قسم کے تھے۔ پورے گھر میں عمدہ قسم کی خوشبوئیں اڑتی پھر رہی تھیں۔ گرم مصالحوں کی اپنی مخصوص خوشبو اشتہا کو بڑھائے دے رہی تھی۔ واقعی آپا نے بڑا کام کیا تھا اور یہ سب میرے منگیتر کے لئے کیا تھا۔ کاش ڈاکٹر کامران میرا منگیتر ہوتا۔

آپا باورچی خانے سے نکلی تو پسینے میں نہائی ہوئی تھی۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھ کر دوپٹے سے چہرہ صاف کرنے لگی۔ میں نے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھ اس کے گلے میں ڈال دیئے اور پیشانی چومتی ہوئی بولی۔ "پیاری آپا تم نے بڑا کام کیا ہے۔ میں تمہیں کوئی اچھا سا تحفہ دوں گی۔"

"تمہارا منگیتر انگلیاں چاٹتا رہ جائے گا۔ گڑیا اب تم کھانا پکانا سیکھو۔ عورت بہترین کھانا پکانا جانتی ہو تو اس کا شوہر ہمیشہ اس کے قابو میں رہتا ہے۔" آپا نے مجھے سمجھایا اور مجھے کسی کا مقولہ یاد آگیا کہ عورت چاہے تو پیٹ کے راستے مرد کے دل پر قبضہ کر سکتی ہے، میں نے سر ہلاتے ہوئے آپا سے کہا۔ "میں نے سوچا ہے کہ ہفتے میں کم از کم دو دن تمہارے ساتھ باورچی خانے میں ضرور گزاروں گی۔"

آپا خاموشی سے چہرے پر دوپٹہ جھلنے لگی۔

کھانا تیار ہو چکا تھا۔ زبیدہ اور آپا رخصت ہونے کی سوچ رہی تھیں۔ جانے سے پہلے زبیدہ نے ایک بار پھر گھر کی آرائش اور زیبائش کا جائزہ لیا۔ اس نے فرنیچر کی ترتیب میں تھوڑی سی تبدیلی کی تھی۔ آتے وقت کچھ سرخ پھول لیتی آئی تھی جسے اس نے ایک گلدان میں سجا کر کھانے کی میز پر رکھ دیا تھا۔ وہ آپا کی کارکردگی سے ہر طرح سے مطمئن تھی تاہم ایک بار باورچی خانے میں جا کر سرسری جائزہ لینا مناسب سمجھا۔ آپا نے ٹماٹر اور سلاد تیار کیا تھا۔ زبیدہ نے انہیں ایک خاص شکل دے کر پلیٹ میں چنا۔ ایسی چیزیں میں نے صرف رسالوں میں دیکھی تھیں مگر آج عملی طور پر دیکھ رہی تھی۔

بالآخر زبیدہ نے تمام انتظامات کو آخری شکل دے کر دیا۔

"اچھا گڑیا اب ہم چلتے ہیں۔" زبیدہ نے میری پیٹھ ٹھونکتے ہوئے مسکرا کر کہا مگر اگلے ہی لمحے اس کی مسکراہٹ بجھ گئی اور میں بے ساختہ اچھل پڑی ——— دروازے پر کسی نے گھنٹی بجائی تھی۔

میرے اور زبیدہ کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا اور آپا ہمیں بڑی حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ خدایا اب کیا ہوگا۔ ڈاکٹر اور اس کا باپ وقت سے پہلے آگئے تھے۔ زبیدہ اور آپا کو دیکھ کر وہ کیا سوچیں گے۔ حاضر الوقت کوئی بہانہ بنا کر ٹال دوں گی مگر بعد میں کیا ہوگا۔ ڈاکٹر کامران سوالات کر کے میرا بھیجا ادھیڑ دے گا۔ اس کی نگاہوں میں میری کوئی حیثیت نہ رہے گی۔ سارا اعتماد ختم ہو جائے گا۔ وہ ذہین اور شاطر آدمی فوراً سمجھ جائے گا کہ میں اس کے اور اپنے بارے میں ایک ایک بات اپنی سہیلیوں کو بتاتی رہی ہوں ——— میرا سر گھوم گیا۔ میں نے زبیدہ کی طرف دیکھا وہ نظروں ہی نظروں میں پوچھ رہی تھی کہ اب کیا کیا جائے۔

آپا نے مجھے ٹہوکا دیتے ہوئے کہا۔ "تمہارا منگیتر تو بہت جلد آگیا۔ کھانے کا کیا وقت رکھا تھا۔ وہ اکیلا ہے یا کوئی اور بھی ساتھ ہے؟"

میرے پاس آپا کو جواب دینے کا وقت نہیں تھا۔ ذہن بس یہی گردان کئے جا رہا تھا کہ کچھ کرو، کچھ کرو، اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کرتی گھنٹی دوبارہ بج اٹھی۔ اب سوچنے کے لئے بھی وقت نہیں رہا تھا۔ میں بوکھلاتے ہوئے زبیدہ سے بولی۔ "تم اور آپا جلدی سے باورچی خانے میں چلی جاؤ۔ میں انہیں لئے ہوئے سیدھے اسٹڈی میں چلی جاؤں گی۔ اس عرصے میں تم دونوں

پچھلے سے باہر چلی جاتا۔ قسمت نے یاوری کی تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

زبیدہ اندر آیا فوراً باورچی خانے میں چلی گئیں۔ میں بیرونی دروازے کی طرف بڑھی اور قریب جا کر پوچھا۔ "کون ؟"

مگر دوسری طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ خدایا یہ کون تھا۔ ڈاکٹر کامران کم از کم اپنے باپ کی موجودگی میں یہ آنکھ مچولی نہ کھیل سکتا تھا یا پھر شاید وہ تنہا ہی آیا ہو اور مجھے ستانے کی غرض سے شرارت کر رہا ہو۔ میں نے ایک بار پھر بلند آواز سے پوچھا کہ دروازے پر کون ہے۔ مگر جواب پھر ندارد۔

میں نے مزید کچھ پوچھے بغیر دروازہ کھول دیا۔ سامنے اور پھر دائیں بائیں نظریں دوڑائیں مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ دور تک کسی کا پتہ نہ تھا۔ پھر میری نظریں اپنے قدموں کے قریب فرش پر پڑیں اور میں خود کو بے ساختہ ہنسنے سے روک نہ سکی۔ میرے پاؤں کے قریب شام کا اخبار پڑا ہوا تھا، یا تو اخبار والے نے شرارت کی تھی یا یہ محسوس کر کے کہ اندر کوئی موجود ہے گھنٹی بجائی تھی تاکہ اخبار لے لیا جائے اور جب دوسری گھنٹی پر بھی کوئی دروازے پر نہ آیا تو وہ وہیں اخبار ڈال کر چلا گیا۔ شاید وہ روز ہی ایسا کرتا ہو۔ مگر اس وقت تو اس نے میری آدھی جان نکال لی تھی۔

میں اخبار اٹھا کر سیدھے باورچی خانے میں گئی۔ زبیدہ نے مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا اور میں نے جھلا کر اسے وہ 'دلدوز' واقعہ سنا دیا۔ زبیدہ کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے بولی۔ "کمبخت نے جان ہی نکال لی تھی۔ میرا اخبار والا ہوتا تو سو جوتے لگاتی۔"

"بشرطیکہ دسویں جوتے کے بعد تھک نہ جائیں۔" میں نے نسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

"اچھا اب باتیں نہ بناؤ اور یہ اخبار ہاتھ میں لئے کیوں رہی ہو۔ جاؤ جا کر اسے مطالعے کی میز پر رکھ آؤ۔ ورنہ ادھر ادھر ڈال دو گی اور اس سے بے سلیقہ ثابت ہو گی۔"

"یہی کروں گی بابا مگر اب تم چلتی پھرتی نظر آؤ۔ ایسا نہ ہو وہ واقعی میں آ پہنچیں اور بات بنائے نہ بنے۔" میں نے کے سامنے دانستہ ڈاکٹر کامران کا نام نہیں لیا۔

"کیوں بدحواس ہوئی جا رہی ہو۔ وہ سات بجے سے پہلے آنے کے تک ہی نہیں ہے۔" زبیدہ باورچی خانے سے باہر نکل آئی۔ آیا تھوڑے فاصلے پر تھی۔ میں نے زبیدہ کے ساتھ چلتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ "مصیبت کہہ کر نہیں آتی، کیا پتہ دروازے پر ٹکراؤ ہو جائے، تم ایسا کرو کہ آیا کی چادر لے کر اوڑھ لو۔ وہ لوگ آیا کو نہیں پہچانتے اس لئے اس کے دیکھ لئے جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ البتہ اگر تم پہچان لی گئیں تو قیامت آ جائے گی۔"

زبیدہ کو چادر اور برقعے کے ذکر سے وحشت ہوتی تھی۔ اُسے ان چیزوں سے اللہ واسطے کا بیر تھا۔ معنوی غصّے سے بولی۔ "چادر وادر تو میں ہرگز نہ اوڑھوں گی اور دیکھو اپنی بوکھلاہٹ سے مجھے نہ چکراؤ، کہہ چکی ہوں کہ ان کے آنے میں ابھی دیر ہے، ساڑھے چھ ہوتے ہیں اور وہ سات سے پہلے ہرگز نہ آئیں گے۔"

زبیدہ نے کہنے کو کہہ دیا مگر اس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ خود بھی مزید یہاں رکنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے مجھے کھینچ کر سینے سے لگایا۔ پیشانی کو چوما اور 'وش یو گڈ لک' کہتی ہوئی آیا کے ساتھ گھر سے باہر نکل گئی۔

ان کے جانے کے بعد میں نے دروازہ مضبوطی سے بند کیا اور پشت سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ کچھ دیر بعد زبیدہ کی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی پھر وہ آواز لمحہ بہ لمحہ دور ہوتی چلی گئی۔ میں نے اطمینان کی گہری اور طویل سانس لی پھر خود بخود مسکراتی اور گنگناتی ہوئی خوابگاہ کی طرف روانہ ہو گئی۔ میں ایک بار پھر آئینے کے سامنے کھڑی تھی اور بار بار جانچی اور پرکھی گئی۔ زیبائش کو ایک بار پھر تنقیدی نظروں سے دیکھنے لگی۔ اب مجھ سے انتظار نہیں ہو رہا تھا میں چاہتی تھی کہ ڈاکٹر کامران اور بڑے میاں جلد از جلد آئیں اور دیکھیں کہ میں نے "تن تنہا" کیا کارنامہ انجام دیا ہے۔ کتنی سلیقہ شعار اور سگھڑ ہوں۔ میں نے کتنی شاندار طریقے سے گھر کو سجایا ہے اور ان کے لئے کتنا عمدہ اور متنوع کھانا تیار کیا ہے اور صرف یہی نہیں اسی عرصے میں بازار بھی گئی ہوں اور شوخ پھول لا کر گلدان میں سجائے ہیں۔ شاید ڈاکٹر کامران سوچنے پر مجبور ہو جائے کہ شادی شدہ ہونا اتنی بُری بات نہیں ہے۔ آدمی تھکا ماندہ گھر آئے اور اسے گرما گرم اور لذیذ کھانا تیار ملے اور بیوی بھی خوب بنی سنوری ہوئی اس کی منتظر ہو تو اس سے بہتر اور پرکیف بات اور کیا ہو سکتی ہے۔

پھر لی سوئی سات پر پہنچی تو اس وقت انتظار کرتے کرتے میری بُری حالت ہو چکی تھی۔ کوئی معمولی سا کھٹکا بھی ہوتا تو میں چونک کر دروازے کی طرف دیکھنے لگتی تھی۔ میں نے خود کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "شہناز بیگم! اس قدر بے تابی اور بےقراری کس لئے۔ تمہارا ان سے کون سا رشتہ ہے، انہیں آنا ہے، وہ آئیں گے۔ ابھی نہیں تو کچھ دیر بعد آئیں گے مگر آئیں گے ضرور پھر تم کیوں انتظار کی کوفت اٹھا رہی ہو اور خود کو ہلکان کر رہی ہو"

وقت جیسے پہاڑ ہو گیا تھا، کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ میں نے آئینے پر آخری نظر ڈالی اور باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ میں ان ہدایات پر غور کرنے لگی جو آپا اور زبیدہ نے کھانے کے سلسلے میں دی تھیں۔ زبیدہ نے بتایا تھا کہ میں کب اور کس وقت کونسی ڈش میز پر پہنچاؤں اور آپا نے سمجھایا تھا کہ میں کس طرح کھانے کو آخر تک گرم رکھ سکتی ہوں۔ ان تمام باتوں کو ذہن میں دہراتے ہوئے گھڑی پر نظر ڈالی تو ساڑھے سات بج رہے تھے۔ پھر میں باورچی خانے سے نکلنے کی سوچ رہی تھی کہ باہر گھنٹی بڑے زور سے بجی، اور اس کے ساتھ ہی میرا دل بڑی طرح دھڑک اٹھا۔ میں کچن سے نکلی اور بیرونی دروازے کی طرف روانہ ہو گئی۔

مسکراتے ہوئے دروازہ کھولا تو سامنے ڈاکٹر کامران اور بڑے میاں کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے بڑے میاں کو سلام کیا انہوں نے مسکراتے ہوئے سر ہلا کر جواب دیا۔ میں انتہائی ادب اور احترام کے ساتھ انہیں لئے ہوئے اندر آ گئی۔ اندر داخل ہونے کے بعد بڑے میاں نے نتھنے سکیڑ کر زوردار سانس لی اور مسکراتے ہوئے بولے "واہ واہ کیا عمدہ خوشبو آ رہی ہے۔ میں اس کھانے کے لئے ایک مدت سے ترس رہا تھا"

میں نے کوئی جواب نہ دیا مسکرا کر رہ گئی۔ ڈاکٹر کامران نے گھوم پھر کر تمام کمروں کا جائزہ لیا۔ ایک ایک چیز کو غور سے دیکھا اور واپس میرے نزدیک آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی نظروں میں پسندیدگی کی جھلک تھی اور لبوں پر بڑی خوبصورت مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ وہ میری طرف مڑتا ہوا بولا "شہنازی تم نے خاصی محنت کر ڈالی۔ کیا یہ سب اکیلے کیا ہے؟"

میرا دل زور سے دھڑکا۔ کیا اس نے زبیدہ اور آپا کو یہاں سے نکلتے دیکھ لیا ہے پھر اپنے احمقانہ خیال پہ مجھے خود ہنسی آ گئی۔ زبیدہ اور آپا تو اس کے آنے سے کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ پہلے یہاں سے جا چکی تھیں۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ دل میں چور ہو تو طرح طرح کے خیال ستاتے ہیں۔ پھر اس کے علاوہ ڈاکٹر کامران کے لہجے میں ایسی کوئی بات بھی نہ تھی جو میری پریشانی کا سبب بنتی۔ میں نے شوخ لہجے میں کہا "نہیں کچھ جن اور پری مدد کو آ گئے تھے"

ڈاکٹر کامران کا باپ میرے جملے سے بہت محظوظ ہوا۔ ہنستے ہوئے بولا "بیٹی انسانی ہاتھ جو کام انجام دے سکتے ہیں وہ جن اور پری کے بس کا بھی نہیں" پھر وہ ڈاکٹر کامران کی طرف مڑا اور سنجیدگی سے بولا "کامی! تمہاری بیوی نہ صرف خوبصورت ہے بلکہ انتہائی خوش سلیقہ اور بزلہ سنج بھی ہے۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ گھرداری میں بھی طاق ہے۔ میں تو سوچ رہا ہوں کہ تم نے خوامخواہ آج اسے دعوت وغیرہ کی زحمت دی۔ اس کی پڑھائی کا حرج ہوا۔ کھانا کہیں باہر کھا لیتے تو اچھا تھا"

"نہیں ابا جان میرا کوئی حرج نہیں ہوا۔ یہ تو میری خوش نصیبی اور عزت افزائی ہے کہ آپ میرے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھائیں گے، کاش مجھے آپ کی خدمت کا کچھ اور موقع ملتا۔ میں تو سوچ سوچ کر اداس ہو جاتی ہوں کہ آپ اتنی جلدی واپس چلے جائیں گے"

بوڑھے کا چہرہ مسرت سے سرخ ہو گیا۔ کپکپاتی ہوئی آواز میں ڈاکٹر کامران کو مخاطب کر کے بولا "دیکھا کامی! میں نہ کہتا تھا کہ تمہاری بیوی بہت اعلیٰ صفات کی حامل ہے۔ ایسی بیویاں قسمت سے ملتی ہیں۔ مجھے تو اس میں تمہاری ماں کی جھلکیاں نظر آتی ہیں" اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

ڈاکٹر کامران نے باپ کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ مسکراتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔ غالباً دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ میں کتنی خوبصورتی سے اپنا کردار نبھا رہی تھی۔ میں اعلیٰ صفات کی حامل بیوی رہی ہوں یا نہ رہی ہوں اعلیٰ درجے کی اداکارہ ضرور تھی اور اپنی اس خوبی اور صلاحیت پر اس وقت خوشی نہیں افسوس ہو رہا تھا۔

کچھ دیر بعد بڑے میاں کی رضامندی پر میں نے میز پر کھانا چننا شروع کیا۔ کھانا شروع ہوا اور اس کے ساتھ بڑے میاں کی زبان چل پڑی، وہ میری تعریف میں رطب اللسان ہو گئے انہوں نے دل کھول کر میری اور میرے کھانے کی تعریف کی۔

ڈاکٹر کامران نے گویا چپ سادھ لی تھی۔ خاموشی سے لقمے لے رہا تھا اور کبھی کبھار نظر اٹھا کر میری طرف دیکھ لیتا تھا۔ وہ جن نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا اس کی تفسیر ذرا مشکل ہے میرے لئے یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ ان نگاہوں میں تشکر تھا یا اظہار محبت یا مصلحت کوشی۔ بہر حال کوئی جذبہ تھا جسے میں باقاعدہ کوئی نام نہ دے سکتی تھی۔

کھانا ختم ہوا اور میری تعریف پر ختم ہوا۔ بڑے میاں نے میری ستائش اور تحسین کا ایک باب کھول دیا تھا۔ جانے کیوں انہیں احساس ہو گیا تھا کہ ان کا بیٹا اپنی بیوی کی اتنی قدر نہیں کرتا جتنی کہ کرنی چاہیئے۔ وہ پیچھے جھاڑ کر ڈاکٹر کامران کے پیچھے پڑ گئے تھے اور ڈاکٹر کامران بجائے کچھ کہنے کے مسکراہٹ پر اکتفا کرتا رہا۔

کھانے کے بعد میں انہیں مطالعے کے کمرے میں لے گئی اور بڑے ادب سے پوچھا ”ایک پیالی چائے کیسی رہے گی؟“

بڑے میاں نے سر نفی میں ہلاتے ہوئے کہا۔ ”نہیں میں رات کو چائے یا کافی نہیں پیتا۔ پی لوں تو پھر نیند نہیں آتی۔“

سوا دس بجے کے قریب وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور ڈاکٹر کامران سے مخاطب ہو کر بولے ”کامی جلد مجھے چھوڑ آؤ۔ اب آرام کروں گا۔ رات کو زیادہ دیر نہیں جاگ سکتا۔“

میں نے بڑے میاں کا کوٹ ان کی طرف بڑھایا۔ کوٹ پہنتے ہوئے انہوں نے ایک بار پھر کھانے اور میرے سلیقے کی تعریف کی اور کہا کہ انہوں نے بڑا اچھا وقت گزارا ہے اور ایک عرصے بعد انہیں ایسی خوشی نصیب ہوئی ہے۔

وہ چلے گئے، ان کے جانے کے بعد میں نے جھوٹے برتن اٹھائے اور میز کو صاف کرنے لگی۔ میز صاف کرنے کے بعد خیال آیا کہ جھوٹے برتنوں کا کیا کیا جائے۔ خود ہی صاف کر لوں یا کل ملازمہ کے لئے چھوڑ دوں۔ مگر ڈاکٹر کامران کی واپسی تک وقت گزارنا بھی اپنی جگہ ایک مسئلہ تھا۔ سوچا کیا حرج ہے برتن دھو ہی ڈالوں۔ وقت بھی گزر جائے گا اور پھر میں نے کیا ہی کیا تھا۔ زبیدہ اور آپا نہ ہوتیں تو جانے کیا حشر ہوتا۔

میں نے پانی گرم کیا اور برتن دھونے بیٹھ گئی۔ دو تین تشتریاں دھوئی تھیں کہ باہر گھنٹی بجی، میں نے جا کر دروازہ کھولا۔ ڈاکٹر کامران واپس آ گیا تھا، اس نے میرے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ ہاتھ پانی میں بھیگے ہوئے تھے۔ اس نے بے جھجک مجھے اپنی طرف گھسیٹ لیا اور ٹھوڑی پکڑتے ہوئے بولا ”بیگم کرو خانم! آج تم نے بڑی زحمت اٹھائی ہے۔ مجھے امید نہیں تھی کہ تم اس قدر مہارت اور ذہانت کا ثبوت دو گی۔“ وہ چند لمحے میری آنکھوں میں دیکھتا رہا پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ ”اب تو مجھے بھی کچھ کچھ یقین ہو چلا ہے کہ تم بقول ابا جان ایک بھرپور اور مکمل ترین بیوی ہو، خوبصورت، خانہ دار اور مہربان۔“

”بقول ابا جان، یعنی خود آپ کا دل ان باتوں کی گواہی نہیں دیتا۔“ میں نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ میرا شاکی لہجہ اس سے چھپا نہ رہ سکا۔

وہ جھکا اور اس کے ہونٹ میرے بائیں رخسار پر جم گئے پھر اس کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی اور وہ سرک کر میرے لبوں میں پیوست ہو گئے۔ ایک عجیب قسم کی لذت اور حرارت میرے وجود میں منتقل ہونے لگی۔ سارے جسم میں ایک نشہ سا دوڑنے لگا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ میری گردن میں حمائل تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ میری پشت اور کمر سہلا رہا تھا۔ میں اس کے چوڑے فٹ وجود سے لپٹی کانپے جا رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں نے میرے لبوں کے درمیان جگہ بنائی اور میری زبان اس کے ہونٹوں کی گرفت میں آ گئی۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میری جان نکلی جا رہی ہے۔ میں اوپر ہی اوپر آسمان کی طرف اڑی جا رہی ہوں، میری آنکھیں بند ہو گئیں اور مدہوشی طاری ہونے لگی۔ اسی لمحے ڈاکٹر کامران نے مجھے خود سے الگ کیا اور سرگوشی میں بولا ”پتہ نہیں عورتیں مردوں سے کیا کیا توقعات رکھتی ہیں آخر وہ یہ کیوں چاہتی ہیں کوئی ہر وقت ان کی تعریف کرتا رہے۔“

مجھ پر اوس پڑ گئی۔ مارے خفت کے کچھ نہ کہہ سکی سارا نشہ ہی جاتا رہا تھا۔ وہ میرے کولہے پر ہاتھ مارتا ہوا بولا ”چلو تمہیں چھوڑ آؤں، بہت دیر ہو چکی ہے۔“

راستے بھر وہ خاموش رہا۔ میں نے سوچا تھا کہ وہ مجھ سے پوچھے گا کہ میں نے تن تنہا سارے انتظامات کس طرح کر لئے تھے۔ پھر کھانے کی تعریف کرے گا۔ مگر اس نے کچھ بھی تو نہ کہا رسمی طور پر بھی نہیں۔ مجھے یہ محسوس کرتے ہوئے بہت دکھ ہوا کہ وہ کس قدر خود پسند اور خود غرض آدمی ہے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ مجھے شاپنگ اور کراکری کی مانند کرائے پر لے

آیا تھا اور بطور معاوضہ چوم چاٹ کر واپس جا رہا تھا۔ مارے خجالت اور شرمندگی کے میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔

نسیمہ کے گھر سے کچھ فاصلے پر جب میں گاڑی سے اتری تو اس نے ایک بار پھر میرے رخسار کو چوما اور آہستگی سے بولا "تمام باتوں کے لئے تمہارا شکریہ۔"

بس یہ تھا میرا انعام۔

یہ تھا میرا صلہ۔

اُس نے اپنی دانست میں میرا حساب بے باک کر دیا تھا۔

اُس نے شکریے کے دو لفظ ادا کئے تھے اور مجھے فارغ کر دیا تھا۔

اُس کی گاڑی واپسی کے لئے مڑی اور ادھر میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔

لڑکیاں ابھی تک جاگ رہی تھیں اور کسی مباحثے میں مصروف تھیں۔ پروین ان کا ہدف تھی اور وہ تابڑ توڑ اس کے اور ہما کے منگیتر کے بارے میں سوالات کر رہی تھیں۔ پروین بڑی دلچسپی اور دلجمعی کے ساتھ ان کے جوابات دے رہی تھی، وہ اس وقت کی ہیروئن تھی۔ مگر جب میں ان کے درمیان پہنچی تو سوالات کا سیلاب میری سمت مڑ گیا اور میں ان کے نرغے میں پھنس گئی، مگر میں اس قدر دل شکستہ تھی کہ کسی "ڈاکٹر کامران" کے 'موضوع' پر کوئی گفتگو نہ کرنا چاہتی تھی۔ ٹالتے ہوئے بولی۔

"بخدا بہت تھکی ہوئی ہوں، پہلے مجھے پروین کا قصہ سن لینے دو۔" پھر پروین کی طرف مڑتے ہوئے بولی۔ "سناؤ پروین کیسا رہا، مردِ میدان رہیں یا ہار گئیں؟"

لڑکیاں بیک وقت چیخنے لگیں کہ وہ اب تک پروین کا قصہ کئی بار سن چکی ہیں اور اب ان میں مزید کچھ سننے کا یارا نہیں ہے۔

"اچھا تو پھر اب میں سوؤں گی، صبح ہی کچھ بتا سکوں گی۔" میں نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

ہما نے مجھے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ "تم ایسے نہیں سو سکتیں ـــ اچھا تو میں پروین کے بارے میں بتا دیتی ہوں اس نے کامیابی حاصل کر لی ہے۔"

"اچھا وہ کیسے؟" میں نے سنبھلتے ہوئے پوچھا۔

"اس نے میرے منگیتر کو بتایا کہ میں کئی سال سے ایک لڑکے سے محبت کرتی آ رہی ہوں اور اس سے حتمی معاہدہ ... والدین کی ضد اور جبر کا نتیجہ ہے ورنہ میں اس سے شادی کرنا نہیں چاہتی۔ بس اتنا کافی تھا۔ میرے منگیتر نے فوراً فیصلہ صادر کر دیا۔ کہ اب وہ میرے والدین کی طرف مڑ کر دیکھے گا بھی نہیں۔"

"جہاں تک میری معلومات ہیں تمہارا منگیتر جو کہ اب سابق منگیتر ہو گیا ہے بدصورت اور معمر ہے۔ پھر پروین کیسے اس کی طرف مائل ہو گئی؟" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"مجھ سے پوچھو میں بتاتی ہوں۔" پروین اچک کر بولی۔ "یہ ٹھیک ہے کہ وہ بدصورت ہے، معمر ہے، بلکہ گنجا اور موٹا بھی ہے مگر اس میں ایک بہت بڑی خوبی بھی ہے۔ وہ یہ کہ وہ بے حد مالدار بھی ہے۔ ہما خوبصورت اور دلکش ہے اس لئے وہ اس کے لئے مناسب نہیں ہے مگر میں ہما جیسی خوبصورت نہیں ہوں اس لئے میرے لئے بالکل ٹھیک ہے ـــ چلو میں نے اپنی بات بتا دی۔ اب تم اپنی داستان شروع کرو۔"

بجبر او قہرا میں نے اپنی داستان شروع کر دی جو ہر لحاظ سے ناخوشگوار تھی۔ مگر سنانا ضروری تھا، ورنہ لڑکیاں مجھے سونے نہ دیتیں۔

میں نے بات ختم کی تو ڈیڑھ بج رہا تھا۔ نیند کے دباؤ سے لڑکیوں کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں لہٰذا سوال و جواب اور بحث مباحثے کو کسی اور وقت کے لئے ملتوی کر دیا گیا۔ ٭٭

اعتذار

گزشتہ شمارے میں اختر آزاد صاحب کے افسانے "ابجد انسان" کے آخری حصے میں اصل پیراگراف کی جگہ سہواً کسی دوسرے افسانے کی نظم کا ٹکڑا لگ گیا تھا جس سے افسانے کا مفہوم متاثر ہوا۔ قارئین کرام موجودہ پیراگراف کی جگہ ذیل کا پیراگراف پڑھیں

"[illegible] ایک سرخ بہار یاد ہے پھر وہ [illegible] میں اگر لہو۔ [illegible] دیکھنے بیٹھیں گر اس کے چہرہ کو ڈھانپ لیا ایک گمبیر احساسِ تنہائی [illegible] کرب [illegible] اذیت!"

اس سہو کے لیے ادارہ اختر آزاد صاحب اور قارئین کرام سے معذرت خواہ ہے۔

بجھادی سی اور لڑکیاں اپنے بستروں پر چلی گئیں۔ آج زبیدہ میرے بستر پر بیٹھی تھی، سرگوشی میں بولی "اس کمبخت نے تو بہت مایوس کیا۔"

"ہاں وہ بہت موذی انسان ہے، خوبصورت درندہ۔" میں نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔

صبح ناشتے کی میز پر اکٹھا ہوئے تو میں نے محسوس کیا کہ ہما بہت پریشان اور غمزدہ ہے۔ اس نے کھوج کھوج کر مجھ سے ایسے سوالات کئے جن سے پتہ چلتا تھا کہ میرے اور ڈاکٹر کامران کے تعلقات کس حد تک استوار ہو چکے ہیں مگر میرے پاس بتانے کے لئے تھا کیا، اور چھپاتی بھی تو کیا چھپاتی، جو کچھ تھا بے کم و کاست بیان کر دیا تھا۔ زبیدہ نے ہنسی مذاق کے ذریعے ہما کو بہلانے کی کوشش کی مگر اس پر بدستور افسردگی طاری رہی۔

ناشتے کی میز پر ہی تھی کہ آیا نے آکر بتایا کہ کوئی فون پر مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے۔ ہم نے ایک دوسرے کی طرف حیرت سے دیکھا پھر میں اٹھی اور فون اٹینڈ کرنے چلی گئی۔ لڑکیاں بھی میرے پیچھے پیچھے آئی تھیں۔

میں نے ریسیور اٹھایا "ہیلو۔"

"شہناز بیگم۔ میں واجد کا دوست بول رہا ہوں۔" دوسری طرف سے آواز آئی اور میں وہ آواز فوراً پہچان گئی اور اس کے ساتھ ہی میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

"ہاں سن رہی ہوں، کہو کیا بات ہے۔" میں نے اپنے لہجے کی پریشانی کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

"بہت بری خبر ہے۔ واجد نے خودکشی کر لی۔" دوسری طرف سے قدرے توقف کے بعد کہا گیا۔

"واجد نے خودکشی کر لی کیا مر گیا۔" میں نے بے ساختہ پوچھا۔ میری ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ گئی تھیں۔ پھر مجھے اپنے عقب میں ایک چیخ سنائی دی، مڑ کر دیکھا تو مہر ایک کرسی پر گری دونوں ہاتھوں سے منہ چھپاتے سسکیاں بھر رہی تھی۔ لڑکیوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئی تھیں اور زبیدہ مہر پر جھکی اسے کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"یہ آوازیں کیسی آ رہی ہیں، کیا وہاں کوئی جلسہ برپا رکھا ہے۔" دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

"فضول باتیں نہیں، جو پوچھا ہے اس کا جواب دو۔" میں برہمی سے بولی۔

"ہاں مرا تو نہیں مگر ..."

جملہ مکمل نہیں کیا گیا تھا مگر لہجے نے بتا دیا تھا کہ واجد مرا نہیں ہے مگر اس کی حالت بہت مخدوش ہے اور اس کے جینے اور مرنے کے بارے میں کوئی حتمی رائے ظاہر نہیں کی جا سکتی۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر واجد کا دوست دوبارہ کہنے لگا۔ "تمہیں اسی وقت میرے کلینک پر پہنچنا ہے۔ تنہا آؤ گی اور کسی دوست کو ساتھ نہیں لاؤ گی۔"

"یہ کیسے ممکن ہے، نہیں میں اکیلی نہیں آ سکتی۔" میں نے گھبراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"صورت حال کی نزاکت کو محسوس کرو۔ یہاں ایک آدمی کی زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ چونکہ تم پہلے بھی آ چکی ہو اس لئے صرف تم ہی کو بلا رہا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ یہ بات زیادہ آدمیوں میں پھیلے۔ میں تمہیں اپنے کلینک کا پتہ بتا رہا ہوں، نوٹ کرو اور فوراً چلی آؤ۔" وہ اپنے کلینک کا پتہ بتانے لگا۔

پھر اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ میں نے بھی مردہ دلی سے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔ مڑ کر دیکھا تو مہر ابھی تک بے حال کرسی پر پڑی ہوئی تھی۔ چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا اور آنکھیں خالی خالی نظر آ رہی تھیں۔ میں بھی ان کے قریب پہنچ گئی، مہر اور لڑکیوں کی نگاہیں سوالیہ انداز میں مجھ پر مرکوز ہو گئیں۔ چھپانا بے کار تھا۔ چھپانے سے حاصل بھی کیا تھا۔ وہ اب تک کے تمام واقعات سے باخبر تھیں، اور اب جو کچھ بھی کرنا تھا باہمی امداد اور مشورے سے کرنا تھا۔ میں نے جو کچھ واجد کے دوست سے سنا تھا انہیں سنا دیا۔

مہر گھٹی گھٹی آواز میں بولی "یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے میں نے واجد کے ساتھ بہت زیادتی کی۔ میں ساری زندگی خود کو معاف نہ کر سکوں گی۔"

"اس قدر مایوس نہ ہو مہر۔ کیا معلوم یہ سب ایک جھوٹ ہو۔ ہو سکتا ہے کہ ہمیں ستانے کے لئے واجد اور اس کا دوست یہ ڈرامہ کھیل رہے ہوں۔" زبیدہ مہر کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر سہلاتے ہوئے بولی۔

"اگر ایسا ہے تو شہناز کا تنہا جانا کسی طور مناسب نہیں۔" ہما نے کہا، پھر قدرے توقف کے بعد بولی "میرا کیا خیال ہے ہم

سب ساتھ ہی چلیں۔"

"نہیں یہ مناسب نہیں ہوگا۔" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "جانے کیوں مجھے محسوس ہوتا ہے کہ واجد کا دوست جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ اس کے لہجے سے شدید گھبراہٹ اور پریشانی عیاں تھی۔ میں واجد کے اس دوست سے ایک بار مل چکی ہوں وہ اس قسم کا آدمی نظر نہیں آتا کہ اداکاری کر سکے۔ یہی بہتر ہوگا کہ میں تنہا جاؤں اور دیکھوں کہ قصہ کیا ہے۔"

لڑکیاں خاموش رہیں اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ مجھ سے متفق تھیں۔ میں دوسرے کمرے میں جا کر لباس تبدیل کرنے لگی۔ لباس تبدیل کر کے واپس آئی تو شیریں نے ملتجیانہ کہا۔ "شہناز میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔ کم از کم اس کا آخری دیدار تو کر لوں۔"

شیریں نے میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے نرمی سے کہا۔ "نہیں مہر تمہارے جانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اگر واجد واقعی مر چکا ہے تو جانا لاحاصل ہے، کیا فائدہ، اسے واپس تو نہ لاسکو گی، اور اگر زندہ ہے تو جا کر اس کے لئے دردسری ہی پیدا کرو گی۔ لہٰذا تم یہیں ٹھہرو اور شہناز کو جانے دو۔"

شیریں کا خیال درست ہے مگر شہناز کا اکیلے جانا بھی ٹھیک نہیں ہے۔ زبیدہ نے کہا۔ "خدا جانے کیا قصہ ہے۔ اب ہم مزید کسی مصیبت کو دعوت دینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں، ہما، مہر اور تم۔" زبیدہ میری طرف مڑی۔ "میں تمہیں بھی مصیبت میں گرفتار سمجھتی ہوں، بہتر ہے کسی کو ساتھ لے جاؤ۔"

"تم چاہو تو میرے ساتھ چل سکتی ہو۔" میں نے شیریں سے کہا۔ "جاؤ لباس تبدیل کر آؤ۔"

شیریں دوسرے کمرے میں گئی اور لباس تبدیل کر کے واپس آگئی۔ میں نے ایک کاغذ پر واجد کے دوست کے کلینک کا پتہ لکھا اور زبیدہ کے حوالے کرتے ہوئے بولی۔ "تم زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے تک ہمارا انتظار کرنا۔ اس عرصے میں واپس نہ آسکے تو جو قدم مناسب سمجھنا اٹھانا۔"

میں اور شیریں مکان سے باہر نکل آئے، شیریں کی موجودگی میں، میں کچھ تقویت سی محسوس کر رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ ایک اور ایک گیارہ ہو جاتے ہیں۔ جانے کیا صورتحال پیش آئے، اگر کوئی پیچیدہ صورت ہوئی تو دونوں مل کر کوئی بہتر حل نکال سکیں گے۔

ٹیکسی کلینک کے سامنے رکی تو میں بڑا اضطراب اور ہیجان محسوس کر رہی تھی اور دل بیٹھا سا جا رہا تھا۔ مڑ کر دیکھا تو شیریں کی حالت بھی غیر نظر آئی۔ اس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا اور آنکھوں سے نامعلوم خوف جھانک رہا تھا۔

ٹیکسی کا کرایہ ادا کیا اور اتر کر کلینک کی عمارت کی طرف چل پڑے۔ شیریں میرے پیچھے تھی۔ برآمدے میں پہنچ کر میں نے بند دروازے پر دستک دینے کے لئے ہاتھ بڑھایا مگر اس وقت شیریں نے عقب سے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور وحشت زدہ لہجے میں بولی۔ "شہناز! اگر واجد واقعی مر گیا ہوگا تو کیا ہوگا۔"

میں شیریں کو کیا جواب دیتی، خود میری اپنی حالت خراب تھی ـــــ میں نے ہاتھ بڑھایا اور آہستہ سے دروازے پر دستک دے دی۔

جذبات کے شعلوں میں
لپٹی ہوئی یہ پُرسوز کہانی
آئندہ شمارے میں
آپ کی حیرت و دلچسپی کیلئے
نیا سامان لے کر آئے گی!

خواجہ احمد عباس

بارش

حساس دلوں کے لیے
خواجہ احمد عباس
کی ایک اچھوتی
محبت بھری کہانی

بارش سنسان رات کے اندھیرے کو اور گہرا کر دیا تھا۔ لگتا ہے سڑک کے کنارے پیڑ کے نیچے کھڑے ہوئے شنکر نے سوچا بھگوان بھی بادلوں کا لحاف اوڑھ کر سو گیا ہے اور اس وقت دنیا میں، میں اکیلا ہوں صرف میں ہوں اور میرے دل کی دھڑکن ہے۔ اور پھر ایک بار بجلی چمکی تو اس نے سوچا میری زندگی بھی اس سڑک کی طرح ہے۔ یہ سڑک جو ناسک سے جنیر (JUNNAR) جاتی ہے۔ ناسک وہ پوتر تیرتھ استھان جہاں بھگوان رام نے اپنے بن باس کے دنوں میں کبھی قیام کیا تھا۔
جنیر وہ تاریخی مقام جہاں چھترپتی شیواجی کا جنم ہوا تھا۔
ایک طرف ناسک ہے جو سوچ رہا تھا دوسری طرف جنیر ہے اور ان کے بیچ میں یہ سڑک ہے جو رات دن موٹروں، بسوں، بیل گاڑیوں اور ٹرکوں سے روندی جاتی ہے۔ ایک ایک لاکھ کی موٹریں دو دو لاکھ کے سے لدی ہوئی بیل گاڑیوں کی جوتیں ایک سلسلہ ہی لگا رہتا ہے، موٹروں کا سلسلہ جاری ہوتا ہے۔

وہ سب سڑک کے سینے کو زخمی کرتی ہوئی گزر جاتی ہیں اور سڑک کے گھاؤ گہرے ہوتے جاتے ہیں۔ اب ان گھاؤں میں کیچڑ پیپ بھری ہوئی ہے اور پھر یہ موسلادھار بارش پہاڑی کی ڈھلان سے پانی کا ریلا بہتا ہوا آ رہا ہے کھیتوں کو سمندر بناتا ہوا سڑک کی طرف بڑھ رہا ہے۔ آج کی رات سڑک پانی میں ڈوب جائے گی۔ آج کی رات یہ بوڑھی گائے کی طرح مر جائے گی اور اس کے ساتھ شنکر مر جائے گا اور وہ تمام امیدیں اور آرزوئیں جو دھان کی نرم نرم کونپلوں کی طرح نہ جانے کتنے برسوں سے اس کے من کے اندھیرے میں پروان چڑھ رہی تھیں آج دم توڑ دیں گی۔

یہ سڑک جو ناسک سے شروع ہوتی ہے اور جنیر ختم ہو جاتی ہے یہ سڑک شنکر نے پھر سوچا جو میری زندگی کی طرح ہے جو شروع ہوئی تھی اس پاٹھ شالا سے جہاں میرا باپ بچوں کو پڑھایا کرتا تھا۔ کتنا چاہتا تھا بابا مجھے۔ ایک دن اس نے مجھے یہ محسوس ہونے دیا کہ میری ماں زندہ نہیں ہے۔ اس نے مجھے ماں کی ممتا بھی دی اور باپ کا پیار بھی۔ کتنے بلند حوصلے تھے اس کے۔ کہتا تھا اپنے بیٹے کو اسکول پاس کرا کے کالج بھیجوں گا۔ دیکھنا لڑکا ایک دن افسر بنے گا اور پھر تم سب اسے سلام کرو گے۔ مگر ابھی میں مڈل بھی پاس نہ کر پایا تھا کہ بابا بھگوان کو پیارے ہو گئے۔ جو کچھ پونجی انہوں نے میری پڑھائی کے لئے جمع جوڑ کر رکھی تھی وہ سب ان کی بیماری اور کریا کرم میں لگ گیا۔ گھر پر ساہوکار نے قبضہ کر لیا۔ اور میری زندگی گھر اور پاٹھ شالا سے نکل کر اس سڑک پر آ گئی۔ جہاں سے یہ موٹریں گزرتی ہیں اور میں دوڑ دوڑ کر مسافروں کو ہوٹل سے چائے، سوڈا، لیمن لا کر دیتا، موٹر کے ریڈی ایٹر میں ٹھنڈا پانی لا کر ڈالتا، راستے کی گرد سے اٹی کار صاف کرتا اور جاتے جاتے موٹر والا شاید میری طرف اکنی دونی پھینک دیتا۔ میں اسے جھک کر سلام کرتا اور ایسی ہی بخشش کی کھوج میں دوسری موٹر کی طرف دوڑ جاتا اور رات کو جب آخری موٹر گزر جاتی اور چولہے پر سناٹا چھا جاتا تو ہوٹل کے چھجے کے نیچے زمین پر لیٹ کر سو جاتا......

شنکر جو چور بازار سے خریدی ہوئی پرانی فوجی برساتی اوڑھے ہوئے تھا اس میں سے پانی رس رس کر اس کی قمیض میں سے بہتا ہوا اس کے سینے تک پہنچ چکا تھا اور اب تھراتی بھرتی ہوئی ٹھنڈی ہوا ہی نفس کے نشتروں سے اس کے بدن کو گدگدا رہی تھی۔ ایسی حالت میں اس کے لئے کچھ سوچنا بھی مشکل تھا۔ اس نے برساتی کے کالر کو چڑھا کر گردن کو ڈھانکنے کی کوشش کی تاکہ بہا نہ سکے۔ راستے زور سے بجلی کوندی کہ ایک پل کے لئے نہ صرف

کچھ ہی بات پہنچا تھا کہ [illegible] کی چوٹی میں ایک دھند
کے کرلوں کی طرح ابھر آئی۔ اتنے نزدیک کہ [illegible] شعور کو پہنچ
[illegible] اندھیرا اور سناٹا [illegible] اسی پل میں
اس نے ایک [illegible] چیز کو اپنے [illegible] پیر کے [illegible] رینگتے اور
گزرتے ہوئے محسوس کیا۔

سانپ! اس نے سوچا۔

اور آپ سے آپ اس کا سارا بدن [illegible] ساکت ہو گیا۔ اس وقت
خیریت اسی میں تھی کہ وہ اسی طرح بے جنبش رہے [illegible]
میں سانپ نے اسے [illegible] کاٹ لیتا [illegible] اس کی
تو جان ہی نکل جائے گی۔ سانپ کو اس کے پاؤں پر سے گزرنے میں [illegible]
[illegible] لگے ہوں گے۔ مگر اس وقت اسے ایسا لگا جیسے جانے
کتنے گھنٹے ہو گئے۔

سانپ کی دُم اس کے پیر پر سے گزر گئی تب بھی وہ [illegible]
وہ ساکت ہی کھڑا رہا کہ کہیں [illegible] پلٹ نہ پڑے۔ تب ہی اس نے برساتی

[illegible] اس کا ذہن [illegible]
[illegible]
[illegible] پانی [illegible]
[illegible]
[illegible] سنہری چوڑیاں۔

سنہری چوڑیاں [illegible] پاروتی کو [illegible] کر
سکتا ہے پاروتی — بڑی بڑی آنکھوں والی [illegible] چمکتے بالوں والی پاروتی
جس کی رنگت نئی فصل کے پکتے ہوئے گیہوں کی طرح سنہری تھی۔ پاروتی
جو اس کا [illegible] تھی [illegible] زندگی [illegible]
ایسا ہی تھا جیسے [illegible]
تھی اور [illegible] مرنے والی تھی مگر
پاروتی تو [illegible] بیٹی تھی [illegible]
[illegible] آوارہ نوجوان کے پلے باندھنے کو تیار نہیں تھا، جو [illegible]
[illegible] اور جس کے پاس [illegible]



کو پہنانے کے لئے سونے کی چار چوڑیاں بھی دیکھیں۔

شنکر نے جھجکتے ہوئے ایک شو روم سے سونے کی چار چوڑیوں کی قیمت پوچھی تھی اور اُسے بتایا گیا تھا کہ پندرہ سولہ سو روپے کا ہوگا اور چار چوڑیوں کی بنائی پر کم سے کم بیس پچیس روپے لاگت آئے گی۔

پاروتی اتنی خوبصورت تھی کہ اُس کو پانے کے لئے چار تو کیا دس بیس تولے سونا بھی کم تھا مگر شنکر نے حساب لگایا تھا کہ جو کام کر کے وہ گھر والوں کی روزی چلاتا تھا اس سے تو ان چار سونے کی چوڑیوں کو حاصل کرنے میں کم سے کم سات برس لگیں گے اور اتنے دنوں میں سونے کا بھاؤ بڑھ گیا تو پھر برس چھ مہینے اور۔ سوال یہ تھا کیا وہ انتظار کر سکتا ہے؟ کیا پاروتی کا باپ انتظار کر سکتا ہے؟ نہیں (اُس نے فیصلہ کر لیا تھا) اُسے بہت سے روپے کمانے کا کوئی اور ڈھنگ سوچنا ہوگا۔

چنانچہ وہ ایس۔ ٹی کی بس میں بیٹھ کر بمبئی پہنچ گیا۔ وہاں اُس نے جوتے پالش کئے، اکنی دونی کے لئے ٹیکسیوں کے پیچھے دوڑا، چھوٹے چھوٹے ہوٹلوں میں بیرا بن کر چائے پلائے کھلایا۔

مگر یہ سب کرنے پر بھی وہ دس روپے سے زیادہ جمع نہ کر سکا۔ پھر ایک دن اُس کے ایک جاننے والے نے اُسے کپڑے کا ایک تھیلا دیا اور کہا۔ اس میں وہسکی کی دو بوتلیں ہیں انہیں وارڈن روڈ پر فلاں بلڈنگ میں فلاں نمبر کے فلیٹ پر پہنچا آؤ۔ دس روپے دوں گا۔ شنکر نے سوچا یہ تو بہت ہی اچھا کام ہے۔ بس میں آنے جانے کے تو صرف آٹھ آنے لگیں گے پورے ساڑھے نو روپے کا فائدہ ہے۔

اور ایسا ہوا بھی۔ بلکہ جہاں اُس نے بوتلیں پہنچائیں اس سیٹھ نے اوپر سے ایک روپیہ انعام دے دیا۔ پھر کیا تھا، شنکر باقاعدہ شراب سپلائی کرنے کا دھندا کرنے لگا۔ جلدی ہی اس کے پاس دو سو سے زیادہ روپے جمع ہو گئے۔ وہ چاہتا تو بآسانی سونے کی چار چوڑیاں بنوا کر واپس گاؤں چلا جاتا۔ مگر اب تو اُسے روپیہ کمانے کا بھید معلوم ہو گیا تھا۔ اب تو وہ چاہتا تھا کہ دو چار ہزار روپے اکٹھے ہو جائیں تو پھر گھر جاؤں تاکہ پاروتی کے لئے نہ صرف چار چوڑیاں بنوا سکوں بلکہ اُس کے اور اپنے ہونے والے بچوں کے لئے ایک چھوٹا موٹا سا گھر بھی بنوا لوں۔ ابھی وہ گھر بنوانے کے سپنے ہی دیکھ رہا تھا کہ ایک دن ماہم کے ناکے پر اس کے ہاتھ سے وہ کپڑے کا تھیلا گر پڑا۔ بوتلیں ٹوٹ کر شراب سڑک پر بہہ نکلی۔ اور وہ پکڑا گیا۔

پہلی بار دو مہینے کی سزا ہوئی۔

دوسری بار تین مہینے کی۔

تیسری بار جب وہ جیل سے چھوٹا تو شہر بدر یعنی بمبئی کے علاقے سے باہر

میں پار کر دیا گیا۔ اور اب بمبئی کے علاقے میں نہیں جا سکتا تھا۔

اور تب سے اُس نے سونے کی چار چوڑیاں بنوانے کے لئے یہ نیا راستہ اختیار کیا تھا۔ گاؤں سے باہر ہٹ کر وہ سڑک پر لوہے کی کیلیں بکھیر دیتا تھا۔ جس سے گزرنے والی موٹر کا پہیہ پنکچر ہو جاتا۔ اس کا پہیہ بدل دیتا یا سیلف اسٹارٹر کام نہ کرتا ہو تو دھکا دے کر موٹر اسٹارٹ کر دیتا۔ اس کام کے بدلے میں اُس کو روپیہ سوا روپیہ مل جاتا۔ لیکن اصل کمائی کچھ اور تھی۔ جیسے ہی موٹر اسٹارٹ ہونے لگتی وہ اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر اس میں سے کوئی چیز اٹھا لیتا۔ ایک بار تو پیچھے لگے ہوئے کیریئر سے اُس نے ایک چھوٹا سا سوٹ کیس ہی اتار لیا تھا۔ مگر بدقسمتی سے اس میں صرف اونی کپڑوں کے سیمپل ہی بھرے ہوئے تھے۔ پھر بھی سوٹ کیس کے پانچ روپے اُسے مل گئے تھے۔ دوسرے موقعوں پر وہ زیادہ کامیاب رہا تھا۔ ایک بار تو ایک ٹرانسسٹر ریڈیو ہاتھ لگ گیا تھا جو اُس نے پچاس روپے میں اُس دلال کے ہاتھ بیچا تھا جو اُس سے مال لے کر بمبئی کے چور بازار میں پہنچاتا تھا۔ دلال نے اسے سو روپے میں بیچا تھا اور بمبئی کی ایک ریڈیو کی دکان پر دوبارہ جا کر وہ ٹرانسسٹر بلیک میں ساڑھے تین سو روپے میں بکا تھا۔ کمبل، شال، ڈریسنگ گون، برساتی — جو چیز بھی آسانی سے اُس کے ہاتھ میں آ جاتی وہ اسے کبھی نہیں چھوڑتا تھا۔ ایک بار اور کچھ نہیں ملا تو اُس نے پٹرول کی ٹنکی کی ڈھکن ہی اتار کر ایک روپے میں بیچ دی تھی۔

اور اس طرح اس کے پاس لگ بھگ پانچ سو روپے جمع ہو گئے تھے۔ لیکن اب سونے کی چار چوڑیوں کا اندازہ دینے میں صرف سو روپیہ کی کسر رہ گئی تھی۔ یہ کمبخت بارش نہ ہوتی تو شاید آج ایک ہی رات میں وہ کسر بھی پوری ہو جاتی۔ مگر اُس نے سوچا چھ سو روپے ہو جائیں گے پھر تو سونا بھی آ جائے گا۔ اس سونے کی چار چوڑیاں بھی بن جائیں گی۔ پھر بڑھا معاملت دادا بھی بیٹی دینے کے لئے راضی ہو جائے گا۔ لیکن پاروتی کے من کو کون بدلے گا؟ جب سے وہ بمبئی سے لوٹا تھا، نہ جانے اُسے کیا ہو گیا تھا۔ پہلے تو وہ اُس سے ہنس ہنس کر باتیں کیا کرتی تھی، مسکراتی ہوئی آنکھوں سے اُسے دیکھا کرتی تھی لیکن اب وہ شنکر کو دیکھتے ہی دوسری طرف منہ پھیر لیتی تھی۔ جیسے اس کی صورت دیکھنا بھی اس کو گوارا نہ ہو۔ ایک دن اکیلے اُس نے پاروتی سے پوچھ لیا: "اری تجھے کیا ہو گیا ہے جو سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتی۔ جب بھی ملتی ہے مجھے ایسے دیکھتی ہے جیسے میں کوئی زہریلا کیڑا ہوں۔ آخر میں نے تیرا کون سا پاپ کیا ہے؟" اور پاروتی کے جواب میں اتنی کڑواہٹ تھی کہ سن کر وہ لاجواب رہ گیا تھا۔ اس نے کہا تھا "مجھے نہیں معلوم تم نے کیا کیا ہے اور تم اب کیا کرتے ہو مگر تمہارے ساتھ

سارے چہرے پر لکھا ہو، لگتا ہے تم کوئی پاپ منظور کرتے ہو؟"
یہ سن کر بھی اس نے سوچا تھا شاید پاروتی مذاق ہی کر رہی ہو۔ ساس
نے پوچھا تھا: "تو کیا کالی کلوٹی مجھ سے بیاہ نہیں کرے گی؟" اس پر پاروتی نے
منہ چڑا کر جواب دیا تھا: "پہلے آئینے میں شکل تو دیکھ لو۔"
تو اب سونے کی چار چوڑیوں کے علاوہ اس کو اپنے چہرے سے
وہ منحوس پھٹکار بھی مٹانی تھی، جو اُسے آئینے میں نظر نہیں آتی تھی،
لیکن پاروتی کو ضرور دکھائی دیتی تھی۔
"ہے بھگوان!" اُس نے دل ہی دل میں پرارتھنا کی۔ "آج کی رات
ایک موٹر بھیج دے۔ موٹر نہیں تو ٹرک، ٹرک نہیں تو بیل گاڑی ہی سہی اور
کچھ نہیں تو اندھیرے میں آکاش کی ایک بدری ہی اُتار دے۔"
اور شاید اُس کی پرارتھنا کے جواب میں بارش کی موسلادھار کو چیرتی
ہوئی ایک موٹر جیسے انجن کی آواز سنائی دی۔ آواز تیزی سے قریب
آ رہی تھی۔ موٹر بڑی تیز رفتار سے......
نہیں۔ نہیں۔ (اس کے تجربہ کار کانوں نے گواہی دی) یہ
موٹر کا انجن نہیں ہے۔ یہ تو ہوائی جہاز ہے۔
ہفتے میں دو تین بار دن میں اور ایک بار عین آدھی رات کو اُن
کے گاؤں کے اوپر سے ایک ہوائی جہاز بمبئی کی طرف جاتا دکھائی دیتا تھا
دکھائی کیا دیتا تھا صرف سنائی دیتا تھا۔ اتنا اونچا ہوتا تھا کہ
دن میں بھی کبھی کبھی تو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا تھا کہ چیل کو ا ہے یا ہوائی
جہاز۔ اور رات کو تو صرف لال ہری نیلی روشنی کی تکون ہوا میں تیرتی دکھائی
دیتی تھی مگر جب وہ بمبئی میں تھا تو سانتا کروز ایئرپورٹ پر اُس نے ایک
بار ایسے ہوائی جہاز قریب سے چڑھتے اُترتے دیکھے تھے۔ ایک ایک ہوائی جہاز
میں سو سوا سو مسافر اور اُن کے علاوہ ہر ہوائی جہاز کے "پیٹ" میں تین
چار ٹرک سامان بھی سما جاتا تھا۔ بکسوں، سوٹ کیسوں، بوریوں، بڑے بڑے جہازی ٹرنک،
تجارتی سامان کی پیٹیاں اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اُس نے سب بکسوں اور
سوٹ کیسوں کا ایکسرے کر ڈالا تھا۔ اندر بڑھیا سوٹ تھے، نئے فیشن
کی چست پتلونیں، سلک کے بش شرٹ، ناگنوں کی قمیضیں، ریشمی ساڑھیاں،
ریڈیو، ٹرانسسٹر، ولایتی سامان، مردوں کے لئے گھڑیاں، عورتوں کے لئے
گھڑیاں، زیور، سونے کی چوڑیاں۔
نیم گری کی پہاڑی پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ بارش بھی موسلادھار
ہو رہی تھی۔ اس حالت میں ہوائی جہاز کی بتیاں کیسے نظر آتیں۔ مگر آواز قریب
ہوتی جا رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا آج ہوائی جہاز بہت نیچے سے گزر رہا تھا
شنکر کی مٹھی میں موٹر کو پنکچر کرنے کے لئے کیلیں تھیں۔ کیا ہی اچھا ہو اُس

کون کیا تھا؟

- کولمبس: امریکہ دریافت کرنے والا، ایک جولاہے کا بیٹا تھا۔
- کمال اتاترک: بابائے ترکی، ایک معمولی کلرک کا بیٹا تھا۔
- سقراط: ایک عظیم فلسفی، ایک معمار کا بیٹا تھا۔
- ابراہیم لنکن: امریکہ کا محب وطن صدر، ایک غریب کسان کا بیٹا تھا۔
- جارج اسٹیفن: ریل کے انجن کا موجد، ایک مزدور تھا جو کوئلے کی کان میں کوئلہ چھانتا تھا۔
- اسٹالن: روس کا صدر، ایک موچی کا بیٹا تھا۔
- آئزن ہاور: امریکہ کا صدر، پہلے ایک اخبار فروش تھا۔

کے من میں چھپے ہوئے ایک شیطان نے چپکے سے کہا کہ میں یہ کیلیں ہوا
میں اچھال دوں اور آج موٹر کی بجائے ایک ہوائی جہاز چکنا چور ہو جائے۔
اور اُسی پل نیم گری کی چوٹی پر بجلی چمکی، پھر بادلوں کی گڑگڑاہٹ سنائی
دی۔ مگر نہیں یہ بجلی نہیں تھی کیونکہ بجلی تو پل دو پل کے لئے چمکتی ہے۔ یہ
روشنی تو شعلوں کی طرح بھڑک رہی تھی۔
ہوائی جہاز! اُس کے دل کی دھڑکن نے چلا کر کہا۔ اندھیرے میں
ہوائی جہاز نیم گری سے ٹکرا گیا ہے!
اور اس کے من میں چھپے ہوئے شیطان نے کہا۔ سونے کی چوڑیاں
سونے کی چوڑیاں!
ہے بھگوان! اُس کے دل کی دھڑکن چلائی۔ بیچارے مسافروں کا
کیا ہوگا؟
مگر اس کے من میں چھپے ہوئے شیطان نے پھر دہرایا۔ سونے کی
چوڑیاں! اور وہ دیوانہ وار نیم گری کی پہاڑی کی طرف دوڑا۔
بچپن میں کتنی بار وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ نیم گری کی چوٹی پر
چڑھا تھا۔ اُس کے پیروں کو وہ سب ٹیڑھے میڑھے راستے یاد تھے۔ مگر

اس وقت اندھیرا تھا، بارش بھی تھی، کیچڑ تھا، خطرناک پھسلن تھی۔

پھر بھی وہ چلتا رہا۔ مگر رات ہی رات پہنچنا ... راستہ ... کبھی کبھی
چکنی نرم مٹی کی چوٹی بالکل سامنے نظر آتی مگر پل بھر میں پھر اندھیرے میں
ڈوب جاتی اور پھر یوں لگتا کہ وہ نیم گری ابھی بہت دور ہے اور اس کی چوٹی
تک پہنچنے کے لیے نہ جانے کتنے دن، کتنے ہفتے، کتنے مہینے لگیں گے۔
ہواؤں کے کاٹتے رہیں، اچھا ہوا کہ اس کا پانی برساتی ... ہو گئی تھی اس کے
جوتے پھٹ گئے۔ پھر ایک ... تو گیا ... کے تلوؤں کا ہاتھ
سا اس نے کبھی آگاہ ... اب اس کے ننگے پیر پتھروں کی چوٹ کو
محسوس کر سکتے تھے۔ شاید کہ ... لہو لہان بھی ہو گئے تھے۔ پھر بھی وہ چلتا
جا رہا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن اسے چلنے پر مجبور کرتی رہی۔ جلدی کرو جلدی
کرو۔ شاید تم کسی مسافر کو بچا سکو۔

مگر سب کچھ ان ہی میں چھپا ہوا اطمینان بھی ہے کہ جب وہ ہانپ رہا تھا، جلدی کرو
جلدی کرو اور ہر بار جب وہ راستہ دیکھنے کے لیے ٹارچ جلاتا تھا اسے
زمین پر روشنی کے دائروں میں چار ... چٹانیں ہی نظر آتی تھیں۔

چلتے چلتے اسے نہ جانے کتنے گھنٹے ہو گئے تھے۔ اب وہ نیم گری
کی ڈھلان پر چڑھ رہا تھا، یا چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا کیونکہ پھسلن
اتنی تھی کہ دو قدم اوپر چڑھتا تھا تو چار قدم پھسل کر واپس آ جاتا تھا۔ ایک بار
وہ پھسلا تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کے پیر کے نیچے کوئی نرم چکنی اور لجلجی
چیز رینگ رہی ہے۔ گھبرا کر وہ پیچھے ہٹا اور ٹارچ کی روشنی کی تو دیکھا ایک
لمبا سا اژدہا ہے جس کا اگلا حصہ ایک پیڑ کے گرد لپٹا ہوا ہے۔ خیریت
ہوئی کہ اس کا پیر اس کی دم پر ہی پڑا تھا۔

ابھی تھوڑا ہی آگے گیا ہو گا کہ اسے جھاڑیوں میں سے ایسی آواز آئی
جیسے کوئی کشمکش ... کر رہا ہو۔ اندھیرے میں شیر کی آنکھیں ایسے چمکیں
جیسے دو دہکتے ہوئے انگارے ہوں۔ ششنکر ایک پیڑ کی آڑ لے کر اسی کے
تنے سے چپک گیا۔ وہ خوفناک آنکھیں دھیرے دھیرے اس کی طرف
بڑھ رہی تھیں...... ششنکر نے اپنا سانس روک لیا۔ شیر اس کے پاس
سے گزر گیا۔ اتنے قریب سے کہ ششنکر نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنی موت
کے لیے تیار ہو گیا۔ کیونکہ شیر کے بھاری پیر پڑنے کی آواز آتی گئی بالکل
پاس آ گئی، یہاں تک کہ ششنکر شیر کے سانس کو بھی سن سکتا تھا۔ اس کی
بو بھی سونگھ سکتا تھا۔ مگر پھر شیر کی بو اور سانس اور پیروں کی چاپ آہستہ آہستہ
دور ہوتی گئی۔ ... ششنکر نے آنکھیں کھول دیں اور پھر ڈھلان
پر چڑھنے لگا۔ بارش اور سردی کے باوجود اس نے محسوس کیا کہ اس کی
قمیض پسینے میں شرابور ہے۔

[illegible] ... سستا رہے گا۔ پھر ... چوٹی ...
اب پہاڑوں پر صرف گھاس تھی یا اونچی جھاڑیاں تھیں۔ بارش بند ہو گئی تھی
مگر جیسے جیسے وہ چوٹی کے پاس پہنچتا جا رہا تھا ہوا تیز ہوتی جا رہی تھی۔
اس کی برساتی کے اب صرف چند چیتھڑے باقی رہ گئے تھے جو اس کے
کندھوں پر پھڑپھڑا رہے تھے۔ اس نے ان کو بھی اتار پھینکا۔

آخر کار وہ چوٹی پر پہنچ گیا۔ ہوا اتنی تیز تھی کہ اس کے لیے اپنے
آپ کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ ... ابھی تک اندھیرا تھا مگر
مشرق میں گھاٹ کی پہاڑیوں کے پیچھے آسمان پر ایک ہلکا سا اجالا پھیلتا
جا رہا تھا۔

ششنکر ٹارچ جلا کر ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ ہوا میں کوئی چیز
پھڑپھڑاتی ہوئی آئی اور اس کے چہرے سے ٹکرائی۔ اس نے گھبرا کر اسے
ہٹایا تو محسوس ہوا کہ کوئی کاغذ ہے۔ ٹارچ کی روشنی میں دیکھا تو نوٹ تھا۔ مگر
ہندوستانی نہیں کسی دوسرے ملک کا۔ جاپانی یا چینی ... جانے کیا
لکھا تھا۔ نوٹ، نوٹ، سوکھے ہوئے پتوں کی طرح نوٹ ہوا میں اڑ رہے
ہیں۔ ٹارچ کی روشنی کے دائروں میں چار چڑیاں ناچنے لگیں۔

ضرور ... ہوائی جہاز کے ٹوٹے ہوئے
ٹکڑے اور اس کا سارا سامان ادھر ہی پڑا ہو گا۔ یہ سوچ کر وہ آگے بڑھ
ہی رہا تھا کہ اس کا پیر کسی چیز سے ٹکرایا۔ ٹارچ کی روشنی میں دیکھا تو ایک لاش
تھی۔ ٹارچ کی روشنی کا دائرہ بڑھا ... جوتے، بھاری ... پتلون اور
اس کے کوٹ پر سے ہوتا ہوا لاش کے چہرے کی طرف بڑھا مگر جہاں سر
ہونا چاہیے تھا وہاں سر نہیں تھا صرف خون سے لتھڑی ہوئی گردن
قمیض کے کالر سے نکل رہی تھی۔ ایک بار ششنکر کانپ اٹھا۔ اس نے فوراً
ٹارچ کی روشنی ہٹا دی اور پیچھے ہٹ گیا۔ مگر دوسری طرف روشنی کی تو اس
کے دائرے میں ایک لیڈیز ہینڈ بیگ پڑا ہوا نظر آیا۔ جلدی سے اس نے
اٹھا لیا۔ اس کے پاس ہی ایک ٹرانسسٹر ریڈیو ٹوٹا پڑا تھا۔ کوئی چیز نہیں
صرف ... اس نے ... اور اسے بھی اٹھا لیا۔

صبح کا دھندلکا نیم گری کی چوٹی پر پھیلتا جا رہا تھا۔ ششنکر نے اپنی
ٹارچ پھینک دی۔ اب وہ پاگلوں کی طرح ادھر ادھر ... چیزیں جمع کر
رہا تھا اور ایک کمبل جو ... لگا تھا۔ اسے پھیلا کر ان پر ... جا رہا
تھا۔ اتنی دولت تو اس نے ساری عمر میں نہیں دیکھی تھی۔

لیڈیز ہینڈ بیگ۔

ٹرانسسٹر ریڈیو۔

نوٹوں سے بھرے ہوئے کتنے ہی بٹوے۔

موتی جڑے طلائی بریسلٹ۔
بندھے بند سوٹ کیس۔
بڑے بڑے پلاسٹک کے لفافوں میں بند کئے ہوئے
بڑھیا اعلیٰ سوٹ۔
گراموفون، گراموفون ریکارڈ۔
کیمرے، ایک دو تین چار کیمرے۔ درجنوں فاؤنٹین پین۔
چاکلیٹ کے ڈبے۔
کتنی ہی مردہ کلائیوں سے اتاری ہوئی ہاتھ کی گھڑیاں۔
کٹی ہوئی ٹانگوں سے اتارے ہوئے دو تین جوتوں کے جوڑے۔
وہ سب مر چکے ہیں۔ اُن کو ان چیزوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔
مگر مجھے ضرورت ہے۔ یہ سب مال میرا ہے۔ میں نے بچا کر اکٹھا کیا ہے۔
اس پر میرے سوا کسی کا حق نہیں ہے۔

وہ پاگلوں کی طرح دوڑ رہا تھا۔ پاگلوں کی طرح سوچ رہا تھا۔ پاگلوں کی طرح اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا۔ پاگلوں کی طرح ہنس رہا تھا۔ چلا رہا تھا۔

اب وہ یہ سوچنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا کہ کیا چیز اس کے کام کی ہے اور کیا نہیں ہے۔ جو بھی ہاتھ لگ رہا تھا اُسے وہ کمبل پر پھینکتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ ایک اونچا سا ڈھیر لگ گیا۔

ایک بچی کے ہاتھ سے دبوچ کر بھی مسکرا رہی تھی! اُس نے گویا ... دو کتابیں لگی اس پر برابر برابر پڑی تھیں۔ ایک بائبل ایک گیتا۔ اُس نے سوچے بنا دونوں کو اٹھا لیا۔

اور پھر اُس نے دیکھا کہ ایک جھاڑی میں سے جھانکتا ہوا مہاتما بدھ کی ایک ننھی سی مورتی مسکرا رہی ہے۔ اس نے اس پر بھی قبضہ کر لیا اور کمبل پر پڑے ہوئے ڈھیر پر رکھ دیا۔ پھر اس نے خوشی اور گھبراہٹ اور خوف سے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کمبل کی گٹھری باندھی۔ جب وہ اس گٹھری کو مضبوط کرنے کے لئے گرہ لگا رہا تھا تو اس کی چوٹی میں سے جھانکتی بدھ کی مورتی اس وقت بھی مسکرا رہی تھی۔

گٹھڑ بہت بھاری ہو گیا تھا۔ پھر بھی کسی نہ کسی طرح اُس نے اسے کندھوں پر اُٹھا لیا اور پہاڑی سے نیچے جانے کے لئے پگڈنڈی ڈھونڈنے لگا۔ صبح کا سورج پھر کالے بادلوں میں چھپ گیا تھا اور ہلکی بارش ہونے لگی تھی۔ اپنے گٹھڑ کے بوجھ کے نیچے وہ دبا جا رہا تھا۔ اسے راستہ بھی نظر نہ آتا تھا۔ ابھی وہ چند قدم ہی پگڈنڈی کی طرف بڑھا تھا کہ اس کے کانوں میں ایک ہلکی سی

کراہنے کی آواز آئی۔ اس نے گھبرا کر سر پر سے گٹھڑ کو ادھر اُدھر دیکھا۔ مگر کچھ نظر نہ آیا۔

ہو سکتا ہے میرے کانوں کو دھوکا ہوا ہو۔ اُس نے سوچا۔ اور پھر آگے بڑھنے ہی والا تھا کہ پھر وہی کراہنے کی آواز آئی۔ اس بار کوئی شبہ نہیں تھا کہ کسی انسان کی آواز ہے۔

کوئی زندہ ہے! کوئی زندہ ہے! اُس کے دل کی دھڑکن چلائی۔
جلدی کر۔ کوئی آ جائے گا تو پھر یہ سامان نہیں لے جا سکے گا۔
اس کے من میں چھپے ہوئے شیطان نے اُسے یاد دلایا۔
کوئی زندہ ہے! کوئی زندہ ہے! اُس کے دل کی دھڑکن چلائی۔
چاندی سونے کی چوڑیاں! من میں چھپے ہوئے شیطان نے اپنا پرانا سبق دہرایا۔ چاندی سونے کی چوڑیاں!

مگر تیسری بار پھر وہی کراہنے کی آواز سنائی دی تو شنکر نے جھجک کر گٹھڑ اُٹھا کر پیچھے مڑ کر دیکھا۔

ایک جھاڑی کی آڑ میں گھاس پر بارش میں بھیگی ہوئی ایک لڑکی پڑی تھی۔ اُس نے قریب جا کر دیکھا تو ایک پل کے لیے اس کے دل کی دھڑکن بند ہو گئی۔ پاروتی!

پاروتی یہاں پڑی سسک رہی ہے اور میں اس کے باپ کی گٹھڑی اٹھائے پھر رہا ہوں۔ اُس نے گٹھڑ اٹھا کر پھینکا اور پاروتی کی طرف دوڑا۔

مگر وہ پاروتی نہیں تھی۔ پاروتی جیسی ہی کوئی لڑکی تھی۔ ویسی ہی پکے ہوئے گیہوں جیسی رنگت۔ ویسے ہی کالے چمکتے گھنگھریالے بال۔ ان کی ایک لٹ اُس کے آدھ کھلے ہونٹوں پر پڑی اس کی سانس سے ہلکے ہلکے جنبش کر رہی تھی۔

پاروتی نہیں ہے۔ کوئی نہیں ہے۔ من میں چھپے ہوئے شیطان نے اُسے یاد دلایا۔
مگر زندہ ہے! زندہ ہے!! زندہ ہے!!! اس کے دل کی دھڑکن چلائی۔

لڑکی ابھی تک زندہ ضرور تھی۔ مگر سانس مشکل سے آ رہا تھا۔ اس کے بدن پر زخم کا کوئی نشان نہیں تھا۔ مگر شاید کسی دھماکے سے اُسے کوئی ایسی اندرونی چوٹ آئی تھی کہ وہ نہ صرف بے ہوش تھی بلکہ اس کے گالوں سے خون کی سرخی بالکل غائب ہو گئی تھی۔ موت کی کالی پرچھائیں اس کے خوبصورت چہرے پر منڈلا رہی تھی۔ بارش اب اور تیز ہو گئی تھی۔ ہوا کا جھکڑ بھی چل رہا تھا۔ بے ہوش ہوتے ہوئے بھی لڑکی کا بدن سردی سے کانپ رہا تھا۔ دفعتاً شنکر کو اس کمبل کا خیال آیا جس میں اُس نے وہ سب سامان باندھا ہوا تھا۔ جلدی سے اُٹھ کر دوڑا گیا اور جلدی جلدی گٹھری کھول کر

گٹھڑی کو اُٹھا کر کمبل گھسیٹ لیا۔

گٹھڑی ڈھلان پر رکھی ہوئی تھی، سارا سامان لڑھک کر اِدھر اُدھر جھاڑیوں میں گھاس میں بکھرا اور پانی میں جا پڑا۔

گھڑیاں اور سیڈیو اور گراموفون اور فاؤنٹین پین اور سوٹ کیس اور بٹوے اور نوٹ اور زیور اور گڈیاں اور بڑھکی مورتی اور ۔۔۔۔

شنکر کو یہ سب دیکھنے کی فرصت نہیں تھی۔ وہ سردی سے کپکپاتی بے ہوش لڑکی کو کمبل میں لپیٹ رہا تھا۔

پانی میں بھیگا ہوا ٹھنڈا ہاتھ کمبل کے اندر کر رہا تھا کہ اس نے دیکھا پیلی نازک کلائی پر سونے کی چوڑیاں ہیں چار۔

مگر اس بار شنکر کو ان چوڑیوں کی اہمیت کا کوئی احساس نہیں ہوا۔ اُس کو فکر تھی کہ بارش میں بھیگ کر سردی سے لڑکی کو کچھ نہ ہو جائے۔ جلدی جلدی اُس نے اُسے کمبل میں اچھی طرح سے لپیٹا اور شاید اسی تھوڑی گرمی کے احساس سے بے ہوش لڑکی کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی دھیمی سی تشکر آمیز مسکراہٹ اُبھر آئی۔

اب وہ ایک نیا بوجھ لے کر نیچے اُتر رہا تھا مگر اس میں اس پہلے گٹھڑ کا بوجھ نہیں تھا۔ دبلی پتلی نازک لڑکی کمبل میں لپٹی ہوئی بالکل ہلکی لگتی تھی۔ شنکر نے اُسے اپنے بدن کی گرمی پہنچانے کے لئے سینے سے لگا رکھا تھا۔ وہ کمبل میں سے بھی لڑکی کے دل کی دھیمی دھڑکن محسوس کر سکتا تھا مگر یہ دھڑکن اور دھیمی ہوتی جا رہی تھی۔ نہ جانے زندہ گاؤں تک پہنچ بھی سکے یا نہیں۔ گیلی پھسلوان ڈھلان پر شنکر تیز بھی نہیں چل سکتا تھا۔ ہر قدم پر گرنے کا ڈر تھا اور اس کے شانے پر بڑا قیمتی بوجھ تھا کسی کی زندگی تھی!

زندگی! دفعتاً اُسے محسوس ہوا کہ اب وہ صرف اپنے دل کی دھڑکن سن رہا ہے۔ وہ دوسری میٹھی دھڑکن اب خاموش ہے۔ یکایک اُس کے کندھے کا بوجھ بھی بھاری ہو گیا جیسے پھولوں کی گٹھڑی اب پتھر بن گئی ہو۔

اُس نے بڑی احتیاط سے لڑکی کو نرم گھاس پر لٹا دیا۔

وہ مر چکی تھی۔

شنکر نے دیکھا کہ لڑکی کے اَدھ کھلے ہونٹوں پر وہ تشکر آمیز مسکراہٹ ابھی تک برقرار ہے۔ وہ موت کے لمحے میں بھی اس کا احسان نہیں بھولی تھی۔

اگلے دن شام کو ہوائی جہاز کے مسافروں کے چند رشتہ دار نینی گری سے لوٹے تو ایک نوجوان نے جس کی آنکھیں روتے روتے سوج گئی تھیں ٹھنڈی سانس لے کر کہا "ہماری شادی اسی مہینے ہونے والی تھی۔"

کسی نے پوچھا "کیا آپ نے اپنے منگیتر کی لاش شناخت کر لی؟"

"جی ہاں۔ اُس کی موت کسی اندرونی چوٹ سے ہوئی ہے لاش پر کوئی زخم تو کیا ایک خراش تک بھی نہیں تھی۔ مگر لگتا ہے کسی نے اُس کی چوڑیاں چرالی ہیں۔ یا ہو سکتا ہے وہ پہنے ہوئے ہی نہیں تھی۔"

"چوڑیاں کیا بہت قیمتی تھیں؟"

"قیمت سونے کی نہیں تھی، محبت کی تھی۔ منگنی پر میں نے اُسے پہنائی تھیں۔ اگر مجھے معلوم ہو جاتا کہ وہ آخری وقت تک پہنے ہوئے تھی۔۔۔"

اور پھر اُس کی آواز ایک گہری درد بھری سسکی میں ڈوب گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے اور وہ انہیں چھپانے کے لئے زمین کی طرف دیکھنے لگا۔

دوسرے لوگ اُسے وہیں چھوڑ کر پولیس کیمپ کی طرف چلے گئے بڑی دیر تک وہ ویسے ہی کھڑا زمین کو تکتا رہا۔ پھر نظر اٹھائی تو سامنے ایک سانولے نوجوان کو کھڑا دیکھا۔ اُس کے کپڑے گیلے، میلے اور پھٹے ہوئے تھے۔ پیر کیچڑ اور خون میں لت پت تھے۔ اُس کی آنکھیں بھی رونے سے سوجی ہوئی تھیں۔

"یہ لیجئے۔" اُس نے کہا اور شہر سے آنے والے کے ہاتھ میں کچھ دے دیا جو ایک پرانے اخبار میں لپٹا ہوا تھا۔

اُس نے کاغذ کھولا تو اس میں سے سونے کی چار چوڑیاں نکلیں۔

"تمہیں یہ کیسے۔۔۔۔؟" اُس نے کہنا شروع کیا۔ مگر لانے والا جا چکا تھا۔

اور کتنے ہی دن بعد جب کھیڈ گاؤں میں ہمالیہ کے ہوائی جہاز کا حادثہ قصہ کہانی بن چکا تھا، ایک دن پاروتی اپنے باپ کے ساتھ بورن جاتے ہوئے چوراہے سے گزری تو اُس نے شنکر کو دیکھا جو اب پھر بھاگ بھاگ کر مسافروں کے لئے چائے پانی لا رہا تھا۔

پاروتی نے پکارا "شنکر۔ ارے شنکر۔ اتنے دنوں سے کہاں ہے رے، نظر ہی نہیں آئے؟"

شنکر اس کی طرف آیا تو وہ اُسے دیکھتی ہی رہ گئی۔

"ایسے کیا گھورتی ہے۔ میرے منحوس چہرے پر تو پھٹکار برستی ہے نا!"

پاروتی نے سر ہلا کر خاموشی سے "نہیں" کہا اور پھر بولی۔

"نا رے شنکر تو بالکل بدل گیا ہے۔ اب تو۔ تو۔ ذرا" اور پھر آنکھیں جھکا کر "(میرے سے) اچھا لگتا ہے۔"

"سچ؟" شنکر خوشی سے چلایا۔

"سچ!" پاروتی نے نظر اٹھا کر کہا۔ اس کی بڑی بڑی کالی آنکھوں میں اس وقت شنکر کو چار سونے کی چوڑیاں جگمگاتی ہوئی نظر آئیں۔

— — — —

آنچ

گربچن سنگھ

دفتروں میں ملازمت کرنے والی لڑکیاں اور ان کے "باس" یہ قصہ غور سے پڑھیں

ایک بھیس آدمی کی کہانی جسے پیار کی آنچ نے پگھلا دیا

ہم دونوں باس کے روم میں تھے۔ شام کے چھ بج چکے تھے اور سارا دفتر خالی ہو چکا تھا۔ سریش نے آج مجھے پکچر لے جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ میں اماں سے اجازت بھی لے آئی تھی۔ لیکن سب پلان فیل ہو گئے۔

باس پائپ سے دھواں اگلتے ہوئے کچھ کہنے کے موڈ میں تھا۔ اس نے کریم کلر کا فلالین کا سوٹ پہن رکھا تھا اور خوبصورت سی ٹائی لگا رکھی تھی۔ ٹائی کی پن میں لگا قیمتی پتھر ٹیبل لیمپ کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ جانے کیوں میری نظر اکثر ٹائی کی پن کے اس قیمتی پتھر پر ٹک جاتی ہے۔ میں غور سے اس کی طرف دیکھتی رہتی ہوں۔

کبھی کبھی باس مجھے کسی دلہن کی طرح دکھائی دینے لگتا ہے۔ ایسا دلہن جس کے ہونٹوں پر شرمائی سی مسکراہٹ ہوتی ہے۔ آنکھوں میں گہری چمک۔ کبھی وہ منہ میں گمبھیرتا کا گھونٹ نگلتا ہے تو کبھی رونی صورت بنا لیتا ہے۔

باس کاروباری ہوتے ہوئے بھی آرٹسٹک مائنڈ کا آدمی ہے۔ بات بڑے سلیقے سے کبھی ہنسی تماشا بھی کرتا ہے۔ اکثر اس کی باتیں بڑی دلچسپ ہوتی ہیں۔

دوپہر کے وقت جب میں اس کے کمرے میں آئی تو وہ میز پر رکھی ایک کتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھنے لگا: "کیا تم نے یہ کتاب پڑھی ہے..... ؟"

میں نے انکار میں سر ہلا دیا تو وہ بولا۔ "پڑھنا چاہو تو لے جا سکتی ہو۔"

وہ مجھ سے پوچھنے لگا، میں نے کس کس ادیب کو پڑھا ہے اور میرا پسندیدہ ادیب کون ہے؟

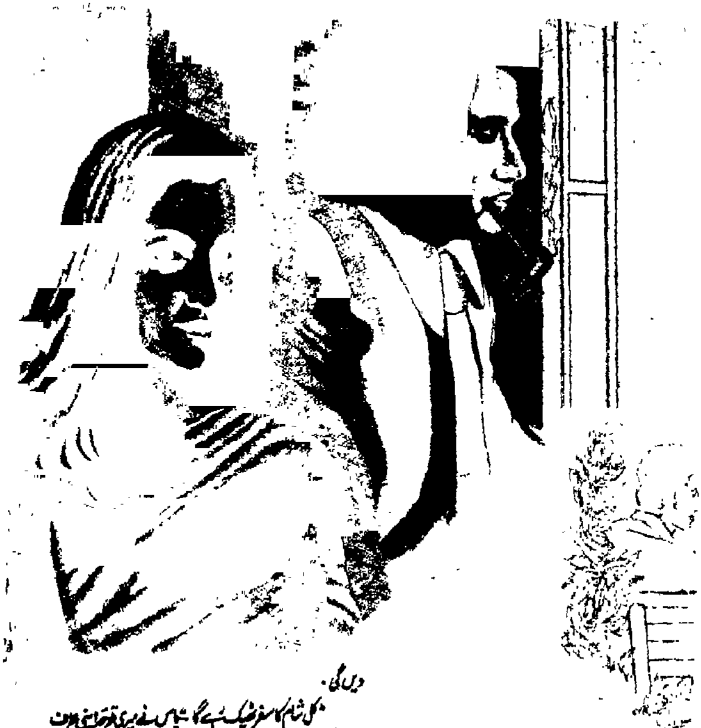
میں خاص کھل کر اس سے کچھ نہیں بول سکی۔ جانے کیوں میں اکثر معاملے میں اس سے مرعوب ہو جاتی ہوں۔

وہ میرا باس ہے۔ فرم کا منیجر بھی اور مالک بھی۔ ادھر چند دنوں سے میں خاص طور پر اس سے امپریسڈ ہوں۔ ایک طرح سے اس کی پرسنل اسسٹنٹ یا سیکریٹری کے، جو بھی سمجھ لیا جائے فرائض انجام دے رہی ہوں۔

سریش باس کا خاص آدمی ہے۔ دوسرے لفظوں میں باس اس کی سنتے ہیں۔

سریش کی میں بہت ہی ممنون ہوں۔ اس کی سفارش سے ہی مجھے نوکری ملی ہے۔ نوکری کے سوا میرے لئے کوئی چارہ نہیں ہے۔ میرے سورگباشی باپ کی بھی یہی خواہش تھی میں کوئی نوکری کروں لیکن میری ماں اس کے حق میں نہیں تھی۔

اچانک باس نے میری طرف غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں میٹھی میٹھی چمک سی تھی۔ چہرے کو گمبھیر بنا کر سریش کی طرف دیکھنے لگا، پائپ کے دو چار کش کھینچے، دھواں اگلتے ہوئے کہنے لگا: "کل تمہیں میرے



تھوڑا سا نیچے چلنا پڑے گا۔"

اس جملے نے مجھے چونکا سا دیا۔ "مجھے اس کے ساتھ ... جانا
پڑے گا ..... وہ کیوں؟ بھلا وہاں کیا کام ہے ..... ؟"

"جی میں ..." کہتے کہتے رُک کر میں مرلیش کی طرف دیکھنے لگی۔
مرلیش کے چہرے پر ہنسی کے آثار تھے اور اس نے میری
... کوئی توجہ نہیں دی۔

"دفتر کے کام میں ... اپنے ساتھ ... ناپسند کروں گا۔"
اس نے میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ "مرلیش ہمارے ساتھ
... گا۔"

"لیکن میں ..." آگے کچھ کہتے کہتے میں رُک سی گئی۔ سمجھ
میں نہ آیا، میں کیسے جا سکوں گی۔ ماں مجھے جانے کی اجازت نہیں
دیں گی۔

"کل شام کا سفر ٹھیک رہے گا۔" اس نے میری توجہ اپنی طرف
مبذول کی اور دوسرے ہی لمحے مرلیش سے کام دھندے سے متعلق کچھ ضروری
کاغذات کا جائزہ لینے بیٹھا۔

مالک ... کا کاروبار ہے۔ وہ ادھر بہت کم جاتا
ہے اسے اپنے ضروری کاروبار کو سنبھالنے سے فرصت ہی کب ملتی ہے۔

میری نظر پھر اس کی ہتھیلی سے ہیرے کی طرف چلی گئی۔
ایک ... چمکدار ہیرا ہے۔ اور دوسرے ہی لمحے سوچنے لگی۔ یہ ایک
... کاروبار کتنی محنت سے سنبھالتا ہے۔

اس نے میری طرف دیکھا اور بولا۔ "اب تم جا سکتی ہو۔"

میں اس کے کمرے سے نکل کر اپنے روم میں آ گئی۔ مرلیش بھی
اسی روم میں بیٹھا کرتا ہے۔ دیکھا اس کی کرسی پر کوئی بیٹھی ہوئی ہے کام
فرصت ہو تو وہ بھی کبھی میرے پاس آ کر بیٹھ جایا کرتی ہے۔ باتوں باتوں
میں وہ اکثر سوال کر بیٹھتی ہے۔ "کوئی خاص بات ہو تو بتاؤ؟"

اس کا اشارہ میری سمجھ میں نہیں آتا ... جانے کیوں ... مرلیش



سے شناسا نہیں ہیں۔ شاید مجھ سے بھی ہوں۔ پہلے شاید سرلش کا اس سے کوئی افیئر چل رہا تھا۔ میرے آنے سے اس کا رُخ بدل گیا۔ سرلش کچھ نہیں بتاتا۔ اس کا الکا سے کس حد تک میل جول رہا ہے۔ کبھی کبھی میرے دماغ میں ایک پریشانی سی گھر کر جاتی ہے۔

میں چند ہی دنوں میں اپنے آپ کو سرلش کے بہت قریب محسوس کرنے لگی ہوں۔ ماں کو بھی وہ بہت اچھا لگتا ہے۔

اوہ! الکا کس لئے یہاں بیٹھی ہے جاتے تو اب تک دفتر سے لے جانا چاہیے تھا۔ میک اپ روم میں بن سنور کر آنے کے باوجود الکا کے چہرے پر تازگی اور نکھار نہیں آ سکا ہے۔

"الکا تم اس قدر اداس کیوں ہو... کس کا انتظار ہے تمہیں؟"

"مجھے تمہارا ہی انتظار تھا۔"

"کیا بات ہے بڑی؟"

"کیا تم باس کے ساتھ کہیں باہر جا رہی ہو؟"

"شاید جانا پڑے۔ لیکن..." کچھ رک کر میں نے پوچھا۔

"تمہیں کیسے پتہ چلا؟"

"میں نے باس کے روم کے پاس کھڑے ہو کر سب کچھ سنا ہے تم بھی ساتھ جاؤ گی نا؟"

"ہاں تو...؟"

الکا کسی سوچ میں ڈوب گئی۔ چند لمحے بعد بولی: "مجھے بھی ایک بار باس کے ساتھ وہاں جانا پڑا تھا۔"

"کیسی جگہ ہے وہ...؟" کچھ دلچسپی لیتے ہوئے میں نے پوچھا۔

"جاؤ گی تو سمجھ جاؤ گی۔" الکا نے کچھ طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔

"کتنے دن رہنا پڑا تھا وہاں...؟" میں نے کھسیا کر پوچھا۔

"جتنے دن باس نے ٹھہرنا تھا۔"

یہ بھی میرے سوال کا سیدھا جواب نہیں تھا۔ وہ کچھ رازدارانہ انداز میں بول رہی تھی۔ اس سلسلے میں میں نے اس سے اور کچھ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔ میں پھر سوچنے لگی۔ باس کے ساتھ میرا جانا کیسے ممکن ہو سکے گا۔

اس دوران الکا بہکنے لگی۔ "سرلش پر تمہیں بہت بھروسہ ہے نا؟ لیکن..." وہ کچھ کہتی کہتی رک گئی۔ اور میری طرف اداس آنکھوں سے دیکھ کر بولی: "ہو سکے تو نہ جاؤ۔ وہ جگہ اچھی نہیں۔"

میری سمجھ میں نہیں آیا میں اس سلسلے میں اس سے کیا کہوں۔

وہ کرسی پر سے اٹھتی ہوئی بولی: "چلنا نہیں ہے کیا؟ اوہ سرلش کا انتظار ہو گا تمہیں۔ اچھا میں چلی۔"

میں اس کا کمرے سے باہر نکلنا دیکھتی رہی۔

تھوڑی ہی دیر میں سرلش بھی آ گیا: "اب سینما کا وقت تو نکل گیا۔ چلو نیو مارکیٹ ہوتے ہوئے گھر چلتے ہیں۔"

"چلو!" کہتی ہوئی میں اس کے ساتھ ہو لی۔

سڑک پر آتے ہی میں نے پوچھا: "رانی گنج جانے کے بارے میں تم نے کیا فیصلہ کیا...؟"

"میں کچھ پریشان ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ جانے سے متعلق میرے بارے میں کوئی فیصلہ کر سکنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ میں نے کہا: "تم بھی تو میرے ساتھ چلو گے ہی۔"

"اگر میرا جانا رک جائے تو...؟"

اس نے مجھے چونکا سا دیا: "وہ کیسے؟" میں نے قدرے تعجب سے پوچھا۔

"ممکن ہے باس مجھے اپنے ساتھ لے جانے کا ارادہ بدل دے۔"

"تو میں بھی نہیں جاؤں گی۔"

"جانا نہ جانا اپنے بس کی بات نہیں۔"

میرے دل میں مایوسی گھر کر گئی۔ بات کا رُخ بدل کر میں نے پوچھا: "نیو مارکیٹ میں کیا خریدنا ہے؟"

"کوئی چیز پسند آئی تو خرید لیں گے۔"

میں کوشش کرنے پر بھی کسی دوسرے موضوع پر گفتگو نہیں کر سکی اور بولی: "اماں مجھے شہر سے باہر اور کہیں جانے کی اجازت نہیں دیں گی۔"

اس نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا: "دفتری معاملات میں اماں کا نہیں باس کا حکم چلتا ہے۔"

کبھی کبھی سریش کی باتوں میں بڑی گھٹی ہوتی ہے۔ اس کا برتاؤ بالکل غیر آدمی جیسا ہوتا ہے۔ نہ جانے میں کیسے سب کچھ برداشت کر لیتی ہوں۔ شاید اس لئے کہ اس کا مجھ پر بہت بڑا احسان ہے۔ واقعی ان دنوں میں بیکاری سے تنگ آ گئی تھی۔ جب سریش نے باس کو بڑی سفارش کر کے نوکری دلوائی تھی۔ اس احسان کو کیسے بھولوں۔ سریش اچھا لگتا ہے مجھے تنہائی کا ساتھی۔

سریش بھی ابھی تک بے ترتیب زندگی جی رہا ہے۔ ابھی تک شادی نہیں کی۔ رشتے کی ایک موسی ہی گھر کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ بھلا وہ کب تک گھر سنبھالے گی۔ کب تک سریش کی دیکھ بھال کرے گی۔ نہ جانے کیوں اس کے متعلق اتنا سوچتی ہوں۔ سریش کیا کچھ بھی نہیں سمجھتا۔

ہم مارکیٹ کی طرف پیدل ہی چل دیئے تھے۔ سریش اپنے کپڑوں میں ایک پیاری سی خوشبو لگایا کرتا ہے۔ صبح کے وقت وہ خوشبو بڑی بھینی اور بہت اچھی لگتی ہے۔ اب بھی اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے میں وہی خوشبو محسوس کر رہی تھی۔ اس کی باتوں کی تلخی کو بھی میں بھول جانے کی کوشش میں تھی۔ اس دوران اس کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے میں نے کہا: "تم ہی کہو میرا کریئر میں جانا کیسے ممکن ہو سکے گا؟"

اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا: "تمہیں تو خوش ہونا چاہئے۔ باس کے ساتھ باہر جانے کا موقع مل رہا ہے۔"

"لیکن تم تو میری مجبوری جانتے ہی ہو!"

"یہ میرے بس کی بات نہیں کہ میں تمہیں جانے سے روک سکوں۔"

"تو کیا تم آنکھ موند کر مجھے کنوئیں میں دھکیل دو گے۔"

سریش کچھ بوکھلا کر بولا۔ "مطلب؟"

"تم کیا کچھ نہیں سمجھتے....؟"

سریش نے کوئی جواب نہیں دیا۔

مارکیٹ تک پھر کوئی خاص بات نہیں ہو سکی۔ وہ مجھے فاؤنڈ فیشن ہاؤس میں لے گیا۔ سیلز مین سے نئے ڈیزائن کی فیشن کی ساڑیاں دکھانے کو کہا۔

ایک پیازی رنگ کی ساڑی مجھے دکھاتے ہوئے بولا۔ "کیا تمہیں یہ پسند ہے؟"

"اس کی ضرورت ہی کیا ہے؟" میں نے روکھے پن کا اظہار کیا۔

"مجھے تو پسند ہے...." کہتے ہوئے اس نے سیلز مین سے ساڑی پیک کر دینے کو کہا۔

سریش پہلے بھی مجھے دو ساڑیاں پریزنٹ کر چکا ہے۔ میں نے انہیں خوشی سے قبول کر لیا تھا۔ لیکن شاید اسے قبول نہ کر سکوں۔ میں ایسا کچھ سوچ ہی رہی تھی کہ کاؤنٹر پر جا کر اس نے بل بھی چکا دیا۔

سیلز مین نے پیکٹ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ جب فیشن ہاؤس سے ہم باہر نکل رہے تھے تو میں نے کہا۔ "تم سے ایک بہت ضروری بات کرنی چاہتی ہوں سریش....."

"کہو...." اس نے ایک سگریٹ سلگاتے ہوئے پوچھا۔

"یہاں نہیں کہیں بیٹھ کر بتاؤں گی۔"

"تو چلو کافی ہاؤس۔"

"وہاں رش ہو گا۔"

"تو ٹھیک ہے۔ چلو آؤ نیرو چلیں۔"

نیرو کے رس گلے اور آئس کریم مشہور ہے۔ ہم وہاں ایک کیبن میں بیٹھ گئے۔

سریش نے پوچھا: "رس گلے کھاؤ گی یا آئس کریم؟"

"کچھ نہیں۔ میرا کچھ کھانے کو من نہیں کر رہا تھا۔"

"کیوں....؟"

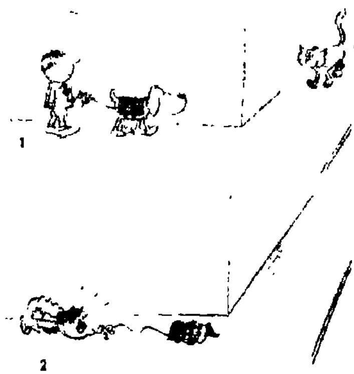
"میری طبیعت ٹھیک نہیں چل رہی ہے۔"

"وجہ....؟"

"یونہی...."

"تو پھر یہاں بیٹھنے سے فائدہ!"

> دو آدمی لڑ رہے تھے۔ بات ابھی تو تو میں میں تک ہی تھی۔ ہاتھا پائی نہ ہوئی تھی۔ آخر ایک شخص کو غصہ آیا۔ بولا۔ "تم اپنے آپ کو سمجھ کیا رہے ہو! تمہیں ابھی میرا پتہ نہیں۔ ایک ہی گھونسہ مار کر بتیس کے بتیس دانت باہر نکال دوں گا۔"
>
> ایک اور آدمی نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "مان گئے بھئی تمہاری بہادری کو! لیکن دانت تو بتیس ہوتے ہیں، تم چونتیس کیسے نکالو گے!"
>
> وہ شخص دانت پیستا ہوا بولا۔ "مجھے پتہ تھا تم درمیان میں ضرور بولو گے۔ اسی لیے میں نے تمہارے بھی دو دانت شامل کر لیے تھے۔"
>
> مرسلہ۔ نبیلہ ملک۔ لاہور



1

2

"اچھا تمہارا جو جی چاہے منگا لو۔"

سریش نے اپنے لئے کافی منگوائی اور میرے لئے آئس کریم۔ آئس کریم مجھے بہت پسند ہے۔ لیکن کھانے لگی تو وہ میرے حلق سے نیچے نہیں اتر رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میں زبردستی دوا نگل رہی ہوں۔

"ہاں کہو کیا کہنا چاہتی ہو؟" سریش نے کافی سپ کرتے ہوئے سوال کیا۔

"میں کہنا چاہتی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔" کہتے کہتے میں رک سی گئی۔

"کہو۔ چپ کیوں ہو گئیں؟"

"باس اچھا آدمی نہیں ہے۔"

"ہاں۔ تم نے کیسے جانا۔ ۔ ۔ ۔ ؟" سوالیہ نظروں سے اس نے میری طرف دیکھا۔

"الکا نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔" کچھ ہمت کر کے میں نے کہا۔

"کیا۔ ۔ ۔ ؟" پیالی اس کے ہونٹوں تک جاتی جاتی رک سی گئی۔ اس کی آنکھیں بکھرنے لگیں۔۔۔ اس وقت مجھے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے پریم اور محبت کی بجائے قہر کے انگارے دہکتے دکھائی دیئے۔ میں ڈر سی گئی۔ لمحہ خیز لہجے میں میں نے کہا۔ "خاص کچھ نہیں۔ یہی جو میں ابھی تمہیں بتا چکی ہوں۔"

وہ آنکھیں جھکا کر چپ چاپ کافی پینے لگا۔ میں آئس کریم کی پیالی میں بے مطلب چمچ گھماتی رہی۔ آئس کریم رفتہ رفتہ پگھل کر دودھ کی طرح چکنی پڑتی جا رہی تھی۔

اس کی نظریں سامنے ایک کیبن کی طرف گڑی ہوئی تھیں۔ وہاں سامنے میں بیٹھی ہوئی دو ماڈرن لڑکیاں سرگوشی کے انداز میں ایک دوسرے کی طرف جھک کر باتیں کر رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ انہیں پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

چند لمحے میں بھی ان کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر نہ جانے کیسے میرے منہ سے نکل گیا۔ "کیا وہ تمہاری جان پہچان کی ہیں؟"

"کون۔ ۔ ۔ ؟" اچانک اس کا دھیان میری طرف ہو گیا۔

"نہیں تو۔" اور کافی کی پیالی منہ سے لگا لی۔ شاید مجھے اسے یوں نہیں چونکانا چاہئے تھا۔

بیرے نے آکر پوچھا۔ "اور کچھ چاہیے؟"

میں نے کہہ دیا۔ "نہیں۔"

نیرجا کے اندر کافی گہما گہمی ہو چلی تھی۔ شاید بیرا ہمیں کرسیاں خالی کرنے کا اشارہ دے گیا تھا۔ سریش نے کافی کی پیالی خالی کر لی تھی۔ میرے پیالے کی آئس کریم قریب قریب دودھ میں بدل گئی تھی۔ اس پر ننھے ننھے چھوٹے چھوٹے بلبلے سے ابھر آئے تھے۔

"چلو چلیں۔ ۔ ۔ ۔"

بل چکا کر نیرجا سے باہر نکلے تو شام رات میں بدل چکی تھی۔ سڑک پر پھیلی جگمگاتی ہوئی بتیوں کی روشنی دھاریوں میں کھری کھری سی لگ رہی تھی۔ چلتی پھرتی بھیڑ بڑی اجنبی اور غیر متعلق سی تھی۔ سریش ابھی پریشان لگ رہا تھا۔ اس کی خاموشی اور بھی پراسرار تھی۔ میں نے اس طلسم کو توڑنے کی غرض سے کہا۔ "آج تو ہمارے سینما چلنے کا پروگرام تھا نا۔"

اس نے اس جملے کا کوئی رسپانس نہیں دیا۔

"ٹکٹیں تو ایڈوانس بک کروائی ہوئی تھیں نا؟"

پھر بھی کوئی جواب نہیں ملا۔

"اچھا ہوتا اگر یہ ٹکٹیں دفتر میں کسی اور کو دے دیتے۔"

چلتے چلتے سریش ایک ایسی جگہ رک گیا جہاں روشنی کچھ دھندلی تھی۔ اس نے سگریٹ سلگایا۔ لائٹر کی ہلکی روشنی میں اس کے چہرے کے جذبات چھپے نہیں رہ سکے۔ وہ پریشان اور اداس نظر آ رہا تھا۔

سگریٹ سلگا کر اس نے مجھ سے پوچھا۔ "کہاں چلنے کا خیال ہے؟" اور جواب کا انتظار کئے بغیر وہ خود ہی بولا۔ "چلو تمہیں گھر تک چھوڑ آؤں۔"

"گھر تک" کا لفظ مجھے بڑا عجیب سا لگا۔ وہ کئی مرتبہ مجھے گھر چھوڑنے گیا ہے، چائے اور ناشتے کے بعد لوٹا ہے۔ ماں کے کہنے پر گھنٹوں گھنٹوں بیٹھا بھی ہے۔ رات کھانا کھا کر ہی وہاں سے آنے کی نوبت آئی ہے لیکن اب گھر تک چھوڑ آنے کا کیا مطلب تھا۔ کیا وہ مجھے کافی ہاؤس تک

ہی چھوڑ آئے گا اور باقی کا غرق کاؤنٹر کلرک کا منہ بند کرنے کے لیے کرنا پڑے گا۔ میں نے پوچھا مگر تم کیوں چھوڑ آئے۔ کیا تمہیں کہیں جانے کی جلدی ہے۔۔۔؟"

"نہیں کوئی ایسا خاص پروگرام نہیں۔"

"تو پھر تم میرے ساتھ گھر کیوں نہیں چلتے؟"

"میں گھر جانا چاہتا ہوں۔ تفریح چاہتا ہوں۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ [illegible] ساتھ دے سکتی ہوں۔ [illegible] میں

بینا چاہنے کے بعد ہی کہہ سکتی ہوں۔"

وہ سگریٹ کے کش لگاتا ہوا خاموشی سے آگے بڑھنے لگا۔ میں بھی چپ چاپ اس کے ساتھ چلی۔ اس کے ساتھ زندگی گزارنے کا خیال مجھے دل ہی دل میں گدگدا رہا تھا۔

ٹیکسی اسٹینڈ کے قریب پہنچ کر اس نے ٹیکسی کو اشارہ کیا اور ہم اس میں بیٹھ گئے۔ اس نے ڈرائیور سے ایک ہوٹل کی طرف چلنے کو کہا۔

ٹیکسی بازاروں کو پار کرتی ہوئی باہر کے کھلے علاقوں میں آ گئی تھی۔ اس طرف ایک ایک دو دو فرلانگ کے فاصلے پر بنگلے بنے ہوئے تھے جن کی کھڑکیوں میں سے چھنتا ہوا اندھیرا اور خاموشی بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ سڑک سیدھی اور سپاٹ تھی جس پر ٹیکسی برق رفتاری سے دوڑی چلی جا رہی تھی۔ میں نے اس کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا، وہ ہاتھ کافی گرم تھا۔

مجھے برابر میں بیٹھا کر گھومنا بڑا اچھا لگتا ہے۔ کبھی میں نے ایک خواب دیکھا تھا۔ اگر میرے پاس ڈھیر سارے روپے ہوں تو میں ایک کار خریدوں اس میں خوب سیر کروں۔ بالکل بچپنا تھا لیکن وہ پرانے سپنے کا جیسے اب [illegible] ہی اٹھتے ہیں۔

میں محسوس کر رہی تھی کہ رفتہ رفتہ اس کے ہاتھ کی گرفت مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ سخت اور سخت یہاں تک کہ میں درد محسوس کرنے لگی مگر زور لگا کر مجھے اپنا ہاتھ چھڑانا پڑا۔

میں دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر شکن کے آثار ابھر رہے تھے۔ وہ چپ چاپ سامنے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھ سے کوئی بات کرنے کی اسے خواہش ہی نہیں تھی۔ ٹیکسی ایک سنسان سڑک پر مڑ چکی تھی [illegible] بنگلوں سے [illegible] ایک [illegible] تھا۔ [illegible]

بیسویں صدی کی انسانیت

یہ عظیم سیاست دانوں، جاگیرداروں، سرمایہ پرستوں سماج کے ٹھیکیداروں اور طاقت کے بل پر [illegible] کی حاکمیت کو تحریر کیا ہے جو کہ اب چند دنوں کے لیے اتنی شاعروں، مزدوروں اور چھوٹا ہوں کی یہ قوتیں کبھی تحریر کر کے دکھایا جائے تو کیا عجب ہے سینکڑوں سال سے ہم لوگ طاقتوروں کی [illegible] پہچانتے رہے ہیں اگر وہ گھڑی [illegible] دم ہے ہیں آ گیا ہوتا ہے۔ (کرشن چندر۔ [illegible])

خیال ہی نہیں تھا۔

تقریباً ایک گھنٹہ گھومنے کے بعد ٹیکسی ایک ریستوران کے سامنے رکی۔ ٹیکسی کے پیسے چکا کر وہ مجھے ریستوران کے اندر لے گیا۔ وہاں زیادہ لوگ نہیں تھے۔ کونے کونے میں چھوٹی چھوٹی میزوں کے قریب کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ہم ایک کونے میں بیٹھ گئے [illegible] والا بیرا آ گیا۔ [illegible] کی طرف [illegible] بالکل ایک [illegible] سامنے [illegible] تھا۔

اس نے مجھ سے پوچھا۔ "کیا کھاؤ گی۔۔۔؟"

خواہش نہ ہونے پر بھی میں نے کہا۔ "کوئی چائے منگوا لو۔"

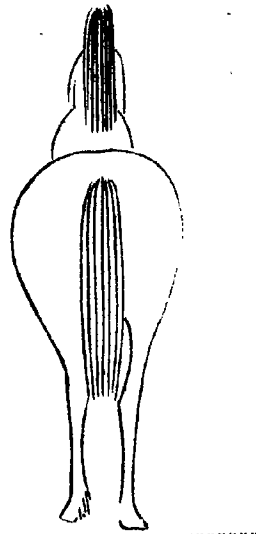
اس نے بیرے سے دو چائے لانے کو کہا اور ساتھ ہی [illegible] دیا۔

میں جانتی ہوں [illegible] لیکن اس نے [illegible]

"میری باتیں تمہیں بری لگ رہی ہیں؟"

وہ چپ رہا۔

بیرا [illegible] سامان میز پر رکھ گیا تھا۔



مٹن چانپ کی پلیٹ میری طرف کھسکا کر وہ گلاس میں سوڈا ڈالنے لگا۔

میں نے پوچھا: "کیا تم چانپ نہیں لوگے؟"

اس نے ایک چانپ اٹھا لیا۔

میری کچھ کھانے کی خواہش نہیں ہو رہی تھی۔ پھر بھی ساتھ دینے لگی۔ وہ وسکی سپ کرنے لگا۔ کچھ لمحوں میں اس نے گلاس خالی کر دیا۔ پھر اس نے دوسرے پیگ کا آرڈر دیا۔ میں معنی خیز نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے وہ گلاس بھی خالی کر دیا۔ پھر تیسرے پیگ کا آرڈر دیا۔

جی چاہا اسے اور پینے سے روکوں۔ لیکن کچھ بولنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ میں نے اس کی بانہہ پکڑ لی۔

وہ آہستہ سے مسکرایا: "کیا بات ہے؟"

میں نے آہستہ سے کہا: "اور مت پیو۔"

"کیوں؟" اس کی آنکھوں سے جیسے سوال نکل رہا تھا۔

"مجھے ڈر لگتا ہے۔"

وہ آہستہ سے ہنسا اور تیسرا گلاس بھی یوں چڑھا گیا جیسے کوئی پیاسا ٹھنڈا پانی پی کر اپنی تشنگی دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

مجھے اس کی آنکھوں کو دیکھ کر ڈر لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ابھری ہوئی پسینے کی بوندیں اسے بھیانک بنا رہی تھیں۔ مجھے لگ رہا تھا میرے سامنے ایک غیر آدمی بیٹھا ہوا ہے۔ بالکل ناواقف۔ یہ وہ سریش نہیں جس کے احسانوں تلے میں دبی پڑی ہوں۔ جس کی میں دل سے عزت کرتی ہوں۔ سریش نہیں، سریش کا سایہ میرے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔

چانپ یونہی پڑے تھے۔ نہ کھانے کا خیال، نہ خواہش۔ اس نے بھی کوئی توجہ نہیں دی۔ بیرے سے بل لانے کو کہا۔

جب بل آگیا تو پیسے چکا وہ مجھے ساتھ لئے ریستوران سے باہر آگیا۔ کچھ نظریں ہمیں گھور رہی تھیں۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ وہ مجھے شاید کوئی کرایہ کی عورت سمجھ رہے تھے اور سریش کو . . . . . وہ میرے ساتھ کچھ ہٹ کر چل رہا تھا اور میں اس کا کچھ بوجھ سا محسوس کر رہی تھی۔

وہ جھیل کے ایک تاریک گوشے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جہاں تنہائی تھی اور سناٹا۔ وہاں سانپ، بچھو اور کسی بھی کیڑے مکوڑے کا ڈر ہو سکتا تھا۔ میں نے کہا: "ادھر کہاں لئے جا رہے ہو؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بلکہ مجھے ہاتھ سے پکڑ کر کھینچتا ہوا اس طرف لے گیا۔ میں نے تھوڑی سی حجت کی۔ لیکن اس کے مضبوط ہاتھوں کی پکڑ کے سامنے مجبور ہو گئی۔ اس نے مجھے سیمنٹ کے ایک بنچ پر بٹھا دیا۔ بنچ اوس سے بھیگی ہوئی تھی۔ نیچے گیلے پن کا احساس ہوا۔ ساڑی بھیگ سی گئی۔

تاریکی میں میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں چنگاریوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ مجھے اس سے اور بھی ڈر لگنے لگا تھا۔ میں نے کانپتی ہوئی آواز میں اس سے پوچھا: "تم مجھے یہاں کس لئے لائے ہو سریش . . . . ؟"

اس نے دونوں ہاتھوں سے میری گردن دبوچ لی اور کرخت لہجے میں بولا: "تمہارا گلا گھونٹنے کے لئے۔"

"کیوں . . . . ؟"

"میں تمہیں مار ڈالنا چاہتا ہوں۔" اس کی پکڑ مضبوط ہو گئی۔

"کیوں۔ مجھے کیوں مار دینا چاہتے ہو؟"

"اس لئے کہ تمہاری وجہ سے مجھے . . . . " وہ کچھ کہتے کہتے رک سا گیا۔ اس کے ہاتھوں کا دباؤ ڈھیلا ہو گیا تھا۔

"میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے . . . . ؟" بڑی مشکل سے میں نے یہ جملے ادا کئے۔

"تم ابھی لڑکی نہیں ہو۔"

اتنا سنتے ہی جانے کہاں سے میرے اندر ایک قوت عود کر آئی۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کے ہاتھ جھٹک دیئے۔ "ایسا کہتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی۔"

میں نے دیکھا اس کا بدن کانپ رہا تھا۔ وہ بولا: "میں جھوٹ نہیں کہتا۔"

میں نے غصے میں پوچھا: "تم نے میری کیا برائی دیکھی ہے۔"

"تم لڑکیاں ۔۔۔۔! برائی کے بیج تمہاری نس نس میں پرورش پاتے ہوتے ہیں۔"

"چپ رہو ۔۔۔۔" میں غصے میں کانپنے لگی۔ "میں نہیں جانتی تھی کہ تم اس قدر گر کر سوچ سکتے ہو۔ اماں ٹھیک ہی کہتی تھی۔"

"کیا کہتی تھی اماں ۔۔۔۔؟" اس کے لہجے میں تیزی آگئی۔

"کہ تم باس کے دلال ہو۔"

"اماں کا خیال ٹھیک نہیں ہے۔ لیکن تم۔" وہ رک کر بولا: "کیا سچ مچ باس کے ساتھ رات گزارنے نہیں جانا چاہتی ہو؟"

"نہیں۔" میں چیخ پڑی۔ "لیکن تم تو ضد کر کے مجھے اس کے ساتھ بھیجنا چاہتے ہو۔" یہ کہتے ہوئے مجھے رونا آگیا۔

"میں ۔۔ میں ۔۔" وہ بولنے لگا، وہ کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن فیصلہ کرنے سے مجبور ہے کہ کیا کہے۔

چند لمحے بعد وہ کچھ ہچکچاتا ہوا بولا: "میری سمجھ میں نہیں آتا میں کیا کروں ۔۔؟"

"تم باس سے میری مجبوری بیان نہیں کر سکتے؟"

"وہ مانے گا نہیں۔ وہ مالک ہے اور ہم اس کے نوکر۔"

"تب کیا ہوگا؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

مجھے آس پاس کا ماحول بوجھل محسوس ہونے لگا تھا۔ ہوا میں ڈوبتی اور سرسراتی ہوئی درختوں کی شاخیں اور پتے، جھاڑیوں میں سے آتی ہوئی کھڑکھڑاہٹ، سبھی کچھ بہت برا لگ رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

کچھ دیر ہمارے درمیان خاموشی سی چھائی رہی۔ اس چپ کو توڑتے ہوئے میں نے کہا: "کیا تم میرے ساتھ رات گزارنے چلو گے؟"

"باس اس کی اجازت کبھی نہیں دے گا۔"

"تو پھر ۔۔۔۔؟"

"صرف ایک طریقہ ہے۔"

"وہ کیا ۔۔۔؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"تم کل سے دفتر جانا چھوڑ دو۔"

"ہوں ۔۔۔۔" میرے دل میں ایک دھکا سا لگا۔ "کتنے دنوں کے لئے چھوڑ جاؤں۔"

"جب تک اپنی عزت پیاری ہے۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں نوکری چھوڑ دوں؟"

"ہاں۔"

"لیکن ماں ۔۔۔۔ چھوٹا بھائی ۔۔۔۔" میرا گلا بھر آیا۔ "نہیں یہ نہ ہو سکے گا۔"

"میں تمہارے لئے ایک اور جگہ تلاش کر دوں گا۔"

میں نے محسوس کیا اب تک کی ساری باتوں کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ کہنے سننے کو اب کوئی بات نہیں رہ گئی ہے۔ ایک الجھا ہوا مسئلہ حل ہو گیا ہے۔

کچھ دیر ہم خاموش بیٹھے رہے پھر وہ اٹھتا ہوا بولا۔ "چلو!"

میں بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ مجھے لگا اس کا نشہ اتر گیا ہے۔

سڑک پر چلتے چلتے میں نے اس سے پوچھا: "باس کی ملازمت کیا تمہیں اچھی لگتی ہے؟"

اس نے جواب دیا: "مجھے اس کے پیسے ملتے ہیں۔"

"تم یہ نوکری چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟"

"میری نوکری آج سے چھوٹ چکی ہے۔"

اس کے الفاظ نے مجھے چونکا دیا۔

"کیسے ۔۔۔۔ کیوں ۔۔۔؟"

"تمہارے لئے ۔۔۔۔" وہ غمگین لہجے میں بولا۔ "آج باس سے جھڑپ ہو گئی تھی۔ مجھے یا تو تمہیں چھوڑنا پڑے گا یا پھر نوکری سے کنارہ کش ہونا پڑے گا۔"

چلتے چلتے میں نے پھر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ پاس سے گزرتی ہوئی ایک ٹیکسی رکی۔ ڈرائیور نے باہر جھانکتے ہوئے پوچھا: "صاحب اب واپس چلو گے؟" یہ وہی ٹیکسی والا تھا جو ہمیں یہاں تک چھوڑ گیا تھا۔ ہم ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ ڈرائیور نے کچھ مسکرا کر ہمارے ملاپ کو شرارت بھری نظروں کی طرف دیکھا۔ اس کی شریر نگاہیں جیسے کہہ رہی ہوں ۔۔ بس مُک گئے جھگڑے ۔۔ اور ٹیکسی آگے بڑھ گئی۔

"دوشیزہ" کا انعام یافتہ
رومانی گھریلو ناول

قسط نمبر (۱۴)

جلتے پھول

عظمت عزمی

ستارا اپنے والدین کی چوتھی بیٹی تھی۔ اس کی ماں لڑکے کی تمنا میں بیٹیوں کو جنم دے دے کر تھک چکی تھی۔ ستارا کی پیدائش سے پہلے وہ یہ آس لگائے بیٹھی تھی کہ اس بار ضرور لڑکا ہوگا۔ ستارا پیدا ہوئی تو ان پر دورے پڑنے لگے اور انھوں نے اسے منحوس قرار دے کر اپنے پیار سے محروم کر دیا۔ ستارا ماں کی محبت کی ایک نظر کے لیے ترستی ہوئی بڑی ہو گئی۔ باپ بیوی کے اس سلوک سے جو وہ ستارا سے کرتی تھی دکھ محسوس کرتا تھا۔ اس نے بیٹی کی محرومی مٹانے کے لیے اس کی ہر خواہش پوری کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ستارا کو حسن اور ذہانت دونوں سے قدرت نے نوازا تھا۔ اس کے پاپا نے اسے پڑھانے کا بیڑا اٹھایا۔ ماں یہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی دوسری بیٹیوں کے مقابلے میں ستارا زیادہ تعلیم حاصل کرے لیکن اس کی ہر مخالفت شوہر کی ضد کے آگے دم توڑ گئی۔ ستارا نے اپنے اسکول کی ایک شفیق ٹیچر مس معراج میں ماں کا پیار تلاش کیا۔ لڑکیوں نے ان کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کر دیں۔ مس معراج نے سرد مہری کا رویہ اختیار کر لیا۔ ستارا کا ننھا سا دل ٹوٹ گیا۔ اسے کسی کے پیار پر بھروسہ نہیں رہا۔ اس نے خودکشی کی ناکام کوشش کی۔ غلط فہمی دور ہو جانے کے بعد مس معراج اس کی عیادت اور معافی مانگنے آئیں مگر اب ستارا بدل چکی تھی۔ اس نے صرف تعلیم کو اپنی منزل بنا لیا تھا۔ اس نے محنت سے پڑھائی جاری رکھی۔ اپنے پاپا کی وجہ سے وہ کامیابی کی منزلیں طے کرتی گئی۔ اس کی دو بہنوں کی منگنی طے ہو گئی۔ ستارا کے لیے بھی ایک ڈاکٹر کا رشتہ آیا جو اس کی ماں کے نزدیک نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھا۔ وہ اس کی شادی کے لیے راضی ہو گئیں لیکن ستارا ڈاکٹر بننا چاہتی تھی اور پاپا اس کے حامی تھے۔ اسی بات پر گھر میں میاں بیوی کا جھگڑا رہنے لگا۔ ماں میٹرک کے بعد اس کی شادی کرنا چاہتی تھی مگر پاپا اسے کالج میں داخلہ دلانے پر مصر تھے۔ میٹرک فرسٹ ڈویژن کرنے کے بعد ستارا کو اس کے پاپا اپنی بیوی سے چھپ کر اپنے ایک دوست احباب صاحب کی مدد سے کالج میں داخلہ دلانے ان کے گھر گئے۔ جہاں احباب صاحب کے صاحبزادے ایاز نے انھیں قائل کر لیا کہ ستارا کو ڈاکٹری کی تعلیم دلانے کے لیے ضروری ہے کہ اسے لڑکوں کے کالج میں داخل دلایا جائے تاکہ اس کے اندر خود اعتمادی پیدا ہو جائے۔ اس کے پاپا پہلے راضی نہ ہوتے تھے لیکن احباب صاحب اور ایاز نے انھیں اونچ نیچ سمجھا کر اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ ستارا کو ایاز کے کالج میں داخل کرا دیں۔



تارا کالج میں داخل ہو گئی۔ وہ یہاں سہمی سہمی سی رہتی تھی کالج کے دوران طالب علم نواز احمد اور رفیق نے خاص طور پر محسوس کیا۔ یہ دونوں لڑکے بڑے اپنے طور پر تارا میں دلچسپی لینے لگے۔ نواز بھی تارا کو متوجہ کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہا تھا لیکن تارا نے اسے مایوس کر دیا کالج میں ہونے والے ٹیسٹوں کے دوران ر... تمیز نے تارا کی مدد کی جس سے تارا کے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ ہو گیا۔ اُدھر گھر میں تارا کی امی اس کے لیے ڈاکٹر کے رشتے کے بارے میں سنجیدہ ہو گئی تھی۔ تارا کے ابا نے انہیں ڈانٹ کر دور مشتعل کر دیا اسی دوران اس کے ابو بیمار پڑ گئے۔ تارا نے پرچے کی تیاری کے سلسلے میں نواز احمد سے ایک کتاب لی تھی ... بیماری کے دوران وہ کالج نہ جا سکی۔ اور رفیق بہانہ کر کے وہ کتاب لینے اس کے گھر آ پہنچا۔

دوسرے دن تارا کالج گئی تو اس کا منہ پھولا ہوا تھا۔ نواز معاملہ سمجھ گیا۔ وہ تارہ کی معصومیت سے پوری طرح گھائل ہو چکا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس لڑکی میں خود اعتمادی پیدا ہو جائے۔ کتاب والے واقعے سے تارا بہت غصے میں تھی۔ رفیق اپنی اس حرکت پر پشیمان تھا۔ تارہ اسے نظر انداز کرتی ہوئی چھٹی کے بعد کالج سے نکلی تو راستے میں نواز مل گیا۔ تارا نے راستہ بدلنا چاہا مگر نواز کی متاثر کن شخصیت اس پر اثر انداز ہو چکی تھی۔ اس کی ایک آواز پر تارہ کے قدم رک گئے۔ اور وہ اس کے حکم پر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ نواز کافی بہت دور لے گیا جس سے تارہ سہم کر رونے لگی۔ درحقیقت نواز اس کے دل سے بے جا خوف ختم کر کے اعتماد پیدا کرنا چاہتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی محبت اور نرمی کے برتاؤ سے تارہ میں جاگ گیا۔ اور جب تارہ اس سے مل کر آئی تو وہ خاصی بدلی ہوئی لڑکی تھی۔ جس نے ماں کے غصے کی بھی پرواہ نہیں کی۔ اس کے پاپا کو ڈاکٹر نے کینسر بتایا جس سے وہ بہت پریشان ہو گئی۔

وہ کالج جا کر ذہنی طور پر اپنی پریشانی بھول گئی۔ تارہ کی امی نے غصے میں اس کے گال پر گرم چمٹا رکھ دیا تھا۔ جس کی جلن کالج آنے کے بعد بڑھ گئی۔ نواز نے موقع پا کر اسے پرنسل کی ٹیوب لا کر دی۔ اور دو چار میٹھی باتیں کیں بعد اس کی ساری جلن جاتی رہی۔ نواز نے اس کے اندر جینے کا حوصلہ پیدا کر دیا تھا۔ کچھ عرصے بعد اس کی دونوں بڑی بہنوں عائشہ اور چاندنی کی شادیاں ہو گئیں۔ تارا نے زندگی میں پہلی بار سنگھار کیا۔ دیکھنے والوں کی آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ خوشیوں کے یہ دن بھی گزر گئے۔ تارا کے پاپا کی بیماری بڑھ گئی۔ نواز نے تسلیوں سے اسے پریشان نہ ہونے دیا۔ لیکن وہ منحوس وقت بھی جلد آ گیا۔ تارا کے پاپا نے دنیا سے منہ موڑ لیا۔ تارا ذہنی طور پر اس صدمے کے لیے تیار نہیں تھی۔ وہ بے ہوش ہو گئی۔ نواز جس نے اسے زندگی بھر کا رفیق بنانے کی قسم کھائی تھی اس کی حالت دیکھ کر اندر ہی اندر رو پڑا۔ جنازے والے روز بھی وہ اس کے گھر آیا رہا۔ تارا کچھ نیم دیوانی سی ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر نے سب کو سمجھا دیا تھا کہ اس کی دلجوئی کرتے رہیں ورنہ یہ پاگل ہو جائے گی۔ چاندنی اور عائشہ کچھ دن رہ کر اپنے اپنے گھر چلی گئیں۔ اب اس گھر میں تارا، ساجدہ اور امی رہ گئی تھیں۔

تارا نے کالج جانا شروع کر دیا۔ رضیہ بی نے ہزار کوشش کی کہ تارا گھر سے نہ نکلے۔ لیکن باپ کے مرنے کے بعد وہ ماں سے اور دور ہو گئی تھی۔ وہ ضرورت کالج ہی نہیں بلکہ نواز سے بھی ملی۔ پیاسی تارا نے نواز کے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائیں۔ اور اُدھر چوری چوری رضیہ بی نے ڈاکٹر احسن سے اس کا رشتہ پکا کرنے کی تیاریاں مکمل کر لیں۔ تارا سے عائشہ نے اس کی رائے پوچھی تو اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ نواز کے علاوہ کسی اور کو شریک حیات بنانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ اگر کسی نے زبردستی کی تو وہ گھر کی روایتوں کو توڑنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ تب رضیہ بی نے پہلی بار ... اس کی آرزو پوری کرنے کا وعدہ کیا۔ اور یوں تارا کی شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ رضیہ بی نے بتایا تھا کہ نواز کے گھر سے پیغام آیا تھا جسے منظور کر لیا گیا ہے۔ تارا خوشی سے دیوانی ہو گئی۔ تارا نے اس دوران ایک بھیانک سپنا دیکھا اور وہ چیخ کر اٹھ بیٹھی۔

اس نے خواب میں دیکھا تھا کہ اس کے مرحوم پاپا کے سفید بال گلیوں میں اڑتے پھر رہے ہیں۔ رضیہ بی نے خواب سن کر تعبیر دی کہ تمہاری وجہ سے تمہارے باپ کی رسوائی کا خطرہ ہے۔ بیٹیاں ہر قربانی دے کر اپنے مرحوم باپ کی لاج رکھتی ہیں۔ اور رضیہ بی کے ان لفظوں کا مطلب اس وقت کھلا جب نکاح کے وقت نواز کی جگہ ڈاکٹر احسن کا نام لیا گیا۔ تارا کو سکتہ سا ہو گیا۔ وہ دلہن بنی نواز کے سپنوں میں گم تھی کہ نکاح خواں نے ڈاکٹر احسن کے نام سے اس کی رضا مانگی۔ رضیہ بی نے مرحوم باپ کی عزت کا واسطہ دے کر اسے ہاں کرنے پر مجبور کر دیا۔ وہ صدمے سے بے ہوش ہو گئی۔ اور اسی نیم بے ہوشی میں اس کی رخصتی ہو گئی۔ ڈاکٹر احسن اپنی بے ہوش دلہن کو حجلۂ عروسی میں لے آیا۔ تارا کو ہوش آیا تو سیج سے اتر کر دوسرے کمرے میں ... ڈاکٹر احسن اس پر جھکا ہوا تھا۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ ڈاکٹر اب تک اس کی بے ہوشی کی وجہ اس کے پاپا کے انتقال کا صدمہ سمجھ رہا تھا۔ مگر تارا نے اس کا اندازہ جھٹک کر صاف کہہ دیا کہ اس کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے۔ اس کی ماں نے دھوکہ دے کر یہ شادی کی ہے۔ ڈاکٹر احسن ہکا بکا رہ گیا۔

تارا کی حالت گری ہوئی تھی ... اس نے ٹھنڈے دل سے اس کے جذبات کا تجزیہ کیا اور اس سے وعدہ کر لیا کہ وہ اس کے راستے سے ہٹ جائے گا۔ مگر ابھی کچھ دنوں اسے اس رشتے کو نبھانا پڑے گا۔ ... معلوم ہونے تک تعلقات کے اعتبار سے صرف دوست رہیں گے۔ اور اس طرح سہاگ رات کسی خوشی کے بغیر بیت گئی۔ تارا کی امی نے ... اپنی زیادتی کی معافی مانگی انھوں نے بتایا کہ سب کچھ انھوں نے اس کی بہتری کے لیے کیا ہے۔ ... اس دوران اس کا ... گیا۔ اور اس کے کچھ دیر بعد نواز بھی ...

رشتہ کیا۔ احسن تو صرف کے رشتے سے ہی کا پابند تھا۔ شادی میں نواز شریک نہیں ہو سکا تھا اسے سوچ نہیں تھا کہ تمارا احسن کی دلہن بن رہی تھی سب۔ وہ شرافت کا تقاضا اپنا تعارف کرانے کے بجائے ایک پستول لے کر دلہن کے کمرے میں پہنچا۔ وہاں ڈاکٹر احسن کو دیکھ کر وہ ہکا بکا رہ گیا۔ تمارا اسے دیکھ کر بکھر گئی۔ مگر وہ یہ صدمہ برداشت نہ کر سکا اور بجھے دل سے خاموشی سے باہر نکل آیا تب اس کے دوسرے ساتھی تمارا کے کمرے میں آئے۔ تمارا اس صدمے سے بری طرح بکھر گئی تھی۔ وہ سب اسے دہشت زدہ دیکھ کر گھبرا گئے۔

تمارا نے انھیں بہلا دیا۔ اب تمارا کسی نہ کسی انداز سے نواز کی غلط فہمی دور کرنا چاہتی تھی۔ وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ اس کی شادی زبردستی ہوئی ہے۔ نواز بہت دنوں بعد احسن کے جانے پر آیا لیکن ہکا بکا اور اکھڑا اکھڑا۔ تمارا اسے دیکھ کر بہت پریشان ہو گئی۔ اسے مسلسل اداس اور پریشان دیکھ کر ڈاکٹر احسن نے مشورہ دیا کہ وہ کالج میں داخلہ لے لے۔ مگر وہ راضی نہ ہوئی۔ وہ تمام دن یونہی شکستہ بستر پر پڑی رہتی۔ نواز نے آنا بند کر دیا تھا۔ ایک دن ڈاکٹر احسن نے اسے زبردستی پکچر دکھانے پر آمادہ کیا۔ وہ نواز کا ٹکٹ بھی لے آئے۔ وہ دونوں نواز کو لینے اس کے گھر پہنچے وہ بیماری سے اٹھا تھا۔ مسکرا کر دیکھ کر تمارا تڑپ اٹھی۔ وہ بڑی مشکل سے ان کے ساتھ فلم دیکھنے پر راضی ہوا۔ سینما ہال میں ایک ساتھ بیٹھے تو ماضی کا رشتہ پھر جاگ اٹھا۔ اس نے تمارا کا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔ تمارا کی آنکھیں برس پڑیں اور وہ چپکے سے ہال سے نکل گیا۔

نواز نے وہ رات اپنے رشتے داروں کے گھر گزاری۔ اس کا ضمیر بے چین تھا کہ اس نے احسن چچا کی بیوی کے ہاتھوں کو کیوں چھوا۔ لہٰذا بہت سوچ بچار کے بعد اس نے فیصلہ کر لیا کہ تمارا سے قطع تعلق کر لے۔ وہ دوسرے روز وہاں کے یہاں گیا اور زیادہ وقت راحت کے ساتھ ہنس کر گزارا۔ تمارا نے بات کرنا چاہی تو وہ کمال بے رخی سے پیش آیا۔ تمارا کا دل بری طرح سے ٹوٹ گیا۔ ادھر ڈاکٹر احسن کو اس کے دوست نے مشورہ دیا کہ تم تمارا سے ازدواجی تعلقات قائم کرو۔ وہ تمہاری بیوی ہے کوئی غیر نہیں۔ ہمت افزائی پا کر احسن نے اس رات تمارا کو اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ تمارا نواز کے رویے سے ٹوٹ کر بکھر چکی تھی۔ وہ احسن کی پیش قدمی کو نہ سمجھ سکی۔ مگر جب احسن کے ہاتھ آگے بڑھنے لگے تو وہ چونک اٹھی اور نفرت بھانپ کر اس کے بازو میں کاٹ لیا۔

ڈاکٹر احسن اپنی بیوی سے حق زوجیت وصول کرنے کے بعد لمبی تان کر سو گئے۔ لیکن تمارا کا پورا وجود ان کے خلاف انتقام کا شعلہ بن گیا۔ اس نے اپنے جسم پر ان کا حق تسلیم نہیں کیا۔ اس کا رویہ پہلے سے زیادہ تند اور سخت ہو گیا۔ ڈاکٹر احسن کا ذہنی سکون تباہ ہونے لگا تو تنگ آ کر ایک دن وہ اسے اس کے میکے چھوڑ آئے۔ ان کا خیال تھا کہ اس ایک جھٹکے سے تمارا کا دماغ درست ہو جائے گا لیکن تمارا کے دل سے نواز کا خیال دور نہ ہو سکا۔ ایک دن وہ اس کے گھر پہنچ گئی اور اسے یہ خوشخبری سنائی کہ میں ڈاکٹر احسن سے طلاق لے رہی ہوں۔ پھر اچانک نہ جانے کیا ہوا کہ نواز نے اسے دبوچ کر اپنے بستر پر گرا لیا اور اس کی آنکھوں سے ہوس کی چنگاریاں نکلنے لگیں۔ وہ سراسیمہ ہو گئی۔ اس نے نواز کی گرفت سے نکلنے کی پوری کوشش کی جب کامیاب نہ ہو سکی تو اس نے تکیے کے نیچے پڑا ہوا پستول اٹھا لیا۔ گولی کی آواز گونجی اور دو چیخیں فضا میں تحلیل ہو گئیں۔

(اب آگے پڑھیے)

نواز دہرا ہو کر بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ تازہ تازہ سرخ لہو چادر پر بڑی سرعت سے پھیل رہا تھا۔ اور تمارا کی آنکھوں میں سرخ دھند سی چھانے لگی۔ اس نے خود کو بڑی مشکل سے سنبھالا اور اسے کچھ خبر نہیں کیسے دروازے کی دہلیز عبور کر کے لان پر دوڑتی چلی گئی ——— گیٹ سے ٹکراتے ٹکراتے بچی ——— سڑک پر آئی۔ اتفاق سے ایک رکشہ سواری اتار کر واپسی کے لئے مڑ رہا تھا۔ تمارا نے اپنا کانپتا ہاتھ اٹھایا اور اس کے رکتے ہی دوڑ کر اس میں چڑھ گئی ——— اس کا ذہن سرخ دھند کی چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ "تمارا! جانِ احسن!" کسی نے ہولے سے اس کے کانوں میں سرگوشی کی ——— احسن ——— وہ سسک اٹھی ——— رکشہ والے نے پلٹ کر دیکھا۔ تمارا نے اس کی سرخ سرخ آنکھیں دیکھیں تو سہم کر بولی۔

"ڈرائیور! ذرا تیز چلاؤ! میرے پاؤں میں بڑی تکلیف ہو رہی ہے ———"

اور جب رکشہ احسن کی کوٹھی کے سامنے سے گزرا تب اسے پتہ

چلا کر وہ پینشنگر جانے کی بجائے رکشہ ڈرائیور کو احسن کا پتہ سمجھا چکی ہے
اس نے رکشہ ٹھہرایا۔ اور خود جیسے بھاگتی ہوئی اندر آ گئی۔ مولا بخش
حیرت سے مالکہ کو دیکھ رہا تھا۔

"بی بی! خیریت تو ہے؟"

"بابا! تم ذرا رکشہ والے کو فارغ کر دو۔ صاحب کہاں ہیں؟"

"اندر ہیں بی بی! بڑی بیگم بھرو بی بی کے ساتھ مری گئی ہوئی
ہیں۔ نیلو بی بی اپنے کمرے میں ہوں گی۔"

اس نے آگے کچھ نہیں سنا۔ اپنے کمرے کی دہلیز پر آ کر اس کے
قدم جیسے جم گئے۔ اندر احسن کے کھانسنے کی آواز آئی۔ جیسے سگریٹ کا دھواں
اٹک گیا ہو۔ اس نے پردے کی اوٹ سے اندر جھانکا۔ احسن مسہری پر
لیٹا تھا۔ تکیہ اس کے پہلو سے نکل کر قالین پر گر پڑا تھا مگر وہ دنیا و مافیہا
سے بے خبر سگریٹ کا دھواں گھونٹ گھونٹ کر کے سینے میں اتار رہا تھا۔
اس کے رخساروں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ آنکھوں تلے سیاہی دور
سے صاف نظر آ رہی تھی ——— "احسن ———" تارا کے دل نے
پھر سسکی لی۔ وہ تھوڑی دیر اور کھڑی رہتی تو شاید دروازے پر ہی دم
سے گر پڑتی ——— پردہ تیزی سے ہٹا کر وہ دوڑتی ہوئی آئی
اور احسن کی باہوں میں جا گری۔

"مجھے ..... مجھے معاف کر دیجئے احسن ... مجھے معاف ..."

احسن نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں ——— یہ آواز ——— یہ آواز
تو انھیں شاید مرنے کے بعد بھی یاد آ سکتی تھی ——— بکھرے بکھرے
بال ——— لرزتا ہوا سا ایک لب، بھیگی بھیگی آنکھیں، تھرتھراتے ہونٹ
وہ فیروزی کپڑوں میں ملبوس ان کے سینے پر اپنا چہرہ رگڑ رگڑ کر کہہ رہی تھی

"احسن مجھے معاف کر دیجئے ——— احسن مجھے معاف کر دیجئے
اب میں آپ کی ہوں، صرف آپ کی۔" احسن نے غور سے دیکھا وہ تارا
ہی تھی۔ لیکن انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا تھا۔ ان کے بازوؤں
کی گرفت تارا پر ایک دم بہت مضبوط ہو گئی اور پھر فوراً ہی ڈھیلی پڑ گئی۔
ان کے ہاتھ اس کی پشت پر پھسلنے لگے۔ ہاں یہ وہی کلیوں جیسا ملائم
بدن ہی تو تھا ——— ہاں ہاں وہی دل کی دھڑکن ——— وہی ہونٹوں
کا اضطراب ——— اور اسی طرح بالکل اسی طرح تپتے تپتے گال۔
احسن نے آگے جھک کر اس کے بالوں میں چہرہ چھپاتے ہوئے ایک لمبی
گہری سانس لی ——— وہی خوشبو بالکل وہی خوشبو میری تارا کے بالوں
کی ——— تو کیا میرے سینے پر سر رکھ کر رونے والی میری تارا ہے
تارا میری محبت، میرا عشق، میرا جنون، میرا سکون، میرا قرار ———
میری تارا ——— میری تارا۔

احسن نے بے قرار ہو کر اسے پھر باہوں میں جکڑ لیا۔ وہ
تھی ——— بس سسک رہی تھی اور احسن آنکھیں بند کر کے اس کے
گھنیرے بالوں کی خوشبو اپنے اندر اتار رہے تھے۔ انھیں تارا کے
تارا کے آنسو روح کو سکون بخش رہے تھے۔ ان کی بے قراری ان کی
ان کی تنہائی ان کی بے زاری سب آہستہ آہستہ واپس لوٹ رہی
ان کا خالی سینہ دھیرے دھیرے بھر رہا تھا۔ آخر وہ بھی تو ایک مرد ہی
اور آج ان کے سینے پر بھی ایک عورت سر رکھ کر آنسوؤں کی بوچھاڑ
اپنی کمزوریوں کا اعتراف کر رہی تھی ——— اپنی محبت کا یقین
دلا رہی تھی ——— اپنے قصور معاف کروا رہی تھی۔ وہ تو خیر
خاصے جذباتی ثابت ہوئے۔ ایسے موقعوں پر تو بڑے سے بڑا مرد بھی
کو موم بن جانا پڑتا ہے۔ دراصل احسن ان لمحوں کو طول دینا چاہتے
اگر یہ خواب تھا تو وہ ساری زندگی خوابیدہ رہنا چاہتے تھے اور اگر
غلط فہمی تھی تو وہ زندگی بھر کے لئے اس غلط فہمی کو یوں ہی قائم
رکھنا چاہتے تھے۔

لیکن وہ بے تاب تھی ——— بے چین تھی ——— اس نے
ان فولادی بازوؤں کی گرفت سے آزاد ہونا چاہا، لیکن احسن نے یہ
ہی نہ دیا۔ اس نے ذرا سا سر اٹھا کر احسن کی طرف دیکھا۔ گلابی گلابی
آنکھیں، سوئے ہوئے سے چہرے پہ بکھرے ہوئے بال، دہکتے ہوئے
عارض ——— احسن کے دل نے بے تاب ہو کر دعا مانگی کہ یا خدا
لمحہ اتنا طویل، اتنا طویل ہو جائے کہ یہ ایک لمحہ پوری زندگی پر محیط ہو جائے
یا پھر زندگی کو اتنا مختصر کر دے کہ وہ اس لمحے میں ڈوب کر گم ہو جائے
لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔ وہ لمحہ ان کی نظروں کے سامنے دم توڑ بیٹھا۔ تارا
نے دوسرے ہی لمحے رک رک کر کہا،

"احسن اب میں آپ کے پاس آ گئی ہوں۔ اب میں کہیں
نہیں جاؤں گی، کہیں بھی نہیں۔" وہ سر جھکا کر رو پڑی۔ دھیمی دھیمی
سسکیوں کی آواز شہنائیوں کی گونج اور ڈھول تاشوں کی دھمک
میں گھل گئی۔ احسن کو یوں لگا جیسے ان کے کمرے میں سہاگ رات
ایک بار پھر اتر آئی ہے اور وہ آہستہ آہستہ تارا کا گھونگھٹ اٹھا رہے
ہیں۔

"تارا میری تارا ———" احسن کے ہاتھوں نے آپ ہی آپ
تارا کے چہرے کو تھام لیا۔ "تم یہ بتاؤ ہی نہیں سکتیں کہ میں تمہاری
راہ دیکھ رہا تھا۔ اب تم مجھے چھوڑ کر تو نہ جاؤ گی۔ میں تمہارے بغیر ادھورا

رہ جاتا ہوں ——— جان بیچ دو ہار جاتا ہوں۔" احسن نے تارا کا چہرہ اپنے چہرے کے قریب کر کے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ شاید کہیں اضطراب ہو، شاید کہیں انتظار ہو، ممکن ہے اجتناب کی ایک ہو سکتا ہے بیچارے اشتیاق سے لیکن اس کی آنکھوں میں گرم پانی کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ وہ تو کچی مٹی کا ڈھیر بن گئی تھی۔ جی چاہے تو کھلونا بنا لو، جی چاہے تو ریزہ ریزہ کر کے بہا دو۔ وہ مٹی کی مورت کی طرح سے کچھ نہ بول سکی۔

"تارا ———" احسن کی آواز جذبات سے بھاری ہو رہی تھی۔ تارا نے آہستہ سے پلکوں کی چلمن اٹھائی تو دو موتی ٹوٹ کر گالوں پر سے لڑھکتے ہوئے احسن کی گردن پر جا پڑے۔ احسن بیتاب ہو گئے۔ ان کے جلتے ہوئے ہونٹوں نے اس کی آنکھوں کے سارے موتی چن لیے۔

فون کی گھنٹی پہلی بار بجی تو احسن نے سنا ہی نہیں۔ دوسری بار بجی تو احسن نے پلٹ کر فون کی طرف دیکھا اور چہرہ موڑ کر تارا کی جبیں پر آئے ہوئے بال سمیٹنے لگے۔ وہ آنکھیں بند کئے ان کے پہلو میں خاموش لیٹی ہوئی تھی۔ گھنٹی تیسری بار بجی تو تارا نے آنکھیں کھول کر احسن کی طرف دیکھا تو احسن مسکرا دیے۔ لیکن تارا نے فوراً ہی آنکھیں موند لیں۔ فون کی گھنٹی ایک بار پھر بج اٹھی۔ تو احسن جھنجھلا گئے۔ "کیا مصیبت ہے یار کبھی چین ہی نہیں۔ ہاں تم اٹھو جان اب منہ دھو لو ——— تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا ——— اٹھو۔" احسن نے تارا کے سر کے نیچے سے اپنا بازو نکالتے ہوئے بڑے پیار سے کہا ہی تھا کہ گھنٹی پھر بجنے لگی۔

"اوہ مائی گاڈ ——— یہ لوگ میرا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ میں چار دن کلینک نہیں گیا تو مصیبت کر دی۔ تارا ڈیئر، پلیز تم ذرا اٹھ بیٹھو۔ تمہارے بغیر تو میرا دل بھی بستر چھوڑنے کو نہیں چاہتا۔ اور میں تو بھول ہی گیا وہ نیلا مجھ سے ناراض ہے۔ تمہاری وجہ سے میری اور اس کی لڑائی ہو گئی ہے۔ چلو ہم دونوں چل کر اس کو منا لیں گے۔ اتنی بڑی ناسمجھی میں نے پرسوں ہی کو پیچھے دیا تھا۔ وہ بار بار تمہارا پوچھتی تھیں ان سوالوں سے بچنے کا یہی ذریعہ تھا ——— یہ فون! خدا کو بندہ سمجھو کیوں نہیں دیا کلینک پر کوئی نہیں ہے ——— ڈاکٹر ملک بھی نہیں کر چلا ——— اچھا تارا تم اٹھو تو میں فون دیکھتا ہوں۔" تارا نے ذرا سی کھلی آنکھوں سے احسن کو دیکھا اور پھر چابی والی گڑیا کی طرح اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ——— "شاباش ——— یہ ہوئی نا بات۔" احسن اس کا کندھا تھپک کر فون کے پاس چلے آئے۔ "ہیلو ——— ہیلو ڈاکٹر احسن اسپیکنگ ———" انھوں نے بیزاری سے کہا۔

"اوہ سعدی بھائی ——— آپ ——— سعدی ڈیئر سعدی بھائی جان ——— دراصل اس کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ وہ ان کی ——— میرا مطلب ہے تارا کی کچھ طبیعت ٹھیک نہیں ہے لیکن کیا ہوا ——— ؟ آپ کیوں پریشان ہیں۔ کیا ——— ؟ کیا کہہ رہے ہیں آپ ——— نہیں نہیں بھائی جان ضرور کوئی غلطی ہے ——— لیکن کیسے ——— مجھے تو یقین نہیں آ رہا ——— آپ بات کہاں سے کر رہے ہیں۔ ہیلو ہیلو بھائی جان ——"

ہولے ہولے سسکتے تیرتے لفظ تارا کے کانوں میں جا ٹھہرے تو وہ بجلی کا کرنٹ کھا بیٹھی ——— اسے بڑی زور سے چکر آیا۔ اس نے سنبھلنا چاہا لیکن توازن قائم نہ رہ سکا۔ اس کا سر مسہری کے کنارے اور مضبوط تکیے سے جا ٹکرایا اور وہ وہیں گر پڑی۔ احسن نے پلٹ کر تارا کو دیکھا تو ریسیور رکھ کر وہ اس کے پاس چلے آئے۔

"تارا ——— تارا ——— کیا ہوا تارا ——— ؟" انھوں نے گھبرا کر تارا کو دونوں ہاتھوں پر اٹھا کر مسہری پر لٹا دیا۔ وہ چوٹ کی شدت کی وجہ سے بے ہوش ہو گئی تھی۔ اس کے ماتھے پر گومڑ پڑ گیا تھا احسن پریشان ہو گئے ——— "ادھر تارا بے ہوش ہو گئی ہے ادھر نواز کو گولی لگ گئی ہے ——— آخر میں کدھر جاؤں کیا کروں ——— ؟" سب سے پہلے احسن نے فون اٹھا کر اپنے قریب رکھ لیا۔ پھر تارا کی نبض ٹٹولی۔ ان کا سارا جنون رفع دفع ہو گیا تھا۔ وہ اس وقت عاشق کامل کی بجائے صرف ڈاکٹر بن گئے تھے۔ انھوں نے تارا کا بلڈ پریشر دیکھا پھر ٹمپریچر نوٹ کیا۔ انجکشن دیا۔ اس کے تلوے سہلا کر گرم کئے کمبل اوڑھا دیا اور اس کے ماتھے پر پڑنے والے گومڑ پر دوا لگائی اور مزید معائنہ کرتے ہوئے دیکھ کر مسکرا پڑے ——— اور پھر انھیں نیلی کی بات یاد آ گئی۔ نواز کو گولی لگنے والی بات کا خیال آیا۔ تارا کی بے ہوشی کا حق بھی جاتا رہا۔ بات کتنی ہو گئی تھی۔ وہ جتنی بھی پر تو نہیں کر سکتے تھے لیکن کچھ گڑبڑ کا احساس ہو گیا تھا۔ تارا کے تعاون کے بغیر تو وہ مر کر نہیں جان سکتے کہ کیا وہ باپ بننے والے ہیں یا نہیں ———

"خدا کرے میرا شک درست ہو ———" احسن نے صمیم قلب سے دعا مانگی۔ انھیں لگا جیسے تارا پلکیں ہلا رہی ہو۔ جھک کر اس کے لب چومتے ہوئے وہ مسکرا کر بڑے خلوص سے بولے۔ "تم سلامت رہو میری جان۔" ——— فون کی گھنٹی بجی تو احسن نے جھپٹ کر چونگا اٹھایا۔ "ہیلو ہیلو میں احسن ہوں ——— جی ——— جی ——— بھائی جان! میں

بول رہا ہوں ——— نہیں نہیں بھائی جان کیا بات کرتے ہیں آپ؟ دراصل اس وقت تارا کو یکدم چکر آگیا تھا اور وہ گر پڑی، کمرے میں میرے سوا اور کوئی نہیں اس لئے میں اُسے اٹھانے کے لئے لپکا تو غیر شعوری طور پر میں نے رسیور کریڈل پر رکھ دیا تو آپ سمجھے کہ میں نے جان بوجھ کر رکھ دیا ——— وہ ابھی تک بیہوش ہے۔ ماتھے پر چوٹ لگی ہے۔ ویسے بھی وہ خاصی ویک ہے ——— آئی ہوپ شی از پریگننٹ ——— نہیں ——— نہیں ——— ایسی کوئی بات نہیں میں ابھی پہنچتا ہوں ——— نیلما ہے گھر پر وہ ان کی تیمارداری کرے گی ——— لیکن بھائی جان میری سمجھ میں نہیں آتا کہ نیلما کیسے ——— ؟ اپنے آپ کیسے لگ جائے گی؟ آپ نے ٹھیک سے نہیں پوچھا اس سے ——— اچھا اچھا ٹھیک ہے۔ آپ نروس نہ ہوں، گھبرانے کی کوئی بات نہیں، میں پہنچتا ہوں، ابھی ——— اور دیکھیں بھائی جان خیال رکھیں کسی کو اندر نہ آنے دیں میرا خیال ہے اس کے پاس اس پستول کا لائسنس بھی نہیں ہے ——— ان ٹھیک ہے بات پھیلنے نہ پائے ——— بہت اچھا کیا کہ آپ نے رپورٹ نہ لکھوائی ——— اچھا بھائی جان پھر میں ابھی پہنچتا ہوں۔"

احسن نے رسیور کریڈل پر رکھ کر تارا کی طرف دیکھا۔ اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی وہ مسکرا پڑے۔ حالانکہ یہ موقع مسکرانے کا نہ تھا۔ اس وقت تو انھیں بڑی روح فرسا خبر ملی تھی کہ ان کا پیارا بھتیجا جو ان کا دوست بھی تھا، اچانک زخمی ہو گیا ہے۔ لیکن وہ اس قدر پریشان اور اداس نہیں تھے جتنا کہ ہونا چاہئے تھا۔ جبکہ وہ جانتے تھے کہ نواز کا زخم کوئی معمولی زخم نہیں گولی کا زخم ہے۔ اور پھر دونوں ہاتھ سینے پر باندھتے ہوئے وہ ہنس کر بڑے عجیب سے لہجے میں بولے:

تارا تمھیں اس وقت اس حالت میں چھوڑ کر کہیں جانے کو دل تو نہیں چاہتا، لیکن وہ نواز ——— سچ پوچھو تو میرے ساتھ قدرت بڑا ظالمانہ مذاق کر رہی ہے ——— جب میں زخمی تھا۔ گھائل تھا، پریشان تھا، اکیلا تھا تو میرے ساتھ یہ مجبوری تھی کہ میں کسی کو اپنا احوال تک نہیں بتا سکتا تھا۔ لیکن اب جب تم میرے دل کے زخموں کے لیے مرہم بن کر آگئی ہو تو نواز زخمی ہو بیٹھا۔ اب بتاؤ میں اس کے زخم دیکھنے جاؤں یا تمھاری دلجوئی کروں ——— اور جبکہ تم مجھے بتا بھی چکی ہو کہ تم اپنی سہیلی سے لڑ کر آئی ہو اور تمھاری امی بھی تم سے خفا ہیں۔ تم نے گھر پر اطلاع بھی نہیں دی اور سہیلی کے گھر سے سیدھی یہاں آگئیں۔ اب جب تم ہوش میں آ گئی اور مجھے اپنے قریب

نہ پاؤ گی کہ تمھارا دل بہت اداس ہوگا۔ لیکن میں کیا کروں وہ محبتیں میرا احساب مانگتی میرے سامنے آکھڑی ہوئی ہیں۔ لیکن جانِ احسن ——— تم افضل ہو سب سے افضل ——— تمھیں اس حال میں چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا ——— "

احسن دوبارہ مسہری پر بیٹھ گئے۔ انھوں نے ہاتھ بڑھا کر تارا کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر نبض پر انگلیاں رکھ دیں۔ ان کے ہونٹوں پر نرم نرم مسکراہٹ انگڑائیاں لے رہی تھی۔ وہ سگریٹ پینا بھی بھولے ہوئے تھے۔ ان کا دل چاہ رہا تھا کہ خوب قہقہے لگائیں، خوب اور اپنے سامنے بے سدھ پڑی ہوئی اس کومل سی لڑکی کو اتنا گدگدائیں کہ وہ ہنستے ہنستے بے حال ہو جائے۔ اس کے گالوں کے گلاب سرخ ہو جائیں۔ اس کے لبوں کے گوشے تھرتھرانے لگیں۔ اور وہ تنگ آکر ہار مان کر، ان کے زانو پر سر رکھ کر ان کے آگے دونوں ہاتھ جوڑ دے۔ لیکن وہ تو اس وقت بے ہوش پڑی تھی اور ان کے ہوش و حواس پر بھی بُرا وقت آیا ہوا تھا۔ وہ تو اپنے آپ کو بھولے جا رہے تھے۔ پھر انھیں یہ کیسے یاد رہتا کہ ان کی لاڈلی بہن اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی روتے روتے نڈھال ہو چکی ہوگی اور اس کے آنسو کسی نے خشک نہیں کئے ہوں گے۔ انھیں تو نواز بھی یاد نہیں رہا تھا جس کی ٹانگ میں گولی لگ گئی تھی نہ انھیں بھائی جان یاد رہے تھے جو ماہر سرجن ہوتے ہوئے بھی اس وقت ڈاکٹر احسن کے محتاج تھے۔ مضبوط دل والے ڈاکٹر ہمدانی جو اپنے بیٹے کو زخمی دیکھ کر نروس ہو گئے تھے۔ انھوں نے کانپتی آواز میں احسن سے کہا تھا کہ احسن خدارا جلدی پہنچو ——— وہ اس وقت اپنے ڈاکٹر بھائی کا انتظار کر رہے تھے اور ان کا ڈاکٹر بھائی اپنی کائناتِ دل کے آگے مریضِ محبت بنا بیٹھا تھا۔ اسے تارا کے ہوش میں آنے کا انتظار تھا۔ تارا نے آہستہ سے گردن ہلائی تو احسن اس کے اور قریب کھسک آئے۔ وہ آنکھیں بند کئے کئے ایک دم چیخ پڑی:

"نہیں ——— نہیں ——— اللہ نہیں ——— مجھے چھوڑ دو، مجھے چھوڑ دو نا ——— " اور وہ پھر سسکنے لگی۔ اس نے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ لی تھیں۔ وہ بُری طرح ڈر رہی تھی۔ احسن بے قرار ہو گئے۔

"تارا ——— تارا ——— کیا ہو گیا تمھیں ——— پریشان مت ہو، میں تمھارے قریب ہوں۔ آنا ڈارلنگ کیوں ہو پاگل لڑکی مجھے بتاؤ کیا ہوا ——— ؟ کیا بات ہے ——— ؟" احسن اس کے اوپر

گئے ——— تارا نے آنکھیں کھول کر احسن کو دیکھا اور ڈوبتی
آواز میں بولی۔
"میں خواب میں ڈر گئی تھی۔"
"ہمیں اپنے خوابوں میں شامل کر لیتیں تو کیوں ڈر لگتا بھلا۔
یقین ہوا کیا تھا ——— بیٹھے بیٹھے غش کیوں آ گیا تھا۔" احسن
بڑے پریم سے پوچھا مگر تارا چپ رہی ——— "بتاؤ کیا ہوا تھا"
ان نے پھر پوچھا۔
"کچھ نہیں ——— بس یوں لگا جیسے ——— جیسے کسی نے
دل کو مٹھی میں لے کر دبا دیا ہو ——— شاید چکر آ گیا تھا۔"
"ہوں تو یہ چکر ہیں ———" احسن نے شریر بچے کی طرح
شوخی سے کہا، لیکن تارا کچھ نہ سمجھ سکی۔ وہ گھبرائے جا رہی تھی۔ اس
بڑی لجاجت سے احسن سے کہا،
"سنئے آپ ابھی اسی وقت امی کو بتا آئیے کہ میں اپنی سہیلی
یہاں سے سیدھی یہاں آ گئی ہوں۔ ورنہ امی بہت پریشان ہوں گی۔"
"ہاں ——— ابھی چلا جاتا ہوں، اور مجھے تو بھائی بھیا
بلایا تھا۔ وہ نواز کو ...... میرا مطلب ہے کہ نواز کی طبیعت خراب
ہے ——— اب تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا ——— میں
چلوں؟" احسن نے اپنی پریشانی چھپاتے ہوئے تارا سے پوچھا۔
"امی کہاں ہیں ——— ؟ مجھے اکیلے میں ڈر لگے گا احسن۔"
"پاگل ڈرنے کی کیا بات ہے۔ اپنا دل مضبوط کرو گڑیا ———
کی یوں نہیں گزرا کرتی جس طرح تم گزار رہی ہو ——— یوں
ذرا سی بات کوئی بھی تمہاری طرح بے ہوش نہیں ہوتا۔ دیکھو نیل
امی پاس رہے گی۔ امی نامرہ کے ساتھ مری گئی ہیں۔ اب تو
امی کو بلوالوں گا۔ زندگی کا صحیح لطف تو اب آئے گا جان ———
اب میں چلوں۔ احمد کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"
تارا نے خوامخواہ آنکھیں بند کر لیں۔
"اچھا اب خدا حافظ تو کہہ دیجئے۔" احسن نے بڑے خوبصورت
انداز سے اجازت مانگی مگر تارا کے لب نہ ہلے۔
"حضور اجازت نہ دیجئے گا۔" احسن نے پھر پوچھا۔
"چلے جائیے ——— لیکن اگر میری طبیعت خراب ہو گئی
میں ڈر گئی تو ——— ؟"
"طبیعت تو اب آپ کی خراب ہوتی نہیں۔ اس بات کی
میں گارنٹی دیتا ہوں ——— رہی بات ڈرنے کی تو نیل آپ
کے پاس رہے گی۔" یہ کہہ کر وہ مڑا۔ "میں بلاتا ہوں اسے ———
بھائی کو نہیں۔ وہ بھی تو مجھ سے ناراض ہے۔ اب میں کدھر جاؤں؟
پتہ ہے تارا ——— اس کی اور میری لڑائی کیوں ہوئی ———
صرف آپ کی وجہ سے ——— آج میں نے پہلی مرتبہ اس پر نہ جانے
کیسے ہاتھ اٹھا لیا۔ وہ میری بڑی پیاری بہن ہے ——— اُف خدا!
میں بھی کتنا خود غرض ہوں۔ اپنی خوشی میں مگن ہو کر اسے منانا بھی
بھول گیا۔ وہ اب تک رو رہی ہوگی ——— بے ——— بے ——— بے ———"
احسن کو سچ مچ بہت افسوس ہو رہا تھا۔
"آپ نے کیوں ڈانٹا نیل کو ——— ؟ وہ تو بہت اچھی
لڑکی ہے ——— آپ کو پتہ ہے بھائی بہنوں پر ہاتھ نہیں اٹھایا کرتے
وہ تو ان کا مان ہوتے ہیں، غرور ہوتے ہیں۔"
"ہاں تم سچ کہہ رہی ہو تارا۔ بھائی بہنوں پر ہاتھ نہیں اٹھاتے
وہ تو بڑی معصوم اور بڑی پیاری ہوتی ہیں۔ میں جاتا ہوں اس کو
ابھی منا کر لاتا ہوں۔" احسن تیزی سے کمرے سے نکل گئے۔
تارا نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس بھر کر بڑی عاجزی سے مانگی
"یا اللہ! میری عزت رکھ لے۔ ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گی ———
مر جاؤں گی ———" اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو غور سے دیکھ
کر سوچا۔ "اگر پستول پر میری انگلیوں کے نشانات مل گئے ——— یا
نواز نے میرا نام لے دیا تو پھر کیا ہوگا ——— ؟ احسن کیا سوچیں گے؟
ان کی بے پناہ محبت ——— یہ دیوانگی ——— یہ چاہت سب
کچھ نفرت میں بدل جائے گی اور پھر ساری دنیا کیا کہے گی ——— اگر
وہ مر گیا تو مجھے پھانسی کی سزا ملے گی ——— میری تصویر اخباروں میں
چھپے گی ——— رفیق، فریدہ اور کالج کے سارے لڑکے لڑکیاں تصویر
دیکھ کر کیا کہیں گے ——— ؟ مرنے کے بعد بھی اسکینڈل بنتے رہیں گے
مرزا صاحب کی پگڑی تو ایک گھڑی میں دس بار نام لے کر کرے گی اور
پھر شاید ساجدہ باجی کی شادی بھی نہ ہو سکے ——— ہائے نواز تم اتنے
ذلیل نکلو گے، یہ مجھے پتہ نہ تھا۔ کاش میں تمہارے پاس نہ جاتی
کاش تم مجھے نہ ملے ہوتے۔ ہائے اللہ اب میں کیا کروں؟"
تارا نے بے چین ہو کر کروٹ بدلی ہی تھی کہ احسن نیلا کا بازو
تھامے کمرے میں چلے آئے۔ وہ بڑی لجاجت سے نیلا سے کہہ رہے تھے
"دیکھو نیل رانی اب میں تمہاری بھابی جان کو منا کر لایا ہوں۔ خدارا
اب تو مجھے معاف کر دو میری پیاری گڑیا۔"
نیل نے بھیگی پلکیں اٹھا کر احسن کو دیکھا اور بے اختیار ہو کر

ان سے لپٹ گئی ——— احسن نے اس کے بال چوم کر پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا ——— "بس ——— بس ——— میری گڑیا ———
اب مت رو۔ مجھے پتہ تھا کہ میری بہن مجھے ضرور معاف کر دے گی۔ اچھا اب مجھے جانے دو گی۔ تمہارے ابو بھائی کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ ہمدانی بھائی نے بلایا ہے مجھے ——— تم اپنی بھابی کے پاس بیٹھو ان کی طبیعت بھی درست نہیں ہے۔ ذرا خیال رکھنا ان کا۔ کہیں باتیں کرتے کرتے ہی بیہوش نہ ہو جائیں۔ میں مولا بخش کو راستے میں بٹھاتا جاتا ہوں ——— جاتے ہی فون کر دوں گا۔ ہو سکتا ہے مجھے دیر بھی ہو جائے تم لوگ پریشان مت ہونا۔" احسن نے نیلی کو کاندھے سے ہٹا کر تارا کی مسہری پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ "اچھا خدا حافظ ———"
احسن نے باری باری دونوں کے گال تھپتھپائے اور کمرے سے باہر چلے گئے۔ ان کا دل دو متضاد جذبوں کے درمیان بھٹک گیا تھا ——— بہن کی مراد پانے کی خوشی ——— اور ——— نواز کے زخمی ہونے کا دکھ ——— دونوں جذبے بیک وقت ان کے دل میں آگرے تھے۔ وہ اپنی خوشیوں پر دکھ کا پتر چڑھانا نہیں چاہتے تھے اور نہ ہی اپنی خوشیوں میں مگن ہو کر اپنے بھائی اور بھتیجے کی پریشانی اور تکلیف کو فراموش کر سکتے تھے۔ اندھا دھند کار چلاتے ہوئے احسن کو نواز پر ایک دم غصہ آگیا ——— بے وقوف کہیں کا۔ کتنی دفعہ منع کر چکا تھا کہ اسلحہ کو کھلونا مت سمجھو۔ لیکن وہ خان صاحب تو اس سے دل بہلاتے تھے۔ یہ جنگل کے لڑکے اس قدر لاپرواہ کیوں ہوتے ہیں۔ گاڑی دائیں جانب موڑتے ہوئے ڈاکٹر احسن کو تارا کی امی کا خیال آیا ——— لعنت خدا! ابھی ان کو بھی اطلاع دینی ہے کہ سیمی کا جوڑا شام کو گھر پہنچ چکا ہے۔ مگر اطلاع نہ دوں تو ——— تو وہ پریشان ہوں گی پہلے ہی میں خاصا لیٹ ہو گیا ہوں ——— خدا جانے نواز کی کیا حالت ہے ——— ہمدانی بھائی نے کچھ نہ کچھ تو سنبھالا ہی ہوگا لیکن وہ گھبرا بھی تو رہے تھے ——— تو پھر کیا کروں۔ سیدھا ہسپتال چلا جاؤں۔ لیکن پھر وہ بھی تو پریشان ہوں گی۔ ان کے گھر میں تو کوئی مرد بھی نہیں ہے ——— اور پھر نہ جانے محلے والے کیا کیا باتیں بنا ڈالیں۔ پورا محلہ بھی ایسا ہی ہے ——— ٹھیک ہے دیکھا جائے گا۔ جہاں اتنی دیر ہوئی ہے وہاں دو منٹ اور سہی۔
احسن نے گاڑی اس جانی پہچانی گلی میں موڑ لی۔ رضیہ بی باہر کے دروازے کا پردہ ہٹائے کھڑی تھیں۔ شاید تارا ہی کا انتظار تھا۔ احسن کی گاڑی کو دیکھ کر ان کا چہرہ یکدم زرد پڑ گیا۔ احسن نے گاڑی کی کھڑکی میں سے جھانک کر سلام کیا تو گھبرا گئیں۔ "ارے بیٹا تم کیسے؟" وہ بوکھلا گئیں۔
"امی میں آپ سے یہ کہنے آیا تھا کہ آپ اب تارا کا انتظار نہ کریں۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لئے وہ اپنے دوست میرا مطلب ہے اپنی سہیلی کے یہاں سے سیدھی گھر پہنچ گئی ہیں۔"
"خدا کا شکر ہے۔ میں تو پریشان ہو گئی تھی۔ منیر اسپیل تھا ——— ارے بیٹا موٹر کار سے نیچے اتر آؤ۔ اندر آجاؤ۔ تم تو ہمارے گھر کا راستہ ہی بھول گئے ہو۔" رضیہ بی نے محبت سے گلہ کیا۔
"نہیں امی اس وقت اجازت دیں۔ میں بہت عجلت میں ہوں۔ میرے بھتیجے کی طبیعت بہت خراب ہے اسے دیکھنے جا رہا ہوں۔ انشاء اللہ پھر کبھی ہم دونوں ہی آئیں گے۔" احسن نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔
"تب تو آؤ بیٹا جم جم آؤ۔ تمہارا ہی گھر ہے۔ لیکن اس وقت ایک کپ چائے تو پی لیتے۔ بس دو گھڑی میں تیار ہو جاتی ہے"
"امی جان ——— میری چائے ادھار رہی۔ ہم دونوں کسی وقت آکر پی لیں گے۔ اب اجازت دیں ——— خدا حافظ۔" احسن نے فوراً گاڑی موڑ لی۔ رضیہ بی دروازے کا پردہ تھامے کھڑی کی کھڑی رہ گئیں۔

***

نواز کی وہی ایک رٹ تھی کہ گولی خود میرے ہاتھ سے چلی ہے لیکن احسن یہ بات ماننے کو تیار نہ تھے۔ گولی بے شک بہت قریب سے چلی تھی لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اگر نواز نشانہ بازی کر رہا تھا اور نشانہ چوکا بھی تھا تو گولی پاؤں کے پنجے میں لگنے کی بجائے گھٹنے کے قریب کیوں لگی۔ یہی بات ڈاکٹر ہمدانی کی سمجھ میں بھی نہیں آ رہی تھی وہ تو ویسے بھی اپنے اکلوتے بیٹے کے پاؤں میں خون بہتے دیکھ کر ایک دم نروس ہو گئے تھے۔ احسن نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی تو وہ بپھرنے لگے۔ "یہ آخر مجھے بتاتا کیوں نہیں کہ اس کا دشمن کون ہے۔ میں اس سالے کو جیل میں سڑوا دوں گا۔ خیر ہے یہ نہیں بتاتا ہے تو نہ بتائے۔ میں اسے زمین کھود کر نکلوا لوں گا۔ ڈی آئی جی میرا اپنا دوست ہے۔ ابھی میں کمشنر کو فون کر دوں تو وہ تبدیل ہو جائے گا۔"
ڈاکٹر ہمدانی نے لہجہ بدل کر پوچھا "مجھے تم خود بتاؤ نواز کہ تمہارا کس سے جھگڑا ہوا تھا؟ قسم ہے تمہاری ماں کی میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا"

"آخر یہ کون سی شرافت ہے کہ گھر بیٹھے گولی مار دی جائے۔ میں پوچھتا ہوں احمد سعید کو اس طرح بتاؤ کرنے والا کون تھا؟" ڈاکٹر ہمدانی غصے سے مٹھیاں بھینچتے ہوئے ٹہلتے ٹہلتے پھر نواز کے قریب چلے آئے۔

"ڈیڈی ـــ ڈیڈی ـــ پلیز آپ میری بات کا یقین کریں کہ میرا کوئی دشمن نہیں ہے پھر کسی نے قاتلانہ حملہ نہیں کیا۔ غلطی میری اپنی ہے۔ چچا جان آپ ہی کچھ سمجھائیں ڈیڈی کو۔ سچ کہہ رہا ہوں گولی خود میرے ہاتھ سے چلی ہے۔ آپ یہ پستول دیکھ لیں۔ وہ پستول ہے جو میں بازار سے لایا تھا۔ دیکھیے اس میں ٹریگر دبایا کہ میں۔ دو گولیاں میں نے سامنے کارنس پر رکھی ہوئی گڑیا کے سر پر مارنے کی کوشش کی ـــ اُف ـــ اُف خدایا میری ٹانگ ـــ میری ٹانگ ـــ سچ کہتا ہوں چچا جان غلطی میری ہی تھی۔" ـــ نواز نے شدتِ کرب سے آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن احسن کے چہرے پر اب بھی بے یقینی کے دھندلے دھندلے سائے لرز رہے تھے۔ انہوں نے ڈاکٹر ہمدانی کو مخاطب کر کے کہا: "ہمدانی بھائی آپ ذرا دوسرے کمرے میں چلے جائیے۔ میں اس سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔" ڈاکٹر ہمدانی نے غصے سے گھور کر نواز کو دیکھا تو احسن نے ان کا بازو پکڑتے ہوئے کہا: "ہمدانی بھائی، دیکھیں احمد کو تکلیف بہت زیادہ ہے۔ آپ کلینک جا کر آپریشن کا بندوبست کیجئے۔ کیونکہ آپریشن تو بہرحال کرنا ہی پڑے گا۔ آپ ایکسرے کے لئے میرا خیال ہے کہ اپنے دوست ربانی سے بات کریں لیکن رازداری کا خیال رکھئے گا۔ بات باہر نہ نکلنے پائے۔ آج رات ہی آپریشن ہو جائے تو بہتر ہے۔ ورنہ زخم کے ساتھ ساتھ بات بڑھ جانے کا بھی خطرہ ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو احسن۔ میرا خیال ہے فون پر بات کرنے سے بہتر ہے کہ میں خود ربانی سے مل آؤں تاکہ بات اس کی سمجھ میں بھی آ جائے اور وہ انکار بھی نہ کر سکے۔ اور ہاں میری بجائے تم اور ربانی مل کر آپریشن کر لینا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اپنے بیٹے کا آپریشن کرنا ایک باپ کے لئے مشکل ترین کام ہوتا ہوگا۔"

ڈاکٹر ہمدانی چلے گئے تو احسن نے بڑے خوشگوار لہجے میں نواز سے پوچھا:

"اب بتاؤ بیٹے اصل معاملہ کیا ہے؟"

"وہ چچا جان آپ بھی یقین نہیں کرتے۔ سب بتا دیئے میں کس طرح سمجھاؤں آپ کو۔"

"آسان سی بات ہے بس اور میں سمجھائے جناب میں یقین کر لوں۔"

"کہیں کوئی واردات تو نہیں ہوئی آپ کے ساتھ؟" احسن مجسم سوال بن گئے۔

نواز نے گہری سانس لے کر کچھ سوچا اور پھر رک رک کر بولا: "چچا جان ـــ آپ کو پتہ ہے کہ میں یہ پستول بازار سے لایا تھا۔ پہلے تو مجھے نشانہ بازی کا کوئی خاص شوق نہیں تھا لیکن جب سے یہ پستول خریدا ہے تب سے میرا دل نشانہ بازی کرنے کو چاہنے لگا تھا۔ پہلے بھی دوپہر کے وقت کمرے بند کر کے میں یہ پستول چلا چکا ہوں۔ دراصل آج تو میں یہ سمجھے ہوئے تھا کہ اس پستول میں صرف دو گولیاں ہیں لیکن وہ میں خود ہی بھول گیا تھا کہ مزید چار گولیاں میں نے اس میں پہلے سے ہی ڈال دی تھیں۔ آج یونہی نشانہ بازی کا خیال آیا تو تکیے کے نیچے سے پستول نکال کر سامنے کارنس ـــ پر رکھی گڑیا کا سر توڑنا چاہا لیکن نشانہ صحیح نہیں بیٹھا۔ وہ دیکھئے کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ گیا ہے لیکن دوسری گولی گڑیا کے سر کی بجائے اس کے پیٹ میں لگی۔ سچ کہہ رہا ہوں چچا جان دو گولیاں چلا کر میں سمجھا تھا کہ پستول خالی ہے۔ میں کافی دیر تک اسے ہاتھوں میں اچھالتا رہا اور پھر یونہی لیٹ گیا۔ بے خیالی میں نہ جانے کیسے ٹریگر دب گیا اور گولی چل گئی۔ سچ چچا جان مجھے پتہ نہیں تھا کہ اس میں ـــ اُف خدا بڑی تکلیف ہے ـــ چچا جان مجھے بے ہوشی کا انجکشن دے دیجئے ـــ"

"برداشت کرو ـــ تھوڑا سا اور برداشت کرو۔ مجھے پتہ ہے کہ تم بہادر جوان ہو ـــ ہمت سے کام لو ـــ اچھا نواز یہ بتاؤ کیا تم اپنے بستر پر بیٹھے ہوئے تھے؟"

"جی ـــ جی ہاں چچا جان میں بستر پر لیٹا تھا ٹانگ پر ٹانگ رکھے ہوئے۔ اصل میں پڑھتے پڑھتے بور ہو گیا تھا اس لئے سوچا کہ کچھ شغل ہو جائے۔ اگر یاد ہوتا تو گولی کیسے لگ جاتی؟"

"چلو یہ کچھ پیارا شغل ـــ مجھے اس بات پر ایک شعر یاد آ گیا۔ کچھ اس طرح ہی ہے کہ دل کے کھیل میں ـــ ہوتا ہے بہت ہی کھڑیاں ـــ عشق کو عشق سمجھو مشغلہ دل نہ بنا ـــ تو دوست میں بھی تم سے یہی کہتا ہوں کہ پستول کو پستول ہی سمجھو کھلونا مت بناؤ۔ تمہاری اس نشانہ بازی نے اب دیکھو کیسی مصیبت کھڑی کر دی ہے۔ اب تمہاری سزا یہ ہے کہ تمہارا یہ پستول میں ضبط کئے لیتا ہوں ـــ"

"ہائے ـــ ہائے ـــ احمد ـــ احمد یہ کیا ہو رہا ہے تمہیں ـــ ہائے بیٹا یاد رکھو کر رہے ہو ـــ بُری بات ـــ بہت

بڑی بات ہے۔"

"نہیں چچا جان میں رو تو نہیں رہا بس یونہی تکلیف برداشت کرتے کرتے آنکھیں نم ہو گئیں۔ چچا جان سچ کہا آپ نے کہ دل کے ہر کھیل میں ہوتا ہے بہت سی کلائیاں —— کاش میں نے پستول کو اتنا بے ضرر نہ سمجھا ہوتا۔ ویسے چچا جان اگر میں رونا بھی چاہوں تو نہیں رو سکتا۔ ڈیڈی کا خوف ہے احساس پشیمانی اور پھر ان کی پریشانی بھی دیکھی نہیں جاتی وہ جس میں تو بکھرتا چلا گیا —— پس چچا جان خود کردہ را علاج نیست۔ اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں زخمی کر لینا بھی بڑا عذاب ہے۔ آپ نہیں سمجھ سکتے کہ میں اس وقت کیا محسوس کر رہا ہوں —— خدا جانے کتنا گہرا زخم پڑ جائے گا۔ اور پتہ نہیں یہ زخم کب مندمل ہو۔ اور یہ بھی ضروری تو نہیں کہ زخم مندمل ہو جائے —— بعض زخم بھرتے ہی نہیں —— ناسور بن جاتے ہیں —— چچا جان خدا کے واسطے مجھے بے ہوش کر دیجئے ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔ میں مر جاؤں گا۔ اور میں ہذیانی انداز میں چیخ چیخ کر مرنا نہیں چاہتا۔ میں سکون سے مرنا چاہتا ہوں۔ میں خاموشی سے مرنا چاہتا ہوں"

"نواز —— نواز بیٹے —— حوصلہ رکھو —— بہادری یہ نہیں کہ آدمی سکون سے مر جائے بہادری یہ ہے کہ آدمی تکلیفوں دکھوں پریشانیوں کو برداشت کرتے ہوئے پرسکون دکھائی دے۔ تم تو بہادر باپ کے بہادر بیٹے ہو —— یہ تو وقتی تکلیف ہے ختم ہو جائے گی —— تم نے کبھی ان لوگوں کے متعلق بھی سوچا ہے جو ذہنی اذیت برداشت کرتے ہیں جن کے دل ٹکڑے ٹکڑے ہوتے ہیں لیکن کوئی نہیں سمجھ پاتا کہ وہ کیوں پریشان ہیں وہ کیوں دکھی ہیں —— نواز تمہاری تو جسمانی تکلیف ہے۔ تمہارا یہ زخم تو سب کو نظر آئے گا سب اس پر مرہم رکھنے کی کوشش کریں گے لیکن جب کسی دل پر یا کسی کی روح میں زخم پڑ جاتا ہے تو اس کا مندمل کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ تم ابھی یہ باتیں نہیں سمجھو گے۔ اچھا —— میری دعا ہے کہ خدا تمہیں ان سب پریشانیوں سے محفوظ رکھے۔" احسن نے خلوص دل سے دعا مانگی لیکن نواز ایک دم ہنس پڑا۔

احسن نے چونک کر اسے دیکھا —— اس کی ہنسی ہنسی نہ تھی ایک آہ تھی —— اس درد بھری ہنسی نے انہیں آزردہ کر دیا۔ وہ کچھ سوچنے لگے۔

"چچا جان" —— نواز نے انہیں پکارا ——

"جی" وہ فوراً بولے۔

"چچا جان میں سوچ رہا تھا کہ یہ بھی اچھا ہی ہے کہ دل کے زخم سب کو نظر نہیں آتے اگر روح کے یا دل کے زخم سب کو نظر آتے —— تو بہت تماشہ ہو جاتا۔"

"ہاں ہو تو جاتا لیکن تم یہ سب کچھ کیوں سوچ رہے ہو؟"

"سوچوں نہ تو کیا کروں —— اول تو ذہن خالی نہیں ہوتا خالی رہوں تو تکلیف کا احساس ستانے لگتا ہے۔"

"اچھا ٹھہرو میں تمہیں انجکشن دے دیتا ہوں۔" ڈاکٹر احسن انجکشن بنانے لگے اور نواز تکلیف پر بے بسی سے سر ہلاتا رہا۔

انجکشن لگنے کے تھوڑی دیر بعد ہی نواز پر غنودگی طاری ہونے لگی اور وہ احسن سے باتیں کرتے کرتے سو گیا —— احسن تھوڑی دیر تو خاموش اس کے قریب بیٹھے رہے اور پھر انہوں نے اپنے گھر کا نمبر ڈائل کر لیا —— فون نیل نے اٹھایا تھا۔

"نیل —— میں احسن بول رہا ہوں۔" جواب میں نیل نے نواز کے متعلق پوچھا۔

"اب تو ٹھیک ہے اس کی طبیعت —— نہیں کوئی خاص بات نہیں ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا —— نہیں نہیں پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ ٹانگ کے زخم میں ٹانکے لگیں گے۔ ہلا جلا نہیں جا رہا ہے نا —— نہیں نہیں تم مت سونا تمہاری بھابی ڈر کے مارے بے ہوش ہو جائیں گی۔ ایسا کرو چائے بنا لو مولا بخش سے اسے بھی پلانا —— میرے آنے کا تو کچھ ٹھیک پتہ نہیں۔ دیکھو دس بجے تک میں پھر فون کروں گا تم لوگ ٹی۔ وی کھول لو سنڈے اسپیشل میں کوئی پکچر آ رہی ہو گی —— اچھا تو وہی پکچر دیکھی جا رہی ہے —— اچھا تمہاری بھابی کی طبیعت کیسی ہے۔ ٹھیک ہے تو پھر ذرا فون انہیں دو حال احوال تو پوچھ لوں۔"

ہیلو —— ہیلو —— کون؟

تارا —— ! ہو کس کی قسمت کا؟

ہیلو —— میں نے کچھ پوچھا تھا جناب۔

ہاں اس کی طبیعت اب ٹھیک ہے —— کوئی خاص بات نہیں۔ بس ذرا سا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ اور کوئی بات پوچھنا ہو تو پوچھ لیں لیکن آپ کو میری بات کا جواب ضرور دینا پڑے گا۔ فون پر نہ دیا تو گھر آ کر پوچھ لوں گا۔ ہیلو —— ہیلو —— تارا خاموش کیوں ہو گئیں بولتی کیوں نہیں؟"

"کیا بولوں —— بھئی یہ کیا بات ہوئی۔ آپ یہ بھی میں ہی تمہیں بتاؤں حالانکہ بولنے کے معاملے میں تو عورتیں بدنام ہیں۔"

"تارا" —— احسن نے دھیمی مگر جذبات سے بوجھل آواز میں

اسے بہت دور سے پکارا تھا۔ "جی" ۔۔۔ تارا نے آہستہ سے جواب دیا۔
"تارا ۔۔۔ میٹھے بول اچھی خیرات ہیں۔ ہم فقیروں کو یہ خیرات دے دو کر بڑے ترسے ہوئے ہیں ہم۔"
دور کہیں کسی مندر میں بجتی ہوئی گھنٹیوں کی مدھر مدھر آواز احسن کے کانوں میں اتری تو وہ سمجھ گئے کہ تارا ہنسی ہے سو وہ بھی ہنس دیئے۔
"تارا ۔۔۔" احسن نہ جانے کیوں یہ نام بار بار لینا چاہتے تھے۔
"جی ۔۔۔" وہ پھر چابی والی گڑیا کی طرح بول اٹھی۔
"نیند تو نہیں آ رہی ۔۔۔ ؟"
"ہائے اکیلے میں نیند کیسے آئے گی ۔۔۔ میرا تو ڈر کے مارے دم نکل جائے گا۔ آپ ہوتے تو شاید میں سو بھی جاتی۔" تارا بڑے بھولپن سے کہہ گئی لیکن احسن کی بے ساختہ ہنسی سن کر وہ جھینپ گئی ۔۔۔ احسن خوش ہو کر کہہ رہے تھے۔ "تارا مجھے تو اپنی سماعت پر رشک کرنے لگا ہے۔ خدا شکر کہ اپنا مقصد جاننا یقین نہیں تھا کہ آپ کو ہمارے بغیر نیند نہیں آئے گی۔ چلئے تھوڑا سا انتظار اور سہی ۔۔۔ ہم ابھی پہنچے جاتے ہیں۔"
"اللہ نہیں ۔۔۔ میرا مطلب یہ تھوڑی تھا۔ اچھا اب آپ نیل سے بات کریں تو مارے شرم کے تارا کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہونے لگے تھے۔ سامنے ہی تو نیل بیٹھی تھی۔ مانا کہ وہ ٹی۔ وی دیکھ رہی تھی لیکن الفاظ تو کانوں میں جاتے ہی ہیں لیکن احسن کو تو بڑا لطف آ رہا تھا وہ تھوڑے سے مرعوب سے بولے۔
"نہیں جی نہیں۔ ہم کیوں کریں نیل سے بات۔ ہم تو آپ ہی سے بات کریں گے کہئے طبیعت کیسی ہے آپ کی؟ دل کا کیا حال ہے؟ اور نبض کیا کہتی ہے ؟"
"سب ٹھیک ہے۔ یہ بتائیں آپ کب آئیں گے؟" تارا نے یونہی پوچھ لیا۔
"اچھا تو آپ کا دل کہتا ہے سب ٹھیک ہے لیکن نبض کہتی ہے آپ کب آئیں گے؟"
"اللہ احسن پلیز ۔۔۔" تارا کچھ کہتے کہتے رک گئی۔
"اللہ احسن پلیز جلدی آ جایئے نا" ۔۔۔ احسن نے تارا کے لہجے کی نقل اتارتے ہوئے جملہ پورا کیا تو تارا کٹ سی گئی ۔۔۔ اس نے سر اٹھا کر نیل کی طرف دیکھا اور دھیرے سے بولی۔
"میں نہیں بولتی آپ سے۔ میں فون رکھ رہی ہوں۔"
"ارے رے رے ۔۔۔ اس کا مطلب ہے کہ میں آ جاؤں گا آج رات ہی واپس آ جاؤں گا ۔۔۔ ذرا آپ سج سنور کر میرا انتظار کیجئے کچھ ریشمی ملبوس ہو۔ کھلا کھلا چہرہ ہو جھکی جھکی آنکھیں ہوں ۔۔۔ گلابی گلابی لب و رخسار ہوں ۔۔۔ اور وہ لیٹے دیکھ کیا ہوتا ہے۔ بس سب کچھ ہی ہو کر بڑا مزہ اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جانے جنگ ہو کر اور پھر یہ تو ہماری سہاگ ..." اس سے پیشتر کے احسن آگے کچھ اور کہتے تارا نے کھٹ سے فون رکھ دیا۔ احسن دو تین سیکنڈ تک ریسیور کان سے لگائے رہے لیکن پھر بڑی خوشدلی سے مسکراتے ہوئے ریسیور رکھ دیا۔

***

ڈاکٹر احسن اور ڈاکٹر ہمدانی کی خوش خلقی اور دوستیاں اس وقت بہت کام آئی تھیں۔ بڑی خاموشی سے نواز کا ایکسرے بھی ہو گیا اور آپریشن بھی۔ ڈاکٹر ربانی نے ان دونوں کا بڑا ساتھ دیا۔ ربانی کے کلینک میں احسن اور ربانی نے مل کر نواز کا آپریشن کیا۔ سرجن ہمدانی ان کے مددگار بنے۔ سب نواز کو خون کی بوتل لگا دی گئی تھی اور وہ لوہے کے بیڈ پر بے ہوش پڑا تھا۔ احسن اور ربانی نے مل کر فیصلہ کیا تھا کہ بات بالکل دبا دی جائے۔ رشتہ داروں اور احباب میں بھی تذکرہ نہیں کیا جائے۔ نواز دو تین روز ربانی کے کلینک میں رہے گا پھر ہمدانی اسے اپنے کلینک میں لے جائیں گے۔ ہمدانی کو ساری باتوں سے اتفاق تھا سوائے اس کے حملہ کرنے والے کا سراغ نہ لگایا جائے ۔۔۔ لیکن ایک ڈیڑھ گھنٹہ کی بحث کے بعد ڈاکٹر احسن اور ڈاکٹر ربانی انہیں یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گئے کہ ان کے حق میں یہی بہتر ہے کہ بات دبا دی جائے کیونکہ نواز خود بھی یہی چاہتا تھا۔ ورنہ وہ خود گولی چلانے والے کا نام یا حلیہ بتا دیتا ۔۔۔
احسن کو تو یقین آ گیا تھا کہ گولی نواز ہی سے چل گئی ہے ربانی اور ڈاکٹر ہمدانی کو شک تھا کہ گولی چلی نہیں چلائی گئی ہے۔ لیکن یہ تو طے تھا کہ گولی نواز کے پستول سے چلی یا چلائی گئی ہے ۔۔۔ اور نواز کے پاس پستول کا لائسنس نہیں تھا بس یہی وہ کمزور پہلو تھا جو ہمدانی کو ہار ماننے پر مجبور کر رہا تھا ورنہ ان جیسے جلالی آدمی کو روکنا بڑا مشکل ہو جاتا یوں بھی اب پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی خود ہمدانی بھی مطمئن ہو گئے تھے ۔۔۔
احسن نے گھڑی میں وقت دیکھا ساڑھے بارہ ہو رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح ہمدانی بھائی سے اجازت لے کر گھر جائیں لیکن مروت انہیں مارے ڈال رہی تھی۔ وہ پندرہ منٹ سے بے قرار ہو کر گھڑی دیکھ رہے تھے۔ ڈاکٹر ہمدانی نے آخر ان کی بے تابی بھانپ لی۔ انہوں نے خود ہی کہہ دیا۔

"احسن تم اب گھر جاؤ۔ بچیاں گھر پر اکیلی ہیں۔ میں رات
یہیں نواز کے پاس ٹھہر رہا ہوں۔ تم صبح فون کر کے پتا کر لینا پھر
دیکھیں گے کہ اگر حالت بہتر ہوئی تو اسے ہم گھر لے جائیں گے۔"
احسن ہدایت سن کر چلے آئے۔ انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے
ان کے سر پر سے منوں بوجھ ہٹ گیا ہو۔ خالی ذہن لیے ہی پہنچ گئے ساتھ
کی سیٹ پر ... بیٹھے ہوئے وہ بہت ... تھے — گجرے
— اور پھولوں کی پالکی — جس کے ہمراہ سیل ... خاموش ری
سے محسوس رہا تھا سیل کی بے رنگی پر ... کھاتے ہوئے ان کی نظر
پھول والے کی دکان پر پڑی — وہ بچے ہوئے گجروں کے
ہار اور گجرے اٹھا کر اندر رکھ رہا تھا اور ساری دکان بند ہو چکی تھی
احسن نے بڑی پھرتی سے بریک لگائے اور گاڑی ایک طرف کھڑی کر کے
اس کے پاس چلے آئے۔ پھول والا غیر متوقع گاہک دیکھ کر کھل اٹھا
اس کے ہار مرجھانے سے بچ گئے تھے — وہ سستا سودا کرنے
پر راضی تھا اور احسن منہ مانگی سوداگری کرنے پر بھی تیار تھے
سارے پھول گجرے ہار ڈال سیٹ پر رکھ کر وہ پھر ہواؤں کے
ہمرکاب ہوئے۔ بارہ بج کر چالیس منٹ پر وہ گھر پہنچے۔ ان ...
کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں لیکن وہ دونوں ایک دوسرے
کی خاطر جاگ رہی تھیں۔ نیل نواز کی طبیعت وغیرہ پوچھ کر اپنے کمرے
میں چلی گئی۔ احسن اسے کمرے تک چھوڑ کر آئے بلکہ اس کی پیشانی پر
کریم کا پھاہا تھا ... "آج میں بہت نادم تھا مجھے خوشی
ہے تم نے مجھے معاف کر دیا" — اور شریر نیل نے ہنس کر کہا
تھا "بھائی جان ایک تھپڑ کے عوض آپ کی اور بھابی کی صلح ہو گئی
تو پھر مجھے سودا مہنگا تو نہیں پڑا" — اور احسن ہنس کر اس کے
سر پر چپت مار کر اپنے کمرے میں آئے تو ان کی نظر سب سے پہلے تارا
پر پڑی۔ وہ چادر سر سے پیر تک اوڑھے ہوئے بستر پر لیٹی تھی —
احسن نے بڑھ کر ایک جھٹکے سے چادر کھینچ لی تو تارا نے نیند بھری گلابی
آنکھیں زبردستی کھولتے ہوئے کہا۔

"اللہ سونے دیجئے نا۔ مجھے بہت نیند آ رہی ہے۔"

"اب ڈر نہیں لگ رہا آپ کو" — احسن نے سیدھے
بیٹھتے پوچھا۔ "نہیں" — اس نے کروٹ بدل لی۔

"لیکن کیوں جی" — احسن اس کے قریب کھسک آئے۔

"آپ جو آ گئے" — وہ اور پرے کھسک گئی۔

"اور اگر میں چلا جاؤں تو" — احسن نے اس کے دوپٹے
کا کونہ پکڑ لیا —

"تو میں بے ہوش ہو جاؤں گی" —

"یہ بے ہوش ہونے والا ہتھیار آپ کے پاس خوب ہے
آپ اتنی جلدی بے ہوش کیوں ہو جاتی ہیں؟" احسن نے دوپٹے
کو جھٹکا دیا۔

"شاید اس لئے کہ قسمت میں ایک ڈاکٹر لکھا تھا" —
احسن بے ساختہ ہنس پڑے — "آپ باتیں بنانا سیکھ گئی ہیں"
"ہوں۔ میں باتیں کر رہی ہوں آپ باتیں بناتے ہیں" —
تارا نے کروٹ بدلی —

احسن پھر ہنس پڑے — "آج آپ بڑے موڈ میں ہیں تارا"

"لیکن میرا موڈ آپ کے موڈ کی طرح خطرناک نہیں ہے —
پلیز اب ... میری چادر واپس کر دیں" —

"اوہو ... احسن — اچھا یہ تو بتائیں آپ نے فون
کیوں رکھ دیا تھا؟"

"اس لئے کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا؟"

"وہ۔ میں تو آپ سے ناراض تھا آپ نے میری بات نہیں
مانی" احسن نے دوپٹے کا کونہ خود ہی چھوڑ دیا۔

"کونسی بات؟" تارا نے آنکھیں کھولیں۔

"وہی بات جس پر آپ نے فون بند کر دیا تھا" — ... نے
تارا کی طرف کروٹ بدلی —

"اُف اللہ شرم نہیں آتی آپ کو" — وہ سمٹ سی گئی۔

"کیوں شرم کی کیا بات ہے؟" — احسن نے پوچھا مگر تارا
چپ رہی — کوک نے کلاک سے ایک بجنے کا اعلان کیا۔

"تارا" — احسن نے پھر اسے پکارا۔

"جی" — وہ بوجھل سی آواز میں بولی۔

"میرے جانے کے بعد آئینہ دیکھا تھا؟"

"اوہو۔ ہوں" —

"کیوں نہیں دیکھا۔ ایک بار دیکھ لو تو یقین کر لیتیں کیسی لگ رہی ہیں"
چلو اٹھو ابھی آئینہ دیکھو —

"آئینہ دیکھ کر کیا میں بدل جاؤں گی تو" —
احسن کو ہنسی آ گئی — انہوں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی
پکڑ لی —

"چلو اٹھو — ذرا چہرہ دکھوا لینا" —

ابھی ہاتھ چھوڑ رہا ہوں ــــ پتہ ہے عادت کو آئینہ نہیں دیکھنے
امی منع کرتی تھیں وہ ــــ

"ہوں، تو پھر امی منہ دھونے کپڑے بدلنے کو بھی منع کرتی ہوں گی"

"نہیں منع تو نہیں کرتی تھیں لیکن یہ کہتی تھیں کہ اگر کسی کو نیند آرہی ہو تو اسے تنگ نہیں کرنا چاہیے" ــــ تارا نے آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے کہا۔ اور احسن نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی روکی آہستہ سے اٹھ کر تارا کے قریب جاتے ہوئے بولے۔

"اور جان! میری امی کہتی تھیں کہ اگر کسی کو غصہ آرہا ہو اور وہ نیند کا بہانہ کئے جائے تو اس کو اتنی گدگدیاں اتنی گدگدیاں کرنا چاہیے کہ وہ سب بھول جائے" احسن نے کہا اور تارا کو گدگدیاں کرنا شروع کردیں۔ ہنس ہنس کر اس کا منہ سرخ ہوگیا۔ اس کے بال بکھر گئے۔ آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ تڑپی مچلی اور پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

آج زندگی میں پہلی مرتبہ اسے خیال آیا تھا کہ امی میری دشمن نہیں تھیں وہ میری بھلائی چاہتی تھیں میرے لئے ان کا انتخاب کچھ غلط تو نہ تھا میں تو شاید پاگل تھی یا ناتجربہ کار تھی جو صورت کے نقشے کو سوچ سوچ کر کڑھنے لگی تھی ــــ

"اب کیا سوچنے لگیں ــــ اٹھو چلو ادھر آؤ ڈریسنگ ٹیبل پر" احسن نے میز پر رکھے ہوئے گجرے میں سے ایک پھول توڑ کر تارا کو پھینک کر مارا۔ اس نے پہلی بار آنکھیں کھول کر بڑے غور سے احسن کو دیکھا ــــ گہری گہری آنکھیں سانولا رنگ، مضبوط جسم اور دائیں طرف کنپٹی کے پاس سے سفید ہوتے ہوئے کچھ بال۔ ہونٹوں پر بھی چھوٹی سی پیاری سی مسکراہٹ تارا کو یوں لگا جیسے اس کا ناول آٹھ دس سال تک اس کو صحراؤں میں جنگلوں میں ڈھونڈتا ڈھونڈتا ایک دم سامنے آگیا ہے۔ اپنی پختہ اور پروقار شخصیت کے ساتھ بالکل بھرپور ہو کر ــــ

"اف خدا جان، اس قدر غور سے کیوں دیکھ رہی ہو کیا نظر لگاؤ گی ہے" احسن نے اسے ٹوکا تو وہ جھینپ گئی ــــ

"آف، ہائے ماں! اتنی شرم بھی کیا بات کہہ دی میں نے اس سے کچھ تو میرے دل کے تاروں کا پاس کرو۔ یہ لگتا ہے صبح تک بدبخت بچے گا نہیں ــــ" تارا نے مسکرا کر احسن کو دیکھا اور پھر ڈریسنگ ٹیبل کے پاس چلی آئی۔ احسن اس کے پیچھے آ کھڑے ہوئے۔ بالوں میں برش کرتے ہوئے اس نے بال پیچھے کئے تو احسن نے ہاتھ مار کر کچھ بال اس کے چہرے پر بکھرا دیئے۔ تارا نے پیار سے احسن کو دیکھا اور پھر دھیرے سے بولی۔

"دیکھیں زیادہ تنگ مت کریں ورنہ سچ میں امی کے پاس جا کر سو جاؤں گی"۔

"اچھا نہیں نہیں ہم زیادہ تنگ نہیں کریں گے تھوڑا تنگ کریں گے ــــ آؤ چوڑیوں کے بعد کچھ سنگھار ڈریسنگ ٹیبل پر بیٹھ جاؤ" تارا نے چہرے پر لوشن لگایا اور لپ اسٹک اٹھاتے اٹھاتے اس کا ہاتھ رک گیا۔ نہ جانے کیوں اس کا دل چاہا کہ احسن اس سے خود کہیں کہ لپ اسٹک لگاؤ ــــ تارا کو آج یہ چھوٹی چھوٹی باتیں بہت اچھی لگ رہی تھیں جو کبھی بڑی بچکانہ سی لگتی تھیں۔ زندگی کا اصل رخ یہ ہے یہ احساس اس کے لئے بالکل اچھوتا، بالکل نیا تھا۔ بار بار اسے اپنی بے وقوفی کا خیال آرہا تھا کئی دفعہ اس نے سوچا کہ میں نے اتنے اچھے اور ٹوٹ کر چاہنے والے شوہر کو کس قدر ستایا کتنا تنگ کیا ــــ اور کئی دفعہ اس نے پکا عہد کیا اب وہ مرتے دم تک احسن کی وفادار رہے گی۔ احسن کو اتنی خوشیاں اتنی محبت دے گی کہ وہ پچھلی تمام تلخیاں بھول جائیں گے۔ اس نے تو یہ بھی سوچ لیا تھا کہ وہ امی کے گلے میں باہیں ڈال کر زندگی میں پہلی دفعہ ان کی پیشانی چوم کر کہے گی کہ میں آپ کی مشکور ہوں کہ آپ نے میرے لئے اتنے اچھے شوہر کا انتخاب کیا ــــ

"کہاں کھو گئیں؟" احسن نے اس کے کندھوں پر اپنے ہاتھوں کا ہلکا سا دباؤ ڈالتے ہوئے کہا تھا۔ اس نے چونک کر احسن کو دیکھا اور یکدم ہنس پڑی۔ "بس اب تو صبح ہوگئی نا" ــــ

"نہیں ــــ کہیں بھی ــــ بیگم وہ لپ اسٹک آپ کا انتظار کر رہی ہے" تارا نے مسکرا کر لپ اسٹک اٹھالی ــــ

آج خوشیوں کی پہلی رات تھی جو بیک وقت ان دونوں کے دلوں میں مسرتوں کے اژدہام کے ساتھ اتری تھی ــــ تارا نے احسن کی فرمائش پر پہناوا پہنا ہوا تھا۔ جو پھول پہنے تھے اور احسن جان نثار کرنے پر آمادہ تھے ــــ

آج کی رات ان تمام تشنگیوں کا انعام بن کر آئی تھی جو ان کے دل ان کی آنکھوں اور ان کے ہونٹوں پر ایک طویل عرصے سے چھائی تھیں ــــ آج کی رات وہ سہاگ رات منانا چاہتے تھے آج کی رات وہ پچھلی تمام راتوں کی تلخیوں کو دلوں میں دفن کر دینا چاہتے تھے۔ آج سے وہ نئی زندگی شروع کرنا چاہتے تھے۔ اسی لئے انہوں نے

"تارا۔ اُف خدایا وہ لاکٹ تو دکھاؤ جو میں نے لڑائی والی رات
تمہیں دیا تھا۔۔۔ اس کا ایک راز تو تمہیں بتانا ہی نہیں ہے۔"

تارا نے گردن پر ہاتھ پھیرا۔۔۔ آگے گلے میں ٹٹولا۔۔۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ گلے میں صرف گلو بند تھا۔ لیکن لاکٹ نہیں تھا۔۔۔ وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ جمپر جھٹک لیا۔ دوپٹہ اتار کر دیکھ لیا۔ لاکٹ نہیں تھا۔ اس کا چہرہ زرد پڑنے لگا۔۔۔

"اللہ احسن۔۔۔ لاکٹ نہیں ہے۔ پتہ نہیں کہاں گیا۔۔۔ سچ کہہ رہی ہوں میں نے خود نہیں اتارا۔۔۔ ہائے اللہ اب کیا ہوگا۔۔۔ وہ لاکٹ تو سونے کا تھا۔۔۔ اتنا مہنگا ہوگا۔۔۔ خدا جانے میں نے کہیں رکھ تو نہیں دیا۔۔۔ لیکن نہیں میں نے تو اتارا ہی نہیں گلے میں ہی تھا۔ ابھی کے یہاں بھی تھا۔۔۔ سچ احسن میں نے ابھی کو بھی نہیں دیا۔۔۔ ہائے اللہ اب کیا ہوگا۔" وہ جلدی جلدی بولنے لگی۔ اس کا چہرہ زرد ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔۔۔

احسن اس کی گھبراہٹ اور پریشانی دیکھ کر ہنس پڑے۔ "ارے ارے کیا ہو گیا تمہیں۔۔۔ یہ آنسو۔۔۔ توبہ توبہ بڑی بات ہے۔ ذرا سے لاکٹ کے لئے اتنا گھبرا رہی ہو۔ دیکھو دیکھو کہیں پھر سے بے ہوش نہ ہو جانا پاگل میں تمہیں دوسرا بنوا دوں گا، ویسا ہی۔۔۔ چلو یہ آنسو پونچھو" احسن نے ہاتھ بڑھا کر اس کے آنسو پونچھنا چاہے تو تارا احسن کا ہاتھ پکڑ کر سچ مچ رو دی۔۔۔

"احسن۔۔۔ آپ سمجھ رہے تھے کہ لاکٹ اتارنا نہیں چاہتی یا کرش۔۔۔ سچ میں نے جان بوجھ کر نہیں گرایا۔"

"ارے پگلی میں کب کہہ رہا ہوں کہ جان بوجھ کر گرایا۔۔۔ ابھی بیوقوف ہی کیوں رہی ہو تم۔۔۔ اور یہ کیا تکلف ہوئی کہ میں نے ابھی نہیں دیا اور وہ مہنگا ہوگا۔۔۔ وہ جو کچھ بھی تھا تم سے بڑھ کر نہیں۔۔۔ اپنی تارا پر میں ایسے دس لاکٹ نثار کر سکتا ہوں۔۔۔ میں تم سے آج اس لئے پوچھ لیا کہ میں تمہیں بتانا چاہتا تھا کہ اس لاکٹ میں میرا فوٹو بھی تھا۔ وہ بجو تمہارا دل سا تھا نہ۔ وہ کھل جاتا تھا اور اس کے اندر میرا فوٹو لگا ہوا تھا۔۔۔ وہ میں نے خصوصی طور تھا اس رات تو خیر تم نے اتنی مہلت ہی نہیں دی کہ تمہیں۔۔۔"

تارا نے احسن کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "اللہ نہیں اب پچھلی باتیں مجھے شرم آتی ہے۔۔۔ دکھ ہوتا ہے۔"

"جی۔۔۔" احسن نے خوش ہو کر بے یقینی سے پوچھا

"ہاں۔۔۔ جی۔۔۔" تارا نے شرما کر سر جھکانا چاہا احسن کے ہاتھوں نے جھک کر اس کے گرد حصار باندھ لیا۔"

٭٭٭

ڈاکٹر احمد جمالی نواز کو اپنے کلینک میں لے آئے تھے وہ بڑی جانفشانی اور تندہی سے نواز کا علاج کر رہے تھے۔ لیکن نواز کا بخار اتر کر ہی نہیں دیتا تھا۔ احسن بھی صبح شام نواز کو دیکھنے آتے تھے۔ کبھی کبھی تو ایک دن میں تین چکر بھی ہو جاتے تھے۔ وہ نواز سے بڑی بڑی اچھی اچھی باتیں کرتے تھے۔ وہ اس سے مذاق کرتے اسے ہنسانا چاہتے، اسے خوش رکھنا چاہتے۔ نواز ان کا دل رکھنے کو کبھی کبھی ہنستا بھی تھا اور خوش رہنے کی بات پر اس نے ہمیشہ ایک ہی جواب دیا کہ چچا جان میں خوش ہوں۔ سچ بہت خوش بہت مطمئن آپ تو خوامخواہ پریشان ہوتے ہیں۔ لیکن احسن جانتے تھے کہ نواز خوش نہیں ہے۔ وہ بجھ کر رہ گیا ہے۔ اس کی شخصیت کا وہ ایک ٹمٹماتا روشن شرارہ جو ہو گیا ہے۔ اسے عام لڑکوں سے منفرد بنائے رکھتا تھا۔ نواز رنجیدہ ہو کر کچھ سوچنے لگتا تو احسن اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہتے۔۔۔

"کیا سوچنے لگے ہو۔۔۔"

"جی۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔ میں کیا سوچوں گا۔" نواز مسکرانا چاہتا لیکن خشک ہونٹوں پر مسکراہٹ ٹکتی ہی نہ تھی۔۔۔

"نواز۔۔۔ خوش رہا کرو۔" احسن مشورہ دیتے۔

"خوش تو ہوں۔۔۔" نواز فوراً بول اٹھتا۔

"نہیں جھوٹ بولتے ہو۔۔۔ خوش رہنے والوں کے چہرے یوں لٹکے ہوئے نہیں ہوتے۔۔۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم وقت پڑنے پر اس قدر بزدل بھی ہو سکتے ہو۔ بہت معمولی سا زخم ہے ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔"

"زخم پڑ جائیں تو بڑی مشکل سے ٹھیک ہوتے ہیں چچا جان" نواز سسکتے ہوئے لہجے میں کہتا لیکن احسن اس کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہتے "مورال بلند رکھو جوان حوصلہ بڑا ہونا چاہئے۔ اچھا اب تم آرام کرو اب میں چلوں گا۔ ارے یاد نواز! اچھا تمہاری چچی جان کی طبیعت خراب ہے ورنہ وہ ضرور تمہیں دیکھنے آتیں۔"

"نہیں چچا جان انہیں تکلیف نہ دیں، رہنے دیں، میں تو ٹھیک ٹھاک ہوں۔" نواز بڑی بشاشت سے کہنا چاہتا تھا لیکن اس کا چہرہ تپنے لگتا۔ اسے وہ قول ٹوٹتے لگتے تو وہ ایک دم تکلیف کا بہانہ بنا لیتا

اور احسن بھی اسے تسلی دے کر چلے آتے۔ سال کا طویل عرصہ تو تارا اسی طرح رہتا تھا۔ وہ اپنے کلینک میں ہوتے یا نواز کے پاس ــــ تارا کی قربت کا احساس ان کے ہمرکاب رہتا ــــ وہ پہلے ہی انہیں عزیز از جان تھی۔ لیکن جب سے انہیں پتہ چلا تھا کہ وہ ان کی محبت کی مقدس امانت کو اپنے لہو سے سینچ رہی ہے تو انہیں وہ خود اپنی حیات سے بڑھ کر پیاری ہو گئی تھی۔

آج بھی احسن نے تارا سے نواز کی عیادت کے لئے چلنے کو کہا تو وہ جھنجلا کر بولی ــــ "آپ مجھ سے بار بار کیوں کہتے ہیں۔ آپ کو پتہ ہے مجھے ہسپتال کے نام سے دہشت ہوتی ہے۔ مجھے اپنے پاپا یاد آنے لگتے ہیں ــــ میں ہسپتال نہیں جاؤں گی۔ اور پھر مجھے صبح سے چکر آ رہے ہیں ــــ بہتر ہے آپ چلے جائیں میں ذرا آرام کروں گی۔"ــــ

"او ہو ــــ یہ چکر کیوں آ رہے ہیں بھئی"ــــ احسن نے پھر اسے ستانا چاہا ــــ

"بس آ رہے ہیں۔ آپ کو مطلب"ــــ

"مطلب ہمیں نہ ہوگا تو کسے ہوگا جان ــــ ہم تو کہتے ہیں کہ آپ اب بھی اپنے منہ سے اعتراف کر لیجئے کہ آپ کے یہ چکر بلا وجہ نہیں۔ دراصل یہی آپ کو ننھے موزے سوئیٹر"..... تارا نے پلٹ کر احسن کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ــــ

"کیوں، کیوں! میرا منہ کیوں بند کر رہی ہو میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا"! احسن نے تارا کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے تو تارا نے منہ بنا کر کہا۔

"بڑے اچھے لگتے ہیں بس خواہ مخواہ ایک بات مل گئی ہے آپ کو تو..... سچ کہتی ہوں اگر آپ نے زیادہ تنگ کیا تو میں ناراض ہو جاؤں گی"ــــ تارا نے وارننگ دی تو احسن مسکرانے لگے ــــ اب تو ان کی زندگی مسکراہٹوں سے عبارت تھی ــــ وہ خود بھی بے دریغ مسکراتے تھے اور نواز کو بھی مسکرانے کا مشورہ دیتے تھے لیکن نواز کے ہونٹوں پر تو اداسیوں کے ڈیرے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ ساری خوشیوں سے ناطہ توڑ بیٹھا ہے اور احسن اس کے پاس آتے تو بہت دیر تک بیٹھے چھوٹی چھوٹی خوشیوں کی کرنیں بکھیرتے کہ اس کے چاروں طرف پھیلا دیتے لیکن وہ سب سے بے نیاز بنا لیٹا رہتا ــــ اسے اپنے کالج کے مس ہو جانے کا افسوس تھا۔ اس کی پڑھائی میں خلل پڑ رہا تھا ــــ اس کے پریکٹیکل نکلے جا رہے تھے ــــ وہ چاہتا تھا کہ کوئی اسے اس کی کتابیں لا دے تاکہ وہ گزرتے وقت کا ظلم سہنے کی بجائے اس وقت سے کچھ خراج لے سکے ــــ لیکن ڈاکٹر ہمدانی کتابیں منگوانے کے ذکر سے ہی بگڑ جاتے۔ وہ چاہتے تھے نواز مکمل آرام کر کے جلد از جلد صحت یاب ہو جائے ــــ لیکن نواز کا دل چاہتا تھا کہ کسی طرح اڑ کر کتابوں تک جا پہنچے لیکن فی الحال وہ معذور تھا۔ ہاں ایک سہارا احسن بھائی کا تھا سو اس نے کسی نہ کسی طرح راضی کر ہی لیا کہ وہ ڈیڈی سے چھپا کر لاکر اسے اس کی کتابیں لا دیں۔

احسن اس کے کمرے کی چابی لے کر سیدھے سوسائٹی جا پہنچے فزکس کی کتاب تو انہیں آسانی سے میز پر رکھی ہوئی مل گئی۔ لیکن بیالوجی کی کتاب انہیں کہیں نظر نہ آئی۔ نواز نے انہیں بتا دیا تھا کہ کتاب اگر میز پر یا شیلف میں نہ ہو تو تکئے کے نیچے ہوگی ــــ احسن نے تکیہ ہٹا کر دیکھا بیالوجی کی کتاب رکھی ہوئی تھی۔ انہوں نے کتاب اٹھائی تو اس کے نیچے سے ایک ڈائجسٹ نکل آئی۔ انہوں نے ڈائجسٹ بھی اٹھا لی ــــ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے انہیں ایک دم یاد آ گیا کہ نواز نے کتابوں کے ساتھ ایک کاپی اور پین بھی منگوایا تھا ــــ کاپیاں تو میز پر تھیں لیکن پین کہاں ہوگا ــــ شاید میز کی دراز میں ہو ــــ

انہوں نے دراز کھولنا چاہی لیکن دراز لاک تھی ــــ وہ تکئے ہٹا کر نیچے سے چابی ڈھونڈنے لگے ــــ چابی یہاں نہیں تھی ــــ نواز نے تو کہا تھا کہ چابی تکئے کے نیچے ہی ملے گی ــــ لیکن چابی! ــــ چابی ہے کہاں؟ ــــ انہوں نے تکیہ ہٹا کر ایک طرف کر دیا۔ بستر کی چادر اٹھائی تو گدے اور مسہری کے درمیان لٹکتی ہوئی سنہری زنجیر نے انہیں اپنی طرف متوجہ کر لیا ــــ شاید اسی زنجیر میں چابی ہو ــــ احسن نے زنجیر کھینچی ــــ سرخ پتھروں والا لاکٹ ان کے ہاتھ میں تھا۔

اس رومانی داستان کے جذباتی کردار
واقعات کے نقطۂ عروج پر پہنچ چکے ہیں!
قیاس کیجئے
ان کرداروں کا انجام کیا ہوگا؟

شفیقہ بریلوی

تاج الرجال اُم الخیر رابعہ بصریہؒ

انسان پہلے آسمان پر مقبول ہوتا ہے
پھر زمین پر مقبول ہوتا ہے

خواتین علم و فن کے میدان میں بڑی بڑی عالم و فاضل گزری ہیں، فقہ میں بڑی بڑی فقیہ خواتین گزری ہیں، ادب میں بڑی بڑی ادیب خواتین گزری ہیں، علم طب میں بڑی بڑی طبیب خواتین گزری ہیں، تجارت کے میدان میں بڑی بڑی تاجر خواتین گزری ہیں، عبادت گزاری میں بڑی بڑی عبادت گزار اور زاہد خواتین گزری ہیں۔

عبادت گزار اور زہد و قناعت اور صبر و شکر بلفظ دیگر صوفیانہ زندگی بسر کرنے والی خواتین میں ایک ممتاز اور مشہور نام حضرت رابعہ بصریہؒ کا بھی ہے، ترویج دین، اللہ تعالیٰ سے لو لگانے کی اہمیت، عبادت گزاری کی عظمت، معاشرے کی اصلاح، پھر ان کی روحانیت بھری باتیں اور ہر گفتگو میں احکامات خداوندی کا تذکرہ، آیاتِ قرآنی کا کثرت سے استعمال، ان تمام باتوں نے ان کو بڑی شہرت بخشی۔

بغداد کو خلافت بنو امیہ (۴۱ھ تا ۱۳۲ھ) کے دور العراق کے مصروف مقامات سے ہیں، اور خاص طور پر بصرہ کی سرزمین سے بڑے بڑے اولیاء اللہ، عارف باللہ اور اصحاب سیف و قلم اٹھے۔ بنی امیہ کی بربادی اور بنی عباس کی خلافت سے جو سیاسی انقلاب ابھرا اس سے عالم اسلام کی ایک نئے دور کی ضرورت محسوس ہوئی۔ عباسیوں کے دوسرے خلیفہ ابو جعفر منصور (۱۳۶ھ تا ۱۵۸ھ) نے بغداد کا نیا شہر آباد کیا، لیکن اس سے قبل مختلف اعتبار سے بصرہ کو بڑی اہمیت و عظمت حاصل تھی۔ اسی بصرہ میں ۹۵ھ ہجری کو قبیلہ عدوی کے سردار محمد اسمٰعیل بصریؒ کے گھر حضرت رابعہؒ کی ولادت ہوئی۔ یہ اپنے والدین کی چوتھی بیٹی تھیں اسی لئے ان کا نام رابعہؒ رکھا گیا۔ ان کے گھر میں ہی علم و عرفان کا دریا موجزن تھا، لہٰذا گھر ہی میں قرآن، تفسیر اور حدیث کی تعلیم حاصل کی، اور پھر دین کی باتوں اور دین کے کاموں میں ہی کھو گئیں یا یوں کہیں کہ زہد و عبادت اور ریاضت ہی ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ اسی وجہ سے ان کو تاج الرجال اور اُم الخیر کے القاب سے یاد کیا جانے لگا۔ بصرہ کے بڑے بڑے علماء اور صلحاء حضرت رابعہؒ کے یہاں آکر عبادت کرتے تھے اور اس عمل کو انتہائی خیر و برکت کا باعث سمجھتے تھے۔ ان بزرگوں میں حضرت ابو سلیمان درانیؒ اور حضرت امام سفیان ثوریؒ کے نام گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ کہا جاتا ہے خلیفۂ وقت بھی آپؒ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور حضرت رابعہؒ کی زبان فیض ترجمان سے اسلام، دین اور تصوف کی باتیں سن کر روح کو خوش اور تازہ کرتا۔ ان کی مجلس سے فیض حاصل کرنے والے فضلاء کی تعداد بھی کافی تھی جو ان سے شرعی مسائل اور تصوف کی باریکیاں پوچھتے تھے۔ حضرت رابعہؒ کے مزاج میں صبر و استقلال اور استغنا بہت تھا، جو ایک سچے مسلمان کی خاص خوبی ہے۔ خلیفۂ وقت اور امراء ان کی خدمت

میں حاضر ہوتے لیکن کبھی کسی قسم کی اپنی حاجت یا ضرورت بیان سے ظاہر نہیں فرماتی تھیں، توکل اور قناعت کے ساتھ زندگی گزارنے میں بہت خوش تھیں۔

حضرت امام سفیان ثوریؒ نے ایک دن آپؒ سے استفسار فرمایا کہ آپ کے ایمان کی کیفیت اور حقیقت کیا ہے؟ حضرت رابعہؒ نے جواب میں فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ کی عبادت اور پرستش نہ میں جنت کی امید و خواہش پر کرتی ہوں اور نہ دوزخ کے خوف سے بلکہ محبت اور شوق کے باعث میں یہ سب کچھ کرتی ہوں" پھر حضرت رابعہؒ نے معرفت کے چند شعر پڑھے جن کو سن کر حضرت امام سفیان ثوریؒ پر جذب و کیف کی حالت طاری ہو گیا۔

حضرت رابعہ بصریہؒ نے شعر و ادب کی دُنیا میں بھی تابناک جواہر پارے چھوڑے ہیں۔ اللہ اور اس کے رسولؐ سے عشق و محبت کا لاوا جن کے دلوں میں کھولتا رہتا ہے اُن کے جذبات بالعموم موزوں ہو کر اثر انگیز اشعار کا روپ اختیار کر لیتے ہیں، حضرت رابعہؒ کا کلام اہل اللہ کے حلقوں میں آج بھی جو آگ لگا دیا کرتا ہے اس کا لطف صرف وہی قلوب اٹھا سکتے ہیں جو سوزِ عشق سے لذت اندوز ہونے کی طلب و صلاحیت رکھتے ہیں، حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے بھی آپؒ کے کلام کی بہت تعریف فرمائی ہے اور ان کے اشعار اکثر اپنے مضامین میں نقل کئے ہیں۔

حضرت امام سفیان ثوریؒ نے ایک مرتبہ حضرت رابعہؒ کی مجلس میں دعا مانگی کہ "یا اللہ، میں تجھ سے سلامتی کا طالب ہوں" حضرت رابعہؒ ان کی یہ دعا سن کر زار و قطار رونے لگیں، حضرت امام سفیان ثوریؒ نے حضرت رابعہؒ سے اچانک رونے کا سبب دریافت کیا تو آپؒ نے فرمایا کہ "تمہاری اس دعا نے مجھ کو رلایا، تم اللہ سے سلامتی چاہتے ہو اور سلامتی نام ہے ترکِ دنیا کا، جس میں تم آلودہ ہو رہے ہو۔ میں ان لوگوں کے حال زار پر بہت افسوس کرتی ہوں جو اپنے حال و قال کو خود سنبھالنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ صرف دعاؤں سے اپنا کام نکالنا چاہتے ہیں۔"

علامہ ابن الجوزیؒ نے بھی حضرت رابعہؒ کی بڑی تعریف لکھی ہے علامہ ابن الجوزی فرماتے ہیں کہ حضرت عبیدہ جو بڑی نیک اور عابدہ خاتون گذری ہیں جو حضرت رابعہ بصریہؒ کی خادمہ تھیں، ان سے روایت ہے کہ حضرت رابعہؒ کا یہ معمول تھا شب بھر عبادت الٰہی میں مصروف رہتی تھیں، صبح کو نماز فجر کے بعد کچھ دیر کے لئے مصلّے پر ہی سو جاتی تھیں اور پھر اٹھ کر عبادت میں مشغول ہو جاتی تھیں۔

حضرت رابعہ بصریہؒ کی محفل میں ایک دن کسی نے اعتراض کیا کہ عورتیں ناقص العقل ہوتی ہیں، اسی وجہ سے کسی عورت کو نبوت نہیں ملی، حضرت رابعہؒ نے یہ بات سن کر جواب میں فرمایا کہ "ہو سکتا ہے کہ تمہاری بات حقیقت پر مبنی ہو لیکن اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اگر ہماری صنف کو نبوت نہیں ملی تو ہماری صنف نے نبوت اور خدائی کا جھوٹا دعویٰ بھی کبھی نہیں کیا، جھوٹی نبوت اور جھوٹی خدائی کے دعویدار بھی صرف مرد ہی ہوئے ہیں۔"

حضرت رابعہؒ بزرگوں کا بڑا احترام کرتی تھیں، ایک دن آپؒ کھانا پکا رہی تھیں کہ خواجہ امام حسن بصریؒ تشریف لے آئے، کھانا پکانا آپؒ نے ترک کر دیا اور خواجہ امام حسن بصریؒ سے دین و تصوف کی باتوں میں محو ہو گئیں، اور فرمایا کہ "واللہ یہ باتیں کھانے سے بہتر ہیں یہ روح کی اصل غذا تو یہی ہے" مغرب تک خواجہ امام حسن بصریؒ سے باتوں میں مصروف رہیں، ان کے رخصت ہونے کے بعد مغرب کی نماز ادا کی اور پھر کھانا پکایا، حضرت رابعہؒ کو اللہ تعالیٰ نے سب کچھ دے رکھا تھا۔ خادمائیں بھی تھیں، اور دولت بھی تھی۔ لیکن وہ اپنا تمام کام خود ہی انجام دیتی تھیں۔

حضرت رابعہؒ کے یہاں دو درویش مہمان آ گئے، اُس وقت ان کے پاس خشک دو روٹیاں تھیں، انہوں نے ان درویشوں کے سامنے وہی دونوں روٹیاں رکھ دیں، اتنے میں دروازہ پر ایک سائل نے صدا دی، یہ صدا سنتے ہی حضرت رابعہؒ نے مہمانوں کے آگے سے وہ دونوں روٹیاں اٹھائیں اور سائل کو دیدیں، مہمان حیران بیٹھے رہے اور کچھ نہ سمجھ سکے کہ کیا معاملہ ہے۔ تھوڑی دیر میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک کنیز خوان میں کھانا لئے ہوئے آ رہی ہے، کھانا مہمانوں کے آگے رکھا گیا تو دیکھا کہ اس میں پوری بیس روٹیاں ہیں، مہمانوں نے تعجب سے پوچھا کہ آخر ماجرا کیا ہے؟ حضرت رابعہؒ نے کہا کہ ان دو خشک روٹیوں سے آپ لوگوں کا تو پیٹ بھرتا نہیں، اس لئے میں نے سائل کی صدا سنتے ہی وہ دونوں روٹیاں اس کو دیدیں، تاکہ اس کے عوض اللہ تعالیٰ میرے مہمانوں کے لئے سامان کر دے، تو اُس نے سامان کر دیا، ہر ایک روٹی کے بدلے میں اُس نے دس روٹیاں بھیج دیں، جیسا کہ دس گنا ثواب دینے کا اس نے وعدہ فرمایا ہے، یہ سن کر وہ دونوں درویش حضرت رابعہؒ کے کمال ایمان کے قائل ہو گئے، اور پھر تمام عمر ان کے حلقہ بگوشوں میں رہے۔

زہد و عبادت اور دین کے دیگر مشاغل میں وہ اس حد تک کھوئی

> زندگی کا شعلہ دوسروں سے مستعار نہیں لیا جاتا۔ یہ صرف اپنی روح کے آتش کدے میں روشن کیا جا سکتا ہے۔
>
> "علامہ اقبالؒ"

ہوتی تھیں کہ دنیاداری کے لئے ان کے پاس وقت ہی نہیں تھا اور اسی وجہ سے انہوں نے عقد بھی نہیں کیا اور تمام زندگی کنواری رہیں۔ ایک مرتبہ کسی نے ان سے سوال کیا کہ آپ نے عقد کیوں نہیں کیا تو آپ نے جواب میں کہا عقد کسی وجود پر ہوتا ہے، یہاں اپنی ہستی اور اپنا وجود ہی کھو چکی تو عقد کیسا؟

آپ با حسن سیرت اور حسن صورت ہر اعتبار سے ممتاز تھیں بصرہ کے ایک رئیس عبدالواحد ابن زید نے ان کو نکاح کا پیغام بھیجا۔ حضرت رابعہؒ نے جواب میں کہلا بھیجا کہ اے سیاہ قلب تو اپنے جیسی کوئی سیاہ قلب عورت تلاش کر لے، جو تیرے ساتھ ازدواجی زندگی کی گاڑی کو دھکیل سکے، اور جس کے دل میں اللہ کے علاوہ کچھ تیری محبت کی گنجائش بھی نکل سکے۔

حضرت رابعہؒ جیسی تارک الدنیا اور کریم خصائل خاتون کو دنیاوی تعلقات میں پھنسانا واقعی مناسب نہ تھا، یہ ترک تعلق ان کے لئے زیور تھا نہ کہ ان لوگوں کے لئے جو تمام علائق دنیوی میں آلودہ ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ نہ تمام مرد حضرت عیسیٰؑ ہیں اور نہ تمام عورتیں حضرت رابعہؒ ہیں، جو باتیں ایک تارک الدنیا اپنے لئے مصلحت تصور کرتا ہے بسا اوقات دنیادار کو اس کی حد سے زیادہ خلاف ہوتی ہے۔

حضرت رابعہؒ کے یہاں ایک دن حسب معمول مجلس گرم تھی کہ دنیا اور اہل دنیا کا موضوع زیر بحث آیا، لوگوں نے دنیا اور اہل دنیا کی برائیوں میں بڑا زور بیان صرف کیا، کچھ دیر تو حضرت رابعہؒ یہ گفتگو سنتی رہیں، پھر ناگواری کے انداز میں بولیں بس خاموش رہو اور یہ بحث ختم کرو، تمہارے اس بحث و مباحثہ سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ تم میں سے ہر شخص دنیادار ہے، اگر تمہارے دلوں میں دنیا کی محبت نہ ہوتی تو تم نشست میں بھی اس کا تذکرہ اس شدت سے نہ کرتے کیونکہ یہ قاعدہ ہے حقیقت ہے کہ جس چیز کی انسان کے دل میں جس قدر محبت وشیفتہ

ہوتا ہے اسی قدر مختلف انداز اور مختلف طریقوں سے وہ اس کا ذکر کرتا ہے۔

حضرت رابعہؒ سے کسی نے دریافت کیا کہ آپ شیطان کو برا کہتی ہیں یا نہیں؟ حضرت رابعہؒ نے جواب میں کہا رحمٰن کی محبت نے دل میں شیطان کی عداوت و دشمنی کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔

حضرت رابعہؒ نے تین بار حج بیت اللہ شریف اور زیارت رسولؐ کی سعادت حاصل کی، ایک عربی خر ان کا پالتو تھا، اسی پر سوار ہو کر وہ حج کے لئے جاتی تھیں، حج کے موقع پر بڑے بڑے صلحاء اولیاء اللہ، مشاہیر علماء اور ممتاز فضلاء سے ان کی ملاقات ہوتی تھی جو سب ان کا احترام کرتے تھے، حضرت ابراہیم ادھمؒ سے بھی مکہ معظمہ میں ان کی ملاقات ہوئی تھی۔

رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک مشہور حدیث ہے کہ انسان پہلے آسمان پر مقبول ہوتا ہے پھر زمین پر مقبول ہوتا ہے۔ یعنی جو شخص اپنی نیکیوں اور اعلیٰ انسانی صفات کی بدولت اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کا مقرب اور مقبول بندہ ثابت کرتا ہے، اس کو دونوں جہانوں کی عزت نصیب ہوتی ہے اور وہ اس دنیا میں بھی ہر دل عزیز ہو جاتا ہے۔

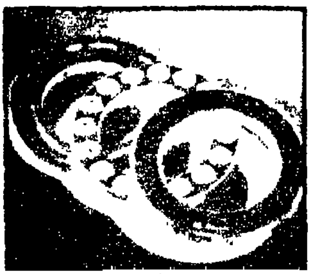
اللہ کی قربت اور مقبولیت اور دنیا میں ہر دل عزیزی نہ علم و فن سے حاصل ہوتی ہے نہ حسن و جمال سے، نہ مال و دولت سے، نہ طاقت و قوت سے، اس کے حصول کا ذریعہ صرف ایک چیز ہے "نیکی"۔

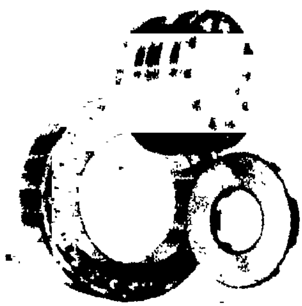
حضرت رابعہؒ کو یہی چیز بدرجہ اتم حاصل تھی لیکن ان کی وصیت یہ تھی کہ اپنی نیکیوں کو اس طرح چھپاؤ جس طرح تم اپنے عیوب کو چھپاتے ہو، وہ کہا کرتی تھیں کہ میری جو نیکی ظاہر ہو گئی ہے میں اس کو اپنی نیکیوں میں شمار نہیں کرتی۔

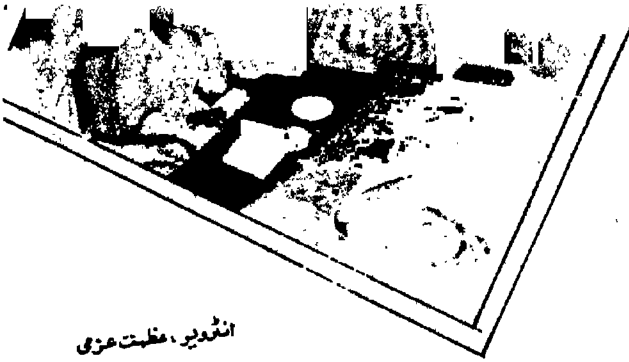
حضرت رابعہ بصریہؒ کی وفات ماہ رمضان المبارک ۱۸۵ ہجری مطابق مارچ ۸۰۱ء میں ہوئی۔ وفات سے قبل انہوں نے اپنی خادمہ عبدہ سے کہا کہ میرا بلاوا آگیا ہے، میری وفات کے بعد تم مجھ کو غسل دے کر میرے جبہ میں جس کو پہن کر وہ عبادت کرتی تھیں، مجھ کو کفنا دینا۔ عبدہ نے ان کے حکم کی تعمیل کی پھر لوگوں نے ان کی وصیت کے مطابق، کوہ طور جہاں حضرت موسیٰؑ نے اللہ تعالیٰ کی تجلی دیکھی تھی اسی جگہ دفن کیا۔











انٹرویو ۔ عظمت عزمی

****

ریڈیو، فلم اور ٹی وی کا سدا بہار فنکار

محمود علی

آوازوں کے گلشن کی منفرد خوشبو

انسانوں کے کارواں کا نیک نفس انسان

ٹھنڈے اور میٹھے پانی کے جھرنوں کی طرح نرم نرم بہتی ہوئی آوازوں کے قافلے میں سے آج میں ایک آواز کا دامن تھام کر چل پڑی ہوں یہ آواز آشتی کے گہرے رنگوں سے رنگی ہوئی مانوس آواز ہے یہ آواز امرت میں گوندھی ہوئی سدا بہار آواز ہے۔

یہ آواز اُڑتی خوشبو کا عنوان ہے۔

یہ آواز محبتوں کی امین ہے۔

اور دنیا اس آواز کو محمود علی کے نام سے پکارتی ہے۔

محمود ــــ علی ــــ!

میں اگر ان دو چھوٹے چھوٹے لفظوں کو چند صفحات میں لپیٹ کر رکھنا چاہوں تو شاید نہیں رکھ سکتی کیونکہ یہ دو لفظ ہمارے جس فنکار کی پیشانی کا عنوان بنے ہوئے ہیں اس کا فن اس قدر وسیع ہے کہ اسے تبصرے کے پیمانوں سے ناپا نہیں جاسکتا۔

آج سے تیس بتیس برس پہلے بمبئی میں آل انڈیا ریڈیو کی طرف جانے والے محمود علی نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ خدائے بزرگ نے ان کے لئے شہرت و مقبولیت کے کتنے قیمتی تمغے منتخب کر رکھے ہیں۔ محمود علی نے آل انڈیا ریڈیو میں بھی کام کیا اور پھر وہ ۱۹۴۶ء میں یہاں آگئے ایک سال تک بے کار رہے لیکن ۱۹۴۷ء میں ان کے رشتے ناطے ریڈیو پاکستان سے بندھ گئے۔

"اچھا محمود علی صاحب یہ بتائیں کہ آپ نے اب تک کتنے ڈراموں میں کام کیا ہے؟" میں نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے سنجیدہ اور بردبار شخص سے سوال کیا تو وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گئے اور پھر کچھ سوچ کر بولے "صحیح تعداد تو مجھے یاد نہیں لیکن میں نے تین چار سو سے زائد ڈرامے کئے ہیں۔ اور تقریباً ۱۵، ۱۶ سلسلہ وار پروگرام بھی کئے ہیں۔"

"بہت خوب ــــ ماشاء اللہ ــــ لیکن صاحب یہ بتایئے کہ ریڈیو پر کام کرنے کا کیا آپ کو بچپن ہی سے شوق تھا؟" میں نے مسکراتے ہوئے یہ سوال کیا تو وہ بھی مسکرا اٹھے اور اعتراف کرتے ہوئے بولے۔



"جی ـــــ شوق تو بے شک بچپن ہی سے تھا لیکن والد [illegible]
اجازت دیتا تھا۔ خاندان کے جنگ سو دستر وسال صبر کر کے
[illegible]تے لیکن اس کے علاوہ ایک شوق اور بھی تھا ـــــ"

"کونسا شوق؟" میں خود ہی پوچھ بیٹھی۔

"نیوی میں ملازمت کا شوق ـــــ اور یہ شوق بھی کسی نہ کسی طرح پورا ہو گیا۔ نیوی میں ملازمت مل گئی حیدرآباد میں میڈیکل چیک اپ ہوا، کامیاب قرار دیا گیا لیکن پھر پونا میں چیک اپ ہوا تو اس میڈیکل چیک اپ میں فیل کر دیا گیا۔ ظاہر ہے ملازمت چھوٹنا تھی اور دل نامراد آتش شوق دل میں چھپائے واپس آ گیا۔"

"لیکن محمود علی صاحب اس کی کوئی وجہ بھی تو ہو گی؟" میں نے ان کا جملہ اچک کر ایک نیا سوال ان کے سامنے کھڑا کر دیا۔





"اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے پاؤں میں فریکچر تھا۔ خیر پھر میں ایک انشورنس کمپنی میں ملازم ہو گیا اس دوران اقبال احمد [illegible] صاحب سے ملاقات ہوئی اور پھر میں ریڈیو پر آ گیا۔"

"تب آپ کی کیا عمر ہو گی؟"

"جی ـــــ سترہ سال۔"

"اور تعلیم؟" میں نے پھر سوال کیا۔

"میں نے ایف۔ اے کیا تھا۔ آج بھی میں سوچتا ہوں کہ اگر میں ریڈیو پر نہ آ گیا ہوتا تو ـــــ کامیاب انجینئر بن چکا ہوتا۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا محمود علی صاحب کہ آپ کو تعلیم سے خاصی دلچسپی تھی؟"

"جی ہاں دلچسپی نہ ہوتی تو میں تعلیمی گیت کیسے لکھتا"

"جی کیا۔ آپ نے تعلیمی گیت بھی لکھے ہیں؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"جی ہاں صرف لکھے ہی نہیں بلکہ گائے بھی تھے۔" وہ میرے



۔۔۔ کا میران ہو کر ان کی باتیں سن رہی تھی اور وہ اپنے مخصوص انداز میں بتا رہے تھے کہ میں نے نہ صرف بچوں کے تعلیمی گیت ہی نہیں گائے بلکہ ہلکے پھلکے مزاحیہ گانے بھی گائے ہیں۔ اور آج کا وہ مشہور و معروف گانا جو بعد میں احمد رشدی نے گایا ہے۔ کہ

مری تنخواہ بڑھا دو جی سیٹھ جی

پہلے میں نے ہی گایا تھا۔ اس کے علاوہ بچوں کے لئے "بہانے" میں نے خود لکھے اور گائے اور پھر میں نے تو بچوں کے خاصے پروگرام کئے ہیں۔ بعض نے تو بے اندازہ مقبولیت حاصل کی۔ مثلاً گھومتے خان پھرتے خان"

"اچھا محمود علی صاحب آپ نے فلموں میں بھی تو کام کیا ہے۔ آپ کی کتنی فلمیں ریلیز ہوئیں۔ اور ان میں سے خاص خاص فلمیں کون کون سی ہیں؟"

"جی میں نے اٹھائیس فلموں میں کام کیا ہے، ان میں سے "دوری" اور "ایسا بھی ہوتا ہے"، "وقت کی پکار"، "پھندے میں رہنے دو"، "پیسہ"، "بنجارن"، "آرزو"، "دوراہا" اور "شکار" وغیرہ شامل ہیں۔"

فن کار کے نام پر ہمارے مدیر ریاض مرزا صاحب چونک گئے وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ یہ نئی فلم "شکار" کا ذکر ہو رہا ہے یا پرانی فلم "شکار" کی بات ہے لیکن محمود علی صاحب بہت کامیاب اور پرانے شکاری نکلے۔ انہوں نے نئی پرانی دونوں فلموں کا شکار کیا تھا۔ پرانی فلم "شکار" میں آپ نے رفیق انور کے ساتھ اسکرپٹ پر کام کیا تھا اور نئی فلم "شکار" میں اداکاری کے جوہر دکھائے تھے۔ محمود علی صاحب اداکاری کے ہر میدان کے شہسوار ہیں۔ اسٹیج۔ ٹی وی۔ ریڈیو سے لے کر فلموں تک ہر جگہ انہوں نے اپنی فنکاری کے گل بکھیرے ہیں تجربے کے ثمر سمیٹے ہیں۔ میں نے اسی لئے محمود علی صاحب سے پوچھا بتائیے کہ فلم اور ریڈیو، ٹی وی میں آپ نے کیا فرق محسوس کیا؟ یہ کہ آپ فلمی دنیا میں خاصی دور تک جا کر پلٹ کیوں آئے؟"

"میں اس لئے پلٹ آیا ہوں کہ مجھے میرا مرکز زیادہ عزیز ہے آپ جانتی ہیں کہ میرا مرکز یہ کراچی ہے۔ اور اس کراچی میں ریڈیو پاکستان کی عمارت میری پرانی محبت ہے۔ یہاں پرانی رفاقتیں ہیں یہاں میں اور سب سے بڑی بات یہ کہ یہاں فن کی قدر ہے یہاں دوستوں کے سہارے اور احباب نوازی کی سیڑھیوں پر پاؤں کو نہیں چڑھنا بلکہ اپنی محنت اور لگن سے اپنے لئے راستہ بنانا ہے۔ ریڈیو سے یہ ادارہ جہاں وہ کچھ نہیں دیتا جو فلمی دنیا دیتی ہے لیکن میرے نزدیک پیسہ بہت کچھ تو ہے لیکن سب کچھ نہیں ہے۔ بعض چیزیں بے بہا اور انمول ہوتی ہیں جیسے فلم میں بھی میرے اچھے دوست ہیں۔ وہ میرے ساتھ خلوص اور محبت سے پیش آتے ہیں بلکہ مسلسل مجھ سے وابستہ بھی ہیں ان میں محمد علی صاحب، شباب صاحب، ندیم اور منور سعید جیسے دوستوں کا اصرار بھی شامل ہے لیکن میں اپنی وفاداریوں اور اپنی محبتوں سے مجبور ہوں۔"

"بہت خوب محمود علی صاحب یہ بتائیں کہ آج کل آپ ریڈیو پر کون سے پروگرام کر رہے ہیں؟" میں نے موقع غنیمت جان کر پھر ایک سوال کر دیا۔ وہ سگریٹ کا کش لے کر دھیمے دھیمے اپنے سلجھے ہوئے مخصوص انداز میں بولے "چھوٹے موٹے کردار تو خاصے ہیں لیکن میرے خاص خاص پروگرام "حامد میاں کے ہاں"، "آئینہ"، "ہنسنا منع ہے" وغیرہ وغیرہ چل رہے ہیں۔"

"اچھا یہ بتائیں کیا آپ یہاں ریڈیو پر مستقل ملازم ہیں؟"

"جی ہاں ۔۔۔ میں یہاں پر اسٹاف آرٹسٹ ہوں خدا کا شکر ہے کہ اچھی تنخواہ پا رہا ہوں اب بھی کبھی سوچتا ہوں تو مجھے وہ دن یاد آتے ہیں جب مجھے یہاں سے ایک سو پندرہ روپے ماہوار ملتے تھے اور اپنا حال بھی ہمارے اعتقاد سا ہوا کرتا تھا۔ میں سائیکل پر ریڈیو آیا جایا کرتا تھا اور آپ کو پتہ ہے میں بتا دوں جی یہ سائیکل قسطوں میں بنائی تھی یعنی ہر ٹکڑا الگ الگ خرید کر خود سائیکل تیار کی تھی جس پر کل لاگت پینتیس روپے آئی تھی۔"

محمود علی صاحب ماضی کے پاس دور سے ٹک کر کھڑے ہونا چاہتے تھے لیکن میں نے انہیں حال کی طرف واپس لاتے ہوئے پوچھا "محمود صاحب اب ماشاء اللہ آپ کے پاس عزت، شہرت دولت اور ذہنی سکون سب کچھ ہے کیا آپ نے پہلے کبھی اتنی کمال اور ایسی شہرت اور عزت کے بارے میں سوچا تھا؟"

"جی نہیں ۔۔۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں اتنا کامیاب فن کار بن جاؤں گا اور مجھ پر خدا کی اس قدر نوازشیں ہوں گی اب تو میں زندگی کے ہر موڑ پر خدائے بزرگ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے اتنا نوازا اور میری محنت میری لگن کو کامیاب بنایا۔" آپ نے بجا فرمایا محمود علی صاحب خدا کا کرم زندگی کی ہر ساعت کے لئے لازمی ہے لیکن شخصی طور پر آپ روشن کامیابی حاصل کرنے کے لئے فکر اول پیکر بنا رہے گا

• آپ نے بہت اچھا سوال پوچھا ہے عرفی صاحب۔ میں نے ہمیشہ محنت اور مسلسل محنت پر اپنا ایمان رکھا ہے۔ میں نے ہمیشہ صدق دل سے سوچا بغیر محنت کے کچھ نہیں ملے گا اور مجھے یہ پتا ہے میری خدمات کا احاطہ کرنے کے لیے میں مسلسل کام کرتا رہا بغیر کسی لالچ کے ——— شاید یہی وجہ ہے کہ میں آسودہ ہوں۔ بہرحال یہ تو طے ہے کہ کوئی فن کار اپنے فن سے کبھی آسودہ اور مطمئن نہیں ہوتا اس لئے مجھے بھی محنت کرنی ہے مسلسل اور انتھک محنت کیونکہ میری اداکاری کا سفر ہنوز جاری ہے۔"

• اور آواز کے ساتھ ساتھ آپ کی اداکاری کا سفر بھی تو لازوال ہے محمود صاحب ——— ٹی وی پر آپ کی اداکاری اتنی جاندار محسوس ہوتی ہے کہ یہ خیال ہی نہیں رہتا کہ آپ اداکاری کر رہے ہیں۔ اس طور پر "راستے کی آنکھیں" کا "بہری" اور "تعلیم بالغاں" کے مولوی صاحب کو ناظرین کبھی نہیں بھلا سکتے۔ آپ یہ بتائیں کہ ان کرداروں نے آپ کی فنی اور نجی زندگی پر کیا اثر ڈالا؟

"خاتون یہ دونوں کردار میرے بھی پسندیدہ کردار رہے ہیں اور خوش قسمتی کی بات ہے کہ ناظرین نے بھی انہیں بے پناہ پسند کیا۔ بہری کے کردار کو عیسائی خاندانوں نے بڑا اکرام دیا اس طرح میں بھی ان کی نظروں میں محترم ہو گیا۔ ہاں البتہ مسلمان گھرانوں میں بہری کی "پینے" والی عادت نے خاصا ناگوار اثر ڈالا۔ جن دنوں میری یہ سیریز چل رہی تھی میرے ایک دوست میرے پاس آئے اور میرے کردار پر اعتراض کیا۔ سچ پوچھئے تو ان کا یہ اعتراض میرے دل کو لگا بھی تھا۔ انہوں نے بتایا کہ میری معصوم بچی یہ پروگرام پابندی سے دیکھتی ہے۔ ایک دن اس نے مجھ سے پوچھا ——— پاپا ——— یہ کیا پیتے ہیں؟ میں بہت پریشان ہوا کہ کیا کہوں۔ چپ رہا لیکن اس کی ضد بڑھتی گئی کہ آخر اسے بتانا پڑا کہ یہ بہت بری شے ہے بہری صاحب بچی ذہین تھی فوراً پوچھ بیٹھی کہ ——— اگر یہ بری ہے تو یہ کیوں پیتے ہیں؟ آخر اسے ادھر ادھر کی باتوں سے بہلا دیا لیکن ایک دن تو اس نے یہ ضد شروع کر دی کہ یہ چیز تو میں بھی پیوں گی۔ میں نے یہ واقعہ پروڈیوسر صاحب کو بتایا۔ ہم سب نے مل کر یہ طریقہ سوچا کہ میں اسکرین پر پیتا ہوا نظر نہ آؤں بلکہ پیتے ہوئے بتاؤں۔"

یہ اعتراض تو واقعی ہمارے دل کو بھی لگا کیونکہ ہمیں بھی اپنا چھوٹا معصوم بھائی سید سلطان یاد آ گیا جو ٹی وی دیکھتے وقت ہم پر چھوٹے سوالوں کی بوچھاڑ کر دیتا ہے اور ہم کھسیانے رہ جاتے ہیں کیونکہ ہم کسی ایسے ٹی وی پروڈیوسر کو نہیں جانتے جو ہمارے اعتراض کو دل لگی سے سن سکے۔ بہرحال ہم نے اپنے خیالات سمیٹ کر محمود علی صاحب سے پوچھا۔

"آجکل آپ اور کیا کر رہے ہیں؟" وہ آہستہ سے بولے "آجکل میں ریڈیو اور ٹیلیویژن کے کارکنان کی یکجہتی کا جنرل سیکرٹری بنا ہوں، ۱۹۷۷ء سے ہوں اس سلسلے میں اجتماعی مسائل حل کرنے اور ایکٹرز کی فلاح و بہبود کے کام کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔"

"ویسے محمود علی صاحب آپ کے بچوں کا آپ کی اداکاری کے بارے میں کیا خیال ہے۔ وہ آپ کی تعریف کرتے ہیں یا تنقید؟ آپ کے



بچے کتنے ہیں؟"

"ماشاءاللہ میرے چار بچے ہیں۔ تین بیٹے انور علی، صمصام علی اور سراج علی سروس کرتے ہیں اور بیٹی قرۃ العین پڑھتی ہے۔ وہ بی اے کر رہی ہے۔ دراصل میں نے اپنا رویہ بچوں کے ساتھ ہمیشہ دوستانہ رکھا ہے۔ وہ تنقید بھی کرتے ہیں اور تعریف بھی ——"

"اور آپ کی بیگم —— ؟ وہ تعریف کرتی ہیں آپ کی؟"

"نہیں وہ تو سیدھی سادی گھریلو خاتون ہیں۔ شروع شروع میں وہ مجھے ٹی وی پر یا ریڈیو پر کسی اور کا شوہر بنا دیکھتی تھیں تو خاموش سی ہو جاتی تھیں لیکن اب تو خیر سمجھ گئی ہیں اب انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوتا"

"اچھا علی صاحب یہ بتائیں آپ ٹی وی اور ریڈیو پر مختلف لہجوں میں بولتے نظر آتے ہیں آپ نے کتنی زبانیں سیکھی ہیں؟"

"ساری زبانیں سیکھی تو نہیں ہیں لیکن کئی زبانوں کے لہجے اور ٹون ضرور سیکھے ہوئے ہیں۔ البتہ میں پوربی، حیدرآبادی اچھی طرح جانتا ہوں ہاں تھوڑی بہت پنجابی بھی آتی ہے"

"یاد آیا علی صاحب کہ آپ کے پاس تو اداکاری صداکاری کے شوقین حضرات بہت آتے ہوں گے آپ انہیں کیا مشورہ دیتے ہیں؟"

"میں ان لوگوں کو اکثر یہی مشورہ دیتا ہوں کہ وہ اپنی تعلیم جاری رکھیں اور اس دشت کی سیاحی میں اپنے آپ کو ضائع نہ کریں کیونکہ یہاں نہ کوئی کورس ہے نہ اداکاری کا امتحان نہ ہی کوئی ایسا ادارہ ہے جس سے آدمی کچھ سیکھ کر یہاں آئے۔ ہاں میں دوشیزہ کے توسط سے ریڈیو پر آنے والے نوجوانوں کو یہ پیغام ضرور دینا چاہوں گا کہ وہ اگر ریڈیو پر آڈیشن دینے آئیں تو سب سے پہلے مندرجہ ذیل باتوں پر ضرور توجہ دے لیں۔ یہاں پر پہلے تو آواز یعنی وائس دیکھی جاتی ہے۔ اس کے بعد لہجہ ہے۔ لہجہ کا درست ہونا بہت ضروری ہے تیسری تلفظ کی طرف پوری توجہ بھی ضروری ہے غلط تلفظ ادا کرنے والے حضرات کبھی آڈیشن پاس نہیں کر سکتے۔ ویسے مجھے خوب رگ لگ آتے رہتے ہیں وہ صداکاری کے شوق میں بھرے رہتے ہیں اور پھر اس قدر ضد کرتے ہیں کہ میں پریشان ہو جاتا ہوں۔ بعض حضرات تو اچھی خاصی جاب اور اچھا خاصا کاروبار رکھتے ہوئے بھی ریڈیو کے چکر میں خوار ہونا چاہتے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے ایک ایم بی بی ایس ڈاکٹر صاحب مصر تھے کہ ریڈیو میں آئیں گے اور اب ایک سنار صاحب ہیں جب بھی ریڈیو آتے ہیں رجسٹر کے رجسٹر ساتھ لاتے ہیں اور دھرنا دے کر بیٹھ جاتے ہیں کہ میں کلام دیکھئے اور کبھی کبھی کوئی انتہائی معمولی اور چھوٹا سا رول مل جاتا ہے تو اس کے چالیس پچاس روپے کو چھوتے نہیں سماتے اور دوستوں میں جا کر بتاتے ہیں"

"ویسے علی صاحب آپ کی شہرت اور مقبولیت کبھی کے لئے پریشانی کا باعث تو نہیں بنی؟"

"جی ہاں، کبھی کبھی تو پریشانی کا باعث بن ہی جاتی ہے یہ شہرت دیکھئے صاحب ہم کھلے عام خریداری نہیں کر سکتے کسی تفریحی مقام پر سکون سے نہیں بیٹھ سکتے۔ ہم بھی انسان ہیں ہمارا بھی دل چاہتا ہے کہ آزادانہ سڑکوں پر پھریں، کبھی سڑک پر کھڑے ہو کر چاٹ کھائیں لیکن نہیں کھا سکتے۔ لیکن جناب کچھ فائدے بھی ہیں۔ وہ کام جو عام آدمی مہینوں میں نہیں کرا سکتا ہمارے لئے لوگ منٹوں میں کر دیتے ہیں وہ ہم سے یہ کہتے کہیں تعارف کروانے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ بہرحال یہ سب محبتیں ہیں اور محبتیں کتنی بھی شدید ہو جائیں دکھ نہیں دے سکتیں اور اگر خدانخواستہ کبھی دنیا محبت دکھ دے بھی دے تو ہمیں یہ دکھ بھی پیارا لگتا ہے"

علی صاحب کی باتیں سن کر میں سوچنے لگی کہ حیدرآباد دکن کے ایک شاعر محمود علی لائق کا نواسہ محمود علی جو مذاقاً اپنے آپ کو محمود غزنوی کہتا ہے واقعی ایک سچا فنکار ہے اور سچے فنکار کی ہی خاصیت ہے کہ وہ ایک اچھا انسان بھی ہو۔ آپ محمود علی سے مل کر دیکھ لیں وہ آوازوں کے گلشن کی منفرد خوشبو ہی نہیں نیک نفس انسان بھی ہے۔

ہم محمود علی صاحب سے انٹرویو لے کر قمر علی عباسی صاحب کی طرف متوجہ ہوئے تب ریڈیو پاکستان کے ہر دلعزیز پروگرام "جیوے" مہمان عباسی صاحب کے مہمان تھے۔ ان کی محبت بھری میزبانی اور قابل تقلید خوش مزاجی سے متاثر تھے ان کا کمال یہ ہے کہ وہ کام کو تندہی اپنے چہرے کی مسکراہٹ اور ہاتھوں کی تیزی، ذہن کی مستعدی اور لہجے کی شگفتگی اور اپنے کام کی کاوش سب ہی یکساں ساتھ قائم رکھتے ہیں اور ہمیں اس خوش رنگ شخصیت کا شکریہ ادا کرنا تھا اس لئے ان کا شکریہ ادا کر کے ہم چلے آئے کہ انہوں نے ہمیں محمود علی صاحب سے ملوایا۔

ان کے ایوانوں میں پوجیں گے اسی پیکر کو
جس کو آذر نے رگ جاں سے تراشا ہوگا!

مانک ٹالہ



خط ایک ایم ایل اے کا

عزیز! بہت ہی پیارے دوست جمن لال۔
خیریت موجود۔ خیریت مطلوب۔ تمہارے کئی خطوط ملے لیکن میں جواب نہ دے سکا دراصل الیکشن کے کام میں اس قدر مصروف تھا کہ سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں تھی۔ سر دھڑ کی بازی لگا دی تھی۔ تمہیں یہ سن کر انتہائی خوشی ہوگی کہ میں اپنے مخالف کو چاروں شانے چت کر کے بارہ ووٹوں کی اکثریت سے اسمبلی کی ممبری میں کامیاب ہو گیا ہوں اسمبلی میں میری نیا نہ ہو سکی ورنہ اور زیادہ ووٹوں سے کامیاب ہوتا اب میں ممبر لیجسلیٹو اسمبلی بن گیا ہوں۔ تمہیں چاہیے کہ آئندہ خط لکھتے وقت لفافے پر میرے نام کے آگے ایم ایل اے یعنی ممبر لیجسلیٹو اسمبلی لکھنا ہرگز نہ بھولنا تاکید ہے۔

پچھلے آخری خط میں تم نے مجھے انتہائی فحش گالیوں سے نوازا ہے جو غالباً تمہارے پچھلے خطوں کا جواب نہیں دے سکا تھا یہ تو ٹھیک ہے کہ ہم دونوں چند نہایت ہی بے تکلف دوستوں میں سے ہیں جن کے درمیان ماں بہن کی گالیوں کا تبادلہ نہایت بے تکلفی سے کیا کرتا تھا۔ ہوتا ہے کہ ہم لوفروں کے کوٹھوں پر مجرا دیکھنا اور کتری کے ٹھیکے پر ٹھرے پینے بھی ہم ساتھ جایا کرتے تھے بیکاری اور آوارگی کے زمانے میں ہم بھی ساتھ ساتھ ناچتے تھے۔

تمہیں یاد ہے کہ ایک مرتبہ کسی مسافر کی جیب پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے ساتھ ساتھ ہی گرفتار ہوئے تھے۔ کیونکہ سپاہی کو رشوت دینے کے لئے ہمارے پاس ایک اٹھنی بھی نہیں تھی۔ پھر تین ماہ کی قید کاٹ کر بھی ساتھ ساتھ رہا ہوئے تھے۔

لیکن اپنے قصبے میں واپس پہنچ کر ہم نے یہ مشہور کر دیا تھا کہ مہاتما گاندھی کے ستیہ گرہ آندولن میں تین ماہ کی قید بھگت کر آئے ہیں چنانچہ ہمیں پھولوں کے ہاروں سے لاد دیا گیا تھا۔ بیل گاڑیوں پر ہمارے جلوس نکلے گئے تھے اور بڑے بڑے جلسوں میں ہماری دیش بھگتی کے گن گائے گئے تھے، ہماری لیاقت، سیاست، قیادت، ریاضت، خباثت، حماقت، ضلالت، کی وہ وہ بڑائیاں بیان کی گئیں جن کا تو مجھے بھی علم نہیں تھا۔

یہیں سے ہماری، نہیں نہیں، میری سیاسی زندگی کا آغاز ہوا تھا، کیونکہ تم سیاسی جوڑ توڑ اور تکڑم بازی کے نااہل ہونے کے باعث سیاست کے پیشے میں ٹانگ پھنسا کر ایسے اوندھے منہ گرے تھے کہ پھر زندگی بھر نہ سنبھل سکے اور تم نے سیاست سے توبہ کر کے پھر وہی پرانا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ اب جبکہ میں ممبر لیجسلیٹو بن چکا ہوں، میں تمہیں ایک انتہائی دوستانہ اور مخلصانہ مشورہ دیتا ہوں کہ آئندہ گفتگو اور خط و کتابت میں تمہیں گالیوں سے پرہیز کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

کوشش کا لفظ میں نے اس لئے لکھا ہے کہ عادت جاتے جاتے ہی جاتی ہے۔ تمہیں آئندہ خط و کتابت میں مہذب اور شائستہ الفاظ زیادہ سے زیادہ استعمال کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ مجھے احساس ہے کہ میری طرح تمہارے پاس بھی شائستہ اور مہذب الفاظ کا بہت کم ذخیرہ ہے

اس لئے میں اپنے ایک تعلیم یافتہ دوست سے پانچ سات سو
یا ایک ہزار شائستہ مہذب اور ایک ایم۔ایل۔اے کی شان کے شایان
الفاظ کی ایک الگ لسٹ بنوا کر اس خط کے ساتھ منسلک کر کے ارسال کر
دوں گا۔

دراصل یہ الیکشن کا کام بھی بڑے لفڑے کا کام ہوتا ہے۔
ایک ایک ووٹر کے پاس جا کر مسکانا پڑتا ہے۔ایسے ایسے لوگ جن
کے ساتھ بات کرتے بھی گھن آتی ہے ان سے بہت محبت اور خلوص
سے پیش آنا پڑتا ہے۔پڑھے لکھے لوگ تو بہت ہی خبیث ہوتے ہیں
بڑے اُلٹے سیدھے سوال کرتے ہیں۔

ایک سرکاری کالج کا پروفیسر مجھ سے پوچھنے لگا: آپ اسمبلی
میں کس لئے جا رہے ہیں؟

میں نے جواب دیا کہ جنتا کی سیوا اور دیش کی اُنتی کی خاطر۔
اس پر وہ پاجی کہنے لگا: جنتا کی سیوا اور دیش کی اُنتی تو آپ
اسمبلی سے باہر رہ کر بھی بہتر ڈھنگ سے کر سکیں گے پھر وہاں جا کر کیا
اور بے پرکاش نارائن کی جالیں پٹیں گے۔

دراصل میں اس قسم کے سوالوں کے لئے تیار ہو کر نہیں آیا تھا۔
اس لئے مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

مجھے خواہ مخواہ اس پر غصہ آگیا۔میں اس پر اپنی مخصوص برانڈ
خود ساختہ گالیوں کی بوچھاڑ کرنا ہی چاہتا تھا کہ مجھے حالات کی نزاکت
کا احساس ہو گیا اور میں نے چکنی چپڑی باتوں سے اسے رام کرنے کی
کوشش کی۔لیکن وہ بہت ڈھیٹ تھا۔کہنے لگا: آپ نے اپنا الیکشن کا
نشان گدھا کیوں چنا ہے؟ اُلّو کیوں نہیں یا پھر بندروں کی جوڑی کا
نشان کیوں نہیں چنا؟

اب میں اسے کس طرح بتا دیتا کہ میں جنتا کو گدھے سے زیادہ
اہمیت نہیں دیتا۔ویسے بھی جنتا سیاسی پارٹیوں کے درمیان دھوبی
کے گدھے کی طرح نہ گھر کی رہتی ہے نہ گھاٹ کی۔اور جب کبھی وہ
سیاسی پارٹیوں کی طرف سے پیدا کردہ ابتر حالات سے پریشان
ہو کر دولتیاں جھاڑنا شروع کر دیتی ہے تو برسرِاقتدار پارٹی اس
کی ٹانگ پکڑ کر وہ ڈنڈے برساتی ہے کہ اسے ساری شوخی بھول جاتی
ہے۔دراصل گدھے کا نشان میں نے جمہوریت میں جنتا کی صحیح حالت
کے نشان کے طور پر منتخب کیا تھا لیکن ڈیماکریسی (ڈیموکریسی) میں یہی
ایک مصیبت ہے کہ ہم جو محسوس کرتے ہیں اسے بیان کرنے کی ہمت
سے محروم ہے۔اسی لئے میں اس پروفیسر کے بچے کو یہ سب باتیں نہ بتا سکا۔
اس پر وہ کہنے لگا کہ آپ بالکل جاہل ہیں۔میں ووٹ ہرگز
آپ کو نہیں دوں گا۔

مگر اب یہ بات اس پر ظاہر ہو جائے گی کہ جاہل میں نہیں بلکہ
وہ نرا گدھا کا گدھا ہے۔

اور اب جبکہ میں الیکشن جیت کر ایم۔ایل۔اے بن چکا ہوں اور
ریاست کا ایجوکیشن منسٹر میرے دائیں ہاتھ کی مٹھی میں ہے۔اب اس
پر ایسے پھندے ڈالوں گا کہ وہ نہ مر سکے گا نہ جی سکے گا اور پھر زندگی بھر کسی
سیاسی لیڈر کی شان میں گستاخی کرنے کی ہمت نہیں کر سکے گا۔یہ ایجوکیشن
ایک بہت بڑی لعنت ہے۔انسان کے دماغ میں بالکل اُلٹی سیدھی باتیں
بھر دیتی ہے اور وہ اپنے آپ کو ولائی خاں کا سالا سمجھنے لگ جاتا ہے۔
حالانکہ وہ زندگی بھر کے لئے ناکارہ ہو جاتا ہے۔اب تم ہی بتاؤ کہ اگر
میں پڑھا لکھا ہوتا تو کیا اسمبلی کا ممبر ہوتا؟ ہرگز نہیں بلکہ کسی اسکول میں
استاد یا زیادہ سے زیادہ کسی کالج کا پروفیسر ہوتا لیکن آج وہ پڑھے لکھے
گدھے میرے سکتر بنے ہوئے ہیں۔

دراصل ہمیشہ کے لئے برسرِاقتدار رہنے اور جنتا کے اوپر اپنا
مکمل اختیار جمائے رکھنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ جنتا کو زیادہ سے
زیادہ غیر تعلیم یافتہ رکھا جائے۔اب اگر میرے حلقے کے سارے ووٹر
اس پروفیسر کی طرح پڑھے لکھے ہوتے تو کیا مجھے اس قدر شاندار
کامیابی حاصل ہوتی؟ ہرگز نہیں!

میرے حلقے کے بیشتر ووٹر جاہل اور اَن پڑھ تھے یا پھر پڑھے
لکھے گدھے تھے۔اس لئے ان پر میرا جادو بڑی آسانی سے چل گیا اور
میں نے اپنی انتخابی مہم کے لئے ایسے ایسے طلسمی نعرے ایجاد کئے کہ میرے
حلقے کے ووٹروں پر اس کا جادو چل گیا۔ان نعروں میں سے چند ایک
نعرے تمہاری اطلاع کے لئے نوٹ کر رہا ہوں:

لے کے رہیں گے روٹی کپڑا اور مکان ــــ ووٹ فار ڈونکی!
گدھے کو ووٹ دیجئے تاکہ دیش ترقی کی طرف سرپٹ
بھاگنے لگے۔
آپ کی کامیابی ترقی اور خوشحالی کا کون ضامن ــــ ڈونکی۔
گدھے کو ووٹ دینا ہر نر ناری کا پرم دھرم ہے۔
ان نعروں کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا اور سارے حلقے میں ووٹ
فار ڈونکی کا نعرہ گونجنے لگا۔بعض لوگوں نے مذاق کا موضوع بھی بنایا
اور یہاں تک کہہ دیا کہ اس حمام میں تو حلقے کا ہر ایک گدھا ہی کھڑا ہوا ہے۔

اور اب جبکہ میں ممبر لیجسلیٹو اسمبلی بن گیا ہوں اب میں ہوں گا اور میرے نیچے میرے حلقے کی جنتا گدھے کی طرح جتی ہوئی ہوگی۔

انتخاب کے دنوں میں اکثر ووٹر لوگ کبوتر کی طرح سینہ پھلائے اکڑ اکڑ کر چلتے ہیں۔ دعوتوں میں شراب، ماس، مرغا اور مرغن غذائیں اڑاتے ہیں اور یوں پیش آتے ہیں جیسے ہمارے داماد ہوں۔

خیر وہ تو صرف دو تین ماہ کے لئے داماد بنتے ہیں لیکن میں اب جبکہ ممبر لیجسلیٹو اسمبلی بن چکا ہوں اب میں ان کا داماد بن کر پانچ سال کے لئے ان کی چھاتی پر مونگ دلوں گا۔

میں نے ممبر بننے کے فوراً بعد اپنے نوکروں، بیوی اور بچوں کو حکم دے دیا ہے کہ کسی ایرے غیرے نتھو خیرے کو میرے بنگلے کے پاس بھی نہ پھٹکنے دیا جائے۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ تعلیم سے ہماری جمہوریت کو سخت خطرہ ہے۔ اس سے لوگوں کے دلوں میں طرح طرح کے الٹے سیدھے خیال پنپنے لگتے ہیں اور وہ سیاسی لیڈروں پر اوٹ پٹانگ سوالوں کی بوچھاڑ کرنے لگ جاتے ہیں اور روزگار، رہائش اور صحت عامہ وغیرہ قسم کی جائز اور نامناسب مانگیں کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

اور اب جبکہ میں لیجسلیٹو اسمبلی بن چکا ہوں میں اپنی پارٹی کی ایک خفیہ میٹنگ بلاؤں گا اور یہ مطالبہ کروں گا کہ جنتا کو زیادہ سے زیادہ جاہل اور غیر تعلیم یافتہ رکھنے کے لئے جلد از جلد ایسے قدم اٹھائے جائیں جن سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

پہلا قدم یہ اٹھایا جائے کہ موجودہ پانچ سالہ پلان میں تعلیم کے لئے جو بجٹ ہے اس کو بڑھا کر دوگنا کر دیا جائے۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ مخالف پارٹیوں کے ہاتھ سے ہماری پارٹی کے خلاف پروپیگنڈہ کا ایک بہت بڑا ہتھیار چھن جائے گا اور سارے دیش بلکہ ساری دنیا پر یہ ظاہر ہو جائے گا کہ ہم اپنے دیش کی جنتا کی تعلیم کی خاطر کس قدر کثیر رقم خرچ کر رہے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی ہر شہر، ہر قصبہ، ہر گاؤں بلکہ ہر محلے میں نئے نئے اسکول کھولے جائیں تاکہ تعلیم کے لئے جو رقم مخصوص ہوئی تھی وہ برابر ہو سکے اور اس کے بعد یہ قدم اٹھایا جائے کہ ٹیچروں کی نوکری کی شرائط اس قدر کڑی اور تنخواہ اس قدر کم رکھی جائیں کہ ہر تعلیم یافتہ شخص [illegible] کی نوکری پر چپراسی کی نوکری کو ترجیح دے اور اگر کوئی مجبوراً ٹیچر کی نوکری قبول کر بھی لے تو پھر اس کا زندہ رہنا اس حد تک دوبھر کر دیا جائے کہ اس کی ساتوں پشتیں اسکول ٹیچری سے توبہ کر لیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اب بھی دیش میں بہت سے ایسے اسکول ہیں جن میں برسوں سے کوئی ٹیچر مقرر نہیں ہے لیکن یہ کافی نہیں ہے۔

اور اب جبکہ میں ایم ایل اے بن چکا ہوں میں اپنی پارٹی کی خفیہ میٹنگ میں یہ پرستاؤ پیش کروں گا کہ جلد از جلد ایسے قدم اٹھائے جائیں کہ دیش کے تقریباً سارے اسکول بغیر ٹیچروں کے ہی چلتے رہیں تاکہ دیش کی جنتا زیادہ سے زیادہ عرصے تک جاہل رہے ورنہ ایک ایسی آندھی چلے گی ایک ایسا طوفان آئے گا کہ جس سے ہماری جمہوریت کی عمارت بنیاد سے اکھڑ کر زمین پر آ رہے گی۔

ایک بات تمہیں بتا دوں کہ لیڈری پھولوں کی سیج نہیں بلکہ کانٹوں کا تاج ہے یہاں کبھی کبھی گندے انڈوں اور پتھروں کی بوچھاڑ کو بھی سہنا پڑتا ہے۔ لیڈری قائم رکھنے کے لئے سوجھ بوجھ اور تکڑم بازی کی ضرورت ہوتی ہے۔

میں نے اس الیکشن میں ایسی ایسی تکڑم بازی کی کہ پارٹی کے اندر جو لوگ ایک دوسرے کے دشمن تھے ان میں سے جن جن کے منسٹر کے چانس زیادہ تھے میں نے ان کے مخالفوں سے دوستی گانٹھ کر طرح طرح کی تکڑم بازیوں سے ان کی ٹانگ ایسی گھسیٹی کہ وہ الیکشن میں بری طرح ناکام ہو گئے۔ اب ان کے مخالف پانچ سال کے لئے میری مٹھی میں آ گئے اور میں نے ان سب کو منسٹر بنوا لیا ہے۔

ان لوگوں نے مل کر مجھ سے بھی منسٹری منڈل میں شامل ہونے کی پرارتھنا کی تھی لیکن میں نے منسٹری بننے سے انکار کر دیا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پارٹی کے سارے ممبر اور نیتا میری [illegible] کا لوہا ماننے لگے۔ اب منسٹری منڈل کے سبھی منسٹری ہر معاملے میں میری رائے اور مشورے کو ضروری سمجھتے ہیں۔

دراصل وزیر بننے سے وزیر گر بننا کہیں زیادہ اہم ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ اقتدار ہر وقت میری مٹھی میں رہے گا اور جو منسٹر ذرا بھی آنکھیں دکھائے گا اسے دھوبی پاٹ کے گر سے چاروں شانے ایسا چت گراؤں گا کہ پھر زندگی بھر اٹھنے کا نام نہیں لے گا۔

میں نے وزیر بننے سے اس لئے بھی انکار کیا کہ وزیر ہر وقت پبلک اور اخباروں کی نگاہوں میں رہتے ہیں۔ اگر ان سے ذرا سی بھی اونچ نیچ ہو جائے تو یہ اخبار والے ایسا طوفان بے تمیزی کھڑا کر دیتے ہیں کہ بس ان سے شیطان ہی بچائے۔

اور پھر میں جو کام کرنا چاہتا ہوں وہ وزارت سے باہر رہ کر زیادہ خوش اسلوبی سے سرانجام دے سکتا ہوں۔

روپے مالیت کا بنگلہ مجھے اس شرط پر دینے کے لئے راضی ہوگیا تھا کہ اس کا روپیہ میں الیکشن میں کامیاب ہونے کے دو سال کے دوران ادا کروں گا۔

اور اب جبکہ میں لیجسلیٹو اسمبلی کا ممبر بن چکا ہوں بلکہ وزیر بھی ہوگیا ہوں اور ریاستی منتری منڈل کے تقریباً سبھی منتری میری مٹھی میں ہیں تو میں نے بھی اپنی اور اپنے رشتہ داروں اور عزیز دوستوں کی ترقی اور خوشحالی کے لئے ایک پانچ سالہ پلان تیار کرلیا ہے۔

وہ پلان اس طرح ہے۔ پہلے دو سالوں میں کم سے کم چھ لاکھ روپیہ کما کر بنگلے کی قیمت اور قرضہ مع سود اتارنا۔

اور آئندہ تین سالوں میں کم سے کم پندرہ لاکھ روپیہ اور پیدا کرنا تاکہ آئندہ الیکشن زیادہ وسیع پیمانے پر لڑے جاسکیں تاکہ میں ریاست کا مکھیہ منتری یا کم سے کم مرکزی منتری منڈل میں شامل ہوسکوں۔

اس مقصد کے لئے سب اسکیمیں مکمل ہوچکی ہیں۔ پہلی اسکیم یہ ہے کہ اپنی بھتیجی کے پھوپھا کے ماموں کے بڑے لڑکے کے سالے کے نام پر ایک بہت بڑی فیکٹری جاری کروں گا۔ جس کے لئے سرکار سے کم سے کم دس لاکھ روپیہ قرض حاصل کروں گا۔

پانچ لاکھ روپیہ اپنے پرانے قرضے اتارنے کے لئے بالا بالا ہی نکال لئے جائیں گے۔ اور باقی کا پانچ لاکھ روپیہ آہستہ آہستہ نقصان دکھا کر برابر کرکے فیکٹری کا دیوالہ نکال دیا جائے گا۔

دوسرا پلان سڑکوں سے متعلق ہے۔ موجودہ پانچ سالہ پلان میں جو نئی سڑکیں بنائی جائیں گی ان کے ٹھیکے تمہارے نام پر حاصل کئے جائیں گے۔ تمہیں تمہارے حصے کے مطابق دو آنہ فی روپیہ منافع ادا کیا جائے گا۔

میں چاہتا تو اس کام کے لئے تنخواہ دار یا معتمد دار رکھ سکتا تھا لیکن میں ناجائز ایکسپلائیٹیشن کے حق میں نہیں ہوں اور پھر تم اپنے یار غار بھی تو ہو۔ بہتی گنگا میں اگر دو چار ڈبکیاں تمہیں بھی نصیب ہوگئیں تو پھر یار کی یاری کس کام آئے گی۔

شاید تم کہو گے کہ تمہیں سڑکیں بنانے کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ لیکن تمہیں سڑکیں ناپنے کا بیس سال کا تجربہ تو ہے۔ یہی تجربہ کافی ہے۔ اب وہ جس نے ٹیوب ویل کھودنے کا ٹھیکہ حاصل کیا تھا اس کو کیا تجربہ تھا اور وہ تو صرف دو درجن ٹیوب ویل ہی کھود سکا تھا جن میں سے [illegible] ناکارہ تھے۔

[illegible] جیسے کام کے لئے لاکھوں روپے

لیکن میری جان روپیہ کی تمہیں کیا فکر۔ روپیہ کا بندوبست میں کروں گا۔ بلکہ روپیہ کے بندوبست کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ دس ہزار روپیہ تمہیں [illegible] لگانے کے لئے دے دوں گا۔

تم حیران ہو رہے ہوگے کہ تاجر کا کاروبار اور کمیشن ہوا لیکن لندن کی اس فرم کا قصہ تم بھول گئے جو سو پونڈ لیمیٹیڈ سو روپیہ کے سرمایہ سے لیمیٹڈ ہوئی تھی اور اس نے ہماری فوج کے لئے لاکھوں روپیہ کی جیپ گاڑیاں اور گولہ بارود سپلائی کرنے کا ٹھیکہ لیا تھا۔ کیا لندن کی اس فرم اور ٹیوب ویل کھودنے والے کو لاکھوں روپیہ بطور پیشگی ہماری سرکار نے نہیں دیا تھا؟ پھر کس بات کی کمی ہے۔ اسی جیپ اسکینڈل کا گلا ہمارے وطن کے پردھان نے خود اپنے ہاتھوں نہیں گھونٹ دیا تھا؟ تو روڈ اسکینڈل کا گلا گھونٹنے کے لئے ہمارے ریاستی مکھیہ منتری کو اتنا اختیار بھی نہ ہوگا؟ پھر تو ہر بڑی ناکامی کے بعد اور بڑی ترقی ملتی ہے۔ دیکھو جیپ اسکینڈل کے بعد جناب ایمبسڈر کو ڈیفنس منسٹر بھی تو بنا دیا گیا تھا۔ [illegible] کو تو لال تو ڈر کاہے کا ۔۔۔ اس لئے میرے پیارے بچپن کے دوست میرے ہوتے ہوئے اور مجھ جیسے وزیر کے ہوتے ہوئے ڈر کس بات کا؟

تم دیکھو گے کہ ٹھیکہ تو اسے ملے گا جس کا ٹینڈر کم سے کم ریٹ کا ہوگا لیکن بھئی ہم کس مرض کی دوا ہیں۔ ہم یہ پتہ لگائیں گے کہ کم سے کم قیمت کا ٹینڈر کتنا ہے۔ ہم اس سے بھی کم قیمت کا ٹینڈر بھروا دیں گے ویسے بھی ٹینڈر کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ یہ تو دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے ایک کارروائی ہوتی ہے۔ ورنہ ٹھیکہ اسے ہی ملتا ہے جس کو ملنا چاہیئے۔

ہم کتنے ہی کم ریٹ کا ٹینڈر بھر دیں۔ ہم ہر حالت میں لاکھوں روپیہ کمائیں گے۔ کیونکہ آج کل کولتار کی سڑکوں کے بجائے سیمنٹ کی سڑکیں بن رہی ہیں۔ تاکہ ہر وقت سیمنٹ کی کمی رہے اور عمارتیں اور فیکٹریاں بنانے والوں کو سیمنٹ صرف بلیک مارکیٹ ہی میں مل سکے۔ ہمیں تو لاکھوں بوریاں سیمنٹ کنٹرول کے دام پر ملیں گی۔ ہم ایک بوری سیمنٹ اور نو بوری ریت کی ملا کر سڑکیں بنائیں گے۔ اور اس طرح دس میں سے نو بوریاں سیمنٹ کی بلیک مارکیٹ میں [illegible] منافع صرف سیمنٹ ہی سے کما جائیں گے۔ سڑک کی [illegible] اور اس سیمنٹ سے تمہارے لئے ایک بنگلہ اور ہوجائے [illegible] بنگلہ بن جانے کا [illegible]۔

تم یہ پوچھو گے کہ ایک بوری سیمنٹ میں نو بوری ریت ملا کر جو سڑک بنے گی وہ کتنے دن چلے گی۔

پیارے جگت مل تم بے حد احمق کے احمق۔ اگر تم میں اتنی حماقت نہ ہوتی تو تم بھی میری طرح ایم۔ ایل۔ اے بنے ہوتے۔ اب تم ہی بتاؤ کہ آج تک جتنی نئی سڑکیں بن چکی ہیں ان کا کیا حشر ہوا ہے؟

ایسا لگتا ہے کہ تم نے سڑکیں ناپنا چھوڑ دیا ہے لیکن اپنی اور پارٹی کی الیکشن مہم کے سلسلے میں مجھے دور دراز کے علاقوں میں دورہ کرنے کا موقع ملا تھا۔ اس طرح مجھے پتہ چلا کہ پہلی اور دوسری پانچ سالہ پلانوں کے تحت جس قدر نئی سڑکیں بنی تھیں ان کا نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ کہیں کہیں خستہ حال سڑکوں کے ایک آدھ ٹکڑے ایسے بچے تھے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی وقت ان علاقوں میں شاندار سڑکوں کا جال بچھا ہوا ہوگا۔

میں ودھان سبھا میں یہ پرستاؤ پیش کرنے والا ہوں کہ جن جن جگہوں پر سڑکوں کے ایسے ایک آدھ ٹکڑے پائے جائیں ان پر محکمۂ آثار قدیمہ قبضہ کر کے انہیں حفاظت میں لے لے تاکہ آزاد بھارت کے تاریخ دانوں کو ریسرچ کرنے میں مشکل پیش نہ آئے اور ہماری آنے والی نسلوں کو بھی معلوم ہو جائے کہ ان کے بزرگوں نے اپنی آنے والی نسلوں کی ترقی و خوشحالی کی خاطر کیا کیا کارنامے کئے تھے۔

تیسرا کام جو میں ہاتھ میں لینا چاہتا ہوں وہ ہے اپنے گاؤں کی نہر کے اوپر بند باندھنے کا۔ نئی ودھان سبھا میں میں پرستاؤ رکھوں گا کہ سارے دریاؤں پر بند باندھے جا چکے ہیں یا باندھے جا رہے ہیں لیکن ابھی تک نہروں اور جوہڑوں پر بھی بند باندھنے کا کام شروع کر دیا جائے اور ان کے ساتھ بجلی پیدا کرنے والے جنریٹرز بھی فٹ کر دیئے جائیں تاکہ قرب و جوار کے دیہاتوں کو بجلی سپلائی کرنے کا انتظام ہو سکے۔

ان بندوں سے تین بڑے بڑے فائدے ہوں گے

پہلا فائدہ یہ ہوگا کہ جب یہ بند سیمنٹ کم اور ریت زیادہ ہونے کے باعث غارت ہو جائیں گے تو ان سے زیادہ تباہی نہیں ہوگی اور دریاؤں پر بندھے ہوئے جو بند ٹوٹ رہے ہیں یا ٹوٹیں گے ان سے لاکھوں گھر برباد اور لاکھوں جانوں کا نقصان ہوتا ہے۔ لیکن نہروں پر بندھے ہوئے بندوں کے ٹوٹنے سے یہ تعداد ہزاروں بلکہ سیکڑوں تک رہے گی اس طرح آئندہ الیکشن میں ہمارے ووٹوں کی تعداد بہت کم نہ ہونے پائے گی۔

دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ ہم غیر ملکوں سے جو بھاری بھاری قرضے اور امداد حاصل کر رہے ہیں اور جنتا پر بڑے بڑے ٹیکس لگا کر جو روپیہ اکٹھا کر رہے ہیں۔ ان کے نکاس کا ایک نیا ذریعہ پیدا ہو جائے گا۔

تیسرا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ ایسے لوگ جو برسر اقتدار لیڈروں کے قریب ہونے کے باوجود فی الحال آزادی کا کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکے ان کی حق تلفی کا کفارہ ادا ہو جائے گا۔ مجھے پوری امید ہے کہ میرا یہ پرستاؤ کثرت رائے سے منظور ہو جائے گا۔

اس ٹھیکے کے لئے میں نے اپنے ایک قریبی رشتہ دار کے لڑکے پر نگاہِ کرم رکھ دی ہے۔ بیچارا تین سال لگاتار میٹرک میں فیل ہونے کے باوجود کوئی سرکاری یا غیر سرکاری نوکری حاصل نہ کر سکا اور جب محکمۂ بیروزگاری کی لمبی لمبی لائنوں میں کھڑے ہو کر اس کی ٹانگیں شل ہو گئیں تو آخر تھک ہار کر اس نے ریڑھی لگا کر ٹھنڈی میٹھی گنڈیریاں بیچنی شروع کر دیں۔

لیکن یہ میونسپلٹی والے پھر بھی اسے چین سے نہیں بیٹھنے دیتے اور بعض اوقات اس کی گنڈیریاں ضبط کر کے چوس جاتے ہیں اور اس پر بھاری بھاری جرمانے کر کے اس کی ریڑھی نیلام کر دیتے ہیں۔

اسے اس کاروبار میں صرف دو پیسے روپیہ منافع دے رہا ہوں اور تمہیں تو میں نے پورے دو آنے کی آفر دے ڈالی ہے۔ اس لئے کہ تم میرے بچپن کے یارِ غار ہو اور ہم نے بے کاری میں افلاس کے دن اکٹھے سڑکیں ناپ کر کاٹے تھے۔

اس لئے میرے پیارے جگت مل تھوڑے لکھے کو بہت جانو۔ اس خط کو تار سمجھو اور خط ملتے ہی فوراً یہاں چلے آؤ تاکہ تمہارے نام پر فرم رجسٹرڈ کروانے اور ٹھیکہ ملنے سے پہلے کی تمام کارروائی مکمل کر لی جائے۔ تمہارا خیر اندیش۔

ہیرا پھیری مل۔ ایم۔ ایل۔ اے

"تم ابھی لڑکی نہیں ہو۔"

اتنا سنتے ہی جانے کہاں سے میرے اندر ایک قوت عود کر آئی۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کے ہاتھ جھٹک دیئے۔ "ایسا کہتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی۔"

میں نے دیکھا اس کا بدن کانپ رہا تھا۔ وہ بولا: "میں عورت نہیں کہتا۔"

میں نے غصے میں پوچھا: "تم نے میری کیا برائی دیکھی ہے؟"

"تم لڑکیاں ...... برائی کے بیج تمہاری نس نس میں پرورش پاتے ہوتے ہیں۔"

"چپ رہو ...." میں غصے میں کانپنے لگی۔ "میں نہیں جانتی تھی کہ تم اس قدر گر کر سوچ سکتے ہو۔ اماں ٹھیک ہی کہتی تھی۔"

"کیا کہتی تھی اماں .... ؟" اس کے لہجے میں تیزی آ گئی۔

"کہ تم باس کے دلال ہو۔"

"اماں کا خیال بالکل ٹھیک نہیں ہے۔ لیکن تم۔" وہ رک کر بولا: "تم کیا سچ مچ باس کے ساتھ راولپنڈی نہیں جانا چاہتی ہو؟"

"نہیں۔" میں چیخ پڑی۔ "لیکن تم تو ضد کر کے مجھے اس کے ساتھ بھیجنا چاہتے ہو۔" یہ کہتے ہوئے مجھے رونا آ گیا۔

"میں ۔۔ میں ۔۔" یوں لگا وہ کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن فیصلہ کرنے سے مجبور ہے کہ کیا کہے۔

چند لمحے بعد وہ کچھ ہچکچاتا ہوا بولا: "میری سمجھ میں نہیں آتا میں کیا کروں۔۔؟"

"تم باس سے میری مجبوری بیان نہیں کر سکتے؟"

"وہ مانے گا نہیں۔ وہ مالک ہے اور ہم اس کے نوکر۔"

"تب کیا ہو گا؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

مجھے اس پاس کا ماحول بوجھل محسوس ہونے لگا تھا۔ ہوا میں ڈوبتی اور سرسراتی ہوئی درختوں کی شاخیں اور پتے، جھاڑیوں میں سے آتی ہوئی کھڑکھڑاہٹ، سبھی کچھ یکسر مجھے چونکا رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

کچھ دیر ہمارے درمیان خاموشی سی چھائی رہی۔ اس چپ کو توڑتے ہوئے میں نے کہا: "کیا تم میرے ساتھ راولپنڈی چلو گے؟"

"باس اس کی اجازت کبھی نہیں دے گا۔"

"تو پھر .... ؟"

معروف ایک طریقہ ہے۔"

"وہ کیا .... ؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"تم کل سے دفتر جانا چھوڑ دو۔"

"ہوں ......" میرے دل میں ایک دھکا سا لگا۔ "کچھ دنوں کے لئے نہ جاؤں؟"

"جب تک اپنی عزت پیاری ہے۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں نوکری چھوڑ دوں؟"

"ہاں ۔"

"لیکن ماں .... چھوٹا بھائی ...." میرا گلا بھر آیا۔ "نہیں یہ نہ ہو سکے گا۔"

"میں تمہارے لئے ایک اور جگہ تلاش کر دوں گا۔"

میں نے محسوس کیا۔ اب تک کی ساری باتوں کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ کہنے سننے کو اب کوئی بات نہیں رہ گئی ہے۔ ایک الجھا ہوا مسئلہ حل ہو گیا ہے۔

کچھ دیر ہم خاموش بیٹھے رہے۔ پھر وہ اٹھتا ہوا بولا۔ "چلو!"

میں بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ مجھے لگا اس کا نشہ اتر گیا ہے۔

سڑک پر چلتے چلتے میں نے اس سے پوچھا: "باس کی وفاداری کیا تمہیں اچھی لگتی ہے؟"

اس نے جواب دیا: "مجھے اس کے پیسے ملتے ہیں۔"

"تم یہ نوکری چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟"

"میری نوکری آج سے چھوٹ چکی ہے۔"

اس کے الفاظ نے مجھے چونکا دیا۔

"کیسے .... کیوں ... ؟"

"تمہارے لئے ....." وہ عجیب لہجے میں بولا۔ "آج باس سے جھڑپ ہو گئی تھی۔ مجھے یا تو تمہیں چھوڑنا پڑے گا یا پھر نوکری سے الگ ہونا پڑے گا۔"

چلتے چلتے میں نے پھر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ پاس سے گزرتی ہوئی ایک ٹیکسی رکی۔ ڈرائیور نے باہر جھانکتے ہوئے پوچھا: "صاحب اب واپس چلنا ہے؟" یہ وہی ٹیکسی والا تھا جو ہمیں یہاں تک چھوڑ گیا تھا۔ ہم ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ ڈرائیور نے مسکرا کر ہمارے اداس اداس چہروں کی طرف دیکھا۔ اس کی مسکراہٹ ایسی تھی جیسے کہہ رہی ہو ۔۔ بس ٹھنڈے ہو گئے ۔۔ اور ٹیکسی آگے بڑھ گئی۔

"دوشیزہ" کا انعام یافتہ
رومانی گھریلو ناول

قسط نمبر (۱۳)

جلے پھول

عظمیٰ عزمی

تارا اپنے والدین کی چوتھی بیٹی تھی۔ اس کی ماں لڑکے کی آرزو میں بیٹیوں کو جنم دیتے دیتے تھک چکی تھی۔ تارا کی پیدائش سے پہلے وہ یہ آس لگائے بیٹھی تھی کہ اس بار ضرور لڑکا ہوگا۔ تارا پیدا ہوئی تو ان پر دورے پڑنے لگے اور انھوں نے اسے منحوس قرار دے کر اپنے پیار سے محروم کر دیا۔ تارا ماں کی محبت کی ایک نظر کے لیے ترستی ہوئی بڑی ہو گئی۔ باپ بیوی کے اس سلوک سے جو وہ تارا سے کرتی تھی دکھ محسوس کرتا تھا۔ اس نے بیٹی کی محرومی مٹانے کے لیے اس کی ہر خواہش پوری کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ تارا حسین تھی حسن اور ذہانت دونوں سے قدرت نے نوازا تھا۔ اس کے پاپا نے اسے پڑھانے کا بیڑا اٹھایا۔ ماں یہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی دوسری بیٹیوں کے مقابلے میں تارا زیادہ تعلیم حاصل کرے لیکن اس کی ہو چکی شوہر کی ضد کے آگے دم توڑ گئی۔ تارا نے اپنے اسکول کی ایک شفیق ٹیچر مس معراج میں ماں کا پیار تلاش کیا۔ لڑکیوں نے ان کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کر دیں۔ مس معراج نے سرد مہری کا رویہ اختیار کر لیا۔ تارا کا ننھا سا دل ٹوٹ گیا۔ اسے کسی کے پیار پر بھروسہ نہیں رہا۔ اس نے خودکشی کی ناکام کوشش کی۔ غلط فہمی دور ہو جانے کے بعد مس معراج اس کی عیادت اور معافی مانگنے آئیں مگر اب تارا بدل چکی تھی۔ اس نے صرف تعلیم کو اپنی منزل بنا لیا تھا۔ اس نے محنت سے پڑھائی جاری رکھی۔ اپنے پاپا کی حوصلہ افزائی سے وہ کامیابی کی منزلیں طے کرتی گئی۔ اس کی دو بہنوں کی منگنی طے ہو گئی۔ تارا کے لیے بھی ایک ڈاکٹر کا رشتہ آیا جو اس کی ماں کے نزدیک نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھا۔ وہ اس کی شادی کے لیے راضی ہو گئی لیکن تارا ڈاکٹر بننا چاہتی تھی اور پاپا اس کے حامی تھے۔ اسی بات پر گھر میں میاں بیوی کا جھگڑا رہنے لگا۔ ماں میٹرک کے بعد اس کی شادی کرنا چاہتی تھی مگر پاپا اسے ڈاکٹر بنانے پر مصر تھے۔ میٹرک فرسٹ ڈویژن کرنے کے بعد تارا کو اس کے پاپا اپنی بیوی سے چھپ کر اپنے ایک دوست ارباب صاحب کی مدد سے کالج میں داخلہ دلانے کے لیے گھر گئے۔ جہاں ارباب صاحب کے صاحبزادے ایاز نے انھیں قائل کر لیا کہ تارا کو ڈاکٹری کی تعلیم دلانے کے لیے ضروری ہے کہ اسے لڑکوں کے کالج میں داخلہ دلایا جائے تاکہ اس کے اندر خود اعتمادی پیدا ہو جائے۔ اس کے پاپا پہلے راضی نہ ہوتے لیکن ارباب صاحب اور ایاز نے انھیں دنیا کے نشیب و فراز سمجھا کر اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ تارا کو ایاز کے کالج میں داخل کرا دیں۔



تارا کالج میں داخل ہو گئی۔ وہ یہاں سہمی سہمی سی رہتی تھی جبکہ کالج کے دو طالب علم نواز احمد اور رفیق … نے محسوس کیا۔ یہ دونوں لڑکے اپنے اپنے طور پر تارا میں دلچسپی لینے لگے۔ ایاز بھی تارا کو متوجہ کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔ لیکن تارا نے اسے مایوس کر دیا۔ کالج میں پکنک کے دوران … نے تارا کی مدد کی جس سے تارا کے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ ہو گیا۔ اُدھر گھر میں تارا کی امی اس کے لیے ڈاکٹر کے رشتے کے بارے میں سنجیدہ ہو گئی تھی۔ تارا کے ابو نے انہیں ذاتی کاروبار منتقل کر دیا۔ اسی دوران اس کے ابو بیمار پڑ گئے۔ تارا نے پیپر کی تیاری کے سلسلے میں نواز احمد سے ایک کتاب لی تھی … بیماری کے دوران وہ کالج نہ جا سکی۔ اور رفیق بہانہ کر کے وہ کتاب لینے اس کے گھر آ پہنچا۔

دوسرے دن تارا کالج گئی تو اس کا منہ پھولا ہوا تھا۔ نواز معاملہ سمجھ گیا۔ وہ تارہ کی معصومیت سے پوری طرح گھائل ہو چکا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس لڑکی میں خود اعتمادی پیدا ہو جائے۔ کتاب والے واقعے سے تارا بہت غصے میں تھی۔ رفیق اپنی اس حرکت پر پشیمان تھا۔ تارہ اسے نظرانداز کرتی ہوئی چھٹی کے بعد کالج سے نکلی تو راستے میں نواز مل گیا۔ تارا نے راستہ بدلنا چاہا مگر نواز کی مقناطیسی شخصیت اس پر اثر انداز ہو چکی تھی۔ اس کی ایک آواز پر تارہ کے قدم رک گئے۔ اور وہ اس کے حکم پر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ نواز اسے بہت دور لے گیا جس سے تارہ سہم کر رونے لگی۔ در حقیقت نواز اس کے دل سے بے جا خوف ختم کر کے اعتماد پیدا کرنا چاہتا تھا۔ جو کچھ دیر بعد اس کی محبت اور نرمی کے برتاؤ سے تارہ میں جاگ گیا۔ اور جب تارہ اس سے مل کر آئی تو وہ خاصی بدلی ہوئی لڑکی تھی۔ جس نے ماں کے غصے کی بھی پروا نہیں کی۔ اس کے پاپا کو ڈاکٹر نے کینسر بتایا جس سے وہ بہت پریشان ہو گئی۔

وہ کالج جا کر ذہنی طور پر اپنی پریشانی بھول گئی۔ تارہ کی امی نے غصے میں اس کے گال پر گرم چمٹا رکھ دیا تھا جس کی جلن کالج آنے کے بعد بڑھ گئی۔ نواز نے موقع پا کر اسے برنال کی ٹیوب لا کر دی۔ اور دو چار میٹھی باتیں کیں اور اس کی ساری جلن جاتی رہی۔ نواز نے اس کے اندر جینے کا حوصلہ پیدا کر دیا تھا۔ کچھ عرصے بعد اس کی دو بڑی بہنوں عائشہ اور چاندنی کی شادیاں ہو گئیں۔ تارا نے زندگی میں پہلی بار سنگھار کیا۔ دیکھنے والوں کی نظریں چکا چوند ہو گئیں۔ خوشیوں کے یہ دن بھی گزر گئے۔ تارا کے پاپا کی بیماری بڑھ گئی۔ نواز نے تسلیوں سے اسے پریشان نہ ہونے دیا۔ لیکن وہ منحوس وقت بھی چلا آیا۔ تارا کے پاپا نے دنیا سے منہ موڑ لیا۔ تارا ذہنی طور پر اس صدمے کے لیے تیار نہیں تھی۔ وہ بیہوش ہو گئی۔ نواز جس نے اسے زندگی بھر کا رفیق بنانے کی قسم کھائی تھی اس کی حالت دیکھ کر اندر ہی اندر رو پڑا۔ جنازے کے بعد سوئم میں اس کے گھر آتا رہا۔ تارا بیچ بیچ نیم دیوانی سی ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر نے سب کو سمجھا دیا تھا کہ اس کی دلجوئی کرتے رہیں ورنہ یہ پاگل ہو جائے گی۔ چاندنی اور عائشہ کچھ دن رہ کر اپنے اپنے گھر چلی گئیں۔ اب اس گھر میں تارا، ساجدہ اور امی رہ گئی تھیں۔

تارا نے کالج جانا شروع کر دیا۔ رضیہ بی نے ہزار کوشش کی کہ تارا گھر سے نہ نکلے۔ لیکن باپ کے مرنے کے بعد وہ ماں سے اور دور ہو گئی تھی۔ وہ … تھی بلکہ نواز سے بھی ملی۔ پیاسی تارا نے نواز کے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائیں۔ اور اُدھر چوری چوری رضیہ بی نے ڈاکٹر احسن سے اس کا رشتہ پکا کرنے کی تیاریاں مکمل کر لیں۔ تارا سے عائشہ نے اس کی رائے پوچھی تو اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ نواز کے علاوہ کسی اور کو شریک حیات بنانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ اگر کسی نے زبردستی کی تو وہ گھر کی روایتوں کو توڑنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ تب رضیہ بی نے پہلی دفعہ اسے گلے لگا کر اس کی آرزو پوری کرنے کا وعدہ کیا۔ اور یوں تارا کی شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ رضیہ بی نے بتایا تھا کہ نواز کے گھر سے پیغام آیا تھا جسے منظور کر لیا گیا ہے۔ تارا خوشی سے دیوانی ہو گئی۔ تارا نے اسی دوران ایک بھیانک سپنا دیکھا۔ وہ چیخ کر اٹھ بیٹھی۔

اس نے خواب میں دیکھا تھا کہ اس کے مرحوم پاپا کے سفید … گلیوں میں اڑتے پھر رہے ہیں۔ رضیہ بی نے خواب سن کر تعبیر دی کہ تمہاری وجہ سے تمہارے باپ کی رسوائی کا خطرہ ہے۔ تمہیں ہر قربانی دے کر اپنے مرحوم باپ کی لاج رکھنی ہے۔ اور رضیہ بی کے ان لفظوں کا بھرم اس وقت کھلا جب نکاح کے وقت نواز کی جگہ ڈاکٹر احسن کا نام لیا گیا۔ تارا کو سکتہ سا ہو گیا۔ وہ دلہن بنی نواز کے سپنوں میں گم تھی کہ نکاح خواں نے ڈاکٹر احسن کے نام سے اس کی رضا مانگی۔ رضیہ بی نے مرحوم باپ کی عزت کا واسطہ دے کر اسے ہاں کرنے پر مجبور کر دیا۔ وہ صدمے سے بے ہوش ہو گئی۔ اور اسی نیم بے ہوشی میں اس کی رخصتی ہو گئی۔ ڈاکٹر احسن اپنی بے ہوش دلہن کو … گود میں … لایا۔ تارا کو ہوش آیا تو … ڈاکٹر احسن اس پر جھکا ہوا تھا۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ ڈاکٹر اب تک اس کی بے ہوشی کی وجہ اس کے پاپا کے انتقال کا صدمہ سمجھ رہا تھا۔ مگر تارا نے اس کا ہاتھ جھٹک کر صاف کہہ دیا کہ اس کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے۔ اس کی ماں نے دھوکہ دے کر شادی کی ہے۔ ڈاکٹر احسن ہکا بکا رہ گیا۔

تارا کی صاف گوئی نے اس کے ارمان خاک میں ملا دیے تھے۔ اس نے ٹھنڈے دل سے اس کے جذبات کا تجزیہ کیا اور اس سے وعدہ کر لیا کہ وہ اس کے راستے سے ہٹ جائے گا۔ مگر ابھی کچھ دنوں اسے اس بندھن سے سمجھوتہ کرنا پڑے گا۔ … تعلقات کے … دونوں دوست رہیں گے۔ اور اس طرح سہاگ رات کسی خوشی کے بغیر بیت گئی۔ تارا کی امی نے … زیادتی کی معافی مانگی۔ انہوں نے بتایا کہ یہ سب کچھ انہوں نے اس کی بہتری کے لیے کیا ہے۔ … ہو گئی۔ اسی دوران اس کا … آ گیا۔ اور اس کے کچھ دیر بعد نواز بھی …

ٹوٹ گیا۔ احسن شفقت کرنے سے اس کو جو اتفاق تھا شادی میں نواز شریک نہیں ہو سکا تھا اسے معلوم نہیں تھا کہ تارا احسن کی دلہن بنادی گئی ہے۔ وہ شرکت کر کے اپنا تعاون کرانے کے لئے ایک تحفہ لے کر دلہن کے کمرے میں پہنچا۔ وہاں تارا کو دیکھ کر وہ ہکا بکا رہ گیا۔ تارا اسے دیکھ کر بکھر گئی۔ نواز یہ صدمہ برداشت نہ کر سکا اور بجھے دل سے خاموشی سے باہر نکل آیا۔ تب اس کے دوسرے رشتے دار اس کے کمرے میں آئے تو تارا اس کو دیکھ کر بری طرح بکھر گئی تھی۔ وہ سب اسے دہشت زدہ دیکھ کر گھبرا گئے۔

تارا نے انہیں بہلا دیا۔ اب تارا کسی نہ کسی انداز سے نواز کی غلط فہمی دور کرنا چاہتی تھی۔ وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ اس کی شادی زبردستی ہوئی ہے۔ نواز بہت دنوں بعد احسن کے جانے پر آیا لیکن ہکا بکا اور اُجڑا اُجڑا۔ تارا اسے دیکھ کر اور پریشان ہو گئی۔ اسے مسلسل اداس اور پریشان دیکھ کر ڈاکٹر احسن نے مشورہ دیا کہ وہ کہیں باہر گھوم آئے۔ مگر وہ راضی نہ ہوئی۔ وہ تمام دن یونہی شکستہ بستر پر پڑی رہتی تھی۔ نواز نے آنا بند کر دیا تھا۔ ایک دن ڈاکٹر احسن نے اسے زبردستی پکچر دکھانے پر آمادہ کیا۔ وہ نواز کا ٹکٹ بھی لے آئے۔ دونوں نواز کو لینے اس کے گھر پہنچے وہ بیماری سے اٹھا تھا۔ اسے کمزور دیکھ کر تارا تڑپ اٹھی۔ وہ بڑی مشکل سے ان کے ساتھ فلم دیکھنے پر راضی ہوا۔ سینما ہال میں ایک ساتھ بیٹھے تو ماضی کا رشتہ پھر جاگ اٹھا۔ اس نے تارا کا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔ تارا کی آنکھیں برس پڑیں اور وہ چپکے سے ہال سے نکل گیا۔

نواز نے وہ رات اپنے رشتے داروں کے گھر گزاری۔ اس کا ضمیر بے چین تھا کہ اس نے احسن چچا کی بیوی کے ہاتھوں کو کیوں چھوا۔ وہ بے حد متفکر اور ملول رہ کر اس نے فیصلہ کر لیا کہ تارا سے قطع تعلق کر لے۔ وہ دوسرے روز وطن کے لئے چلا گیا اور زیادہ وقت راحت کے ساتھ ہنس کر گزارا۔ تارا نے بات کرنا چاہی تو بدکلامی سے پیش آیا۔ تارا کا دل بڑی طرح سے ٹوٹ گیا۔ ادھر ڈاکٹر احسن کو اس کے دوست نے مشورہ دیا کہ تم تارا سے ازدواجی تعلقات قائم کرو۔ وہ تمہاری بیوی ہے کوئی غیر نہیں۔ ہمت افزائی پاکر احسن نے اس رات تارا کو اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ تارا نواز کے رویے سے ٹوٹ کر بکھر چکی تھی۔ وہ احسن کی کوشش قطعی کو نہ سمجھ سکی۔ مگر جب احسن کے ہاتھ آگے بڑھنے لگے تو وہ چونک اٹھی اور نیت بھانپ کر اس کے بازو میں کاٹ لیا۔

ڈاکٹر احسن اپنی بیوی سے حقِ زوجیت وصول کرنے کے بعد لمبی تان کر سو گئے۔ لیکن تارا کا پورا وجود ان کے خلاف انتقام کا شعلہ بن گیا۔ اس نے اپنے جسم پر ان کا حق تسلیم نہیں کیا۔ اس کا رویہ پہلے سے زیادہ تند اور سخت ہو گیا۔ ڈاکٹر احسن کا ذہنی سکون تباہ ہونے لگا تو تنگ آکر ایک دن وہ اسے اس کے میکے چھوڑ آئے۔ ان کا خیال تھا کہ اس ایک جھٹکے سے تارا کا دماغ درست ہو جائے گا لیکن تارا کے دل سے نواز کا خیال دور نہ ہو سکا۔ ایک دن وہ اس کے گھر پہنچ گئی اور اسے یہ خوشخبری سنائی کہ میں ڈاکٹر احسن سے طلاق لے رہی ہوں۔ پھر اچانک نہ جانے کیا ہوا کہ نواز نے اسے دبوچ کر اپنے بستر پر گرا لیا اور اس کی آنکھوں سے ہوس کی چنگاریاں نکلنے لگیں۔ وہ سراسیمہ ہو گئی۔ اس نے نواز کی گرفت سے نکلنے کی پوری کوشش کی جب کامیاب نہ ہو سکی تو اس نے تکیے کے نیچے پڑا ہوا پستول اٹھا لیا۔ گولی کی آواز گونجی اور دو چیخیں فضا میں تحلیل ہو گئیں۔

(اب آگے پڑھئے)

نواز دہرا ہو کر بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ تارا نے تازہ سرخ لہو چادر پر بڑی سرعت سے پھیل رہا تھا۔ اور تارا کی آنکھوں میں سرخ دھند سی چھانے لگی۔ اس نے خود کو بڑی مشکل سے سنبھالا اور اسے کچھ خبر نہیں کیسے وہ اٹھنے کی دہلیز عبور کرتی لان پر دوڑتی چلی گئی —— گیٹ سے ٹکراتی ہوئی —— سڑک پر آئی۔ اتفاق سے ایک رکشہ سواری اتار کر واپسی کے لئے موڑ کاٹ رہا تھا۔ تارا نے اپنا کانپتا ہاتھ اٹھایا اور اس کے رکتے ہی دوڑ کر اس میں چڑھ گئی —— اس کا ذہن سرخ دھند کی چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ "تارا! جانِ احسن!" کسی نے ہولے سے اس کے کانوں میں سرگوشی کی —— احسن —— وہ سسک اٹھی —— رکشہ والے نے پلٹ کر دیکھا۔ تارا نے اس کی سرخ سرخ آنکھیں دیکھیں تو سہم کر بولی۔

"ڈرائیور! ذرا تیز چلاؤ، میرے پاؤں میں بڑی تکلیف ہو رہی ہے۔"

اور جب رکشہ احسن کی کوٹھی کے سامنے سے گزرا تب اسے پتہ

چلا کر وہ اپنے گھر جانے کی بجائے رکشہ ڈرائیور کو احسن کا پتہ بتا چکی ہے اس نے رکشہ ٹھہرایا۔ اور خود جیسے بھاگتی ہوئی اندر آ گئی۔ مولا بخش حیرت سے مالکن کو دیکھ رہا تھا۔

"بی بی! خیریت تو ہے؟"

"بابا! تم ذرا رکشہ والے کو فارغ کر دو۔ صاحب کہاں ہیں؟"

"اندر ہیں بی بی! بڑی بیگم ناصرہ بی بی کے ساتھ مری گئی ہوئی ہیں۔ نیلو بی بی اپنے کمرے میں ہوں گی۔"

اس نے آگے کچھ نہیں سنا۔ اپنے کمرے کی دہلیز پر آ کر اس کے قدم جیسے جم گئے۔ اندر احسن کے کھانسنے کی آواز آئی۔ جیسے سگریٹ کا دھواں اٹک گیا ہو۔ اس نے پردے کی اوٹ سے اندر جھانکا۔ احسن مسہری پر لیٹا تھا۔ تکیہ اس کے سر سے نکل کر قالین پر گر پڑا تھا مگر وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر سگریٹ کا دھواں گھونٹ گھونٹ کر کے سینے میں اتار رہا تھا۔ اس کے رخساروں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ آنکھوں تلے سیاہی دور سے صاف نظر آ رہی تھی ——— "احسن ———" تارا کے دل نے پھر سسکی لی۔ وہ تھوڑی دیر اور کھڑی رہتی تو شاید دروازے پر ہی بے دم سے گر پڑتی ——— پر وہ تیزی سے پردہ ہٹا کر دوڑتی ہوئی آئی اور احسن کی بانہوں میں جا گری۔

"مجھے...... مجھے معاف کر دیجئے احسن... مجھے معاف ———"

احسن نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں ——— یہ آواز ——— یہ آواز تو انہیں شاید مرنے کے بعد بھی آ سکتی تھی ——— بکھرے بکھرے بال ——— اڑا اڑا سا رنگ، بھیگی بھیگی آنکھیں، تھرتھراتے ہونٹ وہ فیروزی کپڑوں میں ملبوس ان کے سینے پر اپنا چہرہ رگڑ رگڑ کر کہہ رہی تھی

"احسن مجھے معاف کر دیجئے ——— احسن مجھے معاف کر دیجئے اب میں آپ کی ہوں، صرف آپ کی۔" احسن نے غور سے دیکھا، وہ تارا ہی تھی۔ لیکن انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا تھا۔ ان کے بازوؤں کی گرفت تارا پر ایک دم بہت مضبوط ہو گئی اور پھر ذرا ہی ڈھیلی پڑ گئی۔ ان کے ہاتھ اس کی پشت پر پھسلنے لگے۔ ہاں یہ وہی کلیوں جیسا نازک بدن ہی تو تھا ——— ہاں ہاں وہی دل کی دھڑکن ——— وہی ہونٹوں کا اضطراب ——— اور اسی طرح بالکل اسی طرح تپتے ہوئے گال۔ احسن نے آگے جھک کر اس کے بالوں میں چہرہ چھپاتے ہوئے ایک لمبی گہری سانس لی ——— ہاں یہی خوشبو بالکل یہی خوشبو میری تارا کے بالوں کی ——— تو کیا میرے سینے پر سر رکھ کر رونے والی میری تارا ہے تارا میری محبت، میرا عشق، میرا جنون، میرا سکون، میرا قرار ——— میری تارا ——— میری تارا۔

احسن نے بے قرار ہو کر اسے پھر بانہوں میں جکڑ لیا۔ وہ رو رہی تھی ——— سسک رہی تھی اور احسن آنکھیں بند کر کے اس کے ریشم جیسے بالوں کی خوشبو اپنے اندر اتار رہے تھے۔ انہیں تارا کی سسکیاں تارا کے آنسو روح کو سکون بخش رہے تھے۔ ان کی بہادری، ان کی ذہانت، ان کی متانت، ان کی بردباری سب آہستہ آہستہ واپس لوٹ رہی تھی، ان کا خالی سینہ دھیرے دھیرے بھر رہا تھا۔ آخر وہ بھی تو ایک مرد تھے۔ اور آج ان کے سینے پر بھی ایک عورت سر رکھ کر آنسوؤں کی بوچھار میں اپنی کمزوریوں کا اعتراف کر رہی تھی ——— اپنی محبت کا یقین دلا رہی تھی ——— اپنے قصور معاف کروا رہی تھی۔ وہ تو خیر ایسے خاصے پڑھے لکھے سمجھدار تھے۔ ایسے موقعوں پر تو پڑھے لکھے سے پڑھا لکھا مرد بھی اپنے آپ کو ہیرو سمجھنے لگتا ہے۔ دراصل احسن ان لمحوں کو طول دینا چاہتے تھے۔ اگر یہ خواب تھا تو وہ ساری زندگی خوابیدہ رہنا چاہتے تھے اور اگر یہ کوئی غلط فہمی تھی تو وہ زندگی بھر کے لئے اس غلط فہمی کو جوں کا توں قائم رکھنا چاہتے تھے۔

لیکن وہ بیتاب تھی ——— بے چین تھی ——— اس نے ان فولادی بازوؤں کی گرفت سے آزاد ہونا چاہا، لیکن احسن نے موقع ہی نہ دیا۔ اس نے ذرا سا سر اٹھا کر احسن کی طرف دیکھا۔ گلابی گلابی آنکھیں، سوجے ہوئے سے پپوٹے، بکھرے ہوئے بال، دہکتے ہوئے عارض ——— احسن کے دل نے بیتاب ہو کر دعا مانگی کہ یا خدایا لمحہ اتنا طویل، اتنا طویل کر دے کہ یہ ایک لمحہ پوری زندگی پر محیط ہو جائے یا پھر زندگی کو اتنا مختصر کر دے کہ وہ اس لمحے میں ڈوب کر گم ہو جائے لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔ وہ لمحہ ان کی نظروں کے سامنے دم توڑ بیٹھا۔ تارا نے دوسرے ہی لمحے رک رک کر کہا،

"احسن اب میں آپ کے پاس آ گئی ہوں۔ اب میں کہیں نہیں جاؤں گی، کہیں بھی نہیں۔" وہ سر جھکا کر رو پڑی۔ دھیمی دھیمی سسکیوں کی آواز شہنائیوں کی گونج اور ڈھول تاشوں کی دھمک میں ڈھل گئی۔ احسن کو یوں لگا جیسے ان کے کمرے میں سہاگ رات ایک بار پھر اتر آئی ہے اور وہ آہستہ آہستہ تارا کا گھونگھٹ اٹھا رہے ہیں۔

"تارا میری تارا ———" احسن کے ہاتھوں نے آپ ہی آپ تارا کے چہرے کو تھام لیا۔ "تارا مجھے تمہارا ہی انتظار تھا۔ میں تمہاری راہ دیکھتا تھا۔ اب تم مجھے چھوڑ کر تو نہ جاؤ گی۔ میں تمہارے بغیر ادھورا

رہ جاتا ہوں ——— جان پچ اصطرار ہوتا ہوں۔" احسن نے
تارا کا چہرہ اپنے چہرے کے قریب کر کے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔
شاید کہیں احتراز ہو، شاید کہیں انکار ہو، ممکن ہے اجتناب کیا جائے
ہو سکتا ہے چھپے اشتعال ہوتے لیکن اس کی آنکھوں میں گہرے پانی کے
سوا کچھ بھی نہ تھا۔ وہ تو کچی مٹی کا ڈھیر بن گئی تھی۔ جی چاہے توڑ کر نا
بنا لو، جی چاہے تو ریزہ ریزہ کر بھلا دو۔ وہ مٹی کی مورت کی طرح سر سے
بکھر نہ بول سکی۔

"تارا ———" احسن کی آواز جذبات سے عاری ہو گئی تھی۔
تارا نے آہستہ سے پلکوں کی چلمن ہٹائی تو دو موتی ٹوٹ کر گالوں پر سے
لڑھکتے ہوئے احسن کی گردن پر جا پڑے۔ احسن بے تاب ہو گئے اور ان کے
جلتے ہوئے ہونٹوں نے اس کی آنکھوں کے سارے موتی چن لیے۔
فون کی گھنٹی پہلی بار بجی تو احسن نے سنا ہی نہیں، دوسری
بار بجی تو احسن نے پلٹ کر فون کی طرف دیکھا اور پھر منہ موڑ کر تارا کی جبیں
پر آئے ہوئے بال سمیٹنے لگے۔ وہ آنکھیں بند کئے ان کے پہلو میں خاموش
لیٹی ہوئی تھی۔ گھنٹی تیسری بار بجی تو تارا نے آنکھیں کھول کر احسن کی طرف
دیکھا تو احسن مسکرا دیئے۔ لیکن تارا نے فوراً ہی آنکھیں موند لیں۔ فون کی
گھنٹی ایک بار پھر بج اٹھی۔ تو احسن جھنجلا گئے۔ "کیا مصیبت ہے یار،
کبھی چین ہی نہیں۔ ہاں تم اٹھو جان اب منہ دھو لو ——— تمہاری
طبیعت تو ٹھیک ہے نا ——— اٹھو۔" احسن نے تارا کے سر کے
نیچے سے اپنا بازو نکالتے ہوئے جھنجلاہٹ سے کہا ہی تھا کہ گھنٹی پھر
بجنے لگی۔

"اللہ مالک ہو ——— یہ لوگ میرا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔
میں چاہتا ہوں کہ ایک دن بھی نہ گیا تو مصیبت کر دی۔ تارا ڈیئر! پلیز تم تو اٹھ
بیٹھو، تمہارے بغیر تو میرا دل بھی بستر چھوڑنے کو نہیں چاہتا۔ اور ایک
تو پھول ہی گیا وہ لیکچر اب سے ملتوی ہے۔ تمہاری وجہ سے میری اور
اس کی لڑائی ہو گئی ہے۔ چلو ہم دونوں چل کر اس کو منا لیں گے۔ اتنی بڑی
نامور کمپنی نے پرسوں ہی بھیج دیا تھا۔ وہ بار بار تمہارا پوچھتی تھیں
ان سوالوں سے بچنے کا یہی ذریعہ تھا ——— یہ فون! خدا کا
بندہ سمجھ کیوں نہیں رہا کہ گھر پر کوئی نہیں ہے ——— وہ ڈسکنکٹ
ہی نہیں کر رہا ——— اچھا تم دونوں اٹھو تو پھر میں فون دیکھتا ہوں۔"
تارا نے ذرا سی جھکی آنکھوں سے احسن کو دیکھا اور پھر چابی والی گڑیا کی
طرح اٹھ کر بیٹھ گئی ——— "شاباش ——— یہ ہوئی نا بات۔"
احسن اس کا کندھا چھو کر فون کے پاس چلے آئے۔ "ہیلو! میں ڈاکٹر
احسن اسپیکنگ ———" انھوں نے بیزاری سے کہا۔
"اوہ ہمدانی بھائی ——— آپ ——— سوری ویری
سوری بھائی جان ——— دراصل اس کمرے میں کوئی نہیں تھا۔
وہ ان کی ——— میرا مطلب ہے تارا کی کچھ طبیعت ٹھیک نہیں ہے
لیکن کیا ہوا ——— ؟ آپ کیوں پریشان ہیں۔ کیا ——— ؟ کیا کہہ رہے
ہیں آپ ——— نہیں نہیں بھائی جان اسد کو گولی لگی ہے ———
لیکن کیسے ——— مجھے تو یقین نہیں آ رہا ——— آپ بات کہاں
سے کر رہے ہیں۔ ہیلو ہیلو بھائی جان ..."
ہولناک سنگ ریزے تیرتے لفظ تارا کے کانوں میں جا کر ٹکرائے
تو وہ بجلی کا کرنٹ کھا بیٹھی ——— اسے بڑی شدت سے چکر آیا۔
اس نے سنبھلنا چاہا لیکن توازن قائم نہ رہ سکا۔ اس کا سر مسہری کے خوبصورت
اور مضبوط تکیے سے جا ٹکرایا اور وہ وہیں گر پڑی۔ احسن نے پلٹ کر
تارا کو دیکھا تو ریسیور رکھ کر وہ اس کے پاس چلے آئے۔
"تارا ——— تارا ——— کیا ہوا تارا ——— ؟" انھوں
نے گھبرا کر تارا کو دونوں ہاتھوں پر اٹھا کر مسہری پر لٹا دیا۔ وہ چوٹ کی
شدت کی وجہ سے بے ہوش ہو گئی تھی۔ اس کے ماتھے پر گومڑ پڑ گیا تھا
احسن پریشان ہو گئے ——— "ادھر تارا بے ہوش ہو گئی ہے ادھر
فواد کو گولی لگ گئی ہے ——— آخر میں کدھر جاؤں، کیا کروں ——— ؟"
سب سے پہلے احسن نے فون اٹھا کر اپنے قریب رکھ لیا۔ پھر تارا کی نبض
ٹٹولی۔ ان کا سارا جنون رفع دفع ہو گیا تھا۔ وہ اس وقت عاشق کامل
کی بجائے صرف ڈاکٹر بن گئے تھے۔ انھوں نے تارا کا بلڈ پریشر دیکھا
ٹمپریچر نوٹ کیا۔ انجکشن دیا۔ اس کے تلوے سہلا کر گرم کئے کمبل اوڑھایا
اور اس کے ماتھے پر پڑنے والے گومڑ پر دوا لگائی اور مزید معائنہ کر کے
ہو گئے۔ وہ یک دم مسکرا پڑے ——— اور پھر انھیں نیلی کی بات بھی
یاد رہی۔ نہ فواد کو لگنے والی گولی کا خیال آیا۔ تارا کی بے ہوشی کا حق بھی
جاتا رہا۔ بات کچھ تو نہیں تھی۔ وہ یقینی طور پر تو نہیں کہہ سکتے تھے
لیکن کچھ گڑبڑ کا احساس ہو گیا تھا۔ تارا کے تعاون کے بغیر تو وہ ہرگز
نہیں جان سکتے کہ آیا وہ باپ بننے والے ہیں یا نہیں ———
"خدا کرے میرا شک درست ہو ———" احسن نے صمیم قلب سے دعا
مانگی۔ انھیں تارا پر بے تحاشا پیار آیا۔ جھک کر اس کے لب چھو کر چومتے
ہوئے وہ مسکرا کر بڑے خلوص سے بولے۔ "تم سلامت رہو تاقیامت۔"
——— فون کی گھنٹی بجی تو احسن نے جھپٹ کر چونگا اٹھایا۔ "ہیلو ہیلو
میں احسن ہوں ——— جی ——— جی ——— بھائی جان! میں

بول رہا ہوں ——— نہیں نہیں بھائی جان کیا بات کرتے ہیں آپ؟ دراصل اس وقت تارا کو یکدم چکر آگیا تھا اور وہ گر پڑی۔ گھر میں میرے سوا اور کوئی نہیں اس لئے میں اُسے اٹھانے کے لئے لپکا تو غیر شعوری طور پر میں نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا تو آپ سمجھے کہ میں نے جان بوجھ کر رکھ دیا ——— وہ ابھی تک بیہوش ہے۔ ماتھے پر چوٹ لگی ہے۔ ویسے بھی وہ خاصی ویک ہے ——— آئی ہوپ شی از پریگننٹ ——— نہیں ——— نہیں ——— ایسی کوئی بات نہیں میں ابھی پہنچتا ہوں ——— نیلما ہے گھر پر وہ ان کی تیمارداری کرے گی ——— لیکن بھائی جان میری سمجھ میں نہیں آتا کہ فائر ہوا کیسے ——— ؟ اپنے آپ کیسے لگ جائے گی ؟ آپ نے ٹھیک سے نہیں پوچھا اس سے ——— اچھا اچھا ٹھیک ہے۔ آپ نروس نہ ہوں۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں، میں پہنچتا ہوں، ابھی ——— اور دیکھیں بھائی جان خیال رکھیں کسی کو اندر نہ آنے دیں میرا خیال ہے اس کے پاس اس پستول کا لائسنس بھی نہیں ہے ——— ہاں ٹھیک ہے بات پھیلنے نہ پائے ——— بہت اچھا کیا کہ آپ نے رپورٹ نہ لکھوائی ——— اچھا بھائی جان پھر میں ابھی پہنچتا ہوں۔"

احسن نے ریسیور کریڈل پر رکھ کر تارا کی طرف دیکھا۔ اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی وہ مسکرا پڑے۔ حالانکہ یہ موقع مسکرانے کا نہ تھا۔ اس وقت تو انھیں بڑی روح فرسا خبر ملی تھی کہ ان کا پیارا بھتیجا جو ان کا دوست بھی تھا۔ اچانک زخمی ہو گیا ہے۔ لیکن وہ اس قدر پریشان اور اداس نہیں تھے جتنا کہ ہونا چاہئے تھا۔ جبکہ وہ جانتے تھے کہ نواز کا زخم کوئی معمولی زخم نہیں گولی کا زخم ہے۔ اور پھر دونوں ہاتھ سینے پر باندھتے ہوئے وہ ہنس کر بڑے عجیب سے لہجے میں بولے؛

"تارا تمھیں اس وقت اس حالت میں چھوڑ کر کہیں جانے کو دل تو نہیں چاہتا، لیکن وہ نواز ——— سچ پوچھو تو میرے ساتھ قدرت بڑا ظالمانہ مذاق کر رہی ہے ——— جب میں زخمی تھا۔ گھائل تھا، پریشان تھا، اکیلا تھا تو میرے ساتھ یہ مجبوری تھی کہ میں کسی کو اپنا احوال تک نہیں بتا سکتا تھا۔ لیکن اب جب تم میرے دل کے زخموں کے لیے مرہم بن کر آگئی ہو تو نواز زخمی ہو بیٹھا۔ اب بتاؤ میں اس کے زخم دیکھنے جاؤں یا تمھاری دلجوئی کروں ——— اور جبکہ تم مجھے بتا بھی چکی ہو کہ تم اپنی سہیلی سے لڑ کر آئی ہو اور تمھاری امی بھی تم سے خفا ہیں۔ تم نے گھر پر اطلاع بھی نہیں دی اور سہیلی کے گھر سے سیدھی یہاں آگئیں۔ اب جب تم ہوش میں آ ؤ گی اور مجھے اپنے قریب نہ پاؤ گی تو تمھارا دل بہت اداس ہو گا۔ لیکن میں کیا کروں مجھ سے دو محبتیں میرا احتساب مانگنے میرے سامنے کھڑی ہوئی ہیں ——— لیکن جانِ احسن ——— تم افضل ہو سب سے افضل ——— میں تمھیں اس حال میں چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا ———" ڈاکٹر احسن دوبارہ مسہری پر بیٹھ گئے۔ انھوں نے ہاتھ بڑھا کر تارا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر نبض پر انگلیاں رکھ دیں۔ ان کے ہونٹوں پر نرم نرم مسکراہٹ انگڑائیاں لے رہی تھی۔ وہ سگریٹ پینا بھی بھول بیٹھے تھے۔ ان کا دل چاہ رہا تھا کہ خوب قہقہے لگائیں خوب ہنسیں اور اپنے سامنے بے سُدھ پڑی ہوئی اس کومل سی لڑکی کو اتنا گدگدائیں کہ وہ ہنستے ہنستے بے حال ہو جائے۔ اس کے گالوں کے گلاب دہکنے لگیں۔ اس کے لبوں کے گوشے تھرتھرانے لگیں۔ اور وہ تنگ آ کر توبہ کر کے ان کے زانو پر سر رکھ کر ان کے آگے دونوں ہاتھ جوڑ دے؛

لیکن وہ تو اس وقت بے ہوش پڑی تھی اور ان کے ہوش و حواس پر بھی بُرا وقت آیا ہوا تھا۔ وہ تو اپنے آپ کو بھولے جا رہے تھے۔ پھر انھیں یہ کیسے یاد رہتا کہ ان کی لاڈلی بہن اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی روتے روتے نڈھال ہو چکی ہو گی اور اس کے آنسو کسی نے خشک نہیں کئے ہوں گے۔ انھیں تو نواز بھی یاد نہیں رہا تھا جس کی ٹانگ میں گولی لگ گئی تھی نہ انھیں ہمدانی بھائی یاد رہے تھے جو ماہر سرجن ہوتے ہوئے بھی اس وقت ڈاکٹر احسن کے محتاج تھے۔ مضبوط دل والے ڈاکٹر ہمدانی جو اپنے بیٹے کو زخمی دیکھ کر نروس ہو گئے تھے۔ انھوں نے کانپتی آواز میں احسن سے کہا تھا کہ احسن خدارا جلدی پہنچو ——— وہ اس وقت اپنے ڈاکٹر بھائی کا انتظار کر رہے تھے اور ان کا ڈاکٹر بھائی اپنی کائناتِ دل کے آگے مریضِ محبت بنا بیٹھا تھا۔ اسے تارا کے ہوش میں آنے کا انتظار تھا۔ تارا نے آہستہ سے گردن ہلائی تو احسن اس کے اور قریب کھسک آئے۔ وہ آنکھیں بند کئے کئے ایک دم چیخ پڑی؛

"نہیں ——— نہیں ——— اللہ نہیں ——— مجھے چھوڑ دو، مجھے چھوڑ دو نا ———" اور وہ پھر سسکنے لگی۔ اس نے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ لی تھیں۔ وہ بُری طرح ڈر رہی تھی۔ احسن بے قرار ہو گئے۔

"تارا ——— تارا ——— کیا ہو گیا تمھیں ——— پریشان مت ہو۔ میں تمھارے قریب ہوں۔ اتنا ڈرتی کیوں ہو پاگل لڑکی مجھے بتاؤ کیا ہوا ——— ؟ کیا بات ہے ——— ؟" احسن اس کے اوپر

جھک گئے ——— تارا نے آنکھیں کھول کر احسن کو دیکھا اور ڈوبتی ہوئی آواز میں بولی،

"میں خواب میں ڈر گئی تھی۔"

"تمہیں اپنے خوابوں میں شامل کر لیتیں تو کیوں ڈر لگتا بھلا۔ اور یہ تمہیں ہوا کیا تھا ——— بیٹھے بیٹھے غش کیوں آ گیا تھا۔" احسن نے بڑے پریم سے پوچھا مگر تارا چپ رہی ——— "بتاؤ کیا ہوا تھا؟" انھوں نے پھر پوچھا۔

"کچھ نہیں ——— بس یوں لگا جیسے ——— جیسے کسی نے میرے دل کو مٹھی میں لے کر مسل دیا ہو ——— شاید چکر آ گیا تھا۔"

"ہوں تو یہ چکر ہیں ———" احسن نے شریر بچے کی طرح بڑی شوخی سے کہا، لیکن تارا کچھ نہ سمجھ سکی۔ وہ گھبرائے جا رہی تھی۔ اس نے بڑی لجاجت سے احسن سے کہا،

"سنئے آپ ابھی اسی وقت امی کو بتا آئیے کہ میں اپنی سہیلی کے یہاں سے سیدھی یہاں آ گئی ہوں۔ ورنہ امی بہت پریشان ہوں گی۔"

"ہاں ——— ابھی چلا جاتا ہوں، اوہ مجھے تو بھابی نے بلایا تھا، وہ نواز کو ...... میرا مطلب ہے کہ نواز کی طبیعت خراب ہے ——— اب تمھاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا ——— میں چلا جاؤں؟" احسن نے اپنی پریشانی چھپاتے ہوئے تارا سے پوچھا۔

"امی کہاں ہیں ——— ؟ مجھے اکیلے میں ڈر لگے گا احسن۔"

"پاگل ڈرنے کی کیا بات ہے۔ اپنا دل مضبوط کرو گڑیا ——— زندگی یوں نہیں گزارا کرتی جس طرح تم گزار رہی ہو ——— یوں بات بے بات کوئی بھی تمھاری طرح بے ہوش نہیں ہوتا۔ دیکھو نیل تمھارے پاس رہے گی۔ امی ناصرہ کے ساتھ مری گئی ہیں۔ سب تو میں امی کو بلوالوں گا۔ زندگی کا صحیح لطف تو اب آئے گا جان ——— اچھا اب میں چلوں۔ احمد کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

تارا نے خواہ مخواہ آنکھیں بند کر لیں۔

"اچھا اب خدا حافظ تو کہہ دیجئے۔" احسن نے بڑے خوبصورت انداز سے اجازت مانگی مگر تارا کے لب نہ ہلے۔

"حضور اجازت نہ دیجئے گا۔" احسن نے پھر پوچھا۔

"چلے جائیے ——— لیکن اگر میری طبیعت خراب ہو گئی یا میں ڈر گئی تو ——— ؟"

"طبیعت تو اب آپ کی خراب ہوتی نہیں۔ اس بات کی تو میں گارنٹی دیتا ہوں ——— رہی بات ڈرنے کی تو نیل آپ کے پاس رہے گی۔" یہ کہہ کر وہ مڑا۔ "میں بلاتا ہوں اسے ——— بھائی کو نہیں۔ وہ بھی تو مجھ سے ناراض ہے۔ اب میں کدھر جاؤں؟ پتہ ہے تارا ——— اس کی اور میری لڑائی کیوں ہوئی ——— صرف آپ کی وجہ سے ——— آج میں نے پہلی مرتبہ اس پر نہ جانے کیسے ہاتھ اٹھا لیا، وہ میری بڑی پیاری بہن ہے ——— اُف خدا! میں بھی کتنا خود غرض ہوں۔ اپنی خوشی میں مگن ہو کر اسے منانا ہی بھول گیا۔ وہ اب تک رو رہی ہوگی ——— چہ ——— چہ ——— چہ ———"

احسن کو سچ مچ بہت افسوس ہو رہا تھا۔

"آپ نے کیوں ڈانٹا نیل کو ——— ؟ وہ تو بہت اچھی لڑکی ہے ——— آپ کو پتہ ہے بھائی بہنوں پر ہاتھ نہیں اٹھایا کرتے وہ تو ان کا مان ہوتے ہیں، غرور ہوتے ہیں۔"

"ہاں تم سچ کہہ رہی ہو تارا۔ بھائی بہنوں پر ہاتھ نہیں اٹھاتے وہ تو بڑی معصوم اور بڑی پیاری ہوتی ہیں۔ میں جاتا ہوں اس کو ابھی منا کر لاتا ہوں۔" احسن تیزی سے کمرے سے نکل گئے۔

تارا نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس بھر کر بڑی عاجزی سے مانگی

"یا اللہ! میری عزت رکھ لے۔ ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گی ——— مر جاؤں گی ———" اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو غور سے دیکھ کر سوچا۔ "اگر پستول پر میری انگلیوں کے نشانات مل گئے ——— یا نواز نے میرا نام لے دیا تو پھر کیا ہوگا ——— ؟ احسن کیا سوچیں گے؟ ان کی بے پناہ محبت ——— یہ دیوانگی ——— یہ چاہت سب کچھ نفرت میں بدل جائے گی اور پھر ساری دنیا کیا کہے گی ——— اگر وہ مر گیا تو مجھے پھانسی کی سزا ملے گی ——— میری تصویر اخباروں میں چھپے گی ——— رفیق، زبیدہ اور کالج کے سارے لڑکے لڑکیاں تصویر دیکھ کر کیا کہیں گے ——— ؟ مرنے کے بعد بھی اسکینڈل بنتے رہیں گے مرزا صاحب کی ماں تو ایک گھڑی میں دس الزام گھڑ لے گی اور پھر شاید ساجدہ باجی کی شادی بھی نہ ہو سکے ——— ہائے نواز تم اتنے ذلیل اتنے کمینے نکلو گے، یہ مجھے پتہ نہ تھا۔ کاش میں تمھارے پاس نہ جاتی کاش تم مجھے نہ ملے ہوتے۔ ہائے اللہ اب میں کیا کروں!"

تارا نے بے چین ہو کر کروٹ بدلی ہی تھی کہ احسن نیل کا بازو تھامے کمرے میں چلے آئے۔ وہ بڑی لجاجت سے نیل سے کہہ رہے تھے "دیکھو نیل رانی اب میں تمھاری بھابی جان کو منا کر لے آیا ہوں۔ خدارا اب تو مجھے معاف کر دو میری پیاری گڑیا۔"

نیل نے بھیگی پلکیں اٹھا کر احسن کو دیکھا اور بے اختیار ہو کر

احسن سے لپٹ گئی ——— احسن نے اس کے بالوں کو چومتے ہوئے تھپتھپاتے ہوئے کہا ——— "بس ——— بس ——— میری گڑیا ———
اب مت رو، مجھے پتہ تھا کہ میری بہن مجھے ضرور معاف کر دے گی۔ اچھا اب مجھے جانے دو گی۔ تمہارے ہمدانی بھائی کی طبیعت ٹھیک نہیں — ہمدانی بھائی نے بلایا ہے مجھے ——— تم اپنی بھابی کے پاس بیٹھو ان کی طبیعت بھی درست نہیں ہے۔ ذرا خیال رکھنا ان کا۔ کہیں باتیں کرتے کرتے ہی بیہوش نہ ہو جائیں۔ میں مولا بخش کو روکے دیتا ہوں بٹھا جاتا ہوں ——— جاتے ہی فون کر دوں گا۔ ہو سکتا ہے مجھے دیر بھی ہو جائے تم لوگ پریشان مت ہونا۔" احسن نے شیلا کو کاندھے سے پکڑ کر تارا کی مسہری پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ "اچھا خدا حافظ ———" احسن نے باری باری دونوں کے گال تھپتھپائے اور کمرے سے باہر چلے گئے۔ ان کا دل دو متضاد جذبوں کے درمیان بھٹک گیا تھا ——— محبت کی مراد پا لینے کی خوشی ——— اور ——— نواز کے زخمی ہونے کا غم ——— دونوں جذبے بیک وقت ان کے دل میں آ گھسے تھے۔ وہ اپنی خوشیوں پر دکھ کا پردہ نہیں چڑھانا چاہتے تھے اور نہ ہی اپنی خوشیوں میں گم ہو کر اپنے بھائی اور بھتیجے کی پریشانی اور تکلیف کو فراموش کر سکتے تھے۔ اندھا دھند کار چلاتے ہوئے احسن کو نواز پر ایک دم غصہ آ گیا ——— بے وقوف کہیں کا۔ کتنی دفعہ منع کر چکا تھا کہ اسلحہ کو کھلونا مت سمجھو، لیکن وہ خان صاحب تو اس سے دل بہلاتے تھے۔ یہ جنگل کے شوقین اس قدر لاپرواہ کیوں ہوتے ہیں۔ گاڑی دائیں جانب موڑتے ہوئے ڈاکٹر احسن کو تارا کی امی کا خیال آ گیا ——— لعنت خدا! ابھی ان کو بھی اطلاع دینی ہے کہ صبح کا نکلا شام کو گھر پہنچ چکا ہے۔ اگر اطلاع نہ دوں تو ——— تو وہ پریشان ہوں گی پہلے ہی میں خاصا لیٹ ہو گیا ہوں ——— خدا جانے نواز کی کیا حالت ہے ——— ہمدانی بھائی نے کچھ نہ کچھ تو سنبھالا ہی ہو گا لیکن وہ گھبرا بھی تو رہے تھے ——— تو پھر کیا کروں سیدھا ساتھ ہی چلا جاؤں۔ لیکن پھر وہ بھی تو پریشان ہوں گی۔ ان کے گھر میں تو کوئی مرد بھی نہیں ہے ——— اور پھر نہ جانے محلے والے کیا کیا باتیں بنا ڈالیں۔ پورا محلہ بھی ایسا ہی ہے ——— ٹھیک ہے دیکھا جائے گا۔ جہاں اتنی دیر ہوئی ہے وہاں دو منٹ اور سہی۔

احسن نے گاڑی اس جانی پہچانی گلی میں موڑ لی۔ رضیہ بی باہر کے دروازے کے پاس ہی کھڑی تھیں۔ شاید تارا ہی کا انتظار تھا۔ احسن کی گاڑی دیکھ کر ان کا چہرہ یکدم زرد پڑ گیا۔ احسن نے گاڑی کی کھڑکی میں سے جھانک کر سلام کیا تو وہ گھبرا گئیں۔ "ارے بیٹا تم ——— تم کیسے؟" وہ ہکلانے لگیں۔

"امی میں آپ سے یہ کہنے آیا تھا کہ آپ اب تارا کا انتظار نہ کریں۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لئے وہ اپنے دوست میرا مطلب ہے اپنی سہیلی کے یہاں سے سیدھی گھر پہنچ گئی ہیں۔"

"اللہ تیرا شکر ہے۔ میں تو پریشان ہو گئی تھی۔ اندھیرا پھیل گیا تھا ——— ارے بیٹا موٹر کار سے نیچے اتر آؤ۔ اندر آ جاؤ۔ تم تو ہمارے گھر کا راستہ ہی بھول گئے ہو۔" رضیہ بی نے محبت بھرا گلہ کیا۔

"نہیں امی اس وقت اجازت دیں۔ میں بہت عجلت میں ہوں۔ میرے بھتیجے کی طبیعت بہت خراب ہے اسے دیکھنے جا رہا ہوں۔ انشاء اللہ پھر کبھی ہم دونوں ہی آئیں گے۔" احسن نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"نت نت آؤ بیٹا، جم جم آؤ۔ تمہارا ہی گھر ہے۔ لیکن اس وقت ایک کپ چائے تو پی لیتے۔ بس دو گھڑی میں تیار ہو جاتی ہے۔"

"امی جان ——— میری چائے ادھار رہی۔ ہم دونوں کسی وقت آ کر پی لیں گے۔ اب اجازت دیں ——— خدا حافظ۔" احسن نے فوراً ہی گاڑی موڑ لی۔ رضیہ بی دروازے کا پٹ تھامے کھڑی کی کھڑی رہ گئیں۔

***

نواز کی ضد یہی ایک رٹ تھی کہ گولی خود میرے ہاتھ سے چلی ہے لیکن احسن یہ بات ماننے کو تیار نہ تھے۔ گولی بے شک بہت قریب سے چلی تھی لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اگر نواز نشانہ بازی کر رہا تھا اور نشانہ چوکا بھی تھا تو گولی پاؤں کے پنجے میں لگنے کی بجائے گھٹنے کے قریب کیوں لگی۔ یہی بات ڈاکٹر ہمدانی کی سمجھ میں بھی نہیں آ رہی تھی۔ وہ تو ویسے بھی اپنے اکلوتے بیٹے کے پاؤں میں خون بہتے دیکھ کر ایک دم نروس ہو گئے تھے۔ احسن نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی تو وہ بپھرنے لگے۔ "یہ آخر مجھے بتاتا کیوں نہیں کہ اس کا دشمن کون ہے۔ میں اس سالے کو جیل میں سڑوا دوں گا۔ ٹھیک ہے یہ نہیں بتاتا ہے تو نہ بتائے۔ میں اسے زمین کھود کر نکلوا لوں گا۔ ڈی آئی جی میرا اچھا دوست ہے۔ مگر میں کمشنر کو فون کر دوں تو وہ تہلکہ مچا دے گا۔"

ڈاکٹر ہمدانی نے لہجہ بدل کر پوچھا۔ "مجھے تم خود بتاؤ نواز کہ تمہاری کس سے لڑائی ہوئی تھی۔ قسم خدا کی میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا

کا آخر یہ کونسی شرافت ہے کہ گھر بیٹھے گولی لگ جائیں میں پوچھتا ہوں احمد سے کس طرح بتاؤ کہ وہ کون تھا؟" ؟ ڈاکٹر ہمدانی غصے سے مٹھیاں بھینچتے ہوئے ایک بار پھر فواد کے قریب چلے آئے

"ڈیڈی —— ڈیڈی —— پلیز آپ میری بات کا یقین کریں کہ میرا کوئی دشمن نہیں ہے مجھ پر کسی نے قاتلانہ حملہ نہیں کیا غلطی میری اپنی ہے۔ چچا جان آپ ہی کچھ سمجھائیں ڈیڈی کو۔ سچ کہہ رہا ہوں گولی خود میرے ہاتھ سے چلی ہے۔ آپ یہ پستول دیکھ لیں وہ پستول ہے جو میں بازار سے لایا تھا۔ دیکھ لیجئے اس میں تین گولیاں کم ہیں۔ دو گولیاں میں نے سامنے کارنس پر رکھی ہوئی گڑیا کے سر پر مارنے کی کوشش کی —— اُف —— اُف خدایا میری ٹانگ —— میری ٹانگ —— سچ کہتا ہوں چچا جان غلطی میری ہی تھی" —— فواد نے شدتِ کرب سے آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن احسن کے چہرے پر اب بھی بے یقینی کے دھندلے دھندلے سائے لرز رہے تھے۔ انہوں نے ڈاکٹر ہمدانی کو مخاطب کر کے کہا "ہمدانی بھائی آپ ذرا دوسرے کمرے میں چلے جائیے۔ میں اس سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں" ڈاکٹر ہمدانی نے غصے سے گھور کر فواد کو دیکھا تو احسن نے فوراً بات پلٹتے ہوئے کہا "ہمدانی بھائی، دیکھیں احمد کو تکلیف بہت زیادہ ہے۔ آپ کلینک جا کر آپریشن کا بندوبست کیجئے۔ کیونکہ آپریشن تو بہرحال کرنا ہی پڑے گا۔ آپ ایکسرے کے لئے میرا خیال ہے کہ اپنے دوست ربانی سے بات کریں لیکن رازداری کا خیال رکھیے گا۔ بات باہر نہ نکلنے پائے۔ آج رات ہی آپریشن ہو جائے تو بہتر ہے۔ ورنہ زخم کے ساتھ ساتھ اثرات بڑھ جانے کا بھی خطرہ ہے"

"تم ٹھیک کہتے ہو احسن میرا خیال ہے فون پر بات کرنے سے بہتر ہے کہ میں خود ربانی سے مل آؤں تاکہ بات اس کی سمجھ میں بھی آجائے اور وہ اطمینان سے کر سکے۔ اور ہاں میری بجائے تم ہی اگر آپریشن کر لیتا میں سمجھتا ہوں کہ اپنے بیٹے کا آپریشن کرنا کسی باپ کے لئے مشکل ترین کام ہوتا ہوگا"

ڈاکٹر ہمدانی چلے گئے تو احسن نے بڑے خوشگوار لہجے میں فواد سے پوچھا؟

"اب بتاؤ بیٹے اصل معاملہ کیا ہے؟"

"لو چچا جان آپ بھی یقین نہیں کر رہے۔ سب بتا دیئے میں کس طرح سمجھاؤں آپ کو"

"آسان بات ہے اور میں سمجھائے جناب میں یقین کر لوں"

"کیا سچ مچ کوئی لڑکی بیٹھی ہوئی تھی آپ کے ساتھ؟" احسن مجسم سوال بن گئے

فواد نے لمبی سانس لے کر کچھ سوچا اور پھر رک رک کر بولا۔ چچا جان —— آپ کو پتہ ہے کہ میں یہ پستول بازار سے لایا تھا پہلے تو مجھے نشانہ بازی کا کوئی خاص شوق نہیں تھا لیکن جب سے یہ پستول خریدا ہے تب سے میرا دل نشانہ بازی کرنے کو چاہنے لگا تھا پہلے بھی دوپہر کے وقت کمرہ بند کر کے میں یہ پستول چلا چکا ہوں۔ دراصل آج تو میں یہ سمجھے ہوئے تھا کہ اس پستول میں صرف دو گولیاں ہیں لیکن میں یہ خود ہی بھول گیا تھا کہ مزید چار گولیاں میں نے اس میں پرسوں شام ڈال دی تھیں۔ آج یونہی نشانہ بازی کا خیال آیا تو تکیے کے نیچے سے پستول نکال کر سامنے کارنس —— پر رکھی ہوئی گڑیا کا سر توڑنا چاہا لیکن نشانہ صحیح نہیں بیٹھا وہ کھڑکی کا شیشہ توڑ گیا ہے لیکن دوسری گولی گڑیا کے سر کی بجائے اس کے پیٹ میں لگی۔ سچ کہہ رہا ہوں چچا جان دو گولیاں چلا کر میں سمجھا تھا کہ پستول خالی ہے میں کافی دیر تک اسے ہاتھوں میں اچھالتا رہا اور پھر یونہی لیٹ گئے۔ —— بے خیالی میں نہ جانے کیسے ٹریگر دب گیا اور گولی چل گئی۔ سچ چچا جان مجھے پتہ نہیں تھا کہ اس میں —— اف خدا بڑی تکلیف ہے —— چچا جان مجھے بے ہوشی کا انجکشن دے دیجئے ——"

"برداشت کرو —— تھوڑا سا اور برداشت کرو مجھے پتہ ہے کہ تم بہادر جوان ہو —— ہمت سے کام لو —— اچھا فواد یہ بتاؤ کیا تم اپنے بستر پر لیٹے ہوئے تھے؟"

"جی —— جی ہاں چچا جان میں بستر پر لیٹا تھا ٹانگ پر ٹانگ رکھے ہوئے شعر دراصل پڑھتے پڑھتے بور ہو گیا تھا اس لئے سوچا کہ کوئی شغل ہو جائے اگر لیٹا ہوا تھا تو گولی کیسے لگ جاتی؟"

"بیٹا عجیب پیارا شغل —— مجھے اس بات پر ایک شعر یاد آ گیا یہ اس طرح ہی ہے کہ دل کے ہر کھیل میں —— ہوتی ہے بہت ہی کہانیاں —— عشق کو عشق سمجھ مشغلہ دل نہ بنا —— تو دوست میں بھی تم سے یہی کہتا ہوں کہ پستول کو پستول ہی سمجھو کھلونا مت بناؤ تمہاری اس نشانہ بازی نے اب دیکھو کیسی مصیبت کھڑی کر دی ہے اب تمہاری سزا یہ ہے کہ تمہارا یہ پستول میں ضبط کئے لیتا ہوں ——

ہائے —— ہائے —— امی —— امی —— یہ کیا ہو رہا ہے تمہیں —— ارے یاد مت ہو کر رہتے ہو —— بری بات —— بہت

بچی بات ہے ؟

"نہیں چچا جان میں رو تو نہیں رہا بس یونہی تکلیف برداشت کرتے کرتے آنکھیں نم ہو گئیں۔ چچا جان سچ کہا آپ نے کہ دل کے ہر کھیل میں ہوتا ہے بہت بری کاریاں ——— کاش میں نے پستول کو اتنا بے ضرر نہ سمجھا ہوتا۔ دیکھیے چچا جان اگر میں رونا بھی چاہوں تو نہیں رو سکتا۔ ڈیڈی کا خوف ہے احساس پشیمانی اور بھیا کی پریشانی بھی دیکھی نہیں جاتی اور میں تڑپتا چلا جا رہا ہوں ——— بس چچا جان خود کردہ را علاج نیست۔ اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں زخمی کر لینا بھی بڑا عذاب ہے۔ آپ نہیں سمجھ سکتے کہ میں اس وقت کیا محسوس کر رہا ہوں ——— خدا جانے کتنا گہرا زخم پڑ جائے گا۔ اور پتہ نہیں یہ زخم کب مندمل ہو۔ اور یہ بھی ضروری تو نہیں کہ زخم مندمل ہو جائے۔ ——— بعض زخم بھرتے ہی نہیں ——— ناسور بن جاتے ہیں ——— چچا جان خدا کے واسطے مجھے بے ہوش کر دیجیے ورنہ درد میں پاگل ہو جاؤں گا۔ میں مر جاؤں گا۔ اور میں ہذیانی انداز میں چیخ چیخ کر مرنا نہیں چاہتا۔ میں سکون سے مرنا چاہتا ہوں۔ میں خاموشی سے مرنا چاہتا ہوں"

"نواز ——— نواز بیٹے ——— حوصلہ رکھو ——— بہادری یہ نہیں کہ آدمی سکون سے مر جائے بہادری یہ ہے کہ آدمی تکلیفوں دکھوں پریشانیوں کو برداشت کرتے ہوئے پرسکون دکھائی دے تم تو بہادر باپ کے بہادر بیٹے ہو ——— یہ تو وقتی تکلیف ہے ختم ہو جائے گی ——— تم نے کبھی ان لوگوں کے متعلق بھی سوچا ہے جو ذہنی اذیت برداشت کرتے ہیں جن کے دل دکھوں سے بھرے ہوتے ہیں لیکن کوئی نہیں سمجھ پاتا کہ وہ کیوں پریشان ہیں وہ کیوں دکھی ہیں ——— نواز تمہاری تو جسمانی تکلیف ہے۔ تمہارا یہ زخم تو سب کو نظر آئے گا سب اس پر مرہم رکھنے کی کوشش کریں گے لیکن جب کسی دل پر یا کسی کی روح میں زخم پڑ جاتا ہے تو اس کا مندمل کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ تم ابھی یہ باتیں نہیں سمجھو گے ——— میری دعا ہے کہ خدا تمہیں ان سب پریشانیوں سے محفوظ رکھے"!! احسن نے خلوص دل سے دعا مانگی لیکن نواز ایک دم ہنس پڑا۔

احسن نے چونک کر اسے دیکھا ——— اس کی ہنسی ہنسی نہ تھی ایک آہ تھی ——— اس دکھ بھری ہنسی نے انہیں آفسردہ کر دیا۔ وہ کچھ سوچنے لگے۔

"چچا جان" ——— نواز نے انہیں پکارا ———

"جی" وہ فوراً بولے۔

"چچا جان میں سوچ رہا تھا کہ یہ بھی اچھا ہی ہے کہ دل کے زخم سب کو نظر نہیں آتے اگر روح کے یا دل کے زخم سب کو نظر آتے ——— تو جینا دوبھر ہو جاتا"

"ہاں ہو تو جاتا لیکن تم یہ سب کچھ کیوں سوچ رہے ہو؟"

"سوچوں نہ تو کیا کروں ——— اول تو ذہن خالی نہیں ہوتا اگر خالی رہوں تو تکلیف کا احساس ستانے لگتا ہے"

"اچھا ٹھہرو میں تمہیں انجکشن دے دیتا ہوں" ڈاکٹر احسن انجکشن بنانے لگے اور نواز تکتے پر بے چینی سے سر ہلاتا رہا۔

انجکشن لگنے کے تھوڑی دیر بعد ہی نواز پر غنودگی طاری ہونے لگی اور وہ احسن سے باتیں کرتے کرتے سو گیا ——— احسن تھوڑی دیر تو خاموش اس کے قریب بیٹھے رہے اور پھر انہوں نے اپنے گھر کا نمبر ڈائل کر لیا ——— فون نیل نے اٹھایا تھا۔

"نیلی ——— میں احسن بول رہا ہوں" جواب میں نیل نے نواز کے متعلق پوچھا۔

"اب تو ٹھیک ہے اس کی طبیعت ——— نہیں کوئی خاص بات نہیں ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا ——— نہیں نہیں پریشانی کی کوئی بات نہیں ٹانگ کے زخم میں ٹانکے لگیں گے مولا بخش جاگ رہا ہے نا ——— نہیں نہیں تم مت سونا تمہاری بھابی ڈر کے مارے بے ہوش ہو جائیں گی۔ ایسا کرو چائے بنوا لو مولا بخش سے۔ اسے بھی پلانا ——— میرے آنے کا تو کچھ ٹھیک پتہ نہیں۔ دیکھو دس بجے تک میں پھر فون کروں گا۔ تم ہو گی ٹی۔ وی کھول لو۔ فرائی ڈے اسپیشل میں کوئی پکچر آ رہی ہو گی ——— اچھا تو وہی پکچر دیکھی جا رہی ہے ——— اچھا تمہاری بھابی کی طبیعت کیسی ہے۔ ٹھیک ہے تو پھر ذرا فون انہیں دو حال احوال تو پوچھ لوں"

ہیلو ——— ہیلو ——— کون؟

تارا ——— ! مگر کس کی قسمت کا؟

ہیلو ——— میں نے کچھ پوچھا تھا جناب۔

ہاں اس کی طبیعت اب ٹھیک ہے ——— کوئی خاص بات نہیں۔ بس ذرا سا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ اور کوئی بات پوچھنا ہو تو پوچھ لیں لیکن آپ کو میری بات کا جواب ضرور دینا پڑے گا۔ فون پر نہ دیا تو گھر آ کر پوچھ لوں گا۔ ہیلو ——— ہیلو ——— تارا خاموش کیوں ہو گئیں۔ بولتی کیوں نہیں؟"

"کیا بولوں؟ احسن یہ کیا بات ہوئی۔ سب یہ بھی میں ہی تمہیں بتاؤں۔ حالانکہ بولنے کے معاملے میں تو عورتیں بدنام ہیں"

"تارا" ——— احسن نے دھیمی مگر جذبات سے بوجھل آواز میں

اسے بہت دور سے پکارا تھا۔" جی"۔۔۔ تارا نے آہستہ سے جواب دیا۔

"تارا ۔۔۔ میٹھے بول اچھی خیرات ہیں۔ ہم فقیروں کو یہ خیرات دے دو کہ بڑے ترسے ہوئے ہیں ہم۔"

دور کہیں کسی مندر میں بجتی ہوئی گھنٹیوں کی مدھر مدھر آواز احسن کے کانوں میں اتری تو وہ سمجھ گئے کہ تارا ہنسی ہے سو وہ بھی ہنس دیئے۔

"تارا۔۔۔ احسن نہ جانے کیوں یہ نام بار بار لینا چاہتے تھے۔

"جی"۔۔۔ وہ پھر چابی والی گڑیا کی طرح بول اٹھی۔

"نیند تو نہیں آرہی ۔۔۔ ؟"

"ہائے اکیلے میں نیند کیسے آئے گی ۔۔۔ میرا تو ڈر کے مارے دم نکل جائے گا۔ آپ ہوتے تو شاید میں سو بھی جاتی۔" تارا بڑے بھولپن سے کہہ گئی لیکن احسن کی بے ساختہ ہنسی سن کر وہ جھینپ گئی ۔۔۔ احسن خوش ہو کر کہہ رہے تھے۔ "تارا! مجھے تو اپنی سماعت پر شک گزرنے لگا ہے صد شکر کہ اپنا مقدمہ جیتا کا یقین نہیں تھا کہ آپ کو ہمارے بغیر نیند نہیں آئے گی۔ چلیے تھوڑا سا انتظار اور سہی ۔۔۔ ہم ابھی پہنچے جاتے ہیں۔"

"اللہ نہیں ۔۔۔ میرا مطلب یہ تھوڑی تھا۔ اچھا اب آپ نیل سے بات کریں۔" مارے شرم کے تارا کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہونے لگے تھے۔ سامنے ہی تو نیل بیٹھی تھی۔ مانا کہ وہ ٹی۔ وی دیکھ رہی تھی لیکن لفظ تو کانوں میں جاتے ہی ہیں لیکن احسن کو تو بڑا لطف آرہا تھا وہ تھوڑے سے مرعوب سے بولے۔

"نہیں جی نہیں۔ ہم کیوں کریں نیل سے بات۔ ہم تو آپ ہی سے بات کریں گے کہیے طبیعت کیسی ہے آپ کی؟ دل کا کیا حال ہے؟ اور نبض کیا کہتی ہے ؟"

"سب ٹھیک ہے۔ یہ بتائیں آپ کب آئیں گے؟" تارا نے یونہی پوچھ لیا۔

"اچھا تو آپ کا دل کہتا ہے سب ٹھیک ہے لیکن نبض کہتی ہے آپ کب آئیں گے؟"

"اللہ احسن پلیز ۔۔۔" تارا کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"اللہ احسن پلیز جلدی آجایئے نا ۔۔۔" احسن نے تارا کے لہجے کی نقل اتارتے ہوئے جملہ پورا کیا تو تارا کٹ سی گئی ۔۔۔ اس نے سر اٹھا کر نیل کی طرف دیکھا اور دھیرے سے بولی۔

"میں نہیں بولتی آپ سے۔ میں فون رکھ رہی ہوں۔"

"ارے رے رے ۔۔۔ اس قدر خفا ہیں میں آجاؤں گا آج رات ہی واپس آجاؤں گا ۔۔۔ ذرا آپ سج سنور کر میرا انتظار کیجیے کچھ ریشمی ریشمی سی ہو۔ نکھرا نکھرا چہرہ، جھکی جھکی آنکھیں ہوں ۔۔۔ گلابی گلابی لب و رخسار ہوں ۔۔۔ اور وہ فیضہ دیکھ کیا ہوتا ہے۔ بس سب کچھ ہی ہو کر بڑا مزہ اس طلب میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر اور پھر یہ تو ہماری سہاگ" اس سے پیشتر کہ احسن آگے کچھ اور کہتے تارا نے کھٹ سے فون رکھ دیا۔ احسن دو تین سیکنڈ تک ریسیور کان سے لگائے رہے لیکن پھر بڑی خوشدلی سے مسکراتے ہوئے ریسیور رکھ دیا۔

***

ڈاکٹر احسن اور ڈاکٹر ہمدانی کی خوش خلقی اور دوستیاں اس وقت بہت کام آئی تھیں۔ بڑی خاموشی سے نواز کا ایکسرے بھی ہو گیا اور آپریشن بھی۔ ڈاکٹر ربانی نے ان دونوں کا بڑا ساتھ دیا۔ ربانی کے کلینک میں احسن اور ربانی نے مل کر نواز کا آپریشن کیا۔ سرجن ہمدانی ان کے مددگار بنے۔ سب سے نواز کو خون کی بوتل لگا دی گئی تھی اور وہ لوہے کے بیڈ پر بے ہوش پڑا تھا۔ احسن اور ربانی نے مل کر فیصلہ کیا تھا کہ بات بالکل دبا دی جائے۔ رشتہ داروں اور احباب میں بھی تذکرہ نہیں کیا جائے۔ نواز دو تین دن ربانی کے کلینک میں رہے گا پھر ہمدانی اسے اپنے کلینک میں لے جائیں گے۔ ہمدانی کو ساری باتوں سے اتفاق تھا سوائے اس کے حملہ کرنے والے کا سراغ نہ لگایا جائے ۔۔۔ لیکن ایک ڈیڑھ گھنٹے کی بحث کے بعد ڈاکٹر احسن اور ڈاکٹر ربانی انہیں یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گئے کہ ان کے حق میں یہی بہتر ہے کہ بات دبا دی جائے کیونکہ نواز خود بھی یہی چاہتا تھا۔ ورنہ وہ خود گولی چلانے والے کا نام یا حلیہ بتا دیتا ۔۔۔

احسن کو تو یقین آگیا تھا کہ گولی نواز ہی سے چل گئی ہے ربانی اور ڈاکٹر ہمدانی کو شک تھا کہ گولی چلی نہیں چلائی گئی ہے۔ لیکن یہ قطعی تھا کہ گولی نواز کے پستول سے چلی یا چلائی گئی ہے ۔۔۔ اور نواز کے پاس پستول کا لائسنس نہیں تھا۔ بس یہی وہ کمزور پہلو تھا جو ہمدانی کو ہار ماننے پہ مجبور کر رہا تھا ورنہ ان جیسے جلالی آدمی کو روکنا بڑا مشکل ہو جاتا یوں بھی اب پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی خود ہمدانی بھی مطمئن ہو گئے تھے ۔۔۔

احسن نے گھڑی میں وقت دیکھا ساڑھے بارہ ہو رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح ہمدانی بھائی سے اجازت لے کر گھر جائیں لیکن مروت انہیں مارے ڈال رہی تھی۔ وہ ہر دو منٹ بعد بے قرار ہو کر گھڑی دیکھ رہے تھے۔ ڈاکٹر ہمدانی نے آخر ان کی بے تابی بھانپ لی اور انہوں نے خود ہی کہہ دیا۔

"احسن تم اب گھر جاؤ۔ بھیا، گھر پہ اکیلی ہیں۔ میں رات
یہیں نواز کے پاس ٹھہر رہا ہوں۔ تم صبح نو دس بجے تک آجانا پھر
دیکھیں گے کہ اگر حالت بہتر ہوئی تو اسے ڈسچارج کرا کے لے جاؤں گا"
احسن اجازت لے کر چلے آئے۔ انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے
ان کے سر پہ سے منوں بوجھ ہٹ گیا ہو۔ خیال ... پر ... ساتھ
کی سیٹ پر ... کار کی سمت موڑتے ہوئے وہ بہت ... تھے ۔۔۔ گھڑی
۔۔۔ اور پھر گھڑی بارہ ۔۔۔ اس کے بعد تسبیل ... فاصلے پر
سے سمٹ رہا تھا۔ تسبیل کی چوڑائی پہ کار گھماتے ہوئے ان کی نظر
پھول والے کی دکان پر پڑی ۔۔۔ وہ بہت سے پھولوں کے
ہار اور گجرے تار کر کے اندر رکھ رہا تھا اور ساری دکانیں بند ہو چکی تھیں
احسن نے بڑی پھرتی سے بریک لگائے اور کار ایک طرف کھڑی کر کے
اس کے پاس چلے آئے۔ پھول والا غیر متوقع گاہک دیکھ کر کھل اٹھا
اس کے ہار بر مجانے سے گئے تھے ۔۔۔ وہ سستا سودا کرنے
پہ راضی تھا اور احسن مہنگی سی مہنگی سوداگری کرنے پہ بھی تیار تھے
سارے پھول گجرے، ہار ساتھ والی سیٹ پہ رکھ کر وہ پھر ہواؤں کے
ہمرکاب ہو لئے۔ بارہ بج کر چھتیس منٹ پہ وہ گھر پہنچے۔ تارا کی
کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں لیکن وہ دونوں ایک دوسرے
کی خاطر جاگ رہی تھیں۔ نیل نواز کی طبیعت وغیرہ پوچھ کر اپنے کمرے
میں چلی گئی۔ احسن اسے کمرے تک چھوڑ کر آئے بلکہ اس کی پیشانی چوم
کر یہ بھی کہہ آئے تھے کہ "آج تمہاری بہن بہت نادم تھا مجھے خوشی
ہے تو نے مجھے معاف کر دیا" ۔۔۔ اور شریر نیل نے ہنس کر کہا
تھا: "بھائی جان ایک تھپڑ کے عوض آپ کی اور بھابی کی صلح ہو گئی
تو پھر یہ سودا مہنگا تو نہیں پڑا" ۔۔۔ اور احسن ہنس کر اس کے
سر پہ چپت مار کر اپنے کمرے میں آئے تو ان کی نظر سب سے پہلے تارا
پر پڑی۔ وہ چادر سر سے پیر تک اوڑھے ہوئے بستر پہ لیٹی تھی ۔۔۔
احسن نے بڑھ کر ایک جھٹکے سے چادر کھینچ لی تو تارا نے نیند بھری گلابی
آنکھیں زبردستی کھولتے ہوئے کہا۔
"اللہ سونے دیجئے نا۔ سچ بہت نیند آ رہی ہے"
"اب خود نہیں لگ رہا آپ کو" ۔۔۔ احسن نے مسہری پہ
بیٹھتے ہوئے پوچھا "نہیں" ۔۔۔ اس نے کروٹ بدل لی۔
"لیکن کیوں؟" ۔۔۔ احسن اس کے قریب کھسک آئے۔
"آپ جو آ گئے" ۔۔۔ وہ اور پرے کھسک گئی۔
"اور اگر میں چلا جاؤں تو" ۔۔۔ احسن نے اس کے تکیے
کا کونہ پکڑ لیا ۔۔۔
"تو میں بے ہوش ہو جاؤں گی" ۔۔۔
"بے ہوش ہونے والا تھیلا آپ کے پاس خوب ہے
آپ اتنی جلدی بے ہوش کیوں ہو جاتی ہیں؟" احسن نے دوپٹے
کو جھٹکا دیا۔
"شاید اس لئے کہ قسمت میں ایک ڈاکٹر لکھا تھا" ۔۔۔
احسن بے ساختہ ہنس پڑے ۔۔۔ "آپ باتیں بھی کرتی ہیں"
"جی ہاں۔ میں باتیں کرتی ہوں اور آپ باتیں بناتے ہیں" ۔۔۔
تارا نے کروٹ بدلی ۔۔۔
احسن پھر ہنس دیئے ۔۔۔ "آج آپ بہت موڈ میں ہیں تارا"
"لیکن شاید موڈ آپ کے موڈ کی طرح خطرناک نہیں ہے ۔۔۔
پلیز اب ... میری چادر واپس کر دیں" ۔۔۔
"اوہو ... احسن ۔۔۔ اچھا یہ تو بتائیں آپ نے فون
کیوں رکھ دیا تھا؟"
"اس لئے کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا؟"
"وہ، میں تو آپ سے مذاق کر رہا تھا۔ آپ نے میری بات نہیں
مانی؟" احسن نے دوپٹے کا کونہ خود بخود چھوڑ دیا۔
"کونسی بات؟" تارا نے آنکھیں کھولیں۔
"وہی بات جس پہ آپ نے فون بند کر دیا تھا" ۔۔۔ ... نے
تارا کی طرف کروٹ بدلی ۔۔۔
"اُف، اللہ شرم نہیں آتی آپ کو" ۔۔۔ وہ سمٹ سی گئی۔
"کیوں شرم کی کیا بات ہے؟" ۔۔۔ احسن نے پوچھا مگر تارا
چپ رہی ۔۔۔ کلاک نے گھنٹے سے ایک بجنے کا اعلان کر دیا۔
"تارا" ۔۔۔ احسن نے پھر اسے پکارا۔
"جی" ۔۔۔ وہ بوجھل سی آواز میں بولی۔
"میرے جانے کے بعد آئینہ دیکھا تھا؟"
"اوہو، کیوں" ۔۔۔
"کیوں نہیں دیکھا۔ ایک بار دیکھ تو لیتیں کتنی اچھی لگ رہی ہو
چلو اٹھو ابھی آئینہ دیکھو" ۔۔۔
"آئینہ دیکھ کر میں پاگل ہو گئی تو" ۔۔۔؟
احسن کو ہنسی آ گئی ۔۔۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی
پکڑ لی ۔۔۔
"چلو اٹھو ۔۔۔ ذرا ... دکھواؤں" ۔۔۔

"ابھی ہاتھ چھوڑیں نا —— پتہ ہے رات کو آئینہ نہیں دیکھتے امی منع کرتی تھیں ہو ——"

"اچھا، تو تمہاری امی منہ دھونے کپڑے بدلنے کو بھی منع کرتی ہوں گی۔"

"نہیں منع تو نہیں کرتی تھیں لیکن یہ کہتی تھیں کہ اگر کسی کو نیند آرہی ہو تو اسے تنگ نہیں کرنا چاہیئے۔" —— تارا نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا۔ اور احسن نے بمشکل مسکراہٹ ہنسی روکی جو بہت سے اٹھ کر تارا کے قریب جاتے ہوئے بولے۔

"اور جان! میری امی کہتی تھیں کہ اگر کسی کو نیند آرہی ہو اور وہ نیند کا بہانہ کئے جائے تو اس کو اتنی گدگدیاں، اتنی گدگدیاں کرنا چاہیئے کہ وہ سب بھول جائے۔" احسن نے سچ مچ تارا کو گدگدیاں کرنا شروع کردیں۔ ہنس ہنس کر اس کا منہ سرخ ہوگیا۔ اسکے بال بکھر گئے۔ آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ تڑپ کر بھاگی اور پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

آج زندگی میں پہلی مرتبہ اسے خیال آیا تھا کہ امی میری دشمن نہیں تھیں وہ میری بھلائی چاہتی تھیں۔ میرے لئے ان کا انتخاب غلط تو نہ تھا میں تو شاید پاگل تھی یا ناتجربہ کار تھی جو رات کے غصے کو سوچ کر بیٹھنے لگی تھی ——

"اب کیا سوچنے لگیں ... اٹھو چلو ادھر آؤ ڈریسنگ ٹیبل پر۔" احسن نے میز پر رکھے ہوئے گجرے میں سے ایک پھول توڑ کر تارا کو پھینک کر مارا۔ اس نے پوری پوری آنکھیں کھول کر بڑے غور سے احسن کو دیکھا —— گہری گہری آنکھیں سانولا رنگ، مضبوط جسم اور دائیں طرف کنپٹی کے پاس سے سفید ہوتے ہوئے کچھ بال، ہونٹوں پر بچی ہوئی بے چین سی مسکراہٹ۔ تارا کو یوں لگا جیسے اس کا ناول آٹھ دس سال تک اس کو صحراؤں میں جنگلوں میں ڈھونڈتا ڈھونڈتا ایک دم سامنے آگیا ہے۔ اپنی پختہ اور پُروقار شخصیت کے ساتھ بالکل میچورڈ ہوکر ——

"اللہ جان، اس قدر غور سے کیوں دیکھ رہی ہو کیا نظر لگاؤ گی بچہ۔" احسن نے ٹوکا تو وہ جھینپ گئی ——

"اُف، اُف مات! اتنی شرم ایسی کیا بات کہہ دی میں نے۔ ان سے کچھ تو میرے دل کی باتوں کا پاس کر دو۔ پھر مجھے لگتا ہے صبح تک بدبخت بچہ گا نہیں۔" تارا نے جھوٹے سے مسکرا کر احسن کو دیکھا اور پھر ڈریسنگ ٹیبل کے پاس چلی آئی۔ احسن اس کے پیچھے آ کھڑے ہوئے۔ بالوں میں برش کرکے اس نے بال پیچھے کئے تو احسن نے ہاتھ مار کر کچھ بال اس کے چہرے پر گرا دیئے۔ تارا نے پلٹ کر احسن کو دیکھا اور پھر دھیرے سے بولی۔

"دیکھیں زیادہ تنگ مت کریں ورنہ سچ میں امی کے پاس جا کر سو جاؤں گی۔"

"اچھا نہیں نہیں ہم زیادہ تنگ نہیں کریں گے تھوڑا تنگ کریں گے ——" احسن پھولوں کے ہار گجرے اٹھا کر ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دیئے۔ تارا نے چہرے پر لوشن لگایا اور لپ اسٹک اٹھاتے اٹھاتے اس کا ہاتھ رک گیا۔ نہ جانے کیوں اس کا جی چاہا کہ احسن اس سے کہیں کہ لپ اسٹک لگاؤ —— تارا کو آج یہ چھوٹی چھوٹی باتیں بہت پیاری لگ رہی تھیں جو کہ بڑی ابھی تک رہی تھی منتظر کی ... اس کا ہر رخ، ہر روپ ہر رنگ اس کے لئے بالکل انوکھا، بالکل نیا تھا۔ بار بار اسے اپنی بے وقوفی کا خیال آرہا تھا کتنی دفعہ اس نے سوچا کہ میں نے اتنے اچھے اتنی قدر چاہنے والے شوہر کو کس قدر ستایا کتنا تنگ کیا —— اور کئی دفعہ اس نے پکا تہیہ کیا کہ اب وہ مرتے دم تک احسن کی وفادار رہے گی۔ احسن کو اتنی خوشیاں، اتنی محبت دے گی کہ وہ پچھلی تمام تلخیاں بھول جائیں گے۔ اس نے تو یہ بھی سوچ لیا تھا کہ رات کو ان کے گلے میں باہیں ڈال کر زندگی میں پہلی دفعہ ان کی پیشانی چوم کر کہے گی کہ میں آپ کی شکر گزار ہوں کہ آپ نے میرے لئے اتنے اچھے شوہر کا انتخاب کیا ——

"کہاں کھو گئیں بھئی" احسن نے اس کے کندھوں پر اپنے ہاتھوں کا ہلکا سا دباؤ ڈالتے ہوئے کہا تھا۔ اس نے چونک کر احسن کو دیکھا اور یکدم ہنس پڑی۔ "بس اب تو صبح ہوگئی نا ——"

"نہیں —— کمی ہے ابھی —— یہ لو وہ لپ اسٹک آپ کا انتظار کر رہی ہے۔" تارا نے مسکرا کر لپ اسٹک اٹھالی ——

آج خوشیوں کی پہلی رات تھی جو بیک وقت ان دونوں کے دلوں میں مسرتوں کے اژدہام کے ساتھ اتری تھی —— تارا نے احسن کی خواہش پر لباس ... تھا۔ ہر پھول چنے تھے اور احسن ... ادا کرنے پر آمادہ تھے —— آج کی رات ان تمام تشنگیوں کا انعام بن کر آئی تھی جو ان کے دل اور ان کی آنکھوں اور ان کے ہونٹوں پر ایک طویل عرصے سے بکھری ہوئی تھیں —— آج کی رات کو وہ سہاگ رات منانا چاہتے تھے۔ آج کی رات وہ پچھلی تمام راتوں کی تلخیوں کو دلوں میں دفن کر دینا چاہتے تھے۔ آج سے وہ نئی زندگی شروع کرنا چاہتے تھے اسی لئے انہوں نے

تارا سے کہا تھا۔

"تارا۔ لاؤ ذرا وہ لاکٹ تو دکھاؤ جو تم نے لڑائی والی رات نہیں دیا تھا ـــــ اس کا ایک راز تو تمہیں پتہ ہی نہیں ہے "

تارا نے گردن پر ہاتھ پھیرا ـــــ آگے گلے میں ٹٹولا ـــــ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ گلے میں صرف گلو بند تھا۔ لیکن لاکٹ نہیں تھا ـــــ وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ جمپر جھٹک لیا۔ دوپٹہ اتار کر دیکھ لیا۔ لاکٹ نہیں تھا۔ اس کا چہرہ زرد پڑنے لگا ـــــ

"اللہ احسن ـــــ لاکٹ نہیں ہے، پتہ نہیں کہاں گیا ـــــ سچ کہہ رہی ہوں میں نے خود نہیں اتارا ـــــ ہائے اللہ اب کیا ہوگا ـــــ وہ لاکٹ تو سونے کا تھا ـــــ اتنا مہنگا ہوگا ـــــ خدا جانے میں نے کہیں رکھ تو نہیں دیا ـــــ لیکن نہیں میں نے تو اتارا ہی نہیں گلے میں ہی تھا۔ امی کے یہاں بھی تھا ـــــ سچ احسن میں نے امی کو بھی نہیں دیا ـــــ ہائے اللہ اب کیا ہوگا " ـــــ وہ جلدی جلدی بولنے لگی۔ اس کا چہرہ زرد ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ـــــ

احسن اس کی گھبراہٹ اور پریشانی دیکھ کر ہنس پڑے "ارے ارے کیا ہو گیا تمہیں ـــــ یہ آنسو ـــــ توبہ توبہ بری بات۔ ذرا سے لاکٹ کے لئے اتنا گھبرا رہی ہو۔ دیکھو دیکھو کہیں پھر سے بےہوش نہ ہو جانا پاگل میں تمہیں دوسرا بنوا دوں گا، ویسا ہی ـــــ چلو یہ آنسو پونچھو" احسن نے ہاتھ بڑھا کر اس کے آنسو پونچھنا چاہے تو تارا احسن کا ہاتھ پکڑ کر سچ مچ رو دی ـــــ

"احسن ـــــ آپ نے کہا تھا یہ لاکٹ اتارنا نہیں۔ اب میں کیا کروں ـــــ سچ میں نے جان بوجھ کر نہیں گرایا "

"ارے پگلی میں کب کہہ رہا ہوں کہ جان بوجھ کر گرایا ـــــ ایسی باتیں سوچ ہی کیوں رہی ہو تم ـــــ اور یہ کیا تم چھوٹی کرتی ہو تم نے امی کو نہیں دیا اور وہ مہنگا ہوگا ـــــ وہ جو کچھ بھی تھا تم سے بڑھ کر نہیں تھا ـــــ اپنی تارا پر میں ایسے دس لاکٹ نثار کر سکتا ہوں ـــــ میں نے تو تم سے آج اس لئے پوچھ لیا کہ میں تمہیں بتانا چاہتا تھا کہ اس لاکٹ کے اندر میرا فوٹو بھی تھا۔ وہ جو پتھر کا دل سا تھا نہ۔ وہ کھل جاتا تھا اور اس دل کے اندر میرا فوٹو لگا ہوا تھا ـــــ وہ میں نے خصوصی طور پر بنوایا تھا اس رات تو خیر تم نے اتنی مہلت ہی نہیں دی کہ تمہیں ـــــ "

تارا نے احسن کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا "اللہ نہیں اب پچھلی باتیں مت کیجئے مجھے شرم آتی ہے ـــــ دکھ ہوتا ہے "

"سچ ـــــ" احسن نے خوش ہو کر بے یقینی سے پوچھا۔

"ہاں ـــــ سچ ـــــ" تارا نے شرما کر سر جھکانا چاہا لیکن احسن کے بازوؤں نے بڑھ کر اس کے گرد حصار باندھ لیا "

6 ـــــ * ـــــ 6

ڈاکٹر احمد ہمدانی نواز کو اپنے کلینک میں لے آئے تھے وہ بڑی جانفشانی اور تندہی سے نواز کا علاج کر رہے تھے۔ لیکن نواز کا بخار اتر کر ہی نہیں دیتا تھا۔ احسن بھی صبح شام نواز کو دیکھنے جاتے تھے کبھی کبھی تو ایک دن میں تین تین چکر بھی ہو جاتے تھے۔ وہ نواز سے بڑی بڑی اچھی اچھی باتیں کرتے تھے، وہ اس سے مذاق کرتے اسے ہنسانا چاہتے۔ اسے خوش رکھنا چاہتے۔ نواز ان کا دل رکھنے کو کبھی کبھی ہنستا بھی تھا اور خوش رہنے کی بات پر اس نے ہمیشہ ایک ہی جواب دیا کہ چچا جان میں خوش ہوں۔ سچ مچ بہت خوش بہت مطمئن آپ تو خواہ مخواہ پریشان ہوتے ہیں۔ لیکن احسن جانتے تھے کہ نواز خوش نہیں ہے۔ وہ بجھ کر رہ گیا ہے۔ اس کی شخصیت کا وہ ایک تم تم کرتا روشن شرارہ مدھم ہو گیا ہے جو اسے عام لڑکوں سے منفرد بنائے رکھتا تھا۔ نواز رنجیدہ ہو کر کچھ سوچنے لگتا تو احسن اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہتے ـــــ

"کیا سوچنے لگے ؟" ـــــ

"جی ـــــ کچھ بھی نہیں۔ میں کیا سوچوں گا " نواز مسکرانا چاہتا لیکن خشک ہونٹوں پر مسکراہٹ ٹکتی ہی نہ تھی ـــــ

"نواز ـــــ خوش رہا کرو " ـــــ احسن مشورہ دیتے۔

"خوش تو ہوں " ـــــ نواز فوراً بول اٹھتا۔

"نہیں جھوٹ بولتے ہو ـــــ خوش رہنے والوں کے چہرے یوں ستے ہوئے نہیں ہوتے ـــــ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم وقت پڑنے پر اس قدر بزدل بھی ہو سکتے ہو۔ بہت معمولی سا زخم ہے ٹھیک ہو جائے گا " ـــــ

"زخم پڑ جائیں تو بڑی مشکل سے ٹھیک ہوتے ہیں چچا جان" نواز سسکتے ہوئے لہجے میں کہتا لیکن احسن اس کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہتے "حوصلہ بلند رکھو جوان حوصلہ بڑا ہونا چاہئے۔ اچھا اب تم آرام کرو اب میں چلوں گا۔ ارے یار نواز اچھا تمہاری چچی جان کی طبیعت خراب ہے ورنہ وہ ضرور تمہیں دیکھنے آتیں "

"نہیں چچا جان انہیں تکلیف نہ دیں۔ رہنے دیں۔ میں تو ٹھیک ٹھاک ہوں " نواز بڑی بشاشت سے کہنا چاہتا تھا لیکن اس کا چہرہ تپنے لگتا سارے خول ٹوٹنے لگتے تو وہ ایک دم تکلیف کا بہانہ بنا لیتا

اور احسن بھی اسے تسلی دے کر چلے آتے۔ ان کا دل تو تارا میں ہی اٹکا رہتا تھا۔ وہ اپنے کلینک میں ہوتے یا نواز کے پاس — تارا کی قربت کا احساس ان کے ہمرکاب رہتا — وہ پہلے ہی انہیں عزیز از جان تھی، لیکن جب سے انہیں پتہ چلا تھا کہ وہ ان کی محبت کی مقدس امانت کو اپنے لہو سے سینچ رہی ہے تو انہیں وہ خود اپنی حیات سے بڑھ کر پیاری ہو گئی تھی۔

آج بھی احسن نے تارا سے نواز کی عیادت کے لئے چلنے کو کہا تو وہ جھنجلا کر بولی — "آپ مجھ سے بار بار کیوں کہتے ہیں۔ آپ کو پتہ ہے مجھے ہسپتال کے نام سے وحشت ہوتی ہے۔ مجھے اپنے پاپا یاد آنے لگتے ہیں — میں ہسپتال نہیں جاؤں گی اور پھر مجھے صبح سے چکر آ رہے ہیں — بہتر ہے آپ چلے جائیں میں ذرا آرام کروں گی" —

"او ہو — یہ چکر کیوں آ رہے ہیں بھئی" — احسن نے پھر اسے ستانا چاہا —

"بس آ رہے ہیں آپ کو مطلب" —

"مطلب کیوں نہ ہو گا تو کسے ہو گا جان — ہم تو کہتے ہیں کہ آپ اب بھی اپنے منہ سے اعتراف کر لیجئے کہ آپ کے یہ چکر بلا وجہ نہیں اور جلد ہی آپ کو ننھے موزے سوئیٹر؟...." تارا نے پلٹ کر احسن کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا —

"کیوں، کیوں؟ میرا منہ کیوں بند کر رہی ہو میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا" احسن نے تارا کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے تو تارا نے منہ بنا کر کہا۔

"بڑے اچھے لگتے ہیں بس خواہ مخواہ ایک بات مل گئی ہے آپ کو تو .... سچ کہتی ہوں اگر آپ نے زیادہ تنگ کیا تو میں ناراض ہو جاؤں گی" — تارا نے وارننگ دی تو احسن مسکرانے لگے — اب تو ان کی زندگی مسکراہٹوں سے عبارت تھی — وہ خود بھی بے دریغ مسکراتے تھے اور نواز کو بھی مسکرانے کا مشورہ دیتے تھے لیکن نواز کے ہونٹوں پر تو اداسیوں کے ڈیرے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ ساری خوشیوں سے ناطہ توڑ بیٹھا ہے اور احسن اس کے پاس آتے تو بہت دیر تک بیٹھے بیٹھے چھوٹی چھوٹی خوشیوں کی کرنیں چن چن کر اس کے چاروں طرف بکھیرتے رہتے۔ لیکن وہ سب سے بے نیاز بنا لیٹا رہتا — اسے اپنے کالج کے مس ہو جانے کا افسوس تھا اس کی پڑھائی میں خلل پڑ رہا تھا — اس کے پریکٹیکل نکلے جا رہے تھے — وہ چاہتا تھا کہ کوئی اسے اس کی کتابیں لا دے تاکہ وہ گزرتے وقت کا ظلم سہنے کی بجائے اس وقت سے کچھ خراج لے سکے — لیکن ڈاکٹر ہمدانی کتابیں منگوانے کے ذکر سے ہی بگڑ جاتے۔ وہ چاہتے تھے نواز مکمل آرام کر کے جلد از جلد صحت یاب ہو جائے — لیکن نواز کا دل چاہتا تھا کہ کسی طرح اڑ کر کتابوں تک جا پہنچے لیکن فی الحال وہ معذور تھا۔ ہاں ایک سہارا احسن چچا کا تھا سو اس نے کسی نہ کسی طرح راضی کر ہی لیا کہ وہ ڈیڈی سے چھپا کر اسے اس کی کتابیں لا دیں۔

احسن اس کے کمرے کی چابی لے کر سیدھے سوسائٹی جا پہنچے فزکس کی کتاب تو انہیں آسانی سے میز پر رکھی ہوئی مل گئی۔ لیکن بیالوجی کی کتاب انہیں کہیں نظر نہ آئی۔ نواز نے انہیں بتا دیا تھا کہ کتاب اگر میز پر یا شیلف میں نہ ہو تو تکئے کے نیچے ہو گی — احسن نے تکیہ ہٹا کر دیکھا بیالوجی کی کتاب رکھی ہوئی تھی۔ انہوں نے کتاب اٹھائی تو اس کے نیچے سے ایک ڈائجسٹ نکل آیا۔ انہوں نے ڈائجسٹ بھی اٹھا لی — کمرے سے باہر نکلتے ہوئے انہیں ایک دم یاد آ گیا کہ نواز نے کتابوں کے ساتھ ایک کاپی اور پین بھی منگوایا تھا — کاپیاں تو میز پر تھیں لیکن پین کہاں ہو گا — شاید میز کی دراز میں ہو —

انہوں نے دراز کھولنا چاہی لیکن دراز لاک تھی — وہ تکئے ہٹا کر نیچے سے چابی ڈھونڈنے لگے — چابی یہاں نہیں تھی — نواز نے تو کہا تھا کہ چابی تکئے کے نیچے ہی ملے گی — لیکن چابی! — چابی ہے کہاں؟ — انہوں نے تکیہ ہٹا کر ایک طرف کر دیا۔ بستر کی چادر ہٹائی تو گدے اور مسہری کے درمیان لٹکتی ہوئی سنہری زنجیر نے انہیں اپنی طرف متوجہ کر لیا — شاید اسی زنجیر میں چابی ہو — احسن نے زنجیر کھینچی — سرخ پتھر دل کا لاکٹ ان کے ہاتھ میں تھا۔

اس رومانی داستان کے جذباتی کردار
واقعات کے نقطۂ عروج پر پہنچ چکے ہیں!
قیاس کیجئے
ان کرداروں کا انجام کیا ہو گا؟

شفیق بریلوی

تاج الرجال اُم الخیر رابعہ بصریہؒ

انسان پہلے آسمان پر مقبول ہوتا ہے
پھر زمین پر مقبول ہوتا ہے

خواتین علم و فن کے میدان میں بڑی بڑی عالم و فاضل گزری ہیں، فقہ میں بڑی بڑی فقیہہ خواتین گزری ہیں، ادب میں بڑی بڑی ادیب خواتین گزری ہیں، علم طب میں بڑی بڑی طبیب خواتین گزری ہیں، تجارت کے میدان میں بڑی بڑی تاجر خواتین گزری ہیں، عبادت گزاری میں بڑی بڑی عبادت گزار و زاہد خواتین گزری ہیں۔

عبادت گزار، زاہد، قناعت اور صبر و شکر بالفاظ دیگر صوفیانہ زندگی بسر کرنے والی خواتین میں ایک ممتاز اور مشہور نام حضرت رابعہ بصریؒ کا بھی ہے، جنہوں نے دین، اللہ تعالیٰ سے لو لگانے کی اہمیت، عبادت گزاری کی عظمت، معاشرے کی اصلاح، پھر ان کی ادبیت ہر بات اور ہر گفتگو میں حکایات، امثال اور نثر کا تذکرہ، آیاتِ قرآنی کا کثرت سے استعمال، ان تمام باتوں نے ان کو بڑی شہرت بخشی۔

بصرہ کو خلافتِ بنو امیہ (۴۱ھ تا ۱۳۲ھ) کے دور میں عراق کے اہم مقامات رہے ہیں، اور خاص طور پر بصرہ کی سرزمین سے بڑے بڑے اولیاء اللہ، عارف باللہ اور صاحبانِ سیف و قلم اٹھے ہیں، بنی امیہ کی بربادی اور بنی عباس کی خلافت سے جو سیاسی انقلاب پیدا ہوا اس سے لامحالہ ایک نئے دارالخلافہ کی ضرورت محسوس ہوئی اور آخر کار عباسیوں کے دوسرے خلیفہ ابو جعفر منصور (۱۳۶ھ تا ۱۵۸ھ) نے بغداد کا نیا شہر آباد کیا، لیکن اس سے قبل مختلف اعتبار سے بصرہ کو ہی بڑی اہمیت و عظمت حاصل تھی۔ اسی بصرہ میں ۹۵ھ ہجری کو قبیلہ عدوی کے سردار محمد اسمٰعیل بصریؒ کے گھر حضرت رابعہؒ کی ولادت ہوئی۔ یہ اپنے والدین کی چوتھی بیٹی تھیں اسی نسبت سے ان کا نام رابعہؒ رکھا گیا۔ ان کے گھر میں ہی علم و عرفان کا دریا موجزن تھا، لہٰذا گھر ہی میں قرآن، تفسیر اور حدیث کی تعلیم حاصل کی، اور پھر دین کی باتوں اور دین کے کاموں میں ہی لگی رہیں، شب و روز عبادت اور ریاضت ہی ان کا محبوب مشغلہ تھا، اسی وجہ سے ان کو تاج الرجال اور اُم الخیر کے القاب سے یاد کیا جانے لگا، بصرہ کے بڑے بڑے علماء اور صلحاء حضرت رابعہؒ کے یہاں آکر عبادت کرتے تھے اور اس عمل کو انتہائی خیر و برکت کا باعث سمجھتے تھے۔ ان بزرگوں میں حضرت ابو سلیمان درانیؒ اور حضرت امام سفیان ثوریؒ کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، کہا جاتا ہے خلیفۂ وقت بھی آپؒ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور حضرت رابعہؒ کی زبان فیض ترجمان سے اسلام، دین اور تصوف کی باتیں سن کر روح کو تر و تازہ کرتا، ان کی مجلس سے فیض حاصل کرنے والے فضلاء کی تعداد بھی کافی تھی جہاں سے شرعی مسائل اور تصوف کی باریکیاں پہنچتے تھے، حضرت رابعہؒ کے مزاج میں صبر و استقلال اور استغنا بہت تھا، جو ایک سچے مسلمان کی خاص خوبی ہے۔ خلیفۂ وقت اور امراء ان کی خدمت

میں حاضر ہوتے لیکن کبھی کسی قسم کی اپنی حاجت یا ضرورت بیان سے ظاہر نہیں فرماتی تھیں توکل اور قناعت کے ساتھ زندگی گزارنے میں ہی یہ بہت خوش تھیں۔

حضرت امام سفیان ثوری نے ایک دن آپؒ سے استفسار فرمایا کہ آپ کے ایمان کی کیفیت اور حقیقت کیا ہے؟ حضرت رابعہؒ نے جواب میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور پرستش نہ میں جنت کی امید و خواہش پر کرتی ہوں اور نہ دوزخ کے خوف سے بلکہ محبت الٰہی اور شوق کے باعث میں یہ سب کچھ کرتی ہوں، پھر حضرت رابعہؒ نے معرفت کے چند اشعار پڑھے جن کو سن کر حضرت امام سفیان ثوریؒ پر جذب و کیف کا عالم طاری ہو گیا۔

حضرت رابعہ بصریہؒ نے شعر و ادب کی دنیا میں بھی تابناک جواہر پارے مہیا کئے ہیں۔ اللہ اور اس کے رسولؐ سے عشق و محبت کا لاوا جن کے دلوں میں کھولتا رہتا ہے اُن کے جذبات بالعموم موزوں ہو کر اثر انگیز اشعار کا روپ اختیار کر لیتے ہیں، حضرت رابعہؒ کا کلام اہل اللہ کی محفلوں میں آج بھی جو آگ لگا دیا کرتا ہے اس کا لطف صرف وہی قلوب اٹھا سکتے ہیں جو سوز عشق سے لذت اندوز ہونے کی طلب و صلاحیت رکھتے ہیں، حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے بھی آپؒ کے کلام کی بہت تعریف فرمائی ہے اور ان کے اشعار اکثر اپنے مضامین میں نقل کئے ہیں۔

حضرت امام سفیان ثوریؒ نے ایک مرتبہ حضرت رابعہؒ کی مجلس میں دعا مانگی کہ۔ یا اللہ، میں تجھ سے سلامتی کا طالب ہوں، حضرت رابعہؒ ان کی یہ دعا سن کر زار و قطار رونے لگیں، حضرت امام سفیان ثوریؒ نے حضرت رابعہؒ سے اچانک رونے کا سبب دریافت کیا تو آپؒ نے فرمایا کہ تمہاری اس دعا نے مجھ کو رلایا، تم اللہ سے سلامتی چاہتے ہو، اور سلامتی نام ہے ترک دنیا کا، جبکہ تم آلودہ ہو رہے ہو، میں ان لوگوں کے حال زار پر بہت افسوس کرتی ہوں، جو اپنے حال و قال کو خود سنبھالنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ صرف دعاؤں سے اپنا کام نکالنا چاہتے ہیں۔

علامہ ابن الجوزیؒ نے بھی حضرت رابعہؒ کی بڑی تعریف لکھی ہے علامہ ابن الجوزی فرماتے ہیں کہ حضرت عبدہ جو بڑی نیک اور عابدہ خاتون گزری ہیں جو حضرت رابعہ بصریہؒ کی خادمہ تھیں، ان سے روایت ہے کہ حضرت رابعہؒ کا یہ معمول تھا شب بھر عبادت الٰہی میں مصروف رہتی تھیں، صبح کو نماز فجر کے بعد کچھ دیر کے لئے مصلے پر ہی سو جاتی تھیں اور پھر اٹھ کر عبادت میں مشغول ہو جاتی تھیں۔

حضرت رابعہ بصریہؒ کی محفل میں ایک دن کسی نے اعتراض کیا کہ عورتیں ناقص العقل ہوتی ہیں، اسی وجہ سے کسی عورت کو نبوت نہیں ملی، حضرت رابعہؒ نے یہ بات سن کر جواب میں فرمایا کہ ہو سکتا ہے کہ تمہاری بات حقیقت پر مبنی ہو، لیکن اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اگر ہماری صنف کو نبوت نہیں ملی تو ہماری صنف نے نبوت اور خدائی کا جھوٹا دعویٰ بھی کبھی نہیں کیا، جھوٹی نبوت اور جھوٹی خدائی کے دعویدار بھی صرف مرد ہی ہوئے ہیں۔

حضرت رابعہؒ بزرگوں کا بڑا احترام کرتی تھیں، ایک دن آپؒ کھانا پکا رہی تھیں کہ خواجہ امام حسن بصریؒ تشریف لے آئے، کھانا پکانا آپؒ نے ترک کر دیا اور خواجہ امام حسن بصریؒ سے دین و تصوف کی باتوں میں محو ہو گئیں، اور فرمایا کہ۔ واللہ یہ باتیں کھانے سے بہتر ہیں، روح کی اصل غذا تو یہی ہے، مغرب تک خواجہ امام حسن بصریؒ سے باتوں میں مصروف رہیں، ان کے رخصت ہونے کے بعد مغرب کی نماز ادا کی اور پھر کھانا پکایا، حضرت رابعہؒ کو اللہ تعالیٰ نے سب کچھ دے رکھا تھا۔ خادمائیں بھی تھیں اور دولت بھی تھی، لیکن وہ اپنا تمام کام خود ہی انجام دیتی تھیں۔

حضرت رابعہؒ کے یہاں دو درویش مہمان آگئے اس وقت ان کے پاس خشک دو روٹیاں تھیں، انھوں نے ان درویشوں کے سامنے وہی دونوں روٹیاں رکھ دیں، اتنے میں دروازہ پر ایک سائل نے صدا دی، یہ صدا سنتے ہی حضرت رابعہؒ نے مہمانوں کے آگے سے وہ دونوں روٹیاں اٹھائیں اور سائل کو دیدیں، مہمان حیران بیٹھے رہے اور کچھ نہ سمجھے کہ کیا معاملہ ہے۔ تھوڑی دیر میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک کنیز خوان میں کھانا لئے ہوئے آ رہی ہے، کھانا مہمانوں کے آگے رکھا گیا تو دیکھا کہ اس میں پوری بیس روٹیاں ہیں، مہمانوں نے تعجب سے پوچھا کہ آخر ماجرا کیا ہے؟ حضرت رابعہؒ نے کہا کہ ان دو خشک روٹیوں سے آپ لوگوں کا تو پیٹ بھرتا نہیں، اس لئے میں نے سائل کی صدا سنتے ہی وہ دونوں روٹیاں اس کو دیدیں، تاکہ اس کے عوض اللہ تعالیٰ میرے مہمانوں کے لئے سامان کر دے، تو اس نے سامان کر دیا، ہر ایک روٹی کے بدلے میں اس نے دس روٹیاں بھیج دیں، جیسا کہ دس گنا ثواب دینے کا اس نے وعدہ فرمایا ہے، یہ سن کر وہ دونوں درویش حضرت رابعہؒ کے کمال ایمان کے قائل ہو گئے، اور پھر تمام عمر ان کے حلقہ بگوشوں میں رہے زہد و عبادت اور دین کے دیگر مشاغل میں وہ اس درجہ کو

> "زندگی کا شعلہ دوسروں سے مستعار نہیں لیا جاتا۔ یہ صرف اپنی روح کے آتش کدے میں روشن کیا جاسکتا ہے۔"
>
> "علامہ اقبال"

ہوتی تھیں کہ دُنیاداری کے لئے ان کے پاس وقت ہی نہیں تھا، اور اسی وجہ سے انھوں نے عقد بھی نہیں کیا اور تمام زندگی کنواری رہیں۔ ایک مرتبہ کسی نے ان سے سوال کیا کہ آپ نے عقد کیوں نہیں کیا؟ تو آپؒ نے جواب میں کہا عقد کسی وجود پر ہوتا ہے میں اپنی ہستی اور اپنا وجود ہی کھو چکی تو عقد کیسا؟

آپ حُسنِ سیرت اور حُسنِ صورت ہر اعتبار سے ممتاز تھیں بصرہ کے ایک رئیس عبدالواحد ابن زید نے ان کو نکاح کا پیغام بھیجا۔ تو حضرت رابعہؒ نے جواب میں کہلا بھیجا کہ اے سیاہ قلب تو اپنے لئے اپنی ہی جیسی کوئی سیاہ قلب عورت تلاش کر لے، جو تیرے ساتھ ازدواجی زندگی کی گاڑی کو دھکیل سکے۔ میں وہ ہوں جس کے دل میں اللہ کے علاوہ کچھ تیری محبت کی گنجائش بھی نکل سکے۔

حضرت رابعہؒ جیسی تارک الدنیا اور کریم خصائل خاتون کو دنیاوی تعلقات میں پھنسانا واقعی مناسب نہ تھا، یہ ترکِ تعلق ان کے لئے زیبا تھا نہ کہ ان لوگوں کے لئے جو تمام علائقِ دنیوی میں آلودہ ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ نہ تمام مرد حضرت عیسیٰؑ ہیں اور نہ تمام عورتیں حضرت رابعہؒ ہیں، جو باتیں ایک تارک الدنیا اپنے لئے خلافِ مصلحت تصور کرتا ہے بسا اوقات دُنیادار کو اس کی حد سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔

حضرت رابعہؒ کے یہاں ایک دن حسبِ معمول مجلس گرم تھی، دُنیا اور اہلِ دُنیا کا موضوع زیرِ بحث آیا، لوگوں نے دُنیا اور اہلِ دُنیا کی برائیوں میں بڑا زورِ بیان صرف کیا، کچھ دیر تو حضرت رابعہؒ یہ گفتگو سنتی رہیں، پھر ناگواری کے انداز میں بولیں۔ بس خاموش رہو، اور یہ بحث ختم کرو، تمہارے اس بحث و مباحثے سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ تم میں سے ہر شخص دُنیادار ہے، اگر تمہارے دلوں میں دُنیا کی محبت نہ ہوتی تو تم مخالفت میں بھی اس کا تذکرہ اس شدت سے نہ کرتے کیونکہ یہ قاعدہ ہے اور یہ حقیقت ہے کہ جس چیز کی انسان کے دل میں جس قدر محبت

ہوتی ہے اسی قدر مختلف انداز اور مختلف طریقوں سے وہ اس کا تذکرہ کرتا ہے۔

حضرت رابعہؒ سے کسی نے دریافت کیا کہ آپ شیطان کو دشمن کہتی ہیں یا نہیں؟ حضرت رابعہؒ نے جواب میں کہا، رحمٰن کی محبت نے میرے دل میں شیطان کی عداوت و دشمنی کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔

حضرت رابعہؒ نے تین بار حجِ بیت اللہ شریف اور زیارت روضۂ رسولؐ کی سعادت حاصل کی، ایک عربی نجران کا پالتو تھا، اسی پر سوار ہو کر وہ حج کے لئے جاتی تھیں، حج کے موقعہ پر بڑے بڑے اولیاء اللہ مشاہیر علماء اور ممتاز فضلاء سے ان کی ملاقات ہوتی تھی، جو سب ان کا احترام کرتے تھے، حضرت ابراہیم ادھمؒ سے بھی مکہ معظمہ میں ان کی ملاقات ہوئی تھی۔

رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک مشہور حدیث ہے کہ انسان پہلے آسمان پر مقبول ہوتا ہے پھر زمین پر مقبول ہوتا ہے۔ یعنی جو شخص اپنی نیکیوں اور اعلیٰ انسانی صفات کی بدولت اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کا مقرب اور مقبول بندہ ثابت کرتا ہے، اس کو دونوں جہانوں کی عزت نصیب ہوتی ہے اور وہ اس دُنیا میں بھی ہر دل عزیز ہو جاتا ہے۔

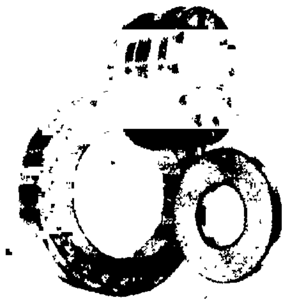
اللہ کی قربت اور مقبولیت اور دُنیا میں ہر دل عزیزی نہ علم و عقل سے حاصل ہوتی ہے نہ حُسن و جمال سے، نہ مال و دولت سے، نہ طاقت و قوت سے، اس کے حصول کا ذریعہ صرف ایک چیز ہے "نیکی"۔

حضرت رابعہؒ کو یہی چیز بدرجہ اتم حاصل تھی لیکن ان کی وصیت یہ تھی کہ اپنی نیکیوں کو اس طرح چھپاؤ جس طرح تم اپنے عیوب کو چھپاتے ہو۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ میری جو نیکی ظاہر ہو گئی ہے میں اس کو اپنی نیکیوں میں شمار نہیں کرتی۔

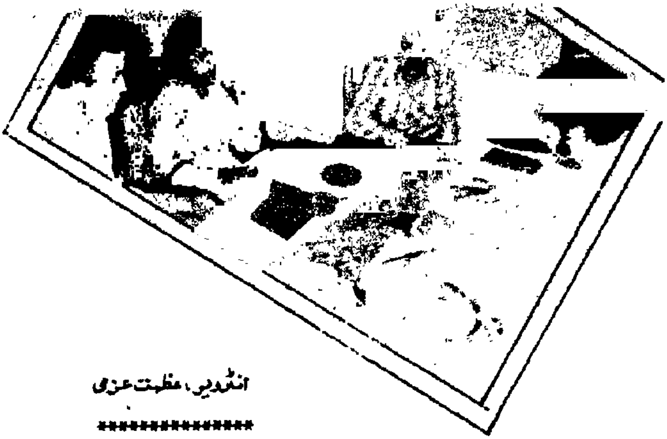
حضرت رابعہ بصریہؒ کی وفات ماہ رمضان المبارک ۱۸۵ھ ہجری مطابق مارچ ۸۰۱ء میں ہوئی۔ وفات سے قبل انھوں نے اپنی خادمہ عبدہ سے کہا کہ میرا بلاوا آگیا ہے، میری وفات کے بعد تم مجھ کو غسل دے کر میرے جبہ میں جس کو پہن کر وہ عبادت کرتی تھیں، مجھ کو کفنا دینا، عبدہ نے ان کے حکم کی تعمیل کی، پھر لوگوں نے ان کی وصیت کے مطابق، کوہِ طور جہاں حضرت موسیٰؑ نے اللہ تعالیٰ کی تجلی دیکھی تھی، لے جا کر دفن کیا۔











انٹرویو، عظمت عزمی

****

ریڈیو، فلم اور ٹی وی کا سدابہار فنکار

محمود علی

آوازوں کے گلشن کی منفرد خوشبو

انسانوں کے کارواں کا نیک نفس انسان

ٹھنڈے اور میٹھے پانی کے جھرنوں کی طرح نرم نرم بہتی ہوئی آوازوں کے قافلے میں سے آج میں ایک آواز کا دامن تھام کر چل پڑی ہوں یہ آواز آشنائی کے گہرے رنگوں سے رنگی ہوئی مانوس آواز ہے یہ آواز امرت میں گوندھی ہوئی صدا بلند آواز ہے۔

یہ آواز اُڑتی خوشبو کا عنوان ہے۔

یہ آواز محبتوں کی امین ہے۔

اور دنیا اس آواز کو محمود علی کے نام سے پکارتی ہے

"محـــمود ـــــــ علی ـــــ!"

میں اگر ان دو چھوٹے چھوٹے لفظوں کو چند صفحات میں لپیٹ کر رکھنا چاہوں تو شاید نہیں رکھ سکتی کیونکہ یہ دو لفظ ہمارے جس فنکار کی پیشانی کا عنوان بنے ہوئے ہیں اس کا فن اس قدر وسیع ہے کہ اسے تبصرے کے پیمانوں سے ناپا نہیں جا سکتا۔

آج سے تیس پینتیس برس پہلے بمبئی میں آل انڈیا ریڈیو کی طرف جانے والے محمود علی نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ خدا نے ازل سے ان کے لئے شہرت و مقبولیت کے کتنے قیمتی تمغے منتخب کر رکھے ہیں۔ محمود علی نے آل انڈیا ریڈیو میں بھی کام کیا اور پھر وہ ۱۹۴۶ء میں یہاں آ گئے ایک سال تک بے کار رہے لیکن ۱۹۴۷ء میں ان کے رشتے ناطے ریڈیو پاکستان سے بندھ گئے۔

"اچھا محمود علی صاحب یہ بتائیں کہ آپ نے اب تک کتنے ڈراموں میں کام کیا ہے؟" میں نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے سنجیدہ اور بردبار شخص سے سوال کیا تو وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گئے اور پھر کچھ سوچ کر بولے "صحیح تعداد تو مجھے یاد نہیں لیکن میں نے تین چار سو سے زائد ڈرامے کئے ہیں۔ اور تقریباً ۱۵، ۲۰ سلسلہ وار پروگرام بھی کئے ہیں"

"بہت خوب ـــــ ماشاء اللہ ـــــ لیکن صاحب یہ بتایئے کہ ریڈیو پر کام کرنے کا کیا آپ کو بچپن ہی سے شوق تھا؟" میں نے مسکراتے ہوئے یہ سوال کیا تو وہ بھی مسکرا اٹھے اور اعتراف کرتے ہوئے بولے۔



"جی ـــ شوق تو بے شک بچپن ہی سے تھا لیکن دل اجازت دیتا تھا نہ خاندان کے بزرگ، سو دس سترہ سال صبر کر کے گزارے لیکن اس کے علاوہ ایک شوق اور بھی تھا ـــ"

"کون سا شوق؟" میں فوراً ہی پوچھ بیٹھی۔

"نیوی میں ملازمت کا شوق ـــ اور یہ شوق بھی کسی نہ کسی طرح پورا ہو گیا۔ نیوی میں ملازمت مل گئی حیدرآباد میں میڈیکل چیک اپ ہوا، کامیاب قرار دیا گیا لیکن پھر پونا میں چیک اپ ہوا تو میں میڈیکل چیک اپ میں فیل کر دیا گیا۔ ظاہر ہے ملازمت چھوڑنا پڑی اور دل تھام کر آتش شوق دل میں چھپائے واپس آ گیا۔"

"لیکن محمود علی صاحب اس کی کوئی وجہ بھی تو ہو گی؟" میں نے ان کا جملہ اچک کر ایک نیا سوال ان کے سامنے رکھ دیا۔





"میں نے ایف۔ اے کیا تھا۔ آج بھی میں سوچتا ہوں کہ اگر میں ریڈیو پر نہ آ گیا ہوتا تو ـــ کامیاب انجینئر بن چکا ہوتا۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا محمود علی صاحب کہ آپ کو تعلیم سے خاصی دلچسپی تھی؟"

"جی ہاں دلچسپی نہ ہوتی تو میں تعلیمی گیت کیسے لکھتا۔"

"جی کیا۔ آپ نے تعلیمی گیت بھی لکھے ہیں؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"جی ہاں صرف لکھے ہی نہیں بلکہ گائے بھی ہیں۔" وہ میری



"اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے پاؤں میں فریکچر تھا۔ خیر پھر میں ایک انشورنس کمپنی میں ملازم ہو گیا اس دوران انور بہزاد صاحب سے ملاقات ہوئی اور پھر میں ریڈیو پر آ گیا۔"

"تب آپ کی کیا عمر ہو گی؟"

"جی ـــ سترہ سال۔"

"اور تعلیم؟" میں نے پھر سوال کیا۔

معلومات میں اضافہ کر رہے تھے اور میں جو ان کی شخصیت کے اس رخ سے قطعاً ناواقف تھی حیران ہو کر ان کی باتیں سن رہی تھی اور وہ اپنے مخصوص انداز میں بتا رہے تھے کہ میں نے نہ صرف بچوں کے تعلیمی گیت ہی نہیں گائے بلکہ ہلکے پھلکے مزاحیہ گانے بھی گائے ہیں۔ اور آج کا وہ مشہور و معروف گانا جو بعد میں احمد رشدی نے گایا ہے۔ کہ

میری تنخواہ بڑھا دو جرا سیٹھ جی

پہلے میں نے ہی گایا تھا۔ اس کے علاوہ بچوں کے لئے "بہادرے" میں نے خود لکھے اور گائے اور پھر میں نے تو بچوں کے خاصے پروگرام کئے ہیں۔ بعض نے تو بے اندازہ مقبولیت حاصل کی۔ مثلاً "گھومتے خان پھرتے خان"۔

"اچھا محمود علی صاحب آپ نے فلموں میں بھی تو کام کیا ہے۔ آپ کی کتنی فلمیں ریلیز ہوئیں۔ اور ان میں سے خاص خاص فلمیں کون کون سی ہیں؟"

"جی میں نے اٹھائیس فلموں میں کام کیا ہے۔ ان میں سے "لوری" اور "ایسا بھی ہوتا ہے"، "وقت کی پکار"، "پھندے میں رہنے دو"، "پیسہ"، "ہم سنجلن"، "آرزو"، "دوراہا" اور "فنکار" وغیرہ شامل ہیں۔"

فن کار کے نام پر ہمارے مدیر ریاض مرزا صاحب چونک گئے وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ یہ نئی فلم "فنکار" کا ذکر ہو رہا ہے یا پرانی فلم "فنکار" کی بات ہے لیکن محمود علی صاحب بہت کامیاب اور پرانے فنکار نکلے۔ انہوں نے نئی پرانی دونوں فلموں کا تذکرہ کیا تھا۔ پرانی فلم "فنکار" میں آپ نے رفیق انور کے ساتھ اسکرپٹ پر کام کیا تھا اور نئی فلم "فنکار" میں اداکاری کے جوہر دکھائے تھے۔ محمود علی صاحب اداکاری کے ہر میدان کے شہسوار ہیں۔ اسٹیج، ٹی وی، ریڈیو سے لے کر فلموں تک ہر جگہ انہوں نے اپنی فنکاری کے گل بکھیرے ہیں اور تجربے کے ثمر سمیٹے ہیں۔ میں نے اسی لئے محمود علی صاحب سے پوچھا "یہ بتائیے کہ فلم اور ریڈیو، ٹی وی میں آپ نے کیا فرق محسوس کیا؟ اور یہ کہ آپ فلمی دنیا میں خاصی حد تک جا کر پلٹ کیوں آئے؟"

"میں اس لئے پلٹ آیا ہوں کہ مجھے میرا مرکز زیادہ عزیز ہے اور آپ جانتی ہیں کہ میرا مرکز یہ کراچی ہے۔ اور اس کراچی میں ریڈیو پاکستان کی عمارت میری پرانی مونس ہے۔ یہاں پرانی رفاقتیں ہیں دوستیاں ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ یہاں فن کی قدر ہے یہاں فنکار دوستوں کے سہارے اور احباب نوازی کی سیڑھیوں پر پاؤں رکھ کر اوپر نہیں چڑھتا بلکہ اپنی محنت اور لگن سے اپنے لئے راستہ بناتا ہے حالانکہ مالی لحاظ سے یہ ادارہ ہمیں وہ کچھ نہیں دیتا جو فلمی دنیا دیتی ہے۔ لیکن میرے نزدیک پیسہ بہت کچھ تو ہے لیکن سب کچھ نہیں ہے۔ بعض چیزیں بے بہا اور انمول ہوتی ہیں۔ فلم میں بھی میرے اچھے دوست ہیں۔ وہ میرے ساتھ خلوص اور محبت سے پیش آتے ہیں بلکہ مسلسل مجھے بلاتے بھی ہیں۔ ان میں محمد علی صاحب، شباب صاحب، ندیم اور منور سعید جیسے اچھے دوستوں کا اصرار بھی شامل ہے لیکن میں اپنی وفاداریوں اور اپنی محبتوں سے مجبور ہوں۔"

"بہت خوب محمود علی صاحب یہ بتائیں کہ آجکل آپ ریڈیو پر کون سے پروگرام کر رہے ہیں؟" میں نے موقع غنیمت جان کر پھر ایک سوال کر دیا۔ وہ سگریٹ کا کش لے کر دھیمے دھیمے اپنے سلجھے ہوئے مخصوص انداز میں بولے "چھوٹے موٹے کردار تو خاصے ہیں لیکن میرے خاص خاص پروگرام "حامد میاں کے یہاں"، "آئینہ"، "ہنسنا منع ہے" وغیرہ وغیرہ چل رہے ہیں۔"

"اچھا یہ بتائیں کیا آپ یہاں ریڈیو پر مستقل ملازم ہیں؟"

"جی ہاں — میں یہاں پر اسٹاف آرٹسٹ ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ اچھی تنخواہ پا رہا ہوں اب بھی کبھی سوچتا ہوں تو مجھے وہ دن یاد آتے ہیں جب مجھے یہاں سے ایک سو پندرہ روپے ماہوار ملتے تھے اور اپنا حال بھی عام آدمی سا ہوا کرتا تھا۔ میں سائیکل پر ریڈیو آیا جایا کرتا تھا اور آپ کو چپکے سے بتا دوں یعنی یہ سائیکل قسطوں میں بنائی تھی یعنی الگ الگ پرزے خرید کر خود سائیکل تیار کی تھی جس پر کل لاگت چھتیس روپے آئی تھی۔"

محمود علی صاحب ماضی کے پاس دور سے لوٹ کر کھو جانا چاہتے تھے لیکن میں نے انہیں حال کی طرف واپس لاتے ہوئے پوچھا: "محمود صاحب اب ماشاء اللہ آپ کے پاس عزت، شہرت دولت اور ذہنی سکون سب کچھ ہے کیا آپ نے پہلے کبھی اتنی [illegible] ایسی شہرت اور عزت کے بارے میں سوچا تھا؟"

"جی نہیں — میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں اتنا کامیاب فن کار بن جاؤں گا اور مجھ پر خدا کی اس قدر نوازشیں ہوں گی اب تو میں زندگی کے ہر موڑ پر اٹھتے بیٹھتے خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے اتنا نوازا اور میری محنت میری لگن کو کامیاب بنایا۔" آپ نے بجا فرمایا محمود علی صاحب خدا کا کرم زندگی کی ہر ساعت کے لئے لازمی ہے لیکن شخصی طور پر آپ روشن کامیابی حاصل کرنے کے لئے کس اصول پر کاربند رہے؟

"آپ نے بہت اچھا سوال پوچھا محترمہ صاحبہ۔ میں نے ہمیشہ محنت اور مسلسل محنت پر اپنا ایمان رکھا ہے۔ میں نے ہمیشہ صدقِ دل سے یہ سوچے بغیر محنت کی کہ مجھے کیا صلہ ملے گا اور مجھے یہ دنیا میری خدمات کا کیا معاوضہ دے گی۔ میں مسلسل کام کرتا رہا بغیر کسی لالچ کے ——— شاید یہی وجہ ہے کہ میں آسودہ ہوں بہرحال یہ تو طے ہے کہ کوئی فن کار اپنے فن سے کبھی آسودہ اور مطمئن نہیں ہوتا اس لئے مجھے بھی محنت کرنی ہے مسلسل اور انتھک محنت کیونکہ میری اداکاری کا سفر ہنوز جاری ہے۔"

"اداکاری کے ساتھ ساتھ آپ کی اداکاری کا سفر بھی تو لافانی ہے محمود صاحب ——— ٹی وی پر آپ کی اداکاری اتنی جاندار ہوتی ہے کہ یہ خیال ہی نہیں رہتا کہ آپ اداکاری کر رہے ہیں۔ خاص طور پر ولت کی "آنکھیں" کا "ہنری" اور "تعلیم بالغاں" کے مولوی صاحب کو ناظرین کبھی نہیں بھلا سکتے۔ آپ یہ بتائیں کہ ان کرداروں نے آپ کی فنی اور نجی زندگی پر کیا اثر ڈالا؟"

"خاتون یہ دونوں کردار میرے بھی پسندیدہ کردار ہیں اور خوش قسمتی کی بات ہے کہ ناظرین نے بھی انہیں بے پناہ پسند کیا۔ ہنری کے کردار کو عیسائی خاندانوں نے بڑا آدر دیا اس طرح میں بھی ان کی نظروں میں محترم ہو گیا۔ ہاں البتہ مسلمان گھرانوں میں ہنری کی "پینے" والی عادت نے خاصا ناگوار اثر ڈالا۔ جن دنوں میری یہ سیریز چل رہی تھی میرے ایک دوست میرے پاس آئے اور میرے کردار پر اعتراض کیا۔ سچ پوچھئے تو ان کا یہ اعتراض میرے دل کو لگا بھی تھا۔ انہوں نے بتایا کہ میری معصوم بچی یہ پروگرام پابندی سے دیکھتی ہے۔ ایک دن اس نے مجھ سے پوچھا ——— پاپا ——— یہ کیا پیتے ہیں؟ میں بہت پریشان ہوا کہ کیا کہوں۔ چپ رہا لیکن اس کی ضد بڑھتی گئی تو مجھے اسے بتانا پڑا کہ یہ بہت بری شے ہے لیکن صاحب بچی ذہین تھی فوراً پوچھ بیٹھی کہ ——— اگر یہ بُری ہے تو یہ کیوں پیتے ہیں۔ آخر اسے ادھر ادھر کی باتوں سے بہلا دیا لیکن ایک دن تو اس نے یہ ضد شروع کر دی کہ یہ "چیز" تو میں بھی پیوں گی۔ میں نے یہ واقعہ پروڈیوسر صاحب کو بتایا ہم سب نے مل کر یہ طے کیا اور سوچا کہ میں اسکرین پر پیتا ہوا "نظر نہ آؤں بلکہ "پینے" سے ہچکچاؤں۔

یہ اعتراض تو واقعی ہمارے دل کو بھی لگا ہمیں بھی اپنا چھوٹا سا معصوم بھائی شیدو سلطان یاد آگیا جو ٹی وی دیکھتے وقت ہم پر بیہودہ سوالوں کی بوچھار کر دیتا ہے اور ہم کھسیانے رہتے ہیں کیونکہ ہم کسی ایسے ٹی وی پروڈیوسر کو نہیں جانتے جو ہمارے اعتراض کو دل لگی کے ساتھ سن سکے۔ بہرحال ہم نے اپنے خیالات سمیٹ کر محمود علی صاحب سے پوچھا۔

"آجکل آپ اور کیا کر رہے ہیں؟" وہ آہستہ سے مسکرائے اور بولے "میں ریڈیو اور ٹیلیویژن کے کارکنان کی ایکٹرز ایکوٹی کا جنرل سیکرٹری بنا ہوں، ۱۹۷۰ء سے ہوں اس سلسلے میں اجتماعی مسائل حل کرنے اور ایکٹرز کی فلاح و بہبود کے کام کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔"

"ویسے محمود علی صاحب آپ کے بچوں کا آپ کی اداکاری کے بارے میں کیا خیال ہے۔ وہ آپ کی تعریف کرتے ہیں یا تنقید۔ ویسے آپ کے



بچے کتنے ہیں؟"

"ماشاءاللہ میرے چار بچے ہیں۔ تین بیٹے انور علی، صمصام علی اور سراج علی سروس کرتے ہیں اور بیٹی قرۃ العین پڑھتی ہے۔ وہ بی ایس سی کر رہی ہے۔ دراصل میں نے اپنا رویہ بچوں کے ساتھ ہمیشہ دوستانہ رکھا ہے۔ وہ تنقید بھی کرتے ہیں اور تعریف بھی——"

"اور آپ کی بیگم —— ؟ وہ تعریف کرتی ہیں آپ کی؟"

"نہیں وہ تو سیدھی سادی گھریلو خاتون ہیں۔ شروع شروع میں وہ مجھے ٹی وی پر یا ریڈیو پر کسی اور کا شوہر بنا دیکھتی تھیں تو خاموش سی ہو جاتی تھیں لیکن اب تو خیر سمجھ گئی ہیں اب انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوتا"

"اچھا علی صاحب یہ بتائیں آپ ٹی وی ریڈیو پر مختلف لہجوں میں بولتے نظر آتے ہیں آپ نے کتنی زبانیں سیکھی ہیں؟"

"ساری زبانیں سیکھی تو نہیں ہیں لیکن کئی زبانوں کے لہجے اور ٹون ضرور سیکھے ہوئے ہیں۔ البتہ میں پوربی، حیدر آبادی اچھی طرح جانتا ہوں ہاں تھوڑی بہت پنجابی بھی آتی ہے۔"

"یاد آیا علی صاحب کہ آپ کے پاس تو اداکاری صداکاری کے شوقین حضرات بہت آتے ہوں گے آپ انہیں کیا مشورہ دیتے ہیں؟"

"میں ان لوگوں کو اکثر یہی مشورہ دیتا ہوں کہ وہ اپنی تعلیم جاری رکھیں اور اس دشت کی سیاحی میں اپنے آپ کو ضائع نہ کریں کیونکہ یہاں نہ کوئی کورس ہے نہ اداکاری کا امتحان نہ ہی کوئی ایسا ادارہ ہے جس سے آدمی کچھ سیکھ کر یہاں آئے۔ ہاں میں دوشیزہ کے توسط سے ریڈیو پر آنے والے نوجوانوں کو یہ پیغام ضرور دینا چاہوں گا کہ وہ اگر ریڈیو پر آڈیشن دینے آئیں تو سب سے پہلے مندرجہ ذیل باتوں پر ضرور توجہ دے لیں۔ یہاں پر پہلے تو آواز یعنی وائس دیکھی جاتی ہے۔ اس کے بعد لہجہ ہے۔ لہجہ کا درست ہونا بہت ضروری ہے تیسری تلفظ کی طرف پوری توجہ بھی ضروری ہے۔ غلط تلفظ ادا کرنے والے حضرات کبھی آڈیشن پاس نہیں کر سکتے۔ ویسے مجھے خوب لوگ ملتے رہتے ہیں وہ صداکاری کے شوق میں مجھ سے ملتے ہیں اور پھر اس قدر ضد کرتے ہیں کہ میں پریشان ہو جاتا ہوں۔ بعض حضرات تو اچھی خاصی جاب اور اچھا خاصا کاروبار رکھتے ہوئے بھی ریڈیو کے چکر میں خوار ہونا چاہتے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے ایک ایم۔ بی۔ بی۔ ایس ڈاکٹر صاحب مصر تھے کہ جی ریڈیو میں کام میں گے اور اب ایک سنار صاحب ہیں جب بھی ریڈیو آتے ہیں دو تین سکے ساتھ لاتے ہیں اور دھرنا دے کر بیٹھ جاتے ہیں کہ جی کام دیجئے اور کبھی کبھی کوئی انتہائی معمولی اور چھوٹا سا رول مل جاتا ہے تو اس کے چالیس پچاس روپے لے کر پھولے نہیں سماتے اور دوستوں میں جا کر بتاتے ہیں۔"

"ویسے علی صاحب آپ کی شہرت اور مقبولیت آپ کے لئے پریشانی کا باعث تو نہیں بنی؟"

"جی ہاں، کبھی کبھی تو پریشانی کا باعث بن ہی جاتی ہے۔ یہ شہرت دیکھئے صاحب ہم کھلے عام خریداری نہیں کر سکتے کسی تفریحی مقام پر سکون سے نہیں بیٹھ سکتے۔ ہم بھی انسان ہیں ہمارا بھی دل چاہتا ہے کہ آزادانہ سڑکوں پر پھریں، کبھی سڑک پر کھڑے ہو کر چاٹ کھائیں لیکن نہیں کھا سکتے۔ لیکن جناب کچھ فائدے بھی ہیں وہ کام جو عام آدمی مہینوں میں نہیں کروا سکتا ہمارے وہ لوگ منٹوں میں کر دیتے ہیں دوسرے یہ کہ ہمیں کہیں قطار لگانے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ بہرحال یہ سب محبتیں ہی ہیں اور محبتیں کتنی بھی شدید ہو جائیں دکھ نہیں دے سکتیں اور اگر خدانخواستہ کبھی کوئی محبت دکھ دے بھی دے تو ہمیں یہ دکھ بھی پیارا لگتا ہے۔"

علی صاحب کی باتیں سن کر میں سوچنے لگی کہ حیدرآباد دکن کے ایک شاعر محمود علی راز کی کا نواسہ محمود علی جو خدا کا شکر ہے کہ اپنے آپ کو محمود علی فلاں کہتا ہے واقعی ایک سچا فنکار ہے اور سچے فنکار کی یہی نشانی ہے کہ وہ ایک اچھا انسان بھی ہو۔ آپ محمود علی سے مل کر دیکھیں وہ آوازوں کے گلشن کی منفرد خوشبو ہی نہیں نیک نفس انسان بھی ہے۔

ہم محمود علی صاحب سے شرف دیدار کر کے قمر علی عباسی صاحب کی طرف متوجہ ہوئے جو ریڈیو پاکستان کے لائیو ٹیلی کاسٹ پروگرام میں آج بھی صاحب کے مہمان تھے۔ ان کی شگفتہ بھری بذلہ سنجی اور قابل تقلید خوش مزاجی سے متاثر تھے ان کا کمال یہ ہے کہ وہ کار کی ڈرائیونگ کرتے وقت اپنے چہرے کی مسکراہٹ اور ہاتھوں کی تیزی دونوں ہی کی ستائش اور لہجے کی شگفتگی اور دلچسپ گفتگو کا رشتہ سب ہی ایک ساتھ قائم رکھتے ہیں اور ہمیں اس خوش رنگ شخصیت کا شکریہ ادا کرنا تھا اس لئے ان کا شکریہ ادا کر کے ہم چلے آئے کہ انہوں نے ہمیں محمود علی صاحب سے ملوایا۔

فن کے ایوان میں پوچھیں گے اسی پیکر کو

جس کو آذر نے رگ جاں سے تراشا ہو گا!

طنز و مزاح

مانک ٹالہ



خط ایک ایم ایل اے کا

پیارے بہت ہی پیارے دوست جٹ مل۔

خیریت موجود۔ خیریت مطلوب۔ تمہارے کئی خطوط ملے لیکن میں جواب نہ دے سکا۔ دراصل الیکشن کے کام میں اس قدر مصروف تھا کہ مرنے کی بھی فرصت نہیں تھی۔ سر دھڑ کی بازی لگا رکھی تھی اور تمہیں یہ سن کر انتہائی خوشی ہوگی کہ میں اپنے مخالف کو چاروں شانے چت گرا کر پورے بارہ ووٹوں کی اکثریت سے اسمبلی کی ممبری میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ افسوس، میرا پھیری زیادہ نہ ہو سکی، ورنہ اور زیادہ ووٹ لے کر کامیاب ہوتا اور اب جبکہ میں ممبر لیجسلیٹو اسمبلی بن گیا ہوں، تمہیں چاہیے کہ آئندہ خط لکھتے وقت سرنامے پر میرے نام کے آگے ایم ایل اے یعنی ممبر لیجسلیٹو اسمبلی لکھنا ہرگز نہ بھولنا تاکید ہے۔

اپنے آخری خط میں تم نے مجھے انتہائی فحش گالیوں سے نوازا ہے کیونکہ میں تمہارے پچھلے خطوں کا جواب نہیں دے سکا تھا۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ تم میرے ان چند نہایت ہی بے تکلف دوستوں میں سے ہو جن کے ساتھ میں ماں بہن کی گالیوں کا تبادلہ نہایت بے تکلفی سے کیا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ طوائفوں کے کوٹھوں پر مجرا دیکھنے اور کرسی کے ٹھیکے پر مٹرگشت کرنے میں بھی ہم ساتھ جایا کرتے تھے۔ بیکاری اور آوارگی کے زمانے میں سڑکیں بھی اکٹھے ناپتے تھے۔

تمہیں یاد ہے کہ ایک مرتبہ کسی مسافر کی جیب پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے اکٹھے ہی گرفتار ہوئے تھے کیونکہ سپاہی کو رشوت دینے کے لئے ہمارے پاس ایک اٹھنی بھی نہیں تھی۔ پھر تین ماہ کی قید کاٹ کر بھی اکٹھے رہا ہوئے تھے۔

لیکن اپنے قصبے میں واپس پہنچ کر ہم نے یہ مشہور کر دیا تھا کہ مہاتما گاندھی کے ستیہ گرہ آندولن میں تین ماہ کی قید بھگت کر آئے ہیں چنانچہ ہمیں پھولوں کے ہاروں سے لاد دیا گیا تھا۔ بیل گاڑیوں پر ہمارے جلوس نکالے گئے تھے اور بڑے بڑے جلسوں میں ہماری دیش بھگتی کے گن گائے گئے تھے۔ ہماری لیاقت، سیاست، قیادت، ریاضت (خباثت، حماقت، رذالت) کی وہ وہ بڑائیاں بیان کی گئیں جن کا خود مجھے بھی علم نہیں تھا۔

یہیں سے ہماری، نہیں نہیں میری سیاسی زندگی کا آغاز ہوا تھا، کیونکہ تم سیاسی جوڑ توڑ اور تکڑم بازی کے نااہل ہونے کے باعث سیاست کے پچڑے میں ٹانگ پھنسا کر ایسے اوندھے منہ گرے تھے کہ پھر زندگی بھر نہ سنبھل سکے اور تم نے سیاست سے توبہ کر کے پھر وہی پرانا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ اب جبکہ میں ممبر لیجسلیٹو بن چکا ہوں، میں تمہیں ایک انتہائی دوستانہ اور مخلصانہ مشورہ دیتا ہوں کہ آئندہ گفتگو اور خط و کتابت میں تمہیں گالیوں سے پرہیز کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

کوشش کا لفظ میں نے اس لئے لکھا ہے کہ عادت جاتے جاتے ہی جاتی ہے۔ تمہیں آئندہ خط و کتابت میں مہذب اور شائستہ الفاظ زیادہ سے زیادہ استعمال کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ مجھے احساس ہے کہ میری طرح تمہارے پاس بھی شائستہ اور مہذب الفاظ کا بہت کم ذخیرہ ہے

...ہم نہ ہونے کے برابر ہے۔
اس لئے میں اپنے ایک تعلیم یافتہ دوست سے پانچ سات سو یا ایک ہزار شائستہ مہذب اور ایک ایم ایل اے کی شان کے شایان الفاظ کی ایک الگ لسٹ بنوا کر اس خط کے ساتھ منسلک کر کے ارسال کر دوں گا۔

دراصل یہ الیکشن کا کام بھی بڑے لفڑے کا کام ہوتا ہے۔ ایک ایک ووٹر کے پاس جا کر مسکا لگانا پڑتا ہے۔ ایسے ایسے لوگ جن کے ساتھ بات کرتے بھی گھن آتی ہے ان سے بہت محبت اور خلوص سے پیش آنا پڑتا ہے۔ پڑھے لکھے لوگ تو بہت ہی خبیث ہوتے ہیں بڑے الٹے سیدھے سوال کرتے ہیں۔
ایک سرکاری کالج کا پروفیسر مجھ سے پوچھنے لگا: "آپ اسمبلی میں کس لئے جا رہے ہیں؟"
میں نے جواب دیا کہ جنتا کی سیوا اور دیش کی اُنتی کی خاطر۔
اس پر وہ پاجی کہنے لگا: "جنتا کی سیوا اور دیش کی اُنتی تو آپ اسمبلی سے باہر رہ کر بھی بہتر ڈھنگ سے کر سکیں گے۔" پھر وہ جاہلانہ اور بے پرکاش نالائقی کی مثالیں پیش کرنے لگا۔
دراصل میں اس قسم کے سوالوں کے لئے تیار ہو کر نہیں آیا تھا۔ اس لئے مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔
مجھے خواہ مخواہ اس پر غصہ آ گیا۔ میں اس پر اپنی مخصوص برانڈ خود ساختہ گالیوں کی بوچھاڑ کرنا ہی چاہتا تھا کہ مجھے حالات کی نزاکت کا احساس ہو گیا اور میں نے چکنی چپڑی باتوں سے اسے رام کرنے کی کوشش کی۔ لیکن حرامزادہ بہت کائیاں، کہنے لگا: "آپ نے اپنا الیکشن کا نشان گدھا کیوں چنا ہے؟ اُلّو کیوں نہیں یا پھر بندروں کی جوڑی کا نشان کیوں نہیں چنا؟"
اب میں اسے کس طرح بتاتا کہ میں جنتا کو گدھے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ ویسے بھی جنتا سیاسی پارٹیوں کے درمیان ہوتی گدھے کی طرح نہ گھر کی رہتی ہے نہ گھاٹ کی۔ اور جب کبھی وہ (سیاسی پارٹیوں کی طرف سے پیدا کردہ) ابتر حالات سے پریشان ہو کر دولتیاں جھاڑنا شروع کر دیتی ہے تو برسرِ اقتدار پارٹی اس کی ننگی پیٹھ پر وہ ڈنڈے برساتی ہے کہ اسے ساری شوخی بھول جاتی ہے۔ دراصل گدھے کا نشان میں نے جمہوریت میں جنتا کی صحیح حالت کے نشان کے طور پر منتخب کیا تھا لیکن [illegible] (ڈیموکریسی) بھی ایک مصیبت ہے کہ ہم جو محسوس کرتے ہیں اسے بیان کرنے کی ہمت نہیں کر سکتے۔ اسی لئے میں اس پروفیسر کے بچے کو یہ سب باتیں نہ بتا سکا۔
اس پر وہ کہنے لگا کہ آپ بالکل جاہل ہیں۔ میں اپنا ووٹ ہرگز آپ کو نہیں دوں گا۔
مگر اب یہ بات اس پر ظاہر ہو جائے گی کہ جاہل میں نہیں بلکہ وہ نرا گدھا کا گدھا ہے۔
اور اب جبکہ میں الیکشن جیت کر ایم ایل اے بن چکا ہوں اور ریاست کا ایجوکیشن منسٹر میرے دائیں ہاتھ کی مٹھی میں ہے۔ اب اس پر ایسے پھندے ڈالوں گا کہ وہ نہ مر سکے گا نہ جی سکے گا اور پھر زندگی بھر کسی سیاسی لیڈر کی شان میں گستاخی کرنے کی ہمت نہیں کر سکے گا۔ یہ ایجوکیشن ایک بہت بڑی لعنت ہے۔ انسان کے دماغ میں بالکل الٹی سیدھی باتیں بھر دیتی ہے اور وہ اپنے آپ کو لاٹ خان کا سالا سمجھنے لگ جاتا ہے۔ حالانکہ وہ زندگی بھر کے لئے ناکارہ ہو جاتا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ کہ اگر میں پڑھا لکھا ہوتا تو کیا اسمبلی کا ممبر ہوتا؟ ہرگز نہیں بلکہ کسی اسکول میں استاد یا زیادہ سے زیادہ کسی کالج کا پروفیسر ہوتا لیکن آج دو پڑھے لکھے گدھے میرے سیکرٹری لگے ہوئے ہیں۔
دراصل ہمیشہ کے لئے برسرِ اقتدار رہنے اور جنتا کے اوپر اپنا مکمل اختیار جمائے رکھنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ جنتا کو زیادہ سے زیادہ غیر تعلیم یافتہ رکھا جائے۔ اب اگر میرے حلقے کے سارے ووٹر اس پروفیسر کی طرح پڑھے لکھے ہوتے تو کیا مجھے اس قدر شاندار کامیابی حاصل ہوتی؟ ہرگز نہیں!
میرے حلقے کے بیشتر ووٹر جاہل اور اَن پڑھ تھے یا پھر پڑھے لکھے گدھے تھے۔ اس لئے ان پر میرا جادو بڑی آسانی سے چل گیا۔ میں نے اپنی انتخابی مہم کے لئے ایسے ایسے طلسمی نعرے ایجاد کئے کہ میرے حلقے کے ووٹروں پر اس کا جادو چل گیا۔ ان نعروں میں سے چند ایک نعرے تمہاری اطلاع کے لئے نوٹ کر رہا ہوں!
لے کے دیں گے روٹی کپڑا اور مکان — ووٹ فار ڈونکی!
گدھے کو ووٹ دیجئے تاکہ دیش ترقی کی طرف سرپٹ بھاگنے لگے۔
آپ کی کامیابی، ترقی اور خوشحالی کا کون ضامن — ڈونکی۔
گدھے کو ووٹ دینا ہر نر ناری کا پرم دھرم ہے۔
ان نعروں کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا اور سارے حلقے میں "ووٹ فار ڈونکی" کا نعرہ گونجنے لگا۔ بعض لوگوں نے مذاق کا موضوع بھی بنایا اور یہاں تک کہہ دیا کہ اس چناؤ حلقے سے ایک گدھا ہی کھڑا ہوا ہے۔

اوراب جبکہ میں ممبر لیجسلیٹو اسمبلی بن گیا ہوں عالم میں ہوں گا
اور میرے پیچھے میرے حلقے کی جنتا گدھے کی طرح جتی ہوئی ہوگی۔

انتخاب کے دنوں میں اکثر ووٹر لوگ کبوتر کی طرح سینہ پھلائے اکڑ اکڑ کر چلتے ہیں۔ دعوتوں میں شراب، ماس، مرغا اور مرغن غذائیں اڑاتے ہیں اور یوں پیش آتے ہیں جیسے ہمارے داماد ہوں۔

خیر وہ تو صرف دو تین ماہ کے لئے داماد بنتے ہیں لیکن میں اب جبکہ ممبر لیجسلیٹو اسمبلی بن چکا ہوں، اب میں ان کا داماد بن کر پانچ سال کے لئے ان کی چھاتی پر مونگ دلوں گا۔

میں نے ممبر بننے کے فوراً بعد اپنے نوکروں، بیروں اور خانساماؤں کو حکم دے دیا ہے کہ کسی ایرے غیرے نتھو خیرے کو میرے بنگلے کے قریب بھی نہ پھٹکنے دیا جائے۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ تعلیم سے ہماری جمہوریت کو سخت خطرہ ہے۔ اس سے لوگوں کے دلوں میں طرح طرح کے الٹے سیدھے خیال پنپنے لگتے ہیں اور وہ سیاسی لیڈروں پر اوٹ پٹانگ سوالوں کی بوچھاڑ کرنے لگ جاتے ہیں اور روزگار، رہائش اور صحت عامہ وغیرہ قسم کی ناجائز اور نامناسب مانگیں کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

اور اب جبکہ میں لیجسلیٹو اسمبلی بن چکا ہوں میں اپنی پارٹی کی ایک خفیہ میٹنگ بلاؤں گا اور یہ مطالبہ کروں گا کہ جنتا کو زیادہ سے زیادہ جاہل اور غیر تعلیم یافتہ رکھنے کیلئے جلد از جلد ایسے قدم اٹھائے جائیں جن سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

پہلا قدم یہ اٹھایا جائے کہ موجودہ پانچ سالہ پلان میں تعلیم کے لئے جو بجٹ ہے اس کو بڑھا کر دوگنا کر دیا جائے۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ مخالف پارٹیوں کے ہاتھ سے ہماری پارٹی کے خلاف پروپیگنڈہ کا ایک بہت بڑا ہتھیار چھن جائے گا اور سارے دیش بلکہ ساری دنیا پر یہ ظاہر ہو جائے گا کہ ہم اپنے دیش کی جنتا کی تعلیم کی خاطر کس قدر کثیر رقم خرچ کر رہے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی ہر شہر، ہر قصبہ، ہر گاؤں بلکہ ہر محلے میں نئے نئے اسکول کھولے جائیں تاکہ تعلیم کے لئے جو رقم مخصوص ہوئی تھی وہ برابر ہو سکے اور اس کے بعد یہ قدم اٹھایا جائے کہ ٹیچروں کے لئے نوکری کی شرائط اس قدر کڑی اور تنخواہ اس قدر کم رکھی جائیں کہ ہر تعلیم یافتہ شخص بلا توقف ٹیچر کی نوکری پر چپراسی کی نوکری کو ترجیح دے اور اگر کوئی مجبوری سے ٹیچر کی نوکری قبول کر بھی لے تو پھر اس کا زندہ رہنا اس حد تک دوبھر کر دیا جائے کہ اس کی سات پشتیں اسکول ٹیچری سے توبہ کرلیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اب بھی دیش میں بہت سے ایسے اسکول ہیں جن میں برسوں سے کوئی ٹیچر مقرر نہیں ہے لیکن یہ کافی نہیں ہے۔

اور اب جبکہ میں ایم ایل اے بن چکا ہوں میں اپنی پارٹی کی خفیہ میٹنگ میں یہ پرستاؤ پیش کروں گا کہ جلد از جلد ایسے قدم اٹھائے جائیں کہ دیش کے تقریباً سارے اسکول بغیر ٹیچروں کے ہی چلتے رہیں تاکہ دیش کی جنتا زیادہ سے زیادہ عرصہ تک جاہل رہے۔ ورنہ ایک ایسی آندھی چلے گی، ایک ایسا طوفان آئے گا کہ جس سے ہماری جمہوریت کی عمارت بنیادوں سے اکھڑ کر زمین پر آ رہے گی۔

ایک بات تمہیں بتا دوں کہ لیڈری پھولوں کی سیج نہیں بلکہ کانٹوں کا تاج ہے۔ یہاں کبھی کبھی گندے انڈوں اور پتھروں کی بوچھاڑ کو بھی سہنا پڑتا ہے۔ لیڈری قائم رکھنے کے لئے سوجھ بوجھ اور تکڑم بازی کی ضرورت ہوتی ہے۔

میں نے اس الیکشن میں ایسی ایسی تکڑم بازی کی کہ پارٹی کے اندر جو لوگ ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ ان میں سے جن جن کے منسٹر کے چانس زیادہ تھے میں نے ان کے مخالفوں سے دوستی گانٹھ کر طرح طرح کی تکڑم بازیوں سے ان کی ٹانگ ایسی گھسیٹی کہ وہ الیکشن میں بری طرح ناکام ہو گئے۔ اب ان کے مخالف پانچ سال کے لئے میری مٹھی میں آ گئے اور میں نے ان سب کو منسٹر بنوا دیا ہے۔

ان لوگوں نے مل کر مجھ سے بھی منسٹری منڈل میں شامل ہونے کی پرارتھنا کی تھی لیکن میں نے منسٹری بننے سے انکار کر دیا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پارٹی کے سارے ممبر اور نیتا میری نشکام سیوا بھاؤنا کو ماننے لگے۔ اب منسٹری منڈل کے سبھی منسٹری ہر معاملے میں میری رائے اور مشورے کو ضروری سمجھتے ہیں۔

دراصل وزیر بننے سے وزیر گر بننا کہیں زیادہ اہم ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ اقتدار ہر وقت میری مٹھی میں رہے گا اور جو منسٹری ذرا بھی آنکھیں دکھائے گا اسے دھوبی پاٹ کے گُر سے چاروں شانے ایسا چت گراؤں گا کہ پھر زندگی بھر اٹھنے کا نام نہیں لے گا۔

میں نے وزیر بننے سے اس لئے بھی انکار کیا کہ وزیر ہر وقت پبلک اور اخباروں کی نگاہوں میں رہتے ہیں۔ اگر ان سے ذرا سی بھی اونچ نیچ ہو جائے تو یہ اخبار والے ایسا طوفان بے تمیزی کھڑا کر دیتے ہیں کہ بس ان سے شیطان ہی بچے۔

اور پھر میں جو کام کرنا چاہتا ہوں وہ وزارت سے باہر رہ کر زیادہ خوش اسلوبی سے انجام دے سکتا ہوں۔

اس الیکشن میں میرا پورا دو لاکھ کی قیمت کا یہ بنگلہ میں نے تین لاکھ میں اس لئے خریدا تھا کہ بنگلے کا مالک یہ بنگلہ مجھے اس شرط پر دینے کے لئے راضی ہو گیا تھا کہ اس کا روپیہ میں الیکشن میں کامیاب ہونے کے دو سال کے دوران ادا کروں گا۔

اور اب جبکہ میں لیجسلیٹو اسمبلی کا ممبر بن چکا ہوں بلکہ وزیر گر بھی ہو گیا ہوں اور ریاستی منتری منڈل کے تقریباً سبھی منتری میری مٹھی میں ہیں تو میں نے بھی اپنی اور اپنے رشتہ داروں اور عزیز دوستوں کی ترقی اور خوشحالی کے لئے ایک پانچ سالہ پلان تیار کر لیا ہے۔

وہ پلان اس طرح ہے۔ پہلے دو سالوں میں کم سے کم چھ لاکھ روپیہ کما کر بنگلے کی قیمت اور قرضہ مع سود اتارنا۔

اور آئندہ تین سالوں میں کم سے کم پندرہ لاکھ روپیہ اور پیدا کرنا تاکہ آئندہ الیکشن زیادہ وسیع پیمانے پر لڑے جا سکیں تاکہ میں ریاست کا چیف منسٹر یا کم سے کم مرکزی منتری منڈل میں شامل ہو سکوں۔

اس مقصد کے لئے سب اسکیمیں مکمل ہو چکی ہیں۔ پہلی اسکیم یہ ہے کہ اپنی بھتیجی کے پھوپھا کے ماموں کے بڑے لڑکے کے سالے کے نام پر ایک بہت بڑی فیکٹری جاری کروں گا۔ جس کے لئے سرکار سے کم سے کم دس لاکھ روپیہ قرض حاصل کروں گا۔

پانچ لاکھ روپیہ اپنے پرانے قرضے اتارنے کے لئے بالا بالا ہی نکال لئے جائیں گے۔ اور باقی کا پانچ لاکھ روپیہ آہستہ آہستہ نقصان دکھا کر برابر کر کے فیکٹری کا دیوالہ نکال دیا جائے گا۔

دوسرا پلان سڑکوں سے متعلق ہے۔ موجودہ پانچ سالہ پلان میں جو نئی سڑکیں بنائی جائیں گی ان کے ٹھیکے تمہارے نام پر حاصل کئے جائیں گے۔ تمہیں تمہارے حصے کے مطابق دو آنہ فی روپیہ منافع ادا کیا جائے گا۔

میں چاہتا تو اس کام کے لئے تنخواہ دار یا حصہ دار رکھ سکتا تھا لیکن میں ناجائز اکسپلائٹیشن کے حق میں نہیں ہوں اور پھر تم اپنے یار غار بھی تو ہو۔ بہتی گنگا ہے اگر دو چار ڈبکیاں تمہیں بھی نہ لگوائیں تو پھر یاری کس کام آئے گی۔

شاید تم کہو گے کہ تمہیں سڑکیں بنانے کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ لیکن تمہیں سڑکیں ناپنے کا بیس سال کا تجربہ تو ہے۔ یہی تجربہ کافی ہے۔

اب وہ جس نے ٹیوب ویل کھودنے کا ٹھیکہ حاصل کیا تھا اس کو کیا تجربہ تھا اور وہ تو صرف دو درجن ٹیوب ویل ہی کھود سکا تھا جن میں سے [illegible] ناکارہ تھے۔

تم کہو گے کہ اتنے بڑے کام کے لئے تو لاکھوں روپیہ درکار ہوگا لیکن میری جان روپیہ کی کیا فکر؟ روپیہ کا بندوبست میں کروں گا۔ بلکہ روپیہ کے بندوبست کی بھی ضرورت نہیں۔ اپنی گرہ سے دو تین ہزار روپیہ تمہیں سرمایہ لگانے کے لئے دینا ہوگا۔

تم حیران ہو رہے ہو کہ اتنا بڑا کاروبار اور تین ہزار کا سرمایہ! لیکن لندن کی اس فرم کا قصہ تم بھول گئے جو سو پونڈ یعنی ساڑھے تیرہ سو روپیہ کے سرمایہ سے لمیٹڈ ہوئی تھی اور اس نے ہماری فوجوں کے لئے لاکھوں روپیہ کی جیپ گاڑیاں اور گولہ بارود سپلائی کرنے کا ٹھیکہ لیا تھا کیا لندن کی اس فرم اور ٹیوب ویل کھودنے والی فرم کو لاکھوں روپیہ بطور پیشگی ہماری سرکار نے نہیں دیا تھا؟ پھر تمہیں فکر کس بات کی کیا اسی جیپ اسکینڈل کا گلا ہمارے وطن کے پردھان منتری نے خود اپنے ہاتھوں نہیں گھونٹ دیا تھا؟ تو وہ اسکینڈل کا گلا گھونٹنے کے لئے ہمارے ریاستی چیف منسٹر کو اتنا اختیار بھی نہ ہوگا؟ پھر یہاں تو ہر بڑی ناکامی کے بعد اور بڑی ترقی ملتی ہے۔ یوں کہ جیپ اسکینڈل کے بعد ہمارے [illegible] کو ڈیفنس منسٹر بھی تو بنا دیا گیا تھا۔ سیاں بھئے کوتوال تو ڈر کاہے کا۔۔۔ اس لئے میرے پیارے جگری دل۔ تمہیں میرے ہوتے اور مجھ ایسے وزیر گر کے ہوتے ڈر کس بات کا؟

تم یہ کہو گے کہ ٹھیکہ تو اسے ملے گا جس کا ٹینڈر کم سے کم ریٹ کا ہوگا لیکن بھئی، ہم کس مرض کی دوا ہیں۔ ہم یہ پتہ لگا لیں گے کہ کم سے کم قیمت کا ٹینڈر کون سا ہے۔ ہم اس سے بھی کم قیمت کا ٹینڈر بھر دیں گے ویسے بھی ٹینڈر کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ یہ تو دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے ایک کارروائی ہوتی ہے۔ ورنہ ٹینڈر اسے ہی ملتا ہے جس کو ملنا چاہئے۔

ہم کتنے ہی کم ریٹ کا ٹینڈر بھر دیں۔ ہم ہر حالت میں لاکھوں روپیہ کمائیں گے کیونکہ آج کل کولتار کی سڑکوں کے بجائے سیمنٹ کی سڑکیں بن رہی ہیں تاکہ ہر وقت سیمنٹ کی کمی رہے اور عمارتیں اور فیکٹریاں بنانے والوں کو سیمنٹ صرف بلیک مارکیٹ ہی میں مل سکے۔

ہمیں تو لاکھوں بوریاں سیمنٹ کنٹرول کے دام پر ملیں گی۔ ہم ایک بوری سیمنٹ اور نو بوری ریت کی ملا کر سڑکیں بنائیں گے اور اس طرح دس میں سے نو بوریاں سیمنٹ کی کالے بازار میں بیچ کر دگنا بلکہ تگنا منافع صرف سیمنٹ ہی سے کما جائیں گے۔ سڑک کی بنوائی کا منافع الگ ہوا۔ اس سیمنٹ سے تمہارے لئے ایک بنگلہ اور میرے لئے دوسرا بنگلہ بن جائے گا وہ الگ۔

تم یہ پوچھو گے کہ ایک بوری سیمنٹ میں نو بوری ریت کی ملا کر جو سڑک بنے گی وہ کتنے دن چلے گی۔

پیارے جبٹ مل تم سے احمق کے احمق اگر تم میں اتنی حماقت نہ ہوتی تو تم بھی میری طرح ایم ایل اے بنے ہوتے۔ اب تم ہی بتاؤ کہ آج تک جتنی نئی سڑکیں بن چکی ہیں ان کا کیا حشر ہوا ہے؟

ایسا لگتا ہے کہ تم نے سڑکیں ناپنا چھوڑ دیا ہے لیکن اپنی پارٹی کی الیکشن مہم کے سلسلے میں مجھے دور دراز کے علاقوں میں دورہ کرنے کا موقع ملا تھا۔ اس طرح مجھے پتہ چلا کہ پہلی اور دوسری پانچ سالہ پلانوں کے تحت جس قدر نئی سڑکیں بنی تھیں ان کا نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ کہیں کہیں خستہ حال سڑکوں کے ایک آدھ ٹکڑے ایسے بچے تھے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی وقت ان علاقوں میں شاندار سڑکوں کا جال بچھا ہوا ہوگا۔

میں ودھیان سبھا میں یہ پرستاؤ پیش کرنے والا ہوں کہ جن جن جگہوں پر سڑکوں کے ایسے ایک آدھ ٹکڑے پائے جائیں ان پر محکمۂ آثار قدیمہ قبضہ جما کر اپنی حفاظت میں لے لے، تاکہ آزاد بھارت کے تاریخ دانوں کو ریسرچ کرنے میں مشکل پیش نہ آئے اور ہماری آنے والی نسلوں کو بھی معلوم ہو جائے کہ ان کے بزرگوں نے اپنی آنے والی نسلوں کی ترقی و خوشحالی کی خاطر کیا کیا کارنامے کئے تھے۔

تیسرا کام جو میں ہاتھ میں لینا چاہتا ہوں وہ ہے اپنے گاؤں کی نہر کے اوپر بند باندھنے کا۔ تم ودھان سبھا میں پرستاؤ رکھوں گا کہ سارے دریاؤں پر بند باندھے جا چکے ہیں یا باندھے جا رہے ہیں لہٰذا اب چھوٹی نہروں اور جوہڑوں پر بھی بند باندھنے کا کام شروع کر دیا جائے اور ان کے ساتھ بجلی پیدا کرنے والے جنریٹرز بھی فٹ کر دیئے جائیں تاکہ قرب و جوار کے دیہاتوں کو بجلی سپلائی کرنے کا انتظام ہو سکے۔

ان بندوں سے تین بڑے بڑے فائدے ہوں گے

پہلا فائدہ یہ ہوگا کہ جب یہ بند سیمنٹ کم اور ریت زیادہ ہونے کے باعث غارت ہو جائیں گے تو ان سے زیادہ تباہی نہیں ہوگی اور دریاؤں پر بندھے ہوئے جو بند ٹوٹ رہے ہیں یا ٹوٹیں گے ان سے لاکھوں گھر برباد اور لاکھوں جانوں کا نقصان ہوتا ہے۔ لیکن نہروں پر بندھے ہوئے بندوں کے ٹوٹنے سے یہ تعداد ہزاروں بلکہ سیکڑوں تک رہے گی اس طرح آئندہ الیکشن میں ہمارے ووٹوں کی تعداد بہت کم نہ ہونے پائے گی۔

دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ ہم غیر ملکوں سے جو بھاری بھاری قرضے اور امداد حاصل کر رہے ہیں اور جنتا پر بڑے بڑے ٹیکس لگا کر جو روپیہ اکٹھا کر رہے ہیں ان کے نکاس کا ایک نیا ذریعہ پیدا ہو جائے گا۔

تیسرا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ ایسے لوگ جو برسر اقتدار لیڈروں کے قریب ہونے کے باوجود فی الحال آزادی کا کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکے ان کی حق تلفی کا کفارہ ادا ہو جائے گا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ میرا یہ پرستاؤ کثرت رائے سے منظور ہو جائے گا۔

اس ٹھیکے کے لئے میں نے اپنا ایک قریبی رشتہ دار کے نور نظر پر نگاہ کرم رکھ دی ہے۔ بیچارا تین سال لگاتار میٹرک میں فیل ہونے کے باوجود کوئی سرکاری یا غیر سرکاری نوکری حاصل نہ کر سکا اور جب محکمۂ بیروزگاری کی لمبی لمبی لائنوں میں کھڑے ہو کر اس کی ٹانگیں سوج گئیں تو آخر تھک ہار کر اس نے ریڑھی لگا کر ٹھنڈی میٹھی گنڈیریاں بیچنی شروع کر دیں۔

لیکن یہ میونسپلٹی والے پھر بھی اسے چین سے نہیں جینے دیتے اور بعض اوقات اس کی گنڈیریاں ضبط کر کے چوس جاتے ہیں اور اس پر بھاری بھاری جرمانے کر کے اس کی ریڑھی نیلام کر دیتے ہیں۔

اسے اس کاروبار میں صرف دو پیسے روپیہ منافع مل رہا ہوں اور تمہیں تو میں نے پورے دو آنے کی آفر دے ڈالی ہے۔ اس لئے کہ تم میرے بچپن کے یار غار ہو اور ہم نے بے کاری میں افلاس کے دن اکٹھے سڑکیں ناپ کر کاٹے تھے۔

اس لئے میرے پیارے جبٹ مل تھوڑے لکھے کو بہت جانو۔ اس خط کو تار سمجھو اور خط ملتے ہی فوراً یہاں چلے آؤ تاکہ تمہارے نام پر فرم رجسٹرڈ کروانے اور ٹھیکہ ملنے سے پہلے کی تمام کارروائی مکمل کر لی جائے۔ تمہارا خیر اندیش۔

ہیرا پھیری مل۔ ایم۔ ایل۔ اے

ذکی الدین علی

جھوٹے افسانے



کبھی کبھی عورت کا سچا پیار بھی اسے جھوٹی محبتوں کے افسانے تراشنے پر مجبور کر دیتا ہے

مگر ـــ کیوں؟

ایک دلکش نفسیاتی افسانہ

اٹلانٹک آئل اینڈ کیمیکل ورکس کی حیدرآباد برانچ پر جنرل منیجر کی حیثیت سے جب ترقی پر میری پوسٹنگ ہوئی تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ میرے تصور میں حیدرآباد کی رنگین شامیں اتر گئیں۔ حسین ساگر کے حسین و جمیل نظاروں کی یادیں دل میں چٹکیاں لینے لگیں۔ دوستوں کی بھولی ہوئی صورتیں پھر نگاہوں میں گھوم گئیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ مجھے تھوڑی سی رنجیدگی بھی ہوئی ـــ حسین ساگر کے خوشنما ریلنگ اور پرکیف نظاروں کی یاد کے ساتھ ایک ہلکی سی پھانس کی چبھن دل میں محسوس ہونے لگی ـــ حسین ساگر کا سوا میل طویل بند ایک دو نہیں ہزاروں داستانیں چھپائے اسی شان سے کھڑا تھا۔ انہیں ہزاروں میں سے میری اپنی بھی ایک کہانی تھی۔ ادھوری، نامکمل، خشک اور تلخ صرف ناکامی اور نامرادی کا مرقع!

اس طویل بند نے مجھے اور پرمیلا کو شانہ بہ شانہ چلتے دیکھا۔ لائٹ کے خاموش کھمبوں نے اپنی دودھیا روشنی میں کتنی بار مجھے اور پرمیلا کو پیمانِ وفا باندھتے دیکھا۔ یہ ملاقاتیں، ایک دوسرے کا ساتھ نیا نہ تھا۔ کالج کے ابتدائی زمانے ہی سے ہم ساتھ ساتھ رہے تھے۔ اس کا اور میرا ذوق ہر چیز میں یگانگی کا حامل تھا اور یہی یگانگی تھی جس نے ہمیں بہت جلد اتنا قریب کر دیا تھا۔ مجھے ان دنوں ہر چیز پر بہار نظر آتی تھی۔ مستقبل کے سنہرے خوابوں سے معمور دل میں خوشیاں ہی خوشیاں پھوٹتی تھیں۔

پرمیلا آہستہ آہستہ میرے خوابوں اور خیالوں پر چھا گئی۔ ان دنوں جیسے ہم ایک جان دو قالب تھے۔ ”میں سمجھتا تھا، پرمیلا کے بغیر میری زندگی زندگی نہیں اور میرے بغیر پرمیلا جی نہیں سکتی۔ اس کے نقوش رفتہ رفتہ میرے دل میں گہرے ہوتے چلے جا رہے تھے ـــ پھر نہ جانے یکایک کہاں سے خزاں آ گئی۔ سنہرے خواب تلخ حقیقتوں میں تبدیل ہو گئے اور پرمیلا نے میری تقدیر راہ میں جھٹک دیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں کسی اونچی پہاڑی سے پھسل پڑا ہوں اور تیزی سے پھسلتا جا رہا ہوں۔ نشیب میں، گہرائی میں، اتھاہ گہرائی میں، پھر مجھے ہوش آیا۔ مجھے یقین کرنا پڑا کہ میں نے کوئی بھیانک خواب نہیں دیکھا۔ یہ حقیقت تھی۔ یہ پرمیلا ہی تھی جو مجھ سے مخاطب تھی۔

”میں نے کافی غور کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے راج!“ اس کا لہجہ جذبات سے عاری تھا۔ ”ہماری زندگی ایک ساتھ رہ کر کامیاب نہیں ہو سکتی۔ میرے اور تمہارے نظریاتِ حیات کے درمیان اب وسیع خلیج پیدا ہو گئی ہے جو پاٹی نہیں جا سکتی۔ میں محسوس کر رہی ہوں کہ میرے تخیلات میں اب ایک نیا موڑ پیدا ہو چکا ہے۔ ہمارے ذوق کی ہم آہنگی کا شیشہ اب ٹوٹ چکا ہے پھر کیوں نہ ہم اپنی راہیں جدا کر لیں۔“

میں نے اسے سمجھایا، منایا، اسے یقین دلایا کہ اس کا فیصلہ قطعی غلط ہے۔ میں نے اس سے کہا۔

"پمی! تم چاہے کہیں بھی جاؤ میری محبت تمہیں پھر میری جانب
کھینچ لاتی رہے گی۔ یقین مانو ہم ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔"
نے جواب میں ایک کھنکتا ہوا قہقہہ لگایا ——— "یا دوسرے
لفظوں میں تم یہ کہتے ہو راج کے تمہارے سوا مجھے کوئی اپنا نہ سکے گا۔ اگر
یہ سمجھتے ہو تو یہ تمہاری بڑی بھول ہے۔ ہم کسی رومانی کہانی یا کسی
ناول کے کردار نہیں۔ یہ جیتی جاگتی دنیا ہے راج! میری مانو تم بھی بہت
جلد کسی دوسری لڑکی سے شادی کر لو۔ بھول جاؤ مجھے ———" پھر
اس نے غور سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "اور اگر تمہیں یہ خوش فہمی
ہے کہ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی تو دیکھ لینا ——— تتیش سے
شادی کر کے میں کتنی خوش رہوں گی۔ میرا انتخاب غلط نہیں ہو سکتا!"

میں نے دیکھا اس کے رخسار اوس میں بھیگے ہوئے گلاب کی
طرح شاداب تھے اور شعلے کے مانند دہک بھی رہے تھے ——— میں
نے افسردگی سے کہا۔ "آخر میں بھی تو تمہارا ہی انتخاب تھا!"

وہ لاجواب ہو گئی۔ پھر جھینپا جھینپا سا کھنکتا ہوا قہقہہ اس
کے گلابی ہونٹوں سے پھسل پڑا ——— اس نے اپنی راہ الگ کر لی۔
نئے ساتھی کو چنا۔ نئی منزلیں طے ہونے لگیں۔ میری بہاریں میری خوشیاں
چھین کر اس نے تتیش کی گود میں ڈال دیں۔ ایک عرصے بعد میں نے سنا
تتیش نے پرمیلا کو دھوکا دیا۔ اس نے پرمیلا سے زیادہ خوبصورت لڑکی
سے شادی کر لی۔ میں نے سنا کہ پرمیلا کو اس سے کافی صدمہ پہنچا۔ پھر
اس کی حالت معلوم نہ ہو سکی۔ انڈین آئرن اینڈ اسٹیل ورکس میں
ملازمت ملتے ہی میں بمبئی چلا گیا اور دو سال یوں بیت گئے جیسے ابھی
ابھی خواب سے آنکھیں کھلی ہوں یا دو دن پھر میں اپنے وطن ترقی پر بھیجا
گیا تھا۔ یہاں کی ایک سب برانچ سکندر آباد میں تھی جس کے انتظامات
میرے ہی ذمے تھے۔

کل شام دفتر کے قریب میں نے پرمیلا کو دیکھ کر کار روک دی
پتہ نہیں چل سکا کہ میں نے کس جذبے کے تحت اور کیوں روکی۔ پرمیلا
کو دیکھتے ہی بس ایسا محسوس ہوا جیسے میرے آگے راستہ بند ہو
مجھے رکنا چاہیے۔ غیر اختیاری طور پر بریک پر پیر دبتا چلا گیا اور کار
رکتی ہوئی کچھ دور تک پرمیلا کے ساتھ چلتی رہی اور پھر پرمیلا کے
کہتے ہی میں نے کار روک دی۔

"راج تم ———؟" اس کی نظروں میں استعجاب تھا اور آواز
میں جھجک تھی۔

"ہاں پمی ——— میں ——— کہو کیسی ہو؟"

اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے افسردگی کی پرچھائیں
نظر آئی۔ پھر ہلکی سی مسکراہٹ اس کے خوبصورت ہونٹوں پر پھیل گئی۔
"بس یونہی ہوں"۔ اس نے ترچھی نگاہیں کار پر ڈالتے ہوئے
مجھے دیکھا۔ "کار تو بہت شاندار ہے! شاید تمہاری ہی ہے؟"
"نہیں میری نہیں۔ میرے ایک دوست کی ہے۔" مجھے خود
حیرت ہوئی کہ یہ بیساختہ جھوٹ میرے منہ سے کیسے نکل گیا۔
"آؤ کسی کافی ہاؤس میں بیٹھ کر باتیں کریں۔" میں اس کا ہاتھ
تھام کر کار کی طرف بڑھا۔

وہ میرے ساتھ چلی آئی۔ پھر کافی ہاؤس میں بہت دیر تک
باتیں ہوتی رہیں۔ کالج کے زمانے کی باتیں، اپنی محبت کی، اپنی کشیدگی
کی باتیں اور پھر تتیش کی باتیں ——— تتیش کا نام آتے ہی میں نے
محسوس کیا جیسے میں نے اس کے زخم پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ اس کی نگاہوں میں
کرب اور اضطراب جھلکنے لگا جسے وہ چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔
پھر اس کی آنکھوں میں اطمینان جھلکنے لگا۔ وہ شاید کسی فیصلے پر پہنچ چکی
تھی۔ اس کی افسردگی، کرب اور بے چینی کی جگہ اطمینان، ٹھہراؤ اور
مسکراہٹ نے لے لی۔ جب میں نے اس کی ملازمت کے بارے میں
پوچھا تو کہنے لگی۔ "انڈین آئرن اینڈ اسٹیل ورکس کی سکندر آباد سب
برانچ میں اسٹینو ہوں۔ فی الحال تو اچھی گزر رہی ہے۔"

میں چونک پڑا۔ میرے چونکنے کا اس نے کوئی نوٹس نہیں لیا اور
اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ہاں تم سناؤ راج! ضرور کسی اچھی سی
اونچی پوسٹ پر ہو گے ——— کیوں؟"

میں نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ "نہیں پمی! ابھی تو بیکار
ہوں۔ دیکھیں آگے کیا ہوتا ہے ——— ہاں سنا ہے تمہارے منیجر
صاحب کوئی نئے آئے ہیں۔ کیا یہ سچ ہے؟"

"ہاں۔ تمہارے ہم نام ایک مسٹر راج کمار ہیں۔ میں نے ابھی تک
انہیں دیکھا تو نہیں ہے۔ کیونکہ میرا برانچ حیدرآباد جانا بہت کم ہوتا ہے
لیکن راج! یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

میں نے پھر نظریں چراتے ہوئے جواب دیا۔ "میں نے بھی اسی
فرم میں درخواست دی تھی۔ ایک دوست نے بتایا تھا کہ منیجر کا تبادلہ
ہو گیا ہے۔"

اور پھر ہم دوسرے تیسرے دن ملتے رہے۔ میں اس سے پھر قریب
ہوتا گیا۔ پھولوں کی مہک پھر میرے دامن میں مہکنے لگی اور کافی ہاؤس
ہماری ملاقات کا مستقل ذریعہ بن گیا۔ ایک دن عجیب بات ہوئی۔ میں

نہیں جانتا تھا کہ وہ اب بھی مجھے ناپسند کرتی ہے۔ جب کبھی میں اس کے قریب ہوتا تو اس کی آنکھوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا وہ دل کی گہرائیوں سے مجھے چاہتی ہے لیکن یہ میری غلط فہمی تھی۔ ایک دن بہت دیر تک ہم ساتھ رہے۔ پکچر سے واپسی پر میں نے اپنا دل پھر اس کے قدموں پر رکھ دیا۔ اس سے کہا کہ ہم جیون ساتھی بن جائیں ——— وہ بہت دیر تک خاموشی کے اتھاہ سمندر میں ڈوبی رہی۔ میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور وہ ناخن سے میز کا گوشہ کرید رہی تھی اور آنکھیں ناخن پر جمی تھیں۔ اس کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ عجیب کشمکش سے دوچار ہے۔ دماغ میں جیسے ہزاروں خیالات گھوم رہے ہوں۔ اس نے نگاہیں اوپر اٹھائیں۔ دو متضاد جذبوں کی پرچھائیاں اس کی آنکھوں میں لہرا رہی تھیں۔ ایک مجھ سے ناپسندیدگی کی اور دوسری مجھ سے محبت کی۔ اس کی نگاہوں میں کرب و اضطراب نے پھر انگڑائی لی لیکن دوسرے ہی لمحے کسی فیصلے کی قطعیت نے اسے پُرسکون کر دیا۔ اس نے نظریں جھکالیں۔

"راج! اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ "راج! ——— میں ——— میں مجبور ہوں۔"

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا کہ یہ پریلا ہی ہے جو مجھ سے مخاطب ہے۔

"کیوں پمی! آخر کیوں؟" میرے احساسِ شکست نے مجھ میں جھنجھلاہٹ پیدا کر دی۔ میں نہیں سوچ سکتا تھا کہ کوئی ایسی مجبوری بھی ہے جو اس کی راہ میں حائل ہو سکتی ہے لیکن دفعتاً اس کی آواز میرے کانوں میں گونج اٹھی۔ اس وقت جبکہ وہ پہلی بار مجھے ٹھکرا رہی تھی......

"تم یہ کہتے ہو راج کہ تمہارے سوا مجھے کوئی اپنا نہیں سکے گا؟ اگر تم یہ سمجھتے ہو تو یہ تمہاری بڑی بھول ہے۔"

پریلا نے اسی طرح ناخن سے میز کا گوشہ کریدتے ہوئے کہا "شاید تم نہیں جانتے راج! لیکن ——— لیکن آج میں حقیقت کے اظہار پر مجبور ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ حقیقت کے اظہار سے تمہارا دل ہی نہ ٹوٹ جائیگا بلکہ شاید تم مجھ سے نفرت بھی کرنے لگو گے۔ یہ بات تو تم جانتے ہو کہ ہماری برانچ کے نئے منیجر تمہارے ہم نام ہیں؟"

میری نگاہیں سوالیہ انداز میں اس پر جمی تھیں "ہاں کیوں؟"

"شاید وہ اور میں بہت جلد ایک دوسرے کے ہو جائیں گے۔"

میرے ہاتھ سے سگریٹ چھوٹ گیا اور میں بوکھلا کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ کیا اسے اس بات کا علم ہو چکا ہے کہ میں برانچ کا نیا منیجر ہوں۔ کیا یہ مجھ سے مذاق کر رہی ہے؟ کیا یہ مجھے بتانا چاہتی تھی کہ میرا مجبورٹ اس پر کھل چکا ہے۔ اس صورت میں وہ میری درخواست کو قبول کر رہی تھی لیکن میری سمجھ میں یہ نہ آیا کہ اسے کس طرح یہ علم ہوا کہ میں ہی برانچ کا نیا منیجر ہوں۔ میری بوکھلاہٹ کا اس نے کوئی اثر نہیں لیا۔

"آج سے ہم دوست ہیں راج!" اس نے جھکی ہوئی نظروں سے کہا "صرف دوست! اور شادی کی بات تم کبھی زبان پر نہ لاؤ گے۔"

میرا دماغ ماؤف سا ہو گیا۔ اس نے پہلی بات میں مجھ سے شادی کا اقرار کیا ہے اور اب حکم ہے کہ شادی کی بات زبان پر نہ لانا۔ اس کا مطلب؟ کیا یہ سب کچھ اداکاری تو نہیں؟ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"پرمی! میری طرف دیکھو۔"

اس نے نگاہیں اوپر اٹھائیں۔ میں اُن خوبصورت آنکھوں میں ڈوب گیا جن میں تصنع کا شائبہ تک نہ تھا۔

"جو کچھ تم کہہ رہی ہو پمی! کیا یہ تمہارے دل کی آواز ہے؟"

"راج!" اس نے رندھی ہوئی آواز سے کہا۔ "اگر تم میری بھلائی چاہتے ہو تو مجھے پریشان نہ کرو۔ میں نے کہا نا کہ آج سے "صرف" دوست ہیں اور کچھ نہیں!" وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور مجھے یونہی اندھیروں میں بھٹکتا چھوڑ کر چلی گئی۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ پریلا کا اس سے کیا مطلب ہے؟ کیا وہ مجھے اپنی جھوٹی محبت کی داستانیں سنانا چاہتی ہے مگر کیوں؟ وہ میرے لیے ایک پہیلی بنی جا رہی تھی عجیب اور ناقابلِ فہم!

جب پھر اس سے ملاقات ہوئی تو وہ بہت خوش تھی۔ پرانی کشیدگی کو اس نے بھلا دیا تھا۔ بلکی نیلی ساڑھی میں وہ سچ مچ ایک خوبصورت گڑیا معلوم ہو رہی تھی۔ جب میں نے اس کے حسن کی تعریف کی تو ایک شرمیلی مسکراہٹ اس کے گلابی ہونٹوں پر رقص کرنے لگی۔ اس کی لانبی پلکیں رخساروں پر جھک گئیں۔

اس نے معصومیت سے پوچھا "کیا تم سچ کہتے ہو؟ یہ ساڑھی مجھ پر اچھی معلوم ہوتی ہے؟"

میں نے مسکرا کر کہا "اگر میری بات کا یقین نہ ہو تو اپنے منیجر صاحب سے پوچھ لو۔"

اس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ رنگ پھیکا پڑ گیا۔ پھر نظریں جھکا کر آہستہ سے بولی "یہ انہی کی تو انتخاب ہے۔"

میرے دماغ پر جیسے ہتھوڑے برسنے لگے۔ اف ظالم! تو نے تو جھوٹی محبت کے لیے انتخاب بھی کیا تو کیسی شخصیت کا۔ مجھے یقین آگیا کہ اُسے اس بات کا علم نہیں کہ میں ہی اس برانچ کا منیجر ہوں!

لیکن ابھی تک یہ معمہ ہی تھا کہ آخر پرمیلا کا اس سے کیا مطلب ہے۔

پھر ہر دوسرے تیسرے دن تحفے دکھائے جانے لگے کبھی ٹیگور صاحب نے خوبصورت کلائی کی گھڑی تحفتاً دی ہے تو کبھی ڈیزائن کا لاجواب ہار اور کبھی بیش قیمت انگوٹھی۔ میری عجیب سی کیفیت ہو گئی تھی۔ ان دنوں کبھی کبھی تو مجھے پرمیلا کے کردار پر شک ہونے لگتا اور کبھی بے انتہا غصہ آتا ——— آخر مجھے کچھ نہ سوجھی تو میں نے اس کا ٹرانسفر اپنے برانچ آفس میں کر دیا تاکہ اُسے اپنے جھوٹ کا احساس ہو جائے۔

جس دن اسے ڈیوٹی جوائن کرنی تھی میں معمول سے پہلے ہی دفتر آ گیا۔ گھڑی پر نظر ڈالی تو ساڑھے نو بج رہے تھے۔ اس کا وقت دس بجے سے تھا۔ میں روزانہ کی فائلیں دیکھنے لگا لیکن کام میں بالکل دل نہیں لگ رہا تھا۔ جی چاہتا تھا ابھی دس بج جائیں۔ اور پرمیلا جوائننگ رپورٹ لے کر میرے کمرے میں داخل ہو۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس کا رد عمل پرمیلا پر کیا ہوگا۔

انتظار کے لمحے بہت تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ وقت تھا کہ جیسے رُک گیا ہو۔ بہت دیر کے بعد گھڑی کے کانٹوں نے اس بات کا احساس دلایا کہ ——— دس بج چکے ہیں ——— دو تین بار سیکشن آفیسر آ کر بھی چلے گئے۔ ہر بار جب بھی چپراسی اندر آتا، میں سمجھتا تھا کہ پرمیلا آ گئی ہے آخر ساڑھے دس بجے کے قریب چپراسی نے اطلاع دی کہ کوئی مس صاحب آئی ہیں۔ میں نے اس سے اندر بھیج دینے کے لیے کہہ دیا۔ آہٹ کی آواز کے ساتھ ہی میں نے نظریں اوپر اٹھائیں۔ سامنے پرمیلا کھڑی تھی۔ نظریں چار ہوتے ہی جیسے اسے سکتہ ہو گیا۔ آنکھوں میں حیرت، احساسِ جرم بے بسی اور بے چارگی کے ملے جلے جذبات تھے۔ رپورٹ اس کے ہاتھ سے چھوٹ پڑی اور کاغذ ہوا میں جھولتا ہوا فرش پر جا گرا۔

"آؤ بیٹھو۔ پرمی۔ اوہ سوری! مس پرمیلا!" میں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ "شاید جوائننگ رپورٹ دینے آئی ہو!"

"راجا تم؟" مجھے محسوس ہوا جیسے اس کی آواز کسی گہرے کنوئیں سے آ رہی ہے۔

یکایک ایک تیز سسکی کی آواز ابھری اور وہ دوسرے ہی لمحے دروازے کے باہر تھی اور میں فرش پر پڑے کاغذ کو دیکھتا رہ گیا۔

دوسرے دن مجھے اس کا استعفیٰ ملا اور ساتھ ہی ایک خط۔ میں نے لفافہ چاک کیا۔ لکھا تھا ———

"راج!

تم شاید مجھ سے نفرت کرنے لگے ہو۔ شاید میرے کردار کے بارے میں بھی تمہیں شک پیدا ہو چکا ہے۔ لیکن یقین کرو کہ پرمیلا اس میں کوئی قصور نہیں۔ میں تمہیں چاہتی ہوں اور بے انتہا چاہتی ہوں۔ میری آنکھیں اسی وقت کھل چکی تھیں جب ستیش نے مجھے ٹھکرا دیا اور میری خودداری زخمی ہو گئی تھی لیکن تمہارا یہ جملہ مجھے ہمیشہ ستاتا رہا، جو تم نے اس وقت کہا تھا، جب میں نے ستیش کو اپنایا تھا "تم کسی کی ہو ہی نہیں سکتیں پرمی! تم چاہے کہیں بھی جاؤ میری محبت تمہیں پھر میری جانب کھینچ لائے گی" اپنے پیار کا کتنا یقین ہے تمہیں۔ کتنا عزم پوشیدہ ہے اس جملے میں لیکن یہی جملہ بار بار مجھے میری شکست کا یقین دلاتا رہا۔

راج! شاید تم عورت کی نفسیات سے واقف نہیں ہو۔ ایک خود دار عورت کی انا اور خودداری جب زخمی ہوتی ہے تو وہ پاگل ہو جاتی ہے۔ میری جھوٹی انا نے مجھے ہمیشہ اس سے باز رکھا کہ میں تم سے اپنی دلی کیفیت بیان کر سکوں۔ میں نے تمہیں اپنی جھوٹی محبت کے قصے صرف اس لیے سنائے کہ تم میں احساسِ شکست ہو اور میری زخمی انا کو تسکین ملے لیکن مجھے پتہ نہ تھا کہ ہماری برانچ کے آفیسر کی حیثیت سے تم ہی آ چکے ہو ورنہ تمہیں میرا یہ جھوٹا افسانہ سننا نہ پڑتا لیکن کسی نہ کسی سے محبت کی کہانی تمہیں ضرور سننی پڑتی۔ لیکن اب جبکہ تم نے میری جھوٹی محبت کا نقاب الٹ دیا ہے۔ میرا دل اسے گوارا نہیں کرتا کہ میں تمہارا سامنا کروں اس لیے میں اس شہر سے جا رہی ہوں۔ ہمیشہ کے لیے۔ بھگوان کرے تم خوش رہو۔ اگر گوارا کر سکو تو آخری بار تمہیں آج شام چھ بجے اسٹیشن پر دیکھ لوں۔

معاف کر سکو تو تمہاری

پرمیلا

شام کو میں جب اسٹیشن پر پہنچا تو وہ میری منتظر تھی۔ آنکھیں کافی سوجی ہوئی اور سُرخ تھیں۔ ٹرین آنے میں ابھی کافی وقت باقی تھا مجھ سے نگاہیں ملتے ہی اس کا سر جھک گیا اور آنکھیں نم ہو گئیں۔

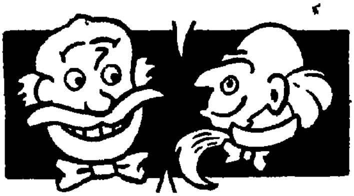
میں نے مسکرا کر کہا "پرمی! کیا مجھے پھر دہرانا پڑے گا کہ تم کسی کی ہو ہی نہیں سکتیں۔ تم چاہے کہیں بھی جاؤ میری محبت تمہیں پھر میری جانب کھینچ لائے گی ——— یقین مانو۔ ہم ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے!"

"راج!" اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ "راج! کیا تم مجھے معاف نہ کرو گے؟"

"صرف اسی صورت میں" میں نے کہا "جب تم شہر چھوڑ دینے کا ارادہ ترک کر دو!"

وہ مسکرا دی اور میں نے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

ریاض مرزا



تکلف برطرف

آپ اس عنوان کے تحت سیاسی، علمی، ادبی، معاشرتی اور ثقافتی نوعیت کے سوالات بھیج سکتے ہیں۔ سوالات بھیجتے وقت تین باتوں کا خیال رکھیں (۱) زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیجے جائیں جن میں سے دو منتخب سوالوں کا جواب شائع کیا جائے گا۔ (۲) سوالات دلچسپ، مختصر اور خوشخط لکھے ہوئے ہوں، (۳) تہذیب و اخلاق سے گرے ہوئے سوالات نہ بھیجے جائیں۔ (ادارہ)

ریحانہ ناز۔ مکلی ٹھٹھہ (سندھ)

س:۔ مجھے مثالی بیوی بننے کے لئے کیا کرنا چاہیئے؟

ج:۔ اپنی خواہشات میں توازن اور فرائض میں مستعدی کا ثبوت دیجئے۔ ایک نئی نویلی دلہن اور اس کا نوجوان شوہر اڑتالیس گھنٹے سے ایک کمرے میں بند تھے۔ آخر نوجوان نے اپنی نئی دلہن سے کہا: "آؤ پیاری۔ ذرا باہر نکلیں" دلہن نے لگاوٹ سے پوچھا: "کیا دو ہی دن میں مجھ سے جی بھر گیا ہے؟" نوجوان بولا: "نہیں ڈارلنگ یہ بات نہیں ہمیں کبھی کبھی کھانا بھی کھا لینا چاہیئے۔"

سجاد خاور۔ سکھر

س:۔ آپ کیسی مونچھیں پسند کرتے ہیں؟

ج:۔ یہ تو بیویوں کی برداشت پر منحصر ہے۔

س:۔ سسرال کا مطلب؟

ج:۔ داماد کے لئے مفتوحہ علاقہ اور بہو کے لئے کڑا امتحان۔

نگہت یاسمین۔ ملتان

س:۔ مرد پر آزمائش کا دور کب شروع ہوتا ہے؟

ج:۔ جب اس کی اپنی بیٹی جوان ہو جاتی ہے۔

س:۔ وہ کون ہے جو آج تک نہیں رویا۔

ج:۔ خدا اور شیطان

لیاقت علی۔ سرگودھا

س:۔ حسن کو پہچاننے کا طریقہ؟

ج:۔ میک اپ کے نت نئے ساز و سامان نے یہ کام اب خاصا مشکل کر دیا ہے۔ کچھ لوگوں کی کوشش سے ایک اندھے کی شادی ہو گئی۔ سہاگ رات کو اس کی دلہن نے اس سے کہا: "کاش تمہاری آنکھیں ہوتیں اور تم میرا حسن دیکھ سکتے تو تمہیں اپنی قسمت پر ناز ہوتا۔" اندھے نے جواب دیا: "نیک بخت اگر تم واقعی حسین ہوتیں تو بھلا آنکھوں والے تمہیں میرے لئے کیوں چھوڑ دیتے۔"

عبدالغفار سولنگی۔ حیدر آباد

س:۔ مردوں کو جنت میں حوریں ملیں گی۔ عورتوں کو کیا ملے گا؟

ج:۔ کتابوں میں حوروں کے ساتھ غلاموں کا ذکر بھی تو ہے!

س:۔ اچھے انسان کی پہچان؟

ج:۔ وہ خود بھی جیتا ہے اور دوسروں کو بھی جینے دیتا ہے۔

نثار احمد۔ کوئٹہ

س:۔ اگر دنیا میں پانی نہ ہوتا تو؟

ج:۔ تو پھر آپ خالص دودھ پیتے۔

س:۔ اجنبیوں پر رعب گانٹھنے کا کوئی آسان طریقہ بتائیے۔
ج:۔ انگریزوں کے لہجے میں غلط اردو بولئے۔ آپ کی مادری برتری کا رعب گٹھ جائے گا۔

محمد ارشد کاظمی۔ الدمام سعودی عربیہ

س:۔ اس شعر میں کہاں تک حقیقت ہے۔
ع محبت کرنے والوں کے نرالے کھیل ہوتے ہیں
نتیجہ جب نکلتا ہے تو عاشق فیل ہوتے ہیں
ج:۔ حقیقت نہیں یہ شعر تو سراسر حقیقت ہے۔
س:۔ میری محبوبہ نشانی دے کر بے وفائی کر گئی ہے — ! کیا کروں؟
ج:۔ تازہ نشانی کو اس گودام میں ڈال دیں جہاں آپ نے پہلی نشانیاں جمع کر رکھی ہیں۔ پھر نئی عشقیہ مہم کے لئے کمربستہ ہو جائیں۔

صادق علی۔ لاہور

س:۔ عشق انتہا پر ہو تو کیا کیفیت ہوتی ہے؟
ج:۔ آدمی غذا اور دوا دونوں سے بے زار ہو جاتا ہے۔
س:۔ لوگ مجھے دیوانہ سمجھتے ہیں مجھے کیا کرنا چاہیئے؟
ج:۔ جمہوریت کا دور ہے۔ رائے عامہ کا احترام کیجئے۔

محمد ایوب پردیسی۔ کراچی

س:۔ دنیا میں سب سے خوبصورت شے کونسی ہے؟
ج:۔ پسند اپنی اپنی۔

ایک بیوی نے اپنے شوہر سے کہا "تم بہت خوبصورت ہو۔ کاش تم گھڑی کا پنڈولم ہوتے تو میں تمہیں اپنے دل میں لٹکائے رکھتی" شوہر نے ٹھنڈی سانس بھر کر جواب دیا۔ "ہاں بیگم تم بھی بہت حسین ہو۔ کاش تم ڈائری ہوتیں اور میں ہر سال اسے بدل دیا کرتا"

ایم اے قلندرانی۔ لسبیلہ

س:۔ آج کل کسی کو سچی اور پاک محبت پر یقین کیوں نہیں آتا؟
ج:۔ ملاوٹ کا زمانہ ہے۔ سچ اور جھوٹ میں امتیاز کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ ایک نوجوان عاشق نے اپنی محبوبہ کو آخری دھمکی دی اس نے کہا "دیکھو اگر تم نے مجھ سے شادی نہ کی اور میری پاک محبت کا یقین نہ کیا تو میں خودکشی کر لوں گا" محبوبہ گھبرا گئی۔ خوف زدہ لہجے میں بولی "کیا واقعی —؟"

عاشق نے مستقل مزاجی سے جوش میں جواب دیا "یہ میرا ہمیشہ کا اصول ہے اور ایسے موقعوں پر میں ہمیشہ یہی کرتا آیا ہوں"

ملک فضل دین۔ الانڈھی۔ کراچی

س:۔ لڑکی شرماتی کیوں ہے؟
ج:۔ تاکہ لڑکے میں اخلاقی جرأت پیدا ہو۔
س:۔ اگر محبت کا کاروبار بند ہو جائے تو؟
ج:۔ محبت کا کاروبار تو مجنوں کی وفات کے بعد ہی بند ہو گیا تھا اب تو محبت کا لیبل لگا کر یار لوگ ہوس کا کاروبار چلاتے ہیں۔

عبدالعزیز۔ راولپنڈی

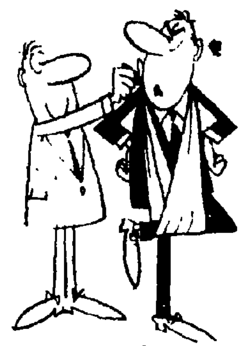
س:۔ اگر میاں بیوی دل سے ایک دوسرے کو نہ چاہتے ہوں تو؟
ج:۔ طلاق دینے سے قبل دونوں کے اختلافات کی وجہ معلوم کرنی چاہیئے۔ ایک بیوی کو شکایت تھی کہ میرے شوہر کو اچھا کھانا پکانا نہیں آتا۔ دوسرے رات کو مجھے سونے نہیں دیتے۔ شوہر نے اعتراض کیا کہ میں نے اس سے کہا کہ میں پرانے انداز کی محبت چاہتا ہوں تو اس نے اپنی نانی سے ملوا دیا اور سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ میری بیوی کی یادداشت بہت واہیات ہے اسے ہر بات یاد رہتی ہے۔

شجاع الدین۔ گجرات

س:۔ کہتے ہیں عورت ایک معمہ ہے اس معمہ کا حل کیا ہے؟
ج:۔ اوّل تو یہ معمہ ہے نہیں۔ اور اگر ہے بھی تو ایسا نہیں ہے کہ حل نہ ہو سکے۔ ایک بیگم صاحبہ کے بیان پر مردم شماری کے ایک افسر کو شبہ ہو گیا۔ اس نے بھویں سکیڑ کر بیگم صاحبہ سے کہا "آپ نے بتایا ہے کہ آپ کا ایک بچہ چار سال کا ہے اور دوسرا صرف دو سال کا۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی" بیگم صاحبہ نے کہا "کیوں؟" مردم شماری کا افسر بولا "اس لئے کہ آپ کے شوہر کو مرے ہوئے چھ سال ہو چکے ہیں" بیگم صاحبہ نے مسکرا کر کہا "شوہر مرے ہیں۔ میں تو ابھی زندہ ہوں"

ناصر علی۔ نواب شاہ

س:۔ پولیس والوں کی رشوتیں کیوں نہیں پکڑی جاتیں؟
ج:۔ اس لئے کہ ان کے خلاف گواہی دینے سے پہلے گواہ کی



غیاں میں سے ناجائز چرس برآمد کرکے اسے جیل بھجوادیا جاتا ہے۔

بدرالدین۔ لائل پور

س:۔ کچھ عرصہ بعد محبت بدمزہ کیوں ہو جاتی ہے؟

ج:۔ کثرتِ استعمال کی وجہ سے۔

س:۔ بعض عورتیں مردوں کو بے وقوف سمجھتی ہیں آخر کیوں؟

ج:۔ اس لئے کہ مرد ان کی سیدھی سادی بات نہیں سمجھ پاتے ایک صاحب رات کو تین بجے گھر پہنچے۔ نیند ان کی آنکھوں میں بھری ہوئی تھی لیکن کمرے میں پہنچتے ہی ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ان کی بیوی غیر مرد کی بانہوں میں سمائی ہوئی تھی۔ انہیں دیکھتے ہی بیوی برس پڑی "تمہیں پتہ نہیں اب رات کے تین بج رہے ہیں۔ کہاں تھے تم اب تک ــــ؟ آوارہ گرد کہیں کے!" ان صاحب نے لرزتی انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا "پہلے تم جواب دو۔ یہ تمہارے ساتھ کون آدمی ہے؟"

بیوی نے حقارت بھرے لہجے میں کہا "موضوع بدلنے کی کوشش نہ کرو۔"

الف اے۔ لاہور

س:۔ تصویر دیکھ کر بتایئے کیا میں بونگی ہوں؟

ج:۔ آپ تو پیکرِ حسن ہیں۔ مجھ میں اتنی جرات کہاں کہ آپ کو بونگی کہوں ــــ؟

سید معظم شاہ ہمدانی۔ کراچی

س:۔ وہ کونسی چیز ہے جو چلی جائے تو دوبارہ نہیں ملتی

ج:۔ زندگی! ایک نوجوان کسی خوبصورت لڑکی سے کرتا تھا۔ جب مسلسل ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا تو نے اپنی محبوبہ سے کہا "اگر تم مجھ سے یوں بے اعتنائی گی تو میں جان دے دوں گا" لڑکی نے اس پر توجہ نہ دی تو نوجوان نے واقعی اپنی جان دے دی ۔۔۔ سال بعد وہ مرگیا۔

س:۔ انسان کی سب سے بڑی کمزوری کیا ہے۔؟

ج:۔ کرسی۔

تنویر عالم زبیری۔ راولپنڈی

س:۔ اگر میاں اور بیوی گاڑی کے دو پہیے ہیں تو پھر بچے کیا

ج:۔ گاڑی کو دھکا لگانے والے۔

س:۔ عورت ایک ایسی ندی ہے جو دوسروں کی پیاس بجھاتی مگر خود پیاسی رہتی ہے آخر کیوں؟

ج:۔ پیاسی ندی وہ ہوتی ہے جو خشک ہو اور جو ندی خشک ہو وہ کسی کی پیاس نہیں بجھاتی۔

محمد رفیع۔ گوجرانوالہ

س:۔ میں بچپن سے بہت شرمیلا ہوں۔ اپنی گرل فرینڈ سے کچھ کہہ نہیں پاتا۔

ج:۔ ضروری تو نہیں کہ ہر بات کہی جائے۔ ایک نوجوان کی شرم سے اس کی محبوبہ تنگ آچکی تھی۔ ایک دن بہت ۔۔۔ اس نوجوان نے محبوبہ کو ایک پھول پیش کیا۔ محبوبہ نے خوشی سے بے قابو ہو کر اس کا رخسار چوم لیا۔ وہ نوجوان ایک دم کھڑا ہو گیا۔ لڑکی نے معذرت بھرے انداز میں کہا "ارے تم ناراض ہو گئے" نوجوان بولا "نہیں نہیں، میں تو اور پھول لینے جا رہا ہوں!"

خالد محمود۔ ہزارہ

س:۔ اگر میری محبوبہ مجھ سے ناراض ہو جائے تو؟

ج:۔ فوراً خودکشی کر لیں صبر آجائے گا۔ آزمودہ نسخہ ہے۔

س:۔ دنیا کسے کہتے ہیں؟

ج:۔ یہ مٹی کا ایک بہت بڑا گولہ ہوتا ہے جس کے تین چوتھائی حصے پر پانی بھرا ہوا ہے۔ اس کے کسی ایک چوتھائی ۔۔۔

میں بیٹھ کر آپ نے ہمیں یہ خط لکھا ہے۔

فرید احمد۔ میرپور خاص

س:۔ عشق کے معنی؟

ج:۔ دل و دماغ کی ویرانی۔

س:۔ اب تو میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہتا ہوں۔

ج:۔ پہلے کس کے پاؤں پر کھڑے ہوا کرتے تھے۔

شیخ حفیظ اللہ حسرت۔ ڈیرہ اسمٰعیل خاں

س:۔ جنہیں ہم بھولنا چاہیں وہ اکثر یاد آتے ہیں آخر کیوں؟

ج:۔ اسی لئے تو چچا غالب کہہ گئے ہیں کہ:۔

ع عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

س:۔ جس لڑکی سے میں پیار کرتا ہوں اسی سے میرا ایک دوست بھی پیار کرتا ہے۔ اب کیا ہوگا؟

ج:۔ آپ فکرمند نہ ہوں لڑکی آپ دونوں کا بینک بیلنس دیکھ کر خود ہی اس مشکل کا حل تلاش کرے گی۔

چوہدری ایم ایس طاہر۔ سیالکوٹ

س:۔ محبت کی تعریف۔

ج:۔ صحرانوردی کا دیباچہ۔

س:۔ حسین بے وفا کیوں ہوتے ہیں؟

ج:۔ منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے۔

نزہت نسرین۔ لاہور

س:۔ میری شادی کب ہوگی؟

ج:۔ موت کا ایک اور شادی کا کوئی وقت معین نہیں۔

س:۔ سب سے مشکل کام؟

ج:۔ سچ بولنا۔ ایک جماعت میں استاد نے کہا "ہم نے اپنا علاوہ شمار عربوں سے لئے، اپنی جنتری رومنوں سے لی۔ اپنا بنکاری کا نظام اطالویوں سے لیا۔ تم ہم کوئی اور مثال دے سکتے ہو؟"

"جی ہم نے اپنی استری رحمان صاحب سے لی اور جارجر مسز بیگ سے لی"

شکیل احمد۔ لاڑکانہ

س:۔ نصیحت کسے کرنی چاہیئے؟

ج:۔ اوّل تو آج کل نصیحت کاری سے ہر حال میں پرہیز کرنا چاہیئے

دعوت کے بعد

مہمان: (چھوٹی لڑکی سے) "آج کی دعوت میں بھلا تمہارا کیا کام؟"

لڑکی: "میرے ذمے دعوت کے بعد کی خدمت ہے۔"

مہمان: "وہ کیا؟"

لڑکی: "مہمانوں کے جانے کے بعد چمچے گننا۔"

لیکن اگر طبیعت بالکل ہی بے قابو ہو جائے تو اپنی ذات کو ہی مخاطب کر لینا چاہیئے۔ ایک بزرگ نے صبح اٹھنے کے فائدے اپنے بچے کے سامنے بیان کئے اور کہا کہ جو صبح ہی صبح اپنے گھونسلے سے نکلتا ہے۔ پیٹ بھرنے کے لئے کیڑے مکوڑے اس کو زیادہ ملتے ہیں۔ یہ سن کر بچہ ہنسا اور کہنے لگا "آپ نے یہ بھی سوچا کہ صبح ہی صبح باہر نکلنے کا انعام کیڑوں مکوڑوں کو کیا ملتا ہے؟"

شہر بانو سحر۔ پشاور

س:۔ میری ہونے والی ساس بہت گرم مزاج ہے بتلایئے میں کیا کروں؟

ج:۔ آپ اپنے ہونے والے فرمانبردار شوہر کے ذریعے شادی سے قبل ہی اس گھر کی کنجیاں منگوائیں تو آپ کی ساس کے مزاج کا درجہ حرارت خود بخود گر جائے گا۔ انشاء اللہ

س:۔ ضدی لڑکوں کا علاج؟

ج:۔ فرمائش کی تکمیل۔

عندلیب بھٹی۔ ٹنڈو الہ یار

س:۔ رات مایوسی کا نام ہے مگر پھر بھی ہر خوشی رات کو منائی جاتی ہے۔ کیوں؟

ج:۔ کیا آپ کی مراد ان خوشیوں سے ہے جو رات کو چھپ کر منائی جاتی ہیں؟

نظیرا نجم ابڑو۔ سندھ یونیورسٹی

س:۔ ہمارا معاشرہ محبت کو نفرت کی نگاہ سے کیوں دیکھتا ہے؟

ج:۔ اس لئے کہ اب محبت میں تین چوتھائی ہوس کی ملاوٹ ہونے لگی ہے۔

س:۔ محبت میں اگر آدمی ناکام ہو جائے تو اسے کیا کرنا چاہئے؟

ج:۔ ایسے موقعوں پر کسی منصوبہ بندی کی ضرورت نہیں پڑتی ناکامی کے بعد ٹھنڈی آہیں بھرنے اور ویرانوں میں گھومنے کا شغل خود بخود شروع ہو جاتا ہے۔

اسے ارخاں۔ گجرات

س:۔ "آ بیل مجھے مار" کا کیا مطلب ہے؟

ج:۔ اس کا مطلب ہے ترغیب، بلاوا اور دعوت۔ ایک لڑکی اور ایک لڑکا تنہائی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ لڑکا خلاؤں میں گھورتا رہا اور گہرے سانس لیتا رہا۔ جب بہت دیر اسی طرح گزر گئی اور رات ڈھلنے لگی تو لڑکی نے کہا "دیکھو تم نے اگر مجھے چومنے کی کوشش کی تو میں آواز دے کر اپنے بھائی کو بلالوں گی" لڑکے نے پوچھا "کتنا بڑا ہے تمہارا بھائی؟" لڑکی نے شرما کر جواب دیا "ابھی تو تین سال کا ہے"

شہناز فقیر۔ نوشہرہ کینٹ

س:۔ مردوں کو اتنے لمبے لمبے بال رکھنے کا فائدہ ۔۔۔؟

ج:۔ عورتوں کے جلوسوں میں بلا امتیاز شرکت کر سکتے ہیں

س:۔ زیادہ تر مرد باتونی ہوتے ہیں لیکن الزام عورتوں کو کیوں دیا جاتا ہے ۔۔۔؟

ج:۔ اب سارے الزام مرد ہی تو اپنے سر نہیں لے سکتا۔

شائستہ ناز، شازیہ ناز۔ کوئٹہ

س:۔ عورتیں شادی کے بعد بیگم سے بے غم ہو کر موٹی کیوں ہو جاتی ہیں۔؟

ج:۔ شادی کے بعد سارے غم شوہر کے حصے میں جو آتے ہیں۔

س:۔ جاسوسی کہانیاں پڑھنے سے کیا ہوتا ہے ۔۔۔؟

ج:۔ رات کاٹنے کے لئے ملازم رکھنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

سلیم اختر شہزاد۔ ڈیرہ غازیخان

س:۔ عورت فریب کیوں دیتی ہے۔؟

ج:۔ یہ آپ سے کس نے کہہ دیا۔ کبھی کسی ماں نے اپنے بیٹے کو فریب دیا ہے۔؟

س:۔ اگر کسی لڑکے کو کوئی دوشیزہ پسند آجائے تو اس کا END کیا ہوگا۔؟

ج:۔ لڑکا THE END

درشہوار مبینہ راجپوت۔ کراچی

س:۔ بے انتہا خوبصورت بولنے والا ایک دم ہی انگلش بولنے لگے تو ۔۔۔؟

ج:۔ پیار کے پانی سے آگ بجھانے کی کوشش کیجئے۔

س:۔ کوئی دل جلا پوچھے کہ میرے دل میں تو ہے تیرے دل میں کیا ہے۔؟ تو کیا جواب دینا چاہئے۔

ج:۔ فوراً رقیب کا نام لے لیں۔ چھٹکارہ مل جائے گا۔

کوثر بوبی۔ مردان

س:۔ انسان کو سب سے زیادہ اعتماد کس پر کرنا چاہئے۔؟

ج:۔ موجودہ دور میں انسان تو کیا جانوروں پر بھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ ایک مسافر بیابان سے گذر رہا تھا کہ اس نے دیکھا ایک کتا پیاس کے مارے تڑپ رہا ہے اس سے کتے کی یہ حالت دیکھی نہ گئی اس نے چھاگل کا آدھا پانی اسے پلادیا۔ وہ مسافر جب اٹھ کر چلنے لگا تو کتے نے بڑھ کر اسے کاٹ کھایا۔ تب اس نیک دل مسافر نے آنسو بھری آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھا اور کہا۔
"مولا! ب مجھے معلوم نہ تھا کہ تو نے کتے میں بھی انسانوں کی سی خصلت رکھی ہے"

فہمیدہ گل۔ نوشہرہ کینٹ

س:۔ دولت ۔۔۔ دولت ۔۔۔ ساری دنیا اسے اپنے دامن میں کیوں سمیٹنا چاہتی ہے۔؟

ج:۔ سنا ہے کہ بغیر دولت کے آدمی کا کوئی مقام نہیں ہے۔! ایک امیدوار سے انٹرویو کے وقت پوچھا گیا "کیا تمہارے غریب رشتہ دار ہیں"
امیدوار بولا "جی ہوں گے، لیکن میں نہیں جانتا" "تو پھر امیر رشتہ دار تو ہوں گے ہی" امیدوار نے مطمئن لہجے میں کہا "جی! ہوں گے مگر وہ مجھے نہیں جانتے"

س:۔ دنیا اتنی مفاد پرست کیوں بن گئی ہے۔؟

ج:۔ کیونکہ آج کل ملاوٹ کے بغیر کوئی چیز دستیاب نہیں۔!

آنسو اور انگارے

شوہر کو تپ دق تھی
اور وہ تنہائی کے مرض میں مبتلا تھی!
ایک مظلوم عورت کی سلگتی کہانی!

سمیع انور

کمرے میں رکھی اپلوں کی آگ سرد ہوتی جا رہی تھی۔ راکھ کے ڈھیر میں دبی ہوئی چنگاریاں امید کے دیوں کی طرح ٹمٹما رہی تھیں۔ باہر سرد ہواؤں کا سمندر سا امڈ رہا تھا اور وہ اپنے سر کو گھٹنوں میں دبائے ایک چھوٹے سے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی ــــــ دور کہیں ڈھولک کھنک رہی تھی۔ اور سریلے گانوں کی باریک آواز تاریک رات کے سناٹے کو چیرتی ہوئی اس کے کانوں سے ٹکرا رہی تھی ــــــ ہر آہٹ پر اس کا سر گھٹنوں کی گرفت سے آزاد ہو کر اوپر اٹھتا اور اس کی نگاہیں بند کواڑوں سے جا الجھتیں۔ پھر وہ اپنے سر کو گھٹنوں میں رکھ کر تو سے کو پیروں تلے دبائے بجھتی ہوئی چنگاریوں کو کریدنے لگتی۔

کریدنے سے چنگاریاں نہیں بھڑکتیں، مگر زخم تازہ ہو جاتے ہیں۔ ایسے زخم جن کو امیدوں کے پھائے بھی نہیں بھر سکتے ــــــ اس کی ساری زندگی زخم آلود ہو کر رہ گئی تھی یادوں کے زخموں سے بھرپور ــــــ یادیں ــــــ ہمیشہ تازہ رہنے والے زخم ــــــ جب کبھی کہیں ڈھولک کھنکتی، اس کے زخموں پر جمے ہوئے کھرنڈ اکھڑ جاتے۔ اور وہ ان زخموں سے رستے ہوئے مواد کو دیکھتی رہتی۔ اس کی منگنی پر بھی ڈھولک



تھی تھی۔ اس کی سہیلیوں نے بھی گانے گائے تھے۔

"لاڈو ہماری مہتاب سی ہے، چاند سا دہ برانگتی ہے!"

"گورے گورے ہاتھوں میں مہندی لگا کے ۔۔۔ نینوں میں کجرا ڈال کے ۔۔۔ چلی گوریا پیا سے ملنے ۔۔۔ چھوٹا سا گھونگھٹ نکال کے۔"

ان گانوں کو سن کر وہ اپنے جسم میں گدگدی محسوس کرتی تھی اور اس گدگداہٹ میں اس کو شرم اور لذت کا ایک انجان اور لطیف احساس ہوتا تھا ۔۔۔۔۔۔ وہ چاہتی کہ ڈھولک یونہی کھنکتی رہے ۔۔۔ جوانیاں یونہی گاتی رہیں اور گانے کا ہر بول اس کے جسم میں پیوست ہو جائے اور وہ ایک حسین اور مجسم نغمہ بن جائے۔ بعض اوقات یہ گدگداہٹ اس کی نس نس میں سما جاتی اور وہ تلملا اٹھتی۔ اور جب برداشت نہ کر سکتی تو قریب بیٹھی ہوئی کسی سہیلی کی بغل میں چٹکی بھر لیتی پھر وہ سوچتی کہ جمیل نے اپنے دل میں کیا سوچا ہوگا کہتی ہوگی کتنی بے شرم ہے۔

پھر جمیلہ بتاؤ! اس کی گول اور چکنی رانوں کو نوچتی جاتی اور کہتی ۔۔۔ "اپنے دولہا کی بغل میں چٹکیاں بھرنا بنو ۔۔۔ وہ تمہیں مزہ چکھائے گا۔ ہمارے پاس کیا رکھا ہے ۔۔۔"

نجمہ اس کی رانوں ہی کو نہیں، بلکہ پوری بوٹی نوچ ڈالتی اور وہ لوٹتے لوٹتے بے دم ہو جاتی اور یوں نڈھال ہو کر رہ جاتی، گویا اس کے جذبات کو تسکین حاصل ہو گئی ہو ور ہنستے ہوئے برا سا منہ بنا کر کہتی:

"نہیں نجمہ ۔۔۔ بھئی اتنا مذاق مت کیا کرو ۔۔۔"

جب اس کی ماں ان کی ہنسی مذاق کو سنتی تو دوسری عورتوں کے درمیان گھری بیٹھی وہیں سے چلاتی۔

"اری لڑکیو! گا رہی ہو یا دل لگیاں کر رہی ہو ۔۔۔"

پھر صحن میں سفید چاندنی پر بیٹھی نو عمر اور جوانی کے منہ لگی لڑکیوں کی ہنسی حلق میں پھنس کر رہ جاتی اور گمبھیر سناٹے میں ہی دیر تک صرف ڈھولک کی آواز گونجتی رہتی۔ اور پھر کوئی نیا گیت چھڑ جاتا۔ باہر ابھی تک ہوا بند تھی اور بے دم کواڑ جھول رہے تھے ڈھولک کی آواز تاریکی میں ڈوب چکی تھی۔ دور کہیں کتے بھونک رہے تھے۔ اور وہ گھٹنوں میں سر دبائے نئے گانے کے چھڑنے کا انتظار کر رہی تھی۔

اس کی ماں نے اپنی بیٹی ہی کی پسند سے اپنے داماد کا انتخاب کیا تھا ماں بھی یہی چاہتی تھی کہ بیٹی کی طرح داماد بھی خوبصورت اور تعلیم یافتہ ملے تاکہ وہ اپنے رشتہ داروں میں اپنا سر اونچا رکھ سکے اور کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ جب بیٹی جاہلوں ہی میں دینی تھی تو اتنا پڑھایا لکھایا کیوں تھا۔؟

اس کی ماں اکثر جان بوجھ کر اس کے سامنے جمیل کا تذکرہ چھیڑ دیتی اور وہ چھوئی موئی کا پیڑ بن کر رہ جاتی۔ اس وقت وہ سمٹی سمٹائی گردن جھکائے دوپٹے کے پلو کو مروڑتی رہتی۔ مگر دل میں میٹھے درد کو محسوس کرتی رہتی ۔۔۔ کانوں کی لویں سرخ ہو جائیں، چہرہ شرم کی تمازت سے تمتمانے لگتا اور رخساروں پر ڈوبتے ہوئے سورج کی لالی چھا جاتی۔ وہ کوشش کے باوجود اپنے حواس پر چھائے ہوئے شرم و حجاب کے احساس سے چھٹکارا پانے میں ہمیشہ ناکام رہتی اور منہ کو دوپٹے میں چھپا کر اپنے کمرے میں جا گھستی۔ تکیہ پر سر رکھ کر وہیں پلنگ پر ڈھیر ہو جاتی۔ اور اس کے جذبات آنسو بن کر آنکھوں سے چھلکنے لگتے۔ جب انسان خوشیوں پر قابو نہیں پا سکتا۔ تو اس کے دل میں رونے کی خواہش بے اختیار اجاگر ہو جاتی ہے۔ اس وقت نسیمہ کو ان ہی حالات سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ اور جب دل میں کلبلاتی خوشیوں کا طوفان تھم جاتا تو وہ نڈھال ہو کر اٹھتی۔ دوپٹے سے آنکھیں صاف کر کے گھر کے کام دھندے میں جٹ جاتی۔ منگنی کے بعد اس کی چال ڈھال اور رکھ رکھاؤ اور بات چیت میں ایک عجیب سی تبدیلی رونما ہونے لگی تھی۔ ماں سے آنکھ ملا کر بات کرنے تک سے اس کو جھجک محسوس ہوتی تھی۔ دروازوں کو زور سے بند کرنا اور برتن پٹک پٹک کر رکھنا وہ قطعاً بھول گئی تھی وہ کوشش کے باوجود زور سے نہ ہنس پاتی۔ اس کی ماں سوچتی اب نسیمہ کتنی سمجھدار ہو گئی ہے ۔۔۔۔۔۔ اور نسیمہ پریشان رہتی کہ میں اتنی کیوں بدل گئی ہوں۔ اس کی ہمجولیاں اور رشتہ کی بہنیں۔ ہر وقت اس سے ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ کرتی رہتیں۔ اس چھیڑ چھاڑ میں اس کو پر کیف سکون کا احساس ہوتا۔ وہ چاہتی کہ کوئی اس کو جمیل کا نام لے کر ہر دم ستاتا رہے مگر تنہائی میں جمیل کا خیال اس کے پرسکون ذہن کو جھنجھوڑ ڈالتا وہ بے چین ہو جاتی اور بستر پر پڑی کروٹیں بدلتی رہتی پھر بھی اس

کو قرار نصیب نہ ہوتا، تو کوئی کتاب اٹھا کر کے پڑھ جاتی۔ لیکن آس پاس کی چھتوں پر خوبصورت لڑکیوں کے ساتھ حسین چہرے دیکھ کر اس کی ذہنی بے چینی میں مزید اضافہ ہو جاتا۔ اور وہ سنجیدہ صورت بنائے ماں کے پاس آ بیٹھتی۔ ماں سے اس کی بے چینی ڈھکی چھپی نہ رہ سکتی تھی —— ماں اس کے سفید چہرے کو دیکھتی اور سینے سے لگا لیتی۔ اس وقت اس کا دل چاہتا کہ وہ ماں کے سینے سے لگی رونی رہے۔ مگر وہ صرف ماں کے دل کی دھڑکنیں ہی سن سکتی تھی — دھک —

دھک —— !

پڑوس میں کسی کا دروازہ کھٹکھٹائے جانے پر وہ ایک دم چونک پڑی اور ہڑبڑا کر اپنا دروازہ کھول کر باہر جھانکنے لگی لیکن وہاں تو کوئی بھی نہیں تھا۔ البتہ نورا کی ماں اس کی پڑوسن کو آوازیں دے رہی تھی۔

"فہیمن بوا —— اری فہیمن بوا —— اے ذرا جلدی چلو۔ دلہن کے درد اٹھ رہا ہے ——"

ہوا کا ایک تیز جھونکا اس کے جسم سے لپٹتا ہوا چلا گیا اور وہ کانپ اٹھی —— اور لرزتی ہوئی سرد آگ کے قریب آ بیٹھی —— باہر اس قدر سردی تھی کہ اس کا احساس منجمد ہو گیا۔ اور وہ اپنے پیروں کو راکھ پر رکھے پڑی دیر تک دانت کٹکٹاتی رہی —— جب سردی کا احساس ذرا کم ہوا تو پھر وہ سوچنے لگی۔ ڈھولک بدستور کھنک رہی تھی۔ اور تیز ہواؤں کے کاندھوں پر اڑتے ہوئے گانوں کے بول صاف سنائی دے رہے تھے۔

" ذرا نیچے جھک ملوں آ گیو —— بنے میری بنی ہے نادان!"

کل کی سی بات ہے۔ نورا کی شادی کو ابھی ایک سال بھی نہیں ہوا۔ اور آج اس کی بیوی کے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔ اس کو اب یاد بھی نہیں رہا تھا کہ اس کی شادی کب ہوئی تھی، کیونکر ہوئی تھی —— وہ شادی کو ایک حسین خواب سمجھے ہوئے تھی ایک ایسا خواب جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔ شادی کے دن وہ کتنی مسرور نظر آ رہی تھی —— دل میں عجیب عجیب امنگیں جنم لے رہی تھیں —— ذہن میں لطیف لطیف وسوسے اٹھ رہے تھے۔ جب وہ اپنے اجلے بدن کو دیکھتی تو ایک عجیب قسم کی خوشی کا احساس اس کے حواس پر چھا جاتا۔ اور وہ پاس بیٹھی ہوئی سہیلیوں اور

خوبصورت جھوٹ

ایک انسپکٹر آف اسکولز معائنے کے لیے ایک کلاس میں آئے۔ انہیں شکایت ملی تھی کہ اس اسکول کے لڑکے بہت جھوٹ بولتے ہیں۔ انھوں نے ایک لڑکے سے پوچھا "تم ایک خوب صورت جھوٹ بولو میں تمھیں پانچ روپے دوں گا۔"

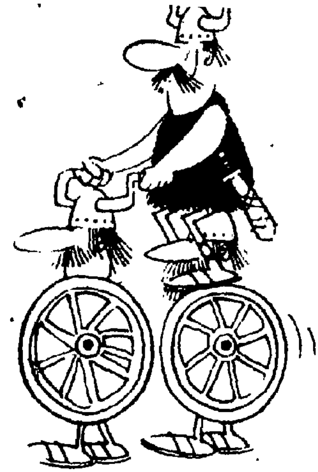
لڑکا بولا۔ "ابھی تو آپ نے کہا تھا دس روپے دوں گا۔ اب آپ پانچ روپے کہہ رہے ہیں۔"

رشتہ کی بہنوں کا خیال کر کے سمٹ کر رہ جاتی۔

ماں سے رخصت ہوتے وقت اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے جنم جنم کے رشتے ٹوٹ رہے ہیں اور یہ سوچ کر کہ اب میں پرائی ہو گئی ہوں اس کا دل ڈوبنے لگا تھا۔ اس دل شکنی کے باوجود اس کے دل میں انجان خوشیوں کا جم غفیر جمع ہونے لگا تھا۔ اور وہ روتے ہوئے پرائے گھر جانے کو تیار ہو گئی تھی۔

اجنبی ماحول میں غیریت کا احساس ہوتے ہوئے بھی اس کے دل کی دھڑکنیں نہ جانے کیوں تیز تر ہو چلی تھیں۔ اور وہ سر نہوڑے بیٹھی کنکھیوں سے ادھر ادھر دیکھ کر اس گھڑی کی بے چینی سے منتظر تھی۔ جب نئے رشتے جڑتے ہیں۔ انتظار کے ساتھ ساتھ نت نئے خدشے اور عجیب عجیب وسوسے سوالیہ نشان بنے قطار در قطار اس کے ذہن میں ابھرتے رہے تھے۔ اور آخر کار وہ گھڑی بھی آن پہنچی تھی جس کے لیے وہ مدتوں سے منتظر تھی۔ اور اس گھڑی کے گزر جانے کے بعد اس کا ذہن بالکل ہلکا ہو گیا تھا اور تمام سوالیہ نشان حرف غلط کی طرح مٹ چکے تھے۔ وہ بڑی دیر تک اپنی ہمجولیوں کو برا بھلا کہتی رہی جنہوں نے اس کو کس قدر خوفزدہ کر دیا تھا۔

سیکنڈ، منٹ، مہینے اور سال تو وقت کے میکانکی لعاد و شمار ہیں جو قطعی طور پر موثر نہیں ہوتے۔ لیکن سفید بال اور جھریاں گزرے ہوئے وقت کی ایسی علامتیں ہیں جن سے وقت کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ نسیمہ بھی گزرے ہوئے وقت کے ساتھی



نشانات سے اثر انداز ہو چکی تھی ـــــ بالوں پر سفیدی چھا جانے کے ساتھ ساتھ چہرے پر ماضی کے نقوش اس طرح ابھرنے لگے تھے۔ گویا ٹھہرے ہوئے پانی میں کنکری ڈال دی ہو۔ نسیمہ نے سینکڑوں راتیں اسی طرح بیٹھے بیٹھے گزاری تھیں۔ کتنی ہی راتوں کی سیاہی میں وہ سینکڑوں زخم کرید چکی تھی ـــــ " یادوں کے زخم، حسین ماضی کے زخم اور اس نے ان زخموں کو کرید کرید کر اپنے جسم میں ناسور پیدا کر لیا تھا ـــــ اور جب وہ اپنی ہجولیوں کے متعلق سوچتی تو اس ناسور میں ٹیس محسوس کرنے لگتی، زخم گہرے ہو جاتے، جھریاں اور ابھر آتیں۔ اس کی تمام سہیلیاں اب تک۔ پرائی ہو چکی تھیں اور بھرے پرے گھروں کی مالک بنی بیٹھی تھیں۔

پچھلی عید کے موقع پر اتفاق سے نجمہ اس کی طرف آنکلی تھی تو پرانے زخم پھر سے تازہ ہو گئے تھے۔ نجمہ اس کی حالت دیکھ کر رو پڑی تھی اور بھرائی ہوئی آواز میں کتنی مایوسی سے پوچھا تھا۔

" اری نسیمہ، یہ تجھے کیا ہو گیا ہے ؟ "

اس ذرا سے جملے میں کتنا درد نہاں تھا، کتنی بہاریں پوشیدہ تھیں، کتنے ہی ارمان دم توڑ رہے تھے۔ کتنی حسرتیں مچل رہی تھیں۔ لیکن نسیمہ جواب دینے کے بجائے دور خلا میں گھورتی رہی تھی جیسے کہیں گم ہو گئی ہو ـــــ جیسے نجمہ نے سوال کسی اور سے کیا ہو ـــــ اس وقت اس کا سارا وجود سمٹ کر ہوا کا ایسا بگولہ بن گیا تھا جو افق کی طرف بڑھ رہا تھا ـــــ " اور دور افق کے پار ـــــ اس کی بڑی بڑی اور بے نور آنکھوں سے درد کی چند بوندیں بھی نہ ٹپک سکی تھیں۔ مگر نجمہ روتی رہی اور وہ نجمہ کو دیکھتی رہی تھی ـــــ وہ نجمہ کو کیونکر بتاتی کہ اس کی امیدوں کے محل مسمار ہو چکے ہیں۔ اس کی شوخی، اس کا شباب اور اس کی جوانی آنسوؤں میں ڈھل چکے ہیں۔ اس کا سب کچھ آنسو بن کر بہہ گیا ہے ـــــ وہ اپنے شوہر کی برائیاں کس زبان سے کرتی۔ وہ دوسروں پر اپنے سرتاج کے عیب کیونکر عیاں کرتی۔ وہ کس منہ سے بتاتی کہ اس کا شوہر شرابی ہے۔ اس کا سرمایۂ حیات جواری ہے، اس کا مجازی خدا آوارہ ہے اگر وہ ایسا کرتی تو زمین نہ پھٹ جاتی، اس کی زبان نہ کھینچ لی جاتی اس کو جہنم کی آگ میں نہ جلنا پڑتا ـــــ اس کے حلق میں سانپ بچھو نہ بھر دیئے جاتے ـــــ وہ اپنی جان پر جھیلی ہوئی اذیتوں کا ذکر اپنی ماں تک سے کرتے ہوئے ہچکچاتی تھی ـــــ وہ تو جیتے جی اپنی ماں کو تج چکی تھی ـــــ اب اس سے اس کا رشتہ ہی نہ رہا تھا۔ اس نے اس گھر میں قدم رکھتے وقت اپنی ماں کے کہے ہوئے الفاظ دہرائے تھے۔

" جہاں بیٹی کا ڈولا جاتا ہے وہاں سے اس کا جنازہ ہی نکلتا اچھا لگتا ہے ـــــ "

رات اس کی جوانی کی طرح بڈھی ہو چکی تھی ـــــ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سردی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ راکھ کے ڈھیر میں دبی ہوئی چنگاریاں دم توڑ چکی تھیں مگر اس کے دل میں دبی ہوئی یادوں کے شعلے بھڑک رہے تھے ـــــ دور کہیں کتے اب بھی بھونک رہے تھے ـــــ کتوں کی آوازوں کے مدھم شور کے ساتھ "جاگتے رہو ـــــ " کی صدا اس کو ابھی تک آس بندھائے ہوئے تھی۔

" آج ان کو اتنی دیر کیوں ہو گئی ـــــ میرا دل ـــــ خدایا رحم کر ـــــ "

اس نے کواڑوں کی جھری میں سے نیلے آسمان کی طرف دیکھا ـــــ وہاں بھی تاریکی چھائی تھی۔ شاید تارے بھی جھلملاتی ہوئی ہواؤں کے خوف سے کہیں دبک گئے تھے ـــــ اس

کی نگاہیں آسمان کی طرف سے واپس مڑیں تو لمبی لمبی انگلیوں اور گوری گوری خالی کلائیوں میں الجھ کر رہ گئیں ——— جب وہ دلہن بنی تھی، تب یہ انگلیاں اور کلائیاں کتنی خوبصورت معلوم ہو رہی تھیں ——— نہ جانے وہ کونسی منحوس گھڑی تھی جب اس نے ساس سسر سے علیحدگی اختیار کی تھی۔ اس کو کیا معلوم تھا کہ یہ علیحدگی اتنی مہنگی پڑے گی مگر وہ کرتی بھی کیا ——— اس کو تو اپنے آقا کے حکم کے آگے سر جھکانا سکھایا گیا تھا۔ اب تو شوہر کی خدمت کرنا ہی اس کا ایمان تھا۔ جمیل اچھا تھا یا برا، وہی اس کا سب کچھ تھا ——— وہی اس کا دیوتا تھا، وہی اس کا خدا تھا۔ ——— اس کی خدمت ہی اس کے لیے راہ نجات تھی۔ لہٰذا وہ دن رات محنت کرتی اور اپنی مشقت کا محنتانہ بخوشی اسی دیوتا کی نذر کر دیتی ——— اس سے اس کے جذبات کو تسکین اور دل کو قرار میسر آتا۔ ساس سسر نے لاکھ چاہا کہ وہ جمیل کو چھوڑ کر ان کے ساتھ رہے یا جمیل کو لے کر ہی ان کے ساتھ رہنے لگے ——— چونکہ دونوں صورتوں میں جمیل اس کے ساتھ نہ رہ سکتا تھا۔ لہٰذا وہ بخوشی مصیبتیں جھیلتی رہی۔ اس نے ساس سسر کی مالی امداد کو بھی ٹھکرا دیا۔ اس نے آج تک اپنے شوہر کو ان احسانات کی قسم دے کر گمراہی سے فرار حاصل کرنے کی تلقین بھی نہیں کی تھی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ جمیل اس کے مشورے کو کس طرح قبول کرے گا۔

پڑوس میں کھانستے ہوئے تپ دق کے مریض دینو کی کھانسی کے دورے نے اس کے خیالات کی باگ سنبھال لی۔ اس کے دل میں دینو کے لیے ہمدردی کا طوفان امڈ آیا۔ اور وہ اس کی بیوی کو برا بھلا کہنے لگی ——— دینو اس کو روز مارتا تھا ——— آخرکار تنگ آ کر وہ اپنی ماں کے پاس چلی گئی تھی اور وہ اب اکیلا پڑا ایڑیاں رگڑا کرتا تھا۔ لیکن وہ جمیل کو چھوڑ کر کہاں چلی جاتی ——— اب اس کے پاس رہ ہی کیا گیا تھا۔ اس نے اپنی ساری زندگی، اپنی تمام رعنائیاں اپنی سب خوشیاں تو جمیل سے وابستہ کر رکھی تھیں ——— اور جمیل اپنی بیوی کا اتنا اثاثہ شراب میں ڈبو کر بھی صحیح راہ پر نہ لگ سکا تھا ——— اگر جمیل کی جگہ کوئی پتھر دل انسان بھی ہوتا تو نسیمہ کی سالہا سال کی شوہر پرستی اس کو کبھی کا موم بنا دیتی ——— مگر جمیل نہ جانے کونسی مٹی کا بنا تھا۔

عجیب

ایک مجسٹریٹ ملزم کی غلط بیانی سے جب تنگ آ گیا تو اس نے ملزم سے کہا: "تمہیں معلوم ہے کہ تم نے سچ بیان دینے کی قسم کھائی تھی۔"

ملزم نے جواب دیا: "جی حضور مجھے معلوم ہے۔"

مجسٹریٹ نے کہا: "اور تم یہ جانتے ہو کہ غلط بیانی کا کیا نتیجہ نکلے گا؟"

ملزم نے کہا: "جی حضور جانتا ہوں کہ مقدمہ جیت جاؤں گا۔"

بیوی تو اس کی زندگی میں سد راہ تھی۔ ماں باپ سے الگ ہو کر بھی وہ اس زندگی سے مطمئن نہیں تھا۔ وہ کب چاہتا تھا کہ ایسی شوہر پرست بیوی ملے ——— جب رات کی تاریکی میں اس پر تمام دروازے بند ہو جاتے تو وہ چند گھنٹے غم غلط کرنے کے لیے نسیمہ پر دست درازی کی خاطر اس کی مضطرب مگر پرسکون زندگی کو تہہ و بالا کرنے آ دھمکتا مگر نسیمہ بھی کتنی نادان تھی ——— وہ ان چند لمحوں کے تکلیف دہ اور اذیت ناک قرب کے لیے گھنٹوں بے کل رہتی ——— اس کو کیا معلوم تھا کہ والدین سے علیحدگی اختیار کرنے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ جمیل اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرنا چاہتا تھا ——— بلکہ اس میں ایک راز مضمر تھا۔ اور وہ اس راز کو سمجھتے ہوئے بھی ابھی تک ناسمجھ بنی ہوئی تھی۔ نازو نعم میں پلے بڑھے، جمیل کی زندگی کا رخ تو جوانی کی دہلیز پھلانگتے ہی بدل گیا تھا۔ نوجوانی ہی میں دوستوں کی چھوٹی چھوٹی صحبتوں میں فلش اور رمی کے دوران ہلکی چسکیاں لگانے کا وہ عادی ہو گیا تھا ——— شراب کے بغیر یہ کھیل اس کے نزدیک قطعاً ناجائز تھا ——— اس کی بے راہ روی اس کے والدین سے پوشیدہ نہیں تھی۔ البتہ نسیمہ کی ماں کی تجربہ کار دوراندیشی نے آج تک ایسی ٹھوکر نہیں کھائی تھی ——— جمیل کے والدین کے لیے بھی اپنا مستقبل سنوارنے

کے لیے شادی کا جوا ہی آخری حربہ تھا۔ مگر اس بازی میں تاش ان کا ساتھ نہ دے سکے ـــــ اب تو وہ بھی اپنی ناقص عقل پر پچھتا رہے تھے۔ اور جمیل ان کے لیے کبھی کا مر چکا تھا۔

ویزو کی بیوی کے ساتھ اس کو جمالو کا بھی خیال آگیا۔ وہ اپنے شرابی شوہر سے پریشان ہو کر اپنے پڑوسی کے ساتھ بھاگ گئی تھی ـــــ وہ اپنے شوہر کو چھوڑ کر کہاں جاتی ـــــ اس کی ماں نے زمانہ میں رسوائی سے بچنے کی خاطر اسے اپنے پاس بلانے سے انکار کر دیا تھا۔ اور اب وہ اس سے ملنے بھی نہ آتی تھی۔ ساری عمر تو اتنی اذیتیں اٹھاتے گزر گئی۔ کیا وہ بھی جمالو بن جائے۔ راکھ میں دبی ہوئی چنگاری ایک دم چمک اٹھی ـــــ جمالو چلی گئی تو محلہ والوں نے اس کا کیا بگاڑ لیا۔ اس کے ماں باپ کے اوپر کس نے انگلی اٹھائی اگر وہ بھی چلی جائے تو ـــــ اس نے اپنے جسم میں کپکپی محسوس کی ـــــ سالہا سال کی شوہر پرستی اس کے سامنے کھڑی کانپ رہی تھی ـــــ اس نے اپنی پیٹھ کی طرف بنی ہوئی کھڑکی کی طرف کنکھیوں سے دیکھا۔ کھڑکی بند تھی۔ مگر اسی کھڑکی کے سامنے ہی تو نتھو حلوائی کے لڑکے کلن کی کوٹھڑی ہے ـــــ جس کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا ہے۔

"نسیمہ! یہ تجھے کیا ہو رہا ہے ـــــ ؟" کسی نے ں کو جھنجھوڑا۔

"تو پھر میں کیا کروں ـــــ یہ بھی کوئی زندگی ہے؟"

"جہاں تو نے اتنی زندگی گزاری، تھوڑے دن اور سہی ـــــ" کسی نے اس کو بڑی نرمی سے سمجھایا۔

"یہ تھوڑے دن ہی تو نہیں کٹتے ـــــ" اس کی وازمیں درد پنہاں تھا۔ ٹیسیں تھیں، کرب تھا ـــــ اور ہ پھر سوچنے لگی۔ کلن جمالو کو ایسی نگاہوں سے گھورتا تھا یسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کھا جائے گا ـــــ اور ایک ے لینے دروازے پر کھڑا کسی سے کہہ رہا تھا۔

"یار دیکھا جمالو کو ـــــ بھاگی بھی تو کس پھکڑ کے تھ ـــــ جو سالا چند دنوں کے بعد اس کو بیچ کھائے گا۔"

پھر جمالو میرے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھی ـــــ جمالو ت کی کوٹھڑی کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا ہے ـــــ تو کیا میں ـــــ بدنامی نے جمالو کا کیا بگاڑ لیا ـــــ تو شریف سے آرام اور خوشی سب کو پیارے ہوتے ہیں ـــــ ہاں آرام، آسائش ـــــ مجھے کیا ملا ـــــ دروازہ ہر وقت کھلا رہتا ہے۔ کلن جمالو کو چاہتا تھا ـــــ مجھے ـــــ جمالو ـــــ خیالات اس کے ذہن کو کھرچتے رہے۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اور پھر وہ سوچنے لگی ـــــ جمالو میرے مقابلہ میں تو کچھ بھی نہیں تھی ـــــ اور وہ کانپ اٹھی۔

دروازے پر مسلسل دستک کی آواز سن کر اس کا رواں رواں کھڑا ہو گیا اور وہ دوڑ کر دروازے پر پہنچ گئی ـــــ دروازہ کھولتے ہی گالیوں کی بوچھاڑ نے اس کے نرم دل کو اور مجروح کر دیا اور وہ گالیوں کی پروا کیے بغیر جمیل کو اپنی کمزور باہوں میں سنبھالتے ہوئے کہنے لگی۔

"آپ اس نامراد کو چھوڑ کیوں نہیں دیتے ـــــ؟"

اس جملے میں اتنی کسک تھی گویا اس کے کریدے ہوئے تمام زخموں کا درد اس میں سمٹ آیا ہے اور اس کو سینے سے لگا کر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی ـــــ لیکن وہ بڑبڑاتا رہا ـــــ

"دور ہو جا میری نظروں سے ـــــ حرامزادی! تو نے میری زندگی برباد کر دی ـــــ میرا سکھ چین چھین لیا۔ میں تجھ سے نفرت کرتا ہوں ـــــ نفرت ـــــ آ تو ... ..."

سرد ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا، اور وہ سردی کے مارے لرز اٹھا ـــــ نسیمہ نے اسے بھینچ لیا ـــــ جمالو مر گئی ـــــ دینو کی بیوی واپس آگئی ـــــ جمیل کی آواز مدھم ہوتی گئی ـــــ میں ـــــ میں تم سے ... ..."

نسیمہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپک کر توے میں رکھی ہوئی راکھ پر گرا ـــــ چھن کی آواز ہوئی ـــــ اور جمیل اس کی گود میں سما گیا ـــــ دور کہیں گھمبیر سناٹے میں ڈھولک اب بھی کھنک رہی تھی ـــــ!



روحانی ڈاک



کشف وکرامات اولیائے کرام کا خاصہ ہے۔ جو کبھی کبھی بزرگانِ دین کے مبارک توسط سے اللہ کے نیک بندوں کو اس کے لطف وکرم کے صدقے میں عطا ہو جاتا ہے۔

بابا سید شان احمد صاحب

کا شمار بھی انہی برگزیدہ ہستیوں میں ہے جنھیں روحانی انعام و اکرام سے نوازا گیا اور اس کا منہ بولتا ثبوت حقیقت حال سے متعلق وہ اہم پیش گوئیاں ہیں جو بذریعہ کشف تجلی کی صورت میں ان پر ظاہر ہوتی رہیں۔ باباجی شادی بیاہ، مقدمات، محبت میں کامیابی یا ناکامی، مالی مشکلات اور اولاد وغیرہ سے متعلق آپ کے سوالات کے جوابات بذریعہ کشف دینے پر رضامند ہو گئے ہیں اور وہ پلک جھپکتے میں آپکے حال اور مستقبل کے تانے بانے میں جھانک کر فوراً خدا لگتی کہہ دیں گے۔ صرف ضرورت ہے اس نام کی جس سے آپ زیادہ پکارے اور پہچانے جاتے ہیں اور اس کے ساتھ آپ کی والدہ محترمہ کا نام، عمر اور مقام پیدائش۔ آپ ایک وقت میں صرف دو سوال کر سکتے ہیں۔ جوابات کے لیے جوابی لفافہ بھیجنا ضروری ہے۔ باباجی کے جوابات کا کوئی نذرانہ نہیں ہے۔

خط لکھنے کا پتہ

روحانی ڈاک

ماہنامہ دوشیزہ پوسٹ بکس ۸۹۵
کراچی ۲۹

بحث و نظر
ترتیب: آغا نذیر کاوش

عریانی! فحاشی! بیحیائی!

یہ وہ لفظ ہے
جس کا ہماری معاشرتی زندگی میں
کوئی مانوس مفہوم نہیں ہے!



آپ نے "دوشیزہ" میں "بحث و نظر" کے تحت اہم مسائل پر اپنے قارئین کی رائے معلوم کرنے اور دوسرے قارئین کو اس رائے سے مستفید کرنے کے لیے واقعی ایک مفید سلسلہ شروع کیا ہے۔

بلاشبہ "عریانی فحاشی اور بے حیائی" ایک خطرناک وبا ہے جو تیزی سے ہمارے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے۔ لیکن اس کے لیے ہم صرف نئی نسل کو مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتے۔ سوال یہ ہے کہ نئی نسل کو اس نہج پر پہنچانے والا کون ہے؟ عدالتیں بھی ملزموں کے خلاف الزامات پر غور کرتی ہیں تو ان حالات کا جائزہ ضرور لیتی ہیں جن میں بیشتر جرائم سرزد ہوا ہے۔ اس سلسلے میں ان حالات کا بھی ضرور جائزہ لینا چاہیے جن کی وجہ سے نئی نسل میں بے حیائی یا عریانیت پسندی کا رجحان فروغ پا رہا ہے۔ حالات بدل دیئے جائیں تو عریانی اور بے حیائی کا خود بخود خاتمہ ہو جائے گا۔

اس سلسلے میں ابلاغ عامہ کے ذرائع مالی منفعت کی خاطر سب سے زیادہ مہلک کردار ادا کر رہے ہیں۔ فلموں میں عریانی اور فحاشی کا عنصر

بہت نمایاں ہوتا ہے۔ ٹی وی والے بھی اشتہارات میں عورتوں کو ایسے انداز میں پیش کرتے ہیں جس سے عریانی کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔

اس کے بعد ایسے والدین کا نمبر آتا ہے جو شام ہوتے ہی نیم عریاں لباس پہننا اور غیر ملکی خوشبوؤں کو اپنے بدن پر چھڑکنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ بچوں کو گھروں پر چھوڑ کر رقص گاہوں، کلبوں اور ہوٹلوں کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔ بچے گھروں میں تنہائی کی اذیت برداشت کرتے ہیں جس سے ان کے دلوں میں اپنے ماں باپ اور اپنے معاشرے کے خلاف بغاوت کے جذبات بیدار ہونے لگتے ہیں۔ ماں باپ کے پیار سے محروم رہنے والے یہ بچے بڑے ہو کر عیش پرستی میں اپنے ماں باپ سے بھی آگے نکل جاتے ہیں۔ جن بچوں کے والدین کلبوں میں داد عیش دے کر نصف شب کے بعد نشے میں دھت گھروں کو واپس آتے ہیں اور پھر اگلے روز گیارہ بارہ بجے تک بستروں میں نیند پوری کرتے ہیں۔ وہ بچے صبح جلد اٹھنے کے عادی کس طرح بن سکتے ہیں۔ اس طرح ماں باپ کی بُری عادات ان کے بچوں کے لیے وقت کی بربادی اور ذہنی آوارگی کا محرک بنتی ہیں۔

تیسری چیز ہے مذہب سے بیگانگی۔ مذہب ہمیں صاف اور پاکیزہ زندگی بسر کرنے کی تلقین کرتا ہے لیکن اس دور میں ایک حلقہ مذہب کے خلاف مسلسل پروپیگنڈہ کر رہا ہے۔ مذہب اور مذہب کے اصولوں پر چلنے والوں کو قدامت پسند اور رجعت پسند کہا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ بھی اسی لئے کیا جا رہا ہے کہ لوگ مذہب سے دور رہیں۔ مذہب سے دور ہوں گے تو شرم و حیا، صفائی، پاکیزگی اور اخلاقی ذمہ داریوں سے خود بخود مبرا ہو جائیں گے جس کے نتیجے میں عریانی، فحاشی اور بے حیائی کو قدم جمانے کے لئے میدان خالی مل جائے گا۔

جیسا کہ میں اوپر کہہ چکی ہوں نئی نسل کے لئے پرانی نسل کے لوگوں نے ایسے حالات پیدا کر رکھے ہیں کہ یہ نسل بے حیائی اختیار کرنے پر مجبور ہو گئی ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ نئی نسل کو دراصل پرانی نسل نے بے حیا بنایا ہے۔ نئی نسل کو بُرا بھلا کہنے سے حالات درست نہیں ہو سکتے۔ برائیاں تب دور ہوں گی جب موجودہ حالات کے خلاف آواز بلند کی جائے گی۔ ذرائع ابلاغ عامہ پر جو لوگ قابض ہیں ان کا محاسبہ کیا جائے۔ والدین کو اپنی روش بدلنے پر مجبور کیا جائے۔ لوگوں میں مذہب کا احترام پیدا کیا جائے۔ جب تک معاشرے کے ذمہ دار اصحاب اس طرح نہیں سوچیں گے بے حیائی اور عریانیت پسندی کا خاتمہ نہیں ہوگا۔

[illegible]

میں ستمبر کے شمارے میں بحث و نظر کے تحت "عریانی فحاشی اور بے حیائی" کے سلسلے میں شائع ہونے والے مضامین خاصے شوق سے پڑھے۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ اس بحث میں حصہ لینے والی خواتین و حضرات نئی نسل یا پرانی نسل کو مورد الزام ٹھہرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میرے خیال میں یہ ایک علمی مسئلہ ہے۔ اسے ہم سماجی مسئلہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس لیے کہ اس کا تعلق ہمارے معاشرے کے افراد کی عملی زندگی سے ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ "جنس" (SEX) کو ہمارے ملک میں حجاب بنا کر رکھ دیا گیا ہے حالانکہ جس طرح دوسرے معاملات زندگی کے بارے میں معلومات فراہم کرنا صاحبان اختیار کی ذمہ داری ہے اسی طرح جنسی معلومات یا سیکس ایجوکیشن بھی اتنی ہی ضروری ہے۔ ہمارے یہاں ایک لڑکی کو شادی سے قبل یہ تک پتہ نہیں ہوتا کہ "ازدواجی زندگی" میں جنسی اختلاط بھی شامل ہے۔ چنانچہ شادی کی پہلی شب میں اکثر لڑکیوں کا طرز عمل نارمل نہیں ہوتا۔ میری ناقص رائے یہ ہے کہ اگر ہمیں جماعت ہائی/کالجوں میں سیکس کو اگر ایک مضمون کی حیثیت سے نصاب میں شامل کر دیا جائے تو بہت سی غیر ضروری الجھنیں خود بخود ختم ہو جائیں گی۔ پھر شاید جنسی معاملات پر گفتگو یا جنسی تسکین کے عملی پہلوؤں پر انسان کے فطری رد عمل کو اس طرح معیوب نہیں سمجھا جائے گا جس طرح آج کل سمجھا جاتا ہے۔ یورپ اور دوسرے ممالک میں سیکس ایجوکیشن مدت سے رائج ہے اور وہ لوگ اسے فطری زندگی کا ایک جزو سمجھتے ہیں۔ اس ضمن میں یہ عرض کرتا چلوں کہ جنس اور جنس سے متعلقہ موضوعات پر میں چند کتابیں تحریر کر چکا ہوں جن میں ایک کتاب "جنس ہونے کا پھیر" خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ یہ کتاب انگریزی کتاب ——

[illegible]

کا ترجمہ ہے جس میں جنس کے مختلف پہلوؤں پر سنجیدگی اور شائستگی سے قیمتی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

[illegible]

آپ کے موقر جریدے میں "فحاشی، عریانی اور بے حیائی" کے

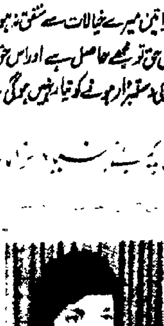
موضوع پر جو بحث چل رہی ہے اس کا میں نے بغور مطالعہ کیا فروری اور مارچ کے پرچے میرے سامنے ہیں۔ ان پرچوں میں جن خواتین و حضرات نے بزعم خویش نئی نسل کے خلاف زہر اگلا ہے ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں، بدرالحسن صاحب، مسرت جہاں صاحبہ، رضوی رشید صاحب، محمد اشرف خان صاحب، قاسم خان صاحب، فرخ صبیم بابر صاحبہ، محمد ظریف صاحب اور نزہت رئیس صاحبہ۔

ان میں سے زیادہ تر وہ خواتین و حضرات ہیں جو کالجوں اور یونیورسٹیوں سے وابستہ ہیں۔ اس لیے میں توقع رکھتی تھی کہ کم از کم ان کے خیالات و آرا میں معقولیت اور استدلال کا پہلو نمایاں ہوگا۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ ان کے پاس بھی سطحی اور کھوکھلی باتوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اگر ماہنامہ دوشیزہ کی پالیسی آزاد اور غیر جانبدارانہ ہے تو مجھے امید ہے کہ آپ میرے اس خط کو ضرور شائع کریں گے۔ میں پوری کوشش کروں گی کہ اپنے خیالات ادب اور تہذیب کے دائرے میں رہ کر بیان کروں۔ گفتگو علمی، معاشرتی اور تہذیبی نوعیت کی ہے۔ اس لیے میں دوسروں سے بھی یہی توقع رکھوں گی کہ میرا یہ خط پڑھ کر جو لوگ یا نہ ہوں اور جواب میں تہذیب سے گرا ہوا لہجہ اختیار نہ کریں۔

اصل سوال یہ ہے کہ "عریانی، فحاشی اور بے حیائی" کا مفہوم کیا ہے؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا یہ چیزیں پاکستان کے معاشرے میں حقیقتاً موجود ہیں یا صرف فرض کر لی گئی ہیں؟ اور محض مفروضہ چیزوں پر سلے دے ہو رہی ہے؟ میں تو یا نہ حرمن کرتی ہوں کہ مذکورہ بالا خواتین و حضرات نے ان دو بنیادی سوالوں کا جواب دینے سے پہلو تہی کی ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ چونکہ کالجوں میں لڑکے اور لڑکیاں آزادی سے میٹھ کر باتیں کرنے لگے ہیں۔ اس لیے ہمارے معاشرے میں بے حیائی پھیل رہی ہے۔ کسی کا ارشاد ہے کہ لڑکیاں بے پردہ ہو گئی ہیں۔ ملبوسات میں نئے نئے فیشن اختیار کرنے لگی ہیں۔ سینما دیکھنے لگی ہیں۔ اس لیے ہمارے معاشرے میں فحاشی، عریانی اور بے حیائی موجود ہے۔ بعض تو بڑی دور کی کوڑی لاتے ہیں۔ فرماتے ہیں چونکہ لڑکیاں اور لڑکے اب اپنی پسند سے شادی کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں اس لیے انہیں عریانیت پسند اور بے حیا سمجھنا چاہیے۔

یہ باتیں کس قدر کھوکھلی، بے جان اور سطحی ہیں۔ ان سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ ہمارا معاشرہ یا ہماری نئی نسل فحاشی، عریانی اور بے حیائی کی طرف مائل ہے۔ البتہ یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ آج کی لڑکیاں (آج کی عورت) بہتر شعور کی مالک ہیں۔ وہ مردوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ انہیں اب بنیادی انسانی حقوق سے محروم نہیں رکھا جا سکتا۔ وہ اپنی مرضی اور اپنی آزاد رائے اور پسند کے مطابق جینا چاہتی ہیں۔ وہ قومی و ملکی امور میں اس طرح حصہ لینا چاہتی ہیں جس طرح مرد حصہ لیتے ہیں۔ انہیں اب گھروں کی فصیلوں میں مقید نہیں رکھا جا سکتا۔ شادی بیاہ کا معاملہ ہو یا معاشی آزادی کا۔ آج کی لڑکیاں زندگی کے جملہ شعبوں میں حق خود اختیاری طلب کرتی ہیں۔ یہ وہ بنیادی انسانی حقوق ہیں جو مغربی ممالک کی عورتیں سو دو سو برس پہلے حاصل کر چکی تھیں۔ پاکستان کے تنگ نظر حلقے انہیں آج بھی ان حقوق سے محروم رکھنا چاہتے ہیں۔ نئی نسل کی لڑکیاں اب یہ غلامی (خواہ اسے عریانی کی روک تھام کے نام پر قائم رکھنے کی کوشش کی جائے) ہرگز قبول نہیں کریں گی۔ پاکستان میں عریانی اور بے حیائی کا وجود ان معنوں میں نہیں ہے جن معنوں میں باور کرانے کی کوشش کی جا رہی ہے جس کے پیچھے اصل مقصد عورتوں کی آزادی اور ان کے بنیادی حقوق سلب کرنا ہے۔ ہو سکتا ہے بہت سے حضرات و خواتین میرے خیالات سے متفق نہ ہوں لیکن اختلاف رائے کا جمہوری حق تو مجھے حاصل ہے اور اس حق سے زمانے کی شاید کوئی بھی طاقت دستبردار ہونے کو تیار نہیں ہوگی۔

نئی نسل پر بے بنیاد الزامات ہیں



مارچ کے "دوشیزہ" میں جناب قاسم خان نے فرمایا ہے کہ نئی نسل عریانیت پسندی کی طرف مائل ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے جو دلیل پیش کی ہے وہ بہت کمزور ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ ہمارے ملک میں جو فلمیں زیادہ چلتی ہیں ان میں عریانیت اور فحاشی

ہوتی ہے۔ یہ فلمیں نئی نسل کے لوگ دیکھتے ہیں لہٰذا نئی نسل عریانیت پسند ہے۔ میں ان سے صرف یہ پوچھوں گا کہ "جہاں"، "آنائی"، "مغل" "چکوری" اور بہت سی دوسری فلمیں کیوں اس قدر کامیاب ہوئی ہیں جبکہ ان میں عریانی اور فحاشی نہیں تھی۔ لہٰذا ان کا یہ کہنا بے جا ہے کہ نئی نسل عریانیت کی سرپرستی کرتی ہے یا عریانیت کی طرف مائل ہے۔

عریاں فلمیں خاص قسم کا ذہن رکھنے والے لوگ دیکھتے ہیں اور ایسے بہت لوگ ہر معاشرے میں ہوتے ہیں۔ ان کی وجہ سے آپ پوری نئی نسل کو مورد الزام کس طرح ٹھہرا سکتے ہیں۔

اب رسائل کو لے لیں۔ سب رسالے تو عریاں یا فحش لٹریچر نہیں پیش کرتے۔ دوشیزہ، پاکیزہ، خواتین ڈائجسٹ، سب رنگ آپ کے سامنے ہیں۔ یہ سب رسالے بے حد مقبول ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ جب ان رسالوں میں عریاں یا فحش لٹریچر نہیں چھپتا تو پھر یہ کیوں مقبول ہیں؟ میں پھر عرض کروں گا کہ کچھ فلمی اور غیر فلمی رسالے ہیں جو عریانی اور فحاشی کی روٹی کھاتے ہیں۔ ان رسالوں کو صرف وہی لوگ پڑھتے ہیں جو ذہنی طور پر پست اور گھٹیا ہیں۔ پوری نئی نسل کے افراد اس بنا پر ملزم کس طرح بنایا جا سکتا ہے۔ اچھے اور برے لوگ ہر جگہ موجود ہیں۔ ساری نئی نسل بری نہیں ہے۔

[illegible]

پاکستان جیسے اسلامی ملک میں فحاشی، عریانی اور بے حیائی اس امر کی دلیل ہے کہ ملک اپنی نظریاتی اساس سے دور ہے جس کی وجہ سے قوم اپنے قول و فعل میں تضاد کا شکار ہے۔ اسی بنا پر ہماری قوم ایک پاک معاشرہ تشکیل دینے میں ناکام رہی۔ پاکستان میں اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ کیا ایک مسلم معاشرہ بے حیائی اور فحاشی کا متحمل ہو سکتا ہے؟ نہیں، ہرگز نہیں۔

نئی نسل پر اس صورت حال کی ذمہ داری عائد کرنا مناسب نہیں۔ درحقیقت اس کی ذمہ داری اقتدار اعلیٰ اور معاشرے کے ذمہ دار افراد پر عائد ہوتی ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ "نیک کام کی تلقین کرو اور برائی سے روکو"۔ سوال یہ ہے کہ برائی سے کون روکے؟ میرے خیال میں یہ فرض اقتدار اعلیٰ اور والدین پر عائد ہوتا ہے۔ یہ حکومت اور والدین کا کام ہے کہ وہ نئی نسل کی صحیح سمت میں رہنمائی کریں۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک افضل وہ ہے جو نیکی اور تقوے میں افضل ہو لیکن ہمارے معاشرے میں پیسے سے عزت ملتی ہے۔ جس میں سارے شرعی عیب ہوں۔ بے حیائی کو آزادی اور بہادری کہا جاتا ہے۔ جھوٹ اور فریب کو سیاسی سوجھ بوجھ قرار دیا جاتا ہے جہاں اخلاقی قدروں کا تعین اس طرح کیا جائے وہاں اخلاقی پستی کیوں نہیں ہوگی جو قوم اخلاقی اعتبار سے انحطاط پذیر ہوگی اس قوم میں بے حیائی اور فحاشی کا دور دورہ ہوگا۔ ان برائیوں کو ختم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ معاشرے میں اخلاقی قدروں کا احترام پیدا کیا جائے اور ایک صاف ستھرے پاکیزہ سماج کی تشکیل کی جائے۔ یہ ذمہ داری حکومت اور سماج کے زعما پر عاید ہوتی ہے۔ انہیں اپنی ذمہ داری کو پورا کرنا چاہیے۔

اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات پیش کرتا ہے۔ اگر ہماری قوم اسلامی اصولوں کو اپنا کر زندگی بسر کرنا شروع کرے تو معاشرے سے فحاشی اور بے حیائی خود بخود دور ہو جائے گی۔ ۱۹ مارچ کو تلاوت کے وقت میر جناب حمید نظامی نے قائد اعظم کے خطبات میں سے حسب ذیل اقتباس پیش کیا تھا۔

"قرآن پاک مسلمانوں کا ضابطہ حیات ہے۔ اس میں مذہبی، مجلسی، دیوانی، فوجداری، عسکری، تعزیری، معاشی اور معاشرتی غرضیکہ سب شعبوں کے لیے احکام موجود ہیں۔ مذہبی رسوم سے لے کر روزانہ امور حیات تک، روح کی نجات سے لے کر جسم کی صحت تک، جماعت کے حقوق سے لے کر فرد کے حقوق و فرائض تک، اخلاق سے لے کر انسداد جرائم تک۔ زندگی میں سزا و جزا سے لے کر عقبیٰ کی جزا و سزا تک یہ ہر فعل، ہر قول اور ہر حرکت پر مکمل احکامات کا مجموعہ ہے لہٰذا جب میں کہتا ہوں کہ مسلمان ایک قوم ہیں تو حیات و مابعد حیات کے ہر معیار اور ہر مقدار کے مطابق کہتا ہوں۔"

بدقسمتی سے بابائے قوم کو موت نے اتنی مہلت نہ دی کہ وہ ملک میں مندرجہ بالا تمام نافذ کر جاتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم مغربی سیاست اور مغربی طرز زندگی کو اپنے معاشرے پر نافذ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم اپنے مذہب کی تعلیمات سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے ہمارے معاشرے میں طرح طرح کی سماجی برائیاں پھیل رہی ہیں۔ میری درخواست یہ ہے کہ اگر ہم انفرادی اور اجتماعی طور پر اسلام کے سنہری اصول اپنا کر زندگی بسر کریں تو ہمارے معاشرے میں عریانی، فحاشی اور بے حیائی کا مکمل خاتمہ ہو جائے گا۔

میں (ماسح ۱۹۹۰) میں شگفتہ فرحت سے اتفاق کرتی ہوں کہ نئی نسل کو بگاڑنے میں ٹی وی فلم اور فحش لٹریچر کا بڑا ہاتھ ہے۔ آج جو کچھ بھی نئی نسل کر رہی ہے۔ صرف ٹی وی اور فلم کے نقش قدم پر چل رہی ہے۔ ٹی وی چونکہ ہر گھر میں ہے اور اس میں عریاں اشتہارات وغیرہ دکھائے جاتے ہیں۔ نئی نسل ٹی وی اور فلم میں جو کچھ دیکھتی ہے اسی پہ عمل کرتی ہے۔ آجکل ٹی وی اور فلم میں لڑکیوں کا دوپٹہ سر سے غائب ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب دوپٹہ صرف نام کا ہی رہ گیا ہے۔ اوّل تو سر سے ہی غائب ہوتا ہے اور اگر کسی نے ڈال بھی لیا تو ڈوری کے انداز میں نظر آئے گا اور پھر لباس بھی ایسا پہنا جاتا ہے کہ اعضاء نظر آئیں۔ جس میں غیر مردوں کی نظریں تعاقب کریں۔ نئی نسل بے انتہا بے حیائی کی طرف بڑھ چکی ہے۔ فلم اور ٹی وی تو خیر بگاڑتے ہیں۔ لیکن والدین بھی اگر اپنی لڑکیوں کو کنٹرول کریں تو بے حیائی اس طرح عام نہ ہو۔ در اصل آجکل والدین نے لڑکیوں کو کھلا چھوڑ دیا ہے۔ ٹی وی اور فلم اس سلسلے میں بڑا موثر کردار ادا کر سکتے ہیں۔ ٹی وی پہ اسلامی طرز زندگی سکھائی جائے۔ پردہ اور بے حیائی کے بارے میں بتایا جائے تاکہ کچھ تو خدا کا خوف ہو اور انہیں پتہ چلے کہ بے حیائی اور عریانی کا کیا انجام ہوتا ہے۔ افسوس کہ ہمارے ملک میں کوئی اسلامی رسالہ نہیں نکلتا (حالانکہ اسلامی ملک ہے) تاکہ اس کو پڑھ کر ہماری نئی نسل کے لوگ اسلامی احکام کو جان سکیں اور بے حیائی کو برا جانیں۔ اس وقت ہمارے ملک میں اسلامی رسالہ نکلنا چاہیئے تاکہ اس کو پڑھ کر روح کو تازگی ملے اور یہ جو بے حیائی عریانی فحاشی اور بے راہ روی پھیل رہی ہے اس کا کوئی سد باب ہو اور ہمارا ملک تو پھر اسلامی جمہوریہ پاکستان ہے۔ اس میں تو جتنے بھی سخت قانون بنیں اتنا ہی اچھا ہے۔

نئی نسل کی جنسی اظہار کی آزادی اور عریانی کی یلغار اسلامی نظریات سے سراسر بغاوت ہے۔ اسلامی معاشرہ میں مرد و عورت کے لیے

اللہ تعالیٰ نے واضح احکامات دیے ہیں۔ جدید بعض ہم بھائی اسے مرد کی غلامی کا نام دیتے ہیں۔ وہ یہ خیال کیوں نہیں رکھتے کہ اسلام تو آیا ہی اس لیے تھا کہ بندہ کو بندہ کی غلامی سے نجات دلا دے۔ معاشرتی زندگی میں جو اعتدال اسلام نے دکھائی ہے نہ اس سے قبل کی تاریخ نے بتائی ہے اور نہ ہی آج کا کوئی مدبر و مفکر پیش کر سکا ہے۔ یورپ کو ہی لیجئے وہاں معاشرتی زندگی کی مٹی پلید ہو رہی ہے۔ بچے خود کمائیں اور کھائیں بیوی ایک کی اور بانہوں میں دوسرے کی۔ ماں باپ بوڑھے ہو جائیں تو وہ تنہائیوں کے حوالے کر دیئے جائیں۔ فرض کیا عورت زندگی بھر مرد کے سارے فرائض و ذمہ داریاں نبھا سکے گی لیکن عورت کے فرائض کو کون پورا کرے گا۔ انسانی نسل کی بقا کیسے ہو سکے گی۔ عورت کی گود جہاں سے اقبال کے لفظوں میں دنیا کو انجام دینے ہوتے ہیں کسی کا پورا معاشرہ عورت کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔ آپ اسے باہر نکال کر بازاری مشین بنا دیں تو نئی پود کی پرورش اور صحیح تربیت کے لیے عورت کہاں سے آئے گی۔ یا تو ہم اپنے لیے اسلام کی بجائے الگ نظریۂ حیات منتخب کر لیں۔ پھر تو جو جی میں آئے کریں لیکن مسلمان قوم سے تعلق بھی رکھیں اور پاکستانی معاشرے پہ فخر بھی کریں تو پھر ہمیں یہ زیب نہیں دیتا کہ عریانی فحاشی اور جنسی انارکی کو ترقی یا عورت کی آزادی کے نام پہ مسلمانوں اور پاکستانیوں کے ذہنوں میں بھرتے جائیں۔ ہمارے یہاں کے ایک معاشرتی زندگی بھی تھی۔ اسے بھی یورپی انداز فکر بگاڑ رہا ہے۔ میں کہتا ہوں آپ اعلیٰ تعلیم ضرور حاصل کریں۔ شاپنگ ضرور کریں کاروبار یا سروس اپنائیں۔ اپنی پسند سے شادی کریں۔ ان باتوں سے اسلام آپ کو روکتا کب ہے۔ اسلام نے تو چند معاشرتی حدود مقرر کر رکھے ہیں۔ ان حدود سے جو معاشرے بھی تجاوز ہوں گے ان کا حشر ضرور خراب ہوگا۔

بے حیائی اور عریانی جس تیزی سے پھیل رہی ہے۔ اس سے آجکل تقریباً سارے ہی ملک متاثر ہو رہے ہیں۔ اس کا اگر بروقت سد باب نہ کیا گیا تو یہ سیلاب ہمیں بہا لے جائے گا۔ اس فحاشی اور عریانی کو پھیلانے میں سب سے نمایاں کردار فلموں نے ادا کیا ہے۔ دوسری طرف فحش رسالوں کی بھرمار ہے۔ والدین اور استادوں کی

ت بھی اس کا سبب ہے۔
اس ماہ کے شمارے میں (مارچ ۱۹۷۷ء) ثریا طلعت صاحبہ جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔ اری نوجوان نسل کے خیالات میں جو جاتنا دو رنا جاتو کے ذوق سے ن نا آشنا ہیں ــــ

اس عریانی کے سیلاب کو روکنے کے لیے ہمیں ٹھوس م اٹھانا چاہیئے۔ عریاں فلموں اور گندے فحش رسالوں کا بائیکاٹ نشیات پر پابندی، تعلیمی اداروں میں سادگی کی تلقین، والدین کا ض ہے کہ وہ اپنے بچوں کو فضول فیشن بالکل نہ کرنے دیں۔ ایسے ش کے لباس جن سے جسم کا زیادہ حصہ برہنہ ہوتا ہو۔ میں نے اکثر ں کو دیکھا ہے کہ وہ خود تو مکمل لباس میں اپنے جسم کو مکمل چھپائے ہوئے تی ہیں اور ان کے ساتھ جوان بیٹیاں ننگے پیٹ اور آستین کے بغیر ز پہن کر محفل میں شریک ہوتی ہیں۔ والدہ جو ادھیڑ عمر ہیں وہ تو باپردہ ں اور جوان بیٹی کا جسم سب کی نگاہوں کا مرکز ہے اور والدہ صاحبہ یہ سب ہو رہی ہیں۔ قصور کس کا ہے۔ ماں کا یا بیٹی کا؟

ہم مسلمان ہیں۔ ہمارا ملک اسلامی ہے۔ ابلاغ عامہ کے ذرائع ری نئی نسل کو بے حیائی عریانی فحاشی سے روشناس کرانے کے ئے ان کو تہذیب اور شرافت کی ترغیب دیں۔ ایسے پروگرام پیش یں جن میں تہذیب اور شائستگی ہو۔ عام طور پر فلموں میں کالجوں اور ولوں کی طلبا اور طالبات کو اس طرح دکھایا جاتا ہے کہ دیکھ کر سر رم سے جھک جاتا ہے گھر سے تعلیم حاصل کرنے جانے والی لڑکی پنے کلاس فیلو کے ساتھ کسی پارک میں یا کسی اور پر فضا مقام پہ ھیہ گا نا گا رہی ہے یا کسی دریا میں نیم برہنہ نہا رہی ہے۔

ہماری نوجوان نئی نسل تعلیم یافتہ ہے اور باشعور بھی ہے ن افسوس کہ اس کا دھیان فحاشی عریانی اور بے حیائی کی طرف ہے ۔ان کی تعداد دیہات میں ابھی کم ہے۔ جتنے شہروں میں بہت ہے لیکن اگر اس کی بروقت روک تھام نہ کی گئی تو یہ سب کو اپنی لپیٹ ں لے لے گی۔ ہمیں نئی نسل کا رخ موڑنے کے لیے میدان میں آنا ہوگا۔

[illegible]

"دوشیزہ مارچ ۷۷ء میں عنوان "بحث و نظر" کے تحت محترمہ ثریا طلعت گورنمنٹ کالج فار ویمن کراچی کے خیالات نظر سے گزرے۔ انہوں نے معاشرے سے کھلی جنسی آزادی مانگی ہے۔ اگر ان کے ہم خیال لوگ معاشرے میں عام ہو جائیں تو نئی نسل برائیوں کے اس گڑھے میں گر جائے گی جس سے اس کا واپس آنا محال ہوگا۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ نئی نسل کو یہ چھٹی دے دی جائے کہ وہ بازاروں میں



اپنا آئیڈیل تلاش کرتے پھریں۔ محبت کی شادیاں اگر تیس فیصد کامیاب ہیں تو ستر فیصد ناکام ہوتی ہیں۔ جو لڑکی اپنے دوست سے ملنے کے لیے گھر سے ہزار حیلے بہانے کر کے اس کا قرب حاصل کرتی ہے وہی آزاد خیال لڑکی اس کو پالینے کے بعد کسی دوسرے شکار کو تلاش کرنا شروع کر دیتی ہے۔ اس کے خاوند کے دل میں بھی ہر وقت یہ شک رہتا ہے کہ جو لڑکی گھر والوں سے چوری چھپے مجھ سے مل سکتی تھی وہ بعد میں وہ کسی اور سے بھی مل سکتی ہے۔ اس کے علاوہ ہمارا ملک ایک اسلامی ملک ہے اور ہم مذہبی طور پر مسلمان ہیں تو کیا اسلام اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ کھلے بندوں جنسی سودے کیے جائیں یا عورت کو ... دی جائے۔

اگر اپنی پسند کی شادی کامیاب ہوتی تو مثلاً ہمیں ماں باپ کا محتاج کیوں کرتا۔ اس کے علاوہ ماں باپ کا طے شدہ رشتہ اس لیے بھی کامیاب ہوتا ہے کہ ان کی پسند میں ان کا وسیع تجربہ شامل ہوتا ہے میں نئی نسل کے اس قسم کے آزاد خیال لوگوں سے پوچھتا ہوں کہ ذرا عبرت شاد باغ لاہور والی یا خوا لہ شاہ لاہور والی کی عبرت مثالیں آپ کا منہ بند کرنے کے لیے کافی نہیں ہیں۔ ان لوگوں کو آسودہ کے حالات اور واقعات دیکھتے ہوئے بھی یہ روش بدلتے ان کا خدا ہی حافظ ہے۔

میری تو رائے یہ ہے کہ اگر ہر مرد دنیا میں تمام عورتوں کو اپنی بیوی کے علاوہ ماں، بہن اور بیٹی سمجھنا شروع کر دے اور دنیا کی تمام عورتیں اپنے خاوند کے علاوہ سب مردوں کو باپ، بھائی اور بیٹا سمجھنا شروع کر دیں تو معاشرے کی تمام برائیاں جو کہ نئی نسل کو گھن کی طرح کھا رہی

یہاں تک تو ٹھیک ہے میری یہ تمام باتیں آزاد خیال لوگوں کو ضرور کڑوی لگیں گی لیکن سچ ہمیشہ کڑوا ہوتا ہے۔

”بحث و نظر“ کے عنوان کے تحت ”فحاشی، عریانی اور بے حیائی“ جیسے اہم مسئلہ پر آپ نے جو قلم اٹھانے کی دعوت دی ہے وہ ایک قابل تعریف اقدام ہے لیکن قبل اس کے کہ میں مزید کچھ لکھوں سب سے پہلے تو آپ کی توجہ ماہ مارچ ۱۹۸۹ء کے ”دوشیزہ“ کے سرورق کی طرف مبذول کرانا چاہتی ہوں۔ ایک طرف تو آپ نے بے حیائی اور عریانی کے خلاف قلم کا محاذ بنایا اور دوسری طرف خود ہی اس قسم کے عریاں سرورق دے کر اس کی تردید کی۔

ماہ مارچ کے دوشیزہ میں محترمہ ثریا طلعت کا مضمون بعنوان ”شادی کے ادارے کیوں قائم ہیں؟“ ان کے بے باک خیالات پڑھ کر بے حد دکھ ہوا کم از کم ایک مسلمان ہی تو ایسا خاتون کو یہ زیب نہیں دیتا کہ اس قسم کی سطحی باتوں کو وجہ حرکت بنائیں۔ وہ ایک طرف تو فرماتی ہیں کہ نئی نسل کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ زندگی کے دوسرے معاملات کی طرح ”جنسی معاملات“ میں بھی انہیں گفتار و عمل کی آزادی دی جائے۔“ اور پھر خود ہی دوسری جگہ باقاعدہ الفاظ میں اس کی تردید بھی کر دی کہ ”اگر نئی نسل کے جوان لڑکے لڑکیاں خود اپنی پسند کے شوہر (یا بیوی) تلاش کر کے شادی کر لیں تو ناجائز“۔ تو ان کی خدمت اقدس میں عرض ہے کہ اپنی پسند کی شادی کرنا کوئی بری بات نہیں بلکہ اس کی اجازت تو ہمارے مذہب نے خود ہی دی ہے۔ ہاں بے راہ روی پر ضرور بندش ہے۔ ویسے عرض یہ ہے کہ جب آپ ”جنسی معاملات“ میں گفتار و عمل کی آزادی چاہتی ہیں تو شادی چہ معنی دارد؟ رہا شادی کے دفتروں کے قیام کا مسئلہ تو یہ بھی ملک میں بڑھتی ہوئی بے راہ روی کو روکنے کے لیے ایک قدم ہے۔

یوں تو ہر نسل اپنی آنے والی نسل پر آزادی کا الزام عاید کرتی ہے اور یہ بالکل درست بات ہے کیونکہ ہر ۲۰، ۲۵ سال بعد حالات یا ماحول نہیں رہتا جو کہ ہم سب سے پہلی نسل دیکھ چکی ہوتی ہے۔ ہمارے بزرگ اگر کسی بات کو منع کرتے ہیں تو غلط نہیں کرتے۔ کیونکہ ان کا تجربہ بہرحال ہم سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ جس چیز کو آج ہم اپنے عہد میں اچھا سمجھ رہے ہیں اور جیسا سمجھتی سے ہم ایسا دھوکہ کھاتے ہیں وہ ”اچھائی“ ہماری زندگی کے لیے ایک چیلنج بن جاتی ہے۔ رہی یہ بات کہ عریانی، فحاشی اور بے حیائی نئی نسل پر ایک الزام ہے تو اس کے لیے عرض یہ ہے کہ یہ الزام نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ روز افزوں ترقی کرتی ہوئی بے حیائی، فحاشی یا عریانی کی دو وجوہ ہیں۔ (۱) مذہب سے بیگانگی (۲) بے جا اندھی تقلید۔ بے جا اندھی تقلید بھی اسی وقت ہوتی ہے جب کہ ہم اچھے برے میں تمیز نہ کر سکیں اور اچھے برے کا مکمل سبق ہمیں اپنے مذہب کے مطالعہ سے ملتا ہے۔ ایک اور محترمہ مردوں سے آزادی کی طلبگار ہیں میری سمجھ میں نہیں آتا کہ خواتین اس قسم کی آزادی کی کس طرح تشریح کریں گی۔ اول تو یہ کہ عورت غلام ہے ہی نہیں اور دوسرے یہ کہ خواتین اپنے آپ کو غلام اور حقیر شے کیوں تصور کرتی ہیں۔ جو خواتین اپنے آپ کو اس قسم کی چیز سمجھتی ہیں تو میرے ناقص خیال میں یہ صرف ان کی سوچ کا فساد ہے۔ یا پھر شدید احساس کمتری کا نتیجہ ہے کیا آج سے پہلے خواتین کارہائے سرانجام نہیں دے چکی ہیں؟ کیا وہ مردوں کے شانہ بشانہ کام نہیں کرتی رہیں۔ لیکن ہر چیز اعتدال میں بہتر رہتی ہے۔ انتہا پسندی کا مطلب ہے تباہی۔ ویسے بھی قدرت نے عورت اور مردوں کے لیے ان کے فرائض علیحدہ علیحدہ مقرر کیے ہیں اور جس نے اپنے فرائض سے غفلت برتی گویا اس نے قدرت سے جنگ کی۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر چیز تباہ و برباد ہو جائے گی اور کسی شے میں کوئی توازن نہیں رہے گا۔



محترمہ ثریا طلعت نے بحث و نظر کے تحت اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ نئی نسل عریانی، فحاشی اور بے حیائی کی طرف مائل نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مطالبہ تو صرف اتنا ہے کہ اسے

"جنسی معاملات" میں گفتگو سے حل کی کاشش کی جائے ۔۔۔
اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مرد اور عورت کے درمیان "جنسی تعلق" ایک فطری تقاضا ہے ۔۔۔ اور شادی بھی اسی لیے کی جاتی ہے کہ یہ فطری تقاضا پورا ہو سکے۔ یہ اعتراض تو تب ہونا چاہیئے تھا جب معاشرہ نے اس فطری تقاضے کو پورا کرنے کے لیے شادی کی اجازت نہ دی ہوتی۔ فطرت کی بات کرتے ہوئے یہ بات کیوں لوگ بھول جاتے ہیں ۔۔۔ کہ فطرت نے اپنے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے کچھ حدود بھی مقرر کی ہیں۔ اگر انسانی زندگی کا مقصد صرف یہی ہے کہ مرد اور عورت کے درمیان جنسی اختلاط ہو اور اس کے نتیجے میں نسل انسانی آگے بڑھے تو پھر باپ بیٹی اور بہن بھائی کے درمیان جنسی تعلق میں آخر کیا حرج ہے۔ جنس کے اعتبار سے وہ بھی تو مرد اور عورت ہیں ۔۔۔ اور ان کے درمیان جنسی تعلق سے بھی نسل انسانی آگے بڑھ سکتی ہے ۔۔۔ آخر کیا وجہ ہے کہ باپ بیٹی اور بہن بھائی میں جنسی تعلق رکھنا تو دور کنار، جنس جیسے لطیف اور نازک موضوع پر ایک دوسرے سے بے تکلفی سے گفتگو کرنا بھی معیوب ہے؟ اور پھر اس عورت کا کیا تصور ہے۔ جسے معاشرہ نے طوائف کا نام دیا ہے ۔۔۔ جسے عورت کا گھٹیا ترین روپ کہا جاتا ہے۔ اور جس کی طرف دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر لیا جاتا ہے ۔۔۔ !

محترمہ کا یہ کہنا کہ جنس اگر فطری بری چیز ہے ۔۔۔ تو پھر معاشرہ میں شادی کے ادارے کیوں قائم ہیں۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص بیرون ملک جانا چاہتا ہو ۔۔۔ اور اس سے کہا جائے کہ پاسپورٹ کے بغیر تم نہیں جا سکتے تو اس کے جواب میں وہ کہے کہ اگر میں باہر نہیں جا سکتا تو پھر یہ پاسپورٹ آفس کیوں قائم ہیں ۔۔۔ عجیب منطق ہے کہ اگر میں اپنی مرضی سے جانا چاہوں تو نہیں جا سکتا ۔۔۔ لیکن اگر ان لوگوں سے پاسپورٹ لے لوں ۔۔۔ تو پھر جا سکتا ہوں ۔۔۔

شادی کے بارے میں اسلام نے جو کہ دین فطرت ہے خود یہ ضابطہ مقرر کیا ہے کہ یہ فریقین کی مرضی کے مطابق ہونی چاہیئے۔ اور اسی لیے نکاح کے وقت لڑکے اور لڑکی کی رضامندی حاصل کی جاتی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ لڑکے اور لڑکیوں کو مخلوط محفلوں میں بے تکلفی سے ملنے کی اجازت ہونی چاہیئے تاکہ وہ اپنے لیے شریک حیات کا انتخاب کر سکیں ۔۔۔ اس طریقے سے ہونے والی شادیاں کم کامیاب ہوتی ہیں ۔۔۔ شادی سے پہلے میاں بیوی اتنے آزاد خیال ہوتے ہیں کہ مخلوط محفلوں میں جانا برا نہیں سمجھتے۔ شادی کے بعد بھی ظاہر ہے کہ وہ ایک دوسرے کو ایسی تقریبات میں شرکت سے نہیں روک سکتے ۔۔۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بیوی اگر کسی سے مسکرا کر بات کرے تو شوہر کی پیشانی پر بل پڑ جاتے ہیں اور ساری رات اسے نیند نہیں آتی ۔۔۔ اور اگر میاں کسی خاتون سے ہنس کر بات کر لیں تو بیوی ساری رات کانٹوں پر لوٹتی رہتی ہے ۔۔۔ دلوں میں شکوک کی گرہیں پڑ جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی پسند اور دوستی کی بنیاد پر شادیاں کامیاب نہیں ہوتیں۔

ہر برائی کی ذمہ داری نئی نسل پر؟

خوجہ ثمینہ الذکیہ۔ قصہ خوانی۔ پشاور

مجھے یہ پوچھنا ہے کہ کیا سیکس ہماری زندگی کا لازمی جزو نہیں ہے؟ پھر اس کے بارے میں اس قدر واویلا کیوں مچایا جاتا ہے۔ اگر اسکولوں اور کالجوں کے لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھتے ہیں یا بحیثیت دوستوں کے اکٹھے گھومتے ہیں اور تفریحی مقامات پر جاتے ہیں تو اس میں فحاشی عریانی یا بے راہروی کی کونسی بات ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ جن لوگوں کے اپنے ذہن گندے ہیں وہ دوسروں کو بھی اپنا ہی جیسا سمجھتے ہیں۔

بے حیائی کے سلسلے میں محبت کا سوال بھی اٹھایا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ نئی نسل محبت کے معاملے میں بڑی بے باک واقع ہوئی ہے اور اسی چیز نے اس نسل کو بے حیائی کی طرف مائل کر رکھا ہے ایک دانشور کا قول ہے کہ کوئی چیز بجائے خود بری نہیں ہوتی، بری سوچ چیز کو برا اور اچھی سوچ چیز کو اچھا بناتی ہے۔

نئی نسل پر ہی کیا موقوف ہے کیا پرانی نسل کے لوگ اپنی جوانی کے زمانے میں محبت نہیں کرتے تھے۔ فرق بس یہ ہے کہ پرانی نسل کے لوگ چھپ چھپ کر محبت کرتے تھے، اور نئی نسل کے لوگ آزادانہ کھل کر محبت کرتے ہیں۔ پرانی نسل کے لوگ لڑکیوں کو فریب دیتے تھے اور اپنا مطلب نکال کر الگ ہو جاتے تھے۔ نئی نسل کے لوگ ایسا نہیں کرتے کیونکہ نئی نسل کی لڑکیاں بے وقوف نہیں ہوتیں کہ جھوٹی محبت کے جال میں پھنس کر اپنا سب کچھ لٹا بیٹھیں۔ آج کے لڑکے اور لڑکیاں محبت کرتی ہیں تو اس غرض سے کہ شادی ہو جائے۔ اس محبت کو بے حیائی نہیں کہا جا سکتا۔ میں پھر بھی کہوں گا کہ جنس یا سیکس انسانی فطرت کا جزو ہے۔

عفت موہانی



تحفہ

کانچ کا نازک دِل
ایک اجنبی کی سُلگتی تمناؤں کا حسین تحفہ
جو دو بہنوں کے دل تک ایک دلگداز کہانی کا عنوان بن گیا

پرویز کا آئیڈیل بننے کی دُھن میں زینت ایک ایسا ماڈل بن کر رہ گئی، جو مصوّر کے سوا کسی اور کی سمجھ میں نہیں آتا جو اپنے ماڈل کے خدوخال ابھارتا ہے ہر ایک نقش کو منہ بولتا جادو بنا دیتا ہے اور جب مصوّری ساحری ہو جاتی ہے۔

سیما کو اپنی باجی کی یہ حرکتیں ایک آنکھ نہ بھاتیں۔ کیا یہ بھی خود کو پرکشش بنانے کی کوئی ترکیب ہے کہ مدتوں خلاء میں نظریں جمائے انسان بیٹھا رہے۔ کھائے پیئے تو خاص ادا سے، چلے پھرے تو انوکھی رفتار سے۔ ہنسی کے ساتھ ساتھ اسے اپنی بہن پر ترس بھی آتا، اور پرویز پر غصہ، اسی نے اوٹ پٹانگ تعریف کر کے اس کو خود نما و خود پرست بنا دیا ہے؟ ویسے زینت بڑی دلکش لڑکی تھی اس کی آنکھیں ستاروں کی سی روشن تھیں۔ عارض پر گلاب مسکراتے تھے لبوں پر شفق کی سی سرخی مچلتی تھی، نور کے سانچے میں ڈھلا ہوا بدن۔ لیکن اسے اپنے ہوشربا حسن کا احساس ایسا زیادہ نہ تھا کہ وہ محض آئینہ کی جلوہ گری میں گم ہو کر رہ جاتی۔ احساس تو پرویز نے دلایا تھا۔

پرویز ان کا کوئی نہ تھا، چند برسوں پیشتر زینت نے ڈلہوزی میں سیما کو اطلاع دی تھی کہ ان کا ایک بہت اچھا دوست تعلیم کے لئے براؤن ہلز میں آکر مقیم ہو گیا ہے، سیما ڈلہوزی کی بہاروں کے مزے لوٹ رہی تھی، اسے زینت کی مداخلت ناگوار ہوئی، باجی نہیں چاہتیں کہ وہ گھومے پھرے۔ اس نے اس خط کے پرزے اڑا دیئے اور بالکل بے فکری سے اپنی چھٹیوں کو زیادہ دلچسپ بنانے میں منہمک ہو گئی۔ باجی کو یوں بھی بچوں سے بے پناہ محبت تھی، اکثر چھوٹے چھوٹے بچوں کو اپنی کوٹھی پہ لے آتیں، نرسوں کے بچے اور آس پاس کے اتنی سو رنگ کے ننھے منے بچے! براؤن ہلز ان کی ننھی منی کلکاریوں سے گونجا کرتا ہو گا کوئی بچہ .... سیما نے سوچا تھا۔ زینت نے لکھا بھی یہی تھا۔ بہت پیارا سا لڑکا ہے۔!

"پیارا سا لڑکا ؟ اگر اس کی ناک چپٹی ہو گی اور رال بہتی ہو گی تب بھی زینت کو اچھا لگے گا .... نہ جانے کونسا کمپلیکس ہے ؟"

پھر جب وہ ملتانی سونا بھری چھٹیاں میں وزن کے ساتھ گزار کر واپس آئی تو زینت نے اس کا استقبال کیا۔

"کہاں ہے وہ پیارا سا لڑکا۔" جو اس نے بڑا سا منہ بنا کر پوچھا۔

"ارے یوں اس کا تذکرہ نہ کرو۔ سیمی ڈیئر پلیز۔" وہ کچھ کچھ برا ماننے لگی۔ "وہ ہمارے پاس رہتا ہے۔ بھلا اس کا ہے کون دنیا میں کون ہے اس کا۔ نہ اس کا باپ نہ بھائی بہن۔ اور نہ کوئی دوست۔"

"اچھا۔ تو یوں کہیے کہ آپ بہرحال اس کی سب کچھ بن بیٹھی ہیں؟" وہ جل گئی۔ "بجی آپا سیدھی بات یہ ہے کہ میں اب بچوں کے شور و غل سے سخت پریشان ہو گئی ہوں۔ آپ اگر یہ الٹا سیدھا مشغلہ ترک نہیں کر سکتیں تو اجازت دیجئے... میں کسی ہوسٹل میں اپنا انتظام کر لوں۔؟"

"اک دم بور..." زینت نے جوٹ سیکھ لئے۔ "اب یہاں کہاں ہیں بچے۔ جب سے پرویز آیا ہے۔ میں نے سب کو بھگا دیا۔"

"اچھا۔ پرویز نام ہے۔" وہ مسکرائی۔

"بے چارہ ننھا بچہ۔ اُف" زینت نے کہا۔ "یقین کرو سیما۔ وہ اب بھی اپنے ماں باپ کی یاد میں روتا ہے۔ جب پرنسپل صاحب نے اس کا تذکرہ مجھ سے کیا کہ وہ خود افسردہ رہتا ہے اور ہوسٹل کے دوسرے لڑکوں کو بھی افسردہ کرتا ہے۔ تو میں نے کہا کہ اس کو میرے پاس بھیج دیجئے۔"

"آپ کو تو افسردہ نہیں کرتا۔" وہ اب بھی جلی ہوئی تھی۔

"ہرگز نہیں۔ اس کی کمپنی میں کوئی بور نہیں ہو سکتا۔ تم خود دیکھنا اب آتا ہو گا۔" اس نے سرسری نظر گھڑی پر دوڑائی اور مسرور انداز میں کوئی انگلش سونگ گنگنانے لگی۔

اور سیما کے لئے اس لڑکے کا انتظار قیامت بن گیا۔ اتنی دیر سے تعریفیں کر رہی ہیں تو کچھ اچھا ہی ہو گا۔ اس کا بھی دل بہلے گا۔ باجی کو تو وہ بالکل بدلا ہوا دیکھ رہی تھی۔ وہ اداسی جو ان کی شخصیت کا نکھار تھی، وہ تو کہیں کھو چکی تھی۔ اب وہ بات بات پر مسکرا اٹھتی اور وہ پچھتانے لگی، اتنی جلدی چلی آئی کہ کم از کم ایک ٹافی کا پیکٹ تک نہ لا سکی۔

ملازمہ نے اطلاع دی۔ "پرویز میاں آ چکے ہیں۔" زینت کے چہرے پر قوس و قزح کے رنگ بکھر گئے۔ "آؤ چلیں۔" زینت اس کا ہاتھ پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔

"مم۔ مگر۔ میں کچھ بھی تو نہ لائی اس کے لئے۔" وہ ہچکچائی۔

زینت اسے کھینچ کر لے گئی۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے ہنس کر سیما کو دیکھا۔ اللہ، پردہ سرکایا۔ وہ اچھل پڑی.... "یہ۔ یہ۔ زینت آپا سچ مچ کمال کرتی ہیں..." ننھا سا لڑکا۔ ہلکے کارڈیگن کا سوٹ پہنے چوڑا سا کمرے میں کھڑا تھا۔ وہ قد میں زینت سے بھی اونچا تھا۔ زینت بیٹھے رانی کا پربت تو بناتی ہی تھی مگر اب پربت کو رانی بنا دیا تھا۔ اسے زینت پر غصہ آنے لگا۔

"کہاں خاک چھاننے چل دیئے تھے.... کب سے تمہارے منتظر ہیں۔" زینت نے بناوٹی خفگی سے کہا۔

"وہ دیکھئے.... وہ.... میں نے سوچا۔" وہ ہکلایا۔

"امی آ گئی ہیں۔ اب وہ تمہیں یہاں رہنے نہ دیں گی۔ اکیلے سو جایا کرو گے۔ اندر چلو۔"

اللہ کی سنو سچ مچ اسے تنہا رہنے نہیں دیا۔ اپنے یہاں لے آئیں اور یوں وہ سب میں گھل مل گیا، جیسے انہی سب میں رہتا آیا ہو۔ آپا سے تو صدا کی بے تکلفی تھی ہی۔ وہ کہانیاں لکھا کرتی تھیں۔ یا پھر گھر بھر کے لئے سویٹر بنا کرتیں اور جب سیما کو آپا کسی اوٹ پٹانگ کہانی کی ہیروئن لگتی یا یہ محسوس ہوتا کہ وہ رنگ برنگی باتوں میں الجھ کر رہ گئی ہے تو وہ سخت بددل ہو جاتی۔ زینت اور پرنسپل کی بے سر پیر کی باتیں وہ شدت سے چاہتا تھا۔ کبھی تو زینت خفا ہو اور اداس نظر آئے۔ عجیب تھا جیسے اسے بھی چمکتی ہوئی مبہم آنکھوں اور شرارت سے کپکپاتے لبوں سے خوف آتا تھا۔

"کتنا پیارا لگے اگر کبھی آپ کی روئی روئی آنکھوں میں آنسو بھر آئیں۔ آپ کے لب لرزنے لگیں۔ اور دل کی دنیا ڈانواں ڈول ہو جائے۔ پتہ نہیں تب آپ کیسی لگیں گی۔"

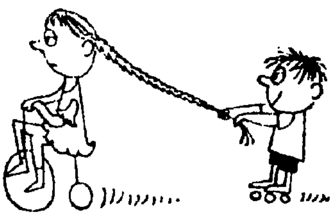
"چلو ہٹو۔ دور ہو جاؤ۔ میں کیوں روؤں خواہ مخواہ۔" زینت ڈر جاتی۔

"اس طرح آپ کا حسن اور سنور جائے گا۔ یعنی آپ نہیں جانتیں یوں بڑی افسانہ نگار بنتی ہیں۔ سچ بتائیے کیا آپ کی ہیروئن کبھی روتی نہیں پھوٹ پھوٹ کے؟"

"کبھی نہیں۔"

"ہر وقت ڈھیٹ چھوکریوں کی طرح دانت نکالے کھڑی رہتی ہے؟"

"واہ۔ دانت کیوں نکالے گی، وہ مسکراتی ہے۔ اور اس کا تبسم حسین جادو بن کر پورے افسانے کے ماحول میں پھیل جاتا ہے۔"



"کبھی اس کو رولا دیجئے تو پتہ چلے کہ جب موتی جیسے آبدار آنسو گلابی گلابی رخساروں پر ٹوٹتے ہیں تو کائنات کا دل تھم جاتا ہے صبح کی نبض تیز ہو جاتی ہے اور شام کی سانس رُکنے لگتی ہے۔"

اور ایسے پاگل کو سیما حیرت سے تکتی رہتی ہے۔ آپا جو کبھی کسی کی بکواس سننا پسند نہ کرتی تھیں کتنے مزے سے ہر بات میں ہاں میں ہاں ملا رہی ہیں۔ کبھی کبھی وہ بھی ہنسانے سے باز نہ آتی۔ مگر وہ تو سخت بدھو تھا بڑا ہی نہ مانتا۔

"آپ کبھی ہنستے ہی نہیں، بڑے غصیلے ہیں۔" اسے پھر جلن لگتی۔

"ہنسا رہی تھیں۔ واہ بھئی۔ پتہ ہی نہیں چلا۔ اچھا پھر سے ہنسا لو۔" دعاتی معصومیت سے کہتا کہ سیما کو ترس آنے لگتا۔ اور جب باقاعدہ ترس آنے لگا تو وہ گھبرائی.... وہ اس کے بارے میں کیوں سوچتی رہتی ہے۔ وہ اس کے گڈمڈ خیالوں میں کیوں اُلجھنے لگا ہے اور وہ پوری کی پوری ہو جاتی کہ اسے پسینہ آنے لگتا، آپا الگ متحیر تھیں، یہ کھلنڈری شریر لڑکی اتنی سنجیدہ اور اداس کیوں رہنے لگی ہے۔

وہ آپا سے نظریں چار کرتے ہوئے ڈرتی۔ کہیں کوئی بھانپ نہ لے۔ وہ پاگل ہو رہی ہے تو پھر کیا ہوگا، کوئی کام ڈھنگ کا نہیں ہو سکتا، وہ جھٹ کوئی بہانہ ڈھونڈ نکالتی "سردیاں آرہی ہیں۔ سوچا تھا کہ سوئیٹر ہی بنا لوں گی۔"

"ارے مجھے سکھا دو۔ چٹ پٹ اگر نہ سب کو مئی جون میں ہی سوئیٹر پہنوا دوں تو دیکھ لینا!"

کاسنی رنگ اسے بہت پسند تھا۔ زینت کی یہی کوشش ہوتی جہاں تک ہو سکے کاسنی لباس پہنے رہے۔ وہ تعریفیں کرتا نہ تھکتا۔

"آپی دیکھئے ان کا چہرہ جیسے اُودی اُودی گھٹاؤں کے بیچ چاند!"

اور وہ بڑی دھاندلی سے کوئی تشبیہ آپا پر رسید کر دیتا۔ سیما بھسم ہو جاتی اور آپا کی آنکھوں میں بوجھل بوجھل غنودگی ڈولنے لگتی۔ چہرے پر دھیمی دھیمی سی روشنی پھیل جاتی.... جیسے دل کے اندر کوئی چراغ جل اٹھا ہو۔

ٹھیک بھری دوپہر کی بیزار کن گرمی تھی۔ زینت کسی کی کہانی پڑھنے میں محو تھی اور سیما اس کی محویت دیکھنے میں محو تھی، اچانک برآمدے میں بھاری قدموں کی آہٹیں گونجیں اور دوسرے لمحے وہ چھ فٹا اندر آ گیا۔

"ماشاء اللہ۔ آج پھر بھاگ آئے کالج سے۔" زینت کے ہاتھ سے قلم چھوٹ گیا۔

"سنئے تو سہی۔" وہ ان کے پاس کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ "یکایک مجھے خیال آیا کہ صبح تو آپ نے بالکل ٹھنڈی چائے پی تھی، اب میں آپ کو بالکل گرما گرم چائے پلا کر چلا جاؤں گا۔"

زینت کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ چائے خواہ مخواہ بے حد طویل ثابت ہوئی، کالج کا وقت ختم ہو گیا۔ دونوں کہیں گھوم آنے کے لئے اٹھ گئے۔

"چلو تم بھی تیار ہو جاؤ۔" اس نے سیما کی طرف دیکھ کر جیسے بھیک بجائی۔ "ہری اپ۔"

"ارے اب وہ کہاں جائے گی۔ کل کی ڈیبیٹ کے لئے پوائنٹس تیار کرنے ہیں۔" زینت نے بات اُچک لی۔ "اچھا تو تم بیٹھی تقریر رٹا کرو ہم ابھی آتے ہیں۔"

"نہ بھئی آنا ہوتا تو میں آپ کے ساتھ تو نہ جاتی۔" وہ کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورنے لگی۔

"بہت بہت شکریہ۔" وہ مسکرایا۔ اور لاپرواہی سے زینت کی طرف مڑ گیا۔

"آخر آپ کو میرے پسندیدہ کلر سے اتنی نفرت کیوں ہے؟" زینت نارنجی لباس میں تھی۔ اس نے اسے بانہہ پکڑ کر وارڈروب میں دھکیل دیا۔

"ڈارک وائیلٹ پلیز۔"

ذرا سی دیر میں زینت گہرے کاسنی سوٹ میں ملبوس باہر آئی تو اس کی آنکھیں چمک اٹھیں مگر اس نے اظہار مسرت کے بجائے ایک اور اعتراض کر دیا۔

"ایسے خالی ہاتھ معلوم ہوتا ہے چوڑیاں بھی مجھ ہی کو پہنانی پڑیں گی، وینا تو سیاہ نیکلس۔ لائیے ہاتھ۔"

"بھئی اللہ! رہنے بھی دو، خواہ مخواہ کھن کھن۔ گھومنے چلا ہی ہوں یاد ہوت میں۔" زینت نے بے زاری سے کہا۔ مگر سیما بناوٹی انداز صاف پہچان گئی۔

"چوڑیوں کی کھن کھن تو زندگی کا نغمہ ہے۔" وہ ہنسا۔

"یا خدا۔ یہ لوگ کس قدر بور کرتے ہیں۔" وہ متحیر و مبہوت دوطرف

کو دیکھتی رہ گئی سا تا کہ وہ ایک گہری سہیلی کا .... تھا۔ مگر للیا ابھی کہاں وہ محبت کی نگاہیں پہچاننے لگی تھی۔ اسے اپنی آپا سے چڑ ہو گئی۔ نجانے خالد بھائی کب مقابلے میں پاس ہوں گے اور کب آپا کو بیاہ کر لے جائیں گے۔ اگر جلدی سے آپا کی شادی ہو جائے تو پھر۔ پھر کیا ہو گا۔ وہ اور پرویز دونوں یونہی گھومنے جائیں گے۔ وہ اپنی پسند کا لباس ان کو پہنائے گا، اپنے ہاتھ سے اس کے بالوں میں پھول لگائے گا۔ یہ خواب بڑے دلکش تھے اس کا جی چاہتا تھا کبھی خوابوں کی دنیا ہی سے وہ باہر نہ نکلے مگر پھر خیال آتا کہاں ہو رہا ہے آپا کی شادی ..... اور وہ مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب جاتی۔

زینت پل بھر کے لئے اسے اپنے سے جدا نہ کرتی، شاید اپنے خیالوں میں وہ اسے ایک ننھا سا بچہ ہی سمجھتی تھی جسے ایک سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔

ایک دن پڑوس میں ضیاء کی سالگرہ تھی۔ سب چلے گئے مگر زینت گھر میں رہ گئی۔ اور ساتھ ہی سیما نے بھی سر درد کا بہانہ بنا دیا۔ دیکھیں کیسے زینت مضطرب ہوتی ہے اور وہ کتنی بے چین تھی کمپاؤنڈ میں کار کا ہارن گونجا۔

اور وہ نروس ہو گئی۔

امی نے آخر بلا بھیجا۔ اس نے بُرا سا منہ بنا لیا۔ "مجھے جانا ہی پڑے گا۔ اچھا سیما، دیکھو تھرماس میں گرم کافی ہے الماری میں سینڈوچز رکھے ہیں۔ وہ کالج سے آتا ہو گا۔ اگر کہے تو کچھ بادام تل دینا۔ سردی زیادہ ہے کہنا کہ فوراً سوئٹر پہن لے۔"

"ہونہہ" وہ جھنا گئی "آپ انہیں ننھا سا بچہ سمجھتی ہیں آپا!"

"تم کیا جانو۔ وہ بچہ ہی ہے" زینت مسکرائی "اچھا خیر میں نہیں جاتی۔"

"نہیں نہیں! آپ بصد شوق جائیے۔ جب وہ آئیں گے تو میں بادام بھی تل دوں گی" اس نے کہا اور شرارت سے مسکرائی۔ "میں آپ کے کپڑے نکال دوں۔ گہرے کاسنی رنگ کے؟"

"ہشت" آپا مسکرائی۔ مگر پہنا وہی لباس جو سیما نے نکالا تھا گہرے اودے رنگ کا دلکش لباس۔

"اوہ۔ ویری سوئیٹ" وہ ان سے لپٹ گئی "خالد بھائی تو آپ کو دیکھ کر بے ہوش ہو جائیں گے" اور وہ بڑے پیار سے ان کے گھنگریلے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

"خالد...." زینت کے دل میں جو چراغ جل رہا تھا وہ

مسکراہٹ

مسکراہٹ:- تاریکی کے بادلوں میں امید کی کرن ہے۔

مسکراہٹ:- یقین واثق ہے مسکرانے والے کا دل نفرت سے پاک ہے۔

مسکراہٹ:- دل میں نقش ہو جاتی ہے۔

مسکراہٹ:- ایک ایسا نذرانہ ہے جو غریب سے غریب شخص بھی پیش کر سکتا ہے۔

◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆

بکھر گیا۔ زینت کو ڈر اکر وہ اس قدر کیوں خوش ہو گئی تھی، یہ وہ بھی نہ سمجھ سکی، زینت کا اضطراب اور تپش ختم ہو گئی، جیسے یکبارگی بڑے زور کا طوفان آئے۔ اور فضا ساکن ہو جائے۔ وہ چلی گئی، اور سیما کو اپنی دنیا میں روتے چھوڑ گئی، پہلی بار اس نے سوچا۔ آپا کا چہرہ مسکراہٹ کے بغیر ایسا لگتا ہے جیسے گلابی ساٹن کا رنگ اڑ جائے۔ وہ دیر تک وہ سوچتی رہی اور پھر پرویز بھی آ گیا۔ لاپرواہ اور بے فکر سا۔ کتابیں ایک طرف اچھالیں۔ اور سیما کے پاس دھم سے بیٹھ گیا۔

"آپ کی آپا کہاں گئیں۔ یہاں سناٹا سا کیوں پڑا ہے؟" اس نے بڑے سرد لہجے میں پوچھا۔

"میری آپا —— آپ کی کون ہیں" اس نے جل کر پوچھا۔

"میری۔ ؟" وہ ہنسا "پتہ نہیں میری کون ہیں —— نہ جانے کون سا رشتہ ہے ہم میں —— ابھی وہ لفظ دنیا میں ایجاد نہیں ہوا جو ان کا اور میرا ہے۔"

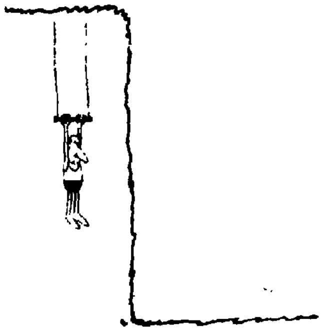
"اچھا۔" وہ طنز سے مسکرائی۔

"اچھا جناب ہم بھی چلے" اس نے پھر کتابیں سنبھالیں۔

"کافی تو پی لیجئے۔ آپ کے لیے سینڈوچز ——"

"وہ تم کھا لینا۔ آج میرا جی نہیں چاہ رہا ہے۔" اس نے کتاب سے اس کے سر پر ہلکی سی چپت جمائی۔ اور کمرے سے نکل گیا اور تانے بانے بکھر گئے۔ ننھے بھیڑیے جھرنے۔ موتی اچھالتے فوارے سب گڈمڈ ہو گئے۔ اور وہ زانو پر سر رکھ کر رو پڑی۔

وہ اس سے دور ہو گیا، ان کی کائنات بس وہی گھر تھی، جہاں زینت تھی، اور پرویز تھا، کتنے دن گزر گئے، پرویز میرا کی





کے گیتوں اور شفیق الرحمٰن کی کہانیوں میں ڈوب گیا۔ زینت صوفہ پر نیم دراز ہوئے ہوئے اس کے الجھے الجھے بالوں میں اپنی مومی انگلیاں الجھا لیتی۔ کسی پسندیدہ کردار کی طرح حسین، متوالا، اور بے چین۔ جیسے کوئی شعر مجسم ہو گیا ہو۔ اس موقعہ پر اگر سیما آجاتی تو انہیں یاد دلاتی وہ دو گیت ہیں نہ کہانی، اسی زمین پر رہنے والے لوگ ہیں۔ محبت وغیرہ ڈھونگ، مکاری ہے۔

"کہیں نہ کہیں محبت ہے ضرور۔۔۔" وہ بڑے یقین سے کہتا۔

"کیسی محبت۔؟" وہ جل کر پوچھتی "دو جنوں قسمیں محبت کی بھی آتی ہیں۔"

"محترمہ کہانی کار صاحب۔ بتائیے محبت کیسی ہوتی ہے۔ محبت کس کو کہتے ہیں۔؟" وہ بھی مسکرانے لگتا۔

"ہائے اللہ مجھ پر نہ اُنڈ آیا کرو۔ مجھے پتہ نہیں۔" آپا ایسے موقعوں پر گھبراتیں۔

"سیما صاحبہ بھئی آپ ہی کچھ روشنی ڈالیئے۔"

"کر کے دیکھئے، پتہ چل جائے گا۔"

"ہاں واقعی، اب تو کسی نہ کسی سے کرنی ہی پڑے گی۔" اس کے لہجے میں شکر دھیمی ہوتی، زینت کو ہنسی آجاتی۔

اچانک انہی دنوں زینت کی سالگرہ آ گئی جگ مگ کرتے ستاروں کے درمیان وہ چاند کی طرح چمک رہی تھی، پھر شور و غل سے پریشان ہو کر وہ اپنے کمرے میں آئی، اور سیما اسے تحفے دکھانے لے گئی۔

"آپ نے مجھ سے کوئی تحفہ نہیں لیا؟" پرویز نے شکایت کی۔

"میں سمجھی تھی کہ اکیلے ہی رہ گئے۔" زینت نے کہا اور سیما ہنس پڑی۔ پرویز نے بڑے انداز سے ایک خوبصورت پیکٹ زینت کی نذر کیا۔ سیلے کے چھلکے کی طرح زینت نے گرد پوش چاک کیا اور تحفے کو دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ دل کی شکل کے بلوریں طشت میں کانچ کا نازک نازک سا تاج محل جگمگا رہا تھا۔

"ہاؤ سویٹ!" زینت نے اپنے رنگین لب تاج پر رکھ دیئے۔

"دکھایئے ذرا۔" سیما نے کہا، اور زینت نے تاج بڑھا دیا۔ سیما کے دل میں آگ لگ رہی تھی، اس نے لینے سے پہلے ہی ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ دل زمین پر آ رہا اور تاج محل کے ٹکڑے ادھر اُدھر بکھر گئے۔ زینت کے لبوں سے ہلکی سی چیخ نکل گئی، دل تھام کر رہ گئی۔

"دل ٹوٹ گیا!" پرویز کے لب خشک ہو گئے، جھک کر ٹکڑے اُٹھانے لگا۔

"مجھے افسوس ہے۔" سیما نے تاسف کی اداکاری کی اور منہ پھیر کر مسکرائی۔

"بدشگونی۔ یہ کیا ہوا۔" زینت کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ پرویز نے بڑی احتیاط سے ٹوٹے ہوئے دل اور تاج محل کے ٹکڑے چن لیے، اور کمرے سے نکل گیا۔

دوسرے ہی روز صبح پھوپھی اماں کا تار ملا۔ خالد آ رہے تھے۔ زینت کی شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی، اور سارے گھر میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔

ویرانوں میں اُجالا پھیلانے والی روشنی نہ جانے کہاں گم ہو گئی۔

"شادی!" پرویز مسکرایا۔ کیسے احمق ہوتے ہیں یہ لوگ کہانی لکھنے والے جیسے ان کی اداکاری پر دوسروں کو یقین آ جائے گا، یہ مسکراہٹ کتنے آنسوؤں میں ڈوب کر لبوں تک آتی ہے کون جانے۔

زینت گھبرائی تھی کہ کوئی بات ہو اور یہ رشتہ ٹوٹ جائے، مگر کیسے ٹوٹتا بہت پرانا رشتہ تھا، وہ خاموش تھی جیسے بولنا بھول گئی ہو۔

"آپ نے مجھ سے کہا بھی نہیں کہ آپ کی زندگی پہلے ہی سے کسی سے وابستہ تھی" پرویز نے کہا اور زینت کے ٹوٹے ہوئے آنسو گالوں پر ڈھلک گئے۔

"یقین نہیں تھا پرویز۔ یہ دن بھی دیکھنا پڑے گا۔"

"بابا۔ خدا نہ کرے۔ کون سا برا دن ہے۔ ارے اس دن کی آرزو میں تو لوگ مر مر کر جیتے ہیں۔ آپ روتی ہیں۔ بھئی واہ۔ خدا قدر نہیں آپ کو اپنی تقدیر کی۔" اس کی ہنسی تیر و نشتر کی طرح زینت کے احساس میں تیر جاتی۔ زہریلا لہجہ چھپا نہ رہتا۔

"تمہیں اسی کی تو آرزو تھی، اب دیکھو، میری آنکھوں میں آنسو چھلک آئے ہیں۔ بہت حسین لگتی ہیں نا یہ آنکھیں۔ تمہاری خاطر میں زندگی بھر روتی رہوں گی پرویز۔"

اس کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ "میری خاطر ———؟" پھر وہ ہنس پڑا۔ "نہیں نہیں۔ اتنا ایثار نہ کیجئے گا میرے لئے۔"

"پرویز"

"بہت بدنصیب ہوں۔ بہت بدنصیب۔" اچانک اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔ "سب مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ اب کون ہے میرا۔ کوئی نہیں۔ کیا کروں گا اس دنیا میں رہ کر۔"

"کتنے خود غرض ہو تم۔" سیما کا دل چیخنے لگتا۔ اس سراب کے پیچھے دوڑو گے جو تمہارے ہر قدم پر اور دور ہو رہا ہے۔ اس نہر کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھو گے جو تمہیں سیراب کر سکتی ہے ——— پرویز پرویز میرے ادھورے خوابوں کی تعبیر۔ آپا تو تم سے بڑی تھیں کسی اور سے وابستہ تھیں۔ میں تمہیں ان سے بڑھ کر محبت دے سکتی ہوں۔

پھر خالد آ گئے اور شادی کی دھوم دھام میں سب کچھ کھو گیا۔ کون سنتا بے صبر دلوں کی دھڑکن۔ کون دیکھتا وہ آنسو جو راتوں کی تنہائی میں چپکے چپکے ہتھیلیوں میں سمیٹ لئے جاتے تھے۔ بہت پرانے ناطے ٹوٹنے لگے تھے۔ کیسی کمزور زنجیریں تھیں، ذرا سا بوجھ بھی نہ سہار سکیں۔ مگر پھر کبھی پرویز نے کوئی شکوہ نہ کیا۔ سسکتے کے بہانے کبھی آہ نہیں کی۔ بڑی بہادری سے قہقہے لگاتا تھا۔ سب کے ساتھ مل کر گھر سجاتا، لڑکیوں میں گھل مل کر کام کرتا۔ باغ میں، کچن میں۔ اسی کے ساتھ، جہاں دیکھو وہی تھا، کتنے دنوں سے وہ جان بوجھ کر زینت سے نہیں ملا تھا۔ اور جس دن بارات آئی۔ وہ خاموش اور گم سم سا برآمدے میں آ کھڑا ہوا۔ گھر مہمانوں سے بھرے ہوئے تھے، شہنائیوں کی گونج میں زینت دلہن بنائی جا رہی تھی وہ باہر کھڑا تھا۔ تھکا ہارا مسافر جو خواہ مخواہ جادہ پیمائی کرتا رہا، جس کی کوئی منزل نہ تھی۔

"کیئے۔ آپا کو دیکھئے" سیما نے اسے آواز دی۔ وہ بے حد خوش تھی۔ جس راستے سے آپا گزر رہی ہیں، اسی راستے سے وہ بھی گزرے گی اس کے ساتھ کوئی خالد نہ ہوگا۔ آپا نے پرویز کا ہاتھ نہیں تھاما تھا۔ وہ دامن تھامے گی، زندگی کی بھری پری راہوں پر آپا کی سہیلی کا بھولا بھولا بھالا، بچھڑ گیا تھا۔ وہ اسے بھٹکے ہوئے مقام سے لے آئے گی پھر چاہے زمانہ کتنے ہی ستم توڑے وہ کبھی جدا نہ ہوں گے ——— اس کے چہرے پر بلا کی روشنی تھی۔

زینت کے نرم نرم لبوں کی کلیاں بند تھیں۔ پلکوں پہ ستارے مسکرا رہے تھے۔ مانگ میں افشاں جھلمل کر رہی تھی۔ پرویز بے ضبط ہو کر اس کے چہرے پر جھکا۔ اس کی گرم گرم سانسیں زینت کے چہرے سے ٹکرائیں۔ اس نے دونوں ہاتھوں کے ہالے میں زینت کا چاند سا چہرہ تھام لیا۔ اور یوں دیکھنے لگا جیسے سحر ہو گیا ہو۔ اور دھیرے دھیرے جیسے سورج کی گرمی سے نئی بہار کا پہلا پھول کھلے، اس کی سانسوں کی تپش سے زینت کی آنکھوں کی بند کلیاں کھلیں جن میں آنسوؤں کی شبنم تیر رہی تھی۔

آج آپ جا رہی ہیں، اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا، اور اپنے آنسو چھپانے کو جلدی جلدی پلکیں جھپکائیں "میری طرف سے ایک تحفہ قبول کیجئے۔"

"پرویز" زینت نے دفعتاً اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "مجھ سے وعدہ کرو تم میرے بعد آنسو نہیں بہاؤ گے۔ تم ہنستے رہو گے پرویز۔ مجھ سے خفا ہو گئے تم۔"

وہ بڑی بے دردی سے ہنسا۔ "کچھ وعدے آپ نے ایفا کئے، کچھ میں کروں گا۔ نہیں نہیں ——— اب میں ایسا پاگل بھی نہیں۔" زینت پکارتی رہ گئی مگر اس نے اس کی آغوش میں کچھ پھینک دیا اور جلدی سے باہر نکل گیا۔

"پرویز" زینت اس کے پیچھے جھپٹی۔ اور ریکا یک دل کا ٹوٹا ہوا تاج محل کے ٹکڑے فرش پر گر کر بکھر گئے۔

سیما کے حلق سے آواز بھی نہ نکلی، وہ ایک جگہ جم گئی، دفعتاً باجوں کا ایک ملا جلا شور ابھرا۔ اور زینت کی چیخ اور سیما کی سسکیاں انہی کی آوازوں میں گھل مل گئیں۔

آج کے پیچیدہ سماجی ڈھانچے میں مناسب رشتوں کی تلاش کا مثبت حل

آئیڈیل کی تلاش

ڈاکٹر مسیح خان

****

پیار کی جنت

میری سہیلی جس کی عمر ۲۳ سال ہے۔ بی اے پاس، اچھی شکل و صورت اور معزز خاندان کی فرد ہے۔ اس کو ایسے شریک سفر کی تلاش ہے جو افواج سے وابستہ ہو، نیوی میں افسر ہو تو زیادہ بہتر ہے اس کے علاوہ کوئی شرط نہیں۔

"عارفہ، کراچی"

دل کا سہارا

میری سہیلی کو ایسے آئیڈیل نوجوان کا رشتہ مطلوب ہے جو مخلص، ہمدرد اور خود مختار ہو۔ صورت چاہے واجبی ہو مگر محنتی اور عمر بھر ساتھ نبھانے والا ہو۔ تعلیم چاہے ایف اے ہو یا میٹرک۔ اگر سعودی عرب میں ہو تو بہتر ہے۔ لڑکی ایف اے پاس ہے۔ صاف رنگ، گھریلو کام کاج میں ماہر اور بے حد مخلص ہے۔

"مس نگہت، لاہور"

خوشیوں کا چمن

میں ایک سچائی پسند ریٹائرڈ جونیئر کمیشن افسر کی ایم سی پاس دختر ہوں۔ میری عمر تقریباً ۲۹ سال، پرکشش نقوش، سانولا رنگ، گھریلو امور میں ماہر۔ یوپی کے متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ میرا آئیڈیل خوش شکل، بردبار، حقیقت پسند، تعلیم یافتہ، اعلیٰ عہدے پر فائز، برسر روزگار، خوب سیرت، وفادار نوجوان ہے جس کی عمر ۳۲ سال سے زائد نہ ہو۔ کراچی والوں کو ترجیح دی جائے گی۔

"زبیدہ بلے ناز، کراچی"

روئے حسین

میرا آئیڈیل ۳۰ سالہ خوب صورت، اسمارٹ، اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان ہے۔ جو سیر و سیاحت کا شوقین ہو، سخت مزاج نہ ہو، کاروباری ہو تو اپنی خوش قسمتی سمجھوں گی۔ میں گورے رنگ، دراز قد، امور خانہ داری میں ماہر ۲۵ سالہ دوشیزہ ہوں۔ لوگ اکثر میرے حسن کی تعریف کرتے ہیں۔ میں اپنے مجازی خدا کی خدمت کا جذبہ

☆

ان کالموں میں آئیڈیل کی تلاش خواتین کے خطوط اور ان کے رشتوں کے بارے میں ان کی تجویز (پیشکش) شائع کی جاتی ہیں۔ یہ خطوط شائع نہیں کئے جاتے جن میں مکمل پتہ درج نہیں ہوتا۔ خواتین کے پتے ان کی اجازت کے بغیر تحریر نہیں کئے جاتے۔ (ادارہ)

...ہ بنے اپنے آئیڈیل کی منتظر ہوں۔
"السماس، کراچی"

...حلۂ مہ و وفا

میں ایک تعلیم یافتہ، عزت دار گھرانے کی ۲۵ سالہ گریجویٹ دوشیزہ ہوں صحت مند، زندہ دل، اسمارٹ اور خوش لباس ہوں۔ درس و تدریس کرتی ہوں اور خواہش یہی ہے کہ میں اپنے ساتھی کے ساتھ مل کر ایک چھوٹی سی جنت تعمیر کروں۔ جہاں خوشیاں ہی خوشیاں ہوں اور بس بہاریں ہوں۔ میرا آئیڈیل خاندانی، تعلیم یافتہ، پروقار، باعتماد اور اچھے عہدے پر فائز ۳۰ سالہ نوجوان ہے جو عمر بھر ساتھ دینے کا وعدہ کرے۔ سی ایس پی افسر ہو تو میں اپنی خوش نصیبی سمجھوں گی۔ سول اور پی آئی اے کا افسر بھی قبول ہے۔
"وانی ملک، ڈیرہ اسمٰعیل خان"

...شبنم کی پیاس

میں بی اے نفسیات کی طالبہ ہوں۔ میرا آئیڈیل ۳۵ سال کا صاحب دولت مند شخص ہے جو بہت پُر وقار شخصیت کا مالک، بزنس مین یا کسی اچھے عہدے پر فائز ہو۔ میں خود بھی ایک شریف گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ اگر مجھے میرا آئیڈیل مل جائے تو اس کو تمام زندگی اتنا پیار دوں گی کہ اس کو دنیا میں رہتے ہوئے جنت کا احساس ہوگا۔
"ص، ف، گوجرانوالہ"

خواب سحر

میری بیٹی کی عمر ۲۲ سال تعلیم بی ایس سی، دُبلی پتلی، خوش لباس اور خوش شکل، صاف رنگ کی مالک ہے۔ مذہبی تعلیم سے آراستہ سیر و تفریح کی بھی شوقین دوشیزہ کے لئے دراز قد، خوش مزاج، شریف اور برسرروزگار نوجوان کی تلاش ہے۔ آمدنی اچھی ہو تاکہ باعزت زندگی گزر سکے۔ لڑکے کے والدین رجوع کریں۔
"بیگم این' بخاری، حیدرآباد"

جمال مہ و انجم

میری چھوٹی بہن جس کی عمر ۲۵ سال ہے۔ تعلیم ایم اے (فائنل)، نہایت سلجھے ہوئے خاندان کی لڑکی ہے۔ شریف، مناسب عہدے پر فائز خوش لباس، خوش مزاج نوجوان کا رشتہ مطلوب ہے۔ ...زاج سے تعلق رکھنے والے حضرات توجہ فرمائیں۔
"مسز ایم اے آئی، کراچی"

نالۂ بلبل

مجھے ایک سنجیدہ اور پُر وقار آئیڈیل کی تلاش ہے جس کا وسیع ذاتی کاروبار، بنگلہ اور کوٹھی کا مالک اور امیر خاندان سے تعلق رکھتا ہو۔ میری عمر ۲۳ سال ہے۔ تعلیم مڈل، گورا رنگ، دراز قد، حساس طبیعت کی مالک، تنہائی پسند اور سنجیدہ لڑکی ہوں۔ کاش مجھے میرا آئیڈیل مل جائے۔
"شازیہ مسرور، جھنگ"

سُندر سُندر، کومل کومل

میرا تعلق کھاتے پیتے گھرانے سے ہے۔ عمر ۲۰ سال، تعلیم میٹرک، مناسب شکل و صورت اور اچھی سیرت کی مالک ہوں۔ امور خانہ داری میں ماہر، گندمی رنگ، بڑی ہی حساس قسم کی لڑکی ہوں۔ بچپن میں ہی والدین کے پیار سے محروم ہو گئی۔ مجھے ایسے ساتھی کی تلاش ہے جو نیک اور ہمدرد انسان ہو۔ ۲۷ سالہ گندمی رنگ کا زندہ دل، خوش لباس اور تعلیم یافتہ نوجوان میرا آئیڈیل ہے۔ کاش مجھے میرا جیون ساتھی مل جائے تو میں اپنی ہر خواہش اور خوشی اس کے قدموں پر نچھاور کر دوں گی۔
"مینا قریشی، حیدرآباد"

شوقِ پرستش

مجھے اپنی بھتیجی کے لئے ایسے شوہر کی تلاش ہے جس کی عمر تقریباً ۳۰ سے ۳۵ سال ہو۔ تعلیم بی اے اور تنخواہ چھ سات سو روپے ہو۔ میری بھتیجی جاذب نظر، مناسب خدوخال کی مالک ہے۔ تعلیم بی اے، بی ایڈ ہے۔ سروس کرتی ہے۔ بہت معصوم اور بھولی بھالی ہے۔
"سعید صائم، کراچی"

حسرتوں کے خیاباں

میں ایک شریف گھرانے کی لڑکی ہوں۔ چاہتی ہوں کہ کوئی ایسا جیون ساتھی ملے جو خلوص اور پیار کو پانے کی تمنا بھی رکھتا ہو اور اس کی قدر بھی کرے۔ میری عمر ۲۲ سال ہے۔ جہیز کے لالچی معاف فرمائیں۔
"زہرہ جبیں، کراچی"

سوجمالِ سراب

مجھے ایسے ہم سفر کی تلاش ہے جو نیک سیرت ہو، شریف خاندان سے تعلق رکھتا ہو۔ اچھے عہدے پر فائز، دراز قد اور خوبصورت جسم کا مالک ہو۔ میں اپنا تمام خلوص اور پیار اس کے قدموں پر نچھاور کر دوں گی۔
"شاہدہ، لاہور"

تینوں کی پھلواری

میرا تعلق ایک خوش حال اور کاروباری گھرانے سے ہے۔ تین بھائیوں کی اکلوتی بہن ہوں۔ عمر ۱۹ سال۔ بڑی بڑی آنکھیں، گورا رنگ، گول چہرہ، گداز جسم، لانبے گھنے بال، دراز قد اور

تعلیم بی اے ہے۔ میں وحید مراد سے مشابہت رکھنے والے نوجوان سے شادی کی خواہاں ہوں۔ اس کی عمر ۲۰ - ۲۵ سال، تعلیم کم از کم میٹرک ہو۔ اگر ملک سے باہر جانے کا ارادہ رکھتا ہو تو اس کی یہ خواہش بھی پوری کی جائے گی۔ "رفعت، کراچی"

کھی تمنا

میں سید گھرانے کی چوبیس سالہ، ایم اے فائنل کی طالبہ ہوں۔ خوب صورت اور خوب سیرت آئیڈیل کی متمنی ہوں جو حقیقتوں کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ ڈاکٹر یا انجینئر کے روپ میں اپنے مجازی خدا کو دیکھنے کی خواہش رکھتی ہوں۔ اپنی غلطیوں کو تسلیم کرنے اور دوسرے کی برائی کو نظر انداز کرنے یا معاف کرنے کی صلاحیت ہو تو خوش نصیبی ہو گی۔ "نگہت مسعود۔ کراچی"

اخلاص کی خوشبو

مجھے اپنی میٹرک پاس اور باسلیقہ لڑکی کے لیے تعلیم یافتہ اور باروزگار لڑکے کی تلاش ہے۔ مخلص اور اردو بولنے والے خاندان رجوع فرمائیں۔ "والدہ نگہت۔ بہاولپور"

ہنستا ہوا پھول

میرا آئیڈیل خوددار اور باوقار انسان ہے۔ جو میری تمام خامیوں کو اپنے پیار سے دور کرے۔ میں بھولی بھالی اور ضدی لڑکی ہوں۔ بہت اسمارٹ اور حساس ہوں۔ مجھے جھوٹ سے سخت نفرت ہے۔

"شفقت گل، لاہور"

تمنا جنائے دل

اپنے آپ کو اس دنیا میں تنہا سمجھنے والا، مایوسیوں اور ناکامیوں کے گرداب میں پھنسا ہوا انسان میرا آئیڈیل ہے۔ ایسے نوجوان کے لئے میں ایک مضبوط سہارا بن سکتی ہوں۔ عمر ۳۰ سال تک ہو۔ میں مہذب گھرانے کی ۱۹ سالہ، میٹرک پاس، کھلتے ہوئے گندمی رنگ کی دوشیزہ ہوں۔ میری آرزو ہے کہ میں کسی تنہا کا سہارا بن سکوں۔ جو اس بھری دنیا میں اکیلا ہو۔ "س، ن۔ راولپنڈی"

تربیت کامل

میری بہن کی عمر ۲۵ سال ہے۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اور گوری رنگت کی بی اے، سی ٹی ٹیچر ہے۔ اس کا آئیڈیل آرمی آفیسر کیپٹن یا میجر ہے۔ اسے جنون کی حد تک آرمی آفیسر سے عقیدت ہے اگر کوئی آرمی آفیسر اس پاکیزہ آرزو کو اپنی آغوش میں سمیٹ لے تو وہ بہترین اور مخلص ساتھی کی حیثیت سے اس کے قدموں میں زندگی گزار دے گی۔ "عبد النساء۔ گوجر خان"

سوز وفا

میرا آئیڈیل پڑھا لکھا، شوخ و شریر، خوب صورت اور نوجوان ہے۔ میں متوسط گھرانے کی سیر و تفریح کی دلدادہ، فیشن سے رکھنے والی پندرہ سالہ دوشیزہ ہوں۔ میں زیادہ خوب صورت تو نہیں البتہ قبول صورت ضرور ہوں۔ میرا شوہر اگر میرے جذبات کی قدر کرے تو میں اس کی دل و جان سے خدمت کروں گی۔ اسے کبھی شکایت کا موقع نہ دوں گی۔ "سنبل سعدیہ، ملتان"

شفق شام

ہماری باجی کی تعلیم مڈل تک ہے۔ ان کا آئیڈیل خوش مزاج، ہنس مکھ، خوب صورت اور اسمارٹ نوجوان ہے۔ میری باجی امور خانہ داری میں ماہر، اسمارٹ اور خوش شکل خاتون ہیں۔ کاش ان کو شریک سفر جلد مل جائے۔ "ریحانہ، ڈیرہ غازی خان"



عذرا، پشاور کے نام:

مجھے مدت سے آپ جیسی لڑکی کی تلاش تھی۔ میرے اور آپ کے خیالات میں ہم آہنگی ہے۔

ایس اعجاز ۔ ۱۰ اے دونی چند اسٹریٹ۔ جین مندر پرانی انارکلی ۔ لاہور

آپ کے جذبات و احساسات کی دلی قدر کرتا ہوں۔ سفر حیات کے لئے آپ جیسا شریک سفر پا کر زندگی یقیناً خوش گوار رہے گی۔

قمر صغیر معرفت مرزا خان۔ کباڑی بازار۔ پشاور صدر

مجھے آپ کی ٹرسٹ کر چاہنے والی بات بہت پسند آئی ہے مجھے موقع دیجئے۔

ایم، کریم خالد

زرعی ترقیاتی بینک آف پاکستان، خداداد روڈ۔ کوئٹہ

اگر آپ ساتھ دینے پر آمادہ ہوں تو زندگی کا سفر خوشگوار

سپاہی عبدالرزاق تبسم
۲۔ فرنٹیئر فورس رجمنٹ سی کمپنی۔ پشاور کینٹ

میری تنخواہ ۔/... ا روپے ماہوار ہے تاآپ کا ہم سفر بن کر
آپ کے تمام غموں کا مداوا کر سکوں گا۔
محمد اسد اللہ خاں ۱۹۴۔ بی شیرآباد سوسائٹی
نزد جوہرآباد روڈ۔ کراچی ۱۸

زمانے کے ہاتھوں بہت زخم کھائے ہیں۔ شاید ہم دونوں
مل کر دکھوں اور غموں کو خوشیوں میں تبدیل کر سکیں۔
جاوید صادق معرفت یاسین
کمپوزٹ وڈ آفیسر، فارسٹ انسٹی ٹیوٹ۔ پشاور

میں بہت غریب آدمی ہوں۔ سوائے پیار اور خلوص کے اور کچھ
نہیں دے سکتا۔ نیاز من علی
مکان نمبر ۲۶/۲ سول کالونی وحدت روڈ۔ کوئٹہ

آپ کی تحریر سے متاثر ہو کر آپ کو اپنانے کے لئے قلم
اٹھایا ہے۔ نواب معرفت ایم علی محمد
مدینہ کاٹن فیکٹری چشتیاں۔ ضلع بہاولنگر

زمانے کا ستایا ہوا انسان آپ کی نگاہ التفات کا طلبگار ہے۔
غفور احمد ناز ، ڈی۔۹۳۶ سٹلائٹ ٹاؤن۔ راولپنڈی

خود مختار دکھی اور آزاد طبیعت کا مالک ہوں چاہتا ہوں
دکھی لڑکی کو اپناؤں تاکہ ہم ایک دوسرے کے درد میں برابر کے
شریک بن سکیں۔ ملک جاوید اکبر ٹی۔ او
انچارج ٹیلیفون آفس۔ تحصیل علی پور۔ ضلع مظفر گڑھ

احساس تنہائی کو مٹانے کا موقع دیں۔
محمد حسین تبسم معرفت عاشق اینڈ کو
ریلوے روڈ۔ پڈعیدن۔ ضلع نواب شاہ

تنخواہ معقول، تعلیم انٹر اور عمر ۲۳ سال ہے۔
اورنگ زیب تبسم
نیشنل گارڈ آف ایتھوپیا۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۳۶۔ ادیس ابابا

مجھے بھی آپ جیسی ساتھی کی تلاش تھی۔ عمر ۲۴ سال، تعلیم میٹرک
تنخواہ ۔/۴۵۰ روپے ہے۔
مرزا حامد بیگ۔ مکان نمبر B - 454/1
گلی نمبر ۱۔ محلہ موہن پورہ۔ راولپنڈی سٹی

میں آپ کا ہم سفر بن کر خوشی محسوس کروں گا اور آپ کو اتنا
پیار دوں گا کہ ہر غم بھول جائیں گی۔
رشید احمد معرفت خٹک ہوٹل۔ محمد علی سوسائٹی
جوہر روڈ۔ بلاک ۸/۷۔ کراچی ۸

عمر ۲۶ سال، تعلیم بی اے، متوسط زمیندار گھرانے سے تعلق ہے۔
رشید انور، ایبرائیڈری کلاتھ ہاؤس
فقیروالی۔ ضلع بہاولنگر

آپ کی تحریر نے بہت متاثر کیا ہے۔ میں آپ کے دکھ میں برابر
کا شریک بننا چاہتا ہوں۔ میری عمر ۲۵ سال اور ماہوار آمدنی ۔/۲۵۰ روپے
ہے۔ رانا پرویز شاہد معرفت منظور احمد مقصود احمد کریانہ مرچنٹ
غلہ منڈی روڈ۔ لیاقت پور ضلع رحیم یار خان

آپ کی تحریر سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ عمر ۲۰ سال اور تنخواہ
۔/۵۰۰ روپے ہے۔ مرزا محمد اقبال
میونسپل ڈسپنسری۔ ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ۔ گوجر گڑھ۔ ونکیوہ

میں آپ کے تمام دکھ اپنی ذات میں سمو لوں گا۔ زندگی بھر غم
آپ کے قریب نہیں آئیں گے۔
شاہد شہزاد۔ جی ون۔ سی ٹو۔ سرور۔ کراچی ۱۳

آپ کی تحریر نے بہت متاثر کیا ہے۔ میری عمر ۲۲ سال۔ تعلیم
بی اے اور تنخواہ ۔/۶۰۰ روپے ماہوار ہے۔

محمد مبین خاں - اولڈ ٹاؤن شپ
کراچی الیکٹرک سپلائی کارپوریشن - کھارادر - کراچی

آپ کی دکھی تحریر نے بہت متاثر کیا۔ خدا نے چاہا تو سب دکھ
دور ہو جائیں گے۔ میری تعلیم ایف اے، عمر ۲۲ سال اور تنخواہ ۶۰۰/-
روپے ماہوار ہے۔
اے جاوید جان۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۰۸۹۔ دوحہ۔ قطر

میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ اور دل و جان سے
آپ کو اپنانے کو تیار ہوں۔ ایم امتیاز شاہد
معرفت پرسنل کلرک جی پی او۔ کیمبل پور

میری عمر ۲۵ سال ہے۔ ملازم ہوں اور زیادہ آمدنی بنا کر
دینا چاہتا ہوں۔ آپ کا ہم سفر بننے کو تیار ہوں۔
عبد القدیر
GRUEGATA-16 OSLO-6 NORWAY

میٹرک پاس ہوں۔ عمر ۱۸ سال اور تنخواہ ۳۶۵/- روپے ہے
اے آر نوشابی معرفت اعوان بیکرز
ٹاہلی موہری - راولپنڈی

میری عمر ۲۵ سال، تعلیم ایم بی بی ایس اور پیشہ ڈاکٹری ہے
آپ کو شریک سفر بنانا چاہتا ہوں۔
سہیل طارق - مکان نمبر ۲۳ - شام گلی ۴۴
کرشنا بازار ۲ - نزد گندا انجن - لاہور

میری ماہوار آمدنی ۴۰۰/- روپے ہے۔ میٹرک پاس ہوں اور
آپ کو شریک سفر بنانا چاہتا ہوں۔ فرہاد حسین
ڈاکخانہ لنڈ کوکوڑ بابل خیل تحصیل کرک۔ ضلع کوہاٹ

میں بہت دکھی انسان ہوں بڑی محنت کے بعد زندگی میں اپنا
مقام بنایا ہے۔ آپ کو اپنانے کی دلی آرزو ہے۔
ایم اکرم معرفت علی شیر نیازی شہباز شاپنگ سینٹر

دکان نمبر ۲۱ - سہون شریف - ضلع دادو

آپ کو اپنا جیون ساتھی بنا کر خوشی ہوگی۔ تعلیم میٹرک۔ عمر
۲۰ سال اور تنخواہ ۶۰۰/- روپے ہے۔
محمد رفیع مرزا - پوسٹ بکس نمبر ۱۳۹۹
مانہ کوارٹری - شارجہ - یو اے ای

مجھے اپنے ہمسفر کی تلاش ہے۔ عمر ۲۵ سال اور ماہانہ آمدنی ۲۰۰۰
ریال ہے۔ جاوید حیات خاں
پوسٹ بکس نمبر ۵۲۲۳ - جدہ - سعودی عرب

میری عمر ۲۳ سال اور ماہانہ آمدنی ۶۵۰/- روپے ہے۔ اس
دنیا میں سوائے دکھوں اور غموں کے کچھ بھی نہیں ملا۔ میں بھی محبت کا
بھوکا ہوں۔ آپ کے جذبات کی قدر کرتے ہوئے آپ کو اپنانے
کے لئے تیار ہوں۔
راجہ محمد افضل معرفت عباسی کریانہ اسٹور
نیشنل پارک گلستان کالونی - راولپنڈی

شاید میں آپ کا ساتھی بن سکوں۔
قیصر خاں عمرانی۔ تحصیل جھٹ پٹ - ضلع نصیر آباد

چاہت اور خلوص جنس لطیف نہیں ہے۔ پیدا نہیں کی جا سکتی۔ البتہ
مجھ سے آپ کو خلوص اور ہمدردی کے بے پناہ خزانے مل سکتے ہیں جن کو
آپ ٹرسٹ کر چاہنے سے بڑھ کر موثر پائیں گی۔
حسین نقوی - قائد اعظم میڈیکل کالج - بہاولپور

آپ کی خواہشات کے عین مطابق ہوں۔
ایم ایس طاہر معرفت ملک شاہ
حبیب بینک لمیٹڈ - جگنال کینٹ (گلگت)

میرا دوست پڑھا لکھا۔ برسر روزگار ہے۔ معقول تنخواہ۔ بیحد
ہمدرد۔ آپ کو ٹرسٹ کر چاہے گا۔
چوہدری محمد ریاض۔ اکاؤنٹس برانچ

انجینئرنگ ڈویژن۔ پوسٹ بکس نمبر ۴۹۶۵۔ کویت۔

فرحت جبیں، سرگودھا کے نام!

میں آپ کو ہر طرح کا تحفظ دینے کو تیار ہوں۔ عمر ۳۰ سال تعلیم میٹرک اور معقول آمدنی ہے۔

آفتاب احمد ملک ۱۹ ای جی ۳۸۳۔ پی او ایف۔ واہ کینٹ

نبیلہ، لاہور کے نام!

میں ایک زمیندار گھرانے کا فرد ہوں۔ کشمیری لڑکی میرا آئیڈیل ہے۔

کاشف مظفر گڑھی

چیف ایڈیٹر الطاہر بیرون ملتانی گیٹ مظفر گڑھ

عمر ۲۵ سال، تعلیم ایف اے، معقول تنخواہ، آزاد خیال اور سمارٹ ہوں

ایم اوائی بٹ

پوسٹ بکس نمبر ۱۳۹۲۔ دمام۔ سعودی عرب

آپ کے معیار پر پورا اتروں گا۔

ابوبکر۔ پوسٹ بکس نمبر ۹۹۳۔ مدینہ منورہ۔ سعودی عرب

عفیفہ فاروقی۔ راولپنڈی کے نام!

میری عمر ۲۲ سال، تعلیم بی اے۔ ماہوار آمدنی ۱۲۰۰/- روپے ہے

آفتاب احمد فاروقی ۱۵-۷-۲۵۔ م

سول لائن۔ جیل روڈ۔ لائلپور

آپ کے آئیڈیل کے مطابق ہوں۔ ماہوار آمدنی ۸۰۰۰/- روپے ہے

محمد رشید تبسم

پوسٹ بکس نمبر ۹۳۸۔ ابوظہبی (یو اے ای)

والدین کا اکلوتا چشم و چراغ ہوں۔ عمر ۲۵ سال اور تنخواہ ۲۵۰۰/- روپے ہے۔

محمد اقبال انجم

پوسٹ بکس نمبر ۲۵۱۹۔ دوبئی۔ (یو اے ای)

آپ کی تحریر سے متاثر ہو کر آپ کو اپنانے کا ارادہ ہے۔

امین تقیر۔ پوسٹ بکس نمبر ۵۶۵۔ ڈیرہ۔ دوبئی

آپ کے معیار پر پورا اتروں گا۔ عمر ۲۵ سال اور تنخواہ ۴۰۰۰/- روپے ہے۔

خالد جاوید

پوسٹ بکس نمبر ۳۶۹۰۔ جدہ۔ سعودی عرب

میری عمر ۲۲ سال ہے کھاتے پیتے گھرانے کا چشم و چراغ اور آپ کے آئیڈیل کے عین مطابق ہوں۔

شمشیر علی اعوان۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۴۹۴۔ ڈیرہ، دوبئی

شاید میں ہی آپ کا آئیڈیل ہوں۔ تعلیم بی اے عمر ۲۵ سال اور تنخواہ ۵۰۰۰/- روپے ہے۔

اقبال احمد فاروقی۔ ایئرپورٹ سروسز ایجنٹ (ایف ٹی سی)

سعودی عربین ایئرلائنز۔ پی او بکس نمبر ۱۲۶

دہران انٹرنیشنل ایئرپورٹ۔ سعودی عرب

عمر ۲۳ سال ہے۔ آپ کے معیار پر پورا اتروں گا۔

ایم ایف طاہر۔ این سی سی پاکستان لمیٹڈ

نزد ایئرپورٹ روڈ۔ گلگت

اچھے عہدے پر فائز ہوں۔ آپ کے حصول کو اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا۔

مہتاب خان

پوسٹ بکس نمبر ۳۹۶ ابوظہبی (یو اے ای)

میں آپ کے آئیڈیل کے مطابق ہوں۔ ماہانہ آمدنی ۶۰۰۰/- روپے اور عمر ۲۴ سال ہے۔

ایم فاروق ملک۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۰۹۹۔ دوحہ قطر

ایسا لگتا ہے آپ نے میرے خیالات اپنی تحریر میں سمو دیئے ہیں۔

شاہد قمر

پوسٹ بکس نمبر ۲۷۳۔ لاہور

روبینہ، کراچی کے نام!

میں آپ کو اپنانے کے لئے تیار ہوں۔

محمد یوسف ڈار معرفت عرفان اصلاح گیسو

دکان نمبر ۲۳۔ بابر مارکیٹ۔ لانڈھی۔ کراچی ۳۰

مجھے بھی آپ جیسے ساتھی کی تلاش ہے۔
نعیم سہیل۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۰۱۲ ا المیین۔ ائرلینی

آپ کے خیالات و احساسات قابلِ ستائش ہیں۔ ممکن ہے
میں ہی آپ کا آئیڈیل ثابت ہوں۔ عمر ۲۲ سال، تعلیم گریجویٹ۔
مستقل آمدنی ہے۔ شیخ حفیظ اللہ حسرت
معرفت راشن شاپ نمبر ۱ سکھراں گیٹ ڈیرہ اسمٰعیل خاں

اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ صرف آپ جیسی مخلص شریکِ سفر کی
کمی ہے۔ غلام حسین عابد
معرفت مانونڈ ویز ریڈیو اینڈ ٹیلیویژن انجینئر
کینٹ ایبٹ آباد ہزارہ

زندگی کا حقیقی لطف ہم دونوں کے ملاپ میں ہے۔ میری عمر
۲۴ سال، تعلیم انٹر، تنخواہ مبلغ ۳۲۵ روپے۔ اسکول ٹیچر ہوں۔
لیاقت علی عمران قریشی وارڈ نمبر ۵
محلہ شنکر پورہ۔ بیلسی۔ ضلع دادو

ہم دو منہ بولے بھائی آپ کے معیار پر پورے اتریں گے۔
محمد افضل معرفت تنویر واچ ایکسپرٹ
پورے والا موڑ۔ عارف والا ضلع ساہیوال

خلوصِ نیت سے یاد کیجئے۔ آپ دونوں میں سے کسی ایک
کے لیے بہترین شریکِ سفر ثابت ہو سکوں گا۔
ایس اے پروانہ، قادری الیکٹرک ورکس
مامونجی روڈ۔ لال کرتی۔ راولپنڈی

ہم دو بھائی سرکاری ملازم ہیں۔ آپ کے معیار پر پورے
اتریں گے۔
ملک، پوسٹ بکس نمبر ۴۲۷۳۔ روی، مسقط۔ عمان

ہم دو دوست ہیں۔ میری عمر ۲۰ سال اور دوست کی عمر
۱۹ سال ہے۔ میری تعلیم بی اے اور میرے دوست کی تعلیم میٹرک

ہے۔ مشترکہ کاروبار اور ماہانہ آمدنی تیس ہزار روپے ہے۔
ایم ایس ملک
AVNKOLL BAKEN _12 GRORUD
OSLO _ 9 NORWAY

میں آپ کا آئیڈیل ثابت ہو سکتا ہوں۔ عمر ۲۰ سال، تعلیم
میٹرک، تنخواہ مبلغ ۳۲۰ روپے ہے۔
اے آر رحیمی مکان نمبر ۱۹۱ ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل۔ راولپنڈی

ہم دو دوست آپ کے معیار پر پورے اتریں گے
دونوں کی ماہانہ آمدنی چار چار ہزار روپے ہے۔
عزیز احمد۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۱۴۹۔ مطرح، عمان

میرے پاس خلوص و وفا کی دولت ہے۔ کیا آپ یہ لے
لیں گی۔ داؤد احمد جاوید
انچارج ڈیویلپمنٹ برانچ۔ ایگریکلچرل انجینئرنگ ورکس
ڈیرہ غازی خاں

ہم دونوں بھائیوں کی ماہانہ آمدنی تقریباً دس ہزار روپے
ہے۔ ایک ہی گھرانے میں شادی کرنے کا ارادہ ہے۔ ہمیں امید ہے
آپ کے معیار پر پورا اتریں گے۔
محمد نصیر، پوسٹ بکس نمبر ۳۷۷۰۔ روی۔ عمان

میں آپ کو اپنانے کے لئے تیار ہوں۔ تعلیم بی اے
ماہانہ آمدنی مبلغ ۰۰۰ روپے ہے۔
قادر بخش غالب۔ یونٹ نمبر ۲۰۹
پوسٹ بکس نمبر ۳۱۸۔ شارجہ۔ (یو اے ای)

ہم دونوں الحمد للہ دبئی میں شریف گھرانے سے تعلق رکھتے
آپ کو اپنانے کو تیار ہیں۔
محمد فاروق۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۴۹۳۔ دوبئی

آپ کو اپنا کر خوشی ہوگی۔ آمدنی مبلغ ۱۴۰۰ روپے۔

۲۴ سال ہے۔ محمد رفیق
پوسٹ بکس نمبر ۱۳۴۳ - شارجہ - دوبئی

ہم دو دوست ہیں جو آپ کے آئیڈیل کی تصویر ہیں۔
محمد نذیر مرزا - معرفت رانا جمیل اشرف
پوسٹ بکس نمبر ۵۸ - جنرل الیکٹرک کمپنی - جدہ سعودی عرب

میری ماہانہ آمدنی ۵۰۰/- روپے ہے۔ آپ کے آئیڈیل
کے مطابق ہوں۔ جاوید اسلام
NESPAK LTD پانچویں منزل
دی مال - راولپنڈی

آپ کے معیار پر پورا اتروں گا۔ تعلیم میٹرک اور تنخواہ
۶۰۰۰/- روپے ہے۔ نصیر عادل رند
پوسٹ بکس نمبر ۲۴۴۲ دوحہ۔ قطر

میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ عمر ۲۸ سال،
تعلیم میٹرک ہے۔ ایم ماہی
OMAN ARTY H.Q BTY IZKI
SULTANATE OF OMAN

بینا کراچی کے نام!
عمر ۳۱ سال اور ماہانہ آمدنی ۳۰۰۰/- روپے ہے۔ آپ
کے معیار پر پورا اتروں گا۔
عنایت اللہ سرویئر - پوسٹ بکس نمبر ۴۸۵ - الخبر
سعودی عرب

آپ کی تحریر نے متاثر کیا۔ آپ کو اپنا جیون ساتھی بنانے
کو تیار ہوں۔ شمیم - بسم اللہ ٹیلرنگ
نزد ملیر کلاسنگ - فیڈرل بی ایریا - کراچی ۳۸

آپ کی شخصیت میں موجود حسن و لطافت مجھے پسند ہے
میجر کمال معرفت منظور بیوپاری
کارپٹ پیلس - شاپنگ سینٹر - ملتان چھاؤنی

دکھوں سے آشنا ہوں اور آپ کی ذات سے وابستہ دکھوں
کو سمیٹنا چاہتا ہوں۔ ندیم معرفت گلفشاں اسٹوڈیو
عزیز شہید روڈ - ملتان کینٹ

مسز پ بخاری - کے نام!
میں آپ کے تمام دکھ درد بانٹ لوں گا۔ دنیا کی ہر آسائش
مجھے میسر ہے۔ افتخار
G-44/6 فیڈرل ایریا - کراچی ۱۹

ایک مقامی فرم میں ملازم ہوں۔ جس ہمدرد ساتھی کی تلاش
میں ہوں شاید وہ آپ ہی ہیں۔
محمد خان معرفت محمد زمان
بنگلہ نمبر ۱۲۹ - آدم جی نگر - بلاک ۸ بی
نزد خالق صلاح الدین روڈ - کراچی ۵

آپ کے حالات پڑھ کر بے حد رنج ہوا۔ میں بھی آپ کی
طرح دکھی انسان ہوں۔ شریک سفر بن کر خوشی ہوگی۔
عبدالعزیز خان - میٹرو گارمنٹ انڈسٹریز
مہر سنز اسٹریٹ - تالپور روڈ - کراچی

سیدہ نسیم۔ کراچی کے نام!
میری عمر ۲۳ سال، تعلیم میٹرک اور تنخواہ ۴۵۰/- روپے
ہے محمد اسلم اے ایم سی
ایچ ۲۹ پنجاب رجمنٹ - کیئر آف ایس بی پی او ۲

تعلیم ایف ایس سی (ڈپلومہ انجینئر)، عمر ۲۴ سال ہے۔
کارپورل ٹیکنیشن منظم معرفت ایئر مین میس ۲
پاکستان ایئر فورس - چکلالہ - راولپنڈی

خدا کا دیا سب کچھ ہے۔ صرف اچھے ساتھی کی تلاش ہے۔
عمر ۲۱ سال، تعلیم میٹرک ہے۔ قمر ناز
۳۱ بلوچ رجمنٹ، اے کمپنی - ملیر کینٹ - کراچی ۹

عمر ۲۵ سال ہے۔ آپ کے آئیڈیل کے مطابق ہوں۔
پرویز خان - پوسٹ بکس نمبر ۱، ام القوین (یو اے ای)

میری عمر ۲۵ سال ہے۔ زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں۔
آپ کے معیار پر پورا اتروں گا۔
محمد سلیم عاصم چودھری
اسٹیشن ورکشاپ۔ ای ایم ای کاکول۔ ایبٹ آباد

فوجی جوان ہوں۔ عمر ۲۲ سال، تعلیم میٹرک ہے۔
محمد علی ساجد۔ سی ایم ایچ۔ سیالکوٹ کینٹ

منیرہ سلطانہ، راولپنڈی کے نام:

شادی کے چھ سال کے بعد بیوی فوت ہو گئی۔ دو بچے ہیں
میری عمر ۳۶ سال ہے اور تنخواہ تین ہزار روپے ہے۔
ماسٹر کرامت حسین۔ پوسٹ بکس نمبر ۴۲۷۲
روئی، مسقط۔ سلطنت آف عمان

میرے دوست کی عمر ۳۲ سال، تعلیم بی اے ہے۔ آپ کو
اپنانے کو تیار ہیں۔ ایس ایم جمیل
وارڈ نمبر ۸، مہاجر کالونی۔ نواب شاہ

آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں اور اپنانے کو تیار ہوں۔
آزر معرفت نذیر احمد رانجھا
سیکریٹری یونین کونسل۔ ہیڈ مرالہ۔ سیالکوٹ

آپ کی تحریر سے متاثر ہو کر آپ کو دل سے اپنانے کو تیار
ہوں۔ محمد فاروق بیگ
ٹیلی فون ٹیکنیشن۔ کراچی پورٹ ٹرسٹ۔ کراچی

آپ کے خیالات سے متاثر ہوا ہوں۔ عمر ۲۶ سال، تعلیم
بی اے۔ بی ایڈ ہے۔ م۔ س حسین
معرفت شیخ اللہ دتہ تجزز ایجنٹ۔ بیول۔ تحصیل گوجر خان

ش۔ ف صدیقی، کراچی کے نام:

ماہانہ آمدنی ۔/۵۰۰۰ روپے ہے۔ پیشہ ور آرٹسٹ ہوں۔
ایم سلیم قلمکار۔ پوسٹ بکس نمبر ۴۷۰۵ مسقط۔ عمان

میں مصور تو نہیں لیکن میرے دل میں مصوری کا شوق ہے۔ عمر
۳۹ سال۔ ذاتی کاروبار ہے۔
بسمل۔ پوسٹ بکس نمبر ۵۴۲۲۳۔ جدہ۔ سعودی عرب

مسز زرینہ بلال، پشاور کے نام:

اعلیٰ اور شریف خاندان سے تعلق، سرکاری ملازم بطور
محکمہ ڈاک خانہ۔ طارق اطہر
معرفت ایم ایس اطہر مسلم کمرشیل بینک
سپر مارکیٹ برانچ۔ شالیمار ۳/۶ اسلام آباد

آپ کی خواہشات کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ تعلیم بی
تنخواہ ۔/۱۹۰۰ روپیہ ماہوار ہے۔
نصرت خان۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۴۶۵۔ دوحہ قطر

شمع ناز، کراچی کے نام:

آپ کے پُرخلوص جذبات اور پاکیزہ خیالات کی تہہ
دل سے قدر کرتا ہوں۔ عمر ۲۴ سال، تعلیم ایف اے، ماہانہ آمدنی
روپے ہے۔ شمیم ناز
پوسٹ بکس نمبر ۱۲۳۸۔ دمام۔ سعودی عرب

آپ کے آئیڈیل کی ہو بہو تصویر ہوں۔ عمر ۲۶ سال، تعلیم
ایف اے، تنخواہ ۔/۶۰۰۰ روپے ماہانہ ہے۔
طالب حسین مغل معرفت راجہ ظہور اصغر
پوسٹ بکس نمبر ۲۰۸۔ ابوظہبی (یو اے ای)

خلوص اور سچائی کو دولت تصور کرتا ہوں، تعلیم بی اے،
عمر ۲۵ سال، تنخواہ دس ہزار روپے ہے۔
عبدالغفار راجہ۔ پوسٹ بکس نمبر ۵۳۰۔ راس الخیمہ

آپ کے خیالات کے مطابق۔ اچھا شریک زندگی بن
ایم نذیر احمد معرفت خیاط وقار
شیخ حامد روڈ۔ محرق۔ بحرین

آپ ہی کی طرح اچھے ہم سفر کی تلاش میں ہوں۔
عمر ۳۵ سال۔ آمدنی ۔/۳۵۰۰ ریال ماہانہ ہے۔
محمد اکرم معرفت ارشد حسین شاہ

بقالہ النصر، شارع الدمام، الصعید، جدہ۔ سعودی عرب

تعلیم میٹرک، عمر ۳۰ سال، تنخواہ ۵۰۰۰/- روپے ہے۔
اخوش رکھنے کی کوشش کروں گا۔
ملک اقبال معرفت غضنفر علی مظفر
پوسٹ بکس نمبر ۳۰۹۔ جدہ۔ سعودی عرب

آپ کے خیالات میرے دل کی عکاسی کرتے ہیں۔
ایم خان۔ پوسٹ بکس نمبر ۹۹۵۔ مسقط۔ عمان

آپ کے آئیڈیل کی ہو بہو تصویر ہوں۔
خان۔ پوسٹ بکس نمبر ۴۸۷۔ مسقط۔ عمان

میں آپ کو خوش رکھ سکتا ہوں گا۔ اچھے عہدے پر فائز ہوں۔
۸۰۰۰/- روپے ہے۔
غلام محمد۔ پوسٹ آفس دخان۔ دولت قطر

میں آپ کی خواہشات کے مطابق ہوں۔ تعلیم اور آمدنی
ل۔ عمر ۲۸ سال ہے۔ ایم شکیل

SOMMERSTEDGADE - 24, I TV

1718 - COPENHAGEN DENMARK

میں آپ کے معیار پر پورا اتروں گا۔
مختار حسین شاہ معرفت پوسٹ بکس نمبر ۲۲۷۔ دوحہ قطر

امریکن آئل کمپنی میں بطور سپروائزر کام کر رہا ہوں۔ تنخواہ
۲۸۰۰ درہم ہے۔ سید سجاد علی شاہ
پوسٹ بکس نمبر ۲۵۸۰۔ دوبئی

[ناہید جاوید، کراچی کے نام!
زندگی بھر خوش رکھوں گا۔ اگر آپ چاہیں تو گھر داماد بھی
بن سکتا ہوں۔
سید عالم گیلانی۔ جی ون۔ سی ڈی۔ مسرور، کراچی

میں صورت اور سیرت ہر لحاظ سے آپ کا آئیڈیل ہوں۔
زندگی بھر آپ خوش رہیں گی۔
ایس آئی نور، کوارٹر ۱، ایم اے ایف۔ کراچی ۱۳

عمر ۲۱ سال۔ آپ کے آئیڈیل کے عین مطابق ہوں۔
ایم اے عانی۔ رقم ۹۰، سوق الملی۔ طرابلس۔ لیبیا

تعلیم بی کام، عمر ۲۲ سال، تنخواہ ۲۵۰۰/- روپے ہے۔
محمد اشرف معرفت ایس او اے ایف۔ آفیسر کلب
(SEEB) پوسٹ بکس نمبر ۸۹۷۔ مسقط۔ عمان

آپ کے آئیڈیل کے عین مطابق ہوں۔ عمر ۲۳ سال تعلیم
بی کام۔ آپ کو زندگی کی حقیقی مسرتوں سے مالا مال کر دوں گا۔
محمد عثمان یعقوب معرفت حبیب بینک لمیٹڈ
پی اے ایف برانچ۔ ڈرگ روڈ۔ کراچی

میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ عمر ۲۱ سال اور تنخواہ
۳۰۰۰/- روپے ہے۔ محمد شریف ۴۲۳
ہیڈ کوارٹر ادجی السیب۔ سلطنت آف عمان

معقول تنخواہ اور عمر ۲۰ سال ہے۔ آپ کے معیار پر پورا
اتروں گا۔ محمد نذیر
پوسٹ بکس نمبر ۱۳۹۲۔ دمام۔ سعودی عرب

آپ کے آئیڈیل کے عین مطابق ہوں۔
ارشد جاوید ۱/۹ رفیقی شہید روڈ چکلالہ۔ راولپنڈی

مجھ میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو آپ کو پسند ہیں۔
فرخ جاوید معرفت ذوالفقار علی قریشی
محلہ کرم خان، مکان نمبر ۱۸۰۲۔ چوک شادی پیر۔ پشاور شہر

تعلیم میٹرک، تنخواہ ۶۰۰۰/- روپے ماہانہ ہے۔ آپ کو اپنا کر
خوشی ہوگی۔ محمود علی ناصر

پوسٹ بکس نمبر ۲۸۹۱ - دوبئی (یو اے ای)

عمر ۲۱ سال، تعلیم انٹر، ذاتی بزنس، اللہ کا دیا سب کچھ ہے،
اختر نبی۔ مکان نمبر ۲/۲۴۴ - ماڈل کالونی۔ کراچی

تعلیم میٹرک، معقول تنخواہ، عمر ۲۱ سال ہے۔ زندگی کے سفر
میں ساتھ ساتھ چل سکیں گے۔
ضیا تبسم۔ پوسٹ بکس نمبر ۵۲۳۰۸۔ طرابلس۔ لیبیا

تصورات میں آپ جیسی لڑکی بسی ہوئی ہے۔ حقیقت کے
روپ میں آپ کے قرب کا متمنی ہوں۔
نسیم اقبال بٹ۔ بٹ میڈیکل اسٹور اچھ (بلوچستان)

کاش ہم دونوں شریک سفر بن سکیں۔
عبدالعلیم قریشی۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۰۵۲۔ دوحہ۔ قطر

میں ہی آپ کے آئیڈیل پر پورا اترتا ہوں۔ سانولا رنگ ہے۔
معقول تنخواہ ہے۔
اے غفور۔ موضع ہرڑ۔ تحصیل و ضلع سیالکوٹ

آپ ہی میری امنگوں کا آئینہ ہیں۔ تعلیم انٹر، عمر ۲۱ سال
اچھے گھرانے سے تعلق ہے۔
نیر نثار احمد۔ ۵۴۵ - پیر الہٰی بخش کالونی۔ کراچی

میں سیکورٹی فورس میں اچھے عہدے پر فائز ہوں۔ عمر ۲۳ سال
تنہا ہوں۔ آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔
منصور، ۲۴ر ٹریننگ بلڈرس جنرل اسٹور، لانڈھی کالونی ۲ کراچی

عمر ۲۱ سال، تعلیم میٹرک اور تنخواہ ۲۵۰/- روپے ہے۔
عطاء الرحمٰن، مکان نمبر ۱۸،
محلہ شیخ جلیل۔ ڈھیری حسن آباد۔ راولپنڈی

آپ کی تحریر نے بہت متاثر کیا۔ آپ کے جذبات کی قدر
کرتا ہوں۔ عمر ۲۳ سال، تعلیم ایف اے۔ تنخواہ ۱۰۰۰/- روپے۔
راجہ منیر احمد طارق۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۸۹ - ابوظہبی

ش، م۔ ملتان کے نام!
مجھے بھی آپ جیسی رفیقۂ حیات کی تمنا ہے۔ عمر ۲۲ سال تعلیم
ایف اے۔ تنخواہ ۴۰۰/- روپے ماہانہ ہے۔
عنایت الرحمٰن۔ محلہ جان آباد۔ نستہ روڈ۔ ضلع مردان

آپ کے سادہ الفاظ سے آپ کے باطن کی سادگی کی جھلک
ملتی ہے۔ مجھے اپنا لیں مایوس نہیں کروں گا۔
شہزاد ۲/۸ اندرون بوہڑ گیٹ۔ ملتان

طاہرہ انجم، نصیر آباد، جہٹ پٹ کے نام!
اللہ کا دیا سب کچھ ہے، صرف آپ جیسے مخلص ساتھی
کی کمی ہے۔ نواب

KROSTRÆDE 17 1ST,TH
2770 KASTRUP DANMARK

عمر ۲۲ سال، تعلیم ایف اے، تنخواہ ۵۰۰/- روپے ہے۔
ایس ایچ ملک، میونسپل آفس۔ جوہر آباد۔ سرگودھا۔

میری عمر ۲۵ سال، تنخواہ ۲۴۰۰/- درہم اور تعلیم انٹر ہے
ایم صدیق ندیم۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۸۹۱ - دوبئی

آپ کے پاکیزہ خیالات کی قدر کرتا ہوں۔ امید ہے آپ کے
معیار پر پورا اتروں گا۔
علی محمد معرفت اکبر سگریٹ اسٹور
کیبن ۲۶ ایل ڈی اے روڈ۔ چشتیاں، ضلع بہاولنگر

میری عمر ۳۵ سال، ذاتی کاروبار اور آمدنی ۳۰۰۰/- روپے ہے
آپ کو اپنانے کو تیار ہوں۔ ایم اے چودھری
الائیڈ ٹاورز، مہران ہوٹل بلڈنگ، اسٹیشن روڈ۔ سکھر

طاہرہ، کراچی کے نام!
میں ہی آپ کا آئیڈیل ہوں، عمر ۲۵ سال تنخواہ ۸۰۰/-
روپے ہے۔ حاجی جنت خان

پوسٹ بکس نمبر ۲۲۳۶، دوحہ، قطر

آپ کے آئیڈیل کے مطابق ہوں عمر ۲۵ سال، ذاتی کاروبار
محمد یونس
پوسٹ بکس نمبر ۱۵۲۲، مکہ مکرمہ، سعودی عرب

اگر آپ کی نظرِ کرم ہو جائے تو منزل مل جائے گی۔
تنویر عالم ۲۳۳ بی مری روڈ، راولپنڈی۔

میری عمر ۲۴ سال ہے، مجھے بھی آپ جیسے ساتھی کی تلاش
سلیم معرفت
LONE THORSGADE 19-40 T.V
2200 KØBENHAVN-N DANMARK

میری عمر ۲۲ سال، تعلیم ایف اے، تنخواہ ۱۶۰۰/- روپے
اچھے عہدے پر فائز ہوں۔
محمد فیاض، پوسٹ بکس نمبر ۵۹۴ - کویت

آپ کے معیار کے عین مطابق ہوں۔
چودھری مظفر علی، پوسٹ بکس نمبر ۹۶۲ - ابوظہبی

اللہ کا دیا سب کچھ ہے، صرف مخلص ساتھی کی جستجو ہے۔
آپ اپنا لیں۔ رشید الرحمٰن معرفت عبدالمنان
پوسٹ بکس نمبر ۹۹۳ - مدینہ منورہ - سعودی عرب

مِس شاہ، پشاور کے نام!
میں آپ کی چھوٹی بہن کا آئیڈیل ہوں۔
خیر اللہ خان - ڈاک خانہ و گاؤں گل آباد
تحصیل چارسدہ، ضلع پشاور

ن۔ کراچی کے نام!
تنخواہ ۲۵۰۰/- روپے ہے۔ آپ کو جیون ساتھی بنانا
چاہتا ہوں۔ زاہد الرحمٰن - پوسٹ بکس ۱۰۵
ابوظہبی SUWEHMAN CAMP

تنخواہ ۱۲۰۰/- روپے، تعلیم بی اے، عمر ۲۵ سال ہے شادی
کے بعد کینیڈا جانے کا خیال ہے۔
منصور احمد، سوتی نادرن کمپنی، گدو بیراج، تحصیل کشمور

ایم احمد۔ کراچی کے نام!
انشاء اللہ آپ کے معیار پر پورا اتروں گا۔
شیخ محمد شریف - قذافی کلاتھ ہاؤس - دکان نمبر ۱۵۴
صدر بازار، کوٹ سلطان، تحصیل لیہ، ضلع مظفر گڑھ

عمر ۲۴ سال، تعلیم میٹرک اور تنخواہ ۲۵۰۰/- روپے ہے۔
ظفر، پوسٹ بکس نمبر ۳۰۹ - جدہ - سعودی عرب

آپ کو زندگی کا ساتھی بنا کر مجھے مسرت ہوگی۔
HUSSAIN C/O NIELSON
STAENBROTEN KLEMETSRUD
OSLO-12 NORWAY

آپ کے خیالات سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ آپ کو جیون
ساتھی بنانے کا خواہش مند ہوں۔
شگفتہ ماشاء اللہ F-1 سی جی ای کالونی
وحدت روڈ - لاہور

آپ کی تحریر نے متاثر کیا ہے۔ میری عمر ۲۵ سال اور تنخواہ
۲۰۰۰/- روپیہ ہے۔
کابل ایم اے چودھری - پوسٹ بکس نمبر ۸۹۷
ایم اے ایم - پاک کابل، مسقط - عمان

آپ کی تحریر نے دل پر اثر کیا ہے۔ میرے معصوم بچے ماں
کی مامتا کے متلاشی ہیں۔ کیا آپ ان کو خوشیاں دے سکیں گی۔
فاروق - ٹیلی فون ٹیکنیشن، پوسٹ بکس نمبر ۲۹۸
پینشن مارکیٹنگ سروس لمیٹڈ - برمانی چیمبرز
۵۰۲ - عبداللہ ہارون روڈ - کراچی ۳



شادی

مُحبت کے ہزار رنگ ہیں
سچے رشتوں کے
سب سے گہرے رنگ کی
ایک حسین وجمیل گھریلو کہانی

شاہد فریدی

عذرا نے جب اپنے فارم گارڈن کے لان کے شاداب مخملیں گھاس پر قدم رکھا اسے محسوس ہوا جیسے سارے دن کی تکان ایک لمحہ میں دور ہو گئی ہو۔ لان کے اطراف ساگوپہ کے مسکراتے ہوئے پھولوں کو دیکھ کر عذرا کی آنکھوں کو جاں نواز ٹھنڈک کا احساس ہوا اور لان پر بچھی ہوئی کرسی پر بیٹھتے وقت لان کے بیچ میں پیالے لٹکائے ہوئے ڈھلیا کے بڑے بڑے خوبصورت پھولوں پر سے ہوتی ہوئی جب اس کی نظریں جربیرا کے خوبصورت پھولوں پر آ کر رکیں تو عذرا کو بے اختیار اپنے بھائی منور کی یاد آئی۔ ان کے بیج انہوں نے خاص طور پر عذرا کے لیے امریکہ سے بھیجے تھے —— "کتنے اچھے ہیں بھائی جان ——" عذرا نے سوچا۔ لیکن کتنے دن ہوئے۔ انہوں نے خط نہیں بھیجا میں بھی اس بار جواب نہ دوں گی۔ عذرا نے اپنے دل میں فیصلہ کیا پھر خیال ہوا، ہو سکتا ہے بھائی جان اسٹڈیز میں اتنے مصروف

ہوں کہ انہیں وقت نہ مل سکا ہو۔

نہیں نہیں، میں کل ہی انہیں خط لکھوں گی بھلا بھائیوں سے بھی کوئی بہن اس طرح خفا ہوتی ہے۔

اور پپا ——— !

جب بھی وہ اپنے پپا کے بارے میں سوچتی اس کے ذہن میں اپنے خوبصورت گارڈن کا تصور اجاگر ہو جاتا۔ اور اسے محسوس ہوتا جیسے پپا نے اس کی زندگی کو بھی اسی طرح سنوار کر زندگی میں پھول ہی پھول بھر دیئے ہوں۔

پھر عذرا نے اپنے لیے چائے کا کپ تیار کیا اور اس سے پہلے کہ کپ اس کے ہونٹوں تک پہنچتا، اس نے محسوس کیا کہ اس کا ہاتھ کانپ رہا ہے۔ اور کانپتے ہوئے ہاتھ سے اس نے کپ رکھ دیا۔ ایک گیت کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔

بچپن کے دن بھی کیا دن تھے۔۔۔ !

عذرا نے محسوس کیا جیسے اس کے ذہن میں ایک ہلچل مچ گئی ہے۔ پھر اس کے سوچ کی راہیں ماضی کے دھندلکوں میں گم ہو گئیں۔ اسے محسوس ہوا جیسے بچپن سے اب تک اس کی زندگی پر پپا ہی چھائے ہوئے ہیں۔ اسے اچھی طرح یاد تھا جب وہ چھ سال کی تھی۔ پپا اسے اپنے ہاتھوں سے نہلاتے خود ہی کنگھی کر کے اس کے بالوں میں ربن باندھتے، پھر گالوں پر کاجل کا تل لگا کر اسے پیار کرتے۔ پھر منوّر کو تیار کرنے کے بعد دونوں کو اپنے ساتھ ناشتے کی میز پر بٹھا لیتے۔ ناشتے کے بعد دونوں کا ٹفن کیریئر تیار کرتے اور اپنے ساتھ کار میں لے جا کر اسکول چھوڑتے اور خود ہاسپٹل چلے جاتے۔ واپسی پر دونوں کو اپنے ساتھ ہی گھر لے آتے یا پھر سے گھومنے چلے جاتے۔ رات میں وہ خود دونوں کو پڑھاتے پڑھائی کے بعد دس بجے وہ اور منوّر اپنے اپنے کمروں میں چلے جاتے پھر پپا اس کے کمرے میں آ کر اسے اچھی طرح لحاف اڑھاتے اور بتی بجھا کر چلے جاتے۔ اور جب چھٹیاں ہوتیں دونوں کو لے کر پہاڑی مقام پر چلے جاتے۔ اور جب عذرا بڑی ہوئی وہ خود پپا اور بھائی جان کی ہر بات کا خیال رکھتی۔ جب اپنے اسٹڈی روم میں پپا دیر تک پڑھتے وہ ان کے ہاتھوں سے کتاب چھین لیتی۔ پپا مسکرا کر کہتے،

"بے بی، ابھی گیارہ بجنے میں تو پورے دس منٹ باقی ہیں؟"

"پپا! آپ کو دودھ بھی تو پینا ہے!" وہ مسکرا کر کہتی۔

پھر وہ پپا کا ہاتھ پکڑ کر انہیں بیڈ روم میں لے آتی پھر ان کے ہونٹوں سے دودھ سے بھرا ہوا گلاس لگاتی اور گلاس اس وقت تک نہ ہٹاتی جب تک پپا دودھ ختم نہ کر لیتے۔ پھر انہیں لحاف اڑھاتی۔ سونے سے پہلے جب پپا اس کی پیشانی پر بوسہ دیتے وہ بتی بجھا کر چلی جاتی۔

اس دن جب اس کے بھائی جان امریکہ جا رہے تھے ایئرپورٹ پر وہ کتنا روئی تھی۔ کہنے کو تو بھائی جان اسے تسلی دے رہے تھے لیکن وہ خود مشکل سے اپنے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"عذرا بی بی! آپ کا سوئیٹر!" نوکرانی اس کا سوئیٹر رکھ کر چلی گئی ——— !

اسے اپنے گالوں پر نمی کا احساس ہوا۔ پھر وہ اپنا سوئیٹر پہن کر روز کی طرح اپنے نوکروں کے کوارٹرس کی طرف چلی آئی تاکہ ان کی خیریت کا پوچھ سکے۔ ان کی نوکرانی سلیمہ چارپائی پر بیٹھی اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ اس بات سے بے خبر کہ عذرا اس کے پاس ہی کھڑی ہے۔ اس نے سلیمہ کے چہرے کو غور سے دیکھا اس کے ہونٹوں پر دل آویز مسکراہٹ رقص کر رہی تھی اور بچہ دودھ پی رہا تھا۔ عذرا کو محسوس ہوا جیسے سلیمہ بچے کو دودھ پلاتے پلاتے اس کے مستقبل کے حسین خواب دیکھ رہی ہے۔ سلیمہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھ کر عذرا نے سوچا، بالکل ایسی ہی مسکراہٹ اس نے کہیں دیکھی ہے ——— کہاں ———؟ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ پھر اسے یاد آیا۔ اس نے ایسی ہی مسکراہٹ ایک شاہکار تصویر کے ہونٹوں پر دیکھی تھی جس کا نام تھا مونالیزا !

آج مونالیزا کی مسکراہٹ کا مطلب اس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔

اس نے سوچا شاید مونالیزا بھی ماں رہی ہو۔

ماں ——— ! ——— ماں !! اس کے ذہن میں ایک ہلچل سی مچ گئی اور وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپائے بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی اور بستر پر گر پڑی۔ پھر اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا

——— ماں ——— !

اور روتے روتے نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

دوسرے دن کالج سے گھر آتے ہوئے عذرا کو شاہین کی یاد آگئی اور اس کے قدم شاہین کے گھر کی طرف اٹھ گئے۔ شاہین کے گھر کے قریب پارک میں کھیلتے ہوئے بچوں کو دیکھ کر اس نے محسوس کیا



اس کے قدم خود بخود رک گئے ہیں۔ وہ بچوں کو پارک میں کھیلتے ہوئے دیکھتی رہی۔ چند بچے جھولا جھول رہے تھے۔ کچھ پھسلنی سے پھسل رہے تھے۔ کوئی تتلیوں کے پیچھے دوڑ رہا تھا تو چند بچے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ اس کی نظر باغ کے ایک گوشے پر پڑی جہاں ایک شریر بچہ لال پریشی ہوئی بچی کی چوٹی پکڑ کر کھینچ رہا تھا۔ شاید وہ بچی سے اپنے ساتھ کھیلنے کے لیے اصرار کر رہا تھا، بچی نہیں مان رہی تھی۔ اور وہ شریر اس کی چوٹی پکڑ کر اٹھنے پر مجبور کر رہا تھا۔ عذرا کو محسوس ہوا جیسے اس کے منہ سے ایک سسکی سی نکل گئی ہو۔ اس نے دیکھا اس کے ہاتھ میں اسی کی اپنی چوٹی ہے اور وہ چوٹی کو زور سے کھینچ رہی ہے۔ عذرا اپنی نادانی پر ہنس پڑی۔

جب وہ شاہین کے گھر پہنچی، شاہین نمائش جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ شاہین اسے بھی اپنے ساتھ نمائش لے گئی۔

جس وقت عذرا شاہین اور اس کی چھوٹی بہن ثمینہ کھلونوں کے ایک اسٹال سے نکل رہے تھے۔ شاہین ایک نوجوان سے ٹکراتے ٹکراتے بچ گئی۔ عذرا نے دیکھا کہ شاہین اور اس نوجوان کی نظریں ملیں۔ پھر شاہین کی نظریں جھکتی ہی چلی گئیں۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس نوجوان کے ہونٹوں پر درد بھری مسکراہٹ ہے۔ نوجوان نے ثمینہ سے پوچھا

"بےبی! تمہاری گڑیا بہت خوبصورت ہے۔ ہمارے گڈے کے ساتھ اس کا بیاہ کرو گی؟"

"نہیں!" ثمینہ نے اپنی گڑیا پر ایک نظر ڈال کر جواب دیا "میری گڑیا کا بیاہ تو ریحانہ کے گڈے کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اس نے میری گڑیا کے لیے بہت اچھے اچھے کپڑے تیار کر رکھے ہیں۔"

نوجوان ثمینہ کی بات سن کر ہنس پڑا۔ پھر اس نے ثمینہ سے کہا ــــ "ہاں بےبی! تم اپنی گڑیا کی شادی ضرور دھوم سے کرنا تاکہ تمہاری سہیلی تمہاری گڑیا کو اچھے اچھے کپڑے پہنا کر اپنے ساتھ

[illegible] سکے! اور میرے پاس موٹر کہاں ہے!" وہ آگے بڑھ گیا۔

عذرا نے دیکھا شاہین کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے

"چلو عذرا!" شاہین نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ اور جب تینوں نمائش سے باہر آئے۔ شاہین جلدی سے کار کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔

"یہ تیری آنکھوں سے آنسو کیوں بہہ رہے ہیں؟" عذرا نے شاہین سے پوچھا۔

"وہ نوجوان جو ثمینہ سے باتیں کر رہا تھا، میرے بچپن کا ساتھی ہے۔ بچپن سے جوانی کی منزلوں تک ہم دونوں ساتھ ساتھ رہے۔ میرے بھائیوں نے ایک دن اس کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرنا چاہا تھا جیسا کہ کیٹس کی نظم [...] کی ہیروئن کے بھائیوں نے ہیرو کے ساتھ کیا تھا۔ بچپن میں میں اور سعید کئی دن گڑیوں کا بیاہ رچانا چاہا تھا۔ لیکن ہماری قسمت میں گڑیوں کا بیاہ بھی نہ تھا۔"

"گڑیوں کا بیاہ نہ ہو سکا تو اس طرح آنسو کیوں بہا رہی ہو؟" عذرا نے معصومیت سے پوچھا۔

"تو ابھی تک بچی ہی ہے عذرا! تو ان باتوں کو ابھی نہ سمجھے گی۔ اگر تجھ سے دل کے بارے میں کچھ پوچھوں تو تو میڈیکل کے نقطۂ نظر سے جواب دے گی۔"

دوسرے دن ڈسکشن ٹیبل پر ایک مردہ باڈی کا دل دیکھتے ہوئے خود بخود اس کے ہاتھ رک گئے۔

"دیکھا راجندر! میں نہ کہتا تھا کہ اردو کے شاعروں کی سب باتیں بےکار ہیں۔ نہ یہاں کوئی دنیا ہے اور نہ کوئی تصویر یار!" کلاس کا سب سے شریر لڑکا اقبال اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا۔

اور عذرا اقبال کی بات سن کر مسکرا کر رہ گئی۔ اقبال اپنی شرارتوں کی وجہ سے ساری کلاس میں مشہور تھا۔ لیکن آج تک اس نے عذرا کے ساتھ کوئی شرارت نہیں کی تھی۔ اس کی سنجیدہ فطرت اور اس کے پیا کی وجہ سے لڑکے ہی نہیں، پروفیسر بھی اس کا احترام کرتے تھے۔ اقبال بہت شریر تھا۔ جب کبھی تجربے کے لیے ڈارک روم میں ہوتا۔ لڑکیوں کے بالوں سے پھول نکال اپنے کوٹ میں لگا لیتا اور لڑکی کو اس وقت پتہ چلتا جب تجربے کے بعد سب لڑکے روم سے باہر آتے۔

اسی شام عذرا کالج سے واپس آکر اپنے گارڈن میں بیٹھی ہوئی شاہین کی باتوں پر غور کر رہی تھی۔ نہ جانے کیوں شاہین کی باتیں اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔ پھر اس کی نظر گھاس پاس کے پھولوں پر پڑی جہاں ایک تتلی بیٹھی تھی۔ تتلی کو دیکھ کر عذرا کو محسوس ہوا جیسے ایک انجانا سا جذبہ اسے کرسی پر سے اٹھنے کے لیے مجبور کر رہا ہے۔ پھر وہ آہستہ آہستہ تتلی کی طرف بڑھی اور اس سے پہلے کہ اس کا ہاتھ تتلی تک پہنچتا تتلی اڑ کر ڈھلیا کے پھول پر جا بیٹھی وہ پھر دبے دبے قدموں سے تتلی کی طرف بڑھی اور جوں ہی اس نے جھپٹ کر تتلی کو پکڑنا چاہا تتلی اڑ گئی اور وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ اور لان پر گر پڑی۔ اس نے اپنی انگلیوں کو دیکھا۔ تتلی کے پروں کا رنگ لگا تھا۔ اس رنگ کو دیکھ کر ایک انجانی سی خوشی کا احساس ہوا۔ نہ جانے کب تک وہ یونہی لان پر پڑی رہتی لیکن اسکوٹر کی آواز نے اسے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔

وہ سیدھا پورچ تک گیا۔ پھر جب اس کی نظر عذرا پر پڑی وہ سیدھا اس کی طرف آرہا تھا۔

اقبال کو دیکھ کر نہ جانے کیوں اس کا دماغ شاہین والے نوجوان کے بارے میں سوچتا چلا گیا۔

”کیا بیٹھنے کے لیے نہیں کہیں گی آپ؟“ اقبال کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

”اوہ! تشریف رکھیے۔“ اور خود بھی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

اقبال کو مسکراتے ہوئے دیکھ کر اس نے سوچا۔

اسے تو آج تک ایک ہی مسکراہٹ بہت پسند تھی اور وہ مسکراہٹ تھی اس کے بھائی جان کی!

لیکن اقبال کے ہونٹوں پر یہ کیسی مسکراہٹ ہے جو آج اسے بہت اچھی معلوم ہو رہی ہے؟ وہ سوچتی رہی اور اسے اس بات کا پتہ نہ چلا کہ اس کی خادمہ چائے کی ٹرے رکھ کر چلی گئی ہے۔ وہ اس وقت چونکی جب اقبال نے اسے اپنے خیالوں میں کھوئی دیکھ کر کہا:

”میں چائے میں دو چمچے شکر پسند کرتا ہوں۔“

وہ چونک گئی۔ پھر خاموشی سے چائے کا کپ تیار کرتی رہی چائے کا کپ تیار کر کے اس نے اقبال کی طرف بڑھایا۔

”آپ کا گارڈن بہت خوبصورت ہے۔ ان خوبصورت پھولوں کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آنکھوں کے سامنے ایک ——— بن گیا ہو!“ اقبال نے عذرا کے ہاتھوں سے چائے

پیمانہ

مصیبت بڑی ہو یا
چھوٹی۔ اس کا پیمانہ ہماری قوتِ برداشت ہے۔
کچھ لوگ مصیبتوں کے پہاڑ ہنس کر اٹھا لیتے ہیں اور
کچھ تنکے کا بوجھ بھی برداشت نہیں کر سکتے۔

کا کپ لیتے ہوئے کہا ——— ”شکریہ ———!“

چائے کا ایک گھونٹ لے کر اس نے کہا:

”چاندنی راتیں یہاں اور بھی حسین ہوتی ہوں گی۔ جب چاند گل مہر کے درختوں سے سرگوشی کرتے ہوئے دیکھ کر کلیاں بھی سرگوشی کرتی ہوں گی اور ... ...“

عذرا ہنس پڑی

”کیا کلیاں بھی سرگوشی کرتی ہیں؟“ اس نے اقبال سے پوچھا

”جی ہاں ———!“

”کب ———؟“

”جب چاندنی راتوں میں ان کا دل دھڑکتا ہے۔“

وہ پھر ہنس پڑی۔

”آپ میڈیکل اسٹوڈنٹ ہو کر بھی نہیں سمجھ سکتے کہ دل صرف انسانوں کا دھڑکتا ہے!“

”جی نہیں! جب بھونرا چاندنی راتوں میں کلیوں پر منڈلاتا ہے اس وقت ان کا بھی دل دھڑکتا ہے۔!“

”راتوں میں بھلا بھونرا کیوں آنے لگا؟“

”ہو سکتا ہے چاندنی کی کشش اور خوشبو اسے کھینچ لاتی ہو۔“

”میں نے آج تک محسوس نہیں کیا۔“

اقبال صرف مسکرا کر رہ گیا۔ پھر اس نے کہا:

”یہ رہی آپ کی نوٹ بک! آپ ڈسکشن کے بعد غلطی سے میری نوٹ بک لے کر چلی آئیں۔ کل اتوار ہے پرسوں کالج میری نوٹ بک لیتی آئیے گا!“

وہ آگے بڑھ گیا۔ لیکن گلاب کے پودے پر دو ادھ کھلی کلیاں دیکھ کر اس کے قدم خود بخود رک گئے اور اس نے کلیوں کو توڑ لیا۔ کلیوں



کو دیکھتے ہوئے تھوڑی دیر تک نہ جانے وہ کیا سوچتا رہا۔ پھر عذرا کے پاس آکر اس نے کہا:

"اور کیوں آپ نے ابھی تک کلیوں کو سرگوشی کرتے ہوئے نہیں دیکھا نا؟"

اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، اس نے کلیوں کو اس کے بالوں میں لگا دیا اور پھر اپنا اسکوٹر لے کر گیٹ سے باہر چلا گیا۔ دوسرے دن جب عذرا کالج جا رہی تھی اس کے قدم کی باغ کے قریب گلاب کے پودوں، اور کھلی کلیاں دیکھ کر خود بخود رک گئے۔ اسے محسوس ہوا جیسے کلیاں اسے دیکھ کر باہم سرگوشی کر رہی ہیں۔ اور جب وہ پودے تک گئی اس نے محسوس کیا جیسے کلیاں اس سے پوچھ رہی ہوں، کیا ہمیں بھی اپنے راز میں شریک نہ کرو گی؟"

عذرا نے کلیوں کو توڑ کر اپنے بالوں میں لگا لیا۔

اسی شام جب وہ لائبریری کے ایک تنہا گوشے میں بیٹھی لکھ رہی تھی، پیچھے سے آواز آئی:

"کہیے کل کلیوں نے آپ سے کچھ کہا؟"

"کل تو نہیں! ہاں آج یہ ضرور کچھ کہہ رہی تھیں!" عذرا نے کہنا چاہا لیکن شرما کر رہ گئی۔

پھر اسے محسوس ہوا جیسے اقبال کے ہاتھ اس کے بالوں تک پہنچ گئے ہوں، اور جب اس نے مڑ کر دیکھا تو اقبال اپنے کوٹ میں اس کے بالوں سے نکالی ہوئی گلاب کی ایک کلی لگا رہا تھا۔

جس دن عذرا کی سالگرہ تھی اس شام ساری کوٹھی کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ قمقموں سے ساری کوٹھی جگمگا رہی تھی۔ پاپا نے اس کی سالگرہ پر شہر کی ساری معزز ہستیوں کو مدعو کیا تھا۔ عذرا، شاہین اور پاپا کے ساتھ کھڑی مہمانوں کا استقبال کر رہی تھی۔ بار بار اس کی نظریں دیوار پر لگی ہوئی گھڑی پر جا کر رک جاتیں۔

"کیا بات ہے! تو جس کا انتظار اتنی بے چینی سے کر رہی ہے وہ ابھی تک نہیں آیا؟" شاہین نے اسے چھیڑا۔

"چل ہٹ شریر!" عذرا شرما گئی۔

اور جب گھڑی نے آٹھ بجنے کا اعلان کیا وہ ڈوبتے دل کے ساتھ ٹیبل کی طرف بڑھی جس پر اس کی سالگرہ کا کیک رکھا ہوا تھا جس کے گرد مہمان کھڑے عذرا کا انتظار کر رہے تھے۔ اور جس وقت وہ جلتی ہوئی موم بتیوں پر پھونک مارنے جا رہی تھی باہر پورچ میں اسکوٹر کی آواز سن کر وہ رک گئی۔

اپنی پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالے، ہونٹوں پر دلکش مسکراہٹ لیے اقبال جب ہال کے اندر داخل ہو کر تھوڑی دیر رکا تو سب لوگوں کی نظریں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ اپنے کوٹ میں گلاب کا تازہ پھول لگائے ہوئے اقبال بہت خوبصورت معلوم ہو رہا تھا۔

عذرا نے سوچا

"کاش وقت کی رفتار رک جائے۔ اور وہ یونہی اقبال کو دیکھتی رہے!"

پھر اقبال سیدھا اس کی طرف آیا

"سالگرہ مبارک ہو عذرا!" اس نے مسکرا کر کہا

اس کے دوسرے دن نوٹس تیار کرتے وقت ریفرنس کے لیے عذرا پاپا کے اسٹڈی روم تک گئی۔ جب اس نے شیلف سے کتاب نکالی۔ ساتھ ہی ایک ڈائری اس کے قدموں میں گر گئی۔ یہ اس کے پاپا کی ڈائری تھی۔ انہوں نے لکھا تھا:

"نسرین! آج تم سے بچھڑے ہوئے ایک زمانہ گزر گیا ہے۔ لیکن میں آج بھی محسوس کرتا ہوں جیسے کل ہی تم سے ملا تھا۔ تمہیں یاد ہیں وہ دن جب ہم ساتھ پڑھتے تھے۔ تم سارے کالج میں خودسر اور ضدی جیسے ناموں سے مشہور تھیں۔ تمہاری خوبصورتی اور دولت نے تمہیں خودسر بنا دیا تھا اور تمہیں اپنا پسند بنانے میں کالج کے ان لڑکوں کا ہاتھ تھا جو تم سے بات کرنے کو ترستے تھے۔ اس دن مجھے بہت حیرت ہوئی تھی۔ جس دن کالج کے کلرک نے

مجھ سے کہا کہ میں امتحان میں بیٹھ سکتا ہوں۔ کیونکہ تم نے میری فیس جمع کرادی تھی۔ تمہاری وجہ سے عادم ہوا گیا تھا۔ کتنا مشکل ہے آدمی کو سمجھنا۔

اور پھر ایک طوفان کی طرح تم مجھے اپنے ساتھ بہا لے گئیں۔

جب ایک دن تم گھر پر نہیں تھیں، تمہارے ڈیڈی نے مجھ سے کہا ——— "میاں صاحبزادے! کیا تم اس قالین کی قیمت کا اندازہ کر سکتے ہو جو اس وقت تمہارے پیروں کے نیچے ہے؟ اور پرویز! یہ تم اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ سات پشتوں سے آج تک کہیں بھی ہمارے خون میں آمیزش نہیں ہے ———!" ٹھیک ہی تو کہا تھا تمہارے ڈیڈی نے! بھلا اس یتیم لڑکے کو خون کی اہمیت اور شجرے کا پتہ کیسے چلتا جس کے ماں باپ بچپن میں ہی مر گئے ہوں۔ پھر اسی رات تم میرے پاس آئیں۔ اور مجھ سے پوچھا

"پرویز! تم ڈیڈی سے ملے تھے؟"

"نہیں ———!" میں نے تم سے جھوٹ بولا

"کیوں ———؟"

"میں نے ضرورت نہیں محسوس کی۔"

"پرویز ڈیئر! میں اس وقت مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں" تم نے کہا۔

"نسرین! میں سنجیدہ ہوں۔ اس وقت اور بہت سوچنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہماری راہیں جدا ہیں ——— میں محسوس کرتا ہوں کہ میں تمہیں خوشی نہ دے سکوں گا۔"

"پرویز! کہیں تم یہ تو نہیں کہنا چاہتے کہ مجھ سے تمہیں خوشی نہ مل سکے گی!"

"اب تم جو چاہو سمجھ سکتی ہو۔"

"تو اب تک یہ ڈھونگ کیوں رچایا تھا؟"

"ڈھونگ اور چاہت میں زمین و آسمان کا فرق ہے نسرین! کیا یہ ضروری ہے کہ جس سے پیار کیا جائے اسی سے شادی ہو اور نسرین! اگر میں نے تم سے شادی کی تو میری حیثیت ایک خریدے ہوئے شوہر سے زیادہ نہ ہوگی۔"

تمہاری انا حقیقت کو برداشت نہ کر سکی اور تم تلملا کر رہ گئیں۔ پھر تم چیخ پڑیں۔

"تم بھی OPPORTUNIST ہو، تم مکار اور ذلیل ہو لیکن یاد رکھو پرویز! تمہیں ایک دن اس کے لیے پچھتانا پڑے گا۔"

سوچ

پادری نے ایصالِ ثواب کی خاطر گرجا کے دروازے پر لکھ دیا۔ "میرا پیارا بھائی اسمتھ آج صبح ساڑھے چار بجے اس جہانِ فانی سے جنت الفردوس کی جانب کوچ کر گیا ہے۔" دوسرے دن جب وہ گرجا گھر میں داخل ہونے لگا تو اس کی نگاہ اپنی تحریر پر پڑی جس کے نیچے کسی نے لکھ دیا تھا۔

"از جنت الفردوس۔ ۹ بجے صبح۔ مسٹر اسمتھ ابھی تک یہاں نہیں پہنچا۔ ہمیں بے حد تشویش ہے۔"

تمہارے کمرے سے چلے جانے کے بعد جب میری آنکھوں سے دو آنسو نکل کر میری گود میں جذب ہو گئے۔ میں نے اس وقت سوچا تھا کیا میرے پیروں کے نیچے کبھی قالین بھی ہوگا۔ تمہاری یاد میرے سینے میں سلگتی تو میں اکثر سوچتا کہ تم خود سر لڑکی ہو، پھر کیوں میں تمہیں اپنانا چاہتا ہوں۔ اور یہ تمہاری ہی یاد تھی جب مجھے لندن تک لے گئی۔ وہاں سے لوٹ کر میں نے سوچا، ہو سکتا ہے تمہارے سینے میں بھی کوئی چنگاری باقی ہو لیکن تمہاری شادی ہو چکی تھی پھر میں نے اپنے ہی جیسی ایک یتیم لڑکی سے شادی کر لی۔ عذرا کی ممی مجھے بہت پیار کرتی تھی۔ بعض اوقات مجھے اس کی چاہت پر پرستش کا گمان ہوتا تھا۔ لیکن وہ بھی دو سال بعد عذرا اور منور کو چھوڑ کر چلی گئی۔ اس وقت سے آج تک میں ہی اپنے بچوں کا باپ ہوں اور میں ہی ان کی ماں بھی ہوں!

"پا ... پا ... !" عذرا کا گلا بھر آیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔

"نسرین! آج میں بہت خوش ہوں۔ ابھی ابھی عذرا کی سالگرہ کا ہنگامہ ختم ہوا ہے۔ آج جہاں عذرا کی زندگی میں ایک سال کا اضافہ ہوا ہے۔ وہاں اقبال بہاروں کا بانکپن لیے عذرا کی زندگی میں داخل ہوا ہے۔ آج وہ شریر بہت شاندار معلوم ہو رہا تھا! آج وہ دونوں بہت خوش ہیں۔ خدا کرے وہ یونہی ہنستے ہوئے زندگی کی راہوں پر ساتھ ساتھ چلتے رہیں اور آج ہی مجھے اپنے ایک اور فرض کا احساس ہوا ہے، عذرا کی شادی! اگر آج عذرا کی ممی یا تم میرے ساتھ ہوتیں تو عذرا کو وداع کرنے اور منور کی دلہن



"وقت سب کے ساتھ انصاف کرتا ہے ڈاکٹر پرویز"، اقبال کی ممی کہہ رہی تھیں ـــــ "آپ نے دیکھ لیا نا وقت کے ہاتھ بچے بچھڑ جانے کے بعد جب آدمی کے ہاتھوں میں آتے ہیں۔ تقدیر کی بازی جیت کر کوئی خوش ہوتا ہے اور کوئی رنجیدہ۔ لیکن ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب بازیاں الٹ جاتی ہیں اور ہارا ہوا انسان جیت جاتا ہے!"

"آپ کی بات سچ نہیں ہے محترمہ نسرین! مجھے کہنے دیجئے کہ وقت کے ہاتھوں پہلے بھی میری ہی ہار ہوئی تھی۔ اور اب بھی ہار میری ہی ہے۔"

"کچھ بھی ہو ڈاکٹر پرویز! مجھے یہ رشتہ پسند نہیں ہے اور اب آپ تشریف لے جا سکتے ہیں۔"

عذرا اقبال کے گھر سے بھاگ کر اپنے گھر آئی اور بستر پر گر کر نہ جانے کب تک روتی رہی۔

ادھر چند دنوں سے عذرا محسوس کر رہی تھی کہ پپا کی حالت کچھ عجیب سی ہو گئی ہے۔ اچھی طرح وہ کھانا بھی نہیں کھاتے اور ناشتے پر وہ اس کی طرف تکتے ہوئے نہ جانے کن خیالات میں کھو جاتے ہیں۔ جب وہ ان سے کچھ کہتی ـــــ "پپا! آپ کیا سوچ رہے ہیں؟" تو وہ چونک پڑتے۔ پھر ناشتے پر سے اٹھ جاتے۔ اور اس سے کہتے ـــــ "بیٹی! تم ناشتہ کر کے کالج چلی جاؤ!"

اور رات میں دیر تک اپنے اسٹڈی روم میں جاگتے رہتے۔

اور جب وہ ان سے سو جانے کے لیے ضد کرتی، وہ کہتے،

"اچھے بچے ضد نہیں کیا کرتے۔ جاؤ سو جاؤ۔"

اور وہ ایش ٹرے میں مسلے ہوئے سگریٹوں پر ایک نظر ڈال کر وہاں سے چلی جاتی۔

ایک دن جب وہ لائبریری میں بیٹھی پڑھ رہی تھی سامنے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ جب اس نے کتاب سے اپنی نظریں اٹھائیں تو اس نے دیکھا سامنے اقبال کھڑا تھا۔ اقبال کو دیکھ کر اس کی آنکھوں سے دو آنسو نکل کر کتاب پر گر گئے۔

"رویا نہیں کرتے عذرا! میں نے ممی سے کہہ دیا ہے کہ اگر میں تمہیں نہ پا سکا تو وہ بھی مجھے نہ پا سکیں گی!"

اسی رات جب عذرا پپا کے بک شیلف سے ایک کتاب تلاش کر رہی تھی اس کے ہاتھ خود بخود پپا کی ڈائری کی طرف بڑھے پپا نے اسی ہفتے ڈائری لکھی تھی۔

لانے میں کتنی آسانی ہوتی لیکن یہ محسوس کرتا ہوں کہ مجھے ہی عذرا کی مانگ افشاں سے بھرنی ہوگی۔ مجھے ہی اس کے ہاتھوں میں مہندی لگانی ہوگی۔ اور اپنے ہاتھوں سے دلہن بنا کر عذرا کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وداع کرنا پڑے گا۔ اور یہ دونوں کام میں ضرور کروں گا۔ کیونکہ میں ہی ان بچوں کی ماں بھی ہوں!"

عذرا ڈائری رکھ کر بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی اور بستر پر گر کر سسک سسک کر روتی رہی۔

"پپا! آپ نے کتنی قربانیاں دی ہیں! اور آپ کو وہ ہستی بھی نہ مل سکی جسے آپ نے چاہا تھا!"

"آپ ہی میری ماں ہیں پپا! آپ ہی میری ماں ہیں!!"

اس دن جب اقبال عذرا کو اپنی ممی سے ملانے اپنے گھر لے گیا۔ دروازے کے قریب دونوں کے قدم خود بخود رک گئے۔ اندر سے آواز آ رہی تھی:

"تصور میں نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ تم مجھ سے اس طرح جدا ہو گی، میری معصوم بچی نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ عورت کے گداز سینے میں محبت کا ایک طوفان پوشیدہ ہوتا ہے اور اتنا وسیع ہوتا ہے کہ اس میں ساری کائنات سما سکتی ہے۔ لیکن کیا تمہارے دل میں میری بچی کے لیے تھوڑی سی بھی جگہ نہیں؟ آج تک میں اپنی بچی کو ہر خوشی دیتا رہا ہوں۔ لیکن جب زندگی میں پہلی بار میری بچی نے کسی کو چاہا، میں کتنا بے بس اور مجبور رہوں کہ اس کی پہلی آرزو بھی پوری نہیں کر سکتا! اس بات کا احساس ہی میرے لیے جان لیوا ہے کہ اس بچی کو جسے میں ساری زندگی پیار ہی پیار دیتا آیا ہوں، اس کی ایک چھوٹی سی خواہش پوری نہیں کر سکتا۔ اگر عذرا اقبال کو نہ پا سکی تو وہ ساری زندگی تڑپتی رہے گی اور میں اسے تڑپتا ہوا ہرگز نہیں دیکھ سکتا۔ اور اسی لیے میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ،

"نہیں پپا! آپ ایسا ہرگز نہیں کر سکتے!" عذرا کا گلا بھر آیا۔

دوسرے دن جب اقبال اپنے ڈیڈی اور ممی کے ساتھ عذرا کے گھر آیا، اسے ڈرائنگ روم میں ایک خط پڑا ہوا ملا۔

عذرا نے اپنے پپا کو لکھا تھا،

"اچھے پپا!

جب انسان زندگی سے دور ہوتا ہے، اس وقت اسے زندگی کتنی پیاری معلوم ہوتی ہے اور زندگی سے بڑھ کر اسے اپنوں کے لیے بہت زیادہ پیار امڈتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور آج ایسا ہی پیار میں آپ کے لیے محسوس کر رہی ہوں۔

پپا! آپ کی ڈائری پڑھنے کے بعد جب میں نے اقبال کی ممی کو دور سے دیکھا مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے مجھے میری وہ ممی مل گئی ہیں جو میری پیدائش کے بعد مر گئی تھیں۔ پپا! اقبال کہتے ہیں اگر وہ مجھے نہ پا سکے تو وہ موت کو گلے لگا لیں گے اور آپ کہتے ہیں کہ میں اقبال کو نہ پا سکی تو آپ اپنی زندگی کو ختم کر دیں گے۔ آپ کی ساری زندگی قربانیوں ہی میں گزری ہے نا پپا! اور آپ یہ کیوں بھول رہے ہیں کہ آپ ایک ڈاکٹر ہیں اور ڈاکٹر کی زندگی پر اس سے زیادہ دوسروں کا حق ہوتا ہے۔ اور پپا! جب بھائی جان کی شادی ہو گی، آپ کی بہو آ جائے گی اس گھر میں۔ آج مجھے اپنی ان دیکھی بھابی پر نہ جانے کیوں اتنا پیار آ رہا ہے؟ یہ محبت کے رشتے بھی کتنے پاک اور مقدس ہوتے ہیں۔ ہے نا پپا! آپ چند برسوں بعد دادا بن جائیں گے۔ اور اس گھر میں آپ کے پوتوں اور پوتیوں کی معصوم شرارتیں ہوں گی۔ پھر وہ آپ سے گھوڑا بننے کے لیے ضد کریں گے۔ اور آپ کی پیٹھ پر سوار ہو کر آپ کو تھکا دیں گے اور میں انہیں خوب ڈانٹوں گی۔ لیکن میں بھی کتنی عجیب ہوں۔ جب اس گھر میں ہوں گی ہی نہیں تو ڈانٹوں گی کیسے؟ —— اور پپا! آپ سگریٹ بہت پیتے ہیں، سگریٹ کم کر دیجئے۔ جب گھڑی کی سوئیاں گیارہ بجا رہی ہوں گی تو آپ کو میری یاد آ جائے گی، آپ اسٹڈی روم سے اٹھ کر بیڈ روم میں جا کر دودھ کا پورا گلاس ختم کر دیا کیجیے گا۔ میں نے فرخ میاں کو تاکید کر دی ہے کہ وہ ہر رات آپ کے سرہانے دودھ کا بھرا ہوا گلاس رکھ دیا کریں۔ اور ہاں پپا! آپ سوتے وقت میری پیشانی کا تصور کر کے بوسہ لینا نہ بھولیے گا اور بھائی جان جب امریکہ سے لوٹیں تو انہیں بہت سے گلاب دیجیے اور کہیے کہ وہ جلدی سے آپ کے لیے ایک خوبصورت سی بہو لائیں۔ اور جب بھابی اس گھر میں آئیں تو انہیں بہت سے سلام کہیے۔ کہیں گے نا پپا آپ؟

بس پپا! اب آگے اور نہیں لکھا جاتا۔ نہ جانے میری آنکھوں کو آج کیا ہو گیا ہے!

اور جب اقبال اپنے ڈیڈی اور ممی کے ساتھ عذرا کے کمرے میں داخل ہوا، انہیں دیکھ کر عذرا کے پپا نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ لی۔

"ہش! آواز مت کرو۔ میری عذرا سو رہی ہے دیکھو! میں نے اپنی بیٹی کو اپنے ہاتھوں سے دلہن بنایا ہے، اسے سونے دو۔ ابھی جب وہ سو کر اٹھے گی، اس گھر کے دروازے پر ایک ڈولی آ جائے گی۔ اور وہ اپنے پپا کو چھوڑ کر اپنے سسرال چلی جائے گی۔ پھر وہ پاگلوں کی طرح زور زور سے ہنسنے لگا۔

اقبال نے دیکھا، مہندی رچے عذرا کے ہاتھ پلنگ سے نیچے جھول رہے ہیں اور مانگ افشاں سے بھری ہے!!

ایک آدمی نے ایک لڑکی کے باپ سے شکایت کی کہ تمہاری لڑکی سے ایک لڑکا فلاں باغ میں پیار کر رہا تھا۔ لڑکی کے باپ نے پوچھا: "کیا وہ لڑکا میری لڑکی کو پیار کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔"
آدمی نے جواب دیا۔ "جی نہیں، اس وقت تک تو کامیاب نہیں ہوا تھا۔" باپ نے مطمئن ہو کر کہا۔

م اک مہتاب



سیلز گرل

وہ اپنی غیرت کا گلا گھونٹ کر اپنے شرابی باپ کا قرض اتارنا چاہتی تھی، لیکن ۔۔۔ !!

"**دیکھو** روزی! مجھے ڈھیلی ڈھالی لڑکیاں پسند نہیں ہیں۔ اس سے میرے بزنس کو نقصان پہنچتا ہے۔" گھاٹیا نے رجسٹر پر سُرخ پنسل سے نشان لگاتے ہوئے کہا۔

خیالات کے گہرے بھنور میں چکر کھاتی ہوئی روزی ایک دم چونک اٹھی اور بولی۔

"ہیر ڈریسر کے ہاں بھیڑ تھی۔ پھر بھی میرے بال اور لباس کچھ بُرا تو نہیں ہے۔ دستکاری کی چیزوں کے ایمپوریم میں لباس بھی تو اجنتا اور ایلورا کے نمونے کا ہونا چاہیئے۔"

گھاٹیا روزی کی بات سن کر من ہی من میں کہنے لگا۔

بے شک اس ساڑی اور مختصر چولی میں تم آج شکنتلا کو مات دے رہی ہو لیکن گھاٹیا بزنس مین ہے عاشق نہیں۔ وہ کمپنی کا منیجر ہے جسے مہینے کے آخر میں سیل شو کرنی ہوتی ہے عشق نہیں کرنا۔

روزی پھر خیالات میں ڈوب گئی تھی۔ اس کا جسم اسٹور میں تھا، دل و دماغ کہیں اور تھے۔ وہ کہیں اکیلے میں بیٹھ کر رونا چاہتی تھی لیکن اس نے دروازے کی طرف دیکھا جہاں ایک ہندوستانی مرد اور ایک یورپین عورت بانہوں میں بانہیں ڈالے اندر آرہے تھے۔ وہ آنسوؤں کا تلخ گھونٹ بھرتے ہوئے آگے بڑھی۔

"میں ایمپوریم کی طرف سے آپ کا خیر مقدم کرتی ہوں۔ بتایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟"

نوجوان نے روزی کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور بولا،

"انہیں ہاتھی دانت کا کچھ سامان گھر لے جانے کے لئے خریدنا ہے۔"

روزی کے ہاتھ مشین کی طرح حرکت میں آگئے۔ وہ الماری کا شٹر کھینچ کر ہاتھی دانت کے نمونے نکالنے لگی۔ اس کی زبان یوں چل رہی تھی جیسے ٹیپ ریکارڈ چلنے لگا ہو۔ ایک ایک چیز کی تعریف اور وضاحت میں وہ فنون کے متعلق اپنی معلومات کے ذخیرے کو کام میں لا رہی تھی۔ یورپین لڑکی نے یسوع، تاج، آئینے اور آرائش بکس پسند کئے۔ پھر وہ اس نوجوان کو ساتھ لے کر روزی سے کپڑے دیکھنے کے لئے اگلے کاؤنٹر پر چلی گئی۔

روزی چپ ہو کر اسٹول پر یوں بیٹھ گئی جیسے کھلونے کی چابی ختم ہو گئی ہو۔ وہ کالی شیروانی والے اس مرد کی طرف دیکھ رہی تھی، جو ابھی ابھی اپنی محبوبہ کی پسند کے لئے اسے سو سو کے چھ نئے نوٹ دے گیا تھا۔ نوٹ جو اس کی تین ماہ کی تنخواہ کے برابر تھے لیکن جو اس حسینہ کی صرف ایک مسکراہٹ کی قیمت تھی۔

صبح اس نے گھاٹیا سے ڈیڑھ سو روپے پیشگی مانگے تھے لیکن گھاٹیا نے یہ کہہ کر کورا جواب دے دیا تھا کہ وہ آدھی تنخواہ پہلے ہی پیشگی لے چکی ہے لیکن اسے تو آج روپے کی سخت ضرورت تھی۔ وہ بار کے منیجر سے وعدہ کر چکی تھی کہ لنچ کے وقفے میں اسے ضرور ڈیڑھ سو روپے پہنچا دے گی۔ نہیں تو ـــــ

نہیں تو ـــــ سوچتے ہوئے اسے ڈر معلوم ہونے لگا۔ نہیں تو منیجر کھنہ اس کے والد کو بار میں گھسنے نہ دے گا۔ اسے جیل بھجوا دے گا ـــــ اس کا چار سو روپیہ کس طرح ادا ہوگا ـــــ

شیروانی والے مرد نے اپنی محبوبہ کے لئے اگلے کاؤنٹر پر بھی سات سو روپے ادا کئے اور روزی آنکھوں میں اُمڈے آنسوؤں کو کناروں ہی پر پونچھ کر سوچنے لگی۔ کیا اس کا محبوب اس

کے والد کا یہ فرض نہیں ادا کر سکتا لیکن اسے تو خود اپنی تعلیم وغیرہ کے لئے روپے کی ضرورت رہتی ہے۔ سریندر پیار کر سکتا ہے، قربانی دے سکتا ہے لیکن روپیہ نہیں۔ وہ تنگی کا فرشتہ ہے زر کا پتلا نہیں۔ وہ تو خود ہی اس کی پاکیزہ مسکراہٹ کے علاوہ اسے کچھ دینا چاہتی ہے۔ جس تاریخ کو اس نے پچاس روپے پیشگی لے کر سریندر ہی کو فیس کے لئے دیئے تھے وہ اسے اداس نہیں دیکھ سکتی۔ وہ اسے جھٹکے نہیں دینا چاہتی۔ وہ چاہتی ہے کہ سریندر اس کے سہارے ہی سہی کسی بڑے مرتبے پر پہنچ جائے۔

ٹھگنے قد کے ایک سردار جی دراز شیدہ قامت پنجابی لڑکیوں کے درمیان گھرے ہوئے سے اسٹور میں داخل ہوئے روزی جھٹ کاؤنٹر پر جا کھڑی ہوئی۔

"ست سری اکال سردار جی! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟" وہ مصنوعی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے بولی۔

ان لڑکیوں کو ہاتھی دانت کی کچھ چیزیں خریدنی تھیں اور کھلونا جاپانی سے پھر چلنے لگا۔ "یہ خالص ہاتھی دانت کے ہیں میں بنگلور کے کاسمیٹک کیس ہیں۔ اگر آپ میری مانیں تو آئیوری کی بجائے سینگ کی چوڑیاں لیجئے۔ دانت تو راجہ مہاراجہ لوگوں کے چونچلے تھے ورنہ دیکھئے یہ جے پور کے جیولری باکس یہ ہاتھیوں کی قطاریں، یہ شیر اور ہاتھی کی لڑائی، کشتی اور ملازم کون ان فن پاروں کی داد نہ دے گا؟"

وہ چیزیں نکال نکال کر رکھتی جا رہی تھی اور لڑکیاں اس کے حسن اور زبان کے جادو سے مسحور ہوئی جاتی تھیں وہ صرف اسی اندازِ گفتگو پر دو سو روپیہ خرچ کر گئیں۔ کاؤنٹر خالی ہو گیا اور چند منٹ پہلے چہکتی ہوئی روزی دیوار سے یوں لگ کر کھڑی ہو گئی جیسے وہسکی کی خالی بوتل اوندھی کر دی گئی ہو۔ گھڑی ڈھائی بجا رہی تھی۔ بار کا منیجر پانچ بجے آجائے گا۔ وہ اسے روپیہ کہاں سے دے گی۔ وہ اس کی بے عزتی کرے گا۔ گھاٹیا کیا کہے گا۔ ہو سکتا ہے، اس کے باپ کو وہ ملازمت سے نکلوا دے، قید کرا دے۔

وہ گھبرا کر پھر کاؤنٹر پہ کھڑی ہو گئی۔ آبنوس کے ہاتھی پر ہاتھ پھیرنے لگی جس کے سفید دانتوں پر طلائی چوڑیاں کتنی خوشنما معلوم ہوتی تھیں اور سوچنے لگی کیا وہ خود بھی ایسی ہی نہیں ہے۔ اس کے ظاہر و باطن میں کیسا تضاد ہے۔ اس کے جسم کا ریشہ ریشہ کراہ رہا ہے لیکن اس کی زبان سے میٹھے نغمے پھوٹ رہے ہیں۔

جس کے سر سے گاہک گھاٹیا کی جیب میں نوٹ ڈالتے جاتے ہیں وہ کب تک ان تعلق داروں کی نمائش کر سکے گی؟

ٹرن۔ ٹرن۔ ٹرن۔

گھاٹیا کے فون پر گھنٹی بجی۔ وہ چونک کر اپنے سینے پر انگلی سے صلیب کا نشان بنانے لگی۔ فون بار کے منیجر کا نہ ہو۔

"روزی!"

"روزی!" گھاٹیا کی آواز سنتے ہی وہ گھبرا گئی۔ "ادھر آؤ۔ یو ونڈر فل گرل! جانتی ہو کس کا فون ہے؟"

"نہیں"

"ونرال نگر کے شہزادہ سامنت کا۔ کہتا ہے روزی کا انتخاب لاجواب ہے۔ روزی نے اس کی کوٹھی کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ وہ آج پھر اسٹور میں آ رہا ہے۔ اسے قالین اور پردے چاہئیں۔ تم ایک بار پھر اس پر جادو کر دو۔ سونے کی اس مکھی کو پھانس دو۔ میں تمہاری ترقی کے لئے سفارش کروں گا۔"

"لیکن میں تو اس ڈیپارٹمنٹ میں کام نہیں کرتی۔"

"کوئی مضائقہ نہیں پہلے تو کر چکی ہو۔ ناگا لازیک۔ فلم کمپنی سیک۔ جاؤ اندر سے بہترین ساڑی پہن لو۔ دو گھنٹے کی چھٹی ہے کسی سیلون سے جا کر بہترین میک اپ کروا آؤ۔ دیکھو آج پرنس کسی اور اسٹور پر نہ جانے پائے۔"

وہ بادل ناخواستہ ٹائلٹ روم میں جا کر لباس تبدیل کرنے لگی۔ پھر دوسرے ڈیپارٹمنٹ میں جا کر قالینوں وغیرہ کا جائزہ لیا، لٹریچر کا مطالعہ کرنے لگی۔ اس کا دل کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ ذہن میں کئی تصویریں اور پتلے ڈھیر ہوئی جاتی تھیں۔ اس کا باپ تھا شراب کے نشے میں دھت لڑکھڑاتا ہوا جوزف۔ مریم کی مانند معصوم ماں، سرخ و سپید نوجوان سریندر جو اسے شام کی سیر کے لئے لے جانے آئے گا۔ گھاٹیا تھا جو اس کے چام کے دام کھرے کرنا چاہتا تھا۔ بار منیجر تھا بڑی بڑی مونچھوں والا گنجا جو اس کے والد کو ملازمت سے نکلوا دینے کی دھمکی دے رہا تھا اور قیمتی شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ پہنے پریوں کا شہزادہ سامنت تھا۔

سامنت کی تصویر ذہن میں آتے ہی وہ گھبرا گئی۔ ایک ہفتہ پہلے اسی دن کی بھیانک یاد میں کھو گئی۔ جب یہی بلند قامت شہزادہ چھڑی گھماتا ہوا اسٹور میں آیا تھا۔ آرٹ کے نمونے پسند کرتا رہا تھا۔ وہ بہت بلند ذوق کا مالک تھا لیکن روزی نے

بھی تو اس پر اپنی معلومات کی دھاک جاری تھی۔ وہ گھما پھرا کر اسے اپنی نئی کوٹھی میں لے گیا تھا تاکہ دونوں مل کر کوٹھی کی آرائش کے لئے سامان کی فہرست مرتب کر سکیں۔

کوٹھی کا ہر گوشہ شیش محل کا گوشہ معلوم ہوتا تھا۔ کاش وہ خود بھی کسی شہر کا شہزادہ ہوتا۔ ماحول پھولوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ وہ نیچے اوپر دوڑ دوڑ کر کمروں کا جائزہ لیتی رہی اور فہرستیں بناتی رہی۔

"بیٹھو روزی! تم تھک گئی ہو گی۔" سامنت کرسی پر بیٹھ کر دھوئیں کے مرغولے فضا میں بکھیرنے لگا۔

"مجھے جلدی جانا ہے۔"

"میں تمہیں کار میں چھوڑ آؤں گا۔"

وہ اس مہذب انسان کی درخواست رد نہ کر سکی۔ کمرے میں اندھیرا ہو رہا تھا۔ سامنت نے بٹن دبایا، گھپ اندھیرا ہو گیا۔ پھر چھت کے چھپے ہوئے گوشوں سے روشنی چاندی کے سفوف کی طرح جھڑنے لگی۔ دیواروں پر مرمریں نیلی لہریں پیدا ہونے لگیں اور اسے یوں محسوس ہوا گویا وہ لہروں میں تیرتی ہوئی سمندر کی تہہ میں چلی جا رہی ہو۔

"آپ بہت تھک گئی ہوں گی۔" سامنت نے ایک اور بٹن دبایا۔ دیوار کی ایک بڑی سل سرک گئی۔ اندر ایک الماری رنگا رنگ شرابوں کی بوتلوں سے جگمگا رہی تھی۔

"کیا لیں گی آپ؟"

"میں نہیں پیتی۔" اس نے رکتے رکتے جواب دیا۔

"میں تمہیں بہت مہذب لڑکی سمجھتا تھا ——— مگر ———"

اس سے پہلے کہ سامنت اسے بیک ورڈ، نیٹو، غیر مہذب وغیرہ کسی لقب سے نوازتا، وہ بولی۔

"سمپل بیئر!"

"بیئر بھی کوئی پینے کی چیز ہے۔ دنیا کی بہترین شرابیں یہاں موجود ہیں۔ پھر یہ موقع تمہیں کہاں ملے گا۔ لو یہ زرد شیری اور گلابی برگنڈی کا مکسچر پیو۔" وہ اس کے لئے پیالہ بھرنے لگا۔ پھر کئی بوتلیں نکال کر اپنے لئے مکسچر بنانے لگا۔ وہ پیالہ منہ سے لگاتے ہوئے تک سکیڑ رہی تھی اور سامنت شرابوں کی تاریخ اور صفات بیان کر رہا تھا۔ وہ جام پہ جام خالی کر رہا تھا۔ اُسے ڈر تھا کہ سامنت بہک کر اس سے دست درازی نہ کرے اس لئے وہ جوتیں اٹھا کر الماری میں رکھنے لگی اور سامنت کے ہاتھ سے جام لے کر بولی۔

"ہاں لگتی ہوں شہزادہ صاحب! آپ کی طرح کا شہر میں کوئی رئیس نہیں۔ لیکن آپ کو مجھے چھوڑنے بھی جانا ہے۔"

"میں صحرا ہوں جس پیاس پانی کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ میں کار چلا کر ماؤنٹ ایورسٹ تک لے جا سکتا ہوں؟"

"لیکن مجھے تو گھر جانا ہے۔"

"کھانا کھائے بغیر جانا میری بے عزتی ہو گی۔ تمہیں ناچنا آتا ہو گا۔ کھانے کا وقت ہونے تک آؤ تھوڑی سی تفریح ہو جائے۔" اس نے بڑھ کر ریڈیو گرام میں ریکارڈ چڑھا دیا۔ کمرے میں روشنی اور نشے کی لہروں میں موسیقی کی لہریں بھی شامل ہو گئیں۔ سامنت نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ ریکارڈ ختم ہونے تک وہ تھک کر چور ہو گئی تھی۔

وہ گھر بھاگ جانا چاہتی تھی لیکن اس کا چہرہ سرخ ہونے لگا تھا۔ پاؤں میں تھوڑی سی لرزش تھی۔ اس لئے وہ رک گئی۔ سامنت کھانے کے لئے اُسے "اسٹینڈ" لے آیا۔ وہ دہلیز پر پاؤں رکھتے ہی کانپ گئی۔ "ہاں تو اس کا فالد کلارنٹ بجا رہا ہو گا۔" وہاں رئیسوں اور رئیس زادیوں کا ہجوم تھا۔ رقص ہو رہا تھا۔ سامنت اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے دو بار جوزف کے پاس سے گزر گیا لیکن جوزف نے آنکھ ہی رکھی تھی کہ اُسے ہر عورت ایک جیسی دکھائی دیتی تھی۔ پھر بھی وہ گھبرا گئی اور سامنت کے رکنے پر بھی وہاں سے بھاگ آئی۔

کتنا خوفناک واقعہ تھا۔ اس نے رومال سے پسینہ پونچھا۔ اچانک اس کے پاس رکھا ہوا ٹیلی فون چیخنے لگا۔ چار بج رہے تھے اُسے ریسیور اٹھانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ کیونکہ ریسیور میں سے کھڈ چیخنے لگے گا ——— تم تنخواہ کے وقفے میں نہیں آئیں۔ ابھی روپیہ پہنچا دو ورنہ جوزف آج گھر جانے کی بجائے حوالات میں ہو گا۔"

وہ ریسیور پر ہاتھ رکھے سوچنے لگی۔ اس کی بھی کیا زندگی ہے۔ ابھی ایک شہزادہ اس پر جان نثار کر رہا تھا اور ابھی وہ ڈیڑھ سو روپے کے خوف سے ریسیور نہیں اٹھا رہی ہے۔ آخر اس نے ریسیور اٹھا ہی لیا اور بولی تھی۔ "یہ کھڈ صاحب!

معاف کیجئے ۔۔۔۔۔ لیکن الفاظ اس کے ہونٹوں ہی میں رہ گئے
روز مسکراہٹ چہرے پر پھیل گئی۔
"کون ؟ تم ہو سریندر ! عجیب ! کیا پیش
آئی سی ایس میں آگیا ہے ۔۔۔۔۔ لیکن تمہارا تعجب کب آ رہا
ہے ۔۔۔۔ اچھا آج پارٹی ہے ۔۔۔ کہاں ۔۔۔ کیا ۔۔۔
کانٹی نینٹل میں ۔ اندیرا بھی ہوگی ۔۔۔ سادے دن لباس پہن کر
آنا ۔۔۔ میں لینے آؤں گا۔"

سریندر کے پیغام نے اُسے نئی زندگی عطا کردی ۔ کاش وہ اس وقفے میں ہیئر ڈریسر سے بال بنوا آتی لیکن اب تو پرنس کے آنے کا وقت ہو رہا تھا۔ وہ آئینے کے کر لبوں کے حاشیے درست کرنے لگی ۔ ٹیلیفون کی گھنٹی پھر بجی ۔

کھنہ چیخ رہا تھا۔ "میں اب کوئی بہانہ نہیں سن سکتا ۔ آج جوزف کو شراب نہیں ملے گی اور جوزف تمہیں نہیں ملے گا اگر پیسہ آج رات تک نہ ملا چاہیئے ۔۔۔"

وہ کھنہ سے التجا کرنا چاہتی تھی کہ وہ اس کی خوشی کے لمحات میں آگ نہ لگائے۔ اسے گہری کھائی میں گرنے پر مجبور نہ کرے لیکن کھنہ فون چھوڑ گیا تھا۔ وہ سکتے کی حالت میں وہیں بیٹھی رہ گئی۔ گھر میں تو پھوٹی کوڑی نہیں ۔ روپیہ کہاں سے آئے ۔ وہ روپے کے لئے سامنت کے آگے ہاتھ پھیلا سکتی تھی لیکن سامنت نے پہنچا پکڑ کے ہاتھ پکڑ لیا تو ۔۔۔۔ تو روزی اور بازاری عورت میں کیا فرق رہ جائے گا۔ پھر سریندر سے محبت تو ایک فریب ہو جائے گا پھر حصول زر کے لئے سامنت کے بعد کس کس سے انکار کرے گی۔ انگلیاں اٹھیں گی ۔ اسے اپنے دوستوں کے حلقے میں جاتے ہوئے ڈر لگے گا ۔ پھر اسے خیال آیا دنیا میں کتنے لوگ ایسے ہوں گے جن کا ظاہر و باطن ایک جیسا ہے پھر اسی کو ریکھا کی تائید کیوں ؟ اگر تھوڑی لچک سے مطلب نکل جائے تو کیا حرج ہے۔ صاف دل کا آئینہ ہی کچھ داغدار ہوگا لیکن دلوں میں جھانک کر کون دیکھتا ہے۔ یہاں تو جس کے جتنے اچھے کپڑے ہیں ۔ جتنی قیمتی لپ اسٹک ہے سماج میں اس کا مرتبہ اتنا ہی بلند ہے۔

گھانیا اسے ڈیڑھ سو روپے دے سکتا ہے لیکن اس کی قیمت چکا دینے کے بعد وہ اسٹور میں ایک منٹ نہ ٹھہر سکے گی۔ پھر وہ سامنت ہی سے کیوں نہ مانگ لے ۔ لیکن سامنت تو اُدھار پر یقین نہیں رکھتا چیک دیتا ہے مال لیتا ہے۔ خیر کچھ بھی ہو ۔ وہ آج سامنت سے ضرور درخواست کرے گی۔ اس نے آئینہ دیکھا رخساروں سے آنسوؤں کے دھبے صاف کئے ۔ بال ٹھیک کئے ۔ اتنے میں پیغام آیا کہ گھانیا پرنس کو لے کر آ رہا ہے۔

روزی ایک دم جاپانی گڑیا کی طرح کھیل دکھانے کے لئے تیار ہو گئی ۔ اس کی زندگی تمام مسکراہٹ سمٹ کر ہونٹوں پہ آگئی وہ پرنس کو دریوں ، گدوں ، قالینوں اور پردوں کے بارے میں اپنی وسیع معلومات سے متاثر کرنا چاہتی تھی لیکن سامنت کی نگاہیں ریکھوں کی نسبت اس کی زلفوں میں زیادہ اُلجھ رہی تھیں ۔ وہ باتوں باتوں میں ڈیڑھ سو روپے کی درخواست کر دینا چاہتی تھی ۔ لیکن گھانیا وہاں موجود تھا۔

سامنت نے بہت کچھ دیکھا لیکن اطمینان نہ ہوا۔ وہ دستی کھڈی کا مال چاہتا تھا جو اسٹور میں کم تھا۔ اس نے خود ہی گھانیا سے کہہ دیا کہ آپ روزی کو میرے ساتھ بھیج دیں تو بہتر ہو گا۔ ٹھیک اندازہ ہو جائے گا۔

"بے شک ۔ بے شک ! " گھانیا کی باچھیں کھلی جارہی تھیں۔ روزی بھی مسکرا دی لیکن گزشتہ ہفتے کا واقعہ یاد آتے ہی اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ نہیں ، نہیں ۔ اسے تو سریندر کے ساتھ کانٹی نینٹل جانا تھا۔ وہ اسے لینے آرہا ہوگا ۔ لیکن ۔۔۔ کھنہ ۔۔۔ لیکن کھنہ ۔۔۔ اور اس سے آگے اس کی سوچ مفلوج ہو گئی۔

اس نے سامنت سے کہا وہ وہیں بیٹھ کر ضروریات کا جائزہ لے سکتے ہیں لیکن سامنت کوٹھی چلنے پر مُصر تھا۔

"روزی چلی جاؤ ایک آدھ گھنٹے کی بات ہے " گھانیا نے التجا کی ۔ فون کی گھنٹی بجی اور گھانیا باہر چلا گیا۔

"آپ سے ایک بات کہنی ہے " روزی نے انگلیوں کو بل دیتے ہوئے کہا۔

"فرمایئے !"

"میرا مطلب تھا " وہ اظہار مدعا سے قاصر تھی۔

"کہئے !"

"میں کہنا چاہتی تھی کہ اسٹور بند ہونے کا وقت ہے ۔ مجھے کہیں جانا ہے ۔ آپ یہ بات کیا کل پر نہیں اٹھا سکتے ؟"

"دیکھ لیجئے ۔ میں کسی اور دکان پر چلا جاتا ہوں " سامنت

ا یں جھجکتے ہوئے بولا۔

"نہیں، نہیں۔ آپ شاید سمجھے نہیں۔ میں آپ سے ذاتی عنایت چاہتی ہوں۔ آپ اندر تشریف لے آئیں۔ میں آپ کو ایران کا مال بھی دکھاتی ہوں۔"

سامنت اندر آ گیا۔ وہ اسے مال دکھاتے ہوئے ڈیڑھ سو کی بات کرنا چاہتی تھی لیکن زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی صرف اتنا کہہ سکی کہ آپ سے ایک ذاتی موضوع پر بات کرنی ہے۔ سامنت گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔

"اب تو اسٹور بند ہونے میں صرف آدھ گھنٹہ باقی ہے۔ مجھے ایک پارٹی میں شریک ہونے کے لئے کاشی نشل جانا ہے۔ بہتر ہے کہ تم میرے ساتھ چلی آؤ۔ بات بھی ہو جائے گی۔ تم پارٹی میں شریک ہونا چاہو تو بہتر ورنہ میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں گا۔"

"کیسی پارٹی ہے؟"

"میرے ایک دوست کا لڑکا آئی اے ایس میں منتخب ہوا ہے۔ چلو تمہیں بھی ملا دوں۔ بڑے لوگوں سے ملنے میں ہمیشہ ہی فائدہ رہتا ہے۔"

"اس پارٹی میں تو میں بھی مدعو ہوں۔" روزی مسکرائی۔

"گڈ گاڈ! پھر دیر کیا ہے؟"

روزی کو سریندر کا انتظار تھا لیکن پھر سامنت سے بات نہیں ہو سکتی تھی۔ ڈیڑھ سو روپیہ کل تک۔ کھنٹہ ڈیڑھ سو روپیہ جوزف۔ ایک عجیب سا چکر تھا۔ وہ سریندر کے لئے رقعہ چھوڑ کر چلی گئی۔

"کہئے کیا بات ہے؟" سامنت نے کار کا آئینہ درست کرتے ہوئے کہا۔

"بات یہ تھی شہزادہ صاحب کہ مجھے ذاتی ضرورت کے لئے کچھ دنوں کے لئے کچھ روپیہ چاہیئے۔"

"یہ کون سی بڑی بات ہے۔"

"میں جلد لوٹا نہ سکوں گی۔"

"تم سے مانگتا کون ہے؟"

"مجھے آج ہی چاہیئے۔"

"گھر چلو۔ جتنا درکار ہو لے جاؤ!"

"مجھے ابھی ——" روزی بات بھی پوری نہ کرنے پائی تھی کہ وہ کاشی نشل پہنچ گئے۔ وہاں ہر صورت شہزادی اور ہر سو شہزادہ دکھائی دیتا تھا۔ ہیلو۔ ہیلو ڈو یو ڈو! کی صوت آوازوں نے انہیں گھیر لیا۔ اور اس کا حجاب گیا۔

وہ رنگ و نور کی ایک نئی دنیا تھی۔ نیم عریاں جسم، چمکتے ہوئے زیورات، بھڑکیلے لباس، تھرکتے قدم، بجتے قہقہے ہی قہقہے۔ منٹ بعد ان دونوں کے ہاتھوں میں سفید ڈرائی جن کے چھوٹے چھوٹے گلاس تھے۔ وہ سامنت سے اپنے کام کی بات کرنا چاہتی تھی مگر وہاں کوئی کان فارغ نہ تھا۔

پھر اس نے دیکھا سریندر ہال کے کونے میں کھویا کھویا سا کھڑا تھا۔ رمیش سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ پھینک دے، سامنت کا ہاتھ جھٹک دے۔ اور بھاگ کر سریندر کے سرخ چہرے کو ہاتھوں میں لے کر کہے —— مجھے معاف کردو میرے محبوب! میں بھٹک گئی تھی۔ لیکن سامنت کی گرفت بہت مضبوط تھی اور جام پھینکنے کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ آرکسٹرا بج رہا تھا ——!

کنور جانکی داس۔ ان کا لڑکا رمیش اور اس کی منگیتر اندرا لوگوں کے پاس جا جا کر مبارکباد وصول کر رہے تھے۔ وہ سامنت کے پاس بھی آئے۔ سریندر بھی ان کے ساتھ تھا۔

"رمیش!" جانکی داس تعارف کراتے ہوئے بولے "یہ ہیں میرے دوست پرنس سامنت آف نوال نگر۔ اور ان کی تعریف!" کنور صاحب نے روزی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اس سے پہلے کہ سامنت کوئی جواب دیتا وہ خود ہی بول اٹھی۔

"مس آیوری۔"

"یعنی مس ہاتھی دانت!" اندرا کے سرخ ہونٹوں سے قہقہہ پھوٹ پڑا جس میں سب شریک ہو گئے۔ سامنت کچھ خفیف سا ہو کر بولا۔

"نہیں، میری فرینڈ مس روزی جوزف۔"

"نہیں۔ نہیں۔ مس آیوری۔ روزی تو گھاٹیا کی سیلز گرل ہے۔ اسے مینیجر کا روپیہ دینا ہے وہ پارٹی میں نہ آ سکی۔" اور روزی ہاتھ سے جام پھینک کر بجلی کی سی تیزی سے ہال سے باہر نکل گئی!!

آخری لڑکی

ایک ایسے نوجوان کی رومانوں بھری کہانی جسے ساری دنیا گھومنے کے بعد بھی عورت کی محبت نہ مل سکی، لیکن تعصبات کے گھپ اندھیرے میں ایک لڑکی ازل سے اس کی منتظر تھی:

ابراہیم جلیس

فریدہ دنیا کی پہلی اور آخری لڑکی تھی جو اس سے شادی کرنے پر رضامند ہو گئی تھی۔

اور پھر فریدہ کی شادی ہو گئی۔

بڑی دھوم دھام سے۔

لیکن فریدہ کا دولہا وہ نہیں تھا۔

پھر اُسے کبھی عورت کی محبت کسی شکل میں بھی نہیں ملی۔ وہ ساری دنیا گھوم آیا تھا۔ وہ ایک جہاز راں کمپنی میں معمولی کلرک سے جہاز کے کپتان کے عہدے تک ترقی کر گیا تھا۔

پہلے وہ خود ایک شکستہ جہاز کی طرح زندگی کے متلاطم سمندر میں بے طرف ہچکولے کھاتا رہا اور پھر آخر وہ کمپنی کے جہازوں میں سمندر سمندر سفر کرنے لگا۔ اس کا کوئی گھر نہیں تھا مگر وہ ہوتا ہے جس میں کسی



چاہے وہ کتنی ہی حسین، چنچل، چھوئی موئی، کھلنڈری، سنجیدہ یا حد سے زیادہ شرمیلی لڑکی کیوں نہ ہو دنیا عورتوں سے بھری پڑی ہے لیکن کبھی کبھی ایسا بھی محسوس ہوتا ہے جیسے دنیا میں ایک بھی عورت نہیں ہے۔ امجد کو بھی ملک ملک شہر شہر ان گنت عورتیں ملیں لیکن عورت کی محبت کسی شکل اور کسی رشتے میں بھی نہیں ملی۔

نہ ماں کی محبت، نہ بہن کی محبت، نہ بیوی کی یا محبوبہ اور بیٹی کی محبت۔

وہ پیدائش ہی کے دن ممتا سے محروم ہو گیا تھا۔ وہ جیسے دنیا کی دہلیز پہ پیدا ہوا تھا۔ ادھر وہ دنیا میں داخل ہوا تھا۔ ادھر اس کی ماں دنیا سے نکل گئی۔

اس کی صرف ایک ہی بڑی بہن تھی وہ واقعی نور جہاں تھی وہ سما بھی اور جہاں بھی۔ نور جہاں قسم کی کوئی لڑکی جوان ہونے کے بعد دو تین کمروں والے چھوٹے غریب گھرانوں میں دیر تک رہ ہی نہیں سکتی۔

بہت زیادہ خوبصورت عورتوں کے دنیا میں صرف دو ہی ٹھکانے ہوتے ہیں۔ مرمریں محل یا پھر بازار کے دونوں طرف دکانوں جیسے کھلے ہوئے جلتے۔ نور جہاں کہاں چلی گئی تھی۔ کسی مرمریں محل میں یا کسی چھپے بازار کی کوٹھی میں یا پھر کھلے بازار کے کوٹھے پر۔۔۔ یا قبر میں زمین کے اندر یا جنت یا دوزخ میں آسمان کے اوپر؟

امجد تو صرف اتنا ہی جانتا ہے کہ ایک صبح امجد کی سوتیلی ماں نے پگلی سالی دھوکھلی کی نور جہاں کے زور سے دو تین تھپڑ مارے تھے اسے ناشتہ بھی نہیں دیا تھا۔ اور وہ سہہ نہ سکتی بلکتی اسکول تو چلی گئی پھر واپس نہیں آئی تو اتنی بڑی دنیا ایک چودہ سالہ ننھی سی لڑکی کو نگل لے تو کیا پتہ چل سکتا ہے!؟

اس پرانی آدم خور دنیا نے تو خدا کے مقربین خاص پیغمبروں، یونان و مصر اور روما جیسی بڑی بڑی سلطنتوں، نمرود، شداد، فرعون، سکندر اور چنگیز جیسے ارضی خداؤں تک کو ہڑپ کر لیا۔ تو کیا تمام جہان کے ایک معمولی بیٹے کلرک کی چودہ سالہ ننھی لڑکی کا کہاں سراغ لگ سکتا تھا۔

امجد ماں کی محبت کے علاوہ بہن کے پیار سے بھی بچھڑ گیا۔

عورت کی محبت نہیں بلکہ عورت کی نفرت کی آگ سے وہ شروع سے جھلس رہا تھا۔ وہ عورت اس کی سوتیلی ماں تھی اس کے ڈر نے امجد کو بچپن ہی سے ڈرپوک بنا دیا تھا۔ وہ سہما سہما بڑا ہوتا جا رہا تھا۔

اپنے چھوٹے سوتیلے بھائی کے لئے ماں اور باپ دونوں کی بے تحاشہ محبت اور اپنے لئے ان کی نفرت کا مظاہرہ کرتے کرتے اس میں شدید احساسِ کمتری بھی پیدا ہو گیا تھا۔

ڈرپوک اور احساسِ کمتری میں مبتلا بچوں کی صحت خراب ہو جاتی ہے۔ ان کی نشوونما بھی صحیح طریقے پر نہیں ہوتی خراب صحت اور خراب نشوونما والے کم صورت یا کمزور بنا دیتے ہیں اور وہ زندگی کے کسی بھی چیلنج کا مقابلہ نہیں کر سکتے فوراً بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔

ایک دن امجد بھی بھاگ کھڑا ہوا۔

اس دن کسی قومی رہنما کے مرنے پر اسکول آدھے دن ہی سے بند ہو گئے تو تیرہ سالہ امجد گھر لوٹ گیا جیسے ہی وہ گھر میں داخل ہوا اس نے دیکھا کہ اس کی سوتیلی ماں غسل خانے کے بجائے صحن کے نلکے کے نیچے بیٹھی نہا رہی ہے۔ سوتیلی ماں نے اسے دیکھ کر شور مچا دیا۔

"اچھا تو تو اس لئے اسکول سے بھاگ کر آیا ہے۔ ٹھہر آنے دے اب اپنے ابا کو۔"

اس دن اس کا ابا کب گھر آیا۔۔۔ اسے کیسے معلوم ہو سکتا تھا اسے تو سینکڑوں میل دور ریل کے ایک ڈبے میں ایک ٹکٹ بابو نے بلا ٹکٹ سفر کرنے کے جرم میں پکڑ لیا تھا اور پھر ڈبے میں بیٹھے ہوئے ایک ادھیڑ عمر کے مرد نے جیب سے جرمانہ بھر کر اسے چھڑا لیا تھا۔

وہ ادھیڑ عمر مرد ماسٹر نور محمد تھے جو ایک فیلڈ گنج لدھیانہ کے ہائی اسکول میں انگریزی کے ماسٹر تھے۔ امجد کو پاکر ماسٹر نور محمد کی بیوی بھی خوش ہوئیں۔۔۔ وہ اولاد کی نعمت سے محروم تھیں۔

اب امجد پھر سے ماں اور باپ کے رشتوں میں جکڑ گیا تھا کیونکہ ماسٹر نور محمد اور ان کی بیوی دونوں اسے بیٹے کی طرح ہی چاہتے تھے۔

ماں نہ سہی، ماں کی طرح۔۔۔ باپ نہ سہی باپ کی طرح۔۔۔ بیٹا نہ سہی، بیٹے کی طرح۔۔۔ یہ بھی تو رشتے ہی ہیں نا؟

ماسٹر نور محمد کے گھر میں غریبی اور تنگدستی کا اندھیرا بڑا ہولناک ہوتا اگر وہاں علم کا چراغ نہ جل رہا ہوتا۔

اس گھر میں، علم کے اجالے میں امجد کو اب دنیا کچھ کچھ صاف نظر آنے لگی تھی۔ بالخصوص رشتوں کا جال اس کی نظروں کے سامنے پھیلا ہوا تھا۔ بہت الجھا، بہت گنجلک، الجھا ہوا، بڑا گھمبیر۔۔۔ جس میں ہر انسان دوسرے سے بری طرح جکڑا ہوا تھا۔

امجد اپنے باپ اور سوتیلی ماں سے رشتے توڑ کر بھاگ نکلا تھا لیکن دنیا میں انسان اکیلا تو ہرگز نہیں رہ سکتا۔ تھوڑی ہی سمجھ آنے کے بعد وہ ماسٹر نور محمد سے بیٹے اور شاگرد کے رشتے میں جکڑ گیا۔ کبھی کبھی ماسٹر نور محمد کی بیوی امجد سے گھریلو نوکر کی طرح پیش آتی تو ماسٹر نور محمد اپنی بیوی کو بری طرح ڈانٹ دیتے۔۔۔ وہ چیخ پڑتے۔

جیسے جنت سے نکلی بات ہو کہ دنیا کے سب انسان برابر برابر ہوتے ہیں۔ کوئی کسی کا آقا اور کوئی کسی کا نوکر نہیں ہوتا۔ امجد وہ اس لیے کہ کبھی یہ محسوس نہ ہونے دیا کہ بھلا نوکر ہے۔ یہ میرا بیٹا ہے ___ نوکر نہیں ہے۔"

ماسٹر نور محمد نے سچ مچ اپنے بیٹے کی طرح امجد کو خوب پڑھایا لکھایا۔ امجد ذہانت میں تھا اور اس پر ماسٹر نور محمد جیسے چراغ کا اجالا ___ امجد سارے صوبے میں بی ایس سی کے امتحان میں فرسٹ کلاس فرسٹ پاس ہوا۔ ملک کے اخبارات میں اس کی تصویریں شائع ہوئیں۔

ماسٹر نور محمد چاہتے تھے کہ اب امجد کوئی بہت بڑا افسر بن جائے لیکن امجد کے پاس نہ تو روپیہ تھا اور نہ کسی بڑے آدمی سے رشتہ داری ___ حتیٰ کہ ایک دن آیا کہ ماسٹر نور محمد سے بھی اس کا رشتہ ٹوٹ گیا۔

ماسٹر نور محمد اسکول سے واپس آئے۔ سینے میں کچھ تکلیف سی محسوس کی۔ ادھر امجد ڈاکٹر کو بلانے گیا، ادھر وہ خالق حقیقی سے جا ملے۔

ان کا مرض الموت یہ تھا کہ وہ بہت اچھے آدمی تھے۔ بہت اچھے آدمیوں کو دنیا کی ہر نعمت بڑی کم ملتی ہے۔ سانس، روٹی، کپڑا، خوش حالی حتیٰ کہ عمر بھی کم۔

ماسٹر نور محمد کے سالے چوہدری نوازشی محمد بخش کی ایک جہاز راں کمپنی میں سپرنٹنڈنٹ تھے۔ پرانی وضع کے بھلے مانس آدمی اور مالکان کے چہیتے۔ انہوں نے اپنی سعی سے امجد کو بلوایا اور مالکان سے کہہ سن کر امجد کو بھی ایک جہاز کا جونیئر افسر مقرر کرا دیا۔

انہی دنوں اسی جہاز پر صرف ایک میٹرک پاس لڑکے کا تقرر سینئر افسر کی اسامی پر ہوا۔ امجد کو برا لگا کہ وہ بی ایس سی فرسٹ کلاس ہو کر جونیئر افسر اور وہ نو وارد میٹرک پاس سینئر افسر ___ لیکن چوہدری نوازشی محمد نے سمجھایا۔

"بیٹا سنو! اس سے زیادہ پڑھا لکھا بھی اس سے کمتر اس لیے ہے کہ وہ مالکان کا رشتہ دار ہے اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ وہ امیر ہے اور تم غریب ہو۔"

امجد جلا اٹھا ___ اس کے کانوں میں ماسٹر نور محمد مرحوم کی گرجتی آواز گونجنے لگی۔

"نہیں ___ اس دنیا میں سب انسان برابر برابر ہیں۔ نہ کوئی امیر، نہ کوئی غریب، نہ کوئی گورا نہ کوئی کالا، نہ کوئی اعلیٰ نسل کا، نہ کوئی ادنیٰ نسل کا، نہ کوئی عربی اور نہ کوئی ایشیائی، نہ کوئی غلام نہ کوئی آقا....."

امجد نڈھال ہو گیا۔ وہ اپنے محسن، اپنے باپ سے بھی زیادہ محسن ماسٹر نور محمد کو جھوٹا کیسے سمجھتا۔ اب چونکہ وہ جو کچھ بھی دیکھ رہا تھا وہ بھی سچ تھا

بالکل سچ ___!

پھر امجد کو اس جہاز پر کام کرتے اور ملک ملک کی سیر کرتے ہوئے چار برس بیت گئے۔ اب امجد کے کپتان بننے کا موقع نکل آیا تھا لیکن ایک دن اسے بتایا گیا کہ کوئی رام چند نامی شخص جہاز کا کپتان بنا دیا گیا ہے۔ وہ بھی امجد سے کم تعلیم یافتہ اور کم تجربہ کار تھا۔ امجد نے مالکان سے احتجاج کرنا چاہا تو اس کے نئے دوست اور ہم راز فرنے اسے مشورہ دیا۔

"یار ___ چپ کر جا ___ یہ کمپنی ہندوؤں کی ہے۔ تو مسلمان ہے۔ ترقی تو ہندو ہی کریں گے۔"

امجد اسے غصے سے گھورنے لگا۔

سوتیلی ماں اور بیٹا، مالک اور نوکر، امیر اور غریب ___ اور اب ہندو اور مسلمان!!

مسٹر رام چند اور امجد بھی ہندو اور مسلمان نہیں تھے۔ جہاز کے ان میں کوئی فرق نہیں ___ مسٹر رام چند اور امجد بڑے اچھے دوست بھی تھے اور ان میں نفرت اتنی بڑھی اتنی بڑھی کہ مسٹر رام چند تو ہندوستان میں رہ گئے اور مسٹر امجد نئے وطن پاکستان چلے آئے۔

پاکستان میں بھی امجد کو ایک جہاز راں کمپنی میں ملازمت مل گئی اور قابلیت اور تجربے کی وجہ سے وہ ایک جہاز کا کپتان بن گیا۔

اب امجد کو زندگی کی ساری نعمتیں مل گئی تھیں ___ بڑی تنخواہ، بڑا بنگلہ، بڑی کار اور دنیا بھر کی سیر کے لیے ایک بڑا جہاز۔ لیکن اس کے باوجود اسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اسے کچھ بھی تو نہیں ملا ہے۔

صرف اس کے اطراف ہی سمندر کا تلاطم نہیں تھا بلکہ اس کے اندر بھی ایک طوفانی سمندر موجزن تھا۔ جوانی کی عمر پر ہوتے ہی اس کا سارا وجود تپ رہا تھا۔ اب اسے کسی ماہ رخ کی بڑی شدت سے تلاش تھی۔ اب وہ چاہتا تھا کہ اسے روز روز کنوارا نہ سونا پڑے۔

اس کے لئے کئی ہی دوستوں کا ہجوم سا جمع تھا لیکن اسے ایسی لڑکی

کی تلاش تھی جس کی آنکھوں میں اسے صرف اپنا چہرہ نظر آئے۔ دنیا بھر کا انکار نظر نہ آئے۔

دنیا عورتوں سے بھری ہوئی ہے لیکن اس کے باوجود صرف ایک عورت بھی نہیں ملی۔

اہل غرض اور اس کی دولت اس کے سامنے ہر روز رشتوں کے ڈھیر لگا دیتے تھے۔

ایک بار ایک لڑکی اسے اتنی پسند آئی کہ اس نے اسے ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہا۔ لڑکی کے والدین بھی آمادہ ہو گئے۔ شادی کی تیاریاں بھی مکمل ہو گئیں۔ شادی سے صرف دو دن پہلے ہندوستان سے لڑکی کی نانی بھی آ گئی اور اسی شام باہر بینڈ باجے ایک دم رک گئے۔ سارا اندر ڈھولک کا گیت دھرا ہی خاموش ہو گیا۔

نانی بی اڑ گئی تھیں۔

"اوں ہوں ــــ اوں ہوں ــــ ہرگز نہیں۔ لڑکا تو سید نہیں ہے ــــ!"

لڑکی کا باپ ایک سچا مسلمان اور پکا پاکستانی تھا۔ اس نے بڑی بی کو ہر ممکن طور پر سمجھانے منانے کی کوشش کی کہ لڑکا مسلمان ہے، پاکستانی ہے لیکن اگلے وقتوں کی بڑی بی ٹس سے مس نہ ہوئیں۔

اس کے بعد ایک اور اچھا رشتہ طے ہو گیا تھا لیکن اب لڑکے اور لڑکی کا سماجی تفاوت آڑے آیا۔

امجد پی ای سی ایچ ایس میں رہتا تھا اور لڑکی لالوکھیت میں۔ امجد کے ہمراز دوست انور نے کہا۔

"یہ شادی بے جوڑ ہو گی اور مختصر رہے گی۔"

لیکن امجد کچھ ایسا دل شکستہ اور مایوس ہو گیا تھا کہ پھر وہ منہ زور بننے لگا۔ شہر شہر آوارہ ہو گیا۔

روم کے مختصر قیام کے دوران ایک اطالوی دوشیزہ اس کی زندگی میں داخل ہوئی۔ وہ دوشیزہ اس کو اپنے ماں باپ سے ملانے لے گئی۔ امجد کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر وہ اندر گئی اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد امجد نے اس کے باپ کی گرجدار آواز سنی۔

"نو نو نو ــــ مرتھل ناٹ ــــ تم ایک رومن لڑکی ہو۔ تم ایک ایشین سے کیسے شادی کر سکتی ہو۔ نو نو نو...."

وہ لڑکی جب امجد کے لئے باہر ڈرائنگ روم میں آئی تو ڈرائنگ روم خالی تھا۔

امجد کے اطراف بھی سمندر تھا اور آنکھوں میں بھی سمندر۔

اس نے سوچا اب وہ عورت کو بھول جائے گا۔ کوئی شخص جب کسی چیز کو بالخصوص اپنی محبت کو ہرگز نہیں بھول سکتا تو وہ ایسا ہی ظاہر کرتا ہے کہ وہ اسے بھول جائے گا۔

چنانچہ عورت کو بھولنے کی یاد کو ہر لمحہ تازہ رکھتے ہوئے کہاں کہاں گھومتا پھرا۔ ایک شام امجد فرانس کو پہنچا۔ اسے بڑی زوروں کی بھوک لگی تھی۔ بندرگاہ سے سیدھے وہ شہر میں چلا گیا اور مارکیٹ روڈ پر ایک اچھے سے ریستوران میں داخل ہو گیا۔ وہ اپنی میز پر بیٹھا رہا، بیٹھا رہا، کوئی ویٹر اس کے پاس نہ آیا حالانکہ اس کے ارد گرد کی میزوں پر اس کے بعد آنے والے گاہکوں نے کھانا بھی شروع کر دیا تھا۔ امجد کو بڑا غصہ آیا۔ وہ اٹھا اور سیدھے کاؤنٹر پر پہنچا لیکن ریستوران کی لیڈی انچارج نے برا منہ بنا کر کہا۔

"سوری جنٹلمین ــــ وی ڈونٹ سرو ٹو کلرڈ پیپل۔"

اگر وہ عورت نہ ہوتی تو شاید امجد کھانے کے بجائے اسے ہی کچا چبا جاتا۔

سوتیلی ماں بیٹا.... آقا نوکر.... امیر غریب..... ہندو مسلمان.... شیعہ سنی.... ہندوستانی پاکستانی.... پی ای سی ایچ ایس لالوکھیت.... یورپی ایشیائی.... گورا کالا.... اور بھی پیغمبروں سے لے کر فلسفیوں تک اور فلسفیوں سے لے کر بانی قائد محمد تک سب ہی یہی کہتے چلے گئے ہیں کہ ــــ سب انسان برابر برابر ہیں۔ نہ کوئی آقا نہ کوئی غلام نہ کوئی امیر نہ کوئی غریب۔ نہ کوئی کالا....

امجد اپنے کمرے میں اکیلے بیٹھے بیٹھے ہنس پڑا لیکن اس کی ہنسی ادھوری رہ گئی کیونکہ اس کے سامنے فریدہ سر جھکائے کھڑی تھی۔ وہ کچھ اداس اور روہانسی نظر آ رہی تھی۔

فریدہ اس کے دفتر کی استقبالیہ کلرک تھی اور عام استقبالیہ کلرک لڑکیوں کی طرح خاصی قبول صورت اور خوش لباس تھی۔ امجد دل ہی دل میں اسے چاہتا تھا لیکن فریدہ کے آگے حال دل بیان کرنے کی ہمت اس میں اس لئے نہیں تھی کہ ایک بار اسی دفتر کے ایک ادھیڑ عمر کے ہیڈ کلرک نے فریدہ سے اظہار عشق کیا تھا تو فریدہ نے امجد کے پاس اس کی تحریری شکایت بھیجی کی تھی کہ ــــ

"میں شیخ حفیظ کو اپنے باپ کے برابر سمجھتی ہوں اور انہیں بھی مجھے اپنی بیٹی کی طرح...."

اس کے آگے امجد اس سے کچھ نہیں پڑھ سکا تھا کہ امجد بھی تو شیخ حفیظ کی عمر کا ہو رہا تھا۔

امجد نے فریدہ کو یوں اداس اور رومانسی دیکھ کر پوچھا۔
"کیوں کیا پھر شیخ حفیظ نے تم سے کوئی بدتمیزی کی ہے؟"
فریدہ نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔
"نہیں میرے والدین میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔"
امجد نے دھڑکتے ہوئے دل اور ہنستے ہوئے ہونٹوں سے کہا۔
"یہ ۔۔۔ یہ ۔۔۔ یہ تو بڑی ۔۔۔ بڑی ہی خوشی کی بات ہے۔"
فریدہ نے کچھ کہنا چاہا۔
"لیکن ۔ ۔ ۔"
لیکن کہہ گئے وہ کچھ کہہ نہ سکی۔ اس نے ایک چٹھی امجد کی میز پر رکھ دی اور تیزی سے مڑ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔
فریدہ کے چلے جانے کے بعد امجد نے وہ چٹھی کھول لی تھی۔
"میرے ماں باپ جس نوجوان سے میری شادی کرنا چاہتے ہیں میں اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ میں اب آپ کو یہ بتا دینا چاہتی ہوں کہ گزشتہ کئی دنوں سے آپ کے لئے میرے دل میں ایک آگ سی بھڑک رہی ہے مجھے ڈر ہے کہ یہ آگ ۔ ۔ ۔ ۔"
امجد نے یوں محسوس کیا جیسے اس آگ کی حدت نے اس کی ساری بصارت سلب کر لی ہے۔ وہ آگے کچھ بھی نہ پڑھ سکا، اور اب آگے پڑھنا بھی کیسا تھا۔
امجد کا دل معاً خوشیوں سے لبالب بھر گیا وہ گھبرانے لگا کہ کہیں خوشیوں سے اس کا دل پھٹ نہ جائے۔
محبت کے معاملے میں بدقسمت کسی قریب المرگ مرد کو کسی عورت کی آنکھوں میں پیار کی ہلکی سی آنچ بھی محسوس ہو تو پھر دوبارہ زندہ ہو اٹھتا ہے پھر دنیا میں لوٹ آتا ہے۔
امجد نے یوں محسوس کیا جیسے آج سے اس کی زندگی کا آغاز ہوا ہے اور آج ہی تو دنیا کا پہلا دن ہے۔
مرد اور عورت کی زندگی اسی دن سے شروع ہوتی ہے جس دن ان کے دل کے محرابوں میں محبت کا پہلا چراغ جل اٹھتا ہے اس سے پہلے تو زندگی صرف تمہید ہوتی ہے صرف سانسوں کی آمدورفت صرف دن اور رات کا طلوع و غروب۔
اصل زندگی کا آفتاب تو محبت کے چراغ کا اجالا بنتا ہے۔
جو پیار فریدہ کے جسم میں چھپا ہوا تھا اور جو پیار آپ ہی آپ اس کے جسم سے چھلک پڑا تھا اس کے لئے تو امجد پانچوں بر اعظم اور ساتوں سمندر پھلانگ آیا تھا۔

اور اسی پیار کا پھول اس کے اپنے آنگن میں مہک رہا تھا امجد کی خوشی جیسے کائنات کی سرحدوں سے بھی آگے پھیل گئی تھی اور امجد اس وقت تصور کے بازاروں میں فریدہ کے لئے ہیرے موتی سونے چاندی کے جگمگ زیورات زرق برق کپڑے اور جیسے دنیا کی ہر چیز خرید رہا تھا۔
شادی کی تاریخ کے لئے فریدہ نے بھی ہاں کر دی تھی۔
لیکن پھر وہی ہوا جو ہمیشہ ہوتا آیا ہے۔
لڑکی "ہاں" کہتی ہے اور ماں باپ "نہیں" [illegible] تھی۔
"واہ ۔۔۔ وہ مہاجر ۔۔۔ ہم مقامی ۔۔۔ یہ بیاہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا ۔۔۔؟"
فریدہ کا باپ امجد کے سامنے اپنی مجبوری ظاہر کر رہا تھا۔
"انسان، مسلمان، پاکستانی یہ سب ٹھیک ہے لیکن یہ بھی تو ایک مجبوری ہے نا۔ ذرا آپ ہی سوچئے نا، آپ مہاجر۔ ہم مقامی ۔ ۔ ۔"
اور پھر فریدہ کی شادی ہو گئی۔
لیکن فریدہ کا دولہا امجد نہیں تھا۔
امجد اپنے ہمراز دوست انور کے ساتھ مزار قائد اعظم کے قریب کھڑا تھا اور سامنے سے بینڈ باجوں، تاشوں، نفیریوں کے درمیان سرخ سرخ گلابوں سے بھی ڈھکی ایک لمبی چمکیلی اجلی اجلی فریدہ سرخ گھونگھٹ میں سر جھکائے اپنے دولہا کے پہلو میں بیٹھی تھی امجد کا دل بھر آیا تو انور نے بغیر سوچے سمجھے یوں اوٹ پٹانگ ڈھارس دی۔
"یار امجد ۔۔۔ ہمت سے کام لو یہاں اگر نہیں تو وہاں تمہیں حور تو ضرور ہی ملے گی۔"

امجد بڑے مایوس شکست خوردہ لہجے میں کھسیانی مسکراہٹ کے ساتھ بولا "کیا پتہ میرے دوست وہ حور بھی یہ کہہ دے کہ ہم جنتی تم دوزخ۔"
امجد پھر اس بازار میں لوٹ گیا جہاں کوئی مرد نہ کوئی عورت ہوتا ہے نہ بدقسمت نہ کالا نہ گورا، نہ مسلمان نہ پاکستانی، نہ ایشیائی نہ یورپی نہ غریب نہ امیر، نہ آقا نہ نوکر، نہ شوہر نہ محبوب ۔ ۔ ۔ "نہایت بے باکی سے مسکراتے ہوئے جب اس عورت نے امجد سے پوچھا۔
"سیب کھاؤ گے؟"
تو امجد نے یوں محسوس کیا جیسے وہ ابھی ابھی زمین پر نازل ہوا ہے اور دنیا از سر نو آباد ہو رہی ہے۔

دوشیزہ کی محفل

رعنا فاروق

○ ہری پور ہزارہ کی رخسانہ نالے ہیں ایک اچھا سا خط بھیجا ہے لکھتی ہیں "میری تعلیم بہت کم ہے صرف آٹھویں تک پڑھ سکی ہوں اس لئے میں اچھا خط نہیں لکھ سکتی اس سے پہلے کسی کو آج تک خط نہیں لکھا کچھ نہیں جانتی کہ خط میں کیا لکھوں کہ آپ میرے جذبات سمجھ جائیں۔ اگر آپ میری بہن ہوتیں تو اپنے سارے دکھ آپ کو سنا کر دل کا بوجھ ہلکا کر لیتی۔"

رخسانہ کیا بہن ہونے کے لئے کسی سرٹیفکیٹ کی ضرورت ہے؟ اور پھر یہ کس نے کہا تمہیں کیوں لگا کہ اچھا خط نہیں لکھ سکتیں۔ تمہارے جذبات میں نے پوری طرح محسوس کر لئے اور تمہارا دکھ بھی سمجھ گئی جس حد تک ہو سکا میں اس میں SHARE کروں گی۔

○ افسانہ "جرگا" اور "قوانین" کی مصنفہ فاروق رشید بی بی ہم سے خاصے برہم ہیں انہوں نے چڑ کے خط لکھا ہے "بھلا آپ کو کس نے کہہ دیا کہ میں ابھی کمسن ہوں آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اس جنوری کی تین تاریخ کو پورے سترہ سال کا ہو گیا ہوں۔ کیا اب بھی آپ مجھے کمسن کہیں گی؟ میرے افسانوں "جرگا" اور "قانون" کو پڑھ کر سارے لوگ کہتے ہیں کتنے بے شرم ہو۔ سچ بتائیے باجی کیا سچ کو سچ کہنا بے شرمی ہوتی ہے؟"

فاروق تو یہ ہماری توبہ، جو آپ کو کمسن کہیں۔ ہاں نابالغ ضرور کہیں گے کیونکہ عمر کے حساب سے قانونی طور پر تم ابھی نابالغ ہی ہو۔ پھر یہ اور بات ہے کہ ذہنی طور پر تم بہت بڑے ہو گئے ہو۔ تم سچ کو سچ کہتے رہو تمہاری باجی بھی سچ کو سچ کہنے کی لعنت سے [illegible] ہے۔ زمانے کو چیخنے چلانے دو میں تمہارے ساتھ ہوں۔

○ جڑانوالہ سے محمد شفیع فاروق نے ہم سے ایک فرمائش کی ہے "باجی خدا کو حاضر و ناظر کر کے سچے دل سے آپ کو اپنی بہن بنانا چاہتا ہوں مجھے پتہ ہے کہ میں نام چھپنے کا کوئی شوق نہیں صرف آپ سے اپنی فرمائش کا جواب چاہتا ہوں۔"

فاروق میں قسموں سے زیادہ انسانی زبان پر زیادہ اعتبار کرتی ہوں مگر آپ کے خلوص کو میں نے دل سے محسوس کیا اور یقین دلاتی ہوں کہ میں آپ کو بالکل اپنے بھائی جیسا خلوص و پیار دیتی رہوں گی۔ بس خوش۔!

○ سید معظم شاہ بھائی نے کراچی سے لکھا ہے "رحمانی ڈاک کو پہلا خط لکھا ابھی تک جواب نہیں ملا۔ آپ کو آزما رہا ہوں دیکھئے کیا جواب ملتا ہے یا نہیں۔ یہ سالانہ چندہ کتنا دینا پڑے گا۔ ممبر بننا چاہتا ہوں۔"

معظم آپ سالانہ چندہ اپنے پتے کے ساتھ دفتر بھیج دیجئے پرچہ ہر ماہ باقاعدگی سے ملتا رہے گا۔

○ نعیم فریدی، رحیم یار خان سے طویل غیر حاضری کے بعد تشریف لائے ہیں ایک غزل ہمراہ لائے ہیں غالباً انہیں معلوم نہیں کہ ان کی غیر حاضری کے دوران پرچے میں غزلیات کی اشاعت بند ہو گئی ہے۔ مگر ہم نے ان کی غزل محفوظ کر لی ہے جب یہ سلسلہ دوبارہ شروع ہو گا۔ انشاء اللہ چھپ جائے گی۔

○ ثمینہ طاہر نے ناظم آباد کراچی سے پرچے پر تبصرہ لکھا ہے "شمارہ پہلے کے سارے افسانے بے حد دلچسپ لگے۔ نیلوفر عباسی صاحبہ کا انٹرویو بہت پسند آیا۔ آپ کی تحریر کردہ تینوں کہانیاں ہمیشہ کی طرح موڑ تھیں۔ مختصر یہ کہ بہار نمبر کیا تھا بہت سارے رنگوں اور خوشبوؤں کو سمیٹے ہوئے تھا۔ میں نے ایک افسانہ بھیجا تھا اس کا کیا بنا؟ کیا افسانہ بھیجنے کے لئے ممبر بننا ضروری ہے؟"

ثمینہ تبصرے کا شکریہ تم ابھی لکھنے کی کوشش جاری رکھو۔ تمہارا افسانہ کچھ "کچا" سا لگا۔ افسانہ بھیجنے کے لئے ممبر شپ کی کوئی شرط نہیں۔

○ شہناز فقیر نے نوشہرہ کینٹ سے تحریر فرمایا ہے "واہ دوشیزہ جی واہ! کیا بتاؤں کہ جولائی کے شمارے نے کیا رنگ جمایا۔ سرورق کیا کہنے کہانیاں اور افسانے سب بہت پسند آئے خاص طور پر ایک خواب طوفان کے بعد اور سپنے داغ بہت پسند آئے بھیجی نثار فاطمہ اپنا کوئی افسانہ لکھیں ابھی تک آپ کے افسانے نہیں پڑھے آپ شکل سے ابھی مغرور لگتی ہیں مگر محفل میں آتی خلوص ہ پتہ نہیں آپ حقیقتاً کیسی ہیں؟ جواب ذرا بڑا سا دینا دو سطروں کا نہیں"

شہناز! کیا کہانیاں افسانوں سے زیادہ دلچسپ نہیں ہوتیں! اب تمہاری خواہش ہے کہ افسانہ لکھوں تو چلو یہ بھی پوری کر دیں گے ویسے میرے افسانے مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں ایک طویل عرصے سے کہانیوں میں الجھ گئی۔ اب اس طرف بھی توجہ دینی پڑے گی۔ اور وہ شکل تصویر سے مغرور لگنے والی بات تو شہناز وہ تو ذرا کیمرے کی ایک آنکھ کو دیکھ کر چہرے پر سنجیدگی آگئی تھی مگر محفل میں قارئین میرے اپنے دوست ہوتے ہیں ان سے ہنسنا بولنا چھیڑنا میری عادت ہے۔ اور یہی میری حقیقی شخصیت بھی۔ جواب بڑا سا دیا ہے نا؟!

○ محمد شفیق عاصم جی نے اسلام آباد سے خط لکھا ہے۔ فرماتے ہیں "آپ میرا ایک عدد خط اور دو غزلیں ہضم کر چکی ہیں یہ کیا کوئی ناراضگی ہے؟ بھلا بہنیں بھی کبھی بھائیوں سے ناراض ہوتی ہیں۔ بولئے۔ عظمت باجی کو جلتے پھول کی مبارکباد پہنچا دیں یہ باقی تحریریں بھی قابل ستائش ہیں۔ دیکھئے جواب ضرور دیجئے گا ورنہ۔۔۔ ورنہ رسالہ ہم پھر بھی باقاعدگی سے پڑھتے رہیں گے"

عاصم جی! منظومات کا سلسلہ کچھ عرصے کے لئے روک دیا گیا ہے اس لئے آپ کی غزلیں خلاصیت فائل میں بند ہو گئیں۔ ورنہ بھلا کی بھلا لڑائی ہو سکتی ہے۔ کبھی نہیں۔ اگر آپ نے لڑائی کی بھی تو۔۔۔ تو ہم پھر بھی عاصم بھائی کے خطوں کا جواب دیتے رہیں گے۔

○ گل رز رشید نے لاہور سے پہلی دفعہ محفل میں شرکت کی ہے لکھتے ہیں "میں نے ایک چھوٹا سا ناول لکھا ہے مگر آپ اجازت دیں تو بھیج دوں۔ میری عمر سولہ سال ہے اور میٹرک کا طالبعلم ہوں"

گل رز رشید تم اپنا ناول بھیج دو۔۔۔ اگر طارق رشید بابی کی طرح تم بھی بالغ ذہن ہو تو خیر کوئی بات نہیں ورنہ میں تمہیں یہ نصیحت کروں گی کہ پڑھائی کی طرف توجہ دو۔۔۔ بہرحال تمہارا ناول دیکھ کر قطعی جواب دیا جا سکتا ہے۔

○ ناہید افغان نے ڈیرہ غازی خان سے خط لکھا ہے "پیاری بہن اگر میں آپ کو سچی کہانی بھیجوں تو کیا آپ شائع کر دیں گی آئیڈیل کی تلاش میں خط لکھا تھا ابھی تک نہیں چھپا۔ آپ کچھ مدد کر دیں"

ناہید تمہارے پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ کہانی ضرور بھیجو۔ شعبۂ آئیڈیل کے کالم میں تمہارا خط شامل ہے عنقریب چھپ جائے گا۔

○ نرگس خان نے درگئی ملاکنڈ سے خط لکھا ہے۔ "پیاری سجیا آپ کی پرخلوص باتوں کو پڑھ کر ذہن کو بڑی تازگی ملتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ میں ہمت کر کے بہت دور سے اس محفل میں شرکت کے لئے آگئی ہوں۔۔۔ جلتے پھول ناول مجھے بہت پسند ہے۔ سالانہ ممبر بننا چاہتی ہوں۔ یہاں جا کر بڑی مشکل سے پرچہ ملتا ہے۔"

نرگس خان تمہاری آمد پر ہماری انشکرو نظر کو تازگی ملی کہ ہمیں پھولوں سے بے حد پیار ہے۔ اور نرگس تو میرا پسندیدہ پھول بھی ہے۔۔۔ سالانہ ممبر شپ کے لئے آپ ساٹھ روپے منی آرڈر بھیج دیجئے۔ پرچہ آپ کو باقاعدگی کے ساتھ ہر ماہ ملتا رہے گا۔

○ اے۔ ایچ ظہیر کھوکھر نے جڑانوالہ سے طویل خط بھیجا ہے لکھتے ہیں "اگست ۱۹۷۶ء سے خط لکھنے کا ارادہ کر رہا لیکن احساس کمتری میں مبتلا تھا کہ جانے آپ گاؤں میں رہنے والوں کو جواب دیتی ہیں یا نہیں۔ آپ اونچی سوسائٹی کے لوگوں میں رہنے والے لوگ ہیں ہمارے مسائل پر آپ کی کیا نظر ہوگی"

ظہیر کھوکھر بھائی ہم نہ اونچی سوسائٹی میں رہنے والے لوگ ہیں اور نہ گاؤں اور شہر کے لوگوں میں تفریق کرنا جانتے ہیں ہمارا سب سے محبت پیار مذہب ہے۔ اسی رشتے سے سبھی بہن بھائیوں کو اپنا شمار بنا رکھا ہے۔ ہم ہر طبقے کے مسائل سمجھتے ہیں مگر یہ بھائی وسائل اتنے محدود ہیں کہ ہمدردی کے سوائے بتاؤ ہمارے پاس اور کیا ہے۔۔۔؟

○ نسیم چمن نے بورلیاں سے بڑی مدھم آواز سے کہا ہے "اگر آپ نے جواب دیا تو بڑا اچھا افسانہ بھیجوں گی ورنہ دوشیزہ سے کٹی"

نسیم چمن تمہاری کٹی کی سیاہی سے لکھی ہوئی دوسا

سرگوشی نے ہمیں بہت مزہ دیا ——— لو جواب حاضر ہے اب اپنا وعدہ پورا کرو۔

○ ناصر رضا نے حیدرآباد سے خط لکھا ہے "فروری کی خوبصورت مالا بہت پسند آئی۔ اداریہ "آہ کرشن چندر" ہم سب کے جذبات کا ترجمان ہے۔ کرشن جی نے اردو ادب کے ذریعے انسانیت کی جو خدمت کی ہے اس کا اعتراف پوری دنیا کر رہی ہے۔ سرحد پار ادبی حلقوں میں دوشیزہ کی یہ گونج ہے آپ ہمارے جذبات ان لوگوں تک پہنچا دیجئے کہ کرشن کی موت پر ہماری آنکھیں چھلک آئی ہیں۔ ایک تحریر پیش خدمت ہے منظور فرمائیں۔ نسیم نے جو ٹرانسپرنسی بنوائی تھی اس کا کیا بنا۔ ؟"

ناصر رضا! نسیم کی ٹرانسپرنسی صاف نہیں بنی۔ دوبارہ وہ یہاں تشریف لائیں تو انہیں دوبارہ زحمت دینی پڑے گی۔

○ "سینکڑوں کرنوں میں اسے کرنے کی کیا اہمیت ہوگی؟ یہ خود ہی دکھی انسان روبی ارشاد کے نام سے ہمیں ملا ہے۔ شہر کا نام کسی بہن نے ہمیں بھیجا نہیں۔ مزید لکھتی ہیں "مجھے تلا ادا اور نواز (جلتے پھول) اور شہناز اور زبیدہ (جالوٹ) کے پتے درکار ہیں ان سے دوستی کرنا چاہتی ہوں۔ میری خواہش ٹھکرا نہ دیں بن ماں کی بیٹی ہوں"

روبی تمہارا پرزہ کو تک کا "پرزہ" نکلا کتنی ساری جگہ گھیری اور تمہارے پتے والی فرمائش ہم پوری نہیں کر سکتے جس کا ہمیں افسوس ہے ویسے روبی ارشاد تمہیں ہماری ایک نصیحت ہے کہ مظلومیت کا چولا اتار پھینکو یہ بہت بڑا مرض ہے۔ دنیا میں ہم سے کہیں زیادہ لوگ مظلوم اور دکھی ہیں۔ دکھ کو ہنس کر سہنا سیکھو شاباش ——— آئندہ خود کو دکھی مت سمجھنا۔

○ عبدالغفار سولنگی نے حیدرآباد سے پہلی مرتبہ خط بھیجا ہے "دوشیزہ کا پرانا قاری ہوں۔ "فرار" ہمارے گھر کے ہر فرد نے دلچسپی سے پڑھی "مجاورہ" بھی آفت جا رہی ہے "جلتے پھول" بھی اچھا جا رہا ہے۔ مجھے یہ بتائیے کہ خط آپ کو ہر ماہ کی کونسی تاریخ تک بھیج دینے چاہئیں۔ ؟"

غفار بھائی پرچے کی پسندیدگی کا شکریہ۔ گھر کے ہر فرد کو ہمارا سلام پہنچا دیجئے۔ خط نو تاریخ سے پہلے ہمیں پہنچ جانا چاہیئے

○ شکیلہ انجم اجوسے نے سندھ یونیورسٹی سے بڑے غصے میں خط لکھا ہے "سوچا تھا کبھی آپ کو خط نہیں لکھوں گا میرے پانچ خطوط آپ نے ہضم کئے ہیں دوست مذاق اڑاتے ہیں کہ تو دوشیزہ کا متوالا ہے اور دوشیزہ تجھے منہ بھی نہیں لگاتی"

انجم! آپ تو واقعی خاصے برہم ہیں مگر بھتیا یہ ہم پر الزام ہے قسم کھانے کے ہم قائل نہیں صرف یقین دلا سکتے ہیں کہ ہم نے آپ کے پانچ خطوط پکے تک نہیں ہضم کرنا تو دور کی بات ہے اپنے ہر قاری کو ہم جواب ضرور دیتے ہیں یہ بات نوٹ کر لیجئے اب یہ حضرت ڈاک کانے والوں پر آتا ہے اور اپنے دوستوں کا منہ بند کیجئے کہ دوشیزہ تم سے اپنے نا کردہ جرم کی معافی مانگ رہی ہے۔

○ آصف ندیم نے حویلی لکھا سے یاد کیا ہے لکھتے ہیں "خالص ادب پر مبنی یہ رسالہ دن بہ دن سنجیدہ طبقے میں اپنا مقام بناتا جا رہا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ ستھری کہانیوں کا یہ رسالہ خوب ترقی کرے۔"

شکریہ آصف ندیم!

○ شاہدہ نے کراچی سے شکایت بھیجی ہے کہ پرچے کا نام تو دوشیزہ ہے مگر آپ نے دوشیزاؤں کے لئے اس میں ایک چیز بھی نہیں رکھی، میرا مطلب ہے کھانا پکانا اور بیوٹی سیلون وغیرہ۔ اور دیکھئے ہمیں نیا قاری مت سمجھئے دوشیزہ سے ہمارا بہت پرانا رشتہ ہے جب یہ ماہ وش سے پہلی بار دوشیزہ میں تبدیل ہوا تھا"

شاہدہ ہماری دوشیزہ ابھی تک ماہ وش ٹائپ ہے بار سنگھار سے اسے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔ اور دوشیزہ صرف دوشیزاؤں کے لئے نہیں مرد حضرات کے لئے بھی تو ہے۔

○ ستی سے شاہدہ قریشی نے خط لکھا ہے فرماتی ہیں "دوشیزہ کی مثل اتنی مکمل ہے کہ تشنگی باقی نہیں رہتی ہے تبدیلی کی تلاش اور تین عورتیں تین کہانیاں رسالے کی جان ہیں کچھ صفحات کھانے پکانے اور سلائی کڑھائی اور بیوٹی بکس کے بھی ہونے چاہئیں میں نے ایک ناول لکھا ہے کہیں تو مسودہ بھجوا دوں؟"

شاہدہ! کیا ساری شاہداؤں کو کھانے پکانے اور سلائی کڑھائی سے دلچسپی ہوتی ہے؟ پہلی شاہدہ نے بھی یہی فرمائش کی اور دوسری آپ نے بھی وہی بات دہرا دی (مشترکہ اسکیم تو نہیں۔ ؟) بہرحال تمہاری تجویز پر اب غور کرنا پڑے گا۔ اور اپنا ناول فوراً بھیج دیں۔ کالم پسند کرنے کا شکریہ۔

○ اپریل کے شمارے میں "تین عورتیں تین کہانیاں"

میں ایک کہانی "دو بہنوں کی شادی ہو جانے پھر" ـــــ شائع ہوئی تھی یہ کہانی نرملا یا ندرینہ لورنشو ـــ کے نام سے چھپی ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں کینیڈا سے انیس اور انیسہ نامی دو خواتین کے خطوط ملے ہیں ان کی خدمت میں عرض ہے کہ اس کہانی سے آپ کا کوئی تعلق نہیں ہے ہم کہانیوں میں نام اور مقامات فرضی لکھتے ہیں تاکہ کہانی چھپنے سے کسی کی زندگی پر کوئی اثر نہ پڑے۔ آپ کے نام اور مقام کی مطابقت محض اتفاق ہے۔ کہانی سے متعلقہ خاتون لندن میں مقیم ہیں اور فیکٹری میں ملازمت کرتی ہیں۔

○ اختر حسین اختر نے دوحہ (قطر) سے بڑی عقیدت سے خط لکھا ہے۔ فرماتے ہیں "میرے ایک دوست نصیر ملول نے "دوشیزہ" کو دو خط لکھے مگر آپ نے کسی کا جواب نہ دیا۔ وہ بہت سی الفت دوشیزہ کے لئے لایا تھا آپ نے محفل میں جگہ نہ دی کہ اس کا دل ٹوٹ گیا۔ اب وہ اپنا غصہ مجھ پر اتار رہا ہے۔"

اختر! آپ خدا اپنے دوست کو سمجھائیے کہ ان کے خطوط ہمیں نہیں ملے ورنہ محبت کا جواب دوشیزہ محبت سے دینا اپنا ایمان سمجھتی ہے۔ ہماری طرف سے آپ اس کا دل جوڑ دیں گے۔

○ لاہور سے شاہد قمر نے خط لکھا تھا کہ "میں خود محفل میں شرکت کا سوچ رہا تھا مگر آپ کے رویئے سے ڈرتا تھا کہ جانے کیا ہو ـــ افسانہ بھیج رہا ہوں نتائج سے آگاہ فرمائیں۔"

شاہد! کیا محفل میں میرا رویہ سخت ہوتا ہے؟ ـــ سچ ہے مجھے تو یہ احساس کبھی نہیں ہوا ـــــ تمہارا افسانہ پڑھنے کے بعد رائے دوں گی۔

○ عبدالجبار مغل کراچی سے تحریر فرماتے ہیں "باجی ہو تو آپ جیسی جب یاد کیا کرتا ہوں محبت سے جواب دے دیتی ہیں دوشیزہ کا دل بہلانے کے لئے یہ لطیفہ بھیج رہا ہوں" جالودی ابھی جاری ہے "جلتے پھول" کچھ کچھ بور کر گئی ہے۔ بجشد نظر اور الجھنوں سے مت گھبرائیے، دلچسپ کالم ہے۔

شکریہ جبار صاحب!

○ ایم۔ اے قندھاری خضدار نے (بلوچستان) سے خط لکھا ہے "میرے ایک کزن نے بحرین سے خط لکھا ہے بیرون پاکستان مقیم حضرات کی دوشیزہ ادبی معموں میں شرکت کرنے کی کیا شرائط ہیں فیس کی رقم بھیجنے کا طریقہ کار بھی بتا دیجئے۔"

قندھاری بھائی! آپ اپنے کزن کو لکھ بھیجئے کہ بینک ڈرافٹ بھیج کر دفتر دوشیزہ سے کیش واچرز منگوالیں۔ اور پھر اپنے حل ارسال کرتے رہیں۔

○ محمد نعیم باجوہ نے مسقط سلطنت آف عمان سے لکھا ہے "اگر میرے خطوط قابل اشاعت نہ ہوا کریں تو اس میں کچھ ترمیم کر کے شائع کر دیا کریں میں اس کا شکر گزار ہوں کہ دوشیزہ ادبی معموں کی فیس کیسے ارسال کروں؟"

نعیم باجوہ! آپ دفتر کے پتے پر بنک ڈرافٹ بھیج دیں یہاں سے آپ کو کیش واچرز بھجوا دیئے جائیں گے اور اس طرح آپ اپنے حل وہاں سے بھیج سکیں گے۔

○ نائیجیریا سے مسٹر اشرف انجم نے یاد کیا ہے "مجھے تینوں تحریریں تینوں کہانیاں بہت پسند آتی ہیں، خوش نصیب ہیں وہ۔"

○ دوبئی سے سعید صاحب نے اپنے نیک جذبات بھیجے ہیں۔ سعید صاحب غزلوں کا سلسلہ ہم نے بند کر رکھا ہے۔ افسانے آپ بلاشبہ ارسال کریں۔

○ عبدالرحمٰن ہند ابوظہبی سے سخت برہم ہیں کہ آئیڈیل کی تلاش سے کسی کو فائدہ پہنچا ہے ـــــ یہ سلسلہ فوراً بند کیا جائے۔ رحمٰن صاحب کیا آپ نے اس میں قسمت آزمائی کی ہے؟ آپ کو کیا پتہ اس سے کتنوں کا بھلا ہوتا ہے!

○ مسعود احمد نے کراچی سے تحریر کیا ہے "جلتے پھول" نے آفت مچادی اور اب "جالودی" نے قیامت ـــــ بہار نمبر کے تقریباً تمام ہی افسانے اچھے تھے۔

○ منصور صدیقی کسی نامعلوم مقام سے محفل میں شریک ہوئے ہیں "جلتے پھول" میں تارا کو ظالم کیوں ظاہر کیا جا رہا ہے۔ منور نوری نے "آفت" چیز پیش کی ہے۔ تعلیمی نقطہ نظر سے دوشیزہ کی آدھی اہمیت اس تاریخی کہانی کو حاصل ہے۔"

صدیقی صاحب آپ کی ہمت افزائی کا شکریہ۔

○ محمد حنیف دوبئی سے لکھتے ہیں کہ دوشیزہ حاصل کرنا بہت مشکل ہے کافی رقم خرچ کرنی پڑتی ہے ـــــ کیا کروں ـــــ!

بھیا حنیف آپ ایک سو بیس روپے کا بنک ڈرافٹ "دوشیزہ" کے نام بھیج دیں آپ کو پرچہ پابندی سے ملتا رہے گا۔



شمیم چوادری

بھابی

ایک مقدس رشتہ جو حالات کے سناٹے میں
اُبھرنے والی سرگوشیوں سے
ایک پُراسرار افسانہ بنا دیا :

"**ایک** بات کہوں، کسی سے کہئے گا تو نہیں؟"

میری بیوی جو دیر سے بے چین سی دکھائی دے رہی تھی، آخر اس سے رہا نہ گیا۔

"کہو ——!" میں نے اپنے اشتیاق کو چھپا کر بے توجہی سے بولا "مگر کسی سے کہنے اور نہ کہنے کی شرط کے بغیر"

"تو میں نہیں کہوں گی"

"تو پھر چھوڑو، آنکھیں بند کر لو، نیند آ جائے گی!" میں نے کہا اور کروٹ بدل لی۔

"مگر یہ اچھا نہیں ہوا!" تھوڑی دیر رک کر وہ آپ سے آپ بڑبڑائی۔

"کیا اچھا نہیں ہوا؟" میں نے یوں پوچھا جیسے ہنکاری بھر رہا ہوں۔

"انھوں نے تو وہ کیا ہے کہ اگر بات دہلیز سے باہر ہوئی تو خاندان بھر کی ناک کٹ جائے گی"

ناک کٹنے کی بات جب آئی تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ ضرور کوئی بڑی ہی اہم بات ہو گئی ہے۔ سننے کا اشتیاق جاگ اٹھا۔ مگر بیگم پر ظاہر نہ ہو جائے اس لیے میں نے ایک ہلکا سا تیکھا دیا۔

"تم بھی کیسی بات کرتی ہو۔ ہماری ناک موم کی ناک نہیں ہے کہ ذرا سی حرارت پائی اور پگھل گئی"

"آپ ناک کی بات کرتے ہیں، یہاں تو سینے پر ایسا گھونسا لگا ہے کہ سانس لینی مشکل ہے۔ ہم لوگ کیا جانتے تھے کہ بھابی اتنی نیچ اور ....." میں نے جلدی سے بات کاٹ کر پوچھا:

"آخر بات کیا ہوئی؟"

"مجھلی چاچی بھابی کے کمرے کے پاس سے گزر رہی تھیں تو انھوں نے بھابی کو تارا کے دولہا کے ساتھ کچھ اس طرح بے تحاشا ہنستے دیکھا کہ اپنے دماغ پر زلزلے کا جھٹکا محسوس کیا۔ چاہا کہ بڑی ممانی (بھابی کی ساس) سے کہہ دیں مگر شاید بات کی نزاکت کی بنا پر کچھ سوچ کر چپ ہو رہیں۔ مگر جو جھٹکا انہیں لگا تھا اس کا مقصد تجسس بیدار بیدار سا رہا۔ اور پھر کل رات کوئی بارہ بجے جب سب کے سب گہری نیند میں ڈوبے ہوئے تھے مجھلی چاچی کسی کام سے باہر آئیں۔ آنگن میں پہنچنے کے لیے انہیں بھابی کے کمرے کے پاس سے گزرنا پڑا۔ دروازہ اندر سے بند تھا اور کسی مرد کی آواز بہت دھیمی دھیمی باہر آ رہی تھی۔ انھوں نے سنا اور بڑی ممانی کو چپکے سے جگا لائیں۔ دونوں نے ایک ساتھ وہ آواز سنی جو والہانہ محبت کے اظہار میں تھی اور اس چاند کو بغیر دیکھے پہلے دونوں اپنے اپنے بستر پر آ لیٹیں۔"

"یہی غلط تھا؟"

"غلط کیسے ہوا؟ آپ جانتے ہیں کہ گھر میں تارا کے دولہا اور آپ کے سوا مردوں کی اور کوئی ذات ہی نہیں اور دونوں داماد ٹھہرے۔۔۔"

میں نے شاطرانہ چالیں چل کر بیگم کی بے کلی اور بے قراری کا راز اگلوا لیا مگر میرے ساتھ کچھ ایسا ہی ہوا کہ جیسے کوئی عورت اُبلتے ہوئے دودھ کی پتیلی پر پانی کے چھینٹے مارنے لگے۔ دودھ کو تو وہ ابلنے سے بچا لے مگر کچھ بجا اس ایسی ہو گئی ہو کہ اس کا آنچل آگ کی لپیٹ میں آجائے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ تو کیا بیگم کو مجھ پر۔۔۔؟

"آپ کیا سوچنے لگے؟"

"ایں ۔۔۔!" میں نے چونک کر بیگم کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر کچھ پڑھنے کی کوشش کی۔ "میں سوچ رہا ہوں حسینہ! آخر کمرے میں کون تھا۔ یہ نہ دیکھ کر تمہاری ممانی نے کچھ اچھا نہیں کیا۔ پتا گھر میں دونوں کے متعلق چہ می گوئیاں ہو رہی ہوں گی۔"

"نہیں صرف تارا کے دولہا کے متعلق۔ آپ پر لوگوں کو کافی اعتماد ہے۔"

"وہ کیسے؟" دفعتاً میں نے اپنے آپ کو ہلکا محسوس کیا۔

"بڑی ممانی نے مجھ سے پوچھ تاچھ کی تھی۔ آپ کے متعلق میں نے صاف کہہ دیا۔ ایک لمحہ کے لیے بھی رات وہ کمرے سے باہر نہیں گئے۔ یہ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔"

"مگر یہ جھوٹ بھی تو ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے تم بے خبر سوئی ہو اور میرے قدم اکھڑ گئے ہوں۔"

"نہیں میں اسے نہیں مانتی۔ آنکھ بند کر کے اپنے شوہر پر اتنا بھروسہ اور دوسرے کے متعلق شک میں مبتلا ہو جانا یہ کیسا انصاف ہے۔ تمہاری بھابی تارا کے دولہا کے ساتھ جتنی بے تکلف اور نزدیک ہیں اس سے کہیں زیادہ وہ مجھ سے رہتی ہیں۔ حتیٰ کہ کئی بار لوگوں کی پروا کیے بغیر کھانا تک میرے ساتھ کھایا ہے۔"

"آپ خواہ مخواہ مجھے مشتبہ کر رہے ہیں۔" حسینہ جھنجھلا کر بولی "میں کہہ رہی ہوں۔ لوگوں کو آپ پر شک ہو تو ہو مگر مجھے نہیں۔ آپ تو جانتے ہیں اشفاق میاں (تارا کے دولہا) جب بھی پنڈی سے آتے ہیں، اپنا زیادہ وقت بھابی کے کمرے میں گزارتے ہیں جس کی بنا پر کئی بار تارا اشفاق میاں سے الجھ بھی چکی ہے۔ تارا کی خاموشی اور کھوئی کھوئی سی کیفیت سے صاف ظاہر ہے کہ رات بھر بھابی کے کمرے میں۔۔۔"

"وہ تو میں جانتا ہوں لیکن اس سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ وہ شخص لازمی طور پر تارا کا دولہا ہو۔"

"اب میں کیا بولوں۔" حسینہ لاجواب ہو گئی ۔۔۔ "میں تو آپ کو فرشتہ سمجھتی ہوں۔"

میں نے غور سے حسینہ کو دیکھا۔ وہ مجھے یوں دیکھے جا رہی تھی جیسے میرے چہرے پر یا اپنے دل کے نہاں خانے میں کچھ ڈھونڈ رہی ہو۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟"

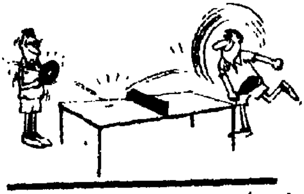
"آں۔۔۔" وہ چونکی۔ "دیکھ نہیں رہی ہوں ۔۔۔ سوچ رہی ہوں!"

"کیا ۔۔۔؟"

"یہی کہ دنیا کس تیزی سے بدلتی جا رہی ہے۔ خیر چھوڑیئے اس قصے کو، میں تو صرف یہ جانتی ہوں کہ عورت خود ٹھیک ہو تو کس کی مجال ہے کہ انگلی بھی پکڑ لے۔ انگوٹھی انگلی میں ہی اچھی لگتی ہے۔ عورت، عورت کے ساتھ ہی اچھی لگتی ہے۔ مگر بھابی کو عورتوں کی قربت سے تو جیسے پیدائشی بیر ہے۔ جب دیکھو مردوں میں بیٹھی گپ شپ، ہنسی مذاق ۔۔۔ قہقہے ۔۔۔ ایک بار دبے لفظوں میں تارا نے ٹوکا بھی۔ بولیں ۔۔۔ "مجھے عورتوں کی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔" تھوڑا بہت پڑھ لیا ہے، تھوڑا بولنا آگیا ہے۔ اور بہت زیادہ خوبصورت ہونے کے غرور نے انہیں پاگل بنا دیا ہے۔ ابا نے ٹھیک ہی کہا تھا۔"

"کیا کہا تھا ۔۔۔؟"

"وہ بھیا کا رشتہ جب ان سے ہوا تو ابا بالکل خلاف تھے۔ سنا ہے شادی سے پہلے بھابی محلے کے کسی لڑکے سے محبت فرماتی تھیں۔ اور دونوں میں شادی کا عہد و پیمان بھی تھا مگر مشکل یہ آن پڑی کہ لڑکا ان کے گھر والوں کو کسی طرح پسند نہیں تھا۔ چنانچہ جب لڑکے والوں نے رشتہ بھیجا تو دو ٹوک جواب ملا۔ ابا کو یہ قصہ کیسے معلوم تھا۔ اس لیے جب انہیں اس رشتہ کی بابت معلوم ہوا تو انہوں نے اس رشتہ کی سخت مخالفت کی مگر بھیا کی ضد کے آگے کسی کی نہ چلی۔ شاید ان کے کسی ہدایت



نے بھابی کے بے خیال حسن سے انہیں آگاہ کر دیا تھا۔"

"لیکن حسینہ! اس عشق سے اس قصہ کا کیا تعلق؟"

"ہے کیسے نہیں؟ آپ تو خواہ مخواہ بھابی کی طرف داری میں لگے ہیں، لوگ سنیں گے تو الٹی سیدھی سوچیں گے۔" حسینہ نے غصے سے کہا۔

"جس کے ضمیر پر کوئی بوجھ ہوگا وہی سچی اور صاف بات کہنے سے گھبرائے گا ...." یہ کہہ کر میں نے موضوع کو ختم کرنے کے لیے کہا ——— "مجھے نیند آ رہی ہے اب سویا جائے۔"

"ہاں مجھے بھی ——— !"

میں نے کروٹ بدلنا چاہی تو حسینہ پھر بولی ——— "ایک بات اور بھی ہے!"

"وہ کیا ——— ؟"

"آج سے آپ بھابی کے پاس نہیں بیٹھیں گے!"

"یہ کیوں ——— ؟"

"بس یوں ہی، اچھا نہیں لگتا مجھے!"

"صاف کہو کہ مجھ پر بھروسہ نہیں ہے تمہیں!"

"اللہ توبہ! آپ کتنا غلط مطلب نکالتے ہیں۔ آپ ہی کے بھلے کے لیے کہہ رہی ہوں۔ موجودہ حالات میں فرشتوں پر بھی شبہ کیا جا سکتا ہے۔"

حسینہ کی یہ بات معقول تھی۔ احتیاط بہرحال لازم ہے اس لیے میں نے سنجیدگی سے کہا "تم ٹھیک کہتی ہو مگر احتیاط صرف میرے ہی لیے کیوں، تمہیں، اور دوسروں کو بھی چاہیئے!"

"مطلب ——— ؟"

"مطلب یہ کہ اگر وہ خود میرے یا لوگوں کے پاس آئیں تو ایسی صورت میں ان سے حسب معمول ملنا چاہیئے جیسے ہم لوگوں کو کچھ نہیں معلوم!"

"بڑی بھابی بھی یہی کہہ رہی تھیں کہ چور کو پکڑنے کے لیے چارہ بنا پڑے گا۔"

"لیکن تم لوگ ایسا کیوں نہیں کرتیں کہ بھابی کو بھیا کے پاس بھجوا دو؟"

"بھیا ایک جگہ کب رہتے ہیں۔ وہ تو مہینے میں تین ہفتے دورے پر رہتے ہیں، کیا وہ انہیں ساتھ لیے پھریں گے!"

"کیا حرج ہے؟" میں نے از راہ مذاق کہا۔

ابا نے خود ان سے کئی بار کہا کہ یہ ایجنسی وجینسی چھوڑ دو یہیں کوئی دھندا کر لو۔ مگر انہوں نے انکار کر دیا۔

میں نے ہنستے ہوئے کہا ——— "بھابی اگر میری بیوی ہوتیں تو میں ان سے ایک دن بھی جدا نہیں رہ سکتا تھا!"

حسینہ تلملا گئی ——— "دیکھیے اگر یہ بات آپ دوبارہ کہیں گے تو میں چھت سے کود جاؤں گی!"

"جلتی ہو ——— ؟"

"آپ کو مذاق کی سوجھی ہے اور یہاں ہم لوگوں کا دم نکل رہا ہے!"

"دم تو میرا بھی نکل رہا ہے مگر ذرا مختلف صورت میں ——— وہ غالب کا مصرع ہے نا کہ ہزاروں صورتیں ایسی کہ ہر صورت پہ دم نکلے ...."

"خدا کے لیے پریشان نہ کیجیے!" وہ روہانسی ہو گئی۔

"اچھا بھائی سو جاؤ، مجھے نیند آ رہی ہے۔"

آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کی تو ایسا لگا مشکل سے ہی نیند آئے گی۔ آنکھوں کے سامنے وہ خوش نصیب نوجوان برابر پھرتا رہا۔ وہ کون ہے؟ تارا کا دولہا .... مگر صرف وہ ہی کیوں، اور بھی کئی نوجوان رشتے دار ہیں جن کی بھابی کے ساتھ اتنی ہی بے تکلفی ہے جتنی مجھ سے یا تارا کے دولہا سے۔ جانے کب سے اس نوجوان نے بھابی کو یا بھابی نے اس نوجوان کو اپنی زندگی میں شامل کر لیا ہے۔ اس نوجوان کو عین وقت پر پکڑنے کی خواہش دم بدم تیز تر ہوتی گئی۔

گھنی اندھیری رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ ایسے میں کوئی مبہم سا سایہ بھابی کے کمرے کے عین سامنے ایستادہ دکھائی دیا۔ اس سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے لیے میں ایک ستون کے پیچھے ہو گیا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا مگر کوئی شبیہ واضح نہ ہو سکی۔ کئی لمحے گزر گئے پھر میں نے دیکھا کہ حسینہ اپنے کمرے سے باہر آ رہی ہے۔ وہ سایہ دھیرے دھیرے آہستہ آہستہ خود

اپنے قدموں کی آواز سے سنائی دے رہی آواز بھر کے کرکے آنگن میں آ گئی
مگر حسینہ ہو رہا تھا سے برآمدے میں سائے سے بے خبر تھی۔ شاید
سائے کی نظر اس پر پڑ گئی اور وہ سایہ جھپک سے اس سمت
غائب ہو گیا جدھر بیٹھے تھے۔ بڑی ممانی کا کوٹھا، منجھلی ممانی
کا کوٹھا۔ شاید حسینہ نے اس سائے کو اب بھی نہیں
دیکھا تھا کیونکہ وہ بھاگ کے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔ لیکن کچھ وقت
گزر گیا۔ پھر ایک اور سایہ اس تیزی کرنے والے حصے کی طرف سے
میں نے آنگن میں آتا دیکھا۔ شاید اس کی نظر میں حسینہ کا جسم سمایا
آ چکا تھا جب ہی وہ بجائے آگے بڑھنے کے ستون کی طرف
رینگ گیا۔ پانچ منٹ ـــــ دس منٹ ـــــ بیس منٹ ... اور
یوں آدھا گھنٹہ ہو گیا۔ تب حسینہ آ کر واپس لوٹ آئی اور جب
برآمدے سے گزر کر کمرے میں داخل ہو رہی تھی، میں نے پیچھے سے
اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"مجھے ڈھونڈ رہی تھیں؟"

حسینہ نے سنا اور جھپک سے پلٹ پڑی۔ میری طرف دیکھا
پھر مسکراتے ہوئے میرے چہرے کی طرف دیکھا۔ جانے اس مسکراہٹ
میں اسے کیا نظر آیا اس نے کیا سمجھا جس کی آنچ نے اس کے چہرے
اور شاید پورے جسم پر پسینے کی پھواریں چھوڑ دیں۔ وہ سر جھکائے
کھڑی رہی، پشیمان پشیمان سی۔ میں اسے داہنے ہاتھ کے حلقے میں
لیے آگے بڑھ گیا۔

"جناب سو رہا ہے؟"

وہ چارپائی پر لیٹ گئی اور شستہ لہجے میں کھوئی کھوئی بولی
جیسے خواب میں بڑبڑا رہی ہو۔

"میں سوئی نہیں تھی، سونے کی کوشش ضرور کی تھی مگر
اس گھر میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ کوئی معمولی بات نہیں ہے اسی
لیے نیند نہیں آ رہی تھی۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ آپ چارپائی
سے اٹھے اور [illegible]
پلنگ خالی تھا۔ [illegible]
حسینہ [illegible]

"[illegible]
[illegible]
سنائی دے رہی [illegible]

"اور مجھے [illegible] حسینہ [illegible] بولی۔"



"نہیں حسینہ ایسا نہیں سوچتے۔ یہ تو قدرتی بات ہے کہ اگر
کسی لڑکی کی کہیں شادی ہو جائے تو اسے گھر چھوڑنا ہی پڑتا ہے۔" حسینہ نے
کوئی جواب نہیں دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ میں بھی سو گیا۔

صبح میری آنکھ بڑی ممانی کی آواز سے کھلی۔ میں باہر گیا۔ بڑی ممانی
[illegible] رہی تھیں۔ منجھلی ممانی برآمدے میں بیٹھی اپنی بچی کے
تیل مل رہی تھیں۔ [illegible] سے ذرا ہٹ کر ایک اونچی چوکی پر
حسینہ کی اماں بیٹھی تسبیح پڑھنے میں مصروف تھیں۔ مگر تارا اور تارا
کے [illegible] بھائی کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ سب اپنی اپنی جگہ پر
خاموش تھے۔

"کیا بات ہے ساجد میاں تمہاری آنکھیں سرخ ہیں رات نیند
نہیں آئی کیا ـــــ؟"

میں نے پلٹ کر دیکھا منجھلی ممانی مجھ سے مخاطب تھیں مگر
[illegible] ایک [illegible] جسم [illegible] ہو گیا۔ مگر
میں نے فوراً جواب دیا۔

"ہاں حسینہ نے سونے نہیں دیا [illegible] مگر اپنی بات
کے [illegible] پلٹ دی [illegible] جانے
کیوں [illegible] ہے اسی [illegible] نے مجھے سونے دیا۔"

[illegible] گھنٹے کے بعد میں گھر سے چلا گیا۔ بارہ بجے کا کھانا باہر ہی
کھایا [illegible] شام کو گھر لوٹا تو [illegible] سے برآمدے
میں [illegible] وہ حسرت [illegible] سے [illegible] تھیں۔
[illegible] کسی کی
بات [illegible] سنجیدہ
[illegible]

مجھے [illegible] ابھی تک صاف ہے
جیسے [illegible] کسی [illegible] سب کچھ جل
[illegible] کوئی [illegible] بات نہیں [illegible] دی۔ جو بھی بات تھی وہ
[illegible] دل میں تھی یا [illegible] زبان پر تھی [illegible] مجھے کے لیے

ایسا لگا کہ رات جو سنا تھا وہ خواب تھا، جھوٹ تھا۔ بھابی کا بھولا بھالا لمبی لمبی سیاہ زلفوں کے بیچ دمکتا ہوا چہرہ اور ان کی مدھ بھری آنکھوں میں معصومیت کی چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ گناہ کے احساس کا بوجھ آدمی کے دل میں بہرحال رہتا ہے۔ میں نے سوچا اس طرح کہاں چھپایا جا سکتا ہے۔ کسی جگہ کسی گوشے میں کہیں نہ کہیں سے تو یہ نمایاں ہو ہی جاتا ہے۔

"آپ مجھے اس طرح کیوں گھور رہے ہیں؟ بیٹھئے نا۔۔!"

اور قبل اس کے کہ میں کوئی جواب دیتا حسینہ نے مجھے آواز دی ——— "سنئے! آپ سے ایک کام ہے۔" اور مجھے بھاگنا پڑا۔

"سو گئے کیا؟" حسینہ سرہانے بیٹھی میرے سر میں تیل کی مالش کر رہی تھی۔

"ابھی تو نہیں، مگر نیند آ رہی ہے۔"

"مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔" حسینہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ تیل کی شیشی طاق پر رکھی اور پھر بولی ——— "کیا بجا ہے؟"

"بارہ ———!" میں نے گھڑی دیکھ کر کہا۔

"اچھا، ایک بات پوچھوں؟" حسینہ بولی اور تیز روشنی والے بلب کا سوئچ دبا دیا کمرہ گہری تاریکی میں ڈوب گیا۔

"پوچھو ———!" بیڈ سوئچ دباتے ہوئے میں بولا۔

ہلکی نیلی روشنی میں حسینہ ایک لمحے سے اپنے پلنگ پر آ بیٹھی ایک منٹ تک خاموش رہی پھر میری طرف دیکھا اور بولی:

"رات آپ کس جگہ تھے؟"

"تمہارے کمرے میں، اور کہاں!"

حسینہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ "نہیں، اس وقت جب کہ میں بھابی کے کمرے کی طرف جا رہی تھی، میں نے آپ کو کہیں نہیں دیکھا ———"

"برآمدے کے ستون کے پیچھے ——— مگر کیوں؟"

"بس یوں ہی!" وہ بولی اور چپ ہو گئی۔

[illegible]

کرنے سے کون روک سکتا ہے؟"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ اچھا اب سو جاؤ۔" میں نے کہا اور باہر کھلنے والی کھڑکی کی طرف کروٹ بدل لی۔

حسینہ سو گئی مگر دھانے کیوں میں جاگتا رہا کچھ دیر بعد میں نے گھڑی دیکھی ایک بج رہا تھا۔ آہستہ سے میں چارپائی سے نیچے اتر آیا۔ دروازے کی کنڈی کھولی اور باہر آ کر اسی احتیاط سے دروازہ بھیڑ دیا اور پھر ستون کے عقب میں کھڑے ہو کر میں نے چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ بظاہر سامنے کوئی نہیں تھا ——— پھر میں اپنے آپ کو تقریباً محفوظ کیے دبے قدموں سے بھابی کے کمرے کی طرف رینگ گیا۔ قبل اس کے کہ میں اندر کی آواز سننے کی کوشش کروں میری سماعت سے ایک آواز ٹکرائی جیسے کوئی مرد سرگوشی میں بول رہا ہو۔ یہ آواز بھابی کے کمرے سے آ رہی تھی ——— جی میں آیا کہ زنجیر کھٹکھٹاؤں یا دروازہ توڑ کر اندر گھس جاؤں۔ مگر دوسرے ہی لمحے اندر کی تاریکی کا خیال آیا۔ دونوں صورتوں میں چور اس تاریکی سے فائدہ اٹھائے گا۔ دفعتاً میں اپنے کمرے کی طرف پلٹ پڑا۔ آنگن عبور کر کے برآمدے میں جیسے ہی پہنچا، ستون کے عقب سے حسینہ نکلی اور سامنے کھڑی ہو گئی۔

"کیوں بھابی نے دروازہ نہیں کھولا ———؟"

قسم سے سنسناتی ہوئی گولی میرے سینے میں اتر گئی۔ جی تو یہ چاہا کہ ایک زوردار طمانچہ حسینہ کے منہ پر جڑ دوں مگر میں نے ایسا نہیں کیا اور کچھ بولے بغیر میں نے اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

کسی مرد کی مدھم آواز بھابی کے کمرے میں بدستور گونج رہی تھی۔ اس بار سماعت سے بھابی کی آواز بھی ٹکرائی۔

"بیلیں، مگر بس بہت آ گئیں بتاتے ہو ۔۔۔!"

نہ جانے اچانک مجھے کیا ہو گیا کہ دروازے سے پرے ہو کر میں نے اپنی پوری قوت سے دروازہ کو دھکا دیا اور دوسرے ہی لمحے میں [illegible] بھابی چیخ کر اٹھ بیٹھیں [illegible] روشن کمرے میں صرف بھابی تھیں [illegible] مرد کی آواز بدستور [illegible]

[illegible]

[illegible] میں نے حسینہ کو دیکھا اور حسینہ نے مجھ کو دیکھا اور [illegible] ان کی نگاہوں سے بچنے کے [illegible] سے اپنے کمرے کی طرف دوڑ گیا۔ ●●

دو مفید پھل

آم ـــــ ایک زبردست ٹانک

آم ہندوستان اور پاکستان کے بہترین پھلوں میں سے ہے۔ دنیا کے کسی پھل میں اتنے اوصاف نہیں جتنے آم میں ہیں۔ یہ ذائقے کے لحاظ سے جتنا لذیذ پھل ہے، اتنا ہی ایک زبردست ٹانک بھی ہے۔ ہندوستان اور پاکستان میں کثرت سے پیدا ہونے کی وجہ سے سستا اور سہل الحصول ہے۔ ہر شخص بآسانی خریدتا اور استعمال کرتا ہے۔

آم کی بہت سی قسمیں ہوتی ہیں جو رنگ، شکل، مزے اور ذائقے کے لحاظ سے پہچانی جاتی ہیں۔ ذائقے کے اعتبار سے تخمی آم قلمی آم سے بہتر ہوتا ہے۔ یہ ریشہ دار ہونے کی وجہ سے معدے میں گرانی پیدا نہیں کرتا اور جلد ہضم ہو کر جزو بدن ہو جاتا ہے۔ پکا ہوا شیریں آم گرم و خشک ہے۔ آم میں جتنی زیادہ ترشی ہوگی اتنا ہی وہ کم گرم ہوگا [illegible] شیریں ہوگا [illegible] زیادہ ہوگی۔ شیریں آم اعضائے رئیسہ [illegible] کو قوت دیتا ہے۔ بدن کو موٹا کرتا ہے [illegible] آم [illegible] اور ترش آم زیادہ مضر ہے۔ قلمی آم ثقیل اور دیر ہضم ہے۔

جدید تحقیقات کی رو سے آم دوسرے پھلوں کے مقابلے میں زیادہ غذائیت بخش پھل ہے۔ اس میں وٹامن اے اور سی کثیر مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ ماہرین غذا نے اپنے تجربات کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ آم میں وٹامن سی کی مقدار سیب اور سنگترے سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ آم میں وٹامن سی کی اس کثرت کا مفہوم یہ ہے کہ آم [illegible] قوت و توانائی بخشنے کے لیے بہترین غذا ہے۔ اس کے استعمال [illegible] خرابیاں بہت جلد دور ہو جاتی ہیں۔

پکا آم مزاج کے اعتبار سے [illegible]

[illegible]

تحلیل ہوتی جاتی ہے۔ جو جسم کی پرورش کے لیے بہت ضروری ہے۔ آم جسم میں قوت و حرارت پیدا کرتا ہے۔ بہترین مقوی باہ، مدر، [illegible] اور خواب آور ہے۔ معدہ، جگر، دل، دماغ اور پٹھوں کو قوت بخشتا ہے۔ اس کے استعمال سے بدن میں خون کی کمی سے پیدا ہونے والی بیماریاں جلد ہی دور ہو جاتی ہیں۔ آم بکثرت خون پیدا کرتا ہے۔

طاقت پیدا کرنے والی غذائیں اور دوائیں عام طور پر ثقیل اور دیر ہضم ہوتی ہیں لیکن آم اس کلیے سے مستثنیٰ ہے۔ یہ زود ہضم بھی ہے اور قوت بخش بھی۔ آم اعضائے رئیسہ کو حرارت پہنچا کر عمدہ طاقت بخشتا ہے۔

معدے کی کمزوری کی صورت میں آم ہرگز استعمال نہ کریں۔ اس سے معدے میں گرانی اور حرارت پیدا ہو جاتی ہے [illegible] اس لیے آم ہمیشہ کھانا کھا کر یا دودھ کے ساتھ استعمال کرنا چاہیے۔

آم خریدتے وقت اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ آم اچھی طرح پکا ہوا، نرم اور خوشبودار ہو [illegible] پیدا کر دیتا ہے۔

آم کھانے کے بعد دودھ یا لسی پینے سے اس کی [illegible]

[illegible]

آم استعمال کرنے سے پہلے [illegible]

پانی میں ملا کر پینا چاہیئے۔ اس طرح اس کی گرمی اور مضر اثرات ختم ہو جاتے ہیں۔
آم گرم مزاج لوگوں کے لئے بھی اتنا ہی مفید ہے جتنا باقی لوگوں کے لئے۔
[illegible] مناسب مقدار میں پینا چاہیئے۔ اس سے بدن کے [illegible] کی [illegible] ہوتی ہے اور تازہ خون پیدا ہوتا ہے [illegible] مقدار میں [illegible] مفید ہیں۔ اس سے خوبصورتی اور [illegible] پیدا ہوتی ہے۔

آم کا مربہ بہت لذیذ، مفرح اور مقوی قلب ہے۔ [illegible] اعضائے رئیسہ میں قوت پیدا کرتا ہے [illegible] تمام اعضاء [illegible] پابندی کے ساتھ [illegible] استعمال کرنے سے [illegible] خواص [illegible] استعمال کریں تو [illegible]۔

انناس — ایک مفید پھل

یہ پھل ہندوستان اور پاکستان میں عام ملتا ہے۔ مزاج کے اعتبار سے سرد و تر اور فرحت بخش پھل ہے۔ جگر اور معدے کو طاقت دیتا ہے۔ گرم مزاج لوگوں کے لئے نہایت مفید ہے۔ سرد مزاج والوں کو مضر ہے [illegible] کرتا ہے لیکن بلغم پیدا کرتا ہے۔

[illegible] کو قوت دیتا ہے۔ ضعف معدہ اور ضعف قلب میں بہت مفید ہے۔ گرمی اور پیاس کو دور کرتا ہے۔ بخار میں تسکین دیتا ہے۔

پکے ہوئے انناس کا رس بخار کی حالت میں معدے کی حرارت کی تیزی کو ہلکا کرتا ہے اور یرقان میں بھی مفید ہوتا ہے۔ انناس کا استعمال خناق (ڈفتھیریا) کے لئے ایک خصوصی علاج کا حکم رکھتا ہے [illegible] یہ علاج [illegible] سے سیکھا ہے۔ اس شخص نے [illegible] کو یہ علاج کرتے دیکھا ہے [illegible] مریض کے حلق میں [illegible] چاہیئے۔ اس کے رس میں [illegible] خناقی جھلی کو کاٹ ڈالتا ہے اور [illegible] نکل جاتا ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ انناس کا رس خناقی جھلی کو گلا اور کاٹ دیتا ہے لیکن [illegible] پہنچا دیتا ہے۔

ڈاکٹر [illegible] لکھتا ہے: انناس کے [illegible] استعمال کیا جائے [illegible] کے

[illegible] کے لئے [illegible] کی [illegible] ہے [illegible]

ڈاکٹر [illegible] لکھتا ہے [illegible] انناس [illegible] مفید ہوگا [illegible]

[illegible] کے لئے انناس بہت مفید ہے [illegible]

قدرت کی ایک بڑی نعمت

خدا نے انسان کو جو بہت سی نعمتیں بخشی ہیں ان میں سب سے بڑی نعمت صحت ہے جس کی وجہ سے ہر رنج و غم اور دکھ درد کو بھول جاتے ہیں۔ ذرا تصور تو کیجئے ہمارا کیا حال ہوتا اگر رنج و غم [illegible] ہوتے [illegible] ہوتا جتنا اس وقت ہوتا [illegible] انسانیت [illegible] صحت و سکون [illegible] ہے اور [illegible] پہنچتی ہے۔

لوگوں پر جالی [illegible] ایسے [illegible] حادثات گزرے ہیں [illegible]

[illegible]

فرخندہ نثار

شخصیت کا جادو



ہر انسان کی فطری خواہش ہوتی ہے کہ اُسے پسند کیا جائے، لوگ اس کی شخصیت میں دلکشی محسوس کریں۔ مجالس و تقاریب میں اس کا حوالہ دیا جائے اور اس کی کشش دل کو موہ لے۔ یہ خواہش فطری ہی نہیں اس کی تکمیل کے لیے بھی ضروری ہے کہ اسی طرح پر زندگی گزاری جائے کہ کوشش کی جائے جو حسن و مقبولیت کی بحالی اور برقراری کا موجب ہو سکے۔

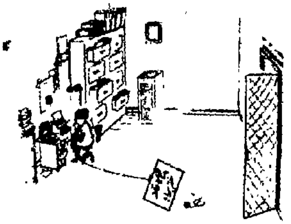
دلکشی کی شخصی خصوصیت کا راز کیا ہے؟ ایسی شخصیت کیسے تشکیل پا سکتی ہے جسے سب پسند کریں؟

ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ صرف ذاتی خدوخال، شکل و شباہت یا ذہنی صلاحیت و اہلیت کا نہیں۔ بہت سے لوگ خوبصورت بھی ہوتے ہیں اور ہوشیار و چالاک بھی، مگر وہ مقبول و ہر دلعزیز نہیں ہوتے جبکہ بہت سے سادہ طبع افراد دوستوں اور سہیلیوں کا وسیع حلقہ رکھتے ہیں۔ شخصیت کی دلکشی کی صفات و خصوصیات عموماً اتنی سادہ اور بظاہر معمولی ہیں کہ لوگوں کی اکثریت انہیں یکسر نظر انداز کر جاتی ہے کیونکہ انہیں کسی زیادہ سنسنی خیز راز کی توقع ہوتی ہے۔ کسی عجیب و غریب نسخے کی تلاش میں لگے رہتے ہیں۔ کسی جادوئی چیز کی طلب و تلاش میں نتیجہ ظاہر ہے کہ عام سادہ اور معمولی باتیں ان کے ذہن سے اوجھل رہ جاتی ہیں۔ دلکشی کے ضمن میں اولین شرط فطری رویہ ہے، سادگی اور بے ساختگی ہوتے ہیں۔ حقیقی دلکشی ان لوگوں میں پائی جاتی ہے جو اپنا سچا اظہار کرتے ہیں۔ آپ کو یہ حقیقت بخوبی جان لینا چاہیے کہ ہر انسانی شخصیت ایک قطعی انفرادی صفت کی حامل ہوتی ہے۔ دنیا میں کوئی دوسرا فرد آپ جیسا نہیں، اس لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ خود اپنی انفرادیت کو اجاگر کیا جائے اور اپنے آپ کو آشکار کیا جائے۔

جب ہم کہتے ہیں آپ آپ ہی رہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اپنی بہترین خصوصیات کو اجاگر کیا جائے، اپنی منفرد صفات کا اظہار کیا جائے لیکن اس اظہار کا ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ اس میں کوئی بناوٹ نہ ہو۔ واضح شخصیت کے لیے جتنا نقصان دہ ہوتا ہے تاثر پیدا کرنے کی مصنوعی کوشش وہ بہت گراں گزرتی ہے۔ دوسروں کی ادائیں بھی اپنانے کے رجحانات یہ کہ آپ ایسی صفات میں جو بظاہر آپ کی ہیں حقیقت میں نمائش کا جو پہلو ہے وہ فطرت سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا وہ کبھی فطری نہیں ہوتا۔ یہ شخصیت میں ایک قسم کی بے ترتیبی و پریشان خیالی کا مظہر ہوتا ہے۔ اس لیے جہاں یہ صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے کہ اپنے جوہر کو نکھارا جائے، اپنی گفتار کو بہتر بنایا جائے اور اپنے ذہنی افق کو وسعت دی جائے وہاں یہ بھی جان لینا چاہیے کہ ہمارا ایک بنیادی شخصی ڈھانچہ ہے جسے تبدیل نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس ڈھانچے میں اس فریم کے اندر رہتے ہوئے ہمیں حسن و دلکشی پیدا کرنا چاہیے۔

سحر و کشش

ہماری اپنی انفرادیت ان بڑے بڑے وسائل و ذرائع میں



صلاحیت ہے جسے ذاتی دلکشی میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اپنا لیجیے دوسروں کی نقالی و تقلید سے کچھ حاصل نہیں بلکہ اپنی انفرادیت کو نکھارنے سے شخصیت کا جادو جاگتا اور مقناطیسیت ابھرتی ہے۔

اس کے ساتھ انکسار لازم ہے۔ مغرور لوگ بہت سی خوبیوں کے مالک ہو سکتے، شہرت پا سکتے اور اثر و رسوخ پیدا کر سکتے ہیں لیکن وہ کبھی دلوں سے، دلی طور پر پسند نہیں کیے جاتے۔

جو لوگ یہ چاہتے یا کوشش کرتے ہیں کہ ہمیشہ شیخی بگھارتے ہوں، وہ کبھی مقبول نہیں ہوتے، گو ان کی سماجی حیثیت بہت اہم یا مقام و مرتبہ بلند ہے تو لوگ انہیں برداشت کر لیتے ہیں مگر پسند ہرگز نہیں کرتے اور اگر ایسے لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ لوگ انہیں پس پشت کیا کہتے ہیں تو یقیناً انہیں بڑے صدمے سے دوچار ہونا پڑے گا

سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا افسانہ کیا

ہر دلعزیزی کا ایک سادہ مگر یقینی اور بے خطا طریق یہ ہے کہ "بولنا بند اور سننا شروع" کر دیجیے۔ یہ بتانے کی بجائے کہ آپ نے کیسے کیسے کارنامے انجام دیے ہیں، یہ جانیے کہ دوسرے لوگ کیا کر رہے ہیں۔ اچھی گفتگو یقیناً دو طرفہ ہوتی ہے لیکن گفتگو میں اپنا حصہ لیا اور تنا رکھیے کہ دوسرے کو کھل کر سامنے آنے کا موقع ملے۔

جو کچھ کہا جا رہا ہو اسے توجہ سے سنیے، ذہانت سے مختصر تبصرہ کرتے جائیے، کسی ایک آدھ سوال سے بات چیت کو آگے بڑھائیے۔ اس سے آپ کی قوت گفتار میں خود بخود حیرت انگیز اضافہ ہوگا۔ دلکشی کا دوسرا راز گرم جوشی ہے۔ یہ وہ قوت ہے جو دوسروں کو بے ساختہ اپنی طرف کھینچ لیتی ہے، جو لوگ ہر وقت بیزار اور متفکر نظر آتے ہیں، جو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ساری دنیا کا بوجھ ان کے کندھوں پر ہے یا جو شکایات زمانہ کے انبار لگائے چلے جاتے ہیں وہ کبھی مقبولیت و کشش کے حامل نہیں بنتے!

ہر شخص دوسروں کو پسند کرتا ہے جس کی دلچسپیاں وسیع ہوتی ہوں جو زندگی کے معاملات میں جوش و خروش، صدق و خلوص اور زندہ دلی و گرم جوشی سے شریک ہوتا ہے، وہ دوسروں کے لیے پرکشش ہو جاتا ہے اس لیے جوش و جذبہ اس خصوصیت کو بڑھانے کا راز ہیں۔ مگر غلط طریق سے نہیں۔

ایک مُعمّر بزرگ سے ان کی کامیاب زندگی کا راز پوچھا گیا تو انہوں نے بڑی سادگی سے جواب دیا "میں نے اپنے جوش و جذبے کو ہمیشہ زندہ و متحرک رکھا ہے۔" لوگوں میں ان کی بہترین صفات و خصوصیات مسلسل کھوجتے رہیے کیونکہ ہر فرد کسی نہ کسی خوبی کا مالک ضرور ہوتا ہے۔ اس خوبی کو تلاش کریں اور اس کی داد دیں۔ اپنے ذہن کو کھلا اور دل کو حساس بنائیں۔ معاملات میں پورے دل سے جوش و جذبے سے حصہ لیں۔ یہ شخصیت کی دلکشی کے وہ عناصر ہیں جو دوسروں کو بلا کسی مزاحمت اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔

آخر میں یہ کہ خود تک، اپنے آپ تک دوسروں کی رسائی کو آسان رکھیں۔ صاحب حیثیت خواتین و حضرات کو یہ نکتہ اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ مقبولیت و ہر دلعزیزی میں ذاتی تعلقات بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ لوگ یہ محسوس کریں کہ آپ تک رسائی ہمیشہ ہو سکتی ہے، آپ دل سے ان کے ساتھ ہیں، ان سے اتحاد کریں اور جانتے ہوں کہ آپ کی شخصیت ان کے لیے منفعت بخش تو ہے نقصان دہ قطعاً نہیں۔

ممکن ہے کہ شاید کوئی ضرورت نہیں کہ عام نوعیت کے ذاتی تعلقات میں زیادہ گہرا جانے کی ضرورت نہیں، ہر شخص سے بے تکلفی بھی نہیں، زندہ دلی ایک بڑی خوبی ہے لیکن اسے پھکڑ پن سے پاک ہونا چاہیے۔ کامیابی کے لیے بجا ان لیا تلفظ بلکہ وہ کامیاب ذاتی تعلقات میں مضمر ہوتی ہے بے تقابلی رسائی ہونے کے خود اپنے گھر قائم رہے ہیں۔

وقت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ایسے فرد کی ملاقات تازگی اور فرحت بخش سمجھی جاتی ہے جو اپنا وقت قربان کرے، جو ہمیں یہ تاثر دے کہ اس لمحے اس کے لیے ہم سے زیادہ اہم چیز دنیا میں اور کوئی نہیں۔ ایسی شخصیت ہمیں جیت لیتی ہے، اپنا مطیع بنا لیتی ہے!!

یہی شخصیت ہوتی ہے جسے ہم پسند کرتے ہیں، دل سے چاہتے ہیں اور اگر ہم خود ایسی شخصیت بن جائیں تو ہماری مقبولیت و کشش میں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟

*

[illegible]

دفتری امور انتظامی اخراجات منہا کرنے کے بعد انعامی رقم ادا کی جائے گی

90,000

۹۰ ہزار روپے کے انعامات

پہلا انعام ۱۰۰ فیصد درست حل پر ۹۰ ہزار روپے

دوسرا انعام ایک غلطی والے حل پر ۲۰ بیس ہزار روپے — تیسرا انعام دو غلطی والے حل پر ۱۰ دس ہزار روپے

فیس داخلہ فی حل ایک روپیہ ایک نام اور ایک کوپن کے ساتھ دو حل بھیجے جا سکتے ہیں۔ اس حساب سے جتنے چاہیں حل بھیج سکتے ہیں۔ دوشیزہ ادبی معمہ نمبر ۲۳ کے اپنے تمام خانوں کے ساتھ ایک کوپن دوشیزہ ادبی معمہ ۲۳ منسلک ہونا ضروری ہے جو ماہنامہ دوشیزہ سے کاٹا گیا ہو۔ مفصل شرائط اور ہدایات کی پابندی لازمی ہے جو دوشیزہ کراچی میں شائع ہوتی ہیں۔ ایک شخص الگ الگ کوپنوں پر الگ الگ انعام حاصل کر سکتا ہے۔ انعامی رقم میں مزید کمی بیشی ہو سکتی ہے۔

دفتر ماہنامہ دوشیزہ ۱۸۸ ہاسی سنٹر کمرشل ایریا علامہ اقبال روڈ بہادر آباد کراچی ۔ دستی حل وصول ہونے کی آخری تاریخ ... جون شام ۶ بجے تک دستی اور ڈاک سے وصول کئے جائیں گے

دوشیزہ ادبی معمہ نمبر ۲۳

نمبر	اشارات	ممکن الفاظ			حل نمبر...	حل نمبر	حل نمبر...
۱	——— علاقے دشمن نے خالی کر دیئے تھے۔	مفتوحہ	ریگستانی	مقبوضہ			
۲	بھلا اتنی بڑی رقم کو کوئی یہ سمجھتی طلب ہے کسی ——— پر ضائع کرنا عظیم حماقت ہے	شخص	اجنبی	عورت			
۳	ہم یہ ——— حق تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے آپ کی نذر کرتے ہیں	زمین	سر	ملک			
۴	——— موت کا سامنا بے جگری سے کرنا ہی جرأت کی معراج ہے	یقینی	فوری	اچانک			
۵	کھوئی ہوئی ——— بھی کہیں مل سکتی ہے؟	عزت	چیز	عصمت			
۶	تمہارے ——— سے ساری دنیا دھوکہ کھا سکتی ہے۔	اعتراف	انکار	اقرار			
۷	اس کا اپنا کوئی ہم ——— نہ تھا جس سے باتیں کر کے اپنا دل ہلکا کرتی	درد	دم	خیال			
۸	پیار بھرے دل کبھی ——— نہیں بدلتے۔	ڈھنگ	سنگ	رنگ			
۹	عورت چاہے امیر ہو یا غریب بڑی ہو کہ کمسن ہر حال میں خدا کی بہت بڑی ——— ہے	رحمت	نعمت	طاقت			
۱۰	مسلمان ایک بار دھوکا کھانے کے بعد دوبارہ ——— نہیں کھاتا	چکمہ	دھوکا	فریب			

(حل سادہ کاغذ پر بھی بھیجے جا سکتے ہیں، کوپن منسلک کرنے کی صورت میں فی کوپن میں پیسے کے ڈاک ٹکٹ بھیجئے)

ڈاک سے اپنے حل اور فیس اس پتے پر بھیجئے

دوشیزہ ادبی معمہ ۲۳ معرفت ماہنامہ دوشیزہ پوسٹ بکس نمبر ۱۸۹۹ کراچی

نام و مکمل پتہ ---------------------

تعداد حل ---------- دستخط ----------

دوشیزہ ادبی معمہ نمبر ۲۳ کا صحیح حل ۹ جون ... کو بیک وقت دفتر دوشیزہ پر شائقین کی موجودگی میں مکمل حوالوں کے ساتھ آویزاں کر دیا جائے گا اور ۹ جون ... کو روزنامہ مشرق کراچی، ۱۰ جون ... کو مشرق لاہور، پشاور، کوئٹہ میں شائع ہوگا۔ انعام یافتگان کی مکمل فہرست جولائی ... کے دوشیزہ میں ملاحظہ فرمائیں۔

[illegible]

کلیم کی آخری تاریخ ۲۳ مئی ۱۹۷۷ء

دوشیزہ ادبی ... کے انعام یافتگان کی مکمل فہرست شائع کی جا رہی ہے ... [illegible]

ضروری اعلان

[illegible]

No. AL_ 991914/1

Payee's A/c Only

Rs100000/-

United Bank Limited

NURSERY, P.E.C.H.S., KARACHI

On Demand pay to Mr. Hafiz Habib-ul-Rehman

the sum of Rupees One lac Only

for value received. .... or order

TO
United Bank Limited
Latifabad, Hyderabad
(413)

For United Bank Limited

3895

1078

No. AMF 0919121/1

Payee's A/c. Only.

Rs100000/-

United Bank Limited

NURSERY, P.E.C.H.S., KARACHI

On Demand pay to Mr. Mohd. Anwar Bhatti

the sum of Rupees One lac Only

for value received. .... or order

TO
United Bank Limited
Bank Square, Lyallpur
(686)

For United Bank Limited

1078

[illegible]

[illegible]

♥♥♥♥

چند ضروری باتوں کا خیال رکھئے!

* لفافوں کو بند کرتے وقت گوند کی اتنی مقدار استعمال نہ کیجئے کہ آپ کے حل بھی لفافے کے ساتھ چپک کر رہ جائیں۔
* جو حضرات اپنے حلوں کو لفافوں کے اندر رکھ کر جگہ جگہ ٹانکے لگاتے ہیں، اس سے پرہیز کریں۔
* فارم کی جگہ بھیجے جانے والے ڈاک ٹکٹ اپنے حلوں پر پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر رسید پر ہرگز ہرگز چسپاں نہ کیجئے ایسے ٹکٹ ہمارے لیے بیکار ہو جاتے ہیں۔
* بڑے لفافے کے اندر رکھے جانے والے چھوٹے لفافے چسپاں نہ کیجئے۔
* سادہ کاغذ پر اشاروں کو لفظ بہ لفظ نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہماری دی ہوئی ترتیب کے مطابق اپنے منتخب الفاظ لکھ دیجئے۔ اور ہر حل کے نیچے اپنا نام، واضح پتہ اور تعداد حل ضرور لکھ دیجئے۔
* چھوٹے چھوٹے پرزوں پر اپنے حل ہرگز نہ بھیجئے۔
* لفافے کی پشت پر اپنا مکمل پتہ اور تعداد حل ضرور لکھ دیجئے۔
* غیر معمولی تعداد میں حل بھیجنے والے حضرات کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ نتائج میں تمام بعض صورتوں میں تاخیر معمولی بھی ہو سکتی ہے۔
* فارم پر بھی اپنے حلوں کی تعداد ضرور لکھ دیجئے۔
* فارم کی جگہ بھیجے جانے والے ڈاک ٹکٹ کے بارے میں بھی اپنے حلوں کے نیچے ضرور تحریر کر دیجئے کہ کتنے حلوں کے ساتھ کتنے ٹکٹ بھیجے جا رہے ہیں۔

[illegible]

[illegible]

دوشیزہ معمے کے حل میں جب آپ الگ الگ لفافوں کے ساتھ بھیجے جانے والے حلوں کا الگ الگ انعام حاصل کر سکتے ہیں چاہے حل ایک ہی نام اور پتے سے کیوں نہ بھیجے گئے ہوں ـــــ لیکن اس رعایت سے آپ اسی صورت میں فائدہ اٹھا سکتے ہیں جب آپ [illegible] ایک منی آرڈر یا پوسٹل آرڈر [illegible] کی طرف سے بھیجے گئے حلوں کی فیس [illegible] کے ذریعے [illegible] کے ساتھ آنے والے حلوں کی فیس [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

♥♥♥♥

چند ضروری باتوں کا خیال رکھئے!

* لفافوں کو بند کرتے وقت گوند کی آتنی مقدار استعمال نہ کیجئے کہ آپ کے حل بھی لفافے کے ساتھ چپک کر رہ جائیں۔
* جو حضرات اپنے حلوں کو لفافوں کے اندر رکھ کر جگہ جگہ ٹانکے لگاتے ہیں، اس سے پرہیز کریں۔
* کوپن کی جگہ بھیجے جانے والے ڈاک ٹکٹ اپنے حل پر پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کی رسید پر ہرگز ہرگز چسپاں نہ کیجئے ایسے ٹکٹ ہمارے لیے بیکار ہو جاتے ہیں۔
* بڑے لفافے کے اندر رکھے جانے والے چھوٹے لفافے چسپاں نہ کیجئے۔
* سادہ کاغذ پر اشاروں کو لفظ بہ لفظ نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہماری دی ہوئی ترتیب کے مطابق اپنے موزوں الفاظ لکھ دیجئے۔ اور ہر حل کے نیچے اپنا نام، واضح پتہ اور تعداد حل ضرور لکھ دیجئے۔
* چھوٹے چھوٹے پرزوں پر اپنے حل ہرگز نہ بھیجئے۔
* لفافے کی پشت پر اپنا مکمل پتہ اور تعداد حل ضرور لکھ دیجئے۔
* غیر معمولی تعداد میں حل بھیجنے والے حضرات کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ انعامی رقم بعض صورتوں میں نہایت معمولی بھی ہو سکتی ہے۔
* کوپن پر بھی اپنے حلوں کی تعداد ضرور لکھ دیجئے۔
* کوپن کی جگہ بھیجے جانے والے ڈاک ٹکٹ کے بارے میں بھی اپنے حلوں کے نیچے ضرور تحریر کر دیجئے کہ کتنے حلوں کے ساتھ کتنے ٹکٹ بھیجے جا رہے ہیں۔

[illegible]

ٹوکن دوشیزہ ادبی معمہ نمبر

دوشیزہ ادبی معموں کی شرائط میں نے بغور
لے لی ہیں اور مجھے ہر شرط کا ایک ایک لفظ منظور
ہے۔ منسلکہ حل شامل مقابلہ کر لیجیے۔ میں آپ
کے ہر فیصلے کا پابند رہوں گا/گی۔

نام ____________________

مقام و پتہ ____________________

____

(تعداد حل   )

ٹوکن دوشیزہ ادبی معمہ نمبر

دوشیزہ ادبی معموں کی شرائط میں نے بغور
لے لی ہیں اور مجھے ہر شرط کا ایک ایک لفظ منظور
ہے۔ منسلکہ حل شامل مقابلہ کر لیجیے۔ میں آپ
کے ہر فیصلے کا پابند رہوں گا/گی۔

نام ____________________

مقام و پتہ ____________________

____

(تعداد حل   )

ٹوکن دوشیزہ ادبی معمہ نمبر

دوشیزہ ادبی معموں کی شرائط میں نے بغور
لے لی ہیں اور مجھے ہر شرط کا ایک ایک لفظ منظور
ہے۔ منسلکہ حل شامل مقابلہ کر لیجیے۔ میں آپ
کے ہر فیصلے کا پابند رہوں گا/گی۔

نام ____________________

مقام و پتہ ____________________

____

(تعداد حل   )

ٹوکن دوشیزہ ادبی معمہ نمبر

دوشیزہ ادبی معموں کی شرائط میں نے بغور
لے لی ہیں اور مجھے ہر شرط کا ایک ایک لفظ منظور
ہے۔ منسلکہ حل شامل مقابلہ کر لیجیے۔ میں آپ
کے ہر فیصلے کا پابند رہوں گا/گی۔

نام ____________________

مقام و پتہ ____________________

____

(تعداد حل   )

ویران




مچلتے
رنگوں کا
نکھار
گل احمد لان
سو فیصد امریکن کاٹن

دوشیزہ



جون ۱۹۷۷ء جلد (۷) — شمارہ (۶)

فون نمبر — ۲۲۲۲۲۲ قیمت — پانچ روپے

سرورق کی شخصیت

ممتاز کنول

خوش شکل، خوش مزاج و خوش لباس

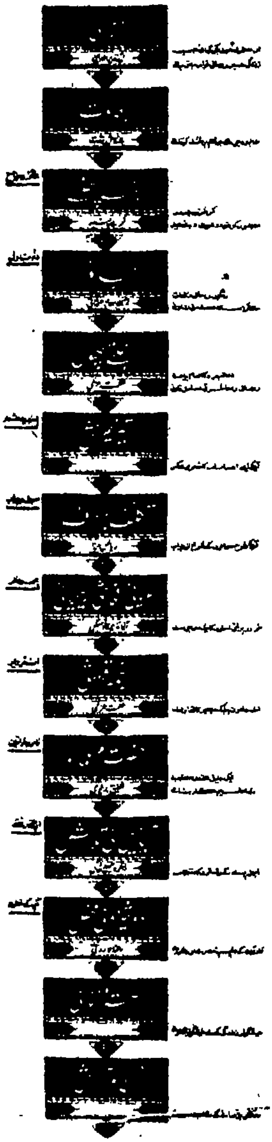
ممتاز کنول

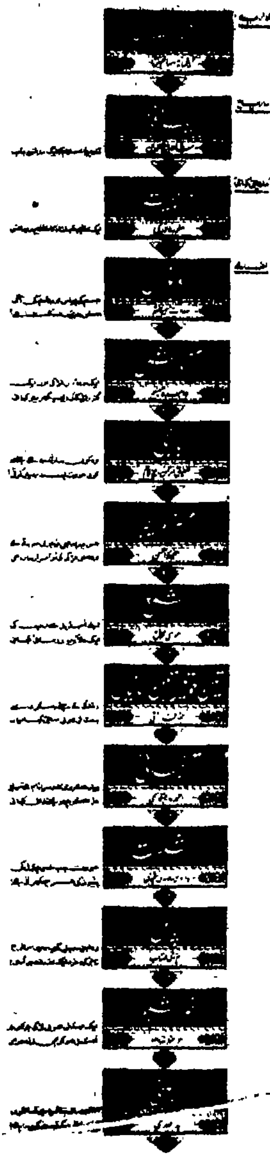
آسمان شہرت کی طرف تیزی سے لپکتی

ہوئی فن کارہ جو ٹیلیویژن کے ڈراموں

میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

[illegible]
[illegible] پوسٹ بکس نمبر ۱۵ [illegible] کراچی
مطبع۔ پاکستان ہیرالڈ پریس کراچی
[illegible] کراچی
[illegible]





سو بچایا - پانچ سو پایا
یہ منافع کہاں سے آیا؟

مُسلم کمرشل بینک کی انوسٹمنٹ سرٹیفکیٹ اسکیم

ایم سی بی انوسٹمنٹ سرٹیفکیٹ اسکیم آپ کی بچت پر بہترین منافع کا واحد ذریعہ ہے۔ اس اسکیم میں آپ کے بچائے ہوئے سو روپے ساڑھے چودہ سال سے بھی کم مدت میں پانچ سو روپوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ گویا آپ کی بچت پر ۳۰ فیصد منافع ملتا ہے۔ اسی طرح دس سالہ پلان میں ۳۲ء۲۱ فیصد اور پانچ سالہ پلان میں ۳۹ء۵ فیصد منافع ملتا ہے۔ آپ اس اسکیم میں سو سو روپے کے حساب سے ایک سال یا اس سے زیادہ مدت کے لئے جتنی رقم چاہیں جمع کرا سکتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت آپ بینک کی قرض کی سہولت سے بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔



MCB

خدمت میں پیش پیش
مسلم کمرشل بینک

MCB-51-75-UD

Ravi-Delmon



جمشید انصاری

پھولوں کے بوجھ سے جھکنے والے اور ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ساتھ اُڑنے والے جمشید انصاری کا جنازہ جب اُٹھایا گیا تو لوگ بتاتے ہیں کہ کافی بھاری تھا، آپس میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں تو ایک معمر شخص نے کہا۔ جمشید انصاری ہلکا پھلکا نوجوان ہو سکتا ہے، اس کا جنازہ ہلکا نہیں ہو سکتا، تین جنازوں کو اُٹھانا کوئی آسان بات تو نہیں ——!

وہ کارٹونسٹ تھا۔

شاعر تھا۔

گلوکار تھا۔

سچ پوچھو تو جمشید انصاری کی موت، تین فنکاروں کی موت ہے۔

فلموں میں گانے کا شوق جب جنون کی حدوں کو چھونے لگا تو اُس نے مجھ سے ایک عاجزانہ درخواست کی تھی، میں شہاب کیرانوی سے ایک اچھے SOURCE کے ذریعے ملنا چاہتا ہوں، اس ضمن میں آپ کو میری مدد کرنی ہوگی۔ میں نے اُس سے نہ صرف مدد کا وعدہ کیا تھا، بلکہ یہ کہہ کر اس کی آتشِ شوق کو اور بھڑکا دیا تھا کہ شہاب کیرانوی ہی ملک کا وہ واحد پروڈیوسر ہے جو TALENTS کا سب سے بڑا قدر دان ہے۔

شہاب کیرانوی جب کراچی آئے تو جمشید جا چکا تھا، میرے وعدے کا پاس کرتے ہوئے شہاب کیرانوی نے جمشید انصاری کی تازہ قبر پر پھول رکھتے ہوئے قدرے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

”یہ کسی بڑے آدمی کی قبر معلوم نہیں ہوتی —— کتنی اُداس، کتنی خاموش اور کتنی بے ضرر قبر ہے یہ!“

”آپ قبر کی بات کرتے ہیں شہاب صاحب!“ میں نے اپنی آنکھوں کی نمی کو چھپاتے ہوئے کہا: ”وہ اپنی زندگی میں بھی اس سے کہیں زیادہ اُداس، خاموش اور بے ضرر انسان تھا، جو لوگ اپنے وجود سے دوسروں کے لیے خوف، دہشت اور ہیبت پیدا نہیں کر سکتے ان کی قبروں سے کوئی کیا خوف کھائے گا؟“

رخسانہ سہام مرزا

ایک وفد

اسلامی لشکر کو قادسیہ میں پڑاؤ ڈالے ایک ہفتے سے زیادہ وقت گزر گیا لیکن ابھی محاذ پر خاموشی چھائی رہی۔ اندر ہی اندر زبردست تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ایک لاکھ سے اونچا لشکر جمع ہو چکا تھا مگر فوجی بھرتی اب بھی جاری تھی۔ عجمی سمجھ چکے تھے کہ یہ مسلمانوں سے نہیں موت سے جنگ ہے۔

رستم کا خیال تھا کہ خود میدان جنگ میں نہ جائے۔ وہ جالنوس کو فوجوں کی کمان کرنے بھیجنا چاہتا تھا۔ ادھر یزدجرد نے رستم کو کہلوایا کہ ——— "تم ہمارے سب سے بڑے سورما ہو اور ہماری بہترین تمناؤں کے مظہر! اس لیے میں چاہتا ہوں کہ عربوں کے مقابلے کے لیے تم خود جاؤ، تم سے زیادہ موزوں کوئی اور نہیں۔"

رستم نے یزدجرد کو اصرار کرتے دیکھا تو اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ:

"میں اس وقت تک اہل فارس کی امیدوں کا مرکز ہوں، جب تک شکست نہ کھاؤں اس لیے ابھی مجھے اپنی مرضی سے کام کرنے دیجئے۔"

یزدجرد خود بھی اس کی بات کو سمجھتا تھا۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ رعایا اور امیر سب اس بات کے خواہشمند ہیں کہ اس مرتبہ رستم ہی فوجوں کی کمان کرے تو اس نے رستم کو پھر کہلوایا کہ:

"اگر تم نہیں تو کچھ نہیں۔ فوراً ساباط روانہ ہو جاؤ! سب کی یہی خواہش ہے۔ عربوں سے اب دو دو ہاتھ ہو جانا ضروری ہے۔"

فارس میں رستم کا دبدبہ ایسا تھا کہ میدان جنگ میں اس کا نام فتح کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بہادری اور جنگی مہارت میں اس کا جواب نہ تھا۔ اسی لیے اہل فارس بے تاب تھے کہ رستم مسلمانوں کا زور توڑنے خود نکلے۔

رستم کا میدانِ جنگ میں اترنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ خود یزدجرد اگر میدانِ جنگ میں آتا تو یہی تیاریاں ہوتیں۔ خزانے کے منہ کھول دیئے گئے۔ تمام سرداروں اور صوبہ داروں کو حکم ہوا کہ:

"جو کچھ ہتھیار اور سامان رسد پاس ہو، لے کر ساباط روانہ ہو جاؤ ———!"

ملک کے کونے کونے سے بہادروں اور جوانمردوں کی ٹولیاں میدان جنگ کی طرف چلیں۔ سرحدوں کے دوست قبیلوں کو اکسا کر ساتھ کر لیا گیا۔ ان جنگی تیاریوں کا عراق کے باشندوں پر بڑا گہرا اثر پڑا۔ جہاں جہاں مسلمانوں نے قبضہ کیا تھا وہاں بغاوتیں پھوٹ نکلیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس مرتبہ فارس سے لشکر و سپاہ کا جو طوفان اٹھا ہے۔ وہ مسلمانوں کے روکے نہ رک سکے گا۔

حضرت سعدؓ نے چاروں طرف خبرداروں کو دوڑا رکھا تھا۔ ایک ایک بات کی اطلاع ان کے پاس آتی گئی۔ انہوں نے بھی تفصیل سے ہر بات لکھ بھیجی۔ مدینے سے جواب آیا کہ:

"مجھے لگتا ہوا ہے کہ جب تم دشمن سے لڑو گے تو تم اس کو شکست دے دو گے!"

کیا خط تھا کہ جس نے پڑھا اس کا دل بڑھ گیا۔ اس طرح ڈھارس بندھانے کے بعد ہدایت دی کہ:

"اگر تم میں سے کوئی شخص کھیل کھیل میں بھی کسی عجمی کو امان دے یا ایسا اشارہ کرے یا ایسے الفاظ کہے جن کو عجمی سمجھتے ہوں مگر وہ اس کو امان جانیں تو تم اس امان کو برقرار رکھو۔ ہنسی مذاق سے بچو، وعدے برابر پورے کرو۔ اگر غلطی سے بھی کوئی وعدہ کر بیٹھو تو اسے پورا کرو۔ یاد رکھو اس کا نتیجہ ہمیشہ اچھا ہوگا۔ اگر غلطی سے بھی وعدہ توڑ دو گے تو اس کا انجام برا ہوگا۔ اس سے تمہاری کمزوری اور دشمن کی قوت ظاہر ہوگی ــــــ خبردار! مسلمانوں کی توہین اور ذلت کا باعث نہ بنو"

کسریٰ فوج کی تیاریاں کسی سے چھپی نہ تھیں۔ لشکر کیا تھا، ٹڈی دل تھا کہ بڑھا چلا آ رہا تھا۔ گزشتہ تمام کئے جا سکتے تھے ہے ہو دشمن کی خوفناک ایک ایک پہر کی خبریں آتے۔ حضرت سعدؓ نے بتایا دشمن کی تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ اب کوئی دن کی بات ہے کہ میدان میں کود پڑے گا ــــ تو تازہ ترین تفصیلات امیرالمومنین کی خدمت میں بھیجیں۔

حضرت عمرؓ نے لکھا کہ:

"دشمن کی تیاریوں سے بالکل پریشان نہ ہونا۔ اللہ سے مدد مانگتے رہو اور اسی پر بھروسہ رکھو۔ اب وقت آ گیا ہے کہ دشمن کے پاس دعوت اسلام دینے کے لیے ایک وفد بھیجا جائے۔ خیال رکھو کہ اس وفد میں ایسے لوگ شریک ہوں جن کی شخصیت کا پہلی ہی نظر میں اثر پڑ سکے۔ اللہ اس دعوت کو ان کی ذلت اور ہماری سربلندی کا ذریعہ بنائے گا ــــــ!"

امیرالمومنین کے حکم کی تعمیل میں ایک وفد شہنشاہِ فارس کی خدمت میں بھیجا گیا۔ قادسیہ سے تیس چالیس میل کے فاصلے پر مدائن تھا۔ سلطنتِ عجم کا صدر مقام! مسلمانوں کا جو وفد شہنشاہ سے ملنے چلا اس میں کل چودہ آدمی تھے۔ ان میں شان و شوکت کی کوئی بات نہ تھی۔ پھر بھی یہ اپنے لشکر سے نکلے اور مدائن کی طرف چلے تو انہیں دیکھنے فارس کے لوگوں کا ہجوم ہو گیا۔ مدائن میں تو شہنشاہ کے محل کے اطراف ہزاروں آدمی جمع ہو گئے۔

خیال تھا یہ اسلامی سفیروں کی شان و شوکت دیکھنے کا نادر موقع ہے! یہی تو وہ لوگ تھے جنہوں نے دنیا کی دو سب سے بڑی سلطنتوں کو عاجز کر رکھا تھا۔ لیکن یہاں کچھ اور ہی صورت تھی۔ کسی کے گھوڑے پر زین تھی کسی کے گھوڑے پر زین تک بھی نہیں، ہاتھوں میں کوڑے، پیروں میں پھٹے پرانے موزے، کندھوں پر چادریں، پھٹے جیسے، ستے ہوئے چہرے، لیکن جس ٹھاٹ سے یہ لوگ اپنے گھوڑوں کی ننگی پیٹھ پر سوار تھے وہ دیکھنے کا منظر تھا۔ گھوڑے راستوں میں ٹھہر تے تھے۔ بار بار زمین پر ٹاپیں مارتے۔ ان کے سموں سے اڑتی ہوئی چنگاریاں تماشائیوں پر سواروں کی جرأت و ہمت کا سکہ بٹھا رہی تھیں۔ بار بار ٹاپ مارنے سے جو گرد اڑ رہی تھی اس نے مدائن کے لوگوں کو پریشان کر رکھا تھا۔

محل کے قریب یہ بے سروسامان پہنچے تو اہلِ فارس نے اپنے دشمنوں کو حقارت کی نظر سے دیکھا۔ کیونکہ ان کا حلیہ ہی ایسا تھا۔ چنانچہ پہرہ چوکی والوں نے محلسرا کے دروازے پر روکا اور پوچھا کہ:

"کس لیے آئے ہو؟"

جواب ملا:

"تمہارے شہنشاہ سے ملنا ہے!"

کہا گیا:

"کیا کام ہے؟"

بتلایا گیا:

"اپنے سپہ سالار کا ایک پیغام پہنچانا ہے!"

"یہ اتنا ضروری ہے کہ ہمارے شہنشاہ کے دربار میں باریاب ہونے کی تمہیں عزت بخشی جائے؟" کسی نے مجاہدوں سے پوچھا۔

جواب دیا گیا:

"اپنی جان بچانا چاہتے ہو تو سیدھے سیدھے لے چلو۔ ہو سکتا ہے کہ اس سے تمہیں فائدہ پہنچ جائے!"

"ہمیں تم سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟" ایک اہلکار نے سوال کیا۔ اتنے میں دوسرے نے بڑے جھنجھلے لہجے میں کہا کہ:

"تم اپنی ہیئت تو دیکھو! کام کا ایک ہتھیار تک پاس نہیں، ڈھنگ کا لباس جسم پر نہیں، گھوڑے ننگے، سر برہنہ، آخر کس بوتے پر تم ہم سے لڑنے آئے ہو؟ خوب یاد رکھو منہ کی کھاؤ گے، پٹ کے جاؤ گے!"

ایک مجاہد نے جواب دیا:

"بس یہی تو وہ بات ہے جسے تم سمجھ نہیں سکتے، جاؤ اور اپنے شہنشاہ کو اطلاع کر دو، ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے" ٹاپوں کی آواز سن کر شاہی محل کے ہرکارے چھوٹ چکے تھے۔ تفصیلات معلوم کر کے محل کے حاجب نے یزدجرد کو وفد کے آنے کی اطلاع بھیج دی۔ بہت سوچ بچار کے بعد طے کیا گیا کہ وفد کو باریاب کیا جائے۔ سفید محلے میں وفد باریاب ہوا تو یزدجرد نے بڑی حقارت سے سوال کیا کہ:

"تمہیں یہ جرأت کیسے ہوئی کہ ہمارے ملک میں گھس آئے ہو؟"
اس کے جواب میں حضرت نعمان بن مقرن نے اسے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔

یزدجرد ہنس پڑا۔ بولا:
"کچھ اور ——— ؟"
کہا گیا:
"تمہیں اس دعوت سے انکار ہے تو جزیہ دینا قبول کرو، ورنہ ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلہ تلوار سے ہوگا!"
یزدجرد نے کہا:
"تم لوگ بھوکے ننگے ہم سے کیا مقابلہ کروگے؟ اگر افلاس سے مجبور ہو کر یہاں آئے ہو تو ہم تمہارے اور تمہارے سردار کے کھانے پینے کا انتظام کر دیتے ہیں، تمہیں کپڑے بھی پہنا دیں گے۔ اور تم ہی میں سے کسی سمجھدار آدمی کو تمہارا بادشاہ بنا دیں گے جو ہمارے حکم سے تم پر مہربانی اور شفقت سے حکومت کرے گا۔"
یہ سن کر حضرت مغیرہ بن شعبہؓ آگے بڑھے اور بڑی نرمی سے اسے اسلامی تعلیمات کا کچھ حال بتایا۔
یزدجرد بگڑ گیا۔ بولا:
"اگر سفیروں کا قتل نامناسب نہ ہوتا تو اسی وقت تم سب کی گردنیں اڑا دی جاتیں ——— میں تمہیں بتاؤں تمہاری کیا حیثیت ہے!"

پھر مڑ کر ایک طرف دیکھا اور حکم دیا کہ "مٹی کا ایک ٹوکرا لایا جائے۔"
اتنے میں ایک خدمت گار مٹی کا ٹوکرا لے آیا۔ یہ ٹوکرا آیا تو بولا
"ان میں سے جو سب سے معزز ہے اس کے سر پر یہ ٹوکرا رکھ دو اور ان سب کو ہانک کر مدائن کے باہر نکال دو۔"
پھر گرج کر وفد سے بولا کہ:
"میں تمہاری سرکوبی کے لیے رستم کو بھیج رہا ہوں! یاد رکھو! وہ قادسیہ کی خندق میں تمہیں دفن کر دے گا۔"
عاصمؓ بن عمرو پاس ہی کھڑے تھے بولے کہ:
"میں ان سب میں سے معزز ہوں۔ لاؤ ٹوکرا میرے حوالے کر دو!"
بسم اللہ کہہ کر انہوں نے چوب دار شاہی سے ٹوکرا لیا اور اپنے گھوڑے پر جا بیٹھے۔
ان کے ساتھ ہی وفد کے دوسرے ارکان بیٹھے اور گھوڑے اڑاتے اپنے پڑاؤ کی طرف چل دیئے۔ حضرت سعدؓ کی خدمت میں پہنچ کر عاصم بولے:
"لیجئے مبارک ہو! انہوں نے اپنی زمین خود ہی ہمیں دے دی۔ دوستو! اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ ان کے ملک کی کنجیاں اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا فرما دیں۔"
یہ قادسیہ میں مسلمانوں کی فتح کی پہلی بشارت تھی۔

آپ کے نفسیاتی اور گھریلو مسائل

نہ جانے کتنے گھر چھوٹے چھوٹے گھریلو مسائل کے سبب اُجڑ جاتے ہیں اور نہ جانے کتنی زندگیاں چھوٹی چھوٹی نفسیاتی الجھنوں کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔
ہم میں سے بیشتر لوگ نہیں جانتے کہ خود ہمارے اندر ایسی صلاحیتیں موجود ہیں جنہیں بروئے کار لاکر ہر قسم کی پریشانیوں پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

ہم یہ اعلان کرنے میں دلی مسرت محسوس کرتے ہیں کہ ملک کے ایک نامور ماہرِ نفسیات نے ہماری درخواست پر "دوشیزہ" کے صفحات پر ان خواتین و حضرات کو مفید مشورے دینے کا وعدہ کر لیا ہے جو نفسیاتی یا گھریلو الجھنوں سے پریشان ہیں۔ یہ سلسلہ آئندہ شمارے سے دوبارہ شروع کر دیا جائے گا۔ آپ اپنے مسائل ہمیں لکھ بھیجیں۔ لیکن اس ضمن میں چند باتوں کا ضرور خیال رکھیں: (۱) اپنے خطوط میں صرف ضروری باتیں لکھیں غیر ضروری باتیں لکھ کر خط کو ہرگز طول نہ دیں، (۲) تحریر صاف اور خوشخط ہو۔ کاغذ کے صرف ایک طرف لکھیں۔

تاریخ انگلستان کی لازوال عشقیہ داستان

ھار جیت

ایک طرف عظیم الشان برطانوی سلطنت کا تخت تھا۔ اور دوسری طرف اس کے دل کی دنیا تھی۔ اس نے سب کچھ ھار کر اپنے پیار کی بازی جیت لی؛
ایک عظیم شہنشاہ کی عظیم رومانی کہانی

منورہ نوری

ان دنوں انگلستان میں شہنشاہ جارج پنجم کے بڑے بیٹے شہزادہ ایڈورڈ ہشتم کی شخصیت اور سب سے جدا گانہ طبیعت کا بڑا چرچا تھا۔ ایڈورڈ ہشتم جو بعد میں ڈیوک آف ونڈسر کہلایا۔ ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوا۔ وہ بچپن سے ہی دیگر شہزادوں سے مختلف تھا۔ وہ محبت کا قائل تھا نہ عالم شباب اسے زیر کر سکا اسی لئے اس نے مجرد رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ لندن کی حسین ترین لڑکیاں اس کے سامنے پیش کی گئیں جنہوں نے اسے محبت کے دام میں پھانسنے کے لئے ہر تدبیر آزمائی جارج پنجم نے بھی اصرار کیا اور آرچ بشپ نے بھی زور دیا مگر نہ بے پناہ حسن اسے متاثر کر سکا نہ باپ کا اصرار اور نہ پیشوایان دین کی نصائح۔

پرنس شکار کا شوقین، شہ سواری کا دلدادہ اور مطالعہ کا عادی تھا۔ شکاری کتوں سے بھی اسے دلچسپی تھی۔ زندگی کو سادے طریقوں سے گزارنا اسے پسند تھا جس کی اسے اجازت نہ تھی۔ گو کہ شہزادگی کے زمانہ میں ہی دستور کے مطابق لباس تبدیل کرنا اور تقریریں براڈ کاسٹ کرنا اس کے لئے ضروری تھا مگر جب وہ ان پابندیوں سے تھوڑے آزاد ہوتا تو سردیاں گزارنے کے لئے جنوبی امریکہ چلا جاتا۔ وہاں پر کبھی کبھی ایک عام انسان کی طرح تفریح کرتے یا شکار کھیلتے ہوئے وہ زندگی کو بڑا ہلکا پھلکا اور آسان تصور کرنے لگتا۔ ۱۹۳۱ء میں ایسا ہی ایک زمانہ تھا جب وہ اپنے ایک بھائی جارج کے ہمراہ شہر سے باہر مشہور شکارگاہ ملٹن موبرے گیا۔ پرنس کی عمر اس وقت سینتیس برس ہو چکی تھی۔ اس کی جدت پسند فطرت دیکھنے والوں کو چونکا دیتی تھی مگر اس کی زندگی ابھی تک ہر قسم کی بے راہ روی اور محبت و عشق سے پاک تھی۔ ملٹن موبرے میں ایک شام پرنس کی ملاقات مسز سمپسن سے ہوئی جس کا اصل نام ولیس تھا جسے کسی کھیل یا کسی شوق سے دلچسپی نہ تھی حتیٰ کہ شہ سواری اور شکاری کتوں سے بھی اسے رغبت نہ تھی جو معزز خواتین کا خاص مشغلہ سمجھا جاتا تھا۔ اس نوجوان خاتون نے پرنس کو چونکا دیا۔ مسٹر سمپسن نے ملٹن موبرے میں شکار کے لئے آنے والے اس شاہی خاندان کو اپنے گھر ضیافت دی۔ ولیس کا مکان بڑا مختصر تھا مگر ولیس نے اسے سجانے میں کمال کر دیا تھا۔ پرنس کو زندگی میں پہلی بار محسوس ہوا کہ زندگی کا سب سے بڑا حسن سادگی اور بے تکلفی میں پنہاں ہے۔ اس نے کھلے دل سے سوال کیا۔

"مسز سیمسن! کیا یہ سب سجاوٹ آپ نے کی ہے؟"

"پرنس!" مسز سیمسن بولی۔ "جی ہاں میرے شوہر نے کہا تھا کہ شاہی خاندان کے اعلیٰ افراد ہمارے مہمان بننے والے ہیں۔ میں آپ جیسی ذی مرتبت ہستی کے لئے بہترین جذبات کا اظہار کرنا چاہتی تھی اور میرے خیال میں اظہار جذبات کا بہترین طریقہ یہی تھا۔"

اس جواب پر پرنس بہت خوش ہوا کہ اس کے احساسات کو ولیس کی زبان مل گئی ہے۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اس کی گہری گہری بھوری آنکھوں میں محبت ڈول گئی اور ولیس نے ستائش کے اس انداز پر ان نظروں کی تاب نہ لا کر آنکھیں چرا لیں۔ اس انداز پر پرنس ایک دم سنبھلا اور مسٹر سیمسن کی طرف دیکھ کر بولا۔

"مسٹر سیمسن! میں آپ کی بیوی کی بے پناہ ذہانت پر آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔"

"پرنس!" مسٹر سیمسن نے جھک کر کہا۔ "یہ میری خوش بختی ہے کہ ولیس کے خیالات کی آپ نے تعریف فرمائی۔"

یہ ملاقات خاصی طویل ہو گئی۔ مسٹر سیمسن دیگر شاہی مہمانوں کی خاطر و مدارات میں مصروف رہا اور ولیس سیمسن پرنس سے ایک الگ تھلگ گوشہ میں محو گفتگو رہی۔ اس وقت پرنس نے ولیس کی اس درجہ تعریف کی کہ اسے محسوس ہوا کہ اس قدر ستائش اسے پہلے کبھی نصیب نہیں ہوئی۔ یہ عجیب سی بات تھی پرنس نے بہت سی حسینائیں دیکھی تھیں مگر عشوہ طرازیوں کے نت نئے انداز، اظہار محبت کے انوکھے ڈھنگ اور لندن کی ساحرانہ حسن رکھنے والی جوانیاں کوئی چیز بھی پرنس کو متوجہ نہ کر سکی تھی مگر ولیس کے سادہ انداز، بے ساختہ طرز گفتگو اور علمی و ذہنی پختگی نے اسے مرعوب کر دیا تھا، اور ولیس بھی جو اپنے شوہر کے ساتھ کامیاب زندگی گزار رہی تھی پرنس سے متاثر ہو گئی تھی۔ پرنس نے اپنی صاف دل عادت کے مطابق ولیس کے ہاتھ تھام کر کہا۔

"ولیس! میں محسوس کرتا ہوں کہ فطرت نے ہم دونوں کی روحوں کو ایک وقت میں بنایا تھا۔ مجھے تمہارے انداز و اطوار سے اس کہنہ نظام سے بغاوت کی بو آتی ہے اور میں خود بھی رسموں اور کہنہ رواجوں کا قائل نہیں۔ اس مختصر ملاقات میں میں نے محسوس کیا کہ ہماری سوچیں اور ہمارے احساسات ایک جیسے ہیں۔"

ولیس نے ایک نظر پرنس کو دیکھا تو اس نے محسوس کیا کہ ولیس کے لب کپکپا رہے تھے مگر اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں۔

"ڈیئر پرنس! مجھے محسوس ہوتا ہے کہ مجھے گوہر مقصود آج ملا ہے۔ میرے جسم میں تمہاری روح ہے، میرے سینہ میں تمہارا قلب ہے۔ میرا جسم بے شک جدا ہے مگر سب کچھ تمہارا ہے۔ میں خود تمہاری ہوں صرف تمہاری۔"

پرنس مشن ہیوسے سے واپس آیا تو اس کی سوچوں میں انقلاب آ چکا تھا۔ ابھی تک جس ذہن نے کسی کے بارے میں نہ سوچا تھا وہ اب بار بار ایک منفرد انداز رکھنے والی ایک حسین خاتون کے لئے سوچ رہا تھا اور جو دل ابھی تک کسی کے لئے نہ دھڑکا تھا ایک شادی شدہ عورت کے لئے دھڑک رہا تھا۔ ہر دھڑکن میں ولیس ولیس کہہ رہی تھی۔

اس ملاقات کے بعد ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا گو کہ ایک پرنس اور ایک بیاہتا عورت کی دوستی عوام سے چھپی نہ رہ سکتی تھی مگر ان دونوں کو اس کی پرواہ نہ تھی۔ ایک دفعہ وہ لندن کی ایک پارٹی میں ملے پرنس نے مسکرا کر کہا۔

"مسٹر سیمسن! آپ کے ساتھ جو خاتون کھڑی ہیں میرا خیال ہے میں ان سے پہلے بھی مل چکا ہوں۔"

اس فقرہ پر ولیس نے چونک کر پرنس کو دیکھا وہ کبھی پرنس اسے بھول گیا مگر پرنس کی حسین بھوری بھوری آنکھوں سے شرارت عیاں تھی۔ چاہت کی چمک ان میں اس درجہ نمایاں تھی کہ ولیس کے ہاتھ کانپ گئے۔ مسٹر سیمسن نے اس بات کو محسوس کیا یا نہیں مگر کئی نظروں نے اسے تاڑ لیا۔ مگر ولیس پرنس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دھڑکتے دل کے ساتھ پرنس کی آنکھوں سے جھلکنے والے رنگوں کے پس منظر پر غور کرتی رہی، وقت گزرتا رہا، پرنس مسکراتا رہا اور ولیس تکتی رہی۔ اسے محسوس ہوا کہ ہیروں کی طرح چمکتی ہوئی دو آنکھیں وہ خوبصورت دریچے ہیں جن کے ذریعے وہ پرنس کے دماغ کی اس وسیع دنیا کی سیر کر رہی تھی جو اس دنیا سے الگ تھلگ اور نرالی تھی اور جہاں صرف وہی تھی۔ دیر تک یہ آنکھ مچولی جاری رہی پھر ہر طرف سے اخبار والوں نے پرنس کو گھیر لیا اور اگلے دن ایک ہی خبر کئی اخبارات کی زینت بنی ہوئی تھی۔ "پرنس اور مسز سیمسن کی دوستی" ان اخباروں میں ولیس کے حسن کی تعریف بھی کی گئی تھی۔ اس شام پرنس محل میں اپنی نشست گاہ میں بیٹھا ہوا ٹیلی فون پر ولیس کی نرم و لطیف آواز اور شیریں لہجہ



سے سکون پا رہا تھا۔ ولیس کا انداز گھبرایا ہوا تھا۔ وہ بولی "پرنس! آج آپ نے اخبارات دیکھے ہیں؟"

"ہاں" پرنس نے مسکرا کر کہا "کسی بھی اخبار نے کوئی نئی بات تو نہیں شائع کی۔"

"مگر" ولیس نے اٹکتے ہوئے کہا "کیا... ہمارے بارے میں انہیں... یہ بات شائع کرنی... چاہیئے تھی؟"

"انہیں اس سے بھی زیادہ شائع کرنی چاہیئے تھی" پرنس نے اطمینان سے کہا "کیونکہ پیاری ولیس! حقیقت تو اس سے بھی زیادہ ہے انہوں نے تو صرف دوستی کے بارے میں لکھا ہے اور ہم تو محبت کرتے ہیں۔"

"مگر... یہ بات تو بدنامی کا باعث ہوگی۔"

"تم بدنامی سے ڈرتی ہو" پرنس نے پیار سے ولیس کی بات قطع کی "ڈیر ولیس آنے والے حالات کا مقابلہ مجھے کرنا ہے تمہیں نہیں، میرے ہوتے ہوئے تمہیں ڈرنا نہیں چاہیئے۔"

یہ جواب بذات خود اس کے جذبات کا مکمل اظہار تھا۔

ولیس مطمئن ہو گئی، اس کے بعد ملاقاتیں طویل ہونے لگیں، ولیس ہر شام خوبصورت لباس زیب تن کر کے پرنس سے ملنے آتی ہر شام ایک نئی شان ہوتی، نیا جلوہ ہوتا اور پرنس نئے انداز سے مسحور ہوتا، آہستہ آہستہ مسٹر سیمسن صرف نمائشی شوہر رہ گیا اور مسز سیمسن نام کی بیوی۔ اب شاہی گھوڑا گاڑی چھوڑ کر پرنس کار استعمال کرنے لگا تھا۔ یہ کار شہر سے باہر جاتی، کبھی مضافات میں، کبھی الگ تھلگ شکارگاہوں میں جہاں پرنس بڑے مسرور دن اور رنگین راتیں گزارتا۔ یہ محبت عام ہوتی گئی۔ امریکن اور انگلش اخبارات چیختے رہے۔ نئی نئی افواہیں شائع کرتے رہے خوبصورت تصویریں چھاپتے رہے نامعلوم ذریعوں سے ولیس کو ان اخبارات کے تراشے ملتے رہے، وہ ہر طرف سے طنزیہ زہریلی باتیں سنتی رہی مگر چند گھنٹوں کی پرنس کی صحبت اسے سب کچھ بھول جانے پر مجبور کر دیتی وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے اور بدنامی کا ہر احساس اور مستقبل کی ہر فکر سے بے نیاز ہو جاتے۔

پرنس کی پراثر شخصیت نے ولیس کو اور ولیس کے ساحرانہ حسن اور فسوں ساز نظروں نے پرنس کو مسحور کر دیا تھا۔ دوستی بڑھتی گئی ملاقات کے اوقات طویل تر ہوتے گئے یہ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ جب شب گہری ہوتی تو مسٹر سیمسن اپنی حسین بیوی کو خفیہ طور پر شاہی محل کے اس حصہ میں چھوڑ آتا جہاں پرنس قیام پذیر تھا اور ولیس صبح واپس لوٹ آتی۔ بارہا ایسا بھی ہوتا کہ پرنس شکار کے لئے شہر سے نکلتا تو مسٹر سیمسن اور مسز سیمسن بھی اس کے ساتھ ہوتے جہاں یہ نمائشی شوہر شکارگاہ میں ٹھہرائے گئے کسی قیام گاہ کے باہر پہرہ دیتا اور ولیس پرنس کی باہوں میں رات گزار دیتی۔

اسی دوران ایک زمانہ ایسا بھی آیا جب مسٹر سیمسن کا کنبہ برنسٹن سکوائر کے ایک خوبصورت فلیٹ میں منتقل ہو گیا۔ بعض لوگوں کا خیال تھا یہ فاصلہ پرنس اور ولیس میں دوری پیدا کر دے گا لیکن یہ خیال خام تھا۔ پرنس باقاعدہ لندن آتا اور برنسٹن میں قیام کرتا۔ اس وقت مسٹر سیمسن اپنی خوابگاہ خالی کر دیتا، دن میں بھی اس کی حیثیت صرف ایک ماتحت کی ہوتی، پرنس کبھی بے تاب ہو کر اس کی بیوی کو بازوؤں میں لے لیتا یا اس کا بوسہ لیتا تو مسٹر سیمسن کمرہ سے نکل جاتا یا اسی جگہ کسی کام میں مصروف ہو جاتا۔ وہ صرف اس انتظار میں تھا کہ کب پرنس حکم دے اور کب وہ ولیس کو طلاق دے کر دست بردار ہو جائے مگر پرنس کو ابھی اس کی ضرورت نہ تھی۔

ولیس ایسی ہی تھی، ہر نئی ملاقات اسے اس کا گرویدہ بنا رہی تھی۔ وہ دونوں گھنٹوں باتیں کرتے۔ چیانگ کائی شیک کی، ہٹلر کی، مسولینی اور اسٹالن کی اور ہر بار ولیس اپنی خوبصورت گفتگو سے پرنس کو متاثر کر دیتی۔ وہ بیرونی دنیا کے سیاسی حالات اور مقامی معاملات پر بڑی خوبصورت تقریریں کر سکتی تھی۔ لندن سے شائع ہونے والا ہر اخبار اس کے زیر مطالعہ آتا اور ملک میں شائع ہونے والی ہر نئی کتاب سب سے پہلے اسے ملتی، اس لئے اس کا علم ہر موضوع پر اتنا تھا کہ کوئی عورت اس کی برابری کا دعویٰ نہ کر سکتی تھی۔ ولیس کی عادات و فضائل اور قابل ستائش معلومات اور اس کی شخصیت کا سحرانگیز حسن پرنس کو پوری طرح مسحور کر چکی تھیں۔

آخر وہ زمانہ بھی آ گیا جب پرنس نے اسے ہمیشہ کے لئے اپنانے کا فیصلہ کر لیا۔ ستمبر کی خوبصورت صبح تھی ان دنوں پرنس لندن میں تھا اور ولیس اپنا ڈریس سلوانے کے لئے پیرس گئی ہوئی تھی تو اس دوری سے گھبرا کر پرنس نے ٹیلیفون کیا اس گفتگو کو کئی افراد نے سنا۔ پرنس نے شکایت آمیز انداز میں کہا۔

"ولیس! جانتی ہو میں لندن میں بالکل تنہا ہوں۔"

"اتنے افراد کی موجودگی میں بھی" ولیس نے شرارت سے

ہنس کر کہا۔

"تم تو نہیں ہونا" پرنس نے گلہ کیا۔ "دس منٹ کے اندر اندر لوٹ آؤ دیکھو میں یہ تنہائی برداشت نہیں کر سکتا۔"

"پرنس" ولیس نے کہا۔ "میرا ٹیلر دس منٹ میں لباس تیار نہیں کر سکتا کم از کم ایک شب لگے گی۔"

"اف ایک شب" پرنس نے پریشان ہو کر جواب دیا "مگر پیاری میں یہ ایک شب کیسے گزاروں گا؟"

"کوئی اور کام کر لیجئے" ولیس نے مسرور ہوتے ہوئے سمجھایا۔ "مدت گزر جائے گی۔ اخبارات کی کٹنگ جو میں نے آپ کو دی تھیں وہ اس قدر ہیں کہ آپ ایک کمیٹی بھی ان کے پڑھنے کو قائم کریں تو چھ ماہ میں ان تراشوں کو مکمل نہ پڑھ سکے گی۔ انہیں پڑھ لیجئے، ورنہ پرانی تصاویر دیکھئے، اگر یہ بھی نہیں تو حسین تصورات تو وقت کا احساس مٹا دیتے ہیں۔"

"آج تم مجھے باتوں سے مطمئن کرنا چاہتی ہو" پرنس نے محبت آمیز لہجہ میں کہا۔ "خیر چلو شب تو تمہارے حسین تصور میں گزر جائے گی مگر اگلی صبح میں کیا کروں گا؟"

"اف توبہ" ولیس کھلکھلا کر ہنسی۔ "صبح آپ چرچ تشریف لے جائیے گا صبح کٹ جائے گی۔"

"چرچ؟" پرنس نے حیران ہو کر کہا۔ "پیاری یہ کام تو میں نے کبھی نہیں کیا۔ میں تو چرچ اور آرچ بشپ دونوں سے بھاگتا ہوں۔ چرچ کی عمارت اور آرچ بشپ کی شکل دونوں مجھے پابند ہونے کا احساس دلاتے ہیں۔"

"لیکن آخر آپ مذہب کے محافظ ہیں" ولیس نے یاد دلایا۔ "آپ کو کبھی تو چرچ جانا چاہیئے۔"

اس گفتگو کے بعد دونوں ہنس دیئے مگر پرنس کو احساس ہو گیا کہ وہ ولیس کے بغیر جسم بے روح کی طرح ہے۔ یہ رات بمشکل گزارنے کے بعد وہ اگلی صبح عمر میں پہلی مرتبہ چرچ گیا جہاں اس نے عبادت کی اور دل کی گہرائیوں سے فیصلہ کیا کہ ولیس کو سمپسن سے طلاق دلوائے گا اور شادی کر لے گا۔ اسی دن ولیس پیرس سے لباس تیار کروا کر واپس آ گئی۔ پرنس یوں ملا جیسے برسوں سے بچھڑا ہوا تھا پھر اس نے اپنے فیصلے سے ولیس کو آگاہ کیا تو وہ قدرے متفکر ہو کر بولی۔

"پرنس! کہیں ہماری شادی آپ کو مشکلات میں مبتلا

اظہارِ رائے کی آزادی

جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ ہوئے اور تمام اسلامی سلطنت زیرِ نگیں ہو گئی تو ایک دن انھوں نے منبر پر خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے کہا کہ اے مسلمانو اب میں تمہارا امیر ہوں، میری اطاعت تم پر فرض ہے۔ اگر میری کوئی بات شریعت کے خلاف ہوئی ہو تو تم میرے ساتھ کیا کرو گے؟

تھوڑی دیر مجمع پر خاموشی طاری رہی پھر ایک شخص اٹھا۔ اس نے تلوار نیام سے نکالی اور کہا کہ اے عمر تم یہ پوچھتے ہو کہ ہم تمہارا کیا کریں گے۔ تو سنو اگر تمہاری کوئی بات شریعت کے خلاف ہوئی تو ہم اس تلوار سے تمہارے بل نکال دیں گے۔

نہ کرے۔ آپ پرنس ہیں مستقبل کے شہنشاہ ہیں جو پارلیمنٹ کے فیصلے کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا کیا آپ نے اس پہلو پر غور کیا ہے؟"

"ولیس" پرنس نے اسے بازوؤں میں بھینچ لیا "شادی میرا ذاتی معاملہ ہے میری مرضی سے طے ہوگا۔"

"مگر آپ ایک بہت بڑی رکاوٹ کو نظر انداز کر رہے ہیں" ولیس نے اس کے کندھے پر سر رکھ کر کہا۔ "اور یہ رکاوٹ ۱۷۷۲ء کا رائل میرج ایکٹ ہے جس کی رو سے شہزادے اور شہزادیوں کی شادیاں اول شہنشاہ کے اختیار میں ہوتی ہیں یا پھر پارلیمنٹ کے اختیار میں ہوتی ہیں۔ ان کی اپنی کوئی مرضی اور رائے نہیں ہوتی۔"

"اسی لئے تو مطمئن ہوں" پرنس نے ولیس کو اطمینان سے اٹھا کر اپنے سامنے بٹھا لیا۔ "میری شادی کے معاملے میں اگر میرے والد مختار ہیں تو مجھے کوئی تردد نہیں۔ میں ولیعہد ہوں اور وہ مجھے سب اولاد سے زیادہ چاہتے ہیں۔"

"پھر آپ ان سے بات کر لیں" ولیس نے محبت سے اس کے گلے میں بانہیں حمائل کر دیں۔

پرنس اس گفتگو کے بعد موقع کی تاک میں رہا کہ کب وہ اپنے باپ جارج پنجم سے اپنی شادی کے لئے اجازت طلب

کر سکا مگر مصروفیات کے باعث یہ موقع نہ ملا۔ ۱۹۳۵ء میں جارج پنجم کی شہنشاہیت کا پچیسواں برس تھا اور تمام سلطنت کے قرب و جوار میں سلور جوبلی منائی جا رہی تھی، اس ہنگامے میں بھی پرنس حد درجہ مصروف ہوا۔ کبھی شہنشاہ کو وقت نہ ملا۔ آخر برطانیہ کے طول و عرض میں بڑی شان سے سلور جوبلی منائی گئی۔ اب وقت آیا تھا کہ پرنس حرف مدعا زبان پر لاتا کہ شہنشاہ جارج پنجم بیمار ہو گیا۔ پرنس نے فیصلہ کیا کہ تندرست ہوتے ہی اپنی خواہش کا اظہار کرے گا مگر ۱۹۳۶ء میں ستر برس کی عمر پاکر جارج پنجم اس دار فانی سے کوچ کر گیا اور ولی عہد پرنس ایڈورڈ ہشتم تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوا۔

اب وہ پرنس نہیں شہنشاہ تھا، سلطنت برطانیہ کا عظیم شہنشاہ۔ اس نے نئی ذمہ داری سنبھالی تو دنیا کے مختلف حصوں اور مختلف حکمرانوں کے پیغام تہنیت موصول ہونے شروع ہوئے اور دستور کے مطابق لوگ اس کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ شہنشاہیت کا اولین دن بڑی مصروفیت میں گزرا۔ اس شام اس نے بکنگھم محل میں جا کر اپنی ماں کی خدمت میں تعظیمی ملاقات کی پھر اپنے خاص کمرہ میں اپنے دوسرے بھائی شہزادہ ڈیوک آف یارک سے ضروری گفتگو کرنے لگا مگر ابھی تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ اسے پیغام ملا کہ انگلستان کے چرچ کا سربراہ لاٹ پادری ملاقات کرنا چاہتا ہے۔ لاٹ پادری کی حیثیت سلطنت کے سب سے ذی مرتبت آدمی کی حیثیت تصور کی جاتی تھی۔ مذہبی طور پر اس کا ہر فیصلہ حرف آخر ہوتا تھا کہ اس کے حکم سے شہنشاہ بھی سرتابی کی مجال نہ کر سکتا تھا، ویسے بھی تمام شاہی خاندان کے لئے لاٹ پادری اس لئے بھی اہم تھا کہ وہ جارج پنجم کا دوست رہ چکا تھا اور دیگر شہزادوں کی طرح ایڈورڈ ہشتم بھی اس کی شخصیت سے متاثر تھا۔ بچپن میں تمام شہزادوں کے ساتھ اس نے بھی چرچ کے آداب اور مذہبی علم لاٹ پادری ہی سے سیکھے تھے لہٰذا جوں ہی اس کی آمد کی خبر آئی ایڈورڈ ہشتم نے اذن باریابی عطا کیا اور شہزادہ ڈیوک آف یارک اس سے اجازت لے کر رخصت ہو گیا۔ لاٹ پادری کمرہ میں داخل ہوا تو ایڈورڈ ہشتم نے ہمیشہ والے پُر وقار انداز میں اس کا استقبال کیا۔ لاٹ پادری نے کہا۔

"میں ہز رائل ہائی نس پرنس ایڈورڈ کو اس عظیم ذمہ داری کے سنبھالنے پر مبارک باد دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں۔"

"میں معزز پادری کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔" ایڈورڈ ہشتم نے جواب دیا تھوڑے توقف کے بعد پادری نے بڑی ہوشیاری سے کہا۔

"شہنشاہ! میں آپ کو ایک اور ذمہ داری کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ آپ برطانیہ کے نئے شہنشاہ ہیں، آپ کو شاہی خاندان کے دستور کے مطابق اب کسی شاہی خاندان کی عورت کو ملکہ کا اعزاز عطا کرنا چاہیئے تاکہ پچھلے چند برس سے عوام پر جو تاثر قائم ہو چکا ہے وہ مٹ جائے۔"

ایڈورڈ نے ناگواری سے لاٹ پادری کی طرف دیکھا وہ ہزار بھی ملک میں باعزت اور شاہی خاندان کے لئے اہم تھا مگر اس کے عشق کے معاملات میں دخل دینا اسے گوارا نہ تھا۔ لاٹ پادری نے فوراً بات بدلی اور خوشامد کے انداز میں بولا۔

"شہنشاہ جب کبھی آپ کے والد نے تنہائی میں مجھ سے آپ کے بارے میں گفتگو کی میں نے ہمیشہ آپ کی تعریف کی۔"

"میرے والد نے میرے بارے میں آپ سے کیا دریافت کیا؟" ایڈورڈ نے چونک کر دیکھا۔

"آپ کے کردار کے بارے میں۔" لاٹ پادری نے جلدی سے کہا۔ "جن دنوں اخبارات آپ کے اور مسز سمپسن کے بارے میں افواہیں پھیلا رہے تھے ان دنوں شہنشاہ نے مجھ سے دریافت کیا تھا تو میں نے آپ کی حمایت کی تھی اور کہا تھا یہ دوستی وقتی ہے۔"

پادری کی یہ بات بیک وقت دو باتوں کی طرف اشارہ تھی اوّل یہ کہ وہ اپنی صفائی پیش کر رہا تھا اور دوسری بات یہ کہ اشاروں کنایوں میں یہ بات واضح کر رہا تھا کہ شہنشاہ ایڈورڈ ہشتم نے اگر ولیس سے شادی کا ارادہ کیا تو چرچ کی حمایت نصیب نہ ہوگی۔ شہنشاہ کو یہ بات سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ اس نے محسوس کیا کہ پادری اس کی محبت اور محبوبہ کا سخت مخالف ہے چند منٹ رسمی گفتگو ہوتی رہی مگر شہنشاہ کے انداز سے اب وہ گرمجوشی عیاں نہ تھی جو وہ ہمیشہ پادری کو دیتا تھا اور جب لاٹ پادری واپس ہوا تو شہنشاہ اپنے اور چرچ کے درمیان ایک ناقابل عبور فاصلہ محسوس کر رہا تھا۔

اس رات شہنشاہ سو نہ سکا وہ عہد رفتہ کا تصور کرتا رہا، جب وہ ہر طرح آزاد تھا مگر اب وہ ایک شہنشاہ تھا۔ اپنی قوم کا نمائشی حکمران، جسے اپنے معاملات میں کوئی آزادی حاصل نہ تھی

اس کے خیالات، تصورات، امیدیں، آرزوئیں اور عمل و قول سب پر دوسروں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ ایک عظیم مرتبہ عطا کرنے کے بعد اس سے سب کچھ چھین لیا گیا تھا، اب سب کچھ ایک شاہی طبقہ کے قبضۂ قدرت میں تھا وہ چاہتا تو اسے زندگی دے دیتا اس کی خوشیاں اسے لوٹا دیتا اور اگر چاہتا تو اسے موت دے دیتا لمحہ لمحہ کی موت جو حقیقی موت سے بہت زیادہ اذیت ناک تھی۔ حالات بڑا عجب موڑ اختیار کر چکے تھے اور وہ وقت تھا کہ کوئی بھی بلند مرتبہ انسان فرض اور محبت کی کشمکش کا شکار ہو کر الجھنوں کا شکار ہو سکتا تھا۔ ایک طرف عوامی حاکمیت ترقی کر رہی تھی وقت کے ساتھ ساتھ اقتدار پارلیمنٹ کے توسل سے عوام کے ہاتھوں میں منتقل ہو رہا تھا۔ بادشاہ کی حیثیت نمائشی رہ گئی تھی۔ وہ ملکی سیاست سے خارج تصور کیا جاتا اور وزیر سیاہ و سفید کا مالک تصور کیا جاتا تھا (اگر یہ کہہ دیا جائے کہ کابینہ نے انتظامی معاملات میں شہنشاہ کی جگہ سنبھال لی تھی تو غلط نہ ہوگا) دوسری طرف شہنشاہ کی محبوبہ اور اس کی لازوال محبت، ان حالات میں ایڈورڈ ہشتم کی کیفیت کیا تھی، اس کا اندازہ اسے خود ہی تھا اس زمانہ میں عوام کا نمائندہ وزیر اعظم مسٹر بالڈون تھا جو فی الحال خاموشی سے حالات کا جائزہ لے رہا تھا، مگر ایڈورڈ ہشتم کو یقین تھا کہ وہ بھی اس کی حمایت نہ کرے گا مگر ان تمام مشکلات کے باوجود وہ اپنی محبت سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہ تھا لہٰذا ولیس سے اب بھی ملاقات ہوتی گو کہ اب وہ پہلی والی آزادی تو نہ تھی مگر شہنشاہیت ان دونوں کی محبت میں رکاوٹ نہ بن سکتی تھی۔ ایڈورڈ ہشتم شاہی خاندان کا وہ فرد تھا جس کی فطرت ہمیشہ سے دیگر شہزادوں سے جدا تھی اور وہ شہنشاہ کے علاوہ خود کو ایک انسان بھی سمجھتا تھا اور انسان ہونے کے ناطے محبت کرنا اس کا حق تھا۔ وہ اب بھی باقاعدہ شہنشاہوں والی بگھی کے بجائے کار میں سفر کرتا، ولیس اس کے ساتھ ہوتی کبھی وہ کسی عام سی جگہ گاڑی روک کر نظارہ بھی کرتے کبھی کسی عام تفریح گاہ میں تفریح کرتے اور کبھی کسی معمولی ہوٹل میں کھانا بھی کھاتے، یہ زندگی انہیں بڑا سکون دیتی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ولیس کی داستانیں اور شہنشاہ کے عشق کے قصے امریکی اور برطانوی اخبارات کی زینت بننے لگے۔ خوبصورت الفاظ کے ساتھ وہ وہ قیاس آرائیاں ہوتیں کہ عوام میں غلط فہمی عام ہونے لگی جگہ جگہ یہی قصے یہی واقعات موضوع بن گئے کسی اخبار نے لکھا۔

"مسز سیمپسن کے حسن کی قوت ہر سحر سے بڑھ کر ہے جسے عام لوگ نہیں سمجھ سکتے۔"

کسی پرچہ نے تعریف کی "امریکی خاتون مسز سیمپسن کلوپیٹرا اور ہیلنا سے بڑھ کر حسین ہے اس کی ساحرانہ قوت، زہرہ اور مشتری سے زیادہ ہے" کسی نے اس کی آنکھوں کو موضوع بنایا کسی نے روشن جبین کو، کسی نے کہا اس کا قد قیامت خیز ہے، کسی نے کہا جسم پرکشش ہے، کہیں آنکھوں کو چھلکتے پیمانے قرار دیا گیا تو کہیں رخساروں کو گلاب سے تشبیہ دی گئی۔ لیکن ولیس کی ہر ہر تعریف میں تضحیک کا پہلو نمایاں تھا ہر خبر کا اختتام اس انداز پر ہوتا کہ پڑھنے والے محسوس کرتے کہ ولیس ایک ایسا جال ہے جو شہنشاہ وقت کو پھانس رہی ہے۔ چند اخبارات نے غیر محتاط انداز میں اس معاملے کو ہوا دی لیکن باقی اخبارات سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ ان دونوں کے خلاف ایک سازش ہے جس میں ملک کے اعلیٰ افراد بھی شامل ہیں۔ خوبصورت انداز میں شہنشاہ کو بدنام کر کے ولیس کو اس کا ذمہ دار ٹھہرانا بڑا شدید ظلم تھا۔ عوام میں یہ موضوع عام تھا کہ شہنشاہ جس نے مجرد رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا جسے شاہی خاندان کی کوئی حسین سے حسین شہزادی بھی اپنی جانب مائل نہ کر سکی، وہ گرفتارِ حسن ہوا بھی تو کس کا؟ ایک بیاہتا عورت کا۔ ان ہی دنوں ایڈورڈ ہشتم نے پیرس کے ایک بڑے ہوٹل میں ولیس سے ملاقات کی۔ ولیس نے متفکرانہ انداز میں کہا۔

"شہنشاہ! میں سمجھتی ہوں اخبارات جو ہمارے خلاف بیان دے رہے ہیں ان سے عوام ایک دم ہمارے خلاف ہو گئے ہیں، اس میں قوم کے اعلیٰ افراد کا ہاتھ بھی ہے اور یہ بات فکر طلب ہے۔"

"ولیس!" شہنشاہ نے اطمینان سے کہا "یہ سب اپنی کم ظرفی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ یاد رکھو ہر چند کہ انسان ماحول سے متاثر ہوتا ہے مگر یہ سب وقتی باتیں ہیں، مستقبل ہر حال انسان کے اپنے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ کابینہ سے کشمکش چلے۔ زمانہ میری تخریب اور تباہی کے لئے تمام ہلاکت سامانیوں کے ساتھ مقابلے پر آ جائے مگر ہوگا وہی جو میں چاہوں گا۔ ولیس تم میری ہو تمہیں کوئی قوت مجھ سے جدا نہیں کر سکتی۔"

ولیس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اس نے اپنے اس

عجیب و غریب چاہنے والے کو دکھ سے دیکھا جو صرف اس کی بدولت مشکلات میں گرفتار ہو گیا تھا۔ شہنشاہ نے ان آنکھوں میں اشک دیکھے تو بیتاب ہو گیا اور بولا۔

"ولیس پیاری! تم آمادۂ گریہ ہو، بھلا کیوں، اب تو صحیح معنوں میں ہمارے ملاپ کا وقت آیا ہے۔ اب تمہیں مسٹر سمپسن سے طلاق لینی ہے اور باقاعدہ میرا بن جانا ہے۔"

"مگر آپ..." ولیس کی آواز گلے میں اٹک گئی، وہ فقرہ مکمل نہ کر سکی مگر ایڈورڈ سمجھ گیا بے پروائی سے بولا۔

"پیاری! میں انسانوں کی اس دنیا کو مافوق الفطرت انسانوں کی دنیا بنانا نہیں چاہتا۔ بادشاہ بھی ایک انسان ہوتا ہے۔ شاہی افراد اور عام لوگوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا جو حقوق دیگر افراد کو حاصل ہیں ہمیں بھی ہیں۔ تم جانتی ہو میں انقلاب پسند واقع ہوا ہوں۔ گو کہ اس وقت میں ایک بادشاہ کی حیثیت میں ہوں مگر میرے نظریات آج بھی وہی ہیں جو پہلے تھے۔"

"لیکن کچھ بھی ہو" ولیس نے کہا "اگر آپ پر کوئی بات آئی، شہنشاہ ہونے کی حیثیت سے پوزیشن میں کوئی فرق آیا تو میں اعلان کروں گی کہ میرا شہنشاہ سے کوئی..."

"ولیس!" شہنشاہ کی ڈانٹ نے ولیس کی بات قطع کر دی "تمہیں میرے جذبات سے کھیلنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ میں کہہ چکا ہوں کہ تم وہ اول عورت ہو جس سے میں نے محبت کی، کرتا ہوں اور کوئی بھی صورتِ حال پیش آئے کرتا رہوں گا۔ کوئی طاقت میرے اور تمہارے درمیان حائل نہیں ہو سکتی اور اس عشق کے جواب میں ایسے ہی جذبات چاہتا ہوں، آئندہ تم ایسی بات زبان سے ادا نہیں کرو گی۔"

اس فقرے میں تنبیہ بھی تھی چاہت بھی اور حکم بھی، ولیس گھبرا کر رونے لگی اور شہنشاہ اسے محبت سے چمکارنے لگا۔ اس شام انہوں نے پھر ایک معمولی ہوٹل میں کھانا کھایا۔ پھر ان کی تصویریں لی گئیں اور اخباروں نے زوردار سرخیاں جما کر اس خبر کو شائع کیا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب ۱۹۳۶ء میں اکتوبر کی ۲۷ تاریخ کو ولیس نے شہنشاہ کے کہنے پر اپنے شوہر مسٹر سمپسن سے طلاق لینے کے لئے عدالت میں درخواست دی، اس وقت مسٹر گاڈرڈ اس کا وکیل تھا۔ اگرچہ بات معمولی تھی مگر اخبارات نے اسے بڑا اہم بنا دیا۔ گھر گھر چرچے ہونے لگے کہ ولیس صرف بادشاہ کے لئے شوہر سے علیحدہ ہو رہی تھی۔ ولیس نے شہنشاہ سے عشق کیا تھا اس کی سزا تو اسے بڑے سنگین انداز میں دے رہی تھی اب اس کی ہر حرکت پر نظر رکھی جانے لگی تھی وہ اپنا ڈریس تیار کروانے پیرس جاتی تو لوگ پوشیدہ طور پر اس کا پہرہ دیتے اور نظر رکھتے اور ہر بات ہر حرکت اخبار کی زینت بنتی۔ ولیس اس صورتِ حال سے بری طرح ہراساں تھی لہٰذا ایک دن شہنشاہ نے دو بڑے اخباروں "ایوننگ اسٹینڈرڈ اور ڈیلی ایکسپریس" کے ایڈیٹروں کو طلب کیا اور انہیں عجیب و غریب حکم دیا، اس نے کہا۔

"آپ لوگ میرے اور ولیس کے معاملے کو سنسنی خیز بنا کر عوام میں عام کرنے کی کوشش بند کر دیں۔ وہ طلاق لے گی۔ اس کے بعد کیا ہوگا یہ معاملہ میرا ہے لیکن میں حکم دیتا ہوں کہ آئندہ ولیس کو بدنام کرنے کی سعی نہ کی جائے۔"

دونوں ایڈیٹروں نے معافی مانگی آئندہ ایسی سرخیاں نہ جمانے کا وعدہ کیا اور چلے گئے وہ تو واقعی محتاط ہو گئے مگر امریکہ اور کینیڈا کے اخبارات نے اب باقاعدہ ولیس اور شہنشاہ کے عشق پر مضمون شائع کرنے شروع کر دیئے، معلوم ہوتا تھا کہ ولیس نے طلاق کا مطالبہ نہیں کیا، ناقابل معافی جرم کیا ہے جس کی سزا اسے ہر طرف سے مل رہی ہے۔ شہنشاہ سخت مشتعل تھا مگر ایک صبح اس کے پرائیویٹ سیکریٹری نے عرض کیا۔

"جناب! وزیر اعظم مسٹر بالڈون ملاقات کے خواہش مند ہیں۔"

شہنشاہ نے اجازت دے دی۔ وزیر اعظم مسٹر بالڈون حاضر ہوا شہنشاہ کو تعظیمی سلام کیا اور عرض کیا۔

"میں شہنشاہ سے اس موضوع پر گفتگو کی اجازت چاہتا ہوں جو عرصے سے ملک بھر میں....."

"آپ جو کہنا چاہتے ہیں فرمایئے۔ میں حیران ہوں کہ وہ کونسا معاملہ ہے جس کے لئے فوری ملاقات ضروری ہے۔"

"اس ملاقات کا مقصد شہنشاہ کو صرف یہ بتانا ہے کہ ولیس کا مسئلہ عجیب رنگ اختیار کر گیا ہے شہنشاہ کی پوزیشن کے لئے شدید خطرہ ہے۔ امریکہ اور کینیڈا کے اخبارات نے اس طرح اچھالا ہے کہ وہ اختیار سے باہر ہو گیا ہے۔"

"کیا آپ کی تشریف آوری کا مقصد صرف یہی بتانا ہے"

شہنشاہ نے اطمینان سے کہا۔

"نہیں" وزیراعظم بالڈن خفیف سا ہو گیا اور بولا "اس حد تک تو شہنشاہ واقف ہیں۔ میرے آنے کا مطلب تو صرف اتنا ہے کہ میں ایک وزیر کی حیثیت سے نہیں بلکہ غمگسار اور دوست بن کر آپ کو مشورہ دوں۔"

"میں وہ مشورہ خوشی سے سنوں گا۔ فرمائیے" شہنشاہ نے مسکرا کر دریافت کیا۔

"جناب" بالڈن نے کہا "آپ ولیس پر زور دیں کہ وہ طلاق کا مطالبہ واپس لے لے کیونکہ اسی دن سے اخبارات اس بات کو زیادہ اہمیت دے کر عوام میں پھیلا رہے ہیں۔ دنیا کے گوشہ گوشہ میں یہ بات پھیل گئی ہے۔۔۔"

"کیا طلاق کا مطالبہ کرنے سے قبل اخبارات کا رویہ صحیح تھا؟" شہنشاہ نے پوچھا۔

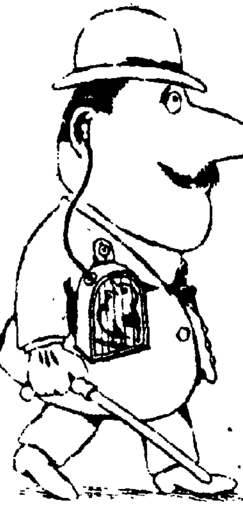
"میرا مطلب ہے" وزیراعظم نے کہا "کہ اب جو خبریں شائع ہو رہی ہیں وہ آپ کی پوزیشن کو گرا رہی ہیں لہٰذا اس کی بہترین صورت یہی ہے کہ ولیس طلاق کی درخواست واپس لے لے اور مسٹر سیمسن کے ساتھ رہے تب کچھ عرصہ بعد عوام کے ذہنوں سے یہ واقعہ محو ہو جائے گا۔"

شہنشاہ نے یہ مشورہ بغور سنا پھر بڑی ہی سنجیدگی سے سوال کیا۔

"وزیراعظم مسٹر بالڈن! کیا یہ مناسب ہے کہ میں شہنشاہ ہونے کی حیثیت سے ایک عام انسان کے ذاتی معاملات میں دخل دوں۔ طلاق ولیس کا قطعی ذاتی معاملہ ہے مجھے کیا حق پہنچتا ہے کہ اسے مجبور کر دوں کہ درخواست واپس لے لے۔"

"کیونکہ عوام میں یہ خیال عام ہے کہ طلاق کے بعد شہنشاہ اس سے شادی کریں گے۔" وزیراعظم نے خطرہ کا اظہار کیا۔

یہ ملاقات ایک گھنٹہ سے زیادہ جاری رہی مگر مسٹر بالڈن ایڈورڈ ہشتم کو قائل کر سکا نہ مجبور، آخر واپس لوٹ گیا۔ چند دن بعد ولیس کو طلاق ہو گئی۔ اس کے شوہر مسٹر سیمسن کو ڈگری دے دی گئی لیکن آخری ڈگری چھ ماہ بعد ملنی تھی جس کے بعد ولیس دوسری شادی کر سکتی تھی۔ گو کہ ابھی چھ ماہ کا عرصہ درمیان میں تھا لیکن ہر طرف چہ مگوئیاں ہونے لگیں، ادھر شہنشاہ اور کابینہ کے درمیان کشمکش ادھر پارلیمنٹ اس شادی کے خلاف



آواز بلند کر رہی تھی۔ ولیس طلاق لے کر اپنی چچی کے ساتھ قیام پذیر تھی۔ شہنشاہ سے ملاقاتوں کا سلسلہ ہنوز جاری تھا وہ اب بھی ساتھ ساتھ تفریحات کرتے ساتھ ساتھ پھرتے مگر شہنشاہ ولیس سے اس موضوع پر بات نہ کرتا۔ ولیس کو علم تھا کہ دنیا شہنشاہ کے خلاف ہو گئی ہے۔ اس دوران شہنشاہ کو ایک خط موصول ہوا۔ یہ اس کے سیکریٹری کی طرف سے تھا۔ اس نے کھول کر پڑھا تو غم و غصہ سے اس کا برا حال ہو گیا۔ اس خط کا متن یہ تھا کہ وزیراعظم بالڈن اور حکومت کے دیگر معزز اراکین لندن میں جمع ہو رہے ہیں۔ اس اجتماع کا مقصد شہنشاہ اور ولیس کے بارے میں کوئی آخری فیصلہ کرنا تھا کیونکہ لندن کے اخبارات کی شہ سرخیاں اور دوسرے حالات خطرناک سے خطرناک تر ہو رہے ہیں اور جو حالت ہو گئی ہے اس کے سدباب کی صرف ایک صورت ہے کہ ولیس کو جلاوطن کر دیا جائے، اس خط سے شہنشاہ مشتعل ہو گیا۔ اسے یقین تھا کہ ان تمام حالات کا ذمہ دار مسٹر بالڈن ہے کہ اب ایک طرف محبت تھی دوسری طرف عوام کے اس عظیم نمائندہ وزیراعظم کا یہ مطالبہ۔

اس رات وہ دیر تک حالات پر غور کرتا رہا اور اگلی

صبح اس نے اپنے مشیر خاص والٹر مانکٹن کو طلب کیا اور اس سے بڑی طویل گفتگو کے بعد فیصلہ کیا کہ وہ حکومت کے اراکین اور وزیر اعظم بالڈن سے ضرور ملاقات کرے گا اور کسی حالت میں جھکے گا نہیں خواہ حالات کوئی صورت بھی اختیار کریں اور اس فیصلے کی تکمیل کے لئے اگلی شام بکنگھم محل کے ایک ہال میں یہ ملاقات ہوئی۔ ایڈورڈ ہشتم ایک صوفہ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے صوفوں کی قطار پر وزیر اعظم بالڈن اور دیگر معززین تشریف فرما تھے۔ قبل اس کے کہ کوئی آغاز گفتگو کرتا شہنشاہ نے خود دریافت کیا۔

"میرے علم میں یہ بات آئی ہے کہ آپ صاحبان میری اس خاتون سے دوستی کے خلاف ہیں۔"

"جی ہاں۔" مسٹر بالڈن نے سخت آواز میں کہا۔ "کابینہ کے تمام وزیر حیران ہیں کہ ہمارا جوان شہنشاہ ایک مطلقہ عورت سے محبت کرتا ہے اور عورت بھی شاہی خاندان سے باہر کی۔ عوام اس بات کو برداشت نہیں کر سکتے اور میں عوام کے ایک نمائندے کی حیثیت سے یہ بات شہنشاہ تک پہنچا رہا ہوں۔"

"آپ لوگوں نے ایک معمولی سی بات کو اپنی انا کا سوال کیوں بنا لیا ہے؟" شہنشاہ نے ناگواری سے کہا۔

"کیونکہ حاکمیت کا اصل اختیار عوام کے ہاتھوں میں ہے۔" بالڈن نے حقیقت بیان کر دی جسے سن کر شہنشاہ سکتے کے سے عالم میں رہ گیا۔ صورت حال یہ رنگ اختیار کر لے گی۔ اسے یہ توقع نہ تھی مگر وہ بھی شکست کھانے والوں میں سے نہ تھا۔

"مسٹر بالڈن۔ آج میں آپ کو اپنا فیصلہ سنا دوں، جوں ہی ولیس اپنی شادی کے معاملہ میں مختار ہو گی میں اس سے شادی کر لوں گا۔ خواہ میں شہنشاہ رہوں یا نہ رہوں۔"

سب نے متعجب ہو کر اسے دیکھا یہ واقعہ اپنی نوعیت کا عجیب واقعہ تھا کہ ایک شہنشاہ ایک عورت کے لئے تخت چھوڑ رہا تھا۔ یہ محفل برخاست ہو گئی، مگر چند یوم بعد محل کے اندر ایک محفل جمی جہاں شہنشاہ کی والدہ بھائی ڈیوک آف یارک اور چند دیگر اعزا نے گفتگو کی مگر آدھا گھنٹہ کی باتوں کے بعد اس کی ماں ولیس سے شادی پر رضامند ہو گئی، البتہ ڈیوک آف یارک نے کہا۔

"عالی جاہ! کیا آپ کا یہ فیصلہ اٹل ہے۔ ایسا نہ ہو کہ زندگی میں کسی وقت پچھتانا پڑے؟"

"نہیں۔" شہنشاہ نے سختی سے کہا۔ "میں ولیس کے لئے شاہی تخت تو کیا اور بھی بہت کچھ چھوڑ سکتا ہوں۔"

ڈیوک آف یارک نے کہا۔ "تو اس سے قبل ایک اور کوشش کر لیں تو بہتر ہو گا وہ یہ کہ کابینہ کے وزراء کو اپنی حمایت میں لانے کی سعی کریں۔"

"تمہارا مشورہ معقول ہے۔" شہنشاہ نے جواب دیا اس واقعہ کے چند روز بعد ہی اسے ایک سفر درپیش ہوا یہ سلو تھ ویلز کا دورہ تھا۔ یہاں سے واپسی پر وہ مسٹر سیموئیل اور مسٹر ڈف کوپر سے ملا۔ بڑی طویل ملاقات ہوئی مگر یہ دونوں وزیر وزیر اعظم مسٹر بالڈن کے زیر اثر تھے۔ لہٰذا ان کے جواب بھی وہی تھے مسٹر سیموئیل نے کہا۔

"شہنشاہ! آپ ایسی عورت سے شادی کے خواہش مند ہیں جو اپنے شوہر سے طلاق لے چکی ہے، لوگ اسے کیسے برداشت کریں گے؟" اور مسٹر ڈف کوپر نے بڑی متانت سے کہا۔

"شہنشاہ! وزارت کے اراکین بعض دستوری مجبوریوں کے تحت اس شادی کے خلاف ہیں، آپ ان کے جذبات کا خیال کیجئے اور مسز سمپسن کو خیرباد کہہ دیجئے۔"

شہنشاہ کو سخت مایوسی ہوئی اور وہ لوٹ آیا۔

شہنشاہ ایڈورڈ ہشتم اپنی محبت سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہ تھا اور نہ کابینہ اسے اجازت دینے کے حق میں تھی۔ عجب کشمکش کا عالم تھا مگر شہنشاہ اور ولیس کی حسین ملاقاتیں جاری تھیں کبھی وہ دونوں پیرس کے بہترین ہوٹل میں ڈنر کرتے کبھی کسی الگ تھلگ تفریح گاہ میں سیر کرتے۔ ایک شام شہنشاہ اور ولیس گارڈن کے ایک پرسکون گوشہ میں بیٹھے ہوئے تھے شہنشاہ سوچ رہا تھا کہ ولیس کو موجودہ صورت حال سے آگاہ کر دینا چاہئے تب اس نے ولیس کے دونوں ہاتھ تھام لئے اور بولا۔

"ولیس! تم جانتی ہو کہ حکومت ہماری شادی کے خلاف ہے؟"

"ہاں، لیکن ابھی تو آپ نے شادی کا اعلان بھی نہیں کیا۔" ولیس نے جواب دیا! اس لمحہ شہنشاہ کو اس پر بے حد پیار آیا اس نے کہا۔

"ولیس پیاری! اس اعلان سے قبل ہی ان لوگوں نے

مخالفت شروع کر دی ہے۔ چند یوم قبل کابینہ کے وزراء نے مجھ سے ملاقات کی مگر میں نے اعلان کر دیا ہے کہ تخت سے دستبردار ہو جاؤں گا مگر اپنی ولیس کو نہ چھوڑوں گا۔"

ولیس نے چونک کر دیکھا۔ اس کی وہ سوچوں کے اتھاہ سمندر میں ڈوبی افسردہ نظر آ رہی تھی، شہنشاہ نے پوچھا۔

"کیا سوچنے لگیں ڈیئر میں نے کوئی لاینحل مسئلہ تو پیش نہیں کیا جو سوچ میں گم ہو گئیں۔" ولیس ایک دم چونک پڑی اور بولی۔

"شہنشاہ! آپ نے بڑا غلط فیصلہ کیا ہے کہیں آپ کو پچھتانا نہ پڑے۔ ولیس کے لئے سب کچھ چھوڑنا معمولی بات نہیں ہے۔" یہ سن کر شہنشاہ کھلکھلا کر ہنسا اس نے ولیس کو اپنی بانہوں میں قید کر لیا اور بولا۔

"ایڈورڈ فیصلہ کر کے پچھتانے والا انسان نہیں ہے۔ سب کچھ دے کر اگر ولیس مل جائے تو یہ سمجھے گا کہ کائنات مل گئی۔" وہ دیر تک اسے پیار کرتا رہا اور وہ نم نم آنکھوں سے اسے تکتی رہی جن میں تردد بھی تھا اور فخر بھی۔

اس کے چند دن بعد سے شہنشاہ اور ولیس دونوں کو گمنام خطوط ملنے شروع ہو گئے جنہیں پا کر ولیس گھبرا جاتی کبھی رونے لگتی اور شہنشاہ انہیں نذر آتش کر دیتا اور گھنٹوں ولیس کو تسلیاں دیتا لیکن کب تک آخر کابینہ کی طرف سے آخری فیصلہ کا دن بھی آ گیا انہوں نے شہنشاہ کے روبرو دو تجاویز رکھیں کہ ان میں سے ایک کو پسند کریں۔

۱۔ ولیس سے شادی کا خیال چھوڑ دیں۔ یا

۲۔ تخت سے دستبردار ہو جائیں۔

کابینہ کا اجلاس پھر ہوا۔ شہنشاہ نے عوام کے نمائندہ مسٹر بالڈن سے کہا۔

"مسٹر بالڈن! کیا واقعی آپ صاحبان چاہتے ہیں کہ میں ایک تجویز ضرور قبول کر لوں۔"

"عالی جاہ۔" وزیر اعظم بالڈن نے کہا۔ "میری اور کابینہ کے دیگر تمام وزراء کی تمنا ہے کہ آپ ہمارے شہنشاہ رہیں۔"

"اس کے لئے آپ سب کی شرط بڑی کڑی ہے۔" شہنشاہ نے جواب دیا۔ "میں اگر بادشاہ کی حیثیت سے ولیس کو اپناتا تو زیادہ خوشی کی بات تھی مگر حکومت اس کی مخالف ہے لہذا اب میں فیصلہ کرتا ہوں کہ مجھے تخت اور ولیس میں سے کسے انتخاب کرنا ہے۔ اگر آپ لوگ اپنی ضد پر قائم ہیں تو میں تخت کو چھوڑ کر ولیس کو اپنا لوں گا۔"

وزراء نے تعجب سے شہنشاہ کو دیکھا۔ وہ کھڑا ہو گیا اور اجلاس برخاست ہو گیا۔ اس شب وہ ولیس کا ہاتھ تھامے چاند کی مدھم مدھم روشنی میں چہل قدمی کر رہا تھا اور وہ خاموشی سے اداس اداس اس کے ساتھ چل رہی تھی تب اس نے اجلاس کی مکمل رپورٹ اسے سنائی تو وہ اس کے شانے پر سر رکھ کر رو پڑی اور پہلی بار اس کا نام لے کر بولی۔

"ایڈورڈ! میں التجا کرتی ہوں کہ آپ کسی حالت میں بھی تخت نہ چھوڑیں۔"

"ولیس۔" شہنشاہ نے کہا۔ "مجھے تردد صرف اتنا ہے کہ تم میری بدولت الجھنوں کا شکار ہو گئی ہو۔"

"نہیں۔" ولیس نے اندوہگیں آواز میں کہا۔ "میں سمجھتی ہوں آپ کی بے سکونی کا باعث میں خود ہوں اور اب میں سنجیدگی سے سوچ رہی ہوں کہ میں انگلستان چھوڑ دوں۔"

ایڈورڈ ہشتم دیر تک سمجھاتا رہا مگر ولیس دہشت زدہ تھی لہذا بڑی دیر تک گفتگو کے بعد طے پایا کہ ولیس کچھ عرصہ کے لئے انگلستان سے چلی جائے اس دوران شہنشاہ تخت کو بچانے کی آخری کوشش کرے اور اگر ناکام رہا تو وہ خود بھی ولیس کے پاس

نفرت

میں ایک وکیل ہوں
مجھے امن پسند اور صلح جو
اشخاص سے نفرت ہے۔

میں ایک ڈاکیہ ہوں۔ مجھے ہر ایسے شخص سے نفرت ہے جو منی آرڈر وصول کر کے صرف "شکریہ" ادا کرتا ہے۔

میں ایک قانون شکن امیر ہوں مجھے اس پولیس آفیسر سے نفرت ہے جو بچوں کی مٹھائی کے نام پر نذرانہ قبول نہیں کرتا۔

میں دفتر میں چپڑاسی ہوں۔ مجھے ہر اس شخص سے نفرت ہے جو صاحب کو ملنے سے پہلے مجھے خوش نہیں کرتا

پہنچ جائے گا۔ چونکہ ان کے یکجا رہنے سے حالات سنگین صورت اختیار کرتے جا رہے تھے لہٰذا یہ طے کر کے دونوں مطمئن ہو گئے مگر اس رات وہ ہمیشہ سے زیادہ دیر تک گفتگو کرتے رہے، شہنشاہ نے کہا۔

"ولیس! میں سوچتا ہوں کہ کیوں نہ خود اپنی رعایا کے سامنے اپنی مجبوریاں بے نقاب کر دوں۔ مجھے یقین ہے کہ میں ایسا کروں گا تو عوام کی رائے میرے حق میں ہو گی۔"

"مگر یہ کیسے ممکن ہے اگر وزیراعظم نے اجازت نہ دی وہ بہرحال انتظامی امور کا ذمہ دار ہے، ہو سکتا ہے اسے اعتراض ہو۔"

"نہیں۔" شہنشاہ نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "میں مکمل حالات پر مشتمل ایک تقریر لکھوں گا اور اسے براڈکاسٹ کر دوں گا۔"

"مگر اخباروں کا رنگ بتا رہا ہے کہ وہ سب وزیراعظم کی حمایت کر رہے ہیں اور ان اخبارات میں عوامی اخبار بھی شامل ہیں، آپ ہر روز نہیں دیکھتے کہ میرے متعلق تمام واقعات کو اس طرح چھاپا جاتا ہے کہ عوام میں نفرت و اشتعال پیدا ہو جاتا ہے ان حالات میں شاید کوئی فرد بھی آپ کی بات سننے کے لئے تیار نہ ہو۔" ولیس نے دکھ سے کہا۔

"میں نے کبھی یہ سوچا بھی نہ تھا کہ حالات یہ رنگ اختیار کر لیں گے۔" شہنشاہ نے غصہ کے انداز میں کہا۔ "لیکن صورتحال کتنی ہی سنگین اور نامساعد ہو۔۔۔ میں خود رعایا سے کلام کرنے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔"

"آپ یہ کام میرے انگلستان سے جانے کے بعد کیجئے گا۔" ولیس نے کہا۔ "میں کل دوپہر روانہ ہو جاؤں گی۔"

"تم کہاں جانا چاہتی ہو؟" شہنشاہ نے پوچھا۔

"میں ان حالات میں فرانس کو محفوظ ترین سمجھتی ہوں۔ اس وقت میری بڑی خواہش ہے کہ ان الجھنوں سے نکل جاؤں اور جب تک آپ صورتِ حال پر قابو پا لیں تب تک انگلستان سے باہر رہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" شہنشاہ نے کہا۔ "تمہاری روانگی صیغۂ راز میں رہنی چاہیئے ورنہ اخبارات نئی نئی خبریں شائع کریں گے۔"

"مگر خفیہ روانگی کیسے ممکن ہے؟" ولیس نے متردد سے انداز میں کہا۔ اس کے انداز سے گھبراہٹ عیاں تھی۔

"میں بتاتا ہوں۔" شہنشاہ نے [illegible]

تو دو بار انگلستان کو نصف شب کے بعد عبور کیا جائے مزید احتیاط کے لئے فورٹ سے ساحل سمندر تک کا تمام سفر عام انسانوں کی طرح بذریعہ کار کیا جائے تاکہ کسی کو شک و شبہ کی گنجائش ہی نہ رہے۔" کافی دیر تک شہنشاہ اس سفر کے لئے پروگرام بناتا رہا اور ولیس افسردہ افسردہ سی بیٹھی سنتی رہی آخر شہنشاہ نے اس کی اداسی کو محسوس کر کے پیار سے خیال ہٹانے کے لئے اس کے دونوں ہاتھ تھامے اور محبت سے بولا۔

"ولیس پیاری! میں جانتا ہوں کہ یہ جدائی بڑی صبر آزما ہو گی مگر یقین کرو یہ صرف چند یوم کے لئے ہے، ہم جلد ملیں گے۔"

"آپ حتی الوسع کوشش کیجئے کہ آپ کی شاہی پوزیشن پر حرف نہ آئے۔" ولیس نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں تو شہنشاہ نے عزم سے کہا۔

"میری صرف ایک کوشش ہو گی کہ کابینہ میرے حق میں فیصلہ دے دے، عوام میری حمایت کریں تاکہ شادی کے لئے مجھے تخت و تاج چھوڑنا نہ پڑے لیکن اگر مجھے دو باتوں میں سے ایک کو منتخب کرنے کا اختیار دیا گیا تو میں صرف تمہیں اپناؤں گا۔ تخت و تاج چھوڑ دوں گا۔"

یہ شب ان دونوں نے ساتھ گزاری۔ اگلی شب جب شام ڈوب رہی تھی اور سیاہی ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی تب شہنشاہ ایڈورڈ ہشتم اپنی محبوبہ کو چند قابل اعتماد رفیقوں کے ساتھ الوداع کہہ رہا تھا۔ اس وقت ان دونوں کی کیفیت کیا تھی اس کا اندازہ وہ خود ہی کر سکتے تھے۔ اس کی روانگی کے بعد شہنشاہ نے پہلا کام یہ کیا کہ وہ تقریر لکھی جس میں اس نے عوام سے اپنے جائز حق کے لئے اپیل کی تھی۔ جب اس کا ڈرافٹ تیار ہو گیا تب اس نے اپنے مشیروں والٹر مانکٹن اور جارج ایلن کو فون کیا۔ وہ دونوں حاضر ہوئے اور انہوں نے شہنشاہ کی مرضی کے مطابق اس کی تیاری میں مدد کی۔ اس اپیل میں شہنشاہ نے مختصر الفاظ میں مکمل حالات بیان کر دیئے تھے اور بتایا تھا کہ جو حق اس ملک کے ہر فرد کو حاصل ہے اس سے شہنشاہ کو محروم کیا جا رہا ہے۔ آخر میں کہا گیا تھا کہ وہ ولیس سے شادی کا خواہش مند ہے لیکن اگر کابینہ کے وزرا اجازت دے دیں اور شاہی [illegible] اور حیثیت برقرار رہے تو زیادہ خوشی کی بات ہے۔ یہ اپیل نامی طویل تھی۔ اب آخری مرحلہ اسے

براڈکاسٹ کرنے کا تھا اور اس کے لئے وزیراعظم بالڈن کی منظوری حاصل کرنا ضروری تھا۔ شہنشاہ نے اپنے خاص دفتر میں وزیراعظم سے ملاقات کی مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ مسٹر بالڈون نے وعدہ کیا کہ وہ اگلے چند دنوں میں کابینہ کا اجلاس طلب کر کے اس معاملہ کو پیش کرے گا۔ شہنشاہ نے پوچھا۔

"مسٹر بالڈن! آپ کی اپنی کیا رائے ہے؟" تو بالڈن نے خوبصورتی سے ٹال دینے کے انداز میں کہا۔

"عالی جاہ! میں اپنے طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن میں خود چاہتا ہوں کہ شہنشاہ آپ رہیں۔"

اس گول مول سے جواب سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اس تقریر کو براڈکاسٹ کرنے کے حق میں نہیں ہے۔ یہ دن اسی گومگو میں گزر گیا۔ ولیس جا چکی تھی، حالات اطمینان بخش نہ تھے۔ غمِ روزگار اور غمِ عشق دونوں نے شہنشاہ کو بے کل کر دیا تھا اب مجبوراً صبح کو اخبار پڑھنا اور عہدِ رفتہ کا تصور کر لینا اس کا مشغلہ تھا ایک صبح اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اخبار اس کے سامنے آئے تو وہ حیران رہ گیا، ہر اخبار اس کی حمایت میں نظر آتا تھا۔ اور ہر پرچہ میں شائع ہونے والے مضامین کا متن ایک ہی تھا کہ بادشاہ کے فیصلے میں کوئی حکومت حائل نہیں ہو سکتی۔ بادشاہ کو اپنی شادی کا اختیار ہے وغیرہ وغیرہ۔

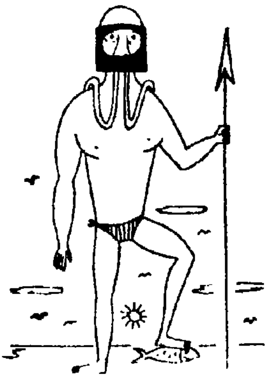
شہنشاہ متعجب تھا کہ اس کے مشیر والٹر مانکٹن نے کہا۔

"عالی جاہ، مبارک ہو تمام اخبارات آپ کی حمایت میں اور تخت سے دستبرداری کے خلاف ہیں۔ ان سب کا متفقہ فیصلہ ہے کہ دستور سے شادی کا کوئی تعلق نہیں اور نہ اسے تخت و تاج چھوڑنے کا باعث بنایا جا سکتا ہے۔"

ابھی وہ محوِ گفتگو تھے کہ شہنشاہ کا سیکریٹری حاضر ہوا اور عرض کیا۔

"عالی جاہ، وزیراعظم نے آج دس بجے اجلاس طلب کیا ہے۔"

شہنشاہ کے ذہن کو جھٹکا سا لگا اس کابینہ کے فوری اجلاس کا مطلب تھا کہ وزیراعظم نئی کروٹ لینے والا ہے یا پھر واقعی کابینہ اس کے حق میں فیصلہ دے گی۔ ابھی وہ اسی امید و بیم میں اجلاس کے فیصلے کا منتظر تھا کہ چیف ایڈمنسٹریٹر کے فون نے اسے چونکا دیا وہ کہہ رہا تھا۔



"جناب ولیس نے انگلستان کو خیرباد کہہ دیا ہے اگرچہ یہ روانگی صیغۂ راز میں رکھی گئی ہے مگر ولیس جوں ہی فرانس کے ساحل پر اتری اور اس کے کاغذات کی جانچ پڑتال کی گئی تو یہ راز کھل گیا اور معتبر ذرائع کے مطابق اطلاعات ہیں کہ وہ اب فرانس کے جنوبی ساحل کے کنارے کینیس (CANNES) کے مقام پر قیام پذیر ہے۔"

شہنشاہ کا سر چکرا گیا جس بات کو وہ صیغۂ راز میں رکھنا چاہتا تھا وہ عام ہو گئی تھی اور اس کے سبب تمام دنیا کی نظروں میں اس کی پوزیشن مزید خراب ہو رہی تھی ایک بار پھر زمانہ اس کے خلاف ہو گیا۔ وہی اخبار جو آج اس کی حمایت میں نظر آ رہے تھے ولیس کی روانگی اور اس کے پس منظر کے بارے میں پھر خبریں بنانے لگے اور اخبار نویس اور رپورٹر کینیس کے مقام پر ولیس سے ملاقات کے لئے جانے لگے۔ ہر تدبیر دھری کی دھری رہ گئی اور وہ راز طشت از بام ہو گیا، شہنشاہ اور ولیس دونوں بہرصورت راز رکھنا چاہتے تھے۔ کابینہ کا اجلاس ہوا مگر شہنشاہ کی پوزیشن اس درجہ گر چکی تھی کہ اسے خطاب کی اجازت نہ دی گئی، وزیراعظم بالڈن نے صاف کہہ دیا۔

"عالی جاہ، میری وزارت آپ کو پبلک براڈکاسٹ کی اجازت دینے کے لئے تیار نہیں ہے اور یہ سب کچھ قانونی مجبوریوں کے باعث ہوا ہے اور میں بحیثیت ایک دوست کے سب کی طرف سے گزارش کروں گا کہ آپ اپنا فیصلہ اب بھی بدل دیں۔"

"مسٹر بالڈن" شہنشاہ نے بے بسی سے کہا "ہمیں کسی مشورہ کی ضرورت نہیں، تم اپنا وقت ضائع مت کرو۔"

اس واقعہ کے دوسرے دن گلی کوچوں اور بازاروں میں شہنشاہ کی حمایت میں نعرے بلند ہو رہے تھے، لوگ کہہ رہے تھے "شہنشاہ کی حمایت کرو" اور شہنشاہ یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا کہ اس کا مشیر مسٹر مانکٹن حاضر ہوا اور عرض کیا۔

"عالی جاہ، کابینہ کے تمام وزراء آپ کے مخالف ہیں، مگر عوام آپ کے ساتھ ہیں، جب بھی اپنی کار میں نکلتا ہوں تو لوگ آپ کے اور اس شادی کے حق میں نعرے لگاتے ہیں، انتہا یہ ہے کہ آج لاٹ پادری نے بھی اس شادی کے حق میں بیان دے دیا ہے آپ اس موقع سے فائدہ اٹھائیں، جمہوری حکومت ہے آپ کو صرف عوام کا رجحان دیکھنا چاہئے۔ آپ آج ہی پارلیمنٹ کی اجازت کے بغیر عوام سے خطاب فرمایئے اور اپنا فیصلہ سنا دیجئے۔"

"مسٹر مانکٹن" شہنشاہ نے ہنس کر کہا "آپ کا مشورہ پرخلوص اور ہمدردانہ ہے، مگر آپ غور فرمایئے کہ اگر میں پارلیمنٹ کی اجازت لئے بغیر قوم سے خطاب کر دوں گا تو آج ہی عوام دو گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے ایک میرا ساتھ دے گا اور دوسرا کابینہ کے فیصلے کا ایسے میں وہ ایک دوسرے کو کاٹنے لگیں گے اور میں یہ کبھی گوارہ نہ کروں گا کہ اپنے ذاتی مفاد کے لئے سلطنت کو کمزور کر دوں۔"

"لیکن عالی جاہ، آپ غور تو فرمایئے کہ آپ ہی کے وزراء آپ کی راہ میں رکاوٹ بن رہے ہیں وہ اپنی مرضی آپ پر ٹھوپ کر اسے ادائیگی فرائض کا نام دیتے ہیں۔ وزیر اعظم کے اختیار میں سب کچھ ہے وہ تمام وزیروں کو قائل کر سکتا تھا مگر اس نے پارلیمنٹ کے ممبران کو بھڑکا دیا ہے۔ اخبارات کو کھلی اجازت دیدی ہے کہ جو دل چاہے کہیں کیا یہ سب جان کر بھی آپ خاموش رہیں گے؟"

"ہاں" شہنشاہ نے ضبط کا مظاہرہ کیا "کیونکہ میں ایسی حکومت کا قائل نہیں ہوں جس میں شہنشاہ اپنے لئے انتشار پیدا کر دے۔ میں بہرحال اپنی سلطنت کو کوئی نقصان پہنچانا نہیں چاہتا میں جانتا ہوں آپ نے شروع دن سے میری حمایت کی ہے۔ میں دل سے آپ کی عزت کرتا ہوں۔ میں جانتا ہوں مسٹر چرچل نے میرا ساتھ دیا ہے میں کبھی انہیں بھی فراموش نہ کر سکوں گا۔"

"مگر عالی جاہ" مسٹر مانکٹن نے کہا "وزیر اعظم بھی اس حق میں ہیں کہ شہنشاہ آپ ہی رہیں۔"

"مگر ان کی شرط بڑی کڑی ہے جسے میں مر کر بھی پورا نہ کر سکوں گا" شہنشاہ نے جواب دیا۔

"پھر آپ کیا کریں گے؟" مسٹر مانکٹن نے سوال کیا۔

"اس ہفتے کے اندر اندر میرا فیصلہ تمام قوم سن لے گی" ایڈورڈ ہشتم نے سختی کے انداز میں کہا۔

مسٹر مانکٹن لوٹ گیا مگر اگلی صبح شہنشاہ نے اسے خود طلب فرمایا اور کہا۔

"مسٹر مانکٹن! آپ آج ہی لندن جائیں اور مسٹر بالڈن سے کہہ دیں کہ آج شام جب وہ مجھ سے ملاقات کریں گے تو میں ایک اہم اعلان کروں گا۔"

"کیا یہ اعلان تخت و تاج کے بارے میں ہوگا؟" مسٹر مانکٹن نے سوال کیا۔

"ہاں" شہنشاہ نے اطمینان سے کہا "میں آج آخری فیصلہ کر دینا چاہتا ہوں۔"

"لیکن عالی جاہ" مسٹر مانکٹن نے کہا "اگر یہ فیصلہ تخت چھوڑ دینے کے بارے میں ہے تو میں ایک بار پھر مشورہ دوں گا کہ غور فرمالیں، کیا آپ کو اندازہ نہیں کہ تخت سے دستبردار ہونے کے بعد حالات کیا رنگ اختیار کریں گے، اور حکومت آپ کے سامنے کیا شرائط پیش کرے گی؟"

"میں سب جانتا ہوں مسٹر مانکٹن" شہنشاہ نے اطمینان سے کہا "ظاہر ہے تخت چھوڑنے کے بعد مصائب کا آغاز ہوگا، مجھے جلاوطن ہونے کا حکم ملے گا اور اس کے بعد موت کے وقت تک مجھے عام انسانوں جیسی زندگی گزارنی ہوگی لیکن سچ کہیئے کیا عام شہری مجھ سے بہتر اور پرسکون زندگی نہیں گزارتے کم از کم زیست کا سب سے اہم فیصلہ تو وہ خود کر لیتے ہیں۔"

"شہنشاہ!" مسٹر مانکٹن نے متردد انداز میں کہا "آپ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی اپنے اقدام کے انجام کو غلط انداز میں سوچ رہے ہیں، میرا مقصد دیگر پریشانیوں سے قطع نظر صرف یہ وضاحت کرنا ہے کہ تخت چھوڑ کر بھی آپ فوری طور پر دلیس سے شادی نہیں کر سکیں گے کیونکہ طلاق کے بعد چھ ماہ کی

مدت ابھی پوری نہیں ہوئی تھی۔"
کیا قانون اس مدت کو ختم نہیں کر سکتا؟" شہنشاہ نے چونک کر دیکھا۔

"اگر عالی جاہ اجازت دیں تو میں اس کے لئے کوشش کروں تاکہ طلاق کا خاص بل منظور ہو جائے ایسے میں آپ تخت سے دستبردار ہوتے ہی شادی کر سکیں گے۔"

"ٹھیک ہے" شہنشاہ نے حکم دیا۔ "آپ فوراً لندن روانہ ہو جائیں۔"

ایڈورڈ ہشتم ابھی دستبردار نہ ہوا تھا مگر یہ خبر عام ہو چکی تھی، اس شام وزیر اعظم بالڈن حاضر خدمت ہوا اور عرض کیا۔

"عالی جاہ! کیا یہ صحیح ہے کہ آپ فیصلہ کر چکے ہیں۔"

"ہاں" شہنشاہ نے اطمینان سے جواب دیا۔ "میں آپ صاحبان کی خوشی کے لئے تخت چھوڑ رہا ہوں۔"

"مگر ہماری خوشی تو یہ نہیں ہے" مسٹر بالڈن نے کہا ہم تو چاہتے ہیں شہنشاہ آپ ہی رہیں۔"

"آپ نے میرے سامنے دو چیزیں پیش کی ہیں۔ ولیس یا تخت مجھے جو عزیز ہے منتخب کر لوں گا اور مجھے ولیس عزیز ہے۔"

"اگر مسز سیمسن خود یہ اعلان کر دیں کہ وہ شہنشاہ سے دستبردار ہو رہی ہیں تو آپ اپنا فیصلہ واپس لیں گے؟"

مسٹر بالڈن نے سوال کیا تو شہنشاہ چونک پڑا وہ چند لمحے تعجب سے مسٹر بالڈن کو تکتا رہا اس وقت اس کی عمیق نظریں اس فقرے کے پس منظر کو دیکھ رہی تھیں اور اسے یہ یقین کرنے میں ذرا بھی دیر نہ لگی کہ وزیر اعظم ولیس سے رابطہ قائم کر کے اس سے یہ اعلان کرانا چاہتا ہے۔ اس وقت وہ سخت مشتعل تھا مگر جذباتی نہ تھا لہذا اس نے نرمی سے کہا۔

"مسٹر بالڈن، اس وقت میں اس سوال کا جواب دینے کے لئے تیار نہیں ہوں آپ جا سکتے ہیں۔"

وزیر اعظم چلا گیا تب اس نے معتبر ذرائع سے معلوم کیا تو اس کے شک کی تصدیق ہو گئی کہ وہ ہستی جس کے لئے وہ شہنشاہی چھوڑ رہا ہے مجبور کی جا رہی ہے کہ اس شادی سے انکار کر دے اور اس میں تمام ہاتھ مسٹر بالڈن اور ولیس کے خاص وکیل مسٹر گارڈنر کا ہے، اور وہ خفیہ طور پر ولیس کو دھمکیاں دے کر یہ بیان لکھا چکے ہیں۔

میں یا تم

ایک شخص مر رہا تھا۔ اس نے وصیت کرنی شروع کی "میرا یہ گھر اکبر کے لئے ہے۔" اس کی بیوی بولی۔

"اکبر فضول خرچ ہے۔ وہ گھر کو بیچ ڈالے گا۔ یہ گھر اصغر کو دے دو۔"

مرنے والے نے کہا "اچھا اصغر کو ہی سہی اور میرا الکوئی کا کارخانہ حمید کے لئے ہے۔"

بیوی نے مداخلت کی "نہیں نہیں حمید کو نہیں سلیم کو دو۔ حمید کو کاروبار سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ کارخانہ تباہ کر دے گا۔"

مرنے والے نے کہا "اچھا یونہی سہی۔" پھر بولا "میرا باغ نصیر کے لئے ہے۔"

بیوی نے پھر مداخلت کی۔ "نہیں نہیں نصیر تو بڑا سگھڑ ہے یہ باغ رشیدہ کو دے دو۔"

مرنے والے کو غصہ آ گیا۔ اس نے جھلا کر کہا۔

"میں پوچھتا ہوں کون مر رہا ہے؟ میں یا تم؟"

"چونکہ میرے لئے شاہ انگلستان کو تخت چھوڑنا پڑ رہا ہے لہذا میں اعلان کرتی ہوں کہ شاہ سے شادی نہیں کروں گی۔"

اس وقت شہنشاہ کی حالت دیوانوں جیسی تھی، اگر وزیر اعظم بالڈن سامنے ہوتا تو وہ شاید اس کا گلا دبا دیتا جس نے ایک بے یار و مددگار عورت کو یہ بیان دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اب خود ولیس سے گفتگو کر کے جلد از جلد اس مخمصے کو پاک کر دے گا۔

"ولیس!" شہنشاہ نے فون پر بات کی۔ "یہ میں کیا سن رہا ہوں۔ کیا تم نے بالڈن کے مجبور کرنے پر وہ بیان دیا ہے؟"

"میں کیا کروں، آپ یہاں کے حالات کا اندازہ نہیں کر سکتے۔" ولیس رو دینے کے انداز میں تھی۔

شہنشاہ کی گرفت ریسیور پر سخت ہو گئی، وہ سمجھ گیا تھا کہ اسے مسلسل گمراہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور وہ خوفزدہ ہو کر

"آپ سوچ لیجئے اور مجھ سے دستبردار ہوجائیں تو بہتر ہے، میں فرانس بھی چھوڑ دوں گی کہیں اور چلی جاؤں گی مگر آپ تخت نہ چھوڑیئے اس میں بڑی قباحتیں ہیں۔"

"ان باتوں کا وقت گزر گیا ہے۔" شہنشاہ نے شدید غصہ سے کہا۔ "آج میں آخری اعلان کردوں گا اور پہلی فرصت میں تمہارے پاس آؤں گا۔" ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ ولیس کی سسکیوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ اس نے پیار سے کہا۔

"ولیس ڈیئر! رو نہیں مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ ہماری مشکلات ختم ہونے والی ہیں، میں تخت و تاج چھوڑ چکا ہوں بس یہ اعلان کرنا اور سرکاری دستاویزات تیار کرنا باقی ہیں۔ اتنی مدت بس یہ احتیاط رکھو کہ جو بھی تم سے ملنے آئے ملنے سے انکار کردو یا بے رخی برتو، مجھے یقین ہے بالڈن کچھ اور کرے گا بس تمہیں یہی کرنا ہے کہ کوئی بیان غلط سلط نہ دو اور میرا انتظار کرو، چند ہفتے تک پہنچنے والا ہوں۔"

"اور اگر میں یہاں کے حالات سے گھبرا کر فرانس سے کہیں اور چلی جاؤں تو؟" ولیس نے دکھ سے پوچھا۔

"تو میں زندگی کے آخری لمحہ تک تمہارا پیچھا کروں گا کیونکہ میں نے تم سے محبت کی ہے صرف تم سے۔" شہنشاہ نے فراخدلی سے کہا۔

اس گفتگو کے بعد شہنشاہ نے بعجلت تمام کام مکمل کئے سرکاری کاغذات مکمل ہو گئے۔ اب یہ بات کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ شہنشاہ نے تخت سے دستبرداری کا اعلان کیا اور تخت سے اپنے دوسرے بھائی ڈیوک آف یارک کے حق میں دستبردار ہو گیا۔ اس دن بی بی سی لندن سے ایڈورڈ ہشتم کی آخری تقریر براڈکاسٹ ہورہی تھی جسے تمام دنیا نے سنا۔

"میرے عزیز ہم وطنو! اگرچہ میں سب کچھ آپ سب پر عیاں کرنا چاہتا تھا مگر پارلیمانی دستور کی بنا پر مجھے آپ لوگوں سے خطاب کرنے کی اجازت نہ تھی۔ ابھی تھوڑی دیر قبل میں تخت سے دستبردار ہو گیا ہوں اور اس کی وجہ آپ سب کے علم میں ہے۔ میں نے چند ماہ قبل شہنشاہ کی حیثیت سے اس عظیم ذمہ داری کو سنبھالا تھا لیکن میں کھلے دل سے یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں جس عورت سے محبت کرتا ہوں اس کے تعاون اور اپنانے کے لئے اپنے وطن اور تخت و تاج کو خیرباد کہنے پر مجبور ہوں لیکن اس کے باوجود میں آپ سب کو یقین دلاتا ہوں کہ میں اپنے دل میں اپنی قوم و ملک اور وطن کی محبت ہمیشہ محسوس کروں گا۔"

اس وقت کچھ لوگ عشق کی اس انوکھی مثال پر حیران اور کچھ افسردہ تھے۔ اس طرح گیارہ ماہ حکومت کرنے کے بعد ۱۹۳۶ء میں شہنشاہ انگلستان اپنی قوم میں بے پناہ مقبولیت کے باوجود ایک عوامی نمائندے کے فیصلے کے سامنے مجبور ہو کر اپنے لازوال عشق کی بدولت تخت و تاج ٹھکرا کر ملک چھوڑ رہا تھا اور دیکھنے والے افسردگی اور دکھ سے دیکھ رہے تھے کہ ۱۱ دسمبر ۱۹۳۶ء کو ایڈورڈ ہشتم نے برطانوی سیاست کو زبردست شکست دیکر حاکمیت کے منہ پر چانٹا مار کر اپنے محل کو، اپنے اور اپنے عزیز و اقربا کو خیرباد کہا اور بحری جہاز میں سوار ہو گیا اس جلاوطن شہنشاہ کی شان اب بھی شہنشاہوں جیسی تھی جیسے وہ ہارا نہیں جیت گیا ہے اور وہ واقعی فتحمند تھا۔ اسی موقع پر اسے ڈیوک آف ونڈسر کا خطاب دیا گیا تھا۔

چند دن بعد ولیس اس کے بازوؤں میں سسک رہی تھی۔

"آپ نے میرے لئے سب کچھ چھوڑ دیا۔"

"مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ میں نے سب کچھ پا لیا۔" اس نے ولیس کے کان میں سرگوشی کی۔

"مگر اب۔۔۔ کیا ہوگا؟" ولیس نے یوں کہا جیسے ابھی تک خوفزدہ ہو۔

"کچھ نہیں ہوگا۔" ایڈورڈ ہشتم نے اس پر اپنی گرفت مضبوط کرلی۔ "بس مستقبل کے مورخین لکھیں گے کہ ولیس اتنی غیر معمولی محبوبہ تھی کہ ایڈورڈ ہشتم نے اس کے لئے تخت کو ٹھکرا دیا تھا اور مطمئن تھا کہ اس کے عشق نے برطانوی حکومت سیاست اور مخالفت پر فتح پالی ہے۔"

سعادت حسن منٹو

سونورل

اردو ادب کے سوہان منٹو مرحوم کا ایک منتخب افسانہ
جس میں اس کی فنی مہارت
اس کا تیز
تیکھا
اور روح کو جھنجوڑ دینے والا انداز
ایک ایک سطر سے مترشح ہے!

بشریٰ نے جب تیسری مرتبہ خواب آور دوا سونورل کی تیس ٹکیاں کھا کر خودکشی کی کوشش کی تو میں سوچنے لگا کہ آخر یہ سلسلہ کیا ہے۔ اگر مرنا ہی ہے تو سنکھیا موجود ہے افیم ہے۔ ان سمیات کے علاوہ اور بھی زہر ہیں جو بڑی آسانی سے دستیاب ہو سکتے ہیں مگر بار بار سونورل ہی کیوں کھائی جاتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ خواب آور دوا زیادہ مقدار میں کھائی جائے تو موت کا باعث ہوتی ہے، لیکن بشریٰ کا تین مرتبہ صرف اسے ہی استعمال کرنا ضرور کوئی معنی رکھتا تھا۔ پہلے میں نے سوچا چونکہ



دوسری مرتبہ وہ دوا کھانے سے اس کی موت واقع نہیں ہوئی، اس لئے وہ شاید اسے ہی استعمال کرتی ہے اور اسے اپنے اقدام خودکشی سے جو اثر پیدا کرنا ہوتا ہے، موت سے ادھر ادھر رہ کر کر لیتی ہے لیکن میں سوچتا تھا کہ وہ ادھر کی ادھر بھی ہو سکتی تھی۔ یہ کوئی سونی صد محفوظ طریقہ نہیں تھا۔

تیسری مرتبہ جب اس نے تیس گولیاں کھائیں تو اس کے تیسرے شوہر کو جو پی ڈبلیو ڈی میں اوور سیئر ہیں صبح ساڑھے چھ بجے کے قریب پتہ چلا کہ وہ فالج زدہ بھینس کی مانند بے حس و حرکت پلنگ پر پڑی تھی اس کو یہ خواب آور دوا کھائے غالباً تین چار گھنٹے ہو چکے تھے۔

سب اوور سیئر صاحب سخت پریشان اور لرزاں میرے پاس آئے۔ مجھے سخت حیرت ہوئی اس لئے کہ بشریٰ سے شادی کرنے کے بعد وہ مجھے قطعاً بھول چکے تھے۔ اس سے پہلے وہ ہر روز میرے پاس آتے اور ہم دونوں اکٹھے بیٹھ کر وسکی پیا کرتے تھے۔

ان دنوں وہ مفلوک الحال تھے۔ سائیکل پر دفتر جاتے اور اسی پر گھر واپس آتے۔ مگر جب ان کی بشریٰ سے دوستی ہوئی اور وہ اس سے شادی کر کے اسے اپنے گھر لائے تو نقشہ ہی بدل گیا۔ ان کا بھی اور ان کے گھر کا بھی۔

اب وہ بہت عمدہ سوٹ پہنتے تھے۔ سواری کے لئے موٹر بھی آ گئی۔ گھر بڑھیا سے بڑھیا فرنیچر سے آراستہ ہو گیا۔ ریس کھیلنے لگے دیسی رم کے بجائے اب اسکاچ وسکی کے دور ان کے یہاں چلتے تھے۔ بشریٰ بھی پینے والی تھی۔ اس لئے دونوں بہت خوش رہتے تھے۔

سب اوور سیئر قمر صاحب کی عمر پچاس برس کے لگ بھگ ہو گی۔ بشریٰ ان سے غالباً پانچ برس بڑی تھی۔ کسی زمانے میں شاید اس کی شکل و صورت قابل قبول ہو، مگر اس عمر میں وہ بہت بھیانک تھی۔ چہرے کی جھریوں والی کھال پر بڑا شوخ میک اپ، بال کالے کئے ہوئے۔ بند بند ڈھیلا جیسے اوس میں پڑی ہوئی پتنگ۔ ڈھلکا ہوا پیٹ۔ انگیا کے کرنیل سے اوپر اٹھائی ہوئی چھاتیاں۔ آنکھوں پر سرمے کی بدخط تحریر۔ میں نے جب بھی اس کو دیکھا وہ مجھے نسوانیت کا ا... بھدا کارٹون سا دکھائی دی۔

قمر صاحب نے جیسا کہ ظاہر ہے اس میں اس کے سوا اور یہ خوبی دیکھی ہو گی کہ وہ مالدار تھی۔ اس کا باپ پنجاب کا ایک بہت بڑا زمیندار تھا جس سے وراثت میں اس کو بہت سی زمینیں ملی تھیں یہاں سے چھ سات سو روپیہ ماہوار کی مستقل آمدن ہو جاتی تھی۔ اس کے علاوہ بینک میں بھی اس کا دس پندرہ ہزار روپیہ موجود تھا اور قمر صاحب ایک معمولی سب اوور سیئر تھے۔ بیوی تھی جو چھ بچے تھے جن میں دو بڑے لڑکے تھے جو کالج میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ان کے گھر میں افلاس ہی افلاس تھا۔ ویسے شوقین مزاج تھے اور شاعر بھی۔ شام کو شراب بہت ضروری سمجھتے تھے۔ اس لئے آپ خود ہی اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان کے بال بچوں کے لئے کیا بچتا ہو گا۔

قمر صاحب نے یوں تو یہ ظاہر کیا تھا کہ وہ بشریٰ کو شرعی طور پر اپنے رشتۂ مناکحت میں لا چکے ہیں، لیکن مجھے شک تھا اور اب بھی ہے کہ یہ محض ایک ڈھونگ تھا۔ قمر صاحب بڑے ہوشیار اور چالاک آدمی ہیں۔ اپنی زندگی کے پچپن برسوں میں نہ جانے کتنے پاپڑ بیل چکے ہیں۔ سرد و گرم چشیدہ ہیں۔ گرگ باراں دیدہ ہیں۔ بشریٰ سے شادی کا جھنجھٹ پالنا کیسے منظور کر سکتے تھے۔

بشریٰ سے شادی کر کے قمر صاحب کے گھر کی حالت بہت حد تک سدھر گئی تھی۔ ان کی تین چھوٹی بچیاں جو سارا دن آوارہ پھرتی رہتی تھیں، عیسائیوں کے کسی اسکول میں داخل کرا دی گئی تھیں۔ ان کی پہلی بیوی کے کپڑے بھی صاف ستھرے ہو گئے تھے۔ کھانا پینا بھی اب عمدہ تھا۔

میں خوش تھا کہ چلو ٹھیک ہے۔ دوسری شادی کی ہے، کچھ برا نہیں ہوا۔ بشریٰ کو ایک خاوند مل گیا ہے جو باسلیقہ اور ہوشیار ہے اور قمر صاحب کو ایک ایسی عورت مل گئی ہے جو بدصورت سہی مگر مالدار تو ہے۔

مگر ان کا یہ سلسلہ زیادہ دیر تک مستحکم نہ رہا۔ کیونکہ ایک روز سننے میں آیا کہ ان کے درمیان بڑے زوروں کا جھگڑا ہوا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ دونوں نے سونیرل کافی مقدار میں کھا لی۔ کمرے میں فرش پر قمر صاحب بے ہوش پڑے تھے اور ان کی اہلیہ محترمہ پلنگ پر لاش کی مانند لیٹی تھیں۔

فوراً ان دونوں کو ہسپتال میں منتقل کرایا گیا۔ جہاں سے وہ دوسرے تیسرے روز ٹھیک ٹھاک ہو کر واپس آ گئے۔ مگر ابھی پندرہ روز بمشکل گزرے ہوں گے کہ پھر دونوں نے سونیرل سے شغل فرمایا۔ معلوم نہیں وہ ہسپتال پہنچائے گئے، یا گھر ہی میں ان کا علاج ہوا۔ بہرحال بچ گئے اس کے بعد غالباً ایک برس تک ان کے یہاں ایسا کوئی حادثہ نہ ہوا۔ لیکن ایک روز علی الصبح مجھے پتہ چلا کہ بشریٰ نے سونیرل کی تیس ٹکیاں کھا لی ہیں۔

قمر صاحب سخت پریشان اور لرزاں تھے۔ ان کے حواس مختل

تھے۔ میں نے فوراً ہسپتال ٹیلی فون کیا اور ایمبولینس گاڑی منگوائی۔ بشریٰ کو وہاں پہنچایا گیا۔ ہاؤس سرجن ــــ اپنے کالرہی تھے جنہیں نے ان کو وہاں سے نکالا اور سلاد ما جرا سنا کر جلدی ہسپتال چلنے کے لئے کہا۔ ان پر میری عجلت طلب درخواست کا کوئی اثر نہ ہوا اپنے بے رحم انداز میں کہنے لگے "مظفر صاحب ــــ مرنے دیجئے اس کو۔ آپ کیوں گھبرا رہے ہیں؟"

ان کو معلوم تھا کہ بشریٰ اس سے پیشتر دو مرتبہ زہر خوردی کے سلسلے میں ہسپتال آ چکی ہے۔ میں نے ان سے بشریٰ کے بارے میں اور کچھ نہ پوچھا اور تھوڑی دیر کے بعد واپس گھر چلا آیا۔

میں یہ نہیں کہتا کہ مجھے بشریٰ کا صدود اربعہ معلوم نہیں تھا اس کی زندگی کے سابقہ حالات میرے علم سے باہر تھے۔ میری اس کی متعدد مرتبہ ملاقات ہو چکی تھی۔ وہ مجھے بھائی سعادت کہتی تھی۔ اس کے ساتھ کئی دفعہ پینے پلانے کا اتفاق بھی ہو چکا تھا۔

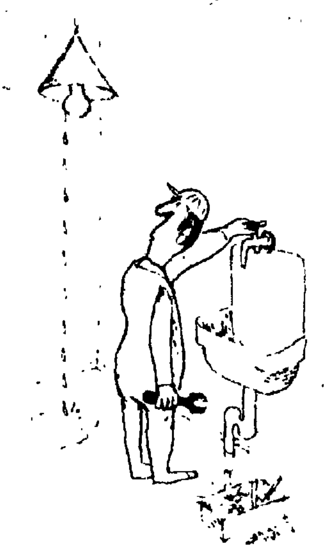
اس کی ایک لڑکی پرویز تھی۔ اس کی تصویر میں نے پہلی مرتبہ اس روز دیکھی جب وہ قمر صاحب کے گھر میں بحیثیت بیوی کے آئی۔ پیچھے دو کمروں میں سامان وغیرہ سجایا جا رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک قبول صورت جوان لڑکی کا فوٹو معمولی سے فریم میں مینٹل پیس پر پڑا ہے

جب ہیجر کا دور چلا تو میں نے بشریٰ سے پوچھا کہ یہ فوٹو کس کا ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کی لڑکی پرویز کا ہے جس نے خودکشی کر لی تھی۔ میں نے جب اس کی وجہ دریافت کی تو مجھے قمر صاحب اور بشریٰ سے جو باتیں معلوم ہوئیں اس کو اگر کہانی کے انداز میں بیان کیا جائے تو کچھ اس قسم کی ہو گی۔

پرویز، بشریٰ کی پہلوٹھی کی لڑکی تھی جو اس کے پہلے خاوند سے پیدا ہوئی۔ وہ بھی کافی دولت مند زمیندار تھا۔ جو مر گیا۔

مجھے دوسرے ذرائع سے معلوم ہوا کہ بشریٰ کا یہ پہلا شوہر جس کا نام اللہ بخش تھا اس سے شادی کے چند برسوں بعد ہی سخت متنفر ہو گیا تھا اس لئے کہ اس کی زندگی ہی میں بشریٰ نے کسی اور شخص سے آنکھ لڑانا شروع کر دی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بشریٰ کو اپنے خاوند کی نفرت و حقارت سے بچنے کے لئے علیحدگی اختیار کرنا پڑی۔ مرنے پر اللہ بخش نے بشریٰ کو ایک کوڑی نہ دی لیکن اپنی بچی پرویز کے لئے کچھ جائیداد الگ کر دی۔

بشریٰ نے دوسری شادی کر لی چونکہ تعلیم یافتہ اور دلکش تھی اس لئے پشاور کا ایک کامیاب بیرسٹر اس کے دام میں گرفتار



ہو گیا۔ اس سے اس کے یہاں دو لڑکے پیدا ہوئے۔ مگر اس دوسرے شوہر کے ساتھ بھی وہ زیادہ دیر تک جم کے نہ رہ سکی، چنانچہ اس سے طلاق حاصل کر لی۔ دراصل وہ آزاد زندگی بسر کرنا چاہتی تھی۔

یہ بیرسٹر ابھی تک زندہ ہے۔ دونوں لڑکے جو اب جوان ہیں اس کے پاس ہیں۔ یہ اپنی ماں سے نہیں ملتے، اس لئے کہ اس کا کردار انہیں پسند نہیں۔

یہ ہے بشریٰ کی زندگی کا مختصر خاکہ۔ اس کی بیٹی پرویز کی کہانی ذرا طویل ہے۔ اس نے اپنا بچپن زیادہ تر دیہات کی کھلی فضاؤں میں گزارا۔ بڑی نرم و نازک بچی تھی۔ سارا دن سرسبز کھیتوں میں کھیلتی رہتی۔ اس کا بھولی کوئی بھی نہ تھا۔ مزارعوں کے بچوں سے میل جول اس کے والدین کو پسند نہیں تھا۔ جب وہ کچھ بڑی ہوئی تو اسے لاہور کے ایک ایسے سکول کے بورڈنگ ہاؤس میں داخل کرا دیا گیا جہاں بڑے بڑے امیروں کے بچے پڑھتے تھے۔

ذہین تھی۔ طبیعت میں جوہر تھا۔ جب سکول سے نکل کر کالج میں داخل ہوئی تو وہ ایک خوبصورت جوان دوشیزہ میں تبدیل ہو چکی تھی جس کا مضطرب دل و دماغ ہر وقت کسی آئیڈیل کی تلاش میں رہتا تھا

بہت سریلی تھی جب گاتی، تو سننے والے اس کی آواز سے مسحور ہو جاتے رقص بھی اس نے سیکھا تھا۔ ناچتی تو دیکھنے والے مبہوت ہو جاتے۔ اس کے اعضا میں بلا کی لوچ تھی۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ جب وہ ناچتی تو اس کے اعضا کی خفیف سے خفیف حرکت بھی دیکھنے والوں سے ہم کلام ہوتی تھی۔

بہت بھولی بھالی تھی۔ اس میں وہی سادگی اور سادہ لوحی تھی جو گاؤں کے اکثر باشندوں میں ہوتی ہے۔ انگریزی اسکول میں پڑھتی تھی کالج میں تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کی سہیلیوں میں بڑی تیز، شریر اور کائیاں لڑکیاں موجود تھیں مگر وہ ان سب سے الگ تھی۔ وہ بادلوں سے بھی اُوپر اُس فضا میں رہتی تھی جو بڑی لطیف ہوتی ہے۔ اس کو دھن دولت کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ وہ ایک ایسے نوجوان کے خواب دیکھتی تھی جس کو معبود بنا کر اس کی ساری زندگی عبادت میں گزر جائے۔ عشق و محبت کی جائے نماز پر وہ مجسم سجدہ تھی۔

اس کی ماں اسے ایبٹ آباد لے گئی تو وہاں مردوں اور عورتوں کی ملی جلی محفل منعقد ہوئی۔ پرویز کو مجبور کیا گیا کہ وہ اپنا رقص دکھائے۔ اس نے حاضرین پر نگاہ دوڑائی۔ ایک خوش پوش پٹھان نوجوان اُدھر کونے میں کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں چمک اور چہرے پر دمک تھی۔ ایک لمحے کے لئے پرویز کی نظریں اس پر رک گئیں۔ نوجوان نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اُس سے کچھ کہا اور پرویز جو انکار کرنے والی تھی سب کچھ بھول کر بڑے دل فریب انداز میں رقص کرنے لگی۔

اس دوران میں اس نے اپنے لچکیلے اور گداز جسم کے بھاؤ اور ہر رنگ سے اپنی رُوح کے اندر چھپی ہوئی خواہشوں کو ایک ایک کر کے باہر نکالا اور اس پٹھان نوجوان کی متحیر اور مسحور آنکھوں کے سامنے ترتیب وار سجا دیا۔

اس نوجوان کا نام یوسف خلزئی تھا۔ اچھے دولت مند قبیلے کا ہونہار فرد۔ فارغ التحصیل ہو کر اب بڑھ چڑھ کے ملکی سیاسیات میں حصہ لے رہا تھا۔ عورت اس کے لئے کوئی عجوبہ نہیں تھی، لیکن پرویز نے اُسے موہ لیا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ دونوں کی شادی بڑے دھوم دھڑکے سے ہوئی اور وہ میاں بیوی بن کر ایبٹ آباد میں رہنے لگے۔ پرویز بہت خوش تھی۔ اس قدر خوش کہ اس کا جی چاہتا تھا ہر وقت رقصاں رہے۔ ہر وقت اس کے ہونٹوں سے سہانے اور سماعت نواز گیت چشموں کی طرح پھوٹتے رہیں۔

وہ یوسف تھا اور پرویز اس کی زلیخا تھی۔ اس کی عبادت میں دن رات مصروف رہتی۔ اس نے اپنی اطراف سے اس کے قدموں پر اپنی تمام نسائیت کا جوہر نکال کر ڈال دیا تھا۔ اس سے زیادہ کوئی عورت کیا کر سکتی ہے۔

شروع شروع میں وہ بہت خوش رہی۔ اتنی خوش اور مسرور کہ اسے یہ محسوس تک نہ ہوا کہ اس کو ازدواجی زندگی بسر کرتے ہوئے پورے تین برس گذر چکے ہیں۔ اس کے یہاں ایک بچی ہوئی تھی مگر وہ اپنے یوسف کی محبت میں اس قدر مستغرق تھی کہ وہ کبھی کبھی اس کے وجود سے بالکل غافل ہو جاتی تھی۔

عجیب بات ہے کہ جب یہ لڑکی پیدا ہوئی تو اس نے یہ محسوس کیا کہ اس کے پیٹ سے بچی کے بجائے یوسف نکلا ہے۔ اس کی کوکھ نے اس کو جنم دیا ہے۔ اس سے آپ پرویز کی والہانہ محبت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

لیکن اس کے معبود کے قدم ثابت نہ رہے۔ وہ طبعاً عیش پرست تھا۔ وہ مصری کی مکھی نہیں، شہد کی مکھی کی طرح باغ کی ہر کلی کا رس چوسنا چاہتا تھا۔ چنانچہ کروٹ بدل کر اور پرویز کی محبت کی زنجیریں توڑنے کے بعد وہ پھر اپنے پہلے اشغال میں مصروف ہو گیا۔

اس کے پاس دولت تھی۔ جوانی تھی۔ پرکشش شخصیت کا مالک تھا۔ ملکی سیاسیات میں سرگرم حصہ لینے کے باعث اس کا نام دن بدن روشن ہو رہا تھا۔ اس کو پرویز کی والہانہ محبت یکسر جہالت پر مبنی دکھائی دی۔ وہ اس سے اکتا گیا۔ ہر وقت کی چوما چاٹی۔ منٹ منٹ کی بھینچا بھانچی، اس کو سخت کھلنے لگی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ پرویز اُسے مکھی کے مانند اپنی محبت کے جالے میں قید کر دے جہاں وہ محبوس ہو جائے۔ اس کے بعد وہ اُسے سنوف میں تبدیل کر کے نسوار کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دے۔

پرویز کو جب معلوم ہوا کہ یوسف سالم کا سالم اس کا نہیں تو اسے سخت صدمہ ہوا۔ کئی دنوں تک وہ اس کے باعث گم سم اور نڈھال رہی۔ اس کو یوں محسوس ہوا کہ اس کے آئیڈیل کو تھوڑے دل کی ظالم ضربوں نے چکنا چور کر کے ڈھیر کر دیا ہے۔

اس نے یوسف سے کچھ نہ کہا۔ اس کی بے اعتنائیوں اور بے وفائیوں کا کوئی گلہ نہ کیا۔ وہ کوئی حتمی فیصلہ کرنا چاہتی تھی۔ طویل عرصے تک تنہائیوں میں رہ کر اس نے حالات پر غور کیا۔ یوسف سے چھٹکارا حاصل کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا، لیکن وہ اس کی جدائی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس کو معبود کا رتبہ عطا کرنے والی وہ خود تھی۔ خدا کو

اس کا بندھن کیسے رد کر سکتا ہے جبکہ وہ ایک بار صدقِ دل سے
اس کی خدائی تسلیم کر چکا ہے۔ اس کے حضور ہر وقت سجدہ ریز رہا ہے۔
اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ یوسف کے لئے نہیں صرف اپنے
اس جذبے کی خاطر جس نے یوسف کو خدائی کا رتبہ بخشا تھا ہمیشہ ہمیشہ کے
لئے اس کے ساتھ رہے گی۔ وہ اس کے لئے بڑی سے بڑی قیمت
دینے کے لئے بھی تیار تھی۔

کہا جاتا ہے کہ اس بے چاری نے یوسف کی آغوش کے لئے
اس عورت کے لئے آسانیاں پیدا کیں جو اس میں تھوڑی دیر کے
لئے حرارت محسوس کرنا چاہتی تھی۔ یہ بڑی بے غیرتی تھی، مگر اس نے
اپنے ٹوٹے پھوٹے آئیڈیل کو مکمل شکست و ریخت سے بچانے کی
احتراز کا یہ عجیب و غریب راستہ اختیار کیا اور ہر قسم کی بے غیرتی
برداشت کی۔

وہ اس کی چند روزہ محبوباؤں سے بڑے پیار محبت سے پیش
آتی۔ ان کی خاطر تواضع کرتی ان کی عصمت باختہ تلون مزاجیوں کو سراہتی
اور ان کو اور اپنے خاوند کو ایسے موقع بہم پہنچاتی کہ اس کی موجودگی
ان کے عیش و عشرت میں مخل نہ ہو پاتی۔

ان عورتوں کے لئے اپنے سینے پر پتھر رکھ کر وہ قسم قسم کے کھانے
پکایا کرتی۔ اس کا خاوند ان واہیات عورتوں کو خوش رکھنے کے لئے جب
اسے حکم دیتا کہ ناچے اور گائے تو وہ ضبط سے کام لے کر کسی بھی لمحے
بہہ پڑنے والی مصنوعی آنکھیں خشک دکھاتی، زخمی دل پہ پھاہے
رکھتی، غم و غصے سے کانپتے ہوئے ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹیں پیدا
کرتی، مسرت و انبساط سے بھرے ہوئے گیت گاتی اور بڑے طربناک
انداز میں رقص کرتی۔ اس کے بعد وہ تنہائی میں اس قدر روتی کہ اس کا
جی بھرتی کہ اسے محسوس ہوتا کہ وہ اب نہیں بچے گی۔ مگر ایسے واقعوں
کے بعد اس میں ایک نئی قوت برداشت پیدا ہو جاتی تھی اور وہ
یوسف کی دلالی میں اپنا منہ کالا کرنا شروع کر دیتی تھی اور خود کو یقین
دلانے کی کوشش کرتی تھی کہ یہ کالک نہیں، بڑا ہی خوش رنگ
غازہ ہے۔

اس دوران میں اس کی ماں اس سے ملنے کے لئے کئی
مرتبہ آ چکی تھی، مگر اس نے اپنے خاوند کے متعلق اس سے کبھی
شکایت نہیں کی تھی۔ وہ اپنے راز یا دکھ میں کسی کو شریک نہیں کرنا
چاہتی تھی۔ ان حالات میں بھی وہ اپنے خاوند کی ذات کے ساتھ
کسی اور کو کسی طریقے سے بھی وابستہ دیکھنا پسند نہیں کرتی تھی۔ وہ یہ

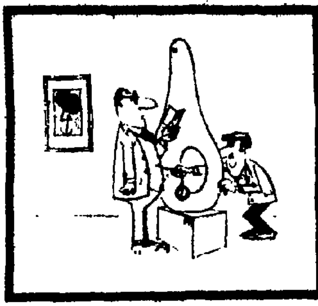
قہقہہ

ایک راہگیر فٹ پاتھ کے ایک کھلے مین ہول میں گر گیا۔ وہ مدد کے لئے چلا رہا تھا کہ ایک صاحب پہنچے اور جھک کر پوچھا۔ "آپ کیوں چلا رہے ہیں؟" راہگیر نے کہا۔ "مجھے جلدی سے باہر نکالو میرا دم گھٹا جا رہا ہے" اس شخص نے کہا "پہلے یہ تو بتاؤ کیا تم اس کے اندر گر گئے تھے؟" راہگیر نے غصے میں جواب دیا "جی نہیں، میں یہاں کھڑا ہوا تھا کہ کارپوریشن والے یہ ہول میرے اوپر بنا کر چلے گئے۔"

سوچتی کہ خاوند میرا ہے، وہ دکھ بھی میرا ہے جو وہ مجھے پہنچا رہا ہے
وہ اگر دوسری عورتوں کو بھی اسی قسم کا دکھ پہنچائے تو مجھے حسد ہو گا
لیکن وہ ایسا نہیں کرتا اس لئے میں خوش ہوں۔

بشریٰ ان دنوں فارغ تھی، یعنی اس نے کوئی نیا شوہر
نہیں کیا ہوا تھا۔ اس کا وقت سیر و تفریح میں گذر رہا تھا۔ دس پندرہ
دن ایبٹ آباد میں پرویز کے ساتھ رہتی۔ یوسف کے ساتھ ادھر
ادھر گھومتی پھرتی۔ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ جب
بشریٰ آتی تو یوسف کا دوسری عورتوں سے ملاقات کا سلسلہ منقطع
ہو جاتا۔ گھنٹوں علیحدہ کمرے میں بیٹھے تاش کھیلنے میں اور پرویز ان
کی خاطر تواضع میں مصروف رہتی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کی ماں زیادہ
دیر تک اس کے پاس ٹھہرے تاکہ سوسائٹی کی ان عورتوں کا جو چکلے
کی رنڈیوں سے بھی بدتر ہیں اس گھر میں داخلہ بند ہے۔ مگر وہ ایک
جگہ بہت عرصے تک ٹک کر نہیں رہ سکتی تھی۔ جب وہ چلی جاتی تو
دوسرے تیسرے روز یوسف پھر اپنی پرانی ڈگر اختیار کر لیتا۔ پرویز دوبارہ
روپ دھار لیتی اور اپنے خاوند کی خاطر نئی سہیلیوں کے قدموں کے
لئے پا انداز بن جاتی۔

اس نے اس زندگی کو آہستہ آہستہ اپنا لیا۔ اب اسے زیادہ
کوفت نہیں ہوتی تھی۔ اس نے خود کو سمجھا بجھا کر راضی کر لیا
تھا کہ اس کو زندگی کے ڈرامے میں یہی رول ادا کرنا تھا جو
وہ کر رہی ہے۔ چنانچہ اس سے اس کے دل و دماغ سے وہ کدورت
جو پہلے پہل بہت اذیت دہ تھی قریب قریب دھل گئی تھی۔ وہ خوش



رہتی تھی یا اسے اپنی ننھی بچی کی طرف زیادہ توجہ دینے لگی تھیں۔

ایک دن اسے کسی ضروری کام سے اچانک لاہور جانا پڑا۔ دو دن کے بعد لوٹی تو شام کا وقت تھا۔ یوسف کا کمرہ بند تھا، مگر اس میں سے اس کے مخمور قہقہوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ پروین نے دروازے کی ایک درز سے اندر جھانک کر دیکھا اور سر تا پا لرز گئی۔ اس کا پیازی رنگ ایک دم کاغذ کے مانند بے جان سفیدی اختیار کر گیا۔

یہ سارے واقعات مجھے بڑے معتبر ذرائع سے معلوم ہوئے۔ بشریٰ نے مجھے جو کچھ بتایا وہ اس سے مختلف تھا۔ اس کا بیان ہے کہ دل ہی دل میں گھٹ گھٹ کر وہ اپنی جان سے بیزار آ گئی تھی۔ اس نے یوسف کی خاطر بڑی سے بڑی ذلت قبول کرنا گوارا کر لیا تھا، مگر اس کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ ایک رات اس نے شراب کے نشے میں بدمست اپنی کسی حسینہ کو آغوش میں لئے پروین سے کہا کہ ننگی ناچے۔ وہ اس کے کسی حکم کو نہیں ٹالتی تھی۔ یوسف اس کا خدا تھا، چنانچہ اس نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور اس کا عریاں بدن رقصاں تھا۔ ناچ ختم ہوا تو اس نے خاموشی سے کپڑے پہنے اور باہر نکل کر زہر کھا لیا اور مر گئی۔

معلوم نہیں حقیقت کیا تھی، لیکن جو کچھ معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ جب پروین نے یوسف کے کمرے میں جھانک کر دیکھا تو اس نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ وہ زندہ نہیں رہے گی۔ چنانچہ اسی وقت وہ موٹر میں سیدھی ایک کیمسٹ کی دکان پر گئی اور اس سے سونول کی پوری ڈبیا طلب کی۔ قیمت ادا کرنے لگی تو اسے معلوم ہوا کہ افراتفری کے عالم میں وہ اپنا پرس وہیں گھر پر بھول آئی ہے۔ چنانچہ اس نے کیمسٹ سے کہا "میں مسز یوسف علوی ہوں۔ پرس ساتھ نہیں لائی۔ بل بھجوا دیجئے گا۔ یوسف صاحب ادا کر دیں گے۔"

گھر آ کے اس نے غالباً کوئی بیک ساری گولیاں دیں اور اس سے کہا "اچھی طرح پیس کے لاؤ۔" یہ سفوف اس نے گرم گرم دودھ میں ڈالا اور پی گئی۔

تھوڑی دیر بعد نوکر آیا اور اس نے پروین سے کہا کہ آپ کی والدہ آئی ہیں۔ یوسف صاحب آپ کو بلاتے ہیں۔ پروین کی آنکھیں بالکل خشک تھیں مگر ان میں خونرنگی تھی، اس لئے کہ زہر کا اثر شروع ہو گیا تھا۔ منہ دھو کر اور بال سنوار کر وہ اندر گئی۔ اپنی ماں سے بغل گیر ہوئی اور یوسف کے ساتھ قالین پر بیٹھ گئی۔ ماں سے باتیں کرتے کرتے ایک دم پروین کو چکر آیا اور بے ہوش ہو کر ایک طرف لڑھک گئی۔ ماں نے تشویش کا اظہار کیا اس لئے کہ اس کی بچی کا رنگ نیلا پڑ رہا تھا، مگر یوسف نے جو نشے میں چور تھا کسی قسم کے تردد کا اظہار نہ کیا اور بشریٰ سے کہا "کچھ بھی نہیں ہوا اسے —— بن رہی ہے۔"

پھر اس نے بڑے زور سے پروین کا شانہ پکڑ کر جھنجھوڑا اور حاکمانہ انداز میں کہا "اٹھو —— مجھے یہ ایکٹنگ پسند نہیں۔"

بشریٰ نے بھی اس کو آوازیں دیں۔ اس کو ہلایا جلایا۔ آخر ڈاکٹر بلایا گیا، مگر وہ جب آیا تو پروین اللہ کو پیاری ہو چکی تھی۔

پروین کی خودکشی کے متعلق کئی قصے مشہور تھے لیکن اس کا جو پہلو مجھ پر معتبر ذرائع سے منکشف ہوا میری سمجھ میں آتا تھا۔ اس لئے میں خاموش رہا اور انتظار کرتا رہا کہ اس کی تصدیق کب ہوتی ہے۔

نور صاحب بشریٰ کو ہسپتال سے واپس لائے تو میں ان سے ملا۔ ان کے پاس اب موٹر نہیں تھی۔ میں نے اس بارے میں استفسار کیا تو انہوں نے شاعرانہ سا [illegible] اختیار کرتے ہوئے جواب دیا "جس کی تھی لے گئی۔" میں نے پوچھا "کیا مطلب ہے؟"

جواب ملا "مطلب یہ کہ موٹر میری کب تھی۔ وہ تو ان محترمہ کی تھی۔ میں نے کچھ عرصے سے اس کا استعمال ترک کر دیا تھا۔ اپنی سائیکل پر دفتر جاتا تھا اور اسی پر واپس آتا تھا۔ جب ان کو ضرورت ہوتی تو میں ڈرائیور کے فرائض ادا کر دیتا تھا۔" میں کچھ کچھ سمجھ گیا "کیا ناچاقی ہو گئی!"

"ہاں کچھ ایسا ہی سمجھئے —— میں نے ان کو طلاق دے دی ہے۔"

بعد میں مجھے جب نور صاحب سے مفصل گفتگو کرنے کا موقع ملا تو انہوں نے مجھے بتایا کہ نکاح وکاح کوئی نہیں ہوا تھا۔ طلاق نامہ انہوں نے صرف اس لئے لکھا کہ لوگوں میں اس بات کی تشہیر نہ

چونکہ وہ غیر شرعی طور پر ان کے ساتھ قریب قریب دو برس رہیں۔

میں زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ ان کے درمیان جو فیصلہ کن لڑائی جھگڑا ہوا اس کی وجہ یہ تھی کہ بقول قمر صاحب ان کی محترمہ نے حیدرآباد کے ایک ادھیڑ عمر کے مہاجر رئیس سے جسمانی رشتہ قائم کر لیا تھا۔ اس سلسلہ میں ان کے لئے قمر صاحب کی ذات میں وہ کشش ختم ہو گئی تھی جو کسی زمانے میں ان کو نظر آتی تھی، بلکہ ریل کے ٹکٹ کلکٹر کے جسم کو دیکھ کر ان کی آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔

مجھے افسوس ہوا۔ اس لئے کہ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ قمر صاحب نے اپنی تینوں ہونہار بچیوں کو اسکول سے اٹھا لیا ہے۔ خود گولڈ فلیک کے بدلے بگلے کے سستے سگریٹ پیتے ہیں۔ پہلے تفریح کے اتنے سامان مہیا تھے مگر اب شتر بے مہار کی طرح بے مطلب ادھر ادھر چکر لگاتے رہتے ہیں۔

محترمہ بشریٰ کے متعلق انہوں نے مجھے بہت کچھ بتایا لیکن میں یہ نہ سمجھ سکا کہ جب علیحدگی کا فیصلہ ہو چکا تھا اور حیدرآباد کے مہاجر رئیس صاحب نے بشریٰ کے ساتھ باقاعدہ راہ و رسم شروع کر رکھی تھیں تو ان کو نسونورل کی تینتیس گولیاں کھا کر خودکشی کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔ بظاہر یہ خطرناک فعل قمر صاحب کے اس اعتراض کا ردِ عمل معلوم ہوتا ہے جو ان کو بشریٰ کے چال چلن پر تھا لیکن حیران کی بات ہے کہ مجھے اس کے عقب میں ایسا کوئی دل شکن عنصر نظر نہیں آتا جو انسان کو موت کی گود میں سو جانے پر مجبور کر دے۔ اس پر قمر صاحب بھی کوئی روشنی ڈالنے سے معذور ہیں۔

ایک دن باتوں باتوں میں ان سے میں آخر پوچھ ہی بیٹھا "نسونورل" کھانے کی روایت جو بشریٰ کی بیٹی پروین نے قائم کی ۔۔۔ آپ نے اور بشریٰ نے جاری رکھی۔ لیکن آپ یہ بتائیے کہ وہ کونسی وجہ تھی جس نے اس غریب کو اتنے خطرناک اقدام کے لئے تیار کر دیا۔ آپ کئی بار مجھے بتا چکے ہیں کہ پروین اپنے شوہر یوسف خان کی جرائم کاریوں کی عادی ہو چکی تھی بلکہ وہ خود اس کی معاونت کرتی تھی۔ کوئی عورت جب اس حد تک پہنچ کر گزشتہ بن جائے خرابے کی انتہا کو پہنچ کر تعمیر کی نہایت ہی خوفناک صورت اختیار کرے، خودکشی کو وہ زبوں ترین فعل سمجھے، اس کو کبھی اس کا خیال تک بھی نہیں آ سکتا۔ میرا اپنا خیال ہے بلکہ یقین ہے کہ اس کی ماں بشریٰ نے جسے آپ محترمہ کہتے ہیں یوسف سے ایسے تعلقات پیدا کر لئے تھے جنہیں عام لوگ ناجائز کہتے ہیں۔"

قمر صاحب نے صرف ان الفاظ میں میری تصدیق کی "یہ بالکل درست ہے ۔۔۔ ایک دن شراب کے نشے میں بشریٰ نے اس کا اقرار کیا تھا اور بہت روئی تھی۔"

اسی دن شام کو معلوم ہوا کہ حیدرآباد کے مہاجر رئیس صاحب نے "مسونورل" کی چھبیس گولیاں کھائی ہیں۔ بشریٰ نے حسبِ معمول تینتیس کھائی تھیں۔ دونوں اسپتال میں بے ہوش پڑے رہے۔ دوسرے روز رئیس صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے۔ چھبیس ہی میں ان کا کام تمام ہو گیا مگر بشریٰ بچ گئی۔

آج کل وہ مرحوم کا سوگ منا رہی ہے۔ جس شخص کے پلس اس نے موٹر بیچی تھی وہ دن رات اس کے پاس دل جوئی کے لئے موجود رہتا ہے۔



آزمائش

[illegible]

[illegible]

"ہائے اللہ! اپیا آپ دلہن بن کر کتنی خوب صورت لگیں گی ——" شاہینہ کے گھر میں داخل ہوتے ہی زرینہ اس کے گلے سے جھول گئی۔ مارے خوشی کے اس کے گال سرخ ہو رہے تھے۔ اپیا کے دلہن بن جانے کے تصور سے خود اس کا اپنا روپ نکھر اٹھا تھا۔

"ارے اللہ یہ کیا مصیبت آن پڑی ہے آخر۔" شاہینہ اس کے ہاتھ اپنے گلے سے الگ کرتی ہوئی بولی۔ "صبح تک تو تم اچھی خاصی تھیں۔"

"اف! بیچاری کو جیسے معلوم ہی نہیں کہ جلد ہی ہمارے انگنا میں ڈھولک بجنے والی ہے ——" وہ مارے اترا ہٹ کے میراثنوں کے انداز میں گانے لگی۔

"دولہا گاؤں کا گنوار دلہن بولتی بھی نہیں۔" شاہینہ کی ہنسی چھوٹ گئی ——— "دولہا گاؤں کا گنوار تو وہ خود ان دنوں ایم اے کا امتحان دے رہی تھی۔ بس آج کل آخری پرچے چل رہے تھے۔ اور یہ بھنک تو بہت دنوں سے اس کے کان میں پڑ رہی تھی کہ ادھر اس کا امتحان ختم ہوا کہ وہ مائیوں بٹھائی گئی۔ ظاہر ہے ایک ایم اے پاس لڑکی کے تعلق سے سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ اسے کسی گنوار کے پلے باندھ دیا جائے گا ——— اور یہ زرینہ ——— ؟ اپنی اچھی خاصی پڑھی لکھی اپیا کو نہ جانے کس گنوار کے پلے ڈال رہی تھی ——— شاہینہ کو ہنستا دیکھ کر زرینہ اچانک بول پڑی۔

"اچھا اپیا اگر سچ مچ ہی دولہا بھائی ایک دم گنوار نکل آئے تو آپ کیا بگاڑ لیں گی ان کا ———؟"

شاہینہ شرارت سے ادھر ادھر دیکھنے لگی کہ کوئی سن نہ رہا ہو۔ پھر مسکرا کر بہن کے کان میں جھک کر بولی۔

"اری دیکھ لینا کان پکڑ کر گھر سے نکال دوں گی ——— ہاں!" اور دونوں بہنوں کے ہنسی کے قہقہے دور تک جگمگاتے گئے۔

اگلے دن پرچہ دے کر شاہینہ گھر لوٹی تو سارا گھر یہاں سے لے کر وہاں تک جگمگا رہا تھا۔ دالان، برآمدے، آنگن سب مہمان بیبیوں سے پٹے پڑے تھے۔ طرح طرح کے رنگین جھلملاتے، چمکدار کپڑے، زیور، گہنے مہمان بیبیوں کے بچے ان سے بھی بڑھ چڑھ کے کپڑے پہنے سارے میں غل غپاڑہ مچاتے پھر رہے تھے۔ ڈائننگ ہال میں بڑی سی میز کھانے پینے کی چیزوں سے لدی ہوئی تھی۔ نوکر کام کم، اُلٹا زیادہ مچا رہے تھے۔ رہی سہی کسر میراثنوں نے پوری کر دی تھی۔ گلے پھاڑ پھاڑ کر جانے کدھر کدھر کے بڑے بڑے گیت گائے جا رہی تھیں۔ شاہینہ جیسے ہی گھر میں داخل ہوئی مہمان بیبیوں میں ہلکی ہلکی سی کھلبلی مچ گئی۔

"ارے یہ کیا تماشا ہے۔ منگنی کے دن بھی لڑکی گھر سے باہر۔"

"اس میں بُری بات کونسی ہو گئی۔ امتحان چل رہا ہے۔"

"ارے بی بی شادی شدہ زندگی میں یہ موئے امتحان وتحان کام نہیں آتے۔ وہاں تو بس میاں کی تابعداری کرنا پڑتی ہے۔" ایک مہمان بی بی نے گود میں لٹائے ہوئے بچے کو دھپا دھپ کوٹتے ہوئے نئی زندگی کا ہولناک نقشہ کھینچا۔

"لے واہ! اس کا مطلب یہ ہوا کہ بے چاری امتحان ادھورا چھوڑ

دیتی ــــــ"

"ارے اللہ سسرال والوں کو جلدی تھی ساس کے ساتھ تو سے اپنے کام دھام کے سٹلے میں آج ہی رات کی گاڑی سے دہلی جانا ہے یہاں کر ساروں میں منگنی کی انگوٹھی پہنانے دکھانے کا چاؤ تھا۔ اس لیے گڑبڑ ہو گئی۔"

یہ ساری اُلجھی اُلجھی باتیں شاہینہ نے خواہ دی سے کرتے سُنیں۔ بوجھل قدموں سے جیسے ہی وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئی اُس کی بہت ساری خلیری، میری بہنوں اور سہیلیوں نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ قدسیہ نے ایک زرتار سرا جوڑا جو گوٹے کناری سے جھلملاتے سرپوش سے ڈھکے طشت میں سجا ہوا تھا، شاہینہ کے سامنے رکھ دیا۔

"اللہ اپیا بس جھٹ پٹ نہا کر یہ جوڑا بدل ڈالیے ورنہ آپ کی سسرال والیاں آجائیں گی۔"

شاہینہ دنگی ہو اٹھی۔

"بھئی یہ کیا ہو رہا ہے، میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے میں کیوں ایسے بھاری بھرکم کپڑے پہن کر بے وقوف بنوں۔"

"اری یہ تو بے وقوف نہیں، دلہن بنو دلہن ــــــ مگر آدھی پاگل دلہن اس وقت، تب جب دولہا میاں باجے گاجے کے ساتھ برات لے کر آئیں گے۔" ایک چچا زاد بہن نے چھیڑ کے کہا۔

"ارے بھئی دراصل اسی لیے تو شاہینہ لپ بی ہے کہ اس کا کہنا ہے کہ دولہا میاں آج ہی بارات لے کر آئیں۔"

شاہینہ نے مصنوعی جھلاہٹ سے اپنی سہیلی کو دیکھا مگر روکنے کے باوجود مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل کر رہ گئی سارے شرم اور خجالت کے اس کی آنکھوں میں گلابیاں تیر گئیں۔

تین چار لڑکیوں نے مل جل کر زبردستی اسے پکڑ کر سنوار ہی دیا۔

باہر سے شور سنائی دینے لگا۔

"اری لڑکیو، جلدی کرو، شام پڑ رہی ہے۔ اُدھر لڑکے کی گاڑی چھوٹنے میں بھی وقت کم رہا جا رہا ہے۔"

"بس خالہ جان لا ہی رہے ہیں۔"

شاہینہ کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اللہ جانے کیا ہونے والا تھا۔ ایسا عجیب و غریب تجربہ تو اسے زندگی میں کبھی نہ ملا تھا ــــــ جی چاہ رہا تھا صاف کہہ دے میں نہیں جاتی واتی باہر ــــــ" مگر اسی دم پھر امی کی آواز آئی۔



"نکھرے سرمت اتاری لڑکیو!"

"اُئے خالہ جان ہم کوئی بے وقوف ہیں۔ دیکھ لیجئے آگے ہی گھونگھٹ ڈال رکھا ہے۔"

"اور ساتھ ہی اتنی ساری ذمے داریاں بھی۔" کسی شریر نے ٹوکا دیا۔

شاہینہ کا دل دہل کر رہ گیا۔

"ہنسی ہنسی میں کس نے اتنی گہری بات کہہ دی؟" اس نے سر اٹھا کر دیکھنا چاہا مگر ذمے داریوں کے بوجھ کے احساس سے اس کی گردن جھک گئی۔

منگنی کی رسم سے شادی کی تاریخ تک پورے دو مہینے باقی تھے۔ ان دو مہینوں میں شاہینہ چاہتی تو کیا کچھ نہیں جان سکتی تھی۔ لیکن اس نے کسی سے الٹ کر پوچھا تک نہیں کہ جسے میرا جیون ساتھی بنایا جا رہا ہے وہ ہے کیا، بقول ندیہ کے گاؤں کا گنوار ہے یا پڑھا لکھا؟ بزنس کرتا ہے یا نوکری۔ خاندان کیسا ہے۔ مزاج کیسا ہے۔ عادتیں کیسی ہیں۔ لیکن اس نے ہر بار یہی سوچا کہ جب امی اور ابا نے مجھ جیسی پڑھی لکھی لڑکی سے کچھ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا تو یقیناً وہ بھی پڑھے لکھے ہی ہوں گے۔ دیکھنے سننے میں بھی اچھے ہی ہوں گے۔ خاندان بھی اچھا ہی ہوگا۔ ان کا مزاج بھی اچھا ہی ہوگا۔ کوئی بھی ماں باپ کیا اولاد کا برا چاہتے ہیں؟ میں یہ سب کیوں سوچوں؟ کبھی کبھار خیالوں نے یلغار کی بھی تو اس نے دل کو بہلا لیا اور آج اس کی شادی کا دن تھا۔

امنگوں، مرادوں اور انسٹ خوشیوں کی وہ رات جو ہر لڑکی کی زندگی میں ایک ہی بار آتی ہے۔ جس کے انتظار میں لڑکیاں جانے کیا کیا نہیں سوچتیں، باہر سے جب اس کے ماموں جان وکیل کو ساتھ لے کر ایک ہجوم کے گواہی لینے آئے تو وہ بید کی طرح کانپ کر رہ گئی جیسے تیز ہوا کے جھونکے سے ———

"بی بی شاہینہ بعوض پچاس ہزار مہر سکہ رائج الوقت تمہیں اعجاز احمد"

مگر اس کے کان کچھ نہیں سن پا رہے تھے ——— "بعوض پچاس ہزار ———"

عوض ———؟ کیا وہ کوئی بکاؤ چیز تھی ———؟ اور اگر بکاؤ تھی بھی تو پچاس ہزار کی حقیر رقم اس کے دہیج کا مول ہو سکتی تھی ——— کیا سونا چاندی خرید سکتی تھیں۔

وہ اپنے ہونے والے شوہر سے ہر چیز کی توقع کر سکتی تھی لیکن یہ کہ کوئی سونے چاندی کا بدلہ دے کر خرید لے جائے۔ "اللہ پتہ نہیں جب ابتدا

ایسی بہو بھی ہو تو اتنا کیا ہو۔"

منہ جانے پاکستانی میں تھیں یا خالہ ——— کتنی آوازوں نے بیک وقت اسے مجبور کیا۔ "ارے بٹیا یہ وقت تو سب ہی لڑکیوں پر آتا ہے۔ ہنکاری بھر دو بٹیا۔ سویرا ہو رہی ہے۔"

کتنے گرم گرم آنسو بیک وقت اس کی کاجل بھری آنکھوں سے بہہ نکلے۔ کسی نے جنگل میں اچھلتی پھرنے والی آزاد ہرنی کو پابہ زنجیر کر دیا۔

دولہا کی بہن نے اس کی گوری گردن میں کالی پوت کا لچھا باندھ دیا کہ اس کے سہاگ کو کسی کی نظر نہ لگ جائے۔

سب جیسے منہ دکھائی، جلوے، آرسی مصحف کی رسومات سے نپٹنے کے بعد وداعی کی گھڑی آن پہنچی۔ چار بجے سے جن سکھی سہیلیوں نے ہنسی مذاق دھوم دھڑکے کا بازار گرم رکھا تھا۔ چپ چپ کر آنسو پونچھتی پھر رہی تھیں۔ ہیر اٹھو کے گیت ان کے اپنے گلے میں گھٹ کر رہ جا رہے تھے۔ بار بار کے گائے گئے بابل اور رخصتیاں نئے سرے سے آنسوؤں کے پھندے گلے میں ڈال رہے تھے۔ امی بے چاری یہاں وہاں گھبراتی پھر رہی تھیں۔ ابا جو اپنے زمانے میں پڑھے لکھے ڈپٹی کلکٹر رہ چکے تھے آنسوؤں کو چھپانے کی سعی لاحاصل کر رہے تھے۔

"اللہ بیٹی کا جنم بھی کیا جنم ہوتا ہے۔ کلیجے کی بچی دھکڑ رہتی ہے۔" کسی بڑی بی نے آنسو پونچھتے ہوئے دہائی دی۔

سسرال والیوں میں سے کوئی چلائیں ——— "اب رخصتی کر دیجئے بہن ——— پھر گھر جا کر بھی تو منہ دکھائی ——— رسمیں کرنی ہیں ابھی ———"

کسی چلبلی نے بات کاٹی ——— "اور انہی رسموں رسموں میں رات گزر گئی تو ہو گئی دولہا میاں کی چھٹی۔"

کالج کی کوئی تیز طرار لڑکی دھیرے سے بولی ——— "اور چھٹی بھی ایسی ویسی ———؟ کرسمس کی چھٹی ———"

کوئی اور وقت ہوتا تو ایسے تیز تیز ہنسی مذاق کے جملے سن کر شاہینہ مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو جاتی۔ لیکن اس وقت اسے کچھ بھی اچھا نہ لگ رہا تھا ——— امی، ابا، زرینہ، چھوٹے بھائی، بڑے بھائی بیک وقت سب ہی اس کے آنسوؤں کو راستہ دے رہے تھے۔

گھونگھٹ میں اس کا چہرہ جھکا ہوا تھا مگر وہ قدموں کی چاپ سے اندازہ لگا سکتی تھی۔ ابا قریب آ گئے ہیں۔ اب انہوں نے اس کے بازو بیٹھے ہوئے دولہا میاں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اپنا سیدھا ہاتھ دولہا کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ اس کے ہاتھ پر چند گرم گرم قطرے ٹپک پڑے۔

عفو و درگزر

حضرت قیس بن عاصم کے لئے ان کی لونڈی نے کباب کی سیخ تیار کی۔ وہ سیخ دے رہی تھی کہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر اس طرح گری کہ حضرت کے صاحبزادے زخمی ہو کر راہی ملک بقا ہوئے۔ لونڈی کے خوف کی کچھ انتہا نہ تھی۔ حضرت نے دیکھ لیا تھا کہ صاحبزادے کی موت کا سبب محض ایک حادثہ تھا جس میں لونڈی کی نیت اور ارادے کا کوئی دخل نہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے لونڈی کو معاف کر دیا اور پھر اسے آزاد کر دیا۔

حضرت امام زین العابدینؓ سے کسی نے کہا کہ فلاں شخص آپ کو برا کہتا ہے۔ حضرت اسے لینے ہمراہ لے کر اس کے پاس آئے اور فرمایا کہ تو نے جو باتیں میری نسبت کہیں اگر سچ ہوں تو خدا مجھے معاف کرے اگر جھوٹ ہوں تو خدا تجھے معاف کرے۔

ایک مجبور باپ کے مجبور آنسو ——— جو بچپن سے لے کر جوانی تک اپنی اولاد کو پال پوس کر بڑا کرتا ہے اور خود ہی ایک اجنبی کے حوالے کر دیتا ہے کہ خدا اور اس کے رسول کا یہی حکم ہے۔

آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آواز میں وہ بول رہے تھے۔

"اعجاز میاں ——— شاہینہ کی شکل میں اپنے دل کا گوشت پوست کا ایک ٹکڑا تمہیں دے رہا ہوں ——— بیٹا ایک باپ ہونے کے ناطے میں نے ہر ممکن خوشی اپنی بچی کو دی ہے اور میں تم سے یہ امید کرتا ہوں کہ تم بھی اسے پھول کی طرح نازک جانو گے۔" آنسوؤں کے مارے ان کی آواز بیچ بیچ میں ٹوٹ ٹوٹ جاتی ہے۔

"مجھے اپنی شاہینہ پر پورا اعتماد ہے کہ وہ ایک بہترین بیوی ثابت ہو گی۔ یہ خوش فہمی نہیں بیٹا۔ یہ وہ اعتماد ہے جو دھیرے دھیرے کہیں برسوں میں جا کر اپنی جڑیں مضبوط کرتا ہے۔ وہ بیک وقت تمہارے دل کی رانی بھی بن سکتی ہے اور تمہاری خادمہ بھی ——— مگر بیٹا ایک ——— صرف ایک نصیحت کرتا ہوں کہ کبھی عورت کا دل نہ دکھانا ——— عورت کا دل وہ دل ہوتا ہے جو پھول کی مار بھی نہیں سہہ سکتا۔ پھر شاہینہ تو ایسی لڑکی ہے جس نے کانٹوں کے بارے میں سنا تک نہیں۔ میں نے اسے صرف پھول ہی پھول آج تک دیئے ہیں ——— میں اور کیا کہوں بیٹا اللہ نے آج تمہیں وہ درجہ دیا ہے کہ تمہارے سامنے میری حیثیت کچھ نہیں ....."

پھر انہوں نے گھونگھٹ ہٹا کر شاہینہ کا آنسوؤں سے بھیگا چہرہ اٹھایا۔

"میری بیٹی ——— میری گڑیا ——— خدا تمہیں دونوں جہانوں میں شاد و آباد رکھے ——— کبھی اپنے والدین کا سر دنیا والوں کے سامنے نیچا نہ ہونے دینا۔"

"آج میں نے اعجاز میاں کا ہاتھ ہی تمہارے ہاتھ میں نہیں دیا ہے بلکہ ان کی زندگی کی ساری خوشیاں اس ہاتھ میں سونپ دی ہیں۔ اتنا یاد رکھنا بیٹیا ——— عورت ہی گھر کو جنت بناتی ہے۔ عورت ہی دوزخ بناتی ہے۔ میری بیٹی تم خود جنت کا ایک روپ ہو...."

ایک باپ کو اپنی بیٹی پر کیسا بھرپور اعتماد تھا؟

شاہینہ سسک کر باپ کے کندھے سے لگ گئی جیسے اس کا رواں رواں پکار اٹھا۔

"ابا میاں میں آپ کے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہیں لگنے دوں گی ——— کبھی نہیں ——— کبھی بھی نہیں ———"

سہاگ رات اس کی توقعات کے بالکل برعکس نکلی۔ سارے خوبصورت اور جگمگاتے ہوئے خواب ایک ایک کر کے چور چور ہو گئے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ زندگی اس کے ساتھ اتنا بڑا ستم بھی کر سکتی ہے ——— بات کچھ بھی نہیں تھی ——— سب کچھ تھی ——— اس نے ایک دو باتوں کے بعد ہی یہ بات محسوس کر لی تھی کہ دولہا میاں کی باتوں لب و لہجہ اور انداز میں کچھ گنوار پن سا ہے ——— رہی سہی کسر یوں پوری ہو گئی کہ جیسے ہی کہ اس نے اپنے نازک اور خوبصورت ہاتھوں سے ان کے شدید اصرار پر پان بنا کر پیش کیا تو وہ بے حد دیہاتی پن سے بولے:۔

"سودی تھینک یو۔"

اس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا ——— اب جو اس نے ڈرتے ڈرتے نظر اٹھا کر دیکھا تو جیسے اس کا دم ہی نکل گیا۔

دولہا میاں تھے تو بڑے خوب رو لیکن گنوار پن اور دیہاتی پن کا نمونہ۔

اس وقت انہوں نے زرتار صافہ، اچکن اور سلک کا کرتا پاجامہ اتار کر گہرے گہرے رنگوں کا رات کا سونے والا لباس پہن رکھا تھا... اسے اچانک یاد آیا۔ دولہا میاں نے بیک ڈھولک گیت گا کر اسے سنایا تھا۔

دولہا گاؤں کا گنوار دلہن برتی بھی نہیں! اور پھر اسے یاد آیا۔

"اچھا اپیا اگر سچ مچ ہی دولہا بھائی اک دم گنوار نکل آئے تو آپ کیا بگاڑ لیں گی ان کا؟"

اور اسے اپنا جواب یاد آیا۔ "اری دیکھ لینا کان پکڑ کر گھر سے نکال دوں گی ——— ہاں ———"

اُس لمحے سے آج تک کے لمحے تک کتنا بڑا فاصلہ اور فرق تھا، کیا... کیا وہ ایسا کوئی اقدام کر سکتی تھی۔

اُسے تذبذب میں دیکھ کر دولہا میاں بولے ——— "تم خفا ہو گئیں کیا؟ دیکھو بھئی میں تم سے کچھ چھپاؤں گا نہیں۔ اصل میں مجھے انگلش ونگلش کچھ آتی نہیں۔ بس تھوڑی سی تعلیم پائی تھی ——— اور ویسے تعلیم کی ضرورت بھی کیا تھی۔ ہمارا الگ ہی کا بہت بڑا بزنس ہے اتنا سد پیسہ ہے کہ سات پشتیں بھی ختم نہیں کر سکتیں۔

اصل میں تمہارے ابا اور امی نے یہ رشتہ اسی لیے قبول بھی کیا کہ تعلیم وعلیم میں کیا دھرا ہے جو کچھ ہے پیسہ ہی تو ہے۔ پڑھ لکھ کر بھی انسان کیا کرتا ہے؟ دولت ہی تو کماتا ہے نا؟ پھر پڑھ لکھ کر خوا مخواہ وقت برباد کرنے سے کیا فائدہ؟"

شاہینہ کا جی چاہا کہیں سے ایک بڑی سی لکڑی مل جائے تو اپنے سر پہ مار کر قصہ ہی ختم کر لے۔ مگر ایسا لگتا تھا کہ زندگی نے اس پر امتحان کے نئے دروازے کھول دیئے ہیں۔ وہ سر جھکائے سنتی رہی۔

"اسی لیے اس کمی کو پورا کرنے کے لیے میں ایک تعلیم یافتہ لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا...." کچھ عجیب دیہاتی پن کہا جس میں معصومیت اور کچھ حماقت کی بھی چھاپ تھی۔

دولہا میاں نے جھجک کر نئی نویلی دلہن سے پوچھا۔ "تم میرا ساتھ دو گی نا شاہینہ۔؟"

شاہینہ نے اپنی کانپتی پلکوں پر اُمڈ آنے والے آنسوؤں کو بمشکل سنبھالا۔ اور ڈوبتی آواز میں بڑی ہمت سے بولی:

"آپ کو مجھ سے کبھی شکایت نہ ہو گی ——— انشاء اللہ۔" اور اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ ڈھانپ لیا۔

اعجاز کا بے حد اصرار تھا کہ ہنی مون کے لیے سارے ملک کا ٹرپ لگائیں لیکن شاہینہ سخت پریشان تھی۔ وہ سوچتی جہاں جاؤں گی ملنے جلنے والے تو ہوں گے ہی۔

آخر اتنے سارے لوگوں سے اعجاز کو کیسے چھپاؤں گی۔ اس کا لہجہ، بات چیت کا انداز، کپڑے پہننے کا طریقہ، ہر انداز اپنی جگہ نرالا تھا۔

اس کے اُٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے تک میں جو دیہاتی پن تھا وہ کیسے چھپ سکتا تھا۔ شاہینہ نے سوچ لیا تھا کہ وہ چند مہینے بے حد ضبط کا مظاہرہ کرے گی اور اعجاز کو سنوار لے گی۔ لیکن یہ امتحان بھی اپنی جگہ کٹھن کڑا تھا۔ بچہ ہو تو کوئی ڈپٹ بھی لے۔ ایک اچھے خاصے جوان مرد کو ہر بات پر روکتے ٹوکتے اچھا بھی تو نہیں لگتا۔ کیا پتہ کس بات پر خفا ہو بیٹھے یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ سسرال والے چڑ جائیں کہ آج تو بیاہ کر آئی ہیں اور آج ہی سے میاں پر ایسی حاوی ہو گئی ہیں کہ انگلی پکڑ کر چلا رہی ہیں۔ ویسے گھر میں زیادہ لوگ تھے بھی تو نہیں۔ ایک ساس تھیں جو بڑی بے ضرر قسم کی تھیں۔ نند ورزہ کر کے زیادہ تر اپنے کمرے میں ہی پڑی رہتیں دو نندیں تھیں جو شہر میں ہوسٹل میں رہتیں اور کالجوں میں پڑھتی تھیں۔ شادی کے فوراً بعد وہ شہر چلی گئی تھیں۔

ایک دیور تھے جو لندن میں میڈیکل کر رہے تھے۔ سسر تھے جو اکثر مردانے میں رہتے تھے۔ بس کھانے کے ٹائم پر گھر میں آتے تھے۔ گھر کیا تھا اچھی خاصی بڑی کوٹھی تھی۔ جدید ترین فرنیچر سے آراستہ پیراستہ۔ سامنے خوبصورت لان باغ۔

سلیقے سے گارڈن چیئرز لگی ہوئی۔ کوئی چیز ایسی نہ تھی جو اس گھر میں نہ تھی۔ ہر چیز کی، روپے پیسے کی ریل پیل۔ سب لوگ کالجوں میں پڑھ رہے تھے۔

پھر پتہ نہیں شاہینہ بے چاری کے نصیبوں پر کیا خدا کی مار تھی کہ اتنی پڑھی لکھی لڑکی کو جاہل شوہر سے سابقہ پڑا۔ ایک دن ایسے ہی گھما پھرا کر شاہینہ نے اعجاز سے پوچھا تو وہ بڑے دیہاتی انداز سے بولے۔ "میں بڑا تھا نا۔ لاڈ چونچلوں میں پڑھنے کا سوچا بھی نہیں۔ پھر بعد میں ہی سمجھ کر خیال آیا کہ چلو بھئی اپن نے نہیں پڑھا تو نہیں مگر چھوٹوں کو تو پڑھانا چاہیے تو یہ سب بچے اب میری ہی وجہ سے پڑھ رہے ہیں۔" اور اس نے بڑے فخر سے شاہینہ کی طرف دیکھا۔ شاہینہ کا دل اندر سے بری طرح چکنا چور ہو رہا تھا مگر اعجاز کا دل رکھنے کو مسکرا کر بولی:

"آپ نے واقعی بہت اچھا کام کیا۔"

اچانک اعجاز بڑے پیار سے پوچھ بیٹھا "شاہینہ تم جو خود ایک اتنی پڑھی لکھی لڑکی ہو تو تمہیں یہ تو خیال نہیں آتا کہ میرا دولہا کتنا جاہل ہے۔"

اعجاز نے کیسے اس کے دل کا چور پکڑ لیا۔ وہ گھبرا سی گئی مگر جیسے اپنے آپ کو سنبھال کر بولی:

"پتہ نہیں آپ بھی کیسی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ کیا دنیا میں تعلیم ہی سب کچھ ہے ———" اور وہ بات بنا کر بولی ——— "کیا آپ چاہیں

تو تعلیم حاصل نہیں کر سکتے ؟"
پھر خوبات سے اعجاز بولا "اب میں پڑھوں گا تو کیا شرم نہیں آئے گی۔"

"میں پڑھاؤں گی۔" شاہینہ ایک عزم کے ساتھ بولی۔ "مجھ سے تو آپ کو شرم نہیں آئے گی نا۔" اس کے لہجے میں پیار امڈ آیا تھا۔

شادی کو ابھی صرف ایک ہی ماہ ہوا تھا اور ابھی تک دعوتوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوا تھا۔ اعجاز چن چن کر ایسے بے تکے لباس پہنتا کہ شاہینہ اپنے آپ میں کٹ کٹ جاتی۔ مگر منہ سے کبھی کچھ نہ کہتی۔

اس دن شاہینہ کی کالج کی تمام سہیلیوں نے دونوں دولہا دلہن کو مدعو کیا تھا۔ پارٹی عائشہ کے بنگلے پر ہونی تھی۔ عائشہ کے ڈیڈی میڈیکل کالج کے ہیڈ تھے۔ بڑی دھوم دھڑکے کی پارٹی تھی۔ شاہینہ کا دل رہ رہ کر ڈوب سا رہا تھا۔ اس کی سہیلیاں کیا سوچیں گی۔ کیسی دل ہی دل میں ہنسی اڑائیں گی۔

اللہ کرے آج اعجاز ذرا سلیقے سے بن جائیں۔ اعجاز تیار ہو کر نکلا تو وہ سہم ہی گئی۔

اعجاز نے کاسنی رنگ کی پتلون پر نیلے رنگ کا کوٹ پہن رکھا تھا اور سرخ رنگ کی دھنک ہوتی ٹائی باندھ رکھی تھی۔ پتہ نہیں کہاں سے برآمد کئے ہوئے پیلے رنگ کے جوتے پہنے تھے اور بالوں میں اتنا تیل چپڑ رکھا تھا کہ لگتا تھا تیل میں ڈوب کر نکلا ہو۔ آتے ہی اس نے بڑے چاؤ سے پوچھا۔

"کیوں شاہینہ کیسا لگ رہا ہوں ؟"

"بہت اچھے۔" شاہینہ بمشکل حلق تر کرتی ہوئی بول سکی۔ یوں جیسے کوئی بچے کو بہلائے۔ بڑے پیار اور ملائمت سے۔ "اگر آپ پورا سوٹ ایک ہی رنگ کا پہنتے تو زیادہ اچھے۔"

"ارے نہیں شاہینہ ——" وہ بے حد خوش دلی سے بولا "میں نے آج خاص طور سے یہ کپڑے پہنے ہیں۔ کیونکہ تمہاری سہیلیوں کے ہاں جو جانا ہے۔"

"جیسی آپ کی مرضی ——" شاہینہ پیار سے بولی۔

"اور آج تمہیں بھی میری پسند کے کپڑے پہننے ہوں گے ——" کہتا ہوا اعجاز الماری کی طرف بڑھا۔

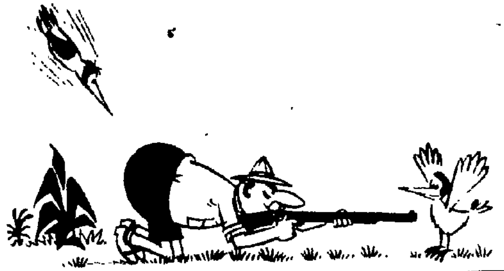
کپڑوں کی حد تک تو یہ غنیمت تھا کیونکہ جیسی ساڑی اس نے چنی اسی کی میچنگ کا بلاؤز ساتھ ہی رکھا تھا جو اسے نکالنا ہی پڑا۔ لیکن نارنجی رنگ کی ساڑی پر اس نے گہرے کتھئی رنگ کی لپ اسٹک شاہینہ

ایک دیہاتی مسافر ایک ریلوے پلیٹ فارم پر رو رو کر کہہ رہا تھا: "میری بیوی کو میرے ساتھ کا مسافر بھگا کر لے گیا۔ میں لٹ گیا، میں برباد ہو گیا۔"
اس کے ارد گرد بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ ایک نوجوان نے ازراہ ہمدردی اس کو مشورہ دیا۔ "اس رونے دھونے سے کچھ فائدہ نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ تم اس واقعہ کی رپورٹ پولیس اسٹیشن پر درج کرا دو۔" دیہاتی روتے روتے رک گیا اور بولا۔ "بھائی میں یہی تو نہیں کر سکتا کیونکہ میں خود اسے بھگا کر لایا تھا۔"

کے لیے چنی۔ حالانکہ اس کے پاس بالکل نارنجی شیڈ کی بڑی پیاری ہلکی سی چمک والی لپ اسٹک موجود تھی۔ غضب تو جب ہوا کہ آدھا زیور اس نے سونے کا نکالا۔ آدھا موتیوں کا۔ انگوٹھی فیروزے کی تو بریسلٹ پکھراج کے۔ نارنجی جوڑے پر اس نے نہ جانے کہاں سے اودے رنگ کی سینڈل کھوج نکالی۔

شاہینہ پریشان ہو گئی۔ کالج بھر میں اس کی نفاست پسندی اور سلیقے کی دھوم تھی۔ اس کی میچنگ کا یہ عالم تھا کہ اگر کبھی ساڑی سفید پہنی تو لپ اسٹک سے لے کر چوڑیاں، انگوٹھی، چپل، زیور تک سفید ہی پہنتی۔ مناسبت کے لیے چاندی کے زیور کو ترجیح دیتی —— اور آج اس کی ساری سہیلیاں جمع ہونے والی تھیں۔ وہ کیا سوچیں گی کہ یہ شاہینہ کو کیا ہو گیا ہے —— وہ کیسے کیسے مذاق نہیں اڑائیں گی۔ اور پھر دونوں کی جوڑی جب ساتھ ساتھ لمبی سی گاڑی سے اترے گی تو کیسے چوں چوں کا مربہ وہ دونوں نظر آئیں گے —— کیا پیسہ ہی سب کچھ ہوتا ہے لیکن اس نے بڑے ضبط اور خوش دلی کے مظاہرے کے ساتھ کپڑے زیور پہنے اور ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد باہر آئی تو بالکل دیوالی کی ہنڈکلیا لگ رہی تھی۔ کوئی رنگ ایسا نہ تھا جو چھوٹ گیا ہو۔ ہر رنگ نے انصاف کیا تھا اور اس کے جسم پر موجود تھا۔ آئینے میں اس نے خود کو دیکھا صورت تو بے حد پیاری لگ رہی تھی۔ گہرے کتھئی رنگ کی لپ اسٹک کے باوجود! مگر پورا حلیہ! اعجاز نے اسے بڑی خوب صورت نگاہوں سے دیکھا اور جیسے سرشار ہو کر بولا:

"اُف —— میرے ذہن میں بالکل ایسی ہی دلہن کا تصور تھا۔"



شاہینہ مسکرا دی اور جواباً بولی :۔

"میں نے بھی اپنے ذہن میں جو ایک روایتی شہزادے کا تصور سجا رکھا تھا وہ بالکل آپ جیسا تھا۔"

اچانک گاڑی میں بیٹھے بیٹھے اعجاز نے اناڑی پن سے پوچھا۔

"مگر شاہینہ مجھے یہ تو بتاتی چلو کہ میں تمہاری سہیلیوں سے بات کیا کروں ۔۔؟"

شاہینہ ہنسی ۔ "ارے کمال کرتے ہیں آپ بھی جو وہ پوچھیں آپ جواب دیجئے گا ۔۔ آپ کی تعریف کریں تو تھینک یو یا شکریہ کہئے گا ۔"

"اور سوری کب بولوں ۔۔ ؟" اس نے بچے کی سی ادا سے پوچھا۔

شاہینہ کا جی چاہا کہ چیخ چیخ کر رو پڑے لیکن ابا میاں کے الفاظ ذہن میں گونج اٹھے ۔ کبھی اپنے والدین کا سر دنیا کے سامنے نیچا نہ ہونے دینا۔ عورت ہی گھر کو جنت بناتی ہے، عورت ہی دوزخ ۔۔۔ تم خود جنت کا ایک روپ ہو۔"

"نہیں نہیں ۔۔۔۔" اس نے اپنے آپ کو سنایا ۔ میں اپنی گھریلو زندگی کو تباہ نہیں ہونے دوں گی ۔ کیا ہوا اگر وہ جاہل ہیں ۔ میں انہیں سنواروں گی ۔۔۔ "اور وہ جیسے آپے میں آکر بولی :۔

"سوری آپ اس وقت بولیں گے جب میری کوئی فرینڈ آپ کی طرف کوئی چیز بڑھائے اور آپ لینا نہ چاہیں ۔ یا آپ کا پیر اتفاقاً کسی کو لگ جائے یا ۔۔۔۔ " اور وہ بچوں کی سے انہماک سے سنتا رہا۔

واپسی میں راستہ بھر دونوں خاموش رہے ۔ اعجاز کی خاموشی میں شرمندگی کا پہلو تھا اور شاہینہ کی خاموشی یوں تھی کہ وہ بات کر کے مزید شرمندگی کا موقع اعجاز کو دینا نہیں چاہتی تھی ۔

بات کچھ بھی نہیں تھی ۔ وہاں پارٹی میں بیٹھے بٹھائے اعجاز نے شاہینہ کی ایک سہیلی کے ٹھوکر مار دی اور پھر بڑے خلوص کے ساتھ کہا ۔

"تھینک یو ۔۔"

اور جب اس کی سہیلی نے چونک کر اسے دیکھا تو وہ بڑے بھولپن سے پوچھ رہا تھا۔

"کیوں شاہینہ میں نے تھینک یو ٹھیک ہی کہا نا ؟"

اُس دن جب دونوں سٹی مارکیٹ سے شاپنگ کر کے لوٹ رہے تھے تو راستے میں ایک جگہ شاہینہ نے اسے کار رکوانے کو کہا۔ اعجاز کو اکیلا چھوڑ کر وہ خود ہی ایک دکان میں گئی اور تھوڑی دیر میں ایک بنڈل لے آئی ۔

"اب چلئے ۔۔" وہ بڑی خوش دلی سے بولی ۔

"یہ کیا ہے ۔۔ ؟" اعجاز تجسس کو نہ روک سکا ۔

"آپ کے لیے ایک تحفہ ۔" وہ ہنس دی ۔

"میں دیکھوں ۔"

"اونہوں ۔" وہ پیار سے بولی "گھر چل کر ۔"

کمرے میں پہنچتے ہی اعجاز نے سب سے پہلے بنڈل کھول کر دیکھا ۔ کتابیں ! انگلش کی !!

"مگر میں یہ پڑھ نہیں سکتا شاہینہ ۔۔ میرے لیے کوئی اور تحفہ لاتیں ۔"

"اسی لیے تو لائی ہوں جناب کہ آپ پڑھ نہیں سکتے میں خود آپ کو پڑھنا سکھاؤں گی ۔"

"تو گویا آپ میری استاد بنیں گی ۔"

"جو بھی آپ سمجھ لیجئے ۔۔" پھر وہ بے حد پیار سے بولی "جی

آپ جیسے بھی ہیں میرے ہیں ــــ میں جیسی بھی ہوں آپ کی ہوں۔ اگر ہم دونوں اپنی خامیاں ایک دوسرے کی مدد سے دور کرسکتے ہیں تو اس میں شرم کیسی۔"

اعجاز اس کی اس قدر بے پناہ محبت سے یوں پگھل کر رہ گیا جیسے آگ کے سامنے موم۔

زندگی سراسر ایک کڑا امتحان تھی مگر اب شاہینہ کو اس امتحان میں بھی ایک لذت محسوس ہونے لگی تھی۔ سارے مہرے ایک ایک کرکے اس کی گرفت میں آتے جا رہے تھے۔ اس کی زندگی کا مقصد صرف ایک ہی تھا۔ اعجاز سنور جائے۔ کوئی یہ نہ سوچے کہ تعلیم یافتہ بیوی نے جاہل شوہر کو ٹھکرا دیا۔ کوئی یہ نہ سوچے کہ مرد جاہل تھا تو بیوی نے اسے گدا ہی نہیں۔ نہ عزت دی نہ محبت ــــ وہ تعلیم کو کیوں بدنام کرے وہ نئے دور کی پردردہ ضرور تھی۔ وہ بے پردہ تھی۔ پارٹیوں میں جاتی تھی پکچر دیکھتی تھی۔ غیر مردوں سے بھی ملتی تھی۔ میک اپ کرتی تھی۔ لپ اسٹک لگاتی تھی۔ سب کچھ کرتی تھی۔ لیکن وہ ان لوگوں میں سے تھی جو باغ میں جاتے ہیں تو پھول سمیٹ لیتے ہیں۔ کانٹوں کو چھوڑ دیتے ہیں یا کانٹے چبھ بھی جائیں تو ان کی چبھن کو برداشت کرنے کا مادہ بھی رکھتے ہیں۔ آج کتنے مہینوں سے وہ کانٹوں کی چبھن برداشت کر رہی تھی مگر منہ سے اُف تک نہ کیا تھا۔

اُس دن جب شاہینہ نے اسے انگلش کی ابتدائی کتاب ختم کروائی تو وہ خوشی سے پھولی نہ سما رہی تھی۔ اعجاز بھی بے حد خوش تھا۔ وہ اپنے انالی بھولپن کے ساتھ بولا۔

"کیوں نہ اس خوشی میں ہم ایک پارٹی دیں۔ ہاں شاہینہ؟"

شاہینہ سہم گئی ــــ پارٹی ...... وہ بول نہ پائی۔ لوگ بھلا کیا سوچیں گے۔ انگلش کی اتنی سی پہلی کتاب ختم ہونے پر پارٹی۔! پھر ایک اور ندامت کا سامنا ــــ مگر وہ بروقت سنبھل گئی۔

"اجی ــــ میں نے آپ کی کوئی بات کبھی نہیں ٹالی۔" مگر وہ منہ پھیر کر شرمائی ...... اور کچھ کسمندی کے ساتھ بولی۔ "اتنی بڑی پارٹی کا انتظام میں نہ کر پاؤں گی۔"

"کیوں بھلا ــــ؟" اعجاز حیرت سے بولا۔

"اوہ ــــ آپ کو تو ہر بات کھول کر سمجھانی پڑتی ہے۔" اور اس نے اجی کے سینے میں اپنا منہ چھپا لیا۔

"اچھا یہ بات ہے ــــ" وہ خوشی سے اچھل پڑا۔ "مگر جان من آج ایک آخری فرمائش ...... اس پارٹی کے بعد سارے ہنگامے

عورت

عورت کی نگاہوں میں قانون سے
زیادہ طاقت ہوتی ہے اور اس کے آنسو ہمارے
دلائل سے زیادہ مضبوط ہوتے ہیں۔ (سیول)

عورت دنیا کی شاعری ہے بالکل اسی طرح
جیسے ستارے آکاش کی۔ (ہارگریں)

عورت کی طرح اور کوئی یہ راز نہیں جانتا کہ
ایسی بات کیسے کی جائے جو نرم بھی ہو اور گہری بھی۔
(ڈاکٹر ہیوگو)

بند جب تک کہ تم اور میں ماں باپ نہیں بن جاتے۔" شاہینہ نے لپک کر اس کا منہ بند کر دیا۔

"خدا نہ کرے جو آپ آخری فرمائش کریں ...... خدا کرے آپ ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہیں اور نت نئی روز ایک سے ایک فرمائش کریں اور میں ہوں آپ کی فرمائشیں پوری کرنے والی۔ آپ کے ناز اٹھانے والی۔"

رات گئے تک دونوں میاں بیوی نے مل کر خوب لمبی چوڑی لسٹ بنا ڈالی۔ کون کون آئے گا۔ کون کون نہیں۔ کیا پکے گا۔ کیا پروگرام رہے گا۔"

"کھانے کے بعد قوالی رہے تو کیسا رہے؟" اعجاز بڑی ترنگ میں تھا۔

"یہ تو خالص بزنس والوں کے چونچلے ہیں۔ رکھوا لیجئے جیسی آپ کی مرضی۔" وہ ہنسی۔

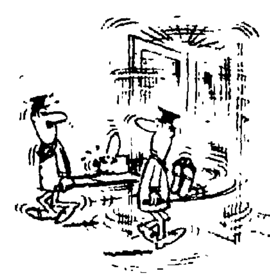
اعجاز مسکرایا۔ "میری جان کبھی تو اپنی بھی مرضی چلا لیا کرو۔"

"اچھا تو کل آپ میری مرضی کے کپڑے پہنیں گے۔"

"ضرور۔" وہ اتراتا ہوا فیصلہ کن انداز میں بولا۔ "یہ کام بائی خود انجام دے لیں گے۔" اتنے دنوں کی پڑھائی کا چھوٹا سا خوش کن نتیجہ یہ تھا کہ اب اعجاز انگلش کے چھوٹے موٹے الفاظ گفتگو میں استعمال کر لیا کرتا تھا۔

اچانک اعجاز بولا۔ "شاہینہ ڈیئر۔ کل تمہیں اپنے سامنے ڈریس سے ملاؤں گا ــــ ملو گی؟"

شاہینہ کو اس پر ایک ساتھ ترس اور پیار آ گیا۔ جیسا کچھ بھی



ں کا اچھی دل کا بُرا نہ تھا ورنہ وہ شاید ہی نباہ کر پاتی۔ وہ کھلے دل سے ہنس کر بولی۔ "ضرور دوں گی۔ آپ جو بھی کہیں کروں گی۔ جو بھی پہنیں گی۔ میں تو بھلا ہی آپ کی۔"

دوسرا دن بڑے صبر اور امتحان کا دن تھا۔ ایک طرف اس کی ہی ساری سہیلیاں اور رشتے ملنے والے۔ دوسری طرف اعجاز کے سارے دوست اور احباب۔ پتہ نہیں آج کی واردات کیا روپ دھالے۔"

"کوئی بات نہیں۔" وہ جیسے اپنے آپ کو سمجھاتی ہوئی بولی، جس طرح یہ سات مہینے نکل گئے ہیں۔ یہ گھڑی بھی ٹل جائے گی۔ —"

دعوت کی نوعیت کے بارے میں سوچ سوچ کر وہ ذہنی جا رہی تھی، پوچھنے والے کیا سوچیں گے — ابتدائی کتاب پہ اتنا بڑا ہنگامہ! پھر س نے خود ہی اپنے آپ کو مطمئن کر لیا۔

"ویسے ہے تو واقعی خوشی کی بات۔ بہرحال ایک انسان نے ترقی کی طرف پہلا قدم تو اٹھایا ہے۔"

شام پڑے اعجاز نے آکر شاہینہ سے بڑے پیار سے کہا۔ "آج ہم دونوں اپنی اپنی پسند کے کپڑے پہنیں گے تم بھی تیار ہو لو میں بھی آتا ہوں" شان کے اس نے پیار سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ میں جان من آج وہ نکھار کرو کہ سارے میں آگ لگ جائے۔"

شاہینہ ناز کے ساتھ اپنا ہاتھ چھڑا کر اندر بھاگ گئی۔

چند منٹوں بعد جب شاہینہ تیار ہو کر نکلی تو اعجاز بن سنور کر سامنے ہی کھڑا تھا۔

شاہینہ اسے دیکھ کر گرتے گرتے بچی۔

"آپ؟" اس کے منہ سے بس یہی ایک لفظ نکلا۔

"آپ کو رس میں۔ کیوں میری جان کو اتنی حیرت کیوں ہے؟"

مگر شاہینہ واقعی اسے حیرت سے دیکھتی رہ گئی۔ ہمیشہ کی طرح گنوار اور دیہاتی نظر آنے والا اعجاز آج کچھ اور ہی نظر آ رہا تھا۔ ہمیشہ تیل میں چپڑے رہنے والے بال آج بھورے بھورے نظر آ رہے تھے۔ گرے کلر کا شاندار سوٹ، اس کے ساتھ میچنگ ٹائی، چوڑے پٹے والی خوبصورت سی گھڑی، چمکتا جوتا، شاندار موزے۔

اس نے بڑے دلکش انداز سے شاہینہ کا ہاتھ تھاما۔ بڑے ہی مہذب اور شائستہ انداز سے اس کو اپنی طرف کھینچ کر بولا۔

"چلو جان! گیٹ پر کھڑے ہو کر ایک ساتھ اپنے دوستوں اور چاہنے والوں کا استقبال کریں۔"

شاہینہ گم سم سی اس کے ساتھ ہو لی۔ ایک ڈیڑھ گھنٹہ تک دونوں ساتھ ساتھ کھڑے مہمانوں کو ریسیو کرتے رہے۔ اعجاز کا رکھ رکھاؤ کس قدر دل نشین کیسا پیارا تھا۔ شاہینہ کو سب خواب سا لگ رہا تھا۔

جب اعجاز کے سارے دوست جمع ہو گئے اور کھانے کی گڑبڑ ہونے لگی تو اعجاز نے ہاتھ اونچا کر کے سب کو مخاطب کیا۔

"ایک منٹ!"

شاہینہ حیرت سے دیکھتی رہی۔

بڑے فصیح و بلیغ الفاظ، بڑے شائستہ اور مہذب انداز میں اعجاز نے کہنا شروع کیا۔

"آج میں اپنے دوستوں کے سامنے ایک فرشتہ خصلت اور فرمانبردار بیوی کو ایک طویل بن باس سے رہائی دلانے جا رہا ہوں۔

شادی سے پہلے ایک دن میرے چند دوستوں کے ساتھ یہ بحث چل نکلی تھی کہ کوئی پڑھی لکھی لڑکی، خاص طور سے آج کل کے زمانے کی لڑکی کسی جاہل کے ساتھ نباہ نہیں کر سکتی۔

مجبوری نالے یا اس کی دولت نا ملے کر بھی سے تو بدمزاجی، جھگڑے اور گھریلو تُنیاں پیچھا نہیں چھوڑ سکتیں۔

ایک ایسی لڑکی، جس نے اپنے ہونے والے شوہر کے بارے میں کبھی سنا ہو نہ اسے دیکھا ہو اور جب سنے تو یوں اور دیکھے تو یوں کہ سوائے شرمندگی اور ندامت کے کچھ نہ ملے۔

کوئی سوچ سکتا ہے اس کے احساسات کیا ہو سکتے ہیں۔

مگر میرا ایمان ہے کہ مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب! مشرقی لڑکی لاکھ پڑھ لکھ لے، نوکری کر لے، بے پردگی کرے، اس کی فطرت میں جو اللہ نے سادگی اور خلوص رکھ دیا ہے اسے کوئی نہیں چھین سکتا۔

جب ہماری یہ بحث ختم ہوئی تو میں تنہا ایک طرف تھا میرے سامنے دوستوں کی پلٹن ایک طرف۔

میں نے ان سب کو چیلنج کیا اب سوچتا ہوں تو مجھے ترس بھی آتا ہے کہ دولت کا پیسے کے فروغ شروع کے دور اول آنے والوں کا ان تو بیچاری دلہن کے محض ایک آزمائش اور امتحان ہی میں کٹ گئے۔

لیکن مجھے خوشی ہے کہ میرا سر نیچا نہیں ہوا۔ صدیوں ہے کہ شاہینہ نے اپنے میکے غلط لکھنا تک چھوڑ دیئے مسبادا دل کی کوئی کسی طرح تحریر میں ظاہر ہو جائے۔

شاہینہ ایک ایسی لڑکی ہے جو زندگی بھر تکلیف اٹھا کر بھی مسکراتی رہی۔ میرا چیلنج تھا کہ سال بھر تک میں طرح طرح سے شاہینہ کو آزماؤں گا لیکن پیارے دوستو! اب جب کہ ہماری بگیا میں بہار پوری طرح چھانے جا رہی ہے۔ میں شاہینہ کو اپنے ہونے والے بچے کو اور خود کو مزید دکھ نہیں دے سکتا۔"

وہ زک کر بولا — "ارے بھائی اس ساری مدت میں میں نے بھی کوئی کم تکلیف نہیں اٹھائی ہے۔ ایک انگلش لٹریچر سے ایم اے پاس شخص کی درگت آپ خود سوچ لیں جسے اے فار ایپل۔ بی فار بے بی۔ پڑھنا پڑے۔"

اس نے مسکرا کر شاہینہ کی طرف دیکھا لیکن۔۔۔ وہ گھبرا گیا۔ تھوڑی دیر کی چھوڑ کر وہ لپکا — شاہینہ ہاتھوں میں منہ چھپائے روتے جا رہی تھی۔

وہ اسے تھام کر اپنے کمرے میں لے آیا۔ "خدا کے لیے شاہینہ میری جان۔۔۔۔"

"آپ نے۔۔۔۔ آپ نے مجھے کتنا ستایا ہے۔ کوئی انداز ہے"

وہ مارے ندامت اور خجالت کے جھکا سا گیا۔

"ٹھیک ہے شاہینہ۔ میں اپنی غلطی کو مانتا ہوں۔ لیکن شاہینہ میری رگوں میں جو مشرقیت ہے وہ مجھے اکسا تی تھی کہ میں نبھا نہ پڑوں۔ میں ان دوستوں کو بتا دینا چاہتا تھا کہ مشرقی لڑکی مشرقی ہی ہوتی ہے۔ اور تم سو فیصدی ویسی ہی ہو میری جان۔"

"اور آپ یہ بھی بتانا چاہتے تھے نا کہ مجھ جیسی لڑکی کو آپ پچاس ہزار میں خرید سکتے ہیں؟" وہ طنز سے بولی۔

"پچاس ہزار؟" وہ حیرت سے بولا۔

"میں نے کب ایسی بات کی؟ تم جیسی لڑکی پچاس ہزار تو کیا پچاس کروڑ میں بھی نہیں خریدی جا سکتی۔"

"پھر آپ نے جہیز کا ڈھونگ کیوں رچایا تھا؟ کیا شادی کے ڈھکوسلوں میں جہیز ایسا ہی ضروری ہے۔ کیا سونا چاندی میری اور آپ کی محبت کا بدل ہو سکتا ہے؟" وہ غصے سے بولی۔

"افوہ — آج پتہ چلا میری رانی کو غصہ بھی آ سکتا ہے۔" اس نے شاہینہ کو اپنے سے قریب کر کے ہونٹ نزدیک لایا۔ مگر وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گئی۔

"بے شرم کہیں کے۔ میں آپ سے نہیں بولوں گی۔"

وہ بجھ سا گیا — "شاہینہ میری جان۔ کیا سچ مچ میں نے تمہارا دل دکھایا ہے؟"

وہ اس کے سینے سے لگ گئی — "نہیں ابھی نہیں آپ نہیں سمجھتے مجھے دکھ صرف ایک بات نے دیا تھا۔ آپ سوچئے جو لڑکی زندگی بھر کے لیے کسی کے ہاتھ اپنے کو سونپ دیتی ہے اس کی ذات اور محبت کو پیسے کے ترازو میں تولنا کتنی عجیب سی بات ہے۔ کیا میں بکنے والی چیز ہوں؟"

"افوہ تم خواہ مخواہ باتیں بنا رہی ہو جان — میں نے کب ایسا سوچا ہے — مگر چند لوگوں میں اپنی حیثیت کے رکھ رکھاؤ کی خاطر یہ سب کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔"

"تو وعدہ کیجئے کہ آپ مجھے وہ پچاس ہزار کی رقم کبھی نہیں دیں گے۔"

باہر سے شاہینہ کی سہیلیاں اور اعجاز کے دوست شور مچانے لگے۔ "ارے بھئی سہاگ رات بعد میں منا لینا یہاں بھوک کے مارے دم نکلا جا رہا ہے۔"

اعجاز نے پیار سے شاہینہ کو اپنی باہوں میں بھر لیا۔۔۔۔۔۔ دنیا بھر کی خوشیاں اس کی گرفت میں تھیں۔ اسے یونہی تھامے ہوئے وہ دھیرے دھیرے باہر نکل آیا جہاں ایک ننھی شام ان دونوں کے انتظار میں جگمگا رہی تھی۔

تحیرخیز ماڈرن رومانی ناول

— قسط نمبر (۶) —

جانور

[illegible]

ڈاکٹر کامران مقامی کالج میں فلسفے کا پروفیسر تھا۔ وہ بے حد وجیہہ اور دلکش تھا۔ لڑکیوں کے لیے اس میں ایک خاص کشش تھی۔ مگر وہ خود لڑکیوں کی طرف مطلق توجہ نہیں کرتا تھا۔ لڑکیوں میں وہ مغرور اور خودپسند مشہور تھا۔ اسی کالج کی چھ لڑکیاں شہناز، زبیدہ، ہما، اختر، شیریں اور پروین بھی ڈاکٹر کامران میں دلچسپی رکھتی تھیں۔ مگر شہناز ان سب سے آگے تھی۔ ڈاکٹر کامران کی دلکشی کے باوجود وہ اس سے شدید محبت کرتی تھی۔ پھر ایک دن ڈاکٹر کامران نے پُراسرار انداز میں ایک پرچہ شہناز کو دیا جس میں اسے آئندہ رات کو ڈاکٹر کامران سے ملنے کے لیے کہا گیا تھا۔ وہ ڈاکٹر کامران کے متعلق سوچ رہی تھی کہ ایک ناخوشگوار واقعہ رونما ہو گیا۔ مہر نے اپنے ایک ضدی اور سرکش عاشق واجد کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ اس واقعے سے لڑکیوں میں سراسیمگی پھیل گئی وہ سب مل کر اس فلیٹ میں واجد کی لاش دیکھنے پہنچیں جہاں کہ مہر نے اسے ہلاک کیا تھا۔ مگر لاش غائب تھی۔ اس صورت حال سے وہ سب حواس باختہ ہو گئیں۔ دوسرے دن شہناز ضروری تیاریوں کے بعد ڈاکٹر کامران سے ملنے پہنچی۔

دروازہ خود ڈاکٹر کامران نے کھولا۔ وہ اس وقت ایک اخبار نویس سے مصروف گفتگو تھا۔ اخبار نویس رخصت ہوا تو ڈاکٹر کامران نے شہناز کی طرف توجہ کی۔ باتوں کا سلسلہ چل نکلا اور شہناز ڈاکٹر کامران سے مسحور ہوتی رہی۔ پھر اچانک ڈاکٹر کامران نے یہ کہہ کر شہناز کو چونکا دیا کہ وہ کچھ عرصے کے لیے اسے ذہنی بیوی بنانا چاہتا ہے۔ شہناز پریشان ہو گئی مگر ڈاکٹر کامران سے اس قدر متاثر تھی کہ آمادگی ظاہر کر دی۔ دوسرے دن ملاقات کا وعدہ کر کے زبیدہ کے گھر واپس آئی تو فون پر ایک اجنبی کا پیغام ملا۔ وہ مہر کو پوچھ رہا تھا اور دھمکی دی تھی کہ واجد کا خون رائیگاں نہیں جائے گا اور مہر سے جلد عوض لیا جائے گا۔ شہناز اس دھمکی پر بوکھلا گئی۔ اس نے اپنے طور پر واجد کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ اسے یقین سا ہونے لگا کہ واجد واقعی میں مر چکا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی اس پر خوف بُری طرح طاری ہو گیا۔ رات وہ د ڈاکٹر کامران سے ملنے اس کے گھر پہنچی۔ باتوں باتوں میں ڈاکٹر کامران نے بتایا کہ اس کا باپ جو دائم المریض ہے اور اپنی بیماری کے سبب کامل طور پر بستر پر ہے عنقریب کچھ عرصے کے لیے یہاں آ رہا ہے۔ اسے ڈاکٹر کامران کی شادی کی [illegible] یہ خواہش تھی اور ڈاکٹر کامران نے اسے ٹالنے کے لیے لکھ دیا تھا کہ اس نے حال ہی میں شادی کر لی ہے۔ اب اس کا باپ بہو سے ملنے آ رہا تھا۔ چونکہ ڈاکٹر کامران نہیں چاہتا تھا کہ اس کا جھوٹ کھلے اور اس کے باپ کو دکھ پہنچے اس لیے اس نے شہناز سے فرضی بیوی بننے کی درخواست کی تھی۔ شہناز کو ڈاکٹر کامران کی یہ بات بڑی عجیب سی لگی مگر اس نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ ڈاکٹر کامران سے مل کر زبیدہ کے گھر آئی تو دروازہ مقفل ملا۔ شہناز نے [illegible]



طور پر اندر آ کر اپنے لیے رات کا کھانا تیار کرنے لگی۔ اس وقت باہر اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ شہناز نے سوچا کہ لڑکیاں واپس آ گئی ہیں۔ اس نے جا کر دروازہ کھولا اور سامنے دیکھا تو مارے خوف کے اس کی چیخ نکل پڑی اور وہ چکرا کر گر گئی۔ اس کے سامنے صحن میں وہی لاش کھڑی تھی۔ پھر وہ لاش اس کے وجود کو چھو کر گزرتی ہوئی مکان میں داخل ہو گئی۔

لڑکیاں واپس آئیں تو شہناز کو ہوش آ چکا تھا۔ طبیعت سنبھلی تو شہناز کو یاد آیا کہ وہ شے جسے وہ لاش سمجھ رہی تھی وہ اصل لاش نہیں تھی بلکہ کوئی عورت تھا۔ اس نے جسم کے گرد سفید چادر لپیٹ رکھی تھی۔ لڑکیوں کے پوچھنے پر شہناز نے بتایا کہ ڈاکٹر کچھ عرصے کے لئے اسے اپنی فرضی بیوی بنانا چاہتا ہے اور وہ یہ محض اپنے بوڑھے اور بیمار باپ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کر رہا ہے جو کہ عنقریب لندن سے آنے والا ہے۔
اگلی صبح شہناز کو فون پر ایک اجنبی کا پیغام موصول ہوا۔ اجنبی اس سے تنہائی میں میڈیکل کالج کی لائبریری میں ملاقات کرنا چاہتا تھا اور شہناز بلا حیل و حجت اس سے ملنے پہنچ گئی۔ اجنبی سے مل کر انکشاف ہوا کہ وہ واجد کا دوست ہے اور واجد مرا نہیں ہے البتہ اس کی حالت بہت خراب ہے اور وہ واجد ہی تھا جو سفید چادر اوڑھے زبیدہ کے گھر میرے ملنے پہنچا تھا مگر ملاقات خود اس سے ہو گئی تھی۔ شہناز یہ خبر سن کر دوستوں کے درمیان پہنچی تو ان سب پر شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس خوشی میں ایک بھرپور جشن کا اہتمام کیا گیا۔ مگر اس وقت ہما ان کے درمیان نہیں تھی۔ ہما کے گھر فون کیا گیا مگر ہما کے گھر سے یہ دہشت ناک خبر ملی کہ ہما گھر پر نہیں ہے اور زبیدہ کے گھر گئی ہے۔ اس اطلاع نے سب کو پریشان کر دیا اور وہ سوچنے لگیں کہ آخر ہما گئی کہاں۔ اگلے دن طے شدہ پروگرام کے مطابق شہناز ڈاکٹر کامران کے گھر گئی۔ اس رات ڈاکٹر کامران کا باپ لندن سے آنے والا تھا۔ ڈاکٹر کامران اپنے باپ کو ائیرپورٹ سے لے کر آیا تو شہناز نے اس بوڑھے شخص کو قریب سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی چمک تھی۔ شہناز کو اچانک خیال آیا کہ کہیں وہ کسی مصیبت میں تو نہیں پھنسنے جا رہی۔ ہو سکتا ہے یہ بوڑھا ڈاکٹر کامران کا باپ نہ ہو، کوئی فراڈ ہو۔ یہ خیال آتے ہی شہناز پر خوف طاری ہو گیا اور اس کی حالت غیر ہو گئی۔
مگر بعد کے واقعات نے بتایا کہ وہ بوڑھا شخص ڈاکٹر کامران کا باپ ہی تھا۔ شہناز کے لیے وہ بہت مہربان اور مشفق ثابت ہوا۔ اس نے شہناز کو واقعی خسر سے کہیں زیادہ بڑھ کر محبت دی۔ ڈاکٹر کامران نے باپ کو ہوٹل میں ٹھہرایا اور وعدہ کیا کہ اگلے دن رات کا کھانا وہ کسی ریستوراں میں کھائیں گے۔ شہناز زبیدہ کے گھر واپس آئی تو اس وقت تک ہما واپس آ چکی تھی۔ ہما کی حالت بہت خراب تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کا ایک عاشق رضا جانے بنا کر اُسے اپنے گھر لے گیا تھا اور بیہوش کر کے داغدار کر دیا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ بُری طرح زدوکوب بھی کیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ ہما کسی دوسری جگہ شادی کرنے کے خیال سے باز آ جائے اور اس سے شادی کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ ہما بہت دل برداشتہ تھی۔ اس نے اپنے منگیتر سے منگنی توڑنے کا ارادہ ظاہر کیا اور کہا کہ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے وہ اس کا انتقام دوسرے مردوں سے لے گی اور سب سے پہلا شکار ڈاکٹر کامران ہوگا۔ دوسرے دن شہناز ڈاکٹر کامران کے گھر پہنچی اور وہاں سے وہ دونوں ہوٹل روانہ ہو گئے۔ رات کا کھانا ڈاکٹر کامران اس کے باپ اور شہناز نے ایک ریستوراں میں کھایا۔ کھانا جاری تھا کہ کسی نے عقب سے ڈاکٹر کامران کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ڈاکٹر کامران نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ چونکنے کی ... کا چہرہ سفید پڑ گیا اور چھری ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑا۔
وہ شخص ڈاکٹر کامران ہی کے کالج میں انگریزی ادبیات کا پروفیسر تھا۔ ڈاکٹر کامران اس سے بہت بداخلاقی سے پیش آیا۔ پروفیسر چلا گیا تو وہ لوگ بھی ریستوراں سے باہر نکل آئے۔ اگلے دن کے لئے طے پایا کہ رات کا کھانا ڈاکٹر کامران اور اس کا باپ گھر پر کھائیں گے اور شہناز کھانا پکائے گی۔ شہناز نے وعدہ تو کر لیا مگر بعد میں پچھتانے لگی کہ ناحق وعدہ کیا۔ وجہ یہ تھی کہ اُسے کھانا پکانا نہیں آتا تھا مگر آخر کار اس نے یہ مسئلہ زبیدہ کے سامنے رکھا۔ زبیدہ اس کی مدد پر آمادہ ہو گئی۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ اگلے دن ڈاکٹر کامران کی آمد سے پہلے اس کے گھر پہنچ جائے گی اور آپا کی مدد سے کھانا تیار کر کے واپس آ جائے گی۔ رات شہناز بستر پر لیٹی تو اس کا ذہن ڈاکٹر کامران کے باپ کی طرف چلا گیا۔ اُسے اس بات پر دکھ ہونے لگا کہ وہ اور ڈاکٹر کامران مل کر اس شریف اور بوڑھے انسان کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ اسے یہ خیال بھی ستانے لگا کہ جب ڈاکٹر کامران کا باپ لندن واپس چلا جائے گا تو ڈاکٹر کامران اس سے قطع تعلق کر لے گا۔ شہناز نے طے کیا کہ وہ ڈاکٹر کامران کے باپ سے مل کر اس پر ساری بات کھول دے گی تاکہ وہ سارے حالات سے باخبر ہو جائے اور ممکن ہے اس پر رحم کھاتے ہوئے وہ اپنے بیٹے کو اس سے شادی پر مجبور کر دے۔ دوسری صبح شہناز اس غرض سے ڈاکٹر کامران کے باپ سے ملنے ہوٹل پہنچی تو اُسے یہ دیکھ کر شدید دھچکا لگا کہ ڈاکٹر کامران وہاں پہلے سے موجود تھا۔ ڈاکٹر کامران نے بالواسطہ اس کی بہت بے عزتی کی اور شہناز دل برداشتہ ہو کر واپس آ گئی۔ اس سہ پہر کو اس نے ڈاکٹر کامران اور اس کے باپ کے لئے زبیدہ اور آپا کی مدد سے بہترین کھانے تیار کئے۔ ان لوگوں نے کھانا بے حد پسند کیا۔ پھر رات گئے ڈاکٹر کامران خود شہناز کو زبیدہ کے گھر چھوڑنے گیا۔ دوسری صبح شہناز کو واجد کے دوست کا فون ملا کہ واجد نے خودکشی کی کوشش کی تھی اور اب اس کی حالت بہت نازک ہے۔ چنانچہ وہ فوراً اس کی کلینک روانہ ہو گئیں۔ شہناز اور شیریں کچھ پس و پیش کے بعد واجد کے دوست سے ملنے کلینک پہنچ گئیں۔ ان دونوں کی خوف اور دہشت سے بُری حالت تھی۔ شہناز نے ایک لمحے توقف کیا اور پھر بند دروازے پر دستک دے دی۔

(بقیہ آگے پڑھئے)

کچھ زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ دروازہ آہستگی سے کھلا اور واجد کے دوست کا چہرہ نمودار ہوا۔ یہ وہی دوست تھا جس سے میں پہلے ایک بار مل چکی تھی اور جس کے ذریعہ معلوم ہوا تھا کہ واجد مرا نہیں، زندہ ہے۔ اس بار وہ پہلے کی مانند پراسرار نظر نہیں آیا۔ اس کے برعکس اس کے لبوں پر بڑی خلیق مسکراہٹ تھی۔ اور آنکھیں ایک خوشگوار چمک سے لئے ہوئے تھیں۔ صورت حال کی نزاکت کے پیش نظر میں نے سوچا کہ وہ ضرور پریشان اور سراسیمہ ہوگا مگر اس کے چہرے سے ایسی کوئی بات ہویدا نہ تھی۔ اس نے ایک نظر مجھے دیکھا پھر اس کی نگاہ میرے عقب میں کھڑی ہوئی شیریں پر پڑ گئی۔ اسے دیکھتے ہی وہ چونکا اور ناگواری سے بولا۔ "میں نے تم سے اکیلی آنے کے لئے کہا تھا۔"

میں اس کے لہجے پر ٹھٹھک گئی۔ آخر شیریں کو ساتھ لانے میں کونسی قیامت برپا ہو گئی، اس میں خفگی کی کیا بات تھی۔ ہم سہیلیوں کے درمیان کونسی بات راز کی حیثیت رکھتی تھی۔ شیریں ساتھ نہ آتی تو بھی اسے یہاں کی تمام باتیں بے کم و کاست معلوم ہو جاتیں۔ اسے کیا تمام لڑکیوں کو معلوم ہو جاتا اور شاید یہ بات وہ خود بھی جانتا ہوگا۔ مگر اس کے باوجود شیریں کے ساتھ آجانے پر چراغ پا ہو رہا تھا۔ میں نے سوچا ممکن ہے مجھے ہی سمجھنے میں کچھ غلطی ہوئی ہو اور واجد کا یہ دوست وہ نہ ہو جو میں سمجھ رہی ہوں۔ پہلی ملاقات میں اپنی شرافت کا ثبوت دے کر ممکن ہے میرا دل جیتنا چاہتا ہو۔ اور اب اعتماد قائم کر کے مجھے کسی چکر میں پھنسانا چاہتا ہے۔

دودھ کا جلا چھاچھ پھونک کر پیتا ہے۔ ہم پر ان دنوں مصیبتیں ٹوٹ رہی تھیں۔ مصائب کی یلغار ہو رہی تھی، مہر پریشان تھی، ہما اپنا آپ گنوا بیٹھی تھی اور میں مسلسل گردش میں تھی۔ سبھی لڑکیاں سہمی ہوئی تھیں اور زبیدہ تو بُری طرح ڈری ہوئی تھی۔ اس جیسی گھاگ عورت کے بھی چھکے چھوٹ گئے تھے اب ہم اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ مزید کسی مصیبت کو دعوت دیتے۔ اگر واجد کا دوست کڑے تیور کے ساتھ شیریں کی آمد پر اعتراض نہ کرتا تو شاید میں اس انداز میں نہ سوچتی مگر اس کے رویئے نے مجھے گڑبڑا دیا۔ میں نے شیریں کا ہاتھ پکڑا اور ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ واجد کے دوست نے میری بدلی ہوئی کیفیت کو تاڑ لیا۔ وہ سمجھ گیا کہ میں نے اس کے اعتراض کو محسوس کیا ہے اور اب کوئی گفتگو کئے بغیر واپسی کا ارادہ رکھتی ہوں۔ وہ جلدی سے آگے بڑھا اور ملائمیت سے بولا۔ "شاید تم پھر کسی بدگمانی کا شکار ہو رہی ہو۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ تم مجھ سے ڈرتی کیوں ہو۔ میں کوئی درندہ تو نہیں ہوں جو تمہیں پھاڑ کھاؤں گا۔ میں نے تمہیں تنہا آنے کے لئے کہا تھا تو اس کی کوئی معقول وجہ ہوگی۔ دوسری بات یہ کہ تم اپنے ذہن سے نکال دو کہ تمہیں یہاں بلانے میں میری اپنی خواہش کارفرما ہوتی ہے۔ میں جو کچھ بھی کر رہا ہوں واجد کی ایما پر کر رہا ہوں۔ ان تمام امور کے پس پردہ واجد ہے اس نے تمہیں یہاں بلایا ہے اور یہ اس کی خواہش تھی کہ تنہا آؤ۔ ممکن ہے وہ تم سے کوئی ایسی گفتگو کرنا چاہتا ہو جو وہ دوسروں کے علم میں لانا پسند نہیں کرتا۔ میں تو خوامخواہ بیچ میں گھسٹ رہا ہوں۔ یہ دوستی کے تقاضے بھی خوب ہوتے ہیں۔ قدم قدم پر غلط فہمیاں اور بدگمانیاں۔" تلخی سے اس کے ہونٹ سکڑ گئے۔

"واجد کی حالت کیسی ہے؟" شیریں اچانک پوچھ بیٹھی۔

اس نے شیریں کے سوال کا جواب نہیں دیا۔ بجائے جواب دینے کے طنزیہ لہجے میں الٹا ایک سوال جڑ دیا۔ "شاید تم بھی اس مجلسِ شوریٰ کی ایک رکن ہو۔" پھر وہ زور سے ہنس دیا۔ ہنستے ہوئے بولا۔ "اب تم لوگ آ گئی ہو تو آؤ اندر آجاؤ۔" ہمیں راستہ دینے کی غرض سے وہ ایک طرف ہٹ گیا۔

میں نے اور شیریں نے آپس میں نگاہوں کا تبادلہ کیا، گویا ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہوں کہ کیا خیال ہے۔ اندر جایا جائے یا نہیں۔ شیریں کے انداز میں کچھ ہچکچاہٹ تھی اور شوق کا بھی اظہار ہو رہا تھا۔ دراصل ہم واجد کے سلسلے میں بہت پریشان اور ذلیل و خوار ہوئے تھے، پہلے ہمارا خیال تھا کہ وہ زخمی ہو کر کہیں روپوش ہو گیا ہے اور بلاوجہ مہر کو تنگ کر رہا ہے۔ مگر جب کئی دن تک اس کے بارے میں کچھ پتہ نہ چلا تو خدشہ ہوا کہ مر گیا ہے۔ اس کی موت کے تصور سے ہم سب بُری طرح سہمے ہوئے تھے۔ پھر واجد کے دوست نے فون پر بتایا کہ واجد مرا نہیں زندہ ہے۔ البتہ حالت بہت خراب ہے۔ پھر اس کے بعد ہی انکشاف ہوا کہ شدید مایوسی اور پریشانی کے عالم میں اس نے خودکشی کر لی ہے۔ ہم سمجھے کہ جب نہیں تو اب واجد اپنی زندگی سے گیا۔ مگر معلوم ہوا کہ وہ موت کے منہ میں جانے سے بچ گیا ہے اور تنہائی میں مجھ سے ملنا

ہ کرنے کا خواہاں ہے۔

یہ تھیں وہ باتیں جس نے مجھے اور شیریں کو بیک وقت
ت و تجسس میں مبتلا کر دیا تھا۔ ہم ڈرہی رہے تھے اور یہ جاننا
ی چاہتے تھے کہ آخر واجد نے مجھے کیوں بلایا ہے اور کس
م کی بات کرنا چاہتا ہے۔ دراصل ہم واجد کو اپنی آنکھوں
سے دیکھ کر کوئی نتیجہ اخذ کرنا چاہتے تھے۔ میں نے اور شیریں
نے ایک دوسرے کو بھرپور نظروں سے دیکھا اور پل بھر میں
طے کر لیا کہ ہمیں اندر ضرور جانا چاہئیے۔ پھر شیریں ہی نے
ہمت کی۔ اس نے قدم اٹھایا اور مجھ سے آگے ہو لی۔

اندر داخل ہوتے ہی واجد کے دوست نے پلٹ
کر دروازہ مضبوطی سے بند کر دیا۔ پھر وہ ہمیں لئے ہوئے ایک
دوسرے کمرے کی طرف چل پڑا۔ وہ بہت مطمئن اور پرسکون
دکھائی دیتا تھا۔ ایسا آدمی ہرگز نظر نہیں آتا تھا جس کے عزیز ترین
دوست نے خودکشی کی کوشش کی ہو اور اب زندگی اور موت
کی کشمکش میں مبتلا ہو۔ اس کے چہرے پر فکر و پریشانی کے آثار
دور دور نہ تھے۔ میں پوچھے بغیر نہ رہ سکی: "تم کیسے دوست ہو
اپنے دوست کی حالت پر ذرہ برابر پریشان نظر نہیں آتے
سے زیادہ تو ہم متاثر ہوتے ہیں۔"

وہ مڑے بغیر انتہائی سرد مہری سے بولا: "میں زیادہ
بات نہیں کرنا چاہتا، بس اتنا بتانا کافی ہے کہ جو کچھ کر رہا ہوں
واجد کی ہدایت پر کر رہا ہوں۔ اس سے ملو گی تو سب کچھ
جان لو گی۔" پھر شانے اچکاتے ہوئے بیزاری سے بولا: "میں
در اصل کر میں بیسویں صدی کے مجنوں سے دوچار ہوں۔ میری
سمجھ میں نہیں آتا کہ اس صدی میں جبکہ انسان کی مصروفیات
بہت زیادہ ہیں، لوگ افلاطونی عشق کے لئے وقت کیسے
نکال لیتے ہیں۔ بہرحال تم لوگوں سے درخواست ہے کہ واجد
سے تیز و تند لہجے میں بات نہ کرنا۔ میں اس کا دوست ہی نہیں
معالج بھی ہوں اور اس کی ذہنی حالت درست نہیں ہے۔"

ایک کمرے کے سامنے پہنچ کر وہ رکا اور شیریں کو
مخاطب کرتے ہوئے بولا: "خاتون میں تم سے واقف نہیں
ہوں، پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ معلوم نہیں تم کس افتاد طبع کی ہو
میری درخواست ہے کہ بے جا سوالات سے واجد کو
پریشان نہ کیجئے گا۔ وہ کسی قسم کے ذہنی دباؤ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔"

اس نے آگے بڑھ کر کمرے کا دروازہ کھول دیا اور اندر جانے کا
اشارہ کیا۔

وہ ایک چھوٹا سا صاف ستھرا کمرہ تھا جیسا کہ عموماً کلینک
یا پرائیویٹ اسپتال کے خصوصی وارڈ میں ہوا کرتا ہے۔ سامنے
آہنی پلنگ پر ایک صاف ستھرا، سفید اور بے داغ بستر لگا
ہوا تھا۔ واجد آنکھیں بند کئے بستر پر پڑا تھا۔ ہمارے قدموں
کی آواز محسوس کرتے ہی وہ اٹھ بیٹھا۔ اس کے خشک اور
پھیکے لبوں پر ایک لمحے کے لئے کمزور سی مسکراہٹ ابھری،
اور فوراً ہی معدوم ہو گئی۔ اس کے پیروں پر چادر پڑی ہوئی
تھی۔ اس نے چادر کھینچ کر ایک طرف ڈال دی، پھر جانے
کیا سوچا کہ دوبارہ اٹھا کر پیروں پر ڈال لی۔ عجیب حرکت
تھی۔ میں نے غور سے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اس کا
چہرہ زردی مائل تھا جیسے کسی نے سارا خون نچوڑ لیا ہو۔ سر
کے گرد ابھی تک پٹی بندھی ہوئی تھی اور داڑھی خاصی بڑھ آئی
تھی۔ بڑھے ہوئے شیو کی وجہ سے وہ کچھ زیادہ ہی لاغر اور
کمزور نظر آ رہا تھا۔

ہم نے کافی عرصے بعد واجد کو دیکھا تھا۔ واجد کو اس
حالت میں دیکھ کر مجھے افسوس ہوا۔ میں نے کنکھیوں سے
شیریں کی طرف دیکھا، وہ بھی بہت متاثر نظر آ رہی تھی۔ ہم نے
واجد کو ہمیشہ ہشاش بشاش اور اچھی حالت میں دیکھا تھا۔ اس
کے جسم پر ہمیشہ بہترین لباس موجود ہوتا تھا اور اس کا شمار
انتہائی اسمارٹ اور چاق و چوبند نوجوانوں میں ہوتا تھا۔ اب
جو اس حالت میں اسے دیکھا تو دل کو سخت دھچکہ پہنچا۔

شیریں کچھ دیر تک تاسف اور ہمدردی سے واجد کو
دیکھتی رہی پھر آگے بڑھ کر انتہائی نرمی سے بولی: "واجد! اب
تمہاری طبیعت کیسی ہے، یقین کرو کہ تمہیں اس حال میں دیکھ کر
ہمیں سخت دکھ پہنچا ہے۔ تمہارے ساتھ جو کچھ پیش آیا اس
پر صرف میں اور شہناز ہی نہیں ساری لڑکیاں بے حد پشیمان
اور شرمندہ ہیں۔ ہم سب تمہارے بارے میں بے حد فکر مند تھے۔"

واجد سر جھکائے اپنے ہاتھ کے ناخنوں کو گھور رہا تھا۔
شیریں کی بات سن کر اس نے سر اٹھایا اور حسرت بار نظروں
سے ہماری طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھ کے ایک گوشے میں
آنسو چمک رہا تھا۔

"کیا تمہارا دل میرے لئے کڑھ رہا ہے کیا تم میری مدد کرنا چاہتی ہو؟" اس نے آہستہ سے پوچھا۔

"بڑی خوشی کے ساتھ۔ مگر میں تمہاری کیا مدد کر سکوں گی تم ہم سب کو قصوروار گردانتے ہو گئے حالانکہ اس میں ہماری کوئی خطا نہیں ہے۔ مہر بہت ۔۔۔"

یک لخت واجد کے چہرے کی کیفیت تبدیل ہو گئی اور اس نے لپک کر شیریں کا ہاتھ پکڑ لیا، جنونی کیفیت میں بولا۔ "کچھ نہ کہنا۔ مہر کی برائی کرنے کی اجازت میں کسی کو نہیں دے سکتا۔" پھر وہ میری طرف مڑا اور قدرے چیخ کر بولا "جانتی ہو میں اس سے کیوں محبت کرتا ہوں، نہیں جانتی ہو تو سنو کہ وہ دوسری لڑکیوں سے بہت مختلف ہے۔ وہ ایک مثالی لڑکی ہے۔ اپنے خیالات اور نظریات میں بے حد منفرد، وہ تم لوگوں کے طبقہ سے ہے، تمہاری دوست ہے مگر ذہنی اعتبار سے تم سب سے برتر ہے۔ اسے تم سب پر فوقیت حاصل ہے۔ وہ تم لوگوں کی مانند دنیاوی شان و شوکت کے پیچھے دیوانہ وار نہیں بھاگ رہی ہے۔ وہ کسی مرد کے پاس پیسہ دیکھ کر اس کے پیچھے نہیں لگ جاتی۔ وہ کندن ہے کندن، سادہ لوح اور باصفا۔"

واجد بہت جوش کے عالم میں بول رہا تھا۔ اس کی گردن کی رگیں پھول گئی تھیں اور جسم کانپنے لگا تھا۔ وہ یونہی ضعیف و نزار تھا شدید ہیجانی کیفیت نے اسے اور ہلا کر رکھ دیا تھا لگ رہا تھا جیسے اس کے دیدے ابل کر حلقے سے باہر نکل آئیں گے۔ میں نے اور شیریں نے ایک دوسرے کو خوفزدہ نظروں سے دیکھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں۔ اگر کچھ کرتے تو جانے واجد پر اس کا کیا ردعمل ہوتا۔

ہم ڈرے سہمے کھڑے تھے کہ واجد کا دوست دوڑتا ہوا اندر آیا اور واجد کے قریب جا کر اس کے شانے سہلانے لگا۔ پھر اس نے ذرا دباؤ ڈال کر واجد کو بستر پر لٹا دیا۔ واجد کے دوست نے ہماری طرف دیکھا اور اشاروں میں سمجھایا کہ ہم ایسی کوئی بات نہ کریں جو واجد کے ہیجان اور جذباتی اشتعال کا باعث بنے۔

واجد خاموشی سے بستر پر لیٹا رہا۔ پھر اس نے دوبارہ رخ ہماری طرف کیا اور خلاف توقع انتہائی نرم لہجے میں بولا۔ "معذرت چاہتا ہوں۔ میرا مقصد تم لوگوں کی توہین نہیں تھا۔ معلوم نہیں کیوں میں مہر کے خلاف کوئی بات نہیں سن سکتا۔ حالانکہ خود مہر نے میرے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا بلکہ یہ جو اس حالت میں ہوں یہ اسی کا فیضان ہے۔ مگر نہیں اس سلسلے میں بھی مہر کو کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس میں بھی میرا اپنا ہی قصور ہے نہ میں مہر کے ساتھ وہ زیادتی کرتا نہ اس حال کو پہنچتا۔ مجھے سمجھ لینا چاہیئے تھا کہ مہر کوئی معمولی لڑکی نہیں ہے اور اسے اوچھے ہتھکنڈوں سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ میں ایک پاکباز لڑکی کو اس کی مرضی کے خلاف دھوکہ دے کر دوست کے فلیٹ میں لے گیا تھا اور اپنی دانست میں اسے برباد ہی کر دیا تھا مگر اس نے اپنے آپ کو بچا لیا اور میرا جو یہ حال ہوا تو یہی حال ہونا چاہیئے تھا۔ ایسے لوگوں کا یہی حال ہوتا ہے۔ ذرا غور کرو مہر کی جگہ کوئی دوسری لڑکی ہوتی تو کیا کرتی۔ دکھانے کے لئے مزاحمت ضرور کرتی مگر آخر آخر میں خود کو میرے حوالے کر دیتی۔ آج کل لڑکیاں جو کچھ ایک مرد میں تلاش کرتی ہیں وہ تمام چیزیں مجھ میں موجود ہیں۔ میرے پاس کیا چیز نہیں ہے۔ دولت، شکل و صورت اور سماجی رتبہ، ہر چیز مجھے حاصل ہے مگر مہر نے ان چیزوں کی پروا نہیں کی۔ میرا خیال ہے اب تمہیں مہر اور دوسری لڑکیوں کا فرق نظر آ گیا ہوگا۔"

واجد دوبارہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور ہمیں بھی بیٹھنے کے لئے اشارہ کیا۔ ہم قریب ہی رکھی ہوئی آہنی بنچ پر بیٹھ گئے۔ واجد نے مہر کے بارے میں جو کچھ کہا تھا اور جس انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا ہمارا ذہن اس میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ واجد کا دوست بھی کمرے کے گوشے سے ایک کرسی اٹھا لایا اور ہمارے قریب بیٹھ گیا۔

"تم نے انہیں بلایا تھا یہ آ گئی ہیں۔ اب جو کچھ کہنا ہے کہہ ڈالو۔" اس نے واجد سے کہا۔ پھر ذرا بدلے ہوئے لہجے میں بولا۔ "یہ ملاقات فیصلہ کن ہو تو بہتر ہے اس لئے کہ میں بار بار شہناز بیگم کو ٹیلی فون کر کے خاصہ بور ہو چکا ہوں۔ ہر ملاقات پر یہ بدگمان نظر آتی ہیں اور مجھے اس طرح اپنی صفائی پیش کرنی پڑتی ہے جیسے میں شہر کا چھٹا ہوا بدمعاش ہوں اور محض اپنی آنکھیں سینکنے کے لئے انہیں زحمت دیتا ہوں۔"

مجھے غصہ بہت آیا مگر پی گئی۔ واجد نے اپنے دوست کی طرف توجہ نہیں دی، غور سے مجھے دیکھنے لگا پھر قدرے مسکراتا

ہوا بولا "شہناز! یہ آدمی بے چارا بہت شریف ہے۔ شکل و صورت اور لب و لہجہ ضرور ایسا ہے کہ لوگ دھوکہ کھا جاتے ہیں اور غریب کو کچھ کا کچھ سمجھنے لگتے ہیں۔ اب یہی دیکھو کہ ڈاکٹر آدمی ہے بے حد مصروف ہے مگر اس کے باوجود میرے لئے وقت نکال لیتا ہے۔ میں اس کے ذریعے زبیدہ کے گھر فون کرواتا ہوں اور تمہی کو بلواتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ لڑکیاں عموماً زبیدہ کے گھر میں جمع رہتی ہیں، اور خاص کر جب تم ہوتی ہو تو کم از کم مہر ضرور موجود ہوتی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تم تمام سہیلیاں آپس میں راز دار ہو۔ کوئی بات ایک دوسرے سے چھپا نہیں سکتیں میں نے اپنے دوست کو ہدایت کی تھی کہ وہ جب بھی تمہیں فون کرے تو تاکیداً تم سے کہے کہ اس فون کال کا تذکرہ سہیلیوں سے نہ کرے، مگر میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ ناممکن ہے تاکید کے باوجود فون پر کی گئی بات ان سب کو معلوم ہو جائے گی۔ مقصد محض یہ تھا کہ میری بیماری، میری نازک حالت اور خودکشی کی خبر مہر کے کانوں تک پہنچ جائے۔ مہر بہت نازک احساسات کی لڑکی ہے۔ میں نے سوچا شاید اس طرح اس کو مجھ پر رحم آجائے اور وہ اپنے خیالات تبدیل کر کے مجھ سے شادی کرنے پر آمادہ ہو جائے۔"

"اب تم وہ بات کرو جس کے لئے مجھے بلایا ہے۔" میں ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی۔ "ویسے میں تمہیں بتا دوں کہ ہم لوگ مہر کو پہلے ہی بہت سمجھا چکے ہیں مگر وہ بہت ضدی، سرکش اور خود رائے لڑکی ہے۔"

میں کچھ اور کہتی مگر واجد کے چہرے کی بدلتی ہوئی کیفیت کو دیکھ کر خاموش ہو گئی۔ اس موقع پر واجد کے دوست نے مداخلت کی، مجھے مخاطب کر کے بولا "تم جا کر مہر سے کہو کہ واجد نے واقعی خواب آور گولیاں کھا کر خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی حالت بہت خراب ہو گئی تھی اور ڈاکٹر نے اس کے معدے کی صفائی کر کے بڑی مشکل سے اسے موت کے منہ سے نکالا ہے۔ اسے بتانا کہ جب تم لوگ یہاں پہنچی تھیں تو واجد ایک طویل بے ہوشی کے بعد ہوش میں آیا تھا۔ تمہیں دیکھتے ہی اس نے مہر کا نام لیا تھا اور تم سے کہا تھا کہ مہر، واجد سے فوراً شادی کرنے پر آمادہ نہ ہوئی تو وہ دوبارہ خودکشی کی کوشش کریگا اور اس وقت تک کرتا رہے گا جب تک کہ ہلاک نہ ہو جائے۔"

شیریں حیرت سے منہ کھولے واجد کے دوست کی طرف دیکھ رہی تھی۔ بے اختیار بول اٹھی "تو یہ سب جھوٹ تھا واجد نے کوئی خودکشی ودکشی نہیں کی۔ وہی تو میں کہوں کہ شہناز کو اکیلا کیوں بلایا جا رہا تھا۔ واجد بیمار ضرور ہے مگر یہ ہرگز نہیں لگتا کہ اس نے خودکشی بھی کی ہوگی۔ بھئی یہ تو بہت بڑا جھوٹ ہے، دھوکہ ہے۔ ہم مہر کو بے وقوف نہیں بنا سکتے۔"

واجد اسپرنگ کی مانند اچھل کر بیٹھ گیا۔ غصے سے کانپتی ہوئی آواز میں بولا "یہ تمہی لوگ ہو جس نے مہر جیسی سیدھی سادی اور معصوم لڑکی کو مجھ سے برگشتہ کر دیا ہے ورنہ کوئی وجہ نظر نہیں آتی جو مہر مجھ سے اجتناب برتے۔ آخر مجھ میں خرابی کیا ہے۔ تم لڑکیوں میں یہ بڑی خوبی ہوتی ہے کھڑے کھڑے دوسروں میں کیڑے نکال دیتی ہو۔ مہر میری نہ ہو سکی تو میں تم سب کو دیکھ لوں گا۔"

"تمہارا خیال غلط ہے واجد۔" شیریں نے بوکھلا کر کہا۔

"ناممکن۔" واجد نے سر ہلاتے ہوئے بدستور غضبناک لہجے میں کہا۔ "میں تم لڑکیوں کو خوب اچھی طرح سمجھتا ہوں، تم نے مہر کو اس قدر بھرا ہے کہ وہ مجھ سے برگشتہ ہو گئی ہے خدا جانے تم لوگوں نے ایسا کیوں کیا اس سے تمہیں کیا حاصل ہوا۔"

واجد کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں اور منہ سے جھاگ سا چھوٹنے لگا تھا۔ میں اس کی یہ حالت دیکھ کر ڈر گئی۔ مجھے خطرہ ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ واجد چھلانگ مار کر بستر سے اترے اور لپک کر شیریں کا گریبان پکڑ لے۔ میں نے دیکھا کہ واجد کے دوست کی آنکھوں سے بھی ناگواری جھانک رہی تھی۔ اس نے پہلے ہی تاکید کر دی تھی کہ واجد سے بحث مباحثہ کرنے اور الجھنے سے احتراز کیا جائے مگر شیریں یہ غلطی کر بیٹھی تھی۔

میں اٹھ کر واجد کے قریب گئی اور اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے انتہائی نرم لہجے میں بولی۔ "اس قدر مشتعل نہ ہو واجد! اس سے تمہارے اعصاب پر برا اثر پڑے گا۔ میں نے تمہاری کسی بات سے اختلاف تو نہیں کیا۔ تم فکر نہ کرو، میں تمہاری بات مہر تک اس انداز میں پہنچاؤں گی کہ وہ ایک دم نرم پڑ جائے گی اور یہ میرا وعدہ ہے کہ میں مہر کو رام کر لوں گی اور اس کا جواب اثبات میں ہوگا۔"

"مہر کو رام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" واجد میرا ہاتھ جھٹکتے ہوئے بولا۔ "یہ اس پر چھوڑ دو کہ وہ خود کیا فیصلہ کرتی ہے"

اگر اس کا جواب نفی میں آیا تو تم لوگوں کی خیریت نہیں ہے۔ میں تم سب سے انتقام لوں گا۔ ایک ایک کو کے سب کو مار ڈالونگا۔ اس لئے کہ یہ تمہی لوگ ہو جس نے مہر کو بھڑکایا ہے اور اس کا دل میری طرف سے ہٹادیا ہے۔" کہتے کہتے وہ رکا اور شیریں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "تمہیں یہاں کس نے بلایا تھا۔ تم خوامخواہ بیچ میں آکودیں۔ اب آہی گئی ہو تو کان کھول کر سن لو کہ صرف شہناز مہر سے بات کرے گی، تم درمیان میں دخل نہیں دو گی۔ البتہ یہاں آکر تصدیق کرو گی کہ میں نے جو کچھ کہا ہے وہی بات شہناز نے مہر سے کہی تھی یا نہیں۔"

شیریں کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ میں نے اس کے تیور سے اندازہ لگایا کہ وہ کوئی سخت بات کہنے جا رہی ہے، کوئی ایسا جملہ جو اس کی اہانت کا ازالہ کر دے۔ مگر میں نے شیریں کو ایسا کرنے سے روک دیا۔ اسے تیز نظروں سے گھور کر دیکھا اور نظروں ہی نظروں میں درخواست کی کہ وہ خاموش ہی رہے تو بہتر ہے۔ مگر واجد نے شاید مجھے اشارہ کرتے دیکھ لیا تھا بگڑ کر بولا "شہناز! اس خیال میں نہ رہنا کہ تم مجھے کوئی دھوکہ دو گی یا فریب کرو گی۔ میرے ساتھ دھوکہ فریب تمہاری موت پر منتج ہوگا۔ جو کچھ میں نے کہا ہے وہی مہر سے جا کر کہنا۔ میری بات محض ایک جملے میں مضمر ہے یا تو مہر کے ساتھ زندگی گزاروں گا یا مر جاؤں گا۔ آخر میرا گناہ کیا ہے، یہی نا کہ مہر سے محبت کرتا ہوں اور اسے حاصل کرنا چاہتا ہوں۔" یک لخت واجد کی آواز بھر آگئی "میں آج تک کسی کے آگے نہیں جھکا مگر اس لڑکی نے مجھے بالکل مجبور کر دیا ہے، بے بس ہو گیا ہوں، مہر میری ضرورت بن گئی ہے، ہوا، پانی اور خوراک کی مانند۔ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"

واجد کی آنکھوں سے آنسو ابل ابل کر چہرے کو بھگونے لگے۔ وہ خاموشی سے بستر پر لیٹ گیا۔ میں نے آج تک کسی مرد کو عشق و محبت کے معاملے روتے نہ دیکھا تھا۔ واجد کی حالت دیکھ کر احساس ہوا کہ مہر سے اس کی محبت کتنی شدید ہے۔ مہر کی مسلسل بے رخی اور بے التفاتی نے اسے کمزور اور نفسیاتی مریض بنا دیا تھا۔ اور یہ نفسیاتی مرض ہی تھا جس کے تحت وہ ہم سب کو مختلف انداز میں دھمکیاں دے رہا تھا۔ اس وقت واجد کی جو کیفیت تھی اور وہ جس انداز میں آنسو بہا رہا تھا ایسے عشاق لڑکیوں کو بہت اپیل کرتے ہیں مگر افسوس کہ مہر اس وقت وہاں موجود نہیں تھی۔

میں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور واجد کے رخسار کو تھپتھپاتے ہوئے مسکرا کر بولی "واجد! میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہارا ما فی الضمیر پوری سچائی کے ساتھ مہر تک پہنچانے کی کوشش کروں گی۔ قسم کھانے کی عادت نہیں ہے مگر کہو تو قسم بھی کھا لوں۔ تم ہم سے بدگمان ہو مگر یقین کرو کہ ہم تمہارے دشمن نہیں ہیں اور اس بات کا ثبوت تمہیں اس وقت مل جائے گا جب تم دیکھو گے کہ مہر اپنی پوری شدت کے ساتھ تمہاری طرف مائل ہو گئی ہے۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ شہناز کا وعدہ۔"

واجد نے نظر بھر کر مجھے دیکھا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا "جو تمہارا دل چاہے کرو، میں بڑے صبر کے ساتھ تمہارے ٹیلی فون کا انتظار کروں گا۔ مگر ٹیلیفون اسی وقت کرنا جب مہر کوئی حتمی فیصلہ کر لے۔ اب میری زندگی اور موت مہر کے فیصلے پر ہی موقوف ہے۔"

اس موقع پر واجد کا دوست آگے بڑھا اور محبت بھرے لہجے میں بولا "مجھے یقین ہے کہ مہر کا جواب حوصلہ افزا ہوگا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا واجد! تم گھبراؤ نہیں۔ اس وقت تمہیں آرام کی ضرورت ہے اب تم ذرا سو جاؤ۔" اس نے واجد کو چادر اوڑھادی اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "میں تمہارے ٹیلیفون کا منتظر رہوں گا۔" اس نے کلینک کا فون نمبر نوٹ کرا دیا۔

شیریں سخت ناراض تھی، واپسی میں وہ میری جان کھا گئی راستے بھر وہ واجد کو کوستی رہی اور بار بار مہر پر لعنت بھیجتی رہی۔ کہ وہ کیسے جنونی اور پاگل آدمی کے شکنجے میں آپھنسی تھی۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں مہر سے واقعی جھوٹ بولوں گی اور بتاؤں گی کہ واجد نے خودکشی کی کوشش کی تھی اور بڑی مشکلوں سے بچایا گیا ہے اور کیا میں واقعی مہر کو واجد سے شادی کرنے پر آمادہ کر دوں گی جواب میں میں نے کہا کہ اس میں حرج کیا ہے۔ اسی میں واجد اور مہر دونوں کی بھلائی ہے، دونوں ہی ابنارمل ہیں، جوڑی بہت مناسب رہے گی۔ مہر کی جیسی روش ہے اس حساب سے اس کی شادی ہونے کے امکانات نظر نہیں آتے اور اگر کسی سے ہو بھی گئی تو شاید وہ خوش نہ رہ سکے۔ دوسری طرف واجد کی مہر سے شادی نہ ہوئی تو وہ ہمیشہ ایک طوفان اٹھائے رکھے گا۔

وہ نہ صرف مہر کو نقصان پہنچائے گا بلکہ ہمارے سروں پر بھی ایک تلوار کی مانند مسلط رہے گا۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ ان دونوں کی شادی ہو جائے۔ میرا خیال ہے کہ واجد شادی کے بعد بھی جان سے مہر کا خیال رکھے گا اور احترام کرتا رہے گا۔"

"مگر یہ تو دیکھو کہ واجد انتہائی جنونی اور جذباتی آدمی ہے۔ میرے خیال میں تو شادی کر کے مہر کی زندگی چوپٹ ہو جائے گی۔" شیریں پریشان ہو کر بولی۔

"میرے خیال میں ایسا نہیں ہوگا۔ بس تم لڑکیوں کے سامنے اپنی زبان بند رکھنا، صرف مجھے بولنے دینا۔ اب وقت آگیا ہے کہ مہر کا معاملہ طے ہو جائے۔ ہم سب میں مہر سب سے عجیب لڑکی ہے۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ سب سے پہلے اسی کا گھر بسے گا۔" میں شیریں کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولی۔

زبیدہ کے گھر پہنچے تو لڑکیاں بے صبری سے ہمارا انتظار کر رہی تھیں۔ مہر کے چہرے پر یاسیت پھیلی ہوئی تھی اور آنکھیں سرخ اور متورم ہو رہی تھیں۔ اس نے دوڑ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بے طاقتی سے پوچھا "کیا ہوا شہناز! واجد کو دیکھا؟ وہ، وہ ..." اس کے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ مگر شیریں نے کچھ کہنے کے لئے بے اختیار منہ کھول دیا۔ میں نے اسے گھور کر دیکھا اور وہ سٹپٹا کر رہ گئی۔ میں نے عمداً سکوت اختیار کیا اور دیر تک کچھ نہ بولی۔ دوسری لڑکیاں بھی مہر کے عقب میں آکر کھڑی ہو گئی تھیں اور میرے سکوت سے ان کا اضطراب اور ہیجان بڑھتا جا رہا تھا۔ پھر زبیدہ نے تابڑ توڑ کئی سوالات کر ڈالے مگر میں نے کسی کا جواب نہیں دیا۔ میں نے مہر کو بازو سے پکڑا اور صوفے پر لا کر بٹھا دیا۔

"تم کچھ بولتی کیوں نہیں ہو، بتاؤ آخر کیا ہوا؟" مہر وحشت کے عالم میں بس یہی کہے جا رہی تھی۔ جب میری خاموشی ناقابلِ برداشت ہو گئی تو وہ چیخ کر بولی "کیا واجد مر گیا؟"

میں نے اسے تیز و تند نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اگر میں تمہیں یہ مژدہ دوں کہ واجد مر گیا تو کیا تم محسوس کرو گی کہ تمہیں ایک مصیبت سے نجات مل گئی ہے۔"

مہر کا چہرہ کورے لٹھے کی طرح سفید پڑ گیا۔ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی "کیا کہہ رہی ہو۔ کیا واقعی واجد ..." اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا اور سسکیوں کے ساتھ رونے لگی۔

میں نے اسے روکا نہیں، رونے دیا۔ میں چاہتی تھی وہ اس لمحے جتنا کمزور ہو جائے اچھا ہے تاکہ میں اس پر بھرپور وار لگا سکوں۔ شیریں نے حسبِ عادت کچھ کہنے کے لئے دو ایک بار منہ کھولا مگر میں نے اشارے سے روک دیا۔

کچھ دیر بعد مہر کی سسکیاں تھم گئیں میری طرف دیکھتے ہوئے غمزدہ لہجے میں بولی "شہناز! مجھے حیرت ہے کہ تم مجھے اس قدر بے رحم اور سنگ دل تصور کرتی ہو۔"

شاید شیریں کا ضبط جواب دے گیا تھا۔ وہ میرے بولنے سے پہلے آپے سے باہر ہو گئی۔ شدید غصے کے عالم میں مہر سے بولی "آخر تم چاہتی کیا ہو، واجد کو گالی دیتی ہو، بُرا بھلا کہتی ہو، ناپسند کرتی ہو، نفرت کرتی ہو، حتیٰ کہ گلدان سے سر توڑ دیتی ہو اور جب وہ مر جاتا ہے تو ٹسوے بہاتی ہو، آخر تم ہو کیا شے، آج تک ہماری سمجھ میں نہیں آسکی ہو۔ اچھا چلو فرض کیا واجد مرا نہیں، زندہ ہے تو کیا تم اس صورت میں اس سے شادی کر لوگی۔"

مہر بُری طرح چونکی اور بھیگی بھیگی آنکھوں سے شیریں کی طرف دیکھنے لگی "میں، میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی۔" وہ ہکلاتے ہوئے بولی "جو ہے صاف صاف بتا کیوں نہیں دیتیں۔ ہاں میں نہیں چاہتی کہ واجد مر جائے، مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ میں اس سے شادی کر لوں۔"

میں نے سوچا کہیں شیریں معاملہ ہی نہ بگاڑ دے، مہر کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے تلخ لہجے میں بولی "مجھ سے پوچھو میں بتاتی ہوں۔ ہم واجد کے دوست کے کلینک پہنچے تو واجد کا معدہ صاف کیا جا رہا تھا، آنتیں دھوئی جا رہی تھیں، اس لئے کہ اس نے وافر مقدار میں زہر کھا لیا تھا اور زہر جسم میں سرایت کرتا جا رہا تھا۔ اسے ہمارے سامنے ہی ہوش آیا۔ مارے نقاہت کے اس کی بُری حالت تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے آنکھیں کھول کر ہمیں دیکھا اور اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ کوشش کے باوجود کچھ نہ بول سکا، ہونٹ پھڑپھڑا کر رہ گئے۔ میں نے اسے بتایا کہ مہر تمہارے لئے بہت پریشان ہے، وہ یہ سن کر مسکرا دیا۔ مسکراہٹ کی ایک تلخ لکیر اس کے چہرے پر کھنچ گئی۔ آہستہ سے بولا، مہر کی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ میں مر جاؤں چنانچہ

میں نے اپنے لئے یہی راستہ منتخب کیا، بدقسمتی ہے جو بچ گیا ہوں۔ اگلی بار کامیاب رہوں گا۔ مہر کو میرا یہ پیغام پہنچا دینا کہ اب اسے مجھ سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

جب واجد یہ کہہ رہا تھا تو میں نے دیکھا اس کی آنکھیں خالی خالی اور ویران سی تھیں، لگ رہا تھا جیسے وہ دو تین دن سے زیادہ زندہ نہ رہ سکے گا۔ واجد کی کیفیت دیکھ کر میں اندر ہی اندر دہل گئی۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا مہر نے تمہارے ساتھ اب تک جو سلوک روا رکھا اس کے لئے بے حد پشیمان اور شرمندہ ہے، اور اب وہ تم سے شادی کرنے پر آمادہ ہے' واجد کھوکھلی ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔ بلاوجہ میری دلجوئی نہ کرو، میں زندہ رہنا نہیں چاہتا۔"

میں گئی اور مہر کو بھرپور نظروں سے دیکھتی ہوئی بولی: "کہو اب کیا کہنا چاہتی ہو، سن لیا پورا قصہ؟"

مہر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ حیرت انگیز طور پر خاموشی اختیار کر لی۔ البتہ اس کے چہرے پر نمایاں طور پر تازگی اور شادابی آ گئی تھی۔ وہ آنکھیں جو آنسوؤں سے چھلک رہی تھیں دھل دھلا کر صاف ہو گئی تھیں اور اب ان میں زندگی کی چمک واضح طور پر دکھائی دے رہی تھی۔ بالکل اسی طرح جس طرح کے باد و باراں کے شدید طوفان کے بعد آسمان ایک دم صاف ہو جاتا ہے اور ننھے منے ستارے اپنی پوری لو کے ساتھ ٹمٹمانے لگتے ہیں۔

ہم سب لڑکیاں بت بنی مہر کی اس حیرتناک تبدیلی کو دیکھ رہی تھیں۔ ہم میں سے کسی نے بھی مہر کو چھیڑنا اور کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔

دوپہر کو کھانے کے بعد جب سب لڑکیاں کمر سیدھی کرنے کے لئے لیٹیں تو مہر نے پلکیں جھپکاتے ہوئے ہمیں اپنے انقلابی فیصلے سے آگاہ کر دیا، اور یہ فیصلہ وہی تھا جس کی میں توقع کر رہی تھی اور جس کا میں واجد سے وعدہ کر آئی تھی۔ یعنی مہر نے واجد سے شادی کرنا منظور کر لی۔

وعدے کے مطابق چھ بجے ڈاکٹر کامران سے ملنے جانا تھا۔ میں نے ساڑھے چار بجے سے تیاری شروع کر دی۔ مہر کے معاملے میں ذہن اس قدر الجھا ہوا تھا کہ دوپہر کو کوشش کے باوجود سو نہ سکی تھی، اب جو نیم گرم پانی سے غسل کیا تو ساری تھکن اور کسلمندی دور ہو گئی۔ آئینے کے سامنے چہرے کو درست کیا اور جدید ترین اسٹائل میں بال سنوارے۔ ڈاکٹر کامران کے باپ کے لائے ہوئے لباس میں سے ایک بہترین جوڑا زیب تن کیا اور ساڑھے پانچ بجے کے قریب گھر سے نکل کر ٹیکسی کے انتظار میں کھڑی ہو گئی۔ پندرہ منٹ نہیں گزرے تھے ڈاکٹر کامران کی گاڑی آتی دکھائی دی۔ اس نے میرے بالکل قریب گاڑی روکی تھی۔ اس کے اس غیر متوقع نزول پر شدید حیرت ہوئی۔ میں ابھی سنبھلنے بھی نہیں پائی تھی کہ اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور سر باہر نکالتے ہوئے بولا "آؤ، اندر آجاؤ، مجھے تم سے ضروری کام ہے"

میری حیرت دوچند ہو گئی اور اسی حیرت کے عالم میں اس کے قریب جا بیٹھی، پھر تجسس سے بے قرار ہو کر پوچھا "آخر ایسا کیا کام آ پڑا ہے جو میری تلاش میں یہاں تک آ پہنچے ہو؟"

"دراصل اسے کام بھی نہیں کہہ سکتے" ڈاکٹر کامران نے کہا۔ پھر سوچ میں ڈوبا ہوا بولا "بات یہ ہے کہ ابا جان کی طبیعت اچانک ہی خراب ہو گئی ہے۔ سانس لینے میں بہت دقت محسوس ہو رہی ہے اور صورت یہ ہے کہ انہیں یہاں مناسب طبی امداد بہم نہیں پہنچائی جا سکتی، جبکہ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ ان کی طبیعت بگڑتی جا رہی ہے۔ میں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور انہیں قائل کر لیا کہ وہ جتنی جلد لندن روانہ ہو جائیں بہتر ہے۔ میں نے کل صبح کی پرواز کے لئے ان کی سیٹ ریزرو کروا دی ہے۔ کل صبح نو بجے وہ لندن کے لئے روانہ ہو جائیں گے جب انہوں نے دیکھا کہ ان کے پاس ایک ہی رات رہ گئی ہے تو وہ سخت پریشان اور رنجیدہ نظر آنے لگے، انہوں نے درخواست کی کہ وہ آج رات ہم لوگوں کے ساتھ گھر پر گزاریں گے، ان کا لہجہ کچھ ایسا تھا، اور وہ اس انداز میں مصر ہوئے کہ میں انکار نہ کر سکا مگر اس تبدیلی کے ساتھ کہ وہ رات ہمارے ساتھ گھر پر نہیں ہوں گے بلکہ ہم ان کے ساتھ ہوٹل میں ہوں گے۔ یہ میں نے اس لئے کیا کہ تمہیں خواہ مخواہ ناشتہ اور کھانا تیار کرنے کی زحمت اٹھانا پڑتی۔

مجھے معلوم ہے کہ گھر سے باہر پوری رات گزارنا تمہارے لئے مشکل ہوگا یا شاید ناممکن ہی ہو۔ مگر کیا کیا جائے مجبوری ہے اب تو میں نے ابا جان سے حامی بھر لی ہے۔ اگر آج رات تم ہمارے ساتھ ہوٹل میں رہ سکو تو یہ میرے لئے تمہارا ایک بہت بڑا ایثار ہوگا۔ دراصل میں ابا جان کے وہ الفاظ نہیں بھول سکتا جو انہوں نے بڑے حسرتناک لہجے میں کہے تھے: انہوں

نے ڈبڈبائی آنکھوں سے کہا تھا کہ کاش میں یہ رات اپنے بیٹے اور بہو کے ساتھ گزار سکتا۔ میرا خیال ہے کہ تم میرا نہیں تو اس بوڑھے آدمی کا احترام ضرور کرو گی۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں محض والد صاحب کو خوش رکھنے کے لئے کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ تم میرے ساتھ تعاون ضرور کرو گی۔ تم بڑے خلوص کے ساتھ میرے کام آتی رہی ہو اور اس بار بھی مایوس نہیں کرو گی"۔

ڈاکٹر کامران گفتگو کر رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی گاڑی کو ادھر سے ادھر مختلف سڑکوں پر دوڑاتا پھر رہا تھا، رفتار کچھ زیادہ نہیں تھی مگر اس کے باوجود ہم زبیدہ کے گھر سے خاصی دور نکل آئے تھے۔ اس نے اپنی گفتگو ختم کی تو اس وقت میرا ذہن متضاد خیالات کی آماجگاہ بن چکا تھا۔ مجھے سب سے زیادہ اس بات کا دکھ تھا کہ اس کا باپ اپنے پروگرام سے بہت پہلے اتنی جلدی یہاں سے واپس جا رہا تھا۔ اس کے چلے جانے کا مطلب تھا ڈاکٹر کامران سے محرومی اور جدائی۔ اس نے محض اپنے باپ کی خاطر مجھ سے رجوع کیا تھا اور اب جبکہ اس کا باپ یہاں نہیں ہوگا تو اس کی نظروں میں میری اہمیت اور افادیت ختم ہو جائے گی۔ میں جانتی تھی کہ جو کچھ ہو رہا تھا محض ایک ڈرامہ تھا۔ اس میں کوئی سچائی اور صداقت نہیں تھی۔ بالآخر مجھے اپنا کردار ادا کر کے اسٹیج سے ہٹ جانا ہوگا۔ مگر یہ سب جانتے بوجھتے ہوئے میں ڈاکٹر کامران کے بے حد قریب آگئی تھی۔ انجام سے اچھی طرح واقف ہوتے ہوئے بھی میں نے دل میں ڈاکٹر کامران کو جگہ دے دی تھی، صاف ظاہر تھا کہ وہ مجھ سے محبت نہیں کرتا تھا۔ میں تو اس کی وقتی ضرورت تھی اور وقت نکل جانے کے بعد میں اس کے لئے بے کار ہو جاتی، مگر اس کے باوجود میں اسے دل دے بیٹھی تھی، اس کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھی۔ مگر اب کیا ہوگا، کیا میری ادھوری محبت مجھے چین سے بیٹھنے دے گی، کیا میں ڈاکٹر کامران سے محرومی اور جدائی کا غم برداشت کر سکوں گی، کیا مجھ سے ناکام محبت کا عذاب جھیلا جا سکے گا۔

میں نے مڑ کر ڈاکٹر کامران کی طرف دیکھا وہ سختی سے ہونٹ بھینچے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا اور اس کی سرد مہر آنکھیں سامنے کسی نامعلوم نقطے پر جمی ہوئی تھیں۔ میں اندر ہی اندر رو پڑی۔ کیا بے بسی تھی، کیا مجبوری تھی۔ میں ڈاکٹر کامران کے بارے میں کیا کیا سوچتی تھی، کیسی آرزوئیں رکھتی تھی۔ اس کی اک نظر التفات کو ترستی تھی، اور حسن اتفاق یا خوش قسمتی سے ڈاکٹر کامران میری زندگی میں آ گیا تھا۔ مگر کس قدر زود گزر، ایک شعلہ کی طرح چمک کر غائب ہو جانے والا۔ اب میں اسے اندھیروں میں ڈھونڈتی رہوں گی۔ خوابوں میں تلاش کرتی رہوں گی۔ پہلے میں خوش ہوئی تھی کہ ڈاکٹر کامران نے مجھے التفات کے قابل جانا اور رقعہ لکھا مگر اب خیال آیا کہ کاش اس نے مجھے کوئی رقعہ نہ لکھا ہوتا اور رقعہ لکھا بھی تھا تو مجھے اس سے ملنے نہیں جانا چاہئے تھا۔ میں ذرا برداشت سے کام لیتی تو یہ المیہ نہ رونما ہوتا۔ کسی کے قریب نہ ہونا اس سے بہتر ہے کہ قریب ہو کر دور ہو جایا جائے۔

پھر مجھے خیال آیا کہ ڈاکٹر کامران اس قدر بے درد اور سنگدل تو نہ ہوگا کہ مطلب براری کے بعد یکسر منہ موڑ لے۔ آخر وہ بھی انسان ہے، انسانی رشتوں کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے دل پر میری وفا، خلوص اور ایثار کی کوئی چھاپ تو ہوگی۔ کیا وہ مجھے فراموش کر سکتا ہے۔ مانا کہ ہم شوہر اور بیوی کے رشتے میں منسلک نہ ہو سکیں گے مگر کیا دوستی بھی ناممکن ہے۔ پھر ایک دوسرا خیال میرے دل میں جاگزیں ہو گیا کہ ڈاکٹر کامران کے بارے میں زیادتی سے کام لے رہی ہوں۔ وہ خود پسند ضرور ہے مگر بے مہر اور بے مروت نہیں ہے۔ وہ کوئی بیس سالہ شوخ اور کھلنڈرا نوجوان نہیں ہے جو جا و بے جا عشقیہ اشعار پڑھے اور رومانی مکالمے ادا کرے۔ وہ پختہ عمر کا سنجیدہ، باوقار اور پڑھا لکھا آدمی ہے۔ ایسے لوگ محبت کے معاملے میں بہت محتاط ہوتے ہیں اور ان کا اظہار محبت بھی دوسروں سے بہت مختلف ہوتا ہے۔ صرف سمجھنے اور محسوس کرنے کی بات ہے ممکن ہے میں ڈاکٹر کامران کو ٹھیک سے سمجھ نہ پائی ہوں اور دل ہی دل میں وہ مجھ سے محبت کرتا ہو اس خیال کو تقویت یوں ملی کہ وہ چاہتا تو اپنے باپ کی خواہش کا احترام کئے بغیر بھی اسے یہاں سے رخصت کر سکتا تھا۔ رات کو ہم یکجا ہوتے یا نہ ہوتے مگر اگلی صبح کو اس کے باپ کی روانگی ضرور ہو جاتی۔ مگر ڈاکٹر کامران نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے اپنے باپ کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے مجھ سے درخواست کی تھی کہ آج رات میں ان کے ساتھ گزاروں۔

خیالات کا سلسلہ جانے کہاں تک پہنچتا کہ اچانک مجھے ڈاکٹر کامران کی آواز سنائی دی، وہ مجھے مخاطب کرتے ہوئے

کہہ رہا تھا "کس سوچ میں پڑ گئی ہو۔ تمہیں یہ آخری مہربانی تو کرنی ہی ہے کیونکہ میں ابا جان سے وعدہ کر چکا ہوں اور وہ بڑی بے چینی سے ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

'آخری مہربانی' میرے ذہن میں یہ الفاظ کسی خنجر کی مانند پیوست ہو گئے اور میں کوشش کے باوجود جواب میں کچھ کہہ نہ سکی۔ مجھے خاموش دیکھ کر ڈاکٹر کامران نے دوبارہ کہا "اس ڈرامے میں تمہاری حیثیت ایک ایسے کردار کی سی ہے جو آخری وقت تک اسٹیج پر رہتا ہے اور اگر اتفاق سے وہ آخری سین میں موجود نہ ہو تو ڈرامہ بری طرح متاثر ہوتا ہے اب تم اپنی اہمیت کا اندازہ کرو۔ سارا کھیل تمہارے ہاتھ میں ہے۔ تم چاہو تو کھیل بگاڑ بھی سکتی ہو مگر مجھے امید ہے کہ تم ایسا نہیں کرو گی۔ کل صبح ابا جان چلے جائیں گے پھر تمہیں تکلیف نہیں دوں گا۔" اس نے کہا اور گاڑی زبیدہ کے مکان کی طرف موڑ لی۔

میرا دل اندر ہی اندر بیٹھ گیا تھا جسے وہ میری تکلیف کہہ رہا تھا وہی تو میری راحت تھی۔ وہ مجھے تکلیف نہیں دیگا۔ یعنی والد صاحب کے چلے جانے کے بعد ملنے ملانے کا سلسلہ ختم ہو جائے گا۔ میں نے ایک ٹھنڈی گہری سانس لی اور سامنے خلاؤں میں گھورنے لگی۔

ڈاکٹر کامران نے گاڑی زبیدہ کے مکان سے کچھ فاصلے پر روکی اور دروازہ کھولتے ہوئے بولا "جلدی سے والدہ سے اجازت لے کر آجاؤ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں شب خوابی کا لباس بھی لیتی آنا۔"

کچھ کہے بغیر میں گاڑی سے اتر آئی۔ اس وقت زبیدہ کے گھر میں کوئی نہیں تھا۔ جانے لڑکیاں کہاں گئی ہوئی تھیں البتہ آپا موجود تھی۔ اس نے مجھے حیرت سے دیکھا اور فوراً سوال جڑ دیا کہ میں اتنی جلدی کیسے واپس آگئی ہوں۔ میں نے اسے بتایا کہ پروگرام کے مطابق مجھے آج رات یہیں ٹھہرنا تھا مگر ایسا کام آپڑا ہے کہ نہ ٹھہر سکوں گی اور اسی سلسلے میں زبیدہ کے لئے ایک تحریر چھوڑنا چاہتی ہوں۔ جب زبیدہ آئے تو رقعہ اسے دے دے۔

میں نے پنسل اٹھائی اور کاغذ کے پرزے پر گھسیٹنا شروع کر دیا۔ "زبیدہ ڈارلنگ! کل صبح ڈاکٹر کامران کا باپ لندن واپس جا رہا ہے۔ اس کی حالت اچھی نہیں ہے اور میں نے وعدہ کیا ہے کہ آج کل ڈاکٹر کامران اور اس کے باپ کے ساتھ ہوٹل میں گزاروں گی۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ چاہو تو تم اسے میرا پاگل پن کہہ سکتی ہو بہرحال ڈاکٹر کامران نے مجھ سے درخواست کی تھی اور مجھے اس کے باپ کی نگاہ میں اس کا بھرم قائم رکھنا تھا۔ مسکرانے یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ہم تینوں ایک ہی کمرے میں سوئیں گے۔ ہاں میں تمہارا نائٹ گاؤن لئے جا رہی ہوں اس کے لئے پیشگی شکریہ۔ تمہاری اپنی شہناز!

رقعہ میں نے آپا کے حوالے کیا۔ لیموئی رنگ کا گاؤن
نے اخبار میں لپیٹا اور باہر نکل آئی۔

ڈاکٹر کامران کی گاڑی اسی مقام پر کھڑی تھی جہاں کہ میں چھوڑ کر گئی تھی اور انجن بھی بدستور اسٹارٹ تھا۔ ڈاکٹر کامران نے میرے لئے دروازہ کھولا اور مسکراتے ہوئے بولا "میں جانتا تھا کہ تم ایک اچھی لڑکی ہو اور میری آخری درخواست کا ضرور احترام کرو گی۔ مجھے یہاں تک یقین ہے کہ تم میرے لئے بڑے سے بڑا خطرہ مول لینے میں ذرہ برابر نہیں ہچکچاؤ گی، حالانکہ اس کی نوبت نہیں آنے گی۔"

اس نے گاؤن کا پیکٹ میرے ہاتھ سے لے لیا۔ کھول کر دیکھا اور پسندیدگی سے سر ہلاتے ہوئے بولا "بڑا اچھا رنگ ہے، تم واقعی بہت خوش ذوق اور باسلیقہ ہو۔"

اس نے گاؤن دوبارہ اخبار میں لپیٹا اور پچھلی نشست پر ڈال دیا۔ گاڑی اسٹارٹ کی اور رفتار بتدریج بڑھاتا گیا اس کا رخ اس ہوٹل کی سمت تھا جہاں اس کا باپ مقیم تھا۔ ڈاکٹر کامران خاموشی سے ڈرائیو کر رہا تھا اور میرا دل اس خیال سے ڈوبا جا رہا تھا کہ یہ ڈاکٹر کامران سے آخری ملاقات ہے۔ اس کے بعد سے ہم ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہوں گے کوئی تعلق ہوگا بھی تو صرف درس و تدریس کا۔ وہ فلسفے کا پروفیسر ہوگا اور میں فلسفے کی طالب علم ——— اور بس۔

گاڑی ہوٹل کی جانب اڑی چلی جا رہی تھی۔ مجھے یک بیک خیال آیا کہ یہ آخر ڈاکٹر کامران کو کیا سوجھی کہ وہ خود مجھ سے ملنے چلا آیا۔ میں تو خود ہی اس کے گھر جا رہی تھی وہ وہاں سے مجھے لے لیتا۔ پھر سوچنے لگی کہ گھر چھوڑ کر خسر، بیٹے اور بہو کا ہوٹل میں

ٹھہرنا بھی خوب ہے۔ ممکن ہے یورپ میں ایسا ہوتا ہو مگر ایک مشرقی ملک میں یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی تھی۔ بہرحال یہ ڈاکٹر کامران کی تجویز تھی۔ اس کی باتیں صرف وہی سمجھ سکتا تھا۔ اس کی تمام باتیں اور سرگرمیاں اس کی مانند عجیب پراسرار اور ناقابلِ فہم تھیں۔

بڑے میاں بڑی بے چینی سے ہمارا انتظار کر رہے تھے یوں تو وہ بستر پر دراز تھے مگر بیمار کسی صورت سے نہ لگتے تھے۔ اور رہی سخت بیمار والی بات تو وہ ان پر کسی طرح نہ جچتی تھی، مجھے دیکھتے ہی وہ بستر سے اُٹھ بیٹھے اور آگے بڑھ کر مجھے سینے سے لگا لیا اور پے در پے میری پیشانی کو چوم ڈالا۔

"آپ کی طبیعت تو ماشاءاللہ خوب ہے پھر اتنی جلدی کیوں واپس جا رہے ہیں۔" میں نے پوچھا۔

بڑے میاں نے ٹھنڈی سانس بھری اور شکایت آمیز نظروں سے ڈاکٹر کامران کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ "طبیعت تو خیر اتنی اچھی نہیں ہے مگر اتنی جلدی لندن واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ کامی نے زبردستی صبح کی پرواز کے لئے میری سیٹ ریزرو کروا دی۔ درحقیقت یہ مجھے مجبور کر رہا ہے کہ میں جلد از جلد یہاں سے چلا جاؤں۔" بڑے میاں کہہ رہے تھے اور ان کے لہجے سے دکھ کا عنصر صاف طور پر جھلک رہا تھا۔ بڑے میاں کی اس وضاحت کو ڈاکٹر کامران نے اچھی نظروں سے نہیں دیکھا معترض لہجے میں بولا۔ "بات یہ نہیں ہے کہ میں آپ کو زبردستی واپس کر رہا ہوں۔ بات یہ ہے کہ یہاں کے موسم اور آب و ہوا میں آپ کی طبیعت روز بروز بگڑتی جا رہی ہے اور آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہاں آپ کا علاج ممکن نہیں ہے۔ اس لئے آپ کی بہتری اسی میں ہے کہ آپ جلد از جلد یہاں سے چلے جائیں" وہ ذرا رکا پھر دوبارہ بولنے لگا۔ "میں جانتا ہوں کہ آپ مجھ سے ناراض ہیں اور ناراضگی کی وجہ یہ ہے کہ میں آپ کے اور شاذی کے درمیان ایک دیوار کی مانند حائل رہا مگر اس میں بھی کچھ مجبوریاں تھیں جو میں آپ کو بتا چکا ہوں۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ آئندہ چند ماہ میں میں شاذی کو لے کر لندن آؤں گا اور کچھ عرصے کے لئے آپ کے پاس چھوڑ جاؤں گا تاکہ آپ جی بھر کے بہو کو دیکھ سکیں۔ اب آپ سے درخواست ہے کہ یہ آخری وقت میرے گناہ اور تقصیرات کے حساب میں نہ گزار دیں۔ میں جو آپ کو اتنی جلدی واپس بھیج رہا ہوں اس کی وجہ محض یہ ہے کہ میں آپ کی صحت اور سلامتی کا خواہاں ہوں۔"

مگر میں اچھی طرح جانتی تھی کہ اسے اپنے باپ کی صحت اور سلامتی سے قطعاً دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو صرف اس لئے باپ کو جلد از جلد لندن واپس بھیج دینا چاہتا تھا کہ اس کے باپ کو میرے اور اس کے تعلقات کی نوعیت کا علم نہ ہو سکے۔ آخر اس کا باپ چند دن اور یہاں رہ جاتا تو اٹھتے بیٹھتے یقیناً اسے ہمارے تعلقات کی نوعیت کا علم ہو جاتا۔ علم نہ ہوتا تو شک و شبے میں ضرور پڑ جاتا اور جیسا کہ اندازہ ہوا تھا ڈاکٹر کامران یہی نہیں چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر کامران میرے اس واقعے سے بُری طرح کھٹک گیا تھا جب میں ایک صبح اس کے علم میں لائے بغیر اس کے باپ سے ملنے ہوٹل پہنچ گئی تھی۔ وہ تو اتفاق سے یا خطرے کی بوسونگھ کر ڈاکٹر کامران پہلے ہی وہاں پہنچ گیا تھا ورنہ میں اس کے باپ کو حقیقتِ حال سے آگاہ کر دیتی اور پانسہ پلٹ چکا ہوتا۔ آن واحد میں ڈاکٹر کامران کا ترتیب دیا ہوا ڈرامہ چوپٹ ہو جاتا۔

ڈاکٹر کامران جس طرح اپنے شفیق اور مہربان باپ کو دھوکہ دے رہا تھا اس پر مجھے طیش آگیا۔ مارے غصے کے میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں بے بسی کے احساس سے رونے لگی۔ مجھے روتے دیکھ کر اس کے باپ نے میرا سر سینے سے لگا لیا اور بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بیٹے سے مخاطب ہو کر بولا "جانتا ہوں کہ تم محض میری سلامتی کے پیشِ نظر مجھے اس قدر جلد روانگی پر مجبور کر رہے ہو لیکن اگر مزید دو ایک دن یہاں رہ جاتا تو مر نہ جاتا۔ سانس کی ہلکی سی شکایت تھی اور کوئی بات نہ تھی۔ یہ معمولی شکایت تو مجھے لندن میں بھی ہو جایا کرتی ہے اور یہ جو شکایت ہوئی تو اس کی وجہ بھی معمولی اور سمجھ میں آنے والی ہے دراصل میں کھانے پینے کے معاملے میں احتیاط سے کام نہیں لے رہا ہوں۔ حد سے زیادہ پکی ہوئی چیزیں مجھے نقصان دے گئی ہیں ورنہ اور کوئی بات نہیں ہے۔" اس نے انگلی سے میرے بھیگے ہوئے رخسار کو صاف کیا اور محبت سے سرشار لہجے میں بولا۔ "بس کرو شاذی بیٹی، میں تمہاری محبت کے لئے بہت ممنون ہوں۔ اتنی محبت نہ دو کہ سہار نہ سکوں۔ مجھے خوشی ہے کہ خداوند نے مجھے اس قدر مہربان اور پرخلوص بہو نصیب کی ہے یقین کرو کہ اب میں بڑی آسانی سے مر سکوں گا۔ مرتے ہوئے مجھے

کوئی دکھ نہ ہوگا۔"

مگر میرے آنسو نہیں رکے، اور شدت سے جاری ہوگئے بوڑھے نے بے اختیار مجھے سینے سے بھینچ لیا اور خود بھی سسکتے ہوئے بولا "خدا کے لئے بیٹی، مجھ بوڑھے میں ضبط اور برداشت کا یارا نہیں رہا۔ یوں بھی میں نے اپنی ساری زندگی میں کسی عورت کو آنسو بہاتے ہوئے دیکھنے کا حوصلہ نہیں پایا۔ انشاء اللہ جیسا کہ کامی نے وعدہ کیا ہے، آئندہ چند مہینوں میں تم دوبارہ میرے قریب ہوگی اب آنسو پونچھ لو۔"

میں نے آنسو پونچھ ڈالے، مگر اچھی طرح جانتی تھی کہ ایسا کبھی نہ ہوسکے گا۔ یعنی میں لندن کبھی نہ جاسکوں گی اور وعدہ وعدہ ہی رہے گا۔ میں بوڑھے آدمی سے کچھ کہنا چاہتی تھی کہ اچانک ڈاکٹر کامران آگے بڑھا اور مجھے ایک جھٹکے سے کھینچ کر باپ سے الگ کردیا۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر حیرت کے آثار تھے اور آنکھوں میں عجیب قسم کی سختی اور خشونت تھی۔

"بس کرو، بہت ہولیا۔" خلاف توقع اس کا لہجہ بے حد نرم تھا۔ وہ مجھے بازو سے پکڑے ہوئے باتھ روم لے گیا۔ آئینے کے سامنے کھڑا کرتے ہوئے ٹھوڑی پکڑ کر شوخی سے بولا "چہرہ دیکھو، تم نے اپنی کیا حالت کرلی ہے۔"

میں نے اپنے چہرے کا جائزہ لیا۔ وہ میرا اپنا چہرہ نہ معلوم ہوا۔ ایک دم ستا گیا تھا۔ ڈاکٹر کامران نے میری پیٹھ پر ہلکی سی تھپکی دی اور باتھ روم سے باہر نکل گیا۔

میں نے صابن سے منہ ہاتھ دھویا، چہرہ خشک کیا اور باہر نکل آئی۔ اب میں خود کو بے حد ہلکی پھلکی محسوس کررہی تھی۔ کچھ دیر بعد رات کا کھانا کھایا گیا پھر ہم گپ شپ میں مشغول ہوگئے۔ ڈاکٹر کامران نے گفتگو میں برائے نام حصہ لیا۔ وہ ہر وقت اپنی توجہ میری طرف مرتکز کئے رہا اور دیکھتا رہا کہ میں کس نوعیت کی گفتگو کررہی ہوں۔ جہاں بھی بہکنے لگتی وہاں یا تو مجھے گھور کر دیکھنے لگتا یا خود گفتگو میں حصہ لیکر موضوع کا رُخ موڑ دیتا۔

رات دوسرے پہر میں داخل ہوئی تو بوڑھے کے چہرے پر تھکن کے آثار نظر آنے لگے۔ اسے یوں بھی صبح روانہ ہوجانا تھا اس لئے بستر پر چلا گیا۔ ڈاکٹر کامران مجھے مخاطب کرکے بولا "شازی تم لباس تبدیل کرلو اور وہ — اس کونے والے بستر پر لیٹ جاؤ۔ میں اور ابا جان ایک ساتھ اس بستر پر سورہیں گے۔"

بڑے میاں ہنستے ہوئے بولے "شازی میں ایک رات کے لئے تمہیں شوہر سے جدا کر رہا ہوں۔ اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔"

میں کیا جواب دیتی۔ میں نے تو شرمانے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی۔ شب خوابی کا لباس اٹھایا اور باتھ روم میں چلی گئی زبیدہ کا لباس کچھ اتنا بے ڈھنگا اور بے باک تھا کہ صحیح معنوں میں میرے جسم کو نہ چھپا سکا۔ مجھے وہ لباس پہنتے ہوئے شرم آرہی تھی۔ مگر کیا کرتی مجبوری تھی۔ لڑکیوں کے درمیان یا شوہر کی موجودگی میں ایسا لباس بے شک چل جاتا ہے مگر جب کمرے میں خسر بھی ہو تو بڑا مسئلہ بن جاتا ہے۔ بہرحال میں نے گاؤن پہنا اور خود کو سمیٹتی سمٹاتی اپنے بستر پر آکر لیٹ گئی۔

بڑے میاں نے دوسری طرف کروٹ لے لی تھی۔ شاید سو بھی گئے تھے۔ البتہ ڈاکٹر کامران اپنی جگہ بدستور کھڑا ہوا تھا، اور متبسم نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے چادر گردن تک کھینچ لی۔ اس نے لاپرواہی سے شانوں کو جھٹکا دیا اور باتھ روم کی طرف چلا گیا۔ میں تصور میں اسے لباس تبدیل کرتے دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کے جسم پر بڑا نفیس قسم کا شب خوابی کا لباس تھا۔ لباس کا رنگ ہلکا نیلا تھا اور وہ اس لباس میں بہت وجیہہ اور اسمارٹ نظر آرہا تھا۔

اس نے ایک نظر اپنے سوتے ہوئے باپ کی طرف ڈالی اور دبے پاؤں میرے قریب آکر مجھ پر جھک گیا۔ میں نے سمجھا کہ کوئی شرارت کرنا چاہتا ہے۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں بند کرلیں۔ میرے چہرے پر گرم سانسیں محسوس ہوئیں پھر اس کے ہونٹ میرے رخسار تک آئے اور کان میں سرگوشی گونجی "شب بخیر"

مجھ پر اوس پڑگئی۔ عجیب سی مایوسی اور محرومی کا احساس ہوا۔ مگر میں آنکھیں بند کئے چپ چاپ پڑی رہی۔ پھر دوبارہ اس کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ہلکی سی کلک کی آواز آئی اور اس کے فوراً بعد دوسری آواز سنائی دی۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ تیز روشنی بجھا کر زیرو کا نیلگوں بلب روشن کیا گیا تھا۔ پھر وہ خود بھی بستر پر چلا گیا۔

پھر دیر بعد نظریں ٹھہریں تو اس مدھم روشنی میں بھی کمرے کی ہر چیز واضح طور پر دکھائی دینے لگی۔ میں نے چہرے پر دائیں ہتھیلی رکھ لی اور انگلیوں کی درز سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ چپ چاپ ساکت لیٹا ہوا تھا۔ خدا جانے کہ سو رہا تھا کہ جاگ رہا تھا۔ ممکن ہے اس کا ذہن آئندہ کا کوئی منصوبہ تیار کر رہا ہو۔ وہ جو کچھ بھی تھا بہت ظالم اور سنگدل تھا ہیرے کی کنی تھا جو اپنے سامنے کی چیز کو کاٹ کر گزر جاتا تھا۔ دوسرے کے دکھ اور تکلیف میں اس کی اپنی راحت تھی۔ مقصد براری کے لئے دوسروں کے جذبات اور احساسات کی پروا نہیں کرتا تھا۔ وہ اپنے باپ کو دھوکہ دے رہا تھا اور مجھے بھی آکٹوپس کی مانند اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا۔ وہ مجھ پر حربے آزما رہا تھا۔ میرے احساسات کو آگ دکھا کر فائدہ اٹھا رہا تھا۔ میں اس سے بدظن تھی، ناراض تھی، خفا تھی مگر اس کے ساتھ ہی مانوس بھی اس قدر ہو گئی تھی کہ اس سے الگ ہو کر اپنا کوئی تصور کوئی شناخت نہ رکھتی تھی۔ عیاں ہے اس قدر مانوس ہو گئی تھی کہ رہائی کے خیال سے مری جا رہی تھی۔ صبح مجھے اس کے شکنجے سے رہائی ملنے والی تھی۔ مگر میں خوش ہونے کی بجائے ملول اور رنجیدہ خاطر ہو رہی تھی۔

میں بستر پر لیٹے لیٹے آنسو بہانے لگی۔ جس شخص نے مجھے کٹھ پتلی کی مانند نچایا تھا میں اس سے جدا ہونے پر رو رہی تھی، کیا تماشہ تھا۔ معلوم نہیں کتنا وقت بیت گیا تھا اچانک مجھے سر درد کا احساس ہوا۔ میرا سر بری طرح دکھ رہا تھا۔ میں نے چادر ایک طرف پھینکی اور پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ نیند نہیں آ رہی تھی اور آنکھیں جل رہی تھیں۔ میں اٹھی اور ننگے پیر باتھ روم کی طرف روانہ ہو گئی۔ دو گھونٹ پانی پیا، منہ دھویا اور دوبارہ بستر پر آ کر لیٹ گئی۔ ادھر ادھر کروٹیں بدلنے کے بعد جانے کب نیند آ گئی۔

معلوم نہیں کتنی دیر سوتی ہوں گی کہ محسوس ہوا جیسے کوئی میرا ہاتھ پکڑ کر آہستہ آہستہ ہلا رہا ہے۔ میں نے آنکھیں کھول دیں، دیکھا کہ ڈاکٹر کامران مجھ پر جھکا ہوا تھا۔ فوراً اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دونوں ہاتھوں سے آنکھیں ملنے لگی، نیند ٹوٹ گئی تھی اور آنکھوں میں مرچیں سی لگنے لگی تھیں۔ پھر اس سے پہلے کہ ڈاکٹر کامران کچھ کہتا میری نظریں دوسرے بیڈ پر چلی گئیں۔ وہ بالکل خالی تھا اس پر کوئی نہیں تھا۔

"تمہارے والد صاحب کہاں گئے؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔ میری گھبراہٹ پر وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔ "میں محسوس کر رہا ہوں کہ آج کل تم پر گھبراہٹ اور وحشت کے دورے پڑ رہے ہیں۔ معلوم نہیں کیوں بات بات پر تمہارے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔"

اس کے لہجے میں طنز اور تمسخر تھا۔ آنکھوں سے شرارت جھانک رہی تھی۔ میں نے خجالت سے سر جھکا لیا اور مری ہوئی آواز میں بولی۔ "بستر پر تو نظر نہیں آتے۔"

"بستر پر تو میں بھی نہیں ہوں، مجھے کیوں نہیں پوچھا۔" اس نے بدستور کٹیلے لہجے میں کہا۔ پھر ہونٹ سکیڑتے ہوئے بولا۔ "ویسے ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی تمہیں والد صاحب کی اس قدر فکر کیوں پڑ گئی ہے۔ انہوں نے تمہیں کیا گھول کر پلا دیا ہے۔ میرا خیال ہے اگر ان کی کوئی حقیقی بہو ہوتی وہ بھی ان کے لئے اس قدر فکرمند نہ ہوتی۔"

اب میں اس کا کیا جواب دیتی۔ چپ چاپ بیٹھی رہی۔ وہ مجھے کچھ دیر گھورتا رہا پھر سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "وہ باتھ روم میں ہیں۔"

"کیا وقت ہوا ہے؟" میں نے اچانک پوچھا۔

"ساڑھے چھ بج رہے ہیں۔ ہمیں ناشتے سے فارغ ہوتے ہی ایئرپورٹ روانہ ہو جانا ہے۔"

"کیا میں بھی ایئرپورٹ چلوں گی؟"

"نہیں، تمہیں ساتھ جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے اباجان سے کہہ دیا ہے کہ آج نو بجے تمہارا پیپر ہے تم ناشتے کی میز پر انہیں خدا حافظ کہہ سکتی ہو۔"

یہ سن کر مجھے بہت دکھ پہنچا۔ ڈاکٹر کامران سے کوئی بحث اور حجت کرنا بے کار تھا۔ اسے کچھ سننے کی عادت ہی نہیں تھی۔ وہی کرتا تھا جو وہ ایک بار کہہ دیتا تھا۔

ہم تینوں کو تیار ہوتے ہوتے آدھ گھنٹہ لگ گیا۔ ڈاکٹر کامران کے باپ کے ساتھ کچھ زیادہ ساز و سامان نہیں تھا۔ البتہ ڈاکٹر کامران نے اپنی سوتیلی ماں اور بہنوں کے لئے کچھ تحائف ضرور ساتھ کر دیئے تھے۔ یہ تمام چیزیں بے حد نفیس اور گراں قیمت تھیں۔ سوا سات بجے ہم ناشتے کی میز پر بیٹھے ہوئے تھے میں بڑی مشکل سے خود پر ضبط کئے، آنسو روکے بیٹھی تھی۔ میری

کیفیت کو اس مشفق بوڑھے نے محسوس کر لیا مگر مصلحتاً خاموش رہا۔ وہ بھی اس قدر جلد واپسی پر رنجیدہ ہو رہا تھا۔ مگر اپنے بیٹے کا کیا کرتا جس نے زبردستی اس کی سیٹ ریزرو کروا دی تھی۔ جس شخص کو خود اس کا باپ نہ سمجھ سکا تھا میں اسے کیا سمجھ پاتی۔ بوڑھا آدمی وقتاً فوقتاً مجھے محبت بھری نظروں سے دیکھتا اور کسی پلیٹ میں سے کوئی چیز اٹھا کر منہ میں ڈال لیتا۔ ڈاکٹر کامران بذات خود لاتعلق سا، بظاہر ہم لوگوں سے بے خبر، ناشتے میں مصروف تھا مگر اس کی حرکات و سکنات بتا رہی تھیں کہ وہ بہت مطمئن اور مسرور ہے۔

ناشتہ جلد اختتام کو پہنچ گیا۔ ڈاکٹر کامران رسٹ واچ پر نظر ڈالتے ہوئے بولا "شازی تم نے کچھ کھایا نہیں یونہی بیٹھی رہیں تو ہمیں دیر ہو جائے گی۔ ہم یہاں سے سیدھے ایرپورٹ جائیں گے۔ تمہارے لئے ٹیکسی منگوا دوں گا تم کالج چلی جانا نو بجے تمہارا پیپر شروع ہو جائے گا۔"

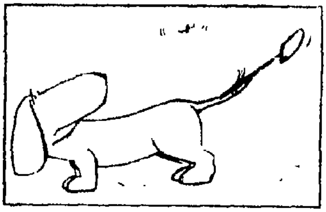
میں اٹھ کھڑی ہوئی اور گلوگیر لہجے میں بولی "تمہیں زحمت کرنے کی ضرورت نہیں ہے، یہ کام تو میں خود بھی کر سکتی ہوں۔"

ڈاکٹر کامران کے باپ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے دوبارہ بٹھاتے ہوئے بولا "تمہارا کالج راستے میں پڑتا ہے ہم تمہیں کالج پر اتار دیں گے۔ ٹیکسی وکیسی لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

"ممکن ہے شازی کو پہلے گھر جانا پڑے وہاں سے نوٹس وغیرہ لینا ہوں گے۔ پرچہ دینے سے پہلے مضمون پر سرسری نظر ڈالنا ضروری ہوتا ہے۔" ڈاکٹر کامران جلدی سے بولا۔

میرے ہاتھ پر بوڑھے آدمی کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ پھر اس نے آہستگی سے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اس نے مجھے بھرپور محبت پاش نظروں سے دیکھا۔ مجھے اس کی بوڑھی آنکھوں میں آنسو چمکتے نظر آئے۔ البتہ اس کے لبوں پر تبسم تھا۔ بڑی افسردہ اور معصوم سی مسکراہٹ۔ اس بار میں خود پر قابو نہ رکھ سکی۔ میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو ابلنے لگے اور اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر کامران کے چہرے پر ناگواری پھیل گئی۔ اس کی آنکھوں میں سختی جھلکنے لگی۔

میں نے آنسوؤں کو پینے کی کوشش کرتے ہوئے دل ہی دل میں خود سے کہا۔ تم اس بے حس، ناشکرے اور سنگدل شخص سے کیا توقع رکھتی ہو، وہ تو جیسا ہے سو ہے۔ یہ تم ہو کہ جس نے اسے خود پر مسلط اور حاوی کر رکھا ہے۔ چلو اٹھ کھڑی ہو۔ اس کی تمام زیادتیوں کو بھول جانے کی کوشش کرو۔ کوشش کرو کہ



اسے دل و دماغ سے نکال پھینکو۔ مان لو کہ وہ تمہارے ڈھب کا آدمی نہیں ہے۔ اگر تم نے خود کو اس سے الگ نہ کیا تو تمہاری زندگی میں بڑے ہولناک طوفان آئیں گے اور تم کبھی قدم جما کر نہ چل سکو گی۔

ڈاکٹر کامران نے ٹیکسی منگوائی اور میں زبیدہ کا شب خوابی کا لباس اخبار میں لپیٹتی ہوئی جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میرے ساتھ ہی وہ دونوں بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ ڈاکٹر کامران کے باپ نے ہاتھ بڑھا کر میرا سر سینے سے لگا لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا "شازی بیٹی! خدا حافظ۔ اگرچہ یہاں میرا قیام بہت مختصر رہا مگر مجھے اتنی زیادہ محبت ملی ہے کہ میں سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ میں ان خوشگوار لمحوں کو کبھی فراموش نہ کر سکوں گا۔ ان لمحوں کی سنہری دھوپ عرصے تک میرے ذہن و دل کو جگمگاتی رہے گی۔ رات کامی میرے پاس لیٹا اور میں نے اس کی سانس اپنی گردن اور چہرے پر محسوس کی تو سالہا سال پیچھے چلا گیا۔ جب کامی صرف دو ڈھائی سال کا تھا اور ہمیشہ میرے پاس سوتا تھا۔ ماں نہیں تھی اور میں ہی اس کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ رات کو وہ تمام باتیں میرے ذہن میں گھوم گئیں۔ رات کو گویا وقت ساکت ہو گیا تھا یا پھر اس نے اپنا سفر الٹا شروع کر دیا تھا۔ میں نے کئی بار کامی کو ٹٹول کر دیکھا کہ کہیں یہ وہی کامی تو نہیں ہے جبکہ وہ صرف دو سال کا تھا۔ رات تم دونوں کی معیت میں جو مسرت نصیب ہوئی ہے میں ایک عرصے سے اس کے لئے ترس رہا تھا۔" وہ ذرا رکا پھر افسردہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا "مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس سفر میں مجھے ایک بیش بہا خزانہ ہاتھ لگا ہے اور وہ خزانہ تم ہو۔ میرے اکلوتے بیٹے کی خوبصورت اور نازک بیوی۔ شازی تم بے مثال ہو۔"

بلڈ سے ادری کا ہی تہیں بھر رہا تھا، زبان نہیں تھک رہی تھی، وہ ابھی جانے اور کیا کچھ کہتا مگر ڈاکٹر کامران نے ٹوک دیا " آبا جان شازی کی ٹیکسی دیر سے کھڑی ہوئی ہے اور آپ کی روانگی کا وقت بھی ہو رہا ہے۔

میں نے شاکی نظروں سے ڈاکٹر کامران کی طرف دیکھا تم دو منٹ صبر نہیں کر سکتے، اب کیا رہ گیا ہے جو اس قدر محتاط ہو رہے ہو۔

ڈاکٹر کامران کے باپ نے مجھے خود سے الگ کیا اور کمزور آواز میں بولا " بیٹی میں جاتے ہی تمہیں خط لکھوں گا اور لکھتا رہوں گا۔ تم پابندی سے جواب دینا — خدا حافظ "

میں اس قدر مغموم تھی اور میرے سینے میں اتنی شدت کا درد ہو رہا تھا کہ میں اسے خدا حافظ نہ کہہ سکی۔ پلٹی اور دوڑتی ہوئی دروازے سے نکل گئی۔

ٹیکسی میں بیٹھی ہوئی زبیدہ کے گھر کی طرف جا رہی تھی تو میری کیفیت کچھ یوں تھی جیسے میں اپنے کسی قریب ترین عزیز کو دفن کرکے آ رہی ہوں، میں ناامید تھی، مایوس تھی، دلگرفتہ تھی، سینہ غم کی شدت سے پھٹا جا رہا تھا، اور آنکھوں کے سامنے سیاہ دھبے سے پھیل رہے تھے۔ صبح کی نرم و لطیف دھوپ اور فرحت بخش ہوا کے جھونکے بھی میرے دل کا بوجھ ہلکا نہیں کر سکے تھے۔

زبیدہ کے گھر پہنچی تو دروازہ آپا نے کھولا۔ لڑکیاں ابھی تک سو رہی تھیں۔ میں نے ایک بار پھر غسل خانے میں جا کر منہ اچھی طرح دھویا اور واپس آ کر صوفے پر پڑ رہی۔ دل و دماغ پر ایک عجیب طرح کا بوجھ تھا۔ ڈاکٹر کامران کا باپ جا چکا تھا۔ کہانی ختم ہو گئی تھی۔ اب میری ضرورت نہیں رہی تھی۔ اب کیا رہ گیا سب کچھ ختم ہو گیا تھا مگر ڈاکٹر کامران پھانس کی مانند میرے سینے میں اٹک کر رہ گیا تھا۔ ختم کرو شہناز، ختم کرو۔ اب ڈاکٹر کامران کے بارے میں مزید کچھ مت سوچو۔ دل کا دروازہ بند کر دو۔ اس کے دریچے پر پردہ گرا دو۔ اپنے آپ میں واپس لوٹ آؤ۔ سایہ گریزاں ہے، سراب ہے، سراب کے پیچھے بھاگنے سے حاصل نہیں۔ جب وہ تمہاری پروا نہیں کرتا تو تم اس کے بارے میں کیوں سوچتی ہو۔ بھول جاؤ۔

مگر میں اچھی طرح جانتی تھی کہ میں اسے کبھی نہ بھول سکوں گی

سب بہلاوا تھا، سب فریب خیال تھا۔ وہ میرے ذہن میں کسی سانپ کی مانند کنڈلی مار کر بیٹھ گیا تھا۔ میں اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکتی تھی۔ ابھی کچھ دیر بعد لڑکیاں جاگیں گی اور مجھ سے سب کچھ پوچھیں گی، میں انہیں کیا بتاؤں گی، کس طرح بتاؤں گی۔ اس وقت میں کسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ جو کچھ ہوگا میرے لئے ایک عذاب سے کم نہیں ہوگا۔

نو بجے کے قریب لڑکیاں ایک ایک کرکے اٹھنے لگیں۔ مجھے اپنے درمیان پایا تو چھیڑ چھاڑ کرنے لگیں۔ زبیدہ نے غور سے میری طرف دیکھا اور قدرے حیرت سے بولی " شہناز کیا تم روتی رہی ہو؟"

میں بُری طرح سٹپٹا گئی، بات بناتے ہوئے بولی " کیا کروں آج کل مجھے رونے دھونے ہی کا کردار ادا کرنا پڑ رہا ہے۔ خسر آج واپس گیا ہے، مروتاً چند آنسو بہانے پڑے ہیں۔"

"چند آنسوؤں میں تمہاری آنکھیں اس قدر سُرخ اور متورم ہو گئی ہیں اگر باقاعدہ رونا پڑے تو شاید خون جاری ہو جائے۔" شیریں مذاق اڑانے کے انداز میں بولی۔

"سچ بتاؤ شہناز کیا واقعی ڈاکٹر کامران کے باپ کی جدائی کی وجہ سے تمہارا یہ حال ہو رہا ہے؟" ہما نے پُرمعنی لہجے میں پوچھا۔

اب اگر میں کچھ کہتی تو بحث و مباحثے کا دروازہ کھل جاتا اور میں فی الوقت بحث سے بچنا چاہتی تھی۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لڑکیاں ڈاکٹر کامران کے حوالے سے بے ہودہ مذاق کرتی رہیں۔ ہما نے میرا ہاتھ پکڑا اور گھسیٹتے ہوئے باورچی خانے میں لے گئی۔ چہکتے ہوئے بولی " اب بتاؤ ڈاکٹر کامران کے ساتھ کیسی گزری۔ زبیدہ کے نام تمہارا رقعہ اس قدر پُراسرار اور دلچسپ تھا کہ ہم سب بے قرار ہو گئے۔ حتیٰ کہ ہم مہر اور واجد کے قصے کو بھی بھول گئے۔"

اسی وقت شیریں اور زبیدہ بھی باورچی خانے میں آ گئیں اور مجھ پر اچانک انکشاف ہوا کہ اس 'مجمع' میں پروین اور مہر نہیں ہیں۔ مہر اور واجد کا ذکر آیا تو میری دلچسپی ان کی طرف منتقل ہو گئی۔ میں نے تجسس کے عالم میں پوچھا " مہر اور واجد کے بارے میں کیا خبر ہے"

"خبر ہمارے لئے پرانی ہو چکی ہے مگر تمہارے لئے نئی

اندرونی خوف

"میں کئی ایسے لوگوں کو بھی جانتا ہوں جو یوں تو عریانیت کے پرستار نظر آتے ہیں، لیکن باطن میں عریانیت سے بہت ڈرتے ہیں اور اکثر چپکے چپکے ان لفظوں میں اپنی کمزوری کا اقبال کر لیتے ہیں: "عریانیت ہے تو اچھی چیز، لیکن دراصل بات یہ ہے کہ ہمیں اپنے آپ کو ننگا دیکھ کر شرم سی محسوس ہوتی ہے" اور یہ شرم بالکل ٹھیک ہے اور حالات کے مطابق ہے۔ کیونکہ انسان کی سرشت میں بدی اب اتنا گھر کر چکی ہے کہ وہ اپنے آپ کو عریاں دیکھنا مطلق پسند نہیں کرتا۔ چوری کرتے وقت شرم محسوس نہیں ہوتی۔ دھوکہ دیتے وقت شرم محسوس نہیں ہوتی، لیکن کپڑے اتارنے پر ضرور شرم محسوس ہوتی ہے اور شاید یہ بھی سچ ہے۔ کیونکہ اب انسانی شرم کے لئے کپڑوں کے سوا اور کون سی جگہ رہ گئی ہے جہاں اسے پناہ دی جاسکے۔"

(کرشن چندر، ننگا رہنے دو)

...ج شام کو مہر اور واجد کا عقد ہے۔" زبیدہ نے جواب دیا۔
مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ایک بڑا بوجھ میرے سینے ...لیا تھا۔ وہ افسردگی جو مجھ پر طاری تھی اس کی جگہ شدید ...نے لے لی۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا: "اتنی جلدی ...ل ہے۔ مہر نے تو حد کر دی۔"

"ہاں بھئی، اس نے شادی کی کچھ شرائط بھی رکھی تھیں۔ ...نے بے چون و چرا اس کی شرطیں مان لیں۔" ہما نے ہنستے ...ہا۔

"اچھا، مہر نے کچھ شرائط بھی رکھی تھیں۔"

"ہاں دو شرطیں تھیں۔" ہما بتانے لگی۔ "مہر کا کہنا تھا کہ ...وار ہے نہ زر پرست۔ وہ روپے پیسے کو اہمیت دینے ...نہیں ہے۔ وہ خدا کا شکر ادا کرتی تھی کہ دوسری عورتوں ...سے قیمتی ملبوسات اور زیورات کا بھی شوق نہیں تھا۔ ...نے اوڑھنے میں کچھ زیادہ لطف نہیں آتا تھا۔ اس نے ...ا سے واجد کی دولت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے مگر اب ...ے شادی ہو ہی رہی ہے تو وہ اس کی دولت سے ...ادیہ میرا آرزو پوری کرے گی۔ اس کی ہمیشہ سے خواہش ...کہ وہ کوئی رفاہی ادارہ قائم کرے۔ ایسا ادارہ جو نادار ...بھرپور کفالت کرے۔ ان کے تمام اخراجات پورے کرے ...کتاب خریدنے کی استطاعت نہ رکھتے ہوں۔ باقاعدہ ...ی جاسکیں۔ مہر کے کچھ اور بھی پروگرام تھے کوئی چھوٹا موٹا شفاخانہ قائم کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ جہاں غریب لوگوں کا مفت میں علاج کیا جاتا۔ اسے ان لڑکیوں سے بھی دلچسپی تھی۔ جن کی مفلسی کے سبب شادیاں نہیں ہو پاتی تھیں۔"

"گویا مہر نے واجد کا جمع جتھا ٹھکانے لگانے کا عہد کر لیا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا: "اب ذرا دوسری شرط بھی سن لوں۔"

"دوسری شرط بہت دلچسپ ہے۔" ہما نے قہقہہ مار کر ہنستے ہوئے کہا: "اس شرط کے تحت واجد ایک سال تک مہر کے قریب نہ جاسکے گا۔ مہر نے کہا کہ اسے مرد کی قربت کے تصور سے ہی وحشت ہوتی ہے۔ اسے ازدواجی زندگی کی عادت ڈالنے کے لئے کم از کم ایک سال درکار ہے۔"

"بہت خوب، واجد نے کیا ردعمل ظاہر کیا۔"

"واجد نے تو حد ہی کر دی، بے چون و چرا مہر کی تمام شرطیں مان لیں۔ اس نے کہا کہ اس کی ہر چیز مہر کی ہے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اس کی دولت لٹائے، اسے کوئی اعتراض نہ ہوگا اور رہی قربت والی بات تو وہ ایک سال کیا ایک برس انتظار کر سکتا ہے، اس کے لئے اتنا کافی ہے کہ مہر اس کی بیوی ہے۔ مگر جواب میں خود واجد نے اتنی بڑی شرط رکھ دی ہے کہ ہم سب کی عقلیں چت ہو گئی ہیں۔"

"اچھا واجد کی بھی کوئی شرط ہے۔" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ایسی ویسی شرط۔ اس نے کہا ہے کہ شادی کے بعد مہر

ہم لوگوں سے تعلقات یکسر منقطع کرنے گی اور لطف کی بات یہ ہے کہ مہر بی بی نے واجد کی اس شرط کو بسر و چشم قبول کر لیا ہے۔"

"تمہیں یہ تمام باتیں اتنی تفصیل کے ساتھ کیسے معلوم ہو گئیں؟" میں نے پوچھا۔

"گزشتہ رات دس بجے کے قریب خود مہر نے ہمیں فون کیا تھا اور ایک ایک بات تفصیل سے بتائی تھی۔" اس بار شیریں نے جواب دیا۔ "اب اسے کسی بات سے دلچسپی نہیں ہے وہ صرف رفاہی ادارے، معاشرتی فلاح و بہبود کے بارے میں سوچتی ہے۔ زبیدہ نے اس سے پوچھا کہ آخر اس کے دل نے کس طرح گوارا کیا کہ محض واجد کے کہنے پر وہ ہماری اتنے عرصے کی گہری دوستی کو ترک کرنے پر تیار ہو گئی ہے۔ جانتی ہو شہناز! اس نے کیا جواب دیا۔" شیریں منہ بگاڑ کر بولی۔ "اس نے کہا کہ بڑے مقاصد کے حصول کے لئے چھوٹے مقاصد کو قربان کر دیا جاتا ہے۔"

ہمانے خشک ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ "اس نے تو ہمیں شادی تک میں نہیں بلایا۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ ہمارے درمیان اتنی بڑی اور عظیم ہستی موجود ہے۔ افسوس کہ ہم اس کی کوئی قدر نہ کر سکے۔"

"اس نے عقد کے موقع پر کوئی بھیڑ بھاڑ نہیں بلائی ہے صرف قریب ترین عزیز جمع ہوں گے۔ اس کا کہنا ہے کہ بے جا اسراف سے کیا فائدہ۔" شیریں نے لقمہ دیا۔

"اچھا جی تو اب ہم اسراف کے زمرے میں آ گئے۔" ہمیں نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

پھر ہم میں سے کوئی کچھ نہیں بولا۔ مگر اس کے باوجود ہم ایک دوسرے کے جذبات و احساسات کو سمجھ رہے تھے۔ ہم میں سے ہر ایک کو شدید دکھ تھا کہ مہر نے ہمیں اپنی شادی کے موقع پر نہیں پوچھا تھا۔ وہ ہم سے اس طرح کٹ گئی تھی، ہم کو اس طرح نظر انداز کر گئی تھی جیسے ہم کبھی ایک دوسرے کے قریب نہیں رہے تھے، جیسے ہمارے اور اس کے تعلقات محض رسمی تھے اس کا ہم سے یوں جدا ہو جانا ہمیں سخت تکلیف پہنچا رہا تھا۔ ہمیں یوں لگ رہا تھا جیسے ہمارے جسم کا کوئی حساس حصہ کٹ کر الگ ہو گیا ہے۔ ہم چھ تھے ایک جان چھ قالب۔ بھرپور ہمارے خیالات میں تضاد تھا مگر ہم اس کے باوجود ایک تھے، ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے، ایک دوسرے کو سمجھتے تھے۔ ایک دوسرے کے مسئلے کو سلجھانے کی کوشش کرتے تھے اور اب مہر نے ایک بڑے مقصد کے لئے چھوٹے مقصد کو قربان کر دیا تھا۔ ہم چھوٹے تھے اور وہ عظیم تھی۔

ہم میں سے ہر ایک یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا، جیسے اس پر مہر کی بے مہری کا کوئی اثر نہیں پڑا ہے مگر ہر ایک کا دکھ اس کے چہرے پر تحریر تھا۔ محبت اور نفرت کو ہزار پردوں میں نہیں چھپایا جا سکتا۔ وہ کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی صورت ظاہر ہو کر رہتے ہیں۔

میں لاپرواہی سے شانے اچکاتے ہوئے لڑکیوں کو مخاطب کر کے بولی۔ "دوستو! ماتم کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ایک ابنارمل لڑکی کی ایک ابنارمل مرد سے شادی تھی۔ بس اس سے آگے اور کچھ نہیں سوچنا۔"

"دیکھا جائے تو مہر شروع سے ہمارے مزاج کی لڑکی نہیں تھی۔" ہمانے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔

"جیسی بھی تھی، جو بھی تھی اب اس کو بھول جاؤ۔ بہتر ہے اس قصے کو یہیں دفن کر دو۔" میں نے معنویت سے کہا۔

پھر مہر کے بارے میں کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ لڑکیاں دیر تک خاموش رہیں۔ کچھ وقت اور گزرا پھر اچانک ہما میری طرف رخ کرتے ہوئے بولی۔ "شہناز! اب تم اپنا قصہ سنا جاؤ۔ رات کے واقعات تفصیل سے سناؤ، کچھ چھوڑنا نہیں۔"

کوئی حیلہ یا مکر بے کار تھا۔ ممکن تھا کہ زبیدہ مجھے معاف کر دیتی مگر شیریں اور ہما بخشنے والی لڑکیاں نہیں تھیں، کچھ سچ کچھ جھوٹ، میں نے رات کی باتیں دہرا دیں۔ زبیدہ اس بات سے کچھ پریشان اور بے چین نظر آنے لگی کہ ڈاکٹر کامران نے مجھ سے آئندہ ملاقات کا کچھ طے نہیں کیا تھا۔ البتہ ہما قدرے خوش اور مطمئن نظر آتی تھی۔ شیریں نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ لاتعلق سی بیٹھی رہی۔ اسے بس ڈاکٹر کامران کے بارے میں کچھ سننا تھا جو اس نے سن لیا تھا۔

اس وقت میری ذہنی کیفیت ایسی نہیں تھی کہ میں تبصرے برداشت کر سکتی۔ مجھے زبیدہ کی دلسوزی اور ہمدردی کا یارا تھا نہ ہما اور شیریں کے مذاق اور شوخیوں کی تاب۔ میں نے انتہائی منت اور سماجت کے ساتھ ان سے اجازت لی اور سیدھی اپنے گھر چلی آئی۔

دن بڑی بے کیفی میں گزر رہے تھے ہر ایک آنے والا دن اپنے ساتھ اداسی اور ویرانی لے آتا تھا۔ میں نے لڑکیوں سے بہانہ بنایا کہ ابوجان راتوں کو میری روز روز کی غیر حاضری سے بہت ناراض ہیں اور اب گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں دیتے۔ اس بہانے کی آڑ لے کر میں کئی دن تک زبیدہ کے گھر نہ گئی۔ دوسری طرف اپنے گھر میں، اپنے کمرے میں یہ کہہ کر مقید ہو گئی کہ امتحان کی تیاریوں میں مصروف ہوں اور کوئی مداخلت پسند نہ کروں گی۔ اس طرح میں افراد خانہ سے کٹ گئی۔ صبح کو میرے ذہن پر طرح طرح کے خیالات کا غلبہ ہوتا اور گزرے ہوئے واقعات کسی فلم کی مانند میرے ذہن میں چلتے رہتے۔ دوپہر کو میں کالج چلی جاتی۔ لڑکیاں میرے ذہنی انتشار سے واقف تھیں اور میری بگڑی ہوئی ذہنی اور جذباتی کیفیت کو خوب سمجھتی تھیں چنانچہ وہ چھیڑ چھاڑ سے احتراز کرتی تھیں ممکن ہے وہ زبیدہ کی ایما پر ایسا کرتی ہوں کیونکہ زبیدہ میرے معاملے میں بے حد سنجیدہ تھی۔

کالج ہی میں مجھے اِدھر اُدھر کی خبریں مل جاتی تھیں۔ تازہ خبر یہ تھی کہ پروین نے ہما کے سابق منگیتر کو پوری طرح اپنے قابو میں کر لیا تھا اور کسی وقت بھی ان کی شادی کا حادثہ رونما ہو سکتا تھا۔ پروین اکثر ہنس کر کہتی کہ مجھے اپنے مقصد میں جو کامیابی ہو رہی ہے وہ محض رعنا کی بدمعاشی کا نتیجہ ہے اور رعنا کے بارے میں خبر یہ تھی کہ وہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ اس کے قریب ترین دوستوں کا خیال تھا کہ وہ اپنے گاؤں چلا گیا ہے اور اس کی واپسی کے بارے میں کوئی حتمی بات نہیں کہی جا سکتی تھی۔

ہما کی کیفیت کچھ اچھی نہیں تھی۔ وہ روز بروز اعصابی اور ذہنی مریض ہوتی جا رہی تھی۔ رعنا کی زیادتی اور بہیمیت نے اسے ذہنی اختلال کا شکار بنا دیا تھا۔ اسے اپنے داغدار ہونے کا شدت سے احساس تھا اور یہ احساس انتقامی کیفیت بن کر بڑی تیزی سے اس کے مزاج میں سرایت کرتا جا رہا تھا۔ اب اسے ایک ہی دُھن تھی کہ کسی طرح ڈاکٹر کامران پر اپنا اثر جما لے۔

مہر بھی کالج آتی تھی مگر ہم سے دور دور رہتی تھی اس کا کہنا تھا کہ وہ ریاکار اور دھوکے باز نہیں ہے۔ جب اس نے واجدہ سے ہم لوگوں سے نہ ملنے کا وعدہ کر لیا ہے تو ہر لحاظ سے اس وعدے کا پاس کرے گی۔

جب تک میں کالج میں رہتی تھی میری توجہ اِدھر اُدھر بٹی رہتی تھی مگر جوں ہی گھر میں داخل ہوتی دل و دماغ پر ایک بوجھ سا پڑ جاتا۔ ڈاکٹر کامران اپنی تمام تر سنگدلی اور خود غرضی کے باوجود میرے ذہن میں آ کھڑا ہوتا اور میں کوشش کے باوجود اس کے تصور سے پیچھا نہ چھڑا پائی۔ میں نے اس سے پہلے کوئی محبت نہیں کی تھی۔ مجھے محبت کا تجربہ نہیں تھا۔ البتہ سنا ضرور تھا کہ محبوب خواہ کتنا ہی سنگدل اور بے مروت ہو اس کے تصور سے راحت اور تسکین ضرور ملتی ہے۔ مگر میرے ساتھ ایسا معاملہ نہیں تھا۔ میری الجھنوں اور پریشانیوں میں کچھ اضافہ ہی ہو جاتا تھا۔ میں خود کو کوستی، بُرا بھلا کہتی اور کوشش کرتی کہ ڈاکٹر کامران کے سحر سے باہر نکل آؤں مگر ہمیشہ ناکام رہتی۔

یہ تو اچھا ہی تھا کہ ڈاکٹر کامران ان دنوں رخصت پر تھا۔ اپنے باپ کے جانے کے بعد وہ سرے سے کالج نہیں آیا تھا۔ اگر وہ آتا ہوتا اور اس کا سامنا ہوتا تو جانے میری کیا حالت ہوتی۔ آئندہ پیر کو کالج میں اس کی آمد متوقع تھی اور میں اس دن کے بارے میں سوچ سوچ کر ہیجان میں مبتلا ہوتی جا رہی تھی۔

وقت گزر رہا تھا، دن گزر رہے تھے اور میں بڑی شدت سے آئندہ پیر کا انتظار کر رہی تھی۔ میں اس مخصوص دن کی منتظر تھی جب ڈاکٹر کامران حسب معمول ٹھیک اپنے وقت پر کلاس میں آئے گا۔ بریف کیس میز پر رکھ کر کلاس پہ طائرانہ نظریں ڈالے گا —— پھر، پھر اس کے بعد کا خود ساختہ منظر میرے ذہن میں مجسم ہو جاتا۔ رفتہ رفتہ وہ منظر میرے ذہن میں پختہ ہوتا گیا۔ میں اٹھتے بیٹھتے وہ خواب دیکھنے لگی۔ میں نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر کامران میں جو دو چار ذاتی اور شخصی خامیاں تھیں وہ اب مجھے کوشش کے باوجود یاد نہیں آ رہی تھیں۔ مجھے تو بس اتنا معلوم تھا کہ وہ خوبصورت تھا، دلکش تھا، اس کی مسکراہٹ سحر کار تھی اور آنکھوں میں شعلہ سا لپکتا تھا۔

بالآخر پیر کا دن آ گیا اور میں اس دن صبح ہی صبح زبیدہ کے گھر پہنچ گئی۔ خوش قسمتی سے زبیدہ گھر پر اکیلی تھی۔ اب لڑکیاں شاذ ہی زبیدہ کے گھر آتی تھیں۔ مہر کا تو سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا پروین سارا وقت ہما کے سابق اور حال اپنے منگیتر کے ساتھ گزارتی

ھی۔ جب سے ہما کی منگنی ٹوٹی تھی ہما کے والدین نے اس پر گھر سے باہر رہنے پر پابندی لگا دی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ منگنی محض ہما کی آزاد روی اور آوارہ گردی کی وجہ سے ٹوٹی ہے' اور رہی شیریں تو اس کا کہنا تھا کہ جب کوئی نہیں آتا تو ہم کیوں آئیں۔

زبیدہ نے مجھے دیکھ کر لمبی "اوہ" کی اور بے ساختہ لپٹا لیا۔ زبیدہ کے قریب رہ کر مجھے ایک عجیب طرح کا سکون اور اطمینان کا احساس ہوتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے میں ہر طرح سے محفوظ ہوں اور کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا، جو میں کسی سے نہ کہہ پاتی تھی، بے خوف و خطر اس سے کہہ دیتی تھی۔ وہ بڑے غور اور توجہ سے میری بات سنتی تھی اور مفید مشورے دیتی تھی۔ وہ میرے دوستوں میں نمبر ون دوست تھی۔ سب بدل سکتے تھے وہ نہیں بدل سکتی تھی اور بعد میں جیسا کہ میں آگے چل کر بتاؤں گی یہ بات درست ثابت ہوئی۔

زبیدہ سمجھ رہی تھی کہ میں اتنے دنوں بعد صبح ہی صبح وہاں کیوں آ دھمکی ہوں۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی میں کب اور کس وقت اس کی ضرورت محسوس کرتی تھی۔ وہ بڑے میٹھے لہجے میں مجھ سے گفتگو کر رہی تھی، وہ کہہ رہی تھی کہ ڈاکٹر کامران میری دید کے لئے سراپا اشتیاق و انتظار ہو گا اور مجھے خوب بن سنور کر کالج جانا چاہیئے۔ ڈاکٹر کامران کے باپ کے دیئے ہوئے لباس زبیدہ کی الماری ہی میں رکھے ہوئے تھے زبیدہ نے میرے لئے بہترین جوڑا منتخب کیا اور پھر میری آرائش کرنے بیٹھ گئی۔ میری دادی جان کہا کرتی تھیں کہ لڑکیوں کو آرائش اس طرح کرنی چاہیئے کہ دوست سمجھ جائیں اور دشمن نہ سمجھیں۔ زبیدہ نے اس وقت کچھ ایسا ہی کمال دکھایا تھا۔

کالج پہنچے تو دفور شوق اور انتہائی ضبط سے میری بری حالت تھی۔ حلق خشک ہو رہا تھا اور قدم کہیں کے کہیں پڑ رہے تھے۔ اگر زبیدہ ساتھ نہ ہوتی تو میں کسی جگہ ڈھے جاتی۔

ہما اور شیریں ہم سے پہلے کالج پہنچ چکی تھیں۔ انہوں نے میرے چہرے پر میرے لباس کو دیکھا تو طنز اور تمسخر سے مسکرانے لگیں۔ انہوں نے میری پیشانی پر آئی ہوئی شکن اور زبیدہ کے بار بار کئے گئے اشاروں کی بھی پروا نہ کی اور متواتر اعصاب شکن مذاق اور چھیڑ چھاڑ کرتی رہیں۔ پھر گھنٹی کی بلند آواز نے ڈاکٹر کامران کی کلاس کے آغاز کا اعلان کیا اور اس کے ساتھ ہی میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

زبیدہ نے میرا ہاتھ پکڑا اور کلاس میں داخل ہو گئی۔ ہمارے آگے پیچھے بھی طلبا کلاس میں داخل ہو رہے تھے ان میں ہما اور شیریں بھی تھیں۔ ہم نے اسی جگہ کا انتخاب کیا جہاں ہم ہمیشہ بیٹھتے تھے۔ میں زبیدہ کے ساتھ بیٹھی اور دوسرے ہاتھ پر عمداً بجائے میز کے کتابیں اور کاپیاں کرسی پر رکھ دیں تاکہ میرے قریب کوئی دوسرا طالب علم نہ بیٹھ سکے۔ زبیدہ کے دوسری طرف ہما اور شیریں بیٹھی تھیں۔ میں نے مڑ کر دیکھا دو قطار چھوڑ کر مہر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے میری طرف دیکھا، سر ہلایا، مسکرائی اور دوبارہ سر جھکا لیا۔

لمحے گزر رہے تھے اور میرے دل کی دھڑکن تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے تیزی سے بخار چڑھ رہا ہو۔ میرا ایک ہاتھ زبیدہ کی گرفت میں تھا اور میں نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں اور بند آنکھوں میں وہ خواب تیر رہا تھا جو کئی دنوں سے میرے ذہن میں مجسم ہو گیا تھا۔ کئی لمحے گزر گئے۔ پھر کلاس میں ہلکی سی بھنبھناہٹ ہوئی اور اسی وقت زبیدہ نے میرا ہاتھ دباتے ہوئے سرگوشی کی۔ "آ گیا"۔

دل کو ایک جھٹکا لگا اور میں نے پوری آنکھیں کھول دیں ڈاکٹر کامران ہمیشہ کی مانند مسکراتا ہوا کلاس میں داخل ہو رہا تھا۔ اس کے چلنے کے انداز میں اس کی مخصوص تمکنت تھی۔ اس نے بریف کیس میز پر رکھا اور اس کی نظریں کلاس کا طائرانہ جائزہ لینے لگیں۔

آئندہ قسط میں
اس پراسرار اور ماڈرن ناول کا مصنف
دلکش واقعات کی
نئی رنگینیاں
اور نئی رعنائیاں
پیش کر رہا ہے:

باجی

زینت نے آہستہ سے چائے کی ٹرے ٹیبل پر رکھ دی۔
مسہری پر ارشد بڑی بےترتیبی سے لیٹا ہوا تھا۔ تکیے سے اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا تھا اور سینے سے بادامی رنگ کی اونی چادر لپٹی ہوئی تھی۔ زینت نے مسکرا کر اس کے خوبصورت چہرے کی طرف دیکھا اور اس کے سرہانے بیٹھ گئی۔ وہ اسے دیکھتی رہی اور دل ہی دل میں ایک بے پناہ مسرت کی گدگدی محسوس کرتی رہی۔ اس نے سوچا جب وہ کنواری تھی تو ایک دن محلے میں رجسٹرار صاحب کے یہاں شہنائی بجی تھی۔ شمیم کی شادی تھی۔ اس رات کو اس نے شمیم کے شوہر کو دیکھا تھا۔ بیلے کے پھولوں کے جال میں بندھا دولہا جب عورتوں کے گیت سے بری طرح شرما رہا تھا تو کتنا خوبصورت معلوم ہوتا تھا۔ فرحت نے کہا تھا —— "دولہا بھائی! ذرا چہرہ تو اوپر اٹھائیے آپ تو ایسے شرما رہے ہیں جیسے آپ ہی میری باجی ہیں۔" اُف کیسی منہ پھٹ تھی فرحت! لیکن انہوں نے بھی تو خوب جواب دیا تھا۔ "شریر لڑکی! اگر میں تمہاری باجی ہوں تو تمہارے دولہے بھائی کہاں گم ہو گئے کی پیٹھ سے چھوٹ کر کے یہاں کیوں چھپ گئے؟ انہیں بھی یہیں بلا لو اپنی دلہن کو تاکہ دیکھ جائیں۔"
فرحت تو بچی تھی خفا ہو کر بھاگ گئی لیکن غضب تو یہ ہوا کہ بوڑھی اور جوان عورتیں بھی اپنے اپنے منہ میں ساڑی کے پلو دبا کر ہنسنے لگی تھیں۔ شاید اس لیے کہ بات شائستہ تھی، سب کو پسند آئی۔ اور



سچ تو یہ ہے کہ مجھے رشک ہونے لگا تھا کیونکہ وہ خوبصورت بھی تھا اور خوش گو بھی معلوم ہوتے تھے۔ آخر میں بھی تو جوان تھی۔ اور ہر جوان لڑکی کی تمنا یہ ہوتی ہے کہ اس کا شوہر بھی خوبصورت ہو، خوش گو ہو جو اپنی پیاری پیاری باتوں سے ہمیشہ اسے ہنساتا رہے۔ محبت بھری باتیں کرتا ہے اور سچ مچ جیسے خدا اس وقت میرے دل کے دریچے میں جھانک کر دیکھ رہا تھا۔ مجھے وہ سب کچھ مل گیا جو میں نے چاہا تھا۔

اس نے ایک گہری نگاہ ارشد پر ڈالی۔ اس کا چہرہ مسکرا رہا تھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس کی جنت اس کے سامنے مسکرا رہی ہے۔ پھر وہ سوچنے لگی۔ یہ مجھے کتنا پیار کرتے ہیں۔ کبھی کبھی تو مجھے یہ خیال ہونے لگتا ہے دنیا میں کوئی اور شوہر اپنی بیوی کو اتنا پیار نہ کرتا ہوگا۔ یہ مجھ سے کہا کرتے ہیں کہ میں ان کے دل کی دھڑکن ہوں، میں ان کی روح سے زیادہ پیاری ہوں، میں چاند کی نورانی فضاؤں سے زیادہ معصوم ہوں، میں ان کی نبضوں کا لطیف ترنم ہوں، میں ان کی سانسوں کی ہلکی ہلکی خوشبو ہوں۔ اور جانے اسی طرح مجھے یہ اور کیا کیا کہا کرتے ہیں۔ اور مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہی میری ان بڑی بڑی آنکھوں کی چمک ہیں، یہی میری گھنیری زلفوں کی خوشبو ہیں، یہی میرے رخساروں کی رنگت ہیں، میرا سب کچھ ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ یہ مجھے بہت پیارے لگتے ہیں، دنیا کی ساری چیزوں سے پیارے!

یہ سب کچھ سوچتے سوچتے وہ ذرا سا ارشد کے چہرے پر جھکی، دوسرے ہی لمحے اپنے گالوں پر اس کی سانسوں کی گرم گرم لطیف لہر محسوس کی تو وہ شرم سے دوہری ہو گئی۔

"کیوں؟ اب تک نیند پوری نہیں ہوئی آپ کی؟"

اس نے آہستہ سے اس کی پیشانی پر اپنی گداز ہتھیلی رکھتے ہوئے کہا۔ ارشد نے آنکھیں جھپکا کر ایک نظر زینت کو دیکھا۔ اور مسکرا کر کہنے لگا:

"ڈارلنگ! آج مجھے سونے کی اوور ٹائم ڈیوٹی کرنی ہے!"

"لیکن میں نے آپ کے اوور ٹائم کی درخواست رد کر ڈالی ہے!"

"وجہ تو سنوں آخر؟"

"بتیے نہیں، دیکھئے!"

ارشد نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔

سامنے زینت کے ہاتھوں میں چائے کی گرم گرم پیالی تھی اور فضا میں اس کی خوشبو تیر رہی تھی۔ ارشد نے ایک گہری سانس لی اور اٹھتے ہوئے کہنے لگا۔

"اوہو زینت! ڈارلنگ آ رہی ہو!"

"یس لو، مائی لارڈ!"

"وہ کیسے ——؟"

"وہ اس طرح کہ آپ نے میرے فیصلے کے خلاف پھر کوئی اپیل نہیں کی!"

"اے میری زینو! تمہاری ہر خواہش میرے لیے ایک حکم کا درجہ رکھتی ہے۔ اور پھر تم تو میرے لیے چائے لائی ہو، بھلا اس کے خلاف کون کافر اپیل کر سکتا ہے۔ اگر تم ایسے فیصلے دن بھر میں سو بار بھی کرو تو میرے سر آنکھوں پر!"

"اچھا اب گپ بند، چائے ٹھنڈی ہو جائے گی"

حکم کی فوراً تعمیل کی گئی۔

ارشد نے زینت کے ہاتھ ہی سے ایک چسکی لی اور اس کے بالوں سے کھیلنے لگا۔

"کیا یہ چائے تم نے بنائی ہے؟"

"نہیں، رحمت باجی نے! کیوں کیا بات ہے؟"

"شکر کچھ کم ہے ——!"

"ٹھہریئے، میں لائے دیتی ہوں۔"

"نہیں سنو! اپنی ان مخمور آنکھوں کی تھوڑی سی شراب ڈال دو!"

"بس آپ کو تو ہر وقت مذاق ہی چاہیئے۔ رحمت باجی اگر سن لیں گی تو کیا کہیں گی؟"

"کہیں گی کیا، وہ جانتی نہیں کہ ہم دونوں جوان ہیں؟"

"اُفوہ! آہستہ بھی نہیں بولتے۔ آپ کو تو جیسے ان کے جذبات کا کچھ خیال ہی نہیں ہے۔"

ارشد یکایک سنجیدہ ہو گیا۔

"مجھے خیال ہے زینت! شاید تم نہیں جانتیں کہ میں نے ان کے متعلق کئی بار بہت گہرائی سے سوچا ہے۔ لیکن کیا بتاؤں قسمت ہی بے چاری کی پھوٹی ہے تو میں کیا کروں؟"

"خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کیجئے۔ آپ ہی سوچئے نا کہ وہ بھی تو ایک زندہ لڑکی ہیں، کوئی بھوت پریت تو نہیں نہیں۔"

"نہیں نہیں، میں یہ کہاں سوچ رہا ہوں۔ تم تو خواہ مخواہ برا مان جاتی ہو۔ میں تو کوشش میں لگا ہی ہوا ہوں۔ جس دن کوئی مناسب لڑکا مل گیا ان کے ہاتھ پیلے کر کے ڈولی پر بٹھا دوں گا۔"

"بس خالی باتیں ہی کر لیتی آتی ہیں آپ کو؟"

"اتنے تلخ لہجے میں بیٹا تم کو میری زندگی! میری دیانتداری اور سچائی کو چوٹ لگی ہے۔"

اور جواب میں وہ اٹھ کر چلی گئی۔ فضا بدل گئی۔ کچھ ہی دیر پہلے جس ماحول میں خوشیاں ہی خوشیاں تھیں وہاں آگ برسنے لگی۔ فضا میں محبت کی خوشبو کے بجائے گرم گرم جھونکے چلنے لگے۔

ارشد سر تھام کر بیٹھ گیا۔

وہ سوچنے لگا

زینت نے اس کی شادی کے ایک ہی ہفتہ بعد اسے بتایا تھا کہ اس کی ایک خالہ زاد بہن رحمت ہے جسے وہ بے حد چاہتی ہے اور رحمت بھی اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتی ہے۔ کیونکہ بچپن ہی میں جب اس کی ماں اسے چھوڑ کر اس دنیا میں چلی گئی تھی جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔ اس وقت سے وہ اسی کے ہاں رہتی ہے اس کے ابا نواب پور میں ایک کلینک میں کمپاؤنڈر تھے۔ وہ رحمت کے لیے پھر کوئی ماں نہیں لائے۔ البتہ جب بھی کبھی وہ آتے تھے رحمت کے لیے کھلونے وغیرہ لاتے تھے اور جب رحمت بڑی ہو گئی تو کپڑے اور سامان وغیرہ لاتے رہتے تھے جس کا نصف حصہ تو وہ برابر زینت ہی کو دے دیا کرتی تھی۔ جانے زینت سے اسے کتنی محبت ہو گئی تھی۔ حالانکہ گھر میں زرینہ، عصمت اور عشرت وغیرہ بھی تھیں لیکن وہ سب سے زیادہ زینت ہی کو چاہتی تھی۔

دن اسی طرح ہنسی خوشی گزر رہے تھے کہ ایک دن غضب ہو گیا۔ رحمت کے ابا ڈاکٹر وحید کے کمپاؤنڈر فراست حسین رکولی ندی میں ڈوب کر مر گئے۔ معلوم ہوا کہ برسات کا موسم پورے شباب پر تھا اور وہ ڈاکٹر وحید کے ساتھ کسی تشویشناک کیس کو دیکھنے جا رہے تھے۔ نواب پور میں وہ کلینک رکولی ندی کے کنارے تھا۔ ندی میں پانی کافی چڑھ آیا تھا۔ فراست حسین نے ڈاکٹر وحید کو ندی میں جیپ اتارنے سے منع کیا تھا لیکن وہ نہ مانے۔ اور جب جیپ بیچ دھارے میں پہنچی تو کسی بڑے گڈھے میں الٹ گئی۔ ڈاکٹر وحید تو کسی طرح بچ گئے لیکن فراست حسین نہ بچ سکے۔ ڈاکٹر وحید نے اس حادثہ کی خبر زینت کے والد علی حیدر صاحب کو پہنچوا دی۔ رحمت کو جب یہ خبر ملی تو چیخ مار کر جو گری تو اسے دو دن تک ہوش نہ آیا۔ لیکن وقت انسان کا بہت بڑا رفیق ہے۔ کتنا ہی بڑا حادثہ کیوں نہ ہو وقت اس کے غم کو ہلکا کر دیتا ہے۔ اور یہی رحمت کا بھی ہوا۔ گزرے لمحات نے اس کے آنسو خشک کر دیئے۔ اس کے دل سے غم والم کے منحوس بادل چھٹنے لگے جیسے

محبت

محبت کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ تو خود اتنی پرکشش اور دلفریب ہوتی ہے کہ ناکام سے ناکام انسان بھی اسے پاکر مسرور و شادماں ہو جاتا ہے اور زندہ رہنے کی تمنا کرنے لگتا ہے۔

اترتے گئے۔ اور پھر کچھ دن بعد زینت کے والدین کی شفقت پاکر وہ سب کچھ بھول گئی۔ رحمت بڑی تیزی سے جوان ہوتی گئی اور جب ایک دن زینت نے چپکے سے آکر اس کے کان میں کہا کہ اس کے لیے ایک گورے چٹے خوبصورت دولہا کی تلاش ہو رہی ہے تو وہ شرم سے یوں سمٹ گئی جیسے کسی نے لاجونتی کی پتیوں کو زور سے پھونک مار دی ہو اور اس کی پوری کی پوری شاخ سمٹ کر جھک گئی ہو۔

اس کی شادی کی فکر علی حیدر صاحب کو تو کم تھی زینت کی ماں کو زیادہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے بار بار کہنے پر علی حیدر صاحب نے ایک جگہ بات پکی کر لی۔ لڑکا اچھا تھا تعلیم یافتہ تھا اور کسی بڑی فرم میں شعبۂ اشتہارات میں ایک ذمہ دار عہدے کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ لیکن اس کی شرط یہ تھی کہ وہ امریکہ سے اعلیٰ ڈگری حاصل کر کے لوٹنے کے بعد ہی شادی کرے گا۔ ادھر زینت کی ماں بضد تھیں کہ کم از کم عقد ہی ہو جائے اور امریکہ سے لوٹنے پر باقی رسمیں ادا کی جائیں۔ ان کی یہ ضد پوری ہو گئی۔ رحمت کا عقد علی حیدر صاحب نے بڑی دھوم دھام کے ساتھ شمشاد سے کر دیا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ ایسی تقریب تزک و احتشام کے اعتبار سے شہر میں واحد تھی۔ علی حیدر صاحب نے ہائی کورٹ میں دس سال کی پریکٹس کی کمائی اس تقریب میں خرچ کر دی۔ وہ لوگوں سے یہی کہا کرتے تھے کہ وہ اپنی لڑکی کی شادی کر رہے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ رحمت کو بے حد چاہتے تھے۔ عقد کے وقت شمشاد نے جب قاضی صاحب کے پوچھنے پر کہا ——— "جی ہاں میں نے قبول کیا" تو علی حیدر صاحب کے آنسو تھے کہ تھمتے ہی نہ تھے۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ ان کے وہ آنسو خوشی کے تھے یا غم کے۔ خوشی تو انہیں اتنی تھی کہ عقد کے وقت

تک وہ سب سے ہنس ہنس کر یہی کہتے رہے تھے کہ بھئی یہ تو خدا کا فضل و کرم ہے۔ ورنہ وہ شرافت صاحب کی دی ہوئی اتنی بڑی ذمہ داری کو کیسے نباہ سکتے تھے۔ لیکن اس خوشی میں بھی انہیں غم تھا۔ رحمت کو اپنے کلیجے کا ٹکڑا سمجھتے تھے۔ اور وہ اس دن ان سے جدا ہو رہی تھی۔

لیکن کون جانتا ہے کہ وقت کے سینے میں حادثات کے کتنے بڑے بڑے جوالا مکھی پوشیدہ ہیں جو کسی بھی وقت پھٹ کر کسی کی خوشیاں کو پلک جھپکتے جھلس سکتے ہیں۔ بھلا کوئی یہ جانتا تھا کہ عقد کے وقت رحمت کے جو مہندی لگائی گئی تھی اس کا سرخ رنگ اتنی جلدی سیاہ ہو جائے گا۔ اس کی مانگ میں جو سیندور گیتوں کی آواز میں بھرا گیا تھا وہ اتنی جلدی آنسوؤں کی چھاؤں میں پونچھ دیا جائے گا لیکن یہی ہوا اور عقد کے چوتھے دن ہی ہوا۔ جب کہ شمشاد اپنے پروگرام کے مطابق امریکہ جا رہا تھا اور راستے ہی میں طیارے میں آگ لگ جانے سے سارے مسافروں کے ساتھ شمشاد بھی پلک جھپکتے ہی ختم ہو گیا تھا۔ علی حیدر صاحب تو اپنے دروازے پر شمشاد کے تار کا انتظار کر رہے تھے کہ وہ امریکہ کیسے پہنچا۔ لیکن انہیں اس حادثے کی خبر ملی۔ سارے گھر میں آگ لگ گئی اس آگ میں رحمت تو بالکل جل کر خاک ہو گئی۔ اس کی چوڑیاں پگھل گئیں، مانگ کا سیندور جھڑ گیا، بدن پر بیوگی کا کفن لپٹ گیا اور وہ سب کچھ ہو گیا جو کبھی نہ ہونا چاہیے تھا۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہوئی کہ رحمت کو علی حیدر صاحب کی شفقت کی بجائے نفرت ملنے لگی۔ زینت کی ماں اس کے سائے سے یوں بھاگنے لگیں جیسے رحمت دنیا کی سب سے منحوس ترین بیوہ ہے۔ محلے کے لوگ اسے حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے اور رفتہ رفتہ لوگوں سے اسے کیا نہ ملا؟ مکروہ نگاہیں، زہر میں ڈھلی ہوئی نگاہیں، طعنے، تشنے، کوسنے، گالیاں سب کچھ! لیکن زینت ایسی نہ تھی۔ اس نے سب کے دلوں میں رحمت کے لیے نفرت و حقارت کی آگ دہکتے ہوئے دیکھی تو اس نے رحمت کو اپنے دل کی گہرائیوں میں ایسے چھپا لیا جیسے سیپ موتی کو! رحمت بھی اپنی زندگی کی خاردار پگڈنڈی پر چلتے چلتے اپنے پاؤں کو لہولہان کر چکی تھی۔ وہ زینت کے پیار کی چھاؤں میں آکر پناہ لینے لگی۔ پھر اسی درمیان زینت کی شادی ہو گئی۔ اور جب زینت نے شادی کے ایک ہی ہفتے بعد رحمت کی دکھ بھری کہانی سنا کر اس سے کہا کہ اسے وہ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھنے کا سوچ چکی ہے، تو زینت کے لیے اس کے دل میں بے پناہ محبت امڈ آئی۔ اور اب اس شادی کو دو سال ہو گئے۔ اس دوران میں زینت نے ہزاروں بار ہاتھ جوڑ جوڑ کر قسمیں دے دے کر کہا کہ وہ رحمت کے لیے کوئی اچھا سا لڑکا تلاش کرے۔ لیکن ...

اور آگے وہ کچھ نہ سوچ سکا۔

خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ زینت پھر کمرے میں واپس آگئی۔

"کیوں آپ نے ابھی تک چائے نہیں پی؟"

"پی لوں گا۔ لیکن تم ذرا ٹھہرو، مجھے کچھ کہنا ہے!"

"بولیے ——!"

"بیٹھو تو سہی!"

زینت ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

"وہاں نہیں، میرے پاس اس مسہری پہ!"

زینت اس کی بغل میں آکر بیٹھ گئی۔

ارشد نے اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں جھانکا اور مسکرا دیا۔ وہ بھی مسکرا دی۔

"اب بول بھی دیجئے۔"

"اچھا اب تم ہی بتاؤ، میں تم سے کیا کہنا چاہتا ہوں؟"

"ویسے تو آپ کی مرضی، لیکن میں یہی چاہتی ہوں کہ آپ کہیں زینت! تمہاری ہی محبت کی قسم تم مجھ سے روٹھا نہ کرو!"

"اچھا! تم کیا جواب دینے والی ہو؟"

"یہی کہ میرے سرکار! آپ کے ایک غمگین لمحے پر میری زندگی کی ساری خوشیاں قربان ہیں۔ میں آپ سے روٹھ کر اپنی خوشی کا ایک لمحہ بھی ضائع کرنا نہیں چاہتی۔"

"اوہ زینت! کتنی گہری ہے تمہاری محبت، کتنے بلند ہیں تمہارے خیالات! میں تمہیں کیسے بتاؤں زینت کہ میں تمہاری ان ہی باتوں کو سننے کے لیے بے چین رہتا ہوں۔ تمہیں پا کر تو جیسے میں نے دنیا کی ساری خوشیاں پالی ہیں؟"

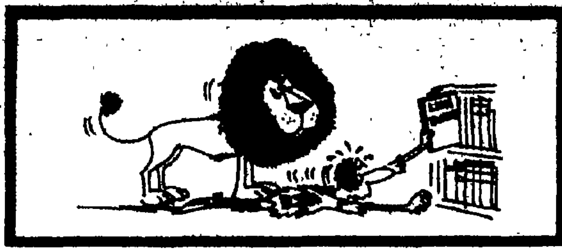
ارشد نے کہتے کہتے اس کے کاندھے پر اپنا سر رکھ دیا۔ زینت نے لپک کر اس کی پیشانی کو چوم لیا۔

اور پھر خود ہی شرم سے سرخ ہو گئی۔

وہ پرے ہٹ گئی۔

ناشتے کی میز پر ارشد نے زینت سے کہا:

"میں اس وقت ڈپٹی ظفر صاحب کی طرف جا رہا ہوں، رحمت کی نسبت کے متعلق باتیں کرنے۔ تم کھانے پر میرا انتظار نہ کرنا اور ہاں اپنی باجی سے کہہ دینا کہ وہ مٹھائی وغیرہ منگا کر رکھیں۔"



اسی وقت زینت کسی کام سے کمرے کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ اس کے کان میں جب ارشد کی یہ آواز گونجی تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے شبنم کے کسی قطرے نے کسی سوکھے پتے پر گر کر اسے تازگی بخشی ہو اور پھر زمین پر لڑھک کر روپوش ہو گیا ہو۔ اس کے افسردہ ہونٹوں پر نہ کوئی مسکراہٹ ابھری اور نہ اس کے جذبات کی پرسکون جھیل میں کوئی تلاطم ہی پیدا ہوا۔

تھوڑی دیر بعد ارشد چلا گیا۔

زینت نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا،

"بس! آپ جلدی سے خوش ہو جائیے باجی! جب وہ نکل کر گئے ہیں تو کوئی اچھا سودا کر کے ہی لوٹیں گے۔"

"خاموش رہو زینت، مجھے پریشان نہ کرو"

"اچھا تو گویا میں آپ کو پریشان کر رہی ہوں۔ لیکن آپ کو میری قسم سچ سچ بتائیے، یہ پریشانی کیسی لگ رہی ہے؟"

"مجھے زیادہ دق نہ کرو۔ پریشانی جیسی بھی ہو پریشانی ہے اور پھر تمہارا یہ مذاق میری گزشتہ زندگی پر ایک طنز ہے!"

"باجی! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟"

"زینت! جس راہ پر چل کر میں آ رہی ہوں، خدا کے لیے مجھے پلٹ کر دیکھنے پر مجبور نہ کرو۔ منع کر دو انہیں کہ میرے لیے وہ کچھ نہ کریں۔ میں صرف زندگی کی سخت دھوپ سے پریشان ہو کر تمہارے پیار کی چھاؤں میں سستانے بیٹھ گئی ہوں۔ میرے پاس خدا کی دی ہوئی ایک امانت ہے اسے میں نے ایمانداری کے ساتھ اس کے پاس پہنچانے کی قسم کھائی ہے۔ اگر تم مجھے زیادہ پریشان کرو گی تو میں اس امانت کو یہیں چھوڑ کر چلی جاؤں گی!"

"باجی خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کیجیے۔ لیکن آپ ہی ذرا سوچیے کہ زندگی کا اتنا لمبا سفر آپ اکیلی کیسے طے کر سکیں گی؟"

"انہیں کسی مرد کی ضرورت ہوتی ہے جنہیں تنہا نہیں چلنا ہے لیکن جس کی قسمت میں تنہا ہی چلنا ہے اسے کسی مرد کی ضرورت کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ سورج تنہا ہی ابھرتا ہے اور سارا دن اپنی آگ میں جلتے جلتے شام کو مر جاتا ہے۔ لیکن چاند کے ساتھ لاکھوں ستارے چلتے ہیں کیونکہ اسے ستاروں کی مدد کی ضرورت ہے۔ وہ اکیلا سفر کر ہی نہیں سکتا۔ میری زندگی بھی سورج کا ایک دہکتا ہوا گولہ ہے زینت! مجھے میری آگ کے سوا اور کچھ نہیں چاہیے اور نہ خود کسی کو میرے نزدیک آنا چاہیے۔ میں نے زندگی کے آسمان پر ابھرتے ہی سب سے پہلے اپنے قریب بیٹھی ہوئی ماں کو ختم کر دیا۔ اور پھر چڑھتے چڑھتے اپنے باپ کو جلا کر راکھ کر دیا اور ڈوبتے ڈوبتے شمشاد کو جھلس کر خاک کر دیا۔ میں خود اب ڈوب گئی۔ میری تو ساری دنیا تاریک ہو گئی ———!"

"لیکن باجی! چاند تو اب نکلنے والا ہے!"

"چاند نہ کہو زینت! آسمان کے چہرے پر سورج کی نحوست کا ایک گہرا داغ ہے جو کوڑھ کے داغ سے زیادہ کریہہ ہے۔ خدا کے لیے مجھے ان سب چیزوں کی یاد مت دلاؤ۔ مجھے ان سب چیزوں سے سخت نفرت ہو گئی ہے۔ جلتی راکھ کو بھلا شبنم کی خنکی کا کیا پتا البتہ شبنم کے قطرے آگ کے قریب آتے ہی بھاپ بن کر اڑ جاتے ہیں۔ میرے احساس پر بجلی گر پڑی ہے۔ میرے دل میں نفرت کی آگ دہک رہی ہے جہاں خوشیوں کی شبنم جل جائے گی زینت!"

اور دوپہر کے ٹھیک دو بجے جب ارشد باہر سے لوٹ کر آیا تو اس کے چہرے پر ناکامیاں رو رہی تھیں۔ وہ جب بھاری بھاری قدموں سے چل کر اپنے کمرے میں آیا تو زینت بھی پیچھے پیچھے آ گئی۔ اس نے آہستہ سے پٹ بند کیا اور اس کے الجھے ہوئے بالوں میں اپنی پتلی پتلی انگلیوں سے کنگھی کرنے لگی۔



"کیا کہا ڈپٹی صاحب سے؟"

"وہ تیار نہیں ہوئے۔ کہنے لگے کہ ابھی لڑکے کو تھیسس جمع کرنا ہے۔ ہم اس کے ڈاکٹریٹ کرنے کے بعد ہی بات چیت کریں گے۔"

کمرے میں ایک عجیب سا سناٹا چھا گیا تھا —— قبرستان کا سا سناٹا —— !

"لیکن زینت! میں رحمت کی شادی کر کے ہی دم لوں گا۔ اس کی زندگی کو برباد ہونے سے بچا لوں گا۔"

زینت خاموش تھی۔ اسے ارشد کے الفاظ ایسے ہی معلوم ہو رہے تھے جیسے کوئی اپنی محبوبہ کی موت کے وقت اس سے کہہ رہا ہو —— "میں بھی تمہارے لیے ایک تاج محل بنا کر رہوں گا۔"

"ارے ہاں خوب یاد آیا۔ ایک لڑکا اور ہے۔"

طوفان تھم گیا۔

"وہ کون ہے؟"

"تم اسے نہیں جانتی ہو۔ پوسٹ گریجویٹ ہے اور تقریباً پانچ سو روپے ماہوار کما رہا ہے۔ خوبصورت تو ایسا ہے کہ اگر اسے دیکھو تو مجھے پہچاننے سے انکار کر دو۔" ارشد نے مسکرا کر کہا۔

"مذاق نہ کیجئے۔ اب بتا بھی دیجئے۔ کون ہے کس کا لڑکا ہے؟"

"لیکن ٹھہرو۔ شاید اس کی شادی ہو چکی ہے!"

ارشد نے دماغ پر زور ڈالتے ہوئے کہا۔

"تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ ایک بیوی کے مرنے کے بعد دوسری اور اس کے بعد تیسری مرد کرتے ہی ہیں۔"

"یہی تو مشکل ہے زینت کہ اس کی بیوی زندہ ہے اور اسے وہ بے انتہا چاہتا بھی ہے۔"

"اچھا تو پھر عجیب آدمی ہے وہ!"

"ہاں! ہے تو عجیب ضرور، لیکن وہ کہتا ہے کہ اسلام نے تو چار شادیوں کی اجازت دے رکھی ہے۔ اس لیے اگر وہ دوسری شادی کرتا ہے تو کوئی گناہ نہیں کرتا۔"

"نہیں میں ایسی جگہ رحمت باجی کی شادی نہیں ہونے دوں گی۔ میں نہیں چاہتی کہ کسی کی زندگی کے آنگن میں جہاں پیار کی چاندنی بکھری ہو، وہاں سورج کی جلتی ہوئی کوئی کرن پہنچے۔"

"لیکن زینت! رحمت تمہاری عزیز سہیلی ہی نہیں، بڑی بہن بھی ہیں۔ کیا تم دونوں ایک ساتھ رہ کر ہمیشہ خوشی کی زندگی نہیں گزار سکتی ہو؟"

"کیا کہا —— ؟؟"

زینت ایک دم چیخ اٹھی۔ جیسے وہ کسی برقی تار سے ٹکرا گئی ہو اس کے دماغ میں تیز تیز آندھیاں چلنے لگیں۔

وہ بوکھلا گئی جیسے کوئی بجلی گرنے والی ہو، جیسے سورج کا گولا چاندنی میں اترنے والا ہو۔

وہ رونے لگی، پھوٹ پھوٹ کر ایک بچے کی طرح!

تھوڑی دیر بعد ارشد نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر اوپر اٹھائی تو زینت نے کہا:

"کاش میرے چہرے کو اوپر اٹھانے کی بجائے آپ میرے دل کی گہرائی میں جھانک کر دیکھتے۔"

"میری زینو! میں نے سب کچھ دیکھ لیا۔ تم تو میرے پیار کی چاندنی ہو!!"

زینت نے ارشد کو التجا بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا

"ایسے میں کہیں سورج نکل آئے تو؟"

"نہیں زینت ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ چاند اور سورج بھی کہیں ساتھ نکلتے ہیں؟"

ارشد نے کہا!

اور پیار سے زینت کی پیشانی چوم لی۔



دیارِ غیر میں مقیم قارئین کے لئے

خوشخبری

آپ دنیا کے کسی حصے میں مقیم ہوں

دوشیزہ

اور دیگر رسائل

آپ کو بہ آسانی اور پابندی سے ملتے رہیں گے۔

کویت	۱۳,۵	امریکن ڈالرز	ایران	۱۳,۵	امریکن ڈالرز
سعودی عرب	۱۳,۵	"	سری لنکا	۱۳,۵	"
یو اے ای	۱۲,۵	"	جاپان	۱۷,۰۰	"
مصر	۱۴,۰۰	"	لیبیا	۱۹,۰۰	"
یونان	۱۷,۰۰	"	ڈین مارک	۱۷,۰۰	"
فرانس	۱۷,۰۰	"	جرمنی	۱۷,۰۰	"
برطانیہ	۱۷,۰۰	"	ہالینڈ	۱۷,۰۰	"
ناروے	۱۷,۰۰	"	پولینڈ	۱۷,۰۰	"

امریکہ اور اس کے جزیرے ۲۸,۰۰ ڈالرز

آپ صرف مطلوبہ رسالے کا نام اور بینک ڈرافٹ مندرجہ ذیل پتے پر روانہ فرمائیں۔ آپ کے نام ایک سال تک آپ کا پسندیدہ رسالہ جاری کر دیا جائیگا۔

ایسٹرن ایکسپورٹ ٹریڈرز

بُرے پھنسے

میں آسانی سے کسی دوست کی مصیبت میں پھنسنے والا آدمی نہیں ہوں لیکن ایک دفعہ یہ ہوا کہ میرے دوست موتی رام نے مجھے چائے پر مدعو کر رکھا تھا اور چونکہ اسی روز شام کو کچھ مہمانوں نے میرے یہاں آنے کی دھمکی دی تھی اس لئے میں نے موتی رام کی چائے کی دعوت جھٹ سے منظور کر لی اور اس کے گھر چائے پینے کے لئے چلا گیا۔ وہاں جا کر ایک عجیب ماجرا دیکھا۔ مسٹر اور مسز رام دونوں باہر جانے کے لئے کپڑے پہنے ہوئے عجیب گھبراہٹ اور پریشانی کے عالم میں کھڑے تھے اور ان کے چھ بچے ان کے آس پاس حیرت سے دم بخود ان کی طرف دیکھ رہے تھے اور چائے کا کہیں دور دور تک پتہ نہیں تھا۔

"کیا بات ہے موتی رام؟" میں نے پوچھا۔

"کیا بتاؤں دوست؟" موتی رام بھرائی ہوئی آواز میں بولا "میرے ایک قریبی رشتے دار کا انتقال ہو گیا ہے بے چارہ کولابے میں رہتا ہے جو یہاں سے پندرہ میل دور ہے۔"

میں نے کہا "اب کولابے میں رہنے والوں نے ہمیشہ زندہ رہنے کا پٹہ تو لکھوا نہیں رکھا موت وہاں بھی آسکتی ہے اور یہاں سے بیس میل دور بھی۔ رہا رشتے دار کے مرنے کا افسوس تو وہ برحق ہے رشتے دار مرتے ہی رہتے ہیں اور ان کی جگہ نئے رشتے دار پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اب اس شہر بمبئی کو ہی لے لو سنتا ہے یہاں ہر روز بیس ہزار آدمی مرتے ہیں اور ان کی جگہ لینے کے لئے پچیس ہزار آدمی ہر روز ریل گاڑیوں میں بھر کر باہر سے آجاتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کس کس کے آنے کا ماتم کیا جائے کس کس کے جانے کا افسوس ____"

"افسوس تو اس بات کا نہیں ہے" مسز موتی رام آنکھوں میں آنسو بھر کر بولیں "کہ ان کا رشتہ دار مر گیا ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ میں اپنے ہاتھ سے آپ کو چائے نہیں پلا سکوں گی۔"

"کوئی بات نہیں بھابی جی۔" میں نے مسز موتی رام کے گلے میں پڑے ہوئے سونے کے گلوبند کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا "میں کل آجاؤں گا چائے پینے کے لئے۔"

اتنا کہہ کر میں کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ فوراً موتی رام نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے روکا۔ وہ میری طرف ملتجیانہ نظروں سے دیکھ کر بولا ____ "دوست! میں اس وقت ایک عجیب مصیبت میں پھنس گیا ہوں چھ بچوں کا ساتھ ہے۔ ساتواں پنگھوڑے میں سو رہا ہے اور مرنے میں اپنے ساتھ میں چھ بچوں کو نہیں لے جا سکتا اور مرنے میں جانا بھی ضروری ہے تم اس وقت میری مدد کرو۔ صرف تین گھنٹے ہماری خاطر اس گھر میں ٹھہر کر ہمارے بچوں کی دیکھ بھال کر دو تو تمہاری بڑی مہربانی ہوگی۔ اس وقت پانچ بجے ہیں۔ ہم آٹھ بجے تک ضرور آجائیں گے۔"

مسز موتی رام نے مجھے سوچنے کا موقع نہیں دیا، جلدی سے بولیں "چائے تم خود بنا کے پی لینا کچن میں سب کچھ رکھا ہے۔ فرج میں انڈے بھی ہیں، اور توس بھی ہیں کچھ کھانے کا سامان بھی ہے مٹھائی بھی ہے۔"

میں نے سوچا، آٹھ بجے تک تو میرے مہمان بھی میرے گھر پر میرا انتظار ضرور ہی کریں گے۔ چلو ادھر چائے کی بچت ہو جائے گی اور مفت میں چائے، مٹھائی، فروٹ سے اپنی تواضع رہے گی۔ تین گھنٹے یہاں آرام سے گزار لیں گے۔ اس میں مصیبت ہی کیا ہے پیارے؟ کبھی کسی دوست کے کام بھی آنا چاہیے۔

چنانچہ میں نے ہاں کر دی اور وہ لوگ میرا شکریہ ادا کر کے اپنا گھر اور اپنے بچے میرے سپرد کر کے جلدی سے رخصت ہو گئے۔

ان کے جانے کے فوراً بعد میں نے گھر کی سب سے بڑی لڑکی کیشی (جس کی عمر دس سال کی تھی) سے کہا۔

"کیشی چائے تو پلاؤ۔"

"ابھی لاتی ہوں انکل۔" وہ مستعدی سے بولی اور دوڑی دوڑی کچن میں گئی۔ دوڑی دوڑی واپس آئی اور کہنے لگی "نعمت خانے میں تو

تالا پڑا ہے۔ معلوم ہوتا ہے جاتے ہوئے ممی غلطی سے تالا لگا گئیں۔
نعمت خانے میں ہی چائے دودھ سب بند ہے۔"

"تو فرج میں دیکھو۔"

"فرج بھی بند کر گئی ہیں!"

بڑا لڑکا ننھو جس کی اصلی عمر آٹھ سال ہے اور جو بارہ سال کا معلوم ہوتا ہے اور بڑے تندرست ہاتھ پاؤں کا ہے۔ بڑے زور سے میرے کندھے پر ہاتھ مار کر بولا "یہ تو ممی کی پرانی عادت ہے باہر جاتے سے ہمیشہ نعمت خانہ بند کر جاتی ہیں۔ مگر آپ فکر نہ کریں انکل۔ آپ کو چائے ضرور پلوائی جائے گی آپ آرام سے اس صوفے پر بیٹھیں۔ کوٹ اتار کر مجھے دے دیجئے، میں اسے اندر کی الماری میں لٹکا دیتا ہوں، پنکھا کھولے دیتا ہوں گرمی کا موسم ہے، ٹائی کھول کر آرام سے بیٹھئے ابھی چائے تیار ہو جاتی ہے۔"

میں نے ٹائی ڈھیلی کی۔ کوٹ اتار کر ننھو کو دے دیا۔ جوتے اتار کر پپو کو دیئے، چھڑی تنو کے ہاتھ میں تھما دی۔ ٹوپی ببلو کے حوالے کی اور خود چار سال کی مینا کو گود میں لے کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں ننھو چائے کا سامان بازار سے لے آیا۔ کیشی نے چائے بنائی اور بڑے سلیقے سے مجھے پیش کی، چائے اور مٹھائی، کیک اور سموسے اور نمک پارے بھی، سب ہی کچھ تھا۔ ایک بات ہے، موتی رام کے بچے بڑے ہونہار اور سلیقے والے ہیں، بہت جی خوش ہوا۔

چائے کے بعد کچھ وقت آرام سے گزرا، پھر مینا نے میری گود میں بیٹھے بیٹھے مجھ سے ایک کہانی سنی۔ ننھو نے حساب کے چند سوال مجھ سے حل کرائے۔ اتنے میں اندر کے کمرے سے منے کے رونے کی آواز آئی۔ غالباً منا جو پنگوڑے میں پڑا سو رہا تھا۔ اور ابھی صرف ایک سال کا تھا جاگ گیا تھا۔ کیشی اسے وہاں سے لے آئی اور خود کچن میں منے کے لئے دودھ گرم کرنے گئی۔ منا رونے لگا تو ببلو نے اسے جلدی سے میرے ہیٹ پر بٹھا دیا اور بولا "دیکھئے انکل منا آپ کے ہیٹ میں بیٹھا ہوا کتنا اچھا لگ رہا ہے۔" سب بچے منا کو دیکھ دیکھ کر ہنس رہے تھے منا بھی انہیں دیکھ کر ہنسنے لگا۔ اسے وہ ہیٹ جس میں وہ بیٹھا ہوا تھا بہت پسند آیا۔ تھوڑی دیر تک وہ اس کے کونے پکڑ کر کھیلتا رہا، پھر وہ اسے کموڈ کی طرح استعمال کرنے لگا۔ کیشی دوڑی دوڑی آئی اور منا کو ہیٹ سمیت اٹھا کر غسل خانے میں لے گئی۔ تھوڑی دیر بعد منا کو تو وہ نہلا دھلا کر باہر لے آئی مگر میرا ہیٹ وہیں چھوڑ آئی۔ تھوڑی دیر بعد ساتھ کے کمرے سے ببلو اور پپو کے جھگڑنے کی آواز آئی۔ میں بھاگ کر گیا کہ دیکھوں ماجرا کیا



ہے؟ دیکھا تو دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھے۔ ببلو پپو سے کہہ رہا تھا "نکال چونی! نکال چونی! نہیں تو گلا گھونٹ دوں گا!"

میں نے بڑی مشکل سے دونوں کو الگ کیا اور ببلو سے پوچھا "کاہے کی چونی بیٹا؟ کاہے کی چونی مانگ رہا ہے؟"

ببلو روتے روتے بولا "پپو نے مجھ سے شرط لگائی تھی کہ یہ انکل کا بوٹ ہے، اس کا سینڈل نہیں بن سکتا۔ میں نے کہا بن سکتا ہے وہ بولا۔ بن سکتا ہے تو بنا کے دکھا میں تجھے چونی دوں گا۔ میں نے بنا کے دکھا دیا۔ اب وہ چونی نہیں دیتا۔ تم ہی دیکھو انکل سینڈل بنا ہے کہ نہیں؟" اس نے مجھے میرا بوٹ دکھایا۔ میں نے گھبرا کر دیکھا ببلو نے غالباً کسی بلیڈ یا قینچی سے میرے جوتے کی ٹو کو کاٹ دیا تھا۔ ایڑی کے اوپر کا چمڑا بھی تراش ڈالا تھا۔ بے چارے نے بڑی محنت سے میرے بوٹ کا سینڈل بنایا تھا اور اس پر پپو کی نالائقی دیکھئے کہ اسے چونی تک نہیں دے رہا تھا۔

خون میری رگوں میں جمنے لگا تھا۔ خوف اور غصے سے میرے

ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگے تھے کہ اتنے میں تنشی مسکراتی ہوئی میرے پاس آئی، بولی "انکل میں نے آپ کا ہیٹ دھو کر پریس کر دیا تھا" اتنا کہہ کر اس نے کوئی چیز میرے ہاتھ پر لا کر رکھ دی۔ یہ میرا فیلٹ ہیٹ تھا جو اب کاغذی کیپ بن چکا تھا۔ میں اس کی تہیں کھول کر اسے غور سے دیکھنے ہی والا تھا کہ زور کی چیخ مار کر ٹلو نے میرے ہاتھ سے ہیٹ چھین لیا اور اسے میری چھڑی کی نوک پر رکھ کر گھمانے لگا۔ سب بچے خوشی سے تالیاں بجانے لگے۔ مینا خوشی سے قہقہے لگاتی ہوئی بولی "سرکس کا جادوگر۔" اتنے میں ببلو میاں میرا کوٹ لے کر میرے پاس آ گئے "سرکس کا کھیل ہوگا اب!" "خیر سے سرکس ہی سہی ———" میرا دل بیٹھنے لگا۔

"آپ جوکر ہیں!"

"بلاشبہ میں جوکر ہوں۔"

مینا میری گود میں بیٹھے بیٹھے تالی بجا کر بولی "آہا انکل جوکر! انکل جوکر!"

بنٹو بولا "اب جوکر بنتا ہے تو ٹھیک طرح میک اپ کرو انکل!"

"کس طرح کروں میک اپ!" میں نے لرز کر پوچھا۔

ٹلو بولا "میں انکل کو جوکر بناتا ہوں۔"

ٹلو گھر کے اندر کے کسی کونے سے ایک پرانا غبارہ لایا۔ اس کا ایک حصہ پھاڑ کر اس نے میری ناک کی نوک سے باندھ دیا۔ ببلو نے اپنے پینٹ باکس میں سے لال رنگ کی روشنائی نکال کر میرے رخسار لال کئے۔ بنٹو نے میرے ہونٹ کالے کئے۔ اب میں جوکر تھا اور بچے میرے چاروں طرف خوشی سے ناچ کود رہے تھے۔ بنٹو نے میری ٹانگوں کے درمیان میری چھڑی رکھ دی اور سب بچے ایک دم ہلّا بول کر اس پر سوار ہو گئے۔ چھڑی چرچرا کے ٹوٹ گئی اور میں بچوں سمیت فرش پر گر پڑا۔ ابھی گھٹنوں کے بل تھا ہی کہ منی نے تالی بجائی "گھوڑا! گھوڑا!" اور اچک کر مجھ پر سوار ہو گئی۔ اس کے سوار ہونے کی دیر تھی کہ ٹلو نے بھی ایک چھلانگ لگائی اور میری گردن پر آ بیٹھا۔ پھر بنٹو اور ببلو بھی ایک دیوار سے جست لگا کر میری پیٹھ پر سوار ہو گئے۔ اتنے زور کا حملہ تھا کہ گھوڑا بیچ میں سے بچک گیا اور فرش پر گر پڑا۔ پھر دو تین گھونسے دھکے لگنے لگے۔ وہ چیخم دھاڑ مچی کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد جب بچے الگ ہوئے تو میں نے اپنا جائزہ لیا چہرہ بھوتوں کا سا، بال نچے کھسٹے، قمیض اور پتلون تار تار، کوٹ دھجیاں دھجیاں، چہرے پر ان گنت خراشیں۔ باقی بدن کا کیا حال تھا یہ تو ایکسرے کروانے کے بعد ہی پتہ چلے گا۔

گھڑی کا فیتہ الگ ہو کر ایک طرف کو لٹک رہا تھا۔ میں نے اسے دوبارہ کلائی پر باندھنے کی کوشش کرتے ہوئے وقت دیکھا۔ ساڑھے نو بج چکے تھے اور ابھی تک وہ لوگ نہیں آئے تھے حالانکہ آٹھ بجے تک آنے کو کہہ گئے تھے۔ بہرحال اب میں زیادہ دیر نہیں رک سکتا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ ایک پاؤں میں بوٹ، دوسرے میں سینڈل اور ہاتھ میں ٹوٹی ہوئی چھڑی لے کر اٹھنے ہی والا تھا کہ دروازے پر گھنٹی بجی۔ بیٹی نے بھاگ کر دروازہ کھولا۔ مسٹر اور مسز موتی رام تھے۔ آتے ہی مجھے دیکھ کر خوشی سے کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔

"تو آپ بھی بچوں میں بچے بن گئے۔ واہ کیا جوکروں کی سی صورت بنا رکھی ہے آپ نے۔" مسز موتی رام چہکیں۔

غصہ تو مجھے بہت آ رہا تھا، مگر کسی طرح پی گیا۔ اپنی کپکپاتی ہوئی آواز کو دباتے ہوئے دھیرے سے بولا "آپ لوگ بڑی سویرے آئے۔"

"نہیں بھائی صاحب۔" مسز موتی رام بولیں "جن کے ہاں ہم لوگ پرسہ دینے گئے تھے وہ لوگ تو ملے ہی نہیں، اس لئے ہم لوگ پکچر دیکھنے چلے گئے۔"

"پکچر دیکھنے چلے گئے!" میں نے دل ہی دل میں دانت پیس کر کہا۔ "اور یہاں یہ گت بن گئی۔" میں نے جلدی سے اجازت چاہی تو بنٹو میرے قریب آ کر بولا "انکل یہ لیجئے سات آنے۔"

"سات آنے! کاہے کے سات آنے بیٹا؟"

"چائے کا سامان نہیں آیا تھا نا؟" بنٹو بولا "ممی نعمت خانہ بند کر گئی تھیں۔ میں آپ کے کوٹ کی جیب سے دس روپے نکال کر لے گیا تھا اس میں سے سات آنے بچے۔ یہ لیجئے۔"

مسز موتی رام خوش ہو کر بولیں "میرا بیٹا بنٹو حساب کا بڑا کھرا ہے۔ کبھی ایک پائی ادھر سے ادھر نہیں کرتا۔ لے لیجئے نا! آپ ہی کے پیسے ہیں۔"

میں غصے سے تھر تھر کانپنے لگا۔ میرا خون ابلنے لگا تھا۔ اس وقت اگر میں ایک آتش فشاں پہاڑ ہوتا تو فوراً پھٹ پڑتا، مگر میں تو ایک مجبور انسان ہوں۔ میں نے سر جھکا لیا اور کچھ کہے بغیر فوراً ان کے گھر سے نکل گیا۔

اس دن سے میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ آئندہ کبھی کسی دوست کی مصیبت کے وقت مدد نہیں کروں گا۔ مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں؟ جب تک اس دنیا میں ہم ہوں گے اور دوست بھی ہوں گے تو مصیبتیں تو آتی ہی رہیں گی، اور ہماری آپ کی طرح کے لوگ ان میں پھنستے ہی رہیں گے۔

قسط نمبر (۱۴)

"دوشیزہ" کا انعام یافتہ
رومانی گھریلو ناول

جلتے پھول

عظمت عزمی

تارا اپنے والدین کی چوتھی بیٹی تھی۔ اس کی ماں لڑکے کی آرزو میں بیٹیوں کو جنم دے دے کر تھک چکی تھی۔ تارا کی پیدائش سے پہلے وہ یہ آس لگائے بیٹھی تھی کہ اس بار ضرور لڑکا ہوگا۔ تارا پیدا ہوئی تو ان پر دورے پڑنے لگے اور انھوں نے اسے منحوس قرار دے کر اپنے پیار سے محروم کر دیا۔ تارا ماں کی محبت کی ایک نظر کے لیے ترستی ہوئی بڑی ہوگئی۔ باپ بیوی کے اس سلوک سے جو وہ تارا سے کرتی تھی دکھ محسوس کرتا تھا۔ اس نے بیٹی کی محرومی مٹانے کے لیے اس کی ہر خواہش پوری کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ تارا حساس تھی۔ حسن اور ذہانت دونوں سے قدرت نے نوازا تھا۔ اس کے پاپا نے اسے پڑھانے کا بیڑا اٹھایا۔ ماں یہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی دوسری بیٹیوں کے مقابلے میں تارا زیادہ تعلیم حاصل کرے لیکن اس کی ہو گئی شوہر کی ضد کے آگے دم توڑ گئی۔ تارا نے اپنے اسکول کی ایک شفیق ٹیچر مس معراج میں ماں کا پیار تلاش کیا۔ لڑکیوں نے ان کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کر دیں۔ مس معراج نے سرد مہری کا رویہ اختیار کر لیا۔ تارا کا ننھا سا دل ٹوٹ گیا۔ اسے کسی کے پیار پر بھروسہ نہیں رہا۔ اس نے خودکشی کی ناکام کوشش کی۔ غلط فہمی دور ہو جانے کے بعد مس معراج اس کی عیادت اور معافی مانگنے آئیں مگر اب تارا بدل چکی تھی۔ اس نے صرف تعلیم کو اپنی منزل بنا لیا تھا۔ اس نے محنت سے پڑھائی جاری رکھی۔ اپنے پاپا کی حوصلہ افزائی سے وہ کامیابی کی منزلیں طے کرتی گئی۔ اس کی دو بہنوں کی شادی طے ہو گئی۔ تارا کے لیے بھی ایک ڈاکٹر کا رشتہ آیا جو اس کی ماں کے نزدیک نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھا۔ وہ اس کی شادی کے لیے اڑ گئی لیکن تارا ڈاکٹر بننا چاہتی تھی اور پاپا اس کے حامی تھے۔ اسی بات پر گھر میں میاں بیوی کا جھگڑا رہنے لگا۔ ماں میٹرک کے بعد اس کی شادی کرنا چاہتی تھی مگر پاپا اسے داخلہ دلانے پر مُصر تھے۔ میٹرک فرسٹ ڈویژن کرنے کے بعد تارا کو اس کے پاپا اپنی بیوی سے چھپ کر اپنے ایک دوست ارباب صاحب کی مدد سے کالج میں داخلہ دلانے ان کے گھر گئے۔ جہاں ارباب صاحب کے صاحبزادے ایاز نے انھیں قائل کر لیا کہ تارا کو ڈاکٹری کی تعلیم دلانے کے لیے ضروری ہے کہ اسے لڑکوں کے کالج میں داخلہ دلایا جائے تاکہ اس کے اندر خود اعتمادی پیدا ہو جائے۔ اس کے پاپا پہلے راضی نہ ہوتے لیکن ارباب صاحب اور ایاز نے انھیں دنیا کے نشیب و فراز سمجھا کر اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ تارا کو ایاز کے کالج میں داخل کر دیں۔

تارا کالج میں داخل ہو گئی۔ وہ یہاں سہمی سہمی سی رہتی جیسے کالج کے دوسرے طالب علموں نواز احمد اور رفیق نے خاص طور پر محسوس کیا۔ یہ دونوں لڑکے اپنے اپنے طور پر تارا میں دلچسپی لینے لگے۔ ایاز بھی تارا کو متوجہ کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہا تھا لیکن تارا نے اسے مایوس کر دیا۔ کالج میں پکنک کے دوران نواز احمد نے تارا کی مدد کی جس سے تارا کے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ ہو گیا۔ اُدھر گھر میں تارا کی امی اس کے لیے ڈاکٹر کے رشتے کے بارے میں سنجیدہ ہو گئی تھی۔ تارا کے ابو نے انہیں ڈانٹ کر اور مشتعل کر دیا تھا۔ اسی دوران اس کے ابو بیمار پڑ گئے۔ تارا نے پیپر کی تیاری کے سلسلے میں نواز احمد سے ایک کتاب لی تھی۔ باپ کی بیماری کے دوران وہ کالج نہ جا سکی۔ اور رفیق بہانہ کر کے وہ کتاب لینے اس کے گھر آ پہنچا۔

دوسرے دن تارا کالج گئی تو اس کا منہ پھولا ہوا تھا۔ نواز معاملہ سمجھ گیا۔ وہ تارہ کی معصومیت سے پوری طرح گھائل ہو چکا تھا وہ چاہتا تھا کہ اس لڑکی میں خود اعتمادی پیدا ہو جائے۔ کتاب والے واقعے سے تارا بے حد خفا تھی۔ رفیق اپنی اس حرکت پر پشیمان تھا۔ تارہ اسے نظر انداز کرتی ہوئی چھٹی کے بعد کالج سے نکلی تو راستے میں نواز مل گیا۔ تارا نے راستہ بدلنا چاہا مگر نواز کی مقناطیسی شخصیت اس پر اثر انداز ہو چکی تھی۔ اس کی ایک آواز پر تارہ کے قدم رُک گئے۔ اور وہ اس کے حکم پر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ نواز گاڑی بہت دور لے گیا جس سے تارہ سہم کر رہ گئی۔ در حقیقت نواز اس کے دل سے بے جا خوف ختم کر کے اعتماد پیدا کرنا چاہتا تھا۔ جو کچھ دیر بعد اس کی محبت اور نرمی کے برتاؤ سے تارہ میں جاگ گیا۔ اور جب تارہ اس سے مل کر آتی تو وہ خاصی بدلی ہوئی لڑکی تھی۔ جس نے ماں کے غصے کی بھی پروا نہیں کی۔ اس کے پاپا کو ڈاکٹر نے کینسر بتایا جس سے وہ بہت پریشان ہو گئی۔

وہ کالج جا کر وقتی طور پر اپنی پریشانی بھول گئی۔ تارہ کی امی نے غصے میں اس کے گال پر گرم چمٹا رکھ دیا تھا جس کی جلن کالج آنے کے بعد بڑھ گئی۔ نواز نے موقع پا کر اسے رومال کی ٹیوب لا کر دی۔ اور وہ چاہت بھری باتیں کیں اور اس کی ساری جلن جاتی رہی۔ نواز نے اس کے اندر جینے کا حوصلہ پیدا کر دیا تھا۔ کچھ عرصے بعد اس کی دو بڑی بہنوں عائشہ اور چاندنی کی شادیاں ہو گئیں۔ تارا نے زندگی میں پہلی بار سنگھار کیا۔ دیکھنے والوں کی نظریں چکا چوند ہو گئیں۔ خوشیوں کے یہ دن بھی گزر گئے۔ تارا کے پاپا کی بیماری بڑھ گئی۔ نواز نے تسلیوں سے اسے پریشان نہ ہونے دیا۔ لیکن وہ منحوس وقت بھی جلد آ گیا۔ تارا کے پاپا نے دنیا سے منہ موڑ لیا۔ تارا ذہنی طور پر اس صدمے کے لیے تیار نہیں تھی۔ وہ بیہوش ہو گئی۔ نواز جس نے اسے زندگی بھر کا رفیق بنانے کی قسم کھائی تھی اس کی حالت دیکھ کر اندر ہی اندر رو پڑا۔ جنازے اور سوئم میں اس کے گھر آتا رہا۔ تارا سچ مچ نیم دیوانی سی ہو گئی تھی۔ اب چچا نے سب کو سمجھا دیا تھا کہ اس کی دلجوئی کرتے رہیں ورنہ یہ پاگل ہو جائے گی۔ چاندنی اور عائشہ کچھ دن رہ کر اپنے اپنے گھر چلی گئیں۔ اب اس گھر میں تارا، ساجدہ اور امی رہ گئی تھیں۔

تارا نے کالج جانا شروع کر دیا۔ رضیہ بی نے ہزار کوشش کی کہ تارا گھر سے نہ نکلے۔ لیکن باپ کے مرنے کے بعد وہ ماں سے اور دور ہو گئی تھی۔ وہ نہ صرف کالج گئی بلکہ نواز سے بھی ملی۔ پیاسی تارا نے نواز کے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائیں۔ اور اُدھر چوری چوری رضیہ بی نے ڈاکٹر احسن سے اس کا رشتہ پکا کرنے کی تیاریاں مکمل کر لیں۔ تارا سے عائشہ نے اس کی رائے پوچھی تو اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ نواز کے علاوہ کسی اور کو شریک حیات بنانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ اگر کسی نے زبردستی کی تو وہ گھر کی روایتوں کو توڑنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ تب رضیہ بی نے پہلی دفعہ اسے گلے لگا کر اس کی آرزو پوری کرنے کا وعدہ کیا۔ اور پھر تارا کی شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ رضیہ بی نے بتایا تھا کہ نواز کے گھر سے پیغام آیا تھا جسے منظور کر لیا گیا ہے۔ تارا خوشی سے دیوانی ہو گئی۔ تارا نے اس دوران ایک بھیانک سپنا دیکھا۔ وہ چیخ کر اٹھ بیٹھی۔

اس نے خواب میں دیکھا تھا کہ اس کے مرحوم پاپا کے سفید بال گلیوں میں اڑتے پھر رہے ہیں۔ رضیہ بی نے خواب سن کر تعبیر یہ بتائی کہ تمہاری وجہ سے تمہارے باپ کی رسوائی کا خطرہ ہے۔ تمہیں ہر قربانی دے کر اپنے مرحوم باپ کی لاج رکھنی ہے۔ اور رضیہ بی کے ان لفظوں کا بھرم اس وقت کھلا جب نکاح کے وقت نواز کی جگہ ڈاکٹر احسن کا نام لیا گیا۔ تارا کو سکتہ سا ہو گیا۔ وہ دلہن بنی نواز کے سپنوں میں گم تھی کہ نکاح خواں نے ڈاکٹر احسن کے نام سے اس کی رضا مانگی۔ رضیہ بی نے مرحوم باپ کی عزت کا واسطہ دے کر اسے ہاں کہنے پر مجبور کر دیا۔ وہ صدمے سے بے ہوش ہو گئی اور اسی نیم بے ہوشی میں اس کی رخصتی ہو گئی۔ ڈاکٹر احسن اپنی بے ہوش دلہن کو حجلۂ عروسی میں لے آیا۔ تارا کو ہوش آیا تو ڈاکٹر احسن اس پر جھکا ہوا تھا۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ ڈاکٹر احسن اب تک اس کی بے ہوشی کی وجہ اس کے پاپا کے انتقال کا صدمہ سمجھ رہا تھا۔ مگر تارا نے اس کا ہاتھ جھٹک کر صاف کہہ دیا کہ اس کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے۔ اس کی ماں نے دھوکہ دے کر یہ شادی کی ہے۔ ڈاکٹر احسن ہکا بکا رہ گیا۔

تارا کی صاف گوئی نے اس کے ارمان خاک میں ملا دیے تھے۔ اس نے ٹھنڈے دل سے اس کے جذبات کا تجزیہ کیا اور اس سے وعدہ کر لیا کہ وہ اس کے راستے سے ہٹ جائے گا۔ مگر ابھی کچھ دنوں اسے اس رشتے سے سمجھوتا کرنا پڑے گا۔ اس کا سلوک بے تکلف تعلقات کے اعتبار سے دوستوں جیسا رہے گا۔ اور اس طرح سہاگ رات کسی خوشی کے بغیر بیت گئی۔ تارا کی امی نے ڈاکٹر سے روزانہ ملنا شروع کر دیا۔ تارا نے اپنی زندگی کی بربادی کا شکوہ کیا تو امی نے بتایا کہ سب کچھ انھوں نے اس کی بہتری کے لیے کیا ہے۔ تارا چپ ہو گئی۔ اسی دوران اس کا ایف اے کا رزلٹ آ گیا۔ اور اس کے کچھ دیر بعد نواز بھی ملاقات کو آیا۔



لوٹ آیا۔ احسن وقار کے رشتے سے اس کو کچھ اتفاق تھا شادی میں نواز شریک نہیں ہو سکا تھا اسے معلوم نہیں تھا کہ تارا احسن کی دلہن بنائی گئی ہے۔ وہ شرارت کے طور پر اپنا تعارف کرانے کے لیے ایک پستول لے کر دلہن کے کمرے میں جا پہنچا۔ سامنے تارا کو دیکھ کر وہ ہکا بکا رہ گیا۔ تارا اسے دیکھ کر گھبرا گئی۔ شکل پہ یاس و حسرت نہ رہ سکا اور بجھے دل سے خاموشی سے باہر نکل آیا۔ تب اس کے والدین، نئے داماد کے کمرے میں آ گئے۔ تارا اس شکل سے بڑی طرح گھبرا گئی تھی۔ وہ سب اسے دہشت زدہ دیکھ کر گھبرا گئے۔

تارا نے انہیں بہلا دیا۔ اب تارا کسی نہ کسی انداز سے نواز کی غلط فہمی دور کرنا چاہتی تھی۔ وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ اس کی شادی بالا دستی ہوئی ہے۔ نواز بہت دنوں بعد احسن کے بلانے پر آیا لیکن ہکا بکا اور اُجڑا اُجڑا۔ تارا اسے دیکھ کر اور پریشان ہو گئی۔ اسے مسلسل اداس اور پریشان دیکھ کر ڈاکٹر احسن نے مشورہ دیا کہ وہ کالج میں داخلہ لے لے۔ مگر وہ راضی نہ ہوئی۔ وہ تمام دن یونہی شکستہ بستر پر پڑی رہتی۔ نواز نے آنا بند کر دیا تھا۔ ایک دن ڈاکٹر احسن نے اسے زبردستی پکچر دکھانے پر آمادہ کیا۔ وہ نواز کو ٹکٹ لینے بھیج آئے۔ دونوں نواز کو لینے اس کے گھر پہنچے وہ بیماری سے اٹھا تھا۔ اسے کمزور دیکھ کر تارا تڑپ اٹھی۔ وہ بڑی مشکل سے ان کے ساتھ فلم دیکھنے پر راضی ہوا۔ سینما ہال میں ایک ساتھ بیٹھے تو ماضی کا رشتہ پھر جاگ اٹھا۔ اس نے تارا کا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔ تارا کی آنکھیں برس پڑیں اور وہ چپکے سے ہال سے نکل گیا۔

نواز نے وہ رات اپنے رشتے داروں کے گھر گزاری۔ اس کا ضمیر بے چین تھا کہ اس نے احسن چچا کی بیوی کے ہاتھوں کو کیوں چھوا۔ دل ہی دل میں شرمندہ ہوا اور طویل سوچ بچار کے بعد اس نے فیصلہ کر لیا کہ تارا سے قطع تعلق کر لے۔ دوسرے روز وہ ان کے یہاں گیا اور زیادہ وقت ماحت کے ساتھ ہنس کر گزارا۔ تارا نے بات کرنا چاہی تو وہ کج ادائی سے پیش آیا۔ تارا کا دل بڑی طرح سے ٹوٹ گیا۔ اِدھر ڈاکٹر احسن کو اس کے دوست نے مشورہ دیا کہ تم تارا سے ازدواجی تعلقات قائم کر لو۔ وہ تمہاری بیوی ہے کوئی غیر نہیں۔ ہمت افزائی پا کر احسن نے اس رات تارا کو اپنی باہوں میں بھر لیا۔ تارا نواز کے رویہ سے ٹوٹ کر بکھر چکی تھی۔ وہ احسن کی پیش قدمی کو نہ سمجھ سکی۔ مگر جب احسن کے ہاتھ اس کے جسم پر رینگنے لگے تو وہ چونک اٹھی۔ اور نفرت سے بپھر کر اس کے بازو میں کاٹ لیا۔

ڈاکٹر احسن اپنی بیوی سے حقِ زوجیت وصول کرنے کے بعد لمبی تان کر سو گئے۔ لیکن تارا کا پورا وجود ان کے خلاف انتقام کا شعلہ بن گیا۔ اس نے اپنے جسم پر ان کا حق تسلیم نہیں کیا۔ اس کا رویہ پہلے سے زیادہ تند اور سخت ہو گیا۔ ڈاکٹر احسن کا ذہنی سکون تباہ ہونے لگا تو تنگ آ کر ایک دن وہ اسے اس کے میکے چھوڑ آئے۔ ان کا خیال تھا کہ اس ایک جھٹکے سے تارا کا دماغ درست ہو جائے گا لیکن تارا کے دل سے نواز کا خیال دور نہ ہو سکا۔ ایک دن وہ اس کے گھر پہنچ گئی اور اسے یہ خوشخبری سنائی کہ میں ڈاکٹر احسن سے طلاق لے رہی ہوں۔ پھر اچانک نہ جانے کیا ہوا کہ نواز نے اسے دبوچ کر اپنے بستر پر گرا لیا اور اس کی آنکھوں سے ہوس کی چنگاریاں نکلنے لگیں۔ وہ سراسیمہ ہو گئی۔ اس نے نواز کی گرفت سے نکلنے کی پوری کوشش کی۔ جب کامیاب نہ ہو سکی تو اس نے تکیے کے نیچے پڑا ہوا پستول اٹھا لیا۔ گولی کی آواز گونجی اور دو چیخیں فضا میں تحلیل ہو گئیں۔

وہ وحشت زدہ سی تارا جلدی سے گھر سے باہر نکل گئی۔ اپنی ماں کے گھر جانے کی بجائے وہ ڈاکٹر احسن کے گھر پہنچ گئی۔ اس نے اپنے حواس اور گھبراہٹ پر قابو پا کر ڈاکٹر سے اپنے پچھلے رویے کی معافی مانگ لی اور آئندہ ان سے وفادار رہنے کا یقین دلا دیا۔ تارا کی محبت پا کر احسن خوشی سے پاگل ہو گئے۔ تب اچانک انہیں ٹیلیفون پر نواز کے زخمی ہونے کی اطلاع ملی تو انہیں مجبوراً اسی وقت ڈاکٹر عبدالحق کے گھر نواز کو دیکھنے کے لیے جانا پڑا۔ ان کے جانے کے بعد تارا اس خیال سے سخت پریشان رہی کہ کہیں انہیں یہ پتہ نہ چل جائے کہ نواز میری گولی سے زخمی ہوا ہے۔ نواز نے بھی یہ بات کسی پر ظاہر نہ ہونے دی۔ اس نے ہر ایک کو یہی بتایا کہ وہ نشانہ بازی کرتے ہوئے غلطی سے خود کو زخمی کر بیٹھا تھا۔ نواز کو فوری آپریشن کے لئے کلینک پہنچا دیا گیا۔ چند روز بعد اس کی طبیعت سنبھلنے لگی۔ ایک دن وقت گزارنے کے لئے نواز نے احسن کو اپنے گھر بھیج کر اپنی کتابیں منگوائیں۔ انہوں نے جب نواز کے کمرے سے اس کے تکیے کے نیچے سے چابی نکالی تو وہاں وہ تارا کا سنہری لاکٹ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ سرخ پتھر کا یہ لاکٹ انھوں نے تارا کو شادی پر تحفہ دیا تھا جس کے اندر ان کی اپنی تصویر لگی ہوئی تھی۔ (اب آگے پڑھئے)

ڈاکٹر احسن کے ہاتھ لرزنے لگے۔ سینے کے
پنجرے میں جکڑی ہوئی تصویر انھیں اپنی سی لگ رہی تھی۔ انھوں نے
بے اختیاری سے ایک بار پھر لاکٹ کی طرف دیکھا اور ہاتھ بڑھا کر
ٹیوب لائٹ کا سوئچ آن کر دیا۔

"کیا پتہ میری نظر کا دھوکہ ہو ——— اندھیرا بھی تو ہے اس کمرے میں ——— " یہی سوچ کر انھوں نے ٹیوب لائٹ جلائی تھی۔ اب پورے کمرے میں ٹھنڈی ٹھنڈی دودھیا روشنی اتر آئی تھی وہی آنکھیں ——— وہی پیشانی ——— ویسے ہی بال ——— سب کچھ تو ان کا اپنا تھا، لیکن وہ پھر بھی خود کو پہچان نہیں پا رہے تھے شاید وہ خود کو پہچاننا ہی نہیں چاہتے تھے ——— انھیں کسی دھوکے کسی فریب کا سہارا درکار تھا ——— ابھی بھی بے نام سا جذبہ ایک موہوم سی امید ان کے دل میں کنڈلی مارے بیٹھی تھی ——— دل تڑپ تڑپ کر کہہ رہا تھا ——— "نہیں ڈاکٹر یہ وہم ہے تمھارا وہ ایسی نہیں، ذرا غور سے تو دیکھو ممکن ہے تمھیں غلط فہمی ہو رہی ہو، بھلا تارا کا لاکٹ نواز کے بستر پر کیسے آ سکتا ہے ——— ؟ وہ نواز کے پاس کیوں آئے گی ——— ؟ اور اگر آئی بھی تھی تو اس کے بستر میں . . . . . "

"نہیں ——— نہیں ——— ایسا کیسے ہو سکتا ہے ؟"
ڈاکٹر احسن نے آنکھیں موند کر ہانپتی امیدوں سے لپٹ کر دعا مانگی کہ یا خدا یہ تصویر میری نہ ہو، بس مجھے غلط فہمی ہو گئی ہو ——— دھوکا ہوا ہو' ——— لیکن ان کی دعا ان کے ہونٹوں پر ہی دم توڑ بیٹھی، انھوں نے ڈرتے ڈرتے سہمے ہوئے بزدل بچے کی طرح آنکھیں کھولیں، تصویر کے خدوخال ان کا تمسخر اڑانے لگے۔ ان کی تصویر ان کی بے بسی پر ہنس رہی تھی ——— انھوں نے گھبرا کر لاکٹ کو الٹ پلٹ کر دیکھنا چاہا، لیکن اسی الٹ پلٹ میں وہ خود ذرہ ذرہ ہو کر بکھرنے لگے ——— نفرتوں کے گہرے گڑھے میں سے ہزاروں سانپ نکل کر ان کے اندر پھنکارنے لگے تھے ——— نفرت اور انتقام کا تازہ تازہ زہر ان کے خون کے ساتھ مل کر گردش کرنے لگا۔ لاکٹ کا سرخ پتھر والا ڈھکنا بند کرتے ہوئے ڈاکٹر احسن نے شعلہ بار نظروں سے لاکٹ کی زنجیر کو جانچا ——— زنجیر کھلی نہیں تھی، ٹوٹی تھی۔

"ہوں! ——— تو بات یہاں تک جا پہنچی ہے ——— ٹھیک ہے تارا بیگم میں سمجھوں گا تم کو ——— لیکن نواز ——— ذلیل کمینے ——— تم تو آستین کا سانپ بن گئے۔ میں ہی ملا تھا تمھیں ڈسنے کے لیے ——— میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ہمدانی کا خون اس قدر گندہ بھی ہو سکتا ہے۔"

ڈاکٹر احسن کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ ان کی پیشانی سلوٹوں سے بھر گئی تھی۔ لاکٹ جیب میں رکھ کر احسن نے بستر کی چادر کھینچی اور پھر تکیہ اٹھا کر ایک طرف پھینکا، گدے کو الٹ دیا، مگر کوئی چیز ان کے ہاتھ نہ لگ سکی، سوائے سگریٹ کی ایک ڈبیہ کے، جس میں ایک آدھ جلی ہوئی سگریٹ پڑی تھی۔ احسن نے غصے سے سگریٹ کی ڈبیہ ایک طرف اچھال دی۔

"میری بلا سے نواز میاں تم سگریٹ پیو ——— بھنگ پیو چرس پیو ——— لیکن میں تم سے یہ ضرور پوچھوں گا کہ تم نے اپنے چچا کی عزت پر کیا سوچ کر ہاتھ ڈالا ——— تمھیں اپنی محبت دینے کا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ تم میری امانت ——— میری عزت میری بیوی سے عشق لڑاتے پھرو ——— " احسن نے غصے میں آ کر پورا کمرہ تہس نہس کر ڈالا۔ وہ کوئی بہت بڑی شہادت لے کر ان دونوں کے پاس جانا چاہتے تھے۔ ان کا تجسس، ان کا انتقام ان دونوں کی کمینی حرکتوں کے بارے میں بہت کچھ جاننا چاہتا تھا۔ کتابیں، میز، درازیں، الماری، ہر جگہ، ہر چیز کو الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد انہیں ایک کتاب میں سے ایک فوٹو ملا۔ یہ فوٹو احسن اور تارا کا تھا۔ شاید یہ اسی فوٹو کی کاپی تھی جو فرقان نے انہلانے میں اتارا تھا۔ وہ جھک کر تارا سے کچھ کہہ رہے تھے اور وہ سپاٹ چہرہ لیے خاموش بیٹھی تھی۔ احسن نے ایک نظر تصویر کو دیکھا، ان کا دل غصے سے بھر گیا۔

"حرافہ کہیں کی ——— کمینی سالی ——— " انھوں نے تصویر کے دو ٹکڑے کر ڈالے، لیکن پھر نہ جانے کیا سوچ کر وہ دونوں ٹکڑے انھوں نے اپنی پینٹ کی جیب میں ٹھونس لیے۔ شک کے غبار بھرے بگولے ایک پل میں کانٹوں کی پکی فصل بن کر کھڑے ہو گئے تھے۔ ان کے ہاتھوں کے ساتھ ان کا ذہن بھی مضطرب تھا ——— تارا نواز ——— نواز اور تارا ——— یہی دو لفظ ان کے ذہن پر ہتھوڑے کی طرح بار بار گر رہے تھے۔ اس چوٹ نے ان کی آنکھیں کھول دیں۔ اب ماضی ان کی نظروں کے سامنے پلٹ آیا تھا۔ کڑیوں سے کڑیاں ملنے لگی تھیں ——— ہوں تو تم اسی لیے مجھ سے اکھڑے آتے تھے نواز احمد ہمدانی صاحب! ——— ظاہر ہے جذبات

پتا بھی تو نہیں رہا ہوگا ——— تمہاری بڑھی ہوئی داڑھی اور
یہ بیماریاں بلا وجہ تو نہیں تھیں ——— اُف! اس دن تو میں نے
خود اپنی بیٹی کو بیچ میں بٹھا دیا تھا ——— مجھے کیا پتہ تھا کہ تم
بدل.......“

ان کا خون ایک بار پھر کھولنے لگا۔ ساری باتیں انہیں ڈسنے
لگی تھیں ——— اوہ مائی گاڈ یہ نواز تو کئی بار اس کی طرف جھکا بھی
تھا لیکن میں سمجھا کچھ کہہ رہا ہوگا ——— کتنا بے وقوف تھا میں بھی
میں نے اپنی آنکھوں پر اعتماد کی پٹی باندھ رکھی تھی ——— آنکھیں
رکھتے ہوئے بھی اندھا تھا ——— سچ سچ آجکل کسی پر اعتبار
نہیں کرنا چاہیے، خواہ وہ اپنا بھائی بھتیجا ہی کیوں نہ ہو ———
کاش مجھے ذرا سا بھی شک ہو جاتا تو میں کچھ نہ کچھ کر ہی لیتا۔ اب میں
سمجھا کہ تم گھر آنے سے کیوں کتراتے تھے ——— کیا پتہ تم میری
غیر موجودگی میں آتے ہو۔ اور میری ماں تو اتنی سیدھی ہے کہ اس نے
کبھی یہ سوچا بھی نہ ہوگا کہ جا کر اپنی بہو کو تو دیکھ لے کہ وہ اپنے کمرے میں
اپنے بھتیجے کے ساتھ کیا کر رہی ہے۔

”میں ——— میں ——— میں تمہیں شوٹ کر دوں گا
نواز ———“ ڈاکٹر احسن بے خیالی میں چیخ اُٹھے۔ انہیں پورے
کمرے میں کوئی اور چیز نہ مل سکی تھی۔ وہ کسی خلا کی تلاش میں تھے۔
نہ جانے کیا سوچ کر ڈاکٹر احسن نے مسہری کے نیچے جھانکا۔ سبز رنگ
کی سنہری مینا کاری والی چوڑیوں کے ٹکڑے پڑے تھے۔

سبز رنگ ان کا پسندیدہ رنگ تھا اور پھر وہ ان ٹوٹے ٹکڑوں
کو کس طرح نہ پہچانتے۔ یہ چوڑی ان ہی چوڑیوں میں سے ایک تھی
جو وہ اس کے لیے خرید کر لائے تھے۔ ٹوٹی چوڑی کے ٹکڑے اٹھا کر
اپنی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے وہ سوچنے لگے ——— میں تو سمجھا تھا
کہ میرے سارے دُکھ ——— ساری محرومیاں ختم ہو گئیں۔ اب معلوم
ہوا کہ دُکھوں کی اذیت بھری داستان تو دراصل اب شروع ہوئی
ہے ——— اور ابھی تو میں نے محرومی سے بڑھ کر اذیت ناک
شے یعنی ذلت کا مزہ تو چکھا ہی نہیں تھا ——— واہ تارا بیگم
اوپر سے تم جتنی پاکیزہ اور معصوم نظر آتی ہو، اندر سے تم اتنی ہی گھناؤنی
اور سرکش ہو ——— بہر حال میں دیکھ لوں گا تمہیں بھی اب تو
سارے حساب چکانے ہیں تارا بیگم!

احسن چوڑیوں کے ٹکڑے جیب میں ڈال کر اُٹھ کھڑے ہوئے
انہیں یہ یاد ہی نہیں رہا کہ وہ کس کام کے لیے یہاں آئے تھے اور
انہیں کہاں جانا تھا ——— وہ بھاری قدموں سے چلتے ہوئے
باہر چلے آئے، پھر کیئر ٹیکر کو کمرے میں تالا ڈالنے کی ہدایت کرتے ہوئے
وہ اپنی کار میں جا بیٹھے۔ ایکسیلیٹر پر پاؤں کا دباؤ ڈالتے ہوئے بھی
انہیں یاد نہیں آیا کہ انہیں کہاں جانا ہے۔ وہ تو بس ماضی کے ڈھیر کو
کرید کرید کر تارا اور نواز کی وابستگی کی وجوہات ڈھونڈنا چاہتے تھے۔ اپنی ان
غفلتوں کا حساب لگانا چاہتے تھے جن کے صدقے نواز اور تارا ان فاصلوں
کو طے کر گئے جو حرمت کے فاصلے تھے، احترام بھرے رشتوں کے فاصلے تھے۔
ان کا دماغ لاوے کی طرح پک رہا تھا۔ شاید ان کا بلڈ پریشر ہائی ہو رہا تھا۔
ان کی نظریں ونڈ اسکرین پر تھیں، لیکن ذہن کہیں اور تھا، اور ہاتھ خود کار مشین
کی طرح اسٹیئرنگ وہیل سے کھیل رہے تھے ——— نواز اور تارا کے کتنے
ہی قابلِ اعتراض زاویے ان کی آنکھوں کے سامنے آتے جا رہے تھے۔

”بے غیرت ———“ وہ آہستہ سے بڑبڑائے۔ بس میں
شوٹ ہی کر دیتا ہوں ان دونوں کو، زیادہ سے زیادہ پھانسی ہو
جائے گی، لیکن اس عذاب سے تو نجات مل جائے گی ——— بے غیرت
بن کر جینا بھی کوئی جینا ہے ——— لیکن میں کیوں جان دوں ان
کے پیچھے ——— جب ان دونوں کم ظرفوں کو میرا خیال نہیں تو پھر
میں کیوں ان کی خاطر اپنی جان گنوا بیٹھوں۔ میرے بغیر تو بہت سے
لوگ زندہ نہیں رہ سکیں گے ——— میری ماں ——— وہ تو
ہنستے ہنستے ہی مر جائے گی ——— اور پھر میری بہنیں بدنام ہو جائیں
گی ——— نیلما سے شادی کون کرے گا ——— ؟ فرقان کیا
سوچے گا ——— ؟ نہیں میں تم دونوں کو قتل نہیں کروں گا ———
تم دونوں کو سسکا سسکا کر ماروں گا ——— تم سے میں اپنی
ایک ایک محرومی کا انتقام لوں گا ——— تم دونوں مل کر رنگ رلیاں
مناتے رہے ——— عیش کرتے رہے اور میں جلتا رہا، سلگتا رہا
اور ہاں اس بات پر تو میں نے کبھی غور ہی نہیں کیا کہ تم دونوں ایک
ہی کالج میں پڑھتے تھے تو یہ بات نئی نہیں بڑی پرانی ہے ———
ہوں، ہوں، ہوں۔

ڈاکٹر احسن نچلا ہونٹ دانتوں سے کاٹتے ہوئے تب ہی
آپ بولے جا رہے تھے ——— تو تم اپنی محبوبہ کو اپنی چچی
کے روپ میں دیکھ کر گھبرا گئے تھے، تبھی کھڑکی سے کود کر بھاگ گئے
تھے پہلے دن ——— نواز میری محبتوں کا، میری مروتوں کا کچھ تو
خیال کیا ہوتا ——— ! مانا کہ میں تمہارا سگا چچا نہیں، لیکن پھر بھی ان
رشتوں کی حرمت کا کچھ خیال تو کرنا تھا، جو رشتے ہمارے باپ دادا نے

استوار کئے تھے۔ ساتھ ہی وہ اپنے آپ سے الجھ رہے تھے۔ انہیں پتہ بھی نہ چلا کہ کب اور کیوں آگے والی گاڑی اچانک رُک گئی۔ انہوں نے بریک پر بے انتہا دباؤ ڈال دیا۔ پہیوں کی چرچراہٹ کی آواز سنائی دی اور پھر ان کا سر بڑی زور سے کار کی کھڑکی کے اوپر والے حصے سے ٹکرایا۔ کار سامنے والی کار سے ٹکرا گئی۔ وہ تو شکر ہوا کہ سامنے والا شیشہ صرف چٹخ گیا تھا۔ ریزہ ریزہ ہو کر بکھرا نہیں تھا۔

ڈاکٹر احسن کا سر چکرا گیا۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ چوٹ بڑی سخت تھی۔ ان کے تمام اعضا شل ہو گئے تھے۔ انہیں یہ بھی خیال نہ رہا کہ میں بیچ سڑک پر رُک گیا ہوں، سارا ٹریفک جام ہو گیا ہو گا۔ آگے والی گاڑی کا پچھلا حصہ پچک گیا تھا۔ اس گاڑی کا مالک چیخ رہا تھا، چلا رہا تھا اور احسن کی کار پر زور زور سے مُکے بھی مار رہا تھا۔ سڑک پر چاروں طرف لوگ جمع ہو گئے تھے۔ تھوڑی دیر میں ٹریفک کانسٹیبل سیٹی بجاتا ہوا آیا تو ڈاکٹر احسن بھی سر سہلاتے باہر نکل آئے۔ سامنے والی گاڑی کا مالک ان کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔

"بتلایئے یہ نقصان کون پورا کرے گا؟ میری نئی گاڑی تباہ ہو گئی۔ آپ گاڑی چلا رہے تھے یا سو رہے تھے؟ میں برابر لائٹس دے رہا ہوں لیکن آپ نے دیکھا ہی نہیں ——— میں کہتا ہوں میری گاڑی ———"

احسن نے جیب میں سے پرس نکالا تو وہ فوراً چپ ہو گیا۔ ڈاکٹر احسن نے دو بڑے نوٹ اس کی طرف بڑھائے تو وہ مسکرا کر بولا "صاحب نقصان تو زیادہ ہوا ہے لیکن میں بھی شریف آدمی ہوں۔"

کانسٹیبل نے چالان بک نکال لی تو وہ خود ہی بول پڑا —

"رہنے دو حوالدار جی! اب کوئی ضرورت نہیں۔"

مجمع آپ ہی آپ چھٹنے لگا۔ احسن اپنی گاڑی میں جا بیٹھے۔ پیچھے والی گاڑیاں مسلسل ہارن دے رہی تھیں۔ کئی گاڑیاں آڑھا ترچھا راستہ بنا کر نکل چکی تھیں۔ ڈاکٹر احسن نے گاڑی آگے بڑھائی تو کانسٹیبل نے ہاتھ کا اشارہ کر کے انہیں روکا۔ احسن نے اپنا کارڈ نکال کر کانسٹیبل کے سامنے کر دیا۔ اور آہستہ سے بولے۔ "مجھے ایک پیشنٹ کو دیکھنے جانا ہے پہلے ہی خاصی دیر ہو چکی ہے۔"

"اچھا جایئے چلیے۔" کانسٹیبل نے جبراً قہراً کہا۔ دراصل اس نے ان دو بڑے نوٹوں کی جھلک دیکھ لی تھی جو ڈاکٹر احسن نے دانستہ کسی کے مالک کو دیئے تھے۔ وہ بھی اپنا حصہ وصول کرنا چاہتا تھا لیکن کارڈ دیکھ کر اسے چپ ہو جانا پڑا۔ ڈاکٹروں کے بارے میں اس کا تجربہ پہلے ہی خاصا تلخ تھا۔ اولاً تو ڈاکٹر خواہ مخواہ کے بور ہوتے ہیں، دوسرے ان کے تعلقات بڑے بڑے لوگوں سے ہوتے ہیں۔ اس لیے فوراً اوپر شکایت کر دیتے ہیں۔ یہی سوچ کر کانسٹیبل نے ڈاکٹر احسن کو چھوڑ دیا تھا۔ اور ڈاکٹر احسن کار چلاتے ہوئے پھر سوچ رہے تھے کہ میں اگر اسی طرح اپنے آپ سے الجھتا رہا تو میں ان دونوں سے انتقام لینے کی بجائے خود اپنے انتقام کا نشانہ بن جاؤں گا۔ کسی دن یا تو میں کار ٹکراؤں گا یا پھر کسی پیشنٹ کو غلط ٹریٹمنٹ دے دوں گا، دونوں صورتوں میں ہی مانگا عذاب سہنا پڑے گا۔ ڈاکٹر احسن سڑک پر لگاتار چلتے بڑی احتیاط سے کار چلا رہے تھے۔ لیکن انہیں یہ پتہ نہ تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ ان کے پاس تو بس ایک ہی احساس تھا کہ وہ جا رہے ہیں، کہیں جا رہے ہیں ——— سیدھی سڑک پر ——— جس طرف سب گاڑیاں دوڑ رہی تھیں۔ وہ اس حادثے سے سنبھل گئے تھے۔ لیکن پھر بھی تارا اور نواز کی صورتیں ان کی نظروں کے سامنے ناچ رہی تھیں۔

آج کا دن ڈاکٹر احسن کے لیے قیامت بن کر آیا تھا۔ آج کے انکشاف نے انہیں بے چین کر دیا تھا۔ وہ اپنا سکون گنوا بیٹھے تھے۔ ان کے دل میں حسد کی آگ بھڑک اٹھی تھی اور اس آگ نے ایک پل میں اس محبت کو جلا کر بھسم کر ڈالا تھا جو ان کے دل میں تارا کے اور نواز کے لیے دریا کی طرح موجزن تھی۔ ان کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ کچھ کر گزریں۔ کوئی قیامت اٹھا دیں ——— کوئی طوفان لے آئیں تاکہ ان دونوں کی عیاریاں سب کے سامنے آ جائیں۔ وہ دونوں جو ساری دنیا کے سامنے معصوم اور نیک بنے ہوئے تھے۔

لیکن وہ جانتے نہیں اچانک یہ کیوں محسوس ہوا کہ جیسے اب وہ تھک چکے ہیں۔ ان کا ضبط جواب دے گیا تھا۔ وہ سکون چاہتے تھے لیکن سکون کہیں نہیں تھا۔ وہ سکون کی تلاش میں شام تک ادھر ادھر یونہی بھٹکتے رہے۔ گلشن روڈ پر انہیں اپنے کالج کا ساتھی فیروز مل گیا، اس نے تین سال تک میڈیکل کے تھرڈ ایئر میں متواتر فیل ہو کر ٹھیکیداری شروع کر دی تھی۔ اور اب تو وہ خاصا بڑا بزنس مین تھا۔ اس نے اپنے متعلق خاصی باتیں احسن کو بتائیں لیکن وہ ہوں ہاں کرتے رہے۔ آخر وہ چڑ کر بولا، کیا ہے یار، ڈاکٹر بن کر مغرور ہو گئے ہو یا مجھ سے بیزار ہو ——— اگر ایسی بات ہے تو گاڑی روک دو، میں ٹیکسی لے لوں گا۔ میں تو تمہیں دیکھ کر خوش ہو گیا تھا کہ چلو گاڑی خراب ہونے کا ایک فائدہ تو ہوا کہ ایک پرانا دوست مل گیا۔ تم تو خیر پہچان بھی نہیں

سب سے تھے مجھے پتہ ہے تم کالج میں بھی مجھ سے دور دور رہتے تھے....“ وہ تعظیماً بولتے گیا۔ اور پھر ڈاکٹر احسن زبردستی مسکرا کر بولے۔

”نہیں میرے دوست ایسی کوئی بات نہیں۔“ پھر انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا ”میں دراصل بہت پریشان ہوں۔ کچھ گھریلو پریشانیاں ایسی ہیں کہ کسی کو بتا بھی نہیں سکتا۔ویسے تم مجھ سے پوچھنے کی کوشش بھی نہیں کرنا۔ بس میں سکون چاہتا ہوں میرے دوست میں سکون چاہتا ہوں۔“

فیروز کئی لمحے تو حیرانی سے احسن کو دیکھتا رہا اور پھر اس نے بڑی محبت سے کہا۔”احسن میں دیکھ رہا ہوں کہ تم خاصے تھکے ہوئے ہو۔ چلو تم ادھر آؤ میں ڈرائیو کرتا ہوں۔“

احسن نے بغیر حیل حجت کے اٹھ کر سیٹ بدل لی۔ وہ سیٹ کی پشت سے سر ٹکا کر بیٹھ گئے۔ انھوں نے آنکھیں بند کر لی تھیں، اس سلسلے میں فیروز نے انہیں ڈسٹرب نہیں کیا۔ شہر کے مشہور بار کے سامنے فیروز نے گاڑی روکی تب بھی احسن نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ وہ نڈھال سے پڑے تھے۔ فیروز نے کار کا دروازہ کھول کر احسن کو آواز دی تو وہ خاموشی سے نیچے اتر آئے۔ وہ کسی معمول کی طرح فیروز کے پیچھے پیچھے چلے جا رہے تھے۔ وہ خاموشی سے وہی کچھ کرتے رہے جو فیروز کہتا رہا۔ اور جب فیروز نے ان کی طرف پہلا پیگ بڑھاتے ہوئے کہا۔”لو پیو۔“ تو وہ چونک گئے۔

”نہیں —— نہیں میں نہیں پیتا۔“ انہوں نے گلاس ہاتھ سے کھسکا دیا۔

”انکار! اتنی بڑی نعمت سے انکار!! بڑے بدقسمت ہو ڈاکٹر جو تم نے ابھی تک اسے نہیں چکھا۔ بس ایک گھونٹ لو اور سارے غموں کو بھول جاؤ۔ اسے ہر عقلمند آدمی پیتا ہے اور پھر جسے سکون کی تلاش ہو وہ تو اس کا دیوانہ ہوتا ہے۔ تم بھی اس کے رسیا بن جاؤ گے۔ بس اٹھاؤ گلاس اٹھاؤ.... اٹھاؤ نا یار ——“

احسن کا ہاتھ آپ ہی آپ گلاس کی طرف بڑھا، لیکن پھر وہ رک گئے انھوں نے مڑ کر چاروں طرف دیکھا۔ وہ دونوں ایک الگ کمرے میں بیٹھے تھے۔ خوب صورت فرنیچر سے سجے ہوئے اس کمرے میں قیمتی قالین اعلیٰ قسم کے صوفے اور نہایت خوب صورت پردے پڑے ہوئے تھے۔ ہلکی ہلکی روشنی دیواروں پر لگی ہوئی پینٹنگ کے پیچھے سے چھلک رہی تھی پینٹنگ بڑی رومانی قسم کی تھی۔ عمر خیام کا پوز تھا شاید باہر سے کمرے میں مدھم مدھم میوزک بھی تیر رہا تھا۔ ڈاکٹر احسن پر خوابناک ماحول دیکھ کر چونک گئے تھے۔ انھوں نے غور سے کمرے میں پڑی ہوئی خوب صورت مسہری اور ڈریسنگ ٹیبل کو دیکھ کر پوچھا۔”یار یہ کیا چکر ہے مجھے کہاں لے آئے تم؟“ فیروز ایک دم قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

”بے خودی کی بھی حد ہوتی ہے یار —— میں نے تو ایسے منظر فلموں میں بھی نہیں دیکھے۔ آپ میرے ساتھ آ کر یہاں اتنی دیر سے بیٹھے ہیں لیکن پوچھ اب رہے ہیں کہ مجھے کہاں لے آئے تم؟ چلو یہ تو پیو سب پتہ چل جائے گا کہ کہاں آگئے ہو اور کس کے مہمان ہو۔ تم نہیں جانتے تمہارا یار فیروز بڑا عیاش آدمی ہے تم پہلے خوش قسمت ہو جو میری ریڈی میڈ جنت میں آ گئے ہو۔“

”جنت —— ؟؟ ریڈی میڈ جنت —— ؟؟ کیا کہہ رہے ہو فیروز تم ؟ میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آ رہا۔“ احسن نے بیزاری سے پوچھا۔

”آ جائے گا —— سب سمجھ میں آ جائے گا میری جان ایک گھونٹ لو گے تو عقل پر لگا ہوا سارا زنگ چھٹ جائے گا۔“ فیروز نے قہقہہ لگا کر ایک آنکھ دبائی —— احسن نے فیروز کے ہشاش بشاش چہرے کو دیکھا اور نہ جانے کیا سوچ کر گلاس ہونٹوں سے لگا لیا ایک ہی سانس میں گلاس آدھا کر کے احسن نے منہ کی ساری تلخی نگلتے ہوئے کہا۔

”تم پیتے ہو اسی لیے اتنے خوش رہتے ہو۔ اب میں بھی پیوں گا تاکہ خوش رہ سکوں۔“

”ہاں ہاں —— یہ ہوئی نا بات —— لاؤ ہاتھ۔“ فیروز نے دوسرا پیگ بناتے ہوئے ہاتھ احسن کی طرف بڑھایا۔ احسن نے اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیا۔

”لیکن فیروز یہ جنت کیسی ہے؟ —— کس کی ہے؟ تم تو یہاں ایسے بیٹھے ہو جیسے یہ تمہارے باپ کی جاگیر ہو؟ میرا مطلب ہے، کیا تم یہاں روز آتے ہو؟“

”روز تو نہیں جب دل کرتا ہے آتے ہیں ڈاکٹر یہ اپنا بار ہے ہم کو کون روکے گا —— آدھے سے زیادہ پیسہ میرا لگا ہوا ہے —— یہ میرا کمرہ ہے یہاں کسی کو آنے کی اجازت نہیں سوائے حوروں کے ——“ فیروز پر نشہ چڑھنے لگا تھا لیکن وہ تیسرا پیگ بنا رہا تھا۔ ڈاکٹر احسن کا گلاس بھی خالی ہونے لگا تو اس نے اس میں اور انڈیل دی ”پیو ڈاکٹر پیو، عیش کرو —— سب مال اپنا ہے —— تم جیسا مال مانگو گے ملے گا ——“ فیروز نے ایک آنکھ دبا کر کہا ”لیکن اب کسی بات کی پرواہ نہیں باس

ایک ڈاکٹر کی ضرورت تھی سو وہ مل گیا۔ اب کوئی کھٹکا نہیں۔"
"لیکن فیروز ——— وہ ——— وہ ———
حوریں کہاں ہیں ——— جنت تو خالی ہے۔" ڈاکٹر احسن ایک پیگ ہی میں آؤٹ ہونے لگے تھے۔
"جنت خالی نہیں ہے ——— میوے ہیں جنت کے میوے، کھاؤ یار کھاؤ ———" فیروز نے ہاتھ جھکا کر پھلوں کی خوب صورت سی ٹوکری اٹھالی۔ اور پھر گھنٹی پر انگلی رکھی ہی تھی کہ ایک مؤدب بیرا چلا آیا۔
"یس باس ———" وہ سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔
"اوئے کھڑا کیوں ہے ——— حوروں کو بلا کر لا کوئی بھی نہیں ہے ——— ایک بھی نہیں، روزی، میرین، عشرت، کوکو ——— انہیں پتہ نہیں ہم آئے ہیں۔"
"یس باس پتہ ہے ——— میں نے فوراً بتا دیا تھا۔"
"تو پھر ——— پھر ——— کیوں نہیں آئیں ——— سب کو ایمرجنسی لگ گئی ہے کیا ——— ؟ اوئے بھیجو ان سب کو بھیجو ——— سالیاں ہر چھ مہینے بعد پھڈا کر دیتی ہیں اور پھر نخرہ کرتی ہیں۔"
"نخرہ کرتی ہیں ——— ؟ ہاں وہ بھی نخرہ کرتی ہے، بہت نخرہ کرتی ہے ———" ڈاکٹر احسن بڑبڑانے لگے۔
"کوئی نخرہ نہیں کرے گی یار سب کو ایسی دوا دینا کہ سب ٹھیک ہو جائیں۔ یہ روز روز کا جھگڑا ہی ختم ہو جائے۔ میں تمہیں اسی لیے یہاں لایا تھا ڈاکٹر۔" فیروز نے پھر آنکھ دبائی۔
"کیسا جھگڑا ——— ؟ کس کا جھگڑا ——— ؟" احسن نے سیدھے ہوتے ہوتے پوچھا۔
"روزی کا، میرین کا، عشرت کا اور سالی کوکو کا جھگڑا یار، لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے جانا پڑتا تھا۔ میں خود تو جاتا نہیں تھا۔ وہ خود ہی معاملہ طے کرتی تھیں، ایک ایک ہزار دیتا تھا، پھر بھی منہ بناتی تھیں اب تم آ گئے ہو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اب سب پتہ چل جائے گا، سب پتہ چل جائے گا سب پتہ ...... سب پتہ ...... ارے پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے۔" فیروز لہک لہک کر گانے لگا
احسن نے سرخ سرخ آنکھوں سے اسے دیکھا اور بھاری آواز میں بولے :۔
"کہاں ہے پتہ ——— کہاں ہے بوٹا ——— یہ جنت ہے یا جہنم ہے ——— جنت میں تو دودھ کی نہریں بہتی ہیں، فرشتے ہوتے ہیں ——— حوریں ہوتی ہیں۔"
"نہریں ——— ہاں دودھ کی نہریں، تو حوروں کے ساتھ .... آہ .... آآ .... حوروں کے ساتھ .... آ ... آ ..... " فیروز پاگلوں کی طرح ہنسنے لگا۔ اور اس کا ساتھ احسن بھی دینے لگے۔

تارا نے بے چین ہو کر وال کلاک کی طرف دیکھا۔ بارہ بجنے میں دس منٹ باقی تھے لیکن احسن ابھی تک نہیں آئے تھے۔ وہ ان کے انتظار میں ابھی تک جاگ رہی تھی۔ گیارہ بجے تک تو امی اور نیلا دونوں اس کے پاس بیٹھی رہیں۔ امی کو تو احسن پر زبردست غصہ آنے لگا تھا لیکن تارا نے فوراً ایک جھوٹ بولا۔ "امی میں تو بھول ہی گئی، وہ دیر سے آنے کو کہہ گئے تھے، انہیں کوئی ضروری کام تھا۔" تب کہیں جا کر امی کا غصہ کم ہوا ——— اس نے اتنی منتیں کر کے امی کو اپنے کمرے میں جا کر سو جانے پر مجبور کیا تھا لیکن اب خود ہی اسے اکیلے لیٹے لیٹے ڈر لگنے لگا تھا۔ ایک ایک پل میلوں لمبا ہو گیا تھا۔ تارا کو اب بھوک بھی لگنے لگی تھی۔ احسن کے انتظار میں اس نے کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ کھانا تو خیر ویسے بھی کہاں کھایا جاتا تھا اس سے۔ جہاں منہ میں نوالہ رکھا وہ پلٹ کر واپس چلا آتا تھا۔ طبیعت جو ایسی ہو رہی تھی۔
امی کو نہ احسن نے کچھ بتایا تھا نہ خود تارا نے، وہ سمجھ گئی تھیں آخر ماں تھیں نا۔ انہیں تو تارا کی سست چال نے ہی بتا دیا تھا کہ گڑبڑ ہو چکی ہے۔ اسی لیے وہ تارا کے کمرے میں ایک پلیٹ میں لیموں کا اچار اور سوکھے آلو بخارے رکھ گئی تھیں۔ تارا نے ایک آلو بخارا منہ میں ڈال لیا۔ سارا منہ کڑوا ہو رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ احسن آ جائیں تو وہ اپنی ساری پریشانیاں، ساری گھبراہٹیں احسن کو بتا دے۔ ظاہر ہے پہلا پہلا موقع تھا۔ وہ گھبرائے جا رہی تھی۔ سارے دن کی کسلمندی اب بیزاری میں ڈھلتی جا رہی تھی۔ کتنی ضد کر رہے تھے کل کہ یہ بھاری کپڑے بدل کر نائٹی پہنو ...... اور آج خود کو پتہ نہیں، نہ جانے کہاں پھر رہے ہوں گے۔
تارا نے کھڑے ہو کر ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اپنا جائزہ لیا اپنے ہاتھ اوپر کر کے انگڑائی لینا چاہی تو نہ جانے کیوں اسے شرم آ گئی۔ "ہائے اللہ کتنی بدل گئی ہوں میں ——— کیسی تبدیلیاں

آگئی ہیں مجھ میں ——— شاید میں نہیں تارا کہ میں تھی ———
ماں میں تارا ہی تو ہوں ——— ایسی ہی تو تھی بس ذرا سمجھدار ہو گئی
ہوں۔" تارا نے اپنے آپ کو دیکھ کر پیار سے ناک چڑھائی۔ وہ پچھلے
اپنے اندر ہونے والی تبدیلیوں پر حیران تھی۔ اس کا جسم بھر رہا تھا۔
اس کے گالوں پر شفق پھوٹنے لگی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک غرور
ایک تمکنت سی آگئی تھی۔

شاید یہ تمکنت ماتا کی تھی۔

یہ غرور تخلیق کا غرور تھا۔

کھٹ کھٹاک ——— کھٹ کھٹاک ——— وال کلاک
نے بارہ بجائے تو اس نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا اور پھر وہ
جھلا گئی۔ "ہونہہ ——— بارہ بج گئے ہیں ——— دوسرا دن شروع ہو گیا
اور آپ کا کہیں پتہ نہیں۔ پہلے تو بڑی جلدی آجاتے تھے۔ سرِشام ہی
نیند آنے لگتی تھی ——— اللہ کیسی منتیں کرتے تھے ——— میں نے
بڑا ستایا ——— تو بہ نہ جانے کیا کیا کہہ دیتی تھی میں ——— لیکن اب
خوامخواہ ہی انتظار کروا رہے ہیں ——— ابھی یہ تانتی وانتی اتار کر
وہی موٹے موٹے کپڑے پہن کر لحاف کے اندر دبک کر سو جاؤں تو ایکدم
موڈ بگڑ جائے گا۔ پھر روٹھے روٹھے پھریں گے کھانا نہیں کھائیں گے۔
ہائے اس وقت بھی تو نہیں کھایا ہو گا کھانا۔ کیا پتہ سچ مچ ہی کوئی کام
نکل آیا ہو۔ ممکن ہے کسی دوست کی طبیعت خراب ہو یا پھر کوئی
حادثہ ..... ؟ لیکن فون تو کرتے نا ——— فون بھی تو نہیں آیا۔
کم از کم بتا ہی دیتے کہ گئے کہاں ——— ؟ اگر امی سے میں جھوٹ نہ
بولتی تو بس مزا ہی آجاتا آج۔

تارا بے زار ہو کر مسہری پر لیٹی ——— آج وہ بہت خوش
تھی۔ آج امی نے اُس سے بہت اچھی اچھی اور بہت ساری باتیں
کی تھیں۔ انھوں نے تارا کا سر اپنے زانو پر رکھ کر اسے لپنے قریب لٹا
لیا تھا۔ وہ اسے اپنے خاندان کے بارے میں بتا رہی تھیں۔ احسن کے
ابا اور اپنی ساس کی باتیں کرتے ہوئے انھوں نے کئی بار بڑے پیار
سے اس کے بال سمیٹے تو تارا نے خوشی سے جھوم کر آنکھیں موند لی تھیں،
انھوں نے بڑی محبت سے تارا سے کہا تھا۔

"تارا بیٹے کبھی اپنا دل نہ جلانا۔ کوئی بھی بات، کوئی بھی شکایت
ہو تو مجھ سے کہہ دینا۔ میں دیکھ لوں گی سب کو۔ اگر احسن بھی لڑیں تو مجھے
بتا دینا۔ میں ٹھیک کر دوں گی انھیں۔" اور تب ہی تارا نے نہ جانے
کیوں امی سے پوچھا تھا۔

"امی آپ کو احسن سے تو محبت ہے ہی لیکن کیا آپ مجھ سے
بھی اتنی ہی محبت کرتی ہیں۔"

تب امی نے جھک کر اس کی پیشانی چوم لی تھی۔ وہ ہنس کر بولی
تھیں "پگلی بیٹی۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ تم اور احسن کیا جدا
جدا ہو اور سچ پوچھو تو بیٹا میں تو بغیر دیکھے ہی تجھ سے محبت کرنے لگی تھی۔"

"لیکن کیوں امی ——— ؟" تارا ایک دم پوچھ بیٹھی۔

"اس لیے بیٹا کہ تم میرے بیٹے بیٹیوں کو جو پسند آ گئی تھیں۔"

"خیر امی آپ کی بیٹیوں کو تو بعد میں پسند آئی تھی پہلے تو
آپ کے ..... " نیلما بیچ میں بول پڑی تھی۔ امی نے اسے
چپ کرانے کے لیے اس کی پیٹھ پر ایک دھپ جما دی۔

تارا سچ مچ جھینپ گئی تھی اور نیلما شرارت سے مسکرائے جا
رہی تھی۔ ویسے بھی آج دن بھر نیلما نے تارا کو تنگ کیا تھا۔ وہ بات
بے بات تارا کو چھیڑ رہی تھی۔ دراصل وہ خود بے انتہا خوش تھی کتنے
دنوں بعد فرقان نے آنے کا لکھا تھا اور وہ بھی ایک دو دن کے لیے
نہیں پورے ڈھائی مہینے کے لیے۔ کئی بار نیلما نے تارا کو جھنجھوڑ کر کہا۔

"فرقان بھائی آ رہے ہیں ——— اللہ سچ کتنا مزہ آئے گا
جب تک میرے امتحان بھی ختم ہو جائیں گے۔ پھر تو خوب گھومنے چلا
کریں گے۔ خوب باتیں کریں گے اور خوب شرارتیں۔"

اور تارا اتنی بہت سی باتوں کے جواب میں حیرانی سے مسکرا
کر اسے دیکھے جا رہی تھی۔ ایسے موقعوں پر بھائیوں کی محبت کی لذت
سے محروم رہنے کا احساس ایک دم جاگ اٹھتا تھا۔ لیکن وہ اپنے ان
احساسات پر خوشی کا خول چڑھا کر نیلما کے ساتھ بیٹھ کر پروگرام بنانے
لگتی تھی۔

اس وقت بھی وہ لیٹی ہوئی اِدھر اُدھر کی باتیں سوچ رہی تھی
احسن کے متعلق سوچتی تھی تو تنہائی کا احساس شدید ہو جاتا تھا اور
پھر اس احساس کے ساتھ ہی ہلکا ہلکا خوف اس کے چاروں طرف
ناچنے لگتا تھا ——— کلاک نے ٹھک سے ساڑھے بارہ بجنے
کا اعلان کیا تو وہ ڈر کر چونک گئی۔

"ہائے اللہ جی، ساڑھے بارہ بج گئے اور ابھی تک نہیں آئے
احسن ——— کیا ہو گیا ——— کہیں کوئی ایکسیڈنٹ ———
نہیں نہیں ایکسیڈنٹ کیسے ہو جائے گا ——— ؟ خدا نہ کرے ایسا ہو۔"
تارا نے اس خیال کو فوراً رد کر دیا ——— "پھر وہ گئے کہاں ——— ؟
نواز کے پاس تو نہیں بیٹھے ——— لیکن ابھی تک ——— شاید

بیت زیادہ خراب ہو گئی ہو ——— ؟ ممکن ہے کچھ اور ہو گیا ہو
میں نواز کو کچھ شک ہو گیا ——— ؟ اللہ! ہو جانے کچھ میری بگا
یہ ایسے بد طینت اور دھوکے باز انسانوں کا تو زندہ رہنا بھی ایک
لیہ ہے۔ پہلے مجھے اُلّو بنایا اور جب مجھ سے دل بھر گیا تو دھتکار
گئی۔ رذیل کہیں کا۔

تارا کے دل سے نفرت کا لاوا بہنے لگا۔ اس نے آنکھیں بند
کے سوچا، امی کتنا سچ کہتی تھیں۔ ان کا تجربہ غلط نہیں تھا سب احسن
تنے بُرے بھی نہیں ——— اچھے خاصے تو ہیں، وہ سب پھر بیٹے
ں۔ نواز کی طرح فلرٹ نہیں ——— تارا آنکھیں بند کئے نہ جانے
یا سوچ رہی تھی کہ کار کے پہیوں کی چرچراہٹ نے اسے ایک دم
ونکا دیا۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

"شاید وہ آ گئے ——— لیکن گیٹ کون کھولے گا۔
مولا بخش تو سو گیا ہوگا ——— کیا میں جاؤں گیٹ کھولنے ———
ے اتنا اندھیرا ہو گا اور اتنی دور بھی تو ہے گیٹ ——— کیا پتہ
نی اور ہو ———" تارا نے کان آواز کی سمت لگا دیے۔ گاڑی
ن کے گیٹ کے پاس آ کر رک گئی تھی۔ اور پھر گاڑی نے ہارن بھی دیا
تھا۔ رات کے سناٹے میں کار کے دروازے کھلنے اور پھر بند ہونے کی
واز صاف سنائی دی تھی۔ تارا تیزی سے بستر سے اُٹھ کر کھڑکی کے قریب
ئی آئی۔ کھڑکی کا پٹ کھول کر اس نے باہر کی جانب جھانکنا چاہا لیکن
سے کچھ نظر نہ آیا۔ کھڑکی کے اُس طرف چار دیواری آڑ بن گئی تھی۔ تارا
نے ڈریسنگ ٹیبل کا اسٹول کھینچ کر کھڑکی کے پاس کر لیا۔ اسٹول پر چڑھ
کر اس نے دیکھا کوئی شخص کسی دوسرے آدمی کو سہارا دے کر اُتار
رہا تھا۔ تارا کا دل دھک سے ہو گیا ——— اس نے سوچا یہ دوسرا
کون ہے ——— ؟ احسن تو اکیلے گئے تھے۔ اور یہ آدمی احسن جیسا
نہیں لگ رہا۔ کہیں وہ دوسرے والے احسن تو نہیں ———
لیکن نہیں ——— انہیں کیا ہوگا جو وہ سہارا لے کر اتریں گے،
اللہ کرے یہ احسن نہ ہوں ——— اللہ کرے یہ احسن نہ ہوں ———
تارا نے جلدی جلدی دعا مانگنی شروع کر دی۔ لیکن ہیڈ لائٹس کی روشنی
میں تارا نے دیکھ لیا وہ احسن ہی تھے ——— اس کا سر گھومنے لگا
کانوں میں سیٹیاں بجنے لگیں ———

ایکسیڈنٹ ! ——— ایکسیڈنٹ ! ——— ایکسیڈنٹ !!
بس صرف یہی لفظ تھا جو تارا کے کانوں میں گونجے جا رہا تھا
وہ دوڑ کر مسہری پر آ بیٹھی۔ مسہری پر بیٹھ کر اپنے دونوں ہاتھوں سے

پھر وچھپا کر تارا نے سچے دل سے دعا مانگی۔
"اچھے اللہ میاں تجھے اور پر جھکتا ——— مجھ سے میری
خوشیاں نہ چھینا وہ لوگ مجھے منحوس کہنے لگیں گے ——— مجھ تو پتہ
ہے اللہ میاں کہ مجھے کبھی کوئی خوشی راس نہیں آتی۔"

تارا نے کال بیل کی آواز سنی لیکن وہ سہمی ہوئی بیٹھی رہی۔ دوسری
دفعہ کال بیل بجی اور تیسری دفعہ شاید مولا بخش نے گیٹ کھول دیا تھا۔
تارا دوڑ کر کمرے کے دروازے کے قریب آ کھڑی ہوئی۔ آہستہ آہستہ
اس نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ دالانے میں مولا بخش احسن کو سہارا
دے کر کمرے کی طرف لا رہا تھا۔ اگر تارا نے نائٹی نہ پہنی ہوتی تو وہ
خود دوڑ کر احسن کو تھام لیتی۔ مولا بخش احسن کو تھامے ہوئے دروازے
تک لایا۔ پھر بھرائی ہوئی رنجیدہ سی آواز میں بولا:۔
"بی بی صاحب سنبھالو صاحب کو ——— ہم کو گاڑی گیراج
میں کھڑی کرنا ہے۔"

تارا نے لپک کر احسن کا بازو تھاما۔ مگر وہ پورے کے پورے
تارا پر اوندھے سے گرے۔ تارا نے حیران ہو کر احسن کی طرف دیکھا ———
سرخ سرخ آنکھیں ——— بکھرے بال اور پسینے میں تر لباس ———
ایسا حال تو پہلے کبھی بھی نہیں ہوا تھا۔

"احسن ——— احسن!" تارا نے احسن کے بوجھ کو سنبھالنا چاہا۔
نہ جانے کیسے احسن کا چہرہ تارا کے کاندھے سے آ لگا۔ بدبو کا ایک جھونکا
تارا کی ناک کو چھوتا ہوا گزر گیا۔ اس کا بدن لرز کر رہ گیا ——— "اوہ!
یہ بدبو ——— اور آنکھیں بھی سرخ ہیں اور پھر ——— چال
بھی ٹھیک نہیں ——— اللہ یہ تو چل بھی نہیں پا رہے ——— کہیں
کہیں ——— شراب ——— شراب ——— شراب ———"
اس کے کانوں میں ایک ہی صدا گونجنے لگی۔

تارا نے بڑی مشکل سے احسن کو مسہری پر لٹایا ———
وہ پوری طرح ہوش میں نہ تھے۔ تارا ان کی حالت دیکھ دیکھ کر پریشان ہوتی
جا رہی تھی۔ امی کو جگاتے ہوئے دل ڈرتا تھا۔ اور احسن کو اس حالت
میں دیکھ کر خوف آ رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ احسن نے شراب پی
ہے۔ لیکن ان کے منہ سے آنے والی بدبو نے اسے تذبذب میں ڈال
دیا تھا۔ کتابوں میں بھی پڑھا تھا اس نے کہ شراب پینے والے کے منہ
سے بدبو آتی ہے اور وہ اپنے ہوش و حواس کھو دیتا ہے۔
"احسن ——— احسن ——— کیا ہوا ہے آپ کو ——— ؟
احسن پلیز کچھ تو بتایئے نا ——— ؟" تارا نے احسن کے بکھرے بکھرے

تی ہیں مجھ میں —— یقین ہی نہیں آتا اگر میں نہ ہوں ——
ں ہیں تارا ہی تو ہوں —— ایسی ہی تو تھی بس ذرا سمارٹ ہو گئی
ں۔" تارا نے اپنے آپ کو دیکھ کر ہلکے سے ناک چڑھائی۔ وہ پچھلے
پنے اندر ہونے والی تبدیلیوں پر حیران تھی۔ احسن کا جسم بھر رہا تھا۔
ں کے گالوں پر شفق پھوٹنے لگی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک غرور
بلا تمکنت سی آ گئی تھی۔

شاید یہ تمکنت ماں تا کی تھی۔

یہ غرور تخلیق کا غرور تھا۔

کھٹ کھٹاک —— کھٹ کھٹاک —— وال کلاک
نے بارہ بجائے تو اس نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا اور پھر وہ
ہلا گئی۔ "اونہہ —— بارہ بج گئے ہیں —— دوسرا دن شروع ہو گیا
ن آپ کا کہیں پتہ نہیں۔ پہلے تو بڑی جلدی آجاتے تھے۔ سر شام ہی
ند آنے لگتی تھی —— اللہ کیسی منتیں کرتے تھے —— میں نے
یا ستایا —— تو یہ نہ جانے کیا کیا کہہ دیتی تھی میں —— لیکن اب
ما خواہ ہی انتظار کروا رہے ہیں —— ابھی یہ نائٹی واٹی اتار کر
ہی موٹے موٹے کپڑے پہن کر لحاف کے اندر دبک کر سو جاؤں تو ایکدم
ڈ گر ہو جائے گا۔ پھر روٹھے روٹھے پھریں گے کھانا نہیں کھائیں گے۔
ے اس وقت بھی تو نہیں کھایا ہو گا کھانا۔ کیا پتہ سچ مچ ہی کوئی کام
ن آیا ہو۔ ممکن ہے کسی دوست کی طبیعت خراب ہو یا پھر کوئی
حادثہ ...... " لیکن فون تو کرتے نا —— فون بھی تو نہیں آیا۔
م از کم بتا ہی دیتے کہ گئے کہاں —— " اگر امی سے میں جھوٹ نہ
بولتی تو بس مزا ہی آجاتا آج۔

تارا بے زار ہو کر پھر مسہری پر آ بیٹھی —— آج وہ بہت خوش
تی۔ آج امی نے اس سے بہت اچھی اچھی اور بہت ساری باتیں
کی تھیں۔ انھوں نے تارا کا سر اپنے زانو پر رکھ کر اسے اپنے قریب لٹا
یا تھا۔ وہ اسے اپنے خاندان کے بارے میں بتا رہی تھیں۔ احسن کے
ابا اور اپنی ساس کی باتیں کرتے ہوئے انھوں نے کئی بار بڑے پیار
سے اس کے بال سہلائے تو تارا نے خوشی سے جھوم کر آنکھیں موند لی تھیں،
انھوں نے بڑی محبت سے تارا سے کہا تھا۔

"تارا بیٹے کبھی اپنا دل نہ جلانا۔ کوئی بھی بات، کوئی بھی تمنا
ہو تو مجھ سے کہہ دینا۔ میں دیکھ لوں گی سب کو۔ اگر احسن بھی لڑے تو مجھے
بتا دینا۔ میں ٹھیک کر دوں گی انھیں۔" اور تب ہی تارا نے نہ جانے

"امی آپ کو احسن سے بڑی محبت ہے جی، لیکن کیا آپ مجھ سے
بھی اتنی ہی محبت کرتی ہیں؟"

تب امی نے جھک کر اس کی پیشانی چوم لی تھی۔ وہ ہنس کر بولی
تھیں "پگلی بیٹی۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ تم اور احسن کیا جدا
جدا ہو۔ اور سچ پوچھو تو بیٹا میں تو بغیر دیکھے ہی تجھ سے محبت کرنے لگی تھی۔"

"لیکن کیوں امی —— ؟" تارا ایک دم پوچھ بیٹھی۔

"اس لیے بیٹا کہ تم میرے بیٹے بیٹیوں کو جو پسند آ گئی تھیں۔"

"خیر امی آپ کی بیٹیوں کو تو بعد میں پسند آئی تھی پہلے تو
آپ کے ......" نیلما بیچ میں بول پڑی تھی۔ امی نے اسے
چپ کرانے کے لیے اس کی پیٹھ پر ایک دھپ جمادی۔

تارا پھر بچ جھینپ گئی تھی اور نیل شرارت سے مسکراتے جا
رہی تھی۔ ویسے بھی آج دن بھر نیلما نے تارا کو تنگ کیا تھا۔ وہ بات
بے بات تارا کو چھیڑ رہی تھی۔ دراصل وہ خود بے انتہا خوش تھی کہ کتنے
دنوں بعد فرقان نے آنے کا لکھا تھا اور وہ بھی ایک دو دن کے لیے
نہیں پورے ڈھائی مہینے کے لیے۔ کئی بار نیلما نے تارا کو جھنجھوڑ کر کہا،

"فرقان بھائی آ رہے ہیں —— اللہ سچ کتنا مزا آئے گا
جب تک میرے امتحان بھی ختم ہو جائیں گے۔ پھر تو خوب گھومنے چلا
کریں گے۔ خوب باتیں کریں گے اور خوب شرارتیں۔"

اور تارا اتنی بہت سی باتوں کے جواب میں حیرانی سے مسکرا
کر اسے دیکھے جا رہی تھی۔ ایسے موقعوں پر بھائیوں کی محبت کی لذت
سے محروم رہنے کا احساس ایک دم جاگ اٹھتا تھا۔ لیکن دوسرے لمحے ان
احساسات پر خوشی کا خول چڑھا کر نیل کے ساتھ بیٹھ کر پروگرام بنانے
لگتی تھی۔

اس وقت بھی وہ لیٹی ہوئی ادھر ادھر کی باتیں سوچ رہی تھی
احسن کے متعلق سوچتی تھی تو تنہائی کا احساس شدید ہو جاتا تھا اور
پھر اس احساس کے ساتھ ہی ہلکا ہلکا خوف اس کے چاروں طرف
ناچنے لگتا تھا —— کلاک نے کھٹ سے ساڑھے بارہ بجنے
کا اعلان کیا تو وہ ڈر کر چونک گئی۔

"اللہ جی، ساڑھے بارہ بج گئے اور ابھی تک نہیں آئے
احسن —— کیا ہو گیا —— کہیں کوئی ایکسیڈنٹ ——
نہیں نہیں ایکسیڈنٹ کیسے ہو جائے گا —— " خدا نہ کرے ایسا ہو۔"
تارا نے اس خیال کو فوراً رد کر دیا —— " پھر وہ گئے کہاں —— ؟

طبیعت ذرا خراب ہو گئی ہو ——— ؟ ممکن ہے کچھ اور ہو گیا ہو کہیں نواز کو تو کچھ نہیں ہو گیا ——— ؟ اللہ کرے ہو جائے کچھ میری بلا سے ایسے بدطینت اور دھوکہ باز انسانوں کا تو زندہ رہنا بھی ایک المیہ ہے۔ پہلے مجھے اُلّو بنایا اور جب مجھ سے دل بھر گیا تو دولت مل گئی۔ رذیل کہیں کا۔

تارا کے دل سے نفرت کا لاوا بہنے لگا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے سوچا، امی کتنا سچ کہتی تھیں۔ ان کا تجربہ غلط نہیں تھا۔ سب احسن اتنے بُرے بھی نہیں ——— اچھے خاصے تو ہیں، دوسرے پھر سنجیدہ ہیں۔ نواز کی طرح فلرٹ نہیں ——— تارا آنکھیں بند کئے دیکھا نہ جانے کیا کیا سوچ رہی تھی کہ کار کے پہیوں کی چرچراہٹ نے اسے ایک بار پھر ڈرا دیا۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

"شاید وہ آ گئے ——— لیکن گیٹ کون کھولے گا ——— مولا بخش تو سو گیا ہو گا ——— کیا میں جاؤں گیٹ کھولنے ——— اُسے اتنا اندھیرا ہو گا اور اتنی دور بھی تو ہے گیٹ ——— کیا پتہ کوئی اور ہو ———" تارا نے کان آواز کی سمت لگا دیے۔ گاڑی ان کے گیٹ کے پاس آ کر رک گئی تھی۔ اور پھر گاڑی نے ہارن بھی دیا تھا۔ رات کے سناٹے میں کار کے دروازے کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز صاف سنائی دی تھی۔ تارا تیزی سے بستر سے اُٹھ کر کھڑکی کے قریب چلی آئی۔ کھڑکی کا پٹ کھول کر اس نے باہر کی جانب جھانکنا چاہا لیکن اسے کچھ نظر نہ آیا۔ کھڑکی کے اُس طرف چار دیواری آڑے بن گئی تھی۔ تارا نے ڈریسنگ ٹیبل کا اسٹول کھینچ کر کھڑکی کے پاس کر لیا۔ اسٹول پر کھڑے ہو کر اس نے دیکھا کوئی شخص کسی دوسرے آدمی کو سہارا دے کر اُتار رہا تھا۔ تارا کا دل دھک سے ہو گیا ——— اس نے سوچا یہ دوسرا کون ہے ——— ؟ احسن تو اکیلے گئے تھے۔ اور یہ آدمی احسن جیسا تو نہیں لگ رہا۔ کہیں وہ دوسرے والے احسن تو نہیں ——— لیکن نہیں ——— انہیں کیا ہو گا جو دوسرا سہارا دے کر اتاریں گے، اللہ کرے یہ احسن نہ ہوں ——— اللہ کرے یہ احسن نہ ہوں ——— تارا نے جلدی جلدی دعا مانگنی شروع کر دی۔ لیکن ہیڈ لائٹس کی روشنی میں تارا نے دیکھ لیا وہ احسن ہی تھے ——— اس کا سر گھومنے لگا کانوں میں سیٹیاں بجنے لگیں ———

ایکسیڈنٹ ! ——— ایکسیڈنٹ ! ——— ایکسیڈنٹ !!

بس صرف یہی لفظ تھا جو تارا کے کانوں میں گونجے جا رہا تھا وہ دوڑ کر مسہری پر آ بیٹھی۔ مسہری پر بیٹھ کر اپنے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر تارا نے سچے دل سے دعا مانگی۔

"اچھے اللہ میاں ہمیشہ اوپر رہنا ——— مجھ سے میری خوشیاں نہ چھیننا ورنہ لوگ مجھے منحوس کہنے لگیں گے ——— تجھے تو پتہ ہے اللہ میاں کہ مجھے کبھی کوئی خوشی راس نہیں آئی۔"

تارا نے کال بیل کی آواز سنی لیکن وہ سہمی ہوئی بیٹھی رہی۔ دوسری دفعہ کال بیل بجی اور تیسری دفعہ شاید مولا بخش نے گیٹ کھول دیا تھا۔ تارا دوڑ کر کمرے کے دروازے کے قریب آ کھڑی ہوئی۔ آہستہ آہستہ اس نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ دالان میں مولا بخش احسن کو سہارا دے کر کمرے کی طرف لا رہا تھا۔ اگر تارا نے نائٹی نہ پہنی ہوتی تو وہ خود دوڑ کر احسن کو تھام لیتی۔ مولا بخش احسن کو تھامے ہوئے دروازے تک لایا۔ پھر بھرائی ہوئی رنجیدہ سی آواز میں بولا:

"بی بی صاحب سنبھالو صاحب کو ——— ہم کو گاڑی گیراج میں کھڑی کرنا ہے۔"

تارا نے لپک کر احسن کا بازو تھاما۔ مگر وہ پورے کے پورے تارا پر اوندھے گئے۔ تارا نے حیران ہو کر احسن کی طرف دیکھا ——— سرخ سرخ آنکھیں ——— بکھرے بال اور پسینے میں شرابور ——— ایسا حال تو پہلے کبھی بھی نہیں ہوا تھا۔

"احسن ——— احسن" تارا نے احسن کے بوجھ کو سنبھالنا چاہا۔ نہ جانے کیسے احسن کا چہرہ تارا کے کاندھے سے آ لگا۔ بدبو کا ایک جھونکا تارا کی ناک کو چیرتا ہوا گزر گیا۔ اس کا بدن لرز کر رہ گیا ——— "اوہ! یہ بدبو ——— اور آنکھیں بھی سرخ ہیں اور پھر ——— چال بھی ٹھیک نہیں ——— اللہ یہ تو چل بھی نہیں پا رہے ——— کہیں کہیں ——— شراب ——— شراب ——— شراب ———" اس کے کانوں میں ایک ہی صدا گونجنے لگی۔

تارا نے بڑی مشکل سے احسن کو مسہری پر لٹایا ——— وہ پہلے ہی ہوش میں نہ تھے۔ تارا ان کی حالت دیکھ دیکھ کر پریشان ہوتی جا رہی تھی۔ انہیں جگاتے ہوئے دل ڈرتا تھا۔ اور احسن کو اس حالت میں دیکھ کر خوف آ رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ احسن نے شراب پی ہے۔ لیکن ان کے منہ سے آنے والی بدبو نے اسے تذبذب میں ڈال دیا تھا۔ کتابوں میں یہی پڑھا تھا اس نے کہ شراب پینے والے کے منہ سے بدبو آتی ہے اور وہ اپنے ہوش و حواس کھو دیتا ہے۔

"احسن ——— احسن ——— کیا ہوا ہے آپ کو ——— ؟ احسن پلیز کچھ تو بتائیے نا ——— ؟" تارا نے احسن کے بکھرے بکھرے

بال اپنی انگلیوں سے سمیٹتے ہوئے کہا۔ احسن نے سرخ سرخ آنکھیں کھول کر اپنے اوپر جھکے ہوئے چہرے کو دیکھا اور اجنبی لہجے میں بولے

"مجھے کیا ہوا ـــــ؟ کیا ہوا ہے مجھے ــــــ میں تو ٹھیک ہوں ـــــ بالکل ـــــ ٹھیک ـــــ پر تم کون ہو ـــــ؟ حور ہو ـــــ؟ حور ہو نا ـــــ؟ جنت کی آؤ پھر میرے پاس آجاؤ ـــــ پر ـــــ پر ـــــ نخرہ نہیں دکھانا وہ تو نخرہ دکھاتی ہے سالی ـــــ" احسن بھاری آواز میں اٹک اٹک کر بول رہے تھے۔

تارا کا چہرہ غصے، پریشانی اور خوف کے جذبات سے جھلسنے لگا۔

"احسن ـــــ احسن یہ آپ نے کیا کیا ـــــ؟" اس نے احسن کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا ـــــ "احسن آپ کو میرا بھی خیال نہیں آیا ـــــ؟ امی کو اگر پتہ چل جائے تو ـــــ؟ انہیں کتنا صدمہ ہوگا۔ احسن ـــــ؟ اف احسن یہ آپ نے کیا کیا ـــــ" وہ گھبرا کر رونے لگی۔ اس کی آنکھوں سے ڈھیروں گرم گرم آنسو ابل پڑے ـــــ اس کا جی چاہا کہ وہ دوڑ کر جائے اور امی کو بلا لائے ـــــ وہ دروازے تک گئی بھی، لیکن پھر نہ جانے کیا سوچ کر پلٹ آئی ـــــ احسن خدا جانے کیا بڑبڑا رہے تھے۔ تارا کچھ دیر تک احسن کو دیکھتی رہی اور پھر ایک دم اسے کچھ خیال آگیا۔ وہ تولیے کو غسل خانے کی طرف بھاگی۔ احسن اس کا ہاتھ پکڑتے ہی رہ گئے لیکن وہ احسن کے منہ پر گیلا تولیہ پھیرتی رہی اور پھر اس نے بغیر سوچے سمجھے احسن کے سر پر گیلا تولیہ نچوڑ دیا۔ ساری چادر گیلی ہوگئی۔ کچھ پانی قالین پر بھی جا گرا لیکن تارا نے ذرا بھی پروا نہ کی۔ احسن باقاعدہ شور مچانے لگے تھے، تارا نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ امی کی آنکھ کھل جائے اور وہ احسن کو اس حالت میں دیکھ لیں۔ اسی لیے وہ جلدی سے دوبارہ تولیہ بھگو لائی۔ دوسری بار اس نے تولیہ احسن کے سر پر نچوڑنا چاہا تو احسن نے اسے ایک طرف دھکیل دیا۔ وہ اگر مسہری کے تکیے کو نہ پکڑ لیتی تو یقیناً گر جاتی۔

اب احسن کی آنکھوں میں خمار کی بجائے غصہ تھا۔ وہ اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے غصے سے کہہ رہے تھے "کون ہے یہ بدتمیز؟ سارے کپڑے گیلے کر دیئے۔"

تارا سکون کا سانس لے کر مسہری کے دوسری طرف قالین پر بیٹھ گئی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر احسن کے جوتوں کے فیتے کھولے۔ وہ احسن کو شرمندہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اسے نہ جانے کیوں اپنی زیادتی کا احساس آجکل بڑی شدت سے ہونے لگا تھا اور وہ ان سب زیادتیوں کا ازالہ کرنا چاہتی تھی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ احسن کا نشہ کم ہوتا جا رہا ہے۔ وہ اپنے کپڑے، بال اور بستر گیلا ہو جانے کی وجہ سے پریشان ہیں۔ انھوں نے گردن گھما کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرتے ہوئے انھوں نے بے اختیاری سے اپنی آنکھیں رگڑیں شاید وہ یاد کر رہے تھے کہ وہ کہاں تھے اور انھیں کیا ہوا تھا۔ گلے سے ٹائی کھول کر ایک طرف پھینکتے ہوئے احسن نے اپنے پیر سمیٹنے چاہے تو تارا نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا وہ سر جھکا کر مسہری کی آڑ میں ہو گئی۔

"لاحول ولا ـــــ کیا مصیبت ہے یار ـــــ سب کچھ ہی گیلا ہو رہا ہے۔" احسن نے غصے میں آکر اپنے سر کے نیچے سے تکیہ نکال کر صوفے پر اچھال دیا۔ وہ قمیض کے بٹن کھول کر قمیض بھی اتار رہے تھے۔ تارا آہستہ سے کھسک کر آگے بڑھی اور پھر اٹھ کر مسہری پر بیٹھ گئی اس نے ہاتھ بڑھا کر احسن کا جوتا اتارنا چاہا۔ احسن نے کسی کی انگلیوں کا لمس پا کر سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں نفرت کی لہریں تڑپ اٹھیں ـــــ تارا نے ان لہروں کا اضطراب کہاں دیکھا تھا۔ وہ تو سر جھکائے ہوئے ہولے ہولے مسکرا رہی تھی۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے۔ ہونٹوں پر جمی ہوئی سرخی نے قیامت اٹھا رکھی تھی اور سفید نائلون کی نائٹی اس کے پرکشش جسم کے سارے راز آشکارا کئے دے رہی تھی ـــــ احسن غصے سے اس خوب صورت لڑکی کو دیکھتے رہے جو اس وقت ایک وفا شعار شوہر پرست بیوی کی طرح اپنے شوہر کے جوتے اتار کر اپنی شدید محبت کا اظہار کرنا چاہتی تھی۔ انھوں نے کوئی سخت سی بات کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ کسی نے آہستہ آہستہ دروازے پر دستک دی "کھٹ ـ کھٹ ـ کھٹ"

دونوں نے ایک ساتھ چونک کر دروازے کی طرف دیکھا ـــــ اس سے پہلے کہ احسن کچھ کہتے تارا دوڑ کر دروازے پر چلی گئی۔ تھوڑا سا دروازہ کھول کر اس نے پوچھا "کون ہے ـــــ؟"

"میں ہوں مولا بخش ـــــ یہ موٹر کار کی چابی ہے بی بی جی میں نے گاڑی بند کر کے گیراج میں کھڑی کر دی ہے۔"

"اچھا اچھا ـــــ ٹھیک کیا تم نے ـــــ جاؤ اب سو جاؤ۔" تارا نے ہاتھ بڑھا کر چابی لے لی۔ اور پھر دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھا کر پردے برابر کرتے ہوئے اس نے پلٹ کر مسکراتے ہوئے بڑی شوخی سے احسن کی طرف دیکھا۔ وہ بیزار ہو کر لاتعلقی سے بس اس کی طرف دیکھ رہے تھے ان کے چہرے پر کوئی میٹھا جذبہ، کوئی شدید رنگ نہیں تھا۔ وہ بنیان

اور سینٹ پہنے جوتوں سمیت مسہری پر آلتی پالتی مار سے بیٹھے تھے۔ بال گیلے ہو کر ماتھے سے چپک گئے تھے، چہرہ کچھ سوجا سوجا سا تھا۔ آنکھوں میں گلابی رنگ گھل گیا تھا، بنیان بھی گیلی ہو کر سینے سے چپک گئی تھی۔ وہ رو دینے ہونے بچے کی طرح خشمگیں نظروں سے تارا کو دیکھ رہے تھے۔ تارا ان کا یہ عجیب و غریب حلیہ اور موڈ دیکھ کر بے ساختہ ہنس پڑی۔ ہنستے ہنستے وہ مسہری کے قریب آئی اور ذرا سا جھک کر بولی

"کیا حال ہیں سرکار؟"

"بکواس بند کرو۔" احسن غصے سے چیخ پڑے۔ تارا ہنستے ہنستے ایک دم چپ ہو گئی، لیکن دوسرے ہی لمحے مسکرا کر بولی:

"معلوم ہوتا ہے نشہ ابھی باقی ہے ——— خمار ابھی اترا نہیں بائی دا وے کتنے پیگ پیے تھے حضور ——— ؟" اس نے شرارت سے احسن کی آنکھوں کے سامنے انگلیاں نچائیں تو احسن نے جھپٹ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور پھر ایک جھٹکا دے کر اسے ایک طرف دھکیلتے ہوئے وہ خونخوار لہجے میں بولے۔

"ان اداؤں کی اب مجھے ضرورت نہیں رہی ——— اپنی یہ ادائیں جا کر اسی کو دکھاؤ جس کے ساتھ عیاشیاں کرتی تھیں۔"

تارا نے ہر چند سنبھلنا چاہا لیکن اس غیر متوقع جھٹکے سے وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکی۔ وہ قالین پر دھم سے گر پڑی۔ اس کا پیر مڑ گیا تھا لیکن اسے اپنی چوٹ کی اتنی فکر نہیں تھی۔ جتنی احسن کے اس بدلے ہوئے رویے کی۔ وہ اس عتاب کے لیے تو ہرگز تیار نہ تھی۔ وہ تو آج کی رات کے لیے نہ جانے کتنی ہی میٹھی میٹھی محبت بھری باتیں اپنے دامن میں باندھے بیٹھی تھی۔ لیکن اس جھٹکے نے وہ ساری چاہتیں بکھیر دی۔ اس نے پریشان ہو کر احسن کی طرف دیکھا اور پھر آہستہ آہستہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ احسن نے جوتے اتار کر فرش پر پھینک دیئے تھے۔ وہ اس کی طرف پیٹھ کر کے کھڑے ہو گئے تھے۔ انھوں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر کسی چیز کو ٹٹولا اور پھر خالی ہاتھ باہر نکال کر چیختے ہوئے لہجے میں بولے۔

"سنو تارا بیگم مجھے تم سے نفرت ہے شدید نفرت ——— تم آئندہ مجھ سے بات کرنے کی کوشش مت کرنا ——— اور ہاں میں نہیں چاہتا کہ تم میرے قریب آؤ یا میرے پاس سوؤ۔ اس لیے اب تم صوفے پر سویا کرو گی اور میں مسہری پر ——— اگر تمہیں کوئی اعتراض ہو تو تم جہاں چاہو وہاں سو سکتی ہو۔ میں تمہیں نہیں بلاؤں گا۔"

تارا پوری آنکھیں کھولے حیرت سے احسن کی پیٹھ کو تکتی رہی۔

اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی احسن ہیں جو صبح اسے خدا حافظ کہتے ہوئے یوں گلے مل کر گئے تھے جیسے پکنک جانے کی بجائے محاذ پر جا رہے ہوں۔ اس نے کتنی کوشش کی تھی ان کی بانہوں کے شکنجے سے نکل جانے کی لیکن وہ تو شرارت پر تلے بیٹھے تھے۔ اس نے کتنی لجاجت سے کہا تھا "احسن پلیز دیکھیں دروازہ کھلا ہے نیلما یا امی آ جائیں گی۔" لیکن وہ اس کے بالوں کی شریر لٹ کھینچتے ہوئے بولے تھے۔

"آ جائیں گی تو آ جانے دو، ڈرتی کیوں ہو، میں تمہیں بھگا کر تو نہیں لایا تھا اگر تم بھاگ کر "تم تو ——— ؟" اور اس نے جھینپ کر احسن کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ احسن اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے ڈالے دروازے کی طرف آنے لگے تو اس نے احسن کے کاندھے پر سر رکھ کر بڑی لجاجت سے کہا تھا۔

"احسن پلیز ——— فار گاڈ سیک" پھر ہنس کر ان کے آگے دونوں ہاتھ جوڑے تو وہ اس کے بالوں پر ہلکے سے کس کرتے ہوئے بولے تھے۔

"پہلے ایک وعدہ کرو جان ———"

تارا نے شرما کر آہستہ سے کہا تھا "وعدہ! مگر کیا وعدہ؟"

"یہ وعدہ کرو کہ تم میرا انتظار کرو گی، یعنی میرے آنے سے پہلے سو نہیں جاؤ گی۔ دوسرے یہ کہ جب آؤں تو تمہیں بنک بیک سنورا ہوا پاؤں یعنی ایک دم ریڈی تا کہ پھر ہم کہیں گھومنے جا سکیں، کسی مووی پر یا پھر ہاکس بے چلیں گے۔" احسن نے تارا کو بازوؤں سے پکڑ کر جھلاتے ہوئے کہا تھا۔ اور تارا نے ہنستے ہنستے ہاتھ بڑھا کر کہا تھا۔

"چلو بابا وعدہ ———!" اور احسن نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چوم لیا تھا۔ اور تارا ایک دم گھبرا گئی تھی۔ اس نے سامنے سے امی کو آتا دیکھ لیا تھا۔ اس لیے وہ فوراً باتھ روم میں چلی گئی تھی۔ اس وقت بھی تارا سوچ رہی تھی کہ وہ اس کمرے سے نکل کر کہیں چلی جائے لیکن وہ کہاں جا سکتی تھی اور پھر اسے یہ یقین کہاں آیا تھا کہ احسن سچ مچ سیریس ہیں ——— وہ تو ان باتوں کو صرف نشہ کا خمار سمجھ کر احسن سے ڈر رہی تھی ——— اس نے آہستہ سے سر اٹھا کر احسن کی طرف دیکھا۔ وہ کھڑکی کے پاس کھڑے سگریٹ کے بڑے بڑے کش لے رہے تھے۔ تارا نے ایک نظر اپنے بدن پر ڈالی اور وہ خاموشی سے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اسے ایک دم بے انتہا تھکن محسوس ہونے لگی تھی۔

"تارا ———" احسن اسے پکار رہے تھے۔

"جی ———" وہ سنبھل کر بولی۔ ایک انجانے خوف نے اسے

اپنی پیشانی سے لیا تھا۔

"تمھارا لاکٹ ملا ——؟"

"جی —— جی نہیں —— وہ —— وہ تو نہیں ملا۔"

وہ رک رک کر بولی۔ اس سوال کی تو اسے قطعی امید نہیں تھی۔ اب اسے احساس ہونے لگا تھا کہ یہ صرف نشہ نہیں کچھ اور بھی ہے۔

"کیوں نہیں ملا ——؟ تم نے ڈھونڈا کیوں نہیں ——؟ وہ اتنی سستی چیز نہیں کہ اسے ڈھونڈنے کی زحمت ہی گوارا نہ کرو ——"

احسن نے سلگتے ہوئے لفظ تارا کی طرف اچھالے تو وہ ششدر رہ گئی۔ اس نے بے اختیاری سے احسن کی طرف دیکھا اور اپنے ڈوبتے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔ آنکھوں میں آنسو آپ ہی آپ امڈے چلے جا رہے تھے۔ "یا اللہ یہ بن مانگا عذاب کیوں بخش دیا تو نے۔ آج صبح یہ شخص اتنا مہربان، اتنا شفیق، اتنا ہمدرد تھا۔ لیکن اب یہ اتنا بدل گیا ہے کہ پہچانا ہی نہیں جاتا ——" تارا نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر آنسو چھپانا چاہے لیکن احسن نے پلٹ کر ایک نظر تارا کو دیکھا اور اکھڑ لہجے میں بولے۔

"محترمہ آنسو بہا کر لاکٹ ہضم کرنے کی کوشش نہ کریں۔ وہ لاکٹ آپ نے جسے بھی بخشا ہے دو دن کے اندر اندر اس سے واپس مانگ لائیے ورنہ......" احسن نے غصے میں بستر کی میلی چادر کھینچ کر ایک طرف پھینکتے ہوئے جملہ ادھورا ہی چھوڑ دیا۔ تارا نے آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹا کر احسن کو دیکھا اور تڑپ کر بولی۔

"ورنہ آپ کیا کر دیں گے —— بس گولی ہی ماریں گے نا۔ تو ابھی مار دیجیے۔ کیونکہ میں نے ہر جگہ لاکٹ ڈھونڈ لیا۔ وہ کہیں نہیں ملا۔ اور مجھے کیا ضرورت تھی کہ میں وہ لاکٹ کسی کو بخش دیتی۔ ویسے نشہ خاصا اچھا رہا۔ وہ چار پیگ ہی آپ کو حساب کتاب میں ماہر کر گئے۔"

"بکواس بند کرو —— میں تمھاری زبان سے اور کچھ نہیں سننا چاہتا۔ مجھے سب کچھ پتہ ہے۔ اب میرے خلاف اپنے آنسوؤں کے ہتھیار مت استعمال کرنا۔ اب ان کا ہر وار خالی جائے گا۔" احسن غصے میں اکڑ کر مسہری پر لیٹ گئے۔

"مجھے لگتا ہے آج آپ نے شراب ہی سے نہیں بھنگ اور چرس سے بھی شغل فرمایا ہے۔" تارا نے وہیں بیٹھے بیٹھے جواب دیا تو احسن غصے سے تلملا کر اٹھ بیٹھے۔ وہ تیر کی طرح سیدھے تارا کے پاس پہنچے اور ایک تھپڑ اس کے گال پر جما دیا۔ وہ چکرا کر رہ گئی۔ اس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ احسن اس پر ہاتھ اٹھائیں گے۔ اور بغیر کوئی وجہ بتائے، بنا کسی قصور کے ——

"اللہ جی! کیا ہو گیا ہے انہیں ——؟" تارا نے ایک سسکاری بھر کر گال پر ہاتھ رکھ لیا۔ آنکھوں سے گرم پانی کے چشمے ابل پڑے —— وہ سسکیاں لے لے کر رونے لگی تھی۔ اس کے کانوں میں احسن کی آواز لاوے کی طرح اترتی چلی گئی۔ وہ کہہ رہے تھے۔

"اب یہ ڈھکوسلے نہیں چلیں گے —— پہلے ہی میں بہت دھوکے کھا چکا ہوں۔ تارا بی بی تم عیش کرتی رہیں۔ رنگ رلیاں مناتی اپنے عاشق کے ساتھ محبت کی پینگیں بڑھاتی رہیں اور ادھر ہم تمہارے فراق میں جلتے رہے، سسکتے رہے —— پہلے جہاں دونوں ہاتھوں سے محبتیں سمیٹی ہیں سو اب یہ نفرتیں بھی سہو۔ میں تم سے نفرت کرتا ہوں، شدید نفرت ——"

"لیکن کیوں ——؟" تارا بے اختیار پوچھ بیٹھی۔

"اس لیے کہ تم آوارہ ہو، دھوکہ باز ہو، تم نے مجھے دھوکہ دیا تم دراصل نواز سے محبت کرتی رہی ہو اور مجھے دھوکہ دیتی رہی ہو۔ حیرت ہے کہ تم اس قدر معصومیت سے کیسے کہتی تھیں کہ میں کسی کو نہیں جانتی، میرا کوئی عاشق نہیں۔ تم مجھے دھوکا دینے کے لیے اسی جگہ سے گئی تھیں جس نے تمہیں کہیں کا نہ رکھا۔"

نواز کا نام سن کر تارا کا دل دھک سے ہو گیا۔ اس کے چہرے پر زردی پھیلنے لگی۔ لیکن اس نے حوصلہ کر کے بڑے ضبط سے کہا۔

"محبت کرنا جرم تو نہیں، محبت تو آپ نے بھی کی تھی، ڈاکٹر صاحب ——"

"وہ محبت نہیں تھی ایک حماقت تھی۔ سراسر ایک نادانی تھی" ڈاکٹر احسن جھلا کر بولے تھے۔

"اور اگر میں بھی یہ کہوں کہ میری محبت بھی ایک حماقت تھی ایک نادانی تھی تو کیا آپ اعتبار کر لیں گے۔" تارا نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"نہیں —— ہرگز نہیں —— میں کبھی بھی تمھاری بات کا اعتبار نہیں کر سکتا —— تم جیسی لڑکیاں محبت نہیں کر سکتیں صرف عیاشیاں کر سکتی ہیں۔"

"آپ حد سے بڑھ رہے ہیں احسن۔ میں اب زیادہ برداشت نہیں کر سکتی۔ آپ مجھے مار سکتے ہیں، پیٹ سکتے ہیں لیکن میری عزت پر کوئی کیچڑ......"

"اوہو! بڑی عزت ہے آپ کی اور بڑا صاف ستھرا اور مضبوط کریکٹر رکھتی ہیں آپ! جبھی تو آپ کسی غیر مرد کے بستر تک جا پہنچتی ہیں۔" احسن نے بڑی سفاکی سے کہا۔ تارا بے اختیار ہو کر زور سے چیخ اٹھی ——

"احسن ـــــــ"

اور احسن نے اس کے نوٹوں کو بہ نکر کو گھورتے ہوئے کہا

"زیادہ چیخنے کی ضرورت نہیں ہے میرے پاس ثبوت موجود ہے یہ بتاؤ تمہارے پاس اپنی بے گناہی اور پاک دامنی کا کیا ثبوت ہے؟"

"ہیں کہ...... میرے پاس تو بہت اچھا ثبوت موجود ہے اگر...... اگر میں پاک دامن نہ ہوتی تو تمہارا" تارا بولتے بولتے ایک دم رک گئی۔ اس نے اپنا نچلا ہونٹ اپنے دانتوں سے چبا ڈالا۔ اس کے چہرے پہ خوف کی پلدی پھیل گئی......

"بولو ـــــ بولو چپ کیوں ہو گئیں کیا کوئی نیا جھوٹ کوئی نیا بہانہ نیا افسانہ سمجھ میں نہیں آیا ـــــ؟" احسن نے بیٹھ موڑتے موڑتے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ لیکن وہ چپ رہی اس نے ہتھیلیوں کی پشت سے آنسو پونچھے اور وارڈ روب میں سے چادر نکالنے لگی دھلی ہوئی سفید چادر اور سفید تکیہ کا غلاف نکال کر وہ مسہری کی طرف چلی گیلی چادر باتھ روم میں ڈال کر وہ مسہری پر دوسری چادر بچھانے لگی اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا اور چہرے پر اداسی اور زردی بھی ہوئی تھی مگر وہ بھینچے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ بڑی مستعدی سے چادر بچھا رہی تھی اور احسن کھڑکی کی طرف منہ کئے سگریٹ کے کش لگا رہے تھے۔

ٹن سے کلاک نے ایک گھنٹہ بجا دیا۔ تارا نے سر اٹھا کر وال کلاک کی طرف دیکھا رات کا ڈیڑھ بج چکا تھا۔ وہ چادر بچھانے کے بعد تکیے پہ غلاف چڑھانے لگی تو احسن نے پلٹ کر اسے دیکھا اور پھر ناگواری سے سگریٹ کے کش لینے لگے۔ تارا مسہری پہ تکیہ رکھنے کے لئے ان کے قریب سے گزری تو وہ فوراً اس کی طرف پلٹ گئے۔

"ہونہہ، تو تمہارے پاس کوئی ثبوت نہیں...... اس کا مطلب ہے کہ تم سچ مچ آلودہ ہو......" احسن نے تارا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا تو وہ آنکھوں کی کور پر اٹکے ہوئے آنسو سنبھالتے ہوئے بے اختیار نفی میں سر ہلا بیٹھی۔ اس کا چہرہ زرد تھا اور اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ احسن اسے دیکھ کر دھیرے سے مسکرائے اور پھر با قاعدہ ہنستے ہوئے بولے "تارا بیگم اب میں تمہاری آنکھوں پہ ایمان نہیں لاؤں گا۔ بے ایمان آنکھیں ہیں اور لب ہیں دکھاتے ان کانپتے ہونٹوں کی زبان بھی نہیں سمجھوں گا کیونکہ میں جان چکا ہوں کہ یہ مکار اور جھوٹے ہونٹ ہیں زہریلے ہونٹ ہیں...... انہی ہونٹوں نے مجھے ڈس لیا ہے۔"

صحیح تشخیص

ایک صاحب کافی عرصے سے ایک ڈاکٹر کے زیر علاج تھے لیکن انہیں کوئی افاقہ نہیں ہو رہا تھا۔ ایک دن جھلا کر انہوں نے اپنے ڈاکٹر سے کہا۔ "جناب میں دوسرے ڈاکٹر کے پاس گیا تھا اس نے بتایا کہ آپ کی تشخیص غلط ہے۔"

ڈاکٹر نے جواب دیا "ٹھیک ہے آپ اس ڈاکٹر سے علاج کرائیں۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ خود بتا دے گی کہ کس کی تشخیص صحیح تھی۔"

آنکھوں کی کور پر اٹکے ہوئے آنسو گالوں پہ سے ڈھلک کر احسن کے قدموں میں جا گرے۔ اس نے ایک لمحے کے لئے آنکھیں موند لیں اور پھر پوری پوری آنکھیں کھول کر وہ لرزتے ہوئے لہجے میں بڑی آہستگی سے بولی "میرے ہونٹوں نے آپ کو ڈس لیا ہے؟ اس کا مطلب ہے کہ میں ناگن ہوں، ٹھیک ہے احسن آپ کی مرضی آپ جو خطاب بھی دیں۔" وہ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر بڑے کرب سے سسکی۔

"لیکن یہ خطاب کچھ ایسا غلط بھی نہیں ہے میں سمجھتا ہوں تمہارے شایان شان ہے تمہیں برا نہیں ماننا چاہیئے۔" احسن سپاٹ لہجے میں کہتے ہوئے مسہری پر جا لیٹے۔

"میں نے کب برا مانا ہے ـــــ" تارا صوفے پہ جا بیٹھی۔

"مان بھی کیسے سکتی ہو۔ جب آدمی مجرم ہو اور پھر اس کی پشت پناہی کرنے والا خود سہاروں کا محتاج ہو جائے تو اسے تھپیڑے ڈالنا ہی پڑتے ہیں ـــــ" احسن نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔

"لیکن میں مجرم نہیں ہوں۔" تارا کی آواز میں بڑی شدت تھی۔

"کیا ثبوت ہے ـــــ؟" احسن نے چادر اپنے اوپر کھینچتے ہوئے پوچھا۔

"ثبوت ـــــ میرا ثبوت تو میری زبان ہے میرا لہجہ ہے مجھے اعتراف ہے کہ میں نواز سے محبت کرتی تھی لیکن اب یہ بات پرانی ہو چکی ہے۔ ہم دونوں ایک ہی کالج میں ایک ہی کلاس میں پڑھتے تھے شاید ہم دونوں کی عمریں ایک جیسی تھیں یا نہ ہوں۔ ہم دونوں میں انڈر اسٹینڈنگ سی پیدا ہو گئی تھی۔ میں خود کو اس کی امانت سمجھتی تھی۔ وہ بھی نا سمجھ تھا میں نے اس سے صرف شادی کرنا چاہی تھی۔ جاہت

طور پر قانونی طریقے سے اس کی بیوی بن جاتا تھا لیکن ایسا نہیں ہو سکا اور اب اگر آپ ذہنی وابستگی کو آوارگی اور بدکرداری سمجھتے ہیں تو ٹھیک ہے میں گناہگار ہوں آپ جی بھر کر سزا دے لیجئے اور ایسی سزا دیجئے کہ میں اس زندگی کے عذاب سے نجات پا جاؤں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"نہیں ——— بس یہی تو نہیں ہوگا ——— میں چاہتا تو تم دونوں کو شوٹ کر سکتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا کہ مجھے پھانسی ہو جاتی اور اخباروں میں ایک چھوٹی سی خبر لگ جاتی کہ ڈاکٹر نے اپنی بیوی اور اس کے آشنا کو قتل کر دیا ——— لیکن اب میں چاہتا ہوں کہ اخبار میں خبر کچھ اس قسم کی آئے کہ ڈاکٹر کی بیوی نے اپنے محبوب کی موت کے غم میں خودکشی کر لی۔ اس کا یہ محبوب اس کا بھتیجا تھا جو گولی لگنے کے اتفاقی حادثہ کا شکار ہو کر جانبر نہ ہو سکا ——— ہوں، کیسی رہے گی یہ خبر ———" احسن نے کروٹ بدل کر تارا کی طرف رخ کیا۔ مگر وہ تو دونوں کانوں پر ہاتھ رکھے ہونٹ دانتوں میں دبائے آنکھیں بند کیے یوں پڑی تھی جیسے وہ یہ سب سننا نہ چاہتی ہو ———

"بس اتنا ہی حوصلہ ہے ———" ڈاکٹر احسن اس کی طرف دیکھ کر ہنس پڑے۔ "گھبراؤ مت میں ساری سزائیں ایک ساتھ دینا نہیں چاہتا۔ آج اتنی ہی سزا کافی ہے۔"

تارا نے آنکھیں کھول کر بستر پہ لیٹے ہوئے اس سفاک آدمی کو دیکھا جو کبھی محبتوں کا پیکر تھا جس کی زبان نرم نرم لہجے میں لفظوں کے پھول گوندھتی تھی۔ اسے آج احساس ہوا تھا کہ سمندروں کی طرح وسیع خاموش اور گہرے لوگ جب بپھر جائیں تو پھر کچھ ایسا ہی حال ہوتا ہے۔ پہلے اس نے خود اس سمندر جیسے گہرے آدمی کے سینے میں کتنے پتھر ڈالے کتنے زہر گھولے لیکن جب بپھرنے لگا ہے اس کی پہلی ہی لہر نے اسے سر سے پاؤں تک لرزا کر رکھ دیا۔

اس کا دم گھٹنے لگا تھا وہ تھکتی جا رہی تھی۔ وہ وہیں صوفے پر پاؤں پھیلا کر لیٹ گئی۔ اس نے آنکھیں موند لیں تو کانوں میں احمد ندیم کا بھولا بسرا شعر ہولے ہولے اترنے لگا۔

اب ترا در چھوڑ کے جاؤں گا تو کہاں جاؤں گا
گھر میں گھر جاؤں گا صحرا میں بکھر جاؤں گا!!

گھر میں گھر جاؤں گا صحرا میں بکھر جاؤں گا ——— گھر میں گھر جاؤں گا ——— وہ زیرِ لب وہی شعر دہراتی گئی اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے دل کی دھڑکن کو زبان مل گئی ہے ———

وہ تارا جو خود احسن سے اپنے گناہوں کی سزا مانگ بیٹھی تھی اب سزا کاٹتے کاٹتے تھک چکی تھی۔ اس کے گالوں کے گلاب مرجھا گئے۔ آنکھوں کے کنول زرد پڑ گئے۔ وہ ہونٹ جنہیں کبھی گلاب کی پنکھڑیوں سے تشبیہ دی جاتی تھی اب سوکھی ہوئی قاشیں بن کر رہ گئے تھے۔ لفظوں کے کوڑے اور طعنوں کے تازیانے کھا کھا کر اس کی روح پر نیل پڑ گئے تھے۔ احسن جتنا بڑا صابر تھا اتنا ہی بڑا جابر ثابت ہوا۔ وہ اسے قطرہ قطرہ زہر دے رہے تھے اور وہ بڑے حوصلے سے یہ زہر پی رہی تھی اس کی پیشانی پر کبھی کوئی سلوٹ نہیں پڑی۔ اس نے اس رات کے بعد کبھی کوئی احتجاج نہیں کیا۔ نہ کبھی اپنی بے گناہی کا ثبوت پیش کرنے کی کوشش، نہ اپنی پاک دامنی کا یقین دلایا۔ وہ تو چپ کی چادر میں اپنے آپ کو چھپا کر مٹی کی مورت بن گئی تھی ایسی مورت جو پوجنے کے لئے نہیں تھی صرف ٹوٹنے کے لئے تھی۔ احسن اسے بار بار توڑتے اور وہ ہر بار اپنی ذات کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو سمیٹ کر نئے پیکر میں ڈھل جاتی۔ اور احسن جل جاتے تھے۔ شاید وہ چاہتے تھے کہ تارا ان کے سامنے روئے گڑگڑائے، اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کی کوشش کرے، اپنے گناہوں کی معافی مانگے اور وہ اسے ٹھکرائیں ذلیل کریں اور تڑپائیں لیکن وہ تھی کہ ہزار ٹھوکریں کھا کر بھی پتھر کی طرح خاموش تھی۔ اس کے لئے سارے ہی راستے بند ہو چکے تھے اور اگر وہ راستے کھلے بھی ہوتے تو اس وقت وہ پلٹ کر ان راستوں پر ہرگز نہ جاتی۔ اس کی خودداری اس کی انا ہی تو اس کا سب سے بڑا سرمایہ تھی اگر وہ یہ سرمایہ بھی لٹا دیتی تو پھر مفلس نہ ہو جاتی ——— وہ تو اپنی زندگی کا یہی رخ دیکھتے دیکھتے مرجانا چاہتی تھی۔ اس نے جان لیا تھا کہ ———

اب ترا در چھوڑ کے جاؤں گا تو کہاں جاؤں گا
گھر میں گھر جاؤں گا صحرا میں بکھر جاؤں گا

اور سچ مچ اب وہ بھرے پرے گھر میں گھٹ کر رہ گئی تھی۔ نیلا کی توجہ اور ساتھی کی محبتیں جس تیزی سے بڑھ رہی تھیں اتنی تیزی سے اس کی گھٹن بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ گھر کے قید خانے میں عمر قید کی سزا کاٹ رہی تھی۔ جوں جوں دن گزرتے جا رہے تھے وہ تھکتی جا رہی تھی۔ حوصلے جواب دینے لگے تھے ضبط کا خول چٹخنے لگا تھا پھر بھی جسم کا بوجھ بڑھتا جا رہا تھا لیکن یہ بوجھ روح پر پڑے ہوئے بوجھ سے زیادہ نہیں تھا ——— وہ اپنی ذات سے اتنی لاتعلق اور اس قدر بے پرواہ رہنے لگی تھی کہ کبھی کبھی تو احسن کو دہشت سی ہونے لگتی۔

وہ اسے پیار سے سمجھاتیں۔ انہیں محبت سے ملتی تھیں لیکن وہ چپ رہتی۔ انہوں نے نئے نئے کپڑوں اور کھلونوں کے ڈھیر لگا دیئے تھے۔ انکی مصروفیت اور ان کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ دن بھر میں ہزار بار اس کے پاس آتیں "بیٹا سوپ پی لو ——— بیٹا جوس رکھا ہے۔ بیٹا سیرپ پیا کہ نہیں۔" اور جب وہ ہوں، ہاں میں جواب دیئے جاتی تو وہ جھلا جاتیں۔

"اے بیٹا خدا کے واسطے اپنا خیال رکھو۔ دیکھو کیسی ہوتی جا رہی ہو۔ کچھ کھایا پیا کرو۔ چاندی بیلا پہلا موقع ہے۔ خدا نخواستہ دشمنوں کے منہ میں خاک تمہیں کچھ ہو گیا بیٹا تو میں کیا کروں گی ——— رضیہ آپا کو کیا جواب دوں گی میرا احسن کہاں جائے گا ———" تب تارا بڑی عجیب طرح سے ہنس پڑتی۔ وہ بڑی سفاکی سے کہتی ———

"مجھے کچھ نہیں ہوگا امی، میں مرنے والوں میں سے نہیں ———"

اور امی جھٹ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتیں۔ ایسی باتیں سن کر ان کا دل بیٹھ سا ہونے لگتا تھا۔ وہ جیسے دھیمے سے سمجھاتیں۔ اس سے احسن کے متعلق پوچھتیں ——— اس کی پریشانی معلوم کرنا چاہتیں تو وہ انہیں ٹال دیتی۔ ان کی خوشی کی خاطر اسے اتنے سارے جھوٹ بولنا پڑتے۔ لیکن اس نے کبھی اپنے اندر پھیلنے والے زہر کی خبر نہیں دی۔ وہ تو محفل میں اجالے کی خاطر شمع کی طرح اکیلی جلنے کی قائل تھی ———

ایک روز امی نے اس سے پوچھا "سچ بتا دو تارا بیٹی تمہیں میری قسم کہ تمہاری اور احسن کی لڑائی تو نہیں ہو گئی ———" لیکن وہ کمال ضبط سے کام لے کر ہنس پڑی۔ اور اس نے بڑی صفائی سے کہا "نہیں امی ہم کیوں لڑیں گے بھلا ——— وہ بس یونہی دل گھبراتا ہے اور پھر ڈر بھی تو لگتا ہے نہ جانے کب ہسپتال جانا پڑ جائے۔" امی نے اس کی بات سن کر بے یقینی سے سر ہلا کر کہا "کمال ہے بھئی تم دونوں بڑے گہرے ہو، کسی بات کا پتہ ہی نہیں دیتے۔ میں اس سے پوچھتی ہوں تو وہ بھی یہی کہتا ہے کہ واہ ہماری لڑائی کیوں ہوگی —— لیکن اب ان سے یہ کون پوچھے کہ میاں اگر تمہاری لڑائی نہیں ہے تو سارا دن گھر سے کیوں بھاگے رہتے ہو۔ اس حالت میں اسے تمہاری ضرورت ڈاکٹر صاحب کی ہوگی یا ڈاکٹر صاحب کی اماں کی ———" تارا نے مسکرا کر ان کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا "مجھے تو سچ پوچھیے اس وقت ڈاکٹر صاحب سے زیادہ ڈاکٹر صاحب کی اماں کی ضرورت ہے ———" اور امی نے پیار سے اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"پگلی کہیں کی ——— خواہ مخواہ مجھ سے اتنی محبت کرنے لگی ہے ورنہ بہوئیں تو ساس کو گلے کی پھانس کہتی ہیں۔" تارا نے فوراً تردید کی "امی خدا نہ کرے کہ میں ایسا سمجھوں۔ آپ کی محبت نے تو مجھے اتنا حوصلہ دیا ہے ورنہ میں تو ———" تارا کچھ کہتے کہتے رک گئی تو امی نے اسے پیار سے ڈانٹ دیا۔ "بس اب زیادہ باتیں مت کرو آرام سے سو جاؤ۔"

وہ تارا آنکھیں بند کر کے سوچنے لگی کہ کیسی ہے میری زندگی۔ دن میں بن مانگے اتنی محبتیں، اتنی نوازشیں ملیں کہ سنبھالی نہ جائیں اور رات کو اتنے عذاب اتنے عتاب اتریں کہ سہے نہ جائیں۔

••

اس دن جب رضیہ بی تارا سے ملنے آئیں تو وہ اپنے کمرے ہی میں بیٹھی رہی۔ وہ خود اس کے کمرے میں آ گئیں تو تکلفاً نہ زیادہ بات کی نہ اٹھ کر بیٹھی۔

آج کل پھر اسے اپنی امی سے نفرت محسوس ہونے لگی تھی۔ اسے لگتا تھا جیسے سارے قصور ان کے ہی ہیں۔ رضیہ بی نے اس کے بستر پر بیٹھ کر کہا "تارا بیٹی تمہاری ساس کہہ رہی تھیں کہ ہمارے خاندان میں رسم ہے کہ پہلی زچگی میکے میں ہوتی ہے لیکن میرا دل نہیں چاہتا کہ اپنی بہو کو چھوڑوں۔ وہ تو ویسے ہی بہت فکر مند ہے اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو تارا کو یہیں رہنے دیں۔ اب تم کہو بیٹا اگر تمہارا دل چاہتا ہے تو میں تمہیں لے چلوں، خرچے کے لئے وہ کہہ رہی تھیں کہ یہ تو ہمارا فرض ہے وہ تو ہم ہی دیں گے خواہ تارا اس گھر سے ہسپتال جائے یا اس گھر سے۔ اب تم کہو بیٹی تمہارا دل کیا کہتا ہے۔"

"میرا دل کہتا ہے کہ سب کو شوٹ کر دوں ———" تارا نے رضیہ بی کو جملہ مکمل ہی نہ کرنے دیا۔ وہ اتنی بری طرح سے چیخی تھی کہ اسے خود اپنی آواز اور اپنے لہجے پر حیرت ہو رہی تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی نبیلا تو سہم ہی گئی تھی اور نبیلا کے پیچھے پیچھے آتی ہوئی امی نے بھی اس کا جملہ سن لیا تھا۔ وہ تارا سے تو کچھ نہیں بولیں جب کسی کام سے احسن ذرا سی دیر کے لئے آئے تو وہ ان کے پیچھے پڑ گئیں۔ انہوں نے احسن کو ان کی لاپرواہی پر خوب ڈانٹا۔ بے شک انہوں نے نفسیات نہیں پڑھی تھی لیکن انہوں نے زندگی سے تجربہ کا سبق تو پڑھا تھا۔ ان کی بوڑھی ممتا بھری آنکھوں سے تارا کی بے چینی اور اس کا ذہنی خلفشار چھپا نہ رہ سکا تھا۔ انہوں نے احسن کو ایک لاپرواہ باپ، غیر ذمہ دار شوہر اور کھوٹا بیٹا قرار دیا تھا لیکن احسن اپنی صفائی میں ایک لفظ بھی نہ بولے۔ وہ خاموشی سے ڈانٹ سنتے

سب اور جب وہ چپ ہو گئیں تو ان کے کمرے سے اٹھ کر وہ تارا کے کمرے میں چلی گئی۔

وہ کشن اور تکیے کے سہارے قالین پر آنکھیں بند کئے بیٹھی تھی۔

"تارا ——" انہوں نے غصے سے اسے پکارا تو وہ چونک گئی

"جی ——" اس نے بڑے سکون سے کہا۔

"اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ تم میری ماں سے میری شکایتیں کر کے مجھ سے بدلہ لو گی تو یہ تمہاری بے وقوفی ہو گی۔ تم میری ماں پر اپنا اثر جمانے کی زیادہ کوشش نہ کرو۔ وہ بڑی سادہ عورت ہے وہ تمہاری چالاکیوں کو نہیں سمجھ سکے گی۔ اور یہ جو تم سارے گھر پر اپنی شخصیت کا رعب ڈالتی پھرتی ہو تو یہ بھی کوئی انوکھی بات نہیں ہے کہ کوئی ہر دم تمہارے سرہانے بیٹھا رہے۔ میں تو تمہارے نخرے اٹھانے سے رہا، میں تو تمہیں خوب جانتا ہوں۔ بس امی ہی تمہارے ناز اٹھائے جائیں گی کیونکہ انہیں یہ نہیں پتہ کہ اس دنیا میں آنے والے جس مہمان کے استقبال کی تیاریں وہ اتنے اہتمام سے کر رہی ہیں اس کے متعلق تو ابھی یہ فیصلہ بھی نہیں ہوا کہ وہ ان کے اپنے بیٹے کی اولاد ہے یا ان کے نوجوان بہادر پوتے کی!!"

احسن تو تارا کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیل کر چلتے بنے لیکن وہ ریزہ ریزہ ہو کر ایسی بکھری کہ کرچیوں کا شمار ہی ناممکن ہو گیا۔ اس کا سر چکرا گیا اور وہ تیورا کر تکیوں پر گر پڑی۔ اب وہ انہی تکیوں پر سر رکھے بلک بلک کر رو رہی تھی —— آج احسن نے سب سے بڑا وار کیا تھا۔

آج کی سزا ناقابل برداشت ہو گئی تھی۔

اس کے کان کی لویں سرخ ہو گئیں اس کا چہرہ جھلسنے لگا۔ ذلیل ہو جانے کے احساس نے اس کی آنکھوں کو پرنالہ بنا دیا —— کیا فائدہ ایسی زندگی سے؟

اس سے اچھا تھا کہ میں پہلے ہی مر جاتی۔

اُف خدا، اتنا بڑا الزام ——

اتنی گھناؤنی تہمت —— کیا میں اتنی بری ہوں کیا مجھے اتنا گرا ہوا سمجھتے ہیں ——

اُف میرے خدا —— میں کہاں جاؤں —— پاپا —— پاپا جانی —— وہ پھر پھک پڑی آج بڑی مدت کے بعد اسے پاپا اتنی شدت کے ساتھ یاد آئے تھے —— وہ کتنی دیر تک روتی رہی۔ اور پھر نہا نے گیا اور کے وہ ایک دم اٹھ بیٹھی۔ اس نے تیزی سے پہلے کمرے کا دروازہ بند کیا اور پھر آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے آپ کو دیکھا۔ کتنا بے ہنگم ہو گیا تھا اس کا جسم اپنے جسم کو دیکھ کر اس نے اپنی سرخ آنکھوں کو دیکھا اور پھر ہنس پڑی۔

ہنہ! میں ساری سزائیں تمہیں ایک ساتھ نہیں دوں گی —— اس نے منہ ٹیڑھا کر کے احسن کا جملہ دہرایا اور پھر وارڈروب کھول کر دوا کی دراز باہر نکال لی —— سلیپنگ پلز ڈھونڈنے میں اسے دیر نہیں لگی —— شیشی کو اس نے مسہری پر رکھا اور باتھ روم میں ہوتے واش بیسن سے پانی لے کر وہ مسہری پر آ بیٹھی۔ اس نے شیشی سے پلز انڈیلے ——

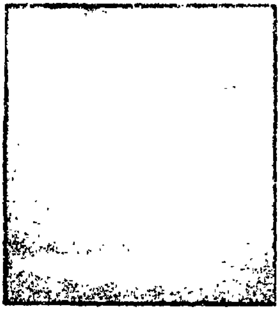
ایک اور دو تین اور دو پانچ اور دو سات اور چار گیارہ یہ چودہ —— ٹھیک ہے کافی ہیں یہ —— پلز مٹھی میں بند کئے تارا نے تکیہ کھسکایا چادر سمیٹی —— اور پھر پانی کا گلاس اٹھا کر بند مٹھی کھولی —— چودہ سلیپنگ پلز اس کی مٹھی کے پسینے میں بھیگ رہے تھے۔ وہ انہیں دیکھ کر بڑی عجیب طرح سے ہنس پڑی اور گہرا سانس لے کر بولی ——

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم

اور آنکھیں بند کر کے سارے پلز منہ میں رکھنا چاہے تو دو پلز گر پڑے ——

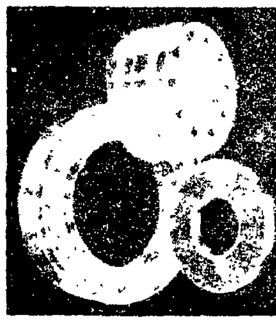


اس خوبصورت کہانی کے
واقعات نقطۂ عروج پر پہنچ چکے ہیں۔
دوشیزہ کے
اگلے شمارے کا انتظار فرمائیے!









مسز گوریجہ

پڑوسن تو بڑی امن پسند اور شریف تھی۔ لیکن اس کی نوجوان خوبصورت لڑکی نے قیامت برپا کر رکھی تھی۔ گلشن کالونی کی اس نئی آبادی میں مسز گوریجہ کو زیادہ تر لوگ اس وجہ سے جانتے تھے کہ وہ دودھ جیسے سفید ہاتھ پیروں والی ایک لڑکی کی ماں تھی۔ جو آسمانی رنگ کا ہلکا سا [illegible] پہن کر اس لڑکی کے ساتھ گھر سے باہر نکلتی تھی کہ ماحول کا رنگ بھی آسمانی ہو جاتا اور وہ سینٹ تو جانے کون سا تھا جس کی بھینی بھینی خوشبو ہوا میں کو چین ہی نہ لینے دیتی تھی۔ جب وہ سفید اور چکیلے ساٹن کی لہریں کرتی شلوار کی شکنیاں بکھیرتی چلی جاتی تو حسن جگنو زور سے سر کو جھٹک کر ماحول [illegible] جیسے اپنی ناک کے راستے پھیپھڑوں میں بھر لیتا۔

"او داغ میری پیچھی تی تو با الوداع، تو گریٹ ہے۔ یہ گلشن کالونی تیرے ہی دم سے آباد ہے۔" قہقہہ لگاتے ہوئے اپنے ہوسٹل بالوں والا ہاتھ میرے ہاتھ پر پٹخ دیتا۔ یہ کچھ حسن جگنو پر ہی موقوف نہ تھا، نیم کے درخت والی کوٹھی کے مجسٹریٹ کا لڑکا جمیل بھی اس چینی کی گڑیا پر جان دیتا تھا۔ اور بالکل [illegible] میں وہ اپنے جسم کے لیے [illegible] کا ایک ایک [illegible] حلوائی کی دکان کے پاس [illegible] کی [illegible] ہوتی [illegible] کھڑے ہوتے تھا جیسے ابھی اس کے پر لگ جائیں گے اور وہ سپر [illegible] بن کر گلشن کالونی کی پوری آبادی پر ہوائی جہاز کی طرح چکر کاٹنا شروع کر دے گا۔ حسن جگنو اس سے بہت جلا کرتا تھا۔ اسے دیکھتے ہی جگنو کی نیلی چمکیلی آنکھیں سکڑ جاتیں اور وہ پان کی پیک پہلو میں چٹکاتے ہوئے کہتا: "یار اس کا تو پیرے ہی بیٹھے کی آنکھیں بھی ٹیڑھی ہیں، کاجل کی لکیریں دیکھی ہیں تم نے، سالا فرانچ کی اولاد معلوم ہوتا ہے۔" میں اس کے غصّہ پر نمک چھڑکنے کے لیے کہتا۔ "یار کچھ بھی کہو ہے ہینڈسم اور تم سے بھی زیادہ اسمارٹ ہے۔"

"اسمارٹ ..... اسمارٹ" وہ چڑ جاتا لیکن وہ فوراً ہی شرارت کو بھانپتے ہوئے زوردار قہقہہ لگاتا۔ "واللہ تم ایسا گاؤدی میں نے ابھی زندگی میں نہیں دیکھا۔" جواب میں اس کی [illegible] چتونوں کو دیکھ میں مسکرا دیتا اور وہ اپنے ڈھیلے ڈھالے شکنوں سے پُر لباس پر اپنے گورے گورے ہاتھ پھیرنے لگتا۔ "اس مجسٹریٹ کے لونڈے سے بھی سمجھ لوں گا کسی دن۔"

"خیال تو ٹھیک ہے لیکن اتنا خیال رہے کہ اس کا باپ مجسٹریٹ درجہ اول ہے۔"

"درجہ اول کی ایسی تیسی [illegible]



ہیں جو ہر وقت مسز گوریجہ کے گھر کی رکھوالی کرتے ہیں، اور یوں قہقہوں میں اڑ جاتی۔"

اپنی لڑکی کے ساتھ مسز گوریجہ تنہا اس مکان میں رہتی تھی۔ شکل بول چال گفتار سے وہ کسی شریف گھرانے کی عورت معلوم ہوتی تھی یافتہ تھی اور آس پڑوس کے دکاندار اس کے اخلاق کی تعریف کرتے تھے۔ اسے اس مکان میں رہتے ہوئے کوئی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا خوب حلوائی سے لے کر سامنے پان فروش تک سب اس کے حسن کی تعریف کرتے تھے۔ اکہرے بدن کی مضبوط اور خوبصورت ہاتھ پیروں والی تھی۔ اور ہر وقت اعلیٰ اور صاف ستھرے لباس میں نظر آتی دوسرے تیسرے روز شہر بھی جاتی تھی۔ شاید کچھ ایسی ضروریات کی خریداری کے سلسلے میں جو اس مختصر آبادی میں نہیں ملتی تھیں۔ میں نے جب اسے غور سے دیکھا تھا۔ اس کا رنگ بہت سفید تھا عمر یہی پینتالیس کے لگ بھگ ہو گی۔ اسے دیکھتے ہی جانے کیوں یہ خیال آنے لگتا کہ اس کی عمر چند لمحوں کے لئے پندرہ بیس برس کم ہو جائے اس کی آنکھوں کے نیچے ان سرمئی رنگ کی تار تار جھریوں کو اگر ان میں جھانک کر دیکھ سکو۔ ان کی آنکھوں کے خلاف بھی ہلکی سی نیلی رنگ کی جھریوں سے الٹے جڑے تھے۔ اور آنکھوں کی سفیدی پر سرخ سرخ لکیریں ایسے نظر آتی تھیں جیسے تختے کی سفید زمین پر ٹیڑھی ترچھی سی ریکھائیں کھینچی گئی ہوں۔

پہلے پہل میں نے اسے رحیموں کنجڑے کی دکان پر دیکھا تھا جہاں وہ پلاسٹک کی سرخ ٹوکری ہاتھ میں لئے پالک خرید رہی تھی ریزگاری لیتے ہوئے ایک چونی اس کے ہاتھ سے گر گئی جسے اٹھانے کے لئے وہ جھکی تو میری نگاہ اس کی گردن پر پڑی جہاں گدی کے نیچے تک بال کاٹے ہوئے تھے اور مہین مہین پھنسیوں کے سیاہ نشان اس کی سفید جلد پر بہت بھدے معلوم ہو رہے تھے۔ کیچڑ کی پھسلن اور تازہ تہہ پر اس کے سیاہ سینڈل والا پاؤں تھوڑا سا پھسلا اور اسے چکر سا آ گیا، لیکن وہ جلدی پھرتی سے سنبھل گئی وہ اپنی شلوار کا پائنچہ جھاڑتے ہوئے ہنسنے لگی میں نے دیکھا اس کی آنکھوں کے گرد پھیلی ہوئی سرمئی جھریوں نے اس کی آنکھوں کو ہولے ہولے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس کی ہنسی میں ایک ایک سلسلہ سا شکایت تھا جیسے کوئی [illegible] کے عالم میں ہنس رہا ہو۔ پھر میری نظریں اس کے بالائی ہونٹ کے اوپر تل کے سیاہ نشان پر پڑیں، وہ تل بھی ہنس رہا تھا۔

وہ کچھ دیر کھڑی رحیموں کنجڑے سے موسم کی تازہ سبزیوں کے نرخ پوچھتی رہی، مہنگائی کی شکایت کرتی رہی۔ رحیموں کنجڑا

پنے گالوں کی ابھری سیاہ فام ہڈیوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے، بی بی جی،
بی بی جی، کہتا رہا۔ وہ اپنی باتوں کی خاموشی سے تائید حاصل کرنے کے
لئے گردن موڑ کر کبھی کبھی میری طرف دیکھتی اور میں اس کی جھریوں میں لپٹی
ہوئی مسکراہٹ کا جواب ایک پھیکی سی ترچھی اور دھندلی مسکراہٹ میں
دے دیتا۔ پھر وہ پاؤں سے بھری ہوئی پلاسٹک کی سرخ ٹوکری ہاتھ میں
لٹکائے چلی گئی۔

شام کو گھر کے سب افراد کھانے کی میز کے گرد جمع تھے۔ باتوں
باتوں میں مسز گوریجہ کا ذکر چل نکلا، میرے منہ سے مسز گوریجہ کی تعریف
سن کر بھابی نے آنکھیں نکال کر میری طرف ایسے دیکھا جیسے منہ میں بھرے
ہوئے نوالے کی بجائے مجھے نگلنا چاہتی ہوں۔ پھر وہ بھائی جان سے مخاطب
ہو کر بولیں: "جی آپ نے دیکھا ہے اس عورت کو ——— گوری چٹی مغرور
پرندنا [illegible] پھرتی ہے۔ ڈیڑھ مہینہ یہاں رہتے ہوئے ہو گیا ہے مجال ہے کسی
عورت سے بات ہی نہیں کرتی، سنا ہے کچھ پڑھی لکھی ہے۔"

"ایم اے پاس ہے بھابی!" میں نے یونہی کہہ دیا۔ بھائی جان
خالی گلاس میز پر رکھتے ہوئے ٹوٹتی ہوئی سانس میں بولے: "مگر تمہیں اس
عورت سے اتنی دلچسپی کیوں ہے؟"

"بھابی جان، وہ ادھیڑ عمر کی ایک پڑھی لکھی شریف عورت
ہے۔" میں نے احتجاجاً کہا۔

"سنا ہے اس کی ایک جوان لڑکی بھی ہے جی؟" بھابی
بولیں۔ بھائی جان زیر لب مسکرائے۔ ٹھنڈے پانی کا دوسرا گلاس منہ
سے لگاتے ہوئے انہوں نے میری طرف تیرتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

"جی اس کا کوئی بندوبست کیجئے۔ اس کے ہوش ٹھکانے نہیں
ہیں۔" بھابی مسکراتے ہوئے چیخ پڑیں اور میں تولیے سے ہونٹ صاف
کرتا ہوا ڈرائنگ روم سے باہر نکل آیا۔

میرے ہوش واقعی ٹھکانے نہیں تھے۔ ایسے معلوم ہو رہا تھا
جیسے میرے ذہن کی تمام تصویریں محو ہو گئی ہیں، مٹ گئی ہیں۔ اور میرا
ذہن ایک کوری سفید چادر بن گیا ہے۔ اس سفید چادر پر ایک بڑے تل
کا نشان تھا جس کے گرد سرمئی رنگ کے چھوٹے چھوٹے تل تالاب ایسی ناگنیں
نشانے گرداب دار چکر لگا رہے تھے۔ کبھی یہ چھوٹے غائب ہو جاتے
اور وہ تل میرے ذہن کی چادر پر پھیلنے لگتا، حتیٰ کہ میرے ذہن میں گھٹا
ٹوپ اندھیرا چھا جاتا۔

دوسرے دن حسن جگنو مجھے علی الصبح ہی مل گیا۔ جس وقت میں
نے اس کی طرف دیکھا تو ایک دم نہ جانے کیوں اس کی نیلی آنکھوں کے
جھلمل ستاروں کی چمک ماند پڑ گئی، مجھے معلوم نہیں کہ میں نے اسے کن
نظروں سے دیکھا تھا لیکن اتنا مجھے یقین ہے کہ اس وقت میری نظریں
وہ نہیں تھیں جن سے میں اسے روز دیکھتا تھا۔ وہ اپنے بھورے بالوں والا
ہاتھ میرے کندھے پر رکھتے ہوئے یوپی والوں کے پنجابی لہجے میں بولا۔
"او نے اکبر علی تینوں کی ہو گیا بادشاہو؟" میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔
اچانک وہ کچھ سوچ کر اداس ہو گیا۔ "میں آج چاند پور جا رہا ہوں۔ میری
موسی سخت بیمار ہے۔ چھ سات دن لگ جائیں گے مجھے، میری چینی کی
گڑیا کا خیال رکھنا، اس مجسٹریٹ کے لونڈے کو اپنی راجدھانی میں قدم
دھرنے نہ دینا۔" اس کا اترا ہوا [illegible] لباس میں [illegible] پھر وہ دھپ
سے میرے کندھے پر اپنا ہاتھ مارتے ہوئے بولا: "مگر کیسی آج تو کیوں
اداس ہے؟" میں ہنس پڑا اور جگنو کی آنکھوں کے تاثرے حیرت سے مجھے
دیکھنے لگے۔

جگنو کے جانے کے بعد جانے کیوں میرے ذہن نے ایک
زبردست انگڑائی لی، جیسے کوئی انسان دن چڑھے تک مسلسل بنا چارپائی
پر کروٹیں بدلتے ہوئے اٹھنے کا ارادہ کر رہا ہو اور پھر ایک ہی جھٹکے کے
ساتھ آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھے، بالکل ایسے ہی میں آنکھیں ملتا ہوا
اٹھ بیٹھا تھا اور آنکھیں کھلتے ہی سب سے پہلے جو چیز مجھے نظر آئی وہ
مسز گوریجہ کی سرمئی جھریاں تھیں جنہوں نے میرے سامنے مہین مہین
ریشوں کا ایک پردہ کھینچ دیا تھا۔ اس پردے کے پیچھے کیا تھا میں نہیں
جاننا چاہتا تھا، اس کوشش میں جب میں نے اپنی بصارت پر زور
دیا تو ایک سیاہ تل گونجتے ہوئے کانٹوں کی طرح میری آنکھ کی پتلی کو
چیرتا ہوا گزر گیا۔ وہ تمام دن میں نے مسز گوریجہ اور اس کی لڑکی کے
بارے میں سوچتے ہوئے گزار دیا۔ وہ لڑکی جس کے ہاتھ پیر دودھ
کی طرح سفید تھے۔ اور جس کی ایڑیاں سفید ساٹن سے بنی ہوئی تھیں،
جس پر میرا دوست جگنو مرتا تھا۔ اور جسے نیم کے درخت والی کوٹھی
کے مجسٹریٹ کا لڑکا سہرا بن کر اٹھا لے جانا چاہتا تھا۔ میں اور تو
کچھ نہ سوچ سکا، میرے قدم مسز گوریجہ کے مکان کی طرف اٹھنے لگے۔
دروازہ کھلنے کو اشاروں کے وسط میں دہلیز تک لٹکتی ہوئی زنجیر کو دیکھ کر میں
نے اپنی باطنی کیفیت کا جائزہ لیا تو مجھے اپنے ذہن پر بدستور اس
سفید چادر کا گمان ہوا جو کورے لٹھے کے کفن کی طرح بے داغ نظر آ رہی
تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ تل کسی سیاہ بھنورے کی طرح گونجتا ہوا اس پر آ بیٹھتا
میں نے آس پاس دیکھتے ہوئے دہلیز پر مردہ سانپ کی طرح لٹکی ہوئی
زنجیر کو آہستہ سے ہلا دیا۔ ادھ کھلا دروازہ تھوڑا سا چرچرایا اور اس

کے بعد مسز گودریجہ کی سرخ نیم خوابیدہ ڈوروں والی آنکھیں چمکدار ہوگئیں جو ایک لمحے کے لئے چمکیں لیکن فوراً ہی اپنی اصلی حالت پر آگئیں۔ مجھے کچھ صحیح یاد نہیں کہ اس وقت میرے منہ سے کون سے الفاظ نکلے تھے۔ جس کے جواب میں مسز گودریجہ نے ایک مہربان مسکراہٹ کے ساتھ گردن ہلائی اور مجھے اندر چلنے کے لئے کہا۔ بس اسی لمحہ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

راہداری کو طے کرتے ہوئے ہم مکان کے عقبی صحن میں پہنچے جہاں ایک چھوٹی گول میز کے گرد پلاسٹک کی رنگدار ریشوں والی پھیکی ہوئی پست قامت کرسیاں رکھی تھیں اور ——— اور میں دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہاں تجمل سیر میں چائے کا کپ ہاتھ میں تھامے میری طرف بڑی ناقابلِ فہم نظروں سے گھور رہا تھا۔ تاہم اس نے اپنی کرسی میں بیٹھے بیٹھے استقبالیہ سی حرکت کی۔ اور پھر سر جھکا کر چائے کی چسکیاں لینے لگا۔ مسز گودریجہ نے اسی نیم خوابیدہ مسکراہٹ کے ساتھ مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور میں بیٹھ گیا۔ پھر یکایک وہ نعمت خانے کی طرف منہ کر کے بولی "بیٹی فرحت چائے اور بناؤ۔"

"معاف کرنا" مسز گودریجہ بولی "آپ کا ان سے تعارف ہے ———؟"

میری اور تجمل کی نظریں آپس میں ٹکرائیں تو وہ مسکرا دیا۔ مجھے اس کی مسکراہٹ بہت بری معلوم ہوئی۔ ہم دونوں نے مصافحہ کیا۔ مسز گودریجہ ہمیں دیکھ کر بدستور مسکراتی رہی۔

"ہاں تو آپ اپنے بھائی صاحب کے لڑکے کے بارے میں کیا کہہ رہے تھے؟" مسز گودریجہ نے مجھ سے پوچھا۔

"جی وہ پانچویں میں پڑھتا ہے ہمیں اس کے لئے ٹیوشن کی ضرورت ہے۔ کسی نے بتایا تھا کہ آپ بچوں کو پڑھاتی رہی ہیں اس لئے پوچھنے چلا آیا۔"

"آپ سے کسی نے غلط کہا ہے۔ ویسے اگر کہیں تو کسی استانی کا بندوبست کر دیتی ہوں، میری فرحت کئی استانیوں کو جانتی ہے۔" مسز گودریجہ نے ایک دفعہ پھر نعمت خانے کی طرف دیکھا "فرحت چائے تیار ہوگئی؟" کوئی جواب نہ پا کر وہ اسی بلند آواز میں بولی "یہ کیا مذاق ہے؟ جواب کیوں نہیں دیتیں؟" اس کی پیشانی پر تیوریاں ابھر آئیں اور وہ اپنے آپ سے بولی "بہت شرارتی ہے، بہت شرارتی ہے۔"

"دیکھئے آپ چائے کا تکلف نہ کیجئے، میں ابھی پی کر آیا ہوں۔"

مذہب

لوگ مذہب کے لئے لڑیں گے، جھگڑیں گے، مذہب کی حمایت میں لکھیں گے، لیکچر دیں گے اور اس کی خاطر مر بھی جائیں گے۔ لیکن اس کے مطابق زندگی بسر نہیں کریں گے۔

(خلیل جبران)

"ٹھہریئے میں خود لاتی ہوں" یہ کہہ کر وہ ایک جھٹکے کے ساتھ کرسی سے اٹھی اور اس کے ساتھ ہی ٹین کی ایک روغنی ڈبیہ اس کے کپڑوں میں سے نیچے فرش پر گر گئی۔ صاف دھلے ہوئے فرش پر چھوٹی چھوٹی سیاہ گولیاں بکھر گئیں، مسز گودریجہ ایسے ٹھہر گئی جیسے اس کے قدموں میں کسی نے بیڑی ڈال دی ہو۔ اس نے اپنے سرمئی بھاری پپوٹوں کو اٹھا کر ایک لمحہ کے لئے ہماری طرف دیکھا اور پھر بڑی پھرتی کے ساتھ ان چھوٹی چھوٹی گولیوں کو موتیوں کے دانوں کی طرح چننے لگی۔ اس کے ہاتھوں میں خفیف سا رعشہ تھا۔ گولیاں اکٹھی کر کے اپنی گردن کو جھٹکا دیتے ہوئے وہ اٹھ کر پھر کرسی پر بیٹھ گئی اور ایک خالی سا قہقہہ لگاتے ہوئے بولی "میری دوائی ہے، میں گردے کے درد کی پرانی مریض ہوں۔" اس چھوٹی سی مشقت کے نتیجے میں جو اسے بکھری ہوئی گولیاں اکٹھی کرنے کے سلسلے میں اٹھانی پڑی تھی وہ کچھ ستہنا سی گئی تھی اور اس کے چہرے کی سفیدی میں کچھ اور بے جان قسم کی سفیدی کا اضافہ ہوگیا تھا۔ اس کے بالائی ہونٹ والا تل بے وجہ کانپے جا رہا تھا۔

"میں آپ کے لئے چائے لاتی ہوں" وہ بڑے اعتماد کے ساتھ اٹھتے ہوئے بولی اور نعمت خانے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد تجمل نے اپنی مخصوص نوکیلی ٹیڑھی مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا اور بولا۔

"کہئے جناب کل پرسوں سے جگنو صاحب نظر نہیں آ رہے کہیں گئے ہوئے ہیں کیا؟"

"جی ہاں وہ آجکل یہاں نہیں ہیں۔" میں نے جل کر جواب دیا۔

"کہاں گئے ہیں؟"

جی تو میرا چاہتا تھا کہ اسے ایسا جواب دوں کہ سن ہو کر رہ

جائے۔ لیکن عین اسی وقت میری نظریں نعمت خانے کی طرف اٹھ گئیں، جہاں ادھ کھلے کواڑوں کے بیچ تربوزیہ جارجیٹ کے دوپٹے کا کنارہ ہوا میں پھڑ پھڑا رہا تھا۔ پھر ہلکی ہلکی سرگوشیوں کی آواز سنائی دینے لگی شاید مسز گور بیچہ اپنی بیٹی فرحت کو ڈانٹ رہی تھی، میں اور تجمل نعمت خانے کے دروازے کی طرف ایسے دیکھ رہے تھے جیسے ہم مہمان نہ ہوں بلکہ اپنے مالک کے انتظار میں کان کھڑے کئے ہوئے زبانیں ہلاتے ہوئے اور ان کا مالک ان کے لئے چھیچھڑے اور ہڈیاں لا رہا ہو۔ تھوڑے توقف کے بعد مسز گور بیچہ نمودار ہوئی، اس کے ہاتھ میں چھوٹی سی ٹرے تھی جس میں دو پیالیاں رکھی ہوئی تھیں۔

"بہت شرمانی ہے۔" وہ چائے کی پیالیاں ہمارے سامنے رکھتے ہوئے بولی۔ ہم چائے پینے لگے، تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد میری نظریں نعمت خانے کے جالی دار کواڑوں کی طرف اٹھ جاتیں اس تربوزیہ جارجیٹ کے دوپٹے کے انتظار میں، لیکن شاید اب ہوا ساکن تھی پھر مسز گور بیچہ نے اپنے بہت سی حسین اور خوشحال باتیں کی باتیں چھیڑ دیں۔ اس کے لہجے میں بلا کی شیرینی اور انکساری تھی جس نے میرے دھڑکتے ہوئے دل کو بڑی تقویت بخشی، اس پہلی ملاقات میں جو تجمل سپر مین کی موجودگی میں ہوئی تھی مجھے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کسی بڑی شخصیت سے مل رہا ہوں جس میں خلاقی، محبت، خلوص اور دانائی کوٹ کوٹ کر بھری ہو۔ مسز گور بیچہ کو زیادہ تر اپنی طرف متوجہ پا کر مجھے اب تجمل سپر مین بھی اتنا برا اور خطرناک آدمی نہیں معلوم ہو رہا تھا۔ مسز گور بیچہ نے بڑی محبت کے ساتھ ہم دونوں کو رخصت کیا۔ باہر نکلتے ہی تجمل کمال بے تکلفی سے بولا۔

"کیا خیال ہے آپ کا، مجھے تو مسز گور بیچہ بہت عظیم عورت معلوم ہوتی ہے۔"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ "بہت بڑی عورت ہے، بہت بڑی عورت ہے۔"

"مگر گردے کے درد نے اس کی جان ہلکان کر رکھی ہے۔ تنگدستی ہے، بیماری۔"

"آپ کب سے انہیں جانتے ہیں؟" چلتے چلتے میرے قدم رک گئے۔

"بہت دنوں سے ——— جن دنوں یہاں آئی تھی، میرے ایک ڈاکٹر دوست کے زیر علاج ہے۔ وہیں تعارف ہوا تھا۔" یہ کہہ کر تجمل نے میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور گلی کے موڑ سے الگ ہو گیا۔

دوسرے دن جب میں نکل کر گرلوی ہاتھ میں لئے دودھ لینے کے لئے توجے حلوائی کی دکان پر آیا تو توجا اپنا گلا بار بار صاف کرنے لگا۔

"کیا بات ہے پہلوان، آج تمہارے گلے میں کچھ پھنس گیا ہے کیا؟" میں نے پوچھا۔ وہ اپنے سانولے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی سیاہ مونچھوں میں سے ایک بڑی چمکدار مسکراہٹ باہر نکالتے ہوئے بولا "یار کفیر علی جیسا جواب نہیں تمہارا۔" یہ سن کر میں سٹپٹا گیا وہ یکایک اپنی مونچھیں میرے کان کے قریب لا کر بولا۔ "یقین جانو میدان صاف ہے۔ یہ سالی گور بیچہ افیون کھاتی ہے۔ کل ٹھیکے پر کھڑی تھی۔ کہاں ہوش رہتا ہوگا اسے، یہ بالو جی لونڈیا اس کی ہیرا ہے ہیرا۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا، توجا دودھ ناپنے والے برتن کو بالٹی میں ڈبوتے ہوئے بولا۔ "ادھر لاؤ برتن، جان بناؤ، بھوری کا دودھ ہے۔" میں بھوری کے دودھ سے بھری ہوئی گڑوی ہاتھ میں لئے گھر کی طرف چل دیا اور توجے حلوائی کی آواز آہستہ آہستہ دور تک میرے کانوں میں دودھ اونڈیلتی رہی وہ کوئی پنجابی گیت گنگنا رہا تھا۔

مجھے گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ اتنی جلدی مسز گور بیچہ سے اتنے اچھے مراسم استوار ہو جائیں گے۔ میں تقریباً روزانہ اس کے گھر چلا جاتا اور وہ بڑی محبت اور توجہ سے پیش آتی۔ فرحت کے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے جسے وہ خود لے کر آتی تھی، بڑی گرم اور خوشبودار ہوتی جسے پی کر ہم خوب باتیں کرتے۔ وہ باتوں ہی باتوں میں خود ہی فرحت کا ذکر چھیڑ دیتی۔ اس کی ایک ایک عادت کی خوب خوب تعریفیں کرتی، مسز گور بیچہ کے خیال میں فرحت لباس کے جدید ڈیزائن اور رنگوں کے انتخاب میں اتنی ماہر تھی کہ دور حاضر کی لڑکیوں میں اس کی مثال ملنا ناممکن تھی بعض اوقات تو وہ فرحت کی تعریفیں گنواتے گنواتے اس حد تک آگے نکل جاتی کہ بے ساختہ اس کے حسن و جمال کے موضوع پر اتر آتی۔ ایسے لمحوں میں اس کی نیم خوابیدہ بوجھل آنکھیں کہیں دور دیکھنے لگتیں اور ایسے معلوم ہوتا جیسے وہ اپنے لہجے کی شیرینی سے خود ہی لطف اندوز ہو رہی ہے یا شاید شام کے آسمان پر کوئی ستارہ تلاش کر رہی ہے جس سے فرحت کی آنکھوں کی چمک کا مقابلہ کر سکے اسے بے شمار اچھی اچھی کتابوں کے نام یاد تھے جو فرحت نے پڑھ ڈالی تھیں۔ اور تان اسی ایک جملے پر آ کر ٹوٹتی، بس ایک نقص ہے اس میں، تنہائی پسند ہے اور بے حد شرمیلی ہے۔ بہتیرا سمجھاتی ہوں کہ پردہ وغیرہ فضول چیز ہے لیکن نہیں مانتی ضدی بھی تو



ہے۔" مسز گوریجہ ایسی ترقی یافتہ اور وسیع النظر عورت کی بیٹی اس طرح چھوئی موئی بن کر گھر کی چار دیواری کے اندر سکڑی سمٹی بیٹھی رہے۔ یہ بات باعثِ حیرت تھی۔ وہ کبھی مسز گوریجہ کے ساتھ بھی گھر سے باہر نظر نہیں آتی تھی، جب کہیں جاتی تنہا ہی جاتی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ماں بیٹی کے راستے الگ الگ ہیں۔ وہ غیر مرد کی موجودگی میں آواز نکالنا بھی پسند نہ کرتی تھی۔ میں نے اس بات کو خاص طور پر نوٹ کیا تھا کہ مسز گوریجہ کی آوازوں کا بھی اس نے کبھی جواب نہیں دیا تھا۔ چیخنے چلانے کے بعد مسز گوریجہ خود ہی اندر جاتی اور خورد و نوش کا سامان اٹھا کر لاتی۔

"بہت شرماتی ہے بس ایک انسان سے اسے دلی لگاؤ ہے۔ وہ ہے اس کی کزن زہرہ، شہر میں میرے دیور رہتے ہیں ان کی لڑکی کا نام زہرہ ہے۔ بس ہر وقت اس سے ملنے کے بہانے ڈھونڈتی ہے۔ بہت محبت ہے دونوں میں۔"

پھر ہوا یوں کہ مسز گوریجہ نے آہستہ آہستہ مجھ سے حسن جگنو کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیا۔ اسے اس بات کا علم تھا کہ جگنو میرا گہرا دوست ہے کئی مرتبہ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ جگنو کے بارے میں مجھ سے کچھ پوچھنے اور سننے کی مشتاق ہے۔ لیکن میں ہمیشہ اس موضوع کو باتوں میں گول کر جاتا اور مسز گوریجہ کو اس بات سے کوفت محسوس ہوتی اور اس کا موڈ خراب ہو جاتا۔ لیکن اس کی طبیعت میں بے حد اعتدال تھا۔ وہ بہت جلد اس کوفت کو اپنی مسکراہٹ میں چھپا لیتی اور دوسری باتوں میں انتہا انہماک سے دلچسپی لینے لگتی گویا جگنو کا ذکر ہوا ہی نہیں تھا لیکن اتنا اکثر میں نے محسوس کیا تھا کہ جگنو کا ذکر کرتے ہوئے اس کے چہرے پر ایک ایسی کیفیت کا ظہور ہوتا جس کا تعلق انسان کے پورے اعصاب سے ہو۔ اس وقت وہ جیسے اپنے حواس کے احتساب کی صلاحیت کھو دیتی تھی۔ اس بات پر میں نے غور کیا تو اس کی ایک امکانی وجہ میری سمجھ میں آئی کہ جگنو دوسرے تیسرے روز فرحت

کو بس اسٹاپ والی سڑک پر کہیں نہ کہیں ضرور نظر آتا تھا۔ اس بات کا فرحت کو علم تھا۔ اس بات کا ذکر ممکن ہے اس نے اپنی ماں سے کیا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ فرحت کو جگنو کی نیلی آنکھوں میں کچھ مل گیا ہو اور مسز گوریجہ نے اپنی بیٹی کے خیالات سے اتفاق کیا ہو۔

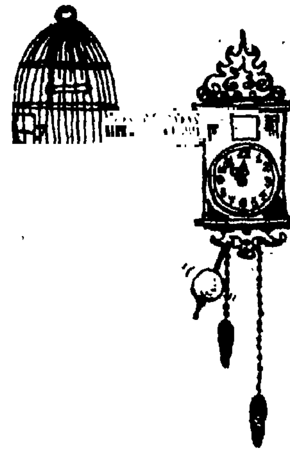
جگنو ابھی اپنی موسی کے گھر سے نہیں لوٹا تھا۔ مجھے اب اس کا ہر لمحے انتظار رہنے لگا تھا۔ کبھی کبھی رات کے اندھیرے میں مجھے یوں لگتا جیسے جگنو بلی کے سے قدم اٹھاتا، اپنی دہکتی ہوئی نیلی آنکھیں میری پشت پر گاڑے میرے پیچھے پیچھے چلا آ رہا ہے۔

لیکن فی الحال تو میں مسز گوریجہ کی نیم خوابیدہ آنکھوں میں ڈوب جانا چاہتا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ آنکھیں مجھے ایک جھیل کی مانند دکھائی دیتیں۔ اس وقت میرا جی چاہتا کہ میں اس جھیل کے ٹھہرے ہوئے پانی میں غوطہ لگاؤں اور اس کی تہہ میں دفن ہوتے در نایاب کو بند مٹھی میں بھینچ کر باہر لے آؤں لیکن پانی گدلا تھا اور مسز گوریجہ کی آنکھوں کی جھیل دیکھ کر ایک انجانا خوف میری رگ و پے میں سرائیت کر جاتا اور مجھے یقین سا ہونے لگتا کہ اگر میں اس جھیل میں کود گیا تو شاید پھر کبھی نہ ابھر سکوں گا۔

ایسے بہت سے اندیشے میرے دل کی دھڑکن کے ساتھ حرکت کر رہے تھے۔ اس کے باوجود مسز گوریجہ سے میری بے تکلفی بڑھتی گئی لیکن تھوڑے ہی دنوں میں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے مسز گوریجہ سے قریب تر ہونے کے بعد فرحت کہیں دور چلی گئی ہے۔ وہ نہ جانے کہاں چھپی ہوئی تھی۔

مسز گوریجہ برآمدے میں بیٹھے بیٹھے اسے آواز دیتی اور اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر کچھ ضروری کام کے متعلق اسے ہدایت دیتی اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر وہی جملہ دہراتی۔

"بہت شرماتی ہے، بہت شرماتی ہے۔"



یہ فقرہ بار بار سننے کے بعد ۔۔۔ مجھے محسوس ہونے
لگا تھا۔ جیسے کہہ رہی ہو۔

"بہت شرم آتی ہے، بہت شرم آتی ہے۔"

اور میرے اندر جو تھوڑی بہت شرم کا کانٹا سا کھٹک رہا تھا، میں اسے اپنے دماغ سے نکال دینا چاہتا تھا۔ ایسا کرنے کے لئے کچھ وقت درکار تھا۔ پھر بالکل اچانک طور پر فرحت کی طبیعت خراب ہو گئی تھی اور اس کے علاج معالجہ کے لئے مسز گوریجہ کو ایک سو روپے کی فوری اور اشد ضرورت تھی جو میں نے ایک دوست سے قرض لے کر مسز گوریجہ کو پیش کر دیا۔ دوسرے روز ہی مسز گوریجہ نے بتایا کہ فرحت کی طبیعت اب ٹھیک ہو گئی ہے۔ اور وہ اپنی کزن زہرہ کے گھر سے شام کو واپس اپنے گھر آ جائے گی۔ لیکن اسی نازک وقت میں حسن جگنو اپنی بیمار موسی کو اکیلا چھوڑ کر واپس آ گیا۔ حالانکہ میں نے اسے خط بھی لکھا تھا کہ جب تک اس کی موسی مکمل طور پر تندرست نہ ہو جائے اسے واپس ہرگز نہیں آنا چاہیے۔ جگنو کی آنکھیں کچھ ماند پڑ گئی تھیں، جیسے بہت دنوں سے سو نہ سکا ہو۔ ان خوبصورت آنکھوں کی ویرانی دیکھ کر مجھے بھی بہت افسوس ہوا۔ ان آنکھوں کی رونق تو فرحت تھی جسے میں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جگنو کی آنکھوں سے اوجھل کر دینے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن میں جگنو کی آنکھوں کو چمک سے خالی ہوتے ہوئے بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یہی تو اس کی زندگی تھی، یہی تو اس کی ذات کا محور تھا۔ اس چمک کا شعلہ میں کسی نہ کسی طور پر اپنی آنکھوں کے سامنے روشن رکھنا چاہتا تھا تاکہ ضمیر کے تقاضوں کی زنجیر بہت ہی مجھے مجبور کرنے کی کوشش کریں تو اس شعلے کی حرارت مجھے بچا لے۔ چنانچہ میں نے اسے بتایا کہ اس کی غیر موجودگی میں تمہارا سپرٹ اس کی پری کو شیشے میں اتار چکا ہے۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں اس ڈرامے کا ڈراپ سین ہوا ہی چاہتا ہے۔ باتوں کے ایک لامتناہی سلسلے کے بعد جب میری زبان خشک ہو گئی اور میرے پاس کہنے کے لئے کچھ نہ رہا تو میں نے جگنو کی آنکھوں کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے جیسے سبز آگ کے شعلے نکل رہے تھے۔ جس طرح جلتی گر کی دھونکنی کے سرخ دہکتے ہوئے کوئلوں پر نوشادر کا سفوف پڑ جائے۔

میں جگنو کو رخصت کر کے گلی کے نکڑ پر کھڑا گھر جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ سامنے سے مسز گوریجہ نمودار ہوئی، مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر ایک بھرپور مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ بڑے اچھے موڈ میں تھی۔ میں نے سلام کیا تو وہ کچھ اور زیادہ مسکراتے ہوئے بولی، میں آپ کو ہی یاد کر رہی تھی۔ میں کوئی جواب نہ دے سکا صرف مسکرا کر رہ گیا۔

"آج شام کو آپ آئیں گے نا؟"

"جی ضرور آؤں گا۔"

"فرحت کپڑوں کے بارے میں کچھ کہہ رہی تھی، میں نے اس سے کہا کہ اکبر صاحب آئیں تو ان سے پوچھ لینا، اگر کسی دکان سے کریڈٹ پر بندوبست ہو جائے تو کرو دیجئے گا۔ کچھ دنوں کے بعد میں بل ادا کر دوں گی، ان دنوں تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ....."

"جی کیوں نہیں" میں نے کہا۔ اس کے ساتھ ہی میری نظریں مسز گوریجہ کی آنکھوں کی طرف اٹھ گئیں جو آج نیم خوابیدگی سے تین چوتھائی خوابیدگی تک پہنچی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ اس کی سانس میں لرزش کی واضح آواز میرے کانوں میں آ رہی تھی۔ اس نے یہ سب کچھ کہتے ہوئے قطعی حجاب محسوس نہ کیا تھا۔ اس وقت مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ماحول کا ہر قسم کا خوف اس سے کوسوں دور ہے۔ اس کے بعد ہم نے دو ایک رسمی قسم کی باتیں کیں اور وہ چلی گئی۔

اس شام کی تقریب کا خیال کر کے میرا دل دھڑکنے لگا۔ آج شاید میں پہلی مرتبہ فرحت کی آواز سننے والا تھا۔ شاید آج اسے دیکھنے کا موقع بھی مل جائے۔ ان لمحات کی سنسنی کا تصور کر کے دل کچھ اور زور زور سے دھڑکنے لگا اور مجھے حوصلے، جرأت اور خود اعتمادی کی عدم موجودگی کا شدت سے احساس ہونے لگا جو عام طور پر ایسے موقعوں کے لئے نہایت ضروری ہے

یہ سوچتے سوچتے مجھے اپنے سوال کی وہ الجھن پھر یاد آگئی۔ جو مجھے
پھر وہ چھپکلی کے بچے سے لیا کرتا تھا اور جو اس کے کہنے کے مطابق بزدل
کو شیر بنا دیتی تھی ساتھ ہر قسم کے اندیشوں کو بھسم کر کے رکھ دیتی تھی۔ "الاؤ"
کے تین بوسوں نے ہی میرے ذہن میں انقلاب برپا کر دیا اور میں تیز تیز
قدم اٹھاتا مسز گرد بیچ کے گھر کی طرف چل دیا۔ شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا،
مہینے کے ابتدائی دنوں کا نامکمل چاند ایسے نظر آرہا تھا جیسے کسی نے کوئی طر
کر اس کے نصف رخ کے پرخچے اڑا دیئے ہوں۔ میں نے مسز گرد بیچ کے مکان
کی طرف دیکھا جس کی عقبی دیوار سے روشنی کی کچھ ٹیڑھی ترچھی لکیریں باہر
والے کمرے کی مٹی پر پڑ رہی تھیں۔ دروازہ بند تھا اور اندر بالکل خاموشی تھی۔
میں چند منٹ بلا مقصد دروازے کے سامنے کھڑا رہا پھر میں نے آہستہ
سے زنجیر ہلادی۔ کچھ دیر بعد جوتوں کی ٹک ٹک کی آواز آئی پھر دروازے
کے پاس کپڑوں کی سرسراہٹ کی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی بھینی بھینی
کی خوشبو کا معطر جھونکا میرے دماغ کی پہنائیوں میں بہار کے پہلے
جھونکے کی طرح پھیل گیا۔

"کون؟" آواز آئی۔

"میں ہوں اکبر۔"

"امی گھر پر نہیں ہیں، ابھی آجائیں گی، آپ بیٹھیں گے؟"

"جی۔" میں نے جواب دیا۔

"اچھا میں بیٹھک کا دروازہ کھولتی ہوں، آپ دو منٹ انتظار کریں۔"

دو منٹ انتظار کرنے کے بعد جب میں نے دروازے کا پٹ
کھولا، تو اس مشہور اور جانی پہچانی خوشبو نے میرے حواس کو اپنی گرفت
میں لے لیا جیسے کوئی کسی سحر کے تابع ہو جائے۔ ملحق کمرے کے بند
دروازے کے پاس پھر وہی ریشمی کپڑوں کی سرسراہٹ کی آواز سنائی
دی۔ میرا دماغ غبار آلود تھا اور نشے کے بوجھ سے میری آنکھیں بند رہی
تھیں۔ کچھ دیر کے لئے آنکھیں بند کر لیتا تو سارا کمرہ گھومنے لگتا، اور
دل ہچکولے پر بیٹھے ہوئے انسان کی طرح ڈولنے لگتا۔ کپڑوں کی اس
پُراسرار سرسراہٹ کے بعد دروازے کے پٹ آہستہ سے کھلے اور ایک سفید
دودھ کی طرح سفید ہاتھ ایک لمحہ کے لئے میرے سامنے لہرایا اور ایک
کاغذ میرے سامنے آپڑا۔

"شاید امی نے آپ کو بتایا ہو، ان کپڑوں کے متعلق آپ بازار
سے لا دیجئے، لا دیں گے نا؟"

میں نے سر کو جھکا کر کاغذ پر نظریں گاڑ دیں، لیکن جانے
کیوں میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا پھر جیسے اندھیرے
کے چھوٹے چھوٹے رقص پتنگوں کی طرح میرے سامنے ناچنے لگے۔
دیکھتے ہی دیکھتے مجھے محسوس ہوا جیسے میرے سامنے پھیلا ہوا سفید کاغذ
مسز گرد بیچ کا چہرہ ہے۔ جس پر لب تولیں کے لاتعداد نشان ابھر آئے
تھے۔ میں نے اپنی آنکھیں زور سے بھینچ لیں۔ میں اس آواز کی جادو خیزی
پر غور کر رہا تھا لیکن اس آواز کا ترنم بھی ریزہ ریزہ ہو کر پتنگوں کی طرح
اڑنے لگا۔ ماحول کی خاموشی نے اس تنہائی کو ابھی زیادہ پُراسرار
بنا دیا تھا۔

"جی میں یہ سب کچھ کل آپ کو پہنچا دوں گا۔" میں نے کہا۔

"شکریہ۔" ایک بار پھر آواز کا ترنم بکھرا اور ریزہ ریزہ ہو گیا۔
مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس ادھ کھلے دروازے کے پیچھے زرینہ نہیں،
بیس برس پہلے والی مسز گرد بیچ بیٹھی ہے۔ اس کے ہونٹ مسکرا رہے ہیں
اور وہ تل بھی مسکرا رہا ہے۔ یہی تو وہ تصویر تھی جو میرے ذہن پر نقش
ہو گئی تھی لیکن اس تصویر کے اوپر ایک پردہ پڑا ہوا تھا۔ سرمئی رنگ کی
تار جھریوں کا پردہ جس کے مہین مہین جھروکے ریشے ٹوٹ رہے تھے اور
ان کے پیچھے ایک صورت ایسی نظر آرہی تھی۔ جیسے بجلی کی چمک تاریکی میں
پڑی ہوئی کسی حنوط شدہ لاش کو ایک دم منور کر دے، پھر اس طرح کہ وہ
اپنے خدوخال کھو کر صرف چمک اور روشنی کا چھپا ہوا معلوم ہو۔ جانے اس
وقت مجھے کیا ہو گیا، میں نے بیٹھے بیٹھے اپنے کریپ سول کے جوتے والا
پاؤں زور سے دروازے میں مارا اور دروازہ ایک بے ہنگم آواز کے ساتھ
دو پٹ کھل گیا۔ میں تقریباً چیخ پڑا۔ میرے سامنے مسز گرد بیچ تربوزی بلاؤز
کے سوٹ میں ملبوس بیٹھی تھی۔ میں نے آج اس کی ہمیشہ نیم خوابیدہ رہنے
والی آنکھوں کو پہلی مرتبہ مکمل اور بھرپور بیداری کے عالم میں دیکھا تھا کیونکہ
وہ قریب قریب حلقوں سے باہر نکل آئی تھیں۔ وہ چند ثانیے میری طرف
ایسے ہی دیکھتی رہی پھر جذبات میں رندھی ہوئی چیخ کے ساتھ پھوٹ پھوٹ
کر رونے لگی۔ جیسے گھٹیا شیشے کے برتن میں کھولتا پانی ڈالتے ہی تڑاخ
سے اس کے ٹکڑے زمین پر بکھر جائیں۔ بلاشبہ آج مسز گرد بیچ کی عمر
بے پناہ میک اپ کی وجہ سے بیس برس تو نہیں دس برس ضرور کم لگ
رہی تھی اور وہ تل یوں بے تحاشہ کانپ رہا تھا جیسے ابھی ہونٹ کے
بالائی حصے سے نکل کر زمین پر آ رہے گا۔ بالکل اسی طرح جیسے اس وقت
مسز گرد بیچ کی روغنی ڈبیہ سے چھوٹی چھوٹی سیاہ گولیاں نکل کر زمین پر بکھر
گئی تھیں۔

***



شمع

موسیٰ مجروح

****

ظفر کے سامنے آٹوگراف بکس کا انبار لگا ہوا تھا۔ وہ یونیورسٹی میں (MODERATION)
کے لئے بلایا گیا تھا۔ اس سلسلے میں اسے وہاں کی بزمِ ادب کا افتتاح
ن کرنے کا موقع ملا۔ افتتاحی تقریر کے بعد فوراً سینکڑوں طلباء
و طالبات نے اسے اپنے نرغے میں لے لیا۔ ظفر نے سب کی
گراف بکس جمع کرلیں وہ ایک ایک ڈائری اٹھاتا، نام کلاس
پتہ دیکھتا۔ ان میں پہلے سے موجود آٹوگراف دینے والوں کی
یروں کا سرسری جائزہ لیتا۔ اور پھر ان تحریروں کی روشنی میں خود
کوئی مناسب شعر لکھ کر آٹوگراف دیتا جا رہا تھا۔ ایک طرف اس کا قلم
ی سے چل رہا تھا دوسری طرف وہ یہ سوچ رہا تھا.... آج سے
سال پہلے وہ اس یونیورسٹی کا طالب علم تھا۔ اس وقت وہ صرف
کالج کا ایک ہر دلعزیز طالب علم شاعر تھا لیکن آج پورے ملک کا مانا
شاعر اور ایک مرکزی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کا صدر۔ دونوں حیثیتوں
ہم اور معروف۔ وہ بے حد مسرور تھا۔ انہی خیالات میں محو وہ آٹوگراف

جب زندگی کی شمع اپنے ہی درد کے شعلے سے پگھل پگھل کر ختم ہونے لگتی ہے
تب وہ "شمع" دل کی گہرائیوں میں اتر جانے والے ایک پیارے سے افسانے کا عنوان
بن جاتی ہے۔

بتایا جا رہا تھا کہ اچانک ایک جگہ ٹھٹھک سا گیا۔ اس کے ہاتھ میں آٹو گراف بک تھی جو پچھلی تمام بکس سے سائز کے اعتبار سے بالکل منفرد تھی۔ اس کے پہلے ورق پر آرٹ کا ایک ایسا نمونہ بنا ہوا تھا جس نے ظفر کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔

ایک جلتی اور پگھلتی ہوئی شمع، جو نصف سے زیادہ جل چکی تھی اور روشنی بے حد مدھم اور گرد و پیش کسی پتنگے کا وجود نہ تھا۔ پس منظر میں کسی دوشیزہ کا دھندلا سا چہرہ پینٹ کیا گیا تھا۔ آنکھیں بے نور اور اندر کو دھنسی ہوئی، چہرے پر بے پناہ اداسی، رخسار پچکے ہوئے، ہونٹ پژمردہ، گیسو پریشان، جو شانوں پر بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے۔ ان تمام باتوں کے باوجود خط و خال جو لکیروں کی مدد سے ابھارے گئے تھے پُر وقار ماضی کی نشاندہی کر رہے تھے۔

ظفر تصویر دیکھتے دیکھتے خیالوں کی نہ جانے کن وادیوں میں کھو گیا۔ بظاہر اس کی نگاہیں آٹو گراف بک اور پس منظر کی تصویر پر مرکوز تھیں لیکن اس کا دماغ ماضی کے کھنڈروں میں بھٹک رہا تھا۔

جہانگیر آرٹ گیلری شائقین سے بھری پڑی تھی۔

شہر میں ہابیز (HOBIES) کی نمائش لگی ہوئی تھی۔ دستکاری، فوٹوگرافی، اسٹیمپس، ڈرائنگ اور پینٹنگ کے بے شمار پورٹریٹ ڈسپلے کئے گئے تھے۔ انہیں مناسب جگہوں پر بہت قرینے سے لگایا گیا تھا۔ سب سے پہلے دستکاری کے بہترین نمونے لکڑی کے چھوٹے چھوٹے اسٹولوں پر لگائے گئے تھے۔ دوسرے نمبر پر مختلف ممالک کے (STAMPS) شیشے کے چھوٹے چھوٹے خوبصورت بکسوں میں نادر ٹکٹ بہت خوبصورتی سے رکھے ہوئے تھے۔ آخر میں فوٹوگرافی اور پینٹنگ کے ایک سے ایک فنکارانہ صلاحیتوں سے معمور پورٹریٹ دیواروں پر آویزاں کئے گئے تھے۔

ہجوم کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ جیسے پورا شہر ہی امڈ کر چلا آیا ہو۔ قدم قدم پر والنٹیرز موجود تھے جو (VISITORS) کو گائیڈ کر رہے تھے۔ اس بھیڑ میں وہ لوگ بھی شامل تھے جن کی دستکاریاں (STAMPS) اور پورٹریٹ نمائش میں پیش کئے گئے تھے۔ یہ لوگ کبھی دور اور کبھی بالکل قریب سے اپنی اپنی کاوشوں کے متعلق لوگوں کی رائے اور تعریفی جملوں کو سن رہے تھے۔ ماڈرن آرٹ کے فن کار اپنی تخلیق کی خوبیوں کو بذاتِ خود شائقین کو سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

ظفر پینٹنگ کے نمونے کو بغور دیکھتا جا رہا تھا۔ دفعتاً اس کی نگاہ ایک پورٹریٹ پر جم کر رہ گئی۔ پینٹنگ کیا تھی داغ کے شعر

شعر

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

کی مکمل تفسیر تھی۔ ایک طرف ایک حسین و جمیل دوشیزہ آنکھوں میں انتظار کی شمع جلائے، اپنے آتشیں رخساروں پر ہاتھ رکھے افسردہ، پریشان خاطر بیٹھی تھی اور دوسری جانب، ٹھیک سامنے ذریعِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی شمع اپنی قسمت پر زار و قطار آنسو بہا رہی تھی۔ شمع کی مدھم روشنی دوشیزہ کے افسردہ چہرے کو اور بھی افسردہ بنا رہی تھی۔ وسط میں اوپر کی سمت ایک پروانہ پریشانی کی حالت میں دکھایا گیا تھا جس کی دوری شمع اور دوشیزہ دونوں سے برابر تھی۔ پینٹنگ کو ایک عنوان بھی دیا گیا تھا "کدھر جاتا ہے پروانہ" ظفر کو پینٹنگ اتنی پسند آئی کہ وہ آس پاس سے بالکل بے نیاز ہو کر اسی میں ڈوب گیا۔ عالمِ محویت میں اس کے منہ سے بے ساختہ قدرے اونچی آواز میں نکل پڑا "واہ، خوب"

پاس ہی کھڑی ہوئی ایک لڑکی جو اسے دیر سے تنکھیوں سے دیکھ رہی تھی پوچھ بیٹھی۔

"کیا آپ کو تصویر پسند آئی ہے؟" جیسے کہیں گھنگرو بج اٹھے ہوں۔

"جی! وہ چونک پڑا" صرف پسند نہیں محترمہ بہت پسند آئی..... بے حد پسند آئی! پھر جیسے اسے یکا یک کچھ خیال آگیا لیکن آپ.... آپ.... آپ کی تعریف؟"

"ناچیز کو فریدہ فردوس کہتے ہیں۔ یہ پینٹنگ میری ہی ہے"

ظفر کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں، اس کی زبان گنگ ہو گئی، ہونٹوں پر مہرِ سکوت لگ گئی۔ وہ دیکھتا ہی رہ گیا۔ سرو قد، متناسب بدن، میدہ کی طرح دھلا ہوا رنگ، مرمریں کلائیاں، سیاہ گھنی گھنی پلکوں کے درمیان کالی کالی آنکھیں، ریشم کی طرح نرم و نازک بالوں والی یہ لڑکی بجائے خود دستِ قدرت کا تراشا ہوا شاہکار معلوم ہو رہی تھی۔ وہ تحیر زدہ اس کی آنکھوں میں دیکھے جا رہا تھا جیسے ان زینوں سے دل کی گہرائیوں میں اترنے کی کوشش کر رہا ہو۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کے ہونٹوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

"خالق اور تخلیق دونوں کا جواب نہیں" ظفر نے کافی دیر کے بعد اپنے مخصوص شاعرانہ انداز میں سرگوشی کی۔

"شکریہ" ایک ہلکی سی مترنم آواز آئی جیسے منہ بند کلی چٹک جائے۔

"خالق کی تعریف کا یا تخلیق کی؟"

"خالق کی بات نہ تخلیق کی تعریف کا" چٹکے چٹکے سرخ ہونٹوں سے پھول کی پنکھڑیاں بکھر گئیں۔

"بہت حسین ذوق پایا ہے آپ نے۔ آرٹ کے ساتھ ساتھ ادب کا اتنا اچھا شعور قابل مبارکباد و ستائش ہے"

"ذرہ نوازی کا مزید شکریہ! ویسے ناچیز کے خیال میں ادب اور آرٹ بنیادی طور پر ایک ہی شے کے دو نام ہیں۔ ادب میں شاعر یا ادیب اپنی تخلیقات کو الفاظ کا جامہ پہناتا ہے اور آرٹسٹ لکیروں اور رنگوں کا" پھول کی بھینی بھینی خوشبو اب ظفر کے دل و دماغ پر اثر انداز ہو رہی تھی۔

"بجا فرمایا ہے آپ نے۔ ہر تخلیق براہ راست اپنے خالق کے اوصاف کی آئینہ دار ہوتی ہے چاہے وہ کسی مصور کی بنائی ہوئی تصویر ہو یا سنگ تراش کا تراشا ہوا بت، کسی ادیب کا تخلیق شہ پارہ ہو یا شاعر کا کلام۔ ان تمام چیزوں میں ان کے صانع کا کردار اور شخصیت کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ مجھے آپ کے اس پورٹریٹ میں آپ کی شخصیت کی جھلک اور ادب اور آرٹ کا حسین بلا کا امتزاج نظر آرہا ہے" ظفر اتنا کہہ کر دوسری طرف بڑھ گیا۔ فردوس اسے بھیڑ میں گم ہوتے دیکھتی رہی۔

یونیورسٹی آڈیٹوریم میں تل رکھنے کی جگہ نہیں تھی۔

سال کے آخر میں بزم ادب کا اختتامیہ فنکشن ہو رہا تھا۔ ہال کی اگلی سیٹوں پر یونیورسٹی کے پروفیسرز اور دوسرے VIPS بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے ایک طرف طلباء اور دوسری جانب طالبات کا ہجوم تھا۔ ہال کے پہلے سرے پر بڑی میز کے ایک کنارے پر مہمان خصوصی صدر بزم ادب اور دوسرے عہدیدار بیٹھے تھے۔ ان کے قریب ہی کھڑا ظفر اپنی ایک پسندیدہ نظم "بے وفا کی محفل میں" درد انگیز آواز میں پڑھ رہا تھا۔ ہال میں رہ رہ کر "آہ" اور "واہ" کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ ماحول سے بے نیاز ایک نگاہ فردوس اسے بے حد حیرت و استعجاب سے دیکھ رہی تھی جیسے اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آرہا ہو۔ ظفر کی نگاہوں نے اس عالم کو بھانپ لیا تھا۔ نظم ختم ہوتے ہی ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ باہر نکلنے پر کتنی لوگوں نے اس کی تعریف کی۔ وہ سب کا اپنی دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ شکریہ ادا کرتا رہا۔

"سنئے" ایک جھنکار ہوئی، جیسے مینا کے تار انگلیوں کے مس سے بج اٹھے ہوں۔

"فرمائیے"

"آپ شاعر ہیں؟" ان تاروں سے جواب ظفر چھوٹ نہ پاتا تھا۔

"جی۔ ایک شاعر ہونے پر آپ کو کوئی اعتراض ہے؟"

"نہیں تو... بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ لیکن" مینا کے تار خاموش ہو گئے جیسے کسی نے یکایک نغمے کا گلا گھونٹ دیا ہو۔

"لیکن کیا؟"

"آپ مجھے کسی ادا، کسی انداز سے شاعر نہیں معلوم ہوتے۔ نہ شیروانی نہ چوڑی دار پاجامہ، نہ پاؤں میں ہاتھی کی سونڈ والا ناگرہ، نہ گردن تک لٹکی ہوئی تراشیدہ زلفیں ہی، نہ آنکھوں پر سنہری کمانی کی عینک... اور نہ ہاتھ میں چھڑی!"

"تو آپ کے خیال میں شاعر ہونے کے لئے اچھا خاصا کارٹون ہونا ضروری ہے؟" ظفر مسکراتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

"قطعی نہیں! فائن آرٹ کی طالبہ ہونے کے ناطے میرے ذہن میں ہر وقت آرٹسٹ، ادیب، شاعر، سیاستدان اور فلسفی سب کی ایک تصویر رقصاں رہتی ہے اور جب میں ان میں سے کسی کو اپنی خیالی تصویر سے مختلف پاتی ہوں تو بہت مایوسی ہوتی ہے"

"مجھے افسوس ہے کہ میں ایک ہونہار فنکار کے لئے مایوسی کا باعث بنا" ظفر نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"آپ تو برا مان گئے مسٹر ظفر۔ میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ایک شاعر کو شیڈی بننا زیب نہیں دیتا۔ میرے سامنے جب بھی شاعر کا ذکر آتا ہے، تو میرے تخیل میں میر و غالب کی تصویر ابھرتی ہے۔ پر عظمت و پر وقار اور سر نیاز عقیدت سے خود بخود خم ہو جاتا ہے۔ انھی برگزیدہ ہستیوں کی مماثلت میں اس دور کے شعراء میں بھی دیکھنے کی متمنی رہتی ہوں"

فردوس نے ایک مختصر لیکن جامع تقریر کر ڈالی۔ ظفر کچھ خفیف سا ہو گیا۔ وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ فردوس ماڈرن ہوتے ہوئے بھی اتنی ماضی پرست ہو سکتی ہے۔ کچھ دیر خاموشی طاری رہنے کے بعد فردوس نے خود ہی سکوت توڑا۔

"اچھا سنئیے"

"سنائیے"

"آپ شاعر ہیں؟"

"یہ تو آپ پہلے بھی دریافت کر چکی ہیں"

"آپ میرا ایک کام کر دیں گے؟"

"ایک نہیں... سوا ایک!"

"آپ مجھے آٹوگراف دے سکتے ہیں۔؟"

"آٹوگراف؟" آٹوگراف کے نام پر ظفر جیسے چونک پڑا۔ "آپ کو معلوم بھی ہے آٹوگراف کس سے لیا جاتا ہے؟ بڑے بڑے ادیب اور شاعر، عظیم فلسفی، سیاستداں، سائنٹسٹ اور آرٹسٹ وغیرہ سے۔ میں تو بالکل تیسرے درجے قسم کا شاعر ہوں۔ آپ بھلا مجھے بے وقوف بنانے پر کیوں آمادہ ہیں؟"

"آج نہیں تو کل آپ بھی عظیم ہو جائیں گے!" فردوس نے ظفر کی بات نظر انداز کرتے ہوئے دلیل پیش کی۔

"پیشین گوئی کا بہت بہت شکریہ! میں آپ سے پھر عرض کروں گا کہ ناچیز اس قابل نہیں کہ اس سے آٹوگراف لیا جائے!"

"یہ فیصلہ تو دوسرے ہی کر سکتے ہیں، آپ خود نہیں!"

"اچھا تو پھر سر تسلیم خم ہے!" ظفر نے بہت ڈرامائی انداز میں سر جھکا دیا۔

"معاف کیجئے، مجھے آپ کا سر نہیں آٹوگراف چاہیئے!" ظفر کو اپنے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے فردوس کے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"اوہ! میں تو بھول ہی گیا تھا۔ اچھا تو لائیے!"

"لیکن ایک شرط ہے!"

"وہ کیا؟" ظفر مجسم سوال بن گیا۔

"یہی کہ آپ اسے ایک مقدس راز کی طرح رکھیں گے۔ اپنے عزیز ترین دوست سے بھی۔ یہاں آئے دن نت نئی کہانیاں جنم لیتی رہتی ہیں، کچھ حقیقی کچھ تخیلی۔ ہم ان شگوفے کھلا کرتے ہیں۔ رنگ برنگے اور میں ان شگوفوں سے اپنے دامن کو رنگین نہیں بنانا چاہتی!" فردوس کی آواز میں بلا کی سنجیدگی اور نگاہوں میں ناقابل تشریح التجا تھی۔

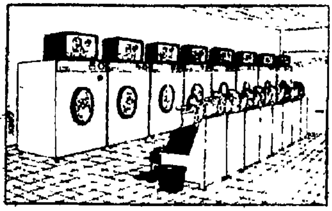
"آپ کا حکم سر آنکھوں پر!"

"مکرم فرمائی کا مکرر شکریہ!" فردوس اپنی آٹوگراف بک ظفر کے ہاتھ میں دے کر آگے بڑھ گئی۔

ظفر آٹوگراف بک کے پہلے ہی ورق سے الجھ کر رہ گیا جس پر شمع کی ایک تصویر بنی ہوئی تھی۔ جلتی پگھلتی سی روشنی مدھم سا منظر بالکل سادہ نیچے اقبال کا یہ مصرعہ بہت فنکارانہ انداز میں تحریر تھا۔

زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

دوسری طرف آٹوگراف بک کے پلاسٹک کے خول میں ایک تصویر ..... جو بظاہر اس طرح رکھی گئی تھی جیسے اس خول میں سہارے کو کوئی



دخل نہ ہو۔ ظفر کبھی فردوس کی تصویر کو دیکھتا اور کبھی جلتی پگھلتی ہوئی شمع کو..... اور کبھی نیچے لکھے ہوئے مصرعہ کو..... وہ قلم کو ہونٹوں سے لگائے کافی دیر تک نہ جانے کیا سوچتا رہا۔ بہت غور و فکر کے بعد اس نے ایک سادہ ورق پر یہ شعر ؎

شمع کی صورت پگھل کر زندگی کیجئے تمام
یا پتنگوں کی طرح جل کر فنا ہو جائیے

لکھ کر اپنے دستخط ثبت کر دیئے۔

دوسرے دن فردوس نے آٹوگراف بک واپس لیتے وقت جب ظفر کا شکریہ ادا کیا تو اس کے ہونٹوں پر ایک بہت پھیکی اور شکست خوردہ سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ گھنی پلکوں کے درمیان صاف شفاف آنکھوں کی چمک یکسر غائب ہو گئی۔ آنکھیں رخسار سفید پڑ گئے۔ اس لئے کہ اس نے ظفر کا آٹوگراف دیکھتے وقت یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ اس کی رکھی ہوئی تصویر اس طرح واپس آ گئی ہے جیسے چھوئی بھی نہ گئی ہو۔ اس کی انا کو شدید ٹھیس لگی اور وہ تڑپ کر رہ گئی۔ لیکن اس نے اس درد کو ظاہر نہ ہونے دیا۔ وہ ان آنسوؤں کو پی لینے میں کامیاب ہو گئی جو خزہ پر آ کر بکھرنے کے لئے بیتاب تھے۔ کاش اسے اس راز کا علم ہوتا کہ ظفر جس کی پہلی نظر میں وہ گرویدہ ہو گئی اور جس پر وہ جان چھڑک رہی ہے، اس کی خاص دوست حنا کی گھنیری زلفوں اور مخمور آنکھوں کا شیدائی ہے جس کی محبت نے اسے شاعر بننے پر مجبور کیا، جس کے پیار میں سرشار ہو کر وہ نظمیں اور گیت لکھتا ہے۔ جس کے معاشرانہ پیکر کو وہ بندش و الفاظ میں ڈھالتا رہتا ہے..... اور جسے وہ مختلف شاعرانہ ناموں سے یاد کرتا ہے۔

اگلے سال ظفر اور فردوس کنووکیشن پنڈال میں ملے۔ دونوں کو ساتھ ساتھ ڈگری ملی۔

"شاندار کامیابی پر میری طرف سے دلی مبارکباد قبول فرمائیے!" ظفر نے سلسلۂ گفتگو شروع کیا۔

"شکریہ — آپ کو بھی مبارک ہو" فردوس نے مختصر سا جواب دیا۔ شگفتہ چہرے پر حزن و ملال کے بے شمار نقوش ابھر آئے۔

"کیا شغل ہے ان دنوں آپ کا؟"

"یونیورسٹی میں پینٹنگ کی لیکچرار ہوں۔ تصویریں بناتی اور بنواتی ہوں" ایک بہت ہی سرد جواب ملا جیسے سارا درد سمٹ کر ہونٹوں پر آ گیا ہو۔

"بہت خوب.... تب تو دوبارہ مبارکباد قبول کیجئے"

"شکریہ.... اور آپ کے کیا شب و روز ہیں؟" کرب میں ڈوبی ہوئی ایک خفیف آواز ابھری۔

"طالب علمی کی آہنی بیڑیوں سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں"

"میں مطلب نہیں سمجھی"

"یعنی.... ریسرچ کر رہا ہوں مسلم یونیورسٹی میں تھیسس مکمل ہونے کے بعد شاید وہیں پر پناہ مل جائے" ظفر نے وضاحت پیش کی۔

"خدا کامیاب کرے میری نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہیں"

"اچھا اب اجازت دیجئے.... خدا حافظ!" ظفر نے بہت پرتپاک انداز میں رخصت طلب کی۔

"خدا حافظ!" درد کے سوتے پھوٹ پڑے۔ فردوس ضبط کے باوجود امڈتے ہوئے آنسوؤں کو نہ روک سکی.... لیکن انہیں دیکھنے والا وہاں موجود نہ تھا۔

ظفر ماضی کے کھنڈروں میں بھٹکتے بھٹکتے جب حال کی دنیا میں واپس آیا تو اس کے دیرینہ آٹوگراف بک تھی جو اپنی ساخت اور پہلے ورق پر پینٹنگ کے اعتبار سے بالکل منفرد تھی۔ وہ شمع کی دھندلی روشنی میں اجاگر چہرے کے نقوش کو اس طرح دیکھ رہا تھا۔ جیسے اس میں کچھ ڈھونڈ رہا ہو۔ کافی دیر بعد اس نے آٹوگراف دینے کے لئے جب ورق الٹنا شروع کیا تو اس کے ہونٹوں پر وہ شعر رقص کر رہا تھا جسے اس نے اپنی زندگی میں پہلی بار آٹوگراف دیتے وقت لکھا تھا۔ ابھی اس کے اشہب قلم نے "شمع کی صورت" ہی تک کی مختصر سی مسافت طے کی تھی کہ اسے رک جانا پڑا۔

"کیا دس سال بعد بھی وہی سزا تجویز کی جائے گی جو دس سال پہلے دی جا چکی ہے.؟"

"کیا مطلب!" ظفر جیسے سوتے میں چونک پڑا۔

"مطلب صرف اتنا ہے کہ یہ سزا تو آپ اس گنہگار کے لیے پہلے بھی تجویز کر چکے ہیں"

ظفر نے جب سر اوپر اٹھایا تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ فردوس اس کے سامنے حسرت و یاس کی سراپا بنی کھڑی تھی شگفتہ ہونٹوں کے گلاب اور آتشیں رخساروں کے کنول مرجھا گئے۔ آنکھوں کی جھیل بالکل خشک نظر آ رہی تھی۔ ریشم کی طرح چکنے اور چمکتے ہوئے چہرے پر غم و اندوہ کی لکیریں نمایاں سیاہ زلفوں کی گھنگھور گھٹائیں بالکل بے رنگ ہو چکی تھیں۔ جیسے کہ کھل گئی ہوں۔ فردوس سفید لباس میں اپنے سن سے کہیں زیادہ عمر اور قبل از وقت بیوہ نظر آ رہی تھی۔ گھبراہٹ میں ظفر کھڑا ہو گیا۔

"فردوس — تم نے یہ کیا شکل بنا رکھی ہے؟" ظفر نے بالکل اتنی اپنائیت سے مخاطب کیا۔

"شکل تو خدا کی بنائی ہوئی ہے ظفر صاحب! میں تو صرف کینوس پر تصویریں بناتی ہوں — بے جان — اور بے رنگ۔" فردوس کی آواز میں بلا کا درد تھا۔

"میرا مطلب ہے یہ کیسی حالت بنا رکھی ہے تم نے؟" ظفر نے محبت اور ہمدردی سے معمور لہجے میں دریافت کیا۔

"آپ ہی نے تو کہا تھا" پژمردہ ہونٹ طائر قفس کی طرح پھڑپھڑائے۔

"میں نے؟" ظفر سراپا سوالیہ نشان بن گیا۔

"جی ہاں — آپ نے کہا تھا —

شمع کی صورت پگھل کر زندگی کیجئے تمام
یا پتنگوں کی طرح جل کر فنا ہو جائیے

شاید آپ بھول گئے ہوں.... لیکن میں نے اسے اپنا مقدر سمجھ لیا.... میں پتنگوں کی طرح جل کر فنا تو نہیں ہو سکی.... لیکن آپ کے حکم کے احترام میں شمع کی صورت پگھل کر زندگی تمام کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ کاش! میں اس کوشش میں کامیاب ہو سکتی!" اتنا کہتے کہتے فردوس کا گلا رندھ گیا۔ جذبات کی شدت سے آواز حلق میں پھنس کے رہ گئی۔ جھلملاتے ہوئے آنسوؤں کے درمیان اسے کمرے کی ہر شئے دھندلی اور گھومتی ہوئی معلوم ہوئی۔ اس سے پہلے کہ فردوس غش کھا کر کمرے کے ننگے فرش پر گر پڑتی ظفر نے اسے اپنے بازوؤں میں تھام لیا۔



تین عورتیں تین کہانیاں

تحریر: رعنا فاروقی

شادی کے نذرانے

ہم چھ بہنیں ہیں بھائی ایک ہے وہ بھی چار بہنوں سے چھوٹا۔ ابا میاں ایک فیکٹری میں سپروائزر لگے ہوئے تھے۔ بڑے با اصول اور وضع دار قسم کے آدمی ہیں۔ محنت اور ایمانداری ان کا ایمان ہے اس لئے ہمیشہ پریشانیوں میں گھرے رہے۔ ایماندار اور محنتی آدمی کی اگر تقدیر اچھی ہو تب وہ دنیا سے مقابلہ کر سکتا ہے (جو عموماً نہیں ہوتی) ورنہ تو بیچارا ساری عمر پستا ہی رہتا ہے باہر افسران بالا اور اپنے احباب کے ہاتھوں اور گھر میں مالی پریشانی میں گھری بیوی اور خواہشات سے محروم بچوں کی بے بسی کے ہاتھوں ——— میرے ابا جان چور رستے گھر میں داخل ہوتے۔ جیسے رشوت نہ لینا بہت بڑا جرم ہے جس کی سزا وہ اپنے بیوی بچوں کو دے رہے ہیں۔ میری امی جان فضول خرچ عورت نہیں ہیں۔ شوہر سے خفا ہو جاتی تھیں مگر جھگڑتی نہیں تھیں۔ اسی وجہ سے ان کا گزارہ ہو گیا۔ ورنہ ڈھائی تین سو کی معمولی تنخواہ میں آٹھ جانوں کا کھانا پہننا آسان کام نہیں۔ کچھ امی سگھڑ تھیں اور تھوڑا بہت سلائی کا کام خود کر لیا کرتی تھیں اور کچھ ابا میاں بیوی کا دل نہیں برا رکھتے تھے۔ جس کی وجہ سے ہمارا بچپن قدرے سکون سے گزر گیا۔ میٹرک تک میں نے بڑی محنت سے پڑھا۔ سب سے بڑی میں ہی تھی۔ امی ٹھنڈی سانس بھرا کرتیں کہ خدا اگر لڑکا ہوتی تو گھر کے آدھے دلدر دور ہو جاتے۔ یہ طعنے سن سن کر میں نے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ابا میاں سے دبے دبے الفاظ سے ملازمت کی بات کی۔ انہوں نے اجازت دے دی۔ امی نے لیت و لعل سے کام لیا۔ لیکن کب تک تکرار کرتیں۔ انہیں اس حقیقت کو قبول کرنا پڑا کہ گھر میں آمدنی بڑھانے کا واحد طریقہ میری ملازمت ہے۔ ابا میاں کے ایک دوست تھے۔ منظور شاہ، بڑے پیارے آدمی تھے۔ اب تو ان کا انتقال ہو گیا ہے میں نے ان جیسا شفیق آدمی اپنی زندگی میں پھر کبھی نہیں دیکھا۔ انہوں نے خود میری درخواست ٹائپ کرائی اور مجھے اپنے ساتھ دواؤں کی کمپنی میں لے گئے۔ مہینے بھر تک اس کمپنی کے چکر کاٹے۔ روز دفتر سے آنا جانا ہوتا۔ کرایہ وہی دیتے کیا مجال جو کبھی ماتھے پر شکن آئی ہو۔ مجھے حوصلہ دیتے کہ بیٹی میں چاہتا ہوں جہاں تمہاری ملازمت ہو وہاں لوگ تمہاری عزت کریں۔ میں اس کمپنی میں چھ سال کام کر چکا ہوں بہت سے لوگ مجھے جانتے ہیں انہیں میں نے بتا دیا ہے کہ تم میری بھتیجی ہو۔ اب یہ لوگ تمہیں تنگ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ بس تمہیں حوصلے اور شرافت کا ثبوت دینا ہوگا۔

ایک ماہ کی بھاگ دوڑ کے بعد ملازمت مل گئی۔ ساڑھے چار سو



تنخواہ بھی ملا کرے گی۔ فیلڈ ورکنگ کے لئے آفس کی گاڑی پر آنا جانا ہوگا۔ دو سو روپے گاڑی کا خرچ بچتا تھا۔ اس طرح کل ملا کے تقریباً سات ہزار کے قریب پڑ جاتے تھے۔ میں نے آفس کی گاڑی نہیں لگوائی۔ بس سے آنا جانا رکھا۔ مہینے میں کئی دن فیلڈ ورکنگ کے ہوتے تھے۔ اس کا بھتہ تنخواہ سے پہلے ہی مل جاتا تھا۔ ابا میاں کے ہاتھ پر میں نے پہلی تنخواہ رکھی تو ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ امی سے کہنے لگے تو ہر وقت روتی تھی کہ پہلوٹھی کا لڑکا نہ ہوا۔ دیکھ لے آج اس نے لڑکوں سے زیادہ تنخواہ لا کر دی ہے۔" امی بولیں "جہیز بھی اسی کا بننا ہے۔ جو کمائے گی ساتھ لے جائے گی۔ احسان کس پر کرے گی۔ لڑکا ہوتا تو کمائی گھر پر خرچ ہوتی۔"

امی کا طعنہ سن کر میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب تنخواہ کی بجائے گھرداری کا سامان خرید کر لایا کروں گی تاکہ پیسے جمع نہ ہوں۔ اگلے ماہ میں نے یہی کیا۔ گھر بھر کے لئے کپڑے خریدے۔ کھانے پینے کا مہینے بھر کا سامان گھر میں ڈلوا دیا اور جو بچا ابا میاں کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ انہوں نے سو روپے میرے ہاتھ پر رکھے۔ کہنے لگے۔ تجھے ماں کی بات بری لگی تھی تبھی تو نے پیسا اپنی مرضی سے خرچ کر دیا۔ چل جس میں تیری ماں راضی وہی کام کیا کر۔ ماں اس ماہ مجھ سے بہت خوش رہیں۔ تب میں نے یہ وطیرہ بنا لیا کہ بچوں کی فیسیں اور کپڑے لینے دینے کے لئے رکھ کر کھانا پینا ابا میاں نے سنبھال لیا۔ پھل وغیرہ میں خرید لیا کرتی۔ اس طرح گھر کا معیار کچھ بہتر ہوتا گیا۔

مجھے کمپنی میں کام کرتے ہوئے تیسرا سال تھا کہ ایک محترمہ کسی تگڑی سفارش سے ہمارے دفتر میں ملازم ہونے آئیں۔ پہلے پہل تو وہ ڈائریکٹر صاحب سے یونہی ملنے آتی تھیں۔ پھر اچانک ان کا تقرر ہو گیا۔ کسی اونچے گھر کی عورت لگتی تھی کیونکہ رہن سہن اور بات چیت کا انداز ہم جیسی لڑکیوں سے قطعی مختلف تھا۔ قریب سے گزرتی تو دیر تک فضا مہکتی رہتی۔ ہر روز نیا اور گراں لباس بدن پر ہوتا۔ ہم چھ لڑکیاں ایک ڈیپارٹمنٹ میں تھیں۔ اس خاتون نے ہمیں کمتری کا شدید احساس دلا دیا۔ لوگ انہیں مسز عثمانی کہتے تھے۔ مگر وہ خود کو شمع کہلواتی تھیں۔ کچھ دن ہم لوگوں سے دور دور رہیں۔ لیکن ایک دن بغیر اطلاع کے آ دھمکیں۔ ہم کام میں مصروف تھے لیکن وہ ایسی شے تھیں کہ ان کی آمد کا نوٹس دینا ناممکن تھا۔ لڑکیاں گھبرا کر کھڑی ہو گئیں۔ وہ بولیں "بیٹھو میں تو تنہا کمرے میں بیٹھی بیٹھی اکتا گئی۔ سوچا تم لوگوں سے دوستی کی جائے۔ میرا نام شمع ہے یہاں لوگ مسز عثمانی کہتے ہیں۔ عثمانی میرے شوہر کا نام ہے آجکل وہ لندن میں کاروبار ڈیل کر رہے ہیں۔ میں یہاں بور ہو رہی تھی اس لئے ملازمت کر لی اور اب آپ اپنا اپنا تعارف کرائیں۔" باری باری سب لڑکیوں نے انہیں اپنا نام اور کام کی نوعیت بتائی۔ وہ تھوڑی دیر میں گھل مل گئیں۔ اور یادداشت اس غضب کی تھی کہ ہم سب کے نام بھی ازبر ہو گئے۔ ان کے متعلق ہمارا نظریہ بدل گیا۔ پہلے ان سے دور دور رہتے تھے مگر اب ان کے بغیر جی نہیں لگتا تھا۔ ہمارے ان کے سٹیٹس میں زمین آسمان کا فرق تھا لیکن ان کی فیاضی نے کمتری کا احساس مٹا دیا۔ ہمارے لئے چھوٹے موٹے تحائف لاتیں۔ کبھی نیل پالش کبھی پرفیوم۔ کہتیں میرے شوہر نے بھجوائی ہیں سوچا ایک ایک ادھر تم میں بانٹ دوں۔ آہستہ آہستہ وہ سب لڑکیوں میں مجھ سے زیادہ قریب آتی گئیں۔ اس کی وجہ وہ یہ بتاتیں کہ تمہاری شکل اور بات چیت کا انداز میری چھوٹی نند سے ملتا ہے جو ان دنوں امریکہ میں ہے۔ کہتی کہ جب آئے گی تو تم سے ضرور ملواؤں گی۔ میں محبت اور توجہ کی ترسی ہوئی لڑکی تھی۔ مسز عثمانی کی محبت کا جواب انتہائی گرمجوشی سے دیا۔ وہ [illegible] آ گئیں۔ انہوں نے مجھے خوبصورت شرٹ پیس دیا۔ کہنے لگیں "کسی اچھے درزی سے کپڑے سلوایا کرو۔ میرے ساتھ چلنا صدر میں ایک درزی ہے کم دام پر اچھے کپڑے سیتا ہے۔" میں نے ان کی ہدایت پر عمل کیا اس سے پہلے میں اپنے کپڑے امی سے سلواتی تھی لیکن باجی شمع کے کہنے پر میں درزی کو کپڑے دینے لگی۔ باجی نے بازار سے خود شاپنگ کرائی۔ میں نے چار نئے جوڑے سلوائے۔ ابا میاں سے میں نے تنخواہ دیتے وقت کہہ دیا کہ اس دفعہ میں نے اپنے لئے کپڑے سلوائے ہیں ساری لڑکیاں درزی کو کپڑے دیتی ہیں۔ میرا مذاق اڑاتی ہیں۔ ابا میاں نے ذرا غور سے میرے چہرے کو دیکھا۔ پھر ہنستے ہوئے کہنے لگے "چلو شکر ہے تجھے اپنا خیال تو آیا۔ ٹھیک ہے بیٹا باہر تو زمانے کے ساتھ چلنا ہی پڑتا ہے۔"

ابا میاں بڑے بھولے آدمی تھے۔ ان کی اجازت ملی اور میں نے دو چار قدم اور بڑھا لئے۔ باجی کی ہدایت کے مطابق تھوڑی سی جیولری خریدی۔ ڈریس کے ساتھ میچنگ کرنے لگی۔ جوتے نئے ڈیزائن کے خریدے۔ امی میری یہ تبدیلیاں خاموشی سے دیکھ رہی تھیں مگر کماؤ بیٹی کو وہ کہاں پابند کر سکتی تھیں۔

ایک دن شمع باجی کہنے لگیں "فرخ آج شام کو لاہور سے میری ایک رشتہ دار آ رہی ہیں۔ آج میں تمہیں ان سے ملواؤں گی۔ میرے ساتھ چلنا تمہیں دیکھ کر وہ خوش ہوں گی۔" میں نے پس و پیش کی کہ ابا میاں نے کہیں آنے جانے پر سخت پابندی لگا رکھی ہے۔ باجی ہنسنے لگیں۔ بولیں "یہ جو تم شام چھ بجے تک آفس میں رہتی ہو کیا اس کا حساب کتاب بھی لیتے ہیں؟"

نکلی کیا ہر ضروری ہے کہ اپنے ابا میاں کو سر بات جا کر بتاؤ کل ہاں تم کے ہے میرے ساتھ چلنا۔ گھر جا کر کہہ دینا فیلڈ ورک کا اچانک پروگرام بن گیا تھا۔" میں نے باجی کی یہ بات بھی مان لی۔ باجی نے مجھے منع کر دیا تھا کہ کسی دوسری لڑکی سے اس کا ذکر کرو مت کرنا لڑکیاں حاسد ہوتی ہیں خواہ مخواہ جلنے لگیں گی۔ پروگرام کے مطابق دوسرے دن انہوں نے مجھے بس سے پک اپ کیا۔ گاڑی وہ خود ڈرائیو کر رہی تھیں راستے میں مجھے اونچی سوسائٹی کے ایٹی کیٹ بتاتی رہیں کہ مردوں سے شرما شرما کر بات نہیں کرنا چاہئے۔ لڑکی جتنے اعتماد سے بات کرے گی مرد اتنا ہی متاثر ہوتا ہے۔ اور پھر اسی طرح ملتے ملاتے رہنے سے اچھے رشتے بھی آسانی سے مل جاتے ہیں۔"

میں سعادت مندی سے باجی کی باتیں سنتی رہی۔ گارڈن دور ہی کتنا تھا ہم نو دس منٹ میں پہنچ گئے۔ باجی نے ہمیں بتا رکھا تھا کہ وہ سوسائٹی میں رہتی ہیں مگر گارڈن میں بھی بقول ان کے ان کا ایک ذاتی مکان تھا۔ اپنے رشتے داروں کو وہ یہاں ٹھہراتی تھیں۔

گھر میں نو دس لوگوں کا اجتماع تھا اور سب کے سب انتہائی ماڈرن۔ تین لڑکیاں تھیں اور چھ سات مرد۔ یہ لوگ ڈرنک کر رہے تھے۔ ڈرائنگ روم میں الکحل کی تیز بو رچی ہوئی تھی باجی نے سب کا مجھ سے تعارف کرایا۔ لڑکیوں نے مجھے گھسیٹ کر ناچنا کودنا شروع کر دیا۔ مرد تالیاں بجانے لگے۔ میں بری طرح سے نروس ہو گئی۔ ایسی ہلڑ بازیوں کا ہماری زندگی میں کہاں گزر تھا۔ میرا تو اس ہنگامے بازیوں سے دم گھٹنے لگا۔ مگر باجی نے کہا تھا خبردار خود کو احمق مت ثابت کرنا۔ میں رات آٹھ بجے تک ان لوگوں کے ساتھ رہی۔ اللہ کی پناہ اتنی بے تکلفی کہ جو جس کا چاہے منہ چوم لے۔ شراب ایسے پی جا رہی تھی جیسے ٹیلیویژن یا انگریزی فلموں میں پی جاتی ہے۔ باجی نے مجھے بار بار پلانے کی کوشش کی مگر میں رونے والی ہو گئی تب انہوں نے ہاتھ روک دیا۔ اس ماحول میں بن پیئے اتنا نشہ تھا کہ میں چکرا گئی کہ کچھ دیر اور رکی تو میں بھی بہک جاؤں گی باجی کی منت کی کہ مجھے گھر چھوڑ دیں۔ وہ بولیں "جان اصل لطف تو اب آئے گا تھوڑی دیر اور رک جاؤ۔" مگر میں بس بیچ رو پڑنے کے قریب تھی۔ باجی نے ایک صاحب سے کہا کہ اسے چھوڑ آتے ہیں کئی لوگوں نے احتجاج کیا مگر باجی نے انہیں پتہ نہیں کیا سمجھایا کہ سب خاموش ہو گئے۔ باجی مجھے لے کر باہر آ گئیں کہنے لگیں "دس منٹ رک جاؤ میں نے ڈرائیور کو بھیج کر اپنے پیر صاحب کو بلایا ہے وہ آتے ہی ہوں گے۔ تب میں خود تمہیں چھوڑ آؤں گی۔" ڈر کے مارے میرا برا حال تھا مگر باجی نے اپنے پیر صاحب کی ایسی ایسی داستانیں سنا رکھی تھیں کہ ان سے

ملنے کا شوق ہو گیا۔ گھر میں باجی سے کہہ آئی تھی کہ ایک لڑکی کی منگنی پر جانا ہے ذرا دیر ہو جائے تو پریشان مت ہوں۔ اس وقت دل کو تسلی تھی تو صرف یہ تھا کہ چلو نہیں یہ لوگ پی کر اور کیا بدتمیزیاں کریں۔ باجی بولیں "تم یہاں لان میں بیٹھی رہو اندر مت آنا۔" میں نے باجی کی بات مان لی۔ باہر بیٹھ گئی۔ باجی اندر چلی گئیں۔ تھوڑی دیر بعد گیٹ پر ہارن بجا۔ اندر کے سب لوگ باہر آ گئے۔ باجی سب سے آگے آگے تھیں مجھے بھی گھسیٹ لیا۔ کہنے لگیں "ان کے گھٹنے چھونا۔" پیر صاحب جونہی اندر داخل ہوئے۔ لڑکیوں نے جھک کر ان کے قدم تھام لئے کسی نے ہاتھ چومے کوئی گھٹنے چومنے لگا۔ عقیدت کا عجیب و غریب مظاہرہ تھا۔ جس میں باجی نے مجھے بھی گھسیٹ لیا۔ پیر صاحب نے مجھے بڑے غور سے دیکھا۔ لحیم شحیم آدمی تھے۔ بے حد سفید رنگ اور سفید داڑھی نے چہرہ پُر نور بنا رکھا تھا۔ باجی کے کہنے پر میں نے ان کے گھٹنے چھوئے۔ باجی بولیں۔ "شاہ جی اس لڑکی کی قسمت کھول دیں۔" شاہ جی مسکرائے۔ کہنے لگے "ذرا دم تو لینے دو۔" باجی کہنے لگی "یہ لڑکی گھر جانا چاہتی ہے اسے دیر ہو جائے گی۔" شاہ جی نے ایک ٹک میری طرف دیکھا اور دیکھتے ہی رہے۔ مجھے یوں محسوس ہوا آنکھوں کے راستے کوئی شے میرے اندر اترتی جا رہی ہے۔ وہ بولے "کیوں لڑکی کیا تو گھر جانا چاہتی ہے؟"

میں نے کچھ بولنا چاہا مگر زبان جیسے تالو سے چپک گئی تھی اور آنکھیں شاہ جی کی آنکھوں سے بری طرح الجھ گئی تھیں۔ وہ پھر ہنس کر بولے "جواب دے۔" میں نے بمشکل زبان کھولی "نہیں پیر جی —— نہیں ——" سب لوگ دم سادھے سامنے کھڑے تھے۔ باجی بولیں شاہ جی یہ لڑکی شراب کو برا سمجھتی ہے۔ پیر جی بولے "لا مجھے دے اس کی کیا مجال جو اللہ کی نعمتوں کو ٹھکرائے۔" باجی نے جلدی سے گلاس بڑھا دیا۔ شاہ جی نے اس میں چٹکی بھر کر کچھ ڈالا۔ اور میری طرف بڑھا دیا۔ بولے "لے لڑکی تیرا باطن بھی روشن ہو جائے گا۔" میں نے مشینی انداز سے گلاس لیا اور بلا چون چرا منہ کو لگا لیا۔

اس کے بعد مجھے نہیں یاد کیا کیا کچھ ہوا۔ رات گیارہ بجے کے قریب میرے حواس تھوڑے قابو میں آئے تو عجیب حال تھا۔ کپڑے نام کی دھجی بھی میرے بدن پر نہیں تھی اور ایک میں ہی کیا اس عالم میں سبھی ننگے تھے۔ اس دوران کیا کچھ نہ ہوا ہوگا۔ باجی مجھے لے کر باتھ روم میں گئیں۔ مجھے خود نہلایا۔ کپڑے پہنائے۔ کہنے لگیں "تم اب سے یہاں آتی رہو گی۔ شاہ جی کا حکم ہے۔" میرا ذہن میرے تابع ہی نہیں تھا میں نے سر ہلا دیا۔ مجھے پھر شاہ جی کے سامنے پیش کیا گیا وہ مجھے سامنے بٹھا کر

خدا جانے کیا کیا منہ میں پڑھتے گئے پھر بولے "یہ لڑکی تو پھر آئے گی ہر ہفتہ کی رات تو ہمارے ساتھ رہے گی۔" باجی نے فقرہ دیا۔ "شاہ جی رات کو نہیں دن کو رکھو۔" وہ بولے "اچھا اچھا سمجھ گیا تو چپ رہ —— ہاں تو لڑکی بتا آئے گی؟" میں نے میکانکی انداز سے جواب دیا "آؤں گی۔" وہ بولے "ذرا ٹھہر پہلے اپنے کپڑے اتار ——" میں نے خاموشی سے کپڑے اتار دیئے۔ وہ بولے "چل اب پہن لے ——" میں نے جلدی جلدی پہن لئے۔ انہوں نے یہ عمل تین چار بار دُہرایا۔ پھر باجی سے بولے۔ "تیرا کام ہو گیا۔ اب اسے چھوڑ آ ——"

باجی نے مجھے راستے میں بتایا کہ "تمہارے والدین سے میں بات کروں گی تم چپ رہنا۔" میرا ذہن تو بالکل سویا ہوا تھا۔ میرے ساتھ کیا ہوا تھا اور کیا ہوتا تھا مجھے قطعی اس کی فکر تھی نہ احساس۔ چاروں طرف شاہ جی کی آواز گونج رہی تھی۔ "لڑکی کپڑے اتار ——" کپڑے اتار اور میرا جی چاہتا تھا ابھی اپنا گریباں چاک کر دوں۔

گھر میں باجی نے امی سے کیا کہا مجھے پتہ نہیں۔ امی نے مجھے تشویش سے دیکھا۔ مجھے پکڑ کر بستر تک لے گئیں۔ ابا میاں بے چین نظر آئے پھر سب چہرے دھندلے ہوتے گئے۔ سوائے ایک چہرے کے جو میرے لاشعور میں اترتا چلا جا رہا تھا —— اور یہ شاہ جی تھے۔

دوسرے دن صبح ہی صبح باجی ڈاکٹر کو لے کر آ گئیں۔ مجھے اس وقت بھی خاصا تیز بخار تھا۔ امی اور ابا میاں دونوں ہی باجی کے ممنون تھے۔ باجی نے انہیں بتایا تھا کہ اسے اچانک ٹمپریچر ہو گیا۔ سردی سے بخار چڑھ گیا تھا اس لئے اپنے گھر ٹھہرا لیا۔ طبیعت کچھ بحال ہوئی تو گھر چھوڑنے آ گئیں۔ امی نے مجھ سے پوچھا میں نے بھی یہی بات دُہرائی۔ سارے رستے وہ یہی جملے دُہرا رہی تھیں۔ اور جو وہ کہہ رہی تھیں اسے جملہ کا لفظ دُہرانا لازمی امر تھا۔ ڈاکٹر نے دیکھ بھال کر دوا دے دی۔ بارہ بجے تک میرا بخار اتر گیا میں بالکل بھلی چنگی ہو گئی۔ شام کو باجی پھر آ گئیں۔ امی نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ وہ کہنے لگیں "آپ فکر مت کریں میں اسے اپنی بہن بنا چکی ہوں ——"

دوسرے روز میں آفس گئی۔ بظاہر میں نارمل تھی مگر میرے اندر ایک عجیب سی تبدیلی رونما ہو گئی تھی۔ ہر لمحہ ایک آواز ٹیپ ریکارڈر کی طرح کانوں میں گونجتی رہتی "تو ہفتہ کے دن آئے گی" باجی کو دیکھتی تو دل چاہتا جھک کر ان کے قدم تھام لوں۔ تابعداری کا یہ عالم تھا کہ وہ کہتیں کنوئیں میں کود جاؤ تو میں بلا سوچے سمجھے چھلانگ لگا دیتی۔ لڑکیوں سے بات کرنے کو بالکل بھی نہیں چاہتا چپ چاپ اپنی میز پر بیٹھی رہتی۔ لڑکیوں نے یہ تبدیلی نوٹ کی۔ وہ نزدیک آتیں میز گھیر کر بیٹھ جاتیں۔ ذہن ہر وقت سویا سویا سا رہنے لگا۔ کام میں غلطیاں ہونے لگیں جنہیں باجی خوش اسلوبی سے COVER کر جاتیں۔

جمعہ کا دن آیا باجی نے مجھے بلایا کہنے لگیں "غور سے سن کل تم آفس کی بجائے سیدھی گارڈن روڈ پر اترو گی۔ وہاں میری گاڑی کھڑی ہو گی اس کا دروازہ کھلا ہو گا تم اندر جا کر بیٹھ جانا۔" میں نے سر ہلا کر حامی بھری۔ گھر والے سمجھے میری خاموشی کی وجہ یہ ہے سے پریشان تھے۔ میں نے گھر کی ہر بات میں دلچسپی لینا چھوڑ دیا تھا زیادہ وقت بستر پر لیٹی رہتی۔ دوسرے دن بالکل مشینی انداز سے گارڈن روڈ پر اتر گئی۔ وہاں سے پندرہ بیس قدم دور گاڑی کھڑی تھی۔ سیدھی اس کی جانب کھنچتی چلی گئی۔ دروازہ کسی نے کھول دیا۔ گاڑی میں باجی موجود تھیں۔ مگر ڈرائیور کوئی مرد تھا۔ باجی نے مجھے کھینچ کر سینے سے لگا لیا اور میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔ مجھے جیسے غنودگی سی ہو رہی تھی۔ گھر پہنچے۔ وہاں شام سات بجے تک رہی۔ جو کچھ وہاں ہوا اسے زبان دُہرانے سے قاصر ہے۔ اس دفعہ کچھ لڑکیاں تھیں اور کچھ ہی مرد۔ پہلے شاہ جی کو لڑکیوں کا نذرانہ دیا گیا۔ اس کے بعد نائٹ کلب جیسے ڈرامے دُہرائے گئے۔ نیم تاریک کمرے میں عیاشی کا پورا پورا سامان موجود تھا۔ میری منتظر نظریں کھلی تھیں ذہن خواب کے سے عالم میں تھا۔ انہوں نے جو کھلایا کھا لیا جو پلایا پی لیا جو مانگا خوشی سے پیش کر دیا۔ شام کو باجی مجھے گھر چھوڑ آئیں۔ اس دفعہ اندر نہیں گئیں کہنے لگیں "تمہارے گھر والے مشکوک ہو جائیں گے۔ اب تم اندر جاؤ۔ پوچھیں تو کہہ دینا آفس سے آ رہی ہوں۔"

اور پھر یہ میرا معمول ہو گیا۔ باجی جس روز مجھے گارڈن بلاتیں میں کسی معمول کی طرح گارڈن پر اتر جاتی۔ اس وقت میری کیفیت ایسی ہوتی کہ اگر کوئی مجھے روکنا چاہتا تو میں اس کا منہ توڑ دیتی۔ سحر زدگی کے عالم میں باطل مجبور کر کے پیدل چلتی رہتی تاکہ مقررہ مقام پر پہنچ جاتی۔ گاڑی نے آنا اب چھوڑ دیا تھا میں خود بخود وہاں پہنچ جاتی تھی۔ ہر دفعہ مختلف عورتوں اور مردوں سے میرا واسطہ پڑتا۔ اور اب تو یہ بھی ہونے لگا کہ مجھے گاڑی میں بٹھا کر کسی اور کے عشرت کدے میں بھیج دیا جاتا۔ گھنٹہ دو گھنٹہ بعد مجھے واپس لے آتے۔ میں اپنے پر ڈھائے گئے ستم کو مسکرا کر سہتی۔ باجی ہر ہفتے اپنے ڈاکٹر سے میڈیکل چیک اپ کراتیں اس طرح میں ہر خطرے سے محفوظ کر دی جاتی۔ میری صحت دن بدن گرتی جا رہی تھی۔ ابا میاں اور امی پریشان تھے کہ اسے کیا ہو گیا سب سے مجھے دلی نفرت ہو گئی تھی۔ کھانے پینے سے قطعی دلچسپی نہیں رہی تھی بیمار

تھیں تو انہیں جھڑک دیتی۔ وہ دونوں بیچاری میرے سامنے سہمی سی کیفیت میں گھری پیچھے پیچھے رہتی تھیں۔

ایک دن طیبہ سے آبا میاں کے دوست کی بیوی ہمارے گھر آئی ہوئی تھیں۔ میں آفس سے آئی اور سیدھی کمرے میں چلی گئی۔ اس سے پہلے میں انہیں بڑی محبت سے سلام کرتی اور دیر تک ان سے باتیں کیا کرتی تھی۔ میرا رویہ دیکھ کر انہوں نے امی سے پوچھا۔ امی نے میرا سارا احوال بتا دیا۔ وہ بولیں کہ اسے مجھے دیکھنے دو۔ امی نے مجھے آواز دی۔ میں منہ بناتی آئی۔ امی بولیں "خالہ کو سلام نہیں کیا؟" میں نے نظریں اٹھائیں اور فوراً جھکا لیں۔ دل نے حکم دیا اس عورت کے منہ پر زور سے تھپڑ مار دو۔ میرا ہاتھ یکبارگی اٹھا۔ امی نے لپک کر ہاتھ پکڑ لیا۔ خالہ بولیں "اسے چھوڑ دو۔" میں نے امی سے ہاتھ چھڑایا۔ اور خالہ کے منہ پر تھپڑ جڑ دیا ——— اس وقت میرا چہرہ بری طرح سے تپ رہا تھا۔ پیر پٹختی اندر آ گئی ——— میرے جانے کے بعد خالہ بولیں اس پر کسی نے سفلی عمل کرا دیا ہے۔ تھوڑا بہت علم میں بھی جانتی ہوں۔ اگر لڑکی کی خیریت چاہتی ہو تو یہ معلوم کرو کہ کس کس سے ملتی ہے۔ امی ڈر گئیں۔ آبا میاں آئے تو انہیں بتایا وہ بھلا ایسی باتوں پر کہاں اعتماد رکھتے تھے۔ الٹا امی پہ برس پڑے۔ مگر امی نے اپنے طور پر کچھ کرنے کا ارادہ کر لیا۔ انہوں نے میرے چھوٹے بھائی کو میرے ساتھ بھیجنا شروع کر دیا۔ وہ مجھے آفس تک چھوڑنے جاتا۔ اور واپسی پر مجھے لینے آتا۔ تین دن بعد ہفتہ آ گیا میں ہر احساس سے بے نیاز تھی۔ جوں ہی گارڈن آیا میں حسب معمول اتر گئی۔ بھائی بھی ساتھ ہی اتر گیا۔ اس نے مجھے آواز دی میں نے پلٹ کر دیکھا۔ اور اس کے منہ پر زور سے طمانچہ مار دیا۔ اور پھر سیدھی چلتی گئی۔ بھائی پیچھے پیچھے آتا رہا۔ میں کوٹھی میں چلی آئی ——— وہ واپس پلٹ گیا۔ مجھے اس وقت یہ احساس ہوا تھا کہ ایک دشمن تیرا پیچھا کر رہا ہے اس سے بچ ——— کوئی ایک گھنٹے بعد ابا میاں ہانپتے کانپتے آ پہنچے۔ باجی نے مجھے دوسرے دروازے سے نکال کر کسی دوسری جگہ پہنچا دیا۔ ابا میاں سے کہہ دیا کہ آپ کی بیٹی یہاں کام سے آئی تھی۔ واپس چلی گئی ہے۔

شام کو حسب معمول میں گھر پہنچی تو امی اور ابا میاں سر جھکائے بیٹھے تھے۔ میں نہ انہیں آفس میں ملی تھی اور نہ گھر پہنچی تھی۔ مجھے کسی بات کا مطلق احساس نہیں تھا۔ اور آئی حسب معمول کمرے میں بیٹھی اور بستر پر گر کر بے خبر سو گئی۔ تب ابا میاں کو تشویش ہوئی۔ وہ مجھے اٹھانا چاہتے تھے اور میں نیم بے ہوش تھی۔ ڈاکٹر کو بلایا۔ وہ انجکشن لگا کر چلا گیا۔ دوسرے روز میری حالت اور خراب ہو گئی۔ امی نے خالہ کو طیبہ سے بلوایا۔ وہ بولیں "اب پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے۔ تم اسے لے کر میرے گھر آ جاؤ۔ میں اپنے پیر و مرشد سے اس کا علاج کراؤں گی۔ اس عرصہ میں اس کی نگرانی ضروری ہے۔" شاید یہاں کے وقت نے بھی انہیں مجبور کیا تب وہ دونوں مجھے طیبہ میں لائے۔ امی گھر پہ بچوں کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتی تھیں مگر میرا علاج بھی ضروری تھا کسی سے میری بیماری کا چرچا بھی کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ خالہ نے ہر مشکل آسان کر دی۔ اپنی بیٹی کو ہمارے گھر بھیج دیا ——— اور تب میرا علاج شروع ہوا ——— مجھے عمل کے دوران اپنی کیفیت بالکل یاد نہیں۔ اور یہ باتیں امی نے مجھے بتائیں۔ جن صاحب سے میرا علاج کروایا تھا وہ رات کو گیارہ بجے گھر پر آتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ لڑکی کو ایک عورت نے اپنے تابع کر لیا ہے وہ اسے اپنے بُرے کاموں میں شریک کرنا چاہتی ہے جس شخص سے عمل کرایا ہے وہ سفلی علوم کا ماہر ہے۔ لڑکی کا ذہن وہ دور بیٹھے کنٹرول کر رہا ہے اور اسے جو حکم دیتا ہے لڑکی اس پر پورا پورا عمل کرتی ہے۔

پندرہ روز بعد مجھے ایسا لگا جیسے سر پر گڑے ہوئے شکنجے نے سرکنا شروع کر دیا ہے۔ میرے سر میں اتنی تکلیف ہوتی تھی کہ زمین پر سر ملتی اور روتی۔ مہینے بھر یہ حالت رہی پھر سر ہلکا ہونے لگا۔ اور میرے حواس جاگتے گئے۔ پوری طرح تندرست ہونے میں پورے تین ماہ لگے۔ امی مجھے گھر لے آئیں۔ جمعرات کے روز مجھے طیبہ لے جاتیں۔ رات بھر وہیں ٹھہرتے جمعہ کو واپسی ہوتی۔ اس طرح پوری توجہ سے میرا علاج ہوا ——— تب مجھے یہ سب کچھ ایک دھندلا دھندلا خواب محسوس ہوا۔ ذہن پر زیادہ زور دیتی تو چکر آنے لگتے۔ مگر شکر ہے کہ مجھے باجی کے نام سے نفرت ہو گئی۔ وہ ایک دفعہ بھی گھر پر نہیں آئیں۔ تندرست ہونے پر جب میں آفس گئی تو خبر ملی وہ سروس چھوڑ چکی ہیں۔ گویا وہ اپنے مشن پہ آئی تھیں پورا ہوا اور رخصت ہو گئیں۔

ابا میاں نے مجھے آفس کی وین لگوا دی۔ ڈرائیور سے ہدایت کر دی کہ اسے حفاظت سے دروازے پر چھوڑ دیا کرو۔

اس واقعہ کو نو سال گزر چکے ہیں۔ اب اللہ کے فضل سے ہمارے حالات بدل گئے ہیں۔ ابا میاں نے نوکری چھوڑ کر ٹیوب کا کاروبار شروع کر دیا۔ اس میں برکت ہوئی۔ دو سال بعد میری نوکری چھڑوا دی اور عزت سے شادی ہو گئی ——— تین چھوٹی بہنوں کی بھی شادی ہو گئی ہے۔ بھائی کالج میں پڑھ رہا ہے۔ وہ منحوس عورت پھر مجھے کبھی نہیں ملی ——— اور پتہ نہیں یہ چکر کیا تھا ———

جو کچھ میرے ساتھ ہوا اس میں اس عورت کا کیا فائدہ تھا۔ اب تو خیال بھی آ جائے تو سر جھٹک دیتی ہوں کہ میرے اللہ میں بے گناہ تھی۔ ——— جو کچھ ہوا اس میں میرا اپنا کوئی دخل تو نہیں تھا ———

غزالہ۔ کراچی

جوبن گل کھلائے

میں سیدھے سادے ماحول میں پلنے والا ایک انتہائی سادہ لوح لڑکا تھا۔ گھر میں والدہ نے نماز روزے کا سختی سے پابند کرا دیا تھا۔ کھانے پینے سے لے کر دوستوں سے ملنے جلنے کی نگرانی تک والد اور والدہ کے سپرد تھی۔ اپنی ذات پر اعتماد کہاں سے سیکھتا جبکہ کپڑے تک اماں جی نکال کر دیتی تھیں۔ میٹرک بمشکل کیا۔ ایک تو پڑھائی میں دل نہیں لگتا تھا۔ دوسرے طبیعت میں حد درجہ لاابالی پن تھا۔ میٹرک میں اچھی ڈویژن تو نہیں آ سکی لیکن فائدہ صرف یہ ہوا کہ والدہ والد کی ڈانٹ پھٹکار سے بچ گیا۔ والد صاحب کے مالی وسائل نے آگے پڑھنے کی اجازت نہیں دی۔ مزید تعلیم کے لئے مجھے شہر میں ہوسٹل میں داخلہ لینا پڑتا۔ جس کے اخراجات والد صاحب کے بس سے باہر تھے فرمانبردار لڑکوں کی طرح میں نے والد صاحب کی خواہش کا احترام کیا۔ ان کے ایک دوست نے سفارش کی اور مجھے محکمہ زراعت میں معمولی سی ملازمت مل گئی۔ یوں ان دنوں میرے لئے بہت بڑی خوشی تھی۔ ٹریجڈی یہ ہوئی کہ مجھے گھر سے دور ایک گاؤں میں بھیج دیا گیا۔ ملازمت کی یہی شرط تھی کہ جہاں تقرر ہوگا جانا پڑے گا۔ مجھے گھر چھوڑنے کا بہت صدمہ تھا۔ دراصل میرا شمار ان بچوں میں ہوتا ہے جو اپنی ماں کے بغیر چند قدم چلنا بھی مصیبت سمجھتے ہیں۔ والدہ کا ہر لمحہ مجھے نظروں کے سامنے رکھنا ناز کی معراج بن گیا۔ اس وقت عمر بھی زیادہ نہیں تھی۔ سولہ سے بھی چند ماہ کم ہی ہوگی۔ دور دراز گاؤں میں بھیجتے ہوئے اماں جی رو رہی تھیں اور میں بھی آنسوؤں سے رومال بھگو رہا تھا۔ جانا ناگزیر تھا اس لئے سب کو روتا دھوتا چھوڑ کر نئی فضا میں چلا آیا۔

یہ بڑا سرسبز اور شاداب گاؤں تھا۔ چند ہی دنوں میں مجھے یہ احساس ہونے لگا میں ایک آزاد پرندہ ہوں جسے ایک رنگین وادی میں اڑنے کے لئے چھوڑ دیا ہو۔ اماں کی تربیت اللہ کو پیاری ہونے لگی جس کا ردعمل یہ ہوا کہ نماز روزے قطعی طور پر چھوڑ دیئے کوئی روک ٹوک نہیں ہوئی تو نظر کے زاویے بھی بدلنے لگے اور میں گاؤں کی ایک معصوم دوشیزہ رضوانہ میں دلچسپی لینے لگا۔ وہ بارہ تیرہ برس کی بھولی بھالی لڑکی تھی۔ کبھی کبھار مجھ سے پھولوں کے بیج مانگنے آتی تھی۔ اس نے اپنے گھر کے باہر چھوٹا سا باغیچہ لگا رکھا تھا جس کی دیکھ بھال وہ خود کرتی تھی پھولوں سے اسے جنون کی حد تک عشق تھا۔ اور اس کی پھولوں سے دلچسپی، میری اس کی ذات میں دلچسپی کا سبب بن گئی۔ وہ مجھے پڑھا لکھا بابو سمجھتی تھی اس لئے میری ہر بات اس کے لئے حکم کی حیثیت رکھتی تھی۔ ایک روز وہ گلاب کی قلم مانگنے آئی میں نے اسے دیکھ کر دھیرے سے کہا "رضوانہ تم تو خود گلاب کا پھول ہو تمہیں باغیچے میں گلاب لگانے کی کیا ضرورت ہے۔ خود کسی جھاڑی میں چھپ کر بیٹھ جایا کرو۔ لوگ سمجھیں گے گلاب کا پودا ہے۔" وہ اس دن سرخ رنگ کی کرتی اور سبز سوسی کی شلوار پہنے ہوئے تھی۔ میری بات حیرانی سے دیکھنے لگی پھر معصومیت سے بولی "آپ سچ کہہ رہے ہیں نا؟" مجھے اس کے بھولے پن نے لوٹ لیا۔ وارفتگی سے بولا "رضوانہ تم ایسے کپڑے مت پہنا کرو تمہیں کسی کی نظر لگ جائے گی۔ دیکھ لینا کسی دن کوئی تمہیں باغیچے سے اٹھا کر لے جائے گا۔" وہ کھلکھلا کر ہنس دی اور میرے تن من کے سارے پھول جھوم جھوم گئے ——— یہ لڑکی بہار کا پہلا جھونکا بن کر میرے دل میں داخل ہوگئی۔ عمر کا تقاضا یہی تھا کہ کسی لڑکی کو چاہو۔ جب گھر کی طرف سے بھی کوئی خوف نہ تھا تو کیوں نہ اپنی چاہت کا اظہار کرتا۔ اس کی معصوم مسکراہٹوں نے میری پذیرائی کی اور میں اس کی محبت کے معاملے میں روز بروز سنجیدہ ہوتا چلا گیا۔ میرے دل کا راز اس پر آشکارہ ہوا تو اس ظالم نے میرے پاس آنا بند کر دیا جس سے یہ آگ اور بھڑک اٹھی۔ آہٹوں پر نظریں چونک چونک اٹھتیں۔ ہر پتلی کمر اور لمبی چوٹی والی لڑکی پر اس کا گمان ہوتا۔ وہ سچ مچ بڑی سیدھی سادی، پاکیزہ صفت لڑکی تھی۔ مجھے کچھ دنوں بیقرار رکھنے کے بعد اس نے ایک بچے کے ہاتھ اپنے ہاتھ سے کڑھے ہوئے رومال بھیجے۔ بچے نے کہا "باجی بولتی ہیں کہ انہیں خط لکھنا نہیں آتا۔ وہ پڑھنا لکھنا سیکھ رہی ہیں جب خط لکھنا آ جائے گا تب آپ کو خط لکھیں گی۔" اس کے معصوم پیغام پر روح کے اندر حلاوت سی گھلتی چلی گئی۔ میں نے بچے کے ہاتھ چوم لئے اسے بہت ساری میٹھی گولیاں دلائیں۔ یہ اس کے پڑوس کا بچہ تھا۔ خاصا تیز اور ذہین ——— اس بات کا ذکر اس نے کسی سے نہیں کیا اور ہر دوسرے تیسرے روز وہ رضوانہ کے تحائف لانے لگا۔ کبھی کھانے پینے کی چیزیں کبھی برتنے کی معمولی اشیاء ——— ان تحائف میں اس کی محبت کا شدید اظہار چھپا ہوا ہوتا تھا اور یہی میری خوشیوں کا اب واحد مرکز بھی تھا۔ میری رہائش گاؤں کی ایک حویلی کی بیٹھک میں تھی۔ یہ حویلی آبادی سے قدرے دور تھی اس لئے رضوانہ کے آنے جانے پر کسی کی روک ٹوک نہیں ہو سکتی تھی وہ جان جہاں خود اتنی شرمیلی تھی کہ میرے بار بار بلانے پر ہفتے میں ایک آدھ دفعہ ہی آتی ——— اور جب تک سامنے بیٹھی رہتی اس کا چہرہ شرم سے لال رہتا۔ آنکھیں ملانا تو اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ میں جرأت کر کے

یتا تو وہ لاج سے دُہری ہو جاتی۔ اس کی پاکیزگی اور
مر پر کچھ ایسا رعب طاری کر دیا تھا کہ کیا مجال جو حضرت
ب بار بھی کامیابی حاصل کی ہو۔ دور دور سے نظروں سے
روہ دوپٹہ انگلیوں سے مسلتی رہتی۔ اس طرح ملاقات
ے بخیر و عافیت گزر جائے۔ بلکہ ہماری چاہت میں کچھ
جاتے۔
سال کا عرصہ گزر گیا۔ رضوانہ اب تھوڑی سی سمجھدار ہو گئی
لوگوں میں اس کے حسن کا چرچا تھا۔ جلد ہی نوجوانوں نے
چر بیچ لیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ہماری کہانی لوگوں کی
رضوانہ کا باپ معمولی کاشتکار تھا۔ عمر رسیدہ آدمی تھا۔
ا انتقال ہو گیا تھا۔ رضوانہ اس کی دوسری بیوی کی واحد اولاد
اس کے والد سے میرا آمنا سامنا ہوتا میں سر جھکا کر گزر
ب رضوانہ کی محبت کا چرچا پھیل گیا تب میں باہر نکلنے سے
رضوانہ کو والدین کی مار بھی پڑی۔ گاؤں والوں کے طعنے
لیکن اب وہ محبت کے سحر میں پوری طرح گرفتار ہو چکی
کا سچا عاشق تھا جو اس کی ایک نظر پر ساری زندگی قربان
زندگی کا ماحصل تھی۔ عورت کو ایسی محبت اور اتنا اعتماد
تو وہ جہنم کو بھی خوشی سے قبول کر لے گی۔ اس نے
ہنسی خوشی سہہ لیا مگر مجھ سے ملنا نہیں چھوڑا۔ جس پر
بہن نے مجھے گھر بلا کر سمجھانے کی ٹھانی۔ انہوں نے ایک
سے مجھے گھر مدعو کیا۔ ڈر تو مجھے بہت لگ رہا تھا لیکن رضوانہ
یم ضرور آنا۔ آج فیصلہ ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے میرے
ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دینے پر راضی ہو جائیں۔
ہمت کر کے ان لوگوں سے ملنے پہنچا۔ دروازے پر دستک
ے کواڑ کا پٹ کھلا اور ایک اٹھائیس انتیس سالہ عورت نے
۔ مجھے دیکھا اور دیر تک دیکھتی رہی ــــ میں اس کی
ں سے بوکھلا گیا۔ واپس پلٹنے لگا مگر اس نے پکار لیا۔
اے نال سے دسدا جا" میں نے جلدی سے کہا میرا نام
رضوانہ کے والد صاحب نے بلایا تھا ــــ اس کے
رے پر تھوڑی سی حیرت سی نظر آئی۔ بولی "اندر آ جاؤ ــــ"
نا اندر آ گیا۔ اور مجھے بعد میں پتہ چلا کہ یہ عورت رضوانہ
اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کی شادی چھوٹی عمر میں ہو گئی
وہ ابھی بھرپور جوان عورت تھی ــــ اس کا رویہ

مجھ سے بہت نرم تھا۔ رضوانہ نے بتایا تھا کہ اس کی ماں بہت سخت ہے۔
لیکن یہاں تو معاملہ الٹا نکلا۔ وہ کچھ کچھ گھلی سی۔ اس کا شوہر کچھ کہنا چاہتا
مگر وہ کہنی مار کر اسے ٹوک دیتی۔ وہ اپنے شوہر پر ہر طرح سے حاوی
تھی۔ اس لئے اس بیچارے کی ایک نہ چلنے دی۔ کہنے لگی "اصغر اس
طرح ہماری بیٹی کی بہت بدنامی ہوتی ہے۔ اگر تو کوئی منگنی وغیرہ کر
لے اور ہمارے یہاں رہائش اختیار کر لے تو دنیا والوں کی زبانیں بند
ہو جائیں گی۔ میں سب جگہ کہہ دوں گی کہ یہ میرے دور کے رشتے داروں
میں سے ہے" رضوانہ کا باپ بیوی کی تجویز پر متفق نظر نہیں آ رہا تھا۔
لیکن بیچارا بیوی سے دبا ہوا تھا اس لئے مخالفت کھل کر نہیں کر سکا۔ اور
مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا اپنے گھر والوں کو ابھی میں اطلاع نہیں
دینا چاہتا تھا۔ ورنہ اور گڑبڑ ہو جاتی مجھ سے بڑی بہنیں ابھی کنواری
بیٹھی تھیں والدہ کبھی ایسا نہ ہونے دیتیں۔ مصلحت کا تقاضا تھا کہ جو رضوانہ
کی ماں کہتی ہے اس پر عمل کرو کیا پتہ رضوانہ کو اپنانے کی کوئی عملی صورت
اسی طرح نکل آئے۔ میں حویلی چھوڑ کر ان کے مکان میں منتقل ہو گیا۔
دوریاں مٹ گئیں۔ دنیا کی زبان وقتی طور پر بند ہو گئی۔ مجھے رضوانہ کی
امی نے تسلی دی کہ مناسب موقع ملتے ہی منگنی کا اعلان کر دیں گے۔
پہلے تمہارے والدین کی رضا جاننی ضروری ہے۔ میں نے انہیں اپنے حالات
بتا دیئے وہ بولیں کچھ عرصے صبر کرو۔ میں سارا معاملہ خود سلجھا دوں گی۔"
میری تنخواہ کا بیشتر حصہ ان لوگوں پر خرچ ہونے لگا۔ میرے
لئے تو اب وہی میرا گھر تھا۔ رضوانہ میری ہونے والی بیوی تھی میری ساس
صاحبہ میرے چہیتے دامادوں والے نخرے اٹھاتی تھیں۔ کھانے پینے کا
ایسے خیال رکھتیں جیسے میری صحت کی انہیں مجھ سے زیادہ فکر ہو۔ رضوانہ
کبھی تنہائی میں مجھ سے ملنے نہیں آتی تھی مگر اس کی نظریں میرا طواف
کرتی تھیں۔ رضوانہ کی امی (جنہیں میں اب خالہ جی کہتا تھا) کا حکم تھا کہ
اگر تم نے کوئی غلط حرکت کی تو کھڑے کھڑے گھر سے نکال دوں گی اور پھر
رضوانہ تمہارے لئے خواب بن جائے گی۔ میں نے ان کی ہدایت پر پورا پورا
عمل کیا اور اس طرح ڈیڑھ سال اور بیت گیا۔ اس عرصے میں رضوانہ
کی ماں کی مجھ سے محبت میں کچھ عملی اضافہ ہو گیا وہ اکثر میری آنکھوں
اور ماتھے کو چومنے لگی۔ کبھی میں بستر پر لیٹا ہوتا تو ساتھ آ کر لیٹ جاتی۔
اور مجھ سے بلی کے بچے جیسا سلوک کرتی کبھی بدن پر ہاتھ پھیرتی کبھی
سر سہلاتی۔ اور میرا جسم تپ جاتا تو گھبرا کر میں اٹھ بیٹھتا۔ اس محبت سے
مجھے وحشت ہونے لگی لیکن اس وحشت میں ایک انوکھی لذت کا پہلو بھی
چھپا ہوا تھا کبھی میرا دل خود چاہتا کہ خالہ جی آ کر مجھے چومیں۔ میرے جسم

پہلا ہاتھ پھیریں۔ خالہ جی ایک مکار بڑھیا کی طرح میری حرکات و سکنات کا جائزہ لیتی رہیں۔ اور ایک دن بھری گرمیوں میں جب میں کمرے کا دروازہ بھیڑ کر سونے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ پہلے سے کوئی اندر داخل ہوا۔ میں سمجھا رضوانہ ہے دل کے کنول کھل گئے۔ یونہی آنکھیں موندے موندے میں نے پلکوں کی اوٹ سے دیکھا تو وہ خالہ جی تھیں۔ انہوں نے دروازہ اندر سے پھر بند کر دیا اور جب ماتھا میرا ماتھا چوما —— پھر میرے برابر لیٹ گئیں۔ پہلے تو وہ یوں ہی بیٹھے بیٹھے مجھے پیار کر کے سر سہلا دیا کرتی تھیں مگر اس دفعہ انہوں نے مجھے اپنے بازوؤں کی گرفت میں لے کر بھینچ دیا۔ میں نے گھبرا کر آنکھ کھولی اور جو شے مجھے نظر آئی اسے پا کر گندم کھانے والا کوئی مرد بے قابو ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ باریک ململ کا کرتہ پہنے ہوئے تھیں، جس میں سے ان کے صحت مند جسم کی بھرپور نمائش ہو رہی تھی مگر یہ آگ نفس کی آگ سے مل کر قیامت کا روپ دھار گئی۔ میں آج بھی مانتا ہوں کہ غلطی میری بھی تھی مگر یہ بھی قسم کھاتا ہوں کہ اس سے پہلے میں عورت کے اس حسن سے قطعی ناآشنا تھا۔ مجھے راستہ اس عورت نے دکھایا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ گناہ کی تاریک وادیوں میں لے گئی۔ رضوانہ کی معصوم صورت چھپ گئی اور شیطانی نفس کے تقاضے جاگ گئے۔ جب قدم ایک بار غلط راہ پر چل پڑے پھر واپس آنا اتنا آسان نہیں ہوتا خالہ جی نے مجھے سوچنے یا پشیمان ہونے کا موقع ہی کب دیا۔ میری خاطر تواضع میں اور اضافہ ہو گیا۔ میں بچنے کی کوشش کرتا تو وہ موقع نکال کر بستر پر آ دھمکتیں۔ مجھے یقین دلاتیں کہ رضوانہ کو کبھی پتہ نہ چلنے دوں گی۔ ہاں اگر تم نے مجھے ترسایا تو پھر اسے حاصل کرنے کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ کچھ زندگی کے اس عجیب و غریب لطف کا لالچ اور کچھ رضوانہ کو پانے کا جنون میں خالہ جی کے چکر میں دن بہ دن پھنستا چلا گیا۔

میرے والدین کو خبر ہو گئی کہ میں یہاں ایک لڑکی کے چکر میں گرفتار ہوں۔ ابا آ دھمکے —— میں نے انہیں سچ بتا دیا کہ میں رضوانہ سے شادی کا خواہاں ہوں۔ والد نے انکار کر دیا، کہنے لگے "تمہاری شادی تمہاری ماں اپنی برادری میں طے کر چکی ہے۔ یہ خیال دل سے نکال دو ورنہ جوتے مار مار کر بھیجہ پلپلا کر دیں گے" وہ مجھے ڈرا دھمکا کر رخصت ہو گئے۔ اور دوسری طرف رضوانہ کے باپ کو لوگوں نے میرے خلاف بھڑکا دیا کہ یہ لڑکا تمہاری بیوی اور بیٹی دونوں پر قبضہ کر چکا ہے۔ وہ آدمی بیوی سے بہت ڈرتا تھا۔ بیچارے کے پاس مردانگی جیسی قوت تو تھی نہیں کس منہ سے بیوی کو ٹوکتا۔ اس کے پاس صرف ایک حربہ تھا کہ وہ رضوانہ کے رشتے سے انکار کر دے۔ میں نے سوچا تھا کہ میں اپنے طور پر شادی کر کے اپنے اور اس کے خاندان سے جدا ہو کر نئی زندگی شروع کر دوں گا مگر بات بگڑ گئی جب رضوانہ کے باپ نے صاف کہہ دیا کہ وہ اب اس رشتے پر راضی نہیں۔ کیونکہ برادری والے لڑکے کو پسند نہیں کرتے۔ بہتر ہے کہ یہ آج ہی گھر سے نکل جائے۔

رضوانہ کی ماں غم اور غصے سے نیم پاگل ہو گئی۔ اور اس نے جو کام کیا وہ ساری عمر میرے ضمیر پہ تازیانہ بنا رہے گا۔ ایک دن رضوانہ کے باپ کی طبیعت خراب تھی —— اس خبیث عورت نے دوا میں زہر کی ہلکی سی مقدار ملا دی۔ گاؤں میں ہیضے کی ایک دو وارداتیں ہو گئی تھیں۔ جب رضوانہ کے ابا کی حالت نازک ہو گئی تو واویلا مچا دیا کہ انہیں ہیضہ ہو گیا۔ حکیم کے ہاتھ پر سو دو سو رکھ دیئے اس نے خاموشی اختیار کر لی اور بیچارے بڑے میاں تین دن مسلسل قے اور دست کرنے کے بعد اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مجھے یہ ساری اسکیم اس عورت نے پہلے بتا دی تھی کہنے لگی صرف ایک ہی راستہ ہے کہ رضوانہ کا باپ مر جائے تبھی تیری شادی رضوانہ سے ہو سکتی ہے۔ اگر تیرا عشق سچا ہے تو زبان بند رکھنا۔ زہر اس نے خود مہیا کیا۔ میں نے صرف حکیم جی کو پیسے ادا کئے۔ باقی سارا معاملہ اس عورت نے خود سنبھالا۔ ایسا رونا پیٹنا مچایا کہ کسی کو شبہ تک نہیں ہوا کہ یہ شخص طبعی موت نہیں مرا ہے۔ اور بڑے میاں اپنی بیوی کے ہاتھوں زہر کا جام پی کر دنیا سے رخصت ہو گئے۔

رضوانہ اب خاصی بڑی ہو گئی تھی وہ ماں کی حرکتیں نوٹ کرتی تھی۔ دل ہی دل میں گھٹتی رہتی۔ مجھ سے بات چیت بہت کم کر دی تھی۔ باپ کی موت نے اسے صدمہ سے نڈھال کر دیا تھا۔ میں اس کی اداس صورت دیکھ کر خود پر لعنتیں بھیجتا —— کبھی دل چاہتا اسے اپنے ساتھ لے کر گھر سے بھاگ جاؤں۔ یہ عورت اپنے اعمالوں کی سزا خود بھگتتی پھرے گی۔ مگر اب حالات اور خراب ہوتے گئے۔ رضوانہ کی برادری نے پنچایت بٹھائی۔ جس نے یہ فیصلہ دیا کہ رضوانہ کی ماں بدکار ہے اس لئے لڑکی کو اس کے ماموں کے حوالے کر دیا جائے۔ اس دن میں خوب رویا۔ رضوانہ چپکے چپکے اپنے کپڑے سمیٹتی رہی۔ اس کی ماں ایک نئے پروگرام کو ترتیب دے رہی تھی۔ میرے پاس آئی۔ کہنے لگی "تو مرد کا بچہ ہو کر رو رہا ہے۔ اگر تیرا پیار سچا ہے تو ضرور کامیاب ہو گا۔ چل میرے ساتھ چل میں اور تو دوسرے شہر چلتے ہیں۔ وہاں عدالت کے ذریعے میں اپنی بیٹی کو حاصل کر لوں گی اور تو میرا ساتھ دے گا۔ تب رضوانہ کو میں تیرے حوالے کر دوں گی"

مجھے اس نے ایسے ایسے سبز باغ دکھائے مگر میں یہ قدم اٹھانے پر راضی نہیں ہوا تب اس نے آخری تیر نکالا۔ کہنے لگی "دیکھو اگر تو مجھے

یری برادری مجھے حاصل کرنے کی کوشش کرے گی تو شرط
مجھ سے شادی کر دو تب سعیدہ کو تمہارے حوالے کر دوں
سردار کھولے گی تب برادری والے جھک جائیں گے۔

بر توف پھر اس کی چالوں میں آ گیا اس رات پھر پنچایت
د خالہ پچھلے سے گاؤں کی حد میں پھلانگ آئے۔ شہر میں
لی۔ نوکری چلی رہی خالہ مجھے گھر میں چھپائے رکھتیں
شہر بیسہ تھا کرایہ کا مکان لے کر سارا خرچہ خود اٹھاتی
ے رحم و کرم پر تھا۔ مجھ پر ان کا کچھ ایسا جادو چل گیا تھا
یا اس پر عمل کرتا۔ مجھے رضوانہ کا لالچ تھا اب سمجھا ہوں تو غصہ
ے کا بچہ تھا اگر محبت سچی تھی تو محبوبہ کو اغوا کر لیا ہوتا مجبور
ا میں کیوں پھنس کر رہ گیا۔ اس نے ایک سال مجھے اپنے
ے رکھا میرے سعد الدین میرے عزیز و اقارب میری تلاش
پھرتے رہے، وہ شہر بدلتی رہی کبھی ملتان کبھی لاہور کبھی
آخر گھر والوں کی محنت بار آور ہوئی۔ بڑے بھائی نے
یا۔ وہ اچانک گھر آ گئے۔ خالہ گھر میں نہیں تھیں۔ میں نہیں
بھائی نے سینے سے لگا لیا اور رونے لگے۔ مجھے بتا دیا
ں ہے ساری بدمعاشی اس عورت کی ہے۔ اس سے
ہیں ساتھ لینے آیا ہوں۔ مجھے اپنے ساتھ ہوٹل میں لائے
کے رشتے داروں کو ٹیلیگرام دے دیا وہ لوگ دوسرے
اُن کی ماں کو ان کے حوالے کر دیا اور اس وقت وہ چوٹ
تھی۔ تڑپ تڑپ کر میرا نام لیتی اور رشتہ داروں کو کوستی
تم سے لے کر رہ رہا تھا۔ لیکن مجھے پتہ چلا کہ اب وہ
رنے مجھ سے نفرت ہونا ہی چاہئے تھی۔ اس کے رشتے دار
ند شادی کر دی۔ جہاں وہ ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہی تھی
رو اس عجیب و غریب محبت کا انجام بھی سن لیں کہ رضوانہ
سے علیحدگی کے تین ماہ بعد بچی کو جنم دیا ——— جسے اس
نے ہمارے گھر بھیجوانا چاہا لیکن میرے سعد الدین نے کہلوا دیا
پنے سر لینا نہیں چاہتے اور مجھے بڑے بھائی کے پاس

سال گزر چکے ہیں میری ایک بہت پیاری اور فرمانبردار بیوی
بچے ہیں۔ بظاہر زندگی میں ہر طرح کا سکون ہے۔ دس
نہ کماتا ہوں بچے اور بیوی انتہائی سکون کی زندگی بسر
میری بیوی کو ایک شکایت ہے کہ میں رات کو سوتے

میں کشور ...... نامی لڑکی کا نام لیتا ہوں۔ میں اسے یہ بتا نہیں سکتا کہ یہ لڑکی
میری زندگی کی سب سے پہلی اور آخری محبت ہے۔ وہ اکثر خوابوں میں
اپنی معصوم صورت لئے میرے پاس آتی ہے کہ بتاؤ مجھ سے کہیں پیارا
تھا یا میری ماں سے ——— ؟ اور میں اسے کیا جواب دوں اسے کیسے
یقین آئے گا کہ اس کی خاطر تو میں اس کی ماں کی بنائی ہوئی دلدل میں پھنس
گیا تھا ——— اور پھر کبھی ایک معصوم سی بچی کا تصور جھنجھوڑ دیتا ہے۔ جس
کا میں باپ ہوں۔ مگر وہ بچی مجھے ابا نہیں کہہ سکتی۔ خدا جانے وہ کن حالات
میں ہوگی اسے دنیا نے کیسی سزا دی ہوگی ——— کیا وہ مجھے معاف کر
سکتی ہے نہیں کبھی نہیں ——— اور وہ بوڑھا مظلوم اپنی آنکھوں میں
سوال لئے میرے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے کہ بتاؤ مجھ کمزور بے بس آدمی
کو تم نے زندگی سے محروم کرنے میں کیوں اس بدکردار عورت کی مدد کی
میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا ——— بولو ——— ؟ میرے پاس
ان تینوں کے سوالوں کا کوئی جواب نہیں۔ چودہ سال سے ان سوالوں
کی آگ میں جھلس رہا ہوں۔ لوگ سمجھتے ہیں مجھے کوئی غم نہیں مگر یہ میرا
خدا جانتا ہے کہ بستر پر ایک رات بھی میری سکون سے نہیں گزری ——
——— میری بیوی کہتی ہے تم رات کو چونک چونک اٹھتے ہو۔ کبھی
رونے لگتے ہو ——— کبھی سسکیاں لیتے ہو۔ یہ سزا کا پھندا ہے جو میری
گردن میں روز بروز تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ کوئی عجب نہیں جو کبھی پاگل
کہلاؤں۔

اسعد علی خان۔ مسقط

[illegible]

طیبہ اپنے اسکول کی سب سے تیز اور شریر لڑکی تھی۔ جلال پور
جٹاں کے گرلز اسکول میں استانیوں کو میرا نام اب تک یاد ہوگا۔ مدرسہ
قدرت نے ذہن بنانے میں فیاضی سے کام لیا تھا مگر جیالے پن نے
مل کیا جہاں لڑکیوں اور گڑیا کرکٹ کے کھیل میں کوئی فرق نہیں رہتا تھا
گھر میں اتنا دبا کر رکھا گیا کہ یوں مت ہنسو، یوں مت چلو، زیادہ پڑھائی
کھائی کس کام کی، ایسی عمر پر لکھنا آ جائے پھر گھر بٹھائیں گے۔ میں یہ
سب سنتے سنتے خود کو لڑکی ہونے کا شدید مجرم سمجھنے لگی اور اس کا
ردِ عمل یہ ہوا کہ میں نے اسکول میں لڑکوں جیسی عادتیں اپنا لیں۔ کسی
کو دھکا دیا کسی کی چوٹی کھینچی کسی کو سیٹی بجا کر آنکھ مار دی۔ اسکول
کی لڑکیاں مجھے دیکھ دیکھ کر ہنسا کرتیں۔ رفتہ رفتہ میری شرارتوں کا

تذکرہ ہر ایک کی زبان پر ہونے لگا۔ استانیاں کلاس میں میری حرکتوں پر ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو جاتیں۔ میں بھی خوب لطیفے یاد کر کے آتی۔ استانی مجھے سبق پڑھانے کے لئے کھڑا کرتیں اور میں ٹھنک کر کہتی پہلے مس ایک لطیفہ سن لیں پھر سبق سناؤں گی۔ وہ میرے اس جملے کی اتنی عادی ہو گئی تھیں کہ سب سے آخر میں مجھے باری دیتیں۔ اور اس طرح ہنستے ہنساتے کلاس ختم ہو جاتی۔ میں غریب گھر کی لڑکی کسی اور طریقے سے تو اپنی اہمیت نہیں منوا سکتی تھی بیچاری غریب لڑکیاں اسکول میں بری طرح سے نظر انداز کر دی جاتی ہیں۔ مگر میں نے اپنی ذہنی صلاحیت سے خود کو اسکول کی مقبول ترین لڑکی بنا لیا چھٹی جماعت میں آئی تو تھوڑا بہت شعور بھی بڑھ گیا لیکن حرکتیں اب بھی وہی تھیں۔ لڑکوں کی نقلیں اتارنا ان جیسے لب و لہجے میں باتیں کرنا۔ اسکول کے ڈراموں میں لڑکوں کے کامیاب کردار ادا کرنا۔ لڑکیاں اکثر کہتیں کہ سمینہ دیکھ لینا کسی دن تیری جنس بدل جائے گی۔ تو سچ مچ کا لڑکا بن جائے گی۔ میں ہنس کر جواب دیتی کہ پھر تمہاری خیر نہیں ہو گی تم سب سے عشق کروں گی۔

یہ ہنسی مذاق اس روز آنسوؤں میں ڈھل گیا جب امی نے اعلان کیا کہ اسکول جانا بند کرو تمہاری شادی کی بات چیت ہو رہی ہے۔ شادی کی خبر اتنی بڑی بات نہیں تھی کہ میں رونے بیٹھ جاتی میری بہت ساری سہیلیوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ چودہ پندرہ برس کی عمر میں ہمارے یہاں اکثر شادیاں ہو جاتی ہیں۔ رونا اس بات کا تھا کہ جس لڑکے سے میری شادی کی بات چیت چلائی جا رہی تھی، وہ اندھا تھا دن کو اسے دھندلا نظر آتا تھا اور رات کو بالکل نظر نہیں آتا تھا۔ انسانی ہمدردی میں اگر یہ رشتہ منظور کر لیتی تو زندگی بھر روتی رہتی۔ خیر اللہ کا شکر ہوا کہ ابا کی کسی بات پر ان سے تکرار بھی ہو گئی جس کی وجہ سے معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا۔ میں اسکول بدستور جاتی رہی مگر دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کب ابا سے وہ معافی مانگ لیں قریبی رشتے داری کا معاملہ تھا ابا انہیں پھر گلے لگا لیتے۔

ایک روز میرے ہاتھ ایک رسالہ آیا اس میں قلمی دوستی کا کالم تھا میں نے ازراہ مذاق بہاول پور کے جاوید نامی ایک لڑکے کا پتہ نوٹ کر لیا اور لڑکا بن کر اسے خط لکھ دیا۔ خلاف توقع جلد ہی اس کا جواب آ گیا۔ وہ ایف اے کا اسٹوڈنٹ تھا اپنے باپ کی دوکان پر کام بھی کرتا تھا۔ ماں بچپن میں مر چکی تھی۔ سوتیلی ماں سے پیار نہ تھے۔ ماں انہیں بہت چاہتی تھی اسے پیار سے محروم کیا ہوا تھا۔ قلمی دوستوں کے سلسلے اس محرومی کو ... کرنا چاہتا تھا اس نے لکھا تھا مجھے تمہارے خط میں سچائی اور خلوص کی بو ملی جس کا دوسرے خطوں میں نام و نشان نہیں تھا۔ تم مجھ سے چھوٹے سہی مگر میں تمہیں اپنا دوست بنانے کا پکا ارادہ کر چکا ہوں۔ دوستی کا مفہوم ہوتا ہے عمر بھر کے لئے ایک دوست کا اعتماد حاصل کرنا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری محبت اور خلوص کی ہمیشہ قدر کروں گا اور یہی عہد تمہیں کرنا ہو گا۔"

میں رسالے وغیرہ پڑھتی رہتی تھی۔ اچھا خط لکھنا آتا تھا جواباً میں نے بھی ملے جلے وعدے لکھ بھیجے کہ میں بھی پیار کا ترسا ہوا لڑکا ہوں اگر زندگی رہی تو وقت بتائے گا کہ میں تم سے کتنا سچا تھا پہلے صاحب وعدے بھی ہو گئے۔ دوستی کی بنیاد بھی پڑ گئی وہ مجھے لڑکا سمجھ کر ہنسی مذاق کی باتیں لکھ دیا کرتا۔ میں بھی ایسی چھیڑ چھاڑ کر لیتی مزے مزے کے لطیفے لکھتی۔ اسکول کے واقعات لکھ بھیجتی مگر یہ احتیاط رکھتی کہ استانیوں اور لڑکیوں کے نام مردانہ کر دیتی مبادا چوری پکڑی جائے۔ میری اس سے دوستی پکی ہو گئی۔ خط ڈاکیہ مجھے ہی لا کر دیتا تھا۔ کیونکہ اسکول سے آ کر میں کھڑکی میں کتابیں رکھ دیا کرتی۔ ڈاکیہ جونہی کھڑکی کی جالی بجاتا میں دوڑ کر پہنچ جاتی اور خط لے لیتی۔ گھر میں کسی کو خط پتر سے دلچسپی نہیں تھی۔ میں ہی مضموں اور لطیفوں کے تراشے بھیجتی رہتی تھی اس لئے اس خط نے کوئی دھماکہ نہیں کیا۔ امی پڑھی لکھی نہیں تھی۔ ابا دوکان پر صبح کے گئے گئے شام کو بلکہ رات کو لوٹتے تھے۔ بھائی چھوٹا تھا وہ کھیل کود کا دیوانہ تھا اس سے چھوٹے تین بھائی اور تھے وہ بہت ہی چھوٹے تھے میں ہی گھر بھر کی لقراط سمجھی جاتی تھی۔ جاوید سے خط و کتابت بغیر روک ٹوک کے جاری رہی اور جب میرے سالانہ امتحان میں صرف پندرہ روز باقی تھے ابا کی اچانک ان لوگوں سے صلح ہو گئی جہاں میرے رشتے کی بات چیت چلتے چلتے رک گئی تھی۔ انہوں نے معافی مانگ لی اور رشتے کے لئے ہاتھ پیر جوڑے۔ یقین دلایا کہ لڑکا علاج سے بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔ قرآن حافظ ہے لڑکی کو بھوکا نہیں مرنے دے گا۔ ان لوگوں کا منصوبہ تھا کہ شادی کے بعد آ کر لڑکے کا علاج کرائیں۔ ابا پتہ نہیں کیوں اس رشتے پر مرے تھے کہ فوراً راضی ہو گئے جھٹ پٹ منگنی کر دی اور شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ مجھے اسکول سے اٹھا دیا گیا کہ بس بہت ہو چکی پڑھائی۔ میں روتی چلاتی رہ گئی کہ خدا کے واسطے میٹرک امتحان تو ہونے دو۔ مگر میری کس نے سنی

تھی۔ اتنا اچھا بر مل گیا تھا بھلا اس کے آگے میری پڑھائی کس کام
کی۔ لڑکے کی ماں نے چپکے سے آکر مجھے سندیسہ دیا کہ بعد میں
تم پڑھ لینا۔ میرے بیٹے کی خواہش ہے کہ تم پڑھ لکھ کر استانی بنو۔

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ گویا ان لوگوں کا ارادہ یہ
تھا کہ پہلے میرے باپ کے خرچے پر وہ اپنے لڑکے کا مکمل علاج کرائیں
اور پھر مجھے استانی بنا کر میری کمائی سے عیش کریں۔ میں نے پڑھائی کے
لئے رونا دھونا ترک کیا اور اپنی ماں سے صاف کہہ دیا کہ اگر تم نے
شادی کی تو میں نے زہر منگوا لیا ہے۔ کھا کر ہمیشہ کی نیند سو جاؤں
گی۔ ماں نے میرے ٹرنک وغیرہ کی تلاشی لی۔ تاکہ زہر ڈھونڈ کر
پھینک دیا جائے۔ میں نے نیلا تھوتھا منگوا لیا تھا وہ ان کے ہاتھ
لگ گیا۔ مجھے پیار کرنے لگیں کہ لنگڑا لڑکا بہت محبت کرنے والا ہے
ڈھونڈ لینا پیر دھو دھو کر پیئے گا۔ میں نے چڑ کر کہا "اسے میرے
پاؤں نظر ہی کہاں آئیں گے جو دھو سکے" ماں نے میرے گال
پر زور سے طمانچہ مارا بولیں "پڑھائی لکھائی نے تیرا دماغ بگاڑ دیا
ہے۔ دین محمد کا ہم علاج کرائیں گے۔ ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ آپریشن سے
ٹانگیں ٹھیک ہو جائیں گی" میں نے روتے ہوئے جواب دیا کہ پہلے
اس کا آپریشن کرا دیں۔ جب ٹھیک ہو جائے پھر شادی کر دیں
بولیں "بیوقوف اگر وہ آپریشن کے بعد شادی سے مکر گیا تو ہمارا
پیسہ ضائع ہو جائے گا۔ تیری موٹی عقل میں یہ بات کیوں نہیں
آتی۔ آخر ہم بھی کچھ دیکھ کر شادی کر رہے ہیں۔ علاج کے بعد اسے
تیرا باپ اپنی دوکان پر بٹھا دے گا۔ اس طرح تو ہمیشہ ہمارے ساتھ
رہے گی"

یہ تھا میرے بھولے والدین کا منصوبہ جو ماں نے مجھے بڑے
پیار سے سمجھا کر بتایا۔ انہیں کیا معلوم کہ جس جوئے میں وہ جیت
کی سمجھ کر رقم لگا رہے تھے وہ الٹا ان کے گلے میں پھندہ بن سکتا
تھا۔ اور پھر میں کوئی بکاؤ مال تو نہیں تھی کہ جس طرح چاہیں وہ استعمال
کریں۔ میری شادی کی تاریخ تیس مارچ مقرر ہوئی تھی۔ مجھے اس
سے پہلے پہلے کچھ کرنا تھا۔ ابھی میرے پاس چند دن باقی تھے۔ میں
نے جاوید کو خط لکھا کہ ملتان میں مجھے اپنے ایک دوست کی شادی
میں شرکت کرنی ہے۔ میں وہاں ایک مہینہ رہوں گا۔ مجھے اس پتے
پر خط لکھنا۔ ملتان جا کر میں تمہیں نئے پتے سے آگاہ کر دوں
گا۔ اگر موقع ملا تو بہاولپور تم سے ملنے ضرور آؤں گا۔

خط پوسٹ کر کے میں مطمئن ہو گئی۔ اس کے بعد میں نے
اپنی روانگی کی چپکے چپکے تیاریاں شروع کر دیں۔ ایک پھٹا پرانا ہینڈ بیگ
ہاتھ لگ گیا۔ اس میں بھائی کے ایک دو پرانے کپڑے بھی ٹھونس
لئے۔ جاوید کے خطوں کو لفافے میں بند کر کے کپڑوں کے ساتھ رکھا
اور مہندی سے ایک رات پہلے جب سارا گھر سویا ہوا تھا میں نے
اپنی ماں کو خط لکھا کہ آپ لوگ اندھے کے ہاتھ میری قسمت کا سودا
کر رہے ہیں میں انسان ہوں فرشتہ نہیں جو ساری عمر زبان بند
رکھوں۔ میں اپنی قسمت خود بنانے جا رہی ہوں تھانے میں رپٹ
فضول ہوگی آپ عقل مندی سے یہ رشتہ توڑ دیں ورنہ ساری عمر
آپ کو میری شکل دیکھنا نصیب نہیں ہوگی۔ اپنے فیصلے کو بدل دیں
تو امروز اخبار میں اطلاع دے دیں میں واپس آ جاؤں گی۔ خط لفافے
میں بند کر کے اپنے گھر کا ایڈریس لکھا اور رات کی ڈاک سے ڈال دیا
اسی خط کی ایک نقل ابا کے سرہانے رکھ دی۔ اور خود چپکے سے
ہینڈ بیگ اٹھا کر ہمیشہ کے لئے گھر چھوڑ دیا۔ چار سو کی رقم میرے
پاس تھی گھر سے چلتے وقت میں نے بھائی کے کپڑے پہن لئے
اور قینچی سے بال کاٹ کر چھوٹے کر لئے پورا گھر میری ان کارروائیوں
سے بے خبر خراٹے لے رہا تھا اور میں لڑکوں کے کپڑے پہن کر گھر
سے نکل کھڑی ہوئی۔ اتفاق سے ملتان جانے والی لاری بھی تیار
کھڑی تھی۔ لڑکوں کے انداز میں بات کرنا میرے لئے کوئی مشکل
کام نہیں تھا بچپن سے یہ ٹریننگ لے رہی تھی جو اب کام آئی۔
بڑے اعتماد سے لاری میں بیٹھ گئی۔ ٹکٹ خریدا۔ ساتھ بیٹھے ہوئے
آدمی نے پوچھا تو کہہ دیا کہ بہن کا ملتان سے بیماری کا تار آیا ہے
اسے دیکھنے جا رہا ہوں۔ اس نے نو عمر لڑکا سمجھ کر زیادہ لفٹ بھی
نہیں دی اور میں مزے سے ملتان جا پہنچی۔

ملتان اپنے ننھیالی رشتے داروں کی شادی پر ایک مرتبہ پہلے
بھی آ چکی تھی۔ راستہ اجنبی ضرور تھا مگر اتنا زیادہ نہیں۔ صبح سویرے
کا وقت تھا لاری اڈے کے بیت الخلا میں جا کر اپنا حلیہ اور آئینے
میں دیکھا۔ بالوں کو ادھر ادھر کر کے پریشان صورت بنائی۔
بھائی کا پھٹا ہوا کوٹ پہلے ہی پہن رکھا تھا۔ اٹنگا سا پاجامہ پاؤں
میں تھا ہوائی چپل ٹوٹ گئی تھی اسے وہیں چھوڑی ننگے پاؤں باہر
نکلی۔ راہ گیر لڑکی سرائے کا پتہ پوچھا کسی نے ادھر اشارہ کیا کسی نے
ادھر میں ڈھونڈتی ڈھانتی آخر پہنچ ہی گئی۔ یہاں ڈیڑھ روپے
پر ایک چارپائی ملتی ہے۔ دس روپے چارپائی کے جمع کرائے۔
نام وغیرہ لکھوا کر اپنا ہینڈ بیگ رکھوا دیا۔ اور پیسے جیب میں ڈال

کر شہر کی طرف نکل گئی۔ پہلے جب میں ملتان آئی تھی تو پڑوس کی ایک لڑکی مجھے لڑکیوں کے کالج لے گئی تھی۔ میں نے بھکارنوں جیسے کپڑے تو پہنے ہوئے تھے رکشہ میں بیٹھ کر سیدھی وہیں پہنچی اور گیٹ پر کھڑی ہو کر ہر آنے جانے والی لڑکی کے آگے ہاتھ پھیلا دیا۔ لڑکیاں اس معاملے میں خاصی سخی ہوتی ہیں۔ پچھلی مرتبہ میں نے بھی ایک بھکاری کو گیٹ پر سکہ دیا تھا اور آج اسی انداز سے میں بھیک مانگ رہی تھی۔ کسی کو غور سے یہ دیکھنے کی فرصت نہیں تھی کہ میں لڑکی ہوں یا لڑکا۔ گرد آلود بال میلے کچیلے کپڑے۔ بوسیدہ سا کوٹ دبلی پتلی تو میں ہوں ہی۔ دوپہر تک میرے پاس پندرہ روپے کی ریزگاری ہو گئی۔ ڈھابے سے تنور پر بیٹھ کر روٹی کھائی مگر اب مجھے اس کام سے اکتاہٹ ہونے لگی تھی۔ ایڈونچر ختم ہو رہا تھا میں کب تک دنیا کی نظروں میں چھپی رہوں گی۔ رات کو کسی نے تنگ کیا تو میرا کیا بنے گا۔ اس خیال نے مجھے ڈرا دیا۔ بہاولپور جانے کا ارادہ کیا۔ سہ پہر کو اپنا ہینڈ بیگ سنبھال کر اسٹیشن پر آ گئی۔ یہ جگہ مجھے خاصی محفوظ لگی۔ زیادہ دیر یہاں بھی نہیں رک سکتی تھی جھٹ سے کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ خوف سے دل سہما جا رہا تھا کہ وہ شہر میرے لئے اجنبی ہے۔ خدا جانے لوگ کیا سلوک کریں۔ گھر سے نکلے ایک دن ہو چکا تھا۔ وہاں بھی میری گمشدگی سے صف ماتم بچھ گئی ہو گی۔ بہاولپور پہنچتے پہنچتے گہری شام ہو گئی۔ میں اللہ کا نام لے کر پلیٹ فارم پر اتر آئی۔ اب لڑکا بن کر اس شہر میں گزارا مشکل تھا۔ میں نے جاوید کو اپنا اصلی روپ دکھانے کا فیصلہ کر لیا۔ عورتوں کا ویٹنگ روم خالی تھا۔ جھپاک سے اندر گھس گئی۔ ایک مائی اندر بیٹھی اونگھ رہی تھی۔ میں نے اسے سلام کیا۔ وہ چونک کر اٹھ بیٹھی۔ تلخی سے بولی: "اے منڈے باہر بھاگ" میں نے جلدی سے اس کے پاؤں پکڑ لئے۔ بولی: "اماں رات مجھے یہاں رہنے دے صبح چلا جاؤں گا۔" مائی بھی اکیلے پن سے اکتائی ہوئی تھی۔ بولی۔ "جا اس کونے میں لیٹ جا۔ کوئی شرارت کی تو تجھے پٹوا دوں گی۔" میں نے کان پکڑے اور کونے میں سکڑ کر لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر میں مائی خراٹے لینے لگی۔ میں چپکے سے اٹھی۔ ہینڈ بیگ سے اپنا ایک جوڑا نکالا اور جلدی جلدی ہاتھ منہ دھو کر کپڑے بدلے پھر دبے پاؤں آ کر لیٹ گئی۔ احتیاطاً جگہ بدل لی تاکہ مائی کو شبہ نہ ہو سکے۔ پھر بے خبر سوئی تو صبح عورتوں کے شور و غل سے آنکھ کھلی۔ عورتوں کا ایک ریلا بچوں سمیت اندر گھس آیا تھا۔ عجب افراتفری مچی ہوئی تھی۔ میں نے لیٹے لیٹے آنکھیں کھول کر حالات کا جائزہ لیا۔ کسی نے مجھ پر توجہ نہیں دی۔ سبھی کو اپنی اپنی پڑی ہوئی تھی۔ دل میں اللہ کا شکر کیا۔ کوئی پندرہ منٹ تک میں جھوٹ موٹ آنکھیں بند کئے رہی۔ گاڑی آنے کا شور ہوا تو عورتیں اسی طرح شور مچاتی کمرے سے نکل گئیں۔ میں جلدی سے بیٹھی۔ رات والی مائی بدل چکی تھی۔ کوئی نئی دبلی پتلی سی عورت کمرے کی جھاڑ پونچھ کرتی پھر رہی تھی۔ مجھے اٹھتے دیکھ کر بولی: "بیٹی کس کے ساتھ آئی ہو۔؟" میں نے غور سے مائی کو دیکھا۔ وہ مجھے بہت سیدھی سی نظر آئی۔ میں نے جمائی لیتے ہوئے بے نیازی سے کہا: "اکیلی ہوں۔" مائی نے چونک کر پیچھے مڑ کر دیکھا اور بولی: "کہاں سے آئی ہو۔؟" اب مجھے احساس ہوا کہ میں نے غلطی کر دی ہے۔ مائی کو سمجھانا بھی ضروری تھا۔ دھیمے سے بولی: "اماں مجھے بہاولپور میں ایک سہیلی کے پاس جانا ہے اس کی آج شادی ہے۔" مائی نے مجھے حیرت سے دیکھا۔ بولی: "بی بی میرے بال دھوپ میں سفید نہیں ہوئے۔ سچ سچ بتا ورنہ ریلوے پولیس کو ابھی بلوا لوں گی۔" میرے تلوے میں کھسک گئی۔ اس سے تو اچھا تھا میں لڑکوں کے کپڑے پہنے ہوتی۔ اب مائی کو اعتماد میں لئے بغیر میں یہاں سے ایک قدم نہیں نکال سکتی تھی۔ مائی میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ کہنے لگی: "میں بچوں والی ہوں اگر کوئی ایسی ویسی بات ہے تو مجھے بتا دے کیا کوئی تجھے بھگا کر لایا تھا۔؟"

میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔ دھیرے سے بولی: "اماں میرے ماں باپ اندھے سے شادی کر رہے تھے میں ان سے ناراض ہو کر اپنی سہیلی کے پاس جا رہی ہوں۔" مائی بولی: "کہاں سے آئی ہے؟" میں نے جواب دیا: "جلال پور سے۔" مائی چونک کر بولی: "کس کی بیٹی ہے؟" میں گھبرا گئی۔ مائی کہنے لگی: "وہاں میرے کچھ رشتے دار ہیں۔" میں نے محلے کا ڈرتے ڈرتے نام بتایا۔ مائی نے مایوسی سے سر ہلا دیا کہنے لگی: "شادی تیری کب تھی؟" میں نے سر جھکا کر کہا: "کل شام کو بارات آنی تھی۔ اگر لڑکا اندھا نہ ہوتا تو میں کبھی والدین کی نافرمانی نہ کرتی مگر اماں تم بتاؤ کیا تو اپنی لڑکی کی کسی اندھے سے شادی کر سکتی ہے۔" یہ کہتے کہتے مجھے سچ مچ رونا آ گیا۔ باہر سے کچھ آہٹیں قریب آنے لگیں مائی بولی: "کچھ عورتیں آ رہی ہیں اس وقت چپ منہ ہاتھ دھو میں تیرے لئے چائے لاتی ہوں پھر بعد میں بات کروں گی۔" میں نے مائی کا رویہ کچھ نرم پایا تو اطمینان ہوا۔ تھوڑی دیر بعد ویٹنگ روم عورتوں سے بھر گیا۔ جو کم ہونے کی بجائے بڑھتی ہی گئیں مائی سے باتوں کی فرصت نہیں ملی۔ وہ چائے کا پیالہ لے کر آئی تو

سرگوشی سے بولی "تمہاری ڈیوٹی ختم ہو جانے پر میرے ساتھ گھر چلنا۔ زیادہ کسی سے یہاں بات وات مت کرنا۔"

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ جیسے ہی ڈبل روٹی کا ناشتہ کر کے میں نے اسٹال سے رسالہ لیا اور پڑھنے بیٹھ گئی۔ وہیں بیٹھے بیٹھے مجھے پھر جاوید کا خیال آیا۔ ساہیوال ٹاؤن میں اگر پہنچ بھی جاتی تو بھلا جاوید کو کیسے بتا سکتی تھی کہ میں کون ہوں کہاں سے آئی ہوں ایک خیال آیا کہ مائی کو ہمراز بنا لیا جائے۔ کیا ہی اچھا ہو جو اس کے ہاتھ پرچہ بھیج کر جاوید کو یہاں بلوا لوں اور ساری بات بتا دوں۔ اگر اللہ نے اس کے دل میں رحم ڈال دیا تو ہو سکتا ہے وہ میری مدد پر آمادہ ہو جائے۔ اسی اُدھیڑبن میں خاصا وقت گزر گیا۔ گاڑیاں آتی جاتی رہیں۔ عورتوں کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہی۔ مائی کی ہدایت کے مطابق میں نے کسی عورت سے بات نہیں کی۔ بارہ بجے کے قریب مائی نے مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے جلدی سے اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا۔ اسٹیشن سے نکل کر مائی نے تانگہ لیا۔ بولی "میرا گھر یہاں سے بہت نزدیک ہے مگر تیری خاطر تانگہ لے رہی ہوں۔" میں نے ممنونیت سے مائی کو دیکھا۔ منہ سے کچھ نہیں بولی۔ تانگے میں بیٹھ کر بات کرنا اچھی بات نہیں تھی۔ اس لئے ہم دونوں چپ رہے۔ تھوڑی دیر بعد مائی کا گھر آ گیا۔ میں نے تانگہ رکتے ہی جلدی سے تانگے والے کو روپیہ تھما دیا۔ مائی نے مجھے گھور کر دیکھا مگر منہ سے کچھ نہ کہا۔ تانگے سے اتر کر ہم تنگ سی گلی میں داخل ہوئے۔ مائی بولی "میرے دو بیٹے ہیں اور ایک نواسہ ہے۔ بیٹی مر چکی ہے۔ داماد نے دوسری شادی کر لی۔ بچہ میرے پاس ہے۔ میری بیٹی کی شکل بالکل تجھ جیسی تھی۔ تیرے بال چھوٹے ہیں، اس کے بہت لمبے تھے۔ میں نے اس کی بہت چھوٹی عمر میں شادی کر دی تھی۔ پہلے بچے کی پیدائش پر وہ مر گئی۔ بچہ دس پونڈ کا تھا خوب موٹا تازہ۔ ماں اس کی صورت بھی نہ دیکھ سکی اور چل بسی۔ تو دیکھنا میرا نواسہ کتنا تندرست ہے۔ یہاں روکھی سوکھی ملتی ہے شکر اللہ جسے اچھی صحت دے۔" یہ کہتے کہتے مائی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اور میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ میں مائی کو اس کی حقیقی بیٹی جیسا پیار دوں گی۔

مائی کا گھر دو چھوٹی چھوٹی کوٹھریوں پر مشتمل تھا۔ اس کے دونوں بیٹے اسکول گئے ہوئے تھے۔ مائی نے جلدی جلدی آٹا گوندھا روٹیاں ڈالیں، رات کا گرم کیا ہوا سالن میرے آگے رکھا، کہنے لگی "پہلے روٹی کھا لے۔ میں عائشہ کا ٹرنک کھولتی ہوں اس کے کچھ کپڑے میرے پاس پڑے ہوئے ہیں وہ تیرے پورے آ جائیں گے۔ نہا کر کپڑے بدل لینا۔" مجھے تیز بھوک لگ رہی تھی۔ جلدی جلدی روٹی کھائی۔ اتنے میں اس کے بچے اسکول سے آ گئے۔ مجھے دیکھ کر حیران سے کھڑے ہو گئے۔ مائی کہنے لگی "یہ تمہاری بہن عائشہ ہے۔ چلو سلام کرو۔ اور بھاگ کر انور کو نصیبن کے گھر سے لے آؤ۔ میں تمہارا کھانا نکالتی ہوں۔"

شام تک میں اس گھر میں ایسی گھل مل گئی۔ مائی کو میں نے اماں جی کہنا شروع کر دیا۔ وہ مجھے اپنی بیٹی کے نام پر عائشہ ہی کہتی تھی۔ اس کے دونوں لڑکے مجھے باجی کہہ کر بلانے لگے۔ پہلے اماں جی اپنے دو سالہ نواسے کو اپنی پڑوسن کے یہاں چھوڑ کر ڈیوٹی پر جاتی تھیں۔ میرے آنے سے بچے کو گھر پر رکھنے کا فیصلہ ہو گیا۔ اماں جی پر اپنا اعتماد بڑھانے کے لئے میں نے ان کی ہر ہدایت پر پورا عمل کیا۔ محلے میں کسی سے میل جول نہیں رکھا۔ اماں جی نے سب سے کہہ دیا تھا کہ میری بیٹی کی چھوٹی نند ہے کچھ دنوں کے لئے آئی ہے۔ اپنے بھتیجے کو دیکھنے پھر چلی جائے گی۔ گھر کا کھانا، صفائی دھلائی میں نے سنبھال لی تھی۔ ایک ہفتہ بڑے مزے سے گزر گیا۔ میں نے گھر کا پتہ معلوم ہو جانے کے بعد جاوید کو خط لکھا۔ اس میں میں نے یہ بتایا کہ میں کچھ دنوں کے لئے بہاولپور آئی ہوں۔ اگر تم ملنا چاہتے ہو تو میرے بتائے ہوئے پتے پر آنا ہو گا۔ اماں جی کو میں نے کہہ دیا کہ میں اپنی سہیلی سے ملنا چاہتی ہوں اگر اس نے مجھے اپنے پاس رکھنا چاہا تو ٹھیک ہے ورنہ میں کچھ دن اور اپنے یہاں رہوں گی۔ اماں جی بولیں "شاید تیرے آنے سے فائدہ ہی ہوا ہے۔ تجھے منہ سے ایک دفعہ بیٹی کہہ دیا۔ اس لئے تیری حفاظت بھی مجھ پر لازمی ہے۔ جب تک تیری سہیلی کا گھر میں خود نہ دیکھ لوں تجھے وہاں جانے کی اجازت نہیں دے سکتی۔ اگر تیرے ماں باپ نے تھانے میں رپٹ کروا دی ہو گی۔ تو پولیس تیری سہیلی کے گھر بھی پہنچی ہو گی۔ معاملہ ٹھنڈا ہونے دے پھر کچھ کرنا۔" میں نے اماں جی کی بات میں وزن محسوس کیا اور چپ ہو گئی۔ چوتھے روز مجھے جاوید کا خط ملا۔ اس نے لکھا تھا کہ "کیسے بے مروت آدمی ہو بہاولپور آ گئے اور مجھے غیروں کی طرح اطلاع دے رہے ہو۔ پہلے مجھے لکھتے تو اسٹیشن پر لینے آ جاتا۔ اب فوراً اپنے گھر کے پتہ سے مطلع کرو۔" خط نے مجھے خاصی ڈھارس دی۔ میں نے دوسرے ہی دن اسے خط لکھ دیا کہ "جمعہ کے دن صبح دس بجے اس پتے پر آ جانا۔ وہاں میں تمہارا انتظار کروں گی۔"

جمعہ کے روز اماں جی کے ڈیوٹی پر جانے کے بعد میں نے جلدی جلدی نہا کر کپڑے پہنے۔ انور کو نصیبن کے یہاں چھوڑنے کا

ارادہ تھا مگر پھر ملتوی کر دیا۔ الٹے ملنے والے سلول ہو جاتیں ہیں۔ الود مجھے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ دس بجے کے قریب دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے جلدی سے دروازہ کھولا۔ سامنے اجنبی کو کھڑے دیکھا دبلا پتلا گورا سا لڑکا تھا۔ میں نے جلدی سے پوچھا "جاوید صاحب" اس نے مسکرا کر سر ہلا دیا۔ "میں سمیع ہوں۔ اندر تشریف لائیے" جاوید مجھے حیرت سے دیکھتا اندر آ گیا۔ گھر میں نے صاف ستھرا کر دیا تھا۔ جاوید کرسی پر بیٹھ گیا۔ کہنے لگا "تم تو بارہ تیرہ سال کے لڑکے لگتے ہو۔ میں سمجھا تھا خوب موٹے تازے ہو گے" مجھے ہنسی آ گئی اور سچ بات یہ ہے کہ دل بھی گھبرانے لگا تھا۔ جھوٹ بولتے ہوئے زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ آخر ہمت کر کے بولی "جاوید صاحب میں آپ سے حقیقت چھپانا نہیں چاہتا۔ میں نے اسی لئے آپ کو اس جگہ بلایا ہے تاکہ یہ بات کھل کر بتا سکوں۔ میں لڑکا نہیں لڑکی ہوں۔ آپ سے یونہی دل لگی کے لئے قلمی دوستی کی تھی مگر اب حالات ایسے ہیں کہ مجھے آپ کی مدد کی ضرورت پڑ گئی ہے۔"

جاوید آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگا جیسے میں کوئی آسمانی مخلوق ہوں۔ میں نے جلدی سے دوپٹہ پلنگ سے اٹھا لیا۔ جاوید کے سارے خطوط اس کے سامنے لا کر رکھ دیئے کہ یہ آپ کی امانت ہے۔ اگر آپ اس دھوکے کے باوجود میرے خلوص و محبت پر یقین کر سکتے ہیں تو میں قسم کھاتی ہوں مجھے آپ ہمیشہ وفادار پائیں گے۔ جاوید ہنسنے لگا۔ کہنے لگا "مجھے یقین نہیں آ رہا کہ یہ حقیقت ہے یا افسانہ۔ میں اکثر ایسا سوچا کرتا تھا کہ اگر سمیع کی جگہ کوئی لڑکی ہوتی تو ـــ مگر بخدا یہ ـــ کتنی عجیب بات ہے کمال ہو گیا۔"

جاوید جب گھر سے رخصت ہوا تو ہمارے درمیان عہد و پیمان ہو چکے تھے میں نے اسے اپنی پوری کہانی سنا ڈالی تھی۔

اور جاوید سے ملنا مانوس ہوا کر لیا وہ وقت اس کی گود میں بیٹھا رہا۔ شام کو اماں جی آئیں تو میں نے انہیں بتا دیا کہ میری سہیلی کا بھائی آیا تھا۔ کل بھی آئے گا آپ اس سے مل لیں۔ اماں جی نے حامی بھر لی۔ دوسرے روز وہ بچوں کے لئے مٹھائی پھل لے کر آیا۔ اماں جی سے ملا۔ میں نے اسے پہلے سے سمجھا دیا تھا کہ تم خود کو میری سہیلی کا بھائی بتانا۔ اس نے بات سنبھال لی اور اماں جی کو خاصا مطمئن کر دیا۔ آخر دس روز بعد اس نے اماں جی سے اپنا مدعا بیان کر دیا کہ در بدر ٹھوکریں کھانے کی بجائے اگر آپ عائشہ کی مجھ سے شادی کر دیں تو ہمارا گھر بس جائے گا۔ میرے والدین رضامند نہیں ہوں گے اس لئے آپ کے گھر ہی شادی کا بندوبست ہو گا اور کچھ عرصہ عائشہ یہیں رہے گی۔ اماں جی نے مجھ سے بات کی۔ میں چپ ہو گئی۔ اماں جی نے سمجھداری دکھائی۔ رضامندی ظاہر کر کے خاموشی اور سادگی سے میرا نکاح کر دیا۔ میں اماں جی کے ساتھ چھ مہینے اور رہی۔ جاوید نے اپنا کاروبار آہستہ آہستہ علیحدہ کر لیا۔ اور ملتان میں رہائش اختیار کر لی۔ باپ کو خاموشی سے بتا دیا کہ میں شادی کر چکا ہوں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو بہو کو دیکھ لیں۔ میں اسے اس گھر میں کبھی نہیں لاؤں گا۔ باپ نے غیظ و غضب میں بول چال بھی ترک کر دی۔ مگر اب جاوید کو کسی کی پروا نہیں تھی۔ سب مجھے لے کر ملتان آ گیا۔ اماں جی نے مجھے بیٹیوں کی طرح آنسوؤں سے رخصت کیا۔ انور کو میں نے ضد کر کے اپنے پاس رکھ لیا۔ وہ مجھے اپنی ماں اور جاوید کو باپ سمجھتا ہے۔ جاوید نے میرا نام ثمینہ رکھ دیا ہے کہتے ہیں پہلے تم میرے لئے سمیع تھیں اب ثمینہ۔

ثمینہ - ملتان

اِن صفحات میں ہم آپ کو زندگی کی ان کہانیوں سے روشناس کراتے ہیں جو ہمارے اور آپ کے اردگرد بکھری ہوئی ہیں مگر انہیں سُنانے کا کم حوصلہ نہیں کرتے۔ آپ بھی معاشرے کو یہ آئینہ دکھانے میں ہمارے ساتھ تعاون کریں۔ سچائی اور بے باکی سے لکھی گئی ان کہانیوں کو بھیجنے کی شرط صرف یہ ہے کہ آپ اپنی زندگی کے ان پہلوؤں پر روشنی ڈالیں جسے بتاتے ہوئے آپ سب گھبراتے ہیں۔ [illegible] سچا ہونا لازمی ہے۔ اپنی لکھی کہانیاں ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک بھیج دیں۔ تحریر نثری ہو یا منظوم ہو اس کی کوئی قید نہیں۔

رفعت فاروقی — دوشیزہ — پوسٹ بکس ۵۹۰۸، کراچی ۲۹

تیرِ نیم کش

قارئین کے پسندیدہ شعر

نیرو زحسن ——— جہلم

آنکھوں کا ہے فریب کہ عکسِ جمال ہے
آتی ہے کیوں نظر تری صورت جگہ جگہ

سمیر شاد ——— بہاولپور

جن دوستوں سے ہم کو ملا تھا کبھی خلوص
ان کی نگاہ میں بھی عداوت ہے آج کل

شکیل انجم ——— بدین

دشمن کے درد کو بھی سمجھتے ہیں اپنا درد
وہ دل عطا کیا ہمیں پروردگار نے

شمیرا انصاری ——— جیکب آباد

یہ فسانۂ محبت یہ وفا کی داستانیں
کوئی اور ذکر چھیڑو مرا دل لہو لہو ہے

زبیر علی ——— لائلپور

اپنی وفا پہ آپ پشیماں ہیں ہم مگر
ان کی جفا پہ ان کو پشیماں نہ کر سکے

نسیم جلالوی ——— پشاور

زیست کی پُر فریب راہوں میں
اک ترے درد کا سہارا ہے

شرت راز ——— بنوں

کیسی بہار، کس کے نظارے، کہاں کے پھول
جب تم نہیں تو دیدۂ دل میں سمائے کون

سرار صدیقی ——— کراچی

کچھ تبسم زیرِ لب کچھ شرم دامنگیر ہے
اُف یہ کس انداز کی ظالم تری تصویر ہے

فاطمہ طارق ——— ملتان

جس قدر چاہو میرا درد سے دامن بھر دو
میں تو زندہ ہوں غمِ زیست اٹھانے کیلئے

احمد علی ——— حیدرآباد

یوں تصور پہ برستی ہیں پرانی یادیں
جیسے برسات میں رم جھم کا سماں ہوتا ہے

ارشاد احمد ——— کراچی

سوچا کہ مل گئی ترے غم سے ہمیں نجات
یہ سوچتے ہی پھر سے تری یاد آ گئی

محمد انور ——— راولپنڈی

دامن چھڑا کے آپ کو جانا ہی تھا اگر
یوں مسکرا کے پیار سے دیکھا تھا کس لئے

شگفتہ جمال ——— کوئٹہ

ہم بے زباں نہیں تھے مگر بے زباں رہے
آنسو ہی حسرتوں کے سدا ترجماں رہے

سلطان احمد ——— لاہور

دل تیرا کانچ کی چوڑی سے بھی نازک ٹھہرا
تُو میرا حال سُنے گی تو پریشاں ہوگی

رفیق خواجہ ——— پشاور

اجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

ریحانہ ناز ——— لاڑکانہ

چھپا چھپا کے خموشی میں اپنی بے چینی
خود اپنے راز کی تشہیر بن گئی ہوں میں

زاہد شیخ ——— گجرات

کاندھا بدلتے جاتے ہیں ہر دو قدم کے بعد
لاشہ بھی دوستوں کو میرا بارِ دوش ہے

ظہیر احمد ——— گوجرانوالہ

ارادہ بھول جانے کا بہت اچھا تو ہے لیکن
بھلانے پر بھی ہم رہ رہ کے یاد آئے تو کیا ہوگا

ایوب شہزاد ——— لائلپور

وہ اور ہوں گے جنہیں دشمنوں سے شکوہ ہے
ہمیں تو دوستوں نے ہمارے فریب دیئے ہیں

ہو گئی تھیں کہ تبسم اس روز بہت اداس تھی اور ثریا اس سے اداسی کا سبب پوچھ رہی تھی۔ پھر تبسم نے کہا تھا:

"وہی خاموشی۔ مگر ثریا، میری اداسی پہلے کبھی تمہاری سمجھ میں آئی ہے جو آج آئے گی۔ میں تم سے کتنی بار کہہ چکی ہوں کہ جب تک تم میرے پاس ہوتی ہو، یہ دنیا آوازوں سے چھلکتی رہتی ہے۔ پھر جب تم چلی جاتی ہو تو نہ جانے سب آوازیں مر جاتی ہیں یا میں بہری ہو جاتی ہوں، اتنی خاموشی ——— اتنی ڈراؤنی خاموشی مجھ پر ٹوٹ پڑتی ہے کہ میں بالکل پس کر رہ جاتی ہوں۔ امی جان نے میرے اتنے بہت سے علاج کرائے، اباجی نے لندن کے ڈاکٹروں سے مشورے کر کے لاتعداد ٹانک بھجوائے۔ ان سے صرف اتنا ہوا کہ میری صحت اچھی ہو گئی مگر میری روح بیمار کی بیمار ہی رہی۔ نفسیات والے کہتے ہیں کہ میں وقت گزرنے کے ساتھ خود بخود ٹھیک ہو جاؤں گی۔ مگر یہ اچھی ٹھیک ہو رہی ہوں کہ تم ایک مہینے کے لیے اپنے چچا میاں کے پاس لاہور جا رہی ہو تو میرے اندر سے جیسے سب کچھ نکل کر کہیں کھو گیا ہے اور میں کھوکھلی ہو گئی ہوں۔ جب سے میں نے یہ سنا ہے خاموشی مجھ پر بل پڑی ہے۔ کوئی مجھ سے بولتا ہے تو اس کے الفاظ تو میری سمجھ میں کسی طرح آ جاتے ہیں مگر مجھے سنائی کچھ نہیں دیتا۔ ثریا، اس ایک مہینے کی خاموشی تو یہاں سرگودھا میں میرا دم گھونٹ دے گی۔"

اور ثریا نے کہا تھا ——— "اچھا، اول تو وعدہ رہا کہ میں لاہور نہیں جاؤں گی اور اگر ابا نے مجھے زبردستی بھیج دیا تو تم یوں کرنا کہ جب بھی تم پر خاموشی حملہ کرے، تم غالب کا یہ مصرع گنگنا لینا۔

؎ نوائے طائرانِ آشیاں گم کردہ آتی ہے!

تب تمہیں عجیب عجیب پیاری پیاری آوازیں سنائی دینے لگیں گی، تمہارے کانوں میں گونجیں گی، کوئلیں کوکیں گی، پپیہے بولیں گے اور خود میں تمہیں پکاروں گی۔ کیونکہ لاہور میں میری حیثیت بھی تو ایک طائر آشیاں گم کردہ کی سی ہو گی۔ اب ذرا گنگناؤ تو یہ مصرع:

نوائے طائران آشیاں گم کردہ آتی ہے!

اور پھر یہ فوائیں کان لگا کر سنو، سن رہی ہو نا؟ ——— میں تو سن رہی ہوں۔"

ممانی دروازے کے پاس کھڑی یہ باتیں سن رہی تھیں، جونہی ثریا نے بات ختم کی، وہ آئیں اور ثریا کو سینے سے لگا لیا اور اسے چوم لیا اور تبسم سے کہنے لگیں:

"تمہارے پاس ثریا کی سی نعمت ہے تبسم! اور تم پھر گھٹی رہتی ہو، تمہیں شرم آنی چاہیئے۔"

اس کے بعد انہوں نے ثریا کی اعلیٰ تعلیم کے اخراجات کرنے کی پیش کش کر دی تھی۔

ثریا کو اپنی ذہانت کی داد تو جگہ جگہ سے ملی تھی مگر تبسم کی داد نے اسے بوکھلا سا دیا۔ ایسی جھینپی کہ تبسم ہنستے ہنستے بے حال ہو گئی۔ تب ممانی تبسم کی طرف متوجہ ہوئیں:

"ہائے میری جان تم ہنستے ہوئے تو اور بھی پیاری لگتی ہو۔" کل وہ ثریا کے سامنے تبسم کے حسن گریاں کی بھی تعریف کر چکی تھیں اس لیے اب تبسم کے جھینپنے اور ثریا کے ہنسنے کی باری تھی۔ اور یہ سلسلہ شروع بھی ہو گیا۔ مگر پھر ممانی نے ثریا کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور باہر لے جانے لگیں تب ثریا سنجیدہ ہو گئی اور تبسم کی طرف حیرت اور بے بسی سے دیکھتی ہوئی ان کے ساتھ باہر چلی گئی۔

ادھر تبسم حیران تھی کہ ممانی کو ثریا سے یکایک کیا ضروری کام پڑ گیا۔ جب کہ ان کا تو ابھی تعارف ہی ٹھیک سے نہیں ہوا تھا۔ خاصی دیر کے بعد واپس آئی تو اس کا چہرہ کسی پراسرار لو سے دمک رہا تھا۔

"سچ سچ بتاؤ کیا بات ہے؟" تبسم مچلی۔ "تمہیں قسم ہے۔"

"مگر تم اتنی بے قرار کیوں ہو رہی ہو!" ثریا چہکی۔

تبسم بولی "میں سوچتی ہوں یہ تمہیں ایک دم کیا ہو گیا۔ تمہارا چہرہ، تمہاری آنکھیں، تمہارے ہاتھوں کی پوریں تک کیوں دمک اٹھی ہیں!"

ثریا اس کے پاس بیٹھ گئی ——— "تمہاری ممانی نے مجھ سے میرے گھر کا پتہ لکھوایا اور وعدہ کیا ہے کہ اگر میں اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان بھی جانا چاہوں تو وہ . . . . . ." تبسم نے فوراً بات کاٹی "مگر یہ تو وہ ابھی میرے سامنے کر چکی ہیں پھر تمہیں الگ لے جانے کا کیا مطلب تھا" ——— اب تبسم کو شرارت سوجھی ——— "کہیں وہ اپنی بہو بنانے کا منصوبہ تو نہیں بنا رہی ہیں؟"

ثریا یوں بکھر سی گئی جیسے تبسم نے ایک ہی پھونک سے اس کے اندر کی لو گل کر دی ہے۔

تبسم نے اسے لپٹا لیا ——— "میں اس لیے کہہ رہی تھی کہ یہ جو میری ممانی ہیں نا، یہ ہیں تو بڑی پیاری مگر ساتھ ہی بڑی تیز بھی ہیں۔ انہوں نے میرے ماموں جان کو یوں جال پھیلا کر پھانس

تھا کہ ساری برادری ہکّا بکّا رہ گئی تھی اور وہ اپنے سسرال کے پنجرے میں جا بیٹھے تھے —— ان سے ڈرنا ہی چاہیے۔"

"تو کان کھول کر سن لو محترمہ تبسم خانم صاحبہ!" ثریا نے دانت پیس کر کہا کہ —— "ممانی اپنے صاحب زادے یوسف کے لیے تمہاری امی جان سے تمہیں مانگنے آئی ہیں۔"

اب وہ پُراسرار لو تبسم کے اندر جل اٹھی اور ثریا بولتی چلی گئی "وہ اسی مقصد سے آئی ہیں اور اسی لیے تو تم انہیں روتی ہوئی بھی اچھی لگتی ہو اور ہنستی ہوئی بھی دکھتی ہو، میں اپنے یوسف سے کہوں گی کہ وہ تبسم کو تبسم نہ کہا کرے زلیخا کہا کرے!"

"زلیخا ——" اندر آتی ہوئی ممانی ایک دم رک گئیں اور پھر ہنسنے لگیں —— "تو یہ ہے۔ ہاں تو تبسم بیٹی، آؤ ذرا میری تیاری تو کر دو میں چار بجے کی گاڑی سے جا رہی ہوں۔"

"جی اچھا ——" تبسم نے اٹھتے ہوئے کہا اور ممانی چلی گئیں تو وہ پھر سے ایک جھٹکتے ہوئے سناٹے میں آکر بیٹھ گئی۔

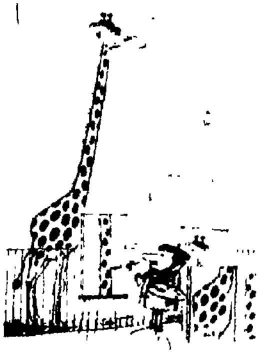
ثریا کہتی رہی —— "خالہ جان نے کہا ہے کہ دونوں پڑھے لکھے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ لیں اور پسند کر لیں تو اس سے زیادہ مجھے اور کیا چاہیے۔ انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ تبسم کے ابا لندن جاتے ہوئے انہیں اجازت دے گئے ہیں کہ جو رشتہ ہو تبسم کی پسند سے ہو —— اور تمہیں یہ رشتہ یقیناً پسند آنے گا کیونکہ مجھے تو بہت ہی پسند آیا ہے۔"

تبسم نے صرف اتنا کہا —— "تم ایسی باتیں بھی کر سکتی ہو ثریا!"

"ابھی کہاں ——!" ثریا تن کر بولی —— "ابھی اور سنو! ہمارے دولہا بھائی بننے کے امیدوار جناب یوسف صاحب ایم اے کا امتحان دے چکے ہیں اور آج کل فارغ ہیں۔ اس لیے ہفتے عشرے کے لیے اپنی پھوپی جان کے ہاں آ رہے ہیں۔ ممانی جاتے ہی انہیں بھیج دیں گی۔ اور ممانی نے مجھے تاکید کی ہے کہ تمہارے ذہن کی زمین ہموار کر دوں۔ اس کام کے لیے انہوں نے مجھے ایک بل ڈوزر بھی دیا ہے۔"

"بل ڈوزر ——!" تبسم حیران رہ گئی۔

"ہاں۔ بل ڈوزر ——!" ثریا بولی —— "دکھاؤں؟" پھر اس نے یوسف کی ایک بڑی سی تصویر تبسم کے سامنے پھیلا دی —— "یہ لمبا اونچا قد، اتنی چوڑی چھاتی، اتنی بڑی بڑی آنکھیں، اتنے مضبوط بھرے بھرے بازو اور یہ میرے تمہارے دو ہاتھوں کا ایک ہاتھ —— میں انہیں بل ڈوزر نہ کہوں تو کیا بلبل کہوں؟"



تب تبسم زور سے ہنسی اور ثریا کو پکڑ کر پیار سے پیٹ ڈالا اور باہر بھاگ گئی۔ پھر جب وہ ممانی کو رخصت کر کے اپنے کمرے میں آئی تو مینٹل پیس پر یوسف کی تصویر ایک فریم میں سجی رکھی تھی۔ ثریا نے فریم میں سے جہانگیر کے مقبرے کا منظر نکال کر ایک طرف رکھ دیا تھا اور اس میں یوسف کو فٹ کر کے گھر چلی گئی تھی —— پلٹ کر اس نے اپنے کمرے کی چٹخنی لگائی اور میز کا لیمپ جلا کر یوسف کی تصویر کو بہت غور سے دیکھنے لگی۔ اس نے آنے سے دس گیارہ برس پہلے اپنے اس ماموں زاد بھائی کو دیکھا تھا۔ مگر اس عرصہ میں وہ کتنا بہت سا بدل گیا تھا (ممانی نے بھی تو اس سے کہا تھا کہ وہ کتنی ڈھیروں بدل گئی ہے!) اسے یاد آیا کہ جب وہ یوسف کو ساتھی بنا کر یوسف کے خالہ زاد بہن بھائی یونس اور صبا کے ساتھ کیرم کھیلی تھی تو انہیں ایسی مار دی تھی کہ وہ دونوں روہانسے ہو کر اٹھے تھے اور الگ جا کر رونے لگے تھے۔ اور یوسف نے ناچ ناچ کر، کود کود کر گھر کے ایک ایک فرد کو اطلاع دی تھی کہ یونس اور صبا کیرم میں ہارنے کے بعد بیٹھے رو رہے ہیں —— اور ——" اس نے تبسم کا ہاتھ پکڑ کر اعلان کیا تھا —— "میری ساتھی یہ شیرنی ہے!"

"گیدڑ کی ساتھی شیرنی!" صبا نے دور سے نعرہ مارا تھا۔ اور سارا گھر لوٹ پوٹ ہو گیا تھا۔

"مگر کیا گیدڑ اس طرح کے ہوتے ہیں!" اس نے یوسف



کی تصویر کو روشنی کے سیلاب میں لا کر سوچا۔ وہ کتنا وجیہ تھا۔ اس کی چراین لائی اسٹائل کی گھنی بھوؤں کے نیچے اس کی بالکل لڑکیوں کی سی بڑی بڑی آنکھوں میں کتنی گہرائی اور روشنی تھی۔ اور خفیف سی مسکراہٹ سے اس کے ہونٹوں کے گوشوں میں ننھی منی سلوٹیں کتنی پیاری لگ رہی تھیں۔

رات کو اسے پہلی بار محسوس ہوا کہ خاموشی کی ایک اپنی آواز ہوتی ہے اور کوئی ایک پل بھی ایسا نہیں گزرتا جب یہ آواز رک جاتی ہو۔ آخر اب تک یہ آواز اس کی سماعت کی گرفت میں کیوں نہیں آئی تھی۔ آخر اب تک اس نے خاموشی کو اتنا جامد، اتنا بے حس کیوں سمجھ رکھا تھا۔ آخر انسان پر قدرت کے سب اسرار قسطوں میں کیوں منکشف ہوتے ہیں۔ ایک ساتھ منکشف ہوں تو کتنی مشکلیں آسان ہو جائیں۔۔۔۔ !

یوسف جب ان کے ہاں ہفتہ عشرہ گزارنے آیا تو تبسم کو تصویر سے بھی اچھا لگا۔ ایک دن تو خاصے تکلف میں ۔۔۔ "معاف کیجیے گا" اور "زحمت تو ہوگی" وغیرہ کے سے جملے ادا کرنے میں ۔۔۔ گزرا۔ مگر دوسرے دن جب وہ کھلا تو تبسم کو معلوم ہوا کہ وہ تو آج سے دس گیارہ سال پہلے کی طرح شگفتگی، زندہ دلی اور شرارت کی پوٹ تھا۔ وہ اپنی باتوں، حرکتوں اور اداکاری تک سے اپنی پھوپھی کو، پھوپھی زاد تبسم کو اور تبسم کی سہیلی ثریا کو اتنا ہنساتا کہ تبسم کی امی تو اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیتیں کہ ۔۔۔ "خدا کے لیے اب رک جاؤ! اب اور ہنساؤ گے تو میرا تو دم گھٹ جائے گا۔"

اصل میں تبسم کی امی کو یوسف کی حرکتوں پر کچھ زیادہ ہی ہنسی آتی تھی۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ یوسف کی حرکتیں ہوتی ہی ایسی تھیں کہ سنجیدہ سے سنجیدہ آدمی بھی مشکل سے ہنسی پر ضبط کر پاتا تھا۔ شروع شروع میں تبسم اور ثریا نے ضبط کرنے کی بڑی کوشش کی اور یوسف کے سامنے سے اٹھ کر کسی کمرے میں جا چھپتیں اور وہاں ایک دوسرے سے لپٹ لپٹ کر ہنستی رہیں۔ مگر پھر ایک روز جب یوسف ہکلوں کی نقل کر رہا تھا اور "ثریا" کہنے کے لیے اس نے "ثور، ثور، ثور، ثور" کی رٹ لگا دی تو ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔ اور تبسم اور ثریا بھی اتنا ہنسیں کہ دوہرے ہو گئے۔ اور لٹیں چہروں پر بکھر گئیں۔ پھر ایک اور وجہ تبسم کی امی کے بے تحاشا ہنسنے کی یہ بھی تھی کہ انہیں اپنی بیٹی زندگی میں پہلی بار اتنی بیباکی سے ہنستی نظر آئی تھی۔ سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے یوسف کی آنکھوں میں تبسم کی اور تبسم کی آنکھوں میں یوسف کی تصویر دیکھ لی تھی اور اس کی تائید ثریا نے بھی کر دی تھی۔ ان کے پوچھنے پر پہلے تو ثریا ٹرخاتی رہی، مگر جب انہوں نے اسے تبسم کے مستقبل کا واسطہ دیا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ خوش ہو کر انہوں نے ثریا کو سینے سے لگا لیا۔ اور کہا،

"کنواری لڑکیوں سے ایسی باتیں نہیں پوچھی جاتیں مگر بیٹی میں اور کس سے پوچھوں۔ اور نہ پوچھوں تو بھائی کو کیا جواب دوں، روز تو ان کا ایک خط آ جاتا ہے۔ انہوں نے تو دھمکی دے دی ہے کہ میں نے کوئی ایسا ویسا جواب دیا تو وہ پاکستان سے چلے جائیں گے اور کناڈا میں جا کر آباد ہو جائیں گے۔ میں خود تبسم سے پوچھ لیتی مگر بیٹی مجھے اس سے ڈر لگتا ہے اور اس کے ابا لندن میں بیٹھے ہیں!"

جس روز انہوں نے طے کر لیا کہ وہ بھائی کو اپنا آخری فیصلہ لکھ بھیجیں گی، تو ثریا کا انتظار کرتی رہیں۔ وہ آئی تو اس سے کہا،

"بیٹی! تم نے اندازے سے کہا تھا نا کہ تبسم یوسف کو پسند کرتی ہے مگر اس کے ابا کی تائید ہے اس لیے اس سے بھی اس کی مرضی پوچھ لو تاکہ میرا فرض پورا ہو جائے!"

پھر جب ثریا تبسم کے کمرے کے دروازے تک پہنچی تو یوسف کہہ رہا تھا،

"مجھے دوستوں نے بتایا تھا کہ رشتہ دار لڑکیوں سے شادی کرنا بہت مہنگا پڑتا ہے مگر معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ان بے چاروں کو تمہارے جیسی رشتہ دار لڑکیاں نصیب ہی نہیں۔ میں خود دعویٰ نہیں کرتا۔ تم سے کہتا ہوں کہ تم کراچی، لاہور، پنڈی، پشاور، ڈھاکہ، سلہٹ، چٹاگانگ، ہر جگہ گھوم آؤ۔ اور اگر کہیں تمہیں اپنے سے زیادہ خوبصورت

اپنے سے زیادہ باوقار لڑکی نظر آجائے اور تم خدا کی قسم کھا کر کہہ دو کہ تم فلاں لڑکی سے فلاں معاملے میں کم تر ہو تو پتہ ہے میں کیا کروں گا؟"

"کیا کریں گے بھلا؟" تبسم نے پوچھا۔

اور یوسف بولا ــــ "میں اپنی ناک کاٹ کر تمہاری ہتھیلی پر رکھ دوں گا!"

اس کے بعد ثریا نے تبسم کی طویل ہنسی سنی۔ ساتھ ہی اس کی آواز آئی ــــ "ہائے توبہ ــــ آپ تو حد کرتے ہیں۔"

"پھر وہی آپ؟" یوسف نے روٹھنے کے انداز میں کہا۔ "یہ تمہاری ثریا مجھے آپ سے مخاطب کرتی ہے تو اسے ایسا ہی کرنا چاہیئے میرا اس کا یہی رشتہ ہے نا کہ وہ تمہاری دوست ہے۔ مگر تم تو میری بچپن کے علاوہ میری جان بھی ہو۔ پھر تم مجھے آپ سے کیوں مخاطب کرتی ہو؟ اب سیدھی طرح ــــ "تم" ــــ بولو، ورنہ گدگدی کر دوں گا۔"

"ہائے بولتی ہوں۔ بولتی ہوں۔" تبسم بے چینی سے بولی۔

"اچھا تو بولو!" یوسف نے کہا

"تم ــــ !" وہ بولی۔

"نہیں ــــ !" یوسف نے کہا ــــ "صرف تم کا کیا مطلب؟ فقرہ پورا ہونا چاہیئے۔"

اور تبسم نے کہا ــــ "اچھا تو ــــ اچھا تو تم ــــ تم میرے لیے وہی ہو جو میں تمہارے لیے ہوں!"

ثریا یہ سن کر وہاں سے بھاگی اور تبسم کی امی کو اطلاع دی کہ تبسم کو اس رشتے پر نہ صرف کوئی اعتراض نہیں ہے بلکہ اس رشتے کے سوا کسی دوسرے رشتے کا ذکر بھی اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگا انہوں نے ثریا کو پیار کے ساتھ اپنے پہلو میں دبایا۔ پھر اس کے سر پر بوسہ دیا۔ عینک لگائی۔ بسم اللہ پڑھی اور بھائی کو خط لکھنے بیٹھ گئیں۔

ثریا باہر صحن میں آ کر لان میں رکھی ہوئی بید کی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گئی اور میز پر سے اخبار اٹھا کر پڑھنے لگی۔ جانے وہ پڑھ رہی تھی یا سوچ رہی تھی۔ مگر وہ ایسی محو تھی کہ تبسم آ کر اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ بھی گئی تو اسے کوئی پتہ نہ چلا۔ پھر جب اس نے تبسم کی دبی دبی ہنسی کی آواز سنی تو سامنے سے اخبار ہٹا کر بولی۔

"کیوں تبسم کوئی لطیفہ ہوا ہے تو مجھے بھی سناؤ نا!"

تبسم اب کھل کر ہنسنے لگی

ثریا بولی ــــ "اچھا تو میں تمہیں بتاؤں تم کیوں ہنس رہی ہو؟"

"تمہارے تو فرشتوں کو بھی خبر نہیں اس کی!" تبسم نے کہا اور پھر ہنسنا شروع کر دیا۔

"فرشتوں کو چاہے خبر نہ ہو مگر مجھے خبر ہے۔" ثریا بولی ــــ "سنو!" پھر اس نے آہستہ سے کہا ــــ "تم میرے لیے وہی ہو جو میں تمہارے لیے ہوں ــــ !"

تبسم اس پر جھپٹی اور ثریا نے ہنستے ہوئے بھاگنا چاہا مگر کسی نے اس کی چوٹی زور سے کھینچی اور وہ کرسی میں گر پڑی۔ پلٹ کر دیکھا تو یوسف دور برآمدے میں کھڑا آداب عرض کر رہا تھا اور ثریا کی چوٹی کرسی کے ایک حصے سے بندھی ہوئی تھی۔ تینوں اتنا ہنسے کہ تبسم کی امی بھی خط چھوڑ کر باہر بھاگی آئیں۔ دیکھا کہ یوسف کرسی سے بندھی ہوئی ثریا کی چوٹی کھول رہا ہے اور کہہ رہا ہے

"اس میں مجھ عاجز کا کوئی قصور نہیں ثریا بی بی! سراسر آپ کی چوٹی کا قصور ہے۔ جو چوٹی اتنی لمبی ہو کہ کرسی پر بیٹھنے سے زمین کو چھونے لگے اسے کرسی کے ساتھ باندھنے سے کون شریف آدمی باز رہ سکتا ہے"

ــــ اور تبسم اتنا ہنس رہی ہے کہ ایک کرسی سے اٹھتی ہے تو ہنستی ہوئی دوسری کرسی پر جا گرتی ہے۔

یوسف کے جانے کے تیسرے ہی دن بعد تبسم کو اس کا خط ملا۔ اور شام تک تبسم نے اسے اتنی بار پڑھا کہ اسے "میری تبسم" سے ــــ "تمہارا یوسف" ــــ تک ساری عبارت ازبر ہو گئی۔ اس رات اسے خواب اور بیداری کا بڑا انوکھا تجربہ ہوا۔ ہر بار جب وہ چونکی تو اسے محسوس ہوا کہ وہ تو جاگ رہی تھی۔ اور جب ایک لمبی سوچ کے بعد اس پر غنودگی طاری ہونے لگی تو جیسے وہ اب تک سوتی

ہار جیت کا فیصلہ

دو آدمی تاش کھیل رہے تھے۔ ایک نے شو کرائی اور پوچھا "تمہارے پاس کیا ہے؟"

دوسرے نے کہا "میرے پاس تین اکے ہیں میں جیت گیا۔"

پہلا بولا۔ "نہیں میں جیتا ہوں۔"

دوسرے نے پوچھا "کیوں تمہارے پاس کیا ہے؟"

پہلے نے جواب دیا۔ "دو اکے اور ایک بھرا ہوا ریوالور۔"

رہی تھی۔

صبح کو اس کی امّی نے اس کی سرخ آنکھیں دیکھ کر اسے سینے سے لپٹا لیا ——— "دیکھو بیٹی! اب مجھ سے جھوٹ نہ بولنا۔ تم رات بھر روتی رہی ہو؟ اور میں جانتی ہوں کہ کیوں روتی رہی ہو۔ مگر دیکھو ہر بیٹی کو آخر کار اپنے ماں باپ سے جدا ہونا ہوتا ہے۔ میں اپنے ماں باپ سے جدا ہو کر تمہارے ابّا کے گھر آئی تھی۔ میری امّی اپنے ماں باپ سے جدا ہو کر میرے ابّا کے گھر آئی تھیں۔ مگر بیٹی! یہ جدائی عجیب جدائی ہوتی ہے۔ ادھر کلیجہ کٹتا جاتا ہے ادھر سِلتا جاتا ہے۔ اور ماشا اللہ تم تو ایسے گھر میں جا رہی ہو جہاں کا ایک ایک فرد تمہارے پاؤں دھو دھو کر پیئے گا۔ بھیا کو میں جانتی ہوں، ممانی کو تم نے دیکھ لیا ہے کہ کیسے بات بات پر تم پہ صدقے قربان ہوتی رہیں ——— اور یوسف تو خیر ——— !"

"کتنی بھولی ہوتی ہیں یہ مائیں!" تبسّم نے سوچا۔ رات کس کافر کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نکلا ہے۔ اگر میری آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں تو اس کی وجہ میرا رات بھر کا سونا یا رات بھر کا جاگنا بھی تو ہو سکتا ہے۔ مگر امی کی سوچ نے ادھر کا رخ ہی نہیں کیا۔ انہوں نے سارا تانا بانا اپنی ذات کے گرد بن لیا۔ لیے یہ انسانی رشتے بھی کتنی لطیف چیز ہوتے ہیں۔

"انسانی رشتے کتنے لطیف ہوتے ہیں تبسّم!" ثریا نے اکر اس کی سوچوں کو زبان دے دی تھی ——— "ان رشتوں میں ایک نئے رشتے کے اضافے نے تمہیں کتنا بدل دیا ہے اور کتنی خوبصورتی سے بدلا ہے۔ تبسّم کلی کرتیا؟ یہ جو تم پچھلے چودہ پندرہ برس سے اداسی اور تنہائی کی مریضہ تھیں تو تمہارا یہ مرض یکایک کہاں غائب ہو گیا ہے؟ چند روز پہلے میں تمہیں تم لئے طائرانِ آشیاں گم کردہ' سننے کے مشورے دے رہی تھی۔ آج تم پہ آشیاں آسودگی کا نشہ چھا رہا ہے ——— چھا رہا ہے کہ نہیں؟"

"چھا تو رہا ہے۔ مگر ثریا، یہ باتیں تو تجربے سے آتی ہیں ——— !"

تبسّم نے طنز کیا ——— "تمہیں کس نے سکھائیں یہ باتیں؟"

"محبّت نے ——— !" ثریا نے بڑے اعتماد سے کہا۔

تبسّم حیران رہ گئی ——— "اچھا تو یہ بات ہے؟ پھر تم نے اب تک یہ راز مجھے کیوں نہیں بتایا؟ تم نے محبت کی ہے؟"

"ہاں ——— !" ثریا نے اثبات میں سر ہلایا تو اپنی ٹھوڑی سینے میں گاڑ لی۔

"کس سے ——— ؟" تبسّم نے پوچھا۔

اور ثریا قہقہہ مار کر بولی ——— "تم سے، اور کس سے ؟"

تبسّم نے اسے لپٹا لیا۔ پھر اسے یوسف کا خط دکھایا تو ثریا نے تبسّم کو چھیڑا ——— "یہ تو بالکل رٹے رٹائے فقرے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ میں نے کہیں پڑھے ہیں۔ میاں صاحب نے اپنے دل سے تو کوئی بات لکھی نہیں۔"

تبسّم ایک دم سنجیدہ ہو گئی تو ثریا نے بڑی مشکل سے اسے منایا اور آخر میں کہا ——— "پس ثابت ہوا کہ جو محبت کرتا ہے وہ تھوڑا سا بور بھی ہو جاتا ہے !"

یوسف کا ایک خط دوسرے روز بھی آیا، پھر تیسرے روز بھی آیا۔ چوتھے روز تبسّم کی امّی ایک لفافہ لیے تبسّم کے کمرے میں آئیں اور بولیں:

"لو بیٹی! یوسف کا خط آیا ہے !"

تبسّم لفافہ لیتے ہوئے کچھ حیران نظر آئی تو وہ بولیں:

"یہ میرا اندازہ ہے بیٹی!" انہوں نے نمایاں آسودگی سے کہا ——— "ورنہ یوسف کے سوا ہر روز ایک خط لکھنے کی مشقت کون برداشت کر سکتا ہے !" ——— ذرا رک کر وہ مسکرائیں تو تبسّم کو وہ بالکل ثریا لگیں۔ مائیں بھی کبھی کیسی سہیلیاں سی بھی تو بن جاتی ہیں پھر وہ ماں بن گئیں۔

"میرے حساب سے یہ یوسف کا چوتھا خط ہے بیٹی! اب تمہارا فرض ہے کہ آج ان سب کا جواب تم بھی اسے لکھ دو ——— یہ تمہارے مستقبل کے لیے بھی اچھا ہو گا۔"

ان کے جاتے ہی تبسّم نے لفافہ کھولا۔ سرنامہ پڑھ کر بستر پر گری اور چت لیٹ گئی۔ پھر سنبھل کے تکیوں میں سر ڈبو کر وہ خط کا ایک ایک لفظ اپنی آنکھوں سے پینے لگی۔ پورا خط پڑھ کر اس نے ایک طویل انگڑائی لی۔ اٹھی، دروازہ اندر سے بند کیا اور یوسف کو زندگی کا پہلا خط لکھنے بیٹھ گئی۔

خط ختم کرنے کے بعد وہ اسے پڑھ رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے خط کو فوراً تکیے کے نیچے رکھا اور بولی "آئیے امّی جان!" ——— باہر سے کوئی آواز نہ آئی تو اس نے دروازہ کھولا۔ مگر وہاں اس کی امّی کی بجائے ثریا کھڑی تھی۔

مگر کیا یہ واقعی ثریا تھی؟

یہ وہ ثریا تو نہیں تھی جو کل شام !

مشاعرہ بازی ـــــ مرغ بازی، بٹیر بازی وغیرہ کی طرح مشاعرہ کرانا یعنی مشاعرہ بازی بھی ایک لت ہے۔ میں خود گزشتہ پندرہ سولہ برس سے اس مرض میں مبتلا ہوں۔ ابتدا میں محض خدمتِ ادب کے خیال سے ایک مشاعرے کی نیو رکھی تھی۔ بعد میں مشاعرے سنے گویا بنی نیو مجھ پہ رکھ دی۔ چنانچہ اس مدت میں درجنوں دُبلے پتلے موٹے تازے مشاعرے کرا چکا ہوں۔ لیکن آج میں مشاعرے سے توبہ کا اعلان کرتا ہوں اور اپنی اسی تحریر کو گواہ بناتا ہوں تاکہ آئندہ اگر مشاعرے کو منہ دکھاؤں تو دنیا کو منہ نہ دکھا سکوں۔

(سید ضمیر جعفری، مشاعرہ تو مل نا تواں نے)

شعر
پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا!
افسونِ انتظار ۔ تمنا کہیں جسے!

یہ شعر گنگنا کر تبسم کو تنگ کرتی رہی تھی اور شادی کے بعد یوسف کو چھیڑنے کے منصوبوں کی تفصیل بتاتی رہی تھی اور جس کے ہونٹ خاموشی میں بھی مسکراتے رہنا نہیں بھولتے تھے ـــ اور دروازے میں کھڑی ہوئی اس ثریا کے تو ہونٹوں کے ساتھ ساتھ جیسے نمی کی ایک دھار، دور آنکھوں کی گہرائیوں تک چلی گئی تھی اور اس کے ہونٹ خشک تھے اور کانپ رہے تھے اور اس کا چہرہ کاغذ کی طرح سفید ہو رہا تھا۔

"کیا بات ہے ثریا؟" ـــــ تبسم اسے دیکھ کر گھبرا گئی۔ "تم نے تو یوں کبھی دستک نہیں دی تھی۔ تم تو دروازہ توڑ کر اندر آ جانے والی لڑکی ہو!"

"اندر آجاؤں ـــــ؟" ثریا نے پوچھا۔ اور آنسو اس کے گالوں پر ڈھلک آئے۔

تبسم نے ثریا کو بازو سے پکڑا اور اندر کھینچ لائی ـــ "شرم نہیں آتی ایسی بات کہتے ہوئے؟" پھر اس نے ثریا کو پلنگ پر بٹھا کر اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور بولی ـــــ "تمہیں کیا ہو گیا ہے میری ثریا، جلدی سے بتاؤ، ورنہ میں چیخنے لگوں گی۔ خدا کے لیے بتاؤ، چچا جان اور خالہ جان تو ٹھیک ہیں؟"

"سب ٹھیک ہیں!" ثریا بھرائی آواز میں بولی "ساری دنیا ٹھیک ہے صرف میں بیمار ہوں"

"بیمار ہو ـــــ؟" تبسم نے اسے اپنے پہلو میں دبا لیا۔

"مجھ سے اتنا پیار نہ کرو تبسم!" ثریا اسی لہجے میں بولتی رہی "صرف اتنا سا پیار کرو کہ جب تم مجھے اپنے پہلو سے جھٹکو تو تمہیں زیادہ صدمہ نہ پہنچے"

"مگر بات کیا ہے ثریا ـــــ؟" تبسم نے فریاد کی۔

ثریا بولی ـــــ "میں ایک ایسی بے گناہ ہوں تبسم، جو کسی گنہگار سے بھی زیادہ گناہ کی زد میں ہو۔ تم مجھے قصوروار تو نہیں ٹھہراؤ گی ـــــ؟"

"مگر کونسا قصور ـــــ؟"

"میں تمہیں بتاؤں گی تو تم پاگل تو نہیں ہو جاؤ گی؟"

"قصہ کیا ہے آخر؟" تبسم نے یہ سوال ثریا کے علاوہ جیسے اپنے آپ سے بھی پوچھا۔

"میں تمہیں کبھی نہ بتاتی ـــ!" ثریا بولی ـــــ "میں پی جاتی مگر اس طرح میری محبت بددیانت ٹھہرتی۔ میں شاید اپنے آپ کو تو دھوکہ دے لیتی۔ مگر اس طرح تم بھی دھوکہ کھا جاتیں۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں نہ اپنے آپ کو دھوکہ دوں گی نہ تمہیں دھوکہ کھانے دوں گی!"

"کھل کر بات کرو ثریا!" اب کے تبسم کے لہجے میں تحکم تھا۔ جیسے اسے بات کا اندازہ ہونے لگا ہے۔

ثریا کچھ دیر ساکت بیٹھی رہی، پھر ہاتھ بڑھا کر بولی ـــــ "یہ یوسف کا خط ہے!"

"تمہارے نام؟" تبسم نے موٹا سا لفافہ جیسے چھین لیا۔ پھر وہ اسے وہیں کھڑی کھڑی پڑھنے لگی۔

یوسف نے ثریا کو ـــ "میری اپنی ثریا" ـــ سے مخاطب کیا تھا۔ اور لکھا تھا کہ ـــــ "جب سے امی نے سرگودھا سے واپسی پر

تبسم کے ساتھ تمہارا اور تمہاری ذہانت کا ذکر کیا تھا تو میں نے ایک عجیب بات سوچی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ جو لڑکیاں ذہین ہوتی ہیں وہ عموماً بدصورت ہوتی ہیں۔ مگر جب سرگودھا آکر میں نے تمہیں دیکھا تو سوچا کہ جب ذہانت اور حسن یکجا ہو جاتے ہیں تو ایک قیامت جنم لیتی ہے جس کا نام لوگ ثریا بھی رکھ دیتے ہیں۔ تبسم میری بڑی پیاری پھوپی کی ایک ہی بیٹی ہے اور پھر پرانی بیمار ہے۔ مجھے اس سے ہمدردی ہے اور ابا اور امی بھی یہی چاہتے ہیں۔ اس لیے مجھے اس کے ساتھ شادی کرنی ہی پڑے گی۔ مگر میرا دل کچھ اور چاہتا ہے۔

اس لیے میری اپنی ثریا! بس، برس ڈیڑھ برس کی بات ہے۔ میں ابا، امی کو بھی رضامند کر لوں گا، اور تبسم کو بھی منا لوں گا اور پھر یوں ہوگا کہ تبسم میرے پنڈی والے بنگلے میں میرے ابا، امی کے ساتھ رہے گی۔ اور میری ثریا اسلام آباد والے اس بنگلے میں میرے ساتھ رہے گی جس کے بارے میں امی نے مجھے بتایا ہے کہ تبسم کے ابا اپنا یہ بنگلہ اپنی بیٹی کو جہیز میں دیں گے۔ میں نے تبسم کو بھی امی کے کہنے پر خط لکھے ہیں، مگر انہیں لکھتے ہوئے بڑا تکلف محسوس ہوتا ہے جیسے میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ اب تمہیں خط لکھ رہا ہوں، اور سوچ رہا ہوں کہ انسان کو سچ بولتے ہوئے کتنی آسودگی محسوس ہوتی ہے۔

اور ثریا، تمہیں یہ خط لکھ کر میں اپنی زندگی کا سب سے بڑا سچ بول رہا ہوں۔ مجھے تم سے اتنی شدید محبت ہے کہ جب سے دنیا پیدا ہوئی ہے کسی مرد نے کسی عورت سے اتنی محبت نہیں کی ہوگی۔ یہ برس ڈیڑھ برس تمہارے پاس میری امانت ہیں۔ وعدہ کرو کہ اگر اس دوران کہیں تمہارے رشتے کی کوئی بات چلی تو تم ہر قیمت پر اس کی مزاحمت کرو گی، کم سے کم ٹالتی رہو گی، حتیٰ کہ خود تبسم کے ہاتھ کا لکھا ہوا اجازت نامہ تمہیں مل جائے گا۔ میں نے آج امی سے تمہارا پتہ اس بہانے حاصل کیا ہے کہ میں ثریا سے تبسم کے ذوق و معیار کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں۔ تمہیں میری بے حساب محبت کا واسطہ کہ تم اس برس ڈیڑھ برس پر بڑی سختی سے پہرہ دو گی۔ اور تبسم کے کان میں ہمارے اس خط اور معاہدے کی بھنک بھی نہیں پڑنے دو گی اور مجھے آج ہی اس خط کا جواب دو گی!"

تبسم خط پڑھ لینے کے بعد بھی وہیں کھڑی رہی۔ پھر ثریا کی طرف دیکھا جو تبسم کو خط تھمانے کے بعد وہیں کی وہیں ... رہ گئی تھی۔ وہ تبسم کی طرف اس ملزم کی طرح تکے جا رہی تھی۔ جو منصف سے آخری فیصلہ سننے کے لیے سانس روکے کھڑا ہو۔

"اس خط کا جواب دو گی؟" آخر تبسم نے پوچھا۔

"دے دیا ہے!" ثریا بولی۔

"دے دیا ہے؟" ——— تبسم نے ثریا کو بے یقینی سے اس کی طرف ایک قدم اٹھایا، مگر پھر جیسے اسے چکر آگیا اور وہ سی گئی۔

ثریا نے لپک کر اسے سہارا دیا اور اس کے سر کو اپنی گو لگا کر بولی:

"میں نے یوسف کا خط تمہارے حوالے کر دیا ہے۔ میر سے یہی اس کا جواب ہے!"

تبسم آنسوؤں میں مسکرا پڑی اور مسکراتے ہوئے ٹوٹ دی۔ اور پرے اس کی امی آگئیں۔ انہیں شاید ثریا کی موجودگی کا تھا۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی بولیں:

"جواب دے دیا نا بیٹی ———؟" مگر ثریا پر نظر پڑ گئیں اور جانے کو پلٹیں۔

مگر تبسم نے لپک کر تکیے کے نیچے سے یوسف کے خ جواب نکالا اور بولی:

"جی ہاں، امی جان! میں نے آپ کے بھتیجے کو جواب ہے!" وہ اپنا لکھا ہوا خط ہاتھ میں لیے اپنی ماں کے پاس ایک دھنت کے ساتھ اس خط کے پرزے پرزے کر دیئے انہیں ماں کے سپرد کرتے ہوئے بولی:

"یہ جواب دیا ہے میں نے!"

دیر تک تینوں یوں کھڑی رہیں جیسے وہ اس کمر ستون ہیں۔ پھر یکایک تبسم نے گھبرا کر اوپر چھت کی طرف د

"امی جان ———!" وہ چیخی ——— اور اس چیخ کائنات کے سناٹے پر جیسے مہر لگا دی۔ اور جیسے آواز کا عنصر بار بکھر کر رہ گیا۔



روحانی ڈاک



کشف وکرامات اولیائے کرامؒ کا خاصہ ہے۔ جو کبھی کبھی بزرگانِ دین کے مبارک توسط سے اللہ نیک بندوں کو اس کے لطف وکرم کے صدقے میں عطا ہو جاتا ہے۔

بابا سیدشان احمدؒ صاحب

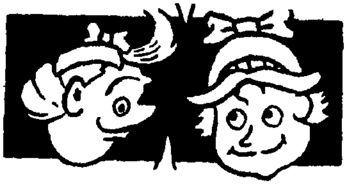
کا شمار بھی انہی برگزیدہ ہستیوں میں ہے جنہیں روحانی انعام و اکرام سے نوازا گیا اور اس کا منہ بولتا ثبوت حقیقتِ حال سے متعلق وہ اہم پیش گوئیاں ہیں جو بذریعہ کشف تجلی کی صورت میں ان پر ظاہر ہوتی رہیں۔ باباجی شادی بیاہ، مقدمات، محبت میں کامیابی یا ناکامی، مالی مشکلات اور اولاد وغیرہ سے متعلق آپ کے سوالات کے جوابات بذریعہ کشف دینے پر رضامند ہو گئے ہیں اور وہ پلک جھپکتے میں آپکے حال اور مستقبل کے تانے بانے میں جھانک کر فوراً خدا لگتی کہہ دیں گے۔ صرف ضرورت ہے اس نام کی جس سے آپ زیادہ پکارے اور پہچانے جاتے ہیں اور اس کے ساتھ آپ کی والدہ محترمہ کا نام، عمر اور مقام پیدائش۔ آپ ایک وقت میں صرف دو سوال کر سکتے ہیں۔ جوابات کے لیے جوابی لفافہ بھیجنا ضروری ہے۔ باباجی کے جوابات کا کوئی نذرانہ نہیں ہے۔

خط لکھنے کا پتہ

روحانی ڈاک

ماہنامہ "دوشیزہ" پوسٹ بکس ۵۸۹۵

کراچی ۲۹



تکلف برطرف

ریاض مرزا

آپ اس عنوان کے تحت سیاسی، علمی، ادبی، معاشرتی اور ثقافتی نوعیت کے سوالات بھیج سکتے ہیں۔ سوالات بھیجتے وقت تین باتوں کا خیال رکھیں (۱) زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیجے جائیں جن میں سے دو منتخب سوالوں کا جواب شائع کیا جائے گا۔ (۲) سوالات دلچسپ، مختصر اور خوشخط لکھے ہوئے ہوں (۳) تہذیب و اخلاق سے گرے ہوئے سوالات نہ بھیجے جائیں۔ (ادارہ)

نظیر انجوا بڑو، سندھ یونیورسٹی

س: انسان کو سب سے زیادہ کون سی چیز پیاری لگتی ہے؟

ج: دوسرے کی بیوی اور اپنی دولت۔

س: اگر کسی لڑکے کو لڑکی سے پیار ہو جائے تو اسے کیا کرنا چاہیئے؟

ج: لڑکی کے ہر حکم پر عمل کرنا چاہیئے۔

ایک لڑکی اپنے دوست کو ساتھ لئے اپنی کوٹھی کے پھاٹک میں داخل ہوئی تو اندر سے لڑکی کا باپ ایک بڑے کتے کے ساتھ نکل رہا تھا۔ لڑکا ایک دم رک گیا۔ تو لڑکی نے اس سے کہا: "اطمینان سے آجاؤ کتا تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔"

کوثر بی بی، ملتان

س: عورت کی سب سے بڑی تمنا کیا ہے؟

ج: کہ وہ دنیا کی حسین ترین عورت بن جائے۔

س: آپ کو کون سا رنگ اور کھانا پسند ہے؟

ج: رنگ وہ جو آنکھوں کو اچھا لگے اور کھانا وہ جو آسانی سے میسر آجائے۔

ہالی وڈ کا ایک مشہور اداکار زوال کے بعد لوگوں کی نظروں سے بچتا بچاتا نیویارک کے ایک گھٹیا ہوٹل میں کھانا کھانے چلا گیا۔ وہ یہ دیکھ کر گھبرا گیا کہ اس کا ایک پرانا ساتھی ہوٹل میں ویٹر ہے۔ "اسکاٹ تم یہاں ویٹر ہو؟" اس نے جھینپ مٹانے کے لئے اپنے ساتھی سے کہا۔

اس کے دوست نے شان سے کہا۔ "ہاں! لیکن میں اس گھٹیا ہوٹل میں کھانا نہیں کھاتا۔"

خادم حسین ایاز، آزاد کشمیر

س: محبت کی جاتی ہے یا ہو جاتی ہے؟

ج: بعض اوقات قدرت بھی اس کا اہتمام کر دیتی ہے۔

ایک ساحلی قصبہ طوفان کی زد میں آگیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے درخت جڑوں سے اکھڑنے لگے۔ مکانوں کی چھتیں اڑنے لگیں۔ ایک میاں بیوی چھت پر سوئے ہوئے تھے۔ طوفان انہیں چھت سمیت اڑا کر دور لے گیا۔ لوگوں نے دیکھا تو ان میں ایک پکارا "دیکھو بیس برس میں وہ پہلی مرتبہ باہر اکٹھے نکلے ہیں۔"

س: محبت پہلے مرد کرتا ہے یا عورت؟

ج: عورت! ماں کی گود محبت کی پہلی درس گاہ ہوتی ہے۔

رشیدہ ناز، ٹنڈو محمد خان

س: لوگ نیکی کرتے ہوئے ڈرتے کیوں ہیں؟

ج : اس لئے کہ بعض لوگ نیکی اور خلوص کو غلط رنگ دے لیتے ہیں
ایک مشہور جیل کے سنتری کی عمر بندی کے بعد مجرم کے ایک ہتھکار
نے جیلر کا شکریہ ادا کیا تو جیلر نے آداب ملحوظ رکھتے ہوئے کہا
"شکریے کی کیا بات ہے جناب! اس جیل کے دروازے آپ
کے لئے ہمیشہ کھلے ہیں۔"

س : اگر آگ جلے تو پانی ڈالیے، اگر دل جلے تو؟
ج : آنسو پیتے۔

میر قمر علی خان، بلوچستان

س : خاندانی منصوبہ بندی کے بارے میں اپنی رائے دیجئے؟
ج : ایک ایسا ادارہ جہاں عشق و محبت لڑانے کی قیمت ہر ماہ کی پہلی کو تنخواہ کی صورت میں مل جاتی ہے۔

س : عورت کی صحیح عمر معلوم کرنے کا کوئی طریقہ بتائیں؟
ج : آجکل اعشاری نظام رائج ہے، اس لئے عورت جو عمر بھی بتائے اس میں دس سال کا اضافہ کریں۔ صحیح عمر نکل آئے گی

یاسمین شبنم، لاہور

س : میں نے اپنی شادی کے لئے شرط رکھی ہے کہ جو کوئی بھی کالا گلاب لائے گا میں اس کی ہو جاؤں گی۔ آپ بتلائیے کیا دنیا میں کالا گلاب ہوتا ہے؟
ج : دنیا کا تو مجھے علم نہیں ہے۔ البتہ میرے لان میں کالے گلاب کے پودے ہیں

س : آپ کا یہ نام کیوں ہے؟
ج : اس لئے کہ مجھے یہ نام پسند ہے۔ یوں بھی ریا ضا کرنے والے کو ہمیشہ ہی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

عبدالعزیز بلوچ، راولپنڈی

س : کیا والدین کی مرضی کے بغیر اپنی پسند کی شادی کرنا جرم ہے؟
ج : لڑکی کے والدین کی مرضی کے بغیر شادی بعض حالات میں تو دو تین سال کے لئے مفت کی روٹی اور مفت کے کپڑے بمعہ رہائش گاہ کے مل جاتے ہیں۔ سمجھ گئے نا!

قاسم خان، پشاور

س : ریل گاڑی کو روکنے کے لئے زنجیر سے کام لیا جاتا ہے مگر لڑکی کو روکنے کے لئے ۔۔۔؟
ج : سر پر ہیلمٹ پہن کر مختلف گلی پر ز ۔۔۔ از ملیئے۔

س : آج کل مرد عورت کا غلام کیوں بنا رہتا ہے؟
ج : اس لئے کہ گھر پر "عورت راج" ہوتا ہے۔ اور وہاں قانونِ نسواں کا نفاذ

فرحت، لاہور

س : کیا آپ سیر کرائیں گے؟
ج : پہلے اپنا گھر بسائیں پھر آنا جانا بھی ہوتا رہے گا۔

س : کسی کام کو سرانجام دینے کے لئے محنت کی ضرورت ہے یا حکمتِ عملی کی؟
ج : حکمتِ عملی کی!
گھر کی مالکن نے نوکر کے پھسڈی پن پر سخت چڑ چڑی جھلا کر بولی: "میں سمجھتی تھی کہ تمہارے آنے سے میری مشکل آسان ہو جائیگی لیکن تم سے کوئی کام بھی ڈھنگ سے نہیں ہوتا۔ اگر یہی حال رہا تو کام کیسے چلے گا۔" کام چور نے مسکین صورت بنا کر جواب دیا "محترمہ آپ کو غلط فہمی ہوئی۔ کام تو میں ہر ایک کر سکتا ہوں اور مجھے خاصا تجربہ بھی ہے لیکن دو طرح کے کام میں نہیں کر سکتا ایک بھاری اس لئے کہ میری صحت اجازت نہیں دیتی اور ایک ہلکا کہ اسے میں اپنی کسرِ شان سمجھتا ہوں۔"

نسیم صدیقی۔ ساہیوال

س : عورت کا حسن بالوں میں ہے یا چہرے میں؟
ج : بالوں اور چہرے کے علاوہ۔
ع مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

عبدالناصر، وہاڑی

س : جب اینٹ سے اینٹ ملتی ہے تو گھر بنتا ہے۔ جب دل سے دل ملتا ہے تو ۔۔۔!
ج : تو خاندانی منصوبہ بندی والوں سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔

س : لڑکی اور لڑکے میں ظاہراً کوئی فرق نہیں رہا۔ کیا کیا جائے؟
ج : موقع سے فائدہ اٹھائیے۔

شاہدہ ڈار، لائلپور

س : اندلس کا موجودہ نام کیا ہے؟
ج : اسپین

س : شہر میں دل نہ لگے تو؟
ج : لائلپور سے ٹکٹ کٹوا کر کراچی کا رُخ کریں، دل لگ جائے گا۔

صبیحہ بانو، شیخوپورہ

س : مجھے تو وہ کارٹون پسند ہے جو تکلف برطرف پر لگایا جاتا ہے

کیا وہ آپ کا ہے؟

ج: جی ہاں! مگر اس میں دو شخصیتیں ہیں۔ ذرا دوسرے کا نام بتائیے

س: کیا اپنے کالم سے شگفت برطرف کر دیا ہے آپ نے، لیکن وہ آج کل ہے کہاں؟

ج: اس وقت بھی آپ کے ہاتھوں میں ہے آپ کی نگاہوں کے سامنے۔

قیصر حمید قیصر، میانوالی

س: آج کے انسان کی وفاداری سے کتے کی وفاداری سبقت کیوں لے گئی ہے؟

ج: آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ آج کل تو کتے کی وفاداری کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا ہے۔

س: سنا ہے جس گھر میں مرد ہو اس کی شان ہی کچھ اور ہوتی ہے۔

ج: کیا آپ کے گھر میں کوئی مرد نہیں ہے۔

سید اسلم، سکھر

س: اگر کسی سے کسی بات پر لڑائی ہو جائے تو کیا کرنا چاہئے؟

ج: بڑا مزہ اس ملاپ میں ہے۔

س: بھلائی کے بدلے میں برائی کیوں ملتی ہے؟

ج: یہاں صبر کریں آخرت میں ایک کے بدلے ستر ملیں گی۔

اسمعین عزیز بلوچ، مکران

س: کیا عورتوں کو ان کے جائز حقوق مل بھی سکیں گے؟

ج: کیوں نہیں!

ایک صاحب کی بیوی بہت جھگڑالو اور زبان دراز تھی وہ ہمیشہ حقوقِ نسواں پر لڑتی رہتی تھی۔ شوہر نے مایوس ہو کر شراب میں پناہ ڈھونڈلی۔ بیوی بہت پریشان ہوئی۔ اپنی سہیلی سے شوہر کی اصلاح کے لئے مشورہ کیا۔ اس کی سہیلی نے کہا: "بہت آسان ترکیب ہے۔ تمہارا شوہر طبعاً بزدل اور ڈرپوک ہے۔ وہ ہر روز شراب خانے سے رات گئے قبرستان کے راستے گھر لوٹتا ہے۔ اس کا ایک ہی راستہ ہے۔ ممکن ہے قبرستان میں بیٹھ کر اگر اسے ڈرایا جائے تو کام بن جائے۔" چنانچہ وہ ایک پرانی قبر میں سیاہ لباس پہن کر بیٹھ گئی اور جیسے ہی شوہر آیا وہ عقب سے نکلی اور کہنے لگی۔ "ہا ہا ہا۔ ہا ہا!" اس کے شوہر نے ہمت سے دیکھا اور پوچھا "تم کون ہو؟" "میں شیطان ہوں۔" بیوی نے جواب دیا۔ "تو پھر آئیے ہاتھ ملائیے مجھ سے۔" اس کے خاوند نے جواب دیا۔ "آپ تو میرے رشتہ دار نکلے آپ کی ہمشیرہ میری بیوی ہے۔"

س: کیا مردوں کی پست ذہنیت تبدیل ہو سکے گی؟

ج: یہ تو ان گروہوں پر منحصر ہے جن میں وہ پروان چڑھتے ہیں۔

مسز عارف، کراچی

س: مسلے ہوئے پھول اور بیوہ میں کیا فرق ہے؟

ج: مسلا ہوا پھول دوبارہ نہیں کھل سکتا جب کہ بیوہ کی گود میں پھول کھل سکتے ہیں۔

س: آنسو اور شبنم میں کیا فرق ہے؟

ج: شبنم پھول کے دل کو فرحت بخشتی ہے اور آنسو پھول دل کو مرجھا گئی۔

سعید اختر مغل، کراچی

س: لڑکیاں اتنی خوبصورت کیوں ہوتی ہیں؟

ج: یہ سب میک اپ کا کمال ہے۔

س: مرد عقلمند ہیں یا عورتیں۔

ج: بعض دفعہ عورتیں بھی عقلمندی کی باتیں کر جاتی ہیں۔

ایک صاحبہ بڑے غصے میں آگ بگولا دفتر پہنچیں اور اپنی سیکرٹری نادوست سے بھڑک کر بولیں۔ "مس کاظمی آپ نے بیگم یعقوب سے کہا ہے کہ میں گپ شپ کا دلدادہ ہوں اور ساری افواہیں مجھ سے شروع ہوتی ہیں۔" مس کاظمی نے غصے کی رتی بھر پرواہ کئے بغیر جواب دیا: "میں سمجھی تھی کہ بیگم یعقوب پہلے سے یہ بات جانتی ہیں۔"

خ م رانا، مظفر گڑھ

س: نہ گل میرے، نہ گلستاں میرا، نہ باغباں اپنا
کیسے بناؤں شاخِ گل پہ آشیاں اپنا

ج: نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پہ
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

ایم اے کبیر اعوان، صلالہ

س: آج کل فیشن ضرورت ہے یا مجبوری؟

ج: نہ ضرورت، نہ مجبوری۔ اسے بھیڑ چال کہئے۔

شکست



پروفیسر حامد تقی وسیم

ان جلتے لمحوں کی ایک
دل گداز رومانی کہانی
جب عورت ایک پاگل جذبے کے تحت
باسی پھول کی پتیوں کی طرح بکھر جاتی ہے

5 بج چکے تھے۔
اس کی بے چینی بڑھ رہی تھی۔
وہ کھڑکی پر آ گئی۔ بہار کی معطر ہوا کے جھونکوں سے ریشمی پردے سرسرا رہے تھے۔ باہر خوشگوار دھوپ تھی اور نیچے لان میں شبنم بید کی نرم گیلی کرسی پر نیم دراز تھی۔ اس کے ریشمی بالوں کی دوشیزہ شانوں کو ڈھکے ہوئے تھیں۔ اس کی گود میں ہیمنگوے کا "اولڈ مین اینڈ دی سی" تھا اور وہ ناول میں گم تھی۔ سفید ریشمی فراک اور شلوار میں وہ سنگ مرمر کا کوئی حسین مجسمہ نظر آ رہی تھی۔ صبیحہ یک ٹک شبنم کو دیکھتی رہی۔ وہ کھو سی گئی۔ جیسے وہ شبنم نہیں، صبیحہ ہی ہے۔ ابھی چند سال پہلے کی بات ہے کہ وہ شبنم کی طرح کھلتی ہوئی کلی تھی۔ ویسا ہی مرمریں خوبصورت جسم، ویسی ہی خواب گوں آنکھیں، ویسی ہی نزاکت۔ کالج میں وہ بیوٹی کوئین کہلاتی تھی، لیکن آج .....
اس کی آنکھیں لان سے آگے دور تک سیب کے درختوں پر کھلے ہوئے شگوفوں میں الجھ گئیں۔ ہوا کے جھونکوں سے پتیاں بکھر

ہی تھیں۔ وہ سوچنے لگی، ہوا کے یہ جھونکے کتنے ظالم ہوتے ہیں کہ کاش
پتیاں بکھر جاتی ہیں۔ درختوں کی شاخوں پر یہ کتنی بھلی کس قدر پیاری
م ہوتی ہیں۔ لیکن یہ پتیاں بکھر جاتی ہیں۔ بکھر جانا ہی ان کی تقدیر
ہے۔

کس کے خیالوں میں اداسی کا کوئی سایہ نہیں لہرایا۔
وہ ہر لمحہ جوانی کے حسین آنچل کو حسن اور محبت کے پھولوں سے
تی ہے۔ وہ روح کی خلوتوں کو خوشبو اور کیف سے آباد کرتی ہے۔
خوشبو اور کیف!

لیکن کیا آج اس کی دلکشی، تازگی اور حسن میں کوئی کمی آگئی ہے؟
س، وہ آج بھی بہاروں کی مانند شاداب اور جوان ہے۔ بہاریں ہمیشہ
ان رہتی ہیں۔ اس کے پہلو میں ایک جوان دل دھڑکتا ہے۔ اس کی
ا ہیں آج بھی حسین لمحوں کی پرستار ہیں۔ وہ حسین لمحوں پر جان دیتی ہے۔
یا زندگی ہے۔ زندگی کے حسین لمحوں کے نشے میں ڈوب جاؤ۔ اور کل
بات کل پر چھوڑ دو۔ یہی زندگی کی مسرتوں کا راز ہے۔

وہ شگوفوں پر ایک بہکی بہکی نظر ڈال کر کمرے کے اندر آئی۔ کمرہ
خوب صورتی کو آج چار چاند لگ گئے تھے۔ جو چیز جہاں تھی نہایت
یقے سے تھی۔ اور آئینے کی طرح جگمگا رہی تھی۔ اخروٹ کی لکڑی کی منقش
ماری میں خوب صورت اور قیمتی کتابیں دیوار کے ساتھ چھوٹے سے ٹیبل
ینگ پر مرمر کے دو یونانی دیوتا۔ اور دیوار میں بنی ہوئی الماری پر فریم
ئے ہوئے کئی گروپ فوٹو۔ سنے ڈیزائن کے ہلکے پھلکے صوفہ سیٹ۔ کرسیوں
ہ ساتھ تپائی پر پھول دار شیشے کے ایش ٹرے۔ سامنے ٹیبل پر انگریزی
لے۔ ان کے سرورق پر نیم عریاں نسوانی تصویریں۔ فرش پر ایک نرم
بھری قالین۔ اس نے ایک گہری نظر سے ڈرائنگ روم کو دیکھا —
بستان کی ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں کے ایک کونے سے
گی۔ اور وہ تیزی سے کمرے سے نکلی جب وہ بیڈ روم میں قدِ آدم
ینے کے سامنے آئی تو اس کے گلابی ہونٹوں کی مسکراہٹ اور شوخ
گئی۔

وہ تو آج بالکل شبنم کی طرح نظر آ رہی ہے۔ ایک کال گرل۔"
سب انوار صاحب پھڑک اٹھیں گے۔ پچھلے مہینے جب وہ اور مسز گرچ
ار احمد کے ساتھ پہاڑی کے دامن میں پک نک کو گئی تھیں اور اس نے
ڈرن فیشن کی تنگ پائنچے کی سفید شلوار اور چست فراک پہنا تھا، تو
ار صاحب اسے دیکھ کر پاگل سے ہو گئے۔
"تم تو بالکل ایک کال گرل معلوم ہوتی ہو۔"

وہ کہتے رہے۔
اور اس کے قہقہے جھرنوں کے شور میں ڈوب گئے۔ آج وہ پھر
اسے اسی لباس میں دیکھیں گے۔ تو..... اسے خود بھی یہ لباس اچھا
لگتا تھا۔

"تمہارے سڈول جسم کے خطوط ایسے جیسے کنول جل اٹھتے ہیں۔"
خوب یاد آیا مسٹر برکت کا خیال تھا یہ۔ اس نے مغل باغ میں ایک
خوب صورت چاندنی رات میں ایک شگوفہ بار ٹہنی کے نیچے دیکھ کر یہ
کہا تھا۔ اور وہ اس کی وحشی نگاہوں سے ڈر گئی تھی۔ "مجھے تمہاری آنکھوں
سے ڈر لگتا ہے!" اور وہ اس کی چوڑی چھاتی سے لگ چکی تھی۔ وہ
دھیرے سے مسکرائی۔ برکت کے بعد انوار احمد ہی ہیں جنہیں یہ لباس
پسند آیا ہے۔ ستیش اور احمد تو اس لباس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اپنے اپنے
ٹیسٹ کی بات ہے۔ ایک بار جب وہ اس لباس میں پارٹی پر گئی
تو احمد نے عادت کے مطابق اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا تھا۔ "یہ جناب
کو ٹیڈی گرل نظر آ رہی ہے۔ یہ..... سلی فیلو۔" لیکن انوار ابھی خود جوان
ہے۔ اس کے سینے میں جوانی کی آگ ہے۔ وہ اسے بھی جوان دیکھنا
چاہتے ہیں۔

اس نے اپنے جسم پر ایک ناقدانہ نظر ڈالی۔
ترشے ہوئے معطر بال، دو بڑی بڑی سرمگیں آنکھیں، ستواں ناک بیٹھے
ہوئے ابرو، چہرے کی صباحت اسے زیادہ پاؤڈر کی ضرورت ہی
محسوس نہیں ہوتی۔ وہ اب بھی پاؤڈر استعمال نہ کرتی اگر اس کے گال
کے نیچے دو ایک شکنیں نمودار نہ ہوتیں۔ اس کے ہونٹ موٹے ہیں پھر بھی
برے نہیں۔ اور دائیں طرف ٹھوڑی کے اوپر ایک سیاہ تل۔ کاش یہ تل
ذرا گال کے اوپر ہوتا۔ گڈ گاڈ! پھر تو اس کے چہرے پر کسی کی نظر نہ ٹھہرتی
لیکن ستیش کو یہ تل پھر بھی بہت پسند ہے۔ اسے تو اس کے جسم میں قلوپطرہ
کا حسن نظر آتا ہے۔ پاگل....!

اس کے جسم کے دوسرے خطوط...... ؟ نہ جانے موٹاپے
کی یہ تہہ کہاں سے چڑھ گئی۔ نہیں تو وہ بہت نازک تھی۔ پھول کی ایک
ٹہنی کی طرح۔

وہ اب بھی جب شبنم کے ساتھ چلتی ہے تو دیکھنے والے سمجھتے ہیں
کہ دو بہنیں جا رہی ہیں۔ یہ بات تو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی
کہ وہ ماں اور بیٹی ہیں۔ یہ تو محض اتفاق ہی ہے کہ شادی کے بعد ایک ہی
سال میں وہ ایک بچی کی ماں بن گئی۔ ورنہ وہ آج بھی ایک کنواری لڑکی نظر
آتی۔ کرنل اشتیاق کے پچھلی جنگ میں لاپتہ ہونے کے بعد اس نے شادی

زکی۔ بڑے بڑے آدمیوں نے اس سے شادی کی آرزو کی۔ لیکن وہ جب اس زنجیر کو اپنے پاؤں میں ڈالنا نہ چاہتی تھی۔ شادی کے بارے میں ہمیشہ اس کا ایک انفرادی نظریہ رہا ہے۔ شادی عہد جاہلیت کی ایک اندھی رسم ہے۔ عورت کی غلامی، شخصیت کی موت۔ لیکن جب اس کی شادی ہوئی تو وہ کوئی احتجاج نہ کر سکی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا احتجاج بے سود ثابت ہوگا۔ کرنل صاحب کی دور تک پھیلی ہوئی جائداد کے چرچے کہاں کہاں نہ تھے۔ لیکن شادی کے ایک ہی سال میں ان کی خانگی زندگی کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ وہ کرنل صاحب کے تحکمانہ رویے کو برداشت نہ کر سکی۔ کرنل صاحب ہوتے تو وہ گھر میں بھی لفٹ رائٹ اور اٹینشن کرنے سے باز نہ آتے۔ اور وہ ہونٹ چبا کر رہ جاتی۔ اور جب کرنل صاحب جنگ میں لاپتہ ہو گئے تو اس نے دوسری شادی نہ کی بلکہ مس شبنم کی تعلیم و تربیت میں گم رہی۔ اور باہر دوستوں کی محبت اور رفاقت میں کھوئی رہی۔ جس طرف اس کی نظریں اٹھیں محبت سے دھڑکتے ہوئے کتنے دل سجدہ ریز ہو گئے۔ اسے اور کیا چاہیئے تھا؟ زندگی کے ہر حسین لمحے کا کیف اور مٹھاس نچوڑ لیتی۔ وہ سرشار لمحوں کے ہجوم میں جی رہی تھی۔

کرنل صاحب کی ساری جائداد کی وہ تنہا مالک تھی۔

اسے اپنی خوش قسمتی پر ناز تھا۔

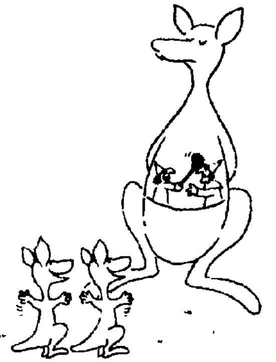
اس نے جس چیز کی آرزو کی وہ اسے ملی۔ ناامیدی کا سایہ بھی اس سے دور رہتا۔

اور جب ٹریڈ کمپنی کے مالک مسٹر انوار احمد کو اس نے پہلی بار دیکھا تو اس کی پلکیں جھپک کر رہ گئیں۔ واپسی پر اس کے دل پر ایک بھاری بوجھ تھا۔ نیند اس رات دیر تک نہ آئی۔ یہ کیسی بے چینی تھی اس کے خیالوں میں۔ روح کی گہرائی میں ایک اجنبی درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔

وہ حیران تھی۔

درد کا یہ کیسا جذبہ اس کے دل میں جاگ اٹھا ہے۔ اس درد نے اس کے اندر کی سوئی ہوئی کتنی حسیات کو بیدار کر دیا تھا۔ کتنی لطیف کیفیتیں اس کے جسم کے رؤیں رؤیں میں کسمسا رہی تھیں۔ اس رات کمرے میں چاندنی میں نہاتے ہوئے دریچے پر اسے محسوس ہوا۔ چاند دہکتا ہوا آگ کا گولہ ہے۔ جو اس کے پہلو میں اتر آیا ہے اور وہ جل رہی ہے۔ انوار احمد کی جگمگاتی ہوئی شخصیت کے جلوؤں نے اس کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر دی تھی۔

وہ گھبرا گئی۔



"کیا مرد اس قدر خوبصورت ہو سکتا ہے؟؟"

"کیا مرد اتنی تیزی سے روح کی خاموش خلوتوں کو ہنگاموں سے بدل سکتا ہے؟"

اور جب اس کی سلگتی ہوئی پلکیں بھیگ گئیں تو اسے احساس ہوا کہ وہ انوار احمد کے بغیر جی نہیں سکتی۔ اور جب تک وہ اس کے پیار کو حاصل نہ کر سکی اس کی اداسی نہ گئی۔

لمحے زہر ٹپکا رہے تھے۔

اس کے پیار اور اس کے التفات کو حاصل کرنے میں اسے کتنی صبر آزما منزلوں سے گزرنا پڑا لیکن وہ کامیاب ہی ہوئی۔ ناکام وہ کبھی نہیں ہوئی تھی۔ شکست اس کی تقدیر نہ تھی۔

اس کے دل نے دھڑک کر کہا،

"وہ آتے ہی ہوں گے؟"

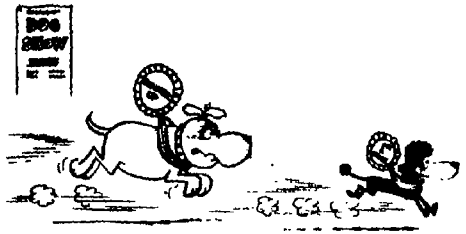
اس نے اپنی سڈول کلائی میں سونے کے ریسٹ میں بندھی ہوئی رومر گھڑی دیکھی۔

ساڑھے پانچ بج چکے تھے!

بیقراری کی ایک تیز لہر اس کے جذبات کو اتھل پتھل کر گئی۔

ڈرائنگ روم میں واپس جانے کی بجائے وہ سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگی۔ وہ فوراً ڈرائنگ روم ہی میں واپس آ گئی اور وہیں انتظار کرنے لگی۔ شبنم تو اپنی دنیا میں گم ہے۔

بے چینی کی تاب نہ لا کر وہ لان میں رنگا رنگ پھولوں کی کیاری



کے قریب کرسی پر نیم دراز شبنم کی طرف جانے لگی۔

شبنم کتاب میں کھوئی ہوئی تھی۔

وہ قدموں کی مترنم آہٹ سے چونکی۔

اس نے انگڑائی لی۔ فضا میں جیسے نشہ بکھر گیا۔ شگوفے مسکرانے

دوسرے لمحے وہ ایک دوشیزہ ادا کے ساتھ اچانک اٹھ کھڑی ہوگئی اور

مخمور لہجے میں بولی؛

"ممی! آگئے آپ کے گیسٹ؟"

"ابھی نہیں آئے۔"

"آئی سی۔" وہ ممی کو گھور رہی تھی۔

"بس آتے ہی ہوں گے۔" جمیلہ کی نظریں جھک گئیں۔

"کون صاحب ہیں یہ؟"

"بوڑھوں کی طرح جرح کرنے لگیں تم۔ میں نے کہا تھا کہ بی اے کے بعد ایل ایل بی کر لو۔"

اس کے لہجے کی ترشی چھپ نہ سکی۔

شبنم خاموش ہوگئی۔

اتنے میں باہر کا گیٹ کھلا۔

دونوں کی نظریں اٹھ گئیں۔

"آئیے انوار صاحب! بہت انتظار دکھایا!" جمیلہ بیتابی پر قابو نہ پاسکی۔

"آئی ایم ویری ساری مسز جمیلہ۔"

وہ ان کے قریب آچکا تھا۔

جمیلہ نے کہا، "یہ شبنم ہیں، میری بچی۔ جن کا ذکر میں نے کیا تھا۔"

"ارے مس شبنم!..... آپ؟" اچانک انوار احمد وفورِ مسرت سے بولے۔

"اور آپ مسٹر انوار!"

شبنم کی خوابناک آنکھیں پھیل گئیں۔

اور جمیلہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کبھی شبنم اور کبھی انوار احمد کو دیکھتی

اور جب شبنم نے انکشاف کیا کہ مسٹر انوار احمد اس کی نئی سہیلی غزالہ کے بھائی ہیں اور پچھلے مہینے ان کی پہلی ملاقات ہوئی ہے۔ اور پھر وہ کئی غزالہ کے ہاں ملے ہیں۔ تو جمیلہ کی آنکھوں میں ایک تاریک سایہ لہرایا۔ کے دل کی دھڑکن ڈوبتی ہوئی محسوس ہوئی۔

وہ تینوں چائے پی رہے تھے۔

مختلف موضوع زیرِ بحث تھے۔

انوار احمد ہر موضوع پر روانی اور شگفتگی سے بول رہے تھے۔

دونوں کے چہرے کھلے ہوئے پھولوں کی طرح شاداب تھے۔

لیکن رہ رہ کر جمیلہ کے دل میں کانٹے کی سی چبھن محسوس ہوتی۔ شبنم کی موجودگی اسے کھٹک رہی تھی۔ اس کے تصور میں انوار احمد سے اس ملاقات میں کسی تیسرے انسان کی پرچھائیوں کا گزر بھی نہ تھا۔ وہ انوار احمد سے مکمل تنہائی میں باتیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ آج تنہائی کے لمحوں میں اپنا دل کھول کر دکھانا چاہتی تھی۔ وہ آج سارے حجابات کو آگ لگانے پر تلی ہوئی تھی۔

اس نے ہر طرح کا اہتمام کر رکھا تھا لیکن.....؟

لیکن شبنم.....؟

چائے کے گھونٹ اسے زہر کے گھونٹ معلوم ہو رہے تھے۔

کاش یہاں شبنم نہ ہوتی۔

کاش اس نے شبنم کو جنم نہ دیا ہوتا۔

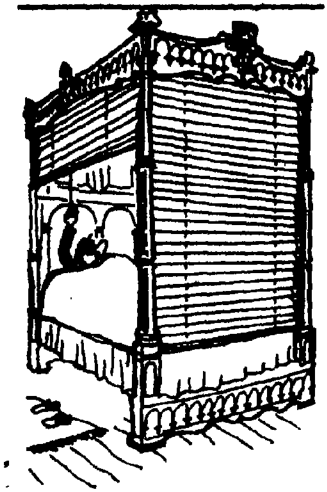
کاش ——!

اچانک اس نے شبنم کے سراپا پر ایک گہری متوقع نظر ڈالی۔

ایک عجیب سی نظر جو نفرت اور جلن سے بھرپور تھی۔

وہ گھبرا گئی۔

شبنم اس کی زندگی کی مسرتوں میں زہر گھول رہی ہے لیکن۔۔۔
"مس شبنم!"
"جی!"
"اب کیا سوچا ہے آپ نے؟"
"کس بارے میں؟"
"مزید تعلیم کے سلسلے میں۔"
"آنٹی جی، آپ تعلیم کے بارے میں پوچھ رہی ہیں۔ ممی کہتی ہیں کہ میں وکالت پڑھوں۔ میرا خیال۔۔۔۔"
"میں ٹھیک کہتی ہوں جیسا کرنا ہو تم سے سیکھے۔"
"بھئی ایسا مشورہ نہ دیجئے نہیں۔ ڈگری لے کر تو یہ بچارے وکیلوں کا ناطقہ بند کر دیں گی۔"
شبنم کا شاداب کنوارا قہقہہ گونج اٹھا۔ اور جیسے تملا رہی تھی کہ انوار کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرنے کی شعوری کوشش کے باوجود وہ بار بار شبنم کو والہانہ نظروں سے دیکھ لیتے اور براہ راست اس سے گفتگو کا کوئی ذکر کوئی پہلو نکالتے۔
مایوسی اور شکست کے لیے اس کی برداشت سے باہر تھے۔ لیکن شکست اس کی تقدیر نہیں۔ اسے اپنی انفرادیت کے جادو پر اعتماد تھا۔
شام کے زرد دھندلکے سیب کے درختوں کی پھیلی ہوئی بانہوں سے الجھ رہے تھے۔ وہ کھڑکی پر تھی۔ اداس اکھڑی ہوئی۔
اتنے میں باہر کا گیٹ کھلا۔
شبنم اندر آئی۔
اور گیٹ کے باہر انوار احمد تھے۔ وہ اندر نہیں آئے۔ دوسرے لمحے انھوں نے کار اسٹارٹ کی۔
"تم کہاں گئی تھیں آج شبنم؟"
"فوزیہ کے ہاں۔"
وہ سانس کو سنبھال نہ سکی۔
"یہ فوزیہ کون ہے؟"
"میری فرینڈ ہے۔" اس کی سوالیہ نظر پھر شبنم کے چہرے پر گڑ گئیں۔
"ہاں ہاں تم نے کہا تھا۔ وہاں مسٹر انوار احمد تو نہیں تھے؟"
"نہیں تو۔ میں نے انھیں کئی روز سے دیکھا نہیں۔"
جیسے خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔
شام کے اندھیروں نے درختوں کی بانہوں کو چھپا لیا تھا۔
جب وہ انوار کو شام کے بعد گھر آئی تو اس کا سارا وجود جیسے کسی آگ میں



جل رہا تھا۔ وہ ایک زخم خوردہ ناگن کی طرح بپھر اٹھی تھی۔ لیکن پچھلی کمک لاتے ہوش مدہوش لاؤنس میں اس نے انوار احمد کو دل کے اندر اٹھتے ہوئے گرجتے ہوئے طوفانوں سے بے خبر رکھا۔ اس نے چہرے کی مسکراہٹ کو بجھنے نہ دیا۔

وہ سب کچھ نچھاور کرنے کے پاگل جذبے کے تحت وہ شگوفوں کی مانند بکھرنے لگی۔ تو انوار احمد کتنی بے نیازی سے دامن جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور وہ ہونٹ چبا کر رہ گئی۔ یہ اس کی نسائیت کی توہین تھی، اور وہ سوچتی رہی، کیا یہ وہی انوار احمد تھے جو اس کی ایک نگاہ غلط انداز کے لیے ترستے تھے۔ وہی انوار احمد جو اس کی ایک مسکراہٹ پر نقد جان لٹانا چاہتے تھے۔
لیکن آج ——!
کیا اس کے جسم میں پہلی سی کشش نہیں رہی ہے؟
کیا اس کی محبت کی آگ سرد پڑ چکی ہے؟
نہیں، ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔
پھر یہ کیا ہو رہا ہے؟
شبنم نے اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا تھا۔
اور شبنم تین روز سے بخار میں جل رہی تھی۔ وہ سکڑ کر کانٹا ہو گئی تھی۔ اور بستر سے لگ گئی تھی۔ وہ بنگلے کے اندر آئی اور سیدھی اپنے کمرے

کے اندر گئی۔ نوکر کو اس نے کمرے میں آنے سے منع کر دیا۔

وہ دیر تک بستر پر یونہی پڑی رہی۔

شام کے پھیلتے ہوئے اندھیرے میں۔

اس کی آنکھیں بند تھیں۔ لیکن اس کے دماغ کی ایک ایک نس جاگ رہی تھی۔

اُس کے دل میں کتنے محشر کروٹیں بدل رہے تھے۔

شکست اس کی تقدیر نہیں۔

مایوسی اس کی زندگی نہیں۔

وہ فتح اور کامرانی کے لیے پیدا ہوئی ہے۔ وہ ہمیشہ کامران رہی ہے۔ جس چیز کی اس نے چاہ کی وہ چیز اُسے مل کر رہی۔

وہ کامران رہے گی یا ٹکرا کر فنا ہو جائے گی۔

وہ زندہ رہے گی۔

اُسے زندگی سے پیار ہے بے پناہ پیار! اور اس کی زندگی انوکھی ہے۔ وہ اب اس کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ اپنی راہ میں حائل ہونے والے ہر پتھر کو وہ پاش پاش کر دے گی۔ اس کی انفرادیت میں طوفانوں کی قوت ہے۔ اُمڈتے ہوئے طوفانوں کے آگے کونسی چیز ٹھہر سکتی ہے۔

معاً اسے ایک نامعلوم اطمینان کا احساس ہوا۔

اُس نے آنکھیں کھولیں۔

وہ اٹھی سوئچ آن کیا۔ سارا کمرہ روشنی کے سیلاب میں ڈوب گیا

اتنی زیادہ روشنی سے وہ کانپ سی گئی۔

سب سے پہلے اس نے کھڑکیوں کے پردے گرا دیے۔

قارئین و افسانہ نگار حضرات سے!

جو قارئین کرام و افسانہ نگار حضرات ہمیں مختلف عنوانات کے تحت خطوط اور افسانے اشاعت کیلئے ارسال فرماتے ہیں ان سے گزارش ہے کہ وہ ان امور کا ضرور خیال رکھیں۔

- تحریر صاف اور خوشخط ہو۔
- کاغذ کے ایک طرف لکھیں۔
- معقول حاشیہ اور سطروں کے درمیان فاصلہ چھوڑ کر لکھیں۔

(ادارہ)

بچاتا ہوا اس نے کچھ سوچا کہ وہ بیٹی پر جھکی۔ وہاں سے اُ
اور کنجیوں کا گچھا لے کر الماری کی طرف گئی۔ تنگی زنگ کر بیٹھی اور دروازے طرف گئی۔ اور پھر کچھ دیر کے بعد شبنم کے کمرے کی طرف آئی۔ وہاں سے نوکر

"کیا حال ہے شبنم کا؟" اس کی اپنی آواز اسے اجنبی محسوس ہوئی

"اب ٹھیک ہے جی! ابھی ابھی آنکھ لگی ہے۔"

نوکر چلا گیا۔

وہ اندر آئی

خاموشی کانپ رہی تھی۔

شبنم بجلی کی بے سدھ روشنی میں سو رہی تھی۔

"شبنم۔۔۔!" اس کے ہونٹ ہلے۔

خاموشی اور گہری ہو گئی۔

وہ جلدی سے وہاں سے نکلی۔ اور بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنے کمرے میں آئی۔

ایک لمحہ بھی نہ گزرا تھا کہ وہ واپس دبے پاؤں شبنم کے کمرے میں پہنچی۔ اس کا کانپتا ہوا جسم پسینے پسینے تھا۔ اس کے دائیں ہاتھوں میں رعشہ سا طاری تھا۔

وہ شبنم کے بیڈ کے قریب آئی۔

شبنم بے خبر سوئی تھی۔ اُس کی ماند کی دھنسی ہوئی آنکھیں بند تھیں دراز پلکیں ہم آغوش تھیں۔ اُس کے نتھنے آہستہ سے ہل رہے تھے۔ اور ہونٹ قدرے کھلے تھے۔ اُس کی نگاہیں اس کے نتھنوں اور ہونٹوں پر جمی رہیں۔

اچانک اس کی نظریں اس کے سارے چہرے پر پھیل گئیں۔ اس کے چہرے پر معصومیت تھی۔ سوئی سوئی معصومیت بکھری سی۔

اُف! یہ اس کے پہلے سے چہرے پر کیسی معصومیت تھی۔ وہ بالکل دودھ پیتی بچی معلوم ہو رہی تھی۔ جیسا ابھی روتے روتے ماں کی گود میں سو گئی ہے۔ لمحہ بھر کے لیے وہ بھول ہی گئی کہ وہ وہاں کیا کرنے آئی ہے۔ وہ سوچنے لگی۔ وہ بارہا اسی طرح روتے روتے اس کی گود میں سو گئی تھی۔

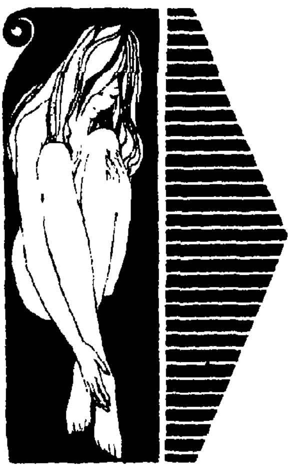
اُس کے سینے میں ایک جھرجھری سی دوڑ گئی۔

وہ ایک عجیب وحشت کے عالم میں پیچھے مڑی۔

اور جب وہ کانپتے ہوئے جسم کے ساتھ اپنے کمرے میں واپس گئی تو بستر پر گرتے ہی اس نے خواب آور گولیوں کی پوری شیشی خالی کر دی!!

ترتیب: آغا نذیر کاوش

عریانی ! فحاشی ! بےحیائی !



یہ وہ لفظ ہے
جس کا ہماری معاشرتی زندگی میں
کوئی دائمی مفہوم نہیں ہے !



آپ نے بحث و نظر کے تحت فحاشی، عریانی اور بےحیائی کے موضوع پر تبادلہ خیال کا سلسلہ شروع کر کے موجودہ وقت کے ایک اہم تقاضے کو پورا کیا ہے۔ ماہ ... کے شمارے میں محترمہ شکیلہ زیدی نے لکھا ہے کہ مرد نے ہمیشہ عورت کو گھر کی چار دیواری میں قید رکھ کر اسے پاؤں کی جوتی سمجھا اور آج جب عورت آزادی حاصل کر کے گھر سے باہر نکل آئی ہے تو اسے عریاں کہا جا رہا ہے۔

میرے خیال میں اگر ماضی میں عورت کو گھر کی چار دیواری میں رکھا جاتا تھا تو اس میں مرد اور عورت دونوں کی بھلائی تھی۔ گھر سے باہر نکلنے ہی کا نتیجہ ہے کہ آج عورت نے فیشن پرستی میں خود کو ننگا کر لیا ہے

جب تک عورتوں پر مردوں کا کنٹرول رہا عورتیں صحیح راستے پر چلتی رہیں اور جب انہیں آزادی دی گئی وہ عریانی کی طرف چلی گئیں۔

ایک دوسری خاتون ثریا طلعت نے لکھا ہے کہ مرد صرف حسد کی وجہ سے عورتوں پر تنقید کرتے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ عورتوں اور مردوں کو سیکس کی باقاعدہ تعلیم دینی چاہیئے۔ میں پوچھتا ہوں کہ جب جنسی تعلیم کے بغیر ہی عورتوں کا یہ حال ہے کہ شرم و حیا سے بالکل عاری ہو چکی ہیں تو خدا سوچیں کہ جنسی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہمارے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں معاشرے میں کتنی گندگی پھیلائیں گی۔ جب ایک مسلمان لڑکی اس قسم کی باتیں کرتی ہے تو سخت افسوس ہوتا ہے۔ اس برائی میں آجکل کے والدین کا بھی بڑا دخل ہے۔ یہ نام نہاد ماڈرن والدین غیروں کے منہ سے اپنی بیٹیوں کے ڈانس اور ان کے حسن و جمال کی تعریف سن کر خوش ہوتے ہیں۔

تاریخ اسلام بہت سی عظیم خواتین کے نام پیش کرتی ہے مثلاً حضرت خدیجہؓ، حضرت فاطمہؓ، حضرت زینبؓ، حضرت کلثومؓ، حضرت رقیہؓ کاش آج کی عورتیں ان پاکیزہ خواتین کی سوانح حیات پڑھ لیتیں تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ اسلام میں عورت کا مقام کیا ہے اور آجکل عورتوں نے اپنا مقام کس قدر گرا دیا ہے۔ انہوں نے اپنی تہذیب کو چھوڑ کر غیروں کی تہذیب کو اپنا لیا ہے۔ اپنی بے وقوفی کے سبب خود تماشہ بن کر رہ گئی ہیں۔ اپنے لئے سڑکوں، پارکوں اور گلیوں میں خود شوہر تلاش کرتی پھرتی ہیں۔ اخبارات اور رسالوں میں شوہروں کے لئے اشتہار نکلواتی ہیں۔ اس کے باوجود دعوے دار یہ ہے کہ آج کی تعلیم یافتہ لڑکیوں میں بےحیائی نہیں ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ انہیں نیک ہدایت دے تاکہ وہ بھلائی اور برائی میں تمیز کر سکیں۔

[illegible]

یہ نئی نسل پر محض الزام ہے کہ وہ فحاشی اور عریانی کی طرف مائل ہے۔ اگر اس قسم کا کوئی مسئلہ ہے بھی تو وہ نئی نہیں بلکہ پرانی نسل کا پیدا کردہ ہے، اور اس کا سب سے بڑا محرک دولت کی ہوس ہے۔ آج کے دور میں کسی بھی چیز کو پھیلانے کے لئے ابلاغ عامہ سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ تمام ذرائع پرانی نسل کے ہاتھوں میں ہیں۔ ریڈیو، ٹی وی، فلم اور اخبار۔ یہ تمام ادارے نئی نسل مکمل خود مختاری سے نہیں چلاتی۔ ان کا سرپرست کون ہے؟ آج ہر شخص کا یہ نظریہ ہے کہ دولت کھینچو، خواہ پیسہ دین ہے اور پیسہ ہی ایمان ہے۔ یہی آج کے معاشرے میں انسان کا مقام اور حیثیت متعین کرتا ہے۔

فحش اشتہار، کہانیاں، فلمیں اور رسالے بند ہو جائیں گے تو ان کے سرپرستوں کی آمدنی کم ہو جائے گی۔ وہ بھلا یہ نقصان کیوں مول لیں گے؟

گناہ لاکھ برا سہی لیکن وقتی طور پر وہ انتہائی پرکشش اور لذت آمیز ہوتا ہے۔ گو وقتی طور پر یہ چند لمحوں کا سکون بخش ذریعہ بھی ثابت ہو لیکن اس کے نتائج انتہائی بھیانک ہوتے ہیں۔

نئی نسل اپنے اندر اور باہر کی دنیا میں پس رہی ہے۔ وہ اپنے مستقبل سے مایوس ہے وہ سبق تو پڑھتی ہے شرافت اور دیانت کے لیکن اپنے ہی بزرگوں کو جب وہ ان اصولوں کا مذاق اڑاتے دیکھتی ہے تو اسے کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ محض وقتی سکون کے لئے اور اپنے آپ کو گم کرنے کے لئے وہ فلموں اور ناولوں کا سہارا لیتی ہے۔ رہی فیشن کی بات تو کوئی بھی فیشن سدا نہیں رہتا۔ اگر آج نوجوان نسل کے لباس پر اعتراض کیا جاتا ہے تو محض اس لئے کہ نکتہ چینی آپ کی فطرت بن چکی ہے۔ ورنہ فیشن پہلے بھی کیا جاتا تھا اور آئندہ بھی کیا جائے گا۔ نئی نسل کو ٹٹول کر تو دیکھئے کوئی بھی لڑکی یہ نہیں چاہتی کہ وہ بے ہودہ لباس پہن کر اپنے آپ کو عریاں کرے اپنی عزت اور وقار کو کھونے کا ذریعہ بنے۔ نوجوان نسل دل سے عریانی اور بےحیائی کے خلاف ہے لیکن اسے ختم کرنے کا کوئی حل اس کے ہاتھ نہیں آتا اور نہ ہی اسے کوئی ایسا موقعہ ہی دیا جاتا ہے۔

ہمارا دوغلا پن ہی ہمیں لے ڈوبے گا۔ بظاہر ہم مظاہرے کرتے ہیں، مقالے لکھتے ہیں اور بحث کرتے ہیں لیکن جب عمل کا وقت آتا ہے تو منہ چھپانے لگتے ہیں کہ ہم نہیں کوئی اور کرے۔ ڈھٹائی اور دیدہ دلیری کی انتہا تو یہ ہے کہ ایک ڈائجسٹ کے اداریئے میں یہ پڑھتی ہوں کہ ہمارا ملک عریانی اور فحاشی کی راہ پر گامزن ہے۔ ہمارے یہاں بلیو پرنٹ اتنے عام ہو چکے ہیں کہ انہیں بند کرنا ممکن نظر نہیں آتا۔ ہم اپنی تہذیب سے بغاوت کر رہے ہیں وغیرہ وغیرہ اور اسی ڈائجسٹ کو جب کھول کر پڑھتی ہوں تو ایسی ایسی تحریریں نظر آتی ہیں کہ شرم سے سر جھک جاتا ہے۔ افسوس ہوتا ہے ان لوگوں کی ذہنیت پر جو کرتا دھرتا ہیں اس معاشرے کے جو معاشرہ میں یہ زہر ناسور کی طرح پھیلا رہے ہیں اور پھر الزام بھی نئی نسل کو دیا جاتا ہے۔

میں کہتی ہوں کہ آج اگر نئی نسل کو موقع دیا جائے تو وہ اس برائی کی جڑیں تک کاٹ پھینکنے کے لئے بےتاب ہے لیکن ان کے ہاتھ کاٹ دیئے گئے ہیں اور انہیں ایسا کوئی موقعہ نہیں دیا جاتا۔ رہی بات فطری

تقاضوں اور انسانی جبلتوں کی تو اس سے نہ آپ کو انکار ہے نہ ہمیں۔ ایک جائز اور فطری چیز کی آڑ لے کر ایک گھناؤنا معاشرہ تخلیق کیا جا رہا ہے۔ اب آگے آگے دیکھئے کہ ہوتا ہے کیا۔ عریانی اور فحاشی کی ابتدا زیادہ تر انہی گھروں سے ہوتی ہے جہاں حرام پیسہ وافر مقدار میں موجود ہے اور اس حرام پیسے کا استعمال نہ اس گھر کے بڑوں کو آتا ہے اور نہ چھوٹوں کو۔ وہ لوگ محض نمایاں ہونے کے لئے بھی اوٹ پٹانگ حرکتیں کرتے ہیں۔ یہ انہی تک رہتا تو کوئی مسئلہ نہ تھا لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ متوسط طبقہ بھی ان کی اندھی تقلید کر رہا ہے۔ شاید وہ لوگ ان جیسا لباس اور طریقہ اپنا کر لاشعوری طور پر اپنے آپ کو بھی انہی کی طرح "اونچا" محسوس کرتے ہیں۔

فحاشی یا عریانی ایک مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس کی جڑیں اور بہت سے مسائل سے پیوستہ ہیں۔ اور اس صورت میں ہم ایک ہی نہیں بلکہ تمام برائیوں سے پیچھا چھڑائیں تو بات بن سکتی ہے ورنہ نہیں۔ آج کا سب سے بڑا مسئلہ معاشی مسئلہ ہے۔ پھر طبقاتی تعریف ہے جو محض اسی وجہ سے ہے۔ معاشرے کی ناانصافیوں سے ہر شخص دل برداشتہ ہے۔ ذہنی سکون ناپید ہے۔ ایسے میں جو چیز چمکتی نظر آتی ہے ہم اسے سونا سمجھ بیٹھتے ہیں۔ انجام جانتے ہوئے بھی وقتی سکون حاصل کرنے کیلئے نہ چاہتے ہوئے بھی غیر ارادی طور پر ہمارے قدم اسی اندھیرے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اس برائی کو ختم کرنا نہ آپ کے بس میں ہے اور نہ میرے بس میں۔ اس کے لئے سب کو یکساں کوشش کرنی پڑے گی اور پورے معاشرے کو بدلنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ میں یہ تو نہیں کہتی کہ یہ ناممکن ہے لیکن ہاں مشکل ضرور ہے۔ اور اس کے لئے جدوجہد اور محنت کی نیز قربانی کی بھی ضرورت ہے۔ اگر آج تمام فحش اشتہارات اور رسالے بند ہو جاتے ہیں تو ظاہر ہے اس سے "کچھ لوگوں" کی آمدنی پر اثر پڑے گا اور وہ یہ کیوں چاہیں گے؟

وہ نوجوان جو ان رسالوں اور فلموں کے عادی بن چکے ہیں وقتی طور پر انہیں بھی تکلیف ہوگی اور ہونی بھی چاہیئے ظاہر ہے کہ کوئی بھی عادت جو جڑ پکڑ چکی ہو اتنی آسانی سے نہیں چھوٹتی لیکن ہمیں یہ وقتی تکلیف گوارا کرنی پڑے گی۔ اگر ہم یہ گوارا کر لیں اور ہر شخص اپنی سی کوشش کرے تو ہمیں روشنی کی کرن نظر آتی ہے اور یہ سب ایک ہی دن میں بھی نہیں ہوگا۔ اس کا اثر بھی آہستہ آہستہ ہی نظر آئے گا۔ محض ایک دوسرے کو الزام دینے سے کچھ بھی نہ ہوگا۔ صرف بحث سے ہی مسائل حل نہیں ہوا کرتے عمل اور صرف عمل یہی ایک حل ہے کسی بھی مسئلے کا۔ اور بس۔



پاکستان کے لئے جو کہ ایک مذہبی ریاست اور اسلامی اقدار کا علمبردار ہونے کا دعویٰ رکھتا ہے۔ یہ موضوع بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

اس میں شک نہیں کہ قومیں ترقی کی دوڑ میں اپنی اعلیٰ اقدار کو کھوتی جا رہی ہیں لیکن تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ اس کی وجوہات ریاستی قانون سے مذہبی عنصر کو نکالنے سے پیدا ہوئی ہیں۔ اس کی ابتدا یورپ میں مسیحی مذہب کی شکست و ریخت اور ریاستی قانون میں سے اس کی بے دخلی اور لادینی قانون کی بالادستی سے ہوئی۔ برطانیہ کا لادینی قانون ہم جنسی تک کو جائز قرار دینے میں معاون بنا۔ سرعام جنسی فعل کو انسانی آزادی کا نام دے کر قانونی تحفظ فراہم کیا گیا۔ امریکہ میں ننگوں کے جزیرے بنائے گئے ہوٹل کلبیں قائم کر کے بیویاں اور خاوند بدلنے کے طریقے مہذبانہ فعل قرار پائے۔ طبعی تسکین کے لئے آزادی کے قوانین بنائے تو گئے مگر اس طرح کہ ان سے انسانی ضمیر مجروح ہوا۔ پاکستان بھی اس طوفان سے نہ بچ سکا۔ ہمارے ملک میں شہروں کی آبادی خاص طور پر فیشن پرست اور عریانی کی دلدادہ بن گئی۔ اس آبادی کو آنکھ کھول کر ماحول ہی ایسا ملتا ہے کہ آپ رشوت لینا معیوب نہیں سمجھتے۔ اتنی کلبوں میں شراب نوش کہلواتی ہیں۔ رشوت اور حرام کی کمائی سے کاریں خریدی جاتی ہیں اور گھروں میں عیش و عشرت کے سامان مہیا کئے جاتے ہیں۔ بچے ان چیزوں سے خود بخود متاثر ہوتے ہیں اور بالغ ہونے سے قبل ہی ماں باپ کی طرح بے حیائی کو اپنا شعار بنا لیتے ہیں۔

اس سے قطع نظر کہ ہم نے یورپی تہذیب کے مضر اثرات قبول کئے ہیں۔ اس افراط کی اصل وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ ہمارے ملک کا قانون اب تک وہی ہے جو انگریز نے بنایا ہے اگر ہمارے ملک میں اسلامی قوانین نافذ ہو جاتے تو یہ عریانی اور بے حیائی یہاں ہرگز نہ پھیلتی۔ میں آپ کو ایک عرب ملک میں پیش آنے والا ایک واقعہ سناتا ہوں۔ قاضی کے پاس ایک مقدمہ آیا جس میں ایک نوجوان پر الزام تھا کہ اس نے ایک دوشیزہ کو جھانک کر دیکھا جب کہ وہ غسل خانہ میں نہا رہی تھی۔ تحقیقات کے بعد الزام درست ثابت ہوا۔ قاضی نے نوجوان کو ایک نامحرم لڑکی کا عریاں جسم دانستہ دیکھنے کی پاداش میں دس ہزار درہم کا جرمانہ اور اس لڑکی سے شادی کرنے



آج سے صدیوں پرانے ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے نظریات میں لچک پیدا کریں۔

کیا ملاوٹ، رشوت خوری، بدعنوانی اور اسمگلنگ وغیرہ عریانی، فحاشی اور بے حیائی جیسے بیہودہ مسئلہ سے کم اہم مسائل ہیں لیکن ملاوٹ، بدعنوانی، رشوت خوری، اسمگلنگ جیسے خطرناک مسئلوں میں پرانی نسل ملوث ہوتی ہے اس لئے ان مسئلوں کو دبانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ پرانی نسل نے نئی نسل کو دیا کیا ہے۔ بے ایمانی، رشوت خوری کا کھوکھلی مذہبی و معاشرتی اقدار۔ گھٹا گھٹا ماحول۔ ملاوٹ شدہ اشیا، بے مقصد تعلیمی نظام۔ ۲۲ فرقوں میں منقسم اسلام اور ذہنی نا آسودگی، کھوکھلے نظریات۔

ہم ایک طرف تو عورت کو اسکول، کالج اور یونیورسٹی تک بھیج دیتے ہیں لیکن پھر اس کے بعد اس پر پابندی کا طوق اور اپنی مرضی مسلط کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وسائل کی کمی نے اس مسئلہ کو چار چاند لگانے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے ہم کو یہ مسئلہ چین، روس یا کسی سوشلسٹ ملک میں نظر نہیں آتا ہے۔ کیا وہاں ہر جگہ عورتوں اور مردوں کے یکجا اجتماع نہیں ہوتے؟ کیا وہ لوگ ساتھ کام نہیں کرتے؟

جہاں تک سیکس کا سوال ہے یہ تو فطرت انسانی ہے جسم کی نمائش کو ہم جنس بے راہ روی نہیں کہہ سکتے۔ آجکل خاص طور پر لڑکی ذمہ پر اعتراض ہوتے ہیں لیکن وہ لوگ یہ بھول گئے کہ اولمپک میں نادیہ اور کمانیچی کو مختصر سے لباس میں دیکھ کر کسی کی جبیں پر شکن تک نہ آئی سیکس تو انسانی آنکھ میں پوشیدہ ہے سیکس تو ہم کو جیل میں سجے ہوئے پاؤں میں بھی نظر آسکتا ہے۔ فطرت پر پابندی نے کتنے ذہنی مریضوں کو جنم دیا؟ آجکل کتنے لوگ شیزوفرینا کے شکار ہیں۔ یہ سب عوامل ذہنی امراض اور دیگر الجھنوں کو جنم دیتے ہیں۔ دنیا چاند پر پہنچ گئی اس لئے ہم کو چاہئے کہ اپنے نظریات کو لیں اور رکھ کر دقیانوسی نظریات کو رد کر کے موجودہ دنیا کے تقاضوں کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالیں کیونکہ نباتات میں بھی اتنی صلاحیت ہوتی ہے وہ اپنے آپ کو ماحول کے مطابق ڈھال لیتے ہیں ہم تو پھر انسان اور اشرف المخلوقات ہیں۔

جن مذہبی اور قانونی پابندیوں کو آج "غیر فطری پابندیاں" قرار دیا جا رہا ہے یہ کم و بیش ہر دور اور ہر معاشرے میں کسی نہ کسی شکل میں علاوہ موجود چلی آ رہی ہیں۔ اگرچہ قدیم اور غیر مہذب معاشرے اور جدید اور مہذب معاشرے میں زمین اور آسمان کا فرق ہے تاہم غیر مہذب معاشرے کا انسان اتنی ہی سختی سے اپنے اصولوں پر کاربند ہوتا تھا جتنا کہ مہذب معاشرے کا انسان مذہبی اور قانونی احکام کو بوجھ محسوس کرتا ہے۔ قدیم انسان زندگی کی سہولتوں سے محروم ہونے کے باعث مجبوراً عریاں تھا اور جدید انسان ان سہولتوں کے ہوتے ہوئے اختیاراً ننگا ہوا چاہتا ہے۔

قدیم انسان کی غیرت کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو زمین میں زندہ گاڑ دینا پسند کرتا تھا مگر کسی کو اپنی دامادی تک میں قبول نہ کرتا تھا قطع نظر اس سے کہ اس کا یہ فعل غیر انسانی تھا مگر اس سے اس کی غیرت کا اندازہ ضرور ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف آج کا جدید انسان اپنی بہو بیٹیوں کو چکلوں، نائٹ کلبوں، بازاروں اور اشتہاروں کے علاوہ غیر مردوں کی بانہوں میں جھولتا دیکھ کر شرم کے بجائے فخر محسوس کرتا ہے کہ وہ دنیا کی مہذب سوسائٹی کا انسان ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ قدیم انسان کو غیر مہذب، وحشی اور قابل نفرت سمجھا جاتا ہے اور جدید انسان کو مہذب، شریف اور قابل ستائش۔

جہاں تک فطرت کے قانون کا تعلق ہے اس ضمن میں بعض دوست غلط فہمی کا شکار ہیں۔ ان کے خیال میں فطرت صرف جنسی ملاپ کا نام ہے یا یہ کہ انسان کی ہر جائز و ناجائز خواہش فطری ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ انسان انسانی اور حیوانی خواہشات کے مجموعے کا نام ہے چنانچہ جب انسان کی انسانی خواہشات بیدار ہوتی ہیں تو ان میں سنجیدگی، شرافت اور شائستگی کا عنصر نمایاں ہوتا ہے لیکن جب انسان کے حیوانی جذبات بھڑک اٹھتے ہیں تو وہ غیر فطری افعال کا ارتکاب کر جاتا ہے یہاں تک کہ اسے یہ تمیز نہیں رہتی کہ وہ کس کے ساتھ کیا کر رہا ہے۔ جنرل یحییٰ خاں کی فوجی حکومت کے دور میں پولیس نے لاہور کے ایک متمول شخص کو اپنی دو کنواری بیٹیوں کے ساتھ جسمانی تعلق کے جرم میں گرفتار کیا تھا جس کی نہ صرف اخبارات میں خبر چھپی بلکہ بعض اخبارات نے تو اس کی مذمت میں اداریے لکھے اور سفارش کی کہ ایسے شخص کو سرعام گولی مار دی جائے۔ ایسی خبروں اور واقعات کے ساتھ ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث پاک بھی یاد آجاتی ہے کہ ایک روز حضرت ابوبکر صدیق اپنی لخت جگر حضرت عائشہؓ کے ساتھ گھر میں تنہا بیٹھے تھے کہ اچانک حضور اکرمؐ تشریف لائے اور فرمایا کہ صدیقؓ! تو نہیں جانتا کہ شیطان، انسان کا صریح دشمن ہے آنحضرتؐ نے تو باپ تک کو اپنی بیٹی کے ساتھ تنہا بیٹھنے سے منع کر دیا تھا جبکہ صدیق اکبرؓ نہایت ہی پاکباز تھے مگر ہماری حالت یہ ہے کہ ہم اپنی نام نہاد سوسائٹی میں بہو بیٹیوں کی ننگی پنڈلیوں اور عریاں بانہوں کا نظارہ کرنے میں ہتک نہیں سمجھتے بلکہ ہم نے غیروں کے ساتھ لڑکیوں کو ہم بستر ہونے تک کی بھی کھلی چھٹی دے رکھی

ہے۔ اور ستم یہ کہ جنسی میل ملاپ پر سے پابندیاں ہٹانے کا مطالبہ بھی کر رہے ہیں کہ معاشرہ "نارمل" ہو جائے۔ جنسی بے راہروی سے اگر کوئی معاشرہ نارمل ہو سکتا تو اس سلسلے میں یورپ سر فہرست ہوتا جہاں برسوں سے جنسی میل ملاپ کا دور دورہ ہے لیکن کیا وہاں کا معاشرہ نارمل ہو گیا ہے ؟

فطرت اس کا نام نہیں ہے کہ راہ چلتی لڑکیوں کو چھیڑا جائے ان پر آوازے کسے جائیں یا جھوٹی محبتوں کے جال میں پھنسا کر ان کی عزت لوٹ لی جائے کیونکہ یہ افعال فطری نہیں حیوانی اور شیطانی ہیں جن کی فطرت ہرگز اجازت نہیں دیتی۔ اللہ نے اسلام کو دین فطرت بنایا ہے اس لئے اسلام کے منافی ہر فعل غیر فطری قرار پائے گا۔ البتہ یہ بات اور ہے کہ کوئی سرے سے مذہب کا قائل ہی نہ ہو جیسے کہ بعض لوگ نہیں ہیں لیکن جو لوگ مذہب کو ایک فرسودہ اور ناقابل عمل دین قرار دیتے ہیں ان کی خدمت میں گذارش ہے کہ وہ مسلمانی کا لبادہ پہن کر مسلمانوں کو مزید فریب نہ دیں تو بہتر ہو گا کہ وہ اس تکلف سے چھٹکارا حاصل کر کے عبداللہ کے بجائے جوزف بن جائیں تاکہ لوگوں کو دھوکہ نہ ہو۔ مگر غضب تو یہ ہے کہ دوسروں کی عزت و ناموس سے کھیلنے کی تو ہم کھلی چھٹی چاہتے ہیں لیکن جب خود اپنی بہن، بیٹی کی باری آتی ہے تو مرنے مارنے پر تل جاتے ہیں حالانکہ انصاف کا تقاضہ تو یہ ہے کہ جنسیت کے "مشن" کی تکمیل کے سلسلے میں ہم خود نہ صرف نمونہ بنیں بلکہ پہل بھی کریں۔ مگر۔۔۔ مگر ہم تو دوسروں کی بگڑی اچھالنے کے رسیا ہیں اپنی باری پہ چیخ اٹھتے ہیں۔ کیوں چیخ اٹھتے ہیں ؟ کیا اپنے اس ردعمل کا تجزیہ کسی نے کیا ہے ؟ اس لئے چیخ اٹھتے ہیں کہ فطرت جہاں ہمیں دوسروں کی عزت تاکنے پہ اکساتی ہے وہاں خود اپنی غیرت کو بھی چیلنج کرتی ہے اس لئے اسلام نے ہمیں دوسروں کے احترام کا سبق بھی دیا ہے اور اپنی آبرو کے تحفظ کی ضمانت بھی۔ انسان چاہے دنیا کا کوئی بھی مذہب اختیار کرے کسی بھی ملک کی شہریت اپنا لے، یہ پابندیاں اگر بادل ناخواستہ بھی ہوں تب بھی ہر حال میں ہر جگہ اس کا استقبال کریں گی کہ یہی فطرت کا اصول ہے مگر ایسی پابندیاں نہ ہوں تو نہ صرف زندگی کا حسن ختم ہو جائے اور معاشرہ بگاڑ کا شکار ہو جائے بلکہ عدالتوں اور مقننہ کا مقصد ہی فوت ہو جائے۔ اب تو خود برطانیہ میں بھی یہ احساس تقویت پا رہا ہے کہ اگر جنسی بے راہروی کی یہی رفتار رہی تو اس کا معاشرہ قعر مذلت میں گر کر تباہ ہو جائے گا۔ برطانیہ کا سنجیدہ اور دانشور طبقہ سخت مضطرب ہے چنانچہ گذشتہ سال ۱۹۷۶ء کے آخری چار مہینے اخلاقیات کے فروغ کے سلسلے میں صرف ہو گئے۔ اسلامک سوسائٹی کے ڈائریکٹر جنرل مسٹر پول کیٹر نے ان چار ماہ کے اندر دوسری باتوں کے علاوہ ایک اسلامی آرٹ پر مبنی نمائش کا بھی اہتمام کیا تھا جس کا مقصد مسلمانوں کی اقدار اور ان کی اسلامی اخلاقی اطوار سے برطانوی نوجوانوں کو روشناس کرانا تھا۔ جنہیں اسلام نے انہیں ورثے میں عطا کیا تھا۔ مسٹر پول کیٹر نے بی بی سی کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ وہ آرٹ کے ذریعے نفسیاتی انداز سے برطانوی نئی نسل کو اسلامی اخلاق سکھائیں گے۔ یہ تو برطانیہ کے دانشوروں کا حال ہے کہ وہ اپنے معاشرے کی مسخ شدہ صورت کو درست کرنے کے لئے اسلامی اخلاقی اصولوں میں پناہ ڈھونڈ رہے ہیں مگر ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہم مسلمان ہوتے ہوئے نہ صرف اسلام سے بیزاری کا اظہار کرنے لگے ہیں بلکہ اسے فرسودہ اور ناقابل عمل نظام قرار دیتے ہیں دراصل اس میں ہماری نوجوان نسل کا بھی قصور نہیں ہے یہ صرف اور صرف سرمایہ دارانہ نظام کا فیض ہے کہ جس نے بھوک، بیماری، افلاس، فیشن اور طرح طرح کی فکری اور ذہنی بیماریاں پیدا کر کے معاشرے کو تباہ کر دیا ہے اس پر مستزاد فلموں کے عریاں مناظر، جنسی لٹریچر اور جاسوسی کتب ہیں کہ نوجوان نسل مذہب و ملت سے بیگانہ ہوتی جا رہی ہے۔ اس صورت حال کے پیش نظر ضروری ہے کہ مخرب اخلاق فلموں کو نہ صرف بند کرایا جائے بلکہ اسی قبیل کی انگریزی فلموں کو بھی درآمد نہ کیا جائے اس کے علاوہ فحش لٹریچر پر بھی پابندی عائد کی جائے اور تعلیمی درسگاہوں میں مغربی اثرات کا قلع قمع کیا جائے موجودہ سرمایہ دارانہ نظام ختم کر کے معاشی اور معاشرتی توازن پیدا کیا جائے۔

[illegible]

ہمارے معاشرے میں عریانی اور بے حیائی پھیلنے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے مذہب سے بہت دور ہو گئے ہیں۔ ہم صرف نام کے مسلمان ہیں۔

افسوس آج کے دور میں پردہ برائے نام ہو گیا ہے۔ اگر عورت گھر سے برقعہ پہن کر نکلتی ہے تو باہر دیکھ برقعہ پرس کی زینت بن جاتا ہے۔ دوپٹہ برائے نام ہے۔ اوّل تو بعض آزادی پرست عورتیں دوپٹہ لینا گوارا ہی نہیں کرتیں۔ اگر دوپٹہ ہو گا بھی تو گلے میں رسی کی مانند ہو گا۔ میں اپنی ان ماؤں اور بہنوں سے پوچھتا ہوں کہ اس نام نہاد پردہ سے کیا فائدہ ! افسوس تو ان مردوں پر ہے جو کہ اپنی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں اور بیویوں کو بے حیائی کی طرف راغب کرتے ہیں۔ انہیں گلیوں کی زینت بناتے ہوئے شرم نہیں محسوس کرتے ہیں۔

اسلامی قانون ہی ان چیزوں کا قلع قمع کر سکتا ہے۔ ورنہ ان چیزوں کا خاتمہ بہت مشکل ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں نوجوان طبقہ اسلام کے زریں اصولوں کو پسند نہیں کرتا۔ وہ تو صرف موسیقی کی تال پرست ہونا جانتے ہیں۔ اگر انہیں کہیں کہ گھر سناؤ تو وہ ہنس کر ٹال دیں گے اور اگر کہیں کہ نور جہاں کا نغمہ سناؤ تو بے دھڑک گھر کا نام کر کہیں گے ۔

اکھ لڑی بدو بدی موقع ملے کدی کدی ! ●●

پائل

م۔ک۔ مہتاب

کبھی کبھی آواز اور رقص کے جادو سے فضا میں دھنک سی لہرانے لگتی ہے
دل میں پیار کے مقدس آگ روشن کر دینے والی ایک حسین رومانی کہانی

اُف! پانی کتنا گرم تھا!

تو میں نے ننگے ہاتھوں دیگچی کو اُٹھا لیا کیوں؟ اس میں پانی کھولیا تصور ہے اُچھلنا اُس کی فطرت ہے اور جلا دینا گرمی کا خاصہ ہے۔

توبہ، توبہ! ہاتھ میں کتنی جلن ہو رہی ہے۔ جیسے کھولتا ہوا پانی جلد کے نیچے چلا گیا ہو۔ یہ میری ہی غلطی تھی لیکن کلونت سنگھ اتنا تو کہہ سکتا تھا

مُرلاری! تم رہنے دو۔ یہ کام حلوائی خود کر لیں گے لیکن اُسے آج فرصت ہی کہاں ہے۔ یہ وہی کلونت ہے جو ۲۳ برس پہلے ایک ایسے ہی دن یہاں ایک غلام کی طرح پھنسا ہوا تھا کسی نہ کسی بہانے کھسک جانے کی کوشش میں تھا۔ اُس دن بھی تو کم بخت یہی ہاتھ جل گیا تھا لیکن وقت اور انسان انسان کا فرق ہے۔ جوں ہی سردار پورن سنگھ کو پتہ چلا بھاگے آئے۔

مُرلاری کاکا! چھوڑ دو، یہ کام تمہارے بس کا نہیں۔ جاؤ ہاتھ پر کالی سیاہی پوت لو، آرام آجائے گا۔ اب آرام کرو صبح تمہیں گھوڑیاں بھی تو اسٹیشن پر لے جانی ہیں!"

"نہیں باپو جی! کوئی زیادہ تکلیف نہیں۔ میں یہ بادام صاف کر کے ہی جاؤں گا اور میں وہیں بیٹھا کام کرتا رہا۔

اُف ــــ ف ــــ ف ــــ کم بخت کتنی جلن ہو رہی ہے۔

اس وقت کہیں کوئی دوا بھی تو نہ ہوگی۔ اِدھر صحن میں لڑکیوں نے دو دھولک پکڑ رکھی ہے کہ توبہ ہی بھلی۔ سر میں درد ہوں نہ جانے کیا بجے جا رہا ہے۔ کہتے ہیں کہ گاؤں کی زندگی میں سکون ہوتا ہے لیکن یہاں تو وہی ہنگامہ ہے جو کلکتہ کے بازاروں میں ہوتا ہے۔ ڈھولک کی آواز کانوں کے پردے پھاڑ رہی ہے۔ لڑکیوں کے بے محل اور بے موقع گیتوں کا شور کواڑوں کو چیرتا ہوا اندر چلا آتا ہے۔ وقت تھا بیاہ شادی پر عورتوں کے لیے اور ادھر راگ ہوتے تھے جن سے جذبات کی تسکین اور دماغ کو راحت ہوتی تھی لیکن اب ہر جگہ فلمی نغموں کا رواج ہے "جب پیار کیا تو ڈرنا کیا؟" کی گردان جاری ہے۔

ایسے میں نیند خاک آئے گی؟ ایسا معلوم ہوتا ہے سب انگلیوں پہ چھالے اُبھر آئے ہیں لیکن کلونت سے اتنا نہیں ہو سکا کہ حال پوچھتا تو کہیں کوئی دوا ہی بھجوا دیتا۔

اور یہ وہی شخص ہے کہ کبھی ہاتھ میرا جلا تھا اور تکلیف اسے ہوئی تھی میں درد برداشت کر کے وہیں بیٹھ گیا۔ اور وہ مجھے وہاں سے اُٹھنے کے لیے مجبور کر رہا تھا۔

"اُٹھو مُرلاری! ہاتھ میں تکلیف بڑھ جائے گی۔ چلو چوبارے میں آرام کریں، وہاں بستر لگا دیئے گئے ہیں۔"

اور وہ مجھے لے کر چوبارے میں آگیا۔

نیچے اسی صحن میں لڑکیاں گا بجا رہی تھیں۔ اُن کے نغموں کی صدائیں سارے ماحول پر محیط تھیں۔ جن کے سحر میں ہم اپنے کالج کی لڑکیوں اور اُن سے وابستہ رومانی داستانیں چھیڑ بیٹھے۔

پھر کلونت کہنے لگا۔

"آؤ نیچے چل کر لڑکیوں کا گانا سنیں، ان کا رقص دیکھیں۔"

"کیوں پٹنے کی نیت ہے کیا؟ ـــــ اگر بے جی کو پتہ لگ گیا تو دماغ درست کر دیں گی!"

لیکن کلونت کو تو عجیب بے کلی سی ہو رہی تھی۔ وہ کہنے لگا۔

"آؤ چارپائیاں برآمدے میں نکال لیں۔ اور باہر جھروکوں میں بیٹھ کر

ان نغموں سے لطف اندوز ہوں۔"

اُس کی تجویز مجھے پسند آئی لیکن ایک انجانے خوف کے تحت میں نے اُس سے کہا۔

"زینے کا دروازہ تو بند کر دو۔ مگر بابو جی آنکلے تو زنّاٹے کا طمانچہ منہ پر جاتے ہوئے کہیں گے۔ کالمبیٹ بدمعاش! لاہور سے یہاں مجرا سننے کے لیے آئے ہو کیا؟"

کلونت دروازہ بند کرنے چلا گیا اور میں جھروکے میں آ کر نظارے میں ایسا گم ہو کر رہ جانے کب کلونت آیا اور میرے قریب بیٹھ گیا۔ صحن میں گیس ٹنگے ہوئے تھے جن کی نیلگوں روشنی میں رنگ برنگے ریشمی لباسوں میں ملبوس لڑکیاں اور عورتیں حلقہ باندھے ڈھولک پر گیت گا رہی تھیں۔ جوان اور تنے ہوئے جسم، گندمی رنگت، مسکراتے چہرے اور سرخ ہونٹوں سے جھڑتے ہوئے نقرئی قہقہے سماں باندھ رہے تھے۔

دو لڑکیاں گلے میں ڈھولک ڈالے ایک دوسری کے مقابل کھڑی تھیں اور دو لڑکیاں جن میں سے ایک نے سرخ اور دوسری نے سبز ریشمی لباس پہن رکھا تھا حلقے کے اندر ناچ رہی تھیں۔ حلقے میں کھڑی لڑکیاں لوک گیت کے بول چھیڑتیں اور ناچتی ہوئی لڑکیاں بول کی نشست کو سنے بغیر گھوم جاتیں۔



ڈھولک گلے میں ڈالے کھڑی لڑکی نے ایک بول فضا میں بکھیرا۔

"کوٹھے تے پرکو ٹھڑا ماہی سکنے دھچائی اے ریت بھلا"

اور اس کے مقابل کھڑی دوسری لڑکی بول اٹھی۔

"اساں گڈھیاں نی پنڈھیاں ماہی کیسے بہانے دیکھ بھلا"

اور حلقے میں آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دونوں لڑکیاں ٹپے کے بول لے کر محوِ رقص ہو گئیں۔

"ڈھے چناں کتھے گذاری آ رات وے ساڈا ماہی دلیلاں ڈے داس ڈے"

حلقے میں کھڑی سب عورتوں نے اُن کی آواز میں آواز ملا دی۔ ڈھولک زور زور سے بجنے لگی۔ ناچنے والی لڑکیوں کے ساٹن کے لباسوں سے گیسوں کی روشنی یوں منعکس ہو رہی تھی جیسے حلقے میں سینکڑوں آئینے رقص کر رہے ہوں۔

کلونت میری گردن میں بازو ڈالے مبہوت بیٹھا تھا۔

چکر ختم ہونے کے بعد پنجابی کے اس لوک گیت کا دوسرا پڑ شروع ہوا۔

"کوٹھے تے پرکوٹھڑا اوے ماہی ہیٹھ وگے دریا بھلا"

اور بالمقابل کھڑی لڑکی بول اُٹھی۔

"میں بن جاواں مچھلی تو بگلا بن کے آ بھلا"

اور سُرخ و سبز شعلے لپکتے ہوئے گویا ہوئے۔

"ڈھے چناں کتھے گذاری آ رات وے میرا جی دلیلاں ڈے داس ڈے"

اور وہ دونوں اتنی تیزی سے چکر لگانے لگیں جیسے ایک مداری سُرخ اور سبز روشنی کے دو گولے ریشمی ڈوری سے باندھ کر اپنی اُنگلی کے گرد گھما رہا ہو۔

سبز پوش لڑکی چھوٹی لڑکی سے کہیں خوبصورت تھی۔ رقص کرتے ہوئے اُس کا انگ انگ متحرک رہا تھا۔ وہ ایک شعلہ جوالا تھی جس کی نشیلی آنکھوں کے پیالے چھلک چھلک کر نشہ بکھیر رہے تھے جس کی سیاہ ناگ پھنکار پھنکار کر تماشائیوں کو ڈس ڈس کر مست کئے جا رہا تھا۔

میں بے اختیار بول اٹھا۔

"کلدیپ! کون ہے یہ قیامت جو تین دن سے اس حویلی میں قلانچیں بھر رہی ہے؟"

"یہ میری بہن امرجیت کی سہیلی پرکاش ہے۔ امرتسر میں اُس کی ہم جماعت تھی۔ آجکل دہلی میں ہے۔ تم بڑے شاعر بنتے ہو، ذرا بتاؤ تو سہی کیسی ہے؟"

کلدیپ نے میری گردن کے گرد اپنے بازو کا حلقہ تنگ کرتے ہوئے کہا ——

"کیا بتاؤں کلونت! جب جھوم جھوم کر چلتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کہکشاں میں کوئی ستارہ بدمست ہو گیا ہو۔"

"اور ناچتی کیسا ہے؟"

"جب آنکھیں مٹکاتی ہوئی پازیب جھنکاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ جھیل کے ساکن پانی میں چاند کے عکس کو کسی ابابیل نے چھو دیا ہو اور پاس کھڑے کنول مسکرانے لگے ہوں!"

پائل پھر چھنکنے لگی تھیں۔ محفل پھر وجد میں آ گئی۔ لوک گیت کے بول بھی اشتعال انگیز ہو گئے تھے۔ کلونت میرے اور بھی قریب ہوتا گیا اور میں ایک سرد آہ بھر کر سوچنے لگا۔ کاش میرے بھی پر ہوتے اور میں سمندر کے نیلگوں پانی میں غوطے لیتا اس سنہری مچھلی کو اچک کر کسی کیلاش پر جا بیٹھتا۔

اچانک کسی نے زینہ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ جیسے ایک حسین سپنا ٹوٹ گیا۔ آئینے میں دراڑیں پڑ گئی ہوں۔ کلونت چھلانگ لگا کر زینے میں اور میں اپنی چارپائی پر تھا۔ گیت آہستہ آہستہ ختم ہو گیا۔ پھر اور گیت شروع ہو گیا لیکن گھنگھروؤں کی گنگنی دھمک اب بھی کان کے پردوں پر یوں محسوس ہو رہی تھی جیسے لطیف ہوا کا جھونکا ریشمی پردے کو سرسرا رہا ہو!

سنگیت ختم ہو گیا لیکن کلونت نہیں لوٹا۔ مجھے تنہائی گراں گزرنے لگی تھی۔ پرکاش کی آواز اور رقص کے جادو نے میرے اندر ایک مقدس آگ سی سلگا دی تھی۔ سونے کی کوشش کی لیکن آنکھوں سے نیند کوئی اٹھا کر لے گیا تھا۔

اُنگلیوں میں کتنا درد ہو رہا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے پانی جلد کے نیچے جا کر پھر کھولنے لگا ہے۔ دیکھو تو ہاتھ کی پشت پر کتنے آبلے اُبھر آئے ہیں۔ اور بالکل ویسی ہی بے چینی ہو رہی ہے جیسی اُس رات نیند نہ آنے سے ہو رہی تھی۔

میں چارپائی پر بیٹھ گیا۔ رات بھیگ گئی۔ دھیرے دھیرے حویلی کی تمام آوازیں رات کے سناٹے میں دب کر رہ گئیں۔ صرف کبھی کبھی کسی کنویں پر کوئی کتا رونے لگتا۔ سب روشنیاں گل ہو چکی تھیں۔ اب صرف صحن میں ایک گیس روشن تھا جس کی کرنیں کھڑکیوں میں سے ہوتی ہوئی برآمدے کے اندھیرے کو دھندلکے میں بدل رہی تھیں۔

کچھ دیر کے بعد دوسری منزل پر کسی کے پاؤں کی چاپ سُنائی دی۔ پھر زینے میں کسی کے اترنے کی آواز آئی۔ کوئی جلدی سے نیچے اُتر گیا۔ میں چوکنا ہو کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد پھر کسی کے سیڑھیوں سے اترنے کی آواز آئی اور ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی زینے کے دروازے سے ٹکرایا ہو۔ میں نے گھور کر



اُدھر دیکھنے لگا کوشش کی۔ ایک سایہ حرکت کرتا ہوا نظر آیا پھر ایک دھندلا سا عکس نظر آیا پھر ایک بھینی سی خوشبو آئی۔ وہ اٹھلاتی ہوئی قریب آ گئی۔ میں نے غور سے دیکھا۔

"پرکاش!"

میرے منہ سے بے اختیار سرگوشی کے انداز میں آواز نکل گئی۔

اُس نے دفعتہً مُنہ پھیر کر میری طرف حیرانی سے دیکھا پھر ہاتھ کی پُشت مُنہ پر رکھ کر جمائی لی۔ جیسے فضا میں دھنک لہرا رہی ہو۔ اور ہکلاتے ہوئے بولی۔

"کیا نیچے جانے کے لئے سیڑھیاں اِدھر ہی سے ہیں؟"

"کیا نیچے آپ ہی ناچ رہی تھیں؟" میں نے اُس کی بات ان سُنی کرتے ہوئے کہا۔

"کب؟" اُس نے اور حیرانی سے پُوچھا۔

"رات کو نیچے ستاروں کے جھرمٹ میں!"

"کیا آپ اُوپر بیٹھے دیکھ رہے تھے؟ شریر کہیں کے۔ آپ کلونت کے دوست ہیں، ورنہ ——"

وہ خفگی کے لہجے میں بولی۔

"کیوں لڑکیوں کو دیکھنا جُرم ہے؟ اُن کی آواز سُننا گناہ ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو خدا انہیں ڈھانپ کر کیوں نہ پیدا کرتا؟"

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی میری بات پر مُسکرا دی۔

اور بولی۔

"نیچے سیڑھیاں اِدھر ہی سے جاتی ہیں؟"

"جاتی تو اُدھر ہی سے تھیں۔ البتہ ایک راستہ اِدھر سے بھی ہے!"

وہ چلنے لگی تو میں نے اُسے روکتے ہوئے کہا۔

"پرکاش جی!"

"کیا بات ہے؟" اُس نے بھڑک کر کہا۔

"اوہو! آپ تو ناراض ہو رہی ہیں۔ دیکھئے آپ امرجیت کی سہیلی ہیں میں کلونت کا دوست ہوں۔ اس میں گھبرانے یا ناراض ہونے کی کیا بات ہے۔ مجھے آپ سے مشورہ کرنا ہے کچھ!"

"تو جلدی کیجئے، کہیں کوئی آ گیا تو؟"

"آپ تو یوں ڈر رہی ہیں جیسے انارکلی چھُپ کر سلیم سے ملنے آئی ہو!"

"آپ بڑے شوخ ہیں!"

"اِس میں شوخی کی کوئی بات نہیں، میں تو آپ کے بے جا تبسم کو دُور کرنا چاہتا ہوں۔"

"تو کہئے مجھے نیند آ رہی ہے۔" اُس نے منہ پر ہاتھ رکھ کر جمائی لیتے ہوئے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے آپ تھک گئی ہیں آیئے پلنگ پر بیٹھ جایئے۔ اور اگر آپ کو کوئی جھجک ہو تو میں اُٹھ جاتا ہوں۔"

"نہیں آپ مجھے جانے دیجئے۔"

لیکن میں نے اُٹھ کر اُس کے بازو پر رکھے ہوئے سبز ریشمی کپڑے تھام لئے۔ جن میں پائل کے گھنگھروؤں کی دبی دبی جھنجھناہٹ ہو رہی تھی، اور وہ کچھ کسمسائی ہوئی پلنگ کی پائنتی کے قریب بیٹھ گئی۔

"پرکاش جی! میں نے آپ کو روکنے کی گستاخی اِس لئے کی ہے کہ میں امرجیت کی شادی پر کوئی تحفہ دینا چاہتا ہوں۔ لاہور سے کچھ لا نہیں سکا اب آپ بتلایئے یہاں کون سی چیز موزوں رہے گی؟"

"کوئی ساڑھی وغیرہ دے دیجئے۔" اُس نے ماحول سے اُکتاہٹ کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"اُوں ہوں!" میں نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال تھا آپ دلی سے آئی ہیں ضرور کوئی اچھی چیز تجویز کریں گی۔ پھر گاؤں میں ساڑھی کہاں مل سکتی ہے؟"

"تو کوئی انگوٹھی بنوا لیجئے!"

اُس نے کپڑے اُٹھانے کی کوشش کی لیکن میں نے اپنا ہاتھ کپڑوں پر رکھتے ہوئے کہا۔

ہونے کے ساتھ ختم تو نہیں ہوگیا؟"

"میں دینا تو نہیں چاہتی تھی لیکن وعدہ چاہے جبر کے تحت کیا وعدہ ہے۔ پھر کسی مرد کا وعدہ نہیں، لڑکی کا وعدہ ہے۔" اور اس جملے کے ساتھ ہی وہ مسکرانے لگی۔

"بڑی شریر ہیں آپ!"

"ادھر سے گھوڑی کے ہنہنانے کی آواز نے یہ طلسم توڑ دیا۔ میں نے دیکھا کاؤنٹ کھیتوں کے پار سڑک پر گھوڑی لئے کھڑا میرا انتظار کر رہا تھا۔ اُسے دیکھ کر مجھے ندامت سے شرمندگی ہوئی اور میں جھٹ اس سے جا ملا۔

"کیوں پسند آئی تمہیں؟"

کاؤنٹ نے میری پیٹھ پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"جوانی کے تپتے صحرا میں تو گدلے پانی کی بوند بھی آب حیات سے کم نہیں ہوتی۔ یہ تو خود آب حیات ہے دوست!"

اور ہم گھوڑیوں کو ایڑ لگا کر ہوا ہو گئے۔

شام کو میں چوبارے میں بیٹھا رات اور صبح کے حسین لمحات کی یاد میں کھو گیا اور سوچ رہا تھا۔ پرکاش سے تحفہ کیسے حاصل کیا جائے؟ رات کو مجھے تحفہ امرجیت کو دینا ہوگا۔ میں اُٹھ کر بھرنے کے لئے آنگن میں آگیا۔ صحن میں خوب چہل پہل تھی۔ پرکاش زری کا بھاری جوڑا پہنے گوٹے کناری سے منقش اوڑھنی اوڑھے ہتھیلی پر مہندی کا تھال اٹھائے عورتوں کے ساتھ کہیں جانے کے لئے تیار کھڑی تھی۔ میں نے اُسے متوجہ کرنے کے لئے کھڑکی کا پٹ کھٹکھٹایا۔ اُس نے میری جانب دیکھا، کچھ جھجکی۔ لیکن میں نے کلائی دکھا کر جب اُسے وعدہ یاد دلایا تو وہ ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے مسکرا دی۔ میں کھڑکی سے ہٹ کر چوبارے میں آگیا۔ چند منٹ بعد سیڑھیوں میں کسی کے آنے کی آواز سنائی دی۔ پرکاش مہندی کی تھالی اٹھائے اوپر آگئی۔

"فرمائیے! کیا حکم ہے کنیز کے لئے شہزادے صاحب۔"

"واللہ خالص دہلوی زبان بھی بولتی ہو۔ میں نے صرف رات کے وعدے کے متعلق گستاخی کی ہے۔"

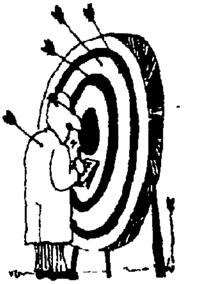
"تو لیجئے رات کو ادھر سے گزرنے کا جرمانہ!"

اور اُس نے سبز کاغذ میں لپٹے ہوئے کنگن نکال کر میری ہتھیلی پر رکھ دیئے۔

"اگر آپ ناراض نہ ہوں تو معاوضہ لے لیجئے۔"

"آپ بہت امیر ہیں کیا؟"

اُس نے آنکھیں مٹکا کر ہنستے ہوئے میری جانب دیکھا۔ میں نے اُس کی تھالی پکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ میری گرفت سے بچ کر بھاگی۔ اور



"یہ دہلی نہیں گاؤں ہے اور صبح تو بارات آرہی ہے!"

وہ زیرِ دام پرندے کی مانند پھڑپھڑا کر رہ گئی۔ اور لجاجت آمیز لہجے میں بولی۔

"ایشور کے لئے مجھے جانے دیجئے۔"

"کوئی اچھی سی تجویز بتائیے اور چلی جائیے۔"

وہ گال میں انگلی گاڑے ایک لمحہ سوچتی رہی۔ پھر بولی۔

"اچھا آپ یوں کیجئے۔ میں چاندی کا ایک جوڑا خوبصورت کنگن بنوا کر لائی ہوں آپ وہ لے لیجئے۔"

اور وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں چھوڑ آؤں؟ ادھر اندھیرا ہے!"

"شکریہ! مجھے دکھائی دیتا ہے۔"

اور وہ کپڑے اٹھا تیز تیز چلتی ہوئی برآمدے کی دوسری سمت یوں گم ہوگئی جیسے آسمان سے کوئی ستارہ ٹوٹ کر روشنی کی لکیر چھوڑتا ہوا اندھیرے میں کھو گیا ہو۔ اور میں رات بھر اس اجنبی خوشبو کے ہالے میں کھویا رہا۔

صبح ہم گھوڑیاں لے کر اسٹیشن کی طرف جا رہے تھے۔ وہ مجھے کنوئیں کے قریب کھیت کی منڈیر پر کھڑی دکھائی دی جیسے گیہوں کی بالی پر اوس کا روشن قطرہ! اور میں گھوڑی کو پانی پلانے کے بہانے کنوئیں کی جانب نکل گیا۔ گھوڑی پانی پیتی رہی اور میں رات کی پیاسی آنکھوں کی تشنگی بجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ میرے قریب آگئی۔ میں اس سے کوئی بات پوچھنا چاہتا تھا لیکن کوئی بات ہی نہ تھی۔ وہ خود ہی پوچھنے لگی۔

"بارات کب آرہی ہے؟"

"ایک بجے کی گاڑی سے۔ لیکن وہ رات کا وعدہ یاد ہے نا؟ دارانِ تمہ

مہندی کا خوشبودار سبز غبار بکھیرتی ہوئی نیچے اُتر گئی۔

گاؤں میں قیام کے باقی دو دن پرکاش کا سراپا میرے دل و دماغ پر چھایا رہا۔ اس سے ملنے کے کتنے مواقع میں نے نکالے اور ہر موقع پر کتنی باتیں کیں۔ جن پر وہ ہنستی ہوئی کہہ دیتی۔

"آپ بڑے وہ ہیں!"

اور جب میں لاہور کے لئے روانہ ہوا تو میرا پتہ اس کے پاس تھا اور اس کا پتہ میری ڈائری میں۔

امتحان تک جو باقی مہینے رہ گئے تھے میرے لئے کانٹوں کی سیج بن گئے میں اپنے تصورات کی دنیا کو پرکاش کی مسکراہٹوں کے پھولوں سے سجاتا رہا۔ لیکن اس دوران میں کلونت نے اپنی حقیقی دنیا پرکاش کی کرنوں سے آباد کر لی تھی!

امتحان کے بعد جب میں گھر لوٹا تو مجھے کلونت کا خط ملا۔

"مراری! تمہیں یہ جان کر خوشی ہوگی کہ میں نے تمہاری پسند کے مطابق پرکاش سے شادی کرنا منظور کر لیا ہے.... "

میں اس سے آگے خط نہ پڑھ سکا۔

نوچ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

"دھوکے باز، کمینہ!"

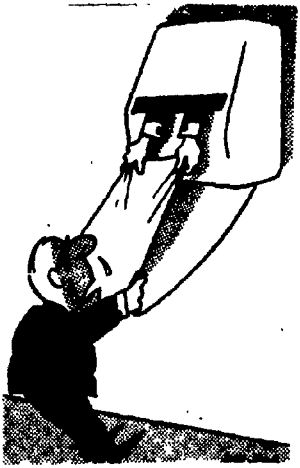
مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے خط کی سطریں سلائیاں بن کر میری آنکھوں میں پھر گئی ہوں۔ جیسے خط نے میرے دل کو داغ داغ کر ڈالا ہو۔ مجھے کلونت سے نفرت ہوگئی اور پرکاش سے بھی۔ کہ اگر اس کا عہد اتنا بودا تھا تو اس نے الفت کے کچے تار کا ایک سرا میرے ہاتھ میں تھمایا ہی کیوں تھا۔ میں شہر آکر پریکٹس شروع کرنی چاہتا تھا لیکن وہیں تو کلونت پرکاش کو بیاہ کر لا رہا تھا۔

اور میں نے وہاں ٹھہرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

کلکتہ چلا گیا۔

کمروں میں کیسا بے ہنگم شور ہو رہا ہے۔ نہ کوئی سُر نہ تال۔ دھما چوکڑی مچی ہے۔ اور درد ہے کہ پھر لہریں مارنے لگا ہے۔ جیسے انگلیوں میں کوئی آری چلا رہا ہو۔ اٹھ کر کہاں جاؤں؟ کہیں کوئی ڈاکٹر بھی نو نہ ہوگا۔ کاش کہیں سے کوئی تیز دھار چاقو ہی مل جائے تو میں ان آبلوں کو چھیل ڈالوں۔ شاید درد کو کچھ سکون حاصل ہو۔

کلکتہ جا کر میں نے سب کچھ بھول جانے کی کوشش کی لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ میرے بس کی بات نہ رہی ہو۔ اس پر کلونت کے خطوط



زخموں پر مسلسل نمک پاشی کرتے رہتے۔ میں نے کبھی اس کے خطوں کا جواب نہ دیا لیکن اس کے خطوط برابر نشتر بن کر میرے زخموں کو ہرا کرتے رہتے کچھ عرصہ بعد میں نے چاہا اُسے ڈانٹ دوں کہ مجھے خط نہ لکھا کرے لیکن میں ایسا نہ کر سکا۔ کیونکہ اب زخموں پر نمک لطف دینے لگا تھا۔

میں کلکتہ میں بہت آرام چین سے ہوں۔ خدا کا دیا سب کچھ ہے وقت بہت اچھا گزرتا لیکن یہ ظالم مجھے آرام بھی تو کرنے دے۔

گزشتہ سال کلونت کا خط آیا تھا کہ اس کے لڑکے کی شادی ہے، میں بال بچوں کو لے کر آؤں۔ لیکن میں نے خط کا جواب نہیں دیا۔ البتہ بہو کے لئے ایک قیمتی ساڑی اور ایک جڑاؤ سیٹ بھیج دیا۔

اب پھر خط آیا۔ اس کی لڑکی امرجیت کی شادی تھی۔ بچوں سمیت شرکت کی دعوت دی تھی۔ میں نے پھر خط کا جواب نہیں دیا۔ ایک قیمتی ساڑی اور سونے کے چودہ چوڑیوں کا کنگن بطور تحفہ بھیج دیئے۔ میں نے سوچا تھا بلا ٹل گئی لیکن چند دن بعد تحفہ واپس آگیا۔ ساتھ پرکاش کا خط تھا اتنے برس بعد پہلا خط!

لکھا تھا۔

"ایشور آپ کو اور زیادہ دے۔ ہم پیار کے بھوکے ہیں دولت کے نہیں۔ پھر لڑکیاں تو سب کی سانجھی ہوتی ہیں۔"

اور میرے پاس پرکاش کے خط کا صرف یہی جواب تھا کہ میں اس ضعیف العمری میں اس کو لکھ کے جاڑے میں ہزار یا میل کی مسافت



برداشت کر کے یہاں آپہنچا ہوں۔

یہاں کلونت ملا۔ پرکاش ملی۔ وہ ویسی ہی ہے جیسی تیس برس پہلے تھی۔ زمانے کی گردش ماحول بدل دیتی ہے، انسان کے خدوخال میں تبدیلیاں کر دیتی ہے لیکن انسانی فطرت کو تبدیل نہیں کر سکتی۔ اُس کے مزاج میں وہی لااُبالی پن ہے۔ وہی شوخی ہے۔ وہی بے باک اندازِ گفتگو ہے۔ بات بات پر ہنستی ہے اور قہقہے لگاتے چلی جاتی ہے۔ مجھ سے باتیں کرتی ہے تو تھمنے کا نام نہیں لیتی لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کچھ کہتے کہتے رُک جاتی ہے۔ شاید نئے ماحول کی ذمہ داریاں راہ میں حائل ہو جاتی ہیں۔

ان دو دنوں میں اُس نے میری خدمت کے لئے کون سا دقیقہ فروگذاشت کیا ہے؟ سیٹھ جی! سیٹھ جی! کی گردان سے اس کی زبان تھک گئی ہوگی۔ وہ مجھ سے ضرور کچھ کہنا چاہتی ہے۔ اپنی بے وفائی کے لئے اظہارِ تاسف کرنا چاہتی ہے۔ ورنہ نہیں تو اس نے میرے ٹھہرنے کے لئے یہاں الگ کیوں انتظام کر دیا ہے۔ کیا وہ یہاں مجھ سے تنہائی میں ملنا چاہتی ہے؟

اوں ہوں! میں بوڑھا ہو گیا ہوں مگر عقل نہیں آئی۔ کیا بچوں کی سی باتیں سوچ رہا ہوں۔ شاید میرے حواس بجا نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے پرکاش نے میرے بارے میں کبھی سوچا بھی نہ ہو۔ اور اس نے محض میرے مرتبے کے احساس سے یا میرے آرام کی خاطر میرے لئے الگ انتظام کیا ہو!

او۔ ہو۔ ہو۔ ہو۔ ہاتھ کتنا درد کر رہا ہے۔ میں نے جان بوجھ کر یہ مصیبت مول لی ہے۔ مجھے یہاں آنا ہی نہیں چاہئے تھا۔ اگر تیس برس پرکاش کو نہیں دیکھا تھا تو اب اسے دیکھ کر کون سی عاقبت سنور گئی۔ پھر مجھے کیا سوجھا کر ایک ہزار میل کی مسافت طے کر کے دھکے کھاتا ہوا اس ویران "بابل"

میں چلا آیا ہوں۔ یہ درد تو رات ہی رات میں مجھے ہلاک کر ڈالے گا۔ کوئی آئے تو اس سے کہوں میری چارپائی ہی کہیں باہر لے چلے۔ یہاں تو لڑکیوں کی دھماچوکڑی مجھے چین نہیں لینے دے گی۔

اتنے میں دروازے پر کھٹکا ہوا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی دروازے سے ٹکرا گیا ہو۔ پھر برآمدے میں جلتی ہوئی نیلی بتی کی روشنی میں ایک عورت ہولے ہولے قدم رکھتی ہوئی آتی دکھائی دی۔ جسم میں وہ گداز تھا لیکن چال میں وہی مستی اور جانا پہچانا بانکپن تھا۔

میں تن کر بیٹھ گیا اور میرے منہ سے سرگوشی کے انداز میں آواز نکل گئی۔

"پرکاش!"

"ہاں!"

اور وہ پلک جھپکتے ہی دہلیز پار کر کے میرے پلنگ کے قریب آ گئی۔

"آؤ کیسے آئیں؟" میں نے پلنگ سے ایک طرف ہٹتے ہوئے کہا۔

"میں نے کاکے سے کہا تھا، جا کر سیٹھ جی کو دودھ دے آئے۔ لیکن وہ بولا۔ ماں جی! تم خود ہی چلی جاؤ۔ سنا ہے آپ کی انگلیاں جل گئی ہیں۔ اب کیا حال ہے؟"

اُس نے دودھ کا کٹورا میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا اور خود قریب رکھی تپائی پر بیٹھ گئی۔

"انگلیوں کا کیا پوچھتی ہو پرکاش! انہیں تو جلنے کی عادت ہو گئی ہے۔ بلکہ اب تو جلنے میں کچھ لذت محسوس ہوتی ہے!"

"آپ اب بھی باتیں بہت دلچسپ کرتے ہیں سیٹھ جی۔" وہ میری بات پر ہنسنے لگی۔

"اور آپ دودھ بہت اچھا بناتی ہیں۔ ایک ایک گھونٹ میں شہد اور امرت ملا معلوم ہوتا ہے۔ اس میں شکر اپنی انگلی سے ملائی تھی کیا؟ کیا خوشبو ہے!!"

اُس نے میری بات پر قہقہہ لگایا۔ لیکن منہ پر ہاتھ رکھ کر کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔ جیسے کہنا چاہتی ہو۔

"شریر کہیں کے! جیسے شوخ ہو تم!"

پھر ایک دم بات کا رُخ بدل کر بولی۔

"آپ کو یہاں لڑکیوں کا گانا بجانا سنائی دے رہا ہے نا؟"

میں نے خالی کٹورا اُس کے حوالے کرتے ہوئے اُس کی جانب دیکھا

اس کی آنکھوں میں اور اُس کے ہونٹوں پر شرارت بھری مسکراہٹ تھی جیسے وہ کسی پُرانے واقعے کی یاد دلا کر طنز کر رہی ہو۔

"اب تو گاؤں میں بھی شہر کے گیتوں کا رواج ہو گیا ہے" وہ کونے کو اپنی انگوٹھی سے کھنکھناتے ہوئے بولی۔

"اب گاؤں گاؤں کہاں ہے پرکاش؟" میں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"نہ وہ پہلا سا خلوص، نہ پہلی سی فضا۔ نہ پہلی سی باتیں، نہ پہلے سے مدھر گیت، وہ کنوؤں کی منڈیروں پر جگنوؤں کی طرح جگمگاتی لڑکیاں اور ان میں اپنے محبوب سے چھپ چھپ کر ملنے کی وہ چاہ رہی ہے، جس کا اظہار وہ اپنے گیتوں میں کرتی تھیں۔ اب کوئی لڑکی پہیلی بن کر رہنا نہیں چاہتی کہ اُس کا محبوب بوجھ نہ سکے اور اُسے اچک کر لے جائے۔ اب تو شہروں کی بے حیائی دیہات میں بھی پھیل گئی۔ سُن لو کیا ہنگامہ بپا ہے ——

"جب پیار کیا تو ڈرنا کیا!"

وہ میری بات سُن کر پھر ہنسنے لگی۔

"سیٹھ جی! آپ اب بھی ویسی لڑکوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔"

"اور تم بھی تو ویسے ہی ہنستی ہو۔"

وہ میری بات پر لڑکیوں کی طرح شرما گئی لیکن بات کا موضوع بدلتے ہوئے پھر بولی۔

"لیکن آپ کو یہ پسند کیوں نہیں؟"

"میں تو کلکتے کی مصنوعی زندگی کی گھٹن سے اُکتا کر یہاں آیا تھا کہ گاؤں میں پھر کوئی چاند کا ٹکڑا پاؤں میں پائل باندھے رقص کرتا ہوا کہہ رہا ہوگا۔

"چناں کتھے گزاری آ رات وے!"

لیکن اب تو جیسے وہ خواب کی بات معلوم ہوتی ہے۔

"تو کیا اتنے برسوں میں کوئی تبدیلی نہ آئی؟"

"تبدیلی کیا قیامت آ گئی ہے۔"

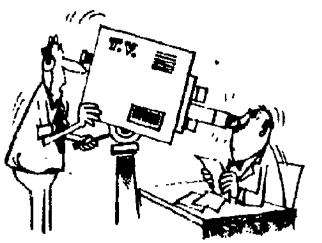
"پھر بھی ——"

"لیکن پھر بھی میری آنکھیں ایک بار وہی نظارہ دیکھنا چاہتی ہیں۔ کان وہی آواز سننا چاہتے ہیں۔ کیا تم ایک بار پھر ——"

میں کہتے کہتے رک گیا۔

پرکاش نے شرما کر سر جھکا لیا اور بولی۔

"میں پھر کبھی نہیں ناچی۔ اس شادی میں میری پائل گم ہو گئی تھی۔



میں نے اُسے بدشگونی سمجھ لیا۔ اور نہ انہوں نے مجھے کبھی اجازت ہی دی۔"

میں نے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈالا۔ اور پائل نکال کر اُس کی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ تو تمہاری امانت! اُس رات تم یہ میرے بستر ہی پر چھوڑ گئی تھیں۔ اب تک یہی میرے سکون کا سامان بنی رہی ہیں۔ میں انہیں تکیے کے نیچے رکھ کر سوتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرے خواب میں کوئی مورنی سی کوئی لہک لہک کر گا رہا ہے۔"

پرکاش نے سر نہیں اُٹھایا۔ پائل جھنکتی ہوئی اُس کی ہتھیلی سے پھسل کر اُس کے پاؤں میں جا گری۔

"کیا میں باندھ دوں؟"

میں نے گلوگیر آواز میں کہا۔

"اُوں ہُوں!"

اُس نے انکار میں سر کو زور سے جھٹکا اور ایک آنسو اُس کی پلکوں سے میری انگلیوں پر آ گرا۔

درد کی لہریں یوں تھم گئیں جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ گئی ہو ——!

—— وہ جانے کے لئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

—— لڑکیاں صحن میں گائے جا رہی تھیں۔

"—— جب پیار کیا تو ڈرنا کیا ——!"

شفیق بریلوی

حضرت اُمِ عمّارہ رضؓ

جنگوں میں خواتین کا شریک ہونا اور میدان جنگ میں لڑنے والے سورماؤں کے ساتھ خواتین کے رہنے کا رواج دنیا کی بہادر اقوام میں عموماً اور عربوں میں خصوصاً زمانۂ قدیم سے تھا۔ اور اقامت گاہوں سے نکل کر رزم گاہوں تک عرب خواتین کے جانے کے متعدد اسباب تھے جن سے صرفِ نظر کر لینا خود عربوں کے لئے بھی ممکن نہ تھا۔ جنگوں میں شریک جانبازوں کے حوصلوں کو بلند رکھنے، دشمن کے خلاف نبرد آزمائی میں جوش و ولولہ کا اضافہ کرنے، زخمیوں اور بیماروں کی دیکھ بھال کرنے کے لئے خواتین کا جنگوں میں ساتھ ہونا بیحد کار آمد تھا۔ خواتین کی عصمت و عفت کو عربوں میں ہمیشہ سے ہی سب سے زیادہ قیمتی شے سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے کسی معرکہ میں شکست کا تصور بھی ان کے لئے باعثِ شرم و ندامت تھا۔ کیونکہ شکست کے بعد خواتین کا باندیاں ہو جانا یقینی تھا

لہٰذا یہ جان دے دینا اور سر کٹا دینے کو شکست کی ذلت کے مقابلہ میں ہمیشہ ترجیح دیتے تھے۔ ایک عرب کے لئے میدانِ جنگ میں تڑپ تڑپ کر جان دے دینا اس سے زیادہ آسان تھا کہ وہ اپنی معزز و عفت مآب خواتین کو اختتامِ جنگ پر دشمنوں کے ہاتھوں میں گرفتار دیکھے۔

اسلام جب آیا تو اس نے ہر قوم کی خوبیوں کو اجاگر کر دیا۔ صحیح یہ ہے کہ اسلام ایک ابرِ نیساں تھا جو برسا اور ساری دنیا پر برسا، جس قوم میں جو اچھائیاں اور خوبیاں تھیں وہ ابھریں اور نمایاں ہو کر سامنے آگئیں، عربوں میں غیرت، عفت اور بہادری پہلے ہی سے موجود تھی۔ اسلام نے اس رنگ کو اور زیادہ گہرا اور تابناک کر دیا۔

جب سنہ ۲ھ میں غزوات کی ابتدا ہوئی تو سب سے پہلے غزوۂ بدر کبریٰ کے موقع پر مسلمان خواتین، وہ خواتین جن کو صحابیات ہونے کا امتیاز حاصل ہے اور جن کو نیک کردار اور نیکوکار ہونے کی سند خود اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں عطا فرمائی ہے، ان خواتین نے حضور سرورِ کائنات فخرِ موجودات صلی اللہ علیہ وسلم سے باصرار درخواست کی تھی کہ انھیں جہاد فی سبیل اللہ میں شرکت کی فضیلت سے محروم نہ رکھا جائے، اور چند خواتین پہلے غزوہ میں بھی خدمتِ مجاہدین کی اجازت حاصل کرنے میں کامیاب ہو کر میدانِ کارزار میں ساتھ گئی تھیں۔

دوسرا غزوہ سنہ ۳ھ میں غزوۂ احد ہے۔ اس میں میدانِ جنگ مدینہ منورہ سے صرف ڈھائی میل کے فاصلے پر کوہِ احد کے دامن میں تھا۔ بدر تو مدینہ سے تقریباً ۸۰ میل دور تھا، لیکن کوہِ احد کا میدانِ جنگ گویا شہرِ مدینہ میں مسلمانوں کے دروازے ہی پر واقع تھا۔ اس غزوہ میں شرکت کے لئے مسلمان خواتین میں کتنا جوش پیدا ہوا ہوگا۔ اس کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں۔ اسی لئے ہمیں نظر آتا ہے کہ احد کے میدانِ جنگ میں اُمہات المومنین، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری بیٹیاں اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی مقدس و محترم اور دلیر بہادر بیٹی حضرت بی بی اسماءؓ بھی موجود تھیں۔

ان مقدس خواتین کی جماعت میں ایک حضرت بی بی اُم عمارہؓ بھی تھیں۔ جن کو بیعتِ عقبۂ ثانیہ کا شرف بھی حاصل تھا۔ انصار تھیں، نام نسیبہ تھا لیکن عرب کے رواج کے مطابق کنیت سے ہی مشہور رہیں۔ والد کا نام کعب بن عمرو بن عوف تھا جو قبیلۂ بنی نجار میں سے تھے۔ والدہ رباب بنت عبداللہ قبیلۂ خزرج میں سے تھیں۔ اُم عمارہؓ کی ولادت ہجرتِ نبوی سے تقریباً چالیس سال قبل مدینہ میں ہوئی۔ پہلا عقد زید بن عاصم سے ہوا۔ وہ ان کے چچازاد بھائی بھی تھے۔ زید ابن عاصم سے دو فرزندوں کی ولادت ہوئی۔ عبداللہ بن زید اور حبیب بن زید۔ یہ دونوں بھائی جوان ہو کر اسلام کے بہت مشہور مجاہد بنے۔ زید بن عاصم نے عین جوانی کے عالم میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا تو اُم عمارہ پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ پھر صبح و شام گزرتے رہے۔ غم کا یہ بوجھ قدرے ہلکا ہوا تو عرب کے دستور کے مطابق ان کا عقدِ ثانی ہوا۔ اور یہ اپنے ہی قبیلے کے ایک معزز شخص عزیہ بن عمرو کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئیں۔ عزیہ بن عمرو سے ان کے بطن سے ایک فرزند تمیم بن عزیہ اور ایک دختر خولہ بنتِ عزیہ پیدا ہوئیں اور اس طرح اب اُم عمارہؓ چار بچوں کی ماں بن گئیں۔

رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم پر رمضان المبارک سنہ ۱۳ قبل الہجرۃ مطابق سنہ ۶۱۰ء کو نزولِ وحی کی ابتدا ہوئی اور حضور اکرمؐ منصبِ نبوت پر فائز ہوئے۔ محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نبوت و رسالت یعنی پیغامِ حق سے سرفراز ہونے کے بعد اپنے فریضۂ اعلانِ دعوتِ اسلام کی جانب متوجہ ہوئے تو سب سے پہلے عورتوں میں حضور اکرمؐ کی رفیقِ حیات حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ نے اسلام قبول کیا اور مردوں میں حضور اکرمؐ کے محبِ صادق حضرت ابوبکر صدیقؓ نے دعوتِ حق پر لبیک کہا۔ پھر حضورؐ نے اہلِ مکہ کو صراطِ مستقیم دکھانے اور ان کو زندگی کے ایک بہتر تصور سے آشنا کرنے کے لئے کوہِ صفا پر چڑھ کر سارے قریش کو بلایا اور دعوتِ اسلام دی۔ بہت سے لوگ آغوشِ اسلام میں آگئے۔ لیکن بہت سے سیاہ قلب لوگ حضور اکرمؐ کے دشمن ہو گئے۔ اور وہ حضور اکرمؐ کو ہی نہیں بلکہ دوسرے اسلام کے نام لیواؤں کو بھی طرح طرح سے ایذائیں پہنچانے لگے۔ تب حضور اکرمؐ نے ان مسلمانوں کو جو دشمنانِ اسلام کی مخالفت کا مقابلہ کرنے کی قوت نہیں رکھتے تھے مکہ سے حبشہ کی جانب ہجرت کر جانے کا حکم صادر فرمایا۔ کیونکہ حبشہ کا بادشاہ نجاشی مسلمانوں سے ہمدردی رکھتا تھا اور اسلام کو ایک سچا مذہب سمجھتا تھا۔ ان ہجرت کرنے والوں میں مردوں کے ساتھ عورتیں بھی تھیں۔ دشمنانِ اسلام اس اقدام پر اور برافروختہ ہوئے۔ لیکن پیغامِ حق کے سمندر کو بھلا کون روک سکتا تھا۔ مکہ میں بھی روز بروز ہدایت پانے والے اور آغوشِ اسلام میں آنے والوں کا اضافہ ہو رہا تھا۔ اسی دوران میں مدینہ سے جس کا نام اس وقت تک یثرب تھا ایک قافلہ حج کے لئے مکہ آیا اور وہ مکہ سے قریب پہاڑ کی ایک گھاٹی میں قیام پذیر ہوا تو حضور اکرمؐ نے ان کے سامنے وعظ فرمایا جس کو سن کر اس قافلے کے چھ آدمیوں نے حضور اکرمؐ کے دستِ مبارک پر بیعت کی سعادت حاصل کی۔ اسی کو بیعتِ عقبۂ اولیٰ کہتے ہیں۔

دوسرے سال مدینہ سے حج کے لئے آنے والوں میں بارہ افراد حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے۔ اب حضور اکرمؐ نے ان بارہ مسلمانوں کے ساتھ اپنے ایک صحابی حضرت مصعب بن عمیرؓ کو مدینہ روانہ کیا کہ یہ وہاں اسلام کی تعلیم کو عام کریں۔ مدینہ کے ان بارہ مسلمانوں کے تعاون و خلوص اور حضرت مصعب بن عمیرؓ کی کوششوں سے مدینہ کے بہت سے قبائل اسلام سے متعارف و متاثر ہو کر حضور اکرمؐ کی نبوت و رسالت پر ایمان لے آئے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تیسرے سال ہی ایام حج میں بہتّر مسلمان مدینہ سے مکہ آئے اور حج کے بعد مخصوص پہاڑی کی گھاٹی میں ان لوگوں نے حاضر ہو کر حضور اکرمؐ کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔ یہی بیعت عقبہ ثانیہ کے نام سے مشہور ہے اور ان لوگوں نے یہ عہد و پیمان کیا کہ۔

"حضورؐ مکہ کی سکونت ترک فرما کر مدینہ کو اپنا مسکن بنالیں تو یہ ہماری بلکہ پورے اہلِ مدینہ کی بڑی خوش قسمتی ہوگی' اور ہم صدقِ دل سے عہد کرتے ہیں کہ جان و مال، اولاد اور زمین سب کچھ اللہ کا دین پھیلانے کے لئے قربان کر دیں گے۔" یہ عہد و پیمان اور بیعت کا شرف حاصل کرنے والوں میں مدینہ کے قبیلہ بنی نجار کا سردار عزیہ بن عمرو اور اس کی نیک دل اور خوش قسمت بیوی حضرت اُم عمارہؓ، ان کے تینوں بیٹے اور ایک بیٹی بھی شامل تھی۔ یہ تھی حضرت اُم عمارہؓ کی اسلام اور بانیٔ اسلامؐ سے وابستگی کی شاندار اور قابلِ رشک ابتدا۔

مدینہ اب مسلمانوں کے لئے دارالعافیت بن گیا تھا۔ لہٰذا حضور اکرمؐ نے صحابہ کرامؓ کو اجازت مرحمت فرمائی کہ وہ مکہ سے ہجرت کر جائیں اس حکم کی تعمیل میں رفتہ رفتہ اکثر صحابہ کرامؓ مدینہ چلے گئے اور پھر ماہ ربیع الاول سنہ ہجری مطابق ماہ ستمبر ۶۲۲ء عیسوی کو احکام الٰہی کے بموجب حضور اکرمؐ اپنے رفیقِ دیرینہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہمراہ مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لے آئے۔ یہاں حضور اکرمؐ کی پذیرائی کرنے والوں میں حضرت اُم عمارہؓ بھی پیش پیش تھیں۔

حضور اکرمؐ کی مکہ سے ہجرت کے بعد قریش کے غیض و غضب میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ اسی وقت سے انھوں نے مدینہ پر حملے کی تیاریاں شروع کر دی تھیں اور مدینہ کے رئیس الانصار عبداللہ بن اُبی کو خط لکھ دیا تھا کہ "یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کر دو، یا مدینہ سے نکال دو۔ ورنہ ہم تم پر حملہ کر کے ختم کر دیں گے اور تمہاری عورتوں کو اپنے تصرف میں لائیں گے۔"

انصارِ مدینہ نے قریش کی ان دھمکیوں کی کوئی پرواہ نہیں کی اور حضور اکرمؐ کے اشارے پر جان پر کھیل جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ آخر رمضان ۲ھ ہجری میں قریش پورے ساز و سامان کے ساتھ مکہ سے مدینہ کی جانب چلے اور مدینہ کے قریب بدر میں خیمہ زن ہو گئے۔ اس لشکر کی تعداد ایک ہزار تھی جس میں مکہ کے بڑے بڑے سردار شامل تھے۔ ادھر مدینہ سے شہنشاہ کونینؐ کی سپہ سالاری میں قریش سے مقابلے کے لئے صرف ۳۱۳ آدمیوں کی جمعیت نکلی۔ لیکن اس مختصر جمعیت کے حوصلے بہت بلند تھے۔ کیونکہ ان کو اپنے رب پر پورا بھروسہ تھا۔ مجاہدین کی خدمت کے لئے حضرت اُم عمارہؓ بھی اس غزوہ میں شریک تھیں۔ جنگ شروع ہوئی تو حضور اکرمؐ نے مہاجرین کا علم حضرت مصعب بن عمیرؓ کو عطا فرمایا۔ کفر و اسلام کی اس اوّلین آویزش کا فیصلہ بہت جلد ہو گیا کیونکہ حق پرستوں کو تائید خداوندی حاصل تھی۔ اللہ کے یہ چند نام لیوا اکثریت پر غالب آ گئے اور فتح و نصرت نے مسلمانوں کے قدم چومے۔ اس غزوہ کے بارے میں خود اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں تفصیل سے ذکر فرمایا ہے۔

کینہ پرور قریش بدر میں مسلمانوں کے ہاتھوں شکست کے بعد خاموش کب بیٹھنے والے تھے۔ ویسے بھی عربوں میں انتقام کا جذبہ سب پر فوقیت رکھتا تھا۔ چنانچہ پورا ایک سال انھوں نے تیاریوں میں صرف کیا اور ۳ھ ہجری میں بڑے اہتمام و انتظام کے ساتھ مکہ سے نکلے اور مدینہ کے قریب پہنچ کر کوہ اُحد پر پڑاؤ ڈالا۔ ان سے مقابلے کے لئے سید کونینؐ کی قیادت میں سات سو صحابہؓ کا مختصر لشکر مدینہ سے نکلا۔ لڑائی کی ابتدا سے پہلے خواتین قریش نے دف پر یہ اشعار پڑھے ؎

هم آسمان کے تاروں کی بیٹیاں ہیں
هم قالینوں پر چلنے والیاں ہیں
اگر تم بڑھ کر لڑو گے تو ہم تم سے گلے ملیں گے
اور پیچھے قدم ہٹایا تو ہم تم سے الگ ہو جائیں گے

طبلِ جنگ بجا، لڑائی کا آغاز ہوا۔ حضور اکرمؐ نے اس غزوہ میں بھی حضرت مصعب بن عمیرؓ کو علم عنایت کیا، جو حضور اکرمؐ سے مشابہ تھے۔ تلواریں اور نیزے فضا میں چمکے اور انسانی خون کی گویا بارش ہو گئی حضرت اُم عمارہ بھی اس غزوہ میں تلوار لئے حضور اکرمؐ کے ساتھ تھیں۔ ان کے بیٹے عبداللہ اور حبیب اور ان کے شوہر عزیہ بن عمیرؓ بھی اسلامی لشکر میں شامل تھے۔ گھمسان کی جنگ جاری تھی اور لڑائی کا پلّہ مسلمانوں ہی کی جانب بھاری تھا۔ خواتین قریش زور و شور سے رجز پڑھ پڑھ کر کفار کے حوصلے بڑھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ جنگ کا فیصلہ ہونا ابھی باقی تھا کہ وہ تیر انداز جن کو مسلمانوں کی پشت کی جانب خود حضور اکرمؐ نے متعین کیا تھا اور فرمایا تھا کہ گو لڑائی فتح ہو جائے تاہم وہ اپنی جگہ نہ چھوڑیں، غلطی

موت

> جب تک میں ہوں موت نہیں ہے اور جب موت آئے گی میں نہ ہوں گا اس طرح میری اور موت کی ملاقات ایک دوسرے سے کبھی نہیں ہوگی پھر کیوں میں اپنی عمر عزیز کو بے فائدہ موت کے خوف سے تباہ کروں۔
> (اپیکورس)

کی بنا پر ان تیراندازوں نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ اور اس کے بعد ہی لڑائی کا نقشہ بدل گیا۔ قریش کے مشہور پہلوان عبداللہ بن قمیہ نے حضرت مصعب بن عمیرؓ علمبردار کو شہید کر دیا تو غل مچ گیا کہ حضور اکرمؐ نے شہادت پائی، کیونکہ مصعب بن عمیرؓ حضور اکرمؐ کے بہت مشابہ تھے۔ ایک طرف خوشی کے نعرے تھے اور دوسری طرف غم کی آہ و بکا۔ مسلمان اب جان دینے کے لئے بے چین تھے، لہذا اور بے جگری سے لڑ رہے تھے۔ لیکن ان کی نگاہیں حضور اکرمؐ کو ڈھونڈ رہی تھیں کہ اچانک ایک صحابی حضرت کعب بن مالکؓ کی نگاہ حضور اکرمؐ پر پڑی۔ حضرت کعب بن مالکؓ نے پکارا "مسلمانو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہاں موجود ہیں۔"

یہ سن کر شمع رسالتؐ کے پروانوں نے ادھر کا رخ کیا۔ کفار نے اس اعلان سے یہ فائدہ اٹھایا کہ زیادہ لوگ اسی جانب ٹوٹ پڑے۔ دونوں طرف سے لڑائی میں پھر ایک نیا جوش و ولولہ پیدا ہو گیا۔ اس وقت حضور اکرمؐ کی حفاظت کے لئے ارد گرد چند ہی مسلمان رہ گئے تھے جن کی تعداد دس سے زیادہ نہ ہوگی۔ انہی میں حضرت ام عمارہؓ ان کے دونوں بیٹے عبداللہؓ اور حبیبؓ اور حضرت ام عمارہ کے شوہر عزیہ بن عمیرؓ بھی تھے۔ کافر یورش کرتے چلے آ رہے تھے کہ ایک کافر نے ایک پتھر پھینک کر حضور اکرمؐ کے مارا جس سے حضور اکرمؐ کا دندان مبارک شہید ہو گیا۔ اسی دوران میں عبداللہ بن قمیہ صفوں کو چیرتا ہوا حضور اکرمؐ کے قریب آگیا اور اس سیاہ بخت نے پوری قوت سے حضور اکرمؐ پر تلوار کا وار کیا۔ اتفاق سے تلوار چہرہ مبارک پر لگی۔ حضور اکرمؐ مغفر پہنے ہوئے تھے جس کی دو کڑیاں چہرہ مبارک میں دھنس گئیں اور خون بہنے لگا۔ حضرت ابی عبیدہ بن الجراحؓ نے ان کڑیوں کو چہرہ مبارک سے نکالا۔ یہ دیکھتے ہی حضرت ام عمارہ تڑپ گئیں اور انہوں نے انتہائی برق رفتاری سے عبداللہ بن قمیہ پر حملہ کیا لیکن وہ زرہ پہنے ہوئے تھا۔ اس لئے محفوظ رہا اور اس نے پھرتی سے پلٹ کر حضرت ام عمارہ پر وار کیا تو ان کے شانے پر شدید زخم آگیا۔ دوسرے مجاہد قمیہ کی جانب لپکے تو وہ تیزی سے بھاگ گیا۔ حضور اکرمؐ نے ام عمارہ کے زخم پر پٹی بندھوائی اور ان کے حق میں اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائی۔ چاروں جانب سے تلواریں اور تیر برس رہے تھے۔ اس عالم میں صحابہ کرامؓ نے حضور اکرمؐ کو حلقہ میں لے لیا اور حضرت ام عمارہؓ سپر بن کر کھڑی ہو گئیں۔ حضور اکرمؐ کی جانب جب کفار بڑھتے تو حضرت ام عمارہؓ تلوار اور تیروں سے ان کو روکتی تھیں۔ اس کشمکش کا حال خود حضرت ام عمارہؓ کی زبانی تفصیل سے سنئے جو اسلامی تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے۔

حضرت ام عمارہ فرماتی ہیں "میں اپنے کاندھے پر مشک لئے مجاہدین کو پانی پلاتی پھر رہی تھی کہ یکایک مسلمانوں میں شکست کے آثار نمایاں ہوئے اور ان کے قدم اکھڑنے لگے۔ کفار نے چاروں طرف سے سخت حملہ کیا تو میں نے مشک کاندھے سے اتار کر پھینکی اور تلوار اور تیر کمان سنبھال کر آنحضرت صلعم کی حفاظت کے لئے کھڑی ہو گئی۔ میرے پاس ڈھال نہ تھی، آنحضرت صلعم نے کسی مجاہد کی جانب اشارہ فرمایا۔ وہ اپنی ڈھال پھینک گیا جو میں نے اٹھا لی۔ میں دشمنوں کے تیروں اور تلواروں کو اسی ڈھال پر روکنے لگی۔ مصیبت یہ تھی کہ مسلمانوں کا لشکر پاپیادہ تھا اور کفار گھوڑوں پر سوار تھے۔ اگر وہ بھی ہماری طرح پیدل ہوتے تو ہم آسانی سے ان کا مقابلہ کر لیتے۔ گھڑ سوار اپنی پوری قوت سے ہمارے اوپر حملہ کرتے تھے۔ پاپیادہ ہونے کی وجہ سے ان کا روکنا ہمارے لئے بہت دشوار ہوتا تھا۔ میں نے تو یہ ترکیب نکالی کہ جب کوئی گھڑ سوار کافر حملہ کرتا تو اس کو روک لیتی اور جونہی وہ آگے بڑھتا پیچھے سے ایک ایسا وار کرتی کہ اس کے گھوڑے کا پاؤں کٹ جاتا اور وہ گھوڑا مع اپنے کافر سوار کے زمین پر گر پڑتا۔ یہ دیکھتے ہی آنحضرت صلعم میرے بیٹے عبداللہ کو آواز دیتے کہ اپنی ماں کی مدد کر۔ وہ فوراً آجاتا اور ہم دونوں مل کر اس کا فوراً خاتمہ کر دیتے۔"

اسی سلسلے میں حضرت ام عمارہ کے بیٹے عبداللہؓ کی زبانی روایت ہے کہ:

"میں اور میری ماں دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

حفاظت کر رہے تھے کہ اچانک ایک مشرک نے پیچھے سے آکر میرے بازو پر ایک تلوار ماری۔ یہ زخم بہت کاری تھا۔ میں نے پلٹ کر اس پر حملہ کیا لیکن وہ بچ کر نکل گیا۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدافعت میں مصروف تھا لیکن میرے بازو کے زخم کا خون بند نہیں ہو رہا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری والدہ حضرت اُم عمارہ کو حکم دیا کہ میرے زخم پر فوراً پٹی باندھی جائے۔ میری والدہ اس مقصد کے لئے اپنے ساتھ بہت سی پٹیاں وغیرہ لائی تھیں۔ میری والدہ نے زخم پر بڑی احتیاط سے ایک پٹی باندھی اور بولیں "جاؤ بیٹا لڑو"۔ میرے زخم سے کافی خون نکل چکا تھا جس کے باعث میں قدرے مضمحل ہو گیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حال دیکھ کر میری والدہ سے فرمایا۔ "اُم عمارہ! ہر شخص میں وہ ہمت اور قوت کہاں ہوتی ہے جو اللہ نے تجھے عطا فرمائی ہے"۔ اتنے میں وہ مشرک جس نے دھوکے سے مجھے زخمی کیا تھا پھر پلٹ کر ہماری جانب آیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دیکھ کر فرمایا۔ "اے اُم عمارہ! وہی شخص جس نے عبداللہ کو زخمی کیا ہے پھر ادھر آ رہا ہے"۔ یہ سنتے ہی حضرت اُم عمارہ نے برق کی سی تیزی کے ساتھ اس مشرک پر تلوار کا وار کیا۔ اس کی ایک ٹانگ کٹ کر علیحدہ ہو گئی۔ اور وہ اسی جگہ زمین پر گر پڑا۔ پھر اُم عمارہؓ نے آگے بڑھ کر اس کا سر کاٹ لیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے اور فرمایا کہ "اُم عمارہ! تجھ کو اللہ تعالیٰ نے بہت ہی تازہ بدلہ عطا کیا"۔

اس غزوہ میں جن خواتینِ اسلام نے شرکت کی ان میں اُم عمارہؓ کے علاوہ اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت اُم سلیمؓ اور حضرت اُم سلیطؓ کے اسمائے گرامی بھی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

میدانِ جنگ سے جن مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے تھے اُن میں سے بعض مدینہ کے قریب تک پہنچ گئے تھے۔ حضرت اُم ایمنؓ جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بچپن میں دودھ پلایا تھا۔ وہ زخمیوں کو پانی پلانے کے لیے مشک لے کر مدینے سے احد کی جانب آ رہی تھیں تو انہوں نے دیکھا کہ لوگ احد کی طرف سے بھاگے آ رہے ہیں۔ حضرت اُم ایمنؓ نے ان سے اس فرار کی وجہ دریافت کی تو ان لوگوں نے میدانِ کارزار میں اپنی پسپائی کا احوال بیان کیا۔ حضرت اُم ایمنؓ نے ان پر ملامت کرتے ہوئے مٹھی میں خاک بھر کر ان کی جانب پھینکی اور کہا۔ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تنہا چھوڑ کر تم لوگ کس طرح چلے آئے، مرد کہلاتے ہو؟ یہ چوڑیاں پہنو۔ گھر کا چولہا چکی سنبھالو اور اپنی تلواریں ہم کو دے دو ہم جا کر لڑیں گے"۔ حضرت اُم ایمنؓ کے طعنے سن کر غیرت آئی اور یہ واپس احد پہنچ کر لڑائی میں شامل ہو گئے۔ لیکن ظہر کے وقت تک لڑائی ختم ہو گئی۔ اس بار نصرت قریش کے حصے میں آئی۔ ستر مسلمانوں کو شہادت نصیب ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر صدیقؓ۔ حضرت عمر فاروقؓ اور دوسرے صحابہ کرام کے ساتھ پہاڑ پر گئے۔ وہاں نماز پڑھائی پھر مدینہ کی جانب روانہ ہوئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی افواہ مدینہ میں پہنچی تو وہاں جو مسلمان عورتیں، بوڑھے بچے اور جوان رہ گئے تھے وہ بے چین ہو گئے۔ حضرت بی بی فاطمۃ الزہراؓ کا حال تو بیان سے باہر ہے۔ وہ دوڑتی ہوئی گئیں تو دیکھا کہ حضور اکرمؐ کے چہرۂ مبارک سے خون ابھی تک جاری ہے۔ حضرت علی مرتضیٰؓ سپر میں پانی لاتے، سیدہ فاطمہ زہراؓ چہرہ مبارک دھوتی جاتی تھیں اور روتی جاتی تھیں۔ خون نہیں تھمتا تھا۔ بالآخر سیدہ فاطمہ زہراؓ نے چٹائی کا ایک ٹکڑا جلا کر زخم میں بھر دیا تو خون فوراً بند ہو گیا۔

حضور اکرمؐ کو حضرت اُم عمارہ کا بہت خیال تھا۔ لہٰذا احد سے مدینہ آنے کے فوراً بعد حضرت عبداللہ بن کعبؓ کو حضرت اُم عمارہ کی خیریت معلوم کرنے کے لئے ان کے گھر بھیجا اور جب حضور اکرمؐ کو معلوم ہو گیا کہ اب ان کی حالت بہتر ہے، زخم مہلک نہیں ہے تب اطمینان ہوا۔ حضرت اُم عمارہ اس زخم کی تکلیف میں پورے ایک سال مبتلا رہیں۔

حضرت اُم عمارہؓ نے غزوہ احد کے بعد حدیبیہ ۶ھ، غزوہ خیبر ۷ھ، عمرۃ القضا ۷ھ اور غزوہ حنین ۸ھ میں بھی حصہ لیا۔

رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ۱۱ھ ہجری کے بعد بھی حضرت اُم عمارہؓ نے جنگ و جہاد میں نمایاں حصہ لیا۔ خاص طور پر حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دورِ خلافت ۱۱ھ تا ۱۳ھ میں جنگ یمامہ میں شجاعت و فراست کے جو بے نظیر کارنامے دکھائے وہ تاریخِ اسلام کا روشن باب ہیں۔

مسیلمہ کذاب "اہلِ یمامہ کا سردار ایک نہایت عیار اور شاطر شخص تھا۔ پہلے وہ مسلمان ہوا پھر دنیا کی جاہ و حشم کے لالچ میں مرتد ہو گیا۔ حضور اکرمؐ کی وفات کے بعد یہ بڑی سرکشی پر اتر آیا۔ اس کا قبیلہ بہت بڑا اور جنگجو تھا۔ تقریباً چالیس ہزار آدمی اس کے زیرِ اثر تھے۔ اس نے اپنی اس قوت کے گھمنڈ میں آکر نبوت کا دعویٰ کر دیا اور سب سے اپنے کو نبی کہلوانے لگا۔ جو اس کو نبی نہ کہتا اس کو طرح طرح سے تکلیف پہنچاتا"۔

حضرت اُم عمارہؓ کے بیٹے حبیب بن زیدؓ عمان سے مدینہ آ رہے تھے کہ راستے میں مسیلمہ کذاب کے آدمیوں نے ان کو گرفتار کر لیا اور مسیلمہ کے پاس

دے گئے۔ مسیلمہ نے ان سے کہا کہ تم گواہی دیتے ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں؟ حبیب بن زید نے کہا کہ "ہاں"۔ مسیلمہ کذاب بولا کہ "کیا تم یہ گواہی دو گے کہ مسیلمہ اللہ کا رسول ہے"۔ حبیب بن زید نے کہا "ہرگز نہیں"۔ اس انکار پر مسیلمہ نے ان کا ایک ہاتھ کاٹ ڈالا۔ پھر یہی سوال کیا۔ حبیبؓ نے پھر وہی جواب دیا تو مسیلمہ نے ان کا دوسرا ہاتھ کاٹ ڈالا۔ الغرض مسیلمہ اپنے جھوٹے دعوے پر اصرار کرتا رہا۔ اور حبیبؓ اپنی صداقت پر قائم رہے۔ آخر مسیلمہ نے ایک ایک کر کے حبیبؓ کے تمام اعضا کاٹ ڈالے۔ اس مرد مومن نے جان دے دی لیکن راہِ تسلیم و رضا سے قدموں کو جنبش نہ ہونے دی۔

حضرت اُم عمارہؓ کو جب اس حادثہ کی اطلاع ملی تو وہ کلیجہ تھام کر رہ گئیں۔ اور انھوں نے عہد کیا کہ اگر مسلمانوں نے یمامہ پر لشکر کشی کی تو اس مرتد ظالم مسیلمہ کذاب کو میں ان شاء اللہ خود اپنی تلوار سے جہنم رسید کروں گی۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جب مسیلمہ کذاب کے ظلم و ستم کی داستانیں سنیں تو خلیفہ نے فوراً فتنہ ارتداد کی بیخ کنی کے لئے حضرت خالد بن ولیدؓ کو چار ہزار فوج کے ساتھ یمامہ روانہ کیا۔ حضرت اُم عمارہؓ کے لئے بہترین موقع ہاتھ آیا تھا۔ یہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور اس معرکہ میں شرکت کے لئے اجازت طلب کی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا: "تم شوق سے جاؤ۔ مسلمانوں کو تمہاری جراتِ جہادی پر فخر ہے"۔

مسلمانوں کا لشکر یمامہ پہنچا۔ مسیلمہ کذاب نے بڑا سخت مقابلہ کیا اور بڑی گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ مسلمان کافی تعداد میں شہید ہوئے۔ لیکن کفار ان سے کہیں زیادہ جہنم رسید ہوئے۔ اس کشمکش اور ہنگامہ میں حضرت اُم عمارہ کی نظریں مسیلمہ کذاب کو ہی ڈھونڈ رہی تھیں۔ اور حضرت خالد بن ولیدؓ بھی اسی مرتد کی فکر میں تھے۔ اس کو پہچاننا نہ حضرت اُم عمارہؓ کے لئے مشکل تھا اور نہ حضرت خالد بن ولیدؓ کے لئے ناممکن۔ کیونکہ اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ایک شیطان مسیلمہ کے تابع ہے۔ اور جب وہ شیطان مسیلمہ کے پاس آتا ہے تو اس کے منہ سے اس قدر کف جاری ہو جاتا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دونوں جبڑوں میں ناسور ہے۔ اور کوئی اچھی بات کرنے کا مسیلمہ ارادہ بھی کرتا ہے تو وہ شیطان اس کو وہ بات کرنے سے روک دیتا ہے۔ لہٰذا اگر تم کو کبھی اس کے خلاف موقع مل جائے تو اس کو ہرگز ہاتھ سے نہ جانے دینا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی روشنی میں حضرت خالد بن ولیدؓ مسیلمہ کذاب پر حملہ کرنے کے لئے زیادہ بے چین تھے اور حضرت اُم عمارہؓ بھی موقع کی تلاش میں مضطرب تھیں۔ اچانک خالد بن ولیدؓ نے آتا

دیکھ کر حملہ کیا کہ مسیلمہ اس کی تاب نہ لا سکا۔ اس ہنگامہ میں حضرت اُم عمارہؓ نے مسیلمہ کو تاک لیا۔ برچھی کی نوک اور تلوار کی دھار سے اپنا راستہ بناتی ہوئی انھیں چیرتی اور خود پر زخم کھاتی ہوئی مسیلمہ کے قریب پہنچ گئیں۔ پورا جسم زخموں سے چور تھا۔ لیکن ہمت و استقلال میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ اتنے میں خالد بن ولیدؓ بھی مسیلمہ کے قریب پہنچ چکے تھے۔ فضا میں بجلی سی چمکی اور دو تلواریں ایک ساتھ مسیلمہ کے اوپر پڑیں۔ وہ شدید طور پر زخمی ہو کر گھوڑے سے نیچے گرا۔ اور نیچے گرتے ہی ایک مجاہد نے مسیلمہ کا سر تن سے جدا کر دیا۔ یہ تھے اُم عمارہ کے بیٹے عبداللہ بن زیدؓ۔ یہ دیکھ کر حضرت اُم عمارہ بہت خوش ہوئیں اور اسی وقت سجدۂ شکر ادا کیا۔ حق کی فتح یقینی تھی جو ہوئی۔ اور اس طرح ایک اور فتنہ کا خاتمہ ہو گیا۔

حضرت اُم عمارہؓ زخموں سے چور تھیں۔ لیکن ان کو کوئی غم نہ تھا۔ شاید ان کے جسم میں فولاد کے تاروں کی رگیں تھیں۔ حضرت خالد بن ولیدؓ حضرت اُم عمارہؓ کی شجاعت اور بزرگی کی وجہ سے ان کا بہت ادب کرتے تھے۔ انھوں نے اُم عمارہؓ کے علاج معالجہ کی جانب کافی توجہ کی اور وہ جلد ہی صحت یاب ہو گئیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دل میں بھی ان کا بڑا احترام تھا۔ اور وہ اکثر خیریت معلوم کرنے خود ان کے گھر آیا کرتے تھے۔

حضرت عمر فاروقؓ کے دورِ خلافت میں ایک مرتبہ مالِ غنیمت میں بہت بیش قیمت کپڑے آئے۔ ان میں ایک دوپٹہ بڑا قیمتی نذرانہ بھی تھا۔ مسئلہ یہ درپیش ہوا کہ یہ بیش قیمت دوپٹہ کس خاتون کو دیا جائے۔ بعض لوگوں کی رائے تھی کہ حضرت عمر فاروقؓ یہ دوپٹہ اپنے فرزند عبداللہؓ کی بیوی کو دے دیں۔ بعض نے مشورہ دیا کہ حضرت علی مرتضیٰؓ کی دختر اور حضرت عمر فاروقؓ کی بیوی حضرت اُم کلثومؓ اس دوپٹہ کی صحیح حقدار ہیں۔ غرض کہ مختلف لوگوں نے مختلف آراء کا اظہار کیا۔ سب کی آراء سننے کے بعد حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا کہ میں تمام خواتین میں سب سے زیادہ اس دوپٹہ کا حقدار اُم عمارہؓ کو سمجھتا ہوں۔ لہٰذا میں یہ دوپٹہ اُم عمارہؓ کو ہی دوں گا۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ ان کی بڑی تعریف فرماتے تھے۔ اس لئے اس تحفہ کا اُم عمارہؓ سے بہتر حقدار اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

حضرت اُم عمارہؓ نے بڑی طویل عمر پائی۔ حضرت عمر فاروقؓ خلیفۂ دوم کے زمانے میں رحلت فرمائی اور جنت البقیع میں مدفون ہوئیں۔

ایک مکتوب پر لفظ سینٹ کی پراسرار کہانی جو بظاہر ڈھلا کر سو سال پرانے تجربے
میں ڈوبی تھی لیکن وہ خود ایک خاص زاویے سے حسن دیکھنے کا اظہار ہے جو ایک معمہ ہے۔ تحریر:

خوشبو



کل رات کھانے کے بعد ایک بار پھر تقاضا شروع ہو گیا کہ کوئی دلچسپ واقعہ سناؤں۔ سارا قصور سعیدہ کا تھا جس نے میری شخصیت کے گرد ان گنت کہانیوں کا جال بن رکھا تھا۔

میری زندگی کا بڑا حصہ سیاحت میں گزرا تھا اور میری آپ بیتی فرضی کہانیوں سے کچھ زیادہ ہی دلچسپ تھی۔

کرسمس کی سرد ہوائیں چلنے لگی تھیں اس لیے ڈرائنگ روم کی کھڑکیاں اور دروازے بند کر دیے گئے، اور دبیز پردے پھیلا دیے گئے۔ سعیدہ نے کمرے کی روشنیاں گل کر دیں۔ صرف ایک نیلا بلب روشن رکھا جس کی وجہ سے ماحول پراسرار ہو گیا۔

"اب شروع کیجئے نا، بہت سوچ چکے آپ!" مجھے خاموش دیکھ کر فوزی نے اپنی بے چینی کا اظہار کیا۔

"آج کون سی کہانی ہو گی، شکار کی؟" زاہد خان نے پوچھا شکار کے وہ دیوانے ہیں۔

"نہیں بھئی آج شکار کی نہیں۔ کوئی دوسرا واقعہ سنائیے ذرا انوکھا ——— لیکن ہو سچا۔" نرگس نے فرمائش کی۔

"اور چونکا دینے والا بھی۔" صفدر نے فوراً لقمہ دیا۔

"ہاں آج چونکا دینے والا واقعہ ہی سنا رہا ہوں عالم ارواح سے متعلق۔" میں نے کہا۔

"ہائے اللہ ——— نہیں ——— مجھے تو روحوں ووحوں سے ڈر لگتا ہے۔" ناظمہ نے ڈر کر کان چھوئے۔ کئی خواتین نے بھی اس کا ساتھ دیا۔

"عجیب بات ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا، جیسے اپنے

آپ سے مخاطب ہوں ــــــــ انسان سے تو ان کی زندگی میں ڈرنا چاہیئے۔ خدا جانے مرنے کے بعد لوگ اس سے اس قدر کیوں ڈرتے ہیں۔" میرا خیال تھا اس پر کوئی ضرور بولے گا لیکن خلاف توقع سب خاموش رہے لیکن میں نے دیکھا سب مجھ سے اور قریب آ گئے جیسے ہمہ تن گوش ہوں۔

"بعض ایسی باتیں ہوتی ہیں جن کا کوئی جواز نہیں ہوتا ان کا سائنسی تجزیہ بھی ممکن نہیں اس کے باوجود ان کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔" میں نے پائپ سلگا کر کہانی شروع کی۔

"بتیس سال پہلے کی بات ہے۔ مجھے وہ تاریخ اور سن اچھی طرح یاد ہے۔ جمعرات تھی اور فروری کی سات تاریخ اور سن ۱۹۴۴ء! ان دنوں میرا قیام حیدر آباد سے پندرہ میل دور حمایت ساگر میں تھا۔ جہاں حکومت نظام کا زرعی فارم تھا۔ یہ جگہ بے حد حسین ہے۔ ایک طرف حسین پہاڑوں کا سلسلہ ہے اور دوسری طرف میلوں پھیلے ہوئے سرسبز لہلہاتے ہوئے کھیت۔ ان کے درمیان ایک خوبصورت ڈاک بنگلہ ہے اور افسروں کے چھوٹے چھوٹے جدید طرز کے بنگلے۔ اس زمانے میں اس روٹ پر بسیں نہیں چلتی تھیں اور میں موٹر کار کی نعمت سے محروم تھا۔ فارم سے تقریباً پانچ میل دور ایک شاہراہ تھی جس پر حیدر آباد اور محبوب نگر کی بسیں آتی جاتی تھیں۔ شہر جانے کے لیے اس پختہ سڑک تک پیدل جا کر بس پکڑنی پڑتی تھی۔

اس جمعرات کو شہر میں چھٹی گزارنے کے بعد میں حمایت ساگر واپس آرہا تھا۔ اتفاق سے راستے میں بس خراب ہو گئی اور دو گھنٹے کی تاخیر سے جب میں منزل سے قریب شاہراہ پر بس سے اترا تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ سنسان سڑک پر میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا تو مجھے وحشت سی ہوئی۔ دور دور تک زندگی کے کوئی آثار نہ تھے۔ سات بجے تھے۔ دائیں طرف بہت دور افق سے قریب ٹمٹماتی ہوئی روشنیاں نظر آئیں۔ یہ حمایت ساگر تھا۔ ہوا میں خاصی خنکی تھی اور آسمان پر ابتدائی دنوں کا چاند بیمار سی روشنی دے رہا تھا۔ شاید چاند کی سات تاریخ تھی۔ میں نے گرم کوٹ کا کالر اوپر اٹھایا اور فیلٹ ہیٹ کو ذرا ترچھا کر کے سر پر رکھا اور اللہ کا نام لے کر اس پگڈنڈی پر ہو لیا جو کھیتوں میں سے گزرتی ہوئی حمایت ساگر تک جاتی تھی۔ اس خاموش راستے پر سے میں کئی بار گزرا تھا لیکن غروب کے بعد یہاں آنے کا پہلا موقع تھا۔ یہ پگڈنڈی تقریباً آدھ میل تک لہلہاتے کھیتوں میں سے گزرتی تھی۔ اس کے بعد گھنے درختوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا جس میں گھرا ہوا ایک پرانا مقبرہ تھا۔ چاندنی راتوں میں گھنے درختوں کے سائے عجیب ڈراؤنی شکلیں اختیار کر لیتے ہیں۔ اور خدا جانے کیوں مجھے یوں لگتا جیسے ہر درخت کی اوٹ میں کوئی بدروح چھپی بیٹھی ہے۔ رات کے وقت اس علاقے کے جنگل سے گزرنے کا میرے لیے یہ پہلا موقع تھا۔

چلتے ہوئے میں نے سوچا کہ اس علاقے میں کتنے مقبرے کھلے ہیں، آخر سب کی حالت اس قدر خستہ کیوں ہے؟ جس مقبرے کے قریب سے مجھے گزرنا تھا وہ اسلامی طرز کا تھا۔ مغلوں کی دکن میں آمد سے پہلے کا تھا اور سنا تھا کہ کسی مشہور درباری مغنیہ کا تھا۔ نام کسی کو معلوم نہیں تھا۔ میں نے ایک بار لوح قبر پر تلاش کرنے کی کوشش کی تو مایوسی ہوئی تھی۔ خوش رنگ قیمتی پتھر لٹیرے لے اڑے تھے اور اب چاروں طرف اونچی اونچی گھاس اگ آئی تھی۔ اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ یہ تقریباً ڈھائی سو سال پرانا ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد میں درختوں کے جھنڈ کے قریب پہنچ گیا۔ چاندنی کی دھیمی سی روشنی میں مقبرے کا مٹیالا گنبد صاف نظر آرہا تھا۔ جوں ہی میں پگڈنڈی پر سے ہو کر کچی سڑک پر آیا یکایک قریب ہی سے مجھے چیخ سنائی دی۔ نسوانی چیخ ... اور میں چلتے چلتے رک گیا۔ میں نے ادھر ادھر غور سے دیکھا تو مجھے مقبرے کی پشت پر دو سائے نظر آئے۔ پھر ایک مرد کی آواز سنائی دی۔

"آواز نکالی تو گلا گھونٹ ڈالوں گا۔" اس کے بعد سسکیاں سنائی دیں۔ یہ سنتے ہی نہ جانے میرا ڈر کہاں غائب ہو گیا اور میری حالت بالکل ویسی ہو گئی جیسے شکار میں جانور کو دیکھ کر تجربہ کار شکاری کی ہوتی ہے مجھ میں ایک عجیب پھرتی آ گئی اور میں دبے پاؤں آگے بڑھا۔ میں نے احتیاط سے جھاڑیاں ہٹائیں تو وہ مجھے نظر آ گئے۔ شکلیں صاف نظر نہیں آرہی تھیں لیکن یہ واضح تھا کہ ایک لمبا تڑنگا مرد ہاتھ میں بڑا خنجر لیے ایک دبلی پتلی عورت کو دھمکا رہا تھا ــــــــ "بول، میرے ساتھ چلے گی یا میں کام تمام کر دوں؟" مرد نے غصہ میں کہا۔

"پاگل نہ بنو، تم بھی زندہ نہ بچ سکو گے۔" عورت نے آہستہ سے جواب دیا لیکن اس کی آواز ڈر سے کانپ رہی تھی۔

"بکواس بند کرو، سیدھی طرح میرے ساتھ چلو۔" یہ کہتے کہتے مرد نے اس کا بازو مضبوطی سے تھام لیا۔ اس کے ساتھ ہی عورت کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ چیخ سنتے ہی جھنجھلا کر مرد نے اس کی گردن پکڑ لی اور اس کا گلا بے دردی سے گھونٹنے لگا۔ میں اس وقت



خدا جانے مجھ میں اتنی ہمت کہاں سے آگئی کہ میں تیزی سے جھاڑیوں سے نکلا اور میں نے مرد کی گردن پر زور سے وار کیا اس کے ہاتھ سے چھرا چھین لیا۔ پہلے تو وہ اس غیر متوقع حملے سے بوکھلا گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ مجھ پر جھپٹا۔ وہ ایک دیوقامت انسان تھا۔ اس نے پلک جھپکتے مجھے دبوچ لیا اور مجھے یوں لگا جیسے میری ہڈیاں پسلیاں چور چور ہو جائیں گی اس سے پہلے کہ میرا دم گھٹ جاتا خدا جانے کیا ہوا کہ یکایک اس کی گرفت ڈھیلی ہوگئی اور وہ لڑکھڑا کر نیچے گرا۔ میں نے سنبھل کر اسے دیکھا تو وہ خنجر صاف نظر آگیا جو ابھی تھوڑی دیر پہلے اس کے ہاتھ میں تھا۔ اب یہ خنجر اس کی پیٹھ میں دھنسا ہوا تھا اور میرے ہاتھوں میں اس کا تازہ گرم خون تھا۔

مجھے یوں لگا جیسے میں کوئی بھیانک خواب دیکھ رہا ہوں آخر میں اس ویرانے میں رات گئے تک کر کیا رہا تھا؟ مجھے تو اس وقت حمایت ساگر میں ہونا چاہیئے تھا —— یہ لاش —— یہ جوان لڑکی —— یہ سب کیا ہے؟ اس پر اسرار ماحول کا فسوں؟ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو وہ لڑکی میرے قریب آگئی اور مجھے سہارا دے کر اٹھایا۔ اس کے ہاتھ بھی خون سے تر تھے ——" چلو بھاگ چلیں، یہ جگہ محفوظ نہیں ہے" اس نے مجھ سے کہا اور وہ مجھے تقریباً گھسیٹتی ہوئی چلنے لگی۔

"کہاں جانا ہے تمہیں؟" اس نے پوچھا۔

"حمایت ساگر" میں نے حواس پر قابو پا کر جواب دیا۔

"یہ کس طرف ہے؟ قلعے سے آگے؟" اس نے یوں پوچھا جیسے پہلی بار نام سنا ہو۔

"خدارا آہستہ چلو!" میری سانس پھول رہی تھی۔

"لیکن ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ اس کے ساتھی کسی وقت بھی آسکتے ہیں" اس نے جواب دیا —— "ان کے آنے سے پہلے میں قلعے پہنچنا چاہتی ہوں"

"کون سا قلعہ؟" اب کے میں نے پوچھا۔

"عجیب احمقانہ سوال ہے، یہاں اور کتنے قلعے ہیں؟" اس نے جواب دیا —— "شاید پردیسی ہو؟"

"نہیں، لیکن بہت دنوں کے بعد دکن آیا ہوں" میں نے جواب دیا۔

"اسی لیے عجیب حلیہ بنا رکھا ہے" یہ کہتے ہوئے وہ رک گئی اور اس نے مڑ کر مجھے غور سے دیکھا۔ پھر اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی —— "پرتگالی؟؟؟" اس نے سہم کر کہا۔

"کیا کہہ رہی ہو؟ یہاں پرتگالی کہاں؟" میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"پھر تمہارا یہ لباس؟ یہ حلیہ؟ یہ ٹوپی؟" اس نے گھبرا کر کہا۔

"خوامخواہ ڈر رہی ہو۔ اب تمہارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ہم آبادی سے قریب ہیں۔ بجلی کی وہ روشنیاں دیکھ رہی ہو؟ وہ ہے حمایت ساگر کا زرعی فارم —— وہاں ٹیلیفون بھی ہے اور جیپ بھی۔ جہاں کہو گی پہنچا دوں گا"

میں نے اسے تسلی دی۔ جب تک میں بولتا رہا۔ وہ آنکھیں پھاڑے مجھے یوں دیکھتی رہی جیسے سخت پریشان ہو۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا:

"بجلی؟ فارم؟ —— جیپ؟ کونسی تاریخ ہے آج؟" اس نے آہستہ سے پوچھا۔ یہ سنتے ہی میں بری طرح سے جھنجلا گیا "خدا کے لیے مذاق چھوڑو۔ اب پوچھو گی کونسی صدی ہے یہ؟"

"جی ہاں —— کون سی صدی ہے یہ؟" اس نے واقعی مجھ سے یہی سوال کیا۔

"بیسویں صدی ہے یہ محترمہ —— یعنی اسلامی چودھویں مہینہ فروری کا یعنی اسلامی رجب کا" میں نے جل کر جواب دیا "اور تاریخ سات ہے"

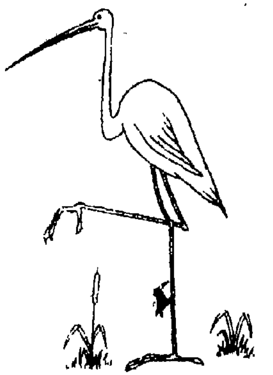
اب کے اس نے فوراً لقمہ دیا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا تو وہ بولی:

"یا اللہ تیرا شکر!"

"مجھے بھی خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے آپ کو آخر زمان و مکان کا احساس ہو ہی گیا" میں نے جل کر کہا۔

"ہاں ہاں ہاں!" اس نے تیزی سے جواب دیا اور فوراً

قبلہ رد ہوگئی اور دونوں ہاتھ اٹھا کر جیسے شکرانے کے انداز میں بولی۔
"تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے یا اللہ کہ کھیل آج آخری بار کھیلا گیا اور میری سزا کے دن پورے ہو گئے۔"
اب کے میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور میں نے جھنجلا کر کہا
"خدا کے لیے یہ ڈراما بند کیجیے محترمہ۔ آپ نے یا تو مجھے احمق سمجھ رکھا ہے یا آپ اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ آپ بہترین اداکارہ ہیں۔ سیدھی طرح میرے ساتھ چلیے، ورنہ میں چلا۔ خدا حافظ!"
یہ کہتے ہوئے میں مڑا اور تیزی سے چلنے لگا۔
"خدا کے لیے رک جاؤ ——— میری بات سنو!" وہ تیزی سے آئی اور اس نے میرا بازو تھام لیا۔ اور میرے شانے سے سر ٹکا دیا عین اس وقت ایک عجیب مست کر دینے والی خوشبو کا سیلاب آیا اور بے اختیار میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اب وہ مجھ سے بے حد قریب تھی اور چاندنی میں اس کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ خوب گورا رنگ، گول چہرہ، ننھی سی ٹھوڑی، ستواں ناک، بڑی بڑی روشن آنکھیں، گھنے سیاہ بال، سڈول سانچے میں ڈھلا حسین جسم ——— !
کیا میں خواب دیکھ رہا تھا۔ ایسی پیاری شکلیں، جوان خوابوں ہی میں نظر آتی ہیں۔ جی چاہا وقت ٹھہر جائے، وہ اسی طرح مجھ سے قریب کھڑی رہے اور یہ حسین لمحے صدیوں کا روپ دھار لیں۔
اس نے یکایک ٹھنڈی سانس لی تو فسوں ٹوٹ گیا اور میں فوراً ہوش میں آ گیا۔
"کہاں پہنچا دوں تمہیں؟" میں نے آہستہ سے پوچھا۔
"کہیں بھی نہیں۔ فی الحال تم جہاں چاہو مجھے لے چلو۔ آج بڑی مبارک جمعرات ہے۔ تم جب تک چاہو میں تمہارے ساتھ رہ سکتی ہوں ——— !"
"اس کے بعد؟" میں نے پوچھا۔
"اس کے بعد میں مہینے بھر کے لیے چلی جاؤں گی۔" اس نے جواب دیا۔
"لیکن کہاں؟" میں نے فوراً پوچھا۔
"اگر بتاؤں تو تم یقین نہیں کرو گے!" اس نے جواب دیا۔
اس کے ساتھ ہی ایک بار پھر میرے چہرے پر ناگواری کے آثار آ گئے اس نے یہ دیکھ لیا اور بولی:
"خدا کے لیے میرا یقین کرو۔ میں واقعی بے حد مجبور ہوں۔ تم نے روحی گلبدن بیگم کا نام سنا ہے؟ ——— نہیں ——— ؟ وہ مقبرہ



دیکھا ہے؟" اس نے مڑ کر ہاتھ کا اشارہ کیا۔
"وہ ہے گلبدن کا مقبرہ! نام اس کا روحی تھا، پر گلبدن بیگم کے نام سے مشہور ہوئی۔ قلعہ گولکنڈہ کی مشہور مغنیہ جو ہزاروں دلوں پر حکومت کرتی تھی، جو جتنی حسین تھی اتنی سنگدل بھی تھی۔ امیر نوجوانوں کو اپنے عشق میں تڑپا کر مارنے میں اسے بڑا مزہ آتا تھا اس خطرناک کھیل سے اسے دیوانگی کی حد تک عشق تھا جس کی بھینٹ جانے کتنے معصوم نوجوان چڑھ گئے۔"
یہ کہتے ہوئے وہ رک گئی۔ ہوا سے بالوں کی ایک باغی لٹ اس کی آنکھ پر آ گئی تھی جسے اس نے ہاتھ اٹھا کر ہٹایا۔
"یہ کہانی مجھے کیوں سنا رہی ہو؟ کیا میں اتنا احمق نظر آتا ہوں؟" میں نے پوچھا۔
"نہیں نہیں، نہیں ——— خدا کے لیے ——— خدا کی قسم بالکل نہیں، میری طرف دیکھو۔ کیا تم نے ایسا لباس دیکھا ہے؟ ان زیورات کو دیکھو جو میرے جسم پر ہیں ——— کیا تمہارے زمانے کی عورتیں ایسے ہی زیور پہنتی ہیں؟ میں نے جو خوشبو استعمال کی ہے کیا تمہارے زمانے میں بھی استعمال ہوتی ہے ———؟ کیا اب بھی تمہیں یقین نہیں کہ میں روحی گلبدن بیگم ہوں ——— قلعہ گولکنڈہ کی مشہور مغنیہ! جس کا جسم اس ڈھائی سو سال پرانے مقبرے میں دفن ہے۔ لیکن جس کی روح سالہا سال سے اس ویرانے میں اپنے محسن کے انتظار میں بھٹک رہی ہے۔ ہر نوچندی جمعرات کو ایک



نہایت بھیانک کھیل یہاں کھیلا جاتا ہے۔ ہر مہینے مجھے اسی طرح بے دردی سے قتل کیا جاتا ہے جس طرح ڈھائی سو سال پہلے ایک رات کر دیا گیا تھا۔ لیکن خدا کی قسم اب یہ کھیل یہاں کبھی نہیں ہوگا۔ جس بزرگ نے اپنے جوان بیٹے کے قتل پر مجھے بددعا دی تھی انہوں نے کہا تھا کہ صدیوں بعد کسی نوچندی جمعرات کو ایک اجنبی آئے گا وہ تمہیں اس عذاب سے نجات دلوائے گا۔ اس دن مہینے کی سات تاریخ ہوگی۔ وہ ایسی باتیں کرے گا جو تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی وہ ایسے کپڑوں میں ہوگا جو تمہیں بے حد عجیب لگیں گے۔ آج وہ پیش گوئی پوری ہو گئی۔ اب مجھے سکون مل گیا ہے۔ خدا کے لیے مجھے یوں پھٹی پھٹی نگاہوں سے نہ دیکھو۔ آج بڑی مبارک رات ہے۔ آج جب تک تم چاہو میں تمہارے ساتھ رہ سکتی ہوں۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے بڑے پیار سے مجھے مسکرا کر دیکھا اور معاً مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا سر چکرا رہا ہے۔ جیسے یہ زمین یہ آسمان، اس کا حسین چہرہ، سب کچھ گردش میں آگیا ہے۔

میں رک گیا کیونکہ میرا پائپ بجھ گیا تھا۔ میں نے جیب میں سے لائٹر نکال کر پائپ جلانے کی کوشش شروع کر دی۔ سب خاموش دم بخود مبہوت مجھے دیکھ رہے تھے۔ چند لمحے بڑی پراسرار خاموشی چھائی رہی۔

پھر سعیدہ نے آہستہ سے پوچھا ”پھر کیا ہوا؟“ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

”پھر شاید میں بے ہوش ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو میں حمایت ساگر کے ڈاک بنگلہ میں تھا۔ اس رات جب میں واپس نہ پہنچا تو دوستوں نے گھبرا کر شہر ٹیلیفون کیا۔ وہاں سے اطلاع ملی کہ میں تو حمایت ساگر چلا گیا تھا۔ لوگ میری تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ ڈاکٹر قادر الدین کا کہنا ہے کہ انہوں نے مجھے سب سے پہلے دیکھا۔ میں مقبرے کے قریب پڑا تھا۔ انہوں نے سفید کپڑوں میں ملبوس کسی عورت کو بھی دیکھا لیکن جب وہ قریب پہنچے تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ ہاں کسی مخمور عطر کی مست کر دینے والی خوشبو مجھ میں بسی ہوئی تھی۔“

ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ اب سارے مہمان مجھ سے اور قریب آگئے۔

”آپ بار بار چپ کیوں ہو جاتے ہیں؟ پھر کیا ہوا؟“ ناز نے بے چینی سے پوچھا۔

”پھر میں پاکستان آگیا۔ لیکن وہ اپنے دعوے پر قائم ہے۔ شاید قیامت تک قائم رہے۔“ میں نے آہستہ سے جواب دیا۔

”ہوتا کیا ہے؟ کیا اب بھی وہ تمہیں نظر آتی ہے؟“ زاہد خان نے پوچھا۔ ان کے لہجے سے ظاہر تھا کہ وہ میری کہانی کو من گھڑت سمجھ رہے تھے۔

”یہ راز کی بات ہے ایسی باتیں بھری محفل میں نہیں کی جاتیں ہاں بھئی سعیدہ ——، جائے ایک بار پھر کافی کا دور، بارہ بجے سے پہلے میں سونا چاہوں گا۔“

یہ کہتے ہوئے میں نے تھکی تھکی سی جماہی لی۔ اس سے پہلے کہ سعیدہ کافی کا انتظام کر کے آتی۔ ناظمہ کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی وہ منہ پر ہاتھ رکھے پھٹی پھٹی نگاہوں سے بڑی کھڑکی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ سب کی نگاہیں بے اختیار اس طرف گئیں۔ اس کا پردہ ہٹا ہوا تھا اور ایک پٹ کھلا ہوا تھا۔

”شاید جلدی میں کھلا رہ گیا۔“ یہ کہتے ہوئے زاہد خان اٹھے۔

”نہیں! میں نے اپنے ہاتھ سے اچھی طرح بند کیا تھا۔“ سعیدہ بولی اور تیزی سے اٹھ کر دریچے تک گئی۔ دوسرے لمحے اس کی ہلکی سی چیخ سنائی دی تو سب اس کی طرف لپکے۔ وہاں کچھ نہ تھا لیکن باہر سے کسی انجانے مست کر دینے والے عطر کی خوشبو آرہی تھی۔ جو دیکھتے ہی دیکھتے کمرہ میں پھیل گئی۔

”میں نے وہاں اس درخت کے نیچے اسے دیکھا —— سفید کپڑوں میں تھی!“ سعیدہ نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

سب خاصے پریشان لگ رہے تھے۔ لیکن اس ہنگامے میں کسی نے غور نہیں کیا کہ واقعی آج نوچندی جمعرات تھی اور اتفاق سے تاریخ بھی سات ہی تھی!!!

ایک گولڈ میڈلسٹ جس کی شخصیت کا سونا بالکل کھرا ہے

نجمہ قریشی

چمکتی آنکھوں والی من موہنی لڑکی

جو

پاکستان کی معیشت کا ایک ستون سنبھالے کھڑی ہے

سادہ سادہ مگر دلکش روپ .....

ہونٹوں پر بکھری ہوئی چمکدار مسکراہٹ ....

اور آنکھوں میں ذہانت کی خوب صورت دلکشی لئے وہ شخص

لڑکی آپ کی منتظر ہے .... جی ہاں صرف آپ کی .....

اور بہت پہلے اگر آپ نے نہیں دیکھا تو آئیے میرے ساتھ آئیے

میں آپ کو اس سے ملواتی ہوں۔ مسلم کمرشیل بینک بہادر آباد برانچ

کی جنرل مینیجر کی سیٹ پر بیٹھی ہوئی یہ من موہنی لڑکی نجمہ قریشی کے نام

سے پہچانی جاتی ہے۔

نجمہ قریشی اس عہدے پر ۱۸ اکتوبر ۱۹۷۶ء سے فائز ہیں۔

۱۸ اکتوبر کا یادگار دن (کہ اس دن سے پہلے پاکستان میں صنف خواتین

کا آغاز ہوا تھا) نجمہ کے لئے بھی یادگار دن بن گیا ہے۔ نجمہ اپنی مخصوص

مسکراہٹ کے ساتھ ہمیں بتا رہی تھیں "یقین کیجئے مجھ سے بھی اس



سیٹ پر بیٹھ کر اس وقت یہ کام کرتے ہوئے بڑی فرحت محسوس ہوتی ہے۔ میں کبھی مشکلات سے نہیں گھبراتی۔ میں نے ہر جگہ خود اعتمادی سے کام کیا ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے ہر جگہ کامیاب کیا۔"

"اچھا نجمہ آپ یہ بتائیں کہ بینک میں آپ کا تقرر منیجر کے عہدے سے ہی ہوا تھا یا آپ نے پروموشن حاصل کی ہے؟" میں نے نجمہ قریشی سے پہلا سوال کیا تو وہ نرم نرم لہجے میں الفاظ پروتے ہوئے بولیں۔

"نہیں عرصہ تقریباً آٹھ سال سے بینک میں کام کر رہی ہوں۔ پہلے اکاؤنٹنٹ تھی اب منیجر بن کر اس نئی برانچ میں آئی ہوں۔ دراصل میں نے ۱۹۶۹ میں بینک جوائن کیا تھا۔ میں نے جغرافیہ میں ایم اے کیا ہے اور پھر چونکہ میں گولڈ میڈلسٹ تھی اس لئے نوکری ملنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی۔"

"جی ۔۔۔ آپ نے گولڈ میڈل لیا تھا؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا تو وہ زندہ دلی سے ہنستے ہوئے بولیں۔

"جی ہاں میں نے گولڈ میڈل لیا ہے۔ خدا کا کچھ کرم ہی تھا کہ میں ابتدائی کلاسوں سے لے کر آخر تک فرسٹ آتی رہی ہوں۔" نجمہ قریشی کی آواز میں خوشیوں کے جیسے دبیے سُر اُٹھنے لگے تھے۔ میں نے غور سے گولڈ میڈل لینے والی لڑکی کو دیکھا جس کی شخصیت کا سنہالی نکھرا تھا۔ مسز شیلے سے پہلے میں بتا رہی تھی کہ ویسے میں نے کبھی یہ نہ سوچا تھا کہ میں کسی کمرشل بینک میں منیجر بنوں گی حالانکہ ہمارا گھرانہ بینکرز کا گھرانہ ہے۔ میرے دونوں بھائی باہر ہیں وہ بھی بینکر ہیں۔ میری دونوں بہنیں قریشی اور شہلا قریشی یو بی ایل کمپیوٹرز میں ہیں۔" وہ بولتے بولتے ایک ذرا رکیں تو میں نے پوچھ لیا کہ

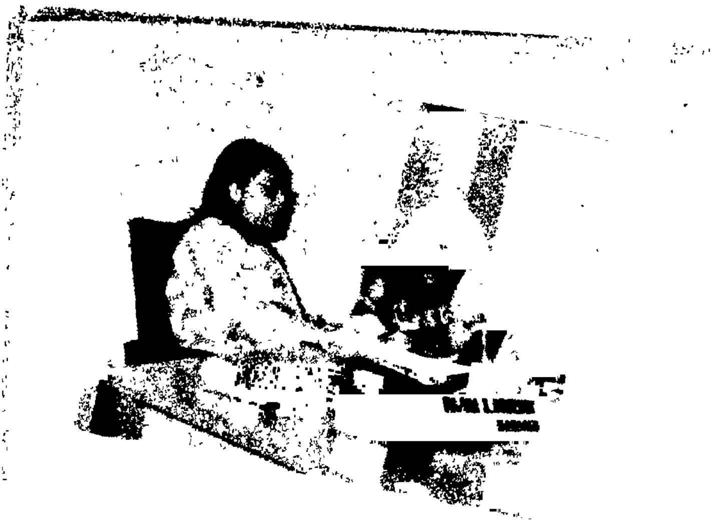
"نجمہ اگر آپ آج منیجر نہ ہوتیں تو کیا ہوتیں؟"

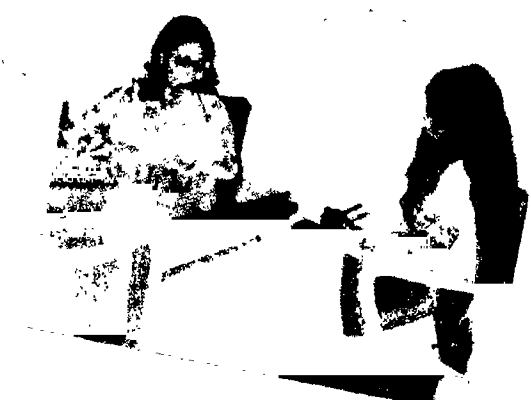
"یقیناً پھر پروفیسر ہوتی۔ کیونکہ میرے ایم اے کا رزلٹ آنے کے فوراً بعد ہی مجھے یونیورسٹی کی طرف سے آفر ہوئی۔ لیکن میں نے رد کر دیا تھا۔ اور پھر مجھے مہینے میں نوکری مل گئی پہلے اسٹیٹ بینک۔ ٹریننگ لی اور پھر کام شروع کر دیا۔"

"آپ کا کیا خیال ہے نجمہ کہ اس شعبے میں مزید خواتین کو آنا چاہئے اور یہ کہ ان کے لئے یہ لائن یا شعبہ کیسا ہے؟ وہ یہ کام پوری ذمہ داری سے کر سکتی ہیں یا نہیں؟"

"کر سکتی ہیں، جی بالکل کر سکتی ہیں بلکہ کر رہی ہیں۔ پہلے کی بہ نسبت ہمارے یہاں کے بینکوں میں خواتین کی تعداد خاصی بڑھ گئی ہے۔"







منیجر کی پوسٹ پر صرف کراچی میں چار خواتین ہیں۔ مجھ سمیت تین جنرل برانچ میں ایک اور ایک لیڈیز برانچ میں۔ دوسرا سوال یہ کہ ان کے لئے یہ شعبہ کیا ہے۔ تو میں تو سمجھتی ہوں کہ ان کے لئے تو یہ شعبہ بہت اچھا بہت بہتر ہے۔ یہاں عزت ہے، تحفظ ہے اور معاشی طور پر خاص استحکام دیتی ہے بینک کی نوکری، ہمارے ملک کی خواتین خاصی ذمے دار ہیں، [illegible] آ رہی ہیں۔"

• جی ہاں آپ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ اچھا نجمہ آپ یہ بتائیں کہ جب شروع شروع میں آپ یہاں آئیں تو کوئی پریشانی تو محسوس نہیں ہوئی۔؟"

• جی نہیں میں نے تو کوئی پریشانی محسوس نہیں کی۔ شاید اس لئے کہ میرے پاس خاصا تجربہ تھا دوسرے میں نے اچھے مخلوط تعلیمی اداروں سے تعلیم حاصل کی، پھر میرا اسٹاف بہت اچھا ہے، مجھ سے تعاون کرتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ کیونکہ میں بینک ڈرانے دھمکانے والی

بارعب اور نخرہ دکھانے والی منیجر نہیں ہوں۔ ہم سب دوستوں کی طرح کام کرتے ہیں۔ اگر ان لوگوں کو کوئی کام سمجھ میں نہیں آتا تو میں بتا دیتی ہوں ۔۔۔"

"اچھا تحریہ بتائیں کہ آپ کو آپ کے کسٹمرز نے تو پریشان نہیں کیا۔۔؟"

"نہیں عرشی! ایسی کوئی بات نہیں ہوتی۔ میں تو اپنے کسٹمرز کے تعاون کی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میری برانچ کو اہمیت دی اور میرے کہنے پر اپنے اکاؤنٹ یہاں زیادہ سے زیادہ تعداد میں کھولے سچ پوچھو تو یہ بہادر آباد کا علاقہ بہت اچھا ہے۔ یہاں کے لوگ روشن خیال اور مہذب ہیں، شاید اسی لئے مجھے کبھی کسی کسٹمر کی وجہ سے کوئی پریشانی نہیں اٹھانی پڑی۔ ویسے میں آپ کو بتا دوں کہ مجھے پہلے مہینے کا ٹارگٹ چھ لاکھ دیا گیا تھا اور آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ میرے پہلے دن کا کیش ساڑھے سات لاکھ ہوگیا تھا۔"

"بہت خوب۔ تحریہ آپ تو تعلیمی میدان کی طرح یہاں بھی آگے ہی رہیں۔ اچھا یہ بتائیں کہ آپ کے یہاں آنے والے کسٹمرز میں خواتین کی تعداد زیادہ ہے یا مردوں کی؟"

"دونوں کی تعداد اب تک تو برابر ہی تھی، لیکن اب خواتین کی تعداد مردوں سے کچھ بڑھتی جا رہی ہے۔ جس تیزی سے خواتین کے علم میں یہ بات آ رہی ہے کہ ایم سی بی بہادر آباد برانچ کی منیجر ایک خاتون ہے اسی تیزی سے خواتین کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ وہ میرے پاس آنے میں کوئی گھبراہٹ یا پریشانی محسوس نہیں کرتیں اور پھر جب ان کا کام سکون کے ساتھ ہو جاتا ہے تو وہ مطمئن ہو کر لوٹ جاتی بلکہ اگلی دفعہ اپنی کسی دوست یا رشتہ دار کو ساتھ لے کر آتی ہیں۔"

"لیکن کبھی ایسا تو نہیں ہوا کہ مرد یعنی کسٹمر آپ کے پاس آیا اور پھر ایک دفعہ یہاں آکر یوں ہوا کہ اسے صبح و شام ایم سی بی برانچ کی یاد ستانے لگی اور پھر روز ہی کچھ لینے کچھ دینے کی ضرورت محسوس ہونے لگی؟" میں نے شرارت سے ہنس کر تحریہ سے پوچھا تو وہ بے ساختہ مسکرا پڑی۔ میرے سوال کا مطلب سمجھ کر وہ اعترافیہ جملے میں آہستہ سے بولیں:

"ہاں! ایسا بھی کبھی کبھی ہوتا ہے۔ لیکن پھر ہمارا رویہ خشک اور لہجہ سخت ہو جاتا ہے۔ اس لئے یہ ضرورت جلد ہی ختم ہو جاتی ہے۔"

"اچھا تحریہ! فرض کیجئے کہ خدانخواستہ آپ کے بینک پر ڈاکہ پڑ جائے تو ۔۔۔۔؟" میں نے خطرناک سا سوال کیا تو تحریہ نے اپنی نرمی کو آہستہ آہستہ سمیٹتے ہوئے بڑے سکون سے کہا۔

"میں ذہنی طور پر تیار ہوں۔ دراصل آج کی دنیا میں بینکوں پر اس تعداد ڈاکے پڑتے ہیں کہ ہر بینک کا منیجر اس بارے میں کبھی نہ کبھی ضرور سنجیدگی سے سوچنے لگتا ہے۔ اور اگر خدانخواستہ کبھی میرے بینک پر ڈاکہ پڑے تو میں بھی وہی کروں گی جو ایک مرد منیجر کر سکتا ہے ظاہر ہے میں اپنے بینک کے مفاد اور اپنے کھاتے داروں کی محنت کی کمائی کی حفاظت ہی کو اولیت دوں گی۔"

"تحریہ آپ یہ بتائیں کہ اگر دوسری لڑکیاں اس شعبے میں آنا چاہیں تو انہیں کیا کرنا ہوگا؟"

"گریجویشن کرنا تو بہرحال ضروری ہے اور پھر اس کے بعد بینکنگ کے امتحانات ہوتے ہیں۔ خواہشمند خواتین اس امتحان میں شریک ہوں محنت کریں اور یقیناً وہ بینک میں اچھا عہدہ حاصل کر سکتی ہیں۔ ذاتی طور پر میں محنت کو اولیت دیتی ہوں۔ محنتی آدمی ہر جگہ اپنا مقام بنا لیتا ہے۔"

"لیکن کہیں کہیں مقام بنانے کے لئے کسی سورس یا سفارش کی ضرورت بھی تو پڑتی ہے۔ کہیں بینکنگ میں بھی ۔۔۔۔؟"

"نہیں عرشی ہمارے یہاں محنت کی بنیاد کا اہمیت ہے آپ مجھے دیکھیں میں یہاں اس کرسی تک اپنی محنت اور قابلیت سے پہنچی ہوں۔ میرے ہاتھ میں سفارش کی لاٹھی تھی، نہ خدانخواستہ رشوت کا طمنچہ، ہاں میرے علم کا نور تھا، ذہن کی دولت تھی، محنت کی کنجی تھی اور ابھی تو ابتدا ہے دیکھئے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں؟"

"ہاں تحریہ خدا آپ کو مزید کامیابیاں دے۔ آپ یہ بتائیں کہ یہاں اپنے فرائض انجام دینے کے بعد آپ کو گھر کے لئے یا اپنے مشاغل کے لئے وقت مل جاتا ہے؟"

"جی ہاں تھوڑا بہت تو مل ہی جاتا ہے۔ آجکل میں ڈرائیونگ سیکھ رہی ہوں۔ اس لئے دو تین گھنٹے ڈرائیونگ پر نکل جاتے ہیں۔ دراصل نت نئے کھانے پکانے اور نئی ڈشیں تیار کرنے کا بہت شوق ہے اور پھر مطالعے کی تو عادت پڑ گئی ہے۔ جب تک کچھ پڑھ نہ لوں نیند نہیں آتی۔"

"کیا کیا پڑھتی ہیں آپ؟"

"یہی ناولیں، رسالے اچھی کتابیں۔ مجھے رضیہ بٹ، سلمیٰ کنول وغیرہ بہت پسند ہیں۔ رسالے بھی شوق سے پڑھ لیتی ہوں اور خاص طور پر آپ کی دوشیزہ۔۔۔۔"

"جی ذرا یہ بتائیے کہ ہماری دوشیزہ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

"بس مت پوچھئے عزیزہ! اس کی صحبت کی عادت پڑ گئی ہے۔ پہلے پہل تو ایک دوست سے قرض لے کر پڑھی اور پھر اس کے بعد یوں ہوا کہ خود خرید کر پڑھی اور نہ ملی تو بیزار ہو کر اسے ڈھونڈتے پھرے۔ پیچ سلسلے وار ناول تو تڑپا دیتا اگر یہ مجھے پچھلوں کی معنو سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ قسمت کی خوبی دیکھئے کہ خود میرے پاس آگئیں۔ آپ کو یقین نہیں آئے گا کہ میں دو دفعہ بازار جا کر پچھلے پچوں کو مکمل کتابی صورت میں ڈھونڈ چکی ہوں لیکن ہر بار ناکامی ہوئی۔ یہ بتائیے آپ کا ناول کب مارکیٹ میں آ رہا ہے۔ میری دو قسطیں رہ گئی ہیں۔" نجمہ نے بے چین ہو کر پوچھا تو میں ہنس پڑی۔

"دیکھیں نجمہ ابھی تو اس کی دو قسطیں باقی ہیں۔ جب دوشیزہ میں قسطیں پوری ہو چکیں گی تب یہ ناول چھپ سکے گا لیکن جناب آپ یہ بتائیں کہ آپ کو جو یہ ناول، افسانے، رسالے وغیرہ پڑھنے کا اس قدر شوق ہے تو یقیناً آپ کو شاعری سے بھی دلچسپی ہو گی۔" میں نے ٹھنڈے کوک کی بوتل ہاتھ میں لیتے ہوئے پوچھا تو نجمہ اعتراف کے طور پہ سر ہلاتے ہوئے بولیں:

"میں اکثر اپنی ڈائری پہ اپنے پسندیدہ شعر لکھتی رہتی ہوں، مجھے ہلکے پھلکے شعر بڑے اچھے لگتے ہیں۔ ساحر اور جان نثار اختر تو میرے من پسند شاعر ہیں۔"

"چلئے تو پھر کوئی شعر ہی سنا دیجئے۔" میں نے فرمائش کر ڈالی۔

"شعر سناؤں...... کوئی پسندیدہ شعر......؟" نجمہ نے اپنی گھومنے والی کرسی پہ آہستہ آہستہ جھولتے ہوئے ذہن کے کواڑ کھولتے ہوئے ایک ساعت کو آنکھیں موندیں اور پھر ایک دم بولیں۔ "سنئے یہ شعر مجھے خاص پسند ہے ؎

زمانہ دوست ہے کس کس کو یاد رکھو گے
خدا کرے کہ تم کو مجھ سے دشمنی ہو جائے"

"خدا کرے کہ تم کو...... مجھ سے دشمنی ہو جائے بہت خوب نجمہ، بڑا خوبصورت شعر سنایا آپ نے۔ اس شعر پہ مجھے دوستوں کی یاد آگئی۔ مجھے لگتا ہے آپ کے بہت سارے دوست ہوں گے؟"

"جی ہاں آپ نے ٹھیک جانا میرے بہت سارے دوست ہیں۔ بہت اچھے پیارے......"

"لیکن کبھی آپ کی ان سے لڑائی ہوئی؟" میں نے بیچ میں پوچھ بیٹھی۔

"نہیں، میری لڑائی بہت ہی کم کسی سے ہوتی ہے کیونکہ مجھے غصہ بہت کم آتا ہے۔ اس لئے میں لوگوں کی باتیں ٹال جاتی ہوں اور پھر اگر مجھے غصہ آتا ہے تو بہت زور دار آتا ہے۔ اس لئے میرا اسٹاف یا میرے دوست مجھے غصہ آنے ہی نہیں دیتے اور اگر آ بھی جائے تو وہ میری باتیں برداشت کر لیتے ہیں۔"

"اچھا نجمہ آپ کیا ہمارے دوشیزہ کے قارئین کو کوئی پیغام دینا چاہیں گی؟"

"جی ضرور! مجھے یقیناً خوشی ہو گی کہ میرا پیغام دوشیزہ کے قارئین تک پہنچے، جس کی ایک قاری میں خود بھی ہوں، عزیزی میرا پیغام یہ ہے کہ ہم سب کو آگے بڑھنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ ہمارا معاشرہ آگے بڑھ چکا ہے۔ اور ہم خواتین کو اس معاشرے میں اپنے آپ کو منوانا چاہئے ہمیں ہر فیلڈ میں، ہر ادارے میں، ہر شعبے میں آگے بڑھ کر کام کرنا چاہئے اگر ہمارے پاس قابلیت اور جوہر ہے تو ہم پیچھے کیوں رہیں۔ پھر ہم آگے بڑھیں کچھ حضرات ہمیں راستہ دیں۔ یوں ہم عورت اور مرد شانہ بشانہ ہو کر اس ملک کی خدمت کریں۔ کیونکہ ہمارا یہ ملک بڑا غریب ہے اور اس غریب ملک کے ہر فرد کی ذمے داری ہے کہ وہ اپنے فرائض صحیح طور پر انجام دے۔" نجمہ قریشی اپنے چہرے پر خلوص کی چمک لئے میٹھے میٹھے دردبھرے لہجے میں بول رہی تھیں۔ ان سے اجازت لے کر واپس آتے ہوئے مجھے آپ ہی آپ مخدوم کا ایک شعر یاد آگیا ؎

اخلاص سے ملنے والوں کے اطوار نرالے ہوتے ہیں
باتوں میں حلاوت ہوتی ہے، آنکھوں میں اجالے ہوتے ہیں

"دوشیزہ" کی وین میں بیٹھتے ہوئے میں نے سوچا کہ نازک سے فریم کی عینک لگانے والی نجمہ قریشی کی شخصیت کا فریم کتنا مضبوط اور کتنا اہم ہے۔ خدا اس فریم کو ہمیشہ سلامت رکھے تاکہ اس غریب ملک کی دوسری بیٹیوں کو بھی نجمہ قریشی بننے کا شوق ہو۔

آج کے پیچیدہ سماجی ڈھانچے میں مناسب رشتوں کی تلاش کا مثبت حل

آئیڈیل کی تلاش

ذاکرہ سمیع خان

تصویر تمنا

میرا آئیڈیل پڑھا لکھا، باوقار شخصیت کا مالک ایک ایسا نوجوان ہے جو خوش اخلاق، خوش لباس اور مستحکم شخصیت رکھتا ہو۔ مالی خوشحالی اور بدحالی سے قطع نظر صرف خلوص، اعتماد اور صاف گوئی کی متلاشی ہوں۔ ذاتی کردار اور ماضی خواہ کیسا ہی کیوں نہ ہو جھوٹ کے سوا تمام خامیوں کو نظر انداز کر دوں گی۔ بشرطیکہ آئندہ شریفانہ زندگی گزارنے کا یقین دلائے۔ میں ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں خوش شکل، خوش لباس، خوش اخلاق اور سلجھے ہوئے خیالات کی مالک دوشیزہ ہوں۔ "نازیہ حسن خان، لاہور"

وفا کا جال

میرا آئیڈیل خوب صورت اور دراز قد کا ۲۵ سالہ شوخ و شریر نوجوان ہے جو کسی اعلیٰ عہدے پر فائز ہو۔ ڈاکٹر یا انجینئر ہو تو زیادہ بہتر ہے میں سترہ سال کی شوخ و شریر، اسمارٹ اور خوبصورت لڑکی ہوں اگر مجھے میرا آئیڈیل مل جائے تو سمجھوں گی میں اپنی خوش نصیبی سمجھوں گی۔

"مس نیلوفر، کراچی"

قندیل محبت

مجھے اپنی سہیلی کے لئے ایک شریک سفر کی تلاش ہے۔ (جو)

سید، نیک سیرت اور خوش شکل ہو، تعلیم کم از کم بی اے ہو، خواہ کسی پیشے سے بھی منسلک ہو مگر تنخواہ اچھی ہونی چاہئے۔ میری سہیلی سید خاندان کی ایف اے سی بی، صاف رنگت اور پرکشش شخصیت کی مالک ہے عمر تقریباً ۲۵ سال ہے۔ بہت معصوم، صابر، صاف گو، شریف، سلجھی ہوئی طبیعت کی مالک، سلیقہ شعار اور امور خانہ داری میں ماہر ہے۔ شریف اور پڑھے لکھے گھرانے میں رشتہ کرنے کے متلاشی مہذب، صاف گو اور سلجھے ہوئے لوگ رجوع کریں۔ "فوزیہ ہاشمی، گوجرانوالہ"

جلوۂ ایثار

میری سہیلی کی شادی ڈھائی سال قبل ایک بہت بڑے افسر کے ساتھ ہوئی۔ لیکن اس کے شرابی اور گندے کردار کی بنا پر نباہ نہ ہو سکا۔ بالآخر دو پیارے پیارے بچوں کی ماں کو طلاق ہو گئی میری سہیلی کی عمر ۲۱ سال ہے، دراز قد، خوب صورت، نیک سیرت، تعلیم یافتہ ذہین اور اسمارٹ لڑکی کے لئے ایسے ساتھی کی ضرورت ہے، جو اس کے ماضی کے سب دکھ بھلا دے۔ بچوں کو حقیقی باپ کا سا پیار دے۔ تنخواہ معقول ہو۔ بے اولاد اور رنڈوے بھی رجوع کر سکتے ہیں۔

"مسز ساجدہ اقبال، ملتان"

پیار کی لگن

میں یوپی کے ایک معزز سید گھرانے کی دوشیزہ ہوں۔ میری عمر ۱۸ سال ہے۔ صاف رنگ اور دراز قد ہوں۔ چہرے پر ہلکے ہلکے چھیپ کے داغ

☆

ان کالموں میں آئیڈیل کی متلاشی خواتین کے خطوط اور ان کے رشتوں کے بارے میں ان کی آرزو (پیشکش) شائع کی جاتی ہیں۔ وہ خطوط شائع نہیں کئے جاتے جن میں مکمل پتے درج نہیں ہوتے۔ خواتین کے پتے ان کی اجازت کے بغیر ظاہر نہیں کئے جاتے۔ (ادارہ)

ہیں۔ میرا آئیڈیل نیک دل، دراز قد اور قبول صورت نوجوان ہے جو درد مند ہو اور مجھے خوشیاں دے سکے۔ آمدنی کم از کم ۸۰۰/- روپیہ اور عمر ۳۰-۳۵ کے درمیان ہو۔ "آنسہ انجم۔ کراچی"

امبر ودان

میرا آئیڈیل ڈاکٹر ہے جو خوب صورت، دراز قد اور اسمارٹ ہو۔ میں گول چہرے، بڑی بڑی خوب صورت آنکھوں والی حسین دوشیزہ ہوں۔ مجھے تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق ہے۔ مستقبل میں وکیل بننے کا ارادہ رکھتی ہوں۔ میری عمر ۱۹ سال ہے۔

"شاہانہ احمد، کراچی"

خوشبوئے گل ستی

میری لڑکی جس کی عمر ۲۲ سال ہے۔ نماز روزے کی پابند، امور خانہ داری سے واقف، معقول ناک نقشہ، بہت ہی حساس ہے۔ چاہتی ہوں کہ اسے ایسا ہمسفر مل جائے جو تعلیم میں اس کا ہم پلہ یعنی ایم اے ہو۔ دولت کی ہوس نہیں، متوسط طبقے سے ہمارا تعلق ہے۔ لڑکی ہر طرح زندگی بسر کرنے کی عادی ہے پیسہ ہو یا نہ ہو میں صرف ذہنی ہم آہنگی اور تعلیم چاہتی ہوں۔ جو نوجوان ان شرائط پر پورا اترے وہ قابل قبول ہوگا۔

"مسز قیصر سجاد، کراچی"

اَشکوں کا ہجوم

میرا آئیڈیل پاک فضائیہ کا شاہین ہے۔ جو کھلتے رنگ، دراز قد اور خوب صورت وکشش کا مالک ہو۔ جو نہ زیادہ شوخ ہو اور نہ زیادہ سنجیدہ ہو۔ گھومنے پھرنے کا شوقین اور باذوق ہو۔ میری عمر ۱۹ سال ہے۔ دل کی اچھی اور پاکیزہ خیالات کی مالک ہوں۔ میرا گھر ایک مثالی گھر کا نمونہ ہوگا۔ جہیز کے لالچی حضرات زحمت نہ کریں۔

"ن، ب، کراچی"

روح کی پیاس

میری ۱۸ سالہ سہیلی جو گورے رنگ کی اسمارٹ اور پرکشش دوشیزہ ہے۔ ایسے نوجوان سے شادی کی آرزومند ہے جو ہینڈسم اور پرکشش ہو۔ عمر ۲۲-۲۶ سال ہو۔ بزنس میں ہو اور پیپلز پارٹی سے تعلق ہو۔ حضرات تحریر کرسکتے ہیں۔ "مس روشنی، راولپنڈی"

حسین آرزو

میرا آئیڈیل شاید دنیا کی تمام لڑکیوں کے آئیڈیل سے مختلف ہو۔ ایک معمولی پڑھا لکھا یا ان پڑھ بزنس مین جسے ایک باشعور اور مذہبی تعلیم یافتہ بیوی کی تلاش ہو جسے تعلیم یافتہ لوگوں سے پیار ہو میں پوسٹ گریجویٹ ہوں۔ عمر ۲۸ سال باذوق، خوش لباس اور سانولی جس رنگ کی ہوں۔ پیسے کے پابند اور تنگ نظر حضرات رجوع نہ کریں۔

"اروما، راولپنڈی"

نفرت کا سایہ

میری ایک خوب صورت، خوب سیرت گریجویٹ سہیلی کے لئے اسمارٹ، خوش مزاج اور اعلیٰ کردار کے مالک نوجوان کا رشتہ مطلوب ہے۔ فوج میں میجر یا کرنل ہو تو بہتر ہے۔

"مسعود، الاٹلیپور"

محبت کا چراغ

میں ایک معزز خاندان کی ۲۸ سالہ دوشیزہ ہوں۔ بہت زیادہ خوب صورت، خوب سیرت اور امور خانہ داری میں ماہر ہوں۔ میری شادی میری مرضی کے خلاف کردی گئی تھی۔ وہ کا پہلے سے شادی شدہ تھا، میرا اس سے نباہ نہ ہوسکا۔ میں بہت ہی افسردہ، دکھی اور حساس لڑکی ہوں۔ میرا آئیڈیل ایک شریف، غیرت مند، تعلیم یافتہ، خوش اخلاق اور برسر روزگار نوجوان ہے۔ مجھے دولت نہیں صرف وفادار ساتھی کی ضرورت ہے۔ جس کی خدمت کو میں اپنا فرض جانوں گی۔

"حبیبہ شاہین، ملتان"

سفید گلاب

میری ایک سہیلی جو اسکول میں ٹیچر ہیں، ان کی عمر ۳۲ سال، تعلیم میٹرک پی ٹی سی، گورا رنگ، درمیانہ قد اور مذہبی قسم کی خاتون ہیں۔ دس بارہ سال قبل ٹائیفائیڈ میں مبتلا ہو کر قوت سماعت میں کمی کا شکار ہوگئی ہیں۔ ان کے لئے نیک اطوار، مذہب پرست، پڑھے لکھے اور خوب صورت نوجوان کا رشتہ مطلوب ہے۔

"مسز نصیر احمد، راولپنڈی کینٹ"

محبت بے تاب

میرا آئیڈیل دراز قد، خوش لباس، بذلہ سنج، شعر و ادب کا دلدادہ پڑھا لکھا نوجوان ہے۔ آمدنی اتنی ہو کہ با آسانی گزر بسر ہوسکے۔ میں ایک معزز گھرانے کی بی اے بی ایڈ سیکنڈ ہوں۔ عمر تقریباً ۳۰ سال ہے۔ اگر مجھے میرا آئیڈیل مل گیا تو میں ایک ذمہ دار شریک زندگی ثابت ہوں گی۔ کراچی والوں کو ترجیح دی جائے گی۔

"مس الیس کے، کراچی"

عمر ابھر دل

میری ایک بہت ہی دکھی سہیلی جسے زمانہ کا پیار ملا اور نہ

بہن بھائی کی محبت، سچے پیار اور خلوص کے لئے ایسے ساتھی کی متلاشی ہے جسے صورت اور دولت کی تمنا نہ ہو۔ میری سہیلی کی عمر ۲۶ سال تعلیم بی اے بی ایڈ، قبول صورت سلیقہ مند اور سنجیدہ طبیعت کی مالک اسکول ٹیچر ہے۔ ایک شریف، پُرخلوص اور تعلیم یافتہ جیون ساتھی کے پیار کی منتظر ہے۔

"ش۔گ۔ کراچی ۱۵"

دل کی نزاکت

مجھے زندگی کی طویل پُرپیچ راہوں پر چلنے کے لئے ایک ایسے ساتھی کی تلاش ہے۔ جو میری محرومیوں اور دکھوں کا مداوا کر سکے میری شادی والدین کی مرضی سے ہوئی تھی۔ لیکن اچانک جیون ساتھی حادثہ کا شکار ہو کر اس دارِ فانی سے کوچ کر گیا۔ میرے بیٹے کی عمر چار سال ہے مجھے ایسے سہارے کی ضرورت ہے جو لڑکے کو باپ کا پیار دے اور مجھے اپنے مضبوط بازوؤں کے حصار میں دنیا کے سارے دکھوں سے بچا لے۔ عمر ۳۰ سے ۳۵ سال تک ہو، برسرِ روزگار، تعلیم یافتہ ہمدرد، دراز قد، خوب سیرت اور قبول صورت ہو۔ آمدنی اتنی ہو کہ آسانی سے گزر بسر ہو سکے۔ میری عمر ۲۰ سال ہے۔ تعلیم بی اے، گندمی کھلتا ہوا رنگ، دراز قد، خوبصورت آنکھوں کی مالک، امورِ خانہ داری میں ماہر ایک خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں پُرسکون زندگی گزارنے کی دل سے تمنائی ہوں۔

"عفت۔ کراچی"

آنچل کی ہوا

میری لڑکی کی عمر ۲۰ سال، تعلیم میٹرک، گورا رنگ، لمبے بال، درمیانہ قد، صاف گو، اطاعت گزار اور صوم وصلوٰۃ کی پابند ہے۔ اس کے لئے ایک ایسے شریکِ سفر کی ضرورت ہے جس کا تعلق افواج کے اداروں سے ہو۔ سرکاری ملازم بھی رجوع کر سکتے ہیں۔ عمر ۲۵ سال سے زیادہ نہ ہو۔ قبول صورت، نیک سیرت، اسمارٹ، ہینڈسم نوجوان قابلِ ترجیح ہوں گے۔

"اسلام الحق، کراچی"

خدوخال کا جادو

میری کزن کا آئیڈیل ۳۲/ ۳۵ سال کا دراز قد اسمارٹ سا نوجوان ہے۔ جس کی تعلیم کم از کم بی اے ہو۔ تنخواہ اتنی کہ با آسانی گزر بسر ہو سکے۔ مستقل ملازمت کراچی میں ہو تو بہتر ہے۔ میری کزن بی اے بی ایڈ ہے۔ سروس کرتی ہے۔ شربتی آنکھوں والی اسارٹ سلونی متناسب جسم کی مالک، نکھرا رنگ اپنے آئیڈیل کی بے چینی سے منتظر ہے۔

"سعدیہ قاسم، کراچی"

شوقِ شوق

میری دو بہنیں جن کی عمریں ۲۳ سال اور ۲۴ سال ہیں، درمیانہ قد کی قبول صورت، امورِ خانہ داری میں ماہر تعلیم بی اے اور ایف اے ہے۔ متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں۔ لڑکے تعلیم یافتہ، شریف اور معقول آمدنی والے ہوں۔ بیرونِ ملک رہنے والوں کو ترجیح دی جائے گی۔

"ایس اے قریشی۔ کراچی"

خوابِ پریشاں

میرا آئیڈیل آرمی کا کیپٹن ہے جو خوش مزاج، خوش لباس اور خوبصورت ہو۔ میں نازک سی دراز زلفوں والی ۱۸ سالہ دوشیزہ ہوں شوخ و شریر گھریلو اور ماڈرن لڑکی اپنے آئیڈیل کا بے چینی سے انتظار کرے گی۔

"شاہینہ۔ کراچی"

خوابوں کے محل

ہم دو بہنیں ہیں، لیکن باپ کے سائے سے محروم۔ ماں کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ اکیلی عورت کیا کر سکتی ہے جب کوئی دکھ بانٹنے والا نہ ہو۔ خدا کا دیا سب کچھ ہے۔ مالی حالت اچھی ہے۔ صرف مخلص اور ہمدرد انسانوں کی ضرورت ہے۔ ہمارے آئیڈیل تعلیم یافتہ، مہذب سلجھے ہوئے مزاج اور اچھی عادات کے مالک نوجوان ہیں جو کسی اچھے عہدے پر فائز یا بزنس مین ہوں۔ دونوں بھائی ہوں تو بہت ہی اچھا۔ ہماری عمریں بالترتیب ۲۶ اور ۲۰ سال ہیں۔ تعلیم بی اے۔ بی ایڈ اور ایف اے ہے۔ پرورش بہت اچھے ماحول میں ہوئی ہے۔

"فہمیدہ، سعیدہ۔ راولپنڈی"

پیار کی چاندنی

میرا آئیڈیل ایک شریف، مہذب اور اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان ہے۔ جو کسی اچھے عہدے پر فائز ہو۔ خوش اخلاق، مخلص اور زندگی بھر ساتھ نبھانے والا ہو۔ میں اپنے باپ کے سایہ سے محروم ہوں تعلیم بی ایس سی، بی ایڈ، عمر ۲۷ سال ہے۔ میری خواہش ہے کہ زندگی کا ساتھی اتنا اچھا ملے کہ میں رشتے داروں میں سر اٹھا کر چل سکوں۔

"نورین چوہدری، راولپنڈی"

بلبلِ خوش نوا

میں ایک امیر اور ماڈرن گھرانے کی فرد ہوں۔ لباس جو بھی پہنتی ہوں جسم پر جچتے ہیں۔ مجھے اسمارٹ، سانولی رنگت کے خوبرو آنکھوں والے نوجوان پسند ہیں۔ چاہتی ہوں کہ جس طرح زندگی آرام و سکون سے گزری ہے، باقی ماندہ زندگی بھی عیش و آرام سے گزرے۔

میرا آئیڈیل اگر مجھے مل جائے تو اسے اپنی خوش قسمتی سمجھوں گی۔

"ثوبیہ اسعید، کراچی"

سہیلہ حسن

مجھے ایسے ساتھی کی تلاش ہے جو مجھے سچا پیار دے۔ میں ماڈل پاس ہوں۔ اچھی شکل و صورت مگر گھر کے کام کاج میں ماہر، گندمی رنگ کی ۲۲ سالہ دوشیزہ ہوں۔ چہرے پر بلا کی کشش ہے۔ لڑکے کی عمر ۳۰ سال ہو۔ اگر غیر ممالک میں ہو تو اچھا ہے۔ اگر مجھے میرا آئیڈیل مل جائے تو میں زندگی بھر اس کی پرستش کروں گی۔

"نجمہ الماس، کراچی"

دوشیزہ میلے نین

اس خود غرض دنیا میں مجھے ایسے جیون ساتھی کی تلاش ہے جو وفا کا پرستار ہو۔ اچھی آمدنی والا، بلند کردار کم گو، خوب صورت اور آرمی میں کسی اچھے عہدے پر فائز نوجوان ہی میرا آئیڈیل ہے۔ میں بڑی بڑی شربتی آنکھوں والی خوش شکل، امور خانہ داری میں ماہر، صوم و صلوٰۃ کی پابند ۱۹ سالہ گریجویٹ دوشیزہ ہوں۔ خاندان بھر میں سلیقہ شعاری اور خوبصورتی کا چرچا ہے۔ اسمارٹ ہوں اور ملنے کے لئے منتظر ہوں

کر بھا کر مینٹل کی اہمیت رکھتی ہوں۔ میں اپنی جھیل جیسی شربتی آنکھوں میں انتظار کے دیپ جلائے اپنے آئیڈیل کی منتظر ہوں۔

"سبین شیرازی، کراچی"

خوابوں کے قافلے

میری دو کزن عمر بالترتیب ۲۰ اور ۲۵ سال پرکشش باقاعدہ صوم و صلوٰۃ کی پابند اور امور خانہ داری میں ماہر ہیں۔ ان کے لئے نیک اطوار اور اعلیٰ کردار کے ۲۵۔۳۰ سالہ کشمیری نوجوانوں کے رشتے مطلوب ہیں جو کسی بھی اچھے عہدے پر فائز ہوں۔ تعلیم بی اے سے کم نہ ہو۔

"روبینہ فیروز، الامکپور"

سہانی کا راز

میرا آئیڈیل دراز قد، خوش اخلاق، اعلیٰ کردار کا شریف انسان ہے جو معقول آمدنی اور درد بھرا دل رکھتا ہو۔ میں تیس سال کے دکھ اٹھاتے اٹھاتے تھک چکی ہوں۔ اس لئے ہمدرد نوجوان کو شریک زندگی بنانا چاہتی ہوں۔ اگر ایسا کوئی نوجوان مجھے مل گیا تو میں ایک اچھی بیوی بن کر ساری زندگی اسے شکایت کا موقع نہ دوں گی۔

"مسرت۔ ضلع ساہیوال"



نرگس ناز، کراچی کے نام!

تعلیم ایم ایس سی، تنخواہ دس ہزار روپے ماہوار، عمر ۲۹ سال ہے۔ آپ ہی میرا آئیڈیل ہیں۔

ریاض احمد کھوکھر

شفقت نوزین۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۹۸ ۔ شارجہ

مسز سعید، گوجرانوالہ کے نام!

مجھے آپ جیسے ساتھی کی ضرورت ہے۔

شاہد نثار معرفت اصغر علی پی ۲۳۶۴۳

ایم ٹی سیکشن۔ پی آئی اے۔ کراچی ایئرپورٹ

ایس نرگس، کراچی کے نام!

آپ کو خوشی دل سے اپنانے کو تیار ہوں، عمر ۱۹ سال، تعلیم میٹرک، سرکاری ملازم ہوں۔

محمد حسن علی نوشاد

معرفت حفیظ واچ میکر۔ لیاقت روڈ۔ بستی

* * * * * *

تنخواہ چار ہزار روپے اور عمر ۳۰ سال ہے۔ پہلی بیوی کی اجازت کے بعد آپ کو اپنانے کا پروگرام ہے۔

محمد اشرف۔ پوسٹ بکس نمبر ۹۷۔ ابوظہبی

* * * * * *

مجھے بھی آپ جیسی پرخلوص ساتھی کی تلاش ہے۔

محمد بشیر۔ بلڈنگ نمبر ۲۱۶۔ ڈیوی جنرل

ینگ اسپینڈ روڈ۔ کراچی

* * * * * *

شاید میں ہی آپ کا آئیڈیل ہوں۔

ایم آفتاب احمد۔ ۷۰ رضویہ مارکیٹ

پہلی چورنگی۔ ناظم آباد۔ کراچی

* * * * * *

کسی غم کا سایہ بھی آپ کے قریب پھٹکنے نہ پائے گا۔ آپ کو دل و جان سے اپنانے پر آمادہ ہوں۔

محسن قریشی

معرفت نئی لائبریری۔ چوبان روڈ، اسلام پورہ۔ لاہور

آپ کے احساسات کا احترام کرتا ہوں میٹرک پاس عمر ۲۶ سال اور ماہانہ آمدنی ۵۰۰/- روپے ہے۔

زیڈ یوسف ملک معرفت منظور شاہ جنرل اسٹور

مچھ بولان (بلوچستان)

* * * * * *

میری عمر ۲۵ سال ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کے جذبات واحساسات پر پورا اتروں گا۔

وسیم

پوسٹ بکس نمبر ۸۲۹ - دوحہ قطر

* * * * * *

آپ کو اپنا شریک سفر بنانا چاہتا ہوں۔

شوکت علی ۸/۱۶ - سی ایریا، لیاقت آباد - کراچی ۱۹

* * * * * *

میں آپ کو پیار اور خلوص دینے کو تیار ہوں۔ آپ کی توقعات پر پورا اتروں گا۔

زمرد حسین

معرفت شمع بک اسٹال، ٹنڈو آدم

یاسمین اختر۔ لاہور کے نام!

خلوص اور عقیدت کے ساتھ آپ کو اپنانے کے لیے تیار ہوں۔

نوید انجم ۲- لاج روڈ

چوک جین مندر - پرانی انار کلی - لاہور

* * * * * *

ہم دونوں ایک دوسرے کے دکھ بانٹ لیں گے۔

تنویر ۳۳-بی ۶ مری روڈ - راولپنڈی

* * * * * *

میں ایک ستم رسیدہ نوجوان آپ جیسے ساتھی کے قرب کا متمنی ہوں۔

غلام قادر طور معرفت ملی دے بیکری

وحدت کالونی - آخری بس اسٹاپ - لاہور

* * * * * *

معقول آمدنی ہے۔ آپ کے آئیڈیل کے مطابق ہوں۔

اعجاز اختر سید معرفت خالد

ہوٹل خان بابا - چوبرجی چوک - لاہور

* * * * * *

تعلیم بی اے اور عمر ۲۸ سال ہے۔ آپ کو اپنا کر خوشی ہوگی۔

چوہدری امیر علی خان منہاس

موضع گوجرہ - براستہ چوہڑ کانہ منڈی - ضلع شیخوپورہ

* * * * * *

اس بھری دنیا میں بالکل تنہا ہوں۔ تعلیم میٹرک۔ آپ جیسی شریک زندگی مل جائے تو اس سے زیادہ خوش قسمتی اور کیا ہوگی۔

ایس اے قمر معرفت عابد جاوید اکبر

۱۹- رسول پارک - فیروز پور روڈ - لاہور

* * * * * *

لاہور کے معروف ہسپتال میں ۹۰۰/- روپے ماہانہ پر ملازم ہوں۔ ماں باپ بچپن میں وفات پا چکے ہیں۔ اگر آپ شریک زندگی بن کر دکھوں کا مداوا کر سکیں تو دیدہ و دل فرش راہ کرتا ہوں۔

ڈاکٹر عبدالعزیز ملک معرفت ہاشم خان

۴- ہیری کورٹ بلڈنگ - بینک اسکوائر - لاہور

* * * * * *

اس دنیا میں بالکل اکیلا ہوں۔ آپ کی ہر خواہش پر پورا اتروں گا۔

محمد اسلم رضا معرفت ڈاکٹر کیپٹن عبدالحمید

مکان نمبر NE/۱۱۹۷ گلی نمبر ۲۱ - محلہ چوہدری ذہرک

نزد مسجد مائی حاجن - راولپنڈی

* * * * * *

میرے ایک دوست جن کی عمر ۲۷ سال ہے، آپ جیسی خاتون سے شادی کے خواہشمند ہیں۔

بلال اے خان - پوسٹ بکس نمبر ۱۹۷ - جدہ - سعودی عرب

* * * * * *

آپ کی تحریر بالکل میری اپنی کہانی ہے۔ آپ کے معیار پر پورا اتروں گا۔ تعلیم میٹرک، تنخواہ ۸۰۰/- روپے ہے۔

ایم رفیق حیدری معرفت انعام حسین مکان نمبر ۲۵

گلی نمبر ۱۳ بی جے اعظم بستی۔ کے ایم سی کالونی۔ کراچی ۱۹

* * * * * *

اس بھری دنیا میں اکیلا ہوں۔ آپ جیسی غمخوار ساتھی کا متلاشی ہوں۔

راحم معرفت محمد سعید کریانہ اسٹور

۹/۲- جی مارکیٹ - اسلام آباد

* * * * * *

پہلی بیوی سے لڑکا ہوا جس کے فوت ہونے کے بعد بیوی کو طلاق ہو گئی۔ آپ کو اپنا کر مجھے خوشی ہوگی۔

نظام الدین شاہ راجپوت معرفت ماسٹر عبدالمجید
پوسٹ آفس گیہولہ۔ ضلع لاڑکانہ

* * * * * *

میں اچھے اور راجپوت گھرانے کا چشم و چراغ ہوں۔
راجہ ایم جنجوعہ معرفت وائٹ ہاؤس۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۱- ابوظہبی

* * * * * *

تعلیم ایف اے عمر ۲۲ سال۔ ماہانہ آمدنی -/۱۰۰۰ روپے ہے
محمد حنیف ٹائم کیپر۔ پوسٹ بکس نمبر ۸۶۱۲ - دوبئی

* * * * * *

۲۵ سال سے زمانے کی سختیوں سے نبرد آزما ہوں۔ اس دنیا
میں بالکل تنہا۔ شاید ہم ایک دوسرے کے بہترین ساتھی ثابت ہوں۔
رانا اسد مقصود احمد۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۶۱
الفجیرہ - متحدہ عرب امارات

* * * * * *

تعلیم ایم اے بی ایس سی ماہوار آمدنی سات آٹھ ہزار روپے
ہے۔ فدا علی۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۷۱۶۔ جدہ۔ سعودی عرب

* * * * * *

گورنمنٹ ملازم، ماں باپ کی شفقت سے محروم ہوں۔
ایم علی محمد۔ مدینہ کاٹن فیکٹری۔ چشتیاں۔ ضلع بہاولنگر

* * * * * *

ماں باپ کی شفقت سے محروم ہوں آپ جیسی مخلص ساتھی
کی تلاش ہے۔ آپ کو خوش رکھ سکوں گا۔
کوثر علی۔ الیکٹرک سپروائزر۔ پوسٹ بکس نمبر ۵۱۶۹۔ جدہ، سعودی عرب

* * * * * *

آپ کے آئیڈیل کے عین مطابق ہوں۔
حسین طارق۔ معرفت نیشنل بینک آف پاکستان
الشجر بلڈنگ۔ چوک نیلا گنبد۔ لاہور

* * * * * *

میں زمانے کا ستایا ہوا انسان ہوں۔ زندگی میں سوائے دکھوں
اور غموں کے اور کچھ نہیں ملا۔ معقول تنخواہ ہے۔
ایم افضل جنجوعہ۔ بمعرفت مظہر حسین
کیٹین ڈیپارٹمنٹ۔ اٹک آئل کمپنی لمیٹڈ۔ مورگاہ۔ راولپنڈی

صوفیہ نرگس، کراچی کے نام!
میں آپ کے آئیڈیل کے مطابق ہوں۔
شاہ محمد فضل معرفت ندیم کریم
۵/۱۸ساتویں ایسٹ اسٹریٹ ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی۔ کراچی

* * * * * *

میں خود کو آپ کے خیالات کی تصویر سمجھتا ہوں۔ زندگی بھر آپ
کا ساتھ دوں گا۔ سہیل اختر
پوسٹ بکس نمبر ۱۴۲۰ - دوحہ۔ قطر

* * * * * *

آپ کو دکھوں اور غموں سے نجات دلا دوں گا۔
محمد اقبال۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۹۴۸۔ جدہ۔ سعودی عرب

سیدہ بیگم، کراچی کے نام!
میری عمر ۲۶ سال اور ماہانہ آمدنی دو ہزار ریال ہے۔ آپ کے
معیار پر پورا اتروں گا۔
سید اورنگزیب بابر۔ پوسٹ بکس نمبر ۹۹۶۔ دوحہ۔ قطر

* * * * * *

تعلیم ایف اے اور ماہانہ آمدنی -/۹۰۰ روپے ہے۔
ایس ایچ شریف۔ سارجنٹ کلرک سی ٹو منسٹری آف
ہیڈ کوارٹر۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۰۹۔ مسقط عمان

* * * * * *

میں آپ کے خیالات کے عین مطابق ہوں۔
امیر خان۔ مکان نمبر ۱۴/۲۴
بی ون ایریا۔ لیاقت آباد۔ کراچی

* * * * * *

میری عمر ۲۸ سال اور آمدنی آٹھ ہزار روپے ماہانہ ہے۔ آپ کو
اپنا کر مجھے خوشی ہوگی۔ عنایت حسین
چیف آپریٹر۔ پوسٹ بکس نمبر ۶۹۸ شارجہ (یو اے ای)

نیلما، کراچی کے نام!
تعلیم بی اے، ذاتی کاروبار ماہانہ آمدنی -/۱۵۰۰ روپے ہے
عمر ۲۶ سال ہے۔
سجاد اصغر 34/6/E سٹلائٹ ٹاؤن گوجرانوالہ

* * * * * *

میرا چچازاد بھائی، ۳۰ سالہ میٹرک پاس، مخلص اور باوفا شخص ہے۔ زندگی بھر آپ کا ساتھ دوں گا۔
نائب صوبیدار ہیڈ کلرک قاضی محمد اسلم اعوان
ناصر آباد۔ نزد فلور مل۔ نیو جھنگ روڈ۔ کیمبل پور

* * * * * *

گریجویٹ، باوقار ملازمت اور آپ کی خواہشات کے عین مطابق ہوں۔
اقبال، پوسٹ بکس نمبر ۳۵۴۷، دوبئی۔

* * * * * *

تعلیم ایم اے، ماہانہ آمدنی ایک ہزار روپے ہے۔
محمد احمد۔ معرفت پوسٹ بکس نمبر ۵۰۸۱۔ کراچی

عنبر قریشی، لاھور کے نام!
تعلیم بی اے، ذاتی کاروبار، صرف اور صرف ایک اچھی ہمسفر کی تلاش ہے۔
بشیر الاسلام قریشی
معرفت کرنل محمود قریشی۔ ۱۰ امین روڈ، اخلاق چیمبرز، لاہور

* * * * * *

اللہ کا دیا سب کچھ ہے صرف آپ جیسی ساتھی کی جستجو تھی۔ ماہانہ آمدنی ۱۲۰۰/- روپے ہے۔
چوہدری قربان حسین جعفری
فیضی انڈسٹریز۔ جی ٹی روڈ۔ کالونی آباد۔ گوجرانوالہ

* * * * * *

میں آپ کے آئیڈیل کے مطابق ہوں۔ تنخواہ چار ہزار روپے ماہانہ ہے۔
ناصر قریشی۔ پوسٹ بکس نمبر ۵۵۶۔ ابوظہبی۔

* * * * * *

تعلیم انٹر ماہوار آمدنی ۳۵۰۰/- روپے مجھے ایک وفا شعار ساتھی کی ضرورت ہے۔
محمد ماجد۔ حاجی دین محمد۔ شارع جنوبی دوحہ۔ کویت

* * * * * *

میں آپ کے آئیڈیل کے عین مطابق ہوں۔
جاوید احمد۔ کانٹی نینٹل ہینڈی کرافٹس
۷۸، کشمیر روڈ۔ راولپنڈی صدر

* * * * * *

تعلیم بی اے، موٹر کمرانے کا چشم و چراغ ہوں۔
لے کے آفریدی چنار جنرل اسٹور
کورٹ روڈ۔ جھنگ صدر

* * * * * *

عمر ۲۳ سال، تعلیم بیچلر گریجویٹ، معقول آمدنی ہو سکتا ہے میں ہی آپ کا آئیڈیل ہوں۔
شیخ حفیظ اللہ عرف معرفت راشن شاپ نمبر ۱
سکراں گیٹ۔ ڈیرہ اسمٰعیل خان

* * * * * *

آپ کی جانب سے اپنائیت کے اظہار کو میں اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا۔ میری عمر ۲۵ سال اور تنخواہ ۵۵۰۰/- روپے ہے۔
غازی۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۰۲۴۔ الفجیرہ۔ یونائیٹڈ عرب امارات

* * * * * *

اپنا کاروبار، ماہانہ آمدنی چار ہزار روپے ہے۔ آپ کے معیار پر پورا اتروں گا۔
ایم گلزار احمد
گرگرا سکوائر۔ ۴۰ میکلوڈ روڈ۔ نزد صنوبر سینما۔ لاہور

* * * * * *

عمر ۲۲ سال، تعلیم ایف اے۔ ماہانہ آمدنی ۲۵۰۰/- روپے ہے کاش آپ شریک سفر بن سکیں۔
عبدالحمید ناز، مکان نمبر ۲۹۵/۷ زرشیو روڈ۔ گوجرانوالہ

* * * * * *

معقول آمدنی ہے۔ آپ کی قربت میں زندگی خوشگوار گزرے گی۔
شاہد رضا معرفت ندیم میڈیکو اینڈ جنرل اسٹور
شادمان کالونی۔ مین مارکیٹ لاہور

* * * * * *

آپ ہی میرے خوابوں کی ملکہ ہیں۔ میری تعلیم ایف اے ہے۔ آپ کو اپنا کر خوشی ہوگی۔
اختر اعجاز۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۹۶۔ ابوظہبی

* * * * * *

آپ کے آئیڈیل کے مطابق ہوں۔ آپ کے ٹکٹ دو بانٹ کر مجھے مسرت ہوگی۔
خواجہ نصرت حسین ہوش
نصرت میڈیکل اسٹور۔ شاہی بازار۔ بدین

* * * * * *

شاید میں ہی آپ کا آئیڈیل ہوں۔
احتراز
JOBU-1440 NORWAY

میں آپ کے خیالات کی دل سے قدر کرتا ہوں۔
محمد بشیر احمد قریشی - پوسٹ بکس نمبر ۲۰۲۲۶ - کویت

* * * * * *

میری عمر ۲۶ سال ہے۔ آپ اگر چاہیں تو شریک زندگی بنا سکتی ہیں۔
رانا اختر جاوید
پوسٹ بکس نمبر ۳۹۴ راس الخیمہ (یو اے ای)

طلعت بانو، راولپنڈی کے نام!
میری عمر ۲۲ سال اور تنخواہ ۹۰۰/- روپے ہے۔ انشاء اللہ آپ کی ہر خواہش پوری کرنے کی کوشش کروں گا۔
عطا محمد طبیب - نیو سینٹر سکھر

* * * * * *

میری تعلیم ایف اے ہے۔ ایک متوسط گھرانے کا فرد ہوں۔ آپ کے معیار پر پورا اتروں گا۔
رخصتی حوالدار عبدالرشید
ڈاکخانہ و مقام سلطان - تحصیل و ضلع جہلم

* * * * * *

آپ کے آئیڈیل کے عین مطابق ہوں۔ تعلیم بی اے۔ عمر ۳۴ سال اور تنخواہ ۸۰۰/- روپے ہے۔
کوکب افضال خان - پوسٹ بکس نمبر ۲۲۶۰۳ - کویت

* * * * * *

تنخواہ سات ہزار روپے ماہانہ، تعلیم ایف اے اور عمر ۲۶ سال ہے۔
نیاز احمد نوشش
پوسٹ بکس نمبر ۷۰۱۵ - ابوظہبی (یو اے ای)

* * * * * *

میں آپ کے آئیڈیل کی مکمل تصویر ہوں۔ عمر ۲۵ سال ماہانہ آمدنی دس ہزار روپے ہے۔
ایم قادر، ورکشاپ انجینئر، پوسٹ بکس نمبر ۱۱۶۹۸
ویسٹ منسٹر ڈریجنگ کمپنی، شارجہ (یو اے ای)

سیمی، لاہور کے نام!
میں بھی آپ جیسی شریک حیات کا متمنی ہوں۔
غلام رضا، اسسٹنٹ آفیسر
معرفت ملک کریانہ فروش - راوال - لاہور

* * * * * *

آپ کی تحریر کے عین مطابق ہوں۔ عمر ۲۵ سال تعلیم ایف اے اور تنخواہ ۲۵۰۰/- ریال ہے۔ عمر بھر آپ کا ساتھ دوں گا۔
مظفر محمود - پوسٹ بکس نمبر ۴۳ - ابوظہبی

* * * * * *

میری تعلیم میٹرک اور تنخواہ ۴۰۰/- روپے ہے۔ آپ کو سدا گلاب کے پھول کی طرح تر و تازہ اور خوش و خرم رکھوں گا
چوہدری اشتاق احمد - رائس ملنگ کارپوریشن آف پاکستان
یونٹ نمبر ۱۴ - پوسٹ آفس مارتین - ضلع شیخوپورہ

* * * * * *

میری تعلیم میٹرک، عمر ۲۳ سال اور تنخواہ ۲۵۰۰/- روپے ہے آپ کے آئیڈیل کے عین مطابق ہوں۔
رحمان شاہ
معرفت عبدالرحمٰن افغان شرکہ پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۴ ابوظہبی

* * * * * *

میری تعلیم میٹرک اور تنخواہ ۴۰۰/- روپے ہے۔ آپ ہی میرا آئیڈیل ہیں۔
محمد الطاف
معرفت محمد ریاض کاربنٹر - پوسٹ بکس نمبر ۱۰۲ - ابوظہبی

* * * * * *

میں آپ کے خیالات کی قدر کرتا ہوں۔
میاں محمد نذیر - پوسٹ بکس نمبر ۴۳۹۴ - ابوظہبی

کے ایس - لاہور کے نام!
مجھے یقین ہے کہ میں آپ کے معیار پر پورا اتروں گا۔
قیصر جاوید - پوسٹ بکس نمبر ۱۳۰۹ - العین - ابوظہبی

* * * * * *

میری عمر ۲۵ سال ہے۔ آپ کو اپنی بانہوں میں سمیٹنے کے لئے بے تاب ہوں۔
ظفر اقبال
نزد سٹی پبلک سکول پوگی نمبر ۳ ملت آباد، سرگودھا

* * * * * *

مصائب سے گھبرانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ آپ کو میرے قرب سے مضبوط سہارا ملے گا۔
شیر محمد معرفت نیو ائیر کارپٹ ہاؤس
نزد اوڈین سینما - ایبٹ روڈ - لاہور

* * * * * *

عمر ۳۰ سال اور تنخواہ ۲۰۰۰/- روپے ماہوار ہے۔ آپ کو

شریکِ زندگی بنانا چاہتا ہوں۔ محمد اسماعیل
مطلق فرنیچر۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۳۳۱۔ ریاض۔ سعودی عرب

* * * * * *

محمد الطاف آپ کا آئیڈیل ایک ہی ہے۔ عمر ۲۲ سال اور ماہوار
آمدنی ۲۵۰۰/- روپے ہے۔ آپ کو سچا پیار دوں گا۔
محمد بلوچ۔ لائن مین واپڈا سب ڈویژن، ای بشیں۔ بلوچستان

* * * * * *

میری تنخواہ ۳۰۰۰/- روپے ہے۔ آپ کو زندگی بھر خوش
رکھوں گا۔ مشرف خان۔ پوسٹ بکس نمبر ۵۵۵۵۔ سالمیہ، کویت

* * * * * *

میں آپ کو تمام خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ اپنانے کو تیار
ہوں۔ میری عمر ۱۸ سال اور تنخواہ ۳۰۰/- روپے ہے۔
سید نند عمران ۵۰۶ ۶/ لیاقت آباد۔ کراچی ۱۹

* * * * * *

میں زندگی بھر آپ کو شکایت کا موقع نہ دوں گا۔ میری عمر ۲۵ سال
تعلیم ایف اے اور تنخواہ ۶۰۰۰/- روپے ماہانہ ہے۔
مرزا طالب حسین مغل۔ معرفت راجہ ظہور
پوسٹ بکس نمبر ۲۰۸۔ ابوظبی (یو اے ای)

* * * * * *

گریجویٹ سرکاری ملازم، عمر ۲۸ سال، ماہوار آمدنی ۷۰۰/- روپے
ہے۔ آپ کے آئیڈیل کی خصوصیات کا حامل ہوں۔
کے این جی۔ حبیب کمرشل کالج۔ پسرور روڈ۔ گوجرانوالہ

* * * * * *

آپ ہی کی طرح متوسط گھرانے کا فرد ہوں۔ آپ کی تحریر میں
مجھے اپنے مستقبل کی جھلک نظر آتی ہے۔
مظفر حسین، اکاؤنٹس سیکشن
انجینئرنگ ڈویژن۔ پوسٹ بکس نمبر ۴۶۵۔ کویت

* * * * * *

میں آپ کے معیار پر پورا اتروں گا۔ خدا کا دیا سب کچھ ہے
صرف نیک اور اچھے ساتھی کی تلاش ہے۔
خواجہ طارق محمود، پوسٹ بکس نمبر ۴۹۲۱۔ ابوظبی

* * * * * *

تعلیم یافتہ کاروباری اور آپ کے آئیڈیل کی تصویر ہوں۔
طارق حمید۔ ۱۰۰ اے روڈ فی چند اسٹریٹ
لارنس روڈ۔ پرانی انارکلی۔ لاہور

* * * * * *

خدا کا دیا سب کچھ ہے صرف نیک سیرت خاتون سے رشتہ
درکار ہے۔ آپ کو شریکِ زندگی بنا کر مسرت ہوگی۔
گل معرفت منشی علی خان، نیشنل پٹرول پمپ
لورالائی۔ بلوچستان

* * * * * *

آپ کو اپنانے کے لئے تیار ہوں۔ انشاء اللہ زندگی کے کسی
موڑ پر بھی غم اور پریشانی کو نزدیک نہ آنے دوں گا۔
مشتاق احمد۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳۹۔ العین۔ ابوظبی

* * * * * *

میں آپ کے معیار کے عین مطابق ہوں۔ تعلیم ایف اے۔
عمر ۲۰ سال اور معقول تنخواہ ہے۔
لانس نائیک کلرک نعیم اختر۔ ۹، ایم پی مری ہلز

* * * * * *

میں ۲۱ سالہ نوجوان ہوں۔ آپ کے اور میرے خیالات میں
ہم آہنگی ہے۔ منظور احمد مجتبیٰ۔ مدرس
ایم ایس فتح پور کمال، تحصیل خانپور، ضلع رحیم یار خان

* * * * * *

ہو بہو آپ کے آئیڈیل کے مطابق ہوں۔
وقار الدین۔ مکان نمبر 1030/0 محلہ مہری پورہ۔ راولپنڈی

* * * * * *

آپ جیسا شریکِ سفر پا کر زندگی یقیناً خوشگوار گزرے گی۔
تعلیم میٹرک، عمر ۲۸ سال، برسرروزگار نوجوان ہوں۔
منیر احمد معرفت فاروق خالد
محلہ رحیم پورہ۔ اللہ آباد۔ وزیر آباد

ایم، ڈیرہ اسماعیل خان کے نام!
میں آپ کے آئیڈیل کے عین مطابق ہوں۔
خورشید عالم، پوسٹ بکس نمبر ۱۹۱۳۔ العین۔ ابوظبی

ف حاتمہ، ایبٹ آباد کے نام!
عمر ۲۵ سال، تعلیم بی اے اور تنخواہ ۴۰۰۰/- روپے ہے۔
خانزادہ راہی۔ قرہ میں پوسٹ بکس نمبر ۲۰۵۹

روم 7 B/17 این پی سی سی سعیبات الطارات ۔گٹ

* * * * * *

آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں ۔ گورنمنٹ سروس اور عمر ۲۷ سال ہے ۔

سید غضنفر علی زیدی

47-C-40-B بم اینڈ گرینیڈ فیکٹری ۔ پی او ایف ۔ واہ کینٹ

* * * * * *

ماہوار آمدنی ۲۷۰۰/۔ روپے ہے ماشاء اللہ زندگی کا بہترین ساتھی ثابت ہوں گا ۔

عبدالعزیز بلوچ

آفس 47/55 پیلری روڈ P/O فیض آباد ۔ راولپنڈی

* * * * * *

تنخواہ ۹۰۰/۔ روپے ہے ۔ آپ کو اپنانے کو تیار ہوں ۔

محمد نسیم عباسی ۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۱۵۸ ۔ دوحہ ۔ قطر

* * * * * *

تنخواہ ۷۵۰۰/۔ روپے ہے ۔ آپ کے آئیڈیل کے عین مطابق ہوں ۔

دلاور خاں

پوسٹ بکس نمبر ۲۸۳۲ دوحہ ، قطر

* * * * * *

۲۱ سالہ خوش اخلاق نوجوان ہوں ۔ تعلیم میٹرک ہے ۔

نذیر احمد معرفت رحمت علی خاں

۲۳۲/۳۹ ماسٹر جی روڈ ۔ لال کرتی ۔ راولپنڈی

* * * * * *

آپ کے آئیڈیل کی ہو بہو تصویر ہوں ۔

محمد فاروق ولد شاد مرحوم ۔ پوسٹ بکس نمبر ۵۰۳۱ ۔ دوحہ قطر

عظمیٰ علی ۔ شاہ ولی کے نام !

میری آمدنی ۸۰۰/۔ روپے ماہانہ ہے ۔ عمر ۲۶ سال ، کامیاب زندگی اور حقیقی مسرتوں کی ضمانت دیتا ہوں ۔

ملک پرواز معرفت اکرشنہ آفس ۔ مچھ ۔ بلوچستان

الف جہاں ۔ کراچی کے نام !

ممکن ہے میں ہی آپ کا آئیڈیل ہوں ۔

ایس سرفراز حسین ۔ اکاؤنٹ آفیسر ایرپورٹ

ہیڈ کوارٹر پی آئی اے بلڈنگ ۔ کراچی ائیرپورٹ

* * * * * *

عمر ۲۴ سال تعلیم ایف اے ماہوار آمدنی ۸۰۰/۔ روپے ہے ۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے ۔ صرف وفا شعار ساتھی کی ضرورت ہے ۔

جمال احمد ۔ فاضل اینڈ کو 66-64-N-6

کورنگی مالا مارکیٹ ۔ کراچی

* * * * * *

شاید آپ نے مجھے ہی پکارا ہے ۔ وہی تصویر ، وہی خیالات وہی خاکہ ، وہی رنگ ۔ آپ ہو بہو میرا آئیڈیل ہیں ۔

؎ مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس دم

ایم شریف 0-15 وحدت کالونی ۔ لاہور

* * * * * *

شمیم محمود ۔ کراچی کے نام !

آپ کی بہن کے آئیڈیل کے مطابق ہوں ۔ تعلیم میٹرک تنخواہ ۲۵۰۰/۔ روپے ہے ۔ خلوص اور پیار کا بھوکا ہوں ۔

ولی خان ۔ پوسٹ بکس نمبر ۹۹۶ ۔ دوحہ ۔ قطر

* * * * * *

میں انشاء اللہ آپ کے معیار پر پورا اتروں گا ۔

گل ایم آپریٹر پوسٹ بکس نمبر ۲۷۱۶ ۔ کے سی سی دبئی

* * * * * *

تنخواہ ۹۰۰/۔ روپے ہے ۔ تعلیم میٹرک اور عمر ۲۰ سال ہے میں صرف خلوص اور چاہت کا بھوکا ہوں ۔

خالد جاوید ۔ پوسٹ بکس نمبر ۴۸۷۵ ۔ جدہ ۔ سعودی عرب

ن ، م ۔ کراچی کے نام !

آپ کی صاف گوئی سے متاثر ہوا ہوں ۔ آپ کو اپنانے کے لئے تیار ہوں ۔

کرافٹ مین ، بی ٹی ۔ محمد انور

اسٹیشن ورکشاپ ۔ ای ، ایم ، ای ۔ کاکول

* * * * * *

میں آپ کو سہارا دے کر فخر محسوس کروں گا ۔

محمد فاروق معرفت نرسنگ اسسٹنٹ خالد محمود ملک

نمبر ۹۸۲۳۶۰۵ سی ایم ایچ ۔ جہلم

* * * * * *

آپ کا ساتھی بننے کو تیار ہوں ۔ مجھے آپ سے ہمدردی ہے ۔

محمد رشید شیلہ ماسٹر

حافظ ٹیلرز ۔ نزد ریکس سینما ۔ سرگودھا

* * * * * *

آپ کے آئیڈیل کے مطابق ہوں۔ تعلیم میٹرک اور ماہوار تنخواہ ۲۵۰۰/- روپے ہے۔
ایم اے لسان۔ وہیکل ہیکنگ ایل سے اوڈی
سلطان آرمی فورس۔ صلالہ۔ سلطنت آف عمان

* * * * * *

آپ کی سچائی سے متاثر ہوا ہوں۔ صدق دل سے اپنی خدمات پیش کرتا ہوں۔ خواجہ محمد سلیم
فلیٹ ۲/۵ پوسٹ بکس نمبر ۲۰۲۶ دوبئی

* * * * * *

آپ کی صاف گوئی پسند آئی۔ آپ کو ہر حالت میں اپنانے کو تیار ہوں۔ ڈاکٹر چوہدری ایم اے تارڑ
ہارون اسٹریٹ۔ ڈی سی روڈ۔ امیر پارک۔ گوجرانوالہ

* * * * * *

میں ایک دکھی انسان ہوں۔ آپ کو اپنانے کے لئے تیار ہوں
قراقی۔ پوسٹ بکس نمبر ۹۱۰ عمان۔ اردن

* * * * * *

میں خود کو آپ کے خیالات کی تصویر سمجھتا ہوں۔ زندگی بھر آپ کا ساتھ دوں گا۔ محمد اقبال نسیم
۱۸۱/۵۲ ۔ ہیوی اک اک رجمنٹ آرٹلری۔ ملیر کینٹ کراچی

* * * * * *

میں آپ کے جذبات کی قدر کرتے ہوئے آپ کو اپنانے کے لئے تیار ہوں۔ میاں خان قلندرانی
معرفت صابر جنرل اسٹور۔ خضدار۔ بلوچستان

* * * * * *

آپ کے خیالات سے پوری طرح متفق ہوں۔
امیر خاں کلنڈ نمبر ۷۷۵ ویسٹرن آرمی انجینئرنگ ورکس
لانڈھی۔ کراچی

* * * * * *

میں آپ کے معیار پر پورا اترتا ہوں۔ تعلیم میٹرک اور تنخواہ ۲۵۰۰/- روپے ہے۔ عبدالرحمٰن
پوسٹ بکس نمبر ۲۴۷۵ ۔ ابوظہبی

* * * * * *

تعلیم بی اے عمر ۲۶ سال اور تنخواہ دس ہزار روپے ہے۔

آپ کے معیار کے عین مطابق ہوں۔
محمد نواز چوہدری۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۹۴۲۱۔ ابوظہبی

* * * * * *

مجھے ایک اچھے ساتھی کی تلاش ہے۔ کاش آپ میری شریکِ سفر بننا قبول فرمائیں۔ عبدالمجید
پوسٹ بکس نمبر ۲۶۹۷ ریاض۔ سعودی عرب

* * * * * *

میں آپ کی تحریر سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ میری عمر ۲۴ سال اور آمدنی ۷۰۰۰/- روپے ماہانہ ہے۔
محمد الیاس گجراتی۔ کپڑا فروش
مکان نمبر NE-2500 متصل ڈاکخانہ امروہہ اولیا نگر، شیخ۔ کراچی کے نام!
میں خود کو آپ کے خیالات کی تصویر سمجھتا ہوں۔ تعلیم فرسٹ ایئر۔ عمر ۳۰ سال اور ماہانہ آمدنی ۸۰۰۰/- روپے ہے۔
نذیر حسین پی کے ۱۹۰۔
FLUOR ARABIA (GAS LTD)
A.C.C JUAYMAH DHAHRAN SAUDI ARABIA

* * * * * *

عمر ۲۵ سال اور تنخواہ ۴۰۰۰/- روپے ہے۔ آپ کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھوں گا۔
104503۔ ایس پی نذیر احمد ۲۱ پاکستان مجرز بٹالین۔ بدین
وجھیہ۔ نواب شاہ کے نام!
آپ کے خیالات کے عین مطابق ہوں۔ عمر ۲۹ سال۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ بیدار بخت خٹک
معرفت پیپلز بک سٹال۔ اڈہ جی ٹی ایس۔ جنگ صدر

* * * * * *

میری تنخواہ ۴۰۰۰/- روپے ہے۔ آپ کے تعاون کو میں اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا۔ نجیب الرحمٰن
ٹیلیفون آپریٹر۔ ٹیلی فون ایکسچینج۔ نواب شاہ

* * * * * *

اگر واقعی آپ میں اتنی خوبیاں ہیں تو میں آپ کو اپنانے کو تیار ہوں۔ میری عمر ۲۸ سال، تعلیم میٹرک اور تنخواہ ۵۰۰۰/- روپے ہے۔
سعید احمد معرفت وزیر محمد نمبر ۴۶۶۲ A1



FLUOR ARABIA LTD GAS - CATERING

A.C.C THAYMAH DHARAN SAUDI ARABIA

* * * * * *

جو کچھ آپ چاہتی ہیں وہ سب میری ذات میں پوشیدہ ہے

حیدر زماں نذیر بنارسی ۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۷۰۱۴ ایسٹین ۔ ابوظہبی

* * * * * *

عمر ۲۵ سال تعلیم انٹر ، بیرون ملک جانے کی تیاری میں مصروف ہوں ۔

قیصر ندیم چودھری

معرفت چودھری کلاتھ ہاؤس ۔ ریلوے روڈ

لیاقت پور ۔ ضلع رحیم یار خاں

* * * * * *

آپ کے آئیڈیل پر پورا اتروں گا ۔

فرخ حسین صدیقی معرفت ڈاکٹر منظور حسین عزری

ڈینٹل سرجن ۔ شاہی بازار ۔ بہاولپور

* * * * * *

آپ کی تحریر پڑھ کر مجھے محسوس ہوا جیسے خدا نے آپ کو صرف میرے لئے اور مجھے آپ کے لئے بنایا ہے ۔ عمر ۲۳ سال اور تنخواہ ۲۸۰۰/- روپے ہے ۔

رانا فرید احمد

پوسٹ بکس نمبر ۲۲۸۲ ۔ روی ۔ مسقط ۔ عمان

* * * * * *

میں صرف خلوص اور چاہت کا طلب گار ہوں ۔

حبیب C-45 الاعظم اسکوائر ۔ فیڈرل بی ایریا ۔ کراچی

عبدالقادر ، اسلام آباد کے نام !

میری عمر ۳۰ سال ، تعلیم ایل ایس بی ایڈ ۔ ماہوار آمدنی ۸۰۰/- روپے ہے ۔

سجاد قاضی

معرفت محمد اقبال ایڈووکیٹ ۔ ضلع کچہری ۔ گوجرانوالہ

مسز شیخ ، کراچی کے نام !

میں آپ کے خیالات کی قدر کرتا ہوں ۔

محمد افضل ۔ پنجاب سویٹ مارٹ ۔ محمود آباد ۔ کراچی



سید مہدی

کمینی

شوبھا سے شادی رمیش شرما کی زندگی کا ایک اہم واقعہ تھا۔ حالانکہ شوبھا اتنی حسین نہ تھی جتنی پردے پر فلمی ہیروئین نظر آتی ہے مگر دیہات میں پروان چڑھنے سے اس میں جو جاذبیت اور الڑھ پن پیدا ہو گیا تھا۔ وہ بہتوں کا ایمان خراب کر دینے کے لئے کافی تھا۔ رمیش خود اپنی خوش نصیبی پر بہت نازاں تھا۔ حالانکہ شادی کے دن ہی لاٹری کا نتیجہ نکلا تھا جس کے اس نے تین ٹکٹ خرید رکھے تھے۔ ٹکٹوں پر پانچ لاکھ کا پہلا انعام تو کیا پچاس روپیوں تک کا انعام بھی نہ ملا تھا۔ شوبھا کو پا کر وہ لکھ پتی بننے کا خواب کچھ عرصہ کے لئے بھول سا گیا تھا آخر شوبھا جیسی پتنی کا پتی ہونا بھی اس جیسے معمولی کلرک کے لئے خوش قسمتی کی شروعات تھی۔

جب وہ اسے لے کر اپنے باس سے آشیرواد لینے گیا تو وہ بھی بہت خوش ہوئے اور کہا "شوبھا صرف تمہاری ہی



نہیں بلکہ ہمارے آفس کی بھی شوبھا لگ رہی ہے اور انہوں نے شادی میں شرکت نہ کرنے پر معذرت چاہی کیونکہ وہ بزنس میں کافی الجھے ہوئے تھے۔ رمیش چند دنوں بعد جب اپنی تنخواہ لینے پہنچا کیشیئر نے اسے سو روپے زیادہ دیئے۔ اس نے نوٹ گننے کے بعد سوچا شاید کیشیئر سے غلطی ہو گئی ہے۔ کیوں نہ نوٹ رکھ کر چپ چاپ چلا جائے مگر جیسے ہی اس نے دزدیدہ نظروں سے کیشیئر کی طرف دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ کھیل رہی تھی، وہ بوکھلا سا گیا "یہ سو روپے شاید آپ نے غلطی سے زیادہ دیئے ہیں" اس نے اٹک اٹک کر کہا "زیادہ نہیں بابو، اس جگہ ۲۵ سالوں سے کام کر رہا ہوں۔ نوٹ تو کیا ان کے نمبر بھی میری انگلیوں سے بات کرتے ہیں"

"پھر کیا بات ہے یہ سو روپے ۔۔؟"

"باس نے تمہاری تنخواہ بڑھا دی ہے، مزے کرو"

وہ حیرت زدہ سا آفس سے باہر نکلا خوشی اور حیرت کے ملے جلے احساس کے ساتھ تیزی سے گھر پہنچا۔

شوبھا نے جب یہ خبر سنی تو بہت خوش ہوئی "اسے تم نے اس کا شکریہ تک ادا نہیں کیا اور گھر چلے آئے" وہ بولی۔

"کیا کروں شوبھا! خوشی اور حیرت نے میرا دماغ مفلوج کر دیا تھا" وہ بولا۔

دوسرے روز جب وہ شکریہ ادا کرنے باس کے ایئرکنڈیشنڈ چیمبر میں داخل ہوا تو اسے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔

باس نے مسکرا کر کہا "بھئی ہمارا اصول ہے ہماری فرم میں کام کرنے والے سب خوش رہیں اور پھر تمہاری نئی نئی شادی ہوئی ہے اخراجات بھی تو بڑھ گئے ہوں گے"

رمیش خوش خوش جب واپس آکر اپنے ٹیبل پر بیٹھا تو وہ پھر بڑے بڑے خواب دیکھنے لگا۔

اس نے سوچا شاید اب میری ترقی کا دور شروع ہوا ہے ہو سکتا ہے باس کی مہربانیاں اسی طرح رہیں تو وہ ایک دن کسی برانچ کا منیجر بن جائے۔ اس کے سامنے ملہوترا کا چہرہ گھوم گیا جب بھی فرم کی میٹنگ ہوتی کس شان سے سوٹ پہنے منہ میں پائپ دبائے وہ اپنی فیئٹ میں آتا۔ حالانکہ کچھ سال پہلے وہ بھی ہیڈ آفس میں ایک کلرک ہی تھا۔ رمیش نے سوچا اب میں اپنے گھر والوں اور دوستوں کو بتلاؤں گا کہ میں کیا ہوں۔ اس کا ماضی کچھ دیر کے لئے اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔

میٹرک پاس کرنے تک اسے اپنے بھائی کے اترے ہوئے کپڑے پہننے پڑے تھے اور کتابیں بھی اس کے بھائی کی چلتی تھیں جو اس سے ایک جماعت آگے تھا۔ نئے کپڑے کسی تہوار کو اور نئی کتابیں اس وقت جب کبھی کورس تبدیل ہو جاتا غرض اس کی زندگی سیکنڈ ہینڈ بن کر رہ گئی تھی۔

کالج میں بھی وہ کوئی کارہائے نمایاں نہ کر سکا تھا سوائے اس کے کہ اس نے بڑی جانفشانی سے تھرڈ ڈویژن میں بی کام کی ڈگری حاصل کی تھی۔ کالج کے معاشقے اس کے لئے بالکل ایسے تھے جیسے کوئی غریب اونچی دکانوں کے شوکیس میں رکھے ہوئے عورتوں کے مجسموں کو گھورے۔ وہ ایک عام شکل و صورت کا لوں ہی سا نوجوان جو ٹھہرا جس میں نہ جسمانی خوبصورتی تھی اور نہ ہی ذہانت اور نہ وہ کسی نامور خاندان سے تعلق رکھتا تھا وہ دوسروں کی عشق کی داستانیں سن کر اور دوستوں کے خطوط ان کی محبوباؤں تک پہنچا کر اس نے اپنے جنسی اطمینان کی تکمیل ڈھونڈ نکالی تھی۔

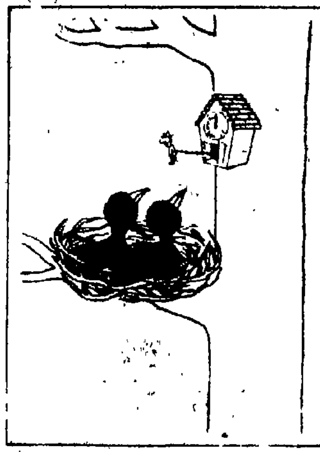
اکثر وہ سوچتا کاش میں کچھ بن جاؤں تاکہ ان تمام لوگوں سے بدلہ لے سکوں۔

بڑی سوسائٹیوں میں گھوم سکوں دبیز سوٹ میں دعوتیں اٹینڈ کر سکوں اور لہراتے سرسراتے پردوں کی خوابگاہ میں آرام کر سکوں۔

جب سے اسٹیٹ لاٹریاں شروع ہوئی تھیں اس کی کچھ امیدیں بندھ گئی تھیں مگر آج تک ٹکٹ خریدنے کے باوجود اسے کسی قسم کا انعام نہ ملا تھا اور جب باس نے سو روپیہ تنخواہ بڑھا دی تو اسے اپنی ترقی کے زینے پھر ایک بار نظر آنے لگے تھے۔

ایک دن کلکتہ برانچ کو سپلائی کئے ہوئے مال کی ماہانہ فہرستیں لے کر وہ باس کے دستخط لینے گیا تو باس کچھ دیر اس کی فہرستوں کو جانچتا رہا اور کہا "کلکتہ برانچ کا منیجر ضرور کچھ گڑبڑ کر رہا ہے۔ کیا خیال ہے تمہارا؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں سر!" اس نے جواب دیا۔ "مگر نہ جانے کیوں پچھلے چار مہینوں سے ان کے آرڈر کچھ زیادہ ہی وصول ہو رہے ہیں۔ اس نے سوچا کیوں نہ ملہوترا کی پوزیشن کو باس کے سامنے ڈاؤن کر دیا جائے۔ بہت اکڑتا ہے۔ کمبخت سیدھے منہ بات تک نہیں کرتا۔



"یہ بھی سننے میں آیا ہے سر۔" اس نے مزید کہا۔ "ملہوترا صاحب بعض لوگوں کو بغیر پریسٹ کے بھی کوششیں لیتے ہیں۔"

"ہاں ہاں کچھ میں نے بھی ایسی رپورٹ سنی ہے۔" تب باس نے ایک گہری نگاہ رمیش کے چہرے پر ڈالی اور کچھ سوچ کر کہا "میں سوچتا ہوں کیا تم فٹ ہو سکو گے۔"

"میں سمجھا نہیں سر؟"

"سوچ رہا ہوں ملہوترا کا ٹرانسفر کا پور کر کے کیوں نہ تمہیں کلکتہ برانچ کا منیجر بنا دیا جائے۔"

یہ جملہ ایک آتشبازی کی طرح اس کے پورے جسم میں سرایت کر گیا۔ اسی ایک لمحہ میں رمیش کو اپنے سارے خواب پورے ہوتے نظر آنے لگے۔ اس نے سوچا فیئٹ گاڑی، ٹیری اول کا سوٹ یا ٹیپ، سر سر لتے پرشے، وہ خاموش رہا۔

باس نے قریب ہی بیٹھی ہوئی اپنی پی اے کو رمیش شرما کے بحیثیت منیجر کلکتہ برانچ پروموشن کے آرڈر ٹائپ کرنے کی ہدایت کی۔ پی اے مس لوسی برگنزا کے لبوں پر ایک دلآویز مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔ چند ہی لمحوں میں آرڈر باس کے سامنے حاضر تھا۔ رمیش سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ قسمت کی دیوی اتنی سرعت سے اس پر مہربان ہو سکتی ہے۔

"سر! آج کی پارٹی کے بارے میں کیا ہدایات ہیں؟" لوسی نے بڑے دلفریب انداز میں اپنے باس سے پوچھا۔

"اوہ ہاں، مسٹر رمیش شرما کیوں نہ تم آج اس پارٹی میں بھی فیملی شریک رہو۔ ہماری تمام شاخوں کے منیجروں کی سالانہ پارٹی ہے اور جس میں انگلینڈ کے مسٹر ہائیڈ ننگ بھی مدعو ہیں، جو جہازوں کے بے تاج بادشاہ کہلاتے ہیں، تم بھی کچھ آداب سے واقف ہو جاؤ گے۔"

"جو حکم سر! میرے لئے یہ بڑی خوش نصیبی ہے۔" رمیش کو ایسے محسوس ہوا جیسے وہ ترقی کے راکٹ پر بیٹھا اونچا بہت اونچا اڑتا جا رہا ہے اور تمام دنیا والے اب اس کی نظروں میں سب بونے نظر آنے لگے تھے۔

"لوسی" باس نے کہا "یہ پروموشن آرڈر دوسرے تمام اہم کاغذات کے ساتھ پیر کو ہمارے سامنے پیش کرنا۔ آج پارٹی کے انتظامات بھی ہیں۔ مسٹر ہائیڈ ننگ کو پک اپ کرنے جانا بھی ہے تم بھی ساتھ چلو۔ ہاں مسٹر رمیش! تم ٹھیک آٹھ بجے میری کوٹھی پہنچ جانا۔"

رمیش یس سر کہتا ہوا ہواؤں میں اڑتا ہوا باس کے چیمبر کے باہر آیا۔ بڑی شان سے اس نے اپنے فائل یکجا کر کے الماری میں رکھ دیئے اور آفس سے باہر نکل آیا۔ باس کی کوٹھی میں تمام برانچوں کے منیجر اور بہت سے معززین شہر مع اپنی بیویوں اور محبوباؤں کے جمع تھے۔ شراب کا دور شروع ہو چکا تھا۔ مرکزی لان میں ایک طرف بینڈ اسٹینڈ تھا تو دوسری طرف بار جہاں شراب کی بوتلیں سوسائٹی کال گرلز کی طرح باہیں پھیلائے کھڑی تھیں۔

رمیش شوبھا کو لئے جھجکتے ہوئے ہال میں داخل ہوا۔ شوبھا اپنے تمام زیورات میں اور شادی کی قیمتی ساڑھی میں ملبوس ہر دیکھنے والے کی آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی کتنی ہی مدہوش نگاہوں نے اس کا بھرپور جائزہ لیا، شوبھا جھینپ سی گئی، اسے محسوس ہوا کہ وہ ننگی ہے نہیں۔ چاروں طرف سے برسنے والے تیر ہیں جو اس کے کپڑوں سے گزر کر اس کے ہر عضو بدن میں پیوست ہوتے جا رہے ہیں۔ بڑے لوگوں کی تہذیب سے ناواقفیت اسے شرم کے گہرے غار میں دھکیل رہی تھی۔

باس نے رمیش سے مصافحہ کیا۔ رمیش اس عزت افزائی سے دل ہی دل میں بہت خوش ہوا۔ لوسی برگنزا لچکتی ہوئی ان کے قریب آئی۔ باس نے دونوں کا مسٹر ہائیڈ ننگ سے تعارف کرایا۔

"بڑو سویٹ" کہہ کر مسٹر ہائیڈ ٹنگ نے شوبھا کو اپنے برابر بٹھا لیا۔ باس نے ایک نظر لوسی پر ڈالی اور رمیش کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں ڈالے ہوئے لگاوٹ کے انداز میں اسے بار کی طرف لے گئی۔

"ایک لارج اور ایک چھوٹا۔" اس نے بارمین کو وسکی کے لئے آرڈر دیا۔

"معاف کرنا لوسی میں شراب نہیں پیتا۔" رمیش نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ "ارے یہ شراب تھوڑی ہی ہے یہ تو وسکی ہے۔"

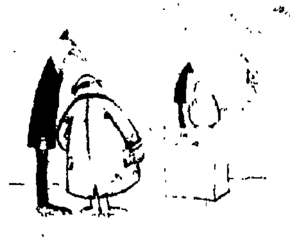
لوسی رمیش سے نہایت قریب کھڑی ہوئی تھی اتنی قریب کہ رمیش ذرا سی نظر نیچی کر کے اس کی بریزیئر کے نمبر تک گن سکتا تھا اور عطر کی خوشبو نے اس کے نتھنوں میں گھس کر اسے عجیب و غریب دنیا میں پہنچا دیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اس کے دماغ نے یہ بات بھی اسے سمجھا دی تھی کہ لوسی اور باس کے سامنے بڑے بڑے برانچ مینیجر ہکلا کر رہ جاتے تھے۔ ایک تو کلیدی عہدہ اور اس پر بھرپور جوانی۔

رمیش اس طرح بغیر مزید احتجاج کے پانچ لارج پیگ چڑھا چکا تھا۔

ڈانس کی موسیقی شروع ہو چکی تھی اور سب رمبا ناچنے میں مگن تھے۔ رمیش جو کسی بھی قسم کے انگریزی ناچ سے ناواقف تھا۔ محض لوسی کے گرم جسم کی قربت کے خیال سے اس کی بانہوں کے حلقہ میں ادھر سے ادھر گھسیٹ رہا تھا ویسے بھی کسے پرواہ تھی۔

مسٹر ہائیڈ ٹنگ باس کی بیوی کے ساتھ ناچ رہے تھے ناچ پورے شباب پر تھا۔ آج بینڈ والوں نے بھی شاید خوب چڑھا رکھی تھی۔ ایک ہی دھن مسلسل بجائے جا رہے تھے۔ ہال میں ایک چیخ گونجی، ایک کے بعد دوسری اور پھر زور سے سسکیاں لینے کی آوازیں۔

پہلے تو کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ مگر آہستہ آہستہ لوگوں کی توجہ ڈانس سے ہٹ کر مرکزی دروازے کی طرف گئی جو کہ باس کی خوابگاہ کی طرف کھلتا تھا۔ لوگوں نے دیکھا شوبھا زور زور سے سسکیاں لے رہی تھی۔ اس کے کپڑوں کی ابتری اور بکھرے ہوئے بال چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے کہ کسی عقاب نے اس پر حملہ کیا تھا لوگ مبہوت کھڑے تھے دوسرے کو سنے میں رمیش



نشے میں دھت لوسی کی بانہوں کے حلقہ میں جھول رہا تھا۔

شوبھا کی نظر رمیش پر پڑی وہ تیر کی طرح اس کی طرف آئی اور اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہنے لگی۔

"سنتے ہو۔۔؟"

شوبھا کو اس حال میں دیکھ کر رمیش کا نشہ ہرن ہو گیا اس کے استفسار کرنے سے پہلے ہی پھٹ پڑی۔

"سنتے ہو اس کمینے نے میری عزت لوٹنا چاہی" اس نے باس کی طرف انگلی اٹھا کر چیختے ہوئے کہا باس اپنی ٹائی کی گرہ ٹھیک کرتے ہوئے بغیر پلک جھپکائے رمیش کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

"سنا تم نے" شوبھا چیخ کر بولی "اس کھوسٹ نے میری آبرو پر ہاتھ ڈالا ہے۔"

رمیش کو ایسا محسوس ہوا جیسے ایٹم بم امریکہ نے ہیروشیما پر نہیں خود اس پر ڈالا ہو۔ مگر جیسے ہی باس سے اس کی نظریں ملیں، اسے لگا جیسے اس کی تمام قوت ارادی جواب دیتی جا رہی ہے۔ ایک لحظہ کے لئے اس کی نظروں میں وہ پروموشن آرڈر گھوم گیا جس پر دوسرے دن باس کے دستخط ہونے والے تھے، اچانک اس کا ہاتھ اٹھا اور ایک زناٹے دار تھپڑ شوبھا کے منہ پر پڑا، شوبھا نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کو دیکھا اور تیورا کر گر پڑی۔

رمیش نے کہا "ایک شریف آدمی پر الزام لگاتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آئی۔ کمینی کہیں کی۔"

بار کے کاؤنٹر سیکرٹری لوسی ہرگنزا نے بارمین کو ایک لارج پیگ کا آرڈر دے دیا۔

دوشیزہ کی محفل

رعنا فاروقی

○ شاہدہ عمر قریشی نے کراچی سے یاد کیا ہے "مجھے نئی قاری مت سمجھئے۔ اس وقت سے دوشیزہ میری ساتھی ہے جب شمیر نقوی کا ناول "مینا" شروع ہوا تھا جب سے اب تک تو اس پرچے نے بہت ترقی کرلی۔ بلکہ یوں کہئے کہ اکثریت کی پسند بن گیا ہے تاریخ کے اوراق، چلتے پھول، جانور، کہانیاں، افسانے سبھی دلچسپ ہیں۔ میں نے رخسانہ سہام مرزا کو ایک خط بھیجا تھا۔ انہوں نے جواب نہیں دیا۔ پتہ نہیں کیوں؟"

شاہدہ! دوشیزہ تمہاری محبت کی ممنون ہے اور جوابی محبت میں خود کو مزید نکھارنے کا وعدہ کرتی ہے۔ رخسانہ سہام مرزا کو تمہارا خط ملا نہیں ہوگا ورنہ وہ جواب ضرور دیتیں۔

○ ایم پی قمر نے کراچی سے مخاطب کیا ہے۔ "کافی عرصے سے "دوشیزہ" کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ کبھی محفل میں آنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ آپ کی ناراضگی سے ڈر لگتا تھا۔ چلتے پھول، تین عورتیں تین کہانیاں بہت پسند ہیں۔ کہانی بھیجوں تو کیا جگہ مل جائے گی۔؟"

قمر میاں! بھلا ہم سے ڈر کیسا؟ آتے جاتے رہا کریں آپس میں اُنس و پیار بڑھتا ہے۔ کہانی ضرور بھیجئے پوچھنے کا کیسا تکلف۔!

○ کوئٹہ سے ہمایوں جمیل پہلی دفعہ محفل میں آئے ہیں، لکھتے ہیں "ڈیر ایڈیٹر میں نے سردیوں کی چھٹیوں میں ایک افسانہ تحریر کیا ہے۔ کیا آپ کو بھیج دوں۔؟"

پیارے افسانہ نگار اپنا افسانہ ضرور بھیجو، اچھا ہوا تو شائع کر دیں گے۔

○ شاہین اختر نے کراچی سے یاد کیا ہے "لکھتی ہیں، سویٹ باجی رانا فاروقی صاحبہ میری طرف سے اتنا پیارا رسالہ شائع کرنے پہ مبارکباد قبول کریں۔ میں اپنا افسانہ بھیجنا چاہتی ہوں مگر یہ پوچھنا ضروری ہے کہ کیا افسانہ ایک ہی لفافے میں بھیجا جا سکتا ہے۔؟"

سویٹ شاہین میں رانا نہیں رعنا ہوں۔ اپنا افسانہ ضرور بھیجو (مگر املا کی غلطی دور کر کے) اگر لفافہ بھاری ہو جائے تو رجسٹرڈ کرا دینا اس طرح تمہارا افسانہ حفاظت سے پہنچ جائے گا۔

○ لبنیٰ اعظمی نے ہمیں اچھا سا خط لکھا ہے مگر شہر کا نام لکھنا بھول گئیں فرماتی ہیں "آپ دوشیزہ کا حسن نکھارنے کے لئے کچھ میک اپ یعنی بیوٹی بکس جیسی چیزوں کا اضافہ بھی کریں۔ اقتباسات اور لطائف وغیرہ کے علیحدہ کالم بنائیں ہو سکے تو اپنی کہانیاں میں ہندی کردار شامل کریں۔ منورہ نوری، عظمت عزمی اور اقراالاسلام عثمانی کو میری طرف سے مبارکباد پہنچا دیجئے خوابوں کی تعبیر، تلوں کے اثرات اور ہاتھ کی لکیروں کے بارے میں کچھ نہ کچھ شائع کرتی رہا کریں۔ میں اپنی سہیلی کی سچی کہانی تحریر کر رہی ہوں امید ہے اسے سچی کہانیوں میں جگہ مل جائے گی"

لبنیٰ تمہارے مشورے نوٹ کر لئے ہیں۔ افسانوں میں ہندی کردار شامل کرنے والی تجویز ہمیں پسند نہیں آئی۔ اس میں تعصب کی بُو آتی ہے اور اس شے سے ہمیں شدید نفرت ہے۔ تمہاری کہانی ہمیں نہیں ملی کیا لفافے میں رکھنا بھول گئیں۔؟

○ شہزاد انجم نے پشاور سے خط بھیجا ہے "اپنی منہ بولی بہن شہناز کے لئے ایک کہانی بھیج رہا ہوں ہو سکتا ہے اس طرح مجھے میری

سے وہ بہن مل جائے۔"

شہزاد تعجب ہے آپ کی کہانی ہمیں نہیں ملی کیا آپ بھی اپنی طرح افسانہ میں کہانی رکھنا بھول گئے۔؟

○ سکھر سے اسمٰعیل خان نے اپنی کہانی ہمیں بھیجی ہے لکھتے ہیں پندرہ سال سے یہ بوجھ روح پر اٹھائے پھر رہا ہوں آپ کی حوصلہ افزائی پر دکھ آپ کے حوالے کر رہا ہوں۔ شاید اس طرح کچھ قرار ملے۔ اگر آپ نے تعاون کیا تو شاید اگلی بار پھر آپ کو اپنی داستان کا مزید حصہ سنا دوں۔"

اسمٰعیل بھائی آپ نے اچھا کیا جو کسی کو غمگسار سمجھ کر اپنا بوجھ ہلکا کیا۔ ورنہ اس بھنور میں عمر بھر چکر کاٹتے رہنے سے ذہن و دل مفلوج سے ہو جاتے ہیں۔ آپ بلا جھجک اپنی داستان کا بقیہ حصہ بھی لکھ ڈالیں۔ آپ کی کہانی اس ماہ کے پرچے میں ہم نے تحریر کر دی ہے۔

○ اختر عزیز نے پیلز کالونی فیصل آباد سے لکھا ہے۔ "ڈیڑھ ہفتہ قبل ایک کہانی "ہنسی ہنسی میں" آپ کو بھیجی تھی اس کی رسید ابھی نہیں ملی۔ ناول کی تلاش کے صفحات کم کر دیں۔ اس کی افادیت بجا مگر اتنے سارے صفحات بے معنی معلوم ہوتے ہیں۔ اور کبھی کبھی جگہ ہر شمارے میں اپنے کسی مستقل لکھنے والوں کا انٹرویو دے دیا کریں تو اچھا ہوگا۔"

اختر بھائی "ہنسی ہنسی میں" تو ڈاک والوں نے اڑا لی۔ بتایئے اب ہم رسید کیسے دیں۔ آپ کی تجاویز نوٹ کر لی ہیں شکریہ۔

○ حنان شوق چیکنی (پشاور) نے بڑی بے تکلفی سے ہاتھ دکھایا ہے۔ "میری اچھی بہنا! سدا خوش رہو۔ آپ بڑی ہوشیار ہیں ہی استادی سے نمبروں کے پردے میں قیمت بڑھا دی ہے۔ حالانکہ صفحات۔ اب اس کا کیا علاج کہ دوشیزہ سے حد درجہ محبت دلیاں بھی نگل لینے پر مجبور کر رہی ہے۔ تکلف برطرف، میں چاہوں گا خواہ نہایت گھٹیا سوالات بھیجے ہیں۔ کتنا اچھا ہو جو لوگ تہذیب کے دائرے میں کچھ معلوماتی سوالات پوچھیں۔"

میرے بہت ہی اچھے بھائی شوق صاحب کیا دوشیزہ نے قیمت میں اضافہ کیا ہے اس کی ضخامت اس کا حسن اور دیگر اسباب کا نوٹس میں اضافہ نہیں ہوا۔ شوق بھی اچھی چیز اچھی قیمت ہی مانگتی ہے۔ پھر شکوہ کیسا۔ تکلف برطرف اس کے لئے آپ کے علاوہ کا قارئین ہی بہتر جواب دے سکتے ہیں۔

○ بنگش فلنگ (ضلع کوہاٹ) سے محمد منصور رہی نام پڑھ گیا ہے، انہے کہیں تا قیامت زندہ رہنے کی دعائیں بھیجی ہیں، لکھتے ہیں۔ "دوشیزہ کی محفل رونق جگمگاتی رہے تمہیں آپ کو دعائیں بھیج رہا ہوں۔"

شمور بھائی ہمیشہ ہم آپ کو بھی دعا دے رہے ہیں تاکہ محفل میں آنے والے بھی ہمارے ساتھ زندہ رہیں۔ آپ لوگ ہیں تو محفل ہے ورنہ اکیلی رہتا کیا دیواروں سے باتیں کرسکتی ہے۔؟

○ صبیحہ بانو نے شیخوپورہ سے تحریر کیا ہے۔ "بہت دنوں سے محفل میں آنے کا سوچ رہی تھی آج ایک دم سے چھلانگ لگا کر آپہنچی ہوں۔ سن لیجئے اگر دوشیزہ کو نظر لگی بھی تو میری ہی لگے گی۔ آپ سے ملنے کو جی چاہتا ہے کیا کروں۔ میری سہیلی نے درد کی دوا کرے کوئی میں اپنا خط بھیجا تھا وہ کالم بند کیوں کر دیا۔"

صبیحہ کیا زیادہ چوٹ تو نہیں آئی اتنی لمبی لمبی چھلانگیں مت مارا کرو۔ اب اگر یہ ہمت کر ہی لی ہے تو ذرا دوسری چھلانگ بھی مار دیکھو اس طرح ہم سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ درد کی دوا کرے کوئی کالم چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر عارضی طور پر بند کیا ہے جونہی حالات نے اجازت دی کالم شروع کر دیں گے۔ اپنی سہیلی کو فی الحال تسلی دے دیں۔

○ ڈیرہ غازی خان سے داؤد احمد جاوید نے یاد کیا ہے لکھتے ہیں۔ "آپ کو ہم نے رسمی بہن نہیں کہا سچے دل سے بہن بنا لیا ہے۔ مئی کا ٹائٹل بہت دیدہ زیب ہے۔ جیتے پھول اور رجالو، دونوں اچھے جا رہے ہیں تکلف برطرف بھی خوب رہا۔ میری طرف سے مصنفین کو مبارکباد پہنچا دیجئے۔ اقتباسات بھیجنا چاہتا ہوں نیز سالانہ ممبر شپ کا طریقہ بھی بتا دیجئے۔"

جاوید بھائی! پرچہ پسند آیا خوشی ہوئی۔ اقتباسات ضرور بھیجئے۔ سالانہ ممبری کے لئے ساٹھ روپے اور اپنا پتہ بھیج دیں۔

○ نوشہرو کینٹ سے فہمیدہ گل نے خط لکھا ہے۔ "پیاری باجی جیتے پھول کا ایک صفحہ اور بڑھا دیں۔ کچھ زیادہ مزہ آجائے گا۔ میں کہانی بھیجنا چاہتی ہوں کیا اجازت ملے گی۔؟"

فہمیدہ اس دفعہ صفحہ بڑھا دیا۔ پڑھ کر مزہ آیا نا۔ کہانی ضرور بھیجو۔ پوچھنا کیسا!

○ زینب اور نیلا دونوں سہیلیوں نے تربت (بلوچستان) سے ہمیں مشترکہ خط لکھا ہے لکھتی ہیں۔ "اپریل کا شمارہ بے حد پسند آیا تمام تحریریں اچھی تھیں۔ آپ کو لطائف کے تحفے بھیجے تھے آپ نے قارئین کو اس کی ہوا تک لگنے نہیں دی۔ اس دفعہ ڈھیٹ بن کر پھر لطیفے بھیج رہے ہیں۔ خدا جانے ان کا کیا حشر ہو۔ اداسیاں چھپ

آپ کے پاس نمبروں کا اسٹاک ختم ہو جائے تو ہم سے حسب وعدہ لیں کچھ نئے نمبروں کے نام بھیج دیں گے۔ ہم پٹھانوں کی عجیب و غریب رسومات پر ایک مضمون تصاویر کے ساتھ بھیجنا چاہتے ہیں۔ قبول کریں گی نا؟"

زینب اور نیلا تم دونوں نے ہمیں بہت دلچسپ خط لکھا ہے۔ پہلے تمہارے لطیفوں کا فیصلہ کر دیں باتیں پھر ہوں گی ہاں تو تمہارا پہلا لطیفہ شائع ہو جائے گا۔

زینب نیلا تمہارا دوسرا لطیفہ ردی کی ٹوکری نے اچک لیا میں کیا کرتی ہائے ہائے کرتی رہ گئی۔ اور نمبروں کے معاملے میں تمہاری پیش کش سے جی بہت خوش ہوا کوئی تو ہمارا معاون ثابت ہوا اپنا مضمون ہمیں بھیج دیں۔ انتظار رہے گا۔

◯ سعید (دوبئی) نے لکھا ہے: "مجھے خود تو لکھنے کا شوق نہیں البتہ دوست احباب کو ادب سے گہرا لگاؤ ہے۔ ان کی چیزوں کی اشاعت کے حقوق میرے پاس ہیں۔ کیا ممکن ہے کہ دوشیزہ میں یہ مضامین میرے اور ان کے دونوں ناموں سے چھپ جائیں؟"

سعید جی آپ کو اس کا کتنا کمیشن ملے گا۔ ذرا کان قریب لائیں۔ ہاں اس طرح۔ تو یہ تو بتائیے میرا کتنا حصہ ہو گا۔

◯ ابوظہبی سے عبدالرحمٰن مہمن نے لکھا ہے "جناب رعنا تو گل رعنا والا ہے مگر یہ فاروقی کا مطلب ہم نہیں سمجھے۔ آپ آئیڈیل کی تلاش میں کب آفر بھیجیں گی؟ تاکہ میں اپنا نام بھیج سکوں مجھے تو لگتا ہے یہ صفحے یوں ہی دوشیزہ کی اشاعت بڑھانے کے لئے شروع کئے گئے ہیں۔ گستاخی معاف۔"

عبدالرحمٰن کیا آپ کو صحیح نہیں پتہ کہ فاروقی کسے کہتے ہیں؟ آپ کراچی آکر میرے چار عدد فاروقی بھائیوں سے اس کا مطلب پوچھ لیجئے۔ وہ آپ کی ہر بات کا خاطر خواہ "جواب" دے دیں گے۔ گستاخی معاف۔

◯ محمد حنیف نے دوبئی سے یاد کیا ہے "بہن رعنا میں دو سال سے رسالہ پڑھ رہا ہوں۔ آپ سے ایک شکایت ہے کہ سلسلے وار کہانیوں کو ایسے موڑ پر چھوڑتے ہیں کہ پڑھنے والا بے تاب ہو کر مہینہ جلد ختم ہونے کی دعا مانگنے لگتا ہے۔ دوسری شکایت یہ کہ دوشیزہ بیرونی ممالک بھیجنے کا کوئی خاص انتظام نہیں ہے جس کی وجہ سے ستر روپے اس ٹیکسی کی نظر ہو جاتے ہیں جس میں بیٹھ کر میں دوشیزہ خریدنے دوبئی آتا ہوں۔ میرا قیام یہاں سے ۸۰ میل دور ہے۔"

حنیف بھائی آپ ہمیں ایک سو بیس روپے کا ڈرافٹ دوشیزہ کے نام بھیج دیں۔ آپ کی دوسری شکایت کا ازالہ ہو جائے گا۔ رہ گئی پہلی شکایت تو عرض ہے ؎

وہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

◯ ایم علی محمد نے چشتیاں سے مخاطب کیا ہے: "میں نے دوشیزہ کی محفل میں مِتّرس۔ الف صاحب کی شکایت پڑھی کہ ان کا خط آئیڈیل کی تلاش میں چھپا مگر کسی نے انہیں آفر نہیں بھیجی میں نے ان کا خط پچھلے شماروں میں تلاش کیا مگر نظر نہیں آیا۔ میں ان محترمہ کو اپنی آفر بھیجنا چاہتا ہوں۔ میرا ایڈریس یہ ہے۔ ایم علی محمد مدینہ کاٹن فیکٹری چشتیاں شریف (ضلع بہاولنگر)۔"

◯ یوسف علی شاکر نے پشاور سے طویل تنقیدی مضمون بھیجا ہے لکھتے ہیں: "جانوس کی سب لڑکیاں دس نمبری لگتی ہیں۔"

یوسف بھائی آپ کو ان سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ پشاور تک ان کی پہنچ نہیں ہو سکتی۔

◯ اشرف ایاز نے ملیر کراچی سے لکھا ہے: "بلاشبہ یہ رسالہ خوبصورت اور منور ہے۔ منورہ نوری کو میری طرف سے مبارکباد پہنچا دیجئے۔ اداریہ بھی بہت خوب ہوتا ہے۔"

اشرف ایاز شکریہ!

◯ قیصر حمید قیصر کالا باغ سے آتے ہیں: "میری عمر سترہ سال ہے۔ میں بچوں کے رسالے میں لکھتا ہوں۔ کیا دوشیزہ ہم جیسے کم سن لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرے گی۔ تینوں عورتیں تین کہانیاں اور جلتے پھول میرے پسندیدہ کالم ہیں۔ کرشن چندر مرحوم کی باجا بک نے بہت متاثر کیا۔"

قیصر لکھنے کے لئے عمر کی نہیں ذہنی بلوغت کی ضرورت ہوتی ہے۔ طارق رشید ہوبی کے دو افسانے پڑھ کر قارئین نے یہ اندازہ لگا لیا ہو گا۔ آپ اپنی تحریر بھیجئے پڑھ کر فیصلہ ہو گا کہ آپ کا تعلق کس طبقے سے ہے۔

◯ نرگس سعید قریشی (کراچی) نے "دوشیزہ" کے حسن کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ رعنا صاحبہ کو آداب۔

شکریہ نرگس، اپنی رائے سے نوازتی رہیئے۔ رخسانہ صبا ہنوز جواباً سلام کہہ رہی ہیں۔

◯ دوحہ سے عبدالناصر نے طارق رشید ہوبی کی کہانی کو ان

بلاشبہ مبارک باد کے مستحق ہیں" باجی، اس ماہ کی بہترین کہانی تھی واقعی دست قضا نے کرشن جیسا پھول توڑ کر ہماری آنکھیں اشکبار کر دیں۔ تکلف برطرف بہت ہی اعلیٰ ہے۔ باجی آخر میں ایک ننھی سی خواہش کر رہا ہوں کیا آپ اپنا ایک رنگین فوٹو عنایت کر سکتی ہیں؟

ناصر صاحب پرچے کی پسندیدگی کا شکریہ۔ کرشن چیشگا ورت نے ہمیں اب تک افسردہ کیا ہوا ہے یہ خلا بمشکل سے پُر ہوگا۔ اپنی تصویر میں ضرور بھیجتی مگر رنگین بنوانا مشکل ہے کھنچوائی ہی نہیں بلیک اینڈ وائٹ کہیئے تو بھیج دوں۔

○ یاسمین شبنم واہ سے لکھتی ہیں: "ایک افسانہ لکھا ہے چکوترہ ترش سا ہے۔ آپ چھاپ لیں تو بتائیں۔ میں ٹائٹل پر اپنی تصویر چھپوانا چاہتی ہوں، بتایئے کیا کروں؟"

شبنم افسانہ ملے گا تو رائے دے سکیں گے کہ کتنا میٹھا ہے یا ترش تیکھا! اپنی تصویر کے لئے تم کسی فوٹوگرافر سے ٹرانسپیرنسی بنوا کر بھیج دو۔

○ محمد انور تبسیم قریشی نے لاہور سے لکھا ہے: "باجی ایسا لگتا ہے جیسے آپ لوگوں نے دنیا داری چھوڑ کر رات دن پرچے کے لئے وقف کر دیئے اور ادھر ہمیں اس کے ہر شمارے کا انتظار رہتا ہے۔ اکثر کامن روم میں جھگڑا ہو جاتا ہے کہ پہلے پرچہ میں پڑھوں گا۔"

انور! یہ تمہارا خلوص ہے جو ہماری محنت کی قدر کرتے ہو۔ اور ہمارے پاس شکریہ ادا کرنے کے سوا اپنے خوشی کے جذبات کے اظہار کا اور کوئی ذریعہ نہیں۔

○ شمیم تبسم ہاشمی نے ہالانی سندھ سے خط بھیجا ہے "شائستہ قیصر سے بھی ملاقات کرا دیں۔"

تبسم آپ کی خواہش جلد پوری ہو جائے گی۔

○ حلیم انصاری نے جامعہ کراچی سے پوچھا ہے: "کیا منورہ نوری صاحبہ سے بحیثیت تاریخ کا طالب علم ہونے کے مل سکتا ہوں۔ خوش قسمت ہیں یہ لوگ کہ انہیں ہمراہ سلام، رضا فاروقی، عظمت عزمی اور منورہ نوری جیسے لوگوں کا تحریری تعاون ملا؟"

شکریہ انصاری صاحب! منورہ نوری کو آپ کی خواہش پہنچا دی ہے۔ وہ جو جواب دیں گی آپ تک پہنچا دیا جائے گا۔

○ شہناز نائل نے لاہور سے لکھا ہے: "دوشیزہ کی محفل کے لئے کوئی ٹکٹ وغیرہ تو نہیں۔ اگر ہو تو اب بھی میں ضرور شائع کیجئے کیونکہ میرے بھائی گھر میں کوئی رسالہ دیکھتے تو پھاڑ دیا کرتے تھے لیکن حیرانگی کی بات ہے کہ دوشیزہ انہوں نے ہی مجھے لا کر دیا۔ وہ بحرین چلے گئے ہیں۔ وہاں سے جب آئے تو میرا خیال تھا۔ وہ دوشیزہ بھول گئے ہوں گے اس لئے تازہ شمارہ انہیں پڑھنے کو دیا تو بولے۔ یہ تو میں بحرین میں پڑھ چکا ہوں۔ جبکہ وہ وہاں چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہیں بے حد مصروف آدمی۔"

شہناز! تمہارے بھیا اور تمہارے خلوص کا بے حد شکریہ ویسے "دوشیزہ" کو بھلانا آسان کام نہیں۔ یہ بات بھی اہل دل جانتے ہیں۔

○ تربت سے یاسمین عزیز لکھتی ہیں: "دوشیزہ" تو گویا اور بار شریف دونوں سے آگے جا رہا ہے مبارک ہو۔ جواب کر اندر خسانہ آتش کو، عظمت عزمی کو بھی کہ انہوں نے جیتے جیتے پھول لکھ کر ہمیں اچھی ذہنی تفریح دی۔ جانور کے سسپنس سے ڈر لگتا ہے کسی دن ہمارا ہارٹ فیل نہ کر دے۔

○ سیدہ عزیزہ نے شیخوپورہ سے اپنی دوست کو پیغام بھیجا ہے لکھتی ہیں "۲۷ مارچ کو پشاور جانے والی بس میں میرا ایک خاتون سے تعارف ہوا۔ ان کی منزل سیالکوٹ تھی انہوں نے مجھے اپنا ایڈریس دیا جو مجھ سے کھو گیا اگر وہ خود پڑھیں تو اس پتے پر رابطہ قائم کریں۔

سیدہ عزیزہ معرفت سید عزیز الغنی ۴۸-بی سول لائنز شیخوپورہ فون نمبر ۴۴۳۶۲-

○ شاہد علی غزل نے کراچی ایئر پورٹ سے خط لکھا ہے "ان شاء اللہ کسی روز دفتر حاضر ہو جاؤں گا۔ اگر اجازت دیں تو دوشیزہ کے لئے کہانیاں ساتھ لیتا آؤں۔؟ فحاشی کی بحث بڑی اچھی چل رہی ہے۔"

شاہد ضرور تشریف لیئے۔ کہانیاں ساتھ لے آیئے پڑھ کر ہی بتا سکیں گے کہ دوشیزہ نے قبول کیں یا نہیں۔ بحث فحاشی کو پسند کرنے کا شکریہ آپ قبول فرمایئے۔



زندگی

ان حسین لمحوں کی ایک خوبصورت کہانی جب انسان زندگی کی تلخیوں سے منہ موڑ کر پر کیف خوابوں کے سایوں میں پناہ ڈھونڈتا ہے۔

شے نذیر الدین

میری بیوی سمن ابھی تک آئینہ کے سامنے سے ہٹی نہ تھی۔ اس کا میک اپ کچھ ایسا ہی طویل ہوتا ہے۔ سمن کا ہی کیا؟ میں صرف اسے ہی کیوں الزام دوں۔ میک اپ کے معاملے میں تقریباً ہر عورت سمن ہوتی ہے۔

ابھی کلب جانا ہے۔ میں تیار ہو چکا ہوں مگر وہ ابھی تک اپنے آپ کو سنوارنے میں لگی ہوئی ہے۔ آخر جب سمن اپنے آپ کو سنوارنے میں لگی رہتی ہے تو میں تیار ہو کر اپنے بیڈ روم کی پچھلی گیلری میں آجاتا ہوں۔ پچھلی گیلری کی دیوار کے ساتھ ہی میرے بنگلے کا احاطہ ختم ہو جاتا ہے۔ میں نے اپنے بنگلے کی پچھلی طرف کمپاؤنڈ نہیں بنوایا۔ بلڈنگ کی پچھلی دیوار کے قریب ہی برگد کا ایک



[illegible] برگد ہے جس کی ٹہنیاں گیلری تک آتی ہیں۔ جنہیں گیلری میں کھڑے ہو کر آسانی سے چھوا جا سکتا ہے۔ سامنے ہی ایک کھلا میدان ہے جو صرف الیکشن کے دنوں میں ہی آباد ہوتا ہے۔ میدان کے اس پار بھی کچھ بنگلے ہیں۔ میدان کی ویرانی مجھے بہت پسند ہے اس لیے سمن کے تیار ہونے تک میں گیلری میں آجاتا ہوں اور سگریٹ سلگا کر برگد کی ٹہنیوں سے کھیلتا رہتا ہوں۔

آج بھی جب میں تیار ہو چکا تو سمن کے تیار ہونے تک اس کا انتظار کرنے کے لیے گیلری میں آگیا اور جیب سے سگریٹ نکال کر لائٹر جلایا ہی تھا کہ چونک پڑا۔ نیچے سے کچھ اجنبی آوازیں آرہی تھیں۔ میں نے لائٹر بجھا دیا اور گیلری سے جھک کر نیچے دیکھا۔ میرے لبوں پر بے اختیار ایک مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے دوبارہ لائٹر جلا کر سگریٹ سلگا لیا۔ اور ایک طویل کش لے کر نیچے متوجہ ہو گیا۔ اس بوڑھے برگد کے سایے تلے دو جوان جسم ایک دوسرے کے قریب بیٹھے محو گفتگو ہیں۔ لڑکی کہہ رہی ہے۔

"دیکھو! یہ جگہ کتنی اچھی ہے، کتنا سکون ہے یہاں! ہم ملنے کے لیے روز یہیں آیا کریں گے!"

لڑکے کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل جاتی ہے۔

"یہ جگہ تمہیں پسند ہے؟"

"ہاں ——— !"

کیوں پسند ہے ——— ؟"

"اس لیے کہ یہاں میرے اور تمہارے علاوہ کوئی نہیں، کیا تمہیں یہاں کوئی اور بھی دکھائی دیتا ہے؟"

لڑکے نے اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا ——— "نہیں کوئی نہیں ہے۔ اگر ہو گا بھی تو ہماری طرف کون دیکھے گا۔ ان بنگلے والوں کے پاس اتنی فرصت کہاں کہ وہ ہماری طرف متوجہ ہوں۔"

واقعی لڑکا بہت گہری بات کہہ رہا تھا۔ ہمارے پاس اتنا وقت کہاں ہوتا ہے؟

"میں تو . . . لڑکا کہہ رہا ہے۔ میرا مطلب ہے۔ ——— پریم! ہم بھی اپنے لیے ایک ایسا ہی بنگلہ بنائیں گے چھوٹا سا خوبصورت بنگلہ . . . . . !"

لڑکی نے سر لڑکے کے شانے پر رکھ دیا ہے۔

"ہاں! چھوٹا سا خوبصورت بنگلہ، جس کے آگے ایک چھوٹا سا گارڈن بھی ہو گا۔ چھوٹی چھوٹی کیاریوں میں بہت سے گلاب کے پھول میں لگاؤں گی۔ جب ہواؤں میں رنگ برنگے خوب کھلیں گے تو۔"

لڑکے نے لڑکی کی بات کاٹتے ہوئے کہا ——— "تو میں وہ پھول تمہارے جوڑے میں ٹانکوں گا!"

لڑکی نے ایک جھٹکے سے اپنا سر اس کے شانے سے ہٹاتے ہوئے کہا:

"نہیں وہ پھول تو میرے ہیں، کیا تم میرے ہی پھول میرے جوڑے میں لگاؤ گے؟ وہ پھول تو میں لگاؤں گی، جب تم دفتر جاؤ گے تو میں ہر روز ایک پھول توڑ کر تمہارے کوٹ کے کالر پر ٹانک دوں گی جو تمام دن مہک کر تمہیں میری یاد دلاتا رہے گا!"

لڑکا ہنس پڑا ہے۔

"چلیے! میں تیار ہو گئی ——— !" میں گھوم کر دیکھتا ہوں سمن دروازے میں کھڑی ہے۔ اس نے لمبی لمبی زلفوں کو لپیٹ کر جوڑا بنا رکھا ہے۔ اس کے رخساروں پر غازہ کی تہہ چڑھی ہوئی ہے اس کے ہونٹ گلابی لپ اسٹک سے رنگے ہوئے ہیں۔ اس نے گلابی ساری اور کھلے آستین کا گلابی بلاؤز پہن رکھا ہے۔ اس کے سینڈل بھی گلابی ہی ہیں۔ کلائیوں میں چھنکنے والی چوڑیوں کا رنگ بھی گلابی ہی ہے اور اس کے ہاتھ میں لٹکتا ہوا پرس بھی گلابی ہے۔ اس کا میک اپ پورا ہو گیا ہے۔ مجھے اس طرح دیکھتے ہوئے پا کر اس نے مسکراتے ہوئے کہا:

"چلیے نا ——— اس طرح کیا دیکھ رہے ہیں؟"

میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا ہے اور اشارہ ہی سے اپنے قریب بلایا ہے۔ وہ میرے قریب آگئی ہے میرا دماغ بہت ساری خوشبوؤں سے مہک اٹھا ہے۔ میں نے اشارے سے اسے نیچے دیکھنے کے لیے کہا ہے۔ وہ نیچے دیکھ کر مسکرا اٹھی ہے اور اپنے دونوں ہاتھ گیلری کی دیوار پر ٹیک کر ان دونوں کی باتیں سننے لگی ہے۔ لڑکا کہہ رہا ہے:

"اور تم اس وقت کیا کرو گی جب میں دفتر چلا جاؤں گا؟"

"تمہارے آنے تک میں اپنے گھر کو سنوارتی رہوں گی۔ جب تمہارے آنے کا وقت ہو جائے گا تو جا کے بنگلے کے لان میں بیٹھی تمہارا انتظار کروں گی!" لڑکی نے کہا ہے۔

"اور میں آتے ہی تمہیں اس طرح اپنی بانہوں میں سمیٹ لوں گا!" ——— اس نے اپنی دونوں بانہوں میں لڑکی کو

سمن میرے بہت ہی قریب آگئی ہے۔ اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا ہے۔ وہ لڑکی تڑپ کر لڑکے کی باہوں سے الگ ہو گئی ہے اور جھینپی جھینپی سی، شرمائی شرمائی سی کہہ رہی ہے:

"تم بڑے شریر ہو!"

لڑکا ہنس پڑا ہے۔ سمن مجھ سے دور ہٹ کر کھڑی ہو گئی ہے۔ لڑکا کہہ رہا ہے:

"یہ تو ابتدا کی بات ہوئی۔ اس وقت تم کیا کرو گی جب ہم دو سے تین ہو جائیں گے؟"

لڑکی نے بھولپن سے پوچھا ہے:

"یعنی ——— ؟"

"یعنی، جب تم ماں اور میں باپ بن جاؤں گا!" اس وقت لڑکی کے رخسار شرم سے سرخ ہو گئے ہیں۔ اس نے اپنا چہرہ اپنی باہوں میں چھپاتے ہوئے کہا ہے:

"چلو! تم بہت بے شرم ہو!"

لڑکا ہنسنے لگا ہے ——— "اس میں شرم کیسی؟ یہ تو ہوگا ہی! جب شادی ہو گی تو بچے بھی ہوں گے! سوچو ہم اس وقت کتنے مسرور رہیں گے جب ہمارا ایک چھوٹا سا بنگلہ ہوگا اور اس بنگلے کے لان پر ہمارے چھوٹے چھوٹے سے بچے کھیل رہے ہوں گے۔ اور تم لان چیئر پر میرے قریب بیٹھی سوئیٹر بنتے ہوئے اپنے بچوں کی شرارتوں سے محظوظ ہو رہی ہو گی۔ اس وقت ہمیں جو مسرت ملے گی، کیا تم اس کا اندازہ لگا سکتی ہو پریم؟"

لڑکی بدستور اپنا چہرہ اپنی باہوں میں چھپائے خاموش بیٹھی ہے لڑکا بھی چپ ہو کر دور خلاؤں میں گھور رہا ہے، جیسے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے مستقبل کی جھلکیاں دیکھ رہا ہو۔ شام کا دھندلکا آہستہ آہستہ بڑھ رہا ہے۔

اچانک لڑکی نے باہوں سے اپنا چہرہ اٹھا کر کہا ہے:

"چلو شام ہو گئی ہے ——— !"

"کہاں چلیں ——— ؟"

لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا ہے ——— "اپنے اپنے گھر اور کہاں ——— ؟"

لڑکے کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی ہے اور وہ بجھے ہوئے لہجے میں کہہ رہا ہے:

"کچھ گھڑیاں خوابوں میں کھو جانے کے بعد پھر سے حقیقتوں کی تلخیوں میں لوٹ جانے کو جی نہیں چاہتا پریم!"

لڑکی نے لڑکے کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا ہے:

"حقیقتیں اپنی نہ سہی، خواب تو ہمارے ہی ہیں نا؟ کل پھر آ جائیں گے یہاں خوابوں میں کھو جانے کے لیے! اب چلو چلیں!"

لڑکا مسکرا کر اٹھ گیا ہے اور لڑکی کا ہاتھ تھامے خراماں خراماں وہاں سے جا رہا ہے!

میں کہتا ہوں ——— "دیکھو سمن! وہ دونوں کتنے خوش ہیں، خواب دیکھ کر وہ کتنے مسرور ہیں۔ یہاں بیٹھ کر وہ جس زندگی کا خواب دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ وہ زندگی ہمارے لیے حقیقت ہے، مگر کیا ہم خوش ہیں ——— ؟ اور اس لڑکی کو دیکھو، کتنی سادگی ہے اس میں! اس کے رخساروں پر غازہ نہیں ہے۔ مگر پھر بھی وہ کس قدر دمک رہی ہے۔ اس کے ہونٹوں پر لپ اسٹک کے رنگ کے بجائے اس کے اپنے شباب کی سرخی ہے۔ اس کی یہی سادگی اس کے حسن کو اور نکھارے ہوئے ہے، تم دیکھ رہی ہو نا؟"

میں نے دیکھا سمن وہاں نہیں تھی گیلری میں میں اکیلا ہی کھڑا رہ گیا تھا۔ مجھے خبر ہی نہیں ہوئی کہ سمن کب یہاں سے چلی گئی۔

میں نے بجھے ہوئے سگریٹ کو پھینک کر دوسرا سگریٹ سلگایا اور بیڈ روم میں سمن کو دیکھنے کے لیے چلا گیا۔ کلب جانے کے لیے ہمیں دیر ہو رہی تھی۔ بیڈ روم میں پہنچ کر مجھے بہت ہی حیرت ہوئی۔ کیونکہ سمن نے اپنا سارا میک اپ اتار دیا تھا۔ میں نے حیرت سے کہا:

"کیوں کلب نہیں چلنا ہے؟"

سمن مسکراتی ہوئی میری طرف بڑھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر میری ٹائی کی گرہ کھول دی۔ شانوں سے کوٹ بھی اتار دیا۔ اور اپنی باہیں میرے گلے میں ڈالتے ہوئے کہا:

"چلیے چلیں ——— !"

"کہاں ——— ؟"

"وہیں، اس برگد کے پیڑ تلے!"



صحت و زندگی

مٹاپے کے اسباب

نیویارک طبی اسکول کے ڈاکٹر ہربرٹ پولک امریکن میڈیکل ایسوسی ایشن کے جرنل میں تحریر فرماتے ہیں۔ مٹاپے کے اصل اسباب میں سب سے بڑا اور اہم سبب —— اپنی ضرورت سے زیادہ کیلوریز یا حرارے کا جسم میں داخل ہوتا ہے۔ خوراک میں تھوڑا سا اضافہ اور اسی کے ساتھ مقررہ کام میں تھوڑی سی کمی، یہ اگر کچھ دنوں تک جاری رہیں تو آدمی موٹا ہو جائے گا۔

جو شخص تین گھنٹے تک گولف کھیلتا ہے وہ اس شخص سے ۴۰ حرارے زیادہ پھونک دیتا ہے جو اتنے ہی عرصہ تک باغ میں کام کرتا ہے۔ ہر شخص کو زندہ رہنے کے لیے اپنی خاص ضرورت کے مطابق حراروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ حراروں کی تعداد کا انحصار اس شخص کی عمر اور جسم کے سطحی رقبے پر ہوتا ہے۔ حراروں کا صرف ہونا بھی جسم کے رقبے پر منحصر ہے۔

تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ سکون سے بیٹھے رہنے اور سکون سے کھڑے رہنے میں جسم کی ہر مربع میٹر سطح کے لیے فی گھنٹہ ۱۰ حراروں کا فرق ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر پولک کہتے ہیں، اگر ایک شخص جب کہ وہ بوڑھا ہو رہا ہے، حراروں میں کمی نہ کرے اور اپنے کام اور سرگرمیوں میں کمی کر دے تو ضرور موٹا ہو جائے گا۔ اور اس کا وزن بڑھ جائے گا۔ مثلاً ایک لڑکی معمولی ٹائپ کرنا چھوڑ کر بجلی سے چلنے والی ٹائپ مشین پر کام کرنے لگتی ہے۔ فرض کیجیے کہ وہ لڑکی پانچ فٹ چھ انچ لمبی ہے اور اس کا وزن ۱۱۰ پونڈ ہے تو اسے بجلی سے چلنے والی مشین پر ۵۰ حرارے کم صرف کرنے چاہئیں۔ اگر وہ حراروں میں کمی نہ کرے تو چند ہی ہفتوں میں اس کا وزن زیادہ ہو جائے گا۔

کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد

حکیم بقراط نے لکھا ہے کہ کھانے سے پہلے تھوڑی سی محنت ضرور ہونی چاہیے، لیکن تھکن کی حالت میں کھانا کھانا مضر ہے۔ کھانا اتنا کھانا چاہیے کہ پیٹ سے اونچا نہ ہو۔ کھانے کے بعد تھوڑا سا آرام کرنا چاہیے۔ خواہ چند ہی منٹ کے لیے کیوں نہ ہو۔

جالینوس نے کہا ہے:

"کھانا کھانے سے پہلے ٹھنڈے یا گرم پانی سے منہ دھو لینا مفید ہوتا ہے۔ پھر کھانے کے بعد تھوڑی سی چہل قدمی، پھر سر یا گردن کو سہلانا یا بالوں میں کنگھی کرنا مفید ہوتا ہے۔ چہل قدمی کے بعد تھوڑی دیر لیٹ جائے تو بہتر ہے۔ لیٹنا اس طرح چاہیے کہ پہلے سیدھے پہلو پر اس کے بعد بائیں پہلو پر، کیونکہ پہلو بائیں ہے وہ گرمی دینے کا محتاج ہے۔ لیکن زیادہ پہلو نہ بدلیں۔ اس سے تشنج پیدا ہوتی ہے۔"

حکیم بقراط کہتا ہے:

"کھانا کھانے سے پہلے تھوڑی سی حرکت اشتہا پیدا کرتی ہے اور کھانے کے بعد کی حرکت کھانے کو نیچے اتارتی ہے۔ اگر کھانے کے بعد تھوڑی سی نیند لے لیں تو جسم کی منتشر حرارت معدے کے گرد جمع ہو جاتی ہے جس سے کھانا اچھی طرح ہضم ہو جاتا ہے۔ اس کے

برعکس کھانے سے پہلے کی نیند خشکی پیدا کرتی ہے۔ کھانا کھانے کے فوراً بعد پانی پینا اچھا نہیں۔ ہاں پیاس زیادہ لگی ہو تو تھوڑا سا پی لینا چاہیئے۔"

کھانا کھانے کے بعد غسل کرنا انتہائی مضر ہے۔ اطبا کہتے ہیں کہ اس سے جگر میں سدے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اکثر اوقات قبض کی شکایت ہو جاتی ہے اور نظامِ ہضم کی خرابی کے باعث معدے اور آنتوں کے دیگر عوارض کے پیدا ہو جانے کا احتمال رہتا ہے۔ کھانا کھانے کے کم از کم ڈھائی گھنٹے بعد غسل کرنا چاہیئے۔

آپ کا دل

ڈاکٹر جے ڈبلیو فاکس ایم ڈی نے اپنے اس مقالہ میں جس اہم حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے اس کی طرف سے غفلت برتنے کے خوفناک نتائج ہمارے سامنے آئے دن آتے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر موصوف لکھتے ہیں:

"ہر چوبیس گھنٹے میں آپ کے دل میں سے تقریباً دس ٹن خون دورہ کرتا ہے۔ یہ ننھا سا پمپ ایک دن میں ایک لاکھ بار حرکت کرتا ہے اور چوبیس گھنٹے رکے بغیر خون آپ کے دل کے خانوں سے خون کی نالیوں میں متواتر بہتا رہتا ہے۔ دل ستر سال کی عمر تک دو ارب پچاس کروڑ بار حرکت کر چکتا ہے اور مرمت کے لیے ایک لمحہ بھی نہیں ٹھہرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ اپنے دل کو دنیا کی سب سے کامل و مکمل مشین سے مشابہت دے سکتے ہیں جو ہر وقت چلتی رہتی ہے۔ جب زندگی کی چنگاری ایک بار روشن ہو جاتی ہے تو دل کی حرکت مسلسل جاری رہتی ہے تاوقتیکہ زندگی کی شمع گل نہ ہو جائے!

قدرت نے دل کو اتنا مضبوط بنایا ہے کہ وہ اس بڑے کام کو بخوبی انجام دے سکے لیکن اس میں یہ صلاحیت صرف اس لیے پائی جاتی ہے کہ جتنا سخت کام وہ سکڑتے وقت کرتا ہے اتنا ہی آرام وہ دو بار حرکت کے درمیان حاصل کرتا ہے۔ ہر شخص کو جو سخت کام کرتا ہے دن میں دو بار اتنا ہی آرام کرنا چاہیئے۔ آٹھ گھنٹے کام کرنے سے، آٹھ گھنٹے تک سونے سے اور آٹھ گھنٹے کھانے پینے اور دوسرے کاموں میں صرف کرنے سے یہ ضرورت پوری ہو جاتی ہے۔ چاہے کوئی کاروباری آدمی ہو یا نہ ہو، سب کا دل ایک ہی اصول کے ماتحت کام کرتا ہے۔ حالات کا کچھ ایسا دباؤ ہے کہ آج کل کے بڑے کاروباری آدمی، صنعت و حرفت میں مصروف رہنے والے، سرکاری افسر اور قوم کے مایۂ ناز رہنما کام اور ذمہ داریوں کی زیادتی کے باعث آرام کے لیے وقت نہیں نکال سکتے اور دل اور خون کی رگوں کی بیماری میں مبتلا ہو کر وقت سے پہلے ہی موت کا شکار ہو جاتے ہیں۔

دل کی صحت کے لیے یہ مشورے بہت اہم ہیں:

(۱) اطمینان سے کام کیجئے۔ بے حد مصروفیت مہلک ثابت ہوگی۔ جلد بازی سے کام کرنے سے دل پر دباؤ بہت زیادہ پڑتا ہے۔

(۲) متوازن غذا کھائیے۔ موٹاپے کو پاس نہ آنے دیجئے۔ زیادہ وزن کے بہت سے نقصانات ہیں۔ اگر آپ کے جسم میں چربی زیادہ ہے تو آپ کے دل کو زیادہ خون مہیا کرنے کے لیے بہت زیادہ کام کرنا پڑتا ہے۔

(۳) فکر و تردد نہ کیجئے۔ فکر کرنے والے دل کی بیماری کے مریض بن جاتے ہیں۔ وہ حال کی بجائے مستقبل کی فکروں سے گرانبار رہتے ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خون کا دباؤ بڑھ جاتا ہے۔

(۴) ضرورت سے زیادہ مصروفیت سے بچئے۔ کیونکہ حد سے زیادہ تکان موت کا باعث ہو سکتی ہے۔

صحت پر جذبات کا اثر

صحت کا انحصار غذا پر نہیں، کھانے والے کی ذہنی اور جذباتی حالت پر ہے۔ جو شخص اپنے ذہن پر تلخی اور منفی جذبات غصہ، خوف، مایوسی کو مسلط ہو جانے دے۔ اسے اچھی سے اچھی غذا بھی تقویت نہ دے گی۔ اس کے برعکس مثبت اور شیریں جذبات، محبت، یقین، امید، شوق، عزم و استقلال رکھنے والا انسان معمولی غذا کھا کر بھی چاق و چوبند رہے گا۔ نانِ جویں کھانے والوں نے دنیا فتح کر لی تھی۔ اس لیے کہ ان کے دلوں میں یقین اور محبت کے دریا موجزن تھے۔

اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے ہمیں جذبات اور جسم انسانی کا باہمی تعلق معلوم کرنا چاہیئے۔ جذبات سے انسانی جسم کے غدود (GLANDS) متحرک ہوتے ہیں۔ اس تحریک کے باعث خون میں ایسے رس داخل ہو جاتے ہیں جن سے جسم میں ہیجان پیدا ہو جاتا ہے۔ تمام اعضا شدت سے کام کرنے لگتے ہیں۔ جگر زیادہ مقدار میں شکر بنا کر خون میں شامل کرتا ہے۔ خون میں سرخ ذروں کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔ دوران خون جسم کے

اندرونی اعضا سے ہٹ کر دماغ، ہاتھوں اور جلد کی طرف بڑھتا ہے۔ دل شدت سے دھڑکتا ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے معدہ اپنا کام بند کر دیتا ہے اور جسم کسی بڑے امتحان کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

جسم کی یہ حالت اگر کبھی کبھی کسی خاص موقع پر پیدا ہو۔ جب انسان کی اپنی یا اس کے خاندان یا قوم کی ہستی خطرے میں ہو تو یہ بہت مفید ہے لیکن اگر کسی شخص کو اپنے جذبات پر قابو نہ ہو اور وہ بات بات پر غصہ میں آ جائے اور ہر وقت اپنے بیوی بچوں، نوکروں اور ماتحتوں پر برستا رہے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ بار بار اس کا دل دھڑکے گا۔ بار بار جگر خون میں شکر لوٹائے گا۔ معدہ بار بار رکے گا، اعصاب تنیں گے، دماغ میں خون کا دباؤ بڑھے گا اور رفتہ رفتہ اس کے تمام اعضائے رئیسہ کمزور ہو جائیں گے۔ بد مزاج اور کج خلق آدمی ایک خاص عمر کو پہنچ کر اختلاج، بلڈ پریشر، ذیابیطس اور ضعفِ معدہ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جو لوگ خوفزدہ اور غمگین رہنے کے عادی ہوتے ہیں ان کے تھائرائیڈ اور پچوٹری غدود متحرک ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے باعث خون میں ایسے رس داخل ہوتے رہتے ہیں جو رفتہ رفتہ جسم کو کمزور اور کھوکھلا کر دیتے ہیں ——!

اپنی مدد آپ

خدا ان کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ جب آپ کے دل میں وسوسوں کا اندھیرا چھایا ہو، امید کی روشنی بجھ چکی ہو۔ آپ اپنے قوت بازو پر بھروسہ نہ رکھتے ہوں۔ جب خطرہ اور تکلیف کے نام ہی سے آپ کا خون خشک ہو جاتا ہو تو خدا کو کیا پڑی ہے کہ وہ ایسے ننگِ انسانیت لوگوں کے لیے اپنے قوانین اور قدرت کو بدلے۔ وہ عادل ہے، وہ ان کی مدد کرتا ہے جو اس کی دی ہوئی قوتوں سے کام لیتے ہیں۔

کولمبس کو اپنی ذات پر اعتماد تھا۔ اس لیے اس نے اٹلی اور اسپین کے دانشوروں اور مدبروں کے استہزا کی پروا نہ کی۔ اور اپنے اصول کی صداقت ظاہر کرنے کے لیے اور زیادہ مستعد ہو گیا۔ مہینوں وہ سمندر میں مصائب برداشت کرتا رہا۔ مشکلات کا مقابلہ کرتا رہا۔ اس کے ساتھیوں نے اسے مار ڈالنا چاہا لیکن وہ نہ گھبرایا۔ وہ اپنی ڈائری میں ہر روز یہی لکھتا رہا —— "آگے بھی ہم آگے بڑھ رہے ہیں"!

اس کے مضبوط دل و دماغ اور چشم بینا کو سمندر کے اس پار ایک سرزمین نظر آ رہی تھی، وہی سرزمین جو آج تہذیب و تمدن کی علمبردار ہے اور جس سے مارکنیز، ہوور، ولسن جیسے مشاہیر پیدا ہوئے ——— دنیا کے انسانوں کے لیے کولمبس کی اولوالعزمی اور مستقل مزاجی نے ایک ایسی شاہراہِ عمل استوار کر دی جو زندگی کے ہر شعبہ میں کامیابی اور منزلِ کامرانی تک پہنچانے کی ضامن ہے۔ اگر آپ خود اعتمادی کی دولت سے محروم ہیں۔ آپ کے اندر اپنی مدد آپ کرنے کا جذبہ مفقود ہے۔ آپ کو اپنی قوت بازو پر بھروسہ نہیں ہے تو یہ بات بجائے خود آپ کی کامیابی کے راستے میں ایسی سنگلاخ چٹان ہے جسے دوسروں کی امداد بھی نہیں ہلا سکتی۔

سانس کی اہمیت

سانس زندگی ہے۔ سانس لینا انسان کی جان کے ساتھ ہے چاہے وہ کسی رنگ و نسل کا ہو، چاہے وہ کسی مذہب و ملت کا ہو۔ مختلف قوموں اور ملکوں کے لوگ اپنی دوسری ضروریات میں چاہے کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں، زندہ رہنے کے لیے کھانا سب کھاتے ہیں، پانی سب پیتے ہیں، سانس سب لیتے ہیں اور تینوں چیزوں میں سانس لینا سب سے اہم ہے۔ ہم بغیر کھائے کچھ مدت تک زندہ رہ سکتے ہیں، کچھ عرصہ تک بغیر پانی پیئے بھی زندہ رہ سکتے ہیں لیکن چند منٹ بھی بغیر سانس لیے زندہ نہیں رہ سکتے۔ اس سے ظاہر ہے کہ سانس لینا کتنا اہم ہے!

اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم جس طرح سانس لیتے ہیں وہ سانس لینے کا صحیح طریقہ ہے یا نہیں اور ہم اس سے پورا فائدہ حاصل کر رہے ہیں یا نہیں؟ مختلف لوگ مختلف طریقے سے سانس لیتے ہیں ہم سانس لینے کے طریقوں کو تین قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں —
اوپری سانس، درمیانی سانس، گہری سانس!

اوپری سانس ہلکی ہوتی ہے اور یہ پھیپھڑوں کے بالائی حصے تک پہنچتی ہے۔ درمیانی سانس میں تھوڑی سی اور ہوا پھیپھڑوں میں پہنچ جاتی ہے۔ جو لوگ درمیانی سانس کے عادی ہوتے ہیں وہ اپنے سینے کو نہیں پھیلاتے۔ اپنے کاندھوں کو اوپر اٹھا لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ محنت تو انہیں زیادہ کرنی پڑتی ہے لیکن فائدہ کم ہوتا ہے۔ سانس لینے کی تیسری قسم یعنی گہری سانس جسم

کے اندر تک پہنچ جاتی ہے۔ اور اس کا اثر پردۂ شکم پر پوری طرح ہوتا ہے۔ اور پھیپھڑوں کے پورے رقبہ کو اس سے فائدہ پہنچتا ہے۔ جب ہم گہری سانس لیتے ہیں تو پردۂ شکم دب جاتا ہے۔ اور ہم آسانی سے سینے کو پھیلا سکتے ہیں اور پھیپھڑے آزادی سے حرکت کر سکتے ہیں۔

تینوں قسم کی سانس لے کر دیکھیے تو آپ کو ان کے فرق کا صحیح اندازہ ہوگا۔ جب ہم گہری سانس لیتے ہیں تو ہمیں صاف طور پر محسوس ہوتا ہے کہ ہم کوئی چیز اپنے جسم کے اندر لے جا رہے ہیں ہماری طبیعت ہشاش بشاش ہو جاتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم پہلے سے زیادہ چاق و چست ہو گئے ہیں اور مشکل سے مشکل کام انجام دینے کی قوت و ہمت ہمارے اندر پیدا ہو گئی ہے روزانہ صبح کو بیدار ہوتے ہی تھوڑی دیر تک لمبی لمبی سانس لینا بے حد مفید ہوتا ہے۔ صبح کو سانس لیتے وقت سوچتے رہیے کہ ہم اپنی تندرستی کے لیے بہت مفید عمل کر رہے ہیں۔ پھر آپ دیکھیں گے۔ جلد ہی یہ خیال حقیقت بن جائے گا۔ یہ حقیقت صحت مندی کی چمک بن کر آپ کی آنکھوں میں مسکرانے لگے گی۔

گہری اور متناسب سانسوں سے جو جسمانی فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ ذہنی اور روحانی اعتبار سے بھی اس کے فوائد کم نہیں ہیں۔ متناسب گہری سانسوں سے اطمینان کا احساس ہوتا ہے۔ اگر کبھی کوئی پریشانی لاحق ہو تو الگ بیٹھ کر تھوڑی دیر تک لمبی لمبی سانس لیتے رہنے سے ضرور سکون حاصل ہوگا۔ اگر ہم پر بہت سے کاموں کا بوجھ ایک ساتھ آپڑے اور ہم گھبرا جائیں۔ سمجھ میں نہ آتا ہو کہ کس طرح ان سب کاموں کو سمیٹیں تو ہمارے لیے یہ بہت مفید ہوگا کہ ہم ایک طرف سب سے الگ تھلگ بیٹھ کر لمبی لمبی سانس چند منٹ تک لیں اس طرح ہمیں سکونِ قلب میسر ہوگا، کھچاؤ اور تناؤ دور ہوگا اور ایسا معلوم ہونے لگے گا جیسے ساری مشکلات حل ہوتی چلی جا رہی ہیں۔

اگر خاص مشکلات حائل نہ ہوں یا دشوار مسئلے ہمیں حل نہ کرنے ہوں تب بھی ہم چند منٹ تک روز صبح کو اس سکون بخش فضا میں گزاریں جو گہری سانس لینے سے پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سے ہم پر مفید اور فرحت بخش اثر ہوگا۔ یہ سکون بخش فضا ہمیں مادی ماحول کی کشمکش سے جس میں ہم پریشان زندگی بسر کر رہے ہیں، اوپر اٹھا کر ذہنی اور روحانی سکون کے ماحول میں لے جائے گی۔ اور لازمی طور پر اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم دن بھر خوش و خرم رہیں گے اور اطمینان و سکون سے اپنے سب کام انجام دیں گے۔

خوش رہنے کا راز

اداسی اور افسردگی قدرت کی مار نہیں۔ یہ ہمارے اوپر موقوف ہے کہ ہم مایوس و ملول رہیں یا مسرور و شادماں رہیں ولیم جونس نے اپنے ایک لیکچر میں کہا تھا۔ چاہو تو تم ارادی طور پر خوش خرم رہ سکتے ہو۔ وہ اس طرح کہ بیٹھو تو یہ ظاہر کرو کہ تم خوش خرم ہو —— ادھر ادھر دیکھو تو اس طرح جیسے خوش و خرم ہیں۔ اور جب کوئی کام کرو یا کسی سے گفتگو کرو تب بھی اس طرح جیسے تم بہت خوش ہو۔

فرصت کے اوقات کا عقل اور سمجھ کے ساتھ استعمال آپ کو مسرت و شادمانی بخش سکتا ہے کھیل، تفریح، قہقہے صحت کے علاوہ مسرت کے بھی ضامن ہیں۔ ان سے ہاضمہ درست ہوتا ہے۔ اعصاب کو سکون ملتا ہے، دورانِ خون میں تیزی پیدا ہوتی ہے، دل کو قوت پہنچتی ہے، جوان تو جوان ایسا کرنے والے بوڑھوں کو بھی یہ نہیں محسوس ہوتا کہ وہ بوڑھے ہیں —— تبسم زیرِ لب کی لہریں اور قہقہوں کے طوفان صحت و مسرت بخشتے اور افسردگی و پژمردگی کو بہالے جاتے ہیں۔

ایک مغربی مفکر کا قول ہے کہ علی الصبح بستر سے اٹھو تو ایک نئی تازگی، شادمانی اور مسرت کے جذبات سے لبریز دل لیے اٹھو اور اس وقت خوشی سے بھرپور ایک قہقہہ ایک گھنٹہ کی چہل قدمی سے بدرجہا بہتر اور کسی دوسری ہلکی ورزش کا نعم البدل ہے کیونکہ اس طرح جسم کے اندرونی اعضا کی بھی خاصی ورزش ہو جاتی ہے خاص طور سے معدہ جگر، آنتوں پر اس کا بڑا خوش گوار اثر ہوتا ہے نتیجہ میں نظامِ ہضم کے بہت سے عوارض دور ہو جاتے ہیں جو بلا واسطہ دل و دماغ کی ہیجانی کیفیت کو دور کر کے سکون بخشتے ہیں

بغاوت



"ظالم وہ بھی ہے جو اپنی ذات پر ظلم برداشت کرتا ہے"
ایک مظلوم لڑکی کی جرأت آموز کہانی جس کا انتقام بغاوت بن گیا تھا

پرکاش پنڈت



بات بے حد معمولی تھی اور اس سے بھی معمولی بلکہ حقیر تھی۔ وہ عورت جس کا نام ست ونتی تھا اور جو حسبِ معمول شادی کے تیسرے ہی دن گھر سے بھاگتے ہوئے پکڑی گئی۔

لفظ "شادی" کا استعمال میں صرف اتفاقاً کر رہا ہوں ورنہ ہماری طرح محلے ٹولے کے ہر شخص کا خیال تھا کہ وہ شادی دراصل میلارام پان فروش کی بربادی تھی۔ کیونکہ باقاعدہ شادی کے بجائے وہ ایک قسم کا معاہدہ تھا جو میلارام پان فروش اور ست ونتی کے ضمیر فروش باپ کے مابین تین سو روپے میں طے پایا تھا۔ اور رفتہ رفتہ اس بات کے سبھی چشم دید گواہ نکل آئے تھے کہ میلارام تک بکنے سے پہلے ست ونتی کم سے کم چھ گھروں میں "جھاڑو" پھیر چکی تھی۔

ہوتا یوں تھا کہ ست ونتی کا باپ کسی بھی عمر کے ضرورت مند آدمی سے اس کی حیثیت کے مطابق پیسے لے کر اپنی بیٹی اسے سونپ دیتا تھا۔ لیکن کنیا دان کرتے ہوئے نہ جانے اس کے کان میں کون سا آشیرواد پھونکتا تھا کہ بیٹی زیادہ سے زیادہ تین مہینے اس گھر میں ٹکتی تھی۔ اور پھر جو کچھ بھی گہنا گٹا ہاتھ لگتا تھا اڑا کے اور کسی دوسرے صوبے میں جا کر ازسرِ نو اپنے غریب ماں باپ کی کنواری بیٹی بن جاتی تھی اور اسے ہم میلارام پان فروش کی بدبختی ہی سمجھتے تھے کہ اس نے بھی ست ونتی کو غریب باپ کی کنواری بیٹی سمجھ کر تین سو روپے نقد گن دیئے تھے۔ یہی نہیں، شادی یا خانہ بربادی کے پہلے دن ہی اپنی ڈیڑھ آنکھ میں تین آنکھوں جتنی محبت، شفقت اور دلار سمیٹے ہوئے اس نے گھر کی چابیوں کا گچھا بھی ست ونتی

کے حوالے کر دیا تھا کہ جو جی چاہے پہنو، اوڑھو اور جو جی چاہے پکاؤ! حالانکہ ست ونتی کے پہلے گھر والوں میں سے کسی نے سوئی تک پر کبھی ایک دمڑی کا بھروسہ نہیں کیا تھا۔

دن گزرتے گئے اور طے شدہ پروگرام کے مطابق ست ونتی میلارام پان فروش کی دکان اور گھر کے ساتھ ساتھ اس کے دل و دماغ پر بھی قبضہ کرتی چلی گئی۔ وہ جب بھی دکان پر سے لوٹتا تو طرح طرح کی چیزوں سے لدا پھندا آتا۔

محلے کے بچے، بڑوں کی باتیں سن کر سیٹی بجانے کے ارادے سے ان کے گھر کے سامنے پہنچتے تو ست ونتی انہیں سچ مچ کی سیٹیاں خرید دیتی۔ عورتیں گپ شپ کے نئے موضوع کی تلاش میں ادھر سے نکلتیں تو ان کی ٹیڑھی ترچھی نظروں کے باوجود انہیں بلا بلا کر ان کے منہ میں پان الائچی بھر دیتی۔ لیکن ہم مردوں کو چونکہ مرد ذات پر عنقریب ہونے والے ظلم کا غم کھائے جاتا تھا۔ اس لیے ہم نے طرح طرح سے میلارام پان فروش کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اگر وہ اپنی خیریت چاہتا ہے تو ست ونتی پر کڑی نظر رکھے اور اس سے بھی بہتر یہ بات ہوگی کہ وہ پولیس کو خبر کر دے کہ اس کی بیوی مال متاع سمیت بھاگنے والی ہے۔

اور یہی وہ مقام تھا جہاں پورے محلے نے میلارام پان فروش کا بائیکاٹ کر دیا کیونکہ میلارام پان فروش نے نہ صرف تمام مفید مشورے ماننے سے صاف انکار کر دیا تھا بلکہ اونچے سروں میں چلا چلا کر یہ بھی کہنے لگا تھا: ——— "جاؤ، جا کے خود اپنی بیویوں کے بارے میں پولیس کو یہی اطلاع دے آؤ!"

ست ونتی کو میلارام کے گھر آئے ہوئے پورے تین مہینے بیت چکے تھے۔ اور اب صرف تماشا دیکھنا باقی تھا اور اس روز تو مکانوں کی چھتوں پر مورچے لگ گئے، جس دن باخبر حلقوں سے یہ اطلاع ملی کہ دن کے وقت جب میلارام پان فروش اپنی دکان پر چلا گیا تھا تو چادر سے اچھی طرح سر اور منہ لپیٹے ہوئے کوئی نامعلوم شخص اس کے گھر میں گھسا تھا۔ باخبر حلقوں نے اسے گھر میں گھستے ہوئے اور پھر تھوڑی دیر بعد اسی حالت میں باہر نکلتے بھی دیکھا تھا۔ اور یہ ٹوہ بھی لگا لی تھی کہ فوراً بعد خود ست ونتی میلارام پان فروش کی دکان پر پہنچی اور اس سے گھر کے سودا سلف کے نام پر [illegible] روپے ہتھیا لائی تھی۔

چھتوں پر مورچے لگے ہوئے تھے لیکن ست ونتی کو ان کی خاک خبر نہ تھی۔ اور میلارام پان فروش تو آخری پان کھا کر اور ست ونتی سے اپنی ٹانگیں اور کمر دبوا کے وقت سے کچھ پہلے ہی سو گیا تھا۔ موقع پا کر ست ونتی آہستہ سے اس کی چارپائی پر سے اٹھی اور پھر بڑی چوکس نظروں سے ادھر ادھر دیکھ کر سیڑھیاں اترتی ہوئی نیچے چلی گئی۔

ایک منٹ ——— !

دو منٹ ——— !!

تین منٹ ——— !!!

معلوم ہوتا تھا، لوگوں نے دم سادھ لیا ہے اور ان کی ساری قوتیں کانوں میں سمٹ آئی تھیں۔ کیونکہ ادھر میلارام کے گھر کا بیرونی دروازہ ہلکے سے چرچرایا۔ ادھر لوگوں کی فوج ان منڈیروں کی طرف لپکی جہاں سے گلی کا پورا منظر دیکھا جا سکتا تھا اور وہ منظر واقعی قابلِ دید تھا۔ جب چادر سے سر لپیٹے ہوئے اس نامعلوم شخص کو جو نہ جانے کب سے دروازے پر کھڑا تھا ست ونتی نے کپڑوں کی ایک گٹھڑی تھما دی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ قابلِ دید منظر وہ تھا جب اسی لمحے کہیں پاس ہی چھپے ہوئے پولیس کے آدھے درجن سپاہی سیٹیاں بجاتے ہوئے نکل آئے اور انہوں نے دونوں کو رنگے ہاتھوں گرفتار کر لیا۔

بس اتنی سی بات تھی۔ اور ست ونتی سے اس سے مختلف کسی بات کی توقع بھی نہیں تھی۔ تماشے کا بھرپور لطف لینے کے لیے ہم لوگ نیچے پہنچ گئے۔

لیکن گلی میں پہنچ کر ہمارے تعجب کا ٹھکانہ نہ رہا۔ ہمیں پتہ چلا کہ وہ نامعلوم شخص جس نے چادر سے سر اور منہ لپیٹ رکھا تھا، ست ونتی کا بردہ فروش باپ ہی تھا۔ اور دن کے وقت ست ونتی جب گھر سے باہر گئی تھی تو میلارام پان فروش سے چالیس روپے لینے کے بعد وہ سیدھی پولیس اسٹیشن پہنچی تھی، اپنے باپ کے خلاف رپورٹ لکھوانے!

حُسن و آرائش

ثریا فہیم خان



موسم

بدل چکا ہے۔ ہوا کی خنکی جو موسم سرما میں ناگوار گزرتی تھی۔ اب خوشگوار معلوم ہوتی ہے۔ کھانے پینے کی ٹھنڈی اشیاء جاڑوں میں استعمال کرنے سے نزلہ ہو جاتا تھا۔ مگر اب یہی مرغوب ہیں کیونکہ ان سے جسم کو راحت محسوس ہوتی ہے۔ لباس میں بھی رد و بدل ہو چکا ہے۔ بھاری، موٹے کپڑے لپیٹ کر صندوقوں میں بند کر دیئے گئے ہیں۔ اب ہلکے پھلکے سوتی کپڑے پہننے کو جی چاہتا ہے۔ ان تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ کپڑوں کے رنگوں کی طرف بھی توجہ کرنی چاہیئے۔ موسم گرما میں ہلکے رنگ بھلے لگتے ہیں۔ کیونکہ ان سے دل میں شگفتگی پیدا ہوتی ہے۔

موٹے آرائشی اور بھاری کپڑے ہلکے رنگوں کے نہیں ہوتے۔ ان کے رنگ گہرے ہوتے ہیں۔ گرمیوں میں یہ رنگ اچھے نہیں معلوم ہوتے موسم بدلنے کے ساتھ ہی آپ کو لباس کے رنگ بھی بدل دینے چاہئیں اب یہ سہانے، دل پذیر اور نظر نواز ہونے چاہئیں۔

اپریل کا مہینہ شروع ہوتے ہی فضا بدل سی جاتی ہے۔ کیا کبھی آپ نے اس پر غور کیا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ شاید نہ کیا ہو۔ لیجئے مجھ سے یہ راز معلوم کر لیجئے۔ یہ تبدیلی درختوں پر بہار آنے کا مظاہرہ ہے۔ ان کی ہریاول یعنی سبز رنگ سے فضا یکسر تبدیل ہو جاتی ہے۔

قدرت کے اس اشارے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ اپنے لباس کے لیے ہلکا سبز رنگ انتخاب کر سکتی ہیں۔ کم سے کم دوپٹہ تو اسی رنگ کا ہونا چاہیئے۔ اگر آپ سر سے پاؤں تک سب کپڑوں کا رنگ ایک ہی رکھنا پسند نہ کریں تو پھر کپڑا سبز رنگ کے جداگانہ شیڈ میں ہو سکتا ہے۔ مثلاً شلوار سبز کاہی رنگ کی ہو تو کرتا دھانی شیڈ کا اور دوپٹہ بہت ہی ہلکا سبز۔

اگر سبز رنگ کسی وجہ سے پسند نہ ہو تو درختوں کی نظر نواز ہریاول سے ذرا اوپر نظر اٹھائیے۔ آپ کے سر پر صاف و شفاف ہلکے نیلے رنگ کا آسمانی شامیانہ ہے۔ اس کے رنگ کی پیروی کرتے ہوئے ہلکے نیلے رنگ کا سوٹ پہنئے۔ لیکن شلوار کرتا اور دوپٹہ تینوں ایک سے نیلے رنگ میں ہرگز نہ رنگیے۔ اگر آپ کو نیلا رنگ پسند ہو تو اس کے بے شمار شیڈ ہیں۔ ان سے خوشگوار فرق پیدا کیا جا سکتا ہے۔

یہ سبز اور نیلے رنگ تو آسمان اور درختوں کے رنگ میں اب ذرا اپنے گرد و پیش نظر دوڑائیے۔ نیلے آسمان پر اودے رنگ کے بادل بھی کبھی کبھی نمودار ہو جاتے ہیں۔ اور گرما کے موسم میں فالسے بھی آیا کرتے ہیں۔ ان کے رنگ کا دوپٹہ ہر رنگ کی شلوار کرتے پر زیب دیتا ہے۔ مگر دوپٹے کا رنگ گہرا فالسئی ہرگز نہ رکھیے ورنہ جاڑوں کے گہرے رنگوں کی یاد تازہ ہو جائے گی۔

فالسئی سے ملتا ہوا ایک رنگ کاسنی بھی ہے۔ یہ ذرا گہرا ہوتا ہے۔ لیکن آپ کپڑا رنگتے وقت رنگ کم کر کے اسے ہلکا کر سکتی ہیں۔ کاسنی رنگ ہلکا ہو کر نظروں کو بہت بھلا معلوم ہوتا ہے۔

اب ذرا گلابی رنگ کی جانب توجہ کیجیے۔ اگر آپ اسے ہلکا کر لیں تو یہ پیازی رنگ بن جائے گا۔ اس رنگ میں آپ پورا سوٹ رنگ سکتی ہیں۔ بہت جاذب نظر معلوم ہوگا۔ اور اس رنگ میں ایک وصف یہ بھی ہے کہ ہر رنگ کی عورت کو زیب دیتا ہے۔

پیازی رنگ کا ایک خاص کمال بھی معلوم کر لیجیے۔ آپ نے اوپر پڑھا کہ فالسائی جیسا ایک اور رنگ کاسنی بھی گرمیوں میں بھلا لگتا ہے۔ لیکن شاید آپ کو یہ معلوم نہ ہو کہ اگر پیازی رنگ میں نیل ملا دیا جائے تو یہ بھی بڑا نظر نواز کاسنی رنگ بن جاتا ہے مگر اس کی سج دھج اصل کاسنی رنگ سے مختلف ہوتی ہے۔

اگر آپ کو فیروزی رنگ پسند ہو تو پورا سوٹ اسی رنگ کا بنا لیجئے۔ گورے رنگ پر فیروزی لباس بڑی پھبن دکھاتا ہے۔ لیکن اگر سرتاپا فیروزی بن کر انسانی فیروزہ نظر نہ آنا چاہیں تو پھر شلوار فیروزی رنگ کی رکھیے۔ کرتا سفید رکھیے اور دوپٹہ پیازی یا گلابی۔ رنگوں کی رنگا رنگی آپ کو بے حد دلکش اور پرکشش بنا دے گی۔

اگر آپ گلابی اور پیازی رنگوں سے بھی زیادہ ہلکے رنگ کی شائق ہوں تو سوٹ کا رنگ خاختائی رکھیے۔ خاختائی رنگ اصل میں

کوئی بنیادی رنگ نہیں، یہ ایک ترکیب سے بنایا جاتا ہے۔ وہ ترکیب یہ ہے کہ پہلے کپڑے کو گلابی رنگتے ہیں پھر اس کو تھوڑا سا نیل دینے کے بعد پھٹکری اور کتھا لگا دیتے ہیں تو اس کا رنگ فاختائی ہو جاتا ہے۔ یہ بڑا سہانا، دلکش اور باوقار رنگ ہے۔ اگر اس رنگ کا سوٹ پہننے والی کا رنگ صبیح ہو تو اس کی شخصیت بہت پروقار اور دلکش بن جاتی ہے۔

اس رنگ سے ملتا جلتا ایک رنگ بادامی ہوتا ہے۔ اگر اسے زیادہ تیز کرنا ہو تو اس میں تھوڑا سا گلابی رنگ ملا دیجئے۔ اس طرح ایک ایسا رنگ بن جائے گا جو شہابی چمک کی شفق پر خندہ زنی کرے گا۔ لیکن اگر بادامی رنگ کو تیز نہ کیا جائے تو بھی یہ بڑا پیارا باوقار اور دلکش رنگ ہے۔ اگر آپ کو کسی رنگ کا لباس پہننے کا شوق ہو تو بادامی یا کتھئی رنگ کی شلوار پر گلابی رنگ کا کرتا پہنئے! اور سر پر پیازی رنگ کا دوپٹہ اوڑھیے۔ گندمی اور صبیح رنگت والی خواتین پر یہ رنگ اس قدر سجیں گے کہ جو دیکھے گا داد دینے پر مجبور ہو گا۔

ایک اور قابل توجہ رنگ اودا بھی ہے۔ کالے یا سانولے رنگ کی خواتین پر اس رنگ کا سوٹ بہت زیب دے گا مگر یہ رنگ بھی ہلکا ہونا چاہئے ورنہ کالے رنگ سے جا ملے گا۔ اگر پورا سوٹ اسی ایک رنگ کا در رکھنا ہو تو پھر لیں کیجئے کہ شلوار اودی یا جامنی، کرتہ فیروزی اور دوپٹہ گلابی۔ آپ دلکش اور نظر افروز رنگوں کا مرقع بن جائیں گی۔

ایک اور رنگ چمپئی بھی ہے مگر اسے زرد رنگ میں خلط ملط نہ کیجئے۔ یہ اس سے بالکل الگ رنگ ہے۔ زرد رنگ ایک تو وہ ہوتا ہے جسے ہلدی کا رنگ کہتے ہیں، یہ موسم سرما میں اچھا لگتا ہے۔ دوسرا زرد رنگ چنبیلی کے پھول کا رنگ ہے۔ یہ بہت زیادہ ہلکا ہوتا ہے۔ اتنے ہلکے زرد رنگ سے کپڑا رنگا جائے گا تو جابجا سفید دھبے نظر آنے لگیں گے۔ گرمی کے موسم کے لائق مناسب ترین زرد وہ رنگ ہے جو چمپا کے پھولوں کا رنگ ہوتا ہے۔ یہ نہ بھاری ہے نہ بہت ہلکا اور نظروں کو بہت بھلا لگتا ہے۔ بازار میں چمپئی رنگ مل جائے گا اگر نہ ملے تو آپ خود تیار کر لیں۔ ترکیب مجھ سے معلوم کر لیجئے۔ جو کپڑا چمپئی رنگنا ہو اسے ناسپال دے کر گیندوں کے پانی سے رنگئے۔ اس کا رنگ دلکش چمپئی ہو جائے گا اور اگر یہ چیزیں بھی دستیاب نہ ہوں تو کپڑے کی کسی دکان سے چمپئی رنگ کا کپڑا خرید لیجئے۔

مگر پورا سوٹ چمپئی رنگ کا نہیں ہونا چاہئے۔ اس کا میل گلابی رنگ کے ساتھ ہے اس لیے گلابی کرتے پر چمپئی رنگ مناسب رہے گا۔ گلابی کرتے کے ساتھ دوپٹے کا رنگ کشمشی ہو سکتا ہے۔ یہ رنگ بھی عجیب رنگ ہے۔ آپ کشمش کے دو دانوں کو ہتھیلی پر رکھ کر غور سے دیکھیں تو آپ کو قدرت کا تماشا نظر آئے گا۔ کشمش کا رنگ نہ محض بھورا ہے نہ محض نہ محض شربتی بلکہ یہ ان تینوں رنگوں کا ایک باوقار اور دلکش ہے۔ اگر آپ دوپٹہ رنگ ریز سے رنگوائیں تو اسے خاص طور سے ہدایت کریں کہ وہ کشمشی رنگ استعمال کرے۔ اور گہرے سر میں تھوڑا سا کالا رنگ ملا کر اسے کشمشی بنانے کی کوشش نہ کریں۔

پورا سوٹ بھی کشمشی رنگ کا ہو سکتا ہے مگر شرط یہ ہے کہ رنگ زیادہ گہرا نہ ہو ورنہ دور سے دیکھنے والے یہی سمجھیں گے کہ میں اونی سوٹ پہن رکھا ہے۔

نارنجی رنگ بھی خاصا دلکش رنگ ہے۔ لیکن اگر اس رنگ کے کپڑے کا سوٹ پہنا جائے تو کپڑے کا رنگ بہت ہی ہلکا ہونا چاہئے اس احتیاط کی وجہ میں یہ رمز ہے کہ موسم گرما میں لال رنگ برا لگتا ہے نارنجی رنگ ہلکا نہ ہو گا تو لال رنگ جیسا آتشیں نظر آئے گا۔ اس کا کرتہ ہر رنگ کی شلوار اور دوپٹے کے ساتھ میل کھا سکتا ہے۔ نیلے رنگ کے سوٹ پر اس رنگ کا دوپٹہ خاصا دلکش معلوم ہوتا ہے۔ نیلا رنگ سلیٹی ہونا چاہئے۔ اگر گہرا نیلا ہوا تو موسم سرما کی یاد دلائے گا۔ نارنجی رنگ چمپئی رنگ سے بھی میچ کرتا ہے۔ اگر شلوار رنگ میں ہو اور اس پر کرتہ ہلکے گلابی رنگ کا ہو تو نارنجی رنگ کے بہت دلکش معلوم ہو گا۔

چمپئی رنگ کی شلوار اور کرتے کے ساتھ ہلکے کاسنی رنگ کا دوپٹہ بہت بھلا لگتا ہے۔ اگر آپ کو تیسرے پہر کے سوٹ کے تین رنگوں کی تلاش ہو تو یہی وہ تین رنگ بتا دیتی ہوں۔ ہلکا چمپئی اور ہلکا کاسنی، گرما گرم دوپہر کے بعد تیسرے پہر کے وقت یہ رنگ قلب و نظر کو بڑی راحت دیتے ہیں۔

اور ہاں اس موسم کے گزرتے ہی بادل گھر گھر آیا کریں گے نیلی، اودی بدلیاں چھایا کریں گی۔ چھما چھم مینہ برسا کرے گا۔ اس میں آپ کو دھانی رنگ بھائے گا یا پھر آپ قوس قزح رنگ دوپٹے اوڑھیں گی۔

دفتری اور انتظامی اخراجات منہا کرنے کے بعد انعامی رقم ادا کی جائے گی

90,000 ۹۰ ہزار روپے کے انعامات

پہلا انعام • بالکل درست حل پر ۶۰ ہزار روپے

دوسرا انعام ایک غلطی والے حل پر بیس ہزار روپے — تیسرا انعام دو غلطی والے حل پر دس ہزار روپے

فیس داخلہ فی حل ایک روپیہ ایک تمام ادبی معمہ کوپن کے ساتھ دو روپے پچاس پیسے کے ٹکٹ بھیجے جا سکتے ہیں۔ اس حساب سے جتنے چاہے حل بھیج سکتے ہیں۔ دوشیزہ ادبی معمہ نمبر ۲۳ کے اپنے تمام حلوں کے ساتھ ایک کوپن دوشیزہ ادبی معمہ ۲۳ ضرور بھیجئے جو ماہنامہ دوشیزہ سے کاٹا گیا ہو۔ مفصل شرائط اور ہدایات کی پابندی لازمی ہے جو دوشیزہ کراچی میں شائع ہوتی ہیں۔ ایک شخص جتنے الگ الگ کوپن پر الگ الگ انعام حاصل کر سکتا ہے۔ انعامی رقم میں مزید کمی بیشی ہو سکتی ہے۔

دفتر ماہنامہ دوشیزہ ... کراچی میں درست حل وصول کرنے کی آخری تاریخ ... شام ... بجے تک اور ڈاک سے ... تک

دوشیزہ ادبی معمہ نمبر ۲۳

نمبر	اشارات	ممکن الفاظ			حل نمبر......	حل نمبر......	حل نمبر......
۱	——— علاقے دشمن نے خالی کر دیئے تھے۔	مفتوحہ	ریگستانی	مقبوضہ			
۲	مجھے اتنی بڑی رقم کھو کر یہ سبق ملا ہے کہ کسی ——— پر بھروسہ کرنا حماقت ہے	شخص	اجنبی	عورت			
۳	ہم یہ ——— حق تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے آپ کی نذر کرتے ہیں	زمین	سر	ملک			
۴	——— موت کا سامنا بے جگری سے کرنا ہی جرأت کی معراج ہے	یقینی	فوری	اچانک			
۵	کھوئی ہوئی ——— بھی کہیں مل سکتی ہے؟	عزت	جہیز	عصمت			
۶	تمہارے ——— سے ساری دنیا دھوکہ کھا سکتی ہے۔	اعتراف	انکار	اقرار			
۷	اس کا اپنا کوئی ہم ——— نہ تھا جس سے باتیں کر کے اپنا دل ہلکا کرتی	درد	دم	خیال			
۸	پیار بھرے دل کبھی ——— نہیں بدلتے۔	ڈھنگ	سنگ	رنگ			
۹	صحت چاہے امیر ہو یا غریب پڑھی لکھی ہو یا ان پڑھ سب سے بڑی ——— ہے	رحمت	نعمت	طاقت			
۱۰	مسلمان ایک بار دھوکا کھانے کے بعد دوبارہ ——— نہیں کھاتا	بکرا	دھوکا	فریب			

(حل سادہ کاغذ پر بھی بھیجے جا سکتے ہیں۔ کوپن نہ ملنے کی صورت میں ... پیسے کے ڈاک ٹکٹ بھیجئے)

ڈاک سے اپنے حل صرف اس پتے پر بھیجئے

دوشیزہ ادبی معمہ ۲۳ ماہنامہ دوشیزہ پوسٹ بکس نمبر ... کراچی

نام و مکمل پتہ ------------------------------

تعداد حل ---------------- دستخط ----------

دوشیزہ ادبی معمہ نمبر ۲۲ کا صحیح حل ... دفتر دوشیزہ ... حلوں کے ساتھ ... کر دیا جائے گا ... انعام یافتگان کی مکمل فہرست ... دوشیزہ میں ملاحظہ فرمائیں۔

برصغیر پاک وہند میں صرف دوشیزہ کو یہ شرف حاصل ہے کہ انعام یافتگان کو بڑے انعامات بینک ڈرافٹ یا پے آرڈر کی صورت میں دیئے جاتے ہیں

محمد اسمٰعیل

This portion to be detached by the Payee before presentation.

819229

United Bank Limited

Messrs Mohd I...

We enclose our payment order for Rs 1,92,000/- on account of Dosheeza adabi mo...

This order must in accordance with the terms be presented through a bank. If presented at this branch for cash, proper identification will be required.

Checker .... Manager

ایک لاکھ ۹۲ ہزار روپے نقد

No. FOZ 819277

Payee's A/c. Only.

ORDER REQUIRES ENDORSEMENT

United Bank Limited

Nursery Branch, KARACHI

Pay Mst Seghra Begum .... or Order

Rupees Two Lacs only

Rs. 200000/-

For United Bank Limited

Accountant Manager

۲ لاکھ روپے

ٹوکن دوشیزہ ادبی معمہ نمبر

دوشیزہ ادبی معموں کی شرائط میں نے پڑھ لی ہیں اور مجھے ہر شرط کا ایک ایک لفظ منظور ہے۔ منسلکہ حل شاملِ مقابلہ کر لیجئے۔ میں آپ کے ہر فیصلے کا پابند رہوں گا/گی۔

نام ____________

مقام و پتہ ____________

____

(تعداد حل

ٹوکن دوشیزہ ادبی معمہ نمبر

دوشیزہ ادبی معموں کی شرائط میں نے پڑھ لی ہیں اور مجھے ہر شرط کا ایک ایک لفظ منظور ہے۔ منسلکہ حل شاملِ مقابلہ کر لیجئے۔ میں آپ کے ہر فیصلے کا پابند رہوں گا/گی۔

نام ____________

مقام و پتہ ____________

____

(تعداد حل

ضروری اعلان

ملک کے مروجہ قوانین کے تحت ادبی معمے جوئے کی تعریف میں نہیں آتے، اگر شرعی قوانین میں ادبی معموں پر پابندی لگ جائے تو قانون کے نفاذ کے دن سے معمہ منسوخ سمجھا جائے گا اور وصول شدہ رقم منی آرڈر کی فیس وضع کرنے کے بعد ارسال کنندہ کو واپس کر دی جائے گی۔ جو حضرات و خواتین اس شرط سے اتفاق نہ کریں ہرگز ان معموں میں حصہ نہ لیں۔

[illegible]

دوشیزہ ادبی معموں میں اب آپ الگ الگ ٹوکنوں کے ساتھ بھیجے ہوئے حلوں کا الگ الگ انعام حاصل کر سکتے ہیں چاہے حل ایک ہی نام اور پتے سے کیوں نہ بھیجے گئے ہوں ـــــ لیکن اس رعایت سے آپ اسی صورت میں فائدہ اٹھا سکتے ہیں جب آپ دوشیزہ ادبی معموں کی شرط نمبر ۲ کی پابندی کرتے ہوئے ایک منی آرڈر یا پوسٹل آرڈر سے ایک ٹوکن کے ساتھ ایک ہی شخص کی طرف سے بھیجے گئے حلوں کی فیس بھیجیں۔ اگر منی آرڈر یا پوسٹل آرڈر کے ذریعے کئی ٹوکنوں کے ساتھ آنے والے حلوں کی فیس بھیجی جاتی ہے تو زائد ٹوکن نظر انداز کر دیے جاتے ہیں اور انعام صرف ایک ٹوکن پر ہی دیا جاتا ہے۔




ارونا
آدم جی انڈسٹریز لمیٹڈ
کراچی (پاکستان)



ناگوار لمحے
قمیص نہیں پہن سکتی
Anne French
این فرینچ



لطافت
صباحت
نفاست
پونڈز
ڈریم فلاور ٹالک
کی بدولت
بادِ سحری کی طرح نرم و لطیف، تر و تازہ اور خوشبودار
پسینہ کی بو دور کرنے کے لئے اس میں
ہیکسا کلوروفین بھی شامل ہے۔
لطافت و تازگی بھی، جلد کی حفاظت بھی
POND'S
PERFUMED TALC
BODY DEODORANT
نئی
لطیف خوشبو
تین مختلف سائزوں
میں
دستیاب ہے

دوشیزہ



فرزانہ سالم مرزا ○ طاف زائق ○ ریاض مرزا آغا نذیر کاوش ○ سید شمیم حسین

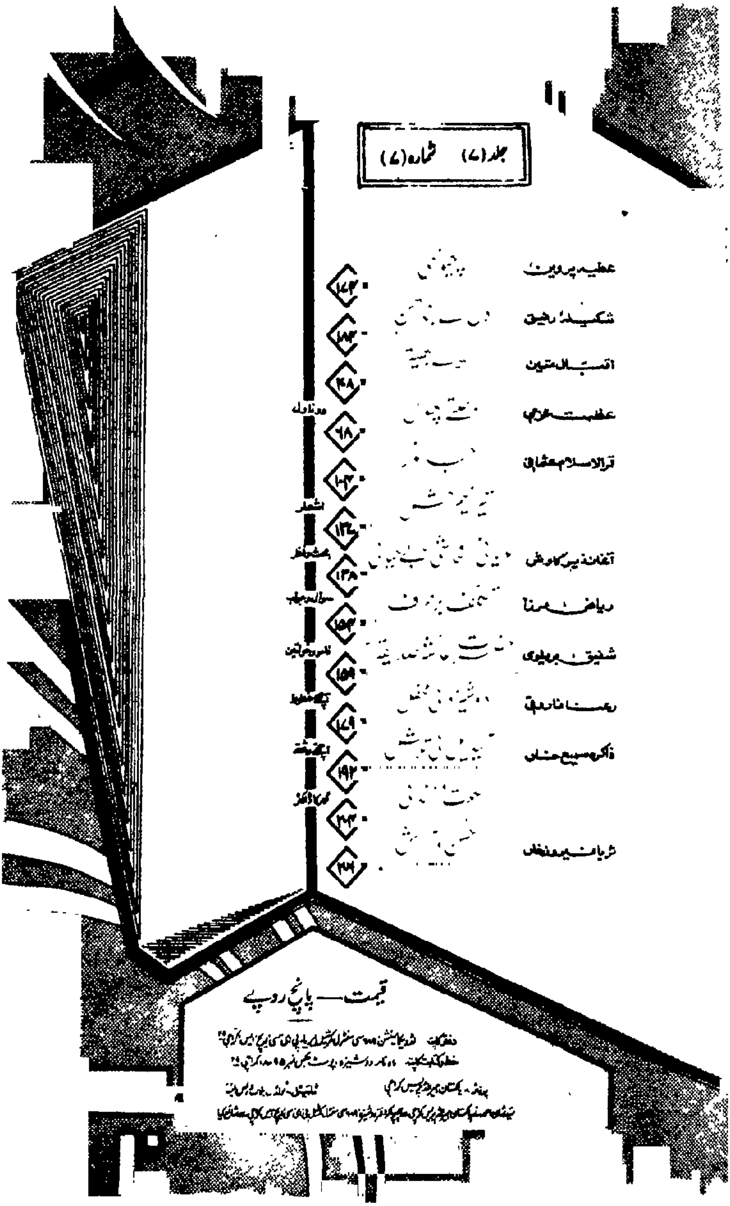
شاہانہ مرزا ○ اسلم صدیقی ○ ڈاکٹر سلیم اختر ○ حمید جہانگیر ○ محمد عاطف رضا

جولائی ۱۹۷۷ء
فون نمبر — ۳۳۳۴۳

سرورق کی شخصیت

[illegible]

جلد (۷) شمارہ (۷)



قیمت — پانچ روپے

[illegible]

آخری دعا

وفاقی وزیر اطلاعات
طاہر محمد خان کو
اچھی طرح علم ہے کہ نیوز پرنٹ
کی قیمتوں میں ۲۵ فی صد
اضافے کے بعد اخباری صنعت
بھی شدید بحران کا شکار ہو گئی ہے!
اگر حکومت کے ارباب اختیار نے اس
بحران کو فوری طور پر حل کرنے کی کوشش
نہیں کی تو بحرانوں کے اس ملک میں ایک
اور بحران آئے گا اور لوگ زندوں کو بھی
اُن چوکوں میں تلاش کرتے پھریں گے جو
شہیدوں کے لئے مخصوص کئے گئے ہیں۔
جب کبھی "دوشیزہ" آپ کے ہاتھ نہ لگے تو
سمجھ لیجئے شہیدوں میں ایک نام کا اور اضافہ
ہو گیا، وفاقی وزیر اطلاعات طاہر محمد خان نے
ہر چند یہ یقین دلایا ہے کہ وہ نیوز پرنٹ کے حصول
اور نرخوں میں مناسب حد تک کمی کے لئے فوری کارروائی
کریں گے۔ لیکن اس کافر دل کا کیا کروں کہ اُسے وزیروں
کی باتوں کا اعتبار ہی نہیں۔ اتنا خوب صورت دعویٰ کرنے
والے کو اللہ ہماری زندگی دے، ہم بدنصیبوں کا مقدر دے،
وعدہ پورا کرنے کی ہمت دے، ایمان دے اور جو کچھ ان کے پاس نہ
ہو وہ بھی دے!

رخسانہ سہام مرزا

دو اور وفد

شاہ بلیغ الدین

[illegible]

رستم قادسیہ کی جنگ کے لیے مدائن سے بڑھ کر
راہ میں ٹھیرا ہوا تھا کہ اسے معلوم ہوا مسلمانوں کا ایک وفد یزدجرد سے
مدائن گیا تھا۔ وہ فوراً ساباط سے مدائن لوٹا تاکہ یزدجرد سے معلوم کرے
باتیں ہوئیں۔ اس کا خیال تھا شاید جنگ کچھ عرصہ کے لیے ٹل جائے
محل پہنچ کر یزدجرد سے اس نے پوچھا کہ ”آپ نے
انوں کو کیسا پایا؟“

یزدجرد نے جواب دیا ”میں نہیں جانتا تھا کہ
ان ایسے ہوتے ہیں۔ وہ لوگ ہمارے درباریوں سے کہیں زیادہ
ہوشیار اور بلا کے نڈر ہیں۔ میرے جاہ و جلال سے وہ ذرا دبے نہیں
میں سمجھا تھا کہ وہ میرے جلال سے ڈر کر رحم کی بھیک مانگنے لگیں گے!“

رستم نے پوچھا ”ان کے ارادے کیا ہیں، آپ نے کوئی
اندازہ لگایا؟“

یزدجرد نے کہا ”ہم ان کا دین قبول کرلیں یا ان سے
لڑ کر رہیں ورنہ مرنے مارنے پر تلے بیٹھے ہیں۔“

رستم یہ سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ یزدجرد نے کہا ”کس
سوچ میں پڑے ہو؟ انہیں ٹھکانے لگانا ہی پڑے گا! میں نے آج
مٹی کا ٹوکرا ان کے سروں پر لدوا کر انہیں دربار سے نکال دیا گستاخی
اور زبان درازی کے لیے یہ کم سے کم سزا تھی جو میں انہیں دے سکتا تھا۔“

رستم نے تفصیل سے یہ واقعہ سنا تو پیچ و تاب کھاتا وہاں سے نکل
گیا۔ بولا ”کم ظرف ماں کا بیٹا تدبر کیا جانے، بردباری کہاں سے
لائے!“

باہر آیا تو پہلا کام یہ کیا کہ تیز رفتار سواروں کا ایک دستہ
مسلمان قاصدوں کے پیچھے دوڑایا۔ انہیں حکم تھا کہ ہوا کی طرح جاؤ
اور شیروں کی طرح جھپٹ کر انہیں پکڑ لاؤ۔ کوئی صورت ہو مگر
مٹی کا وہ ٹوکرا واپس آنا چاہیے!

بہت سے سردار جو رستم کے ساتھ تھے یہ بات سن کر چونکے
فارس کے لوگ فال کے بڑے قائل تھے۔ رستم کو بے چین دیکھ کر
اب انہیں خیال آیا کہ مسلمانوں کے نمائندے نے کیوں آگے بڑھ کر
اس قدر شوق سے وہ ٹوکرا اٹھا لیا تھا۔

سواروں کا دستہ جو مسلمانوں کے پیچھے دوڑایا گیا تھا خالی ہاتھ

لوٹا۔ رستم نے انہیں خالی ہاتھ دیکھا تو اس کا دل بیٹھ گیا۔ اس نے غم و غصہ سے بے تاب ہو کر کہا:

"افسوس! آج یہ ملک ہمارے ہاتھوں سے نکل گیا۔"

رستم خود بھی نجوم اور رمل جانتا تھا۔ اس واقعہ کا اس پر کچھ ایسا اثر ہوا کہ ساباط میں پڑاؤ ڈالے خاموش بیٹھا رہا۔ یزدجرد نے کتنا کہا کہ آگے بڑھو، لڑائی شروع کرو! لیکن اس نے کوئی بات مان کر ہی نہ دی۔ کسی نہ کسی طرح لڑائی کو ٹالتا رہا۔

ادھر مسلمان جانتے تھے کہ لڑائی کسی وقت بھی شروع ہو سکتی ہے اس لیے دشمنوں کو طرح طرح سے خوفزدہ کرتے رہتے۔ جب رسد ختم ہو جاتی، غارت ڈالتے، کھانے پینے کی چیزیں اکٹھی کر کے بیٹھے رہتے۔

یزدجرد تلا ہوا تھا کہ مسلمانوں سے جنگ ہو۔ اسے یقین تھا کہ رستم جیسا سپہ سالار میدان میں ہو، اتنا ساز و سامان اور ایسا بڑا لشکر پاس ہو تو محدود اور بہت تھوڑے وسائل رکھنے والے مسلمانوں کو پیس کر رکھ دینا بڑا آسان کام ہے۔ اس لیے جب اس نے دیکھا کہ رستم ٹال مٹول سے کام لے رہا ہے تو کہلوایا کہ ——"میں خود آگے بڑھ کر مسلمانوں پر حملہ کروں گا!"

یہ صورت اور بھی بری تھی، مجبور ہو کر رستم نے ساباط سے قادسیہ کا رخ کیا۔ رستم کی تلوار کی دھاک سارے ایران پر بیٹھی ہوئی تھی۔ یزدجرد شہنشاہ سہی لیکن کوئی رستم کی اجازت کے بغیر دم نہ مار سکتا تھا۔ اب وہ آگے بڑھا تو سبھی اس کے ساتھ آگے بڑھے۔ پہلے اس نے جالنوس کو چالیس ہزار کا لشکر دے کر بھیجا۔ پھر ساٹھ ہزار کی فوج اپنے ساتھ لے کر نکلا۔

فوج کے سیدھے بازو کی کمان ہرمزان کے پاس تھی اور بائیں بازو پر مہران تھا۔ تین سو ہاتھی ساتھ تھے۔ ان میں سو قلب لشکر میں پچھتر دائیں بازو اور پچھتر بائیں بازو، بیس اگلے حصے میں اور تیس پچھلے دستے میں رکھے گئے۔ اس پر بھی رستم کو اطمینان نہ ہوا تو آرمینیہ سے اپنے بھائی کو بلوایا۔ اسے لکھا کہ ——"جس قدر جلد ہو سکے آؤ اور کیل کانٹے سے لیس ہو کر آؤ۔"

فارس کے ہر حصے سے اس کے پاس سامان بھی آ رہا تھا، اور سپاہی بھی! وہ چاہتا تھا کہ یہ سلسلہ رکنے نہ پائے۔ جب وہ قادسیہ پہنچا تو ایک لاکھ بیس ہزار کا لشکر اس کے پاس تھا۔

مسلمانوں کے پاس دشمن کے برابر کہاں، اس کا ایک چوتھائی لشکر بھی نہ تھا۔ لیکن "بویب" میں مسلمانوں کی فتح سے رستم اس قدر مرعوب ہوا تھا کہ اس نے لشکروں کو آمنے سامنے رکھ کر بھی لڑائی کو ٹالنا چاہا۔ مسلمانوں کے سپہ سالار حضرت سعد بن ابی وقاص کے پاس آدمی دوڑا کر اپنے کسی نمائندے کو بھیجئے تاکہ بات چیت کی جا سکے۔ حضرت ربعی بن عامر کو حکم ہوا کہ ——"جاؤ مسلمانوں کے نمائندے کی حیثیت سے گفتگو کر آؤ۔"

ربعی چلے تو ان کی حالت دیکھنے کی تھی۔ نہ زین، نہ لگام۔ گھوڑے کے پاکھر کی زرہ بنائی۔ اسی کے ایک ٹکڑے کو سر پر لپیٹ لیا۔ کمر میں رسی کا پٹکا باندھ لیا۔ پھٹی ہوئی میان پر کچھ چیتھڑے لپیٹ لیے اور گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر سوار ہو کر آگے بڑھے۔

ادھر ایرانیوں نے پوری آن بان سے دربار سجایا۔ شان و طمطراق کا کوئی مظاہرہ نہ رہ گیا۔ اطلس کا فرش، دیبا کے تکیے، زربفت کے پردے، چاندی کے عصا، سونے کے مورچھل، یہاں وہاں قیمتی قالین، درمیان میں سونے چاندی کا تخت، اس میں ہیرے موتی، لعل اور زمرد جڑے ہوئے، پہرہ دار، عصابردار، نقیب، نقارچی، ایک سے ایک جگمگ کرتا جوڑا پہنے کھڑے۔ دربار کی وہ چمک دمک تھی کہ بادشاہوں کی نظر بھی ٹھہر نہ سکے۔

ربعی ایسے بے نیاز کہ کسی چیز کو خاطر ہی میں نہ لائے۔ سواروں اور پیادوں کی قطار میں سے بے تکلف گھوڑا اڑائے رستم کے خیمے پر پہنچے۔ اترے تو سامنے ایک تخت نظر آیا۔ باگ کو اس پر دھرے ہوئے ایک ریشمیں گاؤ تکیے سے باندھ دیا۔

ایرانیوں نے سوچا کہ مسلمانوں کا سفیر آئے گا تو یہ شان و شوکت دیکھ کر اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی، رعب سے زبان گنگ ہو جائے گی۔ لیکن یہاں نقشہ ہی اور تھا۔ درباری حیران پریشان ربعی کا منہ تکنے لگے۔ ہر ایک کے ذہن میں ایک بات تھی۔ کیا آدمی ہے؟ لیکن کوئی بھی کچھ کہہ نہ سکا۔ ایک نے ہمت کی تو سوچا کہ قاعدے کے مطابق دربار میں جانے سے اس سے ہتھیار رکھوا لینا چاہیئے۔ بڑھ کر ٹوکا ——"ہتھیار چھوڑ جاؤ، ورنہ باریابی نہ ہو سکے گی!"

ربعی نے جواب دیا ——"تمہارا بلایا ہوا آیا ہوں!"

ایرانیوں نے سوچا یہی موقع ہے داب لینا چاہیئے، بولے ——"سفیر بن کر آئے ہو تو آداب بھی ملحوظ رکھو!"

ربعی نے کہا ——"اس طرح میرا آنا تمہیں منظور نہیں تو

بڑھ جاتا ہوں !"

بات رستم تک پہنچی۔ رستم نے سوچا ــــ عجیب سرپھرا آدمی ہے۔ ہمارے دربار اور آداب کا ذرا لحاظ نہیں کرتا۔ لیکن مجبوری تھی ت چیت کئے بنا چارہ نہ تھا۔ حکم دیا کہ ــــ "آنے دو !"

ربعی اسی شانِ بے نیازی سے آگے بڑھے۔ نیزہ ہاتھ میں ما کا کام دے رہا تھا۔ اس کی انی جب بھی ٹیکتے، فرشِ قالین ھٹے دیتا۔ مخملی گل بوٹوں کے دل دہل جاتے۔ رستم کے سامنے پہنچے تو اس زور سے نیزہ فرش پہ مارا کہ قالین کو چھیدتا ہوا زمین پر گڑ کر رہ گیا۔

کسریٰ کے حاشیہ بردار ٹکٹکی لگائے دیکھتے رہے۔ انھی کو نہیں رے دربار کو سانپ سونگھ گیا۔ رستم بھی ٹکٹکی باندھے ربعی کو دیکھتا ا پھر آہستہ سے پوچھا کہ ــــ "ہمارے ملک میں کس لیے ے ہو ــــ؟"

ربعی نے جواب دیا ــــ "اس لیے کہ آپ جا آتش بلور خاک پرستش کی بجائے خدا کی عبادت کی جائے۔ بندے، بندوں کی ملائی سے چھٹکارہ پائیں !!"

گردن پھیرے وہ کچھ سوچتا رہا، مگر سوچ نہ سکا۔ بس ربعی ہی اس کی آنکھوں میں گھومتے رہے۔ کچھ ایسی دہشت اس پر سوار ملی کہ زبان نے ساتھ نہ دیا۔ رک کر بولا ــــ "اچھا میں مشورہ لے کے جواب دوں گا۔"

ربعی لوٹنے لگے تو درباری کبھی انہیں دیکھتے، کبھی ان کے کپڑے اوران کے ہتھیار کو۔ کسی سے رہا نہ گیا تو پوچھ بیٹھا کہ ــــ "اس حالت میں ایران جیسی عظیم الشان سلطنت کو فتح کرنے نکلے ہو؟"

ربعی نے پلٹ کر انہیں دیکھا۔ اپنے کو گھورتے پا کر ان سے کہا ــــ "مجھے کیا گھورتے ہو، میری تلوار کو دیکھو! تلوار کی کاٹ دیکھو! معلوم ہے تمہیں کہ ــــ یہ تو ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ !"

ایک نے اپنی ڈھال آگے کر دی۔ مطلب تھا ــــ "ہاں دیکھیں تو کیسی تلوار ہے اور کیسی کاٹ !"

ربعی نے تلوار سونتی تو بجلی سی کوند گئی۔ پینترا بدل کر وار کیا ڈھال کے پرخچے اڑ گئے۔ پھر گرج کر کہا ــــ "دیکھ لی اس کی کاٹ بھی، مگر یاد رکھو، ہم اس کے بھروسے پر نہیں خدا کے بھروسے لڑتے ہیں! ہاں سچ ہے،

"مسلمانوں کی مدد ہمارا ذمہ ہے ــــ !"

دوشنبہ

ربعی لوٹ گئے تو رستم نے اب ایک اور چال سوچی۔ اب اس کی یہ کوششیں شروع ہوئیں کہ مسلمانوں میں پھوٹ پڑ جائے یا بغیر لڑے بھڑے واپس چلے جائیں۔ یہ ایسی صورت تھی کہ ملک میں اس کا وقار بھی باقی رہتا اور آئی بلا بھی ٹل جاتی۔ لیکن مسلمان ہر بار دو ٹوک گفتگو کر کے چلے آتے۔ مہلت کے تین دن اس نے مسلمانوں کے سفیروں سے بات چیت کی۔

ربعی کے بعد حذیفہ بن محصن گئے۔ یہ تو گھوڑے سے بھی نہ اترے۔ فرش ہی پر گھوڑا لیے رستم کے تخت تک جا پہنچے۔ اور گھوڑے کی پیٹھ ہی پر بیٹھ کر بات چیت کی۔ گفتگو ختم ہوئی تو گھوڑے کو ایڑ لگا دی اور اپنے لشکر میں لوٹ آئے۔ ذہنی طور پر مسلمانوں کو مرعوب کرنے کی ہر کوشش میں رستم ناکام ہوا۔ یہی نہیں بلکہ خود مرعوب ہوتا چلا گیا۔

آخر رستم کی طرف سے پھر ایک بار خواہش ہوئی۔ صلح کی بات چیت کرنے کے لیے مسلمانوں کا کوئی اور سفیر آئے۔ اس مرتبہ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ گئے جو یزدجرد کے پاس بھی ہو آئے تھے۔ رستم نے حکم دیا کہ یہ آخری موقع ہے۔ دربار آراستہ کرو اور اس شان سے کہ مسلمان سفیر اسے دیکھ کر بھونچکا رہ جائے۔

حکم کی تعمیل ہوئی تو اس آن بان کی تیاری ہوئی کہ کیا کہنا! وہ جاہ و جلال تھا کہ ہوائیں تک سہم کر چلتی تھیں۔ ستارے بھی آنکھ نہ اٹھا سکتے تھے۔ راستے میں دور تک سپاہی ہی سپاہی کھڑے تھے، ایک رویہ، دو رویہ، سہ رویہ، سورماؤں کی قطاریں کیا تھیں لوہے کی دیواریں تھیں۔ سب کے تیور کڑے تھے۔ سب چاق و چوبند تھے۔ کوئی چار آہنی سے ترکش ڈالے، کمان لٹکائے ہوئے تھا۔ کوئی خود مغفر اور جوشن پہنے، موزے چڑھائے، بھالا لیے کھڑا تھا۔ کسی کے پرتلے میں تلوار پڑی تھی اور کمر میں خنجر۔ کوئی پنجۂ شیر کو چپکا تا منہ نوچنے کو مستعد نظر آتا تھا۔ ایک طرف سوار ہی سوار تھے، سوار کیا، شہسوار تھے۔ بانکے سجیلے، نکیلے، گٹھیلے جوان! سنگین رگ و پٹھے، مرمر کے ترشے ہوئے جسم، چٹان کی طرح مضبوط یہ آہن پیکر، فولاد شکن مجسموں طرح ایستادہ تھے۔ جیسے یہ تھے ویسے ان کے گھوڑے بھی تھے۔ شیروں کی طرح چست، ہاتھیوں جیسے قوی، ہرنوں کے سے سبک، الیل کرنے پہ آتے تو ناچنے والے موروں کو بٹھا دیتے، سرپٹ نکلتے تو ہوا کے کان کاٹنے لگتے!

لشکر کے سیلاب میں گھرا ہوا سرخ سراپردوں کے بیچ میں ایک

شاہی خیمہ تھا۔ اونچا لمبا چوڑا شامیانہ! لب فرش! انداز تھے۔ قالین، پھر تخت و مسند! شامیانے کی چھت کیا تھی ایک باغ کھلا ہوا تھا۔ یہاں سے وہاں تک بیل بوٹے، پھول، پھل، پتے سونے چاندی سے لپے پتے جگمگ جگمگ کرتے تھے۔ طلاکار تخت کا جواہر نگار منڈپ دلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ ہیرے موتی کی دمک نظروں کو پھیر دیتی تھی۔ زرکار پردے، مخملیں فرش، زربفتی تکیے، تاروں کی ڈوریاں، پٹیک کے لڑیے، موتی ٹنکی جھالریں، سب ایسے خیرہ سامان تھے کہ کرنوں کا سونا بھی ان کے آگے چاندی معلوم ہوتا تھا۔ رستم سپہ سالار ہی نہیں، سلطنت کا امیر الامرا بھی تھا۔ جب سے پوران دخت نے اس کے سر پر نائب السلطنت کا تاج رکھا تھا۔ اس کا جاہ و جلال شہنشاہ سے کم نہ رہا تھا۔

حضرت مغیرہ بن شعبہ پہنچے تو رستم خیمے کے بیچ میں تخت پر بڑی شان سے بیٹھا تھا۔ یہ سیدھے اس کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔ درباریوں کا خون کھول گیا۔ ایک اعرابی اور اس کی یہ ہمت! جس نے دیکھا اس کا دل بس یہی چاہتا تھا کہ آگے بڑھ کر مغیرہ کا سر اتار لے! اتنے میں ایک چوبدار نے حضرت مغیرہ کا ہاتھ پکڑا اور انہیں تخت سے اتار دیا۔

ع : ڈرتا تھا آسماں سے بجلی نہ گر پڑے!

حضرت مغیرہ نے غصہ دبایا، مترجم سے کہا:

"کیا خوب! بار بار اصرار کر کے بلاتے ہو اور گھر آئے ہوئے مہمان سے یہ سلوک روا رکھتے ہو؟ یہ سن لو! کہ تمہاری طرح ہمارے پاس یہ طریقہ نہیں کہ ایک آدمی خدا بن کر بیچ میں بیٹھے اور سب بندے بن کر گردنیں ڈالے رہیں۔ ہم مساوات کے قائل ہیں اور کسی کو بڑا چھوٹا نہیں سمجھتے۔"

مترجم نے جو حیرہ کا رہنے والا تھا، حضرت مغیرہ کی تقریر ترجمہ کیا۔ رستم کا نقشہ الٹا ہو گیا تھا اس لیے وہ بڑے سکون سے بولا ——— "مجھے افسوس ہے کہ چوبدار نے تمہارے ساتھ بڑی زیادتی کی۔ یہ میرا حکم نہ تھا۔ خیر آؤ! یہاں میرے پاس بیٹھ جاؤ۔"

حضرت مغیرہ پاس بیٹھے تو ان کا ترکش دیکھا۔ اس میں سے دو تین تیر نکالے۔ تھوڑی دیر تک انہیں الٹتا پلٹتا رہا، اس طرح کہ درباری بھی انہیں دیکھتے جائیں۔ پھر بڑی زہر بھری مسکراہٹ کے ساتھ بولا ——— "ان تنکوں سے کیا بنے گا؟"

جواب ملا ——— "آگ کم ہو یا زیادہ، جلانا خوب جانتی ہے۔"

یہ حربہ بیکار گیا تو رستم نے مغیرہ کی تلوار کی طرف اشارہ کیا۔ کہنے لگا ——— "خوب خوب! یہ تمہاری نیام ہے؟ ——— ایسی! اور یہ چیتھڑے کیا لپیٹ رکھے ہیں تم نے اس پر!"

تڑاسا جواب ملا ——— "نیام کیا دیکھتے ہو، یہ ہاتھ دیکھو!

ع تلوار کاٹتی ہے مگر ہاتھ چاہیئے!"

رستم بولا ——— "خیر چھوڑو ان باتوں کو! ہمارا یہ جاہ و جلال تمہارے سامنے ہے۔ ہماری سلطنت کس قدر مالا مال ہے یہ بات بھی تم سے چھپی ہوئی نہیں! تمہارے بھلے کو کہتا ہوں کہ ہم سے ٹکرانے کا خیال چھوڑ دو اور کچھ لے لوا کر یہاں سے نکل جاؤ۔ تم نے اپنی حد سے بڑھ کر جو حرکتیں کی ہیں ہم ان کا بھی کوئی خیال نہ کریں گے، بلکہ تمہیں اچھا خاصا انعام دے کر رخصت کریں گے!"

مغیرہؓ بولے ——— "تم اپنے بھلے کی سوچو! اسلام لے آؤ تو ہم کتاب اللہ تمہارے حوالے کر کے چلے جاتے ہیں۔ جیسے ہم ویسے تم! ورنہ جو بات ہم نے تمہارے شہنشاہ سے کہی تھی وہی تم سے بھی کہتے ہیں!"

رستم بولا ——— "یعنی؟"

حضرت مغیرہؓ نے جواب دیا کہ ——— "جزیہ یا جنگ!" یہ کہتے ہوئے ان کا ہاتھ خود بخود تلوار کی طرف بڑھ گیا۔

بھرے دربار میں رستم کی غیرت کو للکارا گیا تھا۔ وہ چلایا۔ "چاند اور سورج کی قسم! کل دن چڑھنے نہ پائے گا کہ تمہیں ملیامیٹ کر کے رکھ دوں گا۔ تم لوگ ہو کس گنتی میں مفلسو! اپنی اوقات بھول بیٹھے! تم نے رستم کا قہر و غضب نہیں دیکھا۔ اب تمہیں معلوم ہو گا کہ تم نے کیا حماقت کی ہے۔"

شیر دل مغیرہؓ بے پروائی سے بیٹھے اس غصے پر مسکرا رہے تھے۔ اٹھے تو بولے ——— "ہم میں جو اللہ کو پیارے ہوں گے وہ تو ہوں گے شہید! جو بچ رہیں گے وہ تمہارے فاتح کہلائیں گے، کچھ سمجھے میری بات ——— !"

یہ کہہ کر مغیرہؓ لوٹ گئے۔ گفتگو کا محل ختم ہوا۔ اب لڑائی کی ٹھن گئی۔

اپنے وقت کی ملکہ اِن سے محبت کرتی تھی
اِس نے انہیں ہر طرح سے متزلزل کرنا چاہا
مگر وہ چٹان کی طرح اپنی جگہ قائم رہے
پھر خدا کو بھی اِس ملکہ پر رحم آ گیا

ماہِ کنعان

صبح کا وقت تھا، آفتاب لمحہ بہ لمحہ بلند ہو رہا تھا۔ کنعان (شام کا ایک صوبہ) کے محلہ اسرائیل کے ایک کشادہ مکان کے باہر گھنے درخت کے سائے میں ایک باریش بزرگ بظاہر محوِ عبادت مگر دراصل کسی کے منتظر تھے۔ ان کے چہرے پر غیر معمولی جلال و رعب کے باوجود اعترافِ بندگی کے آثار نمایاں تھے۔ چوڑا چہرہ، گھنی داڑھی اور روشن کشادہ جبیں سرداری کی غمازی کر رہی تھی۔ یہ بزرگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پوتے حضرت اسحاق علیہ السلام کے بیٹے حضرت یعقوب علیہ السلام تھے۔ ان کا اسمِ مبارک اسرائیل بھی تھا۔ خداوندِ عالم نے انہیں بارہ فرزند عطا کئے تھے جن سے بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے جاری ہوئے جنہیں اسباطِ بنی اسرائیل بھی کہا جاتا ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے دو شادیاں کیں۔ ولیا اور راحیل آپ کی بیویاں تھیں۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس زمانہ میں دو سگی بہنوں سے بیک وقت نکاح کرنا جائز تھا لہذا ولیا اور راحیل دونوں بہنیں حضرت یعقوب علیہ السلام کے نکاح میں تھیں۔ ولیا کے بطن سے چھ فرزند یہودا، شمعون، روبیل، لاوی، زبان اور زبولون پیدا ہوئے اور راحیل کے بطن سے یوسف اور بن یامین نے جنم لیا۔

ولیا کے تین بیٹوں میں قدرت نے مختلف قوتیں عطا کی تھیں۔ یہودا ایسی زبردست چیخ مارتا کہ سننے والے بیہوش ہو جاتے عورتوں کے حمل گر جاتے۔ شمعون شیروں کے جبڑے چیر دیتا اور روبیل آن واحد میں درخت جڑ سے اکھاڑ دیتا۔ ولیا کو بیٹوں کی ان خوبیوں پر غرور تھا۔ راحیل کے بیٹے کو قدرت نے عجب حسن عطا کیا تھا جس دن اس بچے نے جنم لیا اس دن گھر کے در و دیوار روشن ہو گئے مگر راحیل کی عمر نے وفا نہ کی اور وہ دوسرے بیٹے بن یامین کو جنم دینے کے بعد وفات



پاگئیں اور یوسف علیہ السلام اپنی پھوپھی کے پاس پرورشش کے لئے بھیج دیئے گئے۔ ولیا اور اس کے بیٹوں نے محسوس کیا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے اس فرزند کو سب سے زیادہ چاہتے ہیں اور یہ حقیقت تھی کہ جونہی حضرت یوسف سمجھدار ہوئے حضرت یعقوب ان کی پھوپھی کی ہزار چاہت کے باوجود ان سے لے آئے۔ اس وقت ان کی عمر دس برس تھی۔

ان دنوں سب بیٹے صبح کے وقت باپ کی خدمت میں حاضر ہوتے انہیں سلام کرتے اور پھر دنیاوی امور میں مصروف ہو جاتے، آج بھی تمام فرزند انہیں سلام کرنے حاضر ہوئے تھے مگر ابھی تک سب سے لائق بیٹے جو جمال ظاہری و باطنی میں سب پر فائق تھے حاضر نہ ہوئے تھے جبکہ ہر روز وہ سب سے پہلے خدمت اقدس میں حاضر ہونے کا شرف حاصل کرتے تھے یہ چیز وجہ تردد تھی لہذا کچھ متفکر سے انداز میں حضرت یعقوب علیہ السلام ان کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے ابھی وہ محو تصویر ہی تھے کہ ان کے کم عمر فرزند بن یامین حاضر ہوئے سلام کیا اور ادب سے بولے۔

"باباجان! آفتاب بلند ہو رہا ہے، اس کی حدت بڑھ رہی ہے، کوئی لمحہ جاتا ہے کہ درخت کے نیچے تمازت پیدا ہو جائے گی اور آپ ابھی تک یہیں تشریف فرما ہیں کیا حضور کو گرمی کا احساس نہیں ہو رہا؟"

"بن یامین!" حضرت یعقوب علیہ السلام نے فکرمندی سے کہا۔ "آج تمہارا برادر یوسف نہیں آیا ہم اسی کے منتظر ہیں کیا تم اس کے نہ آنے کی وجہ بتا سکتے ہو؟"

"پیارے باباجان!" بن یامین نے کہا۔ "میں بھائی کے نہ آنے کی وجہ تو نہیں بتا سکتا ہاں یہ جانتا ہوں کہ وہ کہاں ہیں آج جب سے وہ بیدار ہوئے مکان کے عقب والی پہاڑی پر بیٹھے کچھ سوچ رہے ہیں۔ اگر آپ حکم دیں تو انہیں بلاؤں۔"

ابھی بات یہیں تک پہنچی تھی کہ حضرت یوسفؑ تشریف لے آئے۔ ان کی شخصیت کے بارے میں یہ کہہ دینا کافی ہے کہ خداوند قدوس نے دولتِ حسن کو دس حصوں میں تقسیم فرمایا ایک حصہ حسن تمام کائنات (آسمان زمین، چاند سورج، دریا پہاڑ، خشکی و سمندر، ستارے و کہکشاں اور جنت کے ہر حصے) کو عطا فرمایا اور نو حصے حسن حضرت یوسف علیہ السلام کو عطا فرمایا جس وقت وہ باپ کے قریب پہنچے اور سلام کیا تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے دریافت کیا۔

"فرزند! آج تم نے آنے میں بڑی دیر کر دی تم نہیں جانتے کہ ہم تمہارے بغیر کیا محسوس کرتے ہیں؟"

"باباجان!" حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا۔ "آج میں شدید الجھن کا شکار رہوں میں نے گزشتہ شب خواب دیکھا ہے بس کی تعبیر پر غور کر رہا تھا یہی چیز قدم بوسی میں تاخیر کا سبب بن گئی۔"

"وہ کیا خواب ہے؟" یعقوب علیہ السلام نے کہا۔ "مجھے سناؤ، اور بن یامین تم یہاں سے چلے جاؤ۔"

"پدرِ عظیم!" حضرت یوسف نے کہا۔ "میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں ایک بلند پہاڑ پر کھڑا ہوں جس کے ہر طرف سبزہ زار لہرا رہے ہیں۔ ابھی میں اس منظر کو دیکھ ہی رہا ہوں کہ ناگاہ گیارہ ستارے اور چاند سورج آسمان سے اترے اور مجھے سجدہ کرنے لگے یہ دیکھتے ہی میری آنکھ کھل گئی، میں اس کی تعبیر پر غور کرتا رہا اور دن نکل آیا۔"

یہ خواب سن کر حضرت یعقوب علیہ السلام چند لمحے سکتے کے سے عالم میں بیٹھے رہے پھر رازداری سے فرمایا۔

"میرے بیٹے! اس خواب کا تذکرہ اپنے بھائیوں سے نہ کرنا تم جانتے ہو وہ تمہاری ماں راحیل اور تمہیں اچھا نہیں سمجھتے، اگر انہوں نے سن لیا تو اپنی ماں ولیا سے کہیں گے کہ دیکھو راحیل کا بیٹا کیسی باتیں کرتا ہے ابھی تک تو سب اسے یہی کہتے تھے کہ وہ سب سے افضل ہے لیکن اب تو اس نے سب کو سرنگوں کر دیا۔"

"باباجان! اس خواب کی تعبیر کیا ہے؟" حضرت یوسفؑ نے پوچھا۔ "میں نے تو کبھی نہیں سوچا کہ میں سب سے افضل ہوں اور آپ نے یہ بات کہہ کر مجھے اور بھی متردد کر دیا بتائیے کہ میں اس خواب کو کیا سمجھوں؟"

"بس یہی سمجھ لو کہ میرا خدا مجھے وہی عزت دینا چاہتا ہے جو ابراہیمؑ کے فرزند اسماعیلؑ کو دی تھی۔ مگر پھر سن لو کہ اپنا خواب کسی سے مت کہنا۔"

ادھر دونوں عظیم پدر و فرزند محوِ گفتگو تھے، ادھر یہ خواب دیگر تمام بیٹوں میں عام ہو چکا تھا، ولیا گھر کے اندر اپنے بیٹوں سے کہہ رہی تھی۔

"سنو راحیل کے فرزند نے کیسا عجیب خواب دیکھا ہے کہ ستارے اسے سجدہ کر رہے ہیں۔ اس کی پھوپھی نے اسے بگاڑ دیا ہے کہ وہ خود کو بڑا اہم سمجھنے لگا ہے۔" ولیا تو یہ بات کہہ کر چلی گئی مگر سب بھائی ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرنے لگے۔ یہودا بولا۔

"ماں احاطہ پار کر کے ادھر آ رہی تھی تو اس نے یہ خواب سن لیا ورنہ باباجان ہمیں کبھی نہ بتائیں گے۔"

"اونہہ" شمعون نے کہا۔ "یوسف نے یہ خواب گھڑ کر باباجان کو سنا دیا ہے اور حیرت ہے کہ کنعان کے لوگ اس کی مدح کیوں کرتے ہیں؟"

"اجی لوگ ہی کیا باباجان کا اپنا بھی یہی خیال ہے کہ اس کی دماغی و فطری استعداد ہم سب سے زیادہ ہے بلکہ اخلاق اور پاکیزگی کے اعتبار سے بھی ہم میں کوئی اس جیسا نہیں ہے۔" روبیل نے ناگواری سے کہا۔

"دراصل وہ خوبصورت بہت ہے۔" لاوی نے حسرت سے کہا۔

"مگر خوبصورتی کے یہ معنی تو نہیں کہ باباجان بڑے بیٹوں پر بھی اسے ترجیح دینے لگیں، کوئی مسئلہ پیش ہو، کوئی مشورہ کرنا ہو وہ راحیل کے فرزند ہی کو اہمیت دیتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ اس

کی رائے صائب اور اس کا مشورہ مفید ہوتا ہے" زبان نے غصے سے کہا۔

"خیر یہ تو ایک بہانہ ہے" شمعون نے کہا "ورنہ حقیقت یہ ہے کہ وہ راحیل کو صدور جہ چاہتے تھے اس لئے اب اس کے بیٹوں کو اہمیت دیتے ہیں اور اسی لئے یوسف کو ہر وقت ساتھ رکھتے ہیں، آج صبح وہ سلام کرنے نہیں آیا تو کس قدر متفکر تھے۔"

"ہاں" دونوں نے تائید کی "میں نے کہا تھا کہ دھوپ میں حدت آیا چاہتی ہے، چلئے میں آپ کو اندر چھوڑ دوں مگر جب تک وہ سامنے نہ آیا وہاں سے اٹھے نہیں کہنے لگے یوسف نہیں آیا تو میں اس جگہ کو کیسے چھوڑ دوں ہر روز وہی مجھے احاطہ سے حجرے تک پہنچاتا ہے آج بھی اسی کو آنے دو۔"

چند منٹ تک سب غصے سے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے مگر شمعون خاموش رہا۔ راحیل نے پوچھا تو بولا۔

"سوچتا ہوں راحیل کے اس فرزند کا پتہ کیسے کاٹا جائے جب تک وہ موجود ہے بابا جان ہم میں سے کسی کو اہمیت نہ دیں گے اور اب تو وہ الٹے سیدھے خواب سنا کر بابا جان کی توجہ حاصل کرنے لگا ہے۔"

"اس کی ایک ترکیب ہے" لاوی نے کہا "یوسف کو ایک شب موت کے گھاٹ اتار دو۔"

"نہیں" زبان نے آہستہ سے کہا "بات کھل جائیگی اور بابا جان ہمیں جیتا نہ چھوڑیں گے۔"

"تو پھر اس کی شکل بگاڑ دو" یہودا نے نئی تجویز پیش کی "میرا خیال ہے علاقہ بھر کے لوگ اسے اس کے حسن کی وجہ سے چاہتے ہیں۔ پرسوں شام کا ایک تاجر کنعان آیا تھا تو کوئی اس سے کہہ رہا تھا کہ یعقوبؑ کا فرزند چودہ تاریخ کے چاند کی طرح روشن اور حسین ہے تم کوئی ترکیب ایسی کرو کہ اس کی صورت بگڑ جائے۔"

"یہ بھی ٹھیک نہیں بھائی" راحیل نے کہا "اس طرح بابا جان کی محبت کچھ اور بڑھ جائے گی بلکہ ہم سب کو کوئی ایسی تدبیر سوچنی چاہیئے کہ راحیل کا بیٹا یہ علاقہ ہی چھوڑ دے۔"

سب بھائی سنجیدگی سے سوچنے لگے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس موقع پر شیطان مجسم ہو کر آیا اس محفل میں شرکت کی اور انہیں بڑی الجھی تدبیر بتائی، بہر حال وہ خود آیا ہو یا شیطانی ترکیب ذہن میں آئی لیکن اس وقت بڑا عجیب فیصلہ ہوا جس پر سب بھائی متفق ہو گئے۔

سہ پہر کا وقت تھا حضرت یعقوب علیہ السلام عبادت سے فارغ ہوتے تھے کہ بیٹوں کا وفد ان کی خدمت میں حاضر ہوا ان کی نمائندگی دنیا کا بڑا بیٹا یہودا کر رہا تھا۔ انہوں نے پوچھا "فرزند تم کہاں سے آ رہے ہو" یہودا بولا۔

"بابا جان! میں کنعان کے بازار سے آ رہا ہوں شام کے چند تاجر آئے ہوئے ہیں اور خدمتِ اقدس میں حاضر ہونا چاہتے ہیں۔"

"کیا کہہ رہے تھے وہ لوگ، کیا کچھ فروخت کرنا چاہتے ہیں؟" حضرت یعقوبؑ نے دریافت کیا۔

"نہیں" یہودا اطمینان سے بولا "اگر صرف سودابازی کا معاملہ ہوتا تو وہ مجھ سے ہی بات کر لیتے مگر وہ خدمت میں آنے کے لئے بے چین ہیں" حضرت یعقوب علیہ السلام نے سکوت کیا۔ شام کے تمام تاجر جب کنعان آئے تو ملے بغیر نہ جاتے تھے یہ کوئی اہم بات نہ تھی مگر یہودا نے یہ بات کہہ کر سب بھائیوں کو معنی خیز انداز میں دیکھا۔ اس رسمی گفتگو کے بعد اب وہ اصل مقصد پر آنا چاہتا تھا۔ قدرے توقف کے بعد بات شروع کی۔

"بابا جان! ہم شکار کی اجازت طلب کرنے کے لئے آئے ہیں۔"

"تم ہمیشہ ہی سیر و تفریح اور شکار کے لئے جاتے ہو میں نے تمہیں کبھی نہیں روکا۔ اب بھی میری طرف سے اجازت ہے" حضرت یعقوبؑ نے کہا۔

"درست ہے بابا جان" یہودا نے خوش دلی سے کہا "آپ نے ہمیں کبھی نہیں روکا مگر آج ہم اپنے لئے نہیں یوسفؑ کے لئے اجازت طلب کر رہے ہیں۔"

یہ سن کر حضرت یعقوب علیہ السلام چونک گئے اور تذبذب جیسے انداز میں گویا ہوئے۔

"میرے بیٹو! میں یوسفؑ کو بھیجتے ہوئے ڈرتا ہوں مبادا اسے کوئی گزند نہ پہنچے ویسے میرا خدا بہترین نگہبان ہے۔"

"بابا جان" یہودا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "یہ کہیئے کہ آپ راحیل کے فرزند کے لئے ہم پر اعتماد نہیں کرتے

ہم اسے اپنے ساتھ لے جائیں یہ آپ کو گوارہ نہیں ہو اصل آپ اسے اپنی ذات سے جدا کرنا نہیں چاہتے اور یہ اس بات کی علامت ہے کہ آپ اسے سب سے زیادہ چاہتے ہیں۔"

"میرے بیٹو!" حضرت یعقوبؑ نے تشویش کے انداز میں کہا۔ "میں تم سب سے ایک جیسی محبت کرتا ہوں مگر یوسفؑ کے لئے اس لئے متردد ہوں کہ وہ کم عمر ہے اور ان مشاغل کا عادی نہیں، کہیں کوئی درندہ اسے گزند نہ پہنچائے۔"

"نہیں باباجان!" یہودا نے اصرار کیا "آپ ایسا گمان بھی نہ کیجئے۔ بھلا یوسفؑ کو تکلیف کیوں کر پہنچ سکتی ہے ہم دس بھائیوں کی جماعت کس لئے ہے اور پھر آپ کے خدا نے ہمیں کتنی غیر معمولی قوتیں عطا کی ہیں۔ میری چیخ سے خلقت ہراساں ہوجاتی ہے، شمعون شیروں کے جبڑے چیر دیتا ہے اور روبیل آن واحد میں درخت اکھاڑ دیتا ہے۔ ہم یوسفؑ کا بال بیکا نہ ہونے دیں گے اسے بھیج دیجئے۔" اس شدید اصرار پر حضرت یعقوب علیہ السلام نے انہیں شکار پر جانے کی اجازت دے دی۔

اگلے دن تخت فلک پر متمکن آفتاب کرہ ارض پر انسانی نفرت و حسد کا عجیب نظارہ کر رہا تھا۔ کنعان سے دور ایک وحشت ناک جنگل میں ایک کم عمر بھائی کے اشک و آہ وزاری ان دس بڑے بھائیوں کو متاثر نہ کر سکی جو برسوں سے بغض و نفرت کی آگ میں جل رہے تھے۔ ایک اندھے کنویں کی منڈیر تھی اور حضرت یوسفؑ خوشامد و منت سماجت سے ہر بھائی سے کہہ رہے تھے: "مجھے باباجان کے پاس لے چلو۔" مگر کسی طرف سے تھپڑ پڑتا، کسی طرف سے ٹھوکر اور کوئی دھکا دیتا۔ طے یہ ہوا تھا کہ ان کا کرتا اتار کر انہیں کنویں میں ڈال دیا جائے اس کے لئے یہ سنگدل بھائی اپنی جلن کی آگ بجھانے کے لئے انہیں مار رہے تھے، گھسیٹ رہے تھے اور ہزل گوئی کر رہے تھے۔ شمعون نے کہا۔

"کہاں ہیں وہ دس ستارے جو تجھے سجدہ کر رہے تھے راحیل کے بیٹے؟"

"اونہہ" دونوں نے منہ پر تھپڑ مارا۔ "یہ ہمارا سردار بنے گا" کسی نے کچھ کہا کسی نے کچھ اور اس کھینچا تانی میں کرتا اتر گیا اور برادران یوسفؑ نے انہیں پکڑ کر کنویں میں اچھال دیا۔ پھر ایک بکری کا بچہ ذبح کیا اس کا خون کرتے پر لگایا ایک مخبر کو کنویں سے قدرے فاصلہ پر بٹھایا اور ہدایت کی کہ جو کچھ ظہور میں آئے انہیں مطلع کرے۔ اس کے بعد روتے پیٹتے واویلا کرتے کنعان کی طرف روانہ ہوگئے۔ ادھر وہ سوچی سمجھی اسکیم کے تحت واپس ہوتے، ادھر حضرت جبرائیل علیہ السلام کنویں میں نازل ہوئے، حضرت یوسف علیہ السلام کو ہاتھوں میں اٹھا کر ایک پتھر پر بٹھایا اور تسلی دی۔ اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام کی عمر دس برس تھی، جب پہلی مرتبہ روح الامین ان کے پاس آئے۔ تین پیغمبروں پر بچپن میں ہی نبوت نازل ہوئی، حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت یحیٰی علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام

ادھر خداوند عالم نے ان رقیبوں کے مقابلے میں اپنے نبی کی تسلی فرمائی، ادھر حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے عزیز فرزند کی واپسی کے بجائے ان کی موت کی خبر سن رہے تھے۔ ان کے بیٹے گریہ وزاری کر رہے تھے۔ "باباجان، ہم ایک شکار کے تعاقب میں دوڑنے لگے، ہماری غیر موجودگی میں یوسف کو بھیڑیا لے گیا۔" یہودا نے خون آلود کرتا ان کے سامنے پیش کیا اس وقت حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے بیٹوں پر اعتماد نہ ہونے کے باوجود مجبور تھے، وہ اس صدمہ کی تاب نہ لا سکے اور بیہوش ہوگئے، ہوش آیا تو بولے۔

"میرے بیٹو! میں تم سے کچھ نہ کہوں گا بلکہ اسی سے فریاد کروں گا جو بہترین نگہبان ہے۔"

دن بھر گھر میں برادران یوسفؑ واویلا کرتے رہے جو آتا اس کے سامنے حضرت یوسف علیہ السلام کے اوصاف بیان کرتے، آخر پھر اپنے اپنے ٹھکانوں پر چلے گئے مگر غمزدہ باپ کا دکھ کم ہونے والا نہ تھا وہ مسلسل گریہ کرتے اور اپنے عظیم فرزند کے فراق میں روتے رہے اپنے مالک سے فریاد کرتے رہے ان کے حاسد بیٹے ان کا یہ حال بظاہر دکھ سے دیکھتے مگر جنگل سے مخبر کے آنے کا انتظار کرتے رہے۔ شب بیتی دوسرا دن طلوع ہوا۔ کنعان میں یہ اندوہناک خبر پھیل گئی۔ وہاں کے باشندے جوق در جوق حضرت یعقوب علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان کے حسین نوعمر بیٹے کی عجیب و غریب موت کی تعزیت کرتے اور چلے جاتے۔ ایک روایت کے مطابق تیسرے دن اور دوسری روایت کے مطابق ساتویں دن

ادران یوسفؑ گھر کے عقب والے میدان میں جمع تھے اور
نبرانہیں عجیب خبر سنا رہا تھا۔

"جناب حیرت کی بات ہے کہ جس جنگل سے کبھی کوئی
ملہ نہیں گزرتا وہاں سے ایک تجارتی قافلہ گزرا جسے پانی کی
رورت ہوئی، اس کے ایک آدمی نے پانی کے لئے ڈول ڈالا
اس میں یوسف اوپر آگئے۔"

"مگر اس کنویں کا پانی تو کھاری ہے اس میں یوسف
ندہ کیسے رہ سکتا ہے اور قافلے والے جانتے ہیں کہ وہ پانی
قابل استعمال ہے۔" یہودا نے حیران ہو کر کہا۔

"معلوم نہیں۔" مخبر نے تعجب کا اظہار کیا۔ "وہ سب اسی
ویں کا پانی نکال کر پی رہے ہیں۔"

"کاش ہم یوسف کو کنویں میں دھکیلنے کے بعد اوپر سے
ب بڑا پتھر ڈال دیتے تو وہ واپس نہ نکل سکتا۔" شمعون نے
لہ سے کہا۔

"مگر بھائی وہ آخر اس اندھے کنویں میں محفوظ کیسے رہا۔"
ولوں نے شمعون کا کندھا ہلایا۔

"شاید کسی پتھر سے چمٹ گیا ہو۔" راحیل نے کہا "مگر اس
یہ وقت ان باتوں کا نہیں جلد کچھ کرنا چاہئے۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔" یہودا بولا۔ "تم میں سے چند میرے
ساتھ آؤ جنگل کی طرف اور باقی گھر جا کر جیسے بھی ہو بابا جان کو مطمئن
رو کہ میں چند گھنٹوں کے لئے کنعان کے بازار میں شامی تاجروں
سے ملنے گیا ہوں۔"

چنانچہ کچھ بھائی گھر کی طرف چلے گئے اور حضرت یوسف
علیہ السلام کا بڑا بھائی یہودا باقی بھائیوں کے ہمراہ تیزی سے
جنگل کی طرف روانہ ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ قافلے کے سالار
سے جھگڑا کر رہا تھا۔ قافلے کے سردار نے یہودا کو سمجھانے کی
کوشش کی۔ "جناب، اس خوبرو لڑکے کو میں نے کنویں سے نکالا
ہے اس پر میرا حق ہے۔"

"لیکن آپ بھول گئے کہ یہ جنگل کنعان کے قریب ہے
اور میں کنعان میں رہتا ہوں، یہ خوبصورت لڑکا میرا غلام ہے
جو بھاگ کر اس کنویں میں آ چھپا تھا اب میں اسے نہ چھوڑوں گا۔"
یہودا نے چلا کر کہا۔

"کیا آپ کا یہ زر خرید غلام ہے؟" سالار قافلہ نے دریافت
کیا۔

"جی ہاں۔" برادران یوسفؑ نے سفید جھوٹ بولا۔ "ہم
نے اسے قیمت دے کر خریدا تھا اور اسے یوں نہ چھوڑیں گے۔"

"جناب" قافلہ کے سردار نے آگے بڑھ کر بات کی۔ "میرا
نام مالک ہے میں سوداگروں کے اس قافلہ کا سردار ہوں، میں
نے ہی اسے کنویں سے نکال کر مصر لے جانے کا فیصلہ کیا ہے
اگر آپ اسے میرے ہاتھ فروخت کر دیں تو بہتر ورنہ میں کسی صورت
اس حسین لڑکے سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہیں ہوں۔"
چند منٹ برادران یوسفؑ اپنی خوشیاں چھپائے ان کے ڈائیلاگ
سنتے رہے اور پھر حضرت یوسف علیہ السلام کا سودا ہو گیا قرآن پاک
میں اس موقع کے لئے درج ہے اور بیچ آئے اس کو ناقص
مول، گنتی کی کئی پاؤلیاں اور ہو رہے تھے اس سے بیزار۔
(سورۃ یوسف) کہا جاتا ہے کہ برادران یوسفؑ نے انہیں مالک
کے ہاتھوں اٹھارہ درہم میں بیچ دیا۔ چند یوم بعد مصر میں غلاموں
کی منڈی لگنے والی تھی قافلے کے سردار کو یقین تھا کہ کوئی نہ کوئی
امیر اس حسین عالم تاب کو منہ مانگی قیمت پر خرید لے گا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب غلامی کا رواج عام تھا، ہر شہر
ہر علاقہ میں غلاموں کی تجارت ہوتی تھی۔ مصر میں یہ کاروبار
عروج پر تھا سوداگر چھوٹے چھوٹے علاقوں سے سستے داموں

■ خدا یا آنکھ مجھے نہیں دیکھ سکتی حالانکہ تو ہر آنکھ
کی پتلی ہے۔ (دیگور)

■ غصے کے عالم میں انسان حق بیان نہیں کر سکتا۔
(چینی دانشور)

■ جسے ایک بار سانپ نے ڈسا وہ برسوں رسی
سے ڈرتا ہے۔ (چینی مفکر)

■ تجربہ ہمارا ایک اچھا استاد ہے۔ (فرینکلن)

■ اس خوشی سے بھاگو جو غم کا نشانہ بن کر واپس آجائے
ہو جائے۔ (ہربرٹ اسپنسر)

■ سچے دین کے نقش قدم پر چلو۔ (قرآن پاک)

■ لوگوں کے ساتھ انصاف اور احسان کرو۔
(حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم)

لڑکے خریدتے اور مصر میں لے جاکر منافع پر بیچ دیتے۔ کنعان کے جنگل سے مصر کے بازار تک قافلہ کا کوئی قیام ایسا نہ تھا جہاں انسانوں کے ہجوم نے مالک کے اس زرخرید غلام کو دیکھ کر حیرت نہ کی ہو جہاں جہاں سے سوداگروں کا قافلہ گزرتا ہر شخص جمال باکمال کے دیدار کا مشتاق ہوتا۔ اس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کے بے پناہ حسن کی شہرت ہوگئی اور جس دن غلاموں کی منڈی لگی اس دن خلقت کا اژدہام تھا مالک نے ایک کرسی پر حضرت یوسف علیہ السلام کو بٹھایا، ان کی کرسی کے ساتھ ساتھ دیگر غلاموں کی نشستیں اور دوسرے سوداگروں کا مال تھا، مصر کا جو تاجر بھی منڈی میں داخل ہوتا، اس کی نظر حضرت یوسف علیہ السلام پر پڑتی اور قدم زمین پر جم کر رہ جاتے۔ چند لمحے ہر نفس حیرت سے ان کا دیدار کرتا پھر مالک سے قیمت کی بابت دریافت کرتا مگر اس برگزیدہ ہستی کی قیمت کوئی عام آدمی ادا نہ کر سکتا تھا۔ لہٰذا لوگ دیکھتے اور آگے بڑھ جاتے اور مالک کا فخر و غرور بڑھ جاتا۔

اچانک شور بلند ہوا کہ عزیز مصر تشریف لاتے ہیں۔

عزیز مصر کا نام قرآن پاک میں درج نہیں ہے، البتہ تورات میں اس امیر کو فاطی فار لکھا ہے، لیکن مصر کی تاریخ میں اس کا نام قطفیر درج ہے مگر وہ عزیز مصر کے لقب سے مشہور تھا۔ اس وقت مصر کا حاکم ریان ابن ولید (فرعون) تھا یہ حاکم قوم عمالقہ سے تعلق رکھتا تھا جو دراصل عرب عاربہ کی ایک شاخ تھے۔

ریان ابن ولید ملقب بہ فرعون کے دربار میں عزیز مصر وزارت کے عہدے پر فائز تھا اور مصر کا بچہ بچہ اس کی حیثیت سے واقف تھا۔ عزیز مصر کی شادی شاہ طیموس کی دختر راعیل سے ہوئی تھی (جو تاریخ میں زلیخا کے نام سے مشہور ہیں) عزیز مصر کی سواری پہنچی تو ہر سوداگر اپنے مال کو نمایاں کرنے کی فکر میں اسے درست کرنے لگا، مگر حضرت یوسف علیہ السلام ابھی تک بدستور اپنی نشست پر براجمان تھے۔ ان کا چہرہ اس قدر روشن اور تابناک تھا کہ محسوس ہوتا تھا کہ بلند ہوتا آفتاب ان ہی کے رخ روشن سے نور چرا چرا کر کائنات کو منور کر رہا ہے۔ عزیز مصر منڈی میں داخل ہوا اس کے دائیں بائیں مسلح غلام تھے اور عقب میں محافظ دستے برہنہ سنگینیں لئے ہوئے تھے۔ اس نے اس غلام کو دیکھا اور پھر کچھ دیکھنے کا شوق باقی نہ رہا۔ اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام کی کیفیت کیا تھی کوئی اندازہ نہ کر سکتا تھا، انہیں یقین تھا کہ یہ امیر انہیں خرید لینے کی سکت رکھتا ہے، یہ خیال انہیں غمگین و آبدیدہ کر رہا تھا۔ چنانچہ مالک نے اس لڑکے کے عوض جو کچھ طلب کیا عزیز مصر نے اس سے زیادہ عطا کر دیا۔ یوں ایک جلیل القدر باپ کا جلیل القدر فرزند دوسری مرتبہ بک گیا مگر تقدیر کچھ اور کہہ رہی تھی۔

"یوسف (علیہ السلام) رنجیدہ نہ ہو تو بکنے کے بعد بھی غلام نہیں ہو سکتا، تیری روشن جبیں سرداری کی علامت ہے کوئی دن جاتا ہے کہ مصر کا بچہ بچہ تیرا غلام ہوگا۔" مگر اپنے مستقبل سے بے خبر حضرت یوسف علیہ السلام اسی دن مصر کے وزیر کے ساتھ اس کے محل میں آ گئے۔ عزیز مصر نے محل میں داخل ہوتے ہی اپنی بیوی (زلیخا) کو آواز دی۔

"راعیل، دیکھو ہم اس لڑکے کو اپنا فرزند بنائیں گے۔"

راعیل نے اس لڑکے کو دیکھا اور دیکھتی ہی رہ گئی۔

پھر حسن و جمال کے ساتھ ساتھ حضرت یوسف علیہ السلام عزیز مصر اور دیگر [illegible] افراد کو اپنی اعلیٰ صلاحیتوں اور بہترین سیرت سے متاثر کر [illegible] رہے۔ عزیز مصر کی عقیدت اور راعیل کی محبت ان کے سا[illegible] ہوا ہوتی رہی۔ حضرت یوسف علیہ السلام ہرچند اس محل میں [illegible] ند کی طرح لائے گئے مگر وہ اپنے فرائض کو پہچانتے تھے اور عزیز [illegible] کے کاموں کو بڑی خوبصورتی سے انجام دیتے۔ یوں وقت تیزی سے گزرتا رہا وہ جوان ہوتے گئے، اجنبی سرزمین میں اپنے اعلیٰ اطوار کے سبب مقبول ہوتے گئے اور شاہ طیموس کی دختر عزیز مصر کی زوجہ راعیل کے دل میں ان کی محبت بڑھ گئی۔ وہ انہیں بہترین لباس پہناتی، ان کی خاطر داری میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتی مگر جتنا ان کا خیال رکھتی اتنا ہی وہ محتاط روی اختیار کرتے رہے، ادھر عشق کی آگ بڑھتی گئی، ادھر اللہ کا وہ برگزیدہ بندہ جسے وہ پیغمبری کے منصب پر فائز کرنے کے لئے منتخب کر چکا تھا۔ جس کی سیرت بے مثال اور بے داغ تھی جو عزیز مصر کی نظروں میں عظیم تھا۔ وہ اتنا ہی اس عورت سے بچتا گیا۔ یہاں تک کہ حضرت یوسف علیہ السلام جوان ہو گئے، لڑکپن کا حسن بے پناہ مردانہ وجاہت میں ڈھل گیا۔ انہیں عزیز مصر کے محل میں چھ برس ہو گئے تھے اور ان عرصہ میں زبردست انقلاب لے آیا تھا۔ اب ان کا عالم شباب تھا، ہر پہلو ہر انداز سے حسن و جمال عیاں تھا۔ ایک طرف وہ

ں درعنائی کا انوکھا مجسمہ تھے دوسری طرف علم وحکمت ان وہر تھا۔ حیا اور عصمت ان کا شعار اور نورانی جبیں سے گر ہونے والی عظمت ان کا خاندانی طرۂ امتیاز تھا راعیل ن ایک نئے انداز سے پروانہ وار نثار ہونے کا اظہار کرتی اسے دل پر قابو نہ رہا تھا اور وہ نت نئے انداز سے اس م سدق وحسا کو اپنی طرف ملتفت کرنا چاہتی تھی مگر ان کی ہ زندگی ان لغویات سے پاک تھی۔ وہ ہستی جو دنیا میں انداری اور سچائی کا درس دینے کے لئے آئی تھی، جسے ت امانت اور حفظِ حقوق کی بنیاد رکھنے کے لئے کرۂ ارض بھیجا گیا تھا، بھلا ایک عورت کے دام میں کیونکر پھنس سکتی تھی عورت بھی کون ان کے محسن ان کے آقا کی بیوی، جس نے انہیں خرید کر فرزندوں کی طرح پرورش کیا تھا۔ یہ شقانہ انداز اور نسوانی حسن سے متاثر ہو جانا ان کی شان پیغمبرانہ منصب کے قطعی خلاف تھا۔ راعیل کا عشق سوا ہوتا ا۔ عاشقانہ اشارے وکنائے اور بےتابانہ اظہار محبت کے ہین انداز انہیں قائل کرنے کی کوشش کرتے رہے مگر کوئی لت حضرت یوسف علیہ السلام کے پائے استقلال میں جنبش یدا نہ کر سکی۔ جب ہر انداز اور ہر طرح محبت کے اظہار کے جود راعیل ناکام رہی تو اس نے دل بے تاب کی تسکین کے ئے ایک نیا طریقہ اختیار کر لیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے صال کی آرزو اس درجہ غالب آئی کہ راعیل جذبات پر قابو پا سکی اور یہ گھڑی اللہ کے اس باعصمت بندے کے لئے ی سخت تھی۔

صبح کا وقت تھا عزیز مصر نے ایک خاص کام کے لئے ت یوسف علیہ السلام کو محل کے اندرونی حصے میں بھیجا حکومت ے خاص امور کے لئے وہ ان کے سوا کسی پر بھروسہ نہ کرتا تھا اس کا اندازہ حضرت یوسف علیہ السلام کو خود بھی تھا وہ محل ے اس حصہ میں جس میں عزیز مصر اور اس کے بزرگوں کے اعلحا تصاویر دیواروں پر نصب تھیں جہاں بڑی بڑی دیوار گیر الماریاں میں صدیوں سے حکومت کے بارے میں وہ دستاویزات موجود تھیں جن کا علم صرف عزیز مصر کو تھا یا اب اس کے معتمد خاص حضرت یوسف علیہ السلام کو۔ حضرت یوسف علیہ السلام اس کمرے میں بارہا آئے تھے۔ یہاں بیٹھ کر انہوں نے گھنٹوں عزیز مصر کے کاموں کو خوش اسلوبی سے انجام دیا تھا اور بہروں یہاں آکر عزیز مصر سے مختلف موضوعات پر گفتگو کی تھی۔ یہ کمرہ محل کا سب سے محفوظ کمرہ تھا نہ ڈر تھا نہ خوف نہ کسی کی دخل اندازی کا خیال لہٰذا آپ ہمیشہ کی طرح کمرے میں داخل ہونے اور اپنے کام میں مصروف ہو گئے مگر ابھی چند لمحے بھی نہ گزرے تھے کہ دروازہ بند ہونے کی آواز نے انہیں چونکا دیا انہوں نے گردن موڑ کر دیکھا راعیل کمرے کا دروازہ بند کر کے ان کی جانب بڑھ رہی تھی۔

ایمان کی آزمائش کے لئے یہ وہ وقت تھا جہاں اچھے اچھے صاحب کردار لوگوں کے قدم لغزش کھا جاتے ہیں۔ کمرے کے دروازے بند تھے۔ شاہی خاندان کی عورت مکمل آرائش و آراستگی کے ساتھ ان کے روبرو شعلہ جوالہ بنی کھڑی تھی یہاں کوئی اور مرد ہوتا تو نفس متزلزل ہوئے بغیر نہ رہتا اور ممکن نہ تھا کہ حسن وزینت کی اس نمائش کے بعد ہاتھ نہ بڑھاتا جو عورت برسوں سے عاشق تھی ان سازگار حالات میں اس کی حوصلہ افزائی نہ کرتا مگر یہ حضرت یوسف علیہ السلام تھے جنہوں نے انتہائی کٹھن وقت میں بھی غلط بات نہ سوچی تھی، انھوں نے اس عورت سے پوچھا۔

"راعیل کیا چاہتی ہو؟"

"اپنی محبت کا جواب اور کچھ نہیں۔" راعیل نے اطمینان سے کہا۔ "ڈرو نہیں نتیجہ کی ذمہ دار میں خود ہوں۔" امین نبوت نے سخت اشتعال کے انداز میں دیکھا مگر بڑے تحمل سے سمجھانے کے انداز میں بولے۔

"میں اپنے مالک کی پناہ مانگتا ہوں ہر برائی سے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ میں اپنے محسن اور مربی کی امانت میں خیانت کروں تم عزیز مصر کی بیوی ہو اور میں ان کا زرخرید۔"

"لیکن میں تمہیں ایسا نہیں سمجھتی۔" راعیل نے اصرار کیا۔ "تم جانتے ہو میں اولین دن سے تمہیں چاہتی ہوں۔ بیقرار ہوں میں نے ان برسوں میں ایک لمحہ کے لئے سکون نہیں پایا آج تم مجھے"

"یہ ناممکن ہے۔" حضرت یوسف علیہ السلام نے سختی سے اس کی بات قطع کر دی۔

راعیل آہستہ خرامی سے انہیں بے خودی کے انداز میں تکتی ہوئی قریب آگئی تھی، حضرت یوسف پیچھے ہٹتے ہوئے اسے پھر سمجھانے لگے مگر وہ اپنی ہٹ دھرمی اور ضد سے باز نہ آئی۔

ایک طرف شدید اصرار تھا، بار بار اظہار محبت تھا مگر دوسری طرف انکار تھا۔ یوں بہت سا وقت گزر گیا مصر کی یہ لالہ رو موقع کی منتظر تھی کہ کب وہ ہاتھ بڑھا کر محبوب کو پکڑ لے مگر اس محبوب کو راہ راست سے ہٹانا ناممکن تھا وہ دلکش و پراثر دلیلوں سے اسے قائل کرتے دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے لیکن راعیل یہ لمحات گنوا دینے کے لئے تیار نہ تھی۔ جانتی تھی کہ یہ وقت گزر گیا تو کبھی نہ آئے گا۔ اس وقت ایک لمحہ ایسا آیا کہ حضرت یوسف علیہ السلام راعیل کی بے قراری اور نگاہوں کی تپش سے خوفزدہ ہو گئے، ہر نصیحت بیکار تھی اب بچاؤ کی صرف ایک صورت تھی جو انہوں نے اختیار کی اور ایک جست میں تمام فاصلہ طے کر کے دروازے پر پہنچ گئے مگر دوسرے ہی لمحہ راعیل عقب سے ان کا کرتا پکڑ چکی تھی، جھپٹ اور بچاؤ کی اس کوشش میں حضرت یوسف علیہ السلام کا کرتا پھٹ گیا۔ انہوں نے پھر تنبیہ کرنے کے لئے گردن موڑ کر راعیل کو دیکھا مگر اسی لمحہ دروازہ کھول کر عزیز مصر کمرے میں داخل ہوا تو ان کے لب بند کے بند رہ گئے وہ مجرم نہ تھے مگر مجرموں کے انداز میں ٹھٹکتے رہ گئے۔ عزیز مصر ان کا انتظار کر کے خود ہی یہاں آیا تھا مگر یہ منظر غیر متوقع تھا۔ راعیل عزیز مصر کی آمد پر ہراساں کھڑی تھی۔ عزیز مصر نے ان دونوں کو دیکھا، ابھی وہ کچھ کہنے نہ پایا تھا کہ راعیل نے ایک خاص حربہ استعمال کیا وہ عزیز مصر کو دکھانے کے لئے ایک دم رو پڑی اور بولی۔

"جس پر آپ اندھا اعتماد کرتے ہیں جسے آپ نے بیٹوں کی طرح رکھا وہ آپ کی عزت سے کھیلنا چاہتا ہے۔ بھلا ایسے ناسپاس کی کیا سزا ہو سکتی ہے؟"

اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام کی کیفیت عجیب تھی اور عزیز مصر یہ غیر متوقع صورت دیکھ کر چکرا گیا تھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی ذات سے اسے یہ توقع نہ تھی نہ وہ ان کے بارے میں کسی برائی کا گمان کر سکتا تھا لہٰذا اس نے غم و غصہ سے انہیں دیکھا حضرت یوسف علیہ السلام اس کا مطلب سمجھ گئے اور فرمایا۔

"اے مصری سردار، میرے محسن! میں ایسی نازیبا حرکت کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، خطا اس عورت نے کی ہے۔"

ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس موقع پر ایک شیر خوار بچہ نے آپ کی بے گناہی کی گواہی دی۔ بہرحال اس وقت عزیز مصر نے کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا مگر اسی دن محل میں داناؤں کی محفل جمی سب نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا مگر عزیز مصر کا ایک رشتہ دار جو دربار فرعون کا دانا مشیر تھا اس نے کہا۔

"معزز فاطی فار! اس جوان کی قمیض پیش کرو۔ اگر وہ آگے سے پھٹی ہوئی ہے تو سمجھ لو کہ راعیل سچ کہتی ہے وہ نوجوان خود بدکار ہے لیکن اگر قمیض کا پچھلا دامن چاک ہوا ہے تو یقین کر لو کہ یوسف سچ کہتا ہے اور دست درازی راعیل نے خود کی ہے۔"

یہ تجویز بڑی معقول تھی، سب داناؤں نے تسلیم کی اور حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیض دیکھی گئی جو حقیقت میں پیچھے سے پھٹی ہوئی تھی اور فیصلہ حضرت یوسف علیہ السلام کے حق میں ہوا اور عزیز مصر فاطی فار کو ان کی بے گناہی کا کامل یقین ہو گیا۔ جب تمام دانا لوٹ گئے تو اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بلایا اور کہا۔

"عزیز! تم مجھے پہلے بھی اتنے ہی عزیز تھے اور اب بھی۔ وقتی طور پر جو شک پیدا ہوا تھا وہ دور ہو گیا لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس قصے کو ختم کر دو، یہ بات مصر میں عام نہ ہو۔" یہ سن کر حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا۔

"میری طرف سے آپ مطمئن رہیں جس شخص نے مجھے غلاموں کی منڈی سے خرید کر عزت و حرمت عطا کی وہ مجھے احسان فراموش نہ پائے گا۔ اگر میں مصر میں یہ بات عام کر دوں تو میرا رب مجھے ظالموں میں ٹھہرائے گا اور ظالم کے لئے فلاح نہیں ہے۔"

عزیز مصر اس معقول جواب سے مطمئن ہو گیا اور راعیل سے بولا۔

"اے عورت! خطا تو نے کی ہے تو توبہ کر۔ بے شک عورتوں کا فریب شیطان سے بڑھ کر ہے۔"

راعیل اس تنبیہ پر رونے لگی اور کوئی نہ سمجھ سکا کہ ان آنسوؤں کا مطلب کیا ہے اعتراف جرم یا عشق میں ناکامی کا احساس گو حضرت یوسف علیہ السلام نے کچھ نہ کہا مگر راعیل کے عشق کا قصہ محل سے نکل کر مصر کے گلی کوچوں میں پھیل گیا۔ مصری سرداروں کی بیویاں آئیں اور طرح طرح سے اسے مطعون کرتیں کوئی کہتی۔

"عزیز مصر کی زوجہ اپنے نوجوان غلام سے عشق لڑا رہی ہے۔" کوئی کہتی۔

"شاہ طیموس کی دختر مصر کے وزیر کی بیوی اپنے زر خرید غلام پر ریجھ گئی۔" کسی نے طعن مارا۔

"واہ او نچے درجہ کی عورت کتنے نیچ مرد پر عاشق ہوئی
ہے بے حیا کہیں کی!" کسی نے بات ماری۔
"واہ عزیز مصر کی ملکہ۔ تم نے تو مکمل اقدامات کر لئے تھے
اس غلام کو قابو نہ کر سکیں۔"
غرضکہ ہر دن راحیل کو نئے نئے طعن سہنے پڑتے، ادھر
عشق کی ناکامی اور ادھر بدنامی سے اسے شاق گزر رہی تھی مگر دل
اگر پھر بھی اسی کے لئے مچلتا تھا، آخر ایک دن جب مصر کی معزز
خواتین اس کے محل میں جمع کبھی اشاروں کنایوں سے اور کبھی
کھلے چست کر کے اس کے عشق کا تمسخر اڑا رہی تھیں تب اس
کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ اس نے ناگواری سے کہا۔
"تم میرے عشق پر مجھے اس لئے معلون کر رہی ہو کہ تم
نے اسے دیکھا ہی نہیں، بے شک وہ فوطی فار کا زر خرید غلام
ہے مگر اس کا حسن عقل کو متحیر کر دیتا ہے۔"
"تو پھر ہماری عقلوں کو بھی متحیر کر دو نا!" ان عورتوں نے
راحیل کا مضحکہ اڑایا تو شدت کرب سے راحیل کی آنکھیں نم
ہو گئیں وہ خود کو اس عشق کے معاملے میں بے قصور سمجھتی تھی لہٰذا
اس نے فیصلہ کیا کہ ان سب کو اپنے محبوب کی ایک جھلک ضرور
دکھائے گی۔ پھر اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اس نے
شاہی خاندان اور عمائدین شہر کی عورتوں کی ضیافت کی اور ان
معزز مہمان خواتین کی محفل وہاں سجائی جہاں سے گزر کر حضرت
یوسف علیہ السلام کو باہر جانا تھا۔ دستر خوان بچھایا گیا۔ ہر خاتون
کے سامنے بھنا ہوا گوشت اور پھل رکھے گئے اور ہاتھوں میں
چھریاں دے دی گئیں کہ حسب دستور گوشت کاٹ لیں یا پھل۔
ٹھیک اسی وقت حضرت یوسف علیہ السلام ادھر سے گزرے (لیکن
ایک روایت یہ بھی ہے کہ انہیں یہاں بلایا گیا) بہر حال شاہی خاندان
کی عورتوں نے راحیل کے محبوب کو دیکھا تو دیکھتی رہ گئیں، رخ انور
کی تابانی نے ان کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا تھا۔ یہ انسانی چہرہ نہیں
ماہ کامل تھا جسے دیکھنے کے بعد وہ سب اپنی سدھ بدھ بھول گئیں
اور چھریاں جو پھل کاٹنے کے لئے ہاتھوں میں تھیں ان کے ہاتھوں
پر چل گئیں، کچھ کے ہاتھ زخمی ہوئے، کچھ کی انگلیاں کٹ گئیں کسی
نے کہا "یہ انسانی حسن نہیں ہے" کسی نے کہا "یہ فرشتہ ہے۔" اور
کوئی لب کشائی کی ہمت ہی نہ کر سکی حضرت یوسف جا چکے تھے
مگر یہ تمام عورتیں جیسے ہوش میں نہ رہی تھیں اور بہت دیر بعد جب
ان کی حیرانی کم ہوئی تو وہ سب راحیل کی دوست اور ہمراز دار بن
چکی تھیں راحیل نے کہا۔
"دیکھا تم نے یہی ہے فوطی فار کا وہ غلام جس کے عشق
پر تم مجھے مسلسل طعن دے رہی ہو، سچ کہنا میرا عشق بجا ہے نا؟"
معزز عورتوں نے کھلے دل سے اعتراف کیا ایک بیوی بولی۔
"راحیل، اب تمہارے عشق کا انجام کیا ہوگا تم نے ہر طرح
اسے قابو کرنا چاہا مگر اس نے عظمت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔"
"میں ایک نہ ایک دن اسے قابو کر لوں گی۔" راحیل نے
جواب دیا۔ "اس جیسے انسان کے ساتھ بدنام ہونا ذلت نہیں
ہے۔"
"میرا خیال ہے۔" ایک عورت نے ہمدردی کی۔ "عزیز مصر
نے اپنے محل میں اس جوان کو ہر عیش و آرام دیا ہوا ہے اس لئے
اسے کسی چیز کی طلب ہے نہ تیری قدر، اگر وہ چند دن مصائب
برداشت کرے تو تیری بات مان سکتا ہے بلکہ خود تیرا طالب
ہو جائے گا۔"
راحیل کو یہ بات پسند آئی، عورتیں واپس لوٹ گئیں مگر
اسے محسوس ہو رہا تھا کہ آج یہ عشق سوا ہو گیا ہے، اس نے فیصلہ
کیا کہ اپنے محبوب سے مطلب حاصل کر کے رہے گی ورنہ اسے بے عزت
کرنے کا کوئی حربہ نہ چھوڑے گی۔ لہٰذا اس نے اپنی کاوشیں تیز
کر دیں۔ جدھر جدھر سے حضرت یوسف علیہ السلام کے گزرنے
کا گمان ہوتا ان راہوں پر کھڑی ہو جاتی اور برملا درد دل سناتی
ان کے انتظار میں پہروں کھڑی رہتی کبھی انہیں بلا ضرورت ہی
بلواتی اور ملتفت کرنے کی کوشش کرنے لگتی۔ ادھر یہ باتیں محل

کے ہر فرد کی نظروں میں آنے لگیں۔ ادھر حضرت یوسف علیہ السلام کو محل کی فضا قید خانہ سے بدتر لگنے لگی اور یہی وہ زمانہ تھا جب انہوں نے اپنے پروردگار سے دعا کی: ”اے رب میرے! قید بہتر ہے میرے لئے اس چیز سے جو پکارتی ہے مجھ کو طرف اس کے (برائی کے) اگر تو نہ پھیرے گا مکر ان کا۔ جھک جاؤں گا میں طرف ان کے اور ہو جاؤں گا نادانوں میں سے“ (سورۃ یوسفؑ) اور شاید یہ اسی دعا کا اثر تھا کہ مصر کے کوچہ کوچہ، بازار بازار میں یہ عشق اس بری طرح مشہور ہوا کہ عزیز مصر کو کوئی صورت نظر نہ آئی تو اس نے اس صورت حال کے سدباب کے لئے حضرت یوسف علیہ السلام کو زنداں خانہ بھیج دیا تاکہ یہ معاملہ مصریوں کے ذہن سے محو ہو جائے یوں اللہ کا یہ برگزیدہ بندہ اپنی دعا پر جیل خانہ پہنچ گیا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی شخصیت اور بلند اطوار نے داروغہ جیل اور قیدیوں کو بھی متاثر کر دیا۔ ادھر قیدی انہیں بہترین معزز ساتھی سمجھتے اور ادھر داروغہ جیل نے سب قیدیوں کا انتظام ان کے سپرد کر دیا۔ ایک دن حضرت یوسف علیہ السلام شب کے آخری حصہ میں اپنے رب کی تسبیح کر رہے تھے اور ان کے ساتھی قیدی محو خواب تھے کہ انہیں آہٹ کی آواز نے چونکا دیا۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک نیا چہرہ ان کے سامنے تھا وہ حیرت سے بولے: ”تم کون ہو اور قید خانہ میں کیسے آ گئے؟“ آنے والے نے جواب دیا۔ ”میں جبرائیل ہوں اور خدائے واحد کی طرف سے تمہارے پاس آیا ہوں۔ اے یوسفؑ تمہارا خدا تمہیں عقل و دانش، حکمت و فطانت اور عزت دینی چاہتا ہے میں تمہیں نبوت کی خبر دیتا ہوں اور علم تعبیر سکھاتا ہوں جس سے تمہیں عزت حاصل ہوگی۔“

اس طرح حضرت جبرائیل علیہ السلام نے انہیں تعلیم تعبیر دی اور وہ اس فن میں کامل ہو گئے۔ اب جو قیدی بھی کوئی خواب دیکھتا وہ اسے صحیح تعبیر بتاتے جو پوری ہوتی، ان دنوں دو نئے قیدی جیل میں آئے، شاہی ساقی اور شاہی باورچی خانہ کا داروغہ۔ ان دونوں نے خواب دیکھے، ساقی نے کہا۔

”جناب میرے خواب کی تعبیر بتایئے۔ میں نے دیکھا ہے کہ حسب دستور فرعون کو شراب پلا رہا ہوں۔“ یہ خواب سن کر حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا۔ ”تجھ پر جو الزام ہے وہ غلط ثابت ہوگا [illegible] تو اپنے منصب پر بحال ہو جائے گا اور بدستور بادشاہ کو شراب پلائے گا۔ شاہی ساقی بہت خوش ہوا، پھر شاہی باورچی آگے بڑھا اور عرض کیا۔

”جناب! میرے خواب کی تعبیر بھی بتا دیجئے۔ میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں بازار میں کھڑا ہوں میرے سر پر روٹیاں رکھی ہیں اور پرندے چونچیں مار مار کر انہیں کھا رہے ہیں۔“ یہ سن کر آپ نے فرمایا۔

”تجھ پر جو الزام ہے صحیح ثابت ہوگا اور تجھے پھانسی دی جائے گی۔“

کچھ دن نہ گزرے تھے کہ یہ دونوں تعبیریں سامنے آ گئیں شاہی ساقی بری ہو کر فرعون مصر کی خدمت پر بحال ہوا اور نانبائی کو پھانسی دے دی گئی۔

یوں وقت گزرتا رہا اور زنداں خانہ میں بند حضرت یوسفؑ اپنے خدا کی تسبیح کرتے رہے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب فرعون مصر نے وہ عجیب و غریب خواب دیکھا جس کا قرآن پاک میں ذکر موجود ہے۔ اگلی صبح وہ اٹھا اس نے مصر کے تمام علماء کو جمع کیا اور اپنا خواب بیان کیا مگر کوئی اسے مطمئن نہ کر سکا۔ اس وقت ایک دم شاہی ساقی کو وہ زمانہ یاد آیا جب قید خانہ میں اس کے ایک عظیم ساتھی نے اس کے خواب کی تعبیر بتائی تھی اس نے عرض کیا۔

”عالی جاہ! زنداں خانہ میں ایک خوبصورت مرد ایسی تعبیریں بتاتا ہے کہ مصر کا کوئی عالم اس کی برابری نہیں کر سکتا۔ حضور اپنے اس عجیب خواب کے بارے میں اس سے دریافت کریں۔“

یہ سن کر فرعون نے حکم دیا۔

”تو زنداں خانہ جا اور اس قیدی سے میرا خواب بیان کر اور جو تعبیر وہ بتائے مجھے آ کر بتا۔“

چنانچہ شاہی ساقی چند لوگوں کے ساتھ جیل خانہ پہنچا اور حضرت یوسف علیہ السلام سے جا کر کہا۔

”جناب! بادشاہ نے خواب دیکھا ہے کہ سات گائیں موٹی تازی پیدا ہوئی لیکن سات دبلی اور لاغر گائیں ان کو کھا گئیں پھر سات سبز اور سات سوکھی بالیں پیدا ہوئیں لیکن خشک بالیاں سبز کو لپٹ گئیں اور ان کی تمام سبزی اور ہریالی اپنے اندر جذب

کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا [illegible]

لی۔ بادشاہ کا حکم ہے کہ اس خواب کی تعبیر بتائیے۔" حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا۔

"سنو! سات موٹی گائیوں کا مطلب ہے کہ سات برس پیداوار اراضی خوب ہوگی، غلہ وافر ہوگا اور رعایا خوشحال ہوگی۔ سات دبلی گائیوں سے مراد ہے کہ باقی سات برس قحط پڑے گا اور پہلے سالوں کی سرسبزی غارت ہو جائے گی۔ مخلوق خدا تنگ اور پریشان حال ہوگی۔ سات سرسبز ڈالیوں سے بھی یہی مراد ہے کہ بعد کی سات سوکھی بالیاں انہیں لپیٹ کر ان کی ہریالی چوس گئیں یہ بھی قحط سالی کی طرف اشارہ ہے۔

یہ تعبیر سن کر شاہی ساقی لوٹ آیا فرعون مصر کو یہ تعبیر اس قدر پسند آئی کہ اس نے حکم دیا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو بصد احترام دربار میں لایا جائے۔ شاہی ہرکارے زنداں خانہ پہنچے مگر آپ نے جیل خانہ چھوڑنے کے لئے منع فرمایا اور کہہ دیا۔

"فرعون مصر سے کہہ دو کہ میں اس حکم سے اس وقت تک کے لئے انکار کرتا ہوں جب تک راعیل کے بارے میں میری برائت ثابت نہ ہو اور میری بے گناہی ظاہر نہ ہو جائے۔"

فرعون مصر ابھی تک اس واقعہ سے لاعلم تھا، چنانچہ اس نے اس عشق کی روداد سنی اور اس مقدمہ کی تحقیق کے لئے شاہی خاندان کی تمام عورتوں اور عزیز مصر کی بیوی راعیل کو طلب کیا وہ تمام معزز خواتین جن کے ہاتھ زخمی ہوئے تھے بولیں۔

"عالی جاہ! ہم نے عزیز مصر کے اس غلام میں کوئی برائی نہیں دیکھی بلکہ وہ اتنا حسین ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔"

فرعون نے راعیل سے حقیقت دریافت کی تو وہ بولی۔

"عالی جاہ! میں اعتراف کرتی ہوں کہ یوسف بے قصور ہے۔ اس نے کبھی کوئی نازیبا حرکت نہیں کی۔ ہاں اس کے حسن و جمال کے سبب میں خود اس سے عشق کرتی ہوں۔"

اس طرح دربار اور مصر میں حضرت یوسف علیہ السلام کی بے گناہی ثابت ہوگئی اور اہل مصر کے قلوب پر ان کی عظمت و جلالت کا سکہ بیٹھ گیا اور حضرت یوسف علیہ السلام زنداں خانہ سے نکل کر فرعون مصر کے دربار میں پہنچے تو فرعون خود اور اراکین دربار اس حسن و جمال کے انوکھے شاہکار کو دیکھ کر دنگ رہ گئے پھر بادشاہ نے اپنے خواب کی تعبیر ان ہی کی زبان سے سنی جب وہ خاموش ہوئے تو اس نے دریافت کیا کہ اب کیا تدابیر اختیار کی جائیں۔ آپ نے جواب دیا۔ "مصر کے تمام عمال کو تاکید فرما دیجیے کہ اول سات برس میں زراعت بکثرت کرائیں ہمیشہ سے زیادہ پیداوار کی کوشش کریں، اس کے بعد تمام علاقوں کے زمینداروں سے غلہ لے کر محفوظ کر لیں تاکہ جب قحط شروع ہو تو ان سات برسوں میں جمع شدہ غلہ انصاف سے تقسیم کر دیا جائے اور رعایا قحط کی آفت سے محفوظ رہے۔"

فرعون مصر کو یہ تجویز بہت پسند آئی، اس نے آپ کی تعریف کی اور دریافت کیا۔

"یہ انتظام کیسے ہوگا؟" حضرت یوسف علیہ السلام نے جواب دیا۔

"میں اس کام کو بخوبی انجام دے سکتا ہوں کیونکہ میں فن حساب میں ماہر ہوں۔" اس گفتگو کے بعد ریان ابن الولید نے طویل گفتگو کی۔ وہ خود تیس زبانیں جانتا تھا اور حضرت یوسف علیہ السلام بتیس زبانیں بول سکتے تھے۔ آخر میں انہوں نے عبرانی زبان میں اسے دعا دی تو وہ بولا۔

"یہ کونسی زبان ہے؟" حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا۔

"یہ میرے باپ یعقوب بن اسحاق کی زبان ہے۔" پھر آپ نے اسے عربی زبان میں دعا دی تو اس نے پوچھا۔ "یہ کونسی زبان ہے؟" آپ نے فرمایا۔

"یہ میرے جد امجد ابراہیمؑ کی زبان عربی ہے۔"

یہ سن کر فرعون مطمئن ہوگیا اور آپ کو ان تمام امور کا منتظم بنا دیا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب حضرت یوسف علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے باقاعدہ تبلیغ اسلام شروع کی تب ریان ابن الولید ملقب بہ فرعون مسلمان ہوگیا اور چونکہ کوئی شخص پیغمبر کی موجودگی میں سردار نہیں رہ سکتا، لہٰذا اس نے حکومت حضرت یوسف علیہ السلام کے سپرد کی اور آپ مصر کے بادشاہ ہوگئے۔ آپ کے حکم سے ارض مصر میں زراعت و پیداوار کے لئے خاطر خواہ کاوشیں ہوتی رہیں اور کچھ نئی باتوں نے جنم لیا۔ عزیز مصر قاطی فار کا انتقال ہوگیا راعیل گوشہ نشیں ہوگئی۔ کسی نے کہا۔ "وہ محل خالی کر گئیں۔" کسی نے کہا۔ "وہ سب کچھ چھوڑ کر آبادی سے دور ویرانہ میں جا بسیں۔" کسی نے کہا۔ "وہ بوڑھی ہوگئیں۔" مگر صحیح کسی کو علم نہ تھا کہ وہ کہاں ہیں کس حال میں ہیں مگر یہ خبر عام ہو رہی تھی کہ عزیز مصر کی بیوہ راعیل مسلمان ہوگئیں اور دنیا کی ہر خوشی سے منہ موڑ کر ویرانہ میں جا آباد ہوئیں، اس دوران حضرت یوسف علیہ السلام نے بھی یہ سب کچھ

سنا مگر وہ ان واقعات کو یاد نہ کرتے تھے۔ ایک دن روح الامین تشریف لائے اور فرمایا۔

"یوسف صادق! اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ تم نے کبھی ہماری اس بندی کی خبر لی جس نے تم سے مایوس ہو کر ہم سے لو لگائی اور ہم کسی کو مایوس نہیں کرتے، تم نہیں جانتے وہ تمہارا کلمہ پڑھتے پڑھتے ہمیں پکارنے لگی ہے۔" وہ محبوب کی تعریف میں کلمہ ادا کرتی جس میں زیر زبر کے فرق سے خدا کی تعریف ہوتی تھی، یہ ادا خدا کو پسند آگئی۔

حضرت یوسفؑ متعجب ہوئے انہیں یاد نہ تھا کہ انہوں نے کبھی کسی کو مایوس کیا ہو لہٰذا بولے۔

"روح الامین! ہم سمجھ نہیں سکے کہ خداوند عالم نے کس بندی کی طرف اشارہ کیا ہے، وضاحت فرما دیجئے تو جان جائیں۔"

"یوسف صادق۔" روح الامین نے فرمایا۔ "آپ بنفس نفیس مصر سے باہر فلاں جنگل میں جائیں وہاں اللہ تعالیٰ کی ایک محبوب بندی رہتی ہے اس سے ملیں۔"

اس دن حضرت یوسف علیہ السلام اس جنگل میں گئے جہاں آپ نے دیکھا ایک جھونپڑی میں ایک کمر جھکی ہوئی نابینا بوڑھی عورت مسلسل ایک ہی کلمہ پڑھ رہی تھی۔ "لا الٰہ الا اللہ یوسف صادق اللہ" اسے کچھ علم نہ تھا کہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے بس ایک ہی کلمہ تھا ایک ہی ذکر تھا، ایک ہی فکر۔ یہ عزیز مصر کی بیوہ راعیل تھی۔ حضرت یوسف علیہ السلام حیران رہ گئے اور سمجھ گئے کہ وہ مسلمان ہو گئی ہے۔ پہلے صرف ان کا عشق تھا مگر اب اس عشق کا انداز بدل گیا تھا پہلے ان کے بے پناہ حسن سے متاثر ہو کر وہ ہوس میں مبتلا تھی لیکن اب صحیح معنوں میں عاشق تھی، آپ نے اسے آواز دی تو وہ یوں چونکی جیسے صرف اسی آواز کی متلاشی تھی، آپ نے فرمایا۔

"راعیل اللہ تم سے خوش ہے، میں اسی کے حکم سے آیا ہوں، تم اپنے محل میں واپس چلو۔"

"یوسف صادق۔" راعیل نے جواب دیا۔ "میں محل میں واپس جانے کے لئے یہاں نہیں آئی۔"

تھوڑی دیر تک حضرت یوسفؑ اصرار کرتے رہے اور راعیل انکار۔ اس کو ضد تھی کہ وہ عزیز مصر کے محل میں اب نہیں رہے گی اور حضرت یوسف اللہ کے حکم سے مجبور تھے لہٰذا واپس نہ جا سکتے تھے آخر راعیل نے کہا۔

"یوسف صادق! میری واپسی کی تین شرطیں ہیں اگر تم خدا کے نبی ہو کر انہیں پورا کر دو تو میں چلوں گی ورنہ مجھے اسی جگہ رہنے دو" آپ نے دریافت کیا تو اس نے وضاحت کی۔

"میری پہلی شرط یہ ہے کہ اپنے خدا سے جس کی وحدانیت پر میں ایمان لائی ہوں دعا کرو کہ میں اندھی ہو گئی ہوں مجھے بینائی دے۔" حضرت یوسف علیہ السلام نے خدا سے دعا کی تو راعیل بینا ہو گئی پھر بولی۔

"میری دوسری شرط یہ ہے کہ اپنے خدا سے جس کی وحدانیت پر میں ایمان لے آئی ہوں دعا کرو کہ مجھے پھر سے جوانی صحت اور حسن عطا کر دے۔" حضرت یوسف علیہ السلام نے پھر ہاتھ اٹھا کر دعا کی، چشم زدن میں راعیل کی جوانی لوٹ آئی اور حسن ہمیشہ سے اتنا زیادہ تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے ادھر سے رخ موڑ لیا اور فرمایا "تیسری شرط بیان کرو۔" راعیل نے کہا۔

"تیسری شرط یہ ہے کہ جو کچھ میں نے چند برس پہلے طلب کیا تھا وہ عطا کر دو۔ میں فاطی فار کے محل میں نہیں تمہارے محل میں جانا چاہتی ہوں۔" یہ سن کر حضرت یوسف علیہ السلام دم بخود رہ گئے۔ مگر ابھی انہوں نے راعیل کی طرف دیکھ کر کوئی جواب نہ دیا تھا کہ روح الامین آئے اور کہا۔

"یوسف صادق! اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اپنی اس بندی کی دو خواہشات ہم نے پوری کر دیں تیسری تم پوری کر دو۔"

اب حضرت یوسف علیہ السلام مجبور ہو گئے۔ زندگی میں پہلی مرتبہ انہوں نے بڑی عزت سے اسے دیکھا وہی عورت جو پہلی نظر میں ان کے بے پناہ حسن پر عاشق ہو گئی تھی جو ان کے محسن و مربی کی بیوہ تھی جس نے ان سے مطلب براری کی ضد کی تھی جس کے باعث وہ بدنام ہوتے جیل گئے، آج پہلے سے چار گنا زیادہ حسن لئے ان کے سامنے کھڑی تھی اور خدا کو اتنی عزیز تھی کہ اس نے انہیں دوبارہ جوانی عطا کر دی تھی اور اب خدا نے ہی حکم دیا تھا کہ وہ اس کی خواہش پوری کر دیں، لہٰذا حضرت یوسف علیہ السلام بڑی عزت و تکریم سے اسے اپنے محل میں لے آئے اور اس دن مصر کے لوگ یہ خبر بڑی عقیدت سے سن رہے تھے کہ مصر کے عظیم حاکم نے عزیز مصر فاطی فار کی بیوہ سے نکاح کر لیا۔ مورخین نے اس خاتون کا نام زلیخا لکھا ہے لیکن قرآن پاک میں اسے صرف "عزیز مصر کی بیوی" کہا گیا ہے۔ یہ وضاحت کہیں بھی نظر نہیں آتی کہ عزیز مصر

کی بیوی، شاہ فیوس کی دختر راعیل کو زلیخا کا خطاب کب اور کس نے دیا، بہرحال وہ اسی لقب سے مشہور ہوئیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بارہ فرزند انہیں سے پیدا ہوئے۔

وقت گزرتا رہا فراغت کا زمانہ گزرا قحط سالی کا دور شروع ہو گیا۔ اس مرتبہ اتنا سخت قحط پڑا کہ اس کا اثر عراق اور شام تک پہنچا مگر حضرت یوسف علیہ السلام کے تدبر سے مصر میں اتنی پیداوار ہوئی تھی اور آپ نے اتنی مقدار میں غلہ جمع کیا تھا کہ یہاں پر رعایا بدستور فراغت سے زیست بسر کر رہی تھی۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی رعایا کی ضروریات کے قابل غلہ محفوظ کر کے مناسب انداز میں تقسیم شروع کر دی۔ روزانہ دور دراز علاقوں کے قافلے آتے اور غلہ خرید کر لے جاتے، آہستہ آہستہ یہ خبر مشہور ہوتی گئی کہ مصر کا بادشاہ تاجروں کو غلہ دیتا ہے۔ یہ سن کر شام کے لوگ گروہ در گروہ مصر آنے لگے اور جو واپس جاتا مصر کے حاکم کے گن گاتا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت یعقوب علیہ السلام فراق فرزند میں گریہ کرتے کرتے نابینا ہو چکے تھے۔ انہوں نے سنا کہ مصر میں غلہ تقسیم ہو رہا ہے تو اپنے فرزندوں کو مصر جانے کا حکم دیا تب شام سے ایک قافلہ کے ساتھ برادران یوسفؑ بھی کنعان سے مصر آئے۔ حضرت یوسف علیہ السلام شاہانہ لباس میں ملبوس چہرے پر نقاب ڈالے عزت و جاہ و جلال کا ایک ایسا نمونہ تھے کہ کسی کو شک بھی نہ ہو سکتا تھا۔ برادرانِ یوسف تو نہ پہچان سکے البتہ حضرت یوسفؑ ان سب کو فوری پہچان گئے۔ اس وقت وہ تخت پر جلوہ افروز تھے اور تمام بھائی قطار میں دست بستہ کھڑے تھے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے نظر ڈالی مگر ان میں ان کا سگا بھائی بن یامین موجود نہ تھے۔ دستور کے مطابق غلہ تقسیم ہونے لگا تو آپ نے پوچھا "تم سب آپس میں کون ہو اور کس علاقے سے آئے ہو؟"

"مصر کے عظیم حاکم!" یہودا نے جواب دیا۔ "ہم کنعان کے مشہور نبی یعقوبؑ کے فرزند ہیں اور کنعان ہی سے آئے ہیں۔"

"تمہیں کتنے افراد کا غلہ لینا ہے؟" آپ نے دریافت کیا۔

"جناب!" یہودا نے پھر دست بستہ عرض کیا۔ "جناب ہم مردوں میں اپنے باپ اور چھوٹے بھائی کو گھر چھوڑ آئے ہیں باقی عورتیں اور بچے ہیں۔"

"کیا تمہارا باپ اور چھوٹا بھائی خود مصر نہیں آ سکتے؟" آپ نے سوال کیا تو شمعون نے جواب دیا۔

"اے سردارِ مصر! ہمارا باپ نابینا ہو گیا ہے اور چھوٹا بھائی اس کی خدمت کے لئے گھر پر رہ گیا ہے ہم دس بھائی حاضر ہیں۔"

یہ سن کر حضرت یوسف علیہ السلام کو رنج ہوا بولے۔

"خیر تمہارے باپ کے حصہ کا غلہ تو ہم دیئے دیتے ہیں مگر اپنے بھائی سے کہنا کہ اپنے حصہ کا غلہ وہ خود لینے آئے ورنہ نہیں ملے گا۔"

شامی قافلہ واپس لوٹ گیا اور حضرت یوسف علیہ السلام بے چینی سے اس کے آنے کا انتظار کرنے لگے۔ اس زمانہ میں آپ نے عام طور پر مذہب کی تبلیغ شروع کر دی تھی اور یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ مصر کا عظیم حاکم گمراہ لوگوں کو سچائی اور دین کی ہدایت دیتا ہے۔ ان ہی دنوں قافلہ کے ساتھ برادران یوسفؑ پھر آئے اس مرتبہ ان کے ہمراہ بن یامین بھی تھا حضرت یوسف علیہ السلام نے اسے دیکھا اور پہچان گئے۔ اس شب آپ نے کنعان سے آئے ہوئے تاجروں کو دعوت دی اور کھانا اس طرح چنا گیا کہ ایک ایک دسترخوان پر صرف دو دو آدمی بیٹھ سکتے تھے جدھر آپ کے تمام بھائی کھانے کے لئے پہنچائے گئے ادھر چلمن کے عقب میں آپ خود تشریف فرما تھے۔ برادرانِ یوسف دو دو ایک ایک دسترخوان پر بیٹھ گئے مگر بن یامین کے ساتھ بیٹھنے والا کوئی نہ تھا لہٰذا دسترخوان پر تنہا بیٹھے ہوئے وہ ایک دم رونے لگا۔ چلمن کے عقب سے آپ نے دریافت کیا۔

"اے کنعان کے معزز مہمان! تم رونے کیوں لگے؟"

بن یامین نے دکھ سے کہا۔

"مصر کے عظیم سردار! مجھے اپنا بھائی یاد آ گیا اگر آج وہ زندہ ہوتا تو میں دسترخوان پر تنہا نہ بیٹھتا۔"

"تمہارے بھائی کو کیا ہوا؟" حضرت یوسف علیہ السلام نے سوال کیا تو یہودا نے بڑھ کر جواب دیا۔

"مصر کے رحم دل حاکم! ہمارے بھائی کو بچپن میں بھیڑیا کھا گیا تھا۔ بن یامین اسی کی یاد میں رو رہا ہے۔"

"تمہارے بھائی کو بھیڑیا کیسے کھا گیا؟" حضرت یوسف علیہ السلام نے حیران ہو کر پوچھا۔ "میں نے تو سنا ہے کہ خدا نے یعقوبؑ کے بیٹوں کو غیر معمولی قوتیں عطا کی ہیں، ایک کی چیخ سے سننے والے وحشت زدہ ہو جاتے ہیں، ایک شیروں کے

جبڑے چیر دیتا ہے اور ایک جبڑے سے درخت اکھاڑ دیتا ہے پھر انھوں نے اس طاقت کا استعمال کیوں نہ کیا؟"

یہ سن کر یہودا، شمعون اور روبیل کے چہرے شرمندگی سے سیاہ ہو گئے مگر حضرت یوسف علیہ السلام نے فوراً موضوع بدل دیا، بولے۔

"خیر اگر تم لوگ کہو تو میں تمہارے اس تنہا بھائی کے ساتھ کھانے میں شامل ہو جاؤں؟"

اس سوال پر یہودا چونک پڑا اس نے دست بستہ عرض کیا۔

"اے عظیم حاکم! اس سے بڑی ہماری خوش بختی اور کیا ہو گی کہ آپ ہمارے بھائی کے ساتھ کھانا تناول فرمائیں۔"

تب حضرت یوسف علیہ السلام نے بن یامین کو جلین کے ادھر ہی اپنے پاس بلایا اور دونوں بھائیوں نے ایک ساتھ کھانا کھایا پھر دستور کے مطابق غلہ تقسیم ہوا اور قافلہ رخصت ہو گیا مگر حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائی کو روکنے کے لئے بڑی خوبصورت چال چلی، جب شامی قافلہ ایک منزل سفر کر چکا تو اس کے عقب میں شاہی ہرکارے دوڑائے جو اعلان کر رہے تھے۔

"قافلے والو ٹھہر جاؤ بادشاہ کا پیالہ گم ہو گیا ہے اور حکم ہے کہ مصر سے نکلنے والے ہر فرد کا مال دیکھا جائے۔"

شامی قافلہ چونکہ چور نہ تھا لہٰذا بے تکلف رک گیا، شاہی ہرکاروں نے تلاشی لی، برادران یوسف بڑھ بڑھ کر تلاشی دیتے تھے، مگر اس وقت وہ سب سکتے کے عالم میں رہ گئے۔ جب بن یامین کے مال سے بادشاہ کا پانی پینے والا سونے کا پیالہ برآمد ہوا جس کے ہر طرف ہیرے جڑے ہوئے تھے، اس وقت ہر نظر بن یامین پر متنفر کے تیر برسا رہی تھی، کوئی طعن دے رہا تھا، کوئی طنز کر رہا تھا اور کوئی مصر کے اس عظیم سردار کے سامنے شرمندگی کے احساس سے مرا جا رہا تھا مگر بن یامین کا ایک ہی اصرار تھا۔

"میں نے چوری نہیں کی۔"

شاہی دستے کے سردار نے کہا۔ "جناب ہمیں حکم دیا گیا تھا کہ چور کو دربار میں واپس لے جائیں۔" لہٰذا برادران یوسف بن یامین کے ساتھ دربار میں پھر لوٹ آئے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے تمام معاملہ سنا سونے کا پیالہ دیکھا اور بن یامین سے بولے،

"کیا تم کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

"بادشاہ مصر!" بن یامین نے متانت سے کہا۔ "اگرچہ میں نے چوری نہیں کی مگر آپ کا پیالہ چونکہ میرے مال سے نکلا ہے لہٰذا سزا بھگتنے کے لئے تیار ہوں۔"

حضرت یوسف علیہ السلام کو یہ بات بہت پسند آئی انہوں نے اپنے دیگر بھائیوں کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

"معزز تاجرو! میں تمہارے بھائی کو تمہارے ہی دین کے مطابق سزا دینی چاہتا ہوں بتائیے آپ کے مذہب میں چوری کی سزا کیا ہے؟"

"اے سردار! ہمارے باپ یعقوب بن اسحاق کے دین میں چوری کی سزا یہ ہے کہ چور ایک برس تک بلا معاوضہ اس کی خدمت کرے جس کا مال چوری کیا ہو، لہٰذا آپ ہمارے بھائی کو ایک سال کے لئے روک لیجئے۔"

حضرت یوسف علیہ السلام یہی چاہتے تھے لہٰذا بن یامین کو دربار میں روک لیا گیا اور کنعان کا قافلہ واپس لوٹ گیا۔ اس شب بتیس برس کے بچھڑے ہوئے دو سگے بھائی ملے۔

برادران یوسف کنعان پہنچے تو حضرت یعقوب علیہ السلام شدت سے ان کے منتظر تھے۔ یہودا نے انہیں بتایا۔

"بابا جان! راحیل کے بیٹے نے ہمیں مصر بھر میں ذلیل کرایا اس نے ہماری ذلت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔"

"کیا ہوا۔ بن یامین نے کیا کیا؟" حضرت یعقوب علیہ السلام نے پوچھا تو شمعون نے رونے والے انداز میں کہا۔

"ہم مصر کے اس عظیم سردار کی آنکھوں سے گر گئے جس کی مہربانی سے قحط کے دن فراغت سے گزر رہے تھے۔ اس نے بادشاہ کا سونے کا پیالہ چوری کر لیا اور اس بادشاہ کی عظمت دیکھئے کہ اس نے اسے ہمارے ہی دین کے مطابق سزا دی ہم اسے ایک برس کے لئے بادشاہ کی خدمت کے لئے چھوڑ آئے ہیں۔"

یہ سن کر حضرت یعقوب علیہ السلام نے دکھ سے دیکھا اور بولے۔ "کیا بن یامین چوری کر سکتا ہے؟" زبولون نے غصے سے چلا کر کہا۔

"اس کے مال سے سونے کا پیالہ برآمد ہوا ہے ہم نے خود دیکھا ہے۔"

یہ سن کر حضرت یعقوب علیہ السلام خاموش ہو گئے۔ ایک

روایت یہ بھی ہے کہ انہوں نے حاکم مصر کو خط لکھ کر بن یامین کو واپس کر دینے اور حاکم مصر کی حیثیت سے حضرت یوسف علیہ السلام نے انہیں اس خط کا جواب دیا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی عزت اور عظمت بڑھتی گئی لوگ جوق در جوق غلہ لینے آتے اور جاتے رہے اور ہر علاقہ میں ان کی عظمت کے گیت گاتے رہے۔ تیسری مرتبہ جب شامی قافلہ مصر آیا تو برادران یوسفؑ پھر اس میں شامل تھے۔ اس مرتبہ حضرت یوسفؑ نے تخلیہ میں ان سب کو طلب کیا اور بولے۔

"یعقوبؑ کے فرزندو آپ کتنے بھائی ہیں؟"

"مصر کے عظیم مختار!" یہودا نے دکھ سے جواب دیا۔ "ہم دراصل بارہ بھائی تھے مگر جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا تھا ہمارے ایک بھائی کو بھیڑیا کھا گیا تھا اب ہم گیارہ ہیں۔"

اس دروغ گوئی پر حضرت یوسف علیہ السلام کو رنج ہوا مگر آپ نے متانت سے کہا۔

"کنعان کے معززین! خدا نے دروغ گوئی پر لعنت فرمائی ہے، آپ سچ کہہ دیجئے کہ آپ سب نے اپنے بھائی کو کنوئیں میں دھکیل دیا تھا اور پھر اسے قافلے والوں کے ہاتھ فروخت کر دیا۔"

سب بھائیوں نے چونک کر دیکھا کیونکہ یہ راز ان کے سوا کسی کو معلوم نہ تھا، انہوں نے حیران ہو کر استفسار کیا تو آپ نے فرمایا۔

"میرے بھائیو! آنکھیں کھول کر دیکھو جسے تم کنوئیں میں دھکیل گئے تھے جو تمہاری نفرت و حسد کی بدولت بکتے بکتے غلاموں کی منڈی میں پہنچ گیا تھا، آج تمہارا وہی بھائی خدا کی مہربانی سے مصر کا مختار ہے۔"

برادران یوسف نے حیران ہو کر دیکھا، شرمندگی و خفت سے ان کی حالت دیدنی تھی۔ اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام نے اسلام کی تبلیغ کی تو سب بھائی اشکبار تھے پھر شمعون نے کہا۔

"اے برادر عظیم! ہمیں معاف کر دے خدا کی قسم ہمیں شیطان نے ورغلایا تھا اور ہمارے دلوں میں تیرے لئے حسد بھر دیا مگر خدا نے تیری مدد کی اور تجھے ہم پر عزت عطا کی تو عظیم ہے سردار ہے۔"

حضرت یوسف علیہ السلام نے ان سب کو معاف فرما دیا پھر اپنا کرتا دیا کہ اسے میرے باپ کے منہ پر ڈال دینا تو آنکھیں روشن ہو جائیں گی یہ سن کر یہودا آگے بڑھا اور دست بستہ عرض کیا۔

"برادر عظیم! یہ کرتا مجھے دے دو، میں نے ہی بکری کے خون میں رنگا ہوا کرتا انہیں تمہاری موت کی خبر کے ساتھ دیا تھا۔ اب میں اس گناہ کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں اور تمہاری زندگی کی خوشخبری سنا کر ان کے منہ پر تمہارا کرتا ڈالوں گا۔"

حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ گزارش قبول فرمائی، انہیں کرتا دے دیا اور سفر خرچ دے کر ہدایت فرمائی کہ تمام کنبہ کو مصر لے آئیں۔

برادران یوسف کنعان کی طرف روانہ ہو گئے ابھی وہ راہ میں ہی تھے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا۔

"لوگو! میں یوسف کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں۔"

لوگوں نے یہ بات سنی اور درگزر کر گئے۔ کچھ نے سوچا کہ ایک سو سنتالیس برس کا آدمی شاید طویل العمری کے باعث کم عقلی کی باتیں کرنے لگا ہے مگر اسی شام برادران یوسف کنعان پہنچ گئے اور تمام ماجرہ بیان کر کے اپنے جرم کا اعتراف اور گناہ کی معافی مانگی اور حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیض ان کی آنکھوں پر رکھی تو وہ بینا ہو گئے۔ اب کنعان کے لوگ یہ عجیب و غریب قصہ سن کر اس کی تصدیق کے لئے حضرت یعقوب علیہ السلام کی خدمت میں آتے اور انہیں دیکھ کر حیران ہوتے تو وہ ایک ہی جواب دیتے۔

"میرا خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

چند یوم بعد ستر افراد پر مشتمل یہ کنبہ مصر پہنچا تو اہل مصر اپنے عظیم حاکم کے باپ کے دیدار کے لئے جمع تھے۔ اس دن حضرت یوسف علیہ السلام نے شاہی دربار منعقد کیا اپنے والدین کو تخت پر اپنے ساتھ جگہ دی اور دیگر تمام افراد کو علی القدر مراتب نشستیں عطا کیں۔ اس وقت دیکھنے والوں نے حیرت سے اور حضرت یعقوب علیہ السلام نے مسرت سے دیکھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام تخت مرصع پر جلوہ افروز تھے اور ان کے گیارہ بھائی انہیں تعظیمی سجدہ کر رہے تھے۔ یہی اس جلیل القدر پیغمبر اور خدا کے برگزیدہ بندہ کے اس خواب کی تعبیر تھی جو اس نے برسوں قبل کنعان میں دیکھا تھا۔

چندرو

اس کی بھی اپنی ایک دُنیا تھی
اس کے بھی سینے میں دل تھا
اس کہانی
کے بارے میں
اتنا کہنا کافی ہے کہ
اسے کرشن چندر نے لکھا ہے!

کرشن چندر

کراچی میں بھی اس کا یہی دھندا تھا اور باندرے
اگر بھی یہی دھندا رہا۔ جہاں تک اس کی ذات کا تعلق تھا کوئی تقسیم نہیں
ہوئی تھی۔ کراچی میں بھی سدھو حلوائی کے گھر کی سیڑھیوں کے نیچے
ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں اسے جگہ ملی تھی۔ اور باندرے میں بھی
وہیں سیڑھیوں کے عقب میں اسے جگہ ملی تھی۔ کراچی میں اس کے پاس
ایک میلا کچیلا بستر، زنگ آلود ٹین کا ایک چھوٹا سا سیاہ ٹرنک
اور ایک پیتل کا لوٹا تھا۔ یہاں پر بھی وہی سامان تھا۔ ذہنی لگاؤ نہ اسے
کراچی سے تھا، نہ بمبئی سے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ اسے معلوم ہی
نہ تھا کہ ذہنی لگاؤ کسے کہتے ہیں؟ کلچر کسے کہتے ہیں؟ حب الوطنی کیا
ہوتی ہے؟ اور کس بھاؤ بیچی جاتی ہے؟ وہ ان سب دھندوں سے
ناواقف تھا۔ بس اتنا اسے یاد تھا کہ جب اس نے آنکھ کھولی، تو اپنے
آپ کو سدھو حلوائی کے گھر میں برتن مانجھتے، جھاڑو دیتے، پانی بھرتے
فرش صاف کرتے اور گالیاں کھاتے پایا۔ اسے ان باتوں کا کبھی
ملال نہ ہوا، کیونکہ اسے معلوم تھا کہ کام کرنے اور گالیاں کھانے کے بعد
ہی روٹی ملتی ہے۔ اور اس کی قسم والے لوگوں کو ایسے ہی ملتی ہے۔
علاوہ ازیں سدھو حلوائی کے گھر میں اس کا جسم تیزی سے بڑھ رہا تھا اور
اسے روٹی کی شدید ضرورت رہتی تھی اور ہر وقت محسوس ہوتی رہتی
تھی۔ اس لئے وہ حلوائی کے جھوٹے سالن کے ساتھ ساتھ اس کی گالی
کو بھی روٹی کے ٹکڑے میں لپیٹ کر نگل جاتا تھا۔

اس کے ماں باپ کون تھے؟ کسی کو پتہ نہ تھا۔ خود چندرو نے
کبھی اس کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ البتہ سدھو حلوائی اسے گالیاں
دیتا ہوا اکثر کہا کرتا تھا کہ چندرو کو سڑک پر سے اٹھا کر لایا ہے۔ اس پر
چندرو نے کبھی حیرت کا اظہار نہیں کیا نہ سدھو کے لئے شکریے کے نرم
جذبے کا اس کے دل تک گزر ہوا کیونکہ چندرو کو کوئی دوسری زندگی
یاد نہیں تھی۔

اسے بس اتنا معلوم تھا کہ کچھ ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کے ماں
باپ ہوتے ہیں، کچھ ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کے ماں باپ نہیں ہوتے
کچھ لوگ گھر والے ہوتے ہیں، کچھ لوگ سیڑھیوں کے نیچے سونے والے
ہوتے ہیں، کچھ لوگ گالیاں دیتے ہیں، کچھ لوگ گالیاں سہتے ہیں۔ ایک
کام کرتا ہے، دوسرا کام کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ بس یہی ہے یہ
دنیا اور ایسی ہی رہے گی۔ دو خانوں میں بٹی ہوئی۔ یعنی ایک وہ جو اوپر
والے ہیں، دوسرے وہ جو نیچے والے ہیں۔ ایسا کیوں ہے اور ایسا کیوں
نہیں، اور جو ہے وہ کب کیوں اور کیسے بہتر ہو سکتا ہے؟ وہ یہ سب
کچھ نہیں جانتا تھا اور نہ اس قسم کی باتوں سے دلچسپی رکھتا تھا۔ البتہ جب
کبھی وہ اپنے ذہن پر زور دے کر سوچنے کی کوشش کرتا تھا تو اس کی
سمجھ میں یہی آتا تھا کہ جس طرح وہ سٹے کے نمبر کا داؤ لگانے کے لئے کبھی



کبھی ہوا میں سکہ اچھال کر ٹاس کر لیتا ہے اسی طرح اس کے پیدا کرنے والے نے اس کے لئے ٹاس کر لیا ہوگا اور اسے خانے میں ڈال دیا ہوگا جو اس کی قسمت تھی۔ یہ کہنا غلط ہوگا کہ چندرو کو اپنی قسمت سے کوئی شکایت تھی، ہرگز نہیں۔ وہ ایک خوش باش محنت کرنے والا بھاگ بھاگ کر جی لگا کر خوش مزاجی سے کام کرنے والا لڑکا تھا۔ وہ رات دن اپنے کام میں مشغول رہتا تھا کہ اسے بیمار پڑنے کی بھی کبھی فرصت نہیں ملی۔

کراچی میں تو وہ ایک چھوٹا سا لڑکا تھا، مگر بمبئی آ کر اس کے ہاتھ پاؤں کھلے اور بڑھے۔ سینہ پھیلا۔ گندمی رنگ صاف ہونے لگا۔ بالوں میں پیچ سے پڑنے لگے۔ آنکھیں زیادہ روشن اور بڑی معلوم ہونے لگیں۔ اس کی آنکھیں اور ہونٹ دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ اس کی ماں ضرور کسی بڑے گھر کی رہی ہوگی۔ اس کے پھیلے ہوئے سینے۔ بانہوں کی مضبوط مچھلیاں اور کھردرے سخت ہاتھ دیکھ کر لگتا تھا کہ اس کا باپ بھی ممکن ہے اسی بڑے خاندان کا کوئی جوان اور نگیلا نوکر رہا ہوگا۔ اس قسم کے تجربے بالعموم سڑک پر پھینک دیئے جاتے ہیں۔

چندرو کی دنیا میں آواز کا اس حد تک گزر تھا کہ وہ سن سکتا تھا، بول نہیں سکتا تھا۔ عام طور پر گونگے بہرے بھی ہوتے ہیں۔ مگر وہ صرف گونگا تھا بہرا نہ تھا۔ اس نے حلوائی ایک دفعہ اسے بچپن میں ایک ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا۔ ڈاکٹر نے چندرو کا معائنہ کرنے کے بعد کہا کہ چندرو کے حلق میں کوئی پیدائشی نقص ہے۔ مگر آپریشن کرنے سے یہ نقص دور کیا جا سکتا ہے اور چندرو کو بولنے کے قابل بنایا جا سکتا ہے۔ مگر حلوائی نے کبھی اس نقص کو آپریشن کے ذریعہ سے دور کرانے کی کوشش نہیں کی۔ سدھو نے سوچا یہ تو بہت اچھا ہے کہ نوکر گالی سن سکے مگر جواب نہ دے سکے۔

چندرو کا یہی نقص سدھو کی نگاہ میں اس کی سب سے بڑی خوبی بن گیا۔ اس دنیا میں مالکوں کی آدھی زندگی اسی فکر میں گزر جاتی ہے کہ کسی طرح وہ اپنے نوکروں کو گونگا کر دیں۔ اس کے لئے تالوں پالے گئے جاتے ہیں۔ پارلیمنٹیں سجائی جاتی ہیں اور اخبار نکالے جاتے ہیں پولیس اور فوج کے پہرے بٹھائے جاتے ہیں۔ پھر بھی مگر چاپلوس نہ دو۔ اور چندرو تو پیدائشی گونگا تھا۔ یقیناً سدھو ایسا احمق نہیں ہے کہ اس کا آپریشن کروائے۔

سدھو بھی دل کا برا نہیں تھا۔ اپنے مخصوص حالات میں مخصوص حدود کے اندر رہ کر اپنا زاویۂ نگاہ رکھتے ہوئے وہ چندرو کو اپنے طریقے سے چاہتا بھی تھا۔ وہ سمجھتا تھا اور اس بات پر خوش تھا اور اکثر اس کا فخریہ اظہار بھی کیا کرتا تھا کہ اس نے چندرو کی پرورش ایک بیٹے کی طرح کی ہے کون کسی یتیم بچے کی اس طرح پرورش کرتا ہے۔ اس طرح پالتا پوستا اور بڑا کرتا ہے۔ کون اس طرح اسے کام پر لگاتا ہے۔ جب تک چندرو کا لڑکپن تھا۔ سدھو اس سے گھر کا کام لیتا رہا۔ جب چندرو لڑکپن کی حدود پھلانگنے لگا تو سدھو نے اس کی خاطر ایک نیا دھندا شروع کیا۔

حلوائی کی دکان پر تو اس کے اپنے بیٹے تھے۔ اس نے چندرو کے لئے چاٹ بیچنے کا دھندا طے کیا۔ ہولے ہولے اس نے چندرو کو چاٹ بنانے کا فن سکھایا۔ پھلی جیرہ اور کانجی بنانے کا فن۔ گول گپے اور دہی بڑے بنانے کے طریقے۔ چٹخارہ پیدا کرنے والے تیکھے مصالحے کڑ کڑی پاپڑیاں اور چنے کا لذیذ مرچیلا سالن۔ بھٹورے بنانے اور تلنے کے انداز۔ پھر سموسے اور آلو کی ٹکیاں بھرنے کا کام ——— پھر چٹنیاں ——— لہسن کی چٹنی لال مرچ کی چٹنی کھٹی چٹنی۔ میٹھی چٹنی ادرک کی چٹنی اور پیاز اور ساندانے کی چٹنی۔

پھر انواع و اقسام کی چاٹیں پروسنے کے انداز۔ دہی بڑے کی چاٹ، کانجی کے بڑے کی چاٹ۔ میٹھی چٹنی پکوڑوں کی چاٹ آلو کی چاٹ، آلو اور آلو پاپڑی کی چاٹ۔ ہری مونگ کے گول گپے آلو کے گول گپے۔ کانجی کے گول گپے۔ ہرے مصالحے کے گول گپے۔

جتنے برسوں میں چندرو نے یہ کام سیکھا، اتنے برسوں میں ایک لڑکا ایم اے پاس کر لیتا ہے پھر بھی بے کار رہتا ہے مگر سدھو کا گھر بے کار گریجویٹوں کو اگلنے کی یونیورسٹی نہیں تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ چندرو اپنے کام میں مشاق ہو گیا ہے اور جوان ہو گیا ہے، تو اس نے چار پہیوں والی ایک ہاتھ گاڑی خریدی۔ چاٹ کے تھال سجائے اور چندرو کو چاٹ بیچنے پر لگا دیا۔ ڈیڑھ روپیہ روزانہ۔

جہاں چندرو چاٹ بیچنے لگا وہاں کوئی اس کا مدمقابل نہ تھا۔ سدھو نے بہت سوچ سمجھ کر یہ جگہ انتخاب کی تھی۔ کھار جمخانہ روڈ اور پانی بل کے چوراہے کے قریب ٹیلی فون ایکسچینج کے سامنے اس نے چاٹ کی چار پہیوں والی گاڑی کو کھڑا کیا۔ یہ جگہ بہت بارونق تھی۔ ایک طرف یونین بنک تھا دوسری طرف ٹیلی فون ایکسچینج تیسری طرف ایرانی کی دکان، چوتھی طرف گھوڑ بندر روڈ کا ناکہ۔ یہاں شام کے وقت کھاتے پیتے خوش باش خوش لباس نوجوان لڑکے لڑکیوں کا ہجوم رہتا تھا۔ چندرو کی چاٹ ہمیشہ تازہ عمدہ اور کراری ہوتی تھی۔

وہ بول نہیں سکتا تھا مگر اس کی مسکراہٹ بڑی ہی دلکش ہوتی تھی۔ اس کا سودا ہمیشہ کھرا ہوتا تھا۔ بات صاف ستول پورا دیتا تھا۔ کر کیا چاہیئے۔ چندرو کی چاٹ اس نو آبادی میں چاروں طرف مقبول ہو گئی۔ شام کے وقت اس کے ٹھیلے کے چاروں طرف نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کا ہجوم رہنے لگا۔ چندرو کو سدھو نے ڈیڑھ روپیہ روزینہ لگایا تھا اور چندرو جو ڈیڑھ روپے میں خوش تھا اب تین روپیہ یومیہ پا کر بھی خوش تھا۔ کیونکہ خوش رہنا اس کی عادت تھی۔ اسے کام کرنا پسند تھا اور وہ اپنا کام جانتا تھا اور اپنے کام سے اسے لگن تھی وہ اپنے گاہکوں کو خوش کرنا جانتا تھا۔ اور انہیں خوش کرنے میں خوشی محسوس کرتا تھا۔ دن بھر وہ چاٹ تیار کرنے میں مصروف رہتا۔ شام کے چار بجے وہ چاٹ کا گاڑی سے کر ناکے پر آ جاتا۔ چار سے آٹھ بجے تک ہاتھ روکے بغیر آرام کا سانس لئے بغیر وہ جلدی جلدی کام کرتا۔ آٹھ بجے اس کا ٹھیلہ خالی ہو جاتا اور وہ اسے لے کر اپنے مالک کے گھر واپس آتا۔ کھانا کھا کے سینما چلا جاتا۔ بارہ بجے رات کو سینما سے لوٹ کر اپنی چٹائی بچھا کر سیڑھیوں کے نیچے سو جاتا اور صبح پھر اپنے کام پر۔

یہ اس کی زندگی تھی۔ یہ اس کی دنیا تھی۔ وہ بے فکر اور زندہ دل تھا۔ نہ ماں نہ باپ، نہ بھائی نہ بہن، نہ بچے نہ بیوی۔ دوسرے لوگوں کے لئے بہت سے خانے ہوتے ہیں۔ اس کا صرف ایک ہی خانہ تھا دوسرے لوگ بہت سے ٹکڑوں کے بہت سے ٹکڑوں میں بٹے ہوتے ہیں اور ان ٹکڑوں کو جوڑ کر ہی ان کی شخصیت دیکھی جا سکتی ہے۔ مگر چندرو ایک ہی لکڑی کا تھا اور لکڑی کے ایک ٹکڑے سے بنا تھا۔ جیسا وہ اندر سے تھا ویسا ہی وہ باہر سے بھی نظر آتا تھا۔ وہ اپنی ذات میں بے جوڑ اور مکمل تھا۔

سانولی پارو کو اسے پریشان کرنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ وہ
چاندی کے بلے جھلاتی پاؤں میں چھوٹی سی پازیب کھنکھناتی جب
اپنی سہیلیوں کے ساتھ اس کے ٹھیلے کے گرد کھڑی ہو جاتی تو
چندرو سمجھ جاتا کہ اب اس کی شامت آئی ہے۔ دہی بڑے کی پتّل
یا چاٹ کر وہ ذرا سا دہی بڑا اس پر لگا رہنے دیتی اور پھر اُسے
لوٹا کر کہتی—

"اے گر گئے! تو بہرہ بھی ہے کیا؟ میں نے دہی بڑے نہیں
لئے تھے، دہی پٹاکری مانگی تھی۔ اب اس کے پیسے کون دے گا تیرا
باپ؟"

اتنا کہہ کر وہ اس بڑے کی تقریباً خالی پتّل کو نُکّے سے دکھا کر بڑی
ادا سے زمین پر پھینک دیتی۔

وہ جلدی جلدی اس کے لئے دہی پٹاکری بنانے لگتا۔ پارو
اس پٹاکری کی پتّل صاف کر کے اس میں آدھی پٹاکری چھوڑ دیتی اور
اسے کہتی—

"اتنی مرچ ڈال دی!— اتنی مرچی!!— چاٹ بنانا نہیں
آتا ہے تو ٹھیلہ لے کر ادھر کیوں آتا ہے۔ یہ لے اپنی پٹاکری واپس
لے لے!"

اتنا کہہ کر وہ دہی اور چٹنی کی پٹاکری اپنے ناخن کی کور میں پھنسا
کر اس کے ٹھیلے پر گھماتی۔ کبھی اسے چھوٹی پٹاکریوں کے تھال میں
واپس ڈال دینے کی دھمکی دیتی۔ اس کی سہیلیاں ہنستیں تالیاں بجاتیں۔
چندرو دونوں ہاتھوں سے ناں ناں کے اشارے کرتا ہوا پارو سے
اپنی چھوٹی پٹاکری زمین پر پھینک دینے کا اشارہ کرتا۔

"اچھا سمجھ گئی، تیرے چنوں کے تھال میں ڈال دوں!" وہ
جان بوجھ کر اس کا اشارہ غلط سمجھتی۔ چندرو جلدی جلدی گھبرائے ہوئے
انداز میں چندرو زور زور سے سر ہلاتا، پھر زمین کی طرف اشارہ کرتا۔
پارو کھلکھلا کر کہتی—

"اچھا زمین سے مٹی اٹھا کر تیرے دہی کے برتن میں ڈال دوں؟"
پارو نیچے زمین سے تھوڑی مٹی اٹھا لیتی۔

اس پر چندرو اور بھی گھبرا جاتا۔ دونوں ہاتھ زور زور سے ہلا
کر منع کرتا۔ بالآخر پارو اسے دھمکاتی— "تو چل جلدی سے آلو کی چھ
ٹکیاں تل دے اور خوب گرم گرم مصالحے والے چنے دینا۔ اور اگر
ابھی نہیں تو یہ پٹاکری ابھی جائے گی تیرے کالے گلاب جامن کے
برتن میں!"

چندرو خوش ہو کر پوری بتیسی نکال دیتا۔ ماتھے پر آئی ہوئی
ایک گھنگھریالی لٹ پیچھے کو ہٹا کے تولئے سے ہاتھ پونچھ کے جلدی
سے پارو اور اس کی سہیلیوں کے لئے آلو کی ٹکیاں تلنے میں مصروف
ہو جاتا۔

پھر کبھی کبھی پارو حساب میں بھی گھپلا کیا کرتی۔

"ساٹھ پیسے کی ٹکیاں، تیس پیسے کی پٹاکری۔ دہی بڑے تو میں
نے مانگے ہی نہ تھے۔ اس کے پیسے کیوں لیں گے تجھے... ۹۰ ہو گئے
نوے پیسے۔ دس پیسے کل کے باقی ہیں... یہ لے ایک روپیہ!"

گونگا چندرو پیسے لینے سے انکار کرتا۔ وہ کبھی کبھی پارو کی
شوخ چمکتی ہوئی شربتی آنکھوں کو دیکھتا۔ کبھی اس کی لمبی لمبی انگلیوں
میں کپکپاتے ایک روپے کے نوٹ کو دیکھتا۔ اور سر ہلا کر انکار کر دیتا
اور حساب سمجھانے بیٹھتا۔ وہ وقت قیامت کا ہوتا تھا جب وہ پارو
کو حساب سمجھاتا تھا۔ دہی بڑے کی تھال کی طرف اشارہ کر کے اپنی انگلی
کو اپنے منہ میں رکھ کر چپ چپ کی آواز پیدا کرتے ہوئے گویا اس
سے کہتا۔

"دہی بڑے کھا تو گئی ہو، اس کے پیسے کیوں نہیں دو گی۔— ہہ"

"تیس پیسے دہی بڑے کے بھی لاؤ!"— وہ اپنے گلے میں سے
تیس پیسے نکال کر پارو کو دکھاتا۔

اس پر وہ فوراً چہک کر کہتی— "اچھا تیس پیسے مجھ دے، اپنی سے
رہے یہ!— لاؤ!"

اس پر چندرو فوراً اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیتا— "نہیں!"
انکار میں وہ سر ہلا کر پارو کو سمجھاتا—

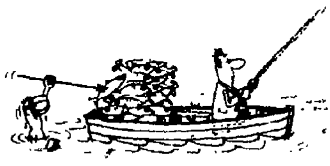
"مجھے نہیں تمہیں دینا ہوں گے یہ تیس پیسے!"— وہ اپنی
تہدیدی انگلی پارو کی طرف بڑھا کے اشارہ کر کے کہتا۔ اس پر پارو
اُسے فوراً ٹوک دیتی—

"اے اپنا ہاتھ پیچھے رکھ!— نہیں تو ماروں گی چپل!"

اس پر چندرو گھبرا جاتا۔ پارو کی ڈانٹ سے لاجواب ہو کر
بالکل بے بس ہو کر مجبور اور خاموش نگاہوں سے پارو کی طرف دیکھنے
لگتا کہ پارو کو اس پر رحم آ جاتا۔ جیب سے پورے پیسے نکال کر اسے دے
دیتی اور بولتی—

"تو بہت گھپلا کرتا ہے حساب میں۔ کل سے تیرے ٹھیلے پر
نہیں آؤں گی!"

مگر دوسرے دن وہ پھر آ جاتی تھی— اسے چندرو کو چھیڑنے



ہ مزا آتا تھا۔ اور اب چندرو کو بھی مزا آنے لگا تھا جس دن وہ نہیں
ٍ تھی حالانکہ اس دن بھی اس کی گاہکی اور کمائی میں کوئی فرق نہیں
نا تھا مگر جانے کیا بات تھی چندرو کو وہ دن سونا سونا سا لگتا تھا۔
جہاں پر اس کا ٹھیلہ رکھا تھا، وہ اس کے سامنے کی ایک گلی
جاتی تھی پہلے پہل چندرو کا ٹھیلہ بالکل یونین بینک کے سامنے
رہتا تھا ہولے ہولے چندرو اپنے ٹھیلے کو کھسکاتے کھسکاتے
ہ کی گلی کے سامنے لے آیا۔ اب وہ دور سے پارو کو اپنے گھر سے
لتے دیکھ سکتا تھا پہلے دن جب اس نے ٹھیلہ یہاں لگایا تھا تو پارو
ٹھیلے کی بدلی ہوئی جگہ دیکھ کر کچھ چونکی تھی، کچھ غصّے سے بھڑک اٹھی تھی۔
"اے تو ناکے سے ادھر کیوں آ گیا رے گونگے؟"
گونگے چندرو نے ٹیلی فون ایکس چینج کی عمارت کی طرف اشارہ
، جہاں وہ اب تک ٹھیلہ لگاتا آ رہا تھا۔ ادھر کیبل بچھانے کے لئے
ین کھودی جا رہی تھی اور بہت سے کالے کالے پائپ رکھے ہوئے
ے۔
وجہ معقول تھی، پارو لاجواب ہو گئی۔ پھر کچھ نہ بولی ۔۔ لیکن پھر جب
لی بچھ گئے، اور زمین کی مٹی ہموار کر دی گئی، تو بھی چندرو نے اپنا
لہ نہیں ہٹایا۔ تو بھی وہ کچھ نہ بولی۔ ہاں اس کے چنچل سبھاؤ میں ایک
یب تیزی سی آ گئی۔ وہ اسے پہلے سے زیادہ ستانے لگی۔
پارو کی دیکھا دیکھی اس کی سہیلیاں بھی چندرو کو ستانے لگیں اور
ا چھوٹے چھوٹے لڑکے بھی۔ مگر لڑکوں کو تو چندرو ڈانٹ دیتا اور وہ
ہری سے بھاگ جاتے۔ ایک بار اس نے پارو کی سہیلیوں سے عاجز
ر انہیں بھی ڈانٹ بتائی تو پارو اس قدر ناراض ہوئی کہ اگلے تین
ا روز تک چندرو کو ستانا بند کر دیا۔ اس پر چندرو کو ایسا لگا کہ
سمان اس پر ڈھے پڑا ہو۔ یا اس کے پیروں تلے زمین پھٹ گئی ہو۔
پارو مجھے ستاتی کیوں نہیں ہے؟ طرح طرح کے حیلوں بہانوں سے
ں نے سمجھایا کہ پارو اسے ڈانٹ پلاتے۔ لیکن جب اس پر بھی پارو
ہ انداز نہیں بدلے اور وہ ایک مہذب متمدن لیکن چاٹ بیچنے والے
نمدو ایسے چھوکروں کو فاصلے پر رکھنے والی لڑکی کی طرح اس سے

چاٹ کھلاتی رہی۔ تو چندرو اپنی گونگی حماقتوں پر بہت نادم ہوا۔
ایک دفعہ اس نے بجائے پارو کے خود حساب میں گھپلا کر
دیا سوا روپیہ بنتا تھا، اس نے پونے دو روپے طلب کئے جان بوجھ
کر خوب لڑائی ہوئی ۔۔۔ جم کے لڑائی ہوئی۔ سوا آخر چندرو نے اپنی
غلطی تسلیم کر لی اور گویا ایک طرح پچھلی تمام غلطیوں کی بھی تلافی تھی
چندرو بہت خوش ہوا، کیونکہ پارو اور اس کی سہیلیاں
اسے پھر ستانے لگی تھیں۔
بس اسے اتنا کچھ ہی چاہیئے۔ ایک پازیب کی کھنک اور
شریر ہنسی جو پھلجھڑی کی طرح اس کی گونگی سنسان دنیا کے ویرانے کو
ایک لمحہ کے لئے روشن کر دے۔ پھر جب پارو کے قدم سہیلیوں کے
قدموں میں گڈمڈ ہو کے چلے جاتے، وہ اس کی پازیب کی کھنک
کو دوسری پازیبوں کی کھنک سے الگ کر کے سن سکتا تھا کیونکہ دوسری
لڑکیاں بھی چاندی کی پازیبیں پہنتی تھیں۔ مگر پارو کی پازیب کی موسیقی
ہی کچھ اور تھی۔ یہ موسیقی جو اس کے کانوں میں نہیں، اس کے دل کی
تنہا تاریک اور شرمیلے گوشے میں سنائی دیتی تھی۔ بس اتنا ہی کافی تھا
اور وہ اسی میں خوش تھا۔
اچانک مصیبت نازل ہوئی ایک دوسرے ٹھیلے کی صورت
میں کیا ٹھیلہ تھا یہ! بالکل نیا اور جدید ڈیزائن کا۔ چاروں طرف چمکتا
ہوا کانچ لگا تھا۔ اوپر نیچے، دائیں بائیں، چاروں طرف لال پیلے اودے
اور نیلے رنگ کے کانچ تھے گیس کے دو ہنڈے تھے جن سے یہ ٹھیلہ بقعۂ
نور بن گیا تھا۔ پتّل کی جگہ چمکتی ہوئی پلیٹیں تھیں۔ ٹھیلے والے کے ساتھ
ایک چھوٹا سا چھوکرا بھی تھا، جو گاہک کو بڑی مستعدی سے ایک پلیٹ
اور ایک صاف ستھری نیپ کن بھی پیش کرتا تھا، اور پانی بھی پلاتا
تھا۔ چاٹ والے کے گھڑے کے گرد موگرے کے پھولوں کا ہار بھی
لپٹا ہوا تھا اور ایک چھوٹا ہار چاٹ والے نے اپنی کلائی پہ باندھ رکھا
تھا۔ اور جب وہ مصالحہ دار پانی میں گول گپّے ڈبو کر پلیٹ میں رکھ کر
گاہک کی طرف سرکاتا تو چاٹ کی کراری خوشبو کے ساتھ گاہک کے
نتھنوں میں موگرے کی مہک بھی شامل ہو جاتی۔ اور گاہک مسکرا کر نئے
چاٹ والے سے گویا تمغے کی طرح اس پلیٹ کو حاصل کر لیتا۔
اور نیا چاٹ والا گونگے چاٹ والے کی طرف تحقیر سے
دیکھ کر پُر نخوت آواز میں زور سے کہتا ۔۔۔۔
"چکھیے ۔۔۔!"
ایک ایک دو دو کر کے چندرو کے بہت سے گاہک ٹوٹ

کرنے ٹھیلے والے کے گرد جمع ہونے لگے، تو بھی چندرو کو زیادہ پریشانی نہیں ہوئی۔ پھر آجائیں گے، یہ اونچی دکان پھیکے پکوان والے کب تک چندرو کی سچی اصلی اور صحیح مصالحوں میں رچی ہوئی چاٹ کا مقابلہ کریں گے۔ ہم بھی دیکھ لیں گے — اس نے دو ایک گاہکوں کو نئے چاٹ والے کی طرف جاتے ہوئے کنکھیوں سے دیکھ بھی لیا تھا۔ اور اسے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ چکنی چمکتی پلیٹوں اور ہوٹل نما سوس کے باوجود انہیں نئے چاٹ والے کی چاٹ زیادہ پسند نہیں آرہی ہے۔

وہ پہلے سے بھی زیادہ مستعد ہو کر اپنے کام میں جٹ گیا لیکا یک اس کے کانوں میں پازیب کی ایک کھنک سنائی دی، اس کا دل زور زور سے دھڑک گیا۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔

گلی سے پارو پازیب کھنکاتی ہوئی اپنی سہیلیوں کے سنگ برآمد ہو رہی تھی۔ جیسے چڑیاں چہکیں ایسے وہ لڑکیاں بول رہی تھیں کتنی ہی بڑی بڑی اور شوخ نگاہیں تھیں، فضا میں ابابیلوں کی طرح تیرتی ہوئی سڑک پار کر کے وہ اس کے ٹھیلے کی طرف بڑھنے لگیں۔

اچانک پارو کی نگاہ ٹھیلے والے کی طرف اٹھی۔

وہ رک گئی۔

اس کی سہیلیاں بھی رک گئیں۔

وہ سانس لئے بغیر پارو کی طرف دیکھنے لگا۔

پارو نے ایک اچٹتی سی نگاہ چندرو کے ٹھیلے پر ڈالی۔ پھر نخوت سے اس نے منہ پھیر لیا، اور ایک ادائے خاص سے مڑ کر اپنی سہیلیوں کو لے کر نئے ٹھیلے والے کے پاس پہنچ گئی —

"تم بھی؟ — تم بھی؟ — پارو تم بھی — ؟"

چندرو کا چہرہ غصہ اور شرم سے لال ہو گیا۔ رگوں اور نسوں میں خون گونجنے لگا، جیسے اس کا حلق خون سے بھر گیا ہو۔ وہ کچھ بول بھی نہیں سکا۔ مگر اسے دیکھ کر لگتا جیسے بولنے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ اس موٹی دیوار کو توڑ دے گا جو اس کی روح کا احاطہ کئے ہوئے تھی اس کے چہرے کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے وہ ابھی چیخ کر کہے گا — "تم بھی! — تم بھی! — پارو! تم بھی!" — مگر خون اس کے حلق میں بھر گیا تھا۔ اس کے کان کسی بڑھتے ہوئے طوفان کی آوازیں سن رہے تھے۔ اور اس کا سارا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا۔ گویائی کی آخری کوشش گویا کسی لوہے کی دیوار سے ٹکرا کر ٹوٹ گئی تھی۔ اور وہ مڑ کر اپنے گاہکوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

مگر اس بے چین پازیب کی کھنک ابھی تک اس کے دل میں تھی — پارو اور اس کی سہیلیاں نئے ٹھیلے والے کے گرد جمع انواع و اقسام کی چاٹیں کھائے چلی جا رہی تھیں اور بیچ بیچ میں تعریفیں کرتی جا رہی تھیں۔ ان سب میں پارو کی آواز سب سے اونچی تھی۔

"ہائے کیسی لذیذ چاٹ ہے! کیسے برابر کے مصالحے ہیں —! اس موئے (نام نہ لے کر محض اشارہ کر کے) پرانے ٹھیلے والے کو تو چاٹ بنانے کی تمیز ہی نہیں ہے۔"

"اب تک جھوٹی پتلوں میں چاٹ کھلا تا رہا ہے!"

"اری اس کے ہاتھ کو دیکھو —!" پارو نے جھک کر چندرو کی طرف اشارہ کیا۔

"کیسے گندے اور غلیظ ہیں۔ معلوم ہوتا ہے سات دن سے نہایا نہیں —!"

"ایک نیپ کن تو ہے نہیں اس کے پاس —! جب ہاتھ پونچھنے کے لئے مانگو، وہ بھی اپنا.... گندا میلا تولیہ آگے کر دیتا ہے"

"اونہہ!" — پارو کے پتلے پتلے ہونٹ نفرت سے خم ہو گئے۔ "میں تو کبھی اس چاٹ والے کے ٹھیلے پر تھوکوں بھی نا —!"

اس کے آگے چندرو کچھ سن نہ سکا۔ ایک لال آندھی اس کی آنکھوں میں چھا گئی۔ وہ گونگوں کی سی ایک وحشت زدہ چیخ کے ساتھ اپنا ٹھیلہ چھوڑ کر آگے بڑھا اور اس نے نئے ٹھیلے والے کو جا لیا۔ اور اس سے گتھم گتھا ہو گیا۔ لڑکیاں چیخ مار کر پیچھے ہٹ گئیں۔

چندرو نئے ٹھیلے والے اور اس کے چھوکرے دونوں پر بھاری ثابت ہوا۔ چندرو ایک وحشی جانور کی طرح لڑ رہا تھا۔ اس نے نئے ٹھیلے والے کو مار مار کر اس کا بھرکس نکال دیا۔ اس کے ٹھیلے کے سارے کانچ توڑ ڈالے چھوکرے کی پٹائی کی۔ نیا ٹھیلہ مع اپنے سارے سامان کے سڑک پر اوندھا دیا۔ پھر سڑک کے بیچ کھڑے ہو کر زور زور سے ہانپنے لگا۔

پولیس آئی اور اسے گرفتار کر کے لے گئی۔

عدالت میں اس نے اپنے جرم کا اقبال کر لیا۔ عدالت نے اسے دو ماہ قید کی سزا دی۔ اور پانچسو روپیہ جرمانہ۔ اور جرمانہ نہ دینے پر چار ماہ قید با مشقت۔

سدھو حلوائی نے جرمانہ نہیں بھرا۔

اور دوسرا کون تھا جو جرمانہ ادا کرتا؟

چندرو نے پورے چھ ماہ کی جیل کاٹی۔

جیل کاٹ کر چندرو پھر سدھو حلوائی کے گھر پہنچ گیا۔ کوئی دوسرا اس کا ٹھکانہ بھی نہیں تھا۔ سدھو حلوائی پہلے تو اسے دیر تک گالیاں

دیتا رہا اس کی حماقت پر اسے بے نقط سناتا رہا اور دیر تک چندو سر جھکائے خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا۔ اگر وہ گونگا بھی نہ ہوتا تو کس سے کیا کہتا۔ اس کا جرم یہ نہیں تھا کہ اس نے ایک ٹھیلے والے کو مارا تھا اس کا جرم یہ تھا کہ اس نے ایک پازیب کی کھنک سنی تھی۔

جب سدھو حلوائی نے خوب اچھی طرح گالیاں دے کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لی تو اس نے اسے پھر کام پر لگا لیا۔ آخر کیا کرتا؟ چندرو بے حد ایماندار محنتی اور اپنے کام میں مشاق تھا۔ اب جیل کاٹ کر آیا ہے تو تھوڑی عقل بھی آگئی ہوگی کہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس نے خوب اچھی طرح سمجھا بجھا کے دو تین دن بعد پھر سے چندرو کو اسی اڈے پر ٹھیلہ دے کر روانہ کر دیا۔

چندرو کی غیر حاضری میں سدھو نے ایک اچھا کام کیا تھا۔ اس نے چندرو کے ٹھیلے پر نیا رنگ روغن کروا دیا۔ کانچ بھی لگا دیا تھا پتیلوں کی جگہ کچھ سستی قسم کی چینی کی پلیٹیں اور چمچے بھی رکھ دیئے تھے۔

چندرو چھ ماہ بعد پھر سے ٹھیلہ لے کر روانہ ہوا۔ آٹھویں دسویں اور گیارھویں سڑک پار کر کے لنکنگ روڈ کے ناکے پر آیا۔ بینک سے گھوم کر ٹیلی فون ایکسچینج کے پاس پہنچا۔ اس نے دیکھا، جہاں پر پہلے اس کا ٹھیلہ تھا، اب اس جگہ اس نئے ٹھیلے والے نے قبضہ کر لیا تھا۔ وہی چھوکرا ہے۔ وہی ٹھیلہ والا ہے۔ اس ٹھیلے والے نے چندرو کو گھور کر دیکھا چندرو نے اپنی نظریں چرا لیں اس نے نئے ٹھیلے والے سے کچھ فاصلے پر ایکسچینج کے ایک طرف اپنا ٹھیلہ روک دیا، اور گاہکوں کا انتظار کرنے لگا۔

چار بج گئے، پانچ گئے، چھ بج گئے۔ کوئی گاہک اس کے پاس نہیں پھٹکا۔ دو ایک گاہک آئے مگر وہ نئے تھے اور اسے جانتے نہیں تھے۔ چار چھ آنے کی چاٹ کھا کر چل دیئے۔ افسردہ دل چندرو سر جھکائے اپنے آپ کو مصروف رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ کبھی ترلیے کر کا نچ چمکاتا۔ ڈوئی ڈال کر گھڑے میں مصالحہ دار پانی کو ہلاتا۔ انگیٹھی میں آنچ ٹھیک کرتا ہوئے ہوئے آلو کے بھرتے میں مٹر کے دانے اور مصالحے ڈال کر ٹکیاں بناتا رہا۔

یکایک اس کے کانوں میں پازیب کی کھنک سنائی دی۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ خون رخساروں کی طرف دوڑنے لگا۔ وہ اپنے جھکتے ہوئے سر کو اوپر اٹھانا چاہتا تھا۔ مگر اس کا سر اوپر نہیں اٹھتا تھا —— پازیب کی کھنک اب سڑک پر آگئی تھی۔

پھر جسم و جان کا زور لگا کر اس نے اپنی گری ہوئی گردن کو اوپر اٹھایا۔ اور جب دیکھا تو اس کی نگاہیں پارو پر جمی کی جمی رہ گئیں۔ ہاتھ سے ڈوئی گر گئی، اور تولیہ اس کے کاندھے سے اتر کر نیچے پانی میں بھیگ گیا۔ اور ایک گاہک نے قریب آ کر کہا۔

"مجھے دو سموسے دو!"

مگر اس نے کچھ نہیں سنا۔ اس کے بدن میں جتنے حواس تھے جذبات تھے، سب کھنچ کر اس کی آنکھوں میں آ گئے تھے۔ اب اس کے پاس کوئی جسم نہ تھا۔ صرف آنکھیں ہی آنکھیں تھیں۔

یہ اس کا ٹھیلہ تھا۔ وہ چند قدم پر دوسرا ٹھیلہ تھا۔ اور وہاں تک جا رہا تھا —— پارو کدھر جائے گی!

ہولے ہولے سرگوشیوں میں باتیں کرتے ہوئے گاہے گاہے اس کی طرف دیکھتے ہوئے۔ لڑکیاں سڑک پر چلتے ہوئے ان دونوں ٹھیلوں کے قریب آ رہی تھیں۔ زیر لب بحث دھیرے دھیرے ساتھ چل رہی تھیں۔

یکایک جیسے اس بحث کا خاتمہ ہو گیا۔ لڑکیوں نے سڑک پار کر کے نئے ٹھیلے والے کو گھیر لیا۔

مگر چندرو کی نگاہیں نئے ٹھیلے کی طرف نہیں پھریں۔ وہ اس خلا میں دیکھتا رہا، گلی اور سڑک کے سنگم پر جہاں آج چھ ماہ بعد اس نے پارو کو دیکھا تھا۔ وہ سر اٹھائے دنیا و مافیہا، گرد و پیش سے بے خبر ادھر ہی دیکھتا رہا۔

وہ پتھر کی طرح کھڑا صرف سامنے دیکھ رہا تھا۔

یکایک بڑی تیزی سے اکیلی پارو اپنی سہیلیوں سے کٹ کر اس کے ٹھیلے پر آ گئی۔ اور چپ چاپ اس کے سامنے ایک مجرم کی طرح کھڑی ہو گئی، اسی لمحہ گونگا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

وہ آنسو نہیں تھے، الفاظ تھے.... ٹھکرانے کے، نفرت کے شکایتوں کے —— ابلتے ہوئے آنسو..... فصیح اور بلیغ جملوں کی طرح اس کے گالوں پر بہتے آ رہے تھے اور پارو سر جھکائے سن رہی تھی۔

آج پارو گونگی تھی اور چندرو بول رہا تھا۔ اسے وہ کیسے کہے اس پگلے سے کہ پارو نے بھی تو چھ ماہ انہی آنسوؤں کا...... انہی آنسوؤں کا انتظار کیا تھا ——!

تلافی

پپّو عفت کی پہلی اولاد نہ تھا کہ وہ اسے تخیل کا چہالہ بنا کے رکھتی۔ بچپن سے پہلے گڑیا اور گڈو تھے ہنستے کھلکھلاتے پیارے سے بچے۔ مگر وہ تو پپّو کے لئے پاگل ہوتی جاتی تھی۔ عفت کی الیاس سے شادی ہوئی تو ایک برس بڑا ہی رواتی سا گزرا۔ الیاس دن چڑھے تک بستر میں پڑے ٹی وی کے سامنے بیٹھے رہتے اور وہ انہیں جاگنے اور آفس جانے کا کہا کرتی۔ وہ آفس جاتے ہی فون کر دیتے اور وہ پیار سے میٹھی جھڑکیاں سنا دیتی۔ الیاس کے آنے سے پہلے وہ بالکل تیار ہوتی۔ الیاس آتے تو اسے کسی ننھی سی گڑیا کی طرح بازوؤں میں سمو لیتے۔ ایک برس بعد گڑیا چلی آئی تو زندگی اور بھی پُر مسرت مگر ذرا مختلف ڈھنگ کی ہو گئی۔ جب وہ گھنٹوں گڑیا کو سناتے گدگداتے ہنستے اور عفت اُن کے کپڑے نکالتی۔ آفس سے آتے ہی وہ گڑیا کی طرف لپکتے۔ زندگی بڑے سکون اور اطمینان سے گزر رہی تھی۔ گڑیا تین برس کی ہو گئی۔ سنہری کٹے ہوئے بالوں اور نیلی آنکھوں والی گڑیا واقعی ڈول لگا کرتی۔ عفت اسے سنوار کر کرسی پر بٹھا دیتی۔ اور وہ اتنی شرارتی سی تھی کہ عفت کے پیچھے گھوما کرتی۔ عفت باورچی خانے میں جاتی تو وہ پیچھے چل دیتی۔ الیاس مذاق اڑایا کرتے۔ "یہ گڑیا تو تمہاری ہی مالک بن بیٹھی۔ ہمیں ایک پیارا سا گڈا لا دو نا۔" اور واقعی اگلے برس نیلی شفاف آنکھوں والا منا سا گڈو اس کے پہلو میں تھا۔

الیاس اُسے تنہا پا کر محبت سے اُس پر جھک آتے تو اس نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ "دو بچوں کے باپ ہو کر ایسی حرکت



کرتے ہیں۔ ۔۔ شرمگیں سی مسکراہٹ نے اس کے چہرے کو مزید خوبصورت بنا دیا تھا۔ گڈو کو بازوؤں میں سے کر وہ پیچھے ہٹ گئے۔

"اب حساب برابر ہو گیا۔ گڈو میرا گڑیا تمہاری۔" تو وہ ناز سے مسکرا دی۔ گڑیا انہیں بہت پیاری تھی۔ مگر لڑکے کی ماں ہونے کا احساس اُسے نہال کر گیا تھا۔

"دونوں بچے آپ پر ہیں۔" عفت نے نزاکت سے مسکرا کر کہا تو وہ فخر سے ہنس دیئے۔

"کیوں نہ ہوں، تمہارے ذہن میں دل و دماغ میں ہم ہی ہوتے ہوں گے تا تمہی بچوں پر اتنی گہری چھاپ ہے ہماری۔" گڈو کی پیدائش پر وہ بہت خوش تھے۔ چھلے اور دوسری تقریبات سے فارغ ہو کر وہ گھر لوٹی تو الیاس نے محبت سے اس کے شانے تھام کر کہا تھا: "بس عفی اب ہمارا خاندان مکمل ہو گیا۔ اب تو خدا ہم سب کو سدا اس گلشن میں مسکراتا رکھے۔" وہ دونوں اپنی زندگیوں میں مگن تھے۔ عفت کے لئے الیاس اور بچوں میں سارا جہاں آباد نظر آتا۔ زندگی اتنی مکمل اور خوبصورت ہو گئی تھی کہ وہ دونوں خوشیوں کے ہنڈولوں میں جھولتے زندگی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

اُن کی پُرسکون زندگی میں ننھا سا کنکر اس روز گرا جب ڈاکٹر نے اُسے اُمید سے ہونے کی خبر سُنائی۔

"اوہ ڈاکٹر!" وہ جھلا گئی۔ "ہمیں اب بچے نہیں چاہئے!"

"یہ تو خدا کی دین ہے مسز الیاس بچے خدا کی نعمت ہوتے ہیں" ڈاکٹر نے پیار سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ الیاس نے سنا تو سنجیدگی سے کہا۔

"عفی سات برسوں میں تین ڈلیوریاں، تمہاری صحت خراب ہو جائے گی۔" وہ دونوں دل سے خوش نہ تھے۔ مگر آنے والی روح آ کر رہتی ہے۔ دسمبر کی ایک سرد ترین رات کو پپو پیدا ہوا۔ عفت نے ایک نظر بیزاری سے اپنے پہلو میں پڑے گوشت کے لوتھڑے کو دیکھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اس پر جھک گئی۔ اس کے ننھے سے چہرے میں جانے کیا نظر آیا کہ اسے اپنی گود میں کھینچ لیا اور پھر کتنی ہی دیر وہ اسے اپنی گود میں بٹھائے چومتی رہی، بلائیں لیتی رہی۔ نرس اسے ہدایت کرتی: "آپ لیٹ جائیں مسز الیاس بہت کمزور ہیں آپ!" مگر وہ سب سے بے خبر اپنے جگر کے ٹکڑے کو پیار کرتی رہی۔

پپو کی پیدائش پر الیاس نے ڈھیروں خوشی کا اظہار کیا۔ مگر عفت جانتی تھی کہ پپو اپنے ابو کے دل میں گڈو کی طرح نہیں سما پایا اور سب سے بے خبر وہ پپو میں کھوتی چلی گئی۔ گڑیا کے سنہری بال کنگھی نہ ہونے کی وجہ سے بکھرے رہتے۔ گڈو کے موزوں میں سوراخ ہو گئے، مگر اس نے مڑ کر خبر نہ لی۔ بس وہ تو پپو کی ذات میں گم تھی۔ سانولی سلونی سی رنگت اور بڑی بڑی سیاہ آنکھوں والا پپو اپنے ابو پر بالکل بھی نہ پڑا تھا۔ ایک روز الیاس نے مذاق میں کہہ ڈالا۔ "عفی پپو تو میری جھلک تک نہ پا سکا۔" تو وہ چڑ گئی۔

"آپ نہیں چاہتے تھے کہ وہ دنیا میں آئے۔ بس وہ انتقاماً ایسا ہو گیا۔" اس کی بات کا مزہ لے کر الیاس خوب ہنسے اور وہ سنجیدگی سے پپو کا نیپکن بدلنے میں مصروف ہو گئی۔

الیاس صبح جاگ کر اُٹھتے تو انہیں اپنے غسل کا سامان خود ہی باتھ روم میں لے جانا ہوتا۔ کئی دفعہ یوں بھی ہوتا کہ وہ نہا کر نکلتے تو ان کے کپڑے تیار نہ ہوتے۔ وہ غصے سے باہر آتے تو عفت نہایت سکون سے مسکراتے پانی میں پپو کا فیڈر ابال رہی ہوتی۔ الیاس اُسے اتنا مصروف دیکھ کر واپس آ جاتے۔ کتنے دن گزر گئے اور عفت ان کی ذات سے لاپرواہ ہوتی گئی۔ بات صرف اپنی ذات کی ہوتی تو وہ برداشت کر جاتے۔ مگر پپو کی آمد کے بعد گڈو اور گڑیا کی دیکھ بھال بہت متاثر ہو رہی تھی۔ گڑیا کو اسکول جانے سے دیر ہو جاتی۔ اسکول کی بس ہارن پہ ہارن بجاتے جاتی اور اس وقت عفت جلدی جلدی الٹا سیدھا تیار کر کے اُسے روانہ کر دیتی۔ گڈو بھوک لگنے پر روتا تو عفت فیڈر میں دودھ بھر کر قالین پر لٹا کر فیڈر اس کے ہاتھوں میں پکڑا دیتی۔ یہ ساری صورتحال الیاس کے لئے ناقابل برداشت ہو رہی تھی۔ پپو کے لئے اس نے سب کو فراموش کر دیا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ خود سے اتنی لاپرواہ ہو گئی تھی کہ کئی کئی دن اُسے کپڑے تبدیل کرنے کا خیال نہ آتا۔

ایک روز جب وہ سونے کے لئے لیٹے تو الیاس نے آہستگی سے کہا۔ "عفی۔" جواباً وہ خاموش رہی۔ "عفی اب ہم تمہیں بہت برے لگنے لگے ہیں نا۔ گڑیا گڈو بھی بہت خراب ہیں۔" وہ شکایتی لہجے میں بولے تو وہ روہانسی سی ہو گئی۔

"آپ کیسی باتیں کرتے ہیں الیاس۔" وہ ایک لمحے کو رکی۔ "آپ سب تو میری زندگی ہیں، زندگی کا حاصل ہیں۔"

"ارے!" وہ ایک دم خوش ہو گئے۔ "آج بہت دنوں بعد کوئی خوبصورت فقرہ سنا ہے تمہارے لبوں سے۔" انہوں نے اپنا بازو پھیلا دیا۔ عفت نے دھیرے سے سرک کر اپنا سر ان کے بازو

پھر رکھ دیا۔

"آپ بچو کے لئے ایسا سوچتے ہی کیا ہو" اس کا لہجہ شاکی سا تھا۔ الیاس نے آہستہ سے سر ہلا دیا تو وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی "بچو بہت کمزور ہے الیاس مجھے اس کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر قریب لیٹے بچو کو سہلایا۔ ہاتھ کا لمس محسوس ہوا تو بچو نے آنکھیں کھول دیں۔ یوں بے آرام ہونے پر وہ رو دیا۔ عفت نے تیزی سے اُسے بازوؤں میں اٹھایا اور بہلانے لگی۔ جب بچو کسی طور بھی چُپ نہیں ہوا تو وہ پلنگ سے نیچے اتر آئی "آپ کو بھی بے آرام کرے گا، میں اسے باہر لے جاتی ہوں۔" وہ بولی اور اُسے بانہوں میں اٹھا کر باہر چل دی۔ الیاس نے آنکھیں موندتے ہوئے سوچا جب گڑیا اور گڈو رات کو جاگ جاتے تو وہ انہیں اس کے سامنے ڈال دیتی "سنبھالیے اپنے بچوں کو، سارا دن ان کے ساتھ رہی ہوں، رات کو بھی سونے نہیں دیتے۔" اس کے غصے میں کتنی اپنائیت ہوتی، وہ خود کروٹ بدل کر لیٹ جاتی اور وہ مُندی مُندی آنکھوں سے بچوں کو سلایا کرتے۔

عفت بچو کو غیر معمولی توجہ دیتے ہوئے تھی۔ مگر اس کے باوجود بچو صحت مند نہ ہو سکا۔ اسے کئی کئی روز بخار رہتا، ساری ساری رات وہ رو یا کرتا اور عفت اُسے بازوؤں میں لئے برآمدے میں پھرا کرتی۔ شب بیداری سے صبح اس کی آنکھیں سرخ ہوتیں۔ مگر وہ خاموشی سے بچو کے ننھے ننھے کپڑے دھونے بیٹھ جاتی۔ بچو کی صحت کے لئے وہ اتنی فکرمند تھی کہ اس کے کپڑوں کو ڈیٹول کے پانی سے دھوتی۔ اس کا بستر دن میں کتنی ہی دفعہ بدلتی۔ بچو کے لئے اس نے اپنی جان ہلکان کر لی تھی۔ تین بچوں کی پیدائش اور اب بچو کے کاموں میں وہ اپنی صحت اور رعنائی بھی بہت حد تک کھو چکی تھی۔ گڑیا گڈو کے بعد تو وہ اور بھی پیاری ہو گئی تھی۔ گردن اٹھا کر اتنے ناز سے چلا کرتی کہ سب رشک کرتے مگر بچو کی آمد نے اس کے سب ناز، سارے ہی انداز فراموش کر دیئے تھے۔

الیاس ایک سہ پہر آفس سے واپس آئے تو لان ہی میں گڈو گڑیا مل گئے "ہیلو بچو!" انہوں نے پیار سے بازو کھول دیئے۔ گڈو ننھے ننھے قدم اٹھاتا ان کی آغوش میں آ گیا۔ مگر گڑیا اسی طرح ناراض سی بیٹھی تنکے زمین پر رہی۔ وہ گڑیا کے قریب گئے "کیا ہو گیا گڑیا میری جان؟" انہوں نے ٹھوڑی تھام کر اس کا چہرہ اونچا کیا۔

"ابو آپ ہمیں اپنے آفس لے جایا کیجئے۔" وہ رو دینے کو تھی۔ گڈو نے ابو کا ہاتھ تھام لیا۔

"ابو ممّا ہم سے بالکل پیار نہیں کرتیں۔" گڈو کی آواز میں معصوم

* حقیقت سے زندگی تنگ ہے اور اس سے ملی سعادت۔ (نٹشے)
* سب سے قیمتی چیز انسان کا ارادہ ہے۔ (طالب لیوس)
* میں نے زندگی میں یہی سیکھا ہے کہ ایک بہت بڑی قندیل ہے جو ایک لمحے کے لئے میرے ہاتھ لگی ہے۔ (برنارڈ شا)
* مسرت دوسروں کے ہاتھوں اور تفریح گاہوں میں نہیں ہمارے اپنے گھروں میں رہتی ہے۔ (آسکر وائلڈ)
* پاؤں کی لغزش کے بعد تو سنبھلا جا سکتا ہے لیکن زبان کی لغزش کے بعد سنبھلنا مشکل ہے۔ (فرینکلن)
* اچھی اور نیک عادت زندگی بھر کی مشکلیں آسان کر دیتی ہے۔ (واشنگٹن)

سا احتجاج تھا۔ "اور آج ہم نے آج صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ ہم نے ٹکڑے کو واپس بھیج دیا۔ ہم نے طے کر لیا ہے جب ممّا ہمیں اپنے ہاتھ سے کھلائیں گی تبھی ہم کھائیں گے۔"

بچوں کے اس معصوم سے شاکی انداز سے الیاس کا من سلگ اٹھا۔ وہ تیز قدموں سے اندر چلے گئے۔ اُن کے ذہن میں غصے سے آگ سی جل رہی تھی۔ مگر عفت کی صورت دیکھ کر لرز گئے۔ اس کے بال بکھر کر اس کے کندھوں پر پڑے تھے، چہرہ خوف کی شدت سے سیاہ پڑ گیا تھا اور آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ الیاس نے دیکھا بچو آنکھیں بند کئے بے سُدھ پڑا تھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھے۔ بچو کا ماتھا بخار کی شدت سے جل رہا تھا آخر بچو ان کا بیٹا تھا۔ ان کے وجود کا ایک حصہ تھا۔ انہوں نے دیوانی سی عفت کے ہاتھوں سے بچو چھین لیا اور اگلے ہی لمحے وہ تیزی سے گاڑی ڈرائیو کرتے ڈاکٹر کی طرف جا رہے تھے۔ چند گھنٹے بعد بچو کی حالت سنبھل گئی۔ بچو نے کسمسا کر آنکھیں کھول دیں۔ تو وہ خوشی سے بے حال ہو گئے۔ ڈاکٹر کے کلینک سے واپس آتے تک خاصی رات ہو چکی تھی۔ گاڑی پورچ میں روک کر وہ اندر جانے کو بڑھے تو ستون کے ساتھ لپٹا سایہ سا دیکھ کر رک گئے۔ قریب آ کر دیکھا تو وہ عفت ہی تھی۔ ننگے سر ننگے پاؤں۔ وہ بنا پلکیں جھپکائے خاموش کھڑی تھی۔ الیاس کا جی بھر آیا۔ انہوں نے آہستگی سے بچو کو عفت کی جانب بڑھا دیا۔ خالی خالی نظروں سے اس نے الیاس کو پھر بچو کو دیکھا۔ بچو نے نیند میں ہونٹ سکوڑے اور بازو ہوا سے ہلکایا۔ عفت نے

بے یقینی کی سی نظروں سے الیاس کو دیکھا اور پھر چلتے ٹپ سے ٹرک بند ہو گئے۔ اس کی خشک آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی سی لگ گئی۔ الیاس کے کندھے پر سر رکھے وہ روئے چلی جا رہی تھی۔ "پپو کو کچھ ہو جاتا تو میں یہیں کھڑے کھڑے جان دے دیتی۔" وہ کہے جا رہی تھی اور الیاس اُسے پیار سے دلاسہ دے رہا تھا۔

اگلی صبح آفس جانے سے پہلے الیاس نے گڈو اور گڑیا کو اپنے پاس بلایا۔ "دیکھو گڑیا اور گڈو تمھاری مما بیمار ہیں۔ پپو بہت چھوٹا ہے۔ اور اُسے مما کی زیادہ ضرورت ہے۔ آئندہ مما سے کوئی شکایت نہیں کرے گا۔ بلکہ ان کے کام میں مدد کی جائے گی انڈراسٹینڈ۔" وہ سمجھانے کے سے انداز میں بولے۔ بچوں نے آہستگی سے سر ہلا دیا اور وہ آفس چلے گئے۔ پپو کو سنبھلتے سنبھلتے کئی دن گزر گئے اور ان دنوں وہ مرجھائی بیگانہ ہوتی گئی۔ الیاس گھر کی بگڑتی ہوئی فضا سے بہت پریشان تھے اور اس روز ان کی پریشانی میں مزید اضافہ ہو گیا جب کانونٹ اسکول سے گڑیا کی مدر نے الیاس کو فون کیا۔ وہ فون پر کہہ رہی تھیں۔

"الیاس صاحب آپ کی بچی پچھلے چند مہینوں سے بہت الجھی ہوئی ہے۔ اس کا یونیفارم بھی صاف نہیں ہوتا اور وہ لیسن LESSON بھی ٹھیک سے یاد نہیں کرتی۔" الیاس نے بڑے شگفتہ لہجے میں مدر سے معذرت کی اور آئندہ محتاط رہنے کا وعدہ کیا۔ اور اسی وعدے کے پیش نظر وہ آفس سے فارغ ہو کر گھر جانے کی بجائے وہ سیدھا ڈاکٹر ربانی کے کلینک چلے گئے۔ ڈاکٹر ربانی مشہور ماہر نفسیات تھے اور الیاس کے بچپن کے دوست بھی۔ ساری بات سننے کے بعد وہ بڑے تسلی آمیز لہجے میں بولے۔

"الیاس اس معاملے میں کوئی بھی بات غیر معمولی نہیں۔ کئی ایسے کیس ہوتے ہیں جن میں کسی نہ کسی وجہ سے ماں کو ایک خاص بچے سے ایک شدید لگاؤ ہوتا ہے۔"

"مگر ڈاکٹر!" الیاس پریشانی سے بولے۔ "پپو پر غیر معمولی توجہ ہمارے گھر کا ماحول تباہ کر رہی ہے۔ میرے بڑے بچے زبردست محرومی کا شکار ہو رہے ہیں اور میں بذاتِ خود شدید اذیت میں گرفتار ہوں۔"

"الیاس تم نے بتایا کہ تم میاں بیوی تیسرا بچہ نہیں چاہتے تھے تیسرے بچے کی پیدائش پر تمہاری بیوی نے سوچا یہ بچہ اپنے والد کا شاید پیار نہ پا سکے گا کیونکہ یہ ان چاہا بچہ تھا۔ بچے کی محرومی کو ختم کرنے کے لئے اس نے اپنا تمام تر پیار اس تیسرے بچے پر نچھاور کر دیا۔ اب تمہارے لئے ضروری ہے کہ تم اپنی بیوی کو احساس دلاؤ کہ یہ بچہ تمہیں بہت پیارا ہے۔ باقی دونوں بچوں کی طرح۔" ڈاکٹر ربانی بڑے اطمینان سے سمجھا رہے تھے اور جب الیاس گھر آئے تو ان کا ذہن خاصا ہلکا پھلکا ہو رہا تھا۔

اُس رات کھانا کھانے کے بعد وہ بلند آواز سے پکارے۔ "گڈا گڈو اور بچے سب میرے پاس آجائیں۔" اپنے کمروں میں جاتے ہوئے گڈا اور گڈو لوٹ آئے۔ عفت نے حیرانی سے انہیں دیکھا اور پپو کو گود میں لے کر ان کے قریب آگئی۔ "بھئی آج ہم ایسا کھیل کھیلیں گے جس میں پپو بھی شامل ہو۔"

"مگر پپو بہت چھوٹا ہے۔" گڈو نے کہا۔ عفت آہستگی سے پلنگ پر بیٹھ گئی۔

"پپو چھوٹا نہیں ہے وہ اب چھ ماہ کا ہو گیا ہے۔ وہ سہارے سے بیٹھ بھی سکتا ہے۔"

"اچھا!" الیاس نے اشتیاق سے کہا۔ "آج ہم پپو کو بیٹھا ہوا دیکھیں گے۔ گڑیا جاؤ کشن لاؤ۔" گڑیا اپنے کمرے سے چھوٹا کشن لے آئی۔ کشن کے سہارے پپو نیم دراز سا بیٹھ گیا۔ گڈو اور گڑیا تالیاں بجا بجا کر ہنسنے لگے۔

"اب پپو کے سونے کا وقت ہے۔" عفت ایک دم سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے پپو کو گود میں اٹھایا اور اس کے جھولے میں ڈال دیا۔

رات کو سب کھانا کھا لیتے تو الیاس بچوں کو لے کر بستر پر بیٹھ جاتے۔ گڈو گڑیا کا رویہ اب قدرے بہتر ہو رہا تھا۔ الیاس نے انہیں ہدایت کی ہوئی تھی کہ وہ ان کی آفس سے واپسی پر لان میں رہیں اور اپنے اسکول کا تمام کام مکمل کریں۔ پپو کو بھرپور پیار دینے کے باوجود عفت کی دیوانگی میں کمی نہ آئی۔ پپو دس ماہ کا ہو گیا مگر اس کی صحت کسی طور بھی اچھی نہیں تھی۔ وہ سخت چڑچڑا ہو گیا تھا۔ اپنے بہن بھائی سے اسے بالکل بھی لگاؤ نہ تھا۔ اس نے پپو کو دیکھ کر کبھی بھی ہاتھ نہیں پھیلاتے۔ بس وہ خاموش اپنے بستر میں لیٹا رہتا۔ جس روز پپو نے پہلا قدم اٹھایا عفت خوشی سے پھولے نہ سمائی۔ جب پپو کا تیسرا آیا تو اس کے گلے میں کوئی تکلیف تھی۔ وہ دودھ ٹھیک سے پی نہ سکتا تھا۔ اس روز عفت کی جان پر بن آئی۔ الیاس اسے سمجھاتے۔ "معمولی سی تکلیف ہے۔ بچوں کو عموماً ایسا ہو جاتا ہے۔" مگر وہ خاموش بیٹھی رہی۔ ڈاکٹر بھی آیا اس نے کافی دوائیاں تجویز کیں۔ مگر پپو کے گلے کی تکلیف بڑھتی گئی۔ ننھے ننھے ہاتھ مار کر وہ درد سے تڑپتا تو الیاس دوڑتے اور عفت تو ہوش و حواس سے بیگانی ہو گئی تھی۔ دہشت زدہ آنکھوں

نکتہ

کل ہند مشاعرے میں ایک نوجوان شاعر فراق گورکھپوری کی ایک غزل کی تضمین میں غزل پڑھ رہا تھا۔ وہ یہاں میں فراق صاحب کی غزل کا ایک شعر بھی پڑھ گیا جس پر سامعین نے بہت داد دی۔ فراق صاحب جو وہاں موجود تھے ان سے یہ چوری برداشت نہ ہو سکی جب وہ نوجوان غزل ختم کر چکا تو انھوں نے اسے اشارے سے بلایا اور پوچھا "بھئی تم نے میرا شعر اپنی غزل میں کیوں شامل کر لیا؟" نوجوان شاعر نے جواب دیا "معاف کیجیے یہ شعر میں نے کہا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میرا خیال آپ کے خیال سے ٹکرا گیا ہو۔"
فراق صاحب نے فرمایا: "یہ ناممکن ہے۔" نوجوان شاعر بولا: "یہ ممکن کیوں نہیں ہے"
فراق صاحب نے برافروختہ ہو کر کہا: "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سائیکل ہوائی جہاز سے ٹکرا جائے۔"

سے بچے کو تکا کرتی۔ کوئی اسے پکارتا تو ایسی خالی خالی نظروں سے دیکھتی کہ خوف سا آنے لگتا۔ بچے کو سانس لینے میں بہت دقت ہوتی تھی، سانس لیتے وقت اس کے گلے سے ہلکی ہلکی آواز پیدا ہوتی۔ کئی دن کے مسلسل علاج کے باوجود افاقہ نہیں ہوا۔ تو الیاس ایک اسپیشلسٹ کو دکھانے لے گئے۔ دن چیک اپ میں لگ گئے۔ اور پھر ایک روز یہ انکشاف ہوا کہ بچہ اس ننھی سی عمر میں دمے کا مریض ہے۔ اسپیشلسٹ کا فیصلہ عفت نے بھی سنا۔ اس نے ایک نظر ڈاکٹر کو دیکھا اور پھر گردن جھکا لی۔ "میں جانتی تھی، میں سب جانتی تھی، بچہ مر جائے گا، وہ کبھی زندہ نہ بچے گا۔" اس کے لہجے میں بے بسی اور بے چارگی تھی۔ وہ چند لمحے اپنے آنچل کے کونے کو انگلی پر لپیٹتی رہی اور پھر بچے کے کمرے میں چلی گئی، کتنے ہی روز بیت گئے وہ بچے کے کمرے سے نہیں نکلی۔ وہ سب کچھ تیاگ کر بچے کی تیمار داری کرتی رہی۔ بچے کے سانس کی آواز اب خاصی بڑھ گئی تھی۔ چند ہی ہفتوں میں اس کے چہرے سے ساری رعنائی غائب ہو گئی تھی۔ سانولا ملیح رنگ جھلس کر سیاہ ہو گیا تھا اور کمزوری سے چہرے پر اس کی بڑی بڑی روشن آنکھیں بہت نمایاں ہو گئی تھیں۔ عفت ان دنوں اتنی کمزور ہو گئی تھی کہ اس کے رخساروں کی ہڈیاں اُبھر آئی تھیں مگر وہ سب سے لاپرواہ اپنے بچے میں گم تھی۔

بہت ہی مشکلوں سے الیاس اُسے ڈاکٹر ربانی تک لے جانے میں کامیاب ہوئے تھے۔ بچہ کچھ بہتر تھا مگر عفت نیم مردہ سی ہو رہی تھی، "ڈاکٹر ربانی تمہارا ذہن پریشانیوں سے پاک کر دیں گے۔" الیاس اُسے سمجھاتے ہوئے کلینک کے اندر لے آئے۔ ڈاکٹر ربانی انھیں اپنے کمرے میں لے گئے۔ بچہ الیاس کی گود میں تھا۔ اس وقت اسے انجکشن دے کر سلا دیا گیا تھا۔ عفت بیڈ پر چپ چاپ لیٹ گئی۔ ڈاکٹر ربانی نے عفت سے اس کی ابتدائی زندگی اور ازدواجی زندگی کے بارے میں مختلف سوال کئے جس کے جواب وہ بہت نقاہت سے دیتی رہی۔ ڈاکٹر ربانی الیاس کو لے کر باہر آ گئے۔

"الیاس تمہاری بیوی کے بارے میں میرا پہلا اندازہ تقریباً غلط تھا تمہاری بیوی کے ذہن میں کسی جرم کا احساس پوشیدہ بیٹھا ہے۔ اس میں مدافعت کی قوت کم ہو رہی ہے۔ میں اُسے ہپناٹائز کر کے اس کا ذہن پڑھ سکتا ہوں۔ اگر تم چاہو تو تجربہ گاہ میں موجود رہ سکتے ہو۔"

تھوڑی ہی دیر بعد عفت کو تجربہ گاہ میں منتقل کر دیا گیا۔ اس نے کوئی حیل و حجت نہیں کی۔ وہ خاموشی سے بیڈ پر لیٹ گئی۔ ڈاکٹر نے ارد گرد کی بتیاں گل کر دیں۔ صرف ایک نیلی دھیمی روشنی کی ٹیوب جل رہی تھی۔ ڈاکٹر نے کرسی اس کے قریب کر لی: "عفت الیاس تم بہت تھک گئی ہو۔ اب آنکھیں بند کر کے چپ چاپ سو جاؤ۔" ڈاکٹر کے نیم تاریک ماحول میں ڈاکٹر کی سرگوشی گونجی۔ عفت نے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ ڈاکٹر متواتر دوہرا رہے تھے: "عفت تم سو گئی ہو، عفت تم بے خبر گہری نیند سو گئی ہو۔" عفت جلد ہی بے سدھ ہو گئی۔ "سنو عفت تم میری بات سن رہی ہو نا، جواب دو عفت۔" عفت کمزور سی آواز میں بولی،

"ہاں میں سب سن رہی ہوں۔"

"عفت میں تم سے جو بھی پوچھوں گا سچ سچ جواب دو گی۔ کسی بھی راز کو سینے میں پوشیدہ نہ رکھو گی۔ آج اپنا بوجھ اتار پھینکو گی۔"

"ہاں۔" عفت کی آواز جیسے کسی گہری سرنگ سے آ رہی تھی۔

"عفت سنو تمہیں بچے سے بہت پیار ہے نا اپنے دوسرے بچوں سے بھی زیادہ۔" ڈاکٹر ربانی اس کی آنکھوں پر نظریں جمائے دھیرے دھیرے کہہ رہا تھا۔ عفت کچھ لمحے خاموش رہی پھر آہستگی سے بولی، "نہیں مجھے بچے بھی اپنی گڑیا، اپنے گڈو جیسا پیارا ہے۔"

"مگر تم بچے کے لئے سب کو بھول جاتی ہو، اپنی ذات کو نظر انداز کر رہی ہو کیوں؟"

"میں بچے کے لئے خوفزدہ ہوں۔ اگر میں نے بچے کی دیکھ بھال ٹھیک سے نہ کی تو وہ مر جائے گا۔"

"موت اور زندگی پر تو کسی کو اختیار نہیں عفت بیٹی، یہ اندیشہ کیسا ہے تمہیں۔"

"بلال چچا بھی مر گئے تھے دمے کی تکلیف سے۔" اس کے لہجے میں اذیت کا پہلو تھا۔ الیاس کے لئے بلال چچا کا نام بالکل نیا تھا۔ اب عفت مکمل کر بات کئے جا رہی تھی۔ "پپو ہماری دلی خواہش کے خلاف اس دنیا میں آیا تھا۔ جس روز اس نے میری کوکھ سے جنم لیا میں خوش نہ تھی۔ میں نے بظاہر سرسری نظر سے پپو کو دیکھا مگر میں کانپ گئی۔ پپو کی صورت میں مجھے بلال چچا کی تصویر نظر آئی۔ پپو کی رنگت، پپو کی روشن بڑی بڑی آنکھیں اور سب سے بڑی بات اس کے بالائی لب پر دائیں طرف سنہری تل۔ پل بھر میں ہی وہ مجھے بلال چچا کی مکمل تصویر نظر آیا۔

"بلال چچا کا مکمل تعارف کراؤ عفت!" ڈاکٹر ربانی نے اسے ٹوکا۔

"مجھے ان کے صحیح رشتے کا علم نہیں۔ ویسے وہ میرے ابا کے بہت قریبی عزیز تھے۔ ہمارا گھر دو منزلہ تھا، اوپر ہم رہا کرتے تھے نیچے ایک کمرے میں ابا نے بیٹھک بنا رکھی تھی، دوسرے کمرے میں بلال چچا رہتے تھے۔ میں نے جب سے آنکھ کھولی انہیں اسی کمرے میں مقید دیکھا۔" وہ ایک پل کو خاموش ہو گئی۔

"تمہارے بلال چچا کافی دنوں سے بیمار تھے؟" ڈاکٹر ربانی نے کمرے کے سناٹے کو توڑا۔

"ہاں انہیں کافی دنوں سے سانس کی بیماری تھی، سردیوں میں ان کی تکلیف بہت بڑھ جاتی۔ ان کے سانس لینے کی آواز اوپر ہمارے دالان تک آیا کرتی تھی، مجھے خوف کے مارے نیند نہ آتی۔ اماں اور ابا بہت بڑبڑایا کرتے تھے۔"

"تمہارے والدین کا رویہ کیسا تھا بلال چچا کے ساتھ؟"

"بہت برا ---" وہ ایک لمحے کو چپ سی ہو گئی --- "وہ بیمار تھے اور تنہا بھی، مگر اماں نے ان کی خوراک کا کبھی بھی خیال نہیں رکھا۔ ابا بھی ان کے پاس کم ہی جاتے تھے۔ بچپن سے میرے دل میں ان کا اتنا خوف بیٹھ گیا تھا کہ گھر سے باہر جانے کے لیے میں ان کے کمرے کے سامنے والی ڈیوڑھی آنکھیں بند کر کے پار کرتی تھی۔ وہ ذرا سی آہٹ پاتے تو پکارتے --- عفت بیٹی، ایک پل کو ادھر آ کاکی! اور میں بنا سنے دبے پاؤں چل دیتی۔ دوپہر کو ابا گھر نہ ہوتے تو اماں میرے ہاتھ کھانا بھجوا دیتیں۔ وہ لمحے مجھے قیامت کے سے لگتے۔ بلال چچا کا رنگ اتنے دنوں تکلیف سہہ کر سیاہ ہو گیا تھا۔ ان کی آنکھیں کمزور سے چہرے پر اتنی بڑی لگتیں۔ میں کھانا دے کر جلدی سے لوٹ آنے کی فکر کرتی۔ وہ کہتے عفت! مجھے گلاس میں پانی دے جا! میں جلدی سے پانی گلاس میں انڈیلا اور بنا کچھ سنے بھاگ جاتی۔ ابا رات کو واپس آتے تو دوپہر کے کھانے کے برتن لے آتے۔ انہی برتنوں میں اماں رات کا کھانا ڈال دیتیں۔ بس تمام دن میں بلال چچا سے ہماری اتنی ہی ملاقات ہو پاتی۔" وہ کہتے کہتے رک گئی۔

"کہو عفت! سب کچھ کہہ ڈالو! ہاں! تم کہہ رہی تھیں کہ تم بلال چچا سے کتراتی تھیں!"

"ہاں ---!" اس کی آواز کانپ گئی --- "میں بڑی ہو گئی، خاصی سمجھدار بھی، مگر بلال چچا سے گریز میری فطرت میں رچ گیا تھا۔ ہمارے درمیان فاصلے بڑھتے ہی جا رہے تھے۔ پھر ایک روز گھر میں میرے رشتے کی بات چلی۔ چند ہی دنوں میں میری منگنی طے کر دی گئی۔ الیاس ہمارے قریبی رشتہ دار نہ تھے۔ مگر میں نے کسی تقریب میں انہیں دیکھا تھا۔ اپنی منگنی کی خبر سن کر میں لہرا اٹھی۔ رات کو میری سہیلیاں اکٹھی ہو گئیں ان دنوں بہت سردی تھی مگر ہم دالان میں بیٹھی ہنسی مذاق کر رہی تھیں میری سہیلیوں نے میرے ہاتھوں میں مہندی کے بڑے حسین بیل بوٹے بنائے۔ اور جب شرارت سے میرے منہ کو مہندی لگانے کو آئیں تو میں تیزی سے نیچے کو دوڑی۔ اس وقت میں نادانستہ طور پر بلال چچا کے کمرے میں گھس گئی۔ میں نے نظر اٹھائی۔ وہ اپنی چارپائی پر نیم دراز تھے ان کی آنکھیں ابلی سی رہی تھیں اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ میں نے انہیں اتنی ابتر حالت میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے ہاتھ سے حرکت کی۔ میں سہمی سہمی ان کے قریب چلی آئی ——

—— "عفی! یہ دوائی گلاس میں ڈال دے" وہ بہت کمزور ہو گئے تھے۔ یہ آواز بمشکل ان کے حلق سے نکل پائی۔ میں نے ایک پل دوائی کی طرف دیکھا اور پھر اپنے ہاتھوں کو، جن پر ابھی مہندی بالکل تازہ تھی۔ جانے وہ کونسا لمحہ تھا کہ میں اتنی پتھر ہو گئی! شاید اپنی خوشیوں کے ہجوم میں بلال چچا کی بے بسی بہت ہیچ لگی تھی۔ میں نے کچھ دیر سوچا، پھر پیچھے ہٹ گئی اور آہستہ سے باہر چل دی۔ دروازے کی طرف جاتے ہوئے میں نے یونہی دیکھا، وہ میری طرف تک رہے تھے۔ ان کی آنکھیں بہت روشن تھیں۔ میں خوفزدہ سی ہو کر چلی آئی۔ اوپر آ کر کتنی ہی دیر میرا دل لرزتا رہا۔ مگر رات کو جب میرے سسرال والے آ گئے تو میں سب کچھ بھول گئی۔ رات بلال چچا کے سانس کی آواز بھی نہ آئی۔ اور صبح جب ابا ناشتہ لے کر ان کے کمرے میں گئے تو بلال چچا مر چکے تھے۔ ابا کی چیخ پر میں اور اماں تیزی سے بھاگیں۔ میں دروازے میں ہی ٹھٹھک کر رہ گئی۔ ان

کی بڑی بڑی آنکھیں کھلی تھیں اور وہ ایسے ہی دروازے کی طرف تک رہے تھے۔ اس وقت میں پوری جان سے کانپ گئی۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا اور میں وہیں دہلیز پر ڈھیر ہو گئی۔

تین پہر کے بعد مجھے ہوش آیا تو میں جیسے سب کچھ بھول گئی تھی اس کے بعد بلال چچا مجھے کبھی یاد نہ آئے۔ بلال چچا کے کمرے میں اماں نے میرے جہیز کا سامان جمع کرنا شروع کر دیا مگر میں اس کمرے میں پھر نہیں جا سکی ——!"

عفت تھک گئی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر خاموش رہی۔ پھر خود ہی بولی ——" شادی کے بعد بھی میں بالکل پرسکون تھی۔ مگر پپو کی آمد نے میری دنیا اتھل پتھل کر دی۔ میں سمجھ گئی، پپو بلال چچا کی مضطرب روح ہے جو مجھ سے انتقام لینا چاہتی ہے۔ پپو میری کوکھ سے پیدا ہوا ہے مگر میں اس کی حفاظت اپنے جرم کے کفارے کے لیے کرتی ہوں؟"

عفت پھر خاموش ہو گئی۔ ڈاکٹر ربانی الیاس کے قریب آئے جو بالکل دم بخود سے بیٹھے تھے۔

"الیاس! عفت سخت کشمکش کا شکار ہے۔ وہ تھک بھی گئی ہے اس وقت اسے بیدار کرنا اور گھر لے جانا شاید اس کے حق میں بہتر نہ ہو عفت یہیں رہے گی!"

"ٹھیک ہے ڈاکٹر! یوں بھی یہ آج کئی ہفتوں کے بعد سوئی ہے ——!"

عفت بجری نیند میں خاموش سوتی رہی۔ پپو کو اس کے پہلو میں لٹا کر ڈاکٹر ربانی اور الیاس باہر آ گئے۔

"الیاس! کوئی بھی ذہنی مریض اپنی الجھن ایک ہی دفعہ اتنی تفصیل سے بیان نہیں کر دیتا۔ مریض کے ذہن کو جاننے کے لیے ہمیں بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔ مگر عفت بہت کمزور تھی اور پھر لاشعوری طور پر وہ یہ بوجھ اتار پھینکنا چاہتی تھی۔ تبھی وہ اپنا راز ایک دم ہم سے کہہ گئی ——!"

رات بہت سکون سے گزر گئی۔ عفت صبح ہی اٹھی اور وہ دونوں بچے کو لیے گھر آ گئے۔ پپو مکمل صحت یاب تو نہ ہو سکا مگر ان دنوں اسے کافی افاقہ تھا۔ الیاس عفت کو روزانہ ڈاکٹر ربانی کے کلینک لے جاتے۔ ڈاکٹر ربانی اپنی تمام تر قوت اور محنت صرف کر کے اس کے ذہن سے احساسِ جرم کو نکال رہے تھے۔ وہ مکمل طور پر مطمئن تو نہ تھی مگر اس کے ذہن کا بوجھ رفتہ رفتہ ہٹ رہا تھا۔ اب وہ الیاس سے کہتی ——

"الیاس! بلال چچا تو دماغی مریض تھے۔ اس وقت میرے دوا دینے سے وہ بچ تو نہ جاتے نا؟" —— اور الیاس اسے پیار سے لگا کر دھیرے دلاسے دیتا!

موسم تبدیل ہوا۔ سردی کی لہری دوڑ گئی اور پپو کی تکلیف عود کر آئی۔ وہ اس قدر بیمار تھا کہ ڈاکٹر جواب دے چکے تھے۔ جس روز اسپیشلسٹ نے مایوسی کا اظہار کیا تو وہ پاگل سے ہو گئے۔ گھنٹوں گم صم اس کے پاس بیٹھے باتیں کیا کرتے۔ مگر وہ آنکھیں کھولے جانے کہاں دیکھتا رہتا۔ عفت بہت پریشان تھی اور متواتر رونے سے اس کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔

ایک رات پپو کی حالت بہت بگڑ گئی۔ وہ درد سے بے حال ہو گیا تھا۔ الیاس اس کے سرہانے بیٹھے رو رہے تھے اور عفت اشکبار آنکھوں سے خدائے ذوالجلال کے حضور میں جھکی ہوئی تھی۔ اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ پپو چیخا ——"مما" —— وہ ایک دم اٹھ گئی۔ آج پپو نے کتنے ہی دنوں کے بعد بات کی تھی۔ اس نے اپنے خشک لبوں سے اسے پکارا تھا۔ وہ دوڑتی ہوئی اس کے قریب آئی۔ پپو نے اپنے ننھے بازو پھیلا دیئے۔ عفت نے اسے مضبوطی سے بھینچ لیا اور ماں کے سینے پر سر رکھے پپو نے بڑے سکون سے دم توڑ دیا ——!

کتنے ہی دن قیامت کے سے گزرے۔ عفت پاگلوں کی طرح دروازوں کی طرف دوڑتی۔ پپو کے ننھے ننھے کپڑے اپنی آنکھوں سے لگاتی اور چیخ چیخ کر بے دم ہو جاتی۔ جوں جوں دن گزرتے گئے شب و روز کی دھول اس کے غم پر پڑتی گئی اور وہ سنبھلتی گئی پپو کے چہلم کے دن وہ بہت ضد سے پپو کی قبر پر گئی۔ چھوٹے سے مٹی کے ڈھیر سے لپٹ کر وہ بری طرح رو دی ——" پپو! بلال چچا سے کہہ دینا میں ان کے امتحان میں پوری اتری ہوں۔ میں نے اس غفلت کی تلافی کر دی۔ میں ایک لمحہ بھی تجھ سے غافل نہیں رہی۔ انہیں کہہ دینا میں نے اپنے آنسوؤں سے اپنا گناہ دھو دیا ہے۔"

وہ قبر سے لپٹی روتی چلی گئی۔ الیاس نے اسے نرمی سے اٹھایا اور گاڑی کی طرف لے آئے ——" عفت ——!" وہ پیار سے بولے "دیکھو! پپو تمہارے ضمیر کی چبھن تھا۔ بلال چچا کی بے چین روح تھا آج تمہارا ضمیر صاف ہے اور بلال چچا کی روح پرسکون ہو گی۔"

عفت نے نم آنکھوں سے الیاس کو دیکھا اور سر جھکا کر گھر کی طرف چلنے لگی!



تحریر: رعنا فاروقی

تین عورتیں تین کہانیاں

میں بازاری

چند برس پہلے جب آپ ایک ہفت روزہ میں تھیں میں نے اپنی کہانی آپ کو بھیجی تھی جس کے چھپتے ہی آپ کے پاس سینکڑوں خطوط کا ڈھیر لگ گیا تھا۔ ملک کے کونے کونے سے ہمدرد بولوں کی مجھ پر بوچھار ہو گئی تھی، کوئی مجھے اپنانے پر آمادہ تھا۔ کسی کے دل میں مجھے بہن بیٹی بنانے کی آرزو بیدار ہو گئی تھی اور کوئی مجھے انسانیت کے ناطے اخلاقی سہارا دینا چاہتا تھا۔ یاد ہے نا آپ کو آپ یہ سارے خطوط جمع کر کے مجھ تک پہنچانے کے لئے بے چین تھیں تب آپ نے یہ سطور اپنے کالم میں شائع کی تھیں کہ شمع تم اپنا صحیح ایڈریس لکھو تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں۔ جواباً میں نے ڈرتے ڈرتے آپ کو اپنا ایڈریس بھیج دیا تھا اور کچھ دنوں بعد آپ کی جانب سے ایک رجسٹری مجھے ملا جس میں میرے نام لکھے گئے بے شمار خطوط اور آپ کا محبت نامہ تھا۔ آپ نے لکھا تھا شمع تم نے سینکڑوں مردوں کی فطرت کا مطالعہ کیا ہے۔ خدا نے تمہیں ذہین دماغ اور حساس دل دیا ہے۔ جس رشتے کو اپنے حق میں بہتر سمجھو ان لوگوں میں سے اس کا انتخاب کرو خدا تمہاری مدد کرے گا۔ میں نے یہ سارے خط سمیٹ کر اپنی الماری میں رکھ دیئے۔ اپنی ماں کی نظروں سے چھپا کر ان سب کو باری باری غور سے پڑھا۔ ہر طوائف کی طرح میرا ذہن مرد کی نیتوں کو عام عورت سے کہیں زیادہ پہچانتا ہے۔ شروع سے میں اعتماد نامی شے کی لذت سے ناآشنا رہی تھی۔ اس لئے مجھے یوں لگتا تھا کہ یہ خطوط کے لفظ محض ہمدردی کے وقتی جذبات کے تحت لکھے گئے ہیں۔ مجھے ہر خط کی ہر سطر جھوٹ بولتی دکھائی دے رہی تھی۔ جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو اپنے ایک دوست ندیم کا سہارا لیا۔ دوشیزہ کے قارئین میری کہانی کی بھول بھلیوں میں الجھ سے گئے ہوں گے کیونکہ جب تک انہیں پس منظر معلوم ہو یہ کہانی ان کے لئے پہیلی بن جائے گی۔ بقیہ داستانوں کے سنانے سے پہلے میں مختصراً وہ کہانی بتا ہی دوں جس کے چھپنے پر مجھے بے شمار خطوط بھیجے گئے تھے۔

میں ایک طوائف ہوں۔ میری ماں۔ نانی اور پرنانی سبھی بازار حسن کی زینت رہی ہیں۔ ان سب کی طرح میں بھی اپنے باپ کے بارے میں قطعی لاعلم ہوں لیکن اپنی فطرت کو دیکھتے ہوئے اس شخص کی یہ پہچان ضرور بتا سکتی ہوں کہ وہ حساس، خوددار اور طبعاً شریف آدمی ہوگا۔ شاید دوستوں کے مجبور کرنے پر پہلی بار



کوٹھے پہ آیا ہو گا۔ میری ماں کی بازاری اداؤں نے اسے لوٹ لیا ہو گا اور اس کی جنسی خواہش کی تکمیل میرا وجود بن گئی۔ شاید وہ اپنے اس فعل پر کبھی پچھتایا بھی ہو اور پھر پلٹ کر اس بازار کا رخ نہ کیا ہو۔ اپنے باپ کی فرضی تصویر میں نے اپنی طبیعت کو دیکھ کر کھینچی ہے، ورنہ بھلا ہم طوائف زادیوں کو اپنے باپوں کا پتہ کیسے مل سکتا ہے ہمیں صرف اپنی ماں اور اس کے بنائے ہوئے اصولوں کا علم ہوتا ہے۔ اصولوں کی ان زنجیروں میں ہمیں بچپن سے ہی جکڑ دیا جاتا ہے۔ میں شاید پندرہ سال کی ہوں گی جب ماں نے ڈھیروں خوشبوؤں اور قیمتی لباس میں لپیٹ کر مجھے موم کی مورتی کی طرح پھولوں بھری مسہری پر بٹھا کر میری رونمائی کرائی تھی، سب سے اونچی بولی دینے والے نے مجھے اسی رات خرید لیا تھا، اور تب میرے ذہن نے چیخ چیخ کر اس ظلم کے خلاف احتجاج کیا تھا ماں کی نظروں سے چھپ چھپ کر پڑھنے والے اخلاقی مضامین نے میرے اندر بغاوت کا پرچم بلند کر دیا تھا۔ مگر پرچم کے ہوس کے دیوانوں نے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اپنے قدموں تلے روند ڈالا۔ مگر وہ میرے اندر کی عورت کو طوائف نہ بنا سکے۔ میں نے جسم کو ایک سنہری پنجرہ تصور کر لیا جس کے اندر ایک بے بس مظلوم مینا قید ہے جو ہر خریدار کو آنسو بھری آنکھوں سے دیکھ کر رہائی کی بھیک مانگتی ہے۔ ماں میرے تیور پہچان گئی تھی۔ اس نے مجھے اولاد کی زنجیر میں جکڑ دینا چاہا۔ وہ چاہتی تھی کہ میں جلدی سے ایک بیٹی کی ماں بن جاؤں۔ تاکہ گھر میں ولی عہد آ جائے۔

میری ماں کا یہ خواب پورا نہ ہوا اس نے میرے مقدس بدن کے شہد میں ہوس کا زہر تو ملا دیا مگر اس سے ابھی اس آرزو کی تکمیل پوری نہ کر سکی بیٹی کی بجائے میں بیٹے کی ماں بن گئی۔ دوسرے سال پھر لڑکا ہو گیا۔ ماں کا چہرہ اتر گیا۔ وہ اداس کر دہ نظر آنے لگی اسے پریشان صورت دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی اور جب اگلی دفعہ میں حاملہ ہوئی تو مجھے یقین تھا اس دفعہ بھی میں اپنی ماں کو جلانے میں کامیاب ہو جاؤں گی۔ مگر پانسہ الٹا پڑا اور گھر میں ولی عہدہ آ گیا۔ میں بیٹی کی ماں بن گئی۔ ماں تو سیدھی مزار پر منت چڑھانے بھاگی اور میں نے رو رو کر آنکھیں سجا لیں بچی کو دیکھتی اور اس میں اپنا عکس ناچنے لگتا۔ ننھے ننھے پیروں میں گھنگرو بندھے دکھائی دینے لگے۔ وہ ہاتھ پیر ملتی اور میں اس میں رقص کے زاویے ڈھونڈنے لگتی۔ میری ماں کے چہرے پر کھوئے کھل اٹھے تھے۔ میں اس کو مسکراتا دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر کر سو گئی۔ سردی کی رات تھی۔ صبح تک بچی کھلی پڑی رہی۔ ماں تو مارے خوشی کے گھوڑے بیچ کر سو گئی تھی۔ اس نے بھی اٹھ کر بچی کو نہیں دیکھا اور اسے ٹھنڈ لگ گئی۔ ماں نے ڈاکٹر بلایا۔ دوائیں لیں جو میں نے چپکے سے پھینک دیں۔ ساری جھوٹی باتیں رہی کہ پلا دی۔ بچی نمونیے کا شکار تھی تو میری ناروا، آٹھ گھنٹے میں چٹ پٹ ہو گئی۔ ممتا کا درد دل میں ضرور اٹھا مگر اس خیال سے کتنی تسکین ملی کہ اب ماں دھواں دھار روئے گی۔ اور میری بچی مردوں کی ہوس کا ایندھن بننے سے بچ گئی کتنی خوش نصیب نکلی مجھ طوائف کی بچی جو اپنا پوتر جسم لئے قبر میں جا سوئی۔

بچی کی موت نے میری ماں کو یقین دلا دیا کہ میں بچی جنم دینے کے قابل نہیں ہوں وہ خوفزدہ ہو گئی تب اس نے پیسے کمانے کا نیا ڈھنگ سوچا اس نے میری خوبصورتی بیچنے کا نیا کاروبار ڈھونڈ نکالا۔ مجھے فلم اسٹار بنانے کے خواب دیکھنے لگی۔ میری بیس سال کی عمر تھی۔ ہر جوان لڑکی کی طرح میں اس آنگن کے خواب دیکھ رہی تھی جس میں ایک نیم کا پیڑ ہو گا جس کے تلے میرا شوہر اور میرے بچے بیٹھ کر کیرم بورڈ کھیلا کریں گے۔ میں نے کسی لان والی کوٹھی یا گاڑی کا سپنا نہیں دیکھا۔ ایک حفاظت اور محبت کرنے والا شخص تو شوہر کے روپ میں دیکھنا چاہتی تھی جو مجھے اس دلدل سے اور میرے معصوم لڑکوں کو عورتوں کا دلال بنانے سے بچا لے۔ مگر میری ماں مجھے شہر کی چکا چوند کر دینے والے ہال کی روشنیوں میں لے آئی۔ مجھے ڈراموں میں چھوٹے موٹے رول ملنے لگے۔ رفتہ رفتہ اچھے آرٹسٹوں میں شمار ہوا۔ لوگوں نے میرے فن کو (جو میرے روح کی آواز تھا) پسند کیا۔ کچھ رسالوں میں انٹرویو بھی آئے۔ میرے پرستاروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا اور میں اس چھوٹے سے شہر کی مشہور فنکارہ کہلانے لگی۔ ماں چاہتی تھی میری شہرت نگار خانوں تک پہنچے اور کوئی بڑا ڈائریکٹر مجھے اپنی KEEP بنا کر فلمی دنیا کا سب سے روشن ستارا بنا دے۔ یہ راستہ بھی مردوں کی سیج سے گزر کر جاتا تھا۔ پتہ نہیں مردوں کے اس خود ساختہ سماج میں عورت کو اس کی صلاحیتوں کے بل بوتے پر اونچا مقام ملنے کا کوئی ایسا راستہ بھی ہے یا نہیں جو ان کی ہوس کی گندگی سے ہو کر نہ جاتا ہو۔ میرا خیال ہے ایسا کوئی راستہ نہیں۔ عورت کا

سوا اس صورت کے اگر وہ کسی عورت کو اس کی صلاحیتوں کا صلہ نہیں دے سکتے، موجود جدوجہد کرے تو ایسا سمجھا جاتا ہے جو کہ ندیدی گیا ہو۔ عورت کچھ پانے کے لئے جدوجہد کرے تو بیشتر مرد اسے کوئی بی بی بنا ڈالتے ہیں۔ خیر میں کس بحث میں الجھ گئی۔ مختصراً عرض کروں کہ میں نے اس راستے پر چلنے سے انکار کر دیا مگر فن کو ترک بھی نہ کر سکی۔ ایک تو یہ میرے باغی جذبات کو تسکین دیتا تھا دوسرے یہاں ایک ندیم نامی لڑکا تھا۔ بہت سیدھا سادھا شریف شہر کے ڈرامائی حلقوں میں اس کی شخصیت جانی پہچانی حیثیت رکھتی تھی۔ اس نے بھی زمانے کی ٹھوکریں کھائی تھیں۔ اس کے ہر مکالمے میں ایک چیخ ہوتی تھی اور عجب اتفاق تھا میں نے جس ڈرامے میں بھی کام کیا اس کا اسکرپٹ رائٹر ندیم ہی ہوتا تھا۔ اس کے لکھے گئے مرکزی کردار میں، میں بالکل فٹ ہو جاتی تھی۔ یہ دبلا پتلا سا لڑکا مجھے اچھا لگنے لگا۔ میں اسے اپنے غموں کا واحد غمگسار سمجھنے لگی کہ شاید اسے میرے اندر لگے زخموں کا علم ہو گیا ہے تبھی ایسے مکالمے لکھتا ہے جسے سن کر میرے اندر کی عورت گھنٹوں سسکتی رہی ہے۔ مجھے بیک وقت اس سے عقیدت بھی تھی اور محبت بھی۔ ریہرسل کے بعد میں اس کے پاس جا کر بیٹھ جاتی اور گھنٹوں باتیں کیا کرتی۔ وہ مجھے کتابیں پڑھنے کو دیتا۔ مطالعہ نے میرے اندر اور گہرائی پیدا کر دی اور میں لاشعوری طور پر اس کے اور قریب آ گئی۔ لیکن جب بھی میں نے اس کے گھر چلنے کو کہا وہ ٹال جاتا۔ صاف گو آدمی تھا۔ اپنے گھر کے متعلق وہ ایک لفظ نہیں کہتا تھا کبھی پوچھتی تو مسکرا کر کہتا۔ تمہارا صرف مجھ سے واسطہ رہنا چاہیئے اور وہ بھی صرف ایک دوست کی طرح۔ جب اس کے جوابی التفات کو میں ترس گئی تو مجھے اعتراف ہے کہ میں نے اپنی بازاری اداؤں کا پٹارہ کھول دیا تاکہ ناز و ادا کے ناگ اسے ڈس کر میرا دیوانہ بنا دیں۔ ایک دفعہ میں ڈرامہ ٹیم کے ساتھ شہر سے باہر گئی۔ رات دو بجے ہمارا پروگرام ختم ہوا۔ لباس بدلنے کے لئے اپنے کمرے میں گئی اپنا اٹیچی کیس کھولا تو شراب کی بوتل پر نظر پڑی جو میں اپنے ساتھ لائی تھی۔ کارک کھول کر غٹاغٹ بوتل چڑھا لی۔ میرے برابر کے کمرے سے متصل ندیم کا کمرہ تھا۔ اسے پروڈیوسر کی ہدایت پر ڈرامے میں کچھ مزاحیہ مکالمے شامل کر دینے تھے، وہ کمرے میں مصروف تھا۔ میں نے دھڑ سے دروازہ کھول دیا اور وہ مجھے لڑکھڑاتے دیکھ کر سہارا دینے اٹھا تھا کہ میں نے اسے چپکا لیا اور بچوں کی طرح اس سے لپٹ کر رونے لگی۔ اپنے محروم بچپن کا عالم مجھے آج بھی یاد ہے جب کسی ضدی بچے کی طرح میں نے اس سے لپٹ کر آنکھیں بند کر لی تھیں اور وہ خود کو چھڑانے کی کوشش سے بے بس ہو کر مجھے بہلانے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ اس نے مجھے تھپکیاں دیں سر پر شفقت کا لمس جگایا اور میں بے خبر سو گئی۔ صبح آنکھ کھلی تو دنگ رہ گئی۔ میرے بستر پر ایک شکن تک نہیں تھی۔ نہ لباس بے ترتیب تھا۔ بلاؤز کا ایک ہک بھی کھلا ہوا نہیں تھا۔ ندیم کمرے میں نہیں تھا وہ ناشتے کی میز پر بھی نظر نہیں آیا پروڈیوسر صاحب نے بتایا وہ صبح اپنے کسی کام سے واپس چلا گیا ہے۔ مجھے اپنی حرکت پر بے حد پشیمانی محسوس ہوئی۔ گھر کا پتہ ہوتا تو معافی مانگ لیتی۔ تین دن سخت بے چین رہی چوتھے روز ڈاک سے مجھے اس کا خط ملا۔ لکھا تھا۔

”آپ اکثر میرے جذبات میں طوفان بن کر داخل ہونے کی کوشش کرتی ہیں۔ مگر یاد رکھئے ہر مرد عورت کی روح تک پہنچنے کے لئے اس کے جسم سے نہیں گزرتا۔ میرے نزدیک بعض جسم اتنے پاکیزہ حیثیت رکھتے ہیں کہ میں انہیں SEX کی آنچ دکھانا اپنی مردانگی کی سب سے بڑی ذلت سمجھتا ہوں۔ ہر چند کہ آپ کا تعلق ایک غلط ماحول سے ہے اور آپ نیلام گھر میں رکھی ہوئی مورتی ہیں، جسے ہر شخص چند لمحوں کے لئے خرید سکتا ہے مگر یقین کیجئے میرے نزدیک آپ کیچڑ کا وہ پھول ہیں جن کی آنکھوں میں حیا اور پاکیزگی جوں کی توں زندہ ہے۔ احترام کے رشتے کو برقرار رکھنے میں میری مدد کیجئے۔ میرا جسم میری بیوی کی امانت ہے جو میرے دو بچوں کی ماں اور میرے گھر کا سکون و قرار بھی ہے۔ امید ہے آئندہ آپ مجھے

اپنا دوست سمجھیں گی؟

فقط ندیم

اس خط نے مجھے ندامت کی جھیل میں ڈبو دیا۔ اس کے بعد وہ جب بھی ملا محبت اور خلوص سے اور میں نے اسے بھائی اور دوست کا مرتبہ دے کر آسمان کی بلندیوں پر بٹھا لیا۔ یہ پہلا شخص تھا جس نے مجھ طوائف کو لفظ اعتماد اور بے غرض محبت سے آشنا کیا۔ تب سے میں اپنی ہر بات میں اس سے مشورہ ضرور کرتی تھی۔ میری کہانی جب پرچے میں چھپی اور اس کے جواب میں لوگوں نے محبت اور ہمدردی کے پُل باندھے۔ تب میں نے وہ سارے خطوط ندیم کو دکھائے کہ دیکھو ندیم کتنے سارے لوگ مجھے سہارا دینے پر تیار ہو گئے۔ اب تم بتاؤ کہ ان میں با اعتماد شخص کون ہے۔ ندیم نے خطوط مجھ سے لے لئے وہ پانچ چھ روز تک ان خطوط کا بغور مطالعہ کرتا رہا اور مجھ سے مشورہ لینے کے بعد اس نے ایک سندھی نوجوان تاج محمد کو اپنے طور پر منتخب کر کے خط تحریر کیا۔ خط کے جواب میں تاج محمد مجھ سے ملنے حیدرآباد آ گیا۔ میں اس کی اس درجہ سنجیدگی پر حیران ہو گئی۔ وہ بہت نامور سندھی زمیندار خاندان کا لڑکا تھا۔ دیکھنے میں بہت خوبرو اور مرعوب کر دینے والا۔ میں نے اسی روز ندیم کو بلوا لیا۔ ندیم نے اسے میرے متعلق ہر وہ بات بتا دی جسے بتانے کی میں اپنے طور پر قدرت نہ رکھتی تھی۔ تاج اپنے جذبے میں سچا تھا۔ اس نے اسی روز نکاح کی پیش کش کی۔ ندیم نے بھائی ہونے کا پورا پورا ثبوت دیا۔ بڑی رازداری سے میرا نکاح ہو گیا اور میں چکلے کے دوزخ سے نکل کر اس کے دل کے گلشن میں آ بسی۔ آپ کو معلوم بھی نہیں ہوگا کہ نکاح والے دن میں نے آپ کو صدق دل سے کتنی دعائیں دے ڈالی تھیں۔ ندیم اور آپ بس یہی دو دوست تھے جنہوں نے عملی طور پر میرا ساتھ دیا اور میں اس جہنم سے نکل سکی۔ تاج مجھے اپنی حویلی میں لے گیا۔ اس کے گھر میں سے کوئی اس شادی سے خوش نہیں تھا خاص طور پر اس کے سوتیلے بھائی اس کے شدید دشمن بن گئے۔ ادھر میری ماں میری خوشی کے صدمے کو برداشت نہ کر سکی۔ دمے کی مریضہ تو تھی ہی۔ چھ مہینے میں وہ اللہ کو پیاری ہو گئی۔ تاج نے مجھے شہزادیوں کی طرح رکھا اور میں نے باندیوں کی طرح اس کی خدمت کی۔ میرے دونوں بچوں کو اس نے ہوسٹل میں داخلہ دلوا دیا۔ تاج بڑی لاابالی طبیعت کا آدمی تھا۔ وہ بچپن سے یورپ میں رہا تھا۔ اس کے باپ نے بیوی کے مرنے کے بعد اپنے بیٹے کو یورپ بھیج دیا تھا کہ وہ اس کی دوسری بیوی اور سوتیلے لڑکوں کی دشمنی کا نشانہ نہ بن سکے۔ دس سال بعد باپ کا انتقال ہو گیا۔ جائیداد کی تقسیم ہوئی۔ تاج کو پاکستان آنا پڑا۔ اس نے بھائیوں سے اپنی جائیداد چھڑوائی وہ اسے اپنے جال میں پھنسانا چاہتے تھے لیکن تاج نے مجھ سے شادی کر لی اور ان سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اس صورت میں اس کے سوتیلے بھائیوں کی دشمنی کا اندازہ آپ لگا سکتے ہیں۔ تاج ان سے ملنا نہیں چاہتا تھا لیکن وہ حویلی میں آتے تھے اور مجھے خونی نظروں سے گھورتے کہ موقع ملے تو کچا چبا جائیں۔ مگر میں اندر سے پُرسکون تھی کہ تاج میرا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔ ایک بار ندیم مجھ سے ملنے آیا۔ میرے اور تاج کے لئے تحفے بھی ساتھ لایا۔ تاج نے اسے میرا بھائی سمجھتے ہوئے خوب خاطر مدارات کی۔ وہ صرف ایک روز رہا اور مجھے ڈھیروں دعائیں دے کر رخصت ہو گیا۔ میں نے چلتے وقت اس سے وعدہ لے لیا تھا کہ ہر مہینے مجھ سے ملنے آیا کرے تاکہ بہن کو یہ احساس ہو سکے کہ اس کے میکے میں کوئی تو ہے۔ میں نے اپنی زندگی کی ساری محرومیوں کا مداوا کر لیا تھا۔ بھائی بھی مل گیا۔ نیک محبت کرنے والا شوہر بھی پا لیا۔ اور بچوں کی تعلیم و تربیت بھی شریفانہ انداز سے ہو رہی تھی۔ اب ان کا مستقبل بھی محفوظ تھا — ندیم چلا گیا اور میں مطمئن تھی کہ تاج نے اسے میرے بھائی کی حیثیت سے قبول کر کے اسے بہت عزت بخشی۔

کوئی چھ روز بعد تاج زمینوں پر گیا۔ وہاں سوتیلے بھائیوں سے کسی بات پر تنازعہ ہو گیا وہ لوگ موقع کی تلاش میں تھے اپنے مزارع سے گولی چلوا دی جو اس کے دل میں پیوست ہو گئی۔ جس دل میں میں آباد تھی وہ پل بھر میں مردہ ہو گیا۔ وہ مر گیا۔ میری محبت مر گئی — میری خوشیاں مر گئیں اور میرے لئے ساری کائنات مر گئی — اس کی خون میں ڈوبی ہوئی لاش میری نظروں میں جب بھی گھومتی ہے۔ مجھے ساری دنیا گھومتی نظر آتی ہے۔ تقدیر کا یہ وار بہت بھیانک تھا۔ ایک ہفتے تک میرے ہوش و حواس معطل رہے۔ ان درندوں نے حویلی میں آ کر ایک ایک قیمتی شے اٹھوا لی۔ اور اب یہاں صرف میں تنہا روح کی طرح رہ گئی تھی تب کچھ دنوں بعد وہ چاروں درندے آدھی رات کے وقت نشے میں دھت آئے۔ میری حالت اس قیدی جیسی

ہو گئی تھی جو اندھیری کوٹھری میں بیٹھا اپنے پھانسی والے دن کا انتظار کر رہا ہو۔ وہ دن آ گیا جب انہوں نے نشے کی حالت میں مجھے توڑنے پھوڑنے کا اذیت ناک کھیل شروع کیا۔ میں جیسے اس گیند کی طرح ہو گئی جس سے بہت سارے بچے ایک ساتھ کھیلتے ہیں۔ ان کی ہوس کے نئے نئے بھیانک انداز مجھے کرچی کرچی کر گئے۔ اور اس طرح مجھے ایک بار پھر یہ سزا دی گئی کہ میں ایک طوائف زادی تھی۔ جاتے وقت وہ لوگ حویلی کے دروازے بند کر گئے تاکہ ہر رات یہ کھیل دہرایا جا سکے۔ میری زندگی انتہائی بدتر ہو کر رہ گئی۔ کھانے پینے کی چیزیں شام کو پہنچا دی جاتیں مجھے ہدایت دی گئی تھی کہ بن سنور کر ان کا استقبال کروں۔ وہ دس دن مجھے دس صدیوں کے برابر لگتے ہیں جب وہ چاروں گدھ میری لاش کو نوچا کرتے تھے۔ میرے بھاگنے کے سارے راستے مسدود تھے۔ حویلی کے باہر تالا ڈال دیا تھا۔ دیکھنے والے سمجھتے ہوں گے کہ اب یہاں کوئی نہیں رہتا۔ مجھے علم نہیں تھا کہ میرے بچے کیسے ہیں ہوسٹل کی فیس نہ گئی ہو گی تو ان کے ساتھ وہاں کیا سلوک ہوا ہو گا۔ واہ میرے رب تو نے مجھے شریفانہ زندگی بسر کرنے کے خواب کی کیسی سزا دی تھی۔ صرف ایک آس زندہ تھی کہ شاید ندیم آ جائے۔ اس نے ایک ماہ بعد آنے کا وعدہ کیا تھا اور ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اس نے اپنا وعدہ نہ نبھایا ہو۔ میں کرسیاں گھسیٹ کر روشندان کے پاس لے جاتی اور انہیں میز پر جا کر اتنا اونچا کر لیتی کہ باہر جھانک سکوں۔ میرا صرف یہ مشغلہ رہ گیا تھا اور یہ محنت رائیگاں نہیں گئی۔ دسویں روز ندیم آ گیا۔ وہ دروازے پر تالا دیکھ کر واپس لوٹ رہا تھا کہ مجھے نظر آ گیا۔ میں نے اسے زور سے آواز دی۔ وہ حیرانی سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ بالآخر میں اسے یہ بتانے میں کامیاب ہو گئی کہ میں زندہ ہوں اور باہر تالا ڈال دیا گیا ہے۔ ندیم کھڑکیوں پر پیر رکھ کر چھوٹی چھت پر چڑھا۔ وہاں سے بالکونی تک پائپ کے سہارے اوپر آیا اور خدا جانے کس طرح وہ صحیح سلامت چھت پر پہنچ گیا۔ زینے پر اندر کی طرف سے وزنی تالا ڈالا ہوا تھا۔ میں نے تالا توڑنے کی پہلے بھی خاصی کوشش کی تھی مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ ندیم نے مجھے رسی ڈھونڈنے کا کہا۔ میں نے چارپائی کی ادوائن کھول کر اس میں چھوٹا سا پتھر لپیٹ کر اوپر پھینکی۔ وہ چار دفعہ کی ناکامی کے بعد ندیم نے اسے دبوچ لیا۔ اس کے سہارے وہ صحن میں اتر گیا۔ میں نے آنسوؤں اور ہچکیوں کے دوران اسے پوری داستان سنائی۔ حویلی کے پچھواڑے ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی جسے مقفل کر دیا گیا تھا۔ ندیم نے اوپر چڑھ کر اس کا تالا توڑ ڈالا۔۔۔ اور اس راستے سے مجھے اتار کر باہر لے آیا۔ بستی سے یہ حویلی خاصی دور تھی اللہ کا شکر ہے کسی نے ہمیں بھاگتے نہیں دیکھا۔ ورنہ چپے چپے پر ان کے لوگ بکھرے ہوتے تھے۔ بس یا ٹرین میں بیٹھتی تو دھر لی جاتی تیس میل تک ہم دونوں پیدل چلے۔ تب جا کر خطرہ دور ہوا اور میں پھر واپس اسی مقام پر آ گئی جہاں سے یہ داستان شروع ہوئی تھی۔ ندیم کی یہی مہربانی بہت تھی کہ اس نے مجھے صحیح سلامت شہر پہنچا دیا۔۔۔ میں اس پر بار گراں کیوں بنتی۔۔۔ سوچتی ہوں دنیا میں اچھے لوگ ضرور ہیں۔ تاج جیسے ندیم جیسے۔۔۔ اور آپ جیسے مگر جس کی تقدیر اچھی نہیں ہوتی وہ سدا آہنی دیواروں سے سر پھوڑتے رہتے ہیں اپنی سہیلی کے یہاں قیام ہے مگر کب تک۔ بچوں کو ہوسٹل سے بلانا پڑے گا۔ قرض لے کر ان کی فیس بھر دی ہے۔ سوچتی ہوں پھر گھنگھرو باندھنے پڑیں گے۔ سلمیٰ سچ ہی کہتی تھی کہ طوائف زادیوں کو شریفانہ زندگی قبول نہیں کرتی۔ بار بار گھنگھرو باندھنا، بیچنے کے لئے بدن سجانا چاہا مگر تاج کی آواز کانوں میں گونجنے لگتی ہے وہ کہتا تھا صنو بعض بدن خدا نے عبادت کے لئے بنائے ہیں۔ میں نے دنیا بھر میں سیکڑوں عورتیں دیکھی ہیں مگر کسی کو دیکھ کر اس کی پوجا کرنے کو جی نہیں چاہتا تجھے دیکھ کر دل چاہتا ہے تیرے بدن کی پوجا کی جائے کتنے ذلیل ہیں زمانے والے جنہوں نے تیری روح اور تیرے جسم کو پامال کیا۔۔۔

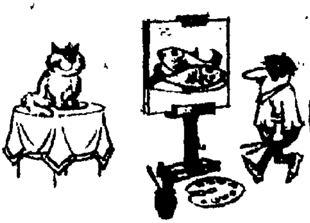
اور پھر میرے ہاتھ گھنگھرو دور پھینک دیتے ہیں۔ کچھ نوچ پھینکتی ہوں۔ میں غلط جگہ پیدا ہو گئی تو کیا ساری عمر اسی گندگی میں لتھڑی رہوں۔ ایسا نہیں ہو گا۔۔۔ ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ مجھے تاج کا انتظار کرنا ہو گا۔۔۔ اگر بھوک مجھے مار بھی دے گی تو اس کا احسان ہو گا۔ لڑکوں کا کیا ہے زمانے کی ٹھوکروں میں ہی پل کر جی لیں گے۔ شراب پر پابندی لگانے والو۔۔۔ نائٹ کلب کو بند کرنے والو ذرا ان بالا خانوں پر آ کر دیکھو کہ تمہاری ہوس نے کیسے کیسے معصوم چہروں کو مکروہ بنا ڈالا ہے۔ کیسے کیسے نازک پھولوں کو آگ میں دھکیلا ہوا ہے۔ اگر کوئی کروڑوں میں ایک تاج بننا چاہتا ہے تو اسے تم [illegible] نہیں رہنے دیتے۔ آخر ہم کہاں جائیں۔ کس کو فریاد سنائیں۔ کیا ہم سب کا خالق یہ تماشا اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھتا ہو گا۔؟

ش۔ع ۔۔۔ حیدر آباد

چار لڑکوں کے بعد میرے پیدا ہونے پر بہت خوشیاں منائی گئیں۔ یوں تو بچے اکثر ماں باپ یا رشتے داروں میں کسی ایک کی صورت لے کر پیدا ہوتے ہیں لیکن مجھے دیکھ کر دادی بوکھلا گئی تھیں۔ "ہائے یہ لڑکی ہے یا لڑکا؟ میرے جبار کی ہو بہو ہی شکل صورت تھی۔" جبار دادی کا سب سے بڑا بیٹا تھا جس کا دس سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ دادی نے اس کی پرورش بڑے ناز و نعم سے کی تھی۔ اس لیے اس کی تصویر ان کے دل میں گڑی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر بے ساختہ ان کے منہ سے یہی نکلا تھا کہ یہ تو دوسرا جبار ہے۔ میری اماں کو ساس کی یہ بات بڑی لگی کہ ننھی بچی کو مردوں سے تشبیہ دے رہی ہے لیکن بعد میں دوسرے بزرگوں نے بھی اس کی تصدیق کر دی کہ بچی ہو بہو لڑکا نظر آ رہی ہے۔ مجھ میں لڑکیوں والی ملاحت نام کو نہیں تھی۔ ہاتھ پاؤں بالکل مردوں جیسے نظر آتے تھے۔ دونوں بھنویں گھنی اور جڑی ہوئی تھیں، چہرے پر روؤں بھی خاصا تھا۔ پہلی نظر میں دیکھ کر سب لڑکا ہونے کا دھوکا کھا جاتے۔ اور میری اماں کو یہ بات بہت بری لگتی۔ میں ان کی اکلوتی بیٹی تھی وہ چاہتی تھیں مجھے بنا سنوار کر گڑیا کی طرح رکھیں لیکن مجھ پر کپڑے سجتے نہیں تھے۔ اماں ڈیڑھ سال تک میرے لیے جھک مارتی رہیں۔ اس کے بعد اللہ میاں نے انہیں اوپر تلے دو بیٹیاں اور دے دیں۔ دونوں کی دونوں خوبصورت نکلیں اماں کے چاؤ چونچلے ان پر نکلنے لگے۔ مجھے بدصورت کھلونا سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا۔ میرے ابا میاں اسکول ماسٹر تھے۔ اپنے کام کی تھکن میں میں انہیں یاد بھی نہیں رہتا تھا کہ اب ان کے کتنے بچے ہو چکے ہیں۔ اولاد کون سی جماعتوں میں پڑھ رہی ہے۔ کبھی موڈ ہوتا تو وہ سب کو ایک لائن سے بٹھا کر ان کا تعلیمی حال احوال پوچھ لیا کرتے تھے۔ ورنہ سب خود ہی لوٹ پوٹ کر پلے بڑھے اور اپنے اپنے روزگار میں لگ گئے۔ دو بھائیوں نے صابن سازی کا کام شروع کر دیا جب کام چل نکلا تو اماں نے ان کی شادیاں کر دیں۔ اپنی اپنی بیویوں کو لے کر وہ الگ ہو گئے۔ ان سے چھوٹے دو بھائی اپنی تعلیم پوری کر کے ملازمت ... ایک لاہور چلا گیا تاکہ وہاں کام کے ساتھ ساتھ اپنی تعلیم بھی مکمل کر سکے اس سے چھوٹے کو ابا میاں نے اپنے اسکول میں ہی لگا لیا تھا وہ آگے پڑھنے کی تیاریاں بھی کر رہا۔ رہ گیا میرا مسئلہ تو اس کا حل کسی کے پاس نہیں تھا۔ میری دونوں چھوٹی بہنیں خوش شکل تھیں۔ خاندان کے سب لڑکے ان سے بیاہ کے خواہشمند تھے۔ میری منگنی کی ہر کوشش ناکام ہو چکی تھی۔ جو مجھے دیکھنے آتا زیر لب مسکراتا واپس لوٹ جاتا کیونکہ بقول خلق خدا مجھ میں نسوانیت نام کو نہیں تھی۔ چودہ سال کی عمر میں میرے ہونٹوں کے اوپر گھنے روئیں نکل آئے۔ قد نکلتا ہوا تھا، آنکھیں چھوٹی اور گہری۔ بھنویں مردوں کی طرح گھنی اور جڑی ہوئی۔ کندھے چوڑے جسم سپاٹ اور قد دن بدن اونچا ہو رہا تھا۔ لوگ دیکھ کر کہتے تھے۔ یہ کیا قصہ ہے؟ آواز تک میں نسوانیت نہیں تھی۔ اماں کہتی تھیں "بچپن میں تھوڑی بہت آواز کانوں کو بھلی لگتی بھی تھی جوں جوں بڑی ہو رہی ہے بھاڑی کرخت جیسی آواز ہوتی جا رہی ہے۔" بھلا میرا اس میں کیا قصور تھا جیسا اللہ میاں نے چاہا بنا دیا۔ اسکول میں کوئی لڑکی مجھے سہیلی بنانے پر راضی نہیں ہوتی۔ استانیاں بھی مجھے دیکھ دیکھ کر ہنستی تھیں جبکہ ذہانت میں میرا سب سے آگے نمبر تھا۔ مجھ میں دن بدن شدید احساس کمتری ہوتا گیا۔ شادی بیاہ کی تقریبوں میں جانے سے گھبراہٹ ہونے لگتی۔ وہاں میرا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ اس لیے جانا ہی چھوڑ دیا۔ ملبوسات کا شوق پیدا ہی نہیں ہوا۔ چہرہ اور جسم اچھا ہو تو شوق خود بخود جنم لیتا ہے یہاں تو انگوٹھی بھی بھدی لگتی تھی۔ اماں مجھے دیکھ دیکھ کر متفکر رہنے لگیں۔ مجھے زمانے کے رویے نے تنہائی پسند بنا دیا۔ کتابوں کے سوا کسی بھی چیز سے تعلق دلچسپی نہیں رہی۔ ہاں ایک شخص تھا سلیم میرا دل چپکے ہی چپکے اس کی راہ پر جا کر ٹکتا تھا۔ میرا ماموں زاد بھائی تھا اور بچپن سے اس کا نام میرے ساتھ لیا جاتا رہا تھا۔ اماں کہتی تھیں "بھائی میری بات نہیں ٹال سکتا۔ ان شاءاللہ کسی دن سلیم سے شادی کر دوں گی۔" سلیم کی ماں اپنی نند کو بہت چاہتی تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے برے دنوں میں اماں نے بھائی کی مالی امداد کی تھی جس کی وجہ سے وہ دونوں میاں بیوی ہم لوگوں کے احسان مند تھے اور اماں کو یقین تھا کہ ان کی بے ڈول بھدی بچی کو سلیم میاں ہمیشہ اپنا لیں گے۔ میں نے اپنی تنہائیوں میں سلیم کو بسا لیا۔ اس کی تصویر کتابوں میں چھپائے رکھتی۔ پڑھتے پڑھتے تصویر کو دیکھ کر آہیں بھرا کرتی۔ مجھے کوئی دن ایسا یاد نہیں جب میں نے اس کی تصویر کو نہ چوما ہو۔ وہ بی۔ اے کے بعد لاہور میں کپڑے کی مل میں ملازم تھا۔ اماں اس

مو قع کی تلاش میں تھیں جب اس سے میرے رشتے کی بات چیت کی جائے۔ اتفاق سے میری چھوٹی بہن کا ایک اچھا رشتہ آگیا۔ اماں نے اپنے بھائی سے رائے مانگی تو وہ کہنے لگے "چھوٹی سے پہلے بڑی کی فکر لازم ہے۔" اماں کو موقع مل گیا۔ کہنے لگیں "تم جانتے ہو میں نے بچپن سے راشدہ کے لیے سلیم کا سوچا ہوا ہے۔ بھلا پھر مجھے اس کی فکر کیوں ہونے لگی۔" ماموں کہنے لگے "میری طرف سے آج ہی شادی کردو۔ اس کی ماں تو راضی ہے لیکن سلیم کے ابا کا کچھ پتہ نہیں۔ جوان بچہ ہے اس سے بھی بات کرلو تو رسم کی تاریخ مقرر کرلیں گے۔" یہ خبر میرے کانوں میں بھی پہنچی۔ ملنے جلنے والوں کی زبانوں سے ہوتی ہوئی اسکول تک پہنچی۔ لڑکیوں نے تو میرا مذاق بنالیا۔ ہر طرف سے یہی آوازیں آنے لگیں "ہائے اللہ اب تو مردے مردوں سے شادیاں کرنے لگے۔" اپنی تضحیک پر دل خون کے آنسو روتا۔ اپنے بنانے والے پر غصہ آتا مگر خدائی فیصلوں پر کس کا بس چلتا ہے۔ مجھے آئینہ نے کبھی خوش نہیں کیا تو دوسرے مجھے کیا پسند کرتے۔ صرف ایک سلیم کا سہارا تھا کہ بچپن سے وہ میرا منگیتر تھا۔ اور اس نے کبھی میرے متعلق ایسی کوئی بات نہیں کی تھی جو میرا دل توڑتی۔ امی نے ماموں پر زور دیا کہ بڑی کی وجہ سے چھوٹی کا رشتہ ہاتھ سے نکل رہا ہے۔ تم اپنی طرف سے ہاں کردو تاکہ پہلے بڑی کی بات پکی ہونے کی خبر مشہور ہوجائے۔ ماموں اور ممانی نے ہاں کردی۔ دونوں طرف سے انگوٹھیوں کا تبادلہ بھی ہوگیا اور اس سے اگلے ہفتے چھوٹی بہن کی منگنی کی رسم بھی ادا ہوگئی۔ میرا پندرھویں سال میں قدم تھا۔ لڑکیوں کی طرح شرمانے کے دن تھے مگر دوسروں نے مجھے اتنا تنگ کیا، اتنا مذاق اڑایا کہ میں نے ڈر کے مارے انگوٹھی کسی کے سامنے پہنی ہی نہیں یا کبھی میں پہنی تو ہاتھ بھی ہنسنے لگے۔ اپنی بدصورتی کی نمائش پر جھنجھلا کر آدھی اور پھر رونا آگیا۔

چھوٹی بہن کی شادی کی تاریخ مانگی جارہی تھی اس کے سسرال والے چکر پر چکر لگارہے تھے۔ اماں چاہتی تھیں کہ ماموں بھی تاریخ لینے آئیں کیونکہ میرے بڑے بھائیوں نے کہہ دیا تھا کہ دونوں کی شادی ایک ساتھ ہوجائے تو وہ خرچ برداشت کرلیں گے۔ مگر ماموں ٹال رہے تھے۔ آخر اماں کو کھل کر بات کرنا پڑی تب ممانی اٹھ جانے لگیں بولیں "آپا میرا بس اللہ ہی نہیں چلتا اگر آپ سمجھا سکیں تو سمجھالیں سلیم نے شادی سے انکار کردیا ہے وہ کہتا ہے زبردستی کی تو گھر کا منہ نہیں دیکھوں گا۔" میری اماں بچاری سناٹے میں آگئیں۔ اگر یہ بات مشہور ہوجاتی تو دوسری کی منگنی ٹوٹنے کا بھی خدشہ موجود تھا۔ ایک لڑکی کالی تو تھی دوسری بہن کے لیے



بھی مصیبت ہوجاتی ہے۔ وہ آنسو بہاتی واپس آگئیں۔ ابا میاں کو حقیقت بتائی۔ ابا میاں دو ٹوک قسم کے آدمی تھے۔ بولے "جب لڑکا ہی نہیں مانتا تو کوئی زبردستی کیسے کرسکتا ہے۔" اماں بولیں "تم سلیم کو ایک دفعہ گھر بلالو تو میں اسے خود منالوں گی۔" ابا میاں گھبراہٹ سنبھال کر بیٹھ گئے۔ سلیم کو بہانے سے خط لکھا کہ تمہاری پھوپی بیمار ہیں۔ چاہے ایک دن کی چھٹی لے کر آجاؤ۔ انکار مت کرنا۔

سلیم ایک دن کی بجائے ایک ہفتے کی چھٹی لے کر آیا۔ دوسرے روز ہمارے گھر آیا۔ اماں کی باچھیں کھل گئیں کہ ابھی تک اس کے دل میں ہمارے لیے محبت اور ہمدردی کے جراثیم موجود ہیں۔ بدقسمتی دیکھیے کہ دالان میں سب سے پہلے میں ہی کھڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ قہقہہ مار کر ہنسا کہنے لگا۔ "ارے راشدہ یہ لوگ تمہاری شادی مجھ سے کرنا چاہتے ہیں تم نے تو آئینہ ہزار بار دیکھا ہوگا خود کیوں نہیں انکار کردیتیں اس شادی سے۔ کہہ دو میں پھٹیچر عورت نہیں ہوں —" یہ کہہ کر وہ انتہائی بےہودگی سے ہنسنے لگا۔ میں قسم کھاتی ہوں اگر اس وقت میرے پاس پستول ہوتا تو اس کی ساری گولیاں اس کے سینے میں اتار جاتی۔ اس نے میری محبت، میری عقل اور عبادت تا چاہت کا مذاق اڑایا تھا۔ میں نے آنسو چھپا کر ہونٹوں پر چپ کی مہر لگالی۔ بیچاری میری اماں کو بے حد صدمہ ہوا جب سلیم نے انہیں صاف صاف کہہ دیا کہ راشدہ میں کوئی ATTRACTION نہیں ہے۔ اگر آپ چاہیں تو زبیدہ (سب سے چھوٹی بہن) کا رشتہ میں خوشی سے قبول کر لوں گا۔" اماں اور ابا میاں چپ کے چپ رہ گئے۔ میں نے دو دن کی لگاتار محنت سے اپنے ہاتھوں پیروں کا میل صاف کیا تھا۔ چہرے پر قیمتی کریم کی پوری شیشی خالی کی تھی۔ آنکھوں میں شہد کی سلائیاں پھیر لی تھیں۔ ہاتھ پاؤں ابٹن سے اجلے کیے تھے۔ یہ سب رائیگاں گیا۔ وہ میرے چہرے اور قدرت پر تھوک کر چلا گیا کہ پہلے آئینہ دیکھو پھر ایمان سے بتانا تم سے کوئی مرد شادی کرسکتا ہے یا نہیں۔ [illegible]

بیٹے ... سلطانہ ایف بی منزہ سے پاؤں پاشس
ہو گیا۔ تنہائیوں نے مجھے پھر سے گھیر لیا۔ مگر نئی نوشتے کی خبر دُور دُور تک پھیل گئی۔ لڑکوں کی نگاہوں اور تمسخر انہ فقروں نے میری روح چھید ڈالی۔ اسکول کے نام سے مجھے وحشت ہونے لگی۔ اماں سے کہہ دیا "اماں مجھ سے اب نہیں پڑھا جائے گا، لڑکیاں میرا مذاق اڑاتی ہیں۔" اماں کی آنکھیں بھر آئیں۔ مجھے سینے سے لگا لیا۔ کہنے لگیں "خدا نے پتہ نہیں مجھ سے کون سے گناہ کا بدلہ لیا ہے جو تجھے یہ رسوائیاں اٹھانی پڑیں۔ اب اپنی جان کی دشمن مت بن۔ اگر پڑھائی بھی چھوڑ دی تو بتا کون تجھے روٹی کھلائے گا۔ باپ کی آنکھ بند ہوتے ہی اپنے سب پرائے ہو جاتے ہیں۔ کوئی عمر بھر اپنی دہلیز پر رکھنے کو تیار نہیں ہوگا۔ پڑھ لکھ کر استانی بن جانا۔ اپنا بوجھ خود اٹھا لینا۔" میری سمجھ میں بات آ گئی۔ پھر سے کتابوں کی گرد جھاڑی اور پڑھائی میں جت گئی۔ میٹرک فرسٹ ڈویژن میں کیا۔ انٹر سائنس کا امتحان بھی اچھے نمبروں سے پاس کیا۔ اگر مالی وسائل ساتھ دیتے تو ڈاکٹری میں آسانی سے داخلہ مل جاتا۔ ایف ایس سی کے بعد بی ٹی میں داخلہ لے لیا اور رزلٹ نکلتے ہی مجھے اسکول میں ملازمت مل گئی۔ اماں کے سینے سے بوجھ ہٹ گیا۔ دونوں چھوٹی بہنوں کی شادیاں کر دی گئیں لیکن پہلے زبیدہ کا رشتہ سلیم سے کر رہی تھیں لیکن میں نے ان سے کہہ دیا اگر آپ نے یہاں رشتہ کیا تو میں بوڑھیاں پیس کر پی جاؤں گی۔"

آپ ذرا خود انصاف کریں کہ سلیم اس گھر کا داماد بن کر پھر دندناتا ہوا گھر میں داخل ہوتا اور میں جو بچپن سے اس کی پوجا کر رہی تھی اسے زبیدہ کے ساتھ ہنستا مسکراتا کیسے دیکھ سکتی تھی۔ میری خالہ ساس نے میرے دل کی آگ دیکھ لی اور انہوں نے زبیدہ کی دوسری جگہ بات پکی کر دی۔ سلیم کے ماموں خاصے برہم ہوئے مگر اماں نے کہلوا دیا کہ راشدہ سے سلیم کی مرضی نہیں تھی اور سلیم سے زبیدہ نے شادی کے لیے انکار کر دیا ہے۔ آپ کو اپنے لڑکے کی خوشی عزیز ہے اور مجھے اپنی لڑکی کی۔"

اماں نے میرے کلیجے میں سلگتی آگ کو تھوڑا سا ٹھنڈا کر دیا تھا۔ مگر کبھی کبھی میں یہ بھی سوچا کرتا تھا کہ سلیم کو ایسا مزہ چکھاؤں کہ وہ عمر بھر یاد کرے۔ اپنی بے بسی پر کڑھ کر رہ جاتا اب مقدر تھا اس لیے چپکے چپکے رو لیتی۔

اس دوران میرا قد پانچ فٹ چھ انچ سے بھی اونچا ہو گیا۔ لڑکیوں والی کوئی علامت مجھ میں پیدا نہیں ہوئی۔ بقول امی کہ کہیں تو میرے پیچ کا سمجھ میں نہیں۔ پریشانی مجھے بھی بہت تھی۔ اسکول میں بدصورتی کا چرچا تھا۔ میں بچپن سے اس چیز کی عادی تھی لیکن اب تو میں خود اپنے آپ سے عاجز آ گئی تھی۔ سمجھ نہیں آتا تھا میں عورت ہوں یا مرد۔ جسم اور چہرے پر کرختگی۔ سینہ سپاٹ مگر ــــ اب تفصیل سے کیا بتاؤں، عجیب سی پوزیشن تھی۔ ملنے جلنے والوں نے اماں کو سمجھایا کہ لڑکی کا علاج کراؤ کہیں ایسا نہ ہو کہ تیسری جنس بن کر رہ جائے ــــ میرے پیٹ میں اکثر درد رہنے لگا۔ ڈاکٹر کے پاس جاتے ہوئے گھبراہٹ ہوتی کہ اگر اس نے معائنہ کر ڈالا تو خواہ مخواہ اپنی ہتک ہوگی۔ ایک رات میرے پیٹ میں ایسا درد ہوا کہ سارا گھر گھبرا گیا۔ ابا میاں اسی وقت ہسپتال لے گئے۔ میرا میڈیکل چیک اپ ہوا۔ ڈاکٹروں نے کہا آپ اسے لاہور لے جائیں۔ معاملہ کچھ گڑبڑ لگتا ہے۔ اس کی جنس بدل رہی ہے۔ آپریشن ہوگا۔ ابا میاں کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ گھر میں انہوں نے کسی کو نہیں بتایا حتیٰ کہ مجھ سے بھی چھپایا۔ مجھے چھوٹے چچا کے پاس لاہور لے گئے ــــ یہاں میرے تین آپریشن ہوئے ــــ اور میری جنس مکمل طور پر بدل گئی۔ اس خبر نے مجھے کتنی توانائی دی ــــ آپ کو کیا بتاؤں لگتا تھا مجھے دوزخ سے نکال کر جنت کے دروازے میں داخل کر دیا ہے۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ یہ تبدیلیاں بچپن سے ہو رہی تھیں والدین نے توجہ نہیں دی اور اب میں بغیر کسی خامی کے مکمل مرد کا روپ دھار چکا تھا۔ مجھے اپنا لب و لہجہ بدلنے میں زیادہ دقت نہیں ہوئی۔ ہسپتال سے ڈسچارج ہونے سے پہلے پہلے میں نے نسوانیت کے ایک ایک نشان کو ذہن سے کھرچ ڈالا۔ اخباروں میں میری تصویر چھپی۔ میرے احساسات کی تفصیل چھپی۔ میں نے کسی کو یہ نہیں بتایا کہ میں نے عورت ہو کر بدصورتی کے کتنے عذاب جھیلے۔ جس چیز کو خدا بگاڑ دے یہ سنگدل معاشرہ اسے دوزخ جیسا عذاب دیتا ہے اور جب مجھ پر حالات مہربان ہو گئے تو سارے زمانے نے کھلے بازوؤں سے استقبال کیا۔ عورتیں مجھے رشک سے دیکھتی تھیں۔ محلے تو کیا شہر کے ہر گھر میں میرا تذکرہ تھا۔ میں راشدہ سے راشد بن چکا تھا۔ ابا میاں کی باچھیں کھل پڑتی تھیں۔ اماں بیچاری بوکھلاہٹ کے مارے مجھ سے بات کرتے ہوئے لفظ بھول جاتی تھیں۔ تب میں سلیم سے ملا ــــ اور یقین کیجئے اب میں اس سے کہیں زیادہ وجیہہ لڑکا تھا۔ میرے احساسات اس کے متعلق اب صرف اتنے سے تھے کہ اس نے میری ہتک کی تھی۔ بس اس کے علاوہ اور کوئی دکھ میں نے محسوس نہیں کیا۔ سلیم مجھ سے ملتے ہوئے قدرے جھینپ رہا تھا۔ میں نے ہنس کر کہا "سلیم اب تو میں تم سے خوبصورت مرد ہوں کیا اب بھی تمہیں بات کرتے ہوئے شرم آ رہی ہے؟" وہ بولا "تم مجھے کبھی لڑکی لگتے ہی نہیں تھے۔ تمہیں پسند کرتا تو کیسے کرتا ــــ" میں نے دل میں سوچا تمہیں اس توہین کا جواب بھی انشاء اللہ ضرور دوں گا۔

آپا میاں سے اصرار کر کے میں نے بی۔ ایس سی میں داخلہ لے لیا۔ یہاں میرا خاصا تماشا بنا مگر یہ اس تماشے سے قطعی مختلف تھا جو زندگی بھر میں بھگتتا آیا تھا۔ میری خود اعتمادی نے مجھے جلد ہی سنبھال لیا۔ میں نے اپنا مطالعہ وسیع کیا۔ محفلوں میں معقول گفتگو کرتا۔ اپنے سابقہ زندگی کے حالات مزاحیہ رنگ میں سنا کر دوستوں کو محظوظ کرتا۔ اپنی وہ تمام صلاحیتوں کو جنہیں دنیا والوں نے زنگ لگا دیا تھا نئے سرے سے پالش کیا اور جلد میرا شمار ذہین خوش مزاج اور ترقی پسند لڑکوں میں ہونے لگا۔ کھیلوں میں، میں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ایک ڈرامہ بھی اسٹیج کرایا جس میں میں نے اپنی لنگ کے کچھ حصے بڑی خوبصورتی سے دکھائے تھے۔ جلد ہی لوگوں نے یہ بھلا دیا کہ میں کبھی لنگ رہا تھا۔ بی ایس سی فرسٹ ڈویژن میں کرنے کے بعد مجھے دواؤں کی فیکٹری میں بہت اچھی جگہ مل گئی تنخواہ معقول ہوگئی۔ اماں کو ڈر تھا کہ شاید میری اب شادی نہیں ہو سکے گی لیکن ڈاکٹروں نے مجھے بڑی معائنے کے بعد یقین دلایا تھا کہ میں بڑے اعتماد سے شادی کر سکتا ہوں۔ اب اللہ کا شکر دیکھ کر ممانی اپنی چھوٹی بیٹی سیدہ کا رشتہ لے کر آ گئیں۔ اس کی وجہ انہوں نے یہ بتائی کہ وہ سلیم کے کیے جھگڑے کو ختم کرنا چاہتی ہیں تاکہ پرانے تعلقات پھر بحال ہو جائیں۔ اماں نے مجھ سے بات کی۔ میں نے تھوڑی دیر کچھ سوچا اور ہاں کر دی۔ ممانی خوش ہوگئیں۔ بڑی دھوم دھام سے منگنی کی رسم ادا ہوئی سلیم نے اس تقریب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس کی وجہ میں جانتا تھا وہ جہاں شادی کرنا چاہتا تھا ان لوگوں کی شرط یہی تھی کہ پہلے بہن کی شادی کرو۔ دراصل سیدہ کی بد زبانی میں دور دور مشہور تھی۔ سلیم بہن کی شادی کے بعد ہی اپنی بات آگے بڑھا سکتا تھا۔ مجھے یہ ساری تفصیل معلوم ہو گئی تھی۔ میں نے اماں کو شادی کی تاریخ مقرر کرنے پر زور دیا۔ تاریخ مقرر ہو گئی اور معلوم ہے پھر میں نے کیا کیا۔۔۔ ؟ شادی سے صرف پندرہ روز پہلے میں نے اعلان کر دیا کہ میری طرف سے منگنی ختم ہو چکی ہے۔ میں فی الحال شادی کرنا نہیں چاہتا۔ اماں سے میں نے کہہ دیا کہ میں اپنی توہین کا بدلہ لینا چاہتا ہوں آپ میرے معاملات میں دخل نہ دیں۔ انہوں نے مجھ سرپھرے کو کیا سمجھانا تھا۔ ماموں اور ممانی نے مجھے گھر بلایا۔ سلیم وہاں موجود تھا۔ میں نے طنزاً اسے دیکھا اور بولا "اپنی بہن کو آئینہ دکھا کر انصاف سے بتاؤ میں اس سے شادی کر سکتا ہوں ۔۔۔ وہ میرے قابل ہے۔۔۔؟"

میرا انتقام پورا ہو چکا۔ سلیم کی منگیتر کی شادی بھی کہیں اور ہو گئی۔ کیونکہ وہ لوگ انتظار نہیں کر سکتے تھے اور جناب سلیم کو بھی پتہ چل گیا کہ لڑکی کی جب منگنی ٹوٹ جائے تو زمانہ کیسی کیسی باتیں بناتا ہے میں ابھی شادی کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ ایم۔ ایس سی کرنے کا ارادہ ہے۔ پھر باہر چلا جاؤں گا۔ واپسی پر شادی کا سوچوں گا۔ ابھی تو مجھے ان محرومیوں کے انتقام لینے ہیں جو بد صورت ہونے کے جرم میں برسوں سہتا رہا ہوں۔

راشد۔ لاہور

اُس وقت شوکت تھانوی محمد عمر نام کے ایک نو عمر طالب علم تھے۔ ایک دن انہوں نے اپنے والد کو اپنی تعلیم کے سلسلے میں ایک خط لکھا۔ ساری باتیں لکھنے کے بعد انہوں نے اختتامیہ کے طور پر یہ شعر بھی لکھ:

ماتو نہ مانو جانِ جہاں اختیار ہے
ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے جاتے ہیں

کیسے معاف کروں

آج صاحب بہادر لندن پرواز کر گئے ہیں۔ جانا تو انہیں تھا ہی مگر اتنی جلدی نہیں۔ اور چلتے چلتے جو فقرہ وہ سب کی نظریں بچا کر میرے کان میں انڈیل گئے ہیں وہ نشتر بن کر میرے دل کی رگوں میں اتر گیا ہے کہہ گئے ہیں "جس ملک میں تم جیسی بے وفا لڑکیاں ہوں وہاں واپس آنے کا اب میں سوچ بھی نہیں سکتا۔" اب اسے کوئی کیسے سمجھائے قسمیں کھالیں، رو رو کر آنکھیں سجا لیں مگر یہ شک جو کسی طور بدگمانی دور ہی نہیں کر سکا تو اب قدموں میں گرنے سے رہی۔ آخر میری بھی کوئی انا ہے۔ صرف رونے پر بس چلتا ہے۔ سو گھنٹے بھر سے رو رہی ہوں گھر والے مجبور ہیں کہ میں اس کے جانے کے روگ میں مبتلا ہوں تو انہیں بہت دنوں بعد پتہ چلے گا کہ حقیقت کیا ہے۔

ہوا یہ تھا کہ میری ایک سہیلی نوشین پنڈی سے میرے بھائی

کی شادی میں جانے لگی تھی۔ میں اپنے حلقۂ احباب میں بڑی ہنس مکھ اور حاضر جواب مشہور ہوں۔ اسکول کالج میں لڑکیاں مجھ سے دوستی کرنے کی خواہشمند رہتی تھیں۔ میں ملتی جلتی سب سے تھی مگر دوستی صرف ایک لڑکی سے تھی اور وہ تھی نوشین۔ پہلے یہ کوئٹہ ہی میں رہتی تھی۔ ایف ایس سی کے بعد اس نے پڑھنا چھوڑ دیا مگر ہماری دوستی میں فرق نہیں آیا۔ پھر اس کے والد کا تبادلہ پنڈی ہو گیا۔ میرے کچھ رشتے دار پنڈی میں تھے۔ ادھر اس کے بھی کچھ رشتے دار رہتے تھے۔ وہ سال میں ایک دفعہ کوئٹہ ضرور آتی تھی اور ہمارا اکثر پنڈی جانا ہوتا رہتا تھا۔ اس طرح ہمارا ملنا جلنا قائم رہا۔ کم از کم سال میں دو بار ہمیں ایک دوسرے کی زیارت نصیب ہو جاتی تھی۔ بھائی کی شادی پر میں نے نوشین اور اس کے گھر والوں کو خصوصی دعوت بھیجی۔ وہ اپنی امی کے ساتھ آ گئی۔ شادی کے ہنگاموں میں ہم نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جب دلہن آ گئی۔ سارے ہنگامے ٹھنڈے پڑ گئے تب ہم دونوں سر جوڑ کر بیٹھے۔ ادھر ادھر کی سیکڑوں باتیں کرنے کے بعد نوشین کہنے لگی "صوفیہ یہاں میرے ایک کزن کی پوسٹنگ ہوئی ہے وہ آرمی میں ہے۔ میں اس سے ملنا چاہتی ہوں" میں نے کہا کہ تمہاری امی بھی چلیں گی۔ وہ چڑ کر بولی "میں تمہیں اتنا بے وقوف تو نہیں سمجھتی تھی" اب ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ میں نے کہا "ٹھیک ہے میں تمہارے ساتھ چلوں گی"

اگلے دن میں نے امی سے اجازت لی کہ ہمیں اپنی ایک سہیلی سے ملنے جانا ہے۔ رکشہ میں بیٹھے اور سیدھے کینٹ پہنچے۔ بس یوں سمجھ لیں گھنٹہ بھر تک در بدر کی خاک چھاننی پڑی۔ کوئی کہتا اس طرف جائیے وہاں کچھ لوگ کورس پہ آئے ہوتے ہیں کوئی بتاتا کہ فلاں بلڈنگ میں کچھ ٹرینیز ٹھہرے ہوتے ہیں۔ غرضیکہ ہم مطلوبہ جگہ پہ پہنچ گئے کچھ لڑکے ہمارے رکشہ کی پھٹ پھٹ سن کر باہر نکل آئے۔ ہم نے ان سے مطلوبہ لڑکے کا نام پوچھا۔ وہ نہ بتا سکے اور تھوڑی سی دیر میں ہمارے چاروں طرف لڑکے جمع ہو گئے۔ ہر کوئی اپنی ہانک رہا تھا ایک نے پوچھا آپ کہاں سے آئی ہیں۔ میرے جواب دینے سے پہلے نوشین بولی "لاہور سے۔ ہمارا سامان اسٹیشن پر پڑا ہے اس لیے آپ جلدی سے زاہد صاحب کو بلوا دیں" مارے گھبراہٹ کے میرے چہرے پر پسینہ بہنے لگا۔ ہم دو لڑکیاں اور بیس پچیس لڑکے ہم کس کس کا جواب دیتے۔ ایک صاحب جن کا نام غالباً خورشید تھا بولے "تم یہ ٹھہریے میں ان کا پتہ کرتا ہوں" رکشہ والا شور مچانے لگا کہ بی بی مجھے فارغ کریں۔ وہ لوگ بولے "آپ رکشہ چھوڑ دیں کمرے میں تشریف لے آئیں۔ خواہ مخواہ پریشانی اٹھانے سے کوئی فائدہ نہیں" بات تھی۔ اب واپس جاتا بھی انہیں ٹھکرا کر دیتا۔ اس لیے رکشہ چھوڑ دیا اور ان کے ساتھ کمرے میں آ گئے۔ ان لوگوں نے ہمارے ساتھ شریفانہ برتاؤ کیا۔ ایک صاحب کہنے لگے "آپ گھبرائیں نہیں اپنے کورس کی بہنوں سے سگی بہنوں جیسا سلوک کرتے ہیں۔ آپ بے فکر ہو کر بیٹھیں خورشید ان کی کوئی خبر لے آئے گا"

ایسے اجنبی ماحول میں بیٹھنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ ان کی تسلیاں بھی کارگر ثابت نہ ہوئیں۔ میں گھبراہٹ میں بار بار دوپٹہ سر پہ جمانے کی کوشش کرتی اور یہی حال نوشین کا تھا۔ ہمیں نروس ہوتا دیکھ کر بہت سے لڑکے کمرے سے نکل گئے۔ صرف دو لڑکے جن کا روم تھا۔ رہ گئے تقریباً بیس پچیس منٹ بعد خورشید واپس آئے۔ وہ یہ خبر لائے کہ زاہد دو روز کی چھٹی پر کہیں گیا ہوا ہے۔ ان کا روم میٹ ساتھ آیا تھا نوشین نے اس سے زاہد کی دو چار باتیں پوچھیں۔ ہم اٹھنے لگے۔ وہ بولے "ٹھہریے ٹھنڈا وغیرہ پی کر جائیے" ہمیں انکار کر دیا کہ ہمیں جلدی ہے۔ وہ پوچھنے لگے "آپ واپس لاہور جائیں گی؟" نوشین نے جواب دیا "نہیں ہم زاہد صاحب سے ملے بغیر نہیں جا سکتے۔ ہمیں اپنے عزیزوں کے گھر قیام کرنا پڑے گا" خورشید خوش ہو کر بولا "تو پھر آپ لوگ کل بھی آئیے گا۔ ہو سکتا ہے کل تک زاہد آ جائے اور آپ نے اپنا نام تک نہیں بتایا۔ یہ بات بد اخلاقی سمجھی جاتی ہے" خورشید نے یہ جملے مجھ سے مخاطب ہو کر کہے تھے۔ میں نے اس کی فضول بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

خورشید ہمیں باہر تک چھوڑنے آیا۔ کہنے لگا "نام بتانے میں کیا چلا جاتا۔ خیر مت بتائیے مگر پلیز جب آپ کی دوست زاہد صاحب سے ملنے آئیں تو آپ ضرور ساتھ آئیے" نوشین نے تیزی سے جواب دیا "کیوں آپ کو یہ بہت پسند آ گئی ہے؟" خورشید ڈھٹائی سے بولا "بہت" نوشین نے کہا "تو پھر اپنی امی کو بھیجیے۔ لوفروں کی طرح ندیدہ پن کیوں دکھاتے ہیں" خورشید نے کہا "آپ اپنا ایڈریس دیجیے تو بتاتی ہی نہیں بھیجوں تو کہاں بھیجوں" اتنے میں رکشہ نظر آ گیا میں نے ہاتھ دیا وہ رک گیا۔ لپک کر ہم بیٹھ گئے میں نے اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔ جب گھر کے قریب پہنچے تو نوشین بولی۔ "ہائے صوفی تیرا رنگ ——" میں نے گھبرا کر اپنی بالیاں چھوئیں واقعی میری ایک بالی غائب تھی۔ بھائی نے برسوں ہی تو مجھے اپنی شادی پہ بالیاں پہنائی تھیں۔ اب اگر امی یا انہوں نے پوچھ لیا تو کیا ہو گا۔ خوف اور

صدمے سے میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ رکشہ اچھی طرح دیکھ لیا کہ شاید اسی میں گری ہو مگر وہاں کہاں ـــــ اب خیال آیا کہ ہو نہ ہو یہ بالیاں ان لڑکوں کے کمرے میں گری ہیں۔ میں نے گھبراہٹ میں بار بار دوپٹہ ٹھیک کیا تھا۔ اسی وقت دوپٹے میں الجھ کر بالی گر گئی ہوگی۔ واپس جانا حماقت تھا کہ گھر کے دروازے تک پہنچ چکے تھے۔ میں دوسری بالی اتار کر پرس میں ڈال لی اور گھر میں داخل ہوگئے کہ اب اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہ تھا۔

نوشین کا اصرار تھا کہ کل جا کر اپنی بالی کا پتہ کر لوں ورنہ پھر کبھی ملنے کی امید نہیں۔ میں دوبارہ جانے کی حامی نہیں تھی۔ وہ لوگ سمجھتے کہ ہم اچھی لڑکیاں نہیں ہیں۔ بہانے کر کے دوبارہ آئے ہیں۔ نوشین کہنے لگی ٹھیک ہے اگر وہ لوگ بالی لے کر ڈھونڈتے ڈھانڈتے تمہارے گھر تک پہنچ گئے پھر گھر والوں کو کیا جواب دو گی ـــ یہ بات میں نے سوچی ہی نہیں تھی۔ لڑکوں کا کیا بھروسہ ہو سکتا ہے انہوں نے ہمارا تعاقب کیا ہو اور گھر دیکھ لیا ہو۔ اگر ایسے میں میری بالی ان کے ہاتھ لگ گئی تو وہ دینے ضرور آئیں گے۔ یہ ڈوب مرنے کی بات تھی۔ میری منگنی میرے ماموں زاد بھائی آصف سے بچپن میں ہو چکی تھی۔ آصف مجھے بہت چاہتا تھا اور میرے دل میں اس کے سوا کسی اور کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ انجینئرنگ کی تعلیم مکمل کر چکا تھا۔ میرے امتحانات کا انتظار تھا۔ ایم ایس سی میں میرا آخری سال تھا۔ خدانخواستہ میری بالی پا کر کوئی ہنگامہ کر دے تو خواہ مخواہ پریشانی کھڑی ہو جاتی۔ بہتر تھا کہ ہم لوگ خود جا کر اپنی بالی لے آتے۔

دوسری صبح ہم دونوں پروگرام کے تحت وہاں پہنچ گئے اتفاق سے پہلا شخص جو ہمیں ملا وہ وہی تھا جس کے کمرے میں کل ہم بیٹھے تھے۔ میں نے پہلا سوال اس سے یہی کیا "کل ہمارا رنگ آپ کے کمرے میں گر گیا ہے پلیز اگر آپ کو ملا ہو تو دے دیں"۔ وہ بولا "آپ اندر تشریف لائیے میں اپنے روم میٹ سے پوچھ کر بتاتا ہوں"۔ ہم اندر آگئے۔ ہمارے آنے سے پھر ہلچل مچ گئی۔ لڑکے اندر آکر باری باری جھانکنے لگے۔ یقیناً وہ ہمیں اچھی لڑکیاں نہیں سمجھ رہے تھے۔ اتنے میں ایک لڑکا بھاگتا ہوا آیا اور دوسرے لڑکے کے کان میں کچھ کہتا ہوا تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس لڑکے کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ بولا "کسی نے ہیڈکوارٹر میں رپورٹ کر دی ہے کہ ان کے روم میں لڑکیاں آتی ہیں وہ لوگ چیکنگ کے لیے آ رہے ہیں"۔ یہ سن کر میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو آگئے۔ کہ اب یہ لوگ ہمیں پکڑ کر اندر کر لے جائیں گے۔ پھر والدین کو بلوایا جائے گا۔ اس شہر میں والد صاحب کو سب لوگ جانتے ہیں۔ ان کی بڑی بدنامی ہو جائے گی۔ مجھے روتا دیکھ کر وہ لڑکا بھی گھبرا گیا۔ کہنے لگا "محترمہ آپ حوصلہ رکھیں۔ وہ لوگ جو کچھ پوچھیں سچ سچ بتا دیں۔ تحقیقات کے بغیر آپ کو کچھ نہیں کہا جائے گا۔ دراصل بیچلر روم میں لڑکیوں کا آنا سختی سے منع ہے۔ اس لیے یہ گڑبڑ ہو گئی"۔ اور اب کیا ہو سکتا تھا سوائے خود کو حوصلہ دینے کے۔ اتنے میں ایم پی کا آدمی اندر آگیا اور بدتمیزی سے بولا۔ "چلیں جی چلیں آپ دونوں کو کیپٹن صاحب کے پاس چلنا ہوگا"۔ اتنے لوگوں کے سامنے اپنی بے عزتی پر میرا خون کھول گیا۔ ہم کوئی کال گرلز تھے جو بے عزتی سہہ جاتے۔ خوف جاتا رہا اور میں جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنے انجام سے بے خبر ہو کر اس آدمی کو بے نقط سنا ڈالیں۔ بولی۔ "آپ کو شریف لڑکیوں سے بات کرنے کی تمیز نہیں ـــ یہ لیں ہمارا فون نمبر اور ہمارے گھر رنگ کر کے ہمارے والدین کو بلوا لیں تاکہ وہ آپ کے سوالات کے خاطر خواہ جوابات دے سکیں اور اپنے کیپٹن سے کہیں اسے کچھ پوچھنا ہے تو یہاں آئے ہم کال گرلز نہیں ہیں جو گھگھیاتے تمہارے صاحب کے پاس جائیں"۔

وہ آدمی شرمندہ ہو کر واپس چلا گیا۔ کوئی دس منٹ بعد کیپٹن صاحب تشریف لے آتے۔ ہم نے انہیں ادب سے سلام کیا۔ وہ بولے "مس یہ کیا معاملہ ہے؟" میں نے انہیں بتایا مسرا کل میری یہ دوست اپنے ماموں زاد بھائی نذابد سے ملنے آئی تھی۔ یہ پنڈی سے آئی ہوئی ہے اور ہمارے گھر ٹھہری ہوئی ہے۔ میں اس کے ہمراہ تھی یہاں غالباً کمرے میں میری بالی گر گئی۔ آج ہم یہ معلوم کرنے آئے تھے اس بات کا بتنگڑ بنا ڈالا گیا۔ کیپٹن صاحب شریف آدمی تھے معاملہ سمجھ گئے کہنے لگے "ہمیں افسوس ہے کہ غلط اطلاع ملنے کے سبب آپ کو

پریشانی اٹھانا پڑی۔ میں تمہارے شخص کو ضرور سزا دلواؤں گا۔ آپ سے ہم معذرت خواہ ہیں۔ ہم ابھی بری لڑکیوں کی پہچان سکتے ہیں ــــ شریف لڑکیوں کی قدر کرنا جانتے ہیں۔" ہم دونوں نے کپتان کا شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے میس میں لے جا کر ہماری خاطر تواضع کی۔ بالی تو نہیں مل سکی۔ مگر انہوں نے ہمیں بڑی عزت سے ہمارے گھر تک پہنچا دیا۔ میں نے سب سے پہلے دو رکعت شکرانے کے نفل ادا کیے اور پھر آیت کریمہ کا ورد شروع کر دیا جو میں نے عزت سے گھر پہنچنے پر اس وقت عہد کیا تھا۔

نوشین رات کی گاڑی سے واپس چلی گئی۔ تیسرے روز آصف ہمارے گھر آئے۔ امی سے کہنے لگے "پھوپھی جان صوفی کو امی نے بلایا ہے کچھ کام ہے۔" ممانی مجھے کبھی کبھار بلایا کرتی تھیں۔ اس امی نے کچھ مائنڈ نہیں کیا اور مجھے جانے کی اجازت دے دی۔ میں آصف کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ آصف خلاف معمول کچھ چپ چپ تھے۔ میں نے بات کرنا چاہی مگر وہ ہاں ہوں کر کے ٹالتے رہے۔ کہنے لگے "صوفی امی کے بلانے کا تو ایک بہانہ تھا۔ میں تمہیں اپنے ساتھ چائے پر ہوٹل لے جانا چاہتا ہوں تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟" اس سے پہلے آصف نے ایسی پیشکش نہیں کی تھی۔ میں نے کہا "نہیں آصف اگر جاننے والوں میں کسی نے دیکھ لیا تو اعتراض کریں گے۔" وہ طنزیہ بولے "میرے ساتھ جانے پر تو اعتراض ہو گا اور جب فوجیوں کے ہوٹلوں میں جاتی ہو اور چھاپے پڑتے ہیں تب تمہیں عزت کا خیال نہیں ــــ"

میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ وہ ڈپٹ کر بولا۔

"میرے ساتھ صاف صاف بات کرو۔ بتاؤ چلو گی یا نہیں ــ؟" اس نے ریستوران کے سامنے گاڑی روک لی تھی۔ میں خود خوشی سے بھرپور کی طرح اکڑ کر اس کے ساتھ گئی۔ کیبن میں بیٹھ کر وہ مختصر ہنسنے کی کوشش کرتا رہا اور میں اپنی صفائی میں کچھ بولنے کی جرأت پیدا کرتی رہی مگر زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ آنسو امڈے آ رہے تھے مگر یہاں رونا تو مکرر رسوا کرنا تھا۔ وہ زہر خند لہجے میں بولا "اب بتاؤ خورشید میں ایسی کیا بات تھی جو تم نے مجھے ٹھکرا دیا؟" میں رو پڑی اور اسے صاف صاف بات بتا دی کہ میرا کسی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ نوشین اپنے کزن سے ملنے گئی تھی۔ وہ طنزیہ ہنسا اور بولا "واہ بھئی واہ ملنے تو نوشین گئی تھی مگر بیڈ پر بالی آپ گرا آئیں۔ آپ کی بالی کے چرچے مجھے میرے دوستوں نے سنا دیے ہیں۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ ایسی عورت سے پیار کر سکوں جس کی بالی دوسروں کے بستر پر گری ملے اب صفائی کی ضرورت نہیں جسے تم نے پسند کر لیا ہے اسے یہ انگوٹھی بھی پہنا دینا ــــ" یہ کہہ کر اس نے منگنی کی انگوٹھی اتار کر میرے سامنے رکھ دی۔ اپنی اس توہین پر میں سر سے پاؤں تک سلگ اٹھی۔ آخر میں بھی عورت تھی اور پھر حق پر تھی۔ کوئی برا کام کیا ہوتا تو شرمندگی ہوتی۔ میں نے انگوٹھی اٹھا کر اس کی گود میں پھینک دی اور چلا کر بولی "اگر تم مجھے ایسا سمجھتے ہو تو پھر ایسا ہی سہی اور انگوٹھی گھر کے بزرگوں نے پہنائی تھی ان کے سامنے ہی اترتا۔"

ادراک صاحب بہادر لندن پرواز کر گئے ہیں کہہ گئے ہیں جس ملک میں تم جیسی بے وفا لڑکیاں ہوں وہاں واپس آنے کا اب میں سوچ بھی نہیں سکتا۔

صوفیہ عروشی

اِن صفحات میں ہم آپ کو زندگی کی ان کہانیوں سے روشناس کراتے ہیں جو ہمارے اور آپ کے اِرد گرد بکھری ہوئی ہیں مگر انہیں سُنانے کا کم حوصلہ نہیں کرتے۔ آپ بھی معاشرے کو میرا آئینہ دکھانے میں ہمارے ساتھ تعاون کریں۔ سچائی اور بے باکی سے لکھی گئی ان کہانیوں کو بھیجنے کی شرط صرف یہ ہے کہ ہم عورتوں کی زندگی کے ان پہلوؤں پر روشنی ڈالیں جسے بتاتے ہوئے آپ سب گھبراتے ہیں۔ کہانی کا سچا ہونا لازمی ہے۔ اپنی لکھی کہانیاں ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک بھیج دیں۔ تحریر ٹوٹی پھوٹی ہو یا مربوط ہو اس کی کوئی قید نہیں۔

رعنا فاروقی ـــ دوشیزہ ـــ پوسٹ بکس ۸۰۹۵ کراچی ۲۹


Crush
COLA
کا احساس
جب زندگی اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ رواں دواں ہو
اور آپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان لمحات کا مزہ لوٹ رہے ہوں تو ایسے میں صرف
کرش کولا جیسا مشروب ہی آپ کا ساتھ دے سکتا ہے۔ کرش کولا ہی آپ کے
بہترین لمحوں کی لذت کو دوبالا کر سکتا ہے۔
کولا کا صحیح ذائقہ کرش کولا میں موجود ہے
Crush
COLA
پاکستان بیوریج لمیٹڈ
کراچی - حیدرآباد

بدصورت آدمی

دُنیا اسے نفرت کرتی تھی
اس لئے کہ وہ بدشکل تھا
اور جب اسے محبت ملی
تو وہ محبت کا مفہوم کھو چکا تھا

ایک ایسے شخص کی کہانی
جس نے نفرتوں کی دُنیا میں خوش رہنا سیکھ لیا تھا!

نفرت کرتے ہوئے شعلے کی طرح اس کے دل میں اُبل رہی تھی اس کے بس میں ہوتا تو وہ اس کا منہ نوچ لیتی۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا گویا وہ ابھی تک کمرے میں موجود ہے اور وہاں ایک طرف کرسی میں ترچھا ہو کر بیٹھا ہوا ہے موٹے اور بدوضع ہونٹ، چھوٹی اور گول آنکھیں سیاہ رنگت، کیکڑے جیسی ٹانگیں دبلی پتلی، لانبی اور پھیلی ہوئی غیر معمولی طور پر طویل بازوؤں کے کندھوں پر سوکھے ہوئے ہات خشک پتوں کی طرح لٹک رہے تھے شخص اور قطعی بےڈھنگا چہرہ سہ پہر کے وقت وہ اس کے منگیتر کے ساتھ آیا تھا۔ لانبے لانبے اور غیر متوازن ڈگ بھرتا ہوا۔ سکڑی ہوئی آنکھیں اور نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا ہوا۔ دہشت سے بھرا ہوا چہرہ، جینا سے تعارف ہوتے وقت اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا، رسمی طور پر خوشی ہوئی کا اعلان بھی نہیں کیا۔ اس لمحے اپنا دُبلا پتلا، لانبا اور سوکھا ہوا ہات اٹھایا۔ اور جینا کی طرف بڑھا دیا۔ یہاں تک کہ وہ مسکرایا بھی نہیں اور کرسی میں ترچھا ہو کر دھنس گیا۔ اکھڑپن اور بے تکلفی کے ساتھ۔

"یہ ہمارے پڑوس میں آکر ٹھہرے ہیں!" اسے اپنے منگیتر کا تعارف یاد آیا، اور اس کا نام کیا تھا؟ جینا نے سوچا۔ بڑا لمبا بیہودہ سا نام تھا۔۔۔ بدر۔۔۔ بدرو۔۔۔ اس نے نفرت کے مارے اس کا نام بگاڑ دیا۔ لیکن اس سے جینا کی تسلی نہیں ہوئی اس نے نتھنے پھلا کر سوچا۔ "ہونہہ! اپنی چمگادڑ جیسی شکل نہیں دیکھی کبھی اور نام رکھا ہے بدر۔۔۔"

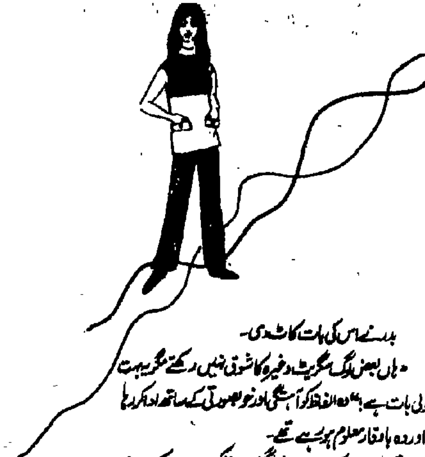
اکتوبر کا اواخر تھا آتشدان میں آگ جل رہی تھی اور کمرہ آرام دہ حد تک گرم تھا، جینا نے لحاف اٹھا کر سر اس کے اندر لے لیا لیکن وہ وہاں بھی اس کے تصور میں موجود تھا۔ اس نے جھلا کر لحاف ایک طرف پھینک دیا اور اٹھ کر بستر پر اکڑوں بیٹھ گئی اور ملاقات کا پورا منظر اس کی آنکھوں کے آگے پھر گیا، بالکل سینما کی تصویروں کی طرح، ترتیب وار اور مسلسل۔

جس وقت وہ آیا ہے جینا کی ماں باورچی خانے کے دروازے پکڑی تھی، البرٹ نے سب سے پہلے اسی کے ساتھ بدر کا تعارف کروایا تھا پھر وہ سامنے کمرے میں سے آیا اور جینا کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

"یہ میری منگیتر ہیں!"

اس نے منہ سے کچھ نہیں کہا تاہم ایک نظر جینا کی طرف دیکھا اور پھر پائپ جلا کر کھڑکی میں تیلی باہر پھینکنے کے لئے چلا گیا۔ تپائی پر ایش ٹرے نہیں تھا البرٹ نے فوراً ہی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"آپ جانتے ہی ہیں کہ میں سگریٹ نہیں پیتا اسی لئے۔۔۔"



بدر نے اس کی بات کاٹ دی۔

"ہاں بعض لوگ سگریٹ وغیرہ کا شوق نہیں رکھتے مگر یہ بہت معمولی بات ہے۔" وہ الفاظ کو آہستگی اور خوبصورتی کے ساتھ ادا کر رہا تھا اور وہ باوقار معلوم ہو رہے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد چائے آگئی، جینا کو جب بدر کے لئے چائے بنانا پڑی تو اسے بہت ناگوار معلوم ہوا لیکن غصّہ اسے اس وقت آیا جب بدر نے چند لمبے لمبے گھونٹ لے کر کپ میں کچھ جگہ خالی کر لی اور پھر اس میں قہوہ بھر لیا۔ جینا کی تیوری پر بل آگیا۔ حالانکہ اس نے چائے بناتے وقت بدر سے قہوے یا شکر کی مقدار کے متعلق بالکل نہیں پوچھا تھا اور بدر نے شکریہ ادا کئے بغیر اس سے چائے کا کپ لے لیا تھا۔

"آپ کب تک قیام کریں گے؟" انور نے اچانک گفتگو شروع کی۔

"پہلی سنو فال کے بعد چلا جاؤں گا۔" بدر نے جواب دینے کے لئے پائپ منہ سے نکال لیا۔

"لیکن مری کا شاندار موسم تو گزر چکا ہے۔" انور نے قدرے تاسف کے ساتھ کہا۔ "اب مال کی رونقیں اور رنگینیاں تو اگلے سال ہی نصیب ہوں گی۔"

بدر نے جواب دینے میں جلدی نہیں کی اس نے اطمینان کے ساتھ پائپ کا کش لگایا اور تھوڑا سا مسکرایا اور اس مختصر سی مسکراہٹ نے ایکا ایکی اس کے چہرے کی بدصورتی کو ختم کر دیا تھا۔

"میرے لئے یہی موسم شاندار ہے جب برف گرے گی اور سنسان بازاروں میں سرِ شام گہرے دھندلکے چھا جائیں گے تو میں ایک ایسا سکون اور سرور محسوس کروں گا جو صرف میرے مقدر میں ہے۔" اس کا نچلا ہونٹ بالائی ہونٹ کی نسبت بہت زیادہ موٹا تھا اور وہ نیچے لٹکا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ بدر نے اسے بھینچ لیا اور چائے کی ٹرے سے ایک پلیٹ لے کر سامنے رکھ لی اور اس میں اپنا پائپ خالی کر دیا۔

انور نے جو ہمیشہ اپنے ملنے جلنے والوں پر اپنی بیگم کے حسن اور اس کی دوسری اکتسابی خوبیوں کا رعب بٹھانے کی کوشش کیا کرتا تھا اور اس میں وہ کامیاب بھی رہتا تھا۔ اس نے چائے کی خالی ٹرے ایک طرف رکھ دی اور الماری سے ہارمونیم اٹھا کر لے آیا "جینی ذرا ایک آدھ گیت تو سناؤ۔" اس نے ہارمونیم تپائی پر رکھ کر اُسے جینا کے سامنے کر دیا اور پھر یہ جملہ اور بڑھا دیا۔ "بدر صاحب بھی موسیقی سے گہرا شغف رکھتے ہیں۔"

وہ بہت اچھا گاتی تھی اور اس پر اُسے دُہرا ناز تھا کیونکہ وہ بہت خوبصورت بھی تھی۔

"اس وقت تو موڈ نہیں ہے۔" اس نے ناگواری سے ناک سکیڑ کر سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "کچھ سر بھاری سا ہے۔" بدر نے اصرار نہیں کیا اور یہ بات جینا کو اس قدر ناگوار گزری کہ اس کا جی چاہا۔ ہارمونیم اٹھا کر بدر کے سر پر دے مارے۔ وہ ذرا سا مسکرایا اور پائپ بھرنے میں مشغول ہو گیا۔ جینا کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ جان بوجھ کر پائپ کو زیادہ اہمیت دے رہا ہے۔

جینا بپھر گئی اور اس کے بدن کا تمام خون کنپٹیوں کی طرف کھنچ آیا اور وہاں دو ننھی ننھی نسیں پھڑکنے لگیں، اس کی حسین پیشانی سلوٹوں سے بھر گئی اور وہ ایک دم اپنی جگہ پہ کھڑی ہو گئی اور اس طرح جھٹک کر کھڑے ہونے میں اس نے کافی تیز آواز پیدا کی، پھر اس نے انور کا بازو تھاما اور کہا۔

"آؤ گھومنے چلیں!" اس کی آواز میں سختی اور درشتی تھی۔

"چلو!" انور نے محبت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا پھر وہ بدر سے مخاطب ہو کر بولا۔ "آپ بھی چلئے!" بدر نے تمباکو کا ڈبہ بند کیا اور سکڑا ہو گیا۔ جینا نے بڑی کیٹلی نظر سے اس کی طرف دیکھا جس سے نفرت اور حقارت کا واضح اظہار ہو رہا تھا۔ پھر اس نے بدر کا بازو چھوڑ دیا۔

"آپ ہو آیئے، مجھے ایک ضروری کام یاد آگیا ہے!"

بدر کے موٹے اور بدوضع ہونٹوں پہ ایک حزیں سی مسکراہٹ پل بھر کے لئے نمودار ہوئی اور پھر اس نے ہونٹ بھینچ لئے اس کے بعد اس کے چہرے پر کوئی کیفیت نہیں تھی۔ اس نے جیب سے ماچس نکال کر پائپ جلایا اور تیلی بجھا کر دوبارہ ماچس میں رکھ لی۔ آخر کار اس نے پرسکون لہجے میں کہا۔

"مجھے اجازت دیجئے۔" اس نے جواب کا انتظار نہیں کیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ انور نے منہ سے کچھ نہیں کہا تاہم اس نے شکایتی نگاہوں سے اپنی منگیتر کی طرف دیکھا۔

"یہ آپ کس جانور کو پکڑ لائے تھے!" جینا نے بڑی تنک مزاجی کے ساتھ کہا اور انور کی شکایت بھری نظروں کو نظر انداز کر دیا۔

"ارے تمہیں تو غصہ چڑھ آیا ہے۔" وہ ہنس پڑا۔ "چلو ہٹاؤ اس قصے کو، آؤ باہر چلیں۔"

آتشدان سرد ہو رہا تھا تاہم کمرہ ابھی ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔ جینا نے لحاف دوبارہ اوڑھ لیا اور دیر تک کروٹیں بدلنے کے بعد آخر کار سو گئی۔

اس واقعہ کے بعد بدر کبھی ان کے گھر نہیں آیا، کچھ دنوں کے بعد جینا کی نفرت دھیمی پڑ گئی مگر اس نے اسے معاف نہیں کیا، اُسے بدر ایک توہین آمیز حادثے کی طرح یاد رہا۔ بدر کا مکان بھی ساتھ ہی تھا اور دونوں گھروں کے درمیان ایک چھوٹا سا خوشنما لان تھا جس میں گھاس کے علاوہ خود رو پھولوں کے اکا دکا پودے بھی تھے کبھی کبھی وہ اسے گھر سے باہر جاتے ہوئے یا گھر آتے ہوئے دکھائی دے جاتا اور جینا کا سینہ نفرت کی آگ سے بھر جاتا اور یہ آگ اتنی شدید ہوتی کہ اس کی پوری ہستی کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی۔

ایک دن دوپہر کے وقت جب وہ مال روڈ جا رہی تھی اس نے مال کی چڑھائی چڑھتے ہوئے اُسے دیکھا۔ وہ اپنی بے ہنگم چال کے ساتھ نیچے اتر رہا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ پتلون کی جیبوں میں ٹھونس رکھے تھے اور پائپ دانتوں تلے دبایا ہوا تھا۔ اس نے معمولی سردی کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ جینا کی نفرت جنگل کی آگ کی طرح ایک دم بھڑک اٹھی۔ راستہ زیادہ کشادہ نہیں تھا اور اسے یوں لگا گویا وہ اسی کے پاس آ رہا تھا۔ اس نے بھویں چڑھا لیں اور اس کے نتھنے پھول گئے اس نے دل میں سوچا اگر بدر نے مجھے مخاطب کیا تو میں اسے ڈانٹ دوں گی۔ وہ اس کا انتظار کرنے لگی اور اس نے سخت ترین الفاظ کو دل میں جمع کر لیا۔ بدر پائپ کا کش لگاتے ہوئے بالکل اس کے قریب آگیا۔ جینا کا دل دھک دھک کرنے لگا، وہ اور بھی قریب آگیا۔ یہاں تک کہ ان کے درمیان ایک گز کا فاصلہ رہ گیا۔ اس نے سرسری سی نگاہ کے ساتھ اس کی طرف دیکھا اور آگے بڑھ گیا۔ جینا بڑبڑائی۔ "بداخلاق ــــ جانور ــــ!" اس کی سانس پھول گئی اور تنی ہوئی بھوؤں کے اوپر ہلکا سا پسینہ آگیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ ویسے ہی تیز تیز اور غیر متوازن قدم اٹھاتا ہوا چلا جا رہا تھا اور پائپ اس کے ہونٹوں کے ایک کونے میں لٹکا ہوا تھا۔

اس نے محبت کا ذائقہ چکھا تھا، اس کی شیرینی اس کی برجستگی اور اس کی مضبوط گرفت کو محسوس کیا تھا لیکن نفرت کے اتنے مضبوط اور طاقتور بازو اس کے گرد لپیٹے تھے کہ اس کی روح تک کچل کے رکھ دی تھی، اس کی پوری ہستی کانپ اٹھی تھی اور اس کے دل و دماغ سے ہر ہر خیال ہر ہر احساس اچانک نکل گیا تھا اب وہ صرف ایک بدر کے متعلق سوچ رہی تھی وہ اس کے خیال کو نظر انداز کر ہی نہیں سکتی تھی وہ اسے حقارت کے ساتھ سوچ رہی تھی تاہم وہ ایک قوی ہیکل بھوت کی طرح اس کی سوچ کے آگے ایستادہ اور ہر قدم پہ اس کا راستہ روک رہا تھا اس نے کمند پھینک کر اس کے دل و دماغ کو باندھ دیا تھا۔ اس کی زندگی کا دائرہ بالکل محدود ہو گیا تھا۔ بدر کی ذات تک نفرت غصے اور حقارت سے بھرا ہوا۔

وہ مال روڈ پہ بے مقصد گھومتی رہی اور اس نے ریسٹورنٹ میں ایک بیرے کو بے قصور ڈانٹ دیا اور اسے ٹپ نہیں دی، وہ اپنی سہیلی کے پاس بھی نہیں گئی جس سے ملنے کے لئے وہ گھر سے نکلی تھی، وہ

اپنا پرس کیبنٹ میں بھول کر ٹرک پر آگئی اور جب بیرا اسے لے کر اس کے پاس آیا تو اس نے اس کا شکریہ ادا نہیں کیا۔ وہ اس واقعہ کو پوری طرح محسوس ہی نہ کر سکی تھی۔ وہ بغیر کسی خاص ارادے کے پنڈی پوائنٹ تک چلی گئی۔ وہ کبھی تیز تیز چلنے لگتی اور کبھی اچانک اس کی رفتار دھیمی پڑ جاتی۔ اس کے دل میں جو طوفان اٹھ رہے تھے اس کے قدم ان منتشر انگیز طوفانوں کے تابع تھے۔ بہت دیر کے بعد جب وہ گھر آئی تو وہ بہت اداس اور مضمحل تھی اور ایک ناقابل شکست غم اور کرب نے اسے دبوچ رکھا تھا۔ وہ ہمیشہ شام انور کے ساتھ گزارا کرتی تھی اور وہ دونوں ایک طویل سیر کے بعد مال کے کسی ریسٹورنٹ سے چائے پینے کے بعد گھر آیا کرتے تھے لیکن آج وہ شام تنہا گزار آئی تھی جب وہ گھر لوٹ کر آئی تو اس نے دروازے پر انور کو انتظار کرتے ہوئے دیکھا اور اسے مطلقاً کوئی افسوس نہ ہوا۔

رات کو وہ چین سے سو نہ سکی۔ بہت دیر تک اسے نیند نہ آئی اور وہ خالی خالی نظروں سے آتشدان میں جلتی ہوئی لکڑیوں کو دیکھتی رہی۔ اسے اپنے سینے میں بھی ایک آتشدان دہکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا جس میں اس کی کل ہستی جل رہی تھی جو کسی صورت سرد ہونے میں نہیں آتا تھا اور جس کی آنچ دم بدم بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ وہ بستر سے اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگی اور آخر کار کھڑکی میں آ کر کھڑی ہو گئی۔

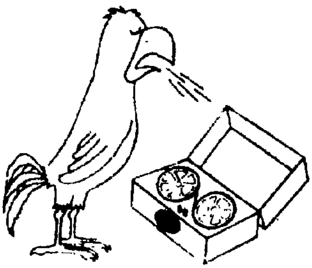
اس نے دیکھا وہ اپنے کمرے کی کھڑکی کھولے میز کے کنارے بیٹھا کوئی موٹی سی کتاب پڑھ رہا تھا اور اس میں پوری طرح منہمک تھا۔ جینا نے ایک دھماکے کے ساتھ کھڑکی بند کر دی اور اس نے کھڑکی کے شیشوں میں سے دیکھا وہ ویسے ہی کتاب کے اوپر جھکا ہوا تھا گویا بے جان پتھر کا مجسمہ ہو۔ لمحہ بھر کے لئے جینا نے اپنی تمام تر نفرت کو بھول کر سوچا "عجیب آدمی ہے۔!"

تھوڑی دیر کے بعد بدر اپنی جگہ سے اٹھا۔ کتاب اس کے ہاتھ میں تھی، اس نے آتشدان میں آگ کو ایک سلاخ سے کریدا اور اس میں اور لکڑیاں ڈال دیں پھر اس نے کھڑکی بند کر دی اور جینا نے دیکھا کہ وہ بند کھڑکی کے شیشوں پر سر ٹکائے ساکن کھڑا ہے، چند لمحوں کے بعد وہ واپس چلا گیا اور کمرے میں غائب ہو گیا۔

صبح ناشتے پر اس نے خود ہی انور سے پوچھا۔

"آپ بدر کو کیسے جانتے ہیں؟"

"ایک عرصے تک ہم اکٹھے پڑھتے رہے ہیں لیکن کئی سالوں سے وہ اچانک غائب تھا۔"



"آپ آپس میں دوست تھے؟" اس کی آواز میں نرمی مطلقاً نہیں تھی۔

"دوست ـــ" انور نے دہرایا اور ذرا دیر سوچنے کے بعد بولا۔ "میرے ساتھ اس کی قدرے بے تکلفی تھی لیکن میں بھی اس کے بارے میں زیادہ باتیں نہیں جانتا۔ اسکول اور کالج کے زمانے میں وہ ہمیشہ خاموش اور اپنی ذات میں بند رہا ہے۔ سب سے الگ تھلگ اور لب بھینچے ہوئے۔ میں نے کبھی اسے قہقہہ لگا کے ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔" انور نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "غالباً اسے اپنی بدصورتی کا بہت احساس ہے لیکن وہ کسی کی پروا بھی نہیں کرتا۔ اس کے متعلق کچھ حتمی طور پہ کہنا بہت مشکل ہے۔"

"لیکن یہ تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ وہ بڑا بدتمیز اور گنوار ہے؟" جینا نے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کیا۔

"ہاں بعض اوقات ایسا ہی محسوس ہوتا ہے! مگر وہ بالکل بے ضرر اور شریف آدمی ہے، ایک مرتبہ اس نے میرے لئے ایک ایسی قربانی ـــ"

"آپ تو اس کا قصیدہ پڑھنے بیٹھ گئے ہیں!" جینا نے اس کی بات کاٹ دی اور غصے کے مارے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"تم تو خواہ مخواہ اس بے چارے سے خفا ہو!"

"وہ ہے ہی اوّل درجے کا بدمعاش!" اس نے نتھنے پھلا کر جواب دیا۔

انور ایکا ایکی سنجیدہ ہو گیا کافی دیر چپ رہنے کے بعد اس نے کہا۔

"تم سراسر زیادتی کر رہی ہو، تم اس کے متعلق بہت کم جانتی

ٹی وی آیات

● ٹی وی کے سارے پروگرام اچھے نہیں ہوتے ورنہ آدمی صرف ٹی وی اور بیوی کا ہو کر رہ جاتا۔
(ایک افسر)

● بچے بڑوں کے پروگرام زیادہ شوق سے دیکھتے ہیں
(ایک ماں)

● ٹی وی میرے لئے رقیب روسیاہ بن گیا ہے، مگر میں بیوی کے ڈر سے اُسے توڑ بھی نہیں سکتا۔
(ایکشوهر)

● لوگ ٹی وی کے مسخروں کو دیکھنے کے لئے گانا سننے بھی نہیں آتے۔
(ایک طوائف)

ہو پھر تمہیں اس قسم کی رائے کا کیسے حق پہنچتا ہے؟"

"اس کی شکل ہی ایسی ہے!" ذرا دیر کے بعد جینا نے اس جملے کا اور اضافہ کر دیا۔ "مجھے تو وہ کوئی خبیث روح معلوم ہوتا ہے۔"

انور چند لمحے خاموش رہا۔ پھر وہ ہنس پڑا اور ریڈیو کھول کر بیٹھ گیا۔

نومبر کی پہلی شام تھی۔ سرد اور کہرے میں چھپی ہوئی۔ دور دور تک چیڑ کے درختوں میں گھری ہوئی سڑک ویران تھی اور وہاں طویل وقفوں کے بعد اکا دکا آدمی چلتا ہوا دکھائی دے جاتا تھا۔ اس کے بعد پھر وہی سو نی اداسی پہاڑوں طرف پھیل جاتی جو موسم ختم ہو جانے پر پہاڑی علاقوں کا مقدر ہوتی ہے۔ جینا اور انور ایک لمبی سیر کے بعد واپس لوٹ رہے تھے انہوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ تھام رکھے تھے اور خاموشی کے ساتھ چل رہے تھے۔ جینا نے دو تین دن سے بدر کو نہیں دیکھا تھا اور اس کا جی چاہ رہا تھا انور سے اس کے متعلق دریافت کرے مگر کوئی اس سے کہہ دیتا کہ وہ چلا گیا ہے تو اسے اتنا ہی افسوس ہوتا جتنا کسی پیارے دوست کے اچانک جدا ہو جانے کا ہو سکتا ہے وہ اسے دیکھنا چاہتی تھی اور اس سے نفرت کرنا چاہتی تھی۔ اس نے سوچا آخر انور اس کے بارے میں گفتگو کیوں نہیں کرتا؟

جب وہ شہر میں داخل ہوئے تو انہیں بدر ڈاک خانے کے پاس کھڑا ہوا مل گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ اوور کوٹ کی جیبوں میں ٹھونس رکھے تھے اور پائپ اس کے ہونٹوں میں دبا ہوا تھا تاہم وہ کش نہیں لے رہا تھا اور سوچ میں ڈوبا ہوا معلوم ہو رہا تھا اور بڑا افسردہ سا لگ رہا تھا۔

"بدر!" سب سے پہلے جینا نے اسے دیکھا اور بے ساختہ اس کے منہ سے اس کا نام نکل گیا۔ جس کا بعد میں اُسے بڑا افسوس ہوا اور اس نے اپنا ہونٹ چبا لیا۔ کیونکہ بدر نے اس کی آواز سن لی تھی اور وہ ایک دم آواز کی طرف مڑ گیا اور پائپ اس کے منہ سے نیچے گر گیا جسے اس نے فوراً ہی اٹھانے کی کوشش نہیں کی اور اپنی جگہ پر کھڑا رہا وہ آگے نہیں بڑھا۔

"کہو بھئی کیسے حال ہیں؟" انور نے قریب آ کر پوچھا اور اپنا ہاتھ مصافحے کے لئے بڑھا دیا۔ البتہ جینا ان سے ایک قدم پیچھے ہٹ کر خاموش کھڑی رہی۔

"ٹھیک ہوں!" اس نے بہت دھیمے لہجے میں جواب دیا اور نیچے جھک کر پائپ اٹھا لیا اور اس میں نئے سرے سے تمباکو بھرنے لگا۔

انور نے جینا کا ہاتھ تھام لیا پھر وہ بدر سے مخاطب ہو کر بولا۔

"آیئے چائے کا ایک دور ہو جائے۔"

بدر نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر وقت دیکھا۔

"اب تو کھانے کا وقت ہے!"

"ہم کھانا بھی کھا سکتے ہیں!" جینا نے اپنے قیمتی دوشالے کو جھٹکے اور تفاخر کے ساتھ سنوارتے ہوئے کہا۔

بدر نے صرف ایک پل کے لئے اس کی طرف دیکھا اور اس کے چہرے پر مطلقاً کوئی کیفیت نہیں تھی۔

"میں ہمیشہ تنہا کھانا کھاتا ہوں۔" اس نے پرسکون اور نپے تلے لہجے میں جواب دیا۔

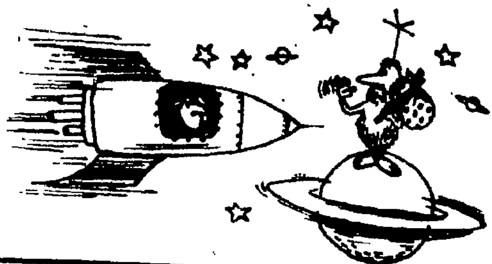
"آپ تشریف لے جا سکتے ہیں" اس نے غصے سے بپھر کر فوراً ہی جواب دیا اور اس کے نتھنے پھڑ پھڑانے لگے۔

تھوڑا سا مسکرایا، اس نے کچھ نہیں کہا صرف اس نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں گھما کر جینا پر ایک بھرپور نگاہ ڈالی پھر اس نے پائپ دانتوں تلے دبا لیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چلا گیا۔

"تمہیں اس طرح سے نہیں کہنا چاہیئے تھا۔" انور نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔

"میں اس کی وکالت سننے کے لئے تیار نہیں، مجھے اس سے شدید نفرت ہے۔!"

رات بھر جینا پلک نہ جھپکا سکی وہ بُری طرح سے تلملائی ہوئی تھی اور اپنے اوپر جھنجلا رہی تھی۔



"آخر میں نے کمانے کے لئے کہا ہی کیوں؟ مجھے اس کی کیا ضرورت پڑی تھی، میں وہاں رک ہی کیوں گئی؟" پھر اس نے سوچا لیکن یہ بدلا تنا غیر متاثر اور اکھڑا کیوں ہے؟ وہ پہاڑ کی طرح اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہیں ہلتا۔

وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی ــــ وہ لانبی اور چھریری تھی۔ اور اس کے بدن میں شاخوں ایسی لچک تھی گندمی رنگت سیاہ غلافی آنکھیں جن کے اوپر بھویں کمان کی طرح تنی ہوئی تھیں اور ان سے ہر لحظہ تیر نکلنے کا گمان ہوتا تھا۔

اس نے ماضی کے آئینے میں جھانک کر دیکھا، دولت شہرت اور آسودگی اس کا مقدر رہی تھی کہیں بھی شکست کا داغ موجود نہیں تھا۔ اس کا منگیتر انور جسے اس نے بہت سے لڑکوں میں سے پسند کیا تھا اور اس سے محبت کی تھی وہ اس کی کس قدر پرستش کرتا تھا اور ہر بات میں آخر کار اس کی ہاں میں ہاں ملا دیا کرتا تھا۔ جوانی، دولت حسن اور آزادی جن مسرتوں سے آدمی کو بہرہ ور کرتی ہے وہ ان سب سے ہمکنار ہو چکی تھی۔ اس نے کھڑکی کے پٹ چوپٹ کھول دیئے اور سرد کنیلی ہوا کو گرم کمرے میں داخل کر لیا۔ بدر کے کمرے کی بتی جل رہی تھی اور بند کھڑکی کے شیشوں کے پیچھے اس کا غیر معمولی طویل سایہ دکھائی دے رہا تھا وہ کمرے کے وسط میں کھڑا تھا اور پائپ پی رہا تھا بہت دیر تک اس نے کوئی حرکت نہیں کی اور اپنی جگہ پر ساکن کھڑا رہا بالکل کھمبے کی مانند ــــ اچانک وہ اپنی جگہ سے ہلا اور کمرے کے اندر غائب ہو گیا تھوڑی دیر کے بعد جینا کھڑکی بند کر چکی تھی اس نے کھڑکی کے شیشوں میں سے دیکھا وہ اپنی بے ہنگم چال کے ساتھ بازار کی طرف جا رہا تھا اور اس نے اپنے مخصوص انداز میں پائپ کو ہونٹوں کے ایک گوشے میں دبا رکھا تھا۔

اس کے سینے میں ایک نامعلوم رنج نے سر اٹھایا۔ "یہ شخص ــــ یہ شخص ــــ" اس نے بدر کو برا بھلا کہے بغیر سوچا۔ "بالکل احمق ہے" وہ چارپائی پر کروٹیں بدلتی رہی اور سارا سارا وقت اپنی آنکھوں کے آگے بدر کا سراپا دکھائی دیا، شام کو جب اس نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ وہ ایک نظر، وہ ایک بھرپور نظر رہ رہ کر اس کے تصور کے دریچوں سے جھانک رہی تھی۔

"یہ اس وقت سنسان بازار میں کیا لینے گیا ہے؟"

دوسرے دن جب انور اور جینا گھوم پھر کر دوپہر کے کھانے کے لئے گھر آ رہے تھے انہوں نے ایک ڈاکٹر کو دوائیوں کا بکس لئے ہوئے بدر کے مکان میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا اس کے ساتھ مالک مکان بھی تھا جو اس کے ساتھ دوسری منزل میں رہتا تھا۔ انور خاموش رہا اور اس نے اس واقعے سے متعلق امکانات پر کوئی گفتگو نہیں کی جینا کو گھر چھوڑ کر انور کچھ کہے بغیر بدر کے ہاں گیا، وہ اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی ہو کر دیکھنے لگی لیکن اس کے کمرے کی کھڑکیاں بند تھیں اور شیشوں کے پیچھے پردے گرے ہوئے تھے، اس کے دل میں کھد بدی ہونے لگی۔

"اسے کیا ہوا ہے؟" اس نے اپنے دل میں سوال کیا "کیا وہ بیمار ہے۔؟"

وہ بڑی بے تابی کے ساتھ انور کا انتظار کرنے لگی اور وہ جلدی ہی واپس آ گیا تاہم جینا کو یوں لگا۔ گویا وہ بہت دیر کے بعد لوٹا ہے جب وہ آ گیا تو اس نے سوچا وہ خود ہی کچھ بتائے گا مگر وہ چپ رہا اور صوفے میں دھنس کر ایک رسالہ پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔

جینا کو سخت الجھن محسوس ہونے لگی "آخر یہ کچھ کہتا کیوں نہیں" پھر اسے خود ہی اپنے اوپر تعجب ہونے لگا "آخر مجھے اتنی دلچسپی کیوں

ایک خوب صورت سیلز گرل نے ایک گھر کے دروازے پر دستک دی۔ صاحب خانہ جب باہر آئے تو ان سے پوچھا: "کیا آپ کی بیگم گھر میں ہیں؟" ان صاحب نے جواب دیا: "نہیں، مگر آپ اندر آ کر ان کا انتظار کر سکتی ہیں۔ وہ ایک ہفتے کے لئے میکے گئی ہوئی ہیں۔"

دو دوست مدت کے بعد ملے تو ایک نے پوچھا: "کہو بھئی تمہاری شادی وادی ہو گئی، بچے کتنے ہیں؟" دوسرے نے جواب دیا:
"ہاں بھئی ہو گئی، تین بچے ہیں۔ سب اوپر والے کی مہربانی ہے۔"
پہلا بولا: "اچھا تمہارے گھر میں اوپر کون رہتا ہے؟"

(مرسلہ: افراسیاب نعیم، پشاور)

ہے؟ میری بلا سے اگر بیمار ہے تو ہوا کرے۔"

"ہونہہ" ۔۔۔ لیکن باوجود کوشش کے وہ اپنے دل میں بدر کے لئے نفرت تلاش نہ کر سکی، آخر کار اس نے کھانا کھاتے ہوئے انور سے پوچھ لیا۔

"آپ وہاں گئے تھے؟"

"ہاں میں گیا تھا، وہ بیمار ہے، سردی لگ گئی ہے۔" اس نے سرسری سا جواب دیا اور کھانا کھانے میں زیادہ انہماک ظاہر کرنے لگا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس موضوع کو ٹالنے کی کوشش کر رہا ہے۔

"کیا وہ بیمار بھی ہو سکتا ہے؟" اس نے سوچا، وہ غیر شعوری طور پر ہی سہی مگر اسے عام لوگوں سے عام باتوں سے مختلف سمجھتی تھی۔ اسے صدمہ یا دکھ نہیں پہنچا تھا بلکہ اسے کچھ یوں محسوس ہو رہا تھا گویا کوئی انہونی سی بات ہو گئی ہے۔

شام کو چائے کے بعد انور نے کہا۔

"میں ذرا بدر کی خبر لے آؤں، تم اتنی دیر میں کپڑے تبدیل کر لو، پھر بازار چلیں گے!"

تھوڑی دیر سوچنے کے بعد اس نے جواب دیا۔

"میں بھی آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔"

انور چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"کیا کہا تم نے؟" اس نے بے یقینی کے سے لہجے میں کہا۔

"بیچارہ پردیسی ہے نا۔"

"اوہ تم دل کی کتنی اچھی ہو۔" انور نے اس کے ہاتھ تھام کر کہا۔

بدر جسم پر لحاف لپیٹے ہوئے چت پڑا ہوا تھا۔ اس نے تکیے کو دوہرا تہرا کر کے سر کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ اس کی سیاہ رنگت بخار کی وجہ سے تمتائی ہوئی تھی اور نچلا ہونٹ بے خیالی میں نیچے لٹکا ہوا تھا اور وہ خالی خالی نظروں سے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جب وہ دونوں کمرے میں داخل ہوئے تو اس نے کسی قسم کے جوش و خروش یا مہمان نوازانہ جذبات کا اظہار نہیں کیا البتہ اس نے اپنے لب بھینچ لئے۔

انور نے کمرے میں داخل ہو کر اس کا حال پوچھا۔

"ٹھیک ہوں!" اس نے آنکھیں ملائے بغیر جواب دیا اور تکیے کے نیچے پائپ تلاش کرنے لگا۔ اس نے لیٹے لیٹے اس میں تمباکو بھرا۔

"مجھے اس دن والی بات کا افسوس ہے۔" جمیلہ نے جو اب تک خاموش کھڑی تھی اور ہونٹ چبا رہی تھی اچانک کہا۔

بدر نے نگاہیں اوپر اٹھائیں اور اس کے بھینچے ہوئے ہونٹ کھل گئے۔ چند لمحے وہ خالی خالی سرد نظروں سے اسے دیکھتا رہا اس کے چہرے سے غم کے جذبات کا اندازہ لگانا ممکن نہیں تھا۔ البتہ اس کی آنکھوں میں پل بھر کے لئے ایک دھیمی سی چمک پیدا ہو کر غائب ہو گئی تھی۔

"اور بھی لوگوں نے مجھ سے نفرت کی ہے، میری صورت سے۔" اک ذرا سے توقف کے بعد اس نے یہ جملہ اور بڑھا دیا۔ "مگر میرے لئے اس کی کوئی اہمیت نہیں۔"

اس نے پائپ منہ میں رکھ لیا اور کمرے میں کافی دیر تک خاموشی طاری رہی۔

تھوڑی دیر کے بعد انور نے اسے مخاطب کیا اور اس کے ساتھ دو چار ادھر ادھر کی باتیں کیں پھر اس نے بدر سے کہا۔

"آپ کی طبیعت اچھی نہیں، آپ کچھ دنوں کے لئے میرے یہاں آ جائیے، وہاں کافی جگہ ہے!"

بدر مسکرایا۔

"شکریہ، لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا، مہمان بننا میرے لئے کبھی

خوشی کا باعث نہیں ہوا۔“ وہ پھر مسکرایا اور ان کے رخصت ہونے تک اس نے مسکراہٹ کو برقرار رکھا۔

رات کو جینا نے سونے سے پیشتر قدآدم آئینے میں اپنے سراپا کو دیکھا۔ بہت دیر تک وہ اپنی حسین شبیہہ کو مختلف زاویوں سے دیکھتی رہی، پھر اس نے اپنے چند نامراد عاشقوں کے خطوط پڑھے اور اسے زندگی میں پہلی مرتبہ اپنے اس عزیز ترین اثاثے کی اہمیت گھٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔

وہ رات گئے تک چارپائی پر لیٹ کر کروٹیں بدلتی رہی، اسے بار بار کمرے میں بدرسکی خالی خالی سرد نگاہیں دکھائی دے رہی تھیں، اس کی غیر متوازن چال یاد آ رہی تھی اور بات چیت کا مخصوص لب و لہجہ اور پائپ پینے کا انداز، غرضیکہ ہر وہ چیز جو اس سے متعلق تھی۔

”اور بھی لوگوں نے مجھ سے نفرت کی ہے۔“ اس سے اس کا کیا مطلب تھا؟ اس نے اپنے دل کو ٹٹولا اور وہ اس پر معمول کے مطابق ناراض نہ ہو سکی۔ ”بے چارہ۔“ اس نے آہستہ سے کہا اور اسے بدر پر کچھ رحم سا آ گیا۔

جینا واپس جا رہی تھی، سامان باندھ دیا گیا تھا اور انور سفر کے لئے بعض ضروری چیزیں خریدنے کے لئے بازار گیا ہوا تھا۔ وہ لان میں کرسی ڈالے دھوپ سینک رہی تھی۔ اس کا جی اداس تھا اور وہ بار بار مضطرب سی ہو رہی تھی، اس نے سوچا آج اگر سفر نہ کیا جائے تو کیا حرج ہے۔؟

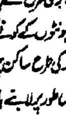
اس نے نگاہ اٹھا کر دیکھا بدر کھڑکی کھولے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے بال الجھے ہوئے تھے، وہ ابھی تک بیمار تھا اور بہت دنوں کے بعد جینا نے اسے دیکھا تھا۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا اور وہ جینا کو زیادہ بدصورت معلوم نہیں ہو رہا تھا، اس نے بدر کے ساتھ نظریں ملائیں اور ناخن کھرچنے میں مشغول ہو گئی، تاہم اس کے پورے جسم میں ایک سرد پھریری پھر گئی۔ اس نے پھر نظر اٹھا کر دیکھا۔ بدر کھڑکی سے سر باہر نکالے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس کا سر کمرے کے اندر غائب ہو گیا۔ ابھی اس نے کچھ سوچا نہیں تھا کہ وہ اپنے مکان کے کمرے سے برآمد ہوا۔ اس وقت پائپ اس کے منہ میں نہیں تھا اور وہ اس کے بغیر کچھ ادھورا سا معلوم ہو رہا تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے محتاط قدموں کے ساتھ چلتا ہوا جینا کی طرف آ رہا تھا۔ اس کا دل بڑے زوروں سے دھڑکنے لگا اور اس کی سانس پھول گئی، جب وہ بالکل نزدیک آ گیا تو وہ مضطرب ہو کر اپنی جگہ پر کھڑی ہو گئی۔ بدر اس کے بہت قریب آ گیا پھر وہ جھکا اور اس نے جینا کے قدموں کے پاس گھاس میں سے ایک خودرو پھول توڑ لیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا واپس چلا گیا۔

وہ بہت دیر تک اپنی جگہ پر ساکن اور ساکت کھڑی رہی تا آنکہ وہ اپنی جگہ سے ہلی اور بدر کے مکان میں گھس گئی۔

بدر سر کو ہاتھوں کے پیالے میں لئے بیٹھا تھا۔ اس نے قدموں کی آہٹ سنی اور سر اٹھا کر جینا کی طرف دیکھا۔ اس نے اپنے لب بھینچ لئے اور پائپ جلا کر گہرے گہرے کش لینے لگا۔ اس کے ہاتھ میں ابھی تک وہ ننھا سا پھول تھا جسے وہ ابھی ابھی اس کے قدموں سے توڑ کر لایا تھا۔ جینا کے دل کی دھڑکن ایک مرتبہ پھر غیر متوازن ہو گئی۔ اس نے یہاں آنے کے متعلق کچھ سوچا نہیں تھا اور وہ بہت سی اس کے بہت قریب کھڑی تھی۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ یوں آگے بڑھی جیسے خواب میں چل رہی ہو۔ اس نے اپنی خوبصورت آنکھیں ہولے سے بند کر لیں اور بڑی آہستگی کے ساتھ سر بدر کے شانے پر رکھ دیا۔

بدر پورے بدن سے کانپ اٹھا، اس کی چھوٹی چھوٹی بے جان سی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس نے اپنا نچلا ہونٹ بری طرح سے چبا ڈالا اور پائپ اس کے ہاتھ سے نیچے گر گیا۔ اس کے ہونٹوں کے کونے کپکپائے اور کنپٹیوں کی نسیں پھڑکنے لگیں اور اس کا دیوار کی طرح ساکن چہرہ ایکا ایکی متغیر ہو گیا۔ ذرا دیر کے بعد اس نے اپنے غیر معمولی طور پر لمبے بازو اوپر اٹھائے اور جینا کو پرے دھکیل دیا۔

”میرے لئے ان چیزوں میں کوئی دلچسپی نہیں!“ اس کی آواز پر کپکپی نہیں تھی، اس نے جھک کر اپنا پائپ اٹھایا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔



"دوشیزہ" کا انعام یافتہ
رومانی گھریلو ناول!

[illegible]

جلتے پھول

عظمت عزمی

تارا اپنے والدین کی چوتھی بیٹی تھی۔ اس کی ماں لڑکے کی تمنا میں بیٹیوں کو جنم دے دے کر تھک چکی تھی۔ تارا کی پیدائش سے پہلے وہ یہ آس لگائے بیٹھی تھی کہ اس بار ضرور لڑکا ہوگا۔ تارا پیدا ہوئی تو ان پر دورے پڑنے لگے اور انھوں نے اسے منحوس قرار دے کر اپنے پیار سے محروم کر دیا۔ تارا ماں کی محبت کی ایک نظر کے لیے ترستی ہوئی بڑی ہو گئی۔ باپ بیوی کے اس سلوک سے جو وہ تارا سے کرتی تھی دکھ محسوس کرتا تھا۔ اس نے بیٹی کی محرومی مٹانے کے لیے اس کی ہر خواہش پوری کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ تارا حساس تھی۔ حسن اور ذہانت دونوں سے قدرت نے نوازا تھا۔ اس کے پاپا نے اسے پڑھانے کا بیڑا اٹھایا۔ ماں یہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی دوسری بیٹیوں کے مقابلے میں تارا زیادہ تعلیم حاصل کرے لیکن اس کی ہر جھکی شوہر کی ضد کے آگے دم توڑ گئی۔ تارا نے اپنے اسکول کی ایک شفیق ٹیچر مس معراج میں ماں کا پیار تلاش کیا۔ لڑکیوں نے ان کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کر دیں۔ مس معراج نے سرد مہری کا رویہ اختیار کر لیا۔ تارا کا ننھا سا دل ٹوٹ گیا۔ اسے کسی کے پیار پر بھروسہ نہیں رہا۔ اس نے خودکشی کی ناکام کوشش کی۔ غلط فہمی دور ہو جانے کے بعد مس معراج اس کی عیادت اور معافی مانگنے آئیں مگر اب تارا بدل چکی تھی۔ اس نے صرف تعلیم کو اپنی منزل بنا لیا تھا۔ اس نے محنت سے پڑھائی جاری رکھی۔ اپنے پاپا کی حوصلہ افزائی سے وہ کامیابی کی منزلیں طے کرتی گئی۔ اس کی دو بہنوں کی منگنی طے ہو گئی۔ تارا کے لیے بھی ایک ڈاکٹر کا رشتہ آیا جو اس کی ماں کے نزدیک نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھا۔ وہ اس کی شادی کے لیے اڑ گئی۔ لیکن تارا ڈاکٹر بننا چاہتی تھی اور پاپا اس کے حامی تھے۔ اسی بات پر گھر میں میاں بیوی کا جھگڑا رہنے لگا۔ ماں میٹرک کے بعد اس کی شادی کرنا چاہتی تھی مگر پاپا اسے داخلہ دلانے پر مصر تھے۔ میٹرک فرسٹ ڈویژن کرنے کے بعد تارا کو اس کے پاپا اپنی بیوی سے چھپ کر اپنے ایک دوست ارباب صاحب کی مدد سے کالج میں داخلہ دلانے ان کے گھر گئے۔ جہاں ارباب صاحب کے صاحبزادے ایاز نے انھیں قائل کر لیا کہ تارا کو ڈاکٹری کی تعلیم دلانے کے لیے ضروری ہے کہ اسے لڑکوں کے کالج میں داخلہ دلایا جائے تاکہ اس کے اندر خود اعتمادی پیدا ہو جائے۔ اس کے پاپا پہلے راضی نہ ہوتے لیکن ارباب صاحب اور ایاز نے انھیں دنیا کے نشیب و فراز سمجھا کر اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ تارا کو ایاز کے کالج میں داخل کرا دیں۔



تارا کالج میں داخل ہوگئی۔ وہ یہاں سہمی سہمی سی رہتی تھی کہ کالج کے دو طالب علموں نواز احمد اور رفیق نے خاص طور پر نوٹ کیا۔ یہ دونوں لڑکے اپنے اپنے طور پر تارا میں دلچسپی لینے لگے۔ ایاز بھی تارا کو متوجہ کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہا تھا لیکن تارا نے اسے مایوس کر دیا۔ کالج میں پولنگ کے دوران نواز نے تارا کی مدد کی جس سے تارا کے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ ہو گیا۔ اُدھر گھر میں تارا کی امی اس کے لیے ڈاکٹر کے رشتے کے بارے میں سنجیدہ ہو گئی تھی۔ تارا کے ابا نے انہیں ڈانٹ کر اور مشتعل کر دیا۔ اسی دوران اس کے ابو بیمار پڑ گئے۔ تارا نے پیپر کی تیاری کے سلسلے میں نواز احمد سے ایک کتاب لی تھی۔ ابو کی بیماری کے دوران وہ کالج نہ جا سکی۔ اور رفیق بہانہ کر کے وہ کتاب لینے اس کے گھر آ پہنچا۔

دوسرے دن تارا کالج گئی تو اس کا منہ پھولا ہوا تھا۔ نواز معاملہ سمجھ گیا۔ وہ تارہ کی معصومیت سے پوری طرح قائل ہو چکا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس لڑکی میں خود اعتمادی پیدا ہو جائے۔ کتاب والے واقعے سے تارا بے حد خفا تھی۔ رفیق اپنی اس حرکت پر پشیمان تھا۔ تارہ اسے نظر انداز کرتی ہوئی چھٹی کے بعد کالج سے نکلی تو راستے میں نواز مل گیا۔ تارا نے راستہ بدلنا چاہا مگر نواز کی مقناطیسی شخصیت اس پر اثر انداز ہو چکی تھی۔ اس کی ایک آواز پر تارہ کے قدم رُک گئے۔ اور وہ اس کے حکم پر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ نواز گاڑی بہت دور لے گیا جس سے تارہ سہم کر رونے لگی۔ درحقیقت نواز اس کے دل سے بے جا خوف ختم کر کے اعتماد پیدا کرنا چاہتا تھا۔ جو کچھ دیر بعد اس کی محبت اور نرمی کے برتاؤ سے تارہ میں جاگ گیا۔ اور جب تارہ اس سے مل کر آئی تو وہ خاصی بدلی ہوئی لڑکی تھی۔ جس نے ماں کے غصے کی بھی پرواہ نہیں کی۔ اس کے پاپا کو ڈاکٹر نے کینسر بتایا جس سے وہ بہت پریشان ہو گئی۔

وہ کالج جا کر ذہنی طور پر اپنی پریشانی بھول گئی۔ تارہ کی امی نے غصے میں اس کے گال پر گرم چمٹا رکھ دیا تھا۔ جس کی جلن کالج آنے کے بعد بڑھ گئی۔ نواز نے موقع پا کر اسے برنال کی ٹیوب لا کر دی۔ اور دو چار میٹھی باتیں کیں اور اس کی ساری جلن جاتی رہی۔ نواز نے اس کے اندر جینے کا حوصلہ پیدا کر دیا تھا۔ کچھ عرصے بعد اس کی دو بڑی بہنوں عائشہ اور چاندنی کی شادیاں ہو گئیں۔ تارا نے زندگی میں پہلی بار سنگھار کیا۔ دیکھنے والوں کی نظریں چکا چوند ہو گئیں۔ خوشیوں کے یہ دن بھی گزر گئے۔ تارا کے پاپا کی بیماری بڑھ گئی۔ نواز نے تسلیوں سے اسے پریشان نہ ہونے دیا۔ لیکن وہ منحوس وقت بھی چلا آیا۔ تارا کے پاپا نے دنیا سے منہ موڑ لیا۔ تارا ذہنی طور پر اس صدمے کے لیے تیار نہیں تھی۔ وہ بے ہوش ہو گئی۔ نواز جس نے اسے زندگی بھر کا رفیق بنانے کی قسم کھائی تھی اس کی حالت دیکھ کر اندر ہی اندر رو پڑا۔ جنازے اور سوئم میں اس کے گھر آتا رہا۔ تارا سچ مچ نیم دیوانی سی ہو گئی تھی۔ [illegible] چچا نے سب کو سمجھا دیا تھا کہ اس کی دلجوئی کرتے رہیں ورنہ یہ پاگل ہو جائے گی۔ چاندنی اور عائشہ کچھ دن رہ کر اپنے اپنے گھر چلی گئیں۔ اب اس گھر میں تارا، ساجدہ اور امی رہ گئی تھیں۔

تارا نے کالج جانا شروع کر دیا۔ رضیہ بی نے بہتیری کوشش کی کہ تارا گھر سے نہ نکلے۔ لیکن باپ کے مرنے کے بعد وہ ماں سے اور دور ہو گئی تھی۔ وہ نہ صرف کالج گئی بلکہ نواز سے بھی ملی۔ پیاسی تارا نے نواز کے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائیں۔ اور اُدھر چوری چھپے رضیہ بی نے ڈاکٹر احسن سے اس کا رشتہ پکا کرنے کی تیاریاں مکمل کر لیں۔ تارا سے عائشہ نے اس کی رائے پوچھی تو اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ نواز کے علاوہ کسی اور کو شریک حیات بنانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ اگر کسی نے زبردستی کی تو وہ گھر کی روایتوں کو توڑنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ تب رضیہ بی نے پہلی دفعہ اسے گلے لگا کر اس کی آرزو پوری کرنے کا وعدہ کیا۔ اور یوں تارا کی شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ رضیہ بی نے بتایا تھا کہ نواز کے گھر سے پیغام آیا تھا جسے منظور کر لیا گیا ہے۔ تارا خوشی سے دیوانی ہو گئی۔ تارا نے اس دوران ایک بھیانک سپنا دیکھا۔ وہ چیخ کر اُٹھ بیٹھی۔

اس نے خواب میں دیکھا تھا کہ اس کے مرحوم پاپا کے سفید بال گلیوں میں اڑتے پھر رہے ہیں۔ رضیہ بی نے خواب سن کر تعبیر دی کہ تمہاری وجہ سے تمہارے باپ کی رسوائی کا خطرہ ہے۔ تمہیں ہر قربانی دے کر اپنے مرحوم باپ کی لاج رکھنی ہے۔ اور رضیہ بی کے ان لفظوں کا بھرم اس وقت کھلا جب نکاح کے وقت نواز کی جگہ ڈاکٹر احسن کا نام لیا گیا۔ تارا کو سکتہ سا ہو گیا۔ وہ دلہن بنی نواز کے سپنوں میں گم تھی کہ نکاح خواں نے ڈاکٹر احسن کے نام سے اس کی رضا مانگی۔ رضیہ بی نے مرحوم باپ کی عزت کا واسطہ دے کر اسے ہاں کرنے پر مجبور کر دیا۔ وہ صدمے سے بے ہوش ہو گئی۔ اسی نیم بے ہوشی میں اس کی رخصتی ہو گئی۔ ڈاکٹر احسن اپنی بے ہوش دلہن کو حجلۂ عروسی میں لے آیا۔ تارا کو ہوش آیا تو سب سے پہلے [illegible] میں ڈاکٹر احسن اس پر جھکا ہوا تھا۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ ڈاکٹر اب تک اس کی بے ہوشی کی وجہ اس کے پاپا کے انتقال کا صدمہ سمجھ رہا تھا۔ مگر تارا نے اس کا ہاتھ جھٹک کر صاف کہہ دیا کہ اس کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے۔ اس کی ماں نے دھوکہ دے کر یہ شادی کی ہے۔ ڈاکٹر احسن ہکا بکا رہ گیا۔

تارا کی صاف گوئی نے اس کے ارمان خاک میں ملا دیئے تھے۔ اس نے ٹھنڈے دل سے اس کے جذبات کا تجزیہ کیا اور اس سے وعدہ کر لیا کہ وہ اس کے راستے سے ہٹ جائے گا۔ مگر ابھی کچھ دنوں اسے اس رشتے سے سمجھوتا کرنا پڑے گا۔ اس کا مطلب ہے تعلقات کے اعتبار سے دونوں دوست رہیں گے۔ اور اس طرح سہاگ رات کسی خوشی کے بغیر بیت گئی۔ تارا کی امی نے دروازے [illegible] سے لگا کر اپنی زیادتی کی معافی مانگی۔ انھوں نے بتایا کہ یہ سب کچھ انھوں نے اس کی بہتری کے لیے کیا ہے۔ امی کا انتقال ہو گیا۔ اسی دوران اس کا [illegible] آ گیا۔ اور اس کے کچھ دیر بعد نواز بھی [illegible]

لوٹ آیا۔ احسن چند سکنڈ سوچتے رہے کہ اتفاق تھا کہ شادی میں نواز شریک نہیں ہوسکا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ تارا احسن کی دلہن بنادی گئی ہے۔ وہ شرارت کے طور پر اپنا تعارف کرانے کے لیے ایک پستول لے کر دلہن کے کمرے میں پہنچا۔ وہاں تارا کو دیکھ کر وہ ہکا بکا رہ گیا۔ تارا اسے دیکھ کر بکھر گئی۔ مگر وہ یہ صدمہ برداشت نہ کرسکا اور بجھے دل سے خاموشی سے باہر نکل آیا۔ تب احسن کمرے سے شور سن کر کمرے میں آگئے۔ تارا اس لڑکے سے بُری طرح بکھر گئی تھی۔ وہ سب اسے دہشت زدہ دیکھ کر گھبرا گئے۔

تارا نے انہیں بہلا دیا۔ اب تارا کسی نہ کسی انداز سے نواز کی غلط فہمی دور کرنا چاہتی تھی۔ وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ اس کی شادی زبردستی ہوئی ہے۔ نواز بہت دنوں بعد احسن کے بلانے پر آیا لیکن ہکا بکا اور اُجڑا اُجڑا۔ تارا اسے دیکھ کر اور پریشان ہو گئی۔ اسے مسلسل اداس اور پریشان دیکھ کر ڈاکٹر احسن نے مشورہ دیا کہ وہ کالج میں داخلہ لے لے۔ مگر وہ راضی نہ ہوئی۔ وہ تمام دن یونہی سست بستر پر پڑی رہتی۔ نواز نے آنا بند کر دیا تھا۔ ایک دن ڈاکٹر احسن نے اسے زبردستی پکچر دکھانے پر آمادہ کیا۔ وہ نواز کا ٹکٹ بھی لے آئے۔ دونوں نواز کو لینے اس کے گھر پہنچے وہ بیماری سے اٹھا تھا۔ اسے کمزور دیکھ کر تارا تڑپ اٹھی۔ وہ بڑی مشکل سے ان کے ساتھ فلم دیکھنے پر راضی ہوا۔ سینما ہال میں ایک ساتھ بیٹھے تو ماضی کا رشتہ پھر جاگ اٹھا۔ اس نے تارا کا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔ تارا کی آنکھیں برس پڑیں اور وہ چپکے سے ہال سے نکل گیا۔

نواز نے دو رات اپنے رشتے داروں کے گھر گزاری۔ اس کا ضمیر بے چین تھا کہ اس نے احسن چچا کی بیوی کے ہاتھوں کو کیوں چھوا۔ بالآخر متفکر اور ملول رہ کر اس نے فیصلہ کر لیا کہ تارا سے قطع تعلق کر لے۔ وہ دوسرے روز ماموں کے یہاں گیا۔ اور زیادہ وقت راحت کے ساتھ ہنس کر گزارا۔ تارا نے بات کرنا چاہی تو وہ روکھائی سے پیش آیا۔ تارا کا دل بُری طرح سے ٹوٹ گیا۔ اور اُدھر ڈاکٹر احسن کو اس کے دوست نے مشورہ دیا کہ تم تارا سے ازدواجی تعلقات قائم کرو۔ وہ تمہاری بیوی ہے کوئی غیر نہیں۔ ہمت افزائی پاکر احسن نے اس رات تارا کو اپنی باہوں میں بھر لیا۔ تارا نواز کے رویے سے ٹوٹ کر بکھر چکی تھی۔ وہ احسن کی پیش قدمی کو نہ سمجھ سکی۔ مگر جب احسن کے ہاتھ آگے بڑھنے لگے تو وہ چونک اٹھی۔ اور نیت بھانپ کر اس کے بازو میں کاٹ لیا۔

ڈاکٹر احسن اپنی بیوی سے حق زوجیت وصول کرنے کے بعد لمبی تان کر سو گئے۔ لیکن تارا کا پورا وجود ان کے خلاف انتقام کا شعلہ بن گیا۔ اس نے اپنے جسم پر ان کا حق تسلیم نہیں کیا۔ اس کا رویہ پہلے سے زیادہ تند اور سخت ہو گیا۔ ڈاکٹر احسن کا ذہنی سکون تباہ ہونے لگا تو تنگ آکر ایک دن وہ اسے اس کے میکے چھوڑ آئے۔ ان کا خیال تھا کہ اس ایک جھٹکے سے تارا کا دماغ درست ہو جائے گا لیکن تارا کے دل سے نواز کا خیال دور نہ ہو سکا۔ ایک دن وہ اس کے گھر پہنچ گئی اور اسے یہ خوشخبری سنائی کہ میں ڈاکٹر احسن سے طلاق لے رہی ہوں۔ پھر اچانک نہ جانے کیا ہوا کہ نواز نے اسے دبوچ کر اپنے بستر پر گرا لیا اور اس کی آنکھوں سے ہوس کی چنگاریاں نکلنے لگیں۔ وہ سراسیمہ ہو گئی۔ اس نے نواز کی گرفت سے نکلنے کی پوری کوشش کی۔ جب کامیاب نہ ہو سکی تو اس نے تکیے کے نیچے پڑا ہوا پستول اُٹھا لیا۔ گولی کی آواز گونجی اور دو چیخیں فضا میں تحلیل ہو گئیں۔

نواز کو خون میں تڑپتا چھوڑ کر تارا جلدی سے گھر سے باہر نکل گئی۔ اپنی ماں کے گھر جانے کی بجائے وہ ڈاکٹر احسن کے گھر پہنچ گئی۔ اس نے اپنے حواس اور گھبراہٹ پر قابو پاکر ڈاکٹر سے اپنے پچھلے رویے کی معافی مانگ لی اور آئندہ ان سے وفادار رہنے کا یقین دلا دیا۔ تارا کی محبت پاکر احسن خوشی سے پاگل ہو گئے۔ تب اچانک انہیں ٹیلیفون پر نواز کے زخمی ہونے کی اطلاع ملی۔ انہیں مجبوراً اسی وقت ڈاکٹر صمدانی کے گھر نواز کو دیکھنے کے لئے جانا پڑا۔ ان کے جانے کے بعد تارا اس خیال سے سخت پریشان رہی کہ کہیں انہیں یہ پتہ نہ چل جائے کہ نواز میری گولی سے زخمی ہوا ہے۔ نواز نے بھی یہ بات کسی پر ظاہر نہ ہونے دی۔ اس نے ہر ایک کو یہی بتایا کہ وہ نشانہ بازی کرتے ہوئے غلطی سے خود کو زخمی کر بیٹھا تھا۔ نواز کو فوری آپریشن کے لئے کلینک پہنچا دیا گیا۔ چند روز بعد اس کی طبیعت سنبھلنے لگی۔ ایک دن وقت گزارنے کے لئے نواز نے احسن کو اپنے گھر بھیج کر اپنی کتابیں منگوائیں۔ انہوں نے جب نواز کے کمرے میں اس کے تکیے کے نیچے سے چابی نکالی تو وہاں وہ تارا کا سنہری لاکٹ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ سرخ پتھر کا یہ لاکٹ انہوں نے تارا کو شادی پر تحفہ دیا تھا جس کے اندر ان کی اپنی تصویر لگی ہوئی تھی۔

لاکٹ کی ٹوٹی ہوئی زنجیر دیکھ کر احسن پاگل سے ہو گئے۔ انہوں نے غصے میں کمرے کی ہر چیز اُلٹ کر رکھ دی۔ ایک کتاب سے تارا اور نواز کی تصویر ملی۔ مسہری کے نیچے سے تارا کی ٹوٹی ہوئی چوڑی بھی ملی۔ نواز اور تارا کے کتنے ہی قابل اعتراض ہیولے ان کی آنکھوں میں گھوم گئے۔ واپس ہوتے ہوئے راستے میں ان کا پرانا دوست فیروز مل گیا جو پرنس بار لے گیا اور دونوں شراب کے نشے میں ڈوب گئے۔ نشے میں دھت آدھی رات کو احسن گھر پہنچے تو تارا نے وفاشعار بیوی کی طرح خدمت کی۔ جب نشہ اترا تو تارا اور احسن میں لاکٹ کے گم ہو جانے پر تلخ کلامی ہوئی اور احسن نے اپنے ہونے والے بچے کو اپنا بچہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ تارا اتنے بڑے الزام کو برداشت نہ کرسکی اور سلیپنگ پلز کھانے کا ارادہ کر لیا۔

(اب آگے پڑھئے)

تارا گڑیاں اٹھانے کے لئے جھکی تو اسے چکر آ گیا۔ اکیلی جان ہوتی تو کسی نہ کسی طرح بدن سنبھال لیتی لیکن پورے سترہ دنوں کا معاملہ تھا امی تو ذرا سی اونچ نیچ نہ ہونے دیتی تھیں لیکن اس وقت وہ یہاں اکیلے کمرے میں قالین پر بچی کے بے جان تودے کی طرح ڈھی پڑی تھی۔ ہاتھ سے ساری گڑیاں چھوٹ کر کانچ کے پہیوں کی طرح گھومتی ہوئی دور دور تک پھیل گئی تھیں۔ اس نے بے بسی سے چاروں طرف بکھری ہوئی گڑیوں کو دیکھا اور پھر تڑپ کر دونوں ہاتھ اپنے پیٹ پر رکھ لئے۔ نہ جانے ایک دم کیا ہونے لگا تھا اسے۔ اتنی شدید تکلیف ایسا جان لیوا درد پہلے تو کبھی نہیں اٹھا تھا۔ اس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں داب کر درد برداشت کرنا چاہا لیکن آنکھوں کے گوشوں سے دو آنسو نکل ہی پڑے۔ ہائے اللہ میاں میں کیا کروں؟

تارا نے بے چین ہو کر کروٹ لی۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اٹھ کر بیٹھ سکے پھر بھی وہ نہ جانے کیسے ساری تکلیفیں سارے درد ضبط کر کے اٹھ بیٹھی مسہری کے پائے کا سہارا لے کر اس نے اپنے قریب پڑی ہوئی دو گڑیاں اٹھا لیں۔ یہ گڑیاں ——— یہ گڑیاں ——— مجھے سارے دکھوں سے نجات دلا سکتی ہیں سارے غموں سے چھٹکارا مل جائے گا مجھے۔ اور پھر سب کو سکون مل جائے گا۔ اب مجھے مرنا ہے ——— بہر حال مجھے مر جانا ہے ——— میں نے تو سوچا تھا احسن کہ تم نے مجھے سمجھ لیا ہے تم تارا کو جان گئے ہو لیکن تم بھی میرے درد نہ سمجھ سکے۔

تارا نے بڑی بے دردی سے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں سے چبا ڈالا اور پھر نہ جانے اسے کیا ہوا وہ بڑی تیزی سے گھٹنوں کے بل قالین پر گھسٹتی ہوئی گڑیاں سمیٹنے لگی ساری گڑیاں اس کے ہاتھ میں آ گئی تھیں سوائے اس گڑیا کے جو ڈریسنگ ٹیبل کے نیچے چلی گئی تھی۔ وہ گڑیاں سمیٹ کر اٹھنے لگی تو اس کا دل آپ ہی آپ دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ اونچی نیچی سانسوں کو سنبھالتے ہوئے اس نے پانی کے گلاس کی طرف دیکھا وہ قالین پر لڑھکا پڑا تھا "اب ——— اب پانی لانا ہوگا" ایک دم بہت ساری تھکن اس سے چمٹ گئی۔ وہ ایک گہری سانس لے کر مسہری پر بیٹھ گئی۔ اس کے دل کو کچھ ہونے لگا تھا سارا بدن پسینے سے بھیگ گیا تھا مٹھی میں دبی ہوئی گولیاں بھی پسیج رہی تھیں۔ اور گلے میں تو شاید کانٹے اُگ آئے تھے۔

"امی ——— امی ——— کہاں ہیں آپ؟ دیکھئے میں آ گیا ہوں!"

بے خوشی میں ڈوبی ہوئی مست اور سرشار سی آواز نے اسے چونکا دیا۔ کتنی تیز کتنی پرجوش تھی یہ آواز تارا نے ایک نظر بند دروازوں کی طرف دیکھا۔ نہ جانے باہر کون آ گیا تھا ——— یہ آواز تو جانی پہچانی اور مانوس سی تھی ——— کون ہے یہ؟ تارا نے حیران ہو کر سوچا۔ آواز تو نواز کی لگتی ہے لیکن وہ کیسے آ سکتا ہے بھلا ——— وہ تو اسپتال میں ہے اور پھر مجھے اس سے کیا مطلب آتا ہے تو سو بار آئے میری بلا سے ——— مجھے اس وقت پانی چاہیئے صرف پانی۔ تارا نے جھک کر قالین پر پڑا گلاس اٹھایا اور باتھ روم کی طرف بڑھی اس وقت تو پانی صرف سنک کے نلکے سے مل سکتا تھا۔ پانی لے کر وہ اپنے کمرے میں واپس آئی تو اسے یوں لگا جیسے گھر میں بہت سارے لوگ جمع ہو گئے ہوں ——— اس وقت وہ کوئی بات نہیں سننا چاہتی تھی وہ بڑے آرام سے پانی لے کر مسہری پر آ بیٹھی بالکل انجان اور لاتعلق بن کر لیکن نہ جانے کیوں اور کیسے امی کی آواز اس کے کانوں میں سرکتی چلی گئی ———

"میرا بیٹا ——— میرا چاند ——— پاگل ہو گیا ہے تو تو بھلا کوئی ماں اپنے دل کے ٹکڑے کو بھول سکتی ہے۔ مجھے پتہ تھا کہ تو پریشان ہوگا۔ میں نے جو تجھے خط نہیں لکھا تھا اسی لئے ناراض ہے نا ——— ؟"

"جی امی جان ——— میری پیاری امی جان میں آپ سے اسی لئے ناراض ہوں میں تو آپ کی گود میں سر رکھ کر لیٹنے کو ترس گیا ہوں امی جان۔ کتنے دن ہو گئے چھٹی نہیں ملتی تھی اب کے تو میں نے لڑ کر چھٹی لی ہے ——— بس اب آپ میرے ساتھ لاہور چلیں گی۔ اب بھائی جان اکیلے تھوڑی ہیں۔ سچ امی جب اکیلے رہو تو پتہ چلتا ہے کہ ماں کیا ہوتی ہے اور پھر آپ جیسی ماں ——— سچ امی یا تو آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا نہیں تو میں واپس نہیں جاؤں گا۔"

"ارے، ارے، چھوڑ شیطان، مجھے چھوڑ، چکر آ جائیں گے۔ یہ پیار کرنے کا اچھا طریقہ ہے۔"

"امی ——— امی ——— پیاری امی ——— اُف کتنے دنوں بعد آپ کو دیکھا ہے۔"

"ہاں میرے چندا یہ بوڑھی آنکھیں تو تجھے دیکھنے کو ترس گئی تھیں۔ کوئی ماں کے دل سے پوچھے کہ بیٹے کا انتظار کیسا ہوتا ہے۔"

تارا نے اس سے آگے کچھ نہیں سنا۔ اس کے دل میں ایک جملہ چبھ گیا تھا "کوئی ماں کے دل سے پوچھے ——— کوئی ماں کے دل سے پوچھے" ——— تارا پاگلوں کی طرح آہستہ آہستہ بڑبڑائی اور پھر اس کی دہشت بھری آنکھوں میں چمک سی لہرا گئی اس کی نظروں کے سامنے پہلے رضیہ بی کا چہرہ آیا اور پھر امی کا ——— "کوئی ماں بھلا اپنے دل کے ٹکڑے کو بھول سکتی ہے۔"

"اور تم بھی تو ماں بننے والی ہو تارا بی" اس کے دل نے سرگوشی کی تو اس کا سارا بدن سنسنانے لگا۔ اس نے ایک نظر اپنے بڑھے ہوئے پیٹ پر ڈال کر سوچا ۔۔ میں بھی ماں بننے والی ہوں۔ لیکن نہیں میں ماں کہاں بنوں گی۔ مجھے تو مر جانا ہے ۔۔ اور میرے ساتھ یہ ۔۔ یہ ۔۔ بھی مر جائے گا ۔۔ میرا لختِ جگر ۔۔ میرے دل کا ٹکڑا ۔۔ اس نے بڑی نرمی سے اپنے پھولے ہوئے پیٹ پر ہاتھ رکھا تو میٹھے میٹھے درد کی ایک لہر سی ریڑھ کی ہڈی سے اٹھ کر سارے بدن میں پھیل گئی۔ گلے میں پڑا ہوا دوپٹہ کھینچ کر قالین پر پھینکتے ہوئے اس نے اپنے سینے پر نظر ڈالی عجیب سی تھرتھراہٹ اور گھٹن نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ اس کے لیے تو یہ سب چیزیں نئی تھیں۔ ہا ۔۔ اس نے ایک گہری سانس لی ۔۔ "نہ جانے ماں بن کر کیسا لگتا ہوگا ذرا امی کو دیکھو فرقان کو دیکھ کر کتنی خوش لگتی ہیں ان کی آواز تک بدلی ہوئی لگ رہی ہے۔ کیا پتہ میرا بھی بیٹا ہو ۔۔۔ ؟

اور بیٹی بھی تو ہو سکتی ہے ۔۔ اس کے دل نے سرگوشی کی۔

ہائے بیٹی ۔۔ پیاری بیٹی اس کی نظروں کے سامنے ایک گول مٹول سی گول گوتھن بچی ہاتھ پیر مارنے لگی۔

"لیکن تارا بی ۔۔ تمہیں کیا مطلب بیٹا ہو یا بیٹی ہو۔ تمہیں تو اپنے ساتھ اسے بھی مار ڈالنا ہے۔ اپنی پریشانیوں کی سزا تم تو آنے والے معصوم فرشتے کو دے رہی ہو ۔۔ بڑی ظالم ماں ہو ۔۔ بے گناہ کو قتل کر رہی ہو ۔۔ آخر اس کا قصور کیا ہے؟ اس نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ ماؤں کے دل تو محبت بھرے ہوتے ہیں وہ تو اپنی اولاد کی خاطر اپنی جان نثار کر دیتی ہیں لیکن تم ۔۔ تم اپنی خاطر اپنی اولاد کو قتل کر رہی ہو ۔۔ تم ظالم ہو ۔۔ تم قاتل ہو ۔۔ تم ظالم ہو۔"

تارا کے بدن کے ہر رونگٹے کو زبان مل گئی تھی۔ "نہیں ۔۔ نہیں۔ میں ظالم نہیں ہوں۔ میں ظالم نہیں ہوں ۔۔ جھوٹ مت بولو تم ظالم ہو ۔۔ تم اپنی ماں کو ظالم سمجھتی تھیں لیکن وہ اتنی ظالم نہیں تھی جتنی کہ تم ہو۔ تم قاتل بھی ہو قاتل بھی ۔۔" کوئی تھا جو اس کے اندر بیٹھا چیخ رہا تھا۔ اور اس میں اتنی سکت نہیں رہی تھی کہ ان چیخوں کو برداشت کر سکے اس نے آہستہ سے اپنی بند مٹھی کھول کر دیکھی گولیاں پسینے سے بھیگ کر اس کی ہتھیلی سے چپکی جا رہی تھیں۔ اس نے غور سے گولیوں کو دیکھا اور پھر تھک کر بولی ۔۔ "میں ان گولیوں کو ابھی نہیں کھاؤں گی۔ احسن خواہ تم مجھ پر ظلم کی انتہا کر دو بے شک تم مجھ پر الزامات کی بوچھاڑ کر دو۔ میں جب تک نہیں مروں گی احسن جب تک تمہیں تمہاری امانت دے جاؤں ۔۔ آخر میں بھی ماں ہوں میں اپنے لختِ جگر کو اپنے ہاتھوں سے زہر نہیں دے سکتی۔ زہر تو مجھے کھانا ہے صرف مجھے ۔۔ تارا نے بھیگی ہوئی گولیوں کو مسل ڈالا۔

"بھابی ۔۔ بھابی جان میں اندر آ جاؤں ۔۔ آپ سو رہی ہیں کیا؟ بھابی میں ہوں آپ کا اکلوتا دیور فرقان" ۔۔ وہ آہستہ آہستہ انگلیوں سے دروازہ بجا رہا تھا۔ تارا نے ایک نظر دروازے پر ڈالی اور پھر تیزی سے ایک ہاتھ سے شلوار سنبھالتی ہوئی باتھ روم کا دروازہ بند کرتے ہوئے اندر سے کہا۔ "آ جاؤ فرقان ۔۔ میں ذرا باتھ روم میں ہوں۔ بس منہ ہاتھ دھو کر آتی ہوں۔" تارا نے مسلی ہوئی گولیاں سنک میں بہا کر منہ پر پانی کے چھینٹے مارے ہی تھے کہ فرقان نے آواز لگائی۔

"ارے بھابی جان بس اب آپ آ بھی جائیں ۔۔ میں کس سے باتیں کروں۔ بھائی جان کلینک میں ہیں۔ نیلی کالج گئی ہے ۔۔ امی میرے لئے کھانا تیار کر رہی ہیں اور آپ"

"بس ابھی آئی بھیا" ۔۔ تارا نے جلدی سے تولیے سے منہ پونچھ کر آئینے میں شکل دیکھی۔ آنکھیں سوج رہی تھیں اور سرخ بھی تھیں ۔۔ اور اس کے گلے میں دوپٹہ بھی نہیں تھا۔ جلدی جلدی میں اس نے قالین پر سے دوپٹہ تک نہیں اٹھایا تھا۔ بڑا تولیہ کندھوں پر ڈال کر اس کے دونوں کونے آگے پیٹ پر پھیلاتے ہوئے اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ اسے فرقان کے سامنے اس حالت میں جاتے ہوئے شرم آ رہی تھی ۔۔ لیکن بہرحال جانا تو تھا ۔۔ وہ بکھرے بکھرے بال سمیٹتی ہوئی کمرے میں آئی تو وہ صوفے پر سے اچھل کر کھڑا ہو گیا

"اوہ ۔۔ بھابی ۔۔ یہ آپ ہیں ۔۔ کتنی چینج ہو گئی ہیں آپ تو ۔۔ ہوں، ہوں، اب میں سمجھا آپ دونوں کو بہت جلدی تھی ارے بھابی دو تین سال تو آرام سے گزار لیتیں ۔۔ ویسے بندہ تو بہت خوش ہے کہ چچا جان یعنی انکل بننے والا ہے ۔۔ کیوں ٹھیک ہے نا بھابی؟"

اس نے شوخی سے پوچھا تو تارا کٹ کر رہ گئی۔

"ویسے بھابی نیلی نے کچھ عرصہ پہلے اپنے خط میں لکھا تو تھا کہ آپ کی طبیعت خراب ہے ۔۔ لیکن میں سمجھا نہیں تھا۔ حالانکہ اس خط میں اس نے لکھا تھا کہ میں عنقریب آپ کو ایک خوشخبری سناؤں گی۔ اور میری بیوقوفی دیکھئے بھابی کہ میں سمجھا کہ وہ مجھے اپنے پاس ہونے کی اطلاع دے گی قیمتی تحفے کی فرمائش کرے گی ۔۔ ارے بھابی بیٹھئے نا آپ ۔۔ آپ تھک جائیں گی اس طرح کھڑے کھڑے ارے ادھر بیٹھے صوفے

پڑ"۔۔۔ اس نے آہستہ سے تارا کا بازو تھام کر اسے صوفہ پر بٹھا دیا۔ تارا نے پلٹ کر قالین پر پڑے ہوئے دوپٹے کی طرف دیکھا تو اس نے جھک کر دوپٹہ اٹھا لیا۔ "اچھا تو یہ بات تھی۔ میں سمجھا کہ آپ کو سردی لگ رہی ہے۔ یہیے اپنا دوپٹہ لے لیجیے۔" تارا نے اس کے ہاتھ سے دوپٹہ لے کر اچھی طرح اوڑھ لیا۔ وہ صوفے پر پڑا تولیہ اٹھا کر تارا کے قریب بیٹھتے ہوئے بچے کے سے انداز میں بولا۔ "اور سنائیں بھابی کیا حال ہیں؟ کیسی گزر رہی ہے؟ ہمارے بھائی جان کیسے لگے؟ وہ نیل کی بچی تو آپ کو تنگ نہیں کرتی؟"

"نہیں فرقان کیا بات کرتے ہو تم۔ نیل تو میرا بڑا خیال رکھتی ہے اتنی پیاری ہے وہ تو۔۔۔۔"

"اور میں۔۔۔۔ میں پیارا سا نہیں ہوں کیا؟" اس نے منہ پھلا کر رنجیدہ لہجے میں پوچھا تو تارا کو ہنسی آگئی۔ "ہاں تم بھی اچھے ہو میرے بہت پیارے سے بھائی ہو۔" تارا نے اس کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ ہنس پڑا۔ "یہ ہوئی نا بات۔۔۔۔" اس نے تارا کے قریب کھسکتے ہوئے اپنا بازو اس کے گلے میں ڈال کر تارا کے کندھے پر اپنا سر ٹکانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "سچ بھابی آپ لوگ مجھے بہت یاد آتے تھے۔ کبھی کبھی تو دل چاہتا تھا کہ اڑ کر کراچی پہنچ جاؤں۔ سچ بتائیے آپ نے بھی مجھے کبھی یاد کیا؟۔۔۔"

تارا جو اس کے بے تکلفانہ انداز سے گھبرائے جا رہی تھی اس کا یہ سوال سن کر بالکل ہی بوکھلا گئی۔ اس نے پلٹ کر فرقان کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر معصومیت اور محبت کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں کے علاوہ کوئی اور غلط جذبہ نہ تھا۔ تارا کو اسی وقت خیال آیا کہ اگر میرا بھائی ہوتا تو وہ بھی تو یوں ہی کرتا نا۔ ٹھیک ہے یہ بھی تو میرا بھائی ہے۔۔۔۔ "اچھا جناب اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ نے مجھے بالکل یاد نہیں کیا تھا۔۔۔۔ آپ تو مجھے سرے سے ہی بھول گئی ہوں گی۔" وہ تارا سے ذرا سا پرے ہٹتے ہوئے بولا۔۔۔۔

"نہیں بھیا میں نے تو تمہیں یاد کیا تھا۔ یہ بتاؤ کہ میں اس شریر لڑکے کو کیسے بھول سکتی تھی جو مجھے خوب ستاتا بھی تھا اور میرا بہت خیال بھی رکھتا تھا اور جس نے مجھے میری شادی کے تحفے کے ساتھ ٹافیوں کا ایک تھیلا بھی دیا تھا۔"

"اوہ، ونڈرفل، بھابی آپ کو تو یاد ہے، سب کچھ یاد ہے میں اب بھی آپ کے لئے ٹافیاں لایا ہوں۔ اور ایران کی آفت "قسم" جیم بھی۔۔۔ لیکن بھابی مجھے افسوس ہے کہ میں نیل افیلڈ اور بیب وغیرہ لانا بھول گیا۔ یہ چیزیں ادھار رہیں۔ کیوں ٹھیک ہے نا۔۔۔۔" اور تارا سر جھکا کر مسکرا دی۔۔۔ وہ بیگ میں ٹافیاں وغیرہ نکالنے چلا گیا۔

نیلما کالج سے لوٹی تو بس ہنگامہ سج گیا۔ قہقہے، شنائیاں، شرارتیں، وہ دونوں تارا کے کمرے میں ہی جمے رہے۔ ظاہر ہے پھر امی کہاں رہتیں۔ تارا بھی کسی نہ کسی طور ان لوگوں کی باتوں میں شامل رہی۔ اسے امی نے زبردستی مسہری پر لٹا دیا تھا۔۔۔۔ وہ تکیوں کے سہارے لیٹی ہوئی تھی۔ نیل اور فرقان قالین پر بیٹھے تھے۔ امی صوفے پر اور باتوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ جاری تھا۔۔۔ کبھی کسی نئے والے نغمے تھے۔ مہمان کے نام تبصرے ہوتے کبھی کسی دوست کے بارے میں شوشے ہوتے کبھی بھابی کو چھیڑا جاتا۔ تارا زبردستی مسکرانی رہی اور زور زور سے بولتی رہی۔ اگر وہ ذرا دیر کو بھی چپ ہوتی تھی تو احسن کے زہریلے جملے اسے ڈسنے لگتے تھے۔

احسن صبح کے گھر سے نکلے ہوئے تھے اور فرقان بڑی بے چینی سے ان کا انتظار کر رہا تھا اور تارا دھیرے دھیرے دعا مانگ رہی تھی کہ خدا کرے احسن دیر سے آئیں تاکہ وہ پہلے ہی امی کے کمرے میں جا کر چپ چاپ سو جائے۔۔۔۔ نیند تو خیر اسے اس وقت بھی آ رہی تھی لیکن فرقان نے تو تہیہ کیا ہوا تھا کہ دوپہر کو نہ وہ خود سوئے گا اور نہ کسی کو سونے دے گا اور رات کو بارہ بجے سے پہلے کسی نے بھی سونے کی کوشش کی تو اسے زبردستی شاور کے نیچے کھڑا کر دیا جائے گا۔۔۔ اس نے نیلما سے راحت سعادت کے لئے بوس میں ان کی سہیلی کے ذریعے پیغام پہنچوا دیا تھا کہ رات آٹھ بجے تک پہنچ جاؤ ورنہ تم دونوں کا کورٹ مارشل کر دیا جائے گا۔۔۔ تارا کو فرقان کی شوخیاں بہت اچھی لگ رہی تھیں ذرا سی دیر میں وہ اسے بہت اچھا لگنے لگا تھا۔ اس کے روشن چہرے کو دیکھ دیکھ کر نہ جانے کیوں تارا کو بار بار یہ خیال آ رہا تھا کہ اگر اس کا بھائی ہوتا تو شاید ایسا ہی ہوتا۔ فرقان کھلنڈرا ضرور تھا مگر تھا محبت کرنے والا انسان۔ اس نے تارا کو کئی بار اتنی۔۔۔۔ اتنی محبت سے بلایا کہ وہ حیران رہ گئی۔ اسے فرقان کو دیکھ کر بڑا حوصلہ ملا تھا۔ تارا نے باتیں کرتے کرتے کئی بار سوچا کہ کہیں میرا فیصلہ غلط تو نہیں لیکن ہر بار اس کے دل نے اسے اطمینان دلا دیا کہ فرقان بہت محبت کرنے والا لڑکا ہے وہ کسی کو کوئی دکھ نہیں دے سکتا۔ تارا نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ جب نیلما نے فرقان کو نواز کے ایکسیڈنٹ کے بارے میں بتایا تو وہ تڑپ گیا وہ اس وقت کھانا کھائے بغیر اس کے پاس جانا چاہتا تھا لیکن امی نے اسے زبردستی روک لیا تھا۔ یہ سمجھا کر کہ یہ اس کے آرام کا وقت ہے اور عیادت کا مطلب تکلیف دینا نہیں تکلیف کم کرنا ہوتا ہے۔۔۔۔ تارا تو نواز کا نام سن کر ایک دم چپ ہو گئی تھی لیکن وہ لوگ دیر تک نواز کی باتیں کرتے

رہے۔ اس کی شرارتوں کا ذکر اس کی طولانی بیداری کے قصے، اس کی قابلیت کے تذکرے۔ وہ نواز کی تعریفیں سن کر سوچتی رہی کہ ہر انسان کے کتنے روپ، کتنے رخ ہوتے ہیں۔ اور جب فرقان نے پوچھا کہ اتنا بڑا ایکسیڈنٹ کیسے ہوا کیوں ہوا تو تارا کا دل آپ ہی آپ دھڑ دھڑ کرنے لگا لیکن نیلما نے فرقان کو سب سمجھا دیا۔۔۔ تارا دو تین بار پہلے بھی ایکسیڈنٹ کی یہ فرضی کہانی سن چکی تھی۔ اسے یہ علم نہیں تھا کہ یہ کہانی احسن نے گھڑی ہے۔ البتہ یہ جان کر اسے بڑا سکون ملا تھا کہ نیلما اور امی کو ذرا بھی شک نہیں ہے۔ وہ سچ مچ یہی سمجھتی ہیں کہ نواز کا اسکوٹر کسی گاڑی سے ٹکرا گیا تھا۔۔۔ لیکن احسن کا کچھ پتہ بھی نہ چلتا تھا۔ انہوں نے تو اپنے اور تارا کے درمیان بہت سی لکیریں کھینچ دی تھیں۔ کچھ لکیریں شک کی تھیں کچھ بے اعتباری کی، کچھ نفرت کی، کچھ انتقام کی۔ وہ تھوڑے دنوں میں تارا سے بہت دور چلے گئے تھے اور تارا ان کے واپس پلٹنے کا انتظار کرتے کرتے تھک چکی تھی مگر احسن اس راہ پر اب دوبارہ پاؤں رکھنا نہیں چاہتے تھے جس راہ پر چل کر نواز نے ان کی محبت پر ڈاکہ ڈالا تھا۔ وہ تو انتقام لینے کی تدبیریں سوچ رہے تھے لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنا انتقام تارا کو طلاق دے کر لے سکتے ہیں یا نواز کو زہر دے کر بہرحال کچھ نہ کچھ تو انہیں کرنا تھا۔ انہیں خود وہ نہ مل سکا جو انہوں نے چاہا تو پھر وہ کس طرح تارا اور نواز کو من کی مراد پا لینے دیتے۔ ان دونوں نے ان کے اعتماد کو پامال کیا تھا اس لئے وہ ان دونوں کو پامال کرنا چاہتے تھے۔ بس انہیں مناسب موقع کا انتظار تھا۔

فرقان کو دیکھ کر انہوں نے اطمینان کی گہری سانس لی تھی انہیں اپنے سر سے بوجھ سرکتا سا محسوس ہوا۔ ان کا یہ چھوٹا بھائی بہت اچھا، بہت محبت کرنے والا تھا۔ وہ اپنی ذمہ داریاں نبھانا جانتا تھا۔ تبھی تو احسن نے فرقان کو دیکھتے ہی سوچ لیا تھا کہ اب اسے کچھ اور ذمہ داریاں بھی اٹھانا ہوں گی۔ اور فرقان۔۔۔ اس کا تو بس نہ چلتا تھا ورنہ وہ احسن کو بھی امی کی طرح بازوؤں میں جکڑ کر دو چار چکر دے ڈالتا۔ وہ احسن کو آتا دیکھ کر دوڑ کر ان سے یوں جا لپٹا تھا جیسے کوئی ترسا ہوا معصوم بچہ ایک مدت بعد اپنے باپ سے ملتا ہے۔ احسن نے بھی اسے سینے سے چمٹا لیا تھا۔ بے شک وہ بھائی تھا لیکن تھا تو اولاد کی طرح پیارا آخر انہوں نے اسے محبت اور محنت سے سینچا تھا۔۔۔

احسن فرقان کو دیکھ کر بڑے زندہ دل شوخ اور نرم طبیعت کے آدمی بن گئے تھے تارا نے تو احسن کی گاڑی کا ہارن سن کر ہی چادر سے منہ ڈھانپ کر نیند کا بہانا بنا لیا تھا لیکن وہ چادر کے اندر منہ کئے بڑے آرام سے احسن کی باتیں سن رہی تھی۔ وہ خاصے خوش معلوم ہو رہے تھے اس وقت نہ ان کے لہجے میں طنز کی تیزی تھی، نہ غصے کی جھلک۔ کئی دفعہ فرقان نے تارا کے حوالے سے احسن سے ہلکا سا مذاق بھی کیا لیکن وہ ہنستے رہے۔ نہ انہیں غصہ آیا نہ انہوں نے باتوں کا موضوع بدلنا چاہا۔ اور جب فرقان نے تارا کی چادر کھینچنا چاہی تو امی کے ساتھ ساتھ احسن نے بھی اسے منع کیا کہ مت جگاؤ اسے ذرا آرام کر لینے دو۔۔۔ آرام کے نام پر تارا کو ہنسی آ گئی تھی آرام۔۔۔؟ آرام کہاں ہے اپنی قسمت میں۔ بس آرام تو اب صرف ایک بار ہوگا۔ اس کڑوی زندگی کے سارے رت جگوں کا حساب بے باق کرنے کے لئے اب تو قبر میں سکون کی نیند سو جانا ہوگا بس کچھ دن اور۔ بس اس مضطرب کے سوا احسن تمہیں جتنا ستانا ہو تم ستا لو ورنہ پھر کون ہوگا جو تمہاری جفائیں، تمہارے ستم یوں گردن جھکا کر سہے گا۔"

تارا بے چین سوچوں کی بیڑیاں گھسیٹتی گھسیٹتی کرب کے صحرا میں جا نکلی اسے پتہ ہی نہ چلا کہ کب فرقان امی سے کار کی چابی لے کر نیلما کے ساتھ نواز کو دیکھنے چلا گیا اور کب امی اٹھ کر نماز پڑھنے چلی گئیں بس صرف احسن صوفے پر بیٹھے بیٹھے سگریٹیں پھونک رہے تھے۔ تارا نے گہری سانس لے کر کروٹ بدلی تو احسن نے چونک کر تارا کی طرف دیکھا۔۔۔ ان کے ذہن میں بجلی کا جھپاکا ہوا اور ہونٹوں پر آسودہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ان کے ذہن میں ایک خیال کرنٹ بن کر دوڑ گیا تھا۔ انہوں نے غور سے تارا کے پھولے ہوئے پیٹ کو دیکھا جو چادر کے اندر سے بھی بہت نمایاں نظر آ رہا تھا۔

"ہنہ، تارا بیگم۔۔۔ چند دن صرف چند دن اور تم اپنے گناہ کو اپنا خون پلا لو اس کے بعد جب تم میرے سامنے میرے رحم و کرم پر پڑی ہوگی، جب تمہیں اپنے جسم کی، اپنے بدن کی کوئی سدھ بدھ نہ ہوگی تب میں سارے انتقام لے لوں گا۔ کوئی بھی مجھ پر شک نہ کر سکے گا۔ آخر میں ڈاکٹر ہوں اور پھر مجھ سے میری بیوی کے ڈلیوری کیس کے بارے میں کون پوچھنے آئے گا۔۔۔؟" احسن سگریٹ پھونک پھونک کر اپنے آپ کو تسکین دیتے رہے۔

"اور بھابی۔۔۔ اگر آپ ہار گئیں تو۔۔۔؟" فرقان نے پیچھے چھیڑتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں ہاروں گی۔۔۔!" تارا نے تکئے کا سہارا لے کر [illegible]

(سینے) پر پھیلائے ہوئے جواب دیا۔

"بھابی، میں فرسٹ کلاس بانجینئر فرقان علی ہوں، مجھے ہرانا (ذرا) مشکل ہے۔ آپ بھائی جان سے جیت جاتی ہوں گی۔"

"نہیں انہی سے تو نہیں جیت سکی ——" تارا ہنستے لہجے میں نہ جانے کیوں کہہ گئی حالانکہ وہ دو دفعہ احسن کو ہرا چکی تھی۔

"ہائیں آپ نے بھائی جان کو بھی نہیں ہرایا، پھر آپ مجھے کیا ہرائیں گی میں تو انہیں دس بار مات دے چکا ہوں جناب، کھیلیں کیا؟ یں پھر باتوں پتے۔"

"ہاں، یا تو فرقان آج ہو ہی جائے تم سے ایک بازی ——"

تارا کا موڈ بڑا عجیب ہو رہا تھا۔

"اور اگر میں جیت گیا تو ——؟"

"کون جیتے گا کون ہارے گا، یہ تو وقت بتائے گا فرقان —— لیکن فرقان یہ قسمت بھی بڑی ظالم چیز ہے۔ جن کا مقدر اچھا ہوتا ہے وہ ہار کر بھی خوش رہتے ہیں اور جن کی قسمت کے ستارے ٹوٹ جاتے ہیں وہ جیت کر بھی دکھی رہتے ہیں۔ ویسے فرقان یہ جیتنا، ہارنا، یہ سب ہیں قسمت کے کھیل، بس جس کے ہاتھ جیسا پتہ آ جائے۔"

"واہ، بھابی، واہ، آج آپ صبح سے ہی بڑا عمدہ قسم کا فلسفہ بول رہی ہیں لیکن حضور اس طرح خالی خولی فلسفے سے پیچھا نہیں چھوٹے گا۔ پہلے صاف صاف شرط لگے گی پھر کھیل چلے گا۔ بولئے آپ ہار گئیں تو کیا دیں گی ——؟"

"میں ہاری تو میں تمہیں کیا دوں گی ——؟ چلو فرقان جو تم بھی کیا یاد کرو گے کہ کس دریا دل بھابی سے واسطہ پڑا تھا۔ سچ کہتی ہوں میں تمہیں ایک بہت قیمتی تحفہ دوں گی —— لیکن اگر تم ہار گئے تو بتاؤ مجھے کیا دو گے؟" تارا نے فرقان سے پوچھا تو وہ ایک آنکھ دبا کر شرارت سے ہنس پڑا۔

"جو مانگو بھابی، وہی دوں گا، دل کہو تو دل، جان کہو تو جان۔ —اور مان میرا احسان ارے نادان کہ میں نے ——" وہ لہرا لہرا کر گانا گانے لگا تھا مگر تارا نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"بیٹا —— زیادہ تیز مت ہو —— شرط کی بات کرو۔ اگر ہار گئے تو ——؟؟"

"تو ——؟؟" اس نے آنکھیں نکال کر تارا کی نقل اتاری۔

"تو —— تو تم مجھے شوٹ کر دینا —— بس! لیکن میں —— ہارنے والوں میں —— بھابی، —— ارے بھابی تمہیں کیا ہوا ——؟

فرقان تلملا کر تڑپتا ہوا چہرہ دیکھ کر اپنی بات بھول گیا۔ وہ ایک دم اتنی زور سے چیخی تھی —— نہیں —— نہیں فرقان نہیں —— اور پھر اس کا چہرہ زرد پڑنے لگا تھا۔ فرقان پتے پھینک کر اسے سنبھالنے لگا۔ اس کی طبیعت بگڑنے لگی تھی پہلے تو وہ اپنے دل پہ ہاتھ رکھ کر بھینچتی رہی پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے پسلیوں کو تھام لیا۔ امّی نے اس کا سر اپنی گود میں رکھا تو وہ بلک پڑی —— بس یونہی بلا وجہ وہ بلک بلک کر روتی رہی —— امّی اسے سمجھاتی رہیں، پیار کرتی رہیں، اپنے سینے سے لگاتی رہیں لیکن اس کی آنکھوں سے برساتیں برستی رہیں۔ اور پھر آہستہ آہستہ اس کی سسکیاں تیز ہوتی گئیں۔ لرزا دینے والے درد اس کے بدن میں ایسے بھونچال لانے لگے تھے کہ وہ تڑپ تڑپ گئی۔ امّی بھی سمجھ گئی تھیں کہ یہ درد کیسے ہیں۔ وہ اسے سنبھالنا چاہتی تھیں لیکن وہ ان سے لپٹ لپٹ کر کہے جا رہی تھی۔

"امّی —— میری پیاری امّی —— مجھے معاف کر دیجئے گا۔ امّی —— میں نے آپ کی کوئی خدمت نہیں کی۔"

"امّی —— میں مر جاؤں تو میرے لئے آنسو مت بہائیے گا۔ امّی —— امّی میں بہت خراب ہوں۔ بہت گناہ گار ہوں۔ میرے بعد میرے لئے دعا کریں گی نا امّی —— امّی —— امّی —— میں مر جاؤں گی —— سچ میں مر جاؤں گی —— یہ درد —— یہ درد —— ہائے اللہ میں کیا کروں ——" امّی اسے چپ کرانے کی بجائے خود ہی رونے لگی تھیں۔ اس کا رونا ان سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ یہ تو خیر وہ جانتی تھیں کہ پہلی پہلی دفعہ ہر لڑکی گھبراتی ہے لیکن اس کے آنسو انہیں لرزائے دے رہے تھے اور وہ فرقان جو ذرا دیر پہلے دل و جان نثار رہا تھا وہ لینے دینے کے سارے چکر بھول کر امّی کے قریب خاموش کھڑا تھا —— اس سے بھابی کی تکلیف دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ امّی کو آنسو بہاتے دیکھ کر وہ اور پریشان ہو گیا۔ اس نے امّی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا —— امّی پلیز آپ بھابی کو سنبھالئے میں بھائی جان کو فون کئے دیتا ہوں۔ وہ ایمبولنس لے کر آ جائیں گے ——!"

اٹکتے اٹکتے لفظ روتی ہوئی تارا کے کانوں میں گئے تو وہ تڑپ گئی —— "نہیں امّی —— میں اسپتال نہیں جاؤں گی —— وہاں احسن ہوں گے —— میں احسن کے سامنے نہیں مرنا چاہتی مجھے اپنے قدموں میں رہنے دیجئے امّی —— امّی —— میں مر جاؤں تو آپ خود اپنے پوتے یا پوتی کو سنبھال لیجئے گا۔ احسن کو مت دیجئے گا امّی احسن کو مت دیجئے گا۔ وہ اسے —— وہ اسے مار ڈالیں گے امّی ——" تارا کی آواز ہچکیوں

میں ڈوب گئی۔

احسن کی باتیں کمال ڈھنگ سے ہو کر رہ گیا۔ فرقان کے ماتھے پر سلوٹیں پھیل گئیں ——— وہ بے چین ہو کر کمرے میں ٹہلنے لگا اور امی نے تارا کو اپنے سینے سے لگا کر کمال ضبط سے کہا۔ "نہیں بیٹا میں اپنے پوتے کو کسی کو نہیں دوں گی۔ میرا پوتا میرے پاس رہے گا ——— احسن کی کیا مجال جو اسے ہاتھ بھی لگا لے ——— میں تمہیں ہسپتال بھی نہیں لے جاؤں گی بیٹا تو بے فکر رہ۔ چاند تجھے کچھ بھی نہیں ہوگا۔ ابھی سب کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے میں رضیہ بہن کو بلاتی ہوں۔ احسن کو تو میں کانوں کان بھی خبر نہیں ہونے دوں گی۔ تم آرام سے لیٹو ——— پیر پھیلا لو میں ابھی آئی بیٹا بس دو منٹ میں ———" احسن کی امی ہچکیاں لیتی تارا کو تکیہ کا سہارا لگا کر کمرے سے باہر آتے ہوئے فرقان کو بھی باہر آنے کا اشارہ کر آئیں۔ ان کے چہرے پر دکھ، ملال کے ساتھ پریشانیوں نے بھی جال بن لیا تھا ——— ان کے سارے شکوک و شبہات آج ایک دم فولادی چٹان بن کر کھڑے ہو گئے تھے۔ احسن کی لاپرواہی تارا کا خوف، ساری باتیں انہیں یاد آ گئی تھیں۔

یوں تو آج صبح کلینک جاتے ہوئے احسن بطور خاص امی سے کہہ گئے تھے کہ امی اگر تارا کی طبیعت خراب ہونے لگے تو مجھے فون کر دیجئے گا میں ایمبولینس لے کر پہنچ جاؤں گا میں نے ڈاکٹر قدسیہ سے بات کر لی ہے۔ وہ اپنے میٹرنٹی ہوم میں، خود بڑی احتیاط سے ڈیلیوری کروائیں گی میں خود وہاں موجود رہوں گا۔ آپ بھی چلی چلیئے گا ——— لیکن اب انہیں خیال آ رہا تھا کہ احسن کے سارے جملے رسمی تھے نہ ان کے چہرے پر کوئی جوش تھا نہ کوئی خوشی ———

"امی؟ ——— فرقان نے انہیں پکارا تو وہ چونک پڑیں۔

"امی ——— آخر یہ چکر کیا ہے ——— میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا، بھابی یہ کیا کہہ رہی تھیں؟ میرا مطلب ہے بھائی جان اور بھابی ———؟"

"بیٹا ——— یہ وقت اس معاملے کو سلجھانے کا نہیں۔ اس کی جان پر بنی ہوئی ہے، اس وقت تو یوں کرو کہ سیدھے ٹیکسی لے کر ڈاکٹر شائستہ حق کے پاس چلے جاؤ ——— اس سے کہنا باجی آپ جیسی بیٹھی ہوں ویسی ہی اٹھ چلئے آپ کو امی نے بلوایا ہے بھابی کی طبیعت خراب ہے۔ اسے بتا دینا کہ ڈیلیوری کیس ہے تاکہ وہ دوائیں ساتھ لیتی آئے اور پھر اسے یہاں چھوڑ کر تم نیلما کو لے آؤ کہ میں نے اسے قاضی صاحب کی بیگم کے ساتھ درزی کے یہاں بھیج دیا ہے درزی ہے اپنا پرانا ——— کیا نام ہے اس کا رحیم ٹیلرز اور سلو مولا بخش کو رضیہ آپا کے ہاں بھیج کر کہلوا دو کہ جیسی بیٹھی ہوں ویسی چلی آئیں۔ بلکہ تم مولا بخش کو ادھر میرے پاس بھیجو میں پہلے مسز انصاری کو بلا لوں۔ ہم ایک سے دو ہو جائیں گے۔ چلو بیٹا جلدی کرو۔"

"لیکن امی پہلے بھائی جان کو فون نہ کر دوں ———؟" فرقان نے پوچھا تو امی جھلا گئیں ——— "نہیں بیٹا نہیں تم نہیں سمجھ رہے ہو وہ غریب تکلیف سے نہ مری ہو کر خدا کرے میرے منہ میں خاک وہ خوف اور پریشانی سے مر جائے گی ——— جاؤ تم جلد کرو بیٹا یہ معاملے تو بعد میں بھی سلجھ سکتے ہیں۔"

فرقان باہر چلا گیا امی مولا بخش کو ہدایات دے کر بھاگی ہوئی اس کے پاس چلی آئیں وہ تکیے پر دونوں بازو پھیلائے بے سدھ پڑی سسک رہی تھی نہ اسے اپنے ہوش کی خبر تھی نہ کپڑوں کی ——— وہ سارے درد خاموشی سے برداشت کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن پھر بھی اس کی چیخیں نکل ہی جاتی تھیں۔ ڈاکٹر شائستہ حق آئیں تو امی کی جان میں جان آئی۔ انہیں ڈر تھا کہ ممکن ہے وہ نہ آئیں۔ لیکن وہ کیسے نہ آتیں۔ جب ڈاکٹر احسن کی امی نے بلایا ہو اور ڈاکٹر احسن کا بھائی انہیں لینے آئے تو وہ بھلا کیوں نہ جاتیں۔ احسن تو ویسے بھی ان کے منہ بولے بھائی تھے۔ تھوڑی دیر بعد نیلما آ گئی۔ وہ بھی آخر میڈیکل کے فورتھ ایئر میں تھی اس نے آتے ہی بڑی خود اعتمادی کے ساتھ ڈاکٹر شائستہ کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا۔ رضیہ بی بھی آ گئی تھیں مسز انصاری بھی موجود تھیں۔ گھر میں عجیب سی افراتفری سی مچ گئی تھی۔ بھابی کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا اور فرقان دروازے کے باہر کھڑا اپنی بھابی کے کراہنے چیخنے کی آوازیں سن سن کر پریشان ہوتے ہار رہا تھا۔ اسے آج اندازہ ہو گیا تھا کہ خدا نے ماں کے پیروں تلے جنت کیوں بنائی ہے۔

۵

ڈاکٹر احسن اپنے کلینک میں بیٹھے ہوئے مریضوں کو دیکھ رہے تھے۔ صبح سے وہ مسلسل کام کر رہے تھے لیکن اب بھی خاصے مریض باقی تھے۔ انہوں نے ایک مریض کو دیکھ کر نئے مریض کو اندر بھیجنے کے لئے گھنٹی بجائی تو بجائے مریض کے سسٹر مریم اندر چلی آئیں۔

"سر ——— آپ کی کوئی رشتے دار خاتون آپ سے ملنے آئی ہیں راحت نام بتاتی ہیں۔"

"راحت ——— راحت ———" ڈاکٹر احسن نے ذہن پر زور دیتے ہوئے پیڈ پر بال پین دو دفعہ مارا ——— "اچھا تو راحت ہے ———

نہیں بیٹھ ــــ سر ــــ ہوا ہے؟"
"نہیں سر ابھی بیٹھتی ہوں۔" مسٹر مریم کے جاتے ہی راحت اندر چلی آئی۔

"اسلام وعلیکم ــــ ماموں جان ــــ"

"وعلیکم ــــ وعلیکم سلام۔ خیریت تو ہے یہاں کیسے آنا ہوا۔؟ بیٹھو ــــ بیٹھو ــــ سب لوگ ٹھیک ہیں گھر میں باجی کیسی ہیں؟"

"سب ٹھیک ہیں ماموں۔ آپ سنایئے؟"

"بس اللہ کا شکر ہے ــــ یہ بتاؤ کوئی خاص بات ہے؟"
احسن راحت کے اس طرح کلینک میں آنے پر خاصے فکرمند ہو گئے تھے۔

"میرے نزدیک تو وہ بات خاص ہی ہے شاید آپ کے نزدیک نہ ہو ــــ" راحت پہیلیوں میں بات کرنا چاہ رہی تھی۔
"کیا بات کیسی بات ہے کونسی بات؟ مجھے بھی تو بتاؤ آخر؟"
احسن بے چین ہو رہے تھے۔

"آپ کو پتہ ہے کہ نواز بھائی امریکہ چلے گئے؟"
"امریکہ چلے گئے ــــ؟ کون نواز ــــ؟ لڑکی پاگل ہوئی ہے کیا۔ ابھی کل تو میں اسے دیکھ کر آیا ہوں۔"
"وہ آج گئے ہیں ــــ"
"آج گیا ہے؟ لیکن کب کیسے؟ اور کیوں؟ مجھے کل تو اس نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ تمہیں کیسے پتہ چلا؟"
"میں صبح انہیں ایئرپورٹ پر سی آف کرنے گئی تھی۔"
"تم گئی تھیں؟؟ اور کون کون تھا؟؟" احسن کی حالت دیدنی تھی۔
"کچھ زیادہ لوگ نہیں تھے۔ میں تھی، سعادت تھی، ہمدانی ماموں تھے، نواز بھائی اور ان کا ایک دوست رفیق تھا ــــ"
"اوں، ہوں ــــ" احسن نے ایک گہری سانس یوں بھری جیسے وہ کہہ رہے ہوں چلو یہ بھی اچھا ہی ہوا ــــ لیکن وہ تھوڑی دیر بعد ہی بولے "آخر یہ سارا ہنگامہ کیا کیوں ہے؟"
"وہ ٹانگ کا علاج کرانے۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ ان کی ٹانگ مستقل ختم ہو چکا تھا اور ہمدانی ماموں یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ ان کے بیٹے کو کوئی لنگڑا کہے۔"
"لیکن ہمدانی بھائی نے مجھے بتایا کیوں نہیں۔ میں کل ان کے پاس کافی دیر تک بیٹھا رہا ہوں ــــ مجھے حیرت ہے کہ انہوں نے مجھ سے یہ بات چھپائی میں لمبے جانے سے تو روکتا نہیں۔"
"احسن ماموں، ہمدانی ماموں کا کوئی قصور نہیں نواز بھائی خود نہیں چاہتے تھے کہ کسی کو یہ پتہ چلے کہ وہ یہاں سے جا رہے ہیں۔ انہوں نے ہمدانی ماموں کو منع کیا تھا۔"
"لیکن تمہارے ساتھ خصوصی رعایت کیوں کی گئی ہے؟"
"اس لئے کہ یہ دنیا مطلب کی ہے۔ نواز بھائی کو مجھ سے کام تھا اس لئے مجھے بلوا لیا۔ ورنہ دنیا میں کون کسے یاد کرتا ہے۔" راحت نے جلے ہوئے لہجے میں کہا تو احسن مسکرانے لگے۔
"لگتا ہے راحت بی بی کہ تم ناراض ہو اس سے۔" احسن نے سوالیہ نظروں سے راحت کو دیکھا۔
"نہیں میں کیوں ناراض ہوتی۔" راحت چڑ گئی۔
"ناراض تو اب آپ ہوں گے۔"
"کیا مطلب؟"
"مطلب وطلب کچھ نہیں۔ بات بالکل سادی سی ہے دراصل نواز بھائی نے مجھے اس لئے بلایا تھا کہ وہ میرے ذریعے نادر ماموں کو ایک ــــ خط بھجوانا چاہتے تھے ــــ" راحت رک رک کر سلگتے ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھی اور احسن ایک دم ہونق ہو گئے تھے ــــ تھوڑی دیر بعد انہوں نے بڑے غصے سے کہا۔
"راحت تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟ میں زیادہ مذاق پسند نہیں کرتا ہوں ــــ سمجھیں تم ــــ"
"میں بڑوں سے مذاق نہیں کرتی ماموں جان ــــ یہ دیکھئے یہ رہا وہ خط ــــ میری غلطی صرف اتنی ہے کہ میرے تجسس نے مجھے اتنا مجبور کیا کہ میں نے یہ خط پڑھ لیا ــــ لیجئے آپ بھی پڑھ لیجئے۔" راحت نے احسن کے آگے خط اچھال دیا۔
"تم نے ــــ تم نے خط پڑھ لیا ہے۔" احسن نے بوکھلا کر پوچھا ــــ انہوں نے بہت چاہا کہ اپنے ہاتھوں کی لرزش پر قابو پا لیں لیکن وہ ایسا نہیں کر سکے۔

راحت ان کے کانپتے ہاتھ دیکھ کر ہنس پڑی۔ احسن نے بمشکل تمام سفید لفافے میں سے نیلے رنگ کے چار چھ کاغذ نکالے ــــ کاغذوں کی تہیں کھولتے کھولتے انہیں یوں لگا جیسے صدیاں بیت گئیں ــــ یہ پہلا صفحہ تھا ــــ اس صفحہ کی پیشانی پر ایک کالم بنا ہوا تھا نیلے رنگ کے کاغذ پر کالی سیاہی کے چھوٹے چھوٹے نقوش ایک

دوسرے کا دامن تھامے بیٹھے تھے۔ احسن نے پڑھنا شروع کیا۔

"تاری جان"

سنو، سنو، تمہیں تمہارے پیار کا واسطہ اس خط کو بغیر پڑھے مت پھاڑنا ــــ دیکھو آج میں نے بہت چاہا کہ تمہیں تاری جان نہ لکھوں صرف احسن لکھ دوں یا بھی جان لکھ دوں، لیکن نہیں لکھ سکا۔ (کیوں نہیں لکھ سکا؟ یہ میں بھی نہیں جانتا) حالانکہ تم نے یا شاید ہم تم دونوں نے وہ رشتے توڑ دیئے ہیں جو پلک جھپکتے بندھ گئے تھے۔ تارا، اب تو میں بہت دور جا رہا ہوں، تمہارے گھر سے تمہارے شہر سے دور کبھی نہ لوٹ کر آنے کے لئے ــــ تارا میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں تمہیں کیا کیا لکھوں اور کہاں تک لکھوں۔ مجھے علم نہیں تھا تارا کہ کبھی کبھی زندگی کا ایک کمزور لمحہ زندگی کی پوری بساط الٹ دیتا ہے۔ وہ پہلا لمحہ تمہیں یاد ہے تاری؟

جب تم زوالوجی پریکٹیکل کرتے ہوئے گھبرا گئی جا رہی تھیں میرا قصور صرف اتنا تھا کہ میں نے کنکھیوں سے تمہیں بار بار دیکھا ــــ بس اس جرم کی سزا یہ ملی کہ تم میری آنکھوں کی پتلیوں میں نقش کر دی گئیں۔

دوسرا لمحہ وہ تھا تارا جس لمحے میں نے لندن جانے کا فیصلہ کیا۔ بس اسی لمحے کی صلیب پر ہم دونوں مصلوب ہو گئے۔ اگر میں لندن نہ جاتا تو شاید تمہاری دہلیز پر احسن چچا کی برات سے پہلے میری برات آکھڑی ہوتی لیکن تارا اگر میری برات نہیں آئی تھی تو تم احسن چچا کی برات لوٹا دیتیں ــــ انکار کر دیتیں، خیر چلو چھوڑو ــــ سنو تارا میری زندگی کے تین لمحے بڑے جابر تھے۔ اور میں تمہیں تیسرے لمحے کا احوال سنانا چاہتا ہوں۔ سنو گی؟

تم سنو نہ سنو میں تمہیں ضرور سناؤں گا کیونکہ میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہوں تارا یہ بوجھ اٹھائے اٹھائے میں تھک گیا ہوں۔ کاش تم ایک دفعہ آکر میرا حوصلہ بڑھا دیتیں تو شاید میں عمر بھر اپنے سینے پر اپنی قبر کا کتبہ لٹکائے پھرتا ــــ ہاں تو میں تیسرے لمحے کی بات کر رہا تھا۔ یہ تیسرا لمحہ وہ تھا تاری جان جس لمحے مجھے میرے چچا کی محبت نے زیر کیا تھا ــــ کاش میں احسان فراموش ہوتا، کاش تارا میں خود غرض ہوتا۔ اب میں سوچتا ہوں کہ میں نے یہ کیوں چاہا کہ تم اپنے شوہر کے ساتھ محبت کرنے لگو ــــ اور تمہارا شوہر تمہیں پا لے؟

تم خود چل کر میرے گھر آئی تھیں، سارے راستے صاف تھے، تم آمادہ تھیں۔ احسن تمہیں طلاق بھی دے رہے تھے، ہم دونوں بڑے مزے سے سول میرج کر سکتے تھے۔ لیکن تارا مجھے کیا ہو گیا تھا۔ میرے سر پر احسن چچا کی محبت کا بھوت سوار تھا۔ تم نے میری منتیں کیں ــــ تم روئیں اور جب میں تمہارے آگے ایک بدھو بن کر بیٹھا رہا تو میں ایک دم فلمی ہیرو بن گیا۔ میں نے سوچا تمہارے دل میں میرے لئے نفرت پیدا ہو گی تو تمہیں احسن کی چھپی ہوئی خوبیاں نظر آنے لگیں گی۔ اور تمہارے دل میں اپنے لئے نفرت پیدا کرنے کا ایک ہی ذریعہ باقی رہ گیا تھا تارا ــــ کاش تم پہلے ہی سمجھ لیتیں کہ میں راحت کی طرف راغب ہو گیا ہوں، میں نے تمہارے سامنے کتنے ناٹک کھیلے تم سے کتنا اجتناب برتا، راحت کی طرف میں کس قدر جھکا لیکن تمہارے یقین میں شگاف نہیں پڑے، تارا یہ کیسا یقین تھا؟

بتاؤ میں اس یقین کو اب کہاں ڈھونڈوں؟

تاری جان کاش تم مجھ سے بدظن ہو جاتیں۔ تو میں یہ آخری تحریر کیوں لکھ رہا ہوتا ــــ؟ اور مجھے کیا پتہ تھا۔ تاری جان کہ تم مجھ پر اس بے دردی سے گولی بھی چلا سکتی ہو؟ کاش تم نے گولی چلانے سے پہلے اپنے نواجی کی بھیگی آنکھیں دیکھ لی ہوتیں۔ اس کے کانپتے ہاتھ دیکھ لئے ہوتے اس کا آنسوؤں سے تر تکیہ دیکھ لیا ہوتا ــــ بھلا وہ تمہیں ریپ کر سکتا تھا، وہ تمہاری عزت سے کھیلنے سے پہلے اپنے ہاتھوں سے اپنے آپ کو شوٹ کر لیتا تارا جان۔

تارا میں تو تمہیں جھنجھوڑ کر ہلا ہلا کر دو چار دھکے دے کر تمہارے دل میں اپنا خوف ڈالنا چاہتا تھا تاکہ تم مجھ سے ڈرو اور ڈر کر احسن کی بانہوں میں جا چھپو ــــ لیکن تارا سچ تو بڑی ظالم ہے۔ دل مجروح کیا سو کیا جان بھی مجروح کر گئی۔ دیکھو اب میں مستقل لنگڑا ہو گیا ہوں۔

ہاں جب تو مجھے گولی مار کر پریشان ہو کر کھڑی ہوئی تھی تو پھر میں ہارنے لگا تھا۔ مجھے تجھ پر پیار آنے لگا تھا لیکن میں نے نہ جانے کیوں اپنے آپ پر خول چڑھا لیا۔ بزدل لڑکی مجھ پر کوئی الزام آتا تو کیا میں سکھی رہتا اسی لئے میں پھر تیری طرف بڑھا تھا۔ جب تو چلی گئی تو پتہ ہے میں نے کتنے عذاب جھیلے۔ میں نے ایک گولی اور چلائی۔ یہ سوچے بغیر کہ اب اگر آواز باہر چلی گئی یا کیا کوئی آ گیا تو کیا ہوگا؟

تارا میں نے جس طرح اپنے باپ کو قائل کیا ہے وہ میں ہی جانتا ہوں۔ میں نے سارے عذاب جھیلے۔ میں نے سارے عتاب سہے لیکن یہ بتا تارا جانی تیرا نام کہیں آیا——؟ تیرے نام پر الزام کبھی آیا——؟

سچ کہنا تارا کبھی تجھے میرا خیال آیا؟

میں نے بہت چاہا کہ تیرے خیال کو اپنے اوپر حرام کر لوں لیکن نہیں کر سکا—— اب میں تجھے ایک ایک بات بتا رہا ہوں اپنا ایک ایک احسان یاد دلا رہا ہوں۔ کیا کروں میں ایک انسان ہوں۔ میں نے اسپتال میں ہزار بار امید جوڑی کہ تو آئے گی مجھے دیکھنے آئے گی غم بانٹنے نہ سہی طنز کرنے آئے گی۔ مگر تارا تو نہیں آئی کیوں نہیں آئی تارا تو کیوں نہیں آئی——؟

میں نے خود چاہا کہ تجھے مجھ سے نفرت ہو جائے اور تجھے مجھ سے نفرت ہو گئی ہے تو میں تجھے یہ بتلانے آیا ہوں کہ میں نفرت کے قابل نہیں۔

میں تو تیرا نواز ہوں تارا۔

”میں تو تیرا نواجی ہوں۔“

آج میں تیرا شہر چھوڑ کر چلا جاؤں گا تارا۔

میرے ساتھ میرے دو زخم جائیں گے۔

ایک دل کا زخم۔

ایک ٹانگ کا زخم۔

ان دونوں زخموں میں تیری خوشبو ہے۔ اور اب یہی خوشبو میری جیون ساتھی ہے۔

تارا خط بہت لمبا ہو گیا ہے لیکن میرا دل چاہتا ہے کہ لکھتا رہوں۔

تارا میں سب کچھ سہہ سکتا ہوں مگر اپنی تاری جان کی نفرت نہیں سہہ سکتا۔ کہو اب تو مجھ سے نفرت نہیں کرو گی نا——؟

میری یاد آئے گی ؟

میرا خیال آئے گا ؟

ہاں مجھے یقین ہے تاری کہ تم میرا خط پڑھتے پڑھتے رو رہی ہو گی۔ تمہیں افسوس ہو رہا ہوگا۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔ میں تمہارے دل کی پاک نقش بن جاؤں تمہاری پلکوں پر ایک آنسو میرے نام کا سدا چمکتا رہے۔ اور تم یہ سوچتی رہو کہ نواز تو بہت عظیم تھا بہت بلند تھا کہ اس نے میری خاطر اپنے آپ کو داؤ پر لگا دیا۔ لیکن تارا جانی۔

——میں نہ عظیم ہوں نہ بلند—— میں بہت کمینہ بہت خود غرض انسان ہوں۔ در اصل میں چاہتا ہوں کہ تم بھی میرے ساتھ اس تیسرے لمحے کا خمیازہ بھگتو جس لمحے میں نے ایک ایثار کر کے افسانوی یا فلمی ہیرو بننا چاہا تھا مگر نہ بن سکا۔

اچھا تارا—— اب اجازت دو۔ راحت آ گئی ہے وہی یہ خط تم تک پہنچائے گی۔ مجھے خط کا جواب دینے کی کوشش نہ کرنا—— اور ہاں منو میاں سے چاہے محبت کر سکو یا نہ کر سکو ان کی قدر ضرور کرنا۔ وہ بہت اچھے بہت پیارے انسان ہیں۔ افسوس میں ان سے مل نہیں سکوں گا۔ بہر حال میرے ملنے نہ ملنے سے کیا ہوتا ہے تم انہیں مل گئی ہو یہی ان کی خوش بختی ہے۔

اچھا تاری جان—— حسرت دید کے ساتھ خدا حافظ۔

فقط،

تمہارا نواجی

احسن نے آخری صفحے کی آخری لائن پڑھ کر سر اوپر اٹھایا تو ان کی آنکھیں خوشی سے بھری ہوئی تھیں ان کے ہونٹوں پر اطمینان بھری مسکراہٹ ہلکورے لے رہی تھی—— انہوں نے ایک نظر راحت پر ڈالی وہ حیرت اور بے یقینی کے ساتھ انہیں ہی دیکھ رہی تھی اور سسٹر مریم آدھا دروازہ کھولے کھڑی تھی۔

”سسٹر پلیز تو تشریف لے جائیں“—— ڈاکٹر احسن نے دو انگلیاں اٹھا کر کہا تو وہ دروازہ بند کر کے باہر چلی گئی۔

”خط پڑھ لیا آپ نے——؟“ راحت نے مردہ سی آواز میں پوچھا۔

"جی، ہاں، پڑھ لیا اور بہت اچھی طرح پڑھ لیا۔" احسن نے مسکرا کر جواب دیا۔

"تو ——— تو ——— تو آپ کو غصہ ——— نہیں آیا؟"

"کیوں صاحب، غصے کی کیا بات ہے اس میں؟"

"کیسی کیسی باتیں لکھی ہیں نواز بھائی نے ممانی کو ———"

"راحت" ——— احسن زور سے چیخے ———

"میں آپ کو آخری وارننگ دے رہا ہوں کہ آپ میری بیوی کے متعلق ایک لفظ زبان پر نہیں لائیں گی۔ سمجھیں۔ اور پھر آپ کو ان باتوں سے کیا انٹرسٹ ——— اول تو آپ کو یہ خط پڑھنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ آپ نے خود غلطی کی اور مجھے بھی اپنے گناہ میں شامل کیا۔ بہرحال خط تو ضبط ہو گیا لیکن آئندہ اگر میں نے کہیں بھی یہ سنا کہ راحت بی بی کسی کے متعلق یہ کہہ رہی تھیں تو پھر دیکھئے گا کہ میں کیا کرتا ہوں؟ ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہے جو آپ ان باتوں میں الجھنے لگیں ——— اور میں نے خود پڑھا ہے کہ آپ کا نام بھی اس خط میں خاص طور پر ہے اگر میں نے آپ کی شکایت باجی سے کر دی تو آپ سب بھول جائیں گی۔" ——— احسن نے رعب سے راحت کو ڈانٹا تو وہ سہم گئی۔ ڈرتے ڈرتے بولی ——— "میں باز آئی ماموں۔"

"نہیں" ——— احسن نے مسکراہٹ چھپا کر سخت آواز میں کہا تو وہ دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

"راحت!"

"جی ——— جی ماموں ———"

"اس خط کا تذکرہ نہ ممانی سے ہونا چاہیئے نہ کسی اور سے اور اگر آپ نے ذکر کر دیا تو سمجھ لیجئے گا کہ آپ بیچاری گئیں۔ کیونکہ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ نہ تو تارا اور نواز ایک کالج میں پڑھتے تھے نہ ہی نواز کو گولی لگی تھی۔ اس کا ٹرک سے ایکسیڈنٹ ہوا تھا اور تارا نے صرف میٹرک کیا ہے۔ اور وہ میرے ساتھ اسپتال جاتی رہی ہیں ——— یہ خط صرف اس لئے نواز نے لکھا ہے تاکہ آپ سے پیچھا چھڑا سکے۔ ورنہ وہ یہ خط آپ کو دینے کی بجائے مولا بخش سے بھجوا سکتا تھا ڈاک کے ذریعے بھیج سکتا تھا ——— آیا کچھ آپ کی عقل شریف میں؟"

احسن نے ڈپٹ کر کہا تو راحت کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اتنی ذلت اور اتنی ہتک کا تو اس نے تصور بھی نہ کیا تھا ——— "میں گھر جا رہی ہوں" ——— وہ ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ تو احسن نے گھنٹی پر انگلی مار دی۔ سسٹر مریم نے اندر جھانکا۔

"سسٹر لیکٹ پیشنٹ پلیز ——— اور سسٹر شہزادہ ہو تو اس سے کہئے کہ گلبرگ کے لئے ٹیکسی یا رکشہ لے آئے۔"

"تھینک یو۔" سسٹر مریم واپس پلٹ گئیں اور راحت دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھنے لگی۔

راحت کے جانے کے بعد ڈاکٹر احسن خوامخواہ مسکرا دیئے۔ مریضوں کو اتنی دیر انتظار کروانے کے بعد خود اٹھ کر چلے جانا اگر انتہائی غیر اخلاقی حرکت نہ ہوتی تو ڈاکٹر احسن کبھی کے گھر جا چکے ہوتے ——— ان کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ابھی اور اسی وقت گھر پہنچ کر تارا سے معافی مانگ لیں۔ وہ مریضوں کو چیک کرتے ہوئے خوامخواہ مسکرا رہے تھے انہیں بار بار تارا اور نواز کا خیال آ رہا تھا۔ "ہنہ ——— پاگل ہیں دونوں" ——— انہوں نے دوسرے مریض کو بلانے کے لئے گھنٹی پر انگلی مارتے ہوئے زیر لب کہا ——— انہوں نے ایک نظر اپنی جیب پر ڈالی اس میں نواز کا خط رکھا تھا ——— نیلے نیلے کاغذوں کو دیکھ کر وہ بے اختیار کہہ اٹھے۔

"واہ راحت بی بی ——— واہ میں مشکور ہوں تمہارا تم نے مجھے ایک بہت بڑے عذاب سے بچا لیا ——— اور اگر یہ خط خدانخواستہ تارا کو مل جاتا ———؟"

"پھر تو میں شاید زندگی بھر انتقام کی آگ میں جھلستا رہتا ——— غضب تو یہ ہے کہ اپنے ہی خون پر شک کرتا رہتا ——— وہ تو اپنی صفائی میں ایک لفظ بھی نہ کہتی ———"

"ڈاکٹر صاحب گلا بند ہو گیا ہے" مریض نے انہیں متوجہ کرنا چاہا تو وہ سنبھل کر اس کی طرف متوجہ ہو گئے ——— نسخہ لکھ کر انہوں نے سسٹر مریم کو آواز دی ———"

"یس سر" سسٹر مریم اندر آ گئیں۔

"سسٹر کتنے پیشنٹ اور ہیں؟" وہ کچھ بیزار ہونے لگے تھے۔

"سر صرف دو اور ہیں۔"

"ٹھیک ہے آپ ان دونوں کو بھیج دیجئے اور جو نئے مریض آئیں ان سے کہئے گا کہ ڈاکٹر صاحب چلے گئے ہیں ذرا ادھر بیٹھ کر کچھ کام کر دوں گا۔"

"جی ٹھیک ہے" سسٹر مریم چلی گئیں تو ڈاکٹر احسن نے جلدی جلدی دونوں مریضوں کو نپٹا کر اپنی کرسی پیچھے کھسکائی اور میز پر دونوں پیر رکھ کر آرام سے بیٹھ گئے۔ وہ ایک بار پھر خط پڑھنا چاہتے تھے انہیں بہت خوشی ہو رہی تھی کہ ان کا معصوم رقیب ان کی زندگی سے دور چلا گیا

[illegible]

کے سامنے تارا کھڑی ہوئی بیمار پریشان اور مضمحل سی۔ ساری اگر یہ خط مجھے نہ ملتا اور میں کچھ کر گزرتا تو ——؟ ڈاکٹر احسن کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ تو بہت کچھ سوچ چکے تھے۔ انہوں نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ تارا کا ڈیلیوری کیس خراب کر دیں گے وہ سسک سسک کر مر جائے گی تو پھر وہ اس نئے مہمان کو نواز کے پاس لے جائیں گے۔ اور کہیں گے۔ نواز باپ بننے کا اتنا ہی شوق تھا تو کم از کم مجھ سے طلاق ہی دلوائی ہوتی —— ظاہر ہے اس سے بڑھ کر نواز کی کیا ذلت ہو سکتی تھی، لیکن سچ نواز میں تمہیں سمجھ نہیں پایا —— کاش مجھے علم ہو جاتا کہ تارا کو تم پسند کرتے ہو تو میں ہرگز اس سے شادی نہ کرتا —— نواز، تم واقعی مجھ سے محبت کرتے ہو —— لیکن ڈیر تمہیں بھی اپنے چچا کی طرح محبت کرنے کا ڈھنگ نہ آیا —— چلو اچھا ہوا کہ تم میری خوشیوں کی خاطر یہاں سے چلے گئے ورنہ میں ہمیشہ تمہارے سامنے جاتے ہوئے شرمندہ ہوتا —— اور تارا تم —— تم بھی کتنی عجیب ہو۔ میں نے تم سے کس کس طرح نہ پوچھا کہ مجھے بتا دو کہ تمہارا نواز سے کس حد تک تعلق ہے لیکن تم نے ہر بار پلٹ کر مجھ سے یہی کہا۔

"تعلقات کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ آدمی جہاں تک چاہے پھیلا لے آپ یہ بتائیے آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔؟"

اور میں نے ایک دن تنگ آ کر پوچھا تھا کہ تارا میں پوچھتا ہوں کہ تم نے نواز کو صرف اپنی محبت سے نوازا ہے یا پھر اپنی عصمت سے بھی —— تو تارا تم کتنی تیزی سے میرے قریب آئی تھیں اور تم نے میرے کوٹ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر کہا تھا۔

"ڈاکٹر احسن —— اگر آپ مجھے اتنا ذلیل ہی سمجھتے ہیں تو پھر ٹھیک ہے میں بدکردار ہوں آوارہ ہوں، ذلیل ہوں —— میں اب اس سلسلے میں ایک لفظ بھی نہیں کہوں گی اگر آپ کو کچھ پوچھنا ہے تو اپنے بھتیجے سے جا کر پوچھئے کہ اس نے آپ کی بیوی پر دست درازی کی ہے یا نہیں —— جائیے ڈاکٹر احسن اس کم ظرف کے پاس جا کر پوچھئے کہ اس بچے کا باپ وہ ہے یا آپ ——؟"

اور تب تارا میں نے تمہیں دو تھپڑ مار دیئے تھے —— اُف خدا میں کتنا ظالم تھا، کتنا احمق، کتنا بے وقوف۔" میں خود اپنے خون کو نہیں پہچان رہا تھا —— لعنت ہے مجھ پر —— سچ تارا میں تمہارا مجرم ہوں میں نے تم پر بہت ظلم کئے۔ میں کیا کروں مجھے اس لاکٹ نے ہلا دیا تھا۔ تارا کیا تم مجھے معاف کر دو گی ——؟ تارا میں نے تم پر بہت ظلم کئے ہیں۔ ڈاکٹر احسن نے بے چین ہو کر کرسی پر پہلو بدلا اور پھر انہوں نے اپنا سر میز پر ٹکا دیا۔ وہ بہت بے قرار اور بے چین تھے ——

"تارا —— میری تارا یہ گولی تم نے چلائی تھی۔ اُف خدا تم نے کتنا ظلم سہا ہے تارا —— واقعی تمہارا حوصلہ بہت بڑا ہے۔ کاش میں یہ سب کچھ پہلے ہی جان لیتا"۔ ڈاکٹر احسن نے اپنے سر کے بالوں میں انگلیاں ڈال کر سر اوپر اٹھایا ان کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں ان کے چہرے پر پشیمانی کا احساس چپکا ہوا تھا۔ انہوں نے ایک بار پھر اپنی جیب میں سے وہی نیلے کاغذ نکال لیے۔ وہ رک رک کر خط پڑھتے گئے اور اپنی آنکھیں رومال سے پونچھتے گئے۔ پورا خط پڑھ کر انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور کرسی سے اٹھتے ہوئے بولے۔

"نواز جانی، میں تم دونوں کا مجرم ہوں میرے پاس نہ تم دونوں جیسا حوصلہ ہے نہ میں تم لوگوں کی طرح بہادر ہوں۔ در اصل میں بہت چھوٹا بہت خود غرض انسان ہوں۔ تم دونوں ایک دفعہ پھر مجھے معاف کر دینا کہ میں تم دونوں پر ایک بار پھر ظلم کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں —— میں یہ خط تارا کو اس لئے نہیں دوں گا نواز کیوں کہ میں چاہتا ہوں کہ پھر میرے حصے میں صرف اس کا جسم آئے گا اس کے دل اور ذہن کے مالک تم بن جاؤ گے نواز"۔ —— احسن نے نیلے رنگ کے کاغذوں کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا۔

"نواز جانی —— میرے لئے یہی بہتر ہے کہ وہ تم سے نفرت کرتی رہے لیکن یقین کرو نواز میرے دل میں اب تمہارے لئے کوئی کدورت نہیں۔ میں تم دونوں سے محبت کرتا رہوں گا۔ گہری اور شدید محبت"۔ —— احسن نے خط کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرتے ہوئے کہا۔

"میری محبت اب کبھی ختم نہیں ہو گی نواز ہاں تم مجھے معاف کر دینا میں تمہارا مجرم ہوں"۔ —— احسن خط کے پرزے اپنے بھیگے ہوئے رومال میں لپیٹ کر باہر چلے آئے —— ان کے دل کو سچ مچ ہی کچھ ہونے لگا تھا۔ کار ڈرائیو کرتے ہوئے انہوں نے اپنے رومال کو کھڑکی سے باہر جھٹک دیا نیلے کاغذ کے ٹکڑے پیچھے کو اڑتے چلے گئے۔

نیلما اور فرقان کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ دونوں خوشی سے پاگل ہوئے جا رہے تھے۔ فرقان کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ کمرے میں گھس کر اپنی بھابی اور بھتیجے کو پیار کرے —— نیلما ہر پل باہر آ آ کر اسے بتاتی تھی ——

"فرقان بھائی ـــــ منا اتنا پیارا ہے اتنا پیارا ہے کہ میں کیا بتاؤں ـــــ؟ آنکھیں تو بالکل بھائی جان جیسی ہیں۔ اور رنگ بھی ویسی ہی کھری کھری ـــــ سچ اتنا اچھا لگ رہا ہے کہ جی کرتا ہے کہ بہت سارے پیار کروں"ـــــ فرقان اس کی تعریفیں سن کر بچھے جا رہا تھا۔ باہر نکلتے وقت امی کے بازو پکڑ لیتا تھا۔

"امی میں اندر جاؤں ـــــ بس ذرا سی دیر کو ـــــ میری پیاری امی میں جاؤں ـــــ؟" وہ منت کر کے پوچھتا اور امی پیار سے جھڑک کر کہتیں "میرے پاگل ہو گیا ہے کیا ـــــ؟ ابھی اندر کیسے جانے گا ویسے فرقان تیرا بھتیجا ماشاءاللہ ہے بڑا خوبصورت مجھے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے احسن چھوٹا ہو گیا ہو۔ بالکل وہی ناک نقشہ وہی چہرہ مہرہ ـــــ ہاں رنگ ذرا سا نیلی سے ملتا ہے ـــــ اللہ کا کرم ہے سب کام خیریت سے ہو گیا ـــــ؟"

"اچھا امی! بھائی جان کو فون کر دوں؟" وہ بے تاب ہو کر کہتا تو امی ہنس کر کہتیں "نہیں اسے تو آج سزا دینی ہے" "دیکھو فرقان اسے تم بالکل فون مت کرنا۔ آنے دو دیکھتے ہیں کتنی دیر سے آتے ہیں۔ میں نے نیلما کو بھی منع کر دیا ہے" امی مسکرا کر بڑے پیار سے کہہ رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں کی روشنی بڑھ گئی تھی۔ چہرے پر ایک پیار بھری تمکنت اور غرور سا آ گیا تھا۔ انہوں نے خوش ہو کر مولا بخش کو پچیس روپے انعام کے دئے اور پچاس روپے تارا پر سے صدقہ کر کے غریبوں میں بٹوا دیئے۔ اور فرقان نے تو سارے محلے کے بچوں کو اپنے بھتیجے کی خوشی میں ٹافیاں اور چیونگم بانٹ ڈالی تھیں۔ بھتیجے کی آمد کی خبر سن کر وہ ایسا دیوانہ ہوا کہ باہر لان میں کھڑے ہو کر بچوں کے ساتھ مل کر نعرے لگانے شروع کر دیئے "تھری چیرز فار بھائی ہپ ہپ ہرا ـــــ" وہ تو امی نے آ کر اسے چپ کرایا کہ شور مت کرو وہ پریشان ہو جائے گی۔ رضیہ بی اور ساجدہ سارے گھر میں خوش خوش پھر رہی تھیں کبھی اندر کبھی باہر ان کا چہرہ دمک رہا تھا۔ فرقان نے رضیہ بی کو بھی خوب ستایا لیکن وہ ہنستی رہیں۔ اور اب جو وہ چادریں سمیٹ کر باہر نکلیں تو وہ ان کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔ "رضیہ خالہ یا تو پہلے میرے بیٹے کو باہر لا کر مجھے دیجئے یا پھر مجھے اندر جانے دیجئے ورنہ آپ کو راستہ نہیں دوں گا۔"

"ارے بیٹا ـــــ ابھی میں اسے باہر کیسے لے آؤں ـــــ ابھی تو اس کے کان میں اذان دی جائے گی"

"تو پھر میں اندر جاتا ہوں اس کے اور اس کی ماں کے دونوں کے کانوں میں اذان میں دوں گا بلکہ نماز بھی پڑھوا دوں گا۔" فرقان آگے بڑھنے لگا تو پیچھے سے امی نے اس کا کندھا پکڑ لیا۔

"ارے بیٹا جی ـــــ کہاں چلے آپ ـــــ ابھی تو آپ وضو کرنا سیکھتے ہیں میں نے مولوی صاحب کو بلایا ہے اذان وہ دیں گے۔"

"امی ـــــ امی آپ ظلم کر رہی ہیں قسم خدا کی دو ڈھائی گھنٹے ہو گئے میرے بیٹے کو اس دنیا میں آئے ہوئے لیکن میں نے اس کی شکل ہی نہیں دیکھی۔"

"بس چندا آدھا گھنٹہ اور صبر کر لو" ـــــ امی اس کا گال تھپتھپا کر اندر چلی گئیں تو پیچھے سے نیلما بھی اس کی پیٹھ سہلا کر یہ کہتی ہوئی اندر چلی گئیں۔

"چچا میاں ذرا انتظار کیجئے ـــــ ابھی اس کی پھوپھی جان اسے دیکھنے جا رہی ہیں۔"

فرقان نے جاتے جاتے اس کی چٹیا پکڑنا چاہی لیکن اس نے کھٹ سے دروازہ بند کر دیا۔

ڈاکٹر شائستہ حق خون کی بوتل چڑھ جانے کا مشورہ دے کر چلی گئی تھیں۔ انہوں نے نیلما کو ساری باتیں سمجھا دی تھیں ویسے بھی تارا کی حالت خطرے سے باہر تھی۔ وہ بہت پرسکون تھی۔ اس کے چہرے پر ٹھنڈا ٹھنڈا اطمینان اور نرم نرم آسودگی بکھری ہوئی تھی۔ وہ آنکھیں بند کئے خاموش لیٹی تھی ـــــ امی نے ان پانچ چھ گھنٹوں میں اسے اتنی دفعہ چوما تھا اتنی دفعہ اس کے بال سلوائے تھے اتنی دعائیں دی تھیں کہ اس کے پیاسے من پر ٹھنڈے چھینٹے پڑ گئے تھے۔ رضیہ بی نے بھی اسے ہزاروں دعائیں دیں۔ نہ جانے کتنی بار پیار کیا ـــــ نیلما نے بھی کبھی سر دبایا کبھی چہرہ پونچھا کبھی بال سمیٹے لیکن وہ خاموش لیٹی رہی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے ساری تھکن ختم ہو گئی ہو۔ اس کے بدن کا پور پور دکھ رہا تھا لیکن وہ یوں لیٹی تھی جیسے وہ پھولوں کی سیج پر لیٹی خوابوں کے محل میں جھول رہی ہو حالانکہ وہ جاگ رہی تھی۔

"تارا بیٹی ـــــ" امی نے اسے پکارا تو اس نے آنکھیں کھول دیں ـــــ

"تارا بیٹی ـــــ وہ پاگل ہوا جا رہا ہے تیرے پاس آنے کو ـــــ کہو تو اسے اندر بھیج دوں؟"

"کون امی ـــــ" تارا نے کمزور سی آواز میں پوچھا۔

"ارے وہی تمہارا دیور ہے فرقان" ـــــ امی نے ہنستے ہوئے کہا۔

سب ہے۔ ادھر آؤ فرقان" ـــــ تارا نے آہستہ سے پکارا تو امّی نے زور سے کہہ دیا ـــــ "آ جاؤ بھئی فرقان تمہاری بھابی بلا رہی ہیں" ـــــ اور فرقان کھٹاک سے دروازہ کھول کر چھلانگ لگاتا ہوا تارا کے قریب آگیا۔

تارا نے آنکھیں کھولیں اور اس نے جھک کر اس کی پسینے میں بھیگی ہوئی پیشانی دو تین مرتبہ چوم لی۔ نیلما، ساجدہ، رضیہ بی ہنسنے لگیں۔ امّی نے اس کی پیٹھ پر ایک دھپ جما دی "بگڑو" ـــــ وہ اسی طرح بولے گیا ـــــ "بھابی ـــــ میری پیاری بھابی ـــــ مبارک ہو۔ آئی وش یو بیسٹ آف لک مائی ڈیرسٹ بھابی۔ اب ذرا یہ بتایئے کہ آپ کی تخلیق کیسی ہے۔ میں تو تعریفیں سن سن کر حیران ہو رہا ہوں۔ سنا ہے کہ بھائی جان کے بچپن کی فوٹو اسٹیٹ کاپی آپ نے تیار کر ڈالی ہے۔"

تارا کے خشک ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ پھیل گئی ـــــ اس نے فرقان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "نہیں بھیّا اس میں اپنے سویٹ انکل کا بھی عکس پایا جاتا ہے۔"

"اوہ نائیس" ـــــ وہ اچھل پڑا۔

تارا نے رک رک کر کہا "فرقان میں نے تم سے وعدہ کیا تھا نا کہ اگر میں ہار گئی تو تمہیں ایک قیمتی تحفہ دوں گی۔"

"ہاں، ہاں بھابی کہا تو تھا لیکن وہ بازی تو ہوئی نہیں۔"

"لیکن ہم شاہ لوگ ہیں فرقان ایک دفعہ جو کہہ دیتے وہ دیتے ضرور ہیں۔"

"اچھا یہ بات ہے تو پھر بھابی قسم سے جو کچھ دینا ہے دے بھی ڈالو آج ـــــ لاؤ کیا دیتی ہو" ـــــ فرقان نے ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیا۔

تارا نے فرقان کا ہاتھ پکڑ کر اس کے ہاتھ میں اپنے پہلو میں لیٹے ہوئے منے کا ہاتھ دیا تو وہ خوشی سے اچھل پڑا ـــــ "اوہ مائی گاڈ ـــــ بھابی تم اپنا بیٹا ـــــ اتنا پیارا بیٹا مجھے دے رہی ہو۔ قسم خدا کی پھر میں لوٹاؤں گا نہیں بس ابھی سوچ لو ـــــ اور پھر وہ جو تمہارے منے کے ابا آئیں گے وہ جو چھین لیں گے مجھ سے۔"

"کیسے چھینے گے، بیٹا ان کا نہیں میرا ہے" ـــــ تارا نے عجیب سی آواز میں کہا تو امّی اس کے قریب آگئیں۔ "ارے بیٹا کیوں اس کے پیچھے اپنا دماغ خراب کرتی ہے بس تم آرام کرو بیٹا شائستہ کہہ کر

"ہاں امّی نیند تو آ رہی ہے" تارا نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا ـــــ "اور اب تو سونا ہی ہے۔"

"ہاں ہاں، سو جاؤ بیٹا ـــــ چلو فرقان تم باہر چلو، نیلی اٹھو تم بھی اٹھو" ـــــ ساجدہ اپنے آپ اٹھ کھڑی ہوئی۔ رضیہ بی بھی پاندان سنبھال کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ "ہاں تارا بیٹی سونے سے پہلے سوپ پی لینا میں ابھی لے کر آتی ہوں اور ہاں ایک درد کی گولی بھی کھانی ہے۔"

"اچھا امّی" تارا نے آنکھیں پھر موند لیں۔

فرقان ننھے کا ہوائی بوسہ لے کر باہر چلا گیا۔

امّی سوپ لے کر آئیں تو تارا نے بڑی لجاجت سے کہا ـــــ "امی ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں سے میرا پرس اٹھا دیں گی آپ۔ ؟"

"ہاں ہاں کیوں نہیں" ـــــ امّی نے دراز کھول کر پرس تارا کو تھما دیا۔ تارا نے پرس سرہانے رکھ کر کہا "امّی دروازہ بند کر دیجئے گا۔ میں ذرا آرام سے سوؤں گی۔ کوئی مجھے جگائے نا۔"

"ہاں ہاں سو جاؤ بیٹا بے خوف ہو کر سو جاؤ۔"

"آپ چاہیں تو منے کو لے جائیں" ـــــ تارا نے غور سے منے کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ارے واہ کیوں لے جاؤں بھئی۔ میں ذرا باہر باورچی خانے کا حال دیکھ لوں پھر یہیں ادھر آ کر بیٹھی جاتی ہوں منے کے پاس تم سوئی رہنا میں اسے دیکھتی رہوں گی۔"

"اچھا بیٹی ـــــ اب سو جاؤ تم" ـــــ امّی اس کی پیشانی چوم کر باہر چلی گئیں۔

☆☆☆

احسن نے ابھی کار ٹھیک سے روکی بھی نہ تھی کہ نیلما دوڑ کر ان کے پاس جا پہنچی۔ پیچھے پیچھے فرقان بھی دوڑا۔ احسن کے چہرے پر ہزاروں گلاب ایک ساتھ کھل گئے انہوں نے نیلما کو اپنی بانہوں میں بھر کر گھما ڈالا ـــــ آج وہ اپنی ساری سنجیدگی بھول گئے تھے۔ فرقان کو گلے لگا کر پیار کرتے ہوئے وہ کھلے جا رہے تھے۔ وہ ان دونوں کے گلے میں بانہیں ڈال کر اندر چلے گئے۔ سامنے رضیہ بی نظر آئیں تو انہیں آداب کیا اور پھر وہ بے تحاشہ دوڑ کر کمرے سے باہر آتی ہوئی امّی سے لپٹ گئے۔

"امّی ـــــ پیاری امّی ـــــ آپ دادی جان بن گئیں۔ مبارک ہو ـــــ مبارک ہو" ـــــ وہ امّی سے لپٹے جا رہے تھے اور امّی اپنی

خوشی ملی مسکراہٹ چھپاتے ہوئے انہیں نرم نرم ہاتھوں سے پیچھے دھکیلے جا رہی تھیں۔

"ہٹو، ہٹو میں تم سے نہیں بولتی میں تم سے ناراض ہوں۔ تم نے بچی کو ڈرا کر رکھ دیا۔"

"ارے امی اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اب میں آپ کی بچی سے معافی مانگ لوں گا۔ اب تو وہ بھی ماں بن گئی ہے۔ وہ مجھے معاف کر دے گی۔ وہ ہے کہاں امی؟ اس کی طبیعت کیسی ہے۔ میں اسے دیکھ لوں۔ ؟ ہیں امی میں اسے دیکھ لوں؟"

احسن نے بڑی لجاجت سے پوچھا تو امی نے ہاتھ بڑھا کر صاف انکار کر دیا۔ "نہیں احسن تم اس کے کمرے میں بالکل نہیں جاؤ گے وہ سو رہی ہے۔ خواہ مخواہ ڈر گئی تو مشکل ہو جائے گی تم یہ بتاؤ کہ تم نے یہ جھگڑا کیا پھیلایا ہے؟ آخر مجھے بھی تو کچھ پتہ چلے۔؟"

"کچھ نہیں امی — سچ کچھ نہیں — بس کچھ ناراضگی ہو گئی تھی ہم میں۔ لیکن آپ اندر جانے کی اجازت دے دیں —" میں منالوں گا اسے، پلیز معافی بھی مانگ لوں گا — پلیز امی — سویٹ امی —"

احسن نے امی کے آگے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے تو وہ ہنسی چھپاتے ہوئے مصنوعی رعب سے بولیں۔

"دیکھو وہ آرام کر رہی ہے۔ جب جاگ جائے تب جانا اندر۔"

"کب سے سو رہی ہے وہ؟" احسن نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"بہت دیر ہو گئی۔ بھائی جان؟" نیلما پٹ سے بول پڑی۔

"بہت دیر ہو گئی۔ ؟ ارے نیم حکیم خطرہ جان تم نے اسے نیند کی گولی تو نہیں دے دی۔ اتنی دیر کا سونا تو اچھا نہیں ہے اس کے لئے امی بس آپ ابھی اندر جانے دیں میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔" احسن بے تاب تھے۔

"ہاں امی اب بہت ہو گئی۔ آپ بھائی جان کو اندر جانے دیں نا۔ وہ بھابی کو دیکھیں گے۔ شاید کوئی بات کرنا ہو" — نیلما نے سارے دانت نکال کر اپنے بھیا کی سفارش کی تو فرقان بھلا کیسے چپ رہ سکتا تھا وہ فٹ سے بولا۔

"امی بھائی جان کو سزا بعد میں دیجئے گا فی الحال انہیں میرا بیٹا تو دیکھنے دیجئے۔"

"یہ سب بیکھنے یہ خواہ مخواہ ہی ابا بنے جا رہے ہیں۔ بیٹے کا باپ میں ہوں سمجھے۔" احسن نے غرا کر فرقان کو آنکھیں دکھائیں تو فرقان بڑی شوخی سے بولا۔ "یہ تو میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا کہ خواہ مخواہ میں ابا بن رہا ہوں یا آپ" — اس وقت تو آپ چلئے اندر چلئے — امی نے بھی مسکرا کر جھنڈی دے دی۔ وہ سب اندر چلے آئے۔ ان کے پیچھے پیچھے رضیہ بی بھی آگئیں۔

نیلما اپنے چہرے پر گلابی جارجٹ کا دوپٹہ ڈالے سو رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر آسودہ سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ احسن نے نیلما کا چہرہ دیکھا تو ان کے ہونٹوں پر پیار بھری مسکان بکھر گئی۔ وہ اس کے بستر کے قریب چلے آئے۔ امی نے سرگوشیوں میں کہا۔ "دیکھو سو رہی ہے تو سونے دو۔"

فرقان نے منے کے منہ پر سے جالی اٹھا کر کہا۔ "بھائی کو تو بعد میں دیکھئے گا بھائی جان ادھر دیکھئے یہاں آپ کا بیٹا سو رہا ہے" احسن منے کو دیکھ کر بے اختیار ہو گئے۔ انہوں نے جھک کر اس کا ننھا سا ماتھا چوم لیا اور وہیں گھٹنوں کے بل بیٹھ کر منے کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھانا چاہا تو اس کی چھوٹی سی مٹھی میں اڑسا ہوا ایک کاغذ نیچے گر پڑا۔ انہوں نے جھپٹ کر پرچہ اٹھا لیا۔ پرچہ کھولتے ہوئے نہ جانے کیوں ان کے ہاتھ کانپنے لگے ان کی نظریں بجلی کی سی تیزی

سے لفظوں پر پھیلنے لگیں۔ لکھا تھا
"پیارے فرقان
سنو فرقان بعض لوگ اتنے کم نصیب ہوتے ہیں کہ وہ اگر اپنی زندگی میں ایک بار بھی جیتنا چاہیں تو نہیں جیت پاتے۔ بس یہی سمجھ لو کہ تمہاری بھابی بھی ان ہی لوگوں میں سے ایک تھی جو ایک بار جیتنے کے شوق میں ہزار بار ہارتے ہیں اور ہارتے ہی چلے جاتے ہیں۔ سچ پوچھو تو میں تو ہارتے ہارتے تھک گئی ہوں۔ اس لئے اب آرام چاہتی ہوں۔ فرقان بھیا۔ آج جب میں یہ خط لکھ رہی ہوں تو مجھے یہ علم نہیں ہے کہ میں بیٹے کی ماں بنوں گی یا کسی بیٹی کو جنم دوں گی ویسے یہ اندازہ تو مجھے ہو گیا ہے کہ دو چار دن میں یہ فیصلہ بھی ہو ہی جائے گا ویسے فرقان ڈیئر میرا دل چاہتا ہے کہ میں بیٹے کی ماں بنوں۔ دعا کرو کہ خدا میری دعا سن لے۔ سچ فرقان اگر اللہ میاں نے میری دعا سن لی اور میں نے بیٹے کو جنم دیا تو میں یہ خط تمہیں دے دوں گی اور وہ بیٹا تمہارا بیٹا ہو گا۔ اس پر اس کے باپ کا کوئی حق نہیں ہو گا۔ وہ ظالم تو اپنے خون کو پہچاننے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا۔ مجھے یقین ہے کہ امی اپنے خون کی مہک پہچان لیں گی۔ ان سے کہنا کہ مجھے معاف کر دیں کیونکہ میں ان کی کوئی خدمت نہ کر سکی بس یہی اک ملال میرے ساتھ میری لحد میں اترے گا ۔۔۔ کیا پتہ فرقان کہ میں بیٹی کو جنم دوں۔ خدا نہ کرے ایسا ہو اگر ایسا ہوا پھر مجھے عربوں کی روایت دہرانی پڑے گی۔ اور اگر میں نے بیٹے کو جنم دیا تو پھر کوئی مجبوری میرے پیر کی زنجیر نہیں بنے گی۔ وہ تو مرد ہو گا ۔۔۔۔ اور احسن کی طرح زندہ رہے گا۔ نواز کی طرح زندگی گنوائے گا۔ ہر طرح سے فائدے میں رہے گا ۔۔۔ ہاں فرقان بھیا میری قبر پختہ نہ بنوانا میں چاہتی ہوں کہ جلد از جلد مٹی میں مل جاؤں۔ میرا کوئی نشان باقی نہ رہے میں نے سلیپنگ پلز بڑی مشکل سے احسن کی دواؤں کی الماری میں سے ڈھونڈ لی ہیں۔ جب تم یہ خط پڑھ رہے ہو گے تب یہ سارے پلز میرے معدے میں حل ہو چکے ہوں گے۔
فقط تمہاری کم نصیب بہن تارا!"

احسن کے ہاتھ کانپتے رہے۔ آنکھیں ہزار بار دھندلائیں لیکن وہ پلکیں جھپکائے بنا خط پڑھ گئے۔ ان کا چہرہ آنسوؤں اور پسینے سے بھیگ گیا تھا۔ وہ خط ہاتھ میں تھامے ہوئے ساکت بیٹھے ہے لیکن جب امی نے ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ "احسن بیٹا کس کا خط ہے۔ کیا لکھا ہے؟" تو وہ ایک دم چیخ مار کر تارا کی طرف بڑھے۔ امی نے انہیں روکنا چاہا تو انہوں نے امی کو دھکا دے دیا۔ ان کے پیچھے بیٹھ کر پرچہ پڑھنے کی کوشش کرنے والا فرقان امی کو سنبھالنے کو آگے بڑھا تو گھبراہٹ میں اس کا ہاتھ تارا کے سرہانے رکھے ہوئے پیکٹ پر جا لگا۔ پیکٹ کے ساتھ ایک خالی شیشی بھی نیچے گر پڑی۔

"بھابی" فرقان چیخ مار کر اپنی بھابی کے قریب آ گیا۔ "نہیں بھابی تم نہیں جاؤ گی۔ نہیں جاؤ گی، نہیں جاؤ گی" وہ پلنگ کی پٹی سے سر ٹکرا ٹکرا کر بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ امی صدمہ سے بے ہوش ہو چکی تھیں احسن کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ تارا کے چہرے پر سکوت تھا۔ اس کی آنکھیں پتھرا چکی تھیں۔ وہ خلا میں اس طرح گھور رہی تھی جیسے اپنی لٹی ہوئی مسرتوں کا تعاقب کر رہی ہو، جیسے اپنی اجڑی ہوئی آرزوؤں کے کھنڈر سمیٹ رہی ہو۔ چاروں طرف چیخوں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں لیکن وہ خاموش تھی۔ اس کے لب منجمد ہو چکے تھے۔ اس کی آنکھوں کے سوتے ہمیشہ کے لئے خشک ہو چکے تھے۔ اس کی جوانی، اس کا شباب، اس کی امنگیں، اس کی خواہشیں سب دم توڑ چکی تھیں۔ اور کائنات میں دھیرے دھیرے اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔

فاطمہ ثریا

کا

سلسلہ وار ناول

چاند سا چہرہ

دوشیزہ

کے اگلے شمارے سے شروع کیا جا رہا ہے

پہلی قسط پڑھنا ہرگز نہ بھولئے

سر کے خار

اس کے حسن میں اس کے سر [illegible]

[illegible]

انور عظیم

سائرہ نے بھڑک کر اپنا دوپٹہ گرا دیا اور ڈرائینگ روم میں کتابوں کے شلف پر اپنی کہنیاں ٹیک کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا منہ بچوں کے ہاتھوں کھنچے ہوئے غبارے کی طرح لمبا ہو گیا۔ آنکھیں خشک رہیں اور ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز نے ڈرائینگ روم میں ایک رقت خیز سماں پیدا کر دیا —— بس ایک المناک نغمی کے چھڑنے کی دیر تھی۔

خان صاحب جواد علی نے اپنی بچی کے گھنگھریالے بالوں کو تھپتھپانا چاہا۔ لیکن سائرہ گلہری کی طرح دمیے خرگوش کی طرح کہتا ...

... ٹیپ چھپتی چلی گئی۔ سائرہ کی آواز تھی ہی ایسی کوکتی ہوئی، تیز اور کبھی کبھی بھونرے کی طرح کرتی ہوئی۔ خان صاحب جواد علی نے اپنی اچکن کے بٹن سے کھیلتے ہوئے مسکرا کر اپنی لاڈلی بچی کی طرف دیکھا جس کا قد ادھیڑ عمری کے زندگا رسینڈل کی بدولت اپنے باپ کے بوٹا سے قد سے جلد انگلا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔

خان صاحب نے اپنی بچی کو گلے لگایا جو انتہائی سعادت مندی اور بھولپن سے باپ کے شانے پر جھک گئی اور انہوں نے آہستہ سے اپنی روشن خیال پدرانہ محبت کی مہر اپنی بچی کے دپ دپ گال پر ثبت کر دی ان کا منہ کچھ کچھ گیا۔ غازے کا کچھ زہر آلود، کچھ میٹھا پھیکا ذائقہ ان کی طبیعت میں مالش کی کیفیت پیدا کرنے لگا۔

"ڈیڈی ڈیئر —— ہائی گاڈ ذرا دیکھئے تو میا ٹیگر کی آنکھیں کتنی لال انگارہ ہو رہی ہیں۔" تاشیگر نے اپنی سرخ آنکھیں بند لیں، ایک خراب دل جماہی لی اور اپنی دم ہلاتے ہوئے ایک الٹی ہوئی مکھی کو ہڑپ کرنے کے لئے منہ چھپانے اور بند کرنے لگا۔

خان صاحب جواد علی نے کار سے اپنے قدم باہر نکالے ہی تھے کہ ایک چہچہاتی ہوئی آواز ان کے کان میں گونج اٹھی اور ان کے دل



"کہو سویٹی آج دن کیسا رہا؟"

"آج ہولی ڈے، ڈیڈی میں کتنی بور ہو رہی ہوں۔ یو کانٹ ایون امیجن۔"

"کیوں اتنے غصہ میں کیوں ہو۔ اف کیا قیامت برپا ہو گئی۔ بولو تو۔ زکام نے پھر حملہ تو نہیں کر دیا ڈارلنگ۔"

"اے کاش مجھے ہو جاتا زکام —— میرا ٹائیگر اچھا رہتا —— پور تھینگ! —— موسم اتنا ڈپریسنگ ہو رہا ہے کبھی دھوپ کبھی چھاؤں۔ ڈیڈی ذرا اپنے فرینڈ ڈاکٹر استھانہ کو رنگ تو کر دیجئے"

"ڈونٹ بی سلی —— وہ حیوانوں کے ڈاکٹر نہیں ہیں بے بی۔"

"ایسا ہوگا" اچھل کر دور ہٹ گئی۔ "ڈیڈی ——— بادُسلی ایکنڈ نے کانٹے لگا رکھے ہیں؟" واقعی وہ بھول گئے تھے کہ ان دنوں سائرہ بالوں میں کرل پیدا کرنے کے موچے پر بُری طرح جمی ہوئی تھی ——— اور یہ اچھا ہی تھا اس طرح لاتے تھے صوفیت ہاتھ لگتی تھی۔

خان صاحب جواد علی کے باوقار چہرے پر رنج کا سایہ سا ابھرا لیکن دوسرے ہی لمحے ان کی رگ رگ میں سمائی ہوئی دھندلاہٹ نے دھواں اڑا دیا اور چہرہ دمک اٹھا یہاں تک کہ مسکراہٹ کی روشنی ان کی جھریوں تک میں دوڑ گئی جس طرح پانی کا ریلا خشک کیاریوں میں دور تک ——— وہ اپنے باتھ روم میں چلے گئے اور کپکپاتی ہوئی نسوانی آواز میں گانے لگے "جہاں دور اب ہے اب میرا انتظار کر" دھیمے دھیمے سروں کے ساتھ گنگنانے لگے کبھی پانی کے گرنے کی آواز تیز ہو جاتی اور کبھی ہلکی۔

شام کے وقت خان صاحب جواد علی ململ کا کرتا، لٹھے کا چست پاجامہ اور نازک سی کالی چپل پہن کر لان میں بیٹھ گئے جہاں ایک طرف انگریزی فرنیچر رکھے تھے اور دوسری طرف ایک تخت پر کشمیری گھا بچھا اور اس پر شرر چادر سبز مخملیں مسند۔

سائرہ نے ایک تو س قزح کے رنگ کی جارجٹ کی ساری پہن رکھی تھی اور بلاؤز کا سُرخ رنگ شفق کی آگ کی طرح دہک رہا تھا۔ اس نے ایک ڈیڑھ گھنٹے کے میک اپ کے بعد قد آدم آئینے کے سامنے ہر زاویئے سے اپنے پیکر جمال کا جائزہ لیتے ہوئے اندازہ لگایا تھا کہ اس کی "ٹائٹنگ" نے بڑا کام کیا اور اس کی کمر سے گوشت کی موٹی تہہ چھٹ رہی ہے۔ اس احساس نے اس میں ایک ایسا ہلکا پن پیدا کر دیا کہ جب وہ باہر نکلی تو وہ ہوا کی موجوں پر تیرتی ہوئی معلوم ہوئی ——— ہوائی موجیں ہموار نہیں تھیں۔ راہ میں خلا بھی حائل تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ اس کی سبک روی میں اصلیت کم اور رومانیت زیادہ تھی۔

سائرہ پہلے چند منٹ پھولوں کی رنگ برنگی کیاریوں کو دیکھتی رہی جس پر ہرے، پیلے، نیلے، سرخ پھول بھونروں کی طرح ہوا میں پرواز کرتے نظر آ رہے تھے۔ اس نے دو تین بار انگڑائی لی لیکن خان صاحب کچھ اداس اداس کھوئے کھوئے سگریٹ کے کش لیتے ہوئے اونچے درختوں سے ٹپکتی ہوئی شام کی دھند میں کچھ بڑی قیمتی چیز تلاش کر رہے تھے۔ وہ ان کی توجہ کھینچنے کے لئے دو تین بار ہلکی ترنم کے ساتھ کھانسی بھی لیکن وہ اسی طرح بیٹھے رہے اور ان کی گلنار کرنگو بے رنگ کی گھنی مونچھوں سے سگریٹ کا دھواں چھنتا رہا۔

بے پاؤں خان صاحب کا کوئی اشیوا منظور آیا اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

تھوڑی دیر قبل وہ اسی طرح سائرہ کے سامنے کھڑا ہوا تھا جب وہ ٹیبل پنکھے کے پاس کھڑی اپنے ریشمیں ڈریسنگ گاؤن میں اپنے بھیگے بھیگے بال سکھا رہی تھی۔

اس نے آکر دو تین بار کھانس کر اپنے وجود کا احساس دلانا چاہا اور جب وہ بے نیاز رہی تو وہ لپکا اور جھپٹ کر اس نے سائرہ کے بال اٹھاتے ہوئے ریشم سے بھی زیادہ نرم اور سحر انگیز محسوس ہوئے۔

"سوائن ——— کیوں مرا جا رہا ہے"

"یہ بال۔ جی پنکھے میں آ جاتے سوچا"

"سوچا خدا اس بہانے چھو ہی دیکھوں ——— کیسی ٹھنڈی ٹھنڈی آگ نکلتی ہے ان سے ——— ذلیل کہیں کا۔"

"وہ میں آج چھٹی پر جانا چاہتا ہوں ایک دن کو۔"

"چھٹی نہیں ملے گی ——— ٹائیٹگر کے لئے ڈاکٹر کو بلا کر کون لائے گا ——— میں ہے"

"وہ بات یہ ہے کہ میرا بچہ بخار میں پھنک رہا ہے۔"

"چھٹی مل جائے گی تو تم کون سے تیر مار لوگے، بخار کوئی شربت تو ہے نہیں جو پی جاؤ گے ——— نہیں ملتی چھٹی ——— شاید ڈیڈی باہر جائیں گے، دعوت پر ——— اور اپنے ڈریسنگ روم میں گھس کر اس نے زور سے دروازہ بند کر لیا تھا جیسے کسی بہت ہی بھیانک بھوت سے جان بچانا چاہتی ہو۔

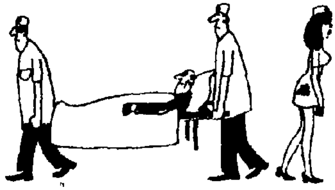
اس وقت خان صاحب ایسے فکر میں غرق تھے کہ انہوں نے مودب غلام کا نوٹس ہی نہیں لیا۔ سائرہ کی آنکھیں جل کر انگارہ بن گئیں۔ "کس کھیت کی مولی ہے۔ اس کی یہ مجال۔ ڈیڈی سے شکایت ———؟"

"ہاں میں کہتی ہوں تجھے چھٹی نہیں ملے گی۔ ڈیڈی کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ یہاں میرا حکم چلتا ہے۔ کار نکال میں باہر جاؤں گی" ——— خان صاحب ایسا چونکے کہ سگریٹ ان کے ہونٹوں سے چھوٹ گئی ——— منظور اپنے لب چاٹتے ہوئے گراج کی طرف چلا گیا۔

"کیا بات ہے سائرہ تم اس غریب پر کیوں برس پڑیں"

"ڈیڈی میں خودکشی کر لوں گی۔ ہر شخص میری انسلٹ کرتا ہے۔ میں اتنی بے عزتی کیسے ٹال ریٹ کر سکتی ہوں" وہ سسکنے لگی۔

خان صاحب خاموش ہو گئے ——— وہ ادھر دو تین ماہ سے اپنی بیٹی پر تیزی سے چڑھتی ہوئی خلفی کو دیکھ دیکھ کر خود حیران تھے۔



جتنا حیران تھے اتنا ہی پریشان تھے۔ اس کی وہ تمام کمزوریاں جو پہلے کھلونے کی حرکتیں معلوم ہوتی تھیں رفتہ رفتہ خطرناک صورت اختیار کرتی جا رہی تھیں۔

جب وہ اور ذرا زور سے سسکنے لگی تو خان صاحب اٹھ کر اس کے پاس آ گئے۔ اس کا سر تھپتھپانے لگے۔

"ہے میری بچی ——— تو اتنی چڑچڑی کیوں ہو گئی ہے، بتا سچ سچ بتا؟"

وہ چپ رہی۔ البتہ اس کی سسکیاں بھی سو گئیں۔

"ارے آج کہیں باہر نہیں جاؤ گی۔ ان دنوں کپتان اترے کہاں ہیں؟"

"جہنم میں" یہ کہتے کہتے اس کی زبان سے نکلا "شاید سنگاپور فلائیٹ پہ گئے ہوئے ہیں۔"

"اور تمہارے دوستوں کا بھی پتہ نہیں۔ شیلا اور سرج بھی نہیں آئیں۔ یہ آ جائیں تو تمہارا دل بہلا لائیں جبھی تم ہی ان کے پاس چلی جاؤ۔" ان کی آواز میں بڑی تھکن تھی۔

منظور کار نکال کر لے آیا۔ سائرہ ایک ٹوٹی ہوئی شاخ گل کی طرح اٹھی اور کار میں بیٹھ گئی۔ اس نے دروازہ اتنی زور سے بند کیا کہ خان صاحب جواد علی کو ایک بار مڑ کر دیکھنا پڑا۔ کار کے گیٹ سے باہر نکلتے نکلتے، ان کی مونچھوں سے چھنتی ہوئی مسکراہٹ ایک گمبھیر ندامت اور فکرمندی میں بدل گئی۔

"بے وقوف لڑکی!"

ان کے گھر میں تنہائی کا بھوت روز بروز زیادہ بھیانک ہوتا جا رہا تھا۔ جب سے ان کی بیگم (جو ایک نواب خاندان کا گوہر نایاب تھیں) اللہ میاں کو پیاری ہو گئیں۔ ان کا دل سونا سونا ضرور تھا لیکن اب اچانک ایسا لگتا تھا کہ اس سناٹے میں ایک ڈراؤنی تاریکی بھرتی جا رہی ہے۔ جیسے بوتل میں دھواں بھر رہا ہو۔ روشنی روشنی ——— ان

کی رٹ لگا رہی اور وہ بے قرار ہو کر کبھی بیئر کی بوتل اٹھا لیتے، کبھی فرانسیسی مصوروں کی عریاں نیم عریاں تصویروں اور قدرتی مناظر کی بے ثباتی اور غم انگیز خاموش اور بے پایاں تنہائی میں ڈوب جاتے کبھی ناولوں کے اوراق میں کھوئی ہوئی پیاری بیٹی سائرہ کے پاس جا بیٹھتے اور ——— اس کے چہرے میں اپنی مرحوم بیگم کے خوابیدہ جلووں کی پاکیزگی اور شوہر پرست معصومیت کی جھلک دیکھنے لگتے۔ ان کے تصور کی آنکھوں میں بلا کی قوت تھی خودرو بن کی طرح سبز۔ ان کی تمام تر تشنہ تمنائیں زندگی برق، تڑپ کر، گمشدہ تتلیوں کی طرح چھم چھم ان کے سامنے ناچنے لگتیں۔

لیکن پچھلے دنوں ایک ایسا واقعہ ہوا کہ ان کے تصور کی خیالی جنت ہمیشہ کے لئے اجڑ گئی۔

سائرہ ایک ناول پر جھکی ہوئی تھی۔ اس کی دونوں ٹانگیں صوفے کی دیوار پر الٹی رکھی تھیں اور اس کا باریک ڈریسنگ گاؤن، رانوں تک سمٹ کر اٹک گیا تھا۔ اور اس کے بھرے بھرے مرمریں جسم کا چھپا ہوا حصہ بھی آنکھ مچولی سی کھیل رہا تھا۔ خان صاحب جواد علی اس وقت انتہائی غمزدہ سی صورت بنائے، دو بوتل بیئر پیٹ میں انڈیل کر، لڑکھڑاتے ہوئے اس کے کمرے میں چلے آئے۔ وہ اس وقت بیگم کی یاد سے تڑپ رہے تھے۔ آتے ہی انہوں نے اپنی بیٹی کے بیٹھنے کے پوز پر غور نہیں کیا اور پوچھنے لگے "کیا پڑھ رہی ہو؟"

"او ڈیڈی ڈیر ——— ڈونٹ اسپوائل اٹ"

"کیوں بیٹا میں کیا اسپوائل کر رہا ہوں؟"

"اس وقت ہمارا ہیرو شراب خانے کے پورے عملے سے اکیلا نبٹ رہا ہے۔ دیکھئے اس خون خرابے کا کیا حشر ہوتا ہے" اس نے ورق الٹتے ہوئے اپنی دونوں ننگی ٹانگوں کو ہلایا اور ہونٹ بھینچ کر اپنے گالوں کو اپنی ہتھیلیوں کی رحل میں چھپا لیا۔

اچانک سوڈے کی بوتل کا ڈھکنا کھلا اور سائرہ اچھل پڑی۔

"یہ کیا بکواس ہے سائرہ۔ تم مجھ سے اس طرح بات کرتی ہو۔ یہ کیا بیہودہ لباس پہن رکھا ہے۔ اف اس میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں۔ میں نے تم کو کئی بار اشارے اشارے میں سمجھایا ہے کہ مہذب لڑکیاں عریانی سے بچتی ہیں اور اپنے جسم کے حسن اور لطافت کا احترام کرتی ہیں۔"

"ڈیڈی ڈیر ——— پارڈن می ——— آپ بہت اچھی تقریر کرتے ہیں لیکن میں لباس کے معاملے میں، اپنی زندگی کی ہر خواہش کے معاملے میں آزادی چاہتی ہوں۔ آپ کو میرے کمرے میں بلا اجازت

آنا ہی نہیں چاہیے۔"

وہ اسی طرح لیٹ گئی، ٹانگیں اوپر صوفے کی دیوار پر، کتاب فرش پر، زلفیں شانوں پر، ہونٹ بھینچے ہوئے، بالوں میں کرل پیدا کرنے والے کلپ جیسے چمکتے ہوئے اور ان سے بھی زیادہ سڈول سی مرمریں پنڈلیاں —

— جسم چمکتی ہوئی ———— ہیرو لہولہان ہو چکا تھا اور شراب کی بوتلیں جھنکار کے ساتھ ٹوٹ رہی تھیں۔ خان صاحب جواد علی کے بیڑ اور غصے سے سنسناتے ہوئے کانوں نے بھی امریکی شراب خانوں کی جھنکار سنی اور انہوں نے دیکھا کہ ان کی بیگم کی پاکیزگی اور معصومیت سائرہ کے چہرے سے کینچلی کی طرح اتر گئی ہے۔ اس کے گالوں میں گہرے نشانات ہیں، بھویں خشمگیں ہیں اور آنکھوں میں گستاخ غرور ہے۔

——اور اس کا منہ تھوک سے بھرا ہوا ہے۔ وہ وہاں سے بھاگ آئے انہوں نے اپنے کمرے میں بیٹھ کر بیئر کی دو اور ٹھنڈی بوتلیں ریفریجریٹر سے نکال کر خالی کیں اور انہیں اپنا جسم ان بوتلوں سے بھی زیادہ خالی خالی سا محسوس ہوا۔ وہ اپنی مسہری پر گر گئے اور تکیے میں آنسو جذب کرتے کرتے سو گئے۔

صبح کے وقت بھی ناشتے کی میز پر سائرہ وہی بلیک ڈریسنگ گاؤن پہنے ہوئے تھی۔ خان صاحب جواد علی نے ایک بے رحم خاموشی سے ناشتہ کیا۔ ان کی آنکھیں نم ہوتی رہیں اور وہ اپنے رومال میں اس نمی کو جذب کرتے رہے۔ سائرہ مزے میں توسٹ پر جیلی اور مکھن لگا کر کھاتی رہی۔

"ڈیڈی" وہ اچانک بولی۔ "امریکی ناولوں کے ہیرو اتنے جاندار کیوں ہوتے ہیں ڈیڈی، اتنے اسمارٹ اور سجیلے اور اتنے بہادر، ان میں تو جیسے بجلی بھری ہوتی ہے، کسی نے آنکھ اٹھا کر دیکھا اور وہ تائیں پستول کبھی بڑی کار اور حسینہ ہے۔ ڈیڈی میں بھی پستول خریدنا چاہتی ہوں۔"

خان صاحب جواد علی اٹھے اور اپنے کتب خانے میں بیٹھ کر کلاسیکی تصویروں کا البم دیکھنے لگے۔ ان کے دماغ میں مختلف قسم کے چیختے ہوئے بگولوں کے بے ہنگم سے جال بننے لگے اور ان کا سر چکرا گیا۔ سائرہ چائے کی میز پر بیٹھی سیٹی بجاتی رہی اور اس کے بعد اپنے کمرے میں جا کر اپنے ناخنوں پر کیوٹکس کی لیپ چڑھانے لگی۔

ایک ڈیڑھ ہفتے تک خان صاحب نے اپنی بیٹی سے بات چیت نہ کی۔ سائرہ نے ان کی کم آمیزی کی بالکل پروا نہ کی۔ اس کی وحشت بڑھتی رہی، اس کا خون کھولتا رہا۔ اس کی ناخوشگواری کی آندھی اور تیز ہو گئی۔

تناؤ تو اب بھی قائم تھا لیکن خان صاحب جواد علی نے اس پر

تصویر

یہ ذکر جن مشہور شاعر کا ہے، وہ خیر سے بہت گندے رہنے کے عادی ہیں۔ حلیہ، میلے کپڑے، چیکٹ بال، جلد پر میل جما ہوا، منہ اور لباس سے ناگوار بو کے بھبکے نکلتے ہوتے۔ ایک مشاعرے میں جب یہ حضرت مائیک پر آتے تو کسی فوٹوگرافر نے اپنا کیمرہ سنبھالا۔ "کیوں صاحب! میری تصویر لے کر کیا کیجیے گا؟" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ فوٹوگرافر سے پہلے شوکت تھانوی مرحوم بول پڑے:

"تصویر اس لئے اتاری ہے کہ ایک تو ٹوٹ کو ذرا تیں گے، دوسرے جو لوگ صفائی کا خیال نہیں رکھتے انہیں دکھا کر عبرت دلائیں گے۔"

اتنی نرم مسکراہٹ، جلوڈریپ ہالوڈ ویوڈ وغیرہ کا حریرہ پردہ ڈال رکھا تھا لیکن اس وقت جب شام کا اندھیرا یلغار کر رہا تھا اور سائرہ کی موٹر کا ہارن ایک نازدہ بچے کی فریاد کی طرح ابھر کر درختوں کی سنسناہٹ کے پروں پر کہیں اڑ گیا تھا۔ ان کا دل بھر آیا، ان کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ اٹھ کر اندر چلے گئے۔ اب ان کے کمرے میں بیئر کی بجائے اسکاچ وہسکی کی بوتلیں رکھی تھیں۔

ابھی سات آٹھ برس پہلے جب انہوں نے فرقہ وارانہ فساد کے بعد اپنی جاگیر چھوڑی تھی تو اسی طرح ان کا کلیجہ پھٹ گیا تھا، لیکن اس وقت انہوں نے شراب کا سہارا نہیں لیا تھا۔ اس وقت تو انہوں نے شراب چکھی بھی نہیں تھی لیکن جب ان کے تمام رشتے دار پاکستان چلے گئے اور وہ اپنے خیال میں دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے وہیں رہ گئے اور انہوں نے اپنی زمینداری بیچ کر راجدھانی میں کوٹھی خرید لی تو یہاں کے رسم و رواج، یہاں کی چہل پہل، یہاں کی اندھیری رات میں لپکتی ہوئی موٹر کی روشنی کی طرح خیرہ کن تہذیب نے، ریشم کی طرح نرم گھلاوٹ میں گھلی ہوئی زہریلی خود غرضی نے ———— ایک دوسرے کی لاش پر کھڑے ہو کر اپنی گردن اونچی کرنے والی انسان دوستی نے ان کی وضعداری کو تراش خراش کر برابر کر دیا۔ آدمی ذہین تھے اور ہوا کے رخ پر کشتی کھیتے

تھے۔ کچھ ہی دنوں میں ہشت پہل ہیرے کی طرح چمک اٹھے۔ جیسے اس کا
علم انہیں بھی تھا کہ یہ ہشت پہل ہیرا، نقلی شیشے کا ایک ٹکڑا ہی تو ہے۔

انہوں نے موٹر کی کمپنی میں حصہ خریدا، ایک تہذیبی ادارے میں رقص و موسیقی کے شعبے کے سرپرست بن گئے، ایک پٹرول پمپ کھول دیا۔ ایک اشاعت گھر کے حصہ دار بن گئے اور شہر میں اپنی ساکھ جمالی۔ مونچھوں پر خضاب بھرنے لگے اور ریفریجریٹر میں بیئر کی بوتلیں دلہنوں کی طرح قطار اندر قطار سجائی جانے لگیں جیسے برہنہ حسینائیں حسن کے مقابلے میں کھڑی ہوں۔ وہ کتنی پاکیزہ مسکراہٹ اور پژمردہ دل کی دھڑکنوں کے ساتھ ان حسیناؤں کو گھورا کرتے۔ اس ہشت پہل ہیرے کا ایک پہلو اور بھی تھا جس میں سے کوندے لپکتے تھے وہ پہلو تھی سائرہ جس کا ننھا منا بے پناہ لپک رہا تھا اور خان صاحب جواد علی کی آنکھیں بیک بے بس حیرانی اور خوف سے پھٹی جا رہی تھیں۔

لیڈی ارون کی تعلیم و تربیت نے بھولی لڑکیوں کی رومانی داستان گوئیوں نے، امریکی فلموں کے قتل و خون میں ڈوبے ہوئے رومانوں نے اور انگریزی ناولوں کے یونانی پیکر والے سورماؤں نے اس کے خیال اور جذبات کی دنیا کو ایک جزیرہ بنا دیا تھا جو افق تا افق پھیلے ہوئے نیلے سمندر میں تیر رہا تھا۔ اس کے اوپر سنہری ابابیلیں اڑ رہی تھیں اور ساحلوں پر آسمان سے بات کرتے ہوئے درختوں کی باہیں قوس و قزح کی طرح لچک لچک کر ہزاروں رنگوں کی افشاں چھڑک رہی تھیں۔

خان صاحب جواد علی کو شروع میں اس بات سے خوشی اور اطمینان ہوتا تھا کہ ان کی بچی ان کے بھتیجے رفیق اور سلیمہ کے راستے پر نہیں چل رہی ہے۔ انہوں نے خوب رسی ڈھیلی کی سائرہ بھاگتی رہی۔ یہاں تک کہ ایک دن اچانک خان صاحب کو محسوس ہوا کہ پتنگ بلند ہوتے ہوتے آنکھوں سے اوجھل ہوتی جا رہی ہے اور دھاگے کا آخری سرا ایک ہی جھٹکے میں ٹوٹنے والا ہے لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی دھاگا ٹوٹ کر رہا۔

اب تو خیر رفیق اور سلیمہ کا کیا سائرہ کی من بھاتی دوست شیلا اور سروج نے بھی کترانا شروع کر دیا تھا۔ شروع میں جب رفیق اور سلیمہ تعلیمی زندگی گزار رہے تھے تو یہاں آتے تھے، چچا جان کو سلام کرنے اور شاید اپنی چچازاد بہن سائرہ سے ملنے بھی۔

رفیق اور سلیمہ دونوں کو معلوم تھا کہ چچا جان نے جو اپنے بڑے بھائی اور ان کے باپ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب ہونے کی دعائیں مانگا کرتے تھے، ان کو شہر میں پرانا سا آبائی مکان دے کر کوئی خاص احسان نہیں کیا ہے اس لئے کہ انہوں نے اپنے یتیم بھتیجے اور بھتیجی کے حصے کا روپیہ یا تو کاروباری جتھے خریدنے میں صرف کر دیا تھا یا حکام اعلیٰ کو دعوتیں کھلانے پر۔ چچا نے اپنے بھائی کی موت کا ناجائز فائدہ اٹھا کر ان کو ٹرخا ضرور دیا تھا لیکن ان کو اس کا کوئی خاص ملال نہیں تھا۔

ان دنوں سائرہ کے احباب کا حلقہ وسیع ہو گیا تھا۔ اس کے گھر پر خاص طور سے اطہر اور قدوس کا آنا جانا تھا۔ اطہر ہوا باز تھا۔ اور کپتان اطہر کہلاتا تھا۔ کافی لمبا تڑنگا سا گندمی رنگ کا وجیہ نوجوان آنکھیں بے چین اور بھنویں گھنی۔ ہونٹوں پر کسی خوبصورت سے راز کو اگل دینے کی ایک بیقرار سی کیفیت۔ قدوس ایک مصور تھا اور حد درجہ لاابالی لیکن اس کی آنکھوں میں ایک عقابی چمک تھی اور انگلیوں میں آگ کو چھو لینے کا حوصلہ گدگدی پیدا کرتا ہوا۔ تھر تھر تھر تھر ——— جیسے وہ ستار کے تار کو چھوتا آیا ہو۔ خان صاحب جواد علی کو وہ دونوں پسند تھے کیونکہ دونوں اچھے خاندان کے شریف لڑکے تھے۔ اپنی کاروں میں آتے تھے۔ تحفے لاتے تھے اور باری باری سے اور کبھی کبھی ایک ساتھ سائرہ کو شہر سے باہر سیر کرانے کے لئے لے جاتے تھے۔ کبھی کبھی کھانے کی میز پر وہ کہتے "بھئی سائرہ تمہارے دونوں ساتھی بڑے پیارے بچے ہیں۔ تمہارے لائق کپتان اطہر ہندو ہے لیکن اتنی اچھی اردو بولتا ہے کہ لگتا نہیں کہ ہندو ہے۔ واہ سبحان اللہ لیکن قدوس کی آنکھیں اتنی سرخ کیوں رہتی ہیں۔ پیتا پلاتا تو نہیں ہے؟" وہ ٹھنڈے پانی کا گلاس خالی کرتے ہوئے پوچھتے اور منہ میں کھانا ختم کئے بغیر سگریٹ لگا لیتے تاکہ بیئر کی بو سائرہ کی ناک تک نہ پہنچے۔ لیکن کنواری لڑکی کی طرح خاموش بیئر کی اجنبیوں کو چھوڑتی۔

ایک دن رفیق اور سلیمہ، دونوں بہن بھائی "نشیمن" (خان صاحب جواد علی کی کوٹھی) پہنچے تو شام کا جھٹپٹا سنہرا، دھندلا دھندلا ہو رہا تھا۔ اس وقت وہاں کپتان اطہر اور قدوس دونوں جمع ہوئے تھے۔ قدوس لمبے لمبے کتھئی ناخنوں کے درمیان سگریٹ دبائے جلدی جلدی کش لگا رہا تھا۔ جیسے اگر اس نے ایک دو منٹ کے اندر سگریٹ کو پھونک کر نہ رکھ دیا تو اس کا سر قلم کر دیا جائے گا۔ لان میں اطہر ایک شریف پہلوان کی طرح ٹہل رہا تھا۔ سائرہ نے ہنس کے ہیلو کہا اور پھر دونوں دوستوں سے گپ کرنے لگی۔ رفیق اور سلیمہ ایک دوسرے کے پاس صوفے میں بیٹھ گئے۔ سلیمہ نے سانس روک کر آہستہ سے کہا "عجب آکر دونوں بھوت یہاں جمے رہتے ہیں۔ گھر کیا ہے بھوتوں کا بسیرا" تھوڑی دیر میں خان صاحب باہر آئے دونوں ان کے پاس بیٹھ کر مزاج پرسی کرنے لگے۔

اطہر اور قدوس سے دونوں کا تعارف تھا لیکن اطہر نے تو رفیق کو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ البتہ کنکھیوں سے سلیمہ کو دیکھتا رہا ہو

ور جیسی تھکی نظر آتی تھی۔ جب خان صاحب اٹھ کر چند منٹ کو اندر گئے
تو پھر وہ کیبن سے بن سنگھے لیکن تھوڑی دیر بعد قدوس نے سلیمہ سے
مخاطب ہو کر کہا "آپ نے تازہ ترین تصویروں کی نمائش دیکھی؟"

"جی ہاں"

"کیا خیال ہے"

"زیادہ تر تصویریں خیالی اور متعصب خیالی ہیں۔"

"جی ہاں سارا مقصد آپ کی طوں والی ساریوں اور رفیق کی انبلا ہوسی کا
اسیر ہو کر رہ گیا ہے۔"

"ہو ملیں" سائرہ نے بڑی اکتاہٹ سے کہا۔

"لگتا ہے آپ عورتوں کی برہنہ تصویریں پسند نہیں کرتیں؟"
اس نے طنزاً پوچھا۔

"جی ہاں میں ننگی ذہنیت کے لوگوں کو بھی پسند نہیں کرتی۔"
اس نے قدرے جذبات سے کہا۔

"اوشٹ اپ ——— میرے دوستوں سے اس طرح
نہ کرو۔"

"کیوں آپ کے اتنے پیارے آئے ہوئے ان دوستوں میں کون
سے خواب کے پر لگے ہوئے ہیں۔"

سائرہ کے بدن میں آگ لگ گئی جس کا شعلہ پھیلتا چلا گیا۔
دن اس نے اپنے چچا زاد بھائی جن کو ان کی غربت، خود غرضی وغیرہ
سنا دیا ——— اور یہاں تک کہہ دیا "میں جانتی ہوں کہ تم دونوں
کی ست یوں اتنا گھل مل کر باتیں کرتے ہو۔ شاید کہیں سے سرکاری
ملازمت ہی دلادیں۔ ہونہہ نیکی کر کنویں میں ڈال۔"

اس پوری بحث کے دوران رفیق بیٹھا رہا۔ اس کے ہونٹوں پر
زہر خند بکھرتا رہا۔ وہ سائرہ کو رحم بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ
بار پہلے اس سے بحث میں جھنجھلا کر کہہ چکا تھا "جو لوگ سرخاب کے
پروں کے پیچھے بھاگتے ہیں آخر میں سب کچھ کھو دیتے ہیں۔"

"رہنے دو اپنا ذلیل فلسفہ۔ جن لوگوں کے پاس دولت ہے،
بے عقل ہے وہ دنیا کی ہر چیز اپنی مٹھی میں رکھ سکتے ہیں۔"
لیکن اس آخری شام وہ خاموش بیٹھا مسکراہٹ اور رحم کا زہر
رہا۔

اس دن اس کو یقین ہو گیا تھا کہ رفیق اس پر فریفتہ ہے۔
وہ اسے لفٹ نہیں دیتی اس لئے وہ نفسیاتی مریض کی طرح اس کے
جل سے جلا ہے اس نے برانڈی کی سپ کی اور آتش دان کی کھلی کھڑکی میں

شہر کے باہر جنگلوں میں چاندنی کا سحر دیکھنے چلی گئی اور سہاگ کے مجو عکوں
نے اسے رفیق کے گھناؤنے تصور سے نجات دلا دی اور اس کی زلفوں
کو کانٹوں کی قید سے بنا دیا۔

لیکن جب تک سائرہ اترے اور قدوس کی دوستی میں گرفتار
نہیں ہوئی تھی وہ سلیمہ اور رفیق سے کچھ خوش گپیاں بھی کر لیتی تھی۔ ان
دنوں شیلا اور سرج کا آنا جانا بھی اس کے یہاں بہت زیادہ تھا۔ ان
دنوں سائرہ پر کالج کی رومانیت چھائی ہوئی تھی۔ اور اس میں انگریزی
ناولوں کا شوق تیزی سے بڑھ رہا تھا۔

ان دنوں وہ بوکھلا بوکھلا کر عجیب عجیب سوال کرتی کبھی شیلا
سے، کبھی سرج سے اور کبھی کبھی سلیمہ سے۔

ایک دن اس نے سلیمہ سے پوچھا "اچھا بتاؤ تمہیں سب سے
پہلے کس نے کس کیا ہے"

"کسی نے بھی نہیں۔"

"بکواس ——— اچھا بتاؤ تمہیں کم سے کم کتنی مدت کی
ملاقات کے بعد کس نے پرپوز کیا؟" پھر خود ہی بتانے لگی ایک بار بمبئی
میں سنیما ہال کے اندر بغل والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ایک نوجوان اجنبی نے
شو کے ختم ہونے تک اس سے پرپوز کر دیا تھا۔ اور جب اس نے فاتحانہ
نظروں سے حیران مجمع کا جائزہ لینا چاہا تو سلیمہ نے ہنس کر کہا تھا۔

"بھئی معاف کرنا ہم میں سے کوئی بھی تمہاری طرح کا اتنا بڑا ایجاد
نہیں ہے ——— یہ جملہ وہ اپنے ذرا بھاری جسم پر طنز بھی۔

بس غضب ہو گیا۔ اس دن سے سلیمہ اور اس کے درمیان خلیج
چوڑی ہی ہوتی چلی گئی۔ آخر اس کی اوقات بھی کیا تھی۔ اسّی نوّے روپے
کی گرلز اسکول ٹیچر، ہونہہ۔

رفیق تو اس کو ہمیشہ سے چڑنے کا عادی تھا۔ ایک دن قدوس کی
بنائی ہوئی ایک کیوبسٹ تصویر نئی نئی لا کر اس نے آتش دان کے
اوپر دیوار پر آویزاں کی تھی۔ رفیق سے کہنے لگی "بڑی فلسفیانہ باتیں
کرتے ہو۔ اچھا دیکھو اس تصویر کو، جذبات کے اظہار میں کیا حسن ہے"
اس نے بات کاٹ کر جواب دیا "مجھے تو یہ تصویر الو کی دم فاختہ
نظر آتی ہے۔"

"تم قدوس سے جلتے ہو۔"
رفیق نے اس جملے کو بھی ایک حقارت آمیز قہقہے میں اڑا
دیا تھا۔

آج جب کہ خان صاحب جواد علی پر شراب کی حکمرانی تھی۔

رات بھاری ہوتی چلی جا رہی تھی، گھر میں سناٹا تھا اور صرف ریڈیو سے بجتے گانے کی طرح دار نسوانی آواز کمرے کو مٹھاس اور درد سے بھر رہی تھی۔

اور اس نازک سے لمحے میں جب کہ سائرہ کو منظور کے ساتھ گئے ہوئے کئی گھنٹے گزر چکے تھے اور وہ شراب پی پی کر اپنے اور اپنی بیٹی کے درمیان کی خلیج کو پاٹنے کی کوشش کر رہا تھا، اس کی انگارہ سی آنکھیں پسیج رہی تھیں، سانس تیز تیز چل رہی تھی، مونچھ پر شراب کے قطرے چمک رہے تھے اور اس کے چہرے پر قتل کے بعد کی پشیمانی چمک رہی تھی۔ ایک دو بار گھر کے ملازموں کی نظر جو اتفاقاً پڑ گئی تو سب کے سب دم سادھ کر بیٹھ گئے۔ ”خان صاحب اتنے غمگین تو اس سے پہلے کبھی نظر نہ آئے تھے۔ پتہ نہیں کون سی بجلی لوٹنے والی تھی۔“ اور سب کا دماغ سائرہ رانی کی طرف مڑ گیا۔

”میں سب کچھ کرتا، رفیق اور سلیمہ کا حق تو نہ مارتا۔ یہ سب میں نے کس لئے کیا۔ سائرہ کے لئے؟ لیکن سائرہ کیا تھی کیا بن گئی۔ وہ اتنی اجنبی ہو گئی ہے کہ میں اسے پہچان بھی نہیں سکتا۔ یہ کس کا گناہ ہے۔ میرا ہی ہے۔“

پھر انگلیاں ہر کونے سے ابھریں اور ان کی طرف رُخ کر کے تھرکنے لگیں۔ بہت سے علاوہ جو انہوں نے مختلف کاروباری اداروں سے کئے تھے ہوا میں اڑنے لگے اور حقیقت سے عکراشہ کر ان کے اوپر گرنے لگے وہ ایک بار زور سے چیخے انہوں نے اپنی جگہ خراش آواز سنی بھی لیکن کوٹھی کے کسی ملازم نے ان کی آواز نہیں سنی۔ اس لئے کہ ان کی آواز حلق میں پہنچ کر خرخراہٹ سے آگے نہ بڑھ سکی تھی جیسے بلی کے حلق میں کوئی ہڈی اٹک گئی ہو۔ انہوں نے شراب کا گلاس اٹھایا اور اپنے جلتے ہوئے ہونٹوں سے لگا لیا۔ جھریوں کی کپکپی ذرا تھم گئی اور مونچھوں کے بھیگے ہوئے موتی دوبارہ چمک اٹھے اور اس وقت ان کو سائرہ کا انتظار بھی نہیں تھا۔

سائرہ آخر کب تک مجھے شہر کے باہر یوں رات گئے آوارہ پھرائے گی ۔۔۔ کون جانے اب وہ بھی جواب دے دے گا۔ بگلی لڑکی۔ خان صاحب مجھے منہ چڑھتی رہتی تھی۔ میرا بچہ مجھے دیکھ کر کتنا چہک اٹھتا۔

سائرہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے اور وہ جنگل کے بے نیاز درختوں کو گھورے جا رہی تھی ۔۔۔ مجھے دیووں اور جنگلی بھوتوں نے گھیر لیا ہے۔ ان کے بڑے بڑے تنے کتنے خوفناک ہیں اور میں کتنی چھوٹی ہوں۔ بالکل تنہا۔ بچاؤ، بچاؤ ۔۔۔ وہ کپتان اترے ہوائی جہاز سے جھانک رہا ہے۔

اس نے کہکشاں کی سیڑھی نیچے لگا دی ۔۔۔ واہ سیاہ پنجوں کو اب پکڑ لو مجھے، میں کہکشاں کی سیڑھی پر قدم جما چکی ہوں ۔۔۔ یہ چلی ۔۔۔ اور دیکھو میرا ہیرو، کپتان اترے کتنے اطمینان سے مسکرا رہا ہے۔ اس مسکراہٹ میں جو چکناہٹ ہے وہ تو توس پر پگھلے ہوئے مکھن میں بھی نہیں۔ منظور نے کار ایک جھٹکے سے روک لی۔ کہیں دور کھیتوں سے لوہے ایک گروہ کے گانے کی آواز آ رہی تھی اور جنگل کے درختوں کی چیخ میں گھلتی چلی جا رہی تھی۔

”کیوں روک لی کار، کمبخت سارا خواب چکنا چور ہو گیا۔“

”میں کب تک یوں مارا مارا پھرتا رہوں۔“

”ہوں۔“ سائرہ نے سانس روک کر کہا۔ ”اچھا تو واپس شہر چلو۔“

بلندی سے شہر کے ان گنت ستاروں پر نظر ڈالتے ہوئے سائرہ نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور منظور سے رازدارانہ سرگوشی میں کہا۔ ”ڈیلائٹ لے چلو۔“

ڈیلائٹ بار میں بڑی چہل پہل تھی۔ لوگ سرمست اور بے خود ہو رہے تھے۔ دھواں، دھواں، دھواں ۔۔۔ باتیں، باتیں، باتیں، فرم کا دھواں، بیئر کا دھواں، سگریٹ کا دھواں ۔۔۔ کاروبار کی باتیں، دھاندلی کی باتیں، شراب کی باتیں۔ در و دیوار پر اجنتائی عورتیں بھی رقص کے نشے میں چور نظر آ رہی تھیں ۔۔۔ اب گریں تملا کر وہ سیدھی اس کارنر میں گئی جہاں قدوس ایک تنہا گوشے میں بیٹھا بیئر سپ کر رہا تھا۔

اس نے سائرہ کے لئے بھی بیئر کا آرڈر دیا اور کاغذ پر پنسل سے بنائے ہوئے اسکیچ کو مٹانے لگا۔ سائرہ نے کاغذ کا ٹکڑا جھپٹ لیا جس میں ایک عورت ایک بڑے سے کتے کو چوم رہی تھی۔

کپتان اترے سے جھگڑا ہونے سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ سائرہ سیدھی قدوس کے پاس آئی ہو اور اس کے پاس دھڑام سے گر گئی ہو۔ پہلے وہ ہوا کے دوش پر لہراتی ہوئی آتی۔ دہن بڑھ کر ہو کہتا تو اس کا جواب ایک بے آواز ہونٹ جو ایک مغرور مسکراہٹ اور لپ اسٹک کے خونی لیپ میں لت پت ہوتی۔ اس کا جواب دیتی اور خم بہ خم زلفوں کو جھٹکا دے کر اس گرین کیبن میں پہنچ جاتی جہاں کپتان اترے اپنے چھوٹے چھوٹے چکنے بالوں پر ایک ہاتھ پھیرتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اس کا ہاتھ تھام لیتا اور وہ اس کے اس انداز پر دل تھام لیتی اور اس کی بڑی بڑی شرابی سی آنکھوں میں غرق ہو جاتی اور پہلی ہی سانس میں اپنی خوبصورت تمناؤں کا راگ چھیڑ دیتی ۔۔۔ نڈھال اور مارے محبت کے آبدیدہ سائرہ کو اس کے گھر چھوڑ کر واپس آتا اور کہیں قدوس سے مڈبھیڑ ہو جاتی تو قدوس کے چھینٹنے پر بچنے لگتا۔ ابھی

تو میاں ہے مجھے خطرہ ہے کہ کہیں چیک نہ جائے - ۱۹۵۴ء کے کیلنڈر سے ۱۹۵۵ء میں کام نہیں چل سکتا۔"

قدوس اس کو آزماتا "ہاں وہ تمہیں چھوڑ نہیں سکتی۔ تم اس پر چھا گئے ہو میری جان!"

"ڈیم اِٹ ——— سائن کی کتنی ہی موٹی تہہ ہو، سمندر میں غوطہ لگانے کی دیر ہے۔ پھر سب کچھ دھل جائے گا ——— میں اب سمندر میں غوطہ لگانے والا ہوں۔" وہ اپنی ٹوپی زور سے میز پر پٹکتا اور نیلی ٹائی کی گرہ ڈھیلی کر دیتا ور گریبان کے بٹن کھول کر گردن سہلانے لگتا۔

اس وقت قدوس کو سائرہ پر بے پناہ رحم آتا۔ وہ سیدھا اپنے سٹوڈیو میں جاتا اور برش اٹھا کر اس کی تصویر بنانے پر اپنے عزیز ترین فن کا سارا زور خرچ کر دیتا ——— اور کبھی ایک ہاتھ کا بنا پھول سونگھتا ہوا نظر آتا اور کبھی ہیٹر کی شکل میں دو آنکھیں چمکتی نظر آتیں ——— "آخر وہ دن آئے گا جب میں اس خوبصورت ترین ماڈل کو اپنے اسٹوڈیو میں لا کر اس کا سارا حسن اپنے برش اور رنگ میں جذب کر لوں گا۔"

آخری رات ——— جب قدوس کے پاس اس کا دمکتا ہوا ماڈل اپنے جلتے ہوئے غم میں اس کو شریک کرنے کے لئے کپتان آترے کی بے وفائی کا گلہ کرتے ہوئے۔ زخم کو اس کی آنکھوں کے سامنے کھولتی چلی جارہی تھی ناترے ... جیسی دھیمی روشنی والے گریں روم میں شہلا اور سرخ کے درمیان تھا۔ ان کو سنگھاڑے کے بادلوں اور نیلے آسمان کے درمیان ایروپلین کے تجربے بتا بتا کر حیران کئے دے رہا تھا۔

اس رات قدوس، آرٹ کے رنگ میں ڈوبتی ہوئی موسیقی پر بہتے لکا ... رہا ——— اس آرٹ پر ہنسنے والے رفیق اور سلیم جیسے پوشتری ذہنیت کے بے وقوف لوگ اپنے انقلابی نعروں کے ساتھ مر جائیں گے لیکن ... اور برش کا معجزہ امر رہے گا۔

تم ... تم دونوں دوستوں کو سرخاب کے پر کہتے ہو۔ لیکن ... نعی۔ وہ رونے لگی۔

قدوس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے خان صاحب جواد علی ... میں بٹھا کر اپنے اسٹوڈیو لے گیا۔

اسٹوڈیو میں پچاسوں تصویریں بکھری پڑی تھیں۔ شیڈ کے اندر ... بھی زرد روشنی نکل رہی تھی۔ قدوس نے برش اٹھا لیا۔ "آج میں اپنی زندگی ... سب سے حسین تصویر بناؤں گا۔"

سائرہ پر قدوس نے جادو کر دیا تھا۔ اس کا جو جی چاہا جس پوز ... سائرہ اس کے اشارے پر ناچتی رہی۔ وہ آج کی رات سوم کی تک ...



چکی تھی۔ اس کی آنکھیں بے چمک تھیں اور رخسار زرد۔

جب کچھ کچھ ہوش آیا تو وہ ننگی کھڑی تھی اور اس کے ہاتھ میں وائلن تھا۔ قدوس برش چلانے کے بجائے یہ غور کر رہا تھا کہ اس حسین اور سڈول ماڈل کے سرخ چہرے اور دہکتے ہوئے بدن کے رنگوں میں کتنا فرق ہے۔

سائرہ نے وائلن کو دیوانگی سے پھینک دیا کہ تڑپ سے ٹوٹ۔ اور تیر کی طرح اسٹوڈیو سے نکل کر سڑک پر پہنچ گئی۔ اس نے پوری وحشت سے منظور کو کار سے پکڑ کر نیچے گرا دیا۔

کوٹھی میں سناٹا تھا۔ درخت سرگوشیاں کر رہے تھے اور پھولوں کی کیاریاں سو رہی تھیں۔

وہ سیدھی ڈیڈی کے کمرے میں گئی۔

خان صاحب جواد علی نشے میں بے سدھ پڑے تھے۔ شراب کا گلاس بھرا رکھا تھا۔ اور وہ کراہ رہے تھے۔ سائرہ نے اپنے ڈیڈی کو اس حالت میں پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ اپنے ڈیڈی کے سینے پر گر پڑی۔ "ڈیڈی ڈیر ——— کپتان آترے بڑا راسکل ہے۔ مجھے چیٹ کر کے نکل گیا۔" وہ رو رہی تھی اور خان صاحب کا گریبان آنسوؤں سے تر ہو رہا تھا۔ وہ نشے میں لڑکھڑاتی زبان سے بولے "لیکن اس میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں ڈارلنگ ——— ؟"

ڈیڈی اور سائرہ دونوں گہری نیند میں تھے اور ٹائیگر خان صاحب جواد علی کی مونچھوں سے شراب چاٹنے کے بعد اب سائرہ کے رخساروں کو چاٹ کر اس کے مہاسوں کے داغ کو عریاں کر رہا تھا۔

*



خاندان کے لوگ اس سے بہت نالاں تھے مگر وقت آنے پر اُس نے ثابت کر دیا کہ وہ اُن کے تصورات سے بہت مختلف تھا!

——— ایک انسان کی کہانی ———

جسے کبھی انسان نہ سمجھا گیا

خون کی شرافت

عفت موہنی

سلطان چچا کی ہوتی بھرائی ہوئی آواز گلی میں سنائی دی۔ وہ جب بھی ادھر آتے پھاٹک پہ کھڑے ہو کر فضور سے باتیں کرنے لگتے گویا اپنے آنے کی اطلاع اندر پہنچا رہے ہوں۔ فوراً ہی اماں بی اپنے آنچل سے روپے پیسے کھول کر تجوری میں مقفل کر دیتیں! اماں کے ہونٹ ناگواری کے انداز سے ہلنے لگتے۔ سلطان چچا ڈرتے دبکتے۔ صحن میں قدم رکھتے پھر ہمت نہ پڑتی کہ آگے بڑھیں۔

کوئی ان کا استقبال بھی نہ کرتا جب تک دل چاہتا کھڑے رہتے۔ شاید منتظر رہتے ہوں کہ کوئی ان سے باتیں کرے مگر جب دیکھتے کہ کوئی بھی ان سے مخاطب نہیں ہوتا تو کڑوے کسیلے جواب سننے کے لیے خود ہی کسی کی خیریت پوچھنے لگتے اور پھر واپس لوٹ جاتے۔

یہ تو مجھے بہت بعد کو پتہ چلا کہ وہ دادی بی کے سوتیلے بیٹے تھے۔ دادا جان کو کسی زمانے میں رنگین مزاجی سوجھی گھر میں کام کرنے

والی چھوکری سے پیچھے چپکے چٹکیں بڑھائیں اور ایک دن نکاح کر کے دھڑلے سے وہ ٹکے کی ماما کو دادی بی کے برابر لا بٹھایا۔ سنا ہے کہ دادی بی نے غریب کو اس قدر پیٹا کہ جان کے لالے پڑ گئے مگر اس نے منہ سے آواز تک نہ نکالی۔ الٹے دادی کے ہاتھ دابنے لگی۔ اسی ماں کے تو یہ بیٹے تھے۔ ہم جب کمتر، ذلیل جیسے زمین پر رینگنے والا کیڑا۔ مجھے بہت دکھ ہوتا جب انہیں سب کے حقارت آمیز سلوک کا اندازہ تھا تو وہ پھر ادھر آتے ہی کیوں تھے۔

"لونڈی بچہ ——— صورت حرام کہیں کا۔" دادی بی کہا کرتیں۔ مگر مجھے ان کی صورت لونڈی بچوں کی سی کبھی نہ لگی ——— لمبا چوڑا جسم ——— بھرے بھرے بازو۔ سیاہ گھنگھریالے بال۔ متبسم ہونٹ۔ پیشانی سے نرم دلی اور محبت عیاں۔ مجھے وہ بہت پسند تھے۔

جیسے جیسے گھر والوں کی نفرت بڑھتی گئی، میری محبت میں اضافہ ہوتا گیا لیکن میں کبھی کچھ بول نہ سکی۔ گھر بھر میں سب سے چھوٹی تھی۔ ان کی ذرا سی طرفداری پر دادی بی جان نکالنے پر آمادہ ہو جاتیں ——— اماں کی زبان بھی کھل جاتی۔ چچا پر گالیوں کے ڈونگرے برسا کر دادی بی سے خیر و برکت وصول کرنے میں کوئی پیچھے نہ رہتا۔ لیکن اکیلی میں اس سعادت سے محروم تھی۔

چچا کو بہت پہلے ہی دادی بی نے گھر سے نکال دیا تھا۔ تھوڑا بہت دلوا آبا کا لحاظ تھا لیکن ان کے مرتے ہی چچا بھی مرد و د ہو گئے! کسی کو پتہ نہ تھا کہ وہ کیا کرتے ہیں۔ کیسے خرچ چلاتے ہیں۔ مگر اتنا جانتا تھا کہ ہمارے گھر سے بڑی دور ایک چھوٹے موٹے کمرے میں کسی کے ساتھ مل کر رہتے ہیں! نہ پھر کبھی انہوں نے ہمارے ساتھ رہنے کی خواہش کی اور نہ کسی کو ان پر ترس آیا۔ ویسے وہ ہر دوسرے تیسرے دن اِدھر کا چکر ضرور لگا لیا کرتے تھے۔ خدا جانے کیا کیا امیدیں لے کر آتے تھے۔ ایک ایک کا منہ دیکھا کرتے جیسے کچھ مانگ رہے ہوں! مگر سب کے سلوک سے دل ٹوٹ جاتا...... میرا بہت جی چاہتا کہ انہیں اپنے کمرے میں لا بٹھاؤں۔ بے شمار باتیں کروں۔ مگر اتنی ہمت مجھ میں کہاں تھی؟۔

"وہ مردود پھر تو گھر میں نہیں آیا تھا؟" آبا اپنی نفرت کا اظہار کیا کرتے۔

جواب میں دادی بی سے سینکڑوں گالیاں سن کر مطمئن ہو جاتے کہ جہاں دادی بی ہوں وہاں سوتیلا بھائی کسی طرح بھی قدم نہیں جما سکے گا۔ شاید دادا ابا کی زندگی میں انہوں نے ایسا سوتیلا پن نہ دکھایا ہو۔ مگر اب تو بڑی شدومد سے سوتیلی ماں کا دل ادا کر رہی تھیں۔

اس دوپہر گرمی کے مارے ہم سب بر کھلا رہے تھے! بابی نے کیفے سے آئس کریم منگوائی تھی۔ سبھی دالان میں پنکھے کے نیچے بیٹھے جانوروں کی طرح اٹھک پن سے آئس کریم نگل رہے تھے اچانک ہی جلچلاتی دھوپ میں ننگے سر پسینے میں شرابور چچا دکھائی دیئے۔

"آئیے چچا!" بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔ شاید عمر بھر میں پہلی بار میں نے چچا کہہ کر پکارا تھا۔ ورنہ وہ رشتے میں ہمارے چچا ضرور ہوتے تھے۔ کہلاتے نہیں جاتے تھے!

"کیا کام ہے؟" دادی بی ادھر دیکھے بغیر دھاڑیں۔

"اماں ادھر سے گزر رہا تھا! بہت دنوں سے آپ کی خیریت......!" وہ دہلیز کے پاس رک گئے۔

"اماں کے سگے تو خیریت پوچھنے نہ آتا تو مر جاتے نا ہم سب ...... لگے! اچھا گھر دیکھ لیا ہے؟"

"اماں......!" ان کا منہ ذرا سا نکل آتا۔

"وہ بھیا تمہارے لیے میں احمد میاں کی بری نہیں ہوں گی۔ اوقات پہ رہو۔ سنا کہ نہیں۔ اس کمبخت غفورے سے کہا تھا کہ دروازہ بند ہی رکھا کرے۔" دادی بی نے پیٹھ موڑ لی۔

وہ واپس مڑ گئے۔ پسینہ بہہ رہا تھا۔ چہرے پر راستے کی گرد پڑی تھی۔ کچھ بھی تو نہ کہا تھا۔ شاید خود کو اس قابل ہی نہ سمجھتے تھے کہ بیگم صاحبہ کے سامنے ہونٹ ہلا سکیں۔

"خدائی خوار۔ بھک منگا!" دادی بی آئس کریم کی کپ میں انگلی ڈال کر چاٹتی ہوئی بولیں۔ "ارے! بہت کچھ اس کی وجہ سے آدھا تباہی ہو چکا ہے۔ وہی سڑی دیوانے لوٹتے کمینی کی اولاد پہ میرا بس نہ چلا۔ نہ کسی کی آئی اسے آئی۔ جتا کر مسٹنڈا بنا پھرتا ہے۔!"

"یہ ادھر کے چکر کیوں کاٹا کرتے ہیں؟" آپا نے پوچھا۔

"ڈھونگ ہیں، یہ موئے ڈھونگ......" دادی بی تیزی سے بولیں۔ چالیس ہزار کے اس مکان میں حصہ ہے نا ——— اس لیے ——— پر جان لو۔ جب تک یہ سانسیں چل رہی ہیں۔ ایک کوڑی ادھر کی ادھر نہیں ہوگی۔ تمہارے دادا نے جب ہی بیچ کھوٹ کے برابر کر دیا تھا! بڑھاپے کا یہ سہارا۔ احمد میاں اور ان کے بچوں کے لیے اپنا سارا زیور بیچ کر میں نے خریدا ہے۔ اس میں کسی کا اجارہ نہیں۔ سنا بیوی!"

"جتنی ہے...... کیوں دیں ہم کسی کو خواہ مخواہ" آپا نے تائید کی۔ اسی لیے زیادہ دادی بی کی منظور نظر تھیں کچھ سوچ کر بیٹے

"مگر یہ ان کا حصہ مکان میں کیسے نکل آیا؟!"

"پتھر پڑیں۔ تمہارے والد کی عقل ہی ماری گئی تھی جو دادی بی نے دونوں کو سنوں کے درمیان میں کہا۔ "مرتے وقت آدھا آدھا دونوں لڑکوں کے نام لکھ دیا۔"

آئس کریم والا لڑکا اوپر آیا اور پھر کپ لینے لگا۔ اماں نے تین روپے آگے بڑھا دیئے۔!

"پیسے مل گئے صاحب۔"

"کہاں سے ملے؟" اماں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"نیچے ایک صاحب کھڑے تھے..... رقم پوچھ کر ادا کر دی۔" لڑکا کپ اٹھا کر چلا گیا۔

دادی اماں کی آنکھیں نکل پڑیں۔ ذلیل کی کانی حلق کے پار اتر چکی تھی — بس نہ چلا کہ انگلی حلق میں ڈال کر پوری آئس کریم نکال باہر کریں سارا دن بڑبڑاتی رہیں۔

میں خوش تھی خواہ مخواہ ہی۔ اس خوشی کا میں کوئی نام نہ دے سکی۔ جب ابا میرے لیے چمکیلی گڑیوں کا جوڑا لاتے تھے۔ تب بھی ایسی خوشی نہیں ہوتی تھی۔ یہ سوچ کر پھولی نہیں سما رہی تھی۔ ان کے کچھ پیسے مجھ پر بھی صرف ہوتے تھے لیکن دولت مندوں کی شرمندگی غصے کی صورت میں ظاہر ہوتی۔ دادی بی کا جھریوں بھرا چہرہ طیش کے مارے سکڑتا سمٹتا رہا۔

اس کے بعد سے وہ ہمارے یہاں نہیں آئے!۔ سب ہی کو سکون ہو گیا۔ مگر مجھے الجھن ہو رہی تھی! — بے وجہ اداسی۔ جیسے میری اچھوتی زندگی سے کوئی معصوم تمنا نکل گئی ہے۔ کسی کام میں دل نہ لگتا۔ عجیب سی خلش تھی۔ ایسا ہی لگتا — میرا چہیتا بھائی، میرا باپ مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بچھڑ گیا ہو۔ میں اس آواز کی منتظر رہتی — "کہو غفور بھائی سب اچھے تو ہیں نا؟" مجھے راتوں کو نیند نہ آتی۔ تنہا پڑی سوچتی رہتی۔ اگر وہ اچانک آ جائیں گے تو میں کیا کروں گی کیسے کہہ سکوں گی — چچا سب آپ سے نفرت کرتے ہیں مگر آپ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ مجھے ان سب لوگوں سے شکایت ہے۔ یہ لوگ جاہل ہیں جو دنیا میں محض کیڑوں مکوڑوں کی سی بے حس زندگی گزارتے ہیں جنہیں کسی کی محبت، گرمجوشی، خلوص اور اپنائیت کا اندازہ ہی نہیں ہوتا۔ چچا مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلئے۔ آپ جہاں بھی رہتے ہوں!

میں اداس اور پریشان پھرتی رہتی۔ جیسے کوئی قیمتی چیز کہیں رکھ کر بھول گئی ہوں۔ ان دنوں جتنی بھی مجھے اپنے حصے کی مٹھائی پیسے اور نئے کپڑے ملے۔ احتیاط سے رکھتی گئی۔ شاید وہ آ جائیں۔ تب میں ان کے سامنے اپنی محبتوں کے انمول خزانے ڈھیر کر دوں! انہیں آج تک کسی کا پیار نہیں ملا۔ وہ نہیں جانتے ماں کی ممتا کیسی ہوتی ہے۔ بھائی کا تعلق خاطر کس چڑیا کا نام ہے۔ ہائے وہ مجھے چھوٹی سی بچی نہ سمجھیں۔ میں ان کی ماں ہوں۔

بہت دنوں بعد ایک شام وہ بھولی بسری آواز پھر آگئی "کہو غفور بھائی۔ سب اچھے تو ہیں نا؟" دادی بی چونک پڑیں۔ بھابی نئے کپڑے پہن کر آئینے کے سامنے مٹک رہی تھیں۔ اندر بھاگ گئیں۔ میں ننگے پاؤں دوڑی گئی اور بے اختیار ان سے لپٹ گئی۔ دل میں بہت کچھ کہہ دینے کے طوفان امڈ رہے تھے۔ زبان پہ تالا سا لگا تھا! میں نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ چچا بھی حیران تھے یہ سلوک ان کے لیے نیا تھا!

"چچا....." میں کچھ دیر بعد بول سکی۔ "اتنے دنوں سے کہاں تھے آپ؟"

وہ خاموش رہے۔

"چچا مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلیے۔"

"اپنے ساتھ۔" وہ مسکرائے "کہاں لے چلوں یاسمین بی بی۔"

"میں آپ کے ساتھ چلوں گی چچا۔ مجھے آپ بہت یاد آتے ہیں۔" بے اختیار ان پر پیار آ رہا تھا۔

"میں بھی تمہیں بہت یاد کرتا ہوں چھوٹی بی بی۔"

"چچا میں آپ کو کچھ دوں؟ آپ لے لیجے گا!"

"یاسمین بی بی — بڑے، چھوٹوں سے کچھ نہیں لیا کرتے!"

"چھوٹی؟ اونہہ۔ دیکھیے نا۔ میں تو پورے بارہ سال کی ہوں۔ اب میں بچی کہاں رہی"۔ وہ ہنسنے لگے۔

"آپ اندر چلیے چچا..... اب آپ کو کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ آپ کے لیے مٹھائی رکھی تھی۔ برفی کی ساری ڈلیاں سوکھ گئیں۔ جلیبیاں دودھ میں بھگو لیجیے گا۔ اچھا؟ شلوار کے لیے لٹھا رکھا ہے۔ اچھے چچا اس کا پاجامہ سلوا لیجئے۔ یہ پیوند لگا پاجامہ پہنے رہتے ہیں۔ آپ کے پاس کوئی قمیض بھی تو نہیں ہے"!

دفعتاً ان کی آنکھیں چھلک گئیں۔ مگر ہنسنے لگے۔ "یاسمین بی بی۔ جو کچھ تم دو گی۔ میں ضرور لے لوں گا!"

چھوٹی چھوٹی خوشیاں بعض وقت کتنی عظیم لگتی ہیں۔ میں نے

گلاب سب سے زیادہ

خوبصورت اس وقت ہوتا ہے جب کھلنا شروع ہوتا ہے۔ امید سب سے درخشاں اس وقت ہوتی ہے۔ جب وہ خوف سے جنم لیتی ہے۔ گلاب پر سب سے زیادہ نکھار اس وقت ہوتا ہے جب اس کا چہرہ شبنم سے دُھل جاتا ہے۔ جتنی سب سے زیادہ حسین اس وقت معلوم ہوتا ہے جب آنسو برس چکتے ہیں۔

(مرسلہ، صابر رضا ۔ لیاقت آباد ۔ کراچی ٦)

نجمہ اور پروین کی شادیاں طے ہو گئیں"!

"خدا مبارک کرے"!

"ابھی طے نہیں ہوئیں" دادی بی نے بات اچک لی " بڑا سوال تو روپے کا ہے۔ دونوں شادیوں پر باتیں ہزار اٹھ رہا ہے۔ لے دے کے ہمارے پاس یہی گھر ہے"!

"گھر بیچ کر ___؟" چچا نے آہستہ سے پوچھا۔

"اور کیا" دادی بی بولیں " اس کے سوا کیا کریں۔ وہ تو اللہ کا شکر ہے کہ بائیس ہزار ہی میں دونوں اٹھ رہی ہیں۔ صورتیں گت کی نہ موئی گن ڈھنگ کی۔ روپے کا لالچ ہے جو کچھ ہے"

"اچھا ___ بہرحال ___ تمہیں اس لیے بلایا تھا کہ ___ کر ___ ابا لڑکھڑا کر رک گئے۔

"ان دستاویزات پر تمہارا بھی نام ہے" دادی بی نسبتاً زیادہ بولڈ تھیں!" وکیل نمک حرام کہتا ہے کہ تمہاری مرضی بھی ضروری ہے آخر وہ تمہاری بھی بھتیجیاں ہیں"

"جی ہاں!" چچا کو کوئی جواب نہ سوجھا۔

"ان لوگوں کو جلدی ہے۔ یہی کہنا تھا کہ تم لکھ دو ___ مکان بکنے پر راضی ہو ___ مہاجن پینتالیس ہزار میں لے رہا ہے ہوٹل کھولے گا!"

"تیس ہزار تو دو شادیوں کے لیے بہت ہیں" چچا نے نیچے دیکھتے ہوئے کہا" مکان اگر اسی قیمت میں جا رہا ہے تو ابا میاں کی وصیت کے مطابق بیس ہزار مجھے بھی" وہ رک گئے

جو کچھ ان کے لیے کیا تھا اکارت کر دیا۔ چچا چلے گئے جیسے ہی امی نے صحن میں قدم رکھا دادی بی چہکنے کو چپکیں۔

"اپنے بیٹے کو کیا یہی اٹھا کر دے دیا۔ کیوں اس بدذات کے پیچھے دیوانی رہتی ہے۔ ٹھہر جا۔ ابھی تیری جان نکالتی ہوں"

میری جان نکلتی رہی۔ مگر میں یہ نہ جان سکی کہ میں اس بدذات کے پیچھے کیوں دیوانی ہوئی جاتی تھی! مجھے خود پتہ نہ تھا۔

گھڑی کی سوئی کی طرح آپا اور باجی گھنیری ہوئی گئیں۔ دادی بی کو فکر ستانے لگی۔ بہت سارے پیغام آتے۔ لے دے کر ہمارے پاس یہی ایک گھر تھا۔ مُک کے چھکے اماں نے کہہ دیا۔ اسی گھر کو بیچ کر دونوں کو نمٹا دیا جائے۔

وکیلوں نے وصیت نامہ کا معائنہ کیا اور پھر یک قلم فیصلہ کیا کہ سلطان صاحب کی رضامندی کے بغیر مکان نہیں بک سکتا۔

ابا غصے کے عالم میں جھلنے لگے ___ دادی بی کے کوسنوں پر کٹر ولی کر نادشوار ہو گیا۔ اب یہ اس بھیک منگے سے کون کہے ___ اس پر راضی نہ ہوا تب ...... وہ کیا میرے خود دار اور غیور ابا بیٹیوں کی شادی کی خاطر ان کے سامنے جھک جائیں گے سب ہی کے نوالے حلق میں پھنسنے لگے۔

"اپنی غرض کی خاطر لوگ گدھے کو باپ بنا لیتے ہیں" اماں نے ترکیب بتائی۔ " وہ تو پھر آپ کا بھائی ہے۔ ذرا سر پر ہاتھ پھیر دیجیے۔ ایک ایک تقریباً ایک ایک ہزار معاف کر تا جائے گا"

"جو میں نے آج تک نہیں کیا ۔ وہ اب بھی نہ کر سکوں گا!" ابا نے صاف انکار کر دیا۔

"تو پھر بٹھا رکھیے جوان لڑکیوں کو"

"اور اگر وہ کمبخت اس کے بعد بھی راضی نہ ہوا تب! بیس ہزار کم نہیں ہوتے"!

پچاسوں مشورے کرنے کے بعد چچا کو بلایا گیا۔ وہ آ گئے۔ مگر ان سے کون ملتا۔ کس منہ سے غرض کا اظہار کیا جاتا۔ میری اس دن جان نکل چکی تھی۔ میں بھی ادھر اُدھر ہو گئی۔ دیر تک وہ صحن میں کھڑے رہے ..... پھر دادی بی اور ابا کو ساتھ ساتھ دالان میں آتے دیکھا تو یکبارگی چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

"بیٹھو میاں" دادی بی نے کہا۔ لہجہ اتنا تیز اور کسیلا نہ تھا!

"میاں" وہ دھک سے رہ گئے۔

"بیٹھو بیٹھو" ابا کہنے لگے "تمہیں تو شاید خبر ہی نہ ہوگی کہ

"چھوٹا منہ بڑی بات" ابا کا چہرہ لال ہو گیا — دادی بی کی سمجھ میں کوئی بددعا نہ آئی بس نہ چلا جو نٹنیوں بھا ٹا لیتیں مار آستین کا۔

"بیس ہزار تجھے ملیں گے؟" دادی بی کا تھرمامیٹر چڑھتا گیا۔ "کبھی خواب میں بھی دیکھے تھے؟!"

"انصاف کیجئے — اماں — جو کچھ میرا حق ہے — وہ مجھے ضرور ملنا چاہیئے" چچا یہ کہہ کر اٹھے اور چل دیئے۔

"دیکھ لیا۔ اسی لیے کہتا تھا کمینے سے شرافت کی توقع نہ کیجئے" ابا میاں بل کھا رہے تھے۔ دادی بی گالیوں کی انسائیکلو پیڈیا بنی ایک حسین گالی سے شوق فرما رہی تھیں۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کیا جائے۔ ادھر سے لڑکوں کا اصرار۔ ادھر سے مہاجن نے زندگی تلخ کرنی شروع کر دی کہ سود لیجئے تو تجھے مدد نہ۔

دو رشتے کے بعد سوچتے ہوئے کلیجہ ہلنے لگتا! ابا کو یہ گوارہ تھا کہ لڑکیاں گھر ہی میں مر جائیں مگر گوارہ نہ تھا کہ بیس ہزار کا خسارہ اٹھایا جائے۔ ماں کی ممتا آڑے آئی۔ ہاتھ کا میل جس کی قیمت فی الحال میں ہزار تھی...... ہاتھ سے چھٹا دیا گیا۔ بڑی بڑی قیاس آرائیاں کی گئیں! لاکھ لاکھ داؤ پیچ سوچے گئے مگر حاصل کچھ نہیں۔ آخرکار بوکھلا کر دادی بی نے وکیل صاحب کو بلا لیا۔ چچا بھی آئے مہاجن موجود تھا سب کے سامنے دادا ابا کا شاندار مکان بک گیا۔ بیس ہزار کی ایک دستاویز چچا کے منہ پر بھی پھینک ماری گئی۔

"دیکھ لینا — دادی بی ہانپ رہی تھیں!" یہ بیس ہزار کفن دفن ہی میں اٹھیں گے۔ ہائے دشمنوں نے مجھے لوٹ لیا..... کیڑے پڑیں اس جنتی کی قبر میں۔ جس نے آستین میں سانپ پالا تھا! ہائے میرے پروردگار — ارے میرے دل میں آگ لگی ہے آگ"

دادی بی کے دل میں آگ لگی ہو یا نہ لگی ہو، مگر ایک دم سے دو دو بہائیوں کو سینے پہ سے سرکتے دیکھ کر اماں کے دل کی آگ ضرور ٹھنڈی پڑ گئی تھی۔ بڑی دھوم دھام سے باراتیں آئیں۔ ہفتہ بھر تک باہر شہنائی گونجتی رہی اور اندر ڈھولک بجتی رہی! گھر پھونک تماشہ دیکھا گیا۔ آپا اور باجی مالا مال سسرال سدھاریں — پیچھے راکھ کا ڈھیر کر چلا۔ پانچ ہزار چنگاریاں نکال کر آپا نے دادی بی کو تھما دیں۔

جیسے ایک دم گھر بھر اجڑ کے رہ گیا! اندھیر تھا اندھیر۔ دادی بی کو غم بھلاتے نہ بھولتا۔ جس نچے ذات پہ یاسمین جان چھڑکتی تھی وہ کروٹیں بھر اودھر ہو کر بھی نہ گزرا۔ جوان بیٹے روٹھے روٹھنے والا کوئی نہ ملے....." وہ پانی پی پی کر کوستیں۔

بھیا اور بھائی جان اپنی بیویاں لے کر پردیس سدھارے۔

جس ڈال پہ بیٹھے پکا پکایا کاکو چگ رہے تھے! اس ڈال پہ خزاں چھا گئی۔ تالاب سوکھ جاتے تو بگلا پیاس کے مارے مر تو نہیں جاتے گا۔ گھر بھر کے پنچھی پھر سے اڑ گئے!

اونچی حویلی سے نکل کر گندے سے مکان میں دم گھٹتا اور بتا تھا جیسے اپنی ایمانداری کی سزا بھگت رہے ہوں — میرا تو جی ہی نہ لگتا — نہ جانے کیا ہو گیا تھا؟ رات دن طرح طرح کے عجیب و غریب خیالات دماغ میں جو کڑیاں بھرا کرتے — ان خیالات کا کوئی مرکز نہ تھا میں انہیں کوئی نام نہ دے سکی۔ رات دن، صبح و شام — بے رحم چکی چلتی رہی۔

ابا کی پنشن ہو گئی — بچے کچھے روپے پیسے تو اس طرح ختم ہوئے کہ اب اماں کی سانس پھولتی تو گھر میں دوا کی قیمت نہ نکلتی۔ میں اسکول سے کالج پہنچی۔ پہلی مرتبہ جیسے معصوم بھیڑوں کے گلے سے کٹ کر سرکش مینڈھوں کے جتھے میں آ گئی۔ ٹاٹ کا کھدر اپنی پیوند لگی اوڑھنی چھپانے کی کوشش کی مگر ایک زندہ دل کی نظر اس پہ پڑ گئی اور پھر پیوند کے کنارے پنسل رکھ کر جو کھینچا تو چرر سے ہولناک آواز کے ساتھ ہی میرا دم بھی نکل گیا۔ اسی مصیبت کی ماری اوڑھنی کو تو اٹھا رکھا تھا۔ مگر اس کا یہ حشر دیکھ کر میرے آنسو امڈ آئے — واپسی پر اپنی آرزوؤں کی چھوٹی سی قبر بنا کر اوڑھنی کی چادر چڑھا دی۔ کالج کی خوشگوار زندگی کا یہی میرا پہلا اور آخری دن تھا۔

دادی بی مجھے دیکھ دیکھ کر جل کھانے لگیں!

"باپ کی پنشن ہے۔ آمدنی کا کوئی ٹھکانہ نہیں — اور یہ بے کار، اللہ کی شان"!

اماں بی دھیرے دھیرے کھو نچے دینے لگیں — "وہ خاک پڑے اس قدر پہ — ارے۔ سر ڈھانک کر چلا کر۔ سڑک کوٹنے کا انجن اس طرح قدم زمین پہ رکھتے ہیں — جد جد کر کے — اس محلے ادھر آواز جاتے ہیں"!

مفلسی ہمارے گھر ہی پر نہیں چھائی تھی۔ زبانوں پر بھی آ گئی تھی پہلے اماں کے منہ سے پھول جھڑا کرتے تھے اور اب نکیلے کانٹے بکھرا کرتے۔ غربت بجائے خود یونیورسٹی ہے۔ میں بہت کچھ سمجھنے لگی تھی۔ یہ پتہ نہ تھا کہ کل کیا ہو گا۔ ایک خواب ٹوٹتا اور دوسرا دیکھنے لگتی۔ اپنے خوابوں اور آرزوؤں کے ڈھیر پر پڑے پڑے میری زندگی کی مرجھائی ہوئی کلی بھی پھول بن گئی۔ چوری چوری نظریں میری طرف اٹھتیں اور کانپ کانپ جاتیں

پتہ نہیں کیوں بات کے سناٹے میں دادی بی اور ابا کی سرگوشیاں سن کر دل دھڑکنے لگتا!۔

اور پھر ایک دن ابا کے ہاتھ میں سرخ لفافہ دیکھ کر میں نے دبی ہوئی خوشیوں کے ادھ کچے اور ادھورے محل کھڑے کر لیے۔

"کلرک ہے تو کیا ہوا؟" — دادی بی کراری آواز میں کہہ رہی تھیں — "اور اس زمانے میں کونسا بادشاہ تمہاری بیٹی کے لیے پیغام بھیجے گا"

"خاندان کیسا ہے — پہلا کا ایک ہے — خلقی مارے" ابا شاید راضی نہ تھے۔

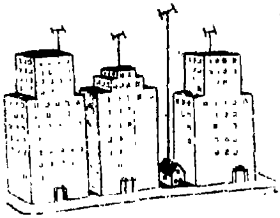
"خدا کی مار تو بیٹی ہے" دادی بی پھر بھی نہ ہاریں — "ایسے ارمان کسی کے نہ تھے۔ آنکھوں کی راہ سے دل میں گھس جاتی ہے۔ اب جیسا بھی ہو — ہاتھ پیلے کر دو۔ ایسے غیروں کی باتیں نہیں ہوتیں"

"اماں بی ...." اماں کی کمزور سی آواز سنائی دی "تنخواہ صرف ساٹھ روپے ..... گنی ہوئی پتا شوربہ .... کیا میری بچی کی تقدیر میں کچھ نہیں ہے" اماں کی آواز رندھ گئی۔

"تو پھر چھوڑ دو شاطرانیں۔ بیٹی کے لیے راجوں نوابوں کے بیٹے ڈھونڈیں!" دادی بی نے سوچا ہوتا — میرے ریت کے محل گرنے لگے تھے! اتنی شدت کی تکلیف ہوئی کہ آنسو بھی نہ نکلے۔

شاید وہ لوگ بھی ادھار کھائے بیٹھے تھے! .... چند ہی دنوں بعد میری انگلی میں سونے کا ایک تار جھلملانے لگا — جو صرف میرے لیے میرے شہزادے نے بھیجا تھا! جس کی تنخواہ صرف ساٹھ روپے تھی!

بہت دن ہوئے میرے گھر کے پچھواڑے سے ایک جنازہ اٹھا تھا۔ لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے .... میرے گھر کے ٹوٹے ہوئے دروازے کے پیچھے بھی ماہ میری کوٹھری میں ایک زندہ لاش پڑی تھی جو خاموش آنسوؤں کے ہجوم میں اپنی آخری منزل پر پہنچائی جا رہی تھی! میرے ٹاٹ پڑے ہوئے دروازے پر شہنائی کی گونج نہیں سنائی دی۔ میرے جہیز کے کپڑے نہیں سیتے گئے۔ میری کوٹھری میں سہیلیوں کے شوخ و شریر قہقہے نہیں بکھرے۔ اماں کٹوری میں مہندی لے کر آئیں۔ ان کی نظریں مجھ پر پڑیں اور پھر یک بیک ان کی آنکھوں کے حلقے آنسوؤں سے لبریز ہو گئے۔ میں جب بھی خاموش بیٹھی رہی۔ میں نے اماں کے آنسو نہیں پونچھے، ان کے گلے نہیں لگی۔ میں انہیں مجرم سمجھ رہی تھی، جس نے بیٹی پیدا کی تھی۔ اس کے ساتھ جوڑے



کے دس ہزار نہیں پیدا کیے تھے۔ مہندی آنسوؤں سے بھیگ گئی — اور میرے ہاتھوں پیروں میں ایسی رچی جیسے میں نے سچ مچ اپنے ہاتھوں سے اپنے معصوم ارمانوں کو ذبح کیا ہو۔

دالان میں مہمان آئے بیٹھے تھے بھیا، باجی اور آپا بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے! — مہمان آ جا رہے تھے! — تنہائی اور سناٹے کے درمیان کبھی کبھی کسی کی آواز آ جاتی — کوئی بچہ قہقہہ لگاتا — ذرا سی دیر کے لیے سکوت ٹوٹ جاتا — میری کوٹھری میں خاموشی طاری تھی! خدا جانے میں کیا سوچ رہی تھی! — پھر اچانک ہی جانے کیوں میرے ذہن کا دریچہ تند و تیز خیالات کی آندھی سے کھل گیا — اور چچا پسینہ پونچھتے ہوئے گھبرائے سے انداز میں ہنستے ہوئے یادوں کی چھوٹی سی کٹیا میں گھس آئے۔

"چچا ......" بے خبری میں میرا دل دھک دھک کر رہا تھا! آنسو بہہ رہے تھے۔ آپ نے بھی مجھ بدنصیب کو نہیں پہچانا۔ میری محبت بے لاگ تھی، عجیب سی محبت۔ جس میں ماں کی ممتا، بہن کا پیار اور دوست کا سا تعلق خاطر تھا۔ وہ محبت خون کے رشتے کی نہ تھی انسانیت کے ناطے کی تھی۔ انمٹ اور امر۔ چچا یہ نہیں دیکھیے گا؟ آپ کی یاسمین بی بی کے ہاتھوں میں کیسی لال لال مہندی رچی ہے؟ — مانجھے کے زرد زرد کپڑوں میں یاسمین بی بی گٹھڑی سی بنی آنے والی گھڑیوں کا انتظار کر رہی ہے۔ جس کے ماں باپ کی پر خلوص دعائیں اسے ساٹھ روپے پانے والا شوہر بخش رہی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد آپ سب کی چھوٹی بی بی بابل کا گھر چھوڑ چلے گی۔ ایک بار آ جائیے۔ میری خاطر۔ اگر کوئی آپ کو کچھ کہے گا تو اس کے قدم چوم کر خوشامد کر دوں گی۔ ہاتھ جوڑ کر التجا کروں گی۔ ایک بار صرف ایک بار۔ اتنی مہلت دے دو۔ میرے چچا مجھے اپنے گلے لگا لیں۔ میری پیشانی چوم لیں خدا را — اتنی اجازت دے دو۔

میں ان کے گلے لگ کر آنسو بہا لوں — جی بھر کے پھر میں کچھ نہیں مانگوں گی! —

میں سسک سسک کر رو پڑی۔

"بی بی! تم سے ملنے کے لیے چچا آئے ہیں۔ یہیں بلا لاؤں؟!"
یہ خواب تھا — میں غفلت میں دھیرے سے بڑبڑائی —
"چچا — !"

"دادی بی کا دماغ خراب ہو گیا ہے"..... باجی کہہ رہی تھیں۔
"شادی کے گھر میں بن بلائے مہمان چلے آتے ہیں۔ لاکھ کچھ کہو یہ تو پھر بھی اپنے ہیں۔ انہوں نے اپنا حق مانگا تھا گناہ تو نہیں کیا تھا۔ دادی بی انہیں باہر نکال رہی تھیں — میرا دل دہانا۔ میں نے بلا لیا"
"چچا کہاں ہیں؟!" — مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔
"ابھی بھیجتی ہوں!" باجی چلی گئیں۔

وہ گھڑی ایک صدی بن گئی۔ کب چچا اندر آئے اور کب میں نے انہیں دیکھا۔ کچھ خبر نہیں۔ میں سارے جسم سے کانپ رہی تھی۔ مدھم سا احساس ہوا کہ مجھے گرنے سے سنبھالتے ہوئے چچا نے اپنے سینے سے بھینچ لیا تھا۔ یہ بھی پتہ نہ تھا۔ کون سا وقت تھا۔ جب آنکھ کھلی — گھر میں سب مہمان آ چکے تھے۔ چچا میرے پاس بیٹھے کچھ کہہ رہے تھے۔
"یاسمین بی بی!" ہائے کاش وہ رو پڑتے۔ ان آنسوؤں میں کتنا حسن تھا جو ان کی آنکھوں کی گہرائی میں چمک رہے تھے۔ میرا منہ پھر سے بننے لگا۔
"خوشی کے موقع پر روتے نہیں یاسمین بی بی!" وہ مجھے بہلانے لگے۔ "اٹھو یہ جلیبیاں کھاؤ۔ دیکھو کئی سال پہلے تم نے جو شلوار کا کپڑا دیا تھا۔ آج تمہاری شادی پر میں اسی کپڑے کا پاجامہ پہن کر آیا ہوں۔"

وہ مجھے ننھی سی بچی سمجھ رہے تھے۔ میرے منہ سے آواز بھی نہ نکلی۔ آنکھیں اس چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ جس پر دکھوں کے نشان تھے مگر ہونٹ اب بھی مسکرا رہے تھے!
"آپ مجھے بھول گئے چچا" بڑی مشکل سے میں کہہ سکی!۔
"نہیں بیٹی" وہ پھر کھسیانے انداز میں ہنس دیتے۔ "میں کسی کو نہیں بھولا۔ تم تو ہمیشہ یاد آتی رہیں۔ میں یہاں نہیں تھا۔ چھوٹی بی بی دو تین ہی دن پہلے آیا ہوں۔ کل بازار میں غفورا سے ملاقات ہوئی پتہ چلا کہ تمہاری شادی ہے — دیکھو — آج ابھی آ گیا۔"
"کندھا دینے" میرا گلا بھر آیا۔
"ارے توبہ توبہ — ایسا نہیں کہتے — بڑی بات" وہ جیسے

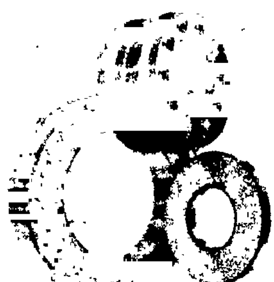
مل رہا سی روشنی ہوئی کہ شرمندگی محسوس کرنے کے لیے سب کچھ اپنے سر لے کر بیٹھ گئے
وہ ساعتیں بھی کتنی کٹھن تھیں۔ دعائیں تو قریب سب ہچکیاں لے رہے تھے مگر مجھے رونا نہیں آ رہا تھا۔ میں اپنے چچا کے سینے سے لپٹی ہوئی تھی۔ جیسے میرے دل پر کسی نے ہاتھ رکھ دیا تھا اور ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا — رخصت ہوتے ہوئے مجھ سے کیا کہیں۔

"جو پچھلے سال لگ جوڑ" دادی بی کی جھڑکی اب بھی برقرار تھی۔
اچانک ہی چچا زور زور سے رونے لگے۔ "اس گھر کا دروازہ مجھ پر بند ہو گیا۔ میرے لیے کیا خیال ہے اماں — میں آپ کا بیٹا نہیں ہوں۔ میں آپ کی خاطر مرتا بیٹا ہوں مگر اس میں میرا کیا قصور ہے اماں۔ ایک دفعہ کہہ دیجئے کہ میں ماں کہہ کر آپ کو پکاروں! بھلا آپ نے بھی اپنے سے دور کر دیا —"
"ہاں ہاں — اب تجھے بیٹا گود میں لے کر بہلائیں گے:" دادی بی جھلائیں۔
چچا کا گلا رندھ گیا تھا پھر بھی خود کو سنبھال کر بولے "نہیں۔ اماں آج کے بعد میں پھر کبھی ادھر نہیں آؤں گا — میں چھوٹی بی بی کی خاطر ادھر آ گیا تھا۔ ان کا قرض چکانا تھا جو کچھ میری چھوٹی بی بی میں — ان ہی کے لیے اتنے دنوں زندہ رہا کہ ایک دن اپنے ہاتھوں سے کچھ دے سکوں گا۔ یہ — یہ میرا حصہ نہیں ہے — اللہ کا ہے — جو لاکھوں یہ بیس ہزار کی دستاویز اپنی بچی کو دے رہا ہوں خدا را اسے نہ ٹھکرا دیجئے۔"
انہوں نے لرزتے کانپتے ہاتھوں سے دستاویز پھیلائی
اماں کے چلتے ہی سے جیسے میں سانس لینی بھاری تھی —
وہ ہانپتے کرتے پلنگ پر گر گئیں۔ دادی بی غالباً تخت لیک کر پیچھے چھپنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ایک دم سے سارے گھر کو ناگن نے ڈس لیا۔
چچا شاید ایسی ذلیل حرکت کر کے بجلا رہے تھے — بلکتے ہوئے بولے۔
"سدھارو بیٹی۔ اللہ تمہیں خوش رکھے!"
پتہ نہیں پھر کیسے چچا آگے بڑھے اور ابا سے لپٹ گئے! برسوں کی تلی ہوئی گھٹا دم جھم کر برس پڑی۔









تحیر خیز ماورائی رومانی ناول
— قسط نمبر ۱۷۱ —

جانور

شمس الاسلام صدیقی

ڈاکٹر کامران مقامی کالج میں فلسفے کا پروفیسر تھا۔ وہ بے حد وجیہ اور دلکش تھا۔ لڑکیوں کے لیے اس میں ایک خاص کشش تھی۔ مگر وہ خود لڑکیوں کی طرف مطلق توجہ نہیں کرتا تھا۔ لڑکیوں میں وہ مغرور اور خود پسند مشہور تھا۔ اسی کالج کی چھ لڑکیاں شہناز، زبیدہ، ہما، عمرانہ، شیریں اور پروین بھی ڈاکٹر کامران میں دلچسپی رکھتی تھیں۔ مگر شہناز ان سب سے آگے تھی۔ ڈاکٹر کامران کی روکھائی کے باوجود وہ اس سے شدید محبت کرتی تھی۔ پھر ایک دن ڈاکٹر کامران نے پُراسرار انداز میں ایک قصہ شہناز کو سنایا جس میں اُسے آئندہ حالات کو ڈاکٹر کامران سے ملنے کے لیے کہا گیا تھا۔ وہ ڈاکٹر کامران کے نقش قدم پر رہی تھی کہ ایک سانحہ رونما ہو گیا۔ ہما نے اپنے ایک غنڈے عاشق اور کرنل واجد کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ اس واقعے سے لڑکیوں میں سراسیمگی پھیل گئی وہ سب اس خلیت میں واجد کی لاش دیکھنے پہنچیں جہاں کہ ہما نے اسے ہلاک کیا تھا۔ مگر لاش غائب تھی۔ اس صورت حال سے وہ سب حواس باختہ ہو گئیں۔ دوسرے دن شہناز ضروری تیاریوں کے بعد ڈاکٹر کامران سے ملنے پہنچی۔

دروازہ خود ڈاکٹر کامران نے کھولا۔ وہ اس وقت ایک اخبار نویس سے مصروف گفتگو تھا۔ اخبار نویس رخصت ہوا تو ڈاکٹر کامران نے شہناز کی طرف توجہ کی۔ باتوں کا سلسلہ چل نکلا اور شہناز ڈاکٹر کامران سے مسحور ہوتی رہی۔ پھر اچانک ڈاکٹر کامران نے یہ کہہ کر شہناز کو چونکا دیا کہ وہ کچھ عرصے کے لیے اسے فرضی بیوی بنانا چاہتا ہے۔ شہناز پریشان ہو گئی مگر ڈاکٹر کامران سے اس قدر متاثر تھی کہ آمادگی ظاہر کر دی۔ دوسرے دن ملاقات کا وعدہ کر کے زبیدہ کے گھر واپس آئی تو فون پر ایک اجنبی کا پیغام ملا۔ وہ ہما کو پوچھ رہا تھا اور دھمکی دی تھی کہ واجد کا خون رائیگاں نہیں جائے گا اور اس کا بدلہ ضرور لیا جائے گا۔ شہناز اس دھمکی پر بوکھلا گئی۔ اس نے اپنے طور پر واجد کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ اُسے یقین سا ہونے لگا کہ واجد واقعی میں مر چکا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی اس پر خوف بُری طرح طاری ہو گیا۔ رات ڈاکٹر کامران سے ملنے اس کے گھر پہنچی۔ باتوں باتوں میں ڈاکٹر کامران نے بتایا کہ اس کا باپ بوڑھا اور مریض ہے اور اپنی بیماری کے سبب مکمل طور پر بستر پر مجبور ہے۔ عنقریب کچھ عرصے کے لیے یہاں آ رہا ہے۔ اُسے ڈاکٹر کامران کی شادی کی حسرت ہے۔ یہ خواہش تھی اور ڈاکٹر کامران نے اسے ٹالنے کے لیے لکھ دیا تھا کہ اس نے حال ہی میں شادی کر لی ہے۔ اب اس کا باپ بہو سے ملنے آ رہا تھا۔ چونکہ ڈاکٹر کامران نہیں چاہتا تھا کہ اس کا جھوٹ کھلے اور اس کے باپ کو دکھ پہنچے اس لیے اس نے شہناز سے فرضی بیوی بننے کی درخواست کی تھی۔ شہناز کو ڈاکٹر کامران کی یہ بات بڑی عجیب سی لگی مگر اس نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ ڈاکٹر کامران سے مل کر زبیدہ کے گھر آئی تو دروازہ مقفل ملا۔ شہناز نے اضافی چابی سے دروازہ


Jabbar

سوچ رہی تھی اور ساتھ ساتھ رات کا کھانا تیار کرنے لگی۔ اس وقت باہر اندھیرا پھیل چکا تھا۔ شہناز نے سوچا کہ لڑکیاں واپس آگئی ہیں۔ اس نے جا کر دروازہ کھولا اور سامنے دیکھا تو مارے خوف کے اس کی چیخ نکل پڑی اور وہ چکرا کر گر گئی۔ اس کے سامنے کفن میں لپٹی ہوئی لاش کھڑی تھی پھر وہ لاش اس کے وجود کو پھلانگتی ہوئی مکان میں داخل ہو گئی۔

لڑکیاں واپس آئیں تو شہناز کو ہوش آچکا تھا۔ طبیعت سنبھلی تو شہناز کو پتا چلا کہ وہ شے جسے وہ لاش سمجھ رہی تھی وہ اصل میں لاش نہیں تھی بلکہ کوئی عورت تھا۔ اس نے جسم کے گرد سفید چادر لپیٹ رکھی تھی۔ لڑکیوں کے پوچھنے پر شہناز نے بتایا کہ ڈاکٹر کچھ عرصے کے لئے اسے اپنی فرضی بیوی بنانا چاہتا ہے اور وہ یہ محض اپنے بوڑھے اور بیمار باپ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کر رہا ہے جو کہ عنقریب لندن سے آنے والا ہے۔
اگلی صبح شہناز کو فون پر ایک اجنبی کا پیغام موصول ہوا۔ اجنبی اس سے تنہائی میں میڈیکل کالج کی لائبریری میں ملاقات کرنا چاہتا تھا۔ اور شہناز با دل نخواستہ اس سے ملنے پہنچ گئی۔ اجنبی سے مل کر انکشاف ہوا کہ وہ واجد کا دوست ہے اور واجد مرا نہیں ہے البتہ اس کی حالت بہت خراب ہے اور وہ واجد ہی تھا جو سفید چادر اوڑھے زبیدہ کے گھر میرے ملنے پہنچا تھا مگر ملاقات خود اس سے ہو گئی تھی۔ شہناز یہ خبر سن کر دوستوں کے درمیان پہنچی تو ان سب پر شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس خوشی میں ایک بھرپور جشن کا اہتمام کیا گیا۔ مگر اس وقت ہما ان کے درمیان نہیں تھی۔ ہما کے گھر فون کیا گیا مگر ہما کے گھر سے یہ دہشت ناک خبر ملی کہ وہ گھر پر نہیں ہے اور زبیدہ کے گھر گئی ہے۔ اس اطلاع نے سب کو پریشان کر دیا اور وہ سوچنے لگیں کہ آخر ہما گئی کہاں۔ اگلے دن طے شدہ پروگرام کے مطابق شہناز ڈاکٹر کامران کے گھر گئی۔ اس رات ڈاکٹر کامران کا باپ لندن سے آنے والا تھا۔ ڈاکٹر کامران اپنے باپ کو ائیر پورٹ سے لے کر آیا تو شہناز نے اس بوڑھے شخص کو قریب سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی چمک تھی۔ شہناز کو اچانک خیال آیا کہ کہیں وہ کسی مصیبت میں تو نہیں پھنسنے جا رہی۔ ہو سکتا ہے یہ بوڑھا ڈاکٹر کامران کا باپ نہ ہو بلکہ کوئی فراڈ ہو۔ یہ خیال آتے ہی شہناز پر خوف طاری ہو گیا۔ اور اس کی حالت غیر ہو گئی۔

مگر بعد کے واقعات نے بتایا کہ وہ بوڑھا شخص ڈاکٹر کامران کا باپ ہی تھا۔ شہناز کے لیے وہ بہت مہربان اور شفیق ثابت ہوا۔ اس نے شہناز کو واقعی خسر سے کہیں زیادہ بڑھ کر محبت دی۔ ڈاکٹر کامران نے باپ کو ہوٹل میں ٹھہرایا اور وعدہ کیا کہ اگلے دن رات کا کھانا وہ کسی ریستوران میں کھائیں گے۔ شہناز زبیدہ کے گھر واپس آئی تو اس وقت تک ہما واپس آچکی تھی۔ ہما کی حالت بہت خراب تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کا ایک عاشق رضا جو بنا کر اسے اپنے گھر لے گیا تھا اور بے ہوش کر کے اغوا کر دیا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ بری طرح زدوکوب بھی کیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ ہما کسی دوسری جگہ شادی کرنے کے خیال سے باز آجائے اور اس سے شادی کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ ہما بہت دل برداشتہ تھی۔ اس نے اپنے منگیتر سے منگنی توڑنے کا ارادہ ظاہر کیا اور کہا کہ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے وہ اس کا انتقام دوسرے طریقے سے لے گی اور سب سے پہلا شکار وہ ڈاکٹر کامران ہوگا۔ دوسرے دن شہناز ڈاکٹر کامران کے گھر پہنچی اور وہاں سے وہ دونوں ہوٹل روانہ ہو گئے۔ رات کا کھانا ڈاکٹر کامران اس کے باپ اور شہناز نے ایک ریستوران میں کھایا۔ کھانا جاری تھا کہ کسی نے عقب سے ڈاکٹر کامران کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ڈاکٹر کامران نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ اچانک ہی اس کا چہرہ سفید پڑ گیا اور چمچہ ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑا۔

وہ شخص ڈاکٹر کامران ہی کے کالج میں انگریزی ادبیات کا پروفیسر تھا۔ ڈاکٹر کامران اس سے بہت بد اخلاقی سے پیش آیا۔ پروفیسر چلا گیا تو وہ لوگ بھی ریستوران سے باہر نکل آئے۔ اگلے دن کے لئے طے پایا کہ رات کا کھانا ڈاکٹر کامران اور اس کا باپ گھر پر کھائیں گے اور شہناز کھانا پکائے گی۔ شہناز نے وعدہ تو کر دیا مگر بعد میں پچھتانے لگی کہ ناحق وعدہ کیا۔ وجہ یہ تھی کہ اسے کھانا پکانا نہیں آتا تھا مگر آکاش نے یہ مسئلہ زبیدہ کے سامنے رکھا۔ زبیدہ اس کی مدد پر آمادہ ہو گئی۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ اگلے دن ڈاکٹر کامران کی آمد سے پہلے اس کے گھر پہنچ جائے گی اور آیا کی مدد سے کھانا تیار کر کے واپس آجائے گی۔ رات شہناز بستر پر لیٹی تو اس کا ذہن ڈاکٹر کامران کے باپ کی طرف چلا گیا۔ اسے اس بات پر دکھ ہونے لگا کہ وہ اور ڈاکٹر کامران مل کر اس شریف اور بوڑھے انسان کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ اسے یہ خیال بھی ستانے لگا کہ جب ڈاکٹر کامران کا باپ لندن واپس چلا جائے گا تو ڈاکٹر کامران اس سے قطع تعلق کر لے گا۔ شہناز نے طے کیا کہ وہ ڈاکٹر کامران کے باپ سے مل کر اس پر ساری بات کھول دے گی تاکہ وہ سارے حالات سے باخبر ہو جائے اور ممکن ہے اس پر رحم کھاتے ہوئے وہ اپنے بیٹے کو اس سے شادی پر مجبور کر دے۔ دوسری صبح شہناز اس غرض سے ڈاکٹر کامران کے باپ سے ملنے ہوٹل پہنچی تو اسے یہ دیکھ کر شدید دھچکا لگا کہ ڈاکٹر کامران وہاں پہلے سے موجود تھا۔ ڈاکٹر کامران نے بالواسطہ طور پر اس کی بہت بے عزتی کی اور شہناز دل برداشتہ ہو کر واپس آگئی۔ اس صدمے کو اس نے ڈاکٹر کامران اور اس کے باپ کے لئے زبیدہ اور آیا کی مدد سے بہترین کھانے تیار کئے۔ ان لوگوں نے کھانا بے حد پسند کیا۔ پھر رات گئے ڈاکٹر کامران خود شہناز کو زبیدہ کے گھر چھوڑنے گیا۔ دوسری صبح شہناز کو واجد کے دوست کا فون ملا کہ واجد نے خودکشی کی کوشش کی تھی اور اب اس کی حالت بہت نازک ہے چنانچہ وہ فوراً اس کی کلینک پہنچ کر ملے۔ شہناز اور شیریں کچھ ہی دیر بعد واجد کے دوست سے ملنے کلینک پہنچ گئیں۔ ان دونوں کی خوف اور دہشت سے بری حالت تھی۔ شہناز نے ایک لمحے توقف کیا اور پھر بند دروازے پر دستک دے دی۔

دوران کھلا اور دروازہ کھولنے والا واجد کا دوست تھا۔ وہ انہیں واجد کے کمرے میں لے گیا جہاں انکشاف ہوا کہ واجد نے خودکشی نہیں کی تھی، خودکشی کا ڈھونگ رچایا تھا۔ البتہ اس کی حالت بہت خراب تھی۔ اس نے شہناز کو محض اس لئے بلایا تھا کہ وہ جاکر مہر کو اس کی خاطر تیار کرے۔ ورنہ سچ مچ خودکشی کرلے گا اور اس کی خودداری مہر اور اس کے والدین پر ہوگی۔ شہناز نے واپس جا کر ایک مرتبہ پیغام دیا اور واجد سے شادی کرنے پر آمادگی۔ اسی شام ڈاکٹر کامران شہناز سے ملا اور شہناز کو اس رات ڈاکٹر کامران اور اس کے باپ کے ساتھ ہوٹل میں ٹھہرنا پڑا۔ وجہ یہ تھی کہ ڈاکٹر کامران کا باپ اپنی علالت کے سبب اگلی صبح لندن کے لئے روانہ ہورہا تھا اور اس کی خواہش تھی کہ وہ رات اپنے بیٹے اور بہو کے ساتھ گزارے۔ صبح وہ بوڑھا آدمی لندن روانہ ہوگیا اور شہناز طول اور دلگرفتہ زبیدہ کے گھر واپس آگئی۔ یہاں اسے معلوم ہوا کہ واجد اور مہر کی شادی طے پاگئی ہے۔ مگر اس نے واجد کی ہدایت پر سہیلیوں کو شادی میں نہیں پوچھا تھا۔ لڑکیوں کو اس کا بہت دکھ ہوا جلدی وہ بھی گئیں۔ اپنے گھر آکر شہناز نے خود کو اپنے کمرے میں قید کرلیا۔ یہ سوچ سوچ کر وہ دبلی ہوئی جارہی تھی کہ باپ کے چلے جانے کے بعد اب ڈاکٹر کامران اس سے تعلق ختم کرلے گا۔ یوں بھی ڈاکٹر کامران باپ کے چلے جانے کے بعد ایک ہفتے کی رخصت پر چلا گیا تھا۔ خدا خدا کرکے رخصت کے دن تمام ہوئے۔ جس دن ڈاکٹر کامران کو کالج آنا تھا اس دن شہناز صبح سویرے زبیدہ کے گھر پہنچ گئی۔ وہ دونوں کالج گئیں اور جب کالج کے گھنٹے نے ڈاکٹر کامران کے پیریڈ کے آغاز کا اعلان کیا تو شہناز کا دل بڑی شدت سے دھڑکنے لگا۔ پھر اگلے ہی لمحے ڈاکٹر کامران اپنے مخصوص باوقار انداز میں چلتا ہوا کلاس میں داخل ہوا۔ اس نے بریف کیس میز پر رکھا اور طائرانہ نظروں سے کلاس کا جائزہ لینے لگا۔

—————— (اب آپ آگے پڑھئے) ——————



میرے ذہن میں وہ واقعہ گھوم گیا جب ڈاکٹر کامران نے اس کلاس میں لیکچر کے دوران مجھ پر پہلی بار توجہ کی تھی اور ملاقات کی غرض سے رقعہ لکھا تھا۔ اب اس بات کو کافی دن ہوگئے تھے اور میں نے اس کی زندگی میں ڈرامائی حیثیت حاصل کرلی تھی۔ گزری ہوئی ایک ایک بات اور ایک ایک واقعہ مجھے یاد تھا۔ ڈاکٹر کامران کی معیت میں گزرے ہوئے تمام لمحے میرے ذہن پر نقش تھے۔ وہ اس کا پہلی بار میری طرف پراسرار انداز میں دیکھنا، پھر ڈرامائی طور پر رقعہ دینا۔ اس کے بعد اس سے پہلی ملاقات، اس ملاقات کا سرور اور خمار۔ پھر اس کا انتہائی عجیب مطالبہ یا درخواست کہ وہ مجھے وقتی طور پر اپنی فرضی بیوی بنانا چاہتا ہے۔ اس کے بعد دوسری تیسری ملاقاتیں، اس کا وہ بوسہ جس نے کہ میرا وجود پگھلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ بوسہ میری زندگی کا پہلا بوسہ تھا۔ پہلی بار کسی مرد نے میرے کنوارے لبوں کو چوما تھا۔ اس بوسے کی حرارت اور لطافت شاید ہی میں کبھی فراموش کرسکوں۔ پھر اس کا بوڑھا باپ لندن سے آگیا تھا اور اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر کامران کے رویئے میں عجیب سی تبدیلی آگئی تھی۔ کبھی وہ نرم ہوجاتا تھا کبھی گرم۔ کبھی شعلہ کبھی شبنم۔ میں اسے سمجھنے کی بہت کوشش کرتی تھی مگر سمجھ نہ پاتی تھی۔ اس کی نرمی اور سنگدلی ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ کبھی تو وہ بہت نرم اور ملائم طبیعت کا آدمی نظر آتا تھا کبھی ایک دم بپھر کر خونخوار درندہ بن جاتا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے زبیدہ کی مدد سے باپ بیٹے کے لئے کتنا عمدہ اور لذیذ کھانا تیار کیا تھا۔ پھر میرے ذہن میں وہ واقعہ آگیا جب ڈاکٹر کامران کے باپ کی اچانک روانگی طے ہوگئی تھی اور میں رات کو ان دونوں کے ساتھ ہوٹل میں ٹھہری تھی۔ دوسری صبح بوڑھا آدمی لندن چلا گیا تھا اور میں بظاہر ڈاکٹر کامران کی زندگی سے کٹ گئی تھی مگر کیا اتنے سرور آور، کیف آگیں اور طویل لمحات گزارنے کے بعد ڈاکٹر کامران مجھے فراموش کرسکے گا؟ مجھے اپنے ذہن سے جھٹکنے میں کامیاب ہوجائے گا۔ کیا وہ شقی القلب ہے کہ مقصد برآری کے بعد مجھے بھلا دے گا۔ نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔ وہ بہرحال انسان ہے۔ گوشت پوست کا انسان۔ اوروں کی مانند اس کے بھی اپنے حواس ہیں، شعور ہے، ذہن ہے، یادیں ہیں، ماضی ہے۔ اس کے ذہن میں، دل میں، میں نے کوئی جگہ بنائی تو ہوگی۔ بے شک مختصر ہی سہی مگر اس

صیغۂ شعور پہ لوح ذہن پر کہیں نہ کہیں موجود ضرور ہوں گی مجھے اس کا یقین تھا۔ بھرپور اعتماد تھا۔ میں اپنے آپ سے مایوس نہیں تھی۔

میں نے سر جھٹک کر خود کو تصورات کے بھنور سے نکالا اور بڑی توجہ سے ڈاکٹر کامران کی طرف دیکھنے لگی۔ ابھی کوئی دزدیدہ یا پھسلتی ہوئی نظر میری طرف آئے گی اور مجھے زندہ کر جائے گی۔ اس کے دیکھنے کے انداز میں ایسی کوئی بات ضرور ہوگی جو مجھے از سر نو تازہ اور شگفتہ کر دے گی۔ میری تمام پژمردگی اور مردہ دلی رخصت ہو جائے گی اور میں ایک بار پھر پہلے کی مانند سرگرم اور فعال ہو جاؤں گی۔

خاصہ وقت گزر گیا مگر ڈاکٹر کامران نے میری طرف نہیں دیکھا اس کا رویہ کچھ ایسا تھا جیسے میں وہاں سرے سے موجود ہی نہیں تھی۔ اس نے اک نگاہ غلط انداز کی بھی ضرورت نہیں سمجھی۔ وہ بدستور بولتا رہا اور گاہے گاہے کلاس پر سرسری نظر دوڑاتا رہا۔ وہ دانستہ یا نادانستہ جس طرح مجھے نظر انداز کر رہا تھا اس سے میرا دل ڈوبنے لگا۔ مجھ پر یاسیت اور محرومی کا شدید غلبہ ہوا اور میں نے چہرہ دوسری طرف گھما لیا۔ پھر اچانک ہی خیال آیا کہ یہ ڈاکٹر کامران بہت محتاط آدمی ہے۔ ممکن ہے قصداً مجھے نظر انداز کر رہا ہو۔ نہیں چاہتا ہوگا کہ طلبا اس کے اور میرے تعلق کو سمجھیں اگر طلبا کو کچھ سن گن مل گئی یا انہوں نے کچھ محسوس کر لیا تو خوامخواہ اسکینڈل بنے گا اور میں اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ اسکینڈل سے کتنا ڈرتا تھا۔

مجھے وہ واقعہ یاد آ گیا جب اس کا باپ لندن سے آیا تھا اور ہم تینوں اس سے ملنے کی غرض سے اس کے ہوٹل گئے تھے۔ اس وقت ڈاکٹر کامران کی حرکات و سکنات اور رفتار و گفتار ایسی تھی کہ دیکھنے والا یہی سمجھتا کہ اس کا مجھ سے اور اس کے باپ سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ وہ ہمارے لئے اجنبی ہے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے وہ واقعہ بھی یاد آیا جب ریستوران میں کھانا کھاتے ہوئے اس کا ایک ساتھی اس سے آ ٹکرایا تھا اس وقت ڈاکٹر کامران کی حالت دیدنی تھی۔ ڈاکٹر کامران جیسے محتاط شخص سے یہ امید رکھنی فضول تھی کہ وہ کلاس میں طلبا کے ہجوم میں میری طرف دیکھے گا اور وہ بھی ایک خاص انداز میں۔ اس کے علاوہ اس نے خود بھی کہہ رکھا تھا کہ وہ کالج کی زندگی اور ذاتی زندگی میں فرق ملحوظ رکھتا ہے۔ کالج کے ماحول میں شاگرد صرف شاگرد ہے۔ خواہ وہ ذاتی زندگی میں کتنا ہی قریبی دوست کیوں نہ ہو۔

میں نے ان باتوں پر غور کیا تو ذرا اطمینان ہوا۔ واقعی کلاس میں ڈاکٹر کامران سے کسی قسم کی توقع رکھنا حماقت اور عاقبت نااندیشی تھی۔ یقیناً ممکن ہے کہ وہ کلاس کے بعد خود مجھ سے رجوع کرتا اور ٹوٹا ہوا سلسلہ ایک بار پھر جڑ جاتا۔ چنانچہ مجھے انتظار کرنا تھا اور انتظار کرنے ہی میں بہتری تھی۔

میرا دل لیکچر میں نہیں لگ رہا تھا۔ میں ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ ہما، شیریں اور پروین میری ہی طرف دیکھ رہی تھیں ان کے لبوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ تھی اور آنکھوں سے ترحم اور ہمدردی کے جذبات جھلک رہے تھے۔ یہ میرے لئے ناقابل برداشت تھا مجھے سبکی سی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے ان کی طرف سے نظریں ہٹا لیں اور زبیدہ کی طرف دیکھنے لگی۔ زبیدہ میری طرف متوجہ نہیں تھی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا اور اندازہ کر لیا کہ وہ عمداً میری طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ میری جانب کیوں نہیں دیکھ رہی تھی، اس کا سبب ظاہر تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ میری پریشانی دیکھے اور مجھ سے ہمدردی یا تاسف کا اظہار کر کے مجھے مزید پریشان اور رنجیدہ کرے۔ مگر بات تو وہی تھی جس سے زبیدہ کترا رہی تھی۔ اس کا اغماض بتا رہا تھا کہ موجودہ صورت حال سے وہ بھی پریشان ہے اور اسے مجھ سے ہمدردی ہے۔ گویا ہما، پروین، شیریں اور زبیدہ سب ہی ڈاکٹر کامران کی اس بے رخی اور بے مروتی کو خوب اچھی طرح محسوس کر رہی تھیں۔ میں نے ڈاکٹر کامران کے لئے کیا نہیں کیا تھا مگر اب وہ اسی طرح انجان اور اجنبی بن گیا تھا جیسے مجھے جانتا ہی نہیں تھا۔ لڑکیاں میرے اور ڈاکٹر کامران کے تعلقات سے اچھی طرح سے باخبر تھیں۔ ڈاکٹر کامران کو اس طرح آنکھیں بدلتے دیکھ کر انہیں بھی حیرت ہوئی ہوگی۔ وہ سمجھ رہی تھیں کہ ڈاکٹر کامران مجھ سے محبت کرنے لگا ہے یا مجھے اس سے محبت ہو گئی ہے یا ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے دام الفت میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ مگر پتہ چلا کہ سب دھوکہ تھا سب فریب تھا جو کچھ کر دیکھا خواب تھا جو سنا افسانہ تھا۔ وہاں محبت نام کی کسی شے کا سرے سے وجود نہیں تھا اور ڈاکٹر کامران مجھے اب تک بے وقوف بناتا آ رہا تھا۔ سارے دعوے باطل ثابت ہوئے تھے۔ ڈاکٹر کامران نے اپنا مقصد حاصل کر لینے کے بعد مجھے دودھ کی مکھی کی مانند نکال پھینکا تھا اور اب حال یہ تھا کہ

پہچان بھی نہیں رہا تھا — بے مروتی کی معراج۔

میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے، جی چاہا کہیں کہیں زمین پھٹے اور میں اس میں سما جاؤں۔ ایسی شدید بے عزتی اور سبکی کا احساس مجھے زندگی میں کبھی نہیں ہوا تھا۔ میں پشیمان ہونے لگی کہ کالج آئی ہی کیوں اور یہ خاص طور پر ڈاکٹر کامران کے باپ کا دیا ہوا لباس پہننے کی کیا ضرورت تھی کوئی دوسرا جوڑا پہن سکتی تھی کسی تقریب میں شرکت کرنی تو تھی نہیں، کالج آنا تھا۔ پھر اس زیب و زینت کی کیا ضرورت تھی۔ میں نے چہرے کی زیبائش کر رکھی تھی۔ بال خاص طور پر بنائے تھے مگر اب یہ سب بیکار اور مضحکہ خیز معلوم ہو رہے تھے۔ اگر ڈاکٹر کامران ایک بار بھی میری طرف دیکھ لیتا تو مجھے ذرا حوصلہ مل جاتا۔ اور مجھے لڑکیوں کے درمیان یوں مجل اور شرمندہ نہ ہونا پڑتا۔ لڑکیاں خوب جانتی تھیں کہ میں محض ڈاکٹر کامران کی خاطر اس سج دھج کے ساتھ کالج آئی تھی مگر اسی ڈاکٹر کامران نے مجھے ان سب کی نظروں میں گرا دیا تھا اور مضحکہ بنا دیا تھا۔ میری آنکھوں اور چہرے پر جلن سی ہونے لگی۔ میرا جی چاہا کہ دونوں ہاتھوں سے اتنی محبت سے بنائے ہوئے بالوں کو نوچ ڈالوں اور چیختی ہوئی اس کلاس سے باہر نکل جاؤں جو اب میرے لئے جہنم سے زیادہ تکلیف دہ ثابت ہو رہی تھی۔

ڈاکٹر کامران اپنے مخصوص انداز میں لیکچر دے رہا تھا اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی ایک امید کے سہارے اس کی جانب نگراں تھی۔ پھر میری برداشت جواب دے گئی اور میں ایک ایک لمحہ گننے لگی کہ کب پریڈ ختم ہو اور میں اپنا منہ چھپا کر یہاں سے دفع ہو جاؤں۔ میری ساتھیوں کی ہمدردی اور ترس کھانے کا انداز ایک زہر کی مانند میرے رگ و پے میں سرایت کرتا جا رہا تھا۔ شاید خدا نے میری سن لی تھی۔ اگلے لمحے گھنٹہ بجا۔ پریڈ ختم ہوا، اور میں ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے اپنی ساتھیوں کا انتظار نہیں کیا۔ خوامخواہ کی گفتگو چھڑ تی۔ ڈاکٹر کامران کے بارے میں باتیں ہوتیں اور میرے اضطراب اور وحشت میں اضافہ ہوتا میری ساتھیوں نے بھی میرے موڈ کو سمجھ لیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی اور نہ کوئی بات کی۔

میں سینے پر غم و اندوہ کا بوجھ لئے ہوئے کلاس سے باہر نکل آئی۔ ڈاکٹر کامران کبھی کا جا چکا تھا اور دوسرے طلبا کلاس سے باہر نکل رہے تھے۔ باہر نکلی تو سامنے واجد کھڑا ہوا نظر آیا۔ وہ میرا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے رُخ دوسری طرف پھیر لیا اور ظاہر کرنے لگا جیسے مجھے نہیں دیکھا۔ اتنی شدید بوریت تھی اور اس قدر جھلاہٹ طاری تھی کہ میں اسے زیرلب گالی بکے بغیر نہ رہ سکی۔ کیا دنیا تھی۔ جس کے بھی کام آؤ جس پر بھی مہربانی کرو وہی آزار پہنچانے کے درپے ہو جاتا ہے۔

کالج سے سیدھے اپنے گھر پہنچی۔ امی نے مجھے حیرت بھری نظروں سے دیکھا اور پوچھا۔

"یہ تم کیسا لباس پہنے ہوئے ہو اور آ کہاں سے رہی ہو۔"

"کہیں سے بھی نہیں۔ یہ لباس زبیدہ نے اصرار کر کے پہنوایا ہے۔"

"اور یہ تمہارے چہرے پر بارہ کیوں بج رہے ہیں۔" امی نے غور سے میرا چہرہ دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"آج ٹسٹ تھا۔ میں جوابات سے مطمئن نہیں ہوں۔ مجھے کچھ زیادہ ہی وقت مطالعے کے لئے دینا ہوگا۔" میں نے بات بنائی اور امی کو مزید کچھ بولنے کا موقع دیئے بغیر تیزی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ دروازہ اندر سے بند کیا اور آئینے کے سامنے جا کھڑی ہو گئی۔ میں نے اپنے لباس، چہرے اور جسم کا جائزہ لیا۔ کس چیز کی کمی تھی مجھ میں۔ مجھ پر اچانک ہی غیظ و غضب کا غلبہ ہو گیا اور غصے کی شدت سے جسم کانپنے لگا۔ میں نے اپنا لباس پارہ پارہ کر ڈالا اور آئینے میں خود سے مخاطب ہو کر بولی۔ "تم میں ضرور کوئی کمی ہے شہناز بیگم! کوئی نہ کوئی نقص یا خامی ضرور موجود ہے۔ ورنہ تم خوبصورت ہو، شاداب ہو اور جوان ہو، جنس مخالف کے لئے ایک خاص کشش رکھتی ہو پھر اس کے باوجود ڈاکٹر کامران کے دل میں کوئی جگہ نہ بنا سکیں۔ وہ تم سے قطعاً متاثر نہیں ہوا ہے۔ یہ احتیاط و متیاط تو سب بکواس چیزیں ہیں۔ دل کا معاملہ ہو تو ضبط اور احتیاط کی گنجائش ہی کہاں رہتی ہے۔ بس اب آنسو بہاؤ تکیہ بھگوؤ اور راتیں کالی کرو کہ اس کھیل میں بالآخر یہی ہوتا ہے۔"

اور ہوا بھی یہی، آنکھوں سے اک نہ رکنے والا سیلاب جاری ہو گیا۔ میں بستر پر گر پڑی اور سسکیوں کے ساتھ رونے لگی اب میں اس خود پسند اور بے حس آدمی کی کلاس میں کیسے جا سکوں گی وہ تو ایسا آدمی تھا جسے اپنے بوڑھے باپ کو بھی فریب دیتے ہوئے کوئی حجاب نہ ہوا تھا۔ نہیں۔ اب مجھے اس کے بارے میں کچھ نہ

سوچنا چاہیئے۔ اس کا خیال میرے دل سے نکال دینا چاہیئے، جو ہوا سو ہوا اب سب بھول جاؤ، آنسو بہانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ آنسو بہانے سے مسائل حل نہیں ہوتے۔

میں نے طرح طرح سے خود کو سمجھایا، تسلی دی تو جا کر کچھ اطمینان نصیب ہوا۔ دو دن تک کالج نہ گئی تاکہ دوستوں کی ہمدردی اور بے تکے سوالات سے محفوظ رہوں۔ مگر مشکل یہ تھی کہ امتحانات سر پر آ گئے تھے اور پروگرام بھی دے دیا گیا تھا۔ اس خیال سے کہ پڑھائی کا کوئی نقصان نہ ہو۔ میں نے خود کو اپنے کمرے میں قید کر لیا اور کتابوں میں کھو گئی۔ سوچا تھا کہ اس طرح دوہرا فائدہ ہوگا اور میں ڈاکٹر کامران کے خیال کو ذہن سے جھٹک دوں گی مگر خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ گزرتے وقت کے ساتھ ڈاکٹر کامران کا خیال میرے دل میں راسخ ہوتا جا رہا تھا۔ میں ہرچند خود کو سمجھاتی کہ دیکھو وہ تمہارے ڈھب کا آدمی نہیں ہے۔ اس کے بارے میں کچھ سوچنا یا اس سے کوئی توقع رکھنا محض تضیع اوقات ہے۔ وہ خود غرض آدمی ہے اور اپنے باپ سے بھی مخلص نہیں ہے۔ تم اس سے بھلا کیا حاصل کر سکو گی۔ اس سے دور رہنے ہی میں بہتری ہے۔ یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ معاملہ خود بخود ختم ہو گیا ورنہ آگے جا کر جانے کتنی مصیبتیں آتیں۔ وہ تمہارا استاد ہے اسے استاد ہی سمجھو، تعلیم مکمل کرو اور کالج سے بستر پیٹ لو بھول جاؤ کہ کوئی ڈاکٹر کامران تمہاری زندگی میں آیا تھا۔

میں کچھ طے کر لیتی، کسی فیصلے پر پہنچ جاتی مگر اچانک ہی کوئی چور دروازہ کھل جاتا اور ڈاکٹر کامران اپنے پورے جاہ و جلال کے ساتھ میرے ذہن میں آ موجود ہوتا۔ اس وقت میں بالکل بے بس ہو کر رہ جاتی۔ میرا ذہن دوبارہ ڈاکٹر کامران کے تصور میں الجھ کر رہ جاتا۔ وہ جیسا بھی تھا جو بھی تھا مگر ایک بات طے تھی کہ وہ آدمی تھا اور آدمی کی حیثیت سے اس کے اپنے احساسات اور جذبات بھی تھے۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ میری طرف کیوں مائل ہوتا۔ کسی بھی غرض سے مائل ہوا ہو مگر کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی موقع پر وہ مجھ سے متاثر بھی ضرور ہوا تھا۔ ایسا نہ ہوتا تو دلارستگی سے مجھے کبھی نہ چومتا۔ اس نے اپنے باپ سے وعدہ بھی کیا تھا کہ وہ دو تین ماہ بعد مجھے لندن لے جائے گا۔ چلو مانا کہ وہ سب جھوٹ تھا۔ وہ مجھے لندن نہیں لے جائے گا۔ مگر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کبھی اس کا باپ دوبارہ یہاں آئے پھر اس صورت میں وہ کیا کرے گا، کون سا بہانہ تراشے گا کس قسم کا جھوٹ گھڑے گا یقیناً وہ دوبارہ میرے پاس آئے گا اور درخواست کرے گا کہ میں ایک بار پھر اس کی بیوی کا رول ادا کروں۔

میرے لب سختی سے بھنچ گئے اور ایک عجیب قسم کی تلخی میرے کام و دہن میں دوڑ گئی۔ "نہیں، اگر ڈاکٹر کامران ایسا کرے گا تو سخت غلطی کرے گا۔ میں دوبارہ اس کے جھانسے میں نہیں آؤں گی میں پہلے ہی اس کے ہاتھوں میں پڑ کر خاصی پریشان ہو چکی ہوں۔ اب دوبارہ مصیبت کو دعوت نہیں دوں گی۔" میں ایسا سوچ ضرور رہی تھی مگر دل پر دماغ سے بخشنے کو تیار نہیں تھی۔ کئی بار میرے ذہن میں آیا کہ ڈاکٹر کامران کے گھر جاؤں اور اس کے باپ کی دی ہوئی انگوٹھی واپس کرنے کے بہانے گفتگو اور آئندہ ملاقات کے لئے دروازہ کھول لوں۔ پھر مجھے ایک خیال اور آیا۔ ڈاکٹر کامران نے جب مجھے اولین ملاقات کے لئے لکھا تھا تو اس نے رازداری کا خیال رکھنے کے لئے کہا تھا، اور اس کے بعد جب میں اس سے ملی تھی اور مزید ملاقاتیں ہوئی تھیں تو میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ اپنے کوائف دوسروں سے چھپاتا ہے۔ اس کے بارے میں کوئی تفصیل سے نہیں جانتا تھا۔ وہ سخت قسم کی رازداری برتتا تھا اور ایک عجیب قسم کے اسرار کے حصار میں رہتا تھا اب جو میں نے ٹھنڈے دل سے غور کیا تو ڈاکٹر کامران سے متعلق نئے نئے خیالات سوجھنے لگے۔ میں نے سوچا کہ اس رازداری اور اسرار کا پردہ ضرور چاک کرنا چاہیئے اور مجھ سے بہتر کون اس کا اہل ہو سکتا تھا مگر اس مقصد کے لئے خود جا کر ڈاکٹر کامران سے ملنا سراسر حماقت تھی۔ سب سے پہلے تو ڈاکٹر کامران کے بارے میں مزید تفصیلات معلوم کرنا ضروری تھا اور یہ کام کسی دوسرے کے ذریعے ہی ہو سکتا تھا۔ یوں بھی میرا اس کے پاس جانے کا کوئی منطقی جواز نہ تھا۔ کیونکہ اس نے کلاس میں اپنے رویے سے مجھے خوب اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ اب میں اس سے کوئی توقع نہ رکھوں بس صاحب سلامت یہیں تک تھی آگے راستے جدا جدا ہیں۔

میں سوچنے لگی کہ کوئی ایسا نقشہ کیوں نہ جمایا جائے کہ وہ خود ہی چل کر میرے پاس آ جائے۔ غور کیا تو ایک ترکیب سوجھ گئی اور خوب سوجھی۔ اگر میں ڈاکٹر کامران کی رازداری کے حصار کو توڑ دوں اور اپنے وعدے کو پس پشت ڈال کر اس پر یہ تاثر دوں کہ جو کچھ میرے اور اس کے درمیان ہوا ہے اسے نہ صرف اپنی

سہیلیوں بلکہ کالج کے تمام طلبا کو بتانے کا ارادہ رکھتی ہوں تو
بسی رہے۔ فوراً میرے پاس بھاگا ہوا آئے گا اور مجھے میرے
ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کرے گا۔ مگر کیا میں اس کی بات
مان جاؤں گی۔ میں نے سوچا تو خود بخود میرے لبوں پر مسکراہٹ
دوڑ گئی۔ میں اپنی اس حرکت سے یقیناً اسے عذاب میں مبتلا
کر دوں گی۔ وہ تڑپے گا، گڑگڑائے گا، درخواست کرے گا اور
میں لطف لوں گی۔

مجھے وہ واقعہ یاد آیا جب اس کے باپ کے ہمراہ ریستوران
میں کھانا کھاتے ہوئے اس کا کالج کا ایک ساتھی اس سے ٹکرایا
تھا اور اس کی حالت یکلخت غیر ہوگئی تھی۔ مگر اب جب پورے
کالج کو میرے اور اس کے تعلقات کا علم ہوگا تو اس کی کیا حالت
ہوگی۔ یقیناً ہارٹ اٹیک ہو جائے گا۔

میں نے ایک راہ نکال لی تھی اور اس کے ساتھ ہی مجھے
بھرپور سکون اور اطمینان کا احساس ہوا تھا۔ میں نے جو کچھ سوچا
تھا اس پر صرف عمل کرنے کی دیر تھی۔ پھر اس کے بعد ڈاکٹر کامران
مکمل طور پر میری گرفت میں ہوتا۔

رات کے نو بجے تھے اور میں سوچوں میں گم تھی کہ امی
نے دروازے پر دستک دی۔ "شہناز! باہر آؤ۔ زبیدہ کا فون
آیا ہے۔"

دو دن سے سہیلیوں سے میرا رابطہ منقطع تھا۔ میں اس
قدر الجھی ہوئی تھی کہ ان سے ملنے اور گفتگو کرنے کا یارا نہ تھا۔ پھر
انہوں نے کلاس میں جس طرح مجھے دیکھا اس کا زخم ابھی تک میرے
دل میں تازہ تھا۔ کوئی اور ہوتا تو شاید انکار کر دیتی۔ مگر یہ زبیدہ
کی بات تھی۔ ناچار اٹھی اور باہر آکر فون اٹینڈ کیا۔

"ہیلو زبیدہ!" میں نے لہجے میں ایک جبری خوشگواری
پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"ارے بھئی کہاں ہو۔ تمہارا تو کچھ پتہ ہی نہیں ہے۔
اسی دنیا میں ہو یا عالم بالا سے ٹہل رہی ہو؟" زبیدہ کی چہکتی ہوئی
آواز سنائی دی۔

بجائے جواب دینے کے میں نے الٹا سوال جڑ دیا۔ "کچھ
ادھر ادھر کی سناؤ بہت دن ہوگئے کوئی دلچسپ خبر سنے ہوئے۔"

"اسی لئے تو فون کیا تھا۔ دلچسپ اور تازہ ترین خبر یہ ہے
کہ پروین کی شادی کے کارڈ چھپ گئے ہیں۔ آئندہ ہفتے کی
شام کو اس کا نکاح ہے۔ اسی رات کو ہم ایک ہوٹل میں شادی
کا جشن منائیں گے۔"

"کیا مطلب، کیا ہم نکاح کے موقع پر مدعو نہیں ہیں؟"
میں نے حیرت کے عالم میں پوچھا۔

"نہیں، پروین نے ہما کی وجہ سے نکاح میں نہیں بلایا
ہے۔ دولہا بہرحال ہما کا سابق منگیتر ہے۔ ہما یونہی آج کل
جنونی اور پاگل ہو رہی ہے۔ کیا بعید اس نازک موقع پر کوئی غلط
حرکت کر بیٹھے۔ محض اس کی وجہ سے ہم سب کو صرف جشنِ عروسی کے
موقع پر پوچھا گیا ہے۔ ہما کا سابق منگیتر اور حالیہ پروین کا شوہر
ہما سے اس قدر ناراض ہے کہ وہ جشن کے موقع پر بھی اُسے
بلانے پر آمادہ نہیں تھا مگر پروین کے اصرار پر مجبور ہوگیا ہے۔
چلو یہ پروین بھی ٹھکانے لگی، باقی رہ گئے تین یعنی شہناز، ہما اور
شیریں۔ ان کا بھی کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ سنو کل صبح لڑکیاں میرے
گھر پر جمع ہو رہی ہیں۔ تم بھی آ جانا۔ پروین خود کارڈ لے کر آئیگی۔"

جی بالکل نہیں چاہ رہا تھا مگر میں نے وعدہ کر لیا کہ کل
زبیدہ کے گھر ضرور جاؤں گی۔ رسیور رکھ کر اپنے کمرے کی طرف
روانہ ہوئی تو اچانک ہی ایک خیال سوجھا۔ یہ خیال مجھے پروین
کی شادی کے کارڈ کے تعلق سے آیا تھا۔ اگر ڈاکٹر کامران کو بھی
پروین کی شادی کا کارڈ بھجوایا جائے تو کیسا ہے اور یہ کارڈ ہما
لے کر جائے۔ میں نے یہ بات اپنے منصوبے کے پیش نظر سوچی
تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ ڈاکٹر کامران پروین کے جشنِ شادی کے موقع
پر نہیں آئے گا مگر اس سے میرا مقصد پورا ہو جاتا تھا۔ ہما جب
شادی کا کارڈ لے کر ڈاکٹر کامران کے گھر پہنچے گی تو ڈاکٹر کامران
یہ ضرور جاننا چاہے گا کہ ہما کو اس کے گھر کا پتہ کیسے معلوم ہوا۔ اور
جب ہما بتائے گی کہ اسے میرے توسط سے اس کے گھر کا پتہ
معلوم ہوا تو یقیناً ڈاکٹر کامران فکرمند ہو جائے اور سوچے گا کہ
میں نے اور کیا کیا ہما کو بتایا ہے۔ محض اپنے شکوک رفع کرنے
کی غرض سے وہ ضرور مجھ سے رابطہ قائم کرے گا۔ اس طرح میرے
اور اس کے درمیان ملاقات کا ایک موقع نکل آئے گا۔

ہما کو ڈاکٹر کامران کے پاس بھیجنے کی ایک خاص وجہ تھی۔
ہما نے طے کیا تھا کہ وہ ڈاکٹر کامران کو حاصل کرے گی اور میں خود
اسے یہ موقع فراہم کر رہی تھی۔ اگرچہ اس میں میرے لئے خطرات
تھے مگر لگے ہاتھوں مجھے ڈاکٹر کامران کے بارے میں دوسری باتیں

معلوم ہو جائیں۔ یہ معلوم ہو جاتا کہ اس کا سلوک ہما کے ساتھ کیسا تھا۔ وہ ہما کے ساتھ کس طرح پیش آیا۔ کیا وہ واقعی خشک اور کھردرا ہے یا میری ہی طرح دوسری لڑکیوں سے بھی پیش آتا ہے سکم از کم مجھے یہ تو اطمینان ہو جاتا کہ وہ مجھ میں اور دوسری لڑکیوں میں کوئی فرق ملحوظ رکھتا ہے یا نہیں۔

شادی کے کارڈ کے سلسلے میں، میں نے ایک بات اور بھی سوچی تھی وہ یہ کہ کارڈ پر ڈاکٹر کامران مع بیگم ضرور لکھوں گی۔ اس طرح یہ بھی معلوم ہو جاتے گا وہ شادی شدہ ہے یا نہیں، بڑا اچھا آئیڈیا ذہن میں آیا تھا مگر سوال یہ تھا کہ کیا ہما اس کام کے لئے آمادہ ہو جائے گی۔ مجھے یقین تھا کہ ضرور آمادہ ہو جائے گی کیونکہ وہ ان دنوں ہر وقت ڈاکٹر کامران کا ذکر کیا کرتی تھی اور اس کی قربت کے بہانے ڈھونڈتی تھی۔ ایک لڑکی کی حیثیت سے مجھے یہ نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ یہ دوراندیشی کے خلاف تھا۔ ہما جیسی لڑکی کو ڈاکٹر کامران کے پاس بھیجنے کا مطلب تھا کہ میں اپنی جگہ اس کے لئے خالی کر رہی ہوں۔ مگر کیا کیا جائے، زندگی میں کبھی کبھی رسک لینا پڑتا ہے اور رسک لئے بغیر بات نہیں بنتی۔

دوسرے دن میں علی الصبح بیدار ہو گئی۔ ضروریات سے فارغ ہو کر سیدھے زبیدہ کے گھر پہنچی۔ ہما اور شیریں مجھ سے پہلے وہاں پہنچ چکی تھیں اور پروین کا انتظار تھا کہ وہ کب کارڈ لے کر وارد ہوتی ہے۔ شیریں مجھے دیکھتے ہی دوڑی اور بُری طرح لپٹ گئی۔ گلے میں بانہیں ڈال کر رخسار چومتی ہوئی بولی۔ "تم تو واقعی ایک حرماں نصیب شاہزادی لگتی ہو۔ کیا بالکل ہی گوشہ نشینی اختیار کر لی ہے۔"

میں شیریں کے لہجے سے سمجھ نہ سکی کہ وہ طنز کر رہی ہے یا دوستانہ لہجے میں بات کر رہی ہے۔ اس لئے خاموش رہنا بہتر سمجھا مگر شیریں ان لڑکیوں میں سے نہیں تھی جو ایک جملے پر اکتفا کر جاتیں میری کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے دوبارہ بولی۔ "اگر میرے ذریعے سے کام بن سکتا ہے تو میں خدمت کے لئے حاضر ہوں میں یہاں تک تیار ہوں کہ ڈاکٹر کامران کے لکچر کے دوران اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوں اور بلند آواز میں کہوں، استاد محترم! شہناز تم پر عاشق ہے اس کی خبر تو لو۔"

ظاہر ہے یہ مذاق تھا سب بے ساختہ ہنس پڑیں اور نہ چاہتے ہوئے میں خود بھی مسکرا دی، مگر اس کے ساتھ ہی مجھے ایک دوسری بات سوجھ گئی۔ بات سے بات نکلتی ہے اور مجھے اپنی بات کہنے کا موقع ہاتھ آگیا تھا، سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بولی۔ "تم تو نہیں البتہ ہما چاہے تو میرا کام کر سکتی ہے۔"

وہ تینوں مجھے حیرت بھری نظروں سے دیکھنے لگیں، پہلے تو وہ میری بات کو مذاق سمجھیں مگر جب میرے چہرے کا جائزہ لیا تو خود بھی سنجیدہ ہو گئیں۔ ہما تجسس کے عالم میں بولی۔ "میں تمہارے کس کام آسکتی ہوں۔" پھر ذرا رکی اور زہرخند کے ساتھ بولی۔ "مگر میں کچھ کر سکتی ہوں تو صرف اپنے مفاد میں کر سکتی ہوں۔ بخدا میں تم سے کچھ کم ڈاکٹر کامران میں دلچسپی نہیں لیتی۔ مگر وہ کمبخت اس قدر ظالم اور سفاک ہے کہ ہم میں سے کسی کی طرف مائل نہیں ہوتا۔"

میں نے بڑی مشکل سے خود پر قابو پایا اور پرسکون لہجے میں بولی۔ "میں تم سے جو چاہتی ہوں وہ کر دو تو ڈاکٹر کامران سر کے بل میرے پاس دوڑا آئے گا۔"

زبیدہ زچ ہو کر بولی۔ "تم ہما سے کونسا کام لینا چاہتی ہو صاف طور پر کیوں نہیں بتاتیں۔"

میں نے ذرا تامل کیا پھر ہما کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مضبوط لہجے میں بولی۔ "کیا تم ڈاکٹر کامران کے گھر جانا پسند کرو گی۔"

"ڈاکٹر کامران کے گھر۔" ہما کچھ حیرت کچھ مسرت کے ساتھ بولی اور اس کے ساتھ ہی زبیدہ اور شیریں بھی بول پڑیں۔ "مگر کس لئے۔"

"اگر ہما جانا چاہے تو میں اس کے لئے ایک معقول بہانہ رکھتی ہوں۔" میں نے ان کی حیرت کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

ہما نے بے چینی سے پہلو بدلا اور میری طرف ہاتھ ہلاتے ہوئے غصے سے بولی۔ "شہناز! جو کہنا ہے جلدی سے کہہ ڈالو اب میں مزید سوال و جواب کی متحمل نہیں ہو سکتی۔"

زبیدہ اور شیریں بھی مجھے تجسس اور بے چین نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ اندازا ایسا تھا کہ اب میں نے مزید وقت تلف کیا تو وہ مجھے مارے بغیر نہ رہیں گی۔ میں ہما کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ "سنو ہما! میں چاہتی ہوں کہ تم پروین کی شادی کا کارڈ لے کر ڈاکٹر کامران کے گھر جاؤ۔ اگر وہ پوچھے کہ تمہیں اس کے گھر کا پتہ کیسے معلوم ہوا تو کہہ کر تمہاری دوست شہناز نے بتایا ہے۔ مگر یاد رکھو صرف اتنا ہی کہنا کوئی وضاحت نہ کرنا۔ اگر وہ دوبارہ پوچھے کہ شہناز کو میرے گھر کا پتہ کس طرح معلوم ہوا تو تم

کہنا کہ تمہیں نہیں معلوم۔ میرا مقصد محض یہ ہے کہ تم اسے شک و شبے میں مبتلا کر دو اور وہ سوچنے لگے کہ میں نے تمہیں اپنے اور اس کے تعلقات کے بارے میں کچھ بتایا ہے یا نہیں، اور بتایا ہے تو کس حد تک بتایا ہے۔ وہ شک و شبے میں مبتلا ہوگا تو فوراً مجھ سے رجوع کرے گا اور میدان میرے ہاتھ میں ہوگا۔ ضمناً تم چاہو تو اسے اپنی طرف مائل کرنے کی پوری کوشش کر سکتی ہو۔ تم اسے یہ تاثر دینا کہ تم انتہائی آزاد روِ لڑکی ہو اور آخر تک اس کا ساتھ دے سکتی ہو۔"

ہما پلکیں جھپکائے بغیر میری بات سن رہی تھی۔ میں نے بات ختم کی تو ہنستے ہوئے بولی۔ "ڈاکٹر کامران اتنا آسان نہیں ہے جتنا کہ تم سمجھ رہی ہو۔"

میرے کچھ کہنے سے قبل شیریں بول پڑی۔ "شہناز میں تمہاری بات کا پہلا حصہ تو سمجھ گئی ہوں۔ کوئی شبہ نہیں کہ تم ذہین اور دور رس ہو اور اس کے لئے میں تمہیں آفرین کہتی ہوں مگر بات کا آخری حصہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ تم ہما کو ڈاکٹر کامران سے عشق لڑانے کو کیوں کہہ رہی ہو۔ آخر اس سے تمہارا کونسا مقصد پورا ہوتا ہے۔"

"کوئی خاص مقصد نہیں ہے۔ الّا یہ کہ میں جاننا چاہتی ہوں کہ یہ شخص کتنے پانی میں ہے۔ ہما کی خوبصورتی اور کشش سے اپنی جگہ سے سرکا سکتی ہے یا نہیں۔ یا وہ ہما سے بھی بے نیازی اور بے اعتنائی سے پیش آئے گا۔" میں نے شانے اچکاتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔

زبیدہ کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ سخت لہجے میں بولی "تمہارے لئے میرا بہترین مشورہ ہے کہ ڈاکٹر کامران سے ہاتھ اٹھا لو اور بھول کر بھی اسے دھیان میں نہ لاؤ۔"

زبیدہ کو جواب دینے کی بجائے میں ہما کو مخاطب کر کے بولی۔ "افسوس کہ میں اپنے ارادے سے منحرف نہیں ہو سکتی۔ ہاں مجھے یہ اندیشہ ضرور ہے کہ شاید تم ڈاکٹر کامران پر قابو پانے میں کامیاب ہو جاؤ۔ خیر وہ میرا نہ ہو سکا، نہ سہی، دیکھوں تم کیا کرتی ہو۔ تم اپنی قسمت آزما لو۔"

احساسِ مسرت سے ہما کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ وہ پُر شور لہجے میں بولی۔ "میں تمہاری طرح جذباتی نہیں ہوں۔ کوئی کسی کی طرف مائل نہیں ہوتا تو اس میں حساس بننے کی کیا بات ہے۔ میں دیکھوں گی کہ جناب استاد میری طرف مائل نہیں ہوتے اور شادی کی درخواست سے گریز کر رہے ہیں تو میں انہیں دوسرے دوستوں کی مانند یادوں کے سرد خانے میں ڈال دوں گی رو دوں گی نہیں۔ تمہاری طرح جان ہلکان نہیں کروں گی۔"

ہما کے تیور، اس کا لب و لہجہ اور طرزِ گفتگو دیکھ کر مجھے غصہ آنے لگا۔ یہ کیسی لڑکی تھی، چوٹ کھائی تھی مگر سنبھلتی نہیں تھی۔

"غصے میں نظر آ رہی ہو شہناز۔" اچانک ہما نے کہا۔ "یہ تمہاری ہی تجویز تھی کہ میں ڈاکٹر کامران کے گھر جاؤں۔ پھر اب ناراضگی کی کیا بات ہے۔"

اب میں ہما سے کیا کہتی۔ اس سے الجھنا خود کو ہلکان کرنا تھا۔ میں خاموش رہی، مگر میری خاموشی اسے نہیں بھاتی۔ فلسفیانہ انداز میں بولی۔ "تم جس قسم کی محبت کی قائل ہو اس کا آج، اس مادی اور مشینی دور میں کہیں وجود نہیں ہے۔ آج کی دنیا میں یکطرفہ محبت کو حماقت اور تضیع اوقات تصور کیا جاتا ہے۔ اگر لڑکیاں تمہاری محبت کے اصول پر چلنے لگیں تو کنواری ہی مر جائیں اور کبھی دولہا نصیب نہ ہو۔ آج کل شوہر ملتے نہیں ہیں، حاصل [illegible] جاتے ہیں۔ اب شوہر کو طشت میں سجا کر پیش کرنے کا زمانہ گیا۔ اب چھینا جھپٹی کا زمانہ ہے۔ جہاں موقع دیکھا ہاتھ مارا، پیچھے رہ گئے تو رہ گئے۔ سنو، جو بڑھ کے خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے۔ تمہاری محبت تو ایسی ہے کہ بس روتے جاؤ۔ میں کہتی ہوں کہ اس قدر بھاگ دوڑ کی بھی کیا ضرورت ہے۔ کونے میں بیٹھ جاؤ اور محبت کرتی رہو۔ محبت زندہ باد۔"

میں نے ٹھنڈے دل سے سوچا کہ ہما سے کیا لگاڑ اور کیا شکایت۔ وہ آج کی لڑکیوں کی نمائندہ تھی۔ میرا سارا تعلق تو ڈاکٹر کامران سے تھا۔ جسے پیا چاہے وہی سہاگن۔ ایک ہما کو روک لوں گی اور کسے کسے روکوں گی۔ ڈاکٹر کامران کی زندگی میں ہما نہیں آئے گی، دوسری بیسیوں لڑکیاں آ جائیں گی۔ پھر ہما سے جلنے اور کڑھنے سے کیا فائدہ۔ بلکہ یہ تو مضحکہ خیز بات ہوگی۔ اگر ڈاکٹر کامران صنفِ نازک میں دلچسپی لینے والا آدمی ہوگا تو ایک ہما پر کیا موقوف متعدد ہمائیں اس کی زندگی میں آئیں گی اور اگر وہ اس طبیعت اور مزاج کا آدمی نہیں ہے تو کوئی ہما اس کی زندگی میں داخل نہ ہو پائے گی۔ میں نے سوچا اور خود بخود مجھے سکون اور قرار آ گیا۔ اب ہما میری طرف سے آزاد تھی جو چاہے سو کرے، مجھے تو یہ دیکھنا

... رہا ہے۔ اب میرے سارے عمل کا دارومدار ڈاکٹر کامران کے رویّے اور ردعمل پر تھا۔

دوپہر کے قریب پروین اپنی شادی کے کارڈ لئے ہوئے نازل ہوگئی۔ وہ بڑی عجلت میں تھی، کارڈ دے کر فوراً بھاگ جانا چاہتی تھی مگر شیریں اس کے گلے میں لٹک گئی اور کچھ ایسا تاثر دیا جیسے اسے پروین سے کوئی بہت ضروری کام ہے۔ پروین کی تو شیریں نے اسے بتایا کہ ہم اس کے جشنِ عروسی میں ڈاکٹر کامران کو مدعو کرنا چاہتے ہیں۔ پروین نے حیرت و مسرت کا ایک نعرہ لگایا بالکل اس طرح جس طرح کوئی زولو سردار اپنے حریف کو مغلوب کرنے کے بعد نعرہ لگاتا ہے۔ اس نے فوراً ایک اضافی کارڈ نکال کر دیا اور اپنے ہاتھوں سے بڑے صاف اور خوشخط میں لکھا۔

ڈاکٹر کامران معہ بیگم۔

پروین کے پاس وقت نہیں تھا چنانچہ وہ معذرت کر کے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد ہم دوبارہ بحث و مباحثے میں مشغول ہوگئے۔ سب سے اہم سوال یہ تھا کہ کیا ڈاکٹر کامران پروین کی شادی کی تقریب میں شرکت کرے گا۔ اس بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا اور میرے لئے اس سے فرق بھی کیا پڑتا تھا۔ اصل مسئلہ تو یہ تھا کہ ڈاکٹر کامران ہما سے کس طرح پیش آتا ہے اور یہ معلوم کرنے کے بعد کہ اسے میں نے ڈاکٹر کامران کے پاس بھیجا ہے وہ کس ردعمل کا اظہار کرتا ہے۔

طے پایا کہ شام کو سات بجے کے قریب ہما کو روانہ کیا جائے اسے سمجھا دیا گیا کہ بالفرض اس وقت ڈاکٹر کامران گھر پر نہ ہوا تو اس صورت میں ہما قریب کے کسی ریستوران میں کچھ وقت گزار کر اس کی واپسی کا انتظار کرے۔ پھر اس کے بعد بڑے زور و شور سے ہما کی روانگی کی تیاری کی جانے لگی۔ اس کے لئے عمدہ لباس منتخب کیا گیا۔ بالوں کو ایک خاص انداز میں سنوارا گیا۔ اسے خوشبو میں بسایا گیا۔ زبیدہ کو یہ سب پسند نہیں آ رہا تھا۔ مگر میری وجہ سے کر رہی تھی۔ شیریں کے نزدیک یہ باتیں ایک ایڈونچر تھیں اور رہی ہما تو وہ خوشی کے مارے بے حال ہوتی جا رہی تھی۔ بالکل اسی انداز میں نخرے دکھا رہی تھی جیسے کہ ڈاکٹر کامران کی دلہن بننے جا رہی ہے۔ میرا معاملہ الگ تھا۔ میں خود کو ایک شکاری تصور کر رہی تھی اور ہما میرا خوبصورت چارہ تھی۔ میں ہما کے ذریعہ ڈاکٹر کامران کو شکار کرنا چاہتی تھی۔

ہما نہیں کیا کم خوبصورت تھی۔ بن سنور کر اور بھی ہوگئی۔ مجھے ایک بار پھر خدشہ ستانے لگا کہ تاکہ پروا پر نہ ہما بہت بے باک اور بے جھجک لڑکی تھی۔ میں نے چشمِ تصور سے دیکھا کہ وہ ڈاکٹر کامران کی آغوش میں پڑی ہوئی ہے ڈاکٹر کامران اس پر بوسوں کی بارش کر رہا ہے۔ میں نے گھبرا کر سر کو جھٹکا دیا اور خود کو اس طلسم سے نکال لیا۔

ساڑھے چھ بجے ہما گھر سے روانہ ہوگئی۔ پھر ہم سے گھر میں بیٹھا گیا۔ ہم تینوں باہر نکل کھڑے ہوئے۔ سوچا کہ ادھر ادھر گھوم کر وقت گزاریں گے اور ساڑھے سات بجے کے قریب واپس آ جائیں گے اور گھر بیٹھ کر ہما کی واپسی کا انتظار کریں گے۔

ہم سے ادھر ادھر تو نہ پھرا گیا البتہ ایک ریستوران میں پورا ایک گھنٹہ گزار لیا۔ اس عرصے میں ہم ڈاکٹر کامران اور ہما کے بارے میں طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرتے رہے پھر ٹھیک پونے آٹھ بجے ہم اٹھ کھڑے ہوئے اور زبیدہ کے گھر کی طرف روانہ ہوگئے۔ خدا جانے ہما واپس آ گئی تھی یا نہیں۔ زبیدہ نے اطلاعی گھنٹی بجانے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو میں نے شیریں سے پوچھا۔ "کیا خیال ہے ہما واپس آ گئی ہوگی یا نہیں؟" مگر اس سے پہلے کہ شیریں کچھ کہتی دروازہ کھل گیا اور دروازہ کھولنے والی خود ہما تھی۔ وہ سخت بے چین اور مضطرب نظر آ رہی تھی جھنجلاہٹ کے عالم میں بولی۔ "تم لوگ کہاں مر گئی تھیں۔ انتظار کرتے کرتے پاگل ہوگئی ہوں۔ اس وقت جو میری ہیجانی کیفیت ہے اس سے کھوپڑی اڑی جا رہی ہے۔ اگر میں تمہیں بتا دوں کہ میں نے ڈاکٹر کامران کے گھر پر کیا دیکھا تو تمہاری کھوپڑی بھی بھک سے اڑ جائے گی۔"

میں اپنی جگہ جم کر رہ گئی۔ زبیدہ اور شیریں کی حالت بھی مجھ سے مختلف نہیں تھی۔ آخر ہما نے ڈاکٹر کامران کے گھر پر کیا دیکھا تھا کہ اس قدر بے چین اور ہیجان زدہ تھی ہما نے میرا ہاتھ پکڑا اور گھر کے اندر کھینچتے ہوئے کہا۔ "تم تو بالکل گم سم ہوگئی ہو۔ آؤ اندر آؤ میں تمہیں سب کچھ تفصیل سے بتاتی ہوں۔"

میں، زبیدہ اور شیریں، ہما کے پیچھے پیچھے مکان میں داخل ہوئے اور سیدھے خوابگاہ میں پہنچ گئے۔ شیریں نے ہما کو بازو سے پکڑتے ہوئے کہا۔ "اب جلدی سے بتا دو کہ تم نے ڈاکٹر کامران کے گھر پر کیا دیکھا تھا۔ ایسی کون سی بات ہے جس سے کہ ہماری

دوشیزہ

کھو پڑی جھٹک سے اڑ جائے گی۔"

میں نے ڈاکٹر کامران کے گھر ایک بہت خوبصورت عورت کو دیکھا۔ یوں سمجھو کہ الف لیلیٰ کی شہزادی کی مانند حسین، نازک اور دلفریب۔"

"کیا وہ بہت خوبصورت تھی یعنی غیر معمولی طور پر حسین؟" زبیدہ نے پوچھا۔

"یہی سمجھ لو، میں نے آج تک ایسی خوبصورت عورت نہیں دیکھی۔"

"اچھا اب داستان طرازی مت کرو، جو بتانا ہے کھل کر بتاؤ۔" شیریں برہم ہو کر بولی۔ "کیا وہ کالج کی کوئی لڑکی تھی یعنی ڈاکٹر کامران کی شاگرد؟"

"نہیں بابا! ڈاکٹر کامران اپنی شاگردوں کو گھاس ڈالنا پسند نہیں کرتا۔ وہ تو کوئی اور ہی شے تھی، حور کہہ لو، پری کہہ لو۔"

"تم نے ہمیں مار ڈالا ہما!" زبیدہ زچ ہو کر بولی۔ "صاف کیوں نہیں بتاتیں کون تھی وہ عورت؟"

"ملک کی صف اول کی اداکارہ۔ ایک نامور فلم اسٹار۔" ہما نے کہا پھر میری طرف مڑتے ہوئے بولی۔ "یہ بات دل سے نکال دینی چاہئے کہ ڈاکٹر کامران تم پر، مجھ پر یا ہم جیسی لڑکیوں پر عاشق ہو سکتا ہے۔ میں شرطیہ کہتی ہوں کہ ڈاکٹر کامران کی زندگی میں درجنوں عورتوں کا عمل دخل ہے۔ وہ کسی سے عشق نہیں کر سکتا لڑکیوں سے جی بھر کے کھیلتا ہے اور دھکا دے دیتا ہے۔"

"میرا خیال ہے ڈاکٹر کامران نے اس پر طلق توجہ نہیں کی ہے تبھی اس کا دماغ چل گیا ہے اور یہ اس طرح کی باتیں کر رہی ہے۔" شیریں نے جل کر کہا اور ہما کو خونخوار نظروں سے دیکھنے لگی۔

"نہیں محترمہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اگر آپ میری جگہ ہوتیں تو آپ کی بھی ایسی ہی حالت ہوتی جیسی کہ میری ہے۔" ہما نے طنز آلود لہجے میں کہا۔

میرا ضبط جواب دے رہا تھا اور سخت غصہ آنے لگا تھا۔ ایک عجیب سی بے قراری اور بے چینی میرے اندر موجزن تھی۔ میں فوراً جان لینا چاہتی تھی کہ ڈاکٹر کامران کے گھر ہما نے کسے دیکھا تھا اور وہ اداکارہ تھی تو کون سی اداکارہ تھی، اس کا کیا نام تھا اور وہ ڈاکٹر کامران کے گھر پر کیا کر رہی تھی مگر ہما تھی کہ بات کو خواہ مخواہ پیچیدہ بنائے دے رہی تھی۔ میں نے ہونٹ کاٹتے ہوئے انتہائی ضبط کے ساتھ پوچھا۔ "آخر وہ اداکارہ کون تھی اور ڈاکٹر کامران کے گھر پر کیا کر رہی تھی؟"

بجائے مختصر جواب دینے کے ہما ایک بار پھر تفصیل میں چلی گئی۔ "یاری باری ہم تینوں پر نظریں دوڑانے کے بعد کہنے لگی ٹھیک سات بجے ڈاکٹر کامران کے گھر پر پہنچ گئی۔ میں نے اطلاعی گھنٹی بجائی کچھ وقفے کے بعد دروازے کی دوسری طرف سے ایک مردانہ آواز ابھری۔ "کون ہے؟" وہ ڈاکٹر کامران ہی تھا۔ میں اس کی آواز کو ہزاروں میں پہچان سکتی ہوں، میں نے مؤدب ہو کر کہا۔ "جناب میں آپ کی شاگرد ہوں، ایک ضروری کام سے آئی ہوں زحمت نہ ہو تو دروازہ کھول دیں۔"

اک توقف کے بعد دروازہ کھل گیا۔ ڈاکٹر کامران کو اپنے سامنے پا کر میں حواس باختہ ہو گئی۔ اس وقت وہ قمیض پہنے ہوئے تھا مگر سارے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ اس نے قمیض عجلت میں پہنی ہے۔ اس کے بال بھی بے ترتیب اور بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھیں سرخی لئے ہوئے تھیں اور چہرے پر شدید ناگواری تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک سی لہرائی اور اس نے قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔ "کیا کام ہے؟"

میں بری طرح سٹپٹا گئی تھی۔ جلدی سے ہینڈ بیگ کھولا اور کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "جناب میں آپ کو اپنی دوست کی شادی کا کارڈ دینے آئی ہوں۔ امید ہے کہ شادی میں شرکت کر کے ہمیں اعزاز بخشیں گے۔"

اس نے گھور کر دیکھا اور عجیب لہجے میں پوچھا۔ "کون دوست؟"

جانے میرے جی میں کیا آیا کہ فوراً کہہ بیٹھی۔ "یہ شہناز کی شادی نہیں ہے بلکہ پروین کی ہے۔ آپ پروین کو اچھی طرح جانتے ہیں وہ کلاس میں ہمیشہ دوسری قطار میں بائیں جانب بیٹھتی ہے۔" اس کے ساتھ میں نے کارڈ اس کی طرف بڑھا دیا اور گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "آپ شاید ہمیں نام سے نہ پہچانتے ہوں۔ بہر حال یہ کارڈ حاضر ہے۔"

جانے کیوں ڈاکٹر کامران کو غصہ آ گیا تھا۔ اس نے ایک جھٹکے سے کارڈ میرے ہاتھ سے لے لیا اور الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا وہ کارڈ دیکھ رہا تھا کہ اس کے عقب میں ایک عورت نمودار ہوئی اب میں کیا بتاؤں وہ کس قدر خوبصورت اور پرکشش تھی۔ اس کا چہرہ تو خوبصورت تھا ہی جسم بھی غضب کا تھا۔ اس وقت اس

مہمسے لرد حصری چادر لپیٹ رکھی تھی۔ چادر کے نیچے وہ
بالکل عریاں تھی، یوں لگتا تھا جیسے اس نے جلدی میں چادر
لپیٹ کر جسم پر ڈال لی ہو۔ جسم پر چادر ہونے کے باوجود اس
کا جسم نیچے گھٹنوں سے اور اوپر سینے کے بالائی حصے سے بالکل
عریاں تھا۔ چادر اس کے جسم کے دلکش نشیب و فراز اور گولائیوں
کو چھپانے میں ناکام رہی تھی۔ وہ بڑی تیزی سے ڈاکٹر کامران
کے قریب آئی اور تحکمانہ لہجے میں بولی "کامی یہ کون ہے تم کس
سے باتیں کر رہے ہو"

میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر کامران کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا
کچھ کہنے کی کوشش میں ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ عورت ڈاکٹر
کامران کے برابر میں کھڑی ہوئی تو میں نے دیکھا کہ وہ ہمارے
اسکرین کی صفِ اول کی فلم اسٹار تھی۔ اس کی فلم ہمیشہ کامیاب
جاتی ہے اور اس پر آئے دن آرٹیکل لکھے جاتے ہیں۔

"فلم اسٹار اور ڈاکٹر کامران کے گھر میں" شیریں حیرت
سے چیختے ہوئے بولی۔

شیریں کی چیخ نے مجھے جھنجھوڑ کر جگا دیا، ورنہ مجھے یوں
محسوس ہو رہا تھا جیسے میں آہستہ آہستہ کسی گہرے کنوئیں میں ڈوبتی
جا رہی ہوں۔ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا "اس فلم اسٹار
کا کیا نام ہے"

"فروزاں، کون ہے جو اسے نہیں جانتا۔ وہ فلموں میں
بوسہ بازی کی قائل ہے۔ فلموں میں جدید رجحانات کی زبردست
علمبردار ہے اور اس کی فلمیں خاصی عریانیت لئے ہوئے ہوتی
ہیں۔ اخبارات اس پر متعدد بار اعتراضات بھی کر چکے ہیں"

"نہیں ہما یہ کیسے ممکن ہے، تمہیں شبہ ہوا ہے وہ کوئی دوسری
عورت ہوگی۔ فروزاں صفِ اول کی اداکارہ سہی۔ اس کی فلمیں
باکس آفس پر ہٹ جاتی ہیں۔ وہ پروڈیوسروں کے لئے ٹکسال ہے
مگر ان تمام باتوں کے باوجود اس کی اچھی شہرت نہیں ہے۔ وہ
صحافت میں جنسی بلی کے نام سے جانی جاتی ہے۔ پھر ایسی
عورت کا ڈاکٹر کامران جیسے ثقہ اور پڑھے لکھے آدمی کے یہاں کیا
کام ہے نہیں مجھے یقین نہیں آتا" زبیدہ بڑے زور سے سر ہلاتے
ہوئے بولی۔

"مجھے کوئی شبہ نہیں ہوا" ہما ہاتھ نچاتے ہوئے بولی۔
"میں اس کی کئی فلمیں دیکھ چکی ہوں اور آئے دن فلمی رسالوں میں
اس کی تصویریں دیکھتی رہتی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ فروزاں
تھی بالکل اسی طرح جس طرح یہ یقین ہے کہ تم زبیدہ ہو" ہما میری
طرف مڑی اور سر ہلاتے ہوئے بولی "کیوں شہناز تمہیں یاد ہے
ہم ایک بار فروزاں کی فلم دیکھنے گئے تھے۔ یوں تو وہ فلم بہت
اچھی تھی مگر بعض مناظر بے حد عریاں تھے اور اس مسئلے پر میری
اور تمہاری زوردار بحث بھی ہوئی تھی۔ نہیں بھئی مجھے کوئی شبہ
نہیں ہوا، وہ صد فی صد فروزاں تھی"

"اچھا آگے بتاؤ، پھر کیا ہوا" زبیدہ نے بات آگے بڑھائی۔

"آگے جو ہوا مجھے ابھی تک اس پر حیرت ہے۔ ڈاکٹر
کامران جیسا متکبر اور خود پسند آدمی اس عورت کے سامنے سکڑ
سمٹ کر بالکل چوہا بن گیا تھا، چہرے کی رنگت اڑ گئی تھی اور سر
جھک گیا تھا۔ اس نے بڑی مری ہوئی آواز میں عورت کو جواب
دیا "یہ خاتون میری شاگرد ہیں اور اپنی ایک دوست کی شادی کا
کارڈ لے کر آئی ہیں" اس نے کارڈ عورت کی طرف بڑھا دیا عورت
نے کارڈ پر بڑی تحقیر آمیز نظر ڈالی پھر مجھے اس طرح دیکھا جیسے
میں جذام میں مبتلا ہوں۔ اس نے ڈاکٹر کامران کا بازو پکڑا اور
حقارت سے بولی "چلو اندر چلو"

اور ڈاکٹر کامران کسی سحر زدہ کی مانند اس کے ساتھ واپسی
کے لئے مڑ گیا۔ عورت نے اتنے زور سے دروازہ بند کیا کہ چوکھٹ
ہل کر رہ گئی۔ میں کچھ دیر حیران پریشان، گم سم دروازے پر کھڑی
رہی پھر واپسی کے لئے پلٹ آئی"

بات ختم کر کے ہما بستر پر جا لیٹی۔ میں، زبیدہ اور شیریں
دیر تک ساکت بیٹھے رہے۔ ڈاکٹر کامران کی زندگی کا بڑا عجیب
رخ سامنے آیا تھا۔ کچھ دیر بعد شیریں نے گفتگو میں پہل کی۔ فکرمند
لہجے میں بولی "میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ڈاکٹر کامران جیسا فلسفی
اور پر مغز انسان فروزاں جیسی جنس زدہ اور خراب شہرت کی عورت
سے کس طرح تعلق رکھ سکتا ہے"

"ناممکن ہے کہ وہ فروزاں سے افلاطون اور سقراط پر
گفتگو کرتا ہو" زبیدہ نے گھٹی ہوئی فضا کو ذرا خوشگوار بنانے کی
کوشش کی۔

"میں ماننے کے لئے تیار ہوں کہ ان کے درمیان جنسی تعلق
ہوگا" ہما بستر پر لیٹے لیٹے بولی "مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ڈاکٹر کامران
فروزاں سے اس قدر خوفزدہ کیوں تھا۔ فروزاں نے اس سے

بہت تحکمانہ لہجے میں بات کی تھی اور تقریباً کھینچتے ہوئے اندر لے گئی تھی۔"

پھر زبیدہ، ہما اور شیریں، ڈاکٹر کامران اور فروزاں کے موضوع پر ایک دوسرے سے الجھ گئیں مگر میرے کانوں میں کوئی آواز نہ پڑ رہی تھی۔ مجھے تو جیسے اپنا ہوش ہی نہ رہا تھا۔ میں کیا سوچ رہی تھی اور کیا ہو گیا تھا۔ میں ہما کو ہی اپنا رقیب سمجھ رہی تھی اور یہاں دوسرا شاخسانہ کھڑا ہو گیا تھا۔ میں ایک طرف پڑ گئی اور فروزاں کے بارے سوچنے لگی۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے اسے پہلی بار اسکرین پر کب دیکھا تھا۔ اس وقت میں چودہ سال کی تھی، اور خوابوں کی دنیا میں رہا کرتی تھی۔ حد سے زیادہ بے باک ہونے کے باوجود مجھے فروزاں پسند آئی تھی۔ مجھے یاد تھا کہ میں نے گھر جا کر آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اسی کے انداز میں اداکاری شروع کر دی تھی اور امی نے کسی طرح مجھے دیکھ لیا تھا اور یہی وہ عمر کا تھا وہ فروزاں کے ابتدائی دن تھے۔ وہ اسکرین پر نئی نئی آئی تھی مگر اپنی آزاد خیالی اور بے باکی کی وجہ سے بڑی تیزی سے شہرت کے زینے طے کر رہی تھی۔ پھر وہ فلموں کی جنسی بلی قرار دے دی گئی اور اس پر اعتراضات کی بوچھار بھی ہونے لگی۔ مگر اس سے اس کی شہرت اور مقبولیت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ لوگ ذوق و شوق سے اس کی فلمیں دیکھتے رہے اور برا بھلا کہتے رہے۔ اس کی فلمیں ہٹ ہوتی رہیں۔ فروزاں فلمی دنیا کی طاقتور شخصیت بن گئی۔ اسے سائن کرنے کے لئے پروڈیوسروں کو اس کے گھر کے سامنے لائن لگانا پڑتی تھی اور فروزاں بڑی مشکل سے انہیں وقت دے پاتی تھی۔ اب یہی فروزاں، ڈاکٹر کامران کے گھر پر دیکھی گئی تھی اور ہما نے جس انداز میں اسے دیکھا تھا وہ میرے لئے سوہان روح تھا۔ آخر فروزاں جیسی عورت کا ڈاکٹر کامران کی خلوت میں کیا کام، کہاں تو ڈاکٹر کامران اس قدر محتاط اور مردم بیزار تھا اور کہاں فروزاں جیسی عورت سے ربط و ضبط۔ کیا اسے اپنے وقار کا خیال نہیں تھا۔ کیا اسے یہ احساس نہیں تھا کہ یہ بات باہر نکل گئی تو اس کی بے داغ شخصیت پر کتنا برا اثر پڑے گا۔ ہما نے بتایا تھا کہ وہ فروزاں سے خوفزدہ نظر آتا تھا اور فروزاں نے اس سے تحکمانہ لہجے میں بات کی تھی۔ آخر ڈاکٹر کامران کے ساتھ ایسی کیا مجبوری تھی جو وہ اس قدر خود سر، خود پسند اور مغرور ہونے کے باوجود فروزاں جیسی عورت کے آگے جھک گیا تھا اور اس کے باؤ میں آ گیا تھا۔

یہ کتنی عجیب بات تھی کہ ڈاکٹر کامران نے مجھے اور ہما جیسی لڑکیوں کو نظر انداز کر دیا تھا اور فروزاں جیسی بدنام اور ادھیڑ عورت کے چکر میں پھنس گیا تھا۔ جہاں تک مجھے معلوم تھا فروزاں نوجوانی کی حدود سے گزر چکی تھی۔ جب میں چودہ سال کی تھی وہ اس وقت بھی جوان تھی۔ وقت کافی آگے نکل آیا تھا ظاہر ہے اب وہ، وہ نہ رہی ہوگی جو پہلے تھی۔ جبکہ میں اور ہما جوان تھیں، ہم بہت خوبصورت نہیں تھے مگر خوبصورت ضرور تھے۔ ہمارے جسم فروزاں سے زیادہ دلکش اور شاداب تھے۔ ہمارے جسموں پر وقت کی دھول نہیں جمی تھی جبکہ فروزاں نے عمر کا نصف سے زیادہ سفر طے کر لیا تھا۔ وقت کی اپنی تحریر ہوتی ہے۔ وقت کی اپنی تصدیق ہوتی ہے۔ پھر ڈاکٹر کامران نے ہم پر فروزاں کو ترجیح کیوں دی۔

سوچا کہ ممکن ہے ڈاکٹر کامران کسی جنسی انحراف میں مبتلا ہو۔ ہو سکتا ہے اس کا شمار ان مردوں میں ہوتا ہو جو جنسی لذت کوشی میں بہت آگے نکل جاتے ہیں۔ وہ حصول لذت میں اذیت کوشی یا اذیت رساں بن جاتے ہیں۔ وہ عام عورت سے مطمئن نہیں ہو پاتے۔ عام اور سیدھی سادی عورت انہیں آسودہ کر ہی نہیں سکتی۔ ان کی تشنگی بہرحال باقی رہ جاتی ہے اور اسی لئے وہ عام اور نارمل آدمیوں کی مانند شادی بھی نہیں کرتے ہمیشہ مجرد رہتے ہیں۔ ایسے مرد عورتوں کو اذیت دیتے ہیں یا ان کے ہاتھوں اذیت اٹھانا پسند کرتے ہیں۔ یا تو وہ عورتوں کو کوڑوں سے اور سلاخوں سے پیٹتے ہیں یا خود ان کے ہاتھوں پٹنا پسند کرتے ہیں اسی سے انہیں جنسی تسکین ملتی ہے۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ برلن یونیورسٹی کا ایک استاد جو کہ اپنے مضمون میں عالم و فاضل تھا اور بین الاقوامی شہرت رکھتا تھا۔ راتوں کو گھر سے نکل جاتا تھا اور شہر کے بدنام علاقوں اور قحبہ خانوں میں گھومتا پھرتا تھا اسے فاحشہ اور آوارہ عورتوں کی قربت سے سکون ملتا تھا۔ وہ ان کی بے ہودہ زبان، ننگی گالیوں اور لچر حرکات سے حظ اٹھاتا تھا۔ اسی طرح ایک اور پروفیسر تھا وہ بھاری معاوضہ دے کر عورتوں سے اپنی پیٹھ پر کوڑے لگواتا تھا اور اس عمل سے جنسی لذت حاصل کرتا تھا۔ آخر میں اس کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ وہ کوڑے کھاتے کھاتے بے ہوش ہو جاتا تھا۔ پھر کوڑے کی جگہ سلاخ نے

لے لی۔ جتنی کہ اس چکر میں وہ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

کیا ڈاکٹر کامران بھی اسی نوعیت کا کوئی جنسی جنونی تھا ورنہ فروزاں جیسی اوباش اور جنس زدہ عورت سے اس کا تعلق؟ اگر ایسا تھا تو فروزاں ہی اسے اپنی اوباشیوں اور سالہا سال کے حاصل کئے گئے جنسی تجربوں سے تسکین دے سکتی تھی۔ یہ ہم بے چاری لڑکیوں کے بس کی بات نہیں ہو سکتی تھی اور شاید اسی لئے ڈاکٹر کامران ہم جیسی لڑکیوں کی طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا تھا ہم خوبصورت تھیں، دلکش تھیں، جوان تھیں مگر اس کے لئے بے کار تھیں۔ اس کے درد کا درماں تو صرف فروزاں جیسی عورت کے پاس ہی ہو سکتا تھا اور جو ڈاکٹر کامران نے مجھے زحمت دی تھی تو اس کا مقصد کوئی دوسرا تھا۔ وہ مقصد پورا ہو چکا تھا اور اس نے مجھے دودھ کی مکھی کی مانند اپنی زندگی سے نکال پھینکا تھا۔

میں نے سوچا، سوچتی رہی پھر بے اختیار رو پڑی۔ ڈاکٹر کامران جیسا فاضل، وجیہہ خوش پوش، باوقار اور پرکشش شخصیت کا مالک، صاحب کمال، جامع الصفات۔ کیا وہ جنسی مریض ہو چکا ہے۔ میرا دل ڈوبنے لگا اور ہاتھ پاؤں ایک دم سرد پڑ گئے۔ وہ فروزاں کا غلام ہے، اس کے اشاروں پر چلتا ہے۔ اس لئے کہ صرف وہی اس کو جنسی تسکین دے سکتی ہے۔ وہ مجبور ہے، بے بس ہے، نفسیاتی کیس ہے۔ وہ جانتا ہے کہ فروزاں اس کی بات کو نہیں پھیلائے گی۔ خلوت کے رازوں کو افشاں نہیں کرے گی جبکہ کسی دوسری عورت سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی۔ یہی بات ہے جو وہ فروزاں کے دباؤ میں ہے اور فروزاں اس پر حکومت کرتی ہے..... مگر مگر پھر بھی، ڈاکٹر کامران اور فروزاں، کس طرح مان لیا جائے۔

میں نے دونوں ہاتھوں سے کنپٹیاں دبالیں۔ میں نے سوچا کہ ایسا نہیں کیا تو میری کنپٹیاں تڑخ جائیں گی۔ میں ڈاکٹر کامران سے محبت کرتی تھی، اس کی پرستش کرتی تھی، وہ میرا محبوب تھا مگر میرے مقابلے پر کیسی ظالم رقیب تھی۔ کیا میں اس عورت سے نبٹ سکوں گی۔ کیا میں اپنے محبوب کو اس سے چھین سکوں گی کیا میرا محبوب اس کے حصار سے باہر آ جائے گا۔ وہ تجربے کار عورت تھی، سرد و گرم چکھے ہوئے جبکہ میں اس کے مقابلے میں گھٹنوں کے بل چل رہی تھی بلکہ چلنا سیکھ رہی تھی، مگر میں اس سے لوں گی ضرور، مجھے اس سے ملنا تھا۔ میں نے طے کر لیا کہ میں اس سے ملنے ضرور جاؤں گی۔

مجھے احساس نہیں ہو سکا تھا مگر شاید وہ میرے سوچ کی شدت تھی کہ میں منہ سے چیخ پڑی تھی۔ میری چیخ کچھ ایسی تھی کہ زبیدہ، ہما اور شیریں بے اختیار اچھل پڑیں اور مجھے حیرت اور خوف بھری نظروں سے دیکھنے لگیں۔ وہ مجھے اس انداز میں دیکھ رہی تھیں جیسے مجھ پر آسیب کا سایہ ہو گیا ہے۔

"میں فروزاں سے ملنے ضرور جاؤں گی۔ میں اُسے دیکھ لوں گی، سمجھ لوں گی۔" میں بڑبڑانے لگی۔ میرا پورا جسم تپ رہا تھا اور چہرہ پسینے میں بھیگتا جا رہا تھا۔ زبیدہ اٹھ کر میرے قریب آئی اور میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے مادرانہ شفقت سے بولی "پاگل ہوئی ہے لڑکی! تیرا ایک اداکارہ سے کیا واسطہ، خیال خام دل سے نکال دے۔"

میں نے جنونی کیفیت میں جواب دیا "میں حقیقت معلوم کر کے رہوں گی۔ میں اس اداکارہ سے مل کر ڈاکٹر کامران کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ میں جاننا چاہتی ہوں کہ یہ ڈاکٹر کامران کون ہے، کس قسم کا آدمی ہے اور اس کا اس سے کیا تعلق ہے۔ مجھے بڑی جستجو ہے کہ یہ متضاد اور مخالف عناصر کس طرح یکجا ہو سکے ہیں اور ان کے درمیان کون سی قدر مشترک ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ کہاں ایک باوقار، معزز اور خود پسند فلسفی اور کہاں ایک بدنام اور جنس زدہ اداکارہ، آخر ان کا ملاپ ہوا تو کیوں کر ہوا۔ میں اس عورت کو کبھی معاف نہ کر سکوں گی۔ میں اس عورت کے بارے میں پوری واقفیت حاصل کرنا چاہتی ہوں اور اس کے لئے اس سے ملنا بے حد ضروری ہے۔"

"شہناز! شہناز ہوش میں آؤ۔" زبیدہ مجھے جھنجھوڑتے ہوئے بولی "اس بے ہودہ اور فضول محبت سے باز آ جاؤ۔ ڈاکٹر کامران تمہارے مطلب کا آدمی نہیں ہے۔ وہ تمہارے درد کا درماں نہیں بن سکتا۔ اگر تم اس تک رسائی چاہتی ہو اور اس کے دل میں جگہ بنانا چاہتی ہو تو تمہیں فروزاں کی حد تک آنا پڑے گا۔ تمہیں بہت نیچے آنا پڑے گا کیا تم یہ گوارا کرو گی۔ نہیں ہرگز نہیں یہ تمہارے بس کی بات نہیں۔"

میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا اور تھکی تھکی آواز میں بولی "ہاں میں فروزاں نہیں بن سکتی۔ میں اس کی طرح بے باک، دلیر اور خود فروش نہیں ہوں۔ مجھ میں اپنا جسم، جوانی اور حسن کا معاوضہ طلب کرنے کی اہلیت نہیں ہے۔ میں اس معاملے

میں بالکل صفر ہوں۔ دوبارہ تین بار جنم لوں تب بھی یہ ناممکن ہے میرا دل تو صرف یہ چاہتا ہے کہ میں اس عورت سے ملوں، اُسے قریب سے دیکھوں اور اس کی باتیں سنوں اور کسی طرح معلوم کر سکوں کہ اس کے اور ڈاکٹر کامران کے درمیان کس قسم کا تعلق ہے۔" میں درد کی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔" زبیدہ! میرے دل کی آگ ٹھنڈی نہیں ہو سکتی۔ یہ آگ مجھے جلا کر راکھ کر دے گی۔ میرے دل میں جلنے والا شعلہ کسی کو دکھائی نہ دے گا اور میں جل کر بھسم ہو جاؤں گی۔ آہ میں تمہیں کس طرح سمجھاؤں کہ میں ڈاکٹر کامران سے کتنی شدید محبت کرتی ہوں۔ جتنا جتنا خود کو سمجھاتی ہوں، یہ آگ بھڑکتی ہی جاتی ہے۔"

کوشش کے باوجود میں خود پر ضبط نہ رکھ سکی اور بے اختیار رونے لگی۔ آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی، اور جسم سسکیوں کی وجہ سے کانپنے لگا۔ میں نے سسکیوں کے درمیان کہا۔" فروزاں سے مل کر مجھے معلوم ہو جائے گا کہ ڈاکٹر کامران کس قسم کا آدمی ہے۔ ممکن ہے وہ بہت پست، ارذل اور کمینہ ثابت ہو۔ اس میں کوئی برائی کا پہلو نکل آئے اور تب پھر شاید میں اس سے نفرت کر سکوں۔ مگر سوچتی ہوں تو مجھے یہ بھی ناممکن نظر آتا ہے۔ بہت مشکل ہے، میں ڈاکٹر کامران کو اپنے ذہن سے جھٹک نہیں سکتی۔"

شیریں اٹھ کر میرے قریب آئی اور پیار سے میرا سر سہلاتے ہوئے بولی۔" شہناز اگر تم نے فروزاں سے ملنے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے تو میں تمہیں ایک ترکیب بتاتی ہوں۔ تم ایک فلمی رپورٹر کی حیثیت سے اسے فون کرو اور فرضی انٹرویو کے لئے کوئی وقت لے لو۔ اس طرح تمہیں اس سے بات کرنے اور اسے ٹٹولنے کا موقع مل جائیگا۔"

شیریں کی بات بڑی معقول تھی۔ ہما نے اس میں مزید اضافہ کیا۔ مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔" اور جب تم اس سے ملو تو ایک فلمی صحافی کی حیثیت سے کہو کہ تم اس کے اور ڈاکٹر کامران کے تعلقات کے بارے میں جاننا چاہتی ہو۔"

مگر زبیدہ نے ایسی تمام تجویزوں کی مخالفت کی۔ اس کا خیال تھا کہ میں ان تمام باتوں میں پڑ کر اور زیادہ الجھ جاؤں گی اور کسی کام کی نہ رہوں گی اور بعد میں جیسے جیسے واقعات پیش آتے گئے، زبیدہ کے اس خیال کی تصدیق ہوتی گئی۔

کبھی کبھی خود میرے اندر سے آواز اٹھتی کہ میں زبیدہ کے مشورے کو مان لوں اور ڈاکٹر کامران کے خیال سے منحرف ہو جاؤں یکطرفہ محبت کس کام کی۔ ایسی محبت قصے کہانیوں میں تو ممکن ہے مگر حقیقی اور عملی زندگی میں دکھ دے جاتی ہے۔ میں ایک ایسے شخص سے محبت کر رہی تھی جو عشق و محبت پر یقین ہی نہیں رکھتا تھا۔ وہ میرے نازک احساسات کو سمجھتا ہی نہیں تھا بلکہ انہیں میری بے وقوفی اور بچپنے پر محمول کرتا تھا۔ اگر اس کی نگاہوں میں پاکیزہ جذبہ کوئی معنی نہیں رکھتا تھا اور وہ صرف جنس کے کاروبار پر یقین رکھتا تھا تو میں اس کے خیالات کو بدلنے میں کس طرح کامیاب ہو سکوں گی۔ نہیں، اسے تبدیل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ نیلا رنگ پسند کرنے والے کو سفید رنگ پسند کرنے پر کس طرح مجبور کیا جا سکتا ہے۔ اے کاش میں اس کی طرف مائل نہ ہوئی ہوتی۔ اے کاش میں نے اس کا فریب نہ کھایا ہوتا۔ مگر اب تو وہ میرے پورے وجود پر حاوی ہو گیا تھا۔ ذرہ ذرہ کر کے مجھ میں سما گیا تھا۔ ایک شیطانی قوت کی مانند حلول کر گیا تھا۔ میں نے ایک ایک اینٹ چن کر ایک قلعہ بنایا تھا اور خود اس میں اسیر ہو گئی تھی۔ وہ قلعہ میری جائے پناہ نہیں، قیدخانہ ثابت ہوا تھا اب میں رونے، تڑپنے، مچلنے اور لاکھ پچھتاووں کے باوجود اس قیدخانے سے باہر نہیں نکل سکتی تھی۔

زبیدہ نے کہا تھا کہ یہ محبت مجھے راس نہیں آئے گی۔ شاید وہ سچ ہی کہتی تھی مگر میں اب کر بھی کیا سکتی تھی۔ میں تو بہت آگے نکل آئی تھی، میری حالت بہت ناگفتہ بہ تھی۔ میری حالت اس ڈوبتے ہوئے شخص جیسی تھی جو گردن تک بھنور میں پھنس گیا ہو اور ہاتھ پاؤں مارنے کے باوجود رہائی کی کوئی صورت نظر نہ آتی ہو اور میں نے یہ مصیبت از خود اپنے سر پر مسلط کی تھی۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ اپنے کئے کی سزا بھگتوں۔ اب میرے آگے ایک جنگ تھی اور مجھے پورے ہوش و حواس کے ساتھ یہ جنگ لڑنی تھی۔ سب سے پہلے تو مجھے اس عورت فروزاں سے لڑنا تھا جو بظاہر ڈاکٹر کامران پر حکومت کرتی نظر آتی تھی۔ ڈاکٹر کامران کو اس کے حلقۂ اثر سے نکال کر مجھے مکمل طور پر اس پر قبضہ و اختیار رکھنا تھا۔ اس خود پسند، مغرور اور سرکش شخص کو ہر حال میں زیر کرنا تھا، اور اسے اس قابل نہیں چھوڑنا تھا کہ وہ کسی دوسری عورت کی طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھ سکے۔

میں نے بہت جوش اور ولولے کے ساتھ یہ سوچا اور دل بہلانے کی خاطر لڑکیوں سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی

لڑکیوں کو میں نے قائل کر لیا تھا کہ دوسروں کے لئے میدان خالی کر کے بھاگنا کوئی دانشمندی کی بات نہیں ہے اور وہ اس بات پر متفق ہو گئی تھیں کہ مجھے فلمی صحافی کا بہروپ بھر کر فروزاں سے ملاقات ضرور کرنی ہے۔

صبح جلد بیدار ہو گئی اور دوستوں سے رخصت ہو کر سیدھی گھر آ گئی۔ میں نے دیکھا کہ امی کی آنکھوں میں شک و شبے کی پرچھائیاں تیر رہی تھیں اور چہرے پر غصہ جھلک رہا تھا مگر انہوں نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ میں کان دبائے سیدھے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ دروازہ بند کیا اور ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا کر ٹیلیفون ایکسچینج سینٹر سے فلم سٹار فروزاں کا فون نمبر مانگنے لگی۔ آپریٹر نے بہت جلد مطلوبہ نمبر مجھے دیدیا۔ میں نے دھڑکتے دل اور لرزتے کانپتے ہاتھوں سے فروزاں کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف کسی ملازم نے ریسیور اٹھایا میں نے فروزاں کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ میڈم ابھی سو رہی ہیں بارہ بجے کے وقت دوبارہ فون کروں۔

میں نے ریسیور رکھ دیا اور بستر پر لیٹ کر مختلف خیالات میں غرق ہو گئی۔ مجھے یاد آیا کہ گزشتہ رات ہما نے بتایا تھا کہ جب اس نے ڈاکٹر کامران سے کہا تھا کہ وہ اپنی ایک سہیلی کی شادی کا کارڈ لے کر آئی ہے تو ایک لمحے کے لئے ڈاکٹر کامران کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا تھا۔ اس اطلاع کا ڈاکٹر کامران پر اس قدر ناگوار اثر کیوں پڑا تھا۔ وہ یقیناً یہی سمجھا ہوگا کہ وہ میری شادی کا کارڈ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اپنے دل میں میرے لئے کوئی نرم گوشہ رکھتا ہے۔ اپنی تمام تر بے اعتنائیوں کے باوجود مجھے چاہتا ہے اور حاصل کرنے کی خواہش رکھتا ہے مگر وہ فروزاں کی طرف مائل ہے تو یقیناً اس کی نوعیت کچھ دوسری ہوگی وہ میرے اور فروزاں کے درمیان ضرور فرق ملحوظ رکھتا ہوگا اور ہما نے جو یہ بتایا تھا کہ وہ فروزاں سے کچھ ڈرا سہما نظر آتا تھا تو یہ ہما کا وہم ہوگا۔ ورنہ ڈاکٹر کامران کسی عورت سے ڈرنے اور سہمنے والا آدمی ہرگز نہیں تھا اس نے ہما کی موجودگی کا خیال کیا ہوگا ورنہ فروزاں نے جس انداز میں اس سے بات کی تھی وہ ضرور اسے ڈانٹ بیٹھتا مگر آخر میں صرف ایک سوال رہ جاتا تھا اور اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ آخر فروزاں ڈاکٹر کامران کے گھر کیوں آئی تھی، وہاں اس کے آنے کا مقصد کیا تھا۔

بس یہی سوال تھا جو میرے ذہن کو کچوک رہا تھا۔ اسی حیص بیص میں ساڑھے گیارہ بج گئے۔ میں نے دوبارہ ریسیور اٹھایا اور فروزاں کے نمبر کو رنگ کیا۔ دوسری طرف کچھ دیر تک گھنٹی بجتی رہی۔ پھر گھنٹی کی آواز دفعتاً رک گئی۔ اور ایک نرم و لطیف نسوانی آواز سنائی دی "ہیلو"

میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور حلق ایک دم خشک ہو گیا۔ میں نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا۔ اور لبوں پر زبان پھیرتی ہوئی بولی ۔۔۔ "معاف کیجئے گا کیا آپ میڈم فروزاں ہیں؟"

"ہاں، کہو کیا بات ہے؟" دوسری طرف سے کہا گیا۔ اس بار لہجے میں قدرے سختی اور اکھڑ پن تھا۔ جیسا کہ عموماً شہرت یافتہ اور خود پسند اداکاراؤں کے لہجے میں ہوتا ہے۔

"میڈم میں "فلم لائٹ" کی رپورٹر ہوں اور آپ سے انٹرویو کرنے کی خواہشمند ہوں؟" میں نے بے جھجک کہہ دیا۔ اپنی جرأت پر مجھے خود حیرانی ہوئی۔ میں اب تک اسے ایک بہت بڑا مرحلہ سمجھے ہوئی تھی۔

دوسری طرف کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر بدلے ہوئے لہجے میں کہا گیا ۔۔۔ "بڑے شوق سے، میں کل شام گھر پر ملوں گی تم آ سکتی ہو۔"

مجھے امید نہیں تھی کہ اتنی جلدی کام بن جائے گا۔ مگر فروزاں تو جیسے انٹرویو دینے پر تیار بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے کل شام کا وقت دیا تھا مگر میرے ساتھ مشکل یہ تھی کہ میں کل شام مصروف تھی۔ کل دوستوں کے ساتھ پروین کے جشن عروسی میں شرکت کرنا تھی۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا "میڈم کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ انٹرویو کل کی بجائے پرسوں شام رکھ لیا جائے۔ دراصل کل شام مجھے کچھ مصروفیت ہے۔"

"پرسوں اتوار ہے کیا تم اتوار کو چھٹی نہیں کرتیں؟"

میں ڈر رہی تھی کہ شاید وہ برہم ہو جائے کیونکہ ان اداکاراؤں کے اول تو دماغ ہی نہیں ہوتا اور ہوتا بھی ہے تو سخت بددماغ ہوتی ہیں۔ مگر شکر ہے کہ ایسا نہیں ہوا اور اس نے بجائے ناراضگی ظاہر کرنے کے ایک دوسرا سوال کر دیا۔ میں نے آہستہ سے ہنستے ہوئے کہا ۔۔۔ "میڈم ہم صحافیوں کی زندگی میں چھٹی اور آرام کہاں، ہمیں تو چھٹیوں میں بھی کام کرنا پڑتا ہے۔ ہمیشہ ہی ایسا ہے۔ ویسے اگر آپ پرسوں وقت نہیں نکال سکتیں تو کل ہی حاضر ہو جاؤں گی۔"

"کوئی بات نہیں، چلو پرسوں ہی رکھ لو۔ صبح میں دیر سے سو کر اٹھتی ہوں اس لیے صبح کا وقت مناسب نہیں رہے گا پھر شام کو ساڑھے سات آٹھ بجے کے قریب گھر سے نکل جاتی ہوں اس لیے سہ پہر کو تین اور چار کا درمیانی وقت ٹھیک رہے گا۔"

"بہتر ہے، اتوار تک کے لیے خدا حافظ!" میں نے کہا۔

حضرت مالک دینار ایک دفعہ کشتی سے سفر فرما رہے تھے۔ کشتی بان آپ سے بھی اُٹھاتے سفر میں کرایہ کے طالب ہوئے۔ آپ متوکل اللہ درویشانہ سفر فرما رہے تھے۔ فرمایا "میرے پاس کرایہ نہیں ہے۔" اس پر کشتی بان بگڑ گئے اور آپ کو بے حد زدوکوب کیا یہاں تک کہ آپ بے ہوش ہو گئے۔ ہوش میں آنے پر انہوں نے پھر کرایہ طلب کیا۔ آپ نے وہی جواب دیا کشتی بانوں نے پھر آپ کو مارا پیٹا اور کہا ہم تجھ کو دریا میں پھینک دیں گے۔ یا دھر رحمت باری اپنے عاشق دربار کی آزمائش پر حرکت میں آئی اور دریا سے بہت سی مچھلیاں ابھریں۔ ہر مچھلی کے منہ میں ایک دینار تھا۔ آپ نے ایک مچھلی کے منہ سے ایک دینار لے کر کشتی بان کے حوالے کر دیا۔ وہ لوگ اس منظر سے ہکے بکے رہ گئے اور آپ کے قدموں پر گر کر معذرت چاہی۔ آپ نے فرمایا "اس میں تمہارا قصور نہیں ہے یہ میرا اور میرے رب کا معاملہ ہے۔" یہ فرمایا اور کشتی سے دریا کے پانیوں پر اس طرح اترے جس طرح خشکی پر اترتے ہیں اور خشکی ہی کی طرح پانی پر قدم رکھتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

"خدا حافظ!" دوسری طرف ریسیور رکھ دیا گیا۔

مارے ہیجان کے میری بری حالت تھی۔ یقین نہیں آرہا تھا کہ میں نے ابھی ابھی شہرت یافتہ اور بدنام زمانہ اداکارہ فروزاں سے بات کی ہے۔ یہ صحافت کا پیشہ بھی خوب ہے۔ صحافی کے لیے ہر دروازہ کھلا ہوتا ہے۔ عام حالات میں یہ عورت بھلا مجھے کب گھاس ڈالتی۔ مگر صحافی اور انٹرویو کا ذکر آتے ہی پگھلے ہوئے لوہے کی طرح نرم پڑ گئی۔ یہ عورت یوں بھی کیا کم مشہور تھی۔ اچھی خاصی شہرت رکھتی تھی۔ بدنام ضرور تھی مگر نوجوانوں اور بوالہوسوں کے دلوں پر نقش تھی اور اخبارات اس کی تصویروں کے بغیر پھیکے نظر آتے تھے۔ مگر اس کے باوجود اسے چھپنے کی مزید طلب تھی۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ اتوار کو اس سے کیا گفتگو کروں گی۔ کیا میں اسے بتانے کی ہمت کر سکوں گی کہ دراصل میں صحافی نہیں ہوں اور اس کا انٹرویو کرنے نہیں آئی ہوں بلکہ یہاں آنے کا میرا مقصد کچھ اور ہے۔ اگر وہ بگڑ گئی اور یقیناً بگڑ جائے گی تو پھر میں کیا کروں گی۔ میرا مقصد دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔ میرا مشن ناکام رہے گا!

میں کچھ دیر سوچتی رہی پھر لاپروائی سے شانوں کو جھٹک دیا کل کی کل دیکھی جائے گی۔ جب وقت آئے گا دیکھ لیں گے۔ پہلے سے جان جلانے سے کیا فائدہ۔ بہت سی باتیں جنہیں ہم مشکل سمجھتے ہیں وقت آنے پر چٹکیوں میں اس طرح حل ہو جاتی ہیں کہ ہم دنگ رہ جاتے ہیں۔ اب یہی فروزاں سے وقت لینے والا مسئلہ کچھ کم مشکل نہیں تھا مگر اس کی بھی سہل شکل نکل آئی تھی۔ جب یہ حل ہو گیا تھا تو وہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ فروزاں جیسی عورتیں خوشامد پسند اور ستائش کی خوگر ہوتی ہیں۔ آدمی ذرا ذہانت اور چرب زبانی سے کام لے تو ایسی عورتوں کو بآسانی شیشے میں اتارا جا سکتا ہے۔

اس روز میں کالج نہیں گئی۔ سارا دن کمرے میں بند فکروں میں غلطاں و پیچاں رہی۔ میری سوچ کا مرکز و محور ڈاکٹر کامران اور صرف ڈاکٹر کامران تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ کل ڈاکٹر کامران پروین کے جشن عروسی میں آئے گا یا نہیں۔ ویسے اس کا آنا مشکل ہی تھا۔ وہ کہیں آتا جاتا نہیں تھا۔ فرض کیا وہ آیا تو میرے لئے بہترین موقع ہوگا کہ میں ایک بار اس کے قریب ہو سکوں اگر نہ آیا تو پھر میں اسے کلاس میں لیکچر دیتے ہوئے دیکھ سکوں گی یا خواب میں۔ امتحانات قریب تھے۔ امتحان کے بعد لمبی چھٹیاں تھیں یعنی ڈاکٹر کامران اور میرے درمیان ایک طویل اور جان لیوا جدائی آنے والی تھی۔

رات دیر تک کروٹیں بدلنے کے بعد مجھے نیند آئی۔ پھر میں نے ایک خواب دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ میں پروین کے جشن عروسی میں شریک ہوں اور ڈاکٹر کامران بھی وہاں آیا ہوا ہے۔ وہ مجھ سے رقص کی درخواست کر رہا ہے۔ میں نے مسکراتے ہوئے اس کی درخواست قبول کر لی اور ہم انتہائی محویت کے عالم میں رقص کر رہے ہیں۔ پھر رقص کے دوران ہی ڈاکٹر کامران نے اپنے لب میرے کان پر رکھ دیئے اور سرگوشی میں بولا "شہناز بیگم! تم نے اپنی دوست کو میرے گھر کا پتہ کیوں دیا۔ میں نے تمہیں منع

کیا تھا نا؟

اس کے لہجے میں کوئی دھمکی یا سرزنش نہیں تھی۔ بلکہ پیار بھرا غصہ تھا یا ایک میٹھی میٹھی شکایت تھی۔ میں نے شرارت سے مسکرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ ڈاکٹر کامران نے نرمی سے میرا ہاتھ پکڑا اور ساتھ لئے ہوئے ہال سے باہر نکل آیا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے ہوٹل کے پائیں باغ میں آ گئی۔ چاند بلند ہو کر درختوں کی چوٹی پر آ گیا تھا۔ نرم و لطیف چاندنی ماحول پر روپہلا غبار پھیلا رہی تھی۔ ہر چیز سفید اور اجلی تھی۔ درختوں کے پتے چاندی کی مانند چمک رہے تھے پھولوں کی خوشبو سے بسا ہوا، ہوا کا کوئی شوخ و شریر جھونکا آتا اور ہمارے جسموں سے ٹکرا کر گزر جاتا۔ جانے کیوں میرا جسم ہلکے سے کانپ اٹھا۔ اس وقت ڈاکٹر کامران نے مجھے بازوؤں میں بھر لیا اور دیوانہ وار میرے لب و رخسار پر بوسوں کی بارش کرنے لگا۔ میں اس کے بازوؤں میں دبی ہوئی تھر تھر کانپنے لگی۔ میرے رگ و پے میں ایک عجیب سا نشہ جاری ہو گیا تھا۔ مجھ پر مدہوشی طاری ہو گئی پھر مجھے اپنا ہوش نہ رہا۔

صبح آنکھ کھلی ہی تھی کہ زبیدہ کا فون آیا کہ فوراً اس کے گھر پہنچوں۔ اس کے گھر پہنچی تو ہما اور شیریں پہلے سے وہاں موجود تھیں۔ میرے پہنچتے ہی انہوں نے پوچھا کہ کیا میں فروزاں سے وقت لینے میں کامیاب ہو گئی ہوں۔ جواب اثبات میں پا کر ان کا تجسس اور بھڑک اٹھا اور وہ بڑی شدت سے اتوار کا انتظار کرنے لگیں، جس دن کہ میں فروزاں سے ملنے جانے والی تھی۔ اس کے بعد گفتگو کا رخ حسب معمول ڈاکٹر کامران کی طرف مڑ گیا۔ شیریں مجھ سے جھگڑنے لگی کہ اگر ڈاکٹر کامران پروین کے جشن عروسی میں آیا تو وہ اس کے ساتھ رقص کا ایک راؤنڈ ضرور لے گی اور یہ کہ مجھے اس پر ناک بھوں ہرگز نہیں چڑھانا چاہئے۔

ہما ہونٹ سکوڑتے ہوئے بولی کہ اگر اس تقریب میں ڈاکٹر کامران کے آنے کا احتمال نہ ہوتا تو وہ ہرگز ہرگز وہاں نہ جاتی اس لئے کہ وہ اپنے اندر اپنے سابق منگیتر سے سامنا کرنے کی ہمت نہیں پاتی۔ ہما نے اپنے گھر میں نہیں بتایا تھا کہ پروین کی شادی کس کے ساتھ ہو رہی ہے۔

زبیدہ نے طے کیا تھا کہ تقریب میں کسی وقت اس کا اور ڈاکٹر کامران کا آمنا سامنا ہوا اور گفتگو کا موقع ملا تو وہ ڈاکٹر کامران کو واضح طور پر بتائے گی کہ میں اس سے کتنی شدید محبت کرتی ہوں اور اس کی بے مروتی اور بے اعتنائی نے میری کیا حالت بنا رکھی ہے۔

اور سچی میں تو میں اس وقت کچھ نہیں سوچ رہی تھی۔ میرے ذہن میں کچھ بھی نہیں تھا۔ بس مجھے شام کا انتظار تھا۔ کب شام ڈھلے گی، رات آئے گی اور میں، زبیدہ، ہما اور شیریں کے ہمراہ پروین کے جشن عروسی میں شرکت کے لئے جاؤں گی۔ وہاں کون کون ہو گا۔ محفل کس انداز میں سجے گی، کن کن بچھڑے ہوئے لوگوں سے ملاقات ہو گی، مجھے ان تمام باتوں کی مطلق پروا نہ تھی۔ مجھے تو بس یہ تھا کہ ڈاکٹر کامران وہاں آئے گا اور شاید میں دوبارہ اسے اپنی طرف مائل کرنے میں کامیاب ہو سکوں۔

جوں جوں وقت سرک رہا تھا اور شام آ رہی تھی میرا اضطراب اور ہیجان بڑھتا جا رہا تھا۔ ہم سہ پہر سے نہانے دھونے اور دوسری تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ آپس میں مل جل کر ہم نے ایک دوسرے کو تیار کیا۔ آخری تنقیدی نظر ڈالی اور ٹھیک آٹھ بجے گھر سے روانہ ہو گئے۔

تقریب میں پہنچنے والے ہم پہلے مہمان تھے۔ ہمارے بعد دیگر مہمان آنا شروع ہوئے۔ ہم ایک گوشے میں کھڑے ہو گئے اور آنے والے مہمانوں کا جائزہ لینے لگے۔ زبیدہ، ہما اور شیریں مہمانوں کے لباس، ان کے فیشن اور آرائش و زیبائش پر تبصرے کر رہی تھی۔ وہ باری باری ہر مہمان کا جائزہ لیتیں اور انہیں نمبر دے کر پاس یا فیل کر دیتیں۔ بڑا اچھا مشغلہ تھا اور وہ اس میں منہمک تھیں۔ مگر میری کیفیت کچھ اور تھی۔ میری توجہ ان کے مشغلے کی طرف نہیں تھی۔ میں ہال میں داخلی دروازے پر نظریں جمائے کھڑی تھی اور دھڑکتے دل کے ساتھ منتظر تھی کہ دیکھیں ڈاکٹر کامران کب ہال میں داخل ہوتا ہے۔ میں دوسرے مہمانوں کی مانند بظاہر بہت مطمئن اور پرسکون نظر آتی تھی مگر حقیقت یہ تھی کہ اندر سے میں بہت بے چین تھی۔ زبیدہ اپنے دلچسپ مشغلے میں مصروف ہونے کے باوجود میری اندرونی کیفیت سے باخبر تھی اور گاہے گاہے میری تسلی کے لئے کوئی جملہ کہہ دیتی تھی۔

ہر گزرنے والے لمحے کے ساتھ میری مایوسی بڑھتی جاتی تھی۔ خاصے مہمان جمع ہو گئے تھے مگر ڈاکٹر کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اور جب دولہا دلہن ہال میں داخل ہوئے تو ایک شور مچ گیا۔

سی نے ریکارڈ پلیئر کو چھیڑ دیا اور ایک عمدہ سا ساز بجنے لگا
بیدہ نے اپنا چہرہ میری طرف گھمایا اور سرگوشی میں بولی۔
راپروین کے چہرے کی طرف دیکھو کس قدر خوش نظر آ رہی ہے
زت حاصل کرنا کوئی اتنی دشوار بات نہیں ہے۔ اب اگر ڈاکٹر
مران تمہیں نہیں ملے تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ تمہاری
رگی میں کبھی خوشی نہ آئے گی؟

بجائے پروین کو دیکھنے کے میں نے دولہا کے چہرے پر نظریں
دیں۔ اس کی شکل و صورت دیکھ کر مجھے سخت دھچکا لگا۔ وہ اس
ر بدشکل اور بھدا تھا کہ میرے دل پر بوجھ سا پڑ گیا۔ میں دل ہی
دل میں پروین کو شاباش دے کر رہ گئی۔ اگر مجھے اس جیسے آدمی کی
بیوی بننا پڑے تو میں شادی کے تیسرے دن مر جاؤں۔ میں نے زبیدہ
کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا "اس جیسے آدمی کی بیوی بننے سے
بہتر ہے ڈاکٹر کامران کی داشتہ بن لیا جائے"

شیریں بھی آنکھیں پھاڑے پروین کے شوہر کو دیکھ رہی
تھی۔ کراہیت کے ساتھ بولی "یہ شخص بہت مالدار ہے اور پروین
جن خیالات کی لڑکی ہے وہ ہم سب پر ظاہر ہے۔ وہ بڈھے منے
کے ساتھ اس شخص کے ساتھ گزر بسر کرتے گی۔ اس کی ازدواجی زندگی
ذرا بھی متاثر نہ ہوگی۔ البتہ مجھے حیرت یہ ہے کہ ہما اس قدر خوبصورت
اور پرکشش ہونے کے باوجود اس شخص سے منگنی کیسے کر بیٹھی تھی
اچھا ہوا جو اس کی منگنی ٹوٹ گئی ورنہ اس کی ازدواجی زندگی بہت
ناکام گزرتی" پھر ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے بولی "میرے خیال
میں ہما کو ہما کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ اس نے نامعقول حرکت کر کے
ہما کو اس غول بیابانی سے بچا لیا"

ہماری گفتگو کچھ اور آگے بڑھتی مگر اسی وقت پروین اور
اس کا شوہر ہمارے بے حد قریب آ گئے۔ مجبوراً ہمیں اپنی گفتگو
منقطع کرنی پڑی۔ پروین ہمارے پاس آ کر رک گئی اور مسکراتے ہوئے
اپنے شوہر سے ہمارا تعارف کرانے لگی۔ میں نے محسوس کیا کہ پروین
کا شوہر ہمارے نظریں چرا رہا تھا۔ تعارف کے بعد پروین اور اس
کا شوہر دوسرے مہمانوں کی طرف بڑھ گئے اور ہم نے اطمینان کا
سانس لیا۔

شیریں نے مشورہ دیا کہ ہمیں مہمانوں کے درمیان گھوم
پھر کر وقت گزارنا چاہیئے۔ مشورہ اچھا تھا کیونکہ بھیڑ بھاڑ میں میں
اپنے اضطراب سے وقتی طور پر نجات پا لیتی۔ میرے دل پر پڑا ہوا

بوجھ لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا تھا اس لئے ضروری تھا کہ میں کچھ دیر
کے لئے خود کو کہیں گم کر دوں۔

ہم نے مہمانوں کے درمیان ایک چکر لگایا۔ اچانک ہی مجھے
خیال آیا کہ اس بھیڑ بھاڑ میں مہر اور واجد کا کہیں پتہ نہیں ہے حالانکہ
پروین نے انہیں بھی کارڈ بھجوایا تھا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ مہر اور
واجد تقریب میں نہیں آئے مگر انہوں نے شادی کا تحفہ بھجوا دیا ہے
ہم نے اس تحفے کو دیکھا وہ ایک منقش ٹیبل لیمپ تھا۔ شیریں مسکراتے
ہوئے بولی "حیرت ہے کہ مہر نے اپنا پیسہ اس تحفے پر خرچ کیا کسی
رفاہی ادارے کو نہیں بھیجا"

زبیدہ، شیریں کی بات پر بے ساختہ ہنس پڑی مگر پھر اچانک
جیسے اس کی ہنسی کو بریک لگ گیا اور اس کے ہونٹ عجیب حیرت خیز
انداز میں سکڑ کر رہ گئے۔ اس کی متحرک اور بے چین نگاہیں کسی نقطے
پر جم کر رہ گئی تھیں۔ پھر وہ مشینی انداز میں میری طرف جھکی اور تیز
سانسوں کے درمیان بولی "شہناز! ڈاکٹر کامران آ گیا ہے۔
وہ دیکھو"

میں فوراً مڑی اور میری نگاہیں ہال کے داخلی دروازے
پر جم گئیں۔ مجھے یوں لگا جیسے ایک برقی رو میرے تن بدن میں دوڑ
گئی ہے۔ پھر میں اپنی جگہ منجمد ہو کر رہ گئی۔ ڈاکٹر کامران بڑے وقار
کے ساتھ دروازے پر کھڑا تھا۔ اس کی نگاہیں ہال میں موجود مہمانوں
کا طائرانہ جائزہ لے رہی تھیں اور اس کے لبوں پر بڑی شاندار اور
پرشکوہ مسکراہٹ تھی۔ ڈاکٹر کامران مجھے اس وقت دنیا کا سب سے
خوبصورت، وجیہہ، پرکشش اور جامع الصفات آدمی لگا۔۔۔۔۔
اس لمحے میں تمام شکوے بھلا بیٹھی۔ ساری کدورتیں دھل گئیں اور میں
فخر محسوس کرنے لگی کہ اس شاندار اور بے مثال آدمی سے محبت کرتی ہوں

جذبات کے شعلوں میں
لپٹی ہوئی یہ پُراسرار کہانی
آئندہ شمارے میں
آپ کی حیرت و دلچسپی کیلئے
نیا سامان لے کر آئے گی!



سونے کی بھوک

ایک طویل [illegible]

[illegible]

تیرو چیراپلی ہسپتال میں کل ایک نوجوان پیرومل نامی کا آپریشن کیا گیا جو انتہائی پیٹ کے درد کے مارے مرا جا رہا تھا۔ جب ڈاکٹروں نے اس کا پیٹ چاک کیا تو اس پر اسرار درد کی وجہ معلوم ہوئی۔ اس کی آنتوں سے کتنے ہی سونے کی زنجیریں اور سونے کے ٹکڑے ملے۔

(تیرو چیراپلی سے آندھرا کی خبر)

بزرگوں نے کہا ہے کہ بچے کو کھلاؤ سونے کا نوالہ پر دیکھو شیر کی نگاہ سے۔"

اور چینی کہاوت ہے کہ "سونے کو تم کھا نہیں سکتے۔ پر سونے کے بغیر کھانا بھی نہیں مل سکتا۔"

پیرومل نے ان دونوں کہاوتوں میں سے کوئی نہیں سنی تھی پر یہ واقعہ تھا کہ دال بھات سے اس کے پیٹ کی بھوک نہیں بھرتی تھی اس کی آنتیں کسی اور ہی خوراک کا مطالبہ کرتی تھیں

پیرومل مشکل سے پانچ برس کا ہو گا کہ پہلی بار اسے عجیب و غریب بھوک کا احساس ہوا۔

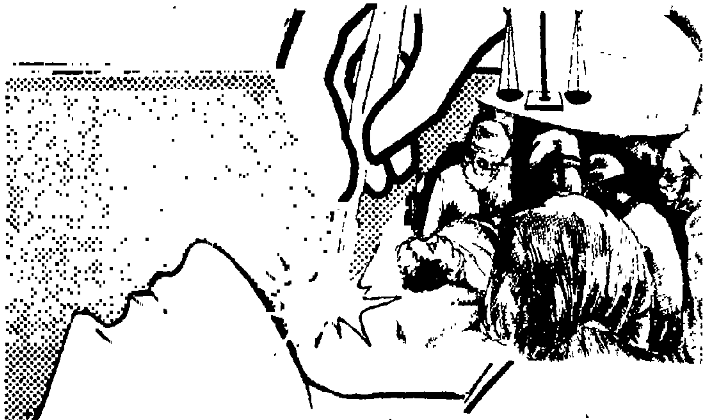
اس کا باپ آندھرا کے اور بہت سے غریب آدمیوں کی طرح رکشا چلاتا تھا۔ شام کو تھکا ہارا گھر لوٹتا تو بیوی کے ہاتھ میں روپیہ سوا روپیہ رکھتا اور باقی جو کچھ بچتا اسے کر تاڑی خانے میں پہنچ جاتا۔ اور اتنی تاڑی پیتا کہ بالکل مدہوش ہو جاتا، اپنے کھوکھلے پھیپھڑوں کی تکلیف اور اپنی سوجی ہوئی ٹانگوں کے درد کو بھول جاتا اور اول فول بکتا، گرتا پڑتا کسی نہ کسی طرح گھر پہنچ جاتا۔ بیوی کھانا سامنے رکھتی کبھی کبھار ایک نوالہ کھا لیتا اور نہ دال اٹھا کر پھینک دیتا اور چلاتا "مجھے بھات نہیں چاہیے۔ مجھے سونے کا نوالہ چاہیے" اور جب اس کا بیٹا پیرومل باپ کی چیخ پکار سے ڈر کر رونے لگتا تو وہ اپنے پاس بلا کر نرمی سے سمجھاتا "دیکھ بیٹا باپ کی یہ بات یاد رکھو۔ جو دال بھات کھاتے ہیں، سوکھی روٹی کھاتے ہیں وہ رکشا چلاتے ہیں، جانوروں کی طرح ٹھیلے کھینچتے ہیں۔ پر جو سونے کا نوالہ کھاتے ہیں وہ عیش کرتے ہیں، کوٹھی، بنگلوں میں رہتے ہیں، لمبی لمبی موٹروں میں گھومتے ہیں۔ بول تو کیا کھائے گا؟"

بچہ گھبرا کر کہتا۔ "بھات کھاؤں گا، بار بار۔"

اور جب باپ ڈانٹ کر کہتا۔ "اسے میری طرح پھیپھڑوں کی دق سے مرنا ہے۔ تجھے بھی۔ بول کیا کھائے گا؟" تو ننھا پیرومل ڈر کے کہتا۔ "سونے کا نوالہ کھاؤں گا بابا۔"

ابھی پیرومل آٹھ برس کا ہوا ہی تھا کہ اس کا باپ چل بسا۔ کریا کرم کو دس دن بھی نہیں ہوئے تھے کہ اس کی ماں نے پیرومل کو اسکول سے اٹھا لیا اور ایک مہاجن کے ہاں نوکر رکھوا دیا۔

پیرومل دن بھر موٹے مہاجن کے پیر دباتا، دکان میں پنکھا جھلتا گھر میں برتن مانجھتا، بازار سے ترکاریاں لاتا اور مہاجن کی بیٹی لکشمی کی کتابیں اٹھا کر اس کو اسکول پہنچا کر آتا۔ لکشمی اس کی ہی ہم عمر تھی۔ مہاجن کی اکلوتی بیٹی تھی۔ ریشمی فراک پہنتی۔ پیروں میں نئے چمکتے جوتے ہاتھوں میں سونے کی چھوٹی چھوٹی چوڑیاں اور کان میں جھولتے ہوئے چھوٹے چھوٹے سونے کے بندے۔ بالوں میں لال یا نیلا یا پیلا ریشمی ربن لگا رہتا جو پیرومل کو بہت ہی بھلا لگتا۔ ویسے اپنے سارے



کاموں میں لکشمی کو اسکول پہنچانا ہی اسے سب سے اچھا لگتا تھا اس لئے کہ لکشمی اسے مالکن کی طرح کوستی نہیں تھی، نہ مہاجن کی طرح مارتی تھی بس ہنس ہنس کر بات کرتی تھی اور کبھی کبھی اپنی مٹھائی میں سے ایک آدھ ڈلی بھر کر اس کو دے دیتی تھی۔

ایک دن پیرو مل لکشمی کو اسکول کے دروازے تک پہنچا ہی رہا تھا کہ اس نے دیکھا کہ دھول میں لکشمی کا ننھا سا آم کی کیری کی شکل کا بندا گرا پڑا ہوا ہے۔ پہلے تو اس کو خیال ہوا کہ بھاگ کر دے آئے۔ مگر اسکول کا گھنٹہ بج چکا تھا اور بچے اپنی اپنی کلاسوں میں جا چکے تھے اس نے سوچا کوئی بات نہیں۔ شام کو جب لینے آؤں گا لوٹا دوں گا اور اس نے بندا اپنی جیب میں رکھ لیا۔

گھر پہنچا ہی تھا کہ مالکن نے کہا، سیٹھ جی نے دکان پر بلایا ہے وہاں گیا تو حکم ملا چل بے پنکھا جھل۔ پیرو مل جلدی جلدی پنکھا جھلنے لگا گھبراہٹ میں ایک بار پنکھا سیٹھ جی کے کندھے کو چھو بھی گیا۔ "ابے دیکھ کے آرام سے پنکھا جھل" اب وہ آہستہ آہستہ جھلنے لگا تو پھر ڈانٹ پڑی "جیسے گیا ہے سے؟ نہ جانے کیسے پنکھا جھلتا ہے۔ ہوا بھی نہیں آتی۔"

اور اس عرصے میں ایک کے بعد ایک مختلف گاہک دکان میں آتے رہے۔ ایک نے پوچھا "چھوٹے چھوٹے بندے ہوں گے؟ بچی کے لئے چاہئیں" مہاجن نے الماری میں سے کئی ڈبیاں نکالیں اور ان میں سے بندے نکال کر گاہک کے سامنے رکھ دیئے۔ پیرو مل نے دیکھا کہ ان میں سے ایک جوڑی بالکل ویسی ہی تھی جیسے لکشمی کے آم کی کیری جیسے بندے جن میں سے ایک اس وقت بھی اس کی جیب میں تھا گاہک نے وہی جوڑی پسند کی اور پوچھا "اس کے دام کتنے ہوں گے" مہاجن نے کہا "پکے ایک تولے کے ہوں گے۔ پندرہ روپے بنائی کے ملا کر ایک سو پچیس کے ہوں گے۔"

"میں تو کوئی ساٹھ، ستر کے لگ بھگ سوچ رہا تھا"

گاہک بندوں کو ہاتھ میں اٹھا کر تکتے ہوئے بولا۔

"کیا بات کرو ہو جی" مہاجن نے کہا اور گاہک کے ہاتھ سے بندے واپس لے لئے۔ ساٹھ ستر میں جوڑی نہیں صرف ایک بندا آسکتا ہے۔

اس کے بعد پیرو مل کو یاد نہیں رہا کہ اس گاہک نے وہ بندوں کی جوڑی خریدی یا نہیں یا دوسرے گاہک جو آئے انہوں نے کون سے زیور لئے مشین کی طرح اس کے ہاتھ پنکھا جھلتے رہے مگر اس کے دماغ میں کوئی اور ہی خیال گونج رہا تھا۔ یہ بندا جو میری جیب میں ہے یہ آدھا تولہ سونا۔ کم سے کم ساٹھ روپے کا ہے ساٹھ روپے یعنی پیرو کے پورے سال کی تنخواہ گویا بارہ مہینے کی محنت۔ پنکھا جھلنا، برتن مانجھنا، سیٹھ جی کی ٹانگیں دبانا، بازار سے بھاجی ترکاری لانا لکشمی کو اسکول

وفا

اُس کاروباری آدمی کی کہانی
—————— جو
محبت کو سود و زیاں کے ترازو پر تولتا تھا
—————— وہ
وقت کو اپنے مفاد میں ساکت دیکھنا چاہتا تھا

خالدہ نفیس علوی

نذیر نے میٹرک پاس کرنے کے بعد اپنے قصبے میں ہی منیاری کی چھوٹی سی دکان کرلی۔

اچھی ملازمت سے اسے نفرت نہ تھی لیکن کلرکی کی گھس گھس کو وہ طبعاً ناپسند کرتا تھا اور ایک میٹرک پاس کی پیشانی پر کلرکی کی مہر گویا ازل سے لگی ہوتی ہے۔ پھر وہ تھوڑا سا آزادی پسند بھی ضرور تھا۔ اور اپنی دکان پر آزادی سے کام کرنے کا اسے پورا پورا موقع حاصل تھا۔ اس کی طبیعت میں صفائی پسندی بھی تھی۔ دھوبی کے دھلے ہوئے استری شدہ کپڑے پاپلین کی قمیض گلے میں مفلر بہترین اون کا سویٹر آنکھوں پر رنگین چشمہ۔ سر کے بال تراشیدہ اور ان میں خوشبودار تیل۔ ٹیڑھی مانگ اور نفاست سے کتری ہوئی ننھی ننھی مونچھیں۔ شکل صورت بھی خاصی تھی۔ قد درمیانہ، گٹھا ہوا جسم اور بدن چھامرا زیب۔

اس کی دکان میں کوئی وافر مال نہیں تھا البتہ جو کچھ تھا وہ دکان میں اس خوبی سے سجا رکھا گیا تھا کہ گاہک ایک نظر ڈال کر دو چار قدم آگے نہ بڑھ سکتا۔ خوبیٔ قسمت سے اس کے قصبے میں بجلی آ گئی تھی۔ اس نے بجلی لگوائی تو سرِشام ہی اس کی دکان بقعۂ نور بن جاتی جو چیزیں الماریوں کے اندر بھی ہوتی تھیں اور الماریوں میں شیشے تھے شیشوں کے پیچھے قمقمے تھے اور ہر قمقمے کا رنگ جدا تھا۔ کہیں نیلا کہیں سرخ اور کہیں سبز قمقمہ اپنی بہار دکھاتا ہوا تھا اس کا قصبہ اتنا بڑا نہیں تھا کہ دکان بہت جلد گھر تک بن جاتا اور پھر نذیر کے اندر لاکھوں پتی بننے والی صفات بھی نہیں تھیں۔ گاہک سے جھگڑنا اس کی فطرت میں نہیں تھا بلکہ زیادہ باتیں کرکے وہ تھک جاتا اور اکثر مایوس ہو کر گاہک بھی کھو بیٹھتا۔ وہ کم سے کم باتیں کرکے اپنی ذہنی قوتیں بحال رکھنا چاہتا۔ کیونکہ سرِشام اس کی دکان پر قصبے کے پڑھے لکھے جوانوں کا ایک مجمع لگتا۔ نذیر نے ایک شیشے لگے ریک میں چند رسالے، ناول اور غزلوں کے دیوان سجا رکھے تھے۔ نوجوان رسالے پڑھنے، ناول لینے یا واپس کرنے آتے اور پڑھی ہوئی چیزوں پر بحث ہوتی۔ نذیر اس ادبی بحث میں خوب چہکتا۔ سارے دن کی بچائی ہوئی قوتیں تنقید اور تبصرے میں سرفرانہ طور پر صرف ہو جاتیں تو نذیر دکان بڑھا دیتا۔

رات کو وہ کچھ نہ کچھ لکھتا بھی۔ غزل سے اسے خاص رغبت تھی۔ اور جگر اس کا محبوب شاعر تھا۔ جگر کی تقلید میں اس نے چند شعر لکھے تھے لیکن ابھی ان میں خام پن تھا۔ اس لئے اس نے اپنی سنہری جلد والی بیاض لوگوں کی نظروں سے یوں بچا کر رکھی تھی جیسے وہ ناتراشیدہ ہیرے جواہرات کا ایک خزانہ ہو۔

نذیر کی دکان پر حسن و عشق کی باتیں بھی ہوتیں لیکن نذیر اس بات چیت کو ایک خاص لے سے آگے نہ بڑھنے دیتا۔ اسی دھیمی سی لے میں تیزی اور تندی نہ ہوتی بڑا اعتدال سا کیف ہوتا جو طوفان نہیں بنا کرتا اور جس میں نسیم صبح کی ہلکی سی خنکی اور مدھم سی روانی ہوتی ہے۔ وہ کہا کرتا تھا۔ عورت بے شک محبوب ہے مگر وہ ماں اور بہن کا مقدس روپ بھی ہے اس لئے ایسا بول نہ بولو کہ عورت کی تذلیل ہو۔ نذیر کی محفل میں بیٹھنے والے اس کے ذوق سے خوب واقف تھے۔

نذیر اپنی اس چھوٹی سی دنیا میں بہت خوش تھا!

یہ زندگی جھیل کے پانی کی طرح طوفان سے ناآشنا۔ اگر کبھی کبھار کوئی ننھا سا کنکر گر بھی جاتا تو چند دائرے بنتے، چند لہریں اٹھتیں اور کناروں سے ٹکرا کر پھر سکون سے ہم آغوش ہو جاتیں۔ نذیر کی ماں بیا



میں صرف اس کی بوڑھی ماں اور ایک ننھی سی بہن شامل تھیں۔ نذیر کی ماں اس پر شادی کے لئے زور ڈالتی تھیں لیکن نذیر انہیں بڑے فنکارانہ انداز میں ٹرخاتے جا رہا تھا۔ اپنی برادری میں کوئی ایسی لڑکی نہ تھی جو اس کی نگاہوں میں جچ سکتی ہو اور قصبہ اتنا چھوٹا سا اور قدامت پسند تھا کہ انتخاب کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ وہ کہتا ”اماں تھوڑی سی آزادی کا موقع اور دیجئے۔ آخر میں ساری عمر کنوارہ تو نہیں رہ سکتا۔“ اور وہ دوستوں سے کہتا: ”یارو نذیر کونسا عرش سے اترا ہوا فرشتہ ہے کہ زمین کی آلائشوں سے پاک رہ سکے گا۔ ابھی کچھ دن اور بلندیوں پر کاٹ لینے دو کسی دن الف لیلوی شہزادی دریچے سے اشارہ کرے گی اور یہ شہزادہ اس کے قدموں پر سر رکھ دے گا۔“

اس دن بے پناہ گرمی اور حبس تھا۔ پیاس گھڑی گھڑی لگ رہی تھی اور پانی سوکھے ایندھن پر تیل کا کام کرتا تھا۔ بس ایک اڈے پر کھڑی ہوئی تو نذیر نے اتر کر دودھ سوڈا پیا۔ ماتھے کا پسینہ پونچھا اور بس سے تھوڑی دور ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ کھڑکی کے پاس بیٹھی ہوئی ایک عورت نے کہا: ”ایک دودھ سوڈا مجھے بھی لا دیجئے۔“

”دودھ سوڈا!“ نذیر نے گھوم کر پوچھا: ”آپ مجھ سے کہہ رہی تھیں، مجھ سے....“ کسی غیر عورت سے بات کرنے کا یہ پہلا موقع تھا اس لئے نذیر کی زبان میں شرمیلگی آگئی۔

”جی ہاں آپ سے....“ اس برقعہ پوش عورت نے کہا۔

”امید ہے کہ آپ نے برا نہ مانا ہوگا۔“

”نہیں.... نہیں....“ نذیر نے کہا اور لپک کر دکان پر پہنچا۔ دودھ سوڈے کی ایک بوتل کھلوائی اور گلاس بھر کر کھڑکی کے پاس لے آیا۔ عورت نے گلاس ہاتھ میں لے کر کہا ”شکریہ!“ نذیر کھڑکی کی طرف پشت کر کے کھڑا ہو گیا۔ چند لمحوں کے بعد اس عورت نے کہا۔

”یہ گلاس!“ نذیر نے گلاس لیا اور اس کے ساتھ عورت نے اس کے ہاتھ میں دس روپے کا نوٹ بھی تھما دیا۔ نذیر نے کچھ دیر بعد نوٹ واپس کرتے ہوئے کہا ”معاف کیجئے! اس کی ریزگاری نہ مل سکی۔“

”پھر تو میں آپ کی بائیس آنے کی مقروض ہوں۔“

”جی.... جی نہیں.... شرافت کا تقاضا یہی تھا کہ....!“

”آپ کہاں جا رہے ہیں؟“ عورت نے پوچھا۔

"واہ واہ" نذیر نے حیران ہو کر کہا۔
"مجھے پوچھنے کا حق تو نہیں ... امید ہے کہ برا نہیں مانیں گی کس کام سے؟"
"خریداری کا سامان خریدنے کے لئے۔"
"کس دکان سے؟" نذیر نے پھر حیران ہو کر عورت کے چہرے کی طرف دیکھا جو نقاب کی اوٹ میں تھا۔
عورت نے کہا: "مجھے یہ سوال نہیں کرنا چاہیے تھا؟"
"نہیں ... نہیں۔ ڈائمنڈ جنرل اسٹور۔"
"ڈائمنڈ جنرل اسٹور!" عورت نے دہرا کر کہا اور بس نے ہارن دے دیا۔ نذیر چند لمحے مبہوت کھڑا رہا۔ وہ کود کر چلتی بس پر سوار ہوا اور اپنی سیٹ پر آ بیٹھا۔ اس کی سیٹ عورت کی سیٹ سے فاصلے پر تھی۔
بس دوڑتی رہی اور نذیر کی توجہ بار بار برقعہ پوش عورت کی طرف لپکتی رہی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ایک نامحرم عورت نے اس بے تکلفی کے ساتھ اس سے باتیں کی تھیں۔ اس کے اپنے ماحول کی کوئی عورت ہوتی تو پیاس سے جان دے دیتی لیکن کسی غیر مرد سے مخاطب نہ ہوتی۔
لیکن یہ عورت عجیب تھی اور نذیر ورطۂ حیرت میں ڈوبا ہوا تھا۔
اس نے دیکھتے ہی بیٹھی ہوئی شہزادی کی پہلی جھلک پالی تھی اور اس جھلک میں بلا کا اشارہ بھی تھا۔ نذیر نے سر کے ایک جھٹکے سے اس خیال کو دور پھینک دیا: "میں بھی کتنا بے وقوف ہوں۔ سفر میں ایسے واقعات عام ہیں۔ ایک عورت نے پانی کا ایک گلاس مانگ لیا تو کون سا طوفان آ گیا!" لیکن باوجود کوشش کے وہ خیال پھر آ موجود ہوا۔ سارا راستہ اسی ادھیڑبن میں گزر گیا۔ وقت پر لگا کر اڑا اور بس لاہور کی بھیڑ میں داخل ہو گئی اور پھر اڈہ آ گیا۔
نذیر بس سے اتر کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ الف لیلوی شہزادی اتری اور ایک شانِ بے نیازی کے ساتھ اس کے پاس سے گزر گئی۔ اس کا الف لیلوی خواب چکنا چور ہو گیا اور اسے اپنے آپ پر ہنسی آ گئی۔ واہ میرے الف لیلوی ہیرو! اور اس ہنسی کے ساتھ شرم بھی محسوس ہوئی جیسے اس نے اپنے ہاتھوں اپنی انا کی تذلیل کر لی ہو۔
ڈائمنڈ جنرل اسٹور کے ہیڈ سیلزمین نے بڑی خوش اخلاقی سے کہا "مسٹر نذیر! آپ جو کچھ خریدنا چاہتے ہیں اس کی ایک فہرست بنا کر دیجئے گا۔" ہیڈ سیلزمین کی یہ خوش اخلاقی خلافِ معمول تھی۔ اس سے پہلے بھی نذیر ڈائمنڈ جنرل اسٹور پر خریداری کے لئے آیا کرتا تھا لیکن ہیڈ سیلزمین کبھی اتنی خوش اخلاقی سے پیش نہ آیا تھا۔ نذیر نے حیران ہو کر فہرست بنائی اور اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ سیلزمین نے کہا: "آپ تشریف رکھیں، آپ کا سامان بندھوا دیا جائے گا۔" نذیر اور حیران ہوا۔ آج تک اسے کھڑے کھڑے ٹرخا دیا جاتا تھا، آج یہ مہربانی کیوں؟
اس نے ساتھ کے کمرے کی طرف قدم بڑھائے۔ دروازہ کھلا تھا۔ سب سے درمیانی میز پر اس صوفے کی طرف بڑھا جو سامنے نظر آ رہا تھا۔ چند قدم چل کر اسے غلطی کا احساس ہوا۔ وہ ٹھٹکا اور اس کے قدم فرش کے ساتھ چپک گئے۔
ایک نسوانی آواز نے کہا: "بیٹھئے! اگر ضرورت ہو تو میں یہ صوفہ خالی کر دوں۔"
"نہیں ... نہیں۔" اس نے غیر ارادی طور پر کہا۔
اور پھر اس کے جسم میں ایک جھرجھری سی آئی جیسے اسے کوئی بھولا بھٹکا نظر یاد آ گیا ہو۔ وہ ایک کرسی کی طرف بڑھا اور گدیلے میں دھنس گیا۔ جھجک کی وجہ سے اس کا پسینہ سوکھ رہا تھا اور بدن پر ٹھنڈک سی رینگ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔
"پانی پیجئے گا؟"
وہ چونک گیا: "جی نہیں ... معاف کیجئے گا۔ مجھے پیاس نہیں۔"
"نہیں ... کیوں؟ مجھے اس احسان کا بدلہ چکانے کا موقع تو دیں گے جو بس میں آپ نے ایک اکیلی عورت کے ساتھ کیا تھا۔"
"تو وہ عورت آپ تھیں؟" نذیر نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "آپ ڈائمنڈ اسٹور میں کیسے پہنچیں؟"
اب عورت کی بجائے سیلزمین نے جواب دیا جو ہاتھ میں رنگین شربت کا ایک جگ لئے کھڑا تھا۔
"مسٹر نذیر! یہ ڈائمنڈ کی مالکہ ہیں۔" جب سیلزمین نے اس کے کانپتے ہاتھ میں لبالب بھرا ہوا گلاس تھما دیا۔ گلاس کا شربت چھلکا اور فرش پر گر گیا۔ اس نے بدحواس ہو کر گلاس منہ سے لگا لیا اور ایک ہی گھونٹ میں خالی کر دیا۔ سیلزمین نے دوسرا گلاس بھرا۔ پھر تیسرا اور نذیر کا گلا پھر بھی خشک رہا۔ اس کی پیاس تیز سے تیز تر ہوتی گئی حتیٰ کہ جگ خالی ہو گیا۔
سیلزمین نے پوچھا: "اور جگ؟" اور مینیجر نے بے خیالی میں سر ہلا دیا اور محض اتفاق تھا کہ سر کی اس حرکت کا مطلب نہیں تھا۔
کچھ دیر بعد نذیر کو جرأت ہوئی کہ وہ گردن اٹھا کر اس صوفے کی طرف دیکھ سکے جہاں اس کی میزبان بیٹھی ہوئی تھی لیکن وہ صوفہ خالی تھا۔ نذیر نے اطمینان کی سانس لے کر کمرے کا جائزہ لیا کمرہ خالی تھا

وہ اٹھا اور ڈائمنڈ جنرل اسٹور کے کاؤنٹر پر آیا۔ جہاں سیلز مین نے کہا
"مسٹر نذیر! آپ تشریف رکھیں۔ آپ کا سامان وہیں پہنچ جائے گا"
نذیر پھر کمرے میں واپس چلا آیا۔ کمرے کی فضا میں سکون تھا اور ٹھنڈک تھی۔ پنکھا چل رہا تھا اور نذیر کے حواس کا اُبلتا ہوا چشمہ ٹھنڈا پڑ رہا تھا۔ خنکی کا یہ احساس اس کے جسم سے ہوتا ہوا اس کی روح تک پہنچا اور وہ الف لیلوی داستان کے گلزار میں کھو گیا۔ دریچے میں بیٹھی شہزادی نے مبہم سا اشارہ ضرور کیا تھا۔ ابھی رُخ سے نقاب اور اسرار سے پردے نہیں اٹھے تھے۔ چھلکتی شراب کا ارغوانی جام بھی نہ بنی تھی کہ شہزادہ بے ہوش ہو کر بیچ چوراہے گر پڑا مگر اس نے الف لیلوی داستانوں کے جادو کی ایک جھلک ضرور دیکھ لی تھی۔

نذیر کا سامان بندھ کر آ گیا۔ اس نے بل ادا کیا تو سیلز مین نے ایک رقعہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ "اسے یہیں پڑھ لیجئے۔ جواب اس کی پشت پر لکھ دیجئے گا" نذیر نے کانپتے ہاتھوں رقعے کی تہیں کھولیں اندر صرف دو سطریں لکھی تھیں: "مسٹر نذیر! میں نے آپ کے چہرے سے لیاقت اور خوش اخلاقی کے نقوش پڑھ لئے ہیں کیا آپ ڈائمنڈ جنرل اسٹور کے منیجر کی حیثیت سے کام کرنا پسند کریں گے؟ زینت"

رقعہ نذیر کے ہاتھ سے گر پڑا۔ سیلز مین نے اٹھا کر پھر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ نذیر نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ "یہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں یہ افسانہ ہے یا حقیقت؟" اس نے حیرت زدہ الجھن کے انداز میں پوچھا۔

"سولہ آنے حقیقت" سیلز مین نے کاروباری زبان میں جواب دیا۔ "بڑا کھرا سودا ہے۔ انکار نہ کریں"

نذیر نے کہا "مجھے انکار نہیں ـــ"

اور یہ تین لفظ پھیل کر اس کی زندگی پر حاوی ہو گئے۔ اس نے تھیلے کی دکان بڑھا دی۔ ڈائمنڈ جنرل منیجر کی حیثیت سے وہ بہت کامیاب رہا۔ لیکن جب الف لیلوی شہزادی نے نقاب اٹھایا تو وہ غش کھا کر نہ گرا۔ ڈائمنڈ جنرل اسٹور کی مالکہ زینت جوانی کے اس دور سے گزر چکی تھی جس کی ایک جھلک پا کر الف لیلوی شہزادے بے ہوش ہو جایا کرتے تھے۔ ابھی جوانی موجود تھی اور چہرے کے خدوخال میں تبدیلی نہ ہوئی تھی۔ نقوش اچھے تھے اور میک اپ بڑا فنکارانہ تھا ـــ لباس بڑا ہنگامہ خیز اور چست تھا جسم کی گولائیاں ابھری ہوئی، وقت سے اور خطوط بھی نمایاں تھے۔ بالوں میں چمک اور سیاہی بھی موجود تھی لیکن بحیثیت مجموعی ان میں کسی چیز کی کمی تھی شاید شباب میں گرمی نہیں تھی اور شراب اپنی تندی اور تلخی کھو چکی تھی اور اب تو صرف ارغوانی رنگ کا لہراتا ہوا سراب ہی باقی تھا۔

ڈائمنڈ جنرل اسٹور کی مالکہ زینت کے جسم اور دولت کا مالک بن کر نذیر نے کوئی روحانی بالیدگی محسوس نہ کی البتہ اسے کبھی کبھار یہ محسوس ہوتا کہ وہ ایک عورت ہے جس نے دولت کے ہاتھوں اپنے شباب کا خزانہ بیچ دیا ہو۔

زینت ایک جوان بیوہ تھی۔ ڈائمنڈ جنرل اسٹور کا مرحوم مالک بڑھاپے کی منزل کو پہنچ چکا تھا جب اس نے زینت کے کنوارپنے کو اپنا شریکِ زندگی بنایا اور زینت کے والدین نے شریفانہ طور پر اسے دولت کی دیوی کے بھینٹ چڑھا دیا۔ زینت بیگم کو جب ہوش آیا تو ہر طرف سونے چاندی کے انبار تھے۔ لیکن شباب کے گرم گرم جذبات کو بڑھاپے کی سرد ہوا کا سامنا تھا۔ جوانی کا چراغ قبل از وقت بجھ سا گیا۔ پھر بڑھاپا قبر کی پستیوں میں لڑھک گیا تو بہار رخصت ہو چکی تھی۔ البتہ ایک صدائے بازگشت کا نغمہ زندہ تھا۔ یہ نغمہ جو تکمیل ناتمام کا دوسرا رُخ تھا اور نذیر کا شباب اس ہلکے سے نغمے کی تال پر رقص کرنے کے لئے مجبور تھا۔

زینت نے گزرے ہوئے شباب کو آواز دی!

اس نے ہر اس حربے کو استعمال کیا جو عورت کر سکتی ہے لیکن جس چراغ کا تیل ختم ہو چکا ہو اس کی زندگی کا نقطۂ عروج آخری ٹمٹماہٹ سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے۔

نذیر اب ڈائمنڈ جنرل اسٹور کا مالک تھا۔ رہنے کے لئے بہترین بنگلہ تھا۔ صوفے اور قالین تھے۔ ریشم اور سونا تھا۔ اعلیٰ ہوٹلوں میں بار بھی تھا۔ پھر بھی نذیر خوش نہیں تھا۔ اس لئے اس نے بیگم زینت کے مشورے سے جسم سے زیادہ کاروبار میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ اس نے ڈائمنڈ جیولری اور ڈائمنڈ وولن ٹیکسٹائل ملز کے قیام سے کاروبار کو اتنا وسیع کر لیا کہ اسے زینت بیگم سے ملنے کو

ایک لکھ پتی کنوارے سے اس کے دوست نے کہا
"یار تم اب بیوی گھر میں لے ہی آؤ۔"
لکھ پتی نے جواب دیا۔ "یار میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ کیا تمہاری بیوی ہے گھر پر؟"

اس میں بچھی پلنے کی فرصت ہی نہ رہی۔ زینت نے اس شریفانہ فرار کو محسوس کیا تو اس نے گنتے ہوئے شباب کی تجدید کے ساتھ ساتھ نسائیت کی ہر اس ادا سے کام لیا جو مرد کو اپنے قبضے میں رکھتی ہے۔ نسائیت نے ماں کا روپ دھارا بچی بہن کا کردار ادا کیا۔ نذیر کی دیکھ بھال میں ایک ایک لمحہ صرف کرنا شروع کر دیا۔ شفقت و محبت کے اس سیلاب میں نذیر نے اپنی انفرادیت کو ڈوبتے ہوئے محسوس کیا تو وہ ایک دن جھلا کر رہ گیا۔ اس نے خشونت سے کہا۔

"بیگم! میں نے اپنا جسم تمہارے ہاتھ بیچ دیا تھا۔ اپنی روح کا سودا نہیں کیا تھا" بیگم نذیر دم بخود رہ گئی۔ آسمان سے بجلی گری اور اس کا جسم راکھ کا غبار بنا اور محبوب کی بے وفائی پر چاروں کھونٹ بکھر گیا۔ ایک آپ کے باوجود جھریاں گری ہوئیں اور سرخی کے باوجود ہونٹوں پر زردی کھنڈ گئی۔ آنکھوں کی چمک جاتی رہی اور ٹوٹا ہوا آنسو دل کے ساتھ بہہ گیا۔ نذیر نے اپنا ستم محسوس کیا تو بڑھ کر بیگم کو تھام لیا۔ اپنے رومال سے بیگم کے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا "زینت مجھے معاف کر دو" زینت نے بظاہر اسے معاف کر دیا لیکن اس کی روح نشتر کے اس چرکے کو کئی دنوں تک محسوس کرتی رہی اور زخمی ہو ہو کر کراہتی رہی۔ کئی ماہ تک بجھی ہوئی راکھ میں پھر زندگی کی چنگاری نہ چمکی اور نذیر نے اپنی مصروفیات کو اور زیادہ بڑھا لیا۔ فرار اور گریز کی پناہ گاہیں اور حصار اور زیادہ مضبوط کر لئے۔ کبھی کبھار اسے اپنے چھوٹے سے قصبے کی معصوم سی زندگی کی یاد آتی تو اس کے ہونٹوں سے بے اختیار آہ نکل جاتی۔ سنہری جلد والی بیاض ابھی تک اس کی دراز میں موجود تھی اور اس کے کچھ بکتے شعر بھی یاد تھے اور وہ سوچتا "میں نے الف لیلوی شہزادی کے ایک بہروپ پر کتنی بڑی قربانی دی شعریت اور روح کی نغمہ سرائی کا بلیدان! اب میرے پاس سوائے راکھ کے کیا باقی رہ گیا ہے" اور وہ سینے کا درد چھپانے پھر فرار اور گریز کے قلعے میں پناہ لے لیتا۔

اور کروڑوں لمحوں کے گزرتے ہوئے ہجوم میں سے ایک لمحے نے رک کر اسے دیکھا۔ اس لمحے میں طلسمات کا حسن تھا اور اس حسن میں قوس و قزح کی تقوسات رنگ تھے۔ ریشمی دھاگوں کے عنکبوتی جال تھے۔ اس لمحے نے یہ جال اس کے گرد تنے۔ یہ جال جو ایک جھٹکے سے ٹوٹ سکتے تھے لیکن ان کے ساتھ روح کی شعریت کا خون بھی ہو جاتا۔

اس ایک لمحے نے دو آنکھوں کا روپ دھارا۔ ان آنکھوں میں سمندروں کی گہرائی تھی۔ پاتال کی اتھاہ گہرائیاں اور پہاڑوں کی خاموش عظمت تھی۔ اور پھر بھنوروں کا رقص تھا۔ کوئل کی کوک اور بلبل کی چہکار تھی۔ ان آنکھوں کے اسرار میں حیرت تھی۔ اور حیرت میں وہ شعر بھی تھے جن میں جگر کی سرخی اور گیتی آشاؤں کی خوشبو تھی۔ ان آنکھوں کا میٹھا درد بھی تھا جو حسرت بن چکے تھے۔

بیگم زینت نے کہا "یہ رخسانہ ہے میری رشتہ دار ہے۔ اسے کچھ دنوں کے لئے بلا لیا ہے"

"بہت اچھا کیا تم نے، تمہارا دل بہلا رہے گا" نذیر نے مسکرا کر جواب دیا لیکن کروڑوں لمحوں کے ہجوم میں سے یہ لمحہ ایک ستارے کی طرح ٹوٹا اور اس کی روح میں روشنی ۔۔۔ بن کر سما گیا۔

رخسانہ بڑی خاموش لڑکی تھی۔ اس میں چلبلاپن تھا نہ کنوارپنے کی شوخی۔ اس کا شباب دوپہر کا سورج تھا نہ چودھویں کا کھلا ہوا چاند نجانے کیوں؟ نذیر نے محسوس کیا کہ وہ اس کے لکھے ہوئے شعر کا ایک شعر ہے جس میں خام پن ہے۔ پکتے ہوئے پھل کا وہ گداز نہیں جو ٹوٹ کر جھولی میں آگرتا ہے لیکن رخسانہ اس کے خوابوں کی تعبیر کیوں بن رہی تھی۔ شاید الف لیلوی شہزادی نے آج پہلی بار دریچے سے جھانکا تھا۔ صدیوں کے بعد اس نے اپنے خوابوں کی نگر کو دیکھا تھا۔ اور یہ بہروپ نہیں تھا اصل روپ تھا جو کلی کا کوتاہ بن کر ٹپکا۔ رخسانہ ایک ڈری سی کرن کی طرح آئی اور اس کے شبستان حرم میں داخل ہو گئی۔ اس نے جس عورت کا مبہم سا ہیولا دیکھا تھا وہ رخسانہ کے روپ میں تخلیق کا ہر مرحلہ طے کر گیا تھا۔ رخسانہ کی آنکھیں اس کے شاعرانہ تخیل سے بھی زیادہ حسین تھیں۔ ان میں بولتا ہوا جادو تھا۔ رخسانہ کا قد بوٹا سا تھا۔ اس کی پیشانی میں آسمان کی بیکراں وسعتیں تھیں اور اس کے بالوں میں شب دیجور کی سیاہی تھی اور اس سیاہی میں ان دیکھے پھولوں کی خوشبو وہ خوشبو جو معطر سانس کی طرح شام زندگی میں کسی نامعلوم دروازے سے گھس آتی ہے۔

جب تک رخسانہ اس کے گھر میں رہی وہ اس کی ہستی سے شعوری بے اعتنائی برتتا رہا لیکن جب رخسانہ جانے لگی تو اس کے لاشعور نے شعور سے بغاوت کر دی ضبط کا ہر بند ٹوٹ گیا۔ اس نے رخسانہ کا ہاتھ تھام لیا۔ اتنی بڑی جرأت پر اس کے حواس تنکوں کی طرح بکھر گئے۔ مگر رخسانہ ڈالی سے ٹوٹے ہوئے خشک پتے کی طرح تھر تھرائی کانپی اور لرزی۔ پہاڑ شرم کے دل میں اتر گئی۔ اس نے کہا "رخسانہ میں مدتوں سے تمہارا انتظار کر رہا تھا" رخسانہ کی لرزش حیرت کے گرداب میں

ڈوب گئی۔ اس نے طوفان میں گھری ہوئی کشتی کی طرح جھکولے کھائے تو نذیر نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور اس کی نم آلود آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا: "رخسانہ ہم زندگی کے کس موڑ پر ایک دوسرے سے ملے۔ زندگی کا یہ موڑ!" اور رخسانہ نے جھکی ہوئی آنکھیں اٹھائیں۔ پلکوں کے سائے اٹھائے وہ لمحہ جو ایک ستارے کی طرح جگمگا رہا تھا چنگاری کی طرح چمکا۔ اور نذیر نے اسے اپنے دل میں یوں بسا لیا کہ یہ لمحہ زندہ تابندہ ہو کر زندگی کے اندھیرے راستوں پر شمع راہ بن گیا۔

رخسانہ چلی گئی!

نذیر نے فرار اور گریز کے حصار میں پناہ لے لی۔

اس نے اپنے مشاغل کو جنون آمیز حد تک اپنی زندگی میں حاوی کر لیا۔ ایک ایک لمحہ سونے چاندی کے انبار میں بدل گیا۔ اور نذیر اس مجنونانہ دوڑ میں اپنی ذات سے بھی بے نیاز ہو گیا۔ اس کے بال الجھ گئے، شیو بڑھی رہنے لگی، کپڑے میلے اور شکن دار ہو گئے، آنکھیں بے خوابی کی وجہ سے سرخ ہو کر اپنی چمک کھو گئیں۔ بیگم نذیر نے اس حالت کو دیکھا تو ٹھٹھک کر رہ گئیں۔ انہوں نے پھر دامن محبت کی پھوار کی۔ نذیر نے اپنے گرد خوابناک اور مادرانہ فردوس کے سایوں کو پھیلتا ہوا محسوس کیا تو گھبرا کر آنکھیں کھول لیں۔

بیگم نذیر نے کہا: "تم اپنی صحت کا خیال نہیں رکھتے ہو نذیر"

"تم خواہ مخواہ فکر کرتی ہو۔ میں اچھا بھلا ہوں!"

بیگم نذیر نے پھر اس کی ہستی کو اپنے تصرف میں لینا چاہا تو نذیر نے جھٹکا کر کینچلی اتار ڈالی۔ وہ پھر پرانی ڈگر کی طرف لوٹ گیا لیکن بیگم نذیر مطمئن نہ ہوئیں اور ایک دن وہ ایک چھوٹا سا اٹیچی کیس اٹھا کر اپنے کسی دور کے رشتہ دار کے ہاں شادی میں شرکت کے لئے چلی گئیں۔ چند دنوں بعد جب وہ واپس آئیں تو بہت مطمئن تھیں اور غازہ رنگے چہرے پر بڑی پراسرار مسکراہٹ تھی۔

نذیر نے جب کئی برسوں کی خاموشی کے بعد رخسانہ کے تصور میں ایک غزل تخلیق کی تو بیگم نذیر نے بھی تخلیق کے میدان میں بڑھ کر قدم مارا اور نذیر ایک صحت مند بچے کا باپ بن گیا۔ نذیر کی غزل میں ابھی ناپختگی کے کئی پہلو تھے لیکن بیگم کی تخلیق ہر لحاظ سے مکمل تھی۔

نذیر نے سنہری جلد والی بیاض پھر صندوق میں دفن کر دی۔

ایک نئی زندگی کا آغاز تھا۔ اس میں کوئی رخسانہ نہیں تھی۔ اس دوسری زندگی میں بیگم زینت کی ہستی بھی ایک نقطۂ موہوم بن کر رہ گئی تھی لیکن بیگم نذیر بھی تخلیق کے اس مرحلے پر نذیر سے بے نیاز ہو کر رہ



گئیں۔ بچہ ماں اور باپ دونوں کی توجہ اور محبت کا مرکز بن گیا۔ پھر اس بچے کے بعد دوسرا بچہ پیدا ہوا تو نذیر نے پہلی بار اپنی کنپٹیوں پر دو سفید بال دیکھے۔ اور وہ مسکرا دیا: "آخر بڑھاپا آ ہی پہنچا لیکن محض لیلوی شہزادے تو موت کے دروازے تک پہنچ کر بھی جوان رہتے ہیں۔ رخسانہ! .... ہوں۔ رخسانہ کو بڑھاپے کے دروازے پر دستک دینے کی کیا ضرورت ہے؟" اس کے ہونٹوں سے ایک خشک پژمردہ سی آہ نکل گئی: "نہ جانے رخسانہ کہاں ہے؟" اس نے سوچا۔ بیگم نذیر نے دوسری بار رخسانہ کو دعوت دینے کی جرأت نہ کی تھی: "عورت کی چھٹی حس نے میری بے حسی کے ساتھ رخسانہ کے غیر محسوس تعلق کو نہ جانے کیسے محسوس کر لیا تھا؟"

رخسانہ زندگی کے ایک موڑ پر جدا ہوئی تو پھر ان کا کسی پگڈنڈی پر آمنا سامنا نہ ہو سکا۔

دوسرے بچے کی پیدائش پر بیگم نذیر محض ماں بن کر رہ گئی۔ وہ عورت مر گئی۔ وہ عورت مر گئی جو نذیر کو نسائیت اور شباب کے فریب میں مبتلا رکھنا چاہتی تھی۔ چہرے سے غازے کی تہیں اتریں۔ آنکھوں سے سرمہ جاتا رہا۔ تنگ پھنسی ہوئی قمیضوں کے گھیرے ڈھیلے ہو کر غبارے بن گئے۔ جسم کا گوشت لٹک آیا۔ زمانے کے بے رحم ہاتھوں نے جو ترچھے بھیگے نقوش کاڑھے تھے اب واضح ہو کر رہ گئے۔ نذیر نے پہلی بار شعوری نظر سے بیگم کو اس روپ میں دیکھا تو اس نے سوچا میری جوانی نے اس عورت سے کیسا فریب کھایا۔ اور وہ اداس ہو گیا لیکن جب اسے آئینے میں کنپٹیوں کے سفید بال نظر آتے تو اس نے پھر زندگی سے سمجھوتہ کر لیا۔

بیگم نذیر حنوط شدہ لاش کی طرح جب دن کی روشنی اور ہوا میں آئیں تو راکھ بن کر رہ گئیں۔ مشت خاک بنانے کی تیزرو

تند آندھیوں نے پرورش کی جیسے وہ اس ارادے کی شکست کا انتظار کر رہی ہوں جو جوانی کے سرودِ رفتہ کی بازیابی کے لئے کوشاں تھا اور اب بڑھاپے نے ساز کا ہر تار توڑ دیا ہو اور ایک دن بیگم نذیر چراغِ سحر کی طرح یکدم بجھ کر رہ گئیں۔ دونوں بچے باغیچے میں کھیل رہے تھے۔ نذیر پلنگ کے پاس گم سم بیٹھا تھا اور اس نے بجھتے ہوئے دیئے کی آخری پھڑپھڑاہٹ کو سُنا اور محسوس کیا۔ یہ احساس نیا ضرور تھا لیکن اس میں کوئی چونکا دینے والی کیفیت نہ تھی جیسے وہ اس چراغ کے بجھنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے دل پر غم کا پہاڑ نہ گرا۔ چار گھونٹ سے اچھو بھی نہ لگا۔

نہ دنیا جہان کی روشنیاں بجھیں نہ زندگی کا دریا تھم گیا جیسے کا ایک سماں پیدا ہوا۔ البتہ زندگی میں ایک خلا کا اضافہ ہو گیا۔ بیگم نذیر آخر عورت تھیں اور ماں۔ گھر میں خاک اُڑنے لگی۔ دونوں بچے ماں کی محبت سے محروم ہوئے تو ادھ کھلی کلیوں کی طرح مرجھا کر رہ گئے۔ نذیر کی ماں فوت ہو چکی تھی اور چھوٹی بہن کی شادی ہو چکی تھی۔

خلا پھیلا تو ویرانی و وحشت کا سماں نظر آنے لگا۔ نذیر کے دوستوں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ نئی شادی کر لے۔ نذیر نے انکار کر دیا۔۔۔ زندگی کے اس موڑ پر اب کسی رخسانہ کا ملنا محال تھا۔ اس نے اشتہار دے کر ایک اینگلو انڈین عورت کو بچوں کے لئے گورنس رکھ لیا۔ یہ عورت جوان تھی اور اس کی جوانی میں آگ تھی۔ اسے اپنے خوبصورت جسم کی نمائش کا شوق بھی تھا۔ ساقِ بلوریں بیمانۂ سرود تھی۔ ننگے سڈول بازوؤں میں وہ فردوس بھی نہیں تھا جو ماں کی آغوش سے چشمۂ نور بن کر پھوٹتا ہے۔ گورنس کو بچوں سے زیادہ نذیر کی ذات میں دلچسپی محسوس ہونے لگی۔ اس نے مسکراہٹوں کا جو الاؤ کھولا اور زلفوں کا آتشیں جال پھیلایا۔ تو نذیر کی شرافت خوف کھا گئی۔ وہ نہ جانے اس دوزخ سے کیوں بچ نکلنا چاہتا تھا۔ اسے خود بھی حیرت تھی اور اس نے اس گورنس کو جواب دے دیا۔ دوسری گورنس بوڑھی تھی اور خزاں رسیدہ پتّے کی طرح تڑی مڑی اور خشک۔ دو تھی۔ اس کے ہونٹ بھنچے رہتے اور آنکھیں محبت کی نمی سے محروم تھیں۔ نذیر نے موت کے اس سائے میں دونوں بچوں کو کملاتا ہوا محسوس کیا تو اس نے اس گورنس سے پیچھا چھڑا لیا۔ اس نے گھر کی پرانی خادمہ کی مدد سے خود بچوں کی نگہداشت شروع کر دی۔ وہ خود انہیں اپنے سامنے نہلاتا۔ دھلاتا کپڑے پہناتا اور سلاتا۔ ان کے تہذیب اخلاق کی غور و پرداخت کرتا لیکن یہ فرض بہت گراں ثابت ہوا۔ اسے اپنا کاروبار اپنی گرفت سے نکلتا ہوا محسوس ہوا۔

آخر اسے اپنے دوستوں کی رائے پر عمل کرنا پڑا۔

"ہمارے معاشرے میں وہی عورت ماں کے فرائض ادا کر سکتی ہے جو رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو۔" اس نے سوچا اور اشتہار دے دیا: "ایک رنڈوے کو جو دو بچوں کا باپ ہے اور ایک کامیاب تاجر ہے۔ اپنے لئے رشتہ درکار ہے۔ بیوہ رشتے کو ترجیح دی جائے گی۔ معرفت مینیجنگ ڈائریکٹر جنرل اسٹورز۔۔۔؟"

خطوط کی بھرمار شروع ہو گئی۔ اس کی میز پر نیلے پیلے سرخ اور معطر لفافوں کے انبار لگ گئے۔ اکثر خطوط خواہشمند عورتوں نے اپنے ہاتھوں سے لکھے تھے۔ اسے عجیب عجیب القاب سے نوازا گیا تھا کسی میں اپنی تنہائی کا رونا تھا اور کسی میں سہارے کی تلاش کا اظہار تھا کسی میں نادیدہ محبت کے ٹوٹے ہوئے الفاظ میں پیش کش کی گئی تھی اکثر خطوط کنواری عورتوں کی طرف سے تھے۔ ان خطوط میں نذیر کے بچوں کی نگہداشت کا بالکل ذکر نہیں تھا اور نذیر نے محسوس کیا کہ ان خطوط کو اس کی کشش نہیں بلکہ مینیجنگ ڈائریکٹر جنرل اسٹورز، مینیجنگ ڈائریکٹر ہول سیل اینڈ ریٹیل ٹیکسٹائل ملز کی سنہری دولت کا انبار اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ بعض خطوط میں فوٹو بھی تھے۔ عجیب عجیب پوز کے فوٹو تھے۔ ان میں کچھ صورتیں دلنشیں بھی تھیں اور نذیر کو مجبور کر رہی تھیں کہ اپنی عمرِ رفتہ کو ایک بار تو آواز دے کر دیکھ لے۔ یہ زہر شکن صورتیں جوانی کی آگ کو پھر سے بھڑکانا چاہتی تھیں اور نذیر نے کبھی اس آگ میں ہاتھ ڈالا اس کے رونگٹے کھڑے ہوتے رہے اور جذبات کی شدت جسم کو پگھلا کر پیشانی پر پسینے کے قطرے بن جاتی رہی۔

اس نے ایک ایک خط کو پڑھا۔ پھر ایک سادہ لفافے کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ اس سے عطر کی بھینی بھینی خوشبو یا سینٹ کے بھبکے نہ آئے اس کے کونوں پر پھول بوٹے بھی نہیں تھے۔ اندر کا کاغذ بھی کھردرا تھا۔ اور نذیر نے مسکرا کر سوچا۔ "یہ محترمہ بڑی اکل کھری معلوم ہوتی ہیں۔ اس خط سے انکسار سادگی کی بو آتی ہے۔" لیکن جب نذیر نے کھول کر پڑھا تو یہ کسی مرد کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔

"محترمی! تسلیم

آپ نے پتے میں محض "ن" کا حرف لکھا ہے لیکن میں سمجھ چکا ہوں کہ آپ کون ہیں۔ آپ مجھے نہیں جانتے کیونکہ آپ کی مرحومہ بیوی کی زندگی میں مجھے آپ کے ہاں بار نہیں تھا۔ البتہ ممکن ہے آپ رخسانہ کو جانتے ہوں۔" رخسانہ

خط اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا اور زندگی کی تُرپنیں راہیں اور پگڈنڈیاں، بشاشتیں اور غم ایک سنگم پر ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔ زندگی کا تانا بانا الجھ گیا۔ اس نے تلملا کر کہا۔

"رخسانہ! تو زندگی کے کس موڑ پر ملی؟"

"رخسانہ آپ کی مرحوم اہلیہ کی دور کی رشتہ دار تھی۔ میں بھی رشتے میں رخسانہ کا بھائی ہوں اور میرے سوا اس وقت رخسانہ کا کوئی نہیں۔ رخسانہ کو مرحومہ نے ازراہِ غریب نوازی خود اپنے ہاتھ سے دلہن بنایا اور بیاہ دیا۔ مجھے خبر تک نہ ہوئی لیکن میں حیران ہوں کہ مرحومہ نے اتنی جلدی کیوں کی؟ اب وہ فردوس مقام ہو چکی ہیں۔ وہ یہ راز بھی اپنے ساتھ قبر میں لے گئی ہیں۔ کون جانے کیا بات تھی؟" اور پھر نذیر نے چونک کر خط میز پر گرا دیا۔ اس کے پانچوں ظاہری حواس سن ہو گئے۔ نہ روشنی نہ اندھیرا، نہ شفق نہ چاند نہ ستارے۔ نجانے کب نذیر کی اس دنیا میں ایک نئی کرن پھوٹی۔ تھوڑی سی روشنی ہوئی اور اس پھوٹتی ہوئی ضیا سے لطیف میں اس کی چھٹی حس بیدار ہو گئی۔ اس نے بھڑکتی ہوئی آگ بن کر کہا "زینت! تم نے کیا کیا؟ اتنی بڑی کمینگی۔ اتنی رذالت۔ مجھے تم سے یہ امید تو نہ تھی۔" اور اس کا جی چاہا کہ گھر کی ہر اس چیز سے اس رذالت کا بدلہ لے جس کا تعلق زینت سے تھا۔ لیکن یکایک پانچوں ظاہری حواس پھر جاگ اٹھے۔ ضبط نے جبروکرا انتقام کا ہاتھ روک لیا۔ جذبات جو لاوے کی طرح ابلے تھے، پھر برف کی قاشیں بن گئے۔ اس نے بھیگی بھیگی آنکھوں سے خط کو گھورا اور شل ہاتھوں میں اٹھا لیا۔

رخسانہ کا خاوند ہمارے خاندان کا بھٹکا ہوا بدمعاش تھا۔ رخسانہ نے اس کے ساتھ مثالی طور پر نباہ کیا۔ اس نے رخسانہ کے جہیز کی ایک ایک چیز بیچ کر شراب اور جوئے کی نذر کر دی۔ اس کے دو بچے ہوئے۔ جب رخسانہ کے پاس کچھ نہ رہا تو اس نے ایک بوڑھی بیوہ پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے اور رخسانہ کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک پرزہ تھما کر گم ہو گیا۔۔۔ کاغذ کا ایک پرزہ۔۔۔ طلاق نامہ۔۔۔ اور اب رخسانہ اکیلی ہے۔ دو بچوں کی ماں ہے۔۔۔ نذیر صاحب! میں جانتا ہوں آپ شادی کیوں کر رہے ہیں۔ آپ اپنے بچوں کے لئے ماں تلاش کر رہے ہیں۔ اور رخسانہ بہترین ماں ثابت ہو گی کیونکہ اس کی نسائیت نے ممتا کی لذت چکھی ہوئی ہے۔ کوئی کنواری عورت ان بچوں کو ممتا نہیں دے سکتی۔ اس لئے میرے مشورے پر عمل کیجئے کیونکہ خلوص بھرے دل سے نکلا ہوا ہے۔

مخلص جمیل صادق

خود کو بے نام آرزوؤں میں کھو دینے سے انسان اپنے آپ کو گنوا دیتا ہے۔

جذبے وہی پاکیزہ ہوتے ہیں جو بلندیاں پیدا کریں۔ بلندیاں پاکیزگیوں کی امین ہوتی ہیں اور کثافتوں سے پاک ہوتی ہیں اور پستیوں میں کیچڑ ہوتا ہے۔

زندگی مسلسل جد و جہد کا نام ہے۔ ترقی تعطل کی نشانی ہے اور تھکاوٹ ہمت کے ٹوٹ جانے کا دوسرا نام ہے۔

کہتے ہیں "وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ" مگر خود اس کی زندگی کتنی بے رنگ ہے یہ کوئی نہیں جانتا۔

عورت بہت نازک ہوتی ہے۔ اس سے عزتیں وابستہ ہوتی ہیں۔ ایک خاندان کی نہیں بلکہ پوری قوم کی۔

مرسلہ:۔ رفعت سلطانہ قمر، کراچی

خط ختم ہو گیا تو رخسانہ زندہ ہو گئی۔ مچلتے بدن والی رخسانہ جس کی آنکھوں میں نیلگوں آسمان کا سایہ تھا اور جس کے جسم میں بید نازک کی لچک تھی۔ اور نو دمیدہ کلیوں کی چٹک جو اس کی ابھری جلد والی بیاض کا ایک کچا پکا شعر تھی۔ اس کی اپنی تخلیق جو ابھی ان چھپی تھی۔ تصور کی ایک اڑان ماہ و سال کے لمبے فاصلے طے کر گئی اور نذیر نے باقی تمام خطوط کو نذرِ آتش کر دیا۔

جمیل صادق کا لفافہ جیب میں ڈال کر وہ راولپنڈی چلا گیا۔ ہوٹل کے گیراج میں کار ٹھہرا کر وہ پا پیادہ گلیوں کی خاک چھاننے لگا۔ کافی تلاش کے بعد ایک تنگ سی گلی میں جمیل صادق کا مکان آخر اسے مل ہی گیا۔ جمیل صادق ایک منحنی سا انسان تھا۔ آنکھوں پر دبیز شیشوں کی عینک تھی۔ گھر کے سامنے گلی میں کھڑے ہو کر اس نے نذیر کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور پھر عینک اتار کر شیشے صاف کرنے لگا۔ معاف کیجئے گا "میں نذیر ہوں" اتنا سنتے ہی جمیل صادق اچھل کر ایک قدم پیچھے ہٹ

کہا "آپ ..... آپ تو گویا آپ نے میری پکار کو سن لیا۔ میں کتنا خوش قسمت ہوں" اس نے نذیر کو بازو سے پکڑ کر چائے پانی کے لئے پوچھا۔ لیکن نذیر نے کہا "جمیل صاحب! میں رخسانہ سے جلد سے جلد ملنا چاہتا ہوں۔"

"اتنی جلدی! پہلے میں رخسانہ کو اس ملاقات کے لئے تیار تو کرلوں۔"

"نہیں ..... نہیں ..... یہ ملاقات تو ایسے غیر رسمی ماحول میں ہونی چاہیئے۔ کیا رخسانہ کو اس کا علم ہے ؟"

"نہیں تو۔ یہ اشتہار میری نظر سے گزرا تھا۔ میں نے محض انسانی ہمدردی کے طور پر .....!"

"ٹھیک ہے ..... آپ نے بہت اچھا کیا لیکن ابھی رخسانہ کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔"

جمیل صادق آگے آگے چل پڑا۔ بیشمار گلیوں کی بھول بھلیوں میں سے گزر کر وہ ایک غار نما کوچے میں پہنچے اور یہاں ایک بوسیدہ سے مکان پر جمیل نے دستک دی۔ ایک ننھے سے بچے نے دروازہ کھولا اور تتلا کر کہا "امی ..... مم ..... مم ..... ماما جان!" جمیل نے ایک قدم بڑھا کر بیٹھک کا دروازہ کھول دیا۔ یہ ایک تنگ سا کمرہ تھا۔ اس میں روشنی بھی کم تھی۔ کمرے میں ایک پلنگ تھا، چند کرسیاں اور ایک چھوٹی سی تپائی تھی لیکن کمرہ صاف تھا۔ اور پلنگ پوش بے داغ اور سفید تھا۔ پرانی کرسیوں پر گرد بھی نہیں تھی۔ جمیل نے کہا "بیٹھئے نذیر صاحب!" نذیر کرسی پر بیٹھ گیا تو جمیل کمرے سے باہر نکل گیا۔ چند لمحوں بعد جمیل نے آکر کہا "نذیر صاحب! رخسانہ آپ سے ملنے کے لئے آرہی ہیں۔"

"رخسانہ!" نذیر صاحب نے تڑپ کر کہا اور اس کا دل دھڑکنے لگا۔ کمرے کا دوسرا دروازہ کھلا۔ روشنی میں تھوڑا سا اضافہ ہوا۔ دوسرے لمحے نذیر کو محسوس ہوا کہ رخسانہ پلنگ پر بیٹھ چکی ہے۔ اس کا سر جھکا ہوا ہے اور سفید اوڑھنی کا پلو اس کے سر کو کانوں کی لوؤں تک ڈھانپے ہوئے ہے۔ نذیر پہلی نظر میں اس سے زیادہ کچھ نہ دیکھ سکا۔ کمرے میں گھپ اندھیرا چھا گیا تھا۔ دوسری نظر پر ذرا روشنی ہوئی تو نذیر نے کہا۔ "رخسانہ! مرحومہ زینت کی وصیت تھی کہ میں آپ سے ملوں۔ مجھے آپ کا پتہ معلوم نہیں تھا۔ یہ بھائی جمیل کی مہربانی اور اتفاقیہ ملاقات کا نتیجہ ہے کہ میں آپ کے ہاں پہنچ سکا۔"

"جی!" رخسانہ نے کہا اور جھکا ہوا سر تھوڑا سا اٹھا۔ نذیر نے دوسری نظر رخسانہ کے چہرے پر ڈالی تو اس کے ہونٹوں سے ایک آہ نکل گئی۔ نذیر نے محسوس کیا کہ اس کا نیم شگفتہ شعر پامال ہو چکا ہے اور ادھ کھلی کلی نجانے کب پھول بنی تھی اور کب پھول مرجھا چکا تھا۔

جمیل صادق نے کہا "رخسانہ بہن! مرحومہ زینت کی وصیت تھی کہ نذیر صاحب آپ سے ملیں۔ میں نے آپ کی زندگی کے واقعات ان کے گوش گزار کر دیئے۔" اور رخسانہ کا جھکا ہوا سر تھوڑا سا اور بلند ہوا حتیٰ کہ وہ آنکھیں نذیر کی آنکھوں سے جا ملیں جن سے ایک لمحہ شرارے کی طرح پھوٹا تھا اور آنکھوں میں بجھی ہوئی راکھ تھی غم اندوہ کے سیاہ بادل تھے۔ جن کے پیچھے کسی ستارے کی ٹمٹماہٹ نہیں تھی۔

"وہ لمحہ مر چکا تھا۔"

نذیر کے جذبات شل ہو کر رہ گئے۔ برف کا ایک تودہ پھسلا اور اس کے سینے پر آپڑا۔ وہ کانپتے قدموں سے اٹھا اور رخسانہ کے مکان سے نکل آیا۔ ہوٹل میں واپس پہنچ کر اس نے کانپتے ہونٹوں سے کہا "جمیل صاحب آپ کا شکریہ! میرے خط کا انتظار کریں۔ رخسانہ سے میری ملاقات کے مقصد کا ذکر ہرگز نہ کریں۔"

"نہیں ..... نہیں آپ مجھ پر اعتماد کیجئے" لاہور پہنچ کر نذیر نے جمیل کو لکھا۔

محترمی تسلیم! یہ خط رخسانہ کو پہنچا دیں۔ آپ اسے پڑھ سکتے ہیں!

"محترمہ!"

مرحومہ زینت آپ کے لئے وصیت کر گئی تھیں کہ آپ کو دو سو روپیہ ماہوار ملتا رہے۔ میری ملاقات کا یہی مقصد تھا۔ الحمدللہ اس کو پورا کرنے کے قابل ہو سکا۔ گذشتہ چند ماہ کا بقایا آپ کو بینک کی معرفت بہت جلد مل جائے گا۔" لفافہ بند کر کے نذیر نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

دو چار دنوں بعد نذیر کی کوٹھی کے کشادہ دالان میں جوان اینگلو انڈین گورنس دھوپ میں اس کے بچوں کو کھلا رہی تھی اور اس کے آتشیں گیسو شعلہ بار تھے۔ نذیر کو دیکھ کر اس کے سرخ ہونٹ مسکرائے۔ ایک شعلہ سا لپکا اور نذیر کا چہرہ اس بوسیدہ ورق کی طرح مرجھا گیا جس نے آگ دیکھ لی ہو!۔

تیرِ نیم کش

قارئین کے پسندیدہ اشعار

شاہد قیس ——— لاہور

آنکھیں ہیں بے قرار نہ دل بے قرار ہے
اس درجہ پرسکون تیرا انتظار ہے

زریں شہپر خان ——— کراچی

تمام عمر سہاروں پہ آس رہتی ہے
تمام عمر سہارے فریب دیتے ہیں

سمیع اللہ عقلی ——— لاڑکانہ

یہ ہم ہیں کہ تیرا درد چھپا کر دل میں
کام دنیا کے بدستور کئے جاتے ہیں

یاسمین شبنم ——— لاہور

کر پیش اپنے آپ کو اپنے ہی رنگ میں
فرمائشِ نگاہِ تماشائی پہ نہ جا

جمیل الرحمٰن ——— قطر

ان سے مل کر فراق خوش ہو لیں
زندگی بھر اداس رہنا ہے

راحت شیرازی ——— پشاور

گزر گئی ہے جو دل سے اک اجنبی کی طرح
اسی نظر سے کچھ اندازۂ کرم ہوگا

لئیق احمد ——— دوبئی

میرا یقین کر کہ محبت کے باب میں
اے دشمنِ وفا! ترا وعدہ نہیں ہوں میں

ذوالفقار علی ——— حیدرآباد

یہ بھی اچھا ہوا تو نے مجھے چاہا نہیں
تو نے بھی میری طرح دھوکا کوئی کھایا نہیں

ظفر یاب ——— گوجرانوالہ

سوچتے سوچتے سکوں مل جائے
دل کا یہ حال بھی گوارہ نہیں

منظور احمد ——— کراچی

یہ ترا پھول سا چہرہ، یہ ترا حسن جواں
میری رعنائی افکار کا سایہ تو نہیں

محمد صادق ——— سکھر

بے بس ہیں بے گناہ مقدر کے سامنے
کھلتی نہیں زباں ستمگر کے سامنے

عزیز احمد ——— کوئٹہ

چند تصویرِ بتاں، چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

ریاض احمد ریاض ——— لاڑکانہ

کیا بحث کریں تم سے سمجھوتہ ہی بہتر ہے
بات اپنے ہی گھر کی ہے بازار میں کیوں لائیں

اشرف شاد ——— راولپنڈی

محبت میں کسی منزل کو منزل کہہ نہیں سکتے
کہ ہونٹوں تک پہنچ کر چھلک جاتا ہے پیمانہ

شفقت رضوی ——— ساہیوال

فقط اک مسکراہٹ ہے مرے دل کے لئے کافی
خدارا آج میری عید کا کچھ بھرم رکھ لے

فرحت پروین ——— ملتان

پھر اس کی یاد میں دل بے قرار ہے ناصر
بچھڑ کے جس سے ہوئی شہر شہر رسوائی

خالد محمود ——— رحیم یار خان

یہ دل بہت اداس ہے جب سے خبر ہوئی
ملتے ہیں وہ خلوص سے ہر آدمی کے ساتھ

ساجد اقبال ——— میرپور خاص

کیوں رلانے کو سناتے ہو وفا کے قصے
دوست اب تو محبت کا یہ دستور نہیں

[illegible]

[illegible]

[illegible]

عریانی ! فحاشی ! بیحیائی !

بحث و نظر



یہ وہ لفظ ہے
جس کا ہماری معاشرتی زندگی میں
کوئی دائمی مفہوم نہیں ہے !

[illegible]

ذہنی انقلاب ناگزیر ہے

شیخ حفیظ اللہ حسرت گورنمنٹ کالج آف کامرس ڈیرہ اسماعیل خان



ہمارے ملک میں لوگوں کا ایک ایسا بڑا طبقہ موجود ہے جو معاشرے میں بڑھتی ہوئی عریانی فحاشی اور بے حیائی سے بیحد پریشان ہے اور وقتاً فوقتاً مختلف طریقوں سے اس پر اپنی تشویش کا اظہار کرتا رہتا ہے۔

[illegible]

میں اس طبقہ سے یہ سوال پوچھنے کی جسارت کرتا ہوں کہ آخر اس معاشرتی برائی کو پیدا کرنے کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے کون سے عوامل ہیں جو اس لعنت کی پشت پر کارفرما ہیں۔

کیا اس لعنت کا خالق ذہنی تنگ نظر طبقہ نہیں ہے جو اب معاشرے میں عریانی، فحاشی اور بے حیائی کا شکوہ کرتا ہے۔ خدا کے لئے ان حالات پر نظر کیجئے جن کے نتیجے میں موجودہ حالات وجود میں آئے۔ ایک عام آدمی بھی جانتا ہے کہ کسی بیماری کے بڑھ جانے کے بعد اس کا علاج اتنا موثر طریقے سے نہیں کیا جاسکتا جتنا کہ ابتدائی دور میں ہوسکتا ہے تو اس معاشرتی برائی کو ختم کرنے کے لئے بھی ضروری ہے کہ شروع سے ہی اس کا قلع قمع کیا جائے اور ایسے حالات ہی پیدا نہ ہونے دیئے جائیں جو بعد میں بڑھ کر موجودہ شکل اختیار کرلیں۔

دوسرے الفاظ میں اس کی تشریح یوں بھی کی جاسکتی ہے کہ ہر انسان میں فطری طور پر تجسس کا مادہ موجود ہوتا ہے جو بچوں میں خصوصی طور پر پایا جاتا ہے۔ جب بچے میں شعور پیدا ہوتا ہے تو اس کے ننھے سے ذہن میں بے شمار سوالات سر اٹھاتے ہیں جن کا جواب طلب کرنے کے لئے وہ عجیب و غریب حرکتیں کرتا ہے۔ مختلف شرارتیں کرتا ہے۔ اور اپنے بڑوں سے الٹے سیدھے سوالات کرتا ہے بعض اوقات قیمتی چیزیں بھی تلف کرتا ہے تاکہ اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے سوالات کے جوابات تلاش کرسکے۔ خصوصاً جب بچہ بلوغت کی حدود میں داخل ہو رہا ہوتا ہے تو اس کا تجسس زوروں پر ہوتا ہے۔ اپنے جسم میں رونما ہونے والی مختلف تبدیلیوں کے بارے میں اس کے ذہن میں کئی سوال پیدا ہوتے ہیں اور یہی وقت بچے کے سنورنے یا بگڑنے کا ہوتا ہے۔ تعلیم یافتہ اور سمجھ دار سرپرست بچے کو پیار اور نرمی سے سب کچھ دوستانہ ماحول میں سمجھاتے ہیں۔ اسے تنبیہہ کرتے ہیں کہ اگر اس نے کوئی حرکت خلافِ قانونِ قدرت کی تو اس کے نتائج مستقبل میں نہایت بھیانک ہوں گے۔ اس طرح وہ بچے کو ہر سوال کے مناسب جوابات مہیا کرکے مطمئن کرلیتے ہیں۔ مگر کیا کیجئے ملک کی اس اکثریت کا جو ان پڑھ ہے اور اگر تعلیم یافتہ بھی ہے تو ان میں اتنی جرأت نہیں ہے کہ مذکورہ مسئلے پر اپنے بچے کی صحیح جنسی تعلیم و تربیت کرسکے۔ ایسے موقع پر بچوں کی صحیح رہنمائی کرنا تو درکنار وہ تو اس موضوع پر بات کرنا ہی معیوب سمجھتی ہے۔ ایسے لوگ اپنے بچوں کو سختی سے جھڑکتے ہیں اور برا بھلا کہتے ہیں۔ جس سے بچے کے معصوم ذہن پر اس کے منفی اثرات ہوتے ہیں اور اس کے ذہن میں جنس (SEX) ایک معمے کی صورت اختیار کرجاتی ہے جسے وہ حل کرنے کے لئے باہر کی دنیا سے رجوع کرتا ہے۔ بُرے لوگوں کی صحبت اختیار کرتا ہے۔ فحش لٹریچر پڑھتا ہے۔ عریاں فلمیں اور تصویریں دیکھتا ہے اور اس تجسس کی تکمیل کے لئے ہر وہ نازیبا حرکت کرتا ہے جو قابلِ اعتراض ہوسکتی ہے۔ اس طرح بالغ ہوکر وہ مذہب سے فرار اختیار کرتا ہے۔ ذہنی اور جسمانی خود لذتی کا شکار ہوجاتا ہے اور اپنی جنسی تشنگی ختم کرنے کے لئے ناجائز ذرائع استعمال کرتا ہے اور یہیں سے فحاشی، عریانی اور بے حیائی جیسی لعنت کی ابتدا ہوتی ہے یہی لوگ آگے چل کر فحاشی، عریانی اور بے حیائی کو پھیلاتے ہیں۔

کیا اس تباہی کا ذمہ دار وہی طبقہ نہیں ہے جس کا میں ذکر کرچکا ہوں؟ تمام بزرگ خواتین و حضرات اس میں برابر کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ مرد حضرات اگر لڑکوں کو بھٹکنے کے ذمہ دار ہیں تو خواتین اپنی لڑکیوں کو اس مقام تک لانے کی ذمہ دار ہوتی ہیں۔ اگر شروع ہی سے بچے کی صحیح خطوط پر تربیت کی جائے تو یہ بچے جوان ہوکر مختلف اخلاقی برائیوں میں پڑ کر اور احساسِ کمتری میں مبتلا ہوکر جسم کے کسی مفلوج شدہ حصے کی طرح ملک و قوم پر بوجھ بننے کی بجائے ملک و قوم کی تعمیر و ترقی میں اہم کردار ادا کرسکتے ہیں۔ صحیح تربیت سے یقیناً ان میں اتنی روحانی اور اخلاقی جرأت پیدا کی جاتی ہے جس کے سامنے فحاشی اور عریانی جیسی لغو باتیں بے معنی ہوکر رہ جاتی ہیں۔

یہ اعتراض بھی عام ہے کہ معاشرے میں بے حیائی کی زیادہ تر ذمہ دار عورتیں ہیں جو گھروں سے باہر نکل کر مختلف طریقوں سے برائیاں پھیلاتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اعتراض بھی اسی تنگ نظر اور تنگ دل طبقہ کا ہے جو نہیں چاہتا کہ عورت تعلیم حاصل کرکے معاشرے میں اپنا جائز مقام حاصل کرسکے۔ حالانکہ عورت کی تعلیم نہایت ضروری ہے کیونکہ بچے کی پہلی تربیت گاہ اس کا گھر اور پہلا معلم اس کی ماں ہوتی ہے۔ اگر عورت تعلیم یافتہ نہ ہو تو ایک عمدہ معاشرے کی تشکیل کیونکر ممکن ہوسکتی ہے۔

عورتوں کو قدرت کی طرف سے دی گئی صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ اٹھانے کے لئے لازمی ہے کہ مردوں اور عورتوں کو مل جل کر کام کرنے کا موقع دیا جائے۔ اس سے کئی فائدے ہوں گے اول یہ کہ عورتوں میں احساسِ ذمہ داری پیدا ہوگا اور انہیں یہ بھی

معلوم ہوگا کہ مرد کس محنت سے کماتے ہیں۔ اس سے ایک طرف تو ان کی فضول خرچی کی عادت ختم ہو جائے گی جو وہ بے دریغ مختلف فیشن اپنانے پر صرف کرتی ہیں دوسری طرف جب مختلف کاموں سے ہی فرصت نہیں ملے گی تو اس کا ذہن کس طرح بے حیائی کی طرف مائل ہوگا کیونکہ صرف بیکار انسان کا ذہن ہی شیطان کا کارخانہ ہوتا ہے۔ دوم یہ کہ فریقین کے درمیان برابری کی بنیاد پر احترام پیدا ہوگا اور اس طرح کئی معاشرتی برائیاں خود بخود معاشرے سے کوچ کر جائیں گی۔

اب وقت آگیا ہے کہ پرانی اور دقیانوسی روش کو ترک کر کے حقیقتوں کو تسلیم کرتے ہوئے زندگی کے تقاضوں کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ آج سے ہزاروں سال پرانا معاشرہ تو اب واپس آنے سے رہا۔ ایسے مشینی دور میں تو زندگی کی گاڑی کو رواں دواں رکھنے کے لئے مرد اور عورت کا مل جل کر کام کرنا اب ناگزیر ہو گیا ہے۔

اس سلسلے میں بہت سے ملکوں اور قوموں کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ یہاں میں اپنے دوست ملک چین کی مثال دینا زیادہ پسند کروں گا۔ کون نہیں جانتا کہ چین میں زندگی کے ہر شعبے میں مرد اور عورتیں مل کر کام کرتے ہیں کیا وہ لوگ جذبات اور جنسی خواہشات سے عاری ہیں؟ آخر وہاں فحاشی، عریانی اور بے حیائی کا مسئلہ کیوں نہیں؟ ٹھیک ہے ہمارے اور ان کے نظام حکومت میں فرق سہی لیکن جسمانی بناوٹ میں تو کوئی فرق نہیں۔ فطرت نے ہر انسان کو ایک جیسا پیدا کیا ہے ہر انسان ایک جیسی خواہشات، جذبات اور امنگیں رکھتا ہے۔ اگر وہ لوگ بے جا جنسی خواہشات کو پس پشت ڈال کر قدم سے قدم ملا کر زندگی کی دوڑ میں حصہ لے سکتے ہیں تو آخر کیا وجہ ہے کہ ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ لیکن اس کے لئے ہمیں حقیقتوں کو تسلیم کرتے ہوئے وسیع النظری سے کام لینا پڑے گا تب جا کر فحاشی، عریانی اور بے حیائی جیسی لعنتوں سے پاک ایک مثالی معاشرے کا قیام ممکن ہوگا۔

عورتوں کے حقوق کیا ہیں؟

ایم۔ آمنہ اشرف دستگیر۔ گوجرانوالہ

مئی کا شمارہ پڑھا یہ شمارہ بھی اپنی قدیم روایات کی طرح قابل تعریف تھا اس شمارہ میں آپ کا عوامی موضوع فحاشی۔ بے حیائی۔ عریانی بھی نظر سے گزرا اور محترمہ طاہرہ یاسمین کے خیالات کو پڑھنے کا موقع ملا مجھے محترمہ کے خیالات سے اختلاف ہے میں محترمہ سے پوچھتا ہوں کیا آپ کو بنیادی حقوق صرف مخلوط تعلیم سے یا بے پردہ بازاروں میں پھرنے سے حاصل ہوں گے جو کہ یورپ کا خاصا ہے۔

آپ کی اطلاع کے لئے عرض کرتا چلوں، مغربی عورت کو ابھی تک وہ حقوق نہیں ملے جو چودہ سو سال پہلے اسلام نے عورت کو عطا کئے تھے۔ آپ نے لکھا ہے مغربی عورت کو دو سو سال سے اس کے حقوق ملے ہوئے ہیں یہ غلط ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ ایک سال پہلے برطانیہ کے سابق وزیر اعظم ولسن نے اعلان کیا تھا کہ اب عورت کو مرد کے برابر ملازمت کے مواقع اور تنخواہ ملا کرے گی۔ اس کے ساتھ دوسری مراعات بھی مرد کے برابر ہوں گی۔

مغربی عورت کے حقوق کے بارے میں مفکر اسلام مولانا مودودیؒ نے اپنی کتاب "پردہ" میں یوں تبصرہ کیا ہے۔

مغرب میں عورت کو جو کچھ ملا ہے وہ بحیثیت مرد ملا ہے نہ کہ عورت۔ کیونکہ مغربی عورت جب مرد بن کر مارکیٹ میں آئی تو اس کو یہ حقوق ملے ہیں۔ آپ کے علم میں ہوگا کہ روس میں عورتیں کان کنی کا کام کرتی ہیں جو عورت کی صنف کے لحاظ سے اس کے ساتھ ایک ظلم ہے کیا آپ کے نزدیک یہ بھی حقوق ہیں تو پھر آپ کو ایسے حقوق مبارک ہوں۔ آپ مغربی عورت کے حقوق کی بات کرتی ہیں آپ ایک مسلمان عورت کے حقوق پر قلم کیوں نہیں اٹھاتی ہیں۔ جب آپ سے پوچھتا ہوں اسلام نے کون سا حق ہے جو عورت کو نہیں دیا۔

کیا عورت ملازمت کا حق مانگتی ہے اسلام نے آپ کا یہ حق ختم نہیں کیا بلکہ مجبوری کے وقت کے لئے کھلا رکھا ہے کیونکہ اسلام نہیں چاہتا کہ عورت بلاضرورت ملازمت کا حق استعمال کر کے گھریلو معاملات سے لاپرواہ ہو جائے جو اس کی اصل ضرورت ہے۔

کیا آپ پسند کی شادی کی بات کرتی ہیں اسلام نے یہ حق بھی آپ کو مغرب سے زیادہ دیا ہے۔ اسلام کہتا ہے اگر کسی نابالغ لڑکی کا نکاح کر دیا گیا ہو تو وہ لڑکی بالغ ہو کر اس نکاح کو ختم کر سکتی ہے۔ اس کے ساتھ اسلام یہ حکم بھی دیتا ہے کہ کسی بالغ لڑکی کا نکاح اس کی مرضی کے بغیر نہ کیا جائے۔

اس کے بعد آپ عورت کے تقدس اور احترام کی بات کرتی ہیں جو عورت کو مغرب میں سرے سے ملا ہی نہیں۔ ہمارے

رسولؐ نے تو ماں کے قدموں کے نیچے جنت کی خوش خبری سنا کر عورت کے تقدس کو بلند کر دیا ہے خدا کو عورت کی عصمت و عزت اس قدر پیاری ہے حکم خداوندی کے مطابق اگر کوئی شخص کسی عورت پر الزام لگائے جسے ثابت نہ کر سکے تو ایسے شخص کو کوڑے اور موت کی سزا دی جاتی ہے۔ اس کی گواہی قبول نہ کی جاتی۔ کیا مغربی عورت کو ایسی عزت نصیب ہے؟ اتنے حقوق دینے کا مطلب صرف یہ ہے کہ اسلام ایک پاک صاف معاشرہ دیکھنا چاہتا ہے اس لئے نپولین نے کہا تھا۔

تم مجھے اچھی مائیں دو میں تم کو اچھی قوم دوں گا۔

ذِلّت ہمارا مقدّر بن جائے گی

محمد حنیف تبسم۔ خانیوال



عریانی اور فحاشی کا یہ بڑھتا ہوا سیلاب ہماری قومی بقا کے لئے بہت ہی خطرناک ہے جن قوموں نے عیش و نشاط اور رقص و موسیقی کو اپنا مشغلہ بنایا تھا کاتب تقدیر نے ان کی تقدیر پر زوال کی مہر ثبت کر دی

ریڈیو اور ٹی وی دن رات نوجوان نسل کے ذہنوں میں فحاشی اور عریانی کا زہر انڈیل رہا ہے آج کل اردو اور پنجابی فلموں میں نہ صرف عریانیت کی بڑھ چڑھ کر نمائش کی جا رہی ہے بلکہ ناچ گانے بھی بے مقصد واہیات اور جنسی جذبات کو برانگیختہ کرنے والے ہوتے ہیں۔ قتل و غارت گری کے ایسے خوفناک مناظر دیکھنے میں آتے ہیں جنہیں دیکھ کر پاکستانی قوم کے سپوت بجائے جاں نثار بننے کے ڈاکو چور اور قاتل بن رہے ہیں جو دن دہاڑے بڑی دیدہ دلیری سے محمد خان جیسے قاتل اور ڈاکو انسان کو پیچھے چھوڑتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں شریف خاندانوں کی عزت و آبرو اور مال و دولت کو سرِعام لوٹ لیے جاتے ہیں۔

تعلیمی اداروں میں ثقافت کے نام پر رقص و سرود کی محفلیں برپا کی جاتی ہیں۔

ایسے پروگراموں کی بدولت اب حال یہ ہے کہ نئی نسل کا ہاتھ اساتذہ کرام کے گریبانوں اور پگڑیوں تک پہنچ چکا ہے بری حرکات سے منع کرنے پر والدین کو زدوکوب کرنے اور اساتذہ پر قاتلانہ حملوں کے واقعات آئے دن اخبارات کی زینت بنتے رہتے ہیں یہ کتنا بڑا المیہ ہے۔

نوجوان نسل کے اخلاق کو تباہ کرنے کی سازش بارودی سرنگ پھٹنے سے کہیں زیادہ خطرناک ہے اگر عریانیت کا زور اس طرح بڑھتا رہا تو ایک دن ذلّت ہمارا مقدّر بن جائے گی۔

نئی نسل پر بے بنیاد الزامات کیوں؟

امجد اقبال حسین۔ پوسٹ بکس ۳۲۳۰۔ قطر



ماہنامہ دوشیزہ کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک نظر آپ کی تحریر پر پڑی۔ جس کا عنوان تھا "نئی نسل کے لڑکوں میں نسوانی کردار کیوں" آپ نے نئی نسل پر ان گنت الزامات عائد کئے ہیں لیکن آپ نے یہ الزامات عائد کرتے وقت پرانی نسل کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ آپ نے فرمایا ہے کہ آج کل چرس بڑی مقدار میں استعمال کی جا رہی ہے۔ تو محترمہ نئی نسل کو یہ چیز پرانی نسل والوں نے مہیا کر کے دی ہے۔

پرانے راجوں، نوابوں نے اپنی نفسانی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا۔ لاتعداد طبیبوں کو اپنے پاس ہی رکھا جاتا تھا بہت سے لوازمات استعمال کئے جاتے تھے۔ اپنی جنسی لذت کو پورا کرنے کے لئے لاتعداد لونڈیاں رکھتے تھے۔ نئی نسل کے نوجوان ایسا نہیں کرتے۔

بقول آپ کے اسکوٹر گاڑیوں پر آنا جانا بھی فحاشی ہے۔ لیکن آپ نے یہ سوچنے کی زحمت گوارہ نہیں کی کہ اسکوٹر یا گاڑی پر سواری کے لئے اپنی بیوی یا اور کسی رشتہ دار کو لانے اور لے جانے کے لئے بھی استعمال کر سکتا ہے۔ فحاشی تو میں اسے سمجھتا ہوں جب پرانی نسل کے لوگ اپنے وقت میں مجلسوں میں بیٹھ کر عیش و عشرت کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی عیش و عشرت کے لئے شراب کو بھی موزوں سمجھا۔ خود اس دنیا سے روپوش ہو گئے لیکن اپنا نمونہ نئی نسل کے لئے چھوڑ گئے۔ جہاں تک فیشن کا معاملہ ہے کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ کیا پہلے زمانے میں فیشن نہیں کیا جاتا تھا اس وقت نشے کے لئے

متوسط لوگ ٹوٹکے وغیرہ اور نواب لوگ شراب اور غریب لوگ تمباکو بکثرت استعمال نہیں کرتے تھے۔ اس دور میں اگر عورتیں یا لڑکیاں تمباکو استعمال کرکے اپنے ہونٹوں کو سرخ کرتی تھیں، اس دور میں لپ اسٹک کے استعمال میں تعجب والی بات کیا ہے۔

محترمہ آپ کے ذہن کے مطابق مجرم سراسر لڑکے ہیں لیکن دوسری طرف جو ہم نے دیکھا ہے وہ یہ ہے کہ لڑکیاں خود لڑکوں کو اکساتی ہیں کہ بے حیائی کو فروغ دیا جائے۔ اگر لڑکا اس سے ذرا دور ہونے کی کوشش کرتا ہے تو لڑکی اسے ذلیل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ تو اس کے لئے عرض ہے کہ فلمیں اس دور یعنی نئی نسل کے زمانے میں بنانی شروع نہیں کی گئیں، اس لئے نئی نسل کو مجرم ٹھہرانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

حقیقت پسندی سے کام لیں

بختیار ۔ مردان

عریانی، فحاشی اور بے حیائی کے لغو اور فضول فرسودہ قسم کے موضوعات ہمارے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتے ــــ یہ موضوعات ہمارے لئے اس لئے اہم ہیں کہ ہمارے پاس ترقی کرنے کے لئے کوئی رہنما اصول نہیں ہیں۔ دوسری قومیں "محنت" کو رہنما اصول تسلیم کرکے اس پر عمل کرتی ہیں اور اس طرح "جنس" ان کے لئے ثانوی چیز بن چکی ہے اور ہم "جنس" کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ اس کی حمایت میں یا اس کے خلاف باتیں کرکے اس کی اہمیت جان بوجھ کر بڑھاتے ہیں پھر ہم جنس کو پردوں میں چھپا کر بھی اس اہمیت کو اجاگر کرتے ہیں یہ فطری بات ہے کہ جب ایک چیز چھپائی جاتی ہے تو اس کے دیکھنے کے لئے تجسس اور بڑھ جاتا ہے۔ خدارا یہ پردے جو مصنوعی ہیں انہیں اٹھائیے، ذرا حقیقت پسندی سے کام لیجئے۔ خوب جی بھر کر نظارہ کیجئے اور وقت گزرنے دیں پھر جلد ہی جنس کی یہ اہمیت خود ختم ہو جائے گی۔

یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمارے ہاں کے جوان لڑکے اور لڑکیاں جنس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے اور پڑھے لکھے گھرانوں میں بھی جنس ایک شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ پھر فطری بات ہے کہ جوانوں کے لئے جنس بلا وجہ اہمیت اختیار کر جاتی ہے۔ اسکولوں اور کالجوں میں عشق کی داستانیں پڑھائی جاتی ہیں لیکن جنس پر ایک حرف بھی پڑھنے کو نہیں ملتا۔ مخلوط تعلیم نا پید ہے۔ شادی سے پہلے لڑکے اور لڑکی کو ملنے نہیں دیا جاتا تاکہ ان کے درمیان ذہنی ہم آہنگی پیدا ہو کر ان کی کامیاب ازدواجی زندگی کی ضمانت بنے۔

عریانی آخر ہے کیا؟

عاصم معین ۔ سوئیڈش پولی ٹیکنیک ۔ کراچی

مئی کے شمارے میں محترمہ طاہرہ یاسین صاحبہ نے عجیب عجیب باتیں لکھی ہیں۔ محترمہ آپ ہی جیسے خیالات رکھنے والی چند آزاد خیال لڑکیوں نے پوری نئی نسل کو بدنام کیا ہے۔ آپ کی ان باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ آپ اپنے دین سے کس قدر دور ہیں۔

قرآن پاک نے عورتوں کے لئے پردے کا حکم دیا ہے دوسرے لفظوں میں آپ پردے کے سلسلے میں مردوں کے بجائے خدا کو مورد الزام ٹھہرا رہی ہیں۔ آپ پاکستان کے تنگ نظر حلقوں کو آزادئ نسواں کے سلسلے میں ملزم ٹھہرا رہی ہیں جن کا قصور صرف اتنا ہے کہ وہ اسلام کے مطابق عورتوں کو ان کے گھر تک محدود رہنے کا حکم دیتے ہیں اس لئے کہ گھر میں عورت ماں ہے، بہن ہے اور بیٹی ہے لیکن آپ کی طرح اپنے گھر کو قید خانہ سمجھنے والی لڑکیاں گھر سے باہر یورپین خواتین کی طرح صرف ایک کھلونا ہیں کیونکہ آپ کی نظر میں فیشن کرنا لڑکوں سے تعلقات رکھنا بے حیائی نہیں ہے، اس لئے جس لڑکے کا دل چاہے آپ سے دل بہلا سکتا ہے۔

محترمہ نے لفظ بے حیائی، فحاشی اور عریانی کے ان معنوں پر تنقید کی ہے جو عام طور پر لئے جاتے ہیں، ان کی نظر میں لڑکیوں کا فیشن کرنا نئی نسل کا آزادی سے بیٹھ کر باتیں کرنا اور اسی قسم کی دوسری باتیں جن سے نئی نسل تباہ ہو رہی ہے (اخلاقی طور پر) بے حیائی نہیں ہے تو میں ان سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ بے حیائی اور عریانی آخر کیا ہے۔ انہوں نے اس کی وضاحت کیوں نہیں کی۔

محترمہ آپ کی باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ آپ اسلامی تاریخ سے دور ہیں اور شاید آپ کو یہ نہیں معلوم کہ جب عیسائی پوری طرح متحد ہو کر بھی صلاح الدین ایوبی کو شکست نہیں دے سکے تو ان کے شعبۂ جاسوسی کے سربراہ ہرمن نے یہ کہا تھا کہ ہم صلاح الدین ایوبی کو میدانِ جنگ میں شکست نہیں دے سکتے لیکن ہم مسلمانوں کو بے حیائی اور شراب میں غرق کرکے انہیں ان کے مذہب سے اس قدر دور کر دیں گے کہ انہیں یہ احساس ہی نہ رہے کہ وہ مسلمان ہیں تاکہ ان کے درمیان پھر کوئی صلاح الدین ایوبی پیدا نہ ہو سکے۔

اور آج آپ کے خیالات پڑھ کر پتہ چلا کہ واقعی عیسائی اپنی اس سازش میں کامیاب ہو چکے ہیں اور آپ جیسے خیالات رکھنے والی لڑکیاں شاید کبھی بھی صلاح الدین ایوبی یا ٹیپو سلطان جیسے جرنیل پیدا نہیں کر سکیں گی۔

بے حیائی کی ذمہ دار پرانی نسل ہے

محمد یوسف ڈار۔ کورنگی (کراچی)



آپ نے دوشیزہ میں "بحث و نظر" کے عنوان سے عریانی فحاشی اور بے حیائی کے خلاف جو سلسلہ شروع کیا ہے۔ ہم اس کے لئے آپ کے بعد ممنون ہیں۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو وہ یہ نہیں جانتا کہ عریانی کس چیز کا نام ہے۔ فحاشی کس چیز کو کہا جاتا ہے اور بے حیائی کس بلا کا نام ہے۔ سب سے پہلے بچہ والدین کے زیر سایہ پرورش پاتا ہے اگر والدین بچے کو مذہبی تعلیم دلوائیں۔ تو بچہ بہت حد تک عریانی۔ فحاشی اور بے حیائی سے دور رہے گا۔ بچوں کو اسکولوں میں مذہبی تعلیم دی جائے۔ پردے کے متعلق اللہ تعالیٰ کے احکامات بتلائے جائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک مسلمان عریانیت کی طرف مائل ہو۔ عریاں فلمیں دکھائی جا رہی ہیں جس سے نئی نسل کا کردار تباہ ہو رہا ہے۔

پرانی نسل نے ایسا معاشرہ قائم کر دیا ہے کہ نئی نسل بے حیائی پر مجبور ہو گئی ہے۔ اب بھی اگر پرانی نسل ان برائیوں کو ختم کرنا چاہتی ہے تو ان کو چاہیئے کہ بچوں کو مذہبی تعلیم سے روشناس کرائے۔ عریاں فلمیں اور فحش لٹریچر بند کیا جائے۔ جب تک پرانی نسل کے ذمہ دار اصحاب اس طرح نہیں سوچیں گے۔ عریانی، فحاشی اور بے حیائی کا خاتمہ نہیں ہو سکتا۔

نئی نسل پر الزام تراشی کیوں؟

اخضر سبنی۔ گورنمنٹ نیشنل کالج کراچی

بحث و نظر کے عنوان کے تحت فحاشی، عریانی اور بے حیائی جیسے اہم ترین مسئلہ پر آپ نے جو قلم اٹھانے کی دعوت دی ہے وہ ایک قابل تعریف اقدام ہے۔ اس سلسلے میں ماہ مئی ۱۹۸۰ء میں جناب

چوہدری محمد افضل شیخوپورہ۔ راولپنڈی کے خیالات نظر سے گزرے۔ انہوں نے بڑی بے دردی سے نئی نسل پر الزام تراشی کی ہے فرماتے ہیں کہ نئی نسل محبت کے معاملے میں بڑی بے باک واقع ہوئی ہے۔ اور اسی چیز نے اس نسل کو بے حیائی کی طرف مائل کر رکھا ہے جناب نئی نسل پر ہی کیا موقوف ہے۔ کیا پرانی نسل کے لوگ اپنی جوانی کے دور میں محبت نہیں کرتے تھے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پرانی نسل کے لوگ چھپ چھپ کر محبت کرتے تھے لیکن نئی نسل کے لوگ آزادانہ محبت کرتے ہیں۔ اور جب محبت قربانی مانگتی ہے تو حالات کے سامنے سینہ سپر ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس پرانی نسل کے لوگ لڑکیوں کو محبت کے نام پر فریب دیتے تھے۔ اور اپنا مطلب نکال کر الگ ہو جاتے تھے۔

آج کل کے لڑکے اور لڑکیاں محبت کرتی ہیں۔ تو اس غرض سے کہ شادی ہو جائے۔ اس محبت کو بے حیائی نہیں کہا جا سکتا۔ اور رہا سوال اپنی پسند کی شادی کا۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔ جب کہ جانتے مذہب اسلام نے بھی اس کی اجازت دی ہے۔ لڑکے اور لڑکی دونوں کی رضامندی سے ہی نکاح جائز ہوتا ہے۔

اچھے اور برے لوگ ہر جگہ پر ہوتے ہیں۔ ساری نئی نسل کو برا کہنا کہاں کا انصاف ہے۔

عورتیں جائز آزادی مانگیں!

ہدایت اللہ۔ انجینئرنگ کالج۔ پشاور



میں شکر گزار ہوں دوشیزہ ادبی رسالے کے تمام کارکنوں کا جنہوں نے اس سنگین مسئلے پر تمام حلقوں کو اظہار خیال کی دعوت دے کر خصوصاً مذہب اسلام کی خدمت کی۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آج کی نئی نسل فحاشی عریانی اور بے حیائی کے اس نقطۂ عروج تک پہنچ چکی ہے کہ ہر دیکھنے والا غیرت مند مسلمان سر سے لے کر پاؤں تک کانپ جاتا ہے۔ میں صرف اتنا پوچھوں گا کہ عریاں فحش اور بے حیا لباس پہن کر ہی ترقی کی جاتی ہے؟ یہ خواتین اور حضرات کل ہمارے وطن کے معمار بنیں گے

لیکن یہ حضرات عریانی، فحاشی اور بے حیائی کے ایسے بڑے طوفان میں پھنس رہے ہیں۔ جس سے پاکستان کے بس سے باہر ہو چکا ہوگا۔ میں ان خواتین سے (خصوصاً نئی نسل کی) صرف اتنا پوچھوں گا کہ عورت کب اور کس زندان میں مقید ہے؟ کیا اسے اپنے والد سے آزادی چاہیئے جو اسے پال پوس کر اپنے پاؤں پر کھڑا کرتا ہے؟ کیا اسے اپنے بھائی سے آزادی چاہیئے جو اس کی ناموس کی خاطر کٹ مرتا ہے کیا اسے اپنے خاوند سے آزادی چاہیئے جو اس کی زندگی کا عظیم ہمسفر ہوتا ہے۔

عورت اور مرد کے درمیان محبت ایک غیر فطری چیز نہیں ہے۔ یہ ایک خوبصورت عظیم اور بڑا مقدس جذبہ ہے۔ اسی جذبے کی بنیاد پر ایک ازدواجی زندگی کی پختہ بنیاد رکھی جاتی ہے۔ جس سے خالد بن ولید، طارق بن زیاد، محمد بن قاسم، سکندر اور سلطان ٹیپو جیسی ہستیاں جنم لیتی ہیں۔ یہی عورت بہن، بیٹی اور بیوی بھی ہے اور یہی عورت ماں جیسا مقدس رشتہ بھی ہے جس کے قدموں تلے جنت ہے۔ کیا یہ سب خواتین غلام تھیں؟ ہاں وہ عورت جو آزاد خیالی، عریانی اور فحاشی کی بھینٹ چڑھ کر بازارِ حسن میں پہنچ جاتی ہے۔ وہ ضرور غلام بن جاتی ہے اگر وہ آزادی مانگتی ہے تو اس کو یہ حق حاصل ہے۔

آج کی محترمہ طاہرہ یاسمین صاحبہ جیسی عورتیں آخر کس قسم کی آزادی چاہتی ہیں۔ اگر وہ مذہبِ اسلام کی آنکھوں سے دیکھیں تو ان کو پتہ چلے کہ عریانی، فحاشی اور بے حیائی اس سرعت سے ترقی کر رہی ہے کہ اگر اس کو روکا نہ گیا تو مسلمان قوم کا شیرازہ بکھر جائے گا۔

محترمہ نے جو کچھ لکھا ہے وہ بوکھلاہٹ میں لکھا ہے کیونکہ ان تمام خواتین و حضرات (جن کا محترمہ نے ذکر کیا ہے) نے عورت کی آزادی یا کسی بنیادی حق پر ڈاکہ نہیں ڈالا۔ کیونکہ جنوری سے لے کر اب تک تمام پرچے میرے پاس موجود ہیں۔ خصوصاً وہ میری بہنیں جنہوں نے ایمانداری اور حقیقت پسندی سے کام لیا ہے انہیں خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں۔

آخر میں محترم راشد سعید صاحب سے گذارش کروں گا کہ اپنی کتاب اور خیالات اپنے تک ہی محدود رکھیں تو یہ اسلام کی بڑی خدمت ہوگی کیونکہ جن ممالک میں سیکس ایجوکیشن رائج ہے وہ غیر مسلم ہیں۔ دوسرے اس قوم کی بیٹیاں سنِ بلوغت تک پہنچنے سے پہلے جذبات کی رو میں بہہ کر اتنی آگے نکل چکی ہوتی ہیں کہ والدین کے سامنے اپنے بوائے فرینڈ سے بوس وکنار کرنے پر مجبور ہوتی ہیں جس کی ہمارے مذہب میں اجازت نہیں اور کوئی غیرت مند باپ یہ برداشت نہیں کر سکتا۔

یہ ناپاک روحیں ہیں!

شہناز بانو۔ محمود آباد۔ کراچی

آپ نے دوشیزہ میں بحث ونظر کا ایک اچھا سلسلہ شروع کیا ہے۔ دوشیزہ کا مطالعہ میں نے دو ماہ سے شروع کیا ہے۔ ماہ مئی کا شمارہ نظر سے گزرا اس میں محترمہ طاہرہ یاسمین کے خیالات پڑھ کر اس دور کی لڑکیوں کی ذہنیت پر ماتم کرنے کو دل چاہتا ہے میں ان سے صرف اتنا عرض کروں گی کہ پاکستان جو ہمارا ملک ہے اور آئین کی رو سے اس کا نام "اسلامی جمہوریہ پاکستان" ہے۔

اسلام نے ہماری عورتوں کو اس قسم کی آزادی قطعاً نہیں دی جس طرح کی آزادی وہ حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ ہمارے قرآن یا حدیث میں یہ بات آج تک مجھے نظر نہیں آئی کہ شادی سے پہلے تمام لڑکے اور لڑکیاں آپس میں غلط انداز کا میل جول رکھیں۔ لڑکیاں دوپٹوں سے بے نیاز ہو کر لڑکوں کی بانہوں میں بانہیں ڈالے بے حیائی سے پاکستان کی شاہراہوں پر تفریح کرتی پھریں۔ اور پھر ان کے ساتھ جا کر سینما ہاؤس میں بے حیائی کے وہ مناظر دیکھیں جن کے تصور سے ہی ایک مسلمان کی روح ناپاک ہو جاتی ہے۔ ایسی قسم کی باتیں ایک مسلمان کا ذہن کبھی نہیں سوچ سکتا۔ کیا یہ سب باتیں بے حیائی کی نہیں ہیں۔ دراصل اسی قسم کے لڑکے اور لڑکیاں مل کر پوری نسل کو بدنام کرتے ہیں۔

یونیورسٹی جو کہ لڑکے اور لڑکیوں کی سب سے بڑی تعلیمی درسگاہ ہے بُری طرح ہماری نوجوان لڑکیوں کی آزادی سے متاثر ہے اور شریف ماں باپ تو اس کے نام سے ہی پناہ مانگتے ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ کوئی شریف لڑکی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر کے شریف نہیں رہ سکتی، اس کے نام کے ساتھ کسی نہ کسی کے اسکینڈل کا دھبہ ضرور لگ جاتا ہے۔

اگر ٹھنڈے ذہن سے ہم یہ سب باتیں سوچیں تو یہ سب باتیں خود بخود ہماری سمجھ میں آجائیں گی کہ عریانی، فحاشی اور بے حیائی کیا ہے؟ اور اس کو ہم کس طرح دور کر سکتے ہیں؟ آخر ہم اپنے مذہب سے اتنا دور کیوں ہیں؟ اس کا جواب آخر

کون دے گا۔

خدارا بے حیائی کی حمایت نہ کریں

(راجہ فضل نواز کیانی۔ تحصیل کہوٹہ ضلع راولپنڈی)

میں تو عریانی اور فحاشی کا بالکل قائل نہیں ہوں کیونکہ جب ہمارا مذہب اس کی اجازت نہیں دیتا تو ہم کون ہوتے ہیں کہ اس کی تائید کریں اور عریانی اور فحاشی کو زندگی کا ایک جزو کہیں۔ مسلمان عورت کے لئے پردہ ضروری ہے اور عورت کو اللہ تعالیٰ نے صرف اپنے بچوں کی پرورش اور خاوند کی تابعداری اور اپنے گھر کو جنت بنانے کے لئے پیدا کیا ہے۔ اس لئے نہیں پیدا کیا کہ وہ بازاروں میں نئے نئے فیشن کر کے سینہ نکال کر لوگوں کو گنہگار کریں۔ اسلام میں تو عورتوں کے لئے پرفیوم تک لگانا حرام ہے لیکن تم تو اپنے اسلام میں عورت کا ایک غیر مرد کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا اور جنسی آزادی بھی حلال سمجھتے ہو اور اس کو زمانے کا بدلنا کہتے ہو۔ یہ میں ان حضرات و خواتین کے لئے کہہ رہا ہوں جو عریانی اور فحاشی کو زندگی کا ایک اہم جزو تسلیم کرتے ہیں۔ اور بحث میں اس کی تائید کرتے ہیں ایک سچا مسلمان کبھی بھی عریانی اور فحاشی کی حمایت نہیں کرے گا۔ کوئی عورت جب اس عنوان کی حمایت میں مضامین لکھتی ہے تو پڑھنے سے میری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں اور سوچتا ہوں کہ جو عورتیں یا مرد عریانی اور فحاشی کو جائز قرار دیتے ہیں۔ وہ سراسر حدیث نبویؐ کی خلاف ورزی کر رہے ہیں اور پھر بھی اپنے آپ کو ایک مسلمان کا درجہ دیتے ہیں آخر میں پھر میں التماس کرتا ہوں کہ خدا کے لئے پاکستان کو مغربی ممالک کے ساتھ نہ ملائیں پاکستان ایک اسلامی ملک ہے اسے اسلامی ملک ہی رہنے دیں۔

پاک صاف معاشرہ تشکیل دیں!

(خدا داد دستگیر درانی بجیوٹا۔ عیسیٰ گلف)

بحث و نظر کے صفحات میں عریانی۔ فحاشی اور بے حیائی کو موضوع بنا کر ماہنامہ دوشیزہ نے قابل تعریف کارنامہ انجام دیا ہے۔

مئی ۱۹۷۷ء کے شمارے میں محترمہ طاہرہ یاسمین صاحبہ گورنمنٹ کالج کراچی نے اپنے خیالات کو "لڑکیاں اب غلامی قبول نہیں کریں گی" کا عنوان دے کر اس طرح تحریر فرمایا ہے۔

"ہماری نئی نسل عریانی۔ فحاشی اور بے حیائی کی طرف مائل نہیں۔ بلکہ آج کی عورت باشعور ہے۔ اور مردوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنا چاہتی ہے۔ انہیں ان کے اس حق سے محروم نہیں رکھا جا سکتا۔ عورتوں کو اب گھروں کے فصیلوں میں مقید نہیں رکھا جا سکتا۔ یہ وہ بنیادی انسانی حقوق ہیں۔ جنہیں مغربی ممالک کی عورتیں سو دو سو برس قبل پا چکی ہیں اور پاکستان کے تنگ نظر لوگ عورتوں کو ان کے اس حقوق سے محروم رکھنا چاہتے ہیں۔"

تو گویا یہ رجحان مغربی ممالک کے مقابلے میں پاکستان میں غیر معمولی تاخیر کے بعد فروغ پا رہا ہے۔ عریانی۔ فحاشی اور بے حیائی ایک ایسے متعدی مرض کی صورت حاصل کر چکے ہیں جس کے پھیلانے کے لئے کسی تحریری تبلیغ کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ ایسے کام ہمیشہ خود بخود پھیلتے ہیں۔

عام طور پر ٹی وی۔ فلم اور فحش لٹریچر کو اس بات کا ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا مندرجہ بالا قسم کی تحریر فحش لٹریچر سے کچھ کم ہے؟

"محترمہ طاہرہ یاسمین صاحبہ نے اس مسئلے کو علمی گفتگو میں بدل کر عورتوں کے حقوق کا ذکر شروع کر دیا ہے اور اس سے قبل کی تحریروں کو کھوکھلی اور بے جان قرار دیا ہے۔ میرے خیال میں اس مسئلے پر سب سے پہلے علمی گفتگو نہیں بلکہ مذہبی گفتگو کی جانے کیونکہ ہم سب مسلمان ہیں۔ مغربی ممالک کی تاریخ کا سہارا لینے کی بجائے سب سے پہلے ہمیں اس مسئلے کی طرف مذہبی نگاہ سے دیکھنا چاہیئے۔ ہمیں خدا کی طرف سے ایک ایسا ضابطہ حیات ملا ہے جس پر عمل کر کے ہم اس کی خوشنودی حاصل کر سکتے ہیں۔ جہاں تک عورتوں کے حقوق کا سوال ہے کسی عورت کے جائز حقوق سلب نہیں ہونے۔ فحاشی عریانی اور بے حیائی پر تبصرہ کرتے وقت عورت کے حقوق کا ذکر کرنا عورت کی توہین ہے۔ عورت تو ہمارے لئے قابل احترام ہے۔ بعض حضرات اس سلسلے میں جنسی تعلیم کی ضرورت پر زور دیتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ پورا معاشرہ اس قدر عریاں۔ فحاش اور بے حیا بن جائے کہ ایسی باتوں سے نفرت کرنے والا کوئی شخص باقی نہ رہے۔

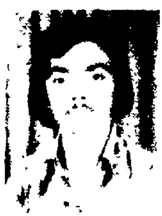
مذہب سے لاتعلقی اور والدین کا اپنے بچوں کو ناقص اخلاقی تربیت دینا ہی عریانی۔ فحاشی اور بے حیائی کے اسباب ہیں ان کے خاتمے کے لئے والدین کو مذہبی اصولوں کا سہارا لے کر میدان عمل

ہیں آنا چاہیئے۔

بچوں کا پہلا مدرسہ اُن کا گھر اور والدین ان کے استاد ہوتے ہیں۔ بچے اپنے پہلے مدرسے میں اپنے والدین کی مکمل سرپرستی میں تانبے کی اس تار کی مانند ہوتے ہیں جو بڑی آسانی سے موڑا جا سکتا ہے۔ اسلام کی مقرر کردہ عمر کی حد پر پہنچتے ہی بچوں کو ارکان اسلام کا پابند بنایا جائے ان کو مخرب اخلاق کاموں سے نفرت دلائی جائے۔ غرض ہر طرح سے ان کی صحیح تربیت کا خیال رکھا جائے کسی بات کو زبردستی ان سے تسلیم نہ کرایا جائے بلکہ انہیں ذہنی طور پر قائل کیا جائے اسی طریقے سے جب ان کی اخلاق دیکھ بھال مذہبی اصولوں کی روشنی میں ہوگی تو جوان ہو کر وہ ایک پاک و صاف معاشرہ کی تشکیل کا سبب بنیں گے۔

اب پچھتائے کیا ہوت ....!

محمد اسلم چنا۔ حیدرآباد



سب سے پہلے ہمیں اس بات پر غور کرنا چاہیئے کہ عریانی فحاشی اور بے حیائی کا آغاز کہاں سے ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں عریانی اور فحاشی لانے والے غیرملکی رسائل اور فلمیں ہیں اور یہی وہ چیزیں ہیں کہ جن کے باعث آج ہمارے ملک میں جنسی بے راہ روی پائی جاتی ہے۔ نئی نسل صرف اور صرف اس لئے فحاشی اور عریانی میں ملوث ہے کہ اسے غیرملکی فحش لٹریچر اور فلمی ٹکڑے مہیا کئے گئے ہیں اگر ایک آدمی نے کوئی چیز دیکھی ہی نہ ہو تو وہ اس چیز کی طلب نہیں کرے گا نہ ہی اسے اپنانے کی کوشش کرے گا۔

اگر فحاشی اور بے حیائی کو ہماری نئی نسل تک پہنچنے سے روک دیا جاتا تو میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ آج صورتحال یہ نہ ہوتی۔ لیکن اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ یقیناً یہ ایک طنز ہے لیکن اس نسل پر کہ جس نے نئی نسل کو اس عذاب میں مبتلا تو کردیا مگر اب اسے نجات دلانے کے بجائے الٹا اسی کو قصوروار کہتی ہے۔

نئی تہذیب کے انڈے

سید علیم عارف حسین اسد۔ مسقط عمان

بحث ونظر میں محترمہ آنسہ شیریں ایس۔ ایل کالج حیدرآباد نے ہمارے آباؤ اجداد کے خلاف غلط باتیں لکھی ہیں۔ محترمہ کو چاہیئے کہ ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں پرانی نسل کے لوگ ہر کسی کی ماں، بہن، اور بیٹی کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے مگر اس زمانے میں ایسا نہیں ہوتا۔

ماضی میں عورتیں تو بلا بنت از در جیسے کام کر کے فخر محسوس کرتی تھیں مگر آج کل کو پتا اور لالی بنتی ہیں حالانکہ اسلام ہم کو یہ سبق دیتا ہے کہ شادی کی بات والدین کریں مگر نئی نسل والی لڑکیاں اپنے محبوب خود پسند کرنے میں دن رات مصروف رہتی ہیں۔ نئی نسل کا ایک کارنامہ سن لیں۔

۱۹۷۶ء فروری کو راولپنڈی میں تین عورتیں جیب کاٹتے ہوئے گرفتار کرلی گئیں۔ کیا یہ بے حیائی کا زندہ ثبوت نہیں؟ والدین کو خبر تک نہ ہوتی لیکن لڑکیاں اپنے پسندیدہ لڑکوں کے ساتھ عیش کرنے میں مصروف ہوتی ہیں۔ ہماری دھرتی میں تو عریانی کی حد ہو چکی ہے ایسے ایسے گندے لباس ایجاد ہو چکے ہیں جن میں عورتیں اپنے جسم کو بطور نمائش پیش کرتی ہیں۔ میں چونکہ عرصہ سے باہر ہوں اس لئے اگر چند مثالیں باہر کی بھی دے دوں تو اچھا ہو گا۔ یہاں پرانی نسل کے لوگ انتہائی اخلاق والے، اسلام کے شیدائی اور پکے مسلمان ہیں۔ مگر نئی نسل پر اگر ایک نگاہ ڈال کر دیکھو تو شراب اور شباب دونوں زیادتی سے ملیں گے مجھے امید ہے کہ میری اس تحریر کو پڑھ کر نئی نسل اپنے گریبان میں منہ ڈالے گی اور اپنا محاسبہ کرے گی۔ یہ عنوان ایسا ہے جس کے ذریعے ہر انسان کھل کر اپنی رائے کا اظہار کر سکتا ہے

تازہ شمارے میں طاہرہ یاسمین گورنمنٹ کالج کراچی نے اپنی تحریر کا رخ بالکل دوسری جانب موڑ دیا ہے۔ میں تمام خواتین حضرات سے اپیل کروں گا کہ اپنے قلم کا رخ سچائی کی جانب رکھیں آخر میں یہی کہوں گا کہ

نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے
اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں!



کہکشاں

اُس روز ہوا میں آمدِ بہار کی موہوم سی خوشبوئیں بسی ہوئی تھیں۔ جیسے اس کے لباس اور سانسوں کی مہک فضا میں پھیل گئی ہو:
جب وہ کالج کے احاطے میں داخل ہوئی تو مجھے یوں لگا جیسے چاروں طرف سے پھول کھل اٹھے ہوں۔ کچھ تو اس کے لباس کی اجلاہٹ اور چہرے کی معصومیت نے مجھے اور جاوید کو مسحور سا کر دیا تھا۔ اور اوپر سے اس کی خوش رفتاری قیامت ڈھا رہی تھی۔ گو کالج میں میرا یہ آخری سال تھا لیکن اس سے پہلے کسی لڑکی نے بھی میری توجہ کو اپنی ذات میں یوں جذب نہیں کیا تھا۔ جب میں نے اسے دیکھا تو دیر تک مبہوت سا ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ حسن و رعنائی کے ساتھ ساتھ سلونی اور معصومیت کا بھی مرقع تھی۔

جاوید نے مجھے کہنی سے ٹھوکا لگایا اور مشورہ دیا کہ میں اس پیکرِ رعنائی تک دل کی بات پہنچانے میں اس کا سہارا لوں لیکن وہاں نامہ و پیام کی جسارت کا کسے ہوش تھا کہ دوسری جانب شاہانہ استغنا اور بے نیازی تھی۔ یعنی ؎

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں
واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں

اس کے اس سکوت اور طرزِ تغافل نے مجھے اور جاوید کو بھی حیرت میں ڈال دیا تھا۔ اور ہمارے شوقِ تجسس کو ایک مہمیز

[illegible] لینے وہاں بنی ہی لڑکیاں آئی تھیں کہکشاں ان سب میں کم سخن محبوب وفکر کی عادی اور کم آمیز تھی اور شاید سب سے زیادہ حیادار بھی!

روز صبح سویرے کہکشاں کبھی تو مجھے کتابوں کے اوپر نیچے ہاتھ جمائے اور نظریں جھکائے کالج کا چھپر یا صحن عبور کرتی نظر آتی اور کبھی ٹولیوں میں بکھری لڑکیوں اور لڑکوں پر طائرانہ نظر ڈالے بغیر سیدھی کلاس روم کی سمت بڑھتی نظر آتی۔ ایک بار کلاس میں داخل ہو کر پھر بلا ضرورت کم ہی ادھر ادھر جاتی۔ چنانچہ اس بندھے ٹکے پروگرام کے کارن اس سے میری بہت کم مڈھ بھیڑ ہوتی۔ ہاں کبھی بر سرِ راہ نظریں چار ہو بھی جاتیں تو ایک تجاہلِ عارفانہ کے ساتھ منہ پھیر کر وہ اپنے راستے ہو لیتی ـــــ یا کبھی "بزمِ ادب" کے فنکشنز میں یا کسی ڈیبیٹ کی تقریب میں رسمی طور پر اسے مخاطب کرنے کی جراءت کرتا تو صاف طرح دے جاتی یا مختصر سا جواب دے کر گفتگو سے پہلو تہی کر لیتی۔

کہکشاں کا وجود میرے لیے سچ مچ ایک معمے سے کم نہ تھا۔ میں اکثر رات گئے مطالعے کے دوران کتاب بند کر کے سوچا کرتا میرے اس قدر اشتیاق کے جواب میں اس کی بیزاری کس بناء پر ہے؟ کیا وہ جذبات و احساسات سے عاری پتھر کا محض ایک مجسمہ ہے یا اس کے سینے میں دھڑکتے ہوئے دل کی جگہ محض پتھر دھرا ہے۔ اس کی دلیتاؤں ایسی خاموشی اور متانت نے میرے اندر ایک ہلچل ایک طوفان کی صورت پیدا کر دی تھی۔ میں اپنے وجودِ معنوی کے اندر ایک تہہ و بالا کر دینے والے بھونچال سے دوچار ہو چکا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میرا پورا وجود کسی دہکتے الاؤ کے سامنے موم بتی کی طرح پگھلا جا رہا ہو، معدوم ہوتا جا رہا ہو۔

ان دنوں میرا دل بھی ایک موم بتی کی طرح پہروں چپ چاپ آنسو بہاتا رہتا تھا۔ کورس کی کتابیں اوّل تو طاقِ نسیاں پر اٹھا رکھی تھیں، جب انہیں کھول کر پڑھنے کی سعی کرتا تو کتاب کے کالے نیلے حروف میری آنکھوں تلے دیوانوں کا رقص شروع کر دیتے۔ ایک سطر پر سے نگاہ خود بخود پھسل کر دوسری سطر پر جا رکتی۔ کتاب کا پورے کا پورا! پیراگراف اپنے مفہوم سمیت پہلے صفحے سے اور پھر ذہن سے غائب ہو جاتا۔ کبھی پیراگراف تو لفظوں کے گورکھ دھندے کے ساتھ صفحے پر موجود رہتا مگر اس کا مفہوم سرے سے غائب ملتا۔ بڑا دھیان کے بکھرے ہوئے اجزا سمیٹ کر مفہوم کی طرف لانے کے جتن کرتا مگر اس میں کامیابی ہوتی بھی تو محض تھی کہ توجہ میں یکسوئی پیدا کر کے سطر کو سطر سے پھر پڑھنے لگتا لیکن اس پیراگراف تک پہنچتے پہنچتے پھر لفظوں کے معانی اور پیراگراف کا مفہوم معدوم ہونے لگتا!

اس آشوب فکر سے دوچار ہونے کے بعد میں بلا ارادہ کتابیں بند کر کے رکھ دیتا اور سوچنے لگتا کہ اگر پڑھائی کا یہی عالم رہا تو امتحان میں کامیابی کی کیا صورت ہوگی؟ اگر ذہنی انتشار کا یہی انداز رہا تو مقصدِ زیست کیونکر پا سکوں گا؟ میں بی اے کے سال آخر میں تھا اور کالج میں میری علمی ساکھ ایسی تھی کہ مجھے امتحان بہر صورت امتیازی حیثیت سے پاس کرنا چاہیے تھا۔ کالج میں ذہین طلباء میں شامل سمجھا جاتا تھا اس طرح میرے فکری انتشار سے نہ صرف میری کامیابی بلکہ میرا مستقبل بھی مخدوش ہو چلا تھا۔

تب میں کہکشاں کا دھیان جھٹک کر اپنے خیالات کو جتنا کتابوں میں لگانے کی سعی کرتا اتنا ہی اس کا خیال شدت کے ساتھ میرے احساسات پر غلبہ پا لیتا۔

ایک دن اس کے خیالوں کی یورش سے بچاؤ کی مجھے انوکھی راہ سوجھی۔ میں نے سوچا کیوں نہ اپنے اندر کوئی ایسی خوبی، کوئی کمال پیدا کر لوں کہ کہکشاں کے ذہن کے راستے دل میں سما جاؤں۔ اس روز کے بعد میں نے کالج کے طلباء میں ممتاز حیثیت حاصل کرنے کی شعوری کوششیں تیز تر کر دیں۔ یوں نہ صرف کتابوں سے اپنا منقطع رشتہ دوبارہ استوار کر لیا بلکہ حصولِ کمال کی خاطر "بزمِ ادب" کی تقاریب اور تقریری مقابلوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کالج بھر میں میری شگفتہ تقریروں اور شستہ اندازِ تخاطب کی دھوم مچ گئی۔ انہی دنوں میری مقبولیت میں اس قدر اضافہ ہوا کہ میں کالج یونین کا صدر بھی منتخب کر لیا گیا۔ پھر کیا تھا، کالج میں جدھر سے گزرتا لڑکے لڑکیاں آنکھوں میں ارادت اور عقیدت کے جذبات لیے مجھے سلام کرتے۔ کئی ایک بھولی تو مجھے جوش و جذبے سے کاندھوں پر اٹھا کر بے اختیار رقص بھی کرنے لگتے۔ اس مقبولیت اور ہر دلعزیزی نے جہاں میرے وقار میں اضافہ کیا وہاں میرے اندر بے پناہ خود اعتمادی اور شعورِ زیست کو بھی دوچند کر دیا۔ میری تعلیمی دلچسپی کے ساتھ ساتھ کالج کی سیاسی سرگرمیاں بھی بڑھ گئیں۔ میرا بیشتر وقت اب طلباء و طالبات کے مسائل پر غور و خوض کے لیے بلائی گئی میٹنگوں کو خطاب کرنے اور متعلقہ حکام سے ملاقات کرنے پر صرف ہو جاتا تھا۔

اس تعلیمی و سیاسی تگ و دو میں بارہا کہکشاں سے آمنا سامنا

…ی ہوا اور میں نے محسوس کیا کہ کالج میں کچھ عرصہ گزارنے کے بعد اس کی شرم و حجاب اور سادگی پسندی میں کمی آنے کی بجائے اور بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ اس میں بے باکی یا چلبلا پن نام کو بھی نہ آیا تھا بلکہ اس کا سادہ پہناوا اور بول چال کی معصومیت بھرا مشرقی انداز جوں کا توں تھا مجھے اس کی شخصیت میں آسمانوں کی پراسراریت اور سمندروں ایسی گہرائی نظر آئی۔

ایک روز سرِ راہے مڈبھیڑ ہونے پر کہکشاں کی آنکھوں میں غور سے جو دیکھا تو اس کی حیا پرور آنکھوں کی پتلیوں میں مجھے ایک ایسی چمک سی لہراتی محسوس ہوئی جس میں ارادت مندانہ اور کسی قدر دوستانہ جذبات کا خفیف سا عکس جھلکتا تھا۔ اس کی آنکھوں کی ضیا پاشی سے میرے دل میں چپ چاپ سو جانے والے چاہت کے جذبے نے پھر سے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے بعد جب بھی اس سے آنکھیں چار ہوئیں تو اس نور پاشی سے مجھے ایک حوصلہ اور ترغیب ملتی رہی اور زندگی میں آگے بڑھنے کی زبردست تحریک بھی!

چنانچہ دوسری بار جاوید میرا پیغام رساں بن کر جب اس کے پاس پہنچا تو میں اس کی واپسی تک امید و یاس کے سنگم پر غلطاں رہا۔ میری حالت عدالتِ عالیہ میں مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے اس مجرم ایسی تھی جو مرگ و زیست میں سے کوئی ایک فیصلہ سننے کے لیے اپنے ذہن کو تیار کر رہا ہو۔ کہکشاں کا ٹھکرا دینا میرے لیے سچ مچ مرگِ آرزو کے مترادف تھا۔ پھر شاید اس کی محبت کا کھلنے والا کنول اپنے آپ کملا جاتا۔ اور دل کی سطح پر تیرتا ہوا کبھی نظر نہ آتا۔ پھر شاید منگروں بھرے دل کی راہوار کی طنابیں کھینچ کر میں اسے اس سبزہ زار سے دور سیاست کے خارزار میں لے جاتا۔ اور وہاں سے پھر اس وادیِ خوش رنگ کی سمت پلٹ کر نہ آسکتا۔ لیکن میرے دل کو جذبۂ لطیف اور احساسِ محبت سے یکسر عاری کر دینا شاید قدرت کو منظور نہ تھا۔

جاوید لوٹا تو مسرّت و شادمانی کی بے پایاں کیفیت میں وہ نہ صرف پیغامِ بہار لایا بلکہ میرے لیے وصل کی نویدِ جانفزا بھی!

وہ شام میرے لیے زندگی کی ان چھوٹی مسرتوں اور انوکھی حلاوتوں کا پیغام لے کر آئی تھی۔ کہکشاں اور میں عالمِ کیف میں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے دور وادیوں کے دامن میں چمکتے روپہلے چشموں پر نظریں گاڑے مسرور و شاداں کھڑے تھے۔

"یہ میری زندگی کی پہلی محبت ہے اور کسی مرد سے پہلی ملاقات بھی ——!" کہکشاں کی آواز میں پہاڑی جھرنوں کی مسحور کن گنگناہٹ تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی غیر مرئی قوت میرے کانوں میں رس انڈیل رہی ہو!

"میری بھی یہ پہلی محبت ہے اور آخری بھی!"

میری یہ بات سن کر وہ کسی قدر چونکی اور پھر غیر شعوری طور پر میرے ہاتھ کو مضبوطی سے تھام لیا۔ اس کی نرم اور ملائم انگلیوں کے لمس سے مجھے ایک انوکھی راحت اور سکون کا احساس ہوا۔ جیسے کسی نے حسیں دل کے زخم پر پھاہا رکھ دیا ہو۔ اس نے اپنی خمار آلود آنکھیں وفورِ جذبات سے تقریباً موندتے ہوئے کہا:

"پہلے میں محبت کے نام سے گھبراتی تھی اور سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میں کسی کی محبت کا دم بھرنے لگوں گی۔ آج میرا رُواں رُواں جو ایک کیفیت میں ڈوبا ہوا ملتا ہے تو میں محسوس کر سکتی ہوں کہ جذبۂ محبت میں تو بڑا مزا ہے!"

میں نے اس کا سر اپنے شانے پر ٹکا دیا۔

"ہاں میں بھی اس انوکھی لذت سے سرشار ہوں!"

کچھ ہی دیر میں کہکشاں چہک چہک کر باتیں کرنے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ پہلے والی خاموش طبع اور متین صورت کہکشاں نہ ہو۔ اس کی باتوں میں نزاکتِ حسن اور شعریت بھی تھی اور احساسِ جمال بھی۔ وہ کہہ رہی تھی:



"شاہ بلوط اور صنوبروں کے خنک سایوں تلے ہماری چاہت کا رنگ کتنا افسانوی سا لگ رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پوری کائنات مہربان ہو کر محبوب کی آغوش کی طرح سکون بخش ہو گئی ہے۔"

میں نے یاد دلایا ——— "لیکن کہکشاں! پہلی بار جب میں نے جاوید کے ذریعے تمہیں پیغام بھجوایا تو تم نے برا کیوں مانا تھا؟"

وہ کچھ ٹھٹکی ——— "نہیں، وہ تو آپ کی اولین کوشش تھی۔ اور اولین کوشش کے جواب میں کوئی حیادار لڑکی اپنے آپ کو محبت کے پُرخطر راستے پر چلنے کے لیے تیار نہیں کر سکتی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس وقت میں آپ کا پیغام پا کر کچھ سٹپٹا ہی نہیں، بلکہ گھبرا بھی گئی تھی۔"

گو ہماری یہ اولین ملاقات زمانی اعتبار سے مختصر سی تھی مگر وہ ایک سحر آمیز کیفیت بن کر میری زندگی کے دلب و یابس پر محیط ہو گئی تھی

انہی دنوں مجھے ترقی میں کیپٹن شپ کی امید ہوئی تو مجھے انٹرویو دینے کے لیے باہر جانا پڑ گیا۔ پانچ سات روز بعد جب لوٹا تو جاوید نے بتایا کہ جس سرسبز شاخ پر آشیانے کی بنا رکھنی چاہی تھی وہ تو طوفان کی زد میں آ کر کبھی کی ٹوٹ چکی ہے۔ میں اس کی یہ بات سن کر طوفانی بگولوں کی زد میں آئے ہوئے ایک خشک پتے کی طرح چکرا کر رہ گیا۔

میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ گلستانِ محبت میں رکھا ہوا پہلا قدم آخری قدم ثابت ہو گا، کسے پتہ تھا کہ انتظارِ بے شمار کے بعد آنے والی بہار اتنی بے مہر اور مختصر ہو گی۔ میں شاکی تھا کہ قدرت نے دو معصوم روحوں کی محبت کی خلش عطا کر کے ان کے ساتھ ایسا بھیانک مذاق کیوں کیا؟ اتنی جلد بچھڑنا تھا تو وصلِ محبوب کی ساعت ہی کیوں آتی تھی ——!

بہرحال یہ ساعت آئی اور پلک جھپکتے گزر بھی گئی۔ اس کے بعد کہکشاں ایک طویل مدت تک میری نظروں سے اوجھل ہی رہی۔ یاد زندگی میں آنے والی بے کیف بہاروں اور خزاؤں کے ہر لمحے اور ہر منظر نے اس کی یادوں کے نقوش مدھم کرنے کی بجائے اور بھی گہرے کر دیئے۔ وہ جسمانی اعتبار سے دور ہو کر روحانی طور پر میرے اور بھی قریب آ گئی۔

بالآخر دو برس کی طویل مدت بعد اپنی کچھ رشتہ دار عورتوں کے جھرمٹ میں ایک روز وہ مجھے اچانک نظر آئی۔ مجھے دیکھ کر پہلے تو وہ کسی قدر محجوب سی ہوئی۔ پھر اس کا رنگ خزاں زدہ پتے کی طرح زرد پڑ گیا۔ میری نظروں میں ایک دم اولین ملاقات کا منظر گھوم گیا۔ اور کانوں میں اس کی حلاوت آمیز گفتگو میلوں دور سے آنے والی کانسی کی گھنٹیوں کی طرح ابھرنے لگی۔ جاوید نے عالمِ محویت سے مجھے جھنجھوڑا۔

"میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں گریز! اس کے دل میں اب بھی تمہاری یاد مچلتی ہے۔ کیونکہ اس کی آنکھوں میں سوزِ ناتمام کی ایک کیفیت اب بھی سلگتی نظر آتی ہے۔"

جاوید نے اپنی جہاں دیدگی اور تجربے کا نچوڑ میرے سامنے پیش کر دیا۔ اس کا اندازہ صحیح نکلا۔

دوسرے ہی روز شام کو سیر کے دوران اپنی رشتہ دار عورتوں سے کٹ کر ایک سہیلی کو ہمراہ لیے وہ مجھ سے آ ملی۔ ہم نے کول کی عقبی پہاڑی کے سبزے پر بیٹھ گئے، جہاں بارش سے دھلی اُجلی چھتوں والی وادی ہتھیلی پر رکھے ہوئے ایک چمکیلے موتی کی طرح نظر آ رہی تھی۔

میری آنکھوں میں سوالات کا ایک ہجوم سا دیکھ کر وہ خود ہی کہنے لگی:

"گریز! تم نے تو ضرور یہ سوچا ہو گا کہ شاید میں بے وفا تھی، نہیں، خدا کی قسم میں بے وفا نہیں ہوں۔ صرف مجبور ہوں۔ بے بس ہوں، ان ہزاروں لڑکیوں کی طرح مجبور اور بے بس جو اپنے خاندانی ناموس اور ان کے جھوٹے وقار کی بھینٹ چڑھ جایا کرتی ہیں۔"

میں نے محسوس کیا کہ کہکشاں کا لہجہ غم سے بوجھل ہے اور اس کی آنکھوں میں کسی محرومی اور تلخی احساس کے سائے سے لہرا رہے ہیں۔ کسی انجانے جذبے کے تحت وہ جھک کر جیسے میرے پاؤں چھو

بستی تھی۔ مگر میں نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا۔ اور شفقت
ے انداز میں اس کے گالوں اور سر کو تھپتھپایا۔ وہ وحشت زدہ
نی کی طرح بستی کی اور دیکھ رہی تھی اور میں صباحتی کی طرف!

"پہلے میں سمجھا تھا کہ شاید آپ مجبور تھیں۔ مگر بعد میں جو اس
طے پر غور کیا تو دل نے کہا، نہیں! تم شاید مجبور نہیں تھیں بلکہ
روفا تھیں۔ اس محبت کی حیثیت تمہارے نزدیک محض ایک خواب
سی تھی۔ تم نے صرف ایک سپنا دیکھا تھا جسے صبح آنکھ کھلنے سے پہلے
ی لبسرا دیا تھا!"

میری بات میں غیر ارادی طور پر ایک دبی دبی ملامت کا رنگ
ابھر آیا جسے وہ محسوس کر کے ایک دم رنجیدہ ہو گئی۔ اس نے آگے بڑھ
کر میرے ہونٹوں پر انگلیاں رکھ دیں۔

"بس بس ڈیئر! خدا کے لیے سب کچھ کہہ لیں مگر پلیز! مجھے بے وفا
نہ کہیں —— پلیز گل ..!"

یکایک اس نے اپنا سر میرے شانے پر گرا دیا اور کسی دکھی
بالک کی طرح سسک سسک کر رونے لگی —— "نہیں نہیں
اللہ قسم نہیں میں بے وفا نہیں ہوں۔ تمہارے جانے کے بعد ہمارے
دور کے ایک رشتہ دار نے اپنے ملنے جلنے والے ایک پختہ عمر جاگیردار
کے ساتھ میرا ناطہ طے کرا دیا۔ امی ابا کو اس نے اس قدر اعتماد میں
لے لیا تھا کہ میری ایک نہ چلی اور وہ لوگ مجھے کار میں بٹھا کر مال غنیمت
کی طرح لے اڑے۔ میں مجبور بے بس جسمانی طور پر تو ان کے ساتھ ہو
لی مگر میرا دل اور میری روح یہیں ان وادیوں میں بھٹکتی رہ گئی۔
تم سے سینکڑوں میل دور ہو کر میرے سبھی خواب پریشان ہو گئے۔ ان
خوابوں میں آ کر بار! تم نے مجھے رلایا۔ مجھے بے وفا ہونے کا طعنہ بھی
دیا مگر تمہاری قسم میں بے وفا نہیں تھی۔ اگر بے وفا ہوتی تو آج دو
سال گزرنے پر تمہاری محبت کی کسک بھی میرے دل کی تہوں سے
مٹ چکی ہوتی۔"

میں اس کے گالوں پر لڑھکتے آنسو اپنے رومال سے خشک
کرنے لگا اور اس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے اس کے سر کو تھپک ڈالا
"کہکشاں —— !" میں نے آواز میں بڑی ملائمت سمیٹ
کر اسے پکارا۔

"گل ریز —— !" اس کی دھیمی مترنم صدا گونجی۔

"اگر برا نہ مانو تو ایک بات کہوں؟"

"کہو —— میں گوش بر آواز ہوں!"

"میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ تم اس زندگی کے ساتھ اب سمجھوتہ کیوں
نہیں کر لیتیں؟"

اس نے مجھے ایسی کربناک نظروں سے دیکھا جیسے میں نے
بجائے کی انی اس کے دل میں اتار ڈالی ہو۔

"اس محبت کو ایک سہانا خواب جان کر اب بھول ہی جاؤ
تو بہتر ہے۔ تمہارا شوہر ایک وضعدار آدمی ہے۔ بقول تمہارے ہر
قسم کے آرام و آسائش کا دھیان رکھتا ہے۔ جسم کے ساتھ وہی تمہاری
روح کا مالک بھی ہو تو کیا ہی اچھا ہو۔ جسم ایک طرف اور روح دوسری
طرف بھٹکتی پھرے تو زندگی خواہ مخواہ جہنم بن جایا کرتی ہے۔"

وہ میرے ناصحانہ انداز پر مچل گئی اور بڑی افسردہ ہو کر بولی:

"مجھے تم سے ایسے الٹے مشورے کی ہرگز توقع نہ تھی۔ میں نے تو
تمہیں اپنا غمگسار ساتھی جان کر دل کا حال سنایا تھا۔"

میں خفیف سا ہو کر اس کے پریشان بالوں کو انگلیوں سے
سلجھانے لگا۔

اس کے بعد کہکشاں سے اکثر ملاقاتیں رہنے لگیں۔ کبھی تم صبح
کے وقت ملتے اور کبھی شام کے جھٹپٹے میں۔ اس دوران جہان بھر کے
موضوعات زیر بحث آتے۔ شکوہ و شکایت کا سلسلہ بھی چل نکلتا ——
راز و نیاز کی بھی باتیں ہوتیں اور ہم آغوشیوں کے مرحلے بھی آتے مگر ان
میں بھی حد اعتدال کا دونوں کو پاس رہتا۔

ایک بار بیٹھے بیٹھے اس نے نہ جانے کیوں اس خدشے کا اظہار

قارئین و افسانہ نگار حضرات سے!

جو قارئین کرام و افسانہ نگار حضرات ہمیں مختلف عنوانات کے تحت خطوط اور افسانے اشاعت کیلئے ارسال فرماتے ہیں ان سے گزارش ہے کہ وہ ان امور کا ضرور خیال رکھیں۔

- تحریر صاف اور خوشخط ہو۔
- کاغذ کے ایک طرف لکھیں۔
- معقول حاشیہ اور سطروں کے درمیان فاصلہ چھوڑ کر لکھیں۔

(ادارہ)



وہ شاہ بلوطوں اور صنوبروں کے خنک سایوں تلے ہماری محبت کا رنگ کتنا افسانوی سا لگ رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پوری کائنات مہربان ہو کر محبوب کی آغوش کی طرح سکون بخش ہو گئی ہے۔"

میں نے یاد دلایا ——— "لیکن کہکشاں! پہلی بار جب میں نے جاوید کے ذریعے تمہیں پیغام بھجوایا تو تم نے بُرا کیوں مانا تھا؟"

وہ کچھ شرمائی ——— "نہیں، وہ تو آپ کی اولین کوشش تھی۔ ور اولین کوشش کے جواب میں کوئی حیادار لڑکی اپنے آپ کو محبت کے پُرخطر راستے پر چلنے کے لیے تیار نہیں کر سکتی۔ سچ تو یہ کہ اس وقت میں آپ کا پیغام پا کر کچھ سٹپٹا ہی نہیں، بلکہ گھبرا بھی گئی تھی۔"

گو ہماری یہ اولین ملاقات زمانی اعتبار سے مختصر سی تھی مگر وہ یک سحر آمیز کیفیت بن کر میری زندگی کے رطب و یابس پر محیط ہو گئی تھی۔

انہی دنوں مجھے فوج میں کمیشن ملنے کی امید ہوئی تو مجھے انٹرویو دینے کے لیے باہر جانا پڑ گیا۔ پانچ سات روز بعد جب لوٹا تو جاوید نے پا کر جس سر سبز شاخ پر آشیانے کی بنا رکھنا چاہی تھی وہ تو طوفان کی میں آ کر کبھی کی ٹوٹ چکی ہے۔ میں اس کی یہ بات سن کر طوفانی گھیل ند میں آئے ہوئے ایک خشک پتے کی طرح چکرا کر رہ گیا۔

میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ گلستانِ محبت میں رکھا ہوا قدم آخری قدم ثابت ہو گا۔ کسے پتہ تھا کہ انتظار بے شمار کے بعد والی بہار اتنی بے مہر اور مختصر ہو گی۔ میں شاکی تھا کہ قسمت نے دو سوم روحوں کی محبت کی خلش عطا کر کے ان کے ساتھ ایسا مذاق کیوں کیا؟ اتنی جلد بچھڑنا تھا تو وصلِ محبوب کی ساعت ہی کیوں آئی تھی ——؟

بہرحال یہ ساعت آئی اور پلک جھپکتے گزر بھی گئی۔ اس کے بعد کہکشاں ایک طویل مدت تک میری نظروں سے اوجھل ہی رہی۔ لیکن زندگی میں آنے والی بے کیف بہاروں اور خزاؤں کے ہر لمحے اور ہر منظر نے اس کی یادوں کے نقوش مدھم کرنے کی بجائے اور بھی گہرے کر دیئے۔ وہ جسمانی اعتبار سے دُور ہو کر روحانی طور پر میرے اور بھی قریب آ گئی۔

بالآخر دس برس کی طویل مدت بعد اپنی کچھ رشتہ دار عورتوں کے جھرمٹ میں، ایک روز وہ مجھے اچانک نظر آئی۔ مجھے دیکھ کر پہلے تو وہ کسی قدر مجحوب سی ہوئی۔ پھر اس کا رنگ خزاں زدہ پتے کی طرح زرد پڑ گیا۔ میری نظروں میں ایک دم اولین ملاقات کا منظر گھوم گیا۔ اور کانوں میں اس کی حلاوت آمیز گفتگو میلوں دور سے آنے والی کانسی کی گھنٹیوں کی طرح ابھرنے لگی۔ جاوید نے عالمِ محویت سے مجھے جھنجوڑا۔

"میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں گریز! اس کے دل میں اب بھی تمہاری یاد مچلتی ہے۔ کیونکہ اس کی آنکھوں میں سوزِ ناتمام کی ایک کیفیت اب بھی سلگتی نظر آتی ہے۔"

جاوید نے اپنی جہاں دیدگی اور تجربے کا نچوڑ میرے سامنے پیش کر دیا۔ اس کا اندازہ صحیح نکلا۔

دوسرے ہی روز شام کو سیر کے دوران اپنی رشتہ دار عورتوں سے کٹ کر ایک سہیلی کو ہمراہ لیے وہ مجھ سے آ ملی۔ ہم ہائی سکول کی عقبی پہاڑی کے سبزے پر بیٹھ گئے۔ جہاں بارش سے دھلی اُجلی چھتوں والی وادی ہتھیلی پر رکھے ہوئے ایک چمکیلے موتی کی طرح نظر آ رہی تھی۔

میری آنکھوں میں سوالات کا ایک ہجوم سا دیکھ کر وہ خود ہی کہنے لگی:

"گریز! تم نے تو ضرور یہ سوچا ہو گا کہ شاید میں بے وفا تھی، نہیں، خدا کی قسم میں بے وفا نہیں ہوں! صرف مجبور ہوں۔ بے بس ہوں۔ ان ہزاروں لڑکیوں کی طرح مجبور اور بے بس جو اپنے خاندانی ناموس اور ان کے جھوٹے وقار کی بھینٹ چڑھ جایا کرتی ہیں!"

میں نے محسوس کیا کہ کہکشاں کا لہجہ غم سے بوجھل ہے اور اس کی آنکھوں میں کسی محرومی اور تلخیٔ احساس کے سائے سے لہرا رہے تھے۔ کسی انجانے جذبے کے تحت وہ جھک کر جیسے میرے پاؤں چھو

چاہتی تھی۔ مگر میں نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا۔ اور شفقت بھرے انداز میں اس کے گالوں اور سر کو تھپتھپایا۔ وہ وحشت زدہ ہرنی کی طرح بستی کی اور دیکھ رہی تھی اور میں عہدِ ماضی کی طرف!

"پہلے میں سمجھا تھا کہ شاید آپ مجبور تھیں۔ مگر بعد میں جو اس معاملے پر غور کیا تو دل نے کہا، نہیں! تم شاید مجبور نہیں تھیں بلکہ بے وفا تھیں۔ اس محبت کی حیثیت تمہارے نزدیک محض ایک خواب سی تھی۔ تم نے صرف ایک سپنا دیکھا تھا جسے صبح آنکھ کھلنے سے پہلے ہی بسرا دیا تھا!"

میری بات میں غیر ارادی طور پر ایک رنجش ملا شکایتی رنگ ابھر آیا جسے وہ محسوس کر کے ایک دم رنجیدہ ہوگئی۔ اس نے آگے بڑھ کر میرے ہونٹوں پر انگلیاں رکھ دیں۔

"بس بس ڈیئر! خدا کے لیے سب کچھ کہہ لیں مگر پلیز، مجھے بے وفا نہ کہیں ـــــ پلیز گل۔۔!"

یکایک اس نے اپنا سر میرے شانے پر گرا دیا اور کسی دکھی بالک کی طرح سسک سسک کر رونے لگی ـــــ "نہیں، نہیں اللہ قسم نہیں میں بے وفا نہیں ہوں۔ تمہارے جانے کے بعد ہمارے دور کے ایک رشتہ دار نے اپنے ملنے جلنے والے ایک پختہ عمر جاگیردار کے ساتھ میرا ناطہ طے کرا دیا۔ امی ابا کو اس نے اس قدر اعتماد میں لے لیا تھا کہ میری ایک نہ چلی اور وہ لوگ مجھے کار میں بٹھا کر مالِ غنیمت کی طرح لے اڑے۔ میں مجبور بے بس جسمانی طور پر تو ان کے ساتھ ہو لی۔ مگر میرا دل اور میری روح یہیں ان وادیوں میں بھٹکتی رہ گئی۔ تم سے سینکڑوں میل دور ہو کر میرے سبھی خواب پریشان ہو گئے۔ ان خوابوں میں آکر بارہا تم نے مجھے رلایا۔ مجھے بے وفا ہونے کا طعنہ بھی دیا مگر تمہاری قسم میں بے وفا نہیں تھی۔ اگر بے وفا ہوتی تو آج دو سال گزرنے پر تمہاری محبت کی کسک بھی میرے دل کی تہوں سے مٹ چکی ہوتی۔"

میں اس کے گالوں پر ڈھلکتے آنسو اپنے رومال سے خشک کرنے لگا اور اس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے اس کے سر کو تھپک دیا

"کہکشاں ـــــ!" میں نے آواز میں بڑی ملائمیت سمیٹ کر اسے پکارا۔

"گل ریز ـــــ!" اس کی دھیمی مترنم صدا گونجی۔

"اگر برا نہ مانو تو ایک بات کہوں؟"

"کہو ـــــ میں گوش بر آواز ہوں!"

"میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ تم اس زندگی کے ساتھ اب سمجھوتہ کیوں نہیں کر لیتیں؟"

اس نے مجھے ایسی کربناک نظروں سے دیکھا جیسے میں نے بھالے کی انی اس کے دل میں اتار ڈالی ہو۔

"اس محبت کو ایک سہانا خواب جان کر اب بھول ہی جاؤ تو بہتر ہے۔ تمہارا شوہر ایک وضعدار آدمی ہے۔ بقول تمہارے ہر قسم کے آرام و آسائش کا دھیان رکھتا ہے۔ جسم کے ساتھ وہی تمہاری روح کا مالک بھی ہو تو کیا ہی اچھا ہو۔ جسم ایک طرف اور روح دوسری طرف بھٹکتی پھرے تو زندگی خواہ مخواہ جہنم بن جایا کرتی ہے۔"

وہ میرے ناصحانہ انداز پر مچل گئی اور بڑی افسردہ ہو کر بولی:

"مجھے تم سے ایسے روکھے مشورے کی ہرگز توقع نہ تھی۔ میں نے تو تمہیں اپنا غمگسار ساتھی جان کر دل کا حال سنایا تھا۔"

میں خفیف سا ہو کر اس کے پریشان بالوں کو انگلیوں سے سلجھانے لگا۔

اس کے بعد کہکشاں سے اکثر ملاقاتیں رہنے لگیں۔ کبھی ہم صبح کے وقت ملتے اور کبھی شام کے جھٹپٹے میں۔ اس دوران جہاں بھر کے موضوعات زیرِ بحث آتے۔ شکوہ و شکایت کا سلسلہ بھی چل نکلتا ـــــ رازونیاز کی بھی باتیں ہوتیں اور ہم آغوشیوں کے مرحلے بھی آتے مگر ان میں بھی حدِ اعتدال کا دونوں کو پاس رہتا۔

ایک بار بیٹھے بیٹھے اس نے نہ جانے کیوں اس خدشے کا اظہار

قارئین و افسانہ نگار حضرات سے!

جو قارئین کرام و افسانہ نگار حضرات ہمیں مختلف عنوانات کے تحت خطوط اور افسانے اشاعت کیلئے ارسال فرماتے ہیں ان سے گزارش ہے کہ وہ ان امور کا ضرور خیال رکھیں۔

- تحریر صاف اور خوشخط ہو۔
- کاغذ کے ایک طرف لکھیں۔
- معقول حاشیے اور سطروں کے درمیان فاصلہ چھوڑ کر لکھیں۔

(ادارہ)



کیا کہیں ہمیں کوئی دیکھ نہ لے، پھر خود ہی انتہائی دلیرانہ انداز میں کہنے لگی ـــــ "کوئی دیکھتا ہے تو دیکھتا پھرے، میری بلا سے! مجھے اب ذرا بھی ڈر نہیں لگتا، میں دنیا سے ڈرتی تھوڑی ہوں، گھر والوں سے عزیز و اقارب سے، شوہر سے، کسی سے بھی نہیں۔ آخر ان لوگوں نے مجھے کیا دیا ہے؟ ان کی سازش نے میری ننھی منی آرزوؤں کو کچل کر مجھے ناحق روپے پیسے کی بھینٹ چڑھا دیا ہے۔"

وہ تھوڑی دیر کے لیے رُک کر دور خلاؤں میں دیکھتے ہوئے کچھ سوچنے لگی اور پھر مجھے متوجہ پا کر خود ہی کہنے لگی:

"یوں تو میرے ارد گرد روپے پیسے کے انبار لگے رہتے ہیں لیکن جب میں احساسات کی بھٹی میں جلنے لگتی ہوں تو یہی روپیہ پیسے کے انبار زہریلے اژدہے بن کر میری نظروں تلے ناچنے لگتے ہیں اور میں پہروں مجبور و بے بس انسانوں کے خون سے نچڑی ہوئی دولت کے بارے میں سوچنے لگتی ہوں جو میرے لکھ پتی شوہر نے اپنی تجوریوں میں بند کر کے ان کی چابیاں میرے حوالے کر رکھی ہیں۔ کبھی کبھی میرے اندر کی باغی عورت جھنجلا کر جاگ اٹھتی ہے۔ اور میں سوچتی ہوں کہ اس کی ساری کی ساری دولت کو اپنے جسم کی آرائش اور عیش و عشرت پر صرف کر کے اپنی محرومی کا انتقام لوں۔ اسی دولت نے تو میری ہنستی مسکراتی روح کو نگل لیا ہے۔ اور مجھے اطلس و کمخواب میں کفنائی ہوئی ایک لاش بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس ماحول میں مسلسل دو برس تک رہتے ہوئے مجھے گھن سی آنے لگی ہے جس میں بیوپار ہی بیوپار ہے، تصنع ہی تصنع ہے۔ جس میں زیور، کوٹھی اور کار کی چاہت میں سبھی مرتے ہیں مگر کسی کے سینے میں دوسرے انسان کے لیے دھڑکتا ہوا محبت بھرا دل نہیں ہے؟"

اس کی باتیں سن کر مجھے خیال آیا کہ غم حد سے گزر جائے تو ایک نارمل انسان کو ابنارمل، اور عام سوچنے والے کو فلسفی بنا کر رکھ دیتا ہے۔ اس وقت کہکشاں پر مجھے ایک ایسی باغی عورت کا گمان گزرا جو اپنے گھٹے ہوئے ماحول اور معاشرتی فرسودگی کے خلاف برسرِپیکار ہو۔ مجھے اس کی جرأت مندانہ فلسفیانہ باتیں سن کر یقین ہی نہ آتا تھا کہ یہ وہی کالج کی چھوٹی موٹی ایسی شرمیلی اور کم سخن لڑکی ہے۔

ایک شام کہکشاں سے ملاقات ہوئی تو جانے کدھر سے اس کی دونوں بچیاں پارک میں کھیلنے کے لیے گھر کی خادمہ کے ساتھ آ دھمکیں۔ معاً وہ مجھ سے دور ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔

میں نے کہا:

"ابھی دل کچھ تشنگی محسوس کر رہا تھا کہ تم جانے بھی لگیں، کیا رات کے وقت ہماری ملاقات ممکن نہیں؟"

یہ سن کر وہ چنبیلی کی لچکیلی شاخ کی طرح کانپ گئی۔ اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اور کسی قدر رنجیدہ ہو کر کہنے لگی:

"مجھے تم سے یہ امید نہ تھی کہ تمہاری سوچ بھی آج کل کے دوسرے نوجوانوں کی طرح سفلی اور سطحی ہو گی۔ دن کے اجالے میں یا شام کی مغموم سی روشنی میں تو ایک طرح کے تقدس کا احساس ملتا ہے۔ لیکن رات کا اندھیرا تو گناہوں کی طرح خوفناک ہوتا ہے۔ اور میری روح تو گناہ کے تصور سے ہی کانپ اٹھتی ہے!"

میں نے ندامت کے طور پر اپنا سر جھکا لیا، اور وہ چلی گئی۔

پھر کئی روز تک اس سے ملاقات نہ ہو سکی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا خادمہ نے ہمیں اکٹھے دیکھ لیا ہے اور اس کا ذکر گھر بھر میں کر دیا ہے اور گھر والوں نے اس پر پابندیاں دوچند کر دی ہیں۔

ایک روز رات گئے اس نے بڑی پریشانی اور اضطرار کی حالت میں میرے دروازے پر دستک دی۔ میں آنکھیں ملتا ہوا باہر آیا تو دیکھا اس کے ایک ہاتھ میں کپڑوں کی گٹھری اور دوسرے میں زیورات وغیرہ کا ڈبہ تھا۔ میں اسے اس حالت میں دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ اس وقت سردی کے باوجود میرے پسینے چھوٹ گئے۔

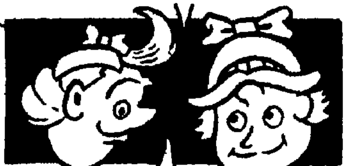
اسے اندر لا کر صوفے پر بٹھایا۔ میرے پوچھنے سے پہلے ہی وہ پھٹ پڑی:

"میں شوہر اور سسرال والوں کے خلاف نفرت کی آگ میں کب سے جل رہی تھی۔ میں روز روز کے لڑائی جھگڑوں سے تنگ آ چکی تھی۔ اور آج میں سارے ناطے بندھن توڑ کر آ گئی ہوں، صرف اپنی محبت کو

ہوں، ورنہ اس گھٹے ہوئے ماحول میں اس کا بھی دم گھٹ
۔ گریز! خدارا مجھے بچا لو، مجھے کہیں چھپا لو، مجھے کہیں لے چلو"
اس کے جذبات کی اضطراری کیفیت نقطۂ عروج پہ تھی۔
اپنے منتشر حواس کو یکجا کیا۔ اسے حوصلہ دیا۔ اور جب وہ سامنے
ہمدد پاکر ذہنی طور پر کسی قدر پرسکون ہوئی تو اسے اس کے
سے باز رکھنے کے لیے بہت سے دلائل بھی دے ڈالے:
"کہکشاں! ذرا سوچو تو کیا یہ سراسر بزدلی نہیں ہے اور ایک
۔ خود غرضی بھی ۔۔۔! بھلا بتلاؤ، ہم لوگ بھاگ کر اگر دنیا کے
کنارے پر بھی چلے گئے تو کیا ضمیر کی چبھن سے بچ جائیں گے؟
ے ضعیف والدین اور معصوم بچوں کے آنسو کیا ہمارے احساس
دہکتے انگارے نہ بن جائیں گے؟ ۔۔۔ ابھی کہکشاں! پیاری
ں! محبت تو ایک بڑا ہی معصوم اور بے ضرر سا جذبہ ہے۔
تو نرمی اور سلگن ہوتی ہے خود غرضی اور سنگدلی نہیں! محبت
کی تکمیل کا نام ہرگز نہیں ہے۔ محبت دوسرے گھروں کے چراغ
پنے گھر میں اجالا کرنے سے عبارت نہیں ہے بلکہ اس میں تو
روؤں اور ارمانوں کا لہو جلا کر دوسروں کے لیے روشنی مہیا کی
ہے۔ اس کی تکمیل کچھ پا لینے کی آرزو میں نہیں بلکہ سب کچھ کھو
میں ہے۔ یہ چاند کی طرح بکھرے کر جینے کی بجائے سورج کی طرح
بکھرے کر جینے میں زندگی کی عظمت تصور کرتی ہے۔"
کہکشاں پر میرے انداز تخاطب یا زور خطابت کا اتنا اثر
ہوا کہ وہ دیر تک تذبذب کے عالم میں کھوئی ہوئی سی کھڑی مجھے
ن نظروں سے دیکھتی رہی۔ پھر نہ جانے کس احساس کے تحت
ے صبر و ضبط کا بند ٹوٹ گیا اور وہ گھٹری ڈبڈبا بھینک کر بے اختیار
سینے سے لپٹ گئی اور دیر تک سسکیاں بھر کر روتی رہی اور
مال سے اس کے آنسو خشک کرتا رہا۔ اور اس کی بکھری ہوئی
کو اس کی پیشانی سے ہٹاتا رہا۔
"میں نے محسوس کیا ہے کہکشاں! کہ میری وجہ سے تمہیں بہت
ا ہے۔ میرے کارن تمہاری ازدواجی مسرتیں گہنا گئی ہیں کہکشاں!
ت تو شاید تمہیں میرے رویے سے اختلاف ہو اور تم میرے
کی وجہ سے مجھ سے نفرت بھی کرنے لگو۔ مگر کچھ عرصہ بعد جب
ت کرنے والے شوہر اور اپنی پھول سی بچیوں کے درمیان تمہاری جنت
مسرتوں اور راحتوں میں گھری ہوگی اور جذبات کی تند و تیز آندھی
ہوگی تو تم ضرور محسوس کروگی کہ میں نے کوئی غلط نہیں سوچا تھا بلکہ

وہی کچھ کیا تھا جو میری انسانیت کا تقاضا تھا اور محبت کو انسانیت
سے کسی طور جدا نہیں کیا جا سکتا!"
میں نے کہکشاں کے نرم و نازک ہاتھوں کو چوما اور اس کی
خوبصورت پیشانی پر الوداعی بوسہ دیا۔ پھر اس کا بازو تھام کر رات کی تاریکی
میں اسے اس کے گھر پہنچا آیا۔ یوں کہ اتنی بڑی اور قیامت خیز بغاوت
کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ ہمیشہ کے لیے بچھڑتے ہوئے اپنے
گھر میں دوبارہ داخل ہونے سے پہلے تو وہ ہچکچائی پھر آنسو پونچھتے ہوئے
اندر داخل ہو گئی۔
چند ہی روز بعد میں نے کوشش کر کے اپنا پاسپورٹ بنوا
لیا اور ملکوں ملکوں سفر کرتا ہوا ایک دوسرے براعظم میں پہنچ گیا۔ اپنا
شہر اور ملک چھوڑتے ہوئے درد و کرب کے عالم سے دوچار تو ہوا لیکن
اس کے سوا قلبی سکون کے لیے کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ میں اس لیے اتنی
دور نکل آیا کہ کہیں پھر کہکشاں کا نور دھندلا نہ جائے۔ اور دل مضطرب
پھر کسی کے لیے پریشاں خاطری اور جذباتی کشاکش کا موجب نہ بن
جائے اور کسی کی زندگی پر گہن کا ہالہ بن کر چھا یا نہ کر دے!

ریاض مرزا



تکلف برطرف

آپ اس عنوان کے تحت سیاسی، علمی، ادبی، معاشرتی اور ثقافتی نوعیت کے سوالات بھیج سکتے ہیں۔ سوالات بھیجتے وقت تین باتوں کا خیال رکھیں (۱) زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیجے جائیں جن میں سے دو منتخب سوالوں کا جواب شائع کیا جائے گا۔ (۲) سوالات دلچسپ، مختصر اور خوشخط لکھے ہوئے ہوں، (۳) تہذیب و اخلاق سے گرے ہوئے سوالات نہ بھیجے جائیں۔ (ادارہ)

سمیع اللہ عقلی، ملاڈ کانہ

س: قسمت کا لکھا پورا ہوتا ہے پھر گناہوں کی سزا کیوں؟

ج: تاکہ انسان اپنے ہوش و حواس میں رہے۔

س: تدبیر سے تقدیر بدلی جا سکتی ہے تو پھر تقدیر کی ضرورت ہی کیا ہے؟

ج: تاکہ انسان میں جستجو اور عمل کی لگن پیدا ہو سکے۔

ایک صاحب ٹیکسی میں جا رہے تھے۔ ڈرائیور منچلا تھا اور کار خطرناک حد تک تیز چلا رہا تھا۔ دو چار جگہ جب حادثہ ہوتے ہوتے بچا تو ان صاحب نے گھبرا کر ٹیکسی والے سے کہا "بھائی ذرا آہستہ چلاؤ ورنہ نہیں تو میرے بارہ بچوں کا خیال کر کے گاڑی احتیاط سے چلاؤ۔"

ڈرائیور نے ہنستے ہوئے کہا "صاحب احتیاط برتنے کا جو مشورہ آپ مجھے دے رہے ہیں اس پر خود آپ کو برسوں پہلے عمل کرنا چاہیے تھا۔"

صبیحہ بانو، شیخوپورہ

س: کیا خیال ہے جب تک آرمی آفیسرز کی ایک نئی کھیپ تیار نہیں ہو جاتی "آئیڈیل" کی تلاش کا کالم بند کر دیا جائے؟

ج: مگر نئی کھیپ تیار کیسے ہوگی محترمہ! کیا آپ کے پاس کوئی نسخہ ہے؟

س: جوابات دیتے وقت تھوڑا سا تہذیب کے دائرے میں رہ کر آئیں تو کیسا رہے گا؟

ج: کیا آپ تہذیب کے "دائرے" کی وضاحت کر سکیں گی!

رضیہ تبسم، دوبئی

س: انسان کا اصل روپ کب سامنے آتا ہے؟

ج: جب وہ دوسری شادی کر کے پہلی بیوی کے دربار میں پیش ہوتا ہے۔

س: عقلمند لوگوں کی پہچان کیا ہے؟

ج: بعض وقت بہت مشکل پڑ جاتی ہے۔

ایک اجنبی ایک عورت کے پیچھے پیچھے ایک کپڑوں کی دکان میں داخل ہوا یکایک عورت نے چیخ ماری اور اجنبی فوراً دکان سے باہر بھاگا اور سیدھا ایک گزرتے ہوئے پولیس مین کی زد میں آ گیا۔ تلاشی پر معلوم ہوا کہ وہ مسلح تھا اور پولیس کو کئی ڈاکے کی وارداتوں میں اس کی تلاش تھی۔ بعد میں دکاندار نے عورت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا "عقلمند خاتون! اگر آپ نہ چیختیں تو میں لٹ جاتا۔ مگر آپ اسے پہچان کیسے گئیں کہ وہ ڈاکو تھا؟" عورت نے جواب دیا "اسے تو میں جانتی بھی نہیں تھی۔ میں تو ساڑھی کی قیمت پڑھ کر چیخی تھی۔"

سارہ، میڈیکل کالج لاڑکانہ

س: جب لڑکے چھیڑتے ہیں تو نہ جانے کن کن خطابات سے نوازے جاتے ہیں اور لڑکیاں چھیڑیں تو شریر کہلاتی ہیں۔

؛ دراصل لڑکوں کو چھیڑنے کا سلیقہ نہیں آتا۔

ایک غیر آباد جگہ پر کار روکتے ہوئے ایک نوجوان نے اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی لڑکی سے کہا "اگر میں حسن کی شان میں گستاخی کروں تو کیا تم کسی کو مدد کے لئے پکارو گی؟"

لڑکی نے جواباً پوچھا "کیا تمہارے خیال میں واقعی تمہیں مدد کی ضرورت پڑے گی؟"

س: جب عورت ہی عورت کو دھوکا دیتی ہے تو پھر مردوں کو قصور وار کیوں ٹھہرایا جاتا ہے؟

ج: مرد بے چارہ تو اکثر بے قصور بلکہ مظلوم ہوتا ہے۔

اپنی نئی گرل فرینڈ کے ساتھ ایک مستی بھری شام گزارنے کے بعد نوجوان نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "کیا تم اپنی ماں کو سب کچھ بتا دو گی کہ آج شام تم نے کیسے گزاری ہے؟" گرل فرینڈ نے جواب دیا،

"ہرگز نہیں۔ میری ماں کو کچھ پروا بھی نہیں ہے۔ ایسی باتوں کی کرید تو میرے شوہر کو رہتی ہے۔"

خواجہ رشید خان، ٹنڈو محمد خان

س: خدا روٹھے تو سجدہ کروں، محبوب روٹھے تو کیا کروں؟

ج: محبوب روٹھ کر بھی ملنے کے لئے مختلف راستے سے ملنے آئے گا۔

فائر اسٹیشن کی گھنٹی بجی، فائر مین نے ریسیور اٹھایا، ورکنگ گرلز ہوٹل سے کوئی عورت گھبرائی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی۔

"دیکھئے ایک نوجوان لمبا تڑنگا آدمی کھڑکی کے راستے میرے کمرے میں گھسنے کی تاک میں لگا ہوا ہے۔"

فائر مین بولا۔ "محترمہ! یہ پولیس اسٹیشن نہیں فائر اسٹیشن ہے۔"

عورت نے جواب دیا۔ "مجھے معلوم ہے۔ مگر بات یہ ہے کہ میرا کمرہ تیسری منزل پر ہے اور اس آدمی کو لمبی سیڑھی کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔"

س: دوستی کا مطلب؟

ج: آج کل تو مطلب پرستی ہے۔

عنبرین شہیر خان، کراچی

س: دنیا سے خلوص کیوں اٹھ گیا ہے؟

ج: ایسی دوڑ میں خلوص نبھانے کا وقت کہاں؟ آجکل تو جانوروں کو بھی اتنی فرصت نہیں ملتی کہ وہ مالک کے ساتھ پرخلوص رہیں۔

ایک صاحب بہت غصے سے چلا رہے تھے "میں آج اپنے اس کتے کو جان سے مار دوں گا۔"

اس کے دوست نے پوچھا "کیوں بھئی اس بیچارے نے کیا قصور کیا ہے؟"

انہوں نے بیزار لہجے میں کہا "آپ قصور کی بات کر رہے ہیں؟ میں نے مرغی پالی تو وہ اس نے کھالی۔ طوطا پالا تو وہ اس نے زخمی کر دیا۔ خرگوش رکھے تو وہ اس نے بھگا دیئے۔ لیکن اب میری ساس چند دن سے آئی ہوئی ہے اور یہ کمبخت ابھی تک کچھ نہیں کر سکا۔"

س: شبنم اور عورت کے آنسو میں کیا فرق ہے؟

ج: شبنم ٹھنڈک اور صداقت کا احساس دلاتی ہے۔ جبکہ عورت کے آنسو گرمی اور فریب کا پیمانہ ہیں۔

شہناز فقیر، نوشہرہ کینٹ

س: رشتے والوں سے پیچھا چھڑانے کی ترکیب بتائیں؟

ج: خوب خاطر مدارت کریں۔

حلوائی کی دکان پر گاہکوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ ایک چھوٹا سا بچہ آکر بولا "میری ماں نے مٹھائی منگوائی ہے جیسی تم نے پچھلے ہفتے دی تھی، انہوں نے کہا ہے بالکل ویسی ہی ہونی چاہئے۔"

حلوائی بہت خوش ہوا اور گاہکوں سے کہنے لگا "اچھی چیز کی قدر ہوتی ہے تبھی لوگ میری دکان پر دوبارہ آتے ہیں۔"

اُسی وقت بچے نے حلوائی کو ٹوکا "مٹھائی پچھلی جیسی ہی ہو۔ ہمارے یہاں کچھ رشتے دار آئے ہیں۔ ماں نہیں چاہتیں کہ وہ دوبارہ آئیں۔"

س: اگر خوشی پیسے سے خریدی جاتی تو...؟

ج: تو خوشی پھر بھی غریب کے حصے میں نہ آتی۔

قادر بخش گوکمانی، شاہجہ

س: میرے خیال میں آجکل عورتوں کی تحریروں میں بھی سوا نہیں پایا جاتا ہے۔؟

ج: ان کی کس بات میں آپ کو نمازین نظر آتا ہے۔

"سالوں گزر گئے اور میں یہ نہ جان سکی کہ میرا شوہر اپنی شامیں کہاں گزارتا ہے۔" سیر و تفریح کی دلدادہ ایک عورت نے کہا۔

"پھر۔؟" کسی نے کہا۔

بیوی نے مسکرا کر جواب دیا: "یہ کیا بات ہوئی، انسان کو حق گو اور انصاف پسند ہونا چاہئے۔ قسم خدا کی اگر میرے بچوں میں عیب ہو تو میں ایک ایک کر کے سامنے ہی گنوا دوں۔"

مسز عصمت عزیز، دوحہ قطر

س: کیا آپ کا تعلق علم نجوم سے بھی ہے؟

ج: وقت کے لحاظ سے قسمت کا حال بھی بتا سکتا ہوں۔

ایک کوٹھی کے دروازے پر کسی شخص نے صدا لگائی "نجومی... قسمت کا حال بتانے والا۔"

ایسے میں ایک شخص باہر آیا اور اپنا ہاتھ آگے بڑھا کر بولا: "اگر تم نے ایک بھی سچی بات بتا دی۔ تو میں تمہارا جھولا نوٹوں سے بھر دوں گا۔"

نجومی نے اس شخص کے ہاتھ کی لکیروں پر نظر ڈال کر کہا: "جو شخص نجومی کا بھیس بدل کر آپ کو دیکھ رہا ہے اصل میں آپ کی خوبصورت بیوی کا پرانا آشنا ہے۔"

تسنیم صبیح، کراچی

س: سادگی کیا ہے؟

ج: حسن ہے۔ مگر آج کل کی لڑکیاں سادگی کو بھی فیشن بنا رہی ہیں اور کپڑوں سے بے نیازی اختیار کرتی جا رہی ہیں۔

س: میاں بیوی کب تک خوش رہ سکتے ہیں؟

ج: جب تک ان کا گھریلو بجٹ ان کا ساتھ دے سکے۔

بجلی اور ڈاکٹر کا بل ایک ساتھ آئے۔ بجٹ میں اتنی گنجائش نہیں تھی کہ دونوں ایک ساتھ ادا کئے جا سکتے۔ شوہر فکر مند ہو کر سوچنے لگا۔

بیوی نے پوچھا: "آخر تم سوچنے کیا لگ گئے؟"

شوہر نے جواب دیا: "میں سوچ رہا ہوں کہ اس ماہ خرچ زیادہ ہیں، یہ دونوں بل ایک ساتھ نہیں ادا کئے جا سکتے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس بل کو روک لوں اور کس کا ادا کروں۔"

بیوی نے جواب دیا: "اس میں سوچنے کی کیا بات ہے۔ بجلی کا بل ادا کر دو۔ ڈاکٹر کا بل روک لو کیونکہ ڈاکٹر تمہارا دورانِ خون تو روک نہیں سکتا۔"

جاوید احمد نصرانی، کراچی

س: کیا یکی پکائی روٹی تازہ تازہ پہنچائی جاتی ہے؟

ج: اس کا تو ہمیں علم نہیں البتہ ایک خاتون نے دکاندار سے سوال کیا۔

"کیا روٹی تازہ ہے؟"

"بیشک ہماری روٹیاں ایسے شفاف اور ایئر پروف کاغذ میں لپیٹی جاتی ہیں کہ برسوں باسی نہیں ہوتیں۔"

"مہربانی فرما کر ہمیں کاغذ ایک سیر تول دیں۔ میرے شوہر تازہ روٹی کھانے کے عادی ہیں۔"

س: گھریلو عورت کیا ہوتی ہے؟

ج: اس انچارج عورت کو کہا جاتا ہے۔ جہاں باورچی کھانا پکائے نوکر برتن دھوئے گھر کی صفائی کرے۔ کھانے کے وقت ناز بنا بنا کر کھائے اور باورچی کو گالیاں دے۔ اور شام کو شوہر گھر میں داخل ہوتے ہی جھگڑا شروع کر دے۔

"میں ان نوکروں سے تنگ آگئی ہوں۔ سب کو نکال دو۔ میں خود یہ کام کر لوں گی۔" یہ کہہ کر کمرے میں جا سوئے۔

فرزانہ نوشع، محمود حسین خان

س: مصلحت کیا ہے؟

ج: موقع شناسی!

ایک دن چچا گھر میں آئے اور بیگم سے کہنے لگے: "دروازے پر کچھ مہمان کھڑے ہیں۔ ان کو کسی صورت ٹال دو۔"

بیگم دروازے پر آئیں اور مہمانوں سے بولیں: "چچا گھر پہ نہیں ہیں۔"

مہمان بولے: "ابھی ابھی تو اسی دروازے سے اندر داخل ہوئے ہیں ضرور اندر ہی ہوں گے۔"

چچا برداشت نہ کر سکے کھڑکی سے جھانک کر بولے "آپ لوگ خوامخواہ اس عورت سے تکرار کر رہے ہیں ممکن ہے وہ شخص دوسرے دروازے سے نکل گیا ہو۔"

س: آجکل لڑکے بازاروں میں کیوں گھومتے پھرتے ہیں؟

ج: اس لئے کہ ان سے دوگنی تعداد میں میک اپ کئے لڑکیاں ان کو بازاروں میں آنے پہ مجبور کرتی ہیں۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ

غزوۂ بدر میں حضور اکرمؐ کے ہاتھ میں جو پرچم تھا وہ حضرت عائشہؓ کی اوڑھنی کا تھا۔

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے ——— "پاک عورتوں کے لیے پاک مرد ہیں اور پاک مردوں کے لیے پاک عورتیں۔ خبیث عورتوں کے لیے خبیث مرد ہیں اور خبیث مردوں کے لیے خبیث عورتیں۔"

یہ قانونِ فطرت کی ایک دفعہ بتائی گئی ہے کہ فطرتِ انسانی کا تقاضا یہی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا قانونِ فطرت ہے جس کے مطابق انسان کی فطرت بنائی گئی ہے۔ یہاں یہ بھی ملحوظ رہے کہ عورت اور مرد کی خباثت اور پاکیزگی لباس، پوشاک وغیرہ کی پاکیزگی و گندگی مراد نہیں ہے بلکہ ایمانی و اخلاقی پاکیزگی و گندگی مراد ہے۔ یقیناً کوئی دیندار و پاکیزہ خصلت عورت کبھی گوارہ نہیں کرسکتی کہ اس کا شوہر بے دین بداخلاق اور آوارہ ہو۔ اسی طرح کوئی دیندار پاک کردار مرد یہ برداشت نہیں کرسکتا کہ اس کی بیوی بے دین بدکردار آوارہ ہو۔ جو لوگ خود دیندار اور نیک کردار ہوتے ہیں وہ اپنی بیویوں، لڑکیوں اور بہنوں کو یہاں تک کہ اپنی ماں وغیرہ کو بھی دینی و اخلاقی تعلیم دے کر دیندار و پاک اخلاق بنا دیتے ہیں، تو پھر وہ اپنی لڑکیوں اور بہنوں کے لیے شوہر تلاش کرتے ہیں تو کسی دیندار، نیک کردار شخص کو ہی منتخب کرتے ہیں۔ اور جب کوئی دیندار نیک کردار شخص اپنے لیے بیوی تلاش کرتا ہے تو اس کی دینداری و نیک کرداری کا تقاضا یہی ہے کہ وہ حسن و جمال ظاہری اور مال و دولت کی اتنی تلاش نہ کرے گا جس قدر وہ اس عورت کی دینداری اور نیک کرداری کا پتہ لگائے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعثت سے قبل تقریباً پچیس سال کی عمر میں اُم المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضؓ سے عقد فرمایا جن کی عمر اس وقت چالیس سال کی تھی۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پندرہ سال بڑی تھیں۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضؓ فطرتاً دیندار نیک کردار اور پاکیزہ اخلاق خاتون تھیں۔ ان کی دینداری بعثت سے پہلے بس اسی حد تک تھی کہ اخلاق و کردار کے اعتبار سے بہت بلند تھیں۔ حق بات کو قبول کر لینے کی عادت تھی۔ نیک طینت اور رحم دل تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان اوصاف کا یہ انعام عطا فرمایا کہ ان کو اپنے آخری نبیؐ کی زوجیت کی منزل تک پہنچا دیا جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کیا۔ ایمان و اسلام میں سبقت لے جانے والوں کی جماعت میں سب سے آگے رہیں۔ وہ عرب کی بہت بڑی تاجر تھیں۔ انہوں نے اپنا سارا مال و متاع تبلیغِ اسلام

سے یے وقف کر دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قبلِ بعثت پندرہ سال کی زندگی گزار چکی تھیں اور بعثت سے قبل ہی سے آپؐ کے اخلاقِ کریمانہ مشہور و متعارف تھے، جن کا حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضؓ شب و روز مشاہدہ کرتی رہتی تھیں۔ پھر بعثت کے بعد تقریباً دس سال تک ساتھ رہیں اور اہلِ مکّہ کے مظالم سہنے میں بھی آپ کی شریک تھیں۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضؓ کی ایک فضیلت یہ بھی ہے کہ حضورِ اکرمؐ کی جتنی اولادیں ہوئیں اور زندہ رہیں وہ سب انہی سے تھیں۔ وہ حضرت زینبؓ، حضرت رقیہؓ، حضرت ام کلثومؓ اور حضرت فاطمہ زہرہؓ کی والدہ ماجدہ تھیں۔ ۶۵ سال کی عمر میں سنہ ۱۰ نبوی میں وفات پائی۔ ہجرت سے قبل تک مکّہ مکرمہ میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ نہ تھی۔ سنہ نبوی میں حضرت عمر فاروق رضؓ ایمان لاتے ہیں اور وہ چالیسویں مسلمان تھے۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضؓ، محمد بن عبداللہ کے عقد میں آئی تھیں۔ اور جب وفات پائی تو وہ رسول اللہ کی زوجہ محترمہ تھیں۔ ام المومنین تھیں۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضؓ کی وفات اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے باعثِ رنج و ملال بدرجہ غایت ہوئی لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہی مرضی تھی کہ اس کا رسول کچھ دنوں بزمانۂ نبوت تجرد کی زندگی بھی گزارے، ایک ہی مہینہ سہی، یعنی رمضان سنہ ۱۰ نبوت کے اوائل میں حضورِ اکرمؐ کے چچا حضرت ابوطالب کا انتقال ہوا تھا۔ اس کے تین دن بعد حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضؓ کا انتقال ہوا۔ شوال سنہ ۱۰ کے اواخر میں حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ اور حضرت سودہ رضؓ سے عقد ہوا۔

حضرت سودہ رضؓ بیوہ تھیں اور سابق الاسلام تھیں۔ یہ خود اور ان کے شوہر حضرت سکران بن عمر رضؓ اولین مسلمان تھے۔ دونوں نے مشرکین مکّہ کے مظالم سے تنگ آکر حبشہ کی جانب ہجرت کی تھی۔ حبشہ سے واپس آنے کے بعد حضرت سکران رضؓ نے وفات پائی اور حضرت سودہ رضؓ اپنے والد حضرت زمعہ رضؓ کے ساتھ مکّہ میں رہنے لگیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضؓ کی وفات کے بعد نہایت پریشان اور غمگین رہتے تھے۔ انہیں شریکِ زندگی کی جدائی کے غم کے علاوہ گھر بار اور بچوں کی دیکھ بھال کی فکر لاحق تھی۔ حضرت خولہ رضؓ بنت حکیم رضؓ جو مشہور صحابی حضرت عثمان بن مظعون رضؓ کی بیوی تھیں، انہوں نے حضورِ اکرمؐ کو اس عالم میں دیکھ کر عقدِ ثانی کی تحریک پیش کی۔

حضورِ اکرمؐ نے فرمایا ــــ "کہاں ــــ؟"

خولہ رضؓ نے کہا ــــ "آپؐ کے لیے کنواری بھی موجود ہے اور بیوہ بھی!"

حضورِ اکرمؐ نے دریافت فرمایا ــ "کنواری کون ہے اور بیوہ کون ہے ــــ؟"

خولہ بولیں ــــ "کنواری تو اس شخص کی دختر ہے جو خود آپؐ کے لیے اس وقت اللہ کی تمام مخلوق سے پیارا ہے یعنی عائشہ رضؓ! اور بیوہ وہ ہے جو آپؐ کی رسالت اور نبوت کو بہت پہلے تسلیم کر کے ایمان لا چکی ہے اور اس کا نام سودہ بنت زمعہ رضؓ ہے۔"

حضورِ اکرمؐ نے فرمایا ــــ "دونوں سے کہو ــــ!"

لہٰذا حضرت خولہ رضؓ دونوں جگہ پیام لے کر گئیں اور حسبِ توقع بامراد واپس آئیں۔ چنانچہ شوال سنہ ۱۰ نبوی میں حضرت سودہ رضؓ بنتِ زمعہ رضؓ سے حضورِ اکرمؐ کا عقد ہوا۔ اور اس کے بعد ہی حضرت عائشہ رضؓ بنتِ ابی بکر رضؓ حبالۂ عقد میں آئیں۔ یہ دونوں نکاح آگے پیچھے اس طرح ہوئے کہ لوگ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ ان دونوں میں پہلے یہ شرف کس کو حاصل ہوا۔ لیکن حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضؓ کی وفات کے بعد گھر بار اور بچوں کی دیکھ بھال کی فکر مندی جب حضورِ اکرمؐ نے ظاہر فرمائی تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سودہ رضؓ پہلے نکاح میں آئیں۔ کیونکہ حضرت سودہ رضؓ کی عمر اس وقت کم و بیش پچاس سال کی تھی۔ اور وہی اس قابل تھیں کہ گھر بار اور بچوں کی دیکھ بھال کرتیں۔ اس کے علاوہ خود حضرت سودہ رضؓ کے مصائب کو دور کرنا مقصود تھا۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کنواری تھیں اور یہ مشہور ہے کہ نکاح کے وقت حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کی عمر صرف چھ سال کی تھی، مگر یہ غلط ہے۔ اہلِ سیر و ائمۂ تاریخ کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ اپنی سوتیلی بہن حضرت اسماء بنت ابی بکر رضؓ سے دس سال چھوٹی تھیں اور حضرت اسماء کی عمر ہجرت کے وقت ۲۷ سال کی تھی۔ تو ہجرت کے وقت حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کی عمر ۱۷ سال کی ہوئی۔ ہجرت سنہ ۱۳ نبوت میں ہوئی تھی۔ اسی لیے حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کا نکاح سنہ ۱۰ نبوت شوال میں ۱۴۔۱۵ سال کی عمر میں ہوا تھا۔ ابنِ جریر طبری نے بھی اپنی تاریخ میں حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کی اولاد کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ابوبکر رضؓ نے زمانۂ جاہلیت میں قتیلہ بنت عبدالعزیٰ سے شادی کی۔ جن سے عبداللہ اور اسماء پیدا ہوئے۔ اور زمانۂ جاہلیت میں ام رومان سے بیاہ کیا۔ تو ان سے عبدالرحمٰن اور عائشہ پیدا ہوئے۔ اور

ٔکی یہ چاروں اولادیں جو ان کی دونوں بیویوں سے پیدا ہوئیں۔
ے نام ہم نے لیے جاہلیت کے زمانہ میں پیدا ہوئیں۔"
اب بعثت سے چار برس قبل حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کی ولادت
مہیجئے جب ہی وہ ہجرت کے وقت ۱۸ سال کی اور حضرت اسماءؓ
س سال چھوٹی ثابت ہو سکتی ہیں۔
"تاریخ کی ایک اور مشہور و مستند کتاب "البدایۃ النہایہ" کی بھی
تحریر پڑھ لیجیے جو میری بات کی مزید تائید کرتی ہے،
"حضرت اسماءؓ سارے مہاجرین و مہاجرات کی آخری بانکا۔
۔ سب سے آخر میں ان ہی کی وفات ہوئی۔ یہ اور ان کی بہن
ت عائشہ رضؓ اور ان کے والد حضرت ابوبکر صدیق رضؓ اور ان کے
ابو عتیق (ابوقحافہ) اور ان کے بیٹے عبداللہ اور ان کے شوہر زبیرؓ
ب کے سب صحابیٔ رسول تھے۔ اور یہ حضرت اسماء رضؓ اپنے بیٹے
اللہ، اور اپنے شوہر (زبیر) کے ساتھ غزوۂ یرموک میں شریک
تھیں، اور یہ اپنی بہن حضرت عائشہ رضؓ سے دس سال بڑی
۔ ——— "؛

اس لیے جتنی روایتیں ایسی ہیں جن میں حضرت عائشہ صدیقہؓ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کے وقت چھ اور بعض میں سات
، بتائی گئی ہے وہ درست نہیں ہیں۔ روایت کی رو سے بھی کہ وہ سب
تیں مجروح و ضعیف راویوں سے مروی ہیں اور عقل کے اعتبار سے
غلط ثابت ہوتی ہیں۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کی ایک فضیلت تو یہ ہے، کہ وہ
مومنین ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کو اللہ
نے مومنین کی مائیں قرار دیا ہے۔ دوسری فضیلت یہ ہے کہ انہوں
آنکھ اسلام کی آغوش میں کھولی۔ ان کے والد ماجد حضرت ابوبکر صدیقؓ
بقین اولین میں ہیں۔ ان کی والدہ، ان کی بہن بلکہ ان کے دادا حضرت
قحافہ بھی ایمان والے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ اپنی بہن حضرت
اءؓ کے فرزند عبداللہ بن زبیر رضؓ کی نسبت سے اُمِ عبداللہ کہلاتی
۔ خود ان کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ ان کی والدہ کا نام زینب تھا مگر
اُم رومان کہلاتی تھیں۔

حضرت عائشہ رضؓ سے عقد کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کا مکہ معظمہ میں قیام تین سال تک رہا۔ ۱۳ نبوی میں حضور اکرمؐ مکہ
سے ہجرت فرما کر مدینہ آ گئے۔ اور مدینہ آنے کے ایک سال بعد شوال ۲ھ
ہجری میں حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کی رسم عروسی ادا کی گئی۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ نے حضور اکرمؐ کے ساتھ نو سال تک
ازدواجی زندگی بسر کی۔ حضور اکرمؐ کو حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ سے بہت
محبت تھی اور حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ بھی حضور پر جان چھڑکتی تھیں۔
حضور اکرمؐ حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کے بارے میں فرمایا کرتے تھے
کہ ——"جس طرح تمام کھانوں میں ثرید ہے، اسی طرح عورتوں
میں بہتر عائشہ رضؓ ہے!"

حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کی فصاحت و بلاغت ضرب المثل
تھی، اور وہ ایمانی و اخلاقی پاکیزگی کا بہترین نمونہ تھیں۔ حضور اکرمؐ
نے زندگی کے آخری ایام حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کے حجرہ میں بسر
کیے۔ اور وصال کے وقت حضور اکرمؐ کا سر مبارک حضرت عائشہ صدیقہؓ
کے زانو پر تھا۔ حضور اکرمؐ رحلت کے بعد حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کے
حجرہ میں ہی مدفون ہوئے۔

اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ ایک بڑے باپ کی بیٹی
اور ایک بڑے شوہر کی بیوی تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے
حضور اکرمؐ کے ارشادات و احادیث اور تعلیمات کی نشر و اشاعت
میں نمایاں حصہ لے کر خود بھی بہت بڑی خاتون ہونے کا ثبوت دیا
ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ صداقت، ذہانت اور صورت و سیرت
ہر اعتبار سے اسی لائق تھیں کہ حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم
کی چہیتی بیوی بننے کا فخر حاصل کرتیں اور "صدیقہ" کے لقب سے
ان کو یاد کیا جاتا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ تمام عرب میں خواب کی صحیح تعبیر دینے
میں بھی بہت مشہور تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ نے جب خواب دیکھا
کہ —— تین چاند آسمان سے ٹوٹ کر ان کی آغوش میں آ گرے،
تو حضرت ابوبکر صدیق رضؓ اپنی بیٹی کا یہ خواب سن کر بہت متاثر اور
مسرور ہوئے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ تمام ازواج مطہرات میں سب سے

کم عمر تھیں، لیکن ان کی تربیت شروع سے ہی ایسی ہوئی تھی کہ علمی حیثیت سے بھی ان کا مرتبہ بہت بلند ہو گیا تھا حضرت ابوبکر صدیق رض ہی کے زمانہ میں یعنی حضور اکرم ص کی وفات کے بعد ہی وہ فتویٰ دینے کے منصب پر پہنچ گئی تھیں۔ وہ اخلاق و کردار کی بلندی اور پاکیزگی کے ساتھ حق گوئی میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتی تھیں۔ انہوں نے حضرت عمر فاروق رض اور حضرت عثمان غنی رض کے زمانہ میں بھی بعض صحابہ کرام کی رائے سے برملا اختلاف کیا۔ ان کی زندگی عورتوں کی تعلیم و تربیت اور تبلیغ کے لیے وقف تھی۔ ان کی نظر مردوں کی فکر و نگاہ کی درستی پر بھی رہتی تھی۔ صحابہ کرام آ کر دین و دنیا کے بعض مسائل میں ان سے مشورہ کرتے تھے۔ تفسیر، حدیث، اسرار شریعت اور ادب و انساب میں ان کو کمال حاصل تھا۔ شعراء کے بڑے بڑے قصیدے ان کو زبانی یاد تھے۔ وہ اعلیٰ درجہ کی خطیب بھی تھیں۔ دو ہزار سے زیادہ حدیثیں ان سے روایت ہو کر احادیث کے مستند مجموعوں میں ہم تک پہنچی ہیں۔ شرعی فتاوے، علمی نکات کی وضاحتیں، عربی روایات کا بیان اور تاریخی واقعات کا تذکرہ، یہ سب ان سے الگ ہیں۔

حضرت عائشہ صدیقہ رض ہمیشہ موٹے اور کم قیمت کپڑے پہنتی تھیں۔ البتہ ان کپڑوں کو ارغوانی یا زعفرانی رنگ میں رنگ لیتی تھیں۔ ہاتھوں کی انگلیوں میں سونے اور چاندی کی انگوٹھی بھی پہن لیتی تھیں۔ باریک کپڑوں سے ان کو نفرت تھی۔ آپ رض کی بھتیجی حفصہ بنت عبدالرحمٰن رض ایک بار آپ رض کے پاس باریک اوڑھنی سر پر ڈال کر آئیں، جس میں سے نگاہ گزر جاتی تھی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رض نے ناراض ہو کر وہ اوڑھنی حفصہ رض کے سر سے کھینچ لی اور اپنے پاس سے ایک موٹی اوڑھنی لا کر ان کو اوڑھا دی اور فرمایا: ــــــ "اللہ تعالیٰ نے سورۂ نور میں بڑی تاکید فرمائی ہے کہ عورتیں اپنی زینت کو چھپائے رکھیں۔"

مدینہ منورہ میں ایک نابینا جن کا نام اسحٰق تھا، حضرت عائشہ صدیقہ رض کی خدمت میں مسائل دریافت کرنے کے لیے آیا کرتے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رض ان سے پردہ فرماتی تھیں۔ اسحٰق نابینا نے ایک دن حضرت عائشہ صدیقہ رض سے کہا: ــــــ "میں تو اندھا ہوں آپ مجھ سے پردہ کیوں کرتی ہیں؟"

حضرت عائشہ صدیقہ رض نے جواب میں فرمایا ــــــ "میں تو اندھی نہیں ہوں!"

حضور اکرم ص کی ازواج مطہرات میں حضرت عائشہ صدیقہ رض کا درجہ بہت بلند ہے، نہ صرف اس لیے کہ حضور اکرم ص ان کو بہت عزیز رکھتے تھے اور نہ اس لیے کہ وہ ایک دیندار، نیک کردار اور پاکیزہ اخلاق خاتون تھیں بلکہ اس لیے بھی کہ آپ نے اپنی ذات سے خواتین اسلام کے لیے ایک نظیر پیش کی۔

حضرت عائشہ صدیقہ رض کی ذات گرامی خوبیوں کا مجموعہ تھی۔ سب سے بڑی خوبی زہد و قناعت تھی۔ ساری زندگی افلاس میں گزاری لیکن کبھی شکوہ زبان پر نہ آیا اور نہ کبھی صبر و استقلال کا دامن ہاتھ سے چھوٹا۔ کہا جاتا ہے کہ آپ رض کے پاس کپڑوں کا صرف ایک جوڑا تھا اسی کو دھو دھو کر پہنتی رہتی تھیں۔ کردار کا ایک روشن پہلو ان کی سخاوت بھی تھی۔ نہایت دریا دل اور سیر چشم واقع ہوئی تھیں۔

رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کا اس قدر لحاظ و خیال رکھتیں کہ ساری زندگی اپنی کسی بات میں ان کے خلاف نہیں کیا۔ آپ رض نے حضور اکرم کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ ایک بیوی اپنے شوہر کو جتنے قریب سے دیکھ سکتی ہے کوئی دوسرا نہیں دیکھ سکتا۔ اس لیے حضور اکرم ص کے بارے میں آپ رض کی ہر بات بڑی عظمت کی حامل ہے اور جو روایات آپ رض سے مروی ہیں، ان کی بڑی اہمیت ہے۔

ترمذی میں ایک حدیث جامع بن عمیر رض سے مروی ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رض سے دریافت کیا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عورتوں میں سب سے زیادہ پیاری کون تھی؟

حضرت عائشہ صدیقہ رض نے جواب میں فرمایا ــــــ "فاطمہ!"

پھر دریافت کیا گیا ــــــ "مردوں میں ــــــ؟"

حضرت عائشہ صدیقہ رض نے فرمایا ــــــ "فاطمہ کا شوہر!"

حضرت عائشہ صدیقہ رض حضور اکرم کے وصال کے بعد تقریباً ۴۸ سال تک زندہ رہیں۔ یعنی تقریباً نصف صدی تک اپنے فرزندان روحانی کو تعلیم دیتی رہیں اور سہ شنبہ کی شب عشاء کے وقت، ۱۷ رمضان المبارک ۵۸ھ ہجری میں انتقال فرمایا۔ وصیت کے مطابق جنت البقیع میں شب کے وقت دفن کی گئیں۔ حضرت ابوہریرہ رض نے نماز جنازہ پڑھائی جو مروان بن حکم کی جانب سے مدینہ منورہ کے حاکم تھے۔

تلاش

جب عورت کا سب کچھ ختم ہو جائے
تو وہ ایک سلگتی آگ بن جاتی ہے۔
جس کی آگ میں وہ خود بھی جل جاتی ہے
اور دنیا کو بھی جلا دیتی ہے۔

ایک دردناک المیہ

گلنار آفرین



وہ ہسپتال کے بستر پر بے سدھ سی پڑی تھی۔ اس کا
سوکھا نحیف جسم سفید چادر میں یوں لگ رہا تھا جیسے وہ مر چکی
ہو۔ مگر وہ وقفے وقفے سے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں لے کے
سل رہی تھی۔ کبھی کبھی چادر اس کے چہرے سے سرک بھی جاتی
تھی جس کی وجہ سے اس کی موت کا یقین نہیں ہو سکتا تھا۔ نرس
بھی ابھی اسے انجکشن لگانے آئی تھی، تو اس نے نرس سے
کہا تھا جب میں مر جاؤں تو تم اتنا سا میرا کام کر دینا۔ میرے
تکیے کے نیچے کچھ کاغذات کا پلندہ ہے وہ تم مسٹر اسلم جو میرے
شوہر ہیں نا انہیں دے دینا۔ نرس نے اس مضطرب عورت
کی بات مان لی۔ پھر جب سے کئی بار نرس نے اسے آ کر جھانکا
کہ شاید وہ مر چکی ہو۔ نرس کو بھی تو آخر بے چینی سی ہو گئی تھی۔
اس نے کیا ہے وہ پلندہ جو وہ اپنے مرنے کے بعد اپنے شوہر کو
دینا چاہتی ہے۔ نرس کا کسی مریض کے پاس دل نہیں لگ
رہا تھا۔ جتنی بار بھی نرس آئی وہ اسے مری ہوئی نہیں ملی۔ نرس
کو اس مریضہ کی زندگی پر غصہ سا آنے لگا۔ مر کے ہی نہیں دیتی۔
کب سے سر کو مسلے جا رہی ہے۔ اونہہ!! اور وہ کھٹ کھٹ
کرتی چلی گئی۔ تب ہی اچانک اسلم اپنے بچے کے ساتھ ہسپتال
میں داخل ہوا۔

"عالیہ! عالیہ!!" اس نے بہت آہستگی سے پکارا۔ پھر
ذرا زور سے آواز دی مگر عالیہ یونہی بے سدھ پڑی رہی بالکل
ایسا جیسے وہ ختم ہو چکی ہو۔ "امی جان!" بچے کی آنسوؤں میں
بھیگی آواز پر عالیہ نے گھبرا کے آنکھیں کھول دیں اور دھندلائی

آنکھوں سے [illegible] دیکھنے لگی۔ پھر دھندلائی آنکھیں آپ ہی آپ [illegible] گئیں۔ اس نے اپنے بچے کو پکارنے کے لئے اپنی تمام قوت یکجا کی۔ ”میرے بچے!“ اس نے کپکپاتا ہوا نحیف سا ہاتھ بچے کے سر پر رکھ دیا۔ ”تم مجھے نظر کیوں نہیں آتے؟ کمرے میں اتنا اندھیرا کیوں ہے؟“

”امی جان!“ بچہ ماں کے کھنڈر جیسے وجود سے چمٹ گیا۔ کتنے ہی آنسو عالیہ کی ویران آنکھوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے۔ ”امی جان آپ کب گھر آئیں گی؟ کب آئیں گی؟“

”گھر؟“ وہ تلخ لہجے سے بولی اور پھر بے ساختہ مسکرادی پھر اس کی آنکھیں عجیب سے احساس سے پھیل گئیں۔ اسلم اس کے بالکل قریب کھڑا کہہ رہا تھا۔ ”عالیہ! اب تم جلدی سے اچھی ہو جاؤ۔ دیکھو بیٹا کتنا اداس ہو گیا ہے۔ گھر، گھر نہیں رہا۔ میں سارے دن کا تھکا ہارا ہوں۔ ایک لمحہ کو بھی سکون نہیں ملتا۔“

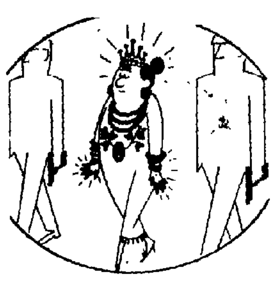
”اچھا؟!!“ اس کے سوکھے بے رونق ہونٹوں پر تلخیوں کا زہر پھیل گیا اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ چہرے پر ان گنت رنگوں کا تغیر بتا رہا تھا کہ عالیہ بھی ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو گئی ہے۔ کیسے عجیب سے رنگ ہیں۔ سفید، سیاہ نیلے، پیلے۔ اسلم حیرت سے دیکھتے ہوئے سوچنے لگا۔ ”مسٹر اسلم!“ ڈاکٹر کی آواز آئی۔ ”آپ انہیں آرام کرنے دیجئے۔“ تب اسلم بچے کو لئے ہوئے تھکے تھکے قدموں سے لوٹ گیا۔

”امی جان آپ گھر کیوں نہیں آتیں؟ آپ گھر کب آرہی ہیں؟“ عالیہ نے گھبرا کے آواز کی گونج پر آنکھیں کھول دیں مگر اس کے پاس تو کوئی بھی نہیں تھا۔ اس نے اپنا سر ہاتھوں میں جکڑ لیا۔ یہ آوازیں کب تک اور کہاں تک میرا پیچھا کرتی رہیں گی۔ ”اف خدایا! آوازوں کا شور بڑھتا جا رہا ہے۔ آوازیں ہی آوازیں، نئی پرانی۔ سب یوں گڈمڈ ہو رہی ہیں۔ کہ مجھے کچھ اور سجھائی نہیں دے رہا۔ کتنا گہرا سکوت ہے یہاں۔ لگتا ہے جیسے یہاں پر ہر انسان مر چکا ہے۔ مگر یہ آوازوں کا بے پناہ شور کیسا ہے۔ اوہ! خدایا!! یہ تو۔ بہت پرانی ہو لگیں ہیں۔ بہت پرانی۔“ اس نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لئے۔ ”نہیں خدایا۔ میں کچھ سننا نہیں چاہتی۔ کچھ بھی نہیں۔ بیشک میں نے بھی کچھ حسین خوابوں کی دنیا بسائی تھی۔ مگر تو ہی بتا، کونسا انسانی وجود ایسا ہے جو بغیر حسین خوابوں کے قائم ہے

وہ سسکیوں کے درمیان سوچتی چلی گئی۔ میرے خوابوں کے محل تو تیرے ہی بنائے ہوئے انسانوں نے بڑی بے رحمی سے روند ڈالے اور تو آسمانی وسعتوں پر خاموش بیٹھا رہا۔ اس کی ہچکیاں نکلنے لگیں تو اس نے چادر کچھ اوپر سرکالی اور اس نے سوچا کہیں میری سسکیوں کی آواز سے سویا ہوا ہسپتال نہ جاگ جائے۔ یہ لوگ جو نہ جانے کتنے زخم چھپائے پڑے ہوں گے شفاف چادر سر تک تن گئی۔ تب عالیہ کا ہر ایک زخم اس سفید چادر کے اندر کچھ اور بھی نمایاں ہوتا گیا۔ پھر ایک ایک سانس سمٹ سمٹ کر اس کے احساس سے ابھرنے لگی اور وہ یادوں کے بے پناہ ہجوم میں ڈوبتی چلی گئی۔ زمانہ کتنا بے وفا، کتنا بے مروت اور کتنا سنگدل ہوتا ہے۔ کاش کوئی زمانے کے بدلتے ہوئے رنگ سمجھ پاتا۔ انسان پہچانا تک نہیں جاتا۔ آج سے بہت پہلے میرا رنگ بھی ایسا پھیکا تو نہ تھا، میں ایسی بدصورت بھی نہیں تھی۔ کسی لافانی فنکار کی تخلیق اگر نہیں تھی تو کسی ناڑی کی تخلیق بھی نہیں تھی۔ ان ہی ویران آنکھوں میں نشہ تھا، سرور تھا۔ چہرے پر جوانی کا تمام نکھار تھا۔ میرے ایک ایک عضو میں جوانی کی رعنائی تھی۔ پتلے پتلے گلابی ہونٹوں پر زندگی کی تمام تر مسرتیں تھیں۔ ہر قدم یوں اٹھاتی یوں چلتی جیسے ہوا کے دوش پر اڑی جا رہی ہوں۔ جدھر نظر اٹھاتی تھی حسن ہی حسن اور بہار ہی بہار تھی۔ پھر میں نے زندگی کی اٹھارویں منزل پر بڑی لاپرواہی سے ہنستے مسکراتے گنگناتے ہوئے قدم رکھا۔ کائنات کا دل جھوم جھوم گیا اور ان ہی دنوں میری شادی کی بات چیت ہونی شروع ہوئی اور پھر ایک روز اسلم سے میری بات پکی کر دی گئی۔ میں نے بھی سنا اور شرم و حیا سے آپ ہی آپ آنکھیں جھک گئیں اور جب ہی دنیا کچھ اور بھی دلکش نظر آنے لگی۔ نئی زندگی کے تصور ہی سے خون میں گردش سی آنے لگتی۔ قدم کہیں رکھتی اور پڑتا کہیں، بات کچھ کرتی اور ذہن کہیں اور ہوتا پھر جب رات پلنگ پر لیٹتی تو کچھ عجیب سے احساسات مجھے جکڑ لیتے۔ شادی کا لفظ رہ رہ کے ذہن کے شفاف پردوں پر یوں ابھرنے لگتا کہ میرے سارے جسم میں گدگداہٹ سی ہونے لگتی۔ تمام احساسات میں ہلچل سی مچ جاتی اور کتنے ہی رنگ میرے چہرے پر نظر آنے لگتے۔ ان ہی دنوں میں راتوں کو اکثر جگمگاتے ستاروں سے بھرول اپنے ان دیکھے ساتھی کے بارے

میں ڈھیر ڈھیر ساری باتیں کیا کرتی تھی۔ میری باتوں پر ستارے بھی بے ساختہ مسکرایا کرتے تھے اور چاند بادلوں کی اوٹ میں چھپ جایا کرتا تھا۔ ان ہی دنوں میں نے نہ جانے کتنے ڈھیر سارے حسین محل سجا ڈالے۔ جس کی ہر روش کو میں نے امنگوں آرزوؤں اور کنوارے احساسات سے سجایا۔ دور دور تک محبت ہی محبت کے پھول سجائے پھر ان ہی روشوں پہ آنکھیں موندے گنگناتی، اٹھکیلیاں کرتی خوابوں کی ان ہی گلپوش وادیوں میں نکل جاتی پھر ایک دن میں نے اپنے تمام سجے سجائے رنگین محلوں کے ساتھ اسلم کے خوبصورت سے گھر میں قدم رکھا، تب دل کی حالت دیکھنے والی تھی، یوں دھڑک رہا تھا جیسے پھر کا ہے کو دھڑکے گا۔ ڈھیروں پسینے کے قطرے میرے وجود پر بکھرے ہوئے تھے۔ رات کچھ اور ڈھلی، میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں، تب اچانک کسی کے قدموں کی چاپ نے مجھے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ آنے والے اسلم ہی تھے۔ وہ میرے بالکل قریب آ گئے تھے۔ اتنے قریب کہ میں ان کی گرم گرم سانسوں سے بوکھلا سی گئی اور سمٹ سمٹا کر کچھ اور گٹھڑی سی بن گئی۔ آنکھوں میں شرم و حیا کے عجیب سے رنگ تیرنے لگے۔ دل عجیب بے ڈھنگے پن سے دھڑک رہا تھا۔

وقت اپنی جگہ بڑی سست رفتاری سے گزر رہا تھا۔ مجھے تب وقت کی سستی پر غصہ سا آنے لگا۔ تب ہی اسلم نے بڑے اطمینان سے میرا لمبا سا گھونگھٹ پلٹا۔ پھر میرا جھکا ہوا چہرہ اپنی طرف کیا۔ میں نے تو بالکل آنکھیں نہیں کھولیں — اُف!! بھلا کیسے ان سے آنکھیں ملاتی۔ میں تو تب اس لمحے سانس تک لینا بھول گئی تھی — پھر رات کا کچھ اور وقت یونہی گزر گیا۔ پھر اسلم نے ڈھیر ساری باتیں کیں !۔ اپنی اور صرف اپنی !۔ انہوں نے اوپر سے شفاف پردے اٹھاتے ہوئے کہا تھا "میں تمہیں کسی قسم کے اندھیرے میں رکھنا نہیں چاہتا عالیہ! چاہتا ہوں اپنے بارے میں آج ہی سب کچھ بتا دوں" میں ساکت سی رہ گئی تھی۔ حیرت سے آنکھیں پھیل گئی تھیں — تو یہ بھی کوئی بتانے کا وقت تھا!!۔ اپنے بارے میں انہوں نے شادی سے پہلے سب کچھ کیوں نہیں بتایا۔ میری سوچیں الجھ الجھ گئیں۔ اسلم میری سوچ سے لاتعلق اپنے بارے میں بڑی روانی سے کہے جا رہے تھے — "عالیہ! عورت اور مرد کی فطرت میں بڑا فرق ہوتا ہے — یہ حقیقت ہے — خدا نے بھی ایسا ہی بنایا ہے" ان کے دونوں ہاتھ سر کے نیچے تھے۔ نگاہیں اور ذہن ماضی کے اندر جھانک رہے تھے — مجھ پر سکتہ سا طاری تھا۔ لبوں پر گہرا سکوت تھا۔ آنکھوں میں درد کا عجیب سا رنگ تھا۔ وہ کہہ رہے تھے "یہ دنیا بھی عجیب جگہ ہے۔ بڑے بڑے پرہیزگار۔ اللہ والے۔ یوں منٹوں میں جذبات کے ریلے میں بہہ گئے اور انہیں معلوم تک نہ ہو سکا۔ دراصل انسانی فطرت کے خلاف کبھی انسان جی نہیں سکتا۔ مثال کے طور پر جب مرد جوانی کی دہلیز پہ قدم رکھتا ہے تو اس کے احساس پر جو ہیولا خاکہ کھنچتا ہے وہ عورت کا ہی ہوتا ہے — پھر مرد اس بے رنگ خاکے میں رنگ بھرنے لگتا ہے — دراصل مرد کی زندگی کا محور عورت کا وجود ہے۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مرد ایک عورت کا کبھی نہیں ہو سکتا۔ لوگ حقیقتوں سے دامن بچانا چاہتے ہیں ورنہ سچ یہی ہے — ہاں تو میں کہنا یہ چاہتا تھا عالیہ کہ تمہارے آنے سے قبل میرے احساسات پر ان گنت خاکے کھنچے اور میں نے ان میں رنگ بھرا — یہ ایک انسان کا ابدی اور حقیقی فعل تھا۔ سو وہ ہوا۔ مگر یہ سب گذری ہوئی کل کی باتیں تھیں — جب تم نہیں آئی تھیں — آج تو تم ہو۔ نئی زندگی کی ابتدا ہمیں کرنی ہے جو میں مکمل سچائی سے کرنا چاہتا ہوں۔ عالیہ! یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مرد خود چاہے کتنے رنگ بھرے اور خود کتنا ہی غلط راستہ پر کیوں نہ چل رہا ہو — اپنی شریک حیات کا وہ صرف ایک ہی رنگ دیکھنا چاہتا ہے — تمہیں نہیں معلوم میرے لئے کتنے بڑے بڑے گھرانوں سے رشتے آتے، مگر میں نے تمہارے ہاں صرف اس لئے شادی کرنا پسند کی کہ تمہارے یہاں — پرانے رسم و رواج ابھی تک زندہ ہیں۔ عزت و پاکیزگی کا احساس نمایاں ہے۔ عالیہ میں نے تمہارا گھرانہ اس لئے بھی پسند کیا کہ جب میں گناہ کے راستوں سے پلٹوں تو تمہارے کردار کی مضبوط بانہوں میں ذہنی سکون



مل جائے ۔ میں چاہتا ہوں تم اپنی جگہ آہنی ستون بنی رہو گی ـــــ وہ دکھ بھرے انداز سے مسکرانے لگے تمہیں میری باتیں عجیب سی لگ رہی ہوں گی نا ۔ مگر کیا کیا جائے حقیقت بہرکیف حقیقت ہوتی ہے ۔ میرا ساتھ دینا اتنا آسان نہیں ہے ۔ بڑی خاردار ہیں میری راہیں ۔ حقیقتیں چاہے کسی قدر تلخ کیوں نہ ہوں ان کا سامنا تو بہرحال کرنا ہی پڑتا ہے ۔ تب میں ساکت سی بنی رہ گئی تھی ۔ اتنی ساکت کہ پلکوں پر الجھے ہوئے آنسو بھی تو نہ گر سکے تھے ، لبوں پر کیسا سکوت تھا ۔ لگتا تھا انہوں نے کبھی ہلنا نہیں سیکھا ۔ ماتھے پر سجا ہوا سہاگ کا ٹیکہ جانے کدھر ڈھلک گیا تھا ۔ آنکھوں کا کاجل جانے کہاں بہہ گیا تھا ۔ مانگ میں سجی موتی افشاں کا ہر ہر ذرہ بکھر کے رہ گیا تھا اور بے چارہ ارمانوں بھرا دل دھڑکنا تک بھول بیٹھا تھا ۔

ذہن کے شفاف پردوں پہ یہ مرد کا پہلا نقش تھا ۔ میں نے پہلی بار ہی تو اپنے سے اتنے نزدیک مرد کو دیکھا تھا ۔ کتنے کٹھور ہوتے ہیں یہ مرد ۔ کتنے سنگدل اور بے رحم !! یوں ذرا سی دیر میں معصوم دل کو مسل دیتے ہیں ۔ کیا ان کے پاس کوئی احساس نہیں ہوتا ۔ کیوں نہیں انہوں نے سوچا کہ میرے پاس بھی اک ان ہی کی طرح کا دل ہے ، احساس ہے ، جذبات ہیں ۔ اور میں آخر کو اک انسانی پیکر ہوں ۔ کتنی بے دردی سے انہوں نے میرے خوابوں کی گلپوش وادیوں کو روند ڈالا ہے ، اور میرے سجے سجائے حسین محل دھڑام سے آگرے ۔ جن کے نیچے میرا تمام وجود دب گیا ۔ اور انہیں کچھ بھی پرواہ نہیں ۔ تو خداوند ! ہی تیرے وہ بندے ہیں جن کے سروں پر انسانیت و شرافت کا تاج رکھا گیا ہے ۔ دیکھ ان ہی لوگوں نے تو تیرے بنائے ہوئے اتنے معصوم و پاکیزہ دل کو کس طرح کچلا ہے ۔ پھر بھی چاہا ، اتنی زور زور سے اپنے اوپر ہنسوں ، چلاؤں ، چیخوں کہ زمین کا سینہ شق ہو جائے ، آسمان دہل جائے اور میں چیختے چیختے ساری عمر کے لئے خاموش ہو جاؤں ۔ اتنی خاموش کہ کوئی حادثہ پھر مجھے نہ جگا سکے ۔ مگر میں کچھ بھی نہ کر سکی ۔

زندگی کے اس عجیب موڑ پر میں یہی بے دم سی بیٹھی رہ گئی ۔ اسلم تم نے مجھے کیوں سب کچھ بتا دیا ؟ کیوں ! میں نے کب چاہا تھا کہ تم اپنے اوپر سے شفاف پردے اتنی جلدی سرکا دو ۔ مجھے دو لمحے تو رک جاتے ۔ میں تو ساری عمر تمہارے سیاہ ماضی پر یونہی شفاف پردے پڑے رہنے دیتی ۔ کبھی بھی تم سے نہ پوچھتی کہ ان کے پیچھے کیا چھپا ہے ۔ ساری زندگی بس یونہی تمہاری پرستش کرتے گزار دیتی ۔ تم نے یہ کیا کیا ؟ قصور تمہارا بھی نہیں ، یہ تو ہماری جیسی احمق لڑکیوں کی ان سوچوں کا ہے جو بس بغیر کچھ سوچے سمجھے خوابوں کے محل سجا بیٹھتی ہیں ۔ احمق کہیں کی ، انہیں جانتیں نا کہ جب خواب حقیقتوں کی ہولناکی سے ٹکراتے ہیں تو ان کا حال کیسا ہو جاتا ہے اور خواب دیکھنے والیاں کس طرح کھنڈر بن جاتی ہیں ۔ اس روز مجھے انسان بالکل بے حقیقت نظر آیا ۔ پھر میں نے سوچا ۔ میں اسلم کا ساتھ دوں گی ۔ چاہے جس طرح بھی ہو ۔ خون رو رو کے سہی ۔ تڑپ تڑپ کے سہی میری سوچوں میں بے پناہ کرب سمٹ آیا تھا ۔ پھر میں نے اتنا سارا غم اپنے معصوم سینے میں چھپا لیا ۔ اک لفظ بھی کسی سے نہ کہا ۔ کوئی بات منہ سے بھی نہ نکالی ۔ کہیں ایسا نہ ہو لوگ میری زندگی کا تماشہ بنا دیں ۔ وقت کا ہر اک لمحہ ۔ شاید میری ہمت پر بڑے طنز سے مسکرایا ۔ یوں جیسے کہہ رہا ہو ابھی تو ابتدا ہے ۔ دیکھنا ہے کہاں تک تو ٹوٹ کر نہیں بکھرتی ہے ۔ میں نے تڑپ کر وقت کی بے رخی کو دیکھا ۔ مگر میری آنکھوں میں اتنے سارے آنسو تھے اور وقت بڑی بے نیازی سے مسکراتا ہوا میرے سامنے سے گزر بھی گیا ۔ ایک سال کا طویل و کٹھن دور میں نے گزار کے ایک بچے کو جنم دیا ۔ میں نے حالات سے سمجھوتا کرنا چاہا مگر حالات تو میرے آگے آہنی دیوار بن گئے تھے ، جن سے ایک سال سے میں ٹکرا رہی تھی ۔ اسلم نے تو بہرحال پہلے ہی اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا ۔ انہوں نے تو کردار کے مضبوط ستون سے رشتہ جوڑا ہی ہوا تھا ۔ انہوں نے مجھے عورت کے روپ میں کب دیکھا تھا ،

میں نے بھی خود کو اک آہنی ستون ہی بنا ڈالا تھا۔ عورت جیسا کوئی احساس تک میرے پاس نہیں رہا تھا۔۔ بالکہ نہیں دیا ٦ گیا تھا۔۔ اس کے باوجود اسلم نے کبھی پلٹ کر دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔۔۔ عالیہ ستون سہی، ہر کیف ستون بھی تو گر جاتے ہیں نا۔ ہماری راہیں بالکل جدا تھیں۔ رات رات بھر میں ان کی راہ تکتے تکتے سو جاتی۔ پہروں اپنی شکستہ زندگی کے بارے میں غور کرتے کرتے اونگھنے لگتی۔ میں نے سوچا تھا اک دن میری محبت میری وفا، میرا خلوص اسلم کو گناہ کی دنیا سے واپس لے آئے گا۔ مگر انہوں نے تو میرے اتنے ڈھیر سارے پیار کو بجز نفرت حقارت کے اور کچھ بھی تو نہیں دیا۔

میری ہمت کو کب تک آزماؤ گے اسلم!۔ میں بلبلا جاتی۔ تم نے مجھے بے جان بنا ڈالا ہے۔ تم نہیں سوچنا چاہتے کہ میرے پاس بھی حس ہے، میرے پاس بھی ذہن ہے۔ سوچیں ہیں، میں بھی غلط راستے پر چل سکتی ہوں۔ کاش تم سوچ سکتے!!؟ لیکن سدا کی بزدل کم ہمت تھی نا!! کبھی جو حرفِ شکایت زبان پہ لاتی۔۔ سوچتی رہی، میرا خلوص خود صحیح اور غلط کی پہچان کرے گا۔

انہوں نے رفتہ رفتہ اکثر راتیں باہر گزارنی شروع کر دیں اب ہر روز ان کا انتظار میرا مقدر بن گیا۔ پھر ہفتے میں دو چار روز بعد گھر میں آتے تو اس طرح کر نشے میں دھت اور نہ اپنا ہوش نہ کسی اور کا۔ پھر یوں ہوا کہ۔۔ انہوں نے سوچا" میں بھی عجیب عورت ہوں؟ شاید میرے سینے میں دل ہی نہیں ہے۔

تب انہوں نے گھر میں لڑکیاں لانی شروع کر دیں رات کی سیاہی جونہی پھیل جاتی وہ بالکل بے باک ہو جاتے۔ ذرہ برابر بھی خوف نہ ہوتا۔ ان کا کمرہ الگ تھا۔ انہوں نے خود ہی اپنا کمرہ الگ بنا رکھا تھا۔ اس کمرے میں رات بھر وہ گناہوں کا بوجھ بھر بھر کے اٹھاتے۔ میں باہر خلاؤں میں جانے کیا ڈھونڈا کرتی تھی۔ کتنے ڈھیر سارے آنسو ٹوٹ کر یونہی بیکار مٹی میں ملا یا کرتی تھی۔ یہ آنسو دکھ، بے بسی اور لاچاری کے تھے۔ ان کی بھلا حقیقت بھی کیا ہوتی۔ میں نے بولنا چاہا۔ روکا بھی۔ مگر انہوں نے میری بات کو کچھ اہمیت ہی نہیں دی، اور دی تو یوں کہ گھر بھر میں ایک حشر بپا ہو گیا۔ قیامت ٹوٹ پڑی!!!۔ گھر کے در و دیوار تک لرز گئے۔۔ پھر میں بے تحاشہ رونے لگتی۔ میرے روئیں روئیں سے خون ٹپکنے لگتا۔۔ یہ کیا اندھیر ہے میرے خدا۔۔؟ یہ کیسی تیری دنیا

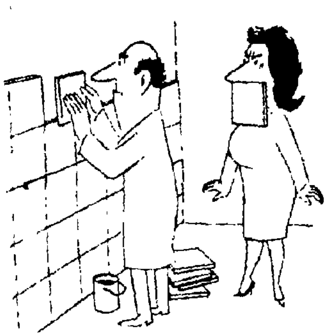
روس کے سابق وزیراعظم خروشیف بھارت کے دورے کے دوران تاج محل آگرہ بھی گئے۔ دنیا کی اس نادر عمارت کو دیکھنے کے بعد کہا۔
"اس عالیشان بیکار عمارت کی بجائے اگر کوئی ہسپتال تعمیر کر دیا جاتا تو آج لاکھوں افراد اس سے فائدہ اٹھاتے۔"

ہے خدایا، جہاں کے لوگوں کے پاس نہ انسانیت ہے نہ شرافت نہ شرم۔ نہ حیا۔ میں تو صبر کی انتہا بنی ہوئی تھی۔ گھونگھٹ پلٹتے ہی تو میں نے دکھوں کا چہرہ دیکھا تھا، پھر بھی تو اسلم کو سوچنا چاہیئے تھا۔ ذرا دیر کو ہی سہی۔ میں بھی انسان ہوں پتھر تو نہیں میری جگہ پتھر بھی ہوتا تو ٹوٹ پھوٹ کر رو پڑا ہوتا۔ وہ تو میں ہی جانے کس مٹی سے بنی ہوئی تھی جو سنگلاخ چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر بھی زندہ تھی۔ ہر روز کے طعنے، گالیاں، مار دھاڑ، کہاں تک سہہ سکتی تھی آخر۔ کونسی ہمت لاتی۔۔؟ میری تو تمام ہمتیں ٹوٹتی جا رہی تھیں۔ میری تمام خودداری کا دامن چھلنی چھلنی ہو گیا تھا۔ ہر روز کی ذلت نے میری روح تک کو جھلسا دیا تھا۔

اور پھر بھی میں زندہ تھی۔۔!! جانے کیسی تھیں میری سانسیں جو ٹوٹ کر جیں دیتی تھیں۔ ہر طرف مایوسیوں کے گھٹا ٹوپ اندھیرے تھے۔ امید کی کوئی ہلکی سی کرن نہیں تھی جس کے سہارے میں اپنی پہاڑ سی زندگی گزارنے کا سوچتی۔

ساری دنیا میرے ہر ایک غم اور دکھ سے بے خبر تھی۔۔ میں نے ہی تو بناوٹ کے دبیز پردے اپنے اوپر ڈال رکھے تھے۔ جھوٹی مسکراہٹوں کے درمیان یہاں سے وہاں تک سب کو خوش فہمی کا یقین دلا رکھا تھا۔۔ اور تب لوگ میرے مقدر پہ رشک کرتے تھے پھر میں آنسوؤں میں چپکے چپکے اپنے اوپر خوب ہنستی تھی۔

میں جو اپنے ہونٹوں پر مصنوعی مسرتوں کا جال بچھائے جی رہی تھی۔ تو اس میں دنیا والوں کا کیا قصور۔۔؟ اور پھر کون کس کے اندر جھانکنے کی کوشش کرتا ہے۔۔ پھر ضرورت بھی کیا ہے؟ اس دنیا کا کونسا فرد ہے جو دکھ سے خالی ہے لیکن اسلم کو تو میرے اندر جھانک لینا چاہیئے تھا۔ انہیں تو کچھ معلوم کرنے



کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ تمام اداسیاں اور محرومیاں تو ان ہی کی دی ہوئی تھیں۔ شادی کے بعد سے کبھی انہوں نے یہ نہیں کہا۔ عالیہ! تمہاری آنکھوں میں اتنی ویرانیاں کیوں ہیں؟ تمہارے چہرے پر اتنے دکھوں کی پرچھائیاں کیوں نظر آتی ہیں ۔ تم اتنی اجاڑ، اتنی ویران کیوں رہتی ہو؟ تم یوں بار بار کہاں گم ہو جاتی ہو؟ بار بار کس لئے تمہاری شفاف آنکھوں میں نمی تیرنے لگتی ہے؟ اور پھر تم کبھی سہاگنوں کی طرح نظر کیوں نہیں آتیں؟ انہوں نے کبھی کچھ نہیں پوچھا۔ انہیں ضرورت بھی بھلا کب تھی؟ کونسی کمی تھی ان کے لئے؟ انہوں نے ہی تو ایک بار مجھ سے انتہائی نفرت سے کہا تھا۔ ”تم سے ایک سے ایک اچھی لڑکیاں پھرتی ہیں۔“

یہ سچ ہے، مگر انہوں نے مجھے کیوں اپنے گھر کا ستون بنایا؟ کیوں؟ میرا جی چاہتا تھا ان کا گریبان چھلنی چھلنی کر دوں اور پھر اتنا ماروں اتنا کہ ان کا دم نکل جائے۔ مگر ہوا یوں کہ ان ہی دنوں ہمارے گھر میں ہمدانی آنے لگا۔ ہمدانی اسلم کا کزن تھا۔ کچھ دنوں ہمارے گھر میں بھی رہا۔ اور جو میں نے نہیں چاہا تھا وہ ہو گیا۔ ہمدانی کے سامنے ہماری زندگی پر جو بناوٹی پردے پڑے ہوئے تھے، جنہیں میں نے بڑی مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا وہ پردے۔ ہمدانی کے سامنے ایک ایک کر کے اٹھ گئے۔ ہمدانی بڑا ہنس مکھ اور انتہائی شوخ و طرار انسان تھا۔ بات بے بات ہنسنا ہنسانا اس کی عادت تھی۔ باتونی اتنا کہ لگتا تھا جیسے ٹیپ چل پڑی ہو۔ عجیب لاابالی، بے فکرہ۔ اس کو سب کچھ ہی تو معلوم ہو گیا۔ مگر وہ یوں بنا رہا جیسے کچھ بھی نہ جانتا ہو۔ مجھے جب بھی اداس دیکھتا اتنا ہا ہو ہو کرتا۔ نت نئے لطیفے سناتا۔ بات بے بات قہقہے بکھیرنے لگتا تا کہ میں اپنا دکھ بھول کر اس کے ساتھ چند لمحے ہنس سکوں اور ہوتا بھی یونہی۔ میں نہیں چاہتی تھی پھر اس کی عجیب عجیب حرکتوں پر آخر کھلکھلا کے مسکراتے مسکراتے اس کے ساتھ ہنسی میں یوں شریک ہو جاتی کہ لمحے بھر کو ذہن سے ہر اک خلش مٹ جاتی۔ اس روز میں بھی بے حد اداس بیٹھی تھی۔ شام کے سائے دور دور تک پھیل گئے۔ میں مایوسیوں کے بھنور میں تنہا تھی۔ اچانک مجھے اپنی آنکھوں پر کسی کے گرم گرم ہاتھوں کا احساس ہوا۔ میں نے فوراً پہچان لیا۔ ہاں تم ہو۔ ہمدانی، وہ مسکراتا ہوا بالکل میرے سامنے بیٹھ گیا۔ ”آج پھر اداس نظر آ رہی ہو؟“

”کونسی نئی بات ہے؟“ میں نے انتہائی کرب سے جواب دیا۔ وہ ایک دم سنجیدہ ہو کے مجھے گھورنے لگا۔ بہت دنوں سے مجھے ہمدانی کچھ بدلا بدلا سا نظر آ رہا تھا۔ اس کے لہجے میں جو میرے لئے ہمدردی تھی وہ کچھ کچھ میں جان گئی تھی۔ بعض اوقات تو وہ میرے دکھ میں یوں شریک ہو جاتا کہ۔ میں خود فکرمند ہو جاتی اس کی نگاہیں اس کے دل کے احساسات کی بڑی صفائی سے عکاسی بھی تو کر رہی تھیں۔ آخر کہاں تک میں خود کو غلط سمجھتی۔ ”عالیہ! تم آخر کب تک یوں ویرانیاں سمیٹتی رہو گی؟“

”یہ تو میرا مقدر ہے۔“ میں نے بات ختم کرنی چاہی۔

”میں نہیں مانتا۔ مقدر انسان خود اپنی کوشش سے بنا سکتا ہے۔“

میں طنز سے ہنسنے لگی۔ کاش خدا اتنی طاقت بھی دے دیتا۔ کم از کم ہم جیسی عورتوں کو دے دیتا!

”تم بے حد کم ہمت ہو عالیہ۔“

”ہو سکتا ہے۔“

”دیکھو عالیہ! جب تک تم ہمت جرأت سے کام نہ لو گی یونہی سسکتی بلکتی رہو گی۔ یہ دنیا اسی کی ہوتی ہے جو اسے زبردستی حاصل کرنے کی جرأت رکھتا ہے۔“

مجھے اداسیوں میں گھرا دیکھ کر وہ یونہی جذباتی سا ہو جاتا تھا۔ میں اسے جب جواب نہ دیتی تو وہ خود کو سنبھال لیتا۔ پھر آپ ہی آپ ہنس پڑتا اور مجھے ہنسانے کی کوشش کرنے لگتا۔ اس روز تو وہ بے حد سنجیدہ ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نہ جانے کیا بات تھی کہ میں نظریں نہ ملا سکی۔

"عالیہ! اک بات پوچھوں؟"
میں نے سوالیہ انداز میں نگاہیں اس کی طرف اٹھا کے دیکھا۔
"نہیں۔ نہیں۔ میری ان آنکھوں میں کیا کچھ نظر نہیں آتا؟"
"نہیں" میں نے ہمت سے جواب دیا۔ وہ پھر مسکرانے لگا اور پھر اس نے بات کا رُخ موڑ دیا۔ مگر میرا دل اس کی کسی بات میں نہیں لگ رہا تھا۔ ذہن یوں لگ رہا تھا جیسے گھوم رہا ہو سارا جسم دھیرے دھیرے لرز رہا تھا۔

اس روز کے بعد اَن گنت ایسے لمحے آئے۔ جب ہمدانی کی نگاہوں نے اس کے جذباتی لہجے نے اس کی ہر اک بات نے مجھے اپنائیت کا، محبت کا، خلوص کا اشارہ کیا۔ اس روز جب میں بے حد پریشان تھی۔ اسلم سے خاصی ہنگامہ آرائی ہوئی تھی میرے ہاتھوں میں پڑی ساری کی ساری چوڑیاں انہوں نے غصے میں توڑ ڈالی تھیں۔ میری ویران کلائیاں خون میں لت پت تھیں۔ آنکھیں آنسو بہا بہا کے انگارہ بنی ہوئی تھیں، بال بکھر کے یوں پریشان ہو رہے تھے کہ جیسے مدتوں کی بیوہ ہوں۔ چہرہ پر بے پناہ محرومیوں اور لاچاریوں کے نیلے نیلے نشان تھے جو ایک طاقتور مرد کی عظمت کی گواہی دے رہے تھے۔ مرد جو اس دنیا کا خود کو حکمران کہہ کر مدہوش ہو گیا ہے۔ مرد جس نے عورت کی عظمت و بلندی کو ہمیشہ ٹھوکروں سے مٹانا چاہا۔ اس روز میں نے سوچا انسان کتنا بے رحم ہوتا ہے۔ خدایا! یہ ہی تیری دنیا ہے جہاں قدم قدم پر یوں دلوں کو پامال کیا جاتا ہے۔ کتنے آنسو بہہ بہہ کے زمین پر جذب ہو رہے تھے، بڑی دھند تھی آنسوؤں کی تب اچانک، ہمدانی کوئی شوخ سی دھن بجاتا ہوا بالکل میرے سامنے آ گیا۔ چہرے پر بکھرے آنسو، خون رستی کلائیاں، زرد زرد چہرے پر نیلے نیلے تھپڑ کے نشان!

"عالیہ!" وہ ششدر ہو کر کہنے لگا "یہ کیا ہو گیا؟ تم۔ تم، اتنی اجاڑ کیسے ہو گئیں، اور یہ تمہارے چہرے پر کس بے رحم نے داغ ڈال دیئے ہیں، ہوا کیا عالیہ؟"

"کچھ بھی نہیں، کچھ بھی تو نہیں۔ مجھے تنہا چھوڑ دو، بالکل تنہا۔"
میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اور وہ بیچارہ دم بخود رہ گیا — سریلی سیٹی کی دھن اس کے ہونٹوں پر الجھ کے رہ گئی تھی۔ پھر وہ ہمیشہ کی طرح دیوانے پنے سے ہنسنے لگا۔ مجھے بہلانے کی جوں جوں کوشش کر رہا تھا۔ اسی قدر میں بلک بلک کر روتے جا رہی تھی۔



آخر وہ تھک گیا۔
"تم نے خود ہی تو اپنے آپ کو اتنا بے بس و لاچار بنا ڈالا ہے۔ خود کو تنہا سمجھتی ہو۔ کبھی آج تک تم نے کسی کو اپنا نہیں جانا اگر اک انسان اس دنیا کا برا ہے تو کیا ساری دنیا سے بیر باندھ لیا جاتا ہے۔ تم نے خود کو اک تماشہ بنا رکھا ہے۔ جب تک انسان جھکتا ہے دنیا جھکاتی ہے، اتنا جھکاتی ہے پھر کر وہ زمین میں جا چھپتا ہے" وہ بے حد جذباتی ہو رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کتنی لکیریں ابھر آئی تھیں۔ میں بھی جھلا گئی — "ہاں ہاں میں زمین میں چھپنا چاہتی ہوں۔ مگر تم لوگ مجھے مرنے بھی تو نہیں دیتے مجھے زندگی کی ضرورت نہیں۔ مجھے کسی کی اپنائیت کی ضرورت نہیں" میں نے اپنا سر دیوار سے دے مارا۔ مگر ہمدانی نے اچانک مجھے اپنی مضبوط بانہوں میں سمیٹ لیا۔

"عالیہ! پاگل ہو رہی ہو کیا؟"
"ہاں میں پاگل ہوں، میں پاگل ہوں" میری سسکیاں بکھرتی رہیں اور وہ انتہائی جذباتی انداز سے تسلیاں دیتا رہا۔
"عالیہ! تم اپنے سارے غم مجھے دے دو۔ آؤ ہم دونوں یہ دکھ بھاری گٹھڑ جو تم اٹھائے پھر رہی ہو بانٹ لیں"
میں آنسوؤں میں ہنس پڑی۔ "کتنے عجیب سے انسان ہو تم بھی۔ بس بولے جاتے ہو کہیں غم دکھ بھی تقسیم ہونے والی چیزیں ہیں۔" وہ میری بات سن کر بجھ سا گیا۔ چہرے پر ڈھیروں کربناک سائے متحرک سے ہو گئے۔ وہ بڑی دیر یونہی جانے کیا سوچتا رہا۔ پھر آپ ہی آپ ہنس پڑا۔ کتنی دکھی تھی اس کی ہنسی!

"ہمدانی!" میں نے اس سے کہا۔ "تم جس راہ پر چل پڑے ہو تا وہ بڑی ہولناک ہے۔ گھپ اندھیرے ہی اندھیرے ہیں جہاں امید کی ایک ہلکی سی کرن بھی نہیں ملے گی۔ تم اس راہ پر چلتے ہوئے زمانے کی نگاہوں میں خود تماشہ بن جاؤ گے۔ مجھے تو عادت ہے غم سہنے کی۔ آنسوؤں میں جینے کی۔ مجھے تنہا رہنے دو۔ اکیلی ان تاریک راستوں پر کسی مدہوش شرابی کی طرح لڑکھڑا لینے دو۔ کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی وقت یہ پریشان سانسیں آپ ہی آپ تھم جائیں گی تم اس کہانی میں کیوں شریک ہونا چاہتے ہو جس کا نہ آغاز اچھا نہ انجام!! جسے کسی بے درد نے انتہائی ظالمانہ انداز سے شروع کیا اور جس نے اپنے کسی بھی کردار پر کبھی توجہ نہ دی۔ جس کی کہانی کا ہر کردار سسکتا ہوا سلگتا ہوا فنا ہو گیا۔ نہیں ہمدانی نہیں۔ تم جوان ہو۔ خوبصورت ہو۔ کیا کمی ہے تم میں؟ تم تو خود اک بالکل نئی کہانی کا آغاز کر سکتے ہو۔ بالکل نئی اور اچھوتی کہانی کا۔ مگر سنو۔ تم اسلم جیسے کہانی کار نہ بنا کبھی نہیں ہمدانی۔ عورت کی دنیا، اس کی کائنات اس کا شوہر ہوتا ہے نا۔ جب وہ سب کچھ ختم ہو جائے تو عورت اک آہ بن جاتی ہے۔ ایسی آہ جو خود بھی جل سکتی ہے اور جلا بھی سکتی ہے۔" میں جذبات میں نہ جانے کیا کچھ کہتی رہی۔ وہ دم بخود سنتا رہا پھر میرے بھیگے ہوئے بالوں کی پریشان لٹوں کو اپنے ہاتھوں سے پیچھے کی طرف ہٹاتے ہوئے سرگوشی کرنے لگا۔

"عالیہ! میں تمہارا غم، تمہارا دکھ سب کچھ جانتا ہوں۔ میں تمہیں کبھی درد کی انتہا نہیں بننے دوں گا۔ کبھی بھی نہیں۔ چاہے مجھے زمانے سے ٹکرانا پڑے یا اپنی زندگی سے۔" میں اپنے آپ پر بے ساختہ ہنس دی۔ کیسا عجیب سا بے ڈھنگا مذاق لاتی ہوں محبت، اپنائیت، خلوص ملا بھی تو کس سے!! کہاں؟ اور کس موڑ پر؟ وہ عجیب سا لاابالی انسان جس نے مجھے یوں لوٹ کر چاہا کہ میں نہ چاہنے کے باوجود اس کی سحر زدہ باتوں میں گم ہو گئی۔ مجھے جہاں دیکھتا جب دیکھتا پروانے کی طرح نثار ہونے لگتا۔ آخر میں بھی اک عورت تھی، وہ بھی میری جیسی محبت کو ترسی ہوئی! اگر میں ہمدانی کے قریب ہوئی تو اس میں میرا کیا دوش تھا؟ دامن کہاں تک بچاتی؟ وہ تو بے حد جذباتی انسان تھا۔ میرے سامنے تو اس کے جذبات کی انتہا ہو جاتی۔ "وہ! وہ" نہ رہتا۔ میں نے سوچنا چاہا۔ سمجھنا چاہا۔ مگر میں کچھ نہ سوچ سکی اور نہ ہی وقت کے گزرتے تیز لمحوں نے مجھے ذرا مہلت ہی دی، اور میں لاشعوری طور پر ہمدانی کے ساتھ اس کے جذبات کی مدہوش لہروں کے ساتھ ساتھ بہتی چلی گئی۔ چہ میگوئیاں ہونا تو یقینی بات تھی، افواہیں یونہی اڑ جایا کرتی ہیں جن میں حقیقت کا رنگ آپ ہی آپ یہ دنیا والے یوں بھر دیا کرتے ہیں کہ ان پر کبھی شک و شبہ کا احساس تک نہیں ہوتا تو میرے اور ہمدانی کے بارے میں جو کچھ بھی کہا گیا وہ سب کچھ سچ ہی تھا۔ سچ میں اگر کچھ اور رنگ بھر دیا جائے تو سونے پر سہاگے کا کام ہو جاتا ہے۔ یہ چہ میگوئیاں یہاں سے وہاں تک پھیل گئی تھیں۔ ہر اک کی زبان پر۔ میرا اور ہمدانی کا چرچا تھا اور اسلم کی بے حسی، بے غیرتی پر لوگ حیران سے تھے۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر وہ ان کی صورت دیکھا کرتے تھے۔ مجھے ان دنوں بڑا سکون مل رہا تھا۔ میں رات جب بستر پر لیٹتی تو خوب جی بھر کے ہنستی۔ تعجب تھا کہ اسلم نے کبھی پلٹ کے مجھ سے کوئی بات نہیں پوچھی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا وہ پوچھیں۔ مجھے یوں غلط روش پر دیکھ کر ان کے منہ سے خون کے جھاگ ابل پڑیں۔ اور پھر وہ مجھے اتنا ماریں اتنا ماریں کہ میں مر جاؤں۔ مگر لوگ شاید سچ ہی کہتے ہوں۔ میں سوچتی کہ اسلم میں غیرت نام کی حس نہیں ہے۔ گناہوں کی دلدل میں جب انسان پھنس جاتا ہے تو اس کی ساری حسیں ختم ہو جاتی ہیں۔

تب میں نڈھال سی ہو جاتی، میری تمام ہنسی سسکیوں میں بدل جاتی۔ یہ سوچیں بھی روز روز کی تھیں۔ پرسکون زندگی کس کو کہتے ہیں؟ مجھے معلوم ہی نہ تھا، وہ تو خدا بھلا کرے ہمدانی کا جس نے مجھے لمحے دو لمحے مسرت سے روشناس کروایا۔ اس روز ہی ہم دونوں پکچر سے آئے تھے، کچھ شاپنگ بھی کی تھی۔ میں اس روز خاصی خوش تھی، کوئی ہلکا سا غم بھی میرے ذہن میں نہیں تھا گھر آ کے میں نے اور ہمدانی نے ساتھ چائے پی۔ چائے کے دوران ہمدانی کہنے لگا۔

"عالیہ! میں بہت دنوں سے تم سے کچھ کہنے کی سوچ رہا تھا۔ ہاں عالیہ۔"

"تو کہو۔ اس میں سوچنے کی کیا بات ہے۔"

"وہ۔ وہ۔ میں چاہتا تھا کہ جب تم اپنی اس موجودہ زندگی سے خوش ہی نہیں ہو تو اسلم سے الگ ہونے کا کیوں نہیں سوچتیں۔"

"ہمدانی" میں چیخ کر کھڑی ہو گئی۔ اف اتنا سارا اندھیرا! میرے چاروں طرف پھیل گیا تھا۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے میں اس گھپ اندھیرے میں گم ہو گئی ہوں۔ کتنے کٹھور ہوتے ہیں یہ دنیا

ے کبھی بھی دل کر دل نہیں جانتے۔ لمحے میں توڑ مروڑ کے رکھ
نہیں۔ سوچیں ایک بار پھر خون رونے لگیں۔ وہ جو چاہتا تھا
کیا تھا، مگر میری چیخ پر وہ میرے جذبات کی ہلچل کو سمجھ گیا تھا۔
ری آنکھوں میں آنسوؤں کی دھند دیکھ کر وہ تڑپ اٹھا۔

"تمہیں میرے لفظوں سے دکھ ہوا ہے عالیہ۔ میں بہت انسان ہوں، بہت برا۔ مگر میں نے بھی مجبور ہو کے تم سے یہ نہ کہی ہے عالیہ! یقین جانو تمہارے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں سکتا۔ تمہارے بغیر میں کچھ بھی تو نہیں رہوں گا۔ میری زندگی کا دار ومدار تمہارے فیصلے پر ہے۔" وہ اور نہ جانے کیا کچھ کہتا رہا۔ میں کچھ اور نہ سن سکی۔ رات میں نے بڑی بے چینی سے گزاری۔ سوچیں الجھ الجھ جاتی تھیں۔ کبھی اسلم تمام تر تلخیوں کے ساتھ میرے سامنے آجاتے تو کبھی ہمدانی اپنی تمام تر محبت، خلوص و اپنائیت کے ساتھ۔ میں گھبرا کے اٹھ بیٹھتی۔ عجیب سی آگ سینے میں سلگ رہی تھی۔ ڈھیر سارا پانی پی گئی۔ مگر دل کی آگ بجھی نہ خیالات میں کوئی ٹھہراؤ آیا۔ ہمدانی جس نے مجھے خوشی دی، مسکرانے پر مجبور کیا جینے کی تلقین کی۔ اسلم جس نے میرے کنوارپنے کو روند کر ان پر اپنے گناہوں کا محل تعمیر کیا۔ خدایا! میں کدھر جاؤں؟ دور دور تک کوئی روشنی نظر نہیں آتی۔ میری زندگی کتنے کٹھن موڑ پہ پہنچ گئی ہے اور میں تنہا اس موڑ پر کھڑی ہوں۔ ساری رات آنسوؤں میں گزار دی۔ صبح ہمدانی خلاف توقع آگیا۔ میں نے اسے دیکھا لگتا تھا وہ بھی ساری رات نہیں سو سکا ہے وہ بالکل میرے قریب آکر بیٹھ گیا۔

"تم نے کچھ سوچا۔۔؟"

"ہاں، میں چاہتی ہوں کہ تم لوٹ جاؤ۔"

"نہیں۔" وہ دھاڑنے لگا۔ "یہ نہیں ہو سکتا۔ میں بہت دور نکل آیا ہوں، بہت دور۔" اس کی آنکھوں میں سارے جہان کے آنسوؤں کا احساس سمٹ آیا تھا۔ "تم نہیں جانتیں کہ میں تمہیں کیا سمجھ بیٹھا ہوں۔"

"تم جذباتی ہو ہمدانی، سب کچھ بھول جاؤ گے۔ وقت سب کچھ بھلا دے گا۔"

میری باتوں پہ اس نے سرخ سرخ آنکھیں، جن میں غصہ بھی تھا، طنز اور جرأت بھی تھی۔ مجھے دکھایا۔ "میں تمہیں حاصل کر کے رہوں گا۔"



"ہمدانی!" میں کانپ گئی۔ "نہیں نہیں ہمدانی، تم یوں نہ سوچو۔ یہ کبھی نہ ہو گا، کبھی بھی نہیں۔"

"تم درد کی انتہا بن گئی ہو عالیہ!"

"اپنے اوپر بناوٹی مسکراہٹوں کے پردے بھی ڈالنے آتے ہیں۔ مگر میں یہ سب نہیں کر سکوں گا عالیہ۔" وہ سسک اٹھا۔

"تم میرے درد کے فلسفے کی بات رہنے دو ہمدانی۔ تم نہیں جان سکو گے کہ عورت کا دل کیا ہوتا ہے۔" میری آواز میں بے پناہ بھر بھراہٹ تھی۔

"عالیہ! میں کیسے یقین دلاؤں، کیسے بتاؤں کہ میں تمہارے علاوہ کبھی مسکرا بھی نہ سکوں گا۔" وہ تڑپ تڑپ کر اپنی محبت کا یقین دلائے جا رہا تھا۔ میں بھی یقین کر لینا چاہتی تھی۔ میرا دل چاہتا تھا۔ ہمدانی یونہی محبت کے الفاظ بولتا رہے اور میں آنکھیں موندے سنتی رہوں۔ میں نے اپنے دل کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ "انسان ہمیشہ سے حسین تصورات کے محل بناتا رہا ہے اور تم بھی بس اک انسان ہی تو ہو نا۔ تم بھی حسین محلوں میں رہنا چاہتے ہو، مگر خواب و خیالات کبھی پورے بھی ہوتے ہیں ہمدانی، اور پھر اب تو میں یہ جانتی ہوں کہ محبت صرف کمزور جذبوں کا نام ہے۔ تم یہ نہ سمجھ بیٹھنا کہ میں محبت سے نفرت کرنے لگی ہوں۔ نہیں ہمدانی، میں بھی تو تمہاری طرح اک انسانی پیکر ہوں نا۔ مجھے بھی اس حسین لفظ سے بے پناہ انس تھا۔ بے حد پیار تھا۔ مگر ہوا یوں کہ محبت کا لفظ میرے ہونٹوں پہ آتے آتے نہ جانے کہاں گم ہو گیا اور آج میں مٹی کا ڈھیر بنی پڑی ہوں۔ محبت، جذبات، احساسات، تصورات!! یہ سارے لفظ میرے آگے بکھر کر رہ گئے ہیں۔ مجھے اب ان کی حقیقت کا پتہ



ہنسی آتی ہے:" مگر اس نے میری ہر بات کو نظرانداز کر دیا۔

" ہمدانی! تم سن رہے ہو نا۔" میں نے اسے پکارتے ہوئے کہا۔

" ہاں۔ آں:" وہ چونکتے ہوئے بولا۔" سن رہا ہوں۔"

" تم جانتے ہو میں نے تمہاری دنیا سے صرف محبت چاہی تھی۔ پر۔ مجھے اتنی بڑی کائنات میں سچی محبت نہیں مل سکی اور نفرتوں کے پہاڑ میں میرا سارا وجود دب کے رہ گیا۔ تم ہی سوچو ہمدانی! میں تمہیں کیا دے سکتی ہوں؟"

اتنا کچھ کہنے کے باوجود بھی وہ نہیں مانا اور مسلسل میرے کمزور سے احساس سے ٹکراتا رہا۔ میں نے بے حد کوشش کی کہ میں ہمدانی سے دور ہو جاؤں۔ مگر اس کی محبت کا جنونی پن کچھ اس طرح کا تھا کہ میں ہمیشہ ہار جاتی تھی۔ وہ میرے سامنے ایک چھوٹا سا بچہ بن جاتا۔ ضد کر کر کے مجھے ہنساتا، بال سنوارتا آنکھوں میں کاجل لگواتا، پہروں میرے سراپا کی تعریفیں کیا کرتا۔

اس روز بھی وہ جذبات کی انتہا بنا ہوا تھا۔ اسلم باہر گئے ہوئے تھے، رات بے حد سرد تھی، کمرے میں ہیٹر جلائے ہم دونوں بیٹھے تھے۔ ہمدانی بے انتہا جذباتی ہوا جا رہا تھا۔ میں عجیب کشمکش کی حالت میں تھی کبھی جی چاہتا ہمدانی کو آگے بڑھنے سے روک دوں، کبھی جی چاہتا نہیں روکوں! کونسا فرق پڑ جائے گا۔ اسلم کو میری کونسی پرواہ ہے، ان کی بلا سے چاہے میں کچھ کر دوں۔ انہیں کونسی مجھ سے محبت ہے۔ ان کے لئے دنیا میں کیا کمی ہے؛ قدم قدم پر مجھ سے اچھی عورتیں ان کو ملتی

رہتی ہیں اور مل سکتی ہیں۔ ذہن میں آگ سی لگ گئی؛ پھر ایسی جگہ آ کے رک گئیں جہاں گھپ اندھیرے تھے اسلم کو مجھ سے کبھی محبت نہ تھی اور نہ ہوگی۔ انہوں نے نفرت، حقارت کے اور دیا بھی کیا ہے۔ پھر پھر میرے اچانک اک لمحہ ایسا بھی آ گیا جب تمام شرافت، انسانیت کی آہنی محرابیں گر کھانے لگیں اور وقت کی سانسیں رک کائنات کا چہرہ یقیناً تب نیلا پڑ گیا ہوگا اور آسمان کا رنگ کچھ پیلا پیلا ہو گیا ہوگا! مجھے بہر حال تب کچھ بھی معلوم نہیں اور ہمدانی تو جذبات کی لہروں میں بہتے ہوئے دور بہت نکل گئے تھے، جہاں بجز گھپ اندھیروں میں بھٹکنے کے اور کچھ بھی نہیں ہوتا۔ جو نہ ہونا تھا وہ ہو گیا، جو نہ چاہا تھا، نہ سوچا وہ کر چکی تھی!!!

اک بے حد ہولناک المیہ اندھیروں کی گود سے ابھرا میرے وجود سے چمٹ گیا!!

تب میں نے گھبرا کے ہمدانی کو دیکھا، اچانک وقت زور سے چیخ ماری تو میں زردی پڑ گئی۔ یہ چیخ کس کی تھی؟ میں نے دھندلائی آنکھوں سے پھر ہمدانی کو دیکھا۔ وہ بے خبر پڑا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر احساس گناہ کی پرچھائیں تک نہ تھیں تو میں۔ میں۔ ہاں میں پھر اکیلی رہ گئی ہوں۔

پھر وہ اٹھا تو اس کے چہرے پر مسکراہٹوں کے ان گنت رنگ تھے! کتنا خوش اور کتنا مسرور تھا وہ۔ ہونٹوں پر بے حد دلکش نغمے کی دھن بجاتا ہوا پھر رہا تھا۔ اور میں پتھر کی بے جان مورتی کی طرح دم سادھے پلنگ پر یوں بے سدھ پڑی تھی جیسے مر گئی ہوں۔ اک آنسو بھی تو میری بنجر آنکھوں میں نہیں تھا۔ پھر ہمدانی نے مجھے سنبھالا، تسلیاں دیں — دلاسے دیئے، "عالیہ جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ دیکھو یوں اگر تم نے خود کو اذیت دی نا تو ساری دنیا جان جائے گی — عالیہ، ہم نے جو کچھ بھی کیا وہ اک ہونے والی بات تھی۔ انسان ہی تو تھے ہم۔ اگر ہم یوں جذبات میں کھو گئے تو کیا ہوا — یہ تو بالکل ایک فطری بات تھی —"

"ہمدانی:" میں لرزتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ آنسوؤں کی دھند گہری تھی۔ کچھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ "یہ قصور صرف تمہارا ہے صرف تمہارا۔ تم مجھے بار بار کیوں پسپٹ رہے ہو۔ تمہارے بھائی

نے مجھے برباد کرنے میں کون سی کسر چھوڑی تھی جو تم نے پوری کر دکھائی۔ کتنے بے رحم، کتنے سنگدل ہوتے ہو تم لوگ!! محبت اخلاق، اپنائیت کے سنہری جال میں پھنسا کے تم نے۔ ہاں تم نے میری آخری پونجی بھی چھین لی۔ خدا کے لئے اب میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔ نکل جاؤ۔ تم نے جو کچھ لینا تھا لے چکے ہو۔ اک مجبور عورت کی آبرو!!! اک دکھیا عورت کی پاکدامنی!! اک ترسی ہوئی عورت کی عظمت!!! اب میرے پاس کچھ نہیں تم جاؤ اور اب اک اور نئی کہانی کا ایسا ہی پلاٹ ڈھونڈو جیسے کر میں تھی۔"

"بس کرو عالیہ! بس کرو!" وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر چلانے لگا۔ "میں گناہگار ہوں۔ بیشک برا انسان ہوں۔ مگر میں نے کبھی تم سے۔ کچھ نہیں مانگا۔ کبھی تم سے یہ نہیں پوچھا کہ تم مجھے چاہتی بھی ہو یا نہیں۔ تم نے کبھی میرے جذباتی قدموں کو سختی سے نہیں روکا۔ تم اگر چاہتیں تو میں اپنے قدم روک لیتا۔ جو کچھ بھی ہوا اس میں نہ میرا قصور ہے نہ تمہارا۔ ہم دونوں ہی جذبات میں الجھ گئے تھے، ہم دونوں ہی مجرم ہیں ایک دوسرے کے۔ صرف میں اکیلا نہیں۔" پھر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا گیا۔ میں اکیلی بالکل اکیلی بیٹھی تھی۔ مجھ پر سکتہ سا ہو گیا تھا اور لمحے بھر میں مجھے یوں لگنے لگا جیسے زلزلے آ رہے ہوں، جیسے آسمان ٹوٹ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گیا ہو۔ جیسے ساری دنیا کے انسان گدھ بن گئے ہیں، اور میں بری طرح دھاڑیں مارنے لگی۔ اپنا گریبان چاک کر ڈالا۔ اپنا منہ نوچ ڈالا اور کتنا خون میرے چہرے سے بہہ رہا تھا۔ تمام بال بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے اور میں دیوانوں کی طرح تمام کمرے میں قہقہے لگا لگا کر لوٹ پوٹ ہوئے جا رہی تھی۔ میرے کتنے ہی روز و شب یونہی ان ہی کیفیتوں میں گزر گئے۔ کتنے ہی ڈاکٹروں نے دیکھا۔ مگر ان کی سمجھ میں میرا مرض نہ آ سکا۔ میں پھر زور زور سے ہنسی۔ یہ بھلا میرا غم کیا جان سکتے ہیں؟ یہ بھی تو مرد ہیں نا؛ جو پتھر سے بنے ہوئے ہیں اور پتھروں میں بھی کہیں احساس ہوتا ہے؟

سفید چادر پر عالیہ کی زندگی کا ایک ایک داغ ابھر رہا تھا۔ سوچوں کے بھنور میں وہ بالکل مردہ سی ہو گئی تھی۔ سوچوں کے ساتھ ساتھ سانسوں کی رفتار بھی رفتہ رفتہ کم سے کم تر ہوتی جا رہی تھی! پھر ہمدانی نے شادی کر لی۔ وہ ہنی مون منانے چلا گیا۔ اور تب میں کتنا ہنسی تھی۔ میرے قہقہوں کی گونج سے کائنات کا دل بھی کانپ اٹھا تھا۔ وہ ہولناک سوچوں میں سکت لیٹی تھی۔ تب آسمان کا رنگ کیسا نیلا نیلا سا تھا اور انسانیت کے شفاف ماتھے پر ڈھیر سارے پسینے کے قطرے ابھر آئے تھے، اور۔۔ اور۔۔ تب۔۔ لیکن عالیہ اس "تب" کے بعد کچھ نہ سوچ سکی اور اس کی ہر ایک سوچ مٹی کا ڈھیر بن چکی تھی۔

جب نرس کھٹ پٹ کرتی عالیہ کے پلنگ کے قریب آئی۔ چھپے ہوئے چہرے پر سے چادر سرکائی تو وہاں گہرا سکوت تھا۔ آنکھیں تب بھی یوں کھلی ہوئی تھیں جیسے کچھ پوچھ رہی ہوں؟

نرس کی آنکھیں جھلملا گئیں۔ کتنے ہی آنسو ٹوٹے اور بکھر گئے۔ میں نے تمہارے مرنے سے پہلے ہی تمہاری کہانی کے تمام کاغذات نکال لئے تھے۔ مجھے معاف کر دینا عالیہ! تمہاری کہانی کا اک اک لفظ میرے احساس کے پردوں پر نقش ہو گیا ہے۔ تم نے بڑی ہمت و جرأت سے زندگی کی تلخیوں کا سامنا کیا لیکن پھر یوں ہوا کہ تم ہمت ہار بیٹھیں۔ تم زندگی کی صرف ایک غلطی کو برداشت نہ کر سکیں اور یوں ساری دنیا کی غلطیاں اپنے سینے میں چھپاتی رہیں۔ تم نے اپنے ضمیر کی آواز کو اتنے قریب سے سنا، اتنی بار سنا۔ اس طرح سنا کہ سانس لینا تک بھول گئیں۔ مگر اسی دنیا کے کردار، اسلم اور ہمدانی بھی تو تھے۔ وہ۔۔ وہ۔۔ تو تمہارے چلے جانے کے بعد بھی یونہی مسکراتے رہیں گے۔ مگر۔ نہیں۔ میں تمہاری یہ کہانی ضرور اسلم اور ہمدانی تک پہنچا دوں گی۔۔ تاکہ وہ جان سکیں کہ تمہارا خون ان کی گردن پر ہے۔۔ اور ان کے لڑکھڑاتے ہوئے احساسات بھی چونک پڑیں۔ ان کو بھی معلوم ہو جائے کہ دکھ جب حد سے بڑھا دیا جاتے تو اس کی شکل کیسی ہو جاتی ہے۔۔ "نرس!" ڈاکٹر احمد کی آواز پر خیالوں میں ڈوبی ہوئی نرس نے چونک کر دیکھا۔

"ڈاکٹر صاحب! مسز عالیہ اسلم مر گئیں۔"

"مر گئیں؟" ڈاکٹر احمد نے جملہ دہرایا اور پھر ان کی متعجب نگاہیں نرس کے بہتے بکھرتے آنسوؤں پر جم گئیں۔



چیونٹی

ہمارے معاشرے کی ایک روایتی مثلث
ساس، بہو اور نند ویک کا قصہ!

دائیں بازو میں جیسے پوری سوئی اتر گئی!
بانو نے بلبلا کر بازو کو جھٹکا، پھر ہاتھ سیدھا کر کے دیکھا ایک ننھی سی چیونٹی بُری طرح کھال سے چمٹی ہوئی تھی۔ بانو نے دوسرے ہاتھ کی چٹکی سے چیونٹی کو نوچا اور اسے زمین پر ڈال کر پاؤں سے مسل دیا۔
"اُف!" اس کے منہ سے نکلا "اتنی ذرا سی جان اور اتنی ظالم!" اچانک ایک اور سوئی سنسناتی ہوئی آئی اور اس کی سماعت میں پیوست ہو گئی۔
"اب بیٹھی بیٹھی ہاتھ پاؤں پر مالش ہی کئے جاؤ گی یا برتن بھی صاف کرو گی، شام ہونے کو آئی۔ بچے اسکول سے آتے ہی ہوں گے.... توبہ ہے! کس قدر کاہل عورت ہے! اتنی عمر میں تو میں جانے کتنا کام منٹوں میں کر کے پھینک دیتی تھی....!"
یہ بانو کی ساس تھیں۔
نرم نرم دھوپ میں گدگدے بستر پر بیٹھی ہوئی وہ حسبِ معمول پان چبا رہی تھیں اور ایک ناول کا مطالعہ کر رہی تھیں۔ مطالعہ کم کیا جاتا، معائنہ زیادہ ہوتا۔ معائنہ کس کا؟ وہی کمبخت بانو کا۔
بانو، جو تین سال پہلے اس گھر کی بہو بن کر آئی تھی لیکن آج بہو کم اور نوکرانی زیادہ معلوم ہوتی تھی۔
بانو نے جلدی جلدی برتن دھونے شروع کئے۔ جاڑوں کے ننھے ننھے دن اور پہاڑ جیسا کام۔ اس سردی میں سالن اور انڈوں کی چکنائی بھی اس طرح جم جاتی ہے کہ چھوٹنے کا نام نہیں لیتی۔ گرم پانی کر کے ذرا آسانی ہوتی تھی مگر ساس صاحبہ کو یہ فضول خرچی قطعی پسند نہیں آتی جتنی دیر میں برتنوں کے لئے پانی گرم ہوتا اتنی دیر میں

بجائے ہر کی انگیٹھی آدھی جل جاتی اور ایک لکڑی ختم ہو جاتی۔ توبہ! اتنی مہنگی لکڑی اور پانچ روپے! اسے تازہ پانی میں گل کیا جا سکتا ہی ہوتا ہے؟

بانو نے اپنے چکنے ہوئے سیاہ ہاتھوں کو دیکھا جو صرف سے نل کے اوپر لگے بریکٹ پر رکھے وِم کے ڈبے کو دیکھا۔ اگر تھوڑا سا وِم بھی مل جائے تو یہ چکنائی چھوٹ جائے۔

"امی جی! تھوڑا سا وِم لے لوں؟ یہ چکنائی چھوٹ نہیں رہی ہے۔" اس نے بڑی مسکینی سے کہا اور ساس کو کنکھیوں سے دیکھا۔ ایک سوئی پھر ساس کی زبان سے نکلی اور سیدھی آ کر بانو کے کلیجے میں پیوست ہو گئی۔

"بس بی بی! اب تو حد ہو گئی۔ اگر گرم گرم راکھ سے تو جانے کتنے برتن صاف کر کے چمکا دیتی تھی میں۔ یہ چکنائی کا نام ہوتا نہ رکھو کا۔ ہم چم کرنے لگتے سارے برتن ... اور اب تم چلی ہو وِم اور سرف سے برتن صاف کرنے! اسے فضول خرچی کی کوئی حد ہوتی ہے! یہ چیزیں وقت بے وقت کے لئے ہوتی ہیں کہ روز کے خرچ کے لئے؟ اور پھر وہ بھی تمہاری جیسی پھوہڑ کے ہاتھوں۔ ایک تھیلی میں آدھا وِم بانٹ دو، پھر بھی صاف نہ ہو۔"

چیونٹی کو تو نوچ کر پھینکا جا سکتا ہے، مسلا جا سکتا ہے لیکن آواز کی ان سوئیوں سے کس طرح بچا جائے؟ جا اللہ! دل لہولہان ہو گیا! اور جسم — وہ جسم بھی تو ...

بانو کے حلق میں آنسوؤں اور درد کا ایک گولہ سا آ پھنسا۔

اپنے ہی گھر میں وہ کس قدر بے بس تھی۔ ساس کا شوہر اقبال گھر کا سارا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے تھا۔ دو بہنوں کا اور ایک بھائی کا بوجھ، ایک ماں کا بوجھ اور ایک بیوی کا بوجھ بھی۔ خدا کے کرم سے آمدنی اچھی تھی، مزے سے گزر بسر ہوتی تھی۔ مگر دلی سکون نام کی چیز اس گھر میں عنقا تھی۔

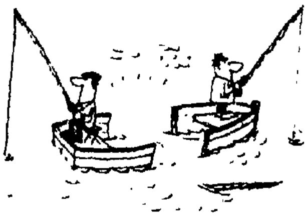
بانو کی گھٹی گھٹی آہیں اور آنسو، ماں کی برچھی جیسی باتیں، بہنوں کے اونچے دماغ، بھائی کی بے راہ روی اور خود سری۔ چھوٹی سی عمر میں ہی اقبال کے سر کے بال آدھے اڑ چکے تھے اور باقی سفید ہو چلے تھے۔ آنکھوں پر چشمہ چڑھ گیا، کمر پر بے شمار بوجھ ڈھیلی ہو گئی تھی۔ ماں کہتی تھی "اسے جب سے اس منحوس قدم نے گھر دیکھا، تب سے ہی نحوست چھا گئی ہے۔ میرا بچہ اندر ہی اندر بتاشے کی طرح گھلا جا رہا ہے ...!" اور بانو بڑے دکھ سے اپنے شوہر کو دیکھتی۔ ہاں سچ مچ وہ کتنا دبلا، کتنا کمزور اور کتنا خاموش ہو گیا تھا مگر کیا اس

کی وجہ وہ تھی؟ کیا شوہر کیا ساس کیا نندیں اور کیا دیور سب ایک کے لئے ایک پاؤں سے کھڑی رہتی ہے۔ گھر کا تانا بانا کاروبار اور ایک نوکر نہیں۔ جب وہ بیاہ کر آئی تھی تو کھانا پکانے والی بھی تھی اور اوپر کا کام کرنے والا ایک لڑکا بھی۔ ساتھ ہی میں بیس سال جھاڑو برتن کرتے اور تعلیم حاصل کرنے اور کھانا پکانے میں گزارے تھے وہ تھک گئی تھی اور اب گئی تھی۔ یہاں سسرال میں دیکھا بڑا آرام ہے۔ بڑا امن ہے۔ نندیں اسکول جاتی ہیں، آتی ہیں، ٹھاٹ سے گھومتی پھرتی ہیں۔ روز کوئی نہ کوئی پروگرام بنتا ہے۔ سہیلیاں آتی ہیں، بازار سے چائے ناشتہ آ جاتا ہے، ہا ہا ہو ہو میں ساس صاحبہ بھی شریک رہتی ہیں۔ بانو اپنے آپ کو دنیا کی خوش قسمت ترین بہو سمجھنے لگی۔ مگر ایک سال کے اندر ہی اس کے سارے خواب چکنا چور ہو گئے۔ ساس کی میٹھی زبان دھیرے دھیرے کڑوی ہوتی گئی، وہ پھر زہر اگلنے لگی۔ اس کی جن باتوں کی تعریف ہوتی تھی اب وہی ہدف ملامت بن گئیں۔ ماما کے ہاتھوں کا کھانا اچانک بدمزہ ہو گیا، چنانچہ اس کو چلتا کر دیا گیا۔ اوپر کا کام والا لڑکا اچانک چور اور نکما نظر آنے لگا، چنانچہ اسے بھی بھگا دیا گیا۔ نندوں کو اپنے پڑھنے اور بناؤ سنگھار سے ہی برابر فرصت نہ ملتی۔ ساس کی پنڈلیوں میں مستقل درد رہنے لگا۔ وہ کام تو در کنار اپنا بستر بھی خود نہ بچھا تیں۔ سر میں نگوڑا تیل لگا کر چٹیا بھی نہ باندھ پاتیں۔ بھوتا نہ کس مرض کی دوا تھی۔ جواب تو بس گرد گرد سا بستر تھا جس پر کھانا، ناشتہ، چائے وقت پر پہنچ جاتا۔ پاندان تھا جس کا ڈھکنا مسلسل بند ہوتا اور کھلتا رہتا اور ناول تھے جن پر خرچ کیا گیا پیسہ ان کو فضول خرچی نہیں بلکہ بہت ہی نیک کام میں لگا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

اب رہی بانو — وہ اس گھر کی بہو بھی تھی، لونڈی بھی اور جو کہو بیٹی تو، توبہ کرو سو بار۔ ساس نے بھوں، منہ ایک ساتھ سکوڑ کر زہر اگلتیں۔

"اے ہے بہو بیٹی برابر ہوتی ہے میں خود ذرا فرق نہیں کرتی مگر ان کو خود ہی گوشت سے ماخن الگ کرنا اچھا لگتا ہے۔ بس نہیں چلتا میرے اقبال کو آلو کا گوشت کھلا دیں۔ اب بھی جیسی بکری بنی پھرتی ...!"

محلے ٹولے میں یا عزیزوں میں کس کا دم خم تھا جو کہہ دیتا۔ ایمان نہ نگلو بی بی، بہو کے ساتھ جیسا سلوک تم کرتی ہو ظاہر ہے اور یہ بے زبان گائے جو کچھ کرتی ہے وہ بھی کھلا ہے۔ کون حق پر ہے، کون ناحق، یہ بھی ظاہر ہے۔ مگر سب شستہ اقبال کی امی جی کی ہتیا



مرچ جیسی زبان سے۔

دن بھر کی تھکی ماندی بانو رات کو گرتی پڑتی اپنے بستر پر جانے لگتی تو اقبال کی امی کراہ کر پکارتیں: "ہائے ہائے اور درد اور اینٹھن کے مارے پنڈلیاں مروڑی جاتی ہیں۔ دلہن ذرا ہاتھ لگا دو تو نیند آجائے...!"

جماہیاں روکتی، نیند بھری آنکھیں پھاڑتی بانو ساس کے قدموں میں آبیٹھتی اور مالش شروع کر دیتی یہ دور اتنا اس قدر طوالت کھینچتا کہ اندر اپنے کمرے میں بیوی سے دو باتیں کر کے دفتر کی بوریت اور تھکن اتارنے والا اقبال، سعادت مند برخوردار بیٹا، کروٹیں بدلتا ہوا سو جاتا اور جب بانو کمرے میں آتی تو اس کو ذرا بھی پتہ نہ چلتا۔ صبح اٹھتا تو بانو غائب۔ بہنیں اور گھر، ماں حاضر مگر بانو ایسے گویا کوسوں دور کچن میں بیٹھی ناشتہ تیار کرنے میں لا اٹھا اٹھا کر سب کو چائے کی پیالیاں پہنچانے میں، بیچ بیچ میں کوئی برتن دھونے میں دوڑ کر دودھ والے سے دودھ لینے میں غرض ایک سانس میں ستر کام کرنے میں مصروف ہوتی۔

اقبال بانو سے کوئی چیز مانگتا تو ماں کے اشارے پر کوئی نہ کوئی بہن دوڑ آتی۔ مثلاً اس نے کہا: "بانو پتلون میں بٹن نہیں ہے۔"

"ابھی آئی۔" بانو میاں کو مخاطب پاکر پھولی نہ سماتی۔ مگر امی بھی فوراً اس کی خوشی کافور کر دیتیں۔

"نہیں تم اپنا کام کرو۔ شبو بٹن ٹانک دے گی۔ اے بیٹا خالی وقت میں بٹن وٹن دیکھ لیا کرو۔ یہ کونسا پھوہڑ پن ہے کہ جو کپڑا دیکھو ادھڑا ہوا، بٹن غائب...!"

بانو گھٹ کر رہ جاتی۔ یہ بھی تو نہ کہتی "امی جی! فرصت نام کی کوئی چیز آپ کے راج میں مل سکتی ہے بھلا؟ اور اگر کوئی کپڑا اسے کرنے کو چھو بھی تو آپ بوں ناک بھوں چڑھاتی ہیں جیسے میں نے کوئی غلط چیز اٹھالی ہے۔

پھر بھی نہیں کہ اس کو ٹھیک کر کے ہی رکھیں بلکہ یوں ہی اٹھا کر ڈال دیتی ہیں اس لئے کہ جو کام ان کے سامنے نہ ہونا چاہیئے وہ سامنے کر دیا جاتا ہے۔"

کبھی اقبال کے دل میں بھڑک اٹھتی تو کہتا: "امی جی بانو دن بھر کام کاج کیا کرتی ہے گھر سے باہر نہیں نکل پاتی۔ شام کو پکچر دکھا لاؤں، ذرا دماغ تازہ ہو جائے گا!"

امی جی تڑپ کر کہتیں: "بس بس چپ رہو۔ ایک تمہاری بیوی دنیا سے نرالی نہیں ہے سب بہو بیٹیاں گھر کا کام کرتی ہیں۔ وہ بیوی ہی کیا جو گھر بار نہ سنبھالے۔ آخر میں نے بھی برسوں یہ سب کیا ہے کون سا روز تفریح کرتی تھی اور کونسی صحت خراب ہو گئی تھی؟"

اقبال سر جھکا کر دل کی اس بھڑک کو گھونٹ لیتا اور بانو دل گھٹنے کے بہانے آنسو بہانے لگتی۔

"بیٹیاں کام نہیں کرتیں تو اس کے لئے امی جی کا کہنا یہ تھا: "پرایا دھن ہیں کل کو چلی جائیں گی، اپنے گھر بار میں الجھ جائیں گی پھر کہاں یہ تفریح اور آزادی ہو گی۔ جی بھر کر گھوم پھر لیں۔ بھاوج کو خود یہ سوچنا چاہیئے۔"

بانو بے چارگی سے ان کو دیکھتی اور رہ جاتی۔

میکے میں بھی توڑ کام کرنے کے باوجود وہ سوکھی کھانے کے بعد بھی بانو کی تندرستی۔ بانو کی شگفتگی دیکھنے والی تھی سرخ و سفید رنگ دیکھ کر تازہ تازہ سیبوں کی تشبیہ بالکل صحیح اترتی۔

لیکن اب؟

گھٹ گھٹ کر، جل جل کر، جذبات و احساسات کو مار مار کر ساس کی نکتہ چینیوں کا بوجھ دل پر اٹھا اٹھا کر وہ سیب جیسی رنگت راکھ ہو چکی تھی! گالوں کی بھری ڈبل روٹی پچک نے لگا تھا ایک اداسی کی تہہ ہر وقت چہرے پر چھائی ہی رہتی تھی۔ اقبال بیوی کی حالت سے بے خبر نہیں تھا لیکن مجبور تھا، بے بس تھا، بچپن ہی سے ماں نے دباؤ بنا کر رکھا۔ جوان ہوا تو باپ کی موت نے ذمہ داریوں کے بوجھ سے دبا دیا۔ ماں نے جو جو تکلیفیں برداشت کی تھیں ان کا بھی اس کو احساس تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ ماں کے دل کو اس کی ذات سے ذرہ برابر بھی دکھ پہنچے۔ مگر بیوی کی زیادتیاں اور زبردستیاں دیکھتا، بہنوں کی بے پروائی دیکھتا اور بانو کو گوشت پوست کی مشین بنا دیکھتا تو کڑھتا تھا جلتا بھی تھا۔ اسے اتنا موقع بھی نہ ملتا کہ اسے ہمدردی کے دو بول ہی سنا سکے، اس کے زرد، پژمردہ مکھڑے کو

کو پیار سے تھپتھپا کر ایک ذرا سی مسکراہٹ ہی دیکھ لے۔ گرمیوں میں سب کے بستر آنگن میں لگتے۔ امّی جی کے ایک طرف شبو اور رنو کا پلنگ ہوتا، دوسری طرف بانو کا۔ اقبال افضال ان چاروں سے کافی دور پلنگ سے پلنگ ملا کر لیٹتے۔

رات کو کسی وقت بانو کی آنکھ کھل جاتی تو وہ سر اٹھا کر میاں کے پلنگ کی طرف دیکھتیں۔ اس حسرت سے اس ہمک سے جس طرح کوئی بچہ چاند کو دیکھتا ہے اور کبھی کبھی ٹھیک اسی وقت اقبال کا سر بھی اٹھتا۔ بانو کھانستی۔ "یا اللہ!" کی ہلکی سی آواز کے ساتھ گویا بتاتی۔

"نیند نہ آئے ساری رات رے۔۔۔۔" اقبال دھیرے سے اٹھتا مگر پلنگ زور سے چرچراتا۔ امّی جان نے شاید یہ پلنگ بھی سوچ سمجھ کر اقبال کو دیا تھا۔

پھر جیسا سر اٹھتا — ادھر بانو کی سانس رک جاتی۔

"اقبال، کیا بیٹے گرمی بہت ہے؟ پنکھا جھلا لو۔" امّی جی کہتیں، پھر وہ اٹھ کر بیٹھ جاتیں، پاندان کھولتیں، پان کھاتیں۔ اپنی بے وقت کی لمبی لمبی ڈکاروں کو کوستیں، بگڑی کا شکوہ کرتیں۔ شبو کو ٹھیک طرح لیٹنے کی تنبیہ کرتیں، رنو کو تکیے پر سیدھا کر لینے کے لیے پکارتیں۔ افضال کے اونچے خراٹوں کو برا بھلا کہتیں۔۔۔۔"

اقبال دم سادھ کر لیٹ جاتا، بانو مردہ بن جاتی۔!

یہ تھے بانو کے شب و روز۔

بانو کے لئے اس ہر لمحہ کی قیامت میں کبھی کوئی تبدیلی آتی تھی تو میکے جانے پر۔ مگر یہ آزادی بھی چند روز کی ہوتی۔ نہ دس دن وا ویلا مچاتیں امّی جی اچانک بیمار پڑ جاتیں۔ پنجرے سے نکل کر پرواز کر کے ابھی چڑیا نے انگڑائی لی ہی ہوتی کہ پنجرے کا دروازہ پھر کھل جاتا، چڑیا پھر مٹھی میں کس لی جاتی۔

امّی جی ہمیشہ افضال کو ہی بانو کے میکے بھیجتیں۔ اقبال نے چوتھی کے بعد سسرال کی دہلیز نہیں دیکھی تھی۔

کبھی کبھی کوئی پوچھ بیٹھتا "بہو کی گود ابھی نہیں بھری۔ اللہ رکھے شادی کو تین سال ہو رہے ہیں۔" تو امّی جی ٹھنڈی سانس بھر کر کہتیں "اپنا اپنا نصیب ہے بہن کوئی بہو آنچل میں کچھ باندھ کر آتی ہے کوئی نہیں۔ تین برس ہو گئے یا ایسی گھو کا کرتی ہے سارے مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ اقبال کے بچے کی حسرت لئے ہی اس دنیا سے اٹھ جاؤں گی۔"

بانو کے دل میں کرچیں چبھنے لگتیں لبوں پر ایک گھٹی گھٹی آہ ابھرتی اور وہ اپنے بے پناہ آنسوؤں کے ابال کو روکتی ہوئی اپنے سنگھاسن یعنی کچن میں جا بیٹھتی۔

اور آج —

اور آج تو اس کو واقعی بڑی سستی معلوم ہو رہی تھی۔ ہاتھ شل ہوئے جا رہے تھے۔ آنکھیں بار بار بند ہو جاتیں اور سر کا درد معاذ اللہ جیسے کوئی ہتھوڑے برسا رہا تھا۔

ابھی کتنے سارے برتن باقی تھے۔ پلیٹیں، تھالیاں، پیالیاں کاسے، ان سب صاف کر چکی تھی لیکن دیگچیاں ابھی سب باقی تھیں، اور یہ فرائی پین، یہ کڑاہی اور وہ توا — اُف!

یہ چکنائی! اس نے تھک کر بے بس ہو کر اپنے چکنے سیاہ ہاتھوں کو دیکھا۔ چونا تھی کہ بادے سے رگڑ رگڑ کر ایک پھر اسے ورنہ صاف برتن رکھتے وقت پھر گندے ہو جائیں گے۔ اقبال شروع میں اس کے لئے چیریں سوپ اور صندل سوپ لاتا تھا۔ انہیں شبو، رنو زیادہ گھستیں۔ وہ تو بس کبھی کبھار ہی استعمال کرتی۔ امّی جی کو اس کے چہرے کی چمک کھٹکی تو انہوں نے اتنے چنگے صابنوں پر پابندی لگا دی "ضرورت ہی کیا ہے صابن کی۔ ذرا سا آٹا گیلا کر و اور منہ پر چپڑ کر دھو ڈالو۔ رہی شبو رنو کی بات۔ صبح شام چیریں سوپ گھستی ہیں تو کیا ہوا؟ کل کو جاتی ہیں۔ چار آدمیوں سے ملتی ہیں۔ پھر یہ کل کو پرائی ہو جائیں گی۔ کاہے کو بھائی کی کمائی کھانے اٹھانے آئیں گی۔"

بانو اٹھی ہی تھی کہ اسے زور کا چکر آیا۔ جلدی سے ہاتھ تھام نہ لیتی تو چٹاخ سے فرش پر گرتی۔

"توبہ ہے بی بی حد کر دی تم نے نزاکت کی!" امّی جی چیخ کر بولیں۔

"مجھوا بھر برتن جٹوئے بیٹھی ہو۔ صبح سے شام کر دی بولا کیا ابھی آتی ہوں گی۔ چائے مانگیں گی اور یہاں چولہا ہی نہیں جلا۔۔۔ اسے کچھ ہو نہیں پاتا تو اماں کو لکھو کہ کوئی لونڈی بھیج دیں۔۔۔ لوگ کہیں گے لونڈی پر لونڈی اتری توبہ! مزاج عرش معلیٰ پر ہیں۔ اپنے میکے میں دن رات جھاڑو برتن کرتی تھیں تو گوارا تھا۔ یہاں۔۔"

بانو نے اپنے چکنائے، چپچپے، پھٹتے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر زمین پر بیٹھتے ہوئے بڑی التجی سی آواز میں کہا "امّی جی بس بہت ہو چکا!"

امّی جی کے سر پر گویا بم پھٹ پڑا۔



ایں! یہ کون بولا؟ یہ کس کی آواز تھی؟ یہ کس کا باغی لہجہ تھا؟ کیا یہ چیونٹی؟ یہ — یہ بانو؟ کیا اس نے کہا تھا؟ وہ بلبلا کر تلملا کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ یوں بڑھیں جیسے بانو کو، اس چیونٹی کو، حقیر سی چیونٹی کو پاؤں سے مسل ڈالیں گی! "کیا کہا؟ دماغ ٹھیک ہے نا تمہارا؟" وہ گرج کر بولیں۔

لیکن بانو دبی نہیں۔ سر جھکا کر باورچی خانے کی طرف بھی نہیں بھاگی۔ اس نے سر اٹھا کر امی جی کی طرف دیکھا۔

اس کا چہرہ زرد انگارے کی طرح تپ رہا تھا۔ آنکھیں سرخ تھیں اور ہونٹ پھڑکے جا رہے تھے۔

"جب چیونٹی دباؤ برداشت نہیں کر پاتی تو کاٹ بھی لیتی ہے بہن!" امی جی کے کانوں میں اچانک محلے کی جگو خالہ کی آواز گونج اٹھی۔ وہ کل ہی تو آئی تھیں۔ دنیا بھر کے قصے سنا رہی تھیں۔ انہوں نے "میں تو خدا لگتی کہوں گی بہن، تمہاری بہو بے زبان گائے ہے۔ گائے ایسی اچھی لڑکی تمہیں چراغ لے کر ڈھونڈنے سے نہ ملتی۔ ارے بہو آج کل کی بہوئیں ہوتی ہیں کہ پٹاخہ۔ دنیں تو ساری سسرال ہلا ڈالیں کیا ساس کیا سسر، کیا نند اور جیٹھ دیور، سب کو ملا جوتی کی نوک پر اور میاں کو لے کر دوسرا گھر بسا بیٹھیں۔ اب ان پڑوس والی وکیلن کو دیکھو، کیسا دبدبہ تھا! کیا دھاک تھی ان کی، اگر بہو آئی اور ان کا راج ختم بیٹا ہے سو بیوی کے اشاروں پر ناچتا ہے۔ آٹھ آٹھ آنسو روتی ہیں ... اور بہن میری اس کے برعکس تمہاری بہو ہے — ہائے مجھے تو اس پر ترس آتا ہے ....!"

بانو ان کو یک ٹک دیکھ رہی تھی۔ آخر یہ آنکھیں کیوں نہیں جھکاتی؟ یہ کیسا انقلاب تھا؟

"نہ کر ساس برائی، تیرے آگے بھی جائی" جگو خالہ برابر ان کے کانوں میں کہے جا رہی تھیں۔ "کل کو تمہاری لڑکیاں بھی ساس کے زیر سایہ ہوں گی۔ ذرا اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر انصاف کرو بہن، میں تو خدا لگتی بات کہوں گی...!"

یہ بانو کا چہرہ اتنا لال کیوں ہے؟

کیا غصے سے دل کی آگ ہے؟ جذبات کی بھڑک ہے؟

اور یہ آنکھیں، جو ان کے سامنے سدا جھکی رہتی تھیں، اس باغیانہ میں ان کو تکے کیوں جا رہی ہیں؟

جگو خالہ نے گھی کا خالی ٹین بجا بجا کر گانا بھی تو گایا تھا۔

"مار لایا رے سمندے سے مچھلی مار لایا رے۔

ساس نہ پکاوے نند نہ پکاوے۔

پکائے بیٹھی بہو پرائی جائی بٹیا پکائے بیٹھی رہی۔"

جگو خالہ خدا تمہارا بیڑا غرق کرے۔ تمہاری باتوں نے ہی یہ انقلاب اٹھایا ہے...

خدا لگتی بات؟

ہاں یہی تو ہے نا کہ بانو واقعی بڑی دکھی بڑی بے کس ہو گئی ہے۔ کس قدر خاموش اور افسردہ رہتی ہے۔ کپڑے سال کپڑے بھی پھٹے میلے ہیں۔ بال بھی نہیں سنوارے گئے ہیں۔

وقت؟ ہاں وقت ہی کب ملتا ہے؟ اتنی دیر سے پیاز لہسن اور دھوئیں کی مہک چلی آ رہی ہے .... اقبال تو بڑا ہی نفاست پسند ہے! کپڑوں پر ہر وقت سینٹ چھڑک کے رہتا ہے ... مگر ... وہ دونوں اس قدر قریب ہی کب ہوتے ہیں کہ بو اور خوشبو کی شکایت ہو۔

"کل کو تمہاری لڑکیاں بھی ....؟"

"نہ کر ساس برائی ....!"

دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔

"مجھے بخار سا ہے امی جی — میں اس وقت معافی چاہوں گی؟"

بانو نے ایک لمبی سانس کھینچ کر جھوٹے برتنوں کے انبار کو دیکھا پھر امی جی کو اور ڈگمگاتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی۔

ابھی دو قدم ہی چلی ہوگی کہ دماغ چکرا گیا۔ اس بار وہ اپنے کو سنبھال نہیں سکی۔

لیکن وہ زمین پر نہیں گری۔ امی جی کی پھیلی ہوئی باہوں میں گری۔ اس کے چکناہٹ لگے سیاہ ہاتھوں، لہسن اور پیاز کی بو میں بسے کپڑوں اور راکھ اور مٹی کے ذرات سے بھرے بالوں سمیت امی جی نے اس کو اپنی گود میں سمیٹ لیا —!

"ہائے تمہیں تو سچ مچ بخار ہے بیٹی — افضال! او افضال! لپک کر اقبال کو بلا لا — دلہن کو ابھی ابھی ڈاکٹر کے یہاں لے جائے توبہ! اتنا بھی کام کیسا کہ آدمی بیوی بچوں کو بھول جائے!"

دوشیزہ کی محفل

رعنا فاروق

بہت اچھی بی بی رخسانہ! اس خط کو اپنے ایک ایسے دور افتادہ بڑے بھائی کا خط سمجھئے جس نے آپ کو دیکھا بھی نہیں۔ ایک نام جو مجھے بےحد عزیز تھا اور جس کے بارے میں زمانے سے میں کچھ جاننا چاہتا تھا۔ جب وہ یکایک میرے سامنے آیا تب ہی سے تفصیلی خط لکھنے کی سوچ رہا تھا۔ کچھ نجی الجھنیں بلکہ گھر کی تبدیلی تاخیر کا باعث ہوئی۔

سب سے پہلے میری دلی مبارکباد قبول کیجئے کہ آپ اتنا اچھا پرچہ نکال رہی ہیں کہ گھر کا ہر شخص اس کا گرویدہ ہے۔ بیوی کے ہاتھوں سے بھاوج لے اڑتی ہے۔ بھاوج سے بچ جائے تو نندیں حملہ کرتی ہیں۔ میرے گھر آنے والا رسالہ مہینہ ختم ہونے تک کسی اور گھر سے دستیاب ہوتا ہے۔ بھرنے پرچے کی آمد کے منتظر سوالات کی بوچھاڑ کر کے مجھے تنگ کرتے ہیں۔ سنا ہے آپ نے عصمت چغتائی نمبر نکالا ہے، شاندار قسم کا! میں تو اس سے بھی محروم ہوں۔

اب ایک کام کیجئے، وہ جو آپ کے نام کے ساتھ ایک نام مشترک ہے سہام مرزا، اس کو میرا بہت بہت پیار پہنچا دیجئے (ستین بھائی اپنا ان دنوں کی یاد دلایئے اور ساتھ کی بات سن لیجئے۔ آپ کے حکم کی تعمیل میں میں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے) یہ نوجوان میرے گھر اکثر آتا تھا۔ مفتی تبسم اور سہام مرزا میں خلیہ میں رہتا تھا۔ دارالعلوم کالج میگزین "ٹکرزوت" کے لیے مجھ سے افسانہ لینے بیسیوں آتے تھے۔ سہام مرزا ان دنوں کالج میگزین کے ایڈیٹر ہوا کرتے تھے۔ مفتی تبسم ملتے رہتے ہیں۔ جب بھی انہوں نے پرانی یادیں تازہ کیں میں نے سہام کو پوچھا، مفتی نے یہی کہا کہ پتہ نہیں کہاں ہے کیسا ہے بس اتنا جانتا ہوں پاکستان گیا تھا۔ دوشیزہ دیکھا تو دوشیزہ کے حسن سے زیادہ اس بات نے مسرور کیا کہ سہام مرزا دستیاب ہوئے۔

اب مجھے جلدی سے ایک اچھا سا خط لکھئے اور سہام مرزا سے لکھوائیے!

(اگر جواب کے طور پر ہم خود ہی آپ تک پہنچ جائیں تو ؟) ـ

ہمیں خوشی ہے کہ ہماری محفل میں دوستوں کی تعداد بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے۔ ہر مہینے ہمیں محبت اور خلوص میں ڈوبے اتنے خطوط ملتے ہیں کہ بعض اوقات ان کا نشہ نہیں اترتا۔ سچا خلوص حقیقتاً بہت بڑا نشہ ہے، ہماری کوشش ہوتی ہے کہ محفل میں سبھی کو جگہ ملے۔ لیکن بعض اوقات صفحات کی کمی یا دیر سے خطوط ملنے کی وجہ سے بہت سے دوست جواب سے محروم رہ جاتے ہیں۔ ان کے خطوط اگلے ماہ سب سے پہلے جگہ پائیں گے

ہیں۔ قارئین سے التجا گزارش ہے کہ پرچہ ہاتھ میں ملنے کے بعد دس دن کے اندر اس کے متعلق اپنی رائے سے آگاہ کر دیا کریں۔ تبھی ان کے خطوط وقت پر مل سکتے ہیں۔ پیار اور خلوص کا شکریہ ایک بار پھر ادا کرنے کے بعد محفل میں آنے والی سب سے پہلی بہن سے سلام دعا شروع کرتی ہوں۔

○ رشیدہ نذر ٹنڈو محمد خان سے آئی ہیں۔ فرما رہی ہیں "یہ میرا دوسرا خط ہے۔ اگر اس کا جواب بھی نہیں ملا تو تیسرا لکھوں گی پھر چوتھا اور پانچواں۔ آخر کب تک میری آواز آپ تک نہ پہنچے گی۔ جون کے شمارے میں دونوں سلسلے "جلتے پھول" اور "جانور" نے بہت متاثر کیا۔ کیا "آئیڈیل کی تلاش" کے ذریعے واقعی شادیاں ہو جاتی ہیں؟ اس کا جواب ضرور دیجئے۔"

رشیدہ جی! اب اپنی آواز ذرا دھیمی کر لو یہ ہم تک آسانی سے پہنچ رہی ہے۔ "آئیڈیل کی تلاش" میں کچھ مجھ سے پوچھنے کی ضرورت کیا ہے؟ آزما دیکھو!

○ درشہوار ایمن راجپوت نے کراچی سے یاد کیا ہے۔ "رعنا دیدی! سلام شوق! یقین کریں شروع سے اب تک "دوشیزہ" دل و جان سے مجھے پیارا ہے۔ میں نے دو ماہ پہلے افسانہ بھیجا تھا، اس کا انجام تو بتا دیجئے۔ سب کو سلام!"

درشہوار! تمہارا افسانہ تھوڑی سی ترمیم کے بعد شائع ہو جائے گا۔ جواباً پیار لو!

○ جاوید اختر مردان سے لکھتے ہیں۔ "جانور" نے اب تک کوئی خاص مزہ نہیں دیا۔ شاید آگے جا کر "فرار" کی طرح دلچسپ ہو جائے۔ "تین عورتیں تین کہانیاں" سب سے دلچسپ سلسلہ ہے۔ پچھلے شمارے میں دو شاہزادوں نے کھانے پکانے وغیرہ کے سلسلوں پر نقد دیا تھا۔ عزیز باجی! ان کی بات مت مانیے۔ کیونکہ پھر یہ "مردوں کے لیے خواتین کا رسالہ" کی بجائے خواتین کے لیے خواتین کا رسالہ بن جائے گا۔"

جاوید! بات تو تم نے واقعی کام کی کہی ہے۔ اور اب ذرا یہ تو بتاؤ "جانور" میں تمہیں کس خاص مزے کا انتظار ہے؟

○ سلمیٰ پروین سولنگی (جگہ گمنام) لکھتی ہیں۔ "بہت خوبصورت ہے میری باجی رعنا! پہلی مرتبہ خط لکھ رہی ہوں۔ مجھے آپ نہیں "دوشیزہ" بہت پسند ہے۔ عظمت عزیز سے کر دیں، تارا کا انجام اچھا ہونا چاہئے ورنہ —— بجز قریشی سے ملاقات اچھی رہی۔ لطیفے بھیج رہی ہوں بتائیے کیسے ہیں؟"

سلمیٰ پہلے تو ہمیں آسمان پر چڑھا دیا پھر سر پر چڑھ گئیں۔ خیر ہم تمہاری پہلی بات سے ہی محظوظ ہوتے رہیں گے (حالانکہ ہم خوبصورت ہرگز نہیں) تارا اپنے انجام کو پہنچ چکی ہے۔ عظمت کو پیغام دینا فضول ہے۔ اور لطیفے تمہارے اتنے پرانے تھے کہ بس ——!

○ نگہت رعنا نیازی لکھتی ہیں "آپ کی اپنائیت نے آنے کے لیے مجبور کر دیا۔ اپنی "دوشیزہ" جی کی بیوٹی بڑھانے کے لیے ایک بیوٹی فل مشورہ یہ ہے کہ خوبصورت اشعار کا سلسلہ شروع کر دیں پھر دوشیزہ کتنی نکھرے گی۔ سمیرا حسن کا شاہکار خوبصورت ناول "جلتے پھول" بہت اچھا جا رہا ہے۔ ایک سچی کہانی بھیج رہی ہوں، یقیناً قابل اشاعت ہوگی۔"

بیوٹی فل لڑکی کا بیوٹی فل مشورہ "دوشیزہ" نے قبول کر لیا اب یہ مجھ سے پوچھ رہی ہے کہ یہ خوبصورت مشورہ کہاں سے آیا۔ میں نے تمہارا نام بتا دیا، شکریہ قبول کرو۔ کہانی کے متعلق تم نے خود کہہ دیا ہے کہ یقیناً قابل اشاعت ہوگی۔ ہماری یہ مجال کہ تمہارا یقین مجروح کریں۔

○ شمع نے بازار حسن حیدرآباد سے ہمیں یاد کیا ہے فرماتی ہیں "آپ کو یاد ہوگا ایک بار پہلے بھی آپ نے کہانی کے ذریعے میری مدد کی تھی۔ قسمت نے مجھے پھر تازیانہ مارا ہے۔ مجھے حوصلہ افزائی اور مدد کی ضرورت ہے۔ ان [illegible]ں اور اچھی تحریروں نے مجھے کہیں کا نہ چھوڑا۔ انہیں نہ چھوڑتی تو اپنے ماحول سے سمجھوتہ کر لیتی۔"

شمع! میرا مکمل خلوص تمہارے ساتھ ہے۔ میں اس دفعہ بھی جس حد تک ہو سکا تمہاری مدد کروں گی۔ اس بار تمہاری کہانی تحریر کر دی ہے۔

○ انور خان نے شمارہ جون کے "اداریئے" کی تعریف کرتے ہوئے رخسانہ سہام مرزا کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں "انہیں مبارکباد کے ساتھ دعا دیتا ہوں کہ معاشرے کو ان جیسی اہل دل اور اہل قلم اور اہل نظر خواتین کی ضرورت ہے۔"

انور! جواباً رخسانہ سہام مرزا کا شکریہ قبول فرمائیے!

○ خالد لو قلندرانی نے بجوں سے شکایت نامہ بھیجا ہے۔ ایک طرف ہدایت ملتی ہے کہ خط ہر ماہ کی ۹ تاریخ کو دفتر پہنچ جانے چاہئیں دوسری طرف خود دوشیزہ کا یہ عالم ہے کہ چار تاریخ تک بھی نہیں

بہنچ پاتی! تو کیا صرف آپ کو اپنی خیریت کا خط لکھ کر بھیج دیا کروں؟"
واہ بھائی قلندر رانی! آپ کی جھنجلاہٹ پر قسم سے میں جی بھر کے ہنسی ہوں۔ ارے بھائی، خیریت کا خط بھیج لینے میں کیا مضائقہ ہے! بنی رائے اگلے شمارے میں بھیج دیجئے، ہم خط ضائع تو نہیں کرتے۔ دراصل ملکی حالات میں گڑبڑ کی وجہ سے پرچے کی تاریخوں میں ردوبدل ہو گیا تھا۔ آپ کی یہ شکایت جلد دور ہو جائے گی ——— ہاں تو اب اپنی خیریت کا خط کب بھیج رہے ہیں؟

○ زہرہ انور نے مردان سے خط بھیجا ہے۔ "باجی! مجھ میں ایک کمی ہے۔ میں صرف ساتویں تک پڑھ پائی ہوں مگر افسانے لکھنے کا شوق ہے۔ کیا میں افسانہ بھیج دوں۔ اس دفعہ آپ کی لکھی کہانیاں میں "میں سازش کا شکار ہو گئی" بہت اچھی لگی۔ مجھے آپ کی تحریر بہت اچھی لگتی ہے۔ خدا آپ کو اچھی زندگی دے تاکہ اسی طرح اچھی تحریریں لکھتی رہیں۔"

زہرہ! میری تحریر اور مجھ سے بے پناہ خلوص کا بے حد شکریہ! تم جب محبت سے میری تحریر پڑھتی ہو تو وہ تمہیں اچھی لگتی ہیں۔ بس! یہ تمہاری چاہت کی بات ہے۔ افسانہ لکھنے کے لیے تم ادب کا کیڑا بن جاؤ۔ جب تک تمہارا مطالعہ بہت زیادہ وسیع نہ ہو جائے۔ قلم ہاتھ میں مت پکڑنا۔ یہ میرا مشورہ ہے۔

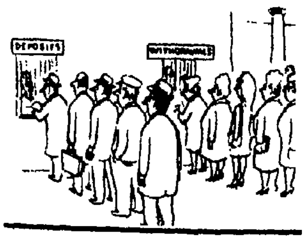
○ غلام حیدر عباسی ڈاکخانہ پنڈورہ شریف سے ایک خواہش لے کر آئے ہیں۔ فرماتے ہیں "آرزو تو بہت پرانی تھی مگر حوصلہ پیدا نہ ہوتا تھا۔ مجھے آپ کی اور رخسانہ صاحبہ کی تصاویر چاہئیں! انہیں عقیدت کے ہار ڈال کر کمرے میں سجاؤں گا۔ اگر میری بات نامعقول لگے تو صرف آٹوگراف پر گزارا کر لوں گا!"

حیدر! میرے اچھے بھائی، اس معاشرے میں نام نہاد شرفا کے نزدیک یہ باتیں معیوب سہی مگر ہمارے ذہنوں میں اتنی وسعت ضرور ہے کہ عقیدت اور خلوص کی پہچان اور اس کی صحیح قدر کر سکیں۔ آپ کی یہ خواہش ضرور پوری کر دوں گی، مگر ذرا فرصت ملے۔

○ لاہور سے شاہد قمر لکھتے ہیں۔ "سویٹ رعنا! میرے افسانے "سایہ" کا کیا بنا؟"

سویٹ قمر بھائی! "سایہ" غائب ہو گیا۔ صبر کر لو، آپ کی دوسری فرمائش نوٹ کر لی ہے، جلد پوری کر دوں گی۔"

○ سمیع اللہ عقیل نے لاڑکانہ سے نوازش نامہ بھیجا ہے۔ "رخسانہ صاحبہ نے جمشید انصاری پر اداریہ لکھا ہے۔ واقعی مرحوم پر جتنا لکھا



جائے کم ہے، خدا ان کے لواحقین کو صبر عنایت کرے۔"
آمین —!

○ راولپنڈی سے ہمارے عزیز دوست طارق رشید لوبی نے یاد کیا ہے۔ "میرے افسانے "پیاسی کی پیاس کب بجھے گی۔" میں نے دو افسانے لکھے تھے۔ [illegible] کرنا باقی تھے کہ گم ہو گئے۔ عظمت عزمی کو میری طرف سے مبارک باد پہنچا دیجئے۔ کیا آپ اپنی تصویر دے سکتی ہیں؟"

طارق! ہم سے جھوٹ مت بولو۔ تم نے ہمیں افسانہ بھیجا ہی کہاں ہے؟ ان دو افسانوں کی طرح اسے بھی خود گم کر دیا ہو گا اور پوچھنے ہم سے بیٹھ گئے۔ کراچی آؤ تو تصویر دے جانا۔

○ یاسمین عزیز لونی نے تربت مکران سے لکھا ہے۔ "مجھے طارق رشید لوبی کے دونوں افسانوں نے متاثر کیا۔ میرا اور ان کا اندازِ فکر ایک جیسا ہے۔ کیا وہ مجھ سے [illegible] دوستی کرنا پسند کریں گے؟ کتنا بڑا المیہ ہے ہم جیسی لڑکیوں کا! اگر وہ کسی مرد سے صاف ستھری دوستی کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے کیونکہ تحریر سے لوگ عموماً غلط فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔ مجھے پتہ نہیں کیوں یقین ہے، طارق رشید لوبی ایسے نہیں ہیں۔ انہیں مبارک باد اور سلام پہنچا دیں۔"

طارق میاں جواب دو!

○ حنا درانی نے کوئٹہ سے طویل خط بھیجا ہے جس کی ایک ایک سطر پیار کی چاشنی میں ڈوبی ہوئی ہے۔ لکھتی ہیں "آخر آپ ہیں کیا بلا؟ بلاوجہ مجھ جیسی خوددار طبیعت لڑکی کو ڈسٹرب کر ڈالا۔ اس پر طرّہ کہ اندازِ تحریر دل موہ لینے والا! آخر کیا ضرورت تھی اتنا اچھا ہونے کی جو میں یوں سالوں سے آپ کو چاہ رہی ہوں!"

حنا! تمہاری چاہت بے اثر تو نہیں گئی۔ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ انسان خود مخلص ہو، سچا ہو، دوسروں سے پیار کرنے

کا جذبہ رکھتا ہو۔ لے پھر بھی اپنے جیسے لگتے ہیں تم خود اچھی ہو
اس لیے اپنی شخصیت کا عکس مجھ میں ڈھونڈنے بیٹھ گئیں۔ پھر بھی تمہارے
اظہار خلوص کا شکریہ۔ جواباً پیار دو، دعائیں لو!

○ اسرار احمد قریشی نے راولپنڈی سے خط بھیجا ہے۔
"دوشیزہ" ایک بہت پیارا ماہنامہ ہے جو ہر ماہ نئی سج دھج کے ساتھ
ملتا ہے۔ آپ کی پوری ٹیم کو مبارکباد! اپنا افسانہ بھیجنا چاہتا ہوں!"

اسرار بھائی! شکریہ! افسانہ بھیجیے کس نے روکا ہے!

○ افشاں دلنشیں نے کراچی سے لکھا ہے "میں اپنی پاکٹ
منی میں سے پانچ روپے سب سے پہلے نکال کر رکھ دیتی ہوں بتائیے
کس لیے؟ جلتے پھول "تین عورتیں تین کہانیاں" اور "جانور" میرے
پسندیدہ کالم ہیں!"

اپنے ادبی ذوق کی مکمل تسکین کے لیے۔۔۔! بوجھ لیا نا!

○ اے جی عارف نے کراچی سے یاد کیا ہے "آپ لوگ چند
ماہ سے ہمارا دل توڑنے لگے ہیں۔ پرچہ بہت دیر سے مارکیٹ میں بھیجتے
ہیں کہ دم الجھنے لگتا ہے۔ آپ کے چند سلسلے "فحاشی و عریانی" اشعار کا
اضافہ بہت خوب ہیں۔ مگر شعر پھیکے پھیکے لگے!"

عارف صاحب! ملکی حالات میں گڑبڑ ہونے کی وجہ سے
ہر شعبے پر اثر پڑا۔ پرچے کی تاخیر کا یہی سبب تھا۔

○ شاہین اختر نے کراچی سے پوسٹ کارڈ بھیجا ہے لکھتی
ہیں۔ "ورق ورق چھان مارا مگر پرچے میں میرا نام نہیں تھا۔ بتائیے
افسانہ کیسے بھیجا جاتا ہے۔۔۔!"

جیسے خط بھیجا ہے۔۔۔ مگر خدارا پوسٹ کارڈ پر نہ لکھ
بھیجیے گا۔۔۔!

○ چوہدری نثار اختر نے وہاڑی سے تحریر کیا ہے "منورہ
نوری اور مسعود مفتی کی خدمت میں مبارکباد پہنچا دیجیے۔ ہر شعبے
سے متعلق خط و کتابت براہ راست آپ سے کی جا سکتی ہے؟ سابقہ
محفل میں آپ کے جذبات سے اتنا متاثر ہوا کہ آپ کو قابل عزت
درجہ دے ڈالا۔۔۔!"

نثار بھائی! سچ بتائیے اس سے پہلے کیا درجہ دیا ہوا تھا؟
آپ اپنے ہر شعبے سے متعلق تجاویز الگ الگ صفحات پر اس محفل میں
براہ راست بھیج سکتے ہیں۔ متعلقہ شعبوں تک وہ پہنچا دی جائیں گی!

○ دبئی سے احمد نے لکھا ہے "مجھے چمن میں ایک خواہش
لے کر حاضر ہوا تھا۔ آپ نے بات تک نہیں پوچھی خواہش پھر دہرا
رہا ہوں ۔۔۔ ایک بے سہارا، غریب، دکھی مگر تعلیم یافتہ ہو
چاہیئے! جس کا کوئی بھائی نہ ہو۔" پتہ ہے۔ احمد معرفت پو
پوسٹ بکس نمبر ۱۸۱۱ دبئی۔

بے سہارا، دکھی، غریب مگر تعلیم یافتہ بہنیں موجود ہیں۔

○ سعید اختر نے کراچی سے یاد کیا ہے "اس دفعہ تیلا گرا
لوٹا گھری لڑکی نے بہت متاثر کیا مجھے حب الوطنی میں دوست
بنانے کا شوق ہے پلیز میرا ایڈریس شائع کر دیجیے۔ سعید اختر مغل ۱۲/۱
C-۱ ناظم آباد کراچی۔

○ اسماء اور شمیم دو پیاری بہنوں نے لیبیا سے ہمیں طویل محبت
نامہ بھیجا ہے لکھتی ہیں "ہم آپ کے لیے اجنبی سہی مگر آپ ہماری طویل
عرصے سے غائبانہ دوست ہیں۔ آپ جس انداز سے "دوشیزہ" میں آتی
ہیں سابقہ پرچے میں تو اس کا عشر عشیر بھی نہیں تھا۔ "عصمت نمبر"
بے حد شاندار رہا۔ ہمیں پرچہ تاخیر سے ملتا ہے اس لیے پچھلے پرچوں
پر ہی تبصرہ کر سکتے ہیں۔ عظمت عزمی کا ناول بہت خوبصورت رہا۔
آپ لوگ اسی انداز سے آگے بڑھتے جائیے مگر معیار میں فرق نہ آنے پائے
رخسانہ سہام مرزا کے اداریئے منفرد اور جامعیت لیے ہوئے ہوتے
ہیں۔ خدا "دوشیزہ" کو دن دگنی اور رات چوگنی ترقی دے۔ سب کو
سلام پہنچا دیجیے!"

اسماء اور شمیم دیرینہ آشنائی نکل آنے پر طبیعت خوش
ہوئی۔ اتنی دور سے آپ نے ہمیں یاد کیا یہ ہماری انتہائی
خوش نصیبی ہے۔ آپ کی نیک خواہشات اور ہمت افزائی
دونوں دل میں اتر گئیں۔ جواباً سب کا سلام اور دعائیں لیں۔
پرچہ وہاں تک جلد پہنچانے کا بندوبست کر رہے ہیں۔ جلد آپ
کو مطلع کر دیا جائے گا۔

○ ہمارے ایک ایرانی بھائی اسحٰق درویش نے ڈیرہ
دبئی سے ہمیں یاد کیا ہے۔ لکھتے ہیں "ایرانی ہوں اردو لکھ نہیں
سکتا لیکن آسانی سے پڑھ لیتا ہوں۔ پچھلے دو سال سے یہ پرچہ
زیر مطالعہ ہے۔ مجھے واجدہ تبسم بہت پسند ہیں۔ ان کا افسانہ
خاص طور پر شوق سے پڑھتا ہوں۔ منورہ نوری، عظمت عزمی
اور قمر الاسلام عثمانی اور خواجہ احمد عباس کو دلی مبارکباد پہنچا دیجیے
رخسانہ مرزا اور آپ سب کو میرا سلام قبول ہو۔"

درویش بھائی محبت کا اظہار زبان کا محتاج نہیں ہوتا۔
آپ اردو لکھنا نہیں جانتے مگر آپ کے جذبات ہم تک پہنچے، ہم نے

دلہ لیے۔ کارکنان دوشیزہ شکر گزاری کے ساتھ جواباً سلام عرض کرتے ہیں!

○ ہدایت اللہ خان ندیم نے افغان کالونی پشاور سے محفل میں شرکت کی ہے: "اپریل کا رسالہ پہلی بار پڑھا کتنی خوشی ہوئی کہ پاکستان میں اتنے اچھے رسالے بھی نکلتے ہیں۔ عظمت عزمی کا ناول بہت دلچسپ ہے۔ "دوشیزہ" میں ناہید اختر کا انٹرویو بھی شائع کریں۔ اس کا ذاتی پتہ کیا ہے؟ اگر آپ نے بتا دیا تو عمر بھر دعائیں دوں گا۔"

ندیم بھائی! اللہ آپ کو ہدایت دے۔ یہ فنکاروں سے جذباتی قسم کی خط و کتابت اچھی نہیں ہوتی۔ ناہید کو دن میں سینکڑوں خطوط ملتے ہوں گے جنہیں وہ مصروفیت کے باعث دیکھ بھی نہیں سکتی ہوگی۔ آپ کیوں اس فہرست میں نام لکھوانا چاہتے ہیں۔

○ کنڈور (آزاد کشمیر) سے خادم حسین ایاز لکھتے ہیں "جلتے پھول" کی مصنفہ کو میری طرف سے مبارکباد پہنچا دیں۔"

ایاز! ان کی جانب سے شکریہ وصول کریں۔

○ اختر کاشف نے مظفر گڑھ سے "دوشیزہ" کے نام محبت نامہ بھیجا ہے۔ "خدا تیرے حسن میں چار چاند لگائے، تیرا چہرہ حسن آفتاب دیکھے، تیری محفل میں نئی نئی جاذبیں کروٹیں لیں۔ ان ناخداؤں کا شکر گزار ہوں جو تیرے حسن و صحت پر توجہ دیتے ہیں۔"

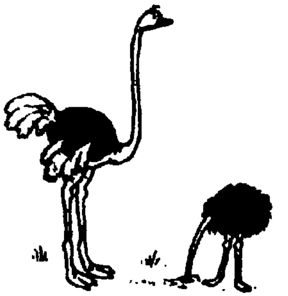
اختر بھائی! آپ تو اچھے خاصے ادیب لگتے ہیں۔ افسانے کیوں نہیں لکھتے؟

○ نوشہرہ کے ادریس چوہدری نے دوشیزہ سے بے پناہ دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے اشعار کا کالم شروع کرنے کی تجویز بھیجی ہے۔ ادریس بھائی! تجویز منظور ہوئی ——— اور کچھ ——؟

○ یوسف علی شاکر نے پشاور سے تحریر کیا ہے: "ایک درخواست ہے کسی کو محفل سے دھکا مت دیا کریں۔"

شاکر صاحب! زیادہ بھیڑ ہو جائے تو دھکم پیل ہو جاتی ہے۔ مگر قسم سے ہم نے خود کسی کو دھکا دے کر محفل سے نکالنے کا سوچا تک نہیں ——— کیا کچھ زیادہ چوٹ آگئی ——؟

○ کیمبل پور کے قاضی مشتاق ڈرائیور کو شکوہ ہے: "میں اپنی قلیل تنخواہ میں سے پانچ روپے خرچ کر کے رسالہ خریدتا ہوں اور پھر اسے آٹھ دفعہ ختم کرتا ہوں۔ ڈیوٹی کے اوقات میں بھی اپنے پاس گاڑی میں رکھتا ہوں۔ مگر آپ اس وارفتگی کے باوجود مجھے محفل میں جگہ نہیں دیتیں، غریب جو ہوا ——— !"



ارے نہیں قاضی بھائی! ہم تو خود مزدور آدمی ہیں۔ آپ جسمانی مشقت کرتے ہیں ہم ذہنی: آپ کو جان بوجھ کر نظر انداز کرنے کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ امیر غریب کے چکروں میں پڑ گئے تو "دوشیزہ" کی گاڑی کیسے چلے گی ——— آمد کا شکریہ!

○ کیمبل پور کے دوسرے قاضی بھائی شیخ احمد بخاری نے دوشیزہ کو نیک تمناؤں سے نوازا ہے۔

شکریہ قاضی صاحب!

○ ڈیرہ غازی خان سے داؤد احمد نے نفسیاتی الجھنوں کا سلسلہ دوبارہ شروع کرنے پر مبارکباد بھیجی ہے۔ لکھتے ہیں: "رسالہ دیر سے شائع ہونے لگا ہے۔ پلیز انتظار مت کروائیں۔"

○ مسعود احمد نے کراچی سے اپنی بہن کے لیے آئیڈیل کی تلاش میں خط لکھا ہے۔ مسعود بھائی! آپ نے اپنا مکمل ایڈریس نہیں بھیجا اس لیے ادارہ اشاعت سے مجبور ہے۔ اپنا افسانہ آپ بھیج دیں، دیکھ کر جواب دوں گی۔

○ عذرا جمال (کراچی) آپ کا خط اسلم صاحب کے ایڈریس پر بھیج دیا ہے۔

○ عبدالصمد (دوبئی) آپ کی نیک خواہش نے متاثر کیا ہے جونہی ایسی ہستی ہمیں ملی آپ کو مطلع کر دیں گے۔

دل کے پتھر

شکیلہ رفیق

یہ غالباً پچھلے منگل کی بات ہے کہ جب میں دفتر سے آیا تو عتیق اور راشدہ کی لڑائی زوروں پر تھی۔ میں نے وجہ جاننے کے لیے کان لگا دیئے مگر وہ دونوں اندرونی کمرے میں تھے لہٰذا بہت کوشش پر بھی کچھ سمجھ نہ سکا لیکن ایک بار پھر میرا دل امید و بیم کی کیفیت میں دھڑکنے ضرور لگا — شاید —— شاید —

عتیق اور راشدہ میاں بیوی تھے اور میرے پڑوسی بھی۔ بالکل دیوار بیچ ان کا گھر تھا۔ ہم لوگوں کے آپس میں بہت اچھے تعلقات تھے۔ میں عتیق کے گھر کی ایک ایک بات سے واقف تھا۔ اور بظاہر عتیق بھی مجھے اچھی طرح جانتا تھا اس کی بیوی راشدہ مجھے بھائی صاحب کہتی تھی۔ بڑی شریف اور پاکباز عورت تھی۔ کم عمر سی خوبصورت راشدہ — لیکن ایمانداری کی بات آپ کو بتاؤں —؟

میں جو راشدہ کو بہن کہہ کر مخاطب کرتا تھا مگر آج تک کبھی بھی اس کو میں نے بہن کی نگاہ سے نہ دیکھا تھا — وہ مجھے بھائی کہتی اور بھائی ہی سمجھتی تھی لیکن میں —— میں جو محلہ بھر میں انتہائی شریف اور بہترین کردار کا انسان مشہور تھا۔ میں جب بھی راشدہ کو دیکھتا میرے بدن میں چنگاریاں سی بھرنے لگتیں۔ جبکہ اس کے برعکس وہ بیچاری جب کبھی میرے سامنے آتی ہمیشہ سر آنچل سے اچھی طرح ڈھک کر۔ کپڑے بھی وہ ہمیشہ سادے اور شرعی قسم کے پہنتی تھی۔

لیکن جب آنکھوں میں گناہ اور ہوس انگڑائیاں لے رہے ہوں تو پھر انسان لوہے کے اس پار بھی دیکھ لیتا ہے یہ تو پھر سوت کے کپڑے تھے۔

میں نے اپنی گنہگار نگاہوں سے ایک بار نہیں کئی بار راشدہ کے سڈول جسم کو دیکھا تھا اسی لیے میں راشدہ کے نشیب و فراز سے اس طرح واقف ہو چکا تھا کہ اگر میری اپنی بیوی ہوتی تو اس سے بھی اسی قدر واقف ہوتا۔

بہن راشدہ کہتے ہوئے میں نے کئی بار سوچا تھا کہ اس کے بازو کس قدر گداز اور ملائم ہوں گے —— وہ بیچاری میری اندرونی کیفیت سے بے نیاز بیٹھی عتیق کا رونا مجھ سے روتی رہتی۔ وہ جوتے کا تلی تھا اور جب ہار جاتا تو اس کی جھنجلاہٹ بیچاری راشدہ پر آ جاتا ——

”کوئی بات نہیں صبر کرو راشدہ بہن —— میں اسے سمجھا دوں گا۔“ میں بظاہر کہتا لیکن اندر ہی اندر میری دلی خواہش ہوتی کہ ایک بار، صرف ایک بار — کیا عتیق اور راشدہ میں فیصلہ کن لڑائی نہیں ہو سکتی —؟

جب بھی وہ دونوں جھگڑتے میرے دل میں یہ دیرینہ آرزو

کو میں اپنے قلتی کہ کاش آج یہ لڑائی انجام کو پہنچ جائے ـــ لیکن ـــ چند ہی گھنٹوں بعد میں ان دونوں کو کہیں باہر جاتے ہوئے دیکھتا تب مایوس ہونے کے ساتھ ساتھ یہ بھی سوچتا کہ عورت واقعی ایک معمہ ہے

راشدہ ـــ! جسے اس کے شوہر نے کبھی کوئی سکھ نہ دیا تھا شاید ہی کوئی دن ایسا جاتا ہو جب ان دونوں کی جھک جھک نہ ہوتی ہو شفیق اکثر راشدہ کی پٹائی بھی کرتا تھا۔

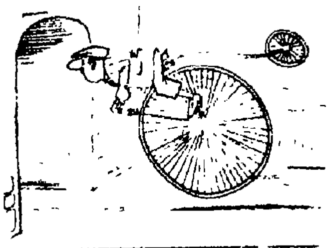
چلتے چلتے میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ ہم دونوں گورنمنٹ کے ملازم ہیں۔ اور چھوٹے چھوٹے کوارٹروں میں رہتے ہیں۔ ہمارے صحن کے درمیان میں ایک ننھی سی کھڑکی ہے جس کو کھول کر ہم اکثر و بیشتر باتیں کیا کرتے ہیں ـــ اس کی کنڈی شفیق کی طرف ہے۔ جب کوئی ضرورت ہوتی ہے تو راشدہ کنڈی کا تالا کھول کر مجھ سے اپنی ضرورت بیان کر دیتی ہے۔ اکثر جب ان دونوں کی لڑائی ہوتی ہے تو میں اسی کھڑکی کی جھریوں سے جھانکا کرتا ہوں۔ غصے میں دونوں کے چہرے سرخ ہو جاتے ہیں۔ ایسی کیفیت میں راشدہ مجھے اور زیادہ حسین نظر آنے لگتی ہے۔ پھر نہ جانے کیا ہوتا ہے کہ دونوں میں صلح ہو جاتی ہے اور تھوڑی ہی دیر بعد دونوں بیٹھ کر مسکرانے لگتے ہیں۔ اس وقت میرے دل پر سانپ لوٹ جاتا ہے۔

راشدہ حسین و جمیل ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد سگھڑ قسم کی عورت ہے۔ شفیق کی معمولی سی تنخواہ میں وہ گھر کو کچھ اس طرح چلاتی ہے کہ ہر ماہ کچھ نہ کچھ پس انداز کر لیتی ہے اور جب کبھی شفیق بے حد گھبراتا ہے تو اسی پس انداز کی ہوئی رقم سے اس کی امداد کر دیتی ہے۔

وہ صبح سے مشین کی طرح کام میں جٹ جاتی ہے اور شفیق کے آنے تک سب کام سے نمٹ کر چھینٹ کی شلوار سوٹ اور جنری کا معمولی سا دوپٹہ اوڑھ کر بیٹھ جاتی ہے۔ کبھی میں بھی شفیق کے ساتھ اس کے گھر چلا جاتا ہوں اور معمولی سے کپڑوں میں چھپا ہوا یہ حسن مجھے کچھ اور بھی بے قرار کر دیتا ہے پھر میرا شدت سے جی چاہتا ہے کہ معمولی کپڑوں میں چھپا ہوا یہ حسن کیا میرا نہیں ہو سکتا؟ کاش! کبھی ان دونوں میں وہ لڑائی ہو جس کی انتہا طلاق پر ہوتی ہے۔!

"آپ صرف چائے پی رہے ہیں یا یہ سموسے بھی تو لیجئے بھائی صاحب! میں نے اپنے ہاتھ سے بنائے ہیں۔" اچانک راشدہ کی پُرخلوص





آواز پر میں چونک اٹھتا ہوں، اور میری نگاہ اس کے چہرے کی جانب اٹھ جاتی ہے۔

وہ چہرے پر بالکل ایک بہن کا سا تقدس لئے مجھے تک رہی ہوتی۔

"اونہہ — ! یہ نگاہیں بدل کیوں نہیں جاتیں؟ مجھے نہیں چاہئے مسعود کی بہن کا پیار۔"

میں جھنجلا کر سوچتا اور سموسہ اٹھا کر منہ میں ڈال لیتا۔

"بہت مزیدار بنے ہیں راشدہ بہن!" میں تعریف کرتا تو وہ خلوص سے مسکرا دیتی۔ میں بھی مسکرا دیتا مگر میری مسکراہٹ میں چھپی شیطانیت کو کوئی بھی تو نہ جان پاتا، نہ راشدہ نہ ہی عتیق — !

ہاں تو میں آپ کو گذشتہ منگل کا واقعہ بتا رہا تھا کہ جب میں دفتر سے گھر پہنچا تو عتیق اور راشدہ کی لڑائی زوروں پر تھی اور اتنے زوروں پر کہ یقیناً سارے محلے کے کان اسی گھر کی طرف لگے ہوں گے۔

"اب ایک پیسہ نہیں ہے میرے پاس —" راشدہ کی آواز آئی۔

"جھوٹ بولتی ہے۔" عتیق نے آنکھیں نکالیں۔

"تم خود جھوٹے ہو —" راشدہ نے بھڑک کر کہا۔

"اچھا اچھا — ! میں جھوٹا ہوں —؟" عتیق دانت پیس کر اسے مارنے کو بڑھا ہی تھا کہ اس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔

میں محبت کی کھڑکی کی جھری سے جھانکنے کے بعد ناکام ہو کر ان کے گھر میں ہی آ گیا تھا۔ نہ جانے کس جذبے کے تحت۔ شاید محبت کے زوردار اتار چڑھاؤ کو دیکھتے ہوئے میری وہ بے نام سی آرزو مجھے یہاں کھینچ لائی تھی۔ عتیق نے مجھے سر جھکائے گھورا دیکھا تو بولا۔

"یار تم ہی سمجھاؤ اپنی بہن کو۔ سیدھی طرح مجھے پچاس روپے دیدے ورنہ —"

"پچاس روپے — ! ہونہہ — !" راشدہ نے طنزیہ کہا "ایسے کہہ رہے ہیں جیسے پچاس پیسے —"

"اچھا تو اتنی ساری رقم کس دن کے لئے جمع کر رہی ہے؟ اپنی قبر میں ساتھ لے جائے گی کیا —؟" عتیق دھاڑا۔

"قبر میں لے جاؤں یا کفن سلواؤں — مگر جوئے میں تو نہ ہاروں گی۔" راشدہ بھی آج بہت غصے میں نظر آ رہی تھی اور میرے دل میں امید کی کرنیں جگمگا رہی تھیں۔ میں اندر ہی اندر خوش ہو رہا تھا۔ آج مجھے یقین ہو چلا تھا کہ آج میری دیرینہ آرزو ضرور تکمیل کو پہنچے گی۔ میں بظاہر افسردگی سے مگر دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوئے بولا۔

"تم دونوں کا یہ ہر وقت کا لڑنا جھگڑنا اچھی بات نہیں ہے راشدہ بہن — !"

"میں کیا کروں بھائی صاحب — ! آپ ہی انصاف سے بتایئے کوڑی کوڑی کر کے رقم جمع کرتی ہوں اور یہ بے حس اسے جوئے میں اڑا دیتا ہے۔"

"رقم جمع کرتی ہوں —" عتیق نے اس کی نقل اتاری "رقم تو کیا کر لاتی ہے کیا —؟"

"کما کر تو تم ہی لاتے ہو مگر میرا بھی اس پر اتنا ہی حق ہے جتنا تمہارا۔ کیوں بھائی صاحب؟"

وہ مجھ سے بولی۔

"ٹھیک تو کہتی ہے راشدہ —" میں نے جلتی پر چنگاری ڈالنے کی کوشش کی۔

"میں کہتا ہوں کہ یہ مجھے آج رقم دے دے پھر میں کبھی نہ مانگوں گا —" وہ مجھ سے یوں بولا جیسے میری سفارش چاہتا ہو۔

"یہ ہر بار یہی کہتے ہیں بھائی صاحب! کہ یہ آخری بار ہے میں کیسے ان کا اعتبار کر لوں۔"

راشدہ نے مجھے یوں دیکھا جیسے وہ میری حمایت چاہتی ہو۔ میں کشمکش میں پڑ گیا۔ مگر فوراً ہی میرے دماغ میں ایک گھناؤنا خیال آیا کہ اگر اس وقت میں عتیق کی حمایت کروں تو ان دونوں کی لڑائی عروج پر پہنچ سکتی ہے اور پھر —؟ پھر شاید وہی ہو جائے جو میرا دل ایک عرصے سے چاہتا ہے۔

"اچھا چلو اس بار دے دو راشدہ! عتیق میرے سامنے وعدہ کر رہا ہے کہ آئندہ کبھی تم سے رقم نہ مانگے گا۔"

راشدہ نے چونک کر میرے چہرے کی طرف دیکھا۔ جو اندر سے

گنار ہو رہا تھا مگر بظاہر مسکین بنا ہوا تھا۔

"اچھا بھائی صاحب! صرف آپ کے کہنے سے میں ان کو رقم دے رہی ہوں مگر بتائے دیتی ہوں کہ آئندہ اگر انہوں نے رقم مانگی تو ذمہ دار آپ ہوں گے" راشدہ نے شکستہ لہجہ میں کہا اور باہر چلی گئی۔

اور میں —— ؟ میں تو جیسے لرزتی زمین تلے کھڑا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ کبھی رقم دے گی اور لڑائی نقطۂ عروج پر پہنچ جائے گی لیکن پانسہ الٹا پڑ گیا تھا مجھ سے کترا رہا ہو گیا اور میں عقیق سے بولا۔

"اچھا میں چلتا ہوں عقیق —— !"

"بہت بہت شکریہ یار!" عقیق مسکرایا۔

اور میں کوئی جواب دئے بنا گھر آکر دھم سے بستر پر گر گیا۔ لحاف میں منہ دیئے میں سوچ رہا تھا۔ یہ میں نے کیا کر دیا۔ لڑائی کو ایک دم ہی ختم کرا دیا۔ میں نے غلط طریقہ کار استعمال کیا —— تو اب ہے یہ راشدہ کا کیا کبھی عقیق کو نہ چھوڑے گی۔ وہ سگھڑ دیسی عورت میرے گھر کا نظام کبھی سنبھالے گی —— ! میں جو کنوارہ ہونے کے باوجود اپنی پوری تنخواہ ادھر ادھر لٹا دیتا ہوں اگر راشدہ میری ہو جائے تو چند ہی روز میں مجھے کیا سے کیا بنا دے۔ مجھے تو جوئے ایسی کوئی بری عادت بھی نہیں۔ اچانک ہی میرا جی ان دونوں کو جھانکنے کو چاہا۔ میں اٹھا اور کھڑکی کی درازوں سے جھانکنے لگا۔

عقیق صحن میں لگے ہوئے سرکاری نلکے کے پاس بیٹھا تھا اور راشدہ جھک کر لوٹے سے پانی ڈال رہی تھی۔

"نلکے میں پانی نہیں آ رہا کیا جو یہاں محبت سے اس کا منہ دھلوا رہی ہے"—— میں تیز قدموں سے گیا اور نل کھول کر دیکھا۔

"ہنہ —— ! یہ سرکاری نل بھی خوب ہیں۔ دن بھر بند رہتے ہیں۔ اور پوری رات ان میں پانی آتا ہے۔ اب رات کو جوڑ جوڑ ٹوٹتے ہوئے بدن کو آرام دینے کے لئے سوئیں یا سارے گھر کا پانی بھرتے پھریں" میں بڑبڑایا اور اس کے ساتھ ہی مجھے یاد آ گیا کہ بے چاری راشدہ رات کو پانی بھی تو بھرتی ہے اور میری پانی کی ضروریات بھی زیادہ تر اسی کے گھڑے پوری ہوتی ہیں —— میں دوبارہ کھڑکی میں گیا مگر وہ دونوں وہاں سے جا چکے تھے۔

پھر رات کو جب دھما دھم کی آوازیں آئیں تب مجھے یہ سمجھنے میں قطعی دشواری نہ ہوئی کہ عقیق پچاس روپے جوئے میں ہار کر گھر آ گیا ہے۔

اور یہ اس کے دو روز بعد کی بات ہے کہ عقیق اور راشدہ پھر آپس میں لڑ رہے تھے —— بالکل ہی عجیب انداز سے گویا گھر کی دیواریں



ہلائے دے رہے ہوں۔

گویا آج کچھ ہو کر رہے گا —— ! میرا دل دھک دھک کر رہا تھا اور اس روز پہلی بار میں خدا کے حضور جھک کر گڑگڑا رہا تھا کہ اس لڑائی کو انجام تک پہنچا دے۔

پروردگار —— ! میری سن لے خدایا —— ! کہ اچانک دروازہ کھلا اور زندگی میں پہلی بار راشدہ ننگے سر میرے سامنے کھڑی ہانپ رہی تھی۔

"کیا ہوا —— ؟" میں نے بظاہر گھبرا کر کہا۔

"ہونا کیا تھا؟ کوئی نئی بات ہو تو بتاؤں۔ پھر وہی پیسوں کی رٹ —— " راشدہ نے غصے سے کہا اور میری چارپائی پر بیٹھ گئی۔

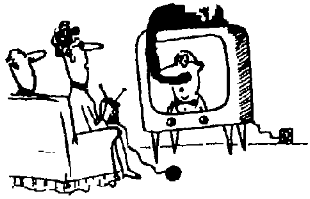
"پھر تم نے کیا کہا —— ؟" خوشی میرے انگ انگ سے پھوٹ پڑنے کو بیتاب تھی مگر میں زبردستی اسے تھپک تھپک کر سلا رہا تھا۔ جھگڑا یقیناً بے حد سنگین تھا ورنہ راشدہ نے یہ تو کبھی نہ کیا تھا کہ جھگڑے کے دوران یوں اٹھ کر میرے گھر تک آ بیٹھے۔

"میں اس سے جھگڑا کر کے آپ کے پاس آ گئی ہوں بھائی صاحب!" راشدہ کی لوگی سی آواز نے مجھے چونکا دیا —— میں نے دیکھا وہ دوپٹہ سے سر ڈھانپ کر پلو سے آنسو پونچھ رہی تھی۔

"یہ تم نے اچھا نہیں کیا راشدہ —— !" میں نے بظاہر کسی شریف بھائی کی طرح کہا مگر میرے اندر ابلیس کی مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔

"پھر کیا کرتی —— ؟ تمام رقم خرچ کر چکا ہے —— اب بس کچھ ہی روپے رہ گئے ہیں سو وہ بھی مانگتا ہے۔ کیسے دیدوں؟ اس روز اس نے آپ کے سامنے وعدہ کیا تھا کہ اب کبھی نہ مانگے گا" راشدہ نے یاد دلایا۔ ابھی اس نے بات ختم ہی کی تھی کہ عقیق بھی لال انگارہ آنکھیں لئے آ پہنچا۔

"گھر چلو —— " اس نے تحکم سے کہا۔



"میں گھر نہیں جاؤں گی ــــ" راشدہ کا لہجہ فیصلہ کن تھا اور میں دل میں ہنس پڑا۔

"میں کہتا ہوں گھر چلو ــــ" اس نے بپھر کر کہا۔

"نہیں ــــ"

"نہیں ــــ؟" عتیق شیر کی طرح غرّایا اور راشدہ کی بانہہ پکڑ کر اٹھانے لگا۔

"چھوڑ دو مجھے" راشدہ نے ایک جھٹکے سے اپنی بانہہ چھڑائی پھر بولی "میں نے کہہ دیا ہے اب میں اس گھر میں واپس نہ جاؤں گی"

"دیکھو سیدھی طرح مان جاؤ ورنہ ــــ" عتیق نے دھمکی دی۔

"ورنہ کیا کر لوگے میرا ــــ؟" راشدہ بھی آج اکڑی ہوئی تھی ورنہ یوں تو وہ بڑی صلح پسند قسم کی عورت تھی۔

"زبردستی لے جاؤں گا تمہیں" عتیق نے دھمکی دی۔

"جب تک میرا بھائی زندہ ہے تم مجھے زبردستی نہیں لے جا سکتے" راشدہ نے کہا اور اٹھ کر میرے پاس آ کھڑی ہوئی۔

"یار تم ہی اسے سمجھاؤ ــ! اتنی سی بات پر کوئی اپنا گھر چھوڑ دیتا ہے ــــ" اچانک ہی عتیق نے شکستہ لہجے میں کہا۔

"ہاں ہاں اس بار چلی جاؤ راشدہ! آئندہ کبھی یہ ایسا کرے تو تم اپنی مرضی کی مختار ہوگی۔ کیوں عتیق؟" میں نے یوں کہا جیسے میں ان دونوں کا بہت بڑا ہمدرد ہوں۔

"ہاں بالکل ــــ یہ میرا وعدہ ہے" عتیق نے کہا۔

"سب جھوٹ ہے" راشدہ چیخ پڑی "ایسے وعدے تو تم ہزار بار کر چکے ہو"

"میرا خیال ہے تم ابھی جاؤ میں اسے سمجھا کر بعد میں بھیج دوں گا ــــ" میں نے عتیق سے سرگوشی کے انداز میں کہا اور وہ سر ہلاتا ہوا چلا گیا۔

"اب تم مجھے بتاؤ کہ جھگڑا شروع کس بات پر ہوا" اس کے جانے کے بعد میں نے راشدہ سے بڑی اپنائیت سے پوچھا۔

"ہوگی تو بھئی وہی پرانی بات، جب اس نے مجھ سے منگنی کی تھی تو میں نے اس روز کا وعدہ یاد دلایا کہ اب پھر مانگ رہے ہو کم رہ گئی ہے سب میں تمہیں دے دوں گی اپنے وعدے پر۔ جس پر وہ بولا ایسے وعدے تو میں ہزار بار کر چکا ہوں۔ تم نے بھائی صاحب کے سامنے وعدہ کیا تھا کہ اب کبھی۔ تو وہ بولا میں کچھ نہیں جانتا تم تمہیں دینی ہی پڑے گی۔ میں بھی تپ گئی میں نے کہا آج مجھے تم جان سے بھی مار ڈالو مگر نہ دوں گی اور یہ گھر بھی چھوڑ جاؤں گی جس پر عتیق بولا۔

"کہاں جاؤ گی؟ یہاں کون ہے تمہارا؟"

میں نے کہا میرے بھائی صاحب ہیں (کس قدر تھی راشدہ کی) میں ان کے پاس چلی جاؤں گی۔ مگر تم جیسے اب نہ دیکھوں گی۔ بس پھر تو اسے بہت غصہ آیا اور جھگڑا ہوا پھر میں یہاں چلی آئی" راشدہ نے سب کچھ تفصیل سے بتا دیا۔

"اب میں واپس نہیں جاؤں گی بھائی صاحب! اور یہیں رہوں گی"

"نہیں راشدہ! عورت کا صحیح مقام اس کا گھر ہوتا ہے" میں نے اسے ایک بڑے بھائی کی طرح سمجھایا۔

"کیا صحیح مقام؟ کیسا صحیح مقام ــــ؟ یہی کہ دن رات خدمت کروں اس کے پیسے کو خون پسینے کی کمائی سمجھ کر احتیاط سے خرچ کروں کوڑی کوڑی جوڑوں اور پھر نتیجہ میں اس کے جوتے کھاؤں۔ نہیں بھائی صاحب مجھے اب واپس نہیں جانا" وہ فیصلہ کن لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"ایسی باتیں نہیں کہتے راشدہ ــ کچھ بھی ہو عتیق تم سے بے پناہ محبت کرتا ہے" میں نے مگرمچھ کے آنسو بہائے۔

"مجھے نہیں چاہیے ایسی محبت" اس نے حقارت سے کہا۔

"اچھا اچھا کوئی بات نہیں گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھو جب غصہ اتر جائے تو چلی جانا"

میں نے کہا مگر ساتھ ہی دل دھڑک اٹھا کہ کہیں یہ واقعی ہی واپس نہ چلی جائے۔

"اگر آپ میرے آجانے سے بوجھ محسوس کر رہے ہیں تو اور بات ہے میں ابھی چلی جاتی ہوں" اس نے یوں کہا جیسے اس کا مان

گیا ہو۔"

"ارے نہیں تم غلط سمجھیں میں تمہیں بوجھ کیوں سمجھنے لگا۔ بھلا بہنیں بھائیوں کے لئے بوجھ ہوا کرتی ہیں۔ میں تو تمہارے اور عتیق کے بھلے کو کہہ رہا تھا۔ ورنہ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے تمہارا دل کرے تو عمر بھر یہیں رہو۔" آخر کار ابلیس نے دل کی بات ہونٹوں سے اگل ہی دی۔

"شکریہ بھائی صاحب ۔۔۔! میں آپ کی خدمت کروں گی آپ کا کھانا پکاؤں گی اور آپ کا باقی بھی سب کام کروں گی بس آپ مجھے یہاں رہنے دیجئے گا۔" راشدہ نے ممنون سے لہجے میں کہا اور ہم دونوں مسکرا دیئے ۔۔۔۔۔

اسی روز رات کو عتیق آیا اور اس نے ہر ہر طرح سے راشدہ کو منانے کی کوشش کی مگر وہ کسی صورت عتیق کے ساتھ جانے پر رضامند نہ ہوئی۔ میں نے بھی اسے کئی بار ہمدردی کر سمجھایا مگر اس کی ایک ہی رٹ تھی یہ جوا چھوڑے گا جبھی اس کے گھر جاؤں گی۔

"اچھا میں جوا چھوڑ دوں گا رشو بس ۔۔۔!" عتیق نے گھٹے ہوئے لہجے میں کہا اور میں نے جلدی سے دعا مانگی کہ عتیق کا ارادہ کبھی پورا نہ ہو۔

"مجھے اب تمہاری کسی بات کا اعتبار نہیں رہا جاؤ چلے جاؤ یہاں سے۔" راشدہ نے بے یقینی سے کہا اور پھر مجھ سے بولی۔

"بھائی صاحب! مجھے اس کی مار منظور ہے۔ ڈانٹ منظور ہے۔ مگر اس کی یہ جوئے کی عادت ہے تو اسے تباہی کی طرف لے جا رہی ہے۔ اسی لئے میں یہاں چلی آئی اور اب میں یہاں سے کبھی نہ جاؤں گی۔" راشدہ نے کہا اور اٹھ کر چلی گئی۔

"یار کسی طرح سمجھاؤ نا اسے ۔۔۔ مجھے اس سے بڑی محبت ہے۔" عتیق نے مجھ سے فقیروں کی طرح گڑگڑا کر کہا۔

"اچھا اچھا اس وقت تو وہ آپے سے باہر ہے۔ میں سمجھا دوں گا تو دو ایک روز میں آ کر لے جانا۔" میں نے اس سے پورے خلوص سے کہا تو وہ مایوسی سے مڑ کر چلا گیا۔

اس رات سردی غضب کی تھی۔ میں نے اپنا بستر راشدہ کو دے دیا اور خود دوسرے کمرے میں فرش پر دری بچھا کر لیٹ گیا ۔۔۔ میں نے راشدہ کو اندر سے کنڈی لگانے کی ہدایت کر دی تھی۔ کیونکہ مجھے اپنے آپ پر اعتبار نہ تھا ۔۔۔ راشدہ کے متعلق جو سوچیں میرے ذہن میں پرورش پاتی رہی تھیں ان کی روشنی میں اس رات میرے قدم ڈگمگا سکتے تھے۔ اور میں نہیں چاہتا تھا کہ اس قدر جلد راشدہ کا اعتماد پارہ پارہ ہو جائے۔ راشدہ کے تیور یہ صاف بتاتے تھے کہ اب وہ کبھی عتیق کے گھر واپس نہ جائے گی ۔۔۔ اور راشدہ کو اعتماد میں لینے کے لئے اپنا بنانے کے لئے میرے پاس ابھی بہت وقت تھا۔ رات کو اس قدر غضب کی سردی کے باوجود کتنی بار مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں شعلوں میں گھر گیا ہوں۔ نہ جانے کیوں ۔۔۔؟



صبح جب میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ میں لحاف میں دبکا ہوا ہوں اسی لحاف میں جو میں نے رات کو راشدہ کو اوڑھنے کو دیا تھا۔ اور خود پتلی سی رضائی لے کر لیٹ گیا تھا ۔۔۔ تو کیا راشدہ ساری رات سردی میں ٹھٹھرتی رہی؟ میں فوراً ہی لحاف پھینک کر اٹھا۔ دوسرے کمرے میں جا کر دیکھا۔ راشدہ کا بستر خالی تھا میرا دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔

تو کیا وہ چلی گئی ۔۔۔؟

میں بوکھلا گیا۔ اسے سارے گھر میں ڈھونڈتا ہوا صحن میں آیا تو دیکھا وہ صابن اور تولیہ لے کر غسل خانے میں جا رہی تھی۔ میری جان میں جان آگئی۔

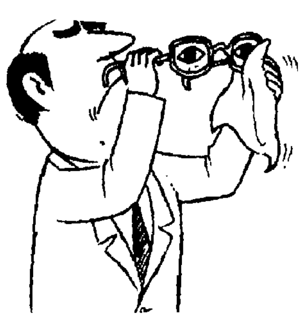
"آپ اٹھ گئے بھائی صاحب! میں نے آپ کے لئے پانی گرم کر دیا ہے منہ ہاتھ دھو لیں۔"

وہ مجھے دیکھ کر سادگی سے بولی اور میں نے سکون کی ایسی سانس لی جسے اس نے بھی محسوس کر لیا۔

"کیا ہوا ۔۔۔؟"

"تمہیں کمرے میں نہ پا کر میں سمجھا تم چلی گئیں ۔۔۔" آخر دل کی بات ہونٹوں تک آ ہی گئی۔

"تمہیں میں جب آ چکی تو بھلا کیوں جانے لگی۔" اس نے پھر سادگی سے کہا اور باورچی خانے کی طرف چل دی شاید اس نے میری بات کی گہرائی کو سمجھا ہی نہیں تھا۔



گرم گرم پانی سے منہ دھوتے ہوئے مجھے کتنا لطف آیا یہ آپ کو کیا بتاؤں ورنہ کتنی سردی ہو پانی تو وہی برف سا ٹھنڈا ہوتا تھا کیونکہ مجھی میں زیادہ تر ہوٹل ہی میں لیا کرتا تھا یا پھر عتیق کے گھر۔ البتہ ناشتہ کا سامان تھوڑا بہت میرے گھر میں موجود رہتا تھا۔ آج صبح کے لئے میں نے رات کو ہی دو انڈے لاکر رکھ دیئے تھے پھر ناشتہ پر جب مجھے گرم گرم پراٹھوں کے ساتھ انڈوں کا خاگینہ کھانے کو ملا تب اس روز شدت سے مجھے یہ احساس ہوا کہ گھر میں کسی عورت کی موجودگی کس قدر ضروری چیز ہے۔

دفتر جاتے وقت میں نے راشدہ کے ہاتھ پر تین روپے رکھ دیئے کہ وہ اس سے سبزی ترکاری خرید لے۔ اور اس روز صبح سے لے کر رات تک میرے لمحات بہت حسین گزرے۔

راشدہ کو میرے یہاں آئے ہوئے تین روز ہو چکے تھے اور وہ انتہائی شرافت و سادگی سے میرے ساتھ رہ رہی تھی کبھی کسی وقت میں سوچتا کہ اگر راشدہ کو میرے دل میں چھپے ہوئے شیطان کی خبر مل جائے تب کیا ہوگا ہے اور اسی وقت میں اپنے اندر کے چور کو چھپانے کے لئے اسے مشورے دینے لگتا کہ عتیق بہت اچھا انسان ہے اسے چاہیئے کہ وہ اس سے صلح کرلے ۔۔۔ اور اس کے قطعی انکار پر میں مجبوراً چپ ہو جاتا تھا۔

آج راشدہ کو میرے گھر آئے پانچواں روز تھا۔ میں اس کی بنا بات اور روزانہ کے کام کاج کا عادی سا ہو چلا تھا ۔۔۔ گھر میں جیسے بہار آ گئی تھی ۔۔۔ عتیق اس روز کے بعد پھر نہ آیا تھا ۔۔۔ اور میں بیٹھا خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ اچانک عتیق کھٹاک سے بھڑے ہوئے دروازے کھول کر اندر آ گیا۔

بال بکھرے ہوئے شیو بڑھا ہوا ۔۔۔ ایسا جیسے سب کچھ لٹا کر یہیں سے آرہا ہو اس کے ہاتھ میں قرآن شریف تھا اور سارا پنڈلی زدہ ہونٹ کانپ رہے تھے۔

"میں نے قرآن ہاتھ میں لے کر قسم کھائی ہے کہ اب کبھی کام نہ کروں گا ۔۔۔ خدا کے لئے گھر چلو راشدہ ۔۔۔ ! میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔" وہ بھکاریوں کی طرح راشدہ سے کہہ رہا تھا۔

راشدہ جو شاید رات کے کھانے کے لئے چاول چن رہی تھی اور بغیر کسی جواب کے دوسرے کمرے میں چلی گئی اور اندر سے کنڈی لگالی۔

"میں تمہیں کیسے بتاؤں دوست کہ راشدہ کے بغیر وہ گھر اور دیواریں مجھے کاٹ کھانے کو دوڑ رہی ہیں۔ اس روز سے آج تک جب نے برف جیسے پانی سے منہ ہاتھ دھویا تھا نہ آدھی ترچھی روٹیاں پکا کر اور رات کو بیروں کے دروسے کراہ پا تھا تو مجھے معلوم ہوا کہ راشدہ کے بغیر زندگی ایسی ہے جیسے پھول کے بغیر خوشبو ۔۔۔ میں راشدہ کو قیمت پر منانا چاہتا ہوں ۔۔۔ وہ جو کچھ کہے گی میں وہی کروں گا ۔۔۔ تم کسی طرح اسے میرے پاس بھیجنے پر راضی کرلو ۔۔۔ میں تمام زندگی تمہارا احسان مند رہوں گا۔" عتیق نے گھگھیا کر مجھ سے کہا۔ "اچھا کہہ دیکھتا ہوں مجھے امید کم ہی ہے کہ وہ مان جائے۔" میں نے ذرا رکھائی سے کہا اور بڑھ کر دروازے پر دستک دی

"میں دروازہ نہیں کھولوں گی بھائی صاحب!" اندر سے راشدہ بولی

"دروازہ تو کھولو میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے ملائمیت سے کہا تو اس نے دروازہ کھول دیا۔ میں اندر جاکر آہستہ سے اس سے بولا۔

"تم ایک بار اس سے بات کرلو ۔۔۔ اس میں حرج ہی کیا ہے ۔۔۔ اگر تمہاری مرضی نہ ہوئی تو تمہیں یہاں سے کوئی نہیں لے جا سکتا۔" میں نے یوں کہا جیسے کہہ رہا ہوں کہ راشدہ یہاں سے چلی تو تمہارا

"میں کسی سے بات کرنا پسند نہیں کرتی۔" وہ زور سے چلا اٹھی اور ایک دم ہی عتیق دروازے پر آ گیا اسے دیکھ کر راشدہ اور زور سے چیخ پڑی۔

"اسے یہاں سے بھگا دیں بھائی صاحب! میں اس کی صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتی۔" اور وہ مجرموں کی طرح بولا۔

"میں نے ان پانچ دنوں میں بڑی کوشش کی کہ گھر میں تیرے بغیر رہنے کی عادت ڈال لوں میرے قدم ہر روز اس دروازے کی طرف اٹھتے تھے مگر میں زبردستی ان کو روک لیتا تھا مگر آج ان قدموں نے میرا کہنا

"نہ مانا اب بتائیں کیا کیا جائے —؟"

"جانتے ہو یا نہیں —؟" اس نے کہا اور وہ دور ہٹ گیا۔

میں بہت دیر تک راشدہ کو سمجھاتا رہا اور اس کی باتوں سے جب مجھے یہ یقین ہو گیا کہ راشدہ ہرگز عتیق کے ساتھ جانے پر رضامند نہ ہوگی تب میں نے باہر آکر عتیق سے بالکل خیریت کے لہجے میں کہا۔

"بات کر کے دیکھ لو — ویسے امید کم ہے۔"

عتیق نے ممنون نگاہوں سے مجھے دیکھا اور کمرے میں چلا گیا "دھک" کی آواز پر میں سمجھا شاید اس نے چٹخنی لگا لی تھی۔

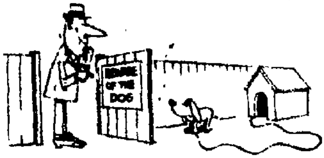
میں بے قراری سے کمرے میں ٹہل رہا تھا — میرے بدن میں جیسے اس وقت پارہ بھر گیا تھا۔ کسی پل چین نہ آتا تھا — بے چین ہرنی کی طرح گھبرایا ہوا ادھر سے ادھر ٹہل ٹہل کر چکر لگا رہا تھا۔

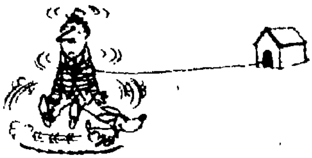
پہلے پہل تو راشدہ کی غصہ بھری بلند آوازیں میرے بے قرار دل کو سکون دیتی رہیں۔ پھر دونوں ہی چیخنے لگے — اور میں خوشی سے اچھل پڑا۔ بس — !! اب — ابھی ایک لمحہ میں طلاق کا لفظ میرے منتظر کانوں سے ٹکرانے ہی والا ہے مگر میرے کان منتظر ہی رہے اور یہ لفظ سنائی نہ دیا۔

اچانک ان کی آوازیں مدھم ہو گئیں — میں نے دروازے سے کان بھی لگا دیئے تو بھی کچھ سنائی نہ دیا۔

میں بے وقوفوں کی طرح باہر کھڑا تھا — کہ دبے دبے قہقہوں نے مجھے چونکا دیا۔ ہاں ! یہ عتیق اور راشدہ کے قہقہے تھے جو بند کمرے میں دھیمے دھیمے ابھر رہے تھے۔ میرے بدن میں جیسے چنگاریاں سی بھر گئیں میں غلط پانسہ پلٹنے کی دعا ایک بار پھر کرنے لگا۔ راشدہ کی نہایت مانوس ہنسی پھر ابھری — پھر دونوں کے ساتھ ہنسنے کی آواز آئی اور میں جیسے دلدل میں دھنسنے لگا — میں اضطراب کے عالم میں ہاتھ مل رہا تھا کہ دروازہ کھلا۔ میں نے پاگلوں کی طرح گھوم کر ان دونوں کی طرف دیکھا۔ راشدہ کا گورا گورا ملائم سا ہاتھ عتیق کے ہاتھوں میں مضبوطی سے بند تھا۔ اور وہ دونوں یوں مسکرا رہے تھے جیسے کبھی جھگڑے ہی نہ تھے میرے پاؤں تلے سے جیسے زمین کھسکنے لگی — سارا کمرہ گویا گھوم رہا تھا میں گر ہی جاتا مگر — میں نے اپنی تمام تر قوتوں کو بروئے کار لا کر اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

"ہم دونوں کی صلح ہو گئی ہے بھائی صاحب — ! ہم دونوں اب کبھی نہیں لڑیں گے — عتیق نے جدا ہونے کا ارادہ چھوڑ دیا ہے — اب میں اپنے گھر جا رہی ہوں بھائی صاحب — !"





راشدہ یوں بول رہی تھی جیسے یہ الفاظ نہیں پھول ہیں جو اس کے منہ سے جھڑ رہے ہیں — وہ بے حد خوش نظر آ رہی تھی۔

"اچھا" میں اور کچھ نہ کہہ سکا۔

"ہاں دوست ! ہماری صلح ہو گئی ہے — اور میں تمہارا بے حد شکر گزار ہوں کہ تم نے ہم دونوں کی صلح کرانے میں بڑا بھاری کردار ادا کیا ہے میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھول سکتا — کہ میری عدم موجودگی میں بھی تم راشدہ کو سمجھاتے رہے اگر تم نہ ہوتے تو میں اپنی ہیرے جیسی بیوی کو کھو بیٹھتا —" عتیق حقیقتاً میرا بڑا احسان مند نظر آ رہا تھا۔

وہ دونوں اپنی بات ختم کر چکے تھے اور غالباً میرے جواب کے منتظر تھے مگر میں —؟ پھر اچانک ہی میں بولا۔

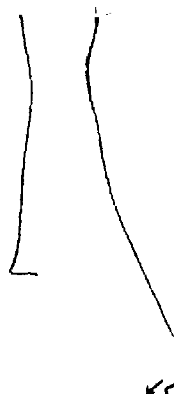
"اس میں شکریے کی کیا بات ہے — یہ تو میرا فرض تھا" — میرے اندر شیطان اور مگرمچھ نے پھر پڑاؤ کر لیا تھا۔

وہ دونوں میرا شکریہ ادا کر کے مسکراتے ہوئے ابھی ابھی اس دروازے سے باہر گئے ہیں۔

سامنے چاولوں کی وہ تھالی پڑی ہے جو ابھی کچھ دیر قبل راشدہ کے نازک ہاتھوں میں تھی — اور میں سوچ رہا ہوں کہ کسی نے واقعی سچ ہی کہا ہے کہ عورت ایک معمہ ہے۔

آئیڈیل کی تلاش ۲

ذاکرہ سمیع خان



شیشے کی کھنک

معزز گھرانے کی ۲۰ سالہ صاف رنگ، دراز قد، سڈول جسم کی دوشیزہ کے لئے شوخ و چنچل، سیر و تفریح کا دلدادہ، خوش لباس اور خوش گفتار، تعلیم یافتہ، برسر روزگار نوجوان کا رشتہ مطلوب ہے۔ صرف ضرورت مند توجہ فرمائیں۔

"مسز نرگس، کراچی"

حسن جفاشعار

میری بہن کی عمر تقریباً بیس سال ہے۔ کتابی چہرہ، گندمی رنگت اور خانہ داری میں ماہر، بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کی مالک، خوبصورت لڑکی کے لئے ۲۵ سالہ خوب صورت و خوب سیرت، دراز قد، ڈاکٹر، انجینئر یا پولیس میں کسی اچھے عہدے پہ فائز نوجوان کا رشتہ مطلوب ہے لڑکے کا مخلص اور بے غرض ہونا ضروری ہے۔

"مسز آفتاب کھوکھر"

نظروں کے کنگن

ہاشمی خاندان کی ۲۴ سالہ خوب صورت، گریجویٹ، دلچسپ اور با اخلاق دوشیزہ کے لئے نیک، سنجیدہ آدمی آفیسر کا رشتہ درکار ہے۔

"شاہین، ایبٹ آباد"

پیار کی چٹکیاں

میری سہیلی جو سرخ و سپید، خوب صورت، ذہین، ملازمت

کشمیر کی کلی

میں ایک معزز کشمیری گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں، عمر ۲۰ سال تعلیم میٹرک ہے، امور خانہ داری میں ماہر ہوں۔ شکل و صورت کی کیا بات کروں، جو بھی دیکھتا ہے دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔ میرا آئیڈیل بس بانکا، سانولے رنگ کا، ہنس مکھ اور صحت مند نوجوان ہے جو کسی اچھے عہدے پر فائز ہو یا کاروباری ہو۔

"مناز، سیالکوٹ"

پیشہ، شائستہ اطوار و عادات کی پچیس سالہ گریجویٹ دوشیزہ ہے۔ اس کے لئے شریف الطبع فوجی افسر یا کسی اچھے عہدے پر فائز شخص کا رشتہ درکار ہے۔ عمر ۲۷-۳۵ سال کے درمیان ہو۔

"نصرت، راولپنڈی"

احساس کی قندیل

مجھے ایسے ساتھی کی تلاش ہے جس کا دل خلوص، محبت اور چاہت سے لبریز ہو، وہ ایسا حقیقی اور سچا پیار دے جس میں بناوٹ نہ ہو۔ وہ میری بے لوث چاہت کو قبول کر کے مجھ سے ٹوٹ کر پیار کرے کیونکہ میں سچے پیار سے آج تک محروم رہی ہوں۔ میرے والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا ہے۔ ایف اے پاس ہوں۔ عمر تقریباً ۱۸ سال ہے۔ میں اپنے آپ کو خوبصورت تو نہیں کہہ سکتی البتہ جاذب نظر ضرور ہوں۔ کیا کوئی شخص مجھ جیسی دکھی لڑکی کو سہارا دینے پر تیار ہوگا۔

"خالدہ تاج، لاہور"

وفا کی آنچ

میرا تعلق ایک متوسط گھرانے سے ہے جہاں شرم و حیا عورت کا زیور ہوتی ہے۔ میں قبول صورت، دراز قد دوشیزہ ہوں۔ مجھے ایسے ساتھی کی تلاش ہے جو مہذب اور پُر خلوص ہو کسی بڑے کاروبار یا اچھے عہدے پر فائز ہو۔ تاکہ میں پُر وقار انداز میں سر اٹھا کر چل سکوں جہیز کی امید رکھنا فضول ہے۔

"ش، پ، کراچی"

عکس اور رقص

میری بہن جس کی عمر ۲۴ سال ہے، دراز قد، خوبصورت جسم جاذب نظر، اسمارٹ، خوش مزاج، گندمی رنگت کی بی اے بی ایڈ امور خانہ داری میں ماہر دوشیزہ ہے۔ اس کے لئے تیس سال کا اسمارٹ، اعلیٰ تعلیم یافتہ، دراز قد، ہنس مکھ اور شریف خاندان کے لڑکے کا رشتہ مطلوب ہے جو آرمی آفیسر، میجر، کرنل یا مسلح افواج کے کسی بھی اچھے عہدے پر فائز ہو۔ خلوص اور نیک نیت رکھنے والے حضرات رجوع کریں۔

"ق، ف، کراچی"

چاند کا رقص

میرا آئیڈیل خوبصورت، دراز قد، فیشن ایبل اور اسمارٹ نوجوان ہے۔ دیار غیر میں ہو تو اچھا ہے۔ میں میٹرک پاس ۱۸ سالہ، خوبصورت گورے رنگ، کتابی چہرہ والی شوخ و چنچل لڑکی ہوں بڑی بڑی شریر آنکھیں راہوں میں بچھائے اپنے آئیڈیل کی بے چینی سے منتظر ہوں۔

"نازیہ نوید، کراچی"

پلکوں کی ڈور

میرا آئیڈیل خوبصورت، خوب سیرت، دراز قد، پرکشش متناسب جسم کا بی اے پاس نوجوان ہے۔ پولیس میں انسپکٹر یا کسی بینک میں منیجر ہو تو بہتر ہے۔ میں ایک ہائی اسکول کی ٹرینڈ ٹیچر ہوں۔ میری عمر ۲۰ سال، رنگ سفید، خوبصورت نقش، درمیانہ قد اور لمبے لمبے بال ہیں۔ کاش مجھے جلد شریک سفر مل جائے

"شہناز پروین، راولپنڈی"

کرنوں کا جال

میں یو پی کے ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ میری دو جوان لڑکیاں ہیں جو ۲۱ سال اور ۱۷ سال کی ہیں۔ میں نے دونوں کو تعلیم دلوانے میں پوری جدوجہد کی۔ میٹرک تک تعلیم دلوانے کے علاوہ دینی علوم سے آراستہ کیا۔ یہ دونوں لڑکیاں گھرداری کی پابند اور شکل و صورت میں بھی ماشاءاللہ اچھی ہیں۔ اس نفسا نفسی اور دھوکے کے دور میں میں ان کی طرف سے بے حد فکر مند ہوں۔ لالچی اور دھوکے باز تو فوراً آ جائیں گے۔ لیکن دینی تعلیم سے رغبت رکھنے والے نہیں ہوں گے میں ایک بیوہ ماں ہوں۔ صرف حسن سیرت کے متمنی رجوع کریں۔

"مسز سعید احمد خان۔ اسلام آباد"

گل کی چٹک

میرا آئیڈیل پُر خلوص، دراز قد، اسمارٹ سا نوجوان ہے، جو پُر خلوص اور سچا ہو۔ میں خوبصورت، خوب سیرت اور سلیقہ شعار دوشیزہ ہوں۔ مجھے اپنے آئیڈیل کا شدت سے انتظار رہے گا۔

"تسنیم، لاہور"

پیار کا لاوا

میری سہیلی کے لئے ایسے ساتھی کی ضرورت ہے جو پُر خلوص

ہمدرد، وفادار، اسمارٹ اور پُروقار ہو۔ عمر تیس سال تک ہو۔ بزنس مین، ڈاکٹر یا کسی اعلیٰ عہدے پر فائز شریف انسان اس کا آئیڈیل ہے۔ میری سہیلی نازک سی، بھولی بھالی، پانچ بھائیوں کی اکلوتی اور لاڈلی بہن ہے۔ خوش مزاج، سلیقہ مند، بی اے پاس ہے۔ اس کے والد اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔

"شہناز، لاہور"

بکھرے بکھرے خواب

میرا آئیڈیل ڈیفنس کے محکمے کا باوقار اور خوددار افسر ہے جو میری وفاؤں کی قدر کر سکے۔ میں ۲۰ سالہ قبول صورت، کم گو، اسمارٹ ایف اے پاس معزز خاندان کی لڑکی ہوں۔ اگر مجھے میرا آئیڈیل مل گیا تو اپنی چاہت کے تمام پھول اس کے قدموں میں نچھاور کر دوں گی۔

"شمسہ، لاہور"

ارمانوں کا درد

میں ایک قبول صورت، سفید رنگت اور درمیانے قد کی پڑھی لکھی لڑکی ہوں۔ میرا آئیڈیل وسیع القلب، دراز قد، بی اے پاس بڑی بڑی سیاہ آنکھوں والا حسین شہزادہ ہے۔ اگر کوئی مجھ جیسا دکھی شخص ہو تو اس کو اپنانے میں، میں فخر محسوس کروں گی۔

"نورین فیروز، خوشاب"

فکر کی قندیل

میری ایک بہن جن کی عمر ۲۷ سال، بی اے، بی ایڈ، دراز قد، قبول صورت، خوش مزاج، امورِ خانہ داری میں ماہر، مقامی پبلک اسکول میں ٹیچر ہیں۔ دوسری بہن صاف رنگت، بڑی بڑی آنکھیں، دراز قد، امورِ خانہ داری میں ماہر، پُرخلوص اور اچھی عادتوں کی مالک ہیں۔ عمر ۲۵ سال ہے۔ ہم لوگ معزز آرائیں خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے لئے ایسے لڑکوں کے رشتے درکار ہیں جو شریف، برسرِ روزگار اور اچھے خاندان سے تعلق رکھتے ہوں۔

"ف، ج، کوئٹہ کینٹ"

چاہت کی کرن

ہے کوئی جو میرے دکھ درد سمیٹ لے۔ سسکتے ہوئے لمحات کو چہکتے ہوئے گلزاروں میں بدل دے۔ میں معاشرے کی ایک انتہائی ستم رسیدہ، بدنصیب اور دکھی لڑکی ہوں۔ آج سے چار سال قبل ایک ظالم نے خلوص اور محبت کے نام پہ دھوکے سے میرا دامن داغدار کر دیا تھا۔ میری شادی میرے خالہ زاد سے ہوئی۔ لیکن میں نے طلاق لے لی۔ میں چاہتی ہوں کہ کوئی میری سچائی اور خلوص سے متاثر ہو کر خلوص اور محبت کا متلاشی نوجوان مجھے اپنے قدموں میں جگہ دے دے۔ مجھے

صداقت کی تلاش ہے۔ تاروں کی کہکشاں بھلکتی ہیں تاکہ تمام اچھا تعلق اور پیار نبھائیں صداقت سے تعبیر ایک سے میں میٹرک پاس، پُرخلوص، خوش مزاج، خوش ذوق، خوش لباس، رنگ اور مناسب نقوش کی اسمارٹ لڑکی ہوں۔ ہر رنگ اور ہر ماحول میں ڈھل جانے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہوں۔ میں اپنی چاہت کی لَو سے اپنے شریکِ سفر کی زندگی کو جگمگا دوں گی۔

"شمع مسان، سدھڑی"

کوئل کی کوک

میں ایک تعلیم یافتہ، عزت دار گھرانے کی ۲۲ سالہ انٹر پاس دوشیزہ ہوں۔ مجھے ایسے آئیڈیل کی تلاش ہے جو زندہ دل، اسمارٹ، خوش لباس، تعلیم یافتہ، پُروقار، بااعتماد اور اچھے عہدے پر فائز ہو۔ عمر ۲۵ سال سے زیادہ نہ ہو، جو عمر بھر ساتھ دینے کا وعدہ کرے۔ اگر مجھے میرا آئیڈیل مل گیا تو میں اپنی ہر خوشی اس پر قربان کر دوں گی۔

"شہناز انجم، کراچی"

پیامِ دل

میری چھوٹی بہن جس کی عمر ۲۵ سال، تعلیم بی اے، بی ایڈ، گندمی رنگت کی قبول صورت، اعلیٰ سیرت کی لڑکی ہے۔ اس کے لئے ایسے ہمسفر کی تلاش ہے جو نیک سیرت، تعلیم یافتہ، دراز قد اور شریف خاندان سے تعلق رکھتا ہو۔ اعلیٰ عہدے پر فائز یا بیرونِ ملک ہو۔ عمر تقریباً ۳۰-۳۵ سال کے درمیان ہو۔

"مسز ج بشیر، راولپنڈی"

سجل شکھڑا۔

میری باجی کے لئے اچھے عہدے پر فائز، تعلیم یافتہ، بلند کردار اور اعلیٰ صفات کے حامل خوب صورت نوجوان کا رشتہ درکار ہے۔ میری باجی کی عمر ۲۵ سال ہے۔ تعلیم ایف اے، بی ٹی ہے۔ خوبصورت، خوب سیرت، بلند کردار کی مالک ہیں۔ ہر ایک کو اپنا گرویدہ بنا لیتی ہیں۔ وہ یقیناً خوش قسمت ہوگا جو میری باجی کا ہمسفر بنے۔

"سی، ایف۔ ڈیرہ اسمٰعیل خان"

جمالِ مشکل

میری بہن کا آئیڈیل اعلیٰ تعلیم یافتہ، کلاس ون آفیسر، انجینئر، فوجی آفیسر، لیکچرار یا کسی اعلیٰ عہدے پر فائز نوجوان ہے جو دراز قد، خوبرو، خوش مزاج، مردانہ وجاہت کا جیتا جاگتا پیکر، سلجھا ہوا انسان جو ازدواجی زندگی گزارنے کے آداب سے بخوبی واقف ہو۔ میری باجی

معزز گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں۔ عمر ۲۳ سال تعلیم ایم اے ماشاءاللہ ذہین، ذی رنگ کی سلیقہ شعار خاتون ہیں۔ "سلطانہ۔ کراچی"

درد کا سوز

میری بیٹی کی عمر ۲۳ سال اور تعلیم بی اے ہے۔ سفید رنگت خوبصورت اور خوش مزاج ہے۔ اس کے لئے آئی اے ایس یا کسی ڈاکٹر کے لئے رشتہ مطلوب ہے۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ جلد اس فرض سے سبکدوش ہوجاؤں۔ "والدہ طاہرہ۔ اسلام آباد"

مہتاب کی ٹھنڈک

میرا آئیڈیل اچھی شکل و صورت کا مالک، صاف گو اور خوش اخلاق نوجوان ہے۔ میں ایسے نوجوان کی زندگی کو اپنانے کو تیار ہوں جسے کوئی لڑکی اپنا نا پسند کرتی ہو۔ مگر مجھ جیسے شخص ہمسفر ملتی ولادے تو اس کے تمام دکھ اپنے دامن میں سمیٹ لوں گی۔ میں لکھے ہوئے خیالات کی خوش شکل، خوش دل اور خوش اخلاق لڑکی ہوں۔

"مسز عثمان۔ جہلم"

ماہ و سیمیں

مجھے ایسے پرسکون ساتھی کی تلاش ہے جو میرے دکھوں کو اپنے

خوشیوں اور پیار سے بھر دے۔ میں سرخ و سفید رنگ، آنکھیں ہیرے فریب کے کنول سے، پتلے گلابی ہونٹ، نازک بدن اور متناسب جسم کی مالک ہوں۔ میری عمر ۲۳ سال ہے۔ یہ آرزو ہے کہ جلد اپنا آئیڈیل کو پالوں۔ "شگفتہ حیات۔ لاہور"

احساس کی زنجیر

میرا آئیڈیل ۲۶-۲۸ سال کا باوقار، باصلاحیت اور سنجیدہ انسان ہے جو روشن خیال اور وسیع النظر ہو۔ میں ۱۸ سالہ انٹر پاس لڑکی ہوں۔ میرا تعلق خوشحال گھرانے سے ہے۔ متناسب قد اور صاف رنگ کی مالک ہوں۔ بے چینی سے اپنے آئیڈیل کی متلاشی ہوں۔

"عاشی۔ کراچی"

گرمئ گفتار

میرا آئیڈیل آرمی آفیسر، ڈاکٹر، انجینئر یا کلاس ون افسر ہے۔ خوش اخلاق، باوقار، منفرد شخصیت کا مالک ہو۔ عمر ۳۰ سے زیادہ نہ ہو۔ میں نہایت معزز گھرانے کی چشم و چراغ ہوں۔ عمر ۱۹ سال، تعلیم بی اے، گوری رنگت، پرکشش آنکھیں، تیکھے نقوش اور سراپا انتہائی دلکش ہے۔

"ص۔ ملتان"

عارفہ، کراچی کے نام!

خوب سیرت، خوب صورت اور معزز گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں۔ آپ کے معیار پر پورا اتروں گا۔

لیاقت علی تاند، بلاک ۲/۴۹

پاک فضائیہ۔ بیس مسرور۔ کراچی

مس نگہت، لاہور کے نام!

میں آپ کے خیالات کی دل و جان سے قدر کرتا ہوں۔ عمر ۲۲ سال اور تنخواہ چھ ہزار روپے ہے۔

ایم سید شماس۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۹، دوحہ، قطر

○

میرا دوست آپ کا بہترین آئیڈیل ثابت ہوگا۔

چوہدری محمد ریاض۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۹۵۔ کویت

○

ذاتی کاروبار، ماہانہ آمدنی چالیس ہزار روپے، عمر ۲۲ سال، تعلیم بی اے ہے۔ عبدالحمید ناز

حمید ٹیکسٹائل انڈسٹریز۔ مسلم روڈ۔ گوجرانوالہ

○

عمر ۲۸ سال، تعلیم ایف اے اور ماہوار آمدنی پانچ ہزار روپے ہے۔ آپ کو شریک سفر بنانے کو تیار ہوں۔

محمد اسلام زیدی۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۸۱۔ ابوظہبی

○

عمر تقریباً ۲۲ سال، تعلیم میٹرک اور تنخواہ ۳۵۰۰/- روپے ہے۔ آپ کے معیار پر پورا اتروں گا۔

چوہدری محمد افضل نگاہ، پوسٹ بکس نمبر ۲۲۸۵

جدہ۔ سعودی عرب

○

آپ کے خیالات کی تصویر ہوں۔

حاجی محمد اکرم۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۱۵۔ الریاض۔ سعودی عرب

میٹرک اور ماہوار آمدنی ۴۰۰۰ روپے ہے تاپ کو پاکر خوشی ہوگی۔
بشیر احمد معرفت کراچی آرٹ فوٹو گیلری
بس اسٹاپ نمبر ۵۔ محمود آباد۔ کراچی

○

آپ کی سچائی اور راست گوئی سے متاثر ہوا ہوں۔ آپ کو شریک سفر بنانے کے لئے تیار ہوں۔ شمیم اختر
معرفت بلال احمد خان سیکریٹری۔ اکنامکس ریسرچ
سعودی عرب ائیر لائن۔ پوسٹ سینٹر ۲۲۲
پوسٹ بکس نمبر ۱۶۷۔ جدہ۔ سعودی عرب

○

اگر آپ مجھے شریک سفر بنائیں تو مسرت محسوس کروں گا۔ تعلیم میٹرک اور تنخواہ تین ہزار ریال ہے۔
ایس اے حسین پوسٹ بکس نمبر ۱۹۷۰۔ دمام سعودی عرب

○

آپ کو اپنانے کے لئے تیار ہوں۔ میری عمر ۲۶ سال تعلیم میٹرک اور تنخواہ ۴۵۰۰/- روپے ہے۔
۲۴۲۰۸۹ زاہد عبدالرحمٰن۔ پوسٹ بکس نمبر ۹۰۵ شاہ کیمپ

○

یقیناً میں آپ کے آئیڈیل پر پورا اتروں گا۔ جو کچھ آپ چاہتی ہیں مجھ میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ احمد نواز چوہدری
معرفت چوہدری کلیم۔ کیروسین آئل ڈپو
مرچی بازار۔ سمندری۔ ضلع لائل پور

○

آپ کے آئیڈیل کے عین مطابق ہوں۔ ساتھ نبھانے کا وعدہ کرتا ہوں محمد اختر
معرفت ڈاکٹر ایم وائی۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۲۷۔ ڈیرہ مودیتی

○

مجھے بھی آپ جیسے جیون ساتھی کی تلاش ہے۔ عمر ۲۵ سال اور تنخواہ ۴۰۰۰/- روپے ہے۔
بدیع الزماں۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۵۴۸۔ الدمام سعودی عرب

○

میں آپ کے معیار کے عین مطابق ہوں۔
محمد صابر غلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۴۰
دہران ائیرپورٹ۔ الخبر۔ سعودی عرب

زبیدہ اسمعان، کراچی کے نام!

آپ کے معیار پر پورا اتروں گا۔ عمر ۲۸ سال، گریجویٹ معقول تنخواہ ہے۔
اے آر خان۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۹۶۔ منامہ۔ بحرین

الماس، کراچی کے نام!

میری تعلیم بی اے عمر ۳۰ سال اور ماہوار آمدنی آٹھ ہزار ہے۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔
محمد خان ملک فورمین سلیم ایم آر پی سی کمپنی
پوسٹ بکس نمبر ۶۱۴۔ مسقط۔ عمان

○

اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ تعلیم بی اے۔ عمر ۳۰ سال اور ماہوار آمدنی دس ہزار روپے ہے۔
مانا محمد نعیم معرفت چوہدری محمد اقبال
پوسٹ بکس نمبر ۴۲۵۔ دہران انٹرنیشنل ائیرپورٹ
سعودی عرب

○

میں ہی آپ کا آئیڈیل ہوں۔ آپ کی شرائط پر پورا اتروں گا۔
حامد معرفت اشرف مرزا۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۴۴۲۔ کراچی

○

اگر آپ واقعی سچے پیار کی تلاش میں ہیں تو میں حاضر ہوں۔ گورنمنٹ ملازم، معقول تنخواہ ہے۔
غلام حیدر عباسی۔ مقام و ڈاکخانہ جھنڈو شریف براستہ حیدرآباد

مسز ایم اے آئی۔ کراچی کے نام!

مجھے آپ جیسی تعلیم یافتہ لڑکی چاہیئے تاکہ میں تعلیم حاصل کرسکوں برسر روزگار ہوں۔ آمدنی معقول ہے۔
منیر اللہ۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۰۸۸۔ ابوظہبی

شازیہ مرزا، چیچہ وطنی کے نام!

خدا کا دیا سب کچھ ہے۔ صرف ایک تمنا ہے کہ کسی کو اپنا ہمسفر بنا سکوں۔ جمیل احمد نظامانی
معرفت نظامانی بلوچ میڈیکل اسٹور۔ ماتلی۔ ضلع بدین

○

میں اس دنیا میں تنہا مایوسیوں اور ناکامیوں کے گرداب

میں پڑھا لکھا انسان ہوں۔ عمر ۲۲ سال ہے۔ آپ کے خیالات کے
عین مطابق ہوں۔
منظور احمد چشتی
معرفت صاحبزادہ احمد حسن شاہد۔ ڈاکخانہ خانقاہ ...
حسن آباد۔ تحصیل لیہ۔ ضلع مظفر گڑھ

○

اگر آپ میری ہم سفر بن جائیں تو دنیا کی ہر چیز آپ کے قدموں
میں نچھاور کر دوں گا۔
محمد افضل نزد سستے کپڑے کا ڈپو۔ گلی نمبر ۲۔ سرگودھا

مینا قریشی، حیدرآباد کے نام:
عمر ۲۴ سال، تعلیم بی اے ہے۔ آپ کے معیار کے عین مطابق ہوں۔
بشیر الاسلام قریشی معرفت کلرک محمود قریشی
اخلاق چیمبرز۔ ۱۰ فین روڈ، لاہور

○

زمانے کے ہاتھوں بہت زخم کھائے ہیں۔ شاید ہم دونوں
مل کر غموں کو خوشیوں میں تبدیل کر سکیں۔
اکرام میاں۔ سراج میاں الیکٹرونک
جی ٹی انور روڈ۔ نزد پل طارق آباد۔ لائلپور

○

آپ کے آئیڈیل کے مطابق ہوں۔
محمد محمود جان معرفت راشن شاپ ۵۵۵
نزد سبیل چوک۔ کراچی نمبر ۵

○

میں آپ کے خیالات کی تصویر ہوں۔ میری عمر ۲۶ سال، تعلیم
بی کام اور تنخواہ دس ہزار روپے ہے۔
محمد زاہیل۔ پوسٹ بکس نمبر ۴۸۰۵۔ الخبر سعودی عرب

○

آپ کی تحریر نے بہت متاثر کیا۔ میری عمر ۲۷ سال، تنخواہ
۵۰۰ روپے اور تعلیم میٹرک ہے۔ آپ کو اپنانے کو تیار ہوں۔
ایم رفیق حیدری۔ کوارٹر نمبر ۲۵۔ گلی نمبر ۱۳
اعظم بستی۔ کے ایم سی کالونی۔ کراچی ۲۹

○

آپ ہی میرا آئیڈیل ہیں۔
نعیم اقبال۔ بٹ میڈیکل سٹور۔ بھچ۔ بلوچستان

میری عمر ۲۲ سال، تعلیم بی اے اور تنخواہ ۱۹۰۰ روپے ہے۔ آپ
کو شریک زندگی بنانے کے لیے تیار ہوں۔
عبدالوحید قریشی۔ گلی نمبر ۹ مکان نمبر ۲۲ طارق آباد، لائلپور

○

مجھے اپنا لو۔ دل میں بسا لو۔ آنکھوں میں سجا لو۔ میں انمول
ہیرا ہوں۔ ڈھونڈو گی بھی تو مجھ جیسا نہ پاؤ گی۔
اخلاق احمد معرفت ارشد مستری
پوسٹ بکس نمبر ۴۲۴۴۔ ڈیرہ۔ دوبئی

○

میں آپ کی ہر خواہش پوری کروں گا۔
اسلم علی سالمین۔ سویلین کلرک۔ پوسٹ بکس نمبر ۸۹۷
مسقط۔ سلطنت آف عمان

سعیدہ خانم، کراچی کے نام:
میں بہت معصوم اور بھولا بھالا ہوں۔ اگر ایسی ہی شریک حیات
مل جائے تو دنیا جنت بن جائے گی۔
ظفر حسین معرفت سردار اختر۔ مکان نمبر 413-D
سیٹلائٹ ٹاؤن۔ سرگودھا

○

میں آپ کے آئیڈیل کے مطابق ہوں۔
رحمت شاہ۔ نیشنل بینک آف پاکستان
بہادر نگر روڈ۔ تبرلہ۔ ضلع ساہیوال

○

آپ کے حالات زندگی میری زندگی سے مطابقت رکھتے ہیں۔
محمد سعید بیوج۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۰۸۸۔ ابوظہبی

زہرہ جبیں، کراچی کے نام:
آپ کو پا کر زندگی کے ہر دکھ کو بھول جاؤں گا۔
منظور احمد نقوی۔ معرفت رشید بک ڈپو اینڈ جنرل سٹور
نزد اکرم میڈیکل سٹور۔ گڑھی فتح شاہ۔ تحصیل سنڈری۔ ضلع ...

○

میری عمر ۲۴ سال، ماہانہ آمدنی ساڑھے پانچ ہزار روپے۔
خدا کا دیا سب کچھ ہے۔ صرف آپ کے خلوص اور پیار کی تمنا ہے۔
عصمت علی حاسی۔ پوسٹ بکس نمبر ۴۲۵۴۔ دوبئی

○

۔ ۔ ۔ ہے ہمیں اپنا لیں مجھے خوشی ہوگی۔
محمد جہان خاں معرفت پوسٹ بکس نمبر ۱۳۲۳
مسقط۔ سلطنت آف عمان

○

تعلیم میٹرک، عمر ۳۰ سال، اپنا ذاتی کاروبار ہے۔ آپ کو اپنانے
کو تیار ہوں۔
ایم اے خان
الائیڈ بینک آف پاکستان۔ قادر آباد برانچ سرگودھا

○

اگر آپ کے ارادے نیک ہیں تو میں آپ کا شریک زندگی
بننے کے لئے تیار ہوں، میری ماہانہ آمدنی ۲۵۰۰ روپیہ اور تعلیم میٹرک ہے
سلیم احمد معرفت مقبول احمد سیکشن ۵
بی ای ایل ٹی ڈی سی سادی پور جعب ایسٹ روڈ کراچی

○

آپ کو اپنی وابستگی کا بھرپور یقین دلاتا ہوں۔
اے ایچ احمد۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۲۷۲ شاپ نمبر ۲ ابوظہبی

○

میرے پیار میں آپ دیوانی ہو جائیں گی بشرطیکہ آپ نے
مجھے قبول کیا۔ میری تعلیم میٹرک اور تنخواہ ۳۰۰۰ روپیہ ہے۔
عبدالرحمٰن۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۲۷۵۔ ابوظہبی

○

میرے اور آپ کے خیالات میں ہم آہنگی ہے۔
ایم ایم احمد۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۶۵۔ شارجہ

○

آپ کی تحریر سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ اللہ کا دیا بہت کچھ
ہے صرف خلوص و پیار کا متلاشی ہوں۔ عمر ۲۴ سال اور ماہوار آمدنی
بہت ہے۔
شیخ محمد اقبال
(اسٹیل شاپ) پوسٹ بکس نمبر ۵۳۔ راس الخیمہ۔ دوبئی

○

آپ مجھ جیسے دکھی انسان کو پیار کا سہارا دیں تو میں اسے اپنی
خوش قسمتی سمجھوں گا۔
محمد سلیم
پوسٹ بکس نمبر ۲۳۶۴۔ الدمام۔ سعودی عرب

○

خدا نے سب کچھ دیا ہے صرف آپ کو اپنانے کی آرزو
ہے۔

اسلم پرویز معرفت علی شبیر
شہباز شاپنگ سنٹر، دکان نمبر ۳۱۔ سیہون شریف

○

آپ کو اپنا جیون ساتھی بنا کر دنیا کی ہر نعمت کو ٹھکرا دوں گا۔
ادریس الحق شاد۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۰۰۳
مطرح۔ سلطنت آف عمان

○

بچپن سے جس شریک سفر کی تلاش تھی وہ آپ ہی ہیں۔
جاوید اقبال۔ جونیئر کلرک۔ گورنمنٹ انٹر کالج
بیلہ۔ ضلع لسبیلہ

○

مجھے صرف محبت اور خلوص چاہیے۔
امجد علی پبلک ہیلتھ انجینئرنگ ڈیپارٹمنٹ سکھر ڈویژن

○

آپ کی تحریر نے بہت متاثر کیا ہے۔ میں آپ کے جذبات
کی دل سے قدر کرتا ہوں۔
اے ایچ راجہ۔ پوسٹ بکس نمبر ۹۲۲۔ جدہ۔ سعودی عرب

○

میں خلوص و پیار کی تمنا بھی کرتا ہوں اور قدر بھی۔ اگر آپ مجھے اپنا
شریک سفر بنا لیں تو سمجھوں گا کہ مجھے دنیا کی ہر خوشی مل گئی ہے۔
عبدالغنی۔ یونٹ نمبر ۳۔ مکان نمبر ۲۸۔ بی لطیف آباد حیدرآباد

○

میرا وعدہ ہے کہ آپ کو ساری عمر کوئی دکھ نہیں دوں گا۔
حاجی محمد اکبر۔ پوسٹ بکس نمبر ۵۲۹۳۔ جدہ۔ سعودی عرب

○

آپ کے خیالات کی قدر کرتا ہوں۔
مبارک علی۔ صندوق البرید ۵۹۔ عجمان۔ متحدہ عرب امارات

○

آپ مجھے اپنے آئیڈیل کے مطابق پائیں گی۔
ایم اظہر قریشی۔ مینیجر یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ جمال عمرہ
تحصیل لیاقت پور۔ ضلع رحیم یار خاں

○

آپ کے معیار پر پورا اتروں گا۔ تعلیم ایف ایس سی۔ تنخواہ

۵۰۰/- روپے اور عمر ۲۳ سال ہے۔
حوالدار فتح محمد۔ سیڈ یو فیلیشن نمبر ۲ کمپنی
۱۴ سگنل بٹالین۔ سیالکوٹ چھاؤنی

○

آپ کے معیار پر پورا اتروں گا۔
عبدالحکیم بزنجو۔ معرفت محمود بلوچ ہوٹل
پوسٹ بکس نمبر ۵۹۵۲۔ منامہ۔ بحرین

○

میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔
دل جان جاماسری۔ پوسٹ بکس نمبر ۵۳۱
شارجہ۔ القاریہ (یو اے ای)

○

تنخواہ -/۲۵۰ روپے اور عمر ۲۴ سال ہے۔ میں پیار کا خواہشمند ہوں۔
لانس نائیک خادم حسین۔ ۴۳۹
آرمی ریکوری کمپنی۔ ای ایم ای
کیئر آف ۶۰۲ کمبائنڈ ورکشاپ۔ کراچی

○

مجھے بھی آپ جیسے جیون ساتھی کی ضرورت ہے میری عمر
۲۷ سال اور تنخواہ -/۱۰۰۰ روپے ہے۔
امیر خان 5/37 لیاری ایریا۔ لیاقت آباد۔ کراچی ۱۹

○

میں آپ کو اتنا پیار دوں گا کہ آپ ہر غم بھول جائیں گی۔
مشتاق احمد جاوید۔ سول انجینئر
معرفت اسلم پرویز ٹھیکیدار۔ مکان نمبر ۱۰۹/۲۱۶
درخشاں سوسائٹی ملیر۔ کراچی ۳۵

○

میں آپ کے خیالات سے اتفاق کرتا ہوں۔
شیخ محمد علی اشرفی معرفت محمد شوکت نمبر ۱۴۹ پیر کالونی
مارٹن روڈ۔ کراچی ۵

○

میری عمر ۲۵ سال اور آمدنی -/۶۰۰۰ روپے ہے۔ آپ کو کسی
قسم کی پریشانی سے دوچار نہ ہونے دوں گا۔
احمد دین۔ پوسٹ بکس نمبر ۵۰۔ عجمان (یو اے ای)

شاہدہ، لاہور کے نام!
سچائی، بھلائی، خلوص کو دولت تصور کرتا ہوں۔ نصیب اپنا
ہے عمر ۲۹ سال، تعلیم ایم اے، ماہانہ آمدنی -/۲۰۰۰ روپے ہے۔
عبدالمجید
J/566 دستگیر روڈ۔ عقب گلستان سینما۔ راولپنڈی

○

میں آپ کو تمام خامیوں کے ساتھ اپنانے کو تیار ہوں۔
اللہ نواز خان معرفت مکان علی پیرا ایم بلاک نمبر ۔ بستی

○

آپ کی تحریر نے بہت متاثر کیا ہے۔ میری عمر ۲۰ سال
تعلیم بی اے ہے۔ منظور علی معرفت پوسٹ آفس
پلاٹ نمبر ۹ بلاک نمبر ۴۵ سیٹلائٹ ٹاؤن میرپور خاص

رفعت، کراچی کے نام!
سو فیصدی آپ کے آئیڈیل کے مطابق ہوں۔
ایم رحمان۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۲۰۲۔ اسلام آباد

○

آپ جیسا شریک سفر پاکر زندگی یقیناً خوشگوار گزرے گی
عمر ۲۲ سال، تعلیم میٹرک اور تنخواہ -/۲۵۰ روپے ہے۔
اللہ بخش۔ ای سی ورکشاپ ہیڈکوارٹر
پوسٹ بکس نمبر ۲۰۲۔ مسقط سلطنت آف عمان

○

ڈٹ کر چاہنے والی بات دل کو لگی تو آپ مجھے موقع دیں۔
منیر احمد، مکان نمبر ۲/۱۴۳ سیٹلائٹ ٹاؤن۔ بہاولپور

○

مجھے بھی آپ جیسی جیون ساتھی کی تلاش تھی۔
ایم ایس شہزاد، ملک نذر گارڈن
پوسٹ آفس فیروزپور روڈ۔ وحدت روڈ۔ لاہور

○

میرے دل کے دروازے ہر وقت آپ کے لئے کھلے ہیں
رانا ایم شمیم سہگل۔ معرفت ڈاکٹر محمد اقبال رانا
خواجہ میڈیکوز۔ مین بازار۔ شکرگڑھ۔ ضلع سیالکوٹ

○

میں آپ کے آئیڈیل کے مطابق ہوں۔

سارا معرفت ناصر الدین
گورنمنٹ کنٹریکٹر۔ ماتلی (سندھ)

○

میری خواہش ہے کہ آپ کو اپنی بانہوں کے حصار میں ہمیشہ کے لئے مقید کر لوں۔
محمد سلیم
معرفت یونس ٹریڈرز۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۱۴۲۷ صدر۔ کراچی

○

میرا دوست آپ کو اپنانا چاہتا ہے۔
محمد اشرف معرفت سب پوسٹ ماسٹر
پوسٹ آفس عثمان کھٹر تحصیل و ضلع راولپنڈی۔

○

آپ جن خوشیوں کی متلاشی ہیں وہ سب مجھ میں موجود ہیں۔
ولی مراد۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۴۲۵۔ شارجہ (یو اے ای)

○

اگر آپ نے خدمت کا موقع دیا تو میں اسے اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا۔
ناصر علی معرفت محمد اقبال شاہد
گلی نمبر ۵۔ طلعت آباد۔ سرگودھا۔

○

آپ کے خیالات و احساسات کا عکس ہوں۔
سید شفقت علی معرفت ٹیلیگراف آفس خضدار، بلوچستان

○

میں آپ کی تمام شرائط پر پورا اتروں گا۔
افضال حسین بخاری، جونیئر کلرک محکمہ خوراک
ٹرانسپورٹ سیل ۴۰ ڈیوس روڈ۔ لاہور

○

اچھی سروس کے ساتھ اچھی طبیعت کا مالک آپ کی نظرِ عنایت طلب گار ہوں
نعمان
پوسٹ بکس نمبر ۴۶۴۴ روی، مسقط

○

میں ناکامیوں اور مایوسیوں کے گرداب میں پھنسا ہوا بیس سالہ ابن جہاں، تعلیم میٹرک ہے۔
رانا ایم ظہیر الحسن۔ چک نمبر 165/K.B جنڈوالی
ڈاک خانہ کھوڑیانوالہ۔ ضلع لائلپور

آپ کی ہر خواہش پوری کرنے کو تیار ہوں۔ آپ کو مجھ سے خوشی ہوگی۔
اقبال شہزاد
پوسٹ بکس نمبر ۵۶۵۲ منامہ۔ بحرین

آپ کی تمام تر توقعات اور خیالات پر پورا اترتا ہوں کا اہم فیصلہ میرے حق میں کرکے آپ مایوس نہ ہوں گی۔
منصور قمر۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۶۶۔ راولپنڈی

○

آپ نے اپنے ذہن میں جس تصوراتی انسان کا خاکہ مرتب ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں اس معیار پر پورا اتروں گا۔
علی ناصر معرفت حبیب الرحمٰن سیکشن کنٹرول آفس
(ڈی ایس آفس) لاہور

○

آپ کو شریک حیات بنانا میں اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا۔
سعید احمد معرفت محمد علی۔ پوسٹ بکس نمبر ۵۴۲
دہران۔ سعودی عرب

○

عمر ۲۰ سال، تعلیم میٹرک اور تنخواہ ۶۵۰/- روپے ہے۔
صداقت رشید۔ نیو پلانٹ داخلہ۔ واہ سیمنٹ ورکس
ضلع راولپنڈی

○

ممکن ہے آپ کے معیار پر پورا اتر سکوں۔ نہ جہیز کا لالچی ہوں اور نہ ہی تنخواہ کی نمائش پسند کرتا ہوں۔
الیاس احمد۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۸۱۱۔ دوبئی

○

میں ۱۹ سالہ میٹرک پاس نوجوان ہوں۔ آپ کو اپنانے کے لئے آمادہ ہوں۔
ظفر اعوان ۱۹-۴۴ ای
بلاک ۶ پی ای سی ایچ ایس۔ کراچی ۲۹

○

آپ کے آئیڈیل میں ہو بہو میری تصویر پنہاں ہے۔
ایم انور ناز۔ شاہد ٹریڈرز [illegible] رحیم یار خان

○

مجھے بھی آپ جیسی جیون ساتھی کی تلاش ہے۔ عمر ۲۲ سال اور تنخواہ ۱۰۰۰/- روپے ہے۔

تبسم جاوید - پوسٹ بکس نمبر ۱۹۲۳ - دوحہ قطر

○

مجھے مدت سے جس ساتھی کی تلاش تھی وہ آپ ہی ہیں۔
سید محمد عارف R.222/20 الفردوس سوسائٹی
فیڈرل بی ایریا - کراچی ۳۸

○

آپ کے آئیڈیل کی ہوبہو تصویر ہوں۔ عمر ۲۳ سال تعلیم بی کام ہے۔
محمد عثمان یعقوب معرفت حبیب بینک لمیٹڈ
پی اے ایف بیس برانچ - ڈرگ روڈ - کراچی

○

میری عمر ۲۵ سال تعلیم ایف اے سی ٹی ہے۔ مقامی اسکول میں ہیڈ ماسٹر ہوں۔ آپ کے معیار پر پورا اتروں گا۔
رانا ایم اے خاں ۔ 21/H-692 واہ کینٹ

○

میں علم کی دولت سے مالا مال ہوں۔ عمر ۲۳ سال اور ماہوار آمدنی ۲۰۰۰/- روپے ہے۔
سجاد پرویز - سب ماؤنٹ آفس - سانگھڑ

○

آپ کے خیالات کے مطابق ہوں۔
ضمیر الدین خاں 1/8 بی ایریا - لیاقت آباد - کراچی

نگہت مسعود، کراچی کے نام!
میں آپ کو زندگی بھر کسی قسم کا شکوہ نہ دوں گا۔ میری عمر ۲۸ سال اور آمدنی چھ ہزار روپے ہے۔
جاوید اقبال - پوسٹ بکس نمبر ۲۱۸۰ - ڈیرہ - دوبئی

والدہ نگہت بہاولپور کے نام!
مجھے بھی ایسی لڑکی کی تلاش تھی جو باسلیقہ اور شریف خاندان کی ہو آپ کی لڑکی کو اپنانے کو تیار ہوں۔
شمیم الحسن، منیجر حبیب بینک
اوچ بخاری، ڈاکخانہ اوچ شریف، بہاولپور

○

میں سرکاری ملازم ہوں تنخواہ ۶۵۰/- روپے ہے۔ دوسری شادی کے لئے آپ سے رجوع کر رہا ہوں۔
مختار احمد الیکٹریشن - ایم سی پی مواپڑا، ڈاکخانہ باسے ضلع کیمبل پور

شفقت گل، لاہور کے نام!
آپ کی بے باک تحریر پڑھنے والوں میں خود بخود آپ کے لئے چاہت پیدا کر دی ہے۔ مجھے جیون ساتھی بنا کر ہمیشہ آپ ناز کریں گی۔
شاہد محمود - پوسٹ بکس نمبر ۵۳ - دمام - سعودی عرب

○

میں آپ کے خیالات کی قدر کرتا ہوں۔
مقصود حسین بٹ - پوسٹ بکس نمبر ۲۱۴ عجمان (یو اے ای)

○

آپ کی طرح مجھے بھی جھوٹ سے سخت نفرت ہے۔
ایم اے خالق - اے سی سی ڈی نائٹ
ایس ایس سی سی - دہران - سعودی عرب

○

اگر آپ نے میرا ساتھ دیا تو آپ کی جھولی خوشیوں سے بھر دوں گا۔
رحمن معرفت عاقل اوکھائی
پوسٹ بکس نمبر ۳۵۲ - ابوظہبی (یو اے ای)

○

کھاتے پیتے گھرانے کا فرد ہوں۔ آپ کے معیار پر پورا اتروں گا۔
محمد اکرم - دکان نمبر ۱۵ - شیر پاؤ روڈ - شاہدرہ موڑ - شاہدرہ لاہور

س۔ن، راولپنڈی کے نام!
میں دنیا کا ٹھکرایا ہوا انسان ہوں۔ آپ کی تحریر نے دل موہ لیا ہے۔
محمد اسلم راہی معرفت اسمٰعیل سنز فرنیچر
شاہراہ عراق - صدر - کراچی ۳

○

میں مایوسیوں اور ناکامیوں کے گرداب میں پھنسا ہوا انسان ہوں۔ میری عمر ۲۵ سال اور تعلیم میٹرک ہے۔
لیاقت علی، سیڈ ریسرچ، ایم سی ایل مقصودیہ - ہزارہ

○

آپ کا تعارف پڑھنے سے دل میں مزید پیدا ہوگا۔ چونکہ میں بذات خود چلتا پھرتا افسانہ ہوں۔ اگر میری منزل آپ ہی ہیں تو پھر خدارا مزید ستم کرنے کے لئے اکیلا نہ چھوڑیئے۔
محمد محبوب صابری
معرفت عبدالحمید حامد معوض مکان مرتی لفتار رحیمہ الخبر
سعودی عرب

○

۔ دیا ہے کہ آپ مجھ کو دیں
برابر کا شریک بنانا چاہتا ہوں۔ میری عمر ۲۲ سال اور ماہوار آمدنی ۷۰۰/-
ہے۔ مقبول احمد تابید معرفت یونیسل کمپنی۔ میرپور خاص

○

اگر آپ میرا ساتھ دیا کریں تو ہر خدمت کے لئے حاضر ہوں
عمر ۲۹ سال، تعلیم میٹرک، آمدنی ۶۰۰/- روپیہ ماہانہ ہے۔
ایم اے اعوان۔ ۱۰ آغا ناظم مارکیٹ۔ سوہ کینٹ

○

میرے زمانہ طالبعلمی میں جو آئیڈیل کا خاکہ تھا آپ کی پُر اثر
تحریر نے اس میں رنگ آمیزی کردی ہے۔
عبدالاسلام جہانگیری کیشئر مسلم کمرشل بینک۔ جاگیوالی شیخو

○

ایک نیم سرکاری ادارے میں ملازم ہوں۔ تنخواہ ۷۰۰/- روپیہ ہے۔
مختار صدیقی ۸۸۲ حویلیاں سٹریٹ ہری پور ہزارہ

○

اگر آپ مجھے سہارا دیں تو شاید میری زندگی کا خلا پُر ہو سکے،
میں تمام عمر آپ کی پوجا کروں گا۔
عطاالٰہی نیشنل بینک آف پاکستان۔ ڈرائی پورٹ شیخوپورہ لاہور

○

آپ کی تحریر نے بہت متاثر کیا۔ میں تنہا ہوں اور بالکل آپ
کے آئیڈیل کے مطابق ہوں۔ میری عمر ۲۹ سال اور ماہانہ آمدنی ۷۰۰/-
ہے۔ نصیر احمد معرفت محمد جمیل اسسٹنٹ انجینئر
سی آئی اے ایس۔ بیرل اسٹور۔ سب ڈپو
ویسٹ وارف روڈ۔ کراچی

○

آپ کے آئیڈیل کے مطابق ہوں۔
منشا احمد۔ مکان نمبر M/1014 گلی نمبر ۴۱
محلہ امریپورہ۔ راولپنڈی

○

میری ماہوار تنخواہ ۱۱۰۰/- روپیہ ہے۔ آپ کے خیالات سے
متفق ہوں۔ شہزاد احمد ڈار
سیکریٹری سفارت خانہ افغانستان۔ اسلام آباد

○

میری عمر ۲۹ سال اور تعلیم ایف اے ہے۔ آپ کے عہدہ
محمد اقبال اعوان ۲۰۸ - جی الیون ٹو ۱۱۴
○

میں بھی آپ کا آئیڈیل ہوں۔ عمر ۳۱ سال، تعلیم
دس ہزار روپیہ ہے۔ مرزا خان بابر
8V PLASS 72 OSLO-1 NORWAY

○

آپ کی تحریر نے بہت متاثر کیا ہے۔ میں آپ کے
ساتھی بننا چاہتا ہوں۔ میری عمر ۳۲ سال اور ماہوار آمدنی پانچ
ہے۔ جاوید احمد۔ پوسٹ بکس نمبر ۵۰۶۔ بمبئی

○

غمگین، غمزدہ اور اکیلا ہوں۔ خدا کرے کہ ہم ایک دوسرے
کا سہارا بن سکیں۔ سید مشتاق کاظمی
معرفت باقی جنرل اسٹور۔ قندھاری بازار، ٹوبہ ٹیک سنگھ

○

میرے دل کے دروازے ہر وقت آپ کے لئے کھلے ہیں۔
۸-سی / ۹۰۷۸ وین ماہی۔ ڈی کمپنی۔ پلاٹون نمبر ۱
بٹالین نمبر ۸ مال روڈ جہلم آباد

○

آپ جیسی خدا ترس اور محبوب ہستی کی رفاقت سے منتظر ہوں۔
ایم جی ملک معرفت الطاف حسین
ADM. COMD. (A) G.H.Q RAWALPINDI CANTT

○

آپ کے آئیڈیل کے مطابق ہوں۔
رشید انور، لائبریرین، ڈی کالا کالج جامعہ اسلامیہ فتح پور ضلع بہاولنگر

○

آپ نے سو فیصدی میرے خیالات کی عکاسی کی ہے۔
محمد علی معرفت شیر محمد ٹرنک والا
متصل نیشنل بینک آف پاکستان ہائی سٹریٹ وزیریاں

○

اگر آپ مجھے شریکِ سفر بنانا پسند کریں تو آپ کی توقعات
پر پورا اتروں گا۔ ایم اے ندیم
محلہ گوپال پورہ گلی نمبر ۲۔ بیلا داس سانگلہ ہل ضلع شیخوپورہ

تنہائیوں کا زہر پی پی کر، مایوسیوں، ناکامیوں کے لق و دق صحرا
میں اس موسم کے تند و تیز جھونکوں کے دوش بدوش چل رہی ہوں
کسی سیاہ ناگن زلفوں کے سائے تلے سکون کی متلاشی ہوں۔
اختر۔ قمر واچ ہاؤس۔ کمیٹی چوک۔ مظفر گڑھ

○

آپ کی تحریر پڑھ کر آپ سے وابستگی کو جی چاہتا ہے۔
محمد محسن معرفت پی اے خان سیکریٹری اکنومی ریسرچ
سعودی عربین ایئرلائنز پوسٹ بکس نمبر ۱۹۷
مدام نمبر ۲۰۱ جدہ۔ سعودی عرب

○

آپ کی تحریر ہو بہو میرے آئیڈیل کی عکاسی کرتی ہے۔
محمد سلیم۔ ڈیاٹس کریم ڈپو۔ میاں محمد شاہ روڈ
کے ڈی اے اسکیم ۱۔ کراچی

○

آپ کا جذبہ قابل قدر ہے۔
بہاول علم پرائمری اسکول۔ ریلوے کالونی
کندیاں۔ ضلع میانوالی۔

○

شاید آپ کا ہاتھ تھام کر مجھے منزل مل جائے۔
ایم شرافت ظہیر۔ جنڈوالی 165 گ ب
ڈاکخانہ کھڑیانوالہ۔ تحصیل و ضلع لائلپور

○

اگر آپ میرے دکھوں کا مداوا کر سکیں تو اسے میں اپنی خوش نصیبی
سمجھوں گا۔ میری تنخواہ ۷۰۰ روپے، تعلیم بی اے اور عمر ۳۰ سال ہے۔
ایم اے خان۔ ۹۹۹ سی ۴/۳-۲-۷-جی اسلام آباد

○

میری عمر ۲۶ سال اور تنخواہ چھ ہزار روپے ہے۔ آپ کو پاکر
مجھے مسرت ہوگی۔ بشیر احمد بٹ
معرفت عبدالباری فرم ۳۲۷۵۸ الخلیج پیپسی کمپنی
پوسٹ بکس نمبر ۱۸۱ دوبئی سائٹ (یو اے ای)

سنبل سعدیہ، ملتان کے نام،
سازِ وفا پر دھڑکتے ہوئے دل کے لئے، خلوص کی معطر
تمناؤں میں اپنی چاہت کے نغمے بکھیر دیجئے پھر دیکھئے زندگی کتنی

مسکین ہوتی ہے۔ رضوی
شبنم ٹیلرز، اندرون لاہوری گیٹ۔ مظفر گڑھ

○

آپ مجھ سے مل کر یقیناً اطمینان محسوس کریں گی۔
راشد ضمیر خان ۱۶۱/۸-۵۱ کورنگی ٹاؤن کراچی ۳۱

○

خدا کرے کہ ہم ایک دوسرے کے معیار پر پورے اتریں۔
شوکت طارق۔ مکان نمبر ۷۴ سیکٹر ۳۲/۵ لانڈھی کالونی ۱
کراچی نمبر ۳۰

○

میرے اور آپ کے خیالات میں ہم آہنگی ہے۔ شعر و شاعری
کتب میری کمزوری ہیں
عاصم سہیل، فہیم جنرل اسٹور، صدر بازار۔ ملتان کینٹ

○

شاید مجھے آپ ہی کا انتظار تھا۔ میری عمر ۲۲ سال، تعلیم ایف اے
اور تنخواہ ۲۵۰۰ روپے ہے۔
ممتاز حسین، پوسٹ بکس نمبر ۵۳۹۶ ۔ ڈیرہ۔ دوبئی

○

آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہ دوں گا۔
محمد رشید معرفت عبدالمالک
نیو کملا ٹیلرنگ ہاؤس۔ مین روڈ۔ سرگودھا

○

میری عمر ۲۳ سال، تعلیم ایف اے، معقول تنخواہ۔ خلوص
بڑھا ہوا ہاتھ کبھی نہیں ٹھکراتا۔
عابد حسین تاز۔ پوسٹ بکس نمبر ۹۲ (الثانی) دوحہ قطر

○

آپ کا ہم خیال اور آپ کی توقعات کے عین مطابق:
عمر ۲۴ سال، تنخواہ ۶۰۰ روپے ماہوار اور تعلیم ایف اے ہے
ندیم زیدی۔ کوارٹر نمبر ۱۵/13 ء 6،
ایچ ایم سی کالونی، ٹیکسلا

صحت و زندگی

صحت مندی کے لئے

اگر آپ صحت مند رہنا چاہتے ہیں تو اپنی غذا پر سب سے زیادہ توجہ دیجیے۔ صحت مند رہنے کے لیے مضر غذاؤں سے پرہیز ہی کافی نہیں ہے۔ صحت مند رہنے کے لیے ایسی غذائیں کھانا بہت ضروری ہے جو صحت بخش ہوں۔ پھل سب سے پہلے آتے ہیں، آٹے کی روٹی اور سبزیاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جہاں تک ممکن ہو ترکاریاں بلا پکائے ہوئے سلاد کی صورت میں استعمال کریں۔ انہیں تھوڑی توجہ سے مزیدار بنایا جا سکتا ہے۔ اس طرح اشتہا کو تحریک بھی پہنچ سکتی ہے۔

مغزیات، خشک میوے بھی اچھی اور طاقت بخش غذائیں ہیں۔

ایسی غذاؤں سے پرہیز و اجتناب کرنا چاہیے جو بہت زیادہ شیریں یا روغن ہوں۔ نشاستے دار غذاؤں کی کثرت بھی صحت کے لیے مضر ہوتی ہے۔ میٹھے کیک، پیسٹری، مربے، چاکلیٹ، چربی دار گوشت اور مٹھائیاں بہت مضر ہیں۔

میدے سے تیار کی ہوئی ہر طرح کی چیزیں، سفید شکر یا چینی بھی صحت کے لیے بے حد مضر ہے۔ اگر آپ صحت مند رہنا چاہتے ہیں تو بے چھنے آٹے کی روٹی، مشین کے بغیر صاف کی ہوئی کھانڈ کھایا کریں۔ مضر صحت مٹھائیوں کے مقابلے میں شہد اور کھجوریں بے حد فائدہ مند ہیں۔ گڑ سفید چینی کی نسبت خوش ذائقہ نہیں ہوتا، لیکن فائدہ یقیناً ہوتا ہے۔ گڑ ہاضمے کو درست کرتا ہے، طاقت بڑھاتا، صاف کرتا اور جسم کو موٹا کرتا ہے۔

کھجور دل اور معدے کو تقویت پہنچاتی، خون پیدا کرتی اور شکایات کو رفع کرتی ہے۔ جسم کو موٹا کرتی ہے۔

شہد سے مٹھاس ہی نہیں حاصل ہوتی، یہ ایک قوت بخش اور بے ضرر غذا ہے۔ اسے آب حیات کہنا مبالغہ نہ ہوگا۔ ہر عمر والوں کے لیے مفید ہے، لیکن بچوں اور بوڑھوں کے لیے اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔

صحت مند رہنے کے لیے کھانے کے اوقات کی پابندی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ کھانے کا ایک وقت مقرر ہونا چاہیے۔ غذا کھانے میں یہ خیال رکھنا چاہیے کہ کوئی غذا کتنی ہی لذیذ اور تقویت بخش ہو اگر اس کی مقدار اور کھانے کے اوقات میں اعتدال ملحوظ نہ رکھا جائے تو یہی نہیں ہوتا کہ جسم کو فائدہ نہیں پہنچتا، الٹا نقصان پہنچتا ہے۔ ہاضمے کی خرابی پیدا ہو کر صحت گرنے لگتی ہے اور طرح طرح کے امراض پیدا ہو کر جسم کی عمارت کو کھوکھلی کر دیتے ہیں۔ اس طرح غذا صحت کا باعث بننے کی بجائے زہر ثابت ہوتی ہے۔ اس لیے صحت مند رہنے کے لیے ضروری ہے کہ غذا کی مقدار اور اوقات کی پابندی کی جائے۔

غلط فہمی

غلط فہمی کی بنا پر لوگ ایک مفید چیز کو ضائع کر دیتے ہیں۔ آپ کو شاید یہ جان کر حیرت ہوگی کہ بھوسی میں بھی نہایت مفید اجزاء ہوتے ہیں۔ اس میں کچھ پروٹین زا اجزائے لحمیہ بھی ہوتے ہیں اور کچھ روغنی اجزاء اور نشاستہ بھی پائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھوسی میں گندھک، فاسفورس، پوٹاشیم، سوڈیم اور دوسرے معدنی نمکیات بھی ملتے ہیں جو ہمارے جسم کے لیے بے حد ضروری ہیں۔ اس میں وٹامنز بھی پائے جاتے ہیں۔ محققین نے انکشاف کیا ہے کہ بھوسی میں پچاس فیصد غذائی اجزاء ہوتے ہیں جو ہضم ہو کر ہمارے جسم کو غذائیت دیتے ہیں۔ باقی پچاس فیصد غذائیت کی استعداد نہیں رکھتے پھر بھی افادیت سے خالی نہیں۔ وہ غیر منہضم اجزاء باقی ہوتے ہیں جو فضلہ بن کر نکل جاتے ہیں اور اپنے ساتھ ہی آنتوں میں تحریک پیدا کر کے ان میں پھنسے ہوئے دوسرے فضلات کو بھی نکال لے جاتے ہیں۔ یہ ایک

...ندہ کا کام دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بیسن کی روٹی یا بیسن سے بنی ہوئی چیزیں کھانے سے قبض ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی اس سے ...ں میں سدے پیدا ہو کر قولنج جیسا درد پیدا ہو جاتا ہے۔

اس لیے ایسے آٹے کی روٹی کھانی چاہیے جس میں سے کم سے کم بھوسی نکالی گئی ہو تاکہ آپ آٹے کے اس مفید جزو سے فائدہ اٹھا سکیں۔

آپ بوڑھے تو نہیں ہو رہے؟

اگر آپ بڑھاپے کی حد میں داخل ہو رہے ہیں تو ضروری ہے کہ اپنے رہنے سہنے کی عادتوں اور اپنے روزمرہ کے طور طریقوں کو بدل کر حالات کے مطابق بنا لیں۔ بدلے ہوئے حالات میں جوش و خروش اور آپ کی سرگرمیاں بھی بدلنی چاہئیں۔ کھانے پینے، محنت مشقت کے ساتھ سیر و تفریح میں بھی اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ زندگی کے اس مرحلہ اس منزل میں پہنچ کر آپ کو چاہیے کہ آپ زندگی کے روزمرہ کے کاموں اور مشاغل میں، سیر و تفریح کے اوقات میں بھی کوئی تناؤ نہ پیدا ہونے دیں۔ آپ اپنے اعصاب کو تناؤ سے جتنا دور رکھیں گے اتنا ہی بہتر ہوگا۔

بڑھاپے میں زیادہ دیر تک محنت مشقت کرنے سے بھی بچنا چاہیے۔ اس لیے کہ اگر آپ ایسا کریں گے اور اپنی طاقت سے زیادہ محنت و مشقت جاری رکھیں گے تو وقت سے پہلے زیادہ بوڑھے ہو جائیں گے اور بہت جلد موت سے ہمکنار ہوں گے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ ساری عملی سرگرمیوں سے کنارہ کش ہو جائیں۔ بڑھاپے میں بھی آپ کو زندگی کی بہت سی چیزوں سے دلچسپی لینا چاہیے اور بہت سے مشاغل سے تحریک حاصل کرنی چاہیے۔

اس عمر میں افسردگی سے خاص طور پر بچنا چاہیے۔ ہر حال میں خود کو خوش رکھنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ ہنسنا اور قہقہے لگانا چاہیے۔ اگر آپ ہنسیں گے، برابر ہنسا کریں گے تو دیر میں بوڑھے ہوں گے۔ زندگی زندہ دلی کا نام ہے۔ مردہ دلی بڑھاپے سے بھی بدتر ہے۔ کسی نے بالکل صحیح کہا ہے — مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں۔

آپ کو جاننا چاہیے

- ایلومینیم کے برتنوں میں پکا ہوا کھانا بے حد مضر صحت ہوتا ہے۔ ان میں کھانا پکانے سے ایلومینیم کے زہریلے اجزا غذا میں شامل ہو جاتے ہیں۔ جب یہ زہر عرصہ تک بار بار جسم میں پہنچتا رہتا ہے تو غیر محسوس صحت پر اثر انداز ہوتا رہتا ہے۔
- برف کے زیادہ استعمال سے معدہ کمزور ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے قوت ہاضمہ میں فتور پیدا ہوتا ہے۔ برف دانتوں کو کمزور کرتی، ان کی جڑوں کو کمزور کر کے پائیوریا کی بنا رکھتی ہے۔ نزلہ و زکام کی تحریک کرتی ہے۔ کھانسی، بلغم، ریح اور درد وغیرہ امراض میں سخت مضر ہے۔
- جن لوگوں کی روزانہ خوراک میں گیہوں کی روٹی، خالص گھی یا مکھن، دودھ، دہی، دہی کی چھاچھ، سبزیاں اور پھل شامل ہوں ان میں طاقت، جرأت، عزم و حوصلہ اور قوت برداشت پیدا ہوتی ہے اور وہ طویل عمر پاتے ہیں۔
- امرود اختلاج قلب کے لیے بہت مفید ہے۔ روزانہ نہار منہ ایک تازہ امرود کھا لیا جائے تو دل کو فرحت حاصل ہوتی ہے اس کے مسلسل استعمال سے اختلاج قلب کی شکایت رفع ہو جاتی ہے امرود دل، دماغ اور معدے کو طاقت دیتا ہے۔
- پانی میں لیموں کے چند قطرے ملا کر پی لینے سے معدہ صاف رہتا ہے۔ موسمی بخار میں لیموں بے حد مفید ہے۔ لیموں کے استعمال سے چہرے کا رنگ نکھر جاتا ہے اور صحت بھی ٹھیک رہتی ہے لیموں کو بجا طور پر جسم کا دھوبی کہا جاتا ہے۔
- جو لوگ کھیرا، ککڑی اور تربوز استعمال کرتے رہتے ہیں۔ پتھری، ریگ مثانہ اور درد گردہ جیسے خوفناک امراض ان کے قریب نہیں آتے۔
- ترش پھل کھانے والے بلڈ پریشر جیسے موذی مرض سے محفوظ رہتے ہیں۔ املی، انار دانہ، سنگترہ، نارنگی، چکوترہ اور ترش دہی، ترش چٹنی اور اچار استعمال کرنا اس مرض سے حفظ ماتقدم کا بہترین ذریعہ ہے۔ بلڈ پریشر میں آملہ اور آملہ کا مربہ مفید ہے۔
- آلو بخارا دل کے لیے بے حد مفید ہے۔ دل کے سارے امراض خفقان اور اختلاج میں فائدہ بخش ہے۔ دل کے لیے مریضوں کو جو قبض میں مبتلا ہوں، آلو بخارا خاص طور پر مفید ہے۔ قبض دور کرتا ہے دل کو بھی تقویت دیتا ہے۔ بدن کی خشکی اور گرمی کو دور کرتا ہے۔ آلو بخارا قے اور متلی کا موثر علاج ہے۔ معدہ کی تیزابیت اور جلن کے لیے مفید ہے۔ اسے کھانے سے سینہ کی جلن دور ہوتی ہے۔ ○

ثریا منیر خان

حسن و آرائش



کہتے ہیں کہ انسان کا چہرہ اس کے دل کا آئینہ ہے مگر ایک عورت کا چہرہ اس کے حسن کا آئینہ ہوتا ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اسے دیکھ کر ایک پل میں یہ محسوس کیا جا سکتا ہے کہ اسے اپنی خوبصورتی کے تحفظ اور اس کی افزائش کا کتنا خیال رہتا ہے۔

بعض نسوانی چہرے صبح کے گلاب کے کھلے ہوئے پھول کی طرح گلابی اور تروتازہ ہوتے ہیں۔ ایک خاتون کا چہرہ بھی صبح ایسا ہی ہے حالانکہ اس وقت ان کی عمر پچاس کے لگ بھگ ہے۔ مجھے ایک عرصے سے جستجو تھی کہ ان کے چہرے کی آب و تاب اور شادابی کا راز کیا ہے کئی مرتبہ میں نے ان سے یہی سوال کر بھی دیا۔ مگر وہ ٹال گئیں۔ آخر میرے بار بار کے اصرار سے تنگ آ کر انہوں نے چند ایسے راز مجھے بتا دیئے جو ان کے چہرے کی سدا بہار خوبصورتی کا سبب ہیں۔

آپ بہنوں نے چہرے کی آرائش اور اس کے حسن کی افزائش کے بارے میں بہت کچھ پڑھا اور سنا ہوگا مگر مجھے ان خاتون سے اس سلسلے میں جو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ یہ اس بنا پر ایک خاص اہمیت ہیں کہ یہ ان کی آزمودہ ہیں اور ان کے کارگر اور مؤثر ہونے کا زندہ ثبوت خاتون کے دلکش چہرے کی آب و تاب اور تازگی ہے۔ اس لئے اس مضمون کو ایک خاص چیز سمجھئے۔

آپ کو شاید یہ خیال گزرا ہو کہ بہن کوئی نایاب اور امریکی مخصوص سازشین یا کریم استعمال کرتی ہوں گی۔ یا پھر انہوں نے وہاں سے کوئی خاص دوا منگوائی ہوگی مگر ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ خاتون اپنے چہرے کی رنگت کو نکھارنے کے لیے محض دیسی چیزیں اور معمولی طریقے استعمال کرتی ہیں۔ لیجئے اب آپ انہیں کی زبانی کارآمد باتیں سنیئے جو آپ تک پہنچانے کے لیے یہ مضمون تحریر کیا گیا۔

"سب سے پہلی بات یہ ہے کہ چہرے کی جلد کو خوش رنگ تازہ رکھنے کے لیے اس کی جانب کبھی کبھار یا تیسرے چوتھے توجہ کرنے سے کام نہیں چلتا۔ ایک وقت تھا جب میں یہی خیال رکھتی تھی مگر تجربے نے اس کو غلط ثابت کر دیا۔ چہرے کی طرف روز بلاناغہ توجہ کرنی چاہیئے۔ اس سے چہرے کا حسن تازگی برقرار رہتا ہے۔

میرا روزانہ معمول یہ ہے کہ رات کو سوتے وقت لیموں کا رس، گلاب کا عرق اور گلیسرین باہم آمیز کر کے چہرے پر ملتی ہوں۔ لیموں کے رس اور عرق گلاب کی مقداریں ہم وزن ہوتی ہیں۔ گلیسرین صرف اتنی ملاتی ہوں کہ جس سے عرق کا مرکب قدرے گاڑھا ہو جائے۔

اسے ملنے کا طریقہ یہ ہے کہ تیل مالش کی طرح نہ ملا جائے بلکہ انگلیوں کی پوروں کے ذریعے کھال کو تھپک تھپک کر اس میں جذب کیا جائے۔ اگر مالش کی جائے گی تو فائدے کے بجائے نقصان ہو جائے گا۔ اسے تھپک تھپک کر لگانے سے یہ کھال کے مسامات کے راستے جلد میں جذب ہوگا جبکہ مالش کرنے سے مسامات مزید کھل جانے سے کھال پھٹ جائے گی۔ مرکب کے جلد میں جذب ہو جانے کا اثر اس شکل میں نمودار ہوگا کہ کھال کو صحیح خوراک ملے گی اور اس کا رنگ گلابی ہو جائے گا جبکہ وہ نرمی اور گداز کے لحاظ سے مخمل جیسی ہو جائے گی۔

بعض مرکب جلد پر لگانے کے کچھ دیر بعد پونچھ دیئے جاتے ہیں مگر یہ مرکب رات بھر چہرے پر لگا رہتا ہے۔ اگلے دن صبح کو میں اسے نیم گرم پانی سے دھو ڈالتی ہوں۔

کیا میرا معمول بس اتنا ہی ہے ــــ جی نہیں۔ میں اپنے چہرے کی جلد کو کسی لمحے بھی ہوا، دھوپ اور گرد و غبار کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑتی۔ صبح کو منہ دھونے کے فوراً بعد میں ایک اور مرکب چہرے پر مل لیتی ہوں۔

دودھ اور روغن بادام سے تیار کیا جاتا ہے۔ تازہ دودھ کو ہلکے ہلکے
(گ)رم کیجیے کے بعد دو چمچے بھر دودھ میں ایک چمچہ روغن
ملاتی ہوں اور اس مرکب کو ہلکے ہاتھ سے سارے چہرے پر
ملتی ہوں۔

مگر اس کا چہرے پر محض پھیلا لینا کافی نہیں، میں اسے انگلیوں
کی تھپکیوں سے جلد کے اندر جذب کرتی ہوں اور جب تک پورا
یہ مرکب جلد کے اندر نہ چلا جائے کھال کو بار بار تھپکتی رہتی ہوں۔

گزشتہ رات جلد کو جو غذا دی گئی ہوتی ہے چونکہ اس کا اثر
صبح تک برقرار رہتا ہے اس لیے یہ روغنی خوراک اسے فراہم
کرتی ہے۔ اس کی خاصیت یہ ہے کہ جلد کے مسامات کے ذریعے
یہ حیات بخش عناصر جلد کو رات پہنچائے گئے ہوتے ہیں یہ ان
اثرات کو نہ صرف یہ کہ ماند نہیں پڑنے دیتی بلکہ ان کو مزید قوت اور
توانائی بخش دیتی ہے جس سے جلد کا رنگ دھیمے گلاب کی پتی
جیسا ہو جاتا ہے اور اس کی بافتوں میں کساوٹ آجاتی ہے۔

اگر کسی بہن کے چہرے پر سن و سال کے اثرات یعنی ادھر
ادھر سے جھریاں یا لکیریں نمودار ہو چکی ہوں یا ہونے ہی ہوں تو انہیں اس
نقص کو دور کرنے کا ایک نسخہ بتاتی ہوں۔ انہیں چاہیے کہ ایک لیموں
کا عرق نکالیں اور اس میں روئی کے پھوہے ڈبو ڈبو کر ان سے کھال کو
...کے ساتھ تھپتھپاتی چلی جائیں۔ یہ عمل رات کو سوتے وقت کرنا چاہیے
لیموں کا عرق چہرے پر رات بھر لگا رہنے دیں، صبح کو نیم گرم پانی سے منہ
دھو ڈالیں۔

اسی طرح اگر چہرے کی جلد کھردری ہو گئی ہے تو اس نقص کو
دور کرنے کی ترکیب یہ ہے کہ سفید کھانڈ یا پسی ہوئی مصری لے کر اسے لیموں کے
عرق میں گھول دیں۔ کھانڈ کی مقدار چائے کا چمچہ بھر ہونی چاہیے۔
لیموں کی تعداد ایک یا دو کافی ہوگی۔ اس مرکب کو چہرے کی جلد پر
ملیں۔ اس سے چہرے پر ایک تہہ سی چڑھ جائے گی جس سے کھال میں
...تناؤ پیدا ہوگا۔ مگر آپ اس عارضی تکلیف کا خیال نہ کریں اور اس
مرکب کو اپنے چہرے پر کچھ دیر تک رہنے دیں پھر گرم پانی سے دھو ڈالیں
اس کے بعد روغن بادام مل کر چہرہ گرم پانی اور صابن سے دھوئیں۔ جلد
کا کھردرا پن اس عمل کے چند مرتبہ دہرانے سے جاتا رہے گا۔

آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ ان سب ترکیبوں کے ذریعے جلد
کو غذا پہنچایا جاتا ہے یعنی اسے چکنا بنایا جاتا ہے مگر بعض بہنوں کی
جلد از خود ضرورت سے زیادہ روغن دار یا چکنی ہوتی ہے۔ اس سے
انہیں یہ نقصان پہنچتا ہے کہ ان کی جلد کے مسامات قدرتی روغن سے
بند ہو جاتے ہیں اور چونکہ وہ مادے جو ان مسامات سے خارج ہو کر جلد کی صحت
کا باعث بنتے ہیں جسم کے اندر رک جاتے ہیں۔ اس لیے ان کے چہروں
پر کیل کہانسے، مہاسے اور دانے نکل آتے ہیں۔ انہیں اپنے چہرے
کو تروتازہ رکھنے کے لیے روغنی مرکبات کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن اس
سے یہ نتیجہ نکال لینا کہ انہیں کلینزنگ لوشنوں یا ڈٹرجنٹ کلینسروں کی بھی
ضرورت ہے۔ چکنی جلد کی صفائی صرف گرم پانی اور عمدہ قسم کے صابن
سے بھی ہو سکتی ہے۔ انہیں چکنی کریمیں ہرگز نہیں لگانی چاہئیں اور
چاکلیٹ، مٹھائی اور روغنی مٹھائیوں سے بھی پرہیز کرنا چاہیے۔ ان بہنوں
کے لیے دھوپ میں بیٹھنا بھی ضروری ہے۔

میری سہیلیوں میں چند لڑکیاں ایسی ہیں کہ انہوں نے اپنے
چہرے کی رنگت نکھارنے اور اس کی جلد کو نرم بنانے کے مختلف
لوشن اور کریمیں استعمال کیں تو ان کا اثر مطلوبہ نتائج کے بالکل برعکس
ہوا۔ اس کی وجہ معلوم کرنا ہر بہن کے لیے ضروری ہے کیونکہ اس امر کا
امکان ہو سکتا ہے کہ ان کے چہرے کی جلد بھی لوشن اور کریم ملنے سے
مزید خراب ہو جائے۔ اس قسم کی جلد حساس جلد کہلاتی ہے۔ آپ نے
دیکھا ہوگا کہ بعض عورتوں کے خواہ کتنی ہی گدگدیاں کی جائیں ان پر کوئی
اثر نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس بعض عورتیں کسی اور کا ہاتھ جسم سے مس
ہوتے ہی اچھل پڑتی ہیں۔ بالکل یہی حال حساس جلد کا بھی ہے۔ جن خواتین
کی جلد کریموں اور لوشنوں کو برداشت نہ کرے انہیں کبھی کبھی پانی ملے
ہوئے کچے دودھ سے منہ دھونا چاہیے۔ اس عمل کے بغیر انہیں اپنے
چہرے پر ایک ایسی چکناہٹ محسوس ہوگی جو قدرے ناگوار گزرے گی۔
اس سے چھٹکارا پانے کے لیے وہ گرم پانی اور صابن سے منہ دھو سکتی ہیں۔

حساس جلد کو تیز دھوپ، ضرورت سے زیادہ حدت، حرارت
اور آگ کی تپش سے بھی بچانا چاہیے اور اگر کبھی مجبوری سے یا اتفاقاً
ان سے سابقہ پڑ جائے تو کچھ دیر بعد ٹھنڈے پانی سے منہ دھو لینا چاہیے۔
سخت گرمی کے دنوں میں دوپہر کے وقت برف کی ٹکی تیلی کاٹی ہوئی
قاشوں کو منہ پر ملنے سے حساس جلد والی عورتوں کو بڑی تسکین اور لذت
محسوس ہوتی ہے اس لیے کبھی کبھی یہ عمل بھی کرنا چاہیے۔ تسکین اور راحت
کا اصل سبب یہ ہوتا ہے کہ ان کی حساس جلد کے اندر موجود تیزابی صفت
مادے برف کی ٹھنڈک سے کچھ دیر کے لیے اپنی کارکردگی بند کر دیتے ہیں۔



رات کے پہر

اس وقت جبکہ میں تمہیں خط لکھ رہی ہوں، آدھی رات گزر چکی ہے — باہر چھوٹی چھوٹی بارش ہو رہی ہے اور کھڑکیوں کے شیشے ٹین پر اس پھوار کی آواز اتنی تیز بھی نہیں ہے جو کمرے میں ٹِک ٹِک کرتی گھڑی کی آواز ہی پر حاوی ہو جائے اور مجھے پل پل اٹھتے ہوئے وقت کے تصور سے آزاد کرے — کب سے سوچ رہی ہوں تمہیں کچھ لکھوں گی — دن مہینوں میں تبدیل ہوئے اور مہینے برس بن گئے — تم بھی بس ایک ہی بے وفا نکلیں — اپنی ساحرہ کو کبھی یاد ہی کیا ہوتا۔

تم سے جدا ہوئی تھی تو تم نے گڑیوں کے گھروندے یہ کہہ کر رکھ لئے تھے کہ مجھے اب اپنے ننھوں ہی کو بہلانے کھلانے سے فرصت نہیں ملے گی — میں بھلا ان گھروندوں کی کہاں حفاظت کر پاؤں گی — سو وہ تو ٹھیک ہی ہوا — میں نے بھی سوچا تھا کہ اپنا گھر جو اپنی چھوٹی سی دُنیا کے لئے مختص تھا، جوں کا توں سجا رہے گا — میں بھی جب کبھی تم سے ملنے آؤں گی اس چھوٹی سی دُنیا کے ہر ایک ساتھی سے پوچھوں گی کہ گھر کے چودہ برس ساتھ گزارنے کے بعد وہ مجھے بھلانے میں کس طرح کامیاب ہو گئے — لیکن اب آؤں بھی تو کس سے بھلا کچھ پوچھ سکوں گی؟ جب تمہی نے یادوں کے دیئے بجھا دیئے ہیں۔

خیر ذکی چھوڑو بھی، میں تو خود کو سبب کر کے تسلی دے لوں گی کہ تم یونیورسٹی ڈگری کورس کے آخری سال میں ہو — تمہیں اپنی کتابوں سے فرصت ہی نہیں ملتی ہو گی ورنہ میری ذکیہ بھلا مجھے بھول سکتی ہے! — دیکھا تم نے — اب میں یادوں کے کھنڈر میں کہاں نکل آئی ہوں — تم مجھے بھول گئیں لیکن میں خود کو جھوٹی تسلیاں دے کر بہلا رہی ہوں — اس فریب کھانے میں کیسا کیسا سکون ملتا ہے۔ آخر دل ملتا ہے — ایسے میں بھلا میں کیسے مان لیتی کہ تم مجھے بھلا بیٹھی ہو — زندگی دشوار جو ہو جاتی پگلی۔

جینے کا قرینہ کوئی ہم بیاہتا عورتوں سے سیکھے — جو اپنا ہے سو اپنا ہی ہے۔ اور جو اپنا نہیں ہے سو بھی اپنا ہی سمجھ بیٹھے ہیں تب ہی تو کہیں گھر بستا ہے۔

سوچتی ہوں ذکی تجھ سے کتنی ہی باتیں کر لوں — پتہ نہیں پھر کبھی وقت ملے نہ ملے۔

باہر بارش تیز ہو گئی ہے اور کھڑکیوں کے ٹین شیڈز پر اس کی آواز مجھے کھرنے لگی ہے کیونکہ کبھی یہ آواز اتنی بری بھی نہیں لگتی —

نیم خوابی کے عالم میں تو جیسے کوئی جلترنگ چھیڑ دیتا ہے اور یہی آواز کانوں میں رس گھولنے لگتی ہے۔ لیکن جانے کیوں یہ آواز بھی اب مجھے نہ بھائی ـــ شاید اس لئے کہ میں جاگ رہی ہوں ـــ ذکی تو نے کبھی یہ بات سوچی ہوگی کہ اکیلے جاگتے رہنے میں، رات کے سناٹے بولنے لگتے ہیں اور جب گھڑی کی ٹک ٹک سے ٹوٹتے ہیں تو مانو یادوں کی کرچیاں کرچیاں سی بکھر جاتی ہیں جنہیں ہم چن بھی نہیں سکتے بس دیکھتے رہ جاتے ہیں ـــ زندگی میں اکیلے جاگتے رہنا کتنا مشکل ہے ـــ خدا کرے جو کبھی تیری سمجھ میں بات آسکے۔

میں تو تجھ سے یہ کہنا چاہتی تھی کہ میرے کمرے کی اس ٹک ٹک کرتی ہوئی گھڑی کو، کوئی خاموش کردے ـــ اور اب، جبکہ مینہ شدید سی بارش کی آواز نے شور مچا کر گھڑی کی اس ٹک ٹک کو میرے کمرے سے نکال دیا ہے تو میں بوکھلائی ہوئی ہوں ـــ حالانکہ وقت ٹھہر نہیں گیا ہے۔ وہ کہاں کسی کا انتظار کرتا ہے ـــ لیکن وہ جو میں نے اپنے سینے کے اندر دل کے نام سے ایک گھڑی چھپا رکھی ہے اس کے چلنے اور بند ہونے تک میں اکیلی ہی جاگتی رہوں گی ـــ گو میں تھک گئی ہوں ـــ واقعی تھک گئی ہوں ذکی۔

اپنی ہستی دوسروں پر نچھاور کرنے میں بھی کیسے کیسے مزے ملتے ہیں ـــ سب کچھ پرایا ہے ـــ یہاں تک کہ اپنا آپ بھی پرایا ہے ـــ میں ذات سے کچھ ہوں ہی نہیں ـــ دوسروں کے لئے سب کچھ ہو جانا اور اپنے لئے کچھ بھی نہ رہنا کوئی اس دھرتی سے سیکھے جس کا سینہ چیر کر بیج بونے پر کونپلیں پھوٹتی ہیں، فصلیں لہلہاتی ہیں ـــ میں بھی بس دھرتی بن گئی ہوں ذکی ـــ روند کر کوئی چلتا ہے تو آواز نہیں کرتی ـــ جھک کر کوئی ماتھا ٹیکتا ہے تو اوپر نہیں اٹھ جاتی۔

لو ـــ ذرا اس ننھے کو تھپک کر سلا دوں، ذرا اس کی آنکھوں میں پھر سے نندیا گھلا دوں تو تم سے باتیں کروں ـــ ابھی ابھی بڑی مشکل سے اس کو سلا سکی تھی ـــ یہ بڑا ضدی ہے۔ مجھے بہت تنگ کرتا ہے رو رو کر خود بھی ہلکان ہوتا ـــ میرا گوشت پوست میرا لہو، میرا سکھ چین، میری نیند غرض کہ میرا آدھا وجود تو بس اس کا ہو کر رہ گیا ہے ـــ گویا میں اپنی بقیہ نصف ہستی دوسروں میں ختم کرتی پھر رہی ہوں ـــ یہ دوسرے بھی کون ہیں ـــ میرے اپنے ہی تو ہیں ـــ میں انہیں دوسرے کیسے کہہ سکتی ہوں ـــ میری عادت بگڑ گیا ہے نا ذکی ـــ اس میں پھر اتنی سمجھ ہے کہ چھوٹے ہاتھوں پر پھیلا دو ہتھیلی ہوتی محبت کو، محسوس کر سکتا ہے تو بہم نہیں ہوتی ـــ بلکہ کبھی کبھی خود بھی اس ننھے ضدی کو پچکار لیتی ہے ـــ یا شاید یہ بھی اس لئے ہے کہ اس نے عورت کا جنم لیا ہے ـــ لیکن اس ننھے سے بچہ بڑا ہے وہ تو بعض وقت بھلا ہے میں میری گود سے ننھے کو کھینچ لیتا ہے ـــ میری نظر بچا کر اس کی ٹھکائی کر دینے سے بھی نہیں چوکتا ـــ خود مجھ پر بھی تو ننھے ننھے ہاتھوں سے ماروں کے پھول برس جاتے ہیں اور میں ان ہاتھوں کو چوم چوم رہ جاتی ہوں ـــ یہ بھی دراصل احتجاج ہے کہ میری وہ محبتیں جس کا یہ ضدی ننھا بلا شرکت غیرے مالک بن بیٹھا ہے اس میں اس کا اپنا بھی تو حق ہے اور میں گویا حقوق کا تحفظ نہیں کر رہی ہوں۔

تمہیں ایک دلچسپ بات سناؤں ـــ شاید تم ہنس پڑو ذکی۔ یہ محبتیں حاصل کرنے میں سبقت لے جانے کی دوڑ شاید آدمی کی فطرت ہے کئی بار تو ایسا بھی ہوا کہ خود وہ مجھ سے خفا ہو گئے ہیں ـــ اس خفگی اور ناراضگی کا سبب جانتی ہو کیا تھا ـــ یہی کہ میں بالکل بچوں کی ہو رہی ہوں اور ان کی طرف توجہ کم کرتی ہوں ـــ گویا وہ بھی اس مقابلے کی دوڑ میں ٹھیا اور منجھلے سے پیچھے نہیں رہنا چاہتے ـــ جب ان کے تیور اس طرح دیکھتی ہوں تو سب کو چھوڑ کر ان کی دلداری کرتی ہوں۔

میں کبھی کبھی سوچتی ہوں ذکی کہ اپنی ہستی کو امڈے ہوئے بادل کی طرح بنا لینا ہی شاید عورت پن ہے ـــ پودوں کو دھوپ جھلس رہی ہو تو سایہ بن گئے اور اگر ان کی جڑیں سوکھ رہی ہوں تو برس پڑے ـــ اب اس برسنے میں یہ تخصیص تو ممکن نہیں تا کہ کس ننھے پودے کی قسمت میں کتنا جل آگیا ہے اور کس تناور درخت کے حصے میں کتنا پانی۔

اب تم کو خط لکھ کر بیٹھ رہوں گی ـــ پتہ نہیں تم جواب دوگی بھی یا نہیں ـــ جو بھی ہو رات کی رات مجھے تمہارے اور اپنے بارے میں سوچ لینے دو ـــ صبح ہوگی تو پھر مجھے فرصت کہاں رہے گی ـــ سورج کی کرنیں میری زندگی میں جاگنے کے ساتھ ساتھ اتنی مصروفیتیں بھی لے آتی ہیں کہ میں مشین بن جاتی ہوں، رات ہوتی ہے اور ننھا ہلکان ہو کے سو جاتا ہے تو پھر رت جگے کوئی گوشت پوست کی عورت میرے وجود میں بیدار ہوتی ہے اور وہی میری بانہہ پکڑ کر مجھے بے وفا تک لے جاتی ہے اور میں تجھ سے میلوں دور رہ کر بھی پہنچ پاکر جب تیرے کمرے میں پہنچتی ہوں تو، تجھ کو معصوم نیند کی آغوش میں ایسی بے شعور ہوتی ہے کہ دل تجھے اٹھانے نہیں دیتا کہ تجھ سے بات کرے ـــ میں گھر بھر میں گھوم پھر کر ایک ایک چیز کو دیکھ کر لوٹ آتی ہوں ـــ کبھی کبھی تو مجھے ایسا محسوس ہوا ہے جیسے ـــ کسی نے ـــ کسی نے مجھے پہچانا نہیں۔ اب یوں بھی ہو جائے تو کیا تعجب ہے ـــ سوچ تو بھلا کیا بیت جاتی ہوگی ـــ سو سو بہانے کر کے بھی کسی کو دل سے نہ نکال سکے ـــ جتنا بھلانا چاہا اتنے ہی مجبور ہوئے ـــ تھک ہار گئے تو پھر بھی

قدموں سے وہاں تک جا پہنچے کہ چلو ذرا دیکھ آئیں ۔۔۔ کہ اس دوشن کے سہارے باقی زندگی بتائیں گے ۔۔۔ اور جب سامنے پہنچے ہیں تو کسی نے اس طرح دیکھا جیسے کہیں دیکھا تھا ۔۔۔ اور ۔۔۔ اور آگے بڑھ گیا ۔ اُف اس کے بعد وہ رہا کوئی آسان بات ہے بھلا ۔۔۔ اسی لئے تو میں تجھ تک آنے سے ڈرتی ہوں ۔۔۔ زندگی کے پہلے نہیں ہوتی جان ۔۔۔ اور پھر میں تو وہ عورت ہوں جو لٹ چکی ہو ۔۔۔ میری اپنی زندگی میری اپنی ہے ہی کہاں ۔۔۔ یہ ننھی تو اس کا مالک ہے ۔ ٹھکانہ کرنے والا یہ یہاں کا مالک ہے ۔ رات کو مٹنے والی بجیا اس کی مالک ہے اور جا سے لئے وہ رات محنت کرنے والے وہ اس کے مالک ہیں ۔۔۔ اپنا کچھ بھی ہے تو اسے لئے بیٹھی ہوں نا ۔۔۔ اور جو کچھ بچ رہا ہے اسے سو سو جتن سے چھپا کر تجھ تک لے آؤں بھی تو وہ اتنا بھی نہیں ہے کہ کسی خالی جھولی کو بھرنے ہی کو پورا کر سکے ۔ سو ایسے میں وہ چیز جو کسی خالی جھولی کے قابل بھی نہیں ہے تیرے خزانے میں بھلا نظر بھی آ سکے گی ؟

ریل گاڑی کی چھک چھک پھر مجھے ستانے لگی ۔۔۔ میں تو ہیں خاموش بیٹھی ۔ بارش تھم چکی ہے ۔ ننھا سو رہا ہے ۔ گھر کا کمرہ جیسے زندگی کی آغوش میں ہے ۔ میرے قدم پھر تیرے آنگن تک مجھے لے آئے ہیں ننھا میری گود میں ہے اور میں بیچ آنگن میں کھڑی سوچ رہی ہوں ۔۔۔ وہ جو کمرہ ہے نا جس کی کھڑکیوں کے ریشمیں پردوں سے سنہری سی روشنیاں چھن چھن کر مجھ تک پہنچ رہی ہیں ۔ اس کمرے میں چپکے سے داخل ہو جاؤں اور تیری بجیا کے پہلو میں ننھے کو سلا کر دبے پاؤں واپس لوٹ آؤں ۔

اور اگر ایسے میں وہ جاگ کر مجھ سے پوچھ لے اس بتا دوں کہ تو میرا چھوٹا کچھ تا ہے ۔۔۔ میں جاتی ہوں ۔۔۔ تیری جاتی ہوں ۔ اسے تو کوئی اپنے بچوں کی خواہش تھی تم اس ننھے ہی کو رکھ لو ۔

اور اگر زندگی تیری بجیا بھی پوچھ بیٹھے کہ بتاؤ کیا قیمت لو گی ؟ کیا کہوں گی ۔۔۔ تو ہی بتا میں کیا کہوں ۔۔۔

میں کہوں گی ۔۔۔ میں کہوں گی ۔۔۔ اپنی آنی ساری کمائی سے کی کمائی میں بجیا کر مجھے شب کو منہ پھیر لو ۔۔۔ میں تھک گئی ہوں ۔۔۔ تھک گئی ہوں جب خدا کا کرم ہو ۔۔۔ تھکن دور ہو تو کسی دن معلوم مجھے امارہ ایسے موڑ پر جہاں سے ملیں نہیں ۔۔۔ ڈھونڈتے میں گر حساب میں الجھی ہوئی رات بہت بیت چکی ہے ۔ ننھا جاگ گیا ۔

۔۔۔ تو اس خط کی رسید مجھے دے گی نا ؟ ۔۔۔ کیونکہ اب میں تجھے پھر کبھی کچھ نہیں لکھوں گی ۔۔۔ یہ خط تیری اپنی مرحوم ساحرہ کا پرسہ بھی ہے ادھر آ ۔۔۔ ذرا اور قریب آ ۔۔۔ اور قریب ۔۔۔ تجھے بتاؤں کل میں نے تیرے بجیا کی تصویر جلا دی ہے ۔۔۔ ہاں ۔۔۔ جلا دی ہے ۔۔۔ بجیا بڑی ہو رہی ہے ۔۔۔ اب میں کہاں اس تصویر کی حفاظت کر سکوں گی ۔۔۔ کہاں کہاں چھپاتی پھروں گی اسے ۔۔۔

چلوں اب ۔۔۔ ہمیشہ تیری اپنی ساحرہ ۔

صحیح حل دوشیزہ ادبی معمہ نمبر ۲۳

نمبر	صحیح حل	کتاب یا رسالہ	مصنف یا مترجم	صفحہ نمبر
۱	مقدور	جنگی قیدی کی ڈائری	بریگیڈیئر منصور الحق	۲۳۲
۲	مخصوص	جوا کام	عزیزہ ذوالفقار	۲۱۹
۳	زمین	حضرت ابو ایوب انصاری	طالب ہاشمی	۱۳۳
۴	یقینی	اندلس میں اجنبی	مستنصر حسین تارڑ	۳۳
۵	چیز	کورے کاغذ	حمیدہ جبیں	۳۰۰
۶	انکار	دو قطرے	سرور جہاں	۳۶۷
۷	خیال	ماہم	زبیدہ خاتون	۴۱۵
۸	رنگ	آیا بسنت سکھی	واجدہ تبسم	۱۲۶
۹	طاقت	ڈھولکرن سیٹھ	طلعت سیف طلعت	۱۳۷
۱۰	فریب	عقیلہ	محمد سعید	۲۹

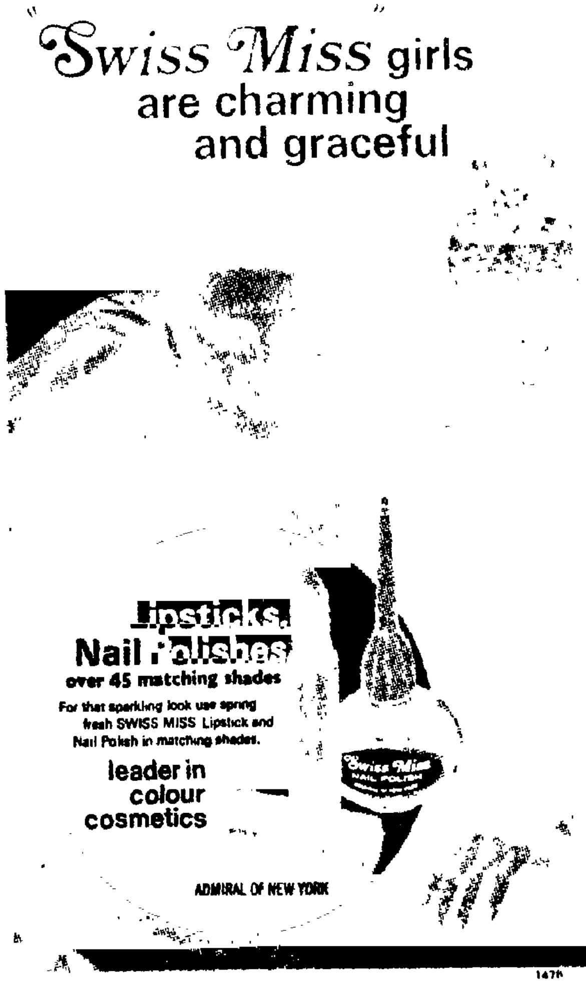
- چھپائی کے کاغذ کی قیمتوں میں زبردست اضافے کے پیشِ نظر انعام پانے والوں کے ناموں کی فہرست شائع نہیں کی جا رہی ہے ۔ اگر اس شمارے کی اشاعت تک آپ کو ایک غلطی اور دو غلطی کے انعامات نہ ملیں تو دفتر کو مطلع فرمائیں ۔
- دوشیزہ ادبی معمہ نمبر ۲۳ کے کوپن کی آخری تاریخ ۳۰ جولائی مقرر کی گئی ہے ۔ اس تاریخ کے بعد کوئی کوپن قابلِ قبول نہ ہوگا ۔
- وفاقی وزارت مذہبی امور حکومت پاکستان کی وضاحت تک ہم دوشیزہ ادبی معموں کو معطل کر رہے ہیں ۔ اگر حکومت نے اسلامی قوانین کے تحت ادبی کاوش کے اس سلسلے کو جائز قرار دے دیا تو دوشیزہ ادبی معمے دوبارہ شان و شوکت کے ساتھ شروع کر دیئے جائیں گے ۔

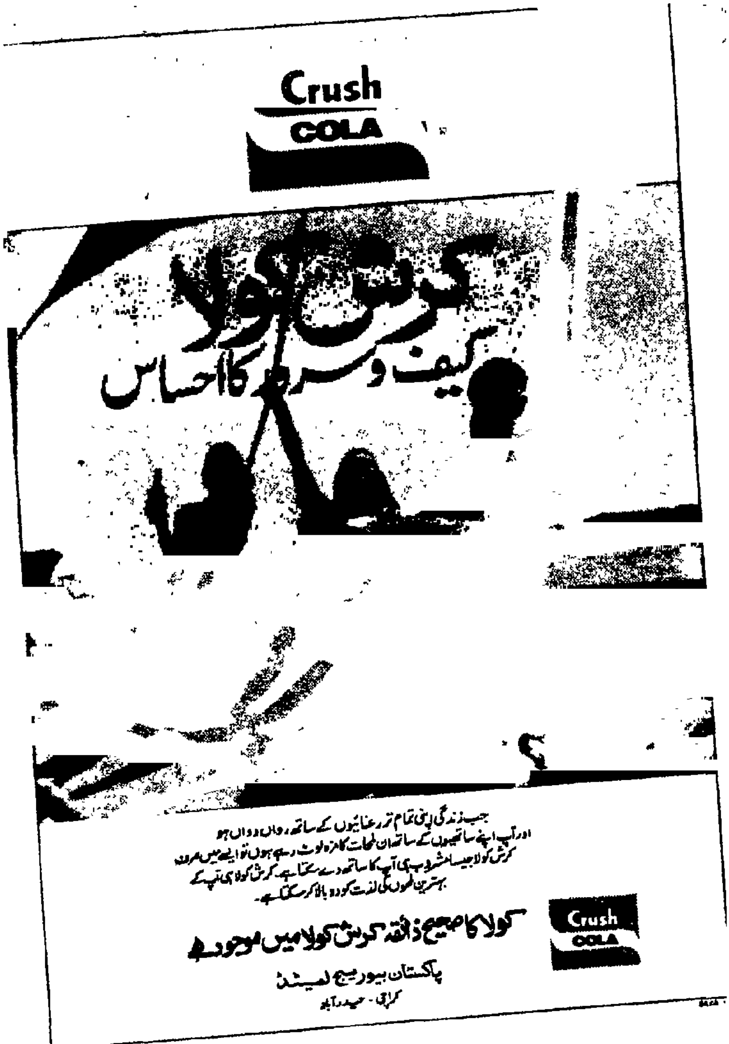
"ادارہ"

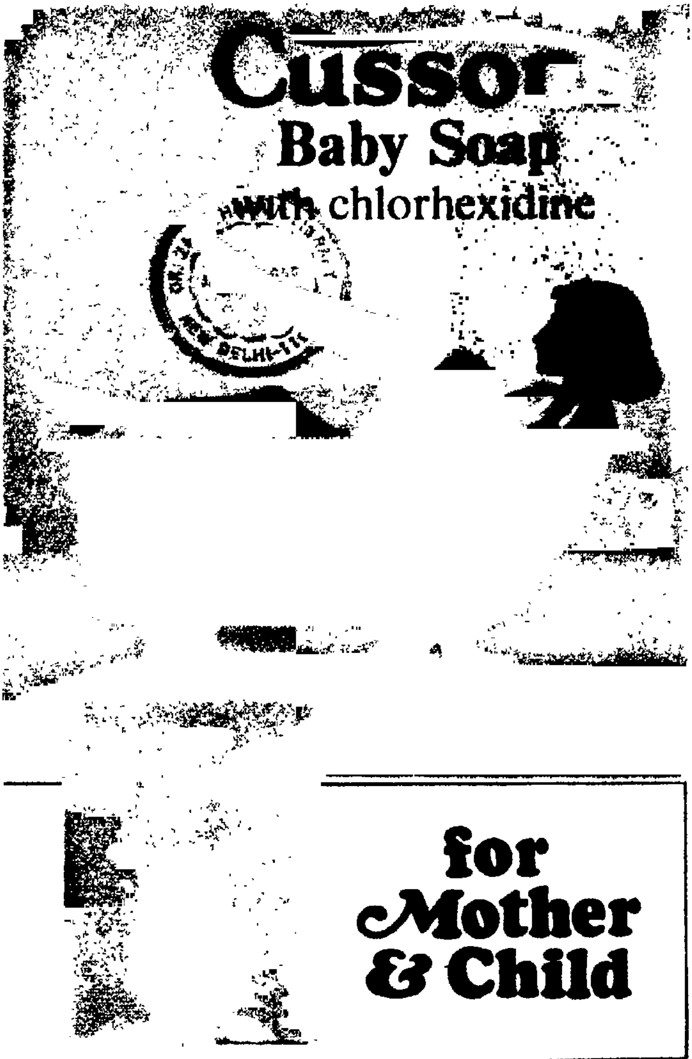
دوشیزہ




آدم جی کے
ملبوسات میں
حسن کچھ اور بھی
بڑھ جاتا ہے
adamjee
آدم جی اینڈ سنز لمیٹڈ
RELINTAS


"Swiss Miss" girls
are charming
and graceful
Lipsticks,
Nail Polishes
over 45 matching shades
For that sparkling look use spring
fresh SWISS MISS Lipstick and
Nail Polish in matching shades.
leader in
colour
cosmetics
Swiss Miss
NAIL POLISH
ADMIRAL OF NEW YORK


Crush
COLA
کرش کولا
کیف و سرور کا احساس
جب زندگی اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ رواں دواں ہو
اور آپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان لمحات کا مزہ لوٹ رہے ہوں تو ایسے میں صرف
کرش کولا جیسا مشروب ہی آپ کا ساتھ دے سکتا ہے۔ کرش کولا ہی آپ کے
بہترین لمحوں کی لذت کو دوبالا کر سکتا ہے۔
کولا کا صحیح ذائقہ کرش کولا میں موجود ہے
Crush
COLA
پاکستان بیوریج لمیٹڈ
کراچی - حیدرآباد


Baby Soap
with chlorhexidine
for
Mother
& Child


آرائشِ لباس کیلئے
پھولوں کی طرح
نرم و نازک
داؤد کی
بسنت
لیمبرک
Terporesina fini
واش اینڈ ویر
۶۵% پولیسٹر
۳۵% کاٹن
داؤد کاٹن ملز لمیٹڈ کراچی



[illegible]

[illegible]

○ [illegible]

○ ریاض مرزا

[illegible]

★

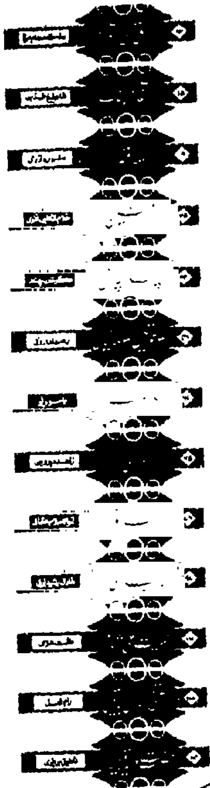
○ [illegible]

○ [illegible]

○ [illegible]

○ [illegible]

○ [illegible]



اگست ۱۹۷۷ء
فون نمبر۔ ۴۳۳۲۴۴

اسٹیج اور ٹی وی کی منفرد اداکارہ پروین اکبر جس کی شگفتہ مزاجی نے پرستاروں کی تعداد بہت جلد بڑھالی ہے۔ پروین تعلیم یافتہ لڑکی ہے۔ اردو کے علاوہ سندھی، پنجابی اور گجراتی پر اسے پورا عبور حاصل ہے

جلد:- ۷ شمارہ: ۸

قیمت :- پانچ روپے
دفتر کا پتہ :- لڈولیکا مینشن ۶۸۹ سی کمرشل ایریا - پی ای سی ایچ ایس کراچی ۲۹
خط و کتابت کا پتہ :- ماہنامہ دوشیزہ - پوسٹ بکس نمبر ۸۰۹۵ - کراچی ۲۹ -
پرنٹر :- حسین ذکری - پاکستان ہیرالڈ پریس کراچی - ٹائیٹل - [illegible]
سید شان احمد نے پاکستان ہیرالڈ پریس کراچی سے چھپوا کر دفتر دوشیزہ
کراچی سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اداریہ

رخسانہ سہام مرزا

حق کی آواز

یہ ہماری انتہائی بدنصیبی ہے کہ ۱۹۷۰ء کے الیکشن کے نتیجے میں قوم کو ایک ایسے وزیراعظم سے پالا پڑا جس نے روٹی، کپڑا اور مکان دینے کا سہانا خواب دکھایا، نفرتوں کو جنم دیا، کارخانہ داروں اور مزدوروں کے درمیان مسلسل جنگ کروائی، علاقائی عصبیت کو ہوا دی، لسانی جھگڑے کھڑے کئے، قانون کی بالادستی ختم کی، اسلام کی دھجیاں اڑائیں، عورت کے تقدس کو پامال کیا، شرافت کو سر بازار عریاں کیا، سرداری اور جاگیرداری نظام اور غیر قانونی صعوبت خانوں کے خاتمے کے دعویدار نے خود ذاتی جیل کھلوا دیئے۔ نااہل لوگوں کی سرپرستی کی، بدمعاشوں کو رہنمائی کے فرائض سونپے، ذاتی اقتدار کے قلعے تیار کئے۔ اپنے تحفظ کے لئے ایف ایس ایف، پیپلز گارڈ اور جانباز فورس جیسی نیم فوجی تنظیمیں کھڑی کیں، اپنے ساتھیوں اور جاں نثاروں کو رسوا کیا، جس کو چاہا گرفتار کر لیا، جس کو چاہا اغوا کر لیا، جہاں چاہا بھیج دیا، جدھر چاہا گولی چلوا دی۔ جب بھی چاہا دستور میں ترمیم کر لی، مصنوعی گرانی پیدا کی، بار بار بحران لاتے گئے، ابلاغ عامہ کے ذریعوں پر صرف اپنا کنٹرول رکھا، ملکی صنعت اور ملکی برآمدات کو تباہ کیا، اچھی بھلی درسگاہوں کو قومی ملکیت میں لے کر تعلیمی معیار پست کر دیا، استعداد اور صلاحیت کو کچل دیا، سیاست کو انتہائی منفعت بخش کاروبار کا درجہ دیا، رشوت اور اقربا پروری کو خوب ہوا دی، پریس کی آزادی سلب کی، سچائی کا منہ بند کیا، آزادیٔ تحریر و تقریر کا حق چھین لیا، صنعتوں کو پھلنے پھولنے سے پہلے قومی تحویل میں لے کر ملک کو کروڑوں روپے کا نقصان پہنچایا۔ جنرک ناموں کا سہارا لے کر گھٹیا ادویات سے بازار بھر دیئے۔ کبھی جی چاہا تو فارن کیپٹل بھیجنے والوں پر انکم ٹیکس ادا کرنے کی پابندی لگا دی اور کبھی جی چاہا تو پابندی اٹھالی، دھان چھڑنے کے کارخانوں پر ہاتھ ڈال کر پرچون اور کباب فروشوں کے کاروبار تک بھی پہنچا دی بندش، زرعی اصلاحات کے نام پر اپنے دوستوں، ساتھیوں اور پارٹی ورکروں کو مالا مال کر دیا، عدلیہ کا وقار خاک میں ملا دیا، تلوار اور تفنگ کی نوک پر اپنے حق میں اداریئے لکھوائے، بلند بانگ دعوؤں میں فراعینِ مصر کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔

غرور اور نخوت کا دعویٰ تھا۔

"یہ کرسی بڑی مضبوط ہے۔"

مضبوط کرسی آخر کہاں گئی — ۹ سو دعوؤں کی طرح ذوالفقار علی بھٹو کا آخری دعویٰ بھی جھوٹا نکلا!

"فراست اور تدبر کے اس پیکر کا اگر ناقدانہ جائزہ لیا جائے تو بھٹو کی ذہانت ۱۲½ سال بگڑے ہوئے بچے کی ذہانت سے زیادہ نظر نہیں آتی جو چوبیس گھنٹے توڑ پھوڑ میں مصروف رہتا ہے۔"

کیا کسی مرحلے پر ذوالفقار علی بھٹو نے بگڑے ہوئے بچے کا رویہ ترک کیا؟ معاشرے میں جس تیزی کے ساتھ ٹوٹ پھوٹ کا عمل جاری تھا، یہ دیکھ کر قوم کے دانا

پر غیر جمہوری روایات کا عمل دخل بڑھتا جا رہا تھا۔ عوام کے نام پر سب سے زیادہ غریب عوام کا استحصال ہوا۔ بے حیائی، بے شرمی اور دہشت گردی کے فروغ میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی تھی۔ خود پسندی اور رعونت کا یہ عالم تھا کہ اس ناپختہ ذہن نے للکارا ـــــ

"کہاں ہے حزبِ اختلاف ـــ؟ سامنے کیوں نہیں آتی۔ ؟!"

جب شرمائی، لجائی حزبِ اختلاف اس مطلق العنان حکمران کے روبرو آئی تو ایک مرتبہ پھر اس گھمنڈ سے بھرے بچے نے بڑے تحقیر آمیز انداز میں عوام سے پوچھا

"ہے ان میں کوئی ایسا لیڈر جو فرانس کے صدر کے ساتھ بیٹھ کر عالمی سیاست پر بات کرسکے ـــ ؟"

فرانس کے صدر کے ساتھ بات کرنے سے پہلے فراست کے بین الاقوامی دعویدار کو خود حزبِ اختلاف سے بات کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اور بقول ان کے سیاست کی ابجد سے ناواقف حزبِ اختلاف نے انھیں انہی کے میدان میں شکست دیدی۔

کامیاب فارن پالیسی کے ڈھنڈورچی کو خود اپنے گھر کی خبر نہیں تھی۔ یہ کتنی حیرت کی بات ہے کہ جب مضبوط کرسی کے دعویدار کو کرسی سے بے دخل کیا گیا تو نہ کہیں گولی چلی اور نہ کوئی چڑیا کا بچہ مرا۔

یہ پانچ جولائی تھی ـــ

۵ جولائی کو ایک سیاہ دور کی تاریکی چھٹ گئی۔ آمریت کا چراغ گل ہو گیا۔ شخصی اقتدار کا سورج ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ سات کروڑ پاکستانیوں کی عزت محفوظ ہو گئی۔

اس خبر نے ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مسرت کی لہر دوڑا دی۔ عوام نے سڑکوں پر بھنگڑا ڈالا۔ ہزاروں من مٹھائی تقسیم ہوئی۔ "جنازے" کو بڑھ چڑھ کر کندھا دیا گیا۔ "تیجے" اور "چہلم" کی تیاریاں شروع ہو گئیں!

شام کو جب جنرل ضیاء الحق کی آواز گونجی، شہر شہر اور دشت و جبل گونجی تو اس ملک کے کروڑوں عوام نے یہی محسوس کیا کہ یہ ضیاء الحق کی آواز نہیں ـــ حق کی آواز ہے! وہ آواز ہے جسے برسوں سے ان کے گلے میں گھونٹا گیا۔ کتنی سادہ، کتنی پرکشش، کتنی واضح اور کتنی اثر انگیز تقریر تھی ـــ نہ اس میں الجھانے والی سیاست تھی اور نہ لفظوں کی جادوگری!

قوم نے آگے بڑھ کر اچانک نمودار ہونے والے اللہ کے اس سپاہی کے ہاتھوں کو بوسہ دیا جس نے اس ملک کو زبردست خونریزی اور خوفناک خانہ جنگی کے منہ سے چھڑا لیا۔ لاکھوں افراد کے قتل کے منصوبے کو خاک میں ملا دیا، ملک کی ماؤں اور بیٹیوں کی آبرو کو لٹنے سے بچا لیا۔

میں اپنی قوم سے پوچھتی ہوں

جس شخص نے ایک صحیح وقت پر صحیح فیصلہ کیا ـــ کیا اس نجات دہندہ کو ہم محسن الملک نہیں کہہ سکتے؟

قوم کے جواب دینے سے پہلے مسٹر بھٹو کے ایک دیرینہ ساتھی "کرم فرما" ہمدرد، مدارا اور عقیدت مند نے مجھے "خوشۂ گندم" دکھاتے ہوئے ایک سوال پوچھا ہے۔

"میں اپنے کارناموں کا دفتر آپ کے سامنے نہیں کھولوں گا۔ مسٹر بھٹو کے کارناموں کے آگے میرے سارے کارنامے ہیچ ہیں۔ ذرا غور کیجئے ـــ بھٹو کی اصلاحات، ترقی پسند پالیسیوں اور لافانی کارناموں سے آپ لوگ تنگ نہ آتے تو کیا نظام مصطفےٰ کے قیام کے لئے اپنے آپ کو متحد کر سکتے تھے ـــ؟ حق کی آواز آپ کی روحوں کو گرما سکتی تھی ـــ؟ دلوں کو برما سکتی تھی ـــ؟؟

بتایئے میں اس شیطان کو کیا جواب دوں؟

آغازِ جنگ

شاہ بلیغ الدین

قادسیہ عراق عرب کا مشہور شہر تھا۔ اس کے ایک طرف شاہ پور کی خندق تھی، دوسری طرف ل شہور نہر عتیق۔ بیچ میں آبادی۔ جگہ بڑی سرسبز و شاداب تھی اور وستحکم! اسے ز۔ نہ جاہلیت ہی سے فارس کا دروازہ سمجھا جاتا تھا۔ سلمان اور عجمی آمنے سامنے تھے لیکن درمیان میں نہر تھی۔ حضرت وکرکے واپس گئے تو رستم نے مسلمانوں کے سپہ سالار سے کہلوایا ے معرکے میں مسلمان دریائے فرات کے اس پار گئے تھے تو دشمن سے پیچ کھیلا اور اتنا موقع بھی نہ دیا کہ فوج میدان میں پہنچ کر باتی

ن اب پھر اس غلطی کو کیسے دہراتے۔

۔ رستم نے دیکھا کہ سعدؓ اس چال میں نہیں آئیں گے تو حکم دیا ایک حصہ پاٹ دیا جائے۔

ں رات یہ کام ہوا اور دوسرے دن دوپہر ہوتے ہوتے عجمی فوج نہر نے بڑی ترتیب سے اپنی فوج کو آراستہ کیا۔ آگے پیچھے تیرہ لشکر کے درمیانی حصے میں ہاتھیوں کا قلعہ بنا دیا گیا۔ بیچ میں شاپوری ا لشکر کے دائیں اور بائیں حصے کے پیچھے بھی ہاتھیوں کا پہرا تھا۔ ان ، اور نیزہ بازوں کے ساتھ ساتھ ہتھیاروں سے بھرے ہوئے صندق ۔ قلب لشکر میں ایک زرنگار تخت بچھا، پر سونے چاندی کا چتر نے تھا۔ رستم اس پر بادشاہوں کی طرح بڑی شان سے بیٹھا تھا۔ ے پاس نامی گرامی سردار اور خاص دستے کے سوار اور سپاہی تھے۔ میں پہنے، سر پہ خود رکھے کئی طرح کے ہتھیار سجائے جنگ کا نقشہ بنانا ی ہدایتوں کے بعد بولا۔

آج ہم ان مٹھی بھر عربوں کو پیس کر رکھ دیں گے!"

بہ غلط ایک لاکھ بیس ہزار کا لشکر جرار تھا۔ ساز و سامان سے لیس رسے بے فکر اپنے وسائل پہ مطمئن۔ دوسری طرف مسلمان تھے ـــــ کل با ہر! جو کچھ ساز و سامان جمع ہو تا گیا تھا ساتھ تھا۔ رسد کے لیے اللہ ا۔ سب سے بڑی فکر کی بات یہ تھی کہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سپہ سالار ے اور اس قابل نہ تھے کہ دو قدم بھی چل سکتے لیکن اللہ کے سپاہی ان ساری باتوں سے بے نیاز تھے۔

حضرت سعد میدان جنگ کے پاس ہی ایک بالاخانے پر تکیے کے سہارے بیٹھ گئے۔ خالد بن عرفطہ کو اپنا نائب مقرر کیا اور اپنے سالاروں کو خطاب کر کے کہا کہ......

کر۔۔۔نہ کہ میں خلاف آجاؤں؟ حضرت سعدؓ نے جواب دیا کہ تم خود کیوں نہیں آجاتے۔

"میں میدان جنگ پر نظر رکھ کر خالد کو یہاں سے ہدایتیں دیتا رہوں گا۔ قرآن پر عمل کرنا۔ یاد رکھو! اللہ کی ذات برحق ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس کا کیا ہوا وعدہ کبھی غلط نہیں ہوتا۔ ہمیں سلطنت عجم کی فتح کی بشارت دی گئی ہے۔ پھر کہا کہ عرب کے شاعر، خطیب اور آتش نوا ذرا اپنے بھائی بندوں سے مل آئیں۔ دیکھیں ان کا حوصلہ کیسا ہے۔

یہ سن کر مغیرہ بن شعبہ، عاصم بن عمرو، طلیحہ بن خویلد، عمرو بن معدی کرب، ربعی بن عامر، قیس بن ہبیرہ، ہذیل اسعدی چند ایک اور ساتھیوں کے ساتھ اسلامی لشکر میں گھوم آئے۔ رجز پڑھتے، بڑھاوے دیتے، نعرے لگاتے۔ ان کی زبانوں سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ ہمت کے مینارے بلند کرتا گیا۔

ہذیل اسعدی نے کہا کہ ـــــ

"مسلمانو! تلواروں کو اپنا قلعہ بناؤ۔ بپھرے ہوئے شیر کی طرح دشمن پر جھپٹو۔ چیتے کی طرح وار خالی دو، گرہ کی زرہ پہن لو۔ اللہ پر بھروسہ کرو اور نگاہیں نیچی رکھو۔ جب تلواریں جواب دے جائیں تو سنان و تیر کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دو کر یقیناً کامیابی سے جبلت نبلہ ممکن نہ دیں گی!"

عاصم بولے ـــــ

"تم خدا کے نام لیوا ہو اور وہ مشرک۔ تمھیں شہادت کی آرزو ہے اور انھیں دنیا کی تمنا۔ جنت تمھاری کنیز ہے۔ آخرت پر نظر رکھو اور خدا کے نام پر آگے بڑھو۔"

کون تھا جس کا دل ان فقروں کو سن کر بڑھ نہ جاتا۔ مسلمانوں نے عہد کیا کہ فتح یا موت! اس کے سوا ہمیں کوئی اور صورت قبول نہیں!

اتنے میں حضرت سعدؓ کی طرف سے اعلا

"دوسری تکبیر سنو تو ہتھیار ٹھیک کرا

درست کر کے ہتھیار تول لینا اور پوری تکبیر پر حملہ کر دینا۔"

اس کے بعد اشارہ ہوا کہ لشکر کے قاری آگے بڑھیں۔ اب سورۂ جہاد کی تلاوت شروع ہوئی۔ میدانِ جنگ، دشمن کا سامنا اور خدا کا کلام۔ تاثیر سے اللہ والوں کے دل ایسے گداز ہوئے کہ اپنے مقصد کے سوا کسی کو کوئی بات یاد ہی نہ رہی۔ ہر ایک کے دل میں ایک ہی خیال تھا۔

اے دردِ یہ چٹکیاں کہاں تک
اٹھ اور جگر کے پار ہو جا

عجمی لشکر کا کیا پوچھنا! انتقام کا لاوا کب کا پک رہا تھا۔ طبلِ جنگ پر چوٹ پڑی تھی کہ اُدھر آتش فشاں پہاڑ پھٹ پڑا۔ کچھ سوار اپنی اپنی صفوں سے نکل آئے اور مقابلے کے لیے اللہ کے سپاہیوں کو للکارنے لگے۔ پہلے تو ہرمز آگے بڑھا جو شاہانِ بابل کے خاندان سے تھا۔ سر پر تاج، بدن پر دیبا کی قبا۔ چار آئینہ سجے ہتھیار چمکاتا وہ اس طرح اپنی صف سے نکلا جیسے پتھر سے شرارہ اٹھتا ہے۔ اِدھر سے غالب بن عبداللہ الاسعدی سینہ تانے بازو پھیلائے نعرہ بر لب نکلے۔ پلک جھپکتے میں تلواریں میان سے نکلیں اور باز کی طرح بہادر ایک دوسرے پر جھپٹے۔ اِس نے چاہا کہ اُس کی ترکی تمام ہو۔ اُس نے سوچا اس کی گردن ناپوں۔ داؤ گھات میں پکے تول کے ہاتھ اٹھاتے ناپ ناپ کے قدم اٹھاتے دونوں ایک دوسرے پر ہاتھ مارے جا رہے تھے کہ یکبارگی اسلامی لشکر سے اللہ اکبر کا نعرہ بلند ہوا اور فریقین نے دیکھا کہ غالب شیرِ ببر کی طرح اپنے شکار کو دبوچے بیٹھے ہیں۔ دشمن بیکل ہو گیا تو غالب اس کی گردن پکڑ کر اسلامی لشکر میں لے آئے۔

حریفوں کا میدان سے ہٹنا تھا کہ عجمی صف سے گھوڑا دوڑاتا ایک اور شہسوار نکلا۔ اللہ والوں کی فوج سے عاصم بڑھے۔ چشم زدن میں ایک دوسرے کو اپنے ہاتھ دکھانے لگے۔ نیزے کبھی علم ہوتے کبھی ٹوٹے کبھی ترچھے۔ کوئی کسی کے ہاتھ سے نیزہ نکالنا چاہتا کوئی ہاتھ سے نیزہ نکلنے نہ دیتا۔ بہادر نیزے پر نیزہ روکتے یا سپر بڑھا آڑ لیتے اور دشمن کا وار خالی دیتے۔ عاصم دشمن کے وار دیکھتے، گھات لیتے کبھی اِدھر کبھی اُدھر جھپٹ رہے تھے کہ دیکھا ان کا ایک وار دشمن نے بھی ڈھال پر لے لیا۔ عاصم کو دُور کی سُوجھی۔ نیزے کو داہنے ہاتھ سے اور زور سے پھرتی سے بائیں ہاتھ سے تلوار سونتی اور دشمن پر جھونک دی۔ ایک آفت سے تو وہ مر مر کے جی رہا تھا یہ نئی مار جو پڑی تو حریف کی سٹی گم ہو گئی۔ وہ میدان سے دم دبا کر بھاگا۔ عاصم کہاں اسے جانے دیتے۔ خرگوش کی طرح بھگا بھگا اس کی صفوں سے پکڑ لائے۔ ایک بار پھر صفِ مردانِ خدا سے اللہ اکبر کا وِرد گونجا اور مسلمان پھر —— وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ —— کا وِرد کرنے لگے۔

سعدی کو جب اسلامی لشکر کو ابھارتے رجز پڑھتے پھر رہے تھے کہ ایک مثال ایرانی تیر انداز اپنی کمان لیے آگے بڑھا۔ دیکھا وہ اپنی صفوں سے بہت آگے نکلے ہوئے ہیں تو چٹکی میں تیر سے کمان پر چڑھا۔ پیکان سنسناتا ہو کر جسم میں گڑ گیا۔ سعدی کو جب خشخشے سے کچھ ہوئے۔ پلٹے اور شیر کی طرح اس کے تن میں کمربند میں ہاتھ ڈال کر اسے اٹھا لیا اور سر سے اونچا گھما کر وہ پانی بھی نہ مانگ سکا۔ پھر ایرانی صفوں کی طرف بڑھتے ہوئے یوں للکارتے ہیں شیرانِ حق!

پھر حملہ تھا کہ فوجیں ایک دوسرے سے گتھ گئیں۔ وہ خونریزی کہ قادسیہ کی فضائیں تھرا اٹھیں۔ مسلمان پہاڑ کی طرح جمے تھے عجمی کا سیلاب آ آ کر ان سے ٹکراتا رہا لیکن جو خود بڑھ کر موت کو گلے لگانے تھے انھیں کس بات کی پروا تھی؟

آج جریر بن عبداللہ اپنے قبیلے کو لیے بے دھڑک بڑھ رہے تھے۔ انھوں نے دیکھا یہ دستہ نگینوں پر حاوی ہوا جاتا ہے تو حکم دیا کہ —— "ان پر اِدھر سے یورش کرو!"

تیرہ ہاتھیوں کا ایک دستہ آگے بڑھایا گیا۔ یہ موت کے سیاہ بادل تھے جو اُمڈے آ رہے تھے۔ مسلمانوں کے گھوڑے دہشت زدہ ہو گئے اور سواروں کو پھینک کر بھاگے۔ بہادر ہاتھیوں کے پیروں تلے روندے جا رہے تھے کہ حضرت سعد نے عاصم بن عمرو کو پیام بھیجا کہ —— "قبیلہ بنو تمیم کے بہادرو! تم اونٹوں اور گھوڑوں والے مشہور ہو۔ ان ہاتھیوں کا بھی تمہارے پاس کوئی علاج ہے؟"

عاصم نے کہا "ہاں! کیوں نہیں! لیجیے میں ابھی انھیں نرغے میں لیے لیتا ہوں۔"

فوراً انھوں نے اپنے بہترین نیزہ بازوں اور تیر اندازوں کو ایک جگہ جمع کیا اور پکار کر کہا کہ —— "ہاتھیوں کو زد میں لو! ہودج کے سواروں کو تاکو! خبردار ان میں کوئی بچ کر نہ جانے پائے۔"

حکم کی دیر تھی کہ اولوں کی طرح نیزے برسے، ہودجوں اور عماریوں پر جا گرے۔ ابھی یہ باڑھ نشانوں پر بیٹھی ہی تھی کہ دوسری باڑھ چلی۔ ساون کی بوندوں کی طرح تیروں کی بوچھار ہاتھیوں کی آنکھوں پر برسی۔ قیامت کی چنگھاڑیں بلند ہوئیں اور ہاتھی اپنے سواروں کو گرا کر میدانِ جنگ سے بھاگے۔

دن گیا رات آئی پھر بھی لڑائی جاری رہی۔ دشمن یلغار پر یلغار کرتا رہا، لیکن مسلمان بھی سر دھڑ کی بازی لگائے رہے۔ ایک پہر رات گزری تو لشکر پیچھے ہٹے۔ میدان خالی ہوا تو زخمی اور شہید میدانِ جنگ سے اٹھائے جانے لگے اور معرکہ آرا اپنے اپنے ہتھیار صیقل کرنے لگے کہ انھیں پھر لڑائی کی آنچ میں دن گزارنا ہے۔


کامیابی کے دوش پر
PIA



ایک مطلق العنان بوالہوس ملکہ کی کہانی
جس نے نصف صدی چین پر حکومت کی
اس کے دورِ حکومت کی تاریخ کا ہر ورق جنسی
آلودگی سے لتھڑا ہوا ہے۔ آتشِ نفس کو بجھانے کے
لیے ایسے ایسے کھیل کھیلے کہ عقل دنگ رہ گئی۔

چین ایشیا کا سب سے بڑا ملک اور دنیا کی قدیم ترین تہذیب کا گہوارہ ہے۔

مختلف ادوار میں اس پر مختلف خاندانوں نے حکومت کی اور دو ہزار قبل مسیح سے بیسویں صدی کے آغاز تک سیا، شنگ، چو، چن، ہنگ



منگول، منگ اور مانچو خاندان اس پر حکمراں رہے یہاں تک کہ ۱۹۱۰ میں مانچو خاندان کے خاتمہ کے ساتھ چین سے شاہی نظام حکومت ختم ہو گیا اور اشتراکی غلبہ کا آغاز ہوا، مگر قمر اسی دور کی شخصیت تھی۔

صبح کا وقت تھا۔ آفتاب بلند ہو چکا تھا۔ اس کی زردیں کرنوں میں خاصی حدت پیدا ہو گئی تھی۔ یہ وہ وقت تھا کہ جب تمام لڑکیاں اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جاتی تھیں اور اس وقت بھی قبیلے کی لڑکیاں جا چکی تھیں مگر وہ جس طرح تصورات میں گم تھی اسی طرح سوچوں میں منہمک کھڑی تھی۔ پتلی کمر، دراز قد، گداز بازوؤں کے درمیان ابھرا ہوا شباب، چمکیلے گھنے دراز گیسو، جھیل جیسی گہری ذہین آنکھیں اور روشن روشن بڑی ہی جاذب نظر شخصیت، چینی حسن سے جداگانہ انداز کا متحیر کر دینے والا حسن۔ یہ تھی یہونالہ۔ اس کا خاندان شاہی خاندان مانچو سے وابستہ تھا اور اس کے قبیلے کے متعدد افراد شاہی محافظ دستے میں ملازم تھے۔ باپ کی بے وقت موت کے بعد یہونالہ اپنے چچا کے گھر پرورش پا رہی تھی جہاں اس کی چچازاد بہن اور بھائی ساکوتہ اور جنگ لو اس کے ساتھی و رفیق تھے۔ شاہی خاندان کے حکم کے مطابق اس قبیلے کی لڑکیوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت اس انداز پر کی جاتی تھی کہ وہ آگے چل کر شہنشاہ چین

کے محل میں شاہی کنیزیں بن سکیں۔ چینی دستور کے مطابق محل کی تمام
کنیزیں بظاہر ملکہ معظمہ کی خادمائیں ہوتیں مگر انہیں شہنشاہ اور
شہزادوں کی خدمت بھی کرنی پڑتی تھی جو جتنی زیادہ حسین ہوتی اسے
اتنا ہی شہنشاہ کی خدمت کا موقع دیا جاتا اور جو بیٹا پیدا کر دیتی اس
کا مستقبل ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جاتا اسی لیے شاہی محل میں انہیں
بڑا اثر حاصل ہوتا لہٰذا ایک طرف اگر والدین یہ تمنا کرتے کہ ان کی بیٹی
بہترین پرورش کے بعد محل میں بلند مرتبہ پائے تو دوسری طرف
ہر لڑکی کی آرزو ہوتی کہ وہ محل میں جاتے ہی شہنشاہ کی منظورِ نظر بن
جائے۔ شاہی مانچو خاندان سے وابستہ اس قبیلے میں ساکوتہ اور ہیونالہ
دونوں عم زاد بہنیں بھی اس خواہش سے بے نیاز نہ تھیں۔ ان کی
پرورش بالکل چینی انداز کے برعکس ہوتی تھی۔ ان کے نہ بال تراشے
گئے تھے نہ پیروں کو لوہے کے جوتوں سے کسا گیا تھا بلکہ ان کی
تعلیم و تربیت کا انداز ادر تھا اور انہیں قدم قدم پر احساس دلایا گیا
تھا ان کی منزل فرزندِ آسمان سین فینگ کا محل ہے اور وہ یہ
سنتے سنتے جوان ہو گئی تھیں جہاں وہ قبیلے کی تمام لڑکیوں سے
مختلف حسن و انداز کی مالک تھیں۔ وہاں ان کے اندازِ فکر میں زبردست
فرق تھا ساکوتہ جھکی جھکی آنکھوں اور ہر دم تمتماتے رخساروں والی
یہ لڑکی ہر وقت خود کو فرزندِ آسمان سین فینگ کی کنیز تصور کرتی
مگر اس سے کہیں زیادہ حسین و ذہین ہیونالہ کنیز کے مرتبہ سے
بہت آگے سوچنے کی عادی تھی۔ وہ جب بھی تنہا ہوتی اس کا تصور
اسے ملکہ کے روپ میں لے آتا...... سرزمینِ چین کی عظیم ملکہ
..... اور آج بھی وہ چشم تصور سے خود کو اسی روپ میں دیکھ رہی
تھی اسے اپنے حسن اور جنسی کشش سے زیادہ اس بات کا احساس
تھا کہ اس کی فراست و ذہانت میں شاعری و اداکاری کا وہ عنصر
شامل تھا جو نہ صرف قبیلے ہی کی نہیں بلکہ ملک کی عورتوں میں بھی مفقود
ا۔ وہ جانتی تھی کہ سیاسی بصیرت اور معاملاتِ حکومت میں کوئی
رت اس کی ہم پلہ نہیں ہے جس فہم و ذکا کی توقع شاہی کنیزوں
ہ نہ کی جاسکتی تھی وہ اس میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔ ہیونالہ مستقبل
مین تصورات میں اس درجہ گم تھی کہ اسے علم نہ ہوا کہ اس کا عم زاد
لو اسے کب سے والہانہ انداز میں کھڑا ہوا تک رہا ہے جو
سے اس کی الفت کا شکار نہ تھا شیدا تھا جس کے ساتھ کھیلتے

ہم سے اس کا بچپن گزرا تھا جو ان دنوں شاہی محافظ دستہ
اور دربار میں اپنے نام سے پہچانا جاتا تھا۔ اور جب بھی
فرائض سے چھٹی ملتی وہ ہیونالہ کے قرب میں وقت گزارنا
کا اعزاز سمجھتا۔ جنگ لو چند منٹ محبت سے اسے تکنے
چپکے چپکے عقب سے آگے بڑھا اور اپنا مضبوط ہاتھ اس کی
پر رکھ دیا۔ ایک دم ہیونالہ کا تصور ٹوٹ گیا۔ چند ساعت
منتشر خیالات کا سامنا کرتی رہی ملکہ کا احساس مٹ گیا تھا اور
ایک سولہ سالہ حسین لڑکی تھی جسے اس کا محبوب چھیڑنے کی غرض
آیا تھا۔ اس نے اپنے خوبصورت ہاتھ اس کے مضبوط ہاتھوں
دیئے اور بولی۔

"جنگ لو"۔ یہ سن کر جنگ لو ہنستے ہوئے سامنے آگیا اور
کے گداز شانے تھام کر بولا۔

"تم نے کیسے پہچانا؟"

"یہ بات تم بار بار پوچھتے ہو۔" ہیونالہ قدرے شاکی
انداز میں بولی۔ "اور میں تمہیں ہر بار بتاتی ہوں کہ پہچانا اسے جاتا ہے
جو ذہن سے محو ہو جائے اور تم تو ہر دم میرے ساتھ رہتے ہو۔"

"اچھا۔" جنگ لو خاموشی سے جھوم گیا۔ "دراصل میں ہر بار
یہی بات سننا چاہتا ہوں۔ اچھا ایک بات بتاؤ کیا اس وقت بھی میرے
ہی بارے میں سوچ رہی تھیں؟"

"نہیں۔" ہیونالہ نے صفائی سے کہا۔ "میں چشم تصور سے اس
دن کا نظارہ کر رہی تھی جب اس سرزمین پر میری حکومت ہوگی۔"

"اوہ ہیونالہ۔" جنگ لو نے پیار سے کہا۔ "تصوراتی زندگی
چھوڑو میں تمہیں ملکہ دیکھنا نہیں چاہتا تم صرف ہیونالہ ہو اور میری ہو۔"

"مگر میری منزل شاہی محل ہے۔" ہیونالہ مسکرائی۔ "مجھے بہرحال
وہاں جانا ہے جس سے تمہارا اعزاز بھی بڑھ جائے گا۔"

"مگر میں تم سے محبت کرتا ہوں۔" جنگ لو نے یاد دلایا۔
"اور پھر مجھے کسی ایسے اعزاز کی ضرورت نہیں جو ہمارے درمیان دیوار
بن جائے۔"

"ٹھیک ہے۔" ہیونالہ اطمینان سے بولی۔ "شاہی زندگی
ہماری محبت میں رکاوٹ نہیں بنے گی۔"

"اس وقت اگر تم ملکہ نہیں صرف کنیز رہیں۔" جنگ لو نے

نرمی سے کہا "لیکن اگر تم ملکہ بن گئیں تو تمہارا جنگ رُمر بھر تمہیں دُور سے دیکھتا اور سلام کرتا رہے گا اس لیے تمہاری یہی حیثیت بہتر ہے۔ تمہارا یہ قرب کافی ہے۔"

پھر دیر تک جنگ لو اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھامے پیار بھری سرگوشیاں کرتا رہا۔ وہ اسے وہی بات سمجھا رہا تھا جو اس سے قبل بھی متعدد بار سمجھا چکا تھا مگر سب کچھ سننے کے بعد یہونالہ نے اپنا سر اس کے شانہ پر ٹیک دیا اور بولی۔

"جنگ لو۔ سنو۔ یہونالا فیصلہ کر چکی ہے کہ جیسے بھی ممکن ہو وہ شہنشاہ کی خواب گاہ سے اس کے تخت تک ضرور جائے گی۔ اور اس کا قرب تمہیں ہمیشہ حاصل رہے گا ملکہ بننے سے قبل بھی اور ملکہ بننے کے بعد بھی یہ اس کا وعدہ تو یاد رکھے۔"

۱۸۵۱ء میں دستور کے مطابق باپ کا سوگ منانے کے بعد اٹھائیس سالہ ولیعہد سین فینگ تخت نشین ہوا تو سب سے پہلے نئے شہنشاہ کے لیے کنیزوں کا انتخاب ہونا تھا لہٰذا مانچو خاندان کے تمام قبائل کی کنواری لڑکیوں کو جمع کیا گیا جن میں سے حسین ترین ستر دوشیزائیں نوجوان شہنشاہ اور ملکہ معظمہ (شہنشاہ کی ماں) کے روبرو پیش کی گئیں ان میں ساکوتہ اور یہونالہ بھی شامل تھیں۔ صبح کا وقت تھا بلند ہوتے آفتاب کی روشنی شاہی محل کے بلند کنگروں پر نثار ہو رہی تھی۔ یہ طویل و عریض بلند و بالا عمارت شہنشاہوں کی رہائش کے لیے مخصوص تھی جو کسی ایک حکمراں کی تعمیر کردہ نہیں بلکہ ہر دور میں ہر خاندان کے حکمراں نے اس میں خوبصورت تبدیلیاں کی تھیں اور عیش و عشرت سکون و آرام کے وہ اسباب مہیا کیے تھے جنہیں دیکھ کر عقل انسانی حیران رہ جاتی۔ اس وقت دیوانِ خاص میں نوجوان شہنشاہ سین فینگ ریشمیں لباس میں ملبوس تکیہ سے ٹیک لگائے ہوئے بیٹھا تھا اس کے قریب ہی ایک قیمتی نشست پر ملکہ بیگم تشریف فرما تھیں ایک طرف عجیب و غریب طرز کی خوبصورت پالکی اس بات کی علامت تھی کہ ملکہ بیگم محل کے زنانہ حصے سے ابھی ابھی تشریف لائی ہیں۔ غلام دست بستہ کھڑے تھے اور خواجہ سرا نظر فرش رکھے جیسے حکم کے منتظر تھے۔ چند لمحے سکوت کی نذر ہو گئے آخر ملکہ بیگم نے سین فینگ کو شفقت سے دیکھا اور بولی۔

"ہم تمہارے لیے صرف ان لڑکیوں کا انتخاب کرنا چاہتے ہیں جو حسین ہونے کے علاوہ صحت مند بھی ہوں تاکہ تم کسی مرض کا شکار نہ ہو جاؤ۔"

"مگر آپ کو کیسے علم ہوگا کہ وہ تندرست ہیں؟" شہنشاہ سین فینگ نے دھیرے سے سوال کیا۔

"اوّل تو ہم آج تک لڑکیوں کے انتخاب میں ناکام نہیں ہوئے دوسرے اس مرتبہ ہم نے این تی ہائی کو طلب کیا ہے تم تو جانتے ہو کہ وہ ایک ماہر طبیب عالم اور ایسا معالج ہے کہ چنگ کور (چین) میں ایسا دوسرا پیدا نہیں ہوا۔" یہ سن کر شہنشاہ سین فینگ جھینپ سا گیا۔ این تی ہائی شاہی طبیب ہی نہیں اس کا راز دار بھی تھا جو آئے دن اسے مقوی و محرک اور شباب آور ادویات بنا کر دیتا تھا ابھی ملکہ بیگم اور نوجوان شہنشاہ کی گفتگو جاری تھی کہ دراز قد این تی ہائی حاضر خدمت ہوا اور جھک کر بولا۔

"غلام فرزندِ آسمان کی خدمت میں سلام پیش کرتا ہے۔" اور پھر ملکہ بیگم کے روبرو جھک گیا تو ملکہ نے نرمی سے کہا۔

"این تی ہائی بیٹھ جاؤ اور نظر رکھنا کہ کوئی ایسی لڑکی شاہی محل میں داخل نہ ہو سکے جو ہمارے بیٹے کو مریض بنا دے۔"

"ملکہ بیگم! این تی ہائی نے ادب سے جھک کر کہا۔ خادم نے طب کی دنیا میں عمر گزاری ہے اور بیمار و تندرست میں تمیز رکھتا ہے۔ کیسا بھی مرض ہو چال بتا دیتی ہے۔ آپ کا غلام نبض سے نہیں چال سے اندازہ کرتا ہے۔"

یہ سن کر ملکہ بیگم اور شہنشاہ مطمئن ہو گئے اسی وقت محل کا سب سے با اثر خواجہ سرا لی لین ینگ حاضر ہوا اور عرض کیا۔

"فرزندِ آسمان اور عظیم ملکہ بیگم مانچو امرء خاندان کی ستر لڑکیاں حاضر ہیں۔"

"لی لین ینگ" ملکہ بیگم نے حکم دیا۔ "ان تمام کو ایک ایک کر کے شہنشاہ کے سامنے سے گزارا جائے۔"

ملکہ بیگم کے اس حکم کی تعمیل کی گئی۔ ستر لڑکیاں ایک ایک کر کے شہنشاہ سین فینگ اور ملکہ بیگم کے سامنے سے گزاری گئیں۔ شہنشاہ بڑی گہری اور ملکہ بیگم تنقیدی نظروں سے سب کا جائزہ لیتی رہی لیکن ان دونوں سے زیادہ گرم اور ناقدانہ نظر این تی ہائی

لی تھی۔ دیر تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ شہنشاہ سین فینگ نے حسن و رعنائی کے عجیب عجیب پیکر دیکھے۔ کبھی نگاہوں کے زاویے بدلے کبھی دل دھڑکا کبھی مبہم مبہم تبسم نے داد حسن پیش کی مگر کنیزوں کے انتخاب کا آخری فیصلہ دستور کے مطابق ملکہ بیگم کو کرنا تھا۔ لہٰذا وہ کچھ نہ بولا اور ملکہ نے ان ستر میں سے تیس لڑکیوں کو منتخب کر لیا جنہیں پھر شہنشاہ اور ملکہ بیگم کے روبرو لایا گیا اس مرتبہ ان سے کلام کیا جانا تھا ملکہ بیگم نے جھکی جھکی آنکھوں اور تمتماتے ہوئے رخساروں والی لڑکی سے پوچھا

"لڑکی۔ تمہارا نام کیا ہے؟"

"ملکہ بیگم!" لڑکی نے کچھ اور سمٹ کر کہا۔ "مجھے ساکوتہ کہتے ہیں اور میں شاہی محافظ جنگ لو کی بہن ہوں۔"

ملکہ بیگم نے کنکھیوں سے شہنشاہ کو دیکھا جس کی آنکھوں میں ساکوتہ کے لیے پسند اور والہانہ پن تھا پھر اس نے این تی ہائی کی طرف دیکھا۔ اس کے رخ پر اطمینان تھا تب وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں بلند آواز سے بولی۔

"ساکوتہ! ہم تمہیں کنیز نمبر ایک قرار دیتے ہیں تم آج ہی سے شہنشاہ کے لیے مامور ہو۔"

یہ سن کر ساکوتہ کا چہرہ کچھ اور سرخ ہو گیا..... پھر ہر لڑکی آئی ملکہ بیگم کے سوالات کا جواب دیتی اور واپس جاتی رہی۔ آخری لڑکی ہیونا تھی جو ساکوتہ کو نمبر ایک قرار دینے سے کچھ رشک و حسد محسوس کر رہی تھی جس کی آنکھوں میں علم و ذہانت کی روشنی اور چہرے سے ایک عزم صمیم جھلکتا تھا وہ آئی اس نے ملکہ بیگم کو نہیں براہ راست شہنشاہ کی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔

"فرزند آسمان! مجھے ہیونا کہتے ہیں"

شہنشاہ کا دل ڈانواڈول ہو گیا اس آواز میں کیسا جادو تھا کیسی شیرینی اور لہجہ میں کیسی انوکھی جرأت تھی۔ ملکہ بیگم ٹھٹک گئی ان گہری گہری دلیر آنکھوں میں کیا تھا وہ چونک گئی شاید وہ سوچ رہی تھی کہ اس نے نادانستگی میں کسے انتخاب کر لیا اور اس لمحہ وہ اپنا فیصلہ بدل دیتی مگر شاہی طبیب این تی ہائی جو غور سے اس لڑکی کو تک رہا تھا ملکہ بیگم کا ارادہ بھانپ گیا تھا اور عرض کیا

"ملکہ بیگم! ہیونا ساکوتہ کی ہم زاد ہے جسے آپ نمبر ایک قرار دے چکی ہیں"

ملکہ بیگم بے بس ہو کر رہ گئی نمبر ایک کنیز کی بہن کو نظر انداز کرنا اس کی توہین تھی لہٰذا ملکہ نے چند ساعت غور کیا پھر بولی۔

"معزز این تی ہائی! ہم ان تیس کنیزوں کو تین درجوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ درجہ اول میں ساکوتہ ہے جو ہر شب شہنشاہ کے لیے لازمی ہے۔ درجہ دوم میں یہ دس لڑکیاں ہیں جو ساکوتہ کی غیر حاضری کے وقت شہنشاہ کی خواب گاہ میں جائیں گی اور باقی تمام لڑکیاں تیسرے درجے میں ہیں جو صرف ضرورت کے وقت اگر شہنشاہ پسند فرمائیں تو طلب کی جا سکتی ہیں۔ ان سب کو محل کے اس حصہ میں پہنچا دو جہاں رہ کر کنیزیں شہنشاہ کے حکم کا انتظار کرتی ہیں اور ان سب کو ایک ایک غلام عطا کر دو۔"

حکم کی فوراً تعمیل کی گئی۔ تیسرے درجہ کی کنیزوں کو صرف حکم کا انتظار کرنا تھا اور ان ہی میں غیر معمولی ہیونا بھی شامل تھی۔ اسے بھی محل کے اس الگ تھلگ حصہ میں پہنچا دیا گیا جہاں رہنے والی کنیزوں کو بسا اوقات عمر بھر انتظار کرنا پڑتا اور شہنشاہ کی خواب گاہ میں کبھی ان کی طلبی نہ ہوتی۔ ہیونا کی حیرت اور غصہ کی انتہا نہ تھی۔ وہ ان تمام لڑکیوں میں سب سے زیادہ حسین اور ذہین تھی مگر اسے بری طرح نظر انداز کیا گیا تھا اور ساکوتہ جو اس کے پاسنگ بھی نہ تھی اسے آج ہی شہنشاہ کے حوالے کر دیا گیا تھا کیوں؟ وہ سمجھ نہ سکی مگر توہین کے احساس نے اسے نیم دیوانہ کر دیا۔ یہ شب اس کے لیے ایک قیامت تھی۔ ادھر ساکوتہ شہنشاہ سین فینگ کے پہلو میں تھی ادھر ہیونا اپنے علیحدہ کمرے میں تڑپ رہی تھی سوچ رہی تھی اگر ساکوتہ بیٹے کی ماں بن گئی تو اس کا مستقبل محفوظ ہو جائے گا۔ اور وہ خود ہزار حسن و ذہانت کے باوجود تیسرے درجہ کی کنیز ہی عمر بھر شہنشاہ کی طلب کی منتظر رہے گی اور تیسرے درجہ کی کنیزوں کو شہنشاہ کب طلب کرتا تھا اسے بخوبی علم تھا جب اس کی منہ چڑھی ہر کنیز مجبور ہو۔ اس کے واضح معنی یہی تھے کہ اسے تاحیات سسکنا تھا۔ وہ سوچتی رہی سلگتی رہی۔ پھر ہر شب یہی تصور اس کی نیند اڑا دیتا دیکھو رات ساکوتہ کی قسمت پر رشک کرتی رہی اور اپنی تقدیر پر کڑھتی سسکتی اور تڑپتی رہی۔ دن ہفتوں اور ہفتے مہینوں میں بیت گئے۔

یہ شب موسم کی سرد ترین اور طویل ترین شب تھی مگر ابھی رات کا ابتدائی

یونانگ یہونالہ کمرے میں پڑے پڑے تنگ آگئی تھی۔ خواب گاہ سے

باہر جا نہیں سکتی تھی اور خواب گاہ میں سخت گھٹن، احساسِ تنہائی اور پراگندہ خیالات سے وہ کبھی جھنجھلا جاتی، کبھی رونے لگتی اور کبھی اپنی توہین آمیز ناکامی کے بارے میں غور کرتی مگر کچھ سمجھ میں نہ آتا ہر طرح سوچنے اور ہر صورت سے غور کرنے کے بعد بھی مستقبل تاریک، مبہم اور غیر اطمینان بخش تھا۔ وہ سوچتی کہ کوئی دن آتا ہے کہ وہ بادشاہ کی منظورِ نظر بن کر شہنشاہ کے پہلے بیٹے کی ماں بن کر ملکہ بیگم کا مرتبہ پالے گی اور اب وہ خود تیسرے درجے کی کنیز بنی یونہی گوشۂ تنہائی میں پڑے پڑے مر جائے گی۔ اس وقت یہونالہ کے تصورات بڑے اذیت ناک تھے۔ پرانی یادیں ایک ایک کر کے ذہن میں ابھرنے لگی تھیں اسے یاد آیا جنگ لینے کہا تھا۔

"یہونالہ! تم تمام عورتوں سے جدا گانہ حسن کی مالک ہو تم اس قدر خوبصورت ہو کہ کوئی تمہارے ہم مرتبہ ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔" مگر اس وقت وہ ہنسی اور دکھ سے مسکراتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ اس بے پناہ حسن نے بھی اسے کوئی عزت نہ دی اور ساکوتہ جو اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہ تھی بازی جیت گئی۔ وہ سوچتی رہی۔ اس توہین و تذلیل کے احساس سے اسے بار بار حسرت ہوتا مگر اشتعال سے کوئی فائدہ نہ تھا۔ کچھ بھی سوچتی کچھ بھی کرتی یہ یقین دلانے کے لیے مجبور تھی کہ شہنشاہ اسے کبھی اپنی خواب گاہ میں طلب نہ کرے گا۔ سوچوں کی بنیاد تھی خیالات کی پرورش اور منتشر گزرتے دن کے ساتھ وہ نڈھال ہوتی جا رہی تھی۔ یہی راتیں ساکوتہ کے لیے راحت و تسکین اور اس کے لیے قیامت بن کر آتی تھیں۔ اس کی آنکھوں کے گوشے ... وہ رو رہی تھی۔ ... تنہائی

رونے کے بعد وہ پھر اپنی ناکامی کے وجوہات پر غور کرنے لگی مگر یہ چیز اس کی سمجھ سے باہر تھی۔ بہت سا وقت اسی طرح گزر گیا اور رات کچھ اور سرک گئی۔ اس وقت ہر کا عالم طاری تھا۔ قریبی کمروں کی تمام کنیزیں شاید محوِ خواب تھیں۔ یوں بھی محل کا یہ حصہ سب سے الگ تھلگ اور خاموش تھا۔ اور رات کے وقت تو ادھر بالکل سناٹا ہوتا تھا۔ یہونالہ اس کی عادی سی ہو گئی تھی۔ اس لیے اس سکوت کے عالم میں قدموں کی مدھم مدھم آواز سے چونک گئی اس وقت یہاں کون آسکتا ہے؟ وہ کچھ خوفزدہ سے انداز میں دیکھنے لگی اسے محسوس ہوا کہ قدموں کی آواز اس کے دروازے کے باہر رک گئی تھی۔ وہ بری طرح سہم گئی۔ اپنی الجھنوں اور تفکرات میں آج وہ کمرہ بند کرنا بھی بھول گئی تھی۔ ابھی وہ دہشت زدہ سے انداز میں دیکھ رہی تھی کہ دروازے کے پٹ آہستہ سے کھلے

اور خوبصورت دراز قد طبیب این تی ہائی کمرہ میں داخل ہو گیا۔ یہونالہ چونک گئی۔ اب خوف نہیں حیرت تھی۔ وہ بولی

"معزز این تی ہائی آپ؟" یہ کہتے کہتے وہ کھڑی ہو گئی اور این تی ہائی آہستہ خرامی سے قریب آگیا۔

"خوبصورت لڑکی! تم نے کس طرح جان لیا کہ مجھے این تی ہائی کہتے ہیں"

"اس دن شہنشاہ اور ملکہ بیگم کی قریبی نشست پر آپ ہی براجمان تھے نا؟" یہونالہ نے کہا۔

"بے شک"۔ این تی ہائی نے اسے پسندیدہ انداز میں دیکھا "تم جتنی حسین ہو اس سے زیادہ ذہین ہو یہ بات میں نے پہلے دن ہی تاڑلی تھی۔ تم میں وہ خصوصیات ہیں جو کنیزوں میں نہیں ملکہ میں ہوتی ہیں"۔

اس فقرہ پر یہونالہ افسردہ ہو گئی کسی نے اس انداز میں اس کے حسن و ذہانت کی تعریف بڑے دن بعد کی تھی ایک دم اس کی آنکھیں چھلک گئیں۔ این تی ہائی نے یہ ... سے دیکھا اور سرگوشی کی۔

"یہونالہ! لڑکیاں اپنی تعریف سے خوش ہوتی ہیں لیکن تم افسردہ کیوں ہو گئیں کیا سبب گریہ نہ بتاؤ گی؟"

"معزز این تی ہائی!" یہونالہ سسکیاں لیتے ہوئے سادگی سے بولی۔ "اب مجھے اس بات کا یقین نہیں رہا کہ میں حسین ہوں۔"

"جبکہ یہ حقیقت ہے کہ اس وقت اس محل میں خال خال عورتیں ہی تمہاری برابری کر سکتی ہیں"۔ این تی ہائی نے کہا۔

"تو پھر مجھے ... ساکوتہ کو پہلے دن ہی مل گیا" یہونالہ نے دکھ سے کہا۔ "مجھے بتائیں آخر مجھے محل میں لا کر بر خوشی سے کیوں کاٹ دیا۔ ساکوتہ کو مجھ پر ترجیح کیوں دی گئی۔ مجھے بتائیں مجھے بتائیں؟"

"سنو پیاری لڑکی"۔ این تی ہائی نے سنجیدگی سے کہا "تمہیں تیسرے درجے کی کنیز قرار دے کر ملکہ بیگم نے تمہاری گستاخی کی سزا دی ہے۔ وہ بہت سخت گیر اور سزا دینے کے معاملہ میں بہت تیز ہیں"۔

یہ سن کر یہونالہ چونک پڑی اس نے خوشامدانہ انداز میں کچھ خوفزدہ ہو کر دریافت کیا۔

"معزز طبیب! میرا قصور کیا تھا آخر مجھے بتا دیں۔ یقین کریں میں نے کوئی گستاخی ملکہ کے حضور نہیں کی"

"معصوم لڑکی"۔ این تی ہائی نے پیار سے کہا "تمہاری اس سے

بڑی گستاخی اور کیا ہوگی کہ تم نے ملکہ بیگم کو نظر انداز کر کے براہِ راست فرزندِ آسمان سے صحبت کی جبکہ کوئی کنیز بھی یہ جرأت نہیں کر سکتی کہ ملکہ بیگم کے ذریعہ نہیں بلکہ براہِ راست شہنشاہ تک رسائی حاصل کر لے۔ کیا تم نے ملکہ کا انداز نہیں دیکھا تھا ملکہ بیگم کو ایسی کنیزیں پسند ہیں؟"

یہونالہ اس بات سے سوچ میں غرق تھی۔ اس وقت اسے خود بھی اپنی گستاخی بڑی سنگین نظر آ رہی تھی۔ این تی ہائی نے محبت پاش نظروں سے اسے چند لمحے دیکھا اور خود ہی بولا۔

"ماپنچو خاندان کی سب سے حسین لڑکی! اس دن ملکہ تمہاری ذہانت اور دلیری سے خوفزدہ ہو گئی۔ وہ جان گئی کہ تم شہنشاہ کے بستر سے اس کے تخت تک پہنچنے والی لڑکی ہو۔ شکر ادا کرو میں نے اس دن بروقت انہیں روک دیا ورنہ وہ تمہاری جرأت سے اتنی برہم تھیں کہ اسی وقت اپنے انتخاب کو رد کر دینے کا اعلان کر دیتیں۔"

"لیکن آپ کے روکنے کے باوجود بھی میں تیسرے درجہ کی کنیز ہوں۔" یہونالہ نے افسردگی سے کہا۔

"یہ ایسی کوئی بات نہیں۔" این تی ہائی نے مسکرا کر اس کے شانہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "محل کے گوشہ گوشہ میں اس خاکسار کی مرضی مانی جاتی ہے۔ ملکہ بیگم میرے مشورہ کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کرتیں۔ فرزندِ آسمان شہنشاہ سین فینگ میری مرضی کے تابع ہیں۔ جب کہو تمہیں ان کی خواب گاہ میں پہنچوا دوں؟"

یہونالہ چونک پڑی۔ اوّل تو اسے اسی دن اندازہ ہو گیا تھا کہ ملکہ بیگم اور فرزندِ آسمان کے نزدیک این تی ہائی کی حیثیت کیا ہے مگر آج جب اس نے خود وضاحت کی تو وہ مرعوب ہوئے بغیر نہ رہی اور اس کا گریبان پکڑ کر بولی۔

اس سوال پر این تی ہائی ہنس دیا اور جھک کر کان میں سرگوشی کے انداز میں بولا۔

"خوبصورت لڑکی! میں تمہیں بہ آسانی شہنشاہ کی خواب گاہ تک پہنچا دوں گا۔ تم بے پناہ حسین ہو۔ تم میں جنسی کشش اس درجہ ہے کہ کوئی مرد نظر انداز نہیں کر سکتا لیکن اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لیے تمہیں میرے کہنے پر عمل کرنا ہوگا۔ اگر تم نے ایسا کر لیا تو اس میدان میں تم ہر عورت کو مات دے دوگی۔"

"مگر مجھے کرنا کیا ہوگا۔ آپ بتا دیجئے؟" یہونالہ نے بے قراری کے لہجہ میں کہا۔

"میں تمہیں وہ تمام تحریریں پڑھنے کے لیے دوں گا جن کا مطالعہ کنیزوں کے لیے ممنوع ہے اور جو محبت کے میدان میں کامیابی کا سب سے بڑا راز ہیں۔ میں تمہیں کچھ تصویریں بھی دکھاؤں گا جن سے تم بہت سے انداز سیکھ جاؤ گی۔ اس کے بعد میں تمہیں بتاؤں گا کہ مرد عورت سے کس وقت کیا طلب کرتا ہے۔ کیا چاہتا ہے۔ اس کے بعد تم وہ تمام ادائیں اور انداز سیکھ جاؤ گی جو انبساط کی گھڑیوں کو اس طرح طویل کر دیتے ہیں کہ ایک ہی وصال کے بعد مرد بے دام غلام بن کر رہ جاتا ہے۔ تاکہ جب تم شہنشاہ کی خواب گاہ میں جاؤ تو وہ تمہارے سوا کسی کو طلب نہ کرے۔"

یہ سن کر یہونالہ خوشی سے دیوانی ہو گئی۔ اس نے این تی ہائی کا گریبان چھوڑ دیا اور رشک سے جھومتے ہوئے بولی۔

"معزز این تی ہائی آپ یہ سب مجھے کب سکھائیں گے؟"

"بہت جلد۔ مگر ایک شرط پر۔" این تی ہائی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ مبہم مبہم تبسم اور آنکھوں میں جذبات کا بحرِ بیکراں۔ یہونالہ کو بڑی آسانی سے اس کا مطلب سمجھ گئی اور اس اندھیری طویل اور سرد رات میں وہ اس کے کمرے میں آنے کا مقصد جان گئی۔ اس نے معزز این تی ہائی کا شانہ چھوڑ دیا اور گھبرا کر بولی۔

"معزز این تی ہائی! آپ جانتے ہیں میری منزل شہنشاہ کی خواب گاہ ہے۔"

"نہیں۔" این تی ہائی نے سرگوشی کی۔ "خواب گاہ سے بہت آگے۔ تم اس کے بستر کے نہیں تخت کے قابل ہو۔ میں بخوبی جانتا ہوں۔ لیکن یاد رکھو تخت تک پہنچنے کے لیے تمہیں فرزندِ آسمان کے بستر اور بستر تک پہنچنے کے لیے میری ضرورت ہے لیکن میری ایک شرط ہے۔ صرف معمولی سی۔"

یہونالہ نے چند لمحے اس دراز قد خوبصورت آدمی کو دیکھا جو اس کی صلاحیتوں کو ایک نظر میں جان گیا تھا جسے حقیقت سمجھنے کی بے پناہ قوت عطا ہوئی تھی اور جو معمولی سے اشارے سے محل میں عزت دلا سکتا تھا مگر اس کے جواب میں وہ کیا طلب کر رہا تھا۔ یہونالہ پریشان ہو گئی پھر بے بسی کے انداز میں بولی۔

"این تی ہائی! کیسی عجیب بات ہے کہ ایک طرف آپ مجھ سے ہمدردی فرما رہے ہیں اور دوسری طرف وہ طلب کر رہے ہیں جس کے بعد میں فرزندِ آسمان کے قابل نہ رہوں گی۔ کیا اس کے بعد شہنشاہ مجھے قبول کر لیں گے؟"

اس بات پر این تی ہائی ہنس دیا۔ اس نے یہونالہ کے شانے تھام لیے اور اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"حسین معصوم لڑکی! تو نہیں جانتی، میں نے شب کی دنیا کھنگال ڈالی

اور اب میں وہ دوا ایجاد کر چکا ہوں۔ جو کھلے ہوئے پھول کو منہ بند کلی بنا دیتی ہے۔ تم اگر کہو تو تمہیں شہنشاہ تک پہنچانے کے بعد ہر شب وہ دوا مہیا کرتا رہوں تاکہ شہنشاہ تمہیں ہر شب ان چھوئی کلی سمجھتا رہے۔"

ہیونالہ نے اسے حیرت سے دیکھا اور این تی ہائی اس کے کان میں بیان کرتا رہا یہاں تک کہ اس نے فیصلہ کر لیا کہ شہنشاہ تک جانے کے لیے وہ اس کا سہارا لے گی اور اس کے بعد اس نے خود کو اس کے سپرد ... یا پھر حویلی اور سہولیات دیکھتی رہی اور محل میں کسی کو علم نہ ہوا کہ شاہی کنیز ہیونالہ نے تخت تک پہنچنے کے لیے کسے سہارا بنایا ہے۔ اس شب ایک عجیب و غریب و خفیہ نسخہ ایجاد کرنے والے طبیب کے ہاتھوں ایک نیا چھوتا تجربہ عمل میں آیا۔ ہیونالہ نے تمام شب اس کے ساتھ گزاری مگر جسم ان چھوئی کلی بن چکی تھی۔ اگلی صبح اس نے این تی ہائی کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور لاڈ سے بولی۔

"میں نے آپ کی شرط پوری کر دی۔ اب آپ کریں اپنا وعدہ ... ہے نا؟"

"ہاں ہاں!" این تی ہائی نے پیار سے کہا۔ "تمہیں پہلے دو باتوں پر عمل کرنا ہے۔ اول یہ کہ زیادہ وقت ملکہ بیگم کے ساتھ گزارو جہاں فرزندِ آسمان آتے رہتے ہیں۔ تمہارا حسن معمولی نہیں کہ وہ نظر انداز کر دیں اور خود کو ایک وفادار کنیز ثابت کرو۔ اس کے علاوہ میں تمہیں آج ہی وہ نسخہ بھی پہنچا دوں گا جو تمہیں ایک سخت کار مجرب بنا دیں گی..... لیکن دھیان رکھنا فرزندِ آسمان تک جانے سے قبل تمہاری ہر ضد پوری ہو۔"

یہ سن کر ہیونالہ ہنس دی۔ اسی دن این تی ہائی نے محل کے صدر ... اپنے خاص آدمی لی لین ینگ کو ہیونالہ سے ملوایا اور کہا۔

"ہیونالہ! یہ لی لین ینگ ہے۔ شاہی محل کا سب سے بڑا جاسوس۔"

یہ سن کر وہ دونوں این تی ہائی کا مطلب جان گئے اور وہ مسکرا کر چلا گیا۔

◎

اب ہیونالہ کی زندگی عجیب تھی۔ ایک طرف وہ این تی ہائی جیسے طبیب کے اشاروں پر ناچ رہی تھی۔ دوسری طرف خود کو تیزی سے ... کے لیے تیار کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اول تو لی لین ینگ کے ذریعہ محل میں ظہور میں آنے والی ہر بات اسے معلوم ہو جاتی۔ اس کے علاوہ وہ ہر روز ملکہ بیگم کی خدمت میں حاضر ہوتی اس وقت وہ کوئی ادا ہی نہ فرماتی۔ اس کی آنکھیں جھکی ہوتیں، رخسار شرم و حیا سے تمتماتے۔ وہ بولنا چاہتی مگر زبان رک رک جاتی اور ملکہ بیگم اسے دیکھتی ہی رہ جاتیں کہ یہ کیسی عجیب ہے۔ اتنی معصوم اتنی شرم آمیز۔ آہستہ آہستہ اول ملاقات کا اثر زائل ہو رہا تھا۔ مستزاد یہ کہ این تی ہائی جیسا اعلیٰ وارفع اور قابل طبیب کہ بیگم کے سامنے اس لڑکی فطرت اور بے پناہ حسن رکھنے والی لڑکی کی تعریف کر چکا تھا۔ لہٰذا ملکہ بیگم اب اسے ضرور ہی طلب کرنے لگی تھیں اور کتنی مرتبہ ایسا ہوا کہ جب وہ ملکہ بیگم کی خدمت میں ہوتی تب ہی شہنشاہ سین فینگ بھی ماں کے پاس آ جاتا۔ ایسے میں ہیونالہ کو جیسے نظر اٹھانے کی مجال ہی نہ ہوتی۔ وہ سمٹ سمٹ جاتی شرماتی کہ یہ اندازہ کرنے میں ذرا بھی دشواری نہ ہوتی کہ اس کا بے پناہ حسن شہنشاہ کو متاثر کر چکا ہے۔ ایسے میں اس کا ظاہری سے دھڑکن سکڑ وہ معصومیت کا پیکر نظر آتی۔ وقت گزرتا رہا اور محل کی کتنی اہم خبریں اسے لی لین ینگ کے ذریعہ معلوم ہوتی رہیں۔

"شہنشاہ سین فینگ لڑکے کی پیدائش کے آرزومند ہیں۔"

ساکرتہ حاملہ ہو گئی اور اب زیادہ عرصہ شہنشاہ کی خدمت نہ کر سکے گی

ہیونالہ تیزی سے قیمتی خفیہ تحریروں کے مطالعہ میں مصروف تھی

ہر شب بے شمار کتب پڑھتی جن کی باریکیاں اسے این تی ہائی سمجھاتا اور وہ ان انمول رازوں کو سینہ میں منتقل کر لیتی۔ یہاں تک کہ اسے بے حساب اشارے و ادائیں آ گئیں اور سترہ برس کی عمر میں ان تحریروں کی رو سے اسے مرد کی نفسیات پر عبور حاصل ہو گیا اور اسے یقین آ گیا کہ اب اس کا کوئی نشانہ خالی نہ جائے گا۔ اسی دوران ایک مرتبہ اس کے بچپن کا محبوب جنگ وراس سے ملا۔ وہ ساکرتہ کے بارے میں بہت مسرور تھا۔ اس نے کہا

"ہیونالہ! تمہاری باری کب آئے گی؟"

"جب میری باری آئے گی تو تم بھی سن لو گے۔ یہ بات چھپی تو نہ رہے گی۔" ہیونالہ نے کہا۔

"مجھے بھول تو نہ جاؤ گی؟" جنگ لو نے محبت سے اسے دیکھا۔

"نہیں۔" ہیونالہ مسکرائی۔ "میں اپنے خاص آدمی کو بھیج کر دوسرے دن ہی تمہیں بلوا لوں گی۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ فرزندِ آسمان کے بعد پہلا موقع تمہیں دوں گی۔"

جنگ لو بہت خوش ہوا اور اس واقعہ کے چند دن بعد ہی وہ اپنا سبق دہرا رہی تھی کہ ایک دم این تی ہائی نے آ کر کہہ دیا۔

"ہیونالہ تمہیں فرزندِ آسمان نے طلب فرمایا ہے۔"

ہیونالہ کے ہاتھ کانپ گئے۔ اس نے ایک دم دل پر ہاتھ رکھ دیا مگر پھر خود ہی ہنس دی۔ این تی ہائی نے کہا۔

"فرزندِ آسمان نے فرمایا ہے کہ چند یوم قبل جس کنیز کو ملکہ بیگم کی نشست گاہ میں دیکھا تھا اسے ان کی خلوت میں پہنچا دیا جائے۔"

پھر ہیونالہ تیزی سے تیار ہونے لگی اور این تی ہائی اسے ہدایات دینے لگا۔ بڑے ہی انتظار کے بعد اس شب ہیونالہ طویل غلام گردشوں پُرسکوت راہداریوں اور خاموش راستوں سے گزرتی ہوئی شہنشاہ سین فینگ

کی آراستہ و پیراستہ خواب گاہ میں پہنچ گئی۔ وہ یہاں پہلی مرتبہ آئی تھی اصولاً دیگر کنیزوں کی طرح اسے بھی گھبرانا چاہیے تھا۔ اس وقت سین ینگ اپنے آرام دہ بستر پر تکیہ سے ٹیک لگائے ہوئے نیم دراز تھا۔ اس کے کشادہ چھپر کھٹ کے تختوں اور دیواروں پر بے شمار سانپوں اور اژدہوں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں اور پائنتی پر موٹا نرم و دبیز کمبل پڑا ہوا تھا اس پر منہ پھاڑے ہوئے شیروں کی ایسی تصویریں تھیں جنہیں دیکھ کر آنے والی ہر کنیز گھبرا جاتی تھی مگر یہ یہونالہ تھی جو کئی ماہ سے اس وقت کے لیے تیاری کر رہی تھی جسے این تی ہائی نے مختلف انداز میں یہاں کے لیے تیار کر دیا تھا اسے علم تھا کہ مرد کس وقت کیا طلب کرتا ہے کیا چاہتا ہے کس ابرو نگاہ کے اشارے اور خفیف سے تبسم کو بھی بامعنی بنانا جانتی تھی اور اسے علم تھا کہ ایک عورت کن اداؤں اور اٹھلاؤں سے مرد کو زیر کر سکتی ہے۔ این تی ہائی نے کہا تھا۔

”خوبصورت لڑکی! تخت تک تمہاری رسائی کا دارومدار صرف اس بات پر ہے کہ تم فرزند آسمان پر اولین اثر کیا ڈالتی ہو؟“

لہٰذا پہلا تاثر چھوڑنے کے لیے یہونالہ پوری طرح لیس ہو کر آئی تھی اور دیگر تمام کنیزوں سے مختلف انداز میں اس نے خواب گاہ میں داخل ہوتے ہی شہنشاہ کی آنکھوں میں اپنی مسحور کن آنکھیں ڈال دیں۔ اس وقت اس کے یاقوتی لبوں پر مدھم مدھم تبسم تھا اور سحر افسوں آنکھیں شہنشاہ کو مدہوش کر رہی تھیں۔ وہ اس عجیب لڑکی کے اس والہانہ انداز پر بے ساختہ مسکرایا اور اپنے بازو پھیلا دیئے اور یہونالہ بے جھجک ان میں سما گئی۔ پھر کامل تین یوم تک محل کے کسی فرد نے فرزند آسمان یا یہونالہ کو نہ دیکھا مگر بہتر گھنٹے بعد جب یہونالہ شہنشاہ کی خواب گاہ سے نکلی تو فوری اس نے این تی ہائی کو طلب کیا کیونکہ فرزند آسمان میں حرکت تک کرنے کی سکت باقی نہ رہی تھی اور اب این تی ہائی ہی اس میں جان ڈال سکتا تھا۔ لیکن تعجب خیز بات تھی کہ یہونالہ اس وقت بھی تین یوم قبل کی طرح ترو تازہ تھی البتہ آنکھوں میں مسرت کی چمک نے حسن میں غیر معمولی اضافہ کر دیا تھا۔ این تی ہائی چونک پڑا اور محل کے گوشہ گوشہ میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ کوئی کہہ رہا تھا۔

”اس لڑکی نے تو فرزند آسمان کی رگ رگ سے لہو نچوڑ لیا۔“

کوئی بولا ”بھئی یہ واحد کنیز ہے جو فرزند آسمان کی خواب گاہ میں بہتر گھنٹے گزارنے کے بعد بھی ترو تازہ ہے۔ ورنہ ایسا مقابلہ کوئی لڑکی نہیں کر سکتی۔“

اور کسی نے کہا ”یہونالہ کی اصل منزل خوابگاہ نہیں۔ اس سے بہت آگے ہے۔“

مگر یہونالہ کو کسی کی پرواہ تھی نہ کسی سے غرض اس کو اب دوسری ہی دھن سوار تھی اور اسی شب جبکہ شہنشاہ سین ینگ ایک لاش کی مانند این تی ہائی کے زیر علاج اور نقاہت کے سبب بیکار ہو چکا تھا یہونالہ خفیہ طور پر اپنے محبوب جنگ لو سے ملاقات کا اہتمام کر رہی تھی کیونکہ دل میں جنگ لو کی محبت تھی نہ اپنے وعدہ کا پاس۔ وہ تو ہر ممکن طریقہ سے آگے بڑھ جانا چاہتی تھی۔ اس نے کہا۔

”جنگ لو! جانتے ہو میں تین دن کیا کرتی رہی؟“

”تمہارے بتائے بغیر کیسے جان سکتا ہوں؟“ جنگ لو نے محبت پاش نظروں سے اسے دیکھا۔

”میں نے بڑا زبردست معرکہ سر کیا ہے۔“ یہونالہ اٹھلا کر بولی ”فرزند آسمان شاہی طبیب کے زیر علاج ہیں۔ یہ سب میری محبت کا نتیجہ ہے۔ شاہی طبیب کا خیال ہے کہ انہیں کئی ہفتے شباب آور اور مقوی ادویات دینی پڑیں گی پھر کہیں قابل ہوں گے۔“

”اچھا؟“ جنگ لو خوش دلی سے ہنسا ”مگر تم تو ہمیشہ سے زیادہ ترو تازہ اور حسین نظر آ رہی ہو۔“

”یہی تو ہمارا کمال ہے۔“ یہونالہ ادا سے ہنس دی ”تم مجھے معمولی لڑکی سمجھتے ہو؟“

”ارے نہیں۔“ جنگ لو نے اسے ایک دم بازوؤں میں بھر لیا ”معمولی سمجھتا تو تم سے محبت کیوں کرتا مگر اب کیا چاہتی ہو؟“

”یہ بھی تم مجھ سے ہی پوچھ رہے ہو؟“ یہونالہ نے اس کی گردن میں بانہیں حمائل کر دیں اور پھر یہ رات بھی سابقہ تین راتوں کی طرح کیف و سرور کی نذر ہو گئی۔ فرق صرف فرزند آسمان اور جنگ لو کا تھا مگر یہونالہ نے محسوس کر لیا کہ جو جوہر شہنشاہ ضائع کر چکا ہے وہ جنگ لو میں ابھی محفوظ ہے۔ ادھر شاہی معالج شہنشاہ کی قوت بحال کرنے کے لیے مصروف تھے ادھر شاہی دستہ کا محافظ سردار جنگ لو ہر شب یہونالہ سے ملنے پہنچ جاتا اور صبح ہونے سے قبل لوٹ جاتا یوں دن پہ دن گزرتے رہے۔ یہاں تک کہ فرزند آسمان کی قوت بحال ہو گئی صحت عود کر آئی اور اس نے پہلا حکم جاری کیا۔

”یہونالہ کو حاضر کیا جائے۔“

لیکن یہونالہ کا جواب تھا ”مجھے آرام کی ضرورت ہے۔“ شاہی خاندان کے افراد چونک پڑے۔ یہونالہ کی خادمائیں سہم گئیں۔ ساکوتہ نے اصرار کیا خواجہ سرائی لین مگ نے سمجھایا۔ این تی ہائی نے فوری حاضر ہونے کا مشورہ دیا اور ملکہ بیگم نے سخت تنبیہ کی مگر یہونالہ کا سب کو ایک ہی جواب تھا۔

”میں تھک گئی ہوں لہٰذا یہ حکم نہیں مان سکتی۔“

اس وقت شاہی محل کے گوشہ گوشہ میں سرگوشیاں ہو رہی تھیں۔ کسی نے کہا ”اس کے برے دن آ گئے۔“ کسی نے خدشہ کا اظہار کیا ”فرزند آسمان

اس خود سر لڑکی کو سخت سزا دیں گے۔"

مگر شاہی محل میں رہنے والی ہر پیش گوئی غلط ثابت ہوئی۔ فلسفہ ساون ژیئن کی وارفتگی و دیوانگی سے اس کا منتظر تھا اور ہیونالا اس کی نفسیات سمجھتی تھی۔ اسے علم تھا کہ دوسرے ہاں کا انتظار پیاس سے تڑپتے ہوئے آدمی کی تشنگی بڑھا دیتا ہے۔ لہٰذا طویل وقت تک اس کی صحبت میں رہنے کے بعد اب اپنی اہمیت بڑھانے کے لیے وہ بڑے خوبصورت طریقوں سے ٹال رہی تھی۔ مگر کب تک وہ کسی روم اصرار اور انکار کی کیفیت سے۔ ملکہ بیگم کے شدید حکم پر وہ پھر اس خواب گاہ میں پہنچا دی گئی جو فرزند آسمان تنبیہہ یا سزا دینے کے بجائے دیوانہ وار اس کے قدموں میں گر گیا۔ اب وہ جسمانی اور ذہنی طور پر اس کا بے دام غلام تھا۔ اسے ساکوتہ کی ضرورت تھی نہ کسی اور کنیز کی طلب بس ہیونالا تھی اور وہ تھی۔ تخت کی جانب اس کا پہلا قدم تھا ادھر شہنشاہ سین فینگ جنسی بے اعتدالیوں کا شکار ہو رہا تھا، ادھر ہیونالا کی حیثیت تعریف اس زندگی سے بہت کر رہی تھیں، سیاسی مسائل و حکومت کے معاملات میں اس کی دلچسپی بڑھ رہی تھی۔ تمام کنیزوں سے بالکل مختلف انداز میں جب وہ فرزند آسمان سے ان موضوعات پر بات کرتی تو وہ متعجب رہ جاتا۔ اس کی سیاسی بصیرت و انتظامی صلاحیت غیر معمولی تھی۔ آہستہ آہستہ شہنشاہ اس کے حسن میں ڈوبتا رہا اور وہ دیگر معاملات میں غالب آتی گئی۔ اب شہنشاہ کے حضور آنے والی ہر تحریر کا وہ باقاعدہ مطالعہ کرتی۔ مختلف صوبوں سے آنے والی رپورٹیں دیکھتی اور ان پر مدلل گفتگو کرتی تو شہنشاہ حسن و ذہانت کے اس انوکھے پیکر کو دیکھ کر متحیر رہ جاتا اور دوست وقت سلطنت کے معاملات میں اس سے خصوصی مشورہ طلب کرتا۔ وقت گزرتا رہا اور کئی نئی باتیں ظہور میں آئیں۔

ساکوتہ نے ایک مردہ بچی کو جنم دیا۔ ملکہ بیگم چند ہفتے علیل رہ کر مر گئی اور دستور کے مطابق بادشاہ بیگم کا خطاب پہلی کنیز ساکوتہ کو عطا ہوا۔ یہ بات ہیونالا نے شدت سے محسوس کی مگر چند روز بعد ہی اس نے ایک خوبصورت بیٹے تنگ چیہہ کو جنم دے کر فرزند آسمان کی دیرینہ آرزو پوری کر دی۔ یہاں بات تھی کہ تنگ چیہہ شہنشاہ کا پہلا بیٹا تھا مگر اس کا تخت کا وارث جنگ لو کے سوا کسی کو نہ تھا لیکن تنگ چیہہ کی پیدائش نے نہ صرف اسے ساکوتہ سے بلند کر دیا تھا بلکہ ایک اہم حیثیت دے دی تھی اس خوشی پر شہنشاہ سین فینگ نے ساکوتہ کو بادشاہ بیگم اور ہیونالا کو ملکہ کا خطاب عطا کیا۔ اس طرح ہیونالا اپنی تمناؤں کے عین مطابق ملکہ بن گئی اور شہنشاہ کی سیاسی مشیرہ دست راست سمجھی جانے لگی۔ اب سیاسی کوئی معاملہ اس کی مرضی کے بغیر طے نہ ہوتا۔ پھر وقت کے ساتھ ساتھ ملکہ قیصر ہیونالا کا اقتدار اور اس کی ہانی کا حوصلہ اور جنگ لو کی دست بڑھتی گئی۔

اس زمانہ میں اقوام مغرب خام مال اور اپنی مصنوعات کی تجارت کے لیے بہترین منڈیوں کی تلاش میں مختلف ممالک میں اپنے قدم جمانے کے لیے کوشاں تھیں۔ ایسے میں چین بھی محفوظ نہ رہا اور ولندیزیوں نے کینٹن میں ایک تجارتی دفتر قائم کر لیا۔ آہستہ آہستہ تجارت کا آغاز ہوا تو دیگر اشیا کے ساتھ ساتھ افیون کی درآمد کا کام وسیع پیمانہ پر شروع ہو گیا اور یہ قومیں آہستہ آہستہ پھیلتی گئیں۔ پھر وہ وقت آ گیا کہ یہ چین کے شاہی تخت کے لیے خطرہ بن گئیں۔ اور وہ ارض چین پر قبضہ کرنے کی فکر میں تھے۔ آئے دن ان کی تجارتی جماعتیں اس سرزمین پر چھوٹے چھوٹے معرکوں کا باعث بننے لگیں۔ دوسری طرف چینی عوام بالخصوص باشعور نوجوان سب چینی محسوس کر رہے تھے۔ ہر چند کہ خطرناک کھیل محل میں کھیلے جا رہے تھے مگر دور بین نظریں دیکھ رہی تھیں کہ بدنظر اور نااہل شہنشاہ کنیزوں کے ہاتھوں کٹھ پتلی بن رہا ہے۔ جس کی بدولت غیر ملکی لوگ تیزی سے غالب آ رہے ہیں۔ لہٰذا گوشے گوشے میں شاہی خاندان کے خلاف غم و غصہ کا اظہار ہونے لگا۔ ایسے میں جگہ جگہ باغی بغاوت پھیلا رہے تھے۔ شاید شہنشاہ سین فینگ خود کوئی قدم اٹھاتا لیکن اس سے قبل ملکہ قیصر نے بنفس نفیس ان سازشوں کی طرف توجہ دینی شروع کر دی۔ سب سے پہلے اس کے حکم پر جنگ لو کی زبردست فوج نے مختلف صوبوں میں باغیوں کی جماعتوں کا قلع قمع کر کے فتح حاصل کر لی۔ پھر اس نے یورپی طاقتوں کی طرف توجہ دی چونکہ ملکہ قیصر کے حکم پر جانے والی فوج فتح مند رہی تھی لہٰذا فرزند آسمان اس سے کچھ مرعوب ہو گیا اب بظاہر حکومت وہ کر رہا تھا مگر سیاسی معاملات میں حکم ملکہ قیصر کی طرف سے دیا جاتا۔ ان دنوں برطانوی فوج نے لارڈ ایلگن کی قیادت میں دارالحکومت کے بیرونی قلعوں پر قبضہ جما لیا ہوا تھا اور یہ خیال عام تھا کہ یہ فوج کسی بھی وقت دارالحکومت (پیکنگ) کی طرف پیش قدمی کر سکے گی۔ اس وقت ملکہ قیصر نے حکم دیا۔

"فرزند آسمان! ہم چاہتے ہیں کہ لارڈ ایلگن کے پاس سفارت روانہ کی جائے۔"

فرزند آسمان نے یہ سفارت روانہ کر دی اور کہا گیا۔ "معزز جنرل! یا تو ان بیرونی قلعوں کو خالی کر دو ورنہ تمہارا انجام ان باغیوں سے مختلف نہ ہوگا جنہیں جنگ لو کی فوج سے سابقہ پڑا تھا۔"

لیکن جوں ہی یہ سفارت لارڈ ایلگن کے حضور پہنچی تو اس نے اس دھمکی سے مشتعل ہو کر قائد سفیر کو گرفتار کر لیا اور باقی افراد کو بے عزت کر کے رلا دیا اور جب تک یہ لوگ شہنشاہ کے حضور واپس پہنچے یہ خبر عام ہو چکی تھی کہ برطانوی جنرل نے چین کے صدر سفیر کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ سفارت ناکام ہو گئی۔ یہ ملکہ قیصر کی پہلی ناکامی تھی اور یہ شب اس کے لیے بڑی بھاری تھی۔ ادھر ساکوتہ اور دیگر

کنیزوں کو اپنا مستقبل پھر روشن نظر آ رہا تھا۔ ادھر اچانک شہنشاہ پر سے یہونالہ کی گرفت کمزور ہو گئی۔ اس بات کو محل کے ہر فرد نے محسوس کیا کہ شہنشاہ کی آڑ لے کر حکومت کرنے والی ملکہ قیصر اب اس کی نظروں سے گرا جاتی ہے۔ اس شب یہونالہ کے محل میں تین افراد کی محفل جمی این تی بائی، جنگ لو اور یہونالہ۔ گو کہ یہ دونوں محبوب ایک دوسرے کی اصل حیثیت سے بے خبر تھے۔ این تی بائی کے خیال میں جنگ لو صرف یہونالہ کا محافظ اور فوج کا سوار تھا اور جنگ لو کی نظر میں این تی بائی صرف شاہی طبیب اور شاہی محل کی با اثر شخصیت مگر وہ دونوں ہی یہونالہ کے لیے لازمی تھے چند لمحے وہ تینوں الجھے الجھے خاموش رہے۔ پھر این تی بائی نے رازداری کے انداز میں کہا۔

"ملکہ قیصر! اس ناکامی سے آپ کو ہمت نہیں ہارنی چاہیئے ورنہ آپ جانتی ہیں کیا ہوگا۔ فرزندِ آسمان پر سے آپ کا تمام اثر زائل ہو جائے گا۔"

"ہوں۔ جنگ لو نے گہرا سانس لیا۔ یہ نہ بھولنا کہ شاہی خاندان کا بچہ بچہ آپ کا بدترین مخالف ہے میرا خیال ہے کہ جیسے بھی ممکن ہو فرزندِ آسمان پر سے اس ناکامی کا احساس مٹانے کی کوشش کریں۔"

"مگر میں کیا کر سکتی ہوں۔" ملکہ قیصر نے کہا۔ "لارڈ ایلگن اور اس کے ساتھیوں نے ہماری دھمکی کا کوئی اثر نہیں لیا بلکہ صدر سفیر کی موت اس بات کی علامت ہے کہ وہ لوگ پیش قدمی کرنے والے ہیں اور بیرونی قلعے خالی نہ کریں گے۔"

"اس کا بہترین علاج شہزادہ کنگ کر سکتے ہیں۔" این تی بائی نے آہستہ سے کہا۔ "شاہی خاندان میں ان سے بڑا سیاست داں اور تجربہ کار نوجوان کوئی اور نہیں ہے۔ آپ ان سے مشورہ کیجئے ملکہ قیصر۔"

"تو پھر میں ان سے بات کروں؟" ملکہ قیصر نے پوچھا۔ "کیونکہ دارالحکومت کے بیرونی قلعے اگر ہماری حکمت سے خالی ہو گئے تو ہم پھر مرتبہ پالیں گے۔"

"نہیں۔" جنگ لو نے کہا۔ "اس وقت ملکہ قیصر بن کر نہیں بلکہ یہونالہ بن کر تمہیں شہنشاہ کے تخلیہ میں جانا چاہیئے اگر تم نے فرزندِ آسمان پر پھر قابو پالیا تو تردد ضعف رہ جائے گا اور وہی مرتبہ بھی حاصل ہو جائے گا۔"

"یہ ٹھیک ہے۔" این تی بائی نے تائید کی اور اسے کچھ نئی ہدایات دینے لگا۔ اس طرح یہ محفل برخاست ہو گئی اور اگلی صبح جب شہنشاہ سین فینگ کے ذہن پر یہونالہ کے حسن کا نشہ سوار تھا سارے تاورد یگر تمام کنیزیں متردد ہو گئی تھیں۔ ایسے میں یہونالہ شہزادہ کنگ سے ملاقات کر رہی تھی۔ شہزادہ کنگ نے کہا۔

"ملکہ قیصر! میرا مشورہ تو یہ ہے کہ اب لارڈ ایلگن سے مصالحانہ گفتگو کی جائے تو بہتر ہے۔ انہیں دھمکیاں دینے سے معاملہ بگڑ جاتے گا اور پھر یہ قوم اس مٹی سے جس میں جو بالی جائے۔"

"ہماری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔ آپ ہی کوئی بہتر طریقہ تجویز کریں۔" ملکہ قیصر نے متردد سے انداز میں کہا۔

"تو پھر سنیئے۔" شہزادہ کنگ نے آہستہ سے کہا۔ "آپ جانتی ہیں کہ انگریز دریائی بندرگاہ (ہانگ کو) پر ایک تجارتی چوکی قائم کرنا چاہتے ہیں جس کے لیے انہیں فرزندِ آسمان ہی اجازت دے سکتے ہیں۔ آپ مصالحانہ گفتگو کے دوران اجازت دینے کی شرط یہی رکھیئے کہ وہ بیرونی قلعوں کو خالی کر دیں۔"

اب ملکہ قیصر نے خاص تبسم کے ساتھ اسے دیکھا۔ یہ اس کے علم سے مرعوب ہو جانے کی علامت تھی تا کہ اسے محسوس ہوا تھا کہ دنیا میں کوئی اور بھی اس سے بڑھ کر سوچ سکتا ہے۔ پھر اس موضوع پر بڑی طویل گفتگو ہوئی۔ ملکہ قیصر نے شہزادہ کنگ کو سیاسی معاملات میں اپنا اتالیق مان لیا اور شہزادہ کنگ اس کے حسن و جمال کا اسیر ہو گیا تھا اور جب یہ محفل برخاست ہوئی تو وہ دونوں ایک دوسرے کو اپنے لیے لازمی تصور کر رہے تھے۔ چند دن بعد یہ خبر مشہور ہو گئی کہ فرزندِ آسمان نے انگریزوں کو دریائی بندرگاہ پر تجارتی چوکی قائم کرنے کی اجازت دے دی اور لارڈ ایلگن نے دارالحکومت کے بیرونی قلعے خالی کر دیئے۔ اس کامیابی کے بعد شہنشاہ ایک مرتبہ پھر ملکہ قیصر کا بے دام غلام بن گیا۔ اب پھر وہی دن تھے وہی حسن پرست شہنشاہ سین فینگ وہی اقتدار کی طالب ملکہ قیصر، وہی این تی بائی۔ وہی جنگ لو۔ ہاں اب کبھی کبھی خوبصورت شہزادہ کنگ بھی ملکہ قیصر کے ساتھ نظر آنے لگا۔ اور ملکہ جو شہنشاہ کے عقب سے خود اقتدار ہاتھ میں لینے کی تمنائی تھی۔ ان سب کو مطمئن کرنے لگی۔ یہی سب تو اس کے دست و بازو تھے۔ این تی بائی اپنی سابقہ خدمات کی بدولت ملکہ قیصر کا معتمد خاص بنتا جا رہا تھا۔ اب اس کی بدولت شاہی محل میں نئی نئی محفلیں منعقد ہوتیں۔ عجیب و غریب تماشے دکھائے جاتے جن میں سے متعدد کو ملکہ قیصر نے بے حد پسند کیا اور اسی کی پسند کے باعث شاہی خاندان کے کئی لڑکوں اور لڑکیوں نے ان میں حصہ لیا۔ اس طرح شاہی محل میں وہ ہونے لگا جو کبھی نہ ہوا تھا مگر کسی کو لب ہلانے کی مجال نہ تھی۔ ہاں ادھر ادھر سرگوشیاں ہو رہی تھیں کہ شاہی محل اکھاڑہ بن گیا ہے۔ اب ملکہ قیصر حقیقت میں ایک ملکہ کی حیثیت سے کبھی این تی بائی کے اور کبھی جنگ لو کے ہمراہ نت نئے لباس پہن کر تفریح کرتی۔ کبھی کسی تنہا گوشہ میں جاتی کبھی دریا کے کنارے چہل قدمی کرتی۔ پھر وقت کے ساتھ ساتھ وہ ان کے اعزاز بڑھاتی گئی۔ آخر اس نے این تی بائی اور جنگ لو کو قیمتی ہیرے اور نگینے عطا کیے جو اقتدار اور شاہی رفاقت کی علامت تھے۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ ملکہ قیصر شہنشاہ کی آڑ میں حکومت کرتی رہی اب اندر اور باہر کسی اور کا راج ممکن نہ تھا۔ ہر طرف ملکہ قیصر ہی کا سکہ

چلنے لگا۔ اس کی دیکھا دیکھی محل کا رنگ بدلنے لگا اور ہر فرد خود کو اس کے رنگ میں رنگنے لگا۔ آہستہ آہستہ این تی ہائی کی بدولت شاہی محل کے اندر جنسی تقریبات منعقد ہونے لگیں۔ ان پر کثیر رقمیں خرچ کی جاتیں۔ کبھی یوں بھی ہوتا کہ ملکہ قصر کے نام پر چندہ جمع ہوتا اور کبھی کبھی ان کے اخراجات ملکہ خود برداشت کرتی۔ یہ تقریبات باقاعدہ ہوتیں ان میں این تی ہائی نوجوان لڑکے لڑکیوں کو باقاعدہ جنسی تربیت دیتا جب تربیت مکمل ہو جاتی تو نوجوان لڑکیاں معمر سرداروں کی اور نوجوان لڑکے خواتین کی آتش نفس کو بجھاتے شاہی خاندان کی خواتین جوان لڑکوں سے صحبت کرتیں ان کی لاشیں رات ہی رات میں ٹھکانے لگا دی جاتیں۔ ملکہ قصر عیش و عشرت میں گم تھی اور شہنشاہ سین فینگ اس کی نازبرداری میں منہمک۔ کچھ ہی عرصہ بعد ملکہ نے اپنے دوسرے بیٹے چیو من کو جنم دیا جس کا باپ این تی ہائی تھا جسے اس بات پر فخر تھا کہ ملکہ قصر کے بطن سے اس کے بیٹے نے جنم لیا ہے۔ نت نئے واقعات ظہور پذیر ہوتے گئے۔ ملکہ قصر کا اقتدار مضبوط ہوتا گیا۔ شہنشاہ اگرچہ اور دیگر کنیزوں کو بھول کر اسی کے اشاروں پر ناچتا رہا۔ ملکہ کے حسن و جنسی کشش میں غیر معمولی اضافہ ہوتا گیا اور وہ بڑے خوبصورت انداز سے اپنے تمام عاشقوں کو مطمئن کرتی رہی اور وقت گزرتا رہا لیکن معاہدہ کے چند ماہ بعد ہی مغربی اقوام نے مزید مراعات کے لیے مطالبہ شروع کر دیا جس کے نتیجہ میں پھر جھگڑے کھڑے ہو گئے۔ ملکہ قصر باقاعدہ سیاسی معاملات میں مداخلت کر رہی تھی مگر اس کی ایک نہ چلی۔ انگریزوں نے پھر دارالحکومت کے بیرونی قلعوں پر قبضہ کر لیا۔ شاید انہیں خیال ہوگا کہ اس مرتبہ پھر مصالحانہ گفتگو ہوگی اور پھر انہیں نئی مراعات دے کر قلعوں کو خالی کرنے کی شرط پیش کی جائے گی اور شاید یہی ہوتا مگر ملکہ قصر نے ڈٹ کر مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس رات اس نے شہنشاہ سین فینگ سے طویل گفتگو کی۔ اس وقت جنگ لو۔ این تی ہائی اور شہزادہ کنگ ملکہ قصر کے حامی تھے مگر شہزادہ پی، شہزادہ چنگ اور چین کی ایک متنفذ شخصیت سوشن مغربی اقوام سے مصالحانہ گفتگو کے حق میں تھے۔ بڑی طویل بحث ہوئی۔ سوشن نے بڑی جرأت سے کام لے کر کہا۔

"ملکہ قصر! میں آپ سے گزارش کروں گا کہ آپ اس موقع پر ملکی معاملات میں دخل نہ دیں۔"

ملکہ قصر سخت چراغ پا ہو گئی اگر بروقت شہزادہ پی بات نہ سنبھالتا تو معاملہ بگڑ جاتا۔ اس نے جلدی سے کہا۔

"ملکہ قصر! سوشن کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں انگریزوں سے ان شرائط پر بات کرنی چاہیے کہ مسئلہ الجھ نہ جائے۔"

"آپ لوگ صاف کہہ دیجیے کہ ہم ہر وہ بات تسلیم کر لیں جو یہ لوگ ہم سے منوانا چاہتے ہیں۔ ہم اپنے ملک کے گوشہ گوشہ میں انہیں عیسائیت کی تبلیغ کی اجازت دے دیں اور وہ لوگ تجارت و تبلیغ کے ذریعہ اپنی قوت بڑھا لیں۔"

ملکہ قصر نے غصے سے کہا۔ سب خاموش رہ گئے مگر این تی ہائی نے کہا۔

"ملکہ قصر کا فرمان بجا ہے۔ اگر آج ہم کمزور ہو گئے تو یہ غالب آ جائیں گے لہٰذا ہمیں مقابلہ کرنا ہے۔"

یہ بحث چلتی رہی اور شہنشاہ سین فینگ خاموش تماشائی کی حیثیت سے تکتا رہا۔ اس میں جرأت نہ تھی کہ ملکہ کے خلاف فیصلہ کر دیتا اور نہ اتنی ہمت تھی کہ شہزادہ پی، شہزادہ چنگ اور سوشن کو خاموش کر دیتا۔ آخر اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ملکہ قصر نے اسی کی زبان سے جنگ کا اعلان کر دیا..... اور پھر منگولوں کی ایک جماعت حملہ آوروں کی جانب روانہ کر دی گئی۔ اس مقابلہ میں انگریزوں کے متعدد افراد قتل ہوئے جس سے ان کی فوج غضبناک ہو کر آگے بڑھنے لگی۔ ابھی تک شہنشاہ سین فینگ ملکہ قصر کے تدبر و سیاسی سوجھ بوجھ پر بھروسہ کیے ہوئے تھا مگر اس صورتحال نے اسے بوکھلا کر رکھ دیا۔ ایک طرف شاہی محل کے مدبرین شہزادہ پی، شہزادہ چنگ اور ایک بااثر رئیس سوشن اس بات کے مخالف تھے اور ان کے ہم خیالوں میں برابر اضافہ ہو رہا تھا۔ دوسری طرف ملکہ اس کے قلب و ذہن پر مسلط تھی مگر انگریزوں کی زبردست پیش قدمی کی خبر نے اس کے حواس معطل کر دیے۔ اور اب راہِ فرار کے سوا کوئی چارہ نہ تھا اس نے ملکہ قصر کی مزاحمت کے باوجود روپوش ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ اس وقت شہزادہ کنگ کو ان حملہ آوروں سے مصالحانہ گفتگو کے لیے چھوڑ کر شاہی خاندان کے افراد فرار ہو گئے۔ ان میں وہ ہستیاں بھی شامل تھیں جو ملکہ قصر کی بے جا مداخلت پر معترض ہوئی تھیں اور عین اس وقت جب حملہ آور دارالحکومت سے چند میل فاصلے تک پہنچ گئے شہنشاہ سین فینگ بادشاہ بیگم ساکوتہ، ملکہ قصر یہونالا اور بہت سے دوسرے افراد نے اپنا سفر شروع کر دیا اور جس وقت وہ صرف بیس میل کے فاصلے پر پہنچے تھے تو شاہی محل سے بلند ہونے والے شعلوں کو بخوبی دیکھ سکتے تھے۔ انہوں نے یہ کربناک منظر دیکھا اور پھر سفر کرنے لگے۔ بڑا طویل فاصلہ طے کرنے کے بعد شاہی قافلے نے جیہول کے مقام پر قیام کیا۔ ملکہ قصر کی زندگی یہاں پر کچھ عجب تھی۔ ایک طرف شہنشاہ کے مصاحبین جنہیں اس کا اقتدار گوارہ نہ تھا۔ وہ در پردہ اس کی مخالفت کر رہے تھے دوسرے پیہم شکستوں اور سیاسی معاملات میں اس کی دخل اندازی کے بعد کام بگڑ جانے سے شہنشاہ پر اس کا کوئی اثر باقی نہ رہا تھا۔ علاوہ ازیں جنسی بے اعتدالیوں نے اسے اتنا کمزور کر دیا تھا کہ اب معالجین نے اسے مسلسل آرام اور کنیزوں سے الگ رہنے کی ہدایت کی تھی۔ ایسے میں ملکہ قصر

محسوس ہوتا کہ اس کا ستارہ گردش میں ہے۔ اس وقت شہزادہ لی، شہزادہ چینگ اور سوشن نے بڑا زبردست کارنامہ انجام دیا۔ انہوں نے ملکہ تقر کے خلاف عجیب و غریب سازش کی اور کسی طرح شہنشاہ کے کان میں یہ بات ڈال دی کہ ولی عہد تنگ چیہہ دراصل جنگ لو کا فرزند ہے۔ کمزور و ناتواں شہنشاہ کے غیظ و غضب کی انتہا نہ رہی۔ ایک روایت کے مطابق وہ بے ہوش ہو گیا اور دوسری روایت کے مطابق اس نے ملکہ تقر ہی کو طلب کیا ... وقت سازشی خوش تھے ... رہے تھے کہ ... سے نجات ملنے والی ہے مگر ملکہ تقر کا جواب تھا کہ وہ شہنشاہ کے ہر سوال کا جواب خلوت ہی میں دے گی۔ اس وقت عام اس کا مطلب نہ سمجھ سکے مگر حقیقت یہ ہے کہ کسی کو بھی علم نہ تھا کہ یہ بے پناہ حسن رکھنے والی عورت کن صفات کی مالک ہے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ شہنشاہ سین فینگ اور ملکہ تقر کی تنہائی میں کیا گفتگو ہوئی۔ بس دیکھنے والوں نے دیکھا کہ خلوت میں طلب کی جانے والی ملکہ تقر تمام شب شہنشاہ کی خواب گاہ میں رہی اور دوسری صبح شہنشاہ پھر اس کے سحر میں آچکا تھا اور ملکہ نے پہلا کام یہ کیا تھا کہ ولی عہد تنگ چیہہ کو جائز وارث تخت قرار دینے کے لیے شہنشاہ سین فینگ سے دستخط لے لیے اور شاہی مہر اپنے قبضہ میں کر لی جس کے باعث ثبت ہونے کے بعد ہی فرمان احکام سمجھے جاتے تھے۔ اب شہنشاہ کی کیفیت اس چراغ کی مانند تھی جو گل ہونے سے قبل بھڑکتا ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ داد عیش دینا چاہتا تھا جس کے لیے اسے صرف ملکہ تقر کی طلب تھی چند یوم اسی طرح گزر گئے۔ ملکہ تقر اس پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کی کوشش کرتی تھی اور مخالفین باریابی کی اجازت طلب کرتے رہے۔ آخر ایک دن شہنشاہ سین فینگ نے شہزادہ لی، شہزادہ چینگ اور سوشن کو طلب کیا اور کہا۔

"معززین! ہم ملکہ تقر کے فرزند تنگ چیہہ کو تخت کا وارث قرار دے چکے ہیں۔ ملکہ تقر نے یقین دلا دیا ہے کہ وہ ہمارا جائز بیٹا ہے۔ لہٰذا ہم حکم دیتے ہیں کہ آئندہ کوئی اس موضوع پر بات نہ کرے۔"

تینوں سازشیوں کے منہ اتر گئے مگر دوسرے ہی لمحے سوشن نے پینترا بدلا اور عرض کیا۔

"فرزند آسمان! ہمیں ولی عہدی سے کوئی غرض نہیں۔ ہم تو تخت کی بقا چاہتے ہیں اور اس کے لیے مناسب ہے کہ آپ ہم تینوں کو مشترکہ طور پر ولی عہد تنگ چیہہ کا نگران و اتالیق قرار دے دیں۔"

"ہاں فرزند آسمان!" شہزادہ لی نے کہا "ہم شہزادے کے جوان ہونے تک ہر طرح اس کی حفاظت کریں گے۔"

یہ بات شہنشاہ کے نزدیک قابل اعتراض نہ تھی کم سن شہزادوں کو کسی نہ کسی کی نگرانی میں دیا ہی جاتا تھا لہٰذا شہنشاہ نے یہ فرمان جاری کر دیا کہ کم سن شہزادہ تنگ چیہہ ملکہ تقر کے بجائے ان تینوں معززین کی نگرانی میں رہے گا مگر اس پر شاہی مہر نہ تھی۔ اور اس اعلان کے ساتھ ہی شہنشاہ سین فینگ کی حالت بگڑ گئی۔ اور وہ موت اور زندگی کی کشمکش میں گرفتار تھا۔ ادھر ملکہ تقر کو اس فرمان کا علم ہوا تو اس نے ایک خفیہ قاصد کے ذریعہ مفصل حالات پر مشتمل ایک رپورٹ شہزادہ کنگ کو روانہ کی جو صرف اس کا سیاسی ... بلکہ ایک ... تھی ... اسے جب ... کا علم ہوا اس نے شاہی پرچم والی فوج کو جنگ لو کی قیادت میں جیہول کی طرف روانہ کر دیا۔ یہ وقت بڑا رقت آمیز تھا۔ ادھر شہنشاہ سین فینگ دم توڑ رہا تھا ادھر سازشی اپنی کارروائیوں میں تیزی سے مصروف تھے کہ اب ہر ممکن طریقہ سے ملکہ تقر سے نجات پانا چاہتے تھے۔ ادھر اچانک جنگ لو کی مضبوط فوج پہنچ گئی اور انہیں علم ہو گیا کہ محافظ دستہ اور فوج کی کثیر تعداد ملکہ تقر کی حمایت میں ہے چنانچہ یہ سازشیں سرد پڑ گئیں۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ شہنشاہ نے اسی موقع پر ساکوتا کو بادشاہ بیگم اور یہونالا کو ملکہ تقر کا خطاب دیا تھا۔ اس کے بعد وہ انتقال کر گیا۔ یہ وہ نازک وقت تھا کہ باغی سردار اور شاہی خاندان کے معززین پھر سر اٹھا سکتے تھے مگر اس وقت ملکہ تقر کی ذہانت کام آئی۔ اس نے اعلان کیا "شاہی رواج کے مطابق شہنشاہ کا جنازہ لے جایا جائے اور شاہی خاندان کی رسم کے عین مطابق تینوں معززین شہزادہ لی، شہزادہ چینگ اور سوشن ولی عہد کے نگراں کی حیثیت سے جنازہ کے ساتھ آہستہ خرامی سے سفر کرتے ہوئے پیکنگ پہنچیں۔"

□

یہ حکم دینے کے بعد ملکہ تقر خود بڑی تیز رفتاری سے پیکنگ پہنچ گئی جہاں اس نے سب سے پہلے شہزادہ کنگ سے تخلیہ میں ملاقات کی اس وقت گفتگو کیا ہوئی یہ وضاحت نہیں ملتی مگر اسی شام شہزادہ کنگ نے سرداروں کا ایک اجلاس طلب کیا جس میں باقاعدہ اعلان کیا گیا کہ جب تک مغربی اقوام دارالحکومت پر قابض ہیں اور جب تک ولی عہد شہزادہ تنگ چیہہ بالغ نہ ہو اس وقت تک بادشاہ بیگم اور ملکہ تقر مشترکہ حکومت کریں گی۔ شہزادہ کنگ کے اس اعلان کے واضح معنی یہی تھے کہ بادشاہ بیگم ساکوتا نہ سیاسی سوجھ بوجھ رکھتی ہے اور نہ فہم و ادراک لہٰذا حکومت صرف ملکہ تقر یہونالا کرے گی اور در پردہ احکامات شہزادہ کنگ دے گا اس طرح بڑی خوبصورتی سے اقتدار بھی اس کے ہاتھ میں آجائے گا اور خوبصورت یہونالا بھی۔ ملکہ تقر نے اس اعلان کا خیر مقدم کیا لیکن وہ کیا سوچ رہی تھی یہ کسی کو علم نہ تھا۔ تین دن گزر گئے۔ یہاں تک کہ شہنشاہ سین فینگ کا تابوت اور شاہی جلوس جیہول سے پیکنگ پہنچ گیا اور اس کی تجہیز و تکفین اس کے شایان شان انداز سے کی گئی پھر دربار عام ہوا اور ملکہ تقر نے پیکنگ قوم سے خطاب کیا۔

"میرے ہم وطنو! آپ سب کو علم ہو گیا ہے کہ بادشاہ بیگم اور مجھے

شریک طور پر حکمران مقرر کیا گیا ہے.........." لیکن ابھی ملکہ قیصر نے
اتنا ہی کہا تھا کہ شہزادہ لی، شہزادہ چنگ اور سوشن احتجاج کے طور پر کھڑے
ہو گئے کیونکہ شہنشاہ کے فرمان کے مطابق انہیں یہ توقع تھی لیکن ابھی
وہ کچھ کہہ نہ پائے تھے صرف کھڑے ہوئے تھے کہ ملکہ قیصر نے ان کے
نوجوان سر فوجی دستے کو اشارہ کیا اور حکم دیا۔

"ان غداروں کو گرفتار کر لیا جائے۔"

یہ تینوں سردار پکڑ لیے گئے۔ پھر ملکہ قیصر نے ان کی سزاؤں کا حکم بھی
سنا دیا۔ اس نے کہا۔

"چین کے عظیم باشندو! آپ سب جانتے ہیں یہ سردار کون ہیں۔
سوشن کا ذہن کام کرتا ہے اور یہ دو شہزادے اس پر عمل کرتے ہیں۔
ان کی باقاعدہ ایک جماعت ہے جو سلطنت کی بقا اور ملک کے امن کے
لیے سب سے بڑا خطرہ ہیں۔ لہٰذا میں حکم دیتی ہوں کہ سوشن کا سر تن سے
جدا کر دیا جائے۔ اور دونوں شہزادے لی اور چنگ شاہی خاندان کی
عظمت کے مطابق موت کے گھاٹ اتارے جائیں۔" (یعنی گلے میں
ریشمیں پھندے ڈال کر خودکشی کر لیں) اس اعلان اور ان تین باغیوں
کی عجیب و غریب موت نے عوام کے دلوں پر ملکہ قیصر کا رعب طاری کر دیا۔
اور وہ جاہ چین دراصل اس کا ہر حکم ماننے لگے اور ملکہ قیصر جو اب این تی ہائی،
چنگ لو اور شہزادہ کنگ کی محبوبہ تھی۔ چین کے پانچ سالہ بادشاہ اور
فرزند آسمان تنگ چیہ کی آڑ لے کر خود حکومت کر رہی تھی، اور اس کے جوان
ہونے تک وہی ملکہ تھی وہی حکمران۔

چند برس ان حال کرنے کے بعد مطلق العنانی شہزادہ کنگ کی فطرت
بنتی گئی گو کہ ملکہ قیصر اسے وہی انعامات و عزت عطا کرتی جس کا وہ حق دار تھا۔
اس نے قدم قدم پر اس کی پذیرائی کی۔ سلطنت کے کاموں میں اس کے
وسیع تجربات و سیاسی سوجھ بوجھ سے فائدہ اٹھایا مگر شہزادہ کنگ اپنے
بے شمار احسانات کے جواب میں اسے صرف اپنی مرضی کا تابع دیکھنا
چاہتا تھا۔ کوئی اور اس پر تصرف رکھے یہ اسے گوارا نہ تھا۔ شاید سیاسی
کشیدگی تو ان پر اثر انداز نہ ہوتی مگر شہزادہ کنگ کے لیے این تی ہائی کی
شخصیت ناقابل برداشت تھی۔ اس کا خیال تھا شروع دن سے ہی اس
طبیب کی بدولت شاہی دربار سازشوں کا اکھاڑہ بنا ہوا ہے۔ وہی ہے
جس کی بدولت محل میں جنسی بے اعتدالیاں پیدا ہوئیں اور اسی نے شہنشاہ
سین فینگ کو غلط راہ پر ڈال کر شرمناک کھیل کھیلے اور شاہی گھرانے کے
ہر فرد کو عیش و عشرت کا دلدادہ بنا دیا۔ شہزادہ ہر پہلو سے غور کرتا اور ہر
انداز سے این تی ہائی اسے بدترین انسان نظر آتا مگر یہی شخص ملکہ قیصر کو آج
بھی بالکل پہلے دن کی طرح عزیز تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس کا سہارا لے کر اس نے اقتدار
حاصل کیا تھا۔ لہٰذا ان دو شخصیتوں کا تصادم عجیب رنگ اختیار کر رہا تھا۔
شروع شروع میں شہزادہ کنگ نے نرمی سے ملکہ قیصر کو قائل کرنا چاہا انہوں
نے کئی مرتبہ این تی ہائی پر گفتگو کی مگر ملکہ قیصر ایک لفظ اس کے خلاف سننے
کے لیے تیار نہ تھی پھر شہزادہ کنگ نے باقاعدہ اس صورت حال کے خلاف
آواز بلند کی مگر سب بے سود۔ این تی ہائی عیش و عشرت کے نت نئے
انداز اختیار کرتا رہا۔ ملکہ قیصر آج بھی وہی تھی۔ وہی بے پناہ حسن وہی مسحور
کر دینے والی کشش اور خوبرو و تنومند این تی ہائی آج اسی طرح اس کی خلوتوں
کا ساتھی تھا۔ اس کا نتیجہ کشت و خون کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس شام ملکہ قیصر
ایک جشن میں مصروف تھی جب شہزادہ کنگ نے ایک انوکھی ترکیب
سوچی اور بادشاہ تنگ چیہ سے اقتدار کا سہارا لے کر این تی ہائی کے قتل کے
حکم پر دستخط لے لیے۔ یہ شب ملکہ قیصر کے لیے قیامت کی رات تھی۔ این
تی ہائی کی اچانک موت نے اسے جیسے دیوانہ کر دیا۔ اس کے ذمہ دار دو
فرد تھے شہزادہ کنگ اور بادشاہ تنگ چیہ مگر اب تک شہزادہ کنگ ایسی حیثیت
اختیار کر چکا تھا کہ ملکہ قیصر اس کا کچھ نہ بگاڑ سکتی تھی اور اب بادشاہ تنگ چیہ وہ بھی ملکہ قیصر
کے دست قدرت سے باہر تھی جنہ نے این تی ہائی کا سوگ منانے کے اور بے پناہ حسن کے
احساس نے ملکہ قیصر کو پھر اسی راہ پر ڈال دیا اور اب اس کا راز دار رفیق
لی لین تنگ تھا جو ہمیشہ شاہی محل کی خبریں اسے دیتا تھا۔ یوں وقت تیزی
سے گزرتا رہا بظاہر مطمئن مگر شہزادہ کنگ اور ملکہ قیصر دونوں ہی ایک دوسرے
کی تاک میں رہے کہ کب وقت آئے اور ایک دوسرے کو کاٹ دیں۔ دن
ہفتے، مہینے اور سال گزرتے رہے۔ اور ولی عہد شہزادہ تنگ چیہ
سولہ برس کا ہو گیا اور دستور کے مطابق اس کی باضابطہ بادشاہت کا اعلان
کر دیا گیا۔ اب وہ فرزند آسمان تھا۔ ملکہ قیصر کو یقین تھا کہ درپردہ حکومت وہ
خود ہی کرے گی اور اس کا بیٹا اس کے اشاروں پر چلے گا مگر تنگ چیہ
کو اس کی یہ روش پسند نہ تھی اور یہ ملکہ قیصر کی زندگی کا وہ پہلا المیہ تھا جس نے
شخصیت کو ہلا دیا۔ اب ایک طرف اقتدار تھا دوسری طرف اپنا بیٹا جسے
دونوں ہی عزیز تھے۔ ادھر اس نے برسوں شاہانہ زندگی گزاری تھی
اور وہ اب بھی حکومت کی تمنائی تھی۔ وہ سنجیدگی سے سوچنے لگی کہ وہ ماں بن
جائے یا ملکہ۔ اگر وہ ماں بن گئی تو ملکہ قیصر کا خطاب کسی اور کو مل جائے گا اور
وہ گمنامی میں چلی جائے گی۔ وہ سوچتی رہی مگر کوئی فیصلہ نہ کر سکی تب
اس نے لی لین تنگ کو طلب کیا۔ اس نے کہا۔

"ملکہ قیصر! جیسے بھی ممکن ہو آپ اپنا اقتدار برقرار رکھیے اور جذبات
میں نہ آئیے۔"

"ہم یہی چاہتے ہیں۔" ملکہ قیصر نے سختی سے کہا۔ "اس وقت کی ذرا
سی نرمی ہمیں محکوم بنا دے گی۔ ہم یہ سوچ رہے ہیں کہ تنگ چیہ کو کس طرح

جاؤ سے بتا میں گے"
"آپ کو اس کی ضرورت نہیں ہے۔" لی لین تنگ نے کہا۔ "تم زندہ
آسمانی کنیزوں سے داد عیش دینے لگے ہیں اور یہ زندگی انہیں حکومت
کے قابل نہ چھوڑے گی۔"
اس بات نے ملکہ قیصر کا تمام تردد ختم کر دیا اور وہ حسین ترین
کنیزوں کو تونگ چیہ کے محل میں بھیجنے لگی یہاں تک کہ نشہ اور
شباب نے مل کر تنگ چیہ کو بری طرح زیر کر لیا۔ ملکہ قیصر پھر حکومت
کرنے لگی اور چند برس بعد لوگوں نے دیکھا کہ وہ اپنے جوان بیٹے کی موت پر
افسردہ نہیں تھی کہ مطلق العنان حکمرانی کی سرمست تھی۔ ایک بار پھر وہی صورت حال
پیش آئی۔ اس نے لی لین تنگ سے مشورہ کیا۔ زیر بحث معاملہ ولی عہدی کا تھا
لی لین تنگ نے کہا۔
"ملکہ قیصر گو شاہی خاندان میں کئی شہزادے موجود ہیں مگر ہمیں بہت
محتاط قدم اٹھانا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ نیا شہنشاہ آپ سے متفق نہ ہو۔"
"ہاں۔" ملکہ قیصر نے چند لمحے سوچنے کے بعد جواب دیا۔ "اسی لیے ہمارا
خیال ہے کہ شہزادہ چین کے شیرخوار فرزند کوانگ سو کو شہنشاہ بنانے کا اعلان
کیا جائے۔"
"آپ کا ارشاد بجا ہے۔ کوانگ سو کے بالغ ہونے میں سولہ
برس کا عرصہ ہے۔ اس طرح بغیر کسی مخالفت کے آپ حکومت کر سکیں گی۔"
وہ دونوں دیر تک غور کرتے رہے۔ پھر جنگ لو کو طلب کیا گیا
اور اس شب بڑے طویل مشورے کے بعد اگلی صبح ولی عہدی کا اعلان
کر دیا گیا اور شہزادہ چین کے شیرخوار فرزند کوانگ سو کو چین کا باضابطہ
بادشاہ بنا کر فرزندِ آسمان بنا دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ اعلان کیا گیا
کہ اس کے بالغ ہونے تک حکومت کا بار ملکہ قیصر اٹھائیں گی۔ لہٰذا اقتدار پر
ملکہ قیصر کی گرفت ایک بار پھر مضبوط ہو گئی اور وہ بے فکر ہو کر پھر حکومت
کرنے لگی۔ بظاہر وہی شب و روز تھے۔ وہی تقریبات وہی چاہنے والوں
کا ہجوم اور وہی اس کے مطمئن کرنے کے حسین انداز لیکن چند گھڑیوں کے لیے
ملکہ قیصر تنہا ہوتی تو سوچتیں ایک اداس انداز اختیار کرتیں مگر وہ سر جھٹک کر
پھر زندگی کے ہنگاموں میں گم ہو جاتیں۔ کبھی جنگ لو کبھی لی لین تنگ کے
سہارے اقتدار کی پٹی آنکھوں پر باندھے وہ زندگی کا کٹھن سفر طے کرتی
رہی اس دوران کئی نئی باتیں ظہور میں آئیں۔ ملکہ قیصر نے اپنی بڑھتی ہوئی
عمر کے احساس سے یا اپنے شباب و حسن کو قائم رکھنے کے لیے خوبصورت
اور نوجوان لڑکیوں سے ٹھٹھے لگانے شروع کر دیے۔ ان لڑکیوں کو ملکہ قیصر کی خوابگاہ
میں بھیجنے سے قبل باقاعدہ آداب سکھائے جاتے۔ ملکہ قیصر کا خیال تھا کہ بڑھتی
ہوئی عمر کو روکنے اور حسن کو برقرار رکھنے کے لیے کم عمر لڑکیوں کی صحبت مفید
ہوتی ہے۔ لہٰذا شاہی محل میں اس نئے کھیل نے جنم لیا۔ پھر اس نے اپنی
شاہانہ طبیعت کی تسکین کے لیے اس قصر کی از سر نو تعمیر شروع کر دی جسے
سین ینگ کے مزار کے وقت یورپی حملہ آوروں نے نذرِ آتش کر دیا تھا
اور اسی زمانہ میں چین نے جاپان سے شکست کھائی اور ملکہ قیصر کی غلطی اس
کے باعث قوم اس سے ایک مرتبہ پھر بدگمان ہو گئی وہ پھر ناقابل برداشت
سمجھی جانے لگی۔ ادھر چین میں غیر ملکی قوتوں کے خلاف خفیہ سرگرمیاں
ہونے لگیں۔ ادھر ملکہ قیصر کی روش سے عام نفرت کی جانے لگی مگر اس کے
اقتدار کے سبب کسی کو کچھ کہنے کی جرأت نہ تھی۔ یوں ماہ و سال گزرتے
گئے۔ یہاں تک کہ شہزادہ کوانگ سو جوان ہو گیا اور لوگوں نے اسے اپنا
شہنشاہ تسلیم کر لیا۔ اب چین کا حکمران کوانگ سو تھا۔ ملکہ قیصر کو یقین تھا
نوجوان اس کے احکامات پر چلے گا مگر اپنی حکومت کے پہلے دن جب
نوجوان کوانگ سو نے قوم سے خطاب کیا تو ملکہ قیصر چونک پڑی۔ یہ نوجوان شہنشاہ
جدید خیالات کا مالک تھا وہ چین کو جدید رنگ میں رنگ کر یورپی طاقتوں
کے مقابل بنانا چاہتا تھا۔ اس اندازِ فکر پر عوام نے داد تحسین پیش کیا یہاں تک
مانچو قبائل بھی اس کے ہم خیال تھے ملکہ قیصر کے جذبات کو دوسری مرتبہ بری
طرح ٹھیس لگی۔ اب مانچو قبائل بھی اس سے برگشتہ تھے اور نیا شہنشاہ
بھی اس کے اطوار کو ناپسند کرتا تھا۔ اس وقت ملکہ قیصر کی عمر ۵۵ برس سے
تجاوز کر رہی تھی مگر اس کا بے پناہ حسن اور جسمانی کشش بدستور تھی۔ شاید
اس لیے بھی اسے یقین تھا کہ نوجوان شہنشاہ کوانگ سو اس کے اشاروں پر
ناچے گا اور جو بات اس کا اپنا بیٹا تنگ چیہ محسوس نہ کر سکا وہ یہ محسوس کرے
گا مگر کوانگ سو اس سے زیادہ بادشاہ بیگم صاحبہ کی طرف مائل تھا۔ وہ ملکہ
کو نہ احترام دیتا نہ اس سے قدم قدم پر مشورہ طلب کر کے اس کے اہم ہونے
کا احساس دلاتا۔ اب وہ فرزندِ آسمان تھا چین کا حاکم تھا مگر ملکہ قیصر بھی کوئی
معمولی عورت نہ تھی۔ ابھی با اقتدار سردار اس کے ساتھ اور فوج اس کے
مجرب جنگ لو کے ماتحت تھی۔ لہٰذا چند دن بعد ہی اہل چین نے سنا
کہ نوجوان کوانگ سو کو ایک مذہبی تقریب میں شرکت کے بعد کسی خاص
وجہ سے معزول کر دیا گیا ہے۔ اور جب تک اس کے لیے آخری فیصلہ نہ ہو
حکومت ملکہ قیصر کرے گی۔ شاید ملکہ قیصر کا خیال تھا کہ جس طرح لوگوں نے
تنگ چیہ کے معاملے میں دخل نہ دیا تھا اب بھی وہی ہوگا اور وہ اصل میں
اس بات کے عادی تھے لیکن پیکنگ کے غیر ملکی سفیروں نے اس موقع
صدائے احتجاج بلند کی اور گلی گلی شور مچنے لگا۔
"شہنشاہ کوانگ سو کا اقتدار بحال کرو۔"
اس مداخلت پر ملکہ چراغ پا ہو گئی اس نے پھر اپنے مشیرِ
جنگ لو اور لی لین تنگ اور شہزادہ کنگ سے مشورہ کیا اور کافی لمبے
مشورے کرنے کے بعد تمام غیر ملکی سفیروں کو معہ ان کی بیگمات کے شاہی
محل میں مدعو کیا گیا۔ اس محفل میں کوانگ سو بھی شریک تھا جس نے

سے حکم پہاں سب سفیروں سے ملاقات کی اور بتا دیا کہ شہنشاہ دل کی بیماری میں مبتلا ہے۔ اس دعوت کا کھانا خاطر خواہ اثر ہوا۔ دوسرے ملکہ کی شخصیت اتنی سحر انگیز اور گفتگو اتنی دلآویز تھی کہ سفیر مرعوب ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور رضامند ہو کر لوٹ گئے۔ اب ملکہ تقصر ایک طرف کوانگ سو سے پاک لگائے ہوئے تھی اور دوسری طرف ان سفیروں کی بے جا مداخلت پر مشتعل۔

*

چین کی سرزمین کو غیر ملکی تسلط سے پاک کرنے کے لیے پوشیدہ طور پر جو انجمنیں قائم تھیں اوّل اوّل انہیں باغی اور سازشی تصور کیا گیا لیکن حالات نے وہ رنگ اختیار کر لیا کہ ملکہ تقصر نے خاص پروگرام کے تحت جماعتوں کی پشت پناہی شروع کر دی۔ اس نے ان جماعتوں کے سربراہ کو جمع کر کے خطاب کیا اور کہا۔

"عزیزو! چین کے طول و عرض میں کسی غیر ملکی کو باقی نہ رہنے دو اپنی قوت بڑھاؤ"

چنانچہ اس زمانہ میں غیر ملکیوں کا قتل عام ہونے لگا حتیٰ کہ شاہی فوج نے چند وجوہات کی بنا پر پیکنگ میں سفارتی علاقہ کا محاصرہ کر لیا اور بن سلیمان کینڈر کو بے دردی سے قتل کر دیا۔ ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ جنگ لو ملکہ تقصر کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا۔

"ملکہ تقصر! شاہی فوج کو حکم دیجیے کہ محاصرہ اٹھا لیں"

ملکہ نے حیران ہو کر دیکھا اس کا محبوب یہ بات کہہ رہا تھا۔ اس نے کہا

"جنگ لو! تم جانتے ہو کہ ان غیر ملکیوں نے دو برس قبل ہمارے معاملے میں مداخلت کی تھی۔"

"جی۔ میں جانتا ہوں۔" جنگ لو نے کہا "مگر اس گستاخی پر اتنا شدید انتقام نہ لیجیے۔"

"ہم چاہتے ہیں کہ ایک بھی غیر ملکی زندہ نہ رہے جبکہ ہمارے مشیر تمہارے ساتھ ہیں تم ہمیں مت روکو۔"

"ملکہ تقصر! اس کا انجام برا ہوگا" جنگ لو نے دھیمے سے کہا۔

"تم وزیر جنگ ہو۔" ملکہ بولی۔ "مگر یاد رکھو حالات کو ہم سے بہتر نہیں سمجھ سکتے۔"

"ملکہ تقصر" جنگ لو نے دھیرے سے کہا۔ "میں صرف گزارش کر رہا ہوں۔ مشورہ نہیں دے رہا۔"

ملکہ نے یہ گزارش قبول کر لی مگر جلد ہی نتیجہ اس کے سامنے آ گیا اس مرتبہ تمام یورپی طاقتوں کی مشترکہ فوج نے بڑی دلیری سے پیشقدمی کر کے پیکنگ کا محاصرہ کر لیا۔ یہ حملہ بڑا غیر متوقع اور سخت تھا۔ ملکہ کے ہوش اڑ گئے اور اسے اپنی زندگی میں دوسری مرتبہ شاہی محل سے فرار ہونا پڑا

ایک دن صبح کا وقت تھا کہ گلزار میں ایک اندھی لڑکی آئی اور میرے لیے ایک پھول مالا کنول کے پتے کے نیچے ڈھانک کر لائی۔ میں نے مالا اپنے گلے میں ڈال لی اور میری آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ میں نے اس لڑکی کو چوم لیا اور کہا۔

"تم پھولوں سی اندھی ہو۔ تم کو خود بھی معلوم نہیں کہ تمہارا یہ ہدیہ کتنا خوب صورت ہے۔"

مرسلہ: عبدالرشید انجاریہ

اس نے فوراً لی ہین تنگ کو طلب کیا اور کہا۔

"معزز لی ہین تنگ! ہم چاہتے ہیں کہ کوانگ سو بھی ہمارے ہمراہ ہے ورنہ یورپی طاقتیں اسے پھر تخت پر بٹھا دیں گی اور اس کے ذریعہ ہم سے انتقام لیں گی۔"

"ملکہ تقصر!" لی ہین تنگ نے سرگوشی کی۔ "اس کا انتظام ہو چکا ہے۔ ہمارے تمام ساتھی دہقانوں کے لباس میں چھکڑوں سے سفر کریں گے اور کوانگ سو کو پہلے ہی سخت پہرہ میں بخیر اور محفوظ مقام پر پہنچا دیا ہے۔ اب صرف آپ کی روانگی باقی ہے۔"

ملکہ نے اس کی ذہانت کی تعریف کی پھر جنگ لو کو بلا کر حکم دیا۔

"جنگ لو۔ تمہیں ہر حالت میں پیکنگ میں رہ کر ان اقوام سے صلح کی گفتگو کرنی ہے۔ مصالحت ہو جائے تو ہمیں اطلاع دینا۔"

اور پھر شاہی خاندان کے ان افراد نے سفر شروع کیا جو بڑا تکلیف دہ تھا۔ انہیں اب علم ہوا تھا کہ غلیظ اور غریب زندگی کیا ہوتی ہے۔ کامل دو ماہ سفر کرنے کے بعد یہ لوگ سیان (چین کے شمالی مغربی صوبہ شین سی کے دار الحکومت) پہنچ گئے۔ جہاں جا کر ملکہ تقصر کی پھر وہی زندگی عود کر آئی۔ اٹھارہ ماہ لگاتار اس نے یہاں بھی شاہی محل کی طرح رنگ رلیاں منائیں حتیٰ کہ جنگ لو کی کوششوں سے یورپی طاقتوں کے ساتھ صلح ہو گئی اور یہ لوگ پھر پیکنگ واپس آ گئے جہاں ملکہ تقصر اپنے اقتدار پر پھر مسلط ہو گئی پھر وقت گزرتا رہا۔ اقتدار کی ہوس باقی رہی مگر ملکہ تھکتی گئی۔ عمر بھر کی جدوجہد کی تھکن اسے اب محسوس ہو رہی تھی۔ اس دوران کئی نئی باتیں ظہور میں آئیں۔ بادشاہ بیگم سا کوتہ کا انتقال ہو گیا۔ ملکہ کو کوئی احساس نہ ہوا۔ کوانگ سو مر گیا۔ ملکہ کو بڑا اطمینان اور سکون محسوس ہوا۔ ایک بڑا بوجھ

سینے سے لگا لیا تھا۔ اب جو وراثت کا مسئلہ درپیش تھا۔ جنگ (اور لی ین تنگ مشیر خاص تھے۔ کئی گھنٹے گفتگو کے بعد فیصلہ ہوا کہ شاہی خاندان کے کمسن شہزادے پوئی کو ولی عہد مقرر کیا جائے تاکہ اس کے بالغ ہونے تک ملکہ تسز پھر مطلق العنان حکمراں کی حیثیت سے حکومت کر سکے۔ اس فیصلے کے بعد پوئی کو چین کا شہنشاہ اور فرزندِ آسمان تسلیم کیا گیا اور اعلان کیا کہ اس کے بالغ ہونے تک پھر ملکہ تسز حکومت کریں گی۔ اس طرح اس حسین عورت کو اس عمر میں بھی حکومت کا موقع مل گیا۔ وقت کچھ اور سرک گیا اور ایک دن لی جنگ ہنگ مر گیا۔ اس وقت سنجانے کیوں ملکہ تسز کو محسوس ہوا کہ آج وہ سوگوار ہے غمگین ہے تنہا ہے اور اس نے ملکہ تسز بن کر نہیں بیوہ بن کر اشک بہائے۔ وہ بہتر برس کی تھی مگر اسے جوان اور حسین ہونے کا جو شدید احساس تھا وہ حرفِ غلط کی طرح مٹ گیا۔ زندگی کی وہ سب سے بڑی حقیقت جسے اس نے کبھی تسلیم نہ کیا تھا اسے ماننی تھی کہ ہر چیز فنا ہونے ... جنگ مر گیا۔ وہ بوڑھی ہو گئی یہ بہت بڑا سانحہ تھا۔ ملکہ تسز تھک گئی اور پھر ایک دن اس کا آخری وقت آ گیا۔

ارا کین سلطنت اور نوعمر شہنشاہ پوئی (سرزمین چین کا آخری شہنشاہ جس ... اشتراکی نظام پہ ختم ہوئی) کو بلایا۔ دستور کے مطابق ملکہ تسز کو وصیت کرنا تھی۔ لوگ جوق در جوق جمع ہو رہے تھے۔ سامعین بہت تھے۔ سلطنت کے خیرخواہ موجود تھے اور چین کی سب سے حسین ملکہ دم توڑ رہی تھی اور سب اس کے آخری الفاظ سننے کے لیے بے تاب تھے۔ اس نے اپنا نحیف و نزار ہاتھ بلند کیا اور وصیت کی تو سننے والے چونک گئے حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ چین کی وہ بے پناہ حسین عورت جس نے حسن و جوانی اور اقتدار کی حفاظت کے لیے ہر سختی برداشت کی ہر مشکل سے گزری۔ وہ غیر معمولی صلاحیت رکھنے والی عورت جس نے ملکہ بننے کا عہد کیا اور عمر بھر تگ و دو کر کے اسے نبھایا۔ وہ مطلق العنان ملکہ جس نے نصف صدی چین پر اس طرح حکومت کی کہ اپنے مقابلہ پر کسی کو ٹکنے نہ دیا یہاں تک کہ اپنے بیٹے تنگ چیہ کو بھی راستے سے ہٹا دیا۔ اس کی وصیت عجیب تھی سننے والے متحیر رہ گئے جب اس نے کہا۔

"مجھے آخری بات صرف یہ کہنی ہے کہ کسی عورت کو اقتدار ہاتھ میں لینے کی اجازت نہ دینا۔"

پھر اس کا ... گیا۔ آنکھیں بے نور گئیں اور روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی اور کوئی نہ جان سکا کہ اقتدار کی ہوس رکھنے والی اس عورت نے یہ وصیت کیوں کی؟



برف کی مورتی کی کہانی جو

محبت کے گرم بازوؤں میں بھی نہ پگھل سکی

[illegible]

غلام الثقلین نقوی

تھیں ٹھنڈی خالی انتڑیاں اور بھوک سے کلبلاتی ہوئی انتڑیاں ۔

"اُف! یہ پتھر کا بت - برف کا تودہ - ایک مجسمۂ یخ بستہ؟"

میں نے زور سے کھڑکی کے پٹ بند کر دیئے۔ دیر تک وہیں بیٹھا رہا اور پھر میں نے منہ موڑ کر کھڑکی کی طرف پشت کر لی اور چپ چاپ بھوکی انتڑیوں کے دردناک نغمے سننے لگا۔ اور بیگم کے قدموں کی چاپ کے انتظار میں محو ہو گیا۔

بیگم ہر روز دوپہر کو کھدر کے دسترخوان میں لپٹی ہوئی روٹیاں اور لسی کا گڑوا لے کر آتی تھی۔ روٹیاں اکثر چپڑی ہوئی ہوتی تھیں۔ اور ان کے اوپر بھی ہری مرچوں کی چٹنی لگی ہوتی تھی۔ اور پھر بیگم روٹی عین اس وقت لے کر آتی۔ جب بھوک جسم کے ہر ریشے کا درد بن جاتی اور روٹیوں کے ساتھ کھدر کا دسترخوان کھانے میں بھی کوئی مضائقہ نہ ہوتا کیونکہ اس میں گھی کی باس اور آٹے کے چارے کی خوشبو بھی رچی ہوئی تھی۔

ٹخ ٹخ، ٹخی ٹخی!"

ان بے معنی سے الفاظ میں نا معلوم کیوں اتنا جادو بھرا تھا۔ میں تڑپ گیا۔ بھوک کے مارے کراہتی انتڑیوں کا شور بند ہو گیا۔ میں فوراً گھوما اور کھڑکی کے پٹ کھول کر باہر جھانکنے لگا۔ میری نظروں کے سامنے ایک کھیت تھا جس کے اردگرد کانٹوں کی باڑ لگی ہوئی تھی۔ اس کھیت اور میری بیٹھک کے درمیان تین فٹ کا ایک تنگ راستہ تھا۔ میری بیٹھک کی لمبائی بھی پچیس فٹ ہو گی اور یہ تین فٹ کا تنگ راستہ بھی پچیس فٹ لمبا تھا۔ اور اس سے پرے سنہری گندم سے اٹے ہوئے میدان تھے۔ بنجر مردہ کھیت تھے۔ کیکر، بیری اور کریر کی سوکھی ہوئی جھاڑیاں تھیں۔ آک کے مرجھائے ہوئے پودے تھے۔ اور ببول کے سفید پھلیوں والے تیز دھوپ میں اکڑ رہے تھے۔ ان کھیتوں کے درمیان پڑاؤ تھا۔ ایک طرف سرخ اینٹوں کے ڈھیر لگے تھے۔ جو بھی ریت کے ذرے چمکیلی دھوپ سے جھلملا کر چمک رہے تھے دوسری طرف گڑھے تھے جن میں پتھیرے سانچوں میں کچی اینٹیں ڈھال رہے تھے۔ اور ان کی عورتیں گدھوں پر اینٹیں لاد لاد کر پڑاؤ سے کی طرف لے جا رہی تھیں۔

"ٹخ ٹخ ٹخی ٹخی!"

میرے سینے کے سب جذبات امڈ کر میری آنکھوں میں سمٹ آئے۔ میری آنکھیں موتی رولنے لگیں۔ میں نے کسی کتاب میں پڑھا ہے کہ اگر موتی رولتی آنکھیں جذبات کی شدت سے چمک اٹھیں۔ تو ان کی کشش بے پناہ ہوتی ہے مسمریزم بھی اسے کہتے ہیں۔ معمولی عورت ایک بار ان آنکھوں میں جھانک لے یہاں کا کوئی ہے جو مال کی سحر بھری آنکھوں کے جال سے کون بچ کر نکل سکتا ہے بھلا!

دوسری سرسراہٹ فضا میں تیز تھی۔ پچھاڑ۔ گدھا جس میں شاید تپتی ہی پڑی کی ٹکی سی چھاؤں کا کوئی اثر نہ ہوا تھا۔ فضا سوز شانت سے سر نیہوڑائے کان لٹکائے ٹرٹراتا ہوا چپ چپ چلا آ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کی تھوتھنی اور کان غائب ہونے اور کمزوری بھگت نظر آنے لگی۔ جس پر دونوں طرف اینٹوں کی اوجھل سے سانے بوجھے خالی ہونے سے ہلک رہے تھے۔ پتلی پتلی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ اور دم کسی ننھے منے پنچھی کی طرح بل کھا رہی تھی۔ ابھی دم نظر کے سامنے لہرا رہی تھی کہ ٹخ ٹخ ٹخی ٹخی، کا بے معنی گیت چھیڑنے والا زہرہ فون آہستہ آہستہ ظاہر ہوا۔ تو آنکھوں میں سمٹے ہوئے جذبات میں طوفان بپا ہو گیا۔ رگ رگ میں جھلسا دینے والی آگ بھڑکنے لگی۔

ایک لمحہ اس سانولی پیشانی پر پسینے کے قطرے ستاروں سے بکھرے ہوئے تھے۔ ہونٹوں کا سرخ غازہ ملا ہوا تھا۔ گالوں پر طبعی شفق کی سرخی جھلملا رہی تھی لیکن آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ اندھیرا سا ملگجا - خالی کھیت، ہڑتے کے جھکڑ اور چمکیلی دھوپ میری آنکھوں کا افسوں بیکار ہو گیا۔ جذبات کا لاوا سرد پڑ گیا۔ آگ بجھ گئی۔ اب یہ سب یہاں ایک جسم تھا جو پتھر کی طرح بے جان تھا۔ وہ آنکھیں تھیں جو مرنی مرتی

بگو کو شروع شروع میں رات کے وقت کھانا لے کر آنے کی اجازت نہیں تھی۔ اگر آ بھی جاتی تو میرا اور اس کا کیا بگڑ جاتا۔ بھدی لڑکی پر قدرت نے جوانی بے کار ضائع کر دی تھی۔ بے ڈھنگا جسم بے کیف آنکھیں۔ نہ جسم میں لچک نہ آنکھوں میں چمک۔ بے نمک پھیکا پھیکا سا رنگ۔ صرف جوانی کس کام کی؟ میں نے اپنی پُر شوق آنکھوں کی ایک نظر بھی کبھی اس پر ضائع نہ کی تھی اور اس نے بگو کی ماں کبھی کبھار رات کو بھی کھانا دے کر اسے بھیج دیا کرتی تھی۔

"آج شاید روٹیوں کے ساتھ آم کے اچار کی پھانکیں بھی ہوں۔" میرے نتھنوں میں ایک مبہم سی بو لپک لپک کر آنے لگی۔ اور اشتہا پہلے سے بھی زیادہ شور مچانے لگی۔ گڑ گڑ گڑ۔ برف کا تودا۔ گڑ گڑ گڑ گڑ بگو کا ریزہ ریزہ بھوک نے آخر کار احساس بھی ہڑپ کر لیا۔ اور میرے جذبات اور کمرے کی فضا پر مکمل سناٹا طاری ہو گیا۔

"ٹنگ ٹنگ ٹنگ شی۔"

کمرے کی کنڈی بند تھی۔ دل اچھلا۔ ہاتھ لپکے لیکن ضبط اور فلسفت کی آہنی زنجیروں اور مایوسی کے شکنجے کی گرفت سخت تھی۔

دھپ دھپ دھپ۔

کمرے کا دروازہ کھلا اور بگو شرماتی ہوئی آئی اور دروازے پر سکڑ سمٹ کر کھڑی ہو گئی۔ میرا جسم جیسے سُن ہو گیا اور دل کی حرکت رک گئی۔ پھر آم کے اچار کی پھانکیں مجسم خوشبو بن کر آنکھوں کے سامنے ناچنے لگیں اور نتھنوں میں گھسنے لگیں۔ میں نے لپک کر دسترخوان اس کے سر پر سے اتار لیا۔ لسی کا گڑوا ڈولتے ڈولتے بچا۔ بگو نے لسی کا گڑوا اور پیالا چارپائی کے پاس نیچے فرش پر رکھ دیا۔ میں نے پہلا لقمہ دال میں تر کرتے ہوئے کہا "تم جاؤ بگو۔" بگو نے ایک اچٹتی ہوئی مایوس نگاہ میرے چہرے پر ڈالی اور لجاتی شرماتی کمرے سے باہر نکل گئی۔ میری نفرت کراہت سے بھی زیادہ کڑوی ہو گئی۔

"ٹنگ۔ ٹنگ۔"

میرے منہ سے غیر ارادی طور پر یہ الفاظ نکل گئے اور دوسرا لقمہ میرے حلق میں پھنس گیا۔

گرمیوں کی دوپہریں، بہت لمبی ہوتی ہیں۔ کاٹے کٹتی نہیں۔ انگارے برستے ہیں۔ لو کے جھکڑ چلتے ہیں۔ پیاس بہت لگتی ہے۔ آج آم کا اچار اور چپڑی ہوئی روٹیاں کھا لینے کے بعد میں نے لسی بھرا ہوا کڑوا چند گھونٹوں میں خالی کر دیا۔ لیکن اس کے باوجود نہ ہونٹوں کی خشکی دور ہوئی اور نہ کلیجے کی تپش مٹ سکی۔ ہونٹوں کی خشکی کیلئے تو ٹھنڈا پانی کافی تھا۔ لیکن کلیجے کی تپش کیلئے میں نے سوچا کلیجے کی تپش کیلئے بھی کوئی علاج ضرور ہونا چاہیے۔ شکر ہے اسی وقت کامی آ گیا۔ کامی سے مجھے خاص اُنس تھا اور کامی کو بھی مجھ سے پیار تھا۔ کامی میرا دوست تھا۔ لیکن وہ اپنے آپ کو مجھ سے کمتر سمجھتا تھا۔ کیونکہ میں آٹھویں جماعت پاس تھا اور کامی کے گاؤں کے لوئر پرائمری اسکول کا واحد استاد تھا۔ اور کامی سے عمر میں پندرہ سال بڑا بھی تھا۔

کامی کے بال کوّے کے پروں کی طرح سیاہ تھے۔ میری تحقیق میں وہ انہیں سرسوں کے تیل سے خوب چپڑتا تھا۔ اور ٹیڑھی مانگ بھی نکالتا تھا۔ اس کی پیشانی پر پسینہ تھا۔ اور پسینے میں سرسوں کے تیل کی ملاوٹ بھی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ کیونکہ وہ بغیر وجہ کے مسکرانے کا عادی تھا۔ آتے ہی دھپ سے کھٹولے پر بیٹھ گیا۔ اس کھٹولے کے متعلق ایک فقرہ۔ میری طرح کھٹولا پرائمری اسکول کے پچھلے کمرے کا واحد فرنیچر تھا۔ کسی زمانے میں اس کی سیٹ بید سے بنی ہوئی تھی۔ لیکن اب بید کی جگہ پھٹا پرانا ٹاٹ پھیلا ہوا تھا۔ اور اس پر بڑھاپے کی جھریاں پڑ چکی تھیں۔

کامی نے کہا "ماسٹر جی چپ چاپ کیوں بیٹھے ہو؟"

"اور کیا کروں؟ کہو تو بھنگڑا ڈالنے لگ جاؤں؟" میں نے چڑ کر کہا۔

"کیوں؟ آج کیا بات ہے؟" کامی نے حیران ہو کر پوچھا۔

"میری طبیعت خراب ہے۔" میں نے چارپائی پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔ کامی کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ میں نے پہلو بدل کر ذرا غضبناک انداز میں پوچھا "کیوں؟ پاگل تو نہیں ہو گئے؟"

"نہیں ماسٹر جی یونہی ہنسی آ گئی۔ حسن والے دل توڑیں تو غصہ دوستوں پہ آتا ہے۔ کیا گڑے والی آج ادھر سے گزری تھی؟"

گڑے والی! مجھے کامی کے گھٹیا پن پر غصہ آیا۔ گڑے والی۔ مجھے کامی کی زبان سے نکلے ہوئے اس گندے لفظ سے گھن آئی۔ جیسے یہ کوئی فحش گالی ہو۔"

"ماسٹر جی جب رانجھا چناب کے کنارے پہلی بار ناؤ سے اترا تو ہیر باغ میں پھولوں کی سیج پر سوئی ہوئی تھی۔ اور رانجھے کو دیکھ کر اس نے منہ پھیر لیا تھا۔"

"پھولوں کی سیج خالی تھا۔ وہ تو رانجھا تھا جو اس کی سیج پر بلا دھڑک آ سویا تھا۔" میں نے کہا اور پھر میں نے پوچھا "کیوں جی؟ یہ قصہ کہاں سے پڑھا؟"

"منور پور کے میلے میں۔" میں حیران ہو گیا۔ "کامی تم تو ان پڑھ ہو؟"

"تھیٹر میں دیکھا۔ واہ، واہ۔ کیا شان تھی ہیر کی۔ ریشمی شلوار، نیلی کھوکا، جیسے ستاروں بھرا دوپٹہ اور زری کی جوتی۔ رانجھا بھی تو بڑا اکڑیل جوان تھا۔ پہاڑ سا۔ رانجھے کا پیٹ کیوں پچکا ہوا تھا؟ مجھے تو وہ نائی دھوبی والی کا بڑا بھائی معلوم ہوتا تھا۔ ویسی بو۔"

میں نے تنگ آ کر کہا "چھوڑو اس قصے کو کامی۔ رانجھا اگر ساون ماہ تو پہاڑ نہ چڑھاتا تو اس کا پیٹ پچکنا لازمی ہے۔"

"یہ ماسٹر جی میرا اور خیال ہے۔"

"وہ کیا؟"

"تھیٹر کے رانجھے کو رات چھوڑی کا ایک بھنا کھانا بندھتا تھا اس نے بہت ہی بڑھو کی ہو گی۔"

"گامی کبھی تو کام کی بات کیا کر۔" میں نے جھنجھلا کر کہا۔ پھر اس نے ہانک لگائی۔ "گدھے والی۔ واہ گدھے والی۔" نخی نخی تھی فربہ سی گدھے کے بنے کان۔ لمبا مختصر، سانولی پیشانی اور سامنے گال کی پر پسینہ تھا۔ اسے پسینے کی اینٹھی لی سرخ دھجی کا فانہ تھا۔ میلا کالا چھپا ہوا کرتا۔ اور کالا لہنگا جو پیچھے سے پھیلا ہوا تھا۔ اور بھی پر گہری دھول کا لیپ تھا۔ اور سرخ زرد سے چھلکے ہوئے تھے۔"

یہ میری بیر تھی اور گامی نے تھیٹر میں نہیں سکو کے غور سے اور سلے ستارے کے دو چیتے اس کی بیر دیکھی تھی اور اس کا راجا میری طرح بڑا پاس بھی نہیں تھا۔ مجھے گامی پر بڑا غصہ آیا۔ میں نے کروٹ بدل کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"یہ قوم کتنی بے غیرت ہے۔ سارا دن عورتوں سے کام کرواتی ہے۔"

"کون سی قوم؟" میں نے پوچھا

"گدھے والی کی قوم۔"

"گدھے والی۔ گدھے والی۔ یہ تو نے گدھے والی کی رٹ کیا لگا رکھی ہے جب سنو گدھے والی۔ تیری زبان کتنی گندی ہے۔"

"ماسٹر! پھر تم اسے اور کس نام سے پکاروں۔ کہو تو کل اس کا نام ہی پوچھ لوں"

"نہیں۔" میں نے گڑبڑا کر کہا اور گامی میری اس گھبراہٹ پر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ پھر اس نے یکایک سنجیدہ ہو کر کہا۔ "ماسٹر! ان کے مرد سارا دن نشے میں دھت رہتے ہیں۔ اور ان کی عورتیں گدھے ہانکتی رہتی ہیں۔ عورتوں سے کام کروانا مردوں کی شان نہیں۔"

"ہاں! ہاں! یہ قوم بہت بے درد ہے۔ بڑی کمینی ہے۔ بہت بے حیا ہے۔ اور پھر اس لڑکی کو دیکھو۔ سارا دن گدھے ہانکنے کے سوا اسے کوئی کام نہیں؟" میں نے پھر دل کا غبار نکال لیا۔ گامی نے کہا۔ "ماسٹر! اس تھیٹر کی بیر کو تھیٹر والے سارا دن چھپا کر رکھتے تھے۔ میں نے ان کے تنبوؤں کے کئی پھیرے لگائے۔ پر کیا مجال ہے جو اسے دیکھ پایا ہو۔ پتہ ہے بیر والی شیشے کی ڈبیا میں بند کر کے رکھتا ہے۔"

"ہنگا ہے ایسا گامی اگر تم نے میرا مطلب ہے تھیٹر والی بیر کو روشنی میں دیکھ لیتے تو تم اسے گدھے والی کہتے۔ میرا مطلب ہے کہ یہ حقیقت ہے بات کہ ہر گدھے والی بیر معلوم ہوتی ہے۔" میں نے ہنس کر کہا اور گامی خوش ہو گیا۔ اس نے لالٹین اٹھا کر رکھا اور پھر سے گیت گانے شروع کر دیئے۔

میں نے آہستہ سے کھڑکی کھول دی۔ باہر ٹرک کے پہیے چل رہے تھے [illegible] کی سرخ انگاروں میں ریت کے ذرے [illegible] چمک رہے تھے [illegible] فضا کے [illegible] پنجاب کے پاس دو لڑکیوں کی چھوٹی سی [illegible]

رہے تھے۔ بڑے سے کھلے ہوئے سینے تھے۔ پیچھے کھیت تک پر جگہ جگہ خیمے لگے ہوئے تھے۔ سرخ، سفید، کاسنی، نیلے، گہرے کالے اور ہر رنگ کے میل کی تھیں تھیں۔ خیموں کے سامنے اونٹوں کے کجاوے تھے۔ جن سے ہوا گزر رہی تھی۔ بڑی کی جھاڑیوں میں چند گدھے تھے۔ ان کی پشتوں پر سرخ دھاگوں میں سلے ہوئے بورے تھے۔ اور ان گدھوں کے پاس کچھ مرد، عورتیں اور بچے تھے۔ مردوں کا اوپر کا دھڑ ننگا تھا۔ اور نیچے دھوتی گھٹنوں تک اٹھی ہوئی دھوتیاں تھیں۔ عورتوں کے سروں پر گہرے نیلے چاندی کے زیور اور لٹکے ہوئے بال تھے۔ ان کے ہاتھوں میں باندھ اور پنڈلیاں کھلی تھیں۔ ننگ دھڑنگ بچے مینڈکوں کی طرح اچھل کود رہے تھے اور ابھی تک گامی بیر گا رہا تھا۔ اور اس کی پیشانی تیل اور پسینے سے چپڑی ہوئی تھی۔

یکایک گامی نے گانا بند کرتے ہوئے کہا۔ "اب گدھے والی ادھر نہیں آئے گی ماسٹر جی! گدھا بے چارہ بھٹک گیا ہو گا۔ اسے ڈھونڈنے گئی ہو گی بے چاری اور گدھے اتنے بے وقت نہیں ہوتے کہ بھٹک کر بار بار ادھر آئیں۔" میں جواب میں مسکرا بھی نہ سکا۔ گامی نے کہا۔ "یہ لڑکی بڑی بے پروا ہے۔ مجال ہے کہ آنکھ اٹھا جائے۔"

"بہت کالا دھا ہے۔" میں نے جھلا کر جواب دیا۔ گامی اپنی ہنسی پڑا اس کی ہنسی نظر آئی تو میں بھی ہنس پڑا۔ ہم اکٹھے ہنستے رہے۔ اور اکٹھے ہی خاموش ہو گئے۔ اور باہر وہی بیجا سی دھوپ، بے کیف منظر اور پژمردگی تھی۔ اور مجھے یکایک بڑی سخت پیاس لگی۔

"گامی ٹھنڈے پانی کا ایک مٹکا تو لاؤ۔"

گامی کے اٹھنے سے پہلے میں نے پھر کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا بڑے کچھ فاصلے پر کنواں چل رہا تھا۔ کنویں پر گھنا سایہ تھا اور تین چار لڑکیاں پانی بھر رہی تھیں۔ ان کی ننگی پنڈلیاں، اور لمبی قمیضیں اور کنویں سے نکلتی ہوئی پانی کی دھار ان کے مٹکوں میں گر رہی تھی۔ گامی نے کہا۔ "کھڑکی بند ہی رہنے دو، لو اندر آ جائے گی۔"

"ٹھیک ہے یہاں تک آتے آتے پانی گرم ہو جائے گا۔"

میں نے کھڑکی بند کر دی۔ دروازے کو کنڈی لگا دی اور ہم دونوں کمرے [illegible] دھوپ میں باہر نکل آئے۔ میری آنکھیں دھوپ کی چمک سے چندھیا گئیں۔ گامی کی تر پیشانی پر دھوپ چمک رہی تھی۔ اور اس کی کالی کالی مونچھوں میں پسینے کے قطرے ڈھلک رہے تھے۔ عورتوں کے مٹکے ٹھنڈے پانی سے بھر چکے تھے۔ انہوں نے دو دو مٹکے سروں پر رکھے اور ایک ایک کو بغل میں لٹکایا۔ وہ ایک دوسرے کے پیچھے سیدھی چلنے لگیں۔ ہم پگڈنڈی سے ایک طرف ہو گئے وہ ایک ایک کر کے ہمارے پاس سے گزر گئیں۔ اور میں انہیں کنکھیوں سے دیکھتا رہا۔ سب سے آخر میں وہ تھی۔ اس نے اوڑھنی سے آدھا منہ ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کے چہرے سے اداسی کی دھول اتر چکی تھی۔ اور مسکراہٹ نکھر آئی تھی۔ گامی نے دھیرے سے کہا۔ "گدھے والی!"

"نہیں۔ سانولی!" میں نے غصہ کو دبا کر بڑبڑاتی ہوئی آواز میں کہا۔ اس نے کھلکھلا کر کہا۔ "سانولی! واہ جی واہ۔ کیا اچھا نام سوچا ہے۔" اور میرا غصہ ختم ہو جاتا رہا۔ میں سانولی کو اتنا قریب سا دیکھ کر کھو سا گیا۔ سانولی کے نقش کتنے تیکھے تھے! اس کی آنکھوں میں کتنی چمک تھی دیئے کی طرح جل رہی تھیں اور اس کے ننگے گداز بازو کتنے نرم اور گداز محسوس ہو رہے تھے۔ کہ نظریں اس میں کھب کر رہ گئی تھیں اور وہ گول پنڈلیاں جو گھٹنوں سے شفاف پانی میں ڈوبی ہوئی کنول کی طرح چمک رہی تھیں۔ وہ چمک جو صرف سنولاہٹ کے ساتھ مخصوص ہوتی ہے اور وہ گداز جس میں صندل کی خوشبو رچی ہوئی ہے۔

سردار کنوئیں کے پاس بیٹھا روٹی کھا رہا تھا۔ اس کے پاس اس کی بہن بیٹھی ہوئی تھی۔ سردار کے سامنے پتلی سی لسی کا ایک کٹورا دھرا ہوا تھا۔ میں نے السلام علیکم کہا تو سردار نے پوچھا "منشی! اتنی دھوپ میں کہاں؟"

"ٹھنڈا پانی پینے۔"

"اتنی دھوپ میں اتنی دور آکر۔" سردار نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں جی سردار۔ اکثر ان پیاسے کے پاس چل کر نہیں آتا۔ پیاسا کنوئیں پر بذات خود جایا کرتا ہے۔"

"ٹھیک ہے منشی جی!" اس نے ایک چھدری سی کھاٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں کھاٹ پر بیٹھ گیا۔ تو سردار نے دو بڑے بڑے گھونٹوں میں کٹورا خالی کرتے ہوئے کہا۔ "ستاں! ایک کٹورا منشی جی کو پلا۔"

ستاں نے کٹورے میں تھوڑی سی گاڑھی لسی ڈالی اور پھر کنوئیں کے ٹھنڈے پانی سے لبالب بھر کر میرے پاس لے آئی۔ میں نے آہستہ سے کٹورا اس کے ہاتھ سے لیا۔ ستاں کی پوروں میں ایک ہلکی سی جھنجھلاہٹ سے [illegible] میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ہماری نگاہیں ملیں تو ستاں کی آنکھیں شرم سے جھک گئیں۔ میں نے کٹورا چند گھونٹوں میں خالی کر دیا۔

ستاں نے دھیمے سے پوچھا "اور؟" میں نے سر ہلا کر انکار کر دیا۔ اور کٹورا اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے میری ایک انگلی اس کی ایک انگلی سے مس کر گئی۔ اس کے زرد چہرے پر خون کا ہلکا سا غازہ بھر گیا۔ جیسے اس نے ہلدی میں پیسی ہوئی سرخ مرچیں ڈال دی ہوں۔

سردار کی بہن ستاں کو شرمانے کی عادت تھی۔ خاص کر مجھے دیکھ کر وہ اکثر شرمایا کرتی تھی۔ گلی کے نکڑ پر جب اسے اچانک یا کھیتوں کے درمیان پتلی سی پگڈنڈی پر، کنوئیں پر وہ کہیں نہ کہیں اتفاقیہ طور پر مجھے مل جاتی۔ اس کی پلکیں جھک جاتیں۔ اس کے گال سرخ ہو جاتے تنفس سی ناک پر پسینے کے قطرے جھلملانے لگتے۔ اس کے ہونٹوں پر ایک مرئی لرزش [illegible] کی لرزش رہتی۔ [illegible] میں نے کئی بار کہا تھا "ماسٹر! ستاں تجھ سے محبت کرتی ہے۔" اور میرا دل خوشی سے اچھلتا تھا۔ اور [illegible] میں نے اس کے دل کی دھڑکن سے، ہونٹوں کی تڑپ سے، پوروں کی جھنجھلاہٹ سے اور پلکوں

کے بہاؤ سے وہ خاموش ہو گئے تو میری روح رقص نہ کر سکی اور میرا دل خوشی سے دھڑک نہ سکا۔ جیسے وہ جیسے کا ایک بے جان مجسمہ بن چکا ہو۔ وہ سانولی پیشانی اور دیئے کی طرح روشن آنکھیں میری روح کے رقص اور میرے دل کی دھڑکن پر مسلط ہو چکی تھیں۔

میں چھدری سی کھاٹ پر لیٹ گیا۔ گھنے سایے کی خنکی میرے جسم میں ٹھنڈے شہد کی طرح رچنے لگی۔ کنوئیں کی ٹنڈوں کی روں روں کی آواز اور اس ننھے نے مجھے لوریاں دے کر سلا دیا۔ جب میں جاگا تو سایہ پھیل کر کھیتوں تک چلا گیا تھا۔ اور درختوں پر پرندے چہچہا رہے تھے۔ کنواں بند تھا۔ گائے جا چکا تھا۔ سردار اور اس کی بہن کنوئیں پر موجود نہیں تھے۔ چند چڑیاں پھدک پھدک کر اڈریں سے پانی پی رہی تھیں۔ میں اٹھا تو کھاٹ کی چرچراہٹ کی آواز سے چڑیاں پھر سے اڑ کر سبز پتوں میں جا چھپیں۔

آہستہ آہستہ نیند کا بوجھل خمار دور ہوا تو میں راجباہے کی طرف چلا گیا۔ راجباہے کے گدلے پانی میں ہلکی ہلکی روانی تھی۔ میں کنارے پر بیٹھ گیا اور پانی کے بے سکون بہاؤ کو دیکھنے لگا۔ سورج کی تیز چمک گدلے پانی کی ہلکی ہلکی لہروں سے کھیل رہی تھی۔ دھیرے دھیرے چمک زائل ہوئی تو پانی کا رنگ سرخ ہوا۔ شفق پھوٹی تو پانی میں آگ لگ گئی اور پھر آہستہ آہستہ بجھ کر چلنے لگی۔ اور رنگین دائرے سامنے آنکھ مچولی کھیلنے لگے۔

خاموشی اور سکون گہرے ہوئے تو آبشار کا دھیما دھیما سا شور رچنے لگا۔ [illegible] فرلانگ کے فاصلے پر راجباہ ایک ننھی سی آبشار بناتا تھا کہ بجلی [illegible] پیدا ہو سکیں۔ میں اٹھا اور آبشار کے پاس ایک "اوکاں" کے نیچے آکر بیٹھ گیا جو دھیما سا شور [illegible] کی جھاڑیوں کے دامن سے ترنم بن کر بہا جا رہا تھا۔ اور ہوا کے جھونکوں میں [illegible] سایے لرز رہے تھے۔ یا ایک مشرقی تاریک دامن پھٹا اور چاند کی پہلی کرن پھوٹی۔ اوکاں کی جھاڑیاں لرزیں تو [illegible] دوب پر نقرئی [illegible] بکھر گئے۔ میری [illegible] چاندنی چھلک گئی۔ ایک [illegible] طرح اڑ کر [illegible] کے پھولوں پر آ بیٹھا۔ رنگ و بو [illegible] اور [illegible] کی وسعت [illegible] بن گیا۔ اوکاں کی جھاڑیوں کا ترنم، آبشار کا مدھم سا شور، [illegible] کا رقص، نقرئی [illegible] کا لرزتا ہوا آہنگ، میرا جسم تحلیل ہو کر ایک شعر کی لطافتوں میں ڈھل گیا۔ یہ شعر [illegible] آسمان پر اڑنے والے [illegible] بادل کا دھواں [illegible] شفق کی سرخیوں میں گم ہوتا ہے اور میں نے شعر [illegible] کے [illegible] کنوئیں کی طرف قدم بڑھا دیا۔

[illegible] کے قریب آکر میرے قدم خود بخود رک گئے۔ میری تو اس دن جیسے [illegible] پر پڑی [illegible] کی آگ بجھ چکی تھی۔ راکھ میں کوئی چنگاری زندہ نہیں تھی۔ [illegible] محبت نے [illegible] اور میری روح کا وہ [illegible] جو چاندنی کی لے پر رقص کر رہا تھا۔

میرے قدم خود بخود دھیرے ہو گئے!
میں نے پیچھے کا پتھر کا ٹکڑا ایک معمولی سا کانپ میرے قدموں کی چاپ
سن کر پھوٹا اور دوسرے لڑکے نے پوچھا "تم کون ہو بھائی؟"
"میں اس گاؤں کے مدرسے کا منشی ہوں۔"
"کوئی کام ہے ہم سے حضور؟"
"نہیں تو۔ میں سیر کرتے کرتے ذرا ادھر کو نکل آیا تھا۔"
"ٹھیک ہے صاحب یہ ادھر سیر کا کیا بھا؟" اس نے تھکی تھکی
آواز میں جواب دیا۔

میں نے قدم بڑھائے۔ گاؤں تک پہنچتے پہنچتے چاندنی بیمار سی معلوم ہونے لگی۔ اور آبشار کا شور نہاں خانۂ دل میں دھیرے دھیرے دفن ہونے لگا۔ جانے کیوں میرا جی بیٹھ گیا۔ اور میری روح بے حس ہو گئی۔ میرے دل پر ان جانی قوتوں کا غلیظ سا غبار چھایا اور دل کی ہر لطافت اسی میں دب کر رہ گئی۔ رات بھر مجھے عجیب خواب نظر آتے رہے۔

پھیکی چاندنی۔ کفن میں لپٹے ہوئے مردے، مرتا ہوا آبشار کا دھیما شور موت کی سرگوشیوں میں بدل جاتا۔ جیسے جن کے پیوند نما لے خون سے بھیگے معلوم ہوتے تھے۔ سایوں میں ڈھلی ہوئی لاشیں جن میں ریت کے ذرے تھے۔ اور جو چلچلاتی دھوپ میں خراد کی طرح چمک رہے تھے اور وہ سانولی پیشانی جس پر پسینے کے قطرے تھے اور پسینے کے قطروں میں جیٹھ کی سرخ دھوپ تھی۔ زندگی بے حس تھی۔ جیسے سمندر کی ایک خاموش لہر کی طرح جس میں کوئی تڑپ کوئی اضطراب نہیں تھا۔ اور میں بھیانک خواب دیکھ کر بھی بیدار نہ ہو سکا اور جب بیدار ہوا تو میرا جسم بھاری تھا۔ اور روح اس سے بھی زیادہ بوجھل تھی۔ میں کنوئیں پر جا کر نہایا۔ تو جسم کا کسل دور ہوا۔ ٹھنڈے پانی کا لمس عجیب سا تھا۔ بھیانک خواب بھی گویا جسم کے میل کے ساتھ دھل کر رہ گئے۔

پھر مدرسہ لگا۔ اکا دکا لڑکے آئے۔ میلے کپڑے، پھٹی ہوئی کتابیں سلیٹیں جن کا روغن اتر چکا تھا۔ تختیوں پر سیاہی کے دھبے تھے۔ جیسے کیڑے مکوڑوں نے ان پر گلکاریاں کی ہوں۔ الف زبر اب اور جیم زبر جب کی گردانیں شروع ہوئیں۔ تو کل کے سارے حسین اور بدصورت تصورات بھی یک قلم اس ہنگامے میں تحلیل ہو گئے۔ گویا کل آج میں جذب ہو کر اپنی ہستی کھو چکا ہو۔

دھوپ تیز ہوئی تو میلے کپڑوں سے پسینے کی بدبو کے بھبکے آنے لگے۔ میں نے صفائی پر ایک چھوٹی سی تقریر کی اور کچھ دیر بعد مدرسہ برخاست ہو گیا
گامی شاید مدرسے کے برخاست ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔
وہ آیا تو کل پھر زندہ ہو گیا۔ کل اور آج میں کوئی فرق باقی نہ رہا۔ میں شاید کل کی بدصورتیوں کو زندہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے گامی کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ گامی نے دہلیز پر بیٹھ کر کہا "منشی جی! بڑے کام کی بات ہے۔" لیکن میں نے اس کی طرف منہ پھیرے بغیر کہا "سب خیریت ہے۔" گامی چند لمحے خاموش رہا پھر اس نے کرسی کا رخ میری طرف پھیرتے ہوئے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ گامی کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ یہ چمک بڑی مضطرب اور بے چین سی تھی۔ گامی کی آنکھوں میں کوئی راز کسمسا رہا تھا۔ جس نے رات بھر اسے سونے نہ دیا ہو اور وہ مطلب زیادہ دیر تک اس کے سینے میں نہ ٹھہر سکتا ہو۔

اس راز کے جسمانی اضطرار نے مجھے پریشان کر دیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا "خیر تو ہے؟" گامی نے خاموش سی مسکراہٹ کی آڑ لی۔ یہ مسکراہٹ ایک تیکھی سی لکیر بن کر اس کے ہونٹوں پر چپک کر رہ گئی۔ میں نے اور زیادہ بیزار ہو کر کہا۔
"گامی! کیا بات ہے؟"
"کچھ بھی نہیں۔" گامی نے شرارت سے کہا۔ "تمہارے لئے ایک خوشخبری لایا ہوں۔"
"خوشخبری! کیسی؟"
"کل ٹھیکیدار آ رہا ہے۔"
"کون ٹھیکیدار؟"
"وہی جو اس پڑاؤ کا مالک ہے۔"
"پھر مجھے کیا؟"
"اسے ایک کارندے کی ضرورت ہے۔ ایک پڑھے لکھے آدمی کی۔"
"بہت خوب۔ یہی خوشخبری تھی جو تمہارے سینے میں نہ سما رہی تھی"
گامی پہلے سٹپٹایا۔ پھر اس نے میرے چہرے پر نفرت کی ایک نظر ڈال کر کہا
"تمہاری عقل کہیں گھاس چرنے گئی ہے؟"
"کیوں؟"
"ارے منشی! تو پڑھا لکھا آدمی ہے۔ پر لوگ سچ کہتے ہیں۔ عقل کی ایک رتی علم کے سو من پر بھاری ہے۔" گامی نے کرسی سرکا کر میرے نزدیک کر لی۔ میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں دبا کر کہنے لگا۔
"منشی! تانے دل کی دے ورخن تانے دکان دا بیوپار۔ ٹھیکیدار سے مل کر پڑاؤ سے پر منشی بن جاؤ۔"
"گامی! لیکن یہ مدرسہ۔"
"دونوں کام ہو سکتے ہیں۔"
"ٹھیک ہے۔" خوشی کی ایک لہر میرے جسم میں در آئی۔ لیکن دوسرے لمحے میرا جی بیٹھ گیا۔ میں نے کہا۔ "میں تیرا احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔ پہلے صاف ملا تو پھر کا بھت ہے۔"
اور دوسرے دن میں ٹھیکیدار سے ملا۔ اس نے معمولی سے معاوضہ

پھر مجھے پزاوے کا نگران مقرر کر دیا۔ مدرسے سے فارغ ہو کر میں پزاوے پر کام کرتا۔ دن میں دو تین بار مزدوروں کے کام کی پڑتال کرتا۔ منہ سویرے سورج نکلتے ہی کام میں لگ جاتے اور شام تک کام کرتے رہتے۔ ان کی عورتیں گدھوں پر اینٹیں ڈھو ڈھو کر پزاوے تک لاتی رہتیں۔ لاکھوں اینٹیں ڈھلتیں اور آگ میں پڑ کر سرخ ہو جاتیں۔ شہر سے ٹرک آتے اور اینٹیں شاندار عمارتوں کی صورت میں تبدیل ہونے کیلئے شہر منتقل ہو جاتیں۔ کام بڑا عجیب دلچسپ تھا اور مجھوں کی باتیں بڑی خشک تھیں۔ کبھی کبھی مجھے ساوری سے باتیں کرنے کا موقع مل جاتا۔

"تم بہت کام کرتی ہو؟"

"جی!"

"تم اتنا کام کیوں کرتی ہو؟"

"جی!"

"تم زیادہ کام نہ کیا کرو۔"

"جی!"

میں اس کی جی جی۔ جی سے بہت جلد بیزار ہو گیا۔ ایک ہی نغمہ سنتے سنتے میرے کان پک گئے۔ ایک گھسا پٹا ریکارڈ جی جی کی بے ہنگم سروں سے بھرا ہوا تھا۔ سوئی لگتے ہی جی جی کا بے معنی نغمہ شروع ہو جاتا اور میں اپنے کان بند کر لیتا۔ ایک نغمہ۔ ایک لے۔ ایک تال جیسے اس ساز میں اور کوئی نغمہ نہ ہو۔ میں نے جس دامن سے پھولوں کی تمنا کی تھی اس میں کانٹے بھرے ہوئے تھے۔ کتنے بے کیف لمحے تھے۔ مجھے ساوری کے اتنا قریب نہیں آنا چاہیئے تھا۔ دور رہ کر اس کی بے رخی کو برداشت کرنا آسان تھا۔

لیکن راتیں اب کیف پرور ہوتی جا رہی تھیں۔ چاند چمکتا۔ کرنیں مسکراتیں۔ ادکان کی جھاڑیوں کے ساتھ مہکتے اور آبشار اس کی لے پر دھیمے سے گنگناتی رہتی۔ زندگی بیدار ہو کر ماحول پر چھا جاتی۔ لیکن جی۔ جی۔ جی بدبودار جیسے۔ اینٹوں کی سرخ دھول اور نغمہ بے معنی کا مسلسل شور۔ اُف
—"آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام۔"

اور ایک دن میں نے جی کڑا کر لیا۔ میں آج اس سے اپنے دل کی بات کہہ دوں گا۔ میں کہوں گا۔ "ساوری! میں تم سے پیار کرتا ہوں۔ تمہارے بال خشک ہیں۔ تمہاری پیشانی پر اینٹوں کی دھول ہے۔ تمہارے کپڑوں میں پسینہ رچا ہوا ہے۔ پھر بھی مجھے تم سے محبت ہے۔ اور میری محبت۔" "جی!" میرے تصور نے کہا۔ "ہوں!" میرے تصور کے کانوں نے نفرت سے جواب دیا اور میں اتنی بڑی جرأت نہ کر سکا۔

ایک دن ٹھیکیدار آیا تو اس نے کہا "منشی جی! اینٹوں کی ضرورت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ مجھوں سے کہو کام دگنا کر دیں۔ اور ہاں تمہاری تنخواہ بھی بلکہ بڑھا دی جائے گی۔ محنت سے کام کرو۔"

اور میری محنت سانچوں میں ڈھلی ہوئی اینٹوں کے
بدبودار کپڑے پسینے میں تر ہو گئے۔ سیاہ بالوں میں دھول جم کر رہ گئی۔ جسم تھک تھک کر چور چور ہو گئے۔ اور ساوری گدے پسینے میں شرابور ہو گئیں۔ رات تک کام چلتا رہتا اور چولھوں میں آگ نہ جلتی۔ میرا دل پتھر بن کر رہ گیا۔ میں مدرسہ پڑھ کے بعد پزاوے پر آتا۔ جیبیں کھلی سکی گولیوں سے بھر لیتا۔ رات تک گولیاں چوستا رہتا۔ نگرانی کی ضرورت نہیں تھی۔ مجھوں لالچ صبح سے لیکر رات تک کام میں مصروف رکھتا۔

اور ایک شام میں اینٹوں کی ایک دیوار کا سہارا لئے
ساوری ادھر سے گزری۔ میں نے اسے اشارے سے بلا
جیب میں ہاتھ ڈالا اور کچھ گولیاں نکال کر بڑی جرأت سے کہا
میری طرف بوکھلائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگی۔

"لے لو" اس نے بھکاریوں کی طرح ہاتھ پھیلا دیا۔
ہتھیلی پر گولیاں بکھیر دیں۔ میری انگلیاں اس کی ہتھیلیوں سے
ایک جھٹکا لگا۔ اور میرا دل پھر گوشت کا لوتھڑا بن گیا۔ جس میں
کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ میں نے اس کی کلائی کو ہاتھ میں لے
آنکھوں میں جھانکا۔ شام کی جھلملی روشنی میں میں نے گویا ایک
جھانک لیا۔ اور اس اتھاہ جھیل کی گہرائیوں میں مجھے اپنی پیا
نہ ملا۔ نگاہیں بے حس تھیں۔ سیاہ پتلیوں کی حرکت تھمی تھمی تھی۔
جمی ہوئی تھی۔ چہرہ تھکا ہوا تھا۔ بجھی ہوئی آنکھوں نے مجھے
انکار کر دیا۔ میرا ہاتھ بے حس ہو کر کلائی پر سے خود بخود پھسل
وہ جانے کیلئے مڑی، تو میں نے چیخ کر کہا۔ "ساو
نے مڑ کر دیکھا اور وہ نہ سمجھ سکی۔ کہ میں نے اسے پکار
کا کیا نام تھا؟ اس نے ایک قدم بڑھایا تو میں نے پھر پکار کر
بات تو سنتی جاؤ؟"

"جی!" میں نے اپنے ہونٹ بھینچ لئے۔

"میں مدت سے ایک بات کہنے کیلئے ترس رہا ہو

"جی!"

"مجھے تم سے پیار ہے۔ میں تمہیں جی جان سے چاہتا

"جی!"

اور میں نے بکھلا ہونٹ دانتوں سے کاٹ لیا۔ ساوری
وہ اسرار نہ پا سکی جو تن بدن میں آگ بن کر سما جاتا ہے۔ یہ آگ
شعلہ آمیز گھونٹوں کی طرح رنگ رنگ میں غرور سے بھر دیتی ہے
انتہا مایوس ہوا جیسے میں نے زہر کا گھونٹ پی لیا ہو۔ اور نہ

وجود میرے جسم و جاں سے خارج ہو رہی ہو۔ میری ٹانگیں لڑکھڑا گئیں اور ماتھے سے پسینے کے قطرے رینگنے لگے۔

اور اسی لمحے میں نے دو مزدوروں کو آتے دیکھ لیا جو آج سارے دن کی ڈھلی ہوئی اینٹوں کا حساب لکھوانے کے لئے آ رہے تھے۔ میں نے مری ہوئی آواز میں کہا "سانوری! تم میرا مطلب نہیں سمجھ رہیں۔ اگر تم میرے پیار کا ساز بجانا چاہتی ہو تو آج رات وہاں آؤ۔" اور میں نے مدرسے کی پکی عمارت کی طرف اشارہ کر دیا۔

"جی!" جانے اس جی کا کیا مطلب تھا۔

میں نے اس دن کی بنی ہوئی اینٹوں کا حساب درج کیا۔ شام کے سائے گہرے ہوئے تو میں اپنے گھر آ گیا۔ رات آئی تو اس کے دامن میں ہوا کے دھیمے دھیمے جھونکے تھے۔ اور ان جھونکوں کے ساتھ خنکی بھی جیسے رینگ رہی تھی۔ ستارے جگمگا اٹھے۔ رات کے جلو میں سکون کے تانے بانے بھی تھے۔ میرے تن بدن میں آگ لگی ہوئی تھی۔ طوفان سے پہلے یا طوفان کے بعد کا سکون تھا۔ جس میں انتظار اور بے چینی بھی نہیں ہوتی۔ تھا تو ایسا ہی سکون جس میں حبس اور گھٹن تھی۔ اور مجھے امید نہیں تھی کہ سانوری آئے گی لیکن اس کے باوجود مجھے اس کا انتظار تھا۔

پھر چاند کی پہلی کرن تھرتھرائی۔

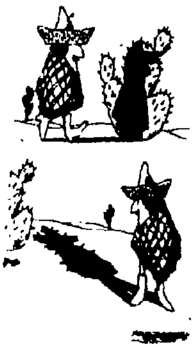
کائنات اس کرن کے ساتھ لرز کر بیدار ہوئی۔ درختوں کی پھننگیں جاگ کر اٹھیں۔ زرد پہلی کرنوں نے درختوں اور مکانوں کی بدصورتیوں کو چھوا۔ پھر سارا گاؤں چاندنی کے نکھار میں ابھر آیا۔ یکدم۔ ایک لمحے کے اندر اندر۔ اور کرنوں کے ہالے سے سانوری کا ہیولیٰ ابھرا۔ میں نے کچھ ایسا لگا کر اس ہیولے کو اپنی روح کی گہرائیوں میں جذب کر لیا۔ شاید یہ چاندنی کا سحر زدہ خواب تھا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ اور پھر میرے کانوں نے قدموں کی چاپ سنی۔ یہ ہلکی سی چاپ اور سانوری کا ہیولیٰ لمحوں کے غبار سے کثافت کے روپ میں آئے ... چاندنی تھرا گئی۔ اور نزول غبار کے بادل چھٹ گئے۔ میں نے آگے بڑھ کر کہا۔

"سانوری!"

"جی۔"

"آخر تو نے میرے دل کی پکار پر لبیک کہہ دیا۔ میری محبت کی کشش تجھے کھینچ لائی۔" میرے لفظ تھرا رہے تھے۔ شعر لفظوں کے آہنگ میں ڈھل چکا تھا۔

"جی۔" میں نے اس کی کلائی پر ہاتھ رکھ دیا۔ منزل میں گداز بھی تھا۔ میں نے اسے سہارا دیا۔ وہ خاموشی سے کمرے کے اندر چلی آئی۔ کھلی کھڑکی سے آنے والی چاندنی کی روشنی کمرے کی تاریکی کو دور کر رہی تھی۔ میں نے جلدی جلدی دیا جلایا اور میری بھوکی نظریں اس کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگیں



اس کا ایک نقش میری نظروں کے راستے میرے جسم میں زخم بنتا چلا گیا۔ میں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "سانوری بیٹھ جاؤ۔"

سانوری فوراً چارپائی پر بیٹھ گئی۔ بڑی خاموشی کے ساتھ بغیر کسی ارادے کے جیسے تعمیل حکم اس کی فطرت ثانیہ ہو۔ میں نے چارپائی پر اس کے پہلو کے ساتھ لگ کر کہا۔ "سانوری! تم میری پہلی محبت ہو۔ تمہاری بھولی بھالی صورت نے میرا من موہ لیا ہے۔"

لیکن وہ بدستور خاموش تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ کو زور سے دبا دیا۔ اس کے جسم میں کوئی تڑپ پیدا نہ ہوئی۔ میں نے اس کی ٹھوڑی کو چھوا۔ پھر میں نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر اپنی طرف موڑا اور پھر غور سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس کی آنکھوں میں کوئی جذبہ نہیں تھا۔ ایک جامد سی حیرت تھی۔ میں نے اس کے چہرے سے اپنے ہاتھ ہٹا لئے۔ میں نے کہا "سانولی تم خاموش کیوں ہو۔ دیکھو چاندنی چھٹکی ہوئی ہے۔ تم مجھ سے باتیں کرو۔ ایک بار کہہ دو کہ تم مجھ سے پیار کرتی ہو۔" میں نے اس کی کلائی کو پھر زور سے پکڑ لیا۔ "جی۔" وہی نغمہ۔ سانوری کو میری بات سمجھ میں نہ آئی تھی۔

کمرے کے اندر چاند کی کرنیں شوخ ہو گئی تھیں۔ دیئے کی سرخ گدلی روشنی ان میں مل گئی تھی۔ اس کی ملگجی روشنی میں کمرے کی فضا بڑی اداس سی نظر آ رہی تھی۔ اور سانوری کا جسم بے حس تھا۔ میرے کان اس کی آواز سننے کیلئے بے تاب تھے۔ لیکن اس کے ہونٹ سلے ہوئے تھے۔ جانے وہ اس کمرے میں کیوں آئی؟ اس نے میری پکار پر لبیک کیوں کہا؟ میرے جسم پر ٹھنڈے پسینے کے قطرے چیونٹیوں کی طرح رینگ

مشاعرے

کے بعد ایک حسین دراز قد لڑکی ایک مشہور اور زندہ دل شاعر سے پوچھنے لگی۔
"کیوں جناب! آپ کیا مجھے بھول گئے؟"
شاعر نے چند لمحوں تک اس خاتون کی طرف بغور دیکھا لیکن جب واقعی کچھ یاد نہ آیا تو مسکرا کر کہنے لگا۔
"محترمہ! اگر آپ کو یاد رکھتا تو بھلا دنیا کا کوئی اور کام کر سکتا تھا؟"

رہتے تھے۔ سانوری کی پیشانی پر بھی پسینے کے قطرے تھے جن میں دیئے کی مدھم لو کا عکس تھا۔ لیکن اس کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔ اور ان پلکوں میں کوئی ایسی نظر نہ تھی جو میرے دل کی تاریک گہرائیوں کو جگمگا دیتی۔ کمرے کے باہر چاندنی اور کمرے کے اندر دیئے کی پھیکی روشنی کی طرح ان کی نظریں بے جان اور افسردہ تھیں۔ کمرہ قبر کی طرح خاموش تھا۔ اور اس ماتمی خاموشی میں صرف میرے دل کی دھڑکنوں کا نغمہ آلود ساز بج رہا تھا۔ میرے کان دیر تک ایک ہی ساز کے غم آگیں نغمے سنتے سنتے پک گئے۔ میری نظریں دیر تک ان دبیز پلکوں کے پیچھے بیر کر خون کو کھولا دینے والی نظر تلاش کرتے کرتے تھک گئیں۔ اور وہ ہاتھ جو اس کی کلائی پر تھا شل ہو کر گر گیا۔

چند لمحوں کے بعد مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میں اور وہ ایک تاریک قبر میں دفن ہیں۔ وہ ایک زندہ لاش ہے۔ جس میں خون کا ایک قطرہ نہیں ایک جوانی جو موت سے ہم آغوش ہے۔ جو زندگی کے آخری سانس پورے کر رہی ہے۔ اور اب وہ جوانی مٹی کا ایک تودا بن کر رہ گئی ہے میرے جذبات کا طوفان یکدم سرد پڑ گیا۔ اور پھر اس مرتے ہوئے طوفان سے ایک خفقت کی لہر اٹھی۔ میں نے اس کی کلائی کو زور سے دبایا۔ اس کی ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ میں تڑپ گیا۔ اس لاش میں ابھی زندگی کی ایک رمق باقی تھی۔ میری گرفت پھر ڈھیلی پڑ گئی۔ میں نے پھر ان آنکھوں میں جھانکا۔ لیکن وہ ویسی ہی مردہ تھیں۔ ان میں کوئی حرکت نہیں تھی۔ میرا جسم پھر سُن ہو کر رہ گیا جذبات شل ہو گئے۔

اور چارپائی پر بیٹھے بیٹھے ایک دوسرے کے پہلو کے ساتھ پہلو ملے ہونے کے باوجود میں نے محسوس کیا کہ دیئے کی لو مدھم پڑتی جا رہی ہے اور کونوں کی چمک پھیکی اور اداس ہو رہی ہے۔ میرے جسم سے، میری روح سے زندگی بجھ کی بھنبھر کی طرح اڑتی چلی جا رہی ہے اور وہ زندہ لاش تھی جس سے زندگی کی آخری رمق بھی دھیرے دھیرے رخصت ہو رہی تھی۔ میرا خون برف کی مانند منجمد ہوا اور چند لمحوں کے بعد کمرے کے اندر اند کمرے میں اپنے سیاہ پر پھیلائے ہوئے کھڑی ہو۔

پھر میری نگاہیں صاف ہو گئیں۔ کمرے کے باہر افسردہ کے اندر افسردہ سی چاندنی تھی۔ دیئے کی لو افسردہ افسردہ تھا۔ اور سانوری میرے پہلو سے پہلو ملائے چارپا کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ پلکوں کے دبیز پردے میں کوئی ہاتھ خود بخود اس کی کلائی پر سے پھسل گیا۔ اور بے جان جو نے اپنے پیار کا خوفناک بھوت دیکھا۔ تو میرے رونگٹے میں ڈر کر کانپ کر چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے کہا" اور سانوری کی چارپائی سے نیچے کود گئی۔ میں نے کے دبیز پردے ایک لمحے کیلئے اٹھے اور ایک پھیکی سی بے حس آنکھوں میں کسمسا اٹھی۔ میں نے سمجھا چاندنی پھر زندہ نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ لیکن وہ پھیکی چمک پھر پلکوں ہو گئی۔ چاندنی کی مشعل کرنیں کالی گھٹاؤں میں جا چھپیں۔ میں جاؤ سانوری خدا کیلئے۔" اور وہ چپ چاپ چلی گئی۔

دھپ - دھپ - یہ بیگو تھی۔ بیگو کی اس بھدی سے مجھے سخت نفرت تھی۔ میرے کان اس دھپ دھپ کرتے تھے۔ لیکن آج مجھے اس دھپ دھپ میں لطف میرا خون سنسنایا۔ دھپ - میرا خون تھوڑا سا گرم ہوا۔ دو میرے جسم کے انگ انگ میں چنگاریاں چمکیں۔ اب میرا میری نس نس میں بجلی کی رو دوڑ گئیں۔ بیگو جوان تھی۔ ا- آؤ بیگو۔"

بیگو ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے اس کی کلا پکڑ لیا۔ اس کی کلائی نرم اور گداز تھی۔ گرم اور زندگی سے بھ

"بیگو وہ مشین تھی۔"

اور بیگو کی گول گول آنکھیں مجسم سوال بن کر رہ گئیں میں نے کہا۔ "بیگو وہ عورت نہیں تھی۔ وہ ایک مر کھی۔ کھی۔ کھی۔ کاہی ہنستا ہوا کمرے کے اندر دا دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔ جیسے قہقہے کو اس نے دفعتاً نگل لیا گلا گھونٹ رہا ہو۔

"کاہی وہ مشین تھی۔"

اور کاہی پھٹی پھٹی نگاہوں سے کبھی میری طرف دیکھنے لگا جس کی کلائی ابھی تک میرے ہاتھ میں تھی۔

پیکالہ پروڈکشن کے دو پارٹنرز تھے۔ داؤد عراقی اور سندر لیس جانی۔ دونوں بے حد چلتے پرزے تھے اور ایک بڑی تصویر بنا رہے تھے۔ ایسٹ مین کلر میں۔ ہرجیت کمار اور آرادھنا کو لے کر جن کی جوڑی ان دنوں فلم انڈسٹری میں ٹاپ کی جوڑی سمجھی جاتی تھی۔ ہرجیت کمار کا کنٹریکٹ بارہ لاکھ کا تھا اور آرادھنا کا آٹھ لاکھ کا۔ پکچر دو تہائی مکمل ہو چکی تھی۔

پیکالہ پروڈکشن کا آفس بے حد شاندار تھا لیکن داؤد اور سندر کا پرائیویٹ کمرہ جو آفس کے بالکل آخر میں تھا سب سے شاندار تھا اور اسے بہت کم لوگوں نے دیکھا تھا۔ آپس کی پرائیویٹ گفتگو کرنے کے لیے داؤد اور سندر اسی کمرے کی طرف رجوع کرتے تھے اس پر ہر وقت تالا پڑا رہتا ہے۔ جس کی چابی داؤد کے پاس تھی، دوسری سندر کے پاس۔ تیسری چابی پلٹو کے پاس تھی۔

پلٹو پیکالہ پروڈکشن کا چپراسی تھا اور دونوں پارٹنرز کا منہ چڑھا تھا کیونکہ اس کے پاس تیسری چابی تھی اور جب دفتر بند ہو جاتا اور دفتر کے لوگ چلے جاتے اس کے بعد بھی داؤد اور سندر اکثر گھنٹوں اسی کمرے میں بیٹھتے تھے۔ ایسے موقعوں پر پلٹو ہی ان کی خدمت کرتا تھا، چار گھنٹے مسلسل ناؤ نوش چلتی۔ گھروں پر بیویوں کو ٹیلی فون ہوتا کہ آفس میں بہت کام ہے۔ فلم کے شوق میں دور دور سے آ کر آنے والی تتلیوں سے ملنے کا یہی وقت تھا۔ ایسے وقت میں پلٹو ہی خدمت کرتا تھا۔

میں بھی ایک عرصے سے پلٹو کی خدمت کر رہا تھا۔ تھوڑی بار اسے بھیل پوری کھلا چکا تھا۔ ایک دن پلٹو نے مجھ سے کہا: "آج دونوں سیٹھ خالی ہیں آٹھ بجے تک، اس لیے تم سات بجے آفس آ جانا۔"

میں ساڑھے چھ بجے ہی پہنچ گیا۔ پلٹو اس وقت سوڈے کی بوتلیں پرائیویٹ روم میں لے جا رہا تھا۔ مجھے جلدی سے آفس کے باہر اپنی کرسی پر بٹھا کر اندر چلا گیا۔ کوئی دس منٹ کے بعد ہنستا مسکراتا باہر نکلا۔ ہاتھ کے اشارے سے مجھے اندر بلانے لگا۔

"اندر چلو سیٹھ بلاتے ہیں۔ میں نے تمہارا انٹروڈکشن کرا دیا ہے مگر خبردار میری کسی بات کو وہاں کاٹنا نہیں، جو میں کہوں اس میں ہاں ملاتے جانا نہیں تو پھڈا ہو جائے گا۔"

میں دھڑکتے دل سے اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ تین عالی شان کمروں کو پار کر کے ہم سیٹھوں کے پرائیویٹ روم کے باہر پہنچے۔ پلٹو نے دستک دی اور آہستہ سے دروازہ کھول کے اندر داخل ہو گیا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے.....

داؤد اور سندر دونوں ایک ہی صوفے پر بیٹھے تھے۔ سامنے کانچ



کی ایک لمبی تپائی تھی جس پر فائلوں کی ایک چھوٹی سی ٹرے تھی کونے میں ایک چھوٹی میز پر ایک ٹائپ رائٹر رکھا تھا۔

ایک کونے میں افغانی رنگ کی مخمل کا دیوان تھا۔ دو صوفے تھے چند کرسیاں اور ایک لوہے کی الماری سیٹھوں کے صوفے کے پیچھے پورے کمرے کی لمبائی میں ایک پھول دار پردہ پڑا تھا۔ نیلے رنگ کے اس دبیز پردے کے پیچھے کیا تھا؟ یہ مجھے معلوم نہ ہو سکا۔ ہاں وہاں سے روشنی چھن چھن کر آ رہی تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ ادھر بھی کچھ ہے۔ میں نے ایک لمحے میں کمرے کا جائزہ لے لیا۔

پلٹو بولا: ”یہ میرا دوست ہے ہینٹ ماسٹر! ہائی کلاس گیت لکھتا ہے۔ تین سال ساحر کا باورچی رہ چکا ہے۔“

”ساحر کا باورچی!“ داؤد نے حیرت سے میری طرف دیکھ کر کہا۔ میں نے بھی حیرت سے پلٹو کی طرف دیکھا، سندر نے جلدی سے مجھے ایک کرسی پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا جس پر میں جلدی سے بیٹھ گیا۔ سیٹھ داؤد کی آواز ایسی کڑوی اور کھوکھلی تھی جیسے سن کر ہمیشہ کے لیے لحن داؤدی سے نفرت ہو جائے۔

”ساحر اپنا ہر گانا کسی کو سنانے سے پہلے اسے سناتا۔ جب یہ پاس کرتا تھا تو کسی دوسرے کو سناتا تھا!“ پلٹو کہتا رہا۔

سندر کا منہ کھلنے لگا۔

”اب بولنے کی بات نہیں ہے۔“ پلٹو بولا: ”ساحر کا تاج محل اسی کا لکھا ہوا ہے۔“

”تاج محل اس کا لکھا ہوا ہے!“ داؤد حیرت سے چیخا۔ ”پلٹو تو بنڈل تو نہیں پھینک رہا ہے؟“

”نہیں سیٹھ!“ پلٹو نے فائلوں کو ایک کنارے پر رکھ کر کانچ کی لمبی تپائی پر خالی گلاس سجاتے ہوئے کہا: ”اپنے کو جھوٹ بولنے سے کیا ملنے والا ہے؟ یہ میرا دوست ہینٹ ماسٹر غضب کا گیت کار ہے۔“

”لیکن تاج محل تو ساحر نے برسوں پہلے لدھیانے میں لکھا تھا ایسا میں نے سنا ہے۔“ داؤد سیٹھ بولا۔

پلٹو نے کہا: ”یہ بھی لدھیانے کا رہنے والا ہے۔ دونوں ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے۔ دونوں شاعر تھے۔ پھر تو یہ اپنی اپنی قسمت کی بات ہے۔ ایک آج آسمان پر ہے دوسرا فٹ پاتھ پر۔“

سندر لس جانی نے مجھے ہمدردی کی نظر سے دیکھا۔

”لدھیانے میں اس نے ایک گیت لکھا تھا: ”راج محل“ اسی کو موڑ توڑ کے ساحر نے تاج محل بنا کے چالو کر دیا: ”تم سنا دو نا ان کو اپنی گلی کا راج محل۔“

پلٹو نے آخری فقرہ مجھ سے کہا۔

”ہیرو جی! کھائی حسن کی چوٹ میرے آنچل کی اوٹ!!“

”دلہن نے چکھی مزے کی لوٹ، دعوت تیرے کی
مزے کی لوٹ اور اس پہ دعوت تیری کی!“

پلٹو نے جلدی سے ایک گلاس میں میرے لیے وہسکی انڈیلی اپنے لیے تیسرے میں داؤد کے لیے آتی انڈیلی کرتے

”بس جانی!“

بس جانی نے ہاتھ روک لیا ہونٹوں میں ہنسا۔ ہوا کر سندر نے ایک دم اپنا لہجہ بدل دیا۔ اپنے گلے کی ٹائی کرتے ہوئے بولا: ”اچھا ہے مگر بہت اچھا نہیں ہے بہت ٹھیک نہیں ہے۔ پہلے کا مگر بہت نہیں چلے گا۔“

”ہاں اچھا ہے مگر کچھ اچھا ہے۔ بجے گا ہے مگر کو بہت محنت کرنا پڑے گا۔“ داؤد سیٹھ بولا۔

”وہ بھی کر لوں گا سیٹھ۔“ میں نے کسی قدر لجاجت سے کہا۔ اندر سے بہت غصہ آ رہا تھا۔

”اس کو ایک چانس ملنا چاہیے۔“ سیٹھ داؤد نے سفارش کی۔ ”اس کی شاعری میں دم معلوم ہوتا ہے۔“

”پھر ساحر کا باورچی بھی رہ چکا ہے۔“ سندر لس جانی ہنستے ہوئے کہا۔

”تو ایک چانس دے دو اس کو۔“

”پر چانس ہے کدھر؟“ سندر نے داؤد سے کہا۔

”بڑا پکچر تو خود ساحر کر رہا ہے۔“

”تو چھوٹا والا اس کو دے دو جو تم اگلے مہینے میں اسٹارٹ“ داؤد ایسے بولا جیسے اس کا اگلی تصویر سے کوئی تعلق نہ ہو۔

”ہاں وہ چھوٹی تصویر... اس میں تم ٹرائی کر سکتے“ سندر نے مجھ سے کہا۔ جیسے مجھ پر بڑی مہربانی کر رہا ہو۔ ”پر مطلب ہے اس کو ہم اس لیے خرچ کر رہے ہیں کہ جو نئے لوگ تمہاری طرح فلم کے کام کی تلاش میں آتے ہیں ان کو اپنے کو کچھ کمانے کا نہیں ہے اس دھندے میں بنا ڈالیں گے نئے لڑکے لڑکیوں کو لے کر۔“

”سب نئے لوگوں کو چانس دیا ہے۔ ہم اس پکچر میں لگا۔“ داؤد نے مجھے پچکار کر کہا: ”اس کا کنٹریکٹ بنا دو جی، ریٹ تم طے کر لیں۔“ سندر لس جانی کسی قدر کڑوے

”ہم پچاس روپیہ ایک گانے کا دیں گے۔ ہے تو یہ پبلسٹی پر بہت خرچ کرے گا۔“

میں ”راج محل“ سنانے لگا۔ جسے میں نے ساحر کے ”تاج محل“ سے موڑ کر لکھا تھا بلکہ کہیں تو مصرعے کے مصرعے اڑا لیے تھے۔

سمجھنے میں ہی تو خرابی ہے۔

"راج محل" سننے کے بعد داؤد اور سندر دونوں نے دانتوں تلے انگلی دبالی۔

داؤد بولا: "وہی بات کی گیلی معلوم ہوتی ہے۔"

سندر بولا: "اور جادو کچھ کچھ آتی ہے۔"

داؤد نے کہا: "صاف دکھتا ہے راج محل کا تاج محل بنا دیا ماسٹر نے۔"

پلٹو نے فتح مندانہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور کہا: "اندر کی بات کیا بتاؤں سیٹھ! جب یہ ساحر کا باورچی تھا وہ روز اس سے ہوگئے پر معلوم کیا تھا کتنی اچھے سے اچھے گیت دیئے ہوئے ہیں۔ اس نے ساحر کی محفلوں میں۔۔۔ اندر کی بات بتا رہا ہوں یہ قسمت دیکھو بے چارہ فٹ پاتھ پر ہے اس کو ایک چانس تو ضرور دو سیٹھ!" پلٹو نے بات ختم کی اور وہسکی کی بوتل تپائی پر رکھ دی۔

"اچھا تم باہر جاؤ!" داؤد نے پلٹو سے کہا: "ہم اس کے سنگ بات کرتا ہے۔"

پلٹو نے بہت ہوشیاری سے مجھے آنکھ ماری اور پھر باہر چلا گیا۔

پلٹو کے جاتے ہی داؤد ذرا سا کھنکارا۔ سندر لیس جانی نے اپنے گلے کی ٹائی درست کی۔

داؤد بولا: "اور کیا کیا لکھان کرتے ہو؟"

"گیل گیت، گانا دوگانا، تیگانہ، سب لکھتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"یہ تیگانہ کیا ہوتا ہے؟" سندر نے پوچھا۔ سندر اور داؤد میں سندر سیٹھ بزنس مین مانا جاتا تھا اور داؤد کی رائے فلمی کہانی، مکالمے گیت کے بارے میں مستند مانی جاتی تھی۔

میں نے کہا: "دوگانا تو ہیرو ہیروئن کا ہوتا ہے۔ تیگانے میں ولن بھی بیچ بیچ میں گاتا ہے۔ جیسے میں نے ایک تیگانہ لکھا ہے۔ پہلے ہیرو گاتا ہے پھر ہیروئن آخر میں ولن سنیے:

ہیرو: "میں کہتا ہوں ڈنکے کی چوٹ تو ہے زہر کی پوٹ!"

ہیروئن: "میں کہتی ہوں ڈنکے کی چوٹ تیرے دل میں ہے کھوٹ!"

ولن: "دھت تیرے کی!"

ولن کی دھت تیرے کی پر داؤد اچھل پڑا میری بدصورت لمبے لمبے ناخنوں والی میل سے بھری ہوئی انگلیاں چوم کر بولا: "دھت تیرے کی! کیا ٹپ کا ٹکڑا لکھا ہے سالا جو بھی ٹکڑا ہے آگے ستاؤ" میں آگے سنانے لگا۔

ہیرو: "میں نے کھویا دس کا پتہ میں نے کھویا سو کا نوٹ!"

"کیا بلیشنگ کرو گے؟" میں نے مل کر کہا: "یہی لکھو گے کہ ہماری چلی جگر ساحر لدھیانوی لکھ رہا ہے دوسری اس کا باورچی؟؟"

"تم تو خفا ہو گیا جینت ماسٹر!" داؤد نے ہنس کر میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ پھر سندر سے مخاطب ہو کر بولا: "ہم جانتا ہے یہ ساحر لوگ کا مال بہت چلتا ہے۔ ابھی کا بات پر بھڑک جاتا ہے۔ اس کو اور وہسکی دو سندر!"

سندر نے میرے لیے اور وہسکی ڈال لی۔ اپنے لیے اور داؤد کے لیے اس کو پھر ہاتھ روک کر کہنا پڑا۔

"بس جانی!"

سندر نے غور سے میرے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "ہم کاہے کو ایسی پبلسٹی کرے گا جس سے تمھاری اور ہماری بدنامی ہو۔ ہم تو کسی سے بولنے کا نہیں کہ تم ساحر کے باورچی رہے ہو۔ ہم تو ساحر سے بھی نہیں ملنے کا۔ ہم ایسا پبلسٹی کرے گا تم جیسے ساحر کے دوست رہ چکے ہو۔ ملوانے کے کام اس فیلڈ پہ دونوں دوست۔ دونوں شاعر۔ اب دونوں ایک ہی کمپنی میں دو الگ الگ پکچر کے گانے لکھتے ہیں۔ ایک نے لکھا راج محل دوسرے نے لکھا تاج محل۔ پبلک الٹ پڑے گی دیکھنے کے لیے کہ دونوں میں سے کون سا اچھا ہے! اتنی بات سمجھے نہیں ہو گیا!"

میں ہکا بکا رہ گیا۔ سندر واقعی ٹھیٹھ بزنس مین تھا۔

"اور تمھارا نام بھی بدلنا پڑے گا۔" داؤد سیٹھ بولا: "یہ جینت ماسٹر نہیں چلے گا۔ تمھارا نام رکھا جائے گا بجلی بھوپالی!"

"بجلی بھوپالی؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں بجلی بھوپالی!" داؤد نے کڑک کر کہا اور پھر داد طلب نگاہوں سے سندر کی طرف دیکھ کر بولا: "کیوں؟"

"بجلی بھوپالی، اسٹرونگ نام ہے۔" سندر بولا۔ "جب پبلسٹی میں آئے گا سالا بجلی کی مانند چمکے گا۔ بجلی بھوپالی۔۔۔ واہ۔۔۔ واہ۔"

سندر سیٹھ نے داؤد سیٹھ کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر کہا: "کیا آرٹسٹک نام ہے۔ مانتا ہوں سیٹھ! آرٹ کے معاملے میں تمھارا دماغ بہت چلتا ہے۔"

"سالا ہم کو آرٹ نہیں آگیا۔" داؤد کسی قدر اداسی سے بولا: "ہم کو ٹائم نہیں ملتا ہے بزنس سے نہیں تو ہم سچ کہتا ہے ہمارا بھیجہ میں ایسا اسٹوری بھرا ہے کہ ایک ایک نئی لکھ دیوے تو سالے رائٹر لوگ کی گردن توڑ دیوے۔ اتنا رائٹر لوگ بمبئی چھوڑ چھوڑ کر بھاگ جاوے!"

وہ تھوڑی دیر چپ رہا پھر بہت اداس ہو کر بولا۔

"پر کیا کرے ہم کو اس دھندے سے ٹائم نہیں ملتا ہے۔"

سیٹھ داؤد کی آنکھ میں آنسو تھے۔

"بے شک بے شک!" سندر لیس جانی نے کہا۔

تھوڑی دیر ہم دونوں اس آدمی کی ٹریجڈی پر غور کرتے رہے جو رائٹر بنتے بنتے بزنس مین بن گیا تھا۔ داؤد سیٹھ نے بھی جب اور غور کیا تو اس میں کچھ زیادہ وزن نہ پایا۔ فوراً ایک لمبا گھونٹ لے کر موڈ بدلا اور میری طرف دیکھ کے بے حد بشاش ہو کر بولا۔

پیرزادہ کے گھر جب بچے ہوئے تو سارے بچے "پیپلز پارٹی زندہ باد۔ پیپلز پارٹی زندہ باد" کے نعرے لگانے لگے۔ جب پارٹی کے چیئرمین کو خبر ہوئی تو پیرزادے کے بچے ہوائی جہاز کے ذریعے اسلام آباد طلب کیے گئے۔ چیئرمین کے سامنے پہنچ کر ان بچوں نے "پی این اے زندہ باد" کے نعرے لگانے شروع کیے تو مسٹر بھٹو نے انتہائی غصے کے عالم میں پوچھا۔ "یہ کیا بکتے ہیں یہ؟"

پیرزادے نے دست بستہ عرض کی "حضور اب ان کی آنکھیں کھل گئی ہیں۔"

"تم کو چانس مل گیا ہمارے بولنے پر۔ ایک بات ہماری بھی دکھی ہوگی۔"

"کیا؟" میں نے داؤد سیٹھ سے پوچھا۔

"جیسے گانا گانے کا پچاس روپیہ پر رسید دو گے پانسو کی۔"

"وہ کیوں؟"

"ارے بابا!" سیٹھ داؤد نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ "ہم یہ فلم پکچر شروع کر کے مصیبت میں پھنس گیا ہے۔ کس کو کتنا بلیک دیوے اور کدھر کدھر اس کو ڈالے؟ اب تو یہ مصیبت ہے کہ کسی جو پڑی میں جگہ نہیں ہے کسی میں اس کو نہیں ڈال سکتا۔ یہ نیا پکچر شروع کرتا ہے کہ تم نئے لوگ کو چانس دے گا اور تھوڑا بلیک ٹھیک کرے گا ورنہ اپنے کو اس دھندے سے کچھ کمانے کا نہیں ہے۔"

"سمجھ گیا۔" میں نے کہا۔ "تم نئے لوگ کو چانس دے گا اور اپنا بلیک ایڈجسٹ کرے گا؟"

"تم ٹھیک سمجھا ہے۔" سندر بس جانی نے کہا۔

"میں جاتا ہوں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

سندر نے جھٹ مجھے بازو سے پکڑ لیا۔ "کدھر جاتا ہے؟"

"واپس فٹ پاتھ پر!"

"یہ پاگل ہوا ہے؟!"

"ہاں پاگل ہے ہم! پچاس روپے لے گا تو پچاس کی رسید دے گا۔ پانسو لے گا تو پانسو کی رسید دے گا۔ ہم کالا دھندا نہیں کرے گا!"

اس پر وہ دونوں پہلے تو چپ رہے پھر ایک دم زور زور سے ہنسنے لگے۔ اتنا ہنسے اتنا ہنسے کہ ان کی آنکھوں میں پانی آگیا۔ ہنستے ہنستے وہ دونوں میری طرف ہاتھ اٹھا اٹھا کر اشارہ کرتے جاتے اور کہتے تھے۔

"بالکل بچہ ہے۔"

"ایک دم کچا ہے۔"

"سالا گدھا ہے۔"

"نرا اُلو کا پٹھا ہے۔"

"سالا تم کس دنیا میں رہتا ہے؟" سیٹھ بس جانی نے ایک ہزار گنی نفرت سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم مجھے ایک بھی دھندے کا نام بتاؤ۔ ایک بھی دھندے کا جو کالے کے بغیر چلتا ہو؟ بس ایک دھندے کا نام! میں تو تمہارے پیشاب سے اپنا شیو کر لوں گا۔"

"رسید کے بغیر میں آپ کو اس کی بھی اجازت نہیں دوں گا۔" میں نے غصے لہجے میں اسے جواب دیا۔ "میرا پیشاب کوئی داڑھی صاف کرنے کا صابن نہیں ہے!"

وہ حیرت سے میرا منہ دیکھنے لگے۔ ایسے جیسے کسی پاگل خانے میں دیکھ رہے ہوں۔ پھر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے کہ آیا وہ جسے دیکھ رہے ہیں وہ واقعی ان کے سامنے کرسی پر موجود ہے۔

"میں اپنے اصول نہیں توڑ سکتا۔" میں نے بہت سختی سے کہا۔

"ہم اپنے نہیں توڑ سکتے۔" آنند بس جانی نے مجھے جواب دیا۔

"میں تو جاتا ہوں!"

"تو جاؤ!" سندر بولا۔

میں اٹھنے لگا تو سیٹھ داؤد بولا۔ "یہ یہ ٹیگار تو دیتے جاؤ۔ ہم تم کو اس کے پچاس کے بدلے پچہتر دیں گے اور پانسو کے بدلے تین سو کی رسید لیں گے۔"

"جی نہیں۔" میں نے کہا۔ "میں اس گانے کے سو روپے لوں گا اور سو کی رسید دوں گا۔ بس۔"

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف مایوس ہو کر دیکھا۔ اتنے میں سیٹھ داؤد نے پھر کوئی خفیہ اشارہ کیا۔ سندر نے جیب سے سو کا نوٹ نکال کر میری طرف بہت بیزاری سے پھینک دیا۔ میں نے سو کا نوٹ جیب میں رکھا اور رسید کو کرٹ دی۔ گانا ان کو کر دیا اور تیلیں بجا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

اتنے میں چپڑاسی نے دروازہ کھولا۔ اس کے پیچھے پیچھے دو نہایت شاندار لڑکیاں نہایت شاندار ساڑیوں میں ملبوس اٹھلاتی بل کھاتی، چمکتی، سمٹتی، ہنستی، مسکراتی بغیر کسی تمہید تعارف اور نوٹس کے داخل ہوئیں۔

ان دونوں کی ساڑیوں کے گرد بھی بھی لپٹ کر کسی خوشبو کا ایک ہالہ دکھائی دینے والا ہالہ لرز رہا تھا۔ انہیں دیکھ کر داؤد اور سندر دونوں اپنے صوفے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں تو غریب پہلے سے ہی کھڑا تھا۔ ان میں سے ایک لڑکی جو دوسری سے قد میں زیادہ لمبی تھی اور لباس بھی شاندار پہنے ہوئے تھی، میری طرف دیکھ کر کچھ ہچکچائی پھر مڑ کر اپنی سہیلی کا تعارف کرانے لگی۔ "یہ میری سہیلی جیوتی ہے۔ آج ہی جبل پور سے آئی ہے۔ اسے فلم میں



کام کرنے کا بہت شوق ہے۔"

دونوں سیٹھوں نے شگفتہ مسکراہٹ سے ان دونوں کا استقبال کیا پھر پہلی لڑکی نے میری طرف غور سے دیکھا۔ سیٹھ نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"یہ ساحر کا باورچی ہے۔"

میں جلدی سے ہاتھ جوڑ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ تیز تیز قدموں سے واپس لوٹ رہا تھا اور میری آنکھوں میں آنسو تھے۔ یکایک میرے پیچھے لڑکیوں کی ہنسی اور قہقہوں کا طوفان سا برپا ہو گیا۔ وہ لوگ کسی بات پہ اتنے زور زور سے ہنس رہے تھے سیٹھوں کے قہقہے بھی ان میں شامل تھے کیا وہ لوگ میری حماقت پر ہنس رہے تھے! ایسا چانس کوئی احمق ہی رد کر سکتا ہے۔

پلٹو کیا کہے گا؟ بے چارے نے کیا کیا فراڈ کر کے مجھے کام دلوا ہی دیا تھا۔ فلم میں پہلا چانس! اور میں کیسا احمق ہوں بالکل کہیں پر اپنے آپ کو ایڈجسٹ نہیں کر سکتا۔ ونیٹ ماسٹر! یہ اصول تیرے کس کام کے ہیں؟ کیا تو انھیں چاٹ سکتا ہے؟ کیا ان کی شمع بنا کے جلا سکتا ہے؟ کیا انھیں کھا سکتا ہے؟ ان کو ایک کتے کی طرح اپنے فٹ پاتھ پر بچھا سکتا ہے۔ کیا ان اصولوں سے ان لڑکیوں کی خوشبو آتی ہے جن کے قہقہے اب تک تیرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔

پھر کب تک ان اصولوں کا کفن سر سے باندھے ایک آوارہ لاش کے میلے میں گھومے گا؟

اب بھی پلٹ جا!!

اور دستخط کر دے اس کنٹریکٹ پر!!

اور شامل ہو جا اس حمام میں!!!

جہاں سب ننگے ہیں۔

تین عورتیں تین کہانیاں

— تحریر: رفعت فاروق



گیند کی طرح اچھال کر

آجکل میرے اسکول میں داخلہ ہو رہا ہے۔ میری مصروفیت وہ چند ہو گئی ہے۔ کام سے فارغ ہو کر تھکن سے چور گھر آئی اور ... بیٹھتے ہی سو گئی۔ میں نے غنودگی کے عالم میں گلی میں کچھ شور سنا۔ ... کی خواہش ہوئی مگر نیند نے اس بری طرح جکڑ لیا کہ آنکھ نہ ... اٹھی تو خاصی ترو تازہ ہو گئی۔ غسل سے فارغ ہو کر اخبار پڑھا۔ اخبار میں ہمیشہ باسی پڑھتی ہوں۔ بوا چائے لے کر آئی تو مجھے گلی میں شور کا دھیان آیا۔ میرے پوچھنے سے پہلے بوا نے بتایا کہ آج پولیس نے چھاپہ مارا تھا رضیہ کو گرفتار کر کے لے گئی ہے۔ اس کے گھر سے ہیروئن اور ... برآمد ہوئی تھی۔ میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ رضیہ کو میں بارہ سال سے جانتی تھی۔ ان دنوں میں چھٹی جماعت میں پڑھا رہی تھی جب یہ لڑکی پہلی بار ہمارے گھر آئی تھی۔ مغرب کا وقت تھا۔ گھر کے لوگ وضو کر کے نماز کی تیاری میں مصروف تھے۔ ابو مسجد میں نماز پڑھتے تھے۔ وہ دروازے کی جانب جا رہے تھے کہ کسی نے ہولے سے دروازے پر دستک دی۔ انہوں نے دروازہ کھولا۔

اور دو قدم پیچھے ہٹ گئے۔ دستک دینے والی ہستی اندر آ گئی۔ یہ لڑکی رضیہ تھی۔ مجھ سے تین چار سال بڑی۔ ایک نوعمر سی خوبصورت لڑکی۔ اس کی گود میں گول مٹول سا بچہ تھا جو اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے ہر شخص کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ میں اسکول کا کام سمیٹ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر اشارہ کیا وہ میرے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ امی نماز سے فارغ ہو کر اسی طرف آ گئیں۔ پوچھا کیا بات ہے تو کہنے لگی "بی بی میں شریف گھر کی لڑکی ہوں۔ میرا خاوند رکشہ چلاتا تھا۔ کچھ مہینے اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ وہ مر گیا سسرال والوں نے سیوا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ بھائی کوئی نہیں ہے۔ ماں نے دوسری شادی کر لی تھی۔ سوتیلے باپ نے مجھے شروع سے نفرت کی ہے۔ ساس سسر زندہ نہیں ہیں۔ جیٹھ دیور رکھنے کو تیار نہیں۔ آپ مجھے نوکر رکھ لیں۔ تو میرے دکھ دور ہو جائیں گے۔ میں محنت مزدوری کر کے اپنے بچے کو پال لوں گی" یہ کہتے کہتے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس کی گفتگو اور بھولپن سے لگتا تھا کہ جو کچھ کہہ رہی ہے وہ سچ ہے۔ امی نے اسے تسلی دی۔ کھانا کھلایا اور دس روپے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ کہنے لگیں "ابھی ہمارے پاس ملازمہ ہے۔ ہم کچھ اور مدد نہیں کر سکتے۔" اس لڑکی نے پیسے واپس لوٹا دیئے کہنے لگی "بیگم صاحب مجھے نوکری چاہئے۔ خیرات کے پیسے سے اپنے بچے کو پالنا نہیں چاہتی۔" وہ یہ کہہ کر اٹھی حسرت سے مجھے دیکھا۔ امی اور میں دونوں شرمندہ سے ہو گئے تھے۔ جب وہ چلی گئی تو میں نے امی سے کہا کہ آپ نے



لڑکیوں نہیں دکھایا یہ کونسا زیادہ کمالیتی۔ امی بولیں "تو نے دیکھا نہیں، کتنی خوبصورت لڑکی ہے۔ جس گھر میں جوان لڑکے ہوں ایسی لڑکیوں کا رکھنا درست نہیں ہوتا۔" امی کا کہنا بھی صحیح تھا۔ ان دنوں ہمارا گھر ہوسٹل بنا ہوا تھا۔ دراصل ہمارا پورا خاندان دیہات میں آباد تھا۔ ابو پشاور میں ملازمت کرتے تھے۔ یہاں مکان ملا ہوا تھا۔ خاندان کے جو لڑکے شہر میں تعلیم حاصل کر رہے تھے وہ ہمارے یہاں قیام پذیر تھے۔ عمران میرے چچا کے لڑکے تھے رفیق اور شفیق میرے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ خالہ زاد بہن جمیلہ آپا بھی ہمارے ساتھ تھیں۔ وہ آٹھویں کی طالبہ تھیں۔ میرے سوا ابو کے کوئی اور بچہ نہیں تھا اس لئے ہم سب کزنز سگے بہن بھائیوں کی طرح رہتے تھے۔ ایسا لگتا تھا، جیسے ابو کے تین لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں۔ ان میں عمران پر ابو بہت جان چھڑکتے تھے۔ امی بھی انہیں زیادہ چاہتی تھیں۔ اپنی اچھی عادتوں کی وجہ سے ہم سبھی بہن بھائی ان کی عزت کرتے تھے۔ اتنے سارے لڑکوں کی موجودگی میں رضیہ کو ملازم رکھنا واقعی مناسب نہیں تھا۔ وہ چلی گئی مگر میرے دل میں اس کے لئے کسک سی جاگ اٹھی جو بہت دنوں مجھے بے چین کئے رہی۔

آٹھ دس دن بعد میں نے رضیہ کو گلی سے گزرتے دیکھا۔ اسکے بدن پر صاف ستھرے کپڑے تھے۔ بال بھی سلیقے سے گندھے ہوئے تھے۔ چہرے پر شادابی اور آنکھوں میں چمک تھی۔ مگر اس کی گود خالی تھی۔ میں لپک کر اس کے پاس پہنچی۔ مجھے دیکھ کر وہ ٹھہر گئی۔ اور میرے کچھ پوچھنے سے پہلے بولی "پچھلی گلی میں جو تحصیلدار صاحب رہتے ہیں نا، انہوں نے مجھے اپنے یہاں نوکر رکھ لیا ہے۔ بڑے اچھے لوگ ہیں۔" میں نے پوچھا "تمہارا بچہ کیسا ہے؟" اس کی آنکھوں میں میرے سوال سے افسردگی تیر گئی۔ رک کر بولی "بیگم صاحبہ کی شرط تھی کہ بچے کو کہیں چھوڑ آؤں۔ تب کام ملے گا۔ تحصیلدار صاحب کے ملنے والوں میں ایک جوڑا بے اولاد تھا۔ انہوں نے زور دیا کہ بچہ انہیں دے دوں۔ وہ اسے شہزادوں کی طرح رکھیں گے۔ اسے پڑھا لکھا کر بہت بڑا آدمی بنا دیں گے۔ میں اسے بھوک اور دکھ کے علاوہ کچھ اور نہ دے سکتی تھی۔ اس لئے بچہ ان لوگوں کے سپرد کر دیا۔ وہ اسے لے کر کراچی چلے گئے۔ بیگم صاحبہ بتاتی ہیں کہ وہ وہاں بچہ گاڑی میں سیر کرنے جاتا ہے بہت آرام سے ہے۔ اللہ اسے خوش رکھے۔ میں نے اس کے مستقبل کیلئے اپنی ممتا کی قربانی دی ہے۔" اس کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ میں نے اسے تسلی دی کہ تو نے یہ کام بہت اچھا کیا ہے۔ تیرا بچہ بڑا ہو کر تجھے ضرور اپنے پاس بلالے گا۔

حسن میری کمزوری ہے۔ خاص طور پر خوبصورت عورت اور بچے مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ اس عادت پر امی سے خاصی جھاڑ بھی پڑتی تھی مگر کیا کروں، حسن نظر انداز کرنا میری فطرت میں ہی نہیں۔ رضیہ بہت خوبصورت لڑکی تھی۔ اس سے مجھے بڑی انسیت سی ہو گئی تھی۔ وہ مجھے اکثر ملتی تھی۔ کبھی کبھی ہمارے گھر بھی آنے لگی۔ اس میں خاصی تبدیلی آگئی تھی۔ بالوں میں رنگین کلپ نظر آنے لگے۔ اور ناخنوں پر پالش چمکنے لگی۔ میں نے اس سے پوچھا "کام کرتے ہوئے تیری ناخن پالش خراب ہو جاتی ہوگی" وہ بولی "نہیں جی میں برتنوں کو ہاتھ نہیں لگاتی۔ صرف جھاڑ پونچھ کرتی ہوں۔"

ایک دن وہ آئی۔ امی مشین پر رضائی سی رہی تھیں۔ اُن کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ امی کسی کام سے اٹھ کر کمرے میں گئیں۔ ان کا بٹوہ مشین میں پڑا تھا۔ رضیہ نے جلدی سے اسے کھولا اور دس روپے نکال لئے اور بٹوہ وہیں رکھ دیا۔ یہ بھید اس کے چلے جانے کے بعد کھلا۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آیا۔ چھ مہینے پہلے جس لڑکی نے دس روپے خیرات کہہ کر لوٹا دیئے تھے۔ وہ دس روپے چوری کر کے بھاگ جائے۔ یہ یقین نہ آنے والی بات تو تھی۔ امی نے سختی سے اس کا آنا جانا بند کر دیا۔ مگر مجھ سے وہ برابر ملتی رہی۔ اسکول جاتی تو راستے میں وہ ضرور مُلاتی۔ سب کا احوال پوچھتی۔ اس طرح وقت گزرتا گیا۔ آٹھویں کے بعد امی نے میرا پردہ کرا دیا۔ جمیلہ باجی کی رفیق بھائی سے شادی ہو گئی۔ عمران، رفیق اور شفیق چھٹیوں میں اپنے اپنے گھر چلے گئے تھے میں گھر میں اکیلی رہ گئی۔ محلے میں ایک چھوٹا سا دھماکہ ہوا۔ قریبی نالے میں ایک نوزائیدہ بچے کی لاش تیرتی ہوئی ملی۔ پولیس آئی محض رسمی کارروائی کر کے چلی گئی۔ تحصیلدار صاحب نے انہیں اپنی بیٹھک میں ہی بٹھا کر کارروائی مکمل کرائی۔ کوئی سراغ نہ ملا کہ یہ کس کا کام تھا۔ کچھ لوگوں نے دبے دبے کچھ افواہیں اڑائیں۔ مگر تحصیلدار صاحب پنج وقتہ نمازی تھے۔ کسی نے یقین نہیں کیا۔ رضیہ بہت دنوں نظر نہیں آئی۔ تحصیلدارنی نے بتایا کہ وہ اپنے بچے کے پاس کراچی چلی گئی۔ وہاں اُسی گھرانے میں اسے نوکری دلا دی۔ اس طرح وہ خواب خیال ہو گئی۔

میٹرک کے بعد میں نے کالج میں داخلہ لے لیا۔ میں خاندان کی واحد لڑکی تھی جو اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ مجھ میں اب خاصی سمجھ آگئی تھی۔ اچھے برے کی تمیز آگئی تھی۔ ایک دن مجھے کالج سے واپسی میں دیر ہو گئی۔ پریشانی کے عالم میں بس اسٹاپ پر کھڑی تھی کہ میری نظریں جھماکا سا ہوا۔ رضیہ اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ نظر آگئی۔ پہلے تو مجھے اسے پہچاننے میں دقت سی ہوئی۔ وہ رکشہ سے اتر کر سڑک عبور کر رہی تھی۔ لباس جدید تراش کا تھا۔ چہرے پر خاصا میک اپ تھا۔ اس کی معصومیت ختم ہو چکی تھی۔ مگر بے باک حسن اور بھی قیامت خیز لگنے لگا تھا۔ میں نے قریب آنے پر پوچھا "تم رضیہ ہی ہو نا ـــــ" وہ ہنسی کہنے لگی "میں تو آپ کو پہچان گئی تھی۔" میں نے پوچھا "تم تو اپنے بچے کے پاس چلی گئی تھیں۔ وہاں سے واپس آگئیں" وہ پھر ہنسنے لگی۔ عجیب بے تکے پن سے بولی "آگئی ـــــ" میں نے پوچھا "اب کہاں رہتی ہو؟" بولی "اپنے گھر اور کہاں؟" مجھے اس کے بے ہودہ لہجے پر بڑا غصہ آیا۔ مگر اسی وقت بس آگئی۔ میں چلی آئی وہ وہیں کھڑی رہی

شاید اسے کسی کا انتظار تھا۔ دوسرے روز میری ایک سہیلی نے پوچھا تم بس اسٹاپ پر کل کس سے باتیں کر رہی تھیں۔ میں ابو کے ساتھ وہاں سے گزر رہی تھی۔ میں نے کہا ایک واقف کار عورت ہے۔ وہ کہنے لگی "اس سے مت ملا کرو۔ ابو بتا رہے تھے کہ یہ تھانیدار کی بیوی ہے۔ بڑی اوباش عورت ہے۔ بیچارے تھانیدار کو ناک چنے چبوا رہی ہے۔"

جس لڑکی نے مجھے یہ بتایا تھا اس کے ابو پولیس میں ملازم تھے۔ اس لئے یہ خبر غلط ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ میرے دل کو بڑی ٹھیس پہنچی۔ امی نے اُسے ملازم نہ رکھ کر بہت اچھا کیا تھا۔ خدا جانے ہمارے یہاں کیا گل کھلاتی۔ اب مجھے اس کی ذات سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی اور تقریباً اُسے بھول گئی۔ بی اے کر لینے کے بعد بی ایڈ کا سوچ رہی تھی کہ ابو بیمار پڑ گئے۔ ان کی خواہش پر میرا نکاح عمران سے کر دیا گیا۔ نکاح کے بعد وہ لندن چلے گئے۔ رخصتی واپسی تک ملتوی ہو گئی۔ وہاں سے عمران نے مجھے خط لکھا۔ شرم کی وجہ سے میں اس کا جواب بے باکی سے نہیں دے سکی۔ مختصراً لکھ دیا کہ میں تمام عمر آپ کا انتظار کروں گی۔ آپ سے محبت کرتی رہوں گی۔ آپ مجھے خط نہ لکھا کریں مجھے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگتا۔

عمران نے اس کے بعد ابو کے نام خطوط بھیجے۔ ابو کی بیماری طول پکڑتی جا رہی تھی۔ میں نے بی ایڈ میں ایڈمیشن لے لیا۔ مگر رزلٹ سے پہلے ابو کا انتقال ہو گیا۔ عمران کا خط آیا۔ مجھ سے ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔ میں نے جواباً مناسب الفاظ میں گھر کے حالات لکھ دیئے۔ اور یہ بھی کہ میں نے ملازمت کر لی ہے۔ کیونکہ ابو کے بعد گھر سنبھالنے والا اور کوئی نہیں رہا ہے اگر عمران میرے خط کا مطلب سمجھ چکا ہوتا تو اُسی وقت آ جاتا۔ لیکن یا تو وہ اتنی گہرائی نہیں رکھتا تھا کہ اشارہ سمجھ سکتا یا پھر اُس نے جان بوجھ کر نظر انداز کیا اور نہیں آیا۔ چچا اس کے نہ آنے پر بہت پریشان تھے۔ رفیق بھائی اپنی بیوی جمیلہ باجی کے ساتھ ہمارے ساتھ رہنے لگے۔ وہ دونوں میاں بیوی ہماری پوری طرح دلجوئی کر رہے تھے۔ ہماری تنہائی دُور ہو گئی تھی۔ گھر میں زندگی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ میرے ملازمت کرنے سے مالی تنگی بھی دُور ہو گئی تھا۔ عمران کے ایک خط نے اس سکون میں کنکر پھینک دیا۔ اُس نے وہاں شادی کر لی تھی۔ میں ذہنی طور پر خاصی پریشان رہی مگر ابو کی موت سے بڑا یہ صدمہ نہیں تھا۔ اس لئے حوصلے سے سہہ لیا۔ ملازمت میں اور گہری دلچسپی لینے لگی۔ چچا اور چچی بے حد برہم تھے۔ وہ عمران کو بُرا بھلا کہتے مگر مجھے مجھے اس سے کوئی گلہ نہیں تھا۔ شاید میں اذیت پسند ہو گئی تھی۔ اسکول میں ہیڈ مسٹریس کا عہدہ مل گیا۔ ذمہ داریاں بڑھ گئیں۔ اپنا غم بھلا دیا۔ امی کی طبیعت کچھ خراب سی رہنے لگی تھی۔ چھٹیوں میں رفیق بھائی نے مری جانے کا پروگرام بنایا۔ امی بمشکل راضی ہوئیں۔ ہم لوگ پنڈی بس اسٹینڈ پر کھڑے تھے کہ یکایک رضیہ نظر آ گئی۔ وہ کیبن میں ایک آدمی کے ساتھ بیٹھی تھی ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ مگر چہرے سے معزز لگتا تھا۔ اور رضیہ بھی خاصی مہذب خاتون لگ رہی تھی۔ بہترین قیمتی ساڑھی زیب تن کی تھی۔ میک اپ بڑا مناسب تھا۔ اُس کا یہ رُوپ بالکل نیا اور چونکا دینے والا تھا۔ خوب سُرخ و سفید ہو رہی تھی۔ دونوں بے تکلفی سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ میں نے سوچا ان چند سالوں میں اس کے شوہر نے اسے سُدھار لیا ہوگا اور غالباً یہی اس کا شوہر ہوگا۔ بات کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وَین تیار ہوئی اور ہم چل دیئے۔ مری سے واپسی پر ہم روز مرہ کے معمولات میں کھو گئے۔ اسکول اور گھر ہی میری زندگی کا محور تھے۔ مجھے رضیہ ایک بار اور ملی۔ بازار سے گزر رہی تھی۔ کسی لڑکے کے اسکوٹر پر بیٹھی تھی۔ ذرا دیر کو اسکوٹر رکا۔ معاً وہ نظر آ گئی۔ اس کے ساتھی نے اسکوٹر اسٹارٹ کر دیا تھا اس لئے بات نہ کر سکی۔ وہ دن بدن اسمارٹ سے اسمارٹ تر ہو رہی تھی اس دفعہ تو وہ بالکل کالج گرل بنی ہوئی تھی۔ انہی دنوں عمران لندن سے اپنی بیوی کے ساتھ آ گئے۔ چچا نے انہیں اپنے پاس رکھنے سے انکار کر دیا وہ کوٹھی لے کر علیحدہ ہو گئے۔ چچا اور میری امی مجھ پر زور دے رہے تھے کہ عمران سے طلاق لے کر دوسری شادی کر لوں۔ مگر میں نے صاف کہہ دیا کہ میں اکیلی زندگی گزاروں گی۔ میرے سامنے طلاق اور دوسرے بیاہ کا نام مت لیا کریں۔ میں نے عمران سے جو اپنے پہلے خط میں وعدہ کیا تھا۔ ساری عمر اس پر کاربند رہنا چاہتی تھی۔ رفیق بھائی اور جمیلہ مجھے بہت سمجھاتے رہے کہ پگلی اس طرح کیسے زندگی گزارو گی۔ مگر میرے ارادوں میں کوئی لغزش نہ آئی۔ میرا موقف یہی رہا کہ جو بندھن میرے ابو باندھ گئے تھے وہ توڑنے کی مجھ میں ہمت نہیں۔ ان لوگوں کے اصرار بڑھنے سے پہلے میرا تبادلہ ایبٹ آباد ہو گیا۔ یہاں میرا قیام پہلے ہوسٹل میں رہا پھر سرکاری رہائش گاہ مل گئی۔ میں نے امی کو اپنے پاس بلا لیا۔ میری پھپھو کی ملازمہ زیبو نُوا بھی ان کے ساتھ آ گئیں۔ زندگی چین سے بسر ہونے لگی۔

ایک دن اسکول سے چھٹی کی۔ الماری میں کپڑے اُلٹ پلٹ ہو رہے تھے۔ میں انہیں تہہ کر کے رکھ رہی تھی کہ محلے کی ایک بچی نے بتایا کہ "دروازے پر ایک انڈے بیچنے والی کھڑی ہے"۔ امی اور نُوا ڈاکٹر کے پاس گئی ہوئی تھیں۔ میں نے دروازے سے باہر جا کر دیکھا تو حیران رہ گئی یہ تو رضیہ تھی۔ اپنی پرانی وضع میں دیہاتی کپڑے پہنے کھڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ بھی گھبرا گئی۔ گویا اس نے بھی مجھے پہچان لیا تھا۔ ہماری عمر میں بارہ تیرہ سال کا اضافہ ہو گیا تھا لیکن پھر بھی ہم ایک دوسرے کو نہ بھول سکے تھے۔ میں نے اسے اندر بلوا لیا۔ امی کے آنے کا ڈر تھا اور میں چاہتی تھی کہ آج اس سے اس کے متعلق ضرور پوچھوں گی۔ میں نے اسے تھرمس سے چائے انڈیل کر دی۔ وہ بے باکی سے مسکراتی رہی کہنے لگی "مجھے پتہ ہے تم جاننا چاہتی ہو کہ آج کل میں کیا کر رہی ہوں"۔ میں نے اُس کی ذہانت

[illegible] روپ رہی۔ مجھے بیٹا تیرہ سال سے رُوپ بدلتے دیکھ رہی ہوں۔ سچ بتاؤ تم ہو کیا بلا۔۔۔؟"

وہ بولی" میرا ایک ہی رُوپ ہے اور اُس کا نام ہے عورت۔ یہ جو آپ دوسرے روپ دیکھتی رہی ہیں۔ یہ لباس تو دنیا والوں نے مجھے پہنایا تھا۔ جس نے جیسا دیکھنا پسند کیا۔ مجھے ویسا پہننے پر مجبور کیا۔"

"اور تم نے پہن لیا؟" میں نے غصّے سے پوچھا۔ وہ بہت زور سے ہنسی۔ بولی بی بی جب میں تجھے پہلی دفعہ ملی تھی جب تو بہت چھوٹی تھی مگر زیادہ بڑی میں بھی نہیں تھی۔ مجھ میں اور تجھ میں فرق یہ تھا کہ میں بے سہارا بیوہ عورت بنا دی گئی تھی اور تو اپنے مشفق باپ بھائیوں کی حفاظت میں سکون کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ اگر تیری ماں مجھے اپنے سائے میں لے لیتی تو شاید مجھے اتنے در در بھٹکنے پڑتے۔ مجھے تحصیلدار صاحب نے ملازم رکھ لیا۔ مگر اصل بات کچھ اور نکلی۔ اُس کی بیگم صاحبہ اپنے خاوند کی بُری عادتیں چھڑانا چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی اس کا میاں کوٹھے والیوں سے خفیہ تعلقات نہ رکھے۔ اس کام کے لئے اسے اس کی رازداروں نے مشورہ دیا کہ گھر پہ کوئی لڑکی رکھ لو۔ میاں گھر پر ہی رہے گا۔ تحصیلدارنی نے مجھے ملازم رکھ لیا۔ خود بے خبری کا مظاہرہ کرتی رہی۔ مگر اس نے مجھے اپنے میاں کا چارہ بنا دیا۔ میرے بچے کو مجھ سے چھڑا کر کراچی میں کسی کا لے پالک بنا دیا۔ مجھے نہلا دھلا کر اچھے کپڑوں میں میاں کے کمرے میں بھیج دیا۔ اور خود وظیفہ پڑھنے جا نماز پر بیٹھ گئی۔ جیسے کچھ جانتی ہی نہیں۔ تحصیلدار نے میری عزت تار تار کر دی۔ اور ڈرا دھمکا کر روزمرہ کا معمول بنا دیا کہ میں ہر روز اُس کے کمرے میں آیا کروں۔ تحصیلدار سُدھر گیا مگر میں بگڑ گئی۔ اُس نے مجھے غلط راستوں میں دھکیل دیا۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ مجھ سے شادی کرلے گا۔ مگر اس کی بیوی بڑی حرافہ عورت تھی اس نے مجھے اپنے میاں کی جسمانی ضرورت تو بنا دیا۔ دل میں جگہ نہ ... جب گناہ ایک نتیجے کی صورت میں ظاہر ہوا تو اس کی بیوی نے ... مجھے گھر سے دور بھیج دیا۔ جو تھانیدار تفتیش پر آیا تھا مجھ سے ملاقات کا خواہاں تھا۔ تحصیلدار نے مجھے اُس کے سپرد کر دیا۔ اُس نے مجھ سے شادی کر لی۔ اس کی پہلی بیوی مر چکی تھی۔ خود بھی بڑھا کھوسٹ مرنے کے قریب تھا۔ عورت کی ہوس اب بھی سوار تھی۔ اپنی نام نہاد شرافت کا بھرم رکھنے کے لئے شادی تو کر لی مگر نبھانا مشکل ہو گیا۔ مجھ پر بات بات پر شک کرتا کہ تو شریف عورت نہیں ہے بھاگ جائے گی۔ اُس کی ناجائز پابندیوں نے مجھے باغی کر دیا۔ اُس کا اعتماد بحال کرنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن وہ دن بدن چڑچڑا ہوتا گیا۔ اپنے مفادات کیلئے مجھے اُونچی سوسائٹی میں لئے گھومتا۔ مگر جب کوئی میری طرف بڑھتا تو گھر سے بُری طرح سے مارتا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ چاہتا کیا ہے۔ بچہ ہونے نہیں دیا۔ کہتا مجھے کیا معلوم کس کا ہو خوامخواہ میں پلتا پھروں۔ چار سال میں اس نے اپنا اور میرا دونوں کا حلیہ بگاڑ دیا۔ تنگ آ کر میں نے خودکشی کی کوشش کی اور اسی جھگڑے میں اس نے طلاق دے دی۔ میں نے فلیٹ کرایے پہ لے لیا۔ میرے پاس خاصا پیسہ جمع ہو چکا تھا جس کے سہارے میں سوسائٹی میں گھومنے پھرنے لگی۔ مجھے ایسا گروہ مل گیا جن کے ساتھ مل کر میں نے کاروبار کے بہانے خوب اسمگلنگ کی۔ وہ لوگ مجھے دنیا بھر میں گھماتے پھرے۔ بہت سارے ملک دیکھ ڈالے۔ اور آخر ایک دن ہم سب گرفتار ہو گئے۔ کچھ لوگ بچ گئے کچھ کو سزا ہوئی۔ مجھے بھی ضمانت پر رہائی مل گئی۔ مقدمے میں بَری ہو گئی۔ بہت عرصہ بھٹکنے کے بعد بیوٹی کلینک میں ملازمت مل گئی۔ میں نے بال کاٹنے کا فن سیکھ لیا تھا۔ یہی ہُنر کام آیا۔ کچھ دن سکون سے گزرے۔ بیوٹی کلینک کے مالک کے لڑکے شوکت نے مجھ پر ڈورے ڈالنے چاہے مگر اب میں خود کو کسی صورت بیچنے پر آمادہ نہیں تھی۔ اس نے شادی کی پیشکش کی، میں نے منظور کر لی۔ شادی کا ڈیڑھ سال بہت سکون سے گزرا۔ ایک بچی ہوئی وہ مر گئی۔ پھر نہ جانے کیسے شوکت کو کسی نے میرے ماضی کا بتا دیا۔ میں نے اُسے بتایا تھا کہ میرے والدین مر چکے ہیں۔ یہاں محنت کر کے وقت گزار رہی ہوں۔ لیکن جب اسے پتہ چلا کہ میں کیا تھی اُس نے مجھے طلاق دے دی۔ اُس وقت میں بیمار تھی اور میری ذہنی حالت بھی تباہ ہو گئی۔ شوکت کا بوڑھا مالی مجھے اپنے گھر لے آیا۔ اُس نے میری بڑی خدمت کی۔ اب مجھے احساس ہو گیا ہے کہ عزت اگر غربت میں بھی ملے تو وہ جھونپڑی بھی محل سے کم نہیں۔ اس نے مجھے بہت پیار دیا۔ آجکل وہ خود بیمار ہے۔ دمے کا مریض ہے علاج کے لئے پیسے نہیں۔ میں انڈے بیچ کر کچھ کما لاتی ہوں۔ اسی پہ گزارہ ہے۔ اور یہ تھی میری کہانی۔ آپ نے مجھے جس جس رُوپ میں جہاں جہاں دیکھا وہ اسی کہانی کے واقعات کے تحت اپنانے گئے تھے۔"

میں رضیہ کی کہانی سے بے حد متاثر ہوئی تھی۔ میں نے کہا کہ کل ... کے پتے پر آ کر مجھ سے ملنا میں تمہیں ملازمت دلانے کی کوشش کروں گی۔ وہ دعائیں دیتی چلی گئی۔ دوسرے روز اسکول آئی میں نے اسے ملازمت دلانے کی خاصی کوشش کی۔ مجھے اس کے ماضی سے ڈر لگتا تھا۔ سب وہ پھر اسکول میں کوئی گُل کھِلا دے۔ ایک دم تو نوکری مل بھی نہیں سکتی تھی۔ اُستانیوں سے چندہ کر کے اُسے خاصی رقم دلا دی۔ حوصلہ دیا کہ جلد ملازمت کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔ وہ دعائیں دیتی چلی گئی کچھ دنوں بعد اُجڑی صورت بنائے آئی۔ مالی مر گیا تھا۔ اور وہ پھر تنہا تھی میری ہر کوشش بے سُود گئی۔ کہیں جگہ اُسے سروس نہ ملی۔ گھر میں ننھا

ہیں۔ دل برداشتہ ہوکر وہ چلی گئی۔

امی بیمار ہوگئیں۔ رفیق بھائی نہیں ساتھ لے کر چلے گئے۔ میں بھی بعد میں چھٹی لے کر اُن کے پاس چلی گئی۔ وہاں امی کی حالت زیادہ بگڑ گئی اور آخر وہ دن آگیا۔ جب انہوں نے بھی مجھے تنہا چھوڑ دیا۔ ان کے چہلم سے فارغ ہوکر واپس ملازمت پر آئی تو پانچ ماہ ہوچکے تھے ——

یہاں رضیہ کا چرچا تھا۔ اُس نے ہمارے ہی محلے میں گھر لے لیا تھا۔ گھر کیا بس کہیے کہ ایک خوب بنی ٹھنی نظر آنے لگی تھی۔ محلے والے اس کے چال چلن سے پریشان تھے مگر اُسکا بگاڑنا نہ ہوسکا۔ اور نہ ہی اب میں اس سے ملنا چاہتی تھی۔ کیونکہ میں ایک شریف اور معزز عورت تھی اور وہ بقول دُنیا بدکردار۔

اور اس "بدکردار" عورت کو آج افیون اور چرس بیچنے کے الزام میں پھر پکڑا گیا تھا۔ حقیقت تو وہ یا پولیس والے جانیں۔ مگر میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ پہلی بار بیوہ ہونے کے بعد وہ انتہائی شریف اور معصوم لڑکی تھی۔ بعد میں زمانے نے اپنی اپنی خواہش کے مطابق اسے جو روپ دیا۔ مجبوری کے عالم میں اس نے پہنا —— مجھے معاشرے میں باپ بھائی کا تحفظ حاصل رہا تبھی میں آج تنہا ہوتے ہوئے بھی شریف اور معزز خاتون ہوں۔ وہ ان سہاروں سے محروم تھی۔ اس لئے اُسے دنیا نے گیند کی طرح اُچھال اُچھال کر اپنی خواہشات کے کھیل کھیلے۔

فرحانہ۔ ایبٹ آباد

تیرا ممنون ہوں

بچپن سے احساس کمتری نے میری شخصیت میں جالے بُن دیئے تھے۔ گھر میں سب بہن بھائی تندرست و توانا تھے۔ مجھے دو سال کی عمر میں ٹائیفائیڈ ہوا۔ یہ موذی مرض اپنی کوئی نہ کوئی نشانی ضرور چھوڑ جاتا ہے۔ اور میرے ساتھ تو بدقسمتی یہ ہوئی تھی کہ ٹائیفائیڈ بگڑ گیا تھا۔ خیر جیسے تیسے اس موذی سے چھٹکارا ہوا۔ پیر میں معمولی سا لنگ ہوگیا جب ہمدردی اور پیار کے بادل چھٹے تو مجھے اپنوں نے ہی چڑانا شروع کردیا۔ میرے ساتھی اپنی تیز رفتاری کا مظاہرہ کرکے میرا مذاق اُڑاتے۔ بہن بھائی لڑائی میں اس کمزوری کو اُچھالتے۔ میں رفتہ رفتہ سب سے تنہا ہوتا گیا۔ کسی نے یہ نوٹس نہیں لیا کہ میں گوشہ نشین ہوتا جارہا ہوں۔ اسکول کے در و دیوار سے وحشت ہونے لگی۔ ساتھیوں کی آوازیں مجھے طنز کے تیر برساتی لگنے لگیں۔ زود رنجی نے یہ حالت بنادی کہ کوئی اچھی بات بھی کرتا تو مجھے وہ طنز و مضحکہ محسوس ہوتی۔ چھوٹی سی عمر میں اپنے پرائے سب سے بیزار ہوگیا۔ سوچتا رہتا تھا کہ کوئی موقع ملے اور اس سب کو چھوڑ کر دُور کہیں نکل جاؤں۔ تعلیم مکمل نہیں تھی۔ کسی اور کام کا تجربہ نہیں تھا اور پھر اس ملک کے ہر کونے میں اس فکر و نظر کے لوگ بھی بستے تھے جو معذوری کا مذاق اُڑانا ذہنی تفریح سمجھتے ہیں۔ مجھے نفرت اور حقارت کے سوا کسی سے کچھ اور جذبے ملنے کی قطعی اُمید نہیں تھی۔ احساس کمتری کی دیمک میرے اندر کے سارے مثبت جذبے چاٹ گئی تھی۔ اور اگر میں اس کا علاج نہ کرتا تو یقین ممکن تھا۔ پندرہ سولہ برس کی عمر میں مجھے دق ہو جاتی۔ گھر میں امارت کا راج ہوتا تو میری جسمانی کمزوری کی خوبصورتی سے ستر پوشی ہو جاتی اور ممکن تھا کہ قیمتی علاج میرے درد کا درماں ہو جاتا۔ مگر یہاں علاج کا تو ذکر ہی کیا۔ اُلٹا حقارت و نفرت کی آری سے میری رُوح بھی گھائل کردی۔ اور مجھے اب ہر قیمت پر اس ملک کو خیرباد کہنا ہی تھا۔ میں نے چودہ پندرہ سال کی عمر سے باہر جانے کی تگ و دو شروع کردی تھی۔ اپنے گھر والوں سے یہ سرگرمیاں چھپائے رکھیں۔ ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔ تین سال کی جانفشانی کے بعد مجھے کچھ ایسے لڑکے مل گئے جو غیر قانونی طور پر باہر جانے کی تیاریاں کررہے تھے۔ میں نے اُن کی منت سماجت کی۔ وہ رضامند ہوگئے۔

تب میں نے خفیہ طور پر باہر جانے کی تیاریاں شروع کردیں۔ بعد میں گھر والوں سے چھپانا فضول سمجھ کر انہیں صورت حال سے مطلع کردیا تھا۔ اس کم عمری میں گھر چھوڑ کر پرائے ملک جانا تکلیف دہ ضرور تھا لیکن والدین نے سوچا کہ اس کے لئے بہتر یہی ہے کہ باہر جاکر اپنا مستقبل بنائے۔ ان کی اجازت ملتے ہی میں زور و شور سے باہر جانے کی کوششیں کرنے لگا بالآخر کامیاب ہوا۔ اور ایک رات گھر والوں سے جدا ہوکر اپنے ساتھیوں کے ساتھ کابل کے راستے روانہ ہوگیا۔ راستے کی صعوبتیں سُنانے کا موڈ نہیں ہے۔ اپنی چھوٹی سی عمر میں میں نے یہ بہت بڑا 'رسک' لیا تھا اس لئے جو کچھ گزرنا لازم تھا۔ ہم چاروں چھپتے چھپاتے جرمنی پہنچ گئے۔ وہاں سے ہم چاروں کی منزلیں جُدا ہوگئیں۔ ایک لندن سدھارا۔ ایک نے جرمنی میں روزگار ڈھونڈ لیا۔ تیسرا کینیڈا جانے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ اس طرف روانہ ہوگیا۔ ایک اکیلا میں رہ گیا جس کی منزل کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ جرمنی میں پناہ ملے بغیر ٹھہرنا خود کو پولیس کے حوالے کردینے کے مترادف تھا۔ اور بدقسمتی سے یورپ کے اس خوبصورت ملک میں مجھے اپنے گھر ٹھہرانے والا کوئی شخص نہ ملا۔ مایوس ہوکر میں نے یونان کی راہ لی۔ اور ایتھنز میں جا اترا۔ یہاں جہاز کی ملازمت کے چرچے سُنے ہوئے تھے۔ سوچا کسی نہ کسی طرح مجھے کسی شپ پر جگہ مل جائے گی۔ تب ان چکروں سے آزاد ہوکر سکون کی زندگی بسر کروں گا۔ بدقسمتی دیکھئے کہ یہاں بھی کوئی

خیر خواہ نہیں ملا۔ مقامی باشندے تو خیر کیا لفٹ دیتے، پاکستانی بھائیوں نے نفرت اور حقارت کے سوا کچھ نہ دیا۔ میرے پاس کھانے پینے کے لئے پیسے نہ رہے تھے۔ اب ہر صورت مجھے یہیں قیام کرنا تھا سب سے بڑا مسئلہ رہائش کا تھا۔ پہلا ہفتہ تو کسی نہ کسی طرح یوتھ ہاسٹل میں گزار دیا تھا۔ نوکری کے ساتھ ساتھ مکان کی تلاش بھی جاری رکھی پر لطف کی بات یہ ہوئی کہ سر راہ ایک آدمی سے ملاقات ہوئی اور اس نے مجھے ایک بلڈنگ کا ایڈریس دے دیا کہ تمہیں یہاں ایک کمرہ آسانی سے مل جائے گا۔ میں نے اللہ کی اس مہربانی کا ہزار بار شکر ادا کیا اور اسی روز اس بلڈنگ میں پہنچ گیا۔ اس کی مالک ایک بیوہ خاتون تھی۔ وہ سب کرایہ داروں نے بتایا کہ وہ تمہیں شام کو ملیں گی نیچے ایک کمرہ خالی تو ہوا ہے۔ لیکن مالکہ اسے کسی ایشیائی کو کرایے پر دینے کے لئے تیار نہیں ہو گی اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کمرے کا کرایہ دار پاکستانی تھا وہ مالکہ کے کمرے سے رقم اور چیزیں چوری کر کے کرایہ ادا کئے بغیر فرار ہو گیا تھا۔ مالکہ نے اس پر خاصا بھروسہ کر رکھا تھا اُسے اس حادثے نے ایشیائی باشندوں سے متنفر کر دیا ہے۔

میں یہ سُن کر اداس ہو گیا۔ لیکن اسی بلڈنگ کے ایک کرایہ دار نے مجھے تسلی دی۔ کہنے لگا "وہ بڑی نیک دل خاتون ہے اگر تم اس کے دل میں ہمدردی کا جذبہ جگا دو تو وہ رہا ختہ تھوک دے گی۔" یہ کام میرے لئے اتنا مشکل نہیں تھا۔ شام تک وہیں بیٹھا رہا۔ مالکہ گھر آئی تب اس سے ملاقات ہوئی۔ میں نے تصور کیا ہوا تھا کہ سفید بالوں والی کوئی بزرگ عورت ہو گی مگر میری توقع کے برعکس وہ تیس سال کی جوان خوبصورت پُرکشش عورت نکلی۔ اس کے نقوش انتہائی دلفریب تھے اور بال کمر تک لہراتے۔ میں اس کی مرعوب کن شخصیت سے گھبرا گیا۔ ورنہ سوچا ہوا تھا کہ بوڑھی عورت ہو گی اس کے گھٹنے پکڑ کر کمرہ کرایہ پر حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا یہاں تو معاملہ ہی اُلٹا نکلا۔ اس عورت کو بوڑھا کہنا یا اس کے آگے رونا گڑگڑانا انتہائی احمقانہ فعل تھا۔ جو کچھ کہنا چاہتا تھا وہ کہیں ذہن سے غائب ہو گیا۔ وہ اپنی نیلی نیلی آنکھوں سے مجھے گھور رہی تھی اور میں بار بار تھوک نگل کر رہا تھا گو تفتیش کرنے میں لگا ہوا تھا جو اس خاتون کے دل میں میرے لئے ہمدردی کا جذبہ جگا دے۔ جب بے بس ہو گیا تو رسالے پکڑا ان والیس آنے لگا تو ایک نرم آواز نے مجھے پکارا "مسٹر! بات کیا تھی؟" مجھے حوصلہ ہوا۔ واپس آیا اور التجا کی کہ ہوا "میڈم مجھے کرایہ کیلئے کمرہ چاہیے تھا مگر مجھے پتہ چلا کہ یہاں کوئی ایشیائی آپ سے کیا تھوڑا کر گیا۔ اب مجھ میں حوصلہ نہیں ہے کہ آپ سے کمرے کے متعلق درخواست کر سکوں اس لئے واپس جا رہا ہوں" شاید خوبصورت خاتون بے ساختہ مسکرا دی۔ بولی "ارادہ تو یہی کیا تھا مگر تم اتنے چھوٹے سے لڑکے ہو کر تمہیں واپس ناکام بھیجنے ہوئے دل کڑھتا ہے۔ اتنی سی عمر میں تم سے اپنے ملک چھوڑا ہے یہاں بھی تمہیں دھتکار دوں۔ یہ بھی تو ظلم ہو گا۔ کیوں ٹھیک ہے نا اردو لنڈ بھی سمجھتی ہو" میں انتہائی حسرت اور حیرت سے اس عظیم عورت کو دیکھنے لگا جس نے مجھ پر اپنے بھرپور اعتماد کا چند لمحوں میں مظاہرہ کر دیا تھا۔ چوٹ کھائے ہوئے دل مشکل سے ہی کسی پر بھروسہ کرتے ہیں مگر اس خاتون نے مجھ پر کامل بھروسہ کر کے میری شخصیت کو پہلی بار احترام کا لطف چکھایا تھا۔ اس کی مسکراہٹ نے مجھے حوصلہ دیا۔ ہمت سے بولا "میں آپ کی نظروں میں عمر اور تجربہ کے اعتبار سے اور نی (چھوٹا) ضرور ہوں لیکن بعد میں دیکھئے گا کہ یہ اور نی اپنے کردار سے کتنا بڑا تھا۔" یہ کہتے کہتے میری آنکھوں میں خوشی سے آنسو آ گئے۔ خاتون اٹھیں۔ میری پیٹھ تھپکی۔ بولیں "جذباتی مت بنو۔ چلو میں تمہیں تمہارا کمرہ دکھا دوں۔"

آپ کو شاید حیرانی ہو رہی ہو گی کہ یہ خاتون اردو کیسے جانتی تھی دراصل اس کا پہلا شوہر بیس سال تک ہندوستان میں ملازمت کے سلسلہ میں رہا تھا وہ اردو اچھی طرح بول سکتا تھا۔ شادی کے بعد اس نے اپنی بیوی کو یہ زبان سکھائی۔ اس کے مرنے کے بعد خاتون کی گزر اوقات مکان کے کرائے پر ہوتی تھی۔ اس میں رہنے والے بیشتر لوگ ایشیائی تھے۔ جن سے اسے اردو بولنا پڑتی تھی۔ رفتہ رفتہ اسے اس زبان پر خاصا عبور ہو گیا۔ جیسا کہ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اسے اردو کے علاوہ اور بہت سی زبانیں آتی تھیں۔ وہ حقیقتاً بردبار عورت تھی اس کی ماں نے یونانی باشندے سے دوسری شادی کر کے اپنے پہلے شوہر کی بچی کو اپنے پاس رکھا۔ سوتیلے باپ نے اس کی پرورش کی اور یہیں اس کی شادی ایک مقامی شخص سے کر دی۔ اس نے ازدواجی زندگی کے صرف چار سال گزارے۔ خدا نے اس سے محبت کرنے والا شوہر چھین لیا اب وہ تنہا رہ گئی تھی۔ اولاد سے محروم تھی۔ ملنے جلنے والوں کا حلقہ بھی محدود تھا۔ بلکہ یوں کہئے کہ یہ خود کلب پارٹیوں اور دوسری ہنگامہ آرا تقریبات سے دور دور رہتی تھی۔ مجھ پر محبت کا جادو رکھو کر اس نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ انسانوں سے ہمدردی کرنا اور ان سے محبت کرنا جانتی ہے۔ میں آپ کو اس کا نام بتانا تو بھول گیا اسے سب نیکی (NEKY) کہتے تھے مجھے یونانی زبان میں تو اس کا ترجمہ نہیں آتا تھا مگر اردو میں یہ لفظ نیکی بنا اور میں تو یہ جانتا ہوں کہ وہ پیکر نیکی کا مجسم تھی۔

رہائش کا مسئلہ حل ہو گیا اور اس کے دوسرے دن مجھے ایک فیکٹری میں مزدوری کی جگہ مل گئی۔ عارضی ملازمت تھی لیکن اس وقت یہ بہت غنیمت تھی۔ فیکٹری میں مجھے ایک شخص مل گیا اس نے مجھے بتایا کہ وہ بحری جہاز میں ملازمت دلا سکتا ہے۔ یہ شخص پاکستانی تھا۔ میں اس کے چکر میں آ گیا اور چلتے ہوئے کی مزدوری اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔ اس نے پاسپورٹ مانگا وہ بھی اسے دے دیا۔ دونوں چیزیں اپنے قبضے میں کر کے وہ چمپت ہو گیا میرے پاؤں تلے زمین کھسک گئی۔ کس سے گلہ کرتا جب اپنے ہی دھوکہ دے گئے ہوں

تو یہاں تو چیزوں سے وفا کی امید کب کرسکتا۔ اپنی سی جدوجہد تو کرنا تھی پولیس میں کیس رجسٹر کرایا۔ پولیس نے جاکر اس شخص کے مکان کا تالا تڑوایا۔ کمرے میں سینکڑوں پاسپورٹ پڑے ہوئے تھے وہ خود سامان سمیت غائب تھا۔ جانے جو بیچارے کتنے سادہ لوح نوجوان اس نے پھانسے ہوں گے۔ خوش قسمتی سے میرا پاسپورٹ بھی انہی میں تھا۔ پیسے جانے کے دکھ کے ساتھ ساتھ یہ غم بھی تھا کہ مکان مالک کو اس ہفتے کا کرایہ کہاں سے دوں۔ پاسپورٹ لے کر چپ چاپ اپنے کمرے میں آگیا۔ شام کو بھوکا ہی لیٹا رہا۔ اگلی صبح جولی کرایہ لینے آئی تو میرا سر ندامت سے جھکا ہوا تھا۔ بمشکل منہ سے کہا کہ میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ وہ کمپنی میں فراڈ کر رہا ہوں۔ اس نے مجھے پریشان صورت دیکھ کر بھانپ لیا کہ ضرور کوئی بات ہے۔ پوچھا ”کیا ہوا ارونی چپ چاپ کیوں ہو؟“ میں نے اسے سچ سچ بتا دیا کہ میرے ساتھ ایک آدمی نے یہ دھوکہ کیا ہے۔ اس کی نیلی نیلی آنکھوں میں سوال سا ابھر آیا کہنے لگی ”ارونی آپ لوگ اپنوں کو بھی لوٹتے ہیں۔ میں تو سمجھی تھی کہ صرف دوسروں کو ہی لوٹتے ہو۔“ میں نے ندامت سے آنکھیں جھکا لیں۔ دل میں کہا کہ خوامخواہ غیر ملکی عورت کے سامنے اپنی قوم کو ننگا کیا۔ مگر جب یہ قوم خود ہی ننگی ہے تو کہاں تک اس کی ستر پوشی کی جائے۔ اس نے محسوس کرلیا کہ میں دل میں شرمندگی محسوس کر رہا ہوں۔ آگے بڑھ کر میرے گال تھپتھپاتے کہنے لگی ”ارونی تم بھی اپنے بچے لگتے ہو۔ فکر مت کرو میں تم سے اس وقت تک کرایہ نہیں لوں گی جب تک تمہاری ملازمت کا پکا انتظام نہیں ہو جاتا۔“ میں نے احسان مندی سے اسے دیکھا وہ ہنستے ہوئے بولی ”یہ تو بتاؤ تم نے کھانا بھی کھایا ہے یا نہیں؟“ میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگی ”چلو اٹھو کیا عورتوں کی طرح بیٹھے سوگ منا رہے ہو۔“

اس نے اس موقع پر میری بڑی دلجوئی کی اپنے کسی واقف کار سے کہہ کر ایک کارخانے میں مجھے اچھی اجرت پر کام دلا دیا۔ میں کام سے واپسی پر سیدھا بیکری جاتا اور وہاں سے اپنے لئے کھانے پینے کا سامان لے آتا۔ وہ بہت دنوں تک خاموشی سے میرے اس معمول کا جائزہ لیتی رہی ایک دن کہنے لگی ”ارونی میں بھی اکیلی رہتی ہوں۔ تم میرے ساتھ کھانا کھایا کرو۔ ہاں لیکن یہ یاد رکھنا کہ جاتے وقت کوئی چیز میرے گھر سے چرا کر نہ لے جانا۔“ مجھے اس کا یہ فقرہ سن کر بہت دکھ محسوس ہوا۔ مگر سوچا کہ اس کے ساتھ بھی کسی نے ڈسا ہے۔ وہ اس شخص کو تلاش نہیں کر سکی۔ مجھے یہ بہت چبھتا جسے کہتے ہو۔ میں اسے بتاؤں گا کہ ہر پاکستانی اس جیسا بے ایمان نہیں ہوتا۔ میرے دل میں اس کیلئے بے پناہ احترام کا جذبہ تھا۔ اس عورت نے دھوکہ کھانے کے باوجود مجھ پر اعتماد کیا تھا۔ حالانکہ میں نے کرائے کی پائی پائی ادا کر دی تھی۔ اور اس کے علاوہ کے باوجود اس کے گھر کھانے پر رضامندی ظاہر نہیں کی تھی۔ صبح کام پر جاتے اور آتے وقت میں اسے سلام

فرد کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ اسے مجھ پر بھروسہ ہوتا گیا۔ ایک دن جب میں کرایہ دینے لگا تو وہ بولی ”تم اتنی باقاعدگی سے کرایہ دیتے ہو کیا تم بھی اسی باقاعدگی سے پیسے کماتے ہو؟“ میں نے اثبات میں جواب دیا وہ بولی ”پھر تمہارے پاس بچتا کیا ہوگا۔ چلو آئندہ میں تم سے کرایہ نہیں لوں گی جب زیادہ پیسے کمانے لگو گے تب دے دینا۔“

خوشی سے میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ مجھے اس بات کی خوشی نہیں تھی کہ اس نے مجھ سے کرایہ لینے سے انکار کر دیا تھا۔ خوشی اس اعتماد کی تھی جو اس نے مجھ پر کیا تھا۔ میں نے اگلے ہفتے سب پیسے ادا کئے تو اس نے لوٹا دیئے میں بولا ”تم یہ پیسے آپ جمع کرتی رہو میں مشکل حالات میں اٹھا لوں گا۔“ اس نے پیسے لے لئے۔ بولی ”یہ تمہاری امانت ہے۔“ مجھے پہلی بار میں ہنس دیا۔ اور اس روز کے بعد میں اس کے ساتھ کھانا کھانے لگا۔ اس نے مجھے اپنے گھر کے فرد جیسی حیثیت بخش دی۔ کتنی عجیب بات ہے جس معذور لڑکے کو اس کے اپنوں نے گلے سے نہ لگایا۔ دوست احباب نے قبول نہ کیا اس ملک سے ہزاروں میل دور ایک اجنبی غیر ملکی عورت نے اپنا سمجھ لیا۔ لوگ سمجھیں گے کہ وہ شاید کسی غلط کام میں مجھے الجھانا چاہتی ہو گی جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے کہ غیر ملکی عورتیں جنسی بلیاں ہوتی ہیں۔ مگر ایسی کوئی بات ہرگز نہیں تھی۔ میری اور اس کی عمر میں دس بارہ سال کا فرق تھا۔ میں اٹھارہ کا تھا وہ تیس سال کی۔ میں معذور لڑکا تھا۔ مجھ میں اس کیلئے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ مگر میں نے کہا نا وہ حقیقتاً عظیم عورت تھی۔ اس نے مجھ سے صرف انسانیت کا رشتہ رکھا۔ اور یہ دنیا کا سب سے گہرا اور پائیدار رشتہ ہے جس نے میری ذات پر سے احساس کمتری کے بدنما دھبے مٹا دیئے مجھ میں جینے کی امنگ پیدا کی۔ اپنی ذات پر بھروسہ کرنا آگیا تو دنیا سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ بھی بیدار ہو گیا۔ بات چیت کرنے کا ڈھنگ آیا اپنا حق لینے کی جرأت آگئی۔ کیا بتاؤں کہ اس عورت نے ایک کامل ماہر نفسیات سے زیادہ اچھا علاج کیا۔ میری معذوری کا علاج اپنی نگرانی میں کرایا بتدریج بہ قدم چل کر چلنا آگیا۔ اور میں نے اسے اپنی ماں، بہن، اپنی اور دوست سبھی رشتوں کی محبت سونپ دی۔ جب میرے پاس پیسے ہوتے تو اس کیلئے تحفے خریدتا وہ بگڑ جاتی کہ ”ارونی تم سمجھتے نہیں ہو جو اس بیہودگی سے خرچہ کرتے ہو۔ پیسے جمع کیا کرو تمہارے کام آئیں گے۔“ میں ہنس کر کہتا ”آپ ہی تو ہیں میرا یہاں کون ہے جسے اپنا سمجھ کر کچھ دوں۔“ وہ حسرت سے کہتی ”ارونی میں اس دنیا میں اکیلی ہوں۔ مجھ سے اتنی محبت مت کرو تم چلے جاؤ گے تو یہ خلا کون پُر کرے گا۔“ میں ہنس کر اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیتا کہ آپ چاہے کتنی دعائیں مانگیں میں یہاں سے جانے والا نہیں ہوں۔ وہ بھی ہنس دیتی کہتی ”تو اتنا چھوٹا سا تو ہے مگر باتیں کتنی بڑی بڑی کرتا ہے۔“

اور یہ بات حقیقت تھی کہ وہ واقعی تنہا عورت تھی۔ نہ اسے کب بازاروں سے دلچسپی تھی نہ ہوٹلوں سے کوئی شغف۔ شراب نہ خود پیتی اور نہ مجھے اس کی اجازت دیتی کہ پیوں۔ ایک روز ایک دوست نے مجھے دھوکے سے شراب پلا دی۔ میں جب لڑکھڑاتا ہوا گھر پہنچا تو اس نے میرے منہ پر طمانچوں کی بارش کر دی۔ اور پھر مجھ سے لگ کر رونے لگی۔ بولی "اردنی تم نے مجھ سے شراب نہ پینے کی قسم کھائی اور خود پینے لگے تم بھی عام لڑکوں کی طرح منافق نکلے" مجھے بہت شرم آئی۔ ایک روز میں نے اس سے کہا تھا کہ ہمارے یہاں شراب پینا گناہ سمجھا جاتا ہے اسی دن سے اس نے شراب چھوڑ دی تھی اور مجھے بھی منع کر دیا تھا کہ اس بری چیز کو کبھی ہاتھ نہ لگاؤں مگر آج میں اس کے سامنے شرمندہ ہو گیا تھا۔ اور یقین کریں کہ وہ میری پہلی اور آخری حرکت تھی۔ اس نے میرے دوستوں سے زیادہ میل جول پر پابندی لگا دی۔ مجھے ہر جگہ اپنے ساتھ لیکر جاتی۔ میرے متعلق لوگ پوچھتے تو ہنس کر جواب دیتی "بیٹا ہے بھائی ہے اور دوست ہے" اس بوڑھی عورت سے میں نے محبت کا وہ درس سیکھا جس سے پہلے میں نا واقف تھا۔ میرے کپڑے وہ خرید لاتی میرے کھانے پینے کا پورا خیال رکھتی۔ مجھے ریڈیو کی دکان پر کام سیکھنے بٹھا دیا۔ تھا جس دکان پر بٹھایا تھا اس کا مالک بڑا ہنس مکھ تھا۔ کام سکھانے کے ساتھ ساتھ وہ مجھے معقول تنخواہ بھی دیتا تھا۔ جو میں نکی کے ہاتھ پر رکھ دیتا اور وہ میرے اکاؤنٹ میں ڈال دیتی۔ میرے کہنے پر اس نے کار بھی سیکھ لیا تھا کبھی پریشان ہوتی تو اپنے ٹوٹے پھوٹے لفظوں سے کچھ پڑھنے لگتی۔ اس نے مجھے بارہا مجبور کیا کہ کام چھوڑ دوں۔ "تمہیں کام کی کیا ضرورت ہے میں تمہارا خرچ برداشت کروں گی" مگر میں نے پیار سے اسے سمجھایا کہ ہمارے یہاں مرد کی مردانگی اس کا کام کرنا سمجھا جاتا ہے۔ میں اپنی محنت کی کمائی سے خوش رہ سکتا ہوں۔ اس نے میرے جواب پر میرا ماتھا چوم لیا۔ بولی "اردنی تم بہت پیارے لڑکے ہو۔ تمہارے نظریات نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ دیکھو تم شراب نہیں پیتے۔ کسی سے غلط قسم کی دوستی نہیں کرتے اور اب تو گھر بھی پا لیا ہے۔ دیکھ لینا میں بھی تم جیسی بن جاؤں گی" گویا اس کے نزدیک میں بڑا با کردار لڑکا تھا مجھے اس عورت نے کتنا اونچا مقام دیا تھا۔ میں جو اپنے وطن میں ایک حقیر اور معذور لڑکا سمجھا جاتا تھا اس غیر ملکی عورت کے نزدیک بہت اہم شخصیت بن گیا تھا۔

اور پھر زندگی میں ایک انقلاب آیا۔ میرے پر سکون روز و شب بکھر کر رہ گئے۔ ایتھنز میں غیر ملکی لوگوں کے خلاف احتجاجی مظاہرے ہونے لگے۔ کالجوں کے لڑکے لڑکیوں نے انہیں ملک سے نکالنے کیلئے جلوس نکالے ان کا نعرہ تھا "فارنرز کو باہر دھکیلو" جگہ جگہ پوسٹر لگا دیئے گئے کہ جہاں جہاں فارنرز نظر آئیں انہیں پکڑ کر سرحد سے پرے دھکیل دو۔ سرکار نے یہ معاملہ مان لیا۔ تاہم از خود یہ خیال ہو سکتا ہے کہ چیکوں کی پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی۔ نکی کا بھی وقت نظر آنے لگا۔ اس نے مجھے چھپانے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالی۔ مگر ناکام رہی۔ میں نے اس سے کہا کہ اب مجھے واپس جانا ہوگا۔ نکی کی آنکھوں میں آنسوؤں کی برسات ہو گئی۔ رونا مجھے بھی آ گیا۔ مگر اس مصیبت سے نجات کی کوئی اور راہ نہیں تھی۔ ایک دن ایک سڑک عبور کر رہا تھا کہ پولیس کانسٹیبل کی نظر مجھ پر پڑی۔ اس نے سیٹی بجا کر مجھے پکارا۔ فرار کا موقع نہ مل سکا اس نے آ کر مجھے اپنے ہمراہ لے جانے کی ضد کرنے لگا۔ میں اسے جل دے کر بھاگنا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ خاموشی سے چل دیا۔ جونہی موقع ملا تیزی سے سڑک پر بھاگ کھڑا ہوا۔ بدقسمتی کہ دو چار گلیوں میں بچتا بچاتا پولیس کے سپاہی سے تو جان چھوٹ گئی مگر ایک گاڑی سے بد حواسی کے عالم میں ٹکرا گیا۔ گاڑی والا مجھے فوراً ہسپتال لے آیا۔ میں نے نکی کا پتہ بتا دیا۔ وہ اسی وقت روتی ہوئی آ گئی میں نے اسے پورا واقعہ بتا دیا۔ اس کی پریشانی دو چند ہو گئی۔ میں تین دن تک ہسپتال میں رہا۔ چوتھے دن وہ مجھے ہسپتال سے لے آئی۔ اس نے میرا گھر سے باہر نکلنا ختم کروا دیا۔ مجھے وہ کسی قیمتی شے کی طرح چھپائے ہوئے تھی۔ اپنے ملنے جلنے والوں کو کہہ دیا کہ وہ لڑکا چلا گیا ہے۔ میرے سنگ کھانا بناتی۔ کپڑے بھی پریس کرتی۔ اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتی۔ اور مجھ سے چھپ کر رو دیتی۔ اس کا رونا بجا تھا میرا جانا ناگزیر ہو گیا تھا۔ میرے اپنے جانے میں مستقل اداسی سی کیفیت رہنے لگی تھی یہ خیال دہشت زدہ کر دیتا کہ میں اس کی محبت سے ہمیشہ کیلئے محروم ہو جاؤں گا۔ لیکن یہ ہونا تھا پولیس نے میرا سراغ نکال لیا۔ وہ گھر پر آ پہنچے۔ سارجنٹ کا رویہ بے حد خشک اور سرد تھا۔ نکی نے اس کی بہت منت سماجت کی کہ میرا بھائی ہے۔ میرا بیٹا ہے۔ اسے مجھ سے مت چھینو۔ لیکن ان سنگدل لوگوں پر انسانی جذبات کا کیا اثر ہوتا۔ وہ مجھے پولیس اسٹیشن لے گئے جہاں مجھ پر ایک ہزار ڈالر جرمانہ ہوا۔ میرا پاسپورٹ لے لیا۔ جرمانہ نکی نے اسی وقت ادا کر دیا۔ پاسپورٹ اس شرط پر واپس کرنے کا وعدہ کیا کہ کسی بھی ملک کا ٹکٹ لے کر آؤ۔ نکی مجھے لے کر ٹریولنگ ایجنسی گئی اور استنبول تک کا ریل کا ٹکٹ لے آئی۔ سارجنٹ نے پاسپورٹ دے دیا۔ بولا مقررہ تاریخ کو ہم اسے پہنچا دیں گے اور اپنی نگرانی میں اسے ریل میں سوار کرا دیں گے۔ نکی مجھے گھر لے آئی۔ اور پھر اس روز سے مقررہ تاریخ تک رونے دھونے کے سوا ہم دونوں کو کوئی کام نہیں تھا۔ وہ غم سے پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ کبھی کہتی "اردنی تو نے مجھے ڈسٹرب کر دیا۔ میں تنہائیوں کی عادی تھی تو نے مجھے اپنا عادی بنا دیا۔ بتا اب میں کیا کروں گی" پھر کبھی وحشت سے اپنے خوبصورت بال نوچنے لگتی چلانے لگتی کہ اللہ مجھے موت آ جائے۔ میں کیا کروں اس کی اور اپنی بے بسی

پہ میرا دل کٹ رہا تھا۔ جدائی کے لمحوں سے کہاں تک بھاگ سکتا تھا۔ دل میں دعا مانگتا رہتا کہ تیرہ کی صبح کبھی نہ آئے اس سے پہلے اللہ مجھے موت دے دے لیکن موت نہ آئی اور تیرہ تاریخ آ گئی۔ جنوری ۱۹۸۷ء کی صبح میں زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔ رات بھر رونے سے ہم دونوں کی آنکھیں سرخ اور متورم ہو رہی تھیں۔ پولیس کی جیپ پر ہم دونوں اس طرح پہنچے جیسے پھانسی کا مجرم پھانسی والے دن کوٹھڑی کا دروازہ کھلنے والے کی چاپ سے خوفزدہ ہوتا ہوگا۔ وہ مجھے گلے سے لگا کر پھر بلک اٹھی۔ میں نے بمشکل اپنے آپ کو سنبھالا۔ دروازہ کھولا۔ پولیس کے سپاہی منتظر کھڑے تھے۔ نکی نے میرا تحفوں سے بھرا اٹیچی کیس اٹھایا۔ اس نے میرے لئے اتنی ساری خریداری کی تھی کہ میرا انہیں سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔ کیمرہ، ٹیپ ریکارڈر، گھڑی، سوٹ، ٹائی، غرضیکہ ہر وہ چیز جس کی تمنا میرے گھر والے کر رہے ہوں گے اس نے مجھے خرید دیں۔ کہتی تھی اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو دو گے تو وہ کتنا خوش ہوں گے۔ میرے لئے اس کی محبت کا بوجھ اٹھانا ہی مشکل ہو رہا تھا۔ ان تحائف نے میرا سر اور جھکا دیا۔ میں نے جھک کر اس خاتون کے پیر چھوئے اور آنکھوں سے لگا لئے۔ آپ خود تصور کریں کہ چند برس پہلے جس عورت کے کمرے سے ایک پاکستانی قیمتی پیپرز چوری کر کے لے گیا تھا آج وہ اپنے پیسوں سے قیمتی چیزیں خرید کر مجھے دے رہی تھی۔ میں نے اس کا اعتماد بحال کر دیا۔ محبت نے جو دنیا کا سب سے عظیم جذبہ ہے ہم دونوں کو ایک اٹوٹ رشتے میں پرو دیا تھا وہ نسل و قوم سے بالاتر ہو کر انسانیت کے مذہب پر ایمان لے آئی تھی ورنہ اس کے مقابلے پر میں کیا تھا۔ احساس کمتری کا مارا ہوا ایک نو عمر مزدور لڑکا۔ جس کے پاس اعلیٰ تعلیم تھی نہ دولت۔ وہ بہت بڑی عورت تھی جو محبت پر ایمان لے آئی۔ اور مجھے ایسی دولت سے نوازا جس نے میری شخصیت ہی بدل دی۔

پولیس کی گاڑی میں پچھلی سیٹ پر ہم دونوں بیٹھے۔ اس کے چہرے کا رنگ مجھ سے دیکھا نہ گیا۔ ایسا لگتا تھا شام تک اسے کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ نو بجے ریلوے اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں وہ سب کے سامنے رو رہی تھی۔ لوگ حیران سے اسے دیکھ رہے تھے۔ گاڑی آنے پر پولیس والوں نے میرا سامان اندر رکھوا دیا۔ مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس نے آخری بار میرے گال پر بوسہ دیا۔ اس کے آنسوؤں کی نمی سے میرا گال بھیگ گیا۔ محبت کی یہ ٹھنڈک میری روح میں اتر گئی۔ گاڑی نے سیٹی دی اور آہستہ آہستہ رینگنے لگی۔ نکی گاڑی کے ساتھ ساتھ کچھ دور چلی مگر جب اس نے رفتار پکڑ لی تو ساتھ چلنا ناممکن ہو گیا۔ کھڑکی سے سر نکال کر میں ہاتھ ہلا ہلا کر اسے الوداع کہہ رہا تھا۔ آنسوؤں نے جلد ہی اس کا سراپا ہیولے میں تبدیل کر دیا جو دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گیا اور میں نے اپنی سیٹ پر بیٹھ کر اپنے ہاتھ دعا کیلئے اٹھا دیئے کہ اے ساری دنیا کو بنانے والے تو اس عظیم عورت کو سکون دینا۔ اسے ہر آفت سے دور رکھنا اور مجھے یقین ہے اللہ نے میرے سچے دل سے مانگی ہوئی دعا قبول کر لی ہوگی۔

استنبول سے کچھ ہی عرصے کے بعد میں پاکستان آ گیا۔ جس نے مجھے دیکھا میری بدلی ہوئی شخصیت سے مرعوب ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ یہاں میں نے ریڈیو کی دکان کھول لی۔ اس کے پتے پر بیسیوں خطوط لکھے مگر شاید اس تک میرا خط پہنچا ہی نہیں۔ ضرور میرا لکھا ہوا ایڈریس غلط ہے ورنہ وہ مجھے ضرور جواب دیتی۔ اب دنیاداری میں اتنا الجھ گیا ہوں کہ چاہنے کے باوجود وہاں نہیں جا سکتا۔ اس کے دیئے ہوئے سارے تحائف میں نے بہن بھائیوں میں بانٹ دیئے مگر ایک گڑیا اپنے پاس رکھ لی جس کے بال ڈارک براؤن اور آنکھیں نیلی ہیں جو ہو بہو نکی کی دوسری تصویر ہے۔ دکان پر یہ گڑیا میرے پاس رکھی رہتی ہے آج جو کچھ میرے پاس ہے وہ اسی عورت کا احسان ہے پھر بھلا کیوں نہ روز اس گڑیا کے میں قدم چوموں۔

لیاقت علی ۔ بھلار (راولپنڈی)



چپ نہیں رہا جاتا

راولپنڈی کے ایک غیر معروف گاؤں میں ہمارا چھوٹا سا گھرانا آباد تھا۔ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑی میں تھی۔ پڑھنے لکھنے کا شوق شروع سے تھا۔ بڑی ہونے کی وجہ سے احساس ذمہ داری بھی کچھ زیادہ ہی تھا۔ گاؤں کے بڑے زمینداروں کے بچے شہر میں تعلیم حاصل کرنے جاتے تھے۔ یہاں پرائمری سے زیادہ پڑھنے کا کوئی انتظام ہی نہیں تھا۔ مجھے بڑی حسرت تھی کہ میں بھی انہی لوگوں کی طرح شہر میں تعلیم حاصل کروں۔ پانچویں جماعت باآسانی پاس کر لینے کے بعد میں گھر بیٹھ گئی۔ شوق پورا کرنے کے لیے آٹھویں کی کتابیں منگوا لیں۔ آٹھویں کا پرائیویٹ امتحان پنڈی جا کر دیا۔ وہاں میرے ماموں کا گھر تھا۔ انھوں نے ابا سے کہا کہ کشور پاس ہو جائے تو اسے یہاں میٹرک میں داخلہ دلا دینا۔ ابا راضی ہو گئے۔ اتفاق سے میری سیکنڈ ڈویژن آ گئی۔ مجھے پنڈی میں داخل کرا دیا۔ دو سال میں میٹرک کیا۔ ماموں کی رائے پر عمل کرتے ہوئے سی ٹی میں ایڈمیشن لے لیا۔ پاس ہونے کے بعد معلمہ بننے کی درخواست بھیج دی جو منظور ہو گئی۔ مجھے پنڈی

کے ایک مڈل اسکول میں ملازمت مل گئی۔ اماں ابا میاں کو جب پہلی تنخواہ بھیجی تو اپنی ذات پر شدید فخر محسوس ہوا کہ اتنی چھوٹی سی عمر میں ان کا ہاتھ بٹانے کے قابل ہو گئی۔ اماں کو اپنے اخراجات کے پیسے ادا کرنے لگی۔ اماں اور میاں مجھ سے خاصی محبت کرتے تھے۔ انھوں نے کبھی میرے معمولات میں مداخلت نہیں کی۔ ان کے اپنے بچے چھوٹے چھوٹے تھے۔ وہ بھی میری عزت کرتے تھے۔ زندگی بڑی دلچسپ محسوس ہوتی تھی۔ مجھ سے چھوٹا بھائی میرے خط میں شہر آنے کی ضد کرنے لگا۔ اس نے مڈل کر لیا تھا۔ میں نے اسے اپنے پاس بلا لیا۔ اسے نویں میں داخلہ دلا دیا۔ اس کے تعلیمی اخراجات میں ہی اٹھاتی تھی۔ وقت گزرتا گیا۔ چار سال بعد اس نے ایف اے کر لیا۔ مجھے ملازمت کرتے ہوئے پانچ سال کا عرصہ ہو گیا تھا۔ میری عمر پچیس سے اوپر ہو چکی تھی۔ اس عمر میں والدین کو بیٹیوں کے بیاہ کی فکر ہوتی ہے مگر یہاں معاملہ الٹا تھا۔ والدین سوچتے تھے کہ اگر اس کی شادی ہو گئی تو ہر ماہ ملنے والی اتنی معقول رقم سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔

انھوں نے بالکل چپ سادھ لی تھی اور ادھر میں تھک چکی تھی۔ جو ملازمت لیڈی ٹیچر کے طور پر کی تھی اب گلے کا پھندہ بننے لگی تھی۔ بھائی کے تعلیمی اخراجات پورے کرنا، گھر معقول رقم بھیجنا اور پھر اپنے اخراجات بھی اٹھانا میرے لیے دوبھر ہو گیا تھا۔ ایک ٹیڈی پیسہ بھی جمع نہیں کر پاتی تھی۔ اگر کہیں شادی بیاہ کا چکر چل جاتا تو جہیز نام کی کوڑی تک دینے کو نہ تھی۔ یہ سوچ کر میں نے بھائی سے کہا کہ ارشد اب تم اپنے تعلیمی اخراجات خود برداشت کرو، میں اتنا بوجھ نہیں اٹھا سکتی۔ تم کہیں ملازمت کر لو۔ پھر چاہے پڑھو یا چھوڑ دو۔

ارشد بولا۔ ”باجی! مجھے خود شرمندگی ہوتی ہے کہ چار سال سے آپ میرا بوجھ اٹھا رہی ہیں۔ مجھے جہاں ملازمت ملے گی ضرور کر لوں گا۔“ اس کے جواب سے مطمئن ہو کر میں نے اس کی ملازمت کی تگ و دو شروع کر دی۔ ہم دونوں بہن بھائی روزانہ اخبارات میں ملازمت کا کالم ڈھونڈتے کہ شاید کہیں تُکا لگ ہی جائے۔

ایک دن اخبار میں کسی فرم کا اشتہار آیا کہ وہاں اسٹینوگرافر کی ضرورت ہے۔ ارشد نے ٹائپنگ سیکھ لی تھی مگر اسے اسٹینو کا تجربہ نہیں تھا۔ میں نے کہا ”تم درخواست دے دو۔ میں تمھارے ساتھ چلوں گی۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ چڑ کر بولا۔ ”آپ جا کر کیا کریں گی جبکہ مجھے اس کام کا کوئی تجربہ ہی نہیں ہے تو ٹیسٹ کیا خاک دوں گا۔“ مجھے غصہ آ گیا۔ اسے ڈانٹ دیا اور خود اس کی جانب سے درخواست لکھ کر بھیج دی۔ اس کی انٹرویو کال آ گئی تو ارشد نروس ہو گیا۔ کہنے لگا۔ ”میں نہیں جاتا انٹرویو دینے۔“ مجھے اس کی بزدلی پر غصہ آ گیا۔ بولی۔ ”تم میرے ساتھ چلو میں خود منیجر سے بات کروں گی۔“ غرضیکہ بڑی مشکل سے وہ راضی ہوا۔ میں اسے لے کر فرم میں پہنچی۔ اتفاق سے ہم وقت مقررہ سے بہت پہلے پہنچ گئے تھے۔ منیجر نے ہم دونوں کو اندر بلوا لیا۔ سچی بات یہ ہے کہ کمرے کے قیمتی فرنیچر اور قالین کے رعب سے میں بھی نروس ہو گئی

تھی مگر پھر دل کو سنبھال لیا۔ منیجر ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ بڑی گہری دلچسپی سے ہم دونوں بہن بھائیوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنی مسکراہٹ چھپاتے ہوئے پوچھا۔ ”تم دونوں میں سے ملازمت کون کرنا چاہتا ہے؟“ میں جلدی سے بولی۔ ”سر! میں تو اسکول میں ملازم ہوں۔ یہ میرا بھائی ارشد ہے۔ اس نے ایف اے کر لیا ہے۔ ٹائپنگ جانتا ہے۔ اسٹینو ابھی نہیں سیکھی ہے، ویسے جلد سیکھ جانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ آپ اسے موقع دیں تو یہ ایک دو ماہ میں سیکھ جائے گا۔“ میں ایک ہی سانس میں ساری باتیں کہہ گئی۔ ارشد سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ منیجر نے پوچھا۔ ”کیا آپ کے بھائی گونگے ہیں؟“ مجھے غصہ آ گیا۔ بولی۔ ”جناب! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ اسے ابھی آفس میں کام کرنے کا تجربہ نہیں ہے۔ جب کام کرنے لگے گا پھر دیکھیے اس کی زبان کیسے چلتی ہے۔ ارشد! کچھ تم بھی بولو نا —— !“ میں نے ارشد کو دھمکایا۔ وہ گلا صاف کر کے بولا۔ ”سر! باجی مجھے زبردستی یہاں لائی ہیں۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ مجھے اسٹینو کا تجربہ نہیں ہے۔ یہ کہنے لگیں کہ سیکھو گے تو آ جائے گا۔“ منیجر مسکرا دیا۔ کہنے لگا۔ ”تم دونوں کے والدین کہاں ہیں؟ انھیں بھی ساتھ لے آتے۔“ میں نے معصومیت سے کہا۔ ”وہ ہڑپن قصبہ میں رہتے ہیں۔ یہاں صرف ہم دونوں بہن بھائی ہیں۔“ منیجر نے دلچسپی سے ہماری باتیں سنیں، کرید کرید کر گھریلو سوالات کیے۔ پھر ارشد سے بولا۔ ”تمھاری باجی بڑی بہادر لڑکی ہیں۔ ان کی سفارش پر تمھیں ملازمت مل رہی ہے مگر شرط یہ ہے کہ کام میں تین مہینے کے اندر اندر مہارت حاصل کرنی ہوگی۔“ ارشد کا چہرہ غیر معمولی طور پر دمک اٹھا۔ میں بھی خوشی سے بے قابو ہو گئی۔ منیجر نے گھنٹی بجائی۔ چپراسی آیا تو اس سے چائے لانے کو کہا اور کہلوا دیا انٹرویو کے لیے جو لوگ آئیں انھیں وقار صاحب کے پاس بھیج دینا۔ ان سے کہہ دینا لڑکا منتخب ہو گیا ہے۔

ارشد کی ملازمت میرے لیے نعمت مترقبہ سے کم نہیں تھی۔ دنیا تو نوکری کے لیے جوتیاں چٹخاتی پھرتی ہے اور اسے پہلے ہی انٹرویو میں بغیر کسی سفارش کے کام مل گیا تھا۔ ارشد خود بہت خوش تھا۔ وہ آفس سے آ کر اپنے منیجر کی مہربانیوں کی داستانیں سنایا کرتا۔ ”باجی! یہاں سے زیادہ آدمی نہیں فرشتے ہیں۔ اپنے ایک آدمی سے کہہ دیا ہے کہ محنت سے کام سکھائے۔ آفس کا سارا عملہ مجھ سے مرعوب ہے۔ وہ لوگ سمجھتے ہیں میں ان کا کوئی عزیز ہوں۔ ان کا مجھ سے سلوک ہی کچھ ایسا ہے۔ اپنے پاس بلا کر چائے پلاتے ہیں۔ میری خیریت پوچھتے ہیں۔“

دنیا میں واقعی اچھے لوگوں کی کمی نہیں۔ یہ شخص ہمارے لیے فرشتہ رحمت ثابت ہوا تھا۔ بھائی کی ملازمت سے مجھ پر سے مالی بوجھ سرک گیا تھا۔ ارشد میری طرح ذمہ داریوں کو محسوس کرنے والا لڑکا تھا۔ پہلے ہی ماہ اس نے کہہ دیا تھا کہ ”باجی! آپ اپنے پیسے اپنے پاس جمع کرتی رہیں، گھر پیسے میں بھجواؤں گا۔“ میری محنت بار آور ثابت ہوئی تھی۔ زندگی میں پہلی

تم اپنے لیے اچھے کپڑے خریدے' اچھے درزی سے سلوائے۔ جب انھیں
پہن کیا تو دل میں عجیب و غریب خواہشات نے جنم لیا کاش انھیں
کوئی دیکھنے والا ہوتا۔ کاش میرے والدین اس بارے میں سنجیدگی سے
سوچتے۔

دن گزرتے گئے۔ ارشد کی ملازمت کو چار ماہ ہو چکے تھے اس کی
شخصیت بدل چکی تھی اس کے اٹھنے بیٹھنے میں اعتماد آ گیا تھا۔ ایک دن وہ
آفس سے بہت جلدی آ گیا۔ اس روز میرا اسکول بند تھا۔ آتے ہی بہرے
میں جھول گیا بولا "باجی! ایک خوشخبری سنیے" میں حیرانی سے اسے
دیکھنے لگی۔ بولا "باجی میں کنفرم ہو گیا میری تنخواہ میں پورے سو روپے کا
اضافہ ہو گیا۔" میں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ کہنے لگا "باجی ایک بات اور ہے"
میں نے پوچھا "کیا؟" کہنے لگا "باجی! منیجر صاحب آپ کو اپنی بہنوں
سے ملوانا چاہتے ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے تم لوگ اکیلا پن محسوس کرتے ہو گے'
اسے خود دادوں سے مل لو۔ کل انھوں نے ہمیں شام کی چائے پر بلوایا ہے"
میں نے کہا "ممانی کو بھی ساتھ لے چلیں گے" ارشد بولا "نہیں
باجی ممانی کا وہاں جانا مناسب نہیں ہے۔ وہ بڑے لوگ ہیں۔ ممانی کوئی
الٹی حرکت کر کے ہماری پوزیشن بھی ڈاؤن کر دیں گی۔ آپ اور میں بس ہم
دونوں چلیں گے۔ ماموں سے میں خود بات کر لوں گا۔"
دوسرے روز میں بڑے اہتمام سے تیار ہوئی۔ روز و شب کی یکسانیت
سے اکتا چکی تھی۔ چلو اس بہانے اچھے کپڑے پہننے کا موقع تو ملا۔ ارشد مجھے
لے کر روانہ ہوا۔ جب گھر کی بجائے اس نے ہوٹل کے آگے رکشہ رکوایا تو مجھے
بڑا تعجب ہوا۔ وہ کہنے لگا "باجی مجھے پتہ تھا آپ ہوٹل کے نام سے گھبرا جائیں
گی اس لیے پہلے نہیں بتایا۔ دراصل داؤد صاحب کی صرف دو بہنیں ہیں
وہ داؤد صاحب کی مصروفیت کی وجہ سے کہیں سیر و تفریح کے لیے نہیں
جاتیں۔ اس بہانے ان کی بھی آؤٹنگ ہو جائے گی۔"
میں جھجکتی ہچکچاتی ہوٹل میں آ گئی۔ داؤد صاحب ہمارا ہی انتظار کر رہے
تھے ان کے دائیں بائیں دو لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ تینوں ہمیں دیکھ کر
مؤدب انداز میں کھڑے ہو گئے۔ لڑکیاں بے حد ماڈرن اور مغرور لگتی تھیں
مگر مجھ سے اچھی طرح ملیں۔ ہم وہاں ایک گھنٹہ بیٹھے۔ ان دونوں لڑکیوں نے
اپنی تعلیم اور نام وغیرہ بتائے۔ مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ داؤد صاحب
زیادہ وقت ارشد سے ہی باتیں کرتے رہے۔ ایک آدھ بار سرسری انداز سے
میری طرف دیکھا' دو چار رسمی باتیں کیں اور چلتے وقت اپنی بہنوں سے بولے۔
"بھئی اب تمھیں مری جانا ہو تو ان لوگوں کو بتا دو۔" وہ دونوں مسکرا دیں بڑی
بولی "آپ نہ بھی کہتے تب بھی ہمیں یہ بات یاد رہتی۔ اب تو ان لوگوں کے بغیر
مری جانے میں لطف ہی نہیں آئے گا۔ ہے نا فرحانہ؟" فرحانہ مسکراتے ہوئے
بولی "بھئی پہیلیاں مت بجھواؤ۔ دراصل کشور بہن ہم لوگ پرسوں مری جا رہے
ہیں۔ بھائی جان کہتے ہیں میں وہاں صرف دو روز رک سکتا ہوں۔ مگر تم لوگ
زیادہ دن ٹھہرنا چاہتی ہو تو ارشد اور اس کی باجی کو ساتھ لے جاؤ۔ وہ لوگ تمھیں
اچھی کمپنی دے دیں گے۔ کیوں کشور آپ چلیں گی نا؟"
ان لوگوں سے ایک دم اتنا قریب ہو جانا اچھا نہیں تھا۔ میں نے معذرت
کر لی مگر ارشد مجھے گھورنے لگا۔ بولا "باجی کو میں منا لوں گا۔ آپ پروگرام پکا
سمجھیں۔" داؤد صاحب نے ہلکے سے تالی بجائی' بولے "ونڈرفل ارشد
تم بہت باصلاحیت نوجوان ہو۔ تمھارا انتخاب میں نے غلط نہیں کیا تھا۔
اب دیکھتے ہیں تم اپنی بہن کو کیسے راضی کرتے ہو۔"
سب ہنس پڑے میں بھی مسکرا دی۔ داؤد صاحب نے ہمیں اپنی گاڑی
میں گھر ڈراپ کیا۔ راستے میں وہ مری کا پروگرام مرتب کرتے رہے۔ طے یہ
ہوا کہ پرسوں صبح گیارہ بجے روانہ ہوں گے۔ ہم دونوں بہن بھائیوں کو مہمان
کی حیثیت حاصل ہو گی اس لیے ہم کسی قسم کی تیاری نہ کریں۔ یہ ذمہ داری
فرحانہ اور رضوانہ سنبھالیں گی۔ وہاں پانچ روز قیام رہے گا۔ داؤد صاحب
تین روز بعد واپس آ جائیں گے۔ دو دن ارشد ہمارے ساتھ رہے گا۔ میں
سارے راستے خاموشی سے پروگرام سنتے دیکھتی رہی۔ گھر آ کر ارشد پر برس پڑی
کہ تم نہیں جانتے یہ بڑے لوگ کیسے ہوتے ہیں جب جی چاہے آسمان پر
چڑھا دیتے ہیں اور جب چاہیں نظروں سے گرا کر معتوب کر دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں
سے ہمیشہ دور رہنا چاہیے۔ ارشد ہنسنے لگا' بولا "باجی یہ باتیں پرانی ہو گئی
ہیں۔ اگر زندگی میں آگے بڑھنا ہے تو باس کو دوست بنانا پڑے گا۔ قدرت
نے ہمیں خود ان سے دوستی کا موقع دیا ہے۔ وہ ہمارے باپ کے برابر ہیں۔
شفقت سے پیش آتے ہیں پھر ڈر نا کیسا؟"
ارشد نے مجھے واقعی منا لیا۔ جانے کو جی میرا بھی چاہ رہا تھا مگر ڈرتی
تھی کہ ان لوگوں کو ہماری کوئی بات بری نہ لگ جائے اور اس طرح ارشد کی
ملازمت پر کوئی برا اثر پڑنے کا ڈر تھا مگر ارشد مجھ سے زیادہ سمجھدار بنا ہوا تھا۔
اس نے مجھے بھی تیار کر لیا تیسرے روز ہم لوگ صبح ہی صبح تیاریوں میں لگ گئے
گیارہ بجے انھوں نے ہمیں سڑک سے پک اپ کر لیا۔ سارا راستہ ہنستے
گاتے گزرا۔ فرحانہ اور رضوانہ بڑی بے باک لڑکیاں تھیں۔ وہ ارشد سے بھی
بے دھڑک باتیں کر رہی تھیں جبکہ مجھ میں فری ہو کر بات کرنے کی جرأت نہیں تھی مگر
وہ گاتی شور مچاتی رہیں۔
مری میں ہمارا قیام ہوٹل میں تھا۔ دن بھر سیر کی۔ رات کو کھانے
کے بعد ایک کمرے میں میں' فرحانہ اور رضوانہ لیٹ گئے۔ دوسرے کمرے
میں ارشد اور داؤد صاحب چلے گئے۔ دن بھر کے تھکے ہوئے تھے جلد ہی
گہری نیند سو گئے۔ دوسرے روز صبح تر و تازہ اٹھے۔ ناشتہ ہم سب نے
ساتھ کیا۔ ناشتے کے بعد داؤد صاحب ارشد کو لے کر کہیں چلے گئے۔ ہمیں
انتظار کرنے کا کہہ گئے۔ گیارہ بجے وہ لوٹے۔ ہوٹل سے سامان اٹھوایا اور

ہم لوگ ایک بنگلے میں منتقل ہوگئے۔ یہ بنگلہ داؤد صاحب کے کسی دوست کا تھا۔ داؤد صاحب اس کی چابی لینے دوست کے رشتے دار کے یہاں گئے تھے۔ کھانا ہوٹل میں ہی کھایا۔ کھانے کے فوراً بعد ارشد سیدھا پاس آیا۔ کہنے لگا "باجی میں مغرب کے وقت تک واپس آجاؤں گا۔ داؤد صاحب کا ایک ضروری کام ہے۔ آپ گھبرایئے گا نہیں۔ فرحانہ اور رضوانہ آپ کے ساتھ رہیں گی۔ میں گھبرا گئی تھی۔ پوچھا کہ آخر جا کہاں رہے ہو؟ وہ بولا "فرم کے متعلق ایک اہم دستاویز داؤد صاحب کھلی دراز میں رکھ آئے ہیں۔ انھوں نے مجھ پر بھروسہ کیا ہے۔ جا تو وہ خود ہی رہے تھے مگر میرے اصرار پر انھوں نے مجھے اجازت دے دی۔ آپ بے فکر رہیں، میں یہ گیا اور یہ آیا۔ رات کا کھانا ساتھ ہی کھائیں گے۔"

ارشد چلا گیا۔ رضوانہ اور فرحانہ مجھے لیکر گھومنے نکل گئیں۔ ہم تینوں نے جی بھر کر سیر کی۔ چار بجے کے قریب تھکے ہارے واپس لوٹے۔ نہا دھو کر کپڑے بدلے۔ داؤد صاحب نے ہمیں کمرے میں ہی بلوا لیا۔ کہنے لگے "لڑکیو اب کیا چائے ولائے بناؤ گی، چلو شربت سے ہی دل بہلا لو۔"

فرحانہ نے جلدی جلدی گلاس بھر لئے۔ مجھے بھی دیا۔ میرا جی چاہ رہا تھا مگر مروتاً گلاس منہ سے لگا لیا۔ عجیب ذائقے کا شربت تھا۔ فرحانہ اور رضوانہ مزے لیکر پی رہی تھیں۔ ان کے چہرے کھلے جا رہے تھے۔ میں منہ بناتی تو غیر مہذب کہلاتی۔ داؤد صاحب مسکراتے ہوئے بولے "کشور بی بی! یہ شربت آہستہ آہستہ پیا جاتا ہے۔ ایک سانس میں پینے سے کڑوا لگنے لگتا ہے۔" ایک گلاس میں نے جیسے تیسے ختم کیا تو دوسرا بھر دیا۔ فرحانہ کے پیہم اصرار پر مجھے وہ بھی ختم کرنا پڑا مگر اس مشروب سے تو میرا سر گھومنے لگا تھا۔ کمرے کی ہر چیز ڈولتی، چکراتی نظر آ رہی تھی۔ میں گھبرا کر اٹھنے لگی تو فرحانہ نے مجھے سنبھال لیا۔ بولی "شاید اس کی طبیعت خراب ہوگئی۔ رضوانہ ذرا بھاگ کر لیمو کا پانی لانا۔" مجھے ایک تیسرا گلاس دے دیا جو میں نے لیمو کا پانی جان کر پی لیا۔ اس کے بعد دنیا کی ہر شے دو دو نظر آنے لگیں۔ کبھی میں زور زور سے ہنسنے لگتی کبھی رونا آتا۔ داؤد صاحب نے آگے بڑھ کر مجھے سنبھال لیا۔ میں خوفزدہ سی ہو کر ان کے بازوؤں میں سمٹ گئی۔ پھر وہ ہولے ہولے میرا سر سہلانے لگے۔ مجھے جیسے غنودگی ہو رہی تھی۔ دل مسلا جا رہا تھا مگر اٹھ نہیں ہو پاتی تھی۔ اسی کیفیت میں سر جھٹکتی تو داؤد صاحب مجھے اور قریب کھینچ لیتے۔ چند ہی لمحوں بعد میں ارد گرد کے ماحول سے بے خبر ہوگئی۔ کبھی کبھی نشے کے بھنور سے ابھرتی اور داؤد صاحب کو اپنے اوپر جھکا دیکھتی۔ اس ایک ڈیڑھ گھنٹے کی کیفیت میں مجھ سے سب کچھ بسالت فرما نے چھین لیے گئے۔ فرحانہ رضوانہ کمرے سے چمپت ہوگئی تھیں۔ کمرے میں صرف داؤد صاحب تھے اور میں۔ نشے میں ڈوبی ہوئی ایک بے بس لڑکی کو انھوں نے جذبات کے بھنور میں دھکیل دیا تھا۔

ہوش آیا تو خود کو اس عجیب و غریب حالت میں پاکر میں نے سر پیٹ پیٹ لیا مگر داؤد صاحب ہنستے رہے۔ بولے "بھئی تمھارے بھائی کی ڈبل پروموشن کردوں گا۔ آخر تمھاری سفارش پہ اسے نوکری دلائی تھی۔ اب ہمیں ذرا اور خوش کردو اس کی ڈبل ترقی کردیں گے۔"

میں نے تو انھیں کیا خوش کرنا تھا، اپنی خوشی کا سامان انھوں نے میری بے بسی سے خود ہی پیدا کر لیا تھا۔ فرحانہ اور رضوانہ دونوں لڑکیاں کال گرلز تھیں جنھیں اس نے بہنیں کہہ کر ارشد اور میرا اعتماد حاصل کیا تھا۔ جب میرا تقدس پامال ہوگیا تو وہ نیم عریاں لباسوں میں کھلکھلاتی اندر آگئیں۔ مجھے اٹھا کر غسل خانے لے گئیں۔ بے ہودہ مذاق کر کے مجھے رُلاتی رہیں۔ جس وقت ارشد واپس آیا، میں ان لوگوں کے جلو میں باہر کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ داؤد نے کہہ دیا تھا اپنے بھائی کو بتاؤ گی تو اس کی ملازمت بھی جائے گی اور میں نے اسے اپنے آفس بھیجا ہے، میں اس پر یہ الزام لگا سکتا ہوں کہ وہ میری غیر موجودگی میں میرے آفس کے کمرے میں گیا اور میری دراز سے فائل چوری کر لی یا دراز توڑ کر کیش نکال لیا۔ فراڈ یا چوری کا الزام ثابت کرنا مشکل کام نہیں۔"

میں بُری طرح سے سہم گئی۔ ارشد آیا تو صرف آنسو بہانے لگی۔ داؤد صاحب بولے "بھئی یہ بہت گھبرا رہی تھیں کہ کہیں تمھیں کوئی حادثہ نہ پیش آگیا ہو۔ شکر ہے تم خیریت سے آگئے ورنہ یہ ہمیں شوٹ کر دیتیں۔" ارشد ہنسنے لگا اور میں —— دل ہی دل میں کڑھنے کے علاوہ اور کچھ نہ کر سکی۔ وہ ساری رات میں نے روتے روتے گزاری۔

دوسری صبح میں نے واپس جانے کی ضد پکڑ لی۔ مجھے حرارت ہو رہی تھی۔ ارشد ٹھہرنا چاہتا تھا۔ داؤد صاحب بولے "میں تو آج شام کو ہی جا رہا ہوں اگر تم لوگ ٹھہرنا چاہتے ہو تو رُک جاؤ۔" فرحانہ اور رضوانہ بولیں "ارے نہیں بھئی، ہم بھی واپس چلیں گے۔" اب ٹھہرنے کا ان لوگوں کو فائدہ بھی کیا تھا۔ ڈرامہ ختم ہوچکا تھا۔ ان کا پارٹ بھی ختم ہوگیا تھا۔ اب بھلا یہاں ٹھہرنے میں انھیں کیا Charm تھا۔

میں نے آج تک ارشد کو یہ سانحہ نہیں بتایا۔ وہ جذباتی لڑکا یونہی میں داؤد کو قتل کروا دیتا۔ یا پھر داؤد صاحب اسے کسی بہانے جیل میں ڈال دیتے۔ میں خود تو تباہ ہوگئی مگر بھائی کو تباہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ زبان پر چپ کی مہر لگائی ہو آج چھ سال بعد بھائی کے کویت چلے جانے پر کھلی ہے۔

کشور جہاں۔ راولپنڈی۔

وہ مسافروں کی کہانی جنہوں نے سالوں بعد دھرتی ماتا کے پگ لاگا تھا



پیار کے پاکیزہ رنگوں سے مزین — دھنک رنگ کہانی

دائرے

واسودیو ایم اے

***

گلوب شپ ٹریولرز کا عالیشان سمندری جہاز گلڈ ہوپ بہت تیزی سے ہندوستان کے ساحل کی طرف رات کی تاریکی کو چیرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ جب ایس بینٹ ڈیک پر پہنچا تو رات کافی بیت چکی تھی۔ ہوا میں خنکی زیادہ آگئی تھی اس لیے جہاز کے مسافر اپنے اپنے کیبنوں میں گھس گئے تھے۔ ڈیک پر اس وقت کہیں کہیں ایک آدھ مسافر یا کوئی جہازی ادھر ادھر گھومتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔

"آج تو برج کھیلتے ہوئے بہت دیر ہوگئی ہے، جینی تو اب تک سوگئی ہوگی؟" بینٹ نے اپنے کیبن کی طرف جاتے ہوئے سوچا لیکن جب وہ اپنے کیبن کے سامنے پہنچا تو اس نے دیکھا کہ کیبن کی بتی ابھی تک جل رہی تھی۔" اس کا مطلب یہ ہے کہ جینی ابھی تک سوئی نہیں ہے۔ اگر اسے نیند نہیں آئی تھی تو وہ میرے پاس کھیل دیکھنے آ جاتی۔ عجیب ہوتی ہیں یہ عورتیں بھی!" بینٹ خود بخود بڑبڑایا۔

کیبن کا دروازہ کھول کر جب وہ اندر داخل ہوا تو اس نے دیکھا اس کی بیوی ایک مرد اور ایک عورت کے ساتھ بیٹھی ہوئی باتیں کررہی تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز نے ان تینوں کا دھیان اس کی طرف مبذول کردیا۔ بینٹ نے وہیں کھڑے ہوئے ان اجنبیوں کی طرف دیکھا۔ مرد بھاری بھرکم جسم کا آدمی تھا اور اس کی عمر کوئی پینتالیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ اس آدمی کی ساتھی عورت کی عمر بھی چالیس سے کم نہ تھی۔ اس کے چہرے بشرے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ عورت نوجوانی میں بہت ہی خوبصورت رہی ہوگی۔ بینٹ کو دیکھ کر اس کی بیوی جینی نے اپنے چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے اس سے کہا:

"ڈارلنگ! آج تو تم نے بہت دیر کردی ہے —— آؤ تمہیں ان سے ملاؤں!"

بینٹ اندر آگیا۔

"یہ مسٹر اور مسز گریول ہیں۔ کینیڈا کے رہنے والے ہیں۔ یہ بھی ہندوستان جارہے ہیں۔ اکیلے بیٹھے بیٹھے میں بور ہوگئی تھی تو تھوڑی دیر کے لیے ڈیک پر گھومنے چلی گئی تھی، وہیں پر مسٹر اور مسز گریول سے ملاقات ہوگئی۔" یہ کہہ کر جینی نے مسٹر اور مسز گریول کا بینٹ سے تعارف کروایا۔

"مسز بینٹ سے معلوم ہوا ہے کہ آپ کا کیلی فورنیا میں ایک بہت بڑا فارم ہے جس کے آپ واحد مالک ہیں۔" مسٹر گریول نے بینٹ سے مصافحہ کرتے ہوئے پوچھا۔

کے چند نرم و نازک اور شوخ و شنگ لڑکوں
نے علامہ اقبال سے دریافت کیا۔
" علامہ! آخر آپ بے چاری عورتوں کے لیے
پردے کو ضروری کیوں خیال کرتے ہیں؟"
علامہ نے کھلکھلاتے ہوئے جواب دیا۔
"تم صرف عورتوں کی بات کر رہے ہو، میں تو تم ایسے
نوجوانوں کو بھی پردے میں بٹھانے کی فکر کر رہا ہوں۔"

****

"بھگوان کی مہربانی ہے۔" جینٹ نے جواب دیا

"بینٹ ڈارلنگ! مسٹر گریول کا بھی اپنا ایک فارم ہے۔ اس لحاظ سے یہ بھی ہمارے ہم پیشہ کسان ہوئے۔" جینی نے اپنے شوہر سے پھر مخاطب ہو کر کہا۔

"بہت خوب! خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو!" بینٹ نے خوش ہو کر پھر گریول کی طرف مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اس وقت جب دو ہاتھ پھر ملے تو ان میں ایک نئی گرم جوشی تھی۔

"آپ شاید پہلی بار ہندوستان جا رہے ہیں ——" مسز گریول نے بینٹ سے پوچھا۔

"جی نہیں! میں آج سے پچیس سال پہلے ہندوستان میں رہا ہوں۔ البتہ میری بیوی جینی پہلی بار ہندوستان جا رہی ہے۔"

"میں بھی پہلی بار ہندوستان جا رہی ہوں۔ مجھے ہندوستان دیکھنے کا بہت اشتیاق ہے!" مسز گریول نے کہا۔

"اب ہندوستان پہنچنے میں دیر ہی کتنی ہے، کل ہم بمبئی پہنچ جائیں گے۔" بیوی کی بات سن کر مسٹر گریول نے جواب دیا۔

"مسٹر گریول آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ کل ہم بمبئی پہنچ جائیں گے وہاں پرانٹرنیشنل ٹریول ایجنسی کا نمائندہ ہمیں ملے گا۔ ہماری ہندوستان کی سیر کا سارا انتظام اسی ایجنسی نے کیا ہے۔" مسٹر بینٹ نے بتایا۔

"ہماری سیر و تفریح کا انتظام تو ایک ایکسپریس کمپنی کی طرف سے ہے۔" مسٹر گریول نے کہا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں بمبئی ہی میں بچھڑنا پڑے گا کاش ہماری یہ ملاقات کچھ دیر تک اور قائم رہتی۔"

"سفر کی لمبائی انسان کو ایک دوسرے کے نزدیک لے آتی ہے لیکن منزل بچھڑنے پر مجبور کر دیتی ہے۔"

کچھ دیر کے بعد مہمان رخصت ہو گئے

جینی بستر پر لیٹتے ہی خراٹے بھرنے لگی۔ لیکن بینٹ کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ وہ اپنے ماضی کی بھول بھلیوں میں الجھ گیا تھا۔ ماضی کی باتیں فلم کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگیں اور وہ پچیس سال پہلے کے واقعات میں کھو گیا۔ اس وقت جبکہ وہ بینٹ نہیں تھا بلکہ ایک سیدھا سادہ ہندوستانی دیہاتی تھا۔ وہ اپنے گاؤں میں اپنے چھوٹے بھائی سنتا سنگھ کے ساتھ بڑے مزے سے رہتا تھا۔ بچپن ہی میں اس کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا تھا۔ بنتا سنگھ اپنے چھوٹے بھائی کو اپنے بیٹے کی طرح عزیز رکھتا تھا۔ سنتا سنگھ کو ذرا بھی تکلیف ہوتی تو وہ فوراً بے چین ہو جاتا تھا۔ بھائی کی خوشی کے لیے وہ ہر قربانی دینے کے لیے تیار تھا۔ ان دونوں کے پیار کو دیکھ کر لوگ انہیں رام لکشمن کی جوڑی کہا کرتے تھے۔ وہ دونوں بھائی اپنی ماں کے ساتھ ہنسی خوشی دن گزار رہے تھے کہ ایک لڑکی ہربنس کور ان کی زندگی میں آئی۔ ہربنس ان کی ماں کی سہیلی کی بیٹی تھی۔ ماں کے مرنے کے بعد وہ یتیم اور بے سہارا ہو گئی تو بنتا سنگھ کی ماں اسے اپنے ہاں لے آئی۔ ہربنس کی موجودگی میں بنتا سنگھ اپنی زندگی میں ایک نئی امنگ، نیا جوش محسوس کرتا تھا۔ ہربنس کور اس کے کام میں برابر کا ہاتھ بٹاتی۔ وہ ایسی خوبصورت، ہنس مکھ اور محنتی لڑکی تھی کہ خواہ مخواہ انسان کا دل اس کی طرف کھینچتا تھا۔ چاروں طرف ہنسی خوشی کا دور دورہ تھا کہ اچانک بنتا سنگھ کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ ماں کی موت سے ان تینوں کا برا حال تھا۔ ہربنس کا تو اور بھی برا حال تھا۔ وہ روتی جاتی اور کہتی جاتی تھی کہ وہ آج دوسری مرتبہ یتیم ہو گئی۔ کچھ ہی دن گزرنے کے بعد جب ایک دن بنتا کھیت پر جا رہا تھا تو گاؤں کا نمبردار مل گیا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد وہ بولا —— "بنتا سنگھ! کچھ ہربنس کور کے بارے میں بھی سوچا ہے؟"

"اس کے بارے میں کیا سوچنا ہے چاچا! ماں کے مرنے کے بعد اس یتیم کو ہم گھر سے نہیں نکالیں گے!"

"میں اسے نکالنے کو نہیں کہتا ہوں بیٹا! میں تو یہ کہتا ہوں کہ اس سے شادی کر لو۔ ایک نوجوان، خوبصورت اور کنواری لڑکی کا کنوارے لڑکوں کے ساتھ رہنا اچھی بات نہیں ہے۔"

نمبردار کی باتیں سوچتا ہوا بنتا سنگھ اپنے کھیت پر پہنچ گیا تو اس نے دیکھا کہ کنوئیں پر درختوں کی چھاؤں میں ہربنس اور سنتا سنگھ باتیں کر رہے تھے۔ وہ ایک طرف ہو کر ان کی باتیں سننے لگا۔

سنتا سنگھ کہہ رہا تھا —— "بنسو! تو مجھ سے شادی کرے

"کیا بات ہے بیر شادی کے بارے میں اچانک کیوں سوچنے لگے؟"

"اچانک نہیں، بہت دنوں سے سوچ رہا ہوں۔ سچ تو یہ ہے جب سے تمہیں دیکھا ہے تبھی سے سوچ رہا ہوں۔ مجھے تم سے پیار ہے۔ اور آج گاؤں کا نمبردار بھی کہہ رہا تھا کہ ایک خوبصورت، نوجوان، کنواری لڑکی دو نوجوان اور کنوارے لڑکوں کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ اسی لیے ہم دونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ تمہیں شادی کرنی ہوگی۔ بولو تم مجھ سے شادی کروگی یا بھیا سے؟"

"ویسے آدمی تو تم بھی اچھے ہو اور تم سے بھی شادی کر سکتی تھی۔ لیکن اگر تم دونوں میں سے مجھے ایک کو چننا پڑا تو تمہارے بڑے بھائی سے شادی کروں گی۔ بے چارہ کولہو کے بیل کی طرح سارا دن کام میں جتا رہتا ہے۔ کوئی بھی تو اس کی دیکھ بھال نہیں کرتا ہے۔ میں اس کی بیوی بن کر دن رات اس کی خدمت کیا کروں گی۔"

"اور میری محبت کا کیا ہوگا؟" سنتا سنگھ نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

اس بات کا اسے کوئی جواب نہ ملا۔

"اچھا جیسی تیری مرضی! جس دن تو بھیا سے شادی کرے گی اسی دن میں یہ گھر، یہ کھیت اور یہ گاؤں چھوڑ کر اتنی دور چلا جاؤں گا کہ پھر تو میرے مرنے کا منہ بھی نہ دیکھ سکے گی ——" کچھ دیر رک کر وہ بولا۔

بنتا سنگھ نے بھائی کی یہ حالت دیکھی تو سوچ میں پڑ گیا۔ آخر بہت کچھ سوچ بچار کے بعد ایک دن صبح سویرے ہی بنتا سنگھ گھر سے نکل گیا پھر کبھی نہ لوٹنے کے لیے! اس نے سوچا وہ چلا جائے گا تو ہر بنس اپنے آپ سنتا سنگھ سے شادی کر لے گی۔

گاؤں سے بنتا سنگھ دلّی آیا اور ایک انگریز کے ہاں نوکری کر لی۔ اس انگریز کو شکار کا بہت شوق تھا۔ اسی شکار کے شوق میں اس کی جان چلی جاتی اگر بنتا سنگھ اسے موت کے منہ سے نہ بچا لیتا۔ وہ انگریز بنتا سنگھ سے اتنا خوش ہوا کہ جب وہ ریٹائر ہوا تو اسے اپنے ساتھ ہی انگلینڈ لے گیا۔ انگلینڈ سے وہ انگریز امریکہ چلا گیا۔ بنتا سنگھ بھی وہاں اس کے ساتھ ہی گیا۔ وہاں اسے جینی سے محبت ہو گئی۔ اس سے شادی کر کے وہ وہیں کا ہو گیا۔ اب اس کے بچے تھے اور بہت بڑا فارم تھا۔ اس خوشحالی میں بھی وہ اپنے بھائی کو برابر یاد کرتا رہا لیکن اس نے اسے کوئی خط نہیں لکھا۔ کیونکہ وہ یہ بھی بتانا نہیں چاہتا تھا کہ کیوں اس نے اپنے گاؤں کو چھوڑا۔ آخر کب تک اپنے جذبات کو دباتا رہتا۔ بھائی کی محبت نے جوش مارا اور آج وہ اپنے وطن ہندوستان جا رہا تھا۔

دوسرے دن جہاز بمبئی کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا۔ بینیٹ اپنی اہلیہ کے ساتھ جے پور اور آگرے ہوتے ہوئے دلّی آیا۔ ایک رات وہ دونوں پنجاب کو جانے والی گاڑی میں سوار ہونے کے لیے دلّی کے ریلوے اسٹیشن پر آئے۔ ایئر کنڈیشنڈ ڈبے میں ان کی سیٹیں ریزرو تھیں۔ جس وقت وہ ڈبے میں سوار ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ مسٹر اور مسز گریول بھی اسی ڈبے میں تھے۔

"ہیلو مسٹر بینیٹ! آخر ہماری دوستی نے ہمیں ہندوستان میں ملا ہی دیا۔" اپنے دوستوں کا سواگت کرتے ہوئے مسٹر گریول نے کہا۔

"زمین گول ہونے کے ثبوت اور آپ کی محبت نے ہمیں ہندوستان میں ملا ہی دیا ہے!" بینیٹ نے ہنستے ہوئے کہا۔

دونوں عورتیں باتوں میں مشغول ہو گئیں۔ گاڑی کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی۔

"کیا آپ کشمیر جا رہے ہیں ——؟" مسٹر گریول نے پوچھا

"نہیں ہم لوگ جالندھر جا رہے ہیں۔ وہاں میرا بھائی رہتا ہے!" بینیٹ نے جواب دیا۔

"بہت خوب! وہ شاید کسی امریکن امدادی مشن کے ساتھ وہاں رہتا ہوگا؟"

"میں مسٹر گریول! آپ مجھے امریکن سمجھ رہے ہیں اس لیے میں آپ کو بتا دوں کہ میں امریکن نہیں ہوں۔ دراصل میں ہندوستان میں ہی پیدا ہوا تھا اور زندگی کے تیس سال ہندوستان ہی میں گزارے ہیں۔ جالندھر کے پاس میرا آبائی گاؤں ہے۔ میرا بھائی ابھی تک وہیں رہتا ہے اسی سے ملنے جا رہا ہوں۔ شاید آپ لوگ کشمیر جا رہے ہیں؟" بینیٹ نے گریول سے پوچھا۔

"جی نہیں، میں بھی جالندھر جا رہا ہوں۔"

"وہ کیوں ——؟"

"جس طرح میں آپ کو امریکن سمجھتا رہا۔ اسی طرح آپ بھی مجھے

لیفٹیننٹ ہوں، میں بی ایس ایس گریوال ہوں۔ ہندوستانی ہوں۔ میرا گاؤں بھی جالندھر کے پاس ہی ہے!" گریوال نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"اوہ! تو یہ بات ہے، دونوں ہی غلط فہمی میں مبتلا ہے شاید اس لیے کہ ہماری بیویاں یورپین ہیں!"

اس پر دونوں خوب دل کھول کر ہنسے۔

"آپ کے گاؤں کا کیا نام ہے؟"

"رام پورہ ——!"

"رام پورہ! میں بھی اسی گاؤں کا رہنے والا ہوں!"

"اچھا ——!"

"آپ کا پورا نام کیا ہے، کس کے لڑکے ہیں آپ؟"

"میرا نام سنتا سنگھ ولد رتن سنگھ ہے، قوم جاٹ، ذات گریوال ہے۔ اسی لیے ایس ایس گریوال کہلاتا ہوں۔ گریوال اور گریوال میں کوئی خاص فرق نہیں ہے!"

"کیا تم سنتا سنگھ ہو —؟" جوشِ مسرت سے بنتا ایک دم گریوال سے لپٹ گیا۔

"اوئے سنتا سنگھ میں ہاں تیرا بھائی بنتا سنگھ!"

دونوں بھائیوں کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو گرنے لگے۔

دونوں عورتیں اپنی ہی باتوں میں مشغول تھیں۔ اپنے مردوں کو اس طرح گرمجوشی سے ایک دوسرے سے بغل گیر ہوتے اور انہیں آنسو بہاتے دیکھ کر بہت حیران ہوئیں اور متجسس نظروں سے انہیں دیکھنے لگیں۔

تھوڑی دیر کے بعد جب دونوں بھائیوں کے جذبات کا طوفان تھما تو بنتا سنگھ نے بھائی سے پوچھا،

"تم کینیڈا کب گئے تھے؟ ہربنس کا کیا حال ہے؟"

سنتا سنگھ نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے بھائی کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھا۔ پھر ایک لمحے کے بعد بولا،

"جس دن آپ صبح سویرے دوسرے گاؤں گئے تھے، اسی دوپہر کو میں بھی گھر سے چلا گیا تھا۔ بات یہ تھی کہ میں ہربنس سے پیار کرتا تھا اور وہ آپ سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ کیونکہ وہ مجھ سے زیادہ آپ کو چاہتی تھی۔ اسی لیے میں گھر سے چلا آیا تھا۔ گھر سے میں بمبئی آیا۔ ایک سمندری جہاز میں کوئلہ جھونکنے پر نوکر ہوگیا۔ جب وہ جہاز کینیڈا پہنچا تو میں وہیں رہ گیا!"

وہ ایک لمحہ رک کر پھر بولا،

"آپ امریکہ کب گئے تھے؟ ہربنس کے بارے میں تو آپ سے میں پوچھنا چاہتا ہوں۔"

سنتا سنگھ نے اپنی کہانی سنا کر بھائی کی طرف دیکھا۔ بنتا سنگھ نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا:

"کنوئیں پر تمہاری اور ہربنس کی بات چیت میں نے سن لی تھی۔ دوسرے گاؤں جانے کا تو بہانہ تھا۔ میں تمہارے راستے سے ہٹنے کے لیے وہاں سے چلا آیا تھا۔ گاؤں سے دہلی آیا، وہاں ایک انگریز کے ہاں نوکری کرلی۔ وہ انگریز وہاں سے مجھے انگلینڈ اور انگلینڈ سے امریکہ لے گیا۔ وہیں میں نے جینی سے شادی کرلی۔"

یہ کہہ کر بنتا سنگھ خاموش ہوگیا۔

کچھ دیر تک دونوں بھائی خاموش بیٹھے رہے۔ اتنے عرصے تک بچھڑے رہنے کے بعد اس طرح اچانک ملاقات سے دونوں کے دل ایک ناقابلِ بیان مسرت و طمانیت سے بھرے ہوئے تھے ان کے چہرے جن پر گزرا ہوا وقت اپنی چھاپ چھوڑ گیا تھا، لافانی محبت کے جذبات سے چمکنے لگے تھے —— لیکن اس مسرت کے دامن میں اس خوشی کی تہہ میں کوئی چیز تھی جو ایک کانٹے کی طرح کھٹک رہی تھی —— اور وہ تھی ہربنس کی یاد، جسے وہ ایک دوسرے کے لیے بہت دور اپنے گاؤں میں چھوڑ آئے تھے۔

عورتوں کی بے چینی کو دور کرنے کے لیے دونوں بھائیوں نے اپنے بارے میں انہیں سب کچھ بتا دیا۔ سفر کی دوستی مضبوط رشتے میں تبدیل ہوگئی تھی۔

"مجھے تو ہربنس پر رحم آتا ہے۔ وہ نہ ادھر کی رہی نہ ادھر کی!"

ساری کہانی سن کر سنتا سنگھ کی بیوی نے کہا —— "کسی نے سچ کہا ہے کہ محبت میں بھی عورت مرد کو بچا سکتی ہے۔ عورت وہاں بھی گھاٹے میں رہتی ہے۔ تم دونوں نے اسے دھوکہ دیا ہے —— دوسری بات ہے کہ تم لوگوں کی نیت بری نہیں تھی۔ نہ جانے بیچاری کی کیا حالت ہوگی!"

مسز سنتا سنگھ کی بات سن کر جینی نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔ سنتا سنگھ اور بنتا سنگھ دونوں خاموش تھے۔ اور وہ جواب دیتے بھی تو کیا؟

اور باہر اندھیرے کو چیرتی اور لوہے کی پٹری کو پھلانگ کر سندری ہوتی گاڑی آگے بڑھتی چلی جارہی تھی

"اللہ مومی کیا بالکل ہی دماغ خراب ہو گیا ہے۔" میں نے ہونق ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

"دماغ خراب ہو تمہارے دشمنوں کا۔ ۔ ۔ دشمنوں کے والدین بزرگوں کا۔ والدین کے دادا پردادا بلکہ سات پشتوں کا۔ ۔ پشتوں کی پشتوں کا۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"اُفوہ!" میں نے اس کی بلند آواز سے عاجز ہو کر اپنا کان سہلایا اور تیوری کے ساتھ پھیل ماہر لڑکی ہی آ گئی۔

اس سیشن ڈیپارٹمنٹ میں میری نئی نئی سروس کا معاملہ تھا۔ دراصل میں فطرتاً سنجیدہ طبیعت اور کسی حد تک سخت گیر تھی۔ اصل چپراسی تو ایک طرف عملے کے ارکان بھی مجھ سے فری نہ ہو سکے تھے۔ ایسے میں اس کی شوخ بیانی بہت کھلی۔ آج وہ ہمیشہ سے زیادہ شرارت پر آمادہ لگ رہی تھی سو باوجود میں نے محسوس کیا کہ وہ بھی کہہ رہی ہے۔ اس وقت یہ لمبی راہداری سنسان پڑی تھی صرف جمعدار نیناں کے فرش صاف کرتا ہوا آخری حصے میں مصروف تھا۔

تورے

"تورے نیناں مجھے بے ایمان تورے نیناں"

۔ ۔ ۔ پچھلے تین منٹ سے یہی مسلسل یہی مصرعہ سُنے جا رہی تھی اور وہ اپنے ذہنیت پن سے لہک لہک کر گائے جا رہی تھی۔ شاید میں کچھ دیر مزید برداشت کر لیتی مگر جب چپراسی نے دروازے کی اوٹ سے اندر کی پوزیشن دیکھنی چاہی تو میرے ضبط کا پیمانہ لبریز ہوا اور میں نے اسے ڈانٹ کر تنبیہ کی۔

"کچھ ہوش کرو مومی یہ تمہارا ڈرائنگ روم نہیں میرا آفس ہے موقع محل دیکھ کر بکا کرو۔"

"تمہارا آصف ہائی پلیس ہوٹل کے انگلش لوڈ القابی صاحب۔ چشمہ اتار کر ملاحظہ فرمائیے آپ کے سامنے کوئی آصف واصف نہیں بلکہ وی وی آئی پی گریٹ تشریف فرما ہے۔ ۔ ۔ سچ مچ تمہارے نیناں کمزور ہو گئے ہیں۔"

۔ ۔ ۔ اس کی آواز خاصی بلند ہو گئی تھی۔

محبت میں گھاٹا ہمیشہ عورت ہی کو ہوتا ہے "ایک مرد کا قول"

زاہدہ پروین



میں سنے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ اس بلا کو یہیں سے ٹالوں۔ پلٹ کر دیکھا وہ معصومیت اور شوخی سے پلکیں جھپکاتی چلی آ رہی تھی۔ سنہری کلیوں کی سی نرم دی ہالی سنہرے فلیپر سوٹ میں اس کا سانولا حسن چھوٹا پڑ رہا تھا۔ ایک دم ہی اس پر ڈھیروں پیار آ گیا میں نے نرمی سے پوچھا۔ "مومی اتنا شور مچانے کی کیا ضرورت ہے سیدھی طرح اپنا مقصد کیوں نہیں بتاتیں؟"

وہ جھٹکے سے بال پیچھے کر کے بولی۔ "میرا مطلب صرف اتنا ہے کہ آج شام ڈیڈی کی پارٹی تمہیں بھی اٹینڈ کرنا ہو گی۔"

"سوری۔ سوری" میں بے ساختہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"کیوں؟" اس نے بھویں سکیڑ کر پوچھا۔

"اس لئے کہ میں مخلوط پارٹیاں قطعی پسند نہیں کرتی۔ اس بات سے تم بھی واقف ہو۔"

"مر جاؤ خدا کرے تم۔" وہ غصے سے دانت پیس کر بولی۔ "میں کہتی ہوں اسے دقیانوسی لڑکی، تم اکیلی اس زمانے میں اور اسکے TREND نہیں بدل سکتیں۔ جب دیکھو ایک ہی بکواس۔ مگر آج میں ہرگز نہ مانوں گی۔ THIS IS MY INSULT" وہ فیصلہ کن انداز میں پیر پٹخ کر بولی تو میں کوئی جواب دیئے بغیر آگے بڑھ گئی۔

اندرونی ہال کے دروازے پر مریضوں کی کراہوں اور مدہم مدہم کھانسیوں کے شور نے میرا خیر مقدم کیا۔ نرسیں اور وارڈ بوائز دیوانہ وار ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ میں نے دیکھا بیڈ نمبر ۹ کے گرد کئی نرسیں کھڑی تھیں اور ڈاکٹر رحمان مریض پر جھکے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر اصغر سر نیچا کیے کھڑے تھے میں بھی ادھر ہی چلی گئی۔

اس مریض کو تین دن قبل داخل کیا تھا کیس بڑا سیریس تھا میرے خیال کے مطابق اس پر تیسرے اسٹیج کی گرفت ہو چکی تھی وہ جوان العمر تھا رنگت جو کبھی سرخ و سپید رہی ہو گی اب شدت کرب سے سیاہ ہو رہی تھی وہ ڈاکٹر رحمان کے ہاتھوں میں بری طرح تڑپ رہا تھا خوبصورت آنکھوں میں ڈھیروں پانی جمع تھا۔ میں نے ڈاکٹر اصغر سے سرنج لے کر نرس کی مدد سے انجکشن لگایا۔ سیدھی کھڑی ہوئی تو مومی پر نظر پڑی جو خبر نہیں کب سے کھڑی ادھر ہی دیکھ رہی تھی میں نے محسوس کیا اس کی رنگت پھیکی پڑ گئی ہے اور آنکھیں جانے کس خیال سے پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ سکتے کے سے عالم میں کھڑی تھی۔ اس کی دلی کیفیات محسوس کر کے میں مسکرا دی بھلا زندگی کی گہما گہمی اور رنگینیوں میں وقت گزارنے والے کیا جانیں یہیں تو ہر روز اس سے بھی زیادہ سیریس کیسز دیکھنے پڑتے ہیں۔

کافی کے بعد میں راؤنڈ مکمل کر کے لوٹی تو حیران رہ گئی مومی ابھی تک یہیں کھڑی تھی مجھے دیکھ کر بجلی کی طرح لپکی۔

"بیڈ نمبر ۹ کا مریض کون ہے؟ وہ کب داخل ہوا؟ اس کا مرض زیادہ سیریس تو نہیں؟"

اتنے سوال بیک وقت سن کر میں نے اسے سر سے پیر تک بغور دیکھا وہ واقعی سنجیدہ لگ رہی تھی خود چلنے کی سکت اس سے ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ انسانی ہمدردی کے اس پرخلوص جذبے نے مجھے بتا دیا تھا کہ وہ اس کی تسلی کر لوں۔

"گھبرانے کی ضرورت نہیں ڈیئر! دنیا میں سبھی کچھ ممکن ہے لیکن اثر نہیں لینا چاہیئے۔ وہ بھی ایک عام سا مریض ہے ٹھیک ہو جائے گا۔"

"بیٹا!" وہ میرا ہاتھ جھٹک کر چلائی پھر خود ہی دھیمی ہو کر بولی۔

"BENNI BE SERIOUS PLEASE خدا کے لئے مجھے بتاؤ اس کا مرض کہاں تک پہنچا ہے اور وہ ٹھیک ہو جائے گا نا؟" اس کا لہجہ سا میرے لئے بالکل ہی نیا تھا مومی بالکل مختلف سی لگ رہی تھی کسی اجنبی کے لئے اس درجہ پریشان میں نے اسے آج ہی دیکھا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کرسی پر بٹھایا اور کہا۔

"گو اس کی حالت اس وقت تسلی بخش نہیں ہے تاہم وہ اصل خطرے سے خاصی دور ہے۔ دورے کی یہ کیفیت رات تک دھیمی ہو سکتی ہے صبح تک سنبھل جائے۔ گلے کے قابل ترین ڈاکٹرز کا کیس ہے وہ مگر۔۔۔ میری سمجھ میں نہیں آتا مومی کہ تم۔۔۔"

"بس ختم کر دو۔" وہ ہاتھ اٹھا کر بولی۔ "اب میں گھر جا رہی ہوں۔" پھر جاتے جاتے مڑ کر بولی۔ "دیکھو بینا! اگر اس کے علاج میں غفلت برتی تو۔۔۔ میں تمہیں قتل کر دوں گی۔" اس کا آخری جملہ سن کر میرا سارا تجسس جاتا رہا۔ کمبخت جملے تو لی ہی بناتی رہی تھی میں اس کی شرارتی طبیعت سے خوب واقف تھی یہی سوچ کر میں نے اس کی حرکتوں کو نظر انداز کر دیا۔

رات کو اپنی رہائش گاہ پر حسب معمول کافی دیر تک مطالعہ کے بعد میں سونے کی تیاری کر رہی تھی تو فون گھنگھنا اٹھا۔ دوسری طرف مومی تھی۔

"ہیلو کیا بات ہے مومی! خیریت تو ہے؟"

"ادھر تو خیریت ہے مگر تم فوراً نئے مریض کی خیریت بتا جاؤ۔"

"ارے تم اسے بھولی نہیں۔" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ بھی کوئی بھولنے کی چیز ہے ڈارلنگ۔" اس کا لہجہ محسوس کر کے میں گنگ رہ گئی۔

میں نے ریسیور کریڈل پر پٹخا تو نیند میری آنکھوں سے اڑ چکی تھی۔ دوپہر سے میں اس کی حرکتوں کو شرارت سمجھ رہی تھی مگر وہ تو خاصی سنجیدہ لگ رہی تھی میں عجیب گومگو کے عالم میں مبتلا تھی نجانے وہ انجان اور ایک اجنبی میں کیسی دلچسپی لے رہی تھی جبکہ اس کی ساری زندگی میرے پیش نظر تھی۔۔۔ والدین اس کی ایسی لگتا تھا جیسے جنم جنم کے ساتھی ہوں۔ ہمارے درمیان کبھی کوئی جدائی حائل نہ ہوئی تھی ہم ہمیشہ ایک دوسرے سے قریب رہے تھے۔ بچپن سے کالج تک ساتھ رہے تھے پھر خوش قسمتی سے ایک ساتھ ہم نے

میڈیکل میں سیکنڈ ہو گئے۔ ڈاکٹری میرا مقصدِ حیات تھا اگر میں نے محض میری خاطر والدین کی مخالفت کے باوجود میڈیکل ہی کو ترجیح دی تھی میں اگر مرنا چاہتی تھی پہلے پہل اس نے مجھے ساتھ گھسیٹنا چاہا اگر جب میں نے میڈیکل لائن کے بارے میں اپنے چلنے سے صاف انکار کر دیا تو مجھا وہ بھی نئے کورس میں بالکل دوری ہی کے پیچھے چل دی۔ ہماری طبیعتوں میں بعد اختلاف ہونے کے باوجود بے مثال دوستی اور یگانگت قائم تھی اس کی رگ رگ میں شرارتیں بھری تھیں۔ وہ طالبعلمی شرارتوں کا حسین مرقع تھی۔ بلا کی ذہین اور کھلنڈری ہر بات ہر موقع پر پیش پیش اس کے علاوہ ہمارے بچپن کے کسی حصے میں ہی استعمال کر گئے تھے۔ اس لئے سعدیہ آنٹی نے مومی کی پرورش انتہائی نازونعم میں کی تھی۔ فطری آزادی، ماحول کی آسودگی اور آنٹی کے لاڈ اور دلار نے اس کی شوخ فطرت کو جلا بخشی تھی۔ اس طرح وہ ایک طرف معصوم اور شوخ تھی تو دوسری جانب انتہائی پُراعتماد، صاف گو اور اعلیٰ ظرف تھی شکل طور پر وہ خوبرو تھی۔ بال مناسب نقش و نگار کی سانولی رنگت والی مومی لڑکی تمام چہرے میں آنکھیں بے حد جاذب تھیں۔ جگمگاتی ہوئی شوخ آنکھیں . . .

ایم۔بی۔بی۔ایس کے بعد اس نے جب مکمل ریسٹ کرنے کا اعلان کیا تو ہمارے مشترکہ ملنے والے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر رہ گئے تھے لیکن میں تو اس سے خوب واقف تھی۔ بقول اس کے اس نے تو محض میرا ساتھ دینے کے لئے اتنے دن ساتھ دیا تھا۔ اب اس کے نام کے ساتھ ایم بی بی ایس کی ڈگری تو ضرور لگ گئی تھی مگر خود محترمہ ملازمت کرتی پھر رہی تھیں اور اب تو کمپنی کلب بھی جانے لگی تھی۔ شہر میں اس کے دوست احباب کی تعداد میں اس درجہ اضافہ ہو گیا تھا کہ ہر روز کوئی نہ کوئی تقریب منعقد ہوتی رہتی جن میں وہ بسا اوقات مجھے بھی گھسیٹ لے جاتی۔

ایم بی بی ایس کے بعد میں نے اپنی دیرینہ خواہش کی تکمیل کی خاطر ٹی۔بی اسپیشلسٹ لائن اختیار کر کے پریم گڑھ میں ایک سال لگایا اور اب اس سینی ٹوریم میں منتقل ہو گئی تھی۔ اس سروس کے دوران مجھے زندگی اتنی بھرپور اور مکمل نظر آتی تھی کہ باقی کوئی تمنا تشنہ دکھائی نہ دیتی تھی۔ خون تھوکتے ہوئے زندگی کی بہاروں سے محروم ان مظلوم مریضوں کی تیمارداری کرنے میں ایک خاص لطف ملنے لگا تھا۔ نزدیک ہونے کی وجہ سے مومی اکثر ہر ویک اینڈ پر مجھ سے ملنے آ جاتی تھی۔ اس کی آتی دونوں کے رشتے میں بھی میری کہانی تو دھیمی چیزیں لگتی تھیں۔ پتہ نہیں میرے ماضی کا کیا پس منظر تھا ایسا جانتی تھی کہ سعدیہ آنٹی ہر جگہ اور ہر وقت مجھے کاؤنٹ کرتی ہیں اور مجھے ہمیشہ اپنی مومی جانا۔

دوسری صبح کا بھی میں ناشتے سے فارغ نہ ہوئی تھی کہ وہ آدھمکی۔ آتے ہی نئے مریضوں کی خیریت دریافت کرنے کے بعد یوں تماشہ کرنے لگی جیسے کوئی بات نہ ہوئی ہو۔ لہٰذا مجھے پوچھنا پڑا۔

"مومی! اب شرافت سے کھل جاؤ کہ تمہاری اس سے کیا عزیزداری ہے؟" چائے کی چسکی لے کر اس نے کپ میز پر رکھا اور پھر میری طرف جھک کر سرگوشی میں بولی۔

"مجھے اس سے عشق ہو گیا ہے ڈارلنگ۔"

"ہائیں!" میں اچھل پڑی۔

"جی ہاں عشق، محبت، پیار، انسیت، لگاؤ، الفت جس کو جو کہہ لیجئے"

اس کی زبان درازی پر مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی مگر پھر تقدس کا خیال کر کے میں نے سختی سے اسے ڈانٹ دیا۔

"شرم نہیں آتی کمبخت تجھے ایک جاں بلب مریض کے لئے ایسی باتیں کرتے ہوئے۔ مذاق کی بھی حد ہوتی ہے۔"

"مذاق!" وہ آنکھیں پھیلا کر بولی۔ "وہ تو میرے خوابوں کا شہزادہ ہے بھئی۔"

"لعنت ہو تم پر۔" مجھے پھر غصہ آگیا اور میں اٹھ کر اندر چل دی۔ بھاگ کر اس نے پیچھے سے میری چوٹی پکڑ لی اور دھیرے سے بولی۔

"یقین کر لے بنیا پیاری۔"

"میں اب سچ مچ بار دور لگ رہی ہوں۔ ہر وقت ایک سی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ زندہ مردہ کی تمیز تو کر لیا کرو۔" میں نے اس کا ہاتھ جھٹک کر کہا۔

"مردہ . . . . . تو کیا وہ . . . . . ." مومی کا رنگ سپید پڑ گیا اور وہ اس زور سے چلائی کہ میں پریشان ہو گئی۔ بڑی مشکل سے اسے تسلی دی۔ دوسرے بیڈ نمبر ۹ کا مریض دکھایا تب وہ ٹلی۔

اگلے چند دن بے حد اہمیت کے حامل ثابت ہوئے۔ مومی حقیقت میں ارباب ہمدانی کے لئے بہت سیریس ہو گئی تھی ان دونوں میں اتنی گہری دوستی ہو گئی تھی کہ مجھے تعجب تھا۔ وہ اپنی ہر شام اسی کے بیڈ کے قریب بیٹھ کر گزارتی تھی اور ارباب ہمدانی جس نے یہ چند دن بیماری کے شدید تکلیف دہ کرب میں تڑپ تڑپ کر گزارے تھے۔ اتنی پیاری لڑکی کے پُرخلوص رویے پر بے حد مسرور اور خوش نظر آتا تھا۔ مومی مجھ سے کچھ کھنچی سی گئی تھی جو ہماری دوستی میں قطعی پہلا واقعہ تھا۔ چنانچہ میں نے بھی حالات سے سمجھوتہ کر لیا کیونکہ میں حالات کو پوری طرح سمجھ چکی تھی۔ اور خوب جانتی تھی کہ مومی جس راہ پر چل نکلی ہے وہاں سے اسے واپس لانا میرے بس کا روگ نہیں ہے۔ وہ تھی کچھ ایسی ہی ٹائپ کی۔ اول تو کسی سے متاثر نہ ہوتی اور جب کوئی شے اسے پسند آ جاتی تو وہ اس کے حصول کو مقصدِ حیات بنا لیتی۔ یوں بھی مجھے اس کے ذاتی معاملات میں دخل اندازی کا کیا حق تھا؟ وہ باشعور اور خودمختار تھی۔ اگر کسی جذبے سے مجبور ہو کر ارباب ہمدانی سے پیار کر بیٹھی تھی تو کیا جرم تھا؟ میں البتہ پہلی ہی نگاہ میں تاڑ گئی تھی بات لطف ہوا تھا اس پہلو پر غور کرنے سے جسے کبھی آتی تھی۔ یہ مومی کمبخت ہر جگہ اور ہر معاملے میں منفرد ہی رہتی تھی۔

"ہاؤ ڈو یو ڈو ڈارلنگ؟"

"او کے۔"

میں نے اسے چڑانے کے لئے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کرلیں میری اس ظاہری بے نیازی پر وہ چڑ اٹھی۔

"اے فضول لڑکی، تمہاری یہ سنجیدگی مجھ پر چلے گی ہاں یہ رعب داب اپنی نرسوں اور سسٹروں پر ہی جھاڑنا۔"

میں نے بمشکل ہنسی ضبط کی اور اس کی بات سنی ان سنی کردی۔

"سنتی بھی ہو؟" وہ پھر پہلو بدلتے ہوئے بولی "میں نے انکل رحمان سے کہہ کر ارباب کے لئے علیحدہ اسپیشل روم حاصل کرلیا ہے۔"

"ارے" میں بے اختیار سیدھی ہو بیٹھی۔ وہ میری حیرت سے لطف اٹھا کر بولی۔

"اور تمہارے لئے یہ کہہ رکھا ہے کہ میرے مریض پر خاص توجہ دی جائے۔"

اور پھر وہ ایک شوخ نظر ڈال کر کمرے سے نکل گئی۔

اور اسی شام میں نے ایک عجیب منظر دیکھا میں اور ڈاکٹر رحمان برآمدے میں کھڑے ایک نئے مریض کے متعلق باتیں کر رہے تھے موسم بے حد خوشگوار ہو رہا تھا دور تک پھیلے ہوئے لان کے سرسبز پیڑوں میں پرندے چہچہاتے سرسرا رہے تھے۔ افق پر شفق کی لالیاں پھیل رہی تھیں شام دھیرے دھیرے ڈھل رہی تھی۔ گیٹ سے ریڈ ٹیکسی اندر رینگ آئی اور موٹی اتر پڑی۔ اگلی سیٹ سے اس نے ایک ریڈیو سیٹ اور بہت سے پیکٹ اٹھائے اور مسکراتے ہوئے ہمارے قریب چلی آئی۔

"ہیلو انکل، ہیلو بیٹا۔ ہاؤ ڈو یو ڈو؟"

"ہیلو بے بی" ڈاکٹر رحمان خوشدلی سے مسکرائے پھر اسے بغور دیکھ کر ہنس کے بولے "میرا خیال ہے بے بی تم نے اسے مکمل طور پر صحت یاب کرنے کا ٹھیکہ لے لیا ہے۔" وہ ہنستی ہوئی ارباب کی طرف بڑھ گئی میں بھی اس کے پیچھے چل دی۔

کمرے میں ارباب صاف ستھرے بیڈ پر آنکھوں پر ایک ہاتھ رکھے سیدھا لیٹا تھا۔ میں نے اس کی نبض دیکھی آج حرارت نہیں تھی۔ آہٹ سن کر وہ تکیہ کا سہارا لے کر بیٹھ گیا۔ موٹی کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں دلکش مسکراہٹ ابھری تھی۔ موٹی نے تپائی گھسیٹ کر بیڈ سے ملائی اس پر ریڈیو سیٹ جمایا پھر پیکٹ کھول کھول کر اس کے سامنے رکھنے لگی۔ مختلف کتابوں اور رسالوں کا چھوٹا سا ڈھیر لگ گیا۔ یہ سب دیکھ کر ارباب کے چہرے پر حیرت و خجالت کے تاثرات گڈمڈ ہو رہے تھے وہ کمزور لہجے میں دھیرے سے بولا۔

"میرے حال پر اتنی عنایات کے بعد زحمت کی کیا ضرورت تھی موٹی!"

موٹی نے بے حد چڑ کر اسے دیکھا پھر انتہائی سنجیدگی سے منہ بنا کر بولی "وہ ۔ ۔ ۔ وہ دراصل مجھے آج پاگل کتے نے کاٹ لیا ہے نا!"

مجھے ہنسی روکنا محال ہوگیا اور اتفاقاً ارباب کے سرہانے اس کا چارٹ دیکھنے لگی۔ وہ دونوں کافی دیر بحث کرتے رہے پھر بے چارے ارباب نے مجھ کو مخاطب کرلیا۔

"دیکھئے نا ڈاکٹر! آپ ہی سمجھائیے انہیں۔ اتنے بیشمار احسانات کا بوجھ میرے۔" بے حد شفقت سے باہر جاتے بات کرتے ہوئے میں نے اس کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی طاری تھی۔

آج میں نے پہلی بار بغور اس کو دیکھا وہ ایک پرکشش شخصیت کا مالک تھا لیکن بیماری کی وجہ سے اس کا چہرہ خطرناک حد تک زرد پڑ گیا تھا مگر ایک خاص قسم کی جاذبیت موجود تھی۔ گہری حساس سرخی مائل سی آنکھیں اور خمدار بالوں کے گچھے۔ اس کی باتیں سن کر میں نے اسے سمجھانا چاہا مگر موٹی جو دیر سے اس کی تکلفانہ گفتگو سن کر سکون سے برداشت کر رہی تھی۔ تنک کر کھڑی ہو گئی اور ارباب کا رخ کرتے ہوئے بولی۔

"آپ اپنی تقریر جاری رکھئے۔ ختم ہو جائے تو مجھے بلا لیجئے گا۔"

وہ بے ساختہ ہنس کر بولا۔

"بس بس ختم ہوگئی۔ اب آپ واپس آ جائیے۔"

میں کچھ دیر بیٹھی رہی پھر ہاسٹل کی طرف آگئی۔

آہستہ آہستہ بہت سے دن گزر گئے۔ ارباب ہسپتال کے ساتھ داخل ہونے والے مریضوں میں سب سے زیادہ صحت مند ہو رہا تھا۔ ہم ڈاکٹروں کی جدوجہد اور کوشش تو ہر مریض کے لئے یکساں ہوتی ہے مگر اس موذی مرض میں دوا علاج کے لئے جس محبت، خلوص اور چاہت کی ضرورت ہوتی ہے وہ اسے بھرپور انداز میں مل رہی تھی۔ موٹی اس کی سب سے بڑی مسیحا، غمگسار، ہمدرد اور پُرخلوص ساتھی کی طرح اسے قدم بقدم صحت کے زینے کی طرف لئے جا رہی تھی۔ ارباب کے خزاں رسیدہ زرد چہرے پر موٹی کے پیار کے پھول کھل اٹھے تھے اور آنکھوں میں چکاچوند کر دینے والی چمک تھی۔ گو وہ ابھی مکمل طور پر صحت یاب نہ ہوا تھا تاہم جس رفتار سے صحت اور تندرستی اس کی طرف لپک رہی تھی۔ اس سے بہت سی امیدیں وابستہ کی جا سکتی تھیں۔ جس روز وہ یہاں لایا گیا تھا اس کی ابتر حالت کے پیش نظر اس بات کی امید بھی کم تھی کہ وہ بچ سکے گا۔ بیسیوں قدیم میں بکتی سسکتی زندگی جتنے قریب سے ہم لوگ دیکھ سکتے ہیں، کہیں لاکھوں جیسی خون تھوکتے ہوئے دکھ کی شدتوں سے نبرد آزما کربناک چیخوں سے سنولاہٹ والے چہرے اور جیتے جیتے لوگ، بند ہوتی ہوئی ٹکٹکی باندھنے والی پتھرائی ہوئی آنکھیں۔ ہم نے روز ہی منظر دیکھنے میں آتے ہیں۔ زندگی سے مایوس اور شاعرانہ حیات کے ان مظلوم اور قابل

جرم افزائی کرنے کی طرف لے جاتا ہے۔ یہی شکار جذبات کی تیم سے
ہیں وہ جاہ پر نازاں ہے اس نے ایک بات کی تحلیل کی۔ سچا عشق بھی
ہو سکتا ہے لیکن جو مجبت اور بے خلوص پیار کے بدلے تاثیر رکھتے ہیں وہ ایک
اسپیشلسٹ کے لئے بھی ممکن نہیں۔ اصل معاملہ اور سیاہ تو یہ ہے جو کمرت
میں جینے کی امنگ پیدا کر سکے مومی نے جس بیڑ مسرور طریق پر ارباب صمدانی
میں زندگی کی مشکلات اور حادثات سے نبرد آزما ہونے کا ولولہ پیدا کیا تھا
انتہائی قابلِ ستائش تھا۔ ڈاکٹر زبیر اس کے قدر دان تھے۔

بہار کے ابتدائی دن تھے موسم میں بڑی خوشگوار تبدیلی آگئی تھی سینی ٹوریم
کے لان کے چپے چپے پر بہاروں نے بسیرا کر لیا تھا۔ صبا بہار پھولوں کی نکہت
کی خوشبو سے دماغ کی گہرائیوں تک اترتی چلی جاتی۔ اس بادلوں بھری دوپہر سے
تحریر دہ ہو کر میں نے لان کا رخ کیا اور سینے کی ناز کے ساتھ ڈیا کے نابل
پھولوں کی جھاڑیوں میں مخصوص بنچ پر بیٹھ کر FIGS IN FROST پڑھنے لگی ناول
کئی دنوں سے شروع کر رکھی تھی لیکن پوری ختم نہ کر پائی تھی۔ اس وقت فری
تھی مگر وائے قسمت ابھی مشکل دو صفحے پڑھے تھے کہ زہرہ سے ہاتھ کے ساتھ
مومی نازل ہو گئی۔ میں نے اُسے گھور کر دیکھا پھر بے نیازی سے ناول کی طرف
متوجہ ہو گئی۔ دراصل میں آج کل باتیں سے کچھ خفا ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔

"ہائے بیچی" وہ نفسیاتی طور پر ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "حضور ممدوحی! اب تم تو
بہت ہی کٹھور اور خود غرض نکلی ہو۔ ایک وقت تھا کہ ان بیتا صاحب کے بغیر
تمہیں ایک پل چین نہ تھا اور ایک یہ دن ہیں کہ شکل بھی نہیں دکھاتیں۔ آہ یہ
مرتی اور جدائیوں کی بے ثباتی کی حد کر دی ہے تم نے۔ ارباب صمدانی کے سوا
تمہیں کچھ بھی یاد نہ رہا۔ لعنت ہو تم پر مومی۔ . . . لیکن سوال یہ ہے کہ

". . . . . . WHAT IS TO BE NOW"

اس کی ڈرامعنی بکواس پر میری ہنسی چھوٹ گئی۔ حقیقتاً میرے دل میں
بھی شکوے تھے۔ میں نے اس کے دھپ جما کر کہا۔

"بڑی بے ایمان ہے مومی۔ تجھ سے بڑھ کر بھی کون مکار ہوگا۔" وہ
مزاحیہ انداز میں جھک جھک کر سلام کرنے لگی۔ پھر اس نے مجھے بالکل نئی . .
اطلاع دی۔

"لارڈ ارلنگ اب تازہ خبر سنو۔ ارباب صمدانی کے متعلق میں نے مکمل چھان
بین کر لی ہے کہیں اس کے حسب نسب کی بہت فکر تھی نا تو سنو۔ اس کا باپ
ایک بڑا بزنس مین تھا۔ حج کرنے گیا تھا کہ پلٹ کر نہ آیا لیکن صاحب زادے
نے ابا جی کا دھیری کچھ زمینیں، بہاول پور کی ایک کوٹھی اور ٹرسٹی کا عہدہ بھی ساتھ کا
سرمایہ بھی چھوڑا ہے مگر پرابلم یہ ہے کہ ارباب کے حریص چچا نے سب کچھ غبن کر
رکھا ہے۔"

"پھر تو بیچارہ بہت ہی مظلوم ہے" میں نے تاسف سے کہا۔ وہ تیقنی
بھر معاملہ رو سے بولی۔

"لیکن صاحب تم اس ظالم چچا کا حشر دیکھنا میں نے اپنے وکیل سے بات
کر لی ہے جلد ہی مقدمہ دائر کر نے والا ہوں کہ حق پر چلنا کام لالوں ان کا احوال
میں حیرت سے تو سدرہ دیکھ رہی تھی۔

دوسرے دن میں ملاقات کی جلدی میں کمرہ نمبر آٹھ میں گئی تو ارباب کا احوال بھی
خوشگوار رہا تھا میز پر سبک سی ٹرے پر گرم سینکے ہوئے ابا جی اپنے بیٹے کو سمجھا رہے منتظر
ہوا تھا اور دونوں ہنس رہے تھے۔ مجھے یاد آیا کہ ارباب کو چیک کرنا ہے
میں تقریباً بھرے کمرے میں تو مومی اسے لطیفہ سنا رہی تھی۔

"ہاں تو ہوئی یوں کہ ایک دفعہ ایک جگہ چند دوست جمع تھے سب
اپنے اپنے مسائل سنا رہے تھے ایک جو دیر سے خاموش تھا سب کے اصرار
پر بولا۔

"دوستو میرا پرابلم یہ ہے کہ . . . میرا دل ہر وقت کچھ نہ کچھ کھانے
کو تیار رہتا ہے میں تو اس عادت کے ہاتھوں سخت پریشان ہوں . . ."
دوسرا جلدی سے بولا "ارے بھئی اس میں پریشان ہونے کی کیا بات
ہے۔ سیدھا سا حل ہے۔ اب بیٹھے ہی بیٹھے فوراً دو چار جوتے کھا لو . .
بس طبیعت صاف . . ."

میں بے ساختہ ہنستی ہوئی اندر داخل ہوئی تو یہ کمبخت اُسے ایسے
ہی لطیفے سنا کر ہنساتی رہتی ہے۔

کمرے میں پہنچ کر مجھے ایک لمحے کو عجیب کوفت کا احساس ہوا تھا۔ ارباب
صمدانی تکیوں کے سہارے نیم دراز تھا اور مومی بیڈ پر اس کے نزدیک بیٹھی
سیب تراش کر دے رہی تھی۔ اس کے لطیفے کا رد عمل یہ ہوا کہ ہنسی کی وجہ سے
اُسے کھانسی نے آ دبوچا اور وہ کھانستے کھانستے دوہرا ہو گیا اس کی حالت بدحال
ہوئی تو فیضی اس کا چہرہ دیکھ کر اپا ڈال کیا۔ مومی اس کے پاس بیٹھی رہی۔ اس نے ہلکا
سا سیب چھیل کر اُسے دیا تو میری طرف دیکھ کر وہ خجالت سے بولا "دیکھئے
ڈاکٹر مومی اپنی روش ترک نہیں کرتی۔ کتابوں، ناولوں کی حد تک تو خیر مناسب ہے
مگر یہ چند مہیروں سے ہوت اٹھا لائی ہیں۔" مومی شرارت سے آنکھیں نچا کر بولی۔
"تم خواہ مخواہ ترددکرتے ہو" بولی۔ "یہ اخراجات براہ راست میں اپنی
محترمہ کے یہاں سے حاصل کرتی ہوں" "لیکن اس کے سخرے پن پر مجھے ذرا
ہنسی نہ آئی۔ میں نے رو کھائی سے اسے مخاطب کر کے کہا۔
"تم جانے ۔ ۔ ۔ دل لینا" اور باہر چلی آئی۔

میں برآمدے میں کرسی پر ڈھیر ہو گئی۔ بہت دن سے جو خلش دل میں
تھی آج ناقابلِ برداشت ہو گئی تھی میرے دل و دماغ کی دنیا عجیب انتشار
کی شکار تھی۔ بلاشبہ مومی کی سوچوں اور چاہتوں کے جذبے پر پہرے بٹھانے کا
مجھے کوئی حق حاصل نہیں تھا۔ مگر میں تو اس کے حسین پیکر پر پرستش کرتی تھی۔
مجھے ہر حیز، ہر جذبہ، ہر بات ایک مناسب حد تک پسند تھی مومی کی خاطر میں سب
کچھ برداشت کر سکتی تھی۔ لیکن ارباب کے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ وہ ایک نہ ختم ہونے والا مسلک

اور مفروری مرض میں مبتلا تھا اور موری جس بے احتیاطی اور بدپرہیزی سے اس کی تیمارداری کر رہی تھی وہ اس کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی تپ دق کے محرک جراثیم (TUBERCLE BACILLUS) کو کیا ضرورت ہے کہ وہ موری کے احساسات کا پاس کر کے اسے بخش دیتا لیکن وہ ہر احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر اس کے کمرے میں بیٹھی اس کا جی بہلاتی رہی۔ حالانکہ ارباب ہمدانی کے ایکسرے رپورٹ اسٹڈی کر کے ڈاکٹر رحمان نے بھی کالی کھانسی کے لئے TUBERCULOSIS PULMONARY تشخیص کی تھی۔

میں خیالات سے چونکی تو موری سامنے بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ بولی۔

"اب کیا کہتی ہو؟"

"میں نے بلا تمہید کہا۔

"موری یہ تم جو اتنی بے احتیاطی سے ارباب کی خدمت گزاریاں کرتی ہو کبھی یہ بھی سوچا کہ تم پر بھی اثر انداز ہو سکتی ہیں۔ یہ مرض جتنا مہلک ہے تم اس سے واقف ہو مگر تم نے جانتے بوجھتے بھی ہر احتیاط کو پس پشت ڈال رکھا ہے یہ سب مجھے ذرا پسند نہیں ۔ ۔ ۔ ۔"

میری پوری بات اس نے بڑے تحمل سے سنی پھر ہنس کر بولی۔

"بگھارنے لگیں اپنی ڈاکٹری۔"

میں نے جل کر کہا "تم بھی پڑھی لکھی بلکہ ایم۔بی۔بی۔ایس ہو عقل پر کیا پردہ پڑ گیا ہے" کافی دیر وہ جواب سوچتی رہی پھر ٹھہر ٹھہر کر بڑی سنجیدگی سے بولی۔

"تم ٹھیک کہتی ہو عینا لیکن ۔ ۔ ۔ ۔ یہ اپنے اپنے سوچ کے انداز ہیں۔ لالہ میں تمہاری سوچ کی افادیت کی بھی قائل ہوں مگر اپنی ذات پر مسلط کرنا ضروری نہیں سمجھتی۔ اس کی سب سے بڑی اور بنیادی وجہ یہ ہے کہ میں ارباب کو احساس کمتری میں مبتلا نہیں دیکھ سکتی۔ میں چاہتی ہوں وہ اپنے مرض کو قطعی فراموش کر دے۔ اسے یہ احساس نہ رہے کہ وہ ایک خطرناک مریض ہے اور لوگ اس سے اور اس کی بیماری سے خائف رہتے ہیں۔ میں بھی خوب واقف ہوں عینا کہ وہ بذات خود ایک خطرناک مریض ہے اور اس کی ہر سانس مہلک جراثیم سے بوجھل ہوتی ہے مگر ۔ ۔ ۔ ۔ میں اس کے اور اپنے درمیان احتیاط کی خلیج قائم کر کے اسے مزید احساس کمتری کا شکار ہرگز نہ ہونے دوں گی ۔ ۔ ۔ ۔" اس کی منطق پر میں نے چڑ کر کہا۔

"میرے نزدیک یہ محبت نہیں جہالت ہے موری۔" وہ ٹھہرے جھک کر اطمینان سے بولی۔

"تم مجھے پڑھی لکھی جاہل کہہ سکتی ہو ڈارلنگ لیکن میں ارباب کا دل نہیں دکھا سکتی۔ اگر تم اس کی محبت کی ضمانت دو تو مجھے اس کا جھوٹا پانی بھی وہ تو میں بخوشی پی سکتی ہوں۔" اور پھر گنگنائی "کہہ کر منہ سے پرس جھلاتی بھاگتی چلی گئی۔

میں دیر تک اس کے اس منفرد عشق کے متعلق سوچتی رہی موری کا معاملہ درست کرنے کا کوئی حل سمجھ میں نہ آیا تو بالآخر مجھے اس کے صادق جذبے پر ایمان لانا پڑا۔

ارباب اس حد تک تندرست ہو گیا تھا کہ موری کی درخواست پر اسے نیچے کے پہاڑی قصبے اور سینی ٹوریم کے مضافات میں گھومنے پھرنے کی اجازت مل گئی تھی۔ اور وہ اکثر موری کے ساتھ چہل قدمی کے لئے چلا جاتا۔ اس کی تیزی سے بحال ہوتی صحت کو دیکھ کر خوشی ہوتی تھی۔ موری کی خوشگوار رفاقت، سینی ٹوریم کے ستھرے ماحول، مناسب علاج، غذا اور دلی خوشیوں نے مل کر اسے ایک شاندار اور خوبصورت شخصیت میں ڈھال دیا تھا۔

ایک بہت خوبصورت شام کو وہ دونوں میری رہائش گاہ پر آئے اور بہت خوش اور مطمئن نظر آ رہے تھے۔ رائل بلیک کے پنک کلر اپنی شلوار سوٹ میں موری کا دمکتا ہوا سانولا حسن پھوٹ پڑ رہا تھا۔ سیاہ بال شانوں پر بکھرے تھے اور ارباب ہمدانی! اسے تو میں دیکھتی رہ گئی۔ اسکائی گرے کلر سوٹ میں نکھرا نکھرا سا مردانہ وجاہت کا شاہکار لگ رہا تھا۔ وہ اس قدر جب پہلے دن ڈھانچہ نظر آتا تھا آج نظروں میں بے طرح جچ رہا تھا۔ میں نے دونوں کو نظر بھر کر دیکھا۔ بلاشبہ وہ ایک دوسرے کے لئے تھے۔

ہم تینوں گھومنے کے لئے باہر گئے۔ اونچائی سے نظر آنے والے قصبے کے مٹے مٹے سے نقوش پاس سے بہت دلآویز تھے۔ ارد گرد کی سبز پوش پہاڑیوں کی ڈھلانوں پر انتہائی دلکش اور خوبصورت مناظر دیکھنے میں آ رہے تھے۔ خودرو بیلیں، خوش رنگ پھول اور گہرے سبز پتوں والی جھاڑیاں پگڈنڈیاں ڈھانپ رہی تھیں۔ سورج ابھی ابھی پہاڑ پر جا نکلنے کی وجہ سے پھول پتے مسکرا اٹھے تھے۔ فضائیں جنگلی پھولوں کی خوشبو سے مہک رہی تھیں۔

ایسے ہی مسکراتے کھلکھلاتے لمحات کے دوران وہ جنتی ہرن آخر بھی آن پہنچی جب ارباب کو ڈسچارج ہونا تھا۔ اتنے طویل انتظار کے بعد اس کے پھیپھڑوں کا ایکسرے بالکل صاف آیا تھا۔ کوئی داغ دھبہ اب نہ رہا تھا۔ اس کا جسم اس موذی جراثیم سے پاک ہو چکا تھا تاہم اسے ہر ماہ اپنا چیک اپ کرانے اور سینی ٹوریم سے مشورے لیتے رہنے کی ہدایت پر رخصت کیا گیا۔ جس روز وہ رخصت ہوا موری نے پورے اسٹاف کو سینی ٹوریم کے لان میں ایک پر تکلف پارٹی دی تھی۔ اس نے اپنے احباب میں سے کسی کو مدعو نہ کیا تھا اور مجھے بھی تاکید کر دی تھی کہ سعدیہ آنٹی سمیت کسی کو بھی ارباب کی بیماری کے متعلق کچھ نہ بتاؤں۔ وہ اسے بالکل نئی حیثیت سے متعارف کرانا چاہتی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ تین ماہ کی رفاقت گزری۔ موری نے ارباب کو سعدیہ آنٹی سے متعارف کروا دیا تھا اور اپنی سرپرستی میں ممتاز ادارے کے اس کے چچا سے راج گڑھ کی زمینیں اور مکان کا قبضہ حاصل کر لیا تھا۔ اب تک ارباب نے

کسی چیز سے وابستہ نظمیں، غزلیں کی زندگی گزارنی تھی، اب کہیں زیادہ زندہ زندگی کا احساس ابھرا تھا اور سب ہی کی کارکردگی اچھی تھی۔

چھٹی کے دن صبح سے ہی ہم سب کچھ پڑھ رہے تھے، بارہ بجے کا ٹائم تھا۔ آج سیارہ ادب شاپنگ کا تھا مگر موسم کو دیکھ کر میں نے ملتوی کر دیا اور صوفی برآمدے میں کرسی پر آ بیٹھی۔ ٹھنڈی ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ ہر سانس مہک کے خوشگوار مہک رہے تھے۔ پنچھی کھلے کھلوں کے دور دور تک پھیلے ہوئے ڈھلوان چھتوں والے مکان ننھے کھلونوں کی مانند لگ رہے تھے۔ دائیں طرف قبرستان کی نیچی سی فصیل پھولی بیل نظر آ رہی تھی۔ سب قبریں خودرو سبزے اور جنگلی پھولوں سے ڈھکی رہتی تھیں۔ اس جگہ سبزے کی شادابی تھی، جگہ جگہ درخت تھے مگر میں نے کبھی یہاں سے کسی کو پھل توڑتے نہیں دیکھا تھا۔ انسانی قدموں سے بنی ہوئی پتلی سی پگڈنڈی دور تک پھیلی گئی۔ وہ وہ یہ سرسبزی کا ننھے وہ جھاڑیاں سرخ سرخ جنگلی بیروں سے لدی پھندی تھیں۔ مجھے معلوم بھی نہ ہو سکا کہ مومی کی بیٹی کس وقت اتفاق اور وہ کس وقت میرے سامنے آ بیٹھی۔ میں متوجہ ہوئی تو وہ الٹی ان سے ٹک پڑھ کے اخبار دیکھ رہی تھیں۔ لے لو، میں جانے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے بولی۔

"آج کل اس موسم پر یہاں کتنے لوگوں نے سیر کی، پہاڑی راستے اس قدر خوش اور خطرناک ہوتے ہیں پھر تم کا ذکر کرو کہ ان کی حالت کیا ڈرائیو کر لی ہو۔ خدا کرے وہ ٹھیک ہو جائے تو . . . ." وہ اس نے طویل سانس کھینچ کر اخبار ایک طرف ڈال دیا، پھر میرے ہاتھ سے لے کر بولی۔

"اگر تم یہ چلنا ختم کرو تو میں کچھ کروں، تمہیں بتانا ہے۔"

"کیسی بات؟"

"پتہ نہیں۔" وہ زیر لب مسکرا کے بولی۔

میں نے بے قراری سے گھور کر جانے کی چسکی لگاتے ہوئے ہنس پڑی۔

"امی کا فون، تم زبردست بے گمان ہو۔"

جب میں اس کے پاس بیٹھ کر چلی تو بولی۔

"بات یہ ہے کہ شیزہ ارباب نے مجھے بتایا ہے اور ممی کے پاس بھی پیاموں کا ڈھیر لگا ہے۔ انہوں نے تم کو خود ہی کے لئے بلایا ہے۔ اب سب تمہاری خوشی پر ہے کہ کسی طرح بھی ارباب کے لئے مناؤ . . . ."

"اچھا تو یہ بات ہے۔" میں نے اس سے چہرے کو موڑ لیا۔

مجھے تو فخر ہو کہ تم دونوں نے وہ گرم خوبیت کیوں نہیں کر لیتی۔ اس نے ہنس کر جواب دیا۔

"وہ تو آپ ارباب کی آنکھوں سے بہت متاثر ہو گئی ہیں۔"

اور اس بات کا مجھے قائل ہونا پڑا حقیقت یہی تھی کہ صبیحہ آنٹی کی آنکھیں منانے کا بلاوجہ ہی زور دے رہی تھیں۔

ہم صبیحہ آنٹی کو ہنسنا دیکھ کر وہیں کھڑے پاپا پر پلٹی سالی پھوپھی ہی تھیں۔ جب پاپا سے ملنے آتے تو بیٹھ کر بھی ان سے ادھر ادھر کی بہت سی باتوں کے بعد صبیحہ آنٹی بہت سے فوٹو میرے سامنے رکھ دیتے۔ ان میں سے چند ایک کے سوا میں کسی سے واقف نہ تھی، زیادہ تر شہر کی معزز فیملیوں سے تعلق رکھتے تھے۔ آنٹی ہر ایک کے متعلق مجھے کوالیفائی بیان کر کے مشورہ کر رہی تھیں، بلکہ خود ہی تصویریں منتخب کر کے انہوں نے مجھے دیں اور کہنے لگیں۔

"بیٹا، ہمیں ان دو میں سے کسی ایک کے لئے تم کو روی کے خیالات پر ملا کر نہیں، میں چاہتی ہوں جلد ہی اس کی انگیجمنٹ کر کے باقی پیاموں کے جواب دے دوں۔"

پھر میں گھبرا کے ان کے اس قطعی فیصلے سے تو معاملہ ہاتھ سے نکل جانے کا خوف تھا مگر مجھے کچھ چاہ دلاتی، تب میں نے جھجک ہوتے ہوئے تصویر ارباب صہبائی کو چپ رہنا ہی کر دیا۔

آنٹی نے جیسے چونک کر پوری آنکھوں سے مجھے دیکھا، پھر قدرے سختی سے بولیں۔

"بیٹا، کیا مومی نے خود تم سے ارباب صہبائی کے متعلق بات کی ہے؟ سچ بولو؟"

میں بوکھلا گئی، مگر سچ بولتے ہی بنی۔

"جی . . . جی ہاں آنٹی۔"

وہ خاموش ہو گئیں۔ دیر تک چپ رہیں، چہرہ ایسی سوچوں کے سائے لہرا رہے تھے، میں ان کے مقابل دم سادھے بیٹھی دل ہی دل میں مومی کو کوس رہی تھی جو کمبخت مجھے اس آزمائش میں ڈال کر خود کہیں جا چھپی تھی۔ بہت دیر کے بعد آنٹی چونکیں، پھر ایک طویل سانس لے کر بولیں۔

"آپ بھی بات ہے، مومی سے اس کو بلاؤ تو میں کرن کو اس کے گھر لے آؤں گی۔"

آنٹی اب تک ایک سکوت کے عالم میں بیٹھی تھیں۔ مومی نے سہیلیوں کو ملا ہوا تھا۔ وہ اس تبدیلی کر چکی تھی، معاملہ رنگ کے شور لگا تے ہیں، خاص سیریس لگ رہا تھا۔

"بیٹا، تم ارباب صہبائی کے لئے پوری طرح سیریس ہو؟"

آنٹی نے دریافت کیا۔

"یس ممی" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

"اور وہ خود؟" دوسرا سوال تھا اس بار اس نے صرف گردن ہلا دی۔

آنٹی نے وہی دوسرا سوال دوسری طرح پوچھا۔

"تم کب سے اسے جانتی ہو اور کیا پوری طرح مطمئن ہو؟"

مومی نے ایک لمحے کے توقف کے بعد بڑے اعتماد سے سر اٹھا کر جواب دیا۔

"میری اس سے تقریباً دو سال پرانی شناسائی ہے ممی۔ میں اس سے بالکل اسی طرح واقف ہوں جیسے خود اپنی ذات سے۔ میں نے خوب سوچ کر یہ فیصلہ کیا ہے اور مکمل بھروسہ کرتی ہوں اس پر۔"

آنٹی لمحے بھر کے بعد کافی دیر تک خاموش رہیں پھر خلاف توقع بیحد ملائمت اور نرمی سے بولیں۔

"اور کسے بیٹی! مجھے تمہارے خیالات سے اختلاف نہیں۔ زندگی بہر حال تمہی کو گزارنی ہے۔ اتنی سمجھدار ہو کہ اپنا اچھا برا سمجھ سکتی ہو۔ ویسے میرے پاس کئے ہوئے پیامو ں میں دو بہر لحاظ سے مناسب اور موزوں تھے۔ ۔ ۔ ۔ خیر۔ ۔ ۔ سب کچھ تمہارے سامنے ہے۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔"

"HOW SWEET OF YOU MY MAMI" مومی اچھل کر فرط خوشی سے ان سے لپٹ گئی اور سعدیہ آنٹی مسکراتے ہوئے بس منظر میں الگ رہی تھیں۔

اگلے ہفتے ان دونوں کی منگنی ہو گئی۔ منگنی انتہائی دھوم دھام اور کر و فر سے ہوئی۔ آنٹی نے جی بھر خوشی منائی۔ تقریب میں آدھا شہر مدعو تھا۔ ان دونوں کے دوست احباب بھی تھے اور سینی ٹوریم کا عملہ بھی نظر آ رہا تھا مگر مدعو مہمانوں میں کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی کہ آج سے قبل ارباب ایک سیریس کیس رہ چکا ہے۔ آنٹی کی طرف دیئے ہوئے کریشل سنو کے سوٹ میں وہ سب سے مسکرا مسکرا کر مبارک باد وصول کر رہا تھا اس کا صحت مند جسم اور دمکتا ہوا چہرہ دیکھ کر اس کی گزشتہ بیماری کا تصور مضحکہ خیز لگتا تھا۔

ان کی انگیجمنٹ کے دوسرے ہی ماہ مجھے ٹرانسفر کے آرڈرز مل گئے میں سخت بد مزہ ہوئی۔

یہاں جانا پہچانا اور اپنا سا اسٹاف تھا۔ اب نئی جگہ پتہ نہیں کیسے لوگوں سے سابقہ پڑتا۔ ٹرانسفر رکوانے کی خاصی بھاگ دوڑ کی۔

ترکی بہ ترکی

فارموسا کے گورنر کے سی دوہ جب صرف ۲۰ سال کے تھے تو پولیٹیکل سائنس کی ڈگری لینے پرنسٹن گئے، اس وقت وہاں کے ڈین مسٹر اینڈ ریوز فلیمنگ ولیسٹ تھے۔ انھوں نے انٹرویو کے وقت ان کے معصوم چہرے کی طرف دیکھا اور کہا۔

"عزیزمن! تم تو ابھی بلوغ کی منزل کو بھی نہیں پہنچے۔" یہ سوال سن کر کے سی دوہ پہلے تو شرمائے پھر برجستہ جواب دیا۔

"لیکن جناب عالی! بلوغ کو پہنچانے کا یہ طریقہ تو خود ہی نابالغی کا غماز ہے۔"

مگر سب بے سود گئی۔ مجبوراً میں کنگی پور سینی ٹوریم میں آ گئی۔

یہاں زندگی بیحد بور سی اور پھیکی لگی۔ مومی اور ارباب میں تو باقی کار مجھ سے ملنے آتے مگر میں مصروفیات کی وجہ سے ایک دن بھی آنٹی سے ملنے نہ جا سکی۔ پھر جیسے مومی مجھ سے غافل ہو گئی مگر مجھے اطمینان تھا وہ ارباب کے ساتھ مگن ہے۔

تقریباً سال بھر کے بعد ڈاکٹر رحمان کی انتھک کوششوں کے بعد مجھے دوبارہ ان کے ہاں بحال کر دیا گیا اور میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ یہاں آ کر ایک ہفتہ بہت مصروفیت کے عالم میں گزر گیا۔ کئی نئے مریضوں کے ایڈمیشن کے چکر میں الجھی رہی۔ فارمس کے ساتھ مل کر اپنی ساس پہلانی۔ ہاسٹل کا روم میں سامان سیٹ کروایا۔ میری غیر حاضری کے زمانے میں یہاں کئی تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ سینی ٹوریم کی پوری عمارت پر نیا روغن ہو چکا تھا۔ بہت سے پرانے مریض ڈسچارج ہو گئے تھے۔ میرا لوشعا الرعل اور دوسری نرسیں ٹرانسفر ہو گئی تھیں۔ ڈاکٹر اشعر نے ایک ایرانی لڑکی سے شادی کر لی تھی اور ڈاکٹر رحمان کی کنپٹیوں پر سفید بالوں کا اضافہ ہو چکا تھا۔

سنیچر کی شام میں نے مومی کو فون کیا بہت دیر تک کسی نے ریسیور ہی نہ اٹھایا پھر ملازم نے بتایا کہ گھر پر کوئی موجود نہیں ہے۔

دوسری صبح ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے اس کے گھر کا رخ کیا۔ سعدیہ لاج حیفظ کی طرح ویران تھی۔ آنٹی لان ہی میں نظر آ گئیں جو شفتالو کے پیڑ کے نیچے دھوپ چھاؤں کے امتزاج میں لان چیئر پر بیٹھی

اخبار پڑھ رہی تھیں شفتالو اور ناشپاتی کے شگوفے جھڑ جھڑ کر ان کی سفید ساڑھی پر گر رہے تھے۔ مجھے اچانک دیکھ کر انہوں نے بہت خوشی کا اظہار کیا پیار سے گلے لگایا اور سامنے بٹھا کر باتیں کرنے لگیں۔

"مومی کہاں ہے؟" میں نے ادھر ادھر دیکھ کر پوچھا!

"وہ کچھ دنوں سے ارباب اور دوسرے ساتھیوں کے ساتھ حنظلہ ہاؤس گئی ہوئی ہے۔ کچھ شکار وغیرہ کا پروگرام تھا ان کا۔ تم سناؤ۔ تمہارے ٹرانسفر کا کیا ہوا؟"

"میں یہیں آ گئی ہوں آنٹی"

"چلو یہ بہت بہتر ہوا!"

وہ مطمئن ہو کر بولیں۔ پھر چند لمحے خاموش رہی وہ بہت گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔

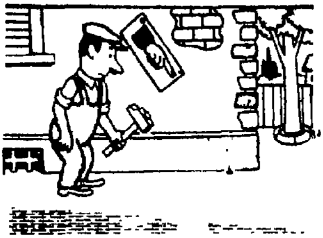
"دیکھو بیٹا" انہوں نے براہِ راست میری آنکھوں میں دیکھ کر کہا "میں بے بی سے بہت مرتبہ کہہ چکی ہوں کہ وہ اب بچپنا چھوڑ دے تاکہ میں اس کی شادی کے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں مگر اس کی ایک ضد ہے معلوم نہیں کیوں وقت لگا رہی ہے منگنی کو بھی ایک برس ہو چکا ہے میں تو جبھی شادی پہ زور دے رہی تھی مگر اس وقت بھی وہ ٹال گئی تھی بہرحال اب میں صبر نہیں کر سکتی۔ مجھے اپنا کوئی بھروسہ نہیں چاہیے اب تم آ گئی ہو یہ اچھا ہوا کسی طرح اسے سمجھاؤ اور . . . ."

میں سر جھکائے سنتی رہی اور دل ہی دل میں ایک نتیجہ پر پہنچ رہی تھی۔

میں یہاں آنے کے فوراً بعد سے ہی فکرمند تھی اس سلسلے میں ڈاکٹر بلال سے بھی بات کر لی تھی۔ ان کے خیال میں ارباب کو اب شادی کرنے میں کوئی حرج نہ تھا۔ اس کے تازہ ترین ایکسرے پرنٹ میں نے خود چیک کئے تھے اور پچھلی ریکارڈ رپورٹیں بھی پڑھ چکی تھی۔ ڈاکٹر اصغر نے مجھے بتایا تھا کہ ڈاکٹر رحمان نے مومی کے سامنے ارباب کو شادی کی اجازت دے دی تھی مگر تاخیر کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

سعدیہ آنٹی سے ملنے کے چوتھے روز میں بیٹھی ایک مریض کی میڈیکل ہسٹری شیٹ دیکھ رہی تھی تو مومی ہوا کے جھونکے کی مانند اندر آ گئی اور دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے پہلی ہی نظر میں محسوس کر لیا تھا کہ وہ پہلے سے بہت کمزور اور بجھی بجھی سی ہے۔ طبیعت کو جھٹکا سا لگا لہٰذا میں نے بلا تمہید پوچھ لیا۔

"کیا بات ہے مومی! تم اتنی کمزور کیوں ہو رہی ہو؟" وہ زور سے ہنس پڑی اور میری طرف اشارہ کر کے بولی۔



"پہلے اپنی خبر لو"

میں نے طنز سے جواب دیا "میری بات چھوڑو۔ ادھر تو ہمیشہ ساون ہرے نہ بھادوں سوکھے۔ ذکر اپنا کرو جو سدا بہار تھیں"

میری بات اس نے ان سنی کر دی اور منہ پھیر کر کھانسنے لگی۔

"اور یہ کھانسی کب سے ہے؟"

میں نے پریشان ہو کر سوال کیا اور اس نے رومال سے آنکھوں میں آیا ہوا پانی خشک کیا پھر منہ بنا کر بولی۔

"مہربانی کر کے تم اپنی ڈاکٹری مجھ پر مت جھاڑا کرو۔ دیکھ نہیں رہی ہو سیزن چینج ہو رہا ہے اب کیا موسمی نزلہ کھانسی پر بھی پرچہ بنواؤ گی؟" وہ کافی دیر باتیں کرتی رہی۔ اسی نے بتایا کہ ارباب آجکل اپنے کسی نئے کاروبار میں بہت مصروف تھا۔

"تم شادی کب کر رہی ہو؟" میں نے اصل موضوع کی طرف آنا چاہا — "معلوم ہوتا ہے تم کو بھی ممی کی طرح میرے سہرے کے پھول کھلے دیکھنے کا بہت ارمان ہے؟"

"اس میں شک ہی کیا ہے؟" مگر اس نے اتنا کڑوا جواب دیا کہ میں خود ہی چپ ہو کر رہ گئی۔ یوں بات ادھوری رہ گئی۔

موسم سرما نے مکمل طور پر اپنا تسلط جما لیا تھا اور موسم یخ بستہ ہواؤں کی زد میں آ گیا تھا۔ فلک بوس پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف جمنے لگی تھی۔ صبح کو ابھرتے ہوئے سورج کی ابتدائی کرنیں شعاعیں برف کے تودوں پر پھیلتیں تو پگھلی ہوئی چاندی کا سماں نظر آتا۔ ایسی ہی ایک یخ بستہ صبح کو مجھے آفس میں مومی کا فون موصول ہوا۔ وہ ارباب کے متعلق پوچھ رہی تھی کہ آیا وہ اب تک مجھ سے ملنے آیا تھا یا نہیں۔ باتوں کے دوران ہی وہ کھانسنے لگی۔ اس کی کھانسی سے ایک مرتبہ پھر میرا دل بری طرح بے چین ہو گیا۔ میں نے بہانے سے آنے کا کہہ کر کال ڈسکنکٹ کر دی۔

پتہ نہیں کیوں بڑی وحشت ہو رہی تھی۔ شاید ہسپتال ہی کے مریضوں کی تیمارداری کرتے اور کھل کھل کھانسیاں سنتے سنتے میری طبیعت وہمی ہو گئی تھی اور ہر بال کی کھال نکالنے کی عادت ہو گئی تھی۔ سچ ہے انسان کا

چیز اس کی فطرت میں رچ بس جاتی ہے۔ شاید اسی وجہ سے مجھے رومی کی گرتی ہوئی صحت اور کھانسی نے پریشان کیا تھا۔

اس وقت میں بے چینی سے رومی کا انتظار کر رہی تھی۔ گیٹ سے ٹیڈی کسی نظر آئی تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ جاتی ہوئی خفیف سی ہوئی میری طرف آ گئی۔ شاید کہ بلاوجہ ظاہر اور سیاہ دھاری دار ہائی نیک سویٹر میں اس کا چہرہ دبے دبے سے تھکا تھکا لگ رہا تھا۔ میں نے اسے سامنے بٹھا کر بالتفصیل پوچھا۔ "تمہیں کھانسی کب سے ہے؟"

"ہو گئے دو ماہ سے۔" اس نے جلدی سے جواب دیا۔

میں نے اسے غور سے دیکھا تو وہ مسکرا کر ہنسنے لگی لیکن میں آج رعایت کے موڈ میں نہیں تھی منہ بنا کر چپ ہو گئی۔

"دیکھو رومی اگر تم نے میرے سوالات کے جواب سنجیدگی سے نہ دیئے تو میں ہمیشہ کے لیے تم سے ہر تعلق توڑ دوں گی۔"

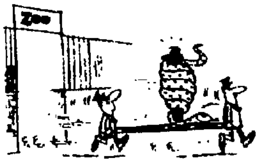
میری دھمکی کا حسبِ خواہ اثر ہوا اور وہ خاصی معقولیت سے بولی:

"ارے بابا خفا کیوں ہوتی ہو۔ میں تو خود سے انجکشن لینے آ رہی تھی۔ چند دن سے حرارت ہے۔" پھر بڑی شرافت سے میرے سوالات کے جواب دیتی رہی۔ میں نے سرنج میں اس کا خون لے کر ٹیسٹ کے لیے بھیجا۔ پھر دھڑکتے دل سے اسے لے کر ایکسرے لیبارٹری میں آ گئی۔ اس نے بڑی بے فکری سے اپنا ایکسرے کرایا اور ہنستی مسکراتی میرے گھر چلی آئی۔ میرا دل اندر سے ہولے ہولے پھٹ رہا تھا مگر وہ مسکرا کے جا رہی تھی۔ جاتے جاتے ہنس کر بولی۔ "دیکھو بیٹا! میرا ایکسرے بالکل صاف آئے گا۔ ویسے مجھے رپورٹ ضرور دینا۔"

اسی شام کی بات ہے۔ میں ڈاکٹر اور اس کی بیوی بیرونی برآمدے میں بیٹھے کافی پی رہے تھے تو چپراسی نے آ کر بتایا کہ آپ کو ڈاکٹر رحمان بلا رہے ہیں۔

میں ایکسرے لیبارٹری پہنچی تو ڈاکٹر رحمان ٹیبل لیمپ کی روشنی میں کوئی ایکسرے پرنٹ اسٹڈی کر رہے تھے۔ مجھے قریب پا کر انہوں نے خاموشی سے ایکسرے پلیٹ پر پرنٹ فکس کر کے بٹن دبایا اور مجھے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ میں جھک کر چیک کرنے لگی۔ یہ کسی کے پھیپھڑوں کا ایکسرے تھا اور دائیں پھیپھڑے کا خاصا حصہ اپنے موذی مرض کی نشاندہی کر رہا تھا۔ میں نے پلٹ کر سوالیہ نظروں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔ تب میری نگاہ میز پر رکھے ایکسرے کے لفافے پر پڑی۔ RESULT SHEET پر باقاعدہ رومی کا نام اور ADDRESS بھی لکھا تھا۔

یکبارگی میرا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرے چھا گئے۔ اور میں سر تھام کر وہیں کرسی پر ڈھے گئی۔ ایک ناقابلِ یقین حقیقت۔۔۔ چڑیلوں کی طرح بال بکھرائے کھڑی دھمکا رہی تھی۔



★ ★

"ڈاکٹر یہ سب کیا ہے؟" مجھے اپنی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔ ڈاکٹر رحمان بھی تاسف سے ہاتھ مل رہے تھے۔ انہوں نے ہمدردی سے مجھے دیکھا اور ایکسرے پرنٹ لفافے میں بند کرتے ہوئے بولے:

"جو کچھ بھی ہے تمہارے سامنے ہے بیٹا۔ اب تو کسی شبہے کی گنجائش نہیں رہی۔۔۔"

"نہیں نہیں۔۔۔" میں دیوانگی کے عالم میں چلا اٹھی۔ "یہ رومی کا ایکسرے پرنٹ نہیں ہو سکتا۔"

ڈاکٹر نے شفقت سے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور تشفی آمیز لہجے میں بولے:

"حوصلہ رکھو بیٹا! رومی مجھے بھی کم عزیز نہیں ہے۔ لیکن ایسی کوئی تشویشناک بات نہیں ہے۔ تم بھی جانتی ہو کہ یہ ہمارے لیے معمولی نوعیت کا کیس ہے۔ اس پر قابو پالینا ناممکن نہیں۔ ابھی تو شروعات ہی ہیں جسے محنت اور ہمت سے ختم کیا جا سکتا ہے۔"

ان کی ہمدردانہ گفتگو نے اور بھی ستم ڈھایا۔ میرے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے اور میں ان کے ہاتھ تھام کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ میں اپنی زندگی میں پہلی بار یوں زار و قطار رو رہی تھی جیسے کسی عزیز سے بچھڑ گئی ہوں۔ ان چند لمحات میں مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے اپنے جسم کا کوئی حصہ ٹوٹ پھوٹ کر مفلوج ہو گیا ہو اور مجھے شدت سے احساس ہوا کہ دلی تعلقات اور قلبی رشتے انسان کو کہیں کا نہیں رکھتے۔ اور ان کے متعلق جب کسی قسم کا شک پہنچتا ہے تو پھر انسان کو شدتِ کرب سے نہ اپنی ظاہری پوزیشن کا خیال رہ جاتا ہے نہ دنیاداری کا۔ کچھ کھو دینے کا کربناک احساس ہوتا ہے آنسوؤں اور اشکوں کا ایک منہ زور ریلا جس میں دنیا سے ملنساری اور احتیاط کا ہر خیال خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتا ہے۔ بالکل یہی کیفیت اس وقت میری تھی۔ ہاں! جو اپنے ہم پیشہ افراد سے طریقہ ہوتا پسند نہ کرتی تھی، اس وقت اپنے عملے کے ہر ایک فرد کے سامنے بھی ننھی بچی کی طرح بلک بلک کر رو رہی تھی۔ اب تک میں نے خود کو اس فریب میں مبتلا کر رکھا تھا کہ رومی کے لیے میرا تجزیہ و شبہ غلط اور بے بنیاد ہے۔ مگر آج مزید کسی طرح کے شک و شبہ کی گنجائش

باقی نہ رہی تھی۔

اس رات مجھے دل کی غلطی اور اپنے خیال پر شدید حیرت ہوئی، مضطرب ہو کر میں بہت دیر تک ہسپتال کے لان میں گھاس پر ٹہلتی رہی۔ رات کی تاریکی، سرد ہواؤں کے نرم جھونکے اور ہر لمحہ بڑھنے والی خاموشی مجھے کچھ اداس کر رہا تھا۔ ایک موہنی کا معصوم پیکر تھا جو ہر وقت نگاہوں میں جلوہ نما تھا۔ باقی دنیا میں بسنے والے کسی چہرے اور نگاہ کی کوئی خبر نہ تھی جب اندھیروں کی پہلی سرمئی شیڈوں کی آنکھوں میں آخری تاریکی کا اندھیرا چھٹا اور چاند کا چہرہ ابھرا تو مجھے حال کا احساس ہوا۔ ایسے وقت کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ ہر جانب ایک سہما ہوا سناٹا اور گھمبیر تنہائی کا عالم طاری تھا۔ سرد ہوا کے جھونکے سبزے کی بانہوں سے لپٹ لپٹ کر جیسے آہ و زاری کر رہے ہوں۔

میں اپنے کمرے میں آئی تو سخت سردی کا احساس ہوا۔ سر میں درد کی شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ تمام رات کروٹیں بدلتے گزری۔ صبح مجھے معلوم ہوا کہ شدید نزلے کی شکار ہو چکی ہوں۔ ... ہلکا ہلکا بخار بھی ہو رہا تھا۔

بھابی کی درخواست پر اگرچہ سارا دن بستر میں آرام کیا لیکن بہ جاری پروسے گزارے۔ آتش دان میں دہکتے انگاروں پر نظر جمائے کمبل اوڑھے پڑی رہی۔ دو دنوں میں تھکاوٹ اور کسلمندی کی وجہ سے ... نیند ہو گیا۔ رات کو سعیدہ لائق فون کیا کہ موہنی نے پلٹ کر کوئی خبر نہ لی تھی ... معلوم ہوا دو تین روز سے سلی جہانداد کے ... میں نے کال ... کی تو دل ہی دل میں اس سے ... یہ صد ہا سال کی ... موہنی پر صحیح صورت حال کا انکشاف ہوتا۔

دوسرے روز میں ڈیوٹی پر گئی تو ڈاکٹروں سے مشورہ کیا۔ سب نے موہنی پر حقیقت ظاہر کر دینے کی رائے دی۔ سوائے اس کے کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ قدرت کے ستم پر تعجب ہوتا تھا کہ ارباب صمدانی اس مرض سے صحت یاب ہوا تو موہنی گرفتار ہو گئی جس کے متعلق میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی مگر قدرت بھی خوب ہے! کیسے کیسے خوفناک المیوں کے بعد بھی صبر کی خیرات ستم خوردہ انسان کی جھولی میں ڈال دیتا ہے۔ دل بہلانے کو میرے پاس بھی یہ معقول جواز موجود تھا کہ موہنی کے مرض کا توڑ ہمارے پاس ہے۔ پھر سب سے بڑھ کر... ارباب صمدانی کا وجود۔ اب اس کی چاہت اور پیار کو بھی دیکھنا اور آزمانا تھا، جو موہنی نے کیا تھا۔

اس دن سویرے سویرے خلاف معمول برف باری ہوئی تھی اس لیے ٹھنڈ میں بھی شدت کا اضافہ ہو گیا تھا۔ سرد ہوا فضا میں بھر رہی تھی۔ سورج نکلنے کے کوئی آثار نہ تھے۔ تیز بارش تھم کر ہلکی پھوار میں تبدیل ہو گئی تھی۔ ... ڈیوٹی کے لیے تیار ہو رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

"ہیلو!" میں نے ریسیور کان سے لگایا۔

"بیٹا فوراً کے لیے جلدی پہنچو۔ میں سخت مشکل میں ہوں۔ موہنی کی گھبرائی

ایک

شخص نے ولی ہونے کا دعویٰ کیا۔ لوگوں نے اس سے پوچھا: "آپ کس طرح دعویٰ کرتے ہیں کہ آپ ولی ہیں؟" اس نے جواب دیا: "میں درخت اور پتھر کو بلاؤں تو وہ میرے پاس چلا آئے گا۔" اتفاق سے سامنے ہی شاہ بلوط کا ایک درخت تھا۔ لوگوں نے کہا: "اسے اشارہ کیجیے کہ آپ کے پاس چلا آئے۔" اس شخص نے تین دفعہ اپنے مخصوص لہجے میں آواز دی اور درخت کو اپنے پاس بلایا مگر اس کا پتا بھی اپنی جگہ سے نہ ہل سکا۔ اس کے بعد وہ شخص نہایت اطمینان کے ساتھ خود درخت کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔

لوگوں نے کہا: "یہ درخت تو آپ کے پاس نہیں آیا، خود آپ اس کے پاس کیوں چلے گئے؟"

کہنے لگا: "ولیوں میں غرور نہیں ہوتا، جب درخت میرے پاس نہیں آیا تو میں فوراً ہی اس کے پاس چلا گیا۔"

ہوئی آواز ابھری اور ساتھ ہی فون بے جان ہو گیا۔ میرے ذہن پر بدلتے ہوئے ... سمجھ گئی شیفالی کا نام ہو چکا تھا۔ مگر میں نے پہلی مرتبہ اپنے فرض سے کوتاہی برتی اور ڈاکٹر اشرف کی پکار کو نظر انداز کر کے اٹھی۔ سعیدہ لاج پہنچی تو ... کہیں اور ... کہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا آنٹی گھر پر نہیں ہیں۔ میں سیدھی موہنی کے کمرے میں گھستی چلی گئی۔ وہ مسہری پر بے دم پڑی تھی اور آنکھیں چھت کی طرف لگی تھیں۔ اس نے مجھے دیکھ کر ہاتھ سے باتھ روم کی طرف اشارہ کیا اور لرزتی ہوئی دھیمی آواز میں بولی:

"میرے... یہ دوسری قے ہے بیٹا۔"

میں نے دیکھا باتھ روم کے چکنے فرش پر جا بجا سرخ خون پھیلا ہوا تھا... یہ میری موہنی کے دل کا خون تھا۔ اس کے ہر دم مسکراتے چمکتے ہونٹوں سے نکلنے والا خون۔ میری روح تک کانپ اٹھی۔ مجھے حد سے تڑپ پاکر اس کے سوکھے ہونٹ ٹوٹ گئے اور وہ تکیے میں منہ چھپا کر بلک بلک کر رو پڑی۔

اس روز وہ میرے ساتھ ہی بین وارڈ میں ایک مریضہ کی حیثیت سے داخل ہوئی۔

سعیدہ آنٹی کو اطلاع دے کر میری اور دیگر ڈاکٹروں کی تمام تر توجہ اسی کی طرف مرکوز ہو گئی۔ نئے سرے سے ایکسرے لیے گئے۔ خون اور تھوک کے ٹیسٹ ہوئے اور پوری تندہی سے علاج شروع ہو گیا۔ اس ایک قے کے بعد دوسری قے نہ ہوئی اور یہ ایک قابل اطمینان امر تھا۔

اگلے دس دنوں میں نے ہر طرح تمام مقام پر ... کوشش کی کہ ...

ایک صبح میں ایک مریض کو انجکشن دے رہی تھی تو نرس نے بتایا کہ روم نمبر ۱۰ میں مومی آپ کو بلا رہی ہے۔ میں اس کے پاس پہنچی تو وہ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی، چہرے پر تھکاوٹ کے آثار تھے اور نقوش میں کچھ الجھی سی افسردگی رچی تھی، مجھے دیکھتے ہی بولی،

"مینا فون کر کے معلوم کرو کہ بوبی وہاں موجود ہے؟" پھر اس نے مجھے کلی جہاندار کا فون نمبر بتایا مگر وہ موجود نہیں تھا۔ آج مومی زیادہ ہی مضطرب اور آزردہ ہو رہی تھی۔ اس کا اداس موڈ دیکھ کر میں نے دوسرے وارڈ میں اپنی چیکنگ ڈیوٹیز منسوخ کروائیں اور اس کے پاس آ بیٹھی اور ادھر ادھر کی باتوں سے اسے بہلانے کی کوشش کرتی رہی۔

دوسری صبح میں مومی کا ٹمپریچر ریکارڈ کر رہی تھی کہ ارباب عمرانی کمرے میں داخل ہوا۔ سفید پینٹ اور میرون کلر جرسی میں بڑا اسمارٹ اور دلکش لگ رہا تھا۔ اس کے ہمراہ ایک بے حد صحت مند اور خوبصورت لڑکی بھی تھی۔ اورنج میکسی پر ڈارک گرے کوٹ میں وہ اتنی حسین اور شوخ لگ رہی تھی کہ ایک لمحے کو میں اسے دیکھتی ہی رہ گئی، سردی کی وجہ سے اس کا چہرہ گلابی ہو رہا تھا اور ایک ایپل میں غضب ڈھا رہی تھی۔ ویسے میرا اندازہ تھا کہ اگر اس کی رنگت بے تحاشہ سرخ و سپید نہ ہوتی اور یہ سج دھج اس میں سے خارج کر دی جاتی تو باقی ایک معمولی نقوش والی معمولی سی لڑکی رہ جاتی۔

ان دونوں کو دیکھ کر مومی کے چہرے پر رونق آ گئی اور میرا تعارف کرواتے ہوئے بولی،

"مینا! یہ میری اور بوبی کی مشترکہ دوست کلی جہاندار ہیں۔"

"NICE TO MEET YOU"۔ وہ بڑی ادا سے میرا ہاتھ چھو کر رسمی انداز میں بولی۔ کچھ رک کر میں باہر آ گئی۔ ارباب کے آنے سے مجھے بڑی تقویت ملی تھی اور دل کو سہارا ہو گیا تھا۔ اس کی توجہ اور بھرپور پیار سے مومی جلد صحتیاب ہو سکتی تھی۔ میں آج تنہائی میں اسے اچھی طرح اونچ نیچ سمجھانا چاہتی تھی۔

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد دوبارہ میں مومی کے کمرے میں پہنچی تو حیران رہ گئی۔ وہ دونوں جا چکے تھے اور مومی کھڑکی کی طرف منہ کئے لیٹی تھی۔

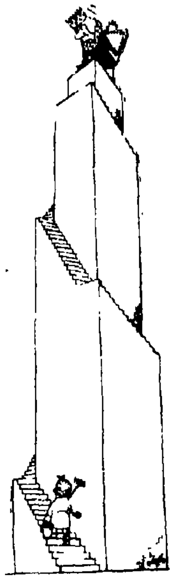
"بوبی گیا؟"

"ہاں!" اس نے دیکھے بغیر مختصر سا جواب دیا۔

"مجھ سے مل کر کیوں نہیں گیا۔ کچھ کہتا تھا تم سے؟" میں نے بے چین ہو کر پوچھا۔

وہ منہ موڑے موڑے تھکے تھکے سے بولی "خدا کے لئے اس وقت پریشان نہ کرو۔ مجھے سونے دو۔"

اس کا موڈ دیکھ کر میں باہر آ گئی۔ پھر کچھ ایسی مصروف ہوئی کہ اس کی طرف جا ہی نہ سکی۔ شام کے وقت نرس نے اس کا بلاوا دیا۔ جا کر دیکھو وہ بیڈ پر بیٹھی کھڑکی سے نیچے دیکھ رہی۔ مجھے دیکھ کر پھیکے سے انداز میں مسکرائی میری توقع کے خلاف آج وہ گزشتہ دنوں کی نسبت زیادہ نڈھال اور زرد لگ رہی تھی۔ آنکھوں کے گرد پڑے سیاہ حلقے اس بات کے گواہ تھے کہ وہ سارا دن سونے کے بجائے کچھ سوچتی رہی ہے۔ مجھے گھبراہٹ ہونے لگی۔ میرا اگر خیال تھا کہ آج رات ارباب کے آ جانے سے اس پر خوشگوار اثر پڑے گا۔ اور میں بہت جلد پہلے کی مومی کو پا سکوں گی لیکن یہ سب میری امید کے قطعی برعکس تھا۔



کوئی بات کرو نا موری! اتنی خاموش کیوں ہو۔ کچھ تو منہ سے کہو۔

ہر کیا محسوس کر رہی ہو؟ میں نے بیقراری سے اس کا ننھا سا سرد ہاتھ تھام کر پوچھا۔ اس نے نگاہ اٹھا کر شاکی نظروں سے دیکھا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس سدا بہار آنکھوں کی خوشیاں دم توڑ گئی ہوں۔ خشک ساحلوں سے آنکھوں کی سرحد ملتے ہی سمندر کی سیاہیوں سے بجلی سی کوندی اور اشکوں کی برات اتر آئی۔ میں احتیاط کر با لائے طاق رکھ کر میں لپکی اور بے اختیار اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ احباب کے لئے ہر وقت قہقہے بکھیرنے والی آج خود بھی ہمیشہ چاہل بن گئی تھی۔ واقعی محبت اندھی ہوتی ہے۔ میں جانتی تھی کہ اس جیسے نازک حساسات کے لئے ہماری کا معمولی سا اظہار بھی ستم گر ثابت ہو گا۔ اس کے اشک میرا دامن بھگو تے رہے اور لمحات صدیاں بن کر گزرتے رہے۔

دیر بعد دل کا غبار دھلا آنکھوں کی برات تھمی تو اس کی آنکھیں شدت گریہ سے اتنی متورم ہو چکی تھیں کہ کھولنا محال تھا۔

"میں کب تک ٹھیک ہو جاؤں گی بیا؟" اس نے بھیگی آواز میں پہلا سوال کیا۔

"انشاء اللہ بہت جلد۔"

میں نے نرمی سے تسلی دی۔ "مرض کی نوعیت تو بہت معمولی ہے اور یہاں سے تو اب جیسے مریض بھی صحت یاب ہو کر ہی گئے۔"

"اب! اب" وہ سلوبدل کر بڑبڑائی۔

"میری بیماری بہت قابل نفرت ہے بیا! میں کیسے ٹھیک ہوں گی۔ یہ لوگ تو مجھ سے خائف رہنے لگے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ میں ایک خطرناک مریض ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب کوئی مجھ کو قریب نہ آنے دے گا ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن ۔ ۔ ۔" اس نے ایک ہاتھ سینے پر رکھ کر دوسرے سے مضبوطی کے ساتھ میرا ہاتھ پکڑ لیا اور منت کر بولی۔

"میں ابھی مرنا نہیں چاہتی بیا ۔ ۔ ۔ مجھے بچاؤ ۔ ۔ ۔ میں جینا چاہتی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔"

اس کے سارے جسم کی توانائی جیسے آنکھوں میں سمٹ آئی تھی۔ اس کو بے ہوش ہو جانے والی پوزیشن سے بیٹھی ہوتی دیکھ کر ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔ اسے سنبھالتے ہوئے میں نے ڈیوٹی نرس کو اشارہ کیا۔

چند لمحوں میں ڈاکٹر رحمان اپنے قابل عملے کے ساتھ آ پہنچے۔ وہ بری طرح تڑپ رہی تھی اور دونوں ہاتھوں سے سینے پر گھٹے مار رہی تھی۔ تکلیف کی شدت سے ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی تھیں۔ آنکھیں حلقوں سے ابلی پڑ رہی تھیں۔ ڈاکٹر رحمان انجکشن لگا چکے تھے مگر کوئی افاقہ نہ ہوا ۔ وہ پوری قوت سے چلائی۔

"میں مرنا نہیں چاہتی ۔ ۔ ۔ مجھے بچاؤ ڈاکٹر ۔ ۔ ۔ مجھے زندگی چاہیے ۔ ۔ ۔ ۔"

پھر میرا دامن پکڑ لیا۔

"مجھے بچاؤ ڈاکٹر ۔ ۔ ۔ مجھے بچاؤ بیا ۔ ۔ ۔ بابی کہتا تھا تم ۔ ۔ ۔ خطرناک ۔ ۔ ۔ مریض ہو ۔ ۔ ۔ وہ ہل ۔ ۔ ۔ سلمٰی سے شادی کر ۔ ۔ ۔ لے گا ۔ ۔ ۔ تم ۔ ۔ ۔ تم مجھے بچاؤ ۔ ۔ ۔ میں اسے منا لوں ۔ ۔ گی ۔ ۔ میں اس کے لئے جینا ۔ ۔ ۔ چاہتی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ وہ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ ۔ ۔ ۔ مجھے ہیں ۔ ۔ ۔ میں ۔ ۔ ۔ منا ۔ ۔ ۔ مجھے بچاؤ ۔ ۔ ۔ بیگ ۔ ۔ ۔ بچاؤ ۔ بی تنں ۔ ۔ ۔" موت کی بھیانک ہچکی نے اس کی فریاد پوری نہ ہونے دی۔

کہ کیسی ناقابل یقین ۔ ۔ ۔ ستمگر! ۔ ۔ ظالم گھڑیاں تھیں میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا تھا۔ میری دوست ۔ ۔ ۔ میری ہمدم ۔ ۔ ۔ میری ساتھی ۔ ۔ ۔ میری رفیق نے میرے ہاتھوں میں دم توڑ دیا تھا ۔ ۔ ۔ احباب تو اس کی منزل نہ بن سکا تھا —— وہ اپنی حقیقی منزل کو پرواز کر گئی تھی۔

اداس شام پر کہر کا دھندلکا خوابوں کی مانند پھیلتا جا رہا تھا —— سورج بوڑھے چناروں کی اوٹ میں ہر لمحہ غروب ہوتا جا رہا تھا اور دیودار کی بلند چوٹیوں سے بوجھل جھونکے سر ٹکراتے گزر رہے تھے اور جب پل کے نیچے بہتی شوریدہ سر لہروں کے سر گم میں ہم پہلے چاند کا کھوڑا اتھا تو سب مل کر موری کو اس کی آخری آرام گاہ میں پہنچا آئے پاس پرانے قبرستان کے ایک کونے میں جہاں زرد چنبیلی سر نہوڑائے رو رہی تھی۔

تحیر خیز ماڈرن رومانی ناول

— قسط نمبر (۸) —

ڈاکٹر کامران مقامی کالج میں فلسفے کا پروفیسر تھا۔ وہ بے حد وجیہہ اور دلکش تھا۔ لڑکیوں کے لیے اس میں ایک خاص کشش تھی۔ مگر وہ خود لڑکیوں کی طرف مطلق توجہ نہیں کرتا تھا۔ لڑکیوں میں وہ خوددار اور خود پسند مشہور تھا۔ اسی کالج کی دو لڑکیاں شہناز اور زبیدہ ہر اعتبار سے حسین اور ہمدرد بھی تھیں۔ ڈاکٹر کامران میں دلچسپی رکھتی تھیں۔ مگر شہناز ان سب سے آگے تھی۔ ڈاکٹر کامران اور شکنی کے باوجود وہ اس سے ملنے جایا کرتی تھی۔ پھر ایک دن ڈاکٹر کامران نے پراسرار انداز میں ایک تقریر شہناز کو ... ڈاکٹر کامران سے ملنے کے لیے گیا تھا۔ وہ ڈاکٹر کامران کی طرح رہی تھی کہ ایک نازک ... ہو گیا۔ ... اس واقعے سے لڑکیاں ... رہ گئی تھی۔ وہ سوال کرتی تھی ... کشش باقی تھی۔ اس صورت حال سے وہ سب واپس ہو گئیں۔ دوسرے دن شہناز ضروری تیاریوں کے بعد ڈاکٹر کامران سے ملنے پہنچی۔

دروازہ خود ڈاکٹر کامران نے کھولا۔ وہ اس وقت ایک اخبار نویس سے مصروف گفتگو تھا۔ اخبار نویس رخصت ہو گیا تو ڈاکٹر کامران نے شہناز کی طرف توجہ کی۔ باتوں کا سلسلہ چل نکلا اور شہناز ڈاکٹر کامران سے مسحور ہوتی رہی۔ پھر اچانک ڈاکٹر کامران نے کہا کہ شہناز کو چونکا دیا کہ وہ کچھ عرصے کے لیے اسے فرضی بیوی بنانا چاہتا ہے۔ شہناز پریشان ہو گئی مگر ڈاکٹر کامران سے اس قدر متاثر تھی کہ آمادگی ظاہر کر دی۔ دوسرے دن ملاقات کا وعدہ کر کے زبیدہ کے گھر واپس آئی تو فون پر ایک اجنبی کا پیغام ملا۔ وہ ... کہ ڈاکٹر کامران ... نہیں جانے گا اور مرنے کے بعد بھی ... شہناز اس دھمکی پر ... اس نے اپنے طور پر ... کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ ... ساتھ ہی اس پر خوف بڑی طرح طاری ہو گیا۔ ... ڈاکٹر کامران سے ملنے اس کے گھر پہنچی۔ باتوں باتوں میں ڈاکٹر کامران نے بتایا کہ اس کا باپ ... بیماری کے سبب ... بستر پر ہے۔ عنقریب کچھ عرصے کے لیے یہاں آ رہا ہے۔ وہ ڈاکٹر کامران کی شادی کی شدید خواہش رکھتا ہے۔ ڈاکٹر کامران نے اسے ... لکھ دیا تھا کہ اس نے حال ہی میں شادی کر لی ہے۔ اب اس کا باپ بیٹے سے ملنے آ رہا تھا۔ چونکہ ڈاکٹر کامران نہیں چاہتا تھا کہ اس کا جھوٹ کھلے اور اس کے باپ کو دکھ پہنچے اس لیے اس نے شہناز سے فرضی بیوی بننے کی درخواست کی تھی۔ شہناز کو ڈاکٹر کامران کی یہ بات بڑی عجیب سی لگی مگر اس نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ ڈاکٹر کامران سے مل کر زبیدہ کے گھر آئی تو دروازہ مقفل تھا۔ شہناز نے اضافی چابی ... دروازہ کھولا اور اندر آ کر اپنے لیے رات کا کھانا تیار کرنے لگی۔ اس وقت باہر اندھیرا گہرا ہو رہا تھا۔ شہناز نے سوچا کہ لڑکیاں واپس آ گئی ہیں۔ اس نے جا کر دروازہ کھولا اور سامنے دیکھا تو مارے خوف کے اس کی چیخ نکل پڑی اور وہ چکرا کر گر گئی۔ اس کے سامنے کفن میں لپٹی ہوئی ایک لاش کھڑی تھی۔ پھر وہ لاش اس کے وجود کو پھلانگتی ہوئی مکان میں داخل ہو گئی۔

لڑکیاں واپس آئیں تو شہناز کو ہوش آ چکا تھا۔ طبیعت سنبھلی تو شہناز کو یاد آیا کہ وہ شے جسے وہ لاش سمجھ رہی تھی دراصل لاش نہیں تھی بلکہ کوئی ہوتا تھا اس نے جسم کے گرد سفید چادر لپیٹ رکھی تھی۔ لڑکیوں کے پوچھنے پر شہناز نے بتایا کہ ڈاکٹر کچھ عرصے کے لیے اسے اپنی فرضی بیوی بنانا چاہتا ہے اور وہ یہ محض اپنے بوڑھے بیمار باپ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کر رہا ہے جو کہ عنقریب لندن سے آنے والا ہے۔ اگلی صبح شہناز کو فون پر ایک اجنبی کا پیغام موصول ہوا۔ اجنبی اس سے ... ملاقات کرنا چاہتا تھا۔ شہناز ... اس سے ملنے پہنچ گئی۔ اجنبی ... ڈاکٹر کامران ... بہت خراب ہے ...



قمر الاسلام عثمانی



اس کا چہرہ سفید پڑ رہا تھا۔ زبیدہ کے گھر پر سے ملنے پہنچی تو ملاقات کی تو اس سے پوچھا گیا کہ شہناز نے بغیر اس کے کسی سے کچھ بیان کیے پہنچی تو ان پر شادی جیسی کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس حالت میں ایک بار اسے بستر پر لٹا دیا گیا۔ مگر اس وقت جب ان کے درمیان تھی تو اچانک گھر والوں کو گھبرا کر جلدی کرنے پر وحشت ناک خبر ملی کہ گھر پر نہیں ہے اور زبیدہ کے گھر گئی ہے۔ اس اطلاع نے سب کو پریشان کر دیا اور سب سوچنے لگے کہ آخر جا کہاں سکتی دن سے شدہ پروگرام کے مطابق شہناز ڈاکٹر کامران کے گھر گئی۔ اس رات ڈاکٹر کامران کا باپ لندن سے آنے والا تھا۔ ڈاکٹر کامران اپنے باپ کو ائیرپورٹ سے لے کر آیا تو شہناز نے اس بوڑھے شخص کو قریب سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی چمک تھی۔ شہناز کو ایک خیال آیا کہ کہیں وہ کسی مصیبت میں تو نہیں پھنسنے جا رہی۔ ہو سکتا ہے یہ بوڑھا ڈاکٹر کامران کا باپ نہ ہو بلکہ کوئی فراڈ ہو۔ یہ خیال آتے ہی شہناز پر خوف طاری ہو گیا اور اس کی حالت غیر ہو گئی۔

مگر بعد کے واقعات نے بتایا کہ وہ بوڑھا شخص ڈاکٹر کامران کا باپ ہی تھا۔ شہناز کے لیے وہ بہت مہربان اور مشفق ثابت ہوا۔ اس نے شہناز کو واقعی بیٹی سے کہیں زیادہ بڑھ کر محبت دی۔ ڈاکٹر کامران نے باپ کو ہوٹل میں ٹھہرایا اور وعدہ کیا کہ اگلے دن رات کا کھانا وہ کسی ریستوراں میں کھائیں گے۔ شہناز زبیدہ کے گھر واپس آئی تو اس وقت تک ہما واپس آ چکی تھی۔ ہما کی حالت بہت خراب تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کا ایک عاشق رضا جانے کیا بنا کر اسے اپنے گھر لے گیا تھا اور بیہوش کر کے اغوا کر دیا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ بری طرح زدوکوب بھی کیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ ہما کسی دوسری جگہ شادی کرنے کے خیال سے باز آ جائے اور اس سے شادی کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ ہما بہت دل برداشتہ تھی۔ اس نے اپنے منگیتر سے منگنی توڑنے کا ارادہ ظاہر کیا اور کہا کہ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے وہ اس کا انتقام دوسرے مردوں سے لے گی اور سب سے پہلا شکار ڈاکٹر کامران ہوگا۔ دوسرے دن شہناز ڈاکٹر کامران کے گھر پہنچی اور ان سے وہ دونوں ہوٹل روانہ ہو گئے۔ رات کا کھانا ڈاکٹر کامران اس کے باپ اور شہناز نے ایک ریستوراں میں کھایا۔ کھانا جاری تھا کہ کسی نے عقب سے ڈاکٹر کامران کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ڈاکٹر کامران نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ اچانک ہی اس کا چہرہ سفید پڑ گیا اور چمچہ ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑا۔

وہ شخص ڈاکٹر کامران ہی کے کالج میں انگریزی ادبیات کا پروفیسر تھا۔ ڈاکٹر کامران اس سے بہت بداخلاقی سے پیش آیا۔ پروفیسر چلا گیا تو وہ لوگ بھی ریستوراں سے باہر نکل آئے۔ اگلے دن کے لئے طے پایا کہ رات کا کھانا ڈاکٹر کامران اور اس کا باپ گھر پر کھائیں گے اور شہناز کھانا پکائے گی۔ شہناز نے وعدہ تو کر لیا مگر بعد میں پچھتانے لگی کہ ناحق وعدہ کیا۔ وجہ یہ تھی کہ اسے کھانا پکانا نہیں آتا تھا مگر اس نے یہ مسئلہ زبیدہ کے سامنے رکھا۔ زبیدہ اس کی مدد پر آمادہ ہو گئی۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ اگلے دن ڈاکٹر کامران کی آمد سے پہلے اس کے گھر پہنچ جائے گی اور آیا کی مدد سے کھانا تیار کر کے واپس آ جائے گی۔ رات شہناز بستر پر لیٹی تو اس کا ذہن ڈاکٹر کامران کے باپ کی طرف چلا گیا۔ اسے اس بات پر دکھ ہونے لگا کہ وہ اور ڈاکٹر کامران مل کر اس شریف اور بوڑھے انسان کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ اسے یہ خیال بھی ستانے لگا کہ جب ڈاکٹر کامران کا باپ لندن واپس چلا جائے گا تو ڈاکٹر کامران اس سے قطع تعلق کر لے گا۔ شہناز نے طے کیا کہ وہ ڈاکٹر کامران کے باپ سے مل کر اس پر ساری بات کھول دے گی تاکہ وہ سارے حالات سے باخبر ہو جائے اور ممکن ہے اس پر رحم کھاتے ہوئے وہ اپنے بیٹے کو اس سے شادی پر مجبور کرے۔ دوسری صبح شہناز اس غرض سے ڈاکٹر کامران کے باپ سے ملنے ہوٹل پہنچی تو اسے یہ دیکھ کر شدید دھچکا لگا کہ ڈاکٹر کامران وہاں پہلے سے موجود تھا۔ ڈاکٹر کامران نے بالواسطہ طور اس کی بہت بے عزتی کی اور شہناز دل برداشتہ ہو کر واپس آ گئی۔ اس سہ پہر کو اس نے ڈاکٹر کامران اور اس کے باپ کے لئے زبیدہ اور آیا کی مدد سے بہترین کھانے تیار کئے۔ ان لوگوں نے کھانا بے حد پسند کیا۔ پھر رات گئے ڈاکٹر کامران خود شہناز کو زبیدہ کے گھر چھوڑنے گیا۔ دوسری صبح شہناز کو واجد کے دوست کا فون ملا کہ واجد نے خودکشی کی کوشش کی تھی اور اب اس کی حالت بہت نازک ہے۔ چنانچہ وہ فوراً اس کی کلینک پہنچ کر ملے۔ شہناز اور شیریں کچھ پس و پیش کے بعد واجد کے دوست سے ملنے کلینک پہنچ گئیں۔ ان دونوں کی خوف اور دہشت سے بری حالت تھی۔ شہناز نے ایک لمحے توقف کیا اور پھر بند دروازے پر دستک دے دی۔

.. دروازہ کھلا اور دروازہ کھولنے والا واجد کا دوست تھا۔ وہ انہیں واجد کے کمرے میں لے گیا۔ یہاں انکشاف ہوا کہ واجد نے خودکشی نہیں کی تھی، خودکشی کا ڈھونگ رچایا تھا۔ البتہ اس کی حالت بہت خراب تھی۔ اس نے شہناز کو محض اس لئے بلایا تھا کہ وہ جا کر مہر کو اس کی خاطر ہموار کرے۔ ورنہ وہ سچ مچ خودکشی کر لے گا اور اس کی موت کی ذمہ داری مہر اور اس کے دوستوں پر عائد ہوگی۔ شہناز نے واپس جا کر ایک حربہ آزمایا اور مہر واجد سے شادی کرنے پر آمادہ ہو گئی۔ اسی شام ڈاکٹر کامران شہناز سے ملا اور شہناز کو اس رات ڈاکٹر کامران اور اس کے باپ کے ساتھ ہوٹل میں ٹھہرنا پڑا۔ وجہ یہ تھی کہ ڈاکٹر کامران کا باپ اپنی علالت کے سبب اگلی صبح لندن کے لئے روانہ ہو رہا تھا اور اس کی خواہش تھی کہ وہ رات اپنے بیٹے اور بہو کے ساتھ گزارے۔ صبح وہ بوڑھا آدمی لندن روانہ ہو گیا اور شہناز ملول اور دل گرفتہ زبیدہ کے گھر واپس آ گئی۔ یہاں اسے معلوم ہوا کہ واجد اور مہر کی شادی طے پا گئی ہے۔ مگر اس نے واجد کی ہدایت پر سہیلیوں کو شادی میں نہیں پوچھا تھا۔ لڑکیوں کو اس کا بہت دکھ ہوا۔ شرمندہ بھی ہو گئیں۔ اپنے گھر آ کر شہناز نے خود کو اپنے کمرے میں مقید کر لیا۔ یہ سوچ سوچ کر وہ

ذہنی ہوتی جا رہی تھی کہ باپ کے چلے جانے کے بعد اب ڈاکٹر کامران اس سے تعلق ختم کر دے گا۔ یوں بھی ڈاکٹر کامران باپ کے چلے جانے کے بعد ایک ہفتے کی رخصت پر چلا گیا تھا۔ خدا خدا کر کے رخصت کے دن تمام ہوئے۔ جس دن ڈاکٹر کامران کو کالج آنا تھا اس دن شہناز صبح سویرے زبیدہ کے گھر پہنچ گئی۔ وہ دونوں کالج گئیں اور جب کالج کے گھنٹے نے ڈاکٹر کامران کے پیریڈ کے آغاز کا اعلان کیا تو شہناز کا دل بڑی شدت سے دھڑکنے لگا۔ پھر اگلے ہی لمحے ڈاکٹر کامران اپنے مخصوص باوقار انداز میں چلتا ہوا کلاس میں داخل ہوا۔ اس نے بریف کیس میز پر رکھا اور طائرانہ نظروں سے کلاس کا جائزہ لینے لگا۔

ڈاکٹر کامران نے لیکچر کے دوران ایک بار بھی شہناز کی طرف نہیں دیکھا۔ اُسے بالکل نظر انداز کر دیا جیسے وہ اسے جانتا ہی نہیں تھا۔ اس کا شہناز کو ... دُکھ ہوا اور وہ دل برداشتہ ہو کر سیدھی اپنے گھر آ گئی۔ پھر اسے زبیدہ کا فون موصول ہوا کہ پروین کی شادی ہونے والی ہے اور لڑکیاں شادی کی تقریب میں مدعو ہیں۔ شہناز زبیدہ کے گھر پہنچی تو پروین بنفسِ نفیس خود شادی کے کارڈ دینے کے لئے وہاں آئی۔ شہناز نے تجویز پیش کی کہ اس تقریب میں ڈاکٹر کامران کو بھی مدعو کیا جائے اور کارڈ ہما لے کر جائے۔ ہما ڈاکٹر کامران کے گھر سے واپس آئی تو اس نے ایک عجیب انکشاف کیا۔ اس نے بتایا کہ اس نے ڈاکٹر کامران کے گھر پر مشہور فلم سٹار فروزاں کو دیکھا تھا اور ڈاکٹر کامران اس سے بہت مرعوب اور متاثر نظر آتا تھا۔ شہناز کے لیے یہ انکشاف ایک دھماکے سے کم نہیں تھا۔ اس نے طے کیا کہ وہ فروزاں سے مل کر ضرور معلوم کرے گی کہ اس کے اور ڈاکٹر کامران کے درمیان کس قسم کے تعلقات ہیں۔ اس نے فلمی صحافی کا روپ بھر کر فروزاں سے ملاقات کا وقت مقرر کر لیا۔ پروین کی شادی کی تقریب میں شمولیت کی غرض سے وہ لڑکیوں کے ساتھ پہنچی تو تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر کامران بھی وہاں آ پہنچا۔ ڈاکٹر کامران پر نظر پڑتے ہی شہناز کی ساری شکایتیں اور کدورتیں دُور ہو گئیں۔

(اب آپ آگے پڑھیے)



شیریں میرے قریب کھڑی تھی میں نے بے اختیار اس کے کندھے کا سہارا لے لیا ایسا نہ کرتی تو یقیناً چکرا کر گر پڑتی۔ ہم لوگ اس امکان پر بحث کرتے آ رہے تھے کہ ڈاکٹر کامران پروین کی شادی میں شرکت کرے گا یا نہیں مگر حتمی طور پر کوئی رائے قائم نہیں کر سکے تھے۔ مگر اب جو یہاں ڈاکٹر کامران کو موجود دیکھا تو عجیب سا لگا۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ ڈاکٹر کامران یہاں بنفسِ نفیس موجود ہے۔ یہ حیرت کی بات تھی کہ ڈاکٹر کامران جیسا متکبر اور مغرور شخص اس تقریب میں شریک ہوا تھا۔ وہ ابھی تک دروازے پر کھڑا تھا اور اپنی سحر کار اور پُرفسوں نظروں سے ماحول کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے اطوار اور کھڑے ہونے کے انداز میں بلا کی کشش تھی۔ وہ یوں بھی وجیہہ ترین تھا مگر اس وقت تو غضب ڈھا رہا تھا۔ وہاں موجود عورتیں شاید ہی جانتی ہوں کہ اس وجیہہ اور پُرکشش چہرے کے پیچھے کس قدر ہلاکت آفرینی ہے۔ اس خوبصورت چہرے کے پیچھے عورتوں کے لئے شدید اذیتیں تھیں۔ عورتیں اس باوقار اور وجیہہ چہرے کے دام میں پھنس کر خود کو عذاب میں مبتلا کر لیتی تھیں۔ ڈاکٹر کامران کی شخصیت اس آدم خور پودے کی مانند تھی جو کہ بہت خوشنما اور دیدہ زیب ہوتا ہے مگر جونہی کوئی تتلی اس پر بیٹھتی ہے فوراً موت سے ہمکنار ہو جاتی ہے ——— تو یہ تھا ڈاکٹر کامران! اور میں نے اس کے متعلق جو رائے قائم کی تھی وہ میرا قیاس نہیں تھا بلکہ میں نے ذاتی تجربے کے حوالے سے یہ بات کہی تھی۔

ہم کافی دیر تک اپنی جگہ بیٹھے سحر زدہ انداز میں ڈاکٹر کامران کو دیکھتے رہے۔ جہاں وہ کھڑا تھا وہاں سے ہم تک خاصا فاصلہ تھا اور درمیان میں عورتوں اور مردوں کے مختلف گروہ کھڑے ہوئے تھے۔ بیشتر عورتوں کی نظریں بھی ڈاکٹر کامران کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ ایک گداز جسم کی ادھیڑ عمر عورت نے جو کہ ہمارے قریب ہی کھڑی ہوئی تھی اپنے ساتھ کھڑی ہوئی عورت کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "ثریا! یہ شخص کس قدر خوبصورت ہے بالکل فلم سٹار معلوم ہوتا ہے۔ آخر یہ ہے کون۔ تم نے پہلے کبھی دیکھا ہے؟"

"میں نے اس قدر خوبصورت اور پرکشش آدمی زندگی میں پہلی بار دیکھا ہے۔ معلوم نہیں کون ہے۔ اس کے ساتھ

کوئی نہیں ہے۔ شاید تنہا ہی آیا ہے۔ میرا خیال ہے دولہا کے دوستوں میں سے ہے۔" دوسری عورت نے جواب دیا۔

ان دونوں کی گفتگو نے ہمیں حیرت سے چونکا دیا۔ زبیدہ نے ایک نظر مجھ پر ڈالی کچھ دیر سوچتی رہی پھر ہما کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ "ہما! تم ڈاکٹر کامران کے پاس جاؤ۔ اپنا تعارف کراؤ اور اسے اس طرف لے آؤ۔"

ہما کی آنکھوں میں دلچسپی اور پسندیدگی کی ایک چمک لہرائی۔ اس نے مجھے شرارتی نظروں سے دیکھا اور ڈاکٹر کامران کی طرف روانہ ہوگئی۔ میں، زبیدہ اور شیریں اسے جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ شیریں سر کو جنبش دیتے ہوئے بولی۔ "مجھے یقین نہیں تھا کہ ڈاکٹر کامران پھوپی کی شادی میں شرکت کرے گا۔ مجھے لگ رہا ہے جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہی ہوں۔"

میں نے شیریں کی بات سنی ان سنی کر دی۔ اس وقت میری ساری حسیات آنکھوں میں سمٹ آئی تھیں۔ میری نظریں ہما کے تعاقب میں تھیں اور میں سوچ رہی تھی کہ آخر ڈاکٹر کامران یہاں کیوں آیا ہے۔ محض رسماً اور مروتاً یا مجھ سے ملاقات کے لئے یا اس کے پس پردہ کوئی دوسری بات تھی جس سے کہ میں بے خبر تھی۔

ڈاکٹر کامران ابھی تک اپنی جگہ پہ کھڑا ہال میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑا رہا تھا۔ شاید اسے اپنے کسی شناسا کی تلاش تھی۔ جوں ہی اس نے ہما کو اپنے قریب پہنچتے دیکھا اس کے لبوں پر بڑی خوشگوار مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے فوراً آگے بڑھ کر ہما کا استقبال کیا اور گفتگو میں مصروف ہوگیا۔ میں نے سوچا کہ اب وہ دونوں ادھر آئیں گے مگر ایسا نہیں ہوا۔ کچھ دیر وہ گفتگو کرتے رہے پھر مہمانوں کے درمیان سے راستہ بنا کر دولہا اور دلہن کی سمت روانہ ہوگئے۔ میں نے دور سے دیکھا کہ پھوپی ڈاکٹر کامران کو اپنے قریب دیکھ کر بے ساختہ اچھل پڑی تھی۔ اس کی بوکھلاہٹ قابل دید تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس لمحے کیا کرے۔ ظاہر ہے کہ اسے بھی توقع نہیں تھی کہ ڈاکٹر کامران اس کی شادی کی تقریب میں شرکت کرے گا۔ اس نے کارڈ محض ہما کے کہنے پر بھجوایا تھا اور ڈاکٹر کامران واقعی آپہنچا تھا۔

ڈاکٹر کامران نے دولہا اور دلہن سے ہاتھ ملایا اور کچھ کہا بھی جسے میں فاصلے کے باعث نہ سن سکی۔ مگر ظاہر تھا کہ اس نے مبارکباد دی ہوگی ورنہ ایسے موقع پر دولہا اور دلہن سے اور کیا گفتگو کی جاسکتی تھی۔ دولہا اور دلہن سے رخصت پا کر ڈاکٹر کامران نے ہما کا بازو پکڑا اور ہال کے اس حصے کی طرف روانہ ہوگیا جو کہ جوڑوں کے رقص کے لئے مخصوص کیا گیا تھا۔ ہال میں ایک عمدہ قسم کا سازینہ بج رہا تھا اور ایک خوبصورت دھن پر چند جوڑے رقص میں مصروف تھے۔ رقص کرتے ہوئے جوڑوں کے درمیان پہنچ کر ڈاکٹر کامران نے ہما کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا اور سازینہ کی دھن پر آہستہ آہستہ ہلکورے لینے لگا۔

میں سحر زدہ کی مانند ان دونوں کو تکتی رہی۔ زبیدہ اور شیریں کی حالت بھی مجھ سے مختلف نہیں تھی پھر ہم تینوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا اور ڈانسنگ فلور کی طرف روانہ ہوگئے۔ رقص کرتے ہوئے جوڑوں سے کچھ فاصلے پر جا کر رک گئے اور آنکھیں پھاڑ کر ڈاکٹر کامران اور ہما کو دیکھنے لگے۔ یہ ڈاکٹر کامران آخر تھا کیا۔ جو کھلتا جاتا تھا اور زیادہ پیچیدہ اور پُراسرار ہوتا جاتا تھا میں کبھی سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ وہ اس مجمع میں اپنی ایک شاگرد کے ساتھ رقص کرنے پر آمادہ ہو جائے گا۔ اس کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات ایک ایک کر کے میری نظروں کے سامنے سے گزرنے لگے۔ وہ کس قدر محتاط آدمی تھا۔ باہر نکلتا تھا تو اپنے باپ اور مجھ سے کترا کر جاتا تھا۔ نہیں چاہتا تھا کہ لوگ ہمارے اور اس کے تعلق کو جانیں۔ کلاس میں خود کو بہت محتاط اور لئے دیئے رکھا تھا۔ اسے دیکھ کر یہ تاثر قائم ہوتا تھا کہ شاید اسے صنف نازک سے الرجی ہے۔ مگر اب، یہاں، اس وقت اس نے ساری احتیاط کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ اور مزے مزے میں بے فکر اور بے پروا اپنی ایک شاگرد کے ساتھ رقص کر رہا تھا۔ اس کے ہونٹ ہما کے کان سے چپکے ہوئے تھے اور وہ سرگوشی میں کچھ کہہ رہا تھا۔ بلکہ کہتے ہوئے خاصی دیر ہوگئی تھی۔ ہما بڑے غمزے اور عشوے دکھا رہی تھی اور جواب کے طور پر بڑے ناز کے ساتھ سر کو ہلاتی جاتی تھی۔ خدا جانے وہ کیا گفتگو کر رہے تھے۔ یہ ہم موسیقی اور مہمانوں کی گفتگو کی وجہ سے نہ سن سکے۔

میں نے ڈاکٹر کامران اور ہما کی طرف سے نظریں ہٹا کر اطراف کا جائزہ لیا۔ بہت ساری نگاہیں ان پر بھی جمی ہوئی تھیں۔ زبیدہ اور شیریں بھی محویت کے عالم میں انہیں دیکھ رہی تھیں۔ ہما رقص کرنا جانتی تھی مگر میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر کامران اس سے بہتر انداز میں قدم اٹھا رہا تھا۔ موسیقی کی لے اور تال پر اس کے قدم بڑے نپے تلے انداز میں اٹھ رہے تھے۔ وہاں رقص کرنے والے جوڑوں میں وہ سب سے بہتر اور دلکش جوڑا تھا۔ مگر مجھے اس وقت ان کے رقص کے حسن و فن سے دلچسپی نہیں تھی۔ مجھے تو بس یہ فکر تھی آخر وہ گفتگو کیا کر رہے تھے۔ وہ کون سا ایسا اہم موضوع تھا جس پر وہ تبادلۂ خیال کر رہے تھے۔ زبیدہ بھی شاید وہی کچھ سوچ رہی تھی جو میرے ذہن میں تھا وہ میری طرف مڑتے ہوئے بولی "یہ ہما سے اتنی دیر سے کیا کہہ رہا ہے"

بجائے میرے، شیریں بول پڑی "یہ ہما سے کہہ رہا تھا کہ وہ کچھ عرصے کے لئے اس کی فرضی بیوی بن جائے۔ یہ اسی طرح اپنا کام نکالتا ہے۔ شادی ہوتی رہتی ہے اور خرچ کچھ نہیں ہوتا" وہ تمسخر سے ہنس پڑی۔

"میرے خیال میں تو یہ کسی پراسرار مرض میں مبتلا ہے۔ کوئی نفسیاتی بیماری بھی ہو سکتی ہے۔ یا پھر فلسفے سے حد سے زیادہ دلچسپی نے اس کے دماغ کو بیکار کر دیا ہے" زبیدہ شانے اچکاتے ہوئے لاپروائی سے بولی۔

ڈاکٹر کامران اور ہما کی گفتگو شاید کسی نتیجے پر پہنچ چکی تھی۔ اب وہ کوئی گفتگو نہیں کر رہے تھے ان کے لب ساکت تھے۔ ڈاکٹر کامران نے ہما کو بری طرح بھینچ رکھا تھا اور اپنے ہونٹ اس کے رخسار سے لگا رکھے تھے۔ ہما کی آنکھیں بند تھیں البتہ چہرے سے ایک دبے دبے جوش اور تمتماہٹ کا اظہار ہو رہا تھا۔ یہ منظر مجھ سے نہ دیکھا گیا۔ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ سارے نفرت اور غم وغصے کے میرا جسم کانپنے لگا۔ کیا ڈاکٹر کامران اسی کے لئے یہاں آیا تھا۔ میں نے بڑی مضبوطی سے زبیدہ کو بازو سے پکڑ لیا۔ زبیدہ کے منہ سے بے ساختہ سی، کی آواز نکل گئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو پتہ چلا کہ میرے ناخن بے چاری کے گوشت میں دھنس گئے تھے۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے بازو سے الگ کیا اور نرم اور مہربان لہجے میں بولی "شہناز! ڈاکٹر کامران جیسا ہے اور جو کچھ ہے تمہارے سامنے ہے۔ اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے اور تمہاری خاطر اپنی روش تبدیل کرے گا تو یہ تمہاری زبردست غلطی ہے۔ اب اگر تم نے اس کا پیچھا کیا اور اس کے ساتھ چلنے کی کوشش کی تو تم یقیناً ذہنی مریض ہو جاؤ گی۔ خدا ایسے آدمی سے ہر لڑکی کو محفوظ رکھے" آخر میں زبیدہ کا لہجہ کچھ تلخ ہو گیا تھا۔ اس نے تاسف کے ساتھ مزید کہا "اب مجھے ہما کی خیریت نظر نہیں آتی۔ یہ لڑکی اپنی قبر کھودنے میں ماہر ہے"

"ہما کے بارے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے" شیریں بولی۔ "وہ بہت زمانہ ساز لڑکی ہے اسے تجربے کرنے کی عادت ہے۔ وہ یکے بعد دیگرے مردوں کو آزماتی تھیں۔ کوئی نہ کوئی تو اس کے قابو میں آ ہی جائے گا [illegible] نہ سمجھو بھولی بھالی ہے۔ بالآخر وہ اپنی مرضی کا شوہر تلاش کر لے گی"

شیریں شاید کچھ اور کہتی مگر اسی وقت ساز نے دم توڑ دیا اور اس کے بعد جو دوبارہ بجا تو دھن پہلے کے مقابلے میں بہت تیز اور وحشیانہ تھی۔ بہت سے جوڑے ڈانسنگ فلور سے واپس آنے لگے انہی میں ڈاکٹر کامران اور ہما بھی تھے۔ وہ ہماری ہی طرف آ رہے تھے۔ ہما نے بڑی مضبوطی سے ڈاکٹر کامران کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا اس کی نظر مجھ پر پڑی اور اس کے ساتھ ہی اس کے لبوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ رینگ گئی۔ وہ اور ڈاکٹر کامران ہمارے قریب آئے تو میرا دل بڑی تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اپنے کالج والے رویے کے برعکس اس نے بڑی گرمجوشی اور خوش دلی سے ہم سے علیک سلیک کی۔ وہ مجھ سے اسی انداز میں پیش آیا جس طرح کہ زبیدہ اور شیریں سے پیش آیا۔ کہیں ذرہ برابر گمان نہ ہو سکا کہ میری اور اس کی پہلے سے اچھی خاصی بلکہ بے تکلفانہ اور بے حجابانہ ملاقات ہے۔ اس نے مجھے ایک عام شاگرد کی حیثیت سے ٹریٹ کیا تھا۔ ڈاکٹر کامران کے اس رویے سے مجھے بہت دکھ پہنچا۔ میں اندر ہی اندر کڑھنے لگی۔ ایک دم ٹوٹ کر رہ گئی۔ اسی لمحے مجھے ہما سے بے پناہ نفرت کا احساس ہوا۔ پھر مجھے زبیدہ کی بات

یاد آگئی۔ اس نے کہا تھا کہ ہو سکتا ہے ڈاکٹر کامران کوئی نفسیاتی کیس ہو۔ ورنہ وہ مجھ سے اس قدر بے تکلفی یا اپنائیت کا اظہار نہ کرتا۔ اتنی شاندار اداکاری کوئی صف اوّل کا اداکار ہی کر سکتا تھا اور ڈاکٹر کامران بہر حال اداکار نہیں تھا۔

ڈاکٹر کامران نے ایک بھرپور نظر زبیدہ پر ڈالی اور مسکراتے ہوئے بولا "کیا تم بھی غیر شادی شدہ ہو؟"

زبیدہ جیسی مضبوط عورت شرما گئی۔ حجاب کے ساتھ بولی "نہیں شادی شدہ ہوں۔ میرے شوہر عموماً کاروباری دورے پر رہتے ہیں"

ڈاکٹر کامران نے ایک سرسری نظر شیریں، ہما اور مجھ پر ڈالی اور سپاٹ لہجے میں بولا "دل تو چاہتا تھا کہ تقریب کے اختتام تک یہاں رہوں مگر مجبوری یہ ہے کہ دوسری جگہ بھی مدعو ہوں۔ میں دولہا دلہن کو مبارکباد دینے آیا تھا بے چاروں نے بڑے خلوص کے ساتھ کارڈ بھیجا تھا۔ اس لئے ان کا شکریہ ادا کرنا ضروری تھا"

شیریں پٹ سے بول پڑی "مگر سر! مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے آپ محض ہما کے ساتھ رقص کرنے آئے تھے!"

ڈاکٹر کامران کے چہرے پر شرارت آمیز مسکراہٹ پھیل گئی۔ چہکتے ہوئے بولا "اگر سازینہ وہی دھن دوبارہ بجائے تو میں تمہارے ساتھ بھی رقص کرنے کے لئے تیار ہوں۔ خیر کوئی بات نہیں کبھی کوئی موقع نکل آئے گا"

اس نے مدھم لہجے میں ہمیں خدا حافظ کہا اور دولہا دلہن کی طرف روانہ گیا۔ پروین اور اس کا شوہر ایک دوسرے گوشے میں مہمانوں میں گھرے کھڑے تھے۔ ڈاکٹر کامران ان کے پاس پہنچا، کچھ کہا اور فوراً بیرونی دروازے کی طرف چل دیا۔ جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گیا ہم چاروں محویت کے عالم میں اسے دیکھتے رہے۔ اس کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی سب سے پہلے شیریں نے زبان کھولی "ڈاکٹر کامران مجھے رقص کی دعوت دے گیا ہے۔ جی چاہتا ہے میں بھی تمہاری رقیب بن جاؤں"

میں شیریں کے مذاق کو نظر انداز کرتے ہوئے ہما کی طرف مڑی اور ٹٹولتی ہوئی نظروں سے پوچھا "کیا ڈاکٹر کامران یہاں محض تم سے ملنے کے لئے آیا تھا۔ رقص کے دوران وہ تم سے کیا کہتا رہا تھا؟"

"اچھا کیا جو تم نے یاد دلایا" ہما پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی "میرے خیال میں وہ مجھی سے ملنے یہاں آیا تھا۔ اس نے اصرار کے ساتھ کہا تھا کہ میں اس عورت کے بارے میں کسی کو اور خاص کر تمہیں کچھ نہ بتاؤں جسے میں نے اس کے گھر پر دیکھا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اس قسم کے اتفاقات ہر مرد کی زندگی میں پیش آتے ہیں مگر ضروری نہیں کہ تمام لوگ اس سے واقف ہوں۔ اس نے کہا تھا کہ میں ایک عقلمند اور سمجھدار لڑکی ہوں۔ اس لئے مجھ پر لازم ہے کہ میں اپنے استاد کے راز کو راز ہی رکھوں۔ اور جو کچھ دیکھا ہے یہ سمجھوں کہ کچھ نہیں دیکھا"

زبیدہ حیرت بھرے لہجے میں بولی "خدایا یہ ڈاکٹر کامران کس قسم کا آدمی ہے۔ کسی کروٹ سمجھ میں نہیں آتا"

شیریں نے ہونٹ چباتے ہوئے اضافہ کیا "اور کس قدر احمق ہے کہ ہما سے تاکید کی ہے وہ ہمیں اس عورت کے بارے میں نہ بتائے"

ہما کی بھویں سکڑ گئیں۔ انتہائی ناگواری سے بولی "اگر میں فرزاں کے بارے میں تم لوگوں کو پہلے نہ بتا چکی ہوتی تو وہی کرتی جو ڈاکٹر کامران نے اس وقت اتنی تاخیر سے کہا ہے۔ اب آئندہ سے میں ڈاکٹر کامران کے بارے میں تم لوگوں کو کچھ نہ بتاؤں گی"

ہما نے براہ راست میری طرف دیکھا اور درخواست کے انداز میں بولی "شہناز! میری تم سے التجا ہے کہ تم فرزاں سے ملاقات کا ارادہ ملتوی کر دو اور اگر ملنے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے تو خدا کے لئے ایسی کوئی بات نہ کرنا جس سے کہ فرزاں پر یہ ظاہر ہو جائے کہ تم نے محض ڈاکٹر کامران اور فرزاں کے تعلقات اور ذاتی زندگی کو ٹٹولنے کے لئے اس سے وقت لیا ہے۔ اگر تم نے ایسا کیا تو ڈاکٹر کامران کی نیک نامی اور وقار پر حرف آئے گا۔ بالآخر وہ ہمارا استاد ہے اور ہمیں اس کا احترام کرنا ہی

لیجئے۔ پھر اس کے علاوہ اس میں میری عزت کی بھی بات ہے۔ میں نے قسم کھا کر ڈاکٹر کامران کو یقین دلایا ہے کہ میں نے فروزاں کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتایا ہے اور نہ بتاؤں گی۔"

میرے دل میں ہما کے لئے نفرت کچھ اور بڑھ گئی۔ جی میں آیا کہ اس کا منہ نوچ ڈالوں مگر یہ مناسب نہیں تھا۔ ضبط کر کے رہ گئی۔ میں نے جبراً چہرے پر مسکراہٹ سجائی اور دروغ گوئی سے کام لیتے ہوئے بولی: "ہاں! ہو سکتا ہے کہ میں فروزاں سے ملنے نہ جاؤں۔ اس لئے کہ جہاں تک میں اس ڈاکٹر کامران کو جان سکی ہوں، اس کی زندگی میں فروزاں نہ ہو گی تو اس جیسی کوئی دوسری عورت ہو گی۔ میں کس کس کے پاس جاؤں گی۔ میں نے فروزاں سے ملنے کے بارے میں سوچا تھا وہ میری احمقانہ سوچ تھی۔ اب میں نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔"

زبیدہ بے یقینی سے مجھے دیکھنے لگی۔ البتہ ہما کے چہرے پر مسرت کی سرخی دوڑ گئی۔ سرشاری سے بولی: "ماشاء اللہ شہلا تو واقعی تم بہت ذہین اور سمجھدار لڑکی ہو۔"

میں نے مڑ کر شیریں کی طرف دیکھا وہ ہماری طرف سے بے خبر چند خوش پوش نوجوان لڑکوں کو دیکھنے میں محو تھی۔

میں نے اسی لمحے طے کر لیا کہ فروزاں سے ملنے ضرور جاؤں گی۔ البتہ اس بارے میں لڑکیوں کو کچھ نہ بتاؤں گی۔ میرے حالات کو میرے علاوہ اور کون سمجھ سکتا تھا۔ جانے کیوں لڑکیاں مرد کے معاملے میں اس قدر خود غرض ہو جاتی ہیں کہ وہ دوستی اور برسوں پرانے تعلقات کی بھی پرواہ نہیں کرتیں۔ شاید ہر عورت میں فساد کی کوئی نہ کوئی رگ ضرور موجود ہوتی ہے اور وہ موقع پڑنے پر پھڑک اٹھتی ہے۔

میں نے دوستوں کی محفل سے ہٹ کر غیروں کے درمیان کسی تقریب میں کبھی نشہ آور شراب کو ہاتھ تک نہ لگایا تھا مگر اس وقت ملازم ٹرے میں وہسکی اور جوس کے الگ الگ گلاس لئے آیا تو میں نے بڑھ کر وہسکی کا گلاس اٹھایا اور لمبا گھونٹ لے لیا۔ حلق میں زبردست سوزش ہوئی اور منہ بگڑ کر رہ گیا۔ زبیدہ نے مجھے زور سے کہنی ماری، گھور کر دیکھا اور ڈانٹتے ہوئے بولی: "پاگل ہوئی ہو۔ تمہیں تقریب میں یہ حرکت نہیں کرنی چاہئے۔ لڑکیوں کے لئے یہ اچھی بات نہیں ہے۔"

میں نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا: "استاد کی محبت کو فراموش کر رہی ہوں۔ عقلمندوں نے کسی کو بھولنے کا یہی طریقہ بتایا ہے۔"

ٹھیک اسی وقت کھانے کا اعلان کیا گیا۔ مہمان مختلف ٹکڑیوں میں کھانے کے کمرے کی طرف جانے لگے اور اسی لمحے جانے کیوں ہما بے حد پریشان نظر آنے لگی۔ وہ انتہائی ہیجانی کیفیت میں بولی: "مجھے بھوک بالکل محسوس نہیں ہو رہی۔ کچھ کھاؤں گی تو طبیعت بگڑ جائے گی۔ میرا خیال ہے کہ گھر چلی جاؤں۔" وہ پُر امید اور اجازت طلب نظروں سے ہماری طرف دیکھنے لگی۔

"چالبازی مت کرو۔ تم نے یقیناً ڈاکٹر کامران سے ملنے کا وقت مقرر کر لیا ہے اور ہمیں الو بنانے چلی ہو۔" شیریں خلاف توقع انتہائی غصے میں بولی۔

ہما کا منہ بن گیا۔ مری ہوئی آواز میں بولی: "کاش وہ مجھے اس قابل سمجھے۔" پھر ذرا ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی: "اصل بات وہ نہیں ہے جو تم سمجھ رہی ہو۔ قصہ یہ ہے کہ میرے منگیتر کی شادی ہے اور میں اس کی دعوت کھانا نہیں چاہتی۔ دوسرے پیرن سے مل کر رخصت کی اجازت بھی نہیں لے سکتی۔ وہ مجھے جبراً روک لے گی اور میرے دل پر بار پڑے گا۔ نہیں بھئی نہیں، اب میں زیادہ دیر نہیں رک سکتی۔"

ہما عجلت تمام ہمیں خدا حافظ کہہ کر رخصت ہو گئی۔ اگرچہ اس نے اپنی قبل از وقت روانگی کی معقول وجہ بتا دی تھی مگر جانے کیوں مجھے اس کی طرف سے اطمینان نہیں ہوا تھا۔ وہ مجھے مشکوک ہی لگی تھی۔ پھر یہ بات بھی میرے ذہن سے نکل گئی۔ وہسکی میرے ذہن پر قبضہ جمانے لگی تھی۔

مہمانوں کی تعداد اچھی خاصی تھی کچھ لوگ ابھی تک کھانے کے کمرے کی طرف جا رہے تھے۔ ہم تینوں بھی ان کے پیچھے ہو لئے۔ اس وقت میرا سر بہت بھاری ہو رہا تھا۔ مجھے کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ میرے اطراف کیا ہو رہا ہے اور میں کہاں ہوں۔ بس میرا دل یہ چاہتا تھا کہ خوب زور زور سے گاؤں اور ناچوں اور چیخ چیخ کر یہاں موجود لوگوں کو اپنا دکھ بتاؤں۔ معلوم نہیں کس طرح کھانے کے کمرے تک پہنچی۔ اگر زبیدہ نہ ہوتی تو شاید وہیں کہیں ڈھیر ہو گئی ہوتی۔ میرے اندر ایک لہر سی اٹھی اور مجھے خود بخود احساس ہوا کہ مجھے خود پر قابو رکھنا چاہئے۔ اگر میں زیادہ بہکی تو معاملہ بے حد خراب ہو جائے گا۔ زبیدہ نے مجھے ایک طشتری تھمائی اور اس میں کھانا ڈالنے لگی۔ میں نے کھانے کی کوشش کی مگر کھایا نہ گیا۔ میری انگلیاں طشتری سے

نی تھی رہیں۔
پھر مجھے اچانک احساس ہوا کہ میری طبیعت بڑی تیزی سے بگڑ رہی ہے۔ زبیدہ نے میری کیفیت کو بھانپ لیا۔ اس نے کھانا چھوڑا اور مجھے اور شیریں کو لے کر پروین کے پاس پہنچی اور اس سے اجازت لے کر ہم گھر واپس آ گئے۔

گھر پہنچے تو آدھی رات گزر چکی تھی۔ مجھے اپنا ہوش نہیں تھا۔ سیدھی بستر پر پڑ گئی، البتہ لڑکیاں حسب عادت گفتگو اور مباحثے میں مشغول ہو گئیں۔ ان کا موضوع بحث پروین، شوہر، ہما اور ڈاکٹر کامران تھے۔ شیریں، پروین پر لعنت ملامت کر رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ لعنت ہو ایسی دولت پر جس کے بدلے ایسا بھونڈا، بھدا اور کریہہ شوہر ملے۔ وہ جانے اور کیا کچھ کہتی رہی مگر میں اپنے خوابیدہ ذہن کے باعث سن نہ سکی۔ پھر آہستہ آہستہ میری پلکیں بھاری ہو گئیں۔

صبح بیدار ہوئی تو زبیدہ اور شیریں نے پروگرام بنایا کہ ساتھ مل کر اسٹڈی کرنا چاہیے کیونکہ اگلے دن امتحان کا پہلا پرچہ تھا۔ مگر میں بہانہ بنا کر گھر بھاگ آئی کہ میں تنہائی میں زیادہ بہتر طور پر پڑھ سکوں گی۔ تنہائی میں پڑھنے کا تو محض بہانہ تھا حقیقت یہ تھی کہ اس دن مجھے فروزاں سے ملنے کے لئے جانا تھا اور میں نہیں چاہتی تھی کہ یہ بات میری دوستوں کو معلوم ہو۔

تنہائی ملی تو میرا ذہن ایک بار پھر ڈاکٹر کامران اور ہما کے بارے میں الجھ گیا۔ مجھے یہ محسوس کر کے شدید حیرت ہو رہی تھی کہ مجھے ہما سے بے پناہ نفرت ہو گئی تھی۔ پھر میں ڈاکٹر کامران کے بارے میں سوچنے لگی۔ مجھے اس کی کل رات کی رفتار و گفتار پر ابھی تک حیرت تھی یہ بڑا عجیب لگ رہا تھا کہ وہ پروین کی شادی میں آیا تھا جب کہ وہ کہیں تعلق بنا ہی نہ تھا۔ کیا وہ واقعی رسماً پروین کی شادی میں شریک ہوا تھا یا اس پردہ کوئی اور بات تھی۔ اگر وہ پروین کی شادی میں شرکت کی غرض سے آیا تھا تو اتنی جلدی واپس کیوں چلا گیا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ شیریں کا خیال ہی درست ہو یعنی وہ محض ہما کے ساتھ رقص کرنے آیا تھا اور پھر یاد آیا کہ ہما نے ڈاکٹر کامران کی حمایت اور ہمنوائی کی تھی۔ اس نے ڈاکٹر کامران کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے مجھ سے اصرار کیا تھا کہ میں فروزاں سے ملنے نہ جاؤں اور جاؤں تو اس سے ڈاکٹر کامران اور اس کے تعلق کے بارے میں کوئی گفتگو نہ کروں۔ آخر ڈاکٹر کامران کو اصرار کیوں تھا کہ ہما فروزاں کا ذکر کسی سے نہ کرے۔ فروزاں کا ڈاکٹر کامران کے گھر پر دیکھ لیا جانا ایسی بات نہیں تھی کہ ڈاکٹر کامران بالکل ہی بوکھلا جائے۔ ایک مجرد اور رنگین مزاج آدمی کی زندگی میں ایسا تو دکا واقعات آ ہی جاتے ہیں۔ یقیناً کوئی خاص بات تھی، کوئی ایسی بات جسے ڈاکٹر کامران نہیں چاہتا کہ کھلے۔ ان کے تعلقات کی نوعیت یقیناً کچھ عجیب۔ اس خیال کے ساتھ ہی میرے دل میں یہ بات مضبوطی کے ساتھ بیٹھ گئی کہ فروزاں سے ضرور ملوں گی اور اس کے اور ڈاکٹر کامران کے تعلق کو ہر حال ٹٹولوں گی۔

فروزاں سے ملاقات کی خواہش شدید تر ہوتی گئی۔ ہما نے رقص کے دوران اپنی اور ڈاکٹر کامران کی گفتگو کے بارے میں مجھے جو کچھ بتایا تھا مجھے اس پر بھی شک تھا۔ سوال یہ تھا کہ ہما اتنی جلدی تقریب سے واپس کیوں چلی گئی اگر وہ اپنے سابق منگیتر سے اس قدر الرجک تھی تو شادی میں شریک ہی کیوں ہوئی۔ شادی میں شریک ہونا اور درمیان میں واک آؤٹ کر جانا میری سمجھ میں نہ آیا۔ ڈاکٹر کامران نے کم از کم اتنا تو کیا تھا کہ پروین اور اس کے شوہر سے باقاعدہ اجازت لے کر گیا تھا۔ مگر ہما نے اس کی بھی ضرورت نہ سمجھی تھی۔ ڈاکٹر کامران کے جاتے ہی اس نے بھی رنگی کا بہانہ تلاش کر لیا تھا۔ گویا وہ محض ڈاکٹر کامران کے ساتھ رقص کرنے آئی تھی۔ دونوں نے رقص کیا اور چلتے بنے۔

کاش میں گزشتہ رات ہما کے گھر فون کر لیتی اور دیکھتی کہ وہ گھر ہی گئی ہے یا کہیں اور۔ اب مجھے یقین سا ہو چلا تھا کہ وہ اپنے گھر نہیں گئی تھی بلکہ کہیں اور گئی تھی اور وہ جگہ ڈاکٹر کامران کے گھر کے سوا اور کوئی نہ ہو سکتی تھی۔ یہ بات ہما سے بعید نہ تھی اور خود ڈاکٹر کامران کو بھلا اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ میں خود پر لعن طعن کرنے لگی کہ میں نے وہسکی کو ہاتھ کیوں لگایا۔ اگر نشے میں نہ ہوتی اور ذہن آزاد ہوتا تو یہ بات مجھے اسی وقت سوجھ گئی ہوتی اور میں فوراً ہما کے گھر فون کر کے اس کی چوری پکڑ لیتی۔ یہ تو مجھے بہت پہلے سمجھ لینا چاہیئے تھا کہ ہما ڈاکٹر کامران کے چکر میں تھی اور گزشتہ رات اس سے مل بیٹھنے اور اس پر جال پھینکنے کا بہترین موقع تھا۔

دوپہر تک میں ڈاکٹر کامران اور ہما کے خیالات میں الجھی رہی۔ فروزاں سے طے شدہ وقت کے مطابق مجھے شام کو تین اور چار بجے کے درمیان اس کے گھر پہنچنا تھا۔ اس وقت ڈھائی بجے تھے مگر مارے ہیجان کے میری بری حالت تھی۔ میں نے سادہ سا لباس پہنا۔ کچھ درسی کتابیں بغل میں دبائیں اور امی سے یہ کہہ کر باہر نکل آئی کہ مطالعے کی غرض سے زبیدہ کے گھر جا رہی ہوں۔

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میں فروزاں سے ملاقات اور مقصد براری میں کس حد تک کامیاب ہوں گی۔ مجھ پر اس وقت ایک عجیب ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ میری حالت اس نوآموز جاسوس کی سی تھی جسے اپنے

پیشے کے پہلے ہی مرحلے میں ہی ایک بے حد اہم اور نازک ذمہ داری سونپ دی گئی ہو۔ بہر حال میں نے ایک جاسوسہ ہی کی مانند اپنے حواس بحال رکھنے کی کوشش کی اور ایک اخباری رپورٹر کے انداز میں سوچنے لگی کہ مجھے فروزاں سے کس انداز میں گفتگو کا آغاز کرنا چاہیے۔ گفتگو اس نہج سے ہونی چاہیے کہ اسے ذرہ برابر شبہ نہ ہو اور میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں۔

ٹیکسی فروزاں کے مکان کے سامنے رکی تو مجھ پر ایک عجیب قسم کا خوف طاری تھا اور جسم میں ہلکی سی لرزش تھی۔ دل بڑی تیزرفتاری سے دھڑک رہا تھا اور پیشانی پسینے میں بھیگ گئی تھی۔ میرے دل میں یہ خوف جاگزیں تھا کہ ایسا نہ ہو گفتگو کے دوران فروزاں تاڑ لے کہ میں اخباری رپورٹر نہیں ہوں بلکہ اخبار سے میرا دور سے کوئی تعلق نہیں ہے اور پھر مجھے دھکے دے کر مکان سے نکلوا دے۔ ایک بار جی میں آئی کہ چپکے سے یہیں سے کھسک لوں اور اس ملاقات کو کسی وقت کے لئے ٹال دوں۔ پھر اپنے اس اقدام کے بارے میں سوچا تو سراسر حماقت نظر آئی۔ دروازے تک آکر واپس جانا واقعی حماقت تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔

گھنٹی کی آواز اندر دور تک گونجی اور باہر خود میرے اعصاب کو جھنجھوڑ گئی۔ دروازہ تو نہیں کھلا البتہ قریب کی ایک کھڑکی کھلی اور ایک مرد کا چہرہ نمودار ہوا۔ میں اس آدمی کو فوراً پہچان گئی۔ وہ خاصا وجیہہ اور پرکشش تھا اور فلموں میں دوسرے درجے کا اداکار تھا۔ میں اسے اسکرین پر کئی بار دیکھ چکی تھی۔ اس نے مجھ سے کچھ پوچھا نہیں، کچھ دیر تک خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا پھر کھڑکی بند کر لی۔ مجھے اس کی یہ حرکت غیر مہذب اور ناشائستہ نظر آئی۔ پھر سوچا کہ یہ اداکار لوگ مغرور اور بد مزاج ہوتے ہی ہیں۔ لوگوں کے لئے تماشہ فراہم کرتے ہیں مگر خود کو عوام الناس سے بلند اور برتر سمجھتے ہیں۔ بہرحال پیشہ کوئی بھی ہو آدمی تو وہ ہوتا ہی ہے اسے کم از کم پوچھنا تو چاہیے تھا کہ میں کون ہوں اور کیوں آئی ہوں۔ اس کی اس حرکت پر میں کچھ دل شکستہ اور رنجیدہ سی ہو گئی۔

میری نظریں بند کھڑکی پر جمی ہوئی تھیں کہ دروازہ کھلا اور ایک خوش پوش بوڑھی عورت باہر نکلی اور مجھے اندر چلنے کا اشارہ کیا ظاہر تھا کہ وہ ملازمہ تھی۔ میں اس کے پیچھے مکان میں داخل ہوئی اور ہال سے گزرتے ہوئے ایک دوسرے بڑے کمرے میں پہنچ گئی۔ یہ کمرہ اپنی آرائش کے اعتبار سے ڈرائنگ روم نظر آتا تھا۔ خاصا بڑا اور کشادہ کمرہ تھا اور خوب سجا ہوا تھا۔ عمدہ قسم کا فرنیچر تھا اور دیواروں پر دیدہ زیب تصاویر اور پینٹنگز آویزاں تھیں۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر آویزاں پردے بھی خوشنما اور دلکش تھے۔ جب یہ کمرہ اتنا بڑا تھا تو پورا مکان کہیں زیادہ بڑا اور کشادہ ہوگا۔

میں ایک چرمی صوفے پر بیٹھ گئی اور کمرے کی آرائش کا تنقیدی نظروں سے جائزہ لینے لگی۔ چند ہی منٹ گزرے تھے کہ ایک دلکش خدوخال کی عورت کمرے میں داخل ہوئی۔ میں پہلی نظر میں اسے پہچان گئی۔ وہ فروزاں تھی۔ فروزاں کو دیکھ کر مجھے ایک عجیب قسم کی بے چینی اور اضطراب کا احساس ہوا۔ تاہم میں فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور مسکراتے ہوئے ایک قدم اس کی طرف بڑھی۔

جواب میں فروزاں بھی مسکرائی اور مجھے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولی "تمہیں ذرا انتظار کرنا پڑا اس کے لئے معذرت چاہتی ہوں۔ بات یہ ہے کہ آج دوپہر کے کھانے پر کچھ مہمان مدعو تھے اور اب وہ ایک ایک دو دو کر کے جا رہے ہیں۔"

مجھے یہ سوچ کر گھبراہٹ ہونے لگی کہ وہ مجھے صحافی سمجھتے ہوئے اپنے مہمانوں کو ٹال کر آئی ہے۔ اگر اسے یہ معلوم ہو جائے میں صحافی نہیں ہوں اور اس کا انٹرویو کرنے نہیں بلکہ کسی اور غرض سے آئی ہوں تو وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرے گی۔ یقیناً اٹھوا کر باہر پھنکوا دے گی۔

"آپ کے مہمانوں میں کون کون ہے؟" میں بے اختیار پوچھ بیٹھی دراصل میرے دل میں چور تھا۔ میں ڈر رہی تھی کہ کہیں فروزاں نے کامران کو بھی مدعو نہ کر رکھا ہو اور میرا اس سے ٹکراؤ ہو جائے مگر فروزاں کا جواب بڑا خوش کن تھا۔

"فلم کے کچھ دوست ہیں۔ ایک فلم کے معاہدے کے لئے آئے تھے۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ میرا خوف اور تردد فی الفور ختم ہو گیا اور میں نے پہلی بار نظر بھر کے فروزاں کی طرف دیکھا۔ اس وقت وہ میک اپ میں نہیں تھی۔ اور جیسا کہ فلموں میں دیکھنے میں آتی تھی اس قدر جوان اور پرکشش بھی نہیں تھی۔ اس کے چہرے پہ کسی حد تک ملائمت ضرور تھی مگر معصومیت اس نے بہ جبر طاری کر رکھی تھی۔ اگر اس معصومیت کے پردے کو ہٹا دیا جاتا تو اس کے چہرے اور آنکھوں میں ہوسناکی اور شہوت پرستی کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ اس کے لب اور آنکھوں کے گوشوں میں ہلکی ہلکی جھریاں واضح طور پر دکھائی دے رہی تھیں جو کہ بڑھتی ہوئی عمر کی غماز تھیں۔ اس نے اپنے بالوں کو رنگ رکھا تھا اور سرخ ربن سے باندھا ہوا تھا۔ اس وقت وہ ایک چست گھریلو لباس میں تھی۔ لباس ایسا تھا کہ اس کے سرکش اور بے لگام جسم کی چغلی کھا رہا تھا اور کسی بھی مرد کو پاگل کر دینے کے لئے کافی تھا۔ مجموعی طور پر فروزاں کے پاس کوئی چیز قابل قدر تھی تو صرف جسم تھا اور وہ اسی جسم سے کما کھا رہی تھی۔ میں نے فروزاں کے بارے میں جو کچھ سوچا تھا اور جس قدر اس سے متاثر تھی وہ اس کے بالکل برعکس نکلی۔ البتہ اس بات کی خوشی تھی کہ وہ دوسری اداکاراؤں

کی مانند بدمزاج، اکھڑ اور مغرور نہیں ثابت ہوئی تھی۔ اس کا میرے ساتھ بڑی شائستگی سے پیش آئی تھی۔

"اچھا تو انٹرویو کس سلسلے میں ہے؟" فروزاں نے میرے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھا اور میں ایک بار پھر نروس ہو گئی۔ مگر خوش قسمتی سے اسی وقت اندرونی حصے سے کچھ لوگوں کے زور زور سے بولنے کی آواز سُنائی دی۔ فروزاں تیزی سے اٹھی اور مجھ سے معذرت چاہتے ہوئے اس حصے کی طرف روانہ ہو گئی۔ میں نے ذرا اطمینان کی سانس لی اور فروزاں کے بارے میں سوچنے لگی۔ دوسرے کمرے سے مردوں کے ہنسنے اور بولنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ان میں فروزاں کے سریلے اور کھنکتے ہوئے قہقہے بھی شامل تھے۔ فروزاں میں بھرپور نسوانیت تھی اور مردوں کے لئے زبردست کشش تھی۔ اس کے علاوہ اس میں ایک اور بھی غیر معمولی خصوصیت موجود تھی جسے میں اپنی ناپختگی کی وجہ سے کوئی نام نہیں دے پا رہی تھی۔ تاہم اتنا کہہ سکتی تھی کہ وہ مردوں کو لبھانے، فریب دینے اور انہیں مرضی کے مطابق ڈھال لینے کی زبردست صلاحیت رکھتی تھی۔

فروزاں مہمانوں کو رخصت کر کے واپس آئی تو میرے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اس کے پیچھے اس کی ملازمہ تھی جس نے چائے کی ٹرے سنبھال رکھی تھی۔ وہ ٹرے رکھ کر واپس چلی گئی۔ فروزاں نے اپنے ہاتھ سے میرے اور اپنے لئے چائے تیار کی۔ چائے پی کر فارغ ہوئے تو میں سوچنے لگی کہ گفتگو کی ابتدا کس طرح کی جائے۔ میں نے فروزاں کی طرف دیکھتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا۔ "میڈم اب میں جو کچھ تم سے کہوں گی امید ہے کہ تم ناراض نہیں ہو گی بلکہ مجھے وضاحت کا پورا پورا موقع دو گی۔"

"ناراضگی، وضاحت، آخر تم یہ کیا لے بیٹھی ہو؟" فروزاں بے ساختہ چونکتے ہوئے بولی۔ "اوہ میں سمجھی۔" اس نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ "یقیناً اخباروں نے میرے بارے میں تازہ ترین افواہ اڑائی ہو گی — انہوں نے لکھا ہو گا کہ آج کل میرے فلاں صنعت کار یا سرمایہ دار سے خفیہ تعلقات ہیں۔ یا آج کل میں ریس کورس میں بہت دلچسپی لینے لگی ہوں یا آج کل میں بہت زیادہ پینے لگی ہوں اور مدہوش ہو کر سیٹ پر جا کر تی ہوں۔ یا میں کئی سال سے انکم ٹیکس کی رقم چوری کر رہی ہوں اور پولیس کو میرے گھر پر چھاپہ مارنا چاہیئے۔ اور تم اس کی تصدیق یا تردید کے لئے یہاں آئی ہو گی؟"

اس خیال سے ہنسی آ گئی کہ وہ بڑے خشوع اور خضوع کے ساتھ مجھے اخبار نویس ہی تصور کئے ہوئے تھی۔ مگر میں اس کے اس تصور کو زیادہ دیر تک قائم نہیں رہنے دینا چاہتی تھی۔ اس سے معاملے کے خراب ہو جانے کے امکانات تھے۔

"یہ وضاحت میرے اپنے بارے میں ہے۔" میں نے فروزاں سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ "میڈم میں اخباری رپورٹر نہیں ہوں میرا کسی بھی اخبار سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں نے تو صرف تم سے ملاقات کی خاطر —"

فروزاں نے مجھے کچھ اس انداز میں دیکھا کہ بقیہ الفاظ میری زبان سے چپک کر رہ گئے۔ اور میں اپنا جملہ پورا نہ کر سکی۔ اس کی آنکھوں میں زبردست حیرت تھی اور اس کے ساتھ ہی خوف کا اظہار بھی ہو رہا تھا ان دونوں کیفیات نے مل کر اس کے چہرے کو تبدیل کر کے رکھ دیا تھا۔ دیر تک وہ خاموش و گنگ بیٹھی رہی اور ناقابل یقین نظروں سے مجھے گھورتی رہی۔ پھر ذرا سنبھلی اور خوفزدہ لہجے میں بولی "پھر تم کون ہو اور یہاں کیوں آئی ہو۔ تمہیں کس نے میرے پاس بھیجا ہے؟"

اس نے بیک وقت تین سوال کر ڈالے تھے۔ جو اس کی گھبراہٹ اور خوفزدگی کا نتیجہ تھے۔ میں نے سوچا کہ پہلے اس کے خوف کو زائل کر دینا ضروری ہے۔ ورنہ مجھے اپنے مقصد کے حصول میں خاصی دقت ہو گی۔ میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "میں کسی کی طرف سے نہیں آئی ہوں اور نہ آپ سے کچھ چاہتی ہوں۔ بس میرا دل آپ کو قریب سے دیکھنے اور بات کرنے کو چاہتا تھا۔"

"تو کیا اس کے لئے اخباری رپورٹر کہہ کر متعارف کرانا ضروری تھا؟" فروزاں نے مجھے بے یقین نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ابھی تک اس کی الجھن رفع نہیں ہوئی تھی۔

"میں نے سوچا تھا کہ ایک فین کی حیثیت سے شاید تم مجھے وقت نہ دے سکو کیونکہ مجھ جیسے جانے کتنے پرستار ہوتے ہیں جو اپنی محبوب شخصیت سے مل بیٹھنے کے بہانے ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ البتہ اگر اخباری رپورٹر بن جاؤں تو ملاقات نہ ہونے کے امکانات صفر کی حد تک رہ جاتے ہیں۔"

فروزاں کے پریشان چہرے پر ہلکی سی شگفتگی دوڑ گئی۔ اس نے مجھے گہری نظروں سے دیکھا اور لمبی سانس کھینچتے ہوئے بولی "تم پہلی عورت ہو جو میری محبت کی دعویدار ہو۔ ورنہ عورتیں تو مجھے دیکھنے تک کی روادار نہیں ہیں۔ میں ان کی آنکھوں میں چبھتی ہوں دل میں کھٹکتی ہوں۔ وہ مجھ سے شدید نفرت کرتی ہیں۔ آج تک ایسا نہیں ہوا کہ میں کسی تقریب میں گئی ہوں اور عورتوں کے منہ سے اپنے لئے کوئی برائی نہ سنی ہو۔ عورتوں کا بس چلے تو مجھے دار پر لٹکوا دیں۔"

میں نے اس کے الفاظ سے اخذ کیا کہ وہ بہت آزردہ خاطر اور زود رنج عورت ہے۔ خود اس کی اپنی صنف نے اسے بہت دکھ پہنچائے ہیں۔ اس کی روح زخمی ہے اور وہ محبت کی بھوکی ہے۔

تسلی اور تشفی کے الفاظ اس کے لئے مرہم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ فروزاں کا ایک کمزور پہلو میری گرفت میں آگیا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس سے فائدہ ضرور اٹھانا چاہیئے۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا: "میڈم جانتی ہو یہ عورتیں تم سے کیوں جلتی ہیں اس لئے کہ وہ نسوانی حیثیت سے خود کو تمہارے مقابلے میں بہت کمزور اور کمتر سمجھتی ہیں۔ تم میں مردوں کو متاثر کرنے کی زبردست صلاحیت ہے جبکہ ان میں یہ خصوصیت تمہارے مقابلے میں نصف بھی نہیں ہے۔ تم تو جانتی ہو میڈم عورتیں فطرتاً حاسد ہوتی ہیں وہ دوسری عورتوں کو خود سے بہتر نہیں سمجھتیں۔ بس تم عورتوں کی اسی حسد کا شکار ہو۔ اور رہا میرا معاملہ ــــ" میں نے ایک لے کو رنگی اور لہجے کو جذباتی رنگ دیتے ہوئے بولی: "ہر شخص خواہ وہ عورت ہو یا مرد اپنے ذہن میں ایک ہیرو یا ہیروئن تراش کر رکھتا ہے۔ میں فلموں کے ذریعہ تم سے متعارف ہوئی اور میں نے ہر لحاظ سے تمہیں ایک مکمل عورت پایا۔ ایک ایسی عورت جو ہر لحاظ سے عورت تھی۔ عورت کا عورت ہونا بہت بڑا ہنر ہے۔ میں تم سے بہت متاثر ہوں اور اگر تم جیسی نہیں بن سکی تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ دوسروں کی مانند تم سے نفرت شروع کر دوں۔" میں نے سر کو ذرا جھکایا اور آواز کو زیادہ سے زیادہ دردناک بناتے ہوئے کہا: "کئی سال سے یہ آرزو لئے بیٹھی تھی کہ آپ کو قریب سے دیکھوں اور آج میں نے کسی طرح وہ موقع نکال لیا ہے۔ اس سلسلے میں میں نے جو طریقہ استعمال کیا ہے اس کے لئے آپ سے معافی چاہتی ہوں۔"

وہ ایک جذب کے عالم میں مجھے سن رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ پلکیں بھی نہیں جھپکا رہی تھی۔ مجھے بڑا اطمینان سا ہوا اور یقین ہو چلا کہ اب میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر رہوں گی۔ میں نے اپنی بات ختم کی تو وہ دیر تک سر جھکائے کچھ سوچتی رہی پھر اچانک چونکی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی "تم نے اچھا کیا جو مجھ سے ملنے چلی آئیں۔" اس کی آواز رقت آمیز ہو گئی اور آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ "کاش تم اندازہ کر سکتیں کہ مجھے تم جیسی لڑکی کی کس قدر شدید ضرورت تھی۔ میں نے ایک ایسی عورت کی کمی ہمیشہ محسوس کی جو میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائے جو مجھ سے نفرت نہ کرتی ہو بلکہ میرے دکھ درد کو سمجھتی ہو۔ میرے ملنے جلنے والے بہت ہیں۔ میرا حلقۂ احباب بہت وسیع ہے۔ مگر ہر بات تو مردوں سے نہیں کہی جا سکتی۔ دوسری طرف عورتیں مجھے عورت ماننے پر تیار نہیں ہیں۔ اب تم میری گھٹن اور بے بسی کا بخوبی اندازہ کر سکتی ہو۔"

مجھے یقین نہیں تھا کہ فروزاں اس قدر جلد میرے قابو میں آ جائے گی۔ میں نے اس سے جھوٹ بولا تھا مجھے اس پر شرمندگی سی ہونے لگی۔ اگر وہ عقل کی بھی غنی ہوتی، ہوشیار اور تیز طرار ہوتی تو میرے جھوٹ اور اداکاری کو پکڑ لیتی اور متواتر سوال کر کے میرا ناطقہ بند کر دیتی مگر اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ اس نے میرے کچھ بعد جو حقیقت بیان کی تھی وہ ظاہر ہے جس قدر شوخ، چنچل، طرار اور دلفریب تھی اندر سے اسی قدر سادہ لوح تھی۔ میں سوچنے لگی کہ آخر ڈاکٹر کامران کو اس عورت میں ایسی کیا چیز نظر آئی جو مر مٹا۔ یقیناً سادہ لوحی اور معصومیت ہی تسکین کا باعث ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر کامران کو فروزاں کی یہی صفات پسند آئی ہوں۔ دیکھا گیا ہے کہ بعض مرد حضرات کسی عورت کی بے وقوفی اور احمقانہ حرکات پر ہی ریجھ جاتے ہیں مگر یہ موقع ان سب باتوں کے سوچنے کا نہیں تھا۔ مجھے تو ابھی فروزاں کو مزید شیشے میں اتارنا تھا۔ اپنائیت کے ساتھ بولی: "اگر تم مجھے کسی قابل سمجھتی ہو تو یہ میری خوش نصیبی ہے۔ میں جانتی ہوں کہ جب آدمی الجھا ہوا اور پریشان ہو تو یقیناً اسے کسی نہ کسی رازدار اور ہمراز کی ضرورت پیش آتی ہے۔ میں بھلا کس قابل ہوں لیکن اگر تم پسند کرو تو میں تمہارا دکھ بانٹنے کے لئے تیار ہوں۔ آدمی کسی سے کہہ سن کر خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگتا ہے۔"

فروزاں کے لبوں پر ایک محبت آمیز مسکراہٹ دوڑ گئی۔ "تمہارا نام کیا ہے؟" اس نے پوچھا

"شہرزاد۔" میں نے جھجکے بغیر فوراً جواب دیا۔ اپنی حاضر دماغی پر مجھے خود حیرت ہوئی تھی۔

"بڑا خوبصورت نام ہے۔ الف لیلوی سا ہے۔ ویسے تم ہو بھی بڑی خوبصورت۔ ایک دم شہزادی لگتی ہو۔ کرتی کیا ہو؟ کہیں ملازم ہو؟"

"نہیں طالب علم ہوں۔"

"طالبہ ہو؟" فروزاں نے قدرے حیرت سے کہا: "کہاں پڑھتی ہو۔ کسی کالج میں یا یونیورسٹی جاتی ہو؟"

وہ مجھ میں بھرپور دلچسپی لے رہی تھی مگر ابھی وہ موقع نہیں آیا تھا کہ میں اسے بتاتی کہ میں ڈاکٹر کامران کی شاگرد ہوں اور اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی غرض سے اس کے پاس آئی ہوں۔ چنانچہ ایک دوسرے کالج کا نام بتا دیا۔ پھر وہ مجھ سے متعلق دوسرے سوالات پوچھنے لگی اور میں نام و پتہ بدل بدل کر اس کے جوابات دیتی رہی۔ فروزاں کو اس بات کی خوشی تھی کہ ایک طالبہ اسے پسند کرتی تھی اور اس سے ملنے آئی تھی۔ وہ مجھ سے گھل مل گئی تھی اور بڑی اپنائیت اور محبت سے بات کر رہی تھی۔ اس نے بڑی سادگی سے بتایا کہ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ کوئی طالبہ اسے اس حد تک چاہتی ہو گی کہ ملنے کے لئے گھر تک آ پہنچے گی۔

مجھے اندازہ ہوا کہ فروزاں پڑھی لکھی نہیں تھی اور اسے تعلیم حاصل کرنے کی بڑی حسرت تھی۔ وہ تعلیم یافتہ لوگوں کا ذکر بڑے رشک سے

کرتی تھی۔ اس کے دل میں ایک تمنا تھی کہ کاش وہ بھی طالبہ رہ چکی ہوتی۔ وہ طلبا کا ذکر کرتی تھی تو اس کے لہجے میں احترام کا عنصر شامل ہوتا تھا۔ عوام الناس اور غریب طبقے میں تو وہ مقبول تھی ہی مگر یہ اس کے لئے بڑی بات تھی کہ کوئی پڑھا لکھا شخص خصوصاً طلبا اس کا ذکر کریں۔ مجھے یہ بھی محسوس ہوا کہ فروزاں ہر طرح کی آسائش میسر ہونے کے باوجود خوش نہیں ہے اور اپنی زندگی میں کسی چیز کی کمی محسوس کرتی ہے۔ مجھے اس کی بے چارگی پر بڑی شدت سے رحم آیا۔

ذرا دیر میں ہم دونوں شیر و شکر ہو گئے۔ وہ خود کم بولی اور مجھے بولنے کا زیادہ موقع دیا۔ بولتے بولتے میں رکی تو اس نے وفورِ محبت سے مسکراتے ہوئے کہا "تم کتنا اچھا بولتی ہو۔ واقعی تم میں بات کہنے کا سلیقہ ہے کیا تم مقررہ ہو۔ کاش میں تم جیسا ذہن رکھتی ہوتی اور تمہاری طرح روشن فکر ہوتی"

یک لخت مجھے احساس ہوا کہ لوہا گرم ہو چکا ہے اور اب وہ موقع آگیا ہے کہ میں بھرپور چوٹ لگاؤں۔ فروزاں میرے اعتماد میں آچکی تھی اور ڈاکٹر کامران کو بیچ میں لے آنے کا یہی مناسب ترین وقت تھا۔ اس احساس کے ساتھ ہی میرا دل بڑے زور سے دھڑکنے لگا۔ میں نے بڑی مشکل سے خود پر قابو پایا اور لہجے کو پرسکون بناتے ہوئے بولی۔ "تم میری تعریف میں مبالغے سے کام لے رہی ہو۔ اب میں اس قدر روشن فکر بھی نہیں ہوں جس قدر کہ تم مجھے سمجھ رہی ہو۔ ہاں یہ ہے کہ میں دشمنوں کی مانند کینہ پرور اور بدخواہ نہیں ہوں۔ ایسے بھی لوگ ہیں جو دن میں دو چار لوگوں کی برائیاں نہ کر لیں تو انہیں کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ نہ نیند آتی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں۔ ابھی گزشتہ چند دن کی بات ہے کہ میں ایک تقریب میں گئی تھی اور وہاں موجود ایک لڑکی تمہارے بارے میں گفتگو کر رہی تھی" یک لخت میرا حلق خشک ہو گیا اور زبان جیسے اکڑ کر رہ گئی۔

"کیا کہہ رہی تھی؟" فروزاں نے بڑے جوش اور اشتیاق سے پوچھا

"وہ بدعقل لڑکی کہہ رہی تھی کہ آج کل تمہارا ایک پروفیسر سے معاشقہ چل رہا ہے" میں نے ہمت کر کے کہہ دیا اور جیسے ایک بہت بڑا بوجھ میرے سینے سے ہٹ گیا۔ میں نے سر اٹھا کر فروزاں کی طرف دیکھا اور مجھے حیرت کا شدید دھچکا لگا۔ فروزاں کے چہرے کی کیفیت ایک دم تبدیل ہو گئی تھی۔ اس کی مسکراہٹ دم توڑ چکی تھی اور چہرہ بالکل پیلا پڑ گیا تھا۔ کچھ دیر وہ کھوئی کھوئی رہی پھر اچانک سنبھالا لیا اور ہکلاتے ہوئے بولی "کون تھی وہ لڑکی؟ اس نے اور کیا کہا تھا۔ وہ کون سی تقریب تھی جہاں یہ گفتگو ہوئی تھی؟"

مجھے گمان نہیں تھا کہ وہ اس قدر شدید رد عمل کا اظہار کرے گی۔ میں سوچنے لگی کہ یہ ایسی بات نہیں تھی کہ فروزاں اس قدر حیران اور پریشان ہو جائے۔ کسی ادا کارہ کا کسی پروفیسر سے معاشقہ چلنا کوئی بات تو نہیں کہ آدمی ہاتھ پاؤں ڈھیلے کر دے۔ اس قسم کی افواہیں تو آئے دن اڑتی رہتی ہیں مگر ادا کارہ کی صحت پر اس کا کیا اثر پڑتا تھا۔ اداکارائیں تو جانے کس کس سے عشق کرتی پھرتی ہیں پروفیسر کا تو بہرحال سوسائٹی میں ایک مقام ہوتا ہے۔ پھر اس کے علاوہ فروزاں یوں بھی اپنی ذاتی زندگی کے سلسلے میں کوئی اچھی شہرت نہیں رکھتی تھی۔ وہ جنس زدہ تھی اور بقول کسے بدکردار تھی اور اس سے متعلق آئے دن افواہیں اڑتی رہتی تھیں۔ فروزاں ان تمام باتوں سے باخبر تھی اور ان کی عادی تھی پھر وہ اپنے اور ایک پروفیسر کے معاشقے کی افواہ سن کر اس قدر پریشان کیوں ہو گئی تھی۔ اس کی کیفیت سے معلوم ہوتا تھا کہ اسے زبردست صدمہ پہنچا ہے۔ آخر اس صدمے کی وجہ کیا تھی اور یہی وہ بات تھی جسے جاننے کے لئے میں یہاں آئی تھی۔

میں نے بڑی کاری ضرب لگائی تھی مگر ابھی اپنے مقصد تک نہیں پہنچی تھی۔ یہ تو اندازہ ہو گیا تھا کہ فروزاں اور ڈاکٹر کامران کے درمیان کچھ ہے۔ مگر کیا ہے بس یہی مجھے معلوم کرنا تھا۔ میں نے سوچا کہ کوئی ایسی بات کہنی چاہیئے کہ فروزاں اپنے دفاع پر مجبور ہو جائے اور دفاع کرتے ہوئے غیر شعوری طور پر وہ بات از خود اگل دے۔ میں نے اپنے چہرے پر تاسف کی کیفیت طاری کرتے ہوئے کہا "لڑکی کہہ رہی تھی کہ وہ پروفیسر اس کا استاد ڈاکٹر کامران ہے۔ اس وقت وہاں بہت سارے مرد اور عورتیں موجود تھیں۔ ایک شخص نے کہا کہ تم نے حال ہی میں ڈاکٹر کامران کو منشیات کا عادی بنا دیا ہے اور اب وہ ہیروئن کے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

پہلے فروزاں کے چہرے پر پیلاہٹ تھی اور اب وہ پیلاہٹ بھی غائب ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے پر زندگی اور حرکت و حرارت کے آثار یکسر معدوم ہو گئے تھے اور آنکھوں سے ویرانی جھانکنے لگی تھی۔ ذرا دیر تک وہ بے جان بیٹھی رہی۔ پھر اس کے جسم کو جنبش ہوئی۔ ہونٹ بری طرح کانپے اور وہ چیخ کر بولی "بکواس ہے۔ کیا ذلیل جھوٹ ہے میں خود نہیں جانتی کہ یہ ہیروئن کیا چیز ہے بھلا دوسروں کو کیسے عادی بناؤں گی اور وہ بھی ڈاکٹر کامران کو۔ ڈاکٹر کامران جو کہ......"

کہتے کہتے وہ رک گئی اور شک بھری نظروں سے مجھے گھورنے لگی۔ اس کے دیکھنے کا انداز ایسا تھا کہ مجھے جھرجھری آگئی۔ اس کی ساری محبت اور اپنائیت ہوا ہو گئی تھی اور آنکھوں سے بیگانگی اور بدظنی جھانکنے لگی تھی۔ وہ انتہائی نفرت اور غیظ و غضب کے عالم میں بولی۔ "میں تمہاری بات کا یقین نہیں کر سکتی۔ اب تک مجھ سے کوئی ایسی کوتاہی

اور غلطی پر ... نہیں ہوئی کہ لوگ میرے اور ڈاکٹر کامران کے تعلقات سے باخبر ہو سکیں ۔۔ مگر نہیں ڈرو۔ شاید ایک چھوٹی سی لاپرواہی ہوئی ہے اور یہ سب اس کا شاخسانہ ہے۔ تم اس لڑکی کی دوست تو نہیں ہو جو چند دن قبل شادی کا کارڈ لے کر ڈاکٹر کامران کے گھر آئی تھی؟"

فرزاں کی نظریں ایکدم بدل گئی تھیں۔ اب اس کی آنکھوں میں نرمی کی جگہ انتہائی درجے کی سختی اور خشونت نے لے لی تھی۔ فرزاں کی بجائے اب میرے بجائے اس ہونے کی باری تھی۔ وہ کسی زخمی شیرنی کی مانند اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور انتہائی اشتعال کے عالم میں کمرے میں ٹہلنے لگی۔ خوف کے سبب میری بُری حالت ہو گئی۔ اور جسم پر پسینہ سرسرانے لگا۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ رکی۔ تیزی سے میرے قریب آئی اور پوری قوت سے چیختے ہوئے بولی۔ "میں احمق ہوں۔ یہ میری ہی غلطی تھی۔ مجھے سمجھنا چاہیے تھا کہ کوئی بغیر کسی غرض اور مقصد کے مجھ سے کس طرح مل سکتا ہے۔ بھلا کون ہے جو بغیر کسی مقصد کے میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائے۔"

غصے کی شدت سے اس کا سارا جسم کانپنے لگا۔ وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے انتہائی نفرت سے چیخی۔ "اگر تمہارا خیال ہے کہ تم کامی کو مجھ سے چھین لوگی تو یہ تمہاری خام خیالی ہے۔ کوئی بھی میرے کامی کو مجھ سے نہیں چھین سکتا۔ کسی میں اتنی جراٴت نہیں ہے۔ کامی مجبور ہے کہ میرے ساتھ رہے۔ حتیٰ کہ ساری دنیا کو ہمارے تعلقات کے بارے میں معلوم ہو جائے تو بھی کامی میرے ساتھ رہنے پر مجبور ہے۔" اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں اور سختی کی وجہ سے جبڑے کی ہڈیاں ابھر آئیں۔ وہ اپنی ایک ہتھیلی پر مکا مارتے ہوئے تکرار کرنے لگی۔ "وہ مجبور ہے۔ وہ میرا غلام ہے۔ وہ میرا پابند ہے۔"

فرزاں کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ اور اس کی کیفیت ایکدم جنونی ہو رہی تھی۔ مجھے خدشہ لاحق ہوا ایسا نہ ہو کہ وہ ایکدم جھپٹے اور مجھے مارنا شروع کر دے یا میرا گلا ہی دبوچ لے یا پھر دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دے ۔۔ میں ڈری، سہمی، پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔

وہ کچھ دیر تک مجھے گھور گھور کر دیکھتی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ نارمل ہو گئی۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ تیزی سے اٹھا ہوا جھاگ بالآخر بیٹھ جاتا ہے۔ اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور میرے شانے پر رکھتے ہوئے انتہائی نرم اور التجا آمیز لہجے میں بولی۔ "سچ بتاؤ تم کون ہو اور مجھ سے کیا چاہتی ہو؟"

میں نے اطمینان کی ایک طویل سانس لی۔ پلک جھپکتے ہی میرا سارا خوف دور ہو گیا۔ میں نے دونوں ہاتھ بڑھا کے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور ہتھیلی کی پشت کو بڑی محبت سے سہلاتے ہوئے بولی۔ "یقین کرو، میڈم کہ میں تمہاری دوست ہوں۔ تمہیں نقصان یا آزار پہنچانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ تم اس قدر غصے میں کیوں آ گئی ہو۔ مجھے تمہاری حرکت پر تعجب ہے نہ رنج البتہ حیرت ہے کہ ایک بے بنیاد افواہ کا تم پر اتنا زیادہ اثر رہا ہے جیسے اعصابی اختلال کا شکار ہو گئی ہو۔ تم تو مجھ سے زیادہ سمجھدار اور تجربہ کار ہو۔ تمہیں سمجھنا چاہیے کہ اگر ہمارے معاشرے میں کوئی نمایاں حیثیت رکھتا ہے تو اس سے متعلق اس قسم کی افواہیں اڑتی ہی رہتی ہیں اور اگر کوئی عورت اداکارہ ہو تو افواہ سازی کی فیکٹری قائم ہو جاتی ہے۔"

فرزاں کچھ ڈھیل پڑ گئی اور دوبارہ صوفے پر میرے قریب بیٹھ گئی۔ اس کی نگاہیں خلا میں گم ہو گئی تھیں۔ اگرچہ اب اس کی پہلی جیسی کیفیت نہیں رہی تھی۔ تاہم چہرے پر اب بھی کھنچاؤ موجود تھا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "شہرزاد! اگر ان تمام باتوں کے پس پشت تمہارا کوئی خاص مقصد پوشیدہ نہیں ہے تو میں صدق دل سے تم سے معافی مانگتی ہوں۔ ویسے بہتر ہے کہ تم مجھے ان اشخاص کے بارے میں بتاؤ جو میرے اور کامی کے بارے میں اس قسم کی گھٹیا گفتگو کر رہے تھے۔"

مجھے فوراً اندازہ ہو گیا کہ وہ ابھی تک میری طرف سے مطمئن نہیں ہے۔ وہ باتوں باتوں میں مجھ سے میرا فی الضمیر اگلوانا چاہتی ہے۔ وہ میری طرف سے کھٹک گئی تھی اور اب دھونس دھاندلی کی بجائے نرمی اور صلح جوئی سے کام نکالنا چاہتی تھی۔ مگر میں اس قدر بے وقوف نہیں تھی جو کچھ میرے دل میں تھا اور جو کچھ کہ میرا مقصد تھا میں اس پر کیسے ظاہر کر سکتی تھی۔ میں نے سوچا کہ اسے کسی دوسرے انداز میں مطمئن کرنا چاہیے۔ محبت سے سرشار لہجے میں بولی۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں اس قدر پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ اس قسم کی افواہیں تمہاری زندگی پر بھلا کیا اثر ڈال سکتی ہیں۔ تم اچھی خاصی شہرت کی مالک ہو اور مشہور شخصیتوں پر اس قسم کے چھینٹے اڑتے ہی رہتے ہیں۔ کیا تم نے نہیں سنا کہ چاند پر تھوکا ہوا تھوک اپنے منہ پر آ کر گرتا ہے۔"

فرزاں نے صوفے کی پشت سے سر ٹکا دیا اور آنکھیں بند کر کے ایک گہری سانس لی۔ کچھ دیر تک یونہی آنکھیں بند کیے پڑی رہی پھر آنکھیں کھولتے ہوئے تھکے ہوئے لہجے میں بولی۔ "میں خاصی پریشان ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔" پھر زہرخند کے ساتھ بولی۔ .... "کیا تم اندازہ کر سکتی ہو کہ اگر مجھ جیسی عورت کسی سے محبت کرے تو اس کی محبت کس قسم کی ہوگی۔ مجھے نہیں معلوم کہ تم میرے اور کامی کے تعلقات کے بارے میں کس حد تک جانتی ہو۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ میرے دوستوں میں سے ہو یا دشمنوں میں سے بہرحال کوئی بھی صورت ہو، حقیقت کچھ بھی ہو تم پہلی اور واحد فرد

ہو جیسے میں خود اپنی زبان سے کہہ رہی ہوں۔ سنو میں اس عمر کو محبت میں گنگ تک دھتکور چکی ہوں۔ اپنی پچیس سالہ زندگی میں، میں نے اتنی شدت سے آج تک کسی کو نہیں چاہا۔ میں تو یہاں تک تیار ہوں کہ اپنی تمام دولت، شہرت اور کامیابیاں و کامرانیاں اس کے قدموں میں ڈال دوں بشرطیکہ وہ صرف ایک بار یہ کہہ دے کہ وہ مجھے دل سے چاہتا ہے ـــ تم نے مجھ سے جو کچھ کہا ہے اگر اس کی بھنک بھی کامی کے کان میں پڑ جائے تو سمجھ لو کہ میری تو بربادی ہو گئی۔ کامی پسند نہیں کرتا کہ میرے اور اس کے تعلقات کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم ہو۔ اگر تم میرے دشمنوں میں سے ہو تو میں ایک محبت کرنے والی عورت کی حیثیت سے تم سے درخواست کرتی ہوں، التجا کرتی ہوں کہ میرے حق میں تم جو برا کر سکتی ہو کر دو، مگر خدا کے لیے کامی اور میرے معاملے کو اپنی ذات کی حد تک رکھو۔"

فروزاں پر مجھے بڑا ترس آیا۔ مجھے اس سے بڑی ہمدردی محسوس ہوئی مگر میں اس پر ترس کھانے یا اس سے ہمدردی کرنے نہیں آئی تھی وہ کچھ کھل گئی تھی۔ کچھ کہنا باقی تھا۔ میں دریا دلی سے کام لیتے ہوئے بولی۔ "میڈم تم ابھی تک مجھ پر اعتماد نہیں کر سکی ہو مگر جلد ہی تم پر ثابت ہو جائے گا کہ میں وہی دوست ہوں جس کی ایک عرصے سے تمہیں تلاش تھی۔ مجھے یہ احساس ستا رہا ہے کہ میں نے بلاوجہ تمہیں پریشان کیا ہے۔ کاش میں اس موضوع کو نہ چھیڑتی۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ ڈاکٹر کامران کون ہے جس پر تم اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کے لیے تیار ہو۔ شاید وہ تم سے محبت نہیں کرتا۔ میں نہیں چاہتی کہ تمہارے اور اس کے تعلقات کی بات چھیڑے۔ میرا خیال ہے کہ اسے خود یہ فخر کرنا چاہیے کہ تم جیسی عورت اس سے والہانہ محبت کرتی ہے۔ پھر تھوڑے والے انداز میں پوچھا کیا وہ شادی شدہ ہے ــ"؟

جواب میں فروزاں دیر تک ساکت رہی پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولی "ڈاکٹر کامران نہ صرف یہ کہ مجھے پسند نہیں کرتا بلکہ ـــ" اچانک وہ رکی اور بڑی خوبصورتی سے جملہ تبدیل کر دیا۔ "میں مردوں میں ایک دیوی کی مانند پوجی جاتی ہوں لیکن یہ واحد مرد ہے جسے میں کسی طور بھی اپنی طرف مائل نہیں کر سکی ہوں۔"

"محبت کا تعلق دل سے ہے۔ اس پر جبر سے کام نہیں لیا جا سکتا اور کیا پتہ وہ تم سے محبت کرتا ہی ہو مگر تم حد سے زیادہ حساس اور زود رنج ہونے کے باعث اسے محسوس نہ کر سکی ہو۔ شاید تم یہ چاہتی ہو کہ وہ کھل کر اپنی محبت کا اظہار کرتا رہے۔"

فروزاں نے سر گھما کر میری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بے پناہ غم ماندہ تھا۔ وہ چند لمحے مجھے خاموشی سے دیکھتی رہی پھر آہستگی سے بولی۔ "شہر زادا میرا منہ اور نہ کھلواؤ۔ تم دیکھ رہی ہو کہ میری ذہنی حالت درست نہیں ہے۔ اگر کبھی مجھ پر ثابت ہو گیا کہ تم واقعی میری دوست ہو تو تم واحد شخصیت ہو گی جس پر میں اپنا وحشت ناک راز ظاہر کروں گی۔"

"محبت پر بات کرنا کوئی گناہ نہیں ہے۔ آدمی جس قدر جلد اس گناہ نے عذاب سے گلو خلاصی حاصل کر لے بہتر ہے۔"

دھیری ہوئی آواز میں کہنے لگی "ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ ایک اداکارہ کو صرف آوارہ اور اوباش لوگوں سے محبت کرنے کا حق حاصل ہے کوئی نہیں سوچتا کہ ایک اداکارہ جو فلمی مناظر میں عریاں یا نیم عریاں ظاہر ہو کر ہے اس کے سینے میں بھی دل ہے۔ اس کی بھی اپنی ایک روح ہے۔ وہ دوسری عورتوں کی مانند سے پاکیزہ، حساس اور معصوم ہو سکتی ہے۔ وہ بھی لطیف جذبات اور احساسات کی مالک ہو سکتی ہے مگر ایسا کوئی نہیں سوچتا۔ لوگ سوچتے ہیں کہ محبت کرنے کا حق صرف ادیبوں، شاعروں اور مصوروں ہی کو حاصل ہے۔ ایک اداکارہ محبت کیوں نہیں کر سکتی۔ اگر ا اداکارہ کسی کالج کے پروفیسر سے محبت کرتی ہے تو اس میں معصیت کیا

اچانک فروزاں کے تیور بگڑ گئے۔ غراتے ہوئے بولی "اگر کوئی شخص ڈگری لے لیتا ہے تو کیا وہ سپرمین بن جاتا ہے۔ محبت تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ میں کوئی امتیاز نہیں رکھتی۔ محبت تو انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ اس کی روح میں رچی بسی ہے۔ وہ محبت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ محبت اس کی غذا ہے۔ زندگی ہے۔ میں ڈاکٹر کامران سے اس لئے محبت نہیں کرتی ہوں کہ وہ فلسفے کا پروفیسر ہے اور معاشرے میں اسے ایک خاص مقام حاصل ہے اگر وہ سبزی فروش ہوتا تب بھی میرے دل میں اس کے لئے اتنی ہی جگہ ہوتی جتنی کہ اب ہے۔"

میں ہنستے ہوئے بولی "اگر وہ سبزی فروش ہوتا تو تمہاری محفل میں جگہ کیسے پاتا۔ نہیں میں تمہارے خیال سے متفق نہیں ہوں۔ میرے خیال میں تم اس سے اس لئے محبت کرتی ہو کہ وہ صد درجہ پڑھا لکھا ذہین اور فاضل ہے۔ اس کی اپنی ایک شہرت بھی ہے۔ اس کے علاوہ وہ انتہائی وجیہہ، پرکشش اور جاذب نظر بھی ہے۔ سنا ہے کہ ایسے خوبصورت لوگ کم دیکھے گئے ہیں۔"

فروزاں ذرا تیز ہو کر بولی "میں کسی یونیورسٹی سے فارغ نہیں ہوں اور نہ ہی مجھے ذاتی طور پر کتابوں سے واسطہ رہا ہے مگر اتنا جانتی ہوں کہ سبزی فروشوں کی بھی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ سمجھدار اور ناسمجھ۔ اس طرح پروفیسروں کی بھی دو اقسام ہوتی ہیں۔ اچھے اور برے۔ ایک تو وہ ۔ صرف کتابی اور نصابی معلومات رکھتے ہیں۔ کتاب سے ہٹ کر وہ کچھ بھی نہیں ہوتے۔ صفر رہ جاتے ہیں۔ اور گفتگو اور نظریات سے کسی کو متاثر نہیں کر پاتے۔ بس صرف پروفیسر ہوتے ہیں۔ پیشہ ور پروفیسر پروفیسری کرتے ہیں اور بھاری تنخواہیں اٹھاتے ہیں۔ وہ پروفیسر نہ ہوتے تو افسر ہوتے۔ افسر نہ ہوتے تو میڈیکل اسٹور کے مالک ہوتے۔ مگر پروفیسروں کی ایک دوسری

قسم بھی ہوتی ہے۔ یہ کتابوں سے ہٹ کر اپنے آئیڈیا اور نظریات رکھتے ہیں
کتاب نہ ہو تو بھی تدریس کر سکتے ہیں بلکہ وہ کتابیں لکھتے ہیں۔ وہ اپنے
مخصوص ذہنی رجحانات اور میلانات کے سبب تدریس کا پیشہ اختیار
کرتے ہیں۔ ان میں دوسروں کو متاثر کرنے اور اپنا ہم خیال بنانے کی
زبردست صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ میں جس پروفیسر کی اسیر ہوں وہ
نرا پروفیسر نہیں ہے۔ اس کی اپنی ایک شخصیت ہے۔ اس کی نگاہوں میں
مقناطیسی قوت ہے۔ اس کی روح میں گہرائی اور گیرائی ہے۔ وہ زبردست
قوتِ ارادی کا مالک ہے۔ اسے اپنے آپ پر بے پناہ اعتماد ہے۔
وہ جب کہیں موجود ہوتا ہے تو دوسرے لوگ اس کے آگے بونے نظر آتے
ہیں۔ وہ ایک نظر میں عورتوں کی گہرائی تک اتر جاتا ہے۔ وہ لوگوں کے
خیالات کو پڑھ لیتا ہے اور اس سے پہلے کہ بولنے والا کچھ بولے وہ بتا
دیتا ہے کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ اب بتاؤ کیا ایسے آدمی کی پرستش نہیں
کرنی چاہیے۔ کیا اس کی محبت سے کنارہ کش ہوا جا سکتا ہے۔ میں اسے
روح کی پوری گہرائی سے چاہتی ہوں۔ میں اس کی غلام ہوں۔"

اچانک اس نے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا اور خوشامدانہ لہجے میں
بولی۔ "سچ بتاؤ تم کون ہو۔ کہیں تم مجھے دھوکا تو نہیں دے رہی ہو۔ ایسا تو
نہیں کہ تم یہاں سے جانے کے بعد پھر پلٹ کر نہ آؤ۔ یا شاید کامی نے
تمہیں کسی مقصد کے تحت میرے پاس بھیجا ہے۔"

میرا دل فروزاں کی حالت پر کڑھنے لگا۔ میں نے ملائمت سے
اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور اس کا شانہ تھپکتے ہوئے بولی۔ "میں تمہیں دھوکا نہیں
دے رہی ہوں اور نہ ہی میں ڈاکٹر کامران کی طرف سے آئی ہوں، بلکہ میں
تو یہ بھی نہیں جانتی کہ یہ ڈاکٹر کامران ہے کون — صرف اس کا نام ہی سنا
ہے اور تفصیل تمہاری زبانی معلوم ہوئی ہے۔ اگر تم اجازت دو گی تو میں
یہاں اکثر آتی رہوں گی۔ اور جب تم میری طرف سے مطمئن ہو
جاؤ۔ تو دوستی کا ہاتھ بڑھا دینا پھر میں بصد شوق تمہارے اس راز میں
شریک ہو جاؤں گی جسے تم اس وقت اجنبیت اور بیگانگی کے سبب
ظاہر کرنے سے احتراز کر رہی ہو۔"

فروزاں سے ڈاکٹر کامران کے بارے میں کچھ مزید اگلوانا اب ممکن
نہیں رہا تھا۔ اس لیے چلتے وقت ایک دوسرا دن دیا یا غروب کے وقت
میں پرسوں شام کو ملنے کا وعدہ کر کے اس کے گھر سے باہر نکل آئی۔

اگلے دن سے میرے امتحان شروع ہو رہے تھے اور امتحانات
کے درمیان ایک ایک دن کا وقفہ تھا۔ میں نے طے کیا کہ ان وقفوں سے
مزید فائدہ اٹھاؤں گی اور اس وقت تک دم نہیں لوں گی جب تک کہ
فروزاں سے ڈاکٹر کامران کے بارے میں سب کچھ اگلوا نہیں لوں گی۔

دوسرے دن پہلا پرچہ تھا کالج پہنچی تو وہاں لڑکیوں میں ایک
ہنگامہ برپا تھا۔ معلوم ہوا کہ رضا پھر گاڑی سے واپس آ گیا ہے۔ زبیدہ نے
وحشت کے عالم میں بتایا۔ "رضا امتحان دینے کی غرض سے آیا ہے اور ظاہر
ہے ہما بھی امتحان میں شریک ہوگی۔ ہما رضا سے بہت الرجک ہے۔
اب دیکھو کیا ہوتا ہے۔ کہیں کوئی نئی مصیبت نہ ٹوٹ پڑے۔ ہمارے چاروں
کے تو ستارے گردش میں آ گئے ہیں۔"

پروین بھی امتحان دینے آئی تھی۔ یہ اس کی شادی کا دوسرا دن
تھا۔ دو دن میں وہ کھل ڈھل کر خوب نکھر گئی تھی۔ بات بات پر قہقہے لگا
رہی تھی اور شادی گل کی مانند کھلی جا رہی تھی۔ اس نے زبیدہ کو ٹہوکا مارتے
ہوئے کہا۔ "اگر کسی نے رضا کو چھیڑا نہیں تو کیا اسے کسی پاگل کتے نے کاٹا
ہے کہ خواہ مخواہ کسی کو نقصان پہنچائے گا۔"

مہر بھی وہیں موجود تھی۔ نفرت سے منہ بناتے ہوئے بولی۔ "پہلے
بھی اسے کون سے پاگل کتے نے کاٹا تھا جو اس نے ہما کی زندگی تباہ کر
دی مگر تمہیں کیا، تم کیوں نہ رضا کی حمایت کرو گی۔ رضا کی حرکت سے تمہیں
سب سے زیادہ فائدہ پہنچا ہے۔ بلکہ دیکھا جائے تو صرف تمہیں ہی فائدہ
پہنچا ہے۔"

پروین کا بھی موڈ آف ہو گیا۔ دونوں میں باقاعدہ ٹھننے والی تھی کہ
زبیدہ نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔

پروین نے مہر کی طرف سے رخ پھیر لیا اور میری طرف دیکھتے
ہوئے بولی۔ "ہم لڑکیوں کی پرسکون زندگی میں تین ایسے مرد آ گھسے ہیں
جو ہر لحاظ سے عجیب ہیں۔ ان پر بہت سے لیبل چسپاں ہو سکتے ہیں۔ وہ
ابنارمل ہیں۔ نفسیاتی مریض ہیں۔ جنسی ہیجانی ہیں اور جانے کیا کیا ہیں۔ انہوں
نے ہماری پرسکون زندگی کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا ہے۔ ہم دن کے چین اور
رات کے آرام سے بھی گئے۔ انہوں نے ہمیں اس قدر پریشان کیا ہے کہ ہم
میں سے بعض خود اعصابی اور نفسیاتی مریض ہو گئے ہیں۔"

"سب سے پہلے تو اسی واجد کو لو۔" پروین نے ذرا توقف کر کے
دوبارہ بولنا شروع کیا۔ "حالانکہ خاصا پڑھا لکھا اور معقول آدمی ہے مگر
زبردست ڈرامے باز ہے۔ اس نے کس کس طرح ہم لڑکیوں کو پریشان نہیں
کیا ہے۔ مجھے تو اس کی انا اور خودداری پر حیرت ہوتی ہے۔ ہر طرح سے
اس کی حوصلہ شکنی اور دل آزاری کی گئی بلکہ دیکھا جائے تو بے عزتی کی گئی مگر وہ
باز نہیں آیا۔ دوسرا کوئی ہوتا تو میدان چھوڑ کر بھاگ جاتا مگر وہ بے حسی سے
اپنی جگہ ڈٹا رہا۔ جب وہ بالکل مایوس ہو گیا تو بڑی ڈھٹائی کے ساتھ خودکشی
کا ڈھونگ رچایا اور بڑی خوبصورتی کے ساتھ مہر کو بے وقوف بنا کر شادی
کر لی۔"

"اپنے الفاظ واپس لو۔" مہر سیخ پا ہو کر بولی۔ "تم مجھے بے وقوف
اور میرے شوہر کو بے حس اور ڈرامے باز کہہ رہی ہو۔ تم کیسے نفسیاتی

مریض اور ضبطی جنونی کہا ہے۔ آخر تمہیں یہ حق کس نے دیا ہے۔" مہر بہت زیادہ گرم ہو گئی تھی۔

"اوہ۔ بہت حمایت کر رہی ہو شوہر کی۔" پروین طنز کے ساتھ ہاتھ نچاتے ہوئے بولی۔ "یہ وہی شوہر صاحب ہیں نا جو تمہیں دھوکے سے دوست کے فلیٹ میں لے گئے تھے اور تمہاری عزت لوٹنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اور آپ جناب نے ان کے سر پر گلدان توڑ دیا تھا۔ شکر کرو شہباز کا جس نے تمہیں بروقت بچا لیا۔ ورنہ آج آپ جیل میں چکی پیس رہی ہوتیں۔"

غصے کی شدت سے مہر کا جسم تھر تھر کانپنے لگا۔ اس نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا مگر بے تکے انداز میں ہکلا کر رہ گئی۔

"ختم کرو پروین، یہ تم کیا لے بیٹھیں۔" زبیدہ مہر کو ڈانٹتے ہوئے بولی۔ "جو ہونا تھا سو ہو گیا اب گڑے مردے اکھیڑنے سے کیا فائدہ۔"

"پہل مہر نے کی تھی۔ میں تو اس کی طرف متوجہ بھی نہیں تھی۔ میں مینا کی بات کر رہی تھی کہ اس نے مجھے ہما کے منگیتر کا طعنہ دیا اور اکثر دیتی رہتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ میں نے کس طرح ہما کے منگیتر کو چھین لیا ہے اگر میں درمیان میں ٹپک پڑتی تو بے شک مورد الزام ٹھہرتی۔ ہما نے منگنی توڑ دی تھی۔ اس کا منگیتر آزاد تھا۔ میں نہ ہوتی تو ہما کے منگیتر کی زندگی میں کوئی دوسری لڑکی ہوتی کوئی نہ کوئی لڑکی اس کی زندگی میں آتی ضرور۔ پھر اس کے علاوہ جب ہما کو کوئی شکایت نہیں ہے تو مہر کیوں شکایت لے بیٹھی۔ میں نے کوئی واجد سے تو شادی نہیں کر لی پھر یہ کیوں اینٹھی جا رہی ہے۔"

مہر نے کچھ بولنا چاہا تھا کہ زبیدہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا "بھئی بس بھی کرو۔ ہم لوگ یونہی بور ہیں مزید بوریت نہ پھیلاؤ۔"

مہر خوں خوار نظروں سے پروین کو گھور کر رہ گئی۔ پروین اسے نظر انداز کر کے دوبارہ میری طرف متوجہ ہو گئی۔ پروین کی بات اپنی جگہ درست تھی اور وہ جو کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔ اس کا مفہوم میں اور وہاں موجود لڑکیاں بخوبی سمجھ رہی تھیں۔ اس کا اشارہ واجد، رضا اور ڈاکٹر کامران

کی طرف تھا۔ یہ تینوں جیسے بھی تھے ہم سب جانتے تھے۔ یہ تینوں واقعی ہمارے لئے پریشانیاں لاتے تھے اور ہم اکثر ان تینوں کے متعلق گفتگو اور بحث کرتے رہتے تھے ہر ممکن ریمارک پاس کرتے تھے اور کبھی کوئی برا نہ مانتا تھا مگر اس وقت مہر ... گئی تھی ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہی ہو کہ واجد کی حیثیت اب تبدیل ہو گئی تھی اب وہ مہر کا شوہر تھا اور کوئی بھی لڑکی شوہر کے خلاف کچھ سننا پسند نہیں کرتی خواہ وہ کیسا ہی ہو۔ اس خوف سے کہ کہیں پروین رضا اور ڈاکٹر کامران کا ذکر شروع

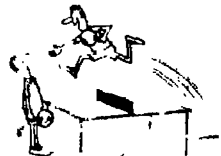


کر دے۔ میں نے لقمہ دینے کے طور پر فوراً کہا "اور بقیہ دو مرد رضا اور ڈاکٹر کامران ہیں واقعی ان دونوں نے بھی ہمیں بہت پریشان کر رکھا ہے۔"

پروین مسکرا کر رہ گئی پھر ملتے ہوئے بولی "اس لحاظ سے میرا شوہر اچھا ہے۔ وہ خوبصورت اور وجیہہ نہیں ہے مگر اس کے ساتھ کوئی کامپلکس بھی نہیں ہے۔"

زبیدہ جواباً اسے کوئی سخت جملہ کہنے والی تھی کہ اچانک کالج کی گھنٹی بج اٹھی۔ امتحان کا وقت ہو گیا تھا گھنٹی کی آواز سنتے ہی لڑکیوں میں کھلبلی مچ گئی۔ ہم سب کالج کے ہال کی طرف چل پڑے۔ ہماری سیٹیں وہیں لگائی گئی تھیں۔ ہمارے آگے پیچھے اور بہت سارے طلبا چل رہے تھے اچانک میری نظر رضا پر پڑی۔ وہ طلبا کے ہجوم میں چل رہا تھا۔ اس نے ایک بوسیدہ اور پرانی برساتی پہن رکھی تھی وہ بہت کمزور نظر آ رہا تھا چہرہ ایک دم سوکھ گیا تھا اور رخساروں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ اچانک ہی اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ چند ثانیوں تک وہ مجھے دیکھتا رہا۔ اس کے دیکھنے کا انداز بڑا تہدیدی تھا جیسے وہ مجھے نگاہوں ہی نگاہوں میں خبردار کر رہا ہو۔ مجھے یوں لگا جیسے میں کسی سانپ سے آنکھیں ملائے کھڑی ہوں اور وہ مجھے بزبان خموشی خبردار کر رہا ہو کہ اگر میں نے اس کا راستہ کاٹنے کی کوشش کی تو بہت برا ہو گا۔ میں نے جلدی سے پلکیں جھپکائیں اور سر جھکا کر دوسری لڑکیوں کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔

چونکہ اس دن ڈاکٹر کامران کا پرچہ تھا اور اس بات کا قوی امکان تھا کہ وہ پرچے کے سلسلے میں ہدایات یا تصحیح کی غرض سے کمرۂ امتحان میں ضرور آئے گا میں نے لباس کے سلسلے میں خصوصی اہتمام کیا تھا اور خوب بن سنور کر آئی تھی اگرچہ میں اس کے گزشتہ رویے اور خصوصاً پروین کی شادی والے دن کے واقعے سے بہت رنجیدہ اور کبیدہ خاطر تھی مگر اس کے باوجود ڈاکٹر کامران کی یاد سے ایک لمحے کے لئے بھی غافل نہیں ہوتی تھی



ڈاکٹر کامران نے اس رات ہما کے ساتھ رقص کر کے اور مجھے مکمل طور پر نظرانداز کر کے شدید دکھ پہنچایا تھا۔ مجھے اتنا رنج پہنچا تھا کہ میں تنہائی میں رو رو پڑتی تھی مگر اس کے باوجود اس کی یاد ایک پل کے لئے بھی میرے ذہن سے محو نہ ہوئی تھی۔ میں جانتی تھی کہ اگر وہ کمرۂ امتحان میں آیا بھی تو پہلے کی طرح نظرانداز کرتا ہوا گزر جائے گا۔ اور میرے دکھوں میں مزید اضافہ ہو جائے گا مگر کیا کرتی اپنے دل کا اور ذہن و دماغ کا کہ وہاں تو صرف اسی کا تصور تھا۔ وہ جتنا جتنا مجھ سے بے نیازی برتتا مجھے ٹھکراتا۔ اتنا ہی میرے دل میں اس کی چاہت، اُس کی طلب بڑھتی جاتی۔ دل کی مجبوری بھی کیسی مجبوری ہوتی ہے کہ انسان سب کچھ جانتے ہوئے اور سمجھتے ہوئے بھی خود کو برباد کر لیتا ہے۔

کاپیاں دی گئیں۔ پرچے بٹے تمام طلبا سر جھکا کر پرچہ دیکھنے میں منہمک ہو گئے۔ پرچہ میرے ہاتھ میں دبا رہا۔ میں نے اس پر نظر بھی نہ ڈالی۔ میرا خیال تھا کہ ڈاکٹر کامران وہاں پہلے سے موجود ہوگا اور کیا پتہ کہ کمرۂ امتحان کا نگراں ہو مگر ایسا نہیں ہوا۔ وہاں کوئی دوسرا پروفیسر تھا۔ میں نے سوچا شاید ڈاکٹر نے اس کمرے میں ڈیوٹی لگوانا پسند نہ کیا ہو اور کسی دوسرے کمرے میں ڈیوٹی دے رہا ہو اگر میرا قیاس درست ہے تو وہ تصحیح یا ہدایات دینے بھی نہ آسکے گا بلکہ یہ فریضہ کسی دوسرے پروفیسر کو سونپ دے گا۔ میں نے یہ سوچا تو میرا سینہ غم واندوہ سے بھر گیا یوں لگا جیسے مجھے بخار چڑھنے والا ہے۔

پرچہ میرے ہاتھ میں ابھی تک دبا ہوا تھا۔ میں نے اسے دیکھا بھی نہیں تھا لکھتی تو کیا لکھتی اور میری حالت ایسی تھی کب کہ کچھ لکھتی۔ میں نے سوچا کہ پرچہ تو خیر کیا لکھ پاؤں گی البتہ امتحانی کاپی پر ڈاکٹر کامران کے نام ایک درد بھرا خط لکھ ڈالوں مجھے معلوم تھا کہ یہ ڈاکٹر کامران کا خاص الخاص مضمون تھا اور وہی اس پرچے کو دیکھے گا۔ یہ سوچ کر مجھے کچھ تقویت ہوئی۔ میں نے قلم اٹھایا اور جملہ لکھنے کی سوچ رہی تھی کہ اچانک کمرۂ امتحان کے نگراں کی آواز سنائی دی۔ وہ بلند آواز سے کہہ رہا تھا "پروفیسر صاحب آ گئے اگر کسی کو سوال وغیرہ کے سلسلے میں کوئی مشکل درپیش ہو تو پوچھ لے"

میں نے نظر اٹھا کر دیکھا اور اس کے ساتھ ہی محسوس ہوا جیسے میرا دل سینہ توڑ کر باہر نکل آئے گا میرا جسم یک لخت بالکل تن گیا پھر یک لخت ایک جھٹکا کھا کر ڈھیلا پڑ گیا میری نظروں کے سامنے ڈاکٹر کامران کھڑا ہوا تھا۔ میں نے جلدی سے نظریں جھکا لیں اور کاپی کے سفید و سادہ صفحے کو گھورنے لگی جس پر ابھی کچھ بھی نہ لکھا گیا تھا۔

چند ثانیے گزرنے کے بعد میں نے دوبارہ نظریں اٹھائیں ہنوز طلبا کے ہاتھ اٹھے ہوئے تھے اور ڈاکٹر کامران ان کے درمیان گھوم پھر کر یکے بعد دیگرے ان کی مشکلات رفع کر رہا تھا۔

جانے کیوں میں خود میں اسے براہ راست دیکھنے کی ہمت نہیں پا رہی تھی کچھ دیر چور نظروں سے اسے دیکھتے رہنے کے بعد میں نے دوبارہ نظریں جھکا لیں۔ میں اب ڈاکٹر کامران کو تو نہیں دیکھ رہی تھی مگر وہ مجسم میرے ذہن میں موجود تھا۔ خدا جانے اس نے مجھے دیکھا تھا یا نہیں اسے اس کمرے میں میری موجودگی کا علم ہو سکے گا یا لاعلمی میں باہر چلا جائے گا۔ بہر حال جو بھی ہوتا جیسے بھی ہوتا مگر کاش وہ اس کمرے ہی میں رہ جاتا تاکہ مجھے ایک طرح کا اطمینان رہتا۔ یہ تصور ہی میرے لئے کافی ہوتا کہ وہ یہاں اس کمرے میں میرے ساتھ موجود ہے۔

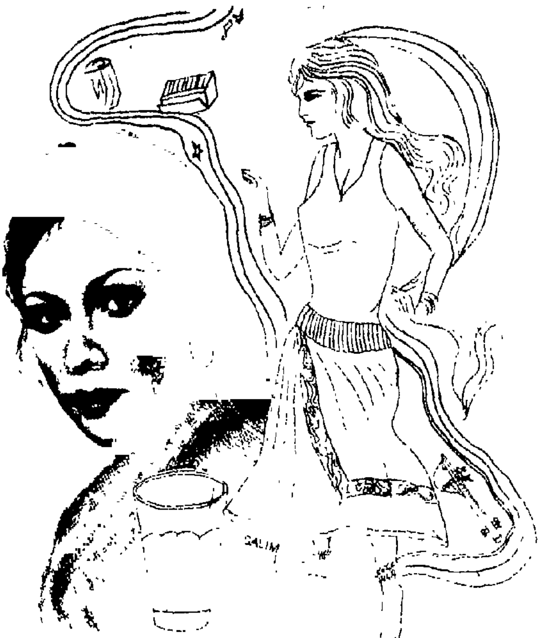
میں سر جھکائے تصور میں ڈوبی ہوئی تھی کہ مجھے اپنے سر پر کسی کے سانس لینے کی آواز سنائی دی۔ میں نے سوچا کہ شاید یہ میرا وہم ہے مگر نہیں یہ میرا وہم نہیں تھا کوئی واقعی میرے قریب سانس لے رہا تھا میں نے مارے وحشت کے ہڑبڑا کر دیکھا۔ ڈاکٹر کامران میرے سر پر کھڑا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے یہ اتنی غیر متوقع بات تھی کہ میں بدحواس ہو گئی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں کیا نہ کروں۔

وہ چند لمحے میرے قریب خاموش کھڑا رہا پھر آہستہ سے جھک کر ہاتھ آگے بڑھا کر میرا قلم اٹھایا اور امتحانی کاپی کے سفید ادھورے صفحے پر کچھ لکھنے لگا۔

میرا سر گھوم گیا۔ خدایا وہ کیا لکھ رہا تھا۔ کیا میری طرف سے امتحانی سوالات کے جوابات لکھ رہا تھا۔ ایک سطر لکھنے کے بعد اس کا ہاتھ رک گیا اور اس نے قلم میز پر ڈال دیا۔ میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس سطر پر نظر ڈالی شکستہ حروف میں لکھا تھا۔ امتحان سے فارغ ہو کر سیدھی میرے گھر پہنچو۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔

★ ★

جذبات کے شعلوں میں
لپٹی ہوئی یہ پُراسرار کہانی
آئندہ شمارے میں
آپ کی حیرت و دلچسپی کیلئے
نیا سامان کر آئے گی!



"آپا! دہی ہے" نفیسہ نے انگلی کا اشارہ کیا اور آپا کی نظریں انگلی کی سمت دوڑ گئیں۔

"لگنے سے مجھے تو نہیں لگتی" آپا نے اُس کی معصوم صورت دیکھ کر ہونٹ بھینچ کر کہا۔

"تمہیں کیا معلوم آپا۔ ان بازاری عورتوں کی صورتیں اسی طرح بھولی بھالی ہوتی ہیں اور کرتوت کم بختوں کے اللہ بچائے" نفیسہ نے اپنی معلومات کا پٹارہ آپا بی کے سامنے کھولتے ہوئے کہا "تم تو ہو ہی سدا کی بھولی آپا کبھی گھر سے نکلو تو پتہ چلے تم تو بس اسکول سے گھر اور گھر سے اسکول کے چکر لگاتی ہو کبھی باہر آیا جایا کرو تب تمہیں معلوم ہو۔ روشن کا میاں تو اس کا یوں دیوانہ ہوا ہے کہ بس کیا بتاؤں۔ نہ گھر بار کی فکر، نہ پیسے کی، کم بخت کا سارا کاروبار ڈبو دیا اس چڑیل نے۔"

نفیسہ ابھی سانس لینے کو رکی تھی کہ دھڑاک سے دروازہ کھلا۔ نجو جھلاتی ہوئی چارپائی پر یوں آن گری جیسے دس من کی لاش۔ "ہائے تجھے کیا ہوا؟" آپا نے چارپائی کا جائزہ لے کر اطمینان کا سانس لے کر کہا جس انداز سے نجو آکر پڑی تھی وہاں لوہے کا بھی پلنگ ہوتا تو ٹوٹ جاتا۔ یہ آپا کی نیک کمائی تھی تبھی تو چارپائی بچ گئی۔ توبہ یہ تو جیسے بارہ من کی دھوبن ہو گئی۔

مرد کو کیسے پھانسا جاتا ہے؟

پیاسی

طارق رشید لودھی

"وہ۔ وہ" سکی گرفت کے پھاٹنے بلی بلی کر اپنی داستان شروع کی " پچھلے ہفتے سے انور دیر سے گھر آتے ہیں۔ کہتے تھے کہ دفتر میں زیادہ کام ہوتا ہے لیکن کل رات میں نے خود اس چڑیل کے گھر سے نکلتے دیکھا ہے " اب تو ہچکی سسکیاں تیز ہونے لگیں اور بھابی کی ہچکی بندھ گئی۔ آپا بی نے تسلی دینے لگیں اور نفیسہ پانی کا گلاس لے آئی۔ بیچاری شادی سے پہلے کتنی اسمارٹ ہوتی تھی۔ ابھی تین سال بھی نہیں گزرے کہ بارہ من کی دھوبن بن گئی ہے اور انور تو پہلے سے بھی چھوٹا لگتا ہے " نفیسہ نے تاسف سے سوچا ٹن ٹن ٹن برآمدے میں لگے ہوئے گھڑیال نے تین کا گجر بجایا تو نفیسہ چونک اٹھی " چلو اٹھو۔ جواب صبر کرو۔ ایک تمہارا شوہر ہی نہیں محلے کے سارے مرد اس کے دیوانے ہیں۔" آپا بی کس کس کے آنسو پونچھیں " وہ دونوں کو روتا چھوڑ کر افسردگی سے چل دیں۔ یہ وقت آپا کے ٹیوشن پڑھانے کا تھا۔

آپا بی اس محلے میں رہنے والے سبھی لوگوں کی آپا بی تھیں۔ کسی کے گھر رشتہ آیا ہے تو رشتے کے لئے آپا بی۔ کسی کے ہاں بچہ ہوا ہے تو نام کی فال کے واسطے آپا بی۔ وہ ہر درد کی دوا تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس جاہلوں کے محلے میں آپا بی گورنمنٹ اسکول میں استانی لگی ہوئی تھیں مہنگائی بڑھنے لگی تو شام کے وقت ٹیوشن بھی پڑھانے لگیں۔ محلے کی لڑکیاں آجاتی تھیں۔ یوں آپا بی کی اچھی خاصی گزر ہو رہی تھی۔ ویسے تو آپا بی بہت سارے مسئلوں کے حل چٹکی بجاتے بتا دیا کرتی تھیں لیکن اب جو چھ ماہ سے محلے میں نیا مسئلہ اُٹھا ہوا تھا اگر وہ دس ہزار چٹکیاں بھی بجاتیں تو وہ حل نہ ہوتا۔ ہوا یوں کہ قریشی صاحب نے شہر سے باہر اپنی کوٹھی بنوائی تو اپنے محلے والا مکان چھوڑ کر خود نئی کوٹھی میں منتقل ہو گئے اس مکان میں نئے کرایہ دار آئے تو سب محلے والوں کو تجسس ہوا کہ کیسے لوگ آئے ہیں۔ پہلے جہیز کا سامان کیا آیا محلے والوں کی جیسے آنکھیں پھٹ گئیں۔ دو فریج، رنگین ٹی وی، فوم کے پلنگ، صوفے، ایرانی قالینچے، چاندی کے جھلملاتے ظروف۔

"مجھے کوئی نواب لگتے ہیں "

"سنتے ہیں کوئی سابقہ فلم ایکٹریس ہے "

"اسمگلر لگتے ہیں اتنا سامان بھلا کوئی ایماندار آدمی اپنی کمائی سے خرید سکتا ہے " آپا بی کے صحن میں جمع ہوئی عورتیں اپنی اپنی رائے دیتی رہیں اور پھر کرائے دار بھی آ گئے۔ ایک بڑی بی جو اکثر سودا لینے کے لئے بازار بھی جاتی نظر آتیں۔ وہ بہت کم گو تھیں اور ایک سرخ آنکھوں اور بڑی بڑی مونچھوں والا پٹھان مرد۔ جو چوکیداری سنبھالے ہوئے تھا اور تیسری ہستی وہ خود فتنہ گر تھی جس نے محلے والیوں کے سکون کو ڈس لیا تھا۔ بیویاں اپنے شوہروں کو یوں چھپانے لگیں جیسے مرغی اپنے بچوں کو چیل سے بچا کر رکھتی ہے۔ اُن کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھتیں۔ کوٹ، پتلون کی جیبیں ٹٹولتیں کہیں اس چڑیل کا رقعہ تو نہیں لکھا ہو۔ موؤں کے گھر آنے کا وقت ہوتا تو خود بن ٹھن کر بیٹھ جاتیں۔ وہ دوپٹے والی سرخی، بہار پہ دہلا دینے والا پاؤڈر کا ڈبہ اب ہر گھر میں دیکھا جانے لگا لیکن اُن موؤں کا کیا کیجئے۔ جو پھر بھی ادھر اُدھر منہ مارنے سے باز نہیں رکھے جا سکتے کہتے ہیں نا کہ پڑوسیوں کے تھوڑ زیادہ ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ سدھانے کے بجائے اپنی پڑوسن کے پاس چوری چھپے جانے لگے۔ اس بازار یکتا حسین کا کرایہ پانچ دس روپیہ بنتا تھا اللہ ڈرائیونگ کی ٹیپ اسی لیے ان کی تو اب گویا چپت ہی چپت تھی۔ بات اُن موؤں تک ہی رہتی جو شروع سے ہی نظر باز تھے تو ٹھیک تھا لیکن جب محلے کے چوکیدار نے پارسیش مولوی صلاح الدین صاحب کو ایک صبح پو پھٹنے پر اُس رنڈی کے گھر سے برآمد ہوتے دیکھ لیا تو جیسے زلزلہ آ گیا۔

"میرے میاں کوئی ایسے ویسے تو نہیں ہیں۔ میرے سوا وہ کسی اور کو ہاتھ لگا ہی نہیں سکتے۔ وہ تو اُس کو سمجھانے گئے تھے کہ یہ گناہ والی زندگی چھوڑ دو نہیں تو جہنم کی آگ میں جلو گی "۔ ان کی بیوی نے لاکھ صفائی پیش کی، لیکن سننے والے اتنے معصوم تو نہیں تھے۔ رات سے لے کر صبح تک بدی کا سبق تو دیا جا سکتا ہے لیکن نیکی کا نہیں۔ اور آپا بی کو اس وقت شاک سا لگا جب ملانی اس کے سامنے پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

آپا بی۔ وہ کم بخت تو کئی دنوں سے اس چڑیل کے پاس جا رہا تھا کل صبح چوکیدار نے دیکھا تو سب کو معلوم ہوا۔ شادی سے پہلے بھی کئی گل کھلا چکا ہے۔ میں اس کے عیبوں پر کب تک پردہ ڈالوں گی "

ہائے بے چارہ صلاح الدین کیا وہ مرد نہیں۔ کیا وہ نہیں چاہتا کہ گندم کی روٹی تو روز روز کھاتا ہے کبھی بیسن کی چٹ پٹی روٹی کھائے کچھ عرصے کے بعد سات لڑکیوں کے باپ پروفیسر زاہد بھی منہ کا ذائقہ بدلنے آئے تو سب عورتوں کو قرب قیامت کی نشانیاں نظر آنے لگیں۔ "آپا بی آپ ہی جا کر سمجھا دیں اس چڑیل کو شریف لوگوں کو تو یہ نہ خراب کرے " ان کا اشارہ مولوی صلاح الدین اور پروفیسر زاہد کی جانب تھا جیسے یہ خواتین اور گھاگ مرد بھی۔ دوشیزہ ہو سکے تو کوئی مرد انہیں خراب کر دے گا۔

"میں ؟" آپا بی بدک گئیں " نہ بابا وہ بگڑی ہوئی عورت نجانے کیا کہہ دے "

"ہائے آپا بی ثواب کا کام ہوگا۔ کئی گھر اجڑنے سے بچ جائیں گے آپ جیسی پڑھی لکھی عورت کی بات وہ مان لے گی۔ ہم جاہلوں کو تو بات کرنے کا ڈھنگ بھی نہیں آتا۔ جو منہ میں آئے گا بک دیں گے اور وہ اور بدک جائے گی " ملانی نے آپا بی کو سمجھایا۔ پورے محلے کی واحد پڑھی لکھی عورت تھیں اُن سے اچھا اخلاقی درس بھلا اور کون دے سکتا تھا آپا بی مان گئیں۔

آپا بی۔ ملانی اور محلے کی چند چار عورتیں پاس ساحرہ کے ڈرائنگ

دم ہی بیٹھی تھیں۔ ایسا سانولا سلونا کہ کچھ پوچھو نہ۔ جھاگ جیسے غالیچے جہاں پاؤں پڑتے دھنس دھنس جاتے۔ نرم کہ گداز صوفے کہ ایک مرتبہ بیٹھو تو دوبارہ اٹھنے کو جی نہ چاہے اور وہ خود سادہ سی ساڑھی باندھے آپا بی کے سامنے والے صوفے پر بڑے وقار سے بیٹھی تھیں۔ سہانے آپا بی کی تواضع سے آپا بی نے منع کر دیا تھا۔ حرام کی کمائی وہ کیسے منہ لگاتیں۔ کچھ دیر کی ناگوار خاموشی کے بعد جب آپا بی نے ساری بات اس کے سامنے رکھی تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ غالیچے کے سارے پھول ہنسے کھلکھلا دیئے۔ "آپ کتنی بھی سیدھی ہیں۔ اس گناہ کی زندگی کو چھوڑ دوں۔ میں کب نہیں چاہتی کہ میرا بھی چھوٹا سا گھر ہو، پیار کرنے والا شوہر، پیارے پیارے بچے۔ لیکن یہاں کے لوگ کیسی لڑکی کو بیٹنگ سمجھتے ہیں۔ سونگھتی ہے تو کاٹ دیتے ہیں اور کتنی بے توقیر کیے جاتے ہیں۔ میں نے شریف رہنے کی کوشش کیا نہ کی ہو گی؟ باپ کے مرنے کے بعد چھوٹے بہن بھائیوں کا پیٹ پالنے کے واسطے گھر سے نکلی تو کسی نے میری میٹرک کی سند نہیں دیکھی، سب نے میری جوانی کو تاکا۔ نوکری کے لئے سفارش مانگی یا میرا جسم۔ میں نے سوچا تین چار سو کی نوکری کروں اور جسم بھی بیچوں، کیوں نا ڈالوں نوکری کی کھلی رشتی کیوں نہ ہی جاؤں "پھر ہم تو بازار میں سجے ہوئے کھلونے ہوتے ہیں۔ خود خریدار چل کر یہاں خریدنے آتے ہیں۔ ہم خود چل کر تو نہیں جاتے۔"

دوسروں کو قرآن مجید اور احادیث کی مثالیں دے دے کر اپنی بات منوانے والی آپا بی ایک منتھی کے آگے لاجواب ہو گئیں۔ آپا بی کو چپ ہوتے دیکھ دوسری عورتوں کے حوصلے بھی پست ہو گئے۔ گویا سب نے ہتھیار ڈال دیئے وہ بے دلی سے اٹھ آئیں۔ آپا بی گھر پہنچیں تو نسیم کا تار آیا تھا۔ کل کی ٹرین سے آ رہی تھی اپنے میاں راشد کے ساتھ۔ "راشد آ رہا ہے" انہوں نے آہستہ سے اپنی سفید لٹ آئینے میں چھپاتے ہوئے کہا۔ آج سے آٹھ نو سال پہلے کی یہ بات ہوتی تو ان کا سانولا رنگ سرخ پڑ جاتا اور سینے میں ہلچل سی مچ جاتی لیکن بالوں پر پڑی ہوئی وقت کی سفید برف نے ان کا دل بھی سرد کر دیا تھا۔ نو سال پہلے آپا بی صرف شمیم تھیں۔ ان سے چھ برس چھوٹی نسیم اس کے بعد تو جیسے بھائیوں کی ایک لمبی قطار لگی ہوئی تھی۔ اماں ابو تو دیکھنے میں دھان پان سے تھے لیکن بچوں کی تعداد بڑھانے میں وہ کمال کی قدرت رکھتے تھے۔ ابھی ایک اماں کی گود سے اترتا تو دوسرا پیٹ میں ہاتھ پیر مارنے لگتا۔ اور اماں یوں نخرے کرتیں جیسے کسی ریاست کی مہارانی پہلی مرتبہ ماں بننے والی ہے۔ سارا دن پلنگ پر پڑے پڑے شمیم اور نسیم پہ آرڈر چلاتیں، پھولوں کو کوسنے دیتیں۔ ابا آتے تو ان سے الگ نخرے اٹھواتی تھیں۔ اور ابا ان کے یوں ناز اٹھاتے جیسے ان کا ہی دل بس پڑے ہو خود سگریٹ نہ پیتے۔ اماں کے واسطے کتنی نارنگیاں، مالٹے اور فالسے منگوا کر لاتے۔ جب گیارہواں بچہ پیدا ہوا اماں کی کمر جھک گئی اور ابا ریٹائر ہو گئے۔ بھلا پنشن میں کیا گزارا ہوتا۔ شمیم نے ان دنوں میٹرک کیا تھا۔ ابا کے دوست نے اسے ایک اسکول میں نوکر رکھوا دیا۔ پہلے پہل اماں نے بڑی واویلا مچائی لیکن جب تنخواہ کے ڈھائی سو ہاتھ پر رکھے تو وہ ریت کی دیوار کی طرح ڈھے گئیں۔

بے پردگی اور عورتوں کی نوکری کے خلاف بولنے والے ابا اب تعلیم نسواں اور عورت کی آزادی کے حق میں دلائل دے کر سننے والے کو قائل کرنے لگے۔ کئی رشتے بھی آئے۔ لیکن ابھی تو بیری شمیم چھوٹی ہے کہہ کر ٹال دیئے گئے۔ جس باپ کی بیٹی کماتی ہو۔ اسے اتنی جلدی بھلا کیسے بیاہا جا سکتا ہے۔ شمیم بھی اپنے آپ کو عمر بھر کنواری ہی سمجھتی رہتی اگر خالہ کے لاڈلے بیٹے راشد نے آ کر رنگین سپنے نہ دکھائے ہوتے۔ وہ دو سال سے بی اے کئے ہوا تھا۔ اپنے شہر میں جوتیاں گھسا کر بھی نوکری نہ ملی تو شمیم کے شہر آ پہنچا۔ اماں نے کلیجے سے لگایا آخر اپنا خون تھا۔

"شمیم جی! تمہاری آنکھیں ہیں یا جھیل کے کنول۔ بالوں کو کھلا چھوڑا تو لگتا ہے جیسے گھٹا چھا گئی ہو۔" کہتے ہوئے راشد کے یہ جملے اس کے کانوں میں مسرت ٹپکانے لگے تو وہ بوکھلا گئی۔ ہائے اس انداز سے تو کسی نے بھی اسے نہ سراہا تھا۔ اس کے سینے میں ہلچل سی ہونے لگتی۔ راشد کو تین مہینے ہو گئے تھے شمیم کے گھر کی روٹیاں توڑتے ہوئے پر نوکری نہیں ملی۔ لیکن شمیم اپنی ضرورت کا گلا گھونٹ کر اس کے لئے کبھی بش شرٹ کبھی پینٹ پیس لے آتی۔ دل میں گدگدی کرنے والے جملوں کی یہ قیمت بہت کم تھی۔ جب اماں نے یہ رنگ ڈھنگ دیکھے تو ماتھا ٹھنکا۔ یہ کمانے والی مشین تو ہاتھوں سے نکل جا رہی تھی۔ "ارے شمیم اس موٹے مسٹنڈے کو کب نوکری ملے گی۔ ہم کسی کے گھر تین دن رہیں تو شرم آنے لگتی ہے۔ اس بے شرم کو تو پورے تین ماہ ہو گئے ہیں۔ ہمارا گھر جیسے ہوسٹل ہو اور شمیم ملازمت دلانے کا ادارہ۔ اس کے اپنے اتنے بڑے شہر میں نوکری نہ ملی تو یہاں کیا خاک ملے گی؟" اماں بڑبڑاتے وقت ذرا نہیں سوچتیں کہ راشد ان کی بہن کا بچہ ہے مگر شمیم کے سینے میں جیسے تیر سا لگتا۔ "امی بے چارہ مجبور ہے۔ نوکری مل گئی تو اپنا بندوبست کر لے گا۔" پھر نہ جانے کس گھڑی کی دعا تھی کہ راشد کو نوکری مل گئی جس دن راشد نے اس کو خوش خبری سنائی۔ وہ خالہ رحمت کے ہاں میلاد میں جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ ابھی مانگ نکال ہی رہی تھی کہ اچانک کالی گھٹاؤں سے سفید سی بجلی چمکی ہو۔ "شمو تمہارے تو بال سفید ہو رہے ہیں۔" راشد ہکلایا اور شمیم کے ہاتھ سے کنگھا گر پڑا۔ اسے تو معلوم ہی نہیں ہوا کہ میں تیس برس کی ہو گئی ہوں۔ ابا تو کہتے تھے ابھی تو ہماری شمیم چھوٹی ہی ہے خود کمانے لگی اور کمائے گی ہم پر بوجھ تھوڑی ہے۔ ہائے! کاش تم کہہ سکتے کہ بیٹی تو بوجھ ہوتی ہے چاہے وہ کمائے نہ کمائے اس کو جتنی جلدی اتار سکو اتار دینا چاہیئے مگر اب یہ بوجھ اتنا بھاری ہو گیا تھا کہ راشد نے اٹھانے سے انکار کر دیا۔ "یہ راشد بدل گیا ہے یا اس کا وہم ہے۔" اس دن کے بعد

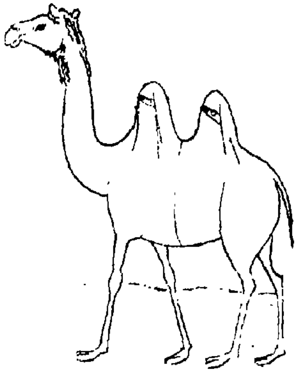
شمیم نے سوچا تیسرے سے منہ بات ہی نہیں کرتا۔ کچھ دنوں بعد وہ شوہر سے شمیم آپا بن گئی تھی پھر انہوں نے نسیم کو مسکراتے گالوں پر گلاب کی سرخی لئے دیکھا اور راشد کو چھیڑ چھاڑ کرتے۔ سینے میں جیسے کوئی چیز اٹک گئی۔ وہ خاموشی سے دست بردار ہو گئیں اور نسیم ڈولی میں بیٹھ کر راشد کے ہاں چلی گئی۔

"بہن پہلے بڑی کی شادی ہوتی پھر چھوٹی کی۔ یہ تم نے کیا کیا؟" مجھے کی نانی خالہ نے آکر ٹوکا تو اماں منے کے منہ میں دودھ ٹھونستے ہوئے بولیں "اسے تو بہت کہا کہ تمہاری شادی کر دیتے ہیں لیکن یہ کہتی ہے کہ پہلے سب کے فرض پورے کر لوں پھر سوچوں گی۔" نانی خالہ نے دکھ اور ہمدردی کے ملے جلے جذبات سے اسے دیکھا۔ وہ کاپیاں درست کر رہی تھی اس کے ہاتھ بھولے ہوئے کانپ رہے تھے۔ یہ بات سن کر وہ گھٹ گھٹ کر رہ گئی اور جب سب کے فرض پورے کر دیئے تو اس کو معلوم ہوا کہ وہ اکیلی ہے۔ بہن سسرال میں بس گئی۔ آدھے بھائی گھر سے چلے گئے۔ باقی شادی شدہ زندگی میں مگن ہو گئے۔ ابا، اماں مر کھپ گئے اور وہ بھرے گھر میں تنہا ہو گئی۔

تین زندگیوں کی آواز پر جیسے جاگ سی گئیں۔ "آپا، آپا" نسیم اس کے گلے میں جھول گئی اور راشد پرے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ وہ آگے بڑھا اور سعادت مندی سے سر جھکا دیا تو آپا بی کو اس پر ہاتھ پھیرنا پڑا۔ یہ مرد کتنے سنگدل ہوتے ہیں مطلب کے وقت عورت کو دنیا کی حسین ترین عورت بنا دیتے ہیں مطلب نکل جائے تو کیسی نظریں پھیر لیتے ہیں۔

فجر کی نماز کے بعد وہ دم بخود تھکے ان کے کمرے میں داخل ہوئیں تو جیسے ان کے وجود پر زلزلہ سا آگیا۔ راشد نسیم کے ساتھ لیٹا ہوا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ نسیم کی کلائیاں پکڑ کر کے گرد تھا اور چہرہ نسیم کے بالوں میں چھپا ہوا تھا۔ نسیم کا سر اس کے بالوں بھرے سینے پر رکھا تھا۔ لحاف ذرا سا کھسکا ہوا تھا۔ دم تو وہ کیا کرتیں یہ نظارہ دیکھ کر خود بے دم ہو گئیں۔ ایسا پیار بھری زندگی کے سپنے انہوں نے بھی تو دیکھے تھے۔ لیکن جب شادی نہ ہوئی تو یہ کہہ کر تسلی کر لی کہ کیا ہوا پہلے بھی تو لوگ جیتے ہیں۔ لیکن ان کو اب معلوم ہوا کہ عورت تو مرد کے بغیر نامکمل رہتی ہے۔ وہ تو نازک سی بیل ہوتی ہے جسے چڑھنے کے لئے آہنی بدن سے لپٹ کر ہی مضبوط سہارا ملتا ہے۔ ان کا دم الجھنے لگا اور الٹے پاؤں اپنے کمرے میں آ کر بستر پر گر گئیں۔ ابھی سوچ نہیں رکی تھی وہ آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرتیں تو ساتھ والے کمرے کا خوابگاہوں کے سامنے آ جاتا پھر سدا کی ڈرپوک اور دنیا کی باتوں سے ڈرنے والی آپا کے اندر کا ستون دھم سے گر گیا اور صرف عورت بن گئیں

صبح ناشتے کے وقت جب نسیم غسل کر کے نکلی تو آپا بی کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ سفید بالوں کو زندگی کا اعزاز قرار دینے والی آپا بی خضاب بالوں پر تھوپے بیٹھی تھیں۔

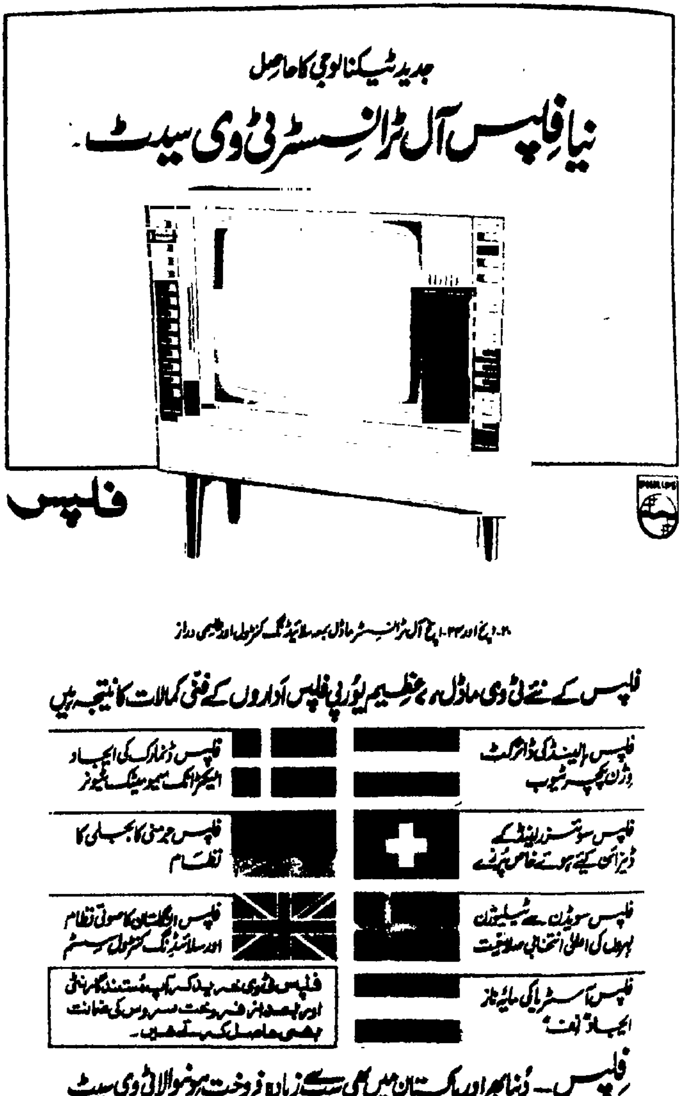


ان کے اسکول کا پچاس سالہ کلرک رنڈوا تھا۔ کئی مرتبہ آپا بی اور دیگر استانیوں نے پوچھا تھا "بابو جی آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے؟" وہ ہنس کر جواب دیتا "بھلا اس عمر میں کون مجھے اپنی لڑکی دے گا؟" یہ کہہ کر وہ ٹھنڈی سانس لے کر اپنی فائل پر جھک جاتا لیکن آج آپا بی نے اس کی ٹھنڈی سانسوں کو گرم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ "تمہارا میک اپ بکس کہاں ہے؟ نسیم ذرا کریم لگانی ہے۔ جلد ٹھیک رہتی ہے۔" اور جب وہ آئینے کے سامنے سے ہٹیں تو کریم کے ساتھ روج کا عمل اور لپ اسٹک بھی ان کے چہرے پر چمک رہا تھا۔ سب سے پہلے وہ اسکول کے اسٹاف روم میں جانے کے بجائے کلرک کے کمرے میں پہنچیں تو وہاں صرف چپراسی اونگھ رہا تھا۔ "بابو جی کہاں ہیں؟" وہ پھولتے سانسوں سے بولیں۔

"جی آج ان کا نکاح ہے۔ اس لئے وہ چھٹی کریں گے۔" چپراسی نے سادگی سے جواب دیا اور آپا بی کا میک اپ پسینہ بن کر بہنے لگا۔

آج پھر وہ زندگی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ اس دن وہ نفیسہ اور علائی وغیرہ کے ساتھ تھیں پر آج وہ اکیلی تھیں۔ وہ انہیں دیکھ کر ذرا جھجک سی گئی کیونکہ آپا بی کی اس دن کی باتوں سے گھبرانے لگی تھی۔ جلدی سے بولی "قسم لے لیجئے اس دن کے بعد کبھی میں نے آنکھ اٹھا کے مرد کو نہ دیکھا" وہ اپنی صفائی پیش کرنے لگی۔ آپا بی نے اسے غور سے دیکھا اور اپنے صوفے سے اٹھ کر اس کے پاس بیٹھ گئیں پہلے ذرا ہچکچائیں پھر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولیں "صرف اتنا بتا دو کہ مرد کو پھانسا کیسے جاتا ہے؟"




جدید ٹیکنالوجی کا حاصل
نیا فلپس آل ٹرانسسٹر ٹی وی سیٹ
فلپس
۲۰ انچ اور ۲۴ انچ آل ٹرانسسٹر ماڈل بمعہ سلائیڈنگ کنٹرول اور قلمی دراز
فلپس کے نئے ٹی وی ماڈل ہر عظیم یورپی فلپس اداروں کے فنی کمالات کا نتیجہ ہیں
فلپس ہالینڈ کی ڈائرکٹ وژن پکچر ٹیوب
فلپس ڈنمارک کی ایجاد الیکٹرانک میمو میٹک ٹیونر
فلپس سوئٹزرلینڈ کے ڈیزائن کیئے ہوئے خاص پہئے
فلپس جرمنی کا بجلی کا نظام
فلپس سویڈن سے شیلیڈن پرزوں کی اعلیٰ انتخابی صلاحیت
فلپس انگلستان کا صوتی نظام اور سلائیڈنگ کنٹرول سسٹم
فلپس آسٹریا کی مایۂ ناز ایجاد ٹیونر
فلپس ٹی وی خرید کر آپ مستند گارنٹی اور بعد از فروخت سروس کی ضمانت بھی حاصل کر سکتے ہیں۔
فلپس۔ دنیا بھر اور پاکستان میں بھی سب سے زیادہ فروخت ہونیوالا ٹی وی سیٹ





ویڈیو

حمایت علی شاعر

عظمت عزمی

ایک شخص ہے......
جو سمندر کی نرم نرم سیپی بھری لہروں کی مانند اپنے اندر لعل و گہر چھپائے بیٹھا ہے۔
ایک شخص......
جس کے نام کی تختی لفظوں کی دنیا کی ہر گلی میں آویزاں ہے۔
ہاں ــــ وہ شخص ایک ایسا بہت شاعر ہے جس کے نقشِ کفِ پا کے سہارے کل کئی کارواں اپنی منزل پانے نکلیں گے۔ اسے میں نے بھی دیکھا ہے اور آپ بھی جانتے ہیں۔ ہاں جی ــــ وہ ہے جناب حمایت علی شاعر۔

جب میں حمایت علی شاعر کا نام سنتی ہوں تو لوگ ہاں آنکھوں میں شناسائی کے رنگ بھر کر کہتے ہیں کہ ارے وہی حمایت علی شاعر جو کسوٹی کے میزبان ہیں۔ ہاں حمایت علی شاعر "لفظ ساز اور اداکار" ہاں سامنے حمایت علی شاعر کو تو ہونے کی دیکھا ہے ما آتا ہے ٹی وی پر ــــ وہی جس کے بال بار بار ماتھے پر آجاتے ہیں۔

میں یہ سب کچھ سنتی ہوں اور مسکرا دیتی ہوں، بار بار پیشانی پر جھک آنے والے بالوں کو ایک ادا کے ساتھ جھٹکنے والے شاعر کا چہرہ واقعی ہر شخص کیلئے شناسا ہے اور آج میں اس شناسا چہرے کے محو خیال میں رہنے بسنے والے اس شاعر سے آپ کی ملاقات کرواتی ہوں جو ایک مہان شاعر ہے جس کی شاعری کا آغاز اسکول کی زندگی سے ہوا۔ یہ ۱۹۴۵ء کی بات ہے۔ گھر کا ماحول خاص مذہبی تھا اور اس مذہبی ماحول میں بہ گری سے تعلق رکھنے والے خاندان کے ایک لڑکے حمایت علی نے اپنے اندر کی آواز کو بڑے لطیف سادہ اور معصوم انداز میں لفظوں کا روپ دیا تو گھر والے مسکرا پڑے۔

"ادھو ــــ شاعر صاحب ــــ یہ لیجئے، ایک اور شاعر آ گئے دنیا میں ــــ یہ منہ اور شاعری!!" ایک لفظ شاعر تھا جو حمایت علی کے پیچھے کوڑے کی طرح دوڑ پڑا ــــ لیکن حمایت علی کی طبیعت بھی بڑی عجیب تھی ایک دن حمایت علی نے تعاقب کرنے والے اس لفظ کو پلٹ کر دیکھا اور بھاگنے کا قائل ہونے کے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

اب حمایت علی، صرف حمایت علی نہیں، حمایت علی شاعر تھا

"شاعر صاحب یہ بتائیے، آپ نے شروع میں صرف شاعری کی یا کچھ اور بھی لکھا" میں نے حمایت علی شاعر سے سوال کیا تو وہ ماضی کے ورق پلٹتے ہوئے بولے۔

ــــ "نہیں میں نے شروع میں صرف شاعری نہیں کی، افسانے بھی لکھے اور یہ افسانے مختلف رسائل میں شائع بھی ہوئے۔ مثلاً بمبئی سے نکلنے والے رسالے ہفت روزہ "نظام" اور "شاعر" وغیرہ میں"

ــــ "اچھا، یہ بتائیے ان دنوں آپ کا انداز فکر کیا تھا؟"

ــــ "یہ تو میں آگے ہے ــــ فرق صرف اتنا ہے کہ ان دنوں میں جذباتی زیادہ تھا، ظاہر ہے کہ وہ میری عمر کا تقاضہ تھا۔ لیکن یہاں



تک زندگی کے بارے میں میری فکر کا تعلق ہے، وہ ہمیشہ ترقی پسندانہ رہا ہے۔ میرے ابتدائی دور کے افسانے ہوں یا شاعری یا وہ ڈرامے جو میں نے بہت بعد میں لکھے ہیں۔"

"اچھا۔ آپ نے ڈرامے بھی لکھے ہیں؟ یہ تو نیا انکشاف ہے"

—— "میں نے ریڈیو کی سروس کے زمانے میں بہت ڈرامے لکھے، منظوم بھی اور منثور بھی، یہ اور بات کہ میں نے انہیں آج تک کہیں نہیں چھپوایا۔ صرف ایک منظوم ڈرامہ ۱۹۶۵ء میں "فنون" کے خاص جنگی نمبر میں شائع ہوا تھا۔ اور یہ بھی عرض کر دوں کہ میرے ڈرامے، عام ڈراموں سے قدرے مختلف بھی ہیں —— بہرحال میں اپنے ڈراموں کے بارے میں خود کیا کہوں، جب چھپ جائیں تو رائے قائم کر لیجئے۔"

—— "آپ نے ابھی ابھی کہا کہ زندگی کے بارے میں آپ کا نقطۂ نظر ترقی پسندانہ ہے۔ کیا میں یہ سمجھ لوں کہ آپ سوشلسٹ ہیں؟"

—— "سوشلسٹ اور کمیونسٹ کی اصطلاحوں میں نہ الجھئے۔ حیات و کائنات کے جدلیاتی عمل کے شعور کا نام ترقی پسندی ہے۔ اور یہ شعور، تاریخ کے مادی نظریے کی روشنی میں، بلا شبہ کارل مارکس سے ملا ہے۔ وہی کارل مارکس جس کے بارے میں علامہ اقبال کہتے ہیں

نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب

میری شاعری میں بھی روشنی اسی کتاب سے آئی ہے ——
خیر یہ ایک طویل بحث ہے اور اس میں بعض بڑے نازک مقام آتے ہیں۔ اور مجھے ہر لمحہ یہ خیال ہے کہ

انہیں ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

"اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ بہت حساس آدمی ہیں"

"حساس نہ ہوتا تو شاعر کیسے ہوتا"

—— "مگر —— ہمارے معاشرے میں شاعر ایک بے عمل آدمی کا نام ہے۔ اور جہاں تک مجھے علم ہے، آپ نے ایک عملی آدمی کی طرح زندگی گزاری ہے۔ زندگی کے کئی محاذوں پر معرکہ آرا رہے ہیں۔"

—— "یہ درست ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ صدی، عملی آدمی کی صدی ہے —— خواب دیکھنے والے آدمی کو اسی وقت شکست فاش ہو گئی تھی جب دنیا میں صنعتی انقلاب آیا۔ یوں تو عملی آدمی نے، خواب دیکھنے والے آدمی کو پہلی شکست اس وقت دے دی تھی جب اس نے پہلا تخلیقی کام انجام دیا تھا۔ جب اس نے اپنے تحفظ کیلئے پتھر کا اوزار بنایا تھا، جب اس نے اپنی پناہ کیلئے دھرتی کی کوکھ سے غار پیدا کیا تھا۔ موجودہ صدی کے آتے آتے عملی آدمی نے اوٹ پٹانگ خواب دیکھنے والے آدمی کی باگیں کھینچ لیں اور اسے بھی عمل کا پابند کر دیا۔ میرے عملی ہونے میں ہی وقت کا بھی تقاضہ کارفرما ہے۔

—— "لیکن اس طرح آپ کی شاعری کو نقصان بھی پہنچا ہوگا۔"

—— "ہاں اگر میرا عمل بے راہ روی کا شکار ہوا تو یقیناً نقصان پہنچا —— ویسے شعر کہنا خود ایک عمل ہے اور عمل کا شعور رکھنے والا شاعر میرے خیال میں کبھی نقصان میں نہیں رہتا۔ وہ ایک ماندگی کے وقفے سے ضرور گزرتا ہے مگر پھر گرم سفر ہو جاتا ہے۔

یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

"میں نے کہیں پڑھا تھا کہ آپ نے وقت سے نبرد آزما ہونے کی خاطر، کسی زمانے میں ہاکر کی طرح اخبار بھی بیچے۔"

—— "جی ہاں —— ایک وقت ایسا بھی آیا تھا۔ دراصل میں محنت پسند آدمی ہوں، اور محنت کے معاملے میں کسی تخصیص کا قائل نہیں ہوں۔ میرے سامنے میرے پیغمبر کی مثال ہے۔ میں ہمیشہ یہ سوچتا ہوں کہ میں ایک غریب ملک کا باشندہ ہوں، ایسے غریب ملک کا جس کے ۹۰ فیصد لوگ بازار میں بکنے والے کپڑوں سے بہ مشکل تن ڈھانپتے ہیں۔ ایسے ملک کے کسی آدمی کو زیب نہیں دیتا کہ وہ محنت کی تخصیص کو معیار بنائے۔ کسی محنت کو افضل سمجھے اور کسی محنت کو کمتر، یہ ذہنی دیوالیہ پن کی علامت ہے۔ قومی کردار کا فقدان ہے۔ ذاتی طور پر میں نے جو زندگی گزاری ہے، اس میں بڑے سخت مقامات آئے ہیں۔ میں نے فاقے بھی کئے ہیں، فٹ پاتھ پر سویا بھی ہوں، جو لنڈے کا کپڑا بھی پہنا ہے لیکن مجھے فخر ہے میں نے کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ اپنی قابلیت یا صلاحیت کی بناء پر کسی سے رحمت کی بھیک نہیں مانگی حتیٰ کہ اپنی خاندانی وراثت کا بھی احسان نہیں اٹھایا۔ اسے آپ میری خودستائی نہ سمجھیں یہ ایک حقیقت ہے جو میں نے آپ کے سامنے بیان کر دی۔ صرف اس لئے کہ آپ نئی نسل کی نمائندہ ہیں۔ اور نئی نسل اپنے پیش روؤں کے مقابلے میں زیادہ حقیقت پسند ہے۔ میرے نزدیک یہ بڑی گھٹیا بات ہے کہ اگر آج میں کسی قابل ہوں تو اپنے غریب اور مجبور کے ننگے ماضی کو جھوٹ کا خوبصورت لباس پہنا دوں، اور اس حقیقت کو چھپا دوں جس سے میرا وجود عبارت ہے۔ یہ تصنع کاری، جاگیردارانہ نظام کی کھوکھلی روایت ہے۔ میں نے جاگیرداری عہد کا وہ روپ بھی دیکھا ہے جس کا دوسرا نام "ریاست حیدرآباد" تھا جہاں بیٹا کے مسلمان ہونے کی وجہ سے ایک غریب آدمی بھی اپنے بچے کو "بادشاہ" کہہ کر پکارتا تھا۔ (میری حیثیت بھی بادشاہ جیسی ہے کہ میں نے اپنی ذات سے حرف غلط کی طرح مٹا دیا ہے حتیٰ کہ میں اپنے نام کے ساتھ "میر" بھی نہیں لکھتا) وہاں لوگ اپنے بڑے بیٹے کو "ولی عہد" کا لقب دے کر خوش ہو لیا کرتے تھے —— میں بھی اپنے والد کا بڑا بیٹا ہوں —— لیکن ولی عہد نہیں ہوں۔ اس لحاظ سے میں اپنے خاندان کا پہلا باغی ہوں —— اس بغاوت کے بارے میں، میں اپنے پہلے مجموعۂ کلام "آگ کے پھول" کے دیباچے میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔

—— "یہ مجموعہ کب شائع ہوا تھا"

—— "۱۹۵۸ء میں —— میں نے اس میں اپنے خاندان اور ... کی روایات پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے میرے کچھ عزیز میری اس حرکت ... برات پر مجھ سے آج تک خفا ہیں۔ کیونکہ وہ اس فرسودہ مقولے کے ... قائل ہیں کہ

سخن ہائے بزرگاں گرفتن خطاست

لیکن میں چونکہ پاکستان میں اپنی اولاد کے جدِ امجد کی حیثیت سے ... زندگی اور روایات کی ایک نئی طرح ڈالنا چاہتا تھا اس لئے میں نے "پدرم سلطان بود" والی خود فریبی کا پردہ چاک کر دیا اور ان کے سامنے وہ آئینہ ... رکھ دیا جس میں وہ اپنے خد و خال کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں —— میں نے انہیں احساس دیا کہ وہ ایک محنت کش باپ کی اولاد ہیں۔ اور ان کے باپ کو اگر کوئی فضیلت حاصل ہوئی ہے تو محنت اور صرف محنت کا نتیجہ ہے ایسی محنت جس سے اس کا ضمیر بھی مطمئن ہے۔"

"آپ کا ایک بہت پیارا شعر یاد آ گیا ——

وہ گل کسی بہار کا احسان کیوں اٹھائے
جس کو ملی ہے زخمِ جگر کی شگفتگی

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ نے اپنی شاعری میں اپنی زندگی کی ترجمانی کی ہے۔"

—— "جی ہاں، اپنی بھی اور حسبِ توفیق دوسروں کی بھی —— کیونکہ میں دوسروں سے الگ نہیں ہوں۔ میری اکائی اس دہائی میں بھی موجود ہے جس سے میری قوم عبارت ہے ——

میں اک اکائی کے مانند ہر عدد میں ہوں

—— "اچھا حمایت صاحب! جیسا کہ میں نے سنا اور پڑھا ہے کہ آپ زندگی کے مختلف مورچوں پر برسرِ پیکار رہے ہیں، آپ مختصراً اس کی تفصیل بتا سکتے ہیں تاکہ سند رہے اور وقتِ ضرورت کام آئے؟"

میرے اس سوال پر حمایت صاحب نے ایک قہقہہ لگایا اور سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہنے لگے —— "خان صاحب حضور —— میری عملی زندگی کا آغاز بحیثیت ایک ریڈیو فنکار اور صحافی کے ہوا ہے۔ آپ تو نہیں البتہ سہام مرزا جانتے ہیں کہ پولیس ایکشن سے پہلے حیدر آباد دکن میں ایک روزنامہ نکلتا تھا —— "منہاج" پولیس ایکشن کے بعد اس کا نام "منزل" ہو گیا تھا —— میری صحافتی زندگی کا آغاز اسی سے ہوتا ہے۔ اس کے ایڈیٹر اظہر حسین رضوی، جو ایک ہر دلعزیز صحافی اطہر ہاشمی (جو غالباً آج کل لندن میں ہیں) کے بڑے بھائی تھے —— میں نے کچھ عرصہ ان کے ساتھ کام کیا۔ یوں سمجھئے کہ صحافت میں میری ابتدائی تربیت اسی اخبار سے ہوئی، پھر میں ... غالب والے ... کی معرفت دکن ریڈیو سے وابستہ ہو گیا (ظفر الحسن صاحب ان دنوں ریڈیو کے ڈائریکٹر ہوتے تھے) ریڈیو پاکستان کے مشہور آرٹسٹ مرحوم عبدالماجد، ... جہاں آرا سعید، بدرالدین اور عبدالرحمٰن انور بہزاد —— ہم سب مل کے ایک ساتھ ریڈیو میں کام کرتے رہے ہیں —— وہاں بھی اور یہاں بھی —— اسی زمانے میں سہام مرزا بھی مختلف رسائل کے ایڈیٹر رہے ہیں۔ دراصل ہماری ادبی زندگی کے باضابطہ آغاز کا یہی دور تھا —— سہام ہمیشہ سے ایک بے باک صحافی اور ادیب رہا ہے، اس نے بھی میری طرح بڑے پاپڑ بیلے ہیں۔ بقول حفیظ جالندھری ——

حفیظ اہلِ ادب کب مانتے تھے
بڑی مشکل سے منوایا گیا ہوں

پولیس ایکشن کے فوری بعد ماجد اور وراثت تو پاکستان آ گئے، میں کچھ عرصہ وہیں رہا۔ پھر یوں ہوا کہ مجھے بھی ریڈیو سے نکال دیا گیا اور آل انڈیا ریڈیو کے تمام اسٹیشنوں پر میرا داخلہ ممنوع قرار پا گیا —— جب روزگار کے سارے راستے بند ہو گئے تو میں نے اخبار فروشی شروع کر دی —— اسی شہر میں جہاں کا بچہ بچہ بحیثیت ریڈیو آرٹسٹ مجھے جانتا تھا میرے اس عمل پر سارے اخبارات اور ادبی انجمنوں میں شور مچ گیا۔ مجھ سے آرٹیکل لکھے گئے اور آل انڈیا ریڈیو کے اربابِ بست و کشاد کو باضمیر ادیبوں اور صحافیوں نے آڑے ہاتھوں لیا۔ حتیٰ کہ حکومت حیدر آباد کو ایک پریس نوٹ نکالنا پڑا کہ حمایت علی شاعر حکومت کا باغی ہے —— حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی —— ورنہ وہ مجھے گرفتار بھی کر سکتے تھے۔ بہرحال —— یہ ایک طویل داستان ہے۔ میں پاکستان آ گیا اور ریڈیو پاکستان کراچی سے منسلک ہو گیا۔ یہاں میں نے اپنی زندگی کا آغاز (حیدر آباد کالونی کے پیچھے ایک عارضی محلہ اسلام آباد میں) ایک جھونپڑی سے کیا —— آپ اندازہ کر سکتی ہیں کہ جھونپڑی کی زندگی کیا ہو سکتی ہے لیکن میں چونکہ بے روزگاری کے بعد بمبئی میں بھی کٹھن سے کٹھن زندگی گزار چکا تھا اس لئے ان ... مصائب کو بھی جھیل گیا لیکن میرے اندر جو زہر بھرتا تھا اس نے میرے لہجے میں تلخی بھر دی۔ میرے پہلے مجموعہ کلام "آگ میں پھول" کے ہر شعر میں یہ تلخی نمایاں ہے ایک طرح سے میری ساری نظمیں اس دور کی تاریخ مرتب کرتی ہیں۔ پھر میں اوروں کے ساتھ ڈرگ کالونی کے جنگل اور ناہموار میدان میں بس گیا میرے دو بچے روشن خیال اور فرزانہ علی اسی دور کی یادگار ہیں۔"

"اچھا تو آپ کی شادی ہو چکی تھی؟"

"جی ہاں، یہ کام تو میں ۱۹۴۹ء ہی میں کر چکا تھا۔"

"اس وقت آپ کی عمر کیا ہوگی؟"

"یہی کوئی انیس یا بیس سال۔"

"اچھا تو یہ لو میرج ہوئی؟"

"یک طرفہ۔ مجھے خاندان کی ایک لڑکی پسند آ گئی، میں نے [illegible]

کی بجائے شریف بزرگوں سے سند رشد و ہدایت لی۔ اور شاعری ہوگئی۔ ان بزرگوں میں ایک بہت معروف شخصیت مسلم فریدی تھی، جو میرے مشفق اور کرم فرما رہے ہیں۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

بات یہ بھی کہ میں نے اس وقت تک میٹرک بھی پاس نہیں کیا تھا۔ ان اپنی مختلف صلاحیتوں سے استفادہ کے بعد گزرا کر لو۔ مگر ایسے لوگ۔ ایسی آدمی کو کہاں خاطر میں لاتے ہیں۔ وہ تو میری غربت سے نہیں قائل ہی کر لیا۔ اور وہ "بہارت کے پاؤں پالنے میں" کے مصداق میری حمایت کر بیٹھے، ورنہ میرے والد تو اس عمر میں میری شاعری کے سخت خلاف تھے۔

"اس وقت کا کوئی شعر آپ کو یاد ہے؟"

"اس وقت تو رومانی شعر ہوا کرتے تھے۔ لیکن شادی کے بعد جب زندگی نے بہار روپ دکھایا تو رومانی پرور خوابوں کی حقیقت کھل گئی۔ اس زمانے کا ایک شعر سنا دوں:

فکرِ معاش کھا گئی، دل کی ہر اک امنگ کو
جا ملی تو نے کے جاتی کیا، عشق کی بارگاہ میں

میں نے اپنے اس دور کی بعض نظمیں "آگ میں پھول" میں محفوظ کی ہیں۔ خاص طور سے میری نظمیں "ادھوری کہانی" اور "حرفِ حاصل"۔ اس کتاب کا تازہ ایڈیشن آ رہا ہے، آپ کو پیش کروں گا" تاکہ آئندہ کوئی تشنگی نہ رہے۔

ظاہر ہے کہ اس جملے پر دونوں کو ہنس جانا چاہیے تھا۔

"اچھا صاحب، آگے چلئے"۔

"آگے۔ میں رفتہ رفتہ عملی آدمی ہوتا گیا۔ میٹرک تو میں نے شادی کے بعد پاس کر لیا تھا، پاکستان آ کر کچھ عرصہ کراچی میں رہا، پھر حیدر آباد سندھ میں ریڈیو کھلا، میں وہاں چلا گیا، اور وہیں سروس کرتے ہوئے میں نے سندھ یونیورسٹی سے ایم۔ اے پاس کیا۔ اس دوران ایک رسالہ "شعور" بھی نکالا، اسٹیج ڈرامے بھی لکھے، خود اداکاری بھی کی۔ ریڈیو پر چونکہ میں ہر شعبے میں کام کر چکا تھا اس لئے اس تجربے نے ہر قدم پر میری رہنمائی کی۔ اس دور کی ایک یادگار حارث والی یادگار ہے جو حیدرآباد میں اب بھی موجود ہے جو ہماری ثقافتی انجمن "ارژنگ" کے نام سے موسوم ہے (یہ اوپن ایئر تھیٹر ارژنگ کی خاطر نیاز احمد صاحب مرحوم کمشنر حیدرآباد نے تعمیر کروائی تھی) اسی زمانہ میں میرا پہلا مجموعہ کلام "آگ میں پھول" بھی شائع ہوا اور انتخاب سے صدارتی ایوارڈ سے نوازا گیا۔"

"آپ کے دوسرے مجموعہ "... کا اعتراف ہے یا آپ کی بہترین شاعری کا ادبی انعام ملا ہے؟"

"جی ہاں ... کی صورت میں بھی ادبی انعام مل چکا ہے، ان کے علاوہ ... ہے ... شاعری کی ... کو نظم ... "آگ میں پھول" ... میری پہلی نظم "... نثر ... بیچ ... کرتے ... ٹھہرا دیا گیا ... کا اعتراف ... پر ... مسلسل ... سال میں نے ... ٹھہرا کر ... کے آخر میں میں نے اپنی نظم "اور" کا آغاز کیا ... مرتب ہوئی ... کئی ... حاصل کئے۔ پہلے میں نے ایک نظم "منزل ہے کہاں تیری" شروع کی جو مکمل ہو گئی۔ پھر ... ہونے کے ... جو نظم ... کر کے ایک ... دارث ہے ... کی دشمنی ... ہے۔"

"آخر آپ کا کیا ارادہ ہے، مطلب کہ پھر کوئی نظم ....."

"جی نہیں۔ اب ... ایسے کسی ... کے لئے نہیں ہوا، پھر خیالات رکھتا ہوں ... ہو۔ میں وہ کام نہیں کرنا چاہتا جو میرے ضمیر کے خلاف ہو ... کی ... کا رہی، جیسے ... لکھ چکا ہوں۔ ان میں اپنے آپ کو شامل کرنا اپنے ضمیر کو ... کرنے ... شاعری کو ... کرنے کے مترادف ہے۔ میں ایک ... تو ... سے ... کر سکتا ہوں۔ لیکن جب اپنے کسی شخص کے نام کر دینے کا کام، دولت کا خواب بن جائے تو وہ اس کا بہتر ہے کہ ... اپنے ضمیر کے ساتھ ... جا سکے۔"

"لیکن اگر آپ کو کسی ... سے ... آپ کی پہچان بھی ... سکے تو کیا آپ ... پسند کریں گے؟"

"یقیناً۔ اس لئے کہ خیالات ... چاہتے تھے، وہ اظہار کا ... ہو ... بلکہ ... ایک ... ذریعہ اظہار ہے۔ اس کے ... بھی ... آگے بڑھوں گا۔"

اچھا شاعر صاحب، ہماری آرزو ہے کہ آپ آگے بڑھتے رہیں، تاکہ نئی نسل بھی آپ جیسے لوگوں کے نقشِ قدم پر چل سکے۔ بہت بہت شکریہ۔ اور میں ... کی ہوں۔

✻

ظہبی

میں دوشیزہ کیلئے
الفت ٹریڈرز ... پی او بکس نمبر ۲۰۳
سے رابطہ قائم کریں



کتنی ساری باتیں

جب کوئی عورت اپنی مرضی سے طلاق لینے کی بات کرے تو وہ مختلف نظر آنے لگتی ہے

ایسی ہی ایک عورت کی منفرد کہانی

میں کمپارٹمنٹ کے سامنے پہنچا تو ایک صاحب ریزرویشن چارٹ دیکھ رہے تھے مجھے اندر جاتے دیکھ کر بولے — معاف کیجئے! آپ ہی مسٹر لہری ہیں؟

میں کچھ چونکا لیکن انہوں نے دوسری سانس میں میری حیرانی دور کر دی۔ میری طرف ہاتھ بڑھا کر بولے — "میں ڈاکٹر کھیدو ہوں۔ آپ میری بیٹی کے ہمسفر ہیں۔ مجھے آپ سے درخواست کرنی ہے۔ راستے میں آپ اس کا خیال رکھیں۔ وہ اکیلی ہے۔ آیئے اس سے ملاقات بھی کرا دوں۔"

ہمیں باتیں کرتے دیکھ کر پچیس چھبیس برس کی ایک خوبصورت عورت اپنے برتھ سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے ہاتھ میں کوئی انگریزی میگزین تھا۔

"ماما! یہ مسٹر لہری ہیں۔ تمہارے ساتھ لکھنؤ تک جائیں گے کیونکہ"

ڈاکٹر کھیدو میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ کر مسکرا بھی دیئے۔

میں نے ان کی تائید کرنے میں دیر نہ کی۔ "جی ہاں لکھنؤ تک ہی۔ آپ بھی کیا لکھنؤ جا رہی ہیں؟"

"جی ہاں ماما بھی وہیں جا رہی ہے۔ اس کا پورا نام ماما گجرال ہے۔ آپ شاید کالا گھوڑا سے آ رہے ہیں؟"

"جی ہاں میں وہاں اسٹیڈ سیر ہوں۔ مجھے یاد آتا ہے ایک بار آپ سے مل چکا ہوں۔ انجکشن لگوانے آیا تھا آپ کے پاس۔"

اسی وقت گاڑی نے چلنے کے لیے سیٹی بجا دی۔ ڈاکٹر کھیدو اپنی بیٹی کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیر کر اسے لکھنؤ پہنچ کر تار دے دینے کے لیے کہتے ہوئے باہر چلے گئے۔ میرے ساتھ انہوں نے کھڑکی ہی سے ہاتھ ملایا اور کہا — "مسٹر لہری، واپسی پر مجھ سے ضرور ملیے گا۔ انجکشن کی ضرورت نہ ہو تب بھی!"

ہم دونوں ہنس پڑے۔ گاڑی جلدی جلدی پلیٹ فارم سے رینگ گئی۔ میں دروازہ بند کر کے پلٹا تو ماما گجرال ابھی تک کھڑی مسکرا رہی تھی بولی — "میرے ڈیڈی بہت دلچسپ ہیں۔ بیٹھئے پلیز! مائنڈ نہ کیجئے گا!"

میں ایک بار پھر ہنس دیا بولا — "مجھے تو ایسا محسوس ہو رہا ہے اپنے ڈیڈی سے زیادہ آپ خود دلچسپ ہوں گی! میرا اندازہ غلط تو نہیں!"

وہ بھی ہنس دی اور بولی "یہ صحیح ہے میں باتیں کرنا پسند

"اس کی صحت بہت بگڑ گئی ہے ورنی محمد! پہلے تو وہ آنگن میں بیٹھتی تھی تو سارا آنگن کانپ جاتا تھا۔ بس اب تو بڑی کمزور ہو گئی ہے۔ پھر روتے ہوئے بات بات پڑتی ہے۔ میرے بیٹے کے گرنے اور بڑھتی عمر دیکھ کے تو وہ اس طرح روتی ہے کہ میں کیا بتاؤں۔ پھر ہنستے ہنستے گلے سے کہہ دیتی ہے۔" "لالہ! کالے خان! تمہارے بیٹے ہو رہا ہوں۔ ورنی محمد! میں بھی کیا انسان ہوں [illegible] جو ہوتے کے بعد ہوا ہے دکھی کئے ہوئے ہوں۔ اس کے آنسو بہتے ہیں تو چپ دیکھتا رہتا ہوں۔ پکڑ کر بیٹھ تو نہیں سکتا نا۔" کالے خان کا لہجہ اداس سا ہو گیا۔ میں نے اس کی گردن پکڑ لی۔

"تم نے پہروں بیکار اس خبر پہ فکر کی ہے۔ خود تمہارا تیا ناس کر رہے ہو، تو یہ تمہاری اپیل منظور ہو جائے گی سمجھ! تم نے اسے تسلی دی ہوتی نا۔" کالے خان نے ذرا دیر بعد سر اٹھایا اور مجھے دیکھ کے کہا۔ "تسلی تو بہت دی ہے لیکن ان تسلیوں سے کبھی دل بھی مانا ہے؟" پھر آپ ہی آپ کہنے لگا۔ "اگلی بار بھی آئے گی تمہیں اس سے ضرور ملاؤں گا۔ میں نے آج بھی ذکر کیا تھا تمہارا اور۔۔" سسکی ذرا رک کے وہ کہنے لگا۔

"نہیں بھئی! اگلی مرتبہ تو تم علیحدہ کمرہ لے کے رہے ہو نا۔ تو تمہیں پھر کیوں [illegible]۔ اپنے پاؤں پر خود ہی کلہاڑا مارنے والی بات ہو گی۔ یہ تو" زور سے ہنس کے کالے خان نے کروٹ بدلی اور میں بھی ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔

میرا خیال تھا کہ ملاقات کا اثر زیادہ دیر تک نہیں رہے گا اور کالے خان جو [illegible] اداس ہے، صبح تک ٹھیک ہو جائے گا۔ میرا خیال درست نکلا کیونکہ صبح تو وہ پہلے سے بھی زیادہ ہشاش بشاش تھا۔ ابھی [illegible] ہوئے تھے کہ اس نے مجھے جھنجھوڑ ڈالا۔ میں نے آنکھیں کھول کر اوپر روزن کی طرف دیکھا تو اندھیرا [illegible] تھے کہ مشرق کی سمت [illegible] لگے۔ میں بھی اٹھ بیٹھا اور ہم دونوں ان چیزوں کا انتظار کرنے لگے جو دونوں [illegible] ختم ہو گئی تھیں اور پیسے نہ ہونے کی وجہ سے ہم منگوا نہ سکے تھے۔

کالے خان اب پہلے سے بھی زیادہ خوش رہتا تھا۔ اب اس کی [illegible] [illegible] اور اس نے [illegible] کام کرنے والے [illegible] بیرک [illegible] [illegible] سے واقفیت پیدا کر لی تھی۔ ہسپتال کے سارے لوگ [illegible] تھے [illegible] جیسے [illegible] بن گیا تھا۔ یہ ایک تبدیلی اس میں یہ آئی تھی کہ اب وہ ہر روز [illegible] قیدی کے پاس جانے لگا تھا۔ [illegible] عادت سی [illegible] تو [illegible] رہتا تھا لیکن [illegible] ملاقات نہ ہو تو اسے رات نیند نہ آتی تھی۔ کئی بار مجھ سے [illegible] کہیں میں تو [illegible] اور [illegible] ہوتے [illegible] اس کا [illegible] تھا، جو بھی اس کی اپیل کا فیصلہ آ سکے گا۔ بار [illegible] اسے بتاتے [illegible] کہ وہ ہر روز [illegible] تھا [illegible] رہتا تھا اور [illegible] اپیل کے فیصلے میں تو [illegible] ہیں تو وہ بڑی حسرت سے کہتا۔

"لیکن ماں تو مجھے [illegible] کتنا انتظار کرنا پڑے گا یار!"

لیکن ایک ماہ اور گزر گیا تھا مگر اپیل کا کوئی جواب نہیں آیا تھا اور نہ ہی بی اس سے ملنے آئی تھی۔

ایک رات باتیں کرتے کرتے کالے خان نے نیند میں [illegible] رکھے ہوئے [illegible] دس روپے [illegible] اپنے سرہانے رکھے تھے۔ اور صبح جب وہ فیکٹری جانے لگا تو اس نے [illegible] کر کے رکھا تھا لیکن وہ روپے اٹھانا بھول گیا تھا۔ [illegible] اسی وقت یاد آیا جب میں نے اس سے کہا کہ آج گھی ختم ہے، تھوڑا [illegible] لیں۔ تو وہ مجھے گھسیٹتا ہوا باہر کی سمت آیا، کمبل اٹھا کے دیکھے ایک ایک کمبل کو جھاڑا لیکن روپے ہوتے تو ملتے۔ [illegible] دوسرا [illegible] پھر گیا تھا۔ کمبل اسی طرح پھونک کے باہر نکلا اور کہنے لگا۔ "پیسے تو ختم ہو گئے یار۔ رات [illegible] دس روپے تھے وہ تو کوئی لے اڑا۔ لیکن یہ بھی کہاں مر گئی جو اتنے دنوں سے نہیں آئی؟"

بی سے پچھلی ملاقات کو لگ بھگ چھ ہفتے ہو رہے تھے [illegible] سے تو وہ [illegible] بے چینی [illegible] رہا تھا۔ گو اس نے مجھ سے چھپانے کی کوشش ضرور کی تھی لیکن میں اس کی حرکات ہی سے تاڑ گیا تھا کہ وہ بے چین ہے اور اس کی بے چینی کی وجہ سمجھنا بڑی بات نہ تھی۔ جس دن اس کے پیسے چوری ہوئے تھے اس سے اگلی رات وہ [illegible] تک نہیں سو سکا تھا جیسے اسے [illegible] گئے تھے۔ شام اس نے [illegible] کی تھی تو [illegible] بے اختیار [illegible] کیا تھا اور اب [illegible] سے طرح طرح کے خیالات اس کی نیند کو [illegible] رہے تھے۔ شام مجھ سے بھی اس نے کہا تھا کہ [illegible] بیمار نہ پڑ گئی ہو۔ اور میں نے اسے تسلی بھی دی تھی لیکن اس کے دل میں جو وسوسے جنم لے چکے تھے، وہ کسی طور ختم نہیں ہو رہے تھے۔

اگلے روز کالے خان کی کچھ عجیب سی حالت تھی [illegible] میں جب [illegible] کا نام [illegible] تو اس کے لب [illegible] اور [illegible] ایک ساتھ کانپ گئے تھے اور اس نے بڑی مشکل سے ایک ایک لقمے کو حلق سے اتارا تھا۔ لیکن ہم ابھی بیرک میں [illegible] کے بعد آ کے بیٹھے ہی تھے کہ جمعدار نے اپنے مخصوص انداز میں اسے پکارا۔ "کالے خان [illegible] تمہاری [illegible] چلو تمہاری ملاقات آئی ہے۔" تو ہم دونوں ایک ساتھ اچھل کھڑے ہوئے [illegible] جب [illegible] اندر آئی اور ادھر بڑے دروازے سے کالے خان [illegible] نے [illegible] میں سے دیکھ کے [illegible] سوچا۔ "وہ دن کب آئے گا میرے دوست! جب تم اس گیٹ سے باہر جاؤ گے اور پھر کبھی یہاں لوٹ کے نہیں آؤ گے، کبھی نہیں۔ جانے وہ دن کب آئے گا؟" سسکی بھرتے ہوئے بیرک میں چلا گیا اور [illegible] لیا بھی کیا تھا۔

لیکن جانے کیا بات تھی، پچھلے کالے خان ملاقات کے بعد اس وقت [illegible] تھا جب بیرک کا آخری دروازہ بھی بند ہونے والا [illegible] سے شام [illegible]

کیا اور پھر گردن کو اپنے ہاتھ سے دھیرے دھیرے سہلانے لگی۔

میں اپنے ہسبینڈ سے دو سال سے نہیں ملی۔ [illegible] تین سال ہی ہوئے ہیں۔ ان تین سالوں میں بس ایک ہی سال تک ہم ساتھ رہ سکے۔ پہلے سال ان کے ساتھ رہتے ہوئے جیسے میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ ویسے کوئی اور بات نہیں ہے۔ وہ پرسنلٹی میں بے حد چارمنگ ہیں لیکن عورت اپنے شوہر میں صرف خوبصورتی ہی کا چارم تو نہیں دیکھتی!

ایک لمحے کے لیے وہ چپ ہوئی تو میں نے اپنی دلچسپی ظاہر کرنے کے لیے کہا "خوبصورتی کے علاوہ اور کیا کیا چاہتی ہے؟ ایک عورت کی زبان سے معلوم کر کے مجھے واقعی خوشی ہوگی۔"

یہ سن کر وہ مسکرا دی لیکن اس کی مسکراہٹ میں وہی کرب نمایاں تھا جو چند منٹ پہلے سے اچانک دکھائی دینے لگا تھا۔ بولی

"مسٹر پرویز، عورت کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس کا شوہر اسے پوری طرح چاہے۔"

"کیا مسٹر کمال آپ سے محبت نہیں کرتے؟ کسی اور کو تو نہیں چاہتے! مجھے یقین نہ آئے گا اگر آپ نے کہا کہ اتنی خوبصورت عورت کو چھوڑ کر کوئی کیوں دوسری جگہ دل لگائے گا!"

ہما نے کہا "نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے اور کوئی بھی عورت ان کے قریب نہیں ہے۔ کوئی عورت ایسا کرے گی بھی تو خوش نہ رہ سکے گی۔ میں جانتی ہوں ان کی نیچر کو۔ وہ اپنی بیوی ہی کو یہ احساس دلاتے ہیں کہ وہ تمام تر اسی کے ہیں۔"

"لیکن یہ بات آپ سب عورتوں کی طرف سے کیسے کہہ سکتی ہیں۔ ہر عورت ایک سی فطرت کی نہیں ہوتی۔ کوئی عورت یہ خواہش کر سکتی ہے کہ مرد اسے چاہے! اور کوئی ایسی بھی یقیناً ہو سکتی ہے جو خود ہی اپنے شوہر کو زیادہ پیار کرنا پسند کرے بھلے ہی شوہر اسے اتنا نہ چاہ سکے۔ چاہنے کا مطلب ایک طرح کا ملکیت کا احساس ہے جیسے کوئی اپنی جائیداد کو ہر دم اپنے قبضے میں رکھنے کی فکر میں مبتلا رہتا ہے۔ بعض عورتیں اپنے شوہر کے بارے میں بھی اسی طرح کا رویہ اختیار کر لیتی ہیں۔"

"آپ میرا مطلب نہیں سمجھے۔" اب وہ اور بھی سنجیدہ نظر آئی۔ مجھے افسوس ہوا۔ ایک جھجکتی ہوئی عورت کو ایسا بنا دیا لیکن کر بھی کیا سکتا تھا۔ اب کہا "اگر آپ کا مطلب یہ ہے کہ مرد عورت کی ہر خواہش کو بغیر کہے سمجھ لے تو ایسا مکمل اور باہوش مرد تو اس دنیا میں کہیں کبھی ہی مل سکے گا اور اس طرح سے سوچنے والی عورتیں عام طور پر ڈسٹربڈ ہوتی ہیں۔ سو فیصدی دل پسند پارٹنر تو لاکھوں میں سے کسی ایک کو ملتا ہوگا!"

"آپ تو مردوں کے ٹاپک پر بہت جذباتی ہو گئے" وہ مسکرا دی۔ مجھے بہت اچھا معلوم ہوا۔ بہت دیر کے بعد وہ مسکرائی تھی۔ بولی "دنیا میں ہر عورت کے لیے کہیں نہ کہیں ایسا مرد ضرور موجود ہے جو اس کے لیے جان بھی دے سکتا ہے۔ اسی طرح ہر مرد کے لیے ایک ایسی عورت بھی ہے اور وہ ایک دوسرے سے مل بھی جاتے ہیں۔ یہ کوئی ناممکن بات نہیں ہے لیکن ٹریجڈی یہ ہے وہ مل کر بھی ایک دوسرے کو نہیں سمجھ پاتے۔"

اسی لمحے گاڑی مراد آباد اسٹیشن پر پہنچ گئی۔ میں نے اس سے کہا "میں یہاں بریک فاسٹ منگوا رہا ہوں۔ آپ بھی ساتھ دیجیے گا نا!"

"بریک فاسٹ میرے ساتھ ہے۔ میرا خیال ہے ہم دونوں کے لیے کافی ہوگا۔ آپ صرف چائے کا آرڈر دیجیے۔"

یہ کہہ کر اس نے پلاسٹک کا ایک فولڈنگ باسکٹ میں سے نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔ اسے کھولا تو آملیٹ اور پراٹھے دکھائی دیئے ان کی خوشبو سے ناک بھر گئی۔ میں نے صرف چائے ہی منگوائی۔

چائے آ گئی تو ہما نے ناشتہ میرے سامنے رکھ کر بولی "میرے اور ان کے ڈفرنسز کو ٹھیک طور سے سمجھنے کے لیے ایک بار ان سے بھی مل لینا ضروری ہے۔ مجھے یقین ہے ان کے ساتھ کچھ ہی دیر رہ کر آپ میری باتوں کی تائید کرنے لگیں گے۔ لیکن ایسا کرنا اب ضروری نہیں ہے۔ میں فیصلہ کر چکی ہوں۔ اب لکھنؤ میں ہی رہوں گی۔ اس نیت سے وہاں جا رہی ہوں، جا کر پہلے تو آنٹی سے خوب لڑوں گی۔ یہ رشتہ انہی کا طے کرایا ہوا ہے۔ ان سے کہوں گی، اب مجھے اپنے پاس رکھیں اور کوئی سروس بھی دلائیں! اس کے بعد میں ڈائیورس کے لیے درخواست دوں گی۔"

جب کوئی عورت اپنی مرضی سے طلاق لے لینے کی بات کرتی ہے تو وہ عام عورتوں سے الگ نظر آنے لگتی ہے۔ ذہن مشتعل، دسترس سے کافی دور! اس کے دل و دماغ تک پہنچنے کے لیے آدمی کو اپنے سارے منطقی ہتھیار کند معلوم ہونے لگتے ہیں۔ کچھ دیر تک میں چپ سا رہ گیا۔ اس کے پیش کیے ہوئے ناشتے میں سے میں نے ایک پراٹھا اور تھوڑا سا آملیٹ لے رکھا تھا لیکن اس نے پورے پراٹھے میری پلیٹ میں رکھ کر کہا "لیجیے نا! اتنا کم کیوں لیا ہے!"

اب اس کے لہجے سے واضح طور پر احساس ہونے لگا۔ وہ عام مزاج کی عورت نہیں ہے۔ اس کی شخصیت کا کوئی ایک گوشہ غیر معمولی اور پیچیدہ ہے جو چہرے سے عیاں نہیں ہوتا۔ شکل و صورت کے اعتبار سے تو وہ اتنی دلکش ہے کہ وہ جیسا مرد چاہے تو اور

کچھ بھی نہیں ہے! صرف اسے پا جانے کے منصوبے بنا رہا ہے۔ میں
اس کے اتنا نزدیک ہو کر بھی صرف یہی سوچ کر مطمئن ہو سکا کہ اس نے
اپنی باتیں چھیڑ کر مجھے سوچنے کے لیے ایک موضوع دے دیا ہے لیکن
اس کی بے تکلفی کے پیشِ نظر یہ پوچھتے ہوئے مجھے ذرا بھی جھجک نہ ہوئی
"کیا آپ کسی اور کو چاہتی ہیں؟ معاف کیجیے یہ سوال بہت زیادہ ذاتی
سا ہے۔"

"نہیں نہیں، آپ کچھ بھی پوچھیے۔ آئی ڈونٹ مائنڈ! لیکن آپ
کی یہ غلط فہمی دور کر دوں۔ ابھی تک میں نے کسی اور کے بارے میں سوچا
تک نہیں ہے۔"

ہمارا سا جھوٹ بولتی نظر آئی۔ فوراً یقین سا ہو گیا۔ پتہ نہیں یہ سن
کر میں خوش کیوں ہوا تھا! مجھے مسکراتے دیکھ کر بولی۔ "اگر میں اپنے شوہر
کو پسند نہیں کرتی تو اس کا یہ مطلب کیسے نکلتا ہے جو آپ نے ابھی پوچھا
ہے! کیا یہ ضروری ہے؟"

"ضروری تو نہیں ہے۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا تھا۔ آپ کا آئیڈیل
مرد کس قسم کا ہو سکتا ہے! یعنی جو خوبی آپ کو مسٹر گجرال میں نہیں نظر
آئی، وہ کون سی ہو سکتی ہے؟"

"دیکھیے پوری صاحب، آئیڈیل وغیرہ کے چکر میں تو میں پڑتی
نہیں۔ اس طرح ڈیٹیلز میں تو ہی نہیں گیا ہے کبھی۔ نہ اس کی خواہش
ہی رکھتی ہوں۔ بس اتنا ہی کہہ سکتی ہوں، مجھے اپنے شوہر کی خاص
ایٹی ٹیوڈ کی وجہ سے پسند نہیں ہیں۔ اس بات کا شکوہ بھی ہے مجھے۔"

اس نے چائے بنا کر پیالہ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ "کہا میں
نے ایک ہی چمچ شکر ڈالی ہے اور چاہیے؟"

"جی نہیں۔ کافی ہے۔" میں جلدی جلدی سپ کرنے لگا۔ مجھے
ایسا کرتے دیکھ کر بولی۔

"چائے ذرا آہستہ آہستہ پینی چاہیے۔ بھلے ہی ٹھنڈی ہو جائے۔
گرم گرم چائے پینے سے آدمی کی نروز دیک ہو جاتی ہیں۔"

ذرا سا ٹھٹکا میں۔ اس کی طرف غور سے دیکھا۔ پھر اسی طرح
چائے پینے لگا۔ جلدی جلدی پیالہ ختم کر لیا تو کہا۔ "معاف کیجیے گا۔ میں
اسی طرح پینے کا عادی ہوں۔"

وہ چپ رہی۔ اگرچہ اسے میرا جواب اچھا نہ معلوم ہوا ہوگا تو
بھی اس نے ضبط کر لیا۔ اپنا احساس ظاہر نہ ہونے دیا۔ کچھ منٹ
دھیرے دھیرے چائے پیتی رہی۔ میں نے سگریٹ سلگا کر کہا۔ "مسٹر
گجرال کا رویہ اپنے دوستوں کے ساتھ کیسا ہے؟ کیا وہ اسے پسند
کرتے ہیں؟"

بولی۔ "ان کے دوستوں کا قصہ مت پوچھیے۔ انہیں تو اپنے دوست
ہی جان سے زیادہ پیارے لگتے ہیں۔ جہاں پہنچتے ہیں نئی نئی دوست
لگتے ہیں۔"

"آپ کو خوشی نہیں ہوتی؟ آپ کے ہمیشہ دوست پالیسی؟"

"اتنا تو برداشت کر سکتی ہوں کہ اُن کے دو ایک بہتر قریبی
لیکن اس کے لیے وہ مجھ سے مشورہ ضرور کر لیں۔ آخر مجھے کھانا بھی تو
کرانا پڑتا ہے۔ ایسے لوگوں کی خاطر داریاں میں کیونکر دل سے نہیں
پسند نہیں کرتی!"

باتوں باتوں میں پتہ ہی نہ چلا، ہم ریلی پہنچ گئے۔ وہاں ہم نے کو
کھانا کھانے دوران میں میں نے اس سے کہا۔ "میرے خیال میں اپنے
گھٹے آپ خود ہی ذمہ دار ہیں۔"

یہ سن کر وہ چپ سی ہو گئی۔ کتنی دیر تک کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کی
تنقید سے شاید ناراض ہو گئی تھی! میرے اس انداز سے شاید اس نے خواہ مخواہ
کرے میں اس کے ہر جواب سے گستاخی ہو رہا ہو۔ اسی لیے وہ گفتگو میں
دلچسپی نہیں دکھا رہی تھی۔ لیکن اب میں نے اس کے چہرے پر ایک جذباتی سی
لہر ابھرتی ہوئی دیکھی۔ میں نے اسے بتایا۔

"بات دراصل یہ ہے جو میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ آپ مسٹر گجرال
کی ایک ہی ہمدرد سکیں گی کوئی بھی ان کی ٹھیک نہیں رہ سکا
ہوا ایک پہلو ہی جیت ہے۔ اگرچہ ان کی بھی حدود ہیں۔ اگر آپ غور کریں
تو ہم اس پر بھی گفتگو کریں گے۔ تھوڑی دیر بعد سہی۔ کھانا کھانے کے
بعد نیند سی لگتی ہے۔ اجازت ہو تو ذرا سو لوں!"

یہ کہہ کر میں لیٹ گیا۔ وہ بھی کھڑکی سے لگ کر لیٹ گئی۔ مجھے
وہ واقعی کچھ ڈری ڈری سی لگی یا میرے رویے کے بارے میں کچھ سوچ رہی
کچھ سوچ رہی ہوگی لیکن میں نے اس کے چہرے پر نظر ڈالنے کی
منہ پھیر لیا اور سو گیا۔

تقریباً دو گھنٹے بعد جب میری آنکھ کھلی تو جانا کہ اس کے
نزدیک گاڑی ایک سٹیشن پر رکی ہوئی تھی۔ ہر طرف پلیٹ فارم پر
بک اسٹال کے سامنے۔ ایک کتاب خرید کر اس نے مجھے دکھایا۔ وہ
کمپارٹمنٹ دیکھ کر چلے آنے کے لیے کہا۔ مجھے کھڑکی سے جھانکتا
جانا میری طرف آئی ہوگی۔

بہت سے لوگ ادھر ادھر گھوم رہے ہیں کے درمیان وہ پہلے سے نیا
نظر آئی! شاید میرے دو گھنٹے کی گہری نیند کا نتیجہ تھا۔ دوپہر شاید
سنجیدگی ہی میرے میں بار ہی خوب گیا۔ اس کے بال کالے تھیں سنہرے
کی گردنے ہی انھیں بیکار دیا ہوگا۔ گو اس کے چہرے پر ہی تھی لیکن
آنکھ کی رنگت میں شرمندگی ہو گئی تھی۔ مجھے گلابی رنگ کی چولی اور پاجامہ
کاندھی دوپٹہ اور کھیری رنگ کا کرتہ۔ کارڈیگن اس نے اتار دیا تھا۔

لڑکی ہی سے کتاب میرے حوالے کر دی۔ بغیر کسی تبصرے کے۔ میں بھی خاموشی سے چند منٹ اوراق الٹتا رہا۔ اتنے میں چائے آ گئی۔ گاڑی بھی چلنے لگی۔ وہ چائے لے کے اندر آئی۔ میرے برتھ پر بیٹھ کر چائے بنانے لگی۔ میں نے محسوس کیا ہماری بیچ گفتگو ماضی کا حصہ بن چکی ہے۔ اُس موضوع پر پھر سے بولنا وقت کا ضیاع محسوس ہو گیا ہے۔ اپنے طور پر مجھے بہت شدت سے ایسا احساس ہوا۔ اُس کی بھی یہی کیفیت نظر آتی تھی۔ میری طرح وہ بھی خاموش تھی۔ ہم ایک دوسرے کی طرف ایک عجیب سی لاتعلقی سے دیکھ رہے تھے۔ لاتعلقی بھی تھی اور ایک طرح کی قربت بھی۔ لیکن بے اطمینانی سے لطف!

چائے اسی خاموشی سے پی گئی۔ چائے ختم ہو گئی اور بیرا برتن سمیٹ کر لے گیا۔ تو ماحول ویسے نہیں رہا گیا۔ بولی "میں ایک بار لکھنؤ گئی تھی۔ بہت بڑا شہر ہو رہا ہے!"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اُس نے ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی۔ جس پر میں کچھ بولتا۔ اُس نے کچھ دیر تک چپ رہ کر پھر ایک بات چھیڑی۔ "پوچھا کیا آپ نے کسی سے محبت کی ہے؟" یہ پوچھ کر وہ مسکرا بھی دی۔

میں نے دیکھا اُس کی آنکھوں میں اچانک چمک سی آ گئی ہے۔ وہی چمک لوٹ آئی ہے جو آغازِ سفر پر میں نے دیکھی تھی۔ اُس کے سوال پر میرے اندر کسی قسم کا جذبہ تو پیدا نہ ہوا۔ لیکن میں نے اپنے اندر بولنے کی ایک تحریک ضرور محسوس کی۔ بات کی جا سکتی ہے۔ سوال بھی خاصا دلچسپ ہے۔ میں نے کہا "کئی سال ہوئے جب میں سول انجینئرنگ کا اسٹوڈنٹ تھا۔ چھٹیوں میں گھر لوٹ رہا تھا۔ ایسے ہی سفر میں ایک لڑکی کو دیکھا۔ اپنے ماں باپ کے ساتھ تھی۔ خوبصورت نسوانی حسن کی ایک مثالی تصویر! اُسے دیکھ کر میں نے اپنے اندر بہت بے اطمینانی محسوس کی۔ بے اطمینانی سمجھتی ہیں نا آپ؟ ایسی حسین کی کوئی وجہ نہیں ہوتی۔

جس کا کوئی پرسنی نام بھی نہیں ہوتا۔ لیکن اس کا احساس ہوتا ہے۔ اس کی ایک میٹھی میٹھی چبھن ہوتی ہے۔ دل کی دھڑکن بھی تیز ہو جاتی ہے۔ آپ شاید مجھے بیوقوف سمجھ رہی ہیں! بات ایسی ہی ہے جو میں نے آج تک کسی اور کو نہیں بتائی۔ پہلی بار آپ کو بتا رہا ہوں۔ مجھے ہنسی بھی آ رہی ہے۔ آپ بھی تو مسکرا رہی ہیں۔ ہاں۔ اس کے ساتھ کافی دیر تک سفر کرنے کے بعد مجھے اچانک احساس ہوا۔ اس لڑکی کو تو شاید مسکرانا ہی نہیں آتا!

یوں وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ باتیں کرتی رہی تھی۔ اس کی آواز میں نے سنی تھی جو میرے کانوں کو بہت بھلی معلوم ہوئی۔ اس نے کئی بار میری طرف دیکھا بھی تھا۔ اس کی نظریں بھی بہت میٹھی محسوس ہوئیں۔ لیکن پتہ نہیں کیوں میرے اندر یہ کرید پیدا ہو گئی جب تک وہ مسکرائے گی نہیں مجھے اطمینان نہیں مل سکتا۔ صرف ایک ہی بار مسکرا دے میری طرف دیکھ کر میرے لیے! لیکن وہ کئی گھنٹوں کے سفر میں ایک بار بھی نہ مسکرائی تو مجھے ایک صدمے کا احساس ہونے لگا۔ اس کی مسکراہٹ دیکھنے کے لیے میری کرید بڑھتی ہی گئی۔ مجھے راستے ہی میں اتر جانا تھا۔ سہارن پور میں! لیکن میں نے سفر جاری رکھا۔ دل ہی دل میں طے کر لیا جس جگہ وہ مسکرا دی، میں وہیں اتر جاؤں گا۔ اپنا سفر ختم کر دوں گا۔ ان لوگوں نے تین جگہ گاڑی بدلی میں بھی ساتھ ساتھ رہا لیکن وہ کہیں بھی نہ مسکرائی۔ پھر ہر پلاؤ کے ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر اتر گئی۔ میں بے حد مایوس، بے حد غمگین، بے حد غصے میں بھرا ہوا لوٹ آیا۔ اس واقعے کو کبھی بھول نہ سکا اس لڑکی کو بھی۔ اس کا چہرہ ابھی تک میری نظروں کے سامنے ہے۔ مسکراہٹ سے عاری چہرہ! شاید میں اب بھی اس سے محبت کرتا ہوں! اگر محبت اسی کا نام ہے!"

ہمانا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ میں نے بھی ہنسنے میں اس کا ساتھ دیا۔ اس نے ہنسی روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "لطیفہ بہت دلچسپ ہے!"

اسے یقین نہ آیا لیکن ہماری بات وہیں ختم ہو گئی۔ کیونکہ اس کے بعد گاڑی لکھنؤ پہنچ گئی۔ اسٹیشن پر اسے آنٹی کے مل جانے کی توقع نہ تھی۔ پھر بھی وہ بہت بے صبری سے باہر جھانکتی رہی۔ باہر نکلنے سے پہلے بولی "میں ڈیڈی کو یہاں سے تار دوں گی۔"

میں نے اسے پلیٹ فارم پر ہی ٹیلی گراف ونڈو کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا۔ اس کا اپنا سامان بھی اسی کے پاس چھوڑا۔ کہا "جب تک آپ تار دیجئے میں اپنے فرینڈ کو فون کر آؤں۔ جس کے ساتھ مجھے ٹھہرنا ہے۔"

میں جلدی ہی واپس آ گیا۔ وہ تار دے دینے کے بعد میرا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے کہا "چلیے! آپ کو ٹیکسی کر دوں۔"

بولی! "ایسا نہیں ہو سکتا۔ مجھے وہاں چھوڑ کر اپنے فرینڈ کے یہاں جائیں کیونکہ دیر بہت ہو چکی ہے۔"

سردیوں میں سات ہی بجے رات ہو جاتی ہے۔ میں نے اس کی بات مان لی۔

جب ہم اس کی آنٹی کے گھر کے سامنے رکے تو وہاں ایک بھیڑ دیکھی۔ دس پندرہ آدمیوں کی بھیڑ جو دروازے کے اندر اور باہر کھڑے تھے ہمانا کا چہرہ انہیں دیکھتے ہی فق ہو گیا۔ اس نے گھبرا کر میری طرف دیکھا بولی "ذرا جلدی سے جا کر ان سے معلوم تو کیجیے۔ کہیں میری آنٹی کو تو کچھ نہیں ہو گیا۔"

یہ کہتے کہتے اس کا گلا بھر آیا۔ لیکن مجھے یقین نہ آیا۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ اتنے غیر متوقع طور پر! ٹیکسی سے باہر آ کر سیدھا ان لوگوں کی طرف گیا۔ انہوں نے بھی میری طرف گہری نظروں سے دیکھا۔ گہری اور ہمدردی سے بھرپور نظروں سے لیکن انہوں نے کچھ کہنے کی بجائے اندر

جانے کے لیے میرے لیے راستہ چھوڑ دیا۔ میں اندر جا کر بھی دور تک آگے نہ بڑھ سکا۔ بانس کی کھپچیوں پر ایک لاش رکھی تھی۔ لال کفن میں لپٹی ہوئی۔ چند عورتیں اس کے پاس خاموش کھڑی تھیں۔ صدمے سے نڈھال لیکن کوئی رو نہیں رہا تھا۔

میں جلدی سے باہر آگیا۔ ہماناکے پاس گیا۔ وہ ابھی تک ٹیکسی کے اندر ہی تھی۔ باہر آنے کی ہمت نہ کر سکی تھی۔ میں نے بہت دھیرے سے کہا "کسی کی ڈیتھ تو یقیناً ہوئی ہے۔ کیا آپ کی آنٹی اسی گھر میں رہتی تھیں! میں تو کسی کو بھی نہیں جانتا۔ آپ باہر آئیے!"

یہ سنتے ہی وہ بے اختیار رو پڑی۔ کچھ لوگ ہمارے قریب آ گئے۔ ایک آدمی نے کہا "شاید آپ مس کپور ہی سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔ اس بیچاری کا تو تین گھنٹے پہلے اچانک ہارٹ فیل ہو گیا! ہم اسے شمشان لے جا رہے تھے!"

کسی اجنبی گھر میں ایسے حالات میں رہنے کا یہ میرے لیے پہلا تجربہ تھا۔ بے حد تکلیف دہ! نکلنے کی کوئی راہ بھی نہ تھی۔ میرے پاس جتنے روپے تھے وہ میں نے شمشان جا کر خرچ کر دیئے۔ رات کو دونکے واپس آیا۔ ہمانا میرا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی میرے ساتھ لپٹ کر رو اٹھی۔ اسے میں نے دلاسہ دیا۔ یقین دلایا میں اس کے ساتھ ہوں۔ اس کے پاس محلے کی ایک بوڑھی سردارنی بھی تھی جسے اس نے روک رکھا تھا۔ ہم تینوں ساری رات باتیں کرتے رہے۔ ہمانا کی آنٹی کے بارے میں۔ اس نے ساری زندگی شادی نہیں کی تھی۔ پچاس سال تک کئی سال پہلے کسی کے ساتھ شادی طے ہوئی تھی لیکن اس آدمی نے کہیں اور رشتہ طے کر لیا تھا۔ اب وہ اسے بھول چکی تھی لیکن شادی نہیں کی تھی۔ ایک اسکول میں پڑھاتی تھی۔ لوگ اس کی بہت عزت کرتے تھے۔

صبح سردارنی کے مشورے سے ہم نے وہاں اکھنڈ پاٹھ رکھوانے کا پروگرام بنایا۔ قریب کے ایک گوردوارے میں جا کر میں اپنے سر پر گرو گرنتھ صاحب اٹھا کر لے آیا۔ ننگے پاؤں چل کر میرے ساتھ دو گرنتھی بھی آئے۔ گوربانی کا پاٹھ کرتے ہوئے گرنتھ صاحب پر چنور بھی جھلتے ہوئے۔ ایک کمرے میں تخت پر گرنتھ صاحب کا پرکاش کرایا۔ ان پر ایک نیا ریشمی رومال بھی چڑھایا۔ بوڑھی سردارنی ہی مجھے قدم قدم پر ہدایت دیتی رہی۔ ایک گرنتھی نے پاٹھ کا آغاز کیا۔ دو گھنٹے بعد اس کی جگہ دوسرے نے لے لی۔ دونوں کی آواز بہت سریلی تھی۔ بہت بھلی ہوئی اور پاکیزہ۔ ایک گرنتھی بوڑھا تھا دوسرا نوجوان۔ اپنے کام سے دونوں بہت عقیدت رکھتے تھے۔ گوربانی سننے والے ہم تین ہی تھے۔ سردارنی ہمانا اور میں۔

ہمانا میری طرف عجیب و غریب نظروں سے دیکھتی تھی۔ احسان مندی اور اطمینان سے بھرپور کسی کسی وقت اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بھی دکھائی دیتی بلکہ مسکراہٹ کا گمان ہی سا ہونے لگتا۔ وہ ابھی مسکرا دے گی۔ اچانک گہرے دکھ میں مبتلا ہو جانے کے بعد بھی آدمی مسکرانا بھی بھولتا نہیں ہے۔ شاید میں اسے بہت عجیب نظر آتا تھا۔ میں نے سر پر رومال باندھ رکھا تھا۔ میرے بعض بکھرتے ابھرتے ہوئے بال چھپ گئے تھے۔ گرو گرنتھ صاحب کے دربار میں ننگے سر بیٹھنا ان کی شان کے خلاف تھا۔

دوپہر کے وقت سردارنی اور گرنتھیوں کو وہاں چھوڑ کر ہم [illegible] چلے گئے۔ ہمانا نے ٹرنک کال پر ڈاکٹر کپور کو کل کے واقعے کی اطلاع دی۔ ڈاکٹر کپور یہ سن کر بہت متعجب ہوئے کہ میں ابھی تک ہمانا کے ساتھ ہوں۔

ڈاکخانے سے نکل کر ہم ایک ہوٹل میں گئے۔ اچانک ہمارے اندر کوئی اندیسا کھانا کھانے کی خواہش پیدا ہو گئی۔ کل رات سے ہم پریشان تھے لیکن کھانے کے دوران ہمارے درمیان بہت کم باتیں ہو سکیں۔ جی تو چاہا تھا، ہمانا کی دلجوئی کی خاطر کچھ کہوں لیکن وہ خیال ہی سے مضطرب دکھائی دیتی تھی کچھ نہ کہہ پاتی تھی۔ بس ایک بار بہت دھیرے سے کہا "میری وجہ سے آپ ناحق پھنس گئے ہیں لیکن آپ ساتھ نہ ہوتے تو میری تو جان ہی نکل گئی ہوتی۔"

مجھے تھوڑی دیر کے لئے اپنے محلے میں جانا تھا جس کام کے لئے آیا تھا اسے پورا کرنا ضروری تھا۔ اس دوست کے ہاں بھی جانا تھا جسے میں نے اسٹیشن پر اترتے ہی اطلاع دی تھی۔ میں نے چاہا ہمانا کو گھر بھیج دوں۔ شام تک میں بھی اس کے پاس پہنچ جاؤں گا لیکن وہ مجھے چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہوئی۔ بولی "مجھے اکیلا نہ چھوڑئیے جہاں بھی جائیے مجھے ساتھ لے چلئے"

وہ ہر جگہ میرے ساتھ گئی پھر ہم ہمانا کے گھر لوٹ گئے۔ گرنتھی پاٹھ میں مصروف تھے سردارنی سر جھکائے آنکھیں موندے بیٹھی تھی۔ ہم بھی اس کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔

اگلے دن صبح سویرے ڈاکٹر کپور اور ان کی مسز آگئے۔ ان کے آتے ہی گھر کا ماحول بدل سا گیا۔ ہمانا کی اداسی بھی دور ہو گئی۔ اب وہ واپس اپنی آواز میں بولنے لگی۔ جیسے میں اوپر کے کمرے میں لیٹا ہوا بھی سن سکتا تھا لیکن وہاں مجھے اب اپنا وجود بے معنی سا محسوس ہونے لگا۔ مجھے یہاں سے چلا جانا چاہیئے۔ میرا دوست مجھے اپنے یہاں چلے آنے کے لئے کہہ چکا تھا یوں بھی وہ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ زیادہ بولتے تھے میرے ساتھ کم۔ ان کے پاس بولنے کے لئے گھریلو مسائل تھے۔ جو عورت مر چکی تھی اس کی زندگی تھی۔ میرے اور ان کے درمیان کوئی جذباتی رشتہ نہ تھا۔ اس کے سوا کہ جب ڈاکٹر صاحب کے سامنے آجاؤں یا کوئی کام کرتا ہوا دکھائی دے جاؤں۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر شکریہ ادا کرنے لگیں۔ اس سے مجھے بہت گھبراہٹ ہوتی۔ اس لئے میں اب اس ماحول کا حصہ بننے کے لئے تیار نہ تھا۔

موقع پا کر میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا "اب میں اجازت چاہتا ہوں۔ اپنے دوست کے ہاں جا کر رہوں گا۔"

یہ سن کر وہ مغموم سے ہو گئے۔ بولے "مجھے آپ کی تکلیف کا پورا احساس ہے لیکن ہم لوگ بھی ایک دو دن میں چلے جائیں گے۔ اب کرسمس آگیا ہے۔ آخری رسوم قریب تو سب ختم ہی ہو رہی ہیں۔"

ہمانتا نے سنا تو اس نے ڈاکٹر صاحب سے کہا "نہیں ڈیڈی انہیں جانے نہ دیجئے گا۔ آپ نہیں جانتے۔ ان کی وجہ سے مجھے کتنا حوصلہ ملا ہے جس دن ہم جائیں گے۔ اس دن یہ بھی اپنے فرینڈ کے ہاں جائیں گے۔"

ہمانتا کو میری کتنی ضرورت تھی۔ اس بات کا احساس مجھے اس دن گھومتے ہوئے ہوا۔ وہ میرے ساتھ مجھ دفتر تک گئی۔ وہاں میری جان پہچان کے لوگوں سے بہت دلچسپی کا اظہار کیا جس پر ہم دونوں بہت محفوظ ہوئے۔ اپنے اپنے دن میں۔ پھر ہم حضرت گنج میں گھومے۔ ہیل گارڈ کے کھنڈروں میں بھی۔ ایک پکچر بھی دیکھی اور ریستوران میں جاتے بھی پی اور لکھنؤ والوں کے مزاج کا بھی مطالعہ کیا۔ کبھی مسکرا دیئے۔ کوئی ایک ہی صورت دیکھ کر کسی کے اندازِ گفتگو پر۔ کبھی کبھی ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے بھی دیکھا جیسے اب ہمارے درمیان ہماری پسند اور ناپسند کے سلسلے میں ایک ذہنی سمجھوتہ سا ہو گیا ہو! لیکن پھر بھی ہم ویسے نہ ہو سکے جیسے لکھنؤ پہنچنے سے پہلے گاڑی کے سفر میں تھے۔ ہر بات پر۔ باتونی بحث کے لئے ہر لمحہ آمادہ۔ اب زیادہ تر خاموش تھے۔ خاموش بھی رہیں۔ زبان سے کچھ نہ کہیں۔ کوئی بھی بات! من ہی من میں سوچتے بھی تھے بہت کچھ! لیکن محسوس ہوتا تھا۔ جو کچھ سوچ رہے ہیں۔ وہ اپنے تک ہی رہنے کا۔ اپنے اپنے خیال دبے رہنے میں بہت سکون ہے۔ اپنے خیالات [illegible] محفوظ تھے۔ [illegible] ہمانتا نے پہلے جیسے شوخ رنگوں والے کپڑے نہیں پہنے تھے جو اس کے مزاج کے غماز تھے۔ اب وہ بہت ہی سادہ سی ساڑھی باندھتی تھی میک اپ نہ کرتی تھی۔ بہت سادگی سے بالوں کو سنوار کرتی تھی لیکن پھر بھی اچھی معلوم ہوتی تھی پہلے سے زیادہ پرکشش ذہین اور سنجیدہ۔

اس شام کو ہم گھر لوٹے تو اس کے چند رشتے دار اور بھی آ چکے تھے۔ ایک تو مسٹر گجرال تھے ہمانتا کے پتی۔ اس سے مل کر میں بہت خوش ہوا۔ گجرال واقعی ایک دلکش مرد تھا۔ ٹھیک میرے اندازے کے مطابق نکلا تھا اور ہمانتا جیسی عورت کے لیے نہایت ہی موزوں! ہمانتا بھی اسے دیکھتے ہی دلہن کے کمرے میں چلی گئی۔ ایک لمحے کے لیے بھی گجرال کے پاس نہ رکی۔ اس نے کوئی بات تک نہ کی۔ اس کی اس حرکت کو گجرال نے اور میں نے کنکھیوں سے دیکھا اور مسکرا دیئے۔ میں نے سوچا گجرال کے ساتھ بھی بہت سی باتیں ہمانتا نے بتائی ہیں بہر طور اچھا ہے۔ میں ہمانتا کی نفسیات کو کافی حد تک سمجھ چکا تھا۔ گجرال کے سامنے اس موضوع پر ایک لمبی گفتگو کر سکتا تھا لیکن موقع نہ مل سکا۔ بہت سا وقت تو یا تو ہی سننے میں نکل گیا سب لوگ وہاں زیادہ سے زیادہ دیر تک بیٹھے رہنا چاہتے تھے۔

اس رات میں بہت جلدی اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اوپر جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا۔ بہت دیر تک ہمانتا کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس نے اپنے پتی کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا؟ ایک تعلیم یافتہ عورت بہت آزادی سے بات کر سکتی ہے۔ اس کے اندر اتنی صلاحیت موجود ہے۔ اذیت سے بھری ہوئی علیحدگی سے بہتر ہے آدمی خوش اسلوبی سے الگ ہو جائے!

میں انہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ اچانک وہاں گجرال آ گیا۔ اسے دیکھتے ہی میں نے فیصلہ کر لیا۔ اب ہمانتا کے بارے میں گفتگو کروں گا۔ اسے ہمانتا کے دل کی ساری باتیں بتا دوں گا۔ یقیناً وہ سننا پسند کرے گا۔ نہیں کرے گا تو دیکھا جائے گا! میرا خیال تھا وہ بھی میرے ساتھ باتیں ہی کرنے کے لیے آیا ہے لیکن میرے پاس بیٹھ کر وہ چپ رہا۔ دیر تک۔ جیسے اس کے دل پر کوئی بوجھ سا ہو! بوجھ تو تھا۔ یقیناً اسے ہلکا ہونا ہی چاہیئے۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ پوچھا۔

"کیسے آنا ہوا؟" اپنے ہاتھ کی طرح اس کا ہاتھ بھی جلتا ہوا محسوس ہوا۔

"بولا ــــ ایک بہت ضروری کام ہے مجھے معلوم ہے آپ میری مدد کر سکتے ہیں۔ ہمانتا نے سب کچھ بتا دیا ہے جو باتیں آپ سے ہوئی ہیں اس کی۔ وہ آپ کی بے حد شکر گزار ہے۔ آپ سے کچھ کہہ نہ سکی۔ اس لیے آپ کے پاس مجھے بھیجا ہے۔ ابھی بہیں اور بھی باتیں کرنی ہیں لیکن تنہائی نہیں ملتی۔ نیچے بہت سے لوگ ہیں! ڈسٹرب ہوتے ہیں۔ اگر آپ وہاں چلے جائیں! جہاں میرا بستر بچھا ہوا ہے!"

یہ کہہ کر اس نے بہت گرم جوشی سے میرا ہاتھ دبایا۔ میرا خیال ہے اس وقت اس کی آنکھیں بھی چمک رہی تھیں۔ اندھیرے کی وجہ سے میں دیکھ نہ پا رہا تھا۔ میں ایک جھٹکے کے ساتھ نیچے چلے جانے کے لیے کمرے سے باہر نکل گیا۔ سیڑھیوں سے اترتے وقت میں نے دیوار کے ساتھ ایک سایہ سا چپکا ہوا دیکھا۔ اپنے بہت قریب! بس ایک ہی ہاتھ کے فاصلے پر۔ چپ، بے حس، سانس تک روکے ہوئے! چند لمحوں تک میں رکا رہا۔ پھر دھیرے دھیرے نیچے اتر گیا۔ صرف ایک بار سر گھما کر دیکھا۔ آخری سیڑھی سے۔ اوپر والے کمرے سے یہ وہ سایہ دھیرے دھیرے حرکت کرتا ہوا میرے کمرے کے اندر داخل ہو رہا تھا۔

حضرت ماریہ قبطیہؓ

شفیق بریلوی

ازواجِ مطہرات کی تعداد میں عام روایات میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔ کسی نے ازواجِ مطہرات کی تعداد نو بتائی ہے، کسی نے گیارہ، کسی نے تیرہ بتائی ہے تو کسی نے پندرہ۔ اور ان روایات کے بیان کرنے والے کوئی معمولی لوگ نہیں ہیں بلکہ سب کے سب کسی نہ کسی حیثیت سے کافی عظمت و اہمیت کے حامل ہیں۔ ابنِ اثیر، ابنِ کثیر، ابنِ عساکر، ابنِ سعد، ابنِ اسحٰق، ابنِ جریر، امام طبریؒ، امام نوویؒ، زہری اور یعقوبی یہ سب تاریخ و سیرت کے امام سمجھے جاتے ہیں لیکن ازواجِ مطہرات کی تعداد کے بارے میں ان سب حضرات کی روایات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ سیرت ابنِ ہشام جو عربی زبان میں سیرتِ نبویؐ پر مستند اور قدیم ترین تالیف سمجھی جاتی ہے۔ اس میں ازواجِ مطہرات کی تعداد گیارہ لکھی ہے۔ موجودہ صدی کے سیرت نگاروں میں مولانا قاضی محمد سلیمان منصور پوری نے اپنی تالیف "رحمۃ للعالمین" میں بھی ازواجِ مطہرات کے گیارہ نام لکھے ہیں۔ علامہ شبلی نعمانی اور علامہ سید سلیمان ندوی کی تالیف "سیرت النبیؐ" میں بھی ازواجِ مطہرات کی تعداد گیارہ ہی درج ہے۔ اس سے یہ نتیجہ بھی اخذ ہوتا ہے کہ گیارہ کی تعداد پر متفق ہونے والوں کی اکثریت ہے۔

حقائق کی روشنی میں ان روایات کی صحت میں شک و شبہ کی گنجائش موجود ہے۔ غالباً ہمارے راویوں اور سیرت نگاروں کی اس غلط فہمی کی وجہ یہ ہے کہ ازواجِ مطہرات میں دو نام عام طور پر چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ ایک "اُمِ ابراہیم حضرت ماریہ قبطیہؓ" کا، دوسرا "حضرت ریحانہؓ" کا۔ بعض تاریخ نویسوں نے ان دونوں خواتین کو کنیزوں میں شمار کیا ہے اور بعض نے تو حضرت صفیہؓ اور حضرت جویریہؓ کو بھی اسی فہرست میں رکھا ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ سب ازواجِ مطہرات تھیں اور اُمت کی مقدس مائیں۔ لہٰذا صحیح تعداد ازواجِ مطہرات کی تیرہ ہے۔ دو خواتین کے نام اور بھی بہت مشہور ہیں جن کو رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کا پیغام دیا مگر وہ شکوہ مند ہو کر نہ آسکیں۔ ان میں سے ایک نام حضرت اسماء بنتِ النعمان الکندیہ اور دوسرا نام حضرت عمرہ بنتِ یزید الکلابیہ کا ہے۔ بعض تاریخ نویسوں اور سیرت نگاروں نے ان کو بھی ازواجِ مطہرات میں شامل کر لیا ہے۔

اُم المومنین حضرت ماریہ قبطیہؓ بنت شمعون مصر کے ایک ممتاز خاندان کی خاتون تھیں۔ مقوقس والیٔ مصر نے ان کے ذریعے مصر و عرب کے اس قدیم رشتہ کو تازہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت ہاجرہ قبطیہ کی شادی سے قائم ہوا تھا۔ حضرت ماریہ قبطیہؓ مسیحی گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں لیکی وہ دین کی متحرک نہیں تھیں۔

رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے ۶ ہجری میں جب شاہانِ عالم کو دعوتِ اسلام دینے کا سلسلہ شروع کیا تو ایک مکتوب والیٔ مصر مقوقس عظیم قبط کو بھی تحریر فرمایا جس کا مضمون ذیل میں درج ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمدؐ خدا کے بندے اور اس کے رسول کی جانب سے
مقوقس حاکمِ مصر کے نام ہدایت کی پیروی کرنے پر سلام ہو۔
بعد ازاں میں آپ کو اسلام کی دعوت دیتا ہوں یعنی
اگر سلامتی منظور ہے تو اسلام قبول کر لیجئے۔ اگر آپ نے اسلام
قبول کر لیا تو اللہ تعالیٰ آپ کو دوہرا اجر عطا فرمائے گا۔ اور اگر
آپ نے انکار کیا تو سارے اہلِ قبط کا گناہ بھی آپ پر ہوگا۔
اے اہلِ کتاب ایسی بات تسلیم کرو جو ہمارے اور تمہارے
درمیان یکساں طور پر مسلّم ہے، اور یہ کہ ہم سب اللہ کے سوا
کسی اور کی عبادت نہ کریں، اور نہ کسی کو اس کا شریک ٹھہرائیں
اور نہ اللہ کے سوا کسی اور کو ارباب بنائیں۔
اگر تم کو اس بات سے انکار ہے تو تمہیں معلوم رہنا
چاہیے کہ ہم بہرحال اللہ کی یکتائی کا عقیدہ رکھتے ہیں۔

اللہ
رسول
محمد

دعوتِ اسلام کا یہ پیام لے کر عزیزِ مصر مقوقس کے پاس حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ گئے تھے۔ جو شاہانِ حیرہ کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے حضرت حاطبؓ اسلام کے پیرو تو تھے ہی لیکن مسیحیت سے بھی واقف تھے۔ انہوں نے مقوقس کو صرف مکتوب ہی نہیں پہنچایا بلکہ خود بھی جو گفتگو کی وہ بہت دلچسپ ہے انہوں نے اپنی گفتگو میں مقوقس کو ماضی کی یاد دلائی، فرعون و موسیٰ کا تذکرہ کیا پھر کہا کہ:

"رسول اللہ کے سب سے بڑے مخالف قریش ہیں اور سب سے بڑے دشمن یہود اور سب سے قریب نصاریٰ ہیں، موسیٰؑ نے عیسیٰؑ کی بشارت اس طرح دی تھی جس طرح عیسیٰؑ نے

مریم کی بشارت دی تھی لہٰذا ہم آپ کو قرآن کی جانب اسی
اسی طرح بلاتے ہیں جس طرح آپ اہلِ توریت کو انجیل کی طرف بلاتے
ہیں۔ ہم کسی کو دینِ مسیح سے روکتے نہیں بلکہ اسی کا حکم دیتے ہیں۔"
حضرت حاطبؓ کی باتیں سن کر مقوقس بہت متاثر ہوا اور بولا۔ بہت
بہت خوب" تم واقعی دانشور ہو اور عظیم دانشور کے پاس سے آئے ہو"
پھر اس نے مکتوبِ گرامی کا جواب ایک عرب کاتب سے لکھوایا جس کی عبارت

- محمد بن عبداللہ کے نام مقوقس عظیم قبط کی طرف سے
آپ پر سلامتی ہو۔ اس کے بعد واضح ہو کہ میں نے آپ کا خط
پڑھا، اور اس میں جو کچھ آپ نے بیان کیا ہے اور جس چیز
کی طرف آپ بلاتے ہیں اس کو میں نے سمجھا اور بے شک مجھے
علم تھا کہ ایک نبی باقی ہے مگر میں سمجھتا تھا کہ وہ شام سے ظہور کرے گا
میں نے آپ کے ایلچی کا اکرام کیا ہے اور دو لڑکیاں
آپ کے پاس بھیجی ہیں جن کا مرتبہ قبطیوں میں عظیم ہے اور
کچھ کپڑے وغیرہ بھی ارسال کئے ہیں اور ایک خچر بھی ہدیہ کیا
ہے تاکہ اس پر آپ سواری کریں۔

مقوقس (عظیم قبط)

رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوتِ اسلام کے مکاتیب کا اثر تو دوسرے والیوں نے بھی بہت لیا تھا اور انہوں نے بھی بڑے بڑے تحائف بھیجے لیکن مقوقس عظیم قبط کے تحائف کی نوعیت بالکل مختلف تھی۔ مقوقس کے خط میں عظیم مرتبہ قبطی لڑکیوں، قیمتی کپڑوں اور سواری کا بھیجنا مخصوص ہے لیکن دیگر میں تحائف کی جو طویل فہرست اور ان کی روانگی کا جو تزک و احتشام نظر آتا ہے اس کو رسولِ انام کی خیر سگالی اور دوستی کا سرسری عمل قرار نہیں دیا جا سکتا۔

عزیزِ مصر مقوقس نے قافلہ حاطبؓ کو رخصت بھی بڑے اہتمام سے کیا۔ مصری دستہ ان کی حفاظت کے لئے ساتھ بھیجا۔ خود حاطب بن ابی بلتعہؓ کو سو دینار اور پانچ قیمتی جوڑے دیئے۔ مصر سے ان کے ہمراہ حضرت ماریہ قبطیہ بنت شمعون کے علاوہ ان کی چھوٹی بہن شیریں آئیں۔ قیصو اور بریرہ نام کی کالی لڑکیاں تھیں مابور نامی ایک کالا غلام آیا اور جانوروں میں ایک گھوڑا آیا جس کا نام میمون تھا۔ ایک گدھا آیا جس کا نام یعفور تھا۔ ایک سرخ خچر آیا جس کا نام دلدل رکھا گیا۔ ایک خوبصورت سنگاردان دیا جس میں سونے کی سرمہ سلائی، کنگھا، آئینہ، خوشبودار تیل کی شیشی اور قینچی تھی۔ ایک مٹکا جس کے علاوہ بنہا کا مشہور اور لذیذ شہد تھا۔ عود، مشک اور عطریات کے علاوہ قیمتی ریشمی کپڑا اور جواہر بھی اس ساز و سامان میں شامل تھے۔

رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں بڑی خندہ پیشانی سے اس قافلہ کا استقبال کیا اور حضرت ماریہ قبطیہؓ کو حضرت اُم سلیم بنت ملحان کے گھر میں اتارا جو حضرت انسؓ کی والدہ تھیں۔ حضرت ماریہ قبطیہؓ یہیں مشرف بہ اسلام ہو کر حضورِ اکرمؐ کے عقد میں آئیں اور اُم المومنین کہلائیں۔

رسولِ اکرمؐ نے کچھ عرصہ بعد مدینہ منورہ سے شہر کی جانب ایک سرسبز و شاداب علاقہ میں جس کو عوالی کہتے ہیں اُم المومنین حضرت ماریہ قبطیہؓ کی مستقل رہائش کا انتظام فرما دیا تھا۔ یہ جگہ آج بھی مشربۂ اُم ابراہیم کے نام سے موجود ہے اور یہاں ایک مسجد ماریہ بھی ہے۔ جہاں رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اور اُم المومنین حضرت ماریہ قبطیہؓ نے نمازیں ادا فرمائی ہیں۔

مشہور عالم اور ممتاز سیرت نگار ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ:

حضرت ماریہ قبطیہؓ مصر کی حسین ترین خاتون تھیں۔ رسولِ اکرمؐ
کی کوئی اولاد حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ اور حضرت ماریہ قبطیہؓ
کے علاوہ کسی اور بیوی سے نہیں ہوئی۔ حضرت ماریہ قبطیہؓ
کے بطن سے ایک فرزند حضرت ابراہیم ہجرت کے آٹھویں
سال ذی الحجہ میں پیدا ہوئے۔ لیکن تقریباً اٹھارہ ماہ بعد
ان کا انتقال ہو گیا۔

حضرت ماریہ قبطیہؓ بہت حسین و جمیل تھیں۔ بہت خوش اخلاق اور بڑی دیندار خاتون تھیں۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کو ان کے خوبصورت بال اور جعد شکلیں بے حد پسند تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں کہ:

"ماریہ" ہماری سوکن تھیں اور رسولِ اکرمؐ ان کے یہاں
صبح و شام تشریف لے جاتے تھے۔

حضرت ماریہ قبطیہؓ کی چھوٹی بہن شیریں جو مصر سے اُن کے ہمراہ آئی تھیں وہ بھی حسن و جمال اور ذہانت و فطانت میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ماریہ قبطیہؓ کے مشورہ پر شیریں دربارِ رسالت کے جلیل القدر شاعر حضرت حسان بن ثابتؓ کے عقد میں آگئیں۔ اس طرح حضرت حسان بن ثابتؓ جن کے اشعار کو خود سرکارِ نبوتؐ سے سند حاصل تھی اب اُن کو حضورِ اکرمؐ کے "ہم زلف" ہونے کی بھی سعادت نصیب ہو گئی۔ حضرت حسان بن ثابتؓ شانِ رسالت مآبؐ میں فرماتے ہیں۔

"یہ وہ ہیں جن پر مہرِ نبوت چمک رہی ہے۔ اللہ کی
جانب سے یہ شہادت ہے جو چمکتی ہے اور دیکھی جاتی ہے
اللہ نے ان کا نام اُن کے اعزاز کے لئے اپنے نام سے مشتق
کیا ہے۔ وہ صاحبِ عرش محمود ہے اور یہ محمدؐ ہیں۔"

حضرت ماریہ قبطیہؓ کے بارے میں منافقین اور مستشرقین نے بہت سی غلط روایتیں بیان کیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ روایتیں سب لغو ہیں۔ حضرت ماریہ قبطیہ کا نام ازواجِ مطہرات کی فہرست سے کسی طرح علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت ماریہ قبطیہؓ اُم المومنین ہیں اور امت کی مقدس ماں۔

اُم المومنین حضرت ماریہ قبطیہؓ کا انتقال رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے پانچ سال بعد حضرت عمر فاروقؓ کے دورِ خلافت میں ہوا۔ مدفن مدینہ منورہ میں ہے۔

ن

ہر ہر را [illegible] اور اگلے ہی لمحے وہ میری بانہوں کی گرفت میں تھا۔

"ممی" اس نے اپنا چہرہ میرے بالوں میں چھپا لیا اور اپنی بانہوں میں لٹکائے کمرے میں آگئی۔

"کیسے ہے بیٹا ممی کی یاد آئی تھی" میں نے لاڈ سے پوچھا تو وہ میرے اور قریب آگیا۔

"ممی میں یہ سات دن کیسے گزارتا ہوں" اس کی آواز بھیگی بھیگی تھی میں نے اس کے رخساروں اور ہونٹوں کو چوم لیا۔

"مجبوری ہے بیٹا ورنہ میں تو ایک پل بھی تمہارے بنا نہ رکھوں" اپنے بالوں کو سمیٹتے ہوئے میں قالین پر ہی بیٹھ گئی یاسر میری گود میں سر رکھے باتیں کیے جارہا تھا کہ ناصر کمرے میں آگئے۔

"آداب" میں نے ذرا سا سر جھکا کر انھیں سلام کیا۔

"ٹھیک تو ہو نا؟"

ایک ننھے سے بچے کی کہانی جسے اپنی ماں کی تلاش تھی



"جی بالکل"

"پڑھائی کیسی جا رہی ہے"

"جی بالکل ٹھیک ہے دعا ہے آپکی" میں سعادت مندی سے بولی۔

ناصر تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد اپنی فرم کو چلے گئے اور میں نے سارا دن یاسر کے ساتھ بتایا۔ دن ڈھلنے لگا تو یاسر کو نہلا کر نیکر اور جرسی پہنا دی اور جوزی کا انتظار کرنے لگی پاپا کی ناراضگی کے خیال سے دل لرزنے لگا۔ یاسر تو سوپ پی کر اپنے کمرے میں سلا دیا تب تک ناصر بھی آگئے۔

"یاسر سو گیا ہے؟" آتے ہی انھوں نے استفسار کیا۔

"جی ہاں ابھی سویا ہے" میں یاسر کے کمرے سے نکل آئی ناصر میرے ہمراہ تھے۔

"آپ کو بہت تکلیف ہوتی ہے نا؟"

"نہیں یاسر بڑا سویٹ بچہ ہے۔"

میں اور ناصر جوزی کے جنرل کا ہاں سنائی دیا کاندھے پر بیگ لٹکائے ۔ ۔ ۔ [illegible] ہمراہ تھی۔

"ہیلو جوزی"

"ہیلو نانی بلکہ کنواری ماں" جوزی حسب معمول شگفتہ موڈ میں تھا

"شٹ اپ" میں نے کہا اور اس کے بستر پر بیٹھ گئی۔

"تمہارا بیٹا اور اس کے پاپا ٹھیک تو ہیں نانی؟"

"تم اس سلسلے میں کوئی مذاق نہیں کر سکتے" میں برا مان گئی تو وہ میری طرف مڑا۔

"ناراض ہو گئیں؟" میں خاموش رہی تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا

"بری بات نانی میں تمہارے لیے کتنے شاندار چائنیز پر مجبور ہو رہا ہوں اور تم مجھ سے ناراض ہو رہی ہو" بلیو شرٹ اور سلور کوٹ پہنے ہوئے وہ مجھے بالکل بچہ لگا یاسر جیسا معصوم اور سویٹ بچہ۔ میں ہنس دی تو وہ خوش ہو گیا اور ہم اپنے گھر آگئے۔

یاسر میری زندگی میں بالکل اچانک ہی آگیا تھا۔ کالج کے زمانے میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ ہم چھانگا مانگا گئے تھے میں ادھر ہی باتیں کرتے ذرا دور نکل گئے ایک چھ سالہ لڑکا دوڑتا ہوا آیا اور میری ٹانگوں سے چمٹ کر رونے لگا میں ہراساں اس کے ساتھ ایک خوش شکل نوجوان بھی تھا جو متواتر بچے کو ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا کچھ دیر تو صورت حال میری سمجھ ہی میں نہ آسکی گر جانے وہ بچہ کیسے اتنا پیارا لگا میں نے اسے گود میں اٹھا لیا وہ سسک رہا تھا "ممی"۔

"کیا بات ہے بیٹے آپ کی ممی کدھر ہیں؟" میں نے پوچھا مگر وہ میرے کندھے سے لگا ہوا ہوئے سسکیاں لے رہا تھا۔

"معاف کیجئے گا خاتون اس کی ممی چند ماہ پہلے وفات پا گئیں" نوجوان نے لب کھولے پھر متاسف سے لہجے میں بولا "مگر پہلے تو کبھی بھی ایسا نہیں ہوا"

"کوئی بات نہیں جناب بچہ ہے نا اسے کیا پتہ" میں نے اپنی دانست میں اس کی شرمندگی دور کی۔

"یاسر!" انھوں نے پکارا "نیچے اترو بیٹا آنٹی سے ایکسکیوز کرو۔" مگر وہ میرے کندھے سے لگا ہوا ہوئے سسکیاں لے رہا تھا۔

"ممی" اس نے آہستہ سے سر اٹھایا "ممی مجھے کیوں چھوڑ گئی تھیں آپ تو اتنا روتے تھے"۔

"ارے نہیں بیٹا میں تمہیں کیسے چھوڑ سکتی ہوں" ایک لمحے میں میں نے فیصلہ کر لیا کہ اگر بچے کا دل توڑ دیا تو ایکدم سے اسے شاک پہنچ جائے گا۔ میں دیکھتے ہی بیٹھ گئی میری گود میں لیٹا وہ ڈھیروں باتیں کرتا رہا جب اس کی پلکیں نیند سے جھکنے لگیں تو میں نے اس کے بالوں میں پیار سے انگلیاں پھیریں میری قمیص اپنے ہاتھوں میں سختی سے پکڑے پکڑے وہ سو گیا اور جب میری قمیص پر اس کی گرفت ڈھیلی ہو گئی تو میں نے اسے اس کے پاپا کی طرف بڑھا دیا۔

"لیجئے جناب یاسر سو گیا ہے۔" ان صاحب نے بچے کو نرمی سے اپنے



بازوؤں میں لے لیا۔

"شکریہ!"

"میرا نام تانیا رحمان ہے میں لاہور میں رہتی ہوں۔"

"مجھے ناصر کہتے ہیں میں بھی لاہور سے آیا ہوں یاسر کو بہلانے کے لئے میں اسے یہاں لے آیا تھا اچھا خدا حافظ۔" وہ ایکدم مڑ گئے۔

"سنیئے" ناصر صاحب یاسر جاگ جائے گا تو آپ کو بہت پریشان کرے گا۔"

وہ خاموش رہے "دیکھئے ناصر صاحب یہ میرا کارڈ ہے اس پہ میرا فون نمبر اور ایڈریس بھی ہے خدانخواستہ ـــــ میں ایک لمحے کو جھجک گئی۔ اگر یاسر زیادہ تنگ کرے تو مجھے اطلاع کر دیجئے گا۔" ناصر نے کارڈ تھام لیا۔

"شکریہ تانیا صاحبہ مگر آپ دعا کیجئے گا کہ اس کی ضرورت ہی نہ پڑے ورنہ یہ آپ کو بھی پریشان کر دے گا۔" ایک بار پھر خدا حافظ کہہ کر ہم واپس چلے آئے دل سے نہ چاہنے کے باوجود لاشعوری طور پر میں ناصر کے فون کی منتظر رہی "یاسر بیمار ہے وہ آپ کو بہت یاد کرتا ہے آپ کو تکلیف تو ہوگی مگر......

......" کئی دفعہ میں نے اپنے خیال پر لعنت بھیجی مگر یاسر کی معصوم صورت اور اس کے پیار کی بھی بھی لرزش مجھے اس کے پاس جانے کو مجبور کر رہی تھی ایک دوپہر جب میں کالج سے واپس آ کر اپنے بستر پر بیٹھی ہی تھی کہ فون آ گیا۔

"سنیئے تانیا میں ناصر بول رہا ہوں" اور مجھ میں نے فون سنا بھی نہیں۔ "میں آ رہی ہوں ناصر صاحب آپ پتہ بتا دیں۔" میں نے جلدی سے ریسیور رکھ دیا۔

یاسر کے گھر اپنی گاڑی اور ڈرائیور لے جانا تو حماقت ہی تھی پاپا میری اس عجیب حرکت پر سوال کرتے اگلے ہی لمحے میں جوزی کو فون کر رہی تھی "جوزی ذرا جلدی سے جیکٹ لے کر آ جاؤ ایک بچہ بیمار ہے۔" میں پریشان سی تھی۔

"مگر تانی میں تو سمجھا تھا تم فائن آرٹس میں انٹرسٹڈ ہو یہ ڈاکٹری کدھر سے سوجھ گئی۔"

"پلیز جوزی!" میرے اس لہجے پر جوزی پگھل گیا۔

"آ رہا ہوں جان ابھی ایک منٹ میں۔" واقعی تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ میرے سامنے تھا۔

"چلو کہاں چلنا ہے؟"

راستے میں میں جوزی کو سب کچھ بتا چکی تھی جوزی کا مجھ سے پردہ ہی کیا تھا ہم دونوں دوست ایک تھے ہمارے دل ایک، دل کی دھڑکنیں ایک تھیں۔ ناصر کے بتائے ہوئے پتے پر جب ہم وہاں پہنچے تو میں جھجک سی گئی

"کتنا عجیب سا لگتا ہے جوزی۔"

"چلو اب نکلو" وہ باہر جیکٹا پر ہی بیٹھ گیا اور میں اندر چلی آئی کمرے کے دروازے کے قریب ناصر نظر آ گئے "آداب"!

"تانیا پلیز جلدی کیجئے" وہ مجھے لے کر اندر آ گئے میری توقع کے مطابق یاسر بیمار نہیں تھا بلکہ وہ شہزادہ نیکر پہنے کمرے کے عین وسط میں بیٹھا چیخ چیخ کر رو رہا تھا اور قریب پڑے کھلونے خوب زور زور سے پٹخ رہا تھا مجھے اندر آتے دیکھ کر اس کے ہاتھ رک گئے اور رونا بھی بند ہو گیا مگر وہ میری طرف بڑھا نہیں بلکہ فوراً آنکھیں بند کر لیں۔ میں اس کے قریب آ گئی "بیٹا! آنکھیں کھولو تمہاری تانی آئی ہیں" ناصر بولے جواباً اس نے اپنا سر نفی میں ہلا دیا۔

"مگر کیوں؟" میں حیران تھی۔



"میں جس سے ناراض ہوتا ہوں اُس کی طرف دیکھتا بھی نہیں" وہ آنکھیں بند کئے ہوئے معصومیت سے بولا۔ میں ہنس دی۔ میں نے دیکھا پریشان سے ناصر کے لبوں پر بھی مسکراہٹ کھیل گئی اور وہ باہر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے اُسے لپٹا لیا "ٹھیک ہے ناراض ہو تو میں جا رہی ہوں پھر۔" اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں اور اپنے بازو میرے گلے میں ڈال دیئے کتنی ہی دیر گم صم گزری یوں لگا کہ وقت پر لگا کر اُڑ گیا۔ یاسر کو بہت مشکل سے مطمئن کرنے کے بعد میں باہر نکلی تو ہنڈا پر بیٹھے بیچارے جوزی کو دیکھ کر ٹھٹھک گئی "ارے!" مجھے واقعی یاد نہیں رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے اپنا ہنڈا سٹارٹ کیا میں شرمندہ سی پیچھے بیٹھ گئی اُس نے بنا بولے ہنڈا چلا دیا "جوزی، جوزی پلیز!" وہ خاموش رہا "جوزی مجھے یہاں اُتار دو میں خود چلی جاؤں گی۔" میں ناراض ہو گئی تو وہ بولا "آرام سے بیٹھی رہو" ہنڈا اُس نے چائنیز کے سامنے کھڑا کیا میں نے اُترنے سے انکار کر دیا وہ نرمی سے بولا "تم سے کس طرح سے اندر کھانا کھا کر چلیں گے گھر۔"

"ارے واقعی کھانا تو میں نے بھی نہیں کھایا۔"

"آج کل تم بہت بھولنے لگی ہو۔" وہ شاکی سا نظر آیا۔

"مگر تمہیں کیسے پتہ چلا میں نے کھانا نہیں کھایا" جوزی نے کھانے کا آرڈر دیا تو میں نے پوچھا۔

"تم کالج سے ایک بجے آتی ہو نا۔ سوا بجے تم نے مجھے فون کیا اور ڈیڑھ بجے ہم تمہارے بیٹے کے گھر تھے تو کھانے کا وقت ہی کیا بچا۔" میں نے اُس کی دانشمندی کی خوب داد دی۔ کھانا کھا کر ہم لوگ گھر لوٹے جوزی نے گڈ بائی کہا اور میں اندر آ گئی۔

بی اے کا امتحان کلیئر کر کے میں نے فائن آرٹس ایم اے میں داخلہ لیا زندگی اسی رفتار سے چل رہی تھی بس اس میں یاسر کا خوشگوار اضافہ ہوا تھا ناصر نے یاسر کو یہ کہہ کر مطمئن کیا تھا کہ میں یعنی اُس کی ممی پڑھائی کی وجہ سے ہاسٹل میں رہتی تھی اور چھٹی کے روز سارا دن اس کے گھر گزارتی تھی۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ پاپا کی میٹنگ عموماً اتوار کو ہی ہوتی تھی اس لئے میری اتوار کی غیر موجودگی انھیں کوئی پانی دینے میں بھی اس معاملے میں جوزی میرا راز دار تھا جوزی جو میرا شریک راز ہونے سے پہلے ہی میرا شریک راہ تھا۔ اتوار کی صبح وہ اپنے ہنڈا پر مجھے یاسر کے گھر چھوڑ جاتا اور واپسی پر بھی وہ میرے ہمراہ ہوتا۔

آج اتوار تھا اور موسم بھی خوشگوار تھا یاسر نے گھر سے باہر اپنے کو جانے پر ضد کیا ہوا تھا "ممی آپ کتنے گھنٹے گزرے ہوئے ہیں سارے بچے بور ہو رہے تھے۔ اب میرے دوست آئیں گے تو آپ ایسے ان کے سامنے جائیں گی؟" وہ میرے فیروزی ٹراؤزر کو دیکھ کے کہہ رہا تھا۔

"اس طرح آپ کو ممی اچھی نہیں لگتیں یاسر؟" میں نے کہا۔

"مگر یہ بات میری تو نہیں ہے نا میرے اتنے ڈھیر سارے دوست آئیں گے پھر۔ آپ اگر بدلنا چاہیں تو الماری کھول لیں سب رکھی ہوئی ہے۔" یاسر کمرے سے چل دیا تھا اور ناصر مجھ سے کہہ رہے تھے "یاسر کی پیدائش کے بعد وہ کچھ بھاری ہو گئی تھیں آپ کو ان کی ساڑی کا بلاؤز ٹھیک آ جائے گا۔" وہ اخبار پر نظریں جمائے بڑے سادہ انداز میں کہہ رہے تھے "مگر یہ ساڑی نہیں پہنتی" چلو واقعی میں ٹراؤزر اور شلوار قمیص کے علاوہ کچھ بھی نہیں پہنتی تھی مگر اُس روز مجھے ساڑی باندھنی ہی پڑی وہ نیوی بلو کلر کی خوبصورت ساڑی تھی بلاؤز کو تھوڑا سا ٹنگ کرنا پڑا۔ ساڑی پہن کر میں باہر نکلی تو خاصی جھجک رہی تھی یاسر میرا ہاتھ تھام کر باہر لان میں لے آیا جہاں اُس کے ڈھیر دوست موجود تھے وہیں ناصر بھی تھے۔ انہوں نے تانیا اُن کی نگاہوں میں پسندیدگی کا عنصر نمایاں تھا میں نے میز پر سامان لگوا دیا جوزی بھی آ گیا تھا لان سے اُس کے ہارن کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی میں نے ناصر کی جانب دیکھا وہ گویا میری نظروں کا مفہوم سمجھ گئے "تانیا کل آپ کا ٹیسٹ ہے نا اب آپ کو پڑھنا ہوگا آپ جائیے" اپنے پاپا کی بات سُن کر یاسر میری جانب آ گیا "ممی کیا آپ جا رہی ہیں؟" اُس کے لہجے میں جانے کیا تھا میرا دل ایکدم رونے کو چاہنے لگا۔ ہارن ایک بار پھر بجا تو میں نے اُسے جھک کر چوما اُس کے دوستوں کو پیار کیا ناصر کو خداحافظ کہہ کر باہر آ گئی جوزی نے مجھے ساڑی میں دیکھا تو زور سے سیٹی بجا دی "لفنگوں والی حرکتیں نہ کیا کرو" ہنڈا پر بیٹھے بیٹھے میں جھینپ کر بولی اس روز جوزی مجھے شیزان لے گیا نسبتاً تاریک ماحول میں ہم بیٹھے کتنی ہی دیر تک باتیں کرتے رہے۔

"تم ساڑی مت پہنا کرو" وہ بولا۔

"کیوں؟"

"بس میری مرضی" وہ ہنستے ہوئے بولا "دراصل مجھے یوں لگتا ہے کہ تم اس لباس میں قید سی ہو اور ہم تو ایسے کھنچے ہیں۔"

"انسان بھی کبھی کبھار مجبور بھی ہو جاتے ہیں جوزی۔" میں اُداس ہو گئی "تم خوامخواہ فلسفی بننے کی کوشش کر رہی ہو۔" وہ بات کو مذاق میں ٹالتے ہوئے بولا "کل میرے ساتھ پکچر چلو گی؟" گھر چھوڑتے ہوئے وہ میرے کرے

بلک لیا۔

"ابھی پڑھائی کو پہلے ہی بہت نقصان ہو رہا ہے" میں واش روم سے نہا کر نکلنے لگی۔

"سارا دن ادھر خراب کر آتی ہو میرے ساتھ چند گھنٹے گزارنے میں کیا حرج ہے۔" وہ چڑچڑے پن سے بولا۔

"پلیز ہوزی تم ہر وقت میرے اوپر احسان مت دھرا کرو میں خود ہی چلی جاؤں گی۔" وہ ابھی بیٹھا ہی تھا کہ میں ڈریسنگ روم میں گھس گئی کپڑے بدل کر واپس آئی تو وہ جا چکا تھا۔

"مجھے خود وہ واقعی نہیں آیا میرا دل بُرا سا ہو گیا" جوزی اب اپنا اصل ہست جانے لگا ہے" میں نے دُکھی دل سے سوچا اُس روز میں رکشے سے ہی گھر گئی یاسر سویا ہوا تھا اور ناصر اپنے کمرے میں کام میں مصروف تھے میں خاموشی سے یاسر کے بستر کے قریب بیٹھی رہی اور سارا وقت ہوزی کی گندا یا سر رات دیر سے سویا تھا۔ جوزی پہلے دیر سویا ہی رہا۔ میں اُس روز جلدی ہی گھر چلی آئی پاپا گھر پر ہی تھے۔

"اچھا ہوا تم آ گئیں میں سیمی کے گھر تمہیں پوچھنے جا رہا تھا" میرا دل لرز گیا پاپا اُس روز خوب موڈ میں تھے کیونکہ وہ بہت خوش تھے پھر میں اسٹڈی کے دروازے کی طرف نے جوزی کو دیکھا اُس کے ساتھ اُس کی بہن تانیا تھی جو ہمیں دیکھ کر وہ ہمارے قریب آ گئی۔

"ہیلو تانیا!"

"ہیلو!" میرا لہجہ خود بخود ہی روکھا سا ہو گیا۔ جوزی ہمارے قریب آیا مگر میں نے اُسے دیکھا بھی نہیں۔ یاسر نے کتنا اچھا افسانہ سمجھایا تھا وہ اتنی جمی ہوئی ذہن میں ناراضگی ہو آنکھیں اُسے دیکھنے کو تیار نہیں ہوتی۔ جوزی میری ناراضگی جان گیا تھا اس لیے چپ چاپ سا ہو گیا تھا تم ہم نے اکٹھے کیا دیکھو جاتے وقت میں نے اُس سے نظر نہیں ملائی۔

جمعے کی شب میں لان میں بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی کہ جوزی آ گیا۔ وہ میرے قریب ہی گھاس پر بیٹھ گیا "تانی!" اُس نے پیار سے پکارا میں خاموش رہی تو اُس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا میں بلا مزاحمت کے خاموش بیٹھی رہی۔ اُس نے میرا ہاتھ اپنے دونوں مضبوط ہاتھوں میں دبا لیا۔ "اتنے دن سے غصہ رہا میں ابھی جانتی ہے" وہ بہت جذباتی ہو رہا تھا میری پلکیں خود بخود بھیگ گئیں۔

"ارے!" وہ چونک گیا "تانیا کی وجہ سے اتنی ناراضگی ہے" میں نے بس آہستہ سے سر ہلا دیا۔

"تانیا تم ایک روز میرے سنگ تانیا کو دیکھ کر اتنی اُداس ہو تو کیا مجھے تمہارا ایک سال سے مستقل یاسر اور اُس کے پاپا سے ملنا اچھا لگتا ہو گا؟" وہ اداس سا ہو گیا۔

"تم مجھے ایسا سمجھتے ہو؟" میری بھرائی ہوئی آواز میں بولی تو وہ ہنستے ہوئے میرے چہرے پر جھک گیا۔

"تمہاری آنکھوں کے یہ آنسو اپنے ہونٹوں میں سمو لوں" وہ شرارت سے

چور

فرانس کے ممتاز افسانہ نگار بالزاک کے گھر ایک رات چور داخل ہوئے اور وہ اس کی تجوری کی تلاشی لینے لگے۔ بالزاک اس وقت جاگ رہا تھا اپنے بستر سے اچانک اٹھا اور ان کی طرف بڑھتا ہوا کہنے لگا۔

"دوستو! میں تمہارے اس کام میں تمہارا ہاتھ بٹانا چاہتا ہوں۔"

"کیوں؟" بے اختیار کسی چور نے پوچھا۔

"کیونکہ" بالزاک نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "میں بھی روزانہ اس تجوری کی تلاشی لیتا ہوں لیکن آج تک کوئی قیمتی شے میرے ہاتھ نہ لگ سکی۔"

پیچھے ہٹ گئی۔

"مجھ سے بات نہیں کرو میری طرف دیکھو بھی نہ" میں ابھی تک ناراض تھی۔

"پگلی تم خود سوچو اس کہانی کا انجام کیا ہوگا کچھ ہی عرصے بعد تم ایم اے مکمل کر لو گی پھر ہم دونوں امریکہ شفٹ کر جائیں گے اس وقت تم یاسر کو اس کی ممی کیسے دے سکو گی؟" شریر جوزی عاشق آج بہت عقلمندی سے سوچ رہا تھا اُس روز بات ختم تو ہو گئی مگر اس کے باوجود میں رات بھر سوچ کر پریشان ہوتی رہی کہ کل کیا ہو گا مگر دوسرے روز جب یاسر میری گود میں تھا تو میرا ذہن تمام وسوسوں سے پاک ہو چکا تھا کل کی کیسی فکر تھی میرے سامنے صرف آج تھا اور آج یاسر میری آغوش میں تھا۔

ممی کی برسی والے روز میرا دل بہت بُرا ہو رہا تھا ممی نے مجھے اُس وقت تنہا چھوڑا تھا جب میں صرف آٹھویں میں تھی سات برس کا سفر میں نے تنہا محض اپنے پاپا کے سہارے طے کر لیا تھا مگر آج محرومی کا احساس اُس روز اس شدت سے میرے دل و دماغ کو متاثر کر گیا کہ میں بیمار پڑ گئی اتوار کے روز بھی میرا بخار کم نہیں ہوا جوزی صبح میرے پاس آیا "تانیا جان آج یاسر کی طرف مت جانا تم بہت بیمار ہو" میں نے نقاہت سے اُس کا ہاتھ پکڑ کر کروٹ بدل لی۔ مگر ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ناصر کا فون آ گیا۔

"آپ ٹھیک تو ہیں تانیا؟"

"نہیں ناصر صاحب مجھے بخار ہے آج میں نہیں آ سکوں گی۔"

"اوہ...!" وہ گھبرا سے گئے "تو آپ بالکل مت آیئے گا یاسر تو بس بے جا ضد کر رہا ہے" انھوں نے فون بند کر دیا مگر میرا دل چاہا ابھی جاؤں اور اسے سینے سے لگا لوں مگر جوزی تو واپس جا چکا تھا اور اس بیماری میں سواری کی کوشش

کرتا ایک مسئلہ تھا آخرکار میں نے جوزی کے پاپا کو فون کیا۔ "جوزی کا بغیر بہانہ نا مگر...
........" میں نے اپنی بات پوری بھی نہ کی تھی کہ وہ بولا۔ "ممی کی بات نہیں تانی میں جانتا تھا تم یاسر سے ملے بغیر نہ رہ سکو گی میں آرہا ہوں۔"

اس روز جوزی میرے ساتھ ہی آگیا میں بیمار تھی زیادہ دیر بیٹھ نہ سکتی تھی ابھی مجھے جوزی کے ہمراہ واپس جانا تھا یاسر مجھے یوں غیر متوقع طور پر اسکے دیکھ کر بہت خوش تھا۔ "میں اب جاؤں بیٹے میری طبیعت خراب ہے۔"

"ممی آپ یہاں رہ جائیے میں آپ کا سر دباؤں گا آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔" وہ پیار سے بولا۔ "ممی یہ آپ کے سر (SIR) ہیں نا؟" یاسر جوزی سے پہلی بار ملا تھا۔

"ہاں بیٹے! کل میرا پیپر ہے اگر میں رکی تو میرے سر مجھے ماریں گے۔" میں نے سمجھایا تو وہ مان گیا میں جانے لگی تو وہ میرے قریب آگیا۔

"ممی بہت زیادہ بخار ہے؟" اس نے میرا گرم ہاتھ تھام لیا ناصر بھائی قریب آگئے۔

"بیٹے اب ممی کو جانے دو نا انھیں آرام کرنا ہے۔" یاسر گیٹ تک میرے ساتھ آیا اور اس روز پہلی بار اُس نے ساتھ چلنے کی ضد کی "ممی مجھے ساتھ لے چلیں! میں اچھی اچھی کہانی سناؤں گا کہ آپ اپنی بیماری بھول جائیں گی۔" میں خاموش رہی اس سے کہتی بھی کیا دروازے پر سے جب ناصر اُسے واپس لے گئے تو دور تک اس کے رونے کی آواز آتی رہی اور میرا دل تڑپتا رہا۔

"تم غلط نہیں ہو تانیا واقعی یاسر بہت پیارا بچہ ہے۔"

"دیکھانا۔" میں تفاخر سے بولی۔

"اس دن کا باپ بھی۔"

"جوزی۔" میری آواز لند گئی۔ "کیسی باتیں کر رہے ہو جوزی۔"

"بس تانیا اب بہت ہو گیا میں اس سے زیادہ برداشت نہ کر سکوں گا۔"

جوزی کا لہجہ بہت بلند ور دتھا جوزی کا یہ بے رحم لہجہ دیکھ کر میں نڈھال سی ہو گئی۔ ہنشا تیز رفتاری سے ہمارے گھر کے دروازے پہ پہنچا میرا سر چکرا رہا تھا میں گیٹ کو پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔ "جوزی...... جوزی پلیز مجھ پر رحم کر دیں ایک التجا ہے کہ آئندہ مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کرنا۔" میں دیوار کا سہارا لئے اندر آنے لگی تو جوزی میرے قریب آگیا۔ "چلو تمہیں تمہارے کمرے تک چھوڑ آؤں۔" میں نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ "بس جوزی تم نے پہلے ہی مجھ پر بہت احسان کئے ہیں اب اور بار نہ اٹھا سکوں گی۔" میرا دماغ شل ہو رہا تھا۔

"اتنی مشکل اُردو نہ بولو میں شرمندہ ہوں۔"

"اب چلے جاؤ پلیز جوزی۔" اور جوزی چلا گیا۔

میرا بخار بگڑ کر ٹائیفائڈ بن گیا۔ جس وقت مجھے ہوش آتا تو خود پر جھکے ہوئے پاپا کو دیکھ کر میں رو پڑتی جوزی بھی ہر وقت میرے پاس رہتا تھا میں ذرا سی آنکھیں کھولتی تو وہ میرے اوپر جھک جاتا۔ "جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ تانیا کی بچی" اور میں کروٹ بدل لیتی مجھ میں اتنا حوصلہ نہ تھا کہ میں اُس سے نظر ملا سکتی۔ ایک روز

کے ایڈیٹر مولوی انشاءاللہ خاں اکثر اقبال کے پاس آیا کرتے تھے۔ ان دنوں علامہ انارکلی بازار میں رہتے تھے اور وہیں طوائفیں بھی آباد تھیں۔ میونسپل کمیٹی نے ان کے رہنے بسنے کے لیے دوسری جگہ تجویز کی اور وہاں سے ان کے کوٹھے اٹھا لیے گئے۔ اس زمانے میں مولوی انشاءاللہ خاں علامہ سے ملنے آئے لیکن اتفاق سے دو تین بار وہ گھر پر نہیں ملے۔ آخر جب چوتھی بار مولوی صاحب علامہ کو گھر میں پانے میں کامیاب ہو گئے تو مذاقاً کہا۔

"ڈاکٹر صاحب! جب سے طوائفیں انارکلی سے اٹھا دی گئیں آپ کا بھی دل یہاں نہیں لگتا!" اس پر اقبال نے فوراً جواب دیا۔

"مولوی صاحب! کیا کیا جائے وہ بھی تو وطن کی بہنیں ہی ہیں۔" اور مدیر "وطن" مولوی صاحب پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

جب یاسر سے ملنے کی تمنا شدید ترین ہو گئی تو میں نے فون کر ڈالا۔ "ہیلو!" فون پہ ناصر تھے۔ "ناصر صاحب میں بہت بیمار ہوں آ نہیں سکتی یاسر کو فون پہ بلا دیں۔"

"یاسر اپنے دوست کے گھر گیا ہوا ہے اسے بلوا دوں؟"

"نہیں وہ آئے تو بلوا دیجئے گا۔"

"ایک بات پوچھوں تانیا؟"

"جی"

"میں آپ کو دیکھنے آ سکتا ہوں؟" ان کا لہجہ بالکل ہی مختلف تھا۔

"کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"او معاف کیجئے گا شاید مجھے ایسی خواہش نہیں کرنی چاہیے تھی ویسے آپ اپنا خیال رکھیے گا خدا حافظ۔" بہت عجلت میں فون بند کر دیا گیا اور میری سوچ کو ایک اور گرہ مل گئی۔

"تانیا!" جوزی کی آواز میرے بہت قریب سے آرہی تھی مگر میں نے جان بوجھ کر آنکھیں نہیں کھولیں۔ "پھر یاسر سے کہہ دوں کہ اُس کی ممی سو رہی ہیں؟" میں نے فوراً آنکھیں کھول دیں جوزی مسکرا دیا میں نے اُس کی بات کو مذاق جانا تھا مگر اس نے ریسیور میری جانب بڑھا دیا۔

"ہیلو ممی!" فون پہ اُس کی آواز بہت بدلی بدلی سی لگ رہی تھی۔ "یہ تم ہو یاسر جان یہ تم ہو نا؟" میں وارفتگی سے بولی۔ جوزی کمرے سے باہر چلا گیا۔

"ممی ممی!" فون پہ ہی اُس نے رونا شروع کر دیا مجھے خود پر قابو نہیں رہ

وہ بھی ریسیور تھامے سسکیاں سلسلے کر رہی تھی۔ فون ناصر نے لے لیا تھا۔

" یہ کیا بے وقوفی ہے تانیا اِس طرح تو آپ اور بھی بیمار ہو جائیں گی یاسر بچہ ہے اپنی ماں کیلئے رو رہا ہے آپ ...."

" ہاں ناصر صاحب میری بھی تو ماں نہیں ہے نا ..." میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

" اسی شب پاپا میرے کمرے میں آئے مجھے پیار سے شانوں سے تھام لیا " جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ تانیا بیٹی زرد زرد دلہنیں اچھی نہیں لگتیں۔"

" جی !" میں بوکھلا گئی۔

" ہاں بیٹے بس تم جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ تو میں بھی اپنی ذمہ داری سے فارغ ہو جاؤں جوزی جلد ہی امریکہ جانے والا ہے۔"

" مگر پاپا"

" میں تمہاری بات سمجھتا ہوں بیٹے مگر ایک ننھے بچے کی ضد کے لئے اپنی پوری زندگی تو قربان نہیں کی جا سکتی نا۔"

" پاپا آپ ......"

" مجھے جوزی نے بتایا ہے تانیا مگر وہ خود بھی اس سلسلے میں پریشان ہے اس کی خواہش ہے کہ تم جلد سے جلد اُس کی دلہن بن جاؤ۔" پاپا جانے کیا کہتے ہے" ٹھیک ہے پاپا گھر میں جوزی سے بات کرنا چاہتی ہوں۔" پاپا کے جانے کے بعد میں نے جوزی کو فون کیا۔

" جوزی تم چاہتے ہو کہ جلد از جلد ہماری شادی ہو جائے میرے اگزام سے بھی پہلے ؟"

" ہاں تانیا اب میں اور صبر نہیں کر سکتا۔" وہ جذبات سے بھرپور آواز میں بولا۔

" نہیں یہ سب اِس لئے ہے کہ تمہیں مجھ پر اعتماد ہے نہ خود پر تم سوچتے ہو گے کہ اگر کچھ دیر ہو گئی تو کہیں میں یاسر کی ممی ہی نہ بن جاؤں" میں کچھ طنزیہ سے لہجے میں بولی۔

" نہیں اب ایسا کبھی ہو ہی نہیں سکتا تم میری ہو صرف میری" وہ سخت جذباتی ہو رہا تھا میں مسکرا دی "خدا حافظ جوزی" میں نے فون بند کر دیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد جوزی میرے سامنے تھا۔" تم نے کیا سوچا ہے؟"

" مجھے کوئی نئی بات تو سوچنی نہیں تھی وہی ہوگا جو ہفتے سے سب نے سوچا ہوا تھا۔" میں بڑی پیاری مسکراہٹ ہونٹوں پہ لئے بولی۔" واقعی ! جوزی کا چہرہ مارے خوشی کے چمک اٹھا فوراً اٹھ کھڑا ہو شاباش۔" اُس روز کئی دنوں کے بعد میں زندگی کا سہارا لیکر لان تک آئی۔

" تم اتنے دن اُس بند کمرے میں پڑی رہی ہو وہ باتیں سوچتی رہیں دیکھو تو دنیا کتنی حسین ہے۔" وہ کسی معصوم سے بچے کی طرح خوش تھا۔

حالی یا ہالی

مولانا حالی ایک بار سہارنپور گئے اور وہاں ایک معزز رئیس کے ہاں ٹھہرے۔

گرمی کے دن تھے اور مولانا کمرے میں لیٹے ہوئے تھے۔ اتفاق سے ایک کسان آگیا۔ رئیس نے اس سے مولانا کو پنکھا جھلنے کو کہا۔ وہ بے چارہ پنکھا جھلنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے ان رئیس سے پوچھا "یہ بزرگ جو سو رہے ہیں کون ہیں؟"

رئیس نے جواب دیا "تم ان بزرگ کو نہیں جانتے، سارے ہندوستان میں ان کا بڑا شہرہ ہے!"

وہ کسان بولا "میں نے تو انھیں پہلی بار دیکھا ہے۔"

"ارے یہ مولوی حالی ہیں۔" ان صاحب نے بتایا۔

اس کسان کو بہت تعجب ہوا وہ کہنے لگا "جی کبھی ہالی بھی مولوی ہوئے ہیں؟"

اگلے ہفتے میرا نکاح تھا رخصتی البتہ ایم اے کے امتحان کے بعد طے پائی اور رخصتی کے چند روز بعد ہی ہم دونوں امریکہ کے لئے فلائی کرنے والے تھے۔ اور آج میں یاسر سے ملنے جا رہی تھی آخری دفعہ اُسے یہ سمجھانے کہ اُس کی ممی مر چکی ہے اور میں صرف ایک سایہ تھی جو دھوپ کے ڈھلتے ہی ختم ہو جاتا ہے۔ جوزی میرے ہمراہ تھا جوزی باہر بیٹھا میرا انتظار کرنا چاہتا تھا مگر میں اُسے اندر لے آئی "اب کیا پردہ رہ گیا ہے جوزی" مجھے دیکھ کر یاسر اپنی ڈرائنگ بک چھوڑ کر میری طرف بڑھا تو میں خوش ہونے کی بجائے غمگین سی ہو گئی ناصر بھی دیکھ کر ہمارے قریب آگئے۔

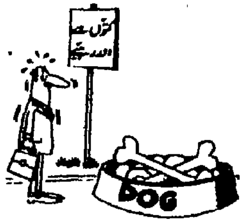
"جوزی تم ناصر صاحب سے بات کرو مجھ میں تو اتنی ہمت نہیں ہے۔" ناصر جوزی کو لے کر ڈرائنگ روم میں چلے گئے اور میں یاسر کو لے کر بیٹھ گئی۔

"بیٹا اگر میں امتحان میں فیل ہو گئی تو مجھے ایک سال اور تم سے جدا ہونا پڑیگا"

"نہیں ممی بالکل نہیں اب اور صبر نہیں ہوتا۔" وہ رونے لگا۔

"تم ایک منٹ میں رو پڑتے ہو یہ اچھی بات نہیں ہے یاسر۔" میں نے اُسے سینے سے لگا لیا۔

"مگر ممی آپ بھی تو رو رہی ہیں۔" گالوں پہ نمی کا احساس ہوا تو میں لرز گئی میں یاسر سے کیسے جدا ہو پاؤں گی میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ سوچا۔ کچھ دیر کے بعد ناصر جوزی کو لئے ہمارے پاس آئے تو ان کا چہرہ تاریک ہو رہا تھا ان کے ہاتھ بھلے ہوئے لرز رہے تھے وہ خاموشی سے میرے قریب آگئے۔ بہت



دیر ہوگئی آنیا اب ہمیں یاسر کو بتانا ہی ہوگا۔" ان کی آواز کا ارتعاش مجھ سے چھپا ہوا نہیں رہ سکا۔ وہ لت لین پر ہی یاسر کو اپنی گود میں لے کر بیٹھ گئے۔ "بیٹا میں تمہیں جو بھی بات بتاؤں گا تم رو گے نہیں۔" یاسر نے حیرانی سے اپنے پاپا کو دیکھا۔ "ہاں بیٹا تمہارے رونے سے مجھے تکلیف ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ بھی ناراض ہوتے ہیں۔"

"آپ کہیئے تو پاپا۔" وہ بیزار سا ہوگیا۔ قیامت کا لمحہ آنے والا تھا میں نے منہ پھیر لیا میں یاسر سے نظر کیسے ملاتی۔

"بیٹا" ایک لمحے کو ناصر کی آواز کانپ گئی پھر وہ قدرے نارمل ہو گئے۔ "تم جانتے ہو کہ تمہاری ممی مر گئی تھیں جس وقت تم چار برس کے تھے اور یہ تمہاری ممی نہیں ہیں۔" ناصر کہہ ہی گئے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے نظر اٹھائی اور یاسر کو دیکھا وہ ویسے ہی بیٹھا تھا۔ "اور بیٹے کیونکہ تانیا تمہاری ممی نہیں ہیں اس لئے وہ تمہارے پاس کیسے رہ سکیں گی انہیں جانا ہی ہوگا۔" یاسر اب بھی بالکل خاموش تھا جوزی اور ناصر حیران سے ہو گئے۔ "تم حیران نہیں ہوئے یاسر۔" جوزی پہلی بار بولا۔ "نہیں انکل" اس نے ایک گہری سانس لی اور پیچھے ہٹ گیا۔

"مجھے یہ پتہ تھا کہ یہ میری ممی نہیں ہیں۔" وہ میرے قریب آ گیا۔

"کیا؟" میری سانس حلق میں اٹک گئی۔ "ہاں پاپا اس روز جب آپ پہلی بار ان سے ملے تھے تو مجھے پتہ تھا کہ یہ میری ممی نہیں ہیں میری ممی تو مر گئی ہیں لیکن یہ مجھے بہت اچھی لگی تھیں مجھے پتہ چل گیا تھا کہ یہ مجھے بہت پیار کریں گی انھوں نے جب مجھے بیٹا کہا تھا نا تو پاپا اس وقت مجھے یہی لگا تھا کہ یہ میری ممی بن گئی ہیں۔" وہ بولتے بولتے خاموش ہو گیا۔ "مجھے پتہ ہے پاپا کہ یہ بھی جائیں گی میری بس کی بھی شادی ہو گئی ان کی بھی ہو جانے گی یہ بھی مجھے چھوڑ کر چلی جائیں گی۔"

"یاسر" میں سسک پڑی اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ "بیٹا ایسے نہ کہو۔" وہ نرمی سے پیچھے ہٹ گیا۔ "آپ مجھے اتنا پیار نہ کریں پھر میں آپ کے بغیر سکول کا مر جاؤں گا آپ کو یاد کرتے کرتے۔" وہ خاموش صوفے پر بیٹھ گیا

ناصر ان کے قریب آ گئے۔ "پاپا مجھے سب معلوم ہے یہ ان کے گھر نہیں ہیں۔" وہ جوزی کی طرف اشارہ کر کے بولا جس دن یہ ان کے ساتھ آئے تھے تو میں ڈر گیا تھا کہ یہ ان کو ہمیشہ کے لئے لے جائیں گے۔" وہ آہستہ آہستہ بول رہا تھا اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرا دماغ پھٹ جائے گا۔ محبت و پیار کا متلاشی یاسر اپنے آپ کو اتنا دھوکہ دے دے گا میرے سان و گمان میں بھی نہ تھا ناصر سر جھکائے خاموش بیٹھے تھے اور جوزی دم بخود سا تھا۔

وہ ننھے ننھے قدم اٹھاتا میرے قریب آ گیا۔ "آپ مجھ سے اتنا بہت سا پیار کرتی تھیں کہ کئی دفعہ مجھے یقین سا ہونے لگتا تھا کہ آپ میری ممی ہیں۔"

"یاسر پلیز یاسر بس کرو۔" میں سسک پڑی اور اسے گود میں لے لیا کتنے ہی لمحے چپ چاپ گزر گئے یاسر کو گود میں لئے میرے ذہن نے ایک بڑا ہی عجیب فیصلہ کر لیا میں اسے تھامے تھامے کرسی پر ٹک گئی "یاسر میرے بچے تم نے ٹھیک کہا تھا سب لڑکیوں کی شادی ہوتی ہے میری بھی شادی ہوگی۔" میں ایک لمحے کو رکی اور پھر کہا "ہاں بیٹا میری بھی شادی ہوگی تیرے پاپا کے ساتھ ..... " میں یہ بات بے ساختہ کہہ گئی جوزی اور ناصر نے چونک کر میری طرف دیکھا مگر میں اپنے بیٹے کی خوشی کو بھانپ لے اور رک گئے میں نے دیکھا جوزی ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ "اچھا میں چلوں ناصر صاحب۔" پھر وہ میرے قریب آ گیا یاسر میرے ساتھ اور مضبوطی سے چمٹ گیا "او کے تانی اب میں چلتا ہوں ناصر صاحب خود ہی تمہیں گھر پہنچا آئیں گے ......" اس کا لہجہ بظاہر نارمل تھا۔

"تم ناراض تو نہیں جوزی!" دل میں ندامت کی لہر اٹھی۔

"تم جیسی اتنا گرا ہوا سمجھتی ہو تانیا..... اچھا خدا حافظ۔" وہ اپنی زندگی میں کبھی اتنا عجیب نہیں ہوا تھا وہ باہر چل دیا اور یاسر میری گود سے سرک گیا "آپ میری ممی بن نا سچ مچ کی ممی ہیں نا!" وہ لاڈ سے بولا۔ "ہاں بیٹے مگر آپ اپنے پاپا سے بھی تو پوچھ لیجئے۔" میری مسکراہٹ بڑی ہی کشش گیں تھی ناصر نے ایک لمحہ میری طرف غور سے دیکھا اور پھر زندگی سے بھرپور آواز میں بولے "جب معاملہ ماں اور بیٹے کے درمیان طے پا گیا تو ہماری کیا مجال کہ کچھ بولیں۔" وہ خوش دلی سے کہنے لگے یاسر میرے پاس تھا میری شہ رگ کے قریب اور ناصر ہمارے پاس تھے مسکراتے ہوئے شاد و سا چہرہ لیے اور اس لمحے فضا شہنائیوں کی آواز سے یوں گونج اٹھی تھی کہ جاتے ہوئے جوزی کی بجتا ہی کی آواز اس میں دب کر رہ گئی۔

عریانی! فحاشی! بیحیائی!

- [illegible]
- [illegible]
- [illegible]

نئی نسل کی نفسیات

لبنیٰ اعجاز ——— اچھرہ۔ لاہور

میں دوشیزہ کی مستقل خریدار ہوں۔ "بحث ونظر" بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ مختلف لوگوں کے اس بارے میں دلائل پڑھ کر مجھے بھی شوق پیدا ہوا کہ میں بھی اس مسئلے میں اپنی رائے پیش کروں۔

مجھے اس بات سے انکار نہیں کہ ہمارے معاشرے میں عریانی، فحاشی، بے حیائی نہیں ہے بلکہ میں کہتی ہوں کہ ہمارے معاشرے میں ان برائیوں کی بھرمار ہے لیکن یہ سب کچھ ہمارے بزرگوں کی غلط تربیت کا نتیجہ ہے۔ اگر وہ کل اپنی اولاد کی صحیح تعلیم و تربیت کرتے تو آج یہ دن دیکھنا نہ پڑتا۔ آج کے زمانے میں دولت کی ہوس بڑھ گئی ہے جس کو دیکھو وہ یہی چاہتا ہے کہ راتوں رات جائز و ناجائز طریقے سے امیر ہو جائے۔ اسی بھاگ دوڑ میں ماں کے بچوں کو ان کی شفقت اور محبت نہیں ملتی۔ عدم توجہ اور عدم محبت سے بچوں کی شخصیت نامکمل رہ جاتی ہے۔ اس طرح بچوں کے دلوں میں احساس کمتری اور احساس محرومی پرورش پا لیتا ہے۔ اس دن رات کے ذہنی خلفشار کے نتیجے میں جو بچہ سن بلوغ کو پہنچتا ہے تو اس میں خود اعتمادی اور اولوالعزمی نام کو نہیں ہوتی۔ وہ ہر وقت ماں باپ کے خلاف نفرت اور عدم محبت سے بے چین رہتا ہے۔ چنانچہ ایسے بے چینی دباؤ کے لیے وہ فحش رسائل اور گھٹیا فلموں میں دلچسپی لینا شروع کر دیتا ہے۔ بعض نوجوان غلط صحبت کے باعث نشہ آور ادویات میں اپنا غم غلط کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اب لڑکیوں کی عریانی اور بے حیائی کی طرف آیئے۔ آج بھی صنفِ نازک کی بڑی تعداد کو حقیر اور پاؤں کی جوتی سمجھا جاتا ہے۔ اس کو حقیر جان کر اس سے برا سلوک کیا جاتا ہے۔ اس کو دبا کر رکھا جاتا ہے۔ اس کو محبت اور توجہ سے محروم رکھا جاتا ہے۔ یہ ماحول دیکھ کر وہ ایک آتش فشاں بن جاتی ہے جو جذبات سے لبریز ہوتا ہے۔ جب وہ محسوس کرتی ہے کہ گھر میں کسی کو اس کی پرواہ نہیں ہے تو وہ سوچتی ہے کہ اگر میں بگڑ جاؤں تو بھی کسی کو بری پرواہ نہیں اور اگر میں اچھی بھی بن جاؤں تو بھی کسی کو پرواہ نہ ہوگی۔ چنانچہ وہ نفرت انگیز تربیت سے بیزار ہوتی ہے۔ اس لیے وہ ماں باپ اور اپنے خاندان سے بدلہ لینے کے لیے بری راہ اختیار کرتی ہے۔ جب گھر پر کوئی اس پر توجہ نہیں دیتا تو وہ باہر کے لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کے لیے عریاں لباس پہنتی ہے اور فیشن سے نمایاں ہونے کی کوشش کرتی ہے۔ ماں باپ کی عدم محبت سے وہ صنفِ مخالف سے بے جا توقعات وابستہ کر لیتی ہے جو کبھی اس کو برائیوں کے عمیق غار میں لے جاتی ہے اور کبھی بدنامی کے سیاہ داغ بخش دیتی ہے۔ چنانچہ یہ ہے نئی نسل کی نفسیات، وہ قدرت کی طرف سے یہ تحفہ نہیں لے کر آئی بلکہ ماحول کے عوامل نے اس کو ایسا بنا دیا ہے۔ اب نئی نسل پر نکتہ چینی کی جاتی ہے

بحث و نظر

یہ وہ لفظ ہے جس کا ہماری معاشرتی زندگی میں کوئی عام مفہوم نہیں ہے:

کہ وہ عریانی کی طرف مائل ہے۔ میں کہتی ہوں اگر انہوں نے شروع سے ان کو صحیح تربیت دی ہوتی۔ ان کو مذہب کے بارے میں آگاہ کیا ہوتا ان میں گناہ کے خلاف نفرت اور نیکی کا شوق پیدا کیا ہوتا۔ تو حال یہاں تک نہ پہنچتا۔ لیکن اب یہ ایک دوسرے پر تنقید کرنے کا وقت نہیں بلکہ ہم کو چاہیے کہ ہم ایک دوسرے کی غلطیوں کو دلوں میں جذب کر لیں اور عریانی، فحاشی، بے حیائی کو جڑ سے اکھاڑنے کا پکا ارادہ کر لیں اور ساتھ ہی یہ عزم بھی کر لیں کہ آئندہ نسل کو اپنی محبت سے محروم نہ کریں گے۔ ان کو مذہب کے بارے میں آگاہ کریں گے اور ان کو پاکستان کا شاندار مستقبل بنائیں گے پھر وہ دن دور نہ ہوگا جب پاکستان میں پاکیزہ معاشرہ جنم لے گا۔

عرب ممالک میں عریانی زیادہ ہے

عبدالجلیل شیخ ——— پوسٹ بکس ۵۱۱۰ کویت

عریانی، فحاشی اور بے حیائی کے عنوان سے ماہنامہ دوشیزہ میں چند ماہ سے مختلف حضرات اپنی اپنی رائے پیش کر رہے ہیں۔ بعض حضرات نئی نسل پر اس کا الزام لگا رہے ہیں اور بعض پرانی نسل پر اور دیگر سرے سے ہی اس کو تسلیم نہیں کرتے کہ عریانی، فحاشی اور بے حیائی نام کی کوئی چیز ہمارے درمیان موجود ہے۔

میری نظر میں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم لوگ دراصل اپنے مذہب کو بالکل بھول چکے ہیں اور نام کے مسلمان ہیں۔ زبانی جمع تفریق کے سوالات کر لیتے ہیں۔ لیکن اس پر کوئی بھی عمل کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ اگر ہم اپنے ملکی قانون کو قرآن و سنت کے مطابق بنائیں اور اس پر عمل کریں تو ہمارے ملک سے کیا تمام مسلم ممالک سے عریانی، فحاشی اور بے حیائی دور ہو سکتی ہے۔ کئی حضرات نے اپنی رائے اس طرح دی کہ عریانی فحاشی اور بے حیائی مغرب سے درآمد کی گئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم لوگ پہلے اپنے گھر میں دیکھیں تو ہمیں سب کچھ نظر آجائے گا۔ ہمارے ملکی اخبار، رسائل اور فلموں میں جو کچھ آپ دیکھتے ہیں۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں۔ کہ ہمارا ملک ترقی کے کس دور سے گزر رہا ہے۔

جون کے شمارے میں جناب محمد زرین صاحب ابوظہبی سے رقمطراز تھے کہ عرب ممالک میں اسکول، کالج وغیرہ سب کچھ ہیں۔ بازاروں میں عورتیں خرید و فروخت کے لیے بھی جاتی ہیں لیکن ان ملکوں میں عریانی، فحاشی اور بے حیائی نام کی کوئی چیز نہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ زرین صاحب نے یہ کس طرح لکھ دیا کہ ان ممالک میں یہ سب کچھ نہیں ہے۔ میرا اپنا ذاتی خیال ہے کہ اگر اس سلسلے میں ہم اپنے ملک کو دیکھیں تو دونوں میں زمین آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ یعنی یہ کہ ہمارے یہاں عریانی، فحاشی اور بے حیائی پانچ فیصد ملے گی۔ لیکن عرب ممالک میں سوائے سعودی عرب کے آپ کو سب کچھ نظر آئے گا میرے اندازے کے مطابق کویت، ایران، عراق، لبنان اور مصر میں تو عریانی فحاشی اور بے حیائی اس قدر ملے گی کہ کیا عرض کروں!

پاکستان میں تو پھر بھی آپ کو خدا کے بندے ایسے نظر آئیں گے کہ جن کے دل میں خوف خدا ہے۔ لیکن یہاں پر اکثریت ہر کام یہ سمجھ کر کر لیتے ہیں کہ "کل واحد" یہاں پر فیشن کا یہ حال ہے کہ عورتیں اکثر بازاروں میں نیم برہنہ لباس میں نظر آئیں گی۔ لیکن مرد اس قسم کا لباس زیب تن کرتے ہیں کہ ان کا سب کچھ چھپا ہوتا ہے۔ یہاں پر عربوں میں یہ بات عام ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنے آپ کو عرب کہلائیں گے بعد میں مسلم۔ حالانکہ مسلمان ہونے کے ناطے ان لوگوں کو اپنے مذہب کے طور طریقوں پر چلنا چاہیے۔ مگر غیر مذہب کے طور طریقوں پر یہاں پر "حیا" نام کی کوئی چیز نہیں۔ البتہ بے حیائی چاروں طرف نظر آئے گی۔

غرض یہ کہ اگر ہم لوگ اپنے مذہب کے نظریے اور قرآن و سنت کی روشنی میں عمل کریں تو نہ عورت مرد کو اور نہ مرد عورت کو اس کا مورد الزام ٹھہرائے گا۔ اور یہ عریانی فحاشی اور بے حیائی اپنے آپ ہی ہم میں سے دور ہو جائے گی۔

فحاشی کا تدارک کس طرح ہو؟

یوسف علی شاکر ——— سرکی گیٹ پشاور

آجکل ہر زبان پر یہی سوالات ہیں۔ ہر انسان "فحاشی" کے خلاف ہے مگر سوچنا یہ ہے کہ فحاشی ہے کیا بلا؟ اس سے کیا مراد ہے میرا خیال ہے کہ فحاشی کی حدود معاشرتی قدریں متعین کرتی ہیں۔ یورپ اور امریکہ کی معاشرت اور پاکستان کی معاشرت دونوں میں بڑا فرق ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہیں، ہماری معاشرتی اقدار کی بنیاد مذہب اسلام ہے۔ اور اس نے پردہ پوشی کی واضح الفاظ میں ہدایت کی ہے۔

فحاشی کی ساری ذمہ داری صرف نئی نسل پر نہیں ڈالی جا سکتی کیونکہ والدین سب کچھ دیکھتے ہیں اور آنکھیں بند رکھتے ہیں۔ اس حد تک وہ ضرور قصوروار ہیں۔ جب بچے ہوشیار ہوتے ہیں۔ باہر نکلتے ہیں تو وہ خود اپنے ہر فعل اور حرکت کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اس طرح دونوں قصوروار ہوئے۔ جو چیز شرافت اور تہذیب کے دائرے سے باہر ہو وہ فحاشی کہلاتی ہے۔ جسم کی نمائش کرتا ہوا لباس پہننا اور بے ہودہ گفتگو کرنا اب عام طور پر خواتین کا فیشن بن گیا ہے۔ فحاشی میں مبتلا ہونے کا الزام پوری نئی نسل پر نہیں لگایا جا سکتا۔ اس لیے کہ ہمارے ہاں اکثریت اب بھی قدیم روایات میں جکڑی ہوئی ہے۔ یہ بات صرف اور صرف ایک محدود طبقے کے

لیے کہی جا سکتی ہے جو ماڈرن سوسائٹی کے نمائندے ہیں اور مغرب پرستی جن کا شیوہ ہے۔ اس گروپ کا ہر اصول و ضابطہ تک سے تمام طریقوں سے جدا ہے۔ فحاشی کی مد میں اس طبقے کی دیکھا دیکھی اور لوگ بھی شامل ہو رہے ہیں۔ جس کے لیے عریاں فلمیں، گندا لٹریچر بہت مددگار ثابت ہو رہا ہے۔ یہ تمام چیزیں باہر سے سمگل کی جاتی تھیں اور اس ذہنیت کے لوگوں کو فراہم کی جاتی تھیں لیکن کچھ برس بن بیٹے ضمیر لوگ اب اس سے پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ یہاں کے فلمساز یورپ سے بھی آگے نکل چکے ہیں اور طلباء میں وہی وہانوی، ستر نگی جیسے نام نہاد ادب کے ٹھیکیداروں کی تحریریں مقبول ہیں۔

اس تباہی کی تمام تر ذمہ داری قبول پر عائد ہوتی ہے۔ اگر وہ بچوں کو صحیح تربیت دیں تو یہ نوبت نہ آئے۔ جیسا گھر کا ماحول ہوتا ہے بچہ ویسے ہی ڈھل جاتا ہے۔ ہر انسان ماحول سے متاثر ہوتا ہے۔ آج کل لڑکیوں کے لباس دیکھ کر کان پکڑنے پڑتے ہیں۔ ایسے ملبوسات نکل چکے ہیں جن کو پہننا یا ننگا رہنا برابر ہے۔ اور یہاں کی نوجوان لڑکیاں بڑے شوق سے ایسے واہیات لباس پہنتی ہیں۔ قمیص اتنی تنگ ہوگی کہ جسم کا ہر حصہ نمایاں طور پر نظر آنے لگا۔ قمیص کی چاک اتنی لمبی ہوگی کہ بازو اٹھائیں تو پیچھے سے پیٹ ننگا ہوگا۔ یہی شان شلواروں کی بھی ہے۔ شلوار کا کپڑا بھی اس قدر باریک ہوگا کہ اندر کا تمام حصہ نظر آتا ہے۔ ساڑھی کی یہ حالت ہے کہ بلاؤز اس پر برائے نام ہوگا۔ آج کل نوجوان لڑکیوں کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ وہ صبح کالج یا دفتر جانے کے لیے نکلتی ہیں تو باہران کے بوائے فرینڈ ڈ کھڑے ہوتے ہیں اور پھر تنگ بوائے فرینڈ سے صبح صبح کام نہ ہو کالج یا دفتر میں ان کا جی نہیں لگتا۔ اور اس طرح لیلیٰ مجنوں کی جوڑیاں سڑکوں پر، بسوں میں، رکشوں میں ہر جگہ دکھائی دیتی ہیں۔ ماں باپ سوچتے ہیں کہ ہماری بیٹی کالج یا دفتر گئی ہے۔ مگر وہ تو صبح دس بجے کا شو دیکھنے کے لیے پی اے ایف اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ پہنچی ہوتی ہے۔

فلموں کا یہ حال ہے کہ اس میں عشق و محبت کے طریقے بتائے جاتے ہیں۔ ان میں یہ بتایا جاتا ہے کہ لڑکی کس طرح پھنستی ہے۔ لڑکا کس طرح قابو میں آتا ہے۔ آج کی لڑکیوں کو ماں باپ کی عزتوں کا کوئی خیال نہیں رکھیاں ہیں، ہوٹل میں اور ساتھ بوائے فرینڈ ز ہیں۔ کتنی ہی لڑکیاں اپنی زندگیاں اور خاندانوں کی عزتوں کو تباہ کر چکی ہیں لیکن آج تک کسی نے کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔ انہوں نے آزادی کا اتنا غلط لیا کہ بے لگام گھوڑیاں بن چکی ہیں۔ معاشرہ گندگی میں اتنا گر چکا ہے کہ شریف عورت کا جینا بھی حرام ہو گیا ہے۔ روزانہ پولیس کے چھاپے مارے جاتے ہیں اور سینکڑوں بدکردار عورتیں پکڑی جاتی ہیں۔

معاشرے میں فلمیں اور ٹیلی ویژن بھی ایک تباہی کا گھر بن چکا ہے۔ ڈراموں کے علاوہ ٹی وی میں جو اشتہارات دکھائے جاتے ہیں وہ بھی عریانی اور فحاشی سے لبریز ہوتے ہیں۔ شوخ کالا کولا، ٹیک صابن، برق پاؤڈر، کیپری الیپرو وغیرہ۔ ان اشتہارات کو دیکھ کر بچے جوان کیا اثر لیتے ہوں گے اور آج کل کی نوجوان نسل میں ایک نہیں تیز دیکھ کر شورش پیدا ہو جاتی ہے وہ ان کو ٹیکنیکل طریقے میں کرتے ہیں جس سے نوجوان نسل مزید بگڑ رہی ہے۔ فلموں میں عشق اور محبت کے علاوہ کچھ نہیں ننگے ڈانس، مختصر لباس، ہیرو ہیروئن کا ایک پلنگ پہ سونا یہ کوئی شرافت ہے۔ اس سے نوجوان نسل کی آنکھ بہکنگی نہیں تو کیا ہوگا۔

میڈیکل کالجوں کا حشر یہ ہے کہ آئے دن وہاں نئے نئے انقلاب رونما ہوتے ہیں۔ لڑکی لڑکا ایک دوسرے پہ پوشیدہ پردے سے آشکار کر رہے ہیں۔ ہاؤس جاب کے لڑکوں کا یہ حال ہے کہ ننگی بچی کا کیس ہوگا تو سر پر کھڑے رہیں گے۔ کیا اسلام میں یہ تہذیب ہے۔ ہم عریانی اور فحاشی میں اس قدر آگے نکل چکے ہیں کہ پیچھے مڑنا مشکل ہی نظر آتا ہے۔ یہاں ایسا سیلاب آ چکا ہے۔ جس کا پانی ہمارے سروں سے اوپر جا چکا ہے۔ اس سیلاب کو روکنے کے لیے اب کوئی نظر نہیں آتا ہے۔

جس قوم کے علماء کی بیٹیاں لمبی لمبی کاروں میں بیٹھ کر عیاشی کرتی پھریں وہ قوم کی دوسری بیٹیوں کا کیا خیال کریں گے۔ انہیں تو عیاشی اور دولت کے لالچ نے گھیر رکھا ہے۔ قومیں غرق ہوتی ہیں تو ان کی وجہ سے ملک تباہ ہوتے ہیں اور علماء خود ان کی وجہ ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ نئی نسل کی تباہی میں ان کا ہاتھ اول ہے تو یہ غلط نہ ہوگا۔ مسجدوں میں بیٹھ کر مفت کے ٹکڑے توڑنے سے اسلام کی تبلیغ نہیں ہوتی۔ قوم و ملک کی خاطر قرآن اور سنت کے اصولوں پر چلنا پڑتا ہے۔ قرآن اور رسول جو کچھ کہتے ہیں۔ ہمیں ان پہ عمل کرنا چاہیے۔ نہ کہ ایک دوسرے سے حسد کریں۔ ہم مسلمان ایک ہیں۔ مل کر قوم و ملک کی بقا کے لیے کوشش کرنی چاہیئے۔ قوم کو عریانی اور برائی سے دور کرنا چاہیئے۔ اور دشمنان دین و قوم کا خاتمہ کرنا چاہیئے۔ یہی قوم چاہتی ہے۔ اسی میں ملک اور قوم کا مستقبل ہے۔

نئی نسل عریانی کا سیلاب روک سکتی ہے

مختار احمد صدیقی ——— ہری پور ہزارہ

یہ پڑھ کر بڑا افسوس ہوتا ہے کہ نوجوان نسل بڑھتے ہوئے ان فحاشی، بےحیائی اور عریانی کے سیلاب کو روکنے میں معاون ثابت ہونے کے بجائے اسے جدت پسندی، اونچی سوسائٹی کی ضرورت اور خود کو ترقی یافتہ کہلانے کے نام سے موسوم کرتی ہے۔ میں نئی نسل کا ایک ادنیٰ سا فرد ہوتے ہوئے سوچ رہا ہوں کہ اس معاملے میں

ہکسے موردِ الزام ٹھہرائیں۔ نئی نسل کو، والدین کو، اساتذہ، حکومت، علماء دین، ذرائع ابلاغ، فحش لٹریچر یا ممالکِ غیر کی جڑیں کھوکھلی کرنے والی پالیسی کو۔

حقیقت یہ ہے کہ اس امڈتے طوفان میں ان سب کا تھوڑا کچھ کردار ضرور ہے مگر میں یہ کہنے میں بھی عار محسوس نہیں کروں گا کہ زیادہ قصور والدین کا اور خود نئی نسل کا ہے۔ والدین جو اولاد کی تربیت کا مرکز ہیں، گھر جو بچے کی تربیت کی پہلی درس گاہ ہے اگر اس میں غلط کردار پرورش پا رہے ہوں گے تو اولاد پر جتنی بھی محنت کی جائے بے مقصد ہوگی۔

ہمارے ملک میں اس وقت ناجائز آمدنی کا رجحان اس قدر فروغ پا رہا ہے کہ لوگ غیر تو غیر اپنوں کو بھی ڈسنے سے باز نہیں رہتے۔ ہر شخص اپنی پوزیشن سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے اگر کوئی پبلک ڈیلنگ کی کرسی پر بیٹھا ہے تو اسے منہ سے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ بس چکر پہ چکر دیئے جایئے جونہ امری آسامی نظر آئے اس کا کام لٹکاتے رہیئے۔ کسی نہ کسی دن وہ خود سمجھ کر آپ کے دہ دولت پہ حاضر ہو جائے گا اور معاملے طے ہو جائیں گا۔ دکانداروں نے اپنی مرضی کے ریٹ لگا رکھے ہیں اگر کوئی شکایت کرے۔ دو ٹوک جواب دے گا "لینا ہے تو لو ورنہ اپنی راہ لو۔"

یہ ایک قدرتی امر ہے کہ ناجائز آمدنی کا زیادہ حصہ لوگ شراب اور دیگر عیاشیوں پر صرف کرتے ہیں۔ ان حالات میں ان کی اولاد نیک سیرت اور بلند کردار ہو جائے۔ یہ بھلا کس طرح ممکن ہے۔ فرض کریں ان کی تربیت پر محنت کی بھی جائے تو آپ یقین کریں کہ اس حرام کی کمائی کا اثر کسی نہ کسی اسٹیج پر جا کر ضرور نمودار ہوگا۔ حرام کی آمدنی والے گھروں میں ایسے ایسے طوفان اٹھتے دیکھے گئے ہیں کہ وہ اپنی اصلی حالت سے بھی محروم ہو گئے۔

اس معاملے میں نئی نسل کا قصور یہ ہے کہ جب ان کے والدین اس ڈگر کے ہوں اور وہ یہ بھی جانتے ہوں کہ ان کے گھر میں رشوت اور ناجائز آمدنی آ رہی ہے تو وہ اس پر بغاوت کیوں نہیں کرتے؟ نئی نسل کو دین سے بھی کوئی لگاؤ نہیں، انہیں فلم، فحش لٹریچر اور عریانی سے اتنی محبت ہے کہ وہ ملکی تعمیر کے فرائض سے بھی غافل ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ نئی نسل کو اپنے کردار کی اصلاح خود کرنی ہوگی مجھ گھر کے ماحول کو دیکھنا اور سدھارنا ہوگا۔

اس کے لئے انہیں اسلامی قواعد و ضوابط اپنانے ہوں گے جس میں سکونِ قلب کے ساتھ ساتھ ملکی ترقی کا راز بھی پوشیدہ ہے اس کی ابتداء اگر نماز سے ہی کر دی جائے تو روحانی طور پر ایک عجیب کیف و سرور ملے گا جو عریانی اور فحاشی کی لذتوں سے کہیں مختلف، بالاتر ہے اور یہ سرور نہ صرف دنیا میں نیک نامی اور بلند کردار کا بولتا ثبوت ہے بلکہ آخرت کے لئے بھی سرمایہ افتخار ہے۔

عورتوں کی بے حیائی کے ذمہ دار مرد ہیں

ایم معوذ مظفر خان ——— پوسٹ بکس ۱۲۲۳ دوحہ

اگر یوں کہا جائے کہ مرد نے ہی عورت کو عریانی، فحاشی جیسے کے تینوں روپ اختیار کرنے پر مجبور کیا ہے تو میری نظر میں یہ بے جا نہیں ہوگا۔ مئی کے شمارے میں کراچی کی ایک بہن نے (طاہرہ) جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ بالکل صحیح ہیں۔ یہ مرد حضرات صرف عورتوں کی آزادی سے گھبرا کر اس قسم کے الزامات عورت ذات کے سر تھوپتے ہیں حالانکہ کل عالم جانتا ہے کہ عورتوں کو بازار کی زینت بھی ان مردوں نے ہی بنایا ہے اور عورتوں کی شہری آزادی کے لئے بھی وہی حضرات رکاوٹ بن رہے ہیں۔ جن کے کردار مشکوک قسم کے ہیں ایک صاحب نے دوشیزہ کے ہی صفحات پر لکھا ہے کہ عورتوں کو بے پردہ بازار میں نہیں آنا چاہیئے۔ کیوں؟ اس لئے کہ عورتوں کو دیکھ کر ان کے دل قابو میں نہیں رہتے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ جب آپ کسی عورت کو بازار میں سے گزرتے ہوئے دیکھیں تو اپنی نظریں نیچی کر لیں لیکن ایسا کون کرے گا کوئی بھی نہیں۔ ایک اور دوست نے لکھا ہے کہ عرب ممالک میں برائی نام کو نہیں اس لئے کہ یہاں اسلامی قوانین نافذ ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ہر اسلامی ملک میں ایک قاضی ہوتا ہے۔ وہی سب فیصلے کرتا ہے لیکن ذرا یہ تو بتائیں کہ کیا بحرین اسلامی ریاست نہیں ہے پھر یہاں عورتوں کے بازارِ حسن کے علاوہ لڑکوں کا بھی ایک بازار کیوں موجود ہے پھر دوبئی بھی تو اسلامی ریاست ہے لیکن وہاں بھی بازارِ حسن نام کی بستی ہے جو سب کو دعوتِ گناہ دیتی ہے۔ کیا ان کے معاشرے کو بھی ہماری پاکستانی عورتوں نے ہی خراب کیا ہے۔ یہ الزام سراسر زیادتی ہے کہ پاکستانی عورتیں بے حیائی اور اس قسم کی دوسری چیزوں کی طرف مائل ہیں۔

جون کے شمارے میں محترمہ صبیحہ بانو کراچی نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ بھی قابلِ ستائش ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ اس عریانی یا فحاشی کو موجودہ وقت میں چھپنے والے رسالوں نے دوگنے کے لئے کیا کیا ہے۔ تقریباً ہر رسالہ اس بات کا رونا روتا ہے لیکن اندر سے رسالے کو کھولیں تو اس قسم کا مواد اس میں بھی ملتا ہے جیسا کہ اس وقت کی بدنام لکھنے والی واجدہ تبسم کی کہانیاں تو ہماری دوشیزہ میں بھی چھپا۔

۔۔۔ الفقہ بدلنے کے لئے لے دیتی ہے۔ محمد شفیق عالم اسلام آباد کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں۔

جنسی میل جول کی آزادی ملنی چاہیئے

سید غضنفر عباس ——— کوئٹہ بلوچستان

بحث و نظر کے تحت عریانی، فحاشی اور بے حیائی کے موضوع پر تبادلہ خیالات کا سلسلہ کافی عرصے سے پڑھ رہا ہوں جو کہ ایک اچھا سلسلہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چند باتیں لکھنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ مرد اور عورت دونوں بے قصور ہیں۔ عموماً یہ سننے میں آیا ہے کہ مرد کی نسبت عورت جنسی ملاپ کی زیادہ خواہشمند ہوتی ہے لیکن خدا نے عورت کو شرم کا ایک ایسا جذبہ یا پردہ بخشا ہے کہ وہ اپنے جنسی جذبات پر قابو پا لیتی ہے اس کے برعکس مرد اپنے جنسی جذبات کے تسکین کی خاطر ہر جائز، ناجائز حربہ اختیار کرتا ہے۔ آخر کیوں؟

عورت برقع کیوں پہنتی ہے جبکہ آج کل کے دور میں برقع ایک فیشن بن گیا ہے جو عورتیں کسی مجبوری کے تحت برقع پہنتی ہیں۔ وہ اس بات کا خاص خیال رکھتی ہیں کہ اس میں بھی ان کے جسم کے خوبصورت خدوخال کی مکمل نمائش ہو سکے اور عموماً دیکھنے میں آیا ہے کہ برقع کے نقاب کو چہرے کے گرد اس طرح لپیٹا جاتا ہے۔ جس سے چہرے کا بالائی حصہ پوری رعنائی کے ساتھ اجاگر ہو سکے جسم کے دیگر مخصوص حصوں پر برقع کی فٹنگ کچھ اس طرح ہوتی ہے کہ عورت کے جسم کے نشیب و فراز دعوت نظارہ دیتے ہیں۔ وہ عورتیں جو بازاروں میں اپنے جسم کی نمائش کرنا فخر محسوس کرتی ہیں۔ گھر میں ایسے بن جاتی ہیں جیسے ان جیسی شریف عورت شاید ہی دنیا میں کوئی ہو اور اس طرح وہ اپنے والدین کو بھی دھوکہ دیتی ہیں۔ اگر پردہ ضروری ہے تو پھر عورت کو مکمل طور پر پردہ میں ہونا چاہیئے یا پھر پردہ بالکل ختم کر دیا جائے کیونکہ کسی عورت کو نامکمل پردے میں دیکھ کر ایک مرد کو خواہ مخواہ تجسس پیدا ہوتا ہے اور عموماً یہ خواہش بیدار ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی طریقے سے اس محترمہ کو بغیر پردے کے دیکھنا چاہیئے جبکہ بغیر پردہ کے عورت کو ایک دفعہ دیکھنے کے بعد بلا وجہ دوسری دفعہ دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ ایسی کئی شادی شدہ خواتین کی مثالیں دے سکتا ہوں جو کہ شادی کے بعد بھی غیر مرد کے ساتھ جنسی تعلقات پیدا کر لیتی ہیں حالانکہ خود ان کا خاوند ایک صحت مند مرد ہوتا ہے۔ کیا عورت ایک مرد سے جنسی تسکین حاصل نہیں کر سکتی؟ شادی کے بعد وہ غیر مردوں کے پاس کیوں جاتی ہے۔ میں ایسی خواتین سے مخاطب ہو کر پوچھتا ہوں کہ وہ ایسا کیوں کرتی ہیں؟

عورت اور مرد کا جسمانی ملاپ ایک فطری بات ہے جو کہ ہمارے معاشرے میں شادی کے بعد عمل میں آتا ہے لیکن مجھے یہ بتایا جائے کہ جنسی تسکین کے لئے شادی کیوں ضروری ہے؟ جبکہ شادی کے بغیر بھی مرد اور عورت جنسی ملاپ کے ذریعے تسکین حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اسلام میں شادی سے پہلے ایسے تعلقات ممنوع ہیں۔ لیکن کیوں؟ جب اسلام کے دائرے سے باہر نکل کر دیکھا جائے تو ہمیں ہر قوم ترقی یافتہ نظر آتی ہے۔ کیا مسلمانوں میں اتنی قابلیت نہیں کہ وہ ترقی کر سکیں۔ مجھے معلوم ہے کہ مسلمان ہر طرح کی قابلیت رکھتے ہیں۔ ہماری پسماندگی کی صرف اور صرف یہی وجہ ہے کہ غیر مسلم قومیں جنسی معاملات پر وقت ضائع نہیں کرتیں اور جنس کو انہوں نے عام حیثیت دے رکھی ہے بلکہ ذہنی طور پر پرسکون ہیں۔ اسی لئے وہ لوگ زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھرپور توجہ دے کر ترقی یافتہ قومیں کہلاتی ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے ملک میں نہ فحاشی ہے نہ عریانی اور نہ بے حیائی ہے بلکہ صرف جنسی تسکین کی خاطر مرد اور عورت نئے نئے طریقے اختیار کر کے ایک دوسرے کی توجہ حاصل کرتے ہیں اور اپنے مقصد میں کامیابی کے بعد ذہنی سکون محسوس کرتے ہیں۔ غیر مسلم قومیں جنس کو فوقیت دے کر برابر ترقی کر رہی ہے جبکہ ہمیں محبت اور عشق کے علاوہ کوئی کام نہیں۔ جب دیکھو لڑکے لمبے لمبے بال رکھ کر ٹائٹ پتلون کپڑے پہن کر لڑکیوں کے چکر میں بازاروں اور گلیوں میں آوارہ گردی کرتے نظر آتے ہیں اگر لڑکیوں کو دیکھا جائے تو وہ اپنی شخصیت کو اجاگر کرنے کے لئے دوسروں کی توجہ حاصل کرنے کی خاطر عریاں لباس زیب تن کر کے میک اپ زدہ چہرے کر کے لڑکوں اور بازاروں میں اٹکھیلیاں کرتی پھرتی ہیں یا پھر پڑھائی کے وقت اپنے محبوب کو عشقیہ خط لکھنے میں مصروف نظر آتی ہیں۔ اسی لئے میری رائے تو یہی ہے کہ شادی سے پہلے بھی باہمی رضامندی سے جنسی ملاپ کوئی بری بات نہیں کیونکہ یہ ایک فطری تقاضا ہے جسے پورا کرنا ضروری ہے۔ چاہے وہ شادی سے پہلے کیا جائے یا بعد بلکہ شادی سے پہلے جنسی ملاپ کے ذریعے مرد اور عورت ایک دوسرے کے تقاضوں کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ جو کہ ازدواجی زندگی کے لئے بہت ضروری ہیں۔

مسلمانوں کیلئے چین اور روس کی مثال نامناسب ہے

ایچ ایوب الصدیقی۔ دفتر محکمہ زراعت۔ ڈیرہ غازی خان

میں نے جون کے دوشیزہ میں فحاشی عریانی پر تبصرے پڑھے۔

جن میں مختلف الخیال لوگوں نے اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔

توصیف حیدر رضوی صاحب نے سادگی، پردہ، شرافت اور حیا کو دقیانوسی قرار دیا ہے اور مثال چین، روس اور کمیونسٹ ممالک کی دی ہے۔ موصوف کی ذہنیت پر جتنا ماتم کیا جائے کم ہے میں ان صاحب سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ اپنے اسلاف سے مثال کیوں نہیں دیتے۔ کیا انھوں نے تاریخ کے سینہ پر گہرے نقوش نہیں چھوڑے؟ میں ان کی رہنمائی کے لئے ایک واقعہ یاد کرا رہا ہوں۔

ایک دفعہ حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا جگر گوشہ بتول قرآن کریم کی تلاوت میں مصروف تھیں کہ حضور کی آنکھ لگ گئی اور رحل پر سر مبارک رکھ کر سو گئیں۔ اس بے خودی میں آپ کے سر مبارک سے دوپٹہ سرک گیا۔ صحابہ کرام باہر انتظار کر رہے کہ صبح صادق ہونے کا انتظار فرما رہے تھے کہ آج کیا وجہ ہے۔ اتنی لمبی رات ہو گئی ہے۔ صبح ہونے کا نام نہیں لیتی تمام صحابہ کرام دربار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوئے اور ماجرا عرض کیا۔ آپ نے فرمایا کہ ابھی جبرائیل علیہ السلام نے آکر مجھے بتایا ہے کہ آل رسول حضرت علی علیہ السلام کی دختر مبارک جگر کا اندر جنت میں سو گئی ہیں۔ ان کا دوپٹہ سر سے اترا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ سورج اس وقت تک حیا سے نہیں نکلے گا جب تک معصومہ اپنا سر مبارک نہ ڈھانپ لیں گی۔ آپ نے حضرت علی علیہ السلام سے ارشاد فرمایا۔ آپ جا کر معصومہ کا سر ڈھانپ دیں تاکہ صبح صادق ہو اور نماز ادا کی جا سکے۔

یہ ہے آل رسول اور ان کی عزت اور ان کا وقار۔

جناب توصیف حیدر رضوی صاحب! چین، روس اور تمام نہاد سوشلسٹ ممالک سے ہمارا نہ تو ہمارا مذہبی رشتہ ہے اور نہ ہی روحانی اور نہ ہی یورپ کی تہذیب سے ہمیں سروکار ہے۔ جن کے چھوڑے جراثیم آپ جیسے لوگوں سے چمٹے ہوئے ہیں اور ہم سعی کر رہے ہیں ان کو نکال باہر کیا جائے لیکن افسوس ہے آپ پر کہ ایک بلند پایہ آپ حقائق سے روگردانی کر رہے ہیں اور برائی کو سنہری لباس پہنا رہے ہیں۔

قارئین حضرات! بات دراصل یہ ہے کہ ہر انسان کے اندر انسان جسے ضمیر بھی کہا جا سکتا ہے اگر حیوانیت اختیار کرے تو اس کو گناہ گناہ نہیں لگتا اور اچھائی برائی میں تمیز نہیں رہتی اور اس انسان حیوان سے حیوانیت کا اظہار ہونے لگتا ہے جیسے کہ کھڑے ہو کر پیشاب کرنا، کھڑے ہو کر کھانا، سڑکوں اور گلیوں میں حیوانوں جیسی حرکتیں کرنا۔

ہم مسلمان ہیں۔ ہماری مثال اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے بتائے ہوئے راستے سے لی جائے گی نہ کہ روس، چین یا سوشلسٹ ممالک سے ———— ہم ایسے دور میں سانس لے رہے ہیں جو کہ ترقی یافتہ دور ہے۔ جب لوگوں کی عقل پر پردہ پڑ جاتے تو وہ بار بار کیا کر سکتا ہے۔ لوگ کام کرو دیکھتے ہیں۔ انجام کو کیوں نہیں دیکھتے؟ اور ایسی دور برائی والے سید صاحب یہی چیزیں تو اولاد آدم کی دشمن ہیں جو کہ ان کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے در پے ہیں۔

اور ایسی دور ۲۔ عورتوں کا فاحشہ اور بے پردہ ہو جانا ۳۔ بڑا آج سے تیرہ سو سال پہلے حضرت علی علیہ السلام نے پیش گوئی فرمائی تھی کہ آخری دور میں عورتیں اس قدر آزاد ہو جائیں گی کہ حیا اور شرم باقی نہ رہے گی۔ مردوں کی وضع قطع نسوانیت پر آجائے گی اور عورتیں سر برہنہ بے پردہ گھومیں گی۔ اس وقت آسمان سے ناگہانی آفات نازل ہوں گی۔ اچانک اموات ہوں گی۔ زلزلے آئیں گے۔ مہلک بیماریاں جائیں گے نفسا نفسی

ہمارے لئے یہ امر باعث مسرت و اطمینان ہے کہ "بحث و نظر" کے موجودہ عنوان کے تحت گزشتہ چند ماہ سے اندرون ملک و بیرون ملک سے ہمارے قارئین کے ہر طبقۂ خیال کی جانب سے معقول تعداد میں خطوط موصول ہو رہے ہیں۔ معاشرتی اصلاحات کے نقطۂ نظر سے اس بحث و تمحیص کو مفید، بحث مند اور تعمیری قرار دیتے ہوئے ہر طبقۂ فکر کے افراد نے اسے سراہا ہے۔

اسی ضمن میں متعدد خواتین و حضرات نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ اس مفید بحث کا دائرہ صرف "عریانی، فحاشی اور بے حیائی" کے موضوع تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ دیگر اہم معاشرتی و قومی مسائل پر بھی "بحث و نظر" کے کالموں میں قارئین کو اظہار خیال کا موقع دیا جائے مثلاً (۱) ہمارے معاشرے میں عورت کا موجودہ مقام کیا ہے؟ اور کیا ہونا چاہئے؟ (۲) کیا پاکستانی قوم حقیقتاً حب الوطنی کے جذبات سے عاری ہے؟ پھر کیا وجہ ہے کہ ہمارا ملک گزشتہ تیس برسوں میں استحکام و ترقی کے اس مقام پر نہیں پہنچ سکا جہاں ہمارے ساتھ یا ہمارے بعد آزاد ہونے والی بہت سی دوسری قومیں پہنچ چکی ہیں؟ (۳) کیا آزادی کے بعد ہماری قوم اجتماعی طور پر اخلاقی اعتبار سے بتدریج انحطاط پذیر ہے یا مثلاً جھوٹ، فریب، خود غرضی، چوری، ذخیرہ اندوزی، چور بازاری، بدعنوانی، بے ایمانی، بد دیانتی وغیرہ، قومی مفاد سے بے تعلقی، باہمی عدم تعاون اور عدم اعتماد اور اسی نوع کی دیگر اخلاقی و معاشرتی برائیاں پھیل رہی ہیں اور ان برائیوں کا تدارک کس طرح ہو؟ (۴) کیا پاکستان کے عوام متحدہ تہذیب و ثقافت کے نظریئے پر اعتقاد رکھتے ہیں؟ ایک قومی نظریہ جس کی بنا پر پاکستان قائم ہوا، اسے پاکستان کے عوام کے دلوں میں دوبارہ کس طرح راسخ کیا جائے؟ (۵) گزشتہ تیس برسوں میں اردو زبان مرکز

…ے بھر جائے گی۔ زمین پر گمراہی پھیل جائے گی۔ مادہ پرستی کا دور دورہ ہوگا۔ خوف خدا چلا جائے گا۔ اور شہر تباہ ہو جائیں گے۔ اگر محترم سید توصیف حیدر جیسے مزید مکھیاں اور پیدا ہوگئے تو وہ وقت دور نہیں کہ ہم تباہی سے … ہوں۔ ننگے سر فاحشہ بے پردہ کلبوں میں پھرنے والی ماؤں کی گود … بھی محمد بن قاسم خالد بن ولید، طارق بن زیاد، محمود غزنوی پیدا نہیں ہو سکتے۔ بابا فرید الدین گنج شکر جیسے بزرگ اس ماں کی گود میں پلتے ہیں جو باپردہ اور باحیا ہوں جو کہ قرآن کریم پڑھ کر معصوم گنج شکر کو لوریاں دیا کرتی تھیں اور اللہ اور اس کے حبیب پر توکل کا درس دیا کرتی تھیں۔ قدرت کا اٹل فیصلہ ہے کہ درخت کی خوبی درخت کے پھل سے ملتی ہے اور لڑکے یا اولاد کے اوصاف ماں باپ کی شخصیت کی عکاسی کرتے ہیں۔ کلبوں میں جانے والی اور لوگوں کی بانہوں میں جھولنے والی مائیں کبھی عظیم ہستیوں کو جنم نہیں دے سکتیں۔

رہا سوال رشوت، اسمگلنگ، چور بازاری اور ملاوٹ کا تو اس کا بھی تجزیہ کیے دیتا ہوں۔ ہمیشہ دیکھنے میں آیا ہے بلکہ حدیث مبارک ہے کہ سادگی ایمان ہے ـــــ اور سادگی میں خوف خدا بھی ہے اور صداقت بھی ہے۔ عام طور پر رشوت، چور بازاری، اسمگلنگ جیسے دھندے وہ لوگ کرتے ہیں جنہیں اپنی جھوٹی شان بنانی ہوتی ہے۔ کلبوں میں جانا ہوتا ہے، شراب پینی ہوتی ہے، بنگلہ اور کوٹھی کا متلاشی ہوتا ہے تو وہ اکثر اس دھندے میں ملوث ہوتا ہے چونکہ مندرجہ بالا برائیاں وہ لوگ اپناتے ہیں جو کہ جھوٹی شان پر ایمان رکھتے ہیں۔ جیسا کہ فلمی اداکار … آج کل لندن میں ذلت سمیٹ رہا ہے۔ اس کے برعکس سادہ اور شریف لوگ ہمیشہ اپنی تنخواہ یا جائز آمدنی پر ہی انحصار کرتے ہیں۔ ان کی سادگی ان سے … دہ مصارفات کا مطالبہ نہیں کرتی جس کی بنا پر وہ ایک سچی اور خالص زندگی گزار سکتے ہیں۔

کرنیں

- خود کو معمولی نہ سمجھو، خود کو معمولی سمجھنے کی عادت ایک بیماری سے کم نہیں۔
- تقلید اور تنقید کو اپنانا اس دنیا میں زندہ رہنے کا زریں اصول ہے۔
- خوش کلامی ایسا پھول ہے جو کبھی نہیں مرجھاتا۔
- الفاظ کے پیچھے مت بھاگو بلکہ خیالات تلاش کرو جب خیالات کا ہجوم ہوگا الفاظ خود بخود اپس آجائیں گے۔
- جب خلوص اور اعتماد ختم ہو جائے تو انسان زندگی کی کسی بھی شاہراہ پر کامیاب نہیں ہو سکتا۔
- وہ دن بالکل ضائع سمجھنا چاہیے جس دن ہنسی نہ آئی ہو۔
- اپنا ہر دن ایسے گزارو کہ وہ تمہاری یادگار بن جائے۔

انتخاب :- یاسمین شبنم، لاہور

آج کل تو فلم انڈسٹری والے بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ معاشرے کی خدمت کر رہے ہیں اور اصلاحی فلمیں بنا رہے ہیں۔ فلم کی بنیاد شر پر ہے کبھی یہ خیر کا کام نہیں دے سکتی۔ قرآن خیر و برکت ہے اور اس سے ہی نزول رحمت ہوتا ہے۔ اور اسی سے ہی اصلاح معاشرہ ممکن ہے جس کا درس اول شرم و حیا اور سادگی ہے۔

… بوں میں انگریزی زبان کی جگہ کیوں نہیں حاصل کر سکی؟ (۶) ہم اپنے قومی لباس کا تعین اب تک کیوں نہیں کر سکے؟ (۷) سادگی اور کفایت شعاری کے بجائے ہم نے فضول خرچی اور نمائشی زندگی کیوں اختیار کی؟

قارئین کی خواہشات کا احترام کرتے ہوئے ادارے نے فیصلہ کیا ہے کہ "بحث و نظر" کے کالموں میں آئندہ شمارے سے مندرجہ بالا معاشرتی و قومی مسائل پر بھی قارئین کرام کے خطوط شائع کیے جائیں گے۔ اس ضمن میں قارئین کرام مندرجہ ذیل باتیں نوٹ کر لیں۔

(۱) "بحث و نظر" کے کالموں کا بنیادی مقصد اصلاح احوال ہے۔ ان کالموں میں ایسے خطوط شائع نہیں کیے جائیں گے جن میں تحریب یا کسی کی دل آزاری کی گئی ہو۔ یا کسی سیاسی یا مذہبی شخصیت کو تنقید و تضحیک کا ہدف بنایا گیا ہو گا۔

(۲) خطوط مختصر اور جامع ہوں۔ ایک ہی بات کو الفاظ بدل بدل کر دہرایا نہ جائے۔ ایک خط میں مندرجہ بالا موضوعات میں سے صرف ایک موضوع پر ذکر کیا جا سکے۔ اپنے موقف کو حقائق و دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کی جائے۔ غیر ضروری طور پر طویل خطوط شائع نہیں کیے جائیں گے۔

(۳) تحریر صاف اور خوشخط ہو۔ کاغذ کے صرف ایک طرف لکھا جائے۔ سطروں کے درمیان فاصلہ اور کاغذ پر حاشیہ چھوڑا جائے۔ خط میں مکمل پتہ … کیا جائے۔

(۴) جو خواتین و حضرات اپنے خطوط کے ساتھ اپنی تصویر شائع کرانا چاہیں وہ پاسپورٹ سائز کی تصویر خط کے ساتھ بھیجیں۔ (ادارہ)

وہ پینتالیس سال کی عمر میں پیار کی چوٹی فتح کرنے گھر سے نکلا

فضا میں بڑا گھٹن تھا۔ بادل چھا جانے کے باوجود زمین سے شعلے لپکتے لگ رہے تھے۔ ماحول میں سناٹا گھلا ہوا تھا۔ ایسا سناٹا جو کسی طوفان کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ سہمی سہمی سی ویران فضا جیسے خاموشی کی آنکھ سے کوئی تماشا دیکھ رہی تھی۔ ٹریفک کا شور تھا نہ لوگوں کی آوازیں اور بچوں کی چہل پہل۔ سب اندر دُبکے بیٹھے تھے۔ کبھی کبھی دور کسی ہوائی فائر کی آواز یا فوجی گاڑی کی گھڑگھڑاہٹ سنائی دے جاتی اور پھر سکوت چھا جاتا۔ بازار بند۔ سڑکیں سنسان۔ گلیاں ویران۔ صرف وہ لوگ باہر چل پھر رہے تھے جن کے پاس باہر نکلنے کا خصوصی اجازت نامہ تھا۔ جمیل احمد بھی ان ہی لوگوں میں سے ایک تھے۔ اس وقت ان کا خصوصی اجازت نامہ ان کے کام آیا تھا لیکن جب وہ سمن ولا سے نکلے تو ان کے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے چہرہ اور سارا جسم پسینے سے شرابور تھا۔ دل منوں ٹنوں وزن کے نیچے دبا زور زور سے دھک دھک کر رہا تھا۔ ذہن میں تیز تیز آندھیوں کے جھکڑ چل رہے تھے۔ شاید قطب جنوبی کی مہم سر کرنے کے بعد کیپٹن اسکاٹ کا بھی یہی حشر ہوا ہوگا۔ کس کر و فر اور ساز و سامان سے لیس ہو کر وہ اس مہم پر نکلا تھا ذوق جستجو۔ شوق سفر۔ حصولِ منزل اور ناکامی مقصد۔ سب کچھ وہی تھا بس دونوں کے میدان کارزار جدا جدا تھے۔ حالانکہ اس سے پہلے جب وہ اس گھر سے نکلتے تھے تو انھیں اپنا وجود ہوا کے دوش پر اڑنے والے بادل کی طرح ہلکا پھلکا محسوس ہوتا تھا اور آنکھوں کے گوشوں کی لطیف سی مسکراہٹ حد درجہ طمانیت کا احساس دیتی تھی ..... اور ابھی کچھ دیر پہلے۔ سمن ولا میں داخل ہونے سے پہلے ان کی آنکھوں کے سامنے ورڈز ورتھ کے DAFFODILS جھوم رہے تھے اور KEATS کے بلبل کی لے کانوں میں رس گھول رہی تھی۔ ذہن میں شفیق الرحمان کی کہانیوں کے شگفتہ شگفتہ رومانی ڈائیلاگ گونج رہے تھے۔ اور وہ سوچ رہے تھے کہ احمد فراز بھی کیا غضب کا شاعر ہے۔ مطلب کی بات کس حسن و خوبی سے ادا کی ہے ؎

دونوں انساں ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں

اور پھر I LOVE YOU ابھی تو کچھ برا نہیں۔ تھوڑا سا بھونڈا سہی لیکن ہے بہت سہل۔

آدمی یوں تو بڑے بڑے معرکے سر کر لیتا ہے۔ K-2 کی چوٹی پر چڑھتا چاند پر کمندیں ڈالتا اور ایٹم و ہائیڈروجن بموں کے دھماکے کرتا لیکن اگر مسئلہ مسئلہ عشق ہے تو نہ جانے کیوں ایک عورت کے سامنے اس کا اظہار کرنے سے پہلے مدتوں پلاننگ کرتا ہے۔ موقع محل کا انتظار کرتا ہے۔ جملے سوچتا ہے، لفظ تولتا ہے اور خیال کو مجتمع رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور پھر بھی عین موقع پر گلا خشک ہونے لگتا ہے ماہر عشاق کی بات تو خیر الگ ہے کہ جن کے لئے صبح و شام ایک نیا عشق کرنا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ لیکن معاملہ اگر جمیل احمد جیسے مردوں کا ہو تو پھر اس قسم کے حالات ضرور پیدا ہوتے ہیں۔

چالیس سال کی عمر تک تو گویا وہ کولہو کے بیل ہی تھے کہ آنکھوں پر پٹی باندھے چلتے رہے کہ ان کا اس محور کے گرد گھومنا ضروری تھا ورنہ بیوہ ماں اور چھوٹے بہن بھائی کا کیا ہوتا؟ اور پھر ماں ہوتی ہے تو اسے بیٹے کے سر پر سہرا باندھنے کا ارمان بھی ہوتا ہے۔ چاہے پرائی بیٹی کو بھی لا کر اس کولہو کے پیچھے باندھ دے۔ زندگی کی پہلی خوشی شاید انھیں بیوی کی صورت ہی میں ملی تھی وہ بہت من موہنی اور نرم و نازک لڑکی تھی۔ وقت کا پہیہ چلتا رہا اور کولہو کے محور کا سفر جاری رہا۔ ہر سال ایک نئے بچے کی آمد نے اس سفر کی رفتار اور تیز کر دی۔ پہلی رات کے بعد شاید انھیں کبھی خیال نہ آیا کہ وہ ایک خوبصورت عورت سے بیاہی تھی۔ بیوی آئی تو پہلے ایک پھر دو پھر تین چار پانچ اور اس طرح افرادِ خانہ میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ لیکن اس کے بعد شاید کسی بچے کی خوش قسمتی سے حالات نے پلٹا کھایا۔ بہن بھائی بڑے ہو گئے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے



جنھیں اپنے گھر والی کی ہو گئی بیماری ایک کے بعد ایک اپنے پیر طرح کرتے ہو گئے۔ اس طرح چالیس سال کی عمر کے لپیٹ کے بعد بدلنا شروع ہوئے۔ پھر تو زندگی میں۔ پھر تو ہر روز ہی اضافے ہوتے اور اب دو تین ایسے سال کے لیے قدم گئے ہوتے جسم کشادہ پیٹ اور پھیلے چہرے والے مرد تھے جس نے لوگ کے موڈ سے نجات پالی تھی اور تھکن کی کوئی کڑی اپنے اندر زندگی دیکھ کر دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ اب تک خود نے اتنی مصروف اور ذمہ داریوں کے بوجھ کے نیچے دبی ہوئی زندگی گزاری تھی کہ کبھی یہ سوچا ہی نہ تھا کہ ان کی بیوی کی کیا خامیاں ہیں۔ اور اب انھیں کبھی کبھی یہ خیال آنے لگا تھا کہ وہ انتہائی بے حس اور کاہل عورت ہے جسے تن آسانی کے سوا کچھ نہیں چاہیے۔ ان کے نزدیک شوہر کے جذبات کا کوئی کبھی خیال نہ کیا تھا۔ بچوں کو دیکھ کر ان کے کبھی بیاہ کا تم ختم دینے کے بعد وہاں سے لپکا تعلق ہو جاتی تھی جیسے وہ ایک بوجھ سے آزاد ہو گئی ہو۔ اب اور ملک کے سبب بچے کی سب ہی جگہ اور تہذیب سے آشنا تھے

ایک بچی پیدائشی روگی تھی۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی بیماری لاحق رہتی۔ دوسرے بچے کو ناقابلِ علاج قسم کا دورہ پڑتا رہتا۔ بڑی لڑکی پڑھنے میں سخت نالائق نکلی۔ بڑا لڑکا مستقل گھر سے باہر محلے کے آوارہ بچوں کے ساتھ گولیاں اور گلی ڈنڈا کھیلتا رہتا اور سب سے چھوٹی بچی یا روتی رہتی یا سوتی رہتی......

ان اپنے تمام حالات میں صحت کا بیوی کو صد درجہ خیال تھا۔ دوپہر کو کھانے سے فارغ ہونے کے بعد اور رات کو نو بجے گھوڑے بیچ کر سونے میں کسی صورت ناغہ نہ ہوتا تھا۔ اپنے گھر کی شاید بہت لاڈلی تھی سسرال آ کر اسے باورچی خانہ سنبھالنا پڑا تھا.... لیکن دس بارہ سال گزرنے کے بعد بھی اسے کام کی عادت نہ ہوئی۔ گھر کا کام کرتے وقت اس کی تیوری پر بل اور آنکھوں سے یہ احساس جھانکتا تھا گویا وہ جمیل احمد کے سارے گھرانے پر احسان کر رہی ہو۔ سرِ شام وہ سو جاتی تو بچوں کو بوڑھی ماں سمیٹتی پھرتی اور جمیل احمد چاہے کتنے خوش، کتنے مضمحل یا تھکے ہوئے گھر میں داخل ہوتے وہ کبھی ان کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش نہ کرتی۔ کوئی موڈ کوئی موسم اس کی پتھر صفت طبیعت کو متاثر نہ کرتا۔

اب جو اچانک ایک دفتر کی ثریا سے ان کی ملاقات ہوئی تو ان کو پتہ چلا کہ بچے سے عمر کی کیفیت کتنی نشاط انگیز ہوتی ہے وہ کہیں بھی ہوتے دو خاموش لیکن مسکراتی آنکھیں ان کے تعاقب میں رہتیں۔ وہ کس شکل و صورت کی عورت تھی انھیں پتہ کہاں چلتا تھا بس جب سامنے ہوتی تو وہ انتہائی دلآویز اور دلکش سی لگتی تھی اور جب سامنے نہ ہوتی تو دو نگاہیں انھیں اپنے دل کے اندر جھانکتی سی محسوس ہوتیں۔ اس کی موجودگی میں اس کے وجود کا سرور کن احساس اور غیر موجودگی میں اس کے تخیل کی لذت انھیں مخمور سا رکھتی۔ وہ ذہین شائستہ ہنس مکھ اور ذہین تھی کہ ان کو اپنی بیوی کی بالکل الٹی نیگیٹو کاپی معلوم ہوتی تھی۔ بات کرتے کرتے وہ بار بار مسکراتی اور ان کا بے ساختہ دل چاہتا تھا کہ جھولی پھیلا کر اس میں اس کی ہنسی کے سارے موتی بٹور لیں۔ لاجواب ہونا اس نے کبھی نہ سیکھا تھا اور انھیں اس سے لاجواب ہو کے ایک مزہ آتا تھا کہ دل چاہتا تھا بار بار بات چھیڑیں اور لاجواب ہوں۔ پھر ننھے ننھے نازک سے جذبوں کا اظہار اتنی لطافت اور خوش سلیقگی سے کرتی کہ اس سے ملتے ہوئے وہ خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھنے لگتے۔ ایک دفعہ ان کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی۔ ثریا کا انھیں انتظار تھا لیکن وہ نہ آئی۔ پیغام آیا تو ان کو پتہ چلا کہ وہ بھی بیمار ہے۔ اس دلچسپ اتفاق پر انھیں عجیب سی خوشی ہوئی۔ اور جب وہ اس کے بعد ملنے پہنچے تو ان کے منہ سے بے ساختہ نکلا

"یہ آپ کو کیا ہو گیا۔؟"

"وہی جو آپ کو ہوا تھا۔" ثریا نے کمزور سے چہرے پر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا۔

"اب کیا حال ہے۔؟"

"آپ کی دعائیں ہیں۔"

اُن سے کچھ جواب نہ بن پڑا۔

"آپ دعاؤں کا نام سن کر خاموش کیوں ہو گئے۔؟" وہ پھر بولی۔

"بیماری کے دوران مجھے غالب کا شعر ؎

پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

نہ جانے کیوں بار بار یاد آتا رہتا۔" نہ جانے کیوں وہ اتنی بے تکلفی سے بول رہی تھی۔ جمیل احمد کا دل دھڑک اٹھا۔ شائد اب اپنے جذبات چھپانا اُس کے بھی بس میں نہیں رہا۔ انھوں نے سوچا مگر کچھ نہ کہہ سکے۔ ثریا ہے نوت ان کی زندگی کا خوبصورت اور دلچسپ ترین موڑ ثابت ہوئی تھی۔ یہ خوبصورت موڑ کتنی کٹھن ترائی بن سکتا ہے اس کا اندازہ انھوں نے کبھی نہ کیا تھا۔ گو وہ کوئی الہڑ چھوٹی لڑکی نہ تھی۔ وہ بہت ہی پیارے پیارے دو معصوم بچوں کی ماں تھی اور اُس کا شوہر بھی زندہ سلامت تھا۔ لیکن اپنے انتہائی پیارے بچوں اور مثالی بیوی کو چھوڑ کر وہ سات سمندر پار جا بسا تھا... پہلے پہل ثریا سے ہمدردی کا جواز انھوں نے محض یہی ڈھونڈا تھا کہ وہ ملتے سنگین حالات میں تن تنہا زندگی کا مردانہ وار مقابلہ کر رہی تھی۔ پھر اُس کی باتوں سے انھیں اندازہ ہوا کہ پانچ سال سے اس کا شوہر اُسے اپنے پاس بلانے کے بہلاوے دے رہا ہے۔ لیکن ہر دفعہ نا گزیر حالات سے مجبور ہو کے اُسے آنے سے روک دیتا ہے یہ اس کے شوہر کی سراسر زیادتی اور نا انصافی ہے جو اس نے ایک ایسی عورت سے روا رکھی تھی جو ہر لحاظ سے مکمل تھی۔ جمیل احمد کی ہمدردیاں بڑھتے بڑھتے مہربانیوں کی حدوں کو چھونے لگیں۔ اور کوئی کسی پہ اللہ نام تو مہربان ہوتا نہیں۔ وہ دل کے ہاتھوں مجبور تھے۔ شروع شروع یہ ہوا کہ ثریا اپنے شوہر کا بھیجا ہوا چیک یا ڈرافٹ لے کے ان کے پاس پہنچتی اور وہ اسے کیش کرا دیتے پھر یہ ہونے لگا کہ وہ خود اُس سے چیک یا ڈرافٹ COLLECT کرتے اور اس کو کیش پہنچانے سمن و اچلے جاتے۔ اس کے یہاں جاتے تو نہایت گرم جوشی سے ان کا استقبال ہوتا۔ خلوص اور اپنائیت سے بھرپور باتیں کی جاتیں۔ مزیدار کھانے کھلائے جاتے۔ پھر کیرم یا تاش کا دور چل پڑتا۔ جمیل احمد اکثر اُس کے پارٹنر بنتے۔ ثریا کا بھائی سیمی اور اس کا بڑا بچہ ان کے مدِ مقابل ہوتے۔ یا کبھی چائنیز کھانے کا پروگرام بن جاتا۔ جمیل احمد کی چھوٹی سی ٹیکسی میں یہ چھوٹا سا قافلہ کسی چائنیز ریستوران جا پہنچتا۔ کھانے کے بعد پکچر دیکھی جاتی اور یوں ہنستے کھیلتے وقت گزر جاتا۔ ایسی ہلکی پھلکی تفریح کے بعد جب وہ گھر واپس ہوتے تو ان کی ساری ذہنی کسلمندی اور جسمانی تھکاوٹ دور ہو جاتی۔ ساری زندگی اسی طرح گزرے تو کتنی سہل اور خوبصورت کہلانے لگے۔ سُنا ہے اس دنیا سے پرے کوئی دنیا ہے جس کا نام جنت ہے مگر کبھی کبھی اس دنیا میں بھی کوئی ایسا مقام آ جاتا ہے کہ پھر کوئی خواہش، حسرت نہیں رہتی۔ لیکن جب وہ

ایک بار

علامہ اقبال سے سوال کیا گیا "عقل کی انتہا کیا ہے؟"

جواب ملا "حیرت!"

سوال کیا گیا "عشق کی انتہا کیا ہے؟"

فرمایا "عشق کی کوئی انتہا نہیں۔ عشق لا انتہا ہے۔"

سوال کرنے والے نے کہا "پھر آپ نے یہ کیا لکھا ہے

؎ تیرے عشق کی انتہا چاہتا ہوں"

اس پر مسکرا کر فرمانے لگے "دوسرا مصرعہ بھی تو پڑھیے، جس میں اپنی حماقت کا اعتراف ہے ؎

مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں"

اپنے اصلی مقام پر پہنچتے تو انھیں محسوس ہوتا کہ وہ جنتِ گم گشتہ تو بس ایک خواب کا سا لمحہ تھی جسے وہ اپنی جیتی جاگتی زندگی سے چُرا کے اپنے سینے کے گہرے اندھیرے غاروں میں کہیں چھپا دیا کرتے۔ ان کی اصلی دُنیا تو یہی گھر ہوتا جہاں ان کی پھوہڑ اور موٹی بھدی بیوی اور تہذیب نا آشنا بچے تھے۔ گھر پہنچتے تو صبح و شام باورچی خانے سے بیوی کے بڑبڑانے کی آوازیں ان کے کانوں میں پڑتی رہتیں۔ ان کے کھانے پینے کا اسے اس وقت تک خیال نہ آتا جب تک وہ خود اپنے منہ سے نہ مانگیں۔ ایسی عورت شوہر کی دلداری کیا خاک کرتی... اکثر گھر میں ان کو جھنجلاہٹ ہونے لگتی وہ اپنی گاڑی نکالتے وقت سیدھے سمن زار جا پہنچتے۔ اور وہاں سے واپسی پر جب وہ ذہنی طور پر بالکل پُر سکون ہوتے تو تنہائی فلسفیانہ انداز میں سوچنا شروع کر دیتے یہ کیا۔؟ کہتے ہیں جسے..... خلل ہے دماغ کا۔؟

اور خود ہی ہولے سے مسکرا دیتے۔

جمیل احمد خاندانی شریف تھے اور زمانہ بھی ان کو شریف سمجھتا تھا لہٰذا فطری طور پر بزدل تھے۔ اس لئے وہ بڑے سوچ سمجھ کر اور پھونک پھونک کر قدم آگے بڑھا رہے تھے۔ ادھر ثریا کے مزاج میں بھی فطری لاابالی پن اپنی پوری معصومیت کے ساتھ موجود تھا۔ اس لئے بات چھیڑ چھاڑ فقرے بازی یا ذہنی عیاشی سے آگے نہ بڑھی۔ لیکن آخر کب تک۔؟ کئی دفعہ انھوں نے یہ محسوس کیا تھا کہ ثریا کچھ کہنا چاہتی ہے۔ لیکن کہتے کہتے رُک جاتی ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ جھجک کچھ کہتے کہتے رُک جانا محبت کے اعتراف کے انداز ہیں۔ مگر زبان نے لفظوں کا سہارا نہیں لیا تھا۔ یہ اسلئے کہ وہ عورت تھی اور پہل کرنا شاید عورت کی فطرت میں نہیں۔ وہ ایک مرد تھے۔ کھولنا بلد سش کا پہلا قطرہ وہ بن جائیں۔ اور ثریا تو زمین کی کوکھ

سے پھوٹتا ہوا ٹھنڈے میٹھے پانی کا ایک جھرنا تھی کیوں نہ اپنے سارے وجود کو اس ٹھنڈے میٹھے پانی کے چشمے میں مدغم کر دیا جائے .... پانی کے اتنے قریب رہ کر پیاسے کیوں۔؟ انھیں اب ثریا کا انتظار کرنے کے بجائے دل کی بات خود ہی کر دینی چاہیئے اور دل کی بات کہنے کیلئے ان کے پاس اس سے اچھا کوئی موقع نہ تھا۔ یہ فیصلہ انھوں نے کئی ہفتوں کے بعد سوچ سمجھ کر کیا تھا پیج اس وقت دفتر میں ہوگا۔ ثریا کا بڑا بچہ ٹیوشن پڑھنے گیا ہوگا۔ اور چھوٹا یہ سو رہا ہوگا یا نگی سو رہا ہوگا تو وہ کافی چھوٹا تھا۔ دوپہر کو کرفیو کا بریک ہونے پر وہ آفس سے اُٹھ گئے۔ سیدھے گھر جا کر نہائے دھوئے کپڑے بدلے اور اپنے اوپر بہت سا یوڈی کولون انڈیل کر انھوں نے گاڑی نکالی اور سیدھا سمن ولا کا رُخ کیا۔ موسم حالات، فضا اور ماحول سے بے نیاز خوبصورت خیال اور سوچوں میں گم وہ سمن ولا پہنچے تو حسب معمول ثریا ان کے استقبال کو نہ آئی بلکہ اس کے بڑے لڑکے نے گیٹ کھولا۔ شگون اچھا نہ ہوا تھا۔ مگر انھوں نے خود کو سنبھال لیا اور جب ثریا کمرے سے نکل کر ڈرائنگ روم کی طرف بڑھی تو انھیں اطمینان ہوا۔ شفیق الرحمن کے جملے اور احمد فراز کا مصرعہ "دونوں انسان ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں" بار بار ذہن کے اُفق پر ثریا کی سنہری پن کر جھومنے لگے۔ لڑکے کو بہانہ کر کے ٹالا جا سکتا ہے۔ وہ مسکرائے۔ اس سے اپنا نام کا جادو تو دیکھو۔ سامنے بیٹھ کر بھی وہ تصور میں چھائی ہوئی ہے۔ اب وہ ڈرائنگ روم میں اس کے سامنے بیٹھے تھے۔ وہ دونوں کمرے میں تنہا تھے۔ اس سے اچھا موقع اور ملاقات [illegible] الفاظ جمع کر رہے تھے۔ اور ثریا بیچ بیچ میں بول کر ان کے خیالات کا سلسلہ منقطع کر دیتی۔ وہ جھنجلا سے گئے۔ ثریا انھیں حیرت سے دیکھنے لگی۔ آخر ایسی کیا بات ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے خاموشی چھا گئی پھر انھوں نے کہا "ثریا۔!" اور ثریا کی ہنستی آنکھیں جیسے کسی گہرائی میں جھانکنے کی کوشش کرنے لگیں۔ انھوں نے چاہا کوئی اور بات کریں۔ گرمی بہت تھی شاید وہ پسینہ پسینہ ہو رہے تھے لیکن ہمت کر کے انھوں نے الفاظ کی چھوٹی سی پوٹلی کو پھر تھامنا چاہا کہ ثریا نے انھیں سہارا دیا۔ "آپ کوئی بات کہہ رہے تھے کہیئے نا؟" وہ بڑی اپنائیت سے بولی جیسے کہہ رہی ہو خدا کے لئے آج دل کی بات مت چھپانا۔

"ہاں وہ۔ میں۔ یہ کہہ رہا تھا" ان کا حلق خشک ہو گیا۔ اور پھر ناگوار خاموشی چھا گئی۔ ثریا نے شکایتی انداز سے دیکھا اور پھر دھیرے سے بولی۔ "اچھا چلئے آپ بات سوچ لیں۔ میں خود کئی دنوں سے ایک بات کہنا چاہ رہی ہوں۔ کہہ نہیں پائی۔"

"کیا۔؟" مجسم شوق بن کر انھوں نے سوال کیا۔ تو تو یہ مرحلہ خود ہی خود طے ہو رہا ہے۔ "ہاں وہ ایسا ہے ثریا ہمہ تن گوش ہوئی۔"

"جمیل صاحب پرویز آج رات کی فلائٹ سے آرہے ہیں۔ اپنے آنے کی اطلاع تو انھوں نے کئی دن پہلے خط میں کر دی تھی۔ آج صبح ٹیلی گرام بھی آگیا۔



جمیل صاحب وہ مجھے لینے آرہے ہیں۔" ان کے اعصاب پر برف کے بادل چھانے لگے۔ "جی۔!" پھنسی پھنسی آواز سے بولے۔

"جمیل صاحب کراچی چھوڑنے کا مجھے بہت افسوس ہوگا۔ اپنا وطن اپنے لوگ۔ آپ جیسے مہربان ہمدرد اور شریف لوگ۔ سچ جانیئے مجھے بہت غم ہے۔ لیکن پرویز میرے شوہر ہیں ان کا ساتھ مجھے ان ساری چیزوں سے عزیز ہے۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر گو یا جھجک جھجک کر بول رہی تھی۔ "آپ پرویز سے ملئے گا۔ بلکہ اب شاید آپ کا یہاں آنا مشکل ہوگا۔ میں خود آپ سے پرویز کو ملانے لاؤں گی FORM P کی تو مجھے ضرورت پڑے گی ہی۔ آپ سے ہی بنواؤں گی۔ آپ ان سے مل کر یقیناً خوش ہوں گے۔" اور پھر مخصوص ہنسی کمرے میں گھنٹیاں سی بجانے لگی۔ اور جمیل احمد یوں محسوس کر رہے تھے جیسے وہ بیٹھے بیٹھے پتھرا چکے ہیں اور ان میں اٹھنے اور چلنے کی سکت باقی نہیں رہ گئی۔

"جمیل صاحب پرویز اتنے عرصے باہر رہے ہیں۔ لیکن یقین جانیئے انھیں اب بھی سیدھی سادی خانی ہوئی سی مشرقی عورت پسند ہے۔ انھیں میرے ہاتھوں میں مہندی اور کھنکتی ہوئی چوڑیاں بہت پسند ہیں۔ اور سارہی کو توڑ کر میں وہ میرے ساتھ اپنے بچوں کا وجود بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ وہ اپنے آپ کو چھائے رکھنا بہت پسند کرتے ہیں۔ اسی لئے تو میں نے کہا کہ آپ کا یہاں آنا اب بہت مشکل ہے۔ لیکن میں ان کو آپ سے ملاؤں گی ضرور۔ آپ واقعی ان سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔" وہ یکبارگی اٹھ کھڑے ہوئے۔

گاڑی میں بیٹھتے ہوئے، انھوں نے سوچا۔

"ہاں میں خوش ہوں گا۔ یقیناً اتنا ہی خوش ہوں گا جیسے کیپٹن اسکاٹ قطب جنوبی کی مہم سر انجام دے کے ہوا تھا وہ بھی تو اپنی منزل کو پہنچ گیا تھا.... بالکل میری طرح لیکن یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ وہاں امنڈسن اپنا جھنڈا پہلے سے لہرا کے جا چکا تھا۔ اس کے دل پر کیا گزری ہوگی۔۔! شاید میں محسوس کر سکتا ہوں۔ اس کی دلی کیفیت .... میں بھی اسکاٹ کی طرح قطب جنوبی کی برف میں دھنس گیا ہوں۔ اگر وہ بر وقت بریک نہ مارتے تو گاڑی یقیناً کسی کھمبے سے ٹکرا جاتی۔



ریاض مرزا

خلیل شہزاد بلوچ، مکران

س: دن بدن عورت کی بے وفائی کیوں بڑھتی جا رہی ہے؟

ج: دراصل عورت محبت کی سچائی پرکھنے کے 2 مختلف طریقے اپناتی ہے۔

ایک دفعہ ایک معزز شخص سے اس کی محبوبہ نے کہا ”اپنی محبت کا کوئی ثبوت پیش کرو۔“ اس شخص نے ایک بھاری رقم کا چیک اس کے حوالے کر دیا۔ ”میں سب ... [illegible] ... اکاؤنٹ میں جمع کرا دو تو جانوں۔“ وہ حسینہ بولی۔ محبوب نے چیک جمع کرا دیا۔ تب اس مہوش نے کہا ”تمہاری محبت اگر سچی ہے تو اپنی خوش قسمتی ہے۔ یہیں بیٹھے جاؤ کہ پھر نظر نہ آنا۔“

س: ہر مرد کو اپنی بیوی خراب اور دوسروں کی بیوی کیوں اچھی لگتی ہے؟

ج: عورتوں کو جس طرح کپڑے بدلنے کا شوق ہوتا ہے اسی طرح مردوں کو بھی کوئی شوق ہونا چاہیے۔

رفعت سلطانہ قمر، کراچی

س: کیا کسی پر اعتماد کیا جا سکتا ہے؟

ج: آج کل تو بیوی اپنے قابل اعتماد شوہر پر اعتماد نہیں کرتی تو آپ کسی پر کیسے اعتماد کر سکتی ہیں۔ پارٹی میں ایک ڈاکٹر ایک بدنام عورت سے محو گفتگو تھے کہ دفعتاً ان کی بیوی آ گئی۔ تھوڑی دیر بعد بیوی نے نہایت غصے سے پوچھا ”اس بدنام زمانہ عورت سے تمہارا کیا تعلق ہے؟“ ڈاکٹر گھبرا کر بولا ”کچھ بھی نہیں، صرف پیشہ ورانہ۔“ ”اس کا پیشہ یا تمہارا پیشہ؟“ بیوی نے وضاحت طلب کی۔

س: کیا مرد کبھی مجبور نہیں ہوتا؟

ج: مرد ہمیشہ مجبور ہوتا ہے۔ شادی کرنے سے پہلے شادی کرنے پر مجبور اور شادی کے بعد گھر میں رہنے پر مجبور!

اسماعیل خان، مسقط

س: کیا گناہ کا بار بار اعتراف کرنے سے ضمیر کی خلش کم ہو جاتی ہے؟

ج: جی ہاں، خلش کے ساتھ ساتھ حقوق والے سکون بھی ختم کر دیتے ہیں۔

س: بن مانگے محبت کب ملتی ہے؟

ج: شادی شدہ مرد جب گھر پہنچتا ہے۔

ایک عورت شوہر کے گھر آتے ہی برس پڑی "نئی قمیص پر کالر پر لپ اسٹک کا نشان کہاں سے آیا ہے؟" شوہر نے گھبرا کر جواب دیا "پتہ نہیں۔ قمیص تو میں نے تمہاری ہی تھی۔"

شائستہ ناز، شان میناں، فورٹ سنڈیمن

س: آجکل رہپ سے کئی کی جاتی ہے اور دل میں بدگشتی، کیوں؟

ج: یکن عورت کے دل میں جو ہوتا ہے وہی زبان پر۔

یکدم دو قابل عورت نے دوسری سے کہا "بہت عرصے کا گوشت ہے ان کے شوہر کو بھی پسند آئے گا۔" دوسری آدم خور عورت نے جواب دیا "مجھو کہیں کی۔ یہ میرے شوہر تو ہیں۔"

س: جب لوگ چاند پر رہنے لگیں گے تو وہ کس چاند کو دیکھ کر عید منائیں گے؟

ج: کچھ مہاند بھی تو وہاں پہنچ چکے ہوں گے۔

شہناز فقیر، نوشہرہ کینٹ

س: آدمی موت سے ڈرتا کیوں ہے؟

ج: جی نہیں آدمی موت سے نہیں ڈرتا۔

شوہر دھیرے دھیرے پنجوں کے بل چلتا ہوا گھر میں داخل ہوا اسی لمحے گھڑیال نے تین بجائے مرد سمجھ گیا کہ بیوی بیدار ہو کر جاگ گئی ہوگی۔ گھڑیال کی طرف منہ کر کے غصے سے بولا "میں سمجھ گیا ایک بجا ہے تمہیں دو مرتبہ تکرار کی کیا ضرورت ہے۔"

س: اس بے حیائی اور عریانی کا انجام کیا ہوگا؟

ج: عریانی! عریانی!!

نظیرا انجم اسٹوڈ، سندھ یونیورسٹی

س: محبت اور عشق میں کیا فرق ہے؟

ج: عشق شادی سے قبل اور محبت شادی کے بعد ــ دو سال تک۔

ایک دوست نے پوچھا "کیا بات ہے تم بجھے بجھے نظر آتے ہو؟" ٹھنڈی سانس بھر کر دوسرا دوست بولا "ایک لڑکی میری دوست تھی کم گو، ملنسار، مہذب، کفایت شعار، سلیقہ مند جو غائب ہو گئی۔" پہلا دوست بولا "کیا ہوا؟ وہ تمہیں چھوڑ گئی؟" دوسرا دوست آہستہ سے بولا "اس نے مجھ سے شادی کر لی ہے!"

سعیدہ محسن، شاہجہ

س: "دوشیزہ" میری کمزوری ہے آخر کیوں؟

ج: تاریخ گواہ ہے "دوشیزہ" نے بڑی بڑی سلطنتوں کے تختے الٹ دیئے پھر آپ کی "کمزوری" کے متعلق تو میں خاموش ہی رہ سکتا ہوں۔

س: چاند دن کی نسبت رات کو زیادہ پیارا کیوں لگتا ہے؟

ج: آپ کس چاند کی بات کر رہے ہیں؟ محلے کے چاند تو نہیں۔؟

محمد آصف خان، پشاور

س: تکلف برطرف، ہم تو سر بازار......؟

ج: جناب میں نے تو آپ کو پشاور کے بازار میں . . .

س: کیا عشق ہر انسان کو کرنا چاہئے؟

ج: جی ہاں! لیکن احتیاط کے ساتھ:

بیوی نے شوہر سے پوچھا "تم دفتر میں لڑکیوں کی موجودگی میں مجھے بھولتے تو نہیں ہو ناڈارلنگ؟" شوہر نے جواب سے جواب دیا "ہاں تم ہر وقت میرے ذہن میں رہتی ہو کہ کہیں آ نہ جاؤ۔"

ایم اے تلند رانی، گوادر، مکران

س: کیا واقعی دیواروں کے کان ہوتے ہیں؟

ج: آپ کان کی بات کر رہے ہیں۔ اب تو دیواروں میں آنکھیں بھی فٹ ہونے لگی ہیں۔

س: مایوسی کفر ہے؟

ج: جی ہاں:

ایک آدمی نے اپنے دوست سے اظہار افسوس کیا "مجھے یہ سن کر انتہائی افسوس ہوا کہ تمہارا ڈرائیور تمہاری بیوی کو لے اڑا۔" دوست نے جواب دیا "اس میں افسوس کی کیا بات ہے۔ میں خود جو ڈرائیور رکھنا چاہتا تھا۔"

تو یہ ین مرزا۔ لاہور

س: جب آپ میرے سوال کا جواب دینے لگیں اور آپ کو پیاس لگ جائے تو آپ پہلے جواب دیں گے یا......!

ج: پہلے "پیاس" بجھائی جائے گی

عطیہ نازنین، کلانیوں

س: اقربا پروری کس قدر عام کیوں ہے؟

ج: اس دور میں ایسے ہی لوگ ہیں جو اس کو برا سمجھتے ہیں۔

ایک معروف صنعت کار اپنے ایک وزیر دوست کے پاس گیا اور اس سے کہنے لگا ـــــ "بھئی اپنے شعبہ وزارت میں میرے بیٹے کو بھی کوئی ملازمت دے دو۔" وزیر نے پوچھا "تمہارا بیٹا کیا کام جانتا ہے" صنعتکار ہنسا اور بولا "تم طنز کر رہے ہو۔ اگر وہ کسی کام کے قابل ہوتا تو میں اسے اپنے ساتھ نہ رکھ لیتا۔"

س: غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑے تو...؟

ج: ضبط اور حوصلہ کی کرین استعمال کریں۔

شاہینہ قمر، دوحا، قطر

س: کسی سے قوم بن سکتی ہے؟

ج: ہرگز نہیں۔

ایک بچہ اپنی ماں اور دو جڑواں بہنوں کو دیکھنے میٹرنٹی ہوم گیا

جب بیٹھے بیٹھے تھک گیا تو سارے وارڈ میں گھومنے پھرنے لگا۔ ایک ادھیڑ عورت نے اسے پیار سے اپنے پاس بلا لیا۔ کچھ باتیں کرنے کے بعد بچے نے اس سے پوچھا "آپ یہاں کب آئیں ؟" وہ ہنستے ہوئے بولی "دو ہفتے ہوئے۔"

"آپ کا بچہ کہاں ہے میں دیکھ لوں۔"

وہ مسکرا کر بولی۔ "میرا کوئی بچہ نہیں۔"

"ارے" بچے کو حیرت ہوئی "آپ تو بہت سست ہیں۔ میری امی تو کل آئی تھیں اور اب تک ان کے پاس دو بچے آ گئے۔"

س : مغربی تہذیب کو اپنا کر لڑکیاں خوشگوار زندگی بسر کر سکتی ہیں ؟

ج : جی ہاں — ! خواب کی دنیا میں۔

عارفہ ھمدانی ، ایبٹ آباد

س : خواہش کیسی ہونی چاہیے ؟

ج : خواہش کیسی بھی ہو مگر اچھی ہو۔

امی ہسپتال میں داخل ہوئیں تو ابو نے نھی سے پوچھا "بیٹی بتاؤ تمہارے لیے کیا لائیں۔ بھائی یا بہن ۔ !" ننھی نے جھٹ جواب دیا "نہ بھائی نہ بہن۔ مجھے تو تین پہیوں کی سائیکل لا دیں۔"

س : زندگی دکھوں کا گہوارہ ہو تو ؟

ج : کیا آپ کو علم ہے سونا کندن کب بنتا ہے ؟

فرحت یاسر ، لاھور

س : اپنی دھاک کس طرح بٹھائی جا سکتی ہے ؟

ج : اپنے تجربات کی بنا پر۔

نئے نئے پائلٹ نے دیکھا کہ ہوائی اڈے پر اس کی محبوبہ موجود ہے تو اس نے اس کو متاثر کرنے کے لئے دو چار عمدہ قلابازیاں کھائیں اور جہاز سے اتر کر فخر سے سینہ تانے وہ محبوبہ کے پاس آیا۔ تو اس کی محبوبہ نے کہا "کوئی بات نہیں جلد ہی سیدھا جہاز اڑانا بھی سیکھ جاؤ گے۔"

س : گل کے ساتھ خار امیر کے ساتھ غریب کیوں ہیں ؟

ج : تاکہ آپ دن رات میں فرق محسوس کر سکیں۔

شیخ محمد اکبر ، رحیم یار خان

س : بعض لوگ خدا سے زیادہ عورت سے کیوں ڈرتے ہیں ؟

ج : اس لیے کہ بڑی سے بڑی غلطی کو خدا معاف کر دیتا ہے لیکن . . . . !

ہالی ووڈ کی ایک اداکارہ نے اپنی سہیلی اداکارہ سے کہا "میرا نیا ہونے والا شوہر ہر اعتبار سے مکمل ہے۔ وہ نہ شراب پیتا ہے نہ جوا کھیلتا ہے۔ نہ کسی دوسری لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہے۔" سہیلی بولی "خدا کی پناہ ! ایسی صورت میں تم آئندہ کبھی اس سے طلاق کیسے لو گی۔"

س : اگر عورتوں کے قدموں کے نیچے جنت ہے تو مرد کے قدموں کے نیچے کیا ہے ؟

ج : ایک ایسی چیز جس کا وہ دوہرا استعمال کرتا ہے۔

دُرِ شہوار مبین راجپوت ، کراچی

س : اگر پورا چاند کے سارے پھول کسی کے قدموں میں ڈھیر ہو جائیں اور وہ ان کو بہت پیار اور آہستگی سے سمیٹ لے تو تماشا دل کیا کہے ؟

ج : دیوتا کا "معجزہ"

س : بتایئے نا ! شگفت کس میں ہے ؟ گورے پیروں میں چھنکتی پائل میں یا پھولوں کے رخساروں پر ٹپ ٹپ کرتی شبنم میں ؟

ج : صرف "روٹی ، کپڑا اور مکان" میں۔

آنسہ تسنیم نثار خان (نامعلوم مقام)

س : حسین چہروں کی زندگی اتنی مختصر کیوں ہوتی ہے ؟

ج : قدرت کا انتظام ہے۔ اگر ان کی زندگی طویل ہوتی تو بہت سے لڑکوں کی زندگی مزید مختصر ہو جاتی۔

س : زندگی کی شاہراہ اس قدر کٹھن اور پیچ دار کیوں ہے ؟

ج : زندگی کی شاہراہ نہ اس قدر کٹھن ہے نہ پیچ دار جتنا لوگ سمجھتے ہیں۔

ایک ڈاکٹر نے مشورہ دیا "اگر تم شراب چھوڑ دو تو تمہاری عمر لمبی ہو جائے گی۔" شرابی نے کچھ دیر سوچا اور کہا "شاید آپ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ میں نے ایک دن شراب نہیں پی تھی اس دن جتنا لمبا دن میں نے ساری زندگی میں نہیں گزارا۔"

نسرین شبیر ، کراچی

س : نزاکت کس میں ہے پھول میں یا عورت میں ؟

ج : پھول میں :

ایک شرابی بھٹکتا لڑکھڑاتا چڑیا گھر میں جا نکلا اور ایک بینڈک گینڈے کو اپنی طرف گھورتے دیکھ کر عاجزی سے کہنے لگا "پیارے اس طرح غصے سے نہ دیکھو میں ابھی بتلائے دیتا ہوں کہ میں اتنی دیر کہاں تھا۔"

س : ٹوٹا ہوا دل کیسے جڑ سکتا ہے ؟

ج : محبت کے گوند اور خلوص کے لیپ سے۔

عبدالناصر ، وھاڑی

س : عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے ۔ ! آپ کا کیا خیال ہے ؟

ج : بعض لوگ کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔

محبوبہ نے کہا "لیکن ڈارلنگ اگر ہم نے شادی کر لی تو میری ملازمت چھوٹ جائے گی۔" لڑکے نے جواب دیا "کیا ہم اپنی شادی کو دنیا والوں سے پوشیدہ نہیں رکھ سکتے ؟" لڑکی بولی "وہ تو ٹھیک ہے لیکن جب بچہ ہوگا تب ؟" لڑکے نے مشورہ دیا "تو کیا ہوا ! ہم بچے کو

جب وہ سیانا ہوگا تو اس راز میں شریک کریں گے۔

س: پاکستانی روپیہ کی ان کرنسیوں کے ساتھ شرح تبادلہ کیا ہے۔
امریکی ڈالر، پونڈ اسٹرلنگ، جاپانی ین، سعودی ریال۔

ج: بالترتیب ۹۴ر۱۲۹، ۱۷ر۱۲، ۰۵ر۲، ۸۸ر۲۶

ناھید افضل، ریاض سعودی عرب

س: جلدی کا کام شیطان کا، کہاں تک صحیح ہے؟

ج: دورِ جدید نے اس محاورے کو بدل کر رکھ دیا ہے۔

بوئنگ ۷۴۷ لندن سے چلنے کے بعد نیویارک ایئرپورٹ پر اترنے لگا۔ جہاز کے کپتان نے آخری بار مسافروں کو الوداع کہتے ہوئے انٹرکام پر کہا "خواتین و حضرات! آپ کے جہاز کا کپتان آپ سے مخاطب ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ کا سفر خوشگوار گزرا ہوگا اور آپ لوگ جلد ہی ہمیں خدمت کا موقع دیں گے۔" یہ کہہ کر کپتان نے ریسیور رکھ دیا مگر انٹرکام بند کرنا بھول گیا، اور کو پائلٹ سے بولا "جانتے ہو میں ایئرپورٹ سے نکلتے ہی کیا کروں گا؟" "نہیں، کیا کرو گے؟" کو پائلٹ نے پوچھا۔ "سب سے پہلے شیو بناؤں گا، اس کے بعد رات کا کھانا کھاؤں گا، اور پھر سنہری بالوں والی ایئر ہوسٹس کے ساتھ رات گزاروں گا۔" اور یہ ساری باتیں لاؤڈ اسپیکر پر سنی جا رہی تھیں، جس کی وجہ سے سنہری بالوں والی ایئر ہوسٹس کپتان کے کمرے کی طرف بھاگی، تاکہ اسے بتا سکے کہ انٹرکام کھلا ہوا ہے اور مسافر ساری باتیں سن رہے ہیں۔ تیزی سے بھاگنے کی وجہ سے ایئر ہوسٹس تو رستے میں کرسی سے الجھ کر گر پڑی۔ برابر کی سیٹ پر سے ایک بڑی بی اٹھیں اور ایئر ہوسٹس کو اٹھانے میں مدد کی اور آہستہ سے کان میں کہا "اتنی جلدی بھی کیا ہے، ابھی تو اس نے پروگرام کے مطابق شیو بھی نہیں بنایا ہے۔"

س: محبت اور جنگ میں کیا چیز مشترک ہے؟

ج: محبت ہو یا جنگ، دونوں کے اختتام پر تباہی!

ڈاکٹر رضیہ نادر، جلالپور جٹاں

س: شادی سے پہلے عورت کی اوڑھنی میں سجانے کے لئے چاند تارے توڑ لانے والے مرد شادی کے بعد بیوی کے لئے دوپٹہ مہیا کرنا بھی مصیبت سمجھتے ہیں، آخر کیوں؟

ج: محترمہ! آج کل کے زمانے میں بیوی کو دوپٹہ مہیا کر کے مرد اپنے آپ کو دقیانوسی کہلانے سے تو رہا۔

شادی سے پہلے ایک حسینہ نے معصوم عاشق سے کہا۔ "ڈیئر میں تمہارے دکھ اپنے آنچل میں سمیٹ لوں گی۔" عاشق نے جواب دیا۔ "خوب، مگر فی الحال تو مجھے کوئی دکھ نہیں۔" محبوبہ ہنسی اور بولی "میں فی الحال کی نہیں شادی کے بعد کی بات کر رہی ہوں۔"

س: آپ نے زندگی میں کیا کھویا کیا پایا؟



ج: میں نے تو ابھی زندگی پائی ہے۔

منصور چاند اعجانہ، سیالکوٹ

س: ناکام عاشق محبت میں ناکامی کی صورت میں اپنی محبوبہ کو زہریلی ناگن کیوں کہتے ہیں؟

ج: جو لوگ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں ان کی زندگی میں خطرناک حد تک حسیناؤں کا زہر سرایت کر چکا ہوتا ہے۔ اور وہ معصوم حق بجانب ہیں۔

س: مرنے والوں کی تعداد مردوں کی زیادہ ہے یا عورتوں کی؟

ج: مردوں کی!

ایک بیوہ نے دوسری شادی کر لی۔ وہ اپنے دوسرے شوہر کے سامنے پہلے شوہر کی تعریف کر رہی تھی۔ "تمہیں میرے پکائے ہوئے کھانے کبھی پسند نہیں آتے اور ایک مرحوم تھے جو پکا کر رکھ دیتی تھی نہ صرف کھا لیتے تھے بلکہ تعریفیں بھی کرتے تھے" ـــــ شوہر بولا "درست ہے مگر یہ بھی تو سوچو کہ وہ کہاں پہنچ چکے ہیں۔"

اسرار احمد قریشی، راولپنڈی

س: فلم دیکھ کر آج کل کے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں کیا سبق حاصل کرتے ہیں؟

ج: "ایک دوجے میں کھو جائیں" کا راگ ہی نہیں الاپتے بلکہ عمل بھی کرتے ہیں۔

س: اگر عورت حیا کا مجسمہ ہے تو آج کل اس کی حیا کہاں ہے؟

ج: آج کل مرد باحیا ہو گئے ہیں۔

صاحب خانہ ملازمہ کو اندر آتے دیکھ کر غصے میں چیخے۔ "تم سے ہزار بار کہا ہے کہ کمرے میں آنے سے پہلے دروازے پر دستک دے دیا کرو۔ پتہ نہیں کون کس حالت میں ہو۔" ملازمہ نے جواب دیا "آپ درست کہتے ہیں جناب، مگر مجھے اس کی ضرورت نہیں پڑتی۔ میں چابی کے سوراخ سے دیکھ لیتی ہوں۔"

آر اے خان، یو اے ای

س: اگر کوئی لڑکا محبت بھرا دل رکھتا ہو مگر محبت کے لئے کوئی لڑکی نہ ملے تو اسے کیا کرنا چاہئے؟

ج: کوئی ضروری نہیں کہ محبت کرنے کے لئے لڑکی تلاش کی جائے، گھر میں ماں بھی تو ہوگی۔

رنگوں کی بہار

بسنت بہار



ہر سال جب بھی گرمیوں کا موسم آتا ہے تو ملبوسات اور فیشن کی دنیا میں یوں لگتا ہے جیسے رنگوں کی بہار آگئی ہو۔ دکانوں پر نیلے، پیلے، ہرے، اودے رنگوں کی لان اور کیمبرک کے کپڑے لہرانے لگتے ہیں۔ نئے نئے ڈیزائنوں میں جاذب نظر پرنٹس نوجوان لڑکیوں میں اس قدر تیزی سے مقبولیت حاصل کرتے ہیں کہ جہاں جاؤ انہی پرنٹس کے چرچے سنائی دیتے ہیں۔ شادی بیاہ کی تقریبات ہوں یا کسی پارک کا پُر فضا ماحول یونیورسٹی کی راہداریاں ہوں یا بوہری بازار یا انارکلی کی تنگ گلیاں ہر جگہ انہی پرنٹس کی بہار نظر آتی ہے۔

گزشتہ برسوں کی طرح اس مرتبہ بھی گرمیوں کے ملبوسات کے لیے ہزاروں قسم کے کپڑے تیار ہوئے ہیں مگر کچھ کپڑے دوسرے تمام کپڑوں میں نمایاں و ممتاز نظر آتے ہیں۔ کیونکہ وہ نہ صرف دیکھنے میں اچھے لگتے ہیں بلکہ انھیں پہن کر شخصیت میں کچھ اور نکھار آجاتا ہے۔

اپنی سابقہ روایات کو برقرار رکھتے ہوئے داؤد کاٹن ملز نے اس سال بھی بہت خوبصورت سمر فیبرکس تیار کیے ہیں۔ جن میں بسنت لان، بسنت کیمبرک اور گنی پاپلین بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ بسنت لان نے تو خواتین اور نوجوان لڑکیوں میں بے پناہ مقبولیت حاصل کر لی ہے۔

بسنت لان سفید کے علاوہ خوبصورت پرنٹس میں بھی دستیاب ہے۔ اسی طرح نسرین لان بھی گرمیوں کے موسم کے ملبوسات کیلئے بہترین انتخاب ہے۔

بسنت لان، نسرین لان، بسنت کیمبرک اور گنی پاپلین سے جدید فیشن کے مطابق بیل باٹم سوٹ، میکسی، ر ۔ ن، ٹراؤزر سوٹ، فلیپر، شلوار قمیص اور کرتے غرض ہر طرح کے لباس تیار کیے جا سکتے ہیں۔

دفعہ ۲۰۹ کے تحت گرفتاری کے شوقین حضرات یہ کہانی ذرا توجہ سے اور بار بار پڑھیں

خدا نہ کرے جو اس "کمزوری" کا آپ شکار ہوں



اس دن منہ اندھیرے ہی میری آنکھ کھل گئی تھی۔

اور جب کبھی ایسا اتفاق ہوجاتا ہے، میں بس کروٹ سوتا چھوڑ کر بڑی آہستگی کے ساتھ پلنگ سے اتر جاتا ہوں پہلے غسل خانے کا رخ کرتا ہوں دانتوں کی صفائی کے بعد منہ ہاتھ دھوتا ہوں اور پھر بالکونی پر چلا جاتا ہوں۔ کبھی رات کی کوکھ سے دن کے جنم لینے کا حسین منظر دیکھنے کے انتظار میں جنگلے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر جھکا جھکا سا کھڑا رہتا ہوں تو کبھی نیچے اتر کر کھلے میدان میں چہل قدمی کرنے لگتا ہوں۔ ایسا کرتے ہوئے مجھے ایک توانائی اور تازگی کا احساس ہونے لگتا ہے۔

اس دن بھی یہی کچھ ہوا تھا مگر نیچے پہنچنے کے بعد ایسا کچھ ہوا جو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا اور نہ ہی اس کا وہم و گمان ہو سکتا تھا۔ بالکل انوکھی اور ناقابلِ یقین بات تھی۔ میں تھوڑا سا ہی آگے بڑھا ہوں گا کہ کھلے کھلے ٹینک میں ماجد صاحب کے فلیٹ کی بالکونی کے عین نیچے زمین پر ایک عورت جھکی ہوئی بیٹھی نظر آئی میری طرف اس کی پشت تھی۔ غور سے دیکھنے پر اس کے ہاتھوں کی حرکت سے صرف یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کپڑے سے کسی شے کو لپیٹنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایک دو بار اس نے اپنے سامنے پڑی ہوئی چیز کو اپنی بانہوں میں اٹھانے کی کوشش کی لیکن شاید وہ کامیاب نہ ہو سکی۔ ایک دم میرے پاؤں زمین پر جم کر رہ گئے — میں تذبذب میں پڑ گیا۔ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ سوچا جلدی سے دوڑ کر وہاں پہنچ جاؤں اور سب کچھ قریب سے دیکھوں مگر میں ایک قدم بھی نہ چل سکا۔ ایک انجانا سا اندیشہ، خوف کا آسیب، وحالہ کر میرے راستے میں حائل ہو گیا تھا۔ یوں بھی میں عجلت

چادر کے نیچے

سے کام لینے کا قائل نہیں ہوں میں نے فیصلہ کیا کہ فی الحال چند لمحے یہیں کھڑے کھڑے اس عورت کی حرکات کا جائزہ لینا چاہیے۔ پھر ایکا ایکی بے دھیانی میں ایک لغزش کا مرتکب ہو گیا۔ اب سوچتا ہوں تو غصہ آتا ہے کہ یہ بھلا کہاں کی عقلمندی تھی۔ ہوا یوں کہ میں ایک دو بار زور زور سے کھنکھارا تو اس عورت نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ مجھے فوری طور پر احساس ہوا کہ یہ فعل بدتمیزی کر کے میں نے اچھا نہیں کیا تھا۔ وہ بے چاری اپنا کام ادھورا چھوڑ کر کھڑی

ہو گئی۔ مجھے اب بھی اس کی صورت واضح طور پر نظر نہیں آ رہی تھی۔ جلدی جلدی سفید چادر سے اُس نے نامعلوم ہستی کو ڈھانپ دیا اور دوڑتی ہوئی ماجد صاحب کے فلیٹ کے زینے پر چڑھ گئی۔

میں نے بھی متلاشی کیفیت میں اِدھر اُدھر دیکھا کہ کوئی ساتھی مل جائے تاکہ قریب جا کر دیکھوں کیا معتہ ہے۔ ابھی تک میں خود کو آمادہ نہیں کر سکا تھا کہ اکیلا وہاں پہنچوں مگر وہاں تو دُور دُور تک کوئی انسان نظر نہ آیا۔ ملازم پیشہ لوگوں کی کالونی ہونے کے باعث اتوار کی صبح کو ایسا ہوتا ہے کہ لوگ دیر سے اُٹھتے ہیں۔

اب مجھے پھر یہ طے کرنا تھا کہ یا تو جرأت سے کام لے کر خود ہی سفید چادر کا راز معلوم کروں یا کچھ دیر اُجالوں کے انتظار میں گم ہو جاؤں۔

میں نے چند منٹ چہل قدمی کرتے ہوئے اسی سوچ ... میں گزار دیئے اور پھر ہمت کر کے اس سفید چادر کے نزدیک پہنچ گیا۔ چادر اٹھائی یوں لگا جیسے بجلی کے ننگے تار کو چھو لیا ہو۔ سارا بدن جھنجھنا کر رہ گیا۔ سفید چادر کے نیچے ماجد صاحب ایک سربستہ راز کی صورت میں پڑے ہوئے تھے۔ سر سے پاؤں تک برہنہ۔ مُردہ حالت میں۔ ان کا پیٹ رنگین دھوتی سے بندھا ہوا تھا مگر ٹانگیں پھر بھی ننگی تھیں۔ فوراً ہی چادر میرے ہاتھوں سے چھوٹ گئی اور آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ چند ساعتوں کے بعد مجھے ایک جھرجھری سی آئی اور میں غنودگی کے عالم میں اپنے فلیٹ کی جانب چلنے لگا۔

اُوپر آیا تو ابھی تک سب لوگ سو رہے تھے۔ میں دبے پاؤں دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ کرسی پر بیٹھ کر میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ میرا ذہن بوجھل ہوتا جا رہا تھا۔ کبھی یوں لگتا جیسے ابھی ابھی جو ایک پُراسرار اور دلخراش منظر دیکھا تھا محض ایک خواب تھا، وہم تھا، سراب تھا لیکن جب یہ خواب حقیقت بن کر میرے سامنے آتا تو لرز جاتا۔ میرے انگ انگ میں ایک انجانے خوف کی لہر دوڑ جاتی۔ کافی دیر میں ایک پریشان کن کیفیت سے دوچار رہا۔

دراصل ماجد صاحب بڑے ہی سنجیدہ اور شریف انسان تھے۔ وہ تقریباً ڈیڑھ دو سال سے اس فلیٹ میں رہ رہے تھے۔ مختصر سا کنبہ تھا۔ ان کی بیوی، چھ سات سالہ بچی اور بوڑھی ماں۔ بڑی خاموش طبیعت پائی تھی انھوں نے۔ نہ کسی کے لینے میں نہ دینے میں۔ نہ لڑائی نہ جھگڑا۔ البتہ جب ان کو مصالحت کنندہ کا کردار ادا کرنے کا موقع میسر آتا تو اسے بڑی مہارت اور کامیابی کے ساتھ انجام دیتے۔ ایسے نیک کاموں میں انھوں نے ہمیشہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ لوگ حیران رہ جاتے تھے جب دیکھتے تھے کہ ایک عام سا آدمی ... بڑے ... چلا جا رہا ہے۔ میری جب بھی اُن سے سلام علیک ہوتی ہمیشہ مسکرا کر جواب دیتے۔ مجھے اُن کی یہ ادا بہت بھلی لگتی تھی اور میں اُن کو ... کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ میں کیا ساری کالونی انھیں اچھی نظروں سے دیکھتی تھی۔

میں نے سگریٹ سلگایا اور اس کسی ہوئی سخت گرہ کو کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ تو کیا ماجد صاحب نے خودکشی کی ہے؟ نہیں میرا خیال ہے کہ ایسا کوئی امکان نہیں۔ ماجد صاحب ایک معقول عہدے پر فائز تھے۔ اُن کی گھریلو زندگی بھی بڑی خوشحال تھی جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے میں بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ انھیں کوئی ایسی معاشی یا گھریلو پریشانی لاحق نہیں تھی جس سے وہ بُری طرح تنگ آ گئے ہوں مگر ہو سکتا ہے کوئی اور... لیکن اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ انھوں نے خودکشی کی ہے تو پھر الف ننگی حالت کا جواز کیا ہو سکتا ہے۔ تو کیا انھیں قتل کیا گیا ہے؟ میرا خیال ہے یہ قتل کی واردات بھی نہیں ہو سکتی۔ اوّل تو ماجد صاحب جیسے بھلے مانس کا ایسا خطرناک دشمن ہونا بعید از قیاس ہے۔ جو اُن کی زندگی کی ڈوری ہی کو کاٹ ڈالے۔ وہ جو دوسروں کے ٹوٹے ہوئے رشتے جوڑتا تھا، رنجشوں کو دُور کرتا تھا، آپس میں میل جول سے رہنے اور خیرسگالی کی تلقین کرتا تھا کیا کسی کو اپنی جان کا دشمن بنا سکتا تھا۔ ؟ نہیں۔ مگر ایک وجہ اور بھی تو ہو سکتی ہے لیکن یہ ایک بہت بڑی بدگمانی ہوگی۔ ویسے بھی میں نے سُن رکھا تھا کہ یہ ماجد صاحب کی دوسری تھی۔ دوسرے میری بیوی بھی اُن کی بیگم سے کئی بار مل چکی تھی اور اُس کے سگھڑپن، متانت اور بھولپن سے بے حد متاثر تھی۔ اُس کی ان خصوصیات کو مدِنظر رکھتے ہوئے بھی یہ سوچنا گناہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے ماجد صاحب سے بے وفائی کی ہوگی یعنی اپنے کسی آشنا سے ماجد صاحب کا کام تمام کروا دیا ہوگا اور پھر ماجد صاحب جس برہنگی کی حالت میں پڑے ہیں... نہیں نہیں یہ قتل ہرگز نہیں ہو سکتا، یہ قتل کی واردات ہو ہی نہیں سکتی۔ میرا دماغ خبط ہو چکا تھا۔ سگریٹ کے کئی لمبے لمبے کش لے کر میں نے ٹوٹا جلا ٹکڑا ایش ٹرے میں ٹھونس دیا۔ کھڑکی کے شیشوں میں سے سورج کی شعاعیں چھن چھن کر اندر منعکس ہو رہی تھیں۔ دُور موٹر رکشاؤں اور بسوں کی گھڑگھڑاہٹ کی آوازیں سُنائی دے رہی تھیں۔ قریب کے فلیٹوں میں سے بھی قدموں اور چہل پہل کی آوازیں اُبھرنے لگی تھیں۔ میں ابھی تک سہما سہما سا بیٹھا تھا۔

مجھے پتہ ہی نہ چلا کب میری بیوی نے کمرے میں قدم رکھا۔ جب اس نے میرے شانے کو ہلایا تو میں نے ہڑبڑا کر اسے دیکھا۔ اُس نے میری سوالیہ پریشان نظروں کا جواب بڑی گھبراہٹ سے دیا۔ ”دیکھیے ماجد صاحب کے فلیٹ کے نیچے آدمی جمع ہیں پتہ تو کیجیے جا کر۔“ میں نے اُس وقت اس کو بتانا مناسب نہیں سمجھا کہ وہاں سفید چادر کے نیچے ماجد صاحب کی ننگی لاش پڑی ہوئی ہے اور صبح سے اس مسئلہ کو حل کرتے کرتے میں زچ ہو چکا ہوں۔ چنانچہ میں ہونکا بن کر ”اچھا“ کہہ کر ساتھ ہی تیزی سے نیچے چلا گیا۔

کالونی کے چند لوگ تو نیم دائرے کی شکل میں جاوید کے ارد گرد جمع تھے اور کچھ لوگ دو دو تین تین کی ٹولیوں میں کھڑے قیاس آرائیوں میں اُلجھے ہوئے تھے سب سے پہلے میری تجسس آمیز نظروں نے صدیقی کو دیکھنا چاہا کو وہ ماجد صاحب سے بہت زیادہ قریب تھا۔ اتنا قریب کہ ماجد صاحب کے گھر میں بھی اُس کا آزادی سے آنا جانا تھا۔ میرا مطلب ہے ماجد صاحب کی بیگم صدیقی سے پردہ نہیں کرتی تھی۔ جب مجھے صدیقی کہیں نظر نہ آیا تو میں شیخ صاحب کی طرف لپکا جو علوی صاحب سے تبادلۂ خیال کر رہے تھے۔ ساری کالونی میں صرف دو شخصیتیں ایسی ہیں جن سے میں خاصا گھل مِل گیا ہوں۔ انہی سے میرے تعلقات خصوصی نوعیت کے ہیں۔ ایک صدیقی دوسرے شیخ صاحب۔ مزاجوں کی ہم آہنگی کے باعث ہم تینوں ہمیشہ اور ہر معاملے میں ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں اور جب بھی کوئی مسئلہ درپیش ہوتا ہے، میں انہی حضرات کی طرف رجوع کرتا ہوں کہ مجھے اُن پر پورا پورا اعتماد ہے۔ ہاں علوی صاحب سے میں حتی الامکان بچنے کی کوشش کرتا ہوں اُس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اکثر نامعقولیت پر اُتر آتے ہیں۔

"سمجھ میں نہیں آتا ماجد صاحب کے ساتھ یہ حادثہ کس طرح اور کیوں کر پیش آیا۔ آدمی تو بڑا بھلا مانس تھا" علوی صاحب بولے۔

"میرا خیال ہے یہ خودکشی کا کیس ہے" شیخ صاحب نے خیال ظاہر کیا۔

"نہیں شیخ صاحب خودکشی اس طرح گھر سے باہر اور ننگی حالت میں نہیں کی جاتی۔ دراصل میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ان کو مارا گیا ہے اور کیس کو اُلجھانے کے لیے ننگا کر کے یہاں ڈال دیا گیا ہے" علوی صاحب بولے۔

"شاید آپ کا اندازہ ٹھیک ہو" شیخ صاحب نے سوچتے ہوئے کہا۔

"اب سوال یہ ہے کہ وہ دشمن کون ہے" علوی صاحب نے میری طرف دیکھا۔

"کہا نہیں جا سکتا" میں نے مختصر جواب دیا۔

"میں بتاؤں آپ کو" علوی صاحب آہستہ سے رازدارانہ لہجے میں بولے "مجھے تو اس کی بیوی پر شبہ ہے۔ یہ کام اُس کی ایما کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا"

میں نے فوراً تردید کی "علوی صاحب اُن کی گھریلو زندگی بے حد خوشگوار تھی یہ بات میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں۔ ویسے بھی اُن کی بیوی ایک ایسی عورت ہے جس میں مشرقی عورت کی تمام صفات موجود ہیں"

"آپ نہیں جانتے قریشی صاحب یہ جسے عورت کہتے ہیں نا بہت مکار ذات بن جاتی ہے کبھی کبھی۔ اُس کو پانا آسان کام نہیں۔ فساد کی جڑ ہوتی ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ بیشتر جھگڑے اور قتل اسی کے سبب ہوتے ہیں۔"

"بہر حال پولیس کو اطلاع بھجوائی جا چکی ہے۔ وہ خود آکر تفتیش کر لے گی"

"میرا خیال ہے کہ اُس سے قبل کہ پولیس آئے، ماجد صاحب کی بیگم سے رابطہ قائم کیا جائے تو کوئی ہرج نہیں" میں نے تجویز پیش کی۔

غیبؒ کی آواز

"اسلامی سوشلزم" کے دعویدار مسٹر بھٹو نے خدا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"خداوندا! میں نے تیری رضا سے۔ ۹۰ ہزار قیدی واپس لیے، دشمن کے قبضے سے پاکستان کا علاقہ واگزار کرایا، اسلامی کانفرنس بلائی، سرداری اور جاگیرداری نظام کا خاتمہ کیا، تیسری دنیا کی رہنمائی کی، روٹی کپڑا اور مکان دیا، ملک کی صنعتوں کو قومی تحویل میں لیا۔ کیا تو اب قومی اتحاد کا بیڑہ غرق نہیں کر سکتا؟"

غیب سے آواز آئی۔

"اب میں نے معجزے دکھانے بند کر دیے ہیں"

"جناب یہ کوشش بھی کر دیکھی ہے" علوی صاحب نے کہا۔

"پھر؟"

"پھر کیا، بیگم صاحبہ نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑی ہیں کسی بات کا جواب ہی نہیں دیتیں" علوی صاحب نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"تو آپ کے خیال میں ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ کمال ہے کسی کی دنیا لُٹ جائے اور وہ اُف بھی نہ کرے" مجھے علوی صاحب کا یہ لہجہ پسند نہ آیا۔

"آپ تو جذباتی ہوتے جا رہے ہیں قریشی صاحب۔ کون کافر کہتا ہے کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے میرا خیال تو یہ ہے کہ یہ سب ڈھونگ رچایا ہے اس عورت نے"

"محض حد سے بڑھی ہوئی بدگمانی کی بھی۔ سب کچھ خود بخود فرض کر لیا آپ نے۔ سارا الزام اُس غریب عورت پر ڈال دیا۔ میں کہتا ہوں جب تک کوئی واضح ثبوت نہ ملے کیا کہا جا سکتا ہے"

"تو پھر آپ ہی بتائیے کیا؟" .... ڈال گئے اس شریف آدمی کو میاں!"

علوی صاحب جو ہر معاملے میں اپنی ٹانگ اڑانے کے عادی تھے اور اپنی بات کے آگے کسی کی نہ چلنے دیتے تھے آج میرے مقابل کھڑے ہو گئے تھے۔ میں کیا ساری کالونی اُن کی فطرت سے واقف تھی کہ ہار ماننا انھوں نے سیکھا ہی نہیں۔ بس جو اُن کے منہ سے نکل گیا وہ ٹھیک ہے۔ باقی سب غلط۔

"اب میں آپ کو کیا بتاؤں علم غیب تو آتا نہیں مجھے" میں نے



دیکھا پچھڑانے کی کوشش کی۔

- لیکن عقل تو اِن سے خدا نے "

جی میں آئی کہ دوں وہ تو ساری آپ کے حصے میں لگی ہے مگر اس نازک موقع پر لڑائی مول لینا کسی صورت میں بھی مناسب نہ تھا چنانچہ بات کو ٹالنے کی ایک اور کوشش کر ڈالی "کیا بتاؤں علوی صاحب بہت زور لگے چکا ہوں دماغ پر، میری سمجھ سے باہر ہے یہ معمہ "

- "تو پھر مان لو بھی نا ہماری بات" علوی صاحب فخر سے بولے " دیکھ لینا میرا اندازہ سو فی صدی درست نکلے گا "

- "کتنا پیارا آدمی تھا" شیخ صاحب نے بات کا رُخ بدلتے ہوئے کہا "ہمیشہ جھک کر ملتا تھا اتنا عرصہ ہو گیا یہاں آباد ہوئے مجال ہے جو کسی کو اُس کی ذات سے ذرا سی بھی تکلیف پہنچی ہو "

- "ہاں" میں نے گہرا سانس لیا "بڑی بردلعزیز شخصیت تھی ابھی پرسوں کی بات ہے یہیں راستے میں ملاقات ہوئی تو کہنے لگے قریشی صاحب بڑا دل چاہتا ہے مل بیٹھ کر باتیں کرنے کو بہت دن سے سوچ رہا ہوں پر فرصت نہیں ملتی خیر اتوار کی شام کو میرے ساتھ چائے پیجیے کیا پتا تھا کہ اتوار کی شام کو بے چارہ قبر میں لیٹا ہوگا "

- "موت کا کوئی وقت نہیں ہوتا بھائی اس پر کسی کا اختیار نہیں۔ ہاں ایک بات کہ موت بھی ڈھنگ کی ہونی چاہیے۔ خدا بچائے ایسی ناگہانی موت سے۔ توبہ توبہ " علوی صاحب دونوں ہاتھوں سے اپنے کان پکڑ کر بولے۔

" ہاں یہ بھی ٹھیک ہے مگر کوئی خود بھلا ایسا کیوں کر چاہنے لگے گا۔ موت کو تو بہرحال آنا ہے جس طرح چاہے آسکتی ہے" شیخ صاحب نے اپنا نقطۂ نظر بیان کیا۔

- "اعمال بھی تو کوئی چیز ہوتے ہیں" علوی کا نزلہ براہِ راست ماجد صاحب پر گرنے لگا۔ وہ شیخ صاحب کی مخالفت میں یہ بھی بھول گئے کہ ابھی ابھی انھوں نے ماجد صاحب کی شان میں چند تعریفی کلمات کہے تھے۔

- "خدا کے خوف سے ڈرنا چاہیے۔ بغیر کسی ٹھوس تصدیق کے کسی پر اتنا بڑا بہتان نہیں لگانا چاہیے" اس بار شیخ صاحب آڑے آگئے۔

- "تو یہ الزام ہے تہمت ہے بہتان ہے کتنا عبرت ناک انجام آپ کے سامنے ہے۔ کیا اس کو بھی آپ ثبوت کی حیثیت نہیں دے سکتے" علوی صاحب تڑخ کر بولے۔

- "اب ہر ایک آپ کی طرح تو ذہین نہیں کہ اتنی جلد بات کی تہہ تک پہنچ جائے" میں نے متوازن لہجے میں کہا۔

- "آپ کو تو بس اعتراض کرنا ہی آتا ہے قریشی صاحب۔ جب تحقیقات مکمل ہو جائے گی تب پوچھوں گا کہ زبانِ کس پہلو بیٹھتی ہے "

اپنی بات کا جب کوئی جواب نہ پایا تو علوی صاحب پھر لاش کے پاس کھسک گئے۔ اب نیم دائرہ مکمل دائرہ بن چکا تھا اور قریب ہی دو دو تین تین کی ٹکڑیوں میں بھی قدرے اضافہ ہو گیا تھا۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ ایک بار اوپر ہو آؤں اور بیوی کو صورتِ حال سے آگاہ کر دوں کہ سامنے سے صدیقی ہماری طرف آتا ہوا نظر آیا لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا۔

ہمارے نزدیک آ کر صدیقی نے اشارے سے ہمیں تھوڑا سا دور ہٹنے کے لیے کہا تین چار گز کے فاصلے پر پہنچ کر وہ رُک گیا۔ ہم نے اس کو ٹوہ لینے کی تاک میں اس کے ساتھ دیکھا کہ وہ ضرور کوئی کام کی بات بتانے کا مگر اُس نے تو خود ہم لوگوں سے ہی سوال کر ڈالا "کچھ معلوم ہوا کیا قصہ ہے؟ "

میں نے کہا "فی الحال تو لوگ اندھیرے میں ہی ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں "

صدیقی دُکھ کے ساتھ بولا "مجھے تو ابھی ابھی پتا چلا ہے۔ عجیب حالت ہے دل کو کسی طرح قرار نہیں آ رہا کل شام ہی اُس سے ملاقات ہوئی تھی۔ یقین ہی نہیں آتا ایسا ہو گیا ہے "

- "معاملہ ہے ہی کچھ اسی نوعیت کا کہ آنکھوں پر اعتبار نہیں آتا" شیخ صاحب بولے۔

- "اور لوگ ہیں کہ بتنگڑ بنائے لے رہے ہیں" صدیقی نے لمحہ بھر کے لیے مجمع کی طرف دیکھا "کوئی اُس کی بیوی کے چال چلن پر کیچڑ اچھال رہا ہے تو بعض خود ماجد کی شرافت کو مشکوک قرار دے کر جھگڑا کرنے والوں سے روشناس کرانے کی کوشش میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں "

- "ابھی علوی صاحب بھی یہی بکواس کر گئے ہیں یہاں سے" شیخ صاحب نے بتایا۔

- "بڑے دُکھ کی بات ہے کہ قتل اور خودکشی کی وارداتیں ثابت کرنے

کے لیے غیر مناسب نظروں اور لہجہ اختیار کیا جاتا ہے۔ صدیقی نے افسوس کا اظہار کیا۔

"اور ہاں ایک بات تو مجھے بتانا یاد نہیں رہی۔" مجھے ایکا ایکی صبح کے ہونے والے حادثے کا خیال آیا۔ "پہلے تو عابد صاحب کی موجودگی کی وجہ سے چپ رہا کہ خواہ مخواہ بات کا بتنگڑ بنا دیں گے۔"

شیخ صاحب بولے کہ "یہ بہت اچھا کیا تم نے۔ وہ شخص اس قابل نہیں کہ کوئی راز کی بات اسے بتائی جائے۔"

میں نے بتایا "صبح جب میں ٹہلنے کے لیے نیچے اترا تو دیکھا کہ یہاں کوئی عورت عابد صاحب کی لاش پر جھکی ہوئی ہے۔ اس عورت نے ان کو مردہ سمجھ کر جگانے کی کوشش کی تھی اور وہ ان کو اٹھا لے جانا چاہتی تھی۔ غلطی مجھ سے ہی ہو گئی۔"

"غلطی کیسی؟" صدیقی نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

"میں کچھ کہنے لگا۔ وہ عورت گھبرا گئی اور سفید چادر لاش کے اوپر ڈال کر دوڑ گئی۔"

"کون؟ کس وقت؟" صدیقی نے بڑے تجسس کے ساتھ پوچھا۔

"میں نے دیکھا عابد صاحب کے فلیٹ کے زینے پر چڑھ گئی تھی۔"

شیخ صاحب چپ تھے۔ صدیقی ایک گہری سوچ میں پڑ گیا اور مجھے خیال آیا کہ اب صدیقی کہہ رہا ہے کہ عابد صاحب کے گھر میں جا کر صورت حال کی حقیقت معلوم کرے۔ [illegible] میں نے فوراً ہی اس خیال کو [illegible] میں ڈھال لیا۔ "اب تم لوگ پولیس کے پاس جاؤ اور ان سے معلوم کرو۔" مجھے

"یہی بہتر رہا ہے۔" صدیقی نے فوراً ہی [illegible] کو اشارہ کیا۔

میں ہمیشہ ہنگاموں سے دور رہتا ہوں اور [illegible] کے نزدیک نہیں پھٹکتا جہاں لوگوں کا ہجوم ہو [illegible] سے مجھے [illegible] تو میرے فلیٹ کے قریب [illegible] تھا [illegible] جو شخص اس کا شکار ہوا تھا وہ میرا [illegible] تھا [illegible] جھپٹنے کے وقت سب سے پہلے میں نے ہی سفید چادر کے نیچے اس [illegible] کو دیکھا تھا جو ابھی تک [illegible] سی پھیلا گئی تھی۔

پولیس جب پہنچ گئی [illegible] میں نے سوچا [illegible] مجھے اوپر چلا جانا چاہیے۔ بیوی پریشان ہو رہی ہو گی [illegible] میں نے معاملے کی نوعیت کے بارے میں کچھ دیر بعد [illegible] شیخ صاحب [illegible] کر اپنے فلیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

"کہو کیا بیچا؟" بیوی نے تمازت سے ہانپتے ہوئے پوچھا۔ "ابھی [illegible]؟"

"ابھی تو وہاں لوگ جمع ہیں۔ تماشا ختم تو نہیں ہوا ابھی۔"

میں اس سے کہنے کے لیے الفاظ سوچنے لگا۔

وہ کچھ بھڑک اٹھی۔ "میں یہاں انتظار کرتے کرتے [illegible] ہو رہی ہوں اور آپ ہیں کہ وہیں گم ہو کر رہ گئے۔ کم از کم مجھے بتا تو جاتے کہ کیا ہوا؟ کیا پہاڑ ٹوٹا ہے، کیا قیامت آئی ہے؟"

میں نے بڑے اطمینان سے دھیمے لہجے میں کہا: "وہ جو عابد صاحب تھے نا"

"ہاں ہاں کیا ہوا انہیں؟" اس نے جلدی جلدی پلک جھپکتے ہوئے پوچھا۔

"وہ... وہ مر گئے ہیں۔" میں نے اس طرح کہا جیسے یہ کوئی معمولی بات ہو۔

"کیسے؟ کیا ہوا تھا ان کو؟" ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

"یہ تو پتہ نہیں چلا کیا بھید ہے۔ چادر کے نیچے انہی کی لاش پڑی ہوئی ہے۔"

"مگر لاش؟ مجھے یقین نہیں آتا ایسا ہوا ہے۔"

"ابھی تم نے اصل بات سنی ہی نہیں۔"

"تو اب تک آپ نقل بات بتا رہے تھے؟"

"سنو۔" میں نے مدھم آواز میں کہا: "سفید چادر کے نیچے جو لاش چھپی ہوئی ہے وہ سر سے پاؤں تک ننگی ہے۔"

میری بیوی نے کچھ کہنا چاہا مگر ایک ساعت کے لیے اس کی آنکھوں کی پتلیاں ساکت ہو گئیں اور منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"یہی تو گورکھ دھندا ہے کہ جس کے سامنے سب لوگ بے بس سے ہو کر رہ گئے ہیں۔" میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

وہ حیرت کا مجسمہ بنی ٹکٹکی باندھے مجھے تک رہی تھی۔ پھر ایکا ایکی وہ بھی میرے روبرو مسہری کی پٹی پر بیٹھ گئی اور اس نے اپنی ٹھوڑی کو داہنی ہتھیلی پر ٹکا دیا۔

کچھ دیر بعد میں نیچے پہنچا تو پولیس آ چکی تھی۔ پولیس والے آدمیوں کا [illegible] لاش کے قریب پہنچ گئے تھے۔ میں نے دیکھا شیخ صاحب [illegible] کے درخت کے نیچے کھڑے تھے۔ صدیقی ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ اب تو وہ تفتیش کے بعد ہی آ سکے گا۔ میں نے سوچا اور شیخ صاحب کی طرف چلنے لگا۔

قریب پہنچا تو شیخ صاحب بولے: "آؤ یار تھوڑی دیر بیٹھک میں بیٹھتے ہیں۔ صدیقی تو اب ذرا دیر سے ہی آئے گا۔ میرا مطلب ہے پولیس کے جانے کے بعد ہی فارغ ہو گا۔"

ہم لوگ پولیس کی موجودگی تک بیٹھک میں بیٹھے رہے۔ جب پولیس چلی گئی اور لاش اٹھائی جا چکی تو پھر باہر آ کر درخت کے نیچے کھڑے ہو گئے۔ اب بھی کچھ لوگ دو دو تین تین کی ٹولیاں بنائے [illegible] سے کھڑے تھے۔ ابھی

میں سوچ ہی رہا تھا کہ ادھر جا کر ہی معلوم کیا جائے کیا تیجہ نکلا کہ سامنے صدیقی نظر آ گیا، وہ ہماری طرف ہی آ رہا تھا۔

ہمارے قریب آ کر جب وہ کچھ نہ بولا تو میں نے پوچھا: "کچھ پتہ چلا۔"

"کیا سب کچھ ہی پتہ چل گیا ہے۔" صدیقی بولا۔

تھوڑے سے وقفے کے بعد صدیقی نے آپ ہی آپ گفتگو کا آغاز کیا "میرا خیال ہے اس دلدوز واقعہ کی تفصیل بتانے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو چند ایسے مناظر بھی دکھاؤں جو غیر معمولی نوعیت کے ہیں۔ یہ باتیں جس قدر صیغۂ راز میں رکھنے کی تھیں۔ اب ماجد کی موت کے بعد اسی قدر ان کی تشہیر ضروری ہے۔"

"تعجب ہے تم نے پہلے کبھی نہیں ذکر کیا۔" شیخ صاحب نے حیرت کا اظہار کیا۔

صدیقی اپنے خیال میں گم تھا، اُس نے شاید شیخ صاحب کی بات پر دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ پھر وہ خود ہی کہنے لگا "یہ چند ماہ قبل کی بات ہے میں شام کے وقت گاندھی گارڈن میں یونہی بے مقصد گھوم پھر رہا تھا جب شام گہری ہو گئی اور میں ٹہلتے ٹہلتے ایک سنسان گوشے کی طرف جا نکلا تو مجھے ایک درخت کے پرانے تنے کی اوٹ میں ماجد ایک عورت کے ساتھ بیٹھا ہوا نظر آیا۔ میں مزید اوٹ میں ہو گیا۔ اس عورت کا چہرہ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ برقعہ پہنے ہوئے تھی۔ ماجد اس عورت سے جڑا بیٹھا تھا۔ پھر میں نے دیکھا اُس نے عورت کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا اور اُس کا چہرہ عورت کے چہرے سے مل گیا۔"

ہم دونوں کا حال ایک سا ہی تھا۔ حیرانی سی حیرانی تھی۔

صدیقی نے بتایا: "میں کچھ دیر اُن کو چھپ کر دیکھتا رہا۔ جب دونوں اُٹھے تو میں نے سوچا اُن کا پیچھا کیا جائے۔ کمال احتیاط سے میں نے یہ کام انجام دیا۔ جب وہ سڑک پر آئے تو میں نے روشنی میں دیکھا۔ وہ عورت ماجد کی بیوی تھی۔"

"اچھا!" ہم دونوں نے ایک ساتھ کہا۔

"ہاں۔ میں فوراً ہی بس میں سوار ہو گیا کہ کہیں آمنا سامنا نہ ہو جائے۔"

"کمال ہے!" میں نے کہا "کوئی تک نظر نہیں آتی۔"

صدیقی نے میری بات کا کوئی نوٹس نہ لیا کہنے لگا: "دوسرا واقعہ دو ہفتے قبل کا ہے۔ میں پکچر دیکھنے گیا تھا۔ انٹرول میں باہر آیا تھا تو دیکھتا کیا ہوں کہ ماجد مع بھابی کے ایک سپاہی کے ساتھ گیٹ سے باہر جا رہا تھا۔ کئی لوگ شرارت بھری نظروں سے اُسے گھور رہے تھے۔ میں ماجد کی طرف جانے لگا راستے میں ایک صاحب کی آواز نے مجھے روک لیا۔ وہ کسی کو بتا رہا تھا صاحب کیا بُرا زمانہ آ گیا ہے صورت دیکھو تو معصومیت ٹپکے مگر کرتوت شیطانوں جیسے حضرت باکس میں اس عورت سے شغل فرما رہے تھے رنگے ہاتھوں پکڑے گئے ہیں۔"

"اچھا!" شیخ صاحب ہونچکا رہ گئے۔

"تو تم نے بتایا نہیں کہ وہ عورت نہیں تھی۔ اس کی بیوی" نے سوال کیا۔

صدیقی بولا: "یہ کہنے کی کوشش میں میری آواز راستے میں رہ گئی، میں نے سوچا سب مجھے ہی پاگل ٹھہرائیں گے کون یقین۔"

"بات بھی تو ایسی ہی تھی" شیخ صاحب نے میری طرف معنی خیز انداز میں دیکھا۔

میں نے نگاہیں جھکا لیں اور سوچنے لگا کہیں میں خواب تو دیکھ رہا۔

تھوڑے سے سنگین وقفے کے بعد صدیقی پھر ہم سے مخاطب "اب سنو رات والا واقعہ۔ وہ دیکھ رہے ہو" صدیقی نے ماجد صاحب کے فلیٹ کی طرف اشارہ کیا "وہ اُوپر کمرے کے دروازے سے ملحق گیلری۔"

"ہاں ہاں دیکھ رہا ہوں۔" میں نے اُس طرف دیکھتے ہوئے جواب۔

"بنگلے کی دیوار کے ساتھ ایک میز بھی ہوتی ہے اور بنگلے کی، اور میز کی اُونچائی بالکل برابر ہے اوپر چڑھ کر دیکھو تو صاف نظر آ جا۔"

شیخ صاحب اور میں نے اثبات میں سر ہلائے۔

"ماجد صاحب کی موت سے اُس میز کا گہرا تعلق ہے" صدیقی نے فلسفیانہ انداز میں بتایا۔

"کیا مطلب؟" میں چونکا۔

شیخ صاحب بھی سٹ پٹا کر رہ گئے۔

"مطلب یہ کہ رات کے پچھلے پہر ماجد نے بھابی کو جگایا اور گیلری میں لے آیا۔"

"پھر؟"

"پھر۔ پھر ایسا مدہوش ہوا کہ یہ بھی خیال نہ رہا کہ میز کی اُونچائی بنگلے کی دیوار کے بالکل برابر ہے چنانچہ تھوڑی سی بے احتیاطی نے اس کو میز سے نیچے گرا دیا۔"

صدیقی نے ایک دم گفتگو کا سلسلہ ختم کر دیا۔

اچانک ایک دھماکا سا ہوا میرے ذہن میں میرا سارا وجود دہل کر رہ گیا۔ پھر میں ایک سناٹے کے حصار میں دم بخود کھڑا تھا۔ مبہوت اور افسردہ چند ساعتوں کے بعد ہم تینوں جھکے جھکے چہروں اور چھوٹے چھوٹے قدموں کے ساتھ اپنے اپنے فلیٹس کی جانب چل رہے تھے۔

تیر نیم کش

قارئین کے پسندیدہ اشعار

ثمرین شہپر ———— کراچی

جنگل میں اس طرح کی اداسی کبھی نہ تھی

اے کارواں شہر، کوئی ساتھی بچھڑ گیا

رضیہ راحت ———— کراچی

کچھ تو نے بھی فریب محبت دیا مجھے

کچھ ٹھوکریں بھی کھائیں میرے اعتماد نے

وہ دل ہی کیا جو تیرے ملنے کی دعا نہ کرے

میں تجھ کو بھول . . . . جیوں خدا نہ کرے

شگفتہ نسیم عندلیب ———— لاٹلپور

کبھی جو آپ مل گئے غزل کے بول بن گئے

نظر کے تار تار سے . . . . زخم بن گئے

دیکھ کر جو ہمیں چپ چاپ گزر جاتا ہے

کبھی اس شخص کو ہم پیار کیا کرتے تھے

نرگس خان ———— ملاکنڈ ایجنسی

بھیانک اندھیرے سے گھبرانا جانا

سحر پیدا ہوگی اسی تیرگی سے

دوستی اب گلے کا ہار نہیں

ار زو نا بکھر گئے دانے

اختر نبی ———— کراچی

کون دیتا ہے محبت کو پرستش کا مقام

تم خدا ہو رہے دیکھو تو دعا دو ہم کو

ایم اے قلندر آفی ———— گوادر مکران

آتے ہیں وہ کبھی بر گھونگھٹ اتار کے

مجھ سے تو نصیب اچھے ہیں میرے مزار کے

روز ہوتی ہے ملاقات یہ عالم ہے مگر

میں سمجھی ہوں کہ ابھی تک انہیں دیکھا ہی نہیں

تسلیم ثناء خان ———— کراچی

کبھی تو وقت کا چشمہ لہو میں ڈوب جائے گا

اسی امید پر کھاتے رہے اہل وفا تیر

پھر اس کے بعد بچھڑنے ہی کون دے گا اسے

کہیں دکھائی تو دے وہ کبھی ملے تو سہی

الماس ... ———— میانوالی

وہ دل کہ جس نے آپ کو اپنا سمجھ لیا

اس لغزش جنوں پہ پشیماں ہے آجکل

سجدوں کے داغ تیری جبیں پر ہے تو کیا

سجدہ وہ کر جو روئے زمیں پر نشاں رہے

شہناز فقیر ———— نوشہرہ کینٹ

احساس مر نہ جائے تو انسان کے لئے

کافی ہے ایک راہ کی ٹھوکر لگی ہوئی

صابر رضا ———— کراچی

جن پتھروں کو ہم نے عطا کی تھیں دھڑکنیں

ان کو زباں ملی تو ہم ہی پہ برس پڑے

سمیع اللہ عقلی ———— لاڑکانہ

عقل سے جوانی نے تعرض جو کیا ہے

گدرا گیا کافر کا بدن اور زیادہ

اسرار احمد قریشی ———— راولپنڈی

اے شمع، دل جلوں سے تیرے نصیب اچھے

تو اک شب جلی ہم برسوں سے جل رہے ہیں

روحانی ڈاک



کشف و کرامات اولیائے کرام کا خاصہ ہے۔ جو کبھی کبھی بزرگانِ دین کے مبارک توسط سے اللہ کے نیک بندوں کو اس کے لطف و کرم کے صدقے میں عطا ہو جاتا ہے۔

بابا سید شاہ احمد صاحب

کا شمار بھی انہی برگزیدہ ہستیوں میں ہے جنہیں روحانی انعام و اکرام سے نوازا گیا اور اس کا منہ بولتا ثبوت حقیقت حال سے متعلق وہ اہم پیش گوئیاں ہیں جو بذریعہ کشف تجلّی کی صورت میں ان پر ظاہر ہوتی رہیں۔ بابا جی شادی بیاہ، تعلقات، محبت میں کامیابی یا ناکامی، مالی مشکلات اور اولاد وغیرہ سے متعلق آپ کے سوالات کے جوابات بذریعہ کشف دینے پر رضامند ہو گئے ہیں اور وہ پلک جھپکتے میں آپ کے حال اور مستقبل کے تانے بانے میں جھانک کر زرا فدا الگ کر دیں گے۔ صرف ضرورت ہے اس نام کی جس سے آپ پکارے اور پہچانے جاتے ہیں اور اس کے ساتھ آپ کی والدہ محترمہ کا نام، عمر اور مقام پیدائش۔ آپ ایک وقت میں صرف دو سوال کر سکتے ہیں۔ جوابات کے لیے جوابی لفافہ بھیجنا ضروری ہے۔ بابا جی کے جوابات کا کوئی نذرانہ نہیں ہے۔

خط لکھنے کا پتہ

روحانی ڈاک

ماہنامہ دوشیزہ، پوسٹ بکس ۵۹۵

کراچی ۲۹

دوشیزہ کی محفل

عنافاروقی

اس ماہ بارش کی بے پناہ تباہ کاریوں کے سبب کراچی سے باہر سے بہت کم دوستوں نے محفل میں شرکت کی ہے۔ اپنے تمام تر خلوص اور محبتوں کے ساتھ ہم اپنے سیلاب زدہ بہن بھائیوں کے دکھ میں شامل ہیں جو ہوتے ہوئے بنگال کے شکار ہو گئے اور اپنے تمام قارئین کے ساتھ ان لوگوں کے لئے بارگاہ خداوندی میں دعائے مغفرت کرتی ہیں جو اس بے رحم بارش میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

★ اس بار سب سے پہلا خط ہے اس بار پہلے ایک ہی سے اشفاق حسین کا لاہور سے لکھتے ہیں: "فرشتے" پڑھی۔ دوشیزہ کا کیا کہوں ہر بار ہی دعوت سے سرشاری کے مزاج کا کیا ہے کبھی تو کبھی مجھے ہر چیز سے عشق ہے پکا عاشق ہوں اس لئے دو تین بار دو چار چکر لگاتا ہوں تب کہیں جاکر وصال یار ہوتا ہے پلیز اس شکایت کا ازالہ کریں۔ اس بار صرف منشا کا ملک ہے۔ اگلی دفعہ کچھ صفحات کہانیوں کی صورت میں ارسال کروں گا اور دل پھر اشاعت تو کریں ہم یہاں پوچھ رہے ہیں۔

اشفاق صاحب سنتے ہیں پولیس والوں کی نہ دوستی اچھی نہ دشمنی لیکن اس کے باوجود دوشیزہ آپ کی دوستی قبول کرتی ہے۔ "فرشتے" تو شیتل حسینوں کو گستاخ لگی ہے اور سب مرزا صاحب نے بتایا ہے۔ شاعری موصول ہوئی۔ لگتا ہے ہماری محفل میں بہت قدر ہے۔ اگلی بار ضرور بھیجئے۔

★ نوری مرزا لاہور سے لکھتی ہیں: "مگر جلتے پھول" ناول کا چسکا دیتا ہوا آئی ہیں کب کی کالی کشتی انتظار کر رہی ہیں۔ خواب اتنا خوفزدہ کیوں کرتی ہیں پہلے سے بڑھ کر سیاہ ہو گئے سیاہ خود دبائے ہوئے سرخی کو بڑی محنت سے پھولوں کا ایک ہار پہنا دیں۔ سلمیٰ کے ساتھ نواز مجھے معلوم ہوتا تو انہیں ضرور بتاتی۔ منصور نوری کی سویٹ کہانی مجھے بڑا پسند آئی ہے۔ سلمیٰ یہ جو باتیں مرزا کی تھیں انہیں مجھ سے جنم جنم کی دشمنی لگتی ہے۔ محفل ہے امید ہے میرے سوال کا جواب دے جائیں گی۔

نوری عزیز مرزا اچھا تو پیچھے ہٹا کر تو دیکھو تمہارا جواب چھپا کیوں نہیں؟ فرصت ملنے سے پہلے ہی تو پرچہ کیا خاک دیکھو گی۔ سیالکوٹ مرزا سے جھگڑا تم خود چکا دو بابا! ہم بیچ میں بڑی بننا نہیں چاہتے۔

★ لیڈی ڈاکٹر رضیہ نادر نے محفل پہ دھیان سے بھلا دیا تھا یاد دلایا ہے "آپ نے میری کہانی کی اشاعت کا وعدہ کیا تھا اس کا کیا ہوا؟ آپ نے عبدالرحمٰن بھٹہ کو خوب جواب دیا۔ ایسی خوفناک اور گمراہ کن باتیں نہیں آتے۔ حقیقت ہے کہ انہیں تھوڑی سی شرم اگر ہوتی تو شرمندہ ہوں گی۔ دوشیزہ کے نکھار کے لئے آپ اور خالہ مرزا کو مبارکباد دیتی ہوں۔

رضیہ: اپنا وعدہ ہمیں یاد ہے۔ کہانی ضرور چھپے گی تھوڑا سا صبر کریں۔ عبدالرحمٰن بھٹہ نے اس دفعہ معذرت کا خط لکھا ہے۔ ہم نے انہیں معاف کیا۔ آپ بھی معاف کر دیں۔ ڈاکٹر رضیہ! واقعی ایک خط تک میں انہیں اجازت ہو گیا۔

★ کراچی سے سیدہ بانو نے یاد کیا ہے لکھتی ہیں۔ "میرے بائیں گال پر ایک بہت گہرے زخم کا نشان ہے۔ میں پردہ دار لڑکی ہوں کس سے مشورہ کروں کہ یہ نشان مٹ جائے؟ ہر قسم کی کریم آزما لی کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ دوشیزہ ایک ہمدرد پرچہ ہے میری مدد ضرور کرے گا۔"

سیدہ آپ کسی کلینک سے رجوع کریں۔ آپ کو زخم کا نشان مٹانے کے لئے پلاسٹک سرجری کی ضرورت ہے کیونکہ یہ نشان نہیں جائے گا۔

★ راشدہ احسان نے اسلام آباد سے ہمیں ایک جھوٹی کہانی بھیجی ہے۔ لکھتی ہیں؟ یا لکھتے ہیں؟ "یہ سمجھ نہیں آتا تمہیں بہن کہوں یا بیٹی۔ تم مجھ سے یقین کرنا اس کہانی کا ایک ایک لفظ سچا ہے۔"

راشدہ احسان صاحب یا صاحبہ جو بھی ہیں تو یہ بھی معلوم ہے کہ آپ کا نام بھی فرضی ہے اور آپ کی داستان سراسر جھوٹ اور بہتان طرازی کا پلندہ ہے۔ آپ کسی اچھے ذہنی ڈاکٹر سے علاج کرائیں۔ آپ جیسے ذہنی مریض معاشرے کے لئے انتہائی خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔

★ گوجرانوالہ ابوظہبی سے محمد شریف صاحب نے انگریزی سے فرمایا ہے۔ "۹۶ کے شمارے میں میرا نام تو ہے لیکن آخر میں چھپا ہوا تھا مگر دوسری طرف سے جواب نہیں آیا کیا کروں؟"

شریف بھائی صبر۔ صرف صبر۔

★ کراچی سے اختر زہرہ صدیقی نے خط لکھا ہے۔ "کیوٹ رعنا آپی مجھے "جلتے پھول، چاند اور تمہیں سوچیں" تینوں کہانیاں بے حد پسند آئیں۔ دیکھتے ہیں نیا ناول کیسا ہو گا؟"

اپنے اختر ان سلسلوں کی پسند کا شکریہ۔ تمہاری فرمائش

نوٹ کرلی ہے۔

★ شمیم تبسم قاسمی نے ہالانی (سندھ) سے خط بھیجا ہے: "اس ماہ "دوشیزہ" بے حد اچھی لگی۔ تاریکی کہانی اور تین عورتیں تین کہانیاں، لاجواب تھیں۔ جلتے پھول نے بہت لطف دیا۔ ٹی وی کے دو فنکار سلیم جعفری اور شکیل سے بھی کبھی ہماری ملاقات کرائیں۔ انہیں خط کیسے بھیجا جا سکتا ہے؟"

تبسم تم ان لوگوں کو ٹی وی کی معرفت خط بھیج سکتی ہو مگر یہ بتاؤ لکھو گی کیا؟

★ ضمیر احمد خاں نے اوماں سے خط لکھا ہے "جوں جوں "دوشیزہ" کی عمر بڑھ رہی ہے۔ یہ زیادہ تر و تازہ نظر آنے لگی ہے۔ کہانیوں کا انتخاب خوب ہوتا ہے۔"

شکریہ ضمیر بھائی "دوشیزہ" کی خوش نصیبی ہے۔ دن بدن نکھرے گی۔ آپ دیکھتے رہیئے۔

★ محبوب مراد مبریج ابوظہبی سے لکھتے ہیں۔ "اس پردیس میں "دوشیزہ" کا ساتھ نعمت مترقبہ سے کم نہیں۔ اس مہینے یعنی جون ۹۰ء کے شمارے میں سرورق کی شخصیت کون تھی؟"

محبوب بھائی شخصیت پوچھنے کے لئے آپ فہرست کے صفحات پر نظر دوڑایا کریں۔

★ نرگس خاں مالاکنڈ ایجنسی سے محفل میں آئی ہیں "مئی کے شمارے میں اپنا جواب پڑھ کر رسالہ چوم چوم لیا۔ آپ کو فوراً خط لکھتی مگر میرا کزن جس کی شادی کو ڈھائی ماہ ہوئے تھے اور جو اپنے بدنصیب باپ کے چند ماہ بعد پیدا ہوا تھا عین جوانی میں کینسر کے موذی مرض سے اچانک فوت ہوگیا۔ ماں جس نے اپنی جوانی برباد کرکے اسے پالا تھا نیم پاگل ہوگئی۔ یہی حال نئی دلہن کا تھا۔ طبیعت پر بڑا بوجھ ہوگیا تھا۔ پرچہ آج ہی پڑھا ہے۔ جلتے پھول کے کامیاب اختتام کی مبارک باد طلعت صاحبہ کو پہنچا دیں۔ میری بہنیں الماس اور فضیلت آپ کو سلام کہہ رہی ہیں۔ میرے اشعار بھی شامل کرلیجئے۔"

نرگس! کارکنان "دوشیزہ" اس غم میں برابر کے شریک ہیں۔ خدا آپ سب کو صبر کی ہمت دے۔ اپنی بہنوں کو میرا جوابی سلام دو۔ اشعار، بیت بازی اور محفل کے لئے الگ الگ کاغذ استعمال کیا کرو۔

★ سفیر احمد عبدالرحمٰن نے مسقط سے یاد کیا ہے: "میں آپ کا احسان مند ہوں کہ آپ مجھ جیسے کنوارے لڑکوں کی ہدایت کے لئے خرمی جیسے لوگوں کی آپ بیتیاں تحریر کرتی ہیں۔ کیا اصغر علی مجھے اپنا ایڈریس بتا سکتے ہیں۔ اللہ انہیں سکون دے۔"

سفیر بھائی اگر وہ ہمیں اجازت دیں گے تو ان کا ایڈریس آپ تک پہنچا دیا جائے گا۔

★ بشریٰ جبیں نے ڈرگ کالونی کراچی سے ہماری تعریف میں شدید جذبات کا سہارا لیا ہے۔ اس کے بعد تحریر کیا ہے: "جلتے پھول، آفت ناول تھا۔ اس کے انجام پسند آیا۔ جولائی کے شمارے میں احمد صاحب نے تعلیم یافتہ بہن کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ آپ انہیں میرا ایڈریس بھیج دیجئے۔"

بشریٰ! تمہارے لکھے ہوئے تعریفی کلمات ہم نے حذف کرلئے ہمیں شرم جو آتی ہے۔ احمد صاحب نے اپنا ایڈریس بھی شائع کیا تھا آپ انہیں براہ راست خط لکھ سکتی ہیں۔ عفت عزمی کی جانب سے شکریہ قبول کریں۔

★ مرزا فرحت عباس مغل نے خوشاب سے بڑی غم زدہ تحریر بھیجی ہے۔ لکھتے ہیں "میری خیریت چھوڑیئے آپ کی خیریت نیک چاہتا ہوں۔ میں اپنی زندگی سے بیزار ہوں۔ اٹھارہ سال کا ہوگیا مگر مجھے زندگی بے کیف نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نہ میری کوئی بہن ہے اور نہ مجھے ٹوٹ کر چاہنے والی کوئی اور ہستی۔ مجتبیٰ کے قصے سن سن کر میں بھی اس معاملے میں ہیرو بننا چاہتا ہوں۔ والدین کو شادی سے انکار کردیا کہ لو میرج کروں گا۔ یا تو کوئی مجھے بھائی بنالے یا محبوب ورنہ مرجاؤں گا سوچ سمجھ کے۔"

فرحت! تمہاری ذہنی حالت پر ہمیں ترس آیا۔ تم سے یہ کس نے کہہ دیا کہ کسی کے ٹوٹ کر چاہنے سے تمہیں قرار مل جائے گا۔ ہوسکتا ہے بے قراری اور بڑھ جائے۔ میرے عزیز بھائی ابھی تم بہت چھوٹے ہو۔ یکسوئی سے تعلیم مکمل کرو۔ اچھی کتابیں پڑھا کرو۔ جذباتی تحریروں سے فی الحال شدید پرہیز کرو۔ ایسی تحریریں حقائق سے دور لے جاتی ہیں۔ والدین کی بات مان کر منگنی کرڈالو سوچ کو مرکز مل جائے گا۔

★ سعد اللہ سعدی نے دیپال پور سے یاد کیا ہے "اتنے سارے نمبروں کے ساتھ اب "شب برات نمبر" بھی آنا چاہیئے۔ مزہ آجائے گا۔"

مشورہ تو خوب ہے۔ شکریہ۔

★ فرحت نسیم نے گجرات سے تبصرہ بھیجا ہے: "زندگی شمع، شکست اور بغاوت اچھی کہانیاں تھیں۔ جلتے پھول کا اختتام بہت اچھا ہوا۔ محفل میں عبدالرحمٰن بہند کی گستاخی پر غصہ آیا۔ اگر ہم نے فراخدلی سے مرد حضرات کو آنے کی اجازت دی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ بدتمیزی پر اتر آئیں۔ تکلف برطرف اچھا سلسلہ ہے غزل اور گیت کی کمی کھٹک رہی ہے۔ میری کہانی کب شائع ہوگی؟"

فرحت تبصرے کا شکریہ! امید ہے مرد حضرات آئندہ محتاط

رہیں گے تمہاری کہانی چھپ جائے گی۔ اتنی بے قراری کیسی؟

★ سجاد حیدر چوہان نے شارجہ سے نوازش نامہ بھیجا ہے "کہانی بھیج رہا ہوں بالکل سچی ہے شائع ضرور کریں۔"

حیدر بھائی کہانی بھیجنا آپ بھول گئے۔ ہمیں صرف آپ کا خط ملا ہے۔

★ تسنیم ثنا خان نے کراچی سے یاد کیا ہے: "دوشیزہ ہر گھر کا مقبول رسالہ ہے۔ ہر فرد اس کا شیدائی ہے۔ آپی کہتی ہیں۔

اس رسالے میں نامور قلمکاروں کی منفرد تحریریں شامل ہوتی ہیں" باجی کیا نئے قلمکاروں کو آپ جگہ نہیں دیتیں؟ میری طرف سے رخسانہ آپا کو سلام پہنچا دیں۔"

تسنیم: تحریر نئے قلمکار کی ہو یا نامور کی۔ اس کا اچھا ہونا شرط ہے۔ تم افسانے بھیج دیکھو کر رائے دوں گی۔ پرچے کی پسندیدگی کا ہم سب کی جانب سے شکریہ۔ رخسانہ جواباً سلام کہتی ہیں۔

★ دہاڑی کے عبدالناصر کو پرچہ تاخیر سے پہنچنے کا غصہ ہے ـــ لکھتے ہیں: "رسالے پر اُلٹی سیدھی آرٹسٹ لڑکیوں کی تصاویر مت چھاپا کریں۔ صرف عام دوشیزاؤں کو ترجیح دیں۔ منور نوری صاحب واقعی بہت محنت کر رہی ہیں۔ انہیں مبارک باد۔ آج کل طارق رشید پنڈی نظر نہیں آ رہے۔ ریاض مرزا کو بھی سلام پہنچا دیں۔ اگست میں کراچی آؤں گا۔ آپ سے ملاقات ہو سکتی ہے؟"

ناصر بھائی پرچہ اس دفعہ آپ کو وقت پر مل گیا ہوگا اور غصہ بھی اتر چکا ہوگا کیوں ناصر بیچاری دوشیزاؤں سے بیزاری کیسی؟ طارق رشید پنڈی کا نیا افسانہ شائع کیا جا رہا ہے۔ ریاض مرزا جواباً سلام کہتے ہیں۔ کراچی آئیں تو ضرور تشریف لائیں۔ فون نمبر پرچے پر درج ہے آنے سے پہلے مطلع کریں۔

★ ارشد محمود نے کراچی سے یاد کیا ہے۔ "ماہِ رواں کا پرچہ بہت تاخیر سے آیا کیوں؟ جیتے پھول، تاریخی کہانی اور جانور بہت خوب سلسلے ہیں۔"

محمود بھائی تاخیر کے لئے اداریہ پڑھ لیجئے وجہ سمجھ میں آ جائے گی۔ سلسلوں کی پسند کا شکریہ۔

★ اصغر علی مبتلا نے دبئی سے دوشیزہ کی طویل تعریف لکھی ہے۔ لکھتے ہیں: "تکلف بر طرف، صحت اور زندگی اچھے سلسلے ہیں۔ ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ میں دوشیزہ کی معرفت اپنے ان دوستوں تک اپنا ایڈریس پہنچانا چاہتا ہوں جو نہیں جانتے میں کہاں ہوں کیونکہ میرا یہاں اچانک آنا ہو گیا ہے: اصغر علی مبتلا پوسٹ بکس نمبر ۲۵۲۶ کوارٹر دبئی ایو اے ای)

★ فضل وہاب ... [illegible]

لائے ہیں: "جواب دینا نہ دینا آپ کے خلوص پر منحصر ہے۔ میں نے تو اپنی عزیز از جان بہن کو مخاطب کر ہی لیا۔ دوشیزہ ہمیں تاخیر سے ملتا ہے اس شکایت کو دور کر دیں۔"

فضل بھائی جواب حاضر ہے آپ کی شکایت دور کر دی جائے گی۔ اور کوئی حکم؟

★ عطا تحسین مسلم نے کراچی سے لکھا ہے: "آپ کی بزم میں شرکت پہلی بار ہے۔ اس لئے اجازت طلب کر رہا ہوں۔ آپکی محفل میں کئی پردہ دار ہیں ورنہ اجازت نہ لیتا۔ رسالے میں غزلیات کو جگہ دیں ورنہ چھپکا پن نہ جا سکے گا۔ ایک بات مانیں گی مجھے ان لوگوں کا پتہ بتا دیں جن کے پاس خوشیاں ہوں۔ میں یہ دولت مستعار لینا چاہتا ہوں۔"

عطا راحتی نایاب شئے آپ کرا دھار کون دے گا اپنے ارد گرد بسنے والے لوگوں کا غم بانٹیں۔ آپ کو خوشی خود بخود مل جائے گی۔

★ ذکا الدین قریشی (یہی نام پڑھا گیا ہے) لاہور نے لکھا ہے۔ "آپ کو ایک سچی کہانی بھیجوں گا جو بہت عجیب و غریب ہے۔ آپ شائع کر دیں گی؟"

قمر بھائی آپ نے اتنی شکستہ تحریر میں دستخط کئے ہیں کہ نام سمجھ میں نہیں آ سکا بہر حال اسی پر گزارا کریں۔ کہانی ضرور بھیجئے۔

★ چشتیاں سے ایم طاہر نعیم بٹ لکھتے ہیں: "جیتے پھول کے کامیاب اختتام پر عظمت کو مبارک باد پہنچا دیں۔ تکلف بر طرف اور جانور دلچسپ سلسلے ہیں۔ ان کے مصنفین کو بھی مبارک باد پہنچا دیں۔"

ان کی جانب سے شکریہ قبول کریں۔

★ طارق رشید پنڈی سے اپنے افسانے "پیاس" سمیت تشریف لائے ہیں لکھتے ہیں: "یار دوست کہتے ہیں دو کہانیوں کے بعد کوئی نئی کہانی نہیں لکھی کیسے ادیب ہو۔ آپ نے تصویر کا محض بہانہ بنایا ہے۔ کراچی کیسے آؤں۔ یہاں کوئی رشتے دار ہے ہی نہیں۔ یاسمین صاحبہ مجھ سے خط و کتابت کر سکتی ہیں۔ میں ان کے اعتماد کو دھوکہ نہیں دوں گا۔ پتہ نوٹ کر لیں: طارق رشید پنڈی ۱۴۹ اسی بی۔ کریم سٹریٹ مسلم ٹاؤن راولپنڈی۔"

طارق! خوش آمدید! افسانہ مل گیا۔ دوستوں کا منہ بند کرنے کے لئے ہر ماہ کچھ نہ کچھ لکھتے رہا کرو۔ تم نے یہ کیسے کہہ دیا کراچی میں کوئی رشتے دار نہیں ہے اگر ایسی بات ہے تو پھر آئندہ ہمیں باجی مت کہنا ویسے تصویر تمہیں بھیج دوں گی۔

★ سلمیٰ پروین سونگی لکھتی ہیں: "مجھے تو آپ بھی پسند

کیا دوشیزہ بھی آخر آپ دوشیزہ سے منسلک حضرات ہی ہیں جو سلسلہ چل
کا اختتام پذیر کر رہے ہو اور آپ جانتی ہوں کی بیوٹی شہناز سے ملاقات
کر سکتی ہیں؟۔

سمیٰ: ہم نے پچھلے خطوط پر اکثر ہی بتایا تھا کہ یہ ایک طویل
ٹاکی کی شہناز سے ملاقات فی الحال مشکل ہے کیوں؟ یہ بات آپ
کو کہانی کا انجام پڑھ کر معلوم ہو جائے گی۔

★ نگہت نے کراچی سے یاد کیا ہے "سیوادی کا شمارہ بہت
عمدہ تھا۔ ستارہ اپنے انجام کو پہنچی۔ عظمت کو مبارک باد۔ داکستان اور
محبت ... صدیقہ پر ستم ہوا ہے بہت ... بطرف عمدہ ...
محفل کا پہ ہے۔ آپ سے ملنے کو جی چاہتا ہے۔ ملاقات کیسے ہو؟
دوشیزہ نے بیا جاؤ کیا ہے کہ مہینہ ختم ہوتے ہی ہیں اور یاں ڈاک
کے انتظار کرتے ہیں۔"

نگہت: جو ... یا تم نے کہ اب ہمیں تھوڑی کی نمایاں
کمی ہے؟ دو تاکہ دوشیزہ زیادہ معقول ہو جائے تم دفتر فون کر کے
جب چاہے آسکتی ہو۔ ملاقات ہو جائے گی۔

★ کویت کے عبدالمجید صاحب لکھتے ہیں: "دوشیزہ کو
چار چاند لگ گئے۔ میں نے اپنا آئیڈیل بھیجا تھا آج تک شائع نہیں
کیا۔ وجہ؟"

بھیا ہم آئیڈیل صرف لڑکیوں کے شائع کرتے ہیں۔ لڑکے
اس کالم میں صرف اپنی آرزو بتا سکتے ہیں۔

★ خان پور سے ثمینہ مجیدی لکھتی ہیں: "ایک افسانہ ...
تصویر بھیجا تھا پھر ترمیم ... اس کا حشر کیا ہوا؟"

ثمی تصویر کچھ زیادہ ہی مختصر تھی اسے ... پہنانے
کی کوشش کرنی پڑے گی۔ اصلاح کے بعد شائع ہو جائے گی۔

★ اسلام آباد سے ... لکھتی ہیں: "میرا افسانہ اچھا
... ہے؟ آپ ... کر کے ہی ... کر دیا ہے
جولائی کا شمارہ بہت خوب تھا۔"

... آپ کی اردو اچھی خاصی ہے لیکن خدا اردو کو مونث سمجھا
ہے ہم تو اللہ کی غلطیاں درگزر کر دیتے ہیں ... گستاخی معاف نہیں کریگی۔

★ میاں شمس الرحمٰن نے پارا چنار سے تحریر بھیجا ہے "...
... کو مبارک باد۔ ... وقت کچھ دور سکتا ہے
... بہترین جواب دینے پر آپ کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں
... پریشانی کو کیسے دور کروں۔"

شمس بھائی نانا جان کے تجسس کو آپ نے ... کا نام دے دیا
... ہم تو چاہتے ہیں ہم سب تہذیب اور شائستگی کا دامن تھام کر

بیٹھے ہوتے تھے اچھی ہی بات چیت کرتے مگر جب خدا ... کرتے جاتی
تو تھوڑی کمی ہر ترقی پڑ جاتی ہے۔ ... جائیں ساتھ
... آرزو کے ذریعے بھیج دیجئے ... جائے گا۔

★ ناصرہ رضا نے حیدرآباد سے فرمائش کی ہے۔
"مجھے میں رخسانہ صبا ... آپ ... تک ہی کیوں
محدود کر دیا ہے ان سے کچھ اور بھی لکھوائیے میرے افسانوں کا کیا
بنا؟ کراچی آکر دوشیزہ کے دفتر ضرور آؤں گی۔"

ناصرہ رضا آپ نے کیسے فرض کر لیا کہ رخسانہ صبا ... اور
ادارے کی حد تک محدود ہو کر رہ گئیں ہر ماہ اتنا خوبصورت ... پرچے
ہاتھوں تک پہنچانا کوئی آسان کام تو نہیں۔ رخسانہ اور ان کی پوری
ٹیم کے ... جائزہ میں تو آپ کو پتہ چلے جتنی کیسے ہوتے
ہیں۔ آپ کے افسانے کچھ رہ گئے۔ دفتر آپ ضرور تشریف لائیے۔

★ شاہ عالم زبیری نے راولپنڈی سے بہت دنوں بعد
یاد کیا ہے "پچھلے ہفتے ... میری شادی تھی کارڈ آپ
کو بھی بھیجا تھا مگر آپ نے نظم یا افسانہ سمجھ کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا
ہوگا۔ اتفاق یہ ہوا کہ میری بیوی ... جہاں ... دوشیزہ سے آشنا
ہی نکلی ہے ... اس ... بجائے ایک ہی پرچے
تک ہم دونوں کا کام چل گیا۔ ہم نے خوب ... پرچے ...۔"

شاہ عالم صاحب شادی مبارک۔ مگر یہ ہم نہیں مانتے کہ آپ
نے کارڈ بھیجا تھا؟ آپ صرف اپنی نظم، افسانہ بھیجتے ہیں۔ خوشی ...
... شریک کر کے ... ایک بات بتائیے یہ شادی ...
... یا جاری ... کم کرنے کے لئے۔

★ بہروز نے راولپنڈی سے تحریر کیا ہے "میرا افسانہ
'انتقام کی آگ' کا کیا بنا؟"

بھیا وہ اسی آگ میں جل کر بھسم ہو گیا۔ ہم کیا کرتے۔

★ تنویر عالم زبیری راولپنڈی! آپ کا خط شمع تک پہنچا
دیا جائے گا۔

★ یوسف علی شاکر ایبٹ آباد سے لکھتے ہیں: "عظمت عزیزی کو اچھا
ناول لکھنے کی مبارکباد پہنچا دیں۔ نانا جان کا تجسس بڑھتا جا رہا ہے
افسانے اچھے تھے مگر آپ نے میرا افسانہ ... شائع نہیں
کیا تو ... کا بائیکاٹ کر دوں گا۔"

یوسف میرے بھائی اگر ہم نے وہ افسانہ شائع کر دیا ہوتا تو بھی
... کا بائیکاٹ کر دیا ... ہوتا۔

★ ... نے حیدرآباد سے خط بھیجا ہے لکھتی ہیں۔
"آپ ... جواب ... نہیں ... کا تحریری کر آپ اپنی

...نیز دوشیزہ میں چھپ جاتی ہیں ساتھ ہی کہانیاں بھی چھپ جاتی ہیں تو دوشیزہ والو گھر جاتے ...میں بھی خط لکھوں تو آپ جواب دیں گی؟"

روحینہ رَنبال! ابھی گرد دور کر دیتے ہیں اور دل الیاس کاشمیری ...میں؟ ہیں تو اس نام کے کسی مصنف کا نام یاد نہیں آ رہا؟ تم ہماری ...خط لکھو یا بزرگی میں ہم جواب ضرور دیں گے۔ آخر یہ سب ہماری ...زبانیں تو ہیں۔

★ توحید چغتائی نے لاہور سے محبت نامہ بھیجا ہے۔ لکھتی ...ایک مدت سے دوشیزہ کی پرستار ہوں۔ ایک افسانہ بھیجا تھا ...کا کیا بنا؟"

توحید! آپ کی کہانی چھپ جائے گی۔ تردد کی ضرورت نہیں۔ ...انتظار کرنا ہوگا۔

★ خادم حسین ایاز نے آزاد کشمیر کنڈور سے خط تحریر کیا ہے ...کی کہانیاں بے حد دلچسپ تھیں۔ دعا ہے کہ باری تعالیٰ دوشیزہ ...دن دگنی رات چوگنی ترقی دے۔ رخسانہ صبا مرزا صاحبہ نے اداریے ...کی گرانی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حکومت نے نیوز پرنٹ ...قیمت میں ایکسائز ڈیوٹی فیصد کا اضافہ کر دیا ہے۔ دوشیزہ ہمیں اتنی ...ہے کہ اگر اس کی قیمت دگنی ہو جائے تب بھی ہم خریدے بغیر ...سکتے۔ کیا کریں پیار جو ہوا۔ جیتے پھول کی مصنفہ کو مبارک باد۔"

خادم! خدا آپ کی اس محبت کو سدا قائم رکھے۔ عظمت ...کی جانب سے شکریہ قبول فرمایئے۔

★ قاضی حمید نے لاہور سے خراج تحسین پیش کیا ہے۔ ...رسالے کی تعریف کروں گا تو آپ سمجھیں گے میں مسکہ لگا رہا ہوں ...بات ہرگز نہیں ہے۔ جولائی کے پرچے میں رخسانہ باجی کا لکھا ...اداریہ پڑھنے کے بعد صرف اتنا کہوں گی کہ اگر پرچے کاغذ کی گرانی ...باعث مہنگا بھی ہو جائے تو ہم خریدنا نہیں چھوڑیں گے۔ جالندھر ...دلچسپ کہانی ہے۔ جیتے پھول میں ناول پر مصنفہ نے بہت قسم ...کئے۔ غیر مرضی ان کی آئیڈیل کی تلاش سے اگر لوگ غلط فائدہ نہ ...اٹھائیں تو باخبر رہے آسرا لوگوں کا بہت بڑا سہارا ثابت ہو۔"

★ حبیب الرحمٰن قریشی نے کوئٹہ سے پہلی بار محفل میں شرکت ...کرتے ہیں: "آپ کو ایک گرما گرم خبر سنانا چاہتا ہوں اگر گرمی زیادہ ...ہے آپ کمرے کی کھڑکیاں کھول لیں۔ میں نے ایک مضمون خلائی تحقیق ...اگر املا کی غلطی ہو تو درست کر لیجیے۔"

تو سب سے بڑی گرمی یہ کہ آپ کسی کی خلائی سیر میں جا رہے ہیں۔ مضمون ...دیکھ کر پتہ چلے گا کیا تیر مارا ہے۔ ابھی تو خالی لفافہ ہی ملا ہے۔

★ منور جہاں شیخ نے ملازمت سے شرکت کی ہے رخصت دیدی۔

دوشیزہ سب مجھے دل و جان سے پیارا ہے۔ سنتے ہیں آپ پہلا شمارہ ختم کر جاتی ہیں تو کیا مجھے دوسرا خط لکھنے کی قسمت ملے گی۔ عظمت عزیزی کو مبارک باد اور رخسانہ آپا سے کہہ دیں کاغذ کی گرانی ہے مگر حکومت کچھ نہیں کر رہی۔۔۔ تو ہم اپنے پیارے پرچے کو ہر قیمت پر خریدیں گے اپنی دوشیزہ کو پریشانی کیسے دیکھ سکتے ہیں؟"

منور! دیکھو تمہارے پہلے خط کا ہی جواب حاضر ہے۔ ہم تمہاری قدر دانی کے شکر گزار ہیں۔ ہمیں قارئین اخلاق بھلا دیتے ہیں۔ یہ بھی بہت بڑی نعمت ہے۔

★ نسرین ناز کراچی سے لکھتی ہیں: "باجی تارا ایچاری ہمارا دنیا سے اٹھ گئی تو بہت رونا آیا۔ فاطمہ ثریا کے "چاند ساچہرہ" کو شدت سے انتظار ہے۔ وہ میری پسندیدہ رائٹر ہیں۔ میرا خط ضرور شامل کر لیجیے۔ ابھی صرف میں آنسوؤں کی طالب ہوں۔"

نسرین! تارا کے المیہ انجام پر رونا دھونا چھوڑ دو اور مضبوط دل کی لڑکی بنو۔

★ کوثر سلطانہ نے کراچی بلدیہ کالونی سے یاد کیا ہے "جولائی کے شمارے میں شمع کی کہانی نے بہت آنسو رلائے۔ میں نے خود بہت دکھ اٹھائے ہیں۔ شمع سے خط و کتابت کرنا چاہتی ہوں۔ آپ پتہ ایڈریس انہیں بھیج دیں۔"

کوثر! تم نے اپنا ایڈریس ہمیں نہیں بھیجا ورنہ ہم شمع کو بھیج دیتے۔

★ یاسمین عزیز لودی نے کوئٹہ سے لکھا ہے "کاغذ کے نرخوں میں بلا سوچے سمجھے دو فیصد اضافہ کر کے پرانا سابق وفاقی وزیر اطلاعات کو رخسانہ صبا مرزا صاحبہ نے جس خوبصورت انداز میں آڑے ہاتھوں لیا ہے پڑھ کر جی خوش ہو گیا۔ دوشیزہ کو شہید کرنے کی خواہش رکھنے والا وزیر بیچارہ خود شہید ہو گیا۔ رخسانہ باجی! دوشیزہ کو کوئی طاقت ہم سے چھین نہیں سکتی۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ تیری نیم کش شروع کر کے آپ نے ہماری بات مانی۔ ہم آپ کی ہر بات مانیں گے اسی محبت سے تو رشتے بڑھتے ہیں اور باجی قرۃ العین حیدر صاحبہ آج کل کہاں ہیں؟"

یاسمین تعاون کا شکریہ۔ دوشیزہ آپ کو کبھی مایوس نہیں کرے گی انشاء اللہ۔ قرۃ العین حیدر صاحبہ بھی انجانے امید ہیں۔

بیگم شاہ نواز بیوہ کیا ہوئیں گویا شہد کا چھتہ بن گئیں۔ چہار جانب سے طرح طرح کے مرد ان کے ارد گرد منڈلانے لگے اور اس منڈلانے میں کئی وجوہات تھیں ایک تو ان کے بے پناہ حسن کی کشش، دوسرے شاہ نواز کی چھوڑی ہوئی ڈھیروں دولت اور پھر ان کے مزاج کی حد سے زیادہ نفاست پسندی، یہ سب کچھ مل کر اب بھی لوگوں کو اور خصوصاً مردوں کو ان کی جانب متوجہ کر دیتے تھے۔

بعض لوگوں کے مزاج میں اتنی نفاست ہوتی ہے کہ وہ بستر کی شکن سے بھی بے چین ہو جاتے ہیں اور بعض سرہانے کپڑوں کا ڈھیر پڑا ہو تو بھی بے فکر ہو کر سوتے رہتے ہیں۔ ممتاز کا شمار بھی انہیں نفاست پسند خواتین میں ہوتا تھا جو بستر کی شکن کو جب تک درست نہ کر لیں چین سے نہ بیٹھیں جھوٹے گلاس کو کئی بار دھلوائے بغیر حلق سے نہ اتاریں۔ لباس اتنا بے شکن ہوتا تھا کہ حیرت ہوتی تھی۔ وہ الجھتی تھیں کس طرح ہیں ہلکی سی شکن بھی پڑ جائے تو لباس اتار کر کئی بار استری کی جاتی تھی۔ اب یہ محض قدرت کی ستم ظریفی تھی کہ شاہ نواز جیسے شخص سے ان کی شادی ہو گئی جو ان کے بالکل برعکس تھا۔ یعنی یہ زمین تھیں اور وہ آسمان مگر دونوں کی بالکل یونہی نبھ رہی تھی جس طرح زمین آسمان کی نبھ رہی ہے۔

کہتے ہیں کہ چہرہ مزاج کا آئینہ ہوتا ہے جو نفاست اور سلیقہ ممتاز کے مزاج میں سمویا ہوا تھا وہی نفاست اس کے چہرے پر بھی نظر آتی تھی بے شکن ملاحت بھرا چہرہ پرکشش بدن حد سے زیادہ حساس اور ہر بات کی پرواہ کرنے والی اس کے برعکس شاہ نواز بالکل لاپرواہ۔ ممتاز کے مزاج کی یہ نفاست کبھی کبھی ان دونوں کے آڑے آ جاتی تھی ویسے تو شاہ نواز ممتاز کو ٹوٹ کر چاہتا تھا اور ممتاز بھی، مگر کبھی کبھی شاہ نواز کو ایک عجیب سی دوری کا احساس ہوتا تھا۔ ایک بار شاہ نواز نے پانی کے لئے آواز دی ملازم گلاس بھر کر لے آیا۔ پانی ان کی پیاس سے زیادہ تھا انہوں نے ذرا سا پی کر گلاس اسٹول پر رکھ دیا کچھ دیر بعد ممتاز کو پیاس لگی وہ ملازم کو آواز دینے ہی والی تھی کہ شاہ نواز نے کہا۔

"میں نے پورا پانی نہیں پیا تھا اس میں ہے۔"

"جی۔۔۔؟"

"یہ لو۔۔۔" شاہ نواز نے گلاس ان کی جانب بڑھایا۔

"نہیں، میں جھوٹا نہیں پی سکتی۔" اس نے نرمی سے کہہ ہی دیا۔

"کیوں۔۔۔؟"

"مجھے گھن آتی ہے۔۔۔"

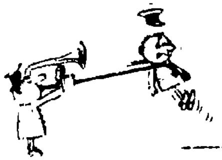
ایک نفاست پسند عورت کی نفیس کہانی جو کسی کا جھوٹا نہیں کھاتی تھی

جھوٹا

شکیلہ رفیق



"اچھا تو دوسرا عشق کیا ہے ۔ ۔" شاہ نواز نے کہنے کو تو کہہ دیا مگر اسے
سا یہ ممتاز کی بات بہت ناگوار گذری ممتاز کی یہی چھوٹی چھوٹی باتیں
دونوں کے درمیان ایک غیر محسوس سلیقے حائل کر رہی تھیں شاہ نواز کو اکثر احساس
ہوتا کہ ممتاز کو سب سے زیادہ پیار اپنے نازک سے مزاج سے ہے یہی
باتیں اس کے ذہن پر بوجھ بننے لگیں اور ایک روز اسی سوچ میں غلط ڈرائیونگ
کی وجہ سے وہ ایکسیڈنٹ میں آ گیا اور موقع پر ہی جاں بحق ہو گیا۔ یوں ممتاز کو اس
خلیج کا احساس بھی نہ ہو سکا جو اس نے اپنے اور اس کے درمیان غیر ارادی
طور پر قائم کر دی تھی۔
شاہ نواز دنیا سے کیا گیا کہ ممتاز کی ساری سلیقہ مندی و رنگینی بھی سمیٹ
لے گیا اب وہ سادہ رہتی تھی مگر سادہ کپڑوں میں بھی اس کی نفاست کا
احساس اسی طرح ہوتا تھا۔ بہت سے شناسا، اپنے شوہر کی زندگی میں
جن کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ ان کی نگاہوں کے انداز
بدلے بدلے تھے۔ وہ سب اسے کوئی پیغام دیتے محسوس ہوتے۔ وہ کشمکش
میں پڑ جاتی۔ اس نے گھر سے نکلنا بہت کم کر دیا تھا مگر پھر بھی کبھی کبھا
ر کسی اشد ضروری تقریب میں جانا ہی پڑتا تب وہ انتہائی سادہ لباس میں
شرکت کرتی مگر پھر بھی سب کی توجہ کا مرکز بن جاتی۔ لوگ کھلم کھلا اظہار سے
جھجکتے تھے مگر دل ہی دل میں سب اسے اپنانا چاہتے تھے نظریں چرا چرا کر
دیکھنے والے۔ اب نجانے یہ دولت کی کشش تھی یا ان کے سادہ اور نفیس
حسن کی۔ یہ نظریں چرا کر دیکھنا اس روز تنگ لے آیا جب ... ایک تقریب
میں شاہ نواز کے ایک بہت اچھے دوست شہزاد نے ان سے کہا۔
"آپ تنہا کیوں کھڑی ہیں؟"
"اس لئے کہ ۔ ۔ ۔ میں تنہا ہوں" وہ مسکرائی۔
"یہ تو اپنی سوچ پر منحصر ہے۔"
"کیا مطلب ......؟"
"یعنی آپ نے سوچ لیا کہ میں تنہا ہوں اور سب سے دور یہاں آ کر
کھڑی ہو گئیں تو ظاہر ہے اکیلا پن آپ کو کیا دنیا ہی تنہا نظر آئے گی۔"
شہزاد نے دلیل دی۔
"سوچنا کیسا ہے میں تو حقیقت بیان کر رہی ہوں۔" انہوں نے ہنس
کر کہا۔ ان کی یہ ہنسی اتنی پھیکی تھی جسے شہزاد نے صاف محسوس کر لیا اور بولا۔
"مگر یہ حقیقت اٹل تو نہیں ۔ ۔ ۔"
"جی ... ؟" وہ کچھ چونکی۔
"میرا مطلب ہے تنہائی ختم ہو سکتی ہے ۔ ۔ ۔ آپ جب چاہیں
تنہائی کو دور کر سکتی ہیں۔"
"میں سمجھی نہیں۔" اب وہ سب کچھ سمجھ چکی تھی۔
"اسے محترمہ جب محفلوں میں آتی ہیں تو لوگوں سے بات کریں ہنسیں



بولیں۔ کچھ ان کی سنیں کچھ اپنی کہیں پھر آپ کو قطعی تنہائی کا احساس نہ ہو گا" وہ موقع دیکھ کر بات بدل گیا۔
"جی نہیں چاہتا۔" ممتاز نے گویا بات ختم کرنی چاہی مگر وہ اتنی آسانی سے دامن چھوڑنے والوں میں سے نہیں تھا۔
"آدمی اپنے گرد جیسا چاہے حصار بنا لے پھر جب وہ اسی حصار میں رہ کر ہی سب کچھ دیکھنا چاہے گا تب اسے بھلا باہر کیا نظر آئے گا؟ آپ نے بھی اپنے گرد تنہائی کا حصار باندھ لیا ہے۔ آپ اگر اس حصار کو توڑ کر دیکھیں تو زندگی آپ کو یقیناً پرکشش نظر آئے گی۔" وہ کافی ہوشیار آدمی تھا اور ہمیشہ باتوں سے، دلائل سے لوگوں کو قائل کر لیا کرتا تھا سب سن کر وہ قدرے بیزاری سے بولی۔
"لیکن آپ کو میری تنہائی یا اس حصار کی اتنی فکر کیوں ہے؟"
اس کو اپنے اس سوال کا جواب ٹھیک دو ماہ بعد اس وقت ملا جب شہزاد نے اسے اپنانے کا ارادہ کیا۔ پہلے تو وہ کسی طرح رضامند نہ ہوئی۔ مگر شہزاد تو جیسے اسے اپنانے کا تہیہ کر چکا تھا اس نے ہر طرح سے ممتاز کو یقین دلایا کہ وہ اسے ہمیشہ خوش رکھے گا۔ اس سے شاہ نواز سے بھی زیادہ پیار کرے گا اور آخر اسے ماننا پڑا۔ یہ مرد شادی سے پہلے ایسے دعوے کرتے ہیں کہ پتھر کی بنی ہوئی عورت بھی موم کی طرح پگھل جاتی ہے۔
شادی کو کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ ممتاز کو احساس ہو گیا کہ شہزاد سے بھی اس کی نفاست پسندی کی کشمکش کی ابتداء ہو گئی ہے۔ اسے شہزاد شاہ نواز سے مختلف نہیں لگا تھا جبکہ اس کی نفاست بدستور قائم تھی بلکہ اس میں کچھ اضافہ ہی ہو گیا تھا۔ مگر شاہ نواز قطعی لاپرواہ قسم کی شخصیت تھا اسے یاد ہی نہ رہتا تھا کہ ممتاز اتنی اتنی سی بات محسوس کرتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ چھ ماہ بھی نہیں ہوئے تھے اور دونوں میں جھگڑا شروع ہو گیا تھا۔ دراصل شہزاد کا مزاج شاہ نواز کی طرح صلح پسند نہ تھا اور وہ اپنی غلطی بھی تسلیم نہ کرتا تھا الٹا ممتاز کو قصوروار ٹھہراتا تھا۔ جس سے جھگڑا الجھ جاتا جبکہ ممتاز نے اب یہ سوچ کر صبر کر لیا تھا کہ شاید سب مرد ایسے ہی ہوتے ہیں۔
شہزاد اس کی چھوٹی چھوٹی نفاستوں سے بہت چڑتا تھا شاید



کہیں جانے کی بہت جلدی ہے مگر وہ استری پر بہت وقت صرف کرتی تھی
یا پیاسے کو ٹھنڈی [illegible] ہے لیکن وہ پیالی لڑکی کئی بار دھو رہی ہوتی تھی۔
یہ باتیں شہزاد کو بہت ناگوار گزرتی تھیں [illegible] میں جھنجھلا جاتی۔

آج صبح [illegible] میں ایسے ہی کسی معمولی جھگڑے کی بنا پر بات
چیت بند تھی۔ شہزاد تو دفتر چلا گیا اور اتفاق سے اس روز خانساماں بھی [illegible]
سارا کام [illegible] خود ہی کرنا پڑا۔ کھانا پکا کر وہ باہر نکلی تو آسمان ابر آلود تھا اور
ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔

شام کو شہزاد بھی آ گیا۔ [illegible] سامنے [illegible] معلوم ہو گیا تھا کہ آج [illegible]
[illegible] ٹھنڈی [illegible] چائے
کی شدید ضرورت محسوس کر رہی تھی مگر بنانے کی ہمت نہ ہو رہی تھی [illegible] شہزاد
[illegible] لیکن شہزاد کو اس پر ترس آ گیا۔

"تم بیٹھو آج چائے میں بناتا ہوں۔"

"جی ... ؟؟" وہ حیران رہ گئی۔

"بس [illegible] حکم ..." اس نے [illegible] تو وہ بھی مسکرا دی۔

"چند منٹ بعد وہ ایک پیالی ہاتھوں میں تھامے آ [illegible] قریب [illegible]
[illegible]

"[illegible] ساری [illegible] در اصل کچن میں صرف ایک پیالی [illegible] تھا۔
[illegible] تمہارے لیے [illegible] بنا لیا۔"

"نہیں آپ پی لیجیے۔" [illegible] نے کہا۔

"ابھی [illegible] تم پی لو" جبکہ [illegible]
[illegible] تھا۔

"نہیں آپ ..."

"آپ ..."

کچھ دیر تکرار ہوتی رہی پھر [illegible]
[illegible] لیتے ہیں۔

[illegible] ٹھیک ہے [illegible] پیالی [illegible]

"دوسری [illegible]
تمہیں دیتا ہوں" شہزاد نے کہا۔

"نہیں ... ؟"

"کیوں ... ؟" [illegible] شہزاد کی بھویں تن گئیں۔

"مجھے گھن آتی ہے کسی اور کے [illegible] میں جھوٹا نہیں پی سکتی۔"

"میرا بھی نہیں؟"

"نہیں ..."

"تمہیں پینی پڑے گی" شہزاد [illegible] لہجے میں کہا۔

"کیا ... ؟؟"

"ہر حکومت [illegible] شاہ [illegible] نہیں ہوں جو تمہاری [illegible] بات ماننا پڑ
جائے" شہزاد نے [illegible] کر کہا۔

"مت مانئے۔ مگر مجھے بھی مجبور مت کیجیے ..."

"تمہیں مجھ سے محبت نہیں ... ؟" شہزاد کی آنکھوں میں [illegible]

"لیکن یہ محبت کی [illegible] کہ ایک دوسرے کا جھوٹا بھی ......"

بس یہیں [illegible] مجھے گھن آتی ہے" اس نے [illegible]

"آپ کو نہیں آتی ... ؟"

"نہیں ..." [illegible] آتی ہوتی تو تم سے شادی کیوں
کرتا ..."

"کیا مطلب ... ؟؟" [illegible]

"جبکہ تم پہلے [illegible] ہو ..." شہزاد نے ہنس کر [illegible]
[illegible] محسوس ہوا [illegible] رہ گئی۔ ⊛



انتقام

**ایک سربستہ راز کی بے حد دلچسپ کہانی
جس کی ہر سطر پڑھنے والے کے دل میں ایک نیا اندیشہ
ایک نئی تشویش اور ایک نیا تجسس ابھارتی ہے**

اظہار اثر

گھر میں اس وقت کل گیارہ افراد تھے ــــ تین ملازم تھے باورچی سلیم، شوفر نیاز اور خادمہ شکورن چار مہمان تھے صاحب خانہ مسٹر جلال کی ساس بیگم زخندہ، مسٹر اکمل ایک مشہور انجینئر ماہر تعمیرات، مسٹر اکمل کی نوجوان اور خوبصورت بیوی افروز اور مس لشی ایک فلم ایکٹریس، تین گھر کے مستقل افراد تھے مسٹر جلال ایک مشہور تاجر دولت مند بادضع اور خوش مزاج شخص، ان کی بیگم رضیہ خانم اور ان کا چھ سالہ لڑکا پرویز!

گیارہویں ہستی تھی، شہناز پروین

شہناز پروین انٹرنیشنل سیکرٹ سروس ایجنٹ یعنی جاسوس تھی۔ زیادہ عرصہ یورپ میں رہتی تھی لیکن جب کبھی ہندوستان آتی تھی اپنی پرانی سہیلیوں سے ضرور ملتی تھی۔

بیگم رضیہ جلال اس کی کلاس فیلو تھیں ــــ شہناز دو دن ہوئے لندن سے دہلی آئی تھی اور اس کا ارادہ دو ماہ دہلی میں رہ کر کام کرنے کا تھا۔ دہلی پہنچتے ہی شہناز نے اپنی سہیلیوں کو فون کئے۔ بیگم رضیہ نے جیسے ہی شہناز کی آواز سنی، مسرت بھری آواز میں فون پر چلا اٹھیں "شہناز ــــ ہائی ڈارلنگ شہناز ــــ آٹھ سال کے بعد تمہاری آواز سنائی دی ہے منحوس، تم سے تو کبھی یہ بھی نہیں ہوا کہ دو لفظوں کا ایک خط ہی لکھ دو۔"

شہناز نے مسکرا کر جواب دیا۔ "میں معذرت کرتی ہوں رضیہ ــــ اور اگر مجھے خط لکھنے کی فرصت ملتی تو سب سے پہلے میں ملک الموت کو خط لکھتی کہ وہ مجھے آ کے لے جائے۔ میں خود سب پرانی دوستوں سے ملنے کے لئے تڑپ رہی ہوں۔"

"بس تو تم فوراً اپنا ایک ہلکا سا اٹیچی کیس اٹھاؤ اور یہاں پہنچ جاؤ۔ اب جب تک تم دہلی میں مقیم ہو، میرے یہاں رہو گی۔"

"یہ تم اپنے حق میں اچھا نہیں کرو گی ــــ میری دوسری سہیلیاں تمہیں قتل کر دیں گی کیونکہ تم تنہا میری مالک نہیں بن سکتیں، بہرحال میں شام کو آ رہی ہوں۔ باقی پروگرام ملنے کے بعد بنائیں گے۔"

"ضرور ــــ ہائی ڈارلنگ شہناز، تمہارا آنا بہت ضروری ہے کیونکہ کل میرے بچے پرویز کی سالگرہ ہے۔"

"میں پہنچ رہی ہوں ڈارلنگ ــــ تھینک یو" کہہ کر شہناز نے فون بند کر دیا۔

جس وقت شہناز رضیہ کی کوٹھی پر پہنچی تو موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ رضیہ نے اپنی کار شہناز کو لینے کے لئے بھیج دی تھی۔



شبانہ کے کوٹھی میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے رضیہ نے ایک نعرہ لگایا اور دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔ دو منٹ تک وہ اس کو نوچتی کھسوٹتی رہی اور بڑبڑاتی رہی۔ پھر یکایک اسے خیال آیا کہ وہ مہذب انسانوں کے درمیان ہے اس لئے جدا ہو کر اس نے اپنے شوہر اور دونوں مہمانوں سے اس کا تعارف کرایا۔

رضیہ کی والدہ بیگم فرخندہ کو شبانہ پہلے سے جانتی تھی۔ رضیہ کے شوہر جلال پاشا سے یہ اس کی پہلی ملاقات تھی۔ وہ ادھیڑ عمر کا صحت مند آدمی تھا۔ بے حد خوش مزاج، اس کے چہرے پر خوبصورت فرنچ کٹ داڑھی تھی۔ مہمانوں میں مسٹر اکمل اور ان کی بیوی افروز بھی با اخلاق آدمی تھے۔ اکمل کی عمر چالیس کے لگ بھگ ہوگی جب کہ ان کی بیوی افروز زیادہ سے زیادہ بیس سال کی ہوگی۔ افروز بے حد خوبصورت تھی اور اس میں وہ تمام شاعرانہ برائیاں تھیں جو ایک انتہائی حسین لڑکی میں ہونی چاہئیں ——— یعنی اسے اپنے حسن کا ضرورت سے زیادہ احساس تھا۔ مس نشی ایک کم گو اور سنجیدہ طبیعت لڑکی تھی۔ شبانہ باوجود کوشش کے یہ معلوم نہ کر سکی کہ وہ رضیہ کی دوست ہے یا جلال کی۔

رسمی تکلفات کے بعد چائے طلب کی گئی اور ختم نہ ہونے والی باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ شبانہ چونکہ سراغ رساں تھی، اس لئے ہر شخص اس کی زندگی کے عجیب و غریب واقعات سننے کا خواہشمند تھا۔ اور شبانہ کو اپنے کارنامے سنانے سے نفرت تھی۔ وہ بڑی خوبصورتی سے ان لوگوں کی خواہشات ٹالتی رہی، ان کو لطیفے سناتی رہی، اِدھر اُدھر کی بے تکی باتیں کرتی رہی۔

آخر باورچی نے اعلان کیا کہ ڈنر میز پر لگا دیا گیا ہے اور وہ سب لوگ کھانا کھانے چل دیئے۔

ایک گھنٹہ ان لوگوں سے باتیں کرنے کے بعد شبانہ نے تین باتوں کا اندازہ لگایا۔

نمبر ایک یہ کہ رضیہ کی آنکھوں میں غم کی جھلک تھی ——— کیوں؟

نمبر دو یہ کہ اکمل کی بیوی افروز کی آنکھوں میں اس وقت چمک پیدا ہو جاتی تھی جب وہ جلال پاشا سے باتیں کرتی تھی۔

نمبر تین یہ کہ رضیہ کی والدہ بیگم فرخندہ کی آنکھوں سے جلال کو دیکھ کر غصے یا نفرت کا ہلکا سا اظہار ہونے لگتا تھا۔

یہ تینوں باتیں اس قدر خفیف تھیں کہ ہر آدمی ان کا سراغ نہیں لگا سکتا تھا لیکن چونکہ شبانہ کو اپنے پیشے میں ہر قسم کے انسانوں سے واسطہ پڑتا رہتا تھا اس لئے وہ انسانی کیریکٹر پڑھنے کی ماہر ہو گئی تھی وہ کسی اجنبی انسان سے پہلی بار مل کر اس کی آنکھوں کی چمک، ہاتھوں کی جنبشوں اور بیٹھنے اٹھنے کے انداز سے ہی اس شخص کے کردار کا اندازہ لگا لیتی تھی۔

رات کے گیارہ بجے تک وہ لوگ برج کھیلتے رہے۔ آخر سب سے پہلے بیگم فرخندہ نے اعلان کیا کہ وہ چونکہ بوڑھی ہوتی جا رہی ہیں۔ اس لئے زیادہ دیر تک نہیں جاگ سکتیں۔ یہ اعلان کر کے وہ سونے کے لئے چلی گئیں۔ اس کے بعد مس نشی، مسٹر اکمل اور مسز اکمل اپنے اپنے کمرے میں سونے کے لئے چلے گئے۔ آخر میں رضیہ نے شبانہ کو اس کا کمرہ دکھایا اور خود بھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

یہ کوٹھی دو منزلہ عمارت تھی۔ اس کا نقشہ اکمل نے ہی بنایا تھا، اور اکمل کے مشورہ پر ہی جلال پاشا نے صرف ایک ماہ پہلے یہ کوٹھی خریدی تھی۔ کوٹھی کا پہلا مالک کسی ریاست کا معزول نواب تھا جس نے اچانک سوئٹزرلینڈ میں بسنے کا فیصلہ کر لیا اور اپنی تمام جائیداد اونے پونے داموں فروخت کر کے چلا گیا۔

رضیہ صرف ایک ماہ پہلے اس کوٹھی میں آئی۔ کوٹھی کی پہلی منزل کے کمرے خوابگاہ کے لئے مخصوص تھے ——— نیچے ایک بڑا ہال تھا، ایک ڈرائنگ روم تھا۔ ہال کے دوسرے سرے پر جلال کی لائبریری تھی، لائبریری کے برابر میں ایک کمرہ تھا، جس کا دروازہ بند تھا ——— ڈائننگ روم اور باورچی خانہ کاریڈور کے دوسری جانب تھے۔ ملازمین کے کوارٹر کوٹھی کی پشت پر گیراج کے اوپر تھے۔

یہ تھا کوٹھی کا مکمل نقشہ اور یہ سب تھے وہ افراد جن کو اس رات ایک عجیب و غریب اور نہایت پر اسرار ٹریجڈی میں حصہ لینا تھا۔

رات کو خدا جانے کس وقت شبانہ کی آنکھ کھل گئی ——— اس نے گھڑی دیکھی تو دو بج کر پانچ منٹ ہوئے تھے باہر ابھی تک موسلادھار بارش ہو رہی تھی۔

شبانہ نے دوبارہ سونے کی بہت کوشش کی لیکن نہ جانے کیوں اسے نیند نہ آسکی۔ آدھے گھنٹے کروٹیں بدلنے کے بعد اس نے سوچا کہ کچھ پڑھا جائے۔ وقت ضائع کرنے سے کیا فائدہ؟ یہ سوچ کر وہ اٹھی اور بیڈ روم سلیپر پہن کر دبے قدموں اپنے کمرے سے باہر نکلی اور بلی کی طرح بے آواز ہوتی وہ زینہ سے نیچے ہال میں آئی۔

نیچے مکمل اندھیرا تھا وہ بتی جلا کر اور لوگوں کو پریشان کرنا نہیں چاہتی

تھی۔ فاصلے سے ہی اندھیرے میں اس نے ہال کے فرش کو پار کیا اور ٹٹول کر لائبریری کا دروازہ تلاش کر کے اس کو کھولا۔

اب اس کی آنکھیں اندھیرے میں چیزوں کے تاریک سائے محسوس کرنے کے قابل ہو گئی تھیں۔ اس کے دائیں جانب سفید دیوار میں ایک دروازہ کا تاریک خاکہ سا محسوس ہو رہا تھا۔ پہلا دروازہ کھولتے ہی شبانہ کو احساس ہوا کہ وہ غلط دروازہ کھول رہی ہے۔ اس کو یاد آ گیا کہ ہال کی اس دیوار میں دو دروازے پاس پاس تھے اور دائیں جانب والا دروازہ لائبریری کا دروازہ تھا۔ جس کمرے کا دروازہ اس نے کھولا تھا، اس کے اندر مکمل اندھیرا تھا۔ چند سیکنڈ وہ اندر دیکھتی رہی۔ پھر اس نے آہستہ سے دروازہ بند کر دیا اور دائیں جانب ہٹ کر دوسرا دروازہ کھولا۔

اندر داخل ہو کر اس نے سوئچ دبایا۔ روشنی ہونے پر پتہ چلا کہ اس کا اندازہ درست تھا۔ لائبریری ہی تھی۔

شبانہ نے دس پندرہ منٹ کی تلاش کے بعد اپنے مطلب کی دو کتابیں نکالیں، بتی بجھائی اور اسی طرح دبے قدموں سے زینہ پر چڑھنے لگی۔ وہ آخری سیڑھی پر تھی کہ کسی طرف سے ایک آواز آئی۔

"کون۔ مسٹر ہلال؟"

یہ آواز اکمل کی تھی۔ شبانہ نے کہا "نہیں میں ہوں شبانہ۔ مسٹر اکمل۔"

"اوہ" اکمل نے اس کے قریب آتے ہوئے کہا "کیا آپ کو بھی میری طرح نیند نہیں آ رہی ہے؟"

"کیا آپ کی بیگم سو گئیں؟"

"مجھے معلوم نہیں —— رضیہ نے ہم سب کو الگ الگ کمرے دیئے ہیں۔ الماس اپنے کمرے میں سو رہی ہوگی۔"

"آئیے پھر ہم لائبریری میں بیٹھ کر کچھ دیر باتیں ہی کریں گے۔" شبانہ نے پیش کش کی جسے اکمل نے فوراً قبول کر لیا۔ اور وہ دونوں لائبریری میں آ کر بیٹھ گئے۔ کوئی آدھے گھنٹے وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد اکمل نے بھی دو ایک کتابیں نکالیں اور دونوں واپس اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

کسی نے بُری طرح شبانہ کو جھنجھوڑ دیا۔ وہ چونک کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے دیکھا کہ دن چڑھ چکا ہے اور ملازمہ شکورن اس کو جگا رہی ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ شکورن کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"جلدی اُٹھیے۔" شکورن نے کہا "سب لوگ نیچے ہال میں جمع ہیں۔ بیگم صاحبہ بہت پریشان ہیں۔"

"کیا ہوا؟" شبانہ نے حیرت سے سوال کیا۔

"صاحب اچانک غائب ہو گئے۔"

"صاحب؟" شبانہ نے چونکتے ہوئے پوچھا "ہلال پاشا؟"

"جی ہاں۔" شکورن نے سر ہلا کر کہا "اور بیگم صاحبہ نے رو رو کر اپنا بُرا حال کر لیا ہے۔"

شبانہ اچھل کر بستر سے اتری اور بولی "تم چلو میں چند منٹ میں نیچے آتی ہوں۔"

شکورن آنسو پونچھتے ہوئے باہر چلی گئی اور شبانہ غسل خانے کی طرف لپکی۔ کوئی بیس منٹ بعد ہی وہ کپڑے تبدیل کر کے نیچے آ گئی۔

ہال میں سب لوگ جمع تھے۔ صوفہ پر رضیہ بیٹھی رو رہی تھی اور اس کی ماں بیگم فرخندہ اس کو تسلی دے رہی تھی۔ سانجنیز اکمل بے تابی سے ادھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔ الماس ایک آرام دہ کرسی پر پتھر کے بت کی مانند بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی بے بسی اور خوف و ہراس تھا۔ نشی کھڑکی میں ساکت کھڑی تھی۔

"کیا ہوا؟" شبانہ نے پورے ہال پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

رضیہ اس کو دیکھ کر اور زیادہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور سوج گئی تھیں۔

"مسٹر ہلال لاپتہ ہیں۔" اکمل نے ٹہلتے ٹہلتے رک کر کہا۔

"کب سے؟"

"صبح وہ اپنے بستر میں نہیں تھے۔"

شبانہ رضیہ کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور اس کے شانے کو تھپتھپا کر بولی "ہمت اور صبر سے کام لو رضیہ۔ مسٹر ہلال ممکن ہے کسی کام سے چلے گئے ہوں۔ واپس آ جائیں گے۔"

رضیہ نے آنسو پونچھ کر ہکلاتے ہوئے کہا "وہ اس طرح بغیر اطلاع دیئے کبھی نہیں جاتے۔"

"کیا رات تم دونوں میں کوئی جھگڑا ہوا تھا؟"

"نہیں ہم رات کو سونے کے لئے اپنی خواب گاہ میں گئے۔ انہوں نے شب خوابی کا لباس پہنا اور مجھ سے کہا کہ وہ تھوڑی دیر اپنے آفس میں جا رہے ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ جلد آ کر سو جانا۔ وہ چلے گئے۔ مجھے فوراً نیند آ گئی۔ صبح اٹھ کر میں نے دیکھا کہ ان کا بستر خالی تھا۔ اور بستر سے پتہ چلتا تھا



کر وہ رات بھر نہیں آئے۔ میں اٹھ کر نیچے آئی اور دفتر میں دیکھا تو وہ دفتر میں بھی نہیں تھے۔"

"ان کا دفتر کہاں ہے؟" شبانہ نے سوال کیا۔

رضیہ نے لائبریری کے برابر والے دروازہ کی طرف اشارہ کر دیا۔

یہ وہی دروازہ تھا جو رات اندھیرے میں شبانہ نے غلطی سے پہلے کھولا تھا۔ اس وقت رات کے ڈھائی بجے تھے اور اس کمرے میں کوئی نہیں تھا۔

شبانہ نے سوچ کر کہا "کیا وہ پلنگ پر کپڑے پہن کر گئے ہیں؟"

"نہیں" رضیہ نے سر ہلایا۔ "ان کے تمام سوٹ الماری میں موجود ہیں۔ وہ اسی سلیپنگ سوٹ میں ہیں۔"

"ہو سکتا ہے اسی سلیپنگ سوٹ میں وہ اپنے شوہر کے آفس میں چلے گئے ہوں؟"

"نہیں ـــــ یہ ناممکن ہے۔ اگر وہ کسی آفس میں گئے ہوتے تو اب تک فون کر دیتے۔"

بیگم فرخندہ نے کہا "پھر بھی بیٹی تم خواہ مخواہ گھبرا رہی ہو۔ وہ سمجھدار انسان ہیں کسی کام سے چلے گئے ہوں گے آجائیں گے۔"

"امی میرا دل گھبرا رہا ہے۔ ان کو ضرور کوئی حادثہ پیش آگیا ہے۔ ورنہ میری یہ حالت کبھی نہ ہوتی۔"

"پلیز مسز جلال ـــــ" انکل نے کہا "حوصلہ رکھیے مجھے یقین ہے آپ کے شوہر ضرور واپس آجائیں گے۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ صرف انتظار کیجئے۔"

شبانہ صوفے سے اٹھی اور جلال پاشا کے آفس کی جانب بڑھی۔ آفس کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ شبانہ نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوگئی۔ ایک لمحہ تو وہ رک گئی۔ یہ ایک چھوٹا سا مستطیل نما کمرہ تھا جس میں ایک میز تھی، تین کرسیاں تھیں۔ ایک فائلوں کی الماری تھی۔

اس وقت کمرہ بالکل خالی تھا۔ کمرے کی ہر چیز ترتیب سے تھی۔ لیکن شبانہ کو جس چیز نے حیران کیا وہ کمرے کی دروازے کے سامنے والی دیوار تھی۔ اس کمرے میں کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ دروازے کے سامنے والی دیوار پر دروازے کے سامنے تقریباً آٹھ فٹ لمبا اور چار فٹ چوڑا شیشہ لگا تھا جس میں اس وقت شبانہ کا عکس دکھائی دے رہا تھا۔ پورا دروازہ شیشے میں نظر آ رہا تھا اور دروازے کے اوپر ایک بڑا گول کلاک نظر آ رہا تھا۔

شبانہ نے ایک قدم اور اندر بڑھ کر دروازے کے اوپر دیکھا۔ کلاک بجلی سے چلنے والا تھا اور صحیح وقت دے رہا تھا۔ اس کی ٹک ٹک کی آواز کمرے کے سکوت میں کافی تیز محسوس ہو رہی تھی۔

کلاک کو دیکھ کر شبانہ کے چہرہ پر حیرت کے آثار دوڑ گئے۔ شبانہ نے دروازہ اسی طرح بند کر دیا جس سے کمرے میں مکمل اندھیرا ہو گیا۔ اب اس نے دیکھا کلاک کے ہندسوں اور سوئیوں پر ریڈیم لگا ہوا تھا جس کی وجہ سے تاریکی میں چمک رہے تھے۔

چند لمحے وہ کھڑی ہوئی کلاک کو دیکھتی رہی پھر اس نے بتی جلائی اور میز کی درازیں کھول کر دیکھنا چاہیں لیکن درازیں اور الماری دونوں مقفل تھے۔

شبانہ باہر آگئی۔ باہر کا منظر بالکل اسی طرح تھا جیسے وہ چھوڑ کر گئی تھی۔

"کوئی سراغ ملا مس شبانہ؟" انکل نے ٹہلتے ٹہلتے رک کر…

شبانہ نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا "کچھ نہیں لیکن ایک بڑی بات کا انکشاف ہوا ہے۔"

"کیا؟" بیگم فرخندہ نے سوال کیا۔

"آفس میں دروازے کے بالکل اوپر ایک کلاک لگا ہوا ہے… یہ وہ کلاک جا رہا ہے جو رات کو کہیں گھومنے چلا جاتا ہے اور واپس دیوار پر آجاتا ہے۔"

سب کے چہروں پر حیرت کے آثار پھیل گئے۔ انسپکٹر… پلٹ کر دیکھا اور کھلکھلاتے ہوئے لہجے میں بولا "یقیناً مس شبانہ آپ مذاق کر رہی ہیں؟"

"نہیں" شبانہ نے سر ہلا کر کہا۔ "میں مذاق نہیں کر رہی۔ اس مکان میں کل میں نے پہلی رات گزاری تھی۔ رات کو دو بجے کے قریب میری آنکھ کھل گئی اور مجھے پیاس لگی۔ میں نے سوچا لائبریری سے کتاب لے کر آؤں۔ چنانچہ میں نیچے آئی اور اندھیرے میں غلطی سے…

کی بات نہ کی کہ وہ کلاک کیوں دیکھا گیا۔ اس وقت آفس میں بالکل اندھیرا تھا اور وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ مجھے فوراً احساس ہوگیا کہ میں نے غلطی سے کلاک دیکھا ہے اس لیے میں نے ڈاکٹر کا دھیان بٹانے کے لیے لائبریری میں چلی گئی کہ ہاں تسبیح پڑھ کر بات کروں گی۔ ڈاکٹر کا دھیان ہٹ گیا تھا اور اس وقت وہ کلاک دیوار پر نہیں تھا۔

نشی نے شہباز کی طرف شکر گزار نظروں سے دیکھا جیسے وہ کوئی احمق یا پاگل کو دیکھ رہی ہو ——— انور نے پہلی بار بولتے ہوئے کہا ”مس شہباز جب کمرے میں بالکل اندھیرا تھا تو آپ کو کلاک کیسے نظر آیا؟“

شہباز نے مسکرا کر کہا ”ہاں کمرے میں بالکل اندھیرا تھا اس لیے کلاک مجھے بھی نظر آجانا چاہیے تھا۔ کلاک کے ہندسوں اور سوئیوں پر ریڈیم چڑھا ہوا ہے جو گہری تاریکی میں زیادہ چمکتا ہے اور دروازے کے سامنے والی دیوار میں ایک کافی لمبا اور چوڑا آئینہ لگا ہوا ہے۔ اگر وہ کلاک دیوار پر تھا تو دروازہ کھولتے ہی مجھے شیشے میں اس کلاک کے اندھیرے میں چمکنے والے ہندسے اور سوئیاں نظر آنے چاہیے تھے۔“

انکل چونکے تھے رک گئے اور بولے ”وہ تو ٹھیک ہے، ہونا چاہیے تھا کیونکہ دروازے کے سامنے والی دیوار میں آئینہ لگا ہوا ہے اور اس پر ریڈیم چڑھا ہوا ہے۔ اندھیرے میں کلاک کا عکس شیشے میں نظر آنا چاہیے تھا۔“

لیکن مس نشی نے گھبرا کر شہباز کی جانب دیکھا۔ ”یا ایسا بھی تو ہوسکتا ہے کہ اس وقت کمرے میں کوئی شخص موجود ہو اور وہ آئینے کے سامنے اندھیرے میں کھڑا ہو۔ جس کی وجہ سے کلاک کا عکس شیشے میں آپ کو نظر نہ آسکا۔“

”نہیں“ شہباز نے سرہلا کر کہا ”یہ ناممکن ہے ——— آئینہ زمین سے چار فٹ بلندی سے شروع ہوتا ہے اور چھت تک چلا گیا ہے۔ کوئی لمبا شخص شیشے کے سامنے ہوتا تو کلاک کا عکس نہیں چھپ سکتا تھا۔“

”پھر اس سے آپ نے کیا نتیجہ نکالا؟“ بیگم فرخندہ نے سوال کیا۔

”صرف دو ہی صورتیں ممکن ہیں“ شہباز نے کہا ”یا تو رات کو اس دیوار پر کلاک نہیں تھا ——— یا پھر سامنے والی دیوار پر شیشہ نہیں تھا لیکن چونکہ شیشہ دیوار پر ثبت ہے اور اس کو ادھر ادھر ہٹانا ناممکن ہے اس لیے یہی سمجھا جاسکتا ہے کہ رات کو کلاک کمرے میں نہیں تھا اور یہ کہ رات کو اس کمرے میں کوئی شخص نہیں تھا۔ مسٹر کمال کو اگر اس رات کو بھی نیند نہیں آرہی تھی اور یہ وہاں ایک گھنٹے تک لائبریری میں بیٹھے رہے۔ کہ رات ہوتے تھے اگر واقعی جمال پاشا پہلے آئے تو ان کے چلنے پھرنے کی آواز ہم سنتے۔“

انکل نے سر ہلاتے ہوئے کہا ”آپ ٹھیک کہتی ہیں مس شہباز“

بیگم فرخندہ نے کہا ”میرا خیال ہے ہمیں فوراً پولیس کو اطلاع کرنی چاہیے۔“

شہباز نے کہا ”میرا خیال ہے یہ جلد بازی ہوگی۔ ہمیں شام تک مسٹر جمال کا انتظار کرنا چاہیے اگر وہ شام تک واپس نہیں لوٹے تو ہم سوچیں گے کہ کیا کریں۔“

”بہت معقول مشورہ ہے“ انکل نے کہا

رضیہ بولی ”تم جاسوس ہو شہباز۔ خدا کے لیے کچھ کرو ——— ——— انہیں تلاش کرو۔“

”وہ میں کر رہی ہوں لیکن بہتر ہے کہ تم اپنے کمرے میں جا کر کچھ دیر سو جاؤ۔“

”اب مجھے نیند نہیں آئے گی۔“

شہباز نے رضیہ کی ماں سے کہا ”امی آپ رضیہ کو خواب گاہ میں لے جائیے اور نیند آنے والی کوئی دوا کھلا کر اس کو سلا دیجیے۔“

بیگم فرخندہ نے سر ہلایا اور رضیہ کو لے کر اوپر چلی گئیں۔

شہباز کچھ دیر وہاں کھڑی رہی پھر خاموشی سے ہال سے باہر نکل گئی اور اس نے اپنے طور پر پوری کوٹھی کی تلاشی لینی شروع کر دی۔

دوپہر کو بارش رک گئی اور سورج اپنی پوری تمازت کے ساتھ زمین پر چمکنے لگا۔ جمال پاشا کا ابھی تک کوئی پتہ نہ تھا۔ ملازمہ نے رضیہ کو خواب آور دوا کھلا کر سلا دیا تھا۔ باقی سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں تھے۔ دوپہر کا کھانا سب نے اکیلے اکیلے آکر باورچی خانے میں بیٹھ کر کھا لیا۔

شہباز کی تجویز پر بیگم فرخندہ نے بچے کی سالگرہ میں آنے والے تمام مہمانوں کو فون کر دیا تھا کہ پارٹی کینسل کر دی گئی ہے۔

چار بجے تک شہباز نے سارے مکان کی تلاشی لے ڈالی۔ چار بجے وہ دوبارہ آفس کے کمرے میں داخل ہوئی اور اندر سے دروازہ بند کر لیا تھک کر وہ اس آفس کے کمرے ہی میں بیٹھ گئی تو اس کا جو پہلا تھا بال بکھرے ہوئے تھے آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔

وہ کچھ دیر وہاں سے کلاک کے لیے پیمائش کرتی رہی پھر اس نے پیچھے کے تمام کمروں کا بغور جائزہ لیا مکان کے عقب کی

- خدا کے نزدیک تم میں عزت والا وہ ہے جو نیکو کار ہے۔
(قرآن پاک)
- نیکی اور پرہیزگاری میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور بُرائی اور سرکشی میں کسی کا ساتھ نہ دو۔ (حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- جس طرح اللہ نے تم پر احسان کیا ہے اسی طرح تم بھی لوگوں پر احسان کرو۔
(حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- اگر تم تیس برس میں طاقتور اور چالیس برس میں عقلمند نہیں بنے تو اب کبھی طاقتور اور عقلمند بننے کی اُمید نہ رکھو۔ (ڈاکٹر چاپنر)

پڑے تھے۔ وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی جہاں فون رکھا تھا۔ دروازہ اندر سے بند کر کے وہ فون کرنے لگی۔ تقریباً پندرہ منٹ تک وہ فون پر گفتگو کرتی رہی۔ پھر فون واپس رکھ کر وہ ہال میں آئی اور ایک صوفہ پر خود کو گرا کر دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا کر بیٹھ گئی۔

تقریباً ایک گھنٹہ وہ اسی طرح کرسی پر ساکت آنکھیں بند کئے بیٹھی رہی لیکن اس پورے وقفہ میں اس کا دماغ روشن تھا اور تیزی سے کام کر رہا تھا۔ وہ ان تمام مبہم اشاروں کو جوڑ کر ایک کہانی ترتیب دے رہا تھا جو اس کو تلاشی کے دوران نظر آئے تھے۔

نو بجے سب لوگ نیچے آ گئے۔ رضیہ بھی جاگ چکی تھی۔ جلال پاشا کی کوئی خبر نہیں آئی تھی۔ ساڑھے بجے انہوں نے مرے ہوئے دل کے ساتھ کھانا زہر مار کیا۔ اس کے بعد کافی کا دور چلا۔ پھر نشی اور افروز وقت گزارنے کے لئے تاش کھیلنے بیٹھ گئیں۔ اکمل ایک کونے کی کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ پینے لگا۔ رضیہ اور بیگم فرخندہ ہاتھ میں ہاتھ لئے صوفہ پر خاموش بیٹھ گئیں۔ شبانہ کھڑکی کے پاس کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ اور اندھیرے میں گھورنے لگی۔

نہ جانے کتنی دیر کے بعد شبانہ کو احساس ہوا کہ اس کا پورا جسم خوفزدہ ہو چکا ہے، اور اس کے ذہن پر ایک نشیلا تاریک پردہ پڑتا جا رہا تھا۔ گھبرا کر اس نے کرسی سے اٹھنا چاہا۔ لیکن اس کے اعصاب جواب دے رہے تھے۔ وہ بڑی تیزی سے نیند کی آغوش میں گرتی جا رہی تھی، شاید یہ بے ہوشی تھی۔ اس نے سر گھمانا چاہا لیکن گردن نے جنبش نہ کی۔ البتہ اس نے نیند سے بوجھل آنکھوں سے یہ ضرور دیکھا کہ ہر شخص اپنی جگہ بیٹھا بیٹھا سو رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا سر بھی بے ہوشی کے عالم میں کرسی کے تکیہ پر جا پڑا۔

آخری خیال شبانہ کے ذہن میں یہ آیا تھا کہ ان سب کو یا تو کسی نے بے ہوش کرنے والی دوا کھلائی ہے ——— یا انہیں زہر دیا گیا ہے۔

شبانہ کو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی جلتی ہوئی چیز اُس کے جسم پر ڈالی جا رہی ہو ——— وہ کسمسا کر اٹھ بیٹھی ——— اس نے دیکھا کہ وہ کھڑکی کے پاس کرسی پر نیم دراز تھی اور کھڑکی سے دھوپ کی تیز کرنیں اس کے سارے جسم پر پڑ رہی تھیں۔

فوراً ہی شبانہ کو سب کچھ یاد آ گیا اور اس نے گھبرا کر کمرے میں نظر دوڑائی۔ ہر شخص اسی طرح اپنی اپنی کرسی یا صوفہ پر پڑا بے خبر سو رہا تھا۔

"مائی گاڈ" شبانہ نے بڑبڑا کر اپنے آپ سے کہا "رات کو ہم سب کو کسی نے نیند لانے والی دوا کھلا کر بے ہوش کیا ہے۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے اٹھی۔ اس کے بالکل قریب نشی ایک صوفہ پر لیٹی تھی۔ اس نے نشی کو جگا دیا۔ نشی آنکھیں ملتے ملتے اٹھ بیٹھی اور اپنے آپ کو صوفے پر دیکھ کر حیرت سے بولی۔ "کیا میں یہیں سو گئی تھی مس شبانہ؟"

"صرف تم ہی نہیں۔ ہم سب رات کو اسی کمرے میں سوئے ہیں یا یہ کہو کہ سلائے گئے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ رات کو کسی نے ہمیں کھانے میں یا کافی میں نیند لانے والی دوا کھلا کر بے ہوش کیا ہے ——— پلیز تم اٹھ کر ذرا ان لوگوں کو جگاؤ۔ میں ابھی آتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ پہلے باورچی خانے میں گئی۔ اس نے دیکھا کہ تینوں ملازم باورچی خانے کے فرش پر پڑے بے خبر سو رہے ہیں۔

شبانہ تیز تیز چلتی ہوئی اوپر گئی۔ اس نے رضیہ کے چھ سالہ پرویز کا کمرہ کھول کر دیکھا۔ پرویز بھی بستر پر بڑے سکون سے سو رہا تھا۔ پھر وہ رضیہ کے کمرے میں آئی۔ اور سارے کمرے کی تلاشی لی۔ آخر میں اس کو غسل خانے میں وہ چیز مل گئی جس کی اسے تلاش تھی۔

یہ خواب آور دوا کی شیشی تھی۔ جو اس وقت بالکل خالی تھی۔

وہ نیچے واپس آئی۔ اس وقت تک نشی نے سب کو جگا دیا تھا۔ سب لوگ اس غیر فطری نیند سے کسل مند اور حیران تھے۔ شبانہ نے وہ شیشی بیگم فرخندہ کو دکھا کر کہا۔ "کیا کل آپ نے اسی شیشی سے نیند لانے والی دوا رضیہ کو دی تھی؟"

"ہاں ———" بیگم فرخندہ نے کہا۔ "لیکن کل تو یہ شیشی بھری ہوئی تھی۔"

"درست ہے۔" شبانہ نے مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے

کہا۔ "رات کو ہم سب لوگوں کو بالائی میں دوا کافی میں پلا دی گئی۔ اسی لئے ہم لوگ اسی کمرے میں بے ہوش ہو گئے تھے۔"

"لیکن ہمیں بے ہوش کس نے کیا تھا؟" افروز نے خوفزدہ لہجہ میں کہا۔

"یہ مجھے نہیں معلوم لیکن میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ کافی میں خواب آور دوا ملانے والا ہم میں سے ہی کوئی ایک تھا۔"

"ہم میں سے کوئی ایک!" بیگم فرخندہ نے کہا۔ "—— یہ ناممکن ہے۔"

"اس کے علاوہ کوئی اور وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔" شبانہ نے کہا۔

"کوئی ہمیں بے ہوشی کے عالم میں قتل بھی کر سکتا تھا؟" نشی بولی۔

"یہ ٹھیک ہے۔" بیگم فرخندہ نے کہا۔ "کوئی بھی ہمیں قتل کر سکتا تھا۔ ہمیں فوراً پولیس کو بلانا چاہیئے۔"

"آپ لوگ پہلے ذرا منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ وغیرہ کر لیں۔" شبانہ نے کہا۔ "اس کے بعد سوچیں گے کہ کیا کریں۔"

سب لوگ اٹھ کر اپنے کمروں میں چلے گئے اور شبانہ چپکے سے مکان سے باہر کھسک گئی۔

ایک گھنٹے بعد وہ واپس آئی تو سب لوگ کچھ تر و تازہ محسوس ہو رہے تھے اور ہال میں جمع تھے۔

رضیہ نے کہا۔ "شبانہ بس اب صبر کی انتہا ہو گئی۔ بہتر ہے کہ اب پولیس کو اطلاع کر دی جائے۔"

شبانہ نے رضیہ کے چہرے پر نظریں جما کر کہا۔ "رضیہ، کیا جلال بھائی کے کچھ دشمن تھے؟"

"مجھے معلوم نہیں۔" رضیہ نے جواب دیا۔ "ویسے وہ اپنے بزنس کے حلقے میں کافی مقبول تھے۔"

"کیا آج صبح کی ڈاک میں کوئی خط آیا ہے؟ میرا مطلب ہے شاید کسی نے ان کو بلیک میل کرنے کے لئے اغوا کر لیا ہو اور روپے کا مطالبہ کیا ہو۔"

"نہیں۔" رضیہ نے جواب دیا۔ "ایسا کوئی خط نہیں ——"

الفاظ اس کے منہ میں ہی رہ گئے۔ دروازے کے باہر ایک ایسی آواز آئی جیسے کوئی چیز گری ہو۔

"یہ کیا تھا؟" یہ کہہ کر شبانہ دروازے کی جانب بھاگی۔ اس کے پیچھے پیچھے ہی اکمل اور نشی دوڑے۔

شبانہ خاکی رنگ کے کاغذ میں لپٹا ہوا ایک پیکٹ لئے اندر داخل ہوئی اور بولی۔ "کوئی یہ پیکٹ دروازے پر چھوڑ گیا ہے اور یہ تمہارے نام ہے رضیہ!"

پارسل پر گھسیٹے ہوئے حرفوں میں رضیہ کا نام اور پتہ لکھا تھا۔

رضیہ نے حیرت سے پارسل لے کر کھولا۔ پارسل کھلتے ہی سب نے دیکھا کہ اس میں مردانہ جوتوں کا ایک جوڑا تھا۔

"ارے!" رضیہ بولی۔ "یہ تو جلال صاحب کے جوتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے ضرور ان کو اغوا کیا گیا ہے۔ اور مجرموں نے اب یہ جوتے بھیجے ہیں۔"

"ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔" شبانہ نے سر ہلا کر کہا، اور سب لوگوں کے چہروں پر ایک نظر ڈالی، ہر شخص کے چہرہ پر حیرت کے آثار تھے۔

اکمل نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ "معاملہ اب بڑھتا جا رہا ہے ہمیں فوراً پولیس کو خبر کرنی چاہیئے۔"

شبانہ نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "کیا کل رات کو جلال یہ جوتے پہنے ہوئے تھے؟"

"نہیں تو ——" رضیہ نے کہا۔ "وہ بیڈ روم سلیپر پہنے ہوئے تھے اور یہ جوتے تو کل دوپہر ہی میں نے دیکھے تھے۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ جوتے رات کو چرائے گئے ہیں جب ہم سب بے ہوش تھے۔ سوال یہ ہے کہ ہمیں بے ہوش کر کے مجرموں کا یہ جوتے چرانے سے کیا مقصد تھا؟"

نشی نے رائے ظاہر کی۔ "شاید وہ اس بار روپے کا مطالبہ کریں۔ فی الحال ایسا معلوم ہوتا ہے وہ ہم پر اپنی چالاکی کا اثر جما رہے ہیں۔"

"پولیس!" بیگم فرخندہ چلائیں۔ "میں کہتی ہوں فوراً پولیس کو بلایا جائے —— اب فضول باتوں میں وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"اگر آپ لوگ یہی چاہتے ہیں تو میں پولیس کو فون کر دوں گی۔" شبانہ نے کہا۔ "لیکن میرا مشورہ ہے کہ کسی جاننے والے پولیس آفیسر کو بلایا جائے جو کیس میں ذرا زیادہ دلچسپی لے سکے۔ یہاں اسپیشل سی آئی ڈی برانچ کے ایک انسپکٹر ملک میرے دوست ہیں۔ اگر آپ کہیں تو میں ان کو بلائے لیتی ہوں۔"

"میرے خیال سے" آفیسر نے کہا "اگر کوئی کال آتی تو پولیس انسپکٹر آگیا ہوتا۔ ہم اب لوگوں سے سوالات کر کے پتا لگانے کی کوشش کریں گے۔"

"میں ابھی فون کرتی ہوں۔"

شہلا نے فون کو کمرے میں جا کر ڈائل کیا اور واپس آئی اور بولی:

"انسپکٹر آفس میں نہیں تھے۔ میں نے پیغام چھوڑ دیا ہے کہ جیسے ہی وہ آئیں ان کو یہاں بھیج دیا جائے۔"

اسی وقت ملازم شوکت ایک بڑا پیکٹ لیے اندر داخل ہوا اور بولا "بی بی جی! یہ پیکٹ دروازے میں پڑا تھا۔"

شہلا نے اس کے ہاتھ سے پیکٹ چھین لیا۔ یہ پیکٹ مس نشی کے نام تھا۔ شہلا نے کہا "یہ پیکٹ آپ کے نام ہے مس نشی۔"

نشی نے جلدی سے پیکٹ لے کر کھول کر دیکھا۔ اس میں کاغذ کے دو کھلونے پانی کے جہاز تھے۔

"عجیب بات ہے! یہ تو ویسے ہی جہاز ہیں جیسے پچھلے ہفتے یہاں کسی نے لا کر دیے تھے۔"

"اور وہ ابھی تک یہیں پڑے ہیں۔ اور پھر کوئی ان سے کھیل رہا تھا۔"

شہلا نے سر ہلا کر کہا "اس کا مطلب ہے یہ جہاز بھی رات کو چوروں کے ساتھ چلے گئے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ یہ کس کا مذاق ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی ستم ظریف ہمارے ساتھ عملی مذاق کر رہا ہے۔"

"یہ مذاق ہے؟" بیگم فرخندہ بولیں "خدا رحم کرے۔ مجھے تو ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے میں جرائم پیشہ لوگوں کے درمیان گھر گئی ہوں۔"

"فکر نہ کیجیے انسپکٹر ملک آنے والے ہیں۔ وہ سب کچھ سنبھال لیں گے۔" یہ کہہ کر شہلا کمرے سے باہر چلی گئی۔

کوئی ایک گھنٹہ وہ کوٹھی کے باہر گھومتی رہی۔ یہ کوٹھی شہر سے باہر تھی۔ کوٹھی کے ایک طرف جنگل سا پھیلا ہوا تھا جس میں جھاڑیاں تھیں، بڑے بڑے پتھر تھے اور سبزہ بھی تھا۔

ایک گھنٹے بعد وہ واپس آئی تو بیگم فرخندہ نے بے چینی کے عالم میں کہا "کہاں ہے وہ تمہارا انسپکٹر ——— مجھے اب ڈر ہے کہ کہیں ہم نے خوامخواہ پولیس کو بلایا ——— یا ———"

الفاظ ان کے منہ میں ہی رہ گئے۔ باہر گاڑی کی آہٹ سنائی دی۔ آہٹ سنتے ہی شہلا باہر بھاگی۔

اس بار تیسرا تحفہ موجود تھا۔ یہ چھوٹی سی کپڑے کی گڑیا تھی۔ وہ فیتے کے جھگڑے میں لپٹی ہوئی تھی۔

شہلا باسکٹ اندر رکھ کر بھاگتی ہوئی باہر گئی۔ گلی میں دور دور تک کوئی نہیں تھا۔ باہر کسی کا نام و نشان نہیں تھا۔ شہلا نے قریب کی ساری جھاڑیوں میں بھی تلاش کیا لیکن کوئی شخص نظر نہ آیا۔ باسکٹ رکھنے والا یا تو ہوا میں غائب ہو گیا تھا یا قریب کے کسی گھر میں گھس گیا تھا۔

واپس آنے پر شہلا کو بتایا گیا کہ ملک صاحب باسکٹ دروازے پر ہی چھوڑ گئے تھے۔ یہ کیسا عجیب واقعہ ہے۔ پھر بیگم نے اس کو الماری میں رکھ دیا۔

"حیرت ہے" شہلا نے تعجب سے کہا "سوال یہ ہے کہ یہ اس قسم کے تحفے کون بھیج رہا ہے اور اس حرکت سے اس کا کیا مقصد ہے؟"

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ہمیں خفیہ پیغام دے رہا ہے" بولیں "پہلے دو جوتے، پھر دو جہاز، پھر دو کھلونے، پھر دو جگ" شہلا نے محسوس کیا کہ ہر چیز دو دو تھیں اور ہر چیز دو سے شروع ہوتی ہے۔

شہلا نے تعریفی لہجے میں کہا "آپ بہت ذہین ہیں مس نشی۔ واقعی ان تحفوں میں کوئی خاص مقصد معلوم ہوتا ہے۔ ہاں میں بھول گئی کہ یہ تحفہ بھی کسی کے نام تھا۔"

"مسٹر اکمل کے نام تھا" نشی نے کہا "ایک کاغذ کا ٹکڑا پڑا ہوا تھا جس میں مسٹر اکمل کا نام لکھا تھا۔"

"ٹھیک کہا۔ پہلا تحفہ رشید کے نام، دوسرا مس نشی کے نام، تیسرا مسٹر اکمل کے نام۔"

اکمل صاحب کمرے میں پاگلوں کی طرح ٹہل رہا تھا۔ اس نے یکایک رک کر غصے سے کہا "بس اب برداشت نہیں ہو سکتا۔ میں ابھی پولیس کو فون کرنے جا رہا ہوں۔"

اسی وقت خوش قسمتی سے رشید اندر داخل ہوا کہ "ایک پولیس انسپکٹر اور چند سپاہی آئے ہیں۔"

"انسپکٹر ملک آ پہنچے۔" یہ کہہ کر شہلا باہر کی جانب بھاگی۔ سی آئی ڈی انسپکٹر ملک بڑا ہی مستعد شخص تھا۔ اس کی شکل سے ذہانت کا اظہار ہوتا تھا۔ اس نے بڑی سنجیدگی سے سب کے بیانات سنے۔ وہ تحفے دیکھے، پورے مکان کی تلاشی لی۔ آخر شہلا سے کوٹھی میں آنے والے تمام لوگوں کے بارے میں پوچھ گچھ کی اور اس نے اعلان کیا،

"لیڈیز اینڈ جنٹلمین میری درخواست ہے کہ آپ سب لوگ لائبریری روم میں چلے جائیں۔ میں دو سپاہی لائبریری روم کے دروازے پر مقرر کر رہا ہوں۔ آپ میں سے کوئی صاحب کمرے سے باہر نہیں آئیں گے۔ خیال رہے، میں محض کہتا ہوں کہ کوئی صاحب سب تک میری اجازت نہ ہو اس کمرے سے باہر نہ آئیں گے۔"

رضیہ نے احتجاج کیا۔ "لیکن یہ زیادتی ہے۔"

"پلیز ـــــ" انسپکٹر ملک نے کہا۔ "مسز جلال اگر آپ میری مدد چاہتی ہیں تو میرے ساتھ تعاون کیجئے اور جو کچھ میں کہوں اس پر عمل کیجئے۔ کیس بہت خطرناک اور پُرپیچ ہے صرف مس شبانہ میرے ساتھ رہیں گی۔ کیونکہ وہ خود جاسوس ہیں۔"

تھوڑی سی تگ و دو کے بعد سب لوگ لائبریری میں چلے گئے۔ ملازمین کو ان کے کوارٹر میں بھیج دیا گیا اور دونوں جگہ سپاہی پہرے پر کھڑے کر دیئے گئے۔

اس کے بعد شبانہ اور انسپکٹر ملک غائب ہو گئے۔

یہ دس بجے کی بات تھی۔ ٹھیک بارہ بجے شبانہ اور انسپکٹر ملک نے لائبریری روم کا دروازہ کھولا۔ انسپکٹر نے کہا۔ "مجھے افسوس ہے کہ آپ یہاں قیدیوں کی طرح بند رہے لیکن یہ ضروری تھا۔ اب براہ کرم سب لوگ مسٹر جلال کے آفس میں تشریف لے آئیں۔ مس شبانہ اس کمرے میں ایک دلچسپ چیز آپ سب کو دکھانا چاہتی ہیں۔"

وہ سب دبے لفظوں میں احتجاج کرتے ہوئے آفس کے کمرے میں آ گئے۔ ملازموں کو بھی بلوا لیا گیا۔

جب سب لوگ آرام سے بیٹھ گئے تو شبانہ نے کہا۔

"ہم سب لوگ پرسوں رات کو یہاں جمع ہوئے تھے۔ میں آٹھ سال کے بعد رضیہ سے ملی تھی۔ رضیہ میری کالج کی ساتھی ہے۔ میرا خیال تھا کہ یہاں دو کر دن کچھ روز آرام سے گزاروں گی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آرام میرے مقدر میں نہیں ہے۔ یہاں پہنچتے ہی کچھ پُراسرار حالات نے ہم سب کو گھیر لیا۔ پہلے جلال پاشا غائب ہوئے پھر دوسری رات کسی نے ہم سب کو نشیلی دوا کھلا کر بے ہوش کر دیا۔ آج دن میں ہمیں عجیب و غریب تحفے ملے۔ دُو جوتے، دُو جہاز، دُو جنگ۔

مس لشی کے کہنے کے مطابق یہ تحفے اس لئے اور بھی عجیب ہیں کہ ہر تحفہ جوڑا اور "ج" سے شروع ہوتا ہے۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ یہ تحفے بھیجنے والا کون ہے اور کیوں وہ اس طرح کے "بامعنی" تحفے بھیج رہا ہے؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ رات کو ہم سب لوگوں کو بے ہوش کرنے والا کون ہے؟ اور تیسرا سوال یہ ہے کہ مسٹر جلال کہاں گئے؟

"میرا خیال ہے ان باتوں کو سمجھنے کے لئے ہمیں اس کمرے کا راز سمجھنا پڑے گا۔ کیونکہ جلال پاشا اسی کمرے سے غائب ہوئے ہیں، اور اسی کمرے کی دیوار کا کلاک رات کو غائب ہوا تھا اور صبح واپس آ گیا تھا۔"

مس لشی بولی۔ "لیکن ابھی ہمارے پاس کیا ثبوت ہے مس شبانہ کہ کلاک رات کو غائب ہوا تھا۔"

شبانہ نے کہا۔ "ویری گڈ مس لشی آپ واقعی ذہین ہیں۔ آپ میں جاسوس بننے کی صلاحیت موجود ہے۔ واقعی ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں کہ کلاک رات کو اس کمرے سے غائب ہوا تھا یا نہیں ـــــ لیکن چونکہ مجھے اپنے حواس پر پورا بھروسہ ہے، اس لئے میں پورے یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ پرسوں رات کو یا تو اس ہال نے کے اوپر رات کو اندھیرے میں چمکنے والا کلاک نہیں تھا، یا اس کی دیوار پر یہ شیشہ نہیں تھا۔

"چونکہ شیشہ بہت بڑا ہے اور اس کو نہیں ہٹایا جا سکتا تھا اس لئے میں نے یہی اندازہ لگایا کہ کلاک رات کو غائب ہوا تھا۔" شبانہ نے ایک گہرا سا سانس لیا پھر لمحے خاموش رہی پھر وہ بولی۔ "اور یہی میری غلطی تھی۔"

"کیا ـــــ؟" لشی نے حیرت سے کہا۔

"یہ کہ میں نے سمجھ لیا کہ شیشہ دیوار سے نہیں ہٹایا جا سکتا۔ آج مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ شیشہ اگر نہیں ہٹایا جا سکتا تو دیوار ہٹائی جا سکتی ہے۔ اور آپ لوگ سمجھ رہے ہیں کہ میرا دماغ خراب ہے۔ بھلا دیوار کیسے ہٹ سکتی ہے؟ لیکن میں دکھاتی ہوں کہ دیوار کیسے ہٹ سکتی ہے۔"

یہ کہہ کر شبانہ شیشہ کے قریب گئی۔ اس نے ہاتھ بلند کر کے شیشے کے قریب دیوار میں کسی چیز کو دبایا۔

اس کے ساتھ ہی ہر شخص کے حلق سے حیرت کی آوازیں نکل پڑیں کیونکہ کوئی خفیہ کانی دبتے ہی شیشہ آگے سرک گیا اس کے بعد شبانہ نے شیشے کو کھینچا ـــــ اور پورا شیشہ دروازہ کی طرح کھل گیا۔

شیشے کے پیچھے ایک بہت چھوٹی سی کوٹھری جیسی جگہ تھی۔

ایک بار پھر ہر شخص کے حلق سے دبی دبی چیخیں نکل گئیں رضیہ خاص طور پر چلائی۔ "جلال صاحب!"

کوٹھری جیسی سیف میں جلال پاشا کھڑے تھے۔ جلال پاشا نے مسکراتے ہوئے قدم باہر رکھا۔

اس وقت اس دن کا سب سے عجیب اور حیرت انگیز واقعہ پیش آیا۔ انجینئر اکمل یکایک کرسی سے اٹھا اور چیخ کر بولا۔

"نہیں ——— نہیں ——— یہ ناممکن ہے۔ یہ بالکل ناممکن ہے۔ یہ جلال نہیں ہو سکتا۔ میں نے خود اس کو کل رات نہیں پرسوں رات میں نے خود اس کو قتل کیا ہے۔"

یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں ——— وہ بے ہوش ہو کر فرش پر گر پڑا۔ اس کے ساتھ ہی رضیہ کے حلق سے بھی ایک چیخ نکلی اور وہ بھی بے ہوش ہو کر اپنی ماں کی گود میں ڈھلک گئی۔

"آل رائیٹ مسٹر سوشیل۔" شبانہ نے کہا۔ "اب آپ میک اپ اتار دیجئے اور ان لوگوں سے ملئے۔"

کوٹھری سے باہر آنے والے شخص نے اپنی فرنچ داڑھی اتاردی اور سر کو خم کر کے بولا۔ "آداب عرض، لیڈیز اینڈ جنٹلمین میرا نام سوشیل ہے اور میں ایک اداکار ہوں۔"

چند لمحوں کے لئے کمرے میں موت کا سا سناٹا چھا گیا۔

آدھے گھنٹے بعد جب اکمل کو گرفتار کر کے پولیس اسٹیشن بھیج دیا گیا اور رضیہ کو ڈاکٹر نے انجکشن لگا کر سلا دیا تو شبانہ نے لائبریری روم میں سب کو بتایا۔

"دراصل مسٹر جلال اور اکمل کی بیوی افروز ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے اور چھپ چھپ کر ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ رضیہ کو اس بات کا علم تھا لیکن وہ کبھی بات زبان پر نہیں لائی۔ پھر اکمل کو بھی یہ راز معلوم ہو گیا۔

پرسوں رات اکمل جلال پاشا سے اس مسئلے پر بات کرنے آیا تو باتوں باتوں میں جھگڑا ہو گیا اور اکمل نے جلال پاشا کو قتل کر دیا۔ قتل کرنے کے بعد وہ گھبرایا کہ لاش کہاں چھپائے۔ باہر بارش ہو رہی تھی۔ تب اس کو اس خفیہ کوٹھری کا خیال آیا۔ یاد رہے کہ اس مکان کا نقشہ اکمل نے ہی بنایا تھا۔ اور اسے معلوم تھا کہ اس کمرے میں یہ جگہ موجود ہے۔ پھر اس نے لاش کو اس کوٹھری میں چھپا دیا۔ پرسوں رات لائبریری سے میں جب میں نے اس کمرے کا دروازہ کھولا تھا تو اس وقت اکمل لاش کو کوٹھری میں چھپا رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شیشے میں مجھے کوٹھری کا اندر نظر نہیں آیا کیونکہ اس وقت شیشہ دیوار سے ہٹا ہوا تھا۔

اکمل نے میری آہٹ سن لی تھی، وہ چپکے سے اوپر چلا گیا اور جب میں کتابیں لے کر واپس جانے لگی تو اس نے دانستہ مجھے جلال پاشا کہہ کر پکارا، تاکہ میں سمجھوں کہ اندھیرے میں وہ مجھے جلال پاشا سمجھ رہا ہے۔

اس کے بعد دوسری رات اس نے ہم سب کی کافی میں خواب آور دوا ملا کر ہمیں بے ہوش کر دیا۔ اور لاش کو لے جا کر تھوہڑ کے درمیان دبا دیا۔

اس کمرے میں یہ خفیہ جگہ میں نے کل ہی تلاش کر لی تھی اور مجھے کل ہی علم ہو گیا تھا کہ جلال پاشا قتل کر دیئے گئے ہیں کیونکہ کل شام تک ان کی لاش کوٹھری میں موجود تھی۔ جب آج لاش غائب ہو گئی تو میں سمجھ گئی کہ رات کو ہمیں اس لئے بے ہوش کیا گیا تھا تاکہ قاتل لاش کو دبا سکے۔ آج دن میں میں نے وہ جگہ بھی تلاش کر لی تھی جہاں جلال پاشا کو دبایا گیا ہے۔"

وہ سانس لینے کے لئے رکی تو لشی نے کہا "مس شبانہ پھر وہ پراسرار تحفے کس نے بھیجے تھے؟"

شبانہ نے مسکرا کر کہا۔ "میں نے۔ مجھے کل ہی معلوم ہو چکا تھا کہ قاتل اکمل ہے لیکن ہمارے پاس اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھا اس لئے میں نے اس کو نروس کرنے کے لئے یہ سارا ڈرامہ کھیلا تھا۔

انسپکٹر ملک کو صبح ہی میں فون کر کے سارے حالات بتا چکی تھی اور یہ تحفے مسٹر ملک ایک سپاہی کے ہاتھ بھجوا رہے تھے۔ تحفے خود میں باہر ہو کر پہنچاتی رہتی تھی۔

اس کے بعد مسٹر ملک کے ذریعہ ہی میں نے مسٹر سوشیل کی خدمات حاصل کیں۔ مسٹر سوشیل اسٹیج ایکٹر ہیں اور میک اپ کے ماہر ہیں۔ جلال پاشا کا فوٹو دکھا کر ہم نے ان کا میک اپ کیا اور ان کے کپڑے پہنا کر ان کو کوٹھری میں کھڑا کر دیا۔ اسی وجہ سے آپ لوگوں کو لائبریری میں قید کیا گیا تھا۔ مقصد صرف اکمل کو نروس کرنا تھا اور وہی ہوا۔ جیسے ہی جلال پاشا کو دیکھ کر اکمل کے ہوش اڑ گئے اور وہ خوف زدہ ہو کر اقبال جرم کر بیٹھا۔

"بس یہ کل واقعات ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ آٹھ سال بعد میں رضیہ سے ملی اور اس بے چاری کو یہ صدمہ دیکھنا پڑا۔"

لشی نے کہا۔ "لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ محض آپ کی وجہ سے قاتل گرفتار ہو سکا ہے مس شبانہ، ورنہ اس جرم کا راز کبھی نہ کھلتا۔"

جواب میں شبانہ صرف مسکرا دی۔

اسے اگر کسی چیز سے دلی بغض اور چڑ تھی تو وہ اس کا نام تھا۔ ماں باپ نے لاڈ میں آکر اس کو گڑیا کہہ دیا تھا تو اس کا مطلب یہ تھوڑی تھا کہ اب جبکہ وہ بیس برس کی لمبی تڑنگی تندرست دوشیزہ ہو گئی تھی سب کے لئے گڑیا ہی رہتی۔ ماں دو چھ بھائیوں کے بعد اللہ آمین سے ساتویں "بٹیا" بن کر آئی تھی۔ یہ صدقے پتلی گول مٹول سی بالشت کی لمبائی کی گوری سی لڑکی۔ ماں نے اس ننھے سے لوتھڑے کو میری گڑیا کہہ کر کلیجے سے لگایا۔ باپ نے پیار بھری نظر ڈال کر میری گڑیا رانی کہا تو تلے اوپر کے ننھے منے بھائیوں نے گڑیا گڑیا کہا۔ آٹھ دس برس تک وہ واقعی چھوٹی موٹی ناک والی گڑیا ہی معلوم ہوتی رہی۔ لیکن جیسے جیسے سن گزرتے گئے اس کا حلیہ بدلتا گیا۔ اب بیس برس کے سن میں تو وہ ایسے کسے بندھے جسم اور لمبے قد کی بھرپور دوشیزہ بن گئی تھی کہ گڑیا پکارنا حماقت ہی معلوم ہوتا تھا۔ لیکن ماں باپ کی نظروں میں وہ اب بھی گڑیا تھی۔ وہی ننھی منی سی بالشت بھر کی جان۔ بھائیوں کی نظروں میں وہ اب بھی گڑیا تھی شریر چلبلی سی چھوکری۔ اور تو اور اسے احسن پر غصہ آتا۔ کم از کم اس کو تو یہ حماقت آمیز نام سے اس کو مخاطب کرنا چاہئے۔ احسن جو اس کا چچا زاد بھائی تھا اور بقول چچی اماں کے بچپنے کا منگیتر بھی۔ بھائیوں کو وہ ٹوکتی تو سب کے سب اس کا مذاق بنانے لگتے۔ اماں ابا سے کچھ بس نہ چل پاتا۔ اچھا بھلا اس کا نام کنیز فاطمہ تھا اسے پورا نہ پکارا جاتا صرف کنیز ہی ہر ایک کے لئے اس کو لونڈی بنانا منظور تھا۔ لیکن گڑیا کہلانا سو ان کی طرح تھا۔ فاطمہ کے جانے پر زور دیا تو سب سے پہلے اماں نے کانوں پر ہاتھ رکھے۔

"نانا بابا۔ جھٹ انھوں نے منہ سے ہر وقت یہ پاک نام پکار کر بے ادبی ہو گی۔" اماں کی آواز گنبد کی آواز بن گئی۔ اور قصہ ختم ہوا۔

احسن اس کا منگیتر تھا۔ قاعدے سے اس کو احسن سے جی بھر بھر کر شرمانا چاہئے تھا۔ لیکن وہ احسن سے کبھی نہ شرمائی۔ نہ اس کا نام سن کر آنچل میں منہ دیا، نہ آمد کی خبر سن کر سرپٹ بھاگ کر کسی کونے میں پناہ لی۔ دونوں ساتھ ہی کھیلے، ساتھ ہی جوان ہوئے اور بڑے بھی ساتھ ہی ہونے کو ٹھانے بیٹھے تھے۔ اماں یوں تو ذرا کٹر خیالات کی تھیں۔ لیکن ان دونوں کے معاملے میں انھوں نے بھی چپ سادھ لی۔ لاڈلی بٹیا اگر ناک کٹا کر رہ جاتیں بھی چھوڑ کر دیتی تو وہ اُف نہ کرتیں۔ رہے باپ بھائی وہ تھے ہی روشن خیال اگر وہ احسن سے پردہ کرتی بھی تو تڑوا دیتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دونوں نکاح کے ایک روز پہلے تک منجھلے اور چھوٹے بھائی کے ساتھ تاش کھیلا کئے۔

شادی میں آئی مہمان بیویوں نے بیٹھے کرتے سرگوشیاں کیں۔ اچھی بھلی آنکھیں حیرت اور دہشت سے پھاڑ پھاڑ لیں۔ لیکن دلہن اور دولہا کے کان پر جوں نہ رینگی۔ رخصتی کے وقت اس نے لڑکیوں کو گلا پھاڑ پھاڑ کر روتے سنا تھا۔

"توبہ ہے یوں تو سانس لیتے بھی شرم آتی ہے اب یہ ہزاروں مردوں عورتوں کے بیچ کلیجہ سے چیخیں نکالتے میں جھینپ نہیں لگتی۔"

رخصتی ہوئی تو اس طرح جیسے وہ پہلے پہل ماں باپ بھائیوں سے چھوٹ کر سسرال نہ جا رہی ہو بلکہ کہیں پکنک کا پروگرام بنا ہو۔ جہاں ماں باپ خوش تھے بھائی خوش تھے، وہ خوش تھی اور احسن تو باغ باغ ہو رہا



گڑیا

عطیہ پروین

وہ اپنے بگڑے نام سے بہت خائف تھی

تھا جیسے کہ جیک نے بصد خوب صورت لڑکی اس کی زندگی کی بہار بن گئی
تھی۔ احسن سے اس کو وہ سب کچھ ملا جو لڑکیاں اپنے محبوب شوہر سے چاہتی
ہیں۔ حقیقتاً اس کا محبوب بھی تھا اور شوہر بھی۔ لیکن ایک بات جو اس
کے دل میں سوئی کی نوک سے بھی زیادہ کھٹکتی تھی، وہ تھی احسن کی لاابالی سی
طبیعت۔ اس نے احسن سے صاف اور کھلے الفاظ میں کہہ دیا تھا۔

"دیکھو ویسے تو میں ٹال بھی جایا کرتی تھی مگر اب اس بات
پر جھگڑا ہو جائے گا۔"

"کس بات پر میری جان؟" احسن اس پر قربان ہوتے ہوئے بولا۔

"اب خبردار جو مجھے کبھی گڑیا کہا۔"

"اوہ! بس اتنی سی بات! نہ کہوں گا مگر پھر کس طرح مخاطب
کروں ۔۔؟"

"جیسے سب میاں بیوی آپس میں مخاطب ہوتے ہیں اور جیسے
مہر میاں اور مہر بی بی بھی تو الگ الگ طرح کے ہوتے ہیں۔
مثلاً بھائی صاحب اپنی بیوی کو بلاتے ہیں..... کہہ کر مخاطب کرتے
ہیں۔ ابا اماں کو احسن کی ماں یا محسن کی اماں کہتے ہیں۔ ہمارے بھیا بھابی
کو اماں ابا کے سامنے بھی ڈیئر کہتے ہیں۔ مجھے بتیا ...."

"اف بس بھی کرو تم تو بس مجھے ....." اور
پھر اس کو جانے کیوں شرم سی آ گئی۔ اس کا سرخ و سفید چہرہ اور بھی لال
ہو گیا۔

"کیا کہا کروں .....؟" احسن اس کے گلنار چہرے کو ستائشی
نگاہ سے دیکھ کر بولا۔

"مجھے بڑا اچھا لگتا ہے جو لوگ اپنی بی بیوں کو بیگم کہہ کر
پکارتے ہیں۔"

"تو میں بھی تمہیں بیگم پکاروں گا۔"

"سچ .... ہو؟" احسن اگر اس کی صراحی دار گردن میں سچے
موتیوں کی لڑی بھی لا کر ڈال دیتا تو اس کو اتنی مسرت نہ ہوتی۔ احسن
کے جانے کے بعد وہ قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اونچا قد،
بھرا بھرا جسم جو شادی کے بعد اور بھی نکھر آیا تھا۔ اس نے اپنے چمکتے
بے داغ چہرے کو دیکھ کر سوچا۔

"وہ واقعی اب بھی بیگم کہے جانے کے لائق ہے۔" یہ نام اس کے
احساسات پر ایک نشہ سا بن کر چھا گیا۔ ایک عجیب سا سرور تھا کہ اس
کی گزشتہ آرزو کی تکمیل شادی کے بعد ہوئی تھی کہ کہہ کر تھک گئی تھی اور

گئی مگر تمام نہ پلٹ سکتا۔ جواب میں خفیف سا کچھ بڑبڑا سا پکارتا تمام۔

"گڑیا ۔۔ اس نے منہ بچکایا۔ بھلا بتاؤ، یہ قد و قامت یہ چہرہ،
یہ شان یہ ٹھاٹ اور پکاری جاؤں گڑیا۔"

احسن جس وقت بیگم کہتا اس کا دل گز بھر کا ہو جاتا۔ لذت شکر احسن
پر پیار آنے لگتا۔ ایسا لگتا احسن نے اس کو ملکہ کائنات بنا دیا ہو۔ یہ چار
حرف احسن کے ہونٹوں سے شہد میں ات پت نکلتے اور اس کے کانوں میں
ٹپک کر رہ جاتے۔ مگر احسن اس کو مستقل یہ سرور بخشنے نہ دے سکا۔ ہمیشہ کا
لاابالی اور بھلکڑ قسم کا آدمی۔ کسی وقت بیگم پکارتا کسی وقت لاڈ میں آ کر
وہی گڑیا ۔۔!

گڑیا کا جی چاہتا کپڑے پھاڑ کر کسی طرف نکل جائے۔ اپنی اور
احسن کی جان ایک کر دے۔ روتی، الزامات کی بوچھاڑ کرتے کرتے پڑ جاتی۔ تب
احسن حیران پریشان پاگل سا بنا پروانے کی طرح اس کے پلنگ کے چکر
لگایا کرتا۔

"ارے خدا کے لئے میرا قصور تو بتا دو؟"

"کیوں گڑیا کہا مجھے؟" وہ آنسوؤں کے درمیان کہتی۔ "تم جان بوجھ
کر مجھے تکلیف پہنچاتے ہو۔"

"مان گیا۔ اپنی غلطی مان گیا۔ خدا کے لئے معاف کر دو۔ اب
نہ کہوں گا۔" گویا بچے کی منت کر کے وہ دلہن والی کو آخر منا ہی لیتا۔ بیگم بیگم
کہہ کر تب وہ جھوٹ موٹ کی خفگی کر دیتا اور خود اس کا نام بن ہی جاتی۔ اماں ٹھنڈی
ابا ٹھنڈی سانسیں بھرتے، بھائی بھاوج کھسر پھسر کرتے رہتے لیکن گڑیا
نے میکہ ایسا چھوڑا کہ پھر جانے کا نام نہ لیا۔ لوگ یہی سمجھے کہ میاں نے لیا
من موہ لیا ہے کہ ماں باپ کی محبت بھول گئی۔ اصل راز تو بس وہی جانتی
تھی۔ ماں نے دنوں کے بعد اس کی دلی مراد پوری ہوئی تھی۔ بیگم کا اعزاز چھوڑ
کر پھر سے گڑیا نہیں بننا چاہتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اب اس کی شادی
ہو گئی ہے۔ مستقبل میں اللہ کے گود بھرنے والی ہے پر اماں ابا کی وہی
گڑیا ہے۔ وہ لوگ آتے تو وہ جانے سے گھٹتے ہی لپک کر گڑیا!! کی
آواز بلند کرتے اور وہ جہاں بھی ہوتی پتھر کی طرح ساکت ہو جاتی، بت کی
طرح منجمد ہو جاتی۔ سارا جوش، سارے ولولے، ساری فرمانبرداری بھاپ کی مانند
اڑ جاتی۔ ماں باپ کا استقبال وہ ایسے کرتی جیسے وہ دشمن نادشمن ہوں۔ بیچارے
اس کے شرح ... رکھتے ... جواب سسری تھے، اٹھتے بیٹھتے دلہن
بیگم رشتے۔ اس کا بس نہ چلتا دونوں بوڑھوں کی جوتیاں آنکھوں پر رکھ لے۔
فرمانبرداری کے عالم میں ... اس نے ... کر کے دیئے تھے ماں باپ کے

گن گاتے تھکتیں۔ بستر پر کا کٹ پٹتے دیکھ کر اساس تو تھا ہی پروانہ۔
جیسے جیسے ان کا لگ بھگ ختے تھے جیٹھانی سے نگو نمٹ اٹھتے ہی میاں کی کمائی پر
سارا حق جتا کر جدا الگ کر لیا تھا۔ پہلا زچہ خانہ سرا جیٹھ کا ہو ہی نہ پایا تھا کہ
نخچے سے اتنے سے کر کے دوسرے مکان میں منتقل ہو گئی۔ دودھ کے جلے کی
طرح اس کی خوش دامن نے اس کو پھونک پھونک کر دیکھا، سمجھا، پرکھا
اور آخر ان کو اپنی رائے بدلنی پڑی کہ ایک مچھلی ہی سارے تالاب کو گندا
کرتی ہے ورنہ تالاب کا پانی کچھ ایسا گندا نہیں ہوتا ہے۔ بڑی بہو کے لگائے
ہوئے زخموں پر چھوٹی بہو نے بھرپور مرہم رکھا۔ مگر خود اس کے دل کے
زخم پر نمک پاشی ہوتی ہی رہتی۔ ایک روز احسن کے ایک بڑے تاجر
کے حیدرآبادی دوست معہ اپنی بیگم کے ملنے آئے تھے۔ سولہ سنگھار کر کے
جب وہ سامنے پہنچی تو وہ بے اختیار اس کے حسن کے قصیدے پڑھنے لگے

"ماشاء اللہ بڑی ہی خوبصورت، بڑی ہی باوقار شخصیت ہے آپ کی"
دوست کی بیگم صاحبہ بھی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی تعریف کر رہی تھیں
اور ابھی وہ ان کے خوبصورت الفاظ کی بازگشت میں ڈوبی ہوئی اترا ہی
رہی تھی کہ اچانک بم پھٹ پڑا۔

"مگر بیا آ . . . بے اولاد ہیں۔"

"ہائے بھابی گڑیا کہاں ہے ہماری؟" اماں مارے لاڈ کے مری
جا رہی تھیں۔ قبل اس کے کہ وہ اندر کو باہر جاتی، بچی اماں بڑھ کر کمرے کے
اندر سے آئیں۔ بس پھر جو اماں نے گڑیا کا تانا بانا باندھا تو اس کا حال غیر ہو گیا
سارا وقار اس ایک لفظ کے بوجھ تلے چکنا چور ہو کر رہ گیا۔ اس بات اس
نے مصمم ارادہ کر لیا۔ دوسرے روز احسن نے جا کر اس کے گھر میں فارغ
دیا۔ بجائے اس کے اماں شرمندہ ہوتیں، شرمندہ کرانے والی تو ہنس ہنس کر
لوٹ گئیں۔

"اوئی۔ تو پھر اسے بڑھیا ہی کیوں نہ کہا کرو، بڑا شوق ہے نا۔"

"بلا سے بڑھیا ہی کہیں پر یہ نحوس نام!" چڑ کر اس نے مٹھیاں
بھینچ لیں۔

"مگر تمہارے ہاں پہلی لڑکی ہوئی تو اس کو گڑیا ہی کہیں گے
سب کی زبانیں تھوڑی پکڑی جاتی ہیں نا۔ اس طرح عادت نہیں جائے گی۔ دوسری
گڑیا آ جائے گی تو تم خود بخود کنیز فاطمہ بن جاؤ گی۔" منجھلی بھابی نے اس
سے کہا۔

"اللہ نہ کرے لڑکی ہو۔" ساس بول اٹھیں۔ "پہلی پہلوٹھی کا بیٹا ہو
گھر کا چراغ جلے۔"

"یا اللہ مجھے لڑکی ہی دینا۔" بلک کر اس نے دل میں کہا۔ پھر
دعا اس کا وظیفہ بن گئی۔ جو اللہ نے اس کو کسی نیکی کے عوض میں قبول
کر لی۔ زندگی اور موت کی شدید جنگ کے بعد جب اس نے ہوش میں آ کر
آنکھ کھولی تو اس کا دل خوف اور امید کے بیچ ڈوبا جا رہا تھا۔ ننھا سا
وجود سفید کپڑے اور چھوٹی سی رضائی میں لپٹا ماں کے پہلو سے لگا تھا۔
ساس الگ ناک منہ لٹکائے بیٹھی تھیں۔ اس کا جی چاہا آنکھیں [illegible]
پھیرے۔

"میری بچی! میری گڑیا!!" اماں نہال ہوئی جا رہی تھیں۔

"آ گئی گھر پر جھاڑو پھیرنے ...." ساس اماں منہ بنا کر
بولیں۔ پہلی بار اس کا جی چاہا کہ وہ جھریوں بھرا چہرہ نوچ لے۔ یہ گڑیا تو
اس کے لیے مسرت بن کر آئی تھی۔ یہ خوشی اس کے انگ انگ پر کچھ
اس طرح چھائی کہ زچہ خانے سے وہ نکلی تو معلوم ہی نہ ہوا کہ مہینہ بھر کی
زچہ ہے۔ چہرہ پر بشاشت، تازگی اور چمک آ گئی تھی۔ جسم شیشے کی طرح
چمکیلا اور سڈول ہو گیا تھا۔ گڑیا کے آنے کے بعد تو وہ اس طرح
کنیز فاطمہ پکاری جانے لگی جیسے سب کی زبانوں سے یہی نام پھرتا ہو،
کنیز فاطمہ بن کر اس نے سکھ کی سانس لی۔ گڑیا ساس کا پیار بڑھتا ہی گیا
ایسا بڑھا کہ خدا کے فضل سے اوپر تین بیٹے ہوئے۔ خیر سے وہ لڑکے لیکن کنیز فاطمہ
کی آنکھ کا تارا گڑیا ہی رہی۔ بیٹے کی اولادیں تھیں، محبت سب سے تھی،
پر گڑیا کی برابری کوئی نہ کر پاتا۔ ساس جلتی کڑھتی اکیلی گھر کے چراغوں کو تکتی

مولانا عبدالمجید سالک

نے خوشی سے چیختے ہوئے غلام رسول مہر کو متوجہ کیا۔
"سنیئے مہر صاحب! علامہ اقبال کا ایک نیا شعر میں نے ابھی ابھی دریافت کیا ہے۔"
مہر صاحب دفتر کے دوسرے کمرے میں بیٹھے بیٹھے بڑے اشتیاق سے وہ شعر سننے کے لیے گوش برآواز ہو کر بولے۔
"فرمایئے!"
اور سالک صاحب نے انتہائی متانت کے ساتھ یہ شعر پڑھ دیا۔

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا

لیٹنے کی بجائے وہ پرانی روشنی پر جی جان واری کئے بیٹھی رہی تھی۔ ثریا نے دنیا میں آنکھ جہاں ماں کو شاد کیا وہاں اپنے ننھیال کے لئے بھی کشش بنی۔ مجبوراً نانی نانا باپ نے کنیز فاطمہ کو دوبارہ پالیا پہلے میکے کی دہلیز دیکھنا گوارا نہ کرتی تھی اب ہر آٹھویں روز اماں کی گودی میں پہنچ جاتی۔

اس کی دیکھا دیکھی احسن بھی ثریا کو زیادہ ماننے لگا۔ انگلی بھی دکھ جاتی تو دونوں کا دانہ پانی چھٹ جاتا۔

"یا اللہ! جب میری بچی کی شادی ہو جائے گی تو میں اس کے بغیر کیسے رہ سکوں گی؟" کنیز فاطمہ بڑے لاڈ بھرے خوف کے ساتھ کہتی۔

"شنو سسرال جائے گی۔ ثریا کے دولہا کو گھر داماد بنائیں گے۔" احسن بڑے سبھاؤ سے کہتا اور ساس اماں یہ سن کر دعا دیتیں۔

"ہاں اور کیا۔ دنیا سے نرالی ہے تمہاری لونڈیا۔ زندگی بھر کلیجہ پہ دھری رہے گی۔"

"ہاں زندگی بھر کلیجے لگی رہے گی۔" کنیز فاطمہ کھینچ کر ثریا کو سینے سے لگا لیتی۔

"ہو بہو تمہارا نقشہ ہے۔" احسن کہتا۔ "یہ بڑی ہوگی تو مجھے تمہاری جوانی لوٹ آئے گی۔"

ہوا بھی یہی ثریا جیسے جیسے بڑی ہو رہی تھی کنیز فاطمہ کی جوانی اس کی صورت میں واپس آ رہی تھی۔ وہی شگفتہ دمکتا ہوا چہرہ، وہی بھرا بھرا جسم، اونچا قد، ویسے ہی ایڑی کو چھوتے ہوئے بال، جگمگاتی آنکھیں، مسکراتے

خم دار لب۔ انہیں دنوں ثریا کی سولہویں سالگرہ تھی۔ کنیز فاطمہ کا دل خوشی کے بوجھ سے پھٹا جا رہا تھا۔ لپک کر ادھر دوڑتی کبھی ادھر۔ مہمانوں کو کہتا۔ چائے پانی دیکھنا، آتے ہوئے تحفے سنبھال کر رکھنا۔ بیچارے کام تھے۔ مگر وہ پھرکی کی طرح ناچے جا رہی تھی۔

"کنیز آج تو تمہیں پھر ثریا بننے کو جی چاہ رہا ہے۔" احسن شرارتاً اس کے قریب آ کر کہا۔

"کیوں؟" وہ بڑے زور سے بگڑی۔ "دیکھو مجھ سے بڑا کوئی برا نہ ہوگا ہاں۔"

"بخدا اس سرخ ساڑھی میں لپٹی ثریا ہی لگ رہی ہو۔"

"میں کہتی ہوں ہوش میں ہو۔" احسن اگر ثریا کہہ کر تعریف کرتا تو وہ گلاب کے پھول کی طرح کھل جاتی۔

"خیر اب اللہ رکھے کسی طرف سے ثریا کہے جانے والی نہیں رہ گئی بھابی بول اٹھیں۔" قاعدے سے اب بیگم صاحب ہی پکارنا چاہیئے کیونکہ شان، یہ وقار اور اب سن بھی آ گیا ہے۔۔۔۔"

"اب یہ کہہ کر میرا دل نہ چھوٹا کیجئے بھابی۔" احسن نے مذاق میں کہا: "دیکھنے والے اب بھی مجھے ۳۰ سال سے کم کا سمجھتے ہیں۔ اس لحاظ سے بیگم کے سامنے گدا ہی بن جاؤں گا۔"

"لے چلو! اپنے منہ میاں مٹھو۔" بڑی بھابی نے اپنے کھچڑی بالوں پہ ستاروں جڑا دوپٹہ ڈھانک کر کہا۔ "دور سے سفید بال چمکتے ہیں کوئی اندھا ہی ۳۰ سال سے کم کہے گا۔"

"کیوں بیگم۔ تمہارا کیا خیال ہے؟" احسن نے گھوم کر اس کی طرف دیکھا۔۔۔ اس کے دل کو جیسے کسی نے گھونسا مار کر بٹھا دیا۔ ایک عجیب سی یاسیت اس کے رگ و پے پہ چھا گئی۔ اس نے سر سے پیر تک احسن کو دیکھا۔ گزرتے ہوئے ماہ و سال نے واقعی اس پر کوئی اثر نہ ڈالا تھا۔ ویسا ہی تر و تازہ، ویسا ہی بشاش چمکتا چہرہ، بھونرا جیسے بال، تنا ہوا سینہ۔

"اوئی! یہ دیکھئے ایک سفید بال۔" شنو بھی اب اس کے کندھے تک آ گئی تھی۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے کنیز فاطمہ کی کنپٹی کے اوپر لہراتی لٹ پکڑ کر کہا۔

کنیز فاطمہ بت بن گئی۔ زندگی کا یہ بھرپور عکس تو جیسا کمر تھا۔ اچانک وہ مڑی اور سارے ہنگامے، ساری چہل پہل، ساری روشنیاں چھوڑ کر تیر کی طرح اپنے کمرے میں پہنچ گئی۔ اندر سے دروازہ بند کر کے لرزتی ہوئی ڈری ڈری وہ سنگھار میز کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

ثریا کی دیکھ بھال، ثریا کے بناؤ سنگھار میں وہ اپنا آپ بھولی جا رہی

تھی۔ محنت کی کنگھی، نہ قاعدے سے کپڑے پہنے، نہ لباس اور اپنی آرائش پر کافی وقت صرف کیا کرتی تھی۔ ایک تو اللہ نے صورت اچھی دی تھی، دوسرے اس کو احساسِ حسن بھی دے دیا تھا۔ وہ ہر وقت گڑیا ہی کی طرح سجی بنی رہا کرتی تھی۔ احسن کے دل کو اور لبھانے کے لئے وہ بار بار، رواں رواں محنت سے سنوارا کرتی تھی۔

اب..... اب تو...... ؟ اس کو شدت سے اپنی بے پروائی پر غصہ آیا۔ اس نے واقعی احسن کے ساتھ زیادتی کی تھی، خود اپنے ساتھ زیادتی کی تھی۔ احسن اکثر اسے دبی زبان میں ٹوکتا، لیکن وہ اپنے حالوں اس قدر مگن تھی کہ سن کر بھی غور نہ کرتی۔ آج بھی اگر شوہر نے زبردستی اس کے کپڑے نہ نکالے ہوتے، زبردستی اس کے بال نہ سنوارے ہوتے تو وہ اسی طرح اُجڑی اُجڑی سی گھوما کرتی..

آئینے میں ایک بھرپور عورت کھڑی تھی۔ باوقار، بھاری بھرکم.... بھورا جیسے بال..... اس نے اپنے گھناؤنے جیسے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے احسن کے بالوں کا تصور کیا۔ مگر یہ کیا ؟ اس کے ہاتھوں کی جنبش کے ساتھ ہی ان گھناؤں میں بجلی چمکی ــــــ نہیں نہیں کوئی سفید تاگا رہا ہوگا۔ کنیز فاطمہ نے دل کو تسلی دیتے ہوئے داہنی طرف کے بالوں کو چھیڑا۔ چم چم کئی چاندی کے تار کھنچ گئے۔ کنگھا اس کے ہاتھ سے میز پر گرا، کھن کی آواز ہوئی۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے جھک کر آئینہ اٹھایا اور چہرے کے بالکل قریب لا کر دیکھنے لگی۔ سرخ و سفید مکھن جیسے چہرے پر ہلکا سا پن آ چلا تھا۔ بڑی بڑی آنکھوں کے گوشے پر شکن ہو رہے تھے۔

"میرا دل نہ توڑا کیجئے۔ میں تو گڑا ہی کروں گا۔" احسن اس کے کانوں کے پاس بولا۔ ہاتھ کا آئینہ اس نے رکھ دیا۔

"بخدا بالکل گڑیا سی لگ رہی ہو۔" احسن کے لہجے میں اب بھی پیار تھا، ملک تھی، سچائی تھی، دل سے نکلی ہوئی یہ آواز اس کے اپنے دل میں گدگدی پیدا کرنے لگی۔ وہ آئینے کے سامنے مڑی، جلدی جلدی بال کھولنے، بڑی محنت سے اس نے جتنے بھی چاندی کے تار تھے چُن چُن کر ہوا میں اڑا دیئے۔ پھر جی بھر کر میک اپ کرنے کے بعد اس نے اپنا جائزہ لیا، وہ اب بھی بے حد حسین تھی، بڑی ہی پُرکشش، سرخ ساڑھی میں لپٹی ہوئی، اس کا جی چاہا احسن آ جائے، ابھی آ جائے۔ احسن تو نہیں آیا گڑیا آ گئی، بھی سنوری گلابی سی کلی۔

"امی..... " اس کا منہ پھولا ہوا تھا۔ "یہ سب لوگ آخر کب تک گڑیا کہیں گے۔ ہاں مجھے نہیں اچھا لگتا ہے..."

صاحب ملاقات کی غرض سے مولانا عبدالحلیم شرر کی خدمت میں پہنچے تو مولانا تصنیف و تالیف میں مشغول تھے۔ چند منٹوں تک مولانا نے ان سے کچھ رسمی بات چیت کی، پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ وہ صاحب کچھ دیر تک تو خاموشی سے بیٹھے رہے پھر وہاں سے اٹھ کر چلے گئے لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد پھر واپس آ گئے۔

مولانا نے قدرے حیرت سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا

"کیوں جناب! کچھ کہنا بھول گئے تھے کیا ؟"

اس کے جواب میں وہ صاحب نہایت بھولپن سے کہنے لگے۔

"نہیں مولانا! میں بھولے سے اٹھ کر چلا گیا تھا۔"

اس کا حسن، اس کی جوانی، اس کی آواز، اس کے خیالات اور اس کا نام .... سب ہی کچھ تو اس لڑکی نے چھین لیا تھا۔

"اچھا اچھا منع کر دوں گی سب سے۔" وہ اُبھر کر بولی "ذرا اپنے پاپا کو بھیج دو کام ہے۔"

احسن تو حکم کا بندہ تھا ہی بھاگا ہوا آیا۔

"مجھے کیوں بلوایا ہے بیگم ؟"

"کیا مادی وقت سے پہلے بڑھاپا بناتے جا رہے ہیں۔" وہ اٹھلائی۔

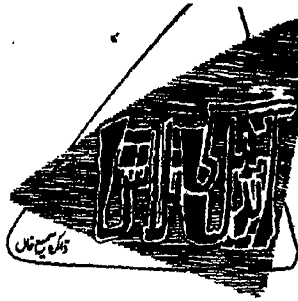
"تمہیں کون بڑھا کر سکتا ہے میری جان۔" احسن کے مضبوط بازو اس کی پھول سی گردن میں حمائل ہو گئے۔ بڑے لاڈ سے اس نے احسن کے سینہ پر سر رکھ دیا۔ برسوں بعد اس ناز، اس پیار اور گرمجوشی کے ساتھ جیسے شادی کے بعد گڑیا کی پیدائش تک وہ رکھا کرتی تھی۔

"سچ احسن، میں بالکل جوان لگتی ہوں نا ؟"

"بالکل .... " احسن کے لبوں نے اس کے ابھرے ہوئے گالوں سے گستاخی کی، اس کی رگ رگ میں نشہ دوڑ گیا۔

"تو پھر .... پھر مجھے اسی نام سے پکارو .... جو تمہیں دل سے پسند ہے ...."

"گڑیا .... " احسن حیرت اور مسرت کے ساتھ بولا۔ اور اس کو ایسا لگا وہ گڑیا کی طرح سجی بنی تتلی بنی اڑتی پھر رہی تھی ⊕



متاعِ دل

میری ایک بہن جن کی عمر ۲۵ سال اور بھتیجی عمر ۱۸ سال کی شادی کے لئے میں کافی فکرمند ہوں۔ ان کے لئے اچھے تعلیم یافتہ، اعلیٰ عہدے پر فائز لڑکوں کی ضرورت ہے۔ آرمی، ایئرفورس، انجینئر یا ڈاکٹر اور اعلیٰ گھرانے کے لوگ رجوع کریں۔ لڑکیاں تعلیم یافتہ اور بہترین کردار کی مالک ہیں۔

"مسز ایس شاہ، رسالپور"

آرزوئے صبح

مجھے اپنی بیٹی جس کی تعلیم ایم اے، عمر ۲۸ سال، سفید رنگ کی مالک ایک ٹانگ سے کمزور ہے اس کے لئے ایسا تعلیم یافتہ اور ہمدرد انسان جو سلجھے ہوئے ذہن کا مالک ہو اور شریف خاندان سے تعلق رکھتا ہو، اس سے رشتہ مطلوب ہے۔ اگر مجھے ایسا شخص مل جائے تو میں خود کو دنیا کی خوش قسمت خاتون سمجھوں گی۔

"ف : ل ، لاہور"

دل کی لگن

میری بہن کا آئیڈیل ایک ایسا نوجوان ہے جس کی عمر ۳۰ سال ہو۔ جہیز کا لالچی نہ ہو، خوش اخلاق، وسیع القلب، سیر و سیاحت کا شوقین، تعلیم یافتہ اور ٹوٹ کر چاہنے والا نوجوان ہو۔ میری بہن ایک معزز پنجابی گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ خوبصورت، خوش اخلاق، خوش لباس ہے۔ تعلیم بی اے۔ بی ایڈ ہے۔ اسے اس کا آئیڈیل مل جائے تو وہ اسے ٹوٹ کر چاہے گی۔ تمام عمر دل و جان سے اس کی خدمت کرے گی۔ کراچی کے رہنے والوں کو ترجیح دی جائے گی۔

"سلطانہ، کراچی"

رُخِ شاداب

میری بہن جس کی عمر تیس سال، رنگ گندمی، جاذبِ نظر چہرہ، مناسب نقوش، اسمارٹ اور ایم اے پاس ہے۔ کالج میں لیکچرار ہے اس کے لئے

راجپوت خاندان کا رشتہ مطلوب ہے۔ لڑکا انجینئر، ڈاکٹر یا ملٹری آفیسر یا گزٹڈ ہو۔

"مسز خان، لاہور"

بہارِ محبت

میں اکیس سالہ دوشیزہ ہوں۔ تعلیم مڈل ہے۔ کشیدہ کاری کا شوق رکھتی ہوں۔ ایک ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر کی لڑکی ہوں۔ پابند پردہ ہوں۔ شکل اچھی، گندمی رنگ، آنکھیں سوکی ہیں۔ مجھے برسرِروزگار رشتے کے ۲۵ سالہ نوجوان کا رشتہ مطلوب ہے۔ غریب گھرانے کی ہوں۔ والدین جہیز نہیں دے سکتے۔ لالچی حضرات زحمت نہ فرمائیں۔

"مس پروین کوثر، بہاولپور"

شیشے کی چمک

میری بہن خوبصورت، اسمارٹ، صاف رنگت کی ذہین، محنتی ۲۳ سالہ نیک سیرت گریجویٹ دوشیزہ ہے۔ میری خواہش ہے کہ اس کا آئیڈیل نیک سیرت، سرکاری یا نیم سرکاری شعبہ میں آفیسر کی حیثیت سے وابستہ ہو، عمر ۲۶-۳۲ سال، صوم و صلوٰۃ کا پابند ہو۔ مشرقی و مغربی کسی بھی پاکستانی علاقہ کے لکھ سکتے ہیں۔

"م ب ، خ ۔ راولپنڈی"

آرزو کی کلیاں

میری ایک سہیلی نیک سیرت، قبول صورت، بی اے پاس ہے نرم

کرتی ہے۔ والد کا انتقال ہو گیا ہے اس لئے ایک نیک سیرت انسان کے سہارے کی ضرورت ہے جو اس کو ٹوٹ کر چاہے اور وہ ماضی کی تمام تکالیف سے چھٹکارا پالے۔ لڑکا نیک سیرت اور قبول صورت ہو۔ آمدنی اتنی کہ باآسانی گزارہ ہو جائے۔ "ثمینہ۔ کراچی"

چاندنی کے سائے

میری بہن کی عمر ۱۸ سال، تعلیم انٹر، رنگ گندمی، دراز قد، حساس اور سیدھی سادی لڑکی ہے۔ اس کے لئے بزنس مین، فوجی یا زمیندار کا رشتہ مطلوب ہے۔ عمر ۳۰ سال ہو۔ خوش اخلاق، خوش مزاج اور عورت کا قدر دان میری بہن کا آئیڈیل ہے۔ "فرزانہ الیاس، کراچی"

آتش گل

میں یو پی کے متوسط طبقے سے تعلق رکھتی ہوں۔ میرا آئیڈیل بردبار ہینڈسم چکیلی سانولی رنگت کا بڑی بڑی آنکھوں والا نوجوان ہے۔ جو پی آئی یا پی ایس سی ہو۔ اتنا کماتا ہو کہ گزر با آسانی ہو جائے۔ اپنا ذاتی گھر ہو تو بہت ہی اچھا ہے۔ "پروین جہاں۔ کراچی"

پگھلتے خواب

مجھے اپنی دو لڑکیوں کے لئے شریک سفر کی تلاش ہے۔ ہم لوگ سید اثنا عشری سے تعلق رکھتے ہوں۔ نیک سیرت اور خوش شکل ہوں تعلیم کم از کم بی اے ہو۔ برسر روزگار ہوں۔ اگر لڑکے بیرون ملک یا افواج پاکستان سے منسلک ہوں۔ مگر اچھے شاہ سیر پر ہوں تو بہت بہتر ہے۔ میری لڑکیاں بڑی بھی ہوتی عادات کی خوگر ہیں۔ جھوٹ کو سخت ناپسند کرتی ہیں صوم و صلوٰۃ کی پابند ہیں۔ دونوں میٹرک پاس نہیں کر سکیں۔ مگر بڑی نے اس سال تعلیم کے بعد دستکاری میں ڈپلومہ کیا ہے۔ چھوٹی لڑکی صرف گھریلو امور میں ماہر ہے۔ ان دونوں کے لئے ایسے شریف اور پڑھے لکھے گھرانوں سے رشتہ کا متلاشی ہوں جو میری بچیوں کو خلوص نیت سے اپنا جیون ساتھی بنانا چاہیں۔

"ایس ایس ایچ نقوی، ٹنڈو محمد خاں"

راکھ سے تلے

میں معمولی پڑھی لکھی اٹھارہ سالہ دوشیزہ ہوں۔ والد صاحب ۱۹۶۵ء میں شہید ہو گئے۔ بھائی اور چچا حال ہی میں ایک مقدمے میں پکڑے گئے اب اس بھری دنیا میں تنہا ہوں۔ مجھے ایسے ہمدرد انسان کی تلاش ہے جو میرا شریک سفر بن کر میری عزت کی حفاظت کر سکے۔

"نور فاطمہ، ضلع سیالکوٹ"

قرب کی آگ

میرا آئیڈیل خوبصورت، جاذب نظر، پرکشش آنکھوں والا خوش لباس خوش اخلاق، دراز قد اور اسمارٹ نوجوان ہے۔ عمر ۲۵-۲۷ سال ہو۔ آرمی کیپٹن، لیفٹیننٹ، انجینئر یا بینک آفیسر کو ترجیح دی جائے گی میں سانولی رنگت کی خوبصورت آنکھوں اور پرکشش نقوش کی مالک ہوں۔ تعلیم انٹر ہے۔ کاش میرا

آئیڈیل حقیقت بن کر جلد میرے سامنے آ جائے۔

"شہناز خان۔ کراچی"

روشن چاند

میری سہیلی جس کی عمر ۲۰ سال ہے رنگ سانولا، دراز قد متناسب جسم تعلیم انٹر، یوپی خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے لئے نیک سیرت خوش مزاج ۲۶ سالہ نوجوان کا رشتہ مطلوب ہے۔ تعلیم کم از کم بی اے ہو ٹیکنیکل لائن سے وابستہ ہو تو زیادہ بہتر ہے۔

"مس فرح خان، حیدرآباد"

پیار کا جھونکا

میں اٹھارہ سالہ انٹر پاس دوشیزہ ہوں۔ ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتی ہوں۔ نہایت خوبصورت، اسمارٹ اور سیر و تفریح کی دلدادہ ہوں امور خانہ داری میں مہارت ہے میرا آئیڈیل ایک فوجی نوجوان ہے۔ وہ مسلح افواج کے کسی بھی شعبے سے تعلق رکھتا ہو قابل ترجیح ہوگا۔ شکل و صورت کی کوئی پابندی نہیں۔ میں اسے اتنا پیار دوں گی کہ وہ ہر غم بھول جائے گا۔ مجھے اپنے آئیڈیل کا شدت سے انتظار ہے۔ "مس نگار جہان۔ کراچی"

پیاسی شبنم

میرا آئیڈیل دراز قد اور وجیہ آرمی آفیسر، ڈاکٹر یا انجینئر ہے۔ جو سعودی عرب یا مشرق وسطیٰ کے کسی بھی ملک میں ہو۔ عمر ۳۰-۳۲ سال ہو۔ ایسے افراد جن کی پہلی بیوی سے علیحدگی ہو چکی ہو اور کوئی بچہ نہ ہو وہ بھی رجوع کر سکتے ہیں۔ میری عمر ۲۲ سال ہے۔ لمبے بال اور سرخ و سفید رنگت ہے۔ میری خواہش ہے کہ کوئی اچھا انسان میرا شریک زندگی بنے۔

"ماریہ علی۔ کراچی"

یاد کی چمک

میری بہن کی عمر ۲۳ سال ہے۔ تعلیم ایف اے، گورا رنگ، خوبصورت شخصیت کی مالک ہے۔ اس کے لیے تعلیم یافتہ، پرخلوص اور خوش مزاج شخص کا رشتہ مطلوب ہے۔ رنڈوا اور دو تین بچوں کا باپ بھی ہو تو کوئی بات نہیں لیکن مالی لحاظ سے اچھا ہونا ضروری ہے۔ بیرون ملک اور لاہور کے رشتوں کو ترجیح دی جائے گی۔ "عذرا ناہید۔ لاہور"

خوابوں کی فصل

پانچ بھائیوں کی اکلوتی لاڈلی باعزت گھرانے کی بی اے پاس موٹی موٹی خوبصورت آنکھوں والی نازک سی پرکشش گڑیا کے لیے خوبصورت، دراز قد، شریف، وفادار اور پرخلوص ڈاکٹر، اچھے عہدے پر فائز سرکاری ملازم یا پی سی ایس کے افسر کا رشتہ مطلوب ہے۔ "شہناز۔ لاہور"

یادوں کی چنار

میری نند سانولی سلونی رنگت کی خوبصورت دوشیزہ ہے۔ عمر ۲۲

سال، تعلیم ایم اے، بہت خوش مزاج اور بااخلاق ہے۔ اس کا آئیڈیل ایک پڑھا لکھا سلجھے ہوئے خیالات کا اسمارٹ سا نوجوان ہے جو تعلیم میں اس کا ہم پلہ ہو۔ بیوی کو خلوص اور محبت دے سکے۔ اگر ایسا ہو جائے تو تا زندگی وہ اپنا پیار اس پر نچھاور کرتی رہے گی۔ "بیگم شرافت حسین کراچی"

چٹخا ہوا شیشہ

میں ایک معزز خاندان کی ۲۷ سالہ دوشیزہ ہوں۔ بہت زیادہ دکھی، غم زدہ اور حساس لڑکی ہوں۔ صرف ایک بار سسرال گئی پھر مجھے طلاق ہو گئی۔ میرا آئیڈیل ایک شریف، ہنرمند، تعلیم یافتہ، خوش اخلاق، برسرروزگار نوجوان ہے۔ مجھے دولت کی تمنا نہیں صرف وفادار ساتھی کی ضرورت ہے۔ اپنے آئیڈیل کو خوشیوں کی دولت سے مالامال کر دوں گی۔

"ن۔ب۔ کراچی"

پیار کا پیراہن

میرا آئیڈیل پڑھا لکھا، خوبرو، اسمارٹ، دراز قد اور شربتی آنکھوں والا نوجوان ہے جو اعلیٰ عہدے پر فائز ہو۔ ڈاکٹر یا انجینئر ہو تو اپنی خوش نصیبی سمجھوں گی۔ میں متناسب قد و قامت کی پڑھی لکھی، صاحب جائیداد لڑکی ہوں۔ اپنے آئیڈیل کا بے چینی سے انتظار کروں گی۔

"شازیہ ناز۔ اسلام آباد"

طوفان بہار

میرا آئیڈیل یہ مہذب، اعلیٰ تعلیم یافتہ، سلجھے ہوئے مزاج کا ۳۰-۳۲ سالہ نو[illegible] جس کا تعلق شریف خاندان سے ہو جو ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کرنے کی ہمت رکھتا ہو کیونکہ مجھے مضبوط سہارے کی ضرورت ہے باپ کا سایہ سر پر نہیں کوئی رشتہ دار نہیں۔ تنہا حالات کا مقابلہ کیا ہے۔ زمانے کی اونچ نیچ دیکھی ہے۔ میں بے حد سلجھے ہوئے مزاج کی خوش اخلاق، نیک سیرت اور اچھی عادت کی مالک ہوں۔ زندگی میں اپنے آپ کو کسی اچھے مقام پر دیکھنا چاہتی ہوں۔ ایک اسکول میں ملازم ہوں۔ اسلام آباد میں رہنے والے قابل ترجیح ہوں گے۔ "نوشین چودھری۔ اسلام آباد"

پیار کے رنگ

میری عمر ۲۰ سال ہے۔ تعلیم میٹرک، گورا رنگ، دراز قد، لانبے بال، خوب صورت اور نیک سیرت کی اسمارٹ دوشیزہ ہوں۔ مجھے ایسے شریک سفر کی ضرورت ہے جو کسی اچھے عہدے پر فائز ہو یا کسی اچھے کاروبار میں شریک ہو۔ اگر مجھے ایسا ہم سفر مل جائے تو زندگی آرام سے گزرے گی۔ میں راہ میں پلکیں بچھائے اپنے آئیڈیل کا بے چینی سے انتظار کروں گی۔

"مس شیریں۔ سرگودھا"

سکر تصویر

[illegible] لمبی دراز قد، خوب صورت شکل و صورت کا مالک، مضبوط

کردار اور اعلیٰ دماغ کا نوجوان ہے۔ عمر ۲۵-۳۰ سال کے درمیان ہو، تعلیم بی اے اور آمدنی اتنی ہو کہ آسانی سے گزارہ ہو جائے۔ میں ایک شریف خاندان سے تعلق رکھتی ہوں۔ دراز قد، تعلیم میٹرک، شوخ و چنچل، ماڈرن اور سادہ ہر طرح کے ماحول میں ڈھل جانے کی صلاحیت رکھنے والی لڑکی ہوں۔ کاش مجھے میرا آئیڈیل مل جائے۔

"نادیہ نقوی۔ کراچی"

وفا کا سنگم

میری دو بہنیں قبول صورت، نیک، امور خانہ داری میں ماہر مکمل مشرقی لڑکیاں ہیں۔ دونوں کے لیے قبول صورت، برسرروزگار شریف لڑکوں کے رشتے درکار ہیں جن کی عمر ۲۵-۲۶ سال اور تعلیم بی اے بی ایڈ ہو۔ "ف۔ س۔ ملتان"

آتش تر

میں پوسٹ گریجویٹ ہوں۔ عمر ۲۳ سال ہے۔ باذوق، ہنرمند اور خوش لباس لڑکی ہوں۔ ایک اچھے مگر غریب خاندان سے تعلق رکھتی ہوں۔ حج اور عمرہ کا جنون کی حد تک شوق ہے۔ عرب ممالک میں رہنے والے برسرروزگار، تعلیم یافتہ شخص جو خود مختار ہو اور ایک انسان کی انسان کی حیثیت سے عزت کرتا ہو میرا آئیڈیل ہے۔ رشتہ میرے والدین کریں گے۔

"رضوانہ شیخ۔ راولپنڈی"

شمع وفا

میری بہن بی اے بی ایڈ، ایک مقامی اسکول میں ٹیچر ہیں۔ پرکشش متناسب جسم کی مالک، صوم و صلوٰۃ کی پابند، گھریلو کام کاج میں ماہر، سلیقہ شعار ہیں۔ ان کے لیے معزز پیشہ، تعلیم یافتہ، باعزت گھرانے کے فرد کا رشتہ مطلوب ہے۔ "فرحانہ شیخ۔ کراچی"

پیار کی شباہت

میرا آئیڈیل انجینئر، ڈاکٹر یا کسی اچھے عہدے پر فائز مخلص اور وفادار شخص ہے جس کی عمر ۳۰ سال ہو۔ اگر امریکہ، کینیڈا یا لندن میں مقیم ہو تو زیادہ مناسب ہے۔ میں ایک معمولی شکل و صورت اور درمیانے قد، گورے رنگ کی ہنس مکھ، خوش لباس اور روشن خیال لڑکی ہوں۔ بی اے کر چکی ہوں۔ ٹائپ اور شارٹ ہینڈ بھی جانتی ہوں۔ خود مختار ہونے کے باوجود تنہا اور دکھی لڑکی ہوں۔ ایک اچھے اور نیک ساتھی کی تلاش ہے۔ "آصفہ۔ کراچی"

کانٹوں کی سیج

میری بھانجی جس کی عمر ۲۵ سال، تعلیم میٹرک، کھلتا ہوا رنگ، درمیانہ قد، امور خانہ داری میں ماہر ہے۔ بے حد اسمارٹ اور خوش لباس و خوش مزاج ہے۔ دو سال پہلے اس کا نکاح ہوا۔ اس کا خاوند نکاح کے بعد جرمنی گیا اور اس نے وہاں شادی کر لی اور اس طرح اسے طلاق لینی پڑی۔ میری بھانجی بہت حساس

ہے۔ وہ بہت افسردہ رہتی ہے۔ اس کے لیے ایسے رشتہ کی تلاش ہے جو شریف، تعلیم یافتہ، خوش اخلاق، اسمارٹ اور کسی اچھے عہدے پر فائز ہو۔ اس کے دکھوں کا مداوا کر سکے۔ میری بھابی معزز، تعلیم یافتہ اور اچھے خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ باپ کے سائے سے محروم ہے۔

مسرت جبیں۔ لاہور

درد کی موجیں

میری سہیلی جس کی عمر ۲۳ سال، بی اے پاس، اچھی شکل وصورت اور معزز خاندان کی فرد ہے۔ اس کا اپنے من چاہے کے دیوتا اور جیون ساتھی کے متعلق خیال ہے کہ وہ خلوص اور چاہت کا جیتا جاگتا مجسمہ ہو، حسن اخلاق اور جگمگاتی ہوئی سیرت کا پجاری تاکہ وہ بھی پجارن بن کر اپنے والہانہ پیار کے ذریعے اس مجازی خدا کی پرستش کرے کیونکہ چاہت اور پرستش ہی اس کی فطرت ہے۔ اپنے آئیڈیل کی قربت پاکر وہ بے پناہ خلوص اور مچلتی ہوئی چاہت کے موتی لٹائے گی — اتنے موتی کہ اس کے دل سے خود بخود یہ آواز آنے لگے۔ "میری چھوٹی سی دنیا جنت سے کم نہیں۔"

"عارفہ ثمر۔ کراچی"



نازیہ حسن خان، لاہور کے نام

● تعلیم میٹرک، عمر ۲۹ سال، تنخواہ چار ہزار روپے، پہلی بیوی سے اجازت کے بعد آپ کو اپنانے کا خواہشمند ہوں۔

عثمان خان، کیبل انسٹرکشن فورمین، پوسٹ بکس ۶۱۹۶، ابوظہبی۔

● ایک سرکاری ادارے میں ذمہ دار پوسٹ پر فائز ہوں، مناسب تنخواہ۔ عمر ۲۶ سال ہے۔ مجھے آپ کی صاف گوئی پسند آگئی ہے۔

مختار احمد صدیقی۔ ۸۸۴، جدید اسٹریٹ، ہری پور ہزارہ۔

● میں ۲۶ سالہ صاف گو نوجوان ہوں آپ کے معیار پر پورا اتروں گا۔

محمد اکرم، ۱۰۳۔ ڈی نرسری، پی ای سی ایچ ایس کراچی ۲۹۔

● آپ کی تحریر سے متاثر ہو کر آپ کو دل وجان سے اپنانے کو تیار ہوں۔ عمر ۲۲ سال، تعلیم ایف اے، آمدنی آٹھ ہزار روپے ہے۔

ہمایوں اختر، پوسٹ بکس نمبر ۳۰۲، ڈیرہ دوبئی۔

● میری عمر ۲۳ سال ہے۔ ہمارے خیالات میں ہم آہنگی ہے۔ آپ کے معیار پر پورا اتروں گا۔

ظہیر احمد نایاب، مفتی محلہ مکان نمبر ۳۶۸/۱۳ شکارپور۔

یمنی فیلو فنر کراچی کے نام

● میں ہی آپ کا آئیڈیل ہوں، عمر ۲۵ سال اور تنخواہ دس ہزار روپے ہے۔ محمد اسلم قریشی۔

پوسٹ بکس نمبر ۳۰۲، راس الخیمہ (یو۔ اے۔ ای)

فوزیہ ہاشمی، گوجرانوالہ کے نام

● قبل از وقت بلند وبانگ دعوے کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ البتہ خود کو ہر لحاظ سے آپ کی سہیلی کے قابل سمجھتا ہوں۔

سید غضنفر عباس بخاری، محلہ برجی والا، جھنگ صدر۔

● زندگی بھر آپ کو کوئی تکلیف نہیں دوں گا۔ تنخواہ ۵ ہزار روپے ہے۔ سید صفدر حسین کاظمی۔

پوسٹ بکس نمبر ۵۲۲۹ بحرین۔ عربین گلف۔

● میرا لڑکا ہومیوپیتھک ڈاکٹر ہے عمر ۲۶ سال اور ماہانہ آمدنی تین ہزار روپے ہے۔

الحاج ایس ایم سید، ڈی/۱۱/۸ فیڈرل کیپٹل ایریا کراچی ۳۷۔

مس ساحرہ اقبال، ملتان کے نام

● اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ تنخواہ ۵۵۰۰ روپے ہے کاش آپ میری شریک سفر بن سکیں۔

عبدالرحمٰن تنبہ۔ پوسٹ بکس ۲۲۰۰۰ صفات کویت۔

● آپ کی تحریر سے متاثر ہوں۔ آپ کی تمام شرائط منظور ہیں۔

رحیمی معرفت ضیا جنرل اسٹور، ہمایوں مارکیٹ، میانوالی۔

● آپ کو شوہر کی محبت بھی دے سکتا ہوں اور آپ کے بچوں کو باپ کا حقیقی پیار بھی۔

ظفر عباس معرفت ماسٹر محمد حسین، مکان نمبر ۴۰۸۔ ڈی، سٹلائٹ ٹاؤن۔ سرگودھا۔

● آپ کو اپنانے کے لئے تیار ہوں۔ تنخواہ ۸ ہزار روپے ہے۔

خالد محمود معرفت عرفان ساجد، پوسٹ بکس نمبر ۳۷۰، جدہ، سعودی عرب۔

● آپ کے آئیڈیل کے عین مطابق ہوں۔

محمد صدیق، مکان نمبر ۷، بلاک نمبر ۳۹، سیکٹر نمبر ۴۔ ڈی لانڈھی ۶۔ کراچی۔

● میں آپ کو اور آپ کے بچوں کو روشن مستقبل کی ضمانت دے سکتا ہوں۔ میری تعلیم میٹرک اور ماہانہ آمدنی ۵ ہزار روپے ہے۔

صابر حسین۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۱۲۷۰، ابوظہبی۔

● میری ماہانہ آمدنی ۹۰۰۰ روپے ہے۔ دل وجان سے آپ کو اپنانے کو تیار ہوں۔

اے۔ ڈی خان پوسٹ بکس نمبر ۱۰۳۰ سیب ایئرپورٹ مسقط عمان۔

شاہانہ احمد۔ کراچی کے نام

● میں کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں۔ اگر آپ مل جائیں تو زندگی بھر آپ کی پوجا کرتا رہوں گا۔

ظفر مسعود۔ مکان نمبر ۲۔ ایک ۱۰/۱۱ ناظم آباد نمبر ۲ جے پور ہاؤس۔ کراچی۔

● شاید آپ روشنی کی کرن ثابت ہوں۔

ایم اے خان۔ اعجاز جنرل سٹور۔ ڈھرک روڈ سکھر

مسز قیصر سردار۔ کراچی کے نام

● آپ کے جذبات اور میرے خیالات میں بڑی حد تک مطابقت ہے۔ محمد جاوید اقبال۔

بلاک پی ۱/کوارٹر نمبر ۱۱ پی اینڈ ٹی کالونی۔ اسلام آباد

● اگر بی ایس سی انجینئر آپ کی صاحبزادی کا ہم پلہ ہو سکتا ہے تو قبول فرمائیں۔

وقار عظیم انجینئر پوسٹ بکس نمبر ۷۰۸۰ دبئی۔

ت، ب کراچی کے نام

● آپ کی توقعات پر پورا اتروں گا۔ معقول آمدنی ہے۔

قاضی نذر الاسلام معرفت حبیب میڈیکل سٹور۔ مانسہرہ، ہزارہ۔

مس درخشندہ، راولپنڈی کے نام

● آپ کو خلوص دل سے اپنانے کو تیار ہوں۔

پرویز اقبال۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۴۱۰ - دوحہ قطر۔

● آپ کیلئے اچھا شریک سفر ثابت ہوں گا۔ عمر ۲۶ سال، تعلیم بی اے ہے۔

ایم۔ اے رزاق۔ پوسٹ بکس نمبر ۴۵۶ ۳ - ابوظہبی۔

● میں آپ کو اپنانے کیلئے تیار ہوں۔ تنخواہ کئی ہزار روپے ہے۔

عبدالرب خاکسار۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۸۲۹ - دوحہ قطر۔

● ساری زندگی ساتھ نبھانے کا وعدہ کرتا ہوں۔ تعلیم میٹرک اور ماہانہ آمدنی ۲ ہزار ریال ہے۔

نذر حسین ہاشمی۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۰۸۰ - دمام۔ سعودی عرب۔

● میری عمر ۲۷ سال ہے۔ اور تنخواہ ۳ ہزار روپے۔ آپ کے خیالات کی تصویر ہوں۔

ارشد محبوب۔ پوسٹ بکس نمبر ۹۶۳ - دبئی

● عمر ۳۲ سال، تعلیم ایف اے اور تنخواہ ۹ ہزار روپے ہے۔ آپ کی توقعات پر پورا اتروں گا۔

ایم ریاض۔ پوسٹ بکس نمبر ۴۰۰۳ - ابوظہبی

● کسی غم کا سایہ آپ کی زندگی پر نہ آنے پائے گا۔ آپ کو دل و جان سے اپنانے کو تیار ہوں۔ تنخواہ ۶ ہزار روپے ہے۔

شاہد رضا۔ پوسٹ بکس نمبر ۴۸۔ گورنمنٹ ہاؤس دوحہ قطر عرب گلف

● آپ کی تمام تر توقعات پر پورا اتروں گا۔

شاد۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۵۸۰ - دبئی

● میری ماہانہ آمدنی ۶ ہزار روپے ہے۔ آپ کو جس چیز کی ضرورت ہے وہ مجھ میں پائیں گی۔

حاجی محمد شریف۔ پوسٹ بکس نمبر ۴۸۴۳ دبئی

● میں آپ کو خلوص دل سے اپنانے کو تیار ہوں۔ عمر ۳۶ سال تعلیم میٹرک ہے۔

نمبر ۴۹-۴۶۰ - زیڈ اے۔ رحمان پوسٹ بکس نمبر ۹۰۵ - شارجہ

● آپ کے خیالات کے عین مطابق ہوں۔

رستم خان۔ معرفت سلطان دوکاندار۔ پوسٹ بکس نمبر ۴۱۳۱ ابوظہبی۔

● میرے اور آپ کے خیالات میں ہم آہنگی ہے۔

محمد یوسف، ہائی کلاس ٹیلرز۔ ۲- لاج روڈ۔ پرانی انارکلی لاہور۔

● عمر ۲۵ سال اور ماہانہ آمدنی نو ہزار روپے ہے صرف آپ جیسی پرخلوص ساتھی کی کمی ہے۔

حضور احمد مجیٹھی۔ پوسٹ بکس نمبر ۵۳۸۰ - الدمام سعودی عرب

● میں آپ کے معیار کے عین مطابق ہوں۔ عمر ۲۸ سال۔ تنخواہ ۲۵۰۰ ریال ہے۔

ایس آفتاب احمد خان۔ پوسٹ بکس نمبر ۷۱۹ - شارجہ

اردما، راولپنڈی کے نام

● عمر ۲۵ سال تنخواہ ایک ہزار روپے ہے۔

ایم۔ اے۔ خان ۱/۱ - سی جیکب لائنز بلڈنگ کمپلیکس۔ کراچی ۳

● بیوی مرچکی ہے۔ دو بچے کراچی ہوسٹل میں رہتے ہیں۔ آپ سے شادی کا خواہش مند ہوں۔

حاجی بی۔ کے جوہری۔ ایس بی آر آر اور انجن شاپ کار کیمپ، نمبر ۱-۱۴ الدمام سعودی عرب

● میں آپ کو اپنانے کو تیار ہوں۔ عمر ۳۰ سال ہے۔ دونوں ٹانگوں سے معذور ہوں۔ معقول آمدنی ہے۔

محمد عالم۔ ایجوکیشن ٹیلرنگ شاپ نمبر ۱۴ سنہری مارکیٹ عبدالستار روڈ کوئٹہ۔

● مجھے آپ جیسی گریجویٹ اور باذوق، خوش لباس لڑکی کی

تم کمشن تھی۔

طلوع اقبال۔ مکان نمبر ۱۱ گلی نمبر ۱۳ محلہ بستی گوجرانوالہ۔

● آپ کی تحریر پڑھ کر بہت متاثر ہوا۔ عمر ۲۵ سال اور تنخواہ ۸ ہزار روپے ہے۔

امیر علی۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۸۰۱۔ ابوظہبی۔

● ہو سکتا ہے میں ہی آپ کے آئیڈیل پر پورا اتروں۔

عالم بیر زادہ انسٹرکٹر جنرل پبلک ورکس۔ کورٹ روڈ بالمقابل گورنمنٹ کالج آف ٹیکنالوجی۔ پشاور

● انشاء اللہ آپ کے خیالات پر پورا اتروں گا۔

واصف معرفت وسیم احمد، کوٹھی نمبر ۷۔ ڈیفنس روڈ نزد سی او ڈی راولپنڈی کینٹ۔

● میں آپ کے خیالات کی قدر کرتا ہوں۔ زندگی بھر آپ کا ساتھ دوں گا۔ آپ کو اپنا کر خوشی ہو گی۔

اجمل خان۔ پوسٹ بکس نمبر ۴۵۶۔ شارجہ

● آپ جیسی شریک سفر کی تمنا ہے۔

محمد انور۔ پوسٹ بکس نمبر ۴۴۴۔ جدہ سعودی عرب

● اگر آپ میری شریک سفر بن جائیں تو زندگی بہت آرام سے گزرے گی۔

پرویز سجاد۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۱۱۔ الدمام سعودی عرب

● آپ کے خیالات و احساسات قابل ستائش ہیں تعلیم بی اے ماہوار آمدنی ۷ ہزار روپے ہے۔

فاروق تبسم۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۸۹۷۔ ڈیرہ۔ دوبئی

● آپ کی تحریر میں مجھے اپنی منزل کی جھلک نظر آتی ہے۔ عمر ۲۴ سال اور تعلیم ایف اے ہے۔

طاہر احمد معرفت مظفر حسین۔ ڈی۔ پی آفس، سرور روڈ راولپنڈی کینٹ

● میں بزنس مین ہوں اور آپ جیسی بلند ذوق اور سلجھے ہوئے خیالات کی مالک لڑکی کو اپنانے کا خواہش مند ہوں۔

ارشد محمود۔ پوسٹ بکس نمبر ۴۲۔ لاٹیہ

● میں آپ کو خلوص دل سے اپنانے کو تیار ہوں۔

محمد زاہد پوسٹ بکس نمبر ۹۵۔ ابوظہبی۔

● میری بیوی ان پڑھ ہے۔ تعلیم یافتہ شریک حیات کی آرزو ہے۔ کاش ہم ایک دوسرے کی مدد کر سکیں۔

محمد جعفر پوسٹ بکس نمبر ۳۶ الدمام سعودی عرب

● میں بالکل آپ کے آئیڈیل کے مطابق ہوں۔

تنویر عالم زبیری۔ ۳۲۳/ب مری روڈ راولپنڈی

● آپ کی تمام شرائط قابل قبول ہیں۔ تعلیم میٹرک اور آمدنی ۴ ہزار روپے ہے۔

عابد حسین۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۰۔ ابوظہبی

عمر ۲۲ سال اور تنخواہ ۸ ہزار روپے ہے۔ آپ کو اپنا کر خوشی ہو گی۔

زیڈ ایم گل۔ پوسٹ بکس نمبر ۶۲۵ شارجہ

● آپ کو خلوص دل سے اپنانے کو تیار ہوں۔ عمر ۲۲ سال تنخواہ ۶ ہزار روپے ہے۔

عارف۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۲۸۹۔ دوحہ قطر

● پوسٹ گریجویٹ ہونے کے باوجود محرومیوں نے آپ کی تحریر کی طرف متوجہ کیا ہے۔

السید احمد۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۸۶۸ جدہ سعودی عرب

● آپ کے آئیڈیل کی حقیقی تصویر ہوں۔ انشاء اللہ پوری زندگی آپ کو شکایت نہ ہو گی۔

زید عبد المالک۔ معرفت محمد عامت دکاندار نزد مارکیٹ نمبر ۱۲ ناظم آباد نمبر ۳ کراچی۔

حبیبہ شاہین مردان کے نام

● آپ کو کبھی دکھ نہیں دوں گا۔ تنخواہ ۵ سو روپے ہے۔

خیر محمد اعوان۔ معرفت ڈاکٹر محمد یعقوب قریشی۔ اقبال میڈیکل ہال خواجہ بازار مظفر آباد۔

● آپ کے آئیڈیل کے مطابق ہوں۔

وحید مراد خان۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۹۲۱۔ دوبئی

● میں بھی زمانے کا ستایا ہوا انسان ہوں۔ آپ کے غموں کو خوشیوں میں بدل دوں گا۔

محمد سلیم معرفت فیض جنرل سٹور۔ نزد پوسٹ آفس موسیٰ کالونی۔ فیڈرل بی ایریا۔ کراچی۔

● خوشگوار اور پرسکون زندگی گزارنے کیلئے آپ کی طرح صاف اور مخلص ساتھی کی ضرورت ہے۔

جاوید اقبال معرفت انسٹرکٹر جنرل پبلک ورکس کورٹ روڈ، بالمقابل گورنمنٹ کالج آف ٹیکنالوجی پشاور۔

● مجھے آپ جیسی پرخلوص احساس اور دکھی رفیقہ حیات کی ضرورت ہے۔ عمر ۲۸ سال، تعلیم ایف ایس سی اور تنخواہ ۱۰۰۰/- روپے ماہوار ہے۔

محمد عارف، کوارٹر نمبر ۲۸۹۔ جی۔ پی۔ او۔ ایف اسٹیٹ۔ حویلیاں تحصیل و ضلع ایبٹ آباد۔

● میں خلوص دل سے آپ کو اپنانے کو تیار ہوں۔

افضل نواب۔ معرفت پوسٹ بکس نمبر ۵۲۳ ظہران سعودی عرب

● بے وفا نہیں ہوں۔ وفا کا یقین دلا سکتا ہوں۔

کاشف رضا۔ معرفت صوفی ریاض۔ ۸۵ اردو نگر ٹیپو ٹاؤن، عثمان روڈ ڈرسمن آباد۔ لاہور۔

● آپ کی تحریر کے مطابق ہوں۔ ماہانہ آمدنی ۹سو روپے ہے۔

باصلی معرفت ضیاء جنرل اسٹور، بہاولپور مارکیٹ۔ میانوالی

● میں آپ کو پیار اور خلوص دینے کو تیار ہوں۔ آپ کی توقعات پر پورا اتروں گا۔

ندامت حسین، ڈاکخانہ و مقام ماہجا ضلع جہلم تحصیل چکوال

● میں بھی آپ کی طرح بہت دکھی اور غمزدہ انسان ہوں۔ آپ کو سچے دل سے اپنا جیون ساتھی بنانا چاہتا ہوں۔

محمد افضل جنجوعہ۔ معرفت منظور حسین کینٹ ڈیپارٹمنٹ اٹک آئل کمپنی لمیٹڈ۔ مورگاہ راولپنڈی۔

● آپ کی دکھ بھری داستان سن کر بڑا صدمہ ہوا۔ زندگی بھر شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔

مرزا اکمل آزاد بیگ۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۴۳۸۱ العین ابوظہبی

● میری تربیت پر آپ رشک کریں گی۔ عمر ۳۲ سال تنخواہ ۷ ہزار روپے ہے۔

ایم۔ ایس خان یوسف زئی۔ پوسٹ بکس نمبر ۶۲۵ شارجہ

مسز نصیر احمد۔ راولپنڈی کے نام

● میں آپ کو اپنانے کیلئے تیار ہوں۔

محمد جمیل معرفت صوفی داخ کمپنی۔ ۱۵ ڈھکی، مظفرآباد، آزاد کشمیر

ش۔ گ۔ کراچی کے نام

● آپ کی تحریر نے بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔ آپ کو اپنانے کو تیار ہوں۔

مرزا احمد فاروق بیگ۔ ٹیلیفون ٹیکنیشن۔ کراچی پورٹ ٹرسٹ کراچی۔

● میں آپ کو اتنا پیار دوں گا کہ شاید ہی کسی نے اپنی شریک حیات کو دیا ہو۔

رشید حسین معرفت حیدری ٹیلرز۔ بالمقابل ہاشمی ہسپتال جھنگ روڈ سرگودھا

● آپ کو اتنا پیار دوں گا کہ آپ پچھلے تمام غم بھول جائیں گی۔

افتخار حسین۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۰۲۳ دوبئی

● مجھے بھی آپ جیسی ساتھی کی تلاش تھی۔

ایم افضل معرفت ڈرائیور محمد صدیق۔ پوسٹ بکس نمبر ۵۵۹ راس الخیمہ

● آپ کے آئیڈیل کے عین مطابق ہوں۔

محمد احمد خان معرفت علم دین، ٹی ٹی بی، یونائیٹڈ بینک، جھنگ اسکواڑ، لاہور

● میں بھی ماں باپ، بہن بھائیوں کی محبت سے محروم ۲۶ سالہ کا نوجوان ہوں۔ تعلیم انٹر اور تنخواہ ۱۸۰۰ روپے ہے۔

عبدالستار معرفت فاروقی۔ جیولرز بلڈنگ ۲/۳/۱۲۸۔ طارق روڈ پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ ایس۔ کراچی

● مجھے صورت اور دولت کی تمنا نہیں صرف آپ جیسی شریک حیات کی ضرورت ہے۔

مقبول حسین قریشی۔ پوسٹ بکس نمبر ۴۱۸۹ دوبئی

عفت۔ کراچی کے نام

● آپ کے معیار پر پورا اتروں گا۔

ماسٹر اقبال احمد خان۔ ایس۔ وی ٹیچر گورنمنٹ ہائی اسکول۔ ماڈل احمدانی تحصیل و ضلع ڈیرہ غازیخان۔

● آپ کی خواہش کے عین مطابق ہوں۔ عمر ۲۸ سال اور تنخواہ پانچ ہزار روپے ہے۔

محمد انور معرفت محمد طفیل۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۳۶ ابوظہبی

● آپ کو اپنانے کیلئے تیار ہوں۔ لڑکے کو بیٹے کی طرح رکھوں گا۔

غلام حسین معرفت محمد صدیق ڈرائیور کوارٹر نمبر ۵۰ واپڈا کالونی سرگودھا

اسماء الحق۔ کراچی کے نام

● عمر ۲۴ سال اور تنخواہ ۲۰۰۰ روپے ہے۔

ملک غلام محمد تحصیل خوشاب۔ مقام و ڈاکخانہ محب پور، ضلع سرگودھا

● میں خلوص اور عقیدت سے آپ کی بیٹی کو اپنانے کو تیار ہوں تنخواہ ۷ سو روپے ہے۔

نظام الدین معرفت محمد شریف الدین فرسٹ فلور کمرشل ڈیپارٹمنٹ پوسٹ بکس نمبر ۵۳۵۰ این ایس سی بلڈنگ کراچی۔

الیف۔ اے قریشی۔ کراچی کے نام

● آپ کو اپنا کر مسرت ہوگی۔

محمد سلیم عثمان۔ پوسٹ بکس نمبر ۵۲۱ ۔ ابوظہبی

تعلیم ایف اے اور ماہانہ آمدنی چار ہزار سعودی ریال ہے۔ اچھے کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں۔

نصراللہ خان۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۰۸ ۔ دمام سعودی عرب

● عمر ۲۲ سال۔ تعلیم بی اے اور تنخواہ دس ہزار روپے ہے۔

ایم۔ اے قریشی۔ انجینئر۔ پی او بکس نمبر ۳۰۲۔ راس الخیمہ

شاہینہ۔ کراچی کے نام

● آپ کے انتظار کی گھڑیاں ختم ہو گئیں۔ آپ کو اپنا شریک سفر بنا کر مجھے خوشی ہوگی۔

شاہد قمر۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۷۳۲۔ لاہور ۱۲

شبہ میدہ۔ سعید، راولپنڈی کے نام

● میں بھی آپ جیسی لڑکی کے قرب کا متمنی ہوں۔ ماہانہ تنخواہ ۸ ہزار روپے ہے۔

قمر زماں۔ پوسٹ بکس نمبر ۴۴۳۲۔ شارجہ

● ہم دو بھائی جن کی عمریں بالترتیب ۲۷ اور ۲۵ سال ہیں۔ تعلیم گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ ہیں۔ صرف آپ جیسی مخلص ساتھیوں کے قرب کے متمنی ہیں۔

محمد اصغر۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۲۰۔ دوبئی

● میں سول انجینئر ہوں میری عمر ۲۷ سال اور تنخواہ ۴ ہزار روپے ہے۔ جبکہ چھوٹا بھائی جنرل فورمین ہے۔ عمر ۲۴ سال اور ماہوار تنخواہ ۸ ہزار روپے ہے۔ ہم دونوں بھائی آپ دونوں کو اپنانے کو تیار ہیں۔

اشرف نوید۔ سول انجینئر۔ الجیدی انجینئرنگ کمپنی پوسٹ بکس نمبر ۵۹۲۴ شارجہ۔

● تعلیم ایف اے۔ عمر ۲۲ سال ہے۔ آپ کو ایک اچھے شریک زندگی کا پیار نصیب ہوگا۔

ارشد محمود بیگ۔ کیشیر۔ الائیڈ بینک آف پاکستان مین برانچ۔ ہری پور ہزارہ

● ہم دونوں بھائی آپ کے معیار پر پورے اتریں گے۔

علی محمد۔ معرفت فتح محمد ہوٹل والا۔ نزد تانگہ اسٹینڈ چشتیاں شریف ضلع بہاولنگر۔

● آپ کو خلوص دل سے اپنانے کو تیار ہوں۔ عمر ۲۵ سال۔ تعلیم میٹرک اور معقول تنخواہ ہے۔

محمد داد کیانی

NIDDAGAU STR - 5

6 - FRANKFURT MAIN - 90 WEST GERMANY

● اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ شاید میں ہی آپ کا آئیڈیل ہوں۔

ملک ذاکر حسین معرفت صوفی رفیق پوسٹ بکس نمبر ۲۲۷۵۔ ابوظہبی

● میری تعلیم بی اے اور عمر ۲۷ سال ہے۔ آمدنی تقریباً ڈیڑھ ہزار روپے ماہوار ہے۔

غلام یٰسین چودھری۔ محمود میڈیکوز۔ صادق آباد ضلع رحیم یار خان

● مجھے ایک عرصے سے آپ ہی کی تلاش تھی۔ تعلیم بی اے اور تنخواہ ۸ ہزار روپے ہے۔

شہزادہ سلیم۔ معرفت ایم رشید خان۔ پوسٹ بکس نمبر ۴۵۴ ڈیرہ دوبئی۔

● آپ کی تمام شرائط پر پورا اتروں گا۔ ماہانہ آمدنی دس ہزار روپے ہے۔

عبدالغفور۔ پوسٹ بکس نمبر ۴۸۵۔ دوبئی۔

نوزیہ چودھری۔ راولپنڈی کے نام

● آپ کے آئیڈیل کے عین مطابق ہوں۔

افتخار عباسی۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۰۰۔ ابوظہبی

● آپ کو خلوص دل سے اپنانے کو تیار ہوں۔

ایم ایم ریاض راحیل۔ اسسٹنٹ رجسٹرار کوآپریٹو سوسائٹیز پشاور روڈ راولپنڈی۔

● آپ کے آئیڈیل کے مطابق ہوں۔ عمر ۲۸ سال تعلیم بی اے تنخواہ ۸۰۰/- روپے ماہوار ہے۔

ایم خان۔ معرفت مکان نمبر C - ۶۹۹ - ۴ - ۲/۳ - G اسلام آباد

● مجھے جس کی تلاش تھی کہیں وہ آپ ہی تو نہیں۔

الف کے چودھری۔ پوسٹ بکس نمبر ۵۵۹ راس الخیمہ

ندیا سعید۔ کراچی کے نام

● آپ کی تحریر نے مجھے متاثر کیا۔ میرا ماضی بھی بالکل آپ جیسا ہے عمر ۲۱ سال اور تنخواہ ۵ ہزار روپے ہے۔

راجہ محمد عارف۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۰۲۴ جدہ۔ سعودی عرب

● میں آپ کے آئیڈیل کا ہو بہو نمونہ ہوں۔

ریاض احمد صدیقی۔ معرفت طفیل نوید اینڈ ریاض برادرز۔ محلہ شاہین بازار۔ پشاور۔

● آپ کی تحریر پڑھ کر متاثر ہوا۔ آپ کو اپنانے کیلئے تیار ہوں۔

محمد اسمٰعیل معرفت صوفی رفیق پوسٹ بکس نمبر ۲۲۷۵۔ ابوظہبی

● میں آپ کو دل و جان سے اپنانے کیلئے تیار ہوں۔

چودھری محمد طفیل پوسٹ بکس نمبر ۴۶۸ راس الخیمہ

● میری عمر ۲۰ سال ہے تنخواہ ۵ ہزار روپے ہے میں آپ کو پیار اور خلوص دینے کو تیار ہوں۔

خالد اکبر۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۲۹۷۔ دوحہ قطر۔ عربین گلف

● مجھے صرف اچھے جیون ساتھی کی ضرورت ہے۔

خواجہ محمد اشرف۔ نائب تحصیلدار کلکٹر حصول اراضی۔ مظفر آباد آزاد کشمیر۔

نجمہ الماس۔ کراچی کے نام

● تعلیم مڈل ہے۔ ماہوار تنخواہ ۸ ہزار روپے ہے۔

سعید عمر۔ معرفت زر خان دکاندار۔ پوسٹ بکس نمبر ۴۵۸۔ شارجہ

● آپ کو خلوص دل سے اپنانے کو تیار ہوں۔

ایم شفیق رضا۔ پوسٹ بکس نمبر ۴۸۸۳۔ جدہ۔ سعودی عرب

● عمر ۲۸ سال اور تنخواہ معقول ہے۔ آپ کو اپنانے کیلئے تیار ہوں۔



فرحان احمد پوسٹ بکس نمبر ۱۰۱۹۱ ۔ دوبئی
میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں ۔آپ کے آئیڈیل کے مطابق ہوں۔

محمد اعجاز خان ۔ ابوظہبی کولڈ اسٹوریج کمپنی ۔ ایس ۔اے پوسٹ بکس نمبر ۲۲۹۱ ۔ ابوظہبی۔
● تنہا زندگی گزار رہا ہوں ۔آپ کو اپنا کر خوشی ہو گی۔

طاہر سلیم ۔پوسٹ بکس نمبر ۲۲۹۲ دمام ۔ سعودی عرب
● میں ہی آپ کا آئیڈیل ہوں ۔ عمر ۳۰ سال اور تنخواہ تین ہزار روپے ہے۔

عزیز ۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۲ ۔ دہران ایئر پورٹ ۔ سعودی عرب
● مجھے بھی ایسے ہی ساتھی کی تلاش ہے جو سچا پیار دے ۔عمر ۲۲ سال اور تنخواہ چار ہزار روپے ہے

دلشن علی ۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۰۲۲ ۔ جدہ ۔ سعودی عرب
● تعلیم بی اے عمر ۲۰ سال ماہانہ آمدنی ۱۱۰۰۰ روپے ہے۔

ایم اے چودھری پوسٹ بکس نمبر ۴۴۲۸ ۔ روی ۔سلطنت آف عمان
● آپ کی تلاش پر پورا اتروں گا ۔ آپ میرے تصورات کے عین مطابق ہیں۔

سے ظفر فوزین النقیات یرہ لمعلوا البحار صندوق برید ۲۲۲۵ ۔ الدمام ۔سعودی عرب۔
● آپ [illegible] نام جھونکا بن کر میرے دل میں سما گئی ہیں۔

ظہور حسین L ۔ ۲/۷۵ ڈرگ کالونی ۔ کراچی ۷۵
● آپ کے جذبات کی قدر کرتے ہوئے آپ کو اپنانے کیلئے تیار ہوں۔

جنگ ۔ پوسٹ بکس نمبر ۹۴۳ ۔ دوحہ قطر

سبین شیرازی ۔ کراچی کے نام
● تعلیم بی ایس سی ۔ تنخواہ ۹ ہزار روپے ہے ۔ اللہ کا دیا سب ہے ۔ مجھے اپنا آئیڈیل بنا کر فخر محسوس کریں گی۔

مرزا بی ۔ ایس معرفت پوسٹ بکس نمبر ۱۱۸۱ ۔ اسماعیل روڈ ۔ دوبئی
● مجھے اپنا کر آپ کی تمام تمنائیں پوری ہو جائیں گی۔

جمال یوسف ۔ پوسٹ بکس نمبر ۹۴۴ ۔ دوبئی

مسرت ۔ ساہیوال کے نام
● کسی غم کا سایہ بھی آپ کے قریب نہ آئے گا زندگی بھر ساتھ دوں گا۔

شیخ محمد اقبال ۔ پوسٹ بکس نمبر ۵۳۰ ۔ راس الخیمہ
● آپ کو دل و جان سے اپنانے پر آمادہ ہوں۔

نثار احمد مکان نمبر ۲/۲۶ ۔ ۲ سنڈی ۔ اختر کالونی ۔ ڈیفنس سوسائٹی ۔ کراچی
● مجھے آپ جیسی شریک حیات کی تمنا تھی۔

تراب علی جتوئی ۔ گاؤں و پوسٹ آفس آگانی اسٹیشن مابوٹا ۔ ضلع لاڑکانہ
● میں نے آپ کو اپنے جیسا پا کر شریک سفر بنانے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے۔

جاوید حسین ۔ خان برادرز ۔ تھانہ روڈ ۔ کوئٹہ
● میں آپ کو خلوص دل سے اپنانے کو تیار ہوں۔

محمد تنویر سجاد تبسم ۔ چک $\frac{55}{5}$ ڈاکخانہ [illegible] آباد ۔ ضلع بہاولنگر
● میں آپ کا ہمدرد بن کر زندگی بھر ساتھ دوں گا۔

عمران ظفر ۔ مکان نمبر ۲۱۲ ۔ ڈی سیٹلائٹ ٹاؤن ۔ سرگودھا
● اگر آپ مجھے مل جائیں تو یہ میری خوش قسمتی ہے۔

مظہر علی ۔ ٹیلی فون آپریٹر ۔ ٹیلی فون دفتر ننکانہ صاحب ۔ ضلع شیخوپورہ
● تعلیم بی اے ۔ گورنمنٹ ملازم ۔ تنخواہ ۱۸۰۰ روپے ہے۔

طارق حسین بٹ ۔ معرفت ماڈرن ڈرائی کلینرز فاطمہ جناح روڈ ۔ کراچی کینٹ۔
● آپ جیسی چاہنے والی کی ضرورت ہے۔

مولانا صدیق مکان نمبر ۷ ۔ بلاک ۶ سیکٹر ۱۱ لانڈھی کراچی
● شاید آپ نے مجھے ہی پکارا ہے ۔ میں ہی آپ کا آئیڈیل ہوں۔

نور ۔ معرفت شوکت پوسٹ بکس نمبر ۱۲۷۷ ۔ دوحہ ۔ قطر

☆

اِن کالموں میں آئیڈیل کی متلاشی خواتین کے خطوط اور ان سے رشتوں کے امیدواروں کی آفرز (پیشکش) شائع کی جاتی ہیں ۔ وہ خطوط شائع نہیں کئے جاتے جن میں مکمل پتہ درج نہیں ہوتے ۔ خواتین کے پتے ان کی اجازت کے بغیر ظاہر نہیں کئے جاتے (ادارہ)



اس لڑکی کا قصۂ محبت جو پیار کرنا بھول گئی تھی

پھر سے پیار

کالی مرغی کٹ کٹ، کوں کوں، کاں کاں، کرتی پہلے تو طاق پر پہنچی، وہاں سے اتری تو پلنگ کے نیچے جا چھپی، وہاں بھی بات نہ بنی تو صندوق کے پیچھے جا بیٹھی۔ ذرا کی ذرا بیٹھی رہی پھر میں اس نے گردن اٹھا کر آنگن کی طرف دیکھا، جانے کیا دل میں آئی کہ اڑ کر کمرے میں چلی آئی اور گردن نیچی اونچی کر کے اس نے بڑی بے بسی سے مالکن کی طرف دیکھا۔ زبیدہ نے دانت سے دھاگا توڑ کر کالی کو دیکھا اور ہاتھ سے اٹھا کر مٹکے میں چھپا دیا۔

عقیل میاں باہر سے آئے تو برآمدے میں زبیدہ کو نہ پا کر سیدھے کمرے میں چلے آئے۔ مٹھی بھر روپے ان کے سامنے پھیلاتے ہوئے بولے۔

"یہ دودھ کے پیسے ہیں۔ ابھی باہر گیا تھا تو ہوٹل والے نے پچھلے سب حوالے کر دیئے۔"

زبیدہ نے پیسے بغیر گنے ہی اٹھا کر گلدان کے ایک خانے میں ڈال دیئے اور لاپروائی سے بولی۔

"ذرا ہاتھ بڑھا کر وہ مٹکا تو اٹھا دیجئے۔"

"کیوں...؟" عقیل میاں نے مٹکے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اس میں کالی کو بند کیا تھا میں نے۔ اب تک تو اس نے انڈا دے دیا ہوگا۔"

عقیل میاں نے مٹکے کو ایک دو جھٹکے دیئے اور اس میں سے

واجدہ تبسم



پر چھت پھاڑتی کان پھاڑتی نکل جاتی۔ گرمیِ گفتار نے انہوں نے زبیدہ کے ہاتھ میں دے دیا۔

"تمہاری زندگی تو بس جانوروں ہی میں گزری جا رہی ہے۔"

"جانوروں میں گزر رہی ہے؟" وہ ذرا تنک کے بولیں۔

"اور جو اتنا بڑا ڈھنڈار کا ڈھنڈار گھر پڑا ہے، اور جو آپ ہیں یہاں پر، آپ بھی جانور ہیں۔"

عقیل میاں بڑی شرافت سے ہنس دیئے۔ "کہاں ہے بھئی۔ اتنے مرنے سے پہلے مجھے بھی جانوروں میں ملا دیا۔"

"اور کیا۔ آپ کی باتیں ہی ایسی ہوتی ہیں۔"

انہوں نے بڑبڑاتے ہوئے اپنی سیون پھیٹی شروع کی۔

"آپ تو گویا مجھ پر احسان جتاتے ہیں نا۔ مگر میں بھی یونہی کسی کا احسان اٹھانے والی نہیں ہوں۔ ڈیڑھ سو روپے مہینے کے منہ پر دے مارتی ہوں۔"

عقیل میاں اس بے وقت کی راگنی سے ذرا بھی تو پریشان نہیں ہوئے تھے۔ جانتے تھے زبیدہ پھوپھی بڑے دل کی ہے، ذرا سا بھڑکنے پر جیسا بھڑکتی اور پھر جب تک وہ اگلے پچھلے سب گلے شکوے نہ کر ڈالتی، خاموش نہ رہتی۔ انہیں اس کی لعن طعن بھری باتیں سننے کی عادت سی ہو گئی تھی بلکہ ایک آدھ دن وہ اپنا شکوہ نہ جھاڑتی تو انہیں لگتا اس سے آج کا دن تو بند ہی بیکار گزر گیا۔

ملک تقسیم ہوا تو اس ہنگامے نے خان صاحب سے ان کے بیٹے کو بھی جدا کر دیا۔ یہاں سے پنشن پا کر مرنے تک گزر کر رہے تھے، گھر میں ہر ان بیٹی تھی، بیٹا تھا، بہو تھی، داماد، پوتے پوتیاں، کرگھر کیا تھا جو بہار بنا ہوا تھا۔ پھر جب اللہ کی زندگی آنکھوں کے سامنے جنتی جیتی نظر آتی ہے تو پھر کسی چیز کی تمنا باقی نہیں رہ جاتی۔ زبیدہ کی بات بہت ہی پھیکی سی تھی، آج کل میں اس کا بھی گھر بسنے ہی والا تھا۔ زندگی کی گاڑی بڑی تیزی سے چلی جا رہی تھی کہ ایک دم سے جھٹکا سا لگ گیا۔ ہنستے مسکراتے گھرانے برباد ہونے لگے، لاکھوں کے دھنی بس جانیں بچا کر گھر چھوڑ چھاڑ کر بھاگنے لگے۔ خان صاحب کا بیٹا تو جلدی جلدی میں اپنی بیوی بچوں کو پاکستان لے بھاگا، مگر خان صاحب کو اپنی مٹی عزیز تھی، کیسے بیٹھے بٹھائے سنبھال بنے بنائے گھر، وہاں تو ایک نا تھی جو کبھی ان سے نہ بولی۔ باپ کے پیچھے اپنی زندگی ویران کرنے والا تو نہ تھا، خشک ہو کر رہ گیا۔ خان صاحب کو بس خیال تھا تو زبیدہ کا، انہوں نے بہتیرا سر پٹخا کہ بھائی کے ساتھ پاکستان چلی جا، مگر اسے بھائی سے زیادہ باپ پیارا تھا۔ دو گھر تو بچا گیا مگر اس کے جاتے ہی جیسے پورے گھر پر نحوست ٹوٹ پڑی۔ بچوں کا ہنسنا بولنا، دیگچی کی کھنکھناہٹ، سانس کی تیز چلتی ہوئی آواز۔ وہ کیا گیا کہ سارا رونق ساتھ سمیٹتا گیا۔ اب گھر وہی تھا، گھر کے مکین بھی وہی تھے، مگر سارے میں ایک سناٹا سا چھایا رہتا۔

ڈاکٹر کے جانے کے کوئی سولہ سترہ دن بعد شہر میں ڈاکٹر کی اور وہ بھی ہو گیا جو نہ ہونا تھا۔ اس رات کی صبح ایسی ہوئی کہ خان صاحب پھر کبھی کسی صبح کو نہ اٹھے۔ پہلے جیسی حویلی ہی اب سیدھے سے دو دن رہ گئے۔ زبیدہ خان کی تھکن ——— تھوڑے سے دن اور یونہی گزر گئے۔ وہی آفتاب جو ہمیشہ اپنے ساتھ ہنسی کرنیں لئے آتا تھا، اب پتہ ہی نہ چلتا کہ کب آتا اور کب چھپ جاتا۔ روز و شب میں اس قدر یکسانیت تھی کہ ہفتے گزر جاتے اور پتہ نہ چلتا کہ آج کونسی بات ایسی ہوئی جو آج کے دن کو اور دنوں سے الگ کر دکھائی۔

پھر بہت دنوں بعد ایک صبح ایسی بھی آئی جس نے روز و شب کی اس یکسانیت کو ختم کر دیا۔ اس صبح زبیدہ جب نیند سے جاگی تو خلاف معمول خان صاحب کو بستر سے غائب پایا۔ وہ انہیں یہاں وہاں ڈھونڈتی بڑے دالان میں پہنچی تو دیکھا ابّا اکیلے میں بڑی لگن سے ہی کھڑکی کرہنی کھولی ہیں۔ زبیدہ نے ہاتھ پکڑ کر انہیں کمرے میں بٹھانا چاہا تو انہوں نے ہنستے ہی ہنستے زور سے ایک طمانچہ اس کے منہ پر جڑ دیا۔ وہ اس درد کو سہہ گئی۔ مگر جب اس نے بڑے سکون سے کہا "ابّا پہلے منہ تو دھو لیجئے۔ بعد میں جنتی ہو بیٹھیے۔" تو انہوں نے تڑ تڑ اپنے ہی: بر تھپڑ مارنے شروع کر دیئے۔

ان کا دماغ چل گیا تھا۔

اتنے بڑے گھر میں کوئی بھی تو نہ تھا جو اس بڑے وقت کا ساتھی ہوتا زبیدہ کو پہلے سے کچھ بین دن گزر جاتے کچھ کئے بادہ دن ہو جاتے

زکریا نہ تھا جو ہاتھ پکڑ کر منزل پہ لے جاتا۔ ماں کی پریشان ہنسی جو گھر کھاتے
باقی تھی۔ وہ ابھی زندہ تھیں تو ابھی ہی رہتیں اور جب تو زبیدہ بچی تھی تو ایک
سرے سے سارے گھر کا گیان کر دیتیں۔

ایک دن زبیدہ باورچی خانے میں تھی نماز عصر کا وقت ساتھ والے صحن سے گلی پڑوسی کے مرثیہ خوانی کر رہی تھیں کہ ایک دم سے دروازہ کھلا اور عقیل میاں اندر داخل ہوئے۔ بال الجھے، الجھے، کپڑے میلے کچیلے ہاتھ میں پرسوں میلی چادر منہ پہ دو ہاتھ سی گلی اپنے شمار سے پیاروں کو ڈھونڈ رہا شا کر آئے ہوں اور دروازے کی کھڑکی پہ زبیدہ پہ جو گئی اور اماں گردانوں میں آ گئی۔ عقیل میاں نے سر گھما کر زبیدہ کو دیکھا۔ زبیدہ بھرا پتے زمانے میں قیامت ڈھاتی تھی جس کی خوبصورتی اور حسن کھو بیٹی کے آگے کسی کا چراغ نہ جل سکا اب کیسی ہو کر رہ گئی تھی۔ جیسے کوئی ٹوٹی پھوٹی قبر۔ اتنی جلدی کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔ ان کے کانوں میں بڑی دور سے آواز آئی۔

"عقیل بھائی۔ آپ کیسی حالت ہو گئی آپ کی؟ بھابی جان اور بچے کہاں ہیں۔؟"

رو پڑے اور پھر اسی دنیا میں لوٹے، جہاں سر جھاڑ منہ پہاڑ زبیدہ کھڑی تھی اور مرثیہ خوانی کرتی خالہ اماں بھی، روتے ہوئے درود دیوار اور صافی کرتی وہ روتی بلکتی ہوئی ہیں۔

"اللہ ہی بہتر جانے۔ میں تو اپنے کام کے سلسلے میں دلی گیا ہوا تھا واپس آیا تو گھر جلا ہوا تھا۔ کسی نے کہا یہاں والے جانیں بچا کر بھاگ نکلے۔ کوئی کہتا تھا سب کچھ جل گیا۔" وہ دل پکڑ کر رہ گئے۔

"سب کچھ جل گیا زبیدہ بی بی۔ بس ہم ظفر خود باقی رہ گئے۔"

جانے اس دن کتنے دنوں بعد زبیدہ کے آنسوؤں کو راہ ملی۔ ادھر کا ہر کا اُدھر جل گیا۔ جیسے بچی دھوپوں نے اپنی جگہ تاروں کو دے ڈالی۔ پھر تاروں نے پھر بجھاتے سورج کا استقبال کیا، مگر وہ ستون کے سہارے لگی بیٹھی رہی۔ گالوں پر آنسوؤں کے لمبے لمبے نشان بن گئے تھے۔ اور گھٹنوں کی مانند بال، زرد چاند ایسے چہرے پہ بچوم کر آ گرے تھے۔ بڑی دیر بعد عقیل میاں نے اسے اٹھایا تھا۔

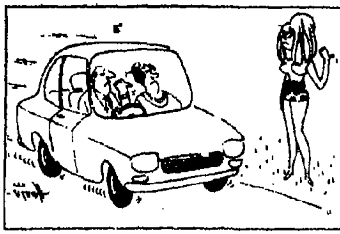
"چلو زبیدہ، زرد گھڑی بیٹھی سے سرلو۔ ہاں تو تم بھی پاگل ہو جاؤ گی۔"
مگر زبیدہ وہ دل و دماغ لائی تھی جو لاکھ صدمہ کا سامنا کرتے پھر بھی کبھی اس بوجھ سے نہ جھکتے۔ ماحول پھر وہی یکسانیت لئے تھا۔ پھر اس ماحول کو اماں نے ہی اس یکسانیت سے بچایا۔ اس دن صبح وہ اپنے پلنگ پہ مردہ ملیں۔ پاس ہی خواب آور گولیوں کی خالی شیشی پڑی تھی۔ رات بھی زبیدہ نے بچو ابلی سے جلا کر دو گولیاں کھائی تھیں۔ وہ بھی تو تنگ آ چکی تھی۔ انہوں نے مدات بھر کی نیند کو کانی سنجالا۔ ایسی سوئی کہ پھر کبھی کسی گولی کی ضرورت نہ پڑی۔

ماں کی موت کے ایک دو ماہ بعد عقیل میاں نے بہت سوچ سمجھ کر زبیدہ کو رشتہ دی۔

"میرا کہا مانتی ہو تو اب تم بھی پاکستان چلی جاؤ۔ بڑے بھیا تو کب کے بلا رہے ہیں۔"
زبیدہ نے بڑے تیکھے پن سے کہا
"اور یہ تو بتائیے آپ سے یہ مشورہ مانگا کس کمبخت نے ہے؟"
اس کے یوں رکھائی سے جواب دینے پر عقیل میاں اسے دیکھتے رہ گئے۔
"آپ کو اتنی بھی عقل نہیں۔ بھلا میں نے ماں باپ کی زندگی میں انہیں چھوڑ کر نہ گئی تو اب ان کی موت کے بعد کیا جاؤں گی۔ اب ہونا بھی کیا ہے زندگی کے دن رہے تھے تو پورے ہو گئے ہیں۔ سب ابھی ہیں۔ البتہ آپ ضرور جائیے اور پتہ لگائیے آپ کی بیوی بچے کن حالوں میں ہیں۔ کہاں ہیں۔؟"

عقیل میاں نے بڑی بے بسی سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ "کون جانے وہ کہاں ہوں۔ اور اب۔ اب تو میرا کاروبار بھی تباہ ہو گیا ہے۔"
زبیدہ ان کا اشارہ سمجھ گئی۔ فوراً بولی۔ "روپے پیسے کی آپ فکر کیوں کرتے ہیں۔" مگر عقیل میاں جتنی بار جانے کا سوچتے اتنی ہی بار رہ جاتے۔
"تمہیں اکیلا چھوڑ کر جاؤں تو کیسے۔" زبیدہ ہنس پڑی۔ "واہ جیسے آپ میرے پیر بزرگ ہی تو ہیں نا۔ مگر آپ کے بغیر میں مر ہی تو جاؤں گی نا۔ ایسی خوش فہمی بھی اچھی نہیں۔" اور وہ بڑی دیر تک کھلکھلا کر ہنستی رہی۔

خود بخود ماہ و سال یونہی گزرتے رہے۔ ابھی ابھی جو بھولی بھالی زبیدہ



انیس سال کی معصوم سی لڑکی تھی، اب ظالم زندگی کے ہاتھوں ایک بوڑھی عورت بن چکی تھی۔ اس کے کانوں کے پاس سفید بال لہرانے لگے تھے، اور دس برس کی مدت میں اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ اور چہرے سے شادابی یوں دور ہو چکی تھی کہ اس کی عمر کی لڑکیاں اب اسے مخاطب کرتے ہوئے "خالہ" کا اضافہ کر دیتیں۔ زندگی نے اس کے چہرے کی شادابی ہی نہیں، اس کے مزاج کی خوبصورتی اور وہ ہنسی بھی چھین لی تھی، جس کی وجہ سے وہ سب میں ہنستی گاتی چڑیا کے نام سے مشہور تھی۔ اب وہ اس قدر چڑچڑی اور زود رنج ہو چکی تھی کہ یہ بھی نہ دیکھتی کہ اس کا مخاطب کون ہے۔ اس کی تنہائی اور بے کیف زندگی کے ساتھی اب وہ سارے جانور تھے جو اس نے وقت کاٹنے کو پال رکھے تھے، مگر اب جن کے بنا وہ اپنی زندگی کا تصور تک بھی نہ کر سکتی تھی۔ کالی پیلی مرغیاں، ڈبو بھینسیں، سفید کتا، ہرا طوطا، بھوری بلیاں انہی کے گرد اس کی زندگی گھومتی تھی۔ عقیل میاں کے دم سے گھر میں کسی مرد کی موجودگی کا احساس ضرور ہوتا۔ مگر زبیدہ کیلئے ان کا وجود اس قدر بے معنی تھا۔ عقیل میاں بھی آخر انسان تھے، مسلسل اس کی چیخ و پکار اور بے جا ناراضگی سے تنگ آ کر وہ بھی اڑنے کی سوچ رہے تھے۔ مگر ابھی تک انہیں ایسا کوئی کارگر بہانہ نہ مل سکا۔ اس دن جب وہ بازار سے لوٹتے ہوئے مرغیوں کیلئے زبیدہ کی لاڈلی نسل پر نہال ہوئے تو زبیدہ دیکھتے ہی چیخ اٹھی۔

"یہ ڈربہ ہے۔ یہ ایسا ڈربہ لانے کو میں نے کہا تھا؟ اس میں تو گھر کی مکھی بھی نہیں۔ جالی تک نہیں۔ میری مرغیاں مر نہ جائیں گی؟ اس سے اچھا تھا کہ آپ اسے اپنا بیڈروم بنا لیں۔" عقیل میاں نے کچھ جواب نہ دیا۔ گھنٹہ بھر تک سر جھکائے سنتے رہے۔ ہر ہر پہلو پر غور کر لیا۔ پھر متانت سے بولے۔

"بس زبیدہ بی بی بہت ہو چکا۔ اب آپ کا ہمارا ساتھ ختم ہم پاکستان جا رہے ہیں۔" زبیدہ نے حیرت سے دیکھا۔ آج تک انہوں نے ایسی بات کبھی نہ کی تھی۔ یہ آج انہیں کیا ہو گیا۔ اس نے چاہا انہیں روک لے، مگر وہ تو غصہ میں پلک جھپک اپنا سامان پیک کئے جا رہے تھے۔

"ہونہہ میری جوتی سے۔ میں کون ان کے بھروسہ زندگی گزار رہی تھی۔" دوسرے دن جب عقیل میاں جانے کو اٹھے تو اسے احساس ہوا کہ اسے یوں تو واقعی بچوں جیسے ہیں۔ دیوار سے ٹیک لگائے فرش پر بیٹھی زبیدہ نے بڑی بے حالی اور بے بسی سے کہا۔ "میری مرغیوں کی دیکھ ریکھ کون کرے گا بھلا؟" وہاں تو ہر جواب پہلے سے سوچا گیا تھا۔ جھٹ سے بولے "تم نہیں ہو گی؟"

"ہوٹل والے سے بات کر کے روپے کوئی لیا کرنا بھئی۔"

"خود ہی چلی جانا کوئی بچہ تو ہو نہیں تم۔"

"اچھا گائیوں بھینسوں کی سانی چارہ کون کرے گا؟"

"فکر کیا ہے کوئی گوالے کی اولاد ہوں؟" وہ جھینک کر بولے "بیچو تو ہزاروں روپے مل جائیں گے۔"

"اور جو کتا بیمار پڑ گیا تو مجھے تو جانوروں کا دوا خانہ معلوم بھی نہیں۔ یہ کیا کروں گی؟" انہوں نے گھور کر اسے دیکھا۔

"رکشہ والا خود ہی پہنچا دے گا۔" انہوں نے تیزی سے جواب دیا اور جھک کر جوتا اٹھا لیا۔ ابھی ایک قدم دروازے کی طرف بڑھایا تھا کہ زبیدہ کی دکھ سے بھری آواز آئی۔ "یہ سب تو ہو جائے گا مگر میری دیکھ بھال کون کرے گا؟"

ان کے قدم جیسے وہیں گڑ سے گئے۔ انہوں نے بمشکل سے سر گھما کر دیکھا۔ زبیدہ دیوار سے لگی اس قدر بے بس نظر آ رہی تھی۔ اس سوال کا جواب تو انہوں نے سوچا بھی نہ تھا!!

من من بھر کے قدم اٹھاتے وہ زبیدہ کے پاس پہنچے اور ایکدم جیسے ان کے چہرے پر مسکراہٹ سی دوڑ گئی۔ روتی ہوئی زبیدہ کا سر اٹھا کر انہوں نے پیار سے پوچھا۔

"کیوں بھئی۔ میں تیرا پہرے دار ہوں؟"

زبیدہ نے شرما کر اپنا منہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔

"بے شرم کہیں کے!" وہ ہنستے ہنستے بولی۔ "خاموش رہنا تو سیکھا نہیں ہے۔ ہر سوال کا جواب جیسے زبان پر رکھا ہے۔" اور اس نے اپنے ہاتھ ان کی گردن میں ڈال دیئے۔



جیل کی ٹھنڈی سلاخوں کے پیچھے ایک محبت بھرا دل دھڑکتا تھا

انتظار

وقار بن الٰہی

اچانک میری آنکھ کھل گئی اور کروٹ بدل کے میں نے دیکھا تو کاسٹن اپنے بستر میں نہیں تھا۔ وہ جیل کی سلاخوں والے دروازے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے جھنجھوڑ رہا تھا جیسے اگر وہ دروازہ ٹوٹ جائے تو وہ اس بیرک سے نکل کے بیوی بچوں کے پاس بھاگ جائے گا۔ وہ دروازے کے پاس کھڑا تھا اور آنکھیں میری بھیگی ہوئی تھیں۔ مجھے یاد آگئی کہ جب میں اپنی باقی ماندہ زندگی اس بیرک کی بھینٹ چڑھا دینے کے لیے یہاں آیا تھا اس رات بھی مجھے نیند نہیں آئی تھی اور میں نے سوچا تو میں رات کے بعد اسی طرح دروازے کو جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ میں یہ بھول گیا تھا کہ اس بیرک کا بیرک میں آ تو گئے ہیں، جو ان دروازے اکھیڑ کے بھاگ سکے ہوں گے۔ ذرا اللہ بیرک کے وسطی جلتے بلب کو دیکھ کے میں نے سوچا، مصیبت میں گھر کے کام کا انتظار ہوتے ہوتے انسان ایک معمولی ہو جاتا ہے۔

پچھلی شام ہی جب میں فیکٹری سے کام کے بعد لوٹ کے آیا تھا تو

معلوم ہے ہماری حالت ہو گئی تھی۔ اور جب گنتی کا وقت قریب آتا تو ہم اپنے ایک ایک کا پیسہ دوست سے ملنے چلے جاتے۔ ہم نے اپنا گھی، چینی، پتی اور دوسری چیزیں اسی کے کمرے میں چھپا کے رکھی ہوئی تھیں۔ بیرک میں رکھنا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ دوست سے پہلے کہ ہم اپنی فرصت کی چیزیں سمیٹتے اور جلدی جلدی دروازہ بند ہونے سے پہلے لوٹ آتے۔ کھانے کے اس میں گھی ڈالتے اور کبھی دال ٹھنڈی ہو جاتی تو ہم ذرا منہ میں رکھ کے ذرا سا گھی بھی توڑ کے ڈال دیتے تھے کہ پیٹ میں جا کے خود ہی حل ہو جائے۔ جب گنتی ختم ہو جاتی اور روشنیاں بجھ جاتیں اور قیدی ادھر ادھر ہو جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے تو میں اور کالے خان کبھی کبھی طرح پیٹ کے اپنے اپنے تولیے لے بیٹھ جاتے۔ دن میں سگریٹ کا ٹکڑا اپنا تو پانی منہ میں رکھتے۔ کالے خان تاکا سگریٹ سلگاتا۔ وہ جب تک سگریٹ سلگا رہتا۔ جتنی اس کے ہونٹوں پر چپکی رہتی تھی۔ پھر وہ باتیں شروع کرتا تو اکثر اس کی باتوں کا مرکز اس کی بیوی ہی ہوتی تھی۔ اس وقت جب کالے خان کا عرف اس کے سوا کوئی نہ تھا اور پھر اس کی بیوی تو بڑے عجیب حقد ہی تھی، اسے ملنی ماہ ناک قدہ کسے یاد کرتا۔

ان دنوں اس ہنستے کھیلتے اور بات بات پر قہقہہ لگانے والے کالے خان کو میں دیکھتا تو مجھے اس کی بات پر یقین آ جاتا تھا کہ بیوی تو واقعی ایک ایسا نشہ ہے جو ایک بار چڑھ جائے تو اترنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ ایک رات ہم حسب معمول دیر سے لیٹے تھے لیکن روشن دان میں سے آتی ہوئی سرد ہوا نے میری نیند توڑ دی۔ سردی سے کانپتے اور کمبل سے منہ نکال کے میں نے دیکھا تو کالے خان ابھی تک جاگ رہا تھا۔ اس نے وہ ساری چیزیں اپنے سینے پر پھیلا رکھی تھیں جو اس کی بیوی دے گئی تھی۔ وہ سگریٹ جلائے بڑی محویت سے چھت کے اندھیروں میں دیکھ رہا تھا۔

اسے جاگا ہوا دیکھ کر لگا کہ مجھ سے منہ دھونے کا سدا نہیں تو وہ سر سے تہبند، داڑھی اور مونچھیں صاف کرنے لگا کیا مجال جو اس کا تہبند میلا یا اس پر دھبا ہو جائے۔ وہ فوراً صابن لے کے سامنے نل پر جا بیٹھتا۔ اور اگر میں نے پوچھ بھی لیا کہ تمہارے کپڑے اتنے گندے تو نہ تھے جو تم انہیں دھونے بیٹھ گئے ہو تو مسکرا کے ہنستا پھر ہنسنے سے پہلے یوں کہتا۔ "نہیں یار! یہ بات نہیں، خیال تھا کہیں شام کو ملاقات نہ آ جائے۔" میں اس کی فکر پر دو چار ہو جاتا تو وہ ہنستے ہوئے کپڑوں کو جلدی جلدی دھونے لگ جاتا۔ اس کی اگلی ملاقات جس کا اسے کئی روز سے انتظار تھا کوئی تین ہفتے بعد آئی۔ اس دن ہم فیکٹری سے نکل ہی رہے تھے کہ بیرک کے جمعدار نے اطلاع دی۔ اتفاق سے کالے خان نے اس روز نہ کپڑے دھوئے تھے نہ ہی شیو بنوائی تھی۔ پھر بھی ملاقات کا سن کے اس کی آنکھوں میں چراغ جل اٹھے تھے اور وہ مجھے چھوڑ کے بھاگ گیا تھا۔

میں اس شام کی ... کالے خان کہیں چلا جاتا تھا تو مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں تنہا رہ گیا ہوں۔ ... تنہائی بانٹنے کے لئے ... کرتی رہتی جانے ... یا گر چکی ہوگی۔ ادھر بیرک سے کالے کے پیٹ میں سے اس کا بستر جھاڑا، پھر اپنا معائنہ کیا تھا اور ... اس شام کھانا ایک ہی تھی۔ ... ہم گھاس ہی کہتے تھے۔ اور چشمہ فرش پر رکھ کے اس کا انتظار کرنے لگ گیا۔ یوں ہی بیٹھے بیٹھے مجھے خیال آیا کہ کالے خان اگر اتنا خوش ہے تو ضرور کچھ امید ہے، تو صرف اس لئے کہ اسے اپنی اپیل منظور ہو جانے کا پورا یقین ہے۔ لیکن اگر اس کی اپیل منظور نہ ہوئی تو۔ یہ بھی میں نے سوچا تو میری نگاہوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اگر ایسا ہوا تو۔ تو کالے خان تو پھر وہ کے انگارے کی طرح بجھ جائے گا۔ اس کی امید اگر ایک بار بھی ٹوٹ گئی تو پھر مشکل ہی ہے جڑے۔ لیکن پھر میں نے اپنا سر جھٹک کر خیال جھٹک ڈالا۔ نہیں، اس کی اپیل منظور ہو گی۔ بیرک کے آخری کونے کی طرف دیکھا تو وہ پہلے کی طرح بیٹھا اپنے آپ سے ہنستا، جھومتا چلا آ رہا تھا۔ یہ خوشی بھی کیا چیز ہے۔ آ جائے تو انسان کرچیوں پر ... جاتے ہیں، چھن جائے تو جیسے وہ زندہ در گور ہو جاتا ہے۔

قریب آ کے کھیس کی بکل کھولتے ہوئے اپنی خوشی کو بمشکل دباتے ہوئے اس نے پوچھا "کہیں گھاس تو نہیں کھا گئے؟" "جناب ہی آپ جیسی اگلی ... تمہارے بغیر تو اب کھانا حلق سے اترتا ہی نہیں۔" وہ سنبھل کے اپنے بستر پر جا بیٹھا۔ ٹیکل کھولوں کے پوٹلیاں سامنے رکھتے ہوئے ہنس کے کہنے لگا۔ "بڑی بھاگوان ہے وہ بھی یار، دیکھ جانے کیا کیا اٹھا لاتی ہے۔" اس نے پوٹلی کھولی تو اس میں دیسی پراٹھے اور ساتھ ساتھ دوسری پوٹلیوں کا جو سلسلہ تھا دو ٹکیاں اور گڑ کی بھیلی تھی۔ بادام اور ساتھ اخروٹ توڑ کے ڈالے گئے تھے اور تھوڑی سی مٹھائی اور سگریٹ کی ڈبی تھی۔ کالے خان نے اور چیزیں تو دوسری طرف سرکا دیں اور دو سگریٹ سامنے رکھ کے ڈبہ اٹھاتے ہوئے بولا۔ "یار ویسے ملاقات کی بڑی تیزی ... ہے یار! یہ بے وقوف اتنے سرد اور ... ہیں۔ جب وہ جانتے ہیں کہ ایک بیوی ہی اپنے خاوند سے ملنے آتی ہے اور وہ بھی اتنی مسافت ... انہیں کم از کم پندرہ منٹ تو ہر بار دے دیا جائے۔" کالے خان ٹھیک کہتا تھا۔ ملاقات کا کمرہ قیدیوں کے بیرکوں اور دفتروں کے بالکل عقب میں تھا۔ اس بڑے کمرے میں بہت ساری سلاخیں ایک قطار میں زمین اور چھت میں گاڑی گئی تھیں۔ اس طرف قیدی بیٹھتے تھے اور دوسری طرف ملاقاتی اور سلاخوں میں سے بڑی مشکل سے بازو ادھر ادھر ہو جا سکتا تھا۔ میں نے بات ذرا ... اس سے کہی۔ "تمہارا ٹھیک ہے لیکن کالے خان۔ ان کے نزدیک تو ایک عورت ایک قیدی سے ملنے آتی ہے اور بس۔ لیکن یار! تم نے پہلے کہا ہوتا تو اس کا بھی بندوبست ہو سکتا تھا۔ وہ اپنا ... کسی وقت کام آئے گا ... پتہ تھا، ... کسی خاص ... گھروالی کو ملوائیں گے۔"

اس بار بھی ... نے اس کا کھانا لیا تھا ایک ایک دو دو سے بہت سارے ... تھی۔ جیل میں بخشش کا معنی تو زیادہ ہوتا ہے ... پیچھے ... کالے خان بولا۔

گرم تھا۔ منہ ہاتھ دھو کے میں نے کھیس سے اپنی خشک کیا اور جلتی آنکھوں کو دبا کر اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ کالے خان اس وقت بھی سو رہا تھا۔ پھر جب میں نے دو چار گرم گرم چائے کی چسکیاں لیں تو وہ ایک دم چونک کے اٹھ بیٹھا اور پھٹی پھٹی نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور پلکیں اور اس کے اردگرد کا گوشت سرخ بھی تھا اور سوجا ہوا بھی۔ سوتے میں گندہ لعاب اس کے منہ سے بہہ کے گال کے ساتھ گلے کے ساتھ سوکھ گیا تھا۔ میں چائے کے گھونٹ بھرتا رہا اور کالے خان چپ چاپ اور تھکا تھکا سا دیکھتا رہا۔ یوں جیسے وہ صرف سر یا آنکھیں اور جگہ ہوں مگر اس کی آنکھ کھلی کسی اور جگہ ہو۔

میرے جانے پر وہ منہ ہاتھ دھو آیا تھا اور آتے ہوئے چائے بھی لیتا آیا تھا۔ جس کی بھاپ سے وہ اپنی آنکھیں سینک رہا تھا اور کبھی کبھی گھونٹ بھی بھر لیتا تھا۔ پھر جب فیکٹری کا بھونپو بجا تو میں نے اٹھ کے کھیس کی بکل اور بھی سختی سے ماری اور کالے خان سے کہا۔ "کام کا وقت ہو گیا ہے کالے خان میں تو فیکٹری جا رہا ہوں۔" کالے خان نے پہلی مرتبہ کوپ ہونٹوں سے ہٹایا اور کسی قدر حیرت سے بولا "فیکٹری۔ یہاں کاہے کی فیکٹری ہے؟" "جیل ہی چھوٹی سی فیکٹری ہے جہاں صرف فرنیچر بنتا ہے اور اسے قیدی بناتے ہیں۔" اس کے لئے یہ بات جیسے خلاف توقع تھی کوپ رکھ کے اور بھی حیران ہوتے ہوئے اس نے پوچھا۔ "تو کیا قیدی چکی نہیں پیستے؟" اسے کسی نے بتایا ہوگا کہ جیل میں تو چکی ہی پسوائی جاتی ہے۔ "نہیں۔ چکی تو وہ قیدی پیستے ہیں جو جیل میں بھی شرارتوں سے باز نہ آئیں۔ باقی یا تو ادھر ادھر کے کام کرتے ہیں اور یا پھر فیکٹری میں جاتے ہیں۔ تمہیں کوئی کام آتا ہے کیا؟" کالے خان جیسے سوچ میں پڑ گیا کہ جب اٹھا کے چائے کا ایک گھونٹ بھر کے کہنے لگا۔ "اور تو کچھ بھی نہیں کر سکتا، البتہ کرسی بن لیتا ہوں۔" یہ سن کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ "اچھا تو اب ہم ساتھ فیکٹری میں بھی رہیں گے۔" جانے کیا بات تھی، کالے خان کے چہرے پر پھیلی معصومیت اور بھولپن نے مجھے بری طرح متاثر کیا تھا۔ اور میں بار بار یہی سوچتا کہ کیا ایسی صورت کا انسان اتنا بڑا مجرم بھی ہو سکتا ہے۔ "تم فکر نہ کرو تھوڑی دیر میں بیرک کا جمعدار آئے گا۔ تم اس کے ساتھ دفتر کے پاس چلے جانا۔ تمہاری ڈیوٹی فیکٹری میں لگا دی جائے گی۔" کالے خان نے جواب نہ دیا۔ میں نے اختلاف بھی کیا اور تیز تیز قدموں سے باہر نکل آیا اس لئے کہ دیر ہو رہی تھی البتہ راستے میں اتنا سوچا ضرور تھا کہ شاید وہ ساری رات روتا رہا ہے۔

دوپہر تک میں دو کرسیوں پر ہی پالش کر سکا۔ حالانکہ اتنی دیر میں تو چار پانچ کرسیاں کو تیار کر دیتا تھا۔ لیکن اس روز تو کام نہیں کر رہا تھا بلکہ مجھے تو کالے خان کا انتظار رہا۔ دوپہر کا کھانا ابھی تقسیم نہیں ہوا تھا کہ جب کالے خان بیرک کے جمعدار کے ساتھ جیلر صاحب کے پاس رپورٹ کرنے کے بعد فیکٹری کے برآمدے میں داخل ہوا۔ میرا سینہ مارے خوشی کے پھول گیا۔ اپنا دکھ درد کہنے، کسی کو سنانے کی لگن تو انسان کو ہمیشہ ہی بے چین رکھتی ہے۔ کالے خان نے کرسی کا ایک ڈھانچہ اٹھایا اور میرے پاس آن بیٹھا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا وہ کرسی بنتا جا رہا تھا اور میں تیار کرسیوں پر پالش کرتا جاتا تھا۔ بُرش روک کے میں کبھی کبھی اس کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ میں چاہتا تھا، اس سے بات کروں لیکن پھر جانے کون سی شے میرا گلا دبا دیتی تھی۔

دوپہر کو ابھی ایک تھالی حصے ہی بن سکا تھا کہ نمبردار قیدیوں کا کھانا لئے وہاں چلے آئے۔ کالے خان اپنی تھالی نہیں لایا تھا۔ میں نے ایک ہی تھالی میں اس کا کھانا بھی لے لیا اور روٹیاں جھولی میں بھر کے لوٹ آیا۔ کالے خان نے کرسی ایک طرف رکھ دی لیکن جب میں نے تھالی اس کے سامنے رکھی تو وہ یوں پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھنے لگا جیسے میں اس کے ساتھ مذاق کر رہا ہوں۔ پھر اس نے ڈوبے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"میاں کیا ایسی ہی ترکاری کھانے کو ملتی ہے؟" شاید اس کا یہ پہلا ہی سابقہ تھا۔

"ہاں۔ کبھی کبھی دال۔ اپنا گھر تو نہیں ہے میاں۔ یہاں تو ایسی ہی دال ملے گی۔ جو پیٹ میں اتر جائے اور پانی ناک سے باہر نکل آئے۔" اس نے دوسری بات نہیں پوچھی۔ چپاتی اٹھائی اور بڑے بڑے نوالے منہ میں ٹھونسنے لگا۔

"اسے بہتر بھی بنایا جا سکتا ہے۔ لیکن مصیبت ہے تو یہ کہ ان دنوں میرے پاس گھی ختم ہو گیا ہے اور پیسے بھی نہیں رہے۔ مدتوں سے گھر سے کوئی بھی ملنے نہیں آیا ورنہ پاؤ کے گھی ڈال کے کام چل جاتا تھا۔" میں نے لقمہ اٹھایا تو کالے خان نے ہاتھ روک لئے۔ ادھر ادھر دیکھ کے اس نے نیفے کو ٹٹولا اور دوبارہ صفحہ میں تقریباً دس کے اس کے چند روپے میرے ہاتھ میں تھما دیئے۔ پانچ پانچ روپے کے چار نوٹ تھے۔ اس کی محبت دیکھ کے میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ جیل تھی اور ایک سرے سے دوسرے سرے تک قیدی بھرے پڑے تھے لیکن جانے کیوں وہ دنیا کی خودغرضی اپنے ساتھ لیتے آئے تھے۔ وہ یہاں بھی اپنے ہی نفس کو پوجتے تھے۔ یہاں بھی وہ اپنے ہی دوزخ کو بھرنے کیلئے بھاگتے رہتے تھے۔ اس وقت تو ہم نے دہی والی کھائی لیکن شام کا انتظام ہو گیا تھا۔

اس دن قریب قریب بیٹھنے کے باوجود کالے خان نے مجھ سے کوئی دوسری بات نہ کی۔ اس دن ہی کیا، چار پانچ روز گزر گئے۔ وہ میرا ساتھی ضرور تھا لیکن کیا مجال جو منہ سے ایک لفظ بھی نکالے۔ میرے اندر تو جیسے کھوج کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ میں چاہتا تھا جتنی جلد ہو سکے وہ اپنے متعلق بتا دے اور اسی لئے میں نے اسے اپنے بارے میں ایک ایک بات بتا دی تھی۔ لیکن کالے خان کا جواب تو ہی ہوں یا ہاں تھا۔ وہ میرے ساتھ فیکٹری سے لوٹ کے آتا میرے ساتھ کام پر جاتا جب تک میں جاگتا رہتا تھا وہ بھی نہیں لیٹتا تھا، بیٹھا رہا اندر کو ہی گھورتا رہتا۔ ہم دونوں اکٹھے جاگتے منہ ہاتھ دھوتے جاتے اور چائے کی چسکیاں بھرتے ایک ساتھ فیکٹری

سے نکل کے سیدھے ہوتے ہوئے نظریں آہستہ آہستہ بادام پہ ڈال کر ہے
پر کس ملا جاتے۔ لیکن باقی کھانا وہ سے وقت ہی ہاں اس سارے معاملے میں کالے
خان اپنی طرف سے ایک لقمہ تک نہیں کھاتا تھا۔ وہ تو جیسے سر سے پاؤں
تک روزہ دار تھا اور اسے روزہ بند رکھنا ہی پسند تھا۔ البتہ ایک بات تھی کہ ہم جب بھی
کھانے بیٹھتے تو پہلے دو چار نوالے اٹھاتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ
جاتے تھے اس کی آنکھوں میں پانی تیر جاتا تھا۔ وہ سر جھکائے ہوئے اپنے
اپنی حالت پر قابو پا لیتا اور پھر آرام سے کھانے لگ جاتا۔ اس کی یہ حالت دیکھ
کے میرے منہ میں نوالا پھنس جاتا۔ آخر وہ کون ہے کہ کالے خان جب بھی کھانے
بیٹھتا ہے تو اسے یاد کر کے اس کے ہاتھ ڈگمگا جاتے ہیں۔

جن دنوں وہ نہیں آیا تھا ان دنوں ٹیکری کی کھڑکی سے بھی بند ہو جایا کرتی تھی
لیکن میں اٹھتے اٹھتے بھی دو دو گھنٹے کھڑکی پر گزار دیا کرتا تھا۔ پانچ بجے گنتی ہوتی تھی
گنتی سے پانچ بجے تک یہ دو گھنٹے جیسے پہاڑ ان چوری لیتے تھے۔ آخر میں تنہا کہاں
بھٹکتا پھرتا۔ پھر بیرک میں تو سارے کے سارے ساتھی چور، ہوتے جیب تراش اور کوہ
خشونتوں والے لوگ تھے کہ دوست بنا سکتے کہ باتیں میرے ساتھ باتیں کرتے
اور گھومتے پھرتے۔ لیکن جس دن سے کالے خان آیا تھا اس دن سے پھر نہ تو گنتی
یہ کھٹکتا تھا ہم پہلی سے ملاقات ہو کے بیٹھ جاتے تھے۔ جو بھی سورج کی روشنی
سامنے کی پہاڑی کی چوٹی پر بہت سے غائب ہو گئی۔ میں کرسی وہیں چھوڑ دیتا
کالے خان سر ہاتھوں میں پکڑ کر وہ سر کے ہاں ہی ڈھیر کر دیتا۔ پھر ہم دونوں اپنے
اپنے کپڑے جھاڑتے چپل پہنتے اور بگل بجنے کے انتظار میں بیٹھ جاتے
بگل بجنے کی آواز پہاڑی سے نکل کے ہم تو ساری جیل کے چکر کاٹتے اور جا کر ہم
کسی جگہ سے کوئی بھولا ہوا دیکھنے چلے جاتے۔ جیل کے ہم جہاں تک آتے
تھے وہاں ہی کو سلام کرتے تھے اور اس کی آنکھوں میں خبر کے بعد کو سلام کرتا
تو ہمارے معمول کے مطابق شامل تھا۔ گزرنے کو وقت اچھا گزر رہا تھا۔ یہ
دوسری بات تھی کہ ہم آپس میں بات بہت نہ کرتے تھے۔

کالے خان نے جو مجھے بتایا وہ یہ تھا۔ وہ سات آٹھ دنوں میں ہی
یہاں ختم ہو گئے کہ وہ پہلی تو بیٹھ کر سوال کرتی تھیں اور باقی دل پر چھوڑ دیتے
کالونی قیدی کا سرہانے کے نیچے سے اٹھالے گیا تھا اس نے کہیں جیب سے
نکالے کر لیا تھا سو تب سے ہی لے اڑا۔ اس شام جب ہم ٹیکری سے نکلے
تو میں نے کالے خان سے کہہ دیا تھا۔ "آج پھر فکر کا سامنا ہی کھانا پڑے گا"
کالے خان نے نہیں پوچھا کہ کیوں۔ اچھا کہہ کے چپ ہو گیا۔ اب تو اس کے
پاس بھی پیسے نہ تھے۔ شاید پیسے نہ ہونے ہی کی وجہ تھی کہ ہم دونوں بڑے
اداس لگ رہے تھے اور راستے پر چلتے ہوئے اور سے تھکے ہوئے سپاہیوں سے
بیرک میں لوٹ آئے تھے جیسے ہم نے کسی روز پر کوئی جیتا ہوا اختیار کھو بیٹھا اور اب
اسے دو تانے چلا رہے ہوں۔

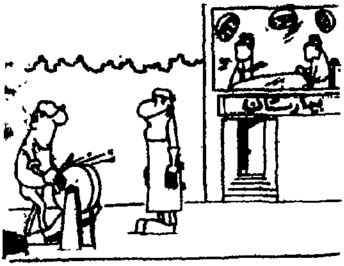
اپنے اپنے تختوں پر بیٹھے ہم جانے کن سوچوں میں ڈوبے تھے کہ پھر

لا پھر ایک قیدی کا بھائی ملنے آیا تھا مستقیم بیچارہ ملاقات نہ کر سکا دور سے
ہاتھ ہلانے کے لئے تھوڑی دیر کھڑا رہا لیکن ملاقات کرنی ہے تو کالے خان کو جاتی
کہ جانے کا کوئی بہانہ کر گیا۔ اس کی آنکھوں میں حیا کا انعکاس چھپ گیا کر
پلٹنے سے پہلے تو مجھ سے پوچھا۔ تمہاری ملاقات کتنی ہے۔ کالا خان
ہاتھ پر ہاتھ رکھے چپ کر رہ گیا۔ اس کی ملاقات! پھر اس نے کوپ رکھ کے
سرہانے کے نیچے سے کپڑا نکالا اور ڈرتے ڈرتے سے کلام اٹھاتا ہوا
جمعدار کے ساتھ بیرک سے باہر نکل گیا۔

گنتی سے کوئی آدھ گھنٹہ پہلے ملاقات کا وقت ختم ہو جاتا تھا کہ اس وقت
لوگ ملے ہوئے قیدی بھی پانچ بجے اپنی بیرکوں میں پہنچ جاتے اور تقریباً اسی وقت
کھانا بھی تقسیم ہوتا تھا۔ میں ملاقات کے بعد دیر سے ایک کونے میں بیٹھا تھا اور کھانا
بانٹا جا رہا تھا۔ میں اپنا اور کالے خان کا کھانا لے آیا تھا۔ ملاقات کا وقت ختم ہو
چکا تھا۔ کھانا بانٹنے کے بعد جمعدار جا چکا تھا اور پہرے داروں نے سوائے ایک
کے باقی سارے دروازے بند کر دیئے تھے۔ لیکن جانے کالے خان ملاقات
کے بعد کہاں چلا گیا تھا کہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔ میں نے یا اللہ یہ تیری کیا حکمت
تو سمجھا وہ کیوں کر حق سے اتر سکے گی۔ آج تو پیسے تھے اور دی گئی تھی۔ پھر
میں نے اپنے گھر والوں کو کوسنا شروع کیا کہ یہ راستے میں گھر جانے پہ بھی پہنچ
نہ آ سکے تھے۔ میں کرسی پر بیٹھا تھا کہ آخری کھلے دروازے میں سے کالے خان
اندر داخل ہوا۔ میں نے دور سے دیکھا اس کی آنکھیں شعلے رہی تھیں اور ایک
گہری اور تیز مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پہ پھیل رہی تھی۔

قریب آ کے وہ ٹکا تو آپ ہی آپ کھلکھلا کے ہنس دیا۔ مجھے حیرت ہوئی
کہ آخر یہ ہنسی کیسی! میں نے تو کوئی بات نہیں کی۔ ہنسی ختم ہوئی مسکراہٹ بن گئی
تو اپنے تختے پر بیٹھ کے اس نے کمیسہ اوپر اٹھایا۔ ایک لفافہ لگا ہوا تھا اور وہ
ملفوف۔ وہ لفافہ میرے سامنے رکھ کے اس نے جو صاف دستر خوان کا کپڑا
کھولا۔ کنارے سے ابھر آئے گئے۔ گرمی میں تھے ہوئے پراٹھے ایک تختے پہ بچھے
رکھے تھے اور ان کے اوپر بچھے ہوئے انڈوں کی بھرواں سی ڈھیری بنی ہوئی تھی
گھی کی سوندھی سوندھی خوشبو جب نتھنوں سے ٹکرائی تو پیٹ سے ڈھیر سارا پانی
منہ میں پھیل گیا۔ کالے خان پھر ہنس دیا اور کہنے لگا۔ "یار! ہم تو دال اور ساگ
کھا کھا کے بیزار ہو رہے تھے آج تو ان کے بس ہی کی بات ہی نہیں۔" اس
نے یہ نہیں بتایا کہ یہ پراٹھے آئے کہاں سے تھے۔ اور کون لایا تھا۔ اس نے
شاید پہلی بار اتنی بے تکلفی سے یار کہہ کے مجھے پکارا تھا۔ اس کی ہنسی تھی کہ رکنے
کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ ہم دونوں نے دیر تک انتظار نہ کیا اور دونوں نوالے اٹھاتے
ہوئے جیسے صدیوں کے بھوکے ہوں۔ ہم بڑے بڑے نوالے تیزی سے
اتار رہے تھے۔ میں نے خود ہی ہنس کے کہا۔

"واقعی کالے خان۔ آج تو جیسے قسمت بھی ہمارا ساتھ دے رہی ہے
ورنہ آج تو دال آئی تھی۔ تمہاری یاد دیکھ کے ہی طبیعت صاف ہو جاتی۔" کالے خان



سامنے سے ۔۔۔ نکلے تھے اور تیوری پر آگے سے زیادہ نکل آئے تھے کہ وہ ہونٹ آپس میں بھینچ کر کسی سی لگا ہوا سے سمجھ رہا اس کے چہرے پر کچھ ایسی کیفیت کے ساتھ بہت سے جذبات پیچھے چھپے ہوئے تھے وہ سمجھا جا سکتا تھا لیکن ساتھ ہی وہ جیسے کسی بات میں چپ کے گھٹنے پر سر رکھ کے کچھ سوچا بھی جا رہا تھا۔ یہی آج حرکت ایک پہیلی سی تھی جو کھولنے پر بھید نظر نکلی۔ اس میں تو بہت سگریٹ اور ماچسیں ہی تھیں۔ بس دو پر لفظ اور وہ منہ دھائی اور وہ گڑ کی بھیلیاں۔ میرے پاس بیٹھ کے پہلے اس نے سگریٹ جلایا، پھر بولا۔

"دین محمد۔ منی کی صحت تو بہت اچھی ہو گئی ہے یار۔ اس کے گال تو ناک کی طرح سرخ ہو گئے ہیں اور اس کا جسم تو پہلے سے بھی زیادہ ہو گیا ہے پر ابھی وقت نہ تھا اس نے کچھ بات کے بتائی تھی۔ پھر جیسے کہ وہ کہہ رہی ہے جاؤں گی، کہتی تھی، ہفتے بعد آؤں گی تو پھر اور دے جاؤں گی۔ یار دین محمد! میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا کہ وہ آج کل کے بات کیوں نہیں کر رہی تھی۔ آج تو وہ منظر میں ملاقات کے بات ہی نہ کر رہی تھی یار! پہلے تو اس کی آنکھیں میرے چہرے پر اتر جاتی تھیں۔ جانے کیا بات ہے!" کالے خان کا اور اس کا چہرہ اور اس کی انگلی کو آنکھیں ہی بتا رہی تھیں کہ اس مرتبہ منی نے اس پیار کی بات کا اظہار نہیں کیا تھا جس کا وہ پہلے کرتی آئی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔

"یہ صرف تمہارا وہم ہے کالے خان۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا شوہر وہاں کوئی اور جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا ہو۔ پھر دیکھنا! جب تم بھی اس کے پاس نہیں تو اس کو غم تو کرنا ہی ہے، پریشان تو ہونا ہی ہے۔" لیکن اس بار کالے خان کی آواز جھڑ اکلی جیسے کسی بڑے فرشتے کو اٹھا رہی ہو۔

"لیکن پہلے تو ہم جوڑے آنگن میں ایک دوسرے سے بغل گیر ہو جاتے تھے۔ ایک دوسرے کا بوسہ لیا کرتے تھے لیکن آج جب اس نے پیار کرنے میں اسے بوسہ لیا تو وہ اپنا چہرہ پھیر کے بڑی ناگواری سے کہنے لگی۔ کوئی دیکھ رہا ہو گا کیا کر رہے ہو تم کالے خان! اب اس بات کا پریشانی سے کیا واسطہ ہے یار!" اس نے خود ہی جھٹ بڑی لاپرواہی سے کہا۔ "چھوڑو بھائی! میں بھی کیا دکھڑا لے بیٹھا ہوں۔ ہفتے بعد ملنے آئے گی تو سب کچھ پوچھ لوں گا۔" پہلے کی طرح ایک ہی تھڑے پر بیٹھ کے ہم نے کھانا کھایا۔ ایک ساتھ کمبل اور اوپر کھینچے لیکن کالے خان نے کروٹ بدل کے منہ دوسری طرف کر لیا۔ جیسے وہ جلد سو جانا چاہتا ہو۔

کہنے کو تو اس نے بڑی لاپرواہی سے کہہ دیا تھا کہ بات معمولی ہے لیکن اب یہی معمولی بات اس کے ذہن میں ایک طوفان سا بپا کئے ہوئے تھی۔ اس رات تو اس نے صرف کروٹیں ہی بدلی تھیں۔ لیکن اگلے سات دن اس کوئی نغمے اسے اندر ہی اندر کھائے جا رہی تھی۔ کبڑے کے اس حقائق کی طرح جس کے اوپر کا ایک بھاری گٹھڑ تو ہٹ جاتا ہو لیکن نیچے سارا کا جیسے کوئی کچھڑا بوجھ پڑ گیا ہو وہ اب بھی ہنستا تھا، باتیں بھی کرتے کچھیں، ہنستا تھا لیکن بات جو اس کے دل میں چبھ گئی تھی، مارے خوف کے وہ اس سے کچھ سہم سا گیا تھا۔ اور بیٹھے بیٹھے اس بڑی طرح چپ ہو جاتا جیسے اب پھر بولنے کا نام بھی نہیں لے گا۔ اتنا مجھے یقین تھا مگر منی نے اس سے کچھ کہا ہو گا تو وہ مجھے ضرور بتا دیتا۔ آج تک اس نے کبھی مجھ سے بات چھپا کے رکھی کون سی تھی جو میں اس پر شک کرتا۔

اس بار جو سگریٹ اور ماچسیں تھیں اس کیلئے لائی تھی کالے خان نے انہیں اٹھا کے بھی نہیں دیکھا تھا۔ ملاقات سے آ کے اس نے ان چیزوں کو جس طرح رکھا تھا، ایک ہفتے بعد بھی وہ اسی طرح پڑی ہوئی تھیں۔ اس ایک ہفتے میں کالے خان نے منی کے بارے میں بہت کم بات کی تھی۔ زیادہ وہ تبدیلیوں اور جیل کے متعلق ہی باتیں کرتا رہا تھا۔ البتہ اب وہ قیدی بار بار کے پاس دن میں دو مرتبہ جانے لگا تھا۔ وہ تو شاید وہ آنکھ بچا کے تیسری مرتبہ بھی چلا جاتا۔ جانا وہ پڑا امید تھا کہ ممکن ہے اس کی اپیل کا جواب آ گیا ہو۔ لیکن واپسی وہ ہمیشہ ہی منہ لٹکائے آتا تھا۔ ان سات دنوں میں ایک بار دم اس نے صرف اتنا کہا تھا۔ "معلوم نہیں کب فیصلہ آ جائے اور میں منی کے گھر چلا جاؤں۔ تم جانتے ہو میں کیا کروں گا؟" پھر وہ خود ہی کہہ دیتا۔ "چھوڑو بھی۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔"

ٹھیک سات دن بعد جو جیلر کا جمعدار آ کے بتایا کہ کالے خان! تمہارا ملاقاتی آیا ہے تو جمعدار نے مسکرا کے بھری تمازت میں کہا تھا۔ "کالے خان اب تو کچھ زیادہ ہی کاٹتا کی آنے لگی ہیں۔ ایک بات کا خیال رکھنا۔ جیل میں اپنا گھر نہیں کر جس کا جی چاہا منہ اٹھائے چلا آیا۔ یہاں ہفتے میں صرف ایک ملاقات کی ہی اجازت ہے۔ جاؤ تم۔" کالے خان نے اندر ہی اندر پیچ و تاب کھائے لیکن پھر یہ حقیقت بھی تو تسلیم کی تھی کہ وہ صرف ایک قیدی تھا۔ ڈیوڑھی میں کھڑا ہوا سے میں بھی اس کے ساتھ ہی گیا۔ کالے خان کو خیال یہی ڈر رہا تھا۔ ورنہ وہ مجھے ضرور واپس جانے کو کہتا۔ وہ سلاخوں کے اندر کالے خان انتظار کرنے لگا۔ اتنی دیر میں پر تو پہنچ کر دیوار سے ٹیک لگا کے ایک کونے میں بیٹھ گیا۔

ہم ساتھ آئے کھڑکی ہو گئی ہو یا ہی نہ سامنے دیکھا تو زنانہ ہال کھلا کے
اور مجھ نا سامنے دروازہ کھینچنے کے ایک طرف ہو گیا۔ عورت اندر آ کے
ترنت چلی گئی۔ اس نے نقاب الٹا تو میں نے شیشے میں سے دیکھ لیا
تو کالے خان کی باتوں سے کہیں بڑھ کے حسین تھی۔ اس کے لب
سے ہوائی اس طرح پھٹ پڑی تھی جیسے ندی میں باڑھ آ گئی ہو۔ مجھے
کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی اور دوسرے گیٹ سے اندر چلا آیا۔

ملکی مرچیاں اور پانی اپنے سامنے رکھ کے میں کالے خان کا انتظار
کا۔ میرا خیال تھا وہ آج بھی جلد ہی لوٹ آئے گا۔ لیکن پہلے سنتری نے
ہو کر نا بند کیا۔ پھر سنتری نے سب کی گنتی کی۔ اس کے دروازے
بیرک میں بتیاں جل اٹھیں اور جب سپاہی آخری دروازہ بھی بند کرنے
جا رہے تھے کالے خان بیرک میں داخل ہوا۔ مجھے تسکین یوں ہو گئی تھی کہ
ان باتوں میں ابھی وقت کا احساس ہی نہیں رہا، لگتا ہی کالے خان
کو ہم نہ جانے کیا بات ہے؟ مجھے اس کا یقین بھی خال خال سا
تھیں۔ اس کے ہونٹوں پر پپڑی سی جمی ہوئی تھی۔ اپنے تھڑے کے
پاس اس نے میری طرف دیکھا بھی نہیں۔ کوئی بات نہیں کی جیل اتارے
بالکل ویسے ہی لیٹ کے کمبل اوپر کھینچ لئے۔ میں نے کالے خان کی
طرف دیکھا اس کی سانس ہموار نہ تھی۔ میں چاہتا تھا بولوں لیکن پھر خود ہی رک گیا
کافی دیر گزر چکی تھی اور سپاہیوں میں سلاخ کے اوپر ایک جھجکی سی اٹھی
ہوئی تھیں۔ پھر کسی طرح ہمت کر کے میں نے اس سے کہا۔ "اٹھو
کھانا تو کھا لو۔" کالے خان کا منہ میری طرف تھا۔ اس نے چہرہ اٹھا کر نہیں
دیکھا۔ "تم کھا لو میرا ابھی جی نہیں چاہ رہا۔" مجھے اس بار شدت سے احساس
ہوا کہ ضرور کوئی بات ہو گئی ہے۔ اپنی جگہ سے اٹھ کے میں اس کے پہلو میں جا بیٹھا
اور ہاتھ لگایا۔ اس کی آنکھوں کے کنارے بھیگے ہوئے تھے۔ "تم تو
رو رہے ہو کالے خان۔ اٹھو، مجھے بتاؤ تو سہی بات کیا ہے؟" آنسو پونچھنے
کو آنکھیں صاف کیں۔ لیکن اٹھا پھر بھی نہیں۔ "اٹھو نا یار لگتا ہے تم کو
تمہارے اندر ہی تمہارے بیٹے کا دکھ کھائے جا رہا ہے؟" تھوڑی دیر چپ رہا تھا اور
پھر دکھ سے تنگ آ کے اٹھ بیٹھا۔

"معلوم نہیں میری بیٹی کا کیا ہو گا۔ کیا ہوا ہے۔ کیا ہوا ہے، معاملہ بگڑتا ہی تو
[illegible] اس بار بات سے کہیں نہیں بنتی۔ کوئی بات ابھی مزید رہ گئی کہ جسے کہنے کی
[illegible] ہمت ختم ہو گئی ہو۔ لیکن ہر بار جیسے بات چھپ جاتی ہے۔
[illegible] ان نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی جیسے اس کا اور
[illegible] ہی نہ ہو۔" میں نے پھر دوبارہ کچھ بات آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ لیکن
[illegible] ملاقات بے معنی رہی اور خاموشی ہی چھائی رہی۔
اس رات بھی وہ کالے خان کے ساتھ لیٹا رہا تو تھا لیکن اس کے
[illegible] کالے خان کا سب کچھ

بچھڑ گیا تھا۔ وہ پچھلی طرح رات دن ایک ہی سوچ میں ڈوبا رہتا۔ اب کھانا تک
نہیں تھا۔ وہ نہ تو بیٹھ سکتا تھا اور نہ ہی سو سکتا تھا۔ کتنے ہی دن اس نے بغیر
کچھ کھائے گزار دیے تھے۔ ایسی ہی دوائیں اس نے بغیر سوئے کاٹ دیں۔ میں نے ایک
دو بار کوشش کی تھی کہ اسے تسلی دوں لیکن اب تو جیسے میری ہمت بھی جواب دے
گئی تھی اور پھر کالے خان خود بھی تو یوں انجان بن گیا تھا جیسے مجھے جانتا ہی نہ ہو۔
پانچ چھ ہی دنوں میں اس کا رنگ زرد پڑ گیا تھا اور چہرے کی ہڈیاں
ایکدم باہر نکل آئی تھیں۔ اس کے کپڑے میل سے سیاہ ہو چکے تھے۔ داڑھی
بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ لیکن اس نے نہ تو کپڑے دھوئے تھے اور نہ ہی شیو
بنوائی تھی۔ اسے تو خود اپنے آپ کا ہوش نہ تھا کپڑوں کی فکر کون کرتا۔

جس شام بھی اس سے ملنے آخری مرتبہ آئی، اس سے دو ہی روز قبل
اسے بخار آنے لگا تھا اور وہ میرے مجبور کرنے پر ہسپتال میں داخل ہو گیا تھا
دوپہر کے وقت اس کی حالت اچھی تھی۔ کم از کم بخار نہیں تھا۔ اس کا جی تو چاہتا
تھا کہ بیرک میں چلے لیکن میں نے ہی اسے روک دیا۔ چھٹی سے پہلے ہی آ کے
میں بیٹھا ہی تھا کہ بڑے بابو قیدی میرے پاس چلے آئے۔ انہیں بھی کی ڈاک
سے چٹھی ملی تھی اور اب بات ان کے پیٹ میں ٹھہر نہیں رہی تھی کہ کالے خان
کی اپیل منظور ہو گئی تھی اور اس کی سزا سات برس کر دی گئی تھی۔ بابو قیدی یہ
بھی کہہ گئے کہ ابھی کالے خان کو پتہ نہ چلے اس لئے کہ جیلر صاحب نے منع کیا
تھی۔ بابو چلے گئے تو بہت دیر رکو کے میں نے سوچا کالے خان سنے گا تو کتنا خوش
ہوگا۔ معافیاں دے دے کے وہ سات برس تو ویسے ہی پلک جھپکتے میں گزر جائیں
گے۔ اس وقت دل اور زیادہ بیقرار ہو رہا تھا۔ میں سر جھکا کے آپ
ہی آپ ہنستا ہوا الماری میں جٹ گیا۔

شام چھ بجنے کی دیر تھی کہ میں نے جلدی سے اٹھ کے جیل
پہنی۔ کھیس کی بکل ماری اور بھاگتا ہوا ہسپتال کی طرف ہو لیا۔ بابو نے جیب
میں جھوٹا کالے خان نے کوئی ذکر نہ کیا تھوڑی دیر پہلے جو بات اس سے نہ
کہی جائے۔ پھولے سانس اور خوشی سے چھلکتے دل کے جب میں ہسپتال
آیا تو کالے خان وہاں نہیں تھا اسے تو آج ہی رخصت کر دیا گیا تھا۔ میں پھر بھاگتا ہوا
بیرک چلا آیا کہ وہ ہسپتال میں نہیں تو بیرک ہی میں ہوگا۔ لیکن وہ تو وہاں بھی نہ تھا
چلا گیا تھا کیونکہ اس کی ملاقات آئی تھی اور سے ڈیوڑھی میں بلایا گیا تھا۔

بنروا نے کھانا تقسیم کیا اور میں اپنا گوشت کے لئے بیٹھا تھا
کالے خان تیز تیز سانسوں میں سے گھورتا ہوا میرے پاس آیا۔ اس
کی ملاقات آئی تھی نا۔ میں نے فوراً اس کی طرف دیکھا۔ چہرہ بے سکون تھا۔
کچھ اس قسم کا جوش اس کے چہرے پر چھایا ہوا تھا۔ کالے خان مردہ سی ہنسی ہنس کے
بولا جیکٹ میں نے کہا "تو مجھے اپنی بات پر سے یاد آ گئی۔" میں نے جلدی
سے کہا چچی ایک خوشخبری سناؤں کالے خان؟" کالے خان کا سر فوراً جھک
گیا اور وہ بڑے درد سے ہونٹ بھینچ کے کہنے لگا۔ "ٹھہرو، پہلے میری سن لو"

ہوں۔ لیکن آج آخری کال یا رقم بھی مل کے گئی ہے۔" میرے قدموں تلے سے
زمین سرک گئی۔ مطلب یہ ہے کہ تم کالے خاں ہو۔ تمہارا ذہن تو ٹھکانے ہے نا"
کالے خاں تو شروع ہی سے پاگل تھا۔ پاگل مکمل کر کے بولا۔

"میرے ذہن کو کچھ نہیں ہوا ہے۔ دیکھو، تو دنیا ہی بدل گئی ہے
ذہانت ہو گئی ہے کہ قسمت سے میرا اختیار چھن رہی تھی اور جیسے تم پیدا ہو گئے
تھے۔ تبھی آئی تو میں نے کو کھولا یا۔ اس کا چہرہ جذبات سے عاری تھا۔ بیٹو کے
بڑی بے رخی سے کہنے لگی۔ "کالے خاں! اس جیل میں رہ کے کبھی تم نے
میرے متعلق بھی سوچا ہے۔ تیس برس تم یہاں اکیلے برس گزار سکتے ہو۔ لیکن بتاؤ تو
میں یہ مدت کیوں کر گزاروں۔ یہ تو ایک زندگی کے برابر ہے۔ کم از کم میں اتنا
طویل انتظار نہیں کر سکتی۔ مجھے کیا پڑی ہے کہ میں تمہاری آس پر اپنی زندگی، اپنی
جوانی سب کچھ برباد کر ڈالوں۔ ہاں! مجھ سے نہ بچا تم۔ تم مجھے۔ طلاق دے دو" اس
اس کی غیر متوقع باتوں سے گھبرا گیا تھا۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ
کیا کہہ رہی ہے۔ میں نے پوچھا تو کہنے لگی "تم مجھے طلاق دے دو۔" یہ کہہ کر
کالے خاں چپ ہو گیا۔ میں عجیب سی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔
کالے خاں کو اپنی بیوی پر کتنا اعتماد تھا۔ لیکن وہ اس کے اعتماد کو ٹھکرا کے گئی
کالے خاں سے پھر پوچھا۔

"آج تک تم کہاں رہے ہو تھا۔ اسے بالکل چھوڑ کر، پھر ایک
جا کے کھاتے ہیں۔ دیکھو تو میرے پاس آج کتنے پیسے ہیں۔ آج
میں ماں کو لالا اور رشتوں کی ایک لڑکی نکال کے میری گود میں پھینک
کہنے لگا "تمہی نے اپنا حق معاف کر دیا ہے اور یہ تمہیں ہر ذرا بھی
ہے کہ جیل سے باہر نکلو تو کسی اور سے شادی کر لوں۔" مجھے
ذہن بالکل ماؤف ہو گیا تھا۔ میں کچھ بھی نہیں سن رہا تھا، جیسے
نہیں رہ سکا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "لیکن کالے خاں تم
جواب دیتے کالے خاں نے نگاہیں اٹھا کے میری طرف دیکھا اور پھر
کے دھندلا دیکھنے لگا۔

"میں اسے کیوں کر کہتا دوست! کہ وہ میرا انتظار کرے
اکیس برس کا! میں نے اسے طلاق دے دی۔" میرے ذہن سے
گرپڑی۔ اسے دور تک گڑگڑاہٹ سی پھیلتی چلی گئی۔
میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس سے کیسے کہوں کہ میرے
کالے! تمہاری تو اپیل منظور ہو گئی ہے اور تمہاری سزا ۔۔۔

یہ شتے ۔۔۔ تمبیت ۔۔۔ کے لئے

* بجری * آف * موم

ماڈرن ۔۔۔

…یعت کیسی ہے بیٹا ——— ؟"

تارا کے منہ کا ذائقہ تلخ ہونے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ کہہ دے …ماری بلا سے امی میں مروں یا جیوں ——— ؟ لیکن لفظ حلق ہی میں …ٹک گئے۔ اس نے گردن موڑ کر دیکھا ——— اس کی مسہری سے …را دور صوفے کے پاس عالمہ آپا سہمی ہوئی کھڑی تھیں۔ ان کی آنکھیں …بھیگی ہوئی تھیں ——— اور چہرہ اترا ہوا تھا ——— …وہ مجرموں کی طرح یوں خاموش کھڑی تھیں جیسے یہی تارا کی …مجرم ہو۔ ساجدہ صوفے پر بیٹھی حیران ہو ہو کر کمرے کی چیزیں دیکھ …رہی تھی ——— تارا نے بیزار ہو کر آنکھیں موند لیں۔

"ناراض ہو بیٹا ——— ؟ اپنی اماں سے ناراض ہو ——— …را ——— تارا بیٹا ——— ابھی تک ناراض ہو ——— ؟"

…رضیہ بی بڑی لجاجت سے پوچھ رہی تھیں۔ تارا کے اندر آندھی کے …جھکڑ چلنے لگے۔ نفرتوں کا آتش فشاں پھٹ پڑا۔ اس نے نچلا ہونٹ …دانتوں میں داب کر کروٹ بدل لی۔

"تارا ——— بیٹا ہم سے بات نہ کرو گی کیا ——— ؟"

…انہوں نے تارا کے سر پہ ہاتھ پھیرا تو تارا نے سر پہ دوپٹہ ڈال لیا۔

"تارا مجھے معاف کر دو ——— مجھے معاف کر دو بیٹا۔ …میں نے تمہیں دھوکا دیا ہے نا ——— پر میں تمہاری دشمن نہیں …ہوں بیٹا ——— میں تمہاری بھلائی چاہتی تھی۔ میں تمہاری …زندگی بنانا چاہتی تھی ——— میں چاہتی تھی کہ تم شہزادیوں …کی طرح رہو ——— کار میں بیٹھو ——— بنگلے میں رہو ——— …کسی بڑے آدمی کی بیوی کہلاؤ ——— بیٹا تم اسی قابل تھیں ——— …میں نے تمہیں پڑھایا لکھایا تھا ——— تم شہزادی ہو بیٹا ——— اور …شہزادیاں جھگیوں میں نہیں رہتیں ——— شہزادیاں تو اتنے …بڑے بڑے بنگلوں میں راج کرتی ہیں ——— وہ لڑکا جس کو تم …پسند کرتی تھیں وہ خود اپنے ماں باپ کا سہارا تھا ——— وہ تمہارا …بوجھ کیسے اٹھاتا ——— ؟ اور بیٹا تم جوانی کے بہکاوے میں آگئی تھیں، …بڑے آدمیوں کے لڑکے غریبوں کی بیٹیوں سے صرف دل بہلا سکتے …ہیں شادیاں نہیں کر سکتے بیٹا۔"

تارا نے گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھا کہ کہیں احسن کی امی باتیں نہ سن لیں ——— رضیہ بی نے وہیں اس کے سرہانے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "گھبراؤ نہیں ہماری باتیں کوئی نہیں سن رہا ——— یہ شریف اور خاندانی لوگ ہیں۔ مجھے پتہ تھا کہ تمہیں یہ لوگ بہت پسند آئیں گے ——— تم سب بھول جاؤ گی احسن میاں جیسا شوہر تو قسمت والوں کو ملتا ہے بیٹا۔"

"لیکن میں کچھ نہیں بھولی مجھے اپنی خوش قسمتی پہ ناز ہے۔ اتنا بڑا دھوکہ دینے سے بہتر تھا کہ آپ میرا گلا گھونٹ دیتیں۔ میں مر جاتی لیکن یہ عذاب تو نہ سہتی۔" تارا نے دبے دبے لفظوں میں زہر اگلا تو رضیہ بی کے آنسو بہہ نکلے۔

"میری بیٹی میری چاند ——— مجھے معاف نہیں کیا تو نے مجھے معاف کر دے ——— مجھے معاف کر دے تارا بیٹا۔" رضیہ بی نے سچ مچ اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔ "میں تیری دشمن نہیں ہوں بیٹا۔ میں جانتی ہوں تو مجھ سے نفرت کرتی ہے۔ لیکن بیٹا میں تجھ سے نفرت نہیں کر سکتی میں ماں ہوں اور تجھ سے اتنی ہی محبت کرتی ہوں جتنی عالمہ اور چاندنی سے۔ ہاں مجھے احساس ہے کہ میں نے تجھ پر ہمیشہ سختی کی لیکن بیٹا میں تجھے اس لئے ڈانٹتی تھی کہ تو اپنے آپ کو اپنی بہنوں سے زیادہ اچھا، زیادہ خوبصورت اور قابل نہ سمجھنے لگے۔ میں تو تجھے اس لئے ڈانٹتی تھی بیٹا کہ تو مجھ سے ڈرتی رہے اور گھر سے باہر نکلے تو تیرے قدم نہ بہکیں۔ میرا خوف تجھے سنبھالے رہے۔ تیرے ابا تجھے بہت چاہتے تھے نا اور زیادہ پیار سے بچے بگڑ جاتے ہیں۔ میں بھی تجھ سے پیار کرتی تو تو بھی بگڑ جاتی۔"

تارا ہنس پڑی ——— بڑی زہریلی ہنسی تھی اس کی۔

"اچھی منطق ہے یہ ——— لیکن میں نے آپ سے شکوہ کب کیا ہے۔ آپ مجھے میرے حال پہ چھوڑ دیں۔" اور رضیہ بی نے جانے کیا سوچ کر اپنے آنسو پونچھ لیں۔ احسن کی امی نے دروازے کو ہلکے سے بجا کر کہا تھا۔ "کیوں رضیہ بہن ہم آسکتے ہیں ؟"

رضیہ بی دوپٹہ سنبھال کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ "آیئے آیئے آپا بی ——— پوچھ کیا رہی ہیں۔ اجازت تو ہم لوگوں کو لینا چاہئے۔"

تارا سنبھل کر بیٹھ گئی۔ سارا بدن ٹوٹ رہا تھا، آنکھیں جل رہی تھیں، لیکن وہ مجبوراً بیٹھ گئی۔ احسن کی امی کے پیچھے نیلا اور نجمہ ٹرے لیے ہوئے چلی آئیں۔ ٹرے میں رکھی ہوئی پلیٹوں میں پھل، میوے اور مٹھائی تھی۔ ان دونوں نے صوفے کے آگے رکھی ہوئی میز پر ساری چیزیں سلیقے سے لگا دیں۔

"ارے بیٹی بیٹھو، تم کھڑی کیوں ہو۔" احسن کی امی نے نجمہ کو دیکھ کر کہا تو تارا نے نگاہوں سے دیکھا۔ احساس ہی جاگ اٹھا۔ اپنی آنکھوں میں ... ایک ٹک اسے ہی دیکھے جا رہی تھی

میرا پہلا دن "آباد" ہو چکا تھا۔ بیرک میں قیدیوں کے سونے کیلئے اوپر نیچے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر سیمنٹ کے تخت نما فرش بنے ہوئے تھے۔ انہی کو ہم اپنا گھر اور اپنے بستر کہتے تھے۔ لیکن یہ اپنے میری بدقسمتی تھی یا نصیب کا چکر کہ پچھلے چار برس میرے ساتھ کے دونوں فرش کسی کو بھی الاٹ نہ ہوئے اور کسی ساتھی کسی ہمسائے کا انتظار کرتے کرتے میری تو جیسے مونچھیں بھی سفید ہو چلی تھیں لیکن بالکل تمام سورج کے غروب ہوتے ہی اور گنتی کے وقت سے پہلے جب میں یہاں آیا تو دو نمبر گھر کالے خان کو الاٹ ہو گیا تھا۔ میں نے مارے خوشی کے روٹی بھی نہیں کھائی۔ اپنے دوست کو دیکھ کے تو میری بھوک ہی مٹ گئی تھی کالے خان کو دیکھ کے مجھے یہ بات تو یاد ہی نہیں رہی تھی کہ وہ نیا قیدی ہے اور اسے اس بیرک میں آئے ابھی چند گھنٹے ہی گزرے ہیں۔

اسے جب میں نے پہلے پہل دیکھا تو مجھے یوں لگا جیسے کوئی جیل کا دادا فلم جیسی جیل کے بھاری حرکات لوٹ کر سے یہاں چلا آیا ہو جسم بارعب، چہرہ بھرا ہوا اور طاقتور رستا، اسی طرح کے دلدار دئے بھی تھے۔ کالے خان نے کندھے کے پیچھے کپڑے اور میلی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ اور قمیص کی بغل مارے ہوئے تھا جو کسی قدر ڈھیلی ہو گئی تھی اور اس کے اندر سے کالے خان کی چوڑی چکلی بغیر بنیان جیسی مضبوط چھاتی جھانک رہی تھی۔ بازوؤں پر قمیص کی گرفت سخت ہونے کی وجہ سے اس کے پٹھے اور مچھلیاں ابھری ہوئی تھیں۔ اس کا چہرہ گو اس وقت زرد پڑ گیا تھا لیکن پھر بھی اس بات کا آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ چند ہی دن پہلے وہ گھی بھر گھُٹتے ہوئے تازہ انار کو بھی شرماتا ہوگا۔ پھر میں نے اس کے ہاتھوں کو دیکھا تھا وہ کھیس سے باہر تھے۔ کالے خان نے اپنا چہرہ بڑی دیر سے ہتھیلیوں میں چھپا رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ مضبوط، سیدھے اور کسی قدر کھُردرے تھے۔ میں نے سوچا تھا۔ ان ہاتھوں میں اگر قیدی کی گردن آجاتی تو شاید ہی کسمسا سکے۔ اس وقت بیرک سے باہر ساری روشنیاں جل چکی تھیں۔ سورج ڈوب چکا تھا اور سیاہ رات جیل کے اردگرد پھیل گئی تھی۔ بیرک کے اندر جھنڈے تو سارے بلب جلتے رہتے لیکن پھر آخری گھنٹی کے ساتھ ہی وہ سب کے سب سوائے ایک کے بجھ گئے۔ یہ روشنیاں اس وقت گل ہوتی تھیں جب داروغہ صاحب گنتی اور "سب اچھے" کے بعد لوٹ جاتے تھے۔ ان کے جاتے ہی قیدی اپنے اپنے گھروں سے نکل آتے اور بیرک کے درمیان جمع ہو کے اتنا ادھم مچاتے جیسے وہ کسی ذاتی طور پر ہوں پہرے دار بند دروازوں کے پیچھے سے ان کو تکتے چلے جاتے۔ وہ چپ نہیں ہوتے تھے۔ اگلی صبح انہیں خاصی سزا ملتی تھی لیکن کیا مجال جو وہ باز آجائیں۔ اس وقت بھی جب وہ سب اکٹھے ہو گئے تو میں نے فوراً سوچا کہ ادھر نہ جاؤں، کچھ نہ کہوں، کالے خان کا غم تو ہلکا کر دوں گا، اس کی ہمت ہی بڑھا سکوں گا۔ ذرا اوپر تک ہو تو میں نے ان سے پوچھا "کیوں دوست! کتنے برس کی قید ہوئی؟" کالے خان نے دونوں ہاتھ جواب نہ دیا۔ کھیس کے اندر اس کے ہاتھ ہلتے رہے جیسے وہ اپنی آنکھیں خشک کر رہا ہو۔ پھر سر اٹھا کے اس نے کہا "اکیس برس۔" میں گم سم رہ گیا۔ ہونا جا

بھی تو بہت ہو جاتی گی۔ اگر سات برس کی سزا ہوتی تو پھر بہت بنا ہنسا بھی تھا لیکن اکیس برس بہت بڑا عرصہ تھا سنا تھا دیکھنے سے تھوڑی ہی کٹنے والے تھے۔ البتہ اس بات سے میں نے اس کا چہرہ خود دیکھا تھا جس پر بڑی معصومیت پھیلی ہوئی تھی۔ مونچھیں ذرا بڑی تھیں۔ داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور اس کی آنکھوں میں بے بسی اور بے چارگی کی تو جیسے ایک گہری لوٹی کی جھلک سی تھی مگر قاتل ہر کسی کو ہوتا ہے لیکن کالے خان تو یوں لگ رہا تھا جیسے اس بیرک میں ایسے چھوٹے موٹے گناہ کے مر جانا ہو پھر میں نے سوچا، اس سے دوسری بات نہیں کرنی چاہئے اس بیرک میں آنے سے پہلے اسے یقیناً چند دنوں تک اوپر بڑی چار دیواری میں رکھا گیا ہوگا یہ وہ علاقہ تھا جہاں خطرناک اور سنگین جرائم کے ارتکاب کرنے والے قیدیوں کو فوراً اس کے نزدیک کوٹھڑیوں میں رکھا جاتا تھا اور جیسے تیسے جیل کے ماحول سے مانوس ہو جاتے اور اگر ان کے ذہن میں بھاگ جانے کا کوئی خیال ہے بھی تو اسے اپنے ہاتھوں ختم کر دیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ کالے خان بڑی گمبھیر عالم میں آئے اتنا زیادہ دکھی دکھائی دے رہا تھا۔

میں نے اس سے اور کچھ بھی نہیں پوچھا۔ اٹھ کے اسے بازو سے پکڑ کے اٹھایا۔ پہلے دو کمبل جھاڑ کے تہہ کر کے بچھائے اور باقی کے دو اوپر نیچے پھیلا کے رکھ دیئے۔ "سو جاؤ دوست! تمہیں نیند آ رہی ہوگی۔" مجھے اس بات کا علم تھا کہ اسے نیند نہیں آئے گی اس لئے کہ جب میں بھی یہاں آیا تھا تو آدھی رات تک نہیں سو سکا تھا۔ لیکن پھر یہ سوچا کہ نیند تو آتی بڑی بلا ہے جو پھانسی کے تختے پر بھی بچھا نہیں چھوڑتی۔ اس سے کہہ ہی دیا۔ "ابھی ابھی نیند آجائے گی۔" مگر کالے خان نے ایک لفظ تک نہ کہا۔ اپنا جوتا اتارا، کھیس کی بغل کھولے بغیر لیٹ گیا اس نے کمبل اوپر کھینچ لئے۔

جب میں اونگھ رہا تھا تو اس وقت میں نے اس کی سسکیوں کی آواز سنی تھی۔ پھر آدھی رات کے بعد میری آنکھ کھلی اور میں نے اسے سلاخوں سے جڑ کے کھڑا دیکھا۔ تو میں نے اسے کہا۔ "دوست! آجاؤ۔ کالے خان! ان سلاخوں اور اس بیرک سے سمجھوتہ کر لو میرے دوست!" کالے خان نے ذرا پلٹ کے میری طرف دیکھا اور پھر تیزی سے کمبل اوڑھ لئے۔ اور مجھے پھر اس کی سسکیوں کی آواز آنے لگی۔

پہرے دار بیرک کے سارے دروازے اس وقت کھولتا تھا جب سورج بہت اوپر آجاتا تھا۔ البتہ سورج کے طلوع کے ساتھ ہی وہ مشرقی حصے کے پہلے دروازے کھول دیتا تھا۔ اور جب داروغہ صاحب صبح کے "سب اچھے" کے بعد لوٹ جاتے تو قیدی ایک ایک کر کے بیرک سے باہر سامنے نل پر منہ ہاتھ دھونے چلے جاتے تھے۔ جب میں جاگا تو میرے سر کے اوپر اور چھت کے قریب روشندان کی چھنتی ہوئی کرنیں اندر داخل ہو رہی تھیں۔ کالے خان سو رہا تھا۔ میں نے اپنے کمبل تہہ کر کے ایک طرف رکھے۔ اپنی قمیص کی بغل ماری اور پھر کپ اٹھا کے باہر کی طرف ہو لیا۔ نل کا پانی تازہ اور نیم

کرتی ہوں بشرطیکہ سموسے ہوں گرم گرم چٹنی جیسی ہو!

میں نے اپنے برتھ پر ہولڈال کھولتے ہوئے کہا — "میں کوشش کروں گا ہم کچھ بولیں، اس میں کچھ نہ کچھ سسپنس ضرور ہو!"

اس طرح قہقہوں اور ایک دوسرے کو زیادہ سے زیادہ جاننے کی خواہش کے ساتھ ہمارے اس سفر کا آغاز ہوا تھا۔ دھام پور سے لکھنؤ تک۔ اس وقت پونے آٹھ بجے تھے۔ کالاگڑھ سے میں صبح ساڑھے پانچ بجے روانہ ہوا تھا۔ راستے کی برف کی طرح ٹھنڈی ہوا ابھی تک میری رگوں میں سمائی ہوئی تھی۔ سورج کی کرنوں کو کھڑکی کے ساتھ ٹکراتے دیکھ کر میں نے کھڑکی کھول دی اور ہمانتا سے کہا — "ہوا سیدھی آپ پر پڑے گی۔ ذرا ادھر ہٹ کر بیٹھ جائیے تاکہ دھوپ میں اپنا بدن سینک لوں۔"

وہ برتھ کے دوسرے سرے پر جا بیٹھی لیکن اس نے فوراً ہی اپنے تھرماس کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا — "میرے پاس چائے ہے۔ "وڈ یو لائک ٹو؟"

"ضرور ضرور! گھر سے چلتے وقت بھی میں نے تین کپ پیئے تھے لیکن معلوم ہوتا ہے۔ دسمبر کی سردی سے چائے اندر پہنچتے ہی برف بن گئی ہے!"

پلاسٹک کا ایک خوبصورت بھرا ہوا کپ میرے ہاتھ میں دے کر اس نے میری آنکھوں میں دیکھا۔ کہا "یوں بھی ٹریولنگ میں ٹھنڈی ہوا زیادہ ٹھنڈی محسوس ہوتی ہے۔ اس وجہ سے میں نے رات کی گاڑی نہیں لی۔"

مجھے تو رات کی گاڑی سے ریزرویشن ہی نہیں ملا اس لیے دن کی گاڑی سے جا رہا ہوں۔ پورا دن سفر میں غارت ہو جائے گا!

لیکن یہ کہتے کہتے مجھے یہ احساس بھی ہوا، اتنی دلچسپ ہمسفر کی موجودگی میں اس سفر کو بیکار کیسے کہا جا سکتا ہے! کہیں وہ بُرا نہ مان جائے! لیکن وہ اسی دلچسپی سے میری طرف دیکھے جا رہی تھی۔ بڑی بڑی بولتی ہوئی آنکھوں سے۔

میں نے موضوع بدلنے کے لیے اس سے پوچھا۔ "آپ مسز گجرال لکھنؤ کیسے جا رہی ہیں؟ کیا وہیں رہتی ہیں؟ میرا مطلب ہے اپنے ہسبینڈ کے پاس؟"

"جی نہیں!" اس نے میرے اندازے کی فوراً تردید کر دی۔ "وہاں میں اپنی آنٹی کے پاس جا رہی ہوں۔"

"مسٹر گجرال کیا دھام پور ہی میں رہتے ہیں؟" رشک کی ایک خاص کیفیت کے تحت میں نے ایک ہی لمحے میں اپنے ذہن میں تیس اکتیس برس کے ایک خوش پوش مہذب آدمی کا اسکیچ بنا لیا تھا۔ اس عورت سے بے پناہ محبت کرتا ہوگا۔ حسین خطوط سے آراستہ اس کے جسم اور ذہانت اور جذباتیت سے بھرپور دماغ و دل پر حکومت بھی کرتا ہوگا۔ یقیناً ایک غاصب یا جابر کی طرح نہیں۔ اس خوبصورت عورت کی پوری رضامندی کے ساتھ۔ ہمانتا کی آنکھیں اس وقت تک نسوانی غرور اور اعتماد سے چمک رہی تھیں لیکن میرے سوال پر وہ چمک اچانک معدوم ہو گئی۔ اس نے پہلے تو ادھر ادھر دیکھا، جیسے میری نگاہوں سے بچنا چاہتی ہو! پھر وہ سر جھکا کر بولی — "وہ تو سہارن پور میں ہیں۔"

ایک آخری گھونٹ لے کر میں نے کپ خالی کر دیا تو اس نے تھرماس پھر آگے کر دیا — "چلتے اور لیجیے!"

"اچھا دے دیجیے۔ اس وقت مجھے ایسی ہی چائے کی ضرورت تھی بہت اچھی بنی ہے۔"

ہمانتا جلدی سے اٹھتی ہوئی بولی — "وہاں تو وہ سروس کے سلسلے میں رہتے ہیں۔ کوئی گھر وغیرہ نہیں ہے۔ ان کا وہاں ریلوے ڈپارٹمنٹ میں لا اسسٹنٹ ہیں۔ ریسٹ روم ہی میں رہتے ہیں۔"

میں نے چائے کا بھرپور گھونٹ لے کر پوچھا۔ "یہ لا اسسٹنٹ کون سی پوسٹ ہوتی ہے؟ کیا ریلوے کے مقدموں کی پیروی کرتے ہیں؟"

"کچھ اسی طرح کی ہوگی ان کی جاب! ٹھیک ٹھیک تو میں بھی نہیں جانتی۔" ایک خفیف سی ہنسی اس کے ہونٹوں پر آ گئی۔

مجھے محسوس ہوا، مسز ہمانتا گجرال اپنے پتی میں بڑی دلچسپی نہیں رکھتی۔ نہیں تو گجرال کی سروس کے بارے میں اسے ایک ایک تفصیل کا علم ہوتا۔ ہوتی ہیں بعض عورتیں! جنہیں اپنے شوہر کی بس تنخواہ ہی سے مطلب رہتا ہے۔ کبھی جاننا ہی نہیں چاہتیں، وہ روپیہ کہاں سے لے آتے اور کتنی تگ و دو سے لاتے! ہمانتا بھی انہیں عورتوں میں سے ہے لیکن میں نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کیا بلکہ کہا "مسٹر گجرال کا پتہ بتلائیے گا۔ سہارن پور جانا ہوا تو ان سے ملوں گا۔ وہ بھی تو آپ لوگوں کی طرح خوش مزاج ہوں گے!"

اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر میں خالی کپ دھونے کے لیے ٹائلٹ کی طرف چلا گیا۔ واپس آیا تو اسے بہت سنجیدگی سے کچھ کہنے کے لیے تیار پایا جب تک میں سگریٹ کا پیکٹ نکال اور اطمینان سے ایک سگریٹ سلگاتا اس نے پیروں پر کمبل ڈال کر اس کی طرف متوجہ ہو کر وہ ... نے آپ سے کہنے لگی "اگر آپ ڈیڈی کو نہ جانتے ہوتے تو شاید میں اس بارے میں چپ ہی رہتی۔ لیکن واپسی پر آپ ان سے ملیں گے اور شاید اس کے بعد بھی کئی بار ملیں گے۔ اس لیے ہو سکتا ہے۔ ڈیڈی خود ہی آپ کو کبھی بتا دیں۔ بہتر ہوگا میں ہی سب بتا دوں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی سفید نازک گردن کو ڈیپ گرین کارڈیگن کے سب سے اوپر والے بٹن سے آزاد